



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لغات القرآن کی تدوین ، ترتیب اور طریق استفادہ کے متعلق ”پیش لفظ“ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ ”پیش لفظ“ بہت پیچھے رہ گیا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس ضمن میں ضروری نکات آپ کے ذہن میں مستحضر نہ ہوں۔ بنا پر یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان میں سے اہم نکات کو دوبارہ پیش کر دیا جائے۔ مثلاً :

۱۔ قرآن کریم کے جس لفظ کے معانی معلوم کرنے ہوں ، اُس لفظ کو ”فہرست الفاظ قرآنی“ میں دیکھئے جو صفحہ ۷۴ تا ۱۸۵ پر چھپی ہے۔ فہرست میں اُس لفظ کے سامنے جو ”مادہ“ دیا گیا ہے ، لغات میں وہ لفظ اُس ”مادہ“ کے تحت ملیگا۔

۲۔ عربی زبان میں الفاظ مختلف شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ لغات میں ہر لفظ کی تمام شکلیں دی گئی ہوں۔ اگر کسی لفظ کی کوئی خاص شکل لغات میں نہ ملے تو ، باب اول ”مبادیات“ میں دیکھئے کہ اُس شکل میں پہنچ کر لفظ کے معنی کیا ہو جاتے ہیں۔ اس کے مطابق معنی متعین کر لیجئے۔

۳۔ قرآنی حوالوں کی صورت یہ ہے کہ اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً (۳۸) سے مراد ہے سورہ آل عمران (تیسری سورت) کی آیت ۷۸۔

۴۔ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کے نسخے میں کوئی آیت اُس نمبر کے سامنے نہ ملے جو لغات میں دیا گیا ہے ، تو ایک دو نمبر اوپر یا نیچے دیکھ لیجئے۔ وہاں آیت مل جائیگی۔

۵۔ لغات میں جہاں آیت درج نہیں کی گئی بلکہ اسکا صرف حوالہ دیا گیا ہے ، اُس آیت کو قرآن سے نکل کر دیکھ لیجئے۔ یہ ضروری ہے۔ اس سے بات صاف ہو جائیگی۔

۶۔ لغات میں جن کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں ان کا تعارف ”پیش لفظ“ میں کرایا جا چکا ہے۔ اگر آپ ان میں سے کسی کتاب کو خود دیکھنا چاہیں تو ”پیش لفظ“ سے اس کی تفصیل معلوم کرائیں۔

۷۔ اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ لغات میں طباعت کی غلطی نہ رہے۔ لیکن اس کے باوجود غلطیاں رہ جائے گا امکان ہے۔ اگر آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو اُس سے مطلع فرمائیں۔

خدا کرے یہ لغات ، قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے میں آپ کی مددو معاون ثابت ہو۔ اس سے بھی مقصود ہے۔ والسلام۔



## مِثَالُ الْحَرْفِ

۱

### ا (حرف)

۱۔ یہ حرف استفہام بھی ہے اور حرف ندا بھی۔ یعنی کسی بات کے دریافت کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور کسی کے پکارنے کے لئے بھی۔ ذیل کی مثالوں سے اس کے استعمال کے مختلف انداز واضح ہو جائیں گے۔

۱۔ کسی سے کوئی بات دریافت کرنے کے لئے۔ جیسے اَزَّيْدٌ قَتَانِيْمٌ؟ (کیا زید کھڑا ہے)۔ اسکا جواب ہاں (نَعَمْ) یا نہ (لَا) میں آئیگا۔ یا اَزَّيْدٌ قَتَانِيْمٌ اَمْ عَمْرٌو (کیا زید کھڑا ہے یا عمرو)۔ قرآن میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے۔ اَآَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِآلِهَتَيْنَا (۲۱)۔ کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ تو نے کیا ہے؟ دوسری قسم کی مثال اَآَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ السَّعْمَاءُ (۶۹)۔ کیا تخلیق میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمان؟

۲۔ ایسا استفہام جس کے بعد نفی آئے اور اس نفی سے اقرار میں تاکید اور زور مقصود ہو۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِسَآَءَ حَكَمٍ اَلْحَقَّ كَيْمِيْن (۹۵)۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟ یعنی وہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے۔ یہاں اَ استفہام کے بعد لَيْسَ (نفی) ہے، لیکن اس نفی سے مراد اُس بات کا انکار نہیں جو آگے کہی جا رہی ہے بلکہ اس کا اقرار مقصود ہے۔ اور اقرار بھی تاکید اور شدت کے ساتھ۔

۳۔ ایسا استفہام جس میں توبيخ (ڈانٹنے) کا مفہوم پایا جائے۔ جیسے۔ اَفَغَيَّرَ دِيْنَ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (۳۴) ! کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ یعنی۔ ہیں! کیا یہ ایسا چاہتے ہیں۔

۴۔ ایسا استفہام جس میں استحقار آمیز تعجب اور طنز کا پہلو ہو۔ مثلاً قوم شعیب کا حضرت شعیب (علیہ السلام) سے کہنا کہ : **أَصَلُّوْا تَكُنْ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتَنَزَّلَ عَلَيْكَ فَاذْهَبْ أَتَانَا (۱۱۱)۔** کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ اپنے آباء و اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اس میں حقارت، طنز اور تعجب کی تمام کیفیات موجود ہیں۔

۵۔ تعجب کے لئے۔ مثلاً۔ **أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظَّلَّالَ (۲۵)۔** کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب کس طرح سایہ کو لجا کرتا ہے؟ مزید برآں دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان ۱۔

۶۔ کسی بات میں تاخیر ہو جانے پر تنبیہ کرنے کے لئے۔ مثلاً۔ **أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا... (۹۹)۔** کیا ایمان والوں کے لئے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ..... یعنی وہ وقت آچکا ہے۔

۷۔ ایسا استفہام جس میں درحقیقت حکم دیا جانا مقصود ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ بتاؤ! تم ایسا کرتے ہو یا نہیں؟ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو..... حضرت ابراہیم (ؑ) کے والد نے ان سے کہا **أَرَأَيْبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي (۱۱۱)۔** کیا تو میرے معبودوں سے کنارہ کشی کرتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ایسا مت کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو **لَارْجُمَنَّكَ**۔ میں تجھے ذلت آمیز سزا دوں گا۔

۸۔ دو باتوں کو برابر قرار دینا۔ لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب یہ **سَوَاءٌ** کے بعد آئے۔ مثلاً۔ **سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲)۔** تم انہیں (ان کی روش کے تباہ کن نتائج سے) متنبہ کرو یا نہ کرو۔ اُن کے لئے یکساں ہے۔

۹۔ ندا (ہکارنے) کے لئے کہتے ہیں **أَزْبَدُ أَقْبِلُ (۱)۔** (اے زبد آگے بڑھو) قرآن کریم میں اس کا استعمال نہیں آیا۔

۱۰۔ اُ ہمیشہ جملہ کے شروع میں آتا ہے۔ حتیٰ کہ واو عطف سے بھی پہلے۔ **أَوَلَمْ يَنْظُرُوا؟ أَمْ لَمْ يَسْمِعُوا؟** بعض اوقات اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے۔ خواہ اس سے پہلے۔ **أَمْ**۔ آ رہا ہو یا نہ آ رہا ہو\*۔ جیسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے کہ جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے پوچھا۔

قَالَ هَذَا رَبِّي\* (۱۰۰)۔ کیا یہ میرا رب ہے؟ یعنی تم کہتے ہو کہ میں اس کی پرستش کروں؟ یہاں حرف استفہام (ا) محذوف ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ (هَذَا رَبِّي\*) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نہیں بلکہ ان کے باپ (آزر) کا قول ہے اور اس کے بعد کَاذِبًا (فَلَمَّا قَاتَلَ قَالَ لَا أُحِيبُ\* الْإِلَهِينَ) (۱۰۱) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا جواب ہے۔ (یعنی یہ سب باہمی مکالمہ ہے) اس صورت میں قَالَ هَذَا رَبِّي میں (ا) کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔

نوٹ :- جب اس ہمزہ کے بعد کوئی ایسا لفظ آئے جس کے شروع میں بھی ہمزہ ہو تو یہ دونوں ہمزہ مل کر ”آ“ بن جاتے ہیں جیسے ”لَا نَ“ (۱۰۱) جو در اعلیٰ ”لَا نَ“ (کیا اب؟) ہے۔

## ا ب ب

الْأَبُ - گھاس خواہ خشک ہو یا تر۔ چراگہ۔ یہ لفظ ہر اس گھاس کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں\*۔ قرآن میں ہے۔ فَتَاكِيهَةً\* وَ آبًا (۱۰۲) مجاہد نے کہا ہے کہ فَوَاكِيهٌ وہ میوے اور پھل ہیں جنہیں آدمی کھاتے ہیں اور آبٌ - جانوروں کے کھانے کی چیزیں ہیں۔ اس میں سبز گھاس۔ چارہ۔ بھوسہ سب شامل ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) چراگہ اور (۲) قصد و ارادہ کے ہیں۔ غالباً اس لئے کہ جانور چراگہ کی طرف قصد و ارادہ سے جاتا ہے۔

صاحب مفردات نے کہا ہے کہ موبشیوں کے لئے آب کی وہی حیثیت ہے جو انسانوں کے لئے فَتَاكِيهَةً\* کی ہے۔ فَتَاكِيهَةً\* اس کھانے کی چیز کو کہتے ہیں جسے لذت کے لئے کھایا جائے۔ اس لئے آبٌ ان کھانے کی چیزوں کو کہہینگے جنہیں موبشی خوشی سے کھائیں۔

## ا ب د

الْأَبَدُ - غیر محدود زمانہ۔ ہمیشہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی طول مدت اور توحش کے ہوتے ہیں۔ رَاغِب نے لکھا ہے کہ أَبَدٌ سے مراد وہ طویل زمانہ ہے جس کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ یعنی جسے حصوں میں تقسیم نہ کیا جاسکے۔ اس کے برعکس ”زَمَانٌ“ اس مدت کو کہتے ہیں جس کا تجزیہ کیا جاسکے۔ اس اعتبار سے أَبَدٌ کا تشبیہ یا جمع نہیں آتی چاہئے تھی

لیکن اس کے باوجود اس کی جمع آبادی آتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ (آباد) عرب عرباء کے کلام میں کہیں نہیں آیا\*۔

أَلَا وَابْدُ - وحشی جانوروں کو کہتے ہیں۔ (کیونکہ عربوں کا خیال تھا کہ) وہ اپنی موت نہیں مرتے، ہمیشہ کسی آفت سے مرتے ہیں۔ غیر مانوس قوافی کو بھی آواید کہتے ہیں اور مصائب کو بھی\*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور حمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش، نفرت، بُعد اور جدائی کا مفہوم ہوتا ہے۔ أَبْدَا لَوَحْشُ کے معنی ہیں جنگلی جانور بدک کر بھاگ اٹھے۔

قرآن میں آبد کا لفظ یا تو اس معنی میں آیا ہے جس معنی میں ہم کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایسا نہ کریگا۔ مثلاً وَ لَنْ يَسْتَمْتِقُوهُ أَبَدًا (۱۶۵) وہ کبھی اس کی آرزو نہیں کریں گے۔ اور یا جنت وغیرہ کے لئے خَالِدِينَ فِيہَا أَبَدًا (۲۴) میں۔ ”وہ اس میں ابدی طور پر رہیں گے“۔ ابدی اور ازلی اصطلاحات قرآنی نہیں۔ (آزل کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا) لہذا آبد کے معنی زمانہ دراز کے ہونگے۔ چنانہ اہل جہنم کے متعلق جہاں یہ آیا ہے کہ خَالِدِينَ فِيہَا أَبَدًا (۱۶۶)۔ وہاں ان کے متعلق لَا يَشِينُ فِيہَا أَحَقَابًا (۲۴) بھی آیا ہے جس کے معنی زمانہ دراز کے ہیں (دیکھئے عنوان ح۔ ق۔ ب) اس کی تشریح مَادَامَتِ السَّحَابَاتُ وَالْأَرْضُ (۱۶۶) سے بھی کر دی گئی ہے۔ یعنی جب تک آسمان اور زمین ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آبد سے مراد غیر مختتم (نہ ختم ہونے والا) زمانہ نہیں۔ مزید دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵۔ زمان (TIME) کی فلسفیانہ بحث بڑی عمیق اور فنی ہے اس لئے ہم اس میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اس مقام پر ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جن معنوں میں ہم خدا کے لئے ازلی اور ابدی بولتے ہیں وہ مفہوم صرف خدا کیلئے مخصوص ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔

## ابراہیم (علیہ السلام)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام)، ترتیب زمانی کے اعتبار سے حضرت نوح (علیہ السلام)۔ حضرت ہود (علیہ السلام) اور حضرت صالح (علیہ السلام) کے بعد آئے ہیں (ان حضرات کے تذکار جلیلہ کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے) لیکن ملت ابراہیمی کے مؤسس اور معمار کعبہ کی حیثیت سے قرآن میں آپ کا ذکر بڑی شرح و بسط سے آیا ہے۔ تورات کا بیان ہے کہ حضرت نوح (علیہ

السلام) کی آٹھویں پشت میں نحور پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے تارح (آزر) اور آزر کے بیٹے حضرت ابراہیم (علیہ السلام)۔ آزر کا خاندان کلدانیوں کے شہر اور میں آباد تھا۔ اس زمانے میں کلدانیوں (بابل) کا تمدن اپنے اوج کمال پر تھا۔ اس تاریخی قیاس کے مطابق آپ کا زمانہ قریب ۲۲۰۰ ق۔ م قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ کی قوم بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود آپ کے والد ایک بہت بڑے ہجاری (آدار) تھے۔ آپ نے اپنی دعوت توحید کا آغاز خود اپنے گھر (والد) سے شروع کیا (۱/۷)۔ باپ نے اس کی سخت مخالفت کی (۱/۱۶)۔ پھر آپ نے قوم کو مخاطب کیا اور واضح الفاظ میں انہیں بتایا کہ وہ کس ضلالت میں مبتلا ہیں (۲/۱۴) یہ کشمکش اس حد تک بڑھی کہ آپ نے ایک دن اُن کے مندر میں جا کر بتوں کو توڑ دیا (۲/۱۸) اس دوران میں خود بادشاہ کے ساتھ بھی آپ مکالمہ ہوا جس میں آپ نے اُسے دلائل و براہین سے لا جواب کر دیا (۲/۵۸)۔

ان بے درہے شکستوں سے قوم کے دل میں آتش انتقام بھڑک اُٹھی اور وہ آپ کی جان کے لاگو ہو گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام تدابیر کو ناکام کر دیا اور آپ (اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کے ساتھ) اس مقام سے شام کی طرف ہجرت کر گئے (۲/۸۰) اور فلسطین میں اقامت پذیر ہو گئے۔

آپ نے اپنے بیٹے (حضرت اسحاقؑ علیہ السلام) کو فلسطین میں بسایا اور دوسرے بیٹے (حضرت اسماعیلؑ علیہ السلام) کو ساتھ لیکر خدا کے حکم سے وادی غیر ذی زرع (حجاز) میں خانہ کعبہ کو تعمیر کیا (۲/۱۲۵) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے سپرد اس کی تولیت کی۔

حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی شاخ میں تمام انبیائے بنی اسرائیل مبعوث ہوئے اور شاخ اسماعیل (علیہ السلام) کے گلی سرسبز نبی اکرمؐ وجہ شادابی عالم ہوئے۔

یہ تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ کَانَ اٰمِنًا ۚ فَتَاٰنَا لِلْظَّالِمِیْنَ فَاٰۤیًا ۚ وَلَمْ یَّکُنْ مِنَ الْمُشْشِرِیْنَ ۚ (۱۱۶) ”بلاشبہ ابراہیم (اپنی شخصیت میں ایک فرد نہیں بلکہ) پوری امت تھا۔ اللہ کے حضور جھکا ہوا۔ اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھا، نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان ابراہیمؑ۔“

## اب ق

اَبٰی الْعَبْدُ اَبٰی قَاۡۤیًا ۚ غلام کا (اپنے قرائض کو چھوڑ کر) بھاگ جانا۔ یعنی نہ اس سے کوئی سخت کام لیا جا رہا ہو اور نہ ہی اسے کسی قسم تاج۔ راغب۔ محیط۔

کا خوف ہو۔ اس کے باوجود اس کا چپکے سے بھاگ جانا\*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں بتا اور ہمزمہ ساتھ آئیں ان میں توحش۔ نفرت۔ بُعد اور جدائی کا مفہوم ہوتا ہے۔ اَبَقَ میں یہی کیفیت ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلام کا بھاگ جانا نیز کسی معاملہ میں تشدد برتنا ہیں۔

الْأَبَقَ\*۔ اپنے فرائض منصبی سے احتراز کر کے بھاگ جانے والا یا چھپ جانے والا۔ تَابَقَ الشَّيْءُ۔ وہ کسی شے کو ناگوار سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کش ہو گیا۔ عَبَدَ الْأَبَقَ\*۔ بھاگ جانے والا غلام\*۔

قرآن نے حضرت یونسؑ کے متعلق أَبَقَ کا لفظ استعمال کیا ہے (إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلِ كَرِهُنَّ مُشِيْعُونَ۔ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا (یونسؑ) رسول کو خاص مشن دیکر اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اُسے اس مشن کی تکمیل میں ہزار مشقتیں اٹھانی پڑتیں، وہ کسی حالت میں بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ لیکن جب مشیت خود دیکھتی کہ اس کا اس جگہ زیادہ عرصہ کیلئے رہنا اس مشن کیلئے مفید نہیں تو اسے اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانے کا حکم مل جاتا۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس (علیہ السلام) نے جب دیکھا کہ ان کی قوم سرکشی سے باز نہیں آئی تو انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ ساحول پیغام خداوندی کے لئے سازگار نہیں رہا۔ اسلئے وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ چونکہ ان کا یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام سے قبل از وقت تھا (اور انہوں نے خدا کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی تھی) اسلئے ان کے اس عمل کیلئے اَبَقَ کہا گیا۔ یعنی اپنے فریضہ منصبی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ واضح رہے کہ یہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ اپنا اجتہادی فیصلہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام کی رو سے ذرا قبل از وقت تھا اس لئے خدا نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ایک رسول کی زندگی کس قدر احکام خداوندی کے تابع ہوتی تھی اور جن معاملات میں فیصلہ خدا کے ساتھ میں ہوتا تھا ان میں رسول اپنی طرف سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دوسرے معاملات میں البتہ اسے آزادی ہوتی تھی کہ وہ وحی کے دئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنا پروگرام آپ مرتب کرتا جائے۔

ا ب ج

آلَیْلٌ ۖ وَالْأَلْبَلُّ\*۔ اونٹ۔ یہ کثیر تعداد میں اونٹوں کیلئے آتا ہے اور اس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا (۱۶/۵)۔ بادل کو بھی اونٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جو ہے أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى آلَیْلِ كَيْفَ خُلِقَتْ\* (۸/۶) ”کیا یہ لوگ ابل کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہیں کس طرح پیدا کیا گیا؟“ اس میں آلَیْل کے معنی بادل بھی ہو سکتے ہیں\*۔

اہل<sup>۱</sup> آبائیہل<sup>۲</sup>۔ گلہ در گلہ اونٹ۔ طیراً آبائیہل<sup>۳</sup> (ہش<sup>۴</sup>) جھنڈ در جھنڈ پرندے<sup>۵</sup>۔ آ<sup>۶</sup> لا<sup>۷</sup> بآلہ<sup>۸</sup>۔ آ<sup>۹</sup> لا<sup>۱۰</sup> بیہل<sup>۱۱</sup>۔ آ<sup>۱۲</sup> لا<sup>۱۳</sup> بول<sup>۱۴</sup>۔ آ<sup>۱۵</sup> لا<sup>۱۶</sup> ببال<sup>۱۷</sup>۔ پرندوں، کھوڑوں اور اونٹوں کی ٹکڑی جو ہے در ہے یکے بعد دیگرے آتی ہے<sup>۱۸</sup>۔

آہل - وہ متوحش ہو گیا - جن الفاظ میں با اور حمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش، نفرت، بُعد اور جدائی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں - اونٹ - کافی ہو جانا - اور بوجھ اور غلبہ -

۱۲۰ و

آباء - آب کی جمع ہے۔ آب اصل میں آبُو تھا - آب - باب - وہ شخص جس سے اس کی نوع کا کوئی دوسرا شخص پیدا ہو یا وہ شخص جو کسی شے کی ایجاد، اصلاح یا ظہور کا موجب ہو۔ سببی - وصی - چچا وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ نیز عمر اور مرتبہ کے لحاظ سے مرہوے آدمی کو بھی آب کہہ دیتے ہیں۔ آبُو تہ، آبُو - میں نے اس کی تربیت کی۔ تآ آبہ اس کو باپ بنا لیا \*\*\*

قرآن میں آباء کا لفظ آبا و اجداد (اسلاف) کے لئے آیا ہے۔ مَا آتَيْنَا عَلَيْهِ آيَاتِنَا (۱۰۱) ”جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا، اور باپ چچا اور دادا کیلئے بھی۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ جب حضرت یعقوب ؑ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبودیت اختیار کرو گے، تو انہوں نے کہا کہ نَعْبُدُ اللَّهَ كَمَا آتَانَا رَبُّكُمُ الْإِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ وَ إِسْحَاقَ (۱۱۳) ”ہم تیرے اللہ - اور تیرے آباء ابراہیم - اسماعیل اور اسحاق کے اللہ کی عبودیت اختیار کریں گے“۔ حضرت اسحاق ؑ حضرت یعقوب ؑ کے والد تھے۔ حضرت اسماعیل ؑ ان کے چچا اور حضرت ابراہیم ؑ ان

\* تاج - راغب \*\* اس کے قرآنی مفہوم کیلئے دیکھئے - عنوان ف ی ل -  
 "العلم الخفاق \*\*\* محیط۔

کے دادا تھے۔ ان سب کے لئے آباء کا لفظ آیا ہے۔ سورہ یوسف میں آبَوَیُّہُ آیا ہے جس کے معنی ماں باپ (والدین) ہیں (۱۹۶)۔ باپ کو پکارنے وقت یا ایسی کی بجائے یسآبت بھی کہتے ہیں\* (مثلاً ۱۲۱ میں)۔ آلا با۔ آلاب کی ایک لغت ہے۔ اس کے معنی ہیں باپ۔

## ابی

آبِی الشَّیْءِ یَأْبَاهُ\*۔ کسی چیز کو نہ پسند کرنا۔ کسی چیز سے رکنا۔ باز رہنا۔ شدت سے انکار کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ أَخَذَهُ أَبَاءً\*۔ مَنِ السَّطْعَامِ۔ اسے کھانے سے کراہت ہو گئی۔ رَجُلٌ أَبِیَّانٌ\*۔ وہ شخص جو کھانا کھانے سے باز رہے۔ آلا بَاءُ\*۔

کراہت۔ نفرت۔ امتناع۔ تکبر۔ نخوت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی بات کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھتے ہوئے اسے پائے استحقاق سے ٹھکرا دینا اور پھر اپنی اس روش پر بضد قائم رہنا۔ آلابی شیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی کرتا ہے اور کسی کے کہنے پر نہیں چلتا\*\*۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور حمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش۔ نفرت۔ بُعد اور جدائی کا مفہوم مضمحل ہوتا ہے۔ آبی میں یہی کیفیت ہے۔ قرآن میں سجدہ (اطاعت) کے مقابلہ میں آبی وَاسْتَكْبَرَ (۲۳۷) آیا ہے۔ یعنی ابلیس حکم خداوندی کی اطاعت سے رکا اور اس نے اس سے سرکشی برقی۔ دوسرے مقام پر ہے وَلَا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ إِذْ أَسَدُوا عَصَا (۲۸۲)۔ ”جب گواہ بلائے جائیں تو وہ گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔ رکیں نہیں“ قرآن میں اس کا استعمال ایک اور انداز سے بھی ہوا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ہم نے قرآنی حقائق کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن قَبَابِیْ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُّوا رَأً (۸۹ نیز ۲۵) ”اکثر لوگ ایسے ہیں جو کفر و انکار کے سوا ہر چیز سے اباء کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس پر غور و فکر کرنے اور اس طرح اس سے راہ نمائی حاصل کرنے سے رکے رہتے ہیں اور اس کے حقائق سے انکار کئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں ہے وَیَأْبِیْ اللّٰهُ لَا اَن یَّتِمَّ نُوْرُهُ (۲۴) ”اللہ کسی بات کو قبول نہیں کرتا بجز اس کے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے“۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ آلا کے ساتھ اس لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے سوا اور کچھ مقصود و مطلوب نہیں۔ سورۃ کہف میں حضرت



موسیٰؑ اور ان کے رفیق سفر کے قصہ میں ہے فَاتَّبَعُوا أَنَّهُ يُضَيِّفُهُمْ (۱۸) ”بستی والوں نے (انہیں حقیر سمجھتے ہوئے) ان کی مہمانداری کرنے سے انکار کر دیا،“۔

## ا ت ی

آتلی - یَا تَبٰی کے معنی ہیں آنا\*۔ راغب کے نزدیک اَتَّيَانٌ\*۔ سہولت کے ساتھ آنے کو کہتے ہیں\*۔ صاحب محیط نے اَتَّيَا لِّمَاءٍ کی مثال دی ہے جس کے معنی ہیں پانی کا راستہ آسان کر دیا\*\*۔ مَّا تَبَّيَّثَا - ضرور آنے والا (گویا اچکا ہے) (۱۱)۔ مَّا تَبَّيَّثَا اصل میں مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی آس چیز کے ہیں جس کے پاس آیا جاتا ہے یا وہ چیز جو آئی ہوئی ہو۔ اس اعتبار سے اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے جو قانون مقرر کر دیا ہے ہر شے اس تک پہنچ کر رہتی ہے۔

آتلی اَلَيْسَ التَّشْيِيءُ کے معنی ہیں اس کی طرف کوئی چیز بھیج دی۔ آتلی فُلَانًا شَيْئًا۔ اس نے اسے وہ چیز دیدی\*۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اِيتَاءٌ - اِعْطَاءٌ کے معنوں میں بکثرت آتا ہے مگر اِيتَاءٌ کے معنی در حقیقت حاضر کرنے کے ہیں۔ راغب نے اسی لئے کہا ہے کہ قرآن میں صدقات وغیرہ کے لئے اِيتَاءٌ ہی کا لفظ آیا ہے۔ اِعْطَاءٌ کا لفظ نہیں آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صدقات سہولت سے دیے جا سکیں اور اس کی ضرورت نہ پڑے کہ اس کی تفتیش کی جائے کہ فلاں آدمی نے کیا دیا ہے\*۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے صدقات\*۔ عنوان ص - د - ق)۔ صاحب تاج العروس نے مختلف اقوال سے بتایا ہے کہ اِعْطَاءٌ اور اِيتَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ اِعْطَاءٌ میں دینے والے کی پوزیشن اس سے ذرا بلند ہوتی ہے جسے دیا جائے لیکن اِيتَاءٌ میں یہ بات نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسے دیا جائے اس کی پوزیشن دینے والے سے ذرا بلند ہی ہو۔ یا کم از کم برابر ہو۔ (لیکن اسے ہم قاعدہ کلیہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ قرآن میں بعض جگہ اِيتَاءٌ اور اِعْطَاءٌ کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے فَاتَّيْنَا اَعْطَيْنَا مِنْهَا رِضْوَانًا..... وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَيْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ..... (۵۸:۵۹)۔ ”سو اگر انہیں ان (صدقات) میں سے دیا جائے تو راضی ہو جائے ہیں۔“..... اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی ہو جائے جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں دیا تھا،“۔

قرآن میں مالِ فقیر کی تقسیم کے ضمن میں ہے کہ "وَمَا أَمْثَلُكُمْ الْتَرْسُولُ" فَخَذُوهُ "وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَأَتْتَهُمْ" (۵۱)۔ جو کچھ تمہیں رسول دے آئے لے لو اور جس کے لینے سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ اس کی تشریح (۹۹) میں ہے جہاں فرمایا۔ "وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آلَاهُمْ اللَّهُ" وَرَسُولُهُ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالِ فقیر اور مالِ غنیمت کے متعلق اصول یہ نہیں کہ جس نے جو لوٹ لیا وہ اس کی ملکیت ہو گیا۔ یہ سارا مال نظام خداوندی کی ملکیت ہوتا ہے اور اس کی تقسیم مرکز نظام کی طرف سے ہوتی ہے۔

سورة ال عمران میں یہ لفظ نزع کے مقابلے میں آیا ہے جس کے معنی لے لینے کے ہیں۔ "تَوَّ تَبَّى الْمُلُوكُ مَن تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلُوكُ مِمَّن تَشَاءُ" (۳۵)۔ "تو جسے چاہتا ہے ملک دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے" (اس کی تفصیل "مشیت" کے ماتحت عنوان ش۔ ی۔ ا میں دیکھیے)۔ اُنسی الیٰرجل۔ اس نے کوئی کام کیا۔ عمل کیا۔ قرآن میں ہے لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَى (۱۶۹)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ساحر خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً سورة الشعراء میں ہے آتَا تَوَّانَ الذِّكْرَانِ مِنَ الْعَالَمِينَ۔ (۲۶۱) "تم دنیا جہاں سے الگ مردوں کے ساتھ بد فعلی کرتے ہو،۔"

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اِيتَاءٌ اور اِعْطَاءٌ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اِيتَاءٌ کے معنی یہ ہیں کہ جسے کچھ دیا جائے وہ اس تک پہنچ جائے اور وہ اسے قبول بھی کرے۔ برعکس اس کے اِعْطَاءٌ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ کسی کو دیا جائے ضروری نہیں کہ وہ اس تک پہنچ بھی جائے یا وہ اسے حاصل بھی کرے۔ اس اعتبار سے قرآن میں جو کہا گیا ہے کہ "كَلَّا نُمِدُّهُمُ لَّا عِ وَهُوَ لَّا عِ مِّنْ عَطَاءِ رَبِّكَ" وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۶۱)۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو کچھ عطا ہوا ہے وہ عام ہے۔ لیکن خدا اسے ہر ایک تک براہ راست نہیں پہنچاتا۔ اسے حاصل کر لینے کے لئے خود جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ نیز یہ کہ کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان بخشائشوں کو عام انسانوں تک نہ پہنچنے دے اور راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جائے۔

تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اِتْيَانٌ کے معنی ہلاک کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے فَآتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا تاج۔

(۵۹)۔ ”اللہ نے انہیں ایسے انداز سے ہلاک کر دیا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔“

## ا ث ث

”لَا اَثَّاتٌ“۔ ہر چیز کا بڑا حصہ۔ مال کثیر۔ گھر کا سامان۔ ہر قسم کا مال مثلاً۔ اونٹ۔ بکریاں۔ غلام وغیرہ۔ اَثَّاتٌ\* اس کا واحد ہے۔ اَثَّاتٌ\* گھر کے نئے سامان کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ ہر اس سامان کیلئے استعمال ہوتا ہے جو گھر کی ضروریات کیلئے بنایا جائے۔ نہ کہ تجارت کی غرض سے\*۔ ابن درید نے لکھا ہے کہ اَثَّاتٌ\* اَلْبَيْتِ سے مراد ہوتی ہے اَلْمَتَاعُ\* اَلْجَدِيدُ۔ گہرا قدر سامان\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بشتیادی معنی اجتماع اور نرمی کے ہوتے ہیں اور اَثَّاتٌ اَلنَّبْتُ اَثَّاتٌ کے معنی ہوتے ہیں، ہودے بہت کثیر ہو گئے۔

قرآن میں اَثَّاتٌ و مَتَاعاً آیا ہے (۸۱)۔ یعنی ساز و سامان۔

## ا ث ر

”لَا اَثَرَ“۔ کسی کھنڈر وغیرہ کا باقی رہ جانے والا حصہ۔ ”لَا اَثَرَ“۔ زخم کا نشان جو اس کے اچھا ہو جانے کے بعد باقی رہ جاتا ہے۔ ”لَا اَثَرَ“۔ ٹھیرا۔ وہ جانور جس کے چلنے سے زمین پر بڑا سا نشان بن جائے۔ اَلثَّوْرُ ثَوْرٌ وَاَلْمِئْشَرُ\*۔ سوہ کا ایک آلہ جس سے اونٹ کے تلوے میں خاص نشان بنا دیتے ہیں کہ اگر وہ کہیں گم ہو جائے تو اس نشان قدم سے اسے تلاش کر لیا جائے۔\*\*\*

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَثَرَ کے چار معنی ہوتے ہیں۔ (۱) نتیجہ جو کسی چیز سے حاصل ہو۔ (۲) علامت۔ (۳) خبر۔ (۴) حکم جو کسی چیز پر مرتب ہو\*۔

قرآن میں ہے فَانْظُرْ اِلٰی اَثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (۵۰)۔ یہاں آثار کے معنی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ فتح میں اَثَرَ الشُّجُوْدِ (۲۹) آیا ہے۔ یعنی اطاعتِ خداوندی سے جو قلبی سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ سورۃ مؤمن میں ہے اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَاَثَارًا فِی الْاَرْضِ (۲۱)۔ دوسری جگہ سورۃ یٰسین میں قَدَمَ مَوَا کے مقابلہ میں اَثَارَهُمْ آیا ہے (۳۴)۔ یعنی جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور جو پیچھے چھوڑتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے عَلٰی اَثَارِهِمْ (۱۸)۔ ان کے

پیچھے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔ فَاَرْتَدَّ اَعْلٰی اَثَارِ هِمَا  
تَصَصًّا (۱۸)۔ اپنے نقوش قدم پر پیچھے کی طرف لوٹے۔ سورۃ حدید میں ہے۔  
ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰی اَثَارِ هِمِّ بَرِّ سُلَیْمَا (۵۴)۔ پھر ہم نے ان کے نقش قدم  
پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے۔ اس سے اُس کے معنی مسلک و مشرب کے  
آتے ہیں (یعنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے) ابن فارس نے کہا ہے کہ  
اَلَا ثَرٌ کے معنی پیچھے چلنے اور پیروی کرنے کے ہوتے ہیں۔ اس میں اَثَرٌ اور  
اِثَرٌ دونوں آتے ہیں۔ سورۃ طہ میں سامری کا قول ہے کہ فَتَقَبَّضْتُمْ قَبْضَةً  
مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (۲۶) میں نے رسول (حضرت موسیٰؑ) کے مسلک و  
مشرب سے تھوڑا سا حاصل کیا تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا قول ہے۔  
عُمُّ اَوْلَاعٍ عَلٰی اَثَرِیْ (۲۸)۔ وہ میرے نقش قدم (مسلک) پر ہیں۔  
سورۃ احقاف میں ہے اَثَارَةٌ مِّنْ عِلْمِ (۱۲)۔ اس کے معنی علمی دلیل  
کے ہیں۔ (یعنی جو کچھ علم میں سے باقی رہ جائے)

اَثَرٌ۔ نشان زدہ کر کے اپنے لئے مخصوص کر لینا یا کسی دوسرے کے  
لئے مختص کر دینا۔ اسی سے اِثْتَارٌ ہے جس کے معنی ہیں کسی کو اپنے اوپر  
ترجیح یا فوقیت دینا۔ ابن فارس نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔ پہلے معنوں میں  
سورۃ اَعْلٰی میں ہے بَلْ تَثُوْثِرُوْنَ اَلْحَمِلُوْا الدُّنْيَا (۸۶)۔ یہ قریبی  
مفاد۔ صرف طبعی زندگی کے انفرادی مفاد۔ کو اپنے لئے ترجیح دیتے ہیں۔ نیز (۲۸)۔  
اور دوسرے معنوں میں سورۃ حشر میں ہے تَثُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ  
(۵۹)۔ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ سورۃ یوسف میں ہے  
لَقَدْ اَثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا (۹۱)۔ خدا نے تمہیں ہم پر فضیلت دی ہے۔  
سورۃ طہ میں ہے لَنْ تَثُوْثِرَكَ عَلٰی مَا جَاءَنَا (۲۲)۔ جو ہمارے  
پاس آچکا ہے تجھے ہم اس پر ترجیح نہیں دینگے۔

حَدِیْثٌ مَّا ثُوْرٌ۔ ایسی بات جس کی لوگ ایک دوسرے کو خبر  
دینے چلے آ رہے ہوں \* ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَلْثَمَاتُ ثُوْرَةٌ اس  
کنویں کو کہتے ہیں جو پہلے بنا ہوا ہو پھر زمین کے نیچے دب گیا ہو لیکن  
جب کوئی وہاں پہنچے تو ڈول اور رسی کے نشانات پائے۔

## ا ث ل

اَلَا ثَلٌ۔ جھاؤ کا درخت۔ \* وہ درخت جسکی جڑ خوب مضبوط ہو  
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی اصل اور اس کے

مجتمع ہونے کے ہیں۔ یعنی پختہ بنیاد ہونا۔ قرآن میں آئٹل (۳۶) جہاؤ کے معنوں میں آیا ہے۔

## ا ث م

آ"لَا تِئْمَةٌ"۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تکان کی وجہ سے مضمحل ہو چکی ہو اور اسلئے بہت آہستہ آہستہ چلے۔ آ"لَمْؤَاثِمْ"۔ وہ اونٹ جو اضمحلال کی وجہ سے چلنے سے جواب دے جائے۔\* لہذا لاثم کے بنیادی معنوں میں اضمحلال۔ افسردگی۔ توانائی کا کم ہو جانا۔ سست روی اور شکستگی کا پہلو ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دیر ہونا اور پیچھے رہ جانا ہیں۔ قرآن میں جرم کیلئے لاثم اور عُدُوَان کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے صحیح مفہم کیلئے (ع-د-و) کا عنوان دیکھئے جہاں عُدُوَان کے مقابلہ میں لاثم کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ مقصد اس سے وہ تمام اعمال ہیں جن سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے۔ جن سے اسکی قوت عمل میں کمزوری واقع ہو جائے۔ جن سے وہ سفر حیات طے کرنے میں سست گام ہو جائے۔ جن سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں پیچھے رہ جائے۔ اس کے لئے قرآن نے خُمُر اور مُسِير کی مثال دی ہے جہاں کہا ہے کہ ان میں فائدہ تو ضرور ہے لیکن ان سے انسان کے قوائے عملیہ میں جو اضمحلال پیدا ہوتا ہے اسکی نقصانات اس فائدہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ وَ لَئِنْ لَّمْ يَكْتُوبُوا لَآ يَكُنْ لَكُمْ فَنَاءٌ (۱۹۰)۔ خُمُر (نشہ آور اشیاء) کے ان اثرات سے کون نا واقف ہے جن سے انسان کی قوتیں آہستہ آہستہ مضمحل ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے "جنت کی شراب" کے متعلق کہا ہے کہ اس میں تَا تِئْمٌ نہیں ہوگی (لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَأْتِئْمٌ)۔ یعنی اس سے قویٰ مضمحل نہیں ہونگے بلکہ ان کی کمی پوری ہو جائیگی۔ لَا يَسْمَعُونَ فِيْهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِئْمًا۔ اَلَا قِيْلَ سَلَامًا سَلَامًا (۲۵) باقی رہا مُسِير۔ سو یہ لفظ يُسِير سے ہے (دیکھئے عنوان ی-س-ر) یسر کے معنی ہیں آسانی (بائیں ہاتھ کا کھیل) لہذا یسر ہر اس آمدنی اور دولت کو کہیں گے جو بغیر محنت کئے حاصل ہو جائے۔ اس قسم کی دولت سے جس طرح انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے اور انسان محنت کر کے کمائے کے قابل نہیں رہتا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے سود خوار کو بھی آ تِئْمٌ کہا گیا ہے۔ (۲۵۶)۔

(ع-د-و) کے عنوان میں عُدُوَان کے معنی یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ ان سے مراد ایسے جرائم ہیں جن کے اثرات متعدی ہوں۔ یعنی ان سے معاشرہ کے دوسرے افراد بھی اثر پذیر ہوتے ہوں۔ اس بنا پر لاثم کے معنی ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر انسان کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتا ہو۔ مثلاً ایک \* تاج۔

شخص افیون کھا کر چپکے سے لیٹے رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکے اس عمل کا اثر اسکی اپنی ذات تک محدود ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ بھی جرم ہے۔ اسلئے کہ اسکے نزدیک زندگی کا مقصود انسانی ذلت کا نشو و نما ہے لہذا ہر وہ کام جس سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جرم ہوگا خواہ وہ انسان کے اپنے ہاتھوں سے ہی پیدا کیوں نہ ہو۔ قرآن کی رو سے انسان کا خود اپنے آپکو نقصان پہنچانا بھی جرم ہے۔ خود کشی بھی قتل نفس میں شامل ہے اور اسلئے اِثْمٌ\* میں داخل۔ اور زنا کے وجہ اِثْمٌ ہونے کے لئے تو کسی ثبوت اور شہادت کی بھی ضرورت نہیں۔ اسلئے قتل نفس اور زنا کے لئے کہا گیا ہے کہ مَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَمًا۔ (۱۸۰)۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو بغیر محنت کئے مفت میں دولت حاصل ہو جائے (خواہ وہ کسی طریق سے ملے) اور وہ کسی کو نقصان بھی نہ پہنچائے۔ تو وہ بھی اِثْمٌ\* ہے۔ اسلئے کہ محنت نہ کرنے سے اسکے قوائے عملیہ مضمحل ہو جائیں گے اور یہ چیز قرآن کی رو سے جرم ہے۔

یہ ہیں اِثْمٌ\* کے بنیادی معنی۔ اسکے بعد یہ لفظ عمومی حیثیت سے عام جرائم (گناہوں) کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ لفظ ان معنی میں آیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے بالخصوص ایسے افعال مراد ہوتے ہیں جو اپنے نتائج مرتب کرنے میں دیر لگائیں\* (یہ چیز بھی اسکے بنیادی معنوں میں داخل ہے۔ یعنی سست روی۔ نتائج پیدا کرنے میں تاخیر۔ آہستہ آہستہ نتائج مرتب کرنے والے۔ جیسے خمر یعنی نشہ آور چیزوں کا استعمال)۔ راغب کے نزدیک اِثْمٌ\* اور ذَنْبٌ\* میں فرق یہ ہے کہ ذَنْبٌ\* عَمْدًا اور سہواً دونوں طریق پر ہو سکتا ہے لیکن اِثْمٌ\* صرف ارادۃً ہوتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے مفہوم میں بَطْؤٌ\* (دیر لگانے) کے معنی ضرور شامل ہوتے ہیں\*\*

اِثْمٌ\* کیلئے (ب۔ر۔ر) کا عنوان بھی دیکھئے کیونکہ قرآن میں یہ لفظ رِثْر کے مقابلہ میں بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تَعَاوَنُوا عَلٰی الْبِرِّ وَالْإِتْقَانِ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلٰی الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲)۔ ہر اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور اِثْمٌ و عدوان میں تعاون مت کرو۔

## اج ج

آلَا جِنَّةٌ۔ آلا جِنِّجٌ۔ آگ کا بھڑکنا۔ مشتعل ہونا۔ آگ کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ آج۔ یَوْج۔ آجٹا۔ وہ تیز چلا۔ سَمِعْتُ\* أَعْتَهُمْ\*۔ میں نے انکے چلنے کی آواز یا مخلوط سا شور سنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی تاج۔\*\* راغب۔

معنی آہٹ اور شدت کے ہیں۔ "أَلَا جَعَلَهُ" - اختلاط و اضطراب - گرمی کی شدت - ماء "أَجْتَا" - سخت کڑوا پانی "وَهَذَا مِلْحٌ" "أَجْتَا" اور یہ سخت کھاری پانی ہے۔ (۱۲۱ و ۱۲۲) - "أَجْتَا فَلَان" - اس نے دشمن پر حملہ کیا \* نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۴

قرآن میں بتا "جُوجُ" - "مَا جُوجُ" کے الفاظ دو مقام پر آئے ہیں۔ (۱۶۸) اور (۱۶۹) میں۔ اول الذکر ذوالقرنین کے قصہ کے ضمن میں ہے جہاں ایک قوم نے اس سے فریاد کی کہ بتا "جُوجُ" و "مَا جُوجُ" آکر تیرا کاریاں مچا دیتے ہیں اسٹے آپ ہمارے لئے ابک ایسی دیوار بنا دیں جو انکے حملوں کے لئے روک ثابت ہو۔ چنانچہ ذوالقرنین نے وہ دیوار تعمیر کر دی جسکا ذکر سورۃ کہف میں (۱۶۹) آتا ہے۔ دوسرا حوالہ سورۃ انبیاء کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "وَحَرَّامٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اٰمَنَّا كُنْتُمْ اَنْتُمْ لَا يَتْرُوْا جَمْعُوْنَ" "حَتّٰى اِذَا فَتَحْتُمْ" "يَا جُوجُ" و "مَا جُوجُ" و "هُمْ مِنْكُمْ" "حَدَبٍ" "يَنْتَسِلُوْنَ" (۱۶۸-۱۶۹)۔

یاجوج و ساجوج کا نام تورات میں ملتا ہے۔ چنانچہ حزقیل نبی کی پیشگوئی میں ہے (واضح رہے کہ حزقیل نبی کو بغت نصر بیت المقدس کی تباہی کے بعد گرفتار کر کے بابل لے گیا تھا جہاں وہ ایران کے بادشاہ سائرس - جسے قرآن میں ذوالقرنین کہا گیا ہے - کے زمانہ تک زندہ تھے) "اور خداوند کا کلام سچہ تک پہنچا۔ اس نے کہا اے آدم زاد تو جوج کی طرف منہ کر کے اس کے خلاف نبوت کر۔ جوج کی طرف جو ساجوج کی سرزمین کا ہے اور ارس - مسک - اور توبال - کا سردار ہے۔" اس کے بعد یہ الفاظ عہد نامہ جدید (یوحنا کے مکاشفات) میں ملتے ہیں جہاں لکھا ہے "جب ہزار سال پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائیگا اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہونگی یعنی یاجوج و ساجوج کو گمراہ کرنے اور لڑائے کیلئے جمع کر کے نکلیگا۔ انکا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا اور وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائیں گی۔" یاجوج و ساجوج یورپ کی زبانوں میں گگ (Gog) میگگ (Magag) کے نام سے متعارف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ یونانی زبان کے نام ہیں اور وہیں سے یورپ کی دیگر زبانوں میں آئے۔ یاجوج و ماجوج کونسی قومیں تھیں، اس کے متعلق محققین کی آراء مختلف ہیں۔ لیکن اکثریت کا رخ جس سمت کو گیا ہے وہ یہی ہے کہ یہ منگولیا کے علاقہ کے وحشی اور صحرا نورد قبائل تھے جن کا کام لوٹ مار تھا۔ یہ آندھی کے طوفان کی طرح اٹھتے اور اس سیلاب بلا کے سامنے جو کچھ آتا اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے۔ چنگیز خاں

اور ہلا کو خاں کے ہلاخیز جھکڑوں سے کون واقف نہیں۔ منگولیا کا قدیم نام ”موگ“، تھا جو یونان میں میگاگ اور عبرانی میں ما جوج ہو گیا۔ اس علاقہ میں دوسرا قبیلہ ”یواچی“ کے نام سے مشہور تھا جس نے عبرانی میں یا جوج کی شکل اختیار کر لی۔ انہی کے حملوں سے بچنے کیلئے قومیں اپنے ملکوں کے گرد دیواریں تعمیر کیا کرتی تھیں۔ یہی وہ سطح مرتفع تھی جہاں سے یہ وحشی قبائل پھرے ہوئے دریاؤں کی پر شور طغیانیوں اور تلاطم انگیزیوں کی طرح ملحقہ اقوام کو تباہ و برباد کر دیتے (مِنْ كَلْبٍ حَدَبٍ يَتْسِيلُونَ)۔ اگر ان الفاظ کو آج سے مشتق مانا جائے تو انکی خصوصیات میں آگ کی شعلہ انگیزیاں، طوفانی دریاؤں کی تلاطم خیزیاں اور تند و تیز ہواؤں کی تباہ کاریاں سب آ جاتی ہیں۔ اشتقاق کی رو سے دیکھا جائے تو ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ سورۃ انبیاء میں اگرچہ نام یا جوج و ما جوج ہی کا لیا گیا ہے لیکن اس سے مفہوم ”یا جوجیت و ما جوجیت“ ہے خواہ وہ کسی قوم میں پائی جائے۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ جو اقوام قعر مذلت میں گر جائیں گی ان کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ بجز ایک صورت کے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب دنیا کی ایسی قومیں جن میں اپنے ملک سے نکل کر دوسرے ممالک پر چھا جانے کی صلاحیت ہوگی ان ہمساندہ اقوام کے ملکوں میں پہنچیں گی تاکہ وہاں اپنی استعماریت قائم کریں تو ان کے اس تصادم سے ان کمزور قوموں کی قوتیں بیدار ہو جائیں گی اور انہیں دوبارہ زندگی حاصل ہو جائیگی۔ ہمارا دور اس پر شاہد ہے کہ یورپ کی اقوام کس طرح کمزور اقوام (بالخصوص ممالک کے ممالک) میں پہنچیں تاکہ ان کا خون پیا جائے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ کمزور اقوام انہی سے سبق سیکھ کر ان کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس طرح دوبارہ زندگی سے متمتع ہو گئیں۔ اس حقیقت کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔

نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۰۶ جلد چہارم عنوان

مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفان مغرب نے

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اسی طرح ان ”یا جوج و ما جوج“ اقوام کی تلاطم انگیزیاں ان مردہ اقوام کیلئے حیات نو کا باعث بن گئیں اور یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ ”وَحَرَامٌ عَلٰی قَوْمٍ يَّتَمَتُّوْنَ اَنْ يَّهْلِكُوْهُمْ اَوْ يَّكُوْنُوْا اَعْدَاۗءُ لِّهٖمْ لَآ يَرْجِعُوْنَ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَأْ جُوجٌ وَمَا جُوجٌ وَهُمْ مِنْ كَلْبٍ حَدَبٍ يَّتْسِيلُوْنَ“ (۹۵:۹۶) لیکن اگر ہم یا جوج و ما جوج کو ان کے علاقہ کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو اس سے یہ بھی اشارہ نکل سکتا ہے کہ روس کا موجودہ سیلاب



جس کی رو سے وہ ساری دنیا پر چھوٹا جانا چاہتا ہے مسلمانوں کے ممالک کی بیداری کا باعث بن سکتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسلمانوں کے ممالک قرآن کا معاشی نظام اپنے ہاں رائج کر لیں۔

نوٹ :- سورة انبیاء کی مندرجہ بالا آیات (۹۶:۹۷) میں حتیٰ کا ترجمہ ”یہاں تک“ کیا گیا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ حرف محض ابتدائی کلام کے لئے بھی آتا ہے اور اس کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ دیکھئے - حرف حتیٰ -

## ا ج ر

”لَا جُرْ“ - کام کا بدلا - ”أَلَا جِرَّةٌ“ - جو کچھ کام کا معاوضہ دیا جائے۔ کرایہ \* - ”اِسْتِئْجَارٌ“ - کسی کو اجرت پر ملازم رکھنا - جیسے سورة قصص میں ہے۔ ”يَا بَنِي إِسْرَءِيلَ اسْتَجِيرُوهُ“ (۲۴) ”اے میرے باپ - اے اجرت پر ملازم رکھ لے“ -

آجُر \* - کنایہ ”اس تحفے کو بھی کہتے ہیں جو بیوی کو شادی کے وقت دیا جاتا ہے (جسے عرف عام میں مہر کہتے ہیں) قرآن میں ہے ”اَتَيْتُكُمْ اَجُورًا“ (۳۳) - یہ مفہوم لینے کا موس کے حوالے سے دیا ہے (دیکھیں ص ۸۷ ج ۱۰) قرآن کریم نے اس قانونِ محکم کو بیان کیا ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے (اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں) وہ اس کے اعمال (کاموں) کا بدلہ ہوتا ہے۔ جو کام نہیں کرتا اسے معاوضہ بھی کچھ نہیں ملتا۔ یہ جہانِ سعی و عمل ہے جس میں مفت خوروں کا کوئی مقام نہیں۔ جس معاشرہ میں کسی شخص کو بغیر کام کئے کچھ مل جاتا ہے (بجز اس کے کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہ رہا ہو) وہ معاشرہ خدائی قوانین کے مطابق متشکل نہیں ہوتا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اجرت (مزدوری) اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کے جوڑنے کے ہیں۔ مزدور کی اجرت کو بھی اس لئے آجُر کہتے ہیں کہ اس سے اس کی مشقت کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ اس کی چٹخ جانے والی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔

[آیت لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی (۲۲)] کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان (ا - ل - ل) اور (ق - ر - ب) بالخصوص (ق - ر - ب) -

## ا ج ل

آلَا جَلٌ - کسی بات کی مدت مقررہ - اَلْتَّأْجِلُ جِئِلٌ - مدت کا تعین کرنا - مدت مقرر کرنا - مَوْجَلٌ - وہ جس کے لئے مدت مقرر کی گئی ہو - تَأْجِلٌ جَلٌ - اس نے تاخیر کی - اَجِلٌ اَجَلًا - وہ پیچھے ہوا، سوخا ہوا - اَلَا جِلٌ - عاجل کی ضد ہے - اَجَلٌ - باعث - وجہ - مِیْنٌ اَجَلٌ - ذَالِیْکَ (۲۶) اسی وجہ سے ..... اَجَلٌ مدتِ معینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس آخری حد کو بھی جہاں وہ مدت ختم ہو جاتی ہے۔  
(وہیں ص ۱۸۸ جلد چہارم)  
قرآن میں ہے لَیْسَ کُلُّ اَمَّةٍ اَجَلٌ (۲۶) - ہر ایک قوم کیلئے (عروج و ترقی کی) ایک مدت ہوتی ہے - لیکن یہ اَجَلٌ (مدت) ایک قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے - لَیْسَ کُلُّ اَجَلٍ کِیْتَابٌ (۱۳۸) - ہر مدت کے لئے ایک قانون ہے - اور وہ قانون یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ قَدِیْمُ کَثُرُ فِی الْاَرْضِ (۱۲) یعنی جو قوم جس قدر نوع انسانی کے لئے منفعت بخش کام کرے گی اسی قدر اسے بقا نصیب ہوگی -

قرآن نے اقوامِ عالم کے استخلاف و استبدال کے متعلق تفصیلی پروگرام دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں قوموں کا عروج و زوال محض اتفاقیہ نہیں ہو جاتا بلکہ ایک محکم قانون کے مطابق ہوتا ہے - وہ کہتا ہے کہ ہر ایک عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مدتِ معینہ کے بعد سامنے آتا ہے - عمل اور اس کے نتیجہ کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو بھی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے - اسے مہلت کا وقفہ بھی کہا جائیگا - یہ وقفہ بھی قانونِ خداوندی کے مطابق متعین ہوتا ہے جیسے بیج کے درخت بننے تک کی مدت -

سوت کے متعلق سورۃ آل عمران میں ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق وارد ہوتی ہے اور یہی قانون اس کے لئے مدت مقرر کرتا ہے - وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِیْذِنِ اللّٰهِ کِیْتَابًا مَّوْجِلًا (۲۳۳) کوئی ذی حیات خدا کے قانون کے بغیر نہیں مرتا (سوت اس کے قانونِ طبعی کے مطابق واقع ہوتی ہے) - اور یہی قانون انسان کی عمر کی مدت کا تعین کرتا ہے - یہ قانون، قانونِ طبعی ہے جس کے مطابق (مثلاً صحت خراب کر لینے سے) عمر کم ہو جاتی ہے اور (صحت کا خیال رکھنے اور ہلاکتوں سے بچنے سے) عمر بڑھ جاتی ہے - وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ اِلَّا فِیْ کِیْتَابٍ (۳۹) - کسی بڑی عمر والے کو عمر نہیں دی جاتی اور نہ

ہی کسی کی عمر میں سے کمی کی جاتی ہے مگر (یہ سب کچھ) ایک قانون کے مطابق ہوتا ہے،۔ یعنی عمر کا بڑھنا اور گھٹنا سب خدا کے قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔

عورت کی عدت کی ميعاد کو بھی آجکل \* کہا گیا ہے (۱۲۱/۱)۔ "وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنِ أَجَلَهُنَّ"۔ (۱۲۱/۱) جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت (عدت) کے قریب پہنچنے لگیں.....

## ا ح د

"لَا أَحَدٌ" ایک۔ پہلا عدد۔ "أَحَدٌ" کوئی ایک۔ اس کا مؤنث "أَحَدٌ" ہوتا ہے۔ "لَا أَحَدٌ" اللہ کی صفت ہے اور اس معنی میں کسی اور کیلئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔ "أَحَدٌ" اور "وَاحِدٌ" میں فرق کیلئے دیکھئے عنوان (ح د)۔ "أَحَدٌ" میں دراصل یگانہ ہونے (Uniqueness) کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں "فَلَاكُنْ أَحَدٌ" "لَا أَحَدَيْنِ"۔ اسکی کوئی مثل و نظیر نہیں۔ یہ کسی کی بلیغ ترین تعریف ہو سکتی ہے \*۔ "لَا تَشْأَحَدُ"۔ مجتمع ہوا۔ متفق ہوا۔ "لَا تَشْأَحَدُ" اسی کا مصدر ہے۔ "أَشْأَحَدُ"۔ منفرد اور تنہا ہوا۔

قرآن میں ہے۔ "وَمَا يَتَعَلَّامُنِ مِنْ أَحَدٍ" (۱۰۴/۱) اس کے معنی ہیں "کسی کو بھی"۔ اور "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" (۱۱۰/۱) میں، "أَحَدٌ" کے معنی یگانہ۔ بے مثل و بے نظیر (Unique) ہیں۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت اسکی انفرادیت (Uniqueness) ہوتی ہے اور چونکہ خدا کی ذات، مکمل ترین ہے اس لئے اس میں یہ صفت بھی اپنے انتہائی کمال تک پہنچی ہوئی ہے (نیز دیکھئے عنوان (ح د))۔

## ا خ ذ

"لَا أَخَذُ"۔ یہ عطا (دینا) کی ضد ہے۔ یعنی لینا۔ کسی شے کا احاطہ کر لینا۔ بعض علمائے لغت نے کہا کہ "أَخَذُ" کے معنوں میں دراصل قہر اور غلبہ کا مفہوم ہوتا ہے اور ہلاک کر دینے اور استئصال (بیخ کنی کر دینے) کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نیز سزا دینے ("مَوْأَخَذَةً") کے معنوں میں بھی \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو احاطہ میں لے لینا۔ وصول کرنا اور جمع کرنا ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے (بحوالہ ابن فارس) کہ "لَا أَخَذُ" حوض جیسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو

جائے۔ آ لَا خَیْذٌ - قیدی کو کہتے ہیں۔ آ لَا خَیْذٌ - غصب کی ہوئی چیز کو۔ \* مَّا خُذٌ - مسلک و منہاج کو۔ \*\*

قرآن میں یہ لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے آخِذْ تُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ مَّاصِرٰی (۱۰۱)۔ یہاں اسکے معنی ”قبول کرنا“ ہیں۔ سورۃ یوسف میں یہ لفظ روک لینے یا گرفتار کر لینے کے معنوں میں آیا ہے۔ فَخُذْ أَحْسَنَ مَا مَكَانَهُ (۱۲۸)۔ ”تو ہم میں سے ایک کو اسکی جگہ روک لے“، سورۃ ہود میں یہ لفظ اس گرفت کے معنوں میں آیا ہے جو اعمال کے نتیجہ میں خدا کے قانون سکافات کی رو سے ہوتی ہے۔ وَكَذٰلِیْكَ أَخَذْنَا مِنْكَ لَمَذَةً لِّذٰلِکَ الْقَرٰی وَهٰی نَذَارَ لِّمَنْ اِنْ أَخَذَهُ اِلَیْمٌ شَدِیْدٌ (۱۲۱) اور اسی طرح تیرے رب کی ہکڑ ہوا کرتی ہے جب وہ ان بستیوں کو پکڑتا ہے جو ظالم ہوں۔ یقیناً اسکی گرفت الم انگیز اور شدید ہوتی ہے، سورۃ المؤمن میں ہے وَهَیْئَتُ کُلِّ اُمَّةٍ یَّرْسُوْا لَیْمٌ لِّیْنَا خُذُوْہُ (۱۰۲)۔ یہاں أَخَذٌ کے معنی ہر قسم کی مخالفت کے ہیں جس سے اس رسول کا مشن آگے نہ بڑھنے پائے سورۃ انفال میں ہے فَوَیْتَا أَخَذَتْ تُمْ (۱۰۱)۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ تم نے کیا تھا یا جو کچھ لیا تھا۔ \*\*\* سورۃ کہف میں تَتَخِذُ فِیْہِمْ حَسْبًا (۱۸) میں اسکے معنی اچھے سلوک کرنے کے ہیں۔ یعنی حسن کا رانہ روش اختیار کرنا۔

## ا خ ر

آخِرٌ (اس کا مونسٹ آخرۃ ہے)۔ آخِرٌ - آءول کا مقابل ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ (۱۰۱)۔ صاحب محیط کے الفاظ میں یہ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آ رہی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخِرٌ ایک سلسلہ کی آخری کڑی ہوتا ہے۔ یعنی اس کے بعد پھر اس جیسی اور کڑیاں نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی (آخرۃ) کو خاتمی جَدِیْدٌ سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۰۱، ۱۰۲) یعنی وہ زندگی، اس موجودہ زندگی کے تسلسل میں (اس سے ملے ہوئے) آئیگی، اس لئے اس لحاظ سے وہ اس کی آخری کڑی ہوگی۔ لیکن اس سے موجودہ طبعی زندگی کی کڑیوں کا خاتمہ ہو جائیگا اور ایک نئے انداز کی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اس اعتبار سے وہ ایک نئی زندگی کی پہلی کڑی ہوگی۔

اسی طرح قرآنی انقلاب کے بعد انسانوں کی جو تمدنی زندگی شروع ہوتی ہے وہ بھی اگرچہ سابقہ تمدن سے متصل ہی ہوتی ہے لیکن وہ اس تمدن کی آخری کڑی ہوتی ہے۔ اس سے ایک نئے انداز کا انسانی تمدن شروع ہوتا ہے۔

لہذا آخرۃ\* کسی سلسلہ کی آخری کڑی کو کہتے ہیں جس کے بعد نئے سلسلہ کا آغاز ہو۔ آخرۃ\* الترحیل کجاوہ کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں جو قتادیر مۃ الترحیل کی ضد ہے۔ آخرۃ\* الثعین آنکھ کے اس کوئے کو کہتے ہیں جو رخسار سے متصل ہوتا ہے اور قتادیر مۃ الثعین اس حصے کو جو ناک سے متصل ہوتا ہے۔

آخرۃ قدام کی ضد ہے۔ قدام کے معنی ہیں آگے ہونا۔ لہذا آخرۃ کے معنی ہیں پیچھے ہونا۔ تآخیر، تَقْدِیر م کی ضد ہوتا ہے۔ مُتَقَدِّم اور مُتَأَخِّر کے معنی اس سے واضح ہیں۔ قرآن میں مَسَاتَبِیْق کے مقابلہ میں مَا یَسْتَأْخِرُونَ (۱۱) بھی آیا ہے۔ مُسْتَقْدِرِ مِیْن کے مقابلہ میں مُسْتَأْخِرِیْن بھی (۲۶)۔

آخِر (خاکہ زبر کے ساتھ) غیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یعنی جو دوسرے سے مختلف ہو۔ جیسے رَجُلٌ آخِرٌ دوسرا آدمی۔ [دوسرے کے معنی (Second) نہیں بلکہ (Another) یا (Other Than) ہیں] اسی طرح اگر ایک لائن میں کچھ آدمی کھڑے ہوں تو پہلے کے بعد دوسرا آدمی آخِر ہوگا۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا آخِر ہوگا۔ اسی طرح یہ سلسلہ اخیر تک چلا جائیگا۔\*

اس کے بعد یہ لفظ آخر مغایرت کے معنوں میں استعمال ہوئے لگا\*\*\* مغایرت کے معنی ہیں جو اپنی پہلی کڑیوں سے مختلف ہو۔ سورۃ المؤمنون میں اس لفظ کے یہ معانی بڑی عمدگی سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں انسانی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کی ابتدائی کے خلاصے سے ہوئی۔ پھر نطفہ بنا اس سے حمل قرار پایا۔ پھر نطفہ سے لوتھڑا بنا۔ لوتھڑا گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہوا۔ پھر اس میں ہڈیاں بنیں۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھا۔ یہاں تک پیدائش کے وہ مراحل ہیں جو قانون طبعی کے مطابق سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی کڑی نہیں آتی جو اس قانون کی رو سے سابقہ کڑی سے الگ ہو۔

\* آخر کی ثالث آخری ہے جس کی جمع آخر ہے (۶)۔

\*\* ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔

\*\*\* ناج

(حتیٰ کہ اس منزل تک حیوان کے بچے اور انسانی جنین میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا)۔ اس کے بعد ہے **ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ** (۲۳) ”پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی تخلیق میں اٹھا کھڑا کیا“۔ یہاں **خَلْقًا آخَرَ** کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ تخلیق کی یہ کڑی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں انسانی ذات کی طرف اشارہ ہے جو طبعی قوانین کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں **فجائی ارتقاء** (Emergent Evolution) کہتے ہیں۔ یعنی جس میں اچانک، غیر متوقع طور پر ایک ایسی تخلیق سامنے آ جاتی ہے جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

لہذا **آخَرَ** اور **آخِرَہ** کے معانی کے اعتبار سے انسانی زندگی کا یہ تصور سامنے آیا کہ انسانی یسکر میں آکر زندگی نے اپنی سابقہ کڑیوں سے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔ اب یہ سلسلہ اس کی طبعی موت تک جاری رہیگا۔ اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جو اگرچہ اس زندگی سے بالکل متصل ہوگی لیکن اس سے موجودہ کڑیوں کا خاتمہ ہو جائیگا اور اس کے بعد زندگی ایک نیا اسلوب اختیار کریگی۔ جو لوگ اس زندگی کے متعلق موجودہ زندگی کے قوانین (Physical Laws) کے مطابق سوچتے ہیں انہیں اس پر یقین پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو دل و دماغ، قدرت کے اچانک انقلابات کی تخلیقی کارفرمائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں وہ آخرت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخرت، اس مستقبل کا نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ گردشِ دولاب (کولہسو کے بیل کی حرکت) کے ذریعے۔ یہ انقلاب اس زندگی میں (قرآن کے ذریعے) پیدا ہوتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے ظہور میں آتی ہے۔

قرآن، **الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا** کے مقابل **قِيٰمَۃً** اور **آخِرَۃً** کے الفاظ لاتا ہے۔ مثلاً **خِزْيٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَیَوْمَ النَّفِیْسِ یُرَدُّوْنَ** ..... (۸۵)۔ اور **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَشْتَرَوْا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِآءِ خِیْرَۃٍ** (۸۶)۔ دنیا کے معنی میں قریبی (دیکھئے عنوان د۔ ن۔ و) اسی طرح وہ **جِلْسَۃً** کے مقابلہ میں **آخِرَۃً** بھی لاتا ہے۔ مثلاً (۸۱، ۸۲)؛ (۲۰، ۲۱) میں۔ یعنی پیش ہوا افتادہ بمقابلہ مستقبل۔ آخر الامر۔ اسی طرح **تَعٰجِلْ** اور **تَاْخَّرْ** بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوئے ہیں (۲۱)۔ نیز **آخِرَۃً** بمقابلہ **اَوَّلٰی** (۲۱) بھی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، سورۃ حجر میں **مُسْتَقْدِرِ مِیْنِ** کے مقابل **مُسْتَأْخِرِیْنِ** کا لفظ آیا ہے (۱۵)۔ یعنی پہلے چلے جانے والے اور بعد میں آنے والے۔ اسی

کی تشریح دوسری جگہ مَاتَسْبِيْقُ مِّنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُوْنَ (۱۵) نے کر دی ہے۔ سورۃ شعراء میں فی الْاٰخِرِیْنَ (۲۶/۸۴) کے معنی آنے والی نسلیں ہیں۔

لہذا ”آخرت“ کے مفہوم میں، پیش پا افتادہ مفاد کے بجائے مستقبل کی خوشگواریاں، موجودہ نسل کے بجائے آنے والی نسلیں (انسانیت عامہ)، انقلاب آفرینی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کی نمود، اور اس طبعی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کے تصورات، سب شامل ہیں۔

اٰخِرٌ۔ یُّؤَخِّرُ۔ کسی کام کو بعد میں کرنا۔ ملتوی کرنا۔ موقوف کرنا (عن)۔ مہلت دینا (الی)۔ تَاْخِرٌ پیچھے رہ جانا۔ دوسرے کے بعد آنا۔ وَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَئِذٍ..... وَمَنْ تَاْخَرَ..... (۲۶/۸۴)۔ ”اور جو جلدی کر کے دو دن میں (چلا جائے).... اور جو پیچھے رہ جائے“ قرآن کریم نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل)

پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر گرا نہیں پڑتے بلکہ ہمیشہ اپنے سامنے مستقبل کا مفاد رکھتے ہیں۔ جو کسان بیچ کے لئے رکھے ہوئے گہیوں کو چکی میں پسوا کر اس کی نرم نرم روٹیاں کھا لیتا ہے اس کی آج کی بھوک تو مٹ جاتی ہے۔ لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کے لئے مستقل بھوک ہوتی ہے۔ لیکن جو کسان اس بیچ کو زمین میں ڈال کر چھ منات ماہ تک براہر محنت کرتا ہے اور نہایت ثبات و تحمل سے فصل پکرنے کا انتظار کرتا ہے اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے اور جب یہ سلسلہ ایک چکر باندھ لیتا ہے تو اس کا حال بھی خوشگوار ہو جاتا ہے اور مستقبل بھی۔ یہ اس لئے کہ اسے مستقبل (آخرت) پر یقین تھا اس لئے وہ مفاد عاجلہ پر لپک نہیں پڑا۔ غور کیجئے۔ دنیا میں وہی قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے جس کے سامنے مستقبل کی بہبودی ہو۔ مومن کو مستقبل پر یقین رکھنے والا کہا گیا تھا۔ لیکن آج اس آسمان کے نیچے جماعت مومنین (مسلمان) سب سے زیادہ عاقبت فراموش (مستقبل سے بے نیاز) ہے اور اس لئے سب سے پیچھے۔ حالانکہ اس کا مستقبل اس قدر حدود فراموش تھا کہ اس کا احاطہ اس دنیا کی چار دیواریوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ موت کے بعد بھی براہر آگے چلتا تھا۔

واضح رہے کہ ایک فرد کی زندگی میں ہر آنے والا سانس مستقبل ہے۔ ایک قوم کی زندگی میں آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے۔ نوع انسانی کے

لئے آنے والے زمانے کی انسانیت (Humanity) اس کا مستقبل ہے، اور ان سب کے لئے اس دنیا کی طبعی زندگی کے بعد، اگلی زندگی (حیاتِ آخرت) مستقبل ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ جب قرآن کریم نے مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں آخرت پر یقین رکھنے کی تاکید کی تھی تو اس کا مفہوم کیا تھا؟ یہی کہ فرد ہو یا قوم۔ وہ

- (۱) صرف اپنے حال ہی کو نہ دیکھے۔ مستقبل پر بھی نگاہ رکھے۔
  - (۲) موجودہ نسل کی بہبود ہی پر قناعت نہ کرے۔ آنے والی نسلوں کی خوش حالی کو بھی پیش نظر رکھے۔ اور
  - (۳) زندگی اس دنیا کی طبعی زندگی کو نہ سمجھ لے۔ موت کے بعد کی زندگی پر بھی یقین رکھے۔
- (اس کے ساتھ (د - ن - و) کا عنوان بھی دیکھئے)۔

## ا خ و

”اَخ“۔ یہ لفظ ”آخِیۃ“ سے مشتق ہے۔ رسی یا آہنی تار کے دونوں سرے زمین میں دبا کر باقی حصے کا جو حلقہ بن جاتا تھا اسے ”آخِیۃ“ کہتے تھے۔ اس کے ساتھ جانوروں کو باندھ دیا جاتا تھا۔ لہذا ”اَخ“ کے معنی ہوئے ایک حلقہ میں بندھے ہوئے یا ایک کنہونٹے کے ساتھ بندھے ہوئے۔ یہ لفظ بھائی اور ہر اس شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسرے شخص سے قبیلہ یا دین یا صفت یا معاملہ یا محبت میں مشترک ہو\*۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ ”وخیل“ ہے جس کے معنی تصد کے ہیں۔ لہذا ”اَخ“ کے معنی ہونگے ہم مقصد\*\*۔ اس کا مؤنث ”اِخْت“ ہے۔

قرآن کریم میں ”اِخْوَان“ بمقابلہ ”اَعْدَاء“ آیا ہے۔ ”اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً“ ..... ”فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا“۔ ”تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا، (۱۳۴)۔ ”اَعْدَاءُ“ انہیں کہتے ہیں جن کے درمیان پھر (Wedge) لگ رہی ہو۔ لہذا ”اِخْوَان“ وہ ہونگے جن کے مابین کوئی چیز حائل نہ ہو۔ قرآن کے الفاظ میں ”فَاَلْتَفَتَ بَيْنَ قَتْلُوْكُمْ“ (۱۳۴)۔ ”اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی،“۔ اس اعتبار سے مومن وہ ہیں جن کے قلوب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل چکے ہوں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے ساتھ گھل مل جاتا ہے\*\*\*۔ قرآن نے تمام مومنین کو ”اِخْوَان“



قرار دیا ہے۔ اِنْتَمَ الْمُؤْمِنُونَ اٰخُوَةٌ\*۔ ”یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں،“ (۲۴۱) جو قرآن کی رسی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا (۲۴۲) ”تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو،“ یہ ہے جماعت مومنین کے افراد کا باہم گر صحیح رشتہ۔

قرآن میں ہم قبیلہ افراد کیلئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی ثَمُوْدَ اَخْتًا هُمْ صَالِحًا (۲۴۳)۔ ”ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا،“ اور ہم مشرب لوگوں کے لئے بھی۔ جیسے مُبَذَّرٌ رَّيْنٌ کو اَخُوَانُ الشَّيَاطِينِ کہا گیا ہے (۲۴۴)۔ اسی طرح ”اُخْتٌ“ ہم قبیلہ ہورت کو کہا گیا ہے۔ جیسے حضرت مریم کو یَا اُخْتُ هَا رُوْنِ کہا گیا ہے (۲۴۵)۔ اور مثیل اور ہم مشرب کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے، جیسے (۲۴۸) میں ہم مشرب اقوام کو ایک دوسرے کی ”اُخْتٌ“ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

## ۵۵۱

آلَا دُ۔ تعجب۔ گھبرا دینے والا معاملہ۔ اچنبھا\*۔ آ لَا دِرِیْدُ\* چیخنے چلانے اور پانی گرنے کی آواز کو کہتے ہیں\*\*۔ ہر ناخوشگوار بات جس میں شور و غوغا ہو\*\*\*۔ یعنی ایسی بات جو لوگوں کو اس قدر ناگوار گذرے کہ اس سے اختلافی خلفشار پیدا ہو جائے اور لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگ جائیں۔ آدَا اَلْبَعِیْرُ۔ اونٹ بڑا یا۔ آدَاتِ التَّقَاتِ۔ اونٹنی کا آہین بھرنا اور رونے کی آواز بلند کرنا۔ آدَتْہُ الدَّاهِیَّةُ۔ مصیبت نے اسے ہریشانی میں ڈال دیا\*۔ تَادَدَا لَامْرُؤَ مَعْمَلِہُ سَنَکِیْنِ ہو گیا\*\*۔ قرآن کریم نے عیسائیوں سے کہا ہے کہ تم نے یہ عقیدہ وضع کر کے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدْثًا (۲۴۹)۔ ایک نہایت افسوس ناک اور کرب انگیز بات کر دی۔ تم نے ایک بڑا ہی خطرناک اور حقیقت سوز عقیدہ ایجاد کر لیا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑا ہونا (امر عظیم) شدید ہونا اور بار بار ہونا۔ نیز ہدک کر بھاگ جانا ہیں۔

## ادریس علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت ادریسؑ کا ذکر انبیاء کرامؑ کے زمرہ میں کیا ہے۔ وَادْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِدْرِیْسَ۔ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّقًا نَبِیًّا (۲۵۰)۔ ”اور تو کتاب میں ادریس کا ذکر کر۔ یقیناً وہ سچا نبی تھا،“ نیز (۲۵۱)

لیکن آپ کا تفصیلی تذکرہ کہیں نہیں آیا۔ قیاس یہ ہے کہ آپ کا زمانہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے کا ہے۔ اور آپ کا نام تورات میں حنوک یا اخنوخ ہے۔ اگر آپ حنوک ہی ہیں تو آپ حضرت نوحؑ کے اجداد میں چوتھی پشت پر آتے ہیں۔ کیونکہ تورات نے حضرت نوحؑ کا نسب نامہ یوں لکھا ہے۔ نوح۔ بن لمک۔ بن متوسلح۔ بن حنوک۔ (پیدائش - ۲۶۴۹)۔

## ا د م

”ا د م“ کے معنی ہیں قرابت۔ موافقت۔ مل جل کر رہنے کی صلاحیت۔ یا خود میل جول۔ ”ا د م“ اور ”ا د م“ کے معنی ہیں مخلوط ہونا۔ موافق ہونا۔ ایک دوسرے میں میل محبت ہونا۔ ”ا د م“ اللہ بیتیہم“ یا ”د م“ کے معنی ہیں خدا نے ان کے درمیان موافقت سازگاری اور ہم آہنگی پیدا کر دی۔ ”ا د م“ ہر موافق چیز کو کہتے ہیں\*۔ یعنی جو مل جل کر رہ سکے۔ اصل میں یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے روٹی لگا کر کھائی جائے (مثلاً سالن۔ ٹرکاری وغیرہ) ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔ یعنی موافقت۔ محبت۔ مودت۔

”ا د م“ گندم گون رنگ کو کہتے ہیں\*\*۔ ”ا د م“۔ اندرون۔ جلد کو بھی کہتے ہیں (ابن فارس)۔ ”ا د م“۔ کسی خاندان کا ایسا مثالی فرد جس سے اس کے قبیلہ کو پہچانا جائے\*۔ ”ا د م“۔ جس کی نسبت ”ا د م“ کی طرف ہو۔ انسان\*۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ”ا د م“ جن کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً ۱) نبی تھے۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصہ ”ا د م“ کی جو تفصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا ”ا د م“ کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر، قصہ ”ا د م“ کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود ”ا د م“ کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم (Primitive) انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی۔ ”ا د م“ کا لفظ خود اس تمدنی زندگی (Social Life) کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لہذا ”ا د م“ انسانی زندگی کی اس حالت کا نام ہے جس میں اس نے مل جل کر رہنا شروع کیا۔ اس طرح مل جل کر رہنے سے باہمی مفادات

\* ناچ۔ \*\* محیط۔ \*\*\* مزید برآں دیکھئے تہذیب ۱۸۰ جلد چہارم عنوان آدم

کا تصادم ہوا۔ اس تصادم کا حل تنہا عقل انسانی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا حل وحی کے ذریعے دیا گیا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”اہلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جس میں آدم کا لفظ اس انداز سے آیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی فرد کا نام ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهٖمَ وَّ اٰلَ عِمرٰنَ عَلٰی الْعَالَمِیْنَ ..... (۲۴) ”یقیناً اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو (ان کی ہم عصر اقوام پر) فضیلت دی تھی.....“۔ یہاں آدم کا ذکر حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے اور وہ (حضرت نوحؑ کی طرح) نبی تھے (اگرچہ اصطفا کا لفظ قرآن میں غیر نبی کے لئے بھی آیا ہے۔ مثلاً حضرت مریم کے متعلق۔ دیکھئے (۱۹)۔ اور خود آیتِ محمدیہ کے متعلق۔ دیکھئے (۲۴)۔)۔ بہر حال جس آدم کا ذکر سورۃ آلِ عمران کی مندرجہ بالا آیت (۲۴) میں آیا ہے وہ ”جنت سے نکلنے والے آدم“ سے مختلف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔ اس نے سلسلہ نبوت کا آغاز عام طور پر حضرت نوحؑ کے ذکر ہی سے کیا ہے۔ مثلاً سورۃ نساء میں ہے اِنَّا اَوْحٰیْنَا اِلَیْكَ کَیْمًا اَوْحٰیْنَا اِلَیْ نُوْحٍ وَّ النَّبِیِّیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ (۲۱)۔ بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جس طرح ہم نے نوحؑ اور اس کے بعد کے انبیاء پر وحی کی..... اگرچہ قرآن کریم سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ میں حضرت نوحؑ سے پہلے اور انبیاء بھی آچکے تھے (دیکھئے ۲۵۔ وھنوان نوحؑ)۔

## ادی (ادو)

اَدَوْتُ کَفْعًا کَذَا۔ تو ایسا کرنے کی تدبیر کرتا رہا \* اسکی اصل آدَاۃ ہے جس کے معنی ایسی تدبیر یا ذریعہ کے ہیں جس سے کسی تک پہنچا جاسکے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی چیز تک پہنچانے یا کسی چیز کے دوسری چیز تک خود بخود پہنچ جانے کے ہیں۔

آدَاۃ۔ تَاَدِیْتُهُ۔ اسکو پہنچا دیا۔ آدَیْتُ دِیْنَتَهُ اس نے اپنا قرض ادا کر دیا۔ اَلَا دَاۡءُ اِسْمٌ ہے \*\*۔ قرآن میں ہے وَ اَدَاۡءُ اِلَیْہِ بِیَاحْسٰنٍ (۲۸)۔ ”اور احسان کے ساتھ اسکی ادائیگی کی جائے“۔

نیز اس کے معنی ہیں کسی کے سپرد کر دینا۔ (جیسے امانت واپس کر دی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا اَدُّوْا اِلَیَّیْ عِبَادَ اللّٰهِ (۲۸)۔ ”اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کر دے۔“، ادا ہے امانت کے لئے یہ لفظ (ہم) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے فَلَیْسُوْا بِالْاٰذِیْ اَوْ تَمِیْنِ اَمَانَتِهٖ۔ ”جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہئے کہ اپنی امانت ادا کر دے۔“

## اِذَا

”اِذَا“۔ جب۔ جسوقت۔ جس جگہ۔ کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ عموماً زمانہ ماضی (گذرے ہوئے زمانے) کے لئے آتا ہے۔ اِذَا قَاتَلَ رَبُّکَ لِلْمَلَاِئِکَةِ (۲۱)۔ ”جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا،،۔ یا اِذَا یَرْفَعُ اِبْرٰهیمُ الْقَوَاعِدَ (۲۲)۔ ”جب ابراہیمؑ (اس گھر کی) بنیادیں اٹھا رہا تھا۔“ بعض اوقات یہ ”کیونکہ،، یا ”اس لئے کہ،، کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثلاً لَنْ یَنْفَعَکُمْ اَلْیَوْمَ اِذَا ظَلَمْتُمْ (۲۳) ”آج یہ تمہیں کچھ فائدہ نہیں دیگا کیونکہ تم زیادتیاں کیا کرتے تھے۔“

لین بے صحاح کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض اوقات (اِذَا) زائد بھی ہوتا ہے۔ مثلاً وَاِذَا وَاَعَدْنَا مُوسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (۲۴)۔ اس کے معنی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو چالیس راتوں کا حکم دیا۔ ایسے مقامات پر اِذَا سابقہ واقعہ میں فصل پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی اس سے ایک نئی بات شروع ہو جاتی ہے۔

یَوْمَئِذٍ۔ اُس دن۔ یَوْمَئِذٍ تَعٰیذُ اَخْبَارَهَا (۲۵)۔ ”اس دن وہ اپنی تمام خبریں بیان کر دیگی۔“  
حِیْنَئِذٍ۔ اُس وقت۔ وَاَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۲۶) اور تم اُس وقت دیکھ رہے ہوئے ہو۔

## اِذَا

اِذَا۔ یہ کئی معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً :

(۱) کبھی یہ ”اچانک،“ کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ دفعتاً ظہور میں آجائے۔ خَرَجْتُ فَاِذَا اَلْاَسَدُ بِاَلْبَابِ۔ میں باہر نکلا تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کے سامنے شیر کھڑا ہے۔ قرآن میں ہے فَاِذَا اِیْہِ حِیْثَ تَسْعٰی (۲۷)۔ ”تو اس نے ہر ایک کیا دیکھا کہ وہ سانس لے رہا ہے۔“

(۲) کبھی اِذَا کے معنی ”ہاں“ کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی بات کے نتیجہ میں کچھ واقعہ ہونا۔ وَ اِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۱۶۱) اور جب ان پر خود انکے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔

(۳) کبھی یہ شرط کے مفہوم کے ساتھ ’جب‘ کے معنوں میں زمانہ ’ماضی‘ اور زمانہ ’مستقبل‘ دونوں کے لئے آتا ہے۔ مثلاً اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۱)۔ جب خدا کی مدد اور فتح آگئی (یعنی زمانہ ’ماضی‘)۔ اور زمانہ ’مستقبل‘ کی مثال فَاِذَا اَعَزَمْتُ فَتَوَكَّلْ عَلٰی اللّٰهِ (۱۵۸) جب تو پختہ ارادہ کر لے تو اللہ (کے قانون) پر پورا پورا بھروسہ رکھ۔ اِذَا۔ یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ اگر یوں ہوا تو اس صورت میں بات یوں ہوگی۔ سورہ مومنوں میں ہے وَلَئِنْ اطَعْتُمْ بِشْرًا مِّثْلَكُمْ لَآتِكُمْ اِذَا الْخُلُسِرُ وَنَ (۱۲۳) اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کی اطاعت کرو گے تو (یاد رکھو) اس صورت میں تم یقیناً سخت نقصان اٹھاؤ گے۔

اِذَا مَا۔ جب۔ جس وقت۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا عَسَمُ يَغْفِرُوْنَ (۲۱۷) وہ جب کبھی غصہ میں آئیں تو دوسروں کو اپنے غصہ کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

## اذن

”اذن“۔ ”اذن“ کے معنی ہیں کان (جسکی جمع ”اذان“ ہے)۔ ”اذن“۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکے کان بڑے بڑے ہوں اور ”اذن“ اسے کہتے ہیں جو ہر شخص کی بات سن لے اور اسے قبول کر لے۔ قرآن کریم میں ہے وَيَقُولُوْنَ هُوَ اَذُنٌ (۶۱) مخالفین، رسول کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کانوں کا کچا ہے۔ ”اذن“ کے معنی اعلان کے ہیں۔ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ اِلٰى النَّاسِ (۱۱) میں اس کے معنی اعلان ہی کے ہیں۔ اَذِنَ اِلَيْهِمْ وَلَهُ کے معنی ہیں کان لگا کر سننا۔ پسندیدگی کے ساتھ۔ لیکن بعض کے نزدیک اسمیں پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کی کوئی شرط نہیں۔ خالی سننے کے لئے بھی ایسا کہا جاتا ہے۔\* لیکن بعض علمائے لغت کے نزدیک اس میں سننے کے ساتھ اطاعت کرنے کا مفہوم بھی

ہایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک وَاذْنَتْ لِرَبِّهِمَا (۸۴)۔ میں صرف سنا ہی مراد نہیں بلکہ اطاعت کرنا بھی ہے۔ تَاذَنْ کے معنی اعلان کرنے (یا کسی کو خبر دینے) کے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک اسکے معنی قسم کھانے کے بھی ہوتے ہیں۔\*\* دراصل اس میں قسم اور یقین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی کہنے والا کہتا ہے کہ میں یقیناً ایسا کرونگا۔ چنانچہ سورہ اعراف میں جہاں ہے وَاذْنَتْ تَاذَنْ رَّشَكَت (۱۶۶)۔ تو اسکے معنی یا تو یہ ہیں کہ جب تیرے رب نے اعلان کیا، یا یہ کہ جب تیرے رب نے کہا کہ میں یقیناً ایسا کرونگا۔ (خدا کے اعلان کرنے یا یقینی طور پر کہنے سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اس بات کے لئے ایسا قاعدہ یا قانون بنا رکھا ہے۔) اذْنِ بِالْشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی بات کا علم حاصل کر لینا۔ اس سے آگہ ہو جانا۔ چنانچہ فَاتَّوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲۱۶) کے معنی ہیں تم آگہ اور خبردار ہو جاؤ کہ تمہارے خلاف خدا نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔\*\*

اذْنٌ لَّہٗ فِی الشَّيْءِ۔ کے معنی ہیں اجازت دیدینا اور اِسْتِیْذَانٌ کے معنی ہیں اجازت طلب کرنا۔\*\*

اذْنٌ کے معنی ہیں اجازت۔ اعلان اور علم (اجازت و اعلان کا ذکر اوپر آگیا ہے۔ علم کے ضمن میں) فَعَلْتَهُ بِاِذْنِیْ کے معنی ہیں اس نے اس کام کو میرے علم سے کیا ہے۔\*\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کان اور علم دونوں ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِذْنٌ اور عِلْمٌ میں فرق یہ ہے کہ اِذْنٌ وہیں بولا جاتا ہے جہاں صاحب علم کا ارادہ اور مشیت بھی اسکے ساتھ شامل ہو لیکن عِلْمٌ میں اسکی شرط نہیں۔ لہذا اِذْنٌ اللہ کے معنی ہوئے اللہ کا علم اور مشیت\*\*\*۔ اس چیز کو عام اصطلاح میں ”خدا کا قانون“ کہتے ہیں۔ (اسکی تفصیل ”مشیت“ عنوان شہی۔ اُسے تحت ملیگی)۔ لہذا قرآن کریم میں جہاں اِذْنٌ اللہ آئیگا اسکے معنی سیاق و سباق کے اعتبار سے خدا کے قانون کے ہونگے جسمیں اسکا علم اور مشیت دونوں آجائے ہیں۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے وَالْتَبَسَلَدُ الْقَطِیْبُ بِمُخْرَجٍ نَّبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ (۸۸)۔ ”اور اچھی زمین سے اسکی پیداوار خدا کے اذن (قانون) کے مطابق نکلتی ہے“۔ ظاہر ہے کہ زراعت کے متعلق خدا نے ایک قانون مقرر کر دیا ہے اور فصلیں اس قانون کے مطابق پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح سورہ الحج میں ہے۔ بِمُسِیْکِ السَّمَاءِ اَنْ تَقَعَ عَلٰی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (۲۲)۔

”وہ بادلوں (بارش) کو تھا مے رکھتا ہے کہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ گرے۔“ یہاں بھی اذن سے مراد قانون خداوندی ہے جس کے مطابق مینہ برستا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۱۶۶) اس کے معنی بھی ہیں کہ عرذی حیات کی موت خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۱۶۶) پر بحث کرتے ہوئے صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر یہ خصوصیت رکھ دی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے وارد کردہ نقصان سے اثر پذیر ہو سکے۔ پتھر میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ یہی خدا کا اِذْن ہے\*۔ اسی کو قانون خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف اشیاء میں مختلف قسم کی خصوصیات جن کی رو سے ان کی روش زندگی متعین ہوتی ہے۔ خارجی کائنات میں اللہ کا یہ اِذْن قانون کائنات کی شکل میں کارفرما ہے۔ اور جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، یہ اِذْن کتاب اللہ (قرآن) کے اندر ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں فَسَمِعَ اللَّهُ الْغَدِرَ يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ لَهُمْ مِنْ اللَّهِ كِتَابٌ مُفَصَّلٌ (۲۵۵) کے معنی ہیں اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ان امور کے بارے میں جن میں انسان اختلاف کرتے ہیں اپنی کتاب (ضابطہ قانون) کے مطابق حق کے ساتھ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہاں بِإِذْنِہ کے معنی ہیں کتاب اللہ (قرآن) کے مطابق یا قرآن کے ذریعے۔ اور اگر اس کے معنی عام قانون لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اپنے قانون ہدایت کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کر رہا ہے اور قانون ہدایت یہ ہے کہ ہدایت اس کو ملتی ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہے۔ جو ہدایت حاصل کرنا نہ چاہے وہ گمراہ رہتا ہے (تفصیل اس کی ش-ی-۱ کے عنوان میں ”مشیت“ کے تحت ملیگی) بہر کیف ”اِذْنِ اللہ کے معنی ہیں خدا کا قانون خواہ وہ قانون کائنات ہو یا قانون ہدایت جو قرآن کے اندر ہے۔

## اُذی

”اِذْ بِثُلَّةٍ“ کسی چیز کا طبیعت پر ناگوار گزونا۔ ناخوشگوار سی بات۔ خفیف سی تکلیف۔ یہ جب ذرا آگے بڑھ جائے تو خُزْرٌ کہلاتی ہے۔ جس کے معنی سخت تکلیف، نقصان یا مصیبت کے ہیں\*\*۔

اُذی - یُوْذِی - ایذا پہنچانا۔ یعنی ایسی باتیں کرنا جو دوسرے کو ناگوار گزریں\*\*۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ اگرچہ قیاسی طور پر اس کا مصدر اِذَّاعٌ آسکتا ہے لیکن کلام عرب میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔

ناتاقہ\* آذیتہ\*۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو طبعاً ایسی ہو کہ کسی ایک مقام پر چین سے نہ بیٹھے\*۔

قرآن کریم نے عورت کے حیض آنے کے متعلق کہا ہے کہ قُلْ هُوَ أَذًى (۲۴۳)۔ اس میں گوسناؤنا پن۔ ناگواری۔ ناخوشگواری اور ذرا سی بے چینی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسی لئے اس حالت میں عورتوں سے الگ رہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے لَا تَبْطِلُوا صِدْقَ قُلُوبِكُمْ بِالْمَعِينِ وَالْأَذَى (۲۴۴)۔ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کیلئے جو کچھ تم دو اس کے بعد ایسی صورت نہ پیدا کرو کہ تم ان کے سر پر سنگ گراں بن کر بیٹھ جاؤ یا کوئی ایسی بات کرو جو انہیں ناگوار گزرے۔ ایسا کرو گے تو تمہاری یہ امداد تعمیری نتائج پیدا کرنے کے بجائے تخریبی نتائج پیدا کریگی۔ یہ عمل، باطل ہو جائیگا۔

سزا دینے کے معنوں میں یہ لفظ (ہڑ) میں آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے وَالَّذِينَ يَأْتِيْنِيهَا مِنْكُمْ فَأَذُواْ وَهُم مُّتَا۟ءُونَ اور تم میں سے جو دو اس کا ارتکاب کریں تو انہیں سزا دو،۔

بیماری کی تکلیف کے لئے سورۃ بقرہ میں ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّنْ رَّأْسِهِ (۱۱۶)۔ ”پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو،۔

## ارب

أَلَا رُبُّ - أَلَا رَبَّةٌ - أَلَا رَبَّةٌ - چالاکى - معاملات کی بصیرت۔ تیز ذہانت۔ پورا مکمل عضو جس میں سے کچھ کم نہ ہو۔ عقل۔ کشادگی۔ أَلَا رَبُّ بِالْشَّيْءِ - کسی چیز کا ماہر ہونا۔ أَلَا رَبُّ إِلَيْهِ - اس نے شدت سے کسی چیز کی ضرورت محسوس کی یا اس کا محتاج ہوا۔ أَلَا رَبُّ - وہ فاصلہ (یا کشادگی) جو انسان کی شہادت کی انگلی اور درسیانی انگلی کے مابین ہوتا ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہیں (۱) ضرورت۔ (۲) عقل۔ (۳) حصہ اور۔ (۴) گرہ باندھنا اور سخت کرنا۔

أَلَا رَبُّ الشَّيْءِ - چیز کو مضبوط کر دیا۔ مکمل کر دیا\*\*۔ أَلَا رَبُّ - شدت، احتیاج، ضرورت۔ أَلَا رَبَّةٌ - أَلَا رَبَّةٌ - حاجت۔ ضرورت۔ غرض۔ أَلَا رَبُّ - وہ اعضاء جن کی شدید ضرورت ہوتی ہے\*\*\*۔

سورۃ طہ میں ہے وَلِيٌّ فَيَسْأَلُهَا رَبُّ الْأَخْيَرِ (۲۱۸)۔ اس سے میری دیگر بہت سی ضرورتیں پوری ہونگی۔ یا میں اس سے دیگر بہت سے معاملات کو



ساجھاؤنگا۔ میں اس سے ایسی بصیرت حاصل کرونگا جس سے مشکل معاملات میں میری عقدہ کشائی ہوتی جائے۔ میں مختلف اہم اور ضروری امور میں اس سے مدد لونگا۔

سورۃ نور میں ہے غَیْثٌ اُولٰٓئِیْہِ الْاَرْضِ بِرَبِّہِ مِنْ الشَّجَرِ اَلْجَالِی (۲۴)۔ مردوں میں سے ایسے (نوکر) جنہیں نکاح کی ضرورت نہ ہو۔ نیز دیکھئے تَمَّۃٌ مِّثْلُ مَثَلِۃٌ جلد چہارم

## ا ر ض

آرُضٌ - زمین۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو، آرُضٌ کہلاتی ہے۔ (برعکس سَمَاءٌ کے)۔ چنانچہ آرُضٌ التَّعْمَلِ جوئے کے تلے کو کہتے ہیں۔ نیز ٹانگوں کا وہ حصہ جو گھٹنے سے نیچے ہو آرُضٌ کہلاتا ہے۔ زمین کو بھی آرُضٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہاؤں کے نیچے رہتی ہے۔

چونکہ انسانی معاش کا بنیادی ذریعہ آرُضٌ (زمین) ہے اس لئے آلا رَاضَۃٌ خوش حالی اور شادابی کو کہتے ہیں۔ آرَضَتْ اَلْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین عمدہ ہو گئی۔ اس میں بہت پیداوار ہونے لگی اور اس لئے آنکھوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔ جَدُّیْ آرِیْضٌ کے معنی ہیں بکری کا موٹا اور فربہ بچہ۔ آلا رَاضٌ دیمک کو کہتے ہیں۔

چونکہ آرُضٌ نیچلی چیز کو کہتے ہیں اس لئے آرَاضَۃٌ کے معنی ہیں کسی کا منکسر المزاج یا مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ آرِیْضٌ کے معنی ہیں خلیق آدمی۔ یا نرم اور عمدہ زمین۔ اس میں خیر کا پہلو غالب ہوتا ہے (ابن فارس)۔ قرآن میں جِبَالٌ کے ساتھ آرُضٌ کا لفظ آیا ہے۔ (مَثَلًا یَوْمَ نَسْفِیْطُ الْجِبَالَ اَوْتَرٰی اَلْاَرْضُ بِاَرۡزَۃٍ) (۱۸) جس دور میں ہم جبل کو (اپنے غلبہ اور قوت سے) ان کی جگہ سے ہلا کر الگ کر دیں گے اور ارض ابھر کر سامنے آ جائیگی،۔ ان مقامات میں جِبَالٌ کے مجازی معنی ہونگے بڑے بڑے لوگ (قوم کے اکابر) اور آرُضٌ کے مجازی معنی چھوٹے طبقے کے لوگ۔

آرُضٌ وَسَمَوَاتٌ کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے۔ اور جہاں ان الفاظ کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے ہو گا تو سَمَاءٌ کے معنی خدا کا کائناتی قانون اور آرُضٌ کے معنی انسان کی معاشی زندگی ہونگے۔ قرآن نے آرُضٌ کے متعلق کہا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَکُمۡ فِیْہَا مَعَاشِشًا (۱۰)

”ہم نے تمہارے لئے زمین میں سامانِ معیشت رکھے ہیں۔“ اگر آپ فوراً کرینگے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ سامانِ زیست کا اصلی سرچشمہ ارض ہی ہے۔ اس لئے یہ لفظ وسائل و ذرائع رزق کے لئے استعمال ہوا ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س - م - و)۔ اگر معاشی زندگی کو خدا کے کائناتی قانون (یا قرآن کے ضابطہ حیات) سے الگ کر لیا جائے تو وہ نہایت پست سطح کی (حیوانی) زندگی ہو جاتی ہے جس میں طبعی زندگی سے متعلق مفادِ عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انسانی زندگی کا بلند نصب العین حاصل نہیں ہوتا۔ اس قسم کی معاش کو قرآن نے عَرَضٌ هَذَا لَا دُنٰی (۱۶۹)۔ ”اس قریبی زندگی کی متاع،“ کہہ کر ہکا رہا ہے۔ اور اسے رفعت (بلندی) کے مقابلہ میں پستی قرار دیا ہے۔ ”وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهٖٓا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلٰی الْاَرْضِ“ (۱۷۰) ”ہم چاہتے تھے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اسے (انسان کو) بلندی عطا کر دیں لیکن وہ پستی کے ساتھ چمٹ گیا،“ اسی کو جذبات پرستی۔ خود غرضی یا نفسانیت اور مفاد پرستی کہا گیا ہے۔ یعنی صرف طبعی زندگی کے مفاد کو مقصدِ حیات قرار دے لینا۔ قرآن کے الفاظ میں ”وَاقْبَلِمْ هُوَ لَهٗ“ (۱۷۱) ”اس نے اپنی خواہشات کا اتباع کر لیا،“ توحید یہ ہے کہ خدا کا جو قانون خارجی کائناتی زندگی میں کارفرما ہے اسی قانون کو انسان کی معاشی زندگی کا مدار بنایا جائے۔ (یہ قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اس توحید کے معنی یہ ہیں کہ اَرْضٌ اور سَمَآءٌ میں ایک ہی قانون کو تسلیم کیا جائے۔ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَاۤءِ اِلٰہٌ وَفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ (۱۷۲) ”ارض و سماء میں وہی صاحبِ اقتدار ہے،“ اگر انسان اپنی معاشی زندگی کو (قانونِ خداوندی کے بجائے) اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھے تو معاشرہ میں ناہمواریوں کا بیہنم پیدا ہو جاتا ہے۔ اَمْ اَتَّخَذُوْا اٰلِهَةً مِّثْلَ اِلٰہِ الْاَرْضِ هُمْ یُنشِرُوْنَ وَنُـلَوْ کَانَ فِیْہِمْ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا (۱۷۳) ”کیا انہوں نے اپنی معاشی زندگی کے لئے اور قوتوں کو صاحبِ اقتدار تسلیم کر رکھا ہے جن کے متعلق انکا خیال یہ ہے کہ وہ ان کی معاشی زندگی کو حیاتِ نوعطا کر دینگے۔ اگر ارض و سماء میں اللہ کے سوا اور صاحبِ اقتدار ہستیاں ہوں تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔“

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اَرْضٌ (زمین) فوع انسانی کے لئے رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کسی فرد کی ملکیت میں نہیں جاسکتی۔

وَالْأَرْضَ رُضًا وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵) کے یہی معنی ہیں (یعنی ارض کو مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے)۔ دوسری جگہ ہے مَتَاعًا لَّكُمْ (۵۶) وَلَا نَعْمَا لَكُمْ (۵۷) ”تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامان زیست۔ متاع حیات“۔ نہ صرف زمین بلکہ دیگر عناصر طبعی جن کے امتزاج و تعاون سے زمین سے رزق پیدا ہوتا ہے، ان سب کے متعلق فرمایا کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقَيِّمِينَ (۵۶) یعنی بھوکوں کے لئے سامان زیست۔ لہذا کوئی نظام جس میں ارض تمام نوع انسانی کے مشترکہ فائدہ کی بجائے کسی خاص گروہ یا افراد کے فائدے کا موجب بن کر رہ جائے، قرآنی تعلیم (یعنی منشاء خداوندی) کے خلاف ہے۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ اس رزق کے سرچشمے (یعنی زمین کی پیداوار) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ سَوَاءٌ لِّلنَّاسِ أَلْيَبُتُّنَ (۶۱)۔ وسائل پیداوار اور سامان زیست (مثلاً روشنی۔ ہوا۔ پانی۔ زمین، قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ ایسا انتظام کرنے سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جسے قرآن چھٹی صدی عیسوی میں اس وقت لایا جب دینا جاگیر داری اور زمینداری کو ہیں ”مطابق فطرت“ سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا نے اسوقت اس انقلاب کی اہمیت کو نہ سمجھا (اور بعد میں خود مسلمانوں نے بھی اسے پشت ڈال دیا) لیکن اب وہی دنیا، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس کی طرف کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا لَأَنَّا تِلْكَ الْأَرْضُ تَنْقُصُهَا مِن أَطْرَافِهَا ..... (۱۳)۔ ”کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں“۔ اس طرح بتدیج وہ وقت آ جائیگا جب زمین کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں رہیگی بلکہ تمام افراد انسانیہ کی پرورش کا ذریعہ بن جائیگی۔ یہ وہ دور ہوگا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۶۹)۔ ”زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھگی“۔

## ارک

الْأَرِيْكَةُ۔ (جمع أَرَايِكُ)۔ تخت یا مسہری جس پر پردے بڑے ہوئے ہوں۔ یا ہو وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ رَاغِب نے کہا ہے کہ چہرہ کھٹ کو أَرِيْكَةُ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بالعموم أَرَاكُ

(یلو) کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا۔ اَلْأَرَاکُ ایک قسم کے ترش چارہ کو بھی کہتے ہیں\*۔ قرآن میں ہے مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ (۱۱۱) ”وہ گدے دار تختوں یا مسہریوں پر تکیہ لگائے ہونگے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قیام کرنے کے ہیں۔ نیز أَرَاکُ\* (درخت) کے۔ علاوہ رہیں، جب زخم مندمل ہو کر باقی جسم کی سطح کے برابر ہو جائے تو اسے بھی أَرَاکُ\* کہتے ہیں۔ اس لفظ کے وہ اپنی اصلی حالت پر قائم ہو جاتا ہے۔ مزید برآں دیکھئے صفحہ ۱۸۰ جلد چہارم۔

## ارم

أَرَامُ\*۔ (واحد أَرَمٌ\*) نشاناتِ راہ۔ یا کسی چیز پر کوئی نشان بنا دینا تاکہ وہ پہچانی جا سکے\*۔ پتھروں کو أَرَمٌ\* کہتے ہیں\*\*۔  
قرآن میں قوم عاد کے متعلق ہے أَرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹)۔ أَرَمٌ\* اس مقام کا نام ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ (ذَاتِ الْعِمَادِ کے لئے دیکھئے عنوان (ع۔ م۔ د)۔ راغب نے کہا ہے کہ أَرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ سے وہ بلند ستون مراد ہیں جن پر نقش و نگار ہوتے تھے\*\*۔ بعض محققین کا یہ خیال بھی ہے کہ قوم عاد کے مورثِ اعلیٰ کا نام أَرَمٌ تھا جو سَام کا بیٹا تھا۔ اس اعتبار سے تادم اور أَرَمٌ ایک ہی قوم کا نام ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عاد)۔  
صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ أَرَامُ رُوسَةُ درخت کی جڑ یا انسان کے حسبِ نسب کو کہتے ہیں\*\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے وکھتے چلے جانا۔ اس میں ترتیب اور بلندی (دونوں) کا مفہوم آ جاتا ہے۔

## ازر

أَزَرٌ\*۔ پشت، قوت\*۔ قرآن میں ہے۔ اَشْدُّ دُہمَ أَزَرِي\* (۲۱)۔ اس سے میری پشت کو مضبوط کر دے۔ میری قوت کو مستحکم کر دے۔ أَزَرٌ\* اصل و بنیاد۔ أَزَرُ\* یہ وہ چیز جو تہائے بدن کیلئے ستر کا کام دے۔ اَلْمُؤَاظَرَةُ\* آمنے سامنے ہونا۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ کھیتی کا ایک دوسرے کے ساتھ گتھہ جانا اور اس طرح بڑے ہودوں کا چھوٹے ہودوں کو تقویت دینا\*۔ أَزَرَ کے معنی ہیں جڑ اور بنیاد کو مضبوط کرنا۔ سورۃ فتح

میں (شجر اسلام کے متعلق) ہے فَتَا زَرَّهٗ فَمَا سَتَغْلَظَ (۲۶)۔ (اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے) پھر اپنی جڑ کو مضبوط کرتی ہے۔ اس طرح وہ موٹی عورت چلی جاتی ہے۔

آزُرٌ۔ ایک بت کا نام تھا جس کے محافظ حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارخ تھے۔ اس بت کی نسبت سے انکا لقب آزُرٌ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ آزُر حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام تھا، یا کسی اور بزرگ کا۔ لیکن قرآن میں لَا یَبْہُ آزُرٌ (۱/۵) آیا ہے۔ چونکہ اس مقام پر کوئی اور معنی لینے کا قریبہ نہیں اس لئے یہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ ہی تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ تارخ ہی کو معرب کر کے آزُر بنا لیا گیا\*۔ لیکن یہ بڑی ضعیف سی بات ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آزُر کے معنی ضَالٌ (گمراہ) کے ہوتے ہیں\*\*۔ لیکن قرآن نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ (نیز دیکھئے عنوان ابراہیم)۔

## از ز

آلَا زَبْرٌ۔ تیزی اور حدت۔ گرج۔ آتَا النَّقَارَ یَبْزُزُہَا۔ اس نے آگ کو روشن کر دیا اور بھڑکا دیا۔ آتَا الْقَیْدَ رٌ۔ ہانڈی میں سخت اہال آگیا۔ آتَا السَّحَابَ بَہٗ۔ بادل زور سے گرجا۔ آلا زٌ۔ رگ کا پھڑکنا۔ ہر انگیکھتہ کرنا۔ بھڑکانا\*۔ سورۃ مریم میں ہے تَتَوَّضَعُہُمْ آتَا (۱۸)۔ وہ (شیاطین) کفار کو اکسائے اور بھڑکائے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحرک۔ تحریک۔ اور کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھاڑ دینا ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی کو کسی دوسرے کے خلاف اس طرح اکسانا ہیں کہ جسے اکسایا جائے اسے محسوس تک نہ ہو کہ اس سے کیا کام لیا جا رہا ہے۔

## از ف

آزَفَ الشَّرَحْضِلُ۔ روانگی کا وقت قریب آگیا۔ آزَفَ الْقَرْجُلُ۔ آدمی نے جلدی کی۔ آتَا زَفٌ۔ قریب قریب اور یکساں قدم رکھنا۔ آلا زَفٌ۔ جلد ہونے والی چیز۔

قرآن میں ہے آزَفْتَ لَازِفَتَہُ (۵۴) آنے والی ساعت قریب آ پہنچی۔ یعنی اعلیٰ کے ظہور نتائج کا وقت۔ اسی کو دوسری جگہ۔ یَوْمَ آلا زِفَتَہُ۔

(۲۱۸) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ ”آنے والی ساعت“۔ انقلاب کی گھڑی۔  
نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں زآ کے ساتھ ہمزہ آئے  
ان میں سختی اور تنگی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی  
معنی قریب اور نزدیک ہونے کے لکھے ہیں۔

## استبرق

اِسْتَبْرَقٌ\*۔ سونے ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے  
کہ یہ ایسا دبیز ریشمی کپڑا ہوتا ہے جس پر سونے کا کام کیا گیا ہو\*۔  
قرآن میں سُنْدُسٌ\* اور اِسْتَبْرَقٌ\* (۱۱۱)۔ اہل جنت کے عمدہ لباس کے لئے  
آئے ہیں۔

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جوہری نے اس لفظ کا مادہ برق بتایا  
ہے۔ اگر یہ برق سے ہے تو ممکن ہے اس میں بجلی کی چمک کا استعارہ ہو۔

## اسحاق علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ فرزند اکبر  
حضرت اسمعیلؑ حضرت ہاجر کے بطن سے تھے۔ اور چھوٹے بیٹے (حضرت  
اسحاقؑ) حضرت سارہ کے بطن سے۔ حضرت اسمعیلؑ حجاز کی وادی غیر ذی  
زروع میں بسے اور حضرت اسحاقؑ کے حصہ میں فلسطین کی سرداری آئی۔  
اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ کے زمرہ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ . . . مَا اَنْزَلْ  
اِلٰی اِبْرٰہِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ . . . (۱۱۱)۔ ”اور جو کچھ  
فازل کیا گیا ابراہیم۔ اسماعیل اور اسحاق کی طرف“۔ انبیائے بنی اسرائیل  
آپ ہی کی اولاد میں سے تھے۔ (نیز دیکھئے عنوان ابراہیم)

## اس ر

اَسْرٌ\*۔ وہ تسمہ یا رسی وغیرہ جس سے کسی چیز کو باندھ لیا  
جائے۔ اَسْرٌ\* کسی چیز کو رسی وغیرہ سے باندھ لینا۔ نیز بندش۔ ساخت  
اور خلقت۔ اَسْرٌ\*۔ قیدی۔ باندھا ہوا (آدمی)۔ اسکی جمع اَسَارِی اور  
اَسْرِی آتی ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی روک دینے  
اور قید کر دینے کے ہیں۔

\* تاج و محیط ۔

باندھنے کے مفہوم سے اس کے معنی مضبوط اور مستحکم ہونے کے بھی آتے ہیں\*۔ قرآن میں آساری کا لفظ قیدیوں کے لئے آیا ہے۔ "وَأِنْ يَأْتِ تَوْكُّمُ" آساری "اور اگر وہ قید ہو کر تمہارے پاس آئیں"۔ (۲/۸۵)۔ سورۃ الدھر میں ہے نَجِّنْهُمْ "خَلَقْنَاهُمْ" وَ شَدَدْنَا أَسْرَهُمْ (۴۶/۴۶)۔ "ہم نے انہیں (انسانوں کو) پیدا کیا اور ان کے آسُر کو مضبوطی سے جکڑ دیا"۔ آسُر کے معنی انسانی جسم یا ہیئت (Form) کے ہیں۔ دورِ حاضرہ کی علمی تحقیقات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ یہ لفظ حقیقت کے ایک بہت بڑے گوشے کو بے نقاب کرتا ہے۔ ہم کسی چیز کو محسوس نہیں کر سکتے جب تک اسکی کوئی (Form) نہ ہو۔ سائنس کی تحقیق نے بتایا ہے کہ مادہ (Matter) در حقیقت کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں۔ یہ (Atoms) کا مجموعہ ہے جو ایک خاص نظام کے ماتحت ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں یہ باہمی جکڑ بندی نہ رہے تو کسی شے کی (Form) باقی نہیں رہ سکتی۔ لہذا یہ آسُر (باہمی جکڑ بندی) ہی ہے جس سے اشیاء کا وجود قائم ہے۔ سرجیمز جینس نے اسے "مقیّد لہروں" (Bottled-up Waves) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو قرآن نے شَدَدْنَا أَسْرَهُمْ کے جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین کے ساتھ ہمزہ آئے ان میں قوت اور شدت کا مفہوم مضمّن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس مادہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

## اسرائیل علیہ السلام

حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا۔ (۱۱/۱۱)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "یعقوب"۔ بنی اسرائیل کیلئے عنوان "بنی اسرائیل" دیکھئے۔

## اس س

الْأَسْ - الْأَسَاسُ - عمارت کی بنیاد جہاں سے تعمیر شروع ہوتی ہے۔ جمع آسَاسٌ - آسَاسٌ - ہر چیز کی اصل - اَلْأَسَاسُ - عمارت کی بنیادیں ڈال دینا۔ \*\* نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں قوت اور شدت کا مفہوم مضمّن ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر ثابت اور قائم ہونا۔ سورۃ توبہ میں ہے اَسِّسْ عَلَی التَّقْوَى (۹/۱۸) (وہ مسجد) جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔

آلَاؤُس - انسان کے دل کو بھی کہتے ہیں - \* اور اس را کہ کو بھی جو کاروان کے منزل سے کوچ کر جانے کے بعد پیچھے رہ جاتی ہے۔ اس سے اسکی معنی کسی چیز کے اثر یا نشان کے لئے جاتے ہیں۔ خُذْ اَسَّ الْقَطْرِ بِنُق۔ کسی سے اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صحیح راستہ تک پہنچنے کے لئے دیگر نشانات و قرائن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے کہا جائے۔

## ا س ف

آلَا سَفْتُ - کسی چیز کے کھو جانے پر شدید ترین حزن کو کہتے ہیں \*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین اور ہمزہ حاتھ آئیں ان میں شدت اور قوت کا مفہوم مضمحل ہوتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف آئے غَضْبَانَ اَسِیْفًا (۱۵۰)۔ ”غصہ میں بھرے ہوئے۔ افسوس کرتے ہوئے“۔ راغب نے کہا ہے کہ آسَفْتُ سے مطلب انتقام کے جذبہ کے ماتحت خونِ دل کا جوش کھانا ہے۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمتر کے لئے پیش آئے تو غَضَبٌ کہلاتی ہے اور اگر اپنے سے بڑتر کے لئے پیش آئے تو حُزْنٌ کہلاتی ہے \*۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق فرمایا ہے فَلَمَّا اَسْفَوْنَا اِنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۳۳/۵۵)۔ جب انہوں نے ہمیں ”ناراض کیا، تو ہم نے انہیں ان کے جرموں کی سزا دی۔ (اللہ کے ”ناراض ہوئے“ کے لئے عنوان (غ۔ض۔ب) دیکھئے)۔ سورۃ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کا قول ہے یَا سَفْیٰ عَلٰی یٰوَسَفْتُ (۱۲/۸۳)۔ ”وائے افسوس! یوسف!۔ لہذا عمام حالات میں اس کے معنی حزن و تاسف کے ہونگے۔ اَرْضٌ آسِیْفَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فوت (یعنی ہاتھ سے نکل جانا) اور حسرت و تاسف بتائے ہیں۔ اَلْجَمَلُ اَلْاَسِیْفُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو فریبہ نہ ہوتا ہو (ابن فارس)۔ آسِیْفٌ غلام کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی پر ہمیشہ محزون رہتا ہے۔ نیز جلد غمگین ہو جانے والے رقیق القلب آدمی کو بھی \*۔

## اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ حضرت ہاجر کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسماعیلؑ بڑے بیٹے تھے۔ انہی کو حضرت ابراہیمؑ، اپنے خواب کو \* تاج۔



حکم خداوندی سمجھ کر خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے لے گئے تھے (۳۴/۱۰۲) لیکن خدا نے انہیں وقتی قربانی کے بجائے، عمر بھر کی قربانی کے لئے زندہ رکھا (۳۴/۱۰۳)۔ یہ بڑی قربانی (ذبح عظیم) تھی، بیت اللہ کی تولیت خانہ خدا کی پاسبانی۔ چنانچہ ان دونوں باپ بیٹوں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمعیلؑ) نے ملکر کعبہ کو تعمیر کیا (۲۱/۱۲۷) اور اس کے بعد حضرت اسمعیلؑ اسکی پاسبانی کے لئے وہیں بس گئے۔ خدا نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا (۲۱/۱۲۸)۔ اور صادق السَّوْعَدِ (۱۱/۱۱۹) کہہ کر پکارا۔ ”اسمعیل“ عبرانی لفظ شماع (سماع سننا) اور ایل (خدا) سے مرکب ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اس لئے آپ کا نام اسمعیل (اللہ کا سننا) رکھا گیا۔ آپ کی اولاد میں حضور خاتم النبیینؐ پیدا ہوئے۔

## اس ن

آسَنَ الْمَاءُ يَأْسَنُ۔ پانی کی بو، رنگ یا مزے کا بگڑ جانا۔ آ لَاسِن وہ پانی جو دیر تک ٹہرا رہنے کی وجہ سے متغیر ہو گیا ہو۔ \*قرآن میں جنت کی انہار کے متعلق ہے۔ مَنْ مَاءٍ غَيْرِ الْسِنِ (۲۵/۱۵) ”ایسے پانی کی نہریں جو بگڑتا نہیں“۔ اسلئے کہ جنتی معاشرہ میں کسی چیز کو روک کر نہیں رکھا جاتا۔ استعمال کی ہر شے گھومتی پھرتی اور رواں دواں جاری رہتی ہے۔ یہ تو جہنمی معاشرہ ہے جس میں يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۰/۱) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی رزق کے جن چشموں کو بہتے رہنا چاہئیں انہیں ارباب قوت و اقتدار اپنے ذاتی مفاد کے لئے روک رکھتے ہیں اور اس طرح رکنے سے ان میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔

[آخرت کی جنت کی کیفیات کو ہم اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن قرآن صرف آخرت کی جنت و جہنم ہی کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اس دنیا کی جنت اور جہنم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ تفصیل جنت (ج-ن) اور جہنم کے عنوانوں میں ملیگی]۔ اس دنیا کے جنتی اور جہنمی معاشرہ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ آخرت کی جنت اور جہنم پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کریم میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔ (۱۱۵/۲۵)

## اس ی

أَسِيتٌ عَلَيْهِ۔ میں اس پر غمگین ہوا۔ رَجُلٌ اسٍ وَأَسِيَانٌ۔ غم کرنے والا آدمی۔ اسٍ (الآسی) طیب و معالج کو کہتے \* تاج و راغب و محیط \* اس میں مادہ (ر، س، و) بھی شامل ہے۔

ہیں)۔ اَمْرًاۃٌۢ اَسِیَّةٌۢ - غم کرنے والی عورت\*۔ قرآن میں ہے فَلَا تَأْسَ عَلٰی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۲۶)۔ ”تو قوم فاسقین (کی تباہی) پر غمگین نہ ہو،“۔

اَسَاۃٌ بِمُصِیْبَةٍ تَّاسِیَّةٌ - اس کی مصیبت میں اس کو تسلی دی۔ فَتَّاسًاۃً - پس اسے تسلی ہو گئی\*۔ لہذا اَسٰی کے معنی (راغب کے الفاظ میں) غم کے ہونے اور تَّاسِیَّةٌ کے معنی غم کو دور کرنے کے۔ چنانچہ اَلَا سُوٌّ زَخْمٌ کِی دوا کرنے کو کہتے ہیں۔ اَلَا سِیۡۃٌ - دوائیں۔ یہ اَلَا سُوٌّ کی جمع ہے۔

اَلَا سِیۡۃٌ - جس کی دوا کی جائے\*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَسُو کے بنیادی معنی دوا دارو کرنا ہیں اور اَسٰی کے معنی رنج و غم ہیں۔

راغب نے کہا ہے کہ اَسُوۃٌ و اَسُوۃٌ کے معنی وہ حالت ہیں جس پر کوئی شخص کسی کا اتباع کرتے وقت ہوتا ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، مسرت بخش ہو یا تکلیف دہ۔ نیز وہ چیز جس سے غمگین آدمی تسلی حاصل کرے۔ جس سے اس کا غم زائل ہو جائے۔ جس سے اس کے دکھوں کا مداوا ہو جائے\*\*۔ اَسُوۃٌ یہ، ہم نے اُسے اس کے لئے قابل تقلید نمونہ قرار دیا۔ جنگ احزاب میں جن لوگوں نے دون ہمتی اور عدم استقلال کا ثبوت دیا تھا ان سے کہا گیا کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَسُوۃٌ حَسَنَۃٌ (۲۴) تمہیں وہی کچھ کرنا چاہئے تھا جو رسول اللہ نے کیا۔ جس طرح وہ ہمت و استقلال سے قانون خداوندی سے کامل ہم آہنگی کے ساتھ تمام مصائب کا مقابلہ کرتے رہے تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاہئے تھا۔ ان کی مثال تمہارے لئے نہایت عمدہ نمونہ تھی۔ اس سے تمہیں اپنی مشکلات میں تسلی حاصل کرنا چاہئے تھی۔ اسی طرح دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے کہ انہوں نے کس طرح نظام خداوندی کے مخالفین سے علانیہ کہہ دیا کہ ہمارا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ اس ضمن میں کہا گیا کہ قَدْ کَانَ لَکُمْ اَسُوۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرٰہِیْمَؑ وَالتَّوْحٰیۡدِیۡنَ مَعَهُ (۲۵)۔ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی یہ روش تمہارے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اس سے تمہارے دکھوں کا مداوا ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں کئی مقامات پر مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم اس نظام کے مخالفین سے کبھی دوستی کا رشتہ نہ رکھو۔ انہیں راز دار نہ بناؤ۔ مثلاً (لَا تَتَّخِذُوْا بَیۡطَٰنَتَہٗۤ اٰمِیۡنٌ دُوۡنَکُمْ) (۱۱۷)۔ ”تم انہوں کے سوا کسی کو راز دار نہ بناؤ،

اَلْمُؤَاسَاةُ۔ کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسرے کو اپنی جگہ پر سمجھو اور جس قدر اپنے لئے نفع حاصل کرنے اور مضرات کو دفع کرنے کی کوشش کرو اتنی ہی اس کے لئے کرو۔ اور اِیْثَارٌ یہ ہے کہ تم اسے اپنے آپ پر بھی ترجیح دو۔۔۔ قرآن کریم اِیْثَارٌ کی تعلیم دیتا ہے یُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ۔ ”وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔“ (۵۹)۔ اسی اصول پر قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی بنیاد ہے \*۔

## ا ش ر

اَشِرَ۔ یَاْشِرُ۔ اَشْرًا۔ بہت زیادہ اترانا اور اکڑنا۔ خود پسندی کے ساتھ خوش ہونا۔ دراصل اَشْرُ الْمِنْجَلِ درانتی کے دندانوں کو کہتے ہیں۔ اور اَلْمِیْثَارُ۔ آرے کو۔ اس لئے اَشْرُ ایسی خود پسندی اور اکڑفوں ہے جو دوسروں کو کاٹتی چلی جائے۔ یعنی شدت کی خود پسندی اور تکبر جس میں انسان عقل کی حدود سے نکل جائے۔۔۔

قرآن کریم میں ہے بَلْ هُوَ كَذَابٌ اَشِرٌ (۵۴)۔ یہ اَشِرَ۔ یَاْشِرُ سے ہے اور اس کے معنی انتہائی متکبر اور خود پسند کے ہیں۔ ”وہ سخت جھوٹا اور بڑا خود پسند ہے،“۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حِدَتْ اور تیزی کے لکھے ہیں۔

## اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ

قوم متبع کے حاکم ذونواس کا وہ لشکر جس نے بڑی بڑی خندقوں میں آگ جلا کر عیسائیوں کو اس میں جھونک دیا تھا۔ (۸۹)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ت۔ ب۔ ع) اور (خ۔ د۔ د)۔

## اَصْحَابُ الْاِیْکَةِ

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے اَصْحَابُ الْاِیْکَةِ کے نام سے پکاری گئی ہے۔ (۱۸)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”شعیبؑ“۔

\* تفصیل کے لئے دیکھئے میری ”کتاب نظام ربوبیت“ \*\* تاج و راغب \*\*\* محیط

## أَصْحَابُ الْحِجْرِ

حضرت اسمعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام نبیط تھا۔ ان کے خاندان کو نبط (جمع انباط) کہا جاتا ہے۔ شام و عرب کی حدود پر ان کی حکومت کے آثار ملتے ہیں۔ تورات میں (حزقیل نبی کے صحیفہ میں) نبط کا ذکر آیا ہے۔ پہلے ان کا دارالسلطنت رقیم تھا۔ لیکن جب اس پر رومیوں نے قبضہ کر لیا تو یہ وادی قریٰ میں شہر حجر کی طرف منتقل ہو کر آ گئے۔ اسی نسبت سے انہیں أَصْحَابُ الْحِجْرِ کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے خدا کے رسولوں کی تکذیب کی اور عذاب میں ماخوذ ہو گئے (۸۰-۸۳)۔

چونکہ ان سے پہلے قوم ثمود کا مرکز بھی حجر کا شہر رہ چکا تھا اس لئے بعض مورخین کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیات میں اصحاب الحجر سے مراد قوم ثمود ہی ہے۔ لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ ان سے مراد قوم نبط ہے جس کے عروج و زوال کی داستانیں آج بھی حجر کے کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش ملتی ہیں۔

## أَصْحَابُ الرَّسِّ

حضرت اسمعیلؑ حجاز میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ آپ کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے اپنے خاندانوں کے رئیس تھے۔ ان میں سے ایک کا نام قیدمہ تھا۔ اصحاب الرِّس انہی کی اولاد میں سے قیاس کئے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قوم ثمود کا ایک قبیلہ تھا۔ قرآن کریم نے تکذیب رسل کے سلسلہ میں دو مقامات پر ان کا نام لیا ہے۔ یعنی (۲۸) اور (۲۲) میں۔

## أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ

وہ نوجوان جنہوں نے آسمانی انقلاب کے سلسلہ میں ایک غار میں جا کر پناہ لی اور وہاں اس انقلاب کی تیاریاں کرتے رہے۔ قرآن کریم میں ان کا ذکر سورہ کہف میں آیا ہے (۱-۱۰)۔ تفصیل ان امور کی سیری کتاب ”شعلہ مستور“ میں ملیگی۔

زمانہ قدیم میں نبطی حکومت کا دارالسلطنت رقیم کا شہر تھا۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا تو اس شہر کو شہرت حاصل

ہوئی۔ لیکن رقیم کے نام سے نہیں بلکہ پشرا کے نام سے، جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرا کہہ کر پکارا۔ دور حاضر کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات کا سراغ لگا لیا ہے جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاہوں کے آثار ملے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ اسلئے نزول قرآن کے وقت عرب، اصحاب کھف (غار والوں) یا اصحاب الرقیم (بطرہ والوں) کے قصہ سے آشنا تھے، لیکن انہی تفصیل کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن کریم نے (جزئیات میں گئے بغیر) اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ ان فوجوانوں کے پیش نظر مقصد کیا تھا اور بعد میں لوگوں نے کیا سمجھ لیا اور انہیں کیا سے کیا بتا دیا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر۔ ق۔ م)

## ا ص د

اَصَد۔ اس نے بند کیا (دروازہ وغیرہ)۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے اندر شامل ہو جانا ہیں۔ اس سے آ' لَا صِيْدُ' باڑے کو کہتے ہیں جس میں جانور بند کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں مُؤَصَّدَةٌ\* آیا ہے (۱۸۴)۔ جس کے معنی ہیں بند کی ہوئی یا مشتمل۔

اہل لغت کا کہنا ہے کہ یہ وصد کا ایک لغت ہے\*۔ اس لئے ہم نے احتیاطاً اسے وہاں (و۔ ص۔ د میں) بھی لکھ دیا ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ بھی ایک مستقل مادہ ہے۔

## ا ص ر

آ' لَا صَرٌّ۔ کسی چیز کو باندھ دینا۔ زبردستی روک دینا\*\*۔

آ' لَا صِيْرَةٌ۔ چھوٹی سی رسی جس سے خیمے کا نچلا حصہ باندھ دیا جائے\*\*\*۔

آ' لَا صَرٌّ۔ محکم عہد جس سے انسان بندھا ہوا ہو۔ نیز اس کے معنی بوجھ کے ہیں\*\*\*۔ سورۃ اعراف میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ اَصْرَهُمْ (۱۵۷)۔ وہ اس بوجھ کو اتار دیگا جس کے نیچے نوع

انسانی دبی چلی آ رہی ہے۔ اور ان گراں بار پابندیوں کو اٹھا دیگا جو انسانوں کے لئے ناقابل برداشت ہوں۔ اور اس طرح انسانیت کو صحیح حریت فکر و عمل عطا کر دیگا۔ یہی وہ اصرار ہے جس سے آزاد رہنے کی آرزو ہمیں سکھائی گئی ہے وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اَصْرًا (۲۸۶)۔ ”اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال،“ یہی وہ حقیقی آزادی ہے جسے قرآن عطا کرتا ہے۔ یعنی اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہوگی، اس کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے حکم کی اطاعت نہیں ہوگی، خواہ وہ مذہبی پیشوا ہوں یا دنیاوی ارباب اقتدار (۳۸)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنے اور جھکانے کے لکھے ہیں۔ یعنی کسی کو محکوم بنا لینا۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْاَصْرُ سے مراد وہ امور ہیں جو بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں مانع اور حائل ہوتے ہیں اور ان تک پہنچنے نہیں دیتے۔

## ا ص ل

”اَلَا صَلُّ“۔ کسی چیز کا سب سے نچلا حصہ۔ اَصْلُ\*۔ کسی چیز کی بنیاد یا جڑ\*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ فَرْع\* کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ\* وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۲۴)۔ جس کے معنی شاخ کے ہیں۔ اَسْتَأْصَلَهُ\*۔ اس کو جڑ سے اکھیڑ دیا\*۔ پا کاٹ دیا\*\*۔

”اَلَا صَيْلٌ“ (جمع اَصَال\*) عصر سے مغرب تک کا وقت\*۔ قرآن کریم میں ہے يَا لَيْلُغَدٌ\* وَ”اَلَا صَالِ“ (۲۵)۔ صبح اور شام۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے معنی شام کے بعد کا وقت ہیں۔ غالباً رات کے نچلے حصے کی جہت سے اسے ایسا کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اَصْلُ\* کسی چیز کے اس بنیادی حصے کو کہتے ہیں کہ اگر اسے مٹا دیا جائے تو وہ ساری چیز ختم ہو جائے۔ اس اعتبار سے عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کو ”اَلَا صَيْلٌ“ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے چلے جانے سے دن ہی ختم ہو جاتا ہے۔

## ا ف ف

”اَلَا فُتٌ“۔ ہر گندی مکروہ اور حقیر چیز کو کہتے ہیں۔ میل کچیل۔ ناخن کی کترن۔ ناخن یا کان کا میل۔ نیز کپڑے پر پڑی ہوئی مٹی یا راکھ وغیرہ کو پھونک مار کر صاف کرنے کے لئے اُفٹ بولا جاتا ہے۔ غائباً پھونک مارنے کی آواز کی جہت سے، ”اَلَا فُتٌ“ ہزدل کو کہتے ہیں۔ یا اُسے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ جس کے پاس کم مال ہو۔ گنڈا آدمی۔ ”اَلَا فُتٌ“۔ ”اکتا جانا۔ ”اَلَا فُتٌ۔ بد بو۔ اُفٹ۔ یؤفٹ۔ بے چینی، اکتاہٹ یا تکلیف

کی وجہ سے "اُتِبَ کہنا۔ کسی سے نفرت و بیزاری یا "اکتاہٹ کے اظہار کے لئے، نیز تحقیر کے موقع پر "اُتِبَ لہ" کہا کرتے ہیں"۔

قرآن کریم میں والدین کے متعلق ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُتِبَ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (۲۱۴) "ان کی تحقیر نہ کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں بلکہ نرمی سے بات کرو"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ناپسندیدہ ہونے کے ہیں۔ (نیز موجودہ وقت کو بھی کہتے ہیں۔ لیکن قرآن میں اس معنی میں یہ لفظ نہیں آیا)۔

## ا ف ق

"اَلَا فُقُ"۔ "اَلَا فُقُ"۔ کنارہ۔ جمع "افاق"۔ یعنی جو کچھ زمین اور آسمان کے اطراف سے نظر آتا ہے۔ "افق" اَلْبَيْتِ خیمے کا اگلا چھجا یا سائبان۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اطراف و جوانب کے درمیان وسعت اور انتہائی بُعد کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے سَنُرِيْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ (۲۱۵)۔ "ہم انہیں اپنی نشانیاں دنیا کے اطراف و جوانب میں اور خود ان کے اپنے اندر دکھائیں گے"۔ یعنی قومی اور بین الاقوامی حوادث۔ نیز اس کے معنی خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے ہو سکتے ہیں۔

فَرَسٌ "افق"۔ خوشنما اور حیرت انگیز رفتار والا گھوڑا۔ اَفِیْقَ الْقَرْجُلُ۔ وہ علم و فضل اور کرم و شرافت اور دیگر فضائل میں انتہا تک پہنچ گیا۔ فَهَوَ اَفِیْقٌ وَ اَفِیْقٌ\*۔

انتہائی وسعت اور بلندی کے اعتبار سے نبی اکرمؐ کے متعلق ہے۔ وَلَقَدْ رَاَهُ بِاَلَا فُقِ الْمُبِیْنِ (۲۱۶)۔ "اور اس (رسول) نے اپنے آپ کو نہایت بلند مرتبہ پر دیکھا"۔ (یا خدا نے رسول کو سیرت و کردار کے بلند مقام پر دیکھا)۔ سورۃ نجم میں ہے وَهُوَ بِاَلَا فُقِ اَلَا عَلٰی (۵۳)۔ "وہ رسول (شرف انسانیت اور علم و حقائق کے) بلند ترین مقام پر ہے"۔

## ا ف ک

اَفَکَ۔ بَا فِکَ۔ جھوٹ بولنا۔ جھوٹی بات بنانا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو الٹ دینا اور اسکی جہت سے

بھیر دینا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں عصائے کلیمی کے متعلق ہے فَاذْأَ هِیَ تَلْقَفُ مَا یَأْفِكُوْنَ (۱۶۷)۔ ”اس نے ان سب چیزوں کو نیست و نابود کر دیا (نگل نیا) جنہیں وہ جھوٹ موٹ بناتے تھے،“۔ سورۃ صافات میں جھوٹے کفار کے متعلق ہے اَیْفَکَا (۳۶)۔ ”کیا تم صحیح راستہ سے ہٹ کر،“ سورۃ شعراء میں ہے اَفْتَاکِبْ اٰثِیْمٍ (۲۲۲)۔ قرآن کریم نے اس کی تشریح سورۃ جاثیہ میں ان الفاظ سے بھی کی ہے یَسْمَعُ اٰیَاتِ اللّٰهِ تَتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یَبْصِرُ مُسْتَکْبِرًا کَانَ لَہُمْ یَسْمَعُہَا (۲۸)۔ ”وہ قوانین خداوندی کو جو اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں سنتا ہے۔ پھر تکبر کرتے ہوئے (اپنی ہی بات پر) اڑے رہتا ہے، گویا اس نے قوانین خداوندی کو سنا ہی نہیں،“۔

اِفْکَکَ۔ کسی چیز کو ہلک دینا۔ الٹ دینا۔ جس طریق پر کسی چیز کو ہونا چاہئے اسے اس سے بھیر دینا۔ راغب کے نزائیک بھی اِفْکَکَ کا یہی مطلب ہے \*\*۔

بھیر دینے کے معنوں میں سورۃ ذاریت میں ہے۔ یُوَفِّکُ عَنْہُ مِّنْ اَفْکَ (۵۱)۔ ”اس سے اس کو بھیرا جاتا ہے جو خود اس سے بھیر جاتا ہے،“۔ یہ ایت ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ یعنی خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ انسان خود ہی گمراہ ہوتا ہے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گمراہ ہونا چاہے اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ یہ کرتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اپنے اندر پتھر جیسی سختی پیدا کر لے تو ہر شیشہ اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیگا اور اگر یہ شیشے جیسا نازک بن جائے تو پتھر کی چھوٹی سی کنکری بھی اسے پاش پاش کر دیگی۔ خدائیکہ وہ جدھر اپنا رخ کر لے اسی سمت کی منزل اس کے سامنے آجائیگی۔ خدا زبردستی کسی انسان کا رخ نہیں بھیرتا۔ فَلَمَّا زَاغُواْ اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَہُمْ (۱۵) ”جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون سکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دئے۔“۔

اَنۡتٰی یُّوَفِّکُوْنَ (۵۵) ”کس طرح یا کدھر اللہ بھیرے جاتے ہیں،“۔ اَلْمُوَفِّکَاتُ (۶۹)۔ وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا۔

اَلَا فِیۡکَۃٌ۔ قحط والے سال کو کہتے ہیں \*\*\*۔ اَلْمَا فُوکَۃٌ۔ جہاں بارش نہ ہوتی ہو اور اس لئے وہاں گھاس وغیرہ کچھ نہ ہو \*\*\*۔



## ا ف ل

أَفَلَا التَّائِبُونَ أَفْتُولُوا - چاند (نیز اجرام فلکی) کا غائب ہو جانا اور غروب ہو جانا۔ أَلَمْ يُؤْخَلْ - ناقص - ضعیف - رَجُلٌ - مَنَاءُ قَوْلُ الْقَرَّاءِ - ضعیف العقل آدمی - \* راغب نے کہا ہے کہ أَلَا قَوْلٌ روشن ستاروں کے غروب ہو جانے کو کہتے ہیں - \*\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غروب ہو جانا بھی ہیں اور چھوٹا اور دھندلا ہو جانا بھی -

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے کائناتی نظام پر بڑی دقت نظر سے غور و فکر کیا۔ اسکی قوتوں کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا۔ وَكَذَٰلِكَ نَبِّئُكَ إِبْرَاهِيمَ مَذْكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ - ”اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں اپنی قدرت دکھائی“۔ (۱۶) اور ان سے ذات باری تعالیٰ پر ایمان کے دلائل کو علی وجہ البصیرت محکم کیا۔ چنانچہ انہوں نے ستاروں کو دیکھا۔ چاند پر غور کیا۔ سورج کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ ان کی قوم ان اجرام سماوی کی پرستش کیا کرتی تھی۔ لیکن انہوں نے ان پر غور و فکر کے بعد کہا کہ ان کی حالت یہ ہے کہ ایک وقت میں نہایت آب و تاب سے نمودار ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں تاریکی کے پردے میں جا چھپتے ہیں۔ لہذا اس قسم کی تغیر پذیر چیزیں کبھی معبود نہیں بن سکتیں۔ صاحب اقتدار خدا وہی ہو سکتا ہے جو تغیرات سے ماورا ہو۔ اسلئے لَا أَحِبُّ إِلَّا قَلِيلًا (۱۶) ”میں تغیر آشنا چیزوں کو معبود ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں“۔ \*\*\*۔ میں اس ہستی کو خدا مانتا ہوں جو ان سب کی خالق ہے۔ (الْقَدْرُ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۝ ۱۶)۔

یہ اعلان کہ ایک تغیر پذیر شے معبود نہیں ہو سکتی، بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی حوادث سے تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ اس کی تعریف، برگسان کے مفہوم کے مطابق، یہ ہے کہ (Changelessness in Change) ”تغیرات کی دنیا میں عدم تغیر“۔ اسلئے خدا جو مکمل ترین ذات (The most complete and Perfect Personality) ہے تغیرات سے یکسر ماوراء ہوگا۔ لہذا، جو آئین

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیات (۱۶-۱۷) میں حضرت ابراہیمؑ کے والد (آزر) اور حضرت ابراہیمؑ کا مکالمہ ہے۔ یعنی قال هذا رہی۔ آزر کا قول ہے اور قال لا احب الاقلین۔ حضرت ابراہیمؑ کا قول۔ اسی طرح دوسری آیات میں بھی -

ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ ”آفلیت“ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت کے منافی ہے۔ جس انسان کی ذات کی نشو و نما ہو جائے اس میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اصولوں کا پکا ہوتا ہے اور خارجی احوال و ظروف کے ساتھ (مرغ بباد نما کی طرح) ہر آن بدلتا نہیں رہتا۔ اسی کو ایمان کی پختگی اور عمل کی استقامت کہتے ہیں۔ ایسے ہی انسان ہیں جن کی بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جن کا خدا ”آفل“، نہیں وہ خود بھی ”آفل“ نہیں ہوتے۔ جیسا کسی انسان یا قوم کا ”خدا“، ویسا ہی وہ انسان یا قوم۔ خدا کے تصور کا انسان کی ذات یا قومی خصوصیات پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ قرآن کریم نے خدائے حقیقی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس پر ایمان رکھنے والی قوم کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نہ قوت و ثبات میں۔ نہ شرف و سعادت میں۔

## اکل

آکل۔ کے معنی ہیں کسی چبانے کی چیز کو چبا کر کھا لینا۔ پینے والی چیز یا جس چیز کو چبانے بغیر نگل لیا جائے اسے ”ما“ ”کول“ نہیں کہا جاتا۔ آئما کول۔ وہ جانور جسے کوئی درندہ کھا جائے (سورۃ فیل میں عصفیہ ”ما“ کول (۱/۵) کے معنی ہیں کھایا ہوا بٹھس یا وہ چارہ اور پتے وغیرہ جنہیں کیڑوں نے کھا لیا ہو۔ کرم خوردہ) اس اعتبار سے ”آلا کیل“ بادشاہ کو کہتے ہیں۔ اور آئما کول رعیت کو۔ ”آلا کیل“ کا استعمال عام طور پر پھلوں کے لئے ہوتا ہے لیکن درحقیقت درختوں اور پودوں سے جو کچھ بھی کھایا جائے ”آلا کیل“ کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے۔ ”اکڈھا دائم“ (۱۳/۵)۔ ”اس کے پھل ہمیشہ رہینگے“۔ نیز وسیم رزق۔ عقل اور رائے اور وزنی عقل کو بھی ”آلا کیل“ کہتے ہیں\*۔

آکل کے حقیقی معنی تو کھانے کے ہیں لیکن اس کے مجازی معنی کسی چیز کے لینے کے بھی آتے ہیں۔ ”لا تات کڈوا الثیربوا“ (۱۶۹) کے معنی ہیں۔ سود ست لو۔ اگرچہ ہمارے ہاں بھی ”سود کھانا“ ہی کہتے ہیں اور سود لینے والے کو سود خوار۔ ”راغب نے لکھا ہے کہ اکل مال سے مراد اتفاق مال ہے اس لئے کہ مال کا بیشتر صرف کھانے پینے اور معاشی ضروریات کے متعلق ہوتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں حرام چیزوں کی فہرست میں ”وما آکل التنبع“ (۵) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ جانور جسے درندوں نے پکڑ کر تھوڑا بہت

کھالیا ہو اور اس میں جان باقی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد ہے "إِلَّا مَا ذُكِّرْتُمْ"۔ ہاں اگر تم اسے ذبح کر لو تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر درندوں نے سارے کا سارا کھالیا ہو تو پھر اس کی حلت و حرمت کے متعلق کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اور اگر وہ مر چکا ہو تو پھر "سردار"، ہو جائیگا جو حرام ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس بارہ کے بنیادی معنی "بتدریج کم ہونا"، ہیں۔ جس چیز کو کھالیا جائے وہ کم ہوتی جاتی ہے۔

## آل (حرف)

آل۔ یہ اسم کو معرفہ بنانے یعنی متعین کرنے کے لئے آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی زبان میں (The) آتا ہے۔ "رجل"۔ کوئی آدمی۔ اور "الرجل"۔ وہ خاص آدمی۔ (The Man)۔ ذیل کی مثالوں سے اس کے استعمال کے اسالیب واضح ہو جائیں گے۔

(۱) پہلے کسی کا عمومی ذکر کرنا۔ اور اس کے بعد جب پھر اس کا ذکر آئے تو آل بڑھا دینا۔ مثلاً حُكَمَا أُرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا۔ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ (۱۵:۱۶)۔ "جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔ سو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی،۔ یہاں الرَّسُولَ کے معنی ہیں وہ رسول جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(۲) کسی ایسی چیز کا ذکر کرنا جس سے سننے والا پہلے ہی متعارف ہو۔ یعنی وہ جانتا ہو کہ یہ کس چیز کا ذکر ہو رہا ہے۔ مثلاً اِذْهَبْ فِي الْغَارِ (۲۶)۔ "جب وہ دونوں غار میں تھے،۔ یہاں پہلے کسی غار کا ذکر نہیں آیا۔ پہلی مرتبہ ہی اسے الغار کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سننے والوں کو معلوم تھا کہ اس سے کونسا غار مراد ہے۔

(۳) جب وقت یا زمانہ متعین کیا جائے۔ مثلاً اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (۳) "آج کے دن۔ یا اس دور میں۔ ہم نے تمہارا غلبہ (یا دین) مکمل کر دیا ہے،۔

(۴) استغراق۔ جب کسی پوری کی پوری نوع کا ذکر ہو۔ یعنی کُلِّ کے معنوں میں۔ مثلاً خَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا (۹۶)۔ انسان کی خلقت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ یہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ خصوصیت تمام نوع انسانی کی بتائی گئی ہے۔

(۵) جب کسی چیز میں اس نوع کی تمام خوییاں جمع ہو جائیں تو اسے بھی آل سے مخصوص کر دیتے ہیں۔ (محیط المحيط)۔ جیسے ذالیک الکتاب (۱۶)۔ یہاں الکتاب سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب میں تمام آسمانی کتابوں کی خصوصیات یک جا جمع ہو گئی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں الکتاب مشار الیہ ہونے کی وجہ سے معروفہ ہے۔ البتہ هو الحق کے آل میں یہ خصوصیت ہے کہ اس نوع کی تمام خوییاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔

(۶) مضاف الیہ کی بجائے جب کسی چیز کی نسبت کسی معین شخص کی طرف کرنی ہو تو آل لگا دیتے ہیں۔ مثلاً التمدینۃ سے مراد ہے ممدینۃ الرسول۔ رسول اللہ کا شہر۔ (اس نسبت سے اس شہر کی عظمت کو چار چاند لگ گئے)۔

(۷) بعض وقت یہ التذری کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً الضارب کے معنی ہیں التذری یضرب۔ وہ شخص جو مارتا ہے۔

## آلا۔ (حرف)

آلا۔ یہ دو حرفوں (یعنی ہمزہ استفہام اور لام نفی) کا مجموعہ ہے (ع+لا)۔ اس کا ترجمہ ہوگا۔ ”کیا نہیں؟“۔ ان معنوں میں قرآن کریم میں ہے آلا تَحْيِثُونَ اَنْ يَتَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (۲۴) ”کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری حفاظت کا سامان کر دے؟“ یا مثلاً آلا تَقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ (۱۳)۔ ”کیا تم ان لوگوں کے خلاف جنگ نہ کرو گے جنہوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا ہے؟“۔

(۲) یہ حرف تنبیہ بھی ہے۔ یعنی اس کا استعمال کسی کو متنبہ (آگاہ) کرنے یا کسی بات کے متعلق یقین دلانے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آلا لَنْتَهُمْ هُمْ اَلْمُفْسِدُوْنَ (۱۴)۔ ”تم آگاہ رہو کہ یہی لوگ مفسد ہیں،“ (یا) ”یہ واقعہ ہے کہ یہی لوگ مفسد ہیں،“۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی اَعْلَمُوْا..... یاد رکھو کہ.....

## ال ف

آلف۔ ایک ہزار (جمع آلف و التوف)۔

چونکہ چار ہندسوں کے اکٹھا ہونے سے ایک ہزار کا عدد بنتا ہے لہذا لآلف کے معنی ہیں ہم آہنگی اور پیوستگی۔ یا گھل مل جائے

والا ساتھی - (یا اَلْتَف کا لفظ اَلْتَف سے ہے) - اَلْتَف بَيْنَهُمْ - ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی - ایسی ہم آہنگی جیسے بادل کے ٹکڑے آپس میں مل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں (..... سَحَابًا ثِمَّ يُوَلِّفُ بَيْنَهُ) (۱۳۱) - اَلْمُوَلِّفُ - وہ چیز جسکے اجزاء کو مرتب کر کے ایک دوسرے کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہو - اَلْوَلِّفَةُ - باہمد گر پیوست ہو جانا - اَلْمُوَلِّفَةُ - قَلُّوْا بَيْنَهُمْ - جن کے دلوں میں محبت اور الفت پیدا کرنا مقصود ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا ہیں - اَلْوَلِّفَةُ - مانوس کرنا اور الفت دلانا، - (لَا يَلَّا فِ قَرَيْشٍ) (۱۳۲) عہد و پیمان - وہ اقرار نامہ جس سے دو فریق ایک دوسرے سے پیوست رہیں - یہ وہ عہد نامے تھے جو قریش نے ہمسایہ ممالک کی حکومتوں سے لیے رکھے تھے کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہ لوٹے کیونکہ وہ کعبہ کے متولی تھے \*

قرآن کریم میں جماعت مومنین کے متعلق ہے اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءٌ فَاَلْفَتْ بَيْنَكُمْ قُلُوْبُكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا (۱۳۲) - "تم ایک دوسرے کے دشمن تھے - خدا نے تمہارے دلوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی اور اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے" - یہاں سے اِثْتِلَاف کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - اِثْتِلَاف درحقیقت تعاون اور اجتماع سے اگلا درجہ ہے - اس میں جماعت کے افراد بالکل ایک دوسرے سے گہل مل جاتے ہیں اور دلوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے - اگر کسی معاشرہ میں افراد کے باہمی تعلقات ایسے نہیں تو وہ مومنین کا معاشرہ نہیں - ایمان کا فطری تقاضا یہاں لازمی نتیجہ ہم آہنگی، فکر و عمل ہے - جب مختلف افراد کے سامنے نصب العین حیات ایک ہو - منزل ایک ہو - راستہ ایک ہو - ضابطہ زندگی ایک ہو تو پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے پیوستگی کیوں نہیں ہوگی ؟

## الک

مَلَأَكُمُ - بعض کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مادہ اَلَك ہے جسکے معنی پیغام رسانی کے ہیں - اَلِكُنِيْ اِلٰی فُلَانٍ (اصل میں اَلِكُنِيْ) (تھا) اسکو میری طرف سے پیغام پہنچا دو - اَلْمَلَأُ كَكَّة - پیغام رسان -

فرشتہ۔ جو اَلْمَا لَکُ سے مقلوب ہے۔ اَلْاَلُو کُنْہُ وَالْمَا لَکُنْہُ  
وَالْاَلُو کُ وَالْمَا لَکُ۔ پیغام۔ (اَلْک کے معنی ہوتے ہیں کسی  
چیز کو منہ میں چبانا۔ پیغام کو اسلئے اَلْاَلُو کُنْہُ کہتے ہیں کہ اسے منہ میں  
چبا کر باہر نکالا جاتا ہے)۔ \* ابن فارس نے اس کے بھی بنیادی معنی لکھے ہیں۔  
یعنی پیغام رسانی۔

لیکن دوسرے محققین کا قول ہے کہ اس کا (مَلِکُہُ کا مادہ مَلِکُ  
ہے جس کے معنی قوت کے ہیں) (دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک) راغب نے کہا ہے  
کہ مَلِکُہُ دراصل مَلِکُہُ ہے۔ فرشتوں میں سے جن کے سپرد انتظامات  
کئے جاتے ہیں ان کو مَلِکُ کہتے ہیں اور انسانوں میں سے جو تدبیر امور  
کرتے ہیں انہیں مَلِکُ کہا جاتا ہے۔ \*\*

مفتی محمد عبدہ نے اپنی تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ ”یہ امر ثابت  
ہے کہ کائنات کی ہر شے کے اندر ایک قوت ایسی ہے جس پر اس چیز کا دار  
و مدار ہے اور جس کے ساتھ اس شے کا قوام و نظام قائم ہے۔ جو لوگ وحی پر  
ایمان نہیں رکھتے وہ ان قوتوں کو طبیعی قوتیں (Physical Forces) کہتے  
ہیں، اور شریعت کی زبان میں انہیں مَلِکُہُ کہا جاتا ہے۔ لیکن انہیں  
مَلِکُہُ کہتے یا کائناتی قوتیں۔ حقیقت ایک ہی ہے اور عقلمند آدمی  
وہ جس کے لئے ”رکھے ہوئے نام“، اصل اسمیات سے حجاب نہ بن جائیں،۔

قرآن کریم میں مَلِکُہُ کو پیغام رساں کہا گیا ہے۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ  
مِنَ الْمَلٰٓئِکَہِ رُسُلًا وَّ مِّنَ النَّاسِ.... (۲۴) ”اللہ ملائکہ میں سے پیغام  
رساں چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔“ لیکن یہ چیز (پیغام رسانی) ملائکہ  
کے فرائض میں سے صرف ایک فریضہ ہے۔ جامع طور پر انہیں ”تدبیرات  
اُمُور“ (۹) اور ”مَقْسِمَاتِ اُمُور“ (۱۰) کہا گیا ہے۔ یعنی ”تدبیر امور  
اور تقسیم امور کرنے والی قوتیں یا جماعتیں“۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ  
کی متعین کردہ مختلف اسکیمیں کارفرما ہیں۔ جو ملکوتی قوتیں خدا کے قانون  
کے مطابق ان تدبیرات کو بروئے کار لاتی ہیں انہیں مَلِکُہُ کہہ کر پکارا  
گیا ہے۔ اس اعتبار سے مَلِکُہُ کا مادہ اَلْک کی بہ نسبت مَلِکُ  
زیادہ صحیح ہوگا۔ یعنی قوتیں۔ ان قوتوں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ  
اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں (اختیار و ارادہ خدا کے بعد صرف انسان کو  
حاصل ہے) اسلئے یہ قوتیں بلا چون و چرا قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرم  
عمل رہتی ہیں۔ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۱)۔ ”جو کچھ ان سے کہا

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج۔ تاج میں یہ مادہ (م ل ک) کے تحت آیا ہے۔

جاتا ہے وہ وہی کچھ کرتی ہیں۔ جس قانون کے مطابق یہ قوتیں مادی کائنات میں کارفرما رہتی ہیں اسکا علم انسان کو دیا گیا ہے۔\* (یعنی انسان میں اس امر کی امکانی صلاحیت موجود ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائی کے قانون کا علم حاصل کر لے) اسلئے یہ قوتیں انسان کے تابع تسخیر آسکتی ہیں۔ (ملائکہ کے سجدہ آدم سے یہی مفہوم ہے۔\*\* اسی کو تسخیر فطرت کہتے ہیں۔

لیکن ملائکہ صرف انہیں قوتوں کو نہیں کہا گیا جو خارجی کائنات میں تدبیر امور کرتی ہیں بلکہ ان قوتوں کو بھی کہا گیا ہے جو انسان کی داخلی دنیا (نفسیاتی زندگی) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اِنَّ الْقَدَرِیْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَا تَتَخَفَتُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا .... (۱۱۳) ”یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کی ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کسی قسم کا غم اور اندیشہ مت کرو۔ اس میں ”نزل ملائکہ“ سے مراد وہ نفسیاتی تغیر ہے جو خدا کی ربوبیت پر یقین محکم سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ (اسکے برعکس جو قوتیں انسان کے دل میں خوف و ہراس اور یاس و ناامیدی پیدا کرتی ہیں (خواہ وہ خارجی قوتیں ہوں یا خود انسان کی داخلی قوتیں) انہیں ابلیس اور شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان بدل۔س اور ش۔ط۔ن) یہی وہ ”ملائکہ“ تھے جو بدر و حنین کے میدان میں مجاہدین کیلئے تسکین خاطر اور تثبیتِ قلب کا موجب بنے تھے (۱۱۴؛ ۱۱۵) اسی قسم کی قوتیں ان تغیرات کا بھی موجب بنتی ہیں جو انسان کے طبعی جسم میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور آخر الامر موت تک منتج ہوتے ہیں۔ (۱۱۶؛ ۱۱۷) نیز ملائکہ اعمال انسانی کے ”رجسٹرار“ (لکھنے والے۔ محفوظ رکھنے والے) ہوتے ہیں یعنی قانون مکافات کو بروئے کار لانے کا موجب بنتے ہیں۔ (۱۱۸؛ ۱۱۹) ان آیات ”کتابت اعمال“ کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ ہے کہ ان امور کو اللہ تعالیٰ خود (لکھ لیتا ہے) (۱۲۰) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ خود انسان کے اپنے گلے میں لٹکا رہتا ہے (۱۲۱)۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ملائکہ وہ ملکوتی قوتیں ہیں جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب کرتی رہتی ہیں اور وہ نتیجہ انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

چونکہ ملائکہ کائنات کی غیر سرئی قوتیں ہیں اس لئے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم ان کے لشکروں کو دیکھ نہیں سکتے (۲۹/۱۰)۔ باقی رہا وہ نظام جس کے مطابق ملائکہ، انبیاء کرام کی طرف وحی لاتے تھے تو اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وحی کی حقیقت و مسابہت ہمارے حیطہ ادراک سے باہر کی چیز ہے۔ ہم اس پر ایمان لانے کے لئے مکلف ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے پر سامور۔ البتہ وحی کی رو سے دئے ہوئے حقائق کی صداقت اور عظمت کو عالم کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے (مزید تفصیل وحی کے عنوان میں ملیگی۔ نیز سیری کتاب "ابلیس و آدم"، میں جہاں ملائکہ اور وحی کے متعلق شرح و بسط سے گفتگو کی گئی ہے)۔ وحی ہی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالم امر میں یہ قوتیں کس طرح کام کرتی ہیں ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ہماری عقل کا دائرہ محسوسات تک محدود ہے۔ یعنی جو قوتیں محسوس کائنات میں کام کرتی ہیں ہم صرف ان کے متعلق تحقیق کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو "اجزائے ایمان" میں سے قرار دیا ہے (مثلاً ۲۸/۲)۔ یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ، کتب، رسل، آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور رکھا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور انہیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لئے متعین کی ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ (۲۰/۷۷) یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ جیسا کہ آدم کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے آدم سے مراد خود آدمی (یا نوع انسان) ہے۔ لہذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کر سکتا ہے۔ انہیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہئے۔ کائنات کی جو قوتیں ایسی ہیں کہ ہمارے علم میں نہیں آئیں، انہیں چھوڑ دیجئے۔ جو قوتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہوگا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکنیں وہ قوم (قرآن کی رو سے) صاف آدمیت میں شمار ہونے کے بغیر قابل نہیں، چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے۔ (کیونکہ مومن کا مقام، عام آدمیوں کے مقام سے کہیں اونچا ہے)۔

اب آپ سوچئے کہ جس قوم کے ایمان میں یہ چیز داخل تھی کہ کائناتی قوتوں کو آدمی کے سامنے جھکنا چاہئے، وہ قوم اگر ان قوتوں کے سامنے جھکی



ہوئی ہو (ان قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے جنہوں نے ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکایا ہوا ہے) تو اس قوم کی ہستی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے؟ یاد رکھئے۔ ”مقام آدم“، یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقام مومن یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو تو نین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔ یاد دہانی تدبیر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آسکتی ہے کہ ہمیں مقام مومن تو کجا، مقام آدم بھی نصیب نہیں۔

## ا ل ل

”ا ل ل“۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا کچھ احترام ہو اور اسکا کچھ حق ہوتا ہو۔ یعنی وہ چیز واجب الاحترام ہو اور اس کا حق ادا کیا جانا ضروری ہو۔ جیسے قرابت داری۔ رحم۔ پڑوس۔ عہد۔\* ہر وہ کھلی ہوئی بات جسکا انکار نہ کیا جا سکتا ہو۔\*\* اس لفظ کے اصلی معنی چمکنے کے ہیں۔\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت کے ساتھ چمک کے ہیں۔ اور آواز کے۔ نیز اس ذریعہ بنا سبب کے جس کی حفاظت کی جائے۔ ”ا ل ل“ معاشرہ کی ایسی باتوں کو کہا جائے گا جو بالکل واضح۔ صاف۔ نکھری اور کھلی ہوئی ہوں۔ جن کے ثابت کرنے کیلئے کسی دلیل یا سند کی ضرورت نہ ہو۔ جو سب کے نزدیک مسلم اور قابل احترام ہوں۔ پڑوسی یا قرابت دار کے ساتھ حسن سلوک، یہہ ہر معاشرہ کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جسکے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں مخالفین (قریش) کے متعلق ہے لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا نُفُوسَهُمْ لَا دِمَاءَهُمْ (۱۱۰) ”یہ اپنی مخالفت میں اس حد تک بڑھ چکا ہیں کہ معاشرہ کے وہ مسلم اصول جن کا ہر شخص خیال رکھتا ہے، تمہارے معاملہ میں یہ ان تک کا بھی خیال نہیں کرتے۔ نہ ہی کسی حق اور حرمت کا پاس کرتے ہیں،،۔ ان لوگوں کی یہی روش تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی اکرمؐ نے ان سے کہا تھا کہ لَا أَسْأَلُكُمْ عَنْ نَفْسِهِ آجَرًا إِلَّا السُّوْدَةَ فِي الْفَرْبَلِيِّ (۱۱۱)۔ میں تم سے اپنی پیغام رسانی کا کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم میری مخالفت میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ جو عام رشتہ داروں کے حقوق ہوتے ہیں انہیں بھی نظر انداز کر دو! واضح رہے کہ نبی اکرمؐ اس چیز کو بھی بطور اجر رسالت نہیں مانگتے۔ (اجر مانگنے سے تو تمام انبیاء انکار کرتے رہے ہیں) بلکہ ان کی توجہ عام معاشرتی حقوق و واجبات کی طرف دلاتے ہیں۔

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر تم باہم (ایک دوسرے سے) صلہ رحمی اور رشتہ داری کے حقوق کا لحاظ رکھو گے تو یہی چیز میری رسالت کا اجر ہو جائے گی۔ اس لئے کہ دوسری جگہ ہے۔ مَا مَنَّا لِّلنَّاسِ مِنْ أَجْرٍ قَهُوْا لَكُمْ (۲۴۶)۔ ”میں جو اجر تم سے مانگتا ہوں وہ خود تمہاری ہی بھلائی کے لئے ہے۔“

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ب اور حرف الا)

## الّا۔ [حرف]

آلّا۔ (آن۔ لا)۔ قرآن کریم میں ہے۔ آلّا تَعْلَمُوْا عَنَّا (۲۴۷) (بات یہ ہے) کہ تم میرے خلاف سرکشی نہ کرو۔ کبھی اس کے پہلے۔ ل۔ آجاتا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں تاکہ۔ مثلاً۔ لِّلّٰہِ يَكُوْنُ لِنَفْسٍ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ (۲۴۸)۔ تاکہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل و حجت نہ رہے۔

## الّا۔ [حرف]

الّا۔ اس کے معنی عام طور پر بجز۔ علاوہ۔۔۔ وا۔ مگر۔ لیکن۔ کے آتے ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے مفہوم واضح ہو جائیگا۔

(۱) قَامَ الْقَوْمُ الْاَلّا زَيْدًا۔ زید کے علاوہ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زید بھی قوم (لوگوں) کے اندر شامل تھا لیکن وہ کھڑا نہیں ہوا۔ قرآن کریم میں ہے۔ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اَلّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۲۴۹) ان میں سے چند لوگوں کے سوا باقی سب نے پانی پی لیا۔ ایسے استثناء کو اصطلاح میں استثناء متصل کہتے ہیں۔

(۲) قَامَ الْقَوْمُ الْاَلّا حِيَمَارًا۔ تمام لوگ کھڑے ہو گئے لیکن گدھا نہیں کھڑا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گدھا لوگوں میں شامل نہیں ہے۔ یعنی قوم۔ ایک الگ شے ہے۔ اور حیمار۔ ایک الگ۔ یہ پہلی مثال (نمبر ۱) کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا اٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلٰیْسَ (۲۵۰)۔ جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ یعنی ابلیس ملائکہ

سے الگ جنس تھا۔ وہ ملائکہ میں شامل نہیں تھا۔ اس آیت کے یہ معنی نہیں کہ باقی ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ (ابلیس کو سجدہ کا حکم دینا قرآن کے دوسرے مقام سے ثابت ہے۔ دیکھئے ۱۶/۲۱)۔ اس قسم کے استثناء کو اصطلاح میں استثنائے منقطع کہتے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہے۔ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (۲۴/۲۱)۔ ان سے کہو کہ میں اس تبلیغ کے بدلے تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ (یا باہمہد گر، ایک دوسرے کے ساتھ) رشتہ داری کے تعلقات کا لحاظ کرو۔ یعنی یہ چیز بھی بطور اجر کے نہیں مانگتا۔ (اردو میں اس کا ترجمہ ..... ہاں البتہ ..... کہا جائے تو مفہوم واضح ہو جائیگا۔) (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (۱- ل- ل) اور (ق- ر- ب)۔

اسی طرح سورۃ یونس میں ہے۔ فَلَمَّوْا لَا کَانَتْ قَرْۢیَۃً ۚ اٰمَنَتْ فَنفَعَهَا اٰیْمَانُهَا الْاَقْوَمُ یُونُسَ (۱۰/۹۸)۔ ”تو کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی (یعنی کوئی بستی ایسی نہ تھی) کہ وہ (عذاب دیکھنے کے بعد) ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا۔ ہاں البتہ یونس کی قوم ایسی تھی“۔

(۳) کبھی یہ واؤ۔ (عاطفہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَا یَخَافُ لَدٰی ۚ اَلْمُرْسَلُوْنَ۔ اِلَآ مَن ظَلَمَ ثُمَّۢ بَدَّلَ حُسْنًاۢۤ بَعْدَ سُوْۤءٍ۔ (۲۱/۲۱) ہمارے حضور ہمارے رسول ڈرا نہیں کرتے۔ اور نہ ہی (وَلَا) وہ لوگ ڈرا کرتے ہیں جو کبھی زیادتی کر بیٹھیں لیکن بعد میں اس برائی کو نیکی سے بدل لیں۔

(۴) قرآن کریم میں ہے اِنْ کُلٌّۢ اِلَآ کَذٰبَ الْوَسْلِ (۳۸/۱۳) ان تمام نے رسولوں کی تکذیب کی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی ایسی نہ تھی جس نے تکذیب نہ کی ہو۔ سب کے سب نے ایسا کیا۔ یعنی اِنْ کُلٌّۢ اِلَآ کے معنی ہیں ”سب کے سب“۔

(۵) کبھی یہ ”اگر نہیں“ (اِنْ۔ لَا) کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً اِلَآ تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ..... (۲/۲۱) اگر تم نے اس کی مدد نہ بھی کی (تو بھی کہا ہے) یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اس کی مدد کی۔

(۶) مفتی شبہ، (اور ان کے شاگرد سید رشید رضا مرحوم) نے تفسیر المنار (جلد نمبر ۱ ص ۲۱۹ - ۲۲۰) میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جب "الآلہ" مشیتِ خداوندی کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہمیشہ بالکل نفی کے ہوتے ہیں۔ سَنَقِرُ لَكَ فَلَا تَمْسِلُ - "الآلہ مَا شَاءَ اللہ" (۵۴) ہم تجھے (قرآن) پڑھائیں گے تو تو اس میں سے کچھ نہیں بھولے گا۔ "الآلہ مَا شَاءَ اللہ" - یعنی بالکل کچھ نہیں۔ یعنی خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں۔ اس کی تائید - (۸۱:۱۸) سے بھی ملتی ہے جہاں کہا گیا کہ "وَلَمَّا سَأَلْنَا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَهْلًا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ أَفْهَمُوا سُبُلًا" اگر ہم چاہتے تو جو کچھ ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے اسے لیے جاتے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ مشیتِ خداوندی نہیں تھا ہی نہیں کہ قرآن میں سے کچھ غیر محفوظ رہ جاتا۔

المنار میں اس قسم کی اور مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ مثلاً خَالِدِينَ فِيهَا مَادَّامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَالْآلَ مَا شَاءَ رَبُّكَ - عَطَاءٌ غَيْرُ مَجْذُوذٍ (۸۱:۱۸)۔ اہل جہنم اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں۔ اور اہل جنت اسی میں رہیں گے۔ ان میں سے کوئی نکل کر دوسری طرف نہیں جاسکیگا۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھئے عنوان (ن - س - ی)۔)

## الَّذِي (الَّتِي) (اسم موصول)

الَّذِي - جو، جس۔ "هُوَ اللہُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ" (۲۱) اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ "الَّذَانِ" - (مذکر - تثنیہ) یعنی دو (مذکر) کے لئے۔ "الَّذَيْنِ" (جمع - مذکر) "الَّتِي" - (واحد مؤنث) "الَّتِي" و "الَّتَيْنِ" - (جمع مؤنث)۔

یعنی :-

الَّذِي - وہ ایک (مذکر) جو

الَّذَانِ - وہ دو (مذکر) جو

الَّذَيْنِ - وہ دو سے زیادہ (مذکر) جو

الَّتِي - وہ ایک (مؤنث) جو

الَّتَانِ - وہ دو (مؤنث) جو

الَّتَيْنِ - وہ دو سے زیادہ (مؤنث) جو

## ال م

آلَمٌ اور آيْلَمَةٌ - درد کو کہتے ہیں - آليم کے معنی درد پہنچانے والا - یا درد ناک - اليم العذاب اس تکلیف کو کہتے ہیں جو اپنی درد انگیزی میں انتہا تک پہنچی ہوئی ہو \* صاحب محیط کے نزدیک زندگی کی ناخوشگوار یوں کو آلم کہتے ہیں - اس کے مقابل لذّة ہے \*\* -

الْوَمَةُ کے معنی خست اور کمینگی کے بھی آتے ہیں \* -  
قرآن حکریم میں عذاب آليم متعدد مقامات پر آیا ہے - اس کے معنی غلط اعمال انسانی کے درد انگیز عواقب ہیں - اس دنیا میں ذلت آمیز زندگی اور تباہی - اور آخرت میں رسوا کن عذاب - حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے سرکشی برقی تو انسیٰ آخاف علیکم عذاب یوم آليم (۱۱) ”تو میں تم پر ایک درد انگیز دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں“ - ان پر یہ عذاب - سیلاب عظیم کی شکل میں آیا تھا جس سے وہ تباہ ہو گئے تھے - سورۃ بقرہ میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ آليمٌ (۱۰) ”ان کے لئے دردناک عذاب ہے“ -

## ال ه

آلِهَ الْاِیْمِهَ یَاْلَهَ کے معنی ہیں گھبرا کر اس کی پناہ ڈھونڈنا - نیز آلِهَ کے معنی ہیں متحیر ہونا - اور آلَهَ - یَاْلَهَ - کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا - امان میں لینا - چنانچہ آلِهَ بَاْلَمَسْکَانِ کے معنی ہیں امن و سکون سے کسی مکان میں سکونت اختیار کر لینا \* - ان معانی کے اعتبار سے آلِهَ کے معنی ہونگے ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے - جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے -

بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لفظ لاہَ یَلِیْہُ سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں \* -

بعض کہتے ہیں کہ آلہ کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور آلِہِہ کے معنی ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا - اس سے تَلِیْہُ کے معنی تَعْبِیْدُ (غلام بنانا) آتے ہیں - اور آلہ اسی سے ہے جو دراصل بمعنی مفعول

مَالُوۡہُ ہے \*\* - (جیسے کتاب بمعنی مَسْکُتُوۡبُہُ ہے) - اس اعتبار سے اِلٰہ کے معنی ایسی ہستی ہونگے جس کا غلبہ و اقتدار قبول کیا جائے۔ جس کے قانون کی اطاعت کی جائے۔ جس کے حکم کا اتباع کیا جائے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی تَعَبَّد کے لکھے ہیں۔ یعنی کسی کی محکومیت اختیار کرنا۔ چنانچہ جب فرہون نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہہ لَتَنِ اتَّخَذَ تَ اِلٰہًا غَیْرِیْ لَا جُعَلَنَیْکَ مِّنَ اِلٰہِ مَسْجُوۡنِیۡنَ (۲۹) (اگر تو نے میرے سوا کسی کو اِلٰہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا) تو وہاں اِلٰہ کے معنی صاحب اقتدار ہی کے ہیں۔ اسی طرح جہاں کہا گیا ہے اَرَاۡیْتَ مَنۡ اتَّخَذَ اِلٰہَہُ ھَوَیۡہُ (۳۵) ”کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا“، تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ انہی کا اقتدار تسلیم کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کا بندہ بن چکا ہے۔ اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ وَھُوَ الْذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ اِلٰہٌ وَفِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ (۳۸)۔ ”وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی اِلٰہ ہے اور پستیوں میں بھی“، (با جو کائناتی اور معاشی دنیا میں اِلٰہ ہے)۔ تو اس کے معنی بھی صاحب اقتدار کے ہیں۔ یعنی کائنات میں بھی اقتدار و اختیار اسی کا ہے اور انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں بھی اسی کا۔

چونکہ تو ہم پرستی کے زمانہ میں لوگ چاند سورج وغیرہ کو بھی بڑی بڑی قوتوں کا مالک مان کر ان کی پرستش کرتے تھے اس لئے اِلٰہَہ کے معنی چاند ہیں اور اِلٰہَہ کے معنی سورج۔ اسی نہج سے ہر معبود کو اِلٰہ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بتوں کو بھی جن کی پرستش کی جاتی ہے (۳۸)۔

ایک خیال یہ ہے کہ اِلٰہ جامد لفظ ہے (کسی دوسرے لفظ سے نکلا نہیں) لیکن دوسرا خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ اِلٰہ تھا (اَل + اِلٰہ)۔ کثرت استعمال سے اِلٰہ کا ہمزہ گر گیا اور پہلا لام دوسرے لام میں مدغم ہو گیا۔ اس طرح یہ لفظ ”اِلٰہ“ بن گیا۔

قرآن کریم میں ”اِلٰہ“ خدا کی ذات کیلئے استعمال ہوا ہے۔ باقی تمام اَسْمَاء (نام) اسکی صفات ہیں۔

لہذا، اللہ، (قرآنی اِله) وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جسکی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متعیر رہ جاتے ہیں۔ جسکا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جسکی اطاعت نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہم اسکی اطاعت اسکے اس قانون کی رو سے کر سکتے ہیں جو اسنے اپنی طرف سے (بذریعہ وحی) ہمیں دیا ہے (اور جو اب قرآن کریم میں محفوظ ہے)۔ لہذا اَطِيعُوا اللہ کے معنی ہونگے خدا کے قانون کی اطاعت کرو۔ اسی طرح کائنات میں بھی جو کچھ ہوتا ہے سب اسی کے قانون کے ماتحت ہوتا ہے۔ لہذا قرآن کریم میں جہاں یہ آئیگا کہ ”اللہ یوں کرتا ہے“، تو اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے قانون کے مطابق اس طرح ہوتا ہے۔ عالم اسر میں بھی اسی کا قانون کار فرما ہے اور عالم خلق میں بھی یہ قوانین اسنے اپنی مشیت سے بنائے ہیں اور اسی کی قدرت (کنٹرول۔ قبضہ۔ اختیار) سے یہ قوانین نافذ العمل اور کار فرما ہیں۔ یہی وہ ”سُنَّةُ“ اللہ ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ (اسکی تفصیل شی۔ی۔ع کے عنوان میں دیکھئے)

تمام قرآن، اللہ تعالیٰ کی صفات، اس کے قوانین، احکام، حکمت بالغہ، ہدایات کا مجموعہ ہے۔ اسکی ساری تعلیم کا نقطہ ”ما سکھ اللہ کی وحدانیت ہے۔ یعنی اس حقیقت کا اعلان و ایمان کہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف اسی کا ہے۔ اس کے سوا کسی کا نہیں۔“

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے، ہم اس کی ماہیت اور کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ محدود (Finite) کسی لا محدود (Infinite) کا ادراک نہیں کر سکتا۔ البتہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات (الاسماء الحسنی) کا ذکر کیا ہے ہم ان سے خدا کے متعلق (اپنی حدود ذہنی کے اندر رہتے ہوئے) اندازہ کر سکتے ہیں۔ اللہ پر وہی ایمان قرآن کریم کی رو سے صحیح ایمان ہے جو قرآن میں بیان کردہ صفات کے مطابق ہو۔ اس لئے دنیا میں جو لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہیں انہیں قرآن کی رو سے ”اللہ پر ایمان رکھنے والے“ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بڑی اہم حقیقت ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ ”خدا ہرستی اور نیک عملی“، وہی درست ہے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ نہ وہ جو مختلف افراد۔ قوم یا مذہب کے اپنے اپنے تصور کے مطابق ہو۔

## ال و (الی)

آلَا۔ یَا لَئِنْ۔ اَلْوَ اَوَّیْتَا۔ کوتاہی کرنا۔ تاخیر کرنا۔ سستی کرنا۔ باز رہنا۔ لَا یَا لَئِنْ لَئِنْ کُمْ خَبَالًا (۱۱۳)۔ ”یہ لوگ تمہاری تعریف میں بالکل کوتاہی نہیں کریں گے“۔ اَلَا لَئِنْ کُنْتُمْ اَسْمٰی۔ اِیْلَآءُ۔ باز رہنے کی

قسم - عورت کے پاس نہ جانے کی قسم \* - لِلْقَدَرَيْنِ يَتَوَلَّوْنَ مِمَّنْ  
نِيسَاعِ هِمَّ (۲۲۶) - "جو لوگ اپنی بیویوں سے باز رہنے کی قسم کھا  
لیتے ہیں،" - سورۃ نہل میں ہے وَلَا يَتَا تَكَلِّ ..... (۲۲۶) - دوسروں  
کی مدد کرنے سے باز رہنے کی قسم نہ کھائیں - ان مقامات سے ظاہر ہے کہ  
یہ قسم اس قسم کی ہے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے - راغب نے اسکی  
بھی خصوصیت بتائی ہے -

مَالُوْتُهُ - میں اس کی وسعت اور طاقت نہیں رکھتا - ابن الاعرابی  
نے کہا ہے کہ اَلُوْضُ اَضْدَادٌ مِّنْ سَعَةٍ - یعنی اس کے معنی کوٹاھی کرنے کے  
بھی ہیں اور قدرت اور طاقت رکھنے کے بھی - روکنے کے بھی اور عطا کرنے  
کے بھی \* - اس لئے اَلَا لَاءُ (جو اَلُوْضُ کی جمع ہے) کے معنی قدرت اور  
طاقت کے بھی ہیں \* اور عطیہ اور نعمت کے بھی - قرآن کریم میں جہاں  
آتا ہے قَبِيْاٰی - اَلَا عِ رَبِّیْکُمْ تَشْکُرُ بَانَ (۳۳) - سو وہاں اس کے معنی  
یہ بھی ہیں کہ تم اپنے نشوونما دینے والے کی کس کس قدرت اور طاقت کو  
جھٹلاؤ گے - اور یہ بھی کہ تم اس کی کس کس نعمت اور عطیہ کو جھٹلاؤ گے -  
ہر مقام پر معنی سیاق و سباق کی رو سے کئے جاتے ہیں - مزید برآں دیکھئے تَمَّتْ اَلْحَجُّ حَرَامٌ  
نوٹ - اَلَا عِ کا واحد اَلُوْضُ تاج العروس کے علاوہ اور کہیں نہیں ملا - دیگر  
کتب لغت و تفاسیر میں اس کا واحد اِلٰی - اِلٰی اور اِلٰی آیا  
ہے - البتہ اس کے معنی نعمت اور قدرت دونوں آتے ہیں -

## الی (حرف)

الی - تک - کی طرف - یہ زمان (وقت) کے لئے بھی آتا ہے - اور  
مکان (جگہ) کے لئے بھی - جیسے ثُمَّ اَتَيْتُمُ الصَّیِّتَامَ اِلٰی اللَّیْلِ (۱۸۰)  
پھر تم رات تک روزہ پورا کرو - اور مِّنْ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ  
اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی (۱۲۴) مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک -  
اس مقام پر ایک بات قابل غور ہے - ثُمَّ اَتَيْتُمُ الصَّیِّتَامَ اِلٰی اللَّیْلِ  
میں اِلٰی اللَّیْلِ کے معنی ہیں آغاز شب تک - یعنی جب دن ختم ہو کر رات  
شروع ہو جائے - اس میں لَیْل (رات) شامل نہیں - یعنی یہ مراد نہیں  
کہ ختم شب تک روزہ رکھو - لیکن وضو کے احکام میں ہے فَاغْسِلُوْا  
وَجُوْهُکُمْ وَاَبْدَیْکُمْ اِلٰی الْمَرَاْفِقِ (۹) - اپنے چہروں اور کہنیوں  
تک ہاتھ دھولیا کرو - اس میں (اِلٰی الْمَرَاْفِقِ) سے مراد ہے کہنیوں  
سمیت - یعنی اَلْمَرَاْفِقِ اس کے اندر داخل ہیں - لہذا اِلٰی (بمعنی تک)  
کے استعمال کا یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہئے -



(۲) مَعَ - (ساتھ) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جیسے وَلَا تَأْكُلُوا  
أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ (۴)۔ اور ان کا سال اپنے سال کے  
ساتھ ملا کر نہ کیا جاؤ۔

(۳) ان معنوں میں بھی جن میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں۔ ”میرے نزدیک،  
یا ”میرے لئے“۔ جیسے رَبِّ السَّيِّئِينَ أَحَبُّ إِلَيَّ (۱۱۱)۔ اے  
میرے پروردگار! میرے نزدیک قید خانہ اس سے کہیں بہتر ہے (جس  
کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں)۔

(۴) ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں ”اس کے لئے“، جیسے وَلَا مَرَّةً  
إِلَيْكَ (۱۱۱) اور معاملہ کا آخری فیصلہ تیرے لئے ہے۔ یعنی تجھے  
ہی آخری فیصلہ کرنا ہے۔

(۵) بعض اوقات یہ عملی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (جس کا  
مطلب ہوتا ہے کسی کے خلاف کوئی بات کرنا۔ جیسے وَقَضَيْنَا إِلَىٰ  
بَنِي إِسْرَآئِيلَ (۱۱۱)۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے خلاف یہ  
فیصلہ کر دیا تھا۔ لیکن اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں  
کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اس کی خبر دے دی تھی۔ اس صورت  
میں اس جگہ اِلٰی بمعنی عملی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے معنی ”کی  
طرف“، ہونگے۔ ان معنوں میں یہ حرف عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(۶) بعض اوقات یہ۔ فی (میں) کے معنوں میں بھی آتا ہے، جیسے  
لَتَجْمَعُنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (۱۱۱) وہ تمہیں یوم القیامۃ  
میں اکٹھا کریگا۔

(۷) بعض اوقات یہ مِّنْ (سے) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔  
(لیکن قرآن کریم سے اس کی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں)۔

## الیاس علیہ السلام

قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ بہ سلسلہ انبیائے کرام کیا ہے (۱۱۱)۔ اور  
خصوصیت سے کہا ہے کہ اِنَّ الْيَاسَ الْمِیْنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۱۱) ”یقیناً الیاس“  
رسولوں میں سے تھا۔ اسی سورت میں آپ کو اِلٰی یَسْرِیْنِ بھی کہا گیا ہے  
(۱۱۱)۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے وہ بَعْل  
کی پرستش کرتی تھی (۱۱۱)۔ قیاس یہ ہے کہ آپ وہی پیغمبر ہیں جن کا  
نام تورات میں اِیْلَآ نَبیٰ آیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت ادریسؑ کا

دوسرا نام الیاس ہے۔ لیکن (جیسا کہ عنوان ادریس میں کہا گیا ہے) اگر حضرت ادریسؑ، حضرت نوحؑ کے اجداد میں سے تھے تو آپ حضرت الیاسؑ نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ آیت (۱۸۵) میں حضرت الیاسؑ کو حضرت نوحؑ (یا حضرت ابراہیمؑ) کی ذریت میں سے بتایا گیا ہے۔ آپ غالباً انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔

## اَلْیَاسِیْنَ

حضرت الیاسؑ کا دوسرا نام ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”الیاس“۔  
قرآن کریم میں آپ کا یہ نام (۳۷) میں آیا ہے۔

## اَلْیَسَعَ

یہ وہی نبی ہیں جنہیں تورات میں (Elisha) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے زمرہ انبیائے کرام میں ان کا ذکر کرنے کے بعد (۱۸۷) کہا ہے کہ ان سب کو کتاب دی گئی تھی (۱۸۷)۔ نیز ان کا نام (۳۸) میں آیا ہے۔ تفصیلی تعارف قرآن کریم نے نہیں کرایا۔

## اُمّ - (حرف)۔

- اُمّ۔ یا۔ حسب ذیل مثالوں سے اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔
- (۱) اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اُمّ السَّعْمَاءُ (۶۹) کیا پسدائش میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمانی کڑے؟
  - (۲) سَوَاءٌ عَلَيْنِهِمْ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲) ان کے لئے برابر ہے خواہ تم انہیں آگاہ کرو یا نہ کرو۔
  - (۳) قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰی وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (۱۳) ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں یا (بلکہ یہ کہ) کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟
  - (۴) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اُمّ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الْقَذْرِ (۵۳)..... میں اس سے بہتر ہوں۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ”یا (کیا) میں اس سے بہتر نہیں ہوں۔“ اس صورت میں اُمّ زائد نہیں ہوگا۔

علم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور، عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ مشہور مفکر (Pringle Pattison) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنسی ہے جس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (Creation) ہے۔ حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی وغیرہ محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے اس کے اظہار کے لئے ضروری تھا کہ دو الگ الگ الفاظ ہوتے۔ قرآن نے اس کے لئے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

امر کا دوسرا حصہ، جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کارفرما ہے، ہمارے سامنے ہے اور اس کے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔ لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امر (یعنی قانون کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسَاجِدُ رَبِّكَ بَاسْمِہٖ (۵۴) سورج۔ چاند۔ ستارے۔ خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وَالْفُلُکَ تَجْسِیْرُۙ فِی الْبَحْرِ بِأَمْرِہٖ (۲۵) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے۔ آیت (۱۴) میں اٰذَنُ اور اَمْرُ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (اٰذَن کے معنی بھی قانون خداوندی ہیں۔ دیکھئے عنوان اٰذَن)

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی کائنات (Physical World) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے، اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور مہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ مکافاتِ عمل کا قانون ہے اور اسے بھی اَمْرُ ہی کہا گیا ہے۔ لَیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًاۙ کَانَ مُفْعُوْلًاۙ لَیْسَ لَیْکَ مِنْہٗۙ هَلٰکَ عَنْۙ بَیِّنَۃٍۙ وَیَحْیٰۙ مَنْ حٰیۙ عَنْۙ بَیِّنَۃٍۙ (۸۴)۔ ”(یہ سب اس لئے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہوا اور جسے زندہ رہنا ہے“ وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق زندہ رہے۔ یہ اَمْرُ (قانون مکافاتِ عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو

## ام ر

”الْأَمْرَةُ“ وَالْأَمْرُ - چھوٹے پتھروں سے بنایا ہوا نشان جو صحراء میں بنا دیا جاتا ہے تاکہ اس سے علاقہ کے حدود یا راستہ کا پتہ لگ سکے، ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معانی میں ”نشان“ کو شامل کیا ہے۔ لہذا اس کے بنیادی معنی ہیں علامت - نشان - راہ نمائی - یہیں سے اس کے معنی مشورہ کرنے کے آتے ہیں۔ ”الْأَمْرُ“ کے معنی ہیں مشورہ کرنا\*۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ فرعون نے اپنے سرداروں سے حضرت موسیٰؑ کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ”فَمَاذَا تَأْمُرُونَ“ (۱۱۰؛ ۱۱۱) ”سو تم کیا مشورہ دیتے ہو (نیز دیکھئے ۱۵)۔“ اسی طرح سورۃ قصص میں ہے کہ شہر کے دوسری طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ ”إِنَّمَا أَمَلَاءُ يَأْتِمُرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ“ (۲۹) ”سرداران قوم تیرے بارے میں باہمی مشورے کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیا جائے“، لیکن تاج العروس میں ہے کہ یہاں اس کے معنی عزم اور ارادہ کر لینے کے ہیں۔ ”تَأْمُرُ“ اسی سے اسم ظرف بصیغہ اسم مفعول ہے۔ مشورہ گاہ۔ آجکل یہ لفظ کانفرنس کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ”آمیر“۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس سے مشورہ لیا جائے۔ نیز اندھے کی راہ نمائی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں\*۔

”أَمْرٌ“ کے معنی ہیں کسی چیز کا بہت زیادہ ہو جانا\*۔ ”أَمِيرُ الرَّجُلِ“ کے معنی ہیں اس شخص کے جانور بکثرت ہو گئے۔ ”الْأَمِيرُ“۔ برکت والا آدمی۔ ان معانی کے اعتبار سے، فراء نے کہا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں آیا ہے ”أَمْرُنَا مُتَّبِعٌ“ (۱۶) تو اس کے معنی ہیں ”ہم متوفین کو کثرت سے مال و دولت دے دیتے ہیں\*“، ”مَزِيدٌ بَرَّانٌ دِيكْحَةً“ جلد چارم۔

”أَمْرٌ“ کے معنی حکم کے بھی ہیں اور حالت - معاملہ - کام یا بات کے بھی۔ (ابن فارس)۔ جب اس کے معنی حکم کے ہوں تو اس کی جمع ”أوامر“ آتی ہے (اوامر و نواہی - جہاں امر، نہیں کی ضد ہے) اور جب اس کے معنی معاملہ - حادثہ - یا واقعہ یا حالت کے ہوں تو اس کی جمع ”أُمُور“ آتی ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ”أوامر“ کا لفظ نہیں آیا۔

ان معنوں کی رو سے "أَمْرٌ" حاکم کو کہتے ہیں۔ "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ" (۱۶۴) کے معنی ہیں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے۔ "عَلَى أَمْرٍ جَامِعٍ" (۱۶۵) کے معنی ہیں اجتماعی معاملہ۔ "أَمْرٌ مَرَّةٌ" کے معنی ہیں حکومت۔ "أَمْرٌ مَرَّةٌ" کے بھی یہی معنی ہیں۔ "أَمْرٌ عَظِيمٌ" کے معنی ہیں حادثہ عظیم۔ "أَوْ يَأْتِي أَمْرٌ رَبِّكَ" (۱۶۶) کے معنی ہیں فیصلہ کن مرحلہ۔ "أَمْرًا" سخت نا پسندیدہ بات (۱۶۷)۔ "أَمْرٌ مَرَّةٌ" کے معنی ہیں بہت حکم دینے والا۔ "بِرَانْگِیختہ کرنیوالا" (۱۶۸)۔ "رأى" مرضی اور خواہش کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ "وَمَا فَعَلْتَهُ عَنْ أَمْرِي" (۱۶۹)۔ "میں نے اسے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔"

قرآن کریم میں خَلَقَ کے مقابلہ میں أَمْرٌ کا لفظ آیا ہے (۱۷۰)۔ اور اس کا ایک خاص مفہوم ہے جس کے سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ یعنی علامت۔ اشارہ۔ راہ نمائی۔ نیز ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما کے بھی ہیں۔ اور (جیسا کہ عنوان۔ خ۔ ل۔ ق۔ میں لکھا گیا ہے) خَلَقَ کے معنی ہیں مختلف عناصر میں نئی نئی تراکیب سے نئی چیزوں کو پیدا کرنا۔ خَلَقَ پیدائش کا یہ وہ مرحلہ ہے جب اشیاء بالعموم اپنی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اشیاء کے اس طرح وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے جب یہ هنوز تدبیری حالت (In the Process of Becoming) میں ہوتی ہیں۔ "یہ تدبیری مرحلہ" عالمِ امر سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ کائنات میں ایک تو اشیائے کائنات ہیں (مثلاً سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین۔ درخت وغیرہ) اور دوسرے وہ قانون ہیں جس کے مطابق یہ تمام اشیائے کائنات ایک نظم و ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ اس قانون کو بھی أَمْرٌ کہتے ہیں (اس کا تفصیلی تعارف مشیت کے ضمن میں عنوان۔ ش۔ ی۔ ا۔ کے ماتحت ملیگا)۔

اشیا کی "تدبیری حالت" کے متعلق قرآن کریم میں ہے "إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ" (۱۷۱) "جب وہ ایک تدبیر (امر) کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔" یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح متشکل ہوتا ہے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارا

علم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور، عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ مشہور مفکر (Pringle Pattison) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنسی ہے جس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (Creation) ہے۔ حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی وغیرہ محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے اس کے اظہار کے لئے ضروری تھا کہ دو الگ الگ الفاظ ہوتے۔ قرآن نے اس کے لئے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

امر کا دوسرا حصہ، جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کارفرما ہے، ہمارے سامنے ہے اور اس کے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں ہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔ لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امر\* (یعنی قانون کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بہرا ہوا ہے۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسَاجِدُ رَبِّكَ بَاسْمِہٖ (۵۶) سورج۔ چاند۔ ستارے۔ خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وَالْفَلَکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِأَمْرِہٖ (۲۱) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے۔ آیت (۱۱) میں لُذُنْ اور أَمْرُ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (اذن کے معنی بھی قانون خداوندی ہیں۔ دیکھئے عنوان اذن)

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی کائنات (Physical World) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے، اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور ہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ مکافاتِ عمل کا قانون ہے اور اسے بھی امر\* ہی کہا گیا ہے۔ لَیَقْضِیَ اللّٰہُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا، لَیْہِ لَیْکَ مَنْ هَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ وَیَحْیِیْ مَنْ حَیٌّ عَنْ بَیِّنَۃٍ (۸۳)۔ ”(یہ سب اس لئے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق زندہ رہے۔ یہ امر\* (قانون مکافاتِ عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو

کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی انسان اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ رسول بھی نہیں۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴿۱۳۷﴾ ”اے رسول تجھے اس قانون میں کوئی دخل نہیں۔“۔ یہ امر (قانون) جس کا تعلق انسانی اعمال سے ہے وحی کے ذریعے (رسولوں) کو ملتا ہے اور انکی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ وَأَتَيْنَهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ﴿۱۳۸﴾ اور ”ہم نے انہیں امر کی واضح باتیں دیں،، یا، ذَالِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْنَا ﴿۱۳۹﴾ ”یہ خدا کا امر (قانون) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔“

لہذا خدا کے امر کے تین گوشے ہیں۔ ایک وہ جہاں ہر قانون متعین ہوتا ہے اور ہر تدبیر بنائی جاتی ہے۔ اس گوشے کی حقیقت و کیفیت کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا امر، قانون۔ کائنات کی شکل میں کارفرما ہے۔ یہ قانون ہر شے کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا علم تجربہ، عقل، بصیرت اور مشاہدات کی رو سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور تیسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا قانون انسانوں کی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قانون وحی کی رو سے رسولوں کو ملتا ہے اور رسولوں کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ یہ قانون قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جس کے مطابق قوموں کی موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں اور ہر انسان، زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ گوشہ اول میں خدا اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جس طرح کا قانون چاہتا ہے مرتب کرتا ہے۔ گوشہ دوم میں خدا اپنی اسکیم کو اپنے مرتب فرمودہ قوانین کے مطابق چلاتا ہے اور اشیائے کائنات اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ گوشہ سوم میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے لیکن انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو اس کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر لیں۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کرے گا اسی کے مطابق نتائج اس کے سامنے آ جائیں گے۔ خدا کا امر (قانون) خارجی کائنات سے متعلق ہو یا انسانی زندگی سے، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا فیصلہ ہے۔

## ا م س

أَمْسِرَ۔ اور آمْسِرَ (ہام طور پر سین کی زیر سے آتا ہے لیکن کبھی پیش سے بھی آ جاتا ہے)۔ گذشتہ کل کا دن۔ سورہ قصص کی آیات فَاذَا التَّذَرٰی اسْتَنْصَرَهُ بِآلِ آمْسِرَ ﴿۲۸﴾ میں یہ لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ ”یعنی

جس شخص نے کل اس سے مدد مانگی تھی،، لیکن جس طرح ہم کہتے ہیں کہ ”جو لوگ کل تک یہ دعائیں مانگتے تھے کہ .....“ تو اس سے مراد گذشتہ کل کا دن نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ دن پہلے تک۔ یا کچھ دنوں پہلے سے اَلْاَمْسِ کا لفظ اس مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے وَاصْبِرْ السَّيْرَيْنِ تَمْتَدُّواْ مَكَانَتْهٖ بِاَلْاَمْسِ (۲۸۶) جو لوگ ابھی کل تک اسکی آرزو کرتے تھے کہ ہمیں وہ پوزیشن حاصل ہو جائے جو (قارون) کو حاصل ہے۔

## ا م ل

اَلْاَمَلُ - امید یا توقع۔ عام طور پر اس لفظ کا استعمال ایسی چیزوں کی توقع کے لئے آتا ہے جن کا حاصل کرنا مستبعد ہو۔ چنانچہ جو شخص دور دراز سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ اَمَلْتُ کہتا ہے۔ لیکن اگر وہ شہر قریب ہو اور وہاں جانا آسان ہو تو وہ طَمِعْتُ کہیگا۔ اس سے اَمَلٌ اور طَمَعٌ کا فرق ظاہر ہے۔ رَجَاءٌ کا لفظ ان دونوں کے بین بین بولا جاتا ہے۔ اَلْاَمِلُ - ریت کا پہاڑ جو ایک دن کی مسافت کا ہو۔ یا لمبائی میں کئی دن کی مسافت کا ہو۔ تَاَمَلَ الْقَرْجُلُ - کسی معاملہ میں ٹھہرنا۔ سوچنا اور انتظار کرنا۔\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انتظار کے ہوتے ہیں۔ نیز جم کر غور کرنا۔ اور ٹھہرنا۔ امید رکھنا لیکن اس میں دیر تک کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ سورۃ حجر میں ہے کہ وَيَلْتَمِھِمْ اَلْاَمَلُ (۱۵)۔ ان کی لمبی چوڑی آرزو انہیں زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کئے رکھتی ہے۔

## ا م م

اُمٌّ - صاحب محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ جامد ہے اور بچہ کی اس آواز سے ماخوذ ہے جب وہ بولنا سیکھنے سے پہلے اُم - اُم - وغیرہ شروع کرتا ہے\*۔ اس سے اس کے اولین معنی والدہ (مان) کے ہو گئے۔ بعض لوگ اُمٌّ کو اُمَّتٌ بھی کہہ دیتے ہیں اور بعض اس لفظ کو اُمَّتِیَّةٌ بھی کہہ دیتے ہیں جس کی جمع اُمَّتَاتٌ آتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُمَّتَاتٌ ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور اُمَّاتٌ غیر ذوی العقول کیلئے۔

ماں کی آغوش کے اعتبار سے انسان کے مسکن کو اُمٌّ کہتے ہیں۔ قوم اور جماعت کو بھی اُمَّتٌ کہتے ہیں۔ بالخصوص ہم مسلک اور ہم



مشرّب گروہ کو۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں مختلف انبیائے کرامؑ کے تذکرہ کے بعد ہے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۱۳۳)۔ ”یہ ایک اُمت تھی جو گذر چکی“ دوسری جگہ انہی کے متعلق ہے اِنَّ هَذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲۹۴) ”یقیناً یہ تمہاری اُمت واحدہ ہے“۔ نیز اس کے معنی ہر شے کی اصل اور بنیاد کے ہیں۔ اُمّ القوٰم۔ قوم کا رئیس۔ اُمّ النّجّوٰم۔ کہکشاں۔ اُمّ التّراّس۔ دماغ۔ نیز ہر وہ مرکز جہاں بہت سی چیزیں آکر مل جاتی ہوں اُمّ کہلاتا ہے۔ جیسے اُمّ القریٰ مکہ معظمہ کو کہتے ہیں۔ اُمّ الکتاب۔ قانون کی اصل و بنیاد۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہیں۔ (۱) بنیاد اور اصل (۲) مرجع (۳) جماعت (۴) دین۔

اُمّۃٌ۔ حالت۔ نعمت۔ شان۔ طریقہ۔ سنت۔ وقت۔ زمانہ۔ مدت۔ شریعت اور دین (مدت کے معنوں میں یہ لفظ ۱۲/۱ میں آیا ہے)۔ نیز اس کے معنی امام اور ہادی کے بھی ہیں۔ جیسے (ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ) اِنَّ اٰیْرَ اٰهِيْمَ كَاَنَّ اُمَّةً قَانِيًا (۱۲/۱) میں اس کے معنی امام کے ہیں۔ اگرچہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک فرد تھے لیکن اپنی شخصیت کی جامعیت کے اعتبار سے ایسے تھے کہ ایک پوری کی پوری امت ان کے اندر سموئی ہوئی تھی۔ ابن قتیبہ نے بھی اُمَّة کے معنی دین۔ امام اور جماعت کے لکھے ہیں۔ لطائف اللغۃ میں اس کے معنی دئے گئے ہیں۔ ”ایسا آدمی جس میں تمام خوبیوں کا جمع ہوں۔ نیز امام“۔ مزید برآں دیکھئے صفحہ ۱۸۱۲ جلد چہارم۔

(۴) اُمّۃٌ۔ آگے ہونا۔ امامؑ وہ شخص جو آگے ہو۔ یہ دراصل اس دھاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار دیکھتے ہیں کہ دیوار کی تمام اینٹیں ایک سیدہ میں آ رہی ہیں یا نہیں۔ (ہر بی میں اس آلے کو فادان اور ہمارے ہاں ساہل کہتے ہیں۔ اس سے امامؑ کا صحیح تصور سامنے آ سکتا ہے) نیز وسیع راستہ کو بھی امامؑ کہتے ہیں (۱۲/۱)۔

(۵) اُمّۃٌ۔ آگے سامنے۔ مستقبل۔ بَلْ يَرِيْدُ الْاِلٰهَ نَسَاٰنَ لِيَفْجُرَ اَمّٰتَهُ، (۱۲/۱)۔

اُمّۃٌ۔ بؤمّۃٌ۔ اُمّۃٌ۔ قصد و ارادہ کرنا۔ اُمّۃٌ (۱۲/۱) قصد و ارادہ کرنے والے۔ قرآن کریم میں اُمّؑ (اور اس کے مشتقات) ان تمام معانی میں آئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انکی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

”امی“ ایک ایسا لفظ ہے جس کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں ایسا شخص جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو (جیسا ماں نے جنا تھا ویسا ہی رہے۔ اسے مادر زاد بھی کہتے ہیں۔) اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ \*۔ نبی اکرمؐ کو اسی اعتبار سے ”امی“ کہا جاتا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن یہ چیز زمانہ قبل از نبوت کی بات ہے۔ نبوت کے بعد آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اسکی واضح شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے وَ مَا كُنْتُمْ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطُّوْهُ بِمِیْنٰیكَ (۲۸) ”تو اس (قرآن کے نزول) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔“ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن سے پہلے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن نزول قرآن کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ اسی لئے قرآن نے مِّنْ قَبْلِهِ کی تخصیص کر دی۔

لیکن قرآن کریم میں خود عربوں کو بھی ”امی“ کہا گیا ہے۔ اسکا مطلب ہے وہ لوگ جنہیں قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں دی گئی تھی۔ اس لئے کہ یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلہ میں آیا ہے (دیکھئے ۱۶ و ۳۰)۔ عرب میں یہود و نصاریٰ اہل کتاب کہلاتے تھے، اور وہ لوگ جو کوئی آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے ان کے مقابلہ میں ”غیر اہل کتاب“، یعنی ”امی“ کہلاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل ان پڑھ تھے۔ یہ وہاں کی اصطلاح تھی جس سے ”اہل کتاب“، ان لوگوں کو اپنے سے الگ کر کے پکارتے تھے۔ \* لہذا قرآن میں بعض مقامات پر ”امی“ کے معنی ان پڑھ ہیں اور بعض مقامات پر اس سے مراد وہ اہل عرب ہیں جو کوئی آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے۔

نیز ”امی“ کے معنی امّ القریٰ (مکہ) کا باشندہ بھی ہیں جیسے حضرمی۔ حضرموت کے رہنے والے کو کہتے ہیں۔ (نوٹ۔ امّا حرف ہے جسے الگ لکھا گیا ہے۔)

\* واضح رہے کہ قرآن نے خود مسلمانوں کو (جنہیں قرآن کی کتاب دی گئی ہے) الذین آؤا لکتاب کہیں پکارا ہے (۱۰۶) لیکن صرف انہی کو جو اس کتاب کا صحیح علم رکھتے ہیں۔

(لطائف اللغة) \*\*

## أَمَّا (حرف) -

أَمَّا - یہ عام طور پر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ”باقی رہا یہ کہ.....“ - یا ”جہان تک اس بات کا تعلق ہے“ - مثلاً -

(۱) فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ..... (۲/۲۶) - جہان تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ایمان لائے سو وہ جانتے ہیں کہ.....  
(یا) آمَنَ اسْتَفْنَىٰ فَآتَتْ لَهُ تَصَدَّقَىٰ (۸۰) باقی رہا وہ جو اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے تو..... (یا) جہان تک اسکا تعلق ہے..... (یا) آمَّا السَّفِيْنَةُ..... (۱۸/۲۹) جہان تک کشتی کا تعلق ہے..... وَأَمَّا الْفُلَامُ..... (۱۸/۸۰) باقی رہا وہ لڑکا.....

(۲) بعض اوقات آمَّا مرکب ہوتا ہے آم + مَّا، کا - اور اس کے معنی ہوتے ہیں ”یا وہ چیز جو“ - یہ وہی آم ہے جو استفہاسی حمزہ (۴) کے بعد آتا ہے - مثلاً سورۃ انعام میں ہے - قُلْ يٰۤاَۤلْذٰكِرِيْنَ حَرَّمَ اَمْرَ الْاُنْثٰیَيْنِ اَمَّا اسْتَمَلْتُمْ عَلَیْهِ اَرْ حَامُ الْاُنْثٰیَيْنِ (۱۳۶) ان سے کہو کہ کیا دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ - یا وہ جو دونوں کے رحم میں ہے -

## ا م ن

آمَنَ - بے خوفی - اطمینان - خوف سے محفوظ ہونے کی حالت - سورہ بقرہ میں ہے فَآذَاۤاَۤمِنْتُمْ (۲/۲۶) ”جب تم امن میں ہو جاؤ“ - سورۃ انعام میں ہے - قَاٰی الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِاَلَاۤمِنِ (۸۴) - ”سو دونوں گروہوں میں سے کونسا گروہ امن کا زیادہ حقدار ہے“ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیانت کی ضد - (۲) اطمینان - قلب اور (۳) تصدیق کرنے کے ہیں -

آمَنَ - کسی کو بے فکر اور مطمئن کر دینا - دوسرے کو امن دیدینا - اسکی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لینا - \*

اٰثِمٰنؑ - کسی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا - کسی کو امانت دار اور محافظ سمجھنا \*۔

نَاقِۃٌ اٰمُوۡنٌؑ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو قوی اور عادات کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو۔ جس کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ پیہم سفر سے کمزور نہیں ہو جائیگی اور راستے میں ٹھوکر کھا کر گر نہیں پڑیگی \*۔

سُوۡمِیۡنٌؑ - امن کی ضمانت دینے والا۔ جس پر بھروسہ کر کے انسان بے فکر اور محفوظ ہو جائے۔ امن عالم کا ضامن \*۔

اٰمٰنَۃٌؑ - وہ چیز جو کسی کے بھروسہ پر دے دی جائے۔ \*\* (حمل امانت کے معنی امانت میں خیانت کرنا ہیں۔ اس کے لئے عنوان ح۔م۔ل دیکھئے)۔

اٰمِیۡنٌؑ - بے خوف۔ مطمئن۔ جسے قابل اعتماد سمجھا جائے۔ جو کسی کو قابل اعتماد سمجھے۔ جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ \* بَلٰدٌ اٰمِیۡنٌؑ (۱۵۰)۔ جس شہر میں امن و حفاظت ہو۔ مَقَامٌ اٰمِیۡنٌؑ - (۵۴) جس مقام میں پورا پورا اطمینان اور سامان حفاظت ہو۔ \*\*\* لَآئِیۡ لَّکُمۡ رَسُوۡلٌ اٰمِیۡنٌؑ (۲۶۲) ”میں تمہارے لئے رسول آمین ہوں۔“

سورۃ نحل میں امن و اطمینان کے معنی حفاظت اور سامان زندگی کی فراوانی کے آئے ہیں۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِیۡنَۃً مُّطْمَئِنِّۃً یَّقٰۡرُۡنَہَا رِزٌّ قَسَہَا رَغَدًا..... فَاِذَا قَسَہَا اللّٰهُ لِبَاسٍ اَلْجُوعِ وَالْخُسُوفِ (۱۱۶) ”اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس میں سامان زیست ہر جگہ سے با فراغت آتا تھا۔ پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی نافرمانی کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا سزہ چکھایا“۔ سورۃ حجر میں ہے۔ وَکَانُوۡا یَسْتَحِیۡتُوۡنَ مِنَ الْجِبَالِ یَئُوۡۡۤا اٰمِیۡیۡنٌ (۱۸۴)۔ ”وہ حفاظت کی غرض سے پہاڑوں کو تراش کر مکان بنایا کرتے تھے“۔ سورۃ آل عمران میں امن بمقابلہ غم آیا ہے۔ ثُمَّ اَنْزَلْ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعْدِ الْغَمِّ اٰمَیۡنَۃً (۱۵۳)۔ ”پھر اس نے تم پر غم کے بعد امن نازل کیا“۔

قرآن میں یہ مادہ اعتماد اور بھروسہ کے معنوں میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں لیس دین کے معاملات کے ضمن میں ہے فَاِنَّ اٰمِیۡنَ بَعْضُکُمۡ بِبَعْضٍ (۲۸۳)۔ ”اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے“۔ سورۃ یوسف میں ہے۔ لَا تَاۡمَنَّا (۱۲)۔

”تو ہمارا اعتبار نہیں کرتا“۔ وَمَا آتَتْ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۱۲)۔ ”اور تو ہماری بات کا اعتبار نہیں کریگا“۔ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَا آمَنْتُكُمْ (۱۳)۔ ”میں اس کے متعلق تمہارا اعتبار نہیں کرتا بجز اس کے جس طرح میں نے (پہلے) تمہارا اعتبار کیا تھا“۔ ان تمام مقامات میں آمَن کا لفظ اعتبار۔ بھروسہ اور یقین آنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

جب آمَن کا صلہ لام ہو تو اس کے معنی بات ماننے کے ہوتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں قصہ بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (۲۵)۔ ”ہم تیری بات نہیں مانیں گے“۔ اس میں اعتبار۔ اعتماد۔ یقین اور اطاعت سب کا مفہوم آ جاتا ہے۔ جب اس کا صلہ ب ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں۔ كَلَّ آمَنَ بِاللّٰهِ (۲۸۵)۔ ”سب ایمان لانے میں اللہ پر“۔ آمَن کے جو معانی اوپر دئے گئے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ”ایمان لانے“ میں ان سب کا مفہوم آ جاتا ہے۔ یعنی۔

- (۱) یقین کرنا۔ ماننا۔ تسلیم کرنا۔ یعنی انکار نہ کرنا۔
- (۲) تصدیق کرنا۔ اس کے سچے ہونے کا اقرار کرنا۔ یعنی تکذیب نہ کرنا۔
- (۳) اعتماد اور بھروسہ کرنا۔
- (۴) بات ماننا۔ اطاعت کرنا۔ سر تسلیم خم کرنا۔

قرآن کی رو سے پانچ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان مؤمن ہو جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْغَيْبِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ (۲۱۷)۔ ”کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر۔ یوم آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے“۔ ان کا (یا ان میں سے کسی ایک کا) انکار کفر ہے۔ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۲۶)۔ ”جو اللہ سے۔ اور اس کے ملائکہ کتب۔ رسل اور یوم آخرت سے انکار کرتا ہے تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل جاتا ہے“۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اسکی ہستی پر یقین۔ اسکی ہر بات پر اعتماد۔ اسکی قوانین پر پورا پورا اعتماد۔ اور ان کی اطاعت کا اقرار۔ یوم آخرت پر ایمان کے معنی ہیں خدا کے قانون سکافات عمل کی معکمیت پر یقین اور اعتماد۔ اور موت کے بعد تسلسل حیات پر یقین۔ ملائکہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملکوتی قوتیں نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ

کے ہر وگرام کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہیں اور خدا نے انہیں انسان کے سامنے جھکا دیا ہے۔ مسخر کر دیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان جھکے۔ انبیاء پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان، تنہا عقل کی رو سے شاہراہ زندگی پر چلنے کی راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ راہ نمائی وحی کی رو سے ملتی ہے۔ اور وحی ہر فرد کو براہ راست نہیں ملتی بلکہ خدا کے منتخب کردہ افراد کی وساطت سے ملتی ہے۔ جنہیں انبیاء کہا جاتا ہے۔ وحی کا یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ کتابوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطہ، حیات، وحی کی رو سے ملا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منزل تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ نبوت پر ایمان لانے کی عملی شہادت اس نبی کی کتاب کو ضابطہ زندگی بنانا ہے۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد کوئی اور کتاب ضابطہ حیات نہیں بن سکتی۔

لہذا مومن (ایمان لانے والا) وہ ہے جسے خدا کے اس قانون کی محکمیت پر بھی پورا پورا بھروسہ ہو جو کائنات میں کار فرما ہے اور اس قانون پر بھی جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وحی کے ذریعے انسانی راہ نمائی کے لئے ملا (اور جواب قرآن کے اندر ہے)۔ اور انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی پر بھی پورا پورا یقین ہو (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی)۔ ایسے افراد پر مشتمل جماعت کو قرآن ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ کر تنبیہ بھی کر دیتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جماعت کا یہ نام تو باقی رہ جائے اور وہ خصوصیات باقی نہ رہیں جن کی بناء پر انہیں اس خطاب کا حامل قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے اس جماعت سے بھی کہہ دیا گیا کہ جس طرح دیگر افراد انسانیہ (یہود - نصاریٰ وغیرہ) کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوانین خداوندی اور مکافاتِ عمل پر پورا پورا یقین رکھیں اسی طرح ان کے لئے بھی ضروری ہے۔ انہیں اطمینان اور بے خوفی کی زندگی اسی طرح مل سکیگی، نہ کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے۔ ”إِنَّ التَّائِبِينَ آمَنُوا وَالتَّائِبِينَ هَادُوا“ وَالتَّائِبِينَ وَالْمُتَابِعِينَ - ”مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ (۲۴)۔ ”یقیناً جو لوگ اپنے آپ کو مومن کہہ کر پکارتے ہیں اور جو یہود اور نصاریٰ اور صابئین ہیں۔ کسے باشد۔ جو بھی اللہ اور آیت

پر ایمان لائیگا اور اس کے اعمال صالح ہونگے۔ تو ایسے لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ہوگا۔ اور انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن۔ (نیز دیکھئے  $\frac{۲۳}{۱۳۶}$ )۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ تو پہلے ہی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے انہیں ”مومن“ ہونے کے لئے نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ جب تک ان تمام امور پر اس طرح ایمان نہ لایا جائے جس طرح قرآن نے بتایا ہے (یعنی ان کی جو تشریحات قرآن نے بیان کی ہیں انہیں اسی طرح نہ مانا جائے) کسی کے (بزعیم خویش) ایمان کو ایمان نہیں کہا جائیگا۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا  $\frac{۲۳}{۱۳۶}$ ۔ ”اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائیگا کہ یہ لوگ صحیح راستے پر ہیں،۔ ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہے اور عمل وہی صالح ہے جسے قرآن صالح قرار دے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور اس کا قانون اس میں کار فرما ہے، لیکن اپنی زندگی (یا انسانی معاملات) میں خدا کی راہ نمائی (وحی) کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو وہ مومن قرار نہیں دیتا اس لئے کہ مومن کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتا ہو۔ مومن وہ ہے جو وحی پر بھی ایمان رکھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے  $\frac{۲۳}{۸۳-۹۰}$ )۔

یہ بھی یاد رہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر، یا جماعت مومنین کے غلبہ و اقتدار کے پیش نظر، ایمان لے آنا بھی ایمان نہیں کہلاتا۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں قانونِ خداوندی کی صداقتوں کا یقین اور اس کی محکمیت پر بھروسہ رکھے۔ سورة الحجرات میں ہے قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَّمْ يَأْمُرْنَا اللَّهُ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ قَوْلُوا اسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ  $\frac{۲۳}{۹۱}$ ۔ ”اعراب (دیہاتی بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ یہ کہو کہ ہم نے تمہاری فرمان برداری اختیار کر لی ہے۔ اس لئے کہ (ابھی تک) تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا،۔

دوسری طرف اسے بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان صرف ان حقائق کو مان لینے کا نام نہیں۔ ان کے سامنے عملاً سر تسلیم خم کر دینا بھی ضروری ہے۔ سورۃ روم میں ہے "اِنْ تَسْمِعْ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ" (۳۰/۳)۔ "تو صرف انہی کو سنا سکتا ہے جو ہمارے احکام پر ایمان لائے ہیں اور وہ ان کے سامنے جھکنے والے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایمان کو کفر کے مقابل رکھا گیا ہے (مثلاً ۲/۲۱۷ میں) وہاں اسے "گریز کی راہیں نکالنے اور پھر جانے" کے مقابل بھی لایا گیا ہے۔ (دیکھئے ۲/۱۳۰) حتیٰ کہ مومن اور فاسق کو بھی ایک دوسرے کی ضد بتایا گیا ہے (مِنْهُمْ اَلْمُؤْمِنُونَ وَاَكْثَرُهُمْ اَلْفٰسِقُونَ) (۱۳۰/۱)۔ اور منافقین کی ضد بھی۔ وَلِيَعْلَمَ اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيَعْلَمَ التَّوْبٰتِ نَاَفَقُوْا (۱۶۵-۱۶۶) "تاکہ وہ مومنوں کو بھی جان لے اور ان لوگوں کو بھی جو منافقت برتتے ہیں"۔

قرآن نے خدا کو اَلْمُؤْمِنُ (۲۳/۵) کہا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور جو اس کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے وہ اسے تخریبی قوتوں کی تباہیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے بندہ مومن وہ ہوگا جس پر تمام انسان اعتماد اور بھروسہ کر سکیں اور جو تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

تصریحات بالا سے اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ مومن کسے کہتے ہیں۔ اس کا مقام کیا ہے اور فرائض اور ذمہ داریاں کیا؟

## اِمَّا (حرف)

اِمَّا (یا تو۔ یا خواہ) حسب ذیل مثالوں سے مفہوم واضح ہو جائیگا:-  
 (۱) اِمَّا يَّعْتَذِرْ بِهٖمْ وَاِمَّا يَنْتَوِبْ عَلَيْهِمْ (۱۶۶/۱)۔ خواہ وہ انہیں عذاب دے اور خواہ ان کی طرف متوجہ ہو۔  
 (۲) قَالُوْٓا۟ اٰلِمْوْٓا۟ سِیۡۤا۟ اِمَّا اَنْ تَكُوْنُوْٓا۟ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی (۲/۲۵) انہوں نے کہا۔ اے موسیٰ یا تو تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالیں۔

(۳) بعض اوقات یہ حرف شرط (اِنْ) کے معنی دیتا ہے۔ اس صورت میں (مَا) اس میں زائد ہوتا ہے۔ جیسے فَتَابِعَا تَرْبِیْنَ مِّنْ اَلْبَشَرِ اَحَدًا (۱۶/۱)۔ پھر اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو..... اس میں صرف اِنْ کے معنی (اگر) آئے ہیں۔ (مَا) زائد ہے۔



## ا م و (امّۃ)

امّۃ - باندی (حقیرہ کی ضد ہے) یہ لفظ دراصل امّوۃ یا امّوۃ تھا۔ قرآن کریم میں مذکر کے لئے عبید اور مونث کے لئے امّۃ آیا ہے (۲۴۱)۔ امّۃ کی جمع امّاء ہے (۱۳۴)۔

## اُن - (حرف) -

اُن - عام طور پر (کہ) کے معنوں میں آتا ہے۔ بِرَبِّدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ (۲۴)۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں۔

(۲) وَاَنْ تَتَّصُوْا خَیْرًا لَّکُمْ..... (۱۸۳) اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ یعنی صَیَّامُکُمْ۔ تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

(۳) بعض اوقات یہ زائد ہوتا ہے۔ مثلاً۔ وَلَمَّا اَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا (۱۱۶)۔ جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کی طرف آئے۔ یہاں اُن زائد ہے۔ چنانچہ (۱۱۶) میں ہے وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا۔ یعنی اس میں اُن نہیں ہے۔ نیز دیکھئے (۱۱۶) جہاں اُن زائد ہے۔

(۴) بعض اوقات اُن سبب کو ظاہر کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً وَعَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ (۳۸)۔ اور انہیں اس بات پر تعجب آ رہا ہے کہ ان کی طرف انہی میں سے ایک آگاہ کرنے والا آگیا! یعنی اس کے تعجب کا سبب یہ ہے کہ ان کی طرف انہی میں سے رسول آگیا۔ وہ اس پر متعجب ہیں کہ ایسا کس طرح ہو گیا۔ (لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دراصل لِاَنْ ہے۔ یعنی اس میں لام سبب، مقدر ہے۔ یعنی وہ لام جس کے معنی ”تاکہ“ یا ”اس وجہ سے“ ہوتے ہیں لکھا نہیں گیا۔ محذوف ہے۔)

(۵) ”تاکہ“ کے معنوں میں۔ وَالْاُنْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوٰسِیْ اَنْ تَعْمِدَ بَیْکُمْ (۱۱۶)۔ ”اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا رکھے ہیں تاکہ تمہیں سامان رزق عطا کرے“۔ ”یا تم اسی پر آرام سے بیٹھے رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے۔“ (بعض کے نزدیک یہاں بھی لام سبب مقدر ہے۔)

- (۶) بعض اوقات اس کا مطلب ہوتا ہے ”یہ کہہ کر کہ“۔ و لَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ اَعْبُدُوا اللَّهَ (۱۱۶)۔ اور ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا۔ یہ پیغام دیکر کہ لوگ صرف اللہ کی محکومی اختیار کریں۔
- (۷) ”ایسا نہ ہو کہ“۔ يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا (۶۷)۔ اللہ یہ باتیں تمہیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تم غلطی میں پڑ جاؤ۔
- (۸) ”تاکہ اگر ایسا ہو تو.....“ کے معنوں میں۔ مثلاً أَنْ تَضِلَّ أَحَدُ أَهْمَا (۲۸۲)۔ تاکہ اگر ایسا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک غلطی کر جائے تو.....

## اِنْ (حرف)

- اِنْ۔ حرف شرط ہے۔ ”اگر“ کے معنوں میں آتا ہے۔ اِنْ يَنْتَهَوْا يُغْفِرَ لَهُمْ (۸۸)۔ اگر وہ رک جائیں تو اللہ ان کی حفاظت کا سامان کر دے۔
- (۲) کبھی یہ۔ مَا أَنْهَىٰ عَنْهُ (۳۵) کے معنوں میں آتا ہے۔ وَقَالُوا اِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۳۵) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں بجز اس کے کہ کھلا ہوا جھوٹ\* ہے۔ يَا وَلَدَيْنَا اِنْ آمَسَّاكَهْمَا..... (۳۵)۔ اگر وہ ہٹ جائیں تو کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔
- (۳) کبھی یہ اِنْ کا مخفف ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں۔ یقیناً۔ بالتحقیق۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ (۹۴)۔ سو تو انہیں قانونِ خداوندی کی یاد دلاتا جا۔ یقیناً یہ بناد دھانی نفع دیتی ہے۔ (بعض کا خیال ہے کہ اس آیت میں اِنْ شرطیہ ہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تذکیر صرف اس وقت کرو جب تک یہ نفع بخش ہو۔ ورنہ صحیح موقع کا انتظار کرو۔)\*\*
- (۴) کبھی یہ زائد ہوتا ہے۔ یعنی کوئی معنی نہیں دیتا۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ آیت وَلَقَدْ مَكَرْتُمُكُم فِيمَا اِنْ مَكَرْتُمْ فِيمَا (۲۶) میں اِنْ زائد ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ہونگے ”اور یقیناً ہم“
- \* دیکھئے عنوان (سج-ر)۔ \*\* جب اِنْ مخفف ہو اِنْ کا تو اسکی خبر ہر اکثر لام تاکید آیا کرتا ہے۔ جیسے وَاِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۲۴) ”اور یقیناً وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے“۔

نے انہیں ایسا تمکن عطا کیا تھا جیسا تمہیں کیا ہے،، لیکن اگر یہاں 'اِنْ' کے معنی مَآ (نہیں) کے لئے جائیں تو معنی ہونگے "ہم نے انہیں ایسا تمکن دیا تھا جیسا تمکن تمہیں بھی نہیں دیا،،۔

(۵) بعض اوقات اس کے معنی اِذْ کے آتے ہیں۔ اور مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "چونکہ تم ایسے ہو اسلئے..... مثلاً اِتَّقُوا اللہَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۱۳)۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس لئے کہ تم مومن ہو۔ (نیز ۲۸)۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ وَ اَشْكُرُوا اللہَ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۲۴۴)۔ اور نعمة خداوندی کی قدردانی کرو در آنحالیکہ (جب کہ) تم اسکی محکومی اختیار کئے ہوئے ہو۔

(۶) اِلَّا۔ (اِنْ + لَا)۔ دیکھئے۔ اِلَّا

## اَنَا (ضمیر)

اَنَا۔ واحد متکلم کی مرفوع ضمیر ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اَنَا رَجُلٌ۔ میں ایک مرد ہوں۔ اَنَا امْرَأَةٌ۔ میں ایک عورت ہوں۔ قرآن کریم میں ہے قَالَ اَنَا اَحْيٰی وَاُمِیّتٌ (۲۵۸) "اس نے کہا کہ میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔" اَنَا کا تشبیہ اور جمع نَحْنُ آتا ہے۔

## اَنْتَ (ضمیر)

اَنْتَ۔ واحد مذکر حاضر کی مرفوع ضمیر ہے۔ اَنْتَ رَجُلٌ۔ تو ایک مرد ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ اَسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةَ (۵۴) "تو اور تیری بیوی باغ میں رہو۔" اس کا تشبیہ اَنْتُمَا اور جمع اَنْتُمْ آتی ہے۔

## اَنْتِ (ضمیر)

اَنْتِ۔ واحد مؤنث حاضر کی مرفوع ضمیر ہے۔ اَنْتِ امْرَأَةٌ۔ تو ایک عورت ہے۔ اس کا تشبیہ اَنْتُمَا اور جمع اَنْتُنَّ آتی ہے۔

## اَنْتُمْ (ضمیر)

اَنْتُمْ - جمع مذکر حاضر کی مرفوع ضمیر ہے۔ اَنْتُمْ رَجَالٌ - تم سب مرد ہو۔ قرآن کریم میں ہے "وَاَنْتُمْ بِسُلَيْمُونِ" (۱۳۱) "تم مسلم ہو"۔ اس کا واحد اَنْتَ ہے۔

## اَنْتُمَا (ضمیر)

اَنْتُمَا - تشبیہ حاضر کی مرفوع ضمیر ہے۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے آتی ہے۔ اَنْتُمَا رَجُلَانِ - تم دونوں مرد ہو۔ اَنْتُمَا امْرَأتَانِ - تم دونوں عورتیں ہو۔ سورۃ قصص میں ہے اَنْتُمَا وَمَنْ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ (۲۸)۔ "تم دونوں اور جو تمہارا اتباع کرے" غالب رہو گے"۔

اس کا واحد اَنْتَ (مذکر کے لئے) اور اَنْتِ (مؤنث کے لئے) ہیں۔

## اَنْتُنَّ (ضمیر)

اَنْتُنَّ - جمع مؤنث حاضر کی مرفوع ضمیر ہے۔ اَنْتُنَّ نِسْوَةٌ - تم سب عورتیں ہو۔ اس کا واحد اَنْتِ ہے۔

## ان ت

اَنْتَ - اس کے بنیادی معنی نرم کے ہیں۔ حَدِيدٌ اَنْيُثٌ - نرم لوہا۔ اَرْضٌ اَنْيُثَةٌ - نرم زمین۔ سَيْفٌ اَنْيُثٌ - نرم تلوار جو قاطع نہ ہو۔ اَنْثَ لَهْ - وہ اس کے لئے نرم ہو گیا۔

راغب نے لکھا ہے کہ چونکہ تمام حیوانات میں مؤنث بمقابلہ مذکر نرم اور ضعیف ہوتی ہے اس لئے اسے "انثی" کہتے ہیں۔ لہذا ہر وہ چیز جس میں فاعلیت کی بجائے انفعالی کا پہلو غالب ہو "انثی" کہلائیگی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے جمادات کو بھی "انثیات" کہتے ہیں۔ اور خدا کے مقابلہ میں جن چیزوں کو بھی معبود بنا لیا جاتا ہے وہ (خدا کی قوت اور فاعلیت کے اعتبار سے) "انثیات" کہلاتی ہیں۔ سورۃ النساء میں جو کہا گیا ہے کہ "اِنْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُونِهِ اِلَّا اِنْثًا" (۱۶) تو اس میں "انثیات" سے مراد ضعیف و کمزور ہی ہیں خواہ وہ پتھر کی مورتیاں ہوں یا دیگر معبود۔ \*\*۔

قرآن کریم میں ذَکَرٌ (نر - مذکر) کے مقابلہ میں اُنْثٰی (مادہ - مؤنث) آیا ہے (۱۱/۲) اور بَنِيْنَ (بیٹے) کے مقابلہ میں بھی اِنَاثٌ (بیٹیاں) آیا ہے (۱۶/۱)۔

## انجیل

اَلْاِنْجِلُ کے بہت سے معنی ہیں - منجملہ ان کے 'بہنے والے پانی کو بھی کہتے ہیں - اور نَجَلْتُ اَلْاَرْضَ کے معنی ہیں زمین سرسبز ہو گئی - نَجَلْتُ الشَّيْءَ اس نے اس چیز کو طاهر کر دیا - بعض نے کہا ہے کہ اَلْاِنْجِلُ اسی سے مشتق ہے\* - لیکن صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ، یونانی لفظ اَوْتَجِلْتُون کا معرب ہے جس کے معنی مسرت انگیز خبر یا بشارت ہیں\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِنْجِلُ - نَجَلْتُ الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں، میں نے اسے نکال لیا - اس کا مفہوم ہے 'واضح کر دیا - کھول کر بیان کر دیا - اس لئے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں - قرآن نے یہ لفظ اس کتاب کے لئے استعمال کیا ہے جو حضرت عیسیٰ کو دی گئی تھی (۵۷/۴)۔

جو انجیل اس وقت عیسائیوں کے پاس ہے اسکی تاریخ کے لئے میری کتاب 'معراج انسانیت'، کا پہلا باب 'ظہر الفساد'، دیکھئے - اس سے واضح ہوگا کہ یہ کتاب اپنی اصلی شکل میں بالکل نہیں - حضرت عیسےؑ جو صحیفہ ربانی (انجیل) اپنے حواریوں کو دیکر گئے تھے، اس کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا - بعد میں جب عیسائی کلیسا، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی ازگاہ بن گیا تو مختلف الخیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں - چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رو سے اس زمانے میں قریب چونتیس اناجیل کا پتہ چلتا ہے - یہ اناجیل درحقیقت حضرت عیسےؑ کے سوانح حیات تھے جنہیں عام روایات سے اخذ کر کے ترتیب دیا گیا تھا - حضرت عیسےؑ اور آپ کے حواریوں کی زبان ارامی تھی لیکن حیرت ہے کہ ان چونتیس اناجیل میں سے (سوائے ایک کے جواب مفقود ہے) کوئی انجیل بھی ارامی زبان میں نہیں تھی - سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں - نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متی -

مرقس - لوقا - یوحنا) کو منتخب کر کے بقایا کو جعلی قرار دے دیا گیا۔ ان منتخب کردہ اناجیل (اور ان خطوط کو جنہیں سینٹ پال اور حواریوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں صفحہ ارض پر موجود نہیں۔ اس وقت دنیا میں اناجیل کے صرف تین قدیم نسخے ہیں۔ ایک ویٹکن میں۔ دوسرا برٹش میوزیم میں اور تیسرا وہ جسے روس نے انگلستان کے پاس فروخت کیا ہے۔ پہلے دونوں نسخے پانچویں صدی کے اور تیسرا نسخہ چوتھی صدی کا ہے۔ چوتھی صدی میں جیروم نے یونانی زبان سے ان کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ یہی ترجمہ اس ترجمہ کا ماخذ ہے جو شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں) شائع کیا گیا اور جو مستند ترجمہ کہلاتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں کنٹریری میں ستائیس علمائے عیسائیت کی ایک مجلس بدیں غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ناقص ہے اس لئے ایک اور مستند ترجمہ شائع کیا جائے۔ اس ترجمہ کو (Revised Edition) کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اناجیل کے جو تراجم اب مروج ہیں وہ ان دو تراجم کے عین مطابق ہیں۔ بالکل نہیں۔ بائبل سوسائٹیز کی طرف سے شائع ہونے والا ہر نسخہ، پہلے نسخوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسا مختلف کہ جب جرمن ڈاکٹر میل نے عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے موازنہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کئے۔ اور جان جیمس نے جب ذرا زیادہ تحقیق سے کام لیا تو دس لاکھ اختلافات سامنے آ گئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے الائنکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون (Gospel) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ اتھکس کا مضمون (Bible)۔)

یہ ہے مختصراً انجیل کی کیفیت جسے عیسائی دنیا آسمانی کتاب مانتی ہے۔ واضح رہے کہ اناجیل میں یہ تعریفات سہواً نہیں کی گئیں۔ دانستہ اور ”کارثواب“، سمجھ کر کی گئی ہیں۔ چنانچہ (اور تو اور خود)۔ سینٹ پال کا بیان ہے کہ

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر ایک گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے؟

(رومیوں کے نام خط - ۲)۔

اس ”جھوٹ“ سے ”خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے“ کس طرح ظاہر ہوئی، اس کے متعلق (زیادہ نہیں) صرف ایک شہادت کافی ہوگی۔ ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب (God And Evil) میں لکھتا ہے کہ

جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کا وہ  
کیریڈکٹر ہے جسے اناجیل پیش کرتی ہیں۔ (صفحہ ۳۱۹)۔

اس سے یہ حقیقت سمجھ میں آجائیگی کہ جب قرآن نے یہ کہہ کر کہ انجیل  
معرف ہے، حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے صحیح سوانح حیات پیش کئے تو  
یہ خود دنیا نے عیسائیت پر کتنا بڑا احسان تھا۔

## ان س

”انّس“۔ مانوس ہونا۔ (وحشت کی ضد ہے)۔ چنانچہ اَلْحَمْرُ  
”الانسیّۃ“ پالتو گدھوں کو کہتے ہیں۔ اور حِمَارٌ ”وحشی“ جنگلی گدھے  
(گورخر) کو۔ اِسْتَانَسَ الْوَحْشِیُّ کے معنی ہیں جانور مانوس ہو گیا\*۔

انّسٌ فُلَانٌ۔ فلاں شخص کا خاص دوست یا اس کا خالص رفیق۔  
انّسٌ۔ بشر۔ اس کا واحد انّسیّ ہے۔ الانّس: وہ قبیلہ جو کسی جگہ  
مقیم ہو\*۔ انّس کے برعکس، وہ خانہ بدوش قبائل جو جگہ جگہ  
بھرتے رہتے تھے اور اس طرح عام نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے، جن  
کہلاتے تھے۔ (دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ن)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ  
انّس کے بنیادی معنی ظا ہر ہونے کے ہیں۔ برعکس اَلْجِن کے، جس کے  
معنی پوشیدہ ہونے کے ہیں۔ اس کی جمع ”انّاس“ اور ”انّاسی“ آتی ہے۔  
بعض کے نزدیک اَلنّاس بھی اس کی جمع ہے۔ قبیلے کے معنوں میں ”انّاس“  
سورۃ بقرہ میں آیا ہے۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اِنّاسٍ مَّشْرَبَهُمْ۔ (۲۰)۔  
”سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا“۔ نوع انسانی کے معنوں میں  
”انّاسی“ اور اَلنّاس سورۃ فرقان میں آئے ہیں۔ (دیکھئے ۲۹ : ۵۰)۔

لفظ ”انّسان“ کے متعلق بہت سی توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن  
اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ یہ بھی انّس سے ہی ہے۔ قرآن میں  
”انّسان“ اور ”بشّر“ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (دیکھئے ۲۸ : ۲۶)۔  
نیز ”انّسیّاً“ بھی ”بشّر“ کے ساتھ آیا ہے (۲۶)۔ ”انسان“ بشر کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان ”بشّر“

”انّاس“۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بعض کے نزدیک یہ ”انّس“ کی  
جمع ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قَوْم کی طرح اسم جمع ہے۔ بعض کے  
نزدیک اَلنّاس دراصل ”انّاس“ تھا جو ”انّس“ کی جمع ہے۔ ایک گروہ کا  
خیال ہے کہ یہ دراصل ”انّاسی“ تھا۔ کثرت استعمال سے آخری یاء  
گر گئی۔ اس کے بعد ”انّاس“ کا درمیانی ہمزہ بھی تخفیفاً حذف کر دیا اور  
اس طرح اَلنّاس باقی رہ گیا\*\*۔

\* تاج و لین و اقرب الموارد۔ \*\* تاج

آئس کے معنی دیکھنے اور محسوس کرنے کے ہیں۔ تذکرہ حضرت سوسا<sup>۱</sup> میں جہاں انہوں نے کہا ہے اِنِیْ اَنْسَتْ نَارًا (۲۹ : ۲۹) تو اس میں آئس کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ اِنِیْ اَنْسَتْ - کسی شے کی معرفت اور ادراک حاصل کر لینے اور یقین کو کہتے ہیں۔ مِسْتَانِیْسْ - جو مانوس اور بے تکلف ہو۔ سورۃ احزاب میں ہے مِسْتَانِیْسِیْنِ لِحَدِّ بَثْیَ (۳۳ : ۳۳)۔ اس کے معنی ہیں بے تکلف باتوں میں لگ جانا۔

اِسْتَانَسْ - اجازت طلب کرنا۔ سورۃ نور میں ہے حَتّٰی تَسْتَانِسُوْا (۲۴ : ۲۴) اس کے معنی اگلی آیت (۲۴ : ۲۸) سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اِسْتَانَسْ کے معنی دراصل معلومات حاصل کرنے کے ہوتے ہیں۔ جو شخص کسی مکان کے باہر کھڑا ہو کر دستک یا آواز دیتا ہے وہ دریافت کرتا ہے کہ گھر میں کوئی ہے۔ اور اگر ہے تو وہ اندر آ سکتا ہے؟ اس بنا پر یہ لفظ اِسْتِیْذَانْ (اجازت طلبی) کے معنوں میں استعمال ہوئے لگا۔ اس قسم کی اجازت طلبی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آنے والا گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایسا انداز اختیار کرے جس سے وہ اہل خانہ کے نزدیک اجنبی نہ رہے۔ مانوس ہو جائے۔

قرآن کا خدا رَبُّ النَّاسِ - مَلِیْکِ النَّاسِ - اِلٰہِ النَّاسِ (۱۱۳ : ۱۱۳) ہے اور خود قرآن بَصَّائِرُ لِلنَّاسِ (۲۵ : ۲۵)۔ اس لئے یہ دعوت بلا حدودِ زمان و مکان، تمام نوع انسانی کے لئے ہے اور خدا کی ربوبیت، ربوبیت عالمینی ہے۔ نوٹ :- قرآن میں جِنَّ و اِنْسْ کے الفاظ اکٹھے بھی آئے ہیں اور انسان سے پہلے جانُّ کی تخلیق کا بھی ذکر آیا ہے (۱۵ : ۱۵)۔ اس کے لئے (ج - ن - ن) کا عنوان دیکھئے۔

## ا ن ف

اَلَا تَنْفُ - ناک\*۔ ہر چیز کی ابتدا اور اس کا مضبوط اور سخت ترین حصہ\*۔ اَلَا تَنْفُ یا اَلَا تَنْفُ (۵ : ۵)۔ ”ناک کے بدلے ناک“۔ اَلَا تَسْتَشْفُ کسی کام کو از سر نو شروع کرنا\*۔ عرب ’ہزت اور ذلت دونوں کی نسبت اَنْفَتْ کی طرف کرتے ہیں۔ مثلاً حَمِیْ اَنْفَتْ۔ وہ معزز ہو گیا، اور رَغِیْمَ اَنْفَتْ۔ وہ ذلیل ہو گیا\*\*۔ ہماری زبان میں بھی ”اونچی ناک والا“ اور ”ناک کٹ گئی“ عزت اور ذلت کے معنوں میں بولتے ہیں۔

\* تاج و راغب - \*\* محیط -



انیفأ۔ ابھی ابھی۔ قرآن کریم میں ہے مَاذَا قَالَاَنِفأ (۲۹) اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟۔

## ان م

آلَا تَأْمُ مَخْلُوق کو کہتے ہیں۔ یا صرف جن و انس کو کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان تمام چیزوں کو آتَم کہتے ہیں جو روئے زمین پر ہیں۔ غالباً یہ کُوم سے ماخوذ ہے اور ہر اس چیز کو آتَم کہہ سکتے ہیں جس پر نیند طاری ہوتی ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آلَا تَأْم ہر جاندار چیز کو کہتے ہیں۔ \*\*

قرآن کریم میں ہے وَالْاَرْضُ رُضًا وَضَعَهَا لِلْاِنَامِ (۲۹) ”زمین کو مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا، اس سے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا نظام جس میں زمین (سرچشمہ رزق) تمام مخلوق کے فائدے کے بجائے چند افراد کے مفاد کا ذریعہ بن جائے (یا بے فائدہ پڑی رہے) منشاء خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس کی تشریح میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہہ دیا ہے کہ اَرْضُ كُوءًا لِّلْاِنَامِ (۱۰) رہنا چاہئے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ (مزید تفصیل ا۔ ر۔ ض کے عنوان میں ملیکی)۔

## ان (حرف)

ان۔ تاکید اور تحقیق کے لئے آتا ہے۔ اِنَّ التَّوْبَةَ كَفَرًا (۲) یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ (اس نظام حیات سے) انکار کرتے ہیں۔

اِنَّمَا (ان + مَا)۔ صرف (Only) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ (اسے حصر کہتے ہیں) اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ (۹) صدقات صرف فقراء کے لئے ہیں۔ اور محض تاکید کے لئے بھی (نیز دیکھئے عنوان۔ مَا)۔

انشیٰ در اصل اِنْ اور ی (متکلم کی ضمیر) سے مل کر بنا ہے۔ اسے اِنْشِیٰ اور اِنْشِیٰ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

اِنَّا۔ در اصل اِنْ اور نا (جمع متکلم کی ضمیر) کا مرکب ہے۔ اسے اِنَّا اور اِنشَا دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

## آن - (حرف)

آن در حقیقت ان کی طرح ہے۔ تاکید کے لئے آتا ہے۔ جب اس پر کاف تشبیہ کا آجائے تو کائن ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے ”کائن“ کے ماتحت) انشما کے معنی بھی ان ہی کے ہوتے ہیں۔ مطلب تحقیق اور تاکید عوتا ہے۔ **اَنشَمَا اللّٰهُ کُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ** (۱۸۰/۱)۔ یقیناً تمہارا اللہ واحد ہے۔ اس پر کاف تشبیہ آجائے تو کائنما ہو جاتا ہے۔ ان اور آن کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ ابتدائے کلام میں ان استعمال کرتے ہیں اور درمیان کلام میں آن استعمال کرتے ہیں۔ البتہ قال اور اس کے مشتقات کے بعد ان استعمال کیا جاتا ہے۔ آن استعمال نہیں کیا جاتا۔

## آنی (حرف)

(۱) **اَنشٰی**۔ کَیْنَف (کسطرح - کیونکر) کے معنوں میں۔ **وَ اَنشٰی لَہِ الْیَذَّکَّرٰی** (۱۳۰/۱)۔ اور (اس دن) اسکے لئے قانون کی یاد دہانی کسطرح ہو سکے گی؟

(۲) **مَتٰی** (کب اور جب) کے معنوں میں۔ **قَالَ رَبِّ اَنشٰی یَتَکُوْنُ رِیُّ غُلَامٍ** (۱۹/۱)۔ زکریا نے کہا۔ اے میرے نشوونما دینے والے! میرے ہاں کب بیٹا پیدا ہوگا۔ (لیکن یہاں اس کے معنی ”کسطرح“، یا ”کیونکر“ بھی ہو سکتے ہیں)۔

(۳) **مِنْ اَیْنٍ** (کہاں سے) کے معنوں میں۔ **اَنشٰی لَکِیْ هٰذَا** (۱۳۰/۱)۔ تجھے یہ (رزق) کہاں سے ملا؟ (یہاں اسکے معنی ”کسطرح“۔ کب سے یا ”کیونکر“ بھی ہو سکتے ہیں)۔

(۴) **کَدھَر**، کے معنوں میں۔ **قَاَنشٰی تَوُوْ فَکُتُوْن** (۱۴۰/۱)۔ تم کدھر لٹے پھر رہے ہو۔

(۵) سورہ بقرہ میں ہے۔ **نِیْسَاؤُکُمْ حٰرٰثٌ لَّکُمْ**۔ **قَاَنشٰی حٰرٰثٌ لَّکُمْ**۔ **اَنشٰی شِیْئَتُمْ** (۱۳۰/۱)۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تم اپنی کھیتیوں میں (ممنوع اوقاتِ حیض کے علاوہ) جب جی چاہے آؤ۔ یہاں **اَنشٰی** کے معنی **جیسے** ہیں (ضحاک)۔ ابن عباس کا قول ہے کہ اسکے معنی ہیں۔ **اَنشٰی شِیْئَتُمْ** **مِنْ اللّٰقِیْلِ وَالنَّشَا**۔

رات اور دن میں جب تم چاہو۔ صاحب تاج العروس نے بھی اسکے معانی میں ”جسب“ شامل کیا ہے۔ سرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) ابو حیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسکے معنی ”اگر“ کے ہیں۔ یعنی اگر تم چاہو۔

## ا ن ی

آ نَی الشَّیْءُ \* اَنْسِیَا - کسی بات کا وقت ہو جانا۔ اسکا اپنی غایت اور تکمیل تک پہنچ جانا۔ پختہ ہو جانا۔ بَلَغَ هَذَا اَنَاءَهُ وَاَنَاءَهُ۔ یہ چیز اپنی پختگی اور تکمیل کو پہنچ گئی \* سورة احزاب میں ہے۔ نَظِیْرُیْنِ اِنَّهٗ (۳۳/۵۸)۔ کھانے کے وقت کا انتظار کرنے والے۔ یعنی جب تمہیں کھانے پر بلایا جائے اس وقت آؤ۔ یہ نہ کرو کہ یونہی آجاؤ اور پھر باتیں کرتے رہو تا آنکہ کھانے کا وقت آجائے اور تم اس میں (خواہ مخواہ) شامل ہو جاؤ۔ سورة الحديد میں ہے اَلَسْمُ بِاَنْ لِّیَقْدِرُیْنَ اَلْمَسْوَ (۵۹/۱۶) راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنی یہ ہیں کہ کیا مومنین کے لئے اس بات کی تکمیل اور پختگی کا وقت نہیں آیا؟ سورة غاشیہ میں عِیْنِ الْاٰیَةِ آیا ہے (۸۸/۵)۔ اسکے معنی ہیں چشمے کا وہ پانی جو اپنی حرارت میں شدت تک پہنچ گیا ہو۔ کھولتا ہوا۔

اَلَا نَءَا \* برتن \* جمع اَنْیَۃ \* (۹۵/۱۵)

اَلَا نَءَا جمع ہے اَنْی \* اَنْی \* کی، جس کے معنی وقت کا کچھ حصہ۔ ساعت ہیں۔ اَنْءَا التَّیْلُ۔ رات کی گھڑیاں \* (۳۴/۱۴ ذ ۱۴/۲) ابن فارس نے کہا ہے کہ اَنْی رات کے کسی وقت کے لئے ہی بولا جاتا ہے۔ اَنْیْتُ الشَّیْءُ۔ میں نے اس چیز کو اسکے وقت سے مؤخر کر دیا \*\*

## ا ه ل

اَہْل \* صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے معنی عبرانی زبان میں خیمہ کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اسکا مفہوم ہوا وہ لوگ جو ایک خیمہ میں رہتے ہوں \*\*\* اسکے بعد (راغب کے الفاظ میں) یہ لفظ ان لوگوں کیلئے بولا جانے لگا جو آپس میں نسب۔ دین یا پیشہ۔ مکان اور شہر میں مشترک ہوں۔ \*\* عام طور پر اَہْلُ الْقَرْجُلِ آدمی کے خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ اَہْلُ الْبَیْتِ۔ گھر میں رہنے والے۔ اَہْلُ الْقَرْجُلِ۔ بیوی اور

\* تاج۔ \*\* راغب \*\*\* محیط۔

اولاد کے لئے بھی آتا ہے۔ \* صاحب محیط نے اس لفظ کے متعدد معنی درج کئے ہیں۔ پھر ابو حنیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے بالخصوص بیوی مراد ہوتی ہے۔ \* آہلیؑ اس چوپایہ کو کہتے ہیں جو مکانات سے مانوس ہو جائے \* یعنی پالتو۔

ییشک قرآن کریم قرابت اور رشتہ داری کو اہمیت دیتا ہے لیکن اس کے نزدیک انسانوں کی بنیادی تقسیم کا ایک ہی معیار ہے۔ یعنی کفر اور ایمان (Ideology)۔ جو لوگ ایک دین کے رشتہ میں پروئے جائیں، وہ ایک گروہ، جماعت اور قوم کے افراد۔ لہذا اپنے۔ جو اس رشتہ سے باہر ہوں، وہ دوسری جماعت اور قوم سے متعلق۔ لہذا بیگانے۔ ان اپنوں میں سے جو قرابت دار ہوں وہ اس قرابت داری کی بنا پر قریبی ہو جاتے ہیں لیکن اگر قرابت دار دین میں مشترک نہ ہوں تو وہ اپنوں میں سے نہیں رہتے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے حضرت نوحؑ پر یہ کہہ کر منکشف کیا گیا کہ تمہارا بیٹا اِنْقَہ لَیْسَ مِنِ اٰہْلِکَ (۱۱) وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔ \* \* \* اس لئے کہ اِنْقَہ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (۱۱) اسکے اعمال غیر صالح ہیں۔ اس سے پہلے بتا دیا گیا کہ وہ بیٹا جماعت مومنین میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وَ کَانَ فِیْ مَعْزِلٍ (۱۱) لہذا حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہو یا حضرت نوحؑ کا بیٹا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی ہو یا نبی اکرمؐ کے قریب ترین رشتہ دار (مثلاً چچا) اگر وہ دین کے رشتہ میں منسلک نہیں ہوتے تو وہ آہلؑ میں سے نہیں ہو سکتے۔ اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنے اہل میں سے نہ ہوں ان سے نفرت اور عداوت کا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ عدل و انصاف اور انسانیت کا سلوک کیا جائے گا۔ اہل کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ اس جماعت کے افراد ہوں گے جو قرآن کے نظام ربوبیت کی حامل ہوگی، یعنی جن کے ذمہ نوع انسانی کی پرورش کا اہم فریضہ ہوگا۔

هُوَ اٰہِلٌ لِّکَیْذَا۔ وہ اسکا مستحق ہے \*۔ سورۃ نساؑ میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یَسْأَلُکُمْ اَنْ تَوَدُّوْا اِلَّا مَّا نَحْنُ اِلَیْہِہَا (۵۸) ”اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کی طرف لوٹا دو،۔ یہاں امانات سے اگر وہ چیزیں مراد ہیں جو کوئی شخص کسی دوسرے کے پاس بطور امانت رکھ دے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کی امانت میں خیانت نہ کرو۔ اسے اس کے مالک کو واپس دے دو۔ اور اگر امانات سے مراد امت کی وہ چیزیں ہیں

\* محیط۔ \*\* تاج و راغب۔ \*\*\* (بعض نے کہا ہے کہ یہاں اہل کے معنی سزاوار۔ شاہان شان ہیں۔ غریب القرآن از مرزا ابوالفضل)

جو ارباب بست و کشاد کے پاس بطور (Trust) ہوتی ہیں۔ مثلاً اختیارات وغیرہ، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ چیزیں ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ نا اہلوں کے سپرد مت کرو۔

قرآن کریم میں آہل اہل کتاب کا ذکر بڑی کثرت سے آیا ہے۔ اس زمانے کے عربوں میں دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے۔ یہ آہل اہل کتاب کہلاتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو کسی آسمانی کتاب کو نہیں مانتے تھے۔ انہیں بالعموم مشرک کہتے تھے۔ (اگرچہ جہان تک شرک کا تعلق ہے ان اہل کتاب میں بھی شرک کے عقائد پائے جاتے تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ک) عرب کے غیر اہل کتاب کو امشیقین بھی کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ام م) ان تمام گروہوں میں سے جو لوگ رسول اللہ پر ایمان لے آئے مومنین کہلاتے تھے، اور جو اس جماعت سے باہر رہ جاتے تھے کافرین کہلاتے تھے۔

لہذا رسول کا اہل وہ ہے جو اسکی پیروی کرے (۸۳)۔ نیز (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اسکے معنی حقدار، مالک اور ان کے بھی ہیں جو کسی کام کی اہلیت رکھیں (۵۸)۔

## او (حرف)

او۔ ”یا“ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) شک کے لئے۔ مثلاً لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (۱۹)۔ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ یعنی کہنے والے کو یقینی طور پر علم نہیں کہ ان دونوں میں سے کونسی ایک بات ہوئی ہے۔

(۲) جب دو چیزوں میں اختیار دیا جائے کہ چاہے یہ کر لو اور چاہے وہ کر لو۔ تَزَوَّجْ هِنْدًا أَوْ أَخْتَهَا۔ چاہے ہندہ سے شادی کر لو اور چاہے اس کی بہن سے۔ قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔

(۳) جب اس کے پہلے نفی آ جائے تو او سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک بھی نہیں۔ وَلَا تَطِيعُ مِنْهُمْ أَيْمًا أَوْ كَفُورًا (۲۱)۔ تم نہ کسی آئم کی اطاعت کرو اور نہ کفور کی۔

(۴) ”بلکہ“ کے معنوں میں۔ وَ أَرْسَلْنَاهُ بِالْحَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَمِيزُ وَنَ (۳۷) اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا۔ بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ تھے۔

(۵) حَتَّىٰ (یہاں تک کہ) کے معنوں میں۔ تَقَاتِلُوْهُمْ اَوْ يَسْلِمُوْا  
(۲۸/۲۹) تم ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ تمہارے تابع فرمان  
ہو جائیں۔

(۶) ”کبھی یوں ہوا اور کبھی یوں ہوا“ کے معنوں میں۔ فَجَاءَ هَا  
بَا سُنَّاتًا اَوْ هُمُ قَاتِلُوْنَ - (۳۰) - سو ہمارا عذاب کبھی ان  
پر رات کے وقت آیا اور کبھی اس وقت جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے  
تھے۔ یعنی کسی قوم پر رات کے وقت اور کسی قوم پر دوپہر کے وقت۔

## اوب

اَلَا اَوْبٌ - تیز دوڑنے وقت ٹانگوں کو لوٹا کر پیچھے لانا اور تیزی  
سے گھمانا۔ اَلَا وُبَاتٌ - ٹانگوں کو کہنے ہیں۔ اَلتَّوْبَةُ کے  
معنی ہیں دن بھر سفر کر کے رات میں ٹھہرنا۔ رِيْحٌ مَّوْءٍ - اس ہوا کو  
کہتے ہیں جو دن بھر چلتی رہے۔ اَوْبٌ کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے  
کے بھی ہیں۔ رَجُوْعٌ اور اَوْبٌ کے معنوں میں فرق یہ ہے کہ رَجُوْعٌ  
ارادہ و اختیار کے ساتھ یا بلا ارادہ لوٹنے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن اَوْبٌ  
صرف صاحب ارادہ کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی کسی کی طرف بالارادہ رجوع  
کرنا۔ اَلْمَتَابُ - پلٹنا اور رجوع کرنا۔ نیز مستقر۔ جہاں ٹھہرا جائے،  
جہاں کوئی چیز چھپ جائے۔ یا وہ جگہ جہاں کوئی چیز پلٹ کر جائے۔  
چنانچہ کہتے ہیں بَيْنَهُمَا ثَلَاثُ مَتَابٍ - ان دونوں (مقامات)  
کے درمیان تین ٹھہرنے کے مقامات (منازل یا پڑاؤ) ہیں۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ اِلَيْنَا اِيَّا يَتُّبُّوْنَ - (۳۵)۔ ”ان کا لوٹنا  
ہماری ہی طرف ہے“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ غلط راستے پر چل  
رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ راستہ ہمیں زندگی کی خوشگوار دیوں کی طرف  
لے جائیگا۔ یہ ان کی بھول ہے۔ ان کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے  
جو ہم نے ان کے اعمال کے نتائج کے لئے مقرر کر رکھی ہے۔ ان کا کوئی  
مقدم ہمارے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں جاسکتا۔ یہ کشاں کشاں  
اسی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ - (۳۶)۔  
ان کے ہر عمل کا حساب ہمارے قانونِ مکافات کے ذمے ہے۔

اس اعتبار سے حُسْنِ عمل کے نتائج کو حُسْنُ الْعَمَلِ (۳۳) کہا گیا ہے۔ یعنی خوشگوار یوں کی توازن بدوش منزل۔ لیکن آخری مقام نہیں بلکہ راستہ میں ٹھہرنے کی منزل۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے جنت انسانی زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے (تفصیل جنت کے عنوان میں ملیگی۔ دیکھئے۔ ج۔ ن۔ ن)۔

حضرت ایوبؑ کے متعلق ہے، اِنَّهٗ اٰتٰوَابٌ (۳۸)۔ یعنی بڑی تیزی سے قانونِ خداوندی کی طرف دوڑنے والا۔ اطاعت گزار۔ انہی معانی میں حضرت داؤدؑ کی قوم کے سرداروں سے کہا گیا کہ یٰجِبَالُ اَوْرِیْیْ مَعَهٗ (۳۲)۔ ”داؤد کے ساتھ تم بھی نہایت سرگرمی سے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو“۔ (لفظی اعتبار سے یٰجِبَالُ کے معنی ہیں ”اے پہاڑو“۔ لیکن اس کے مجازی معنی سردارانِ قوم ہیں۔ دیکھئے عنوان۔ ج۔ ب۔ ل)۔ **زید بن دیحجہ ترمذی ص ۱۸۳ جلد چہارم**۔

## اول

اَلَا وُدٌ۔ ٹیڑھا ہو جانا۔ اَلَا وُدٌ: جھکانا اور ٹیڑھا کر دینا، گران گذرنا۔ شاق گذرنا۔ بوجھل اور گرانبار کرنا۔ چنانچہ اَلَا وُدَّةٌ بوجھ کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بار بن جانا۔ اَدَّةٌ اَلَا مُرٌ۔ کسی معاملہ کی گران باری نے اسکی کمر ٹیڑھی کر دی۔ تَا وُدَّةٌ اَلَا مُرٌ۔ اس معاملہ نے ایسے جھکا دیا اور گرانبار کر دیا۔\*

اَلَا یَوُدُّہٗ حِفْظُہُمَا (۲۴)۔ کائنات کا کنٹرول خدا پر قطعاً گران نہیں گذرتا۔ اس پر بوجھ نہیں بن رہا۔ اصل میں اسکی بنیادی معنی کسی چیز کا مڑ کر جھک جانا یا ٹیڑھا ہو جانا ہیں (ابن فارس)۔ یعنی بوجھ سے جھک جانا اور ٹیڑھا ہو جانا۔

## اول

اَلِ التَّیْرِ اَوْ لَا۔ اس کی طرف رجوع کیا۔ لوٹا۔ اَلْ عَمْدُہ۔ اسکی طرف سے پھر گیا۔ اسکی بنیادی معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اَوَّلَ اللّٰہِ عَلَیْکَ ضَالَّتْکَ۔ خدا تیری کھوئی ہوئی چیز کو تیری طرف لوٹا دے۔ سأل کہتے ہیں اس نقطہ یا مقام کو جس کی طرف کوئی بات آخر الامر لوٹ کر آئے۔ انجام کار۔ کسی بات کا آخری نتیجہ۔ تَا وِیْلٌ\*

کسی بات کو اس کے صحیح رخ کی طرف پھیرنے کو کہتے ہیں۔ اَوَّلَ الْكَلَامِ  
تأویل۔ اس نے بات کا نتیجہ اور اندازہ واضح کیا۔ اس نے کلام (بات) کی  
ترجمانی کی۔ \*

أَلْ عَلَيَّ الْقَوْمِ کے معنی ہیں وہ قوم کا والی اور حاکم بن گیا۔  
أَلِ السَّمَالِ وَائْتَالَهُ اس نے مال کی خبر گیری کی۔ اس کا انتظام کیا۔  
ایسے درست کیا۔ آلا یتالہ۔ سیاست۔ حدود مملکت۔ \*\*  
أَل کے معنی کم ہو جانا اور نجات پانا بھی ہوتے ہیں۔ \*

اَوَّلَ۔ آخر کی ضد ہے (کے)۔ سب سے پہلا۔ راغب نے کہا ہے کہ  
أَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ کے معنی یہ ہیں کہ میں سب سے پہلے قوافین  
خداوندی کے سامنے جھک کر دوسروں کے لئے نمونہ یا مقتدا بتا ہوں۔  
قرآن میں خدا کے لئے اَوَّلَ اَوَّلَ آیا ہے۔ (کے) اس سے اس کی وہ لامحدودیت  
(Infinity) مراد ہے جس کا احاطہ انسانی ذہن نہیں کر سکتا۔

أَوَّلَ الرَّجُلِ يَأْوِلُ اَوَّلًا۔ وہ سابق ہو گیا۔ سب سے پہلے نمبر  
پر ہو گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابتدائے اسر اور  
انتھائے اسر دونوں کے آتے ہیں۔ اَوَّلِی اس کی تائید ہے۔ \* اَوَّلَ خَيْرَةٍ  
وَأَوَّلِی (۴۹)۔ آل۔ آدمی کے اہل و عیال۔ رفقا۔ متبعین۔ آل کا  
استعمال شرفاء ہی میں ہوتا ہے، اراذل میں نہیں ہوتا۔ \* قرآن میں آل  
یَعْقُوبَ (۱۱ میں) اولاد کے معنوں میں آیا ہے۔ اور رفقا اور متبعین کے  
معنی میں آل فِرْعَوْنَ (۹۶ میں)۔ آل آلہ۔ حالت۔ اوزار۔ اس کی جمع  
آلات ہے۔ \*

قرآن میں تَأْوِيلُ کا لفظ بات کے آخری نتیجہ کیلئے استعمال ہوا ہے۔  
انجام کار۔ مآل کار۔ ذَالِکَ خَيْرٌ وَاحْسَنُ تَأْوِيلًا (۵۶)۔ ”یہ روش سب  
سے بہتر ہے اور اس کا نتیجہ نہایت عمدہ نکلیگا،۔“ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا  
تَأْوِيلَهُ (۳۶) ”اب انہیں صرف اس کا انتظار ہے کہ اس کتاب کے دعاوی  
کی صداقت ان کے سامنے آجائے“۔ یعنی اس کتاب نے ان کے اعمال کے جو  
نتائج بتائے تھے وہ ان کے سامنے آجائیں۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ہم سفر  
بزرگ کے قصے کے آخر میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ  
سَأَنْبِیْئُکَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِيعْ عَلَيْهِ صَبْرًا (۱۸)۔ ”میں  
اب تجھے ان باتوں کی حقیقت کی خبر دیتا ہوں جسے معلوم کرنے کیلئے تو



اس قدر مضطرب و یقربار تھا،۔ حضرت یوسفؑ کے متعلق حضرت یعقوبؑ نے کہا تھا کہ وَ یُعَلِّمُکَ مِیْنُ تَاوَرِیْلَ الْاَحْسَادِ یُثَرِ (۱۲)۔ خدا تجھے ایسی بصیرت و فراست عطا کریگا کہ تو بات سنکر فوراً اسکی تہ تک پہنچ جایا کریگا۔ معاملات کے آغاز پر نگاہ ڈالکر ان کے انجام تک پہنچ جایا کریگا۔ تمہاری فراست کی یہ کیفیت ہوگی۔ کہ خارے دید و احوال چمن گفت۔ خواب کی تعبیر کو بھی اسی لئے تَاوَرِیْلُ کہتے ہیں (۱۲) کہ اس سے انسان خواب کے مبہم اشارات سے اس کی حقیقت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

قرآن حکیم میں آیات متشابہات کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمَا یُعَلِّمُ تَاوَرِیْلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَالْقُرَاسِیْعُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳)۔ یعنی یہ بات کہ فلاں تشبیہ اور مثال سے اصلی مقصود کیا ہے اس کا علم خدا کو ہوتا ہے یا ان لوگوں کو جو علم میں پختگی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ہ۔ ب۔ ہ اور ح۔ ک۔ م)۔

## اُولَآءِ (اسم)

اُولَآءِ۔ یہ سب (جمع)۔ اس کا واحد اَآءِ ہے (دیکھئے ذ۔ ا)۔  
 اُولَیْکَ۔ وہ سب (جمع)۔ اس کا واحد اَآءِ اور اَآءِکَ اَآءِ ہے۔ (دیکھئے ذ۔ ا)۔  
 اُولَیْکُمْ۔ وہ سب۔ مثلاً (۲۱) میں۔ یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اس پر ہائے تنبیہ بھی آتی ہے، جیسے اَھُوْلَا عَرَبِنَا قِیْ (۲۸)۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔

## اُولُوْا (اسم)

اُولُوْا۔ بمعنی ”والے“، (جمع مذکر)۔ اُولُوْا لَیْسَابِ (۳۹)۔ عقل و بصیرت والے (نصب اور جر میں) اُولِیْ اَلْاَلْبَابِ (۳۸)۔ ان کا واحد اُولُوْا ہے (دیکھئے ذ۔ و)۔  
 اُولَاتُ۔ جمع مؤنث۔ (واحد ذات)۔ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ (۳۵)۔ حامل والیاں۔

## ا۔ و۔ ن

اَلْاَنَ۔ وہ وقت جس میں تم موجود ہو \*۔ اب۔ اسوقت۔ اَلْاَنَ جِئْتَ بِاَلْعَبِیْ (۲)۔ ”اب تم سچی بات لائے“،

## اوی

آہ۔ آوہ۔ آوہ۔ یہ تمام کلمات شکایت اور درد کے وقت بولے جاتے ہیں۔ آوہ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ تآوہ کرتا ہو۔ تآوہ کے معنی ہیں آوہ کہنا۔ یعنی حزن اور غم کا اظہار کرنا۔ آہیں بھرنا۔ لہذا اس سے مراد ہوتا ہے ایسا شخص جو بہت رقیق القلب ہو اور لوگوں کی حالت پر بہت زیادہ متأسف اور ان کا غمخوار ہو\*۔ ویسے سمجھدار اور فقیہ کو بھی کہتے ہیں اور بہت دعائیں کرنے والے کو بھی\*۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے کہ وہ آوہ حلیمؑ (۱۱۳) تھے۔ رحمدل۔ غمخوار۔ دوسروں کی مصیبت پر متأسف ہونے والے۔

## اوی

اَوَيْتُ مَنزِلِي۔ میں اپنے گھر میں اترا۔ یا اس کی طرف لوٹا۔ یا اس میں رہا۔ یہ سب معنی آتے ہیں۔ یہیں سے اَوَيْتُ مَنزِلِي کے معنی ہیں اس کی طرف جھکا اور مائل ہو گیا\*۔ اَوَيْتُ مَنزِلِي۔ مجھے اس پر رحم آ گیا۔ یعنی رَجَعْتُ اِلَيْهِ بِقَلْبِي۔ میں اس کی طرف اپنے دل سے مائل ہوا\*\*۔ اَلْمَاوِي۔ وہ جگہ جہاں کوئی چیز رات کو یا دن کو لوٹے۔ وہ جگہ جہاں اونٹ رات کو آرام کرنے کے لئے بونیں\*۔ اَلْمَاوِي۔ ایک جھنڈ میں اکٹھے رہنے والے پرندوں کو کہا جاتا ہے۔ اَلْمَاوِي۔ اس باغیچہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں رات گزاری جائے۔ اَوَيْتُہ۔ میں نے اسے گھر میں اتارا\*۔ (نیز دیکھئے عنوان ث۔ و۔ ی)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا ہو جانا۔ اور (۲) رحم اور ڈر کے ہیں۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت نوحؑ کے بیٹے نے کہا سَاوِي اِلٰی جَبَلٍ (۱۱)۔ ”میں پہاڑ کی طرف پناہ لینے کے لئے مراجعت کرونگا“۔ سورۃ مومنوں میں ہے اَوَيْتُهُمَا (۲۳)۔ ”ہم نے (عیسیٰ اور مریم کو) پناہ دی“۔ سورۃ احزاب میں تَثْوِي بِمَقَابِلِہِ تَرْجِيٰ اِیَاہ (۳۳)۔ یعنی اپنے پاس جگہ دینا۔ سورۃ انفال میں ہے۔ فَاَوَاکُمْ (۲۶)۔ ”اللہ نے تمہیں پناہ دی“۔ قرآن نے جنت کو اَلْمَاوِي کہا ہے (۵۳)۔ یعنی وہ مقام جہاں اس اطمینان سے رہا جائے کہ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ جہاں یہ خوف نہ ہو کہ کوئی اچک

کر لے جائیگا (۳۱)۔ لیکن جہنم کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ ”وَمَا وَهُمْ  
النَّارُ“ (۳۳)۔ جہاں اس کے معنی مطلق رہنے کی جگہ کے ہیں۔ اس لئے  
”وَمَا“ کے اعتبار سے ”وَا“، ہر منزل، مرجع یا مسکن کو کہہ سکتے ہیں۔

## ای (حرف)

ای۔ ہاں۔ قُلْ اٰیُّ وَاٰیُّ رَبِّیْ اِنَّہٗ لَحَقُّ (۱)۔ ان سے کہو کہ  
ہاں۔ بیشک یہی بات ہے۔ میرا رب اس پر شاہد ہے کہ یہ یقیناً حق ہے۔  
ای کے بعد قسم کا آنا ضروری ہے۔

## ای د

اِد۔ یتَّیَّدُ۔ اَیَّدُ۔ مضبوط اور قوی ہونا۔ سخت ہونا۔ اَلَا دُ  
سختی اور قوت۔ یہی معنی اَلَا یَّدُ کے ہیں۔ اَلَا یَّدُ۔ صاحبِ قوت۔  
اَیَّدُ تہ، تَایَّدُ۔ کسی چیز کو بہت زیادہ تقویت دینا۔ اَلَا یَّدُ۔ جس  
چیز سے کسی کو تقویت دی جائے۔ مٹی جو خیمہ کے کنارے لگائی جائے تاکہ  
بارش کا پانی اس کے اندر نہ جائے۔ بلند ٹیلہ۔ محکم پہاڑ\*۔ ابن فارس نے  
کہا ہے کہ اس کے چپادی مٹی قوت اور حفاظت کے ہوتے ہیں۔

وَاَیَّدُ تہ، بِرُّوْحِ الْقُدُّسِ (۲)۔ ”اور ہم نے عیسیٰ کو روح  
القدس کے ذریعہ تقویت دی“۔ وَالشَّعْمَاءُ بَنَیْنٰہَا یَا یَّدُ (۳)۔ ”ہم  
نے اجرام فلکی کو بڑی قوت کے ساتھ بنایا ہے“۔  
(اَیَّدُ۔ یَدُ (ہاتھ) کی جمع ہے۔ دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ۶)

## ای گ

اَلَا یُسْكُنُ۔ بہت سے گھنے درخت۔ درختوں کا جھنڈ۔ وہ بن جس  
میں پیری وغیرہ کے درخت آگئے ہوں۔ درختوں کی کثرت، خواہ وہ کسی  
قسم کے درخت ہوں۔ اَیُّسْكُنُ واحد ہے\*۔ قرآن کریم میں اَصْحَابُ  
اَلَا یُسْكُنُ (۱) اہل مدین کیلئے آیا ہے جو گھنے جنگلوں میں رہتے تھے۔  
(نیز دیکھئے عنوان اصحاب الایکۃ)

## ای م

اَلَا یَامُ۔ دھوئیں کو کہتے ہیں اور اَمَ یَتَّیْسُمُ۔ وَیَتَّوْمُ اِیْمَانًا  
کے معنی ہوتے ہیں اس نے شہد کا چہرہ اتارنے کے لئے شہد کی مکھیوں کو

دھونی دی تاکہ مکھیاں اڑ جائیں اور چھتہ خالی رہ جائے۔ اس سے ”لَا یَمِیْمٌ“ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو۔ اسکی جمع ”الْیَمَامِی“ ہے۔ عربوں میں معاورہ تھا کہ ”الْحَرْبُ مَآ یَمَۃٌ“ ”لِثْنِیْسَاءِ“ جنگ عورتوں کو بیوہ کر دیتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے ”وَ اَنْتَکِیْحُوْا الْیَمَامِی مِنْکُمْ“ (۲۴۴) جو تم میں مجرد ہوں (خواہ عورتیں خواہ مرد۔ غیر شادی شدہ ہوں یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں، اس میں سب داخل ہیں) انکی شادی کر دیا کرو۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی معاشرہ کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسے حالات اور سہولتیں پیدا کرے جن میں افراد معاشرہ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔

## اَیْن

اَیْن - کہاں، کدھر، کس طرف، کس جگہ۔ اَیْنَمَا کے معنی ہیں، جہاں، کدھر، کہیں۔ اَیْنُ اَلْتَفَرُّ؟ مگر کہاں ہے (۲۵) اَیْنُ مَا تَكُوْنُوْا یَاۤتِ بِکُمْ اللّٰهُ جَمِیْعًا..... (۲۶۸)۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تمہیں اکٹھا کرے گا۔

## اِی

اِی - بمعنی کون۔ کیا۔ کونسا (استفہام کے لئے)۔ اِیَّ اَیِّ حَیْدِیْثٍ بَعْدَہُ ”یَوْمَیْمُتُوْنَ“ (۱۸۵)۔ اس کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں گے۔ اِیَّامًا تَدْعُوْا فَلَہُ اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (۱۶۱)۔ تم اسے جس نام سے بھی پکارو۔ اسماء حسنیٰ سب اس کے لئے ہیں۔

(۲) ندا (پکارنے) کے لئے۔ اِیْہَا النَّاسُ۔ اے لوگو!

## اِیَّا۔ (حرف)

اِیَّا۔ اسمیں تخصیص کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ تنہا نہیں آتا بلکہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے۔ اِیَّاکَ، تَعْبُدُ (۱)۔ ”ہم تیری ہی محکومی اختیار کرتے ہیں۔“ فَارِیْہَا فَاَرُہْبُوْنَ (۱۶۱)۔ ”سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔“ نَحْنُ نَرْزُقْکُمْ وَاِیَّاہُمْ (۱۶۲)۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔“

## آیَان

آیَان (آی + آن) کب - یَسْتَنْلُوْا نَتَكَ عَنِ السَّاعَةِ آیَانِ  
مَرْسَلَهَا (۱۸۷) - یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ انقلاب کی گھڑی کب  
آئیگی؟

## ایوب علیہ السلام

حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے تھے - حضرت یعقوبؑ اور عیسو - عیسو اپنے  
چچا حضرت اسماعیلؑ کے ہاں چلے گئے اور ان کی صاحبزادی سے شادی کر  
لی - ان کی متعدد اولادیں ہوئیں جن میں سے عمالق اور عوض مشہور ہیں -  
عیسو کا عرف، ادوم (سرخ گوں) تھا اس لئے یہ خاندان ادوسی کہلایا -  
بحریت اور خلیج عقبہ کا درمیانی علاقہ ان کا مسکن تھا - تورات میں اس کا نام  
کوہ سعیر آیا ہے - اس کا دارالحکومت رقیم (پٹرا) تھا - حضرت ایوبؑ، عوض  
کے قبیلہ سے متعلق تھے - تورات میں سفر ایوب ان کی طرف منسوب ہے - یوہاب،  
ایوب اور آیوب ایک ہی نام ہے - ان کا زمانہ ۱۰۰۰ اور ۷۰۰ ق - م کے  
درمیان سمجھئے (اگرچہ بعض ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ آپ کا زمانہ حضرت  
موسےؑ سے پہلے کا ہے) - سفر ایوب میں ان کا تفصیلی قصہ مذکور ہے اور  
(تورات کے ہام انداز کے مطابق) اس میں زیب داستان کے لئے بھی بہت کچھ  
بڑھایا چڑھایا گیا ہے - قرآن کریم نے آپ کی زندگی کا صرف ایک واقعہ بیان  
کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ پر ایک زمانہ سخت مصیبت اور  
پریشانی کا گزرا - لیکن آپ نے ان مصائب کو بڑی ہمت اور استقامت سے برداشت  
کیا - تفصیل کے لئے دیکھئے (۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳

لیا ہے\*۔ خدا کی ذات، انسانی ادراک کے احاطہ کے اندر نہیں آسکتی۔ لہذا اسکے متعلق ان ظاہری علامات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ اسلئے یہ کائنات اور اسکی تمام اشیاء آیات اللہ ہیں۔ یہ وہ نشانات راہ ہیں جس سے ہم اُس ”منزل“ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا میں وحی، خدا کی سب سے بڑی نشانی عوتی ہے اسلئے یہ بھی آیات اللہ ہے۔ قرآن کریم کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے پیغام (رسالۃ) کو بھی آیت کہتے ہیں\*\*۔ حتیٰ کہ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ دیکھنے کیلئے کہ تم قانون خداوندی کا احترام کرتے ہو یا نہیں میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس اونٹنی کو کھلا چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اسکی باری پر اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم قانون خداوندی کا پاس رکھتے ہو اور اگر تم نے اسے روکا تو یہ اسکی علامت ہوگی کہ تم اس قانون کا کوئی پاس نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے اس اونٹنی کو آیت کہا گیا۔

هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ (۳۳) ”یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے“۔ اسی طرح حفرت نوحؑ کی کشتی کو بھی آیت ”لِّلْعَالَمِينَ“ (۲۹) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اس غیر سرئی حقیقت کی نشانی تھی کہ جو قوم قانون خداوندی کا اتباع کریگی وہ خطرات سے محفوظ رہیگی۔ مختصراً یہ کہ ہر وہ محسوس شے جو انسان کی توجہ کو خدا اور اس کے قانون کی طرف منعطف کر دے آیت اللہ ہے۔ نیز فکری دلائل بھی آیت اللہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صاحب محیط کے نزدیک معقولات پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتٍ (۱۴) میں انہی فکری دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ان سے انسان فکری طور پر اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ کائنات جامد (Static) نہیں بلکہ متحرک (Dynamic) ہے۔ سورۃ شعراء میں آیت کا لفظ اس عمارت وغیرہ کیلئے استعمال ہوا ہے جسے کسی کی یادگار (Memorial) کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ (۲۱/۱۲۸)۔

آيَاتُ النَّبَاتِ۔ پودوں کے پھول اور خوبصورتی کو کہتے ہیں\*\*۔  
آيَاتُ الشَّمْسِ۔ سورج کی کرنوں کو کہتے ہیں\*\*\*۔

تَآيَاتٍ کے معنی ہیں کسی جگہ ٹھہرنا۔ تَآيَاتٍ لِّمَا لَمَكَانٍ وہ اس جگہ ٹھہرا اور دیر لگا دی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ٹھہر کر غور و فکر کرنا۔ اور (۲) قصد و ارادہ کرنا ہیں۔

\* راغب و تاج و محیط۔ \*\* لین۔ \*\*\* تاج و محیط۔

”ٹھہر کر غور و فکر کرنے“ کی خصوصیت سے آیتؑ کے مفہوم پر بڑی بلیغ روشنی پڑتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں ہر ایک آیتؑ اللہ ہے لیکن یہ اسی کے لئے آیت ثابت ہو سکتی ہیں جو ان پر ٹھہر کر، رک کر، غور و فکر کریگا۔ اس غور و فکر سے اس کی توجہ ان اشیاء کے خالق کی طرف منعطف ہو جائیگی۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیات پر بھی رک کر، غور و فکر سے انسان اصل مقصود کو پا سکتا ہے۔ اگر کسی آیت پر رک کر، غور و فکر نہ کیا جائے تو وہ انسان کو اصل و غایت کا پتہ نشان نہیں دے سکتی۔ یعنی وہ حقیقی معنوں میں ”آیت“ نہیں بنتی۔

# ب

## ب (حرف)

ب - حرف جر ہے - ذیل کی مثالوں سے اس کا استعمال اور مفہوم واضح ہو جائیگا -

(۱) اردو میں کہتے ہیں ”میں نے زید کو پکڑا“ - عربی میں کہیں گے -  
 اَمْسَكْتُ بِيَزِيدٍ - قرآن کریم میں ہے - فَاَمْسَحُوْا اَيْوُجُوتُ هِيَكُمْ  
 (۳۳) ”اپنے چہروں کو (پر) مسح کر لو“ -

(۲) اردو میں کہتے ہیں ”میں زید کے پاس سے گذرا“ - عربی میں کہیں گے -  
 مَرَرْتُ بِزَيْدٍ - قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرَّوْا بِاللَّغَوِی (۲۵)  
 ”جب وہ لغو کے پاس سے گزرتے ہیں“ -

(۳) فعل لازم کو متعدی بنانے کے لئے - مثلاً - ذَهَبَ زَيْدٌ کے معنی  
 ہیں زید گیا - یہ فعل لازم ہے - ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ کے معنی ہوں گے -  
 میں زید کے ساتھ گیا یعنی زید کو لے گیا - اس طرح یہ فعل لازم سے  
 متعدی بن گیا - قرآن کریم میں ہے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورٍ رَّهِمٍ (۲۶)  
 ”اللہ ان کی روشنی کو لے گیا“ -

(۴) سبب کو ظاہر کرتا ہے - مثلاً اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاِتِّخَاذِكُمْ  
 الْيَعْجَلَ (۲۷) - ”تم نے بچھڑے کی پرستش کی وجہ سے اپنے آپ پر  
 ظلم کیا ہے“ -

(۵) ”کے ساتھ“ کے معنوں میں - يَنْتَوَحُّ اَهْبِطُ بِسَلَامٍ مِّنْهَا (۲۸) ”اے  
 نوح! ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اتر جا“ - يٰۤاَعْلَمُ بِالْقَاتَمِ  
 (۲۹) - ”اس نے قلم کے ذریعے سکھایا“ -



(۶) وقت یا جگہ بتانے کے لئے بمعنی فی (میں)۔ مثلاً نَجْتَنِيْهُمْ بِسَحِيْرٍ (۵۳)۔ ”ہم نے انہیں صبح کے وقت بچا لیا“۔ اور وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ يَبَدُّرٍ۔ (۱۳۲) ”یقیناً اللہ نے بدر کے میدان میں تمہاری مدد کی ہے“۔

(۷) ”کسی چیز کے عوض“۔ اِشْتَرَيْتُهُ، يَأْتِيْكَ دُرُّهُمْ۔ میں نے اسے ایک ہزار درہم کے عوض خریدا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲)۔ ”اور انہوں نے اسے (حضرت یوسف کو) تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ ڈالا“۔

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں۔ لَوْ تَسْتَوِيْ بِهِيْمٍ اِلَّا رُضٍ (۲۳)۔ ”اگر (یا اے کاش) ان پر (ان کے اوپر) زمین ہموار کر دی جاتی“۔

(۹) عَنِ (سے) کے معنوں میں۔ فَسْتَقْلُ بِهٖ خَبِيْرًا۔ (۲۵) ”اس کے متعلق اس سے پوچھو جو خبر رکھتا ہے“۔

(۱۰) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ عَيْنُنَا يَشْرَبُ بِهٖمَا عِيْبَا دُ اللّٰهِ (۴۱)۔ ”چشمہ جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں“۔

بعض کا خیال ہے کہ جس طرح مِنْ تبعیض کے لئے آتا ہے۔ اسی طرح ب بھی تبعیض کے لئے آتا ہے۔ تبعیض کے معنی ہیں، کسی چیز کا بعض۔ یعنی کچھ حصہ۔ پورا نہیں، بلکہ اس کا بعض حصہ۔ چنانچہ اُن کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے وَاسْتَحْضُوا بِرُءُوسِكُمْ (۵)۔ تو اس کے معنی ہیں ”سر کے کچھ حصہ کا مسح کر لیا کرو“۔ لیکن یہ صرف بعض کا خیال ہے (معنی اللیب)۔

(۱۱) بعض مقامات پر یہ حرف زائد ہوتا ہے۔ یعنی اس کے معنی کچھ نہیں ہوتے۔ جیسے كَفَّلِيْ بِاللّٰهِ شَهِيدًا (۱۳)۔ ”اللہ کافی شاہد ہے“۔ اگر كَفَّلِيْ اللّٰهُ شَهِيدًا کہیں تو بھی وہی معنی ہونگے۔

(۱۲) میرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) لکھا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ میں ب کے معنی استعانت کے ہیں۔ یعنی مدد طلب کرنے کے۔

(۱۳) بِاللّٰهِ کے معنی ہیں اللہ کی قسم۔ یعنی بِسْمِ اللّٰهِ کے معنوں میں بھی آتی ہے۔

## ب ا ر

اَلْبِشْرُ۔ کنواں۔ اَلْمِثْبَرُ دراصل اس گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر

\* اس کا مجازی مفہوم کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھئے عنوان (س۔ و۔ ی)

جائے\*۔ قرآن کریم میں بِئْسَ مَعْطَلَةٌ آیا ہے (۲۲/۳۵)۔ ”اندھے (بیکار) کنویں“۔

## ب ا س

بِئْسَ - (بُرا) ویسے تو فعل ماضی ہے لیکن اسکی گردان مستعمل نہیں۔ یہ بِئْسَ سے اسی طرح بنا لیا گیا ہے جس طرح نَعِمَ سے نِعْمٌ - یہ دونوں فعل (بِئْسَ اور نِعْمَ) ذم اور مدح کی طرف منتقل کر لئے گئے ہیں اسلئے حروف کے مشابہ ہو گئے ہیں۔ بِئْسَ کے ساتھ بعض اوقات مآ بھی آتا ہے۔ بِئْسَ مآ (۲۴/۲۶)۔\*

أَلْبَاسٌ کے معنی ہیں سخت مصیبت۔ جنگ میں شدت۔ سختی۔ قوت۔

لَا بَأْسَ عَلَیْكَ - یعنی لَا خَوْفَ - بَسْؤُسُ الرَّجُلُ - آدمی بہادر ہو گیا۔ بَئِیسُ الرَّجُلُ - بَسْؤَسًا - آدمی سخت ضرورت مند ہو گیا۔ أَلْبَاسًا سَاءَ شِدَّت - عَذَابٌ بَئِیسٌ - سخت عذاب۔ وہ عذاب جس میں معیشت کی تنگی شامل ہو۔ أَلْبَاسًا سَاءَ کے معنی بھوک کے بھی ہوتے ہیں۔\* صاحب محیط نے کہا ہے کہ أَلْبَاسًا سَاءَ مال و دولت کے نقصان کو کہتے ہیں اور الْقَضَرَاءُ جسمانی نقصان کو۔ مثلاً بیماری۔\*\*

أَلْمُبْتَلِیْسُ - غمگین و حزین کو کہتے ہیں\* قرآن کریم میں بَأْسًا شَدِیدًا بمقابلہ أَجْرًا حَسَنًا آیا ہے (۱۸/۱۸)۔ یہاں اسکے معنی غلط اعمال کے ناخوشگوار نتائج ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے فَجَاءَهُمَ بَأْسُنَا (۲۱/۲۱)۔ ”جب اس بستی پر ہمارا عذاب آیا“۔ یعنی قانون مکافات کی رو سے سخت مصیبت آ گئی جو ان کی بد اعمالیوں کا نتیجہ تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ان طاقتور جنگجو قسم کے لوگوں کے لئے ”اولیٰ“ بَأْسٍ (۱۶/۱۶) آیا ہے جو سخت مصیبتیں لاتے تھے۔ سورۃ حدید میں فولاد کے متعلق ہے فِیْہِ بَأْسٌ شَدِیدٌ (۲۵/۲۵)۔ ”اسمیں بڑی سختی ہے“۔

أَبْنِیَاسٌ کے معنی ہیں برا ماننا۔ غمگین ہونا۔ سورۃ ہود میں حضرت نوحؑ سے کہا گیا ہے کہ فَالَا تَبْتَیْسُ بِمَا کَانُوا یَفْعَلُونَ (۱۱/۱۱)۔ ”یہ مخالفین جو کچھ کرتے ہیں اسکی وجہ سے تو غمناک نہ ہو“۔ یا ان کے متعلق دل گرفتہ نہ ہو (کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ ان کے اعمال ہی ایسے ہیں)۔

## ب ا بِل

قدیم کلدانی تہذیب کا مرکز، شہر بابل۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر سحر و کھانت کے آن افسانوں کے ضمن میں کیا ہے جنہیں یہودی لٹریچر میں حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور جن کی تردید قرآن نے کی ہے۔  
 ”وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْكَ إِلَّا الْحَقُّ بَيِّنَاتٍ هَارُوتَ وَ مَارُوتَ“ (۲۰:۸۰)۔  
 ”اور بابل میں ہاروت و ماروت (مزعومہ) فرشتوں پر بھی کوئی ایسی بات نازل نہیں کی گئی تھی“۔ یہ سب ان شیاطین (شریر لوگوں) کے خود ساختہ افسانے تھے۔

## ب ت ر

آلَبَتْر۔ کسی چیز کو اسکی تکمیل سے پہلے ہی کاٹ ڈالنا۔ (ابن فارس)  
 ”دم کو جڑ سے کاٹ دینا۔ سَیْفٌ بَاتِرٌ۔ کاٹ ڈالنے والی تلوار۔ آلا بَتْرٌ۔ نامراد۔ فقیر جسکے پاس کچھ نہ ہو۔ بے اولاد۔ جسکی نسل کی جڑ کاٹ جائے۔ وہ جسکی موت کے بعد اس کا نام و نشان اور ذکر خیر تک باقی نہ رہے۔“  
 قرآن کریم میں ہے ”إِنَّ شَانِئَكَ عِوَاذًا بَتْرٌ“ (۱۱۰:۱۱)۔ ”تیرے مخالف کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کہیں ذکر خیر نہیں ہوگا۔“  
 ”نام و نشان باقی نہ رہنے“ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی وہ قوت و شوکت جس کی بنا پر وہ اسقدر مخالفت کرتے ہیں سب ختم ہو جائیگی اور انہیں زندگی کے خیر و برکت سے کوئی حصہ نہیں ملیگا۔

## ب ت ک

بَتَكٌ کے بنیادی معنی کاٹنے کے ہیں، نیز کسی کے بال یا پر وغیرہ پکڑ کر اپنی طرف اس طرح کھینچنا کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں۔ چنانچہ اَلْبَتَكَةُ ان اکھڑے ہوئے پروں یا بالوں کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے بَتَكٌ کے معنی ہونگے جڑ سے اکھڑ دینا، لیکن اسکے عرفی معنی ہیں جانوروں کے کان کاٹ کر یا چیر کر (انہیں بتوں کے نام پر) چھوڑ دینا۔ یہ جاہلیت عرب کا رواج تھا \*۔  
 سورہ نساء میں ہے ”فَلْيُبَيِّنْ لَكُمْ آذَانَ الْغَنَامِ“ (۲:۱۶) ”سو وہ جانوروں کے کان چیریں گے۔“

السَّيْفُ الْبَاتِكُ۔ کاٹنے والی تلوار کو کہتے ہیں \* ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کاٹنے کے لکھے ہیں۔

## ب ت ل

بَتَّلَهُ\*۔ يَبْتُلُهُ\*۔ اس نے اسے قطع کر دیا۔ فَأَنْبَتُلَ\*۔ چنانچہ وہ جدا ہو گیا۔ تَبَتَّلَ\*۔ کے بھی یہی معنی ہیں۔ اَلْبَتُّوْلُ\*۔ مردوں سے، یا از دواجی زندگی سے دور رہنے والی عورت۔ اَلْمُبْتَلَّةُ\*۔ حسین عورت۔ وہ عورت جس کے تمام اعضاء سٹے ہوئے ہوں۔ تَبَتَّلَتِ الْمَرْأَةُ\*۔ عورت نے اپنا بناؤ سنگھار کر لیا۔ اَلْمُبْتَلِ\*۔ منفرد۔ اَلْبَتُّلُ\*۔ حق\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اس کے ماسوا سے الگ کر لینے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً (۳۸)۔ ”سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جا“۔ صرف اس کے نظام کے قیام کی کوششوں میں لگ جا۔ کیونکہ اَنْبَتُلَ فِي سَيِّرِهِ\* کے معنی ہیں وہ کوشش کر کے تیز چلا\*۔

رسول اللہ\* کو جب نظام خداوندی کے اصول عطا کر دئے گئے تو آپ کو حکم ہوا کہ اب اپنے مخلص رفقاء کو ایک جماعت کی شکل دے کر (دیکھئے عنوان۔ ز۔ م۔ ل) اس نظام کی تشکیل میں مصروف عملی ہو جائیں۔ ایسا کرنے میں ان مخالفین کی باتوں پر قطعاً دھیان نہ دھریں۔ قُلْ اِنَّ اِلَهَكُمْ اِلَهٌ وَاحِدٌ (۱۶۳)۔ ”کہو۔ اللہ۔ اور ان مخالفین کو چھوڑ کر (.....) اپنے پروگرام کی تکمیل میں لگ جاؤ“۔

جب انسان اپنا نصب العین متعین کر لے تو اس کے بعد این و آن کے خیال کو چھوڑ کر\* اس نصب العین کو سامنے رکھ کر، ہر قدم اس کی طرف اٹھانا چاہئے۔ اور یہ سب کچھ حسن کارانہ انداز سے کرنا چاہئے کیونکہ تَبَتَّلَ\* میں زیبائش و آرائش کا مفہوم بھی ہے\*۔

## ب ث ث

بَثَّ\* کے معنی ہیں کسی چیز کو منتشر اور پراگندہ کر دینا۔ اس سے پھیلا دینے کے بھی معنی آ گئے۔ اور بڑھا دینے (بکثرت پیدا کر دینے) کے بھی\*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی ایجاد کرنا اور پیدا کرنا ہیں۔ راغب نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے

اور لکھا ہے کہ بَثَّ کے معنی کسی چھپی ہوئی چیز کے ظاہر کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سے مراد ایسی چیزوں کو نمودار کر دینا ہے جو پہلے موجود نہ تھیں\*\*\*۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ظاہر کر دینا اور منتشر کر دینا ہیں۔

بَثَّ الْغُبَارَ - غبار اڑانا - بَثَّتْكَ الشَّيْرُ - میں نے تجھ پر راز ظاہر کر دیا - أَبْثَّتْكَ - میں نے تجھ پر اپنا غم ظاہر کر دیا\* - اسی سے الْبَثَّ سخت ترین غم کو کہتے ہیں جو چھپا نہ رہ سکے\* - سورة بقرہ میں ہے - وَبَثَّ فِيهِمَا مِثْرَ كَيْلٍ كَذَّابَةٌ (۱۶۳) - ”خدا نے زمین میں ہر قسم کے حرکت کرنے والے جان داروں کو پھیلا دیا - بکثرت پیدا کر دیا“ سورة القارعة میں ہے - كَالْفَرَّاشِ الَّتِي تَبْثُوثُ (۱۶۱) - ”بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح“ - سورة واقعہ میں هَبَاءٌ مُنَبِّئًا (۵۱) آیا ہے - یعنی فضا میں منتشر ذرات - سورة يوسف میں بَثِّي وَحُزِّي اِكْثَمَا آیا ہے (۸۶) - اس سے ظاہر ہے کہ بَثَّ، حزن سے الگ اور شدید غم کا نام ہے - ایسا غم جو چھپائے چھپ نہ سکے -

## ب ج س

بَجَسَ الْمَاءُ - پانی کا کسی چیز کو شق کر دینا اور اس میں سے پھوٹ کر بہہ نکلنا - مَاءٌ بَجَسَ - اس طرح پھوٹ کر بہہ نکلنے والا پانی\* - قرآن کریم میں ہے فَاتَّبَعْنَاهُ مِنْهُ..... (۱۶۰) ”اس میں سے پانی کے چشمے پھوٹ بہے“ - سورة بقرہ میں اِیۡسَیۡ فَاتَّبَعْنَاهُ مِنْهُ..... (۱۶۰) ”اس میں سے پانی (۱۶۰) - راغب نے کہا ہے کہ اِتَّبَعْنَاهُ وہاں بولا جاتا ہے جہاں پانی کسی تنگ چیز میں سے نکل رہا ہو اور اِتَّبَعْنَاهُ عام ہے\*\*\* - لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قرآن کریم نے دونوں الفاظ ہم معنی استعمال کئے ہیں -

## ب ح ث

الْبَحِثُ - مٹی میں کسی چیز کو تلاش کرنا - یا مٹی کو پھینکا - ابن فارس کے نزدیک یہی اس کے بنیادی معنی ہیں - اَلْبَحَاثَةُ - کرید کر نکالی ہوئی مٹی - اَلْبَحْوُثُ - وہ اونٹ جو دوڑتا ہوا اپنے پاؤں سے مٹی پیچھے کی طرف

”اڑاتا جائے“ \* - ”اَلْبَحْثُ“ - کان جس میں سونا چاندی تلاش کیا جائے \*\* -  
سورۃ مائدہ میں ہے ”غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْاَرْضِ“ (۵۱) - ”ایک کوا“  
زمین کو کرید رہا تھا“ - ”اَلْبَحِيْثُ“ راز کو کہتے ہیں \* -

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں بَاء اور حَاء ساتھ  
آئیں ان میں تفتیش کا مفہوم مضمر ہوتا ہے - یعنی ایک چیز سے دوسری  
چیز نکالنا -

## ب ح ر

”اَلْبَحْرُ“ - وسیع پیمانے پر شق کرنے - بھاڑنے یا چیرنے کو کہتے ہیں -  
چنانچہ دریا یا سمندر کو بھی اسی لئے ”بَحْرُ“ کہتے ہیں کہ وہ زمین میں کھدا  
ہوا ہوتا ہے - کان کے چیرنے کو بھی ”بَحْرُ“ کہتے ہیں - چنانچہ وہ اونٹنی یا  
بکری جو دس بجے جن چکتی تھی اسکا کان چیر کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیا  
کرتے تھے - ایسے ”بَحِيْرَة“ کہتے تھے \* - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے  
کہ جن الفاظ میں باء اور حاء ایک ساتھ ہوں ان میں تفتیش کا مفہوم مضمر ہوتا  
ہے - یعنی ایک چیز سے دوسری چیز نکالنا - ابن فارس نے (خلیل کے  
حوالے سے) کہا ہے کہ ”بَحْرُ“ کو بحر اس کی وسعت کی بناء پر کہتے ہیں -  
دریا، جسکا پانی مسلسل بہتا رہے، ”بَحْرُ“ کہلاتا ہے - (جیسے دجلہ  
یا نیل) - اور سمندر کو ”بَحْرُ“ کہتے ہیں - کتاب الاشتقاق میں ہے کہ  
کثیر پانی (خواہ میٹھا ہو خواہ کڑوا) ”بَحْرُ“ کہلاتا ہے - ”بَحْرُ“ دراصل اس  
جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو - نیز ”بَحْرُ“ اس زمین کو کہتے  
ہیں جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہو - نیز شہروں کو بالخصوص ان شہروں کو جو  
پانی کے کنارے آباد ہوں \*\*\* - ”ظَهْرًا لِّبَسَادٍ فِي الْبَرِّ“ و ”اَلْبَحْرُ“ (۳۶) کے  
یہ معنی بھی ہیں کہ شہری آبادیوں اور بادیدہ نشینوں، سب کے معاشرہ میں  
ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں - اور یہ بھی کہ دنیا کے خشک و تر میں خرابیاں  
پیدا ہو چکی تھیں - خشکی اور تری (سمندر اور خشک زمین) کے معنوں میں یہ  
الفاظ (۱۴) میں آئے ہیں - (نیز دیکھئے عنوان ی - م - م، کیونکہ حضرت موسیٰؑ  
کے دریا پار کرنے اور فرعون کے غرق ہونے کے لئے ”بَحْرُ“ اور ”يَمُّ“  
دونوں الفاظ آئے ہیں مَعًا: ۲۸۰)

قرآن کریم نے ”صَيْدُ“ اَلْبَحْرِ وَطَعَامُهُ“ (۹۶) ”سمندر کے شکار“ کو  
حلال قرار دیا ہے - یعنی ایسے بھی جسے تم خود پکڑو - اور وہ بھی جسے پانی

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* تاج ولین

خود بخود باعر اچھال دے۔ یا جو پانی کے پیچھے ہٹ جائے سے خشکی پر رہ جائے (دیکھئے عنوان ط۔ ع۔ م)۔

## ب خ س

آلْبَخْسٌ \* کم کرنا۔ ظلم کرنا \*۔ (حقوق میں کمی کرنے کا نام ظَلَمٌ ہے) اسی لئے ابن السکیت نے کہا ہے کہ بَخْسٌ کے معنی حق سے کم دینا یا حق میں کمی کرنا ہیں \*۔ آلباخیس \* تھوڑی سی ناقص چیز \*۔ آلبَخْسٌ \* چونگی یا محصول جو والی ملک وصول کرتا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نقص اور کمی کے ہوتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا يَبْخَسْ مِثْلَهُ شَيْئًا (۲۸۲)۔ ”اور اس میں ذرا بھی کمی نہ کرے“۔ سورۃ جن میں ہے فَلَا يَخْأَفُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا (۹۴)۔ ”اسے نہ اس کا خوف ہوگا کہ اس کے حقوق میں کمی ہوگی اور نہ ظلم و زیادتی کا ڈر“۔ سورۃ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲)۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں ”اسے تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ دیا، لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ظلم و زیادتی سے اسے فروخت کر دیا، کیونکہ انسان کا بیچنا ممنوع ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں بَاء اور خَاء اکٹھے آئیں ان کا مفہوم آنکھ کو پھوڑ دینا یا اسی قسم کی کوئی اور بات کرنا ہوتا ہے۔ اس سے ظلم اور زیادتی کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔

## ب خ ع

آلْبِخَاعٌ \* گردن کی ایک رگ کا نام ہے جو گدی کے اندر ہوتی ہے۔ بَخْعٌ بِالشَّاقَةِ کے معنی ہیں اس نے بکری کو اس زور سے ذبح کیا کہ اس کی بَخْعٌ تک کاٹ ڈالی۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ عربی لغت کیلئے استعمال ہونے لگا۔

بَخْعٌ نَفْسَهُ بَبَخْعٍ \* خود کو غم یا غصہ سے مار ڈالنا۔ بَخْعٌ آلا رَضٍ بِالْإِزْرَاعَةِ \* وہ زمین میں مسلسل کھیتی کرتا رہا جس سے زمین کی ماری قوت ختم ہو گئی \*۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے لَعَلَّكَ بَارِخٌ نَفْسَكَ عَلَى الْإِثَارِ هِيمٌ (۱۸)۔ ”تو اس غم میں (کہ یہ لوگ ایمان

کیوں نہیں لائے) اپنے آپ کو ہلاک کر لیگا۔“ - غور کیجئے کہ ایک داعی الی الحق، طبیب، مشفق کی طرح کس قدر غمگسار اور بھی خواہ ہوتا ہے۔

## ب خ ل

الْبُخْلُ\* - اپنی حاصل کردہ چیزوں کو ان مواقع سے روکنا جہاں سے انہیں روکنا نہیں چاہیے\* راغب نے لکھا ہے کہ بخل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اپنی جمع جوڑ کے ساتھ بخل کرے۔ یعنی انہیں خرچ کی ضرورت پر روکے رکھے۔ اور دوسری قسم یہ کہ انسان دوسرے کی جمع جوڑ کو ضرورت پر خرچ ہونے نہ دیکھ سکے۔ اور یہ زیادہ قابل مذمت ہے۔ مؤخر الذکر کیلئے دیکھیں آیت ۳۴:۳۰\* صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بَخْلُ\*

اشیاء کے روک لینے کو کہتے ہیں اور شُحُّ اس جذبہ کو کہتے ہیں جس کے ماتحت انسان ایسا کرتا ہے\*\*\*۔ (یعنی شُحُّ میں حرص اور بخل دونوں جذبے ہوتے ہیں)۔

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِينَ يَبْخُلُونَ اَوْيَتًا مَّرُوءًا النَّاسَ بِاَلْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا اٰتٰهُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ..... (۳۴:۳۰)۔ ”وہ لوگ جو (رزق کو) روک رکھتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے ہیں کہ وہ (سامانِ زیست کو) روک کر رکھ لیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہوتا ہے اسے چھپاتے ہیں۔“ قرآن کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائی کرے۔ پھر اس میں سے صرف اپنی ضروریات کیلئے لے اور باقی سب کچھ نوعِ انسانی کی ربوبیت کیلئے کھلا رکھ دے۔ (دیکھئے عنوان - ن - ف - ق) بَخْلُ\* اس تعلیم کی عین ضد ہے جس میں انسان سب کچھ اپنے لئے روک رکھتا ہے اور دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا نہیں۔ اس طرح وہ معاشرہ کی ہمواریوں اور خوشگوار یوں کی عملاً تکذیب کرتا ہے (۱۲۹:۱)۔ قرآن کریم اِنْتِفَاق\* کی تاکید اور بَخْلُ\* کی مذمت کو مختلف انداز میں پیش کرتا ہے۔ اپنی محنت کی کمائی کو، خدا کے قانون کے مطابق، نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھنا اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ یہی تَقْوٰی ہے (۱۲۸:۱)۔ اسی سے دنیا کی مشکلات حل ہوتی ہیں اور اسی سے انسان کی مستقبل کی زندگی (آخرت) سنورتی ہے۔ قرآن کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو قوم بَخْلُ\* کی روش اختیار کر لیتی ہے اُسے بساطِ زندگی سے الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم آجاتی ہے جو اس قوم جیسی نہیں ہوتی (۳۸:۴)۔



اس لئے کہ خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ مَآیَتُنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُكِّثُ فِيهِ لَازِلًا (۱۳)۔ ”دنیا میں بقاء اسی کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہے“ جو (نظام یا طریق زندگی) محض ایک فرد، ایک گروہ، یا ایک قوم کے مفاد کے لئے ہے (پوری انسانیت کے مفاد کے لئے نہیں) اسے بقاء اور دوام نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب کسی شے کی منفعت بخشی کو عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہونے کی بجائے اس طرح روک دیا جائے تو یہ بخل ہو جائیگا جس کا نتیجہ تباہی ہے، افراد کی صورت میں بھی اور اقوام کے لئے بھی۔

## ب د ا

بَدَأَ بِہ - بَدَأَ "وَابْتَدَأَ" - کسی چیز کے ساتھ شروع کرنا - بَدَأَ الشَّيْءُ - اس چیز کو شروع کر دیا - اس نے پہل کی، فُلَانٌ مَّا يَبْدِي "وَمَا يُعْيِدُ" - فلان آدمی نہ از خود کوئی بات کرتا ہے - (Initiate) کرتا ہے اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتا ہے - اَلْبَدِي "سردار اول - بَدَأَ مِنْ أَرْضِهِ إِلَى الْآخِرَى - اپنی زمین سے دوسری زمین کی طرف نکل کھڑا ہوا - اپنا ملک چھوڑ گیا \* - اَلْبَدْعُ - اَلْبَدْعُ "اَلْبَدْعُ" - کسی چیز کو اس کے غیر (ماسوا) پر مقدم کرنا \* - بَادِي "الْقَرَّاءِ" وہ رائے جو ابتداء قائم کر لی جائے - یا بَادِي "الْقَرَّاءِ" - وہ رائے جو بالکل ظاہر ہو \* - (نیز دیکھئے عنوان - ب - د - و)

قرآن کریم میں ہے "وَعَمَّ بَدْعٌ وَكُمُ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۳)۔" "انہوں نے ہی پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ ابتداء کی ہے" - پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے - تخلیق کائنات کے سلسلہ میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اِنَّہٗ يَبْدَعُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعْيِدُہُ (۱۴) - "وہی مخلوق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اسے گردش دیتا ہے" - یہ ظاہر ہے کہ ہر شے کی تخلیقی ابتداء اس کے نقطہ آغاز سے ہوتی ہے - پھر وہ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے - اس کا نقطہ آغاز بھی خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور پھر اس کی مختلف گردشیں اور گردشوں کے بعد تکمیل بھی اسی کی رو سے ہوتی ہے (نیز دیکھئے عنوانات (ف - ط - ر) ; (ب - د - ع) اور (ع - و - د))۔

\* تاج - \*\* راغب -

سورة سبا میں ہے قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبَدِّلُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۹)۔ ”ان سے کہہ دو کہ خدا کا اٹل تعمیری قانون آ گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں تخریبی پروگرام ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس لئے کہ تخریبی قانون میں یہ قوت ہی نہیں کہ کسی اسکیم کی ابتدا کر سکے اور پھر اسے پلٹ کر اور لوٹا کر تکمیل تک لے جائے۔“ باطل کوئی نتیجہ خیز بات کر ہی نہیں سکتا۔

سورة هود میں بَدَايَ الْاَرَايَ آیا ہے۔ (۱۱) اس کے لئے دیکھئے عنوان (ب - د - و)۔

## ب د ر

بَدَا رَهْ - مُبَادَرَةٌ - بیدار آ - اس کام کے لئے جلدی کرنا جو خود کو اچھا لگے۔ \* سورة نساء میں ہے لَمَسْرًا فَاَوْبَدَا رَا (۲)۔ ”فضول خرچی اور عجلت کرتے ہوئے۔ جلدی جلدی“۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنی بھر جانے اور بھرپور ہو جانے کے ہیں۔ عجلت میں بھی چونکہ انسان اپنی پوری پوری قوت صرف کر دیتا ہے اس لئے اسے مُبَادَرَةٌ کہتے ہیں۔ \* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) کسی چیز کا کامل اور بھرا ہوا ہونا۔ اور (۲) کسی چیز کی طرف جلدی سے جانا۔

اَلْبَدْرُ - بھرا ہوا (پورا چاند) بھر پور جوان۔ نیز بَدْرٌ - مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ \* اس مقام پر مخالفین سے جنگ ہوئی تھی (۱۳۳)۔ راعب کے نزدیک اس مادہ کی اصل ہی اَلْبَدْرُ (پورا چاند ہے)۔ \*\* نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور دال ساتھ آئیں ان میں کسی کام کی ابتداء یا ظہور (ظاہر ہونے) کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ بَدْرٌ اَلَيْسَ بِسَكَنٍ کے معنی ہیں اس نے اس کے لئے فلاں بات کو ظاہر کر دیا۔ \*\*\* اس سے اَلْبَدْرُ کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ظہور کامل۔

## ب د ع

اَلْبِدْعُ - وہ کام جو پہلے پہل ہوا ہو اور اس سے پہلے اسکی مثال موجود نہ ہو (ابن فارس)۔ اَلْبَدْرُ - وہ نئی رسی جسے پہلی بار نئے ریشہ سے بٹا گیا ہو۔ رِکْبَةُ بَدْرٍ عَسَہُ نِیْلَا کہو دا ہوا کنواں۔ \* نواب صدیق

حسن حال نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء کے ساتھ دال آئے ان میں ابتداء اور ظہور کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ "لَا بُدَّاع" کے معنی ہیں کسی چیز کو بغیر کسی کی تقلید کے از خود پیدا کرنا۔ اور جب یہ لفظ خدا کیلئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے ایجاد کرنا۔ "بَدْرَبِعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ" (۱۱۷) کا یہی مفہوم ہے۔ \*\* اس کے معنی (Originator) کے ہیں۔

کائنات کو عدم سے وجود میں لانا تو صرف خدا کیلئے ہے، لیکن اس کائنات میں نئی نئی چیزیں دریافت کرنا اور ایجاد کرنا انسان میں صفت خداوندی کا منعکس ہونا ہے اور وجہ شرف انسانیت۔ اس شرط کے ساتھ کہ ان ایجادات کو قانون خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی تعمیر میں صرف کیا جائے، نہ کہ تخریب کے لئے۔ لیکن یہ ایجادات طبعی دنیا کے اندر ہونگی۔ خدا کے قوانین جو نوع انسانی کی راہنمائی کیلئے (قرآن کے اندر) ہیں ان میں کسی نئے قانون کو شامل نہیں کیا جائیگا۔ اس لئے کہ یہ قوانین عقل کی رو سے وضع نہیں کئے جاسکتے، صرف وحی کی رو سے مل سکتے ہیں۔ اور وحی، قرآن کریم کے اندر پہنچ کر مکمل ہو چکی ہے۔ دین میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رہبانیت کو بدعت کہہ کر اس کی مذمت کی ہے (۲۷)۔ البتہ دین کے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کئے جاسکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (۲۶) "آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں، میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی رسول آئے رہے ہیں۔"

## ب د ل

بَدَلٌ - بَدَلٌ - بَدْرَبِلٌ - جو چیز کسی دوسری چیز کی قائم مقام بن جائے۔ جو کسی کا عوض یا بدل بن جائے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ أَبْدَلْتُ الْخَتَامَ بِالْحَقِيقَةِ کے معنی ہیں میں نے انگھوٹھی کو اتار کر اس کی جگہ چھلا پہن لیا۔ اور بَدَلْتُ الْخَتَامَ بِالْحَقِيقَةِ کے معنی ہیں میں نے انگھوٹھی کو پگھلا کر اس کا چھلا بنوالیا۔ یعنی تَبَدُّلٌ تو یہ ہے

کہ ایک صورت سے دوسری صورت بدل دی جائے۔ جوہر (Substance) وہی باقی رہے۔ اور ابدال کے معنی ہیں ایک جوہر کو چھوڑ کر دوسرا جوہر اختیار کر لینا۔ متبادلتہ کے معنی ہیں جیسی چیز اس سے لی اسکی مثل اسے دی۔ تبدل کے معنی ہیں متغیر ہو گیا۔ بدل گیا۔ نیز تبدلتہ و تبدل بہ کے معنی ہیں اسے کسی چیز کی جگہ لے لیا، بدل لیا، تبدل لے کر تحریف کو بھی کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں بدل (۱/۸) بدل (معاوضہ) کے معنی میں آیا ہے۔ اور بدل (۱/۹) ایک چیز کی جگہ دوسری چیز تبدیل کر لینے کے لئے۔ سورہ روم میں ہے لَا تَبْدِلْ لِي خَلْقِ اللَّهِ (۳۰/۲۷)۔ ”خدا کا عمل تخلیق کبھی نہیں بدلتا“۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۲۷/۲۷)۔ ”قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں“۔ یعنی نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کی جگہ کوئی اور قوانین لے سکتے ہیں۔ سورہ تحریم میں ہے اِنْ طَلَّقْتُمْ اَنْ يَّشْبَدِلْتُمْ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ (۲/۲۷)۔ ”..... اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو خدا اسے تم سے بہتر بیویاں بدل کر دیدے“۔ سورہ احزاب میں ہے وَلَا اَنْ تَبْدِلْ يٰهَيْهِنَ (۳۳/۳۳)۔ ”نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں لے لے“۔ سورہ نساء میں ہے اَسْتَبْدِلْ زَوْجًا مِّمَّا كُنْتَ زَوْجًا (۴/۴)۔ ”ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کی تبدیلی چاہنا“۔ استبدال قومی کے لئے دیکھئے (۳۸/۳۸)۔

## ب د ن

اَلْبَدَنُ - جسم - سوائے سر اور ہاتھ پاؤں کے - لیکن ازہری نے کہا ہے کہ یہ لفظ تمام جسم کیلئے بولا جاتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ بدن جسم کو جسے کہتے ہیں اور جسے رنگ کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی خود کسی چیز کے ہیں۔ اسکی اطراف کے نہیں۔ قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے کہ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ (۱۰۸/۱۰)۔ ”آج ہم تیرے بدن (لاش) کو محفوظ کر دینگے“۔ مصر میں رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کی لاشوں کو مومی بنا کر محفوظ کر لیتے تھے چنانچہ فرعون مصر کے قدیم مقبروں سے اس قسم کی مومی شدہ لاشیں بہت سی برآمد ہوئی ہیں۔ جس فرعون نے حضرت موسیٰ کا پیچھا کیا تھا وہ پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ اسلئے اسطرف خیال جاتا تھا کہ



## ب ذ ر

بَذَرْتَهُ بَذْرًا : میں نے اسے بکھیرا، متفرق کیا، خراب کیا۔ التَّبَذْرُ۔  
اس غلہ کو کہتے ہیں جو بیج ڈالنے کیلئے الگ رکھ لیا گیا ہو۔  
اس سے اسکے معنی کھیتی کرنے کے آنے ہیں۔ نیز کھیتی یا سبزی کا  
وہ پودا جو شروع شروع میں زمین سے نکلتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے  
لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور ذال اکھٹے آئیں ان کا مشہوم کسی چیز کو  
نکال دینا ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بکھیرنے اور  
متفرق کر دینے کے ہیں۔

اپنی اصل کے اعتبار سے تَبَذِيرٌ کے معنی ہونگے اس غلہ کو بھی  
خرچ کر لینا جو بیج کے لئے رکھا ہو۔ مجازاً مال ضائع کر دینے کے لئے بھی یہ  
لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلئے کہ تَبَذِيرٌ متفرق کر دینے یا بکھیر دینے کو  
بھی کہتے ہیں \*

قرآن کریم میں ہے لَا تَبْذِرُوا رُبَّ بَذْرٍ اِنَّمَا تُبْذِرُ رَيْنًا كَانُورًا  
اَلْخَوَانُ الشَّيْطَانِيْنَ (۲۱:۳۴) ”تم مال کو بے جا صرف مت کرو۔ اس طرح  
مال کو ضائع کرنے والے لوگ شیاطین کے بھائی ہیں۔“

## ب ر ا

بَرَّأٌ - اسکے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ان چیزوں سے الگ ہو جانا  
جو اسکی غیر ہوں۔ بَرَّاءٌ - وہ اس سے الگ اور جدا ہو گیا۔ تَبَرَّأْنَا -  
ہم سب جدا ہو گئے۔ بَرَّيْنَا لَمَرِّبُضٍّ مِّنْ مَّرْضِهِمْ - مریض شفا یاب  
ہو گیا۔ یعنی اسکا مرض اس سے الگ ہو گیا۔ اَنَا بَرَّاءٌ مِّنْهُ - میں اس  
سے بری ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں ہے  
اِذْ تَبَرَّأْنَا لِلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا مِّنَ الْاٰتِذِيْنَ اَتَّبَعُوْا (۱۶۹)۔ ”جب لیڈراہنے  
پیچھے چلنے والوں سے بیزار اور الگ ہو جائیں گے۔“

سورۃ توبہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ بَرَاءَةٌ مِّنْ اَللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ  
(۱)۔ ”یہہ اللہ اور اسکے رسول (قرآنی نظام کے مرکز) کی طرف سے اس امر  
کا اعلان ہے کہ ہم ان مشرکین مکہ سے بالکل الگ ہیں جن کے ساتھ معاہدہ  
کیا گیا تھا،۔ ان کے ساتھ اب ہمارا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ یہی  
معنی (۱) میں ہیں۔

خدا کو اَلْبَارِیٰؑ کہا گیا ہے (۵۹/۲۶)۔ اس میں درحقیقت تخلیق اشیاء کے تین مراحل میں سے ایک مرحلہ کا ذکر ہے۔ یعنی اَلْخَالِقُ اَلْبَارِیٰؑ اَلْمُصَوِّرُؑ (۵۹/۲۶)۔ کائنات میں تمام عناصر باہمی ملے جلے رہتے ہیں۔ اللہ کے سامنے جب کسی نئی چیز کی پیدائش کی تدبیر (اسکیم) ہوتی ہے تو وہ مختلف عناصر کو ایک نئی ترتیب دیتا ہے۔ یہ خَلْقُؑ ہے (دیکھئے عنوان خ۔ ل۔ ق)۔ پھر انہیں باقی عناصر سے الگ کرتا ہے۔ یہ بَرَأَۃُؑ ہے۔ اور اسکے بعد انہیں ایک متعین شکل (Form) عطا کر دیتا ہے۔ یہ مُصَوِّرُ رِیَّتِؑ ہے۔ (دیکھئے عنوان ص۔ و۔ ر)۔ اس اعتبار سے وہ خالق اور باری اور مصور کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسی نہج سے مخلوق کو اَلْبَرِیْقَةُؑ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے اُولَیِّئَکَ هُمْ شَرُّ اَلْبَرِیْقَةِ (۹۸/۱)۔ (بَرِیْقَةُؑ کی اصل بَرِیْؑ ہے۔ اور یہ اَلْبَرِیٰؑ سے ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں)۔

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راہ اکٹھے آئیں ان کا مفہوم ”ظاہر ہونا، ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی حادثہ کے واقع کرنے (رونما کرنے) کیلئے بھی بَرِیْقَةُؑ آتا ہے (۵۹/۲۶)۔ مُبَرَّءُؑ کے معنی ہیں بَرِیْؑ اَلذِّمَّةُؑ (پاک) (۲۴/۲۶)۔ اَبْرَأُؑ کے معنی ہیں کسی سے مرض دور کر دینا (۳۸/۳۸)۔

## ب ر ج

”بَرْجٌ“۔ جمع بُرُوجٌ۔ کسی محل کے چاروں طرف جو محفوظ کوٹھڑیاں بنا دی جاتی ہیں انہیں بُرُوجٌؑ کہا جاتا ہے۔ جو کوٹھڑیاں شہر پناہ یا قلعہ کی دیوار پر بنائی جاتی ہیں انہیں بھی بُرُوجٌؑ کہتے ہیں۔ نیز اسکے معنی قلعہ کے بھی ہوتے ہیں\*۔ چنانچہ (۲۸/۲۸) میں اسکے یہی معنی ہیں۔ دراصل، ج۔ ب۔ ر اپنی تمام تراکیب میں شدت اور قوت پر دلالت کرتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ظاہر ہونا اور جائے پناہ کے ہیں۔

سورة احزاب میں ہے وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُولٰٓئِ (۳۳/۳۳)۔ ”اپنے گھروں میں سنجیدگی سے رہو اور سابقہ جاہلیت کے طریق پر اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو“۔ اور سورة نور میں ہے غَیْرَ مُتَّبَرِّجَاتٍ بِزَیْنَتٍ (۲۴/۲۴)۔ ”اپنی زینت کو نمایاں نہ کرنے والیاں“

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ تَبْرَجَ کے معنی ہیں عورت نے اپنی زینت اور محاسن کو مردوں کے سامنے ظاہر کیا، اس طرح کہ اسکی آنکھوں میں شوخی جھلک رہی تھی۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راہ ساتھ آئیں ان میں اظہار کا مفہوم مضمر ہوتا ہے، جیسے بَرَجَ۔ ظاہر ہو گیا۔ اسی سے تَبْرَجَ ہے۔ \*\* ابواسحق نے کہا کہ \* تَبْرَجَ اس اظہار زینت کو کہتے ہیں جو مردانہ شہوت کی انگیزت کا ذریعہ بن جائے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ التَّبْرَجُ شُكُّ مَشْكٍ كَرَجْلَةٍ كَوَكْتَةٍ هِيَ اَوَّلُ التَّبْرَجِ خوبصورت اور حسین چہرے والے کو کہتے ہیں۔ اور اَلَا بَرَجَ حسین آنکھوں والے کو \*\*\*\*۔ اَلْبَرَجُ آنکھ کا کشادہ اور حسین ہونا \*\*\*۔ لسان میں دونوں ابرؤں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو بَرَج بتایا ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ عورت کے تَبْرَجَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے محل سے باہر نکل آئی۔ چنانچہ اس سے پہلے جو آیا ہے وَقَرْنِيْ بِئِيَّوْ تَكُنَّ اس نے بھی ان معانی کی تائید کر دی ہے \*\*\*۔

لیکن ہمارے نزدیک صحیح معنی وہی ہیں جو ابواسحق نے کہے ہیں یعنی اس انداز کی نمائش جو مردوں کے جذبات کے مشتعل ہونے کا سبب بن جائے۔ دراصل اَبْرَجَ بلونی یا اس مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلو کر اس سے مکھن نکالا جاتا ہے \*\*\*\*۔ لہذا تَبْرَجَ کے معنی ہیں حسن اور زینت کی اس انداز کی نمائش کہ عورت کی آنکھوں میں شوخی جھلک رہی ہو اور اس سے مردوں کے جذبات متحرک اور مشتعل ہو جائیں۔ ایسی نسود و نمائش جو مردوں کے سینوں میں (بلونی کی طرح) تلاطم برپا کر دے۔ ابھی ممانعت ہے۔ جنسی جذبات از خود بیدار نہیں ہوتے۔ انسانی خیالات انہیں بیدار اور مشتعل کرتے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم ان تمام محرکات کو روکتا ہے جن سے ان جذبات میں انگیزت پیدا ہو۔ اس نے مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط (میل جول) کے لئے جو حدود مقرر کئے ہیں ان سے یہی مقصود ہے۔

قدیم علم الافلاک کی رو سے، آسمان میں بارہ برج تسلیم کئے جاتے تھے۔ ابن درید نے (جمہرة اللغة میں) لکھا ہے کہ عرب، ان بروج السماء (آسمانی بروجوں) کو نہیں جانتے تھے۔ ان کے کلام میں ”منازلِ قمر“ کا تو ذکر ملتا ہے لیکن ”بروج السَّمَاء“ کا ذکر نہیں ملتا۔ لہذا، قرآن کریم میں جہاں ”بروج السَّمَاء“ کا ذکر آیا ہے تو اس سے وہاں مراد ستارے یا بڑے بڑے ستارے ہیں۔ مثلاً سورۃ



حجر میں ہے وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّظِيرِينَ (۱۵)،  
 ”اور یقیناً ہم نے آسمان میں بروج بتائے ہیں اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے  
 خوشنما بنایا ہے۔“ یہاں ”بروج“ سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں جو ابھرے  
 ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا  
 بِبُرُوجٍ يَنْكَرُ الْكَوْكَبُ (۳۶) ”اور ہم نے قریبی آسمان کو (عجیب) زینت  
 یعنی ستاروں سے آراستہ کیا ہے۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے  
 ”بُرُوج“ کو ستاروں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

## ب ر ح

آ”لَبَرَّاحُ“۔ کھلی وسیع زمین جہاں درخت، کھیتی، عمارت وغیرہ کچھ  
 نہ ہو۔ اس سے یہ لفظ اس معاملہ کے لئے بولتے ہیں جو بالکل واضح، ظاہر اور  
 کھلا ہوا ہو۔ لَا بَرَّاحَ۔ اس میں کوئی شک و شبہ یا ابہام نہیں۔ بَرَّاحٌ لَخَفَاءُ۔  
 راز فاش ہو گیا۔\* نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء کے  
 ساتھ را آئے ان کے مفہوم میں ”ظاہر ہونا“ پایا جاتا ہے۔ جیسے  
 بَرَّاحٌ لَخَفَاءُ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ظاہر  
 ہو جانا۔ زائل ہو جانا اور کھل جانا۔ اور (۲) سخت ہونا اور بڑا ہونا  
 ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ لَا أَبْرَحُ اثبات یعنی مستقل جم کر رہنے یا  
 کام کرنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔\*\* صاحب محیط نے کہا ہے کہ بَرَّاحٌ  
 ایک کلمہ ہے جو نشانہ خطا ہو جانے پر بولتے ہیں۔ چنانچہ آ”لَبَرَّاحُ“  
 مِّنَ الظُّلُمَاتِ وَالظُّلُمَاتِ اس ہرن یا پرندے کو کہتے ہیں جو شکاری کے  
 سامنے ایسے رخ سے آئے کہ اس کا نشانہ کرنا دقت طلب ہو۔\*\*\*

قرآن کریم میں یہ لفظ اثبات اور تاکید کے لئے آیا ہے۔ جیسے  
 سورة يوسف میں ہے فَلَن أَبْرَحَ الْأَرْضَ (۱۲) ”میں اس سر زمین کو  
 کبھی نہیں چھوڑوں گا“۔ سورة کہف میں ہے لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ  
 مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ (۱۸)۔ ”میں چلنا نہیں چھوڑوں گا (یعنی مسلسل  
 چلتا رہوں گا) حتیٰ کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں“۔

## ب ر د

آ”لَبَرْدُ“۔ ٹھنڈا ہونا، بہ حرُّ (گرم ہونے) کی ضد ہے۔ ماءٌ بَرْدٌ  
 وبارِدٌ۔ ٹھنڈا پانی۔ آ”لَبَرْدُ“۔ نیند۔ آ”لَبَرْدُ“۔ اولیٰ۔ عیش بَارِدٌ۔  
 خوشگوار زندگی۔ بَرْدُ السَّيْفِ۔ تلوار اچٹ گئی۔

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* محیط۔

راغب نے لکھا ہے کہ جس طرح حرّؑ کے ساتھ حرکت مختص ہوتی ہے اسی طرح برّؑ کے ساتھ کسی چیز کا جمود و ثبات مختص ہوتا ہے۔ مثلاً برّؑ عَلَیْہِ دِیْن کے معنی ہیں اس پر قرضہ ٹھہر گیا، یعنی ادا نہ ہو سکا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معانی میں سکون اور ثبات کو بھی شامل کیا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ہے یُنَارُ کُوْنِیْ برّؑ اَوْ سَلَامًا عَلَیْ اِبْرَہِیْمَ (۲۱۹)۔ ”اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈ اور سلامتی ہو جا“۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مخالفین نے ابراہیمؑ کے خلاف تدبیریں اور سازشیں شروع کیں اور آمادہ بہ فساد ہو گئے لیکن ہم نے اسے ان کی شعلہ سامانیوں سے محفوظ رکھا اور خیریت سے نکال کر دوسرے ملک میں لے گئے۔ (فَاَنزَلْنَاهُ اِلٰہُ مِّنَ النَّارِ ۲۱۹)۔ ”انہوں نے اسے زندہ جلا دینے تک کی بھی ٹھان لی لیکن ہم نے ان کی تدبیروں کو ناکام بنا دیا اور ابراہیمؑ کو صحیح و سلامت بچا کر لے گئے“ (۹۹-۱۰۰)۔ ”وَاَرَادُوْا بِہِ کَیْدًا فَجَعَلْنٰہُمْ اِلَّا خَسِرٰتِیْنَ (۲۱)۔“ انہوں نے اس کے خلاف سازش کا ارادہ کیا لیکن ہم نے انہیں ناکام بنا دیا“۔ یعنی ان کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ حضرت ابراہیمؑ بحفاظت وہاں سے نکل کر دوسرے ملک میں چلے گئے (۹۹)؛ (۲۱)؛ (۲۱)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ یہاں آگ سے مراد ان لوگوں کی آتش انتقام تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی سازش میں ناکام رہ گئے تھے۔

اولوں (ژالہ باری) کے معنوں میں یہ لفظ (۲۲) میں آیا ہے۔ سورۃ واقعہ میں عذاب جہنم کے ضمن میں ہے لَا بَارِدٌ وَلَا کَرِیْمٌ (۵۶)۔ ”نہ ٹھنڈ نہ پہنچانے والا۔ نہ خوشگوار اور نفع بخش“۔

سورۃ النبا میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا یَذُوْکُوْنَ فِیْہَا برّؑ اَوْ لَا شَرَّ اَبًا (۲۸) ”وہ اس میں ٹھنڈ اور پینے کی چیز نہیں پائیں گے“۔ صاحب تاج العروس نے یہاں برّؑ کے معنی نیند کے کئے ہیں۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ وبسے اس سے مفہوم راحت و آرام بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہی معنی زیادہ موزوں ہیں۔ عذاب میں راحت کہاں؟ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں اضطراب اور حرکت کو بھی شامل کیا ہے۔

## ب ر ر

ب ر ر - اس سادہ کے اصلی معنی وسعت - فراخی اور کشادگی کے ہیں کیونکہ بَحْرٌ کے مقابلہ میں بَرٌّ کا لفظ خشکی کیلئے استعمال ہوتا ہے (۱۶)۔ اَلْبَرُّ بے آب و گیاہ چٹیل میدان کو کہتے ہیں اور بَحْرٌ ان مقامات اور شہروں کو جہاں پانی بھی ہو۔ بَرٌّ بکریوں کو (جنگل کی طرف) ہانک دینے کو کہتے ہیں۔ وسعت کے اعتبار سے اس کے معنی کثرت کے بھی ہو گئے۔ چنانچہ اَبَرُّ الْقُرُجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی کثیر الاولاد ہو گیا۔ اَبَرُّ الْقَوْمِ - قوم بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس سے غلبہ و تسلط کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اَبَرُّ عَلَيْهِمْ - وہ ان پر فوقیت لے گیا اور غالب آیا۔ اَلْمُبِيرُ - غالب آنے والے کو کہتے ہیں\*۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے آئیں ان کا مفہوم ”ظاہر ہونا،، ہوتا ہے۔ چنانچہ بَرٌّ کے معنی ہیں وہ ظاہر ہو گیا۔ اس سے کشادگی اور غلبہ دونوں مفہوم واضح ہو جاتے ہیں۔

نگاہ کی کشادگی اور دل کی وسعت کے اعتبار سے بَرٌّ کے معنی وسیع پیمانہ پر نیک سلوک، صلہ رحمی اور احسان کے آتے ہیں۔ نیز صداقت (بات پر پورا اترنا) اور اطاعت کے بھی۔ بَرٌّ اور بَرٌّ - قسم میں سچا ہونے کو کہتے ہیں۔ اَلْبَرُّ - خدا کے اسماء حسنوا میں سے ہے (۲۸)۔ نیز سچے اور احسان کرنے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں بَرٌّ بمقابلہ اِثْمٌ آیا ہے (۴)۔ اِثْمٌ کے معنی ہیں کمزوری۔ اضمحلال۔ تکان۔ لہذا بَرٌّ کے معنی ہونگے قوت۔ وسعت۔ کثرت۔ کشادگی۔ فراخی۔ چونکہ اِثْمٌ جرم (گناہ) ہے اس لئے بَرٌّ نیکی (Virtue) ہے۔ لہذا قرآن کی رو سے ”نیک کام،، (بَرٌّ) وہ ہونگے جن سے کشادگی کی راہیں کھل جائیں۔ جن سے انفرادی طور پر نگاہ میں فراخی، قلب میں کشادگی اور انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے اور اجتماعی طور پر سامان زیست میں کثرت اور وسعت آجائے۔ اور معاملات میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا جائے۔ بَرٌّ اور تَقْوٰی کے الفاظ اسی لئے اکٹھے آئے ہیں (مثلاً ۲۴ : ۴) کیونکہ تَقْوٰی (قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے) سے انسان سے تنگ نظری دور ہو جاتی ہے اور کشادہ ظرفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ

انسان اپنی عزیز ترین متاع (مال و دولت حتی کہ جان تک کو) قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھے۔ چنانچہ ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تَحِبُّونَ (۹۱)۔ ”جب تک تم ان چیزوں کو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہیں (نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے) کھلا نہیں رکھو گے تمہیں کشادگی اور وسعت نصیب نہیں ہو سکیگی۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ”مذہبی شعائر، کو رسمی طور پر ادا کر لینے کا نام برّ (نیکی) ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ..... (۱۶۷)۔ کشادگی کی راہ یہ نہیں (تم معیارِ خداوندی پر اس طرح پورے نہیں اتر سکتے) کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی کی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے بعد اپنے مال کو اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود ضرورت مندوں کے لئے دیدو۔ ایسا کرنے والوں کو اَبْرَارٌ بمقابلہ فَجَّارٌ کہا گیا ہے (۱۱۲-۱۱۳)۔ اور بَرّۃٌ بھی (۹۱)۔

حضرت یحییٰؑ کے متعلق ہے۔ بَرًّا يُوَالِدِيْهِ (۹۹)۔ ”وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک (کشادہ نگہی) سے پیش آتا تھا،۔ خدا کو اَلْبَرُّ الرَّحِيْمُ کہا گیا ہے (۵۲)۔ ”وسعتیں عطا کرنے والا۔ سامانِ نشو و نما دینے والا،۔ جس خدا نے تمام نوعِ انسانی کیلئے سامانِ ربوبیت اس وسعت و کثرت سے عطا کر رکھا ہے اس کی کشادگی اور فراخی میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟۔ لہذا جو معاشرہ اپنے اندر خدا کی صفات کو منعکس کریگا وہ بھی علیٰ حدِ بشریت بَرٌّ وَرَحِيْمٌ ہوگا۔ یعنی نوعِ انسانی کی ربوبیت کیلئے وسعت ظرف اور کشادگی نگاہ کا مالک۔ اسی کا نام برّ ہے جس کا ترجمہ عام طور پر نیکی کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے لفظ ”نیکی“ کا عمومی تصور برّ (وسعت و کشادگی) کا مفہوم نہیں پیدا کر سکتا۔ نیک آدمی عام طور پر اسے کہا جاتا ہے جو برائیوں سے بچے۔ لیکن برائیوں سے بچنا سلبی پہلو (Negative Aspect) ہے۔ قرآن کریم اس کے ساتھ مثبت جوہروں (Positive Virtues) کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ بسا بریں جس فرد میں کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی نہیں اور جس قوم کو ربوبیت کا سامان وسعت و کثرت کے ساتھ نصیب نہیں اور وہ اسے اسی وسعت و کشادگی کے ساتھ نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے صرف نہیں کرتی۔ وہ قرآن کی رو سے حاملِ برّ (نیکی) نہیں ہو سکتی۔

## ب ر ز

الْبِرَّازُ - الْبِرَّازُ - وسیع اور کھلی جگہ جہاں درخت وغیرہ کچھ نہ ہوں (چونکہ لوگ قضاے حاجت کے لئے باہر کھلی جگہ کی طرف جایا کرتے تھے اسلئے الْبِرَّازُ وَالْبِرَّازُ کے معنی پاخانہ کے ہو گئے)۔

بَرَزَ - نمایاں ہو جانا - ظاہر ہو جانا - نکھر کر سامنے آ جانا - الْبَرَّازُ وہ چیز جو پوری طرح ظاہر ہو جائے - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے ہوں ان میں ظاہر ہو جانے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے - ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معانی ظاہر ہو جانا - اور کسی چیز کا اپنے جیسی اور چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں - بَرَّازٌ مُبَّارَزَةٌ - میدان جنگ میں جوانوں کا صفوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے کے سامنے آنا - بَرَزَ - دوسروں پر فضیلت و شجاعت میں سبقت لی جانا - اور آگے بڑھ جانا -

سورة بقرہ میں ہے وَ لَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ (۲۵۰) - ”جب وہ جالوت کے مقابلہ میں جنگ کیلئے سامنے آئے“ - سورة کہف میں ہے وَ تَسْرٰی الْاَرْضُ بَرَّازَةً (۱۸) - ”تو زمین کدڑ دیکھیگا کہ وہ بالکل کھلی ہوئی ہے“ (یا وہ لوگ جنہیں استبداد زمانہ نے دبائے رکھا ہے تو دیکھیگا کہ وہ ابھر کر اوپر آجائیں گے) سورة ابراہیم میں ہے وَ بَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِیْعًا (۱۴) - ”چھوٹے بڑے سب خدا (کے قانون مکافات کے) سامنے آجائیں گے - ان کے اعمال کے نتائج ابھر کر سامنے آجائیں گے - یعنی لَا يَتَخَفٰی عَلٰی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْئٌ“ (۱۶) - ”ان کی کوئی شے اللہ سے مخفی نہیں ہوتی“ - اسی کو دوسری جگہ وَ بَرَزَتِ الْجَحِیْمُ (۲۶) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی ظہور نتائج کے وقت جہنم ابھر کر سامنے آجائیگی - لیکن اسی کے لئے جو آنکھیں رکھتا ہے - لِمَنْ یُّشْرِی (۲۶) - یوں تو مجرم اور جہنم اب بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں - (۸۲) - جہنم ہر مجرم کو گھیرے ہوئے ہے - (۲۹) - لیکن اسے دیکھ وہی سکتا ہے جو آنکھیں رکھتا ہے - وہ اسی کے سامنے ابھر کر آتی ہے جسے اسکا احساس ہو - (تفصیل جہنم کے عنوان میں ملیگی) -

## ب ر ز خ

بَرَزَخٌ - دو چیزوں کے درمیان روک یا حد کو کہتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ یہ دراصل بَرَزَةٌ (پردہ) ہے جسے مغرب بنالیا گیا ہے - لیکن ابن فارس کا کہنا ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے جس کا مادہ برز ہے اور

خاء اس میں مبالغہ کے لئے بڑھائی گئی ہے۔ معنی اسکے ہیں اتنی بڑی وسعت جو اسکے باہر کی چیزوں کے لئے اوٹ بن جائے۔ مطلب اس سے بھی روک یا حائل ہونے کا ہوگا۔ سورۃ رحمن میں ہے۔ **بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ** (۲۵) ”ان دونوں دریاؤں کے درمیان ایک روک ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔“ (نیز ۲۵)۔

سورۃ مومنوں میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تو میں ضرور اعمالِ صالحہ کروں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے کہنے کی باتیں ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ **وَمِنْ وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ** (۲۳، ۲۴) ”ان کے پیچھے ایک روک ہے یومِ بعثت تک۔“ (نیز دیکھئے وراء۔ عنوان ”و۔ ر۔ ی“ میں اور عنوان ”ب۔ ع۔ ث“)

## ب ر ص

**الْبَرَصُ**۔ سفید داغ جو بیماری کی وجہ سے بدن میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ پھلپھری۔ **الْبِيرَاصُ**۔ ریگستانی خطے جہاں کچھ پیدا نہ ہو۔ بنجر زمین۔ **تَبَرَّصَ الْبَغِيرُ** ”لا رُص“۔ اونٹ نے تمام گھاس چر لی۔ زمین پر کچھ بھی نہ چھوڑا۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ **وَأَبْرِيءٌ لَا كُفْرَہَ وَلَا بَرَصَ** (۳۸)۔ ”میں پیدائشی اندھے کو نگاہ عطا کروں گا اور آبرص کو اسکی بیماری سے نجات دلا دوں گا“۔ بنی اسرائیل کی اسوقت کی حالت کو آبرص سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یا تو اسکے یہ معنی ہیں کہ انکی ارضی حیات کے کسی حصہ میں بھی سرسبزی اور تروتازگی باقی نہیں رہی تھی۔ اور یا یہ کہ وہ دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی انہیں اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ **وَضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ أَيْنًا مَّا تَقِفُوا** (۱۱۱) ”وہ جہاں کہیں بھی جائیں ذلت و رسوائیاں انکے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔“ دونوں معانی میں مفہوم ایک ہی ہے۔ رسول آتا ہی اسلئے ہے کہ قوم کو ذلت و رسوائیوں سے نجات دلائے اور اسکی بنجر زمینوں میں سرسبزی و شادابی کے سامان پیدا کرے۔

قرآن کریم نے اخلاقی ذمائم کو بیماریوں سے تشبیہ دی ہے۔ کہیں ایسے لوگوں کو بہرے۔ گونگے۔ اندھے۔ (صُمٌّ - بُكْمٌ - عُتَمٌ) (۲۱)۔ کہہ کر ہکا راہے۔ کہیں کہا ہے کہ ”ان کے دلوں میں روگ ہے“ (فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ) (۲۲)۔ حتیٰ کہ انہیں مردہ (مَوْتًا) (۲۳) بھی کہا گیا ہے۔ اسی اعتبار سے آسمانی تعلیم کو ہدیٰ و شفاء (۲۴) ”ہدایت اور شفاء“ اور شفاء (۲۵) ”لِیَمَارِفِ الصَّدُورِ“ (۲۶) ”جو کچھ سینوں میں ہے اس کے لئے شفاء“ کہا گیا ہے۔ حضرات انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد اور زندگی کا مشن جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد ”انسانیت کی بیماریوں“ کا علاج ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے آکُمَہ (اندھے) کو بینائی عطا کرنے اور اَبْرَص (کوڑھی) کو اچھا کرنے سے بھی یہی مراد ہے۔ یہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ (تفصیل میری کتاب ”شعلہ“ مستور“ میں ملیکی)

## ب ر ق

بَرْقٌ - بجلی جو بادلوں میں چمکتی ہے۔ اس کے بنیادی معنی چمک کے ہیں۔ بِسْرِقٍ بَصَرُهُ کے معنی ہیں اسکی آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو گئی۔ اور وہ حیرت و دہشت کی وجہ سے کچھ دیکھنے کے قابل نہ رہا۔ (فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ) (۲۷)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی متعیر رہ جانے کے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے یَا دُ الْبَرْقِ یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ (۲۸) قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو اچک کر لے جائے۔

اِسْتَبْرَقٌ - دیبیز ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں (۲۹: ۳۰) \* اور اِبْرِیقٌ (۳۱) لوٹے یا صراحی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ فارسی لفظ ”آب ریز“ کا معرب سمجھا جاتا ہے \*\*۔ لیکن ابن فارس کا قول ہے کہ یہ برق ہی سے ہے اور ہر چمک دار اور خوبصورت چیز کے لئے بولا جاتا ہے۔

## ب ر ک

بَرَكَةٌ - کے اصلی معنی اس ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی شامل ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اسکے ساتھ ساتھ بڑھ بھی رہی ہو۔ لہذا اس میں استحکام اور کثرت۔ ثبات اور نشوونما دونوں شامل ہوتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں

باء اور راء اکثر آئیں ان میں ”ظاہر ہونے“ کا مفہوم مضمحل ہوتا ہے۔ نشو و نما کے معنی ہی یہ ہیں کہ مضمحل صلاحیتیں نمودار ہو کر سامنے آجائیں۔ لہذا بَرَکَة میں ثبات۔ استحکام۔ کثرت۔ نشو و نما اور ظہور و نمود کے تمام پہلو آجائے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے معنی ثبات اور نشو و نما لکھے ہیں۔ مُبَارَكٌ یا فَيْضٌ بَرَکَة۔ اس وقت کہتے ہیں جب کسی شے میں کثرت اور زیادتی محسوس ہو اور اسمیں ثبات و استحکام بھی ہو۔ یہ لفظ بَرَکٌ اَلْبَعِيرُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اونٹ جم کر بیٹھ گیا اور وہاں سے اٹھا نہیں۔ اَلْبِرْكَة۔ اونٹ کے سینے کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگا کر وہ جم کر بیٹھتا ہے۔ اور بہت دودھ دینے والی بکری کو بھی۔ نیز حوض وغیرہ جس میں پانی ٹھہرا رہے \*۔

بَرَکَة کی جمع بَرَکَات ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، بَرَکَة کے معنی ثبات۔ استحکام۔ نشو و نما۔ ہر قسم کا خیر اور فلاح ہیں۔ لیکن یہ چیزیں متعلقہ اسباب کے ذریعے ملتی ہیں اس لئے مجازاً خود ان اسبابِ خیر کو بھی بَرَکَات کہا جائیگا۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ ایمان و تقویٰ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کو بَرَکَات مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ملتی ہیں (۹۶)۔ یعنی تمام استحکام بخش اسبابِ حیات کی کثرت و فراوانی۔ آسمانی راہ نمائی بھی اور معاشی سہولتیں بھی۔ زمین کے متعلق فرمایا وَبَارَكْ فَيْضًا (۱۱)۔ (خدا نے) اس میں اس سامان کی فراوانی رکھ دی ہے جس سے نوعِ انسانی کو استحکام اور نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔ سورۃ ق میں کہا کہ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا (۵۰)۔ ”ہم نے آسمان سے بارش برساتی جو نوعِ انسانی کی نشو و نما اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے“۔ اور قرآنِ کریم کو بھی کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ لَلَّيْكَ مُبَارَكٌ کہا ہے (۳۸)۔ یعنی وہ ضابطہٗ حیات جس میں ایسے اصول و قوانین ہیں جو دائمی خیر و فلاح کا موجب ہیں۔ جن سے انسان کا ثبات و استحکام اور نشو و نما وابستہ ہے۔ اور اس لیل کو بھی مُبَارَكٌ کہا جس میں یہ نازل ہوا (۲۲)۔ مکہ کو (جو قرآن کے نظامِ ربوبیت کا مرکز ہے) مُبَارَكٌ کہا (۹۵)۔ خود خدا بھی اپنی ربوبیتِ عالمی کی وجہ سے مُبَارَكٌ ہے۔ تَبَارَكُ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۲۶)۔ تَبَارَكُ بابرکت اور ہر قسم کے خیر و برکت کا سرچشمہ ہونا۔

تَبَارَكُ الَّذِي... سے مراد ہے وہ ذات جس میں خیر و برکت اپنی پوری کثرت کے ساتھ انتہائی پہنچ چکی ہو۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل سرچشمہٗ خیر و برکت جہاں تمام خوبیاں اپنی کامل شکل میں موجود ہیں اور ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی ذاتِ خداوندی ہے۔ اور ربوبیتِ عالمی اسی سرچشمہٗ خیر و برکت سے ہوتی ہے۔ جو قوم اللہ کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرے اسے بھی (علیٰ حدِّ بشریت خیر و برکت اور عالمگیر انسانیت کے) لئے سامانِ نشو و نما مہیا کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔

\* تاج۔ محیط۔ راغب۔



## ب ر م

اَبْرَمَ الْتَحْبِلَ - اسنے رسی کو مضبوطی سے بٹ لیا (دو رنگوں میں یا دو بٹوں میں) - اَلْمَبْتَارِمُ - چرخیاں وغیرہ جن سے رسیاں مضبوط بٹی جائیں - اَلْبَرِّیْمُ - دو مختلف بٹوں والا (مثلاً سرخ و سفید) دھاگا جسے عورتیں اپنے بازو یا کمر پر بھی باندھ لیتی ہیں - ہر وہ چیز جس میں دو مختلف رنگ ہوں - رَسی یا ڈورا جس میں دو رنگ ہوں - اَبْرَمَ اَلَا مَرَّ - اسنے معاملہ کو محکم اور مضبوط کر دیا\* - اسی سے قَضَاءُ مَبْرَمٌ - محکم اور اٹل فیصلے کو کہتے ہیں - قرآن حکیم میں ہے اَمُ اَبْرَمُوا اَمْرًا فَاِنَّا مَبْرَمُونَ (۲۹) - ”کیا انہوں نے (حق کی مخالفت کیلئے اپنے) معاملہ کو مضبوط کر لیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم بھی معاملہ کو محکم کر لینے والے ہیں“ -

چونکہ رسی کو مضبوط بٹنے میں بار بار ہل دینا اور کئی بار بٹنا پڑتا ہے اس لئے اصرار کرنے اور بضد رہنے کے لئے بھی اَبْرَامُ\* بولا جاتا ہے\*\* - ممکن ہے اسی جہت سے چیچڑی کو اَبْرَامُ\* کہا جاتا ہو - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں (۱) کسی چیز کا محکم ہو جانا - (۲) دو مختلف رنگ - اور (۳) تھک جانا اور دل برداشتہ ہو جانا لکھے ہیں -

آخری معانی کے لئے یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا -

## ب ر ہ

اَلْبَرَّہُ - گورے پن کے ساتھ گدازی بدن - اَلْبَرَّہُ مَرَّہً - سفید نوجوان حسینہ ، جو حسن و نزاکت کی وجہ سے لچکتی ہو، رنگ کی صفائی کے باعث جسکی جلد چمک رہی ہو، تنعم و آسودگی کی وجہ سے جو تروتازہ ہو\*\*\* - اَلْبَرَّہُ مَرَّہً وَالْبَرَّہُ طویل\* - زمانہ طویل\* -

اَبْرَہَانُ - خلیل نے کہا ہے کہ یہ لفظ بَرَّہُ مَرَّہً سے ماخوذ ہے (جسکے معنی اوپر لکھے گئے ہیں) یعنی روشن اور لطیف دلیل - یا بَرَّہُ مَرَّہً سے ماخوذ ہے، اپنے ثابت اور قائم ہونے کی وجہ سے - ایک اور قبول ہے کہ یہ لفظ فعلان کے وزن پر ہے اور بَرَّہُ سے ماخوذ ہے جسکے معنی قطع کرنے کے ہوتے ہیں - یعنی دلیل فاطمہ\*\*\* - بعض نے نون کو اصلی مانکر اسے رباعی تسلیم کر لیا ہے - لیکن ایسا کثرت استعمال کی وجہ سے مانا گیا ہے ورنہ یہ برہ ہی سے -

راغب نے کہا ہے کہ یہ قَعْلَان کے وزن پر ہے اور بَرَرہ - يَبْرَرہ سے ماخوذ ہے جسکے معنی سفید ہونے کے آتے ہیں\*\*\*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ حن الفاظ میں با، اور را، اکٹھے آئیں ان میں ”ظاہر ہونے“ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس کے معنی ایسی دلیل کے ہیں جو ہر حال میں، ہمیشہ، سچی ہو۔ روشن واضح اور سچی دلیل۔ ایسی دلیل جو بالکل ظاہر ہو۔

قرآن کریم نے اپنے آپکو بُرْہَانٌ مِّنْ رَبِّکُمْ (۱۲۵) کہا ہے۔ ”تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل“۔ اسلئے کہ اسکا ہر دھوی دلیل و برہان پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بھی دلیل و برہان ہی کا مطالبہ کرتا ہے اور علانیہ کہتا ہے کہ هَاتُوا بُرْہَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۱۱۱)۔ ”اگر تم اپنے دھوے میں سچے ہو تو اسکی تائید میں دلیل پیش کرو“۔ اسے اپنے دعوے کی صداقت پر اسقدر یقین ہے کہ اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی دلیل قاطع نہیں ہو سکتی۔ لَا بُرْہَانَ لَّہٗ بِہٖ (۱۱۳)۔ ”کسی کے پاس (شرک کی تائید میں) دلیل نہیں ہو سکتی“۔

مذہب\*\*\*\* کو (جسے ہمیشہ عقل کا حریف اور دلیل کا دشمن سمجھا جاتا تھا) علم و عقل اور دلیل و برہان کی رو سے پیش کرنا اور منوانا، قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنے ہر دعوے کو علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔

## ب ز ع

بَزَعٌ نَّابٌ الثَّبَعِیْر کے معنی ہیں اونٹ کی ڈاڑھ گوشت کوشق کر کے نمودار ہوئی۔ اس سے چاند اور سورج کے طلوع ہو جانے کو جب انکی روشنی پھیل رہی ہو بُزْعٌ کہتے ہیں۔\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نکلنے اور ظاہر ہو جانے کے ہیں۔ اِبْتَزَعَ الثَّرِیْعُ۔ بہار کا آغاز ہو گیا۔ شگوفے پھوٹنے شروع ہو گئے۔\*

\* تاج۔ \*\* محیط۔ \*\*\* راغب۔ \*\*\*\* قرآن نے دین عطا کیا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن میں نہیں ہے۔ ہم نے یہ لفظ عام استعمال کے پیش نظر لکھ دیا ہے۔ ورنہ اسلام کو الدین کہنا چاہئے۔ یعنی خدا کا مقرر کردہ ضابطہ، حیات۔ طریق زندگی۔ نظام معاشرہ۔

قرآن کریم میں ہے اَلْقَمَرَ بَارِزًا اور اَلشَّمْسُ بَارِزَةً (۸۰-۷۹)  
 ”طلوع ہونے ہوئے یا چمکنے ہوئے چاند اور سورج“

نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ جب کسی لفظ میں بآ اور زآ  
 اکٹھے آئیں تو اس میں ”کسی چیز کے نکلنے اور ظاہر ہونے“ کا مفہوم پایا جاتا  
 ہے۔ بَزْغ میں بھی کیفیت ہوتی ہے۔

## ب ب س

اَلْبَسْرُ۔ کسی چیز کا وقت سے پہلے، نا مکمل حالت میں جلدی ہو  
 جانا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ بَسْرُ الدِّمِ مَقْلٌ۔ اس نے پھوڑے کو پکنے  
 سے پہلے ہی پھوڑ دیا۔ اَلْبَسْرُ ہر تروتازہ چیز نیز کھجور جو ابھی پکی نہ ہو\*۔ ان  
 معانی کے اعتبار سے ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۴۳) کے معنی ہیں اس نے منہ بگاڑ  
 لیا۔ لیکن بَسْر کے معنی شدت کراہت سے کسی کی طرف دیکھنے کے بھی  
 آتے ہیں\*۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ٹیسوری چڑھانے اور منہ بگاڑنے کے  
 ہونکے۔ خیال اس طرف جاتا ہے کہ چونکہ کچا پھل کھانے سے منہ بد مزہ  
 ہو جاتا ہے اس لئے بَسْر کے معنی ”بد مزہ ہو گیا“ ہیں۔ بد مزگی سے منہ ضرور  
 بگڑتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بِأَسِيرَةٍ (۴۵)۔ ”اس دن بعض  
 چہرے برے بنے ہوئے ہونگے“۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) کسی چیز کی پکنے سے  
 پہلے کی حالت۔ اور (۲) کسی چیز کی حرکت کم ہو جانا یا اس کا ٹھہر  
 جانا ہیں۔ نیز بَسْرُ الرَّجُلِ اِلْحَاجَّةُ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنی  
 ضرورت کو وہاں تلاش کیا جہاں اس کے ملنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

## ب ب س

ستویا خشک روٹیوں کا سفوف جو ستو کی طرح پانی میں گھول کر کھا  
 لیا جائے۔ گھولنے، خلط ملط کرنے اور چورا چورا کرنے کے لئے بَسَسَ يَبْسِسُ  
 بَسًّا بولا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے معنی کسی چیز کے ریزہ ریزہ کر دینے کے  
 بھی ہیں۔

لیکن بَسَسَ اِلَّا بِلَ بَسًّا کے معنی ہیں اس نے اونٹوں کو فرمی سے  
 ہانکا۔ اَلْبَسَّ۔ اونٹوں کو مختلف شہروں میں بھیجدینا اور متفرق کر دینا۔  
 اس اعتبار سے اس کے معنی اپنی جگہ سے چلانے کے ہونگے\*۔ چنانچہ اَلْبَسَّتِ  
 اَلْحَبَّاتُ کے معنی ہیں سانپ تیزی سے رینگ گئے\*۔ قرآن کریم میں ہے

\*تاج و راغب۔

وَبَسَّتِ الْجِبَالَ بَسًّا (۵۶)۔ اسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جبال (بڑے بڑے سرداران قوم - جابر و متکبر لوگ) ریزہ ریزہ ہو جائیں گے - اور یا یہ کہ وہ اپنے مقام سے ہانک کر ہٹا دیے جائیں گے یا وہ خود ہی رینگ کر الگ ہو جائیں گے۔ انہیں معانی کیلئے دوسری جگہ ہے وَسَيِّرَتِ الْجِبَالَ فَكَانَتْ سَرَابًا (۴۸) یا وَآذَ الْجِبَالَ سَيِّرَتِ (۸۱)۔ یا، وَآذَ الْجِبَالَ نُسِفَتْ (۴۹)۔ نیز بَنَسِفُهُارَبَشِي نَسْفًا (۲۰۵)۔ ان تمام مقامات میں مفہوم ایک ہی ہے۔ انکی قوت و استحکام کا ٹوٹ جانا۔ انکے مقام کا ان سے چھن جانا۔ انقلاب سے زیر و زبر ہو جانا۔ (عنوان ن-سرف بھی دیکھئے اور ج-ب-ل بھی)۔ واضح رہے کہ جبَل کے لغوی معنی پہاڑ ہیں۔ اس لئے ان آیات میں اگر لغوی معنی لئے جائیں تو مطلب پہاڑوں کا اڑ جانا یا ریزہ ریزہ ہو جانا ہوگا۔ لیکن آیات کے سیاق و سباق کے پیش نظر مجازی معنی زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مجازی معانی لکھے ہیں۔

## ب س ط

بَسَطَهُ - بَسَطَتَهُ - پھیلا نا - نشر کرنا - توسیع کرنا - وسعت دینا -  
بمقابلہ قَبْضُ (۲۰۵) - نیز بمقابلہ قَدَرُ (۲۰۶)۔ قَدَرُ کے معنی ہیں پیمانوں سے ناپ تول کر دینا، بمقابلہ مَغْلُوطَةٍ بمعنی بندھا ہوا - (۱۶ و ۵۶)۔ نیز اسکے معنی حملہ کرنے - ہاتھ بڑھانے - دست درازی کرنے کے بھی آتے ہیں (۵۱) جس کے مقابلہ میں فَكَفَّ أَبْدَرِيَهُمْ عَنْكُمْ آیا ہے - (۵۱)۔ یعنی "اس نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روکا،" - اور مسلط ہونے کے معنی بھی -  
وَأَلْمَلِيكَتُ بَاسِطُوا أَيْدِيَهُمْ (۶۶)۔ "اور فوشتے اپنے ہاتھ پھیلا رہے ہونگے،" - یعنی مسلط ہو جائیں گے - مَبْسُوطٌ - کشادہ - (۵۶) - بَسَاطٌ - بچھی ہوئی یا وسیع اور پھیلی ہوئی (۱۶)۔

قرآن کریم میں حضرت طالوت کے متعلق ہے کہ زَادَهُ بَسْطَةُ فَيِّ الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲۰۶)۔ اسکے عام معنی یہ ہیں کہ اسے علم اور جسمانی قوت بہت زیادہ دی ہے۔ لیکن رَاغِب نے کہا ہے کہ بَسْطَةُ فَيِّ الْعِلْمِ یہ ہے کہ انسان اپنے علم سے خود بھی نفع اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائے \*\*\*۔ لہذا بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم اپنی قوتوں کو اپنی ذاتی منفعت کیلئے صرف کرتے ہو لیکن طالوت اپنے علم اور توانائی سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اسے ہم نے تمہارے

اوپر کمان کے لئے منتخب کیا ہے۔ کمانڈر ہونے کے لئے جسمانی اور دماغی دونوں قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس خصوصیت کی بھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔

## ب س ق

آلْبُسَاقٌ - لعاب دھن - بَسَقٌ - اسنے تھوکا - (بجائے "س" کے "ص" سے بصدق بھی کہتے ہیں)۔

بَسَقٌ النَّخْلُ بَسُوْقًا - کھجور کے درخت لمبے اور بلند ہوئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔

بَسَقٌ عَلَيْهِمْ - وہ ان پر فضیلت میں بازی لے گیا۔ بڑھ چڑھ گیا۔ آلْبَسُوْقٌ وہ بکری جسکے تھن لمبے ہوں۔

بَسَقٌ الشَّيْءُ بَسُوْقًا - چیز کی لمبائی مکمل ہو گئی۔

قرآن کریم میں ہے - وَالنَّخْلُ بَسِیْقَتِ (۱۰۱)۔ "لمبے لمبے کھجوروں کے درخت،"۔

صاحب محیط نے اسکے معنی باردار کھجوروں کے بھی کئے ہیں \*\*۔

## ب س ل

بَسَلَ کے اصلی معنی روک دینے کے ہیں یَوْمٌ بَسِیلٌ سخت دن کو کہتے ہیں۔ آلْبَسِیلٌ شیر کو کہتے ہیں۔ یہیں سے بَسَالَةٌ کے معنی بہادری کے ہیں کیونکہ بہادر اپنی مدافعت کرتا ہے \*\*۔ ازر روکنے کے مفہوم کے پیش نظر اسکے معنی ہیں کسی کو اچھی چیزوں سے محروم کر دینا \*\*\*\*۔ بَسَلَالَةً، - اسے تباہی آ جائے \*\*\*\*۔ آلْبَسَلَ - چھلنی میں چھاننا۔ کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا لینا۔ کسی کو قید کر دینا۔ آلْبَسَلَةً، اسے ہلاکت اور تباہی کے حوالہ کر دیا۔ آلْبَسَلَةً لِعَمَلِهِ اسے اسکے عمل کے حوالہ کر دیا کہ جو کچھ اسنے کیا ہے اسکی سزا بھگتے \*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے - اَنْ تَبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۱۰۱)۔ "ایسا نہ ہو کہ کوئی فرد اپنے (غلط) اعمال کی وجہ سے، (قرآن کی بخشائشوں سے) محروم رہ جائے،"۔ اور "اَوَلَيْكَ التَّذٰیۡنُ اَبْسَلُوْاۤ اِیْمًا کَسَبُوْا (۱۰۲)۔" یہ وہ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے محروم کئے گئے ہیں،"۔ اس سے مفہوم ہے قانون مکافات کی رو سے اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا۔ غلط اعمال کے نتیجہ میں زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جانا اور اسطرح انسانی نشوونما کا رک جانا۔

\* تاج و راغب - \*\* محیط - \*\*\* تاج - \*\*\*\* راغب - راغب کی عبارت کے ترجمہ کے لئے دیکھیں تہذیب اسلامیہ جلد چہارم۔

## ب س م

بَسَمَ - يَبْسِمُ - بَسْمًا - انسان کا خوشی اور مسرت میں ہلکی سی ہنسی ہنسنا، مسکرایا۔ (قدرے ہونٹ کھول کر اور تھوڑے تھوڑے دانت نکال کر)۔ اَبْسَمَ وَ تَبَسَمَ - وہ کم از کم اور حسین ترین ہنسی ہنسا۔ مسکرایا۔ مَا بَسَمْتُ فِي الشَّيْءِ - میں نے اس چیز کو چکھا تک نہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے فَتَبَسَّمْ ضَاحِكًا (۲۹)۔ ”وہ خوشی سے مسکرایا،“۔

## ب ش ر

بَشَرَةٌ\* کے معنی انسان کی جلد کی اوپر کی سطح کے ہیں۔ چنانچہ اَلْبَشَرُ کے معنی ہیں کھال کو چھیل دینا\*۔ (یعنی اس کے بال صاف کر دینا)۔ پھر اَلْبَشَرُ کے معنی خود انسان کے ہو گئے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بَشَرٌ سے صرف انسان کی طبعی ساخت اور جسمانی بناوٹ مراد ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسانی بچہ (یا انسان) بشر ہوتا ہے۔ لیکن انسانیت کے جوہر اور خصوصیات ہر بشر میں مختلف ہونگے۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ جہاں یہ کہتے ہیں کہ اَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ (میں بھی تمہارے جیسا بَشَر ہوں) تو اس سے بشریت کے طبعی تقاضوں کا اشتراک مقصود ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ مومنوں میں ہے مَا هَذَا اِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِثْلًا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِثْلًا تَشْرَبُوْنَ (۲۳)۔ (انہوں نے کہا کہ) ”یہ رسول تمہارے جیسا ایک بشر ہی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے۔ جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے،“۔ یعنی اگر اس وحی کو الگ کر لیا جائے جو اسے خدا کی طرف سے ملتی ہے تو نبی کی طبعی خلقت عام انسانوں کی سی ہوتی ہے۔ لیکن نبوت (خدا کی طرف سے وحی پانا) ایسی خصوصیت نہیں تھی جسے ہر انسان اپنے کسب و ہنر سے حاصل کر سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتی تھی۔ نبی کی بشری حیثیت موت سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی نبوت (وحی) آگے چلتی ہے۔

عمومی حیثیت سے اِنْسَانٌ اور بَشَرٌ مراد ف طور پر بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً - (۱۵۹) اور (۱۵۸) میں ایک جگہ اِنْسَانٌ اور دوسری جگہ بَشَرٌ

کہا گیا ہے۔ بَا شَرَّہَا کے معنی عورت سے مجامعت کرنے کے ہیں (۲/۱۸۷)۔  
اس نہج سے کہ اس میں عورت اور مرد کی جلد سے جلد مل جاتی ہے۔ کبھی  
اسکے معنی محض لپٹانے اور بوس و کنار کے بھی آتے ہیں\*۔ لیکن قرآن میں  
بَا شَرُّوْہُنَّ (۲/۱۸۷) کے معنی مجامعت کے ہیں۔

بِشَارَۃٌ\* (بالکسر) کے بنیادی معنی ایسی خبر کے ہیں جس سے انسان  
کے چہرے (کی رنگت) میں تغیر پیدا ہو جائے خواہ وہ خبر خوشی کی ہو یا غم  
کی۔ بِشَارَۃٌ کے معنی ہیں اس قسم کی خبر دینا۔ چنانچہ قرآن حکریم میں  
عَذَابٌ أَلِيمٌ کی خبر کیلئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۳/۴۰) اسی طرح سورۃ نحل  
میں ہے کہ جب ان لوگوں کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو انکے  
چہرے کی رنگت سیاہ ہو جاتی ہے۔ اسکے لئے بھی "بشیر" کا لفظ آیا ہے (۱۱/۵۸)۔  
لیکن عام حالات میں بِشَارَۃٌ اچھی خبر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا  
ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حسن و جمال کے ساتھ ظاہر ہو جانا  
ہیں۔

أَبْشَرَ اور اسْتَبْشَرَ کے معنی بھی خوش ہونے کے آتے ہیں۔ چنانچہ  
سورۃ زمر (۳۹/۶۵) میں اَشْمِئِزْ اَزْ کے مقابلہ میں اَسْتَبْشَرَ آیا ہے۔ اَشْمِئِزْ اَزْ  
کے معنی منقبض ہونے کے ہیں۔

الْبَشَارَۃُ\* (بالفتح) کے معنی حسن و خوبصورتی کے بھی آتے ہیں۔  
الْبَشِيرُ\* خوشخبری دینے والے کو کہتے ہیں۔ اَلْبَشِيرُ\* خندہ پیشانی اور  
کشادہ روئی کو کہتے ہیں۔ التَّبَشِيرُ\* کے معنی خوشخبری کے ہیں، نیز ہر چیز  
کے ابتدائی حصے کے۔ صبح کے وقت روشنی کی پہلے پہل رونما ہونے والی  
کرنوں کو بھی کہتے ہیں۔

الْبَشِيرَاتُ\* ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو سحاب بردوش آتی ہیں اور  
بارش کی خوشخبری دیتی ہیں۔ مزید برآں دیکھئے تہ ص ۱۸۵ جلد چہارم عنوان ب ش ر۔

## ب ص ر

بَصَرَ\*۔ قوتِ بینائی۔ (اس میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ہوتا ہے)  
چنانچہ تیر کے پہل پر جو تھوڑا سا خون لگ جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا  
ہے کہ وہ کسی شکار کے لگا ہے، اسے بَصِيرَةٌ کہتے ہیں۔ خون کا نشان یا ٹیکا جس کے ذریعے شکار کی  
نشاندہی ہوتی ہو نیز چمکدار ڈھال اور زرہ بھتر کو بھی۔ اس زمین کو جس میں چمکدار اور نرم پتھر ہوں  
بَصْرَةٌ کہتے ہیں۔ سخت زمین نیز سفید پتھر کو بھی (تاج)۔ راغب نے چمکدار کا اضافہ کیا ہے۔ ابن فارس  
نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو جان لینا اور کسی چیز کا مونا ہونا ہیں۔

صاحب مصباح نے کہا ہے کہ بَصَرٌ اس روشنی کو کہتے ہیں جس سے آنکھ مَبْصِرَات (نظر آنے والی چیزوں) کا ادراک کر لیتی ہے۔ اسکے بعد آنکھ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ نیز بَصَرٌ کے معنی کسی چیز کا دل میں اتر جانا ہیں۔ اسی وجہ سے اسکے معنی علم کے آتے ہیں۔ بَصِيرٌ دیکھنے والے کو نیز عالم کو کہتے ہیں۔ اور بَصِيرَةٌ قوتِ ادراک یا ذہانت و فطانت کو کہتے ہیں۔ نیز حجت اور دلیل کو۔ اور یقین و ارادہ کو۔ اور عبرت و موعظت کو۔ بَصِيرَةٌ کے معنی گواہ اور شاہد کے بھی آتے ہیں\*۔

قرآن کریم نے اس مادہ کو عام دیکھنے کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے آمُ لَہُمْ اَعْمٰیۡنُ \* یُبْصِرُوۡنَ یَہٰتَا (۱۹۵) ”کیا انکی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں“۔ اور بَصِيرٌ کے مقابل اَعْمٰی (اندھا) کا لفظ لا کر (۱۹۵) ان معانی کو واضح کر دیا ہے۔ لیکن اس نے نَظَر اور بَصَر کے باریک فرق کو نہایت عمدگی سے واضح کر کے بتا دیا ہے کہ بصیرت کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ تَرٰہُمْ یَنْظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَہُمْ لَا یُبْصِرُوۡنَ (۱۹۸)۔ ”تو دیکھتا ہے کہ انکی آنکھیں تیری طرف ہیں (نظر) لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوئے“ (لَا یُبْصِرُوۡنَ)۔ یہاں سے نَظَر اور بَصَر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ انہی لوگوں کو (سورۃ یونس) میں عُمٰی (اندھے) کہا ہے۔ یعنی جو بصیرت سے کام نہیں لیتے (نہم)۔ نیز (۱۹۶) میں انہی جیسوں کے متعلق کہا ہے کہ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ تیری بات سن رہے ہیں حالانکہ وہ اسوقت کسی اور خیال میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور (جیسا کہ ش۔ م۔ ع کے عنوان میں بتایا جائیگا) \* بَصِيرَةٌ اسکی ہوتی ہے جو اپنے علم سے وحی کی راہ نمائی میں کام لے۔ (۱۹۷) میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے\*۔ مومن، صاحب بصیرت ہوتے ہیں، یعنی وحی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لینے والے۔

قرآن کریم میں بَصِيرَةٌ گواہ اور شاہد کے معنوں میں بھی آیا ہے (۱۹۸)۔ مَبْصِرَةٌ (۱۹۹) کے معنی روشن اور واضح دلیل کے ہیں۔

بصیرت سے سمجھ لینے کے معنوں میں یہ لفظ (بَصِيرًا) سورۃ یوسف میں (۱۹۹) میں آیا ہے۔ قرآن نے اپنے آپکو بَصَائِرُ کہا ہے (۱۹۵)۔ یعنی واضح دلائل۔ کھلی ہوئی حقیقتیں۔ روشن علم۔ مزید برآں دیکھتے تہمتہ ص ۱۸۵ / ۱۸۶ جلد ہفتم عنوان پانچواں

\* تاج۔ \*\* (اس مفہوم کی وضاحت کیلئے س۔ م۔ ع۔ ق۔ ل۔ ب اور خ۔ ت۔ م کے عنوانات دیکھئے)۔



## ب ص ل

بَصَلَ\* - پیاز کو کہتے ہیں\* -  
قرآن کریم میں یہ لفظ (۱/۶۹) میں آیا ہے -

## ب ض ع

الْبِضْعُ\* - کاٹنا - بَضَعْتُ الْفَلَحِمَ - میں نے گوشت کاٹا - گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - الْبِضْعُ\* - ایک حصہ - کچھ حصہ\*\* - قرآن کریم میں ہے بِضْعِ سِنِينَ (۱۲/۱۲) - ”کچھ سال - چند برس“، لیکن یہ قین سے اوپر اور دس سے کم کے لئے آتا ہے\* - الْبِضَاعَةُ\* - سال کا وہ حصہ جس سے تجارت کی جائے\*\* - سامان تجارت - ہونجی - سورة يوسف میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے - وَأَسْرُوهُ بِضَاعَةً (۱۲/۱۶) ”انہوں نے اسے سال تجارت سمجھ کر چھپائے رکھا“، - بِضَاعَتَهُمْ\* ”ہونجی“، - (۱۲/۱۶) و (۱۲/۱۷) -

## ب ط ا

بَطُو\* - يَبْطُو\* - بَطَاءٌ\* - تاخیر کرنا - ”بَطُوْا“ - ان کے جانور سست رفتار ہو گئے\* - راغب نے لکھا ہے کہ ”الْبَطُوْا“ کے معنی ہیں چلنے یا اٹھنے میں دیر لگانا۔ اس اعتبار سے اس نے سورة نسا کی اس آیت (وَأَن مِّنْكُمْ لَمَن لَّيْسَ بِطَائِفٍ) کے معنی کئے ہیں، ”وہ لوگ جو خود بھی دیر لگائیں گے اور دوسروں سے بھی دیر لگوائیں گے“، -

## ب ط ر

”الْبَطَرُ\* - کسی نا اہل کو اگر بہت سی دولت اور قوت مل جائے تو اس سے اس میں جو تکبر، اکثر فون، اوجھا پن اور اترانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسے بَطَرُ\* کہتے ہیں - اصل میں بَطَرُ\* - يَبْطَرُ\* کے معنی ہونے ہیں پھاڑ دینا - شق کر دینا - (الْبَطَرُ\* وِثْرَنِي ذَاكَرُ كُو كَهْتِي هِي جَو حَيَوَانَاتِ كِي چیر پھاڑ کرتا ہے) - چونکہ کثرت مال و دولت سے تنگ ظرف انسان کا دیدہ بھٹ جاتا ہے اسلئے اس نفسیاتی کیفیت کو بَطَرُ\* کہتے ہیں - ”الْبَطَرُ\*“ ”الْمَالُ\* - مال و دولت نے اس میں اوجھا پن پیدا کر دیا\* -

قرآن کریم میں ہے الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ بَطَرًا (۸/۸) - ”جو اپنے گھروں سے اکلے اور اترانے ہوئے نکلے“، - سورة قصص میں ہے - بَطَرَتْ مِعْيَشَتَهَا (۲۸/۲۸) - جو قومیں اسباب زیست کی فراوانیوں پر اتراتی تھیں -

## ب ط ش

بَطَشٌ - يَبِطِشُ - کسی چیز کو زبردستی اور طاقت کے ساتھ لیے لینا۔  
الْبَطْشُ - سخت گرفت - جنگ - بَطْشٌ عَلَيْهِ - اس پر تیزی سے حملہ کیا۔\*

قرآن کریم میں ہے اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَبِطُشُونَ يَهَا (۱۹۵) ”کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کسی چیز کو گرفت میں لیے سکتے ہیں“۔ اِنْ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ (۹۴) - ”تیرے رب (کے قانون مکافات) کی گرفت بڑی سخت ہے،۔۔۔ يَوْمَ تَبِطُشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى (۲۰)۔“ جس دن ہم سب سے بڑی شدید گرفت سے پکڑینگے،، (جب ظہور نتائج کا وقت آئیگا)۔ یہ تو قانون عدل و انصاف کی گرفت ہے۔ دوسری طرف ظلم و استبداد کی گرفت ہے جسے ہلاک ہونے والی قوموں کا شیوہ بتایا گیا ہے۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطْشَتُمْ جَبَّارِيْنٌ (۱۰۱) ”جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو جابرانہ انداز سے پکڑتے ہو،،۔ کمزور انسانوں کو اس گرفت سے چھڑانے کے لئے خدا کا نظام آتا ہے جو ظالموں کو اپنی گرفت میں لیے لیتا ہے۔

## ب ط ل

بَاطِلٌ - قرآن میں حَقِّق کے مقابلہ میں بَاطِلٌ آیا ہے (مثلاً ۲۱)۔ لہذا بَاطِلٌ کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے حَقِّق کا عنوان دیکھئے جہاں اس کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ یعنی ہر وہ چیز یا تصور یا نظریہ جو حق نہیں، وہ بَاطِلٌ ہے۔ مثلاً حَقِّق کے معنی ٹھوس تعمیری نتائج کے ہیں۔ اسلئے بَاطِلٌ کے معنی تخریبی کوششوں کے یا ایسی کوششوں کے ہونگے جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ یعنی بَاطِلٌ صرف تخریبی کوششیں ہی نہیں بلکہ ہر وہ کام باطل ہے جسکا کچھ نتیجہ نہ نکلے۔ چنانچہ بَطْلُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کا بونہی ضائع چلا جانا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا جاتے رہنا اور کم ٹھہرنا ہوتے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ جب کسی چیز کو کسوٹی پر پرکھا جائے اور وہ اس پر پوری نہ اترے تو اسے بَاطِلٌ کہتے ہیں۔ یعنی حَقُّ وہ جو کسوٹی پر پورا اترے اور بَاطِلٌ وہ جو معیار پر پورا نہ اترے۔

اِبْطَال کے معنی ہیں کسی چیز کو خراب کر دینا اور زائل کر دینا خواہ وہ چیز حَقِّ ۛ ہی کیوں نہ ہو۔ بَطْلُ ۛ لَا جِبْر ۛ کے معنی ہیں مزدور بیکار ہو گیا۔ \*صاحب محیط کے نزدیک بَطْلِل ۛ ان چیزوں کو کہتے ہیں کہ جن مفادات و مقاصد کیلئے وہ بنائی گئی تھیں ان میں وہ مفادات مین ۛ کئی ۛ۔ وَجْہ ۛ (پوری طرح) باقی نہ رہیں اور انکی صرف صورت باقی رہ جائے ۛ۔ \* (چنانچہ وہ کہتا ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ اس مادہ کے اصلی معنی خالی ہونا ہوں) ۛ۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے مذہب کے وہ تمام اعمال باطل قرار پا جاتے ہیں جنہیں محض رسماً ادا کیا جائے اور ان سے وہ فائدے حاصل نہ ہو رہے ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ (ح۔ ک۔ م کا عنوان دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے قرآن میں قوانین کے ساتھ یہ بھی خود ہی متعین کر دیا ہے کہ ان قوانین سے کیا کیا نتائج مرتب ہونگے)۔ اسی لئے قرآن میں نِعْمَۃ ۛ کے بالمقابل بَطْلِل ۛ آیا ہے (۱۹۹: ۱۰۰) اس لئے کہ حق پر عمل پیرا ہونے کا لازمی نتیجہ نعمائے حیات کا ملنا ہے۔ اور جہاں نعمائے نہ ہوں ظاہر ہے وہاں حق نہیں باطل کار قمرسا ہے، خواہ ہم اپنے ذہن میں اسے کیسا ہی حق کیوں نہ سمجھ لیں۔ یا حَقِّ ۛ کے معنی ہیں وہ شے جو اپنی جگہ پر اٹل ہو، محکم ہو۔ اسلئے بَطْلِل ۛ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں ثبات نہ ہو ۛ۔ یعنی وہ بظاہر نظر آئے لیکن جب تحقیق کی جائے تو اس میں ثبات دکھائی نہ دے ۛ۔ چنانچہ قرآن میں ہے جَاءَ الْحَقُّ وَوَرَّى الْبَاطِلُ ۛ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوًۢقًا ۛ (۸۱: ۱۰)۔ ”حق آگیا اور باطل تباہ ہو گیا۔ باطل ہوتا ہی تباہ ہونے والا ہے۔“ باطل کہتے ہی اسے ہیں جو باقی رہنے والا نہ ہو۔ وہ اسوقت تک باقی رہتا ہے جب تک حق نہیں آتا۔ چراغ آپا، اور اندھیرا گنا۔ لہذا باطل کو مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام (حق) کو عمل میں لا با جائے۔ تعمیری کوششیں کی جائیں۔ انکے محکم نتائج سے تخریبی اور بیکار کوششیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الْفَسِيَّاتِ ۛ (۱۱۳: ۱۰)۔ ہمواریوں اور خوشگواروں سے ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں خود بخود مٹ جاتی ہیں۔ ناہموار جگہ کو ہموار کر دیجئے، اسکی ناہمواری خود بخود مٹ جائیگی۔

اسی طرح حق کے مختلف معانی کو دیکھئے اور جو چیز اسکی نقیض ہو اسے باطل سمجھئے۔ نیز دیکھئے تَمَمَّۃ ص ۱۸۱۶ جلد چہارم عنوان ب ط ل تحت ص ۳۲۶۔

بَطَالٌ وَبَطَلٌ \* - بہت بہادر آدمی جو دوسرے کے خون کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا اور اسے یونہی ضائع کر دیتا ہے \* -

بَطْنٌ کے معنی پیٹ۔ اندرونی حصہ۔ اس کی جمع بَطُونٌ ہے۔

الْبَطْنُ \* - ظہر کی ضد ہے \* - محیط میں ہے کہ اصلی معنی اس مادہ میں خالی ہونا۔ فارغ ہونا ہیں \* - راغب نے کہا ہے کہ ہر چیز کی نیچے کی جہت (Side) کو بَطْنٌ کہتے ہیں اور اوپر کی طرف کو ظہر \*\*\* -

الْبَطْنُ \* - پیٹ کو کہتے ہیں - جمع بَطُونٌ \* - ہر چیز کا اندرونی حصہ - بَطْنُ الْأُمِّرِ - معاملہ کی اندرونی حالت \* -

الْبَطَانَةُ مِنَ الثَّوْبِ کپڑے کا استر۔ اندرونی حصہ۔ اس کی جمع بَطَائِنُ ہے (۵۶)۔ یہیں سے اس کے معنی رازداں کے آتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو اندر آ جا سکے اور اندرونی معاملات پر واقفیت رکھ سکے \* - قرآن میں ہے لَا تَتَّبِعُوا بَاطِلًا مِّنْ دُونِكُمْ (۱۶۷)۔ "اپنی جماعت کے افراد کے علاوہ کسی اور کو ایسی ہوزیشن نہ دو کہ وہ تمہارے اندرونی رازوں سے واقف ہو جائے"، - زجاج نے کہا ہے کہ الْبَطَانَةُ وہ دخیل لوگ کہلاتے ہیں جن کے ساتھ کھل کر بات کی جاتی ہو اور انہیں رازوں میں شریک کر لیا جاتا ہو۔ نیز اس کے معنی راز کے بھی آتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ آیا ہے (۵۷)۔ اس کے پورے پورے مفہوم کیلئے (ظ - ہ - ر) کا عنوان دیکھئے۔ جب نگہ بصیرت کائنات کے تخلیقی مظاہر پر غور کرے تو وہ خالق کائنات کے متعلق اندازہ کر سکتی ہے۔ یعنی اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس مخلوق کا کوئی خالق بھی ہے اور اس مجیر العقول مشنری کے پیچھے کوئی بڑی علیم و حکیم قوت کام کر رہی ہے۔ اس اعتبار سے خدا الظَّاهِرُ ہے۔ لیکن وہ اپنی کنہ و حقیقت کے اعتبار سے نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۱۷)۔ "وہ نگاہوں کے ذریعے ہمارے ادراک میں نہیں آ سکتا"، - اس لحاظ سے وہ الْبَاطِنُ ہے۔ (ظہور اور بطون کے دوسرے گوشے (ظ - ہ - ر) کے عنوان میں سامنے آئینگے۔ اسے بھی ساتھ ہی دیکھ لیجئے)۔ یاد رکھئے، هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے یہ مراد لینا کہ جو کچھ کائنات میں ظاہر ہے وہ بھی خدا ہے اور جو اس کے باطن میں

ہے وہ بھی خدا ہی ہے۔ یعنی ان محسوسات کے پردوں میں خود خدا ہے، باطل عقیدہ اور قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس عقیدہ کو تصوف کی اصطلاح میں ”وحدت وجود“، یا ”ہمہ اوست“، کہا جاتا ہے جو ہندوؤں کے فلسفہ و یدانت کا چربہ ہے۔ ظاہر الّا تہربا طنہ (۱۳۱) سے مراد ہے گناہ کی محسوس و غیر محسوس شکلیں، اس میں نگاہ کی خیانت اور دل میں ترزرنے والے خیالات تک آجاتے ہیں۔

## ب ع ث

بَعَث کے بنیادی معنی ہیں وہ چیز جو کسی کی آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں حائل ہو اسے راستہ سے ہٹا دینا، اس قسم کے موانع کو زور کر دینا، اور یوں اس کی حرکت کو جاری کر دینا۔ بَعَثُ النَّفَاقَةِ۔ اس نے اونٹنی کی رسیاں وغیرہ کھول کر اسے آزاد چھوڑ دیا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ابھارنے اور اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ سورۃ تطفیف میں ہے کہ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنۡتَہُمۡ مَّبۡعُوۡنَ وۡنَ۔ لَيۡسَ وۡمَ عَظِيۡمَ (۸۳) اس سورۃ میں قرآن کریم نظام معیشت کے ایک بنیادی اور عظیم اصول کو سامنے لایا ہے۔ اس نے پہلے یہ کہا ہے کہ نظام سرمایہ داری میں ”تاجرانہ ذہنیت“ یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار جب دوسرے سے لیتا ہے تو پورا پورا لیتا ہے اور جب (مزدور کو) دیتا ہے تو جس قدر وہ پیدا کر کے دیتا ہے، اسے اس سے کم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد ہی اس ذہنیت اور منہاج پر ہے۔ لیکن خدا کا قانون یہ نہیں چاہتا۔ وہ کسی کو اس سے کم نہیں دینا چاہتا جو وہ پیدا کرتا ہے۔ اس سے پورے کا پورا معاشی نظام بدل جاتا ہے۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حامل یہ سمجھتے ہیں کہ جو نظام انہوں نے قائم کر رکھا ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ یہ نظام ضرور الٹ کر رہیگا۔ اس لئے ان لوگوں کو جو یوں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے (اَنۡتَہُمۡ مَّبۡعُوۡنَ وۡنَ) تو یہ اس انقلاب عظیم تک کے لئے (لَيۡسَ وۡمَ عَظِيۡمَ) ہے جس میں تمام نوع انسانی، اس غلط نظام سے تنگ آ کر، خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی (يَوۡمَ يَقُوۡمُ النّٰفَاسُ لِرَبِّہِۭا لِّعَالَمِیۡنَ) (۱۳)۔ نظام سرمایہ داری جو اس طرح بے روک ٹوک (ناقہ) بے زمام کی طرح) بڑھے جا رہا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تنگ آ کر، بہ ہیئت مجموعی، نظام ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے، جس میں لینے اور دینے میں کم اور بیش کا سوال ہی نہیں ہوگا۔

الْبَعَثُ کے معنی کسی کو بھیجنے کے بھی ہیں۔ ثُمَّ "بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ هِم مُوسَى (۱۸۰)" "پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو بھیجا،،۔ نیز کسی بیٹھی ہوئی چیز کو اٹھا دینا نیز یہ لفظ نیند سے جگا دینے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے\*۔ (دیکھئے: ۱۶۰)۔ اَلْبَعِثُ۔ راتوں کو بار بار جاگنے والا۔ اِنْبَعَثَ فُلَانٌ لِشَانِهِ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص جذبہ میں بھر کر اٹھ کھڑا ہو اور اپنا کام کرنے کو چل دے۔

بَاعِثُ کے معنی سبب یا جذبہ محرکہ کے بھی ہیں (Cause or Motive) کیونکہ وہ عمل کے راستہ کے موانع کو ہٹا کر انسان کو کام کے لئے اٹھا دیتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ "بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ" (۲۰۶)۔ "پھر ہم نے تمہیں غش کی حالت کے بعد اٹھا کر کھڑا کیا،،۔ یعنی تمہارے ہوش کی راہ میں جو موانع تھے انہیں دور کر کے پھر سے ہوش میں لے آئے۔ اسی سورۃ میں آگے ہے فَاَمَاتَهُ اللهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ (۲۵۹)۔ "پھر اللہ نے اسے سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور پھر اسے اٹھا کھڑا کیا،،۔ یہ قوموں کی اجتماعی موت اور زندگی کا تشبیلی بیان ہے۔ یہاں بَعَثُ کے معنی ان موانع کو دور کرنے کے ہیں جو کسی قوم کی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بنی اسرائیل کی یہی حالت رہی تھی۔ (تفصیل میری کتاب "برق طور،، میں ملیگی)۔

رسول بھیجنے کے معنوں میں دیکھئے (۱۶۹) اور کسی کو کسی کام کیلئے مقرر کر دینے کے معنوں میں (۳۳) میں، جہاں کہا ہے فَاَبْعَثُوا حِکْمًا مِنْ اَهْلِهِ۔ "اس کے خاندان میں سے کسی کو ثالث مقرر کر دو،،۔

بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ (۱۵۰) کے معنی ہیں، تم پر انہیں غالب کر دیا۔

یَوْمَ الْبَعْثِ یا یَوْمَ یُبْعَثُونَ۔ یَوْمَ الدِّیْنِ کی طرح قرآن کی اہم اصطلاحات ہیں جن کا صحیح مفہوم ہر مقام پر سیاق و سباق کے مطابق متعین کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی معنی ان کے حیاتِ فو یا ظہور نتائج کے وقت کے ہیں۔ خواہ یہ حیاتِ نو اسی دنیا میں (قوموں کی اجتماعی موت کے بعد) ملے۔ یا مرنے کے بعد دوسری زندگی (حیاتِ آخرت کی شکل میں)۔

## ب ع ث ر

بَعَثَرَهُ - اسے دیکھا اور تلاش کیا - بَعَثَرَ الشَّيْءُ - اس نے اس چیز کو نکال کر اسے کھول دیا - بَعَثَرَ الْحَوْضَ - اس نے حوض کو منہدم کر کے اس کے نچلے حصے کو اوپر کر دیا - بَعَثَرَ مَتَاعَهُ، اس نے اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیا - اَلْبَعَثَرَةُ - جی مٹانے کو کہتے ہیں\* - اس میں بھی الٹ پلٹ کرنے کا تصور موجود ہے -

قرآن میں ہے "وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ" (۸۲) - "جب قبور کو الٹ پلٹ کیا جائیگا،، - (قُبُورٌ کیلئے دیکھئے عنوان (ق - ب - ر) - جب تلاش و تفتیش کے بعد دبی ہوئی چیزیں نکلی جائیں گی - یعنی إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ (۹۶) - جو کچھ قبور میں ہے جب اسے باہر نکالا جائیگا،، -

## ب ع د

بُعْدٌ دوری، دور ہونا، یہ قَرَبٌ کی ضد ہے قَرِيبٌ بمقابلہ بَعِيدٌ (۲۱۹) - بَعِيدٌ - يَبْعُدُ - بَعْدًا وَ بَعْدًا - ہلاک ہونا - تباہ و برباد ہو جانا\* - (زندگی کی خوشگوار یوں سے دور ہو جانا) - بَعْدًا "لِيَلْقَوْا الشَّظِيلِينَ" (۱۱ و ۱۲) "ظالم قوم کے لئے تباہی ہے،، - ان کے لئے زندگی کی خوشگوار یوں سے محرومی ہے - بَعِيدٌ وَ بَاعِيدٌ وَ بَعَادٌ - دور ہونے والا - تباہ ہونے والا\* - بَعْدٌ - قَبْلٌ کی ضد ہے - یعنی گزرے ہوئے زمانہ کے بعد آنے والا زمانہ\* -

أَلَّا بَعْدٌ - أَقْرَبٌ کی ضد ہے - نیز خائن کو بھی کہتے ہیں - اور اَلْبُعْدَاءُ - اجنبی لوگوں کو کہتے ہیں\* -

بَعْدٌ کے معنی غَیْرُ کے بھی آتے ہیں - فَمَنْ يَهْدِ يَهْدِ مِّنْ بَعْدِ اللَّهِ (۲۵) - اسکے معنی ہیں "خدا کے سوا" مِّنْ غَيْرِ اللَّهِ،، اسے کسوں راہ نمائی دے سکتا ہے،، - صحیح راہ نمائی صرف خدا کے قانسون سے مل سکتی ہے -

نیز اسکے معنی "با وجود،، کے بھی ہیں - فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۸) - "جو اسکے باوجود سرکشی اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے درد ناک عذاب ہے،، -

## ب ع ر

”لَبْعِیْرٌ“ - اونٹ - جوان اونٹ - نیز ”لَبْعِیْرٌ“ گدھے کو بھی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ اس جانور کیلئے بولا جاتا ہے جس پر بوجھ لادا جائے۔ بار برداری کا جانور۔ ”لَبْعِیْرٌ“ - مینگنی کو کہتے ہیں\* - سورة یوسف میں ”حِمْلٌ“ ”لَبْعِیْرٌ“ (۱۲) آیا ہے - یعنی ایک اونٹ (یا گدھے) کا بوجھ -

## ب ع ض

”بَعْضٌ“ - ہر چیز کا کچھ حصہ خواہ وہ کم ہو یا زیادہ (۲/۸) - مثلاً آٹھ، دس کا بعض ہے اور دو بھی دس کا بعض ہے۔ آٹھ اور دو دونوں ملکر دس ہو جاتے ہیں۔ ”بَعْضُ الشَّیْءِ“ کے معنی ہیں چیز کو تقسیم کر دیا۔ ”تَبْعِیْعُضٌ“ کے معنی ہیں الگ الگ کر دینا - تقسیم کر دینا\* -

سورة بقرہ میں ہے ”اِذَا خَلَا بِبَعْضِهِمْ“ (۲/۶) - ”جب ان میں سے کچھ لوگ اپنے دوسرے لوگوں سے خلوت میں ملتے ہیں یا انکی طرف چلے جاتے ہیں،، - ”بَعْضُنَا“ - ”ہم میں سے کوئی یا کسی نے،، - بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ ”بَعْضٌ“ کے معنی کُلِّ کے بھی آتے ہیں اور اسکی تائید میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے - ”یُصِیْبُکُمْ بِبَعْضِ الْقَدْرِ یَعِیْدُکُمْ“ (۲/۸) ”جن باتوں کی تمہیں دھمکی دی جاتی ہے وہ سب تم پر واقع ہو کر رہینگی،،\*\* - لیکن اس کے معنی ”بعض،، بھی ٹھیک ہیں - نیز (۲/۳۳) -

”بَعُوْضَةٌ“ (جسکی جمع ”بَعُوْضٌ“ آتی ہے) مچھر کو کہتے ہیں (۲/۶) - چونکہ باقی حیوانات کے مقابلہ میں اسکا جسم بہت چھوٹا ہوتا ہے اسلئے یہ ”بَعْضٌ“ سے ماخوذ ہے\*\*\* -

## ب ع ل

”بَعْلٌ“ - بلند زمین جس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکتا ہو - ہر درخت، بوذا یا کھیتی جو بغیر آب ہاشی کے اپنی جڑوں سے آپ پانی کھینچ لے - بلندی اور غیر محتاجی کے اعتبار سے ”بَعْلٌ“ کے معنی مالک اور آقا کے ہو گئے - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) صاحب (۲) حیرت اور دھشت اور (۳) اونچائی لکھے ہیں - ”صاحب،، میں رفیق اور ساتھی بھی آجاتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اہل عرب اپنے بتوں کا نام ”بَعْلٌ“ رکھتے تھے کیونکہ وہ



انہیں بلند اور برتر خیال کرتے تھے۔ اسی طرح چونکہ ان کے معاشرہ میں تصور یہ تھا کہ مرد، عورت پر غالب ہوتا ہے اسلئے وہ خاوند کو بھی بَعْل کہنے لگے۔ اسکی جمع بَعُولۃ ہے۔ نیز ہر اس چیز کو جو دوسری چیزوں پر غلبہ و استیلاء رکھتی ہو۔ لیکن چونکہ انہیں اسکا بھی احساس تھا کہ ہر مستبد اور متغلب دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے اسلئے وہ بوجھ کو بھی بَعْل کہتے تھے۔ چنانچہ اَصْبَحَ قَلَانٌ بَعْلًا عَلٰی اَعْلٰیہ کے معنی ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں پر بوجھ بن گیا ہے۔\*

چونکہ عربوں میں خاوند کیلئے بَعْل کا لفظ رائج تھا اسلئے قرآن کریم میں بھی یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے (۲۳۸ و ۲۳۹)۔ یعنی غلبہ و استیلاء کے معنوں میں نہیں بلکہ خاوند کے معنوں میں۔ بلکہ لین نے (مختلف اسناد سے) لکھا ہے کہ زَوْج کی طرح بَعْل بھی خاوند اور بیوی دونوں کے لئے آتا ہے۔ نیز جس طرح زَوْج سے زَوْجۃ آتا ہے اسی طرح بَعْل سے بَعْلۃ آتا ہے۔ اس لئے اس میں غلبہ و استیلاء کا مفہوم نہیں۔ صرف میاں بیوی ہونے کا مفہوم ہے۔ قرآن کریم نے جب نکاح کو بہ طیب خاطر معاہدہ قرار دیا ہے تو اس میں کسی فریق کے غلبہ و استیلاء کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

صاحب محیط کے نزدیک بَعْل اور زَوْج میں فرق یہ ہے کہ زَوْج تو ہر خاوند کو کہتے ہیں لیکن بَعْل اسوقت کہتے ہیں جب وہ بیوی سے جنسی اختلاط کر چکا ہو\*\*\*۔

حضرت الیاسؑ کی قوم اپنے بت کو بَعْل کہتی تھی (۳۴)۔ یہ سامی قبائل میں سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام میں خصوصیت سے اسکی پرستش ہوتی تھی۔ تورات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے (مثلاً تواریخ ۲ - ۳۳)۔

## ب غ ت

اَلْبَغْتُ وَالْبَغْتَةُ۔ یکبارگی۔ اچانک۔ اَلْمُبَاغْتَةُ۔ ایک دوسرے کے پاس اچانک پہنچ جانا\*۔ راعب نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے نمودار ہو جانا جہاں سے گمان بھی نہ ہو\*\*۔ قرآن میں ہے اِذَا جَاءَ تَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً (۳۱) ”جب ان پر الساعۃ اچانک آجائیگی،“۔ (السَّاعَةُ کس طرح اچانک اور یکبارگی آتی ہے، اسکے لئے

س۔ و۔ ع کا عنوان دیکھئے)۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے: ”إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً“ (۱/۲۱)۔ ”تم پر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا اسطرح کہ پہلے اس کی علامات ظاہر طور پر تمہارے سامنے آئیں اور اس کے بعد عذاب آئے“۔ اس سے واضح ہے کہ بَغْتَةً اُس انداز کو کہہینگے جس میں کوئی واقعہ تدریجی یا ارتقائی طور پر (By Evolution) نمودار نہ ہو بلکہ انقلابی طور پر (By Revolution) یا دور حاضر کی تحقیق کے مطابق، فجائی ارتقاء کے طریق سے (by Emergent Evolution) واقع ہو۔ اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہر عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے کچھ وقت کے بعد آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں ہے فَلَمَّا آخَسَوْا بَنَاهُمْ سِنًا... (۲۱/۲۱)۔ ”جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا،... یعنی وہ عذاب غیر محسوس شکل میں تو پہلے سے مرتب ہو رہا تھا لیکن ان کے سامنے محسوس شکل میں بعد میں آیا تھا۔ بعض صورتوں میں اس آنے والے عذاب (یعنی نتائج) کی علامات ظہور سے پہلے سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ (اسے جَهْرَةً کہہینگے)۔ اور بعض اوقات اس کا علم اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے (یہ بَغْتَةً ہے)۔ یعنی فَاتَتْهُمْ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ“ (۳۹/۴۵)۔ ”ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کی انہیں خبر تک نہ ملی“۔ جو ان کی عقل و شعور میں نہیں آسکتی۔ سطح بین قومیں اپنی تباہی کے اسباب کا اندازہ ان واقعات اور عناصر سے لگانے کی کوشش کرتی ہیں جو تباہی واقع ہونے کے وقت محسوس طور پر ان کے سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان اسباب کا سراغ درحقیقت بہت پیچھے جا کر لگانا چاہئے۔

## ب غ ض

أَلْبَغُضُ۔ یہ لفظ الْحُبُّ (محبت) کی ضد ہے۔ یعنی کسی چیز سے دل کا متنفر اور بیزار ہونا، أَلْبَغُضَاءُ۔ شدت بغض کو کہتے ہیں\*۔ (۱۱/۳۰)

## ب غ ل

أَلْبَغْلُ۔ خچر\*۔ جمع بَغَالٌ (۱/۸)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جسمانی قوت کے ہیں۔ خچر کو أَلْبَغْلُ اسکی مضبوطی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ أَلْبَغْلُ جِسْمٌ كَامِلٌ اور سخت ہونا\*۔ چونکہ خچر گھوڑی اور گدھے کے اختلاط سے وجود میں آتا ہے اس لیے ہر اس جانور کو بھی\* تاج۔ راعب۔ محیط۔ بَغْلٌ کہتے ہیں جو دو مختلف جنسوں کے ملاپ سے پیدا ہو۔

## ب غ ی

الْبَغْيُ - درمیانہ روی کی حد سے بڑھ جانے کی خواہش (خواہ حد سے تجاوز کر سکے یا نہ کر سکے) - الْبَغْيُ بہت زیادہ ہارش کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھ جائے - بَغْتِ السَّمَاءِ بادل اپنی حد سے بڑھ گیا - بہت زیادہ برسا - یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) کسی چیز کو طلب کرنا - اور (۲) بگڑ جانا ہیں -

فَيْئَةٍ بَغْيَةٍ اس جماعت کو کہتے ہیں جو حدود شکنی کرے اور نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہو - اور الْبَغْيَا ان ہراول دستوں کو کہتے ہیں جو لشکر کے پہنچنے سے پہلے انتظامات کرنے کے لئے چلتے ہیں -

بَغْيِي يَبْغِي - اس نے تکبر کیا اور اپنی حد سے بڑھ گیا - تَبَاغَوْا - ایک دوسرے پر زیادتی کرنا -

بَغْتِ الْمَرْأَةُ يَبْغَاءُ - عورت اپنی حدودِ عفت سے بڑھ گئی اور زنا کی مرتکب ہو گئی - بَغْيٌ اور بَغْوٌ زنا کار عورت کو کہتے ہیں - بَغْيٌ عَلَيْهِ کسی پر زیادتی کرنا - ظلم کرنا - دست درازی کرنا - نیز حسد کرنا (کہ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا ہے) -

اِبْتِغَاءٌ - کسی چیز کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرنا - اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محدود ہو جاتی ہے - ورنہ مذموم \* -

اَلْبَغْيَةُ اور اَلْبَغْيَةُ - اس مطلوب چیز کو کہتے ہیں جس کے حصول کی اس طرح کوشش کی جائے - اس گم گشتہ چیز کو بھی کہتے ہیں جسکی بہت زیادہ تلاش کی جائے - اَلْبَغْيُ - تلاش کرنے والے کو بھی کہتے ہیں \* -

اَلْبَغْيُ الشَّيْءُ کے معنی میں کسی چیز کا آسان ہو جانا، مہیا ہو جانا، یا مناسب ہونا - چنانچہ مَا يَنْبَغِي کے معنی ہیں، یہ درست نہیں - یہ مناسب نہیں - یہ ممکن نہیں - جائز نہیں \* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ يَنْبَغِي میں دو چیزوں میں سے ایک کی طرف رجحان اور دوسری کے جواز کا پہلو مضمحل ہوتا ہے \*\* - سورة يٰس میں ہے وَمَا عَلَّمْنَاهُ اِلْتِعَارَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ (۳۶) - ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی

ایک داعی انقلاب کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ اس پر حقائق کے مقابلہ میں جذبات غالب ہوں۔ (یہی شاعر کی نفسیات ہے) ”اِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِیْنٌ“ (۳۶)۔ اسے جو کچھ دیا گیا ہے وہ تاریخ کے محکم نوشتے ہیں اور زندگی کے واضح قوانین۔ ان میں جذباتی تلون انگیزیوں کا کیا دخل؟ (مزید تفصیل ش۔ ع۔ ر کے عنوان میں ملیگی)۔

سورۃ حج میں ہے ”بُنِیْ عِلْمُہ“ (۲۲) جس پر زیادتی ہوئی ہو، قارون کے متعلق ہے کہ ”فَبَغَىٰ عِلْمُہِم“ (۲۸) ”وہ ان پر زیادتی کرتا تھا،“ یا ان سے آگے بڑھا ہوا رہنا چاہتا تھا۔ نیز اس کے معنی حکومت اور سلطنت طالب کرنے کے بھی ہیں \*۔

سورۃ النساء میں ہے ”وَلَا تَهِنُوا فِی الْبَغَاءِ الْقَوْمِ“ (۲۷) ”دشمن کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو،“ اس کی تلاش میں پیچھے جانے کی پوری پوری کوشش کرو۔ سورۃ آل عمران میں ”بَغِیَاءَ الْفِتْنَةِ“ (۶) آیا ہے۔ یعنی فتنہ پیدا کرنے کی انتہائی خواہش۔

سورۃ نور میں ”الْبَغَاءُ“ کا لفظ زنا کاری کے لئے آیا ہے (۲۴)۔ لیکن سورۃ مریم میں ”بَغِیًّا“ کا لفظ حدود شکن کیلئے (۱۹) آیا ہے۔ خاص طور پر زنا کار کے لئے نہیں۔ یعنی حضرت مریم نے کہا کہ میں ہیکل میں (Nun) کی زندگی بسر کر رہی ہوں اور (Nuns) کے متعلق ”قانون شریعت“، بد ہے کہ وہ مجرد کی زندگی بسر کریں۔ میں اس قانون کو نہیں توڑا۔ واضح رہے کہ ہیکل کے احبار و رہبان حضرت مریمؑ کے خلاف یہ الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے ہیکل سے نکل کر متاہل زندگی اختیار کر لی ہے اور یہ چیز شریعت خانقاہیت کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا تھا کہ تیری ماں تو ان حدود شریعت کو نہیں توڑتی تھی۔ (۱۹) تو نے حدود شکنی کیسے اختیار کر لی؟ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ یہ حدود، تمہاری خود ساختہ شریعت کی ہیں۔ مجھے اللہ نے نبی بنایا ہے۔ اور کتاب دی ہے۔ اُس کتاب میں ایسا کوئی قانون نہیں۔ اس لئے میری والدہ نے قانون خداوندی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ مزید برآں اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ یہودی قرآن حکیم کی مخالفت محض اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں حسد ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں سے ایک شخص کی طرف کیوں نازل ہو گیا ہے۔ اس کے لئے ”بَغِیًّا“ آیا ہے (۲۰)۔

قرآن کریم میں کھانے پینے کی حرام اشیاء کے تذکرہ کے بعد ہے فَمَنْ  
اَضْطَرَّ غَيْرَ بَسَاحٍ وَلَا عَادٍ فَلا اثمَ عَلَيْهِ (۲۸)۔ بھوک سے جس  
شخص کی جان پر اپنے تو اس پر کوئی جرم نہیں (کہ وہ ان حرام چیزوں کو  
استعمال کر لے) بشرطیکہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے۔ اور حد سے نہ  
بڑھے اور نہ ہی اسکی نیت قانون شکنی کی ہو۔ یعنی نہ تو وہ محض اس لئے  
کھائے کہ اس کا جی چاہتا ہے اور نہ ہی زائد از ضرورت لے۔

## ب ق ر

بَقَرٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو چیرنا پھاڑنا۔ جیسے کسی جانور کا  
پیٹ چاک کرنا۔ اسائے بَقَرِ الْعِلْمِ کے معنی ہیں علم کی گہری تحقیق و  
تجسس کرنا۔ بَاقِرٌ کے معنی شیر کے بھی ہوتے ہیں اور علمی محقق کے بھی\*۔  
بَقَرٌ۔ گائے اور بیل (دونوں) کو کہتے ہیں\*۔ یہ جمع ہے۔ اس کا  
واحد بَقْرَةٌ ہے۔ قصہ بنی اسرائیل میں یہ لفظ (بَقْرٌ) میں آیا ہے۔ مابعد آیات  
میں جو کچھ مذکور ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مطلب ساند تھا  
جس سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ دیوتاؤں کے نام پر ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔  
مصر میں ساند کی پرستش ہوتی تھی اور بھی جذبہ تھا جو بنی اسرائیل کے دلوں  
کی گہرائی میں (شعوری یا غیر شعوری طور پر) جا گزیں ہو چکا تھا۔ اسی جذبہ  
عقیدت کو دور کرنے کے لئے ذبح بقر کا حکم دیا گیا تھا۔

## ب ق ج

الْبَاقِعُ۔ چتکبرا کٹوا یا کتا۔ اس کے بنیادی معنی رنگوں کا مختلف  
ہونا ہیں (ابن فارس)۔ الْبَاقِيعَةُ۔ ایک پرندہ جو بہت ہوشیار اور چوکنا  
ہوتا ہے اور ہر وقت ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی شکاری اس کی گھات  
میں تو نہیں، وہ پانی پینے کے لئے بھی دوسرے پرندوں کی روش سے ہٹ کر  
کسی نامانوس جگہ پر آتا ہے\*۔ پہلے معنوں کے لحاظ سے اَرْضُ الْبَاقِيعَةِ  
اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کہیں گھاس اور سبزہ ہو اور کہیں خشکی۔  
یعنی چتکبری زمین۔ الْبَقِيعَةُ زمین کا ایسا قطعہ جو اپنے آس پاس کی زمینوں سے  
الگ ہو\*۔

قرآن کریم میں ہے فِی الْبَقِيعَةِ الْعَبَّارِ كَعَمَلِ الشَّجَرَةِ  
(۲۹)۔ ”درخت والے مبارک قطعہ زمین میں (جو باقی زمینوں سے الگ

تھا)۔ ”وَيَسِّرَ الْبَقْعَةَ“ ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو گیا ہو\*۔

## ب ق ل

بَقْلُ الشَّيْءِ\*۔ چیز ظاہر ہو گئی۔ بَقَلْتُ الْاَرْضَ\*۔ زمین پر سبزیاں نمودار ہو گئیں۔ راغب نے کہا ہے کہ بَقْلٌ\* ان سبزیوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی روئیدگی کے ہیں۔ ابو زیاد نے کہا ہے کہ جو کچھ زمین سے پہلے پھل نکلے اسے بَقْلٌ\* کہتے ہیں۔ اقرب الموائد میں ہے کہ بَقْلٌ\* ایسی سبزی کو کہتے ہیں جو (آلو۔ گجر۔ شلجم کی طرح) زمین کے اندر پیدا نہ ہوتی ہو بلکہ (میتھی، پالک، گوبھی، ٹماٹر وغیرہ کی طرح) زمین کے اوپر پیدا ہوتی ہو۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سبزی ترکاری کے معنوں میں (۲/۱۶۱) میں آیا ہے۔

## ب ق ی

بَقِيٌّ\*۔ يَبْقَى\*۔ بَقَاءٌ\*۔ کسی چیز کا اپنی حالت پر قائم رہنا۔ تغیر پذیر نہ ہونا۔ یہ فَنَاءٌ\* کی ضد ہے جس کے معنی تغیر پذیر ہو جانا ہیں۔ اَبْقَاءٌ\*۔ اِسْتَبْقَاءٌ\*۔ باقی رکھنا\*۔ نیز اس کے معنی حفاظت اور نگہبانی کے بھی آتے ہیں\*۔

کائنات میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لیکن ذاتِ خداوندی تغیرات سے بلند ہے۔ اسی طرح اس کا قانون بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ یہی مستقل اقدار ہیں۔ جو اعمال اس کے قانون کے مطابق سرزد ہوں ان کے نتائج بھی غیر متبدل ثمرات کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سے انسانی ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ تغیرات سے بلند ہو جاتی ہے۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغیرات کی دنیا میں غیر متغیر رہتی ہے (Changelessness in Change)۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”نظام ربوبیت“ نیز من و یزدان۔ اور معارف القرآن کی پانچویں جلد جس کا عنوان ہے ”انسان نے کیا سوچا“)۔

ان معانی کی روشنی میں ان الفاظ کو دیکھئے جو قرآن کریم میں اس مادہ (بقی) سے آئے ہیں، بات واضح ہو جائیگی۔ سورۃ النحل میں ہے مَاعِیْنِدْکُمْ یَنْفَعْدُ وَمَاعِیْنِدْ اللّٰہِ بَاقٍ (۱۶۱)۔ ”جو کچھ تمہارے پاس تمہارے اپنے تصورات کے مطابق ہوتا ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ لیکن جو کچھ قانون خداوندی کے مطابق حاصل ہوتا ہے (خواہ وہ زیست کی خوشگواریاں ہوں اور خواہ انسانی ذات کی نشوونما) وہ تغیر نا آشنا ہوتا ہے۔“ سورۃ کہف میں ہے۔ اَلْمَالُ وَالْاِبْنٰوْنَ زِیْنَتٌ اِلْحٰیوۃِ الدُّنْیَا۔ ”دولت۔ اولاد، یہ انسان کی قریبی (طبعی) زندگی کی زینت کی چیزیں ہیں،“۔ یہ بھی بُری نہیں کہہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن وَالْبَقِیَّاتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِندَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَخَیْرٌ اَمَلًا (۱۸۶)۔ ”خدا کے قانون ربوبیت کی رو سے بہترین اعمال وہ ہیں جن کے صلاحیت بخش نتائج تغیر پذیر نہیں ہوتے،“۔ انہی کی اسید رکھنا بہترین نصب العین حیات ہے۔ اسی طرح سورۃ ہود میں بَقِیَّةٌ اللّٰہِ (۱۱۱) اُس دولت اور سامان کو کہا گیا ہے جو خدا کے قانون کی رو سے حاصل کیا جائے۔ اس سے ذرا آگے اُولُوْا بَقِیَّةٍ (۱۱۱) اُن لوگوں کو کہا گیا ہے جو قانون خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور کَلِمَۃٌ بَاقِیَّةٌ (۲۳۸) توحید کی تعلیم (ضابطہ) قوانین خداوندی کی اصل و بنیاد) جسے حضرات انبیاء کرام اپنے متبعین کو دیکر جاتے تھے۔ اور جو کبھی تغیر پذیر نہیں ہوتی۔ ساحرین دربار فرعون نے اسی کو خَیْرٌ وَاَبْقٰی (۱۱۱) کہا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ تغیر نا آشنا۔ سورۃ الرحمن میں ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَاَنٍ (۲۱۹) اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔ وَبَقِیَّةٍ وَجْہٌ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۲۵۵)۔ لیکن خدا کی ذات تغیرات سے مساوراء ہے۔ اور اسکی صفت ربوبیت اور اسکا قانون ربوبیت اور اسکی نتائج و اثرات بھی تغیر نا آشنا ہیں۔ ”فنا“ کا جو مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے اور جسکا مطلب معدوم ہو جانا ہے وہ درست نہیں۔ (اسکی لئے دیکھئے عنوان ف۔ ن۔ ی)۔ وَجْہِ رَبِّکَ کے دوسرے مفہوم کے لئے عنوان (و۔ ج۔ ۴) دیکھئے۔

بَقِیَّةٌ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا باقی ماندہ حصہ۔ لیکن اسے اس چیز کی جنس میں سے ہونا چاہئے۔ لہذا بھائی کو بَقِیَّةٌ اَلْاَبِ نہیں کہہ سکتے\*۔ بنی اسرائیل کے تابوت سکینت کے متعلق کہا ہے کہ اس میں بَقِیَّةٌ مِمَّا تَسَرَکْتَ اَلْ مُوسٰی وَاَلْ هَارُوْنُ (۲۴۸) تھا۔ یعنی جو کچھ آل موسیٰ اور آل ہارون نے چھوڑا تھا اس کا باقیماندہ حصہ۔

## ب ک ر

”لَبِكَرٌ مَّعَ الْبُكَارِ“ کنواری عورت، نیز وہ مرد جو اب تک کسی عورت کے پاس نہ گیا ہو۔ پہلا بچہ دینے والی عورت یا اونٹنی۔ پہلا بچہ، ہر پہلی چیز۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ گائے جو ابھی حاملہ نہ ہوئی ہو یا نوجوان ہو۔ ”لَا فَارِضٌ وَلَا يَكْرُ“ (۲/۸) ”نہ بوڑھی ہے نہ نوجوان“۔

”لَبِكَرَةٌ“ - صبح - دن کا پہلا اور ابتدائی حصہ\* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ”لَا بُكَارٌ“ - طلوع فجر سے چاشت کے وقت تک کی مدت کو کہتے ہیں۔ (۱۴/۳ و ۳/۳) نیز اس کے نزدیک ”بُكَرٌ“ کے مادہ کے اصلی معنی شق کرنے یا قطع کرنے کے ہیں\*\*۔

ایسی چیزوں کو بھی جن کی پہلے نظیر نہ ہو، ”بُكَارٌ“ کہتے ہیں\*\*\*۔ (۳۵/۳۶) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی صحیح تعلیم و تربیت اور اعمال صالحہ سے ان میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ ایسی مخلوق بن گئیں جس کی پہلے نظیر نہ تھی۔ وہ عہد جاہلیہ کی عورتوں سے یکسر مختلف ہو گئیں۔

## ب ک ک

”بَكَّةٌ“ - ”يَرْبُكُهُ“ - ”بَكَ“ - کسی چیز کو بھاڑ دینا۔ متفرق کر دینا۔ کسی پر هجوم کرنا۔ مزاحمت کرنا۔ ”بَكَ عُنُقُهُ“ - اس نے اس کی گردن توڑ دی\*۔

مکہ مکرمہ کا نام ”بَكَّةٌ“ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے ”إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا“ (۲/۱۲۵)۔ ”یقیناً پہلا گھر جو نوع انسان کے لئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت، اس نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ لوگ اس کی طرف هجوم کر کے آتے ہیں اور طواف میں بڑا ازدحام ہوتا ہے اس لئے اسے ”بَكَّةٌ“ کہا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ یہاں سرکشوں اور ظالموں کی گردن ٹوٹ جاتی ہے اس لئے اس کا یہ نام ہے۔ لیکن راغب کا خیال ہے کہ یہ ”بَكَّةٌ“ ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ عربی میں میم کے باء کے



ساتھ بدل جانے کی کئی مثالیں ملتی ہیں \*\*۔ مثلاً سَبَد اور سَمَد۔  
ایسے ہی لَا زِبْ اور لَا زِم۔ \*\* ہر دو لفظ خواہ ”ب“ سے ہوں یا ”میم“  
سے ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

## ب ک م

بُکْم کے معنی ہیں گونگا ہونا۔ ازعری نے کہا ہے کہ أَبُکْم اور آخِرُس میں یہ فرق ہے کہ آخِرُس اسے کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر بول ہی نہ سکتا ہو اور أَبُکْم اسے کہتے ہیں جو بولتا تو ہو لیکن حاضر جواب نہ ہو اور طریقہ سے بات نہ کرنے کی وجہ سے اسکی بات سمجھ میں نہ آتی ہو۔ لیکن أَبُکْم اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گونگا بہرا اور اندھا ہو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ أَبُکْم (جسکی جمع بُکْم ہے) اسے کہتے ہیں جو جہالت کی وجہ سے یا دانستہ بولنے چالنے سے گریز کرے۔ نیز جو بات کو واضح طور پر بیان نہ کر سکے۔

قرآن کریم میں صَمُّ بُکْم عُمی آیا ہے (۱۸)۔ جہاں بُکْم کے معنی صرف گونگا ہیں (کیونکہ بہرے اور اندھے کیلئے اسکے ساتھ صَم اور عُمی کے الفاظ موجود ہیں)۔ سورۃ انفال میں الصَّمُّ، البُکْم کے ساتھ الْقَذِیْن لَا یَعْقِلُوْنَ (۴۲) کے الفاظ لا کربات واضح کردی کہ اس سے مراد طبعی طور پر بہرے اور گونگے نہیں، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سورۃ نحل میں أَبُکْم (۱۶) کے بعد ہے، جو کسی شے کی قدرت نہیں رکھتا۔ جو اپنے مالک پر بوجھ ہے۔ وہ آسے جدھر بھیجتا ہے کوئی اچھا کام کر کے نہیں آتا۔ اس کے مقابلہ میں وہ ہے جو صاحب اختیار ہے۔ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ اور صراط مستقیم پر چلتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک صَمُّ بُکْم سے مفہوم کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو عقل و فکر سے کام نہ لیں بلکہ اندھا دھند اپنی غلط روش پر چلے جائیں۔

## ب کی ی

بُکاء۔ غم کے ساتھ آنسو بہانا۔ کبھی محض غم یا آنسو بہانے کو بھی کہہ دیتے ہیں \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رونا اور (۲) چیز کا کم ہو جانا ہیں۔ قرآن کریم میں ضحیک کے مقابلہ میں بُکئی

آیا ہے (۱/۸۲)۔ لہذا اس کے معنی غم کرنے کے ہیں۔ سورۃ دخان میں ہے فَمَا  
بَكَتْ عَنِّيهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (۲۹/۲۹)۔ ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا  
نہ زمین۔ اس لئے کہ ان کی تباہی خدا کے قانون مکافات کے مطابق واقع ہوئی  
تھی۔ بکیتاً (۱۱/۵۸)۔ قوانین خداوندی کے سامنے دل کے پورے گداز کے ساتھ  
جھکنے والے۔ لیکن اندھے اور بہرے بنکر نہیں (۲۰/۲۰)۔ عقل و بصیرت کی رو  
سے قوانین خداوندی کو اختیار کر کے دل کی گہرائیوں سے ان کی متابعت کرنے  
والے۔

## بَلّ - (حرف)

- بَلّ - بلکہ - ذیل کی مثالوں سے استعمال اور مفہوم واضح ہو جائیگا۔
- (۱) جب یہ فقرے کے درمیان آئے تو پہلی بات کی تردید اور دوسری بات کی  
تائید مقصود ہوتی ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ -  
بَلّ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ (۲۱/۲۱)۔ ”اور یہ کہتے ہیں کہ خدا نے  
رحمن نے بیٹا بنایا ہے۔ ایسا نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جنہیں یہ  
اس کے بیٹے قرار دیتے ہیں وہ اس کے معزز بندے ہیں۔“
- (۲) پہلی بات کی تردید کے بغیر دوسری بات کی تائید۔ وَلَدَيْنَا مَزِيبٌ  
يَنْطَلِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُفْلِتُونَ - بَلّ قُلُوبُهُمْ فِیْ  
غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا (۲۳/۲۳)۔ ”ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حق  
بات کہتی ہے اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن (یا  
اور) ان کے دل تذبذب اور جہالت میں ہیں۔“ یعنی دوسری بات پہلی  
بات سے الگ ہے (نیز ۱۳/۱۳)۔ ان مقامات میں بَلّ - وَ - (اور) کے  
معنوں میں آیا ہے۔ (نیز دیکھئے ۲۱/۲۱)۔ اسی طرح (۲۲/۲۲) میں بھی  
بَلّ فَعَلَهُ كَسِیْرٌ مِّنْهُ سے نیا فقرہ شروع ہو سکتا ہے۔ (تفصیل اس  
کی متعلقہ عنوان میں ملیگی)۔

## ب ل د

الْبَلَدُ - زمین کا ہر وہ حصہ جسکی حد بندی کی گئی ہو۔ خواہ وہ آباد  
ہو یا غیر آباد۔ مٹی - زمین - اسکی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے۔ اسکا  
استعمال قَرْیَۃً (بستی) کے معنوں میں بعد میں ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں هٰذَا  
بَلَدٌ (۱۴۱/۱۴۱) سے قطعہ زمین اور بستی دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ سورۃ البلد

میں یہاں اَلْبَلَدِ (۱۰۲) سے مراد مکہ ہے۔ اسی کو دوسری جگہ اَلْبَلَدِ  
اَلْاَمِيْنِ (۱۰۵) ”امن والا شہر“ کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا  
مانگی تھی (۱۰۶) کہ یہ بستی دنیا میں جو رو استبداد کے ستارے ہوئے ہر  
انسان کیلئے امن کا مقام بن جائے۔ نوع انسانی کے امن کی ضامن امت (جماعت  
مؤمنین) اور خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے مرکز کو یقیناً عالم انسانیت کے  
لئے امن کا مقام ہونا چاہئے۔ مزید تفصیل کے لئے حج اور کعبہ سے متعلق  
ہنوانات دیکھئے۔

زمین سے متمسک (زمین گیر) ہونے کی جہت سے کہتے ہیں بَلَدٌ اَلْفَرَسُ۔  
گھوڑا دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ آگے نہ نکل سکا\*\*\*۔ اسی لئے بَلِيْدٌ کے معنی  
کند ذہن کے ہوتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی  
سینے (چھاتی) کے ہوتے ہیں۔ اور بَلَدَةُ الرَّجُلِ بِالْاَلَا رُض کے معنی ہیں  
اس شخص نے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیا۔ یعنی وہ زمین کے ساتھ چپک  
گیا۔

## ب ل س

اَبْلَسَ۔ کے معنی ہیں وہ ناامید ہو گیا۔ مایوس ہو گیا۔ ابن فارس نے  
اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔ (اِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ) ”وہ ناگہاں  
اس میں مایوس ہو جائیں گے“۔ (۲۰)۔ نیز دہشت زدہ اور متحیر ہو جانا\*۔ (پرائی  
سامی لغت میں اسکے معنی تھے ”کچل کر مار ڈالنا۔ روند ڈالنا“\*\*\*۔  
اَبْلِسَ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اَبْلَسَ ہی سے مشتق ہے اور  
اسکے معنی ہیں رحمت خداوندی سے ابدی طور پر مایوس اور ناامید۔ لیکن دوسرے  
ائمہ لغت نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں بلکہ معرب ہے\*۔

قرآن کریم میں ابلیس کو سرکشی اور بغاوت کے پیکر کی حیثیت سے  
پیش کیا گیا ہے۔ اَبْلٰی وَاَسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (۲۰)۔ ”اسنے  
حکم خداوندی کی اطاعت سے انکار کیا۔ خدا سے بغاوت و سرکشی اختیار کی اور  
کہنا نہ ماننے والوں میں سے ہو گیا“۔ اسکے برعکس مَلَاٰئِكَةُ ہیں جن  
کی فطرت میں اطاعت و انقیاد رکھ دیا گیا ہے (فَسَجَدَ الْمَلَاٰئِكَةُ  
”كُلُّهُمْ اَجْمَعُونَ“ تمام کے تمام ملائکہ نے سجدہ کر دیا“ (۲۱)۔ کائنات  
میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اسکا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو  
قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ کائنات کی

کسی اور شے کو معصیت (قانون خداوندی کی خلاف ورزی) کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان، قانون خداوندی کی اطاعت سے سرکشی اسوقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات اسے (عالمگیر مفاد کلی کے مقابلہ میں) ذاتی مفاد پرستی پر ابھارتے ہیں اور وہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال کر ان مفادات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر اسکی عقل اسے وہ طریقے بتاتی ہے جن سے وہ ان مفادات کو حاصل کر سکے۔ قرآن کریم نے ایسے جذبات اور انکے بروئے کار لانے والے سامان و ذرائع (عقل حیلہ جو کے بنائے ہوئے طرق و حیل) کو ابلیس کہہ کر پکارا ہے، اور اس کی سرکشی کی بنا پر اسکے متعلق کہا ہے کہ اسکی تخلیق آتش (نار) سے ہوئی ہے (۱۳)۔ اور چونکہ انسانی جذبات آنکھوں سے پنہاں ہوتے ہیں اور غیر محسوس طور پر مصروف عمل رہتے ہیں اسلئے کَانَ مِّنَ الْيَجْنِ (۱۴) کہا ہے (یَجْن کے معنی ہیں چھپا ہوا)۔ نیز چونکہ انسان کے یہ جذبات اور اسکے یہ اختیارات جسکی رو سے یہ قوانین خداوندی سے سرکشی برت سکتا ہے، انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور جب تک انسان زندہ رہتا ہے اسوقت تک یہ ساتھ رہتے ہیں، اسلئے قرآن نے آدم کی جو سرگزشت بیان کی ہے (دیکھئے عنوان ادم) اسمیں ابلیس بھی آدم کے ساتھ ہی نمودار ہو جاتا ہے اور اسے انسانوں کے ساتھ ہی اسوقت تک مہلت دی گئی ہے جب تک انسان اس دنیا سے اٹھ نہیں جائے۔ رَبِّ فَآ نَظِيرُ نِيْ اِلٰی يَوْمِ يَبْعَثُوْنَ (۱۵)۔ مزید برآں دیکھئے تہتمہ ص ۱۸۱ جلد چہارم عنوان ب ل س۔

جو انسان قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے وہ ان تمام سعادتوں اور خوشگوارییوں سے محروم رہ جاتا ہے جو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اسلئے ابلیس کو محروم و ناامید کہا گیا ہے۔ اسکے برعکس جو لوگ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۶)۔ ”ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا“۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ابلیس کا ان پر کسی قسم کا غلبہ و تسلط نہیں ہوگا (۱۷)۔

قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان کو ایسک ہی سکے کے دو رخ، اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو بتایا گیا ہے۔ مثلاً قصہ آدم میں دیکھئے۔ سجدے سے انکار۔ سرکشی و تکبر۔ ذریت آدم کو بہکانے کا چیلنج۔ سب ابلیس کی طرف سے ہے۔ لیکن اس کے بعد جب آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو اسے شیطان

کیطرف منسوب کیا گیا ہے (فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا - ۱۱۶ - نیز دیکھئے ۱۱۶ : ۱۱۶-۲۰)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس ایک خاص ذہنیت کا نام ہے اور جس انداز سے وہ ذہنیت کام کرتی ہے اسے شیطان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (شیطان کیلئے دیکھئے عنوان ش - ط - ن - نیز ان تمام امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ جو سلسلہٴ معارف القرآن کی ایک کڑی ہے) ابلیس اور شیطان (ناامیدی و سرکشی) درحقیقت وہ موانع ہیں جو انسانی خودی کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اگر انسانی خودی ان موانع پر غالب آکر اپنے استحکام کا ثبوت دیتی ہے تو سلسلہ ارتقاء میں اسکا قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ موانع اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ زندگی کی نچلی (حیوانی) سطح میں دب کر رہ جاتی ہے۔ زندگی درحقیقت ”ابلیس و آدم“ کی اسی کشمکش کا نام ہے۔ اسلئے آدم کے ساتھ ابلیس کا وجود ناگزیر ہے۔ مخالفت (Opposition) اور تصادمات (Clashes) کے بغیر انسانی ذات میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا یوں کہئے کہ اسکی قوت و استحکام کا امتحان (Test) نہیں ہو سکتا۔ نہر کی مسلسل روانی کے لئے ٹھوکر (Fall) کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا ٹھوکر کے پتھر، نہر کے پانی کے لئے بند بنکر اسے جوئے رواں سے جوہڑ بنا دیتے ہیں۔ یا نہر کا پانی اپنے زورِ دروں سے ان پتھروں کو پھاند کر آگے نکل جاتا ہے؟ ایسے راستے تلاش اور اختیار کرنا جن میں پتھر نہ ہوں (یعنی مسلکِ رہبانیت و خانقاہیت) اپنی روانی کو اپنے ہاتھوں ختم کر لیتا ہے۔ زندگی مسلسل جد و جہد (جہاد) کا نام ہے۔ یعنی ابلیس و آدم کی پیہم کشمکش کا۔

اوپر کہا گیا ہے کہ ابلیس (ناامیدی) اور شیطان (سرکشی) ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ علم النفس (سائیکا لوجی) کی تحقیقات حاضہ اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں کہ ناامیدی (Frustration) سے سرکشی کے جذبات (Aggressiveness) پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہو رہا جو کچھ وہ چاہتا ہے تو اس میں غصہ ابھرتا شروع ہو جاتا ہے۔ اس غصے کو اگر وہ خود اپنے آپ کے خلاف نکالتا ہے تو یہ بریشانی (Worry) یا افسردگی و غمگینی (Gloominess) ہوتی ہے جس کی آخری شکل خود کشی (Suicide) ہے۔ جب اس غصہ کا مظاہرہ اس شخص یا شے کے خلاف ہو جو اس کی مایوسی کا باعث تھی تو اسے انتقام کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس سے انتقام نہ لے سکے تو غیر متعلقہ چیزوں کے خلاف اپنا غصہ نکالتا ہے۔ یہ ہسٹل پن کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مایوسی اور سرکشی میں کس قدر گہرا تعلق

ہے، یہی تعلق ابلیس اور شیطان میں ہے۔ یہ انسان کی نفسیاتی کیفیات ہیں۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں افراد کیلئے مایوسی کے مواقع پیدا نہیں ہوتے۔ "لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ" (۳۹)۔ "اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو" وہاں کا معمول ہوتا ہے۔ اور یہ رحمت (سامانِ نشوونما) زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوتا ہے (وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ) (۲۱)۔ لہذا اس قرآنی معاشرہ میں ابلیسیت کسی پر غالب نہیں آ سکتی۔ اسی لئے ابلیس سے کہا گیا ہے کہ "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ" (۱۶)۔ "یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکیگا"۔ نیز دیکھئے عزرائل (ق۔ ن۔ ط) اور (ی۔ ا۔ س)۔

## ب ل ع

بَلِّغْ۔ بَلِّغْ۔ کسی چیز کو حلق سے نیچے اتار لینا۔ التَّمْلِغُ وہ جگہ جہاں سے کھانا حلق سے اتر کر سری میں جاتا ہے۔ التَّمْلُوعُ پینے کی چیز۔ التَّمْلِغَةُ۔ گھونٹ\*۔ نیز چکی کا دھانہ جس میں اناج ڈالا جاتا ہے\*\*۔ قرآن کریم میں طوفان حضرت نوحؑ کے متعلق ہے کہ اسکے بعد زمین کو حکم دیا گیا کہ ابْلِغِي مَاءَكَ (۱۶)۔ "اپنا پانی نکل جا"۔ یعنی اسے جذب کر لے۔

## ب ل غ

بَلِّغِ الْمَكَانَ بَلِّغُوا غَا۔ وہ اُس مقام تک پہنچ گیا۔ مفردات میں ہے کہ بَلِّغُوا غَا اور بَلِّغُوا غَا کے معنی مقصد کے آخری سرے تک پہنچ جانا ہیں خواہ یہ آخری حد مکلف ہو یا زمانی، یا کسی اندازہ کئے ہوئے معاملہ کی۔ لیکن کبھی محض قریب تک پہنچ جانے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ہے فَتَا ذَا بَلِّغْنِ أَجَلَهُنَّ (۲۱)۔ یعنی جب وہ عدت ختم ہونے کے قریب تک پہنچ جائیں۔ انکی عدت کی مدت قریب الاختتام ہو\*۔ یعنی جب وہ مقررہ مدت کی آخری حد پر پہنچیں۔ التَّمْلِغُ۔ کسی چیز کا اتنا کافی ہونا کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے آخری مقصد تک پہنچ جائے اور اسے کسی اور سامان یا ذریعہ کی ضرورت نہ پڑے\*۔

التَّمْلِغَةُ۔ ہر وہ شے جس سے کسی مقصد تک پہنچا جائے۔ ہر وہ شے جو کسی مقصد تک پہنچانے کیلئے کافی ہو جائے\*۔

عرب کے بادیہ نشین صحراؤں میں پھرتے رہتے تھے۔ پانی پران کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ صحراء میں کہیں کہیں کنویں ہوتے تھے جن پر ڈول اور رسی رکھی رہتی تھی۔ لیکن گرم مقامات کے کنوؤں کا پانی ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتا۔ اکثر نیچے اتر جاتا ہے جسکی وجہ سے ڈول کی رسی پانی کی سطح تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس مقصد کیلئے یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ رسی کا ٹکڑا رکھتے تھے جسے ڈول کی رسی (الشِرشَاء) کے ساتھ باندھ دیتے تاکہ ڈول پانی تک پہنچ جائے۔ اس رسی کے ٹکڑے کو التَّبْلِغَةُ کہتے تھے۔ یہاں سے تَبْلِغٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک انسان اپنی ذاتی استعداد کی کمی کی وجہ سے کسی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا تو اسکی اس کمی کو اسطرح پورا کر دیا جائے کہ وہ اصل مقصد تک پہنچ جائے۔ لیکن اگر وہ اپنی رسی (الشِرشَاء) کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہتا تو خالی تَبْلِغَةُ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔ تبلیغ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت کو بھی کام میں لائے۔ مَبْلَغٌ آخری مقام جس تک کوئی پہنچ سکے (۵۳)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو مَبْلَغٌ لِلنَّاسِ (۱۴۴) کہا ہے۔ یعنی وہ ذریعہ جس سے انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے اور اسکے ہوتے ہوئے اسے کسی اور ذریعہ یا سامان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لہذا قرآن کیا ہے؟ انسانیت کو اسکی منزل مقصود تک پہنچانے کا کافی ذریعہ۔ لیکن یہ آنہی کو منزل تک پہنچا سکتا ہے جو اسکی اطاعت اختیار کریں۔ جو اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسلئے کہ اِنْ رَفِیْ هٰذَا التَّبْلِغُ لِقَوْمٍ عَلَیْدِیْنِ (۱۴۵)۔ ”یہ اسی قوم کیلئے بلاغ ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرے“۔ یہ چیز انسان کے اپنے اختیار پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بتائی ہوئی صحیح روش پر چلے یا کسی دوسری (غلط) روش پر۔ کسی کو کسی خاص روش پر چلنے کیلئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مجبور کرنا ہوتا تو خدا انسانوں کو پیدا ہی اس انداز سے کر دیتا کہ وہ اس روش سے سوا کوئی دوسری روش اختیار نہ کر سکتے، جسطرح کائنات کی دوسری چیزیں قوانین فطرت پر چلنے کیلئے مجبور ہیں۔ اسلئے رسولوں کا کام پیغامات خداوندی انسانوں تک پہنچا دینا ہے۔ انہیں زبردستی ان پیغامات پر چلانا نہیں۔ فَهَلْ عَلٰی النَّاسِ اِلَّا التَّبْلِغُ الْمُبِیْنُ (۱۴۶)۔ ”رسولوں کے ذمہ اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قانون خداوندی کو نکھار کر پہنچا دیں۔“

بَالِغَةُ۔ پہنچنے والی (۱۴۷)۔

## ب ل و

بَلَاءٌ - اِتِّیْلَاءٌ - راغب نے کہا ہے کہ اس لفظ کے دو معنی ہیں۔  
 (۱) کسی کا حال معلوم کرنا یعنی اسکے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصلی حالت کا ظاہر ہونا۔ خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ جب یہ لفظ خدا کیلئے استعمال ہوگا تو وہاں صرف دوسرے معنی مراد ہونگے۔ کیونکہ خدا علام الغیوب ہے اسلئے اسکے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی کی حالت سے بے خبر ہے\*۔  
 لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی حالات کا معلوم کرنا یا اصل حقیقت کا ظاہر کرنا ہیں۔

بَلَّی - یَبْلُی - کے معنی کپڑے کا بوسیدہ ہو جانا یا پرانا ہو کر گھس جانا بھی ہیں\*\*\*\*۔ اس لئے کہ اس طرح گھس کر اسکی اندرونی حالت نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ لہذا بَلَاءٌ کے معنی ہیں مشکلات و مصائب کے وقت انسان کی حقیقی سیرت اور مضمحل کیفیتوں کا ظاہر ہو جانا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز کی اصلی حالت خراب ہی ہو۔ وہ حالت اچھی بھی ہو سکتی ہے۔ اسلئے مذکورہ صدر معنی کے برعکس بَلَاءٌ کے معنی ہونگے خوشحالی اور آسائش کے وقت انسان کی حقیقی سیرت کی نمود۔ انسان کی حقیقی سیرت اور اصلی ذہنیت کی نمود کے وہ نون مواقع ہوتے ہیں۔ — نامساعد حالات اور کامیابیوں اور کامرانیوں کا دور۔ — یہی مواقع ہر اس کی ذات کی نمود ہوتی ہے۔  
 اَلْمَبَالَاةُ کے وہ منافست و مناخرت کے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے مقابلہ میں زندگی کے جو سکر رہیں پر فخر کرنا\*\*۔ نیز اِتِّیْلَاءٌ کے معنی انتخاب کرنا۔ پسند کرنا بھی ہیں\*\*\*۔

سورة بقرہ میں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ قوم فرہون تمہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھا کرتی تھی۔ ہم نے تمہیں انکے پہنچہ استبداد سے نجات دلائی۔ وَفِيْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲۴۹) ان کے مظالم سے نجات نے تمہارے لئے یہ ظاہر کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا کہ آزادی ملنے پر تم کیسے کام کرتے ہو۔ سورة انفال میں ہے کہ خدا نے بدر کے میدان میں جماعت مومنین کو کامیابی عطا کی۔ لَیْسَ بِلِیِّ الْمُؤْمِنِیْنَ مِثْنَهُ بَلَاءٌ حَسْبًا (۱۶۰)۔ تا کہ وہ زندگی کی کامرانیوں سے

\* تاج و راغب\*\* محیط - \*\*\* تاج - \*\*\*\* بعض ارباب لغت نے بلو (ب-ل-و) اور بلی (ب-ل-ی) کو ایک ہی جگہ لکھ دیا ہے۔ لیکن ہم نے بلی کو الگ بھی لکھا ہے۔ اترچہ ان دونوں میں بہت لطیف فرق ہے اور بعض اوقات ان میں تمیز بھی بمشکل ہوتی ہے۔



انہیں یہ مواقع بہم پہنچادے کہ وہ دنیا کو بتا دیں کہ حکومت ملنے پر وہ کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ سورۃ دخان میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ہم نے انہیں اقوام عالم پر برگزیدگی عطا کی اور انہیں وہ کچھ دیا مافیہدہ۔ **بَلَّوْا امَّیْنُ** (۳۳) جس میں ان کی نمود ذات کے مواقع تھے۔

ظاہر کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ سورۃ الطارق میں آیا ہے جہاں کہا ہے **یَوْمَ تَبْلُغُ السِّرَّ اَیْرُ** (۹۷) ”جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی“۔ سورۃ آل عمران میں ہے **لِیُبْتَلِّیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُورِکُمْ** (۳۳) ”تا کہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں تھیں“۔ سورۃ یونس میں **هٰذَا لَیْکَ تَبْلُغُ اَکْلُ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ** (۱۰۱)۔ ”وہاں ہر شخص اپنے ان اعمال کو سامنے موجود دیکھیگا جو اس نے اس سے پہلے کئے تھے“۔ سورۃ المومنون میں قوم نوح کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد کہا ہے **اِنْ کُنْتُمْ لَمُبْتَلِّیْنِ** (۲۳) ”ہم (اقوام سابقہ کی ان سرگزشتوں کو اس طرح) ظاہر کرتے رہتے ہیں“۔

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کبھی خوشگوار یوں کے سکون افزا پہلو۔ اس طریق کو بھی قرآن نے **اِبْتَلٰی** کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آتے رہنا۔ سورۃ الفجر میں یہ مفہوم نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے (دیکھئے ۱۰۱)۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان خود دیکھ لے، پرکھ لے کہ اسکی صلاحیتیں کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں۔ کیونکہ وہ مزاحمتوں کا مقابلہ اسی حد تک کر سکیگا جس حد تک اسکی مضمر قوتیں بیدار ہو چکی ہوں گی یہ حوادث جن سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے درحقیقت اسکی نمود ذات کے مواقع ہوتے ہیں۔ یہ ہے مفہوم **اِبْتِلَاءٌ** کا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ **وَ اِذْ اِبْتَلٰی اِبْرٰہِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ** (۲۴) ”جب اسکی نشو و نما دینے والے (رب) نے ابراہیمؑ کیلئے مختلف قوانین کے ذریعے اسکی نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے“۔ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی کے مختلف حوادث اسکی سامنے آئے تا کہ وہ دیکھ سکے کہ اسکی صلاحیتیں کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں۔ جس طرح ابراہیمؑ نے ان حوادث کا مقابلہ کیا (اسنے Re-act کیا) اس سے واضح ہو گیا کہ اسکی صلاحیتیں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں۔ ”انکی پوری پوری نشو و نما ہو چکی تھی۔ **فَاَتَمَّہُنَّ** (۲۴)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ جس چیز کو ہم اِبْتِلَاء یعنی خدا کی طرف سے آزمائش کہتے ہیں وہ قرآنی تصور نہیں۔ خدا کسی کو آزماتا نہیں۔ وہ ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس سے انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے اور دیکھے کہ وہ کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں۔ اور اس طرح اپنے آپ کا اندازہ کرتا ہوا اپنی صلاحیتوں کی مزید نشو و بالیدگی کیلئے کوشش کرتا جائے۔

سورۃ الدھر میں اِبْتِلٰی کے لفظ کو قرآن نے ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے مضمیر جوہروں کے محسوس شکل میں سامنے آ جائے گا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش، مرد اور عورت کے نطفہ کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ نطفہ ایسے باریک جرثوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آ سکتے لیکن انہیں جرثوموں میں پورے کا پورا انسانی بچہ چھپا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے قرآن کہتا ہے اِنَّا خَلَقْنٰا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۹۶)۔ ”ہم نے انسان کی پیدائش (کی ابتداء) ایک ملے جلے نطفہ سے کی اور ایسا انتظام کیا کہ رحم سادر میں اس کے مضمیر جوہروں کی نمود ہوتی جائے تا آنکہ وہ ایک ستے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے۔“

یہ ہے اِبْتِلَاء کا صحیح نقشہ۔ مضمیر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آ جانا۔ ان کی نمود ہو جانا۔

## بلی۔ (حرف)

بلی۔ سوال نفی میں ہو اور اس سوال کی تردید مقصود ہو تو اس وقت بلی آتا ہے۔ مثلاً اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ یہ سوال نفی میں ہے۔ اسکا جواب ہے قَالُوْا بَلٰی (۱۰۲)۔ ”انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں! تو ہمارا رب ہے۔“ یا مثلاً اَمْ يَحْسُبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ؟ ”کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور مخفی مشوروں کو سنتے نہیں؟“۔ بلی۔ کیوں نہیں۔ ہم ضرور سنتے ہیں۔ (۱۰۳)

(۲) یا سوال نہ بھی ہو، ویسے ہی نفی کی تردید مقصود ہو۔ جیسے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْْمَانِيْهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ۔ یہ

اللہ کی قسمیں اور سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے زندہ نہیں کرتا۔ بَلٰی۔ یہ بالکل غلط کہتے ہیں۔ وَعْدًا وَعَدًا حَقًّا (۱۸)۔ یہ اس کا وعدہ (قانون) ہے (کہ مرنے کے بعد زندگی ہوگی) جسکا پورا ہونا ضروری ہے۔ یہاں بَلٰی نے پہلے ٹکڑے کی تردید کر دی (نیز۔ ۱۸)۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص ان کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد ہے۔ بَلٰی، مَنۡ اَسْلَمَ وَجْهَہٗ لِلّٰہِ... (۱۱۲)۔ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو قانون خداوندی (قرآن) کے سامنے جھکا دے.... وہ جنت میں جا سکتا ہے۔

## ب ل ی

بَلٰی یَبْلٰی بِلٰی الثَّوْبُ۔ کپڑا پرانا اور خستہ ہو گیا۔ اس طرح پرانا ہو کر کمزور اور جھڑا ہو جانے والے کپڑے کو بِلٰی کہا جائیگا۔ قرآن کریم میں ہے مَلٰئِکَ لَا یَبْلٰی (۱۲۱)۔ ایسی حکومت جس میں زوال و انحطاط رونما نہ ہو۔ ایسی مملکت جو ہمیشہ تازہ بہ تازہ رہے اور اس میں کٹھنکی اور خستگی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

زندہ رہنے اور حیاتِ دوام حاصل کرنے کی آرزو ہر انسان میں ہے۔ قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس جذبہ کو (Exploit) کیا اور اس سے کہا هَلْ اَدْرٰکَ عَلٰی شَجَرَةٍ الْخُلْدِ وَ مَلٰئِکَ لَا یَبْلٰی (۱۲۱)۔ ”کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا اور ایک ایسی حکومت کا جو کبھی پرانی نہ ہو، پتہ نشان دوں؟“۔ اس کے بعد قرآن نے نہایت لطیف اشارے سے بتایا ہے کہ ابلیس نے کہا کہ حیاتِ جاوداں اولاد کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سے انسان کا نام روشن رہتا ہے۔ لیکن یہ ابلیسی فریب ہے۔ حیاتِ جاوید انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے جس کیلئے قرآن نے خاص پروگرام دیا ہے (اس کو ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں)۔ اولاد سے افزائشِ نسل ہوتی ہے۔ فرد کی ذات کی نشوونما نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ اسی کو بقائے دوام سمجھ لیتے ہیں۔

\* تاج و راغب و اقرب الموارد۔

## ب ن ن

بَنَ بِالْمَكَانِ - يَبْنِي - بِنَاءً - کسی جگہ اقامت کرنا - ٹھہر جانا -  
 أَبْنَتِ السَّحَابَةُ - بادل چند دن تک جما رہا - تَبَنَّتْ - وہ جما رہا -  
 الْبَنَانُ - انگلیاں یا انگلیوں کے اطراف\* (پوربن اور بالائی سرے) اسلئے کہ  
 انگلیوں ہی سے انسان کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑتا ہے - (حقیقت یہ ہے  
 کہ انگلیاں، بالخصوص انگوٹھا پختہ گرفت کرنے کے لئے ایک اہم اور قوی عضو  
 ہے جو انسان کو دیا گیا ہے) - لہذا انسانی قوت، قبضہ کرنے کی طاقت اور محکم  
 گرفت کیلئے اس لفظ کو بولا جاتا ہے - چنانچہ سورۃ انفال میں ہے وَأَضْرِبُوا  
 مِثْلَهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۱۴) - "ان کے ہر بنان پر مارو" - اسمیں اگرچہ  
 بَنَانُ کے معنی انگلیاں ہیں لیکن مراد اس سے ہر وہ شے ہے جس سے دشمنوں  
 کی طاقت اور گرفت کی قدرت وابستہ ہو - سورۃ قیامۃ میں ہے بَلْیَ قَادِرٌ عَلَىٰ  
 عَمَلِ آنَ نَسِیَوُیَ بَنَاتِهِ (۹۰) - "ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ انسان  
 کے تمام اعضا یا قوتوں کو مکمل کر دیں - ہر اس چیز کو مکمل کر دیں جس سے  
 وہ دوسری چیزوں کی گرفت کرتا ہے - یعنی وہ تمام قوتیں جن سے انسانی اعمال  
 سرزد ہوتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ بَنَانُ کے معنی ہاتھ پیر کے ہیں -

## ب ن ی (ب - ن - و)

بِنَاءٌ کے معنی ہیں عمارت - جو چیز بھی تعمیر کی جائے - حَتَّىٰ کہ  
 ان خیموں کو بھی کہتے ہیں جن میں بدو و صحراؤں میں رہتے ہیں - نیز اسکے  
 معنی چھت کے بھی ہوتے ہیں - ابوحنیفہ کا قول ہے کہ بِنَاءٌ درحقیقت اُن  
 چیزوں کو کہتے ہیں جن میں قوتِ نمونہ ہو - یعنی (Inorganic) مثلاً  
 پتھر مٹی وغیرہ - بِنَاءٌ معمار کو کہتے ہیں - نیز (Architect) کو بھی -  
 بَنَانِ بھی عمارت بنانے والے کو کہتے ہیں جسکی جمع بِنَاتٌ ہے - بَنَانِیَّةٌ پسلی کی  
 خمیدہ ہڈی کو بھی کہتے ہیں - بَنَانُ دیوار کو کہتے ہیں (بعض کا خیال ہے  
 کہ یہ جمع ہے) - اور بِنَانِیَّةٌ طرز تعمیر کو - اَرْضٌ مَبْنِیَّةٌ اس زمین  
 کو کہتے ہیں جس پر عمارت بنائی جائے\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس  
 سادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے کچھ حصے کو دوسرے حصہ کے ساتھ  
 ملا کر بنانا -

ابن\* - بیٹے کو کہتے ہیں - کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے\* - یا اس لئے کہ اس میں کچھ حصہ باپ کا بھی شامل ہوتا ہے - اسکی جمع آبْنَاءٌ وَّ بَنُوْنَ ، بَنِيْنَ ہے - بِنْتٌ بیٹی - (جمع بَنَاتٌ) - تَبَنَّى\* کے معنی ہیں کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالینا - نیز کسی چیز سے زیادہ ربط ضبط اور لگاؤ رکھنے والے، اور اس میں دلچسپی لینے والے کو بھی ابْنٌ کہتے ہیں - مثلاً ابْنُ حَرْبٍ (جنگجو) - یا ابْنُ السَّبِيلِ (مسافر)\* -

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَاءَ بِنَاءً (۲۲)۔ ”جس نے تمہارے لئے زمین کو نیچے بچھی ہوئی بنایا اور سما کو اوپر چھایا ہوا،۔۔ یہاں بِنَاءٌ بمقابلہ فِرَاش آیا ہے - فِرَاش نیچے بچھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں اسلئے بِنَاءٌ کے معنی اوپر چھائی ہوئی چیز کے ہونگے - جیسے خیمہ - سورۃ نحل میں ہے فَاَتَى اللّٰهُ بَنِيَّانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السُّجُفُ (۱۶) ”اللہ نے ان کی عمارتوں کو بنیادوں سے گرا دیا سوان کی چھتیں انکے اوپر آگریں،۔۔ یہاں بَنِيَّانٌ کے معنی عمارت ہیں جن کے نیچے بنیادیں ہوں اور اوپر چھتیں - قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے قصہ میں آبْنَاءٌ بمقابلہ نِسَاءً آیا ہے - مثلاً (۱۴) میں ہے وَ يَذَّبِحُوْنَ آبْنَاءَ كُفٍّ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ كُفٍّ ”وہ تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری نساء کو زندہ رکھتے تھے،“ یہاں یا نو نِسَاءً کے معنی بیٹیاں ہونگے - لہذا آبْنَاءٌ کے معنی بیٹے - اور اگر نِسَاءً کے معنی عورتیں لئے جائیں تو آبْنَاءٌ کے معنی مرد ہونگے - ان معانی کی تائید (۱۵) سے بھی ہوتی ہے جہاں بَنِيْنَ (Males) کے مقابلہ میں اِنَاث (Females) آیا ہے - مجازی معنوں کے اعتبار سے آبْنَاءٌ کے معنی قوم کے معزز افراد ہونگے (ابنائے قوم) -

(نیز دیکھئے عنوان ن - س - و)

سورۃ لقمان میں يٰبُنَيَّ آیا ہے (۳۱) جس کے معنی ہیں ”اے میرے ننھے بیٹے،“ - یہاں بُنَيَّ - ابْنٌ کی تصغیر ہے -

## بنی اسرائیل

حضرت یعقوبؑ (حضرت ابراہیمؑ کے پوتے) کا لقب اسرائیل (یعنی مردِ خدا) تھا - آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے

ہیں۔ آپ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن بامین کی نسل کا قبیلہ، فلسطین کے علاقہ (Juda) میں حکمران تھا۔ اس قبیلہ کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں عام طور پر یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے ایک ہی مفہوم لیا جانے لگا۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا لیکن جب حضرت یوسفؑ مصر میں صاحب اقتدار ہو گئے تو انہوں نے اپنے والد اور تمام خاندان کو مصر بلا لیا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے مصر میں اس قبیلہ کی بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ انقلاب بھی آیا کہ فرعون مصر نے انہیں اپنا محکوم بنا لیا اور جو برتاؤ محکوموں کے ساتھ ہوتا ہے وہی ان کے ساتھ ہونے لگا۔ جب ان کی ذلت و پستی اتنا تک پہنچ گئی تو ان کی طرف حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے جو انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر پھر فلسطین کے میدانوں کی طرف لے گئے۔ یہ واقعہ قریب ۱۶۰۰ ق۔ م کا ہے۔ یہاں انہوں نے بڑا عروج حاصل کیا۔ ان میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے صاحب سطوت و شوکت نبی پیدا ہوئے۔ لیکن اس کے بعد اس قوم نے قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تشت و انتشار کے عذاب میں مبتلا ہو کر دن بدن کمزور ہوتے چلی گئی۔ ۵۹۹ ق۔ م میں بابل کے شاہنشاہ بنوکد نصر (بخت نصر) نے یروشلم (یروشلم المقدس) پر حملہ کیا اور یہودیوں کے اس ملی مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ انہیں قید کر کے بابل لے گیا اور وہاں ذلیل ترین زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ (قرآن کریم نے یہودیوں کی اس پہلی تبعاعی کی طرف (۲۴) میں اشارہ کیا ہے)۔ قریب اسی سال تک یہ اس عذاب میں مبتلا رہے تا آنکہ فارس کے تین بڑے بڑے شاہنشاہ خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا یکے بعد دیگرے ان کی امداد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے انہیں بابل کی قید سے رہائی دلا کر یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۱۵ ق۔ م میں ہیکل دوبارہ تعمیر ہو گیا اور آوارہ وطن یہودی پھر اپنے ملی مرکز میں آباد ہو گئے۔ [قرآن نے اس کی طرف (۲۴) میں اشارہ کیا ہے اور (۲۵) میں اس سوسال کی ”ملت“ کو تعمیلی انداز میں بیان کیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر وہی حالت ہو گئی۔ چنانچہ ۳۳۲ ق۔ م میں پہلے اسکندر نے ان پر حملہ کر کے ان کا شہرازہ بکھیر دیا اور پھر ۳۲۰ ق۔ م

میں بطليموس (Ptolemy) نے یروشلم پر قبضہ کر کے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اسکے بعد ۶۶ ق۔ م میں ہاپٹی (رومی) نے یروشلم کو تباہ کیا۔ ۵۱ ق۔ م میں ایک اور یورش نے ان کے وقار کو یکسر ختم کر دیا [قرآن کریم نے (۱۰۷) میں اس دوسری تباہی کی طرف اشارہ کیا ہے]۔

اس مقام پر فطرت نے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقعہ دیا اور ان میں حضرت عیسےؑ مبعوث ہوئے۔ لیکن ہیکل کے مشائخ و علما نے حکومت کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کی اور اس طرح اپنی تباہی پر خود اپنے ہاتھوں مہر ثبت کر دی۔ ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائٹس نے ان پر آخری وار کیا جس سے (مرکزی حیثیت سے) ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ انسانکو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں۔

۷۰ء مہینے کی دسویں تاریخ کو ایسے خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی، سقوط یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلادیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہودیوں کے علما و مشائخ نے حضرت عیسےؑ کی مخالفت کیوں کی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا یہ بیان قابل غور ہے۔ اس کتاب کی فصل ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ

”تب ان لوگوں نے کاهنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا، اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم پر یہ بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اسوقت تو یہ ہمازی تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ لیکن (اگر اسے حکومت حاصل ہو گئی تو) اس کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دئے جائیں گے تو ہم مجبور ہونگے کہ اپنی روفی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اسوقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں ہیں جیسا کہ ہم ان کی شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اسی سبب سے ہم اسکی قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہے وہ کر لینگے۔ (اسوقت) اگر ہم غلطی کرتے ہیں تو ہمارا خدا رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ

کے ساتھ اسے راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جبکہ یہ آدمی ہمارا بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ کیا جاسکیگا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسے موسیٰؑ نے لکھی ہے۔“

جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو وہ اگر تباہی اور بربادی کے رسوا کن عذاب میں مبتلا نہ ہو تو اور کیا ہو؟ نبی اکرمؐ کے دور رحمت مآب میں ان کے لئے پھر ایک موقعہ آیا تھا کہ نظام خداوندی کے اتباع سے شرف انسانیت کی سعادت حاصل کر لیں لیکن انہوں نے اپنی ضد اور تساوت قلبی کی بناء پر اس دعوت کی بھی انتہائی مخالفت کی اور بالآخر جزیرۃ العرب سے نکال دئے گئے (قرآن حکیم نے اس کا ذکر (۵۹) میں کیا ہے) اس کے بعد یہ قوم ”آوارہ گرد یہودی“ (Wandering Jews) کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی تاآنکہ اب بعض طاقتور سلطنتوں کے سیاسی مصالح نے ان کے لئے فلسطین میں ”گھر“ بنا دیا ہے۔ (چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس مقام پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)۔

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہودیوں کے ہاں مذہب نسلی (قومی) تھا۔ یعنی یہودی وہی ہو سکتا تھا جو یہودیوں کے گھر پیدا ہو۔ کوئی غیر بنی اسرائیلی یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ ایک بات ہی اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ مذہب قطعاً وہ نہیں تھا جو ان کے انبیائے کرام کو خدا کی طرف سے ملا تھا۔ خدا کا دیا ہوا دین تمام نوع انسانی کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ساحرین دربار فرعون حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر رد نہیں کر دیا کہ خدا پر ایمان صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ تم اس دین میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے اسے قومی دین بنا لیا۔ (بنی اسرائیل کے متعلق مزید تفصیل میری کتاب ”برق طور“ میں ملیگی)

## ب ہ ت

بہت - حیرت زدہ ہو جانا۔ متحیر ہو کر خاموش ہو جانا۔ اَلْبَهْتُ۔ کسی کو اچانک پکڑ لینا۔ فَبْهَتَ اَلْیَزْدِی کَفَرًا (۴۵۸)۔ جس نے خدا کا انکار کیا تھا وہ اس دلیل قاطع کی گرفت میں اس طرح آ گیا کہ ششدر و حیران ہو کر خاموش رہ گیا۔ فَبْهَتُوْهُمْ (۱۲) وہ انقلاب اس طرح اچانک آئیگا کہ



انہیں مبہوت کر دیگا۔ بَہْتَانٌ کسی پر ایسا الزام لگا دینا جسے منکر وہ ششدر و حیران رہ جائے۔ (۲۴)۔ یعنی اِنْكَ مَسِيْنٌ۔ جھوٹی بات (۲۴)۔  
سورۃ ممتحنہ میں یہ لفظ (بَہْتَانٌ) ہر عمل شنیع اور ناروا حرکت کے لئے آیا ہے جہاں کہا ہے وَلَا يَأْتِيَنَّ يَبْهَتَانِ يَفْتَرِيْنَهٗ (۱۲) ”اور نہ کوئی بہتان باندھ لائینگی“۔ یعنی کسی عمل شنیع کی مرتکب نہیں ہونگی۔

## ب ہ ج

اَلْبَهْجَةُ۔ حسن و جمال۔ نباتات میں تروتازگی اور انسانوں میں خندہ روئی اور ہشاشت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اَلَا يَبْتَهِجُ۔ خوشی اور سرور۔ تَبَاهَجَ الْقُرُوصُ۔ باغ میں پھول بہت کھل گئے۔ سورۃ حج میں ہے۔ وَاَنْتَبَهتْ مِّنْ كَيْلٍ زَوْجٍ بَهِيْجٍ (۲۲) ”اور زمین ہر قسم کے تروتازہ اور حسین و خوشنما ہودے آگئی ہے“۔ سورۃ نمل میں ہے۔ حَتّٰى اَتٰى ذَاتَ الْبَهْجَةِ (۲۶)۔ ”حسین و خوشنما باغات“۔

## ب ہ ل

اَبْهَلَ۔ اسے اسکی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دیا۔ اَبْهَلَ النَّاقَةَ۔ اونٹنی کو تنہا باندھ بغیر چھوڑ دیا کہ جسکے جی میں آئے اسکا دودھ دوہ کرے جائے۔ یا بغیر سہار کے چھوڑ دیا کہ وہ جہاں سے چاہے چرتی رہے۔ اِسْتَبْهَلَ الْوَالِي الْقَرْعِيَّةَ۔ حاکم نے رعایا کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو جی میں آئے کرے\*۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ اَبْهَلَ کے اصلی معنی کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اسکی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ اسے اسکی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ راغب نے اَلَا يَبْتَهِلُ فِی الدُّعَاءِ کے معنی کھل کر عاجزی سے دعا کرتے رہنا بھی لکھے ہیں\*\*۔ اَلْبَهْلُ مِیْنِ الْهَالِ۔ کے معنی تھوڑا سا مال ہیں۔ اَلْبَهْلُ تھوڑی سی حقیر چیز\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں پانی کی کمی کو بھی شامل کیا ہے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۶) میں آیا ہے جہاں رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اگر یہ اہل کتاب ان دلائل و براہین کے بعد بھی نہ مانیں تو ان سے کہو کہ ہم اور ہمارے اہل و خیال ایک طرف ہو جاتے ہیں اور تم اور

تمہارے اہل و عیال ایک طرف ہو جائیں۔ (تَمَّ تَبْتَهیل)۔ اور اس طرح فَتَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَی الْكَذَّابِینَ (۳۰)۔ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اس کے بعد تمہارے اور ہمارے درمیان یہ معاملہ ہونا چاہئے کہ تم ہمارے معاشرہ میں دخیل نہ ہو اور ہم تم لوگوں سے کچھ واسطہ نہ رکھیں (یعنی ایک دوسرے کو اس کی فکر و رائے میں آزاد چھوڑ دیا جائے) اور طرفین اپنی اپنی جگہ اپنا پروگرام مکمل کرتے جائیں۔ اس کے بعد یہ ہتھ چل جائیگا کہ کونسی جماعت خدا کی نوازشوں سے محروم (یعنی ملعون) ہو جاتی ہے، (لعنت کے یہی معنی ہیں) بس وہی اپنے دعوے میں جھوٹی ہوگی۔ یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقامات پر ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ وَ أَهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیلًا (۳۱)۔ (نیز فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیلَ (۸۵) ، ”نہایت عمدگی سے ان سے کنارہ کش ہوتے ہوئے انہیں چھوڑ دے“۔ اور اس کے بعد ان سے کہہ دے کہ اَعْمَلُوا عَلَیْ مَا نَنْحِیْکُمْ اِیْنِیْ عَمَلٌ فَتَعْلَمُوْنَ مَنْ تَعْمَلُوْنَ لَہٗ عَاقِبَۃٌ اَلَّذِیْنَ اَنۡشَءَ لَا یُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ (۳۲)۔ ”تم اپنی جگہ کام کرتے جاؤ اور میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دینگے کہ آخر الامر کس کے حصہ میں آتی ہے۔ اس سے خدا کے اس قانون کی صداقت واضح ہو جائیگی کہ ظالمین کی کھیتیاں کبھی ثمر بار نہیں ہوا کرتیں“۔ یہی لعنة الله علی الکاذبین ہے۔

رسول کے انقلاب آفرینی کے پروگرام میں پہلا مرحلہ تبلیغ کا ہوتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ان لوگوں سے حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی کا ہوتا ہے جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اس پیغام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس مرحلہ میں ان سے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ تم میرے پروگرام میں دخل نہ دو، میں تمہارے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ اسی کسر سورۃ آل عمران میں تَبْتَهیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ تصادم (ٹکراؤ) کا ہوتا ہے جب نتائج نکل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یعنی فلاح اور لعنت کے بٹین طور پر سامنے آ جانے کا مرحلہ۔

## ب ر ہ م

اَلْبُہْمَۃُ۔ ٹھوس چٹان۔ اس سے اَلَا بُہْمٌ ٹھوس اور بند چیز۔ گونگا۔ نیز غیر واضح۔ غیر فصیح کو کہتے ہیں۔ اور بُہْمَۃٌ مشکل معاملہ کو جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ اَلَا بُہْمٌ اَلَا سُرٌ اِبْہَامًا۔ معاملہ غیر واضح ہو

گیا اور سمجھ میں نہ آ سکا کہ اسے کس طرح نحل کیا جائے۔ حَائِطٌ مُّبْہَمٌ\*۔ اس دیوار کو کہتے ہیں جسم میں کوئی دروازہ نہ ہو\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح ہو جانا کہ اسکی طرف جانے کا راستہ نہ ملے۔ یعنی غیر واضح اور مبہم ہو جانا۔

گوئگی عوئے اور وضاحت سے کلام نہ کر سکنے کے اعتبار سے بَہَائِمٌ\* (واحد اَلْبَہِیْمَةُ\*) تمام بے عقل اور بے زبان جانوروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بول نہیں سکتے یا انکی آواز میں ابہام ہوتا ہے اور اس سے بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس میں تمام جانور شامل ہوتے ہیں خواہ وہ دریا ہی میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن صاحب محیط اور راغب دونوں نے لکھا ہے کہ درندے اور پرندے اسمیں شامل نہیں ہوتے\*۔ قرآن کریم نے کہا ہے اَحِلَّتْ لَّكُمْ بَہِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یَتَلٰی عَلَیْکُمْ (۵۱)۔ تمہارے لئے بَہِیْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال قرار دیئے گئے ہیں، بجز ان کے جنہیں خود وحی (قرآن) کی رو سے حرام قرار دینا گیا ہے۔ (۵۲)۔ اسکے مفہوم کیلئے (ن۔ ع۔ م کے عنوان میں اَنْعَامٌ\* دیکھئے)

## ب و ا

بَاءٌ - یَبْوْءٌ - بَوْءٌ\*۔ کے بنیادی معنی ہیں کسی کی طرف لوٹنا۔ رجوع کرنا۔ موافق و مطابق ہو جانا۔ اقرار و اعتراف کرنا۔ بوجہ اٹھانا۔ برابر سرابر ہو جانا\*\*۔ قرآن کریم میں ہے وَ بَاءُ وَا یَغْضَبُ مِیْنَ اللّٰہِ (۲۱)۔ وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور اسے لادے ہوئے پائے، وہ اپنے اعمال کی وجہ سے سزا کے مستوجب ہو گئے۔ انکے اعمال، اور ذلت و رسوائی کی عقوبت، ایک دوسرے کے ساتھ بالکل فیت (موافق) ہو گئے۔

سورة المائدہ میں فرزندِ آدم کے قصے میں کہا گیا ہے کہ مظلوم نے ظالم سے کہا اِنِّیْ اَرِیْکَ اَنْ تَسْبُوْءَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِکَ (۲۹)۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے قتل کے جرم اور اپنے دیگر جرائم کا بوجہ اٹھا لے،۔ انکی سزا کا مستحق بن جائے۔

اَلْمَبَآءُ\*۔ چہتہ کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنی ہیں مکان۔ قیام گاہ\*۔ بَوْءُ الْمَکَانَ: وہ کسی جگہ ٹھہرا، اقرار۔ بَوْءُ الْعَنْزِیْلِ اُسے کسی جگہ اتارا، ٹھہرایا۔ (لازم و متعدی)۔ نیز بَوْءُ مَنَّیْزِلَہٗ کے معنی ہیں اس کے لئے کسی

جگہ کو موافق و سازگار بنایا، ہموار اور درست کیا \*\*\*۔ راغب نے بھی اس مادہ کے معنوں میں کسی جگہ کے اجزاء کا ہموار ہونا، سازگار و مناسب ہونا بتایا ہے۔ **بَوَّاتٌ لَّہٗ مَسَکَاتٌ**۔ میں نے اس کے لئے کسی جگہ کو ہموار و درست کیا \*\*\*۔ **سُورَةُ حَجِّ** میں ہے **وَاذْ بَوَّاتِ اِنَّا لَا بُرَہِیْمَ مَسَکَانَ النَّبِیِّتِ** (۲۲)۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ابراہیمؑ کیلئے خانہ کعبہ کی جگہ کو متعین کیا، اسے ان کے لئے سازگار و ہموار کیا۔ اور یہ بھی کہ اس مقام کو ان کے لئے مرجع بنا دیا۔ **تَبَوَّاتِ الْمَکَانَ** : کسی جگہ اترا اور وہاں اقامت کی \*\*\*۔ **سُورَةُ حَشْرِ** میں ہے **وَالَّذِیْنَ تَبَوَّوْا الدَّارَ وَالْاٰیْمَانَ مِنْ قَبْلِہِمْ** (۵۹)۔ ”جن لوگوں نے ان سے پہلے مدینہ کو قیام گاہ بنا لیا اور ایمان کو اپنے دل میں محکم جگہ دے لی“۔

## ب و ر

**بَابٌ**۔ داخل ہونے کی جگہ\* دروازہ، اسکی جمع **أَبْوَابٌ** ہے۔ مزارعت (کھیتی باڑی) میں ان جگہوں کو بھی **أَبْوَابٌ** کہتے ہیں جہاں سے پانی کھولا جائے \*\*\*۔

**ہَذَا أَبْوَابُہٗ**۔ یہ اس کے مناسب ہے۔ اس کے لائق ہے۔ یا اسکی شرط ہے\*۔

**أَبْوَابُ السَّمَاۓِ** (۱۶)۔ خیر و برکت کی راہیں۔  
**أَبْوَابُ جَهَنَّمَ** (۲۴)۔ جہنم کے طبقات۔ درجات (نیز ۳۱)۔ **أَبْوَابُ کَیْلِ شَیۡطٰنِی** (۲۴)۔ ہر طرح کی راحت کے اسباب و سامان۔  
**سُورَةُ بَقَرَةِ** میں **سُکَانَ** کے دروازوں (**أَبْوَابٌ**) کے مقابلہ میں **ظُہُورٌ** رہتا (۱۸۹)۔ ”پچھواڑے“، آیا ہے۔

## ب و ر

**الْبُورُ**۔ غیر آباد زمین جس میں کھیتی نہ کی گئی ہو۔ ناقابل کاشت زمین۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی **هَلَکَتْ** اور **تَعَطَّلَ** لکھے ہیں۔

**بَارِعَ مَلِئَہٗ**۔ اسکا عمل بیکار گیا \*\*\*۔ **قرآن کریم** میں ہے۔ **وَمَکَرُہٗ** **اَوَّلَیْکَ هُوَ یَبُورُ** (۳۵)۔ ”انکی تدبیر بیکار جائیگی“۔ بے نتیجہ رہ جائیگی۔ **بَارَتِ السُّوقُ** بازار مسدا پڑ گیا \*\*\*۔ **قرآن** میں ہے **تِجَارَۃٌ لَّنْ تَبُورُ** (۳۵)۔ ”ایسی تجارت جو مندی نہ پڑے“۔ جس میں خسارہ نہ ہو۔ **الْبُورُ**

\* تاج۔ \*\* محیط۔ \*\*\* تاج۔ محیط۔ راغب

نکمنے، بے فیض، نقصان اٹھانے والے، تباہ و برباد ہو جانے والے\*۔ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا (۲۸)۔ ”وہ ہلاک ہونے والی قوم تھی“۔ اَلْبَوَارُ۔ تباہی، بربادی، مندا پن۔ بَوَارُ اَلْاَیْم۔ کنواری یا بیوہ لڑکی کا اس لئے گھر میں بیٹھا رہنا کہ اس کے لئے کوئی پیغام نہ آئے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَاحْتَلَوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۲۸)۔ وہ اپنی قوم کو ایسی جگہ لے آئے جہاں اس جنس کا کسب کا کوئی گاہک نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کی بات تک نہ ہوچھے۔ جہاں اسے کوئی ”پیغام“ نہ دے۔ جہاں یہ سخت خسارہ میں ہو۔ جہاں اسکے لئے تباہی اور ہلاکت سامانی ہو۔ راہنماؤں کی غلط اندیشیوں اور مفاد پرستیوں سے قومیں ایسے ہی مقام میں پہنچ جاتی ہیں۔ اسے قرآن نے جَہَنَّمُ کہہ کر پکارا ہے (۲۹)۔ پوری آیات کا ترجمہ یہ ہے۔ ”کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے نعمت خداوندی کی جگہ کفر اختیار کر لیا اور اپنے کاروانِ ملت کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار نہ ہو۔ یعنی جہنم میں۔ اور اس میں وہ داخل ہو گئے۔ اور وہ بہت بری جگہ ٹھہرنے کی ہے“۔ جو لیڈر، نعمائے خداوندی کی قدر نہیں کوئے وہ اپنی قوم کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں لے آتے ہیں جہاں لیڈر اور ان کے متبعین، سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے ”جہنم“ میں لیڈروں اور ان کے متبعین کے باہمی مکالمات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یہ مقامات بڑے عبرت انگیز ہیں۔ (دیکھئے) ۲۱ و ۲۲ و ۳۳ و ۳۴ و ۳۶ و ۳۷ و ۳۸)۔

## ب و ل

اَلْبَالُ\*۔ وہ حالت جسکے متعلق کچھ فکر یا پرواہ کی جائے۔ گراقتدار اور مہتمم بالشان معاملہ جس میں جی اٹکا رہے۔ انسان کا دل۔ دل میں گزرنے والا خیال۔ نیز آرزو اور تمنا\*۔ سورة یوسف میں ہے مَابَالُ الْیَتْسُوْرِ (۲۵)۔ ”ان عورتوں کی حالت کیا ہے“۔ ان کا معاملہ کیا ہے۔ بَالُ کہنے سے مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ حضرت یوسفؑ کو اسکی فکر تھی۔ سورة محمد میں ہے وَاصْلَحْ بِاَلْبَالِمْ (۲۴)۔ ”خدا ان کے حالات اور معاملات کو سنوار دیگا“۔

## ب ی ت

بَیْتُ\*۔ راغب نے کہا ہے کہ بَیْتُ اصل میں اس جگہ کو کہنے میں جس میں انسان رات میں پناہ لے۔ لیکن اسکے بعد یہ لفظ گھر اور مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا\*\*۔

\*تاج۔ محیط۔ راغب۔ \*\*راغب۔

بَيْتُ الرَّجُلِ - آدمی کی بیوی نیز اس کے بال بچوں کو کہتے ہیں۔  
 اور اَلْبَيْتُ شَرَفٌ - اَلْبَيْتُ کے معنی شادی کرنا بھی ہیں\*۔  
 بَاتٌ - یَبِیتُ - رات بھر کوئی کام کرنا۔ اس کے معنی سونا اور آرام  
 کرنا نہیں ہیں۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص جو کہیں رات  
 گزارے اس کے لئے بَاتٌ کہنا صحیح ہے خواہ وہ رات کو سوئے یا کام کرے۔  
 بَيْتٌ اَلْاَمْرُ کے معنی ہیں کام کی تدبیر رات کے وقت کرنا۔ یا کام کو رات  
 کے وقت کرنا۔ بَيْتُ الْقَوْمِ - قوم پر رات کے وقت حملہ کرنا\*۔ اَلْبَيْتُ  
 غِذَا - اَلْبَيَاتُ - باسی (جو تازہ نہ ہو)\*\*۔

سورة بقرہ میں اَلْبَيْتُ خانہ کعبہ کیلئے آیا ہے (۱۲۵)۔ سورة الفرقان  
 میں یُبَیِّتُونَ (۲۵) راتوں کو مشورہ کرنے کے معنوں میں آیا ہے یا رات  
 گزارنے کے معنوں میں۔ اور (۲۹) میں یہ لفظ رات کے وقت حملہ کرنے کے  
 معنوں میں آیا ہے۔  
 بَيَاتًا (۴) راتوں رات۔

## ب ی د

بَادٌ - یَبِیدُ - کسی چیز کا جاتے رہنا۔ ختم ہو جانا۔ ہلاک ہو  
 جانا۔ بَادَتِ الشَّمْسُ بَيُّودًا - آفتاب غروب ہو گیا۔ اصل میں اَلْبَيْدُ آءٌ  
 لقی و دق جنگل یا صحرا کو کہتے ہیں جس میں سفر کرنا موجب ہلاکت ہو  
 بَادَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں وہ چیز متفرق اور منتشر ہو گئی۔ اسی سے اس کے  
 معنی جاتے رہنے اور برباد ہو جانے کے آئے ہیں۔ أَبَادَهُ اللهُ - خدا نے اسے  
 ہلاک کر دیا\*\*\*۔ سورة کہف میں ہے مَا ظَنُّ أَنْ تَبِیدَ هَذِهِ أَبَدًا  
 (۱۸)۔ ”میں گمان تک نہیں کرتا تھا کہ یہ کبھی برباد ہوگا،“۔ اَلْبَيَادُ  
 ہلاک ہونے والا\*\*۔

## ب ی ض

اَلْاَبْيَضُ - سفید۔ (جمع بیض اور مؤنث بَيْضَاءُ)۔ اَلْبَيَاضُ - سفیدی۔  
 یہ اَسْوَدٌ اور سَوَادٌ کی ضد ہے\*۔ چونکہ عربوں کے ہاں بَيَاضٌ افضل  
 ترین رنگ تھا اسلئے وہ فضل و کرم اور عمدہ خصائل کو بیاض سے تعبیر کرتے  
 تھے۔ چنانچہ جو شخص کسی عیب کے ساتھ آلودہ نہ ہو وہ اَبْيَضٌ اَلْوَجْہُ

کہلاتا تھا\*\*۔ نیز اس سے مراد زندگی کی بشارت اور شگفتگی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ (۱۰۵) ”جس دن کچھ چہرے سفید ہونگے اور کچھ چہرے سیاہ،“۔ اس میں تَبْيَضُّ سے مراد زندگی کی مسرتیں حاصل ہونا ہیں، جس طرح تَسْوَدُّ سے مراد حزن و غم ہے\*\*۔ اَلْبَيَاضَةُ۔ انڈا۔ نیز ہر چیز کی اصل اور مقام اجتماع۔ اجتماعی قوت۔ بنیاد۔ مقام حکومت و تسلط۔ جماعت۔ قبیلہ۔ اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ۔ وہ حجت جس پر دلیل و برہان قائم ہو۔ یعنی روشن اور واضح دلیل۔ نیز وہ ہاتھ جو کسی کو کچھ دیکر احسان نہ جتائے۔ جو بلا سوال دے\*۔ صاحب محیط نے اس کے معنی لکھے ہیں نعمت۔ قدرت۔ فخر۔ جودت۔ شہرت\*\*۔ قرآن کریم میں، حضرت موسیٰؑ کے قصے میں ”يَدُ بَيْضَاءُ“ کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے (مثلاً ۱۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸) اس کے مجازی معنی روشن اور واضح دلائل کے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

قرآن کریم نے جتنی عورتوں کے متعلق کہا ہے کَاَنْتَهُنَّ بَيِّضٌ مَّكْنُشُونَ (۳۹) یوں سمجھو جیسے وہ محفوظ رکھے عورتیں ”انڈے“ ہیں۔ سفید۔ شفاف۔ بے داغ۔ گوہر آبدار۔ کَاَنْتَهُنَّ اَلْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۸) ”گو یا وہ یاقوت اور مرجان ہیں،“۔ وہ عفت مآب جنہیں (شادی سے قبل) کسی نے چھوا تک نہ ہو (۵۹)۔ عفت و عصمت اور شرف و مجد کی مالک خواتین۔

اَبْيَضَّتْ یا بَيَضَّتْ کے معنی ہیں بھر جانا۔ آنکھوں میں آنسو بھر جانا۔ اَبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں\*\*\*۔ سورۃ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (۱۲)۔ اس کے یہی معنی ہیں۔ یعنی غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں۔

## ب ی ع

بَاعَ۔ بَيِّعَ۔ بَيْعًا۔ کسی چیز کو فروخت کر دینا یا خرید لینا۔ دونوں معنوں میں آتا ہے۔  
\*ناج۔ \*\*محیط۔ \*\*\*رازی۔

سورة بقرہ میں ہے یَوْمَ لَا يَبِيعُ فِيْهِ (۲۵۴) ”جس دن خرید و فروخت نہیں ہوگی“ اسی سورة میں آگے چل کر ہے۔ وَ اَحَلَ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الشِّرْبَ (۲۵۵) ”خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور (ربو) کو حرام ٹھہرایا ہے“۔ آگے چل کر (جہاں لین دین کے معاملات کے متعلق احکام دئے گئے ہیں) کہا گیا ہے کہ اَنْ تَكُوْنُ تِجَارَةً حَاضِرَةً (۲۸۲) ”نقد تجارت کی صورت میں لکھنے کی ضرورت نہیں“ وَ اَشْهَدُ وَاِذَا تَبَايَعْتُمْ (۲۸۴) ”جب باہمی بیع کا معاملہ ہو تو اس پر گواہ ٹھہراؤ،“۔ (اور لکھو بھی۔ سابق سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں اس خرید و فروخت کی طرف اشارہ ہے جو نقد نہ ہو) اس سے معلوم ہوا کہ تجارت اور بیع میں فرق ہے۔ اس کی تائید سورة نور سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے رَجَالٌ لَا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنِ ذِکْرِ اللّٰهِ (۲۴)۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی“۔ آجکل کی اصطلاح میں ان دونوں میں فرق یہ سمجھئے کہ بَيْعٌ تو عام خرید و فروخت کو کہینگے ”تجارة“ اسے جسے انگریزی میں (Trade or Commerce) کہتے ہیں\*۔ یا تجارت، پیشہ ورانہ سوداگری کو کہینگے اور بَيْعٌ میں عام تبادلہ اشیاء آجائیکا۔

اس آیت کو پھر سامنے لائیں جس میں کہا گیا ہے کہ ”خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربو کو حرام“۔ (۲۵۵) ”ربو“ کے متعلق گفتگو متعلقہ عنوان میں کی جائیگی۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”بیع“ کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے (اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوتا ہے) کہ بیع، یعنی خرید و فروخت میں جس قدر منافع لے لیا جائے وہ جائز ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ سورہ تطفیف میں ہے۔ وَ یُلْ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ۔ الَّذِیْنَ اِذَا كَانُوْا عَلٰی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَانُوْا مِنْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یَخْسِرُوْنَ (۸۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے۔ ”تباہی ہے ان کے لئے جو کمی کرتے ہیں۔ یعنی ان کے لئے کہ وہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا ماپ لیتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں“۔ ان آیات کا یہی مفہوم نہیں کہ ”ماپ تول پورا رکھنا چاہئے“۔ یہ آیات، قرآنی نظام معیشت کے ایک بہت بڑے اصول کو بیان کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ (مثلاً) ایک



کاریگر جوتا بنا کر دوکاندار کے پاس لاتا ہے۔ دوکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے کم سے کم دام دیکر جوتا خریدے۔ پھر جب اسی جوتے کا گاہک آتا ہے تو دوکاندار اس سے زیادہ سے زیادہ دام وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ تاجرانہ ذہنیت ہے جسے قرآن کریم نے تباہی کا موجب بتایا ہے اور اس کمائی کو ”تطفیف“ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ دوکاندار، کاریگر کو کم از کم دام کیوں دیتا ہے؟ یا یوں کہئے کہ کاریگر، کم از کم داسوں پر اپنی چیز بیچنے پر کیوں مجبور ہو جاتا ہے؟ اس لئے کہ اس کے پاس ”سرمایہ“ نہیں۔ لہذا یہ ”منافع“ (جو اس طرح گاہک سے وصول کیا جاتا ہے) سرمایہ پر بڑھتی ہے جو جائز نہیں ہو سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ دوکاندار کو کس قدر منافع لینا جائز ہے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ دوکاندار ایک تو سرمایہ لگاتا ہے۔ اور دوسرے دن بھر دوکان پر بیٹھ کر محنت کرتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِيْلَا نِسْآنِ اِلَّا مَا سَعَى (۲۹) ”انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے“۔ لہذا یہ دوکاندار اپنی محنت (Labour) کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ پر زیادہ لینے کا حقدار نہیں۔ اس کے لئے یہ مقرر ہونا چاہیے کہ اس دوکاندار کی دن بھر کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ وہ اس کاروبار میں سے اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ یعنی وہ گاہک سے ”رأس المال + اپنی محنت“ لے سکتا ہے۔ معاشیات میں قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تَظْلَمُوْنَ (۲۹) ”نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ۔ نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے“۔ نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ نہ تم پر زیادتی کی جائے۔ ربوٰ میں چونکہ محنت کچھ نہیں ہوتی۔ صرف سرمایہ پر بڑھتی لی جاتی ہے، اسلئے اس میں صرف رأس المال کا واپس لینا جائز ہے (۲۹)۔ اور بیع میں چونکہ ماتہ محنت بھی ہوتی ہے اسلئے اس میں رأس المال اور محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ صورت بھی اسوقت تک ہوگی جب تک قرآن کا معاشی نظام اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوتا۔ اسوقت تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) پر ہوگی اور اشیاء کے تبادلہ میں منافع لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

لہذا جس کاروبار میں صرف سرمایہ سے آمدنی ہو جائے اسلئے معاشرہ میں وہ جائز نہیں ہوگا۔ بیع اور ربوٰ میں فرق یہ ہے کہ بیع میں سرمایہ کے ساتھ محنت بھی ہوتی ہے اور ربوٰ میں فقط سرمایہ ہوتا ہے۔ بیع میں محنت کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔

بیع کے معنی باہمی معاہدہ کے بھی ہوتے ہیں \*۔ قرآن کریم کی رو سے مؤمن اور اس کے خدا کے درمیان خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ "ان الله اشترىكم من المؤمنين أنفسهم وأموالهم بآن لهم الجنة" (۱۱۱) "ہے شک اللہ نے مومنوں سے انکی جانوں اور مالوں کا سودا جنت کے عوض کر لیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس معاہدہ کی رو سے نہ مال اقدار کی ذاتی ملکیت میں رہتا ہے، نہ وہ اپنی جان کے آپ مالک ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ان کے پاس بطور امانت رکھتے ہیں۔ ان کے معاوضہ میں انہیں اس دنیا میں بنی جنتی زندگی دیدی جاتی ہے اور آخرت میں بھی (تفصیل میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملیگی)۔ عملاً یہ معاہدہ اس نظام کے مرکز کے ساتھ ہوتا ہے جو دنیا میں خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے (سب سے پہلے رسول اللہ کے ساتھ اور حضور کے بعد خلافت علیٰ منہاج رسالت کے ساتھ جو ہمیشہ قائم کی جاسکتی ہے) یہی وہ معاہدہ ہے جو شروع میں اسلام لاتے وقت کیا جاتا ہے، جیسا کہ سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبَايِعُوكَ... (۱۲)" "اے نبی جب مومن عورتیں تیرے پاس اس معاہدہ کے لئے آئیں"۔ اور جس کی تجدید اس وقت ہوتی ہے جب اس نظام کو سخت مشکلات کا سامنا ہو اور جماعت مؤمنین کو سر بکف میدان میں نکل آنا پڑے۔ یہ وہ بیعت تھی جو جماعت مؤمنین نے حدیبیہ کے مقام پر کی تھی اور جس کا ذکر سورہ فتح میں ان الفاظ میں آیا ہے "ان الذين آمنوا بآياتنا يبعونك انما يبایعون الله يبد الله فوق أيديهم" (۱۰) "جو لوگ تسبیح سے بیعت (معاہدہ) کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے معاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر (بظاہر تمہارا ہاتھ لیکن درحقیقت) اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے"۔ آپ نے دیکھا کہ جو معاہدہ خدا کے ساتھ کیا جاتا ہو اسکی عملی شکل کیا ہوتی ہے؟ یعنی وہ معاہدہ اس نظام کے مرکز کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہو۔ یہ تھی وہ بیعت جو جان اور مال، یعنی سب کچھ دیکر جنت لینے کے لئے کی جاتی تھی۔ لیکن جب دین، مذہب، خانقاہیت میں بدل گیا تو بیعت سے مفہوم رہ گیا "پیری سربدی کی بیعت"!

یا وسعت ابلاک میں تسکیر مسلسل

یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب سردان خود آگہ و خدا مست

یہ مذہب سلا و نباتات و جمادات (اقبال)

الْبَيْعَةُ - یہود کا کنیسہ، یا نصاریٰ کی عبادت گاہ \* (۲۱) - صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ کنیسہ یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں اور الْبَيْعَةُ نصاریٰ کی -

## ب ی ن

الْبَيْنُ - جدائی، الگ الگ کرنا یا ہونا (لازم و متعدی) بعض لغویین کا خیال ہے کہ اس میں جدا ہونے اور ملنے کے متضاد معنی پائے جاتے ہیں، لیکن یہ خیال کمزور سا ہے۔ اس کا صحیح استعمال 'فصل' (الگ الگ کرنے) کیلئے ہوتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔ الْبَيْنُ دو زمینوں کے درمیانی فاصلہ یا حد کو کہتے ہیں - بَا' نُوَا' بَيْنًا - وہ جدا ہو گئے - بَا' نَ الشَّيْءِ - وہ چیز منقطع ہو گئی - ضَرْبَهُ فَا' بَانَ رَأْسَهُ - اسے مارا اور اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیا - طَلَاقُ بَائِنٍ - اس طلاق کو کہتے ہیں جس کے بعد میاں بیوی کے تعلقات منقطع ہو جائیں \* - (واضح رہے کہ یہ ایک فقہی اصطلاح ہے - قرآن کی رو سے طلاق رشتہ مناکحت کو منقطع کر دینے کے فیصلہ کا نام ہے دیکھئے عنوان ط - ل - ق) بَيْنٌ - دو چیزوں کے وسط اور درمیان کو کہتے ہیں \*

الْبَيَانُ کے معنی ہیں کسی چیز کا کھل کر سامنے آجانا، واضح ہو جانا، نمودار ہو جانا - (اس میں لازم اور متعدی دونوں معنی پائے جاتے ہیں) - بَيْنُ الشَّجَرِ - درخت کے پتے نکل آئے - یا جو چیزیں سب سے پہلے نمودار ہوتی ہیں (شکوئے وغیرہ) وہ نمودار ہو گئیں - بَيْنُ الْقُرْآنِ - بینگ نکل آیا - صاحب محیط کے نزدیک وہ دلیل و غیرہ جس سے کوئی چیز آشکارا اور واضح ہو جائے بَيَانٌ کہلاتی ہے \*\* - قرآن کریم میں تَبْيِيْنٌ بمقابلہ کَتَمٌ آیا ہے (۱۸۶، ۱۸۷) کَتَمَ کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپا دینا - لہذا تَبْيِيْنٌ کے معنی ہوئے کسی چیز کا ظاہر کر دینا - نمایاں کر دینا - دوسری جگہ یہ لفظ اخْبَانٌ (چھپانا) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵) - اسی جگہ قرآن گو کہ تَبْيِيْنٌ \* (۱۵) کہہ رہا ہے - حقائق مستورہ کو ظاہر کرنے والا ضابطہ حیات - یا وہ ضابطہ حیات جو کھلے کھلے حقائق اپنے اندر رکھتا ہے - جن حقائق کا تعلق دنیا کے محسوسات سے ماوراء ہے ان کا معلوم کر لینا انسان کے بس کی بات نہیں - وہ انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں - انہیں خود خدا وحی کے ذریعے رسول پر

منکشف کرتا ہے۔ اس طرح حقیقت کو منکشف کر دینے کا نام تَبْیَانٌ ہے۔ اسی لئے قرآنی حقائق کو بَيِّنَاتٌ کہا گیا ہے۔ یعنی وہ حقیقتیں جنہیں خدا نے خود ظاہر کیا ہے۔ اگر وہ انہیں بَيِّنَاتٌ (ظاہر) نہ کرتا تو وہ مستور ہی رہتیں۔

یہاں تک اس مرحلہ کا ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان مستورہ حقائق کو بذریعہ وحی نبی اکرمؐ پر منکشف کیا۔ اب اگلا مرحلہ دیکھئے۔ اور وہ بھی بہت اہم ہے۔

قرآن کریم کی رو سے خدا کی طرف سے انسانوں پر انکشاف حقیقت کا ایک ہی طریق ہے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی، حضرات انبیاءؑ کرامؑ کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن انسانی ذہن نے غیر از انبیاءؑ پر بھی انکشاف حقیقت کا تصور پیدا کر لیا اور اسے کشف والہام کا نام دیدیا (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل ھ م)۔ اور کشف والہام کے متعلق یہ عقیدہ پیدا کر لیا کہ اس سے صرف وہی شخص کیف اندوز ہو سکتا ہے جس پر حقائق منکشف ہوں۔ انہیں دوسروں تک منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ ”ذوق این بادہ ندانی بخدا تانہ چشی“ اور ”کاترا کہ خبر شد خبرش باز نیاید“، وغیرہ قسم کے اقوال اسی عقیدہ کے مظہر ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ عقیدہ غلط ہے۔ خدا کی طرف سے کشف حقیقت سے مقصود ہی یہ ہے کہ اسے دوسرے لوگوں پر بھی ظاہر کیا جائے۔ یہ انکشاف حقائق ایک فرد (رسول) کے ذریعے تمام انسانوں کے لئے کیا جاتا ہے لہذا اس فرد (رسول) کا فریضہ ہے کہ اسے دوسروں پر ظاہر کرے۔ اور جن پر اسے ظاہر کیا جائے ان کا فریضہ یہ ہے کہ غور و فکر سے اسے سمجھیں اور پھر دوسروں پر اس کا اظہار کریں۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جسے سورۃ نحل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”وَآتَيْنَاكَ الْكِتَابَ الْكَرِيمَ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ“ (۱۶) ”اور ہم نے اس ضابطہ“ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے تو اسے لوگوں پر ظاہر کر دے اور تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں“، (نیز ۱۶)۔ یعنی قرآن نے یہ کہا ہے کہ۔

(۱) خدا نے رسول کی طرف کتاب نازل کی۔ (”وَآتَيْنَاكَ الْكِتَابَ“)

(۲) لیکن یہ کتاب درحقیقت تمام انسانوں کی طرف نازل کی گئی ہے (”مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“)۔ اس لئے

(۳) رسول کا فریضہ ہے کہ اسے (اپنے) تک ہی محدود نہ رکھے، جیسا کہ

کشف والہام کے غلط تصور کی بناء پر سمجھا جاتا تھا ) ہاں کہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (تَبَيَّنَ لِلنَّاسِ)۔ اسے ان تک پہنچا دے۔ (بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ...)۔

(۴) جو لوگ اسے چھپاتے ہیں ان پر خدا کی لعنت ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ الْقَذِرِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اُنْزِلْنَا مِنْ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ وَلِئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۲۵۹)۔ ”جو لوگ اسے چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی کھلی باتوں یعنی ہدایت سے نازل کیا ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے قرآن میں تمام لوگوں کے لئے ظاہر کر دیا ہے۔ تو ان لوگوں پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے“ (لعنت کے لئے دیکھئے عدوان (ل۔ ع۔ ن)۔ اس کے بعد ہے۔ اِلَّا الْقَذِرِيْنَ تَاٰتُوْا وَاَصْلَحُوْا وَيَتَّخِذُوْا فَاٰوِلٰئِكَ اَتُوبُ عَلَيْهِمْ)۔ (۲۶۰) ”مگر وہ لوگ جو اس روش سے باز آ گئے۔ اور انہوں نے اصلاح کر لی۔ اور ظاہر کر دیا (جو کچھ اللہ نے نازل کیا تھا)۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی طرف میں لوٹ کر آ جاتا ہوں“۔

جو کتاب رسول اللہ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن کریم) اس کے متعلق بتا دیا کہ۔

(۱) وہ تَبَيَّنَ اَلْكُلِّ شَيْءٍ ہے (۱۸۹)۔ یعنی جن باتوں کو بذریعہ وحی دیا جانا مقصود تھا اس نے ان سب باتوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ دوسری جگہ ہے جَكَذَّ اِلَيْكَ يٰٓيَسٰٓرُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّاهُمْ يَتَّقُوْنَ (۲۸۷) ”اس طرح اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لئے ظاہر کر دیتا ہے تاکہ وہ ان کی نگہداشت کریں“۔

(۲) لہذا یہ کتاب تمام نوع انسانی کے لئے اظہار حقیقت ہے۔ هٰذَا بَيٰٓاٰنٌ لِلنَّاسِ (۱۳۷)۔

(۳) اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل ظاہر ہو گئے ہیں۔ قَدْ تَبَيَّنَ الشَّرُّدُ مِنَ الْغَيِّ (۲۵۶)۔

(۴) یہ کتاب مُبَيَّنٌ (۱۵) ہے۔ یعنی بالکل واضح اور ظاہر۔ کھلے اور واضح راستے کو امام مُبَيَّنٌ (۱۹) کہتے ہیں۔

(۵) یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۱۵) ”یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (روشنی) یعنی واضح کتاب آ گئی،“۔ روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی چیز کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشن ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو آنکھوں سے کام لے دوسری چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لئے اسے تَفْصِيلٌ کُلُّ شَيْءٍ (۱۱۱) بھی کہا گیا ہے۔ ”تفصیل“ کے معنی ہیں الگ الگ کر کے دکھا دینا (دیکھئے عنوان ف۔ ص۔ ل)۔

یہ ہیں اس کتاب (قرآن) کی خصوصیات جسے اللہ تعالیٰ نے بوساطت نبی اکرمؐ تمام نوع انسانی کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ قرآن کا انداز تَبْصِيْرٌ کیا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے وَكَذَٰلِكَ نَصْرِفُ الْآيَاتِ وَلِيَتَّبِعُوْا اَدْرَسْتَ وَلِيَبْلُوْنَهُ لِيَقُوْمَ يَْعَزِمُوْنَ (۱۶۶)۔ ”اس طرح ہم اس کی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ یہ کہیں کہ تو نے بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔ اور تا کہ ہم اسے ان لوگوں پر ظاہر کر دیں جو علم سے کام لیتے ہیں،“۔ یعنی قرآن تصریف آیات سے تبيانِ حقیقت کرتا ہے اور اسے علم و فکر کی رو سے سمجھا جاتا ہے۔ اَلْبَيِّنَاتُ کے معنی ہیں ایسی دلیل جو عقلی طور پر یا محسوس طور پر واضح ہو\*۔ جمع بَيِّنَاتٌ ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے عَلَّمَهُ اَلْبَيِّنَاتُ (۲۰)۔ اللہ نے اسے اظہارِ خیالات کی صلاحیت دی ہے۔ یعنی یہ صلاحیت کہ وہ زبان اور قلم کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ یہ خصوصیت انسان کو باقی حیوانات سے متمیز کرتی ہے اور انسانی تہذیب و تمدن اور عروج و ارتقاء کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

بَيِّنٌ کے معنی ہیں درمیان۔ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (۱۳۰)۔ ”اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے،“۔ (بَيِّنٌ يَدَّيْهِ کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی)۔

اُمْتَبَاكَ اَلْاَمْرُ۔ معاملہ کھل گیا، ظاہر اور واضح ہوا۔ قرآن کریم میں ہے وَلَيَسْتَبِيْنَنَّ سَبِيْلَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۵۵) تاکہ مجرموں کی راہ کھل کر واضح ہو جائے۔ تَبْيِيْنُ الشَّيْءِ جِز واضح اور ظاہر ہونے کا۔ تَبْيِيْنُهُ میں نے اسے کھولا واضح کیا اور اسے سمجھا دلازم و متعدی (۱۵۵)۔

## ت

## ت۔ (حرف)

ت۔ یہ حرف جر ہے جو قسم کہانے کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے تَاللّٰہ (۲۰۹) ”اللہ کی قسم“۔ الثعالبی نے ( فقه اللغة میں ) لکھا ہے کہ یہ ”تاء“ اللہ تعالیٰ کے اسماء کے علاوہ اور کہیں استعمال نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم میں متعدد مقامات میں یَا بَتَّ آیا ہے جس کے معنی ہیں ”اے میرے باپ“ (مثلاً ۱۲۱)۔ یہاں ت دراصل ی کی جگہ آئی ہے۔ یہ صرف آب کے ساتھ خصوصیت ہے۔

## تَابُوتٌ

تَابُوتٌ\*۔ صندوق\*۔ (۲۰۹)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی قلب اور سینے کے بھی ہیں\*\*۔ لسان العرب سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے (۲۰۸) میں اسکے معنی ایسے قلب کے ہونگے جو سکون و اطمینان سے لبریز ہو اور اسمیں حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی تعلیم ہو اور اسے کائناتی قوتوں (ملائکہ) کی تائید حاصل ہوتا کہ اسمیں ثبات اور استقامت رہے۔ مراد یہ ہے کہ حضرت طالوت کو اس قسم کا قلب عطا ہوا تھا۔ اور اگر اس کے مجازی معنی نہ لئے جائیں تو اس سے مراد وہ تابوت ہے جس کا ذکر بائبل میں آیا ہے۔

(بعض کے نزدیک یہ تاب سے ہے۔ دیکھئے عنوان ت۔ و۔ ب)

## ت ب ب

التَّبَّ - خسارہ۔ التَّبَابُ - التَّيِّبُ - التَّيِّبُ - نقصان اور خسارہ۔ ہلاکت اور تباہی۔ بربادی\*۔ سورۃ ہود میں ہے وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ (۱۱۱)۔ ”اس سے انکا نقصان یا ہلاکت ہی زیادہ ہوئی۔“

سورة المؤمن میں ہے وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ (۲۵)۔  
 ”فرعون کی تدبیر ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ تھی“۔ تَبَابٌ فَلَانًا۔ اس نے  
 فلان آدمی کو ہلاک کر دیا۔ اسْتَتَبَّ الْقَرْجُلُ۔ آدمی ضعیف اور کمزور  
 ہو گیا۔ عاجز ہو گیا۔ \*۔ التَّابُ۔ کمزور اور بوڑھا آدمی۔ اونٹ یا گدھا  
 جسکی کمر زخمی ہو گئی ہو اور اسطرح وہ کام کے قابل نہ رہے۔ \*

قرآن کریم میں ہے تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (۱۱)۔  
 ”ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہو گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہو گیا“۔ وہ  
 خود بھی تباہ ہو گیا اور جس قوت کے بل پر وہ نظام خداوندی کی مخالفت کرتا  
 تھا وہ بھی ختم ہو گئی۔ وہ مقابلہ کرنے سے عاجز آ گیا۔ تباہ و برباد ہو گیا۔  
 سخت نقصان میں رہا۔ (راغب کے الفاظ میں) مسلسل خسارہ میں رہا۔ \*\*\*۔

## ت ب ر

التَّبِيرُ۔ سونا۔ بغض لوگوں نے کہا ہے کہ چاندی اور دیگر معدنیات  
 کو بھی کہتے ہیں۔ بالخصوص اس حالت میں جبکہ انہیں کان سے نکالا جائے  
 اور صاف کر کے ڈھالا نہ جائے۔ التَّبِيرُ۔ توڑ دینا۔ ہلاک کر دینا۔ \*۔ ابن  
 فارس نے اس کے یہ دونوں معانی بنیادی لکھے ہیں۔ وَكَبَّلَ تَبِيرًا  
 تَتَبِيرًا (۲۵)۔ ”ان سب کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا“۔ ہلاک  
 کر دیا۔ تباہ و برباد کر دیا۔ تَبَارًا (۲۸)۔ ہلاکت۔ مَتَبِيرٌ (۳۹)۔  
 ہلاک شدہ۔ برباد شدہ۔ ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا۔

## ت ب ع

تَبِعَ کے معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا۔ بِقَرَّةٍ مُّتَّبِعٍ اس گائے کو کہتے  
 ہیں جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ اور اس کے پیچھے چلنے والے  
 بچھڑے کو تَبِيعٌ کہتے ہیں۔ التَّبِعُ۔ پیچھے چلنے والا (یہ تَبِيعٌ کی  
 جمع بھی ہے یعنی پیچھے چلنے والے)۔ اتَّبَعْتَهُمْ۔ میں ان کے پیچھے  
 پیچھے چلا۔ وہ مجھ سے آگے نکل گئے تھے لیکن میں نے انہیں جا لیا۔ \*

قرآن کریم میں تَبِيعَ کا لفظ عَصَى (سرکشی) کے مقابلے میں آیا  
 ہے (۱۴)۔ لِهَذَا اتَّبَعُوا کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت۔ ان  
 قوانین کو (Follow) کرنا۔ اس کے برعکس وہ شخص ہے مَن يَنْقَلِبْ  
 عَلَى عَقْبَيْهِ (۳۳)۔ ”جو پچھلے پاؤں واپس ہو جاتا ہے“۔



دین چونکہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اس لئے قوانین خداوندی کا اتباع انفرادی طور پر نہیں ہوگا بلکہ نظام کے تابع ہوگا۔ یہ نظام سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس لئے اتباع قوانین خداوندی آپؐ کے اتباع سے ہوتا تھا (۱۵۷)۔ آپؐ کے بعد یہ نظام آگے چلا اس لئے اس نظام میں خلیفۃ الرسول کے اتباع نے وہی مقام لے لیا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد تم پھر اپنی قدیم روش پر نہ چلے جانا بلکہ اس سلسلہ اتباع کو جاری رکھنا۔ دیکھئے (۱۶۳)۔ واضح رہے کہ اتباع اور اطاعت میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ جیسے پیروی اور فرمانبرداری میں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اطاعت بھی اس فرمانبرداری کو کہتے ہیں جو بطیب خاطر کی جائے لیکن اس میں حکم کا شائبہ یا کسی قدر قانونی تقاضا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اتباع میں انسان، تَبِيعٌ کی طرح، بلا حکم و فرمان، محبانہ جذبہ اور کشش سے کسی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

التَّابِعُ اور التَّبِيعُ۔ خادم کو کہتے ہیں\*۔ تابع کی جمع، التَّابِعِیْنَ (۲۴)۔ لیکن (۱۶۹) میں تَبِيعًا کے معنی ہیں کسی کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے والا۔ یا باز پرس کرنے والا۔ نیز مطالبہ یا تقاضا کرتے ہوئے پیچھے لگ جانے والا۔ سورۃ الشعراء میں اِتَّبِعْ کا لفظ جلوس نکالنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی فاتح ساحرین کو آگے رکھ کر ان کا جلوس نکالا جانے (۲۱)۔

تَبِعَ کے معنی ہیں ایک بات کے ساتھ ہی دوسری بات لے آنا۔ یکے بعد دیگرے (مسلسل) واقع ہونا۔ بے دریغ واقع ہونا\*۔ اَلتَّبِيعُ یمن کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ کیونکہ وہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہتے تھے\*۔ قرآن کریم میں قوم تَبِيع کا ذکر آیا ہے۔ (۱۶۰)۔ اسے الگ عنوان میں بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان تَبِيع)۔

کتاب الاشتقاق میں اَلتَّبِيع کے معنی الظَّئِل (سایہ) دئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ سایہ، روشنی کے سرچشمہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

و ت ب

تبیع

سورۃ ق میں ہے وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَيع۔ کُلُّ كَذَّابٍ اَلرَّسُلُ (۱۶)۔ "اصحاب الایکۃ اور قوم تبیع، ان سب نے ہمارے رسولوں

کو جھٹلایا، - دوسری جگہ قریش کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ اَہَمُّ خَیْرٌ  
 اَمُّ قَوْمٍ تَبِيعَ (۱۴۳) ”کیا (یہ قریش) بہتر ہیں یا قوم۔ تبیع، -

تذکرہ حضرت سلیمانؑ میں بتایا گیا ہے کہ یمن کے مشرقی علاقہ میں  
 سبا کی حکومت تھی۔ اسی قوم کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی  
 جسے حیمیر کہتے ہیں۔ جب رومیوں نے اہل سبا کی تجارت کو تباہ کیا  
 تو حمیر کا ستارہ اقبال چمک اٹھا اور وہ بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک  
 بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب تبیع اختیار کیا جس کے  
 معنی (حبشی زبان میں) سلطان کے ہیں۔ یعنی غلبہ و استیلاء اور قوت و جبروت  
 کا مالک۔ یہ خاندان بھی (اہل سبا کی طرح) شروع میں کواکب پرست تھا  
 لیکن بعد میں انہوں نے یہود کا مذہب اختیار کر لیا۔ جب ذونواس کے زمانہ  
 میں عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو وہ سخت مشتعل ہو گیا۔  
 اس نے عیسائیت کے مرکز نجران پر حملہ کر دیا۔ پہلے تو اہل شہر قلعہ  
 گزیں ہو گئے لیکن بالآخر شکست کھائی۔ ذونواس کا تعصب بڑھ کر بربریت  
 کی حد تک پہنچ گیا۔ اس نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ جلائی اور  
 عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ یہودیت اختیار کریں۔ جو اس سے انکار کرتا  
 آگ کے گڑھے میں جھونک دیا جاتا۔ قرآن کریم نے ذونواس کے اس  
 سرکش لشکر کو اصحابِ الاُخْدُوْدِ کہا ہے اور ان کے اس ظلم کی  
 سخت مذمت کی ہے (۱۴۹)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا مقصد دنیا میں ظلم کو  
 روکنا ہے خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سے ہو اور کسی کے خلاف ہو۔

## ت ج ر

تِجَارَةٌ - (پیشہ ورانہ) خرید و فروخت۔ سودا گری۔ کاروبار کو کہتے  
 ہیں۔ راغب نے تجارت کے معنی نفع کمانے کے لئے راس المال کو کاروبار میں  
 لگانا بتائے ہیں۔ محیط نے تجارت کے معنی وہ سال بھی بتائے ہیں جس سے  
 تجارت کی جائے۔ تاجیر پیشہ ور خرید و فروخت کرنے والے کو کہتے ہیں۔  
 عرب شراب بیچنے والے کو بھی تاجیر کہتے تھے\*۔ مجازاً کسی معاملہ میں  
 سہارت اور ہوشیاری کو بھی تِجَارَةٌ کہتے ہیں اور حاذق و ماهر کو تاجر\*۔

قرآن کریم میں ہے فَمَّا رَیْحَتِ تِجَارَتُهُمْ (۱۵۰)۔ ”انکی خرید و  
 فروخت (ہدایت کے بدلے گمراہی اختیار کر لینے) نے انہیں کوئی فائدہ نہ  
 پہنچایا، -

قرآن کریم نے ایمان (اسلام) کو بھی ایک قسم کی تجارت قرار دیا ہے جس میں بیع و شری (خرید و فروخت) کا معاملہ ہوتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ** ... (۹۱:۱)۔ ”یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں۔ اور ان کے بدلے میں انہیں جنت عطا کر دی ہے،“۔ اس تجارت میں جماعتِ مومنین اپنی وہی اور اکتسابی صلاحیتوں کے نتائج (جان اور مال) کو اس معاشرہ کے سپرد کر دیتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق مشکل ہوتا ہے اور یہ معاشرہ ان کے لئے دنیا میں جنتی زندگی کے سامان سہیا کر دیتا ہے (اور آخرت میں بھی انہیں جنت ملتی ہے)۔ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ**۔ ”تو مومنوں! یا اللہ! و رسولہ و تجاہد و فی سبیل اللہ یا موالیکم و انفسیکم۔ ذالیکم خیر لکم ان کنتم تعملون“ (۱۰۱:۱)۔ ”اے جماعتِ مومنین! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان دوں جو تمہیں درد ناک عذاب سے نجات دلا دے؟“۔ (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لو گے تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائیگی کہ یہ تجارت تمہارے لئے کس قدر اچھی ہے،“۔ اس تجارت کا ماحصل عام کاروبار سے کہیں زیادہ نفع رساں ہے (۱۱۲:۱)۔ \*\*

تبادلہٴ اشیاء (خرید و فروخت) کے معاملہ میں کس قدر منافع لیا جاسکتا ہے، اس کے متعلق عنوان (ب۔ ی۔ ع) میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اصول یہ ہے کہ منافع صرف محنت کے معاوضہ کے برابر لیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ پر کچھ نہیں لیا جاسکتا۔ یہی اصول تجارت پر بھی صادق آئیگا۔ اس اصول کی روشنی میں قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آ جائیگا جس میں کہا گیا ہے کہ **لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِطِلٍ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً** عَنِ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴:۲۹)۔ ”تم ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ سوائے اس کے کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو،“۔ آجکل ”باہمی رضامندی سے تجارت“ سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ تم جس قدر جی چاہے منافع گاہک سے طلب کرو اور کہہ دو کہ جی چاہے تو خریدو

\* تاج و محیط ۔ \*\* تجارت اور بیع میں فرق کے لئے دیکھئے عنوان (ب۔ ی۔ ع)

نہ جی چاہے نہ خریدو۔ اس کے بغیر اگر وہ خرید لیتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا منافع دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ گاہک اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔ یہ تجارت "عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" نہیں کہلا سکتی۔ جب منافع صرف محنت کا معاوضہ ہو جسے معاشرہ متعین کر دے، تو اسے ہر شخص بہ طیب خاطر ادا کر دیگا۔ اسے تراضیٰ ساین کہنا جائیگا۔ پہلی شکل تو وہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت کے ساتھ) کہا ہے کہ "وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ" (۲۹۱)۔ "ایک دوسرے کو قتل مت کرو"۔ یا "اپنے لوگوں کو قتل مت کرو"۔ دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر منہ مانگے دام لینا، اپنے لوگوں کو قتل کرنا ہے۔ محنت کا معاوضہ لینا ایسا اصول ہے جس میں "لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ" (۲۹۲) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ نہ کوئی تم پر زیادتی کرے۔ تبادلہ اشیاء کا طریق کار، معاشرہ میں ایک دوسرے کی زندگی بڑھانے کے لئے ہونا چاہئے۔ نہ کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے۔ اگر تجارت، قرآن کی مستقل اقدار کے راستے میں حائل ہوتی ہے تو اسکا انجام تباہی ہے۔ (۲۹۳)۔

## ت ح ت

تَحْتَ - فَوْق (اوپر) کی ضد ہے۔ یعنی نیچے۔ تَجَرِي مِّنْ تَحْتِهَا "لَا نَهَارٌ" (۲۵۱)۔ "جن کے نیچے نہریں جاری ہیں"۔  
الَّتِي تَحْتَ تَحْتَ کی جمع ہے جسکے معنی ہیں رذیل اور پست درجے کے لوگ\*۔

راغب نے کہا ہے کہ تَحْتَ کسی شے کے نچلے حصے کو نہیں کہتے بلکہ اس سے الگ اس کے نیچے کی چیز کے لئے بولتے ہیں۔ اس کے برعکس، آسْفَلُ اُسی چیز کے نیچے کے حصے کو کہتے ہیں۔ یعنی جب ایک چیز کے نیچے کوئی دوسری چیز ہوگی تو اسوقت تَحْتَ کہینگے۔ لیکن جب اُسی چیز کا نچلا حصہ کہنا ہو تو آسْفَلُ کہینگے۔

## ت ر ب

الْبُرَابُ - الشَّرَابُ - مِثْقَلُ (عَلَيْهِ تَرَابٌ) (۲۴۲)۔ اسکی جمع

اَثَرِبَةً\* اور تِرْبَان\* آتی ہے۔ مَثَرِبَةً\*۔ مسکنت۔ افلاس۔ فاقہ۔  
 ذَامَثَرِبَةً\* (۹۶)۔ خاک آلود۔ حاجتمند۔ مضیبت زدہ\*  
 جَمَلٌ\* تَرَبُّوت\*۔ فرما تہر دار اور سدا ہوا اونٹ\*  
 اَللَّتْرَائِبُ\*۔ سینہ کی ہڈیاں (۸۶)۔

اَلتَّرِبُ\*۔ ہم عمر۔ جمع اَثَرَاب\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہمسر  
 اور برابر کے لوگوں کو کہتے ہیں اور یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔  
 نیز اس کے معنی رفیق۔ حبیب۔ دوست اور سہیلی کے ہیں۔

قرآن کریم میں جنت کے سلسلہ میں عَثْرَبًا اَثَرَابًا (۵۶)۔ یا  
 کَوَاعِیبَ اَثَرَابًا (۷۸) کا ذکر آیا ہے۔ اس کے معنی ہم طور پر ہم عمر بیویاں  
 کئے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کے معنی ایسے ساتھیوں کے ہیں جو عادات و اطوار  
 میں ایک دوسرے سے مماثل (ملنے) ہوں\*۔ ہم۔ گل۔ ایک ہی مٹی کے  
 بنے ہوئے۔ کَوَاعِیبَ اَثَرَابًا اور عَثْرَبًا اَثَرَابًا میں اَثَرَابًا صفت ہے  
 کَوَاعِیبَ اور عَثْرَبًا کی۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ایسی عورتیں  
 ہونگے جو ہم مزاج اور مماثل ہوں۔ یہ ہم مزاجی اور مماثلت  
 عورتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ان میں ایک  
 دوسرے کے خلاف جذباتِ عداوت و رقابت اور بیگانگی و مغایرت نہیں  
 ہونگے بلکہ ان میں موافقتِ خیالات و تصورات ہوگی۔ اور میاں بیوی  
 میں باہمی موافقت اور مماثلت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی ایسی عورتیں جو  
 اپنے خاوندوں کے ہم مزاج و ہم خیال ہونگی۔\* اخروی جنت میں ان تعلقات  
 کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لیکن اس دنیا میں،  
 میاں اور بیوی کا ہم مزاج و ہم خیال ہونا جس طرح گھر کو جنت بنا سکتا ہے  
 وہ ظاہر ہے (۲۳۶)۔ نیز چونکہ اَثَرَاب\*، ہمسر اور برابر کے لوگوں کو بھی  
 کہتے ہیں، اس لئے اس میں برابری اور مساوات کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ (اس کے  
 لئے عنوان ز۔ و۔ ج بھی دیکھئے)۔

## ت ر ف

التَّرَفَّة\*۔ آسودگی اور فراخی عیش۔ عمدہ چیز۔ خوشگوار کھانا۔  
 تَرِیف\*۔ وہ آسودہ و خوش حال ہوا، اُسے عیش و آرام کے سامان مل گئے۔

اَتَتَرَفَ - اسے خوش حال و آسودہ کیا۔ اَلْمُتَتَرَفُ\*۔ وہ شخص جو عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہو اور لذات و شہوات میں بڑھتا چلا جائے جسے فراخی عیش اور آسودگی نے بدست کر دیا ہو۔ بعض لوگوں نے اسکے معنی ایسے خوشحال کے کئے ہیں جس کے پاس کثرت سے دولت ہو اور وہ اسکی بنا پر لیڈر بن جائے، اور جو کچھ کرے اس پر اسے ٹوکا نہ جائے۔ نیز وہ شخص کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرنا رہے اور اسے کوئی روکنے والا نہ ہو\*۔ جو کثرت دولت کی بنا پر سرکشی اختیار کرے۔ اسکی جمع مُتَرَفُوْنَ اور مُتَتَرَفِیْنَ\* ہے۔ اَتَتَرَفَ فُلَانٌ\*۔ اسنے سرکشی اختیار کر لی اور نافرمانی میں بڑھتا چلا گیا۔ مُتَتَرَفِیْنَ\*۔ قرآن کریم کی اہم اصطلاح ہے۔ اسنے کہا ہے کہ شروع ہی سے یہہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ خدا کی طرف سے جب بھی کوئی صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والا آیا تو قوم کے مُتَتَرَفِیْنَ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی۔ یہہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے اور پھر ان لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحیح نظام ربوبیت میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اسلئے یہ ہمیشہ اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں۔ دیکھئے قرآن کس حصر کے ساتھ کہتا ہے کہ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتَرَفُّوْهُمَا إِنَّا بَعَثْنَا فِيهِمُ آبِلًا مِّنْهُمْ كَافِرُوْنَ (۳۳) ”ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا جس کے مترنین نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر اور مخالف ہیں،“ اس سے اگلی آیت نے مترفین کی وضاحت کر دی۔ قَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَآؤْ لَا دَا (۳۴) ”وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت اور افراد خاندان بڑی کثرت سے ہیں،“ اس لئے ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جو عصر حاضر میں سرمایہ داروں کا طبقہ کہلاتا ہے اور جو محض اپنی دولت کے زور پر قوت و اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ انہی میں وہ مذہبی پیشوا بھی شامل ہیں جو خود کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر انہی لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں جو انہیں لا لا کر کھلاتے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ طبقہ بھی ہمارے قوانین و نظام کی مخالفت میں پیش پیش رہتا ہے اور لوگوں کو یہہ کہہ کر بھڑکاتا رہتا ہے کہ دیکھو یہہ داعی انقلاب اس مذہب کی مخالفت کرتا ہے جو تمہارے آبا و اجداد سے چلا آتا ہے۔ (دیکھئے ۴۳، ۴۴)۔ یہہ سب مُتَتَرَفِیْنَ ہیں جنہیں قرآن نے

انسانیت کے بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ اور یہی اہل جہنم ہیں۔ (انہم) کا قتل قبول ذالک متبرک فین (۱۱۱)۔ سورۃ مومنوں میں ہے وَاَلْبَرَقَاتُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۱۲) ”یہ لوگ ہمارے قوانین کی مخالفت اسلئے کرتے ہیں کہ انہیں سامان زندگی بڑی فراوانی سے حاصل ہے اور اسلئے انہیں سرکش و متکبر بنا دیا ہے۔“ قرآنی نظام میں نہ سرمایہ داری باقی رہتی ہے نہ مذہبی پیشوائیت۔ اس میں ہر شخص کام کرتا ہے اور کوئی دوسرے کی محنت پر عیش نہیں اڑا سکتا۔ (نیز دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ا)

## ت ر ک

تَرَكَتَ - کے معنیے ہیں چھوڑ دینا۔ بھینک دینا۔ ڈال دینا۔ خالی کر دینا۔ تَبْرَكَةُ التَّرَجُلِ - آدمی کی میراث کو کہتے ہیں جسے وہ چھوڑ کر مرے۔ تَبْرِكَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جس سے کوئی شادی نہ کرے۔ نیز انڈے کا خول جس میں سے چوزہ نکل گیا ہو\*۔

التَّبْرِيْكُ - اس خوشے کو کہتے ہیں جس کے تمام پھل کھا لئے گئے ہوں یا جھاڑ لئے گئے ہوں\*۔

بعض کا خیال ہے کہ کسی کام کو چھوڑ دینا۔ خواہ ارادۃً ہو خواہ مجبوراً۔ تَرَكَتَ کہلاتا ہے۔ اس میں دونوں باتیں شامل ہوتی ہیں۔ یعنی جس کام کو انسان کر رہا ہے اسے چھوڑ دینا، یا کسی کام سے محتاط رہنا (اسے ہاتھ ہی نہ لگانا) یہ بھی تَرَكَتَ ہے۔ چنانچہ التَّبْرِيْكُ اس باغیچہ کو کہتے ہیں جس کے سالک اس سے غفلت برتیں اور اس کی دیکھ بھال نہ کریں (ابن فارس)۔ لیکن جس کام کے کرنے کی انسان میں قدرت ہی نہ ہو اسے نہ کہنا تَرَكَتَ نہیں کہلا سکتا\*\*۔

تَرَكَتَ - جَعَلَ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے\*\*\*۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو ایسا کر دینا۔ نیز اس کے معنی کسی سلسلہ کو باقی رکھنے (دوام عطا کر دینے) کے بھی ہوتے ہیں\*\*\*۔ مثلاً وَتَرَكَنَا عَلَيْهِ فَيَا لَآخِرِ بْنِ (۱۱۳) کے معنی ہیں ہم نے اس کا تذکرہ آنے والی نسلوں میں باقی رکھا۔ اسے دوام عطا کر دیا۔ تَرَكَتَ کے معنی ہیں وہ جس حالت میں تھا اسے اسی حالت میں رہنے دیا\*\*\*۔

## ت س ع

تِسْعَةَ رَجَالٍ - نو آدمی - تِسْعُ نِسْوَةٍ - نو عورتیں - تِسْعُ آيَاتٍ  
(۲۴) نونشانیاں - تِسْعَةَ عَشَرَ (۲۷) انیس (داروغے) تِسْعُ وَ  
تِسْعُونَ نَعْجَةً (۳۸) ننانوے بھیڑیں -

## ت ع س

التَّعَسُّس - منہ کے بل گر پڑنا - ایسا گرنا کہ پھر اٹھا ہی نہ جائے -  
لغزش - ہلاکت - پست عو جانا - انعطاط - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی  
الٹ دینا لکھے ہیں - تَعَسَّسَهُ اللهُ - خدا نے اسے تباہ کر دیا - فَهُوَ  
مَتَعَسُّوسٌ - وہ تباہ ہو گیا - بد دعا کے طور پر کہتے ہیں تَعَسَّالَهُ\*\* -  
قرآن کریم میں ہے وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَّالَهُمْ (۲۸) ”جنہوں نے  
انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کے لئے ہلاکت اور بربادی، ذلت اور  
نگوئی ساری ہے۔“

## ت ف ث

التَّفَثُّ - صاحب تاج العروس نے مختلف ائمہ لغت کے حوالوں سے  
لکھا ہے کہ اشعار جاہلیہ میں یہ لفظ کہیں نہیں ملتا اس لئے اسکے لغوی معنی  
متعین نہیں کئے جا سکتے - البتہ تفسیر میں ہے کہ تَفَثٌ حج کے مناسک  
میں سے سر منڈانے - ناخن کتروانے - بغل اور زیر ناف کے بال صاف کرنے -  
ثربانی اور رسی (کنکریاں مارنے) کیلئے آنا ہے\* - صاحب محیط نے لکھا ہے  
کہ التَّفَثُّ - بالوں کی ہرا گندگی و پریشانی کو کہتے ہیں - نیز ابن عباس  
سے منقول ہے کہ تَفَثٌ تمام مناسک حج کے لئے جامع لفظ ہے - اس اعتبار سے  
ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ (۲۹) کے معنی ہونگے وہ اپنے جملہ ارکان حج ادا  
کریں - تَفَثُ الرَّجُلِ تَفَثٌ - اسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص اپنے  
بالوں کو صاف کرنا اور ان میں کنگھی وغیرہ کرنا چھوڑ دے اور اسطرح  
”زولیدہ و پراگندہ بال ہو جائے\*\*\* - جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قرآن کریم  
میں حج کے اجتماع کے ضمن میں ہے ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ (۲۹) ”پھر  
چاہئے کہ وہ اپنے ”تفث“ کو پورا کریں،“ - اسے اگر مناسک حج تک محدود  
رکھیں تو اسکا مفہوم بالوں وغیرہ کی صفائی ہوگا - لیکن اگر مجازاً اسکا مفہوم  
وسیع کر لیا جائے تو اسکے معنی ملت کی کثافتیں دور کرنے کی تدابیر سوچنا  
ہوگا - حج، ملی مسائل کا حل سوچنے کے لئے عالمگیر اجتماع ہوتا ہے -  
(حج میں بال مونڈنے کے متعلق دیکھئے عنوان ح - ل - ق)

\* تاج و راغب - \*\* تاج - \*\*\* محیط - لے ابن عباس کا قول یہ ہے کہ ”تفث“ سر کے بال مونڈنے  
یا تریشنے، داڑھی مونچھیں بنانے اور بغل کے بال لینے  
اور ذریعہ درمی کو کہتے ہیں۔“



## ت ق ن

التَّقْنُ - ماہر آدمی \*۔ ہر وہ چیز جس سے انسانی معاش قائم ہوتی ہے اور معاملات کی درستگی ہو جاتی ہے۔ جیسے معدنیات وغیرہ۔ نیز، ہر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز کی درستگی ہو جائے \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی کو مضبوط اور محکم بنانا اور (۲) گرا اور چکنی کالی مٹی۔ "تَقْنُ لَا مَرَّ لَا تَقَانًا"۔ کسی معاملہ کو محکم کر دینا \*۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے "تَقْنُ كُلُّ شَيْءٍ" (۲۸۸) "اس نے ہر شے کو نہایت درست اور محکم بنایا ہے۔"

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنی (الاسماء الحسنی) بیان کرنے سے جہاں صفات خداوندی کا صحیح تصور سامنے لانا مقصود ہے وہاں یہ بتانا بھی مطلوب ہے کہ جو افراد، قوم، معاشرہ یا نظام قوانین خداوندی کا اتباع کریگا اس میں (تباہ حد بشریت) یہی صفات اجاگر ہوتی چلی جائیگی۔ مثلاً جب خدا کے متعلق کہا گیا ہے کہ "صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي أَتَقْنُ كُلُّ شَيْءٍ" (۲۸۸) "یہ اس خدا کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو نہایت درست اور محکم بنایا ہے"، تو اس سے مقصود یہ بھی ہے کہ جماعت مومنین کی بنیادی صفت یہ بھی ہوگی کہ وہ جو چیز بنائیگی محکم اور درست بنائیگی۔ اس میں نہ کسی قسم کا جھول ہوگا نہ سلوٹ، نہ نقص ہوگا نہ عدم تناسب، نہ ہی وہ ناپختہ اور ناتمام ہوگی۔ جس طرح کارگاہ کائنات کے متعلق پورے حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ "مَاتَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفْوُتٍ" (۲۱) "تو رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھے گا"، اسی طرح اس قوم کی مصنوعات کے متعلق بھی پورے پورے یقین اور اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ تم ان میں کہیں تناسب و قوازن کی کمی نہیں دیکھو گے۔ دنیا میں ایسی قوم، نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام فروع انسانی کے لئے جس قدر سکون و اطمینان کا موجب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اور یہ تو صرف ایک صفت خداوندی کے انعکاس کا ذکر ہے۔ جس قوم میں تمام صفات خداوندی اسی انداز سے جھلک رہی ہوں، اس کی نفع رسانیوں اور سکون بخشوں کا کیا ٹھکانہ ہے؟

## ت ل ک

تَلْکَ - اشارہ بعید کے لئے مؤنث کا صیغہ ہے۔ یعنی ”وہ“۔ (مؤنث)۔  
تفصیل کے لئے دیکھئے ذہا۔

## ت ل ل

تَلَّ کے اصلی معنی ایسی جگہ کے ہیں جو اپنے آس پاس کی زمین سے قدرے بلند ہو۔ اَلْقَتْلُ مِّنَ الشَّرَابِ۔ مٹی کا ٹیلہ۔ نیز الْقَتْلُ کے معنی تکیہ، گدا، ہیں۔ پھر اس سے اس کے معنی ٹیلہ پر پچھاڑ دینے یا لٹا دینے کے آئے ہیں۔ یا پھر یہ تَلِيلٌ ہے جس کے معنی گردن اور رخسار کے ہیں۔ اس سے تَلَّہُ کے معنی ہونگے اسے گردن اور رخسار کے بل گرایا۔ تَلَّہُ۔ یَتَلَّہُ۔ تَلَّہُ۔ اسنے اس کو پچھاڑ دیا۔ قَوْمٌ تَلَّی - پچھڑے عوئے لوگ۔ تَلَّ۔ یَتَلَّ۔ پچھڑا بنا، گر پڑنا۔ گرا دینا۔ اَلتَّلَّہُ۔ گرا دینا۔ لٹا دینا (ایک مرتبہ) اَلْمِیْتَلُ۔ وہ جگہ جہاں کسی کو پچھاڑا جائے۔ یا وہ نیزہ وغیرہ جس سے کسی کو گرایا جائے۔ اَلتَّلَّی - ذبح کی ہوئی بکری\*۔

قرآن حکیم میں قصہ حضرت ابراہیمؑ و اسمعیلؑ میں ہے وَتَلَّہُ لَیْلَیْنِ (۲۰۵)۔ ”اس نے اسے پٹ پڑی (کن ہٹی) کے بل لٹا دیا،“۔

## ت ل و

تَلَّوْتَہُ۔ تَلَّیْتَہُ۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ اَتَلَّیْتَہُ اِیْشَہُ میں نے اس سے اس کی پیروی کرائی۔ اسے اس کے پیچھے لگایا۔ تَلَّوْ۔ وہ شخص جو ہمیشہ پیچھے پیچھے چلے۔ اَلتَّلَّوْ۔ جو چیز کسی کے پیچھے آئے۔ اونٹ، خچر یا بکری کا بچہ جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلے۔ اَتَلَّتِ النِّیَاقَۃُ۔ اونٹنی کے پیچھے پیچھے اس کا بچہ چلا۔ اَلتَّلَّوَالِیُ وَالتَّلَّیَاتُ پچھلے حصے۔ اَلتَّلَّیْقَۃُ اور التَّلَّوۃُ۔ قرض وغیرہ کے باقی ماندہ حصہ کو کہتے ہیں جو پیچھے (باقی) رہ جاتا ہے۔

راغِب\* نے کہا ہے کہ تَلَّوْ وَتَلَّوْ کے معنی متابعت (پیچھے چلنے۔ اتباع کرنے) کے ہوتے ہیں جو کہیں جسمانی طور پر ہوتی ہے اور کہیں احکام کا اتباع ہوتا ہے \* تاج۔ محیط۔ راغِب۔ \* راغِب کی عبارت کے پورے ترجمہ کے لئے دیکھئے شتمہ ص ۱۸۱ جلد چہارم۔

ہے۔ جسمانی طور پر پیچھے جانے کی مثال چاند کی ہے۔ وَالْقَمَرَ إِذَا تَلَّهَا (۱/۲۱) جس کے معنی ہیں، چاند سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس سے روشنی کا اقتباس کرتا ہے۔ تَتَلَّاهُ تَتَلَّيَا۔ اس نے اس کا پیچھا کیا۔ تَتَلَّيْتُ حَقَّتِي: میں نے اسکا پیچھا لیکر اس سے اپنا پورا پورا حق وصول کر لیا۔ اتباع احکام کیلئے تلاوت قرآن کا حکم موجود ہے۔ راغب کے نزدیک تلاوة بالخصوص خدا کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس اتباع کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ان احکام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اسلئے انہیں اس طرح پڑھنے کو بھی تلاوة کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ قیراءۃ (پڑھنے) سے خاص ہے۔ یعنی قیراءۃ (پڑھنا) بہر حال تلاوة کے اندر آ جاتا ہے لیکن تلاوة (اتباع کرنا) قراءۃ کے اندر نہیں آتا۔ لہذا تلاوت قرآن کریم کے معنی ہیں قرآن ہر عمل کرنے کے لئے آئے پڑھنا۔ (نہ صرف پڑھتے رہنا)۔

فُلَانٌ يَتَلَوُّ عَلَى فُلَانٍ وَ يَقُولُ عَلَيْهِ۔ عربی معاوڑہ ہے جس کے معنی ہیں فلاں آدمی فلاں کے خلاف جھوٹ بولتا اور غلط بیانی کرتا ہے۔

تلاوة کے معنی ”اسے چھوڑ دیا“ بھی آتے ہیں۔ یعنی اس طرح چھوڑ دینا کہ وہ پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو (ابن فارس)

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ اُولٰٓئِكَ يُوْمِنُوْنَ بِهٖ (۱۲۱)۔ ”جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اسکی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے، یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں“۔ ظاہر ہے کہ اسمیں تلاوت کے معنی اتباع کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہی لوگ درحقیقت اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر اسکے معنی فقط پڑھنے کے ہوں تو قرآن کو تو غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ لہذا قرآن کی تلاوت سے مراد اسکے احکام کا اتباع ہے۔ اسے پڑھا اسلئے جاتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور سمجھا اسلئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جاسکے۔ قرآن کا اس طرح پڑھنا کہ وہ سمجھ میں نہ آئے یا اسے فقط سمجھ لینا اور اس پر عمل نہ کرنا، کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ مومن درحقیقت وہی ہیں جو اسکی پوری پوری پیروی کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کے متعلق جنو فرمایا ہے کہہ یَتَلَوْا عَلَیْہِمْ آیَاتِہِ (۱۶۳) ”وہ جماعت مومنین کے سامنے خدا کے احکام پیش کرتا ہے۔“ تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہہ وَیَزَکِّیْہِمْ (۱۶۳)۔ وہ ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے (دیکھئے عنوان زک۔ و) اس سے ظاہر ہے کہ تلاوت قرآن سے مقصود یہ ہے کہ خدا کا نظام عملاً متشکل ہو جائے جس کے تعمیری نتائج (یعنی افراد معاشرہ کی نشو و نما) محسوس ضرورت میں سامنے آجائیں۔ صرف قرآن پڑھ لینے کو تلاوت کہنا اور سمجھ لینا کہ اس سے مقصد حاصل ہو گیا ہے خود فریبی ہے۔ قرآن کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ قرآن کا پڑھنا اصلئے ضروری ہے کہ ایسے سمجھ لیا جائے اور سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر قرآن کو سمجھا نہ جائے تو اس کا پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بیکار ہے۔

سورة صلفۃ میں قَالَتِلْہِیْتِ ذِکْرًا (۳۴) آیا ہے۔ یعنی قرآن کا اتباع کرنے والی جماعتیں۔ سورة بقرہ میں یہودیوں کے خلاف ایک الزام یہ بھی ہے کہہ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُو الشَّیْطٰنِ عَلٰی مُلْکِہِ سُلْطٰنِ (۱۰۲)۔ ”یہ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین (دین خداوندی کے دشمنوں) نے مملکت سلیمان کے متعلق عام کر رکھی تھیں“۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ دین خداوندی کے دشمنوں نے انبیائے بنی اسرائیل کے خلاف کیا کیا افسانے وضع کئے تھے، اور یہودی کس طرح ان افسانوں کو آسمانی تعلیم مانتے ہیں، تو اس کے لئے تورات (بائبل کا عہد نامہ عتیق) پڑھئے۔ اس میں ایسی ایسی باتیں ان انبیائے کرامؑ کے خلاف موجود ہیں جنہیں کوئی شریف آدمی سن نہیں سکتا۔

## ت م م

تَمَامُ الشَّیْءِ۔ وہ چیز جس سے کسی شے کی کمی پوری ہو جائے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی پورا ہونے کے لکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے تَمَامُ اور کَمَالُ کو مترادف قرار دیا ہے لیکن بعض نے ان میں یہ فرق کیا ہے کہ تَمَامُ کسی چیز کی کمی کو پورا کر دینے کو کہتے ہیں اور کَمَالُ اس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک وہ اپنی پوری پوری نشو و نما (Devlopment) کے بعد پہنچ سکے۔ یا وہ اس مقصد کو پورا کر دے

جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے۔ چنانچہ ”رَجُلٌ تَامٌ“ اَلْخَلْقِ کے معنی ہوتے ہیں ایسا آدمی جس کے اعضاء میں کوئی نقص (Constitutional Defect) نہ رہ گیا ہو۔ اور کَامِلٌ اَلْخَلْقِ اسے کہتے ہیں جس میں حسن و خوبی اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو۔ یعنی یہ تَمَامٌ سے آگے ہوتا ہے۔

تَمَّ الشَّيْءُ - چیز پوری ہو گئی۔ تَمَّ عَلَيْهِ - وہ اس پر مداومت سے قائم رہا۔ اس کا ہمیشہ پابند رہا۔ اَتَمَّ الشَّيْءُ : چیز کو پورا کر دیا۔

قرآن حکیم میں ہے ”وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ“ (۱۲۴) ”جب اس کے نشو و نما دینے والے نے ابراہیم کے لئے نمود ذات کے مختلف مواقع بہم پہنچائے تو وہ دوام و ثبات سے ان میں پورا اترا اور اس طرح اس نے بتا دیا کہ اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔“ سورة المائدہ میں ہے۔ ”آلِیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ ”وَأَتَمَّمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی“ (۱۱۰) ”اب ہم نے تمہارا غلبہ و اقتدار انتہا تک پہنچا دیا۔ (کوئی سرکش قوت باقی نہیں رہی) تمہارے نظام زندگی کی تکمیل ہو گئی۔ اور ہماری نعمتوں میں سے جس جس کی کمی تھی ہم نے وہ سب پوری کر دی۔“ سورة انعام میں ہے۔ ”وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَقَعْدًا“ ”لَا مَبْدَلَ لِّلَّیْکَلِمَاتِیہِ“ (۱۱۶) ”قوانین خداوندی میں سے جو کچھ باقی رہتا تھا وہ بھی سب کا سب صدق و عدل سے پورا ہو گیا، اور اب اس میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں۔“ اس طرح دین کی تکمیل ہو گئی اور نبوت ختم ہو گئی۔ اس لئے کہ جب قوانین خداوندی میں نہ کسی اضافے کی ضرورت باقی رہے نہ رد و بدل کی گنجائش، تو پھر اور نبی آئیکا کس کام کیلئے؟ آیت ۹ کے مزید مفہوم کے لئے دیکھیں تَمَّتْ صَدَقَہُ جَلَدِ جہادِ عَنَّا تَامَمٌ۔

مُتِمٌّ - پورا کرنے والا (۱۱۸)۔

## تنور

اَلتَّنُّورُ - بعض نے کہا ہے کہ اس کا مادہ نَارٌ - نَوْرٌ ہے (دیکھئے عنوان ن - و - ر) لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے۔ عربوں نے معرب بنا لیا ہے۔ اس کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ہماری زبان میں رائج ہیں۔ یعنی روٹی پکالنے کا تنور۔ لیکن اَلتَّنُّورُ وادی کے ایک مقام کو بھی کہتے ہیں۔

جہاں پانی جمع ہو جائے۔ نیز ہر اس جگہ کو جہاں سے پانی کا چشمہ ابلتا ہو۔ نیز بلند اور اونچی زمین کو کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ضمن میں ہے فَارْتَدُّوْا رُءُوسَكُمْ (۱۱۱)۔ یہاں تنور سے مراد وادی کی وہ جگہ ہے جہاں بارش کا پانی جمع ہو رہا تھا۔ یعنی بارش اس زور کی ہوئی (۱۱۱) کہ وادی میں جہاں پانی جمع ہوتا تھا وہاں پانی میں سخت جوش پیدا ہو گیا اور اس نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔

## توب

تَابَ - تَوْبًا - تَوْبَةً - مَتَابًا - کے معنی ہیں واپس آنا\*\*۔ آپ شاہراہ حیات پر چلے جا رہے ہیں۔ راستہ میں ایک چسوراہا آیا جہاں سے آپ ایک طرف کو مڑ گئے۔ چند قدم آگے بھاگ کر آپ کو محسوس ہوا کہ آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے۔ صحیح راستہ یہ نہیں۔ اب آپ کو صحیح راستہ کی طرف جانے کیلئے اُس مقام تک لوٹ کر آنا ہوگا جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کو اٹھا تھا۔ اس واپسی کو تَوْبَةً کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسکے لئے آپ کو چل کر واپس آنا ہوتا ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اگر آپ عمر بھر بھی افسوس کرتے رہیں گے کہ میں نے غلط سمت کی طرف کیوں قدم اٹھا لیا تو یہ تَوْبَةً نہیں ہوگی۔ تَوْبَةً ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کو (Un-Do) کیا جاتا ہے۔ اس کے مضر اثرات کی تلافی کی جاتی ہے۔ تَابَ عَنْهُ اور مِثْلُہ کے معنی ہیں اس نے اپنی غلطی کا احساس کر کے غلط روش کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف لوٹ آیا۔ غلطی کا احساس، احساس کے بعد غلط روش سے اجتناب اور پھر صحیح روش کا اختیار کرنا، یہ تینوں مراحل تَوْبَةً کے اندر شامل ہیں۔ ایسا کرنے والے کو تَائِبٌ کہتے ہیں\*\*۔ اسی لئے قرآن کریم میں آیا ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۱)۔ ”اعمالِ حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر دیں،“۔ اسی کو تَوْبَةً کہتے ہیں۔ یعنی غلط کام کے نقصان رساں نتائج کی تلافی کے لئے صحیح کام کرنے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ آپ نے کسی شخص کا کوئی حق دبا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی اس غلط حرکت کا احساس ہوا۔ آپ کے دل میں ندامت کے جذبات بیدار ہوئے۔ آپ کی تسوہ یہ ہے کہ آپ اس شخص کا حق واپس دیدیں اور

آئندہ کے لئے عہد کریں کہ آپ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے شراب پی لی۔ کچھ وقت کے بعد آپ کو اپنی غلط کاری کا احساس ہوا۔ اس میں توبہ کی شکل یہی ہے کہ آپ اپنے عمل پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے کبھی اس کے مرتکب نہ ہوں۔

شروع میں بیان کردہ مثال میں، جب آپ نے اس چوراہے سے غلط راستہ اختیار کیا تھا تو صحیح راستہ نے آپکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جب آپ نے اپنی غلطی کے احساس کے بعد غلط راستہ کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف رخ کیا تو صحیح راستہ نے بھی (جو اس وقت تک آپ سے منہ سوڑے ہوئے تھا) آپکی طرف رخ کر لیا۔ رخ ہی نہیں کر لیا بلکہ آپ نے اسکی طرف ایک قدم اٹھایا تو وہ دو قدم اٹھا کر آپکی طرف بڑھ آیا۔ دو قدم اس طرح کہ ایک قدم وہ کم ہوا جو آپ پہلے مخالف سمت میں جائے وقت اٹھا رہے تھے اور دوسرا قدم وہ جو آپ نے اسکی طرف اٹھایا۔ اسے تَابَ عَلَیْہِ کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والے کو تَوَّابٌ \*۔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (۱۱۱) خدا کے متعلق ہے۔ اور اِنَّ اللہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (۲۴۲) بندوں کے متعلق۔ یعنی جب انسان غیر خدائی قانون کو چھوڑ کر قانون خداوندی کی طرف رخ کرتا ہے تو یہ قانون اپنے تمام خوشگوار نتائج کو لئے ہوئے اس انسان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے (۱۳۷) میں یہ لفظ عَذَابٌ \* کے مقابلہ میں آیا ہے۔ نیز (۱۶۶) میں۔ بالفاظ دیگر انسان کسی جرم کے ارتکاب سے ابدی طور پر زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم نہیں ہو سکتا۔ وہ جب بھی قانون خداوندی کو اختیار کریگا اس قانون کے خوشگوار نتائج اسکی طرف لپک کر آجائیں گے۔ یعنی ہر شخص کیلئے باز آفرینی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر قوم کیلئے نشانیۃً ثانیۃً کا امکان۔ (قوموں کی زندگی میں وہ مرحلہ کمب آتا ہے جب انکی حیات نو ناممکن ہو جاتی ہے اس کے متعلق ہ۔ ل۔ ک کے عنوان میں بتایا جائیگا) لیکن یہ باز آفرینی اسی وقت تک ممکن ہے جب انسان کے لئے عمل صالح کرنے کا امکان ہو۔ جب عمل کا موقع ختم ہو جائے تو پھر باز آفرینی ناممکن ہو جاتی ہے۔ جہنم میں عمل کا موقع باقی نہیں رہتا اس لئے باز آفرینی ناممکن ہو جاتی ہے۔

توبہ اور استغفار میں کیا فرق ہے اسکے لئے (غ۔ ف۔ ر) کا عنوان دیکھئے۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ توبہ سابقہ گناہوں پر ندامت کو کہتے ہیں۔ اور انابت، مستقبل میں ترک معاصی کو۔

التَّابُوتُ\* - صندوق کو کہتے ہیں کیونکہ جو چیزیں اس سے نکالی جاتی ہیں وہ اس میں واپس ہوتی رہتی ہیں\* - (اس ضمن میں عنوان تَابُوت\* بھی دیکھئے)۔

## ت و ر

التَّوْرُ\* - پہنا، جاری ہونا۔ ایلچی، سفیر۔ التَّوْرَةُ\* - باندی جنو اپنے چاہنے والوں میں آتی جاتی رہے۔

التَّارَةُ\* - وقت۔ مرتبہ۔ جیسے جِئْتَهُ تَارَةً أُخْرٰی\* - میں اس کے پاس دوسری مرتبہ گیا۔ آتارہ\* - اسنے اسے یکے بعد دیگرے دھرایا۔ التَّائِرُ\* - تھکنے کے بعد بھی برابر کام میں لگا رہنے والا\*۔

سورة طہ میں ہے نَخْرَجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی (۲۵)۔ ”ہم تم کو دوسری مرتبہ نکالینگے،“۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ تَارُ الْجُرْحُ سے ماخوذ ہے جسکے معنی زخم کا بھر جانا اور مندمل ہو جانا ہے\*\*۔ پہنا۔ جاری رہنا۔ اور تھکنے کے بعد بھی کام میں لگے رہنا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو زندگی کی جوئے رواں کے لئے تَارَةُ\* کا لفظ کس قدر معنی خیز ہے۔ حیات کا سلسلہ غیر منقطع ہے۔ اس میں صرف احوال و ظروف کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس کا نام تَارَةُ أُخْرٰی ہے۔

التَّوْرَةُ\* - (دیکھئے عنوان تورات)۔

## تورات

بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ تَوْرٰی\* سے ماخوذ ہے جسکے معنی روشن کرنے کے ہیں\*۔ (اس کے لئے دیکھئے عنوان و۔ ر۔ ی)

لیکن اصل وہی ہے جو صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ تَوْرَةُ\* کا معرب ہے جو عبرانی لفظ ہے اور جسکے معنی شریعت اور حکم کے ہیں۔ اسکی جمع تَوْرَات\* ہے۔ یعنی احکام و شرائع\*\*\*۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تورات اس کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن قرآن کریم نے حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا نام خصوصیت سے تورات نہیں بتایا۔ تورات کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد (۳۳) بلکہ حضرت یعقوبؑ کے بعد (۹۳) اور حضرت



عیسےؑ سے پہلے (۵۶) نازل ہوئی تھی۔ یہ یہودیوں کے لئے آسمانی راہنمائی تھی اور اس میں احکام خداوندی مندرج تھے۔ (۵۷)۔ اس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اس کے مطابق انبیائے بنی اسرائیل اور ان کے علما و مشائخ معاملات کا فیصلہ کرتے تھے (۵۸)۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے تورات آن مجموعہ کتب کا نام ہے جو انبیائے بنی اسرائیل پر حضرت عیسےؑ سے پہلے نازل ہوئیں۔ اسی مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہا جاتا ہے۔ اس میں انتالیس صحیفے ہیں اور ہر صحیفہ اپنے نبی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں ”اسفار موسیٰ“ بھی شامل ہیں جنہیں قرآن ”صحف موسیٰ“ سے تعبیر کرتا ہے (۵۹) نیز ”کتاب موسیٰ“ سے بھی (۶۰)۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق، یہ کتاب چند تختیوں پر لکھی ہوئی تھی (۶۱)۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، موجودہ عہد نامہ عتیق کے مجموعہ میں انتالیس کتابیں ہیں لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جو اس مجموعہ میں موجود نہیں ہیں۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں گنائی جا سکتی ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ مجموعہ ناکمل ہے۔

اس سے آگے بڑھئے۔ ”اسفار موسیٰ“، کو حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن ان میں حضرت موسیٰؑ کی وفات اور وفات کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کا اضافہ ہے۔

عہد نامہ عتیق کی کتابوں کے متعلق اس وقت تک بالتحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ ابتداءً یہ کس عہد میں مدون ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جس میں ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا۔ یعنی جب چھٹی صدی قبل مسیح میں بابیل کے شہنشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا ہے (دیکھئے عنوان بنی اسرائیل)۔ تو اس نے تورات کی الواح کو جلا کر رکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ جب یہودی، بابل کی قید سے رہائی کے بعد دوبارہ بیت المقدس میں آئے تو انہیں اپنے گم گشتہ صحف مقدسہ کی ترتیب نو کی فکر ہوئی۔ چنانچہ عزرا نبی نے سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو اوسرنو مرتب کر کے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلمبند کیا۔ لیکن خود عزرا نبی کے متعلق بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کب یروشلم آئے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ قلم میں ان کتابوں کو

مرتب کیا تھا۔ یہ ترتیب و تدوین کسطرح عمل میں آئی تھی اس کے متعلق خود عزرا کی زبان سے سنئے۔ وہ کہتے ہیں۔

”دوسرے روز ایک آواز نے مجھے بلایا اور کہا کہ عزرا! اپنا منہ کھولو اور وہ کچھ پیو جسے میں تمہیں پینے کے لئے دیتا ہوں۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ تب دیکھو اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیجا۔ وہ پانی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں نے اسے لیا اور پی گیا۔ جب میں نے اسے ہی لیا تو میرے دل میں فہم و فراست اور سینے میں بصیرت پیدا ہو گئی اور میری روح نے میرے حافظہ کو قوی بنا دیا۔ اور پھر جو میری زبان کھلی ہے تو بند نہیں ہوئی اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے لکھتے رہے۔ وہ دن بھر لکھتے تھے اور صرف رات کے وقت کچھ کھاتے اور میں دن بھر لکھاتا رہتا تھا اور رات کو بھی میری زبان بند نہ ہوتی تھی۔ چالیس دنوں میں انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں“۔ (کتاب عزرا ۲ - ۳۸:۱۳)۔

یہ بیان کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ یروشلم کی تباہی ۵۸۷ ق م میں ہوئی اور عزرا نے ان کتابوں کو ۴۴۴ ق م میں لکھوایا۔ یعنی قریب ڈیڑھ سو سال بعد۔ ظاہر ہے کہ عزرا نے ان کتابوں کو خود کہیں نہیں دیکھا تھا جو انہیں حفظ یاد کر لیا ہوتا۔ اس لئے انہوں نے حفظ کردہ کتابوں کو دوبارہ نہیں لکھوایا بلکہ ان کتابوں کو انہوں نے خود تصنیف کیا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ خود عزرا کے بیان کے مطابق انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھوائی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ انہوں نے صرف پانچ کتابیں (اسفار موسیٰ) مرتب کرائی تھیں۔

عزرا کے بعد نحemiah نبی نے کچھ اور کتابوں کو مرتب کیا۔ لیکن ۱۶۸ ق م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ، انٹونس نے پھر بیت المقدس کو برباد کیا اور مقدس صحیفوں کو جلا دیا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے ان صحیفوں کو از سر نو مرتب کیا گیا۔ لیکن ۷۰ ق م میں رومیوں کا طوفان اسڈا اور ٹائٹس نے بیت المقدس کو اس طرح برباد کیا کہ یہودی اسمیں پھر نہ بس سکے۔ یہ ان صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد یہودی علما نے ان صحیفوں کو اپنے حافظہ کی مدد سے پھر مرتب کیا۔

پھر بھی نہیں کہ ان کتابوں کو حوادث ارضی و سماوی تباہ کر دیتے تھے۔ ان میں دانستہ تحریف و الحاق کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مؤرخ رینان (Life of Jesus) میں لکھتا ہے کہ

زمانہ قرب مسیح<sup>۲</sup> میں تورات میں بہت سی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ بالکل نئی کتابیں (مثل کتاب استثناء) مرتب کی گئیں۔ یہ کتابیں حضرت موسیٰ<sup>۳</sup> کی اصل شریعت کی حامل کہی جاتی ہیں حالانکہ ان کی روح پرانی کتابوں سے بالکل مختلف تھی۔ (ص۔ ۴۰)

اس کے علاوہ یہودیوں نے ایک اور عقیدہ بھی وضع کیا۔ وہ یہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تورہ شیکتب (یعنی وحی مکتوب یا متلو) اور دوسری تورہ شیعلفہ، وحی غیر مکتوب (وحی غیر متلو)۔ یہودی علماء نے وحی غیر متلو کی روایات کو جمع کر کے اسے بھی تورات کا درجہ دیدیا۔ اس مجموعہ کو مشنا کہا جاتا ہے۔ پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفسیرات جمع کی گئیں۔ اس کا نام جمارا ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں۔ تالمود دو ہیں۔ ایک شامی دوسرا بابلی۔ دونوں پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں اور آسمانی سمجھے جاتے ہیں۔

ان روایات کے علاوہ، یہودیوں کے ہاں ”باطنی علم“ کا عقیدہ بھی موجود ہے۔ اس علم کی کتابوں کو ”سفریم جنوزیم“ (مخفی خزانہ کی کتابیں) کہا جاتا ہے۔

اب کچھ تورات کی زبان کے متعلق بھی دیکھئے۔ یہودیوں کی قدیم زبان عبرانی تھی۔ بابل سے واپسی کے بعد ان کی زبان ارامی ہو گئی۔ لیکن یہودیوں کی کوئی کتاب نہ عبرانی زبان میں تھی نہ ارامی میں۔ ان کی سب کتابیں جن سے دنیا روشناس ہوئی یونانی زبان میں تھیں۔ اسفار موسیٰ<sup>۴</sup> کا یونانی زبان سے عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ یہ یونانی نسخہ اسکندریہ کی لائبریری میں تھا جسے عیسائیوں نے جلا دیا تھا۔ ۳۹۴ء میں سینٹ جیروم نے ان کتابوں کا مشہور رومی ترجمہ شائع کیا جو (Vulgate) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ سینٹ جیروم کے پاس کونسا نسخہ تھا جس کا اس نے رومی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

تورات کے جو نسخے دنیا میں آج مروج ہیں ان کے اختلافات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آس کا پہلا نسخہ ۱۴۸۸ء میں چھپا۔ جب اس کے دوسرے ایڈیشن کا ۱۷۵۰ء میں انتظام کیا گیا تو اس میں اور پہلے ایڈیشن میں قریب بارہ ہزار جگہ اختلاف کرنا پڑا۔ اس طبع دوم کا نسخہ اب عام طور پر تورات (عہد نامہ عتیق) کہلاتا ہے۔

مروجہ عہدنامہ عتیق کے متعلق خود یہودیوں اور عیسائی محققین کی تنقیدات کیا ہیں اس کے متعلق میری کتاب ”معراج انسانیت“ کے باب اول (ظہر الفساد) میں تورات کا عنوان ملاحظہ کیجیئے۔

یہ ہے اس تورات کی مختصر سی سرگزشت جسے یہودی اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں اور جس کے متعلق قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ انہوں نے خدا کی کتاب کو بری طرح سے مسخ کر ڈالا ہے۔ جب قرآن کریم ہم سے کہتا ہے کہ تم پہلی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لاؤ تو اس کا مطالبہ فقط اتنا ہوتا ہے کہ تم مانو کہ انبیائے سابقہ پر بھی خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہ جن کتابوں کو اہل کتاب آسمانی کتابیں کہتے ہیں انہیں حرفاً حرفاً خدا کی وحی سمجھو۔ قرآن ان کی کس طرح ”تصدیق“ کرتا ہے اس کے لئے عنوان (ص۔ د۔ ق) دیکھئے۔

## ت ی ن

الثین\* - انجیر یا انجیر کے درخت کو کہتے ہیں۔ نیز ایک پہاڑی کا نام ہے، جس طرح ”زیتون“ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے\*۔ الثین\* سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے حضرت نوح\* نے اپنی دھوت کی آواز بلند کی تھی۔ جس طرح ”زیتون“ وہ مقام ہے جہاں سے دعوتِ حضرت عیسیٰ\* کا آغاز ہوا تھا۔ قرآن کریم نے ان مقامات (تین - زیتون - طور سینا اور مکہ) کو اس حقیقت پر شاہد ٹھہرایا ہے (۹۵) کہ حق و باطل کی یہ کشمکش شروع سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ یعنی آسمانی پیغام جہاں جہاں بھی آیا، مترقین نے اس کی مخالفت کی۔ وہ دعوتِ حضرت نوح\* کی تھی (التین) یا حضرت عیسیٰ\* کی (الزیتون)۔ حضرت موسیٰ\* کی تھی (طور سینا) یا نبی اکرم\* کی (البلد الامین)۔ ہر دعوت الی اللہ کی یکساں مخالفت ہوئی۔

## ت ی ہ

أرض\* تینہ\* - اس سرزمین کو کہتے ہیں جس میں نہ پہاڑ ہوں نہ ٹیلے۔ نہ کوئی دوسری چیزیں ہوں جنہیں نشانِ راہ بنایا جاسکے اور اس طرح مسافر اس میں راستہ کھو کر حیران و سرگردان پھرے۔ تاء تینہ\* فی الأرض\* - راستہ گم کر کے زمین میں حیران و پریشان بھٹکتے پھرنے۔

”رَجُلٌ تَائِهٌ“ - بھٹکتا ہوا راہی \* - اس سے تَائِهٌ - يَتَّيِّهُ کے معنی متحیر ہونے کے آتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - نیز تَائِهٌ يَتَّيِّهُ کے معنی خود رائی اور تکبر کرنا ہیں \* - التَّيِّهُ - التَّشْوُّهُ مقامات حیرت \*\* - بنی اسرائیل کے متعلق ہے - يَتَّيِّهُونَ فِي الْأَرْضِ (۴۰) ”وہ (چالیس سال تک) حیران و سرگردان پھرتے رہینگے“ - یہہ حالت ہوتی ہے اُس قوم کی جو قوانین خداوندی سے گریز کی راہیں تلاش کرنے اور ان میں حجتیں نکلے - وہ سفر زندگی میں حیران و پریشان ماری ماری بھرتی ہے اور اسے کہیں نشانِ راہ اور سراغِ منزل نہیں ملتا - (جیسا کہ خود ہمارے ساتھ صدیوں سے ہو رہا ہے) -

—————:O:—————

## ث

## ث ب ت

ثَبَّتَ ثَابِتٌ رَهْنًا - ایک حالت پر جمے رہنا - الثَّابِتُ مِّنَ الْخَيْلِ - اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو ایک رفتار پر دوڑتا چلا جائے - الثَّيِّبَاتُ - وہ تسمہ جس سے کجاوہ کو باندھ کر جمایا جائے - اور ایسے کجاوہ کو (جسے اس تسمہ سے باندھا جائے) الثَّيِّبَاتُ کہتے ہیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوام - شے کے ہوتے ہیں - سورة رعد میں الثَّيِّبَاتُ بمقابلہ مَحْصُوٍّ (مٹا دینا) آیا ہے (۱۳۳) اور سورة ابراهيم میں يَثْبُتُ بمقابلہ يَنْضِلُ (۱۲۷) - لہذا اس کے معنی ہوئے، جو رائگاں نہ جائے بلکہ نتیجہ خیز اور بار آور ہو - جو مٹے نہیں، اپنی جگہ نہ چھوڑے بلکہ قائم و دائم رہے - الْقَوْلُ الثَّابِتُ (۱۲۷) محکم نظریہ حیات - أَصْلُهَا ثَابِتٌ (۱۲۷) - جسکی جڑیں مضبوط جمی ہوں - اس کے مقابلہ میں ہے، ایسا درخت اُجْتُثَّتْ مِّنْ قَوِّقٍ الْأَرْضِ مَالَهَا مِّنْ قَرَارٍ (۱۲۷) جسے زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے کچھ بھی قرار نہ ہو - سورة نحل میں ثَبُوتٌ بمقابلہ تَزَلٌ آیا ہے - یعنی لغزش نہ کرنا اور جمے رہنا (۱۲۷) - اور سورة بنی اسرائیل میں بمقابلہ تَزَكَّنْ (۱۲۷) - یعنی ذرا نہ جھکنا - قطعاً سائل نہ ہونا - یعنی وَيَثْبُتَ بِهِمُ الْإِقْدَامُ (۱۲۷) - سورة نسا میں ہے وَ أَشَدُّ تَثْبِيثًا (۱۲۷) استحکام دینے میں زیادہ مضبوط دُاعِ ثَبَّاتٌ - وہ بیماری جو انسان کو حرکت کرنے کے قابل نہ چھوڑے \* - اس اعتبار سے آثَبَتْ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو قید کر دینا یا ایسا کر دینا کہ وہ نقل و حرکت کے قابل نہ رہے - سورة انفال میں لِيُثْبِتُوكَ (۱۲۷) کے یہی معنی ہیں -

جماعت مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کے عطا کردہ محکم نظریہ حیات (قرآن) پر جم کر کھڑی رہے اور اس پر عمل پیرا ہو کر اتنی قوت پیدا کرے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے مقام سے ہلا نہ سکے -

## ث ب ر

الْتَّبَرُّ - روکنا - کسی بات سے منع کرنا - مَا تَبَرَّكَ عَنْ هَذَا - تمہیں کس چیز نے اس بات سے روک دیا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ الْتَّبَرُّ اس مٹی کو کہتے ہیں جو چوٹے سے مشابہ ہوتی ہے اور جب کھجور کی جڑ اس مٹی تک پہنچ جاتی ہے تو اسکی نشوونما رک جاتی ہے - اس سے اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - الْتَّبَرُّ - نامراد و ناکام کرنا - خوشگوار یوں سے محروم کر دینا - چنانچہ الْتَّمْتَبَرُّ اس شخص کو کہتے ہیں جس پر جسم کی وجہ سے حد (سزا) لگ چکی ہو اور وہ اسطرح آزادی سے محروم کر دیا گیا ہو\*\* - الْتَّمْتَبَرُّ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں اونٹ ذبح کیا جائے - اس اعتبار سے الْتَّبَرُّ - ہلاکت اور مسلسل تباہی کو کہتے ہیں\* - دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا (۲۵) - ”وہ وہاں ہلاکت کو پکارینگے“ - مَثْبُورٌ - نامراد و ناکام - ہلاک شدہ - ناقص العقل - محروم\* - اِنِّیْ لَا اَظُنُّکَ یَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا (۱۰۳) - ”اے فرعون! میں دیکھتا ہوں کہ تجھ میں عقل کی کمی ہے“ - ثَبَرٌ فُلَانٌ - فلاں آدمی ہلاک ہو گیا یا اسکی نشو و نما رک گئی - قرآن کی رو سے مطلب دونوں کا ایک ہی ہے - (دیکھئے عنوان ج - ح - م)

## ث ب ط

تَبَطَّطَ عَنْ لَامٍ - اسکو کسی بات سے روک دیا اور دوسرے کام میں لگا دیا - دیر کرا دی - قرآن کریم میں ہے فَتَبَطَّطُوْهُمْ (۱۰۱) - ”سو انہیں روک دیا“ - تَبَطَّطَ کے معنی ہیں کسی آدمی کو اس کام سے روک دینا جو وہ کر رہا ہو - بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں آدمی اور اسکے ارادوں کے درمیان حائل ہو جانا - الْتَّبَطُّ اسے کہتے ہیں جو اپنے کام میں سست اناڑی اور کمزور ہو - جو دیر سے حرکت کرے\*\*\* -

## ث ب ی

الْتَّنْبِیْةُ - ڈھیر ڈھیر جمع کرنا - کسی معاملہ پر جم جانا اور مستقل مزاجی سے لگے رہنا - بار بار اپنے قبیلہ کی تعریف کرنا - متفرق خوبیوں کو بیان کرنا - چیز کی اصلاح کرنا اور اس میں اضافہ کر دینا - مکمل کر دینا -

\* تاج و محیط و راغب - \*\* تاج - \*\*\* تاج و محیط

پورا کر دینا - تعظیم کرنا - آدمی کا اپنے باپ کی سیرت پر چلنا - خیر اور شر کو جمع کر لینا - بہت زیادہ ملامت اور نکتہ چینی کرنا - ثَبَّيْتُ الْمَالَ - میں نے مال کو جمع کر دیا - مَالٌ مُّثَبِّیٌّ - جمع کیا ہوا مال - الثَّيْبِيُّ - لوگوں کی بہت تعریفیں کرنے والا - الثَّيْبَةُ - حوض کا درمیانی حصہ - لوگوں کی جماعت - سواروں کا دستہ - جَاءَتِ الْخَيْلُ ثَبَاتٍ - گھوڑے ٹکڑی ٹکڑی آئے - ابن جنس نے کہا ہے کہ ثَبَّةٌ کے آخر سے واؤ گرا ہوا ہے - (جیسا کہ آبٌ - آخٌ اور مَنَّةٌ اور عِصَّةٌ وغیرہ میں ہے) ابن بری نے کہا ہے کہ محققین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اسکی اصل ثَبْوَةٌ تھی - ابو اسحق نے کہا ہے کہ یہ ثَابُ الْمَاءِ يَثْوُبُ سے مشتق ہے - جوہری نے کہا ہے کہ ثَبَّةٌ وسط حوض کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے - اور آخر کی ہاء (یا تاء مربوطہ) درمیانی واؤ کے عوض میں ہے - (اس صورت میں اس کا مادہ ث - و - ب ہوگا - لیکن) راعب نے کہا ہے کہ اس کے آخر میں سے ایک یاء محذوف ہے اور اس کا مادہ ثَبَّیٌّ ہے \* -

ثَبَّيْتُ الشَّيْءَ يَثْبِيْهِ ثَبْيًا - چیز کو جمع کرنا - بڑا کرنا - درست کرنا - اس میں اضافہ کرنا - مکمل کرنا - قرآن کریم میں ہے فَانْفِرُوا ثَبَاتٍ اَوْ اَنْفِرُوا جَمِيعًا (۱۶۱) - اس میں ثَبَاتٍ جمع ہے ثَبَّةٌ کی جس کے معنی ایک الگ جماعت کے ہوتے ہیں - اس کے مقابلہ میں جَمِيعًا آیا ہے - یعنی تم الگ، گروہ گروہ ہو کر نکلو یا سب کے سب اکٹھے - اس کی جمع ثَبَاتٍ اور ثَبْوُنٌ ثَبِيْنٌ آتی ہے - اس میں آخری یاء محذوف ہے \*\* - (نیز دیکھئے عنوان ث - و - ب) -

## ث ج ج

تَجَّ الْمَاءُ يَتَجَّ - تَجْوَجًا - پانی کا بہنا - زور سے گرنا - اِنْتَجَجَ - پانی گر گیا - التَّجَجَّاجُ مِنَ الْمَطَرِ - زور سے برسنے والی موٹا دھار بارش \*\*\* - قرآن کریم میں ہے وَ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا (۱۶۱) - "ہم نے بادلوں سے زور سے برسنے والا پانی اتارا،، -

## ث خ ن

تَخَنَّنَ - يَتَخَنَّنُ - کسی چیز کا موٹا کثیف اور گاڑھا ہو جانا، اس طرح کہ وہ بہ نہ سکے - اَتَخَنَّنَ فِي الْعَدُوِّ - اسنے دشمنوں کو بہت زیادہ قتل



اور زخمی کیا۔ اِسْتَضَحَنَ مِنْهُ الْقَوْمُ۔ نیند اس پر غالب آگئی۔ اِثْحَنَ۔  
وہ غالب آ گیا۔ اس نے تسلط پا لیا۔

سورة انفال میں ہے حَتَّى يَسْتَحِينَ فِي الْأَرْضِ (۱۶۷)۔ ”جب تک وہ  
تمام دشمنوں پر غالب نہ آ جائے“۔ اور انہیں انکی مخالفانہ کارروائیاں جاری  
رکھنے سے نہ روکدے۔ سورة محمد میں ہے حَتَّى إِذَا اِثْحَنْتُمْهُمْ  
(۲۶) ”جب تم انہیں مغلوب کر لو“۔

دراصل اِثْحَنَ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اس قدر بھاری (یا  
(بوجھل) ہو جانا کہ وہ اسکی وجہ سے حرکت نہ کر سکے۔ (ابن فارس)۔  
چونکہ مغلوب یا مقتول اپنے مقام سے حرکت نہیں کر سکتا اس لئے اس کے  
لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہونگے اس قسم کا غلبہ جو  
دشمن کو بے حس و حرکت اور بے دست و پا کردے اور اس طرح وہ مخالفت  
کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ تَخِیْنٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی ہتھیار  
نہ ہو۔\*\*۔ محیط میں لکھا ہے کہ تَخِیْنٌ کے معنی ہتھیار بند ہیں۔ ممکن ہے  
کہ اپنی اصل کے لحاظ سے اس لفظ میں یہ دونوں معنی پیدا ہو گئے ہوں۔ اس  
لئے کہ جس طرح ہتھیار بند اسلحہ کے بوجھ اور بندش کی وجہ سے آزاد نہیں  
رہتا اور پوری طرح تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا، اسی طرح نہتا بھی خوف  
کے باعث آزاد نہیں رہتا اور اسکی حرکت میں کمی آ جاتی ہے۔

## ث ر ب

ثَرَبٌ پتلی باریک چربی جو انٹریوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تَثْرَبُ يَثْرَبُ  
اس چربی کا ازالہ کر دینا۔ اسے وہاں سے ہٹا دینا۔ ثَرَبَ الثَّوْبَ اسنے  
کپڑے کو لپیٹ دیا۔ ثَرَبَهُ وَعَلَيْهِ يَثْرَبُ تَثْرَبُ يَثْرَبُ اسے اسکی غاطی  
پر عار دلانا یا ملامت کرنا۔ زجر و توبیخ کرنا۔ سرزنش کرنا۔\*\*\*۔ سورة يوسف  
میں ہے۔ لَا تَثْرِبْ يَبْ عَلَيَّكَمُ الْيَوْمَ (۱۲)۔ ”تم پر آج کوئی ملامت  
نہیں“۔ میں تمہیں زجر و توبیخ اور سرزنش نہیں کرتا۔ تمہیں معافی ہے پچھلی  
لغزشوں پر، اور آئندہ تمہیں عار نہیں دلانی جائیگی۔

يَثْرِبُ۔ مدینہ منورہ کا قدیمی نام ہے۔\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے يَا هَلْ  
يَثْرِبُ۔ ”اے یثرب کے رہنے والو“۔ (۳۳)۔

\* تاج۔ \*\* ابن فارس۔ \*\*\* تاج و راغب و محیط۔

## ث ر ی (ث ر و)

الشَّرَى - نمی - نم آلود مٹی - یعنی وہ مٹی جو گیلی ہو گئی ہو لیکن گارا نہ بنی ہو۔ زمین کی اوپر کی سطح خشک ہوتی ہے اور اس کے نیچے نم آلود - اس سطح کو ثری کہتے ہیں - مَا تَحْتَ الشَّرَى (نہ) - ”جو کچھ ثری کے نیچے ہے“ - تَرِيتِ الْأَرْضُ - زمین نم آلود ہو گئی - چونکہ زمین کی نمی کھیتی کیلئے نہایت ضروری ہے اسلئے فَلَانٌ قَرِيبٌ الشَّرَى کے معنی ہیں ایسا آدمی جو آسانی سے خیر و برکت عطا کر دے - حقیقی ثروت زمین کی نمی کے ساتھ وابستہ ہے جو رزق کا سرچشمہ ہے - اَنَا ثَرِيٌّ بِهِ - میں اس سے خوش ہوں\* -

## ث ع ب

ثَعْبُ الْمَاءِ - پانی بہایا - فَانْثَعَبَ - چنانچہ پانی بہہ نکلا - مَاءٌ ثَعْبَانٌ - بہنے والا پانی - مَتَاعِيبُ الْمَدِينَةِ - شہر کی پانی بہنے کی جگہیں - الثَّعْبَانُ - سانپ (موٹا لمبا اور نر سانپ) - چونکہ سانپ زمین پر اس طرح چلتا ہے جیسے پانی کی نالی بہہ رہی ہو اسلئے اسے ثَعْبَانٌ کہتے ہیں\* - اَلَا ثَعْبَانٌ - بھاری بھر کم سفید اور حسین چہرہ\* -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی درازی اور پھیلنے کے ہوتے ہیں - (پانی وغیرہ میں) -

قرآن کریم میں قصہ حضرت موسیٰ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے فَاتَّقَى عَصَاهُ فَيَاذَاهِبِي ثَعْبَانٌ مُبِينٌ ... (۱۰۷) - اس کے لغوی معنی ہیں ”تب اس نے اپنا عصا ڈالا تو وہ صریح سانپ (اڑدھا) تھا“ - اس کے مجازی مفہوم کے لئے عنوان (ع - ص - و) میں لفظ عصا دیکھئے -

## ث ق ب

الثَّقَبُ - سوراخ - آر پار شکاف - ثَقْبُهُ - ثَقْبُهُ - اسنے اسمیں سوراخ کر دیا - فَانْثَقَبَ - اسمیں سوراخ ہو گیا - اَلِثْقَابُ - سوراخ کرنے کا آلہ - ثَقَبَتِ السَّارُ - آگ بھڑک اٹھی - ثَقَبَ الْكُوكَبُ ستارہ چمکا - شِمَابٌ ثَقِيبٌ - روشن ستارہ - گویا وہ تاریکی کی چادر میں سوراخ کر کے باہر نکل آتا ہے، یا اسکی کرنیں فضا کی تاریکی میں چھید کرتی جاتی ہیں -

الْتَمِيبُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت دودھیاری ہو۔ جسکے دودھ کی دھاریں چھید کرتی جائیں \*۔ قرآن کریم میں شہتاب \* ثاقب \* (۳۰)۔ اور الْتَجَمُ الثَّقِيبُ \* (۸۱) آیا ہے۔

## ث ق ف

الْتَقَفَ - کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے بھانپ لینے اور پا لینے میں مہارت اور کسی کام کے کرنے میں حذاقت۔ ثَقِيفٌ كَذَّاءٌ - میں نے کسی چیز کو مہارت نظر کے ذریعہ تاڑ لیا۔ اسکے بعد یہ لفظ محض پا لینے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا خواہ اسکے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ ہو \*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کے معنی غلبہ پا لینے کے بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اِنْ يَتَثَقَّفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَاءُ (۲۰)۔ ”اگر وہ تم پر غلبہ پالینگے تو تمہارے دشمن ہو جائیں گے“۔ یا وَاَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (۱۶۱) ”جہاں تم انہیں بھانپ لو اور غلبہ پا لو انہیں قتل کر دو“۔

الْتَقَافُ - کے معنی باہم جھگڑنے اور تلواریں چلانے کے ہیں۔ نیز وہ آلہ جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے \*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی ٹیڑھی چیز کو سیدھا کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ثَقِفْتُ الْقِنَاةَ کے معنی ہیں میر نے نیزہ کے خم کو سیدھا کر دیا۔ اس اعتبار سے الْتَقَافَةُ میں جہاں نگاہ کی تیزی۔ ذہانت۔ اور حذاقت کا مفہوم ہے وہاں اس میں تلوار چلانے اور نیزہ کے خم کو سیدھا کر دینے کا مفہوم بھی ہے \*۔ قوموں کی اولین ثَقَافَتِ شمشیر و سناں ہوتی ہے اور آخر الامر اس سے مفہوم شعر گوئی اور افسانہ طرازی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ قوم کی ثقافت، نگاہ کی تیزی اور شمشیر کی خارہ شگافی (دونوں) کا مجموعہ ہوتی ہے۔

## ث ق ل

الْتَقِلَ - خِفَّةٌ کی ضد ہے۔ بھاری اور بوجھل ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ دونوں مقابل کے الفاظ ہیں۔ جب تم کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے حاتمہ وزن یا اندازہ کر رہے ہو تو جو چیز بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہتے ہیں اور جو ہلکی ہو اسے خَفِيْفٌ۔ ثَقِيْلٌ کی جِمْ ثِقَالٌ آتی ہے \*\*\*۔

\* تاج و محیط و راغب - \*\* راغب - \*\*\* تاج۔

عظیم الشان وزنی بات - قَتُولًا ثَقِيلًا (۳۳/۵) - ثَقَلَتَيْنِ - دو عظیم القدر چیزیں - یا جماعتیں - آيَةُ الثَّقَلَيْنِ (۵۵/۱) - صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس سے مراد عرب و عجم ہیں کیونکہ دونوں صفحہ ارض پر ثَقُلٌ ہیں\*\* -

اَثْقَالَ (ثِقْلٌ کی جمع ہے) وزن - بوجھ - اعمال کے نتائج - (۲۹/۱) - سورة زلزال میں ہے وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (۹۹/۲) - ”زمین اپنے اَثْقَالَ کو اوپر لے آئیگی - باہر نکال دیگی،“ - اس سے مراد زمین کے چھپے ہوئے خزان و دفائن (معدنیات وغیرہ) بھی ہیں اور بڑے بڑے لوگ بھی - مِثْقَالٌ - ہر وہ چیز جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے - چنانچہ ہر باٹ کو مِثْقَالٌ کہہ سکتے ہیں\* (۲۰/۲) -

ثَقُلٌ - بھاری ہونا\* - ثَقُلْتُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۱۸۷/۱) - ”وہ ارض و سماء میں بھاری ہے،“ - اَثْقَلْتُ الْبَرَاءَةَ وَثَقُلْتُ - ہورت کا حمل ظاہر ہو گیا\* - (۱۸۷/۱) - اِثْقَالَ - بوجھل ہو کر (زمین کی طرف) جھک جانا - سست ہو جانا - دیر لگا دینا\*\* - (۱۸۷/۱) -

مُثْقَلٌ - بوجھ سے دبا ہوا\* (۵۲/۲) - مُثْقَلَةٌ (۳۵/۱۸) -

سورة توبہ میں ہے - اُنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا (۹/۲) - جب تمہیں جہاد کیلئے بلایا جائے تو تم چاہے فراخی کی حالت میں ہو یا تنگی کی حالت میں ہر حال میں جہاد کیلئے چل کھڑے ہو - تاج العروس نے جوان اور بوڑھے بھی کہا ہے\* - نیز اس کے - مئے چست اور سست بھی ہو سکتے ہیں اور سامانِ حرب سے ادھوری یا پوری طرح تیس ہونے والے بھی -

ثَقُلْتُ مَتَوَارِثُهُ، کے لئے دیکھئے عنوان (خ - ف - ف) -

## ث ل ث

اَلثَّلَاثُ - اَلثَّلَاثُ - ایک تہائی حصہ (۱/۳ حصہ) قِيلَا مِثْلِ الثَّلَاثِ (۱/۱) - ”تو اسکی ماں کے لئے ایک تہائی حصہ ہے“ - اَلثَّلَاثَانِ - دو تہائی - ثَلَاثٌ - گھوڑے کا دوڑ میں ”مَصِیاتی“ کے بعد تیسرے نمبر پر آنا - (مَصِیاتی وہ ہوتا ہے جو پہلے نمبر سے متصل دوسرے نمبر پر آئے) - اَلثَّلَاثَةُ - تین کا عدد، مذکر (ثَلَاثٌ مؤنث) - قرآن کریم میں ہے - فَصِيحَاتُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ (۲۶/۱) - ”تین دن کے روزے (بطور فدیہ)،“ -

ثَلَاثٌ - تین تین - مِثْنَتِي وَثَلَاثَ وَرُبْعٍ - (۲/۲) - ”دو دو - تین تین - چار چار،“ - اَلثَّلَاثِيْنَ وَالثَّلَاثُوْنَ - تیس (۳۰) -

## ث ل ل

الْثَّلَاقَةُ - بہت سی بھیڑیں یا بکریاں۔ اصل میں اون کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔ چونکہ بھیڑ بکریوں پر اون ہوتی ہے اسلئے ان کے ریوڑ کیلئے بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ حَبَلٌ ثَلَاثَةٌ - اون کی رسی۔ الثَّلَاثَةُ - آدمیوں کی جماعت\*۔ قرآن کریم میں ہے ثَلَاثَةٌ مِّنْ آلِ لَاوِلِیِّیْنَ (۵۶)۔ ”پہلوں میں سے ایک بہت بڑی جماعت“۔

ثَلَّ الدَّارَ - گھر کی دیوار کی بنیاد میں سے مٹی نکال لینا اور پھر اسے دھکا دیکر گرا دینا۔ بَیَّتٌ مَّثْلُوهٌ\* - منہدم مکان کو کہتے ہیں۔ الثَّلَاثَةُ\* - ہلاکت\*۔ یعنی ڈھیر ہو کر رہ جانا۔

## ث م د

الْتَّمَدُ - الْتَّمَدُ - الْتَّمَدُ - تھوڑا سا پانی جو کہیں جمع ہو جائے اور جسکا کوئی چشمہ نہ ہو۔ مثلاً بارش کا پانی۔ الْتَّمَدُ الْمَاءِ: بارش کے پانی کو گڑھوں وغیرہ میں محفوظ کیا۔\*\*  
الْتَّمَدُ کے معنی ہیں چوپایہ یا انسان کا بچہ جو تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کرے۔ یہ اس کی ابتدائی عمر ہوتی ہے۔

تَمَوَّد - محققین علم الاقوام نے دنیا کی قوموں کو تین بڑی بڑی شاخوں میں تقسیم کیا ہے (۱) آریائی (۲) منگولی (۳) سامی۔ سامی اقوام میں عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن نے جن اقوام اور انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا ہے وہ سامی اقوام سے متعلق ہیں۔ تورات کے بیان کے مطابق سام، حضرت نوحؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا۔ ان کی اولاد سامی کہلاتی ہے۔ دور حاضریہ کی تحقیق کے مطابق امم سامیہ کا اولین وطن عرب تھا جہاں سے نکل کر وہ بابل، شام، مصر وغیرہ تک پھیل گئیں۔ ان میں سے جنہوں نے اندرون عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ تَمَوَّد کا تھا۔ تَمَدٌ کے لغوی معنی کے پیش نظر، بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام تَمَوَّد اس لئے تھا کہ ان کے علاقہ میں پانی کی قلت تھی اور یہ بارش کے پانی پر گزارہ کیا کرتے تھے\*\*۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے وادی قریٰ کہتے تھے۔ حجاز ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم

راستے پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادی قریٰ کے گرد و پیش کا علاقہ بڑا سرسبز ہے لیکن آتش فشاں سادہ سے لبریز۔ یہ قوم میدانوں میں وسیع و رفیع محلات تعمیر کرتی اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتی تھی جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (۱۸: ۸۵)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے لئے سامانِ رزق زمین کے دسترخوان پر بافراط بچھا دیا تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لے۔ لیکن مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت بنا لیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور انسان بھوکے مر جائے۔ حضراتِ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ رزق کے چشموں کو مستبد قوتوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر نوعِ انسانی کے لئے عام کر دیں۔

قدیم زمانہ (اور آج بھی صحرا قورد اور باد یہ پیم افرام) میں ہانی کے چشمے اور چراگاہیں رزق کے اولین ذرائع ہوتے ہیں۔ قومِ ثمود کے ہاں بھی یہی حالت تھی۔ سردارانِ قوم نے ہانی کے چشموں کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور کمزور انسان انکے دستِ نگر تھے۔ معاشرہ کے اس فساد کو مٹانے کے لئے ان میں حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (۲۱: ۶۱) جنہوں نے ان سے کہا کہ وہ ملک میں اس قسم کی ناہمواریاں (فساد) پیدا نہ کریں (۲۱: ۶۲)۔ کمزور طبقے نے حضرت صالحؑ کا ہاتھ دیا لیکن دولت مند طبقہ نے ان کی سخت مخالفت کی (۲۱: ۶۳)۔ اور آپ کی دھوت کے جواب میں کہا کہ ہمارے ہاں جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہونے دیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ کی پوزیشن مستحکم تھی اس لئے انہوں (سرداروں) نے آپ سے معاہدہ کر لیا کہ ہانی کے چشموں پر جانوروں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور امیروں اور غریبوں (سب) کے جانور اپنی اپنی باری پر ہانی ہی لیا کریں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس بات کے ثبوت کے لئے کہ تم اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہو یا نہیں میں اپنی اونٹنی چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اسے اسکی باری پر ہانی ہی لینے دیا تو سمجھا جائیگا کہ تم اپنی بات کے پکے ہو (۲۱: ۶۴)۔ لیکن ان مفسدین نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اسطرح اپنی بات سے پھر گئے (۲۱: ۶۵)۔ یہ اونٹنی گویا خدا کے قانون کی محسوس علامت تھی۔ اس لئے اسے نفاقۃ اللہ اور آیتۃ (۲۱: ۶۶) کہا گیا ہے۔ وہ لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک رات آتش فشاں پہاڑوں میں دھماکا ہوا۔ ایک چیخ۔

ایک گرج۔ ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر ہو گئیں (۷۸)۔

[اس قوم کی فساد انگیز روش۔ زندگی اور اس حادثہ میں باہمی تعلق کیا تھا۔ اس کے متعلق میری کتاب ”جوئے نور“ میں (حضرت نوحؑ کے تذکرہ کے ضمن میں) تفصیل ملیگی]

## ث م ر

ثَمَرٌ - درخت کے پھل - ہر قسم کا سال - سونا چاندی - سب کو ثَمَرٌ کہتے ہیں - الثَّمَرَةُ خود درخت کو بھی کہتے ہیں - اور اولاد کو بھی - سَالٌ ثَمَرٌ - کثیر سال، (جو بہت جلد بڑھ جائے) - ثَمَرُ النَّبَاتِ کے معنی ہیں پودے نے پھول جھاڑا اور اسکی جگہ پھل نمودار ہوا - ابن فارس نے اس مادہ کی اصل وہ چیز بتائی ہے جو مجتمع شکل میں کسی دوسری چیز سے پیدا ہو، پھر استعارۃً دوسری چیزوں کو بھی کہہ دیا جاتا ہے -

قرآن کریم میں یہ لفظ سال و دولت کیلئے بھی آیا ہے - (كَانَ لَهُ ثَمَرٌ ۱۸۸) - شہد کی مکھی کیلئے کہا گیا ہے کہ وہ تمام ثَمَرَاتٌ سے رس چوستی ہے (۱۶۶) - راغب نے لکھا ہے کہ ثَمَرٌ درخت کے تمام ان اجزاء پر حاوی ہے جنکو کھایا اور چکھا جاسکے - اس لئے ثَمَرَات میں پھلوں کے علاوہ پھولوں وغیرہ کے بھی وہ اجزاء شامل ہیں جنہیں کھایا یا چکھا جاسکے -

## ثم

ثَمٌ - یہ ظرف مکان ہے - اور ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں انگریزی میں (There) استعمال ہوتا ہے - یعنی وہاں\*\* - سورة بقرۃ میں ہے - فَآيُنْمَا تَوَلَّوْا فِثَمٍ وَجْهَ اللّٰهِ (۱۱۵) ”ثم جسطرف بھی اپنا رخ کرو گے وہاں اس راستہ کو اپنے سامنے پاؤ گے جو تمہیں خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لیجائے“ - قانون خداوندی زندگی کے ہر گوشے میں مل جائیگا (دیکھئے عنوان و-ج-ہ) - سورة شعراء میں ہے وَأَرْ لَفْثَنَا ثَمٌ الْاٰخِرِيْنَ (۲۶۶) - ”ہم دوسروں کو بھی وہیں قریب لے آئے“ - سورة الذھر میں ہے اِذَا رَا يْتَ ثَمٌ رَا يْتَ نَسْعِيْمًا (۶۰) ”جب تو وہاں دیکھیگا (یا ادھر دیکھیگا) تو نعمتیں نظر آئیں گی“ - سورة تکوین میں ہے مَطَاعٌ ثَمٌ اَمِيْنٌ (۸۱) ”وہ مطاع بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی امین بھی“ -

\* (تاج) - \*\* تاج و لین - لہ - اس آیت میں وجہ اللہ کے معنی ذات خداوندی بھی ہو سکتے ہیں - لیکن ذات خداوندی ہمارے سامنے اس کی آیات کی رو سے ہی آتی ہے - آیات اللہ میں قانون خداوندی کی حیثیت بنیادی ہے -

(ثُمَّ) - فعل بھی ہوتا ہے جسکے مختلف معانی ہیں۔ مثلاً درست کر دینا۔ پاؤں سے روندنا۔ جمع کرنا وغیرہ۔

## ثُمَّ (حرف)

ثُمَّ - عام طور پر یہ اس مقام پر آتا ہے جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا پھر پانی پیا۔ سورۃ مومنوں میں ہے۔ ثُمَّ "أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ" قَرْنًا الْآخَرَ يٰۤأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (۲۳۳) "پھر ہم نے ان کے بعد ایک اور نسل پیدا کی،۔"

(۲) لیکن ضروری نہیں کہ ثُمَّ ہر جگہ ترتیب کے معنی ہی میں استعمال ہو۔ یہ وَ (اور) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ یونس میں ہے۔ ثُمَّ "اللَّهُ شَمِيعٌ عَلِيمٌ مَا يَفْعَلُونَ" (۱۰۶)۔ "اور اللہ اس پر گواہ ہے جو یہ کرتے ہیں،،۔ اسکی ایک اور بیشن مثال یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں ہے "هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ" (۲۹)۔ "اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔ (ثُمَّ) اور وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور انہیں متعدد کثرون میں درست کیا،،۔ اگر یہاں ثُمَّ کے معنی "پھر"، کئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے زمین کو بنایا اور پھر آسمانی کرون کو۔ لیکن سورۃ نازعات میں پہلے آسمانی کثرون کے متعلق ہے۔ رَفَعَ سَمَكَمَهَا فَسَوَّاهَا۔ "اس نے آسمان کی بلندی کو اونچا کیا اور اسے ٹھیک بنایا،،۔ اس کے بعد ہے۔ وَأَلَّاَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا (۲۹) "اور زمین کو اس کے بعد پھینکا،،۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے آسمانی کرون کو مرتب کیا۔ پھر زمین کو دور پھینکا۔ (اسکی تائید کہ ان کثرون کو چھینٹوں کی طرح اڑایا (۱۱۲) سے بھی ہوتی ہے)۔ اس سے ظاہر ہے کہ (۲۹) میں ثُمَّ، ترتیب کے لئے نہیں آیا۔ لہذا اس کے معنی ہر مقام پر ترتیب کے نہیں لئے جائیں گے۔ کہیں وَ (اور) کے بھی لئے جائیں گے۔

نیز کہیں یہ زائد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِ (۱۱۸)۔ "یہاں تک کہ جب ان پر زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہو گئی۔ اور وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے۔ اور انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ کی سزا سے اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔ تو اللہ انکی طرف متوجہ ہوا،،۔ یہاں ثُمَّ کچھ معنی نہیں دیتا۔ اسے زائد کہتے ہیں۔ ("زائد"، کے متعلق کتاب کا پیش لفظ دیکھو)۔

ثُمَّ کے ایک معنی "اس پر بھی اس کے باوجود بھی" ہوتے ہیں مثلاً يَعْرِفُونَ نِعْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا (۱۱۸)۔



## ث م ن

تَمَنُّ الشَّيْءُ - وہ کچھ جسے ادا کرنے کے بعد چیز کی ملکیت حاصل ہو جائے۔ عام طور پر تَمَنُّ کسی چیز کی اس قیمت کو کہتے ہیں جس پر خریدار اور فروخت کرنے والا باہم راضی ہو جائیں۔ اور ”قیمت“ اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو اس چیز کے فی الواقعہ برابر ہو۔ مَتَاعٌ تَمَیْنٌ - قیمتی سامان\*۔

قرآن کریم میں ہے - وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (۲۴) ”میری آیات کو تھوڑی سی قیمت کے عوض مت بیچو،“ اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں زیادہ قیمت پر بیچو۔ کم قیمت پر مت بیچو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حقیقی قیمت وہی ہے جو ان پر عمل پیرا ہونے سے ان کے نتائج کی صورت میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جو قیمت بھی ہوگی وہ ثمنِ قلیل ہوگی۔ دین کو ذاتی اغراض و مصالح کے حصول کا ذریعہ بنانا بدترین جرم ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا مدار ہی اس پر ہے۔ چنانچہ قرآن، شیطان کی زبان سے کہلواتا ہے کہ لَا تَغْزِیْہُمْ مِّنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوضًا (۲۱۸) ”میں ضرور تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لوں گا،“ اسی کو وہ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا کہہ کر پکارتا ہے (۱۹)۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی کے مفاد و متاع جس میں اس کی مستقبل کی زندگی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ یہ متاع بہر حال قلیل عوتی ہے (۲۰) خواہ اسکی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جس متاع سے انسانی ذات کی نشو و نما نہ ہو وہ میزانِ انسانیت میں کچھ وزن نہیں رکھتی۔ مذہبی پیشوائیت کا باہمی گٹھ جوڑ اسی متاع کے لئے ہوتا ہے۔ (۲۱)۔ اسی لئے پیشوائیت اور اسلام متضاد تصور ہیں۔

تَمَانِیَّةٌ - آٹھ (مذکر کے لئے)۔ تَمَانِیَّةٌ اَیَّامٌ (۲۲)۔ ”آٹھ دن،“۔ تَمَانٍ یَا تَمَانِیُّ - آٹھ (مؤنث کے لئے)۔ تَمَانِیُّ حِجَجٌ (۲۳)۔ ”آٹھ سال،“۔

تَمَانُؤُنَ - تَمَانِیْنُ - اسی - تَمَانِیْنُ جِلْدَةٌ (۲۴)۔ ”اسٹی کوڑے،“۔

التَّمَنُّ - التَّمَنُّ - التَّمَیْنُ - کسی چیز کا آٹھواں حصہ۔

فَلتَمَنَّ التَّمَنُّ (۲۵)۔ ”ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے،“۔

مرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) سرسید احمد خاں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ لفظ کبھی محض فصاحت کلام کیلئے بھی بولا جاتا ہے جسمیں اسکے معنی غیر متناہی کے ہوتے ہیں - یعنی بہت سے)۔

## تھوڑ

دیکھئے عنوان (ث - م - د)۔

## ث ن ی

ثَنَاهُ - ثَنِيًا - کسی چیز کو دھرا کرنا یا تہہ کرنا (جیسے کپڑا)۔  
یا کسی چیز کو موڑ کر دھرا کرنا (جیسے درخت کی شاخ کو موڑ کر دھرا کر دیا جائے)۔

ثَنَى الشَّيْءُ - چیز کو موڑ دیا یا لپیٹ دیا - ثَنَتْنِي - چیز مڑ گئی -  
ثَنَى الْحَقِيقَةَ - سانپ کا ہل کھانا - الثَّنِيَةُ مِّنَ الْوَادِي - وادی کا موڑ -  
اس کی جمع آثَنَانِي مِّنَ الْوَادِي ہے - آثَمَتَانِي مِّنَ الدَّاءِ ابْتَدَ -  
چوہا یہ کے گھسنے اور کہنیاں جو مڑ کر دھری ہو جاتی ہیں \* - ثِنَاءٌ \* -  
اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا گھٹنا موڑ کر اس کی ران سے باندھا جاتا ہے \*\* - ثِنِيٌّ \* - وہ چیز جسے دھرایا جائے، یکے بعد دیگرے بار بار کیا جائے \* - آثَنَانِ - دو - ایک کا دگنا \* - مؤنث اثْنَتَانِ، اثْنَتَيْنِ -  
فَوْقَ اثْنَتَيْنِ (۱۱) - ”دو سے زیادہ“ (عورتیں)۔

آثَنَاءُ الْكَلَامِ - وسط کلام، - فِيْ آثَنَاءِ ذَالِكَ - اس درمیان

میں -

اِسْتِثْنَاءٌ - کسی کو مستثنیٰ کرنا \* - الگ نکال کر رکھ دینا -  
چنانچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی (۱) ایک کام کو دوبارہ (مکرر) کرنا اور (۲) ایک چیز کی دو الگ الگ چیزیں بنا دینا ہیں -

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے اَلَا لَنتَهُمُ يَتَشَوُّنَ صُدُوْرَهُمْ (۱۱) - ”وہ اپنے سینے کو دھرا کئے ہوتے ہیں“ - ایسے تہہ کر لیتے ہیں کہ اوپر کچھ اور دکھائی دے اور نیچے کچھ اور ہو -  
(Dual Personality) - سورۃ حج میں کتاب اللہ سے اعراض ہر تنے والے اور گریز کی راہیں نکالنے والے کے متعلق کہا گیا ہے ثَنَانِيْ عِطْفِيْهِ (۲۲) - ”وہ

اپنی گردن سوڑ کر چل دیتا ہے۔ امراض برتتا ہے "سورة القلم میں ہے کہ تباہ ہونے والے سرمایہ پرست لَا یَسْتَتِنُونَ (۱۸)۔ "دوسروں کا حق نکال کر الگ نہیں رکھتے تھے" یعنی سب کا سب اپنے لئے رکھ لیں گے۔ اس میں سے کچھ بقی باقی نہیں چھوڑیں گے۔

سورة الحجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ اَتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنْ اَلْمَثَانِي "وَالْقُرْآنُ اَلْعَظِيْمُ" (۸۴)۔ "ہم نے تجھے سبعا مِّنْ اَلْمَثَانِي" اور الْقُرْآنُ اَلْعَظِيْمُ عطا کیا۔" اَلْقُرْآنُ اَلْعَظِيْمُ" خدا کے مقرر کردہ بنیادی اصول ہیں جن کے مطابق اعمال اپنا اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ ظ۔ م)۔ اور اَلْمَثَانِي وہ تاریخی حقائق ہیں جو اپنے آپ کو دہرائے رہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ایک توان بنیادی اصولوں کو بیان کر دیا جن کی رو سے قوموں کو عروج و زوال حاصل ہوتا ہے (یعنی قرآن کریم) اور اس کی تائید میں وہ متعدد تاریخی شواہد بیان کر دئے جو ہر زمانہ میں بار بار سامنے آتے ہیں۔ قرآن کی ابدی صداقتوں کے پرکھنے کا ایک اہم طریق یہ بھی ہے کہ تاریخ میں دیکھا جائے کہ فلاں قوم نے جب وہ روش اختیار کی جسے قرآن حق کی روش قرار دیتا ہے تو اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے اور جس قوم نے باطل کی روش اختیار کی تو اس کے ہواقب کیا ہوئے۔ (مزید تفصیل کیلئے مُحْكَمَات\* اور مُتَشَابِهَات\* کی بحث دیکھئے۔ عنوان (ح۔ ک۔ م) کے تحت)۔

سورة زمر میں قرآن کریم کے متعلق ہے كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي (۳۹)۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مَثَانِي کے معنی ہیں وہ چیزیں جو ایک دوسرے کے سامنے آجائیں۔ (جیسے چوپاؤں کے گھٹنے اور کہنیاں جو مڑ کر ایک دوسرے کے سامنے آجاتی ہیں)۔ اور مُتَشَابِهَات کے معنی ہیں آپس میں ملتی جلتی۔ قرآن کی ساری تعلیم، یہاں سے وہاں تک، ایک دوسرے سے ملتی جلتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کہیں تضاد نہیں۔ تخالف نہیں۔ لیکن اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر بات صاف کر دیتا ہے۔ مثلاً ظُلُمَات کے مقابلہ میں نُور۔ حَيَات کے مقابلہ میں مَوْت۔ اَبْرَار کے مقابلہ میں کُفَر۔

یعنی متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر مطلب کی وضاحت کر دینا (لہذا قرآن مُتَشَابِه\* بھی ہے اور مَثَانِي\* بھی۔ ایسی کتاب جس کی ایک کڑی

دوسری کڑی سے ملتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن جس کے مطالب کو متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر واضح کیا گیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ش۔ ب۔ ہ) اور (ح۔ ک۔ م)۔

مثنوی۔ دو، دو (۳۵)۔ (نیز ۳۶) اثنتا عشر (مذکر) اثنتا عشرۃ (مؤنث) (۳۷) بارہ۔ کتاباً متشابہاً مثلاً فی کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم پہلی کتابوں کے تشابہ ہے اور اصولاً ان کی تکرار۔

## ث و ب

ثَابٌ - يَثْوُبٌ - ثَوْبًا - چلے جانے کے بعد پھر واپس آ جانا۔ ثَابٌ - جَسْمُهُ ثَوْبَانًا وَأَثَابٌ - اسکا جسم بیماری کے بعد پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا، اور امطر رخ ضائع شدہ توانائی اور صحت پھر عود کر آئی\*۔ ثَابٌ - الثَّمَاءُ - پانی نکلے جانے کے بعد پھر اتنا ہی آ گیا۔ بحال ہو گیا\*\*۔ الثَّائِبُ مِّنَ الْبَحْرِ - جزر کے بعد سمندر کا بچ رہنے والا پانی۔ يَثْرُ ثَيْبٌ\* - وہ کنواں جسمیں دوبارہ پانی پلٹ آئے اور جمع ہو جائے\*۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ ثَابٌ يَثْوُبُ کے معنی رَجَعَ (واپس آ جانے) کے ہیں۔ كَلَّ رَاجِعٌ ثَائِبٌ - ہر واپس آنے والے کو ثَائِبٌ کہا جاتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔

مَثَابَةٌ الثَّيْبُ - جہاں تک کنویں کا پانی پہنچ رہا ہو۔ الثَّمَابَةُ - وہ مقام جہاں بار بار جمع ہوا جائے۔ مرجع - مکان - منزل - ثَابُ النَّاسِ - لوگ جمع ہو گئے\*۔

الثَّوْبُ\* - کپڑے کو کہتے ہیں (غالباً اسانے کہہ اسکرے بننے میں نال بار بار آئی اور جاتی ہے) اسکی جمع ثِيَابٌ\* ہے۔ ثَوَابٌ\* - کپڑا بیچنے والا\*۔ ہرب عام طور پر ثِيَابٌ\* کے لفظ سے انسان کی شخصیت مراد لیتے ہیں۔ یعنی خود کپڑے پہننے والا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں قُلَانٌ\* دَئِيسُ الثَّيْتَابِ\* - یعنی وہ شخص بڑی خبیث فطرت کا ہے۔ اسکی شخصیت بڑی خراب ہے\*۔

اس اعتبار سے کہ خود ثَابٌ کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ اور اسلئے بھی کہ عربوں میں جب لوگوں کو جمع کرنا مقصود ہوتا تو ایک آدمی کسی اونچی جگہ کھڑا ہو کر کپڑا ہلاتا، ثَثْوَيْبٌ\* کے معنی ہیں لوگوں کو آواز دیکر بلانا، اکٹھا کرنا۔ چنانچہ صبح کی نماز میں التَّصْلُوَةُ خَيْرٌ مِّنَ الثَّمُومِ پکارنے کو ثَثْوَيْبٌ\* کہتے ہیں\*\*،

ثَابَ يَثُوبُ۔ کے ان بنیادی معنوں کو سامنے لائیے (جن کا شروع میں ذکر آیا ہے)۔ اس سے ثَوَابٌ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائیگا۔ ثَاب کے معنے ہیں جو چیز چلی جائے اسکا پھر سے واپس آ جانا۔ آپ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں آپکا کچھ نہ کچھ صرف ہوتا ہے۔ اگر اور کچھ صرف نہ ہو تو بھی آپکے جسم کی توانائی۔ وقت اور ذہن کی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ اگر آپکا وہ کام بیکار ہے تو آپکی یہ سب توانائیاں (جو آپنے صرف کی ہیں) ضائع چلی جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ کام نتیجہ خیز اور صلاحیت بخش ہے تو آپنے جو کچھ صرف کیا ہے وہ سب آپکو واپس مل جاتا ہے۔ اس (Restoration) کا نام ثَوَابٌ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز محض ذہنی یا خیالی نہیں ہو سکتی کہ ثواب ہو اور آپ کو محسوس ہی نہ ہو کہ کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ آپ جو کچھ صرف کرتے ہیں اسکا آپکو پورا پورا احساس ہوتا ہے (خواہ وہ وقت یا جسم یا ذہن کی توانائی ہی کیوں نہیں) اسلئے جو کچھ آپکو واپس ملے (Restore ہو) اسکا بھی آپکو احساس ہونا چاہئے۔ ورنہ آپکو معلوم کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ واپس مل گیا ہے یا نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں ثَوَابٌ اٰلَاخِرَۃً (۱۳۷) کہا ہے۔ یعنی وہ بازیابی (واپسی) جو انجام کار (یا بعد کی زندگی میں) ملے، اسکے ساتھ ہی ثَوَابٌ الدُّنْيَا (۱۳۷) بھی کہا ہے۔ یعنی اسی دنیا کی زندگی میں بازیابی۔ نتیجہ خیزی۔ اور اس خیال سے کہ کسی کو غلط فہمی نہ رہے کہ یہ ثَوَابٌ کس شکل میں ملیگا اسکی تفصیل میں بتا دیا کہ یہ ثواب، سرداری و سر بلندی کے نشانات، دبیز اور لطیف ریشمی ملبوسات اور سرقرازیوں کی نشست گاہیں ہیں۔ (۱۳۸)۔ قرآن نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا حتمی اور یقینی نتیجہ اس دنیا کی حکومت اور سطوت بھی بتایا ہے۔ (۱۳۹)۔ اس لئے ثَوَابٌ (نتائج اعمال) سب سے پہلے اسی دنیا میں سامنے آجائے چاہئیں۔ اس کے بعد اُخروی زندگی میں بھی۔ چونکہ زندگی کی یہ تمام آسائشیں اور خوشگواریاں اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اور ارتقاء، اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لئے ثَوَابٌ کے معنے اعمال کا نتیجہ بھی ہیں۔ یعنی قانونِ مکافات کی رو سے اعمالِ انسانی کا نتیجہ مرتب ہونا۔ عام طور پر اچھے نتائج کیلئے ہی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات غلط کاموں کے خراب نتائج کیلئے بھی اسکا استعمال ہوتا ہے، (مثلاً ۱۴۰ اور ۱۴۱ میں)۔ یعنی انسان نے جو کچھ کیا ہے اسکا اسکی طرف لوٹ کر آ جانا۔ اس کی (Return)۔ ہل "ثَوَابٌ الْكُفَّارُ مَاكَانُوا" يَفْعَلُونَ (۱۴۱)۔ "کفار کے اعمال ہی نتیجہ بنکر انکی طرف لوٹ کر آ جاتے

ہیں، قرآن کریم نے مکافات عمل کے ضمن میں یہ پڑا باریک نکتہ بیان کیا ہے کہ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ خود عمل کے اندر اسکا نتیجہ مضمر ہوتا ہے۔ آپ صبح کے وقت سیر کیلئے جاتے ہیں۔ دو تین میل کا چکر لگاتے ہیں۔ اس سے آپکی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ لیکن اس سے آپکو صحت و توانائی، شگفتگی اور بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ یہ صحت اور بشاشت کیا ہے۔ آپکی سیر کا نتیجہ ہے۔ یعنی آپکی سیر کا عمل خود اپنا آپ نتیجہ بن گیا ہے۔ اسے ثواب کہتے ہیں۔ ثواب کے اس مفہوم کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ایصالِ ثواب کہتے ہیں وہ کس قدر غیر قرآنی تصور ہے۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ سیر تو آپ کریں اور اس سیر کا نتیجہ آپ میری طرف منتقل کر دیں؟ یہ ناممکن ہے۔ اگر آپ سیر کرتے ہیں تو آپ ہی کی صحت ٹھیک ہوگی۔ اگر میں سیر نہیں کرتا تو آپکا سیر کرنا میرے کسی کام نہیں آسکتا۔ آپ ہزار چاہیں لیکن اس سیر کا نتیجہ (ثواب) آپ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپکا کسی دوسرے کو ثواب پہنچانا ایک سوہوم عقیدہ ہے جسکا حقیقت (قرآن) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ملتا ہے۔ ہر عمل کا اثر انسان کی اپنی ذات پر ہوتا ہے اس لئے اس کے (کسی دوسرے کی طرف) منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مَثُوبَةً (۴۰) بدلہ یا مکافات عمل کیلئے آیا ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے وَثِيَابَكَ فَطَيِّهْرِ (۴۱)۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ثياب کے معنی انسانی شخصیت اور سیرت و کردار کے ہیں۔ (چنانچہ خود قرآن میں دوسرے مقامات پر یہ لفظ انسانی شخصیت یا قلب و دماغ کیلئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً (۱۱ و ۱۲)۔ اسلئے اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ اپنی سیرت و شخصیت کو پاکیزہ رکھو۔ اور اگر تَتَّوَبْ (۴۲) کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اپنی دعوت کو ان لوگوں سے پاک اور صاف (یا دور دور) رکھو جو دل میں نفاق وغیرہ کی خباثتیں لئے ہوں۔ لہذا اسمیں سیرت و شخصیت یا دعوت اور پکار کی پاکیزگی اور بلندی کا حکم ہے۔ نہ کہ کپڑوں کو صاف رکھنے کا۔ (ثواب کے ایک اور مفہوم کیلئے لفظ سُدی دیکھئے)۔

## ث و ر

السَّوْرَانِ - ہیجان کو کہتے ہیں۔ ثَارَ اللَّيْثِي - اس چیز میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ ثَارَ الْغُبَارِ - غبار اوپر کو اٹھا اور پھیل گیا۔ قَدْ ثَارَ ثَائِرُهُ

وہ شخص غضبناک ہو گیا۔ آثَارَةٌ و تَوَثَّرَةٌ و اسْتَشَارَةٌ۔ اسنے اسے بھڑکا دیا۔ برانگیختہ کر دیا۔ آثَارًا لَا رُضَ۔ زمین میں ہل چلا کر اسکی مٹی کو الٹ پلٹ دیا\*۔ سورۃ عادیات میں ہے فَاتَّرَنَ بِهِم نَقْعًا (۱۰۱)۔ ”وہ گھوڑے اپنے سموں کو زمین پر مار کر گرد اڑاتے ہیں“۔

سورۃ بقرہ میں ہے لَا ذَلَّوْا تَتَّبِعُوا لِرَاضٍ (۲۱۶)۔ ”اس بیل کو ابھی ہل میں نہیں جوتا گیا،“۔ سورۃ روم میں ہواؤں کے متعلق ہے فَتَتَّبِعُوا سَحَابًا (۳۸)۔ ”وہ بادلوں میں ہیجان پیدا کر کے انہیں اوپر اٹھاتی ہیں“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے اوپر اٹھنے کے ہوتے ہیں۔

## ث و ی

ثَوَى السَّكَّانَ۔ کسی جگہ دیر تک ٹھہرا، وہاں مستقل اقامت کے لئے اتر،۔ اَلْمَثْوَى۔ اقامت گاہ۔ قرار گاہ۔ وہ جگہ جہاں مستقل طور پر رہا جائے۔ منزل۔ اَبْوْ مَثْوًى۔ مہمان، میزبان، صاحب خانہ۔ اَلثَّوَى۔ مہمان۔ نیز وہ کمرہ جسے مہمان کیلئے تیار کیا جائے۔ اَثْوَاهُ۔ اسکی مہمانی کی، اَلثَّوَّةُ۔ گھر کے ارد گرد اونٹوں کے آرام کرنے کی جگہ (نیز دیکھئے عنوان ا۔ و۔ ی)۔ اسے اَلثَّوْبَةُ بھی کہتے ہیں\*\*۔ سورۃ قصص میں ہے وَمَا كُنْتُمْ ثَارًا بِأَهْلِ مَدْيَنَ (۲۵)۔ ”تو اہل مدین میں قیام پذیر نہیں تھا“۔ سورۃ یوسف میں ہے۔ اَكْتَرِمْنِي مَثْوًى (۲۴)۔ ”اسے باعزت طریق سے رکھو“۔ اسے اپنے ہاں ہزت کی جگہ دو۔ اس مادہ میں مستقل اقامت اور مہمانی کا مفہوم یہ بتا رہا ہے کہ عزیز مصر نے پہلے ہی حضرت یوسفؑ کو باعزت مہمان کی حیثیت دیدی تھی اور انہیں عام غلاموں کی طرح نہیں رکھا گیا تھا۔ سورۃ آل عمران میں ہے يَتَّبِعُ الْمَثْوَى الظَّالِمِينَ (۱۵۰)۔ ”سرکشوں کی قرار گاہ (جہنم) کیا ہی بری ہے“۔

## ث ی ب

اَلثَّيْبُ۔ اس ہورت کو کہتے ہیں جو کسی وجہ سے شوہر سے الگ ہو چکی ہو (خواہ بیوگی کی وجہ سے یا طلاق کی وجہ سے)۔ قرآن کریم میں ثَيِّبَتٌ بمقابلہ اَبْكَارِ آہے۔ اَبْكَارٌ کے معنی کنواری ہورتوں کے ہیں۔ (۲۱)۔ بَشْرٌ ثَيِّبٌ۔ وہ کنواں جس کا بانی ختم ہو جانے کے بعد اس میں دوبارہ پانی آجائے۔

ثَيِّبَتِ الْمَرْأَةُ وَ تَثَيَّبَتِ۔ ہورت بیوہ ہو گئی\*۔

## ج

## جَارٌ

جَوَّارٌ\* - اس کے بنیادی معنی زور سے پکارنے اور آواز نکالنے کے ہیں (خواہ انسان کی طرف سے ہو یا حیوان کی طرف سے) مثلاً بلند آواز سے دعا کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوگا اور گائے وغیرہ کے بولنے کے لئے بھی۔ الْجَوَّارُ بمعنی خَوَّارٌ (بیل کا ڈکارنا) بھی ہے۔ اسی سے جَارٌ الدِّعَاۃِی\* یَجَّارٌ کے معنی ہیں دعا کے ساتھ آواز بلند کرنا۔ جَارٌ الرَّجُلِ\* اَللّٰہ - وہ خدا کے سامنے دعا کے ساتھ گڑگڑایا\* دعا اور تضرع و زاری میں افراط کے موقع پر بولنے ہیں\*\*۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب تمہیں مصیبت پڑتی ہے نوامئید تَجَرُّوْنَ (۱۱۵) ”تم چیخنے چلائے۔ گڑگڑاتے ہوئے“ خدا سے ہی فریاد کرتے ہو،۔

## جَالُوْتُ

جَالُوْتُ\* - یہ عجمی لفظ ہے\*\*\*۔ فلسطین میں ایک سرکش سردار تھا جسے حضرت داؤدؑ نے قتل کیا تھا (۲۵۱)۔ اس کا عبرانی تلفظ جَلِیَّات\* ہے\*\*\*\*۔ بغض کا خیال ہے کہ یہ جَالٌ سے ہے اور جَالٌ فِی الْحَرْبِ کے معنی ہیں اس نے جنگ میں شدت سے حملہ کیا۔ انگریزی میں اسے (Goliath) کہتے ہیں۔

## ج ب ب

الْجَبَبُ\* - الْجَبَابُ\* لَا جَبَابَ\* - کَاثُ الدَّالِہَا - قطع کر دینا۔  
الْجَبَبُ\* - کنواں - بہت گہرا کنواں - وہ کنواں جو پختہ یا لپٹا ہوا نہ ہو۔

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* تاج و راغب - \*\*\*\* محیط -



یہ اس وقت جب کہلاتا ہے جب وہ ایسی حالت میں پایا جائے کہ اسے لوگوں نے کھود کر خاص طور پر تیار نہ کیا ہو، بلکہ کھائی سی بنی ہوئی ہو یا گڑھا سا کھدا ہوا ہو۔ (از خود بن جانے والا کنواں جسے خاص طور پر تیار نہ کیا گیا ہو)۔ اب ہی کنواں تھا جس میں برادران یوسف نے حضرت یوسفؑ کو ڈالا تھا (۱۲)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ ایسے گڑھے اور کھائی کو بھی کہتے ہیں جس کی تہ اور آخری حد معلوم نہ ہو۔

راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے کنوئیں کو کہتے ہیں جو سخت زمین میں کھودا جاتا ہے۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے دوسرے بنیادی معنی چیزوں کا جمع کرنا ہیں۔ اس اعتبار سے الْجَبِيتَةُ لباس کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سارے جسم کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ لیکن صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ الْجَبِيتَةُ اس لباس کو کہتے ہیں جو کپڑے کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو سی کر بنا لیا جائے۔

## ج ب ت

الْجَبِيتُ - تاج العروس میں اس کے معنی، بُت - ساحر - کاہن کے لکھے ہیں۔ نیز شعبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی سحر کے ہیں۔ اس کی اصل الْجَبِيتُ بتائی گئی ہے جس کے معنی ہر اس چیز کے ہیں جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔\*\* صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی الاصل ہے جس کے معنی "مُجْتَوَف" (یعنی کھوکھلی شے) کے آئے ہیں۔ اس کے بعد ہر خالی اور کھوکھلی چیز کیلئے استعمال ہونے لگا۔\*\*\* صاحب المنار نے بھی اس کی تائید کی ہے۔\*\*\*\*

قرآن میں اعلیٰ کتاب کے متعلق ہے۔ يَتَوَمَّنُونَ بِالْجَبِيتِ وَالْقَظَاهُوتِ (۱۶) طَاغُوتِ انسانوں کے خیر و ساختہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی قوتیں۔ اور جَبِيتُ ہر بے حقیقت اور بے معنی چیز۔ تو ہم پرستیان - رسومات جن میں روح باقی نہ رہی ہو۔ جو اندر سے کھوکھلی (مُجْتَوَف) ہو چکی ہوں۔ جو قوم بھی خدا کی طرف سے دئے ہوئے الدین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا "معبود" بنا لیتی ہے۔

## ج ب ر

الْجَبْرِ - اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کی اس طرح اصلاح کرنا کہ اس میں کچھ قوت صرف کرنی پڑے۔ چنانچہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لئے جموں لکڑیاں (Splints) اوپر اور نیچے رکھی جاتی ہیں انہیں الْجَبْرِ ثَر،

اور اس طرح ہڈی جوڑنے کو "جَبَرًا لْعَظْمِ" کہتے ہیں۔ "الْجَبَائِرُ"۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا\*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ ج۔ ب۔ ر اپنی مختلف تراکیب میں قوت اور شدت کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ بنیادی طور پر اس کے اندر عظمت۔ بلندی اور استقامت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ "الْجَبَرُ"۔ خدا کی صفت ہے۔ یعنی کائناتی نظام یا انسان کی ہر شکستگی کو قوانین کی (Splints) میں رکھ کر جوڑنے والا۔ اس سے اس کے معنی ضرورتوں سے بے نیاز کر دینے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں جَبَرًا لْفَقِيرِ مِّنَ الْفَقِيرِ۔ اس نے محتاج کو اس کی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا۔ تَجَبَّرَ الشَّجَرُ۔ درخت سرسبز ہو گیا۔ تَجَبَّرَ لِمَرِيضٍ\*۔ مریض کی حالت سدھری۔ ان مثالوں سے خدا کی جَبَرِیَّت (جَبَرُوت) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ بھی اس کی ربوبیت اور رحمانیت ہی کا ایک پہلو ہے البتہ اسمین انسان کو قانون کی حدود میں گھیر کر چلانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن جب انسانی قوتیں قوانین خداوندی کی حدیں توڑ کر سرکش ہو جاتی ہیں تو یہ جوئبار سیلابِ بلا انگیز بن جاتی ہے۔ اس لئے اس حالت میں جَبَرُ کے معنی استبداد اور جَبَرًا کے معنی مستبد۔ ظالم۔ سرکش اور حد سے بڑھ جانے والا ہونگے۔ چنانچہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَرًا أَشَقِيًّا (۱۹/۱۹)۔ "خدا نے مجھے مستبد، سرکش اور بدبخت نہیں بنایا"۔ اور سورۃ ق میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۵/۵۵)۔ "تو ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے"۔ جبراً کوئی بات منوانے والا نہیں ہے۔ قوم عاد کے متعلق ہے إِذَا بَطُلْتُمْ بِطُغْيَانِ جَبَّارِينَ (۱۳۰/۱۳۰)۔ "جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو نہایت مستبد انداز سے پکڑتے ہو۔" ویسے عام قوی ہیکل لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۴۲/۴۲)۔ اس لئے کہ آلِ جَبَّارِ مِّنَ الشَّيْخِيَّةِ اس لمبی کھجور کو کہتے ہیں جس تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔

آپ نے غور کیا کہ انسان کی کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ہے نہ شر۔ یہ اس کا مقصد استعمال، یعنی جس مقصد کے حصول کے لئے اس قوت کو استعمال کیا جائے۔ اسے خیر یا شر بنا دیتی ہے۔ اگر قوت کو ٹوٹی ہوئی ہڈی کے جوڑنے کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ خیر ہے اور اگر اسے کسی مظلوم کی ہڈی توڑنے کے لئے صرف کیا جائے تو وہ شر ہے۔ ظلم روکنے والا "جَبَر" نوع انسان کے لئے آیہ رحمت ہے، اور ظلم کرنے والا

"جَبَر" موجب عذاب۔ \* تاج و محیط و راغب۔

## جبریل

جبریل - عبرانی لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس سے مراد خدا کی وہ قوت ہے جو قلبِ نبویؐ پر وحیِ خداوندی کا القاء کرتی تھی۔ فَارْتَقِہُ تَزَالُہُ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۲/۹۷)۔ ”اس نے اللہ کے قانون کے مطابق اسے تیرے قلب پر نازل کیا،۔ اسے رُوحُ الْقُدُسُ (۱۱/۲)۔ اور رُوحُ الْاَمِیْنِ (۲/۹۷) بھی کہا گیا ہے۔ لفظ جبریل، دوبارہ سورۃ بقرہ میں (۲/۹۸) اور ایک بار سورۃ تحریم میں آیا ہے (۱/۶)۔ چونکہ کوئی غیر نبی وحی کی ماہیت کو سمجھ نہیں سکتا (کیونکہ وحی اس علم کا نام ہے جسکا سرچشمہ انسانی ادراک سے ماوراء ہے) اسلئے ہم نہیں جان سکتے کہ جبریلؑ کی ماہیت کیا ہے۔ ہمارا واسطہ اس وحی سے ہے جو قرآن کے اندر ہے اور اسکا مفہوم ہم سمجھ سکتے ہیں۔ اس قوت (رُوح) کو قُدُس اور اَمِیْن کہنے سے مطلب یہ ہے کہ وحی خداوندی میں (جو قلبِ نبویؐ پر نازل کی جاتی ہے) نہ کسی قسم کی آمیزش ہوتی ہے، نہ خیانت۔ نہ اس میں نبی کے اپنے جذبات کا کوئی شائبہ ہوتا ہے (مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی - ۵۳)۔ نہ وہ اس میں کسی قسم کی خیانت کرتا ہے (۱/۶)۔ اور نہ ہی کوئی کائناتی قوت وحی میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکتی ہے۔ وحی میں آمیزش اور خیانت رسول کے بعد اس کے دین کے دشمن کرتے ہیں (خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے) لیکن قرآن کریم کے الفاظ میں نہ کوئی آمیزش کر سکتا ہے نہ خیانت۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود لے رکھی ہے۔

## ج ب ل

الْجَبَلُ - پہاڑ۔ قوم کا سردار یا عالم۔ (جمع جِبَال) \*۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ (۲۱/۸۰) ہم نے اس قوم کے بڑے بڑے لوگوں کو داؤد کے مقصدِ زندگی کی تکمیل کیلئے) تابع فرمان کر دیا۔ یہی معنی (۳۲/۱۶) میں ہیں۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ پہاڑوں کو مسخر کر کے اپنے مصرف میں لاتے تھے \*۔ سورۃ کہف میں الْجِبَالُ - بمقابلہ اَلْاَرْضُ آیا ہے۔ (۱۸/۱)۔ اسمیں بھی جِبَال سے مراد سردارانِ قوم ہیں اور اَرْض سے مراد قوم کا نچلا طبقہ۔ الْجِبَالُ وَالْجِبَالُ۔

\* تاج۔ \* حضرت داؤدؑ کے پہاڑوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں مزید دیکھیں عنوان (د۔ د۔ ب) تترہ میں ص ۱۸۱ پر جلد چہارم۔

انسانوں کی بڑی جماعت \* - (۳۶) - بڑی جماعت، \* - (۲۱) - الْجِبِلَّة - کسی شے کی کثرت - مستحکم عادت - طبیعت - خلقت \*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا بلند ہونا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اجزاء کا ایک دوسرے کے ساتھ مستحکم طور پر اکٹھے ہونا ہیں - لہذا جِبَال \* میں بلندی و سرفرازی اور قوت و جمعیت دونوں شامل ہونگی -

واضح رہے کہ جَبَل \* کے لغوی معنی پہاڑ کے ہیں اور اس کے مجازی معنی سردار قوم کے ہیں - قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں (سیاق و سباق کو دیکھ کر) متعین کیا جاسکتا ہے کہ اسے لغوی معنوں میں کہاں استعمال کیا گیا ہے اور مجازی معنوں میں کہاں -

## ج ب ن

الْجَبْن \* - بزدلی - دل کا کمزور ہو جانا - نیز اس کے معنی پتیر بھی ہیں - الْجَبِينَان - پیشانی کے دونوں طرف کے کنارے جو بھوروں کے بعد سے شروع ہو کر سر تک چلے جاتے ہیں اور جن کے اندر پُشٹ پُشریاں آجاتی ہیں - اس کا واحد الْجَبِين \* ہے - پیشانی (جَبْهَة \*) ان دونوں جبینوں کے درمیان میں ہوتی ہے \*\*\* -

قرآنِ کریم میں قصہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے ضمن میں ہے وَتَلَّهِ الْجَبِين \* (۱۰۴) - ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو پٹ پیڑی کے بل لٹا دیا - آپ نے دیکھا ہوگا کہ قصاب بکرے کو ذبح کرنے کیلئے ایک پہلو پر (یعنی کن پٹی کے بل لٹاتا ہے - اس سے ذبح کرنے میں آسانی ہوتی ہے - قرآن کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو اسی طرح لٹایا تھا -

## ج ب لا

الْجَبْهَة \* - پیشانی - اسکی جمع جِبَاه \* ہے - جَبْهَاء \* - کشادہ، حسین اور بلند پیشانی والی عورت \* - صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنی بلند اور لمبا ہونا ہیں \*\* -

قرآن میں ہے جِبَاهُهُمْ \* (۱۵) ان کی پیشانیاں -

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* تاج و محیط و راغب

## ج ب و (ی)

جَبَّتِ الْخِرَاجَ وَالْمَالَ - خراج اور مال جمع کیا - جَبَّتِ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ - حوض میں پانی جمع کیا - اصل معنی اس مادہ کے جمع کرنے یا جمع ہو جانے کے ہیں \* - سورة قصص میں ہے يَجْتَبِي إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ (٢٨) - حرم کعبہ کی طرف ہر قسم کے پھل کھینچ کر چلے آتے ہیں اور جمع ہو جاتے ہیں - جَبَّأ - تالیف کرنا یا جمع کرنا - سورة اعراف میں ہے وَإِذْ أَلَمُّ تَأْتِيهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا آلَوْ لَا اجْتَبَيْتُمَا (٣٠) - ”جب تو انکے پاس کوئی آیت (قرآنی) نہیں لاتا تو یہ کہتے ہیں کہ تو خود ہی انہیں تالیف کیوں نہیں کر لیتا“ - یعنی تو ادھر ادھر کی باتوں میں سے چن کر ایک آیت کیوں نہیں بنالیتا - کفار، قرآن کے متعلق یہ تصور رکھتے تھے کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے (معاذ اللہ) ادھر ادھر سے اکٹھا کر لیا ہے - اب بھی مستشرقین حضور ﷺ کے متعلق کچھ اسی قسم کے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں - اسکی وجہ یا تو نبوت کے متعلق ان کی بے خبری ہے یا تعصب - دونوں صورتوں میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ پر ان کی اس قسم کی تصانیف کا بڑا برا اثر پڑتا ہے -

آلَا جَتَبَاءُ - جہاں سے مال مل سکتا ہو وہاں سے مال نکالنا اور جمع کرنا - (یعنی خراج کے مال کو اس طرح وصول کرنا) - اس سے اسکے معنی بطور انتخاب جمع کرنا ہیں - یعنی چن کر اکٹھا کرنا \* - آلهُ يَجْتَبِي (٣٨) - ”اللہ چن لیتا ہے“ - جَبَّتِ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ کے لئے مزید دیکھیں صفحہ ۸۲۱ جلد چہارم

## ج ث ث

الْجَثَّةُ - درخت کو جڑ سے کاٹ دینا یا اکھاڑ لینا - آلَا جَتِيَّاتُ - کے بھی یہی معنی ہیں، بلکہ زیادہ شدت اور مبالغہ کے ساتھ \* - قرآن میں الْجَتِيَّاتُ (١٢) آبا ہے - یعنی اسکی جڑ بنیاد تمام کی تمام اکھیڑ دی گئی - الْجَتَّةُ - زمین کا بلند حصہ جو ایک چھوٹے سے ٹیلے کی طرح ہو جائے - اس سے جَتَّةُ الْإِنْسَانِ آتا ہے - انسانی جٹہ \* - یہ اسوقت بولتے ہیں جب انسان بیٹھا ہوا یا سویا ہوا ہو کیونکہ اسوقت اس کا تمام جسم اکٹھا اور سمٹا ہوتا ہے \*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع ہونے کے ہیں - درخت کو جڑ سے اکھیڑنے کیلئے یہ لفظ اسلئے استعمال ہوتا ہے کہ جس درخت کو اکھیڑا جاتا ہے اسکی جڑیں وغیرہ سب اکٹھی کی جاتی ہیں تا کہ ان میں سے کوئی چیز زمین میں باقی نہ رہ جائے -

## ج ث م

جَثَمٌ - يَجْثِمُ - جَثْمًا وَجْثُومًا - اپنی جگہ پر چمٹ جانا اور اسے نہ چھوڑنا - (پرند وغیرہ کا) سینہ کے بل بیٹھنا - اس طرح جم کر یا سینہ کے بل بیٹھ جانے والا جو اپنی جگہ سے نہ ہٹے الْجَائِمُ کہلائیکا - الْجُثْمَةُ - مٹی، گارے یا راکھ کا ڈھیر - الْجُثُومُ وَالْجُثْمَةُ - ٹیلہ - الْمُجْثَمَةُ - اس جانور یا پرندے کو کہتے تھے جسے باندھ کر نشانہ بنا لیا جائے اور اس طرح مار دیا جائے \* - لہذا اس لفظ کے معنی کسی ایک جگہ جم کر رہے جس و حرکت پڑے رہنے کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چیز کے مجتمع ہو جانے کے ہیں -

قرآن میں ہے فَاصْبِرْ حَتَّىٰ آفِي دَارِ عَمٍ جَثِمَيْنِ (۷۸) - "وہ اپنے گھروں میں رہے جس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے - ڈھیر ہو کر رہ گئے" -

## ج ث و

الْجَثْوَةُ (جیم کی تینوں حرکتوں - زیر - زیر - پیش کے ساتھ) - پتھروں کا ڈھیر - ریت کا ڈھیر - جسم - جَثَى الْحَرَمِ - رسی جمار کی وجہ سے حرم میں جمع ہو جانے والے پتھر یا وہ پتھر جو حرم کی حدود پر رکھ دئے جاتے تھے - تھان (انصاب) جن پر ایام جاہلیت میں جانور قربانی کے طور پر ذبح کئے جاتے تھے - پتھروں کے ڈھیر کے اعتبار سے الْجَثَا جماعتوں کو کہتے ہیں، اور جَثَوَاتُ الْإِبِلِ کے معنی ہیں میں نے اونٹوں کو جمع کیا -

جَثَا - يَجْثُو - جَثِيًا - (جھکڑا کرنے کیلئے) گھٹنوں کے بل بیٹھ جانا - فَهَوُ جَثَا - گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا - اسکی جمع جَثِيٌّ اور جِثِيٌّ آتی ہے \* -

سورۃ جاثیہ میں ہے وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَآثِيَةً (۲۸) - تو ہر جماعت کو (اس وقت) گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے دیکھیگا - یعنی ذلت و خواری اور عاجزی و درماندگی کی حالت میں -

سورۃ مریم میں ہے وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًا (۱۲) - "ہم ظالمین کو اس میں گھٹنوں پر گرا ہوا چھوڑینگے" اور لَنَحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًا (۱۸) یعنی "ہم انہیں جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل گرے ہوئے حاضر کریں گے"، اس سے مراد ذلت و خواری یا عاجزی و درماندگی ہے -

## ج ح د

بَجَعِدَ حَقَّقَهُ - جان بوجھ کر کسی کے حق سے مکر جانا اور انکار کر دینا - اَرْضٌ جَعِيدَةٌ خشک زمین کو کہتے ہیں - اور عَامٌ جَعِيدٌ کم بارش والے سال کو - أَجْعَدُ الرَّجُلُ اسوقت کہتے ہیں جب کسی کا سب کچھ جاتا رہے اور وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی قلتِ خیر (یعنی اچھی چیزوں کی کمی) کے ہیں - راغب اور صاحب محیط نے کہا ہے اَلْجَعْدُ کے معنی ہوتے ہیں اس چیز سے انکار کر دینا جسکا اقرار دل کے اندر ہو اور اسکا اقرار کرنا جسکا انکار دل کر رہا ہو\*\* - قرآن کریم نے حقائق کا انکار کرنے والوں کے متعلق متعدد مقامات پر کہا ہے بَنَاتِ اللَّهِ يَجْعَدُونَ (۱۳) - یہ جانتے بوجھتے (محض ضد اور سرکشی کی بنا پر) قوانین خداوندی کا انکار کرتے ہیں - ("جانتے بوجھتے"، کی تشریح قرآن کریم نے خود ہی دوسری جگہ کر دی ہے - جہاں کہا وَجَعَدُوا اٰیٰتِہَا وَاسْتَفْتٰنٰہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلُمًا وَعُتُوًّا (۲۴) - "یہ بعض ظلم و تکبر کی بنا پر اسکا انکار کر رہے ہیں حالانکہ ان کا دل اندر سے اسے صحیح مانتا ہے"، - صاحب محیط نے کہا ہے کہ جَعَدَ النِّعْمَةَ کے معنی ہیں اس نے نعمت کا یا تو شعور ہی نہیں کیا اور یا سمجھنے بوجھنے کے باوجود منعم کا شکر نہیں کیا -

## ج ح م

أَجْحَمَ عَنْهُ - وہ اس سے رک گیا - اَلْجَحْمُ - بخیل کو کہتے ہیں جو سال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے\* - جَحْمُ الْبَعِیْرِ اونٹ کے منہ پر ایسا چھینکا چڑھا دینا جس سے وہ کاٹے سے رک جائے - تَجَحَّمَ اَلْمَكَانُ "وَالْقَلْبُ" - مکان یا دل تنگ ہو گیا\*\*\* - امام الرمسانی نے أَجْحَمَ کو اَمْسَکَ اور اِنْتَهٰی کا مرادف قرار دیا ہے\*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ ان معنوں میں یہ لفظ أَجْحَمَ سے مقلوب ہے -

تَجَحَّمَ کے معنی ہیں بخل اور تنگ دل کی وجہ سے جل بھن جانا - اس سے جَحْمَ کے معنی ہوتے ہیں آگ بھڑکانا - اَلْجَحْمَةُ - تر بڑی آگ کو کہتے ہیں جو کسی گہری جگہ میں ہو - نیز سخت گرم جگہ کو - اَلْجَاحِمُ

مَنْ اَلْخُرْبِ - سخت گھسان کی جنگ کو کہتے ہیں \* - ابن فارس نے اس کے معنی حرارت اور گرمی کی شدت کے لکھے ہیں - قرآن کریم میں اَلْجَحِيمُ جہنم کیلئے آیا ہے دیکھئے (۲۴) اور (۶۸-۶۹-۷۵) - قرآن کریم میں غلط اعمال کے نتائج کو عذابِ نار سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ آگ سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے - لیکن اگر زندگی اور اس کے مقاصد کے متعلق قرآنی نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سلسلہ ارتقاء کی ایک کڑی ہے جسے ابھی بہت آگے چلنا ہے - قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانی صلاحیتوں میں ایسی نشوونما آجاتی ہے جس سے وہ (مرنے کے بعد) زندگی کی اگلی ارتقائی منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے - لیکن اگر اس کی صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما نہ ہو تو وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا، وہیں رک جاتا ہے - یسقانون ارتقاء کا بنیادی اصول ہے - اس رک جانے کو قرآن نے اَلْجَحِيمُ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جس کے بنیادی معنی رک جانے کے ہیں - لہذا اَلْجَحِيمُ انسانی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے - اور چونکہ اس رک جانے کا احساس شدید ہوگا اس لئے اس سے انسان کے دل میں ایسی آگ بھڑک اٹھے گی (۱۸) جو اس کی کشتِ امل (امیدوں کی کھیتی) کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیگی - قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم، جس مقام پر رک جائے، وہ جحیم ہے - زندگی تو ایک جوئے رواں ہے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا چاہئے - جو نہی اس کی روانی بند ہوئی، وہ جوئے رواں نہ رہی جو عڑ بن گئی اور اس میں سٹراہند پیدا ہونی شروع ہو گئی -

## ج د ث

اَلْجَدَاثُ - قبر - جمع اَجْدَاثُ وَاَجْدَاثُ - قرآن کریم میں ہے فَاِذَا هُمْ مِّنْ اَلْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَتَسَّالُوْنَ (۳۱) - "پس وہ ناگہاں قبروں سے (نکل کر) اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے" - اس سے آگے ہے کہ وہ کف افسوس ملتے ہوئے کہیں گے کہ مَنْ بَعَثَنَا مِّنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶) "ہمیں ہماری خوابگاہ سے کس نے جگا دیا" - لہذا جَدَاثُ اور مَرْقَدُ ہم معنی ہیں - واضح رہے کہ اس سے مقصود کوئی خاص مقام نہیں، کیفیت ہے - اَلْجَدَاثُ - اونٹ کے پاؤں کی زمین پر پڑنے کی آواز \*\* -



## ج د د

الْجَدَّةُ - اس مادہ میں اصل معنی قطع کرنے اور کاٹنے کے آتے ہیں\*۔  
 مثلاً ثَوْبٌ جَدِيدٌ کے اصل معنی کاٹے ہوئے (قطع کردہ) کپڑے کے ہیں۔  
 پھر ہر اس چیز کو کہنے لگے جس کی پیدائش نئی نئی ہوئی ہو\*\*۔  
 الْجَدِيدُ - وہ چیز جس کے ساتھ تمہارا کبھی واسطہ نہ رہا ہو\*\*\*۔  
 قرآن کریم میں ہے اِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۲۰)۔  
 ”وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق  
 لے آئے“، (ایسی مخلوق لے آئے جس سے تمہیں کبھی واسطہ نہ رہا ہو)۔  
 الْجَدَّةُ - ہر چیز کا راستہ (جس سے اسے قطع کیا جاتا ہے یا جو اسے قطع  
 کرتا ہوا چلا جاتا ہے)۔ اس کی جمع جَدَدٌ آتی ہے۔ قرآن کریم میں  
 پہاڑوں کے متعلق ہے جَدَدٌ بَيْضٌ وَحُمْرٌ (۳۵)۔ سفید اور سرخ رنگ  
 کے راستے۔ راستہ سے یہاں مراد دھاریاں ہیں جو پہاڑوں کے مختلف  
 قطعات اور تہوں کو متمیز کرتی ہیں۔ چنانچہ الْجَدَّةُ اس دھاری کو  
 بھی کہتے ہیں جو گدھے کی کمر پر ہوتی ہے\*\*\*۔

الْجَدَّةُ - روئے زمین کو کہتے ہیں، اور بڑے نصیبہ والے آدمی کو  
 بھی۔ دادا اور نانا کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اس کے معنی بڑائی، عظمت  
 و جلال کے بھی آتے ہیں\*\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَانْتَهَ تَعَالَى  
 جَدُّ رَبِّنَا (۹۲)۔ ”ہمارے رب کی عظمت بہت بڑی ہے“۔

الْجِدُّ - کسی کام میں کوشش کرنا۔ نیز جلدی اور عجلت کو بھی  
 کہتے ہیں۔ نیز اس لفظ کو ہر بات میں مبالغہ کے لئے بھی استعمال  
 کرتے ہیں مثلاً عَالِمٌ جِدُّ عَالِمٍ - وہ عالم ہے اور بہت بڑا عالم\*\*\*۔  
 ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے تین بنیادی معانی ہیں (۱)  
 عظمت - (۲) نصیبہ اور (۳) کاٹ دینا۔ تینوں کی مثالیں اوپر  
 مذکور ہیں۔

## ج د ر

الْجِدَارُ - الْجِدَارُ - دیوار کو کہتے ہیں۔ الْحَائِطُ - دیوار کو  
 احاطہ کرنے کی وجہ سے کہتے ہیں اور الْجِدَارُ اسکی بلند ہونے کی وجہ  
 سے۔ کیونکہ اس مادہ میں اصل معنی احاطہ کرنا۔ ابھرنا۔ بلند ہونا ہیں۔

\* محیط - \*\* راغب - \*\*\* تاج -

چنانچہ جَدَّ رَتْ الْجِدَّارَ کے معنی ہیں میں نے دیوار کو اونچا کر دیا۔  
الْجَدُّرُ ایک قسم کا پودا جو ریتلی زمین میں اگتا ہے\*۔

سورة کھف میں جِدَّارُ (۱۸/۱) دیوار کے معنی میں آیا ہے۔  
الْجَدْرِ - مناسب اور لائق - قَدْ جَدَّ رَ جَدَّارَةً - وہ لائق ہوا۔  
انَّہْ سَجَدُوْرٌ اَنْ یَفْعَلَ ذٰلِکَ - وہ ایسا کرنے کے قابل ہے\*۔ قرآن  
کریم میں ہے وَ اَجْنَدَرُ اَقْلًا یَعْلَمُوْا (۹۶/۱)۔ "ان کی حالت اس کے زیادہ  
قابل ہے کہ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکیں"۔ الْجَدْرِ یُرَّةٌ طبیعت کو  
کہتے ہیں\*۔

## ج د ل

اَلْجَدَلُ - اصل معنی اس سادہ میں بٹنے کے ہیں۔ جَدَلٌ اَلْحَبَلُ -  
رسی کو مضبوط بنا۔ اَلْجَدِیْلُ - چمڑے کی بٹی ہوئی لگام کو کہتے ہیں۔ یا  
چمڑے کی بٹی ہوئی رسی کو\*\*۔ اَلْجَدَّالُ ہر مضبوط چیز کو کہتے ہیں\*\*\*۔  
اَلْجَدَالَةُ - سخت زمین\*\*۔ جَدَلٌ الشَّیْ جَدُّوْلًا - کسی چیز کا سخت  
اور قوی ہو جانا\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز  
کا لمبا اور مستحکم ہونا۔ جھگڑے کو جَدَلٌ گفتگو کی درازی کی وجہ سے  
کہتے ہیں۔

اَلْجَدَالُ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایسی گفتگو کرنے کے  
ہیں جس میں طرفین ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور غلبہ حاصل کر لینے  
کی کوشش کریں اور اس طرح خواہ مخواہ بات کو بڑھاتے چلے جائیں۔ اسی سے  
بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی صِرَاعٌ کے ہیں، یعنی ایک انسان کا  
دوسرے انسان کو زمین پر گرا دینا۔ پچھاڑ دینا\*\*۔

قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّجِ (۲/۱۹۷)  
آیا ہے۔ اَلْجَدَّالُ کے جو معنی اوپر دئے گئے ہیں ان سے مطلب واضح ہو جاتا  
ہے۔ حج مسلمانوں کا بین الملی اجتماع ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ امت کے  
اجتماعی مسائل کا حل باہمی مشاورت سے تلاش کیا جائے۔ قرآن کریم کہتا  
ہے کہ اس مقصد کے لئے باہمی گفتگو میں ایسی روش اختیار نہ کرو جس سے  
مقصد یہ ہو کہ تم فریق مقابل کو مناظرانہ شکست دیدو اور اس کے لئے  
خواہ مخواہ بات بڑھاتے اور اس پر اصرار کرتے چلے جاؤ۔ تم متانت اور سنجیدگی  
سے بات کرو اور مقصد یہ سامنے رکھو کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ  
مسائل کا تصفیہ ہو جائے۔

سورة مَجَادِلَة میں جو آیا ہے اَلْغَيْبِ "تَجَادِلْكَ" (۵۸) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہورت رسول اللہ سے اپنے خاوند کے متعلق بار بار سوال کرتی تھی۔ خواہ مخواہ بات کو طول دے جا رہی تھی۔ اپنی بات پر اصرار کرتی تھی اور یوں اس سے جھگڑے کا سا پہلو نکلتا تھا۔

سورة كهف میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ - وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸)۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر معاملہ کے متعلق بات واضح طور پر کہ دی گئی ہے لیکن اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان اس ذہنیت کو لیکر قرآن کی طرف نہ آئے کہ مجھے بہر حال اپنی بات پراڑے رہنا اور قرآن کو شکست دیدینا ہے۔ وہ خالی الذہن ہو کر قرآن پر غور و فکر کرے اور مقصد پیش نظر یہ رکھے کہ مجھے حق اور صداقت کو تلاش کرنا ہے۔ اس طرح قرآن سے صحیح راہ نمائی مل جائیگی۔

## ج ذ ن

الْجَذَاءُ - نسی چیز کو توڑ دینا - کَسَرْتَهُ 'أَجْذَأْذَا' - میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دیا \* - الْجَذَاءُ - دراصل کسی شے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس سے کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو \*\*۔

جَذَاذٌ - سونے کے ڈے یا ٹکڑے یا ریزے \*\*\* - سورة انبیاء میں ہے فَجَعَلْنَاهُمْ جَذَاذًا (۲۱) - "ابراہیم" نے ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

سورة هود میں جنت کے متعلق ہے عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْذُوذٍ (۱۱) - غیر منقطع عطاء - ایسی عطاء جو ان سے قطع نہیں کی جائیگی - جو ہمیشہ رہیگی - یعنی أَجْرٌ غَيْرٌ مَمْنُونٍ (۹۵) -

## ج ذ ع

جِذْعٌ \* - درخت (خرما) کا تنہ - (جمع جُذُوعٌ) - بعض نے کہا ہے کہ اس تنہ کو کہتے ہیں جو خشک ہو چکا ہو - بعض نے کہا ہے کہ اسے کہتے ہیں جو کاٹ لیا گیا ہو - لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ اسمین نہ خشک ہونے کی شرط ہے اور نہ کاٹ لینے کی \* - سورة مریم میں جِذْعُ النَّخْلَةِ (۲۳) - کھجور کے تنے کیلئے آیا ہے - اور (۲۵) سے ظاہر ہے کہ

وہ سرسبز اور ثمردار کھجور تھی۔ لیکن سورۃ طہ میں صلیب کی لکڑیوں کے لئے جَذْوَعُ الشَّخْلِ (۲۶) آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خشک کاٹے ہوئے تنے ہوئے تھے جن پر صلیب دی جاتی تھی۔ ویسے جَذْعَتْہ کے معنی ہیں میں نے اسے کاٹ لیا۔\*\*\* جَذْعُ الشَّادِبَةِ۔ اس نے جانور کو روک دیا۔ الْجَذْوَعَةُ۔ جوانی اور نوعمری کو کہتے ہیں۔\*\*\* ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) نوعمری اور تازگی۔ (۲) درخت کا تنہ اور (۳) کسی چیز کو مٹانے کے لکھے ہیں۔

## ج ذ و

جَذَا عَلَى الشَّيْءِ بِجَذْوٍ وَجَذْوًا۔ وہ کسی چیز پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ جَذَا التَّرَجُلُ عَلَى أَطْرَافِ أَصَابِعِهِ۔ آدمی اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔\* گویا اسمیں کسی چیز کے کسی ایک مقام پر جم کر ٹھہر جانے کا مفہوم مضمحل ہوتا ہے۔ اسلئے جَذْوَةٌ لِسُكْرَى کے اس انکارے کو کہتے ہیں جس سے شعلہ ختم ہو جائے اور صرف انگارہ باقی رہ جائے۔\* یعنی اس میں شعلے کا ابھرنا اور تڑپنا باقی نہ رہے اور وہ ایک مقام پر ٹھہر جائے۔ قرآن میں جَذْوَةٌ مِّنَ النَّارِ (۲۸) آیا ہے۔ یعنی آگ کا انگارہ۔

## ج ر ح

جَرَحٌ۔ کسی چیز کو حاصل کرنا۔ اکتساب کے معنوں میں آتا ہے۔\*\* ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمانا اور (۲) کھال کو پھاڑنا (زخمی کرنا) بتائے ہیں۔ کمانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے آمُ حَسِبَ الَّذِينَ أَجْرَوْا حَتَّىٰ السَّيِّئَاتِ (۲۹)۔ ”جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں۔“۔ یعنی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا سورۃ انعام میں ہے مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ (۲۶)۔ ”جو کچھ تم دن میں کرتے ہو،“۔ اسی بنا پر أَجْرًا رَحٌ انسان کے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء کو کہتے ہیں جو اس کے لئے کام کرتے ہیں۔\*\* صاحب محیط نے کہا ہے کہ أَجْرًا رَحٌ ان مصائب کو کہتے ہیں جو دن کے وقت آئیں۔ جیسا کہ ذات کے وقت آنے والی مصیبتوں کو طَوَارِقُ کہتے ہیں۔\*\*\* نیز اس کے معنی شکار کرنے والے جانور ہیں۔ اس لئے کہ جَرَحٌ بِجَرَحٍ کے معنی زخمی کر دینے کے

ہیں۔ "آلْجَرَّاحَةُ"۔ نیزہ یا تلوار کے زخم کو کہتے ہیں\*۔ قرآن میں  
 "آلْجَوَارِحُ مَكَلَّيْنِ" آیا ہے (۵۰)۔ یعنی شکار کے لٹے سدھائے عوٹے  
 کتے یا دیگر جانور۔ "آلْجَرُّوحُ" زخموں کیلئے آیا ہے (۵۵)۔

## ج ر د

جَرَدٌ - يَجْرِدُ - چھیل دینا - چھلکا اتار دینا - جَرَدٌ اَلْجِلْدُ -  
 اس نے کھال کے اوپر سے بال صاف کر لئے - جَرَدٌ زَيْدٌ اَمِنْ ثَوْبِيہ -  
 اس نے زید کو اس کے کپڑوں سے ننگا کر دیا - فَتَجَرَّدَ - پس وہ ننگا  
 ہو گیا - اَلتَّجَرُّدُ - ننگا ہونا - "آلْجَرَّادُ" (۱۳۳) - ثُدًى (کیونکہ وہ  
 درختوں کو ننگا کر دیتی ہے) - مَكَانٌ جَرِدٌ - وہ جگہ جہاں گھاس  
 نہ ہو - سَنَةٌ جَارٌ وَدٌ - سخت قحط کا سال\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ  
 اس کے بنیادی معنی عوٹے ہیں کسی چیز کا اس طرح صاف ہو جانا کہ وہ  
 کھل کر نظر آنے لگ جائے۔

## ج ر ز

جَرَزٌ - يَجْرُزُ - جَرَزٌ ا - تیزی سے کھانا - قتل کر دینا - كَاثُ ذَالِئِ  
 جَرُ بِنِيَادٍ سے اکھیڑ دینا - اصل معنی اس سادہ میں قطع و استئصال کے آتے  
 ہیں - اَلْجَرُّوْزُ - بہت کھانے والا کہ جب وہ کھانے کیلئے بیٹھے تو  
 دسترخوان پر کچھ نہ چھوڑے - اَرْضٌ جَرَزٌ - وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ  
 ہوتا ہو یا وہ زمین جس سے تمام گھاس وغیرہ چر کر ختم کر دیا گیا ہو -  
 اَلْجَرَزُ - قحط کا سال - اَلْجَارِزُ - بانجھ عورت - اَلْجَرَّازُ - تیز تلوار\*\*۔

قرآن کریم میں ہے لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدٌ اَجْرُزًا  
 (۲۹) "ہم اس زمین کو ایسی بنا دینے والے ہیں کہ اس پر سبزہ کا نام و نشان  
 نک نہ رہے، اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ زمین پر ہے اسے مٹا کر خاک اور خشک و  
 بے گیہا کرتے رہتے ہیں (بہار اور تزا کے دور جاری رہتے ہیں)۔"

## ج ر ع

اَلْجَرَّةُ - (جیم کی تینوں حرکتوں - زیر - زیر - پیش - کے ساتھ)  
 گھونٹ - لسان العرب میں ہے کہ جَرَّةٌ عَہٌ ایک مرتبہ گھونٹ کے نکلنے کو  
 کہتے ہیں اور جَرَّةٌ عَہٌ اس چیز کو جسے اس طرح نکلا جائے - اَلتَّجَرُّعُ  
 کسی چیز کو اس طرح گھونٹ گھونٹ کر کے نکلنا جس سے معلوم ہو کہ اسکا

پینا پینے والے پر سخت نا گوار گذر رہا ہے \*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہنمی کے متعلق ہے کہ اسے جو کچھ پینے کو ملیگا یَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يَشْبِغُهُ (۱۳/۱)۔ ”وہ اسے سخت نا گواری سے گھونٹ گھونٹ کر کے پئے گا اور گلے سے نیچے نہیں اتار سکیگا،“۔ (الامان والحفیظ) اس دنیا میں ذلت اور محکومی کی روٹی بھی کیسی تلخ ہوتی ہے۔ کھائے بغیر گزارہ بھی نہیں اور حلق سے نیچے بھی نہیں اترتی

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اصل معنی اس سادہ میں کسی چیز کو توڑ کر یا کاٹ کر الگ کر دینے (یا جمع کر لینے) کے ہیں \*\*۔ وَتَرَّجِرَعُ کمان کے ایسے تسانت کو کہتے ہیں جسکا کوئی بٹ اسقدر ٹیڑھا ہو کہ دوسرے بٹوں میں نمایاں طور پر نظر آ رہا ہو۔ اَلَا جَرَعُ سخت اور سنگلاخ زمین کو بھی کہتے ہیں \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پینے کی چیز کے کم ہونے کے ہیں۔

## ج ر ف

جَرَفَ - يَجْرِفُ - جَرَفًا - بہت زیادہ لے لینا - سب کچھ لے لینا یا بڑا حصہ لے لینا۔ جَرَفَ الطَّيْنُ - اس نے زمین سے مٹی کو کھرچ لیا۔ اس سے اَلْجَرَفُ اس تباہی کو کہتے ہیں جو قوم کے اموال کو برباد کر دے۔ طاعون اور وبا کو بھی کہتے ہیں۔ مَثَلُ جَرَفٍ - وہ سیلاب جو سب کچھ بہا کر لے جائے۔ اَلْجَرَفُ وَالْجَرَفُ زمین کا وہ حصہ جو کسی دریا کے کنارے واقع ہو اور وہ کٹ کٹ کر دریا میں گرتا رہے یا سیلاب کی زد میں آکر بہ جائے \*\*\*۔

سورۃ توبہ میں شَفَا جَرَفٍ (۹/۱۶)۔ آیا ہے۔ یعنی ایسا کنارہ جو کٹ کٹ کر گر رہا ہو۔ اصل معنی اس مادہ میں صاف کر دینے اور نکال لینے چٹو سے لے لینے نیر کاٹ دینے کے ہوتے ہیں \*\*۔ یا کسی چیز پر پورا پورا قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر جانے کے \*\*\*\*۔

## ج ر م

جَرَمٌ \*۔ کے بنیادی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے یا اس پر سے کسی چیز کو ہٹا کر اسے ننگا کر دینے کے ہیں \*\*۔ عام طور پر درخت سے پھل کاٹنے یا توڑنے کے لئے بولا جاتا ہے \*\*\*\*۔ جَرَمَ الشَّجَلُ - کھجور کو کاٹ دیا یا اسکا پھل توڑ لیا۔

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* تاج و راغب - \*\*\*\* ابن فارس - \*\*\*\*\* راغب -

الْجَرِّمْ مَۃ۔ وہ لوگ جو کہ بھجوروں کا پھل توڑتے ہیں۔ جَرَّمَ لَشَاۃَ جَرَّمَۃً۔ اس نے بھیڑ کی اون کاٹ لی\*۔ جَرَّمَ لَلْعَظَمِ عَن لِعَظْمِ۔ ہڈی پر سے گوشت نوج لیا اور اس طرح ہڈی کو ننگا کر دیا\*\*۔ ان مثالوں سے لفظ جَرَّمَ کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یعنی لوٹ کھسوٹ۔ سلب و نہب (Exploitation)۔ دوسرے کا پھل توڑ کر اپنے ہاں لے جانا۔ دوسروں کی محنت کا ماحصل چھین کر لے جانا اور انہیں ننگا کر دینا۔ ایسا کرنے والوں کو مَجْرِمُون کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ہر اکتسابِ مکروہ (ناپسندیدہ کمائی) کو جَرَّمَ کہا جاتا ہے۔ اَجَرَّمَ۔ وہ جرم والا ہوا۔\*\*\*۔ جرم کے اس مفہوم کو سامنے رکھتے اور سونچتے کہ جب قرآن کریم قَوْمِ مَجْرِمُون (مجرم قوم) کو جہنم رہنم کرتا ہے تو اس سے مقصود کیا ہے۔ قرآن کی رو سے بدترین نظام اور معاشرہ وہ ہے جس میں کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو (Exploit) کریں اور انکی محنت کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ ایسا معاشرہ جہنمی معاشرہ ہے اور اسکا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ سورۃ القلم میں ہے اَفَتَجْعَلُ الْمُتْسِلِمِیْنَ کَالْمَجْرِمِیْنَ (۷۸) ”کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کر دینگے“ یہاں مسلمین کے مقابلہ میں مجرمین آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی مسلم مجرم نہیں ہو سکتا۔ (نیز دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ی)۔

لَا جَرَّمَ۔ لا محالہ۔ ضرور\*۔ بے شک۔ (جو بات واضح اور بے نقاب یعنی برہنہ ہو)۔ سورۃ ہود میں ہے لَا جَرَّمَ اَللّٰهُمَّ فِیْ اَلْاٰخِرَةِ هُمْ اَلْاٰخِسْرُوْنَ (۱۱)۔ ”بلا شک و شبہ یہی لوگ آخر الامر سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے“۔ سورۃ مائدہ میں ہے لَا یَجْرِیْ مَنَکُمُ شَتَّانٌ قَوْمٌ (۳)۔ اس کے معنی آمادہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کے اکتساب پر تمہیں آمادہ نہ کر دے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ جَرَّمَ کے معنی کمانے کے بھی ہوتے ہیں۔

## ج ر ی

جَرَّیْ وَ جَرَّیْتَانِ\*۔ کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا چلنا۔ بلا روک ٹوک بہنا۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْجَرَّیْ تیزی سے چلنے کو کہتے ہیں چنانچہ جَرَّیْ لَفَرَسٌ کے معنی ہیں گھوڑا تیزی سے دوڑا۔ کَلَّ یَجْرِیْ لَا جَلَ مُسْتَمَلًی (۱۳) ”ہر کردہ مدت معینہ کے لئے تیزی سے چل رہا ہے“۔ اس کے راستہ میں کوئی روک نہیں۔ اَلْجَارِیۃ مَوْتٌ جَبَّارٌ اَوَّلُ الْجَارِیۃِ کا جس کے معنی ہیں چلنے والا پہنچنے والا تیزی سے دوڑنے والا۔ جَارِیۃ تاج۔\*\*\* محیط۔\*\*\* راغب۔ کی جمع جَارِیَاتٌ اور جَوَارِیۃ تیزی سے۔ قرآن مجید میں ہے اَلْجَارِیۃُ یَسْرِعُ (۱۴)۔ پتہ اور پانی میں تیزی سے چلنے والے کی وجہ سے تیزی

کو بھی جَارِیۃً کہہ دیتے ہیں۔ جمع جَوَارِ اور جَارِیَات ہے۔ اَلْجَارِیۃُ آفتاب کو کہتے ہیں۔ اور اَلْجَوَارِی سستاروں کو۔ جَارِیۃً لڑکی کو کہتے ہیں۔ جَرِیۃً الشَّیْءُ کے معنی ہیں وہ شے اس کے لئے ہمیشہ قائم رہی۔ یعنی اسمیں دوام کے معنی بھی پائے جاتے ہیں\*۔ (دوام کے مفہوم کیلئے جن۔ن کا عنوان دیکھئے جہاں جَنَّت کے ضمن میں تَجْرِی مِّنْ تَحْتِهَا اَلْاَنْهَارُ کی تشریح کی گئی ہے)۔ قرآن حکریم میں مُجَرَّہَا کے مقابلہ میں مُرْسَلُہَا کا لفظ آیا ہے (۱۱۱)۔ یعنی کشتی کا چلنا اور اس کا لنگر انداز عونا۔ اَلْجَرِیۃُ۔ وکیل اور ضامن کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ سورۃ غاشیہ میں ہے فِیْہَا عَیْنُ جَارِیۃً (۸۸)۔ اس میں بہتا چشمہ ہے۔ سورۃ شوریٰ میں ہے اَلْجَوَارِی فِی الْبَحْرِ (۳۲) سمندر میں کشتیاں۔

## ج ز ا

اَلْجُزْءُ۔ کسی چیز کا حصہ یا اس کا ٹکڑا۔ جمع اَجْزَاءُ۔ یعنی وہ ٹکڑے جن سے کوئی چیز مل کر بنے، جیسے اجزاءُ الْقَسْفِیۃُ۔ اجزاءُ الْقَدَوَاءِ وغیرہ۔ بہت سی چیزوں کے مجموعہ میں سے اگر کچھ چیزیں الگ کر لی جائیں تو وہ بھی اس مجموعہ کا جُزْءُ کہلاتی ہیں\*۔ سورۃ زخرف میں عِيسٰیوٰی کے متعلق ہے وَجَعَلُوْا اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا (۳۱)۔ ”وہ خدا کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء قرار دیتے ہیں“۔ اس سے تشلیث کے عقیدہ کا ابطال مقصود ہے جس میں ”تین میں ایک اور ایک میں تین“ کے گورکھ دھندے سے خدا کو تین حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ یا ہر اس عقیدہ کا ابطال جس کی رو سے کسی انسان یا کسی قوت کو خدائی کاروبار میں شریک سمجھا جائے۔ ابنیتِ مسیح اور وحدت الوجود جیسے عقائد بھی اسی کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

جُزْءُ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، الگ الگ کر دینا ہیں۔ اَلْجُزْءُ کسی چیز کے حصہ اور ٹکڑے کو کہتے ہیں خواہ وہ اپنے کل سے ملا ہوا ہو یا اس سے الگ کر لیا گیا ہو، یہ ضروری نہیں کہ جُزْءُ کے لئے کل کے ہر فرد کو بھی توڑا یا کاٹا جائے۔ عوسکتا ہے کہ بہت سے فرد مل کر ایک کل کے جُزْء بنیں۔ مثلاً سورۃ الحج میں ہے کہ لِّکُلِّ بَابٍ مِنْہُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵)۔ یعنی ان (جہنم میں داخل ہونے والے انسانوں) میں سے، ہر دروازہ کیلئے، ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ مطلب



نہیں کہ ان انسانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کا ایک ایک حصہ الگ کر لیا گیا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کا ایک ایک گروہ الگ کر لیا گیا ہے۔ اس سے سورۃ بقرہ کی اس آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا ہے کہ چار پرندوں کو اچھی طرح سداھا کر اور اپنی طرف مائل کر کے۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً (۲۶۰) پھر انہیں الگ الگ کر لو اور ایک ایک پرندہ کو الگ الگ پہاڑیوں میں چھوڑ دو۔ پھر انہیں آواز دو تو وہ اڑنے ہوئے تمہاری طرف آجائیں گے۔ قرآن میں اعمال کے نتیجہ کیلئے جُزْءٌ کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی (ج۔زی) کے عنوان میں دیکھئے۔

## ج زع

جُزْءٌ\* - کے اصلی معنی رسی کو بیچ سے کاٹ دینا ہوتے ہیں\*۔ پھر اسکا استعمال ہر شے کو کاٹ دینے یا قطع کر دینے کے لئے ہونے لگا۔ جُزْءٌ اَلْاَرْضِ وَالْوَادِیَ - اسے زمین اور وادی کو قطع کر دیا\*۔ اصل میں جُزْءٌ اَلْوَادِیَ\*۔ وادی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں پہنچ کر وادی ختم ہو جاتی ہے یا سڑ جاتی ہے۔ اَلْجَزَارُوع\* اس شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے شہتیریاں آ آ کر اس پر مل جاتی ہیں۔ اس طرح وہ ان شہتیریوں (یا خود کمرے) کو دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے\*۔

اَلْجَزْعُ\* - صَبْرٌ کی ضد ہے۔ صَبْرٌ کہتے ہیں کسی معاملہ کی مسلسل پیروی کرنا۔ استقامت دکھانا (دیکھئے عنوان ص۔ب۔ر)۔ اور جب کسی معاملہ کو درمیان ہی میں چھوڑ دیا جائے۔ یعنی انسان اسکی پیروی سے اپنے آپکو منقطع کر لے۔ تو وہ اَلْجَزْعُ ہوگا۔ یعنی ہمت ہار دینا۔ استقامت چھوڑ دینا\*۔ سورۃ ابراہیم میں ہے اَجِزْ عَنِ الْمُؤْمِنِ صَبْرًا (۱۲۱)۔ خواہ ہم ہمت ہار دیں یا استقامت سے برداشت کریں۔

## ج زی

جَزَاءٌ\* - (نیز جَزَاۃً\*) کسی چیز کا بدلہ۔ جَزَاۃً کَذَا وہو عَلَیْہِ۔ اس نے اسے کسی بات پر ایسا بدلہ دیا\*\*۔ مُجَازَاۃً\*۔ ایک دوسرے کو بدلہ دینا۔ (ہام طور پر مُجَازَاۃً\* شرمیں استعمال ہوتا ہے اور

مُكَافَاةٌ خیر میں) \*\* ابن فارص نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسک چیز کا دوسری چیز کے قائم مقام عونا ہیں۔ یہ مفہوم ایک عظیم حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ جس چیز کو عام طور پر ”عمل کا بدلہ“ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہوتا ہے۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں یہ آپ کا عمل ہے۔ آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ اس عمل کا نتیجہ ہے۔ عمل تو فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجہ نے اس کی جگہ لے لی۔ اس سے جزا اور سزا کا قرآنی تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اس تصور کی رو سے نہ سزا خارجی طور پر (باہر سے) ملتی ہے۔ نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے۔ آپ نے کسی کو گالی دی۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا۔ گالی اور تھپڑ میں باہمی کوئی تعلق نہیں۔ یہ سزا خارج سے ملی ہے۔ لیکن آپ نے سنکھیا کھایا اور آپ کی سوت واقع ہو گئی۔ یہ چیز آپ کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یعنی عمل کی جانشین۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ هَلْ يَجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴۰)۔ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ ہر عمل کا نتیجہ اس عمل کی جگہ آ جاتا ہے۔ اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

جَزَى الشَّقِيَّ ”تَجْزِي“ کے معنے ہیں وہ چیز کافی ہو گئی۔ ابن فارص نے یہی اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں۔ مَا يَجْزِيْنِي هَذَا الثَّوْبُ۔ مجھے یہ کپڑا کافی نہیں ہوگا۔ هَذَا اَيْلٌ مَّجَازِي۔ یہ اونٹ بار برداری کے لئے مجھے کافی ہیں۔ \* يَتَوَمَّا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲۸)۔ ”جس دن کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی کسی دوسرے کے کسی جرم کا بدلہ نہیں بن سکیگا“۔ اس میں سے کچھ بھی اپنے سر نہیں لے سکیگا۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کافی نہیں ہو سکیگا۔ ابن فارص نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی دوسرے کی طرف سے کچھ ادا کر دینا۔

جِزْ يَّةٌ - (۲۹) وہ ٹیکس جو غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے بدلے میں لیا جائے۔ یعنی جو ان کی جان، مال، آبرو، معاہدہ وغیرہ کی حفاظت کے لئے کافی سمجھا جائے اور جس کی وجہ سے ان پر (جنگ وغیرہ میں شریک ہونے کی) ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔ یہ تھوڑا سامانی معاوضہ

ان تمام آسائشوں کے بدلے میں لیا جاتا ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں حاصل ہوتی ہیں اور جن کے ہم ہم پہنچانے کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوتی ہے۔

اسام الرمانی نے "لَجِزِيَّةً" کو "لَعَهْدٌ"۔ "الذِّمَّةُ"۔ "الْأَمَانُ"۔ "لِخَرَاجٍ" کا مرادف قرار دیا ہے \*\*\* لہذا اس کے معنی وہ معاہدہ ہونگے جس میں کسی سے کچھ خراج لیکر اسے امان کی ذمہ داری دی جائے۔

## ج س د

"لَجَسَدٌ" انسان کے جسم کو کہتے ہیں۔ دوسرے کھانے پینے والے اجسام کو "جَسَدٌ" نہیں کہتے۔ البتہ جو مخلوق کھاتی پیتی نہ ہو اور ذوی العقول میں سے ہو (ہربوں کے عقیدہ کے مطابق۔ مثلاً جنات اور ملائکہ) تو انکے اجسام کو بھی "جَسَدٌ" کہہ دیتے تھے\*۔ لیکن قرآن حکریم نے بنی اسرائیل کے بچھڑے کو بھی "جَسَدًا" (۱۶۸) کہا ہے۔ صاحب محیط (نیز ابن قاری) نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی کسی چیز کا مجتمع اور سخت ہونا ہوتے ہیں۔ لہذا "جَسَدٌ" ٹھوس اور مرکب جسم کو کہیں گے۔ گوسالہ، سامری کو "جَسَدٌ" کہنے کی یہ توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ وہ ٹھوس بھی تھا اور مختلف زیورات کو ڈھال کر مرکب بنایا گیا تھا۔ کلیات میں ہے کہ "جَسَدٌ" دراصل رنگدار جسم کو کہتے ہیں\*\*۔ سورة انبیاء میں انسانی اجسام کیلئے "جَسَدًا" کا لفظ آیا ہے (۲۸)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ "جَسَدًا" ایسے نہ تھے جو کھانے پیتے نہ ہوں۔ اور حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کو (جو جہانبانی کی اہلیت نہیں رکھتا تھا) "جَسَدًا" کہا ہے (۳۸)۔ یعنی محض گوشت کا لوتھڑا۔ بلکہ صرف "دَابَّةً" (۱۶۳)۔ تورات میں (حضرت سلیمانؑ) کے اس بیٹے (اجعام کے متعلق) ہے :-

"اور اجعام کی سلطنت کے پانچویں برس ایسا ہوا کہ مصر کے بادشاہ سبک نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس نے خداوند کا خزانہ اور بادشاہ کے گھر کا خزانہ لوٹ لیا۔ (نیز)۔۔۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اسوقت تو وہ اپنی بوساھی میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن اجعام کے عہد میں اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ

ملا کر اجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل کے مقابلے میں وہ بت خانے تعمیر کرائے جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔“  
(سلاطین ۱ - باب ۱۳ : ۱۲ : ۱۱)

حضرت سلیمانؑ کا یہی بیٹا (جانشین) ہے جسے قرآن کریم نے جیتے جاگتے انسان کے بجائے ”جسد“، - محض گوشت پوست کا مرکب کہہ کر اسکی نا اہلی کیطرف اشارہ کیا ہے۔ آیت (۳۸/۳۳) سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو اپنی زندگی ہی میں اس کا احساس تھا اور انہوں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مملکت تخریبی اثرات سے محفوظ رہے۔

## ج س س

جَسَّ کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور اسطرح نبض دیکھ کر تشخیص کرنا کہ وہ تندرست ہے یا بیمار۔ یہ لفظ حَسَّ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ حَسَّ ان چیزوں کے معلوم کرنے کو کہتے ہیں جن کا ادراک احساس کرسکیے۔ اَلْحَسَّ - خبریں اور اندرونی حالات تلاش کرنا اور ان کی کرید کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ تَجَسَّسٌ (جیم کے ساتھ) اور تَحَسَّسٌ (حاء کے ساتھ) ایک ہی معنی میں آتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ تَجَسَّسٌ کسی دوسرے کیلئے خبریں تلاش کرنا ہوتا ہے (اسی سے جاسوسؑ ہے) اور تَحَسَّسٌ خود اپنے لئے ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تَجَسَّسٌ کے معنی چھپی ہوئی باتوں کی کرید کرنا ہوتا ہے اور تَحَسَّسٌ سے مفہوم چھپ کر باتیں سننا\*۔ اَلْجاسوسُ بُرے راز ناں کو کہتے ہیں اور اَلنَّاموسُ اور اَلْحاسوسُ اچھے رازداں کو\*\*۔

قرآن میں ہے لَا تَجَسَّسُوا (۲۴/۲۴) پوشیدہ باتوں کی خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ یعنی کسی کے ایسے اندرونی اور نجی حالات جنہیں وہ راز میں رکھنا چاہتا ہے اور اس سے اجتماعی فساد کا کوئی امکان نہیں، اپنے ذاتی غرض سے انہیں معلوم کرنے میں دلچسپی نہ لو۔ خواہ مخواہ اپنے قیمتی وقت کو ایسے فضول، لا یعنی کاموں میں خرچ نہ کرو۔ مندرجہ بالا معانی کے اعتبار سے اس میں ارادے کی برائی بھی شامل ہے۔ یعنی بری نیت سے (شرانگیز مقصد کیلئے) ایسا کرنا معیوب ہے۔ حکومت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ باشندگان ملک اور بیرونی دشمنوں کے اندرونی حالات تک سے باخبر ہو۔ یہ چیز اس تحسس میں نہیں آئیگی جس سے قرآن نے منع کیا ہے۔

## ج س م

الْجِسْمُ\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے جمع ہو جانے کے ہیں - بدن (کی مجموعی شکل) - اعضاء بدن\* - تَعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ\* (۱۳۳) یعنی انکی جسمانی ہیئت اور ڈیل ڈول - سورۃ بقرہ میں یہ لفظ جسمانی توانائی کیلئے بھی آیا ہے (۲۴۷) جہاں کہا گیا ہے کہ فوج کی کمان اسے دی جاسکتی ہے جس کا علم بھی زیادہ ہو اور جسمانی توانائی بھی، اور اس سے دوسرے بھی مستفید ہوئے ہوں - غور کیجئے، قرآن نے علم کے ساتھ جسمانی توانائی کی اہمیت کو کس انداز سے اجاگر کیا ہے - جو فرد یا قوم جسمانی طور پر (Physically) کمزور ہو جائے اس کا علم زیادہ نفع رساں اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا - جسمانی قوت میں ہر قسم کی طبیعی قوت (Physical Force) آجاتی ہے - اس میں شبہ نہیں کہ مقصود حیات، انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما ہے لیکن زندگی کی موجودہ سطح پر یہ نشو و نما جسم کے بغیر نہیں ہو سکتی - اس کے لئے جسم کی پرورش ایسے ہی ضروری ہے جسطرح انڈے میں بچہ بننے کے لئے انڈے کے خول کا صحیح و سالم ہونا ضروری ہے - قرآنی نظام میں جسم اور ذات دونوں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچتا ہے -

## ج ع ل

جَعَلَ\* کے بہت سے معنی آتے ہیں اور راغب کے قول کے مطابق یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے بولا جاسکتا ہے - نِزَّ جَعَلَ (اسنے کیا) اور صَنَعَ (اس نے بنایا) وغیرہ کی نسبت جَعَلَ بہت زیادہ وسیع المعنی ہے\*\* - مثلاً قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْنِي نَبِيًّا (۱۱۰) "اسنے مجھے نبی بنا دیا"، یہاں اسکے معنی خَلَقَ اور صَنَعَ سے بالکل الگ ہیں - لیکن جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ (۱۰) "اللہ نے تاریکی اور روشنی کو بنایا"، میں جَعَلَ کے معنی تَخْلِيقَ و اِیْجَادَ کے ہیں - اگرچہ یہاں بھی پہلے خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ کہا ہے اور پھر جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ - اسی طرح وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ - (۱۵) "اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا"، اور جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۱۶) - "خدا نے تمہارے لئے سمع و بصر اور قلب بنائے"، میں

بھی جمع کے بھی معنی ہیں۔ اس کے بعد فی آنے سے اس کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً يَجْمَعُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي الْاِذَانِهِمْ (۱۶)۔ ”وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں“۔ نیز وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الْكَافِرِينَ أَتَقَبُّوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً (۵۷) ”ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس (حضرت عیسیٰ) کی پیغمبری کا اتباع کیا نرسي اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے“۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، سیاق و سباق کے مطابق اس کے معنی کئے جائیں گے۔ ہر مقام پر ایک ہی معنی نہیں ہونگے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ لفظ (انگریزی کے (To Make) کی طرح) وسیع المعنی ہے۔ جعل کے دیگر معانی کے لئے دیکھئے تترتہ ص ۱۸۳ جلد چہارم۔

## ج ف ن

الْجَفْنُ - غلافِ چشم۔ پیوٹا (اوپر اور نیچے کا)۔ تلوار کا نیام۔ الْجَفْنَتُ - چھوٹا کنواں۔ بڑا پیالہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہو۔ اس کی جمع جَفَنَاتُ آتی ہے\* (۳۳)۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ پہناڑی علاقہ کے لوگ (جن) جنہیں حضرت سلیمان نے کام میں لگایا تھا، ان کے لئے علاوہ دیگر اشیاء کے، بڑے بڑے لگن بناتے تھے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہر اس چیز کے ہیں جو کسی دوسری چیز کو محیط ہو۔ یعنی اسے اپنے گھیرے میں لے لے۔

## ج ف و (جفا)

جَفَا - جَفَاءً - تَجَافَى - وہ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہا، جیسے زین جو گھوڑے کی پشت پر قائم نہ رہے۔ اجْتَفَيْتُهُ - میں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔ جَفَا مَالَهُ - وہ اپنے اونٹوں سے جدا ہو گیا۔ الْجَفَاءُ - ہانڈی کا میل کچیل جو اہمال آنے سے ادھر ادھر گز جائے۔ کہتے ہیں اَجْفَتَ الْقَيْدُ رَبْدًا هَا - ہانڈی نے اپنا اہمال پھینک دیا\*\*۔ اس معنی میں راغب نے اَجْفَنَاتِ الْقَيْدُ بھی لکھا ہے\*\*\*۔ اسی سے وادی کے دونوں کناروں پر رہ جانے والا کوڑا کرکٹ، نیز بیکاروہے نائندہ اور باطل شے کو جَفَاءً کہتے ہیں\*\*۔ سورۃ رعد میں ہے فَاَمَّا الْقَزِيدُ فَيَذْهَبُ جَفَاءً (۱۳)۔ ”سو جھاگ بالکل رائگن جاتا ہے“۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے ہیں جَفَتِ الْاَرْضُ وَ اَجْفَتِ - زمین بے خیر اور بے برکت ہو گئی۔ بالکل بے کار ہو گئی\*\*۔

(راغب نے کہا ہے کہ یہ تمام الفاظ واوی ہیں۔ مہموز نہیں) \*  
قرآن میں ”نومنین“ کے متعلق ہے ”تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنْ الْمَضَاجِعِ“  
(۳۲/۱۶)۔ ”ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں“۔ خداوندی پروگرام  
کی تکمیل میں ان پر راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

## ج ل ب

جَلْبَنَةٌ - ”جَلْبَنَةٌ“ اس نے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف  
ہانکا۔ ”ہرائے تجارت مال وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا۔“ \*  
وہ لوگ جو اونٹ بکریاں وغیرہ فروخت کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ  
لے جاتے ہیں۔ نیز خود ان اونٹ بکریوں کو بھی جَلْبَنٌ اور جَلْبَنَةٌ  
کہتے ہیں۔ عَبْدٌ جَلْبَنٌ۔ وہ غلام جو کسی دوسرے شہر سے لایا گیا  
ہو۔ ”آلِ جَلْبَنَةٍ“۔ زمانہ کی سختی۔ بھوک کی شدت۔ مشقت۔ اسی سے ”آلِ جَلْبَنٍ“  
کے معنی ہیں کسی پر ظلم اور سختی کرنا۔ جَلْبَنٌ عَلَيْنَا۔ اس نے اس پر  
ظلم کیا۔ ”آلِ جَلْبَنٍ“ ”لِقَوْمٍ“ عَلَيْنَا۔ قوم اس کے خلاف جمع ہو گئی۔  
”آلِ جَلْبَنٍ“ ”لِقَوْمٍ“۔ لوگ ہر طرف سے جنگ کے لئے جمع ہو گئے۔ انہی معنوں  
میں قرآن کریم میں ہے ”وَآلِ جَلْبَنٍ عَلَيْنَهُمْ“ (۱۶/۱۶)۔ ”تو ان کے خلاف  
اپنے تمام لشکر جمع کر لا“۔ ان پر چڑھ دوڑ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دوسرے بنیادی معنی کسی ایسی چیز  
کے ہیں جو دوسری چیز کو ڈھانپ لے۔ اس اعتبار سے ”آلِ جَلْبَنَابٍ“۔ اوڑھتی  
سے بڑا اور چادر سے چھوٹا کپڑا ہوتا ہے جس سے عورتیں اپنے سر اور سینے  
کو چھپاتی ہیں۔ \*۔ قرآن میں ہے ”يُؤَدُّنَّ لِيُنَّ عَلَيْنَهُنَّ“ ”مِنْ“ ”جَلَا بِيَسِيَهُنَّ“  
(۳۳/۵۹)۔ ”اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں“۔ انصار کی عورتیں سیاہ  
ملبوس (اور کوٹ کی طرح) اوپر سے پہنتی تھیں۔ اسے بھی جَلْبَنَابٌ کہتے  
تھے۔ لہذا اس سے مراد اپسا کپڑا یا لباس ہے جو اوپر سے اوڑھ یا پہن  
لیا جائے تاکہ اس سے زینت کی چیزیں نمایاں نہ ہوں۔ ابن فارس نے یہ بھی  
کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جَلْبَنَابٌ یا اسی قسم کے دیگر کشادہ لباسوں  
سے (بطور محاورہ) وقار اور سکون مراد لیا جاتا ہے۔

## ج ل د

”آلِ جَلْدٍ“ (”وَآلِ جَلْدٍ“)۔ ہر جاندار کی کھال (۱۱/۱۱) اس کی جمع جُلُودٌ  
اور ”آلِ جَلْدٍ“ ہے۔ ”آلِ جَلْدٍ“ سے کنایہ ”عضو تناسل“ بھی مراد لیا جاتا ہے۔

\* تاج۔ \* تاج و محیط و راغب۔ \* محیط۔

أَجْلًا ذُو الْأُتْسَانِ سے مراد آدمی کا پورا ڈھانچہ اور جسم ہے جس پر کھال ہوتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت اور صلابت (سختی) کے ہوتے ہیں۔ فَلَانٌ عَظِيمٌ "الْأَجْلَادُ"۔ وہ قوی اعضا اور مضبوط جسم والا ہے۔ يَا مَا أَشْبَهَ أَجْلَادَهُ يَا أَجْلَادُ آبِيهِ۔ اس کا جسم اور ناک نقشہ، چہرہ، بشرہ اور ذیل ڈول اپنے باپ سے کس قدر مشابہ ہے۔ \* أَلْجَلْدُ (بچہ کی) بھس بھری ہوئی کھال (جو اونٹنی وغیرہ کے سامنے دودھ اتارنے کے لئے رکھ دی جائے)۔ أَلْجَلْدُ۔ شدت اور قوت۔ استقامت اور سختی۔ \* صاحب محیط نے اس کے معنی آسمان، کمرہ، ہوائی، اور اس پانی کے کٹے ہیں جو اوپر سے گر کر زمین پر جم جائے۔ راغب نے کہا ہے کہ جس طرح قُلُوبٌ سے مراد نفوس ہوتے ہیں اسی طرح جُلُودٌ سے مراد اجسام ہوتے ہیں۔ \*\*۔

أَلْجَلْدُ۔ چمڑے کا ٹکڑہ جسے نوحہ کرنے والیاں اپنے چہرے پر مارا کرتی تھیں۔ جَلْدٌ يَجْلِدُ۔ کوڑوں سے مارنا \*۔ (۲۴)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں (۱) چمڑے سے مارنا اور (۲) چمڑی پر مارنا۔ جَلْدُهُ عَلَى الْأَمْرِ۔ اسے اس بات پر مجبور کر دیا \*۔

سورة نسا میں ہے كُنْتُمْ مَنَاصِيحَتٌ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ (۵۶)۔ اس کے لفظی معنی ہیں "جب ان کی جلود (کھالیں) پسک جائیں گی تو ہم ان کی جگہ انہیں اور جلود (کھالیں) دیدہ بنگے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان مخالفین پر ذلت و رسوائیوں کا عذاب پیہم اور مسلسل آتا رہیگا۔ جب ایک دفعہ کی شکست سے ان کی قوت ٹوٹ جائیگی تو یہ پھر مقابلہ کے لئے اٹھیں گے۔ اور پھر شکست اور ناکامی کی ذلت کا سزہ چکھیں گے۔ اس طرح پیہم شکستوں اور متواتر ناکامیوں سے ان کی سختی اور صلابت ٹوٹے گی۔ بدر کی جنگ سے فتح مکہ تک پیہم شکستوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر آخر الامر ان مخالفین کی شدت و صلابت ختم ہوئی۔

سورة حم سجدہ میں سمع و بصر کے ساتھ جُلُودٌ کی شہادت کا ذکر آیا ہے (۲۲-۲۳)۔ یعنی مجرمین کی سماعت، بصارت اور سارا جسم ان کے اعمال کی شہادت دینگے۔ وہ خود اپنے اعمال کی شہادت کے مجسمے ہونگے۔ ہر عمل کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس لئے انسانی اعمال کی بنیادی



شاہد خود انسان کی ذات ہوتی ہے خواہ عقل حیلہ جو ان کے جواز میں کتنی دلیلیں کیوں نہ تراشے۔ بَلْ اَلْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖٓ بَصِيْرٌ\*۔ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِ بَرٍّ\* (۱۵-۱۶)۔ ”انسان اپنی ذات کے خلاف خود دلیل ہے۔ خواہ (ویسے) وہ (اپنے اعمال کی مدافعت میں) کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے،۔ یہی ”سمع و بصر و جلود“ کی شہادت ہے۔ ظہور نتائج کا وقت بھی کیسا عبرت انگیز اور دلدوز ہوتا ہے جب انسان کا کوئی خفیہ سے خفیہ عمل بھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال تک بھی نہیں۔

## ج ل س

جَلَسَ - يَجْلِسُ\* - جَلُوسًا - مَجْلِسًا - بیٹھنا - جُلُوسٌ\*۔ اس شخص کیلئے آتا ہے جو لیٹا ہو اور اس کے بعد اٹھ بیٹھے۔ اور قُعُوْدٌ\*۔ اس شخص کیلئے آتا ہے جو کھڑا ہو اور اس کے بعد بیٹھ جائے۔ اَلْجَلْسُ\*۔ دراصل سخت اور بلند زمین کو کہتے ہیں۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ بیٹھنے کیلئے یہ لفظ اسلئے استعمال ہوتا ہے کہ اس میں انسان اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھتا ہے\* لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں اور چونکہ لیٹا ہوا آدمی جب اٹھتا ہے تو وہ بلند ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں مَجَالِسُ\* کا لفظ (۵۸/۱۱) میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ مقامات جہاں لوگ جمع ہو کر بیٹھیں۔

## ج ل ل

جَلَّ الرَّجُلُ\* يَجِلُّ\* جَلَالَةً\* وَ جَلَالًا\*۔ سن رسیدہ اور معمر ہو جانا۔ قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا عظیم المرتبت یا جلیل القدر ہونا جَلِيلٌ\* کہلائیگا۔ جَلَّ الشَّيْءُ\*۔ چیز کا بڑا حصہ۔ اَلْجَلَالُ\*۔ اس عظیم اَلْجَلُّ\* وہ کپڑا جو حفاظت کیلئے چوپایہ پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اَلْجَلِيلُ\*۔ بڑا آدمی۔ اونٹ کو بھی کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دَقِيقٌ\* بکری کو کہتے ہیں۔\*\* صاحب محیط کے نزدیک اصل معنی اس مادہ میں گول اور بلند ہونے کے ہیں\*\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ جلال میں جلالت سے زیادہ کمال پایا جاتا ہے۔

\* تاج - محیط - راغب - \*\* تاج و راغب - \*\*\* محیط -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کیلئے ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵) آیا ہے۔ یعنی عظمت و جلالت کا مالک۔ (اِکْرَام کے لئے مادہ ک۔ ر۔ م دیکھئے)۔

## ج ل و

الْجَلَاءُ\*۔ منتشر کر دینا۔ علیحدہ اور الگ الگ کر دینا۔ جلا وطن کر دینا (۵۹)۔ جَلَا فُلَانًا اِلَّا مَرًّا۔ اس نے فُلَان کیلئے معاملہ کو کھول دیا۔ واضح کر دیا۔ ظاہر کر دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ وَالشَّهَارُ اِذَا جَلَّ شَهَا (۶۱)۔ یعنی اِذَا جَلَّ الشَّظِیْمَةُ۔ دن، جب وہ تاریکی کو دور کر کے ہر چیز کو واضح اور نمایاں کر دیتا ہے\*۔

الْجَبَلُ\*۔ واضح امر۔ خفی کی ضد ہے۔ الْجَلَاءُ\*۔ واضح امر۔

الْجِلْوَةُ\*۔ وہ چیز جو دولہا کی طرف سے دلہن (عروس) کو منہ دکھائی میں دی جائے\*۔ فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ (۶۳) ”جب اس کا رب پہاڑ پر جلوہ بار ہوا“۔ جَلْوُ کے اصل معنی ظاہر طور پر کھول دینے کے آتے ہیں\*\*۔

## ج م ح

جَمَعَ الْفَرَسُ\*۔ گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اس طرح کہ وہ سوار کے قابو میں نہ رہے اور سر کو اونچا کئے اس طرح دوڑتا جائے کہ سوار اس کی گردن کو موڑ نہ سکے\*\*\*۔ وَهُمْ يَجْمَعُونَ (۶۸) وہ بے قابو ہو کر دوڑے جا رہے ہیں۔ قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کر رہے ہیں۔ الْجُمُاعُ\*۔ جنگ میں شکست کھا کر بھاگنے والے کہ جنہیں پھر میدان میں لانا ممکن نہ ہو۔ جَمَعَتِ الْمَرْأَةُ مِیْنَ زَوْجِیْهَا۔ عورت اپنے خاوند سے ناراض ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی، بغیر اس کے کہ شوہر نے اسے طلاق دی ہو۔ جَمَعَ\*۔ مرد کے عضو مخصوص کو کہتے ہیں۔ اور الْجَمْعُ وَح\*۔ اس شخص کو جو بے قابو ہو کر اپنے جذبات کے تابع چلے اور اسے اس سے باز رکھنا ممکن نہ ہو\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا قوت اور غلبہ کے ساتھ آگے بڑھتے جانا۔ اس کے بعد اس کے معنی عام طور پر دوڑنے یا دوڑ جانے کے ہو گئے۔

\*تاج۔ \*\*راغب۔ \*\*\*تاج و محیط۔ راغب۔

## ج م د

جَمَدُ الثَّمَاءِ - پانی جم گیا۔ کھڑا ہو گیا۔ اَلْجَمَدُ - برف۔ جما ہوا پانی۔  
 اَلْجَمَادُ - سست رفتار اونٹنی جسکا دودھ نہ رہا ہو۔ جَمَادُ الْكَفِّ -  
 بخیل آدمی۔ عِثْنُ جَمُودٌ - وہ آنکھ جس سے آنسو نہ بہیں \*۔ اَلْجَمَادُ - زمین۔  
 ہر وہ چیز جو نشوونما نہ پاتی ہو۔ جو نامی نہو (Inorganic)۔ جمادی۔  
 جَمَادِی الْاُولٰی اور جَمَادِی الْاٰخِرَةُ - ربیع الثانی کے بعد دونوں  
 مہینوں کو کہتے ہیں۔ جس زمانے میں انکے یہ نام رکھے گئے تھے یہ  
 مہینے سخت سردی میں آتے تھے (اب چونکہ حساب قمری ہے اسلئے یہ ضروری  
 نہیں رہا کہ ہر مہینہ، ہر سال اسی موسم میں آئے) \*۔

قرآن کریم میں پہاڑوں (یا قوم کے سرداروں) کے متعلق ہے۔  
 تَحْسِبُہَا جَمَادَةً (۲۸۸) "تو انہیں جما ہوا سمجھتا ہے"۔

## ج م ع

اَلْجَمْعُ - متفرق چیزوں کو اکٹھا کر دینا۔ راغب نے کہا ہے،  
 چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ سرخ رنگ کے ایک گوند  
 کو بھی کہتے ہیں۔ نیز لوگوں کے گروہ کو بھی۔ اَلْجَمِيعُ - لشکر۔ مجتمع  
 قبیلہ۔ اَلْجُمُعَاتُ - ہر چیز جس کے اجزاء باہم ملے ہوئے اور مجتمع ہوں۔  
 مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ نیز کسی چیز کی جڑ کے  
 جمع ہونے کی جگہ۔ جَمْعُ الْكَفِّ - بندھی ہوئی مٹھی \*۔

اَجْمَعُ - (مذکر) جَمْعَاءُ (مؤنث)۔ اَجْمَعُوْنَ (جمع مذکر)  
 جَمْعُ (جمع مؤنث) یہ الفاظ محض تاکید کے لئے آتے ہیں \*۔  
 یعنی جب ہم کہیں گے اَجْمَعُوْنَ - "سب لوگ"، تو اس سے لازماً  
 یہ مراد نہیں ہوگی کہ کوئی ایک شخص بھی باقی نہیں رہا۔ مقصد  
 اکثریت ہوگا۔ اَجْمَعْتُ الْاَمْرَ - میں نے اس امر کا پختہ ارادہ کر لیا  
 (۱/۱۰)۔ (اس کے بعد عَمَّیْہ بھی آ جاتا ہے)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس  
 میں کسی بات پر غور و فکر کے بعد ارادہ کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اَمْرٌ  
 جَامِعٌ - عظیم الشان کام جس کے لئے لوگ جمع ہو جائیں۔ یَوْمُ الْجُمُعَةِ -  
 اسلام سے پہلے قریش، ہفتہ میں ایک دن، جسے وہ یَوْمُ الْاَسْوَدِ کہتے تھے،  
 دارقطنی کے پاس دارالندوہ (اپنے قومی دارالمشاوَرَت) میں

جمع ہوا کرتے تھے۔ کعب بن لؤیؓ نے اس دن کا نام یومؓ الجمعۃ رکھ دیا۔ اسی حیثیت سے اَلْمُجْتَمِعُ، قُصَصِی بن کلاب کا لقب ہے جس نے دارالندوہ بنایا تھا\*۔ اس سے جمعہ کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی مشورہ کے لئے اکٹھا ہونا۔ قرآن کریم میں ہے کہ جماعت مومنین کا شیوہ یہ ہے اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۳۸) ”وہ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں“۔ صلوٰۃ کے اجتماعات میں خدا کے حضور جھکنا اور سجدہ ریز ہونا اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اور اسی مقصد کے لئے ہماری مشاورت ہوگی۔ محیط میں ہے کہ اَلْمُجْتَمِعَةُ، اِجْتِمَاعٌ سے ماخوذ ہے جس طرح اَلْفُرْقَةُ، اِفْتِرَاقٌ سے ماخوذ ہے\*\*۔

قرآن کریم میں جَمِيعًا بمقابلہ اَشْتَاتًا (۲۶) آیا ہے جس سے اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ (اَشْتَاتًا کے معنی ہیں الگ الگ) سورة النساء میں جَمِيعًا بمقابلہ ثَبَاتٍ (۲)۔ آیا ہے جہاں اس کے معنی ہیں ایک پورا لشکر بنا کر۔ (ثَبَاتٍ کے لئے دیکھئے۔ ث۔ ب۔ ی)۔

اَجْمَعِيْن کا لفظ قرآن کریم میں بکثرت آیا ہے (مثلاً ۱۶۱)۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس سے مفہوم محض تاکید ہوتی ہے نہ کہ یہ کہنا کہ اس سے کوئی ایک فرد بھی باہر نہیں رہا۔

## ج م ل

اَلْجَمَلُ۔ اَلْجَمَلُ۔ نر اونٹ۔ اس کی جمع جِمَالَةٌ آتی ہے (۳۴)۔ جَمَالٌ۔ خوبصورتی\*۔ (۱۶)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا ہونا اور خلقت میں بڑا ہونا اور (۲) خوبصورتی ہیں۔ عربوں کے نزدیک جَمَلٌ (اونٹ) سے بڑھ کر عظمت اور بلندی اور حسن و خوبصورتی اور کس چیز میں ہو سکتی تھی؟ یا خود ان کا جمال و حسن بھی اونٹوں کی وجہ سے ہوا کرتا تھا۔ جَمِیلٌ۔ خوبصورت انداز۔ عمدہ چیز\*۔ فَصْبُرٌ جَمِیلٌ (۱۲) حسن کا رانہ انداز سے صدمہ کو برداشت کرنا اور استقامت کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

الْجُمْلُ - الْجُمْلُ - الْجُمْلُ - الْجُمْلُ - الْجُمْلُ - کشتی کا موٹا  
 رسہ \*۔ قرآن کریم میں ہے حَتَّىٰ يَلِجَ الْجُمْلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (ج)۔  
 ”حتیٰ کہ جہاز کا رسہ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے“۔ الْجُمْلَةُ -  
 چیز کا مجموعہ \*۔ یہیں سے الْجُمْلُ بھی بہت سی چیزوں کے مجموعہ کو  
 کہتے ہیں۔ یعنی جس کی چیزیں الگ (منفصل) نہ کی گئی ہوں \*۔ قرآن کریم  
 میں جُمْلَةٌ وَاحِدَةٌ (۲۵/۲۵) آیا ہے۔ یعنی سارے کا سارا ایک ہی بار۔  
 (مجمل اور مفصل کے لئے دیکھئے عنوان ف۔ ص۔ ل)۔

## ج م م

الْجَمَّ - ہر چیز کی کثرت - مَالٌ جَمٌّ - بہت زیادہ مال - جُمَّةٌ  
 الماء - زیادہ مقدار میں پانی کے جمع ہونے کی جگہ \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ  
 اس کے بنیادی معنی کثرت اور اجتماع کے ہیں - جَمَّتِ الْبَيْتُ - کنوین  
 میں پانی (نکلے جانے کے بعد) لوٹ آیا اور کثیر اور مجتمع ہو گیا - الْجَمَمُ -  
 پیمانہ کو کناروں تک (لبالب) بھر دینے کے بعد جو کچھ اس کے اوپر ہو \*۔  
 الْجَمَامَةُ - راحت - سیری - جَمًّا غَفِيرًا - سب کے سب، لوگوں کی  
 بہت بڑی تعداد جس میں چھوٹے بڑے، ادنے اور اعلیٰ سب شامل ہوں \*\*\*\*۔  
 قرآن میں ہے وَ تَحْيَوْنَ أَمْوَالَكُمْ حَبًا حَبًّا (۴/۴) - تم بڑی شدت  
 سے دولت سے محبت رکھتے ہو - تم چاہتے ہو کہ جس طرح گڑھے میں ارد گرد  
 کا پانی جمع ہو جاتا ہے \*\*\* اسی طرح سب کی دولت، وہ تھوڑی ہو یا زیادہ،  
 سمٹ سمٹا کر تمہاری طرف آجائے۔ نظام سرمایہ داری میں ہوتا ہی یہ ہے کہ  
 دولت سمٹ سمٹا کر چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ قرآن اس نظام کو  
 مٹانے کے لئے آیا تھا۔

## ج ن ب

الْجَنَبُ - پہلو \*۔ اسکی جمع جُنُوبٌ ہے - (۱۹/۱۹) - الصَّاحِبُ  
 بِالْجَنْبِ (۲۶/۲۶) - ساتھی، رفیق - الْجَارُ الْجَنْبِ (۲۶/۲۶) - ایسا ہمسایہ  
 جو رشتہ دار نہ ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے الْجَارُ ذِی الْقُرْبَىٰ آیا ہے۔  
 کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی الْغَرَبُ ہے۔ یعنی اجنبی کے دئے ہیں۔ سورۃ  
 الزمر میں ہے مَا فَرَّقْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ (۳۹/۳۹) - ”یعنی خدا کے (حقوق  
 ادا کرنے کے) بارے میں جو کوتاہی کی“ - زجاج نے کہا ہے کہ اسکی

معنی اللہ کے اس راستہ کے ہیں جسکی طرف اسنے مجھے دعوت دی\*۔ سورۃ سائدہ میں ہے وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا (۳)۔ اسکے معنی حالت جنابت کے ہیں۔ (ہم آغوشی کی رعایت سے)۔ جُنُوبَہ\*۔ دوسروں سے الگ رہنا۔ جُنُوبَہ\*۔ وہ چیز جس سے کوئی دور رہے\*\*\*۔

جُنُوبَہ\*۔ جُنَانِبَہ\*۔ اسے دور کر دیا۔ جُنُوبَہ\*۔ اجْنُوبَہ\*۔ اسے ہٹا دیا۔ رَجُلٌ جَنْبٌ\*۔ کنارہ کش، اجنبی نیز وہ شخص جو بخل کی وجہ سے عام راستہ سے ہٹ کر رہتا ہو تاکہ مہمانی نہ کرنا پڑے\*۔ سَيَجْنُبُہَا (۱۴)۔ يَتَجَنَّبُہَا (۱۱)۔ اجْتَنَّبَ (۳۹)۔ یہ سب الفاظ انہی معانی میں آئے ہیں۔ یعنی دور رکھنا۔ یا دور رہنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) کنارہ اور (۲) دوری کے ہیں۔ جَانِبٌ الْبَيْتِ (۱۸)۔ خشکی کا قطعہ۔ الْجَنْابُ\*۔ گھر کے سامنے کھلے ہوئے میدان کو کہتے ہیں\*۔ نیز کسی کے آنرنے یا ٹھہرنے کی جگہ کو\*\*\*۔

سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی ماں نے بچہ کو (صندوق میں رکھ کر) دریا میں بہا دیا تو بیٹی سے کہا کہ وہ صندوق کے پیچھے پیچھے جائے فَيَتَصَرَّتْ بِہِ عَنْ جَنْبٍ وَہُمُ لَا يَشْعُرُونَ (۲۸)۔ اس مادہ کے جو معانی اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ان کے پیش نظر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ (۱) وہ اسے دور سے دیکھتی رہی اور (فرعون کے) لوگوں نے اسے محسوس نہ کیا کہ وہ اسکا پیچھا کر رہی ہے۔ یا

(۲) وہ اسے کچھ اجنبی سا ہنس کر دیکھتی رہی تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اسکی تاک میں ہے۔

## ج ن ح

الْجَنَاحُ\*۔ (جمع اجْنِحَۃ\*) ہاتھ۔ بازو۔ پرندے کا بازو۔ بغل۔ پہلو۔ نیز اسکا اطلاق خود نفس شے پر بھی عوتا ہے\*\*\*۔

أَنَا فِي جَنَاحِہِ\*۔ میں اس کے۔ ائے اور حفاظت میں ہوں\*۔ اس قسم کی حفاظت جیسے مرغی اپنے بچوں کو خطرہ کے وقت اپنے پیروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ جَنَاحَ الْیَمِہِ\*۔ وہ اسکی طرف مائل ہو گیا۔ جھک گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھکنے کے ہیں۔ اس سے الْجَنَاحُ\* کے معنی ہیں گناہ کی طرف میلان\*۔ لیکن محیط میں ہے کہ یہ لفظ گناہ کا معرب ہے\*\*۔ یہ لفظ مضائقہ یا حرج کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے\*۔

جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ مخالفین سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی تنظیم کریں۔ (۱۵۰/۱)۔ تو اس کیلئے ان الفاظ میں تاکید کی گئی کہ **وَ خَفِضْ جَنَاحَكَ لِلْعَمَلِ مِثْلِينَ** (۱۵۰/۸) ”اپنی جماعت کے افراد کے لئے اپنا بازو جھکا دے“۔ انہیں اپنے ہروں کے نیچے ایسے سمیٹ لے جس طرح مرغی اپنے نوزائیدہ بچوں کو اپنے ہروں کے نیچے لے لیتی ہے۔۔۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کے ساتھ کشمکش میں گھبرانے نہیں۔ اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا۔ **وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الْقُرْهَبِ** (۲۸/۲۸) خوف کے وقت پھڑپھڑانا نہیں بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا، حواس قائم رکھنا۔ یا اپنے افراد جماعت کی حفاظت کرنا، انکی تنظیم کرنا۔ یہ سب معانی اسمیں آجاتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ماں باپ کی پرورش و حفاظت کی تاکید کیلئے بھی کہا گیا ہے کہ **وَ خَفِضْ لَهَا جَنَاحَ الْإِنْدَلِ** (۱۷۶/۱)۔ نرمی اور رحمت سے اپنے بازو کو انکی طرف اور جھکا دو۔ انکی حفاظت اور خدمت نہایت نرم روی سے کرو کیونکہ وہ معذور ہو چکے ہیں۔

سورۃ فاطر میں ملائکہ کے متعلق کہا ہے **أُولَئِكَ أَجْنِحَةُ** (۳۵/۱)۔ اس کے لفظی معنی ہیں بازوؤں (ہروں) والے۔ چونکہ بازو یا پر وہ سہارا ہیں جن سے پرندے فضا میں اڑتے ہیں اس لئے مجازی طور پر **أُولَئِكَ أَجْنِحَةُ** کے معنی عوئلکے مختلف خواص کی مالک کائناتی قوتیں۔

گناہ، حرج یا مضائقہ کے معنوں میں **جُنَاحٌ** کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً **لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا** (۲۵۸/۱)۔ ان پہاڑیوں (صفا اور مروہ) میں چلنے پھرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، یا زیادتی نہیں۔ کیونکہ ابن فارس نے اس کے دوسرے بنیادی معنی ”زیادتی“، لکھے ہیں۔

## ج ن د

**الْجُنْدُ**۔ سخت زمین۔ پتھر جو مٹی سے مشابہ ہوں۔ **جُنْدٌ**۔ جمع عوجانیوالے لوگ (یا اشیاء)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور مدد کرنے کے ہیں۔ غلظت اور سختی کی وجہ سے لشکر کو **الْجُنْدُ** کہتے ہیں۔ (اسکی جمع **جُنُودٌ** آتی ہے) اور جمع ہوجانے کے اعتبار سے ہر جماعت اور انصار کو **جُنْدٌ**۔ سورۃ مریم میں ہے **أَضْعَفُ جُنْدًا** (۱۹/۱) اس کے معنی ہیں جس کے رفقاء اور ساتھی، اعیان و انصار، جماعت

اور جتھے کمزور ہے۔ سورۃ فتح میں ہے **لِلّٰهِ جُنُودٌ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (۳۸)۔ ”ارض و سماء کے لشکر اللہ کے لئے ہیں“، اس سے مراد کائنات کی تمام اشیاء اور قوتیں ہیں۔ محیط میں ہے کہہ اسکے معنی ایک نوع کی مخلوق کے بھی ہیں۔ سورۃ بروج میں ہے **هَلْ اَتٰكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ** (۹۵)۔ ”کیا تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے۔“ یعنی بڑے بڑے لشکر اور قوت والوں کی داستان۔ (اس سے اگلی آیت میں فرعون اور ثمود کا ذکر ہے)۔

## ج ن ف

**اَلْجَنَفُ**۔ کسی ایک طرف جھک جانا۔ جانبداری۔ دل کا میلان۔ (یہ عدل کا راستہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف جھک جانے کے لئے آتا ہے)۔ **تَجَانَفَ عَيْنٌ** ”طیریتھیہ“۔ اپنے راستہ سے ایک طرف کو ہٹ گیا\*۔ قرآن کریم میں ہے **فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا (۱۸۴)**۔ ”جسے اسکا خدشہ ہو کہ وصیت کرنے والا کسی کی طرفداری کرے گا“، یعنی وہ انصاف سے ہٹ کر کسی ایک کو زیادہ دیدیگا۔ یاد رہے کہ **مُجَنِفٌ** اس کو کہہینگے جو حق و انصاف کو چھوڑ کر کسی کی طرفداری کرے\*۔

سورۃ مائدہ میں ہے **غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِآثِمٍ (۵)**۔ جو گناہ (آثم) کی طرف جھکنے والا نہ ہو۔

## ج ن ن

**جَنَنٌ** کے معنی ہیں چھپا لینا۔ یہی اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ راغب نے کہا ہے کہ **جَنَنٌ** کے معنی کسی چیز کو ماسہ (نگاہ) سے پوشیدہ کر دینا ہیں۔ **فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ اللَّیْلُ رَأٰی كَوْكَبًا (۲۱)** ”جب رات کی تاریکی نے اسے چھپا لیا تو اسنے ایک ستارہ دیکھا“۔ ویسے بھی ہر اس چیز کے لئے جو تم سے چھپ جائے **قَدْ جَنَّ عَنْكَ** کہتے ہیں۔ **جَنَنٌ** قبر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ مردہ کو چھپا لیتی ہے۔ اور خود میت اور اسکے کفن کو بھی۔ **جَنَنِ** جمع **اجَنَّة** (۵۳) اس بچہ کو کہتے ہیں جو ہنوز ماں کے پیٹ میں ہو۔ **جَنَنَةٌ**۔ اس ہتھیار کو کہتے ہیں جس سے آدمی اپنا بچاؤ کرے۔ ہر پردہ اور آڑ۔ **جَنَنَةٌ** اور **مِجَنَنَةٌ** ڈھال کو بھی کہتے ہیں\*۔ (۵۸)۔ **لَا جِنَّةَ بِيْهَذَا** ”لامیر کے معنی ہیں اس بات میں کوئی راز (پوشیدہ) نہیں۔ **جِنَنَةٌ** جنون



کو کہتے ہیں (۲۵)۔ دراصل عربوں کے ہاں مَجْنُونٌ کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے جِنُّ چمٹ گیا ہے\*۔

دور توہم پرستی میں تمام وہ قوتیں جو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتیں اور جن کے متعلق اس زمانے کے انسان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، دیوی دیوتا بن جاتی تھیں۔ انہی کو عرب (ان کے نگاہوں سے پوشیدہ ہونے کی بنا پر) جِنُّ کہتے تھے۔ وہ فرشتوں کو بھی جِنُّ کہا کرتے تھے، حالانکہ انکی پرستش بھی کرتے تھے۔ راعب نے کہا ہے کہ اَلْجِنُّ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک تو ان تمام مخفی قوتوں (روحانیات) کے لئے جو حواس سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے جِنُّ میں فرشتے بھی شامل ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان مخفی قوتوں (روحانیات) میں سے بعض کو جِنُّ کہتے ہیں، اس طرح کہ جو روحانیات نیک ہوتے ہیں وہ فرشتے کہلاتے ہیں، جو بد اور سرکش ہوتے ہیں وہ شیاطین کہلاتے ہیں\*\*۔ اور جن میں نیک و بد دونوں شامل ہوتے ہیں وہ جِنُّ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کے کئی مقامات میں جہاں جہاں ثابت عرب میں جِنُّ کی پرستش کا ذکر ہے وہاں رَجْنَةٌ سے مراد فرشتے ہی ہیں (مثلاً ۱۵۸) وغیرہ\*\*۔

ہماری زمین ابتدا میں ایک آتشی گولہ تھی جسے ٹھنڈا ہو کر انسانی آبادی کے قابل بننے کے لئے لاکھوں اور کروڑوں برس لگ گئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب کرہٴ ارض پر ہنوز انسانوں کی آبادی نہیں ہوئی تھی تو اسمیں جو مخلوق یہاں بستی تھی اسمیں حرارت برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ اسکے بعد وہ مخلوق ختم (Extinct) ہو گئی اور اسکا جانشین (خلیفہ) دیکھئے عنوان خ-ل-ف) انسان ہوا۔ چونکہ اس (پہلی) مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی اور چونکہ اب وہ انسانوں کے سامنے نہیں ہے، ان کی نسل ختم (Extinct) ہو چکی ہے، اسلئے قرآن نے کہا ہے کہ وَالْجَنُّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ سِنٍ نَّارِ السَّمُومِ (۲۵)۔ انسان سے پہلے ہم نے ایک مخلوق کو جلتی ہوئی ہوا کی حرارت سے پیدا کیا تھا۔ وہ مخلوق اب تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اسے الْجَنُّ کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اشیائے کائنات مادہ کی مرنی اور محسوس شکل میں آنے سے پہلے، مخفی توانائی (Energy) کی حالت میں تھیں۔ یہی توانائی اب مادہ کے اندر (Latent) صورت میں ہے۔

نگاہوں سے پوشیدہ ہونے ، نیز اسکی خوئے سرکشسی کی وجہ سے ، ابلیس کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ جینٹوں میں سے تھا (دیکھئے عنوان ب۔ ل۔ س اور ش۔ ط۔ ن)۔

قرآن کریم میں جینٹ اور انٹس کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ ہم (ان۔س) کے عنوان میں بتاچکے ہیں کہ عربوں میں آلا نٹس ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جائیں۔ لیکن جینٹ وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ بہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔ اب بھی دنیا میں جہاں جہاں اس قسم کے قبائل پائے جاتے ہیں وہ شہر والوں سے دور دور ، جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ آجکل وسائل رسل و رسائل کے عام ہو جانے سے ، ان قبائل اور شہر والوں کی زندگی میں بہت سے امور مشترک ہو چکے ہیں ، اس لئے ان میں کوئی بنیادی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جس زمانے میں ملتے جلتے کے وسائل اور نشر و اشاعت کے طریق عام نہیں تھے ، شہر والوں اور ان خانہ بدوش ، صحرائشیوں کے تمدن و معاشرت ، عادات و اطوار ، خصائص و خصائل اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ میں اس قدر فرق تھا کہ یہ دونوں ایک نوع کے افراد نظر نہیں آتے تھے۔ عربوں میں یہ صحرا نشین قبائل بہت زیادہ تھے (انہیں بدو یا اعراب کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرا نشینوں سب کی طرف تھا اس لئے اس نے جینٹ و انٹس دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جینٹ سے مراد انسان ہی ہیں۔ یعنی وہ وحشی قبائل (Gypsies) جو جنگلوں اور صحراؤں میں رہا کرتے تھے۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے یٰمَعْشَرَ الْجِینِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَا تِکُمْ رَسُلٌ مِّنْکُمْ (۱۳۱)۔ اے گروہ جن و انس ، کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے۔ قرآن نے کسی رسول کا ذکر نہیں کیا جو جن تھا۔ اور سورۃ اعراف میں اس کی تصریح کردی کہ رسول ، بنی آدم میں سے ، انہی کی طرف بھیجے گئے تھے (۷۵)۔ سورۃ جن اور سورۃ احقاف میں مذکور ہے کہ جنوں کی ایک جماعت رسول اللہ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئی (دیکھئے ۲۱ : ۲۹)۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جنوں کی طرف رسول انسانوں میں سے ہی ہوئے تھے۔ انہی سورتوں (سورۃ جن اور سورۃ احقاف) سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو جن رسول اللہ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئے تھے وہ انسان ہی تھے۔

(وحشی قبائل میں سے عیسائی - یہودی اور مشرک) - سورة بنی اسرائیل میں ہے کہ اگر ”جن و انس“ اکٹھے ہو جائیں تو بھی اس قرآن کی مثل نہ بنا سکیں۔ سورة انعام میں ہے کہ ”انس و جن“ کے سرکش لوگ انبیاء کی مخالفت کیا کرتے تھے (۱۱۳) سورة اعراف میں ہے کہ ”جن و انس“ میں اکثریت ان کی ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے وہ اہل جہنم ہیں (۱۷۹)۔ سورة حم سجدہ میں ہے کہ اہل جہنم کہہینگے کہ ہمیں ”جن و انس“ میں سے بعض نے گمراہ کیا تھا (۲۱) سورة انعام میں ہے کہ انیس کہہینگے کہ ہم جنوں سے فوائد حاصل کیا کرتے تھے اور جین کہہینگے کہ ہم انیس سے فوائد اٹھایا کرتے تھے (۱۶۹)۔ سورة نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس جن و انس کے لشکر تھے۔ (۲۷)۔ ان جنوں کے متعلق سورة سبا میں ہے کہ وہ ہیکل کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ جسے تراشتے تھے۔ لکن اور دیگیں بناتے تھے (۱۳۲)۔ سمندروں میں غوطہ خوری سے منقوش نکالتے تھے (۲۱)۔ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا (۳۸)۔ تورات میں اسکی صراحت موجود ہے کہ حضرت سلیمان نے صور کے بادشاہ سے صیدونی قوم کے آدمی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لئے مانگے تھے۔ چنانچہ یہ قبائل اور ”جلیلیم“ پہاڑی قبائل۔ ان کے لئے لکڑیاں کاٹنے اور پتھر تراشتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت سلیمان نے فلسطین کے پہاڑی اور جنگلی (غیر بنی اسرائیل) قبائل میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بطور مزدور اور دس ہزار کو درخت کاٹنے اور پتھر تراشنے پر متعین کیا تھا (دیکھئے کتاب سلاطین و کتاب تاریخ الایام)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن میں ”جن و انس“ سے مراد وحشی اور متعبد انسان ہیں۔ انس جو مانوس تھے اور جن، جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں مایکی)۔

الْجَنُّ زرد رنگ کے سیاہ چشم سانپ کو بھی کہتے ہیں \* (۱۶۹) ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ جَنُّ سے تشبیہ کی بنا پر بولا جاتا ہے۔ الْجَنُّ مِنَ النَّبَاتِ شگوفوں اور پھولوں کو کہتے ہیں \*۔ جَنَّاتٍ اِلَّا رُضٌّ کے معنی ہیں زمین پر سبز گھاس خوب پھیل گئی اور نگاہوں کو بھلی نظر آنے لگی \*۔ جَنُّ النَّبَاتِ کے معنی ہیں پودے لمبے ہو گئے اور آپس میں خوب گمٹھ گمٹھ گئے۔ نَخْلَةٌ مَجْنُونَةٌ نہایت لمبا کھجور کا درخت \*۔

جَنَّةٌ\*۔ کھجوروں اور انگوروں کے باغ کو کہتے ہیں۔ (اگر کسی باغ میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت نہ ہوں دوسرے درخت ہوں تو اسے حَدِیْقَةٌ\* کہتے ہیں۔ جَنَّةٌ\* انہیں کہتے ہیں)\*۔ لیکن راجب کا قول ہے کہ جَنَّةٌ\* ہر اس باغ کو کہتے ہیں جسکی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے\*\*۔

قرآن کریم میں جَنَّةٌ\* کا لفظ بڑی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ قرآنی نظام پر عمل پیرا ہونے سے اس دنیا میں جس قسم کا فردوس بدوش معاشرہ متشکل ہوتا ہے اسے بھی جنت سے تعبیر کیا گیا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں حسن عمل کے جو خوشگوار نتائج سامنے آتے ہیں انہیں بھی جنت ہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن پر عمل کرنے والوں (مومنین) کو اس دنیا میں جس قسم کا جنتی معاشرہ نصیب ہوتا ہے اسکی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات میں مذکور ہیں۔ لیکن اسے اگر دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں تو اس آیت کو سامنے لے آنا چاہئے جو آدم کی سرگذشت سے متعلق ہے۔ اس جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَكُنَّا مِنْهُمْ نَارِغِدًا احْيَاثُ شَيْئَتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵)۔ ”اس میں سے جہاں جی چاہے نہایت فراغت سے کھاؤ لیکن اس شجر کے قریب نہ جانا“ (شجر کے لئے دیکھئے عنوان ش۔ ج۔ ر)۔ یعنی جنت اس معاشرہ کا نام ہے جس میں زندگی کی تمام آسائشیں بافراط موجود ہوں۔ جہاں سامان زیست کی فراوانیاں ہوں۔ (صرف غذا ہی نہیں بلکہ لباس۔ مکان۔ یعنی تمام بنیادی ضروریات زندگی ۱۱۸-۱۱۹) لیکن ان کا استعمال حدود اللہ (قوانین خداوندی) کے مطابق کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائیگا تو اس معاشرہ کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آئیگی۔ اسی لئے اسے تجیریٰ میں تَحْتِیْہَا لَا تَنْهَارُ (۲/۳۵) کہا گیا ہے۔ یعنی اس باغ کے نیچے آب رواں ہمیشہ جاری رہیگا۔ قرآن نے اسکی تفسیر ان الفاظ سے کردی ہے اُكُلْتُمْ دَائِمًا وَظِلُّوْہَا (۲/۳۵) ”اسکے پھل اور دیگر آسائشیں ہمیشہ رہیں گی،“۔ باقی رہے اعمالِ حسنہ کے وہ نتائج جو مرنے کے بعد سامنے آئیں گے، سوا گرجہ انہیں بھی جنت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مِّمَّا اخْفِیَ لَہُمْ مِّنْ قِسْرَةٍ اَعْمٰی (۲۱/۳۱)۔ ”خدا نے اعمال کے بدلے میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان چھپا کر رکھا ہے وہ کسی انسان کے

حیطہ ادراک میں نہیں آسکتا،،۔ اس زندگی کی کیفیات کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت کی اس قدر تفصیل دینے کے باوجود یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ سب تمثیلی بیان ہے (۱۳/۳۵)۔

لیکن اس دنیا کی جنت ہمارے سامنے آسکتی ہے، اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ اسمیں انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کی تمام آسائشیں اور راحتیں موجود ہونگی۔ لیکن اس سے بعد کی زندگی کی جنت کی کیفیت ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس دنیا میں جنتی زندگی بسر کرنے سے نہ صرف طبعی آسائشیں ہی ملتی ہیں بلکہ انسانی ذات (Personality) کی بھی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ اس سے انسانی ذات اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ اس زندگی کے بعد اگلے ارتقائی مراحل طے کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اس قسم کی انسانی ذات مرنے کے بعد جس مرحلہ میں پہنچتی ہے اس کا نام جنت ہے۔ وہ انسانی زندگی کی آخری منزل نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا مقام ہے۔ اس لئے کہ وہاں بھی ”انسان کا نور اس کے آگے آگے چل رہا ہوگا،“ (۵۴/۱۴)۔ اس کے برعکس جن کی ذات کی نشوونما (Development) رک چکی ہوگی، جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی، وہ اہل جہنم ہونگے (دیکھئے عنوان جہنم و ج-ح-م)۔ بہر حال، مرنے کے بعد کی جنت اور جہنم، مقامات نہیں ہیں، انسانی ذات کی کیفیات ہیں جن کی حقیقت ہم آج سمجھ نہیں سکتے۔ آج ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کسی طرح اس دنیا کی جہنم (جس میں ہم سب مبتلا ہیں) جنت سے بدل جائے۔ یہ قرآنی نظام کی رو سے عوسکیگا۔

## ج ن ی

جَنَّتِ الشَّجَرَةُ يَجْنِيهَا - اسنے پھل کو درخت سے توڑ لیا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ (ابن فارس) فَهَوَ جَانٍ - وہ پھل توڑنے والا ہے۔ الْجَنَّتِی پختہ اور تازہ کھجور۔ چنے ہوئے پھل۔ آجَنَّتِ الشَّجَرُ - درخت کے پھل توڑنے کے قابل ہو گئے۔ ثَمَرٌ جَنَّتِ - تازہ پھل جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو\*۔ سورۃ مریم میں رَطَبًا جَنَّتَا (۱۹/۱۵)۔ ترو تازہ کھجوروں کے لئے آیا ہے۔ اور سورۃ رحمن میں جَنَّا (۵۵/۵۳) پھلوں کیلئے۔

کسی کا پھل توڑ کر لے جانا جرم ہے۔ اس سے اَلْجِنَايَةُ اس جرم کو کہتے ہیں جس سے سزا لازم آتی ہو۔ جَان کے معنی ہیں مجرم۔ جَانِي عَلَيْهِ مُجْتَانَاةٌ۔ اسنے اسکے خلاف جرم کا دعویٰ کر دیا\*۔ غور کیجئے، جب ایک شخص کسی دوسرے کا پھل توڑ کر لے جائے سے مجرم بنتا ہے تو جو لوگ دوسروں کی محنت کے محاصل کو غضب کر لیں وہ مجرم کیوں نہیں؟ (اس ضمن میں عنوان ج-ر-م بھی دیکھئے)۔

## ج ۵

اَلْجُهْدُ۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ جُهْدُ کے معنی تکلیف اور مشقت اور کسی کام کو اسکی انتہا تک پہنچا دینے کے ہیں۔ اور جُهْدُ کے معنی وسعت اور طاقت کے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جُهْدُ اور جُهْدُ دونوں وسعت اور طاقت کے معنوں میں آتے ہیں۔ لیکن مشقت کے معنوں میں صرف جُهْدُ آتا ہے\*۔ لیکن قرآن میں جُهْدُ بھی مشقت کے معنوں میں آیا ہے (۹۶) ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اسکے بنیادی معنی ہیں۔ جِهَادُ کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کیلئے اپنی طاقت اور وسعت کو پورا پورا صرف کر دینا۔ اسمیں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا۔ اور جِهَادُ کے معنی ہیں سخت زمین جسمیں گھاس وغیرہ کچھ نہ ہو\*۔ اَجْهَدَتْ لَكَ اَلْاَرْضُ۔ زمین تیرے لئے ظاہر ہو گئی\*۔

اَلْاَجْتِهَادُ۔ کسی ایسے مقصد کے حاصل کرنے میں اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دینا جس میں کلفت اور مشقت لازمی ہو\*\*۔ یعنی اس کام کا مشکل اور کٹھن ہونا ضروری ہے۔ اَلْجَاهِدُ۔ جاگنے والا\*\*۔

قرآن کریم میں مُجَاهِدِ يْنٌ بِمُقَابَلَةِ قَاعِدِ يْنٌ آیا ہے (۳۵)۔ قَاعِدِ يْنٌ کے معنی ہیں بیٹھ رہنے والے۔ سستی کرنے والے۔ لہذا مُجَاهِدِ يْنٌ کے معنی ہوئے جد و جہد کرنے والے۔ حصول مقاصد کیلئے پوری پوری کوشش کرنے والے۔ خواہ اسمیں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ قرآن کی رو سے زندگی کا راز جد و جہد اور سعی و عمل میں ہے۔ لہذا مردِ مومن، جو زندگی کا پیکر ہوتا ہے، ساری عمر مجاہد رہتا ہے۔ یعنی مصروفِ سعی و عمل۔ (جنگ کے لئے دیکھئے عنوان ق-ت-ل) سورة التَّحْلِ میں جِهْدُ اَيْمَانِيْهِمْ (۱۸) سخت قسموں کیلئے آیا ہے۔

## ج ۵ ر

جَهْرٌ - راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنی کسی چیز کا حد سے زیادہ زور کے ساتھ نمایاں اور ظاہر ہونا ہے، خواہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو یا سننے سے۔ چنانچہ رَأَى جَهْرًا کے معنی ہیں اسے کھلم کھلا اس طرح دیکھا کہ دونوں کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا۔ اور جَهْرُ الصَّوْتِ کے معنی ہیں آواز کو بلند کیا۔ جَهْرُ الْكَلَامِ اسنے اس بات کو کھول کر بآواز بلند کہا۔ جَهْرُ أَعْيُنِ الْقَوْمِ - قوم کے ممتاز اور برگزیدہ افراد\*۔ جَهْرُ الْقَوْمِ الْقَوْمِ - ایک قبیلے نے دوسرے قبیلہ پر صبح دم غفلت میں چڑھائی کر دی۔ مَجْرَاهُ - ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرنا\*۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وہ بے حجاب (جَهْرًا) نہیں دیکھا جاسکتا (۲۵)۔ سورة حدید میں اللہ کے لئے هُوَ الظَّاهِرُ آیا ہے۔ (۵۴) اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوانات (ظ - ۵ - ر) و (ب - ط - ن)۔ سورة انعام میں جَهْرٌ بِمَقَابِلِهِ سِرٌّ آیا ہے (۱۱۰)۔ اور (۲۱۰) میں یہ لفظ كَتَمَ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ سورة بنی اسرائیل میں جَهْرٌ بِمَقَابِلِهِ خَفَّتْ آیا ہے۔ (۱۱۰) وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ يَٰصَلَاتُكَ وَلَا تُخَافِتُ بِهٖا\*\*۔ سورة انعام میں ہے إِنَّ أَوْلَىٰ لَكُمُ عِندَ اللَّهِ بِغُتَّةٍ أَوْ جَهْرَةً (۱۲۴)۔ بَغُتَّةٌ کے معنی ہیں جسکی علامات وغیرہ پہلے سے ظاہر نہ ہوں (اچانک) لہذا جَهْرَةً کے معنی ہوئے جسکی علامات پہلے سے نمایاں ہو جائیں۔

سورة الحجرات میں ہے لَا تَسْرِعُوا الْقَوْلَ آمُّوْا أَمْرَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ يَٰلِاَقَوْلِ كَجَهْرٍ بِعُضَيْكُم لِيَبْعُضَ (۲۴)۔ اگرچہ اس کے ظاہری معنی یہی ہیں کہ تم نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ہی اس سے چٹلا کر باتیں کرو جیسا کہ آپس میں کرتے ہو، لیکن اگر اسے آدابِ مجالس سے وسیع تر مفہوم میں لیا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم اسکے فیصلہ پر اپنی رائے کو غالب رکھنے کی کوشش نہ کرو۔ اسکے فیصلوں کو دل کے کامل جھکاؤ کے ساتھ تسلیم کرو۔ قرآنی مملکت میں، مرکز کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے کہ وہاں کا فیصلہ حرفِ آخر قرار دیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں یہ حیثیت حضور کو حاصل تھی۔ آپؐ کے بعد، یہ حیثیت حضورؐ کے جانشینان (یعنی خلافت علیٰ منہاج رسالت یا قرآنی نظامِ مملکت کے مرکز) کو حاصل ہوگی۔

## ج ۵ ز

الْجَهَّازُ - سامان سفر - جو سامان سواری پر لدا ہوتا ہے \* - ساز  
و سامان جو کسی کی ضرورت کا ہو \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے  
بنیادی معنی ایسی چیز کے ہوتے ہیں جسے خریدنا اور حاصل کیا جاسکے -  
الْجَهَّازُ سامان سفر لادنا یا دینا \* - سورة يوسف میں ہے وَ لَمَّا  
جَهَّزْهُمْ بِجَهَّازِهِمْ (۱۲۰) - ”جب انہیں ان کا سامان دیکر سفر کیلئے  
تیار کر دیا“ -  
الْجَهَّازُ مِنَ الْأَرْضِ - بلند زمین کو کہتے ہیں \* -

## ج ۵ ل

الْجَهْلُ کے معنی ہوتے ہیں جو امور واضح نہ ہوں ان کی واقفیت  
حاصل کئے بغیر ان میں پیش قدمی کرنا - راغب نے کہا ہے کہ جَہْلُ  
کی تین قسمیں ہوتی ہیں (۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا (یہ  
بنیادی معنی ہیں) - (۲) کسی بات کے متعلق اس کی صحیح کیفیت کے خلاف  
اعتقاد رکھنا اور (۳) کسی بات کو جس طرح کرنا چاہئے اس کے خلاف  
کرنا - خواہ اس کی بابت اعتقاد صحیح ہو یا غلط \* - ابن فارس نے کہا ہے  
کہ اس کے بنیادی معنی (۱) علم کی ضد اور (۲) ہلکا پن اور بے اطمینانی  
کے ہیں -

مَجْهُولٌ - اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نشانات راہ نہ ہونے کی  
وجہ سے صحیح راستہ نہ مل سکے \* - صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْجَهْلُ  
اس سادہ لوح اور نا تجربہ کار آدمی کو کہتے ہیں جو جلد دھوکے میں  
آجائے \* - صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جَاهِلٌ کا لفظ مذمت کے لئے  
آتا ہے لیکن کبھی اس کے معنی نا واقف کے بھی ہوتے ہیں - اس صورت میں  
یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں آتا - مثلاً قرآن کریم میں ہے يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ  
أَغْنِيَاءَ (۴۰) ”ناواقف انہیں دولت مند سمجھتا ہے“ -

عربوں کے زمانہ قبل از اسلام کے لئے جَاهِلِيَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا  
ہے - قرآن میں بھی اس لفظ کا استعمال آیا ہے (مثلاً (۳۳) - اس کے معنی یہ  
نہیں کہ وہ لوگ جاہل مطلق تھے - اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین سے ناواقف  
تھے - جاہلیت سے مراد ان کی جہالت نہیں بلکہ اس دین سے ناواقفیت ہے



جو نبی اکرمؐ کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ لہذا رسوم جاہلیت سے مراد وہ رسوم ہی نہیں جو زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ اس سے مراد وہ تمام غلط اعتقادات اور غیر قرآنی اعمال حیات ہیں جو دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں۔ نیز علم ہو جانے کے بعد بھی اسی روش پر جمے رہنا (محض اس لئے کہ وہ روش اسی طرح چلی آرہی ہے) جاہلیت ہے۔ یہ مسلک پتھروں کا ہے جو کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ اسی لئے بڑی چٹان کو صفاۃً ”جہل“ کہتے ہیں۔\*\*۔ یہ جہالت و جاہلیت کی بدترین قسم ہے۔ اسی لئے صاحب تاج العروس نے اسے ”جہل“ ”مرکب“ سے تعبیر کیا ہے۔\*

احمد امین مصری (مرحوم) نے کہا ہے کہ ”سلام“ کے معنی مسالمت کے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت ”وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا“ (۲۴) میں جہالت کے مقابلہ میں سلام کا لفظ لایا گیا ہے۔ غالباً اس آیت کے ذریعہ ہم وہ وجہ معلوم کر سکتے ہیں جس کی بنا پر نبی اکرمؐ کی بعثت سے پچھلے زمانہ کو جاہلیت کا اور بعثت کے بعد کے زمانہ کو اسلام کا لقب دیا گیا۔ یہ لفظ ”جاہلیت“ اس ”جہل“ سے ماخوذ نہیں جس کے معنی نہ جاننے (علیم کی ضد) کے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ اس ”جہل“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سفاقت، غضب، اور حمیت کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے کسی کو اس کی ماں کے نام سے عار دلائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”إِنَّكَ أُمْرٌؤٌ لِّمِثْلِكَ جَاهِلِيَّةٌ“۔ ”تمہارے اندر جاہلیت کی روح اب تک موجود ہے“۔ اسی جہالت سے عربوں کا محاورہ ہے ”لَا تَجْهَلُكَ الشَّيْءُ“، یعنی اس چیز نے اسے عقل و خرد سے بیگانہ بنا دیا۔ کسی شاعر کا مصرع ہے۔ ”دَعَاكَ الْهَوَىٰ وَاسْتَجَبْتَ لَكَ الْهَوَىٰ“۔ ”محببت نے تجھے پکارا اور محبوب کے مکانوں نے تیرے حواس گم کر دیے۔ عمرو بن کثوم کے معلقہ میں ہے۔

أَلَا لَا يَجْهَلُنَّ أَحَدٌ عَسَلِيْنًا۔

فَتَجْهَلُ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا۔

خبردار کوئی ہمارے خلاف زیادتی نہ کرے ورنہ ہم زیادتی کرنے والوں سے بڑھ کر زیادتی کریں گے۔ ان استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کا لفظ ہلکے پن،

عقل و ہوش سے بیگانگی، عصبیت، حمیت اور مفاخرت وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کا اہم ترین عنصر تھا۔ اسی لئے اس زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ان معانی کے بالمقابل سکون نفس، تواضع، اعمال صالحہ کی اہمیت کا احساس، اور نسلی فخر و غرور کی بے اعتباری وغیرہ رجحانات، سلامتی اور مصالحت کے ہوتے ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نہج زندگی کیا ہے اور جاہلیت کی روش کیا؟

قرآن کریم کی رو سے علم حاصل نہ کرنا جرم ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم (مزید تفصیل ع۔ل۔م اور ع۔ق۔ل کے عنوانات میں ملیگی)۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ھٰزِوٰۃ کے ساتھ آیا ہے (۱۰۶) لہذا اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مسائل اور احکام و قوانین کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لیں۔ انہیں مذاق ہی سمجھیں۔

### جہنم

جَہَنَّمَ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ ہے جسکے معنی ہیں گہرا۔ کہتے ہیں ”رَکَّیۃ جَہَنَّمَ“ ”گہری تہ والا کنواں“۔ بعض نے اسے عبرانی لفظ گہننام سے معرب مانا ہے۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عبرانی الاصل ہے اور دو لفظوں سے مرکب۔ جی، جسکے معنی وادی ہیں اور ھَنُوم سے۔ ھَنُوم ایک آدمی کا نام تھا۔ وادی ھَنُوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں سولوک (عُثْمُوْنِیِّیْن کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہذا جی ھَنُوم سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کئے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جَہَنَّمَ کا ترجمہ انسانیت کی قربانگاہ ہوگا۔ خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت نشوونما پائے جتنی معاشرہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ معاشرہ جس میں انسانیت ذبح ہو جائے اور جاکر راکھ کا ڈھیر بن جائے جَہَنَّمَ معاشرہ ہے۔ اس کے لئے عربی لفظ جَہَنَّمَ ہے جس کے معنی روک دینا ہیں (دیکھئے عنوان ج ح م)۔ یعنی جس مقام پر انسانیت کی نشوونما رک جائے۔

\* فجر الاسلام صفحہ ۶۹۔ ۷۰۔ \*\* تاج۔ \*\*\* محیط نیز غرر اللغات ص ۱۰۱۔

سورة بنی اسرائیل میں جہنّم کے متعلق کہا ہے "وَجَعَلْنٰهَا جَهَنَّمَ" <sup>(۱۴)</sup>۔ جہنّم ان لوگوں کے لئے روک کا مقام ہے جو قانون خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے آسٹے جسکی نشوونما یہاں رک جاتی ہے وہ زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس زندگی میں بھی وہ جہنّم میں رہتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس زندگی میں جہنّم کی کیفیات کیسی ہونگی، اس کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ موجودہ زندگی میں جہنّم کا عذاب ہم ہر وقت محسوس کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اجتماعی طور پر جو قوم غلط راستے پر چلتی ہے اسکی سعی و عمل ثمر بار ہونے کی بجائے جاکر خا کستر ہو جاتی ہے۔ یہ جہنّم ہے۔ اور اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی۔ اسکی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات میں ملینگی۔ اسی طرح اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے جوہر انسانیت جاکر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہنّم، انسان کے اپنے اعمال ہی سے بنتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ "وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ" <sup>(۲۹)</sup> "یقیناً جہنّم کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے"۔ "وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ" <sup>(۳۱)</sup>۔ یہ اسکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ہی ہے، لیکن ان کا عدم احساس اسے ان کی نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے۔ جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ "وَبَرَزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَدْرِي" <sup>(۳۲)</sup>۔ وہ دیکھنے والے کے لئے ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس میں "یوم الدین" میں داخل ہونگے "يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ" <sup>(۳۳)</sup>۔ "یوم الدین"، ظہور نتائج کا زمانہ ہے، اس دنیا میں یا مرنے کے بعد۔

## ج و ب

آلِجَوْبُ\*۔ قطع کرنا۔ پہاڑنا۔ سوراخ کرنا۔ یہ اس مادہ کے اصلی معنی ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے "وَتَمُودُ الْقَدْرُ بْنُ جَابُو الصَّخْرَ بِأَلْوَادٍ" <sup>(۸)</sup> اور تمود جو وادی میں پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر (اپنے مکان بناتے تھے)۔ آلِجَوْبَةُ\*۔ مکانات کے پچھواڑے جو گڑھا سا بن جائے جسمیں بارش کا پانی جمع ہو جائے\*۔ آلِجَوْبُ\* ڈھال کو بھی کہتے ہیں\*۔

اَجَابَ۔ مُجِيبٌ۔ اِجَابًا وَاِجَابَةً۔ جواب دینا۔ (اس لئے کہ جواب دینے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ اس کے مُنہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے۔ ویسے سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ راغب)۔ اس سے اسم فاعل مُجِيبٌ ہے۔ جواب دینے والا۔ قرآن میں ہے اِنَّ رَّبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱۱)۔

”یقیناً میرا رب قریب ہی ہے اور بات کا جواب بھی دیتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَاكَ (۱۸۶)۔“ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے،،۔ دعا اور خدا کی طرف سے اسکے جواب کے صحیح مفہوم کیلئے (د۔ ع۔ و) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دُعا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا، اور اسکی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔ چنانچہ سورۃ المومنین میں ہے وَ قَالَ رَبِّ بِكُمْ اِدْعُوْنِيْ اَسْتَجِيبْ لَكُمْ (۲۰۶)۔ ”تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا“ اسکے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۲۰۶)۔ جو لوگ میری اطاعت گزاری سے سرکشی برتتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہونگے،،۔ اس پوری آیت سے واضح ہے کہ دعا در حقیقت ”يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ“ کی ضد ہے۔ لہذا دعا سے مقصود خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی لئے اس سے ذرا پہلے ہے وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۲۰۵)۔ ”جو لوگ قوانین خداوندی سے انکار کرتے ہیں انکی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی،،۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ کہا ہے کہ اُجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَاكَ (۱۸۶)۔ ”میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں“ تو اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ يَسْتَجِيبُوْنَ لِيْ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ اَبٰى (۱۸۶)۔ ”لہذا انہیں چاہئے کہ میرے قوانین پر ایمان رکھیں اور میری اطاعت کریں،، یہ لوگ یہ کچھ کریں اور میں انکی بمعنی و عمل کو نتیجہ خیز کروں گا۔ یہ ہے دعا اور اجابت۔ دعا کا قرآنی مفہوم۔ یعنی جو کچھ خدا کے تقاضے ہیں انہیں تم پورا کرو۔ جو کچھ تمہارے تقاضے ہونگے خدا انہیں پورا کر دیگا۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ جو شخص جس قدر دارانہ انداز سے اسکے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ اسکی محنت کو وراثت میں نہیں جاتے دیتا۔ وَ اصْبِرْ فَاِنَّ اِلٰهَكَ بِصَبْرِكَ اَحْسَنُ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵)۔ ”اور استقامت سے جما رہ۔ بیشک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا،،۔ اور کوشش کے بغیر کچھ ملتا نہیں۔ وَ اَنْ لَّيْسَ لِنَاسٍ اِلَّا نَسَاْنٌ اِلَّا مَّا سَمِعْنٰ (۵۳)۔ ”انسان کے لئے کچھ نہیں بجز اسکے جسکے لئے وہ کوشش اور محنت کرے“۔ سوال دوم کا جواب ہے۔ ایک تو کسی بات پر مسئلہ کا دریافت کرنا اور دوسرے امداد و اعانت طلب کرنا۔ لہذا اس اعتبار سے جواب کی بھی دو قسمیں ہوں گی اور اجابت و استقامت ان دونوں قسموں کے جواب کے لئے بولا جائے گا۔ یعنی کسی سوال کا جواب دینا، یا کسی مانگ اور مطالبہ کو پورا کر دینا۔

## ج و د

الْجَمَادُ - عمدہ چیز - جَوْدَةٌ - عمدہ ہونا - آجَادَةٌ - اسے عمدہ بنا دیا - الْجَوَادُ - سخی \* - الْجَوْدَرُ - اس پہاڑی یا ٹیلہ کا نام ہے جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی (۱۱/۲۲) - کہا جاتا ہے کہ یہ اس سلسلہ کوہ میں واقع ہے جو آرمینیا کو میسوپوٹیمیا سے جدا کرتا ہے -

جَوَادٌ - اعلیٰ درجے کا گھوڑا جو نہایت تیز رفتار ہو اور دوڑنے میں اپنی ساری طاقت صرف کردے \*\* - (جمع جیاد) - سورہ ص میں ہے الصَّافِيَتُ الْجَيَادُ (۳۸/۳۸) - "اصیل، تیز رو گھوڑے"، -

## ج و ر

الْجَوْرُ - درمیانی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جانا - اس سے اسکے معنی ظلم و ستم اور بے انصافی کے ہو گئے - اسی سے جَار کے معنی ہیں عدل کی راہ چھوڑی \* - قرآن میں قَصْدُ السَّبِيلِ کے مقابل جائِر آیا ہے (۱۱/۱۹) قَصْدُ السَّبِيلِ، درمیانی راہ اور جائِر، ایک طرف کو ہٹنی ہوئی راہ - الْجَارُ - پڑوسی، ہمسایہ، نیز وہ شخص جسے تم نے کسی کے جور و ستم سے پناہ دی ہو - نیز ساتھی، شریک، مددگار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے \* قرآن میں الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ اور الْجَارِ الْجُنُبِ آیا ہے (۳۶/۳۶) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج - ن - ب) - سورہ احزاب میں ہے لَا يُجَارُ وُرُوكُكُمْ فِيْهَا (۳۳/۶۳) - "وہ اس شہر میں تیسرے ہمسایہ بنکر نہیں رہنے پائیں گے"، - سورہ انفال میں ہے اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ (۸/۳۸) - "میں تمہارا پناہ دینے والا یا سامی و مددگار ہوں"، - آجَارُہ - اسکو پناہ دیدی - ایسے حفاظت میں لے لیا (۲۴/۲۴) - اِسْتَجَارَ - پناہ طلب کرنا (۱/۱) - سورہ رعد میں ہے قَطَعَ مَسْجِدَیْہِمْ (۱۳/۱۳) - "آپس میں ملے ہوئے قطععات زمین"، -

## ج و ز

جَاَزَ اَلْمَوْضِعَ - وہ اس مقام پر سے گزر گیا - اسے پیچھے چھوڑ گیا - اگر دریا ہو تو اس کے معنی ہونگے اسے عبور کر گیا - نیز جَاَوَزَ (۱۱/۲۲، ۲۳/۲۳) کسی مقام سے آگے بڑھ جانا \* - اصل معنی اس مادہ میں قطع کرنا - کاٹنا ہیں \*\*\* -

تَجَوُّزَ عَن ذَنْبِهِ۔ اسکی خطایہ درگزر کر دیا۔ وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ (۳۶)۔ ”ہم ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو قطع کرنا اور کسی شے کا وسط ہیں۔ چنانچہ جَوُّزُ ”کل“ ”شے“ ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے التَّجَاوُزُ اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کے وسط میں سے گزر جائے۔ نیز اَلتَّجَاوُزُ صحیح سمت کو گزرنے والا \*\*۔ اَلْمَجَازُ راستہ جسے ایک طرف سے دوسری طرف کو قطع کیا جائے \*۔ یا وہ راستہ جس پر لوگ بہت زیادہ گزرتے ہوں \*۔ التَّجَاوُزَةُ عطیہ۔ انعام۔ وہ زاد سفر جو مسافر کو دیا جاتا ہے جس کے سہارے وہ ایک دن اور رات کی مسافت طے کر لے۔ (ممکن ہے اسی سے مبالغہ انعام و عطیہ کے لئے بولا جائے لگا ہو)۔

## ج و س

اَلْجَوُّسُ۔ کسی چیز کی آخری حد تک اسے تلاش کرنا۔ چھان مارنا۔ گھومنا پھرنا \*\*\*۔ اَلْجَمْتِيَّاسُ۔ رات میں گھومنا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندر گھس جانے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے فَجَاءَ سُوَّاءُ خَيْلِ اَللَّهِ يَتَارِ (۱۰۵)۔ ”وہ تمہارے شہروں کے اندر گھس گئے اور تمہاری کھوج میں انہوں نے گلی کوچوں کو چھان مارا“ اور اس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہیں قتل یا گرفتار کیا۔ محیط نے اس کے معنوں میں حملہ کرنے یا لوٹ مار کرنے میں ادھر ادھر آمد و رفت کرنا بھی بتائے ہیں۔

## ج و ع

اَلْجَوُّوعُ۔ بھوک۔ جَاعٌ۔ يَجْجُوْعُ۔ جَوْعًا۔ بھوکا ہونا۔ عَامٌ مَجْجَاعَةٌ۔ بھوک کا سال۔ قحط سالی \*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بھوک کیلئے آیا ہے (۱۰۵)۔ اور جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اسمیں بھوک (رزق کی تنگی) نہیں ہوگی۔ اِنَّ لَكَ اِلَّا تَجْجُوْعُ فِيْهَا (۲۱۸)۔ ”تیرے لئے یہ ہے کہ تو اس میں بھوکا نہیں رہیگا“۔ کفرانِ نعمت (خدا کی طرف سے ملے ہوئے سامانِ زیست کو چھپا کر رکھنے یا غلط طور پر استعمال کرنے) کا نتیجہ لِبَاسٌ اَلْجَوُّوعِ۔ ”واللَّخْوَفِ (۱۱۲) بتایا ہے۔ یعنی بھوک اور خوف کا عذاب۔ لہذا کسی قوم میں سامان

رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے اور اسکی فراوانی جنتی معاشرہ کی خصوصیت۔ قرآن کی رو سے جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نظام میں ہر فرد کو روٹی مل جائے اُسے نظام خداوندی اور اس معاشرہ کو جنتی معاشرہ کہا جائیگا۔ نظام خداوندی اور جنتی معاشرہ کی بہت سی خصوصیات ہیں اور جب تک وہ سب موجود نہ ہوں اسے جنتی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نظام یا معاشرہ میں لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے اسے نہ نظام خداوندی کہہ سکتے ہیں نہ جنتی معاشرہ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم ایسے ہنگامی حالات سے گزرے جس میں کچھ وقت کے لئے رزق کی تنگی آجائے (مثلاً جنگ کے زمانہ میں)۔ لیکن کسی قوم میں نہج زندگی ایسا قائم ہو جانا جس میں تمام افراد کو پیٹ بھر کر، باطمینان، کھانے کو نہ ملے، خدا کا عذاب ہے، اور جو قوم ایسی حالت سے نکلنا نہیں چاہتی وہ جہنم میں رہنا چاہتی ہے۔

## ج و ف

الْجَوْفُ - وسیع نشیبی زمین - شکم (پیٹ) نیز کسی چیز کے اندرونی حصہ کو کہتے ہیں - جَوْفُ الْبَيْتِ - گھر کا اندرونی حصہ - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندرون کے ہوتے ہیں - جَافَهُ - يَجْوِفُهُ - جَوْفًا - اس نے اسے گہرا کر دیا - التَّجْوِيفُ - گہرائی والی چیز (مُحْدَقٌ کے مقابلہ میں) - نیز وہ شخص جس کا دل نہو، (بزدل) یعنی جس کے سینے میں خلا ہو\*۔

قرآن کریم میں ہے مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (۳۳) یہاں جَوْفٌ سے مراد سینہ ہے - یعنی اللہ نے کسی شخص کے لئے اس کے سینے میں دو دل نہیں پیدا کئے۔

## ج و و

الْجَوُّ - فضا - زمین اور آسمان کے درمیان خلا\*\*۔ قرآن کریم میں ہے مَسَاجِدَ فِيْ الْجَوِّ السَّمَاوِيَّاتِ (۱۶) - اس کے معنی فضائے آسمانی ہیں - یعنی (پرنڈے) آسمان کی فضا میں مسخر کئے ہوئے ہیں - ویسے الْجَوُّ اندرون مکان کو بھی کہتے ہیں\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے اطراف کو گھیرے ہوئے ہو - بِاللَّيْلِ فَضَاكَ الْجَوُّ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ زمین کے اطراف کو گھیرے ہوئے دکھائی دیتا ہے -

## ج ی ا

جاءَ - یَجِئُ\* - آنا - آجاءُ\* - وَجِئْتُ\* - یہ - میں اسے لایا\* - راغب نے اِثْنَانُ\* اور سَجْنِی\* کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اِثْنَانُ\* کسی کام کے کرنے کے ارادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے (خواہ وہ کام ہو سکے)۔ لیکن السَجْنِی\* اس وقت بولا جائیگا جب کوئی کام زورنا اور واقع ہو گیا ہو\*\*۔ نیز اس کے معنی لیکر آنا یا مرتکب ہونا ہیں۔ حضرت مریم\* سے لوگوں نے کہا لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِیْثًا (۱۹۱)۔ تو نے ایک انوکھا کام کیا ہے، تو ایک نرالی حرکت کی مرتکب ہوئی ہے۔ یہ تیری اپنی اختراع ہے۔ اسی طرح سورة کہف میں (قصہ حضرت موسیٰ\* اور مرد بزرگ میں) ہے لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا اِمْرًا (۱۹۱)۔ ”تو ایک خطرناک کام کا مرتکب ہوا ہے“۔ سورة مریم میں ہے فَآجاءُ هَآءِ لَمَخَضُ\* اِلٰی جَنَدِ النّٰخِلَةِ۔ اس کے معنی ہیں درد زہ اسے کھجور کے درخت کی طرف لے آیا۔ یعنی اس میں مجبوری کا پہلو پایا جاتا ہے۔

## ج ی ب

جَنِبُ\* الْقَمَیْصِ - کرنے کا گریبان۔ الْجَنِبُ\* سینہ کیلئے بھی مجازاً بولا جاتا ہے جس پر کر۔ ن ہوتا ہے نیز دل کو بھی کہتے ہیں۔ ہَوْنًا صَیْحُ الْجَنِبِ - وہ صاف دل اور صاف سینہ والا یعنی مخلص ہے\*۔ سورة نور میں عورتوں سے کہا گیا ہے وَلَیْسَ مِنْ بَعْضِہُمْ مَنْ عَلٰی جُنُوبِہِمْ (۲۴)۔ ”انہیں چاہئے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں“۔ قصہ حضرت موسیٰ\* میں ہے وَادَّخَلَ یَدَکَ فِیْ جَنَبِیکَ (۲۴) اور اسْلُکَ یَدَکَ فِیْ جَنَبِیکَ (۲۸)۔ ”اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر با ڈال“۔ (ان آیات کے مفہوم کیلئے ی۔ د۔ ی اور ب۔ ی۔ ض کے عنوان دیکھئے)۔

## ج ی د

جِئِدٌ - گردن یا گردن کا اگلا حصہ یا گردن کی وہ جگہ جہاں ہار لٹکا رہتا ہے۔ ایک قول کے مطابق جِئِدٌ، مقام مدح میں بولا جاتا ہے اور عُنُقٌ، مذمت میں\*۔ قرآن کریم میں ابولہب کی بیوی کے متعلق ہے فِیْ جِئِدِہَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱) ”اسکی گردن میں کھجور کے ریشوں کی رسی ہے“۔ یعنی وہ گردن جو بڑی عزت و توقیر اور سرفرازی و سربلندی کی حامل سمجھی جاتی تھی، اس طرح ذلیل ہو رہی ہے۔ اس کا تکبر خاک میں مل رہا ہے۔

جلد اول ختم شد



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ح

## ح اش (ح ش و)

الْحَاشِيَّةُ - کنارہ (کیڑے وغیرہ کا) - حَشْوَةُ النَّفَاسِ - رذیل لوگ\* (یعنی وہ لوگ جنہیں کنارے پر دور دور رکھا جائے) - یہیں سے اس کے معنی دوری کے آتے ہیں - حَاشَ لِلَّهِ - خدا اس سے بہت دور ہے وہ منزہ ہے - یا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں - (کیونکہ الْحَاشِيَّةُ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی حفاظت میں رہتے ہوں)\*

قرآن کریم میں ہے وَ قُلْنَا حَاشَ لِلَّهِ (۱۲/۱۳) - "انہوں نے کہا کہ خدا تمام عیوب سے پاک ہے - وہ نقائص سے سبرا ہے" - یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے\*\* - یعنی عیوب اور نقائص سے منزہ ہونے کے معنوں میں۔

## ح باب

الْحَبُّ - الْمَحَبَّةُ - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے پانچ معانی ہیں - (۱) سفیدی اور صفائی - یہاں سے حَبَبُ اُلاَسْتَانِ لیا گیا ہے یعنی دانتوں کی چمک (۲) بلند ہونا اور ظاہر و نمودار ہونا - یہاں سے حَبَابُ الثَّمَارِ لیا گیا ہے - یعنی پانی کا بلبلہ (۳) کسی چیز کا اپنی جگہ ٹھہرے اور جمے رہنا - یہاں سے حَبُّ التَّبَعِيرِ وَاَحَبُّ لیا گیا ہے - یعنی اونٹ اس طرح جم کر بیٹھ گیا کہ پھر نہ اٹھا - (۴) کسی چیز کا خالص ہونا یا اس کا لب لباب اور حقیقی جوہر - جیسے حَبَّةُ الْقَلْبِ سوبدائے دل کو کہتے ہیں اور (۵) کسی کی حفاظت کرنا -

\* تاج - \*\* راغب - لے جاشے کے مادہ کے بارے میں علماء لغت کا اختلاف ہے - بعض رَجَش و بَقَاعَہ اور تاج بعض رَجَش - تاج نے حَاشَ یَقَعُ کے معنی تَمَازُ الْعُجْبِ لکھے ہیں نیز میں اللہ کی حفاظت اور پناہ

اسے تھامے رکھنا۔ اسی سے حُبُّ الثَّمَارِ مٹکا یا ٹھلایا یا مشک کو کہتے ہیں جسمیں پانی محفوظ رکھا جائے۔ یا گھڑونچی جس پر مٹکے رکھے جائے ہیں۔ حُبُّ الرَّجُلِ کے معنی ہیں آدمی ٹھہر گیا۔ أَحَبُّ الزَّرْعِ۔ کھیتی میں دانے پڑ گئے۔ یعنی اسکی نشوونما کے نتائج ابھر کر سامنے آ گئے۔ \*

راغب نے لکھا ہے کہ محبت کے معنی اس چیز کو چاہنا ہیں جسے اچھا اور مفید پایا جائے، اس کے تین پہلو ہیں، ایک تولدت کیلئے۔ جیسے مرد عورت سے محبت کرتا ہے، دوسری مفید اور نفع بخش (مادی) چیزوں کو چاہنا، تیسرا پہلو یہ ہے کہ فضل و شرف (معنوی امور) سے محبت رکھنا، جیسے اہل علم، علم و فضل کی بناء پر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کبھی محبت کے معنی ارادہ کے بھی کئے جاتے ہیں۔ لیکن محبت میں ارادہ سے زیادہ زور و قوت ہے۔ \*\*۔ اسْتَعَبَّ۔ اسے چال پند کیا۔ اسْتَحَبَّہُ عَلَیْہِ۔ اسے اس پر ترجیح دی (۱۳/۱۴)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ الْحَبُّ اور الْمَحَبَّة کے معنی کسی کو لازم پکڑنا ہیں۔ اس مادہ کے بنیادی معنی لزوم اور ثبات کے ہیں۔ یعنی کسی شے کو لازم پکڑنا اور اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا۔

قرآن کریم میں حُبُّ کا لفظ کثرت کے مقابلہ میں آیا ہے۔ وہاں اس کے معنی پسندیدگی کے ہیں (مثلاً ۲/۱۶۶؛ ۲۹)۔ یہ معانی کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں۔ لیکن جہاں قرآن میں اللہ کی محبت کا ذکر آیا ہے وہ مقامات تشریح طلب ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (۲/۱۶۵)۔ ”اور ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قیوتوں کو اسکا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اسطرح محبت کرتے ہیں جسطرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر کرتے ہیں۔“ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳/۳۰)۔ ”ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کریگا۔ اور تمہارے قصوروں

\* محوط۔ \*\* راغب۔ \*\*\* اگر محیط نے یہ تفسیر کی ہے کہ ان معنوں میں یہ فارسی سے عویب ہے۔

کو معاف کر دیگا۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے)۔

ان آیات سے اللہ سے محبت، اور اللہ کی محبت، کی سند لی جاتی ہے اور پھر اس پر تصوف کی پوری عمارت استوار کر لی جاتی ہے جس کا اصل الاصول خدا کی محبت ہے۔ اور محبت بھی ایسی شدت کی محبت کہ اس ذات میں اپنے آپ کو جذب کر دینا اسکا منتھی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سارا تصور لفظ محبت کو اُن معنوں میں لے لینے سے پیدا ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اسے انسانوں سے محبت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

خدا سے اس قسم کے تعلق کا تصور غیر قرآنی ہے۔ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے ہمارے حیطہ ادراک میں آہی نہیں سکتی۔ اسلئے اس سے اس قسم کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ کسی کی اولاد ہی کیوں نہ ہو)۔ کسی اُن دیکھی چیز سے اس قسم کی محبت کا پیدا ہونا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ یہی وہ دشواری تھی جسکے پیش نظر لوگوں کو خدا کو بشکل انسان (اوتاروں کے روپ میں) ڈھالنا پڑا یا اسکی مورتیاں بنانی پڑیں۔

لفظ محبت کے اُن معانی پر غور کیجئے جنہیں شروع میں درج کیا گیا ہے۔ ساری بات صاف ہو جائیگی۔ حُب کے معنی ہیں کسی چیز پر ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ جمے رہنا۔ لہذا خدا کے ساتھ انسان کی محبت کے معنی ہیں، احکام خداوندی کی خلوص اور استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ ان پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہنا۔ ان سے ذرا ادھر ادھر نہ ہٹنا۔ ان معانی کی تائید خود وہ آیات کر رہی ہیں جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۱۶۵) میں دیکھئے۔ جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی صاحب اقتدار و اختیار مانتے ہیں (اَنْدَادًا مِیْنَ دُوْنِ اللّٰہِ) وہ اُن کے قوانین اور فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور نہایت شدت سے اطاعت کرتے ہیں۔ لہذا اس آیت میں اللہ کی محبت کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت۔ سورۃ آل عمران کی آیات (۳/۳۰-۳۱) میں اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان میں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ كِی تَقْسِرِ اَطِيعُوْا اللّٰہَ نے کردی ہے۔ اور

اسکے مقابل میں تَوَكَّلُوا (روگردانی کرنے) کے لفظ نے اسکی مزید وضاحت کر دی ہے۔ لہذا ان آیات میں بھی خدا سے محبت سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے جو اُس نظام کے مرکز کی وساطت سے کی جاتی ہے جو اُسکے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے متشکل ہوتا ہے۔ اس کی تائید سورۃ المائدہ کی آیات (۵۶-۵۷) سے بھی ہوتی ہے۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر جائے تو اسے سبچہ لینا چاہئے کہ خدا کا دین اسکی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ یہ نہ خیال کرے کہ اس نے اس دین کو چھوڑ دیا تو اس دین کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رہیگا۔ اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیگا یُحْيِيہُمْ و یُحْيِیْہُمْ تَوَّابٌ جن سے خدا محبت رکھیگا اور وہ خدا سے محبت رکھیں گے۔ یعنی وہ لوگ اپنوں کے سامنے نہایت نرم اور مخالفین کے مقابلہ میں غالب آنے والے ہونگے۔ وہ اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے اِنْقَمَا وَلِیْسَ لَکُمْ اِلٰہٌ وَّ رَسُوْلٌہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا... (۵۵)۔ ”تمہارے دوست اللہ اور اس کا رسول اور مومنین ہیں“۔ اس سے واضح ہے کہ ”محبت“ سے مراد ”ولی ہونا“ ہیں۔ اس سے آگے مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم کفار کو اپنا ولی مت بناؤ (۵۶)۔ اس سے بھی ”خدا سے محبت“ کرنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اطاعت کرنا۔

اب رہا خدا کا بندے سے محبت کرنا، تو اس کے لئے اس لفظ کے دوسرے معانی کو سامنے لائے یعنی حفاظت کرنا۔ تھامے رکھنا۔ مضمحل صلاحیتوں کا نمودار کرنا۔ اعمال کا نتیجہ خیز ہونا۔ لہذا خدا کی طرف سے محبت کے معنی ہیں اُن تمام ثمرات و نتائج کا حاصل ہو جانا جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری ماحصل ہیں۔

یہ ہے قرآنی مفہوم، انسان کے خدا سے محبت اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کا۔ یہی مفہوم اللہ کا انسان کے ولی (دوست) ہونے یا انسان کا اللہ کا ولی ہونے سے ہے۔ (دیکھئے عنوان و۔ ل۔ ی)

حَبَّ - دانہ - اناج - غلہ (۵۵) - حَبَبَةٌ (واحد) دانہ (۲۶۱)۔

## ح ب ر

الْحَبِیْرُ - روشنائی (جس سے لکھا جاتا ہے)۔ الْحَبِیْرَةُ - دوات۔ الْحَبِیْرِیُّ - روشنائی فروش۔ الْحَبِیْرُ\* - اہل کتاب کا عالم۔ بالخصوص یہود کا عالم۔ جمع أَحْبَارٌ\* (۵۶)۔ الْحَبِیْرُ - حسن اور حسن کی رونق۔ یہ وہ سفید عالم کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اس مادہ کے بیاری معنوں کے لحاظ سے یہ ایسے عالم کو کہا جائیگا جو مہارت و کمال سے شرف

الْحَبْرَةُ - سرور - خوشی - مسرت - حَبْرَةٌ\* - کامل نعمت و آسائش ، فراوانی عیش - الْحَبْرَةُ\* - جنت میں سماع - موسیقی - عمدہ نغمہ - چنانچہ قرآن میں جو ہے فَهْمٌ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۳۱۵) - یا اُدْ خَلُّوْ الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ (۳۳) تو زہاج نے اسکی تفسیر موسیقی کے ساتھ ہی کی ہے - اس نے کہا ہے کہ لغت میں الْحَبْرَةُ\* عمدہ گانے کو کہتے ہیں\* - درحقیقت اس میں حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی نیز خوشی اور مسرت کے تمام مظاہر آجائے ہیں خواہ وہ جنتِ نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش - آرٹ کے شاہکار ہوں یا حیات افروز موسیقی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسے نشانات کے ہیں جن سے اس چیز کا حسن اور رونق نمایاں ہوں -

حَبْرَ الْخَطِّ وَالْيَشْعَرِ - اسنے خط اور شعر کو عمدہ بنایا اور مزین کر دیا - تَحْبَرُ الشَّجَلُ\* - آدمی حسین اور مزین بن گیا\*\* - ثَوْبٌ حَبِيرٌ\* - عمدہ اور نیا کپڑا - اَلْيَحْبُورُ\* - نرم و نازک بدن والا آدمی\* - راغب نے کہا ہے کہ الْحَبِيرُ نہایت عمدہ اور حسین اثر (نشان) کو کہتے ہیں - الْحَبِيرُ\* عالم کو اسلئے کہتے ہیں کہ اس کے علم کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی رہتا ہے اور اس کے عمدہ آثار قدم کی پیروی کی جاتی ہے\*\*\* -

قرآن ، کائنات کی ہر حسین شے کی تحسین (Appreciation) کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے ، اس شرط کے ساتھ کہ انسان حدودِ اللہ سے تجاوز نہ کرے - ایک جنتی معاشرہ اس قسم کے حسن کا مظاہر ہوتا ہے جس میں آرٹ - نغمہ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر وجہِ شادابی قلوب و نظر بنتے ہیں - اور چونکہ اسمیں حدودِ اللہ کا ہر وقت خیال رکھا جاتا ہے اسلئے اس سے مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے پاتے - حسن و زیبائی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کا ذکر ، قرآن نے ، جنتی زندگی کے ضمن میں نہیں کیا ؟ لیکن زندگی ، جنتی بنتی اسوقت ہے جب وہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے -

## ح ب س

الْحَبْسُ\* - روک لینا - قید کر دینا - اِحْتَبَسَتْ\* - اسے روک دیا - فَاتِحَبَسَ\* - پس وہ رک گیا - اَلْمَحْبَسُ\* جانوروں کے چارہ رکھنے کی جگہ\* - چھٹلا جو انگلیوں میں پھنسا جاتا ہے\*\* - حَبَسَتْ عَنْهُ\* کے معنی اسے کسی چیز سے روکنے کے ہوتے ہیں - اور حَبَسَتْ عَلَيْهِ\* کے معنی وقف کر دینے کے\*\* -

قرآن کریم میں ہے - تَحْبِيسُوْهُنَّهَمَّا (۱۱۶/۵) ”تم ان دونوں (گواہوں) کو روک لو“۔

## ح ب ط

الْحَبِطُ - زخم کا نشان جو زخم اچھا ہو جانے کے بعد رہ جائے۔  
الْحَبَّاطُ - موشیوں کی ایک بیماری ہے جس میں ان کا پیٹ ابھر جاتا ہے اور وہ مر جاتے ہیں۔ زبخی اور ابن الاثیر نے کہا ہے کہ حَبِطَتِ الْقِدَابَةُ حَبَّطاً کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی نہایت اچھی چراگاہ میں پہنچ کر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کر سکے۔ اس سے اسکا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باطل ہو جانا اور درد و الم کے ہیں۔

قرآن کریم نے حَبِطَ اَعْمَال (اعمال کے رائیگاں جانے) کی اصطلاح نہایت پر معنی طریق سے استعمال کی ہے۔ (۲۱۷/۲)۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اسکا جزو بدن بن جائے تو اس سے اسکی صحت قائم رہتی ہے اور وہ قرہ و توانا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اسکا چارہ ہضم نہ ہو تو اسکا پیٹ پھول جاتا ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت قرہ ہے لیکن یہ درحقیقت قرہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان بہت کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ درحقیقت اسکی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اسے قرآن حَبِطَ اَعْمَال سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو ان نتائج کا مرتب نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کر سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُولَئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲۱۷/۲)۔ انہی کے لئے آیا ہے۔ یعنی وہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائیگاں جاتے ہیں۔ ان کے اعمال کے صرف نشانات رہ جاتے ہیں۔ نتائج کچھ نہیں نکلتے۔ اور وقت اور توانائی، سب ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہذا اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصور یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں۔ اچھے اور برے اعمال کا معیار، اللہ کی کتاب

ہے۔ جو اعمال اس کی رو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ کریں۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے حاتمہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلیگا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائیگاں جائینگے۔ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا۔ (۱۸۰/۱) ”سوان کے اعمال بے نتیجہ رہ گئے۔ لہذا ہم ان کے لئے ظہور نتائج کے وقت میزان تک کھڑی نہیں کریں گے“۔ ان کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ غور کیجئے کہ ہمارے کس قدر اعمال ہیں جو یوں بے نتیجہ چلے جا رہے ہیں اور ہم کبھی رک کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ خدا کی کتاب (اعمال کے نتائج کی زندہ کسوٹی) ہمارے پاس ہے

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نہ صرف باطل ہونے کے ہیں بلکہ اس کے ساتھ الم و تکلیف کے بھی ہیں۔ یعنی اعمال کا محض رائیگاں جانا ہی نہیں بلکہ ان کا الم و تکلیف کا موجب بن جانا بھی۔ خود یہی احساس کیا کم الم و تکلیف کا موجب ہے کہ جن کاموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کے نتائج ایسے خوشگوار مرتب ہونگے، وہ آخر الامر بے نتیجہ ثابت ہوں؟

## ح ب ک

الْحَبْبُکَ۔ کس کو باندھنا اور مضبوط کرنا۔ الْحَبْبُکَ۔ ازار باندھنے کی جگہ۔ تَحْبِطُکَ تَحْبِطًا۔ اسنے کمر پر ازار باندھ لیا۔ الْحَبْبُکَ۔ وہ رسی جو کمر پر باندھی جائے۔ الْحَبْبُکَ مِّنَ السَّمَاءِ۔ ستاروں کے راستے۔ حَبْبُکَ الْقُرْمَلِ۔ ریت کی لہریں۔ فراء نے کہا ہے کہ حَبْبُکَ کسی چیز کے بل کہا کر مڑ جانے یا ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ الْحَبْبُکَ

مِنْ الشَّعْمَرِ ان گھونگھریالے بالوں کو کہتے ہیں جو بل کھا کر ٹوٹے پڑتے ہوں۔ اور اَلْحَبَّكُكُ کے معنی کاٹ ڈالنے اور گردن اڑا دینے کے ہیں\*۔

قرآن کریم میں وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۵۱) آیا ہے۔ یعنی راستوں والا آسمان۔ وہ بلند فضا جس میں مختلف اجرام فلکی اپنے اپنے راستوں میں چلتے اور مڑتے رہتے ہیں۔ اور اگر اس کے معنی مضبوطی کے لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا ایسی بلند فضا جس میں تمام اجرام اپنے اپنے دوائر میں نہایت مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اَلْحَبَّكُ لکڑیوں کے اس گٹھے کو کہتے ہیں جسے مضبوطی سے اس طرح باندھا جائے کہ کوئی لکڑی اپنی جگہ سے ہلے نہیں\*\*۔ اور اگر اس کے معنی ٹوٹنے کے لئے جائیں تو مفہوم ہوگا ان اجرام فلکی والی فضا جس میں مختلف اجرام اپنے اولین ہیولے سے ٹوٹ کر چکر کاٹ رہے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا تسلسل، درازی اور مضبوطی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ کے معنی ہونگے ایسی بلندی (فضا) جس میں اجرام فلکی کے لئے لمبے لمبے راستے ہوں۔

## ح ب ل

اَلْحَبْلُ - باندھنے کی چیز۔ رسی۔ اسکی جمع حَبَالُ\* ہے۔ حَبْلَتَہ - اسے رسی سے باندھ دیا\*۔ سورۃ طہ - میں حَبَالَتُهُمْ\* آیا ہے (۲۶) جس کے معنی ”رسیاں“ ہیں۔ نیز اَلْحَبْلُ کے معنی عہد، ذمہ اور امان کے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا (۱۰۲)۔ ”تم سب کے سب جبل اللہ کیو توہامے رکھو“۔ اس کے ساتھ متمسک رہو۔ اس میں، صاحب تاج العروس کے نزدیک، حَبْلُ کے معنی عہد کے ہیں۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کی درازی پر دلالت کرتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے حَبْلُ\* کہلاتی ہے۔ اس لئے اس آیت میں حَبْلُ اللہ کے معنی ہیں وہ چیز جو تمہیں خدا تک پہنچادے، یعنی قرآن کریم۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اَلْاَعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللَّهِ کے معنی اتباع قرآن کریم ہے۔ ابن مسعود نے حَبْلُ اللہ کے معنی قرآن کریم



ہی لئے ہیں۔ ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں  
ہے إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّفَاسِ (۱۱۱) جسکے معنی ہیں  
خدا کی ذمہ داری یا لوگوں کی دی ہوئی ذمہ داری۔ اسلئے (۱۰۴) میں بھی  
حَبْلٌ مِّنَ اللَّهِ کے معنی خدا کی ذمہ داری کے ہیں \*۔

لیکن اسکے معنی رستی لیں یا ذریعہ۔ ذمہ لیں یا عہد۔ بات ایک ہی  
ہے۔ خدا سے ہمارا تعلق قرآن کریم کی رو سے ہے۔ یہی وہ رسی ہے جو اسکی  
طرف سے ہم تک آئی ہے اور جس سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہ  
سکتے ہیں (کیونکہ آیت کا اگلا حصہ ہے وَلَا تَقْرَءُوا اور اس سے آگے  
مومنین کو ایک امت بنکر رہنے کی تاکید کی گئی ہے دیکھئے ۱۰۳ : ۱۰۹)  
لہذا حَبْلٌ مِّنَ اللَّهِ کے معنی ہیں وہ نظام اجتماعی جو قرآن کریم کی بنیادوں پر  
قائم ہو اور جسکا مقصد، وحدت، ملت اور اطاعتِ قوانین الہیہ ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ  
مِّنْ حَبْلٍ الْوَرِيدِ (۱۱) ”ہم، انسان سے حَبْلٌ الْوَرِيدِ سے بھی  
زیادہ قریب ہیں“۔ فراء نے لکھا ہے کہ حَبْلٌ اور وَرِيدٌ کے ایک ہی  
معنی ہیں۔ یعنی رگِ جان۔ شدتِ قرب کی بنا پر دونوں الفاظ آئے ہیں \*۔ اس  
”قربِ خداوندی کی تشریح آیت کے پہلے حصہ میں یہ کہہ کر کر دی گئی  
ہے۔ وَنَعْلَمُ مَا تَوَسَّوْنَ بِهِ نَفْسُهُ (۱۱) ”ہم اسکے وساوسِ نفس  
تک سے بھی واقف ہیں“۔ یعنی اہمیں علم الہی کی طرف اشارہ ہے جس پر  
قانونِ مکافاتِ عمل کا مدار ہے۔ انسان کا کوئی عمل، حتّٰی کہ اس کے دل میں  
گذرنے والا خیال تک بھی خدا کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں  
رہ سکتا۔ مَا يَتْلُفُظُ مِّنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۱۲) نے  
اسکی مزید وضاحت کر دی ہے۔ یعنی انسان کی ہر بات پر ایک نگہبان  
(چوکیدار۔ محاسب) موجود ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کے رگِ جان سے بھی قریب تر  
ہونے کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو انسان کے دل میں گذرنے  
والے خیالات کو بھی محیط ہے۔

## ح ت م

حَتْمَةٌ وَحَتْمٌ بِكَذَا - بِحَتْمٍ - حَتْمًا - اس نے کسی بات کا  
فیصلہ کر دیا۔ اسے طے کر دیا۔ حَتْمٌ عَلَيْهِ الْأَمْرُ - اس پر کوئی بات  
واجب اور لازم کر دی۔ أَلْحَاتِمٌ - فیصلہ کرنے والا۔ فیصلہ کو کسی پر واجب  
اور لازم کرنے والا \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے **كَانَ عَلَی رَجُلٍ مِّنْكُمْ حَتَّمًا مَّقْضِيًّا (۱۱)**  
 ”یہ تیرے رب پر لازم ہے۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“  
 ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ کوئی بنیادی لفظ نہیں بلکہ اس میں تاء کاف سے بدلی ہوئی ہے۔ یعنی **حَتَمَ** اصل میں **حَكَمَ** تھا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

## حتیٰ - (حرف)

حتیٰ - حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ”یہاں تک کہ“۔ **قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ (۲۱)**۔ ”انہوں نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ چمٹے رہیں گے تا آنکہ موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آجائے۔“ یعنی اس وقت تک ہم ایسا کئے جائیں گے جب تک.....

(۲) بعض اوقات اس کے معنی ”تا کہ“، بھی ہوتے ہیں۔ جیسے بعض کے نزدیک اس آیت میں آیا ہے۔ **وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (۲۱)**۔ ”اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے تا کہ اگر انہیں اسکی طاقت ہو تو تمہیں تمہارے دین سے بھرا دیں۔“ یعنی ان کے جنگ کرنے کا مقصد یہ ہے۔

(۳) بعض اوقات **إِلَّا** کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ **تاج العروس اور محيط المحيط میں ابن مالک کے حوالہ سے اسکی مثال میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے۔**  
**لَيْسَ الْعَطَاءُ مِنَ الْفَضُولِ سَعَادَةً**  
**حَتَّىٰ تَجُودَ وَمَا لَكَ قَلِيلُ**

ضرورت سے زیادہ مال میں سے کچھ دہدینا سخاوت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ تمہارے پاس جو کچھ مال ہو وہ تھوڑا ہو اور تم پھر بھی سخاوت کرو۔

بعض اوقات یہ **وَ** (اور) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثلاً اس آیت میں۔  
**فَإِذَ الْقَيْمَاتِ الَّذِينَ كَفَرُوا أَفْزَرُوا الْفِرْقَابَ حَتَّىٰ إِذَا أَثْغَنَتْهُمُ هُمُ..... (۲۱)**۔ ”سو جب تم کفار کے مقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارو۔ اور جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو.....“ (اس میں شبہ نہیں۔ کہ یہاں حتیٰ کے معنی تا آنکہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ”اور“ سے بھی معنی واضح ہو جاتے ہیں)۔

(۵) بغض اوقات یہ محض ابتدائے کلام (بات شروع کرنے) کے لئے آتا ہے۔ جیسے حَتَّٰثِیْ اِذَا اَتَوْا عَلٰی وَاْدِ النَّمْلِ ..... (۲۹/۱۸)۔ ”بہر حال۔ غرض، جب وہ وادی نمل میں آئے تو.....“ یعنی حَتَّٰثِی سے ایک بالکل نئی بات شروع ہوئی ہے۔ سابقہ بات سے اسکا تعلق نہیں۔

## ح ث ث

حَتَّٰثِیْ یَسْعٰثِیْ حَتَّٰثِیْ - جلدی کرانا۔ جلدی کا تقاضا کرنا (لگاتار) حَتَّٰثِیْ عَلَیْہِ۔ اسے کسی کام پر ابھارا، اکسایا، برانگیختہ کیا۔ الْحَتَّٰثِیْثُ۔ تیز رفتار۔ اپنے کام میں چست\*۔ قرآن کریم میں لیل و نہار کے متعلق ہے یَطْلُبُہُ حَتَّٰثِیًّا (۲۹/۵۴)۔ یعنی وہ (دن) اس (رات) کے پیچھے نہایت تیزی سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ حریری نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حَتَّٰثِی اور حَضَّ مرادف الفاظ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حَتَّٰثِی چلنے میں جلدی کرائے اور برانگیختہ کرنے کو کہتے ہیں اور حَضَّ دوسرے کاموں پر ابھارنے اور جلدی کرائے کو\*۔

## ح ج ب

حَتَّٰجِبٌ - یَحْتَجِبُ - ڈھانپنا - چھپانا - الْحِجَابُ - وہ چیز جو بطور پردہ کے استعمال کی جائے\*\*۔ وَ بَیِّنَتْہُمْ حِجَابٌ (۲۹/۲۶)۔ ”ان دونوں کے درمیان پردہ ہوگا“۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ایسی روک کے ہیں جو ایک چیز کے دوسری چیز تک پہنچنے میں حائل ہو\*\*\*۔ یعنی اہل جہنم کا عذاب، جنت والوں تک نہیں پہنچ سکتے کا اور اہل جنت کی لذات سے اہل جہنم محروم ہونگے۔ ”محروم“ کے معنوں میں سورۃ تطہیف میں ہے اِنْتَهَمُ عَنْ رَبِّہِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمْ یَحْجُوا یَوْمَ (۸۳/۱۵)۔ ”وہ اس دور میں خدا کے عطایا سے محروم ہونگے“، اپنے اعمال کی وجہ سے۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کا مفہوم منع کرنا اور روکنا ہوتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں۔

الْحَتَّٰجِبُ مِّنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ - چاند اور سورج کا کنارہ جو پہلے پہل نمودار ہو\*\*۔

## ح ج ح

الْحَجَّ - ارادہ کرنا - قصد کرنا - حَجَّجْتُ فُلَانًا - میں نے اسکا قصد کیا - بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی با عظمت شے کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ہیں \* - اسی لئے مسکے معظمہ کا سفر کرنے کے قصد کو حَجَّ کہا جانے لگا - الْحَجَّجَةُ ایسی سال کو بھی کہتے ہیں \* - اسکی جمع حَجَجٌ ہے - سورۃ قصص میں ہے تَمْنِیْ حِجَجٍ (۲۴) یعنی آٹھ سال -

الْحَجَّ کے معنی روکنا بھی ہیں - حَجَّجْتُ عَنْ الشَّيْءِ - اس کو اس چیز سے روک دیا - منع کر دیا - اسی سے اس کے معنی جھکڑا کرنے کے آئے ہیں - الْمُتَحَجِّجَةُ آپس میں ایک دوسرے سے جھکڑا کرنا \* - اسکی اصل یہ ہے کہ جھکڑا کرنے والوں میں سے ہر فریق دوسرے کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے - فَإِنْ حَاجَّوْا كَ (۱۳) ”اگر یہ تجھے تیسرے ارادے سے روکیں“ - نِيز (۸۱) - حُجَّةٌ - دلیل - محیط میں ہے کہ دلیل کو بُيِّنَةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے اور حُجَّةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے فریق مقابل پر فتح حاصل ہو جاتی ہے \*\* -

سورۃ انعام میں قرآنی دلائل و احکام کو الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (۱۵۰) کہا گیا ہے - حج کعبہ کیلئے لفظ حج (۲۶۶) میں آیا ہے - اسی لفظ (۲۶) میں حِجَّ الْبَيْتِ کہا گیا ہے - الْحُجَّاجُ (۱۶) حج کرنے والا -

حج ، عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس اُمت کے مرکز محسوس (کعبہ) میں اس غرض کیلئے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کے رو سے تلاش کیا جائے اور اس طرح یہ اُمت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے - لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲۸) ”تاکہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں“ - نظام کے قیام کے لئے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں - غور کیجئے - قرآن نے اُس زمانے میں مشاورتی نظام (۲۲۸) اور اس کے لئے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی اور بادشاہ کو ”ایشور کا اوتار“ اور

خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی۔ صلوة کے مقامی اجتماعات سے لیکر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ امت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوع انسان کی بہبود کے سامان و ذرائع پر غور کریں۔ (مزید تفصیل ”قبلہ“ کے عنوان میں ملیگی)

## ح ج ر

حَجَرٌ۔ پتھر (جمع أَحْجَارٌ و حِجَارَةٌ) (ح) کی تینوں حرکات زیر زیر پیش کے ساتھ) منع کرنا۔ روکنا۔ حفاظت کرنا۔ حِجْرٌ أَسْحَبُ رَأً (۲۵) کے معنی روک کے ہیں۔ حَجْرَةٌ۔ اونٹوں کا ہاڑہ۔ کمرہ۔ جمع حَجَرَات (۳۹) الْحِجْرُ۔ عقل جو انسان کو روکتی ہے (۸۹)۔ نواب صدیقی حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کے معنوں میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائے گا\*۔

حِجْرٌ۔ قوم ثمود کی بستیوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ پہاڑوں میں پتھر تراش تراش کر بنائی گئی تھیں۔ حَنْجَرَةٌ۔ حلق۔ اسکی جمع حَنْجَائِرٌ ہے۔ (۳۳۷ ; ۱۸)۔ حَجَرٌ۔ سونے اور چاندی کو بھی کہتے ہیں۔ اور ایسے آدمی کو بھی جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو\*۔

قرآن کریم میں النار کے متعلق ہے کہ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲۰)۔ ”جسکا ایندھن انسان اور پتھر ہیں“۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہوں جیسے پتھر۔ انہی کے متعلق ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً (۲۱)۔ ”پھر اسکی بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، سو وہ پتھر کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر“۔ یعنی جن میں سمجھنے سونچنے اور اثر پذیری کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ یا جن کی صلاحیتوں کی نشو و نما رک چکی ہے۔ یا، النَّاسُ کے معنی ہونگے عام لوگ (جو بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں) اور حِجَارَةٌ کے معنی ہونگے وہ چالاک اور ہوشیار لوگ جو لیڈر بن کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ غلط راستے پر چلنے والے عوام اور خواص (لیڈر اور ان کے متبعین) سب جہنم میں ہونگے۔ اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہو جاتی ہے (مثلاً ۱۲۱ ; ۳۳۷) اور اگر اسکی معنی سونے چاندی کے لئے جائیں تو اسکی معنی ہونگے سرمایہ

ہرستی جو ایک جہنمی معاشرہ پیدا کر دیتی ہے ، کیونکہ سورۃ توبہ میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی رہویت کیلئے کھلا نہیں رکھتے تو اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے انکی پیشانیوں پر اور پشت پر داغ دیا جائیگا (۳۵-۳۴)۔ لہذا جہنم کا ایندھن سرمایہ ہرست اور انکی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں۔ لیکن اگر (۲۵) میں اَلنَّارُ کے معنی جنگ کے لئے جائیں (دیکھئے ہنوان ن۔ و۔ ر) تو اَلْحِجَارَةُ کے معنی ہونگے وہ پتھراؤ جو اُس زمانہ میں مخالفین پر کیا جاتا تھا (جیسا کہ سورۃ فیل میں ۱۵ آیا ہے)۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ تم لوگ جب علم و بصیرت کی رو سے بات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تو اسکا نتیجہ جنگ ہوگی جو انسانوں کے ہاتھوں سے اور ان پتھروں کے ذریعوں سے بھڑکائی جائیگی جو فریق مخالف کی تباہی کیلئے ہمسائے جاتے ہیں۔ یہ جنگ ، نظام خداوندی کی حاصل جماعت اور مخالفین کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور مخالفین کی باہمی جنگ بھی (جس کیلئے دیکھئے ۶۵ : ۱۳۴ : ۸۲-۸۳)۔ نظام خداوندی کی حاصل جماعت کو جنگ اسلئے کرنی پڑتی ہے کہ دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ ہو جائے (۴۴)۔

سورۃ انعام میں ہے حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا (۱۳۹)۔ یعنی ممنوع۔ جسکے کھانے کی ہام اجازت نہ ہو۔

حِجْوَرٌ کے معنی ہیں حفاظت۔ (۴۳)۔ حِجْرٌ کے معنی گود بھی ہیں۔\*

## ح ج ز

حَجَزَةٌ۔ يَحْجِزُهُ۔ حِجَازَةٌ۔ منع کرنا۔ روک دینا۔ اصل میں حَجَزَ التَّبَعِيْرُ کے معنی ہوتے ہیں اونٹ کو بٹھا کر اس کی ٹانگوں کے نچلے جوڑوں کو رسی سے باندھ کر اس رسی سے اسکی کمر باندھ دینا تاکہ وہ ہل نہ سکے اور اسطرح اسکی پشت کے زخم کا علاج کیا جاسکے۔ اَلْحِجَازُ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کو اسطرح باندھا جائے۔ کمر بند کو بھی کہتے ہیں۔ حِجَازٌ کو اسلئے حِجَازٌ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ نجد اور تہامہ کے درمیان روک ہے۔\*\*

الْحَجَّزُ - دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان حائل ہونا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں حَاجِزاً (۲۹) کا لفظ روک کیلئے آیا ہے۔ دوسری جگہ حَاجِزِیْن (۱۹) آیا ہے جسکے معنی روکنے والے یا منع کرنے والے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائیگا۔

## ح د ب

الْعَدَبُ - سینہ اور پیٹ کا اندر گھس جانا اور کمر کا کوہ نکل آنا۔ حَدَبٌ یَّحْدَبُ حَدَبًا کَبْرًا ہو جانا۔ اَلْحَدَبُ - بلند (مرتفع) زمین\*\*۔ زمین کا سخت اور بلند حصہ\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بلند ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں یا جوج و ماجوج کے متعلق ہے وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَنْتَسِبُونَ (۲۱)۔ ”وہ سطح مرتفع (بلند زمین) سے نہایت تیزی سے اچھل کر نکل پڑینگے“۔ اسکی تشریح کیلئے عنوان (ا-ج-ج) میں لفظ یَاجُوجُ دیکھئے۔

## ح د ث

الْحَدِیْثُ - قدیم کی ضد ہے۔ نئی بات۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عدم سے وجود میں آنے کے ہیں۔ حَوَادِثُ - نئے نئے واقعات جو سامنے آتے رہیں۔ اَلْحَدَاثُ - شروع سال میں ہونے والی بارشیں۔ حَدِیْثُ السَّیْنِ - کم عمر نوجوان۔ اَحْدَثَهُ - اس نے کسی کام کو (جو پہلے نہیں تھا) پہلی بار کیا۔

اَحْدَاثُ - وجود میں لانا۔ اَلْمُحَدَّثُ - صادق اور سچا آدمی۔ اَلْمُحَدِّثُ - حدیث بیان کرنے والا\*\*\*\*۔ مُحَدَّثٌ - جو قائم بذاتہ نہ ہو\*\*\*۔ نئی رونما ہونے والی بات۔ جو بات پہلی بار وجود میں آئے۔ جس کی پہلے نظیر نہ ہو۔ نیز جس بات کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو۔ قرآن میں مُحَدَّثٌ کا لفظ انہی معنوں میں آیا ہے (۲۱؛ ۲۱)۔

سورة کہف میں ہے اُحْدِثْ لَكَ (۱۸)۔ ”میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات کروں،“۔ سورة طہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے یُحْدِثْ لَہُمْ ذِکْرًا (۲۱۳)۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہ قرآن کریم لوگوں کو رفعت و بلندی عطا کر دیگا۔ (دیکھئے عنوان ذ۔ ک۔ ر) اور یہ بھی کہ یہ ان کے سامنے نصیحت کی باتیں یا اقوام عالم کے تاریخی نوشتے لائیکا جس سے ان کی سمجھنے کی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ دونوں صورتوں میں اُحْدِثْ کے معنی وجود میں لانے کے ہیں۔ سورة الضحیٰ میں ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (۱)۔ یہاں تَحْدِثْ کے معنی ہیں عام چرچا کرنا۔ ”تو اپنے رب کی نعمتوں کا عام چرچا کرتا رہ،“۔ اَحَادِیْثُ۔ \*\* (واحد حدیث) قصے۔ داستانیں۔ باتیں۔ (۱)۔ افسانے (۲)۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ابن فارس نے کہا ہے حَدَّثَ کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے موجود نہ تھی۔ اسی سے اَلْحَدِیْثُ ہے کیونکہ وہ ایسی بات ہوتی ہے جس سے ایک کے بعد دوسری بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے بات میں سے بات نکلتی جاتی ہے۔ افسانہ در افسانہ۔

شرعی اصطلاح میں اَلْحَدِیْثُ اس قول یا عمل کو کہتے ہیں جسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔ (واضح رہے کہ حدیث کی تفصیلی تعریف طویل ہے۔ ہم نے اسے یہاں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے)۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا۔

## ح د د

اَلْحَدِّدُ۔ اس مادہ میں اصلی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں\*۔ حَدَّ الرَّجُلِ عَنِ الْاَمْرِ۔ آدمی کو اس معاملہ سے روکا۔ منع کیا۔ حَدَّ دُتْ فُلَانًا عَنِ الشَّيْءِ۔ میں نے فلان کو شے سے روکا۔ اَلْحَدِّدُ۔ روک۔ رکاوٹ۔ ہذا اَمْرٌ حَدَّ دُ۔ یہ امر ممنوع ہے۔ اَلْحَدِّدُ۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے معیز کرنا۔ نیز وہ شے جو دو چیزوں کے درمیان فصل بن جائے تاکہ ایک چیز دوسری چیز سے مل نہ جائے۔ یا ایک چیز دوسری چیز تک پہنچ نہ جائے اَلْحَدِّدُ۔ لوہا۔ کیونکہ یہ اپنی سختی کی وجہ سے روک بن جاتا ہے (خصوصاً دشمن سے)۔ نیز تیز یا آرہار ہو جانے والی چیز کو بھی کہتے ہیں۔ حَدَّ۔ دھار تیز کرنا۔ الْمُحَادَّةُ۔ آپس میں دشمنی کرنا، اور ایک دوسرے کی مخالفت

\* محیط۔ \*\* نراء کے نزدیک احادیث در اصل اُحد و ثد کی جمع ہے جو قہاس کے مطابق ہے لیکن بعد میں یہ حدیث کی جمع بن گئی۔



کرنا۔\*۔ دراصل اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو روکنے اور باز رکھنے کی کوشش کرنا۔ سورۃ احزاب میں تیز زبانی (یا طعن و تشنیع) کیلئے بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ آیا ہے (۳۳/۱۹) اس میں حَدَاد، حَدِيد کی جمع ہے یعنی تیز زبانوں سے۔ سورۃ ق میں ہے قَبَصْرٌ كَتَّ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۱۰۴/۲۴)۔ جسکے معنی ایسی نگاہ کے ہیں جو حقیقت پر بڑے ہوئے پردوں سے آرہا گزر کر سب کچھ دیکھ لے۔ جسکے سامنے چھپی ہوئی چیزیں آجائیں۔ اس میں ظہور نتائج کے وقت کی کیفیت کا ذکر ہے جب نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ وہ اعمال کے اندر چھپے ہوئے نتائج و ہواقب کو بے نقاب دیکھ لیں گی۔ سورۃ الحديد میں کتاب (ضابطہ قوانین) کی عملی تنفیذ کیلئے حَدِيدٌ (فولاد) کے نازل کرنے کا ذکر ہے جسکے معنی نوت (یا شمشیر) کے ہیں۔ (۱۰۴/۲۵)۔ سورۃ مجادلہ میں ہے إِنَّ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (۱۸/۵۸)۔ اسکے معنی مزاحمت کرنے کے ہیں۔ یعنی جو لوگ قانونِ مملکت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں قوانینِ خداوندی کیلئے متعدد مقامات پر آیا ہے تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا (۲/۱۸۷)۔ ”یہ اللہ کی حدود ہیں جن کے قریب مت جاؤ“۔ قوانینِ الہیہ کو حُدُودُ اللَّهِ سے تعبیر کرنے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآنِ کریم نے (عام طور پر) صرف اصولی احکام دئے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں۔ قرآن کے اصول تو غیر متبدل رہینگے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی قوانین بنائے جائیں گے وہ حالات کی تبدیلی کیساتھ بدلتے رہینگے۔ اس طرح انسان کو غیر متبدل حدود کے اندر سعی و عمل کی پوری آزادی رہتی ہے، جس طرح کھیل کے میدان میں چند لکیروں اور ضابطوں کے اندر ٹیم کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق کھیلے۔ لہذا قرآن ایک ایسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسان، مستقل اقدار اور تبدیل ہونے والے تقاضے، دونوں کا ساتھ دیتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی آزادی کو قاطبۂ سلب کرتا ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت پر غیر متبدل پابندی عائد کر دے، اور نہ ہی اسے ایسا بے زمام چھوڑتا ہے کہ وہ مستقل اقدار کی پابندی سے بھی بے نیاز ہو جائے۔ یہ ہے مقصد حُدُودُ اللَّهِ کا۔ لیکن ہم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اپنے لئے ایسے جامد احکام وضع کر رکھے ہیں جس سے اسلام ایک زندہ حرکت بننے کے

بجائے منجمد اور متعجز نظریات و رسمیات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا۔

چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین۔ ”حدود اللہ“ قوانین کی وہ آفریں حریف یا سرے میں جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

## ح ذ ق

الْحَدَقَةُ - آنکھ کی سیاہی جو پتلی کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی چیز کا احاطہ کرے، اُسے اپنے گھیرے میں لے لے۔ حَدَقُوا ابہ، يَحْدِقُونَ۔ انہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنی گولائی کے ساتھ گھیرے میں لے لے، اس کے لئے أَحْدَقَ یہ کہتے ہیں۔ آنکھ کی سیاہی کی نسبت سے حَدَرِيقَةُ وادی کے اس گڑھے کو کہتے ہیں جو پانی کو اپنے اندر جمع کر لے۔ یا ہر نشیبی زمین کو جس میں پانی رک جائے۔ اسی طرح حَدَرِيقَةُ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف دیوار ہو۔ جس کے گرد دیوار نہ ہو اسے حَدَرِيقَةُ نہیں کہتے۔ نیز اس میں گھاس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر گھاس نہ ہو تو اسے رَوْضَةُ کہیں گے۔ اس کی جمع حَدَائِقُ ہے۔ قرآن حکزیم میں حَدَائِقُ ذَاتِ بَهْجَةٍ (۲۶) آیا ہے۔ یعنی خوشنما باغات۔ یہاں اس سے مراد عام باغات ہیں۔

## ح ذ ر

حِذْرٌ - حَذَرٌ - خوف زدہ کرنے والی چیز سے بچنا۔ محتاط رہنا۔ اجتناب کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بچاؤ اور چوکنا رہنے کے ہیں۔ چنانچہ رَجُلٌ حَذِرٌ، اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت احتیاط کی وجہ سے جاگتا رہے۔ اَبْنٌ أَحْدَرٌ، اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی محتاط ہو۔ حَذَرَ حَذَرَ کے معنی ہیں۔ بچو، بچو۔ \*\*۔ الْحَذَرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہتھیار لگا کر جنگ کیلئے بالکل مستعد ہو۔ اس کی جمع حَذَرٌ رُوْنٌ ہے۔ وَ لَئِنَّا لَجَمِيعٌ حَذِرٌ رُوْنٌ (۲۶) کے معنی اسلحہ بند لشکروں کے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا (۱۴) کے معنی ہیں خدا کا عذاب (یعنی انسان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ) فی الواقعہ ایک ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ سورۃ

بقرہ میں فَاحْذَرُوْهُ (۲/۳۵) کے معنی ہیں قانون خداوندی کی نگہداشت اور پاسداری رکھو۔ سورۃ زمر میں بندہ مومن کے متعلق ہے يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (۳۹/۱) وہ آخرت (مستقبل) کی زندگی کی نگہداشت رکھتا ہے۔ سورہ مائدہ میں فَحْذَرُوْهُ کے مقابلہ میں فَاحْذَرُوْا آیا ہے (۳/۳۹) جس کے معنی کسی شے سے محترز رہنے کے ہونگے۔ سورۃ بقرہ میں حَذَرَ الْمَوْتِ (۲/۱۹) کے معنی ہیں موت سے بچنے کی خاطر۔ سورۃ نساء میں حَذُّواْ حِذْرَكُمْ (۴/۲۹) میں تمام حفاظتی تدابیر آ جاتی ہیں، بیدار مغزی کے ساتھ۔

حَذَرَهُ تَحْذِيرًا اسے چوکنا کیا، خبردار کیا۔ محتاط رہنے کے لئے کہا۔ حَذَرَهُ مِّنْ اَمْرٍ يَّا حَذَرَهُ الْاَمْرُ۔ اس نے اُسے اُس بات سے محتاط رہنے کے لئے کہا (یا تاکید کی)۔ قرآن کریم میں ہے يَحْذَرُكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۳۸/۳) ”خدا تمہیں اپنے (قانون، مکافات کے حواقب سے) محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر یوں کہی گئی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۱۴/۵) ”یقیناً تیرے رب کا عذاب (غلط اعمال کے نتائج) ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

## ح ر ب

الْحَرْبُ\*۔ صاحب محیط کے نزدیک اس مادہ میں اصل معنی ویرانی۔ تباہی و بربادی۔ تلف۔ سلب و نہب کے ہیں\*۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے الْحَرْبُ\*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھیننے کے ہیں۔ یہ لفظ مِلْم\* (اسن و صلیح) کی ضد ہے۔ یعنی لڑائی\*\*۔ حَارَبَهُ\*۔ اس سے لڑائی کی، نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے\*\*۔ چنانچہ لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهٗ (۱۶۱/۱)۔ یا۔ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۲۳/۳۳) میں اسکے معنی سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں\*\*۔ حَرْبٌ\*۔ جنگ (۲/۲۹)۔ اَلْمِحْرَابُ\*۔ بالا خانہ۔ بلند جگہ۔ صدر مکان۔ نیز محلات (بحوالہ کتاب الاشتقاق) کیونکہ ایسی اونچی جگہیں دراصل حرب ہی کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ جیسے قلعوں کی ہرجیاں وغیرہ۔ مَحَارِبُ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ\*۔ بنی اسرائیل کی مساجد جن میں وہ امور حرب کے متعلق مشورے\*\*\* کیا کرتے تھے\*\*۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے

\* محیط۔ \*\* تاج۔ \*\*\* قرآن میں مسلمانوں کے متعلق بھی اقامت صلوات کے ساتھ و ابرہم شوریٰ بینہم آیا ہے (۲۴/۳۸) یعنی وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ اس سے مساجد اور مشاورت کا تعلق ظاہر ہے۔

کہ میحْرَاب ہیکل میں اس مقام کو کہتے تھے جہاں قربانیاں دی جاتی تھیں۔ یعنی قربانگاہ۔ حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے **هُوَ قَتَائِمٌ بِصَلَاتِي رَفِيٍّ** المِیْحْرَابِ (۳۸)۔ ”وہ قربانگاہ میں کھڑا مصروفِ صلوة تھا“۔

سورۃ سبا میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کیلئے مَسْحَارٌ یُسَبُّ تیار ہونے تھے (۳۳/۱۳) اسکے معنی مضبوط قلعے یا محلات بھی ہو سکتے ہیں اور ہیکل (مساجد) بھی۔

## ح ر ث

الْحَرُثُ کے بنیادی معنی ہیں کچھ کمانا۔ کسب و ہنر کرنا۔ اسکے بعد یہ لفظ زمین پر کام کرنے کیلئے عام ہو گیا۔ چنانچہ حَرُث کے معنی ہیں کھیتی باڑی کرنا۔ چونکہ کام کرنے اور کمانے کیلئے تگ و تاز اور فکر و تجسس کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے حَرُث الشَّقِیُّ کے معنی ہیں اس نے اس بات میں ترقہ حاصل کر لیا۔ اَلْحَرُثُ کے معنی ہیں آگ کو حرکت دینا تاکہ وہ زیادہ روشن ہو جائے۔ اَلْمِیْحْرَاثُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے آگ کریدی جائے\*۔ قرآن کریم نے ہورتوں کو حَرُث (کھیتی) سے تشبیہ دی ہے۔ (۲۳/۲۳) اس لئے کہ وہ افزائشِ نسلِ انسانی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے میان بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصود کیا ہے۔ یعنی افزائشِ نسل۔ (مزید تفصیل ح۔ ص۔ ن اور س۔ ف۔ ح کے ہنوانات میں ملیگی)

سورۃ واقعہ میں تَحْرُثُ تُسَوِّنُ (۵۶/۱) کے معنی ہیں تخم ریزی (یعنی زمین میں بیج ڈالنا)۔ اور اسکے بعد تَزْرَعُونَ (۵۶/۲) کے معنی ہیں کھیتی کا زمین سے اُگنا۔ حَرُث نو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لیکن زَرْع خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان زمین میں بیج ڈال سکتا ہے۔ اُس بیج کو زمین سے اُگنا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ فرد متعلقہ کی محنت اور خدا کے وہی عطیہ دونوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں سے فرد متعلقہ صرف اپنی محنت کا حقدار ہو سکتا ہے۔ وہ موہبتِ خداوندی کا سالک نہیں بن سکتا۔ تفصیل کے لئے میری کتاب نظام ربوبیت دیکھئے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ حَرُث نَاقَتَہ کے معنی ہیں اس نے اپنی اونٹنی کو لاغر کر دیا۔ غالباً تگ و تاز اور محنت کی بنا پر یہ معنی لئے گئے ہیں۔

## ح ر ج

الْحَرَجُ - دراصل چیزوں کو اس طرح جمع کرنے کو کہتے ہیں جس سے تنگی نظر آنے لگے۔ بعینہ جگہ کم ہو اور چیزیں زیادہ ہوں تو وہ جگہ تنگی نظر آنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں بہت ہی گھنے درخت ہوں\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے یہ لفظ اضطراب، بے اطمینانی اور شک کے معنوں میں استعمال ہونے لگا\*۔ جو کام دل کی کشادہ سے نہ کیا جائے اس کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ حَرَجَ الشَّجْلُ أَنْيَابَهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے دانت پیسے\*۔ لَا حَرَجَ عَلَيْكَت - تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں\*\*۔ اسی سے یہ لفظ گناہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے\*\*\*۔

اصل یہ ہے کہ جن الفاظ میں حَاء اور رَاء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ حَرَجٌ میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے\*\*\*\*۔

سورۃ نساء میں ہے کہ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کی اطاعت اس طرح کریں کہ لَا يَتَّخِذُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴/۵۷)۔ ”وہ اس اطاعت سے اپنے دل میں ذرا سی بھی کبیدگی محسوس نہ کریں“۔ سورۃ نور میں یہ لفظ قابل اعتراض بات کے معنوں میں آیا ہے (۲۴/۲۱)۔ سورۃ حج میں ہے وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۲/۱۸)۔ ”اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی“۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دین زبردستی قبول نہیں کرایا جاسکتا۔ اسے بہ طیب خاطر اختیار کیا جائیگا۔ لَا اكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶)۔ اور یہ معنی بھی کہ دین میں جن قوانین کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ تم سے کوئی بیگاری جاتی ہے۔ بلکہ یہ اس لئے ہے کہ خود تمہاری ذات میں وسعت اور استحکام پیدا ہو۔ لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ ”اللہ کسی نفس کو کسی کام کے لئے مکلف نہیں ٹھہراتا بجز اس کے کہ اس سے مقصد خود اس ذات (نفس) میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے“۔ بآد رکھئے۔ ”دین میں تنگی نہیں“ سے مراد یہ نہیں کہ آپ دین (نظام) کے اندر بھی رہیں اور اس کے بعد جن باتوں میں آسانی محسوس کریں انہیں ملائیں اور جن میں کچھ گرائی نظر آئے انہیں بہ کھکر چھوڑ دیں کہ دین میں تنگی نہیں۔ جب تک آپ اس نظام کے اندر ہیں

اسکے تمام قوانین و ضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہوگا۔ جسوقت آپ اسمیں تنگی محسوس کریں اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائیں۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے نظام کے ہر حکم اور ضابطہ کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ جبر نہیں بلکہ ایسی پابندی ہے جسے انسان خوش دلانہ اور رضاکارانہ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ یعنی اس کا بہ طیب خاطر دین قبول کر لینا اس امر کا اقرار ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ پابندیوں کو اپنے اوپر لازم قرار دینگا۔ دین میں تنگی نہ ہونے سے یہ مراد ہے۔

## ح ۲۲

حَرَدٌ - يَحْرُدُ - حَرْدًا اس نے اسکا قصد کیا۔ اس نے اسے روکا اور منع کیا۔ الْحَرْدُ کے معنی الگ تھلگ رہنے کے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ارادہ کرنا (۲) غصہ ہونا اور (۳) ایک طرف کو ہو جانا، ہیں۔ رَجُلٌ حَرْدٌ - الگ رہنے والا آدمی - غضبناک آدمی کو بھی کہتے ہیں \*۔ قرآن میں باغ والوں کی مثال کے ضمن میں کہا ہے وَغَدَوْا عَلَى حَرْدٍ قَادِرِينَ (۳۸) - اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل پر قادر تھے۔ اور یہ بھی کہ وہ اسکی قوت رکھتے تھے کہ شریکوں اور مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔ سباق عبارت کی رو سے دوسرے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔

فواب صدیق حسن خاں نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں حَاء اور رَاء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوتا ہے۔ مثلاً الْحَرْدُ - غضب اور غصہ۔

## ح ۲۲

الْحَرْدُ - الْحَرُورُ - الْحَرَارَةُ - گرمی - الْحَرُورُ - (دھوپ کی) تپش (قرآن میں یہ لفظ ظیل کے مقابلہ میں آیا ہے ۳۸) - الْحَرُورُ - ریشمی کپڑا (۹۶) - راغب نے لکھا ہے کہ ہر باریک کپڑے کو حَرِيرٌ کہتے ہیں۔ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس انداز سے خالص ہونا کہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو \*\*۔

الْحَرْدُ - عُبْدٌ کی ضد ہے۔ مرد آزاد بمقابلہ غلام۔ ہر چیز کا بہترین حصہ۔ عمدہ گھوڑا۔ عام زمین اور ریشمی زمین میں سے بہترین زمین۔

”حَشْرٌ كُلٌّ اَرْضٍ - ہر زمین کا بہترین حصہ - مَا هَذَا مِنْكَ يَحْشُرُ -  
یہ بات تمہاری طرف سے اچھی نہیں ہے \*

”حَقْرٌ - يَحْشُرُ - آزاد ہونا - اَلْتَّحْشُرُ يَحْشُرُ - (بائندی اور غلام کو) آزاد  
کرنا - تَحْشِيرُ الْكِتَابِ میں اگرچہ تحریر کے معنی اس اعتبار سے آزاد  
کرنا ہو۔ مکتے ہیں کہ انسان اپنے خیالات کو ذہن کی قید سے آزاد کر کے صفحہ  
قرطاس پر لے آتا ہے لیکن صاحبِ تاج کے خیال میں اس سے مراد کتاب کے  
حروف کو خوبصورت بنانا اور اس کے اغلاط کو درست کرنا ہیں۔ یعنی بہتر  
بنانا۔ \*

”تَحْرِيرُ الْوَقْدِ - کسی بچہ کو معبد یا خانقاہ کی خدمت کے لئے وقف  
کر دینا - سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے کہا تھا  
اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ ”مَحْقَرًا“ (۳۳)۔ ”جو کچھ میرے پیٹ  
میں ہے اسے میں نے معبد کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی منت مانی ہے، اس  
میں ”مَحْقَرٌ“ کے یہی معنی ہیں۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ بچہ اپنی  
ساری عمر اس خدمت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یعنی وہ عمر بھر کے لئے کنیسہ  
کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اب بھی عیسائیوں کی (Nuns)  
کو عمر بھر غیر شادی شدہ رہ کر اپنے آپ کو کلیسا کی خدمت کے لئے وقف  
رکھنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے وہ تمام مقامات واضح ہو  
جاتے ہیں جن میں یہودیوں نے حضرت مریم کو مورد طعن و تشنیع بنایا تھا۔  
حضرت مریم کو کنیسہ کی خدمت کے لئے بطور (Nun) وقف کر دیا گیا تھا۔  
معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت مریم کی والدہ نے انہیں ہیکل کی نذر کیا  
تھا اس وقت ابھی ہیکل کے دستور میں یہ چیز داخل نہیں تھی کہ ہیکل کی  
خدمت گار لڑکی کو عمر بھر تعبد کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ یہودیوں نے بعد  
میں یہ قاعدہ وضع کر لیا (جو پھر عیسائیوں میں بھی جاری رہا۔ اور اب تک  
جاری ہے) حضرت مریم نے خدا کے حکم کے مطابق (انسانوں کے اس خود  
ساختمہ مستبد) قاعدے کو ٹھکرائے ہوئے شادی کر لی اور خانقاہ کو چھوڑ کر  
تاهل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ یہودیوں کے خود ساختمہ ضابطہ  
خانقاہیت کی رو سے ان کا یہ عمل بہت بڑا جرم تھا اور ”دین“ سے سرکشی  
کے مرادف۔ اس لئے یہودیوں کے احبار و رہبان ان کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ تھا  
حضرت مریم کا جرم۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”شعلہ“ مشور، میں  
ملے گی)۔

## ح ر ص

حَرَسَهُ - يَحْرِسُهُ - وَيَحْرُسُهُ - اس نے اس کی حفاظت کی -  
 الْحَرَسَةُ - سرکاری چوکیدار اور محافظ - حَرَسَ الرَّجُلُ - اس آدمی نے  
 چوری کی - الْحَرِيسَةُ - مسروقہ شے - \*

قرآن کریم میں ہے حَرَسًا شَدِيدًا (۲۸) یعنی سخت پھرے  
 دار - حَرَسَ اور حَرَسَ - حَرَسَ کی جمع ہے جس کے معنی کسی  
 جگہ کے محافظ کے ہیں - حَرَزَ ، سامان کی حفاظت کو کہتے ہیں اور حَرَسَ  
 جگہ کی حفاظت کو - \*\*

اس میں سختی اور مشقت کا پہلو مضمر ہوگا کیونکہ اس لفظ میں  
 حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں - اور یہ ان کا خاصہ ہے \*\*\* -

## ح ر ص

الْحَرَصُ کے معنی ہیں کسی چیز میں چھید کر دینا - کسی چیز کو  
 بھاڑ دینا یا چھیل دینا - جس طرح دھوبی کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اس  
 میں سوراخ کر دیتا ہے یا بھاڑ دیتا ہے - چنانچہ ثَوْبٌ حَرَرِيصٌ اس طرح  
 بھاڑے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں - الْحَارِصَةُ - اس بادل کو کہتے  
 ہیں جو اہنی بارش سے زمین میں سوراخ کر دے - یا اس کی بالائی سطح کو  
 کھرچ دے - الْحَرَصَةُ - تھنوں کا اس طرح پھٹ جانا کہ دودھ کی دھاریں  
 منتشر ہو کر برتن میں گریں \*\*\*\* -

ان بنیادی معانی کے پیش نظر حِرْصٌ ایسی شدید آرزو کو کہتے ہیں  
 (خواہ وہ اچھی چیز کی ہو اور خواہ بری چیز کی) جو دل کے آر پار ہو جائے -  
 دل میں نہ ٹھہرے اور اس کا بار بار اظہار کیا جائے - یعنی نہایت شدید  
 خواہش - \* ابن فارس نے بہ دونوں اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَلَتَجِدَنَّ فِيهِمْ أَصْرًا كَثِيرًا مِّنْ عَٰلِي حَبْلَةٍ  
 (۲۶) ”تو دیکھیگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہنے کی خواہش بہت  
 زیادہ ہے“ - دوسری جگہ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے - حَرَرِيصٌ عَلَيْكُمْ  
 (۱۳۸) - ازہری نے کہا ہے کہ حَرَرِيصٌ عَلَيْكُمْ کے معنی اہل حرب کے  
 نزدیک حَرَرِيصٌ عَلَيْكُمْ تَفْعِيكَ ہونے ہیں - یعنی اس کے دل میں



تمہاری منفعت کی آرزو نہایت شدید ہے۔ یعنی عَمَزَ يَزْ عَلَيَّهِ مَا عَنِتُّمْ (۱۶۸) ”جو تمہیں دکھ پہنچتا ہے وہ اس پر شاق گزرتا ہے“ منفيانہ پہلو ہے، اور حَرَّ يَضْ عَلَيَّكُمْ ”وہ تمہاری منفعت کی شدید آرزو رکھتا ہے“ اس کا مثبت پہلو۔

## ح ر ض

الْحَرَضُ\*۔ بگاڑ۔ خواہ جسم میں ہو خواہ عقل میں\*۔ تھکا ہوا کمزور آدمی جو بالکل تباہی کے قریب ہو نیز جسے غم و عشق نے گویا ڈالا ہو (۱۷۳)\*۔ ناقابل اعتناء چیز جس میں کوئی خوبی باقی نہ رہ گئی ہو\*\*\*۔ الْحَرَضُ\*۔ جو شخص بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نڈھال ہو چکا ہو۔ اور ازکار رفتہ\*۔

راغب نے کہا ہے کہ تَحَرُّرُ يَضْ کے معنی اِزَالَةُ الْحَرَضِ کے ہیں۔ یعنی کسی کی کمزوری، لاغری یا خرابی کو دور کر دینا۔ جیسے مَرَضُئْتَهُ کے معنی مرض دور کرنے کے ہوتے ہیں\*\*\*۔ لہذا حَرَضُ کے معنی ہیں کسی شخص کو ایسے کام کے لئے ہرانگیختہ کرنا جو اس کے لئے حیات بخش ہو اور اگر وہ ایسے نہ کرے تو اسکی ہلاکت کا خوف ہو۔ قرآن میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے وَحَرَضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (۱۷۵)۔ اس کے عام معنی ہیں ”تو انہیں جنگ کیلئے ہرانگیختہ کر“۔ لیکن اس کے اصلی معنی ہونگے تو ان مومنین (یعنی اپنے رفقاء) کی تمام کمزوریوں اور کمیوں کو دور کر دے تاکہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اسی کا نام تزکیہ ہے۔ وَ يَزَكِّيهِمْ (۱۷۴) یعنی نشوونما دینا۔ بالیدگی اور نمو پیدا کرنا۔ کمزوری اور کمی کو رفع کرنا اس پر وگرم کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔

## ح ر ف

حَرَفٌ\*۔ کسی چیز کا سرا، کنارہ یا حد۔ حَرَفُ الْجَبَلِ۔ پہاڑ کا اوپر کا حصہ جو ایک طرف کو نکلا ہوا ہو۔ فُلَانٌ عَلَيَّ حَرَفٌ مِّنْ أَمْرِهِ۔ وہ شخص اپنے معاملہ میں ایک کنارہ پر کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ جس طرف جائے میں اسے فائدہ نظر آئے اسی طرف چلا جائے\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَ مِّنَ النَّفَاسِ مَن يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَيَّ حَرَفٍ (۲۲۱)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کے معاملہ میں ایک

کنارہ پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت میں فائدہ ہو تو پیوں کر لیا جائے اور اگر انہیں چھوڑنے میں فائدہ نظر آئے تو چھوڑ دیا جائے۔ حَرَفَ الشَّيْءُ عَنْ وَجْهِهِ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے پھیر دیا۔ بدل دیا۔ اَلْتَحَرَّفَ يَتَحَرَّفُ - تغیر و تبدیل کر دینا۔ خواہ یہ لفظی ہو خواہ معنوی۔ قلم پر لڑھا قلم لگانا۔ اِنْحَرَفَ - ایک کنارہ کی طرف جھک جانا، ٹیڑھا ہو جانا۔ \* بَحَرَفْتُوْنَهٗ مِّنْ بَعْدِ مَا عَقَلْتُوْهُ (۲/۲۵)۔ ”کلام اللہ کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تغیر و تبدیل کر دیتے ہیں۔“

حَرَفَ لِعِيَالِهِ - اس نے اپنے اہل و عیال کیلئے کمائی کی \*۔ اَلْحِرْفَةُ - صنعت اور پیشہ جس سے انسان اپنی معاش پیدا کرے۔ حَرَفَ يَفْكُكْتَ تمہارا ہم پیشہ \*\*۔ (ہم پیشہ لوگوں میں باہمی چشمک کی وجہ سے یہ لفظ ہمارے ہاں مد مقابل یا دشمن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)۔ اَلْمُحَارَفُ - وہ شخص جو حصول معاش کیلئے بڑی محنت کرے لیکن اسکے باوجود اسکی آمدنی اسکے اہل و عیال کے گزارہ کیلئے کافی نہ ہو \*\*۔ اَلْمُحَرَّفُ - وہ شخص جس کا مال جاتا رہا ہو \*\*۔ لہذا تعریف کے معنی - طرح کی توجیہ و تاویل کرنا ہونگے جس سے اس کی وہ روح جاتی رہے جو دراصل اس کا راس المال ہے۔ خواہ یہ تعریف، الفاظ کے رد و بدل سے ہو یا مفہوم کی تبدیلی سے۔ اہل کتاب نے اپنی آسانی کتابوں میں جو تعریف کی ہے اس کے متعلق سورۃ نسا میں ہے يَحَرِّفُوْنَ اَلْكَلِمَ عَنْ مَّقَوِّمِهِ (۴/۲۶) ”وہ کلمات کو ان کے مقاصد سے ہٹا دیتے ہیں“۔ نیز (۱۱/۲۶)۔ اس سے تعریف لفظی بھی مراد ہو سکتی ہے اور تعریف معنوی بھی۔ اور سورۃ بقرہ میں ہے يَتَكَلَّبُوْنَ اَلْكِتَابَ يَاْبُدِّيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ... (۲/۲۶) ”یہ لوگ اَلْكِتَاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے“ اس سے تحریف لفظی مراد ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنی آسانی کتابوں میں جس بڑی طرح سے تحریف کی ہے اس کی تفصیل میری کتاب ”معراج انسانیت“ کے پہلے باب ”ظہر الفساد“ میں ملے گی۔ ان کی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

## ح ر ق

حَرَقَ اَلْعِدِيْدَ بِاَلْمِيْرَادِ - لوہے کو ریتی سے گھسا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ چونکہ اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے

معنی آگ میں ڈال کر جلا دینے کے ہیں۔ ”أَلْهَرَقُ“۔ آگ کا شعلہ یا آگ۔  
 ”أَلْهَرَقَةُ“۔ آگ۔ ”أَلْهَرِقُ“ مِّنَ السَّحَابِ۔ سخت بجلیوں والا بادل۔\*  
 ”أَلْهَرِيقُ“۔ آگ۔\*\*\* نیز جلنا۔\*\*\*\*

سورۃ آل عمران میں ہے ”ذُوقُوا عَذَابَ الْهَرِيقِ“ (۳/۶۸)۔ ”سب کچھ جلا کر تباہ کر دینے والا عذاب چکھو“۔ سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے ”فَالْتَوُوا حَرِّ نَارٍ“ (۲۱/۶۸)۔ ”انہوں نے کہا کہ اسے جلا ڈالو“۔ ”أَلْهَرِقُ“۔ جل جانا (۲۱/۶۹)۔

چونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں اس لئے اس کے مفہوم میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوگا۔ یہی اس کا خاصہ ہے۔\*\*

## ح رک

”حَرَكَتٌ“۔ ”يُحَرِّكُ“۔ ”حَرَكَتًا وَحَدَّ كَتَّةً“۔ ہلا، حرکت کی (سکون کی ضد ہے)۔ ”حَرَكَتُهُ“ ”فَتَحَرَّكَتْ“۔ میں نے اسے حرکت دی۔  
 پس وہ متحرک ہو گیا۔ یہ صرف مادی چیزوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات ”تَحَرَّكَتْ“ اس موقع پر بھی بولتے ہیں جب کسی چیز میں کچھ تغیر ہو جائے۔ یعنی اس کے اجزاء میں کمی بیشی ہو جائے۔\*

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے ”لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ“ (۹۹/۱۶)۔ ”اس کے لفظی معنی ہیں تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت مت دے، تاکہ اسے جلدی لے لے، اس کا مفہوم ہمام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کریم کے متعلق ہے اس لئے کہ دوسرے مقام پر ہے، ”وَلَا تُعْجَلْ بِالنُّزُورِ“ ”مِنْ قَبْلِ أَنْ يَنْزِلَ إِلَيْكَ وَحْيُهُ“ (۲۱/۶۸) یعنی جب تک (کسی ایک معاملہ کے متعلق) وحی کی پوری تعلیم سامنے نہ آجائے اس کے عملی پروگرام میں عجلت مت کرو۔ عملی قدم اس وقت اٹھاؤ جب سارا پروگرام واضح طور پر سامنے آجائے۔ لیکن (۹۹/۱۶) سے پہلے قرآن کا ذکر نہیں۔ انسان اور اس کے اعمال کا ذکر ہے۔ اس صورت میں، اس آیت سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اگر ربط مضمون پیش نظر ہو تو یہ سمجھنا ہوگا کہ یہاں خطاب خود انسان سے ہے اور بات بھی اس کے اعمال نامہ سے متعلق ہے۔ (اس کی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں کی جائیگی کیونکہ وہی اس کا صحیح مقام ہے۔)

## ح ۲۴

حَرَمَتُهُ الشَّيْءُ حَرَرِيْعًا وَ حَيْرًا مَانًا - اس سے کسی شے کو روک لینا - اس شے کو اس تک پہنچنے نہ دینا - لہذا اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روک دینے یا ممانعت کر دینے کے ہیں - (ابن فارس) الْحَرَامُ - تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کردی گئی ہو - جنکے کرنے سے روک دیا گیا ہو - یہ الْحِلَالُ کی ضد ہے جسکے معنی ہیں رسمیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کر دینا - أَحْرَمَ الْحَاجُّ - حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک ایسی چیزیں ممنوع ہو گئیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا - اسی کو حالت احرام کہتے ہیں - الْحَرَمُ یَمُّ - ہر حرام کی ہوئی ممنوع چیز - ہر جگہ جس کی حمایت و حفاظت لازمی ہو - نیز ایام جہاں میں ان کپڑوں کو کہتے تھے جنہیں وہ لوگ طواف کعبہ کے وقت اتار دیا کرتے تھے اور ننگے حج کیا کرتے تھے - یعنی ان کپڑوں کا پہننا ممنوع تھا - اسی طرح أَشْهُرُ الْحَرَمِ - وہ (چار) مہینے (رجب - ذوالقعدہ - ذوالحجۃ اور محرم) تھے جن میں جنگ کی ممانعت تھی \* -

روکنے کے اعتبار سے حَرَرِ یَمُّ الدَّارِ ، مکان کے اس اندرونی حصہ کو کہتے ہیں جو حد بندی کر کے مکان میں داخل کر لیا گیا ہو \* -

الْحَرَمُ وَ مٌ - وہ ہے جسکی ضروریات رک جائیں - جسکے پاس کچھ نہ رہے \* - اصل میں اس میں مشقت کا پہلو مضمر ہے - اس لئے کہ حَرَمٌ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں - اور ان کا خاصہ ہے کہ جس لفظ میں یہ اکٹھے آئیں اس میں مشقت اور سختی پائی جائے \*\* - اسی لئے اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روکنے کے ہیں - الْحَرَمُ مَسَّةٌ کے معنی ہیں وہ کام جس کا کرنا جائز نہ ہو - وہ پابندی جسکے توڑنے کی ممانعت ہو - نیز وہ ذمہ داری جس کی حفاظت لازمی ہو - وہ کام جسکا کرنا ضروری ہو \* - قرآن میں جہاں ہے تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ كُفُّوا عَنْهُ عَذَابُهُمْ أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ كُفُّوا عَنْهُ عَذَابُهُمْ (۱۵۲) - تو وہاں اسکے معنی یہی ہیں کہ یہ وہ باتیں ہیں جو اللہ نے تم پر واجب قرار دی ہیں - جنکی خلاف ورزی سے تمہیں روکا گیا ہے -

سورة انبیاء میں ہے وَ حَرَامٌ عَلٰی قَرْبٰنٍ اٰھْلَکَکُنْہَا اَنۡھُمْ لَا یَرْجِعُوۡنَ (۲۱) - جو قوم ہمارے قانون مکافات کے مطابق تباہ و برباد

ہو جاتی ہے اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ پھر زندہ نہ ہو سکے\*۔ یعنی اسکی باز آفرینی اسکے لئے ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ قوموں کی وہ آخری تباہی ہے جو مہلت کے وقفہ کے بعد عمل میں آجاتی ہے اور جس سے وہ قومیں پھر ابھر نہیں سکتیں۔ لیکن اگر اس آیت کو اس کے بعد کی آیت سے ملایا جائے جو حتمی سے شروع ہوتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ انکی باز آفرینی اسوقت ممکن ہوتی ہے جب وہ صورت پیدا ہو جائے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ یا اس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ جب ہم نے ہستیوں کو ہلاک کیا تھا تو ان پر یہ سزا اس لئے واجب ہوئی تھی (”حَرَامٌ عَلَیْهِ“) کہ وہ کسی طرح بھی خدا کے قانون کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ یعنی کوئی قوم مستحقِ ہلاکت اسوقت ہوتی ہے جب اس میں ”رجعت الی اللہ“ کی صلاحیت نہیں رہتی۔ (اس صورت میں اگلی آیت میں حتمی زائد ہوگا)

حَرْمٌ\*۔ حالتِ احترام میں (۵۱)۔ ”لِحَرُمَاتٍ\*۔ جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے (۱۹۴)۔

مَنْحَرُومٌ\*۔ جو کسی چیز سے روک دیا گیا ہو۔ حتمی اپنی محنت کے ماحصل سے بھی۔ (۵۶)۔ جسکی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں (۵۹) ”مَنْحَرُومٌ\*۔ جو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہو (۸۵)۔ جسے واجب التعمیم یا واجب الاحترام بنایا گیا ہو (۱۲۷)۔

حرام و حلال۔ چونکہ حرام اور حلال کے سوال کو مذہب (اور دین) میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایسی اہمیت کہ بعض اوقات یہی شے ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم۔ ہر انسان۔ محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے) (۱۷) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔

\* ابنِ قتیبہ نے بھی لکھا ہے کہ لا یرجعون میں لا زائد ہے۔ یا حرام کے معنی واجب کے ہیں۔ (القرطبن ج ۱/ ص ۱۳۳ ج ۲/ ص ۲۶) دوسرے معنی صحیح ہیں۔ لا زائد نہیں مانا جاسکتا۔

اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَّا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَقُولَ تَبِعَنِي أَلَا تَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ ذُوُ الْقُدْرَةِ الْعَظِيمُ (۳۸) ”کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اسے ضابطہ قوانین۔ یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری حکومت اختیار کرو،۔ لہذا قرآن حکیم کی رو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر ہائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑھا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے ”حرام“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ”حلال“ کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں، رسواں کھول کر آزاد کر

دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا۔ اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن حکیم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ  
وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ إِنَّمَا حَرَّمَ  
عَلَيْكُمْ الثَّمِينَ وَالْقَدَمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا  
أُهِلَ بِهِ لِيَغْتَرِ اللَّهُ..... (۱۴۳-۱۴۴)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طہیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور خون\* اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورہ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ  
وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ..... (۳۴)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے :-

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا  
وَمَا بَطْنٌ..... (۳۵)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

\* سورہ النام میں دس مسفوحاً کہہ کر اس کی تصریح کردی کہ صرف بہنا ہوا خون حرام ہے۔ (۱۳۶)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

- (i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔
- (ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔
- (iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔
- (iv) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دئیے جو رسول اللہؐ پر نازل ہوئی تھی۔ سورۃ انعام میں ہے۔

قُلْ لَا آجِدُ فِيْ مَا أُوحِيَ اِلَيَّ مَحْزُومًا عَلٰى  
طَاعِمٍ يَّتَطَعُّهُ اِلَّا... (۱۶۶)

(اے رسول ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اس میں کسی چیز کو جو کھائے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے (مردار، بہتے خون، لحم خنزیر اور اسکے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو)

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رو سے کر دیا ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۃ حج میں ہے۔

وَاُحِلَّتْ لَكُمْ اِلَّا نِعَامٌ اِلَّا مَا يَتَنَلَّٰى عَلَيْكُمْ  
..... (۲۲)

اور تمہارے لئے چوہائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رو سے بتادیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنائی) جاتی ہے۔

یہ ”مَا يَتَنَلَّٰى“ وہ وحی تھی جو ”الکتاب“ میں تھی۔ سورۃ عنکبوت میں ہے اُتِلْ مَا أُوحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (۲۵) ”اے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے۔“ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۃ آل عمران کی اس آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے



کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۸)۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو۔ سورۃ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنْقَمَاتُ امْرِئْتُ . . . . . اَنْ اَتْلُو الْقُرْآنَ . . . (۲/۹۴) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں۔“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور

(ii) ایسے جو کچھ حرام قرار دینا تھا ایسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۃ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدیٰ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) ”ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟“ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ..

..... (۲۱/۱)

اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے،

تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے؟

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ، دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

\*تلاوت کے معنی پوری کرنے کے بھی ہیں۔

اس مقام پر ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طیبیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا**..... (۱۶۸)۔ ”اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے۔ اسے طیب و انداز سے کھاؤ“ طیب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق، میلان طبع، طبی ضرورت اور دیگر تضمینات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف، یا عقیدتمندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح، بالواسطہ (Indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ پہلی قوموں میں ایسا ہو چکا تھا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) ”خدا نے حرام قرار دیا تھا، اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ ”كُلُّ الْقِطْعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَآئِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآئِيلُ عَلٰی نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ“ (۳۳) ”یہ تمام کھائے (جواب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے

اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے، (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہوسکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی امت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کر لیں۔ اسلئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث نہ تمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۃ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیات کبریٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وَ يُحِيلُ لَتَهُمُ الْقَطِيبُتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْغَبَائِثَ (۱۵۰) ”وہ ان کے لئے طیات کو حلال قرار دے گا اور غبائث کو حرام ٹھہرائے گا۔“ اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(i) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و

حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(ii) خود نبی اکرمؐ سے یہ نص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تَحْزِرُونَ مَا

أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ (۱۱) ”جس چیز کو اللہ نے تمہارے لئے حلال

قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔“

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور

کبھی رسول کی طرف ( کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول می کی وساطت سے پہنچتے تھے ) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی ( یعنی قرآن کریم ) ہوتا ہے ، سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ **وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** (۲/۸۹) ”جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں“۔ اور دوسری جگہ ہے **وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** (۲/۱۲۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے ، خدا ، وحی ، کتاب ، رسول۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد ، اب آیت زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ **وَيُحِيلُ لَهُمُ التَّطْيِيبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِنَّ الْغَبَايِثَ** (۲۵/۱) یعنی رسول ان کے لئے طہیبات کو حلال کرتا ہے اور خباثت کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورہ سائدہ میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرِّمُوا مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ** (۵/۸۴) ”اے ایمان والو! جن طہیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔“ یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طہیبات کو اللہ نے حلال فرار دیا ہے۔ ( اسی ) سورہ اہراف میں ہے **قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ** (۲۴/۲۳) ”اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے تو صرف فواحش حرام کئے ہیں ، یہاں خود رسول اللہ کی زبان مبارک سے کہلوا یا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں ہے **وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الشِّرْكَ** (۲/۲۳) اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربو کو حرام ،

لہذا قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

اس سلسلہ میں سورہ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ آمَنُوا بِمَا هُوَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا  
يَلِيْهُمْ الْآخِرُ وَلَا يُعْرِضُونَ مَّا حَرَّمَ اللَّهُ  
وَرَسُولُهُ (۹/۲۴)

(اہل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے۔ ان سے جنگ کرو۔

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ اس آیت میں،، ”يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ“، سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حرام کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضا مند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

قرآن حکیم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھہرایا) انہیں حرام قرار دیدیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرِّمُوا طَيِّبَاتٍ مَّا  
أَحْلَلَّ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا  
يُحِبُّ الْمُتَعْتِدِينَ (۴۸)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کا اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ  
هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا  
عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ..... (۱۱۶)

اور جو تمہاری زبانیں ہونہی جھوٹ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر محض بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن کریم نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (یا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں) اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ”شریعت خداوندی“ کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں مسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افتراء ہے۔ کذب ہے۔ بہتان عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا آتَا اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ  
فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ اللَّهُ آذِنُ  
لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ (۵۹)

ان سے کہو کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے، تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو) یا تم اللہ پر افتراء باندھتے ہو۔

قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افتراء باندھتا ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے، کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُنْفِيرٍ...  
ذَٰلِكَ جَزَايَنَّهُمْ بَيِّنَاتٍ لَّهُمْ..... (۱۶۴)

اور ہم نے یہودیوں پر سب نساخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دیدئے تھے۔ اور گلے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔

سورہ نساء میں ہے

فَبَيِّضْهُمْ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ  
طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ..... (۱۶۵)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام قرار دیدیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ سورہ نحل میں کہا گیا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے (۱۶۸)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دیدینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے

وَلَا حِيلَ لَكُم بِبَعْضِ الَّذِي حَرَّمْ عَلَيْكُمْ.....  
..... (۳۹)

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دیدی گئی ہیں ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہ بتایا کہ

وَبُحِيلٌ لِّتَوْنُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يَحْيَرُمُ عَاكِتِهِمْ  
الْعَبْلِيَّتْ..... (۱۵۱)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کریگا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ساخوذ ہیں۔  
اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب، سو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں، جو بعض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ سوتیلیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۱۳۹)۔ فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۱۴۰)۔ اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں (۱۴۱)۔ ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ اجداد کی مرتب کردہ ہیں (۱۴۲)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو۔ (۱۴۱)۔ اس کے بعد انہیں چیلنج دیا گیا اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (۱۵۱)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اتھارٹ نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناٹنے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورہ نسا کی آیات ۲۴-۱۲ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کریم کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال



عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے۔ مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلٹھ اوفیسر حکم دیدیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے۔ یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے۔ وقس علی ذالک۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے، اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان ح۔ ل۔ ل۔ او۔ ن۔ ع۔ م۔)

## ح ر ی

التَّحَرُّیُّ\*۔ قصد کرنا۔ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا۔ کسی کام کو کرنے کا خصوصیت کے ساتھ ارادہ کرنا۔ تَحَرُّاهُ\*۔ اس نے اس کا ارادہ کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ بہتر اور حق چیز کی طلب میں کوشش کرنے کو کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے فَاتَّوَلَّيْنَاكَ تَحَرُّوْا رَشَدًا (۹۲/۱)۔ ”بہ لوگ ہیں جنہوں نے رشد و سعادت کے حصول کے لئے عزیمت مندانہ قصد کر لیا۔“

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) قرب و ارادہ (۲) حرارت اور (۳) لوٹ جانا یا کم ہو جانا لکھے ہیں۔ حیراء مکہ میں ایک پہاڑ تھا جس کے غار میں (کہا جاتا ہے کہ) حضورؐ قبل از نبوت (رشد و ہدایت کی طلب صادق میں) جایا کرتے تھے\* یہ صرف تاریخ کایان ہے۔ قرآن کریم میں اس کی صراحت نہیں۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ قبل از نبوت حضورؐ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے۔ دیکھئے عنوان ض۔ ل۔ ل۔

## ح ز ب

نیز اس کے معنی ورد ہیں۔ یعنی تلاوت قرآن کریم و غیرہ بار بار تکرار

الْحَزْبُ\*۔ ہانی پر اترنے کی باری کے لوگوں کی جماعت، فریق، گروہ (اسکی جمع احْزَاب\* ہے) اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان کے دل اور اعمال ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ خواہ وہ ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں یا نہ ملے ہوں\*\*۔ راغب

\* تاج و راغب۔ \*\* تاج۔

نے کہا ہے کہ اسکی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان میں سختی اور شدت پائی جائے\*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حِزْبُ اللہ (۵۸/۳۳) اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ (۵۸/۱۹) دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ حِزْبُ اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی پر نہایت سختی سے کاربند ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں، اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ وہ ہیں جو غیر خدائی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے متعلق ہوں۔ قرآن کریم، قوموں کی تشکیل، نظریہٴ زیست یا نصب العین حیات کی بنیادوں پر کرتا ہے نہ کہ وطن، نسل یا زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ سورۃ مومن میں احْزَاب (۳۳/۱) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے خدا کے رسولوں کی مخالفت کی تھی۔ سورۃ احزاب میں اَلْاَحْزَاب (۳۳/۱) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی تھی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ”کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہِمْ فَرِحُوْنَ“ (۳۳/۳۳)۔ ہر فرقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ حق پر ہے (اور باقی سب فرقے باطل پر ہیں)۔ قرآن کریم نے ”کُلُّ حِزْبٍ“ (تمام فرقے) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں تو پھر یہ سمجھنا غلط ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اور باقی باطل پر۔ فرقوں کا تو وجود ہی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ (۳۳/۳۳)۔ جب تک الدین کا نظام (یعنی اسلامی مملکت کا نظام) قائم رہے، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو دین، انفرادی چیز بن جاتا ہے جس میں فرقے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ جب فرقے پیدا ہو جائیں تو انہیں مٹانے کی ایک ہی شکل ہے۔ یعنی اسلامی نظام مملکت کا قیام۔ اس کے سوا اس ”شرک“ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

## ح ز ن

حَزَنٌ - یہ ایک جامع لفظ ہے جو ہر اس غم و فکر اور پریشانی کے لئے بولا جاتا ہے جو انسان کو کسی وجہ سے لاحق ہو۔ اس میں معاشی پریشانی خاص طور پر شامل ہے چنانچہ حَزَانَةُ الرَّجُلِ - انسان کے وہ متعلقین (اہل و عیال) میں جن کی تکلیف سے اسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے سامانِ زیست نہ

اہتمام کرے\*۔ تاج العروس میں ہے کہ سورۃ فاطر کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اٰذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۳۵)۔ میں حَزْنَ کے معنی ہیں صبح اور شام کے کھانے کی فکر۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں لَا تَحْزَنْ یا لَا تَحْزَنُوْا کہا گیا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ تم فکر مت کرو، اسلئے کہ فکر پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم ان اسباب کو مت پیدا ہونے دو جن سے حَزْنُ پیدا ہوتا ہے\*۔ یہ چیز معاشی فارغ البالی اور مرفہ الحالی سے پیدا ہوگی کیونکہ حَزْنُ کے معنی فکر معاش سے پیدا ہونے والی پریشانی کے ہیں۔ نیز اَلْحَزْنُ۔ سخت پتھریلی زمین کو کہتے اس کی ضد ”سَهْل“ ہے\*۔ (غالباً اسلئے کہ اس میں اناج وغیرہ پیدا نہیں ہو سکتا)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ میں سختی۔ شدت اور کھردرے پن کا پہلو ہوتا ہے۔

خَسَافَ کے عنوان میں آپ دیکھینگے کہ خَسَوْفٌ اس پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہو (یعنی اس کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے حادثہ سے ہوتا ہے)۔ جب ان معانی کے مقابل میں حَزْنُ کا استعمال ہو تو اس سے مراد وہ غم ہوتا ہے جو اس حادثہ کی وجہ سے ہو جو گزر چکا ہے۔ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خَسَوْفٌ ہے۔ اس نقصان (یا حادثہ کے واقع ہو جانے) کے بعد خسوف ختم ہو جاتا ہے اور غم یا حزن شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمْ اَلَا عُلُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۱۳۸)۔ یہاں وَهْنٌ اور حَزْنٌ۔ عظمت اور بلندی۔ مروج و اقبال اور غلبہ و تمکن (علو) کے مقابلہ میں آیا ہے۔

قصہ آدم میں ہے کہ جب آدم سے جنت کی زندگی چھن گئی تو اسکی بازیابی کیلئے اس سے کہا گیا کہ اگر تم وحی کے تابع زندگی بسر کرو گے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَسَوْفَ عَلَیْہِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲)۔ اس سے خوف اور حزن نہیں رہیگا۔ جب یہ جنتی معاشرہ اس دنیا میں قائم ہوگا تو اسمیں (منجملہ دیگر اسباب اطمینان و آسائش) ساسانِ معاش کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہ حَزْنُ کے بنیادی معنی ہیں۔ نیز جس جنت سے آدم نکلا تھا اس کی خصوصیت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں بھوک۔ پیاس۔ لباس اور مکان کیلئے کسی کو جگر پاش مشقت نہیں اٹھانی پڑتی

تھی اور نہ ہی کوئی اس سے محروم رہتا تھا۔ (۱۸۰-۱۹)۔ اس سے بھی حُزُن کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ (ان اسور کی تفصیل کیلئے ا۔ د۔ م، ہ۔ ج۔ ر، ج۔ ن۔ ن، کے عنوانات دیکھئے)۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ جو قوم خوف، بھوک، حُزُن وغیرہ کی پریشانیوں میں مبتلا ہو اُسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی کا اتباع نہیں کر رہی۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی یہاں کی زندگی بھی مرفہ الحالی اور سرفرازی کی ہو اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی۔

سورۃ یوسف میں حُزُن کے معنی اس غم کے آئے ہیں جو کسی گزرے ہوئے واقعہ سے پیدا ہو (۱۸۳)۔ اور لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ (۱۸۸) کے معنی ہیں ان پر غم نہ کیا۔ تَحْزَنْ عَلَیْہِ کے معنی ہیں وہ اس پر درد مند ہوا\*۔

## ح س ب

حَسَبَ یَحْسِبُ حُسْبَانًا وِ حِسَابًا۔ گنا۔ شمار کرنا۔ احتساب۔ یَحْسِبُ مَحْسَبَةً وِ حِسْبَانًا۔ خیال کرنا۔ گمان کرنا۔ حَسَبٌ۔ وہ جو کافی ہو۔ جو کفایت کرے۔ جسکے بعد کچھ اور ضرورت نہ رہے۔ حَاسِبٌ۔ حساب کرنے والا۔ حُسْبَانٌ۔ (حیستاب کی جمع)۔ گنتی۔ شمار۔ حَسْبُكَ دِرْہَمٌ۔ تمہیں ایک درہم کافی ہے۔ حُسْبُنَا اللہ (۹۹)۔ ہمارے لئے اللہ (کا قانون) کافی ہے۔ اسکے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ہماری تمام ضروریات کو پورا کر دینے کیلئے کافی ہے۔ ہَذَا یَحْسِبُ ذَا۔ یہ اسکے مطابق یا اسکے بقدر ہے\*\*۔

حَسِبٌ۔ حساب کرنے والا۔ نگرانی کرنے والا۔ کَفَلْتُ یَنْفُسَکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیبًا (۱۴)۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب شدہ نتائج کے ظہور کے وقت کسی خارجی شاہد اور محاسب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان کی اپنی ذات خود اپنے خلاف زندہ شاہد ہوتی ہے۔ بَلْ لَا تَنْسَانُ عَلَیْ نَفْسِہِ بَصِیرَةً (۲۵)۔ اعمال کے جو اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں وہ اپنے منہ سے خود بول اٹھتے ہیں کہ اس نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ظہورِ نتائج کے وقت کو یَوْمُ الْحِیَابِ یا یَوْمُ یَقُومُ الْعِیَابُ (۲۴) کہا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہوتا

شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اسکی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے۔ جیسے درخت میں پھل تو اسوقت سے بننا شروع ہو جاتا ہے جب اس میں پھلا شگولہ (ہلکہ کونپل) پھوٹتی ہے لیکن وہ پھل کی شکل میں کچھ عرصہ بعد سامنے آتا ہے۔ اسے ظہور نتائج کا وقت کہتے ہیں۔

سورة انعام میں ہے وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا (۱۶۱)۔ اسی کی تشریح دوسری جگہ اَنْ الْفَاظُ سے کر دی۔ لِيَتَمَلَّكُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابُ (۱۶۰; ۱۶۱) چاند اور سورج کو اسلئے بنایا تاکہ اُن سے ماہ و سال وغیرہ کا حساب رکھا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیلنڈر، سورج کے حساب سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ قمری اور شمسی میں سے جو زیادہ آسان اور ملی مفاد کے مطابق ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سورة کہف میں ہے وَ يُرْسِلُ عَذِيبُهُمَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ (۱۸)۔ وہ کھیتی پر آ۔ مان سے حُسْبَان بھیج دے۔ یہاں حُسْبَان کے معنی عام طور پر بلا کے لئے جاتے ہیں۔ یعنی کوئی آفت سماوی جس سے کھیتی تباہ و برباد ہو جائے۔ مثلاً بارش کا طوفان۔ آندھی۔ جھکڑ۔ یا ژالہ باری۔ یا ٹنڈی دل وغیرہ\*۔ لیکن (لفت حمیر میں) اسکے معنی سخت سردی کے آتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے اس کے معنی ٹنڈی اور اولیٰ دونوں لکھے ہیں۔

اِحْتِسَابُ۔ کے معنی گمان کرنا یا خیال کرنا ہیں\*\*\*۔ سورة طلاق میں ہے۔ وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۱۵)۔ خدا کا قانون اسے ایسے مقامات سے رزق پہنچاتا ہے جو اسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں۔

سورة بقرہ میں ہے وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۴)۔ ”جو ایسا چاہتا ہے اسے اللہ بغیر حساب رزق دیتا ہے“۔ راغب نے اسکے مختلف معانی لکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اُسے دیتا ہے لیکن اُس سے لیتا نہیں۔ یا لوگوں کے عام اندازے اور شمار کے مطابق نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے\*\*\*\*۔ جب معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں رزق کی فراوانیاں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

## ح س د

حَسَدُ\*۔ کے اصلی معنی چھیلنے کے ہیں۔ الْحَسَدُ۔ وہ ذہنیت جسکی رو سے تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے چھین کر

مجھے مل جائے، اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے۔ غیظۃ\* یہ ہے کہ ایسی چیز اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مل جائے (اسے رشک کہتے ہیں)\*۔ راغب نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس میں اس مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہ مخالفین حسد کی وجہ سے اسکی انتقامی آرزو کرتے ہیں کہ تم ایمان کو چھوڑ کر پھر سے کفر اختیار کر لو۔ یعنی ایمان کے خوشگوار نتائج تم سے ضرور چھن جائیں خواہ اس سے ان کا اپنا کچھ بھلا ہو یا نہ ہو (۱۰۹)۔

قرآن کریم نے حسد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور اس سے، اور ایسی ذہنیت رکھنے والوں کی تخریبی کوششوں سے بچنے کی تاکید کی ہے (۱۱۳) یہ بچاؤ، قانونِ خداوندی کے ساتھ گہرے تمسک (تَمَوُّذٌ) سے حاصل ہو سکتا ہے۔

## ح س ر

حَسْرَ - بتحسیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ چھیل دینا۔ کھمال اتار دینا۔ اَلتَّحْسِيرُ کے معنی ہیں ہرندے کے بال و پر گرجانا\*۔ یہاں سے اسکے معنی عاجز و درماندہ ہو جانے کے آتے ہیں۔ حَسْرَ التَّحْسِيرِ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک کر عاجز و درماندہ ہو گیا۔ اسی بنا پر اَلْحَسْرَةُ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی حالت تھکے ماندے اونٹ کی سی ہو جائے۔ اس میں عجز و ندامت دونوں پائے جاتے ہیں۔ نیز غم و تاسف بھی\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْحَسْرَةُ کے معنی ہیں کسی چیز کے فوت ہو جانے پر غم اور شرمندگی کی حالت۔ گویا اس شخص سے اب وہ جہالت دور ہو گئی ہے جسکی وجہ سے اس نے یہ کام کیا تھا، اب انکشاف حقیقت ہو گیا ہے\*\*۔ اسی لئے صاحبِ معبط نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنی کشف کے ہیں\*\*\*۔ (یعنی کھول دینا)۔ حَسْرَ التَّحْسِيرِ عَنِ السَّاحِلِ کے معنی ہیں دریا ساحل سے پیچھے ہٹ گیا اور پانی کے نیچے جو زمین تھی وہ کھل کر سامنے آگئی\*۔ اس میں عجز اور کشف کے دونوں پہلو ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے یَرْبِّهِمْ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسْرَاتٍ عَلَیْهِمْ (۱۶۴)۔ اللہ ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے انہیں دکھا دے گا اور اس انکشاف حقیقت سے ان پر ہری طرح عجز و درماندگی چھا جائیگی۔ حَسْرَاتُ التَّحْسِيرِ کے معنی ہیں

مینے گھر میں جھاڑو دی اور اَلْمِحْسَرَةُ\* - جھاڑو کو کہتے ہیں\*\* - اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم منہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال پکسر پے نتیجہ ہو کر رہ گئے۔ ان کے گھٹے کرائے ہر جھاڑو پھر گئی۔

سورة انبیاء میں لَا یَسْتَجِیْرُوْنَ (۲۱۹) آیا ہے جسکے معنی تھک جانے کے ہیں۔ سورة بنی اسرائیل میں سَلُّوْا مَعِیْ سُوْرًا (۱۴۹) آیا ہے۔ یعنی درمندانہ۔ ایسی حالت جس میں تمہارے پاس کچھ باقی نہ رہے، سب کچھ صاف ہو جائے اور تم کو اپنے کئے ہر پشیمانی ہو۔ اور (۱۴۹) میں حَسِیْرٌ\* آیا ہے۔ یعنی تھکی ماندی۔

اَلْحَسِیْرُ\* - ہلاؤں اور مصیبتوں کو کہتے ہیں۔ حَسْرَةُ\* کے معنی سخت افسوس و ندامت اور ہاتھ سے نکل جانے والی چیز ہر غم کرنے کے ہیں\*\*۔ یَا حَسْرَتِی (۳۹) - والے افسوس۔

## ح س س

اَلْحَسَّ - حرکت۔ خفی آواز (اس چیز کی جسے تم دیکھ نہ رہے ہو)۔ اَلْحَتَّاسُ\* اسی سے ہے۔ اَلْحَسَّ - محسوس کرنا۔ آگاہ ہونا\*۔ راعب نے کہا ہے کہ جب کوئی چیز اس طرح نمایاں اور آشکارا ہو جائے کہ وہ با آسانی محسوس کی جا سکے تو اس وقت اَحَسَّ بولا جاتا ہے۔ فَكَلَّمَا اَحَسَّ (۵۱) - جب اس نے محسوس کیا۔ تَحَسَّسَ - کسی کا ہتھ لگانا (۱۲۸)۔

حَسِیْسٌ\* - ہلکی سی آواز۔ اَهْتَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَمَا (۲۱۳)۔ اَلْحِیْسُ\* - سردی جو گھاس کو جلا دے۔ حَوَّاسٌ اَلْاَرْضِ - سردی۔ اولہ - ہوا۔ ٹڈی اور مویشی جو کھیتی پر تباہی لے آئیں۔ اس سے اس کے معنی تباہی اور ہربادی کے آئے ہیں۔ چنانچہ اَلْحَسَّاسُ\* قحط سالی کو کہتے ہیں\*۔ سورة آل عمران میں هَ اِذْ تَحْسَبُوْنَهُمْ (۱۵۱) - ”جب تم نہیں ہلاک اور ہرباد کر رہے تھے“۔ ابن فارس نے اَلْحِیْسُ کے معنی قتل کرنے کے بھی لکھے ہیں۔

## ح س م

حَسَمَهُ - بِحَسِیْمِهِ\* - اس نے اسے قطع کر دیا۔ حَسَمَ الْعِیْرُقُ - اس نے وگ کو کاٹ دیا۔ اور اس پر لوہے سے داغ لگا دیا تاکہ اسکا خون نہ

ہے\*۔ ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اسکی جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں۔ اَلْحُسَامُ\*۔ تیز کاٹنے والی تلوار۔ اَلْحُسُوْمُ\*۔ بد بختی۔ ازہری نے کہا ہے کہ ہر اس چیز کو جو دوسری چیز کے بعد فوراً آجاتی ہو حاسیم کہتے ہیں، جسکی جمع حُسُوْمُ\* ہے۔ لہذا اسکی معنی ہیں یہ درپے اور مسلسل آنے والی چیزیں\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْحُسْنُ\* کے معنی کسی چیز کے اثر کو مٹا دینے کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو اس طرح تباہ کرنا کہ اس کا نشان تک مٹ جائے\*\*۔

قرآن کریم میں ہے کہ قوم عاد پر جو آندھی کا عذاب آیا تھا سَخْرَہَا عَلٰیہِمْ\* سَبَّحَ لَیْلًا۔ وَ نَعْلَمِیَّتَہٗ اَیَّامًا حُسُوْمًا (۲۹)۔ ”اس نے اس (آندھی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا“ (حُسُوْمًا کا ترجمہ نہیں کیا گیا)۔ اس میں حُسُوْمًا کے معنی مسلسل کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن عذاب کی شدت کے اعتبار سے یہ معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کہ وہ ایسی آندھی تھی جس نے اس قوم کے نام و نشان تک کو مٹا دیا۔ یا ان کی جڑوں تک کو کاٹ کر رکھ دیا۔

## ح س ن

اَلْحُسْنُ\*۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ حسن سے مراد ہوتا ہے اعضاء کا صحیح صحیح تناسب اور توازن۔ اور حرف عام میں حسین ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو نگاہ کو بھلی معلوم ہوں\*\*\*۔ لہذا حُسْنُ\* کے بنیادی معنی ہیں تناسب و توازن کا قائم رہنا اور یہ سُوء\* کی ضد ہے۔ نیز اس کے مقابلہ میں فُسَادُ\* کا لفظ آیا ہے (۲۸) جس کے معنی ہگڑے ہوئے توازن کے ہیں۔ لہذا اَلْاِحْسَانُ\* کے معنی ہونے کسی کے ہگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا۔ یعنی اگر کسی وجہ سے افراد معاشرہ میں سے کسی کی کسی فوت و صلاحیت میں کمی واقع ہو گئی ہے تو اس کمی کے پورا کر دینے کا نام اِحْسَانُ\* ہے۔ (دیکھئے عنوان ع۔ د۔ ل۔ جسمیں مَدُلُ\* و اِحْسَانُ\* کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے)۔ راغب نے کہا ہے کہ احسان دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا (یعنی اسکی کمی کو پورا کر کے اسکا توازن درست کر دینا)۔ اور دوسرے خود اپنے کاموں (سیرت و کردار) میں توازن پیدا کرنا۔ اس میں حسن پیدا کرنا\*\*۔



نیز راغب نے کہا ہے کہ عدل\* تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ذمہ ہو وہ دیدو اور جتنا تمہارا حق ہے وہ لے لو۔ اور احسان\* یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمہارے ذمہ ہے اور اس سے کم لو جتنا تمہارا حق ہے\*۔  
یعنی احسان\* میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد، توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰ\* کے متعلق ہے کہ جب وہ جوانی کو پہنچے وَاَسْتَوٰی اور اسمیں ہر طرح کا اعتدال پیدا ہو گیا۔ تو ہم نے انہیں علم و حکم (قوت فیصلہ) عطا کیا۔ اسکے بعد ہے کَذٰلِکَ فَجَزٰی الْمُحْسِنِیْنَ (۲۸/۱۳)۔ ہم اس طرح محسنین کو ان کے اعمال کا ثمرہ دیا کرتے ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ مُحْسِنِیْنَ سے مراد اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

هُوَ یَحْسِنُ الشَّیْءُ احْسَانًا کے معنی ہیں وہ اس چیز کو اچھی طرح سے جانتا ہے\*۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ جب قید خانہ میں ان دو نوجوانوں نے حضرت یوسف\* سے اپنا اپنا خواب بیان کیا اور آپ سے کہا کہ ان خوابوں کی تاویل بتائیے تو اسکے بعد ہے اِنَّا نَرٰ اَکْتَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲/۳۴)۔ یہاں مُحْسِنِیْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہوں\*۔

قرآن کریم میں حَسَنَات\* (بمقابلہ سِیِّئَات\*) زندگی کی خوشگوار بیوں کیلئے آیا ہے (مثلاً ۱۱۹/۳ : ۱۳۱/۳) سورۃ توبہ میں حَسَنَۃ\* کے مقابلہ میں مُصِیْبَۃ\* آیا ہے (۲/۵)۔ لہذا حَسَنَۃ\* ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کو آرام ملے۔ راحت و آسائش کا سامان۔ اور چونکہ سامان راحت و آسائش کی تکمیل مملکت و حکومت میں جا کر ہوتی ہے اسلئے بنی اسرائیل کی داستان کے سلسلہ میں کہا کہ ہم نے انہیں ارض فلسطین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا اور اس طرح تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی (۱۳۰/۳)۔ ”تیرے نشو و نما دینے والے کے توازن بدوش قانون کی تکمیل (حسن کارانہ انداز سے) ہو گئی“۔ (حُسْنٰی مونث ہے احسن\* کا)۔ خدا کے اَسْمَاء کو الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (۵۹/۲۴) کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جسمیں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کو لے، انتہائی حسن کارانہ انداز سے یک جا جمع ہیں۔ جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب۔ یہ ہے خدا کا تصور قرآن کریم کی رو سے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا مقصد بہ بتایا

کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔ (۲/۱۳۸)۔ اس لئے خدا کا ”مقرب“ وہ ہے جسکی ذات (Personality) کی مختلف صلاحیتیں نشوونما حاصل کرتی جائیں، بایں نظم کہ ان میں پورا پورا توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ لَيْسَ الْإِنْسَانُ أَتَمَّ الْخَلْقِ فَادْعُوهُ بِهَا۔ (آسمانے خداوندی۔ صفاتِ الہیہ۔ پورا پورا توازن لئے ہوتی ہیں اس لئے خدا کو انہی کے مطابق پکارو۔ یعنی خدا کے متعلق وہی تصور درست ہے جو ان صفات کے مطابق قائم ہو۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ۔ (۱۸۰) جو لوگ ان صفات میں سے کسی ایک میں بھی (توازن کی راہ چھوڑ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لہذا خدا کی صفات کا اپنے اندر منعکس کرنا (یعنی انسانی ذات کے مضمحل جوہروں کی نمود اور بالیدگی) ہی مقصود نہیں بلکہ ان میں حسن و توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس زندگی میں حسن نہیں سمجھ لیجئے کہ وہ قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اندر کس قدر حسن پیدا کرتے ہو اور کائنات میں کس قدر حسن کا اضافہ کرتے ہو۔ خارجی دنیا میں اس احسان (حسن پیدا کرنے) کی ابتدا اپنے رفقاء سفر (دوسرے افرادِ معاشرہ) کے ساتھ حسنِ معاملہ سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے کہا ہے کہ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲/۸۳)۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرو جن سے حسن پیدا ہو۔ اور اسکا عملی طریقہ یہ ہے کہ أَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھو اور اس طرح أَحْسِنُوا (۲/۱۹۵) معاشرہ میں حسن پیدا کرتے رہو۔ اسی کا دوسرا نام احسان ہے (۲/۸۳)۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم سے جو حسن پیدا کرے (احسان) کی تاکید کی گئی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ چیز کسی معاوضہ کی خاطر نہیں کی جائیگی۔ اس لئے کہ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ\* (۹۶)۔ حسن پیدا کرنے (احسان) کا بدلہ (یعنی نتیجہ) یہ ہے

\* (ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے یعنی کسی آدمی پر کوئی وقت آ پڑا۔ وہ دوسرے کے پاس مدد کے لئے گیا۔ اس نے اسکی مدد کی۔ یہ اسکا احسان ہوا۔ اب یہ دوسرا شخص اس انتظار میں رہے کہ کب اس پہلے شخص پر کوئی مصیبت پڑے اور یہ اس کے احسان کا بدلہ اتارے۔ اور جب تک اس کا بدلہ نہ اٹارے اس کا بے دام غلام بنا رہے۔ اگر اس نے اسکی کسی بات سے بھی اختلاف کیا تو اس نے جھٹکے دیا کہ یہ کس قدر احسان فراموش ہے؟ یہ ہے احسان سے مراد ہمارے معاشرے میں۔ اور وہ ہے احسان کا مفہوم قرآن کی رو سے جس میں تفاوت رہ از کجاست تا یہ کجا۔

کہ اس سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی مقصود بالذات ہے۔ یعنی احسان کا بدلہ یہ ہے کہ تم احسان کرتے جاؤ اور اس کے معاوضہ کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو ان سے بر ملا کہہ دیتے ہیں کہ ”لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا“ (۹۶)۔ ”ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متقاضی ہیں۔ لہذا قرآنی تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ انسان حسن پیدا کرے۔ خود اپنی ذات میں۔ دوسرے انسانوں میں اور خارجی کائنات میں۔ (Make it more Beautiful)۔ یہ چیز اپنا بدلہ آپ ہوگی اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہاں دیکھو کہ توازن بگڑ گیا ہے، اُسے درست کر دو۔ اسکے درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہاں حسن پیدا کر دو (توازن قائم کر دو) اس سے بگاڑ خود بخود دور ہو جائیگا۔ اِدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ الْحَسَنَ (۲۳۹)۔ پہلے خود اپنا جائزہ لو۔ اگر تمہاری ذات متوازن (Balanced Personality) نہیں تو اس میں احسان (توازن پیدا کرنے) کی کوشش کرو۔ اسکے بعد جب کسی دوسرے شخص کو دیکھو کہ وہ اپنا توازن کھو رہا ہے تو اس سے احسان کرو۔ یعنی اس کا توازن قائم کرنے کی کوشش کرو۔ جب معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو معاشرے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح خارجی کائنات میں علم و تحقیق کی رو سے حسین اضافے کرتے جاؤ۔ تمہاری یہ کوششیں اپنا بدنہ آپ ہونگی۔ حسن پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسن پیدا ہو جائیگا۔ یعنی بگڑا ہوا توازن قائم ہو جائیگا۔ زندگی کا یہی مقصود ہے۔ یعنی تخلیق حسن۔ اور خدا کی ذات وہ ہے جس میں حسن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ (الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى)۔ اس لئے انسانی ذات کی صحیح نشوونما اور تکمیل کے لئے خارجی معیار (Objective Standard) خدا کی ذات ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔

## ح ش ر

الْحَشْرُ۔ (لوگوں کو) جمع کر کے ہانک کر کسی طرف لیجانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنا، اٹھانا۔ اٹھ کھڑا ہونا اور چل پڑنا ہیں، اہل لغت الْحَشْرُ کے بمعنی اکٹھا کرنا اور ہانکنا کرتے ہیں۔ اَلْمَحْشِيرُ (ش کو زیر اور زیر کے ساتھ) جمع ہونے کی جگہ\*۔ محیط

میں ہے کہ عوام اس لفظ کو ہجوم اور ایک دوسرے کے لئے تنگی پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں\*\*۔ بعد ازاں ہجوم (اجتماع) جو دوسروں کیلئے مشکل اور تنگی پیدا کرنے کیلئے کیا جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جنگ کے اجتماع کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ (۱۴) ”سلیمان کے حکم کے مطابق اس کے لشکر جمع کر کے لیجائے گئے“۔ اور یہودیوں کے متعلق سورۃ حشر میں ہے هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹) ”اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی، پہلے حشر، کے لئے ان کے گھروں سے نکالا“۔ اس سے بھی مراد جنگ کا اجتماع ہے۔ یا جلاوطنی جو اسکا نتیجہ تھی۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان مخالفین سے کہدو کہ سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ (۱۱) ”تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تباہی کے میدان میں جمع کر کے جہنم کی طرف لے جائے جاؤ گے۔ اس سے اگلی آیت میں اس جنگ کی تفصیل درج ہے۔ سورۃ شعراء میں فرعون کے متعلق ہے کہ اس نے مختلف شہروں میں حَاشِرِينَ بھیجے (۲۶)۔ یعنی ہرکارے جو لوگوں کو جمع کر کے لائیں۔

الْحَشْرُ کے معنی دھار تیز کرنے نیز جمع کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے قحط سالی لوگوں کو دیہات سے نکال کر شہروں کی طرف لے آتی ہے\*۔ الْحَشْرَةُ کے معنی ہیں شکار یا کھایا جانے والا شکار نیز کیڑا مکوڑا اس سے جمع حَشَرَاتٌ کیڑوں مکوڑوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے\*۔ لغت یمن میں اس کے معنی بھوسی کے بھی ہیں\*۔

الْحَشْرُ۔ موت کو کہتے ہیں۔ نیز کان کا لطیف اور ہار بیک حصہ\*۔ سورۃ طہ میں ہے وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمًى (۲۲) ”اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے“۔ اس کے معنی اعمال کا بدنہ دینے کے ہیں جو نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی اعمال کے اثرات و نتائج نہایت لطیف انداز سے مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

مَحْشُورَةٌ\*۔ اکٹھا کئے ہوئے۔ (۳۸)۔ ذَالِكِ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ (۵۰)۔ ”یہ اکٹھا کرنا ہمارے لئے آسان ہے“۔ وَأَذَا حَشِيرَ النَّاسِ (۲۱) ”جب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے“۔ ان مقاسات میں جمع کرنے کے ساتھ، آگے لے جانے کا مفہوم بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ہمارے ہاں حَشْر سے مراد صرف مرنے کے بعد (قیامت کے دن) حساب کتاب کے لئے جمع ہونا لیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ آخرت۔ قیامت۔ ساعت۔ بعث وغیرہ کے تحت لکھا گیا ہے)۔ یہ قرآن کریم کی جامع اصطلاحات ہیں جن سے مفہوم صرف مرنے کے بعد جی اٹھنا نہیں بلکہ اس دنیا میں قوموں کی نشاۃ ثانیہ بھی ہے۔ چنانچہ حَشْر کے متعلق شاہ ولی اللہ (حجۃ اللہ البالغہ۔ کتاب الفتن میں) کہتے ہیں کہ ”زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک لوگوں کا ملک شام میں جمع ہونا، قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اُس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (غالباً جنگ سے مراد ہے) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد زندہ ہونا۔“

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئیں متن کے اعتبار سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے یا اس دنیا میں انقلاب آفرینی۔

## ح ص ب

الْحَصْبَةُ۔ کنکری۔ پتھر۔ الْحَصْبُ۔ ایندھن۔ جو کہ آگ میں ڈالاجائے تاکہ وہ جلے اور اس سے آگ میں لہانہ برادر وہ تیز جھڑکے۔ لکڑی کو بھی حَصْب کہتے ہیں جب اس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیا جائے۔ الْحَصِيبُ۔ وہ تیز ہوا (اندھی کا جھکڑ) جو مٹی۔ غبار اور کنکریاں اڑائے۔ قرآن کریم میں ہے یُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا (۱۸/۱)۔ تم پر کنکر برسائے والی اندھی بھیج دے۔ سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ (۲۱/۲) ”تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں۔“ یہاں حَصْب کے معنی ایندھن کے ہیں۔ قوم لوط پر آتش فشاں پہاڑ سے جو شعلہ آمیز اندھی چلی تھی اسے بھی حَاصِبًا کہا گیا ہے (۲۵/۲)۔ اس میں پتھروں کی کنکریاں اور آگ کی حرارت دونوں کا امتزاج ہے۔

## ح ص د

حَصَدَ۔ کھیتی یا ہودوں کو درانتی سے کاٹنا۔ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْبُلِهِ (۱۲/۱)۔ ”جو کھیتی تم کاٹو اسے اس کے خوشوں ہی

میں رہنے دو۔ - حَصَادٌ\*۔ کھیتی کاٹنا (۱۶۴) یا کھیتی کاٹنے کا وقت۔  
 الْحَصِيدُ\*۔ کاٹی ہوئی کھیتی (۱۶۵) قرآن کریم نے ہلاک شدہ قوموں  
 کے متعلق کہا ہے کہ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ (۲۱۵) ”انہیں ہم  
 نے کٹے ہوئے کھیت کی طرح بے حس و حرکت اور خاموش کر دیا۔“ انیس نشوونما پر بادی اور زندگی  
 کی حرارت سے محرومی کا کیسا عبرت انگیز نقشہ ہے!

## ح ص ر

الْحَصْرُ\*۔ روک دینا۔ قید کرنا۔ تنگی پیدا کر دینا\*۔ راغب نے لکھا  
 ہے حَصْرٌ اور احْصَارٌ اُس وقت بولتے ہیں جب رکاوٹ کی وجہ کوئی ظاہری  
 سبب ہو (جیسے دشمن نے روک دیا ہو) یا باطنی سبب ہو (جیسے بیماری  
 رکاوٹ پیدا کر دے) لیکن جب رکاوٹ صرف باطنی سبب سے ہو تو اس موقع پر  
 حَصْرٌ ہی کہتے ہیں\*\*۔ سورۃ نساء میں ہے اَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ  
 صُدُورُهُمْ (۹۶)۔ ”یا وہ تمہارے پاس آئیں اس حالت میں کہ ان کے  
 سینے بھنچے ہوئے اور دل تنگ ہوں“۔ حَصِيرٌ (۱۸) قید خانہ کو بھی  
 کہتے ہیں اور تنگدل شخص کو بھی۔ نیز وہ بخیل آدمی جو بخل کی وجہ سے  
 شراب نہ پیے\*۔

الْحَصُورُ\* (۳۸) رکنے والا۔ بالخصوص وہ شخص جو ہورتوں کے  
 پاس جانے سے رکا رہے\*۔ نیز حَصُورٌ اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو  
 اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور اپنی نفسانی خواہشات کو لگام دے سکتا ہو۔  
 مُحَاصِرَةٌ\*۔ دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر روک لینا۔ حَصَرَ الْقَوْمُ\*  
 یَفْلَانِ۔ قوم نے فلان کو گھیر لیا\*۔

سورۃ بقرہ میں اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کی تفسیر لَا يَسْتَطِيعُونَ  
 ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (۲۱۷)۔ نے کر دی۔ یعنی جو اس طرح روک لئے جانیں  
 کہ نقل و حرکت کی استطاعت نہ رکھیں۔ ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگا  
 دی جائے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جَعَلْنَاهُمْ حَصِيرًا کہا گیا ہے۔ (۱۸)۔  
 یعنی وہ مقام جہاں کسی کی نشوونما (Development) رک جائے۔ جہاں کسی  
 کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ (جہنم کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے  
 عنوان جَعَلْنَاهُمْ اور ج۔ ح۔ م۔)

## ح ص ص (ح ص ح ص)

الْحَصَّ - بالون کو سونڈ دینا - (تا کہ سر صاف ہو جائے) -  
 الْحَصَّاءُ مِنَ الثَّيْرِ بِسَاحٍ - صاف ہوا جس میں گرد و غبار نہ ہو -  
 حَصَّصَ الشَّيْءُ تَحْصِيَةً صَاحِبًا وَحَصَّصَتْ \*\*\* - چیز ظاہر ہو گئی -  
 واضح ہو گئی (جو چیز پہلے چھپی ہوئی ہو اور پھر واضح ہو جائے اس کے  
 متعلق کہتے ہیں) \* -

سورہ یوسف میں ہے الثَّنِ حَصَّصَ الْحَقُّ (۱۴/۱۱) - "اب حقیقت  
 واضح ہو گئی" - اب اصل بات بے نقاب ہو کر سامنے آگئی - لیکن صاحب  
 محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حَصَّصَ الثَّيْرِ سے  
 ہے جس کے معنی ہوتے ہیں اونٹ نے بیٹھنے کے لئے اپنے سینہ اور گھٹنوں کو  
 اچھی طرح زمین پر جمایا - اس لئے حَصَّصَ الْحَقُّ کے معنی ہونگے حق  
 ثابت اور برقرار ہو گیا \* - حِصَّةٌ - (حصہ) جو چیز اصل میں سے کاٹ کر الگ  
 کر لی جائے - مجموعہ کا ایک ٹکڑا \* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں  
 (۱) حصہ اور (۲) واضح اور متعین ہو جانا لکھا ہے - نیز کسی چیز کا ختم  
 پا کم ہو جانا -

## ح ص ل

الْحَصِيلُ مِنَ كُلِّ شَيْءٍ - کسی چیز میں سے جو کچھ باقی رہ  
 جائے - اَلتَّحْصِيلُ - جو کچھ حاصل ہو جائے اسے الگ الگ کر دینا -  
 دراصل تَحْصِيلٌ کے معنی چھلکے سے مغز نکالنا ہوتا ہے - مثلاً بھوسے سے  
 گیہوں کے دانوں کو یا مٹی پتھر کو، الگ کرنا - تَحْصِيلُ الشَّيْءِ -  
 چیز جمع اور ثابت ہو گئی - اس سے اَلْحَوْصِلَةُ - ہرندے کے پوئے کو  
 کہتے ہیں \* -

قرآن کریم میں ہے وَ حَصِيلٌ مَّا فِي الصُّدُورِ (۱۱/۱۱) جو کچھ  
 سینوں میں (ہا کہیں اور پوشیدہ) ہے اسے یوں الگ کر کے باہر نکال لیا  
 جائے گا جیسے چھلکے سے مغز الگ کر لیتے ہیں - ابن فارس نے لکھا ہے کہ  
 تَحْصِيلٌ کے معنی پوئے یا چاندی کو کان کی مٹی سے نکالنے کے ہیں -

\* تاج و راغب - \*\* محیط - \*\*\* حصص رباعی ہے لیکن ہم نے اسے الگ لکھنے کی  
 بجائے یہیں (ثلاثی میں) لکھ دینا مناسب سمجھا ہے -

## ح ص ن

أَلَا حُصَّانٌ کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ ایسے محفوظ رکھنا۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ حَصْنٌ أَلَمْ يَكُنْ يَحْصِنُ۔ جگہ کا محفوظ ہونا اس طرح کہ اس تک پہنچنے کی راہ نہ ہو، ایسی محفوظ جگہ حَصِينٌ کہلائیگی۔ حَصْنَتُهُ وَ أَحْصَنَتُهُ اس نے ایسے محفوظ کر دیا۔ أَلْحِصْنُ ہر محفوظ مقام جسکے اندر تک رسائی نہ ہو سکے۔ جمع حَصُونٌ۔ (۵۹) مُحَصَّنَةٌ۔ محفوظ کی ہوئی (۵۹)۔ أَلْحِصْنُ۔ فعل۔ حفاظت کرنے کے معنوں میں سورۃ انبیاء میں ہے لِيُحَصِّنَ كُمْ (۲۱/۸) تاکہ وہ تمہیں محفوظ رکھے۔

سورۃ یوسف میں بحفاظت ذخیرہ کی ہوئی گندم کیلئے ہے مِثْقَاتُ حَصِينُونَ (۱۲/۶۸)۔ حفاظت کے اعتبار سے، حَصَّانٌ اس ہورت کو کہتے ہیں جو پاکدامن ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھتی ہو\*۔ (موتی کو بھی کہتے ہیں کہ وہ سیپ میں محفوظ ہوتا ہے)۔ ہورت کی پاکدامنی دو طریق پر ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ شادی کر کے (صرف ایک کی ہو جائے) اور اس طرح اسکی عصمت (غیروں کے ہاتھوں سے) محفوظ ہو جائے۔ اس اعتبار سے پاکدامن ہورت کو مُحَصِّنٌ بھی کہتے ہیں اور مُحَصَّنٌ بھی۔ (یعنی بصیغہ فاعل اور بصیغہ مفعول دونوں طرح)۔ راغب نے کہا ہے کہ مُحَصِّنٌ (حفاظت کرنے والی) اسوقت کہتے ہیں جب وہ (غیر شادی شدہ حالت میں) اپنی عفت کی حفاظت آپ کرے۔ اور مُحَصَّنٌ۔ (جس کی حفاظت کی جائے) جب اسکی عصمت کی حفاظت شادی کے ذریعہ سے ہو جائے۔ چنانچہ أَلْمُحَصَّنَاتُ۔ شادی شدہ ہورتوں کو کہتے ہیں۔ أَحْصَنٌ۔ کے معنی ہیں شادی کرنا۔ لیکن تاج العروس میں (جوہری اور ثعلب کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ پاکدامن عورت کے لئے مُحَصِّنَةٌ اور مُحَصَّنَةٌ۔ دونوں الفاظ آتے ہیں، لیکن شادی شدہ کیلئے صرف مُحَصَّنَةٌ آتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں پاکدامن ہورتوں کیلئے أَلْمُحَصَّنَاتُ آیا ہے (۲۴/۲)۔ جسمیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں شامل ہیں۔ لہذا جہاں مُحَصَّنَةٌ آئیگا، وہاں سیاق و سباق کی رو سے دیکھنا ہوگا کہ اس سے مطلب غیر شادی شدہ پاکدامن ہورت ہے یا شادی شدہ ہورت۔



قرآن کریم میں یہ لفظ یا کدامن کے معنوں میں (  $\frac{۵}{۴۳}$  ;  $\frac{۴۴}{۴۳}$  ) میں آیا ہے ۔ سورۃ نسا (  $\frac{۴۴}{۴۳}$  ) میں یہ لفظ قَتْلَات کے مقابلہ میں آیا ہے جہاں اسکے معنی آزاد عورتوں کے ہیں ( بمقابلہ لونڈیوں کے ) ۔ اسی سورۃ کی چوبیسویں آیت (  $\frac{۴۴}{۴۳}$  ) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ، وہاں اسکے معنی ”پاکدامن“ بھی ہو سکتے ہیں اور ”شوہر دار“ بھی ۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاکدامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں ہوں ۔ اور دوسرے معانی کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم ہر شوہر دار عورتیں حرام ہیں ، بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آچکی ہوں ( دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک ) ۔ یا بجز شوہر دار عورتوں کے جن کا استثناء (  $\frac{۱}{۱}$  ) میں کیا گیا ہے ۔ ہمارے نزدیک یہاں شوہر دار کا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کیلئے دو لفظ استعمال کئے ہیں ۔ مُحْصِنَاتٌ غَيْرُ مُسْتَفْعِيَاتٍ (  $\frac{۴۴}{۴۳}$  ) ۔ (مستفع کے تفصیلی معنی عنوان م۔ ف۔ ح کے تحت دیکھئے ۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اسکے معنی ہیں اپنے مادہ کو یوں ہی بہا دینا یا گرا دینا ) یعنی اگر یہ اختلاط معنی محض سادہ کو نکالنے کیلئے ہے ( جسے شہوت رانی کہتے ہیں ۔ یعنی جنسی اشتعال کی تسکین ۔ زنا کا مقصد یہی ہوتا ہے ) تو یہ ناجائز ہے ۔ اور اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ اس طرح مادہ ( استقرار حمل کی رو سے ) محفوظ ہو جائے اور یونہی بہکے ضائع نہ چلا جائے ۔ تو یہ اختلاط جائز ہے ۔ اسے نکاح کہتے ہیں ۔ چنانچہ عربوں میں نِكَاح کے مقابلہ میں لفظ سِفَاح آتا تھا ۔ نیز ان کے ہاں تیروں سے جڑا کھیلا کرتے تھے ۔ ہر تیر کسی خاص حصہ کیلئے ہوتا تھا ۔ لیکن ان میں ایک تیر خالی رکھا جاتا تھا جو محض خانہ پری کیلئے ہوتا تھا ۔ اسکا نہ کوئی حصہ ہوتا تھا نہ نتیجہ ۔ اس تیر کو الْقَسْفِیْحُ کہتے تھے \* ۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مُحْصِنَاتٌ غَيْرُ مُسْتَفْعِيَاتٍ کے معنی کیا ہیں ۔ اَلْمُسْتَفْعُوۡحُ مِّنَ الزَّرْعِ ۔ اس کہیتی کو کہتے تھے جسکے پتے شدت سردی سے زرد پڑ جائیں ۔ دانے مرجھا کر پتلے ہو جائیں ۔ بالیں سیاہ پڑ جائیں ۔ اور انکے پرت گر پڑیں \*\* ۔ اس طرح ساری کہیتی ضائع ہو جائے ۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کا منشا کیا ہے ۔ اسی لئے اس نے عورتوں کو حَرَّتْ ( کہیتی ) کہا ہے ۔ (  $\frac{۴۴}{۴۳}$  ) ۔ یعنی مرد اور عورت کا جنسی اختلاط بطریق

مُحْصِنِينَ ہونا چاہئے۔ یعنی ذمہ داریوں کی حفاظت کی غرض سے جو نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں اور جسکا منشا تحفظ اور بقائے نسل انسانی ہے، نہ کہ محض جنسی تسکین کی خاطر۔ ”خالی تیر جلانے“ کیلئے۔ ”وقتی نکاح“ بھی سَفَح\* ہی ہوتا ہے نہ کہ احْصَان\*۔ (نیز دیکھئے عنوان خ۔ د۔ ن)

(مردوں اور عورتوں کے جنسی اختلاط کے حدود و ضوابط کا قوموں کے تمدن اور کلچر سے کسقدر گہرا تعلق ہے، اس کے لئے میری کتاب ”طاہرہ کے نام خطوط“، ملاحظہ کیجئے)۔

## ح ص ی

الْحَصٰی۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ سنگریزے۔ چونکہ عرب ابتداء چیزوں کی گنتی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے کرتے تھے (جیسا کہ ہم انگلیوں سے گنتے ہیں) اس لئے احْصَاء\* کے معنی گنتی کرنے (۱۴/۱۳۶)۔ یا گنتی کر کے کسی چیز کو حاصل کر لینے اور احاطہ میں لے لینے کے ہو گئے\*۔

قرآن کریم میں ہے ”وَاحْصٰی كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا“ (۲۸/۶۲)۔ ”اس نے ہر چیز کو گن کر احاطہ میں لے رکھا ہے“۔ یعنی اس میں گنتی اور اس کے بعد حفاظت سے حاصل کر لینے کے دونوں گوشے آ جاتے ہیں۔ جیسے سورۃ مزمل میں ہے ”عَلِمَ اَن لَّنْ تَحْصُوْهُ“ (۳۳/۴)۔ ”وہ جانتا ہے کہ تم ہابندی کے ساتھ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے“۔ سورۃ کہف میں ہے ”اِنَّ الْحِزْبَ بَيْنَ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا“ (۱۸/۱)۔ ”ان دونوں گروہوں میں سے کس نے اس عرصہ کا احاطہ کیا ہے“، اور اس مدت کو شمار کر لیا ہے یا اسے اپنے ضبط اور کنٹرول میں رکھا ہے۔ عموماً اس آیت میں اَحْصٰی افعال التفضیل سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ اسے فعل ماضی سمجھا جائے۔ کشاف نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں، نیز شمار کرنا اور بدقت کسی کام کی طاقت رکھنا۔ اس سے بھی مطلب احاطہ کرنا اور ضبط کرنا ہیں۔

## ح ض ر

حَضَرَ۔ يَحْضُرُ۔ حَاضِرًا۔ حاضر ہونا۔ موجود ہونا۔ (غائب کی ضد ہے)۔ نیز حَاضِرٌ۔ موجود۔ اَحْضَرَ الشَّيْءُ۔ چیز کو حاضر کر دیا\*۔

حَضْرَةٌ\* وَاحْتَضَرَهُ وَاحْتَضَرَهُ\*۔ اُسے حاضر و موجود کیا، نیز اس کے پاس آیا اور پہنچا\* ابن فارس نے اس سادہ کے معانی پہنچنا، پہنچانا، موجود ہونا بتائے ہیں۔ اس اعتبار سے الاحْتَضَارُ دم مرگ کو کہتے ہیں جب موت حاضر ہو جاتی ہے۔ آیت (۲۳/۸) میں يَحْضُرُونَ کے معنی بتائے ہوئے اس نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی ایذا پہنچانا اور برا کرنا بھی بتائے ہیں۔ الْحَضَارَةُ\*۔ شہر میں اقامت کرنا۔ برخلاف بَدَاوَةٌ\* کے، جس کے معنی دیہات میں سکونت اختیار کرنا ہیں۔ الْحَضَائِرَةُ\*۔ شہر، بستیاں، سرسبز آباد علاقے\*\*۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ (۲/۱۳۳) ”جب یعقوب کے سامنے موت آگئی“۔ یعنی ان کے مرنے کا وقت آ گیا۔

حَاضِرَةُ الْبَحْرِ (۱۶/۶۳) دریا کے کنارے واقع ہونے والی۔ تِجَارَةٌ\* حَاضِرَةٌ (۲/۸۲) نقد تجارت۔ نقد سودا۔ مُحَضَّرُونَ (۳۶/۱۶) حاضر کئے ہوئے، مبتلائے عذاب۔ مُحَضَّرٌ\* (۵۲/۸) حاضر کیا ہوا۔ یعنی جس کی باری ہوگی اس کے لئے گھاٹ موجود ہوگا۔ کسی دوسرے نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہوگا۔

## ح ض ض

الْحَضُّ\*۔ کسی کام پر برانگیختہ کرنا، ابھارنا۔ خلیل کے نزدیک الْحَضُّ ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ (بحوالہ ابن فارس) حَضَّه\*۔ يَحْضُّهُ\* علی امر۔ کسی کو کسی کام پر ابھارنا۔ برانگیختہ کرنا۔ حَضِيضٌ\*۔ نشیبی زمین کو کہتے ہیں\*\*\*۔ (کیونکہ اس طرف انسان تیزی سے چلا جاتا ہے)۔ اصل میں حَضٌّ کے معنی ہی جانور کو نشیب کی طرف ہانکنے کے ہوتے ہیں\*\*\*\*۔ پھر اس کے معنی ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے آنے لگے۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا يَحْضُ عَلٰی طَعَامِ الْمُسْكِينِ (۳۴/۳۴) ”وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا“۔ سورۃ فجر میں وَلَا تَحْضُونِ (۱۸/۸) آیا ہے۔ ”وہ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے“۔ ایسا کرنے والے دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ (۱۴/۱۴)۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے دین اور معاشیات کا کتنا گہرا تعلق ہے ا

## ح ط ب

الْحَطَّابُ\* - وہ لکڑیاں جو آگ جلانے کے لئے درختوں سے کاٹی جاتی ہیں۔ ایندھن (جب ان لکڑیوں میں آگ لگائی جائے تو پھر اس ایندھن کو وَقُود\* کہا جائیگا) \*\*\* - حَطَّابٌ يَحْطِيبُ\* - لکڑیاں جمع کرنا۔ مَسْكَانٌ\* حَطِيبٌ\* - وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں۔ هُوَ حَطِيبٌ قَيْلٍ\* - وہ بری بھلی، کار آمد و بیکار، ہر قسم کی باتیں بیان کرتا ہے۔ جیسے رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والا کبھی سانپ کو بھی لکڑی سمجھ کر اٹھا لیتا ہے\* - فُلَانٌ يَحْطِيبُ عُلَى فُلَانٍ\* - فلان آدمی فلان کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے۔ حَطِيبٌ فُلَانٌ يَصْأَحِبِيهِ\* - فلان نے اپنے ساتھی کے خلاف جفلی کھائی\*\*۔

قرآن کریم میں حَطَّابًا (۶۲/۱۸) ایندھن کے لئے آیا ہے۔ اور ابولہب کی بیوی کو حَمَّالَةَ الْحَطَّابِ (۱۱۱/۱) کہا گیا ہے۔ اس کے معنی جفلہ خور کے بھی ہو سکتے ہیں اور دشمنی کی آگ بھڑکانے کے بھی۔ اس کا مفہوم ”لگائی بچھائی کرنے والی“ زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یا اسباب مخالفت میں اضافہ کرنے والی۔

## ح ط ط

الْحَطَّاءُ\* - اس مادہ کے اصلی معنی اوپر سے اتارنا اور نیچے رکھنا ہیں\*\*\*\*۔ الْحَطَّاءُ وَالْأَحْطِيطَاءُ\* کے معنی ہیں سواری وغیرہ سے سامان اتار دینا۔ حَطَّاءٌ فِي مَسْكَانٍ\* - وہ کسی جگہ اتر گیا۔ أَلْمَحْطَّاءُ\* - منزل، قیام گاہ۔ حَطَّاءُ الرَّجُلِ\* - بَحْطَاءُ\* - وہ آدمی اوپر سے نیچے کی طرف اترتا۔ أَلْحَطَّائِيَّةُ\* - چھوٹے قد کا آدمی\*۔

سورۃ بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ تم اب اس شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو جاؤ، وہاں ہے وَقُولُوا حِطَّةٌ (۲/۵۸)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس شہر میں جا بسو، اور پھر یہ دعا کرو کہ اب ہماری دشت فوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم ہو جائے۔ ہمارا رختہ سفر ہماری سواریوں سے اتر جائے اور ہم اس قیامگاہ میں آرام سے زندگی بسر کریں۔

راغب نے کہا ہے کہ حِطَّة کے معنی ہیں حُطّ عَنَّا ذُنُوبَنَا۔  
یعنی ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے۔ دور کر دے۔ اسکا بھی مطلب یہی  
ہے کہ اب ہماری خطا معاف ہو اور صحرا نوردی اور دشت بیانی کی زندگی کا  
خاتمہ ہو جائے۔

## ح ط م

الْحِطْمُ۔ توڑ دینا۔ خواہ کسی طریق سے بھی ہو۔ خشک چیز جیسے  
ہڈی وغیرہ کو توڑ دینا۔ انْحَطَمَ وہ چیز ٹوٹ گئی۔ اَلْحِطْمَةُ۔ اَلْحِطَامَةُ  
جو کچھ کسی چیز میں سے ٹوٹ جائے۔ اَلْحَطِیْمُ۔ وہ حصہ جو خانہ کعبہ  
کی عمارت سے الگ چھوڑا ہوا ہے۔ اَلْحِطْمَةُ۔ سخت قحط کا سال۔ اَلْحِطْمَةُ۔  
کثیر تعداد میں اونٹ یا بکریاں جو زمین کے بالائی حصہ یا ہودوں کو ہمال  
کردیں۔ سخت آگ جو ہر اس چیز کو جو اس میں ڈالی جائے بھسم کر کے  
رکھ دے۔ ایسا چرواہا جو اپنے جانوروں پر سخت ظلم کرے۔  
سورة نمل میں ہے لَا يَحْطِیْمَنَّكُمْ (۲۸) ”وہ کہیں تمہیں کچل نہ  
ڈالیں۔“

سورة زمر میں ہے ثُمَّ يَجْعَلُهُ حِطَامًا (۳۹) ”پھر وہ اسے چورا چورا  
کر دیتا ہے۔ کچلی ہوئی چیز کی طرح کر دیتا ہے۔ سورة الْهُمَزَةِ میں  
جہنم کیلئے اَلْحِطْمَةُ آیا ہے (۱۴)۔ یعنی جس میں انسانیت کچلی جائے۔“

## ح ظ ر

حَظَرَهُ الشَّيْطَانُ يَحْظَرُهُ۔ اس سے کسی چیز کو روک دینا، بند  
کر دینا، منع کر دینا۔ جب کوئی شے تمہارے اور کسی دوسرے کے درمیان  
روک بن کر حائل ہو جائے تو کہتے ہیں حَظَرَهُ عَلَيْكَ۔ اَلْحِظِيْرَةُ۔  
باڑ جو کھیت کے گرد لگادی جائے۔ احاطہ۔ کھجور کی شاخوں اور پتھوں سے  
ایک دائرہ سا بنا لیتے ہیں جس میں کھجوریں توڑ توڑ کر اکٹھی کرتے جاتے  
ہیں۔ نیز اونٹوں وغیرہ کا باڑہ۔ اَلْحِظَارُ۔ دیوار کو بھی کہتے ہیں۔

اَلْحِظِيْرُ۔ بخیل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مال کو اپنے لئے روک  
رکھتا ہے اور نوع انسانی کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔ اَلْمَحْظُوْرُ۔ روکا  
ہوا۔ محروم۔ جسے کسی چیز کے لینے سے روک دیا ہو۔

قرآن کریم میں ہے کہ جہانتک خدا کے قانون طبعی کے ذریعہ دنیا کے مال و متاع سامنے کا تعلق ہے یہ ہر شخص کو اسکی کوشش کے مطابق مل سکتا ہے۔ اس میں کافر و مومن، کسی کی تمیز نہیں۔ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۱۲) ”خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں پر کوئی احاطہ بندی نہیں کر رکھی“۔ اسے تمام نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھا ہے۔ لہذا انہیں اسی طرح کھلا رہنا چاہئے۔ جو نظام، خدا کے دینے ہوئے رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیتوں میں دیکر انہیں محظور کر دیتا ہے وہ خدا کے نظام رب العالمین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی کو يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جس رزق کو پانی کی طرح بہتا رہنا چاہئے تھا اسے بند لگا کر روک رکھنا۔

سورۃ قمر میں قوم ثمود کی تباہی کے ضمن میں ہے فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ (۱۰۱)۔ وہ ایسے ہو گئے جیسے پرانی ہاڑ کا فرسودہ چورہ ہوتا ہے۔ (ابن فارس) یا اس بھوسہ کی طرح ہو گئے جس کو رکھنے کیلئے ہاڑ بنانے والا ہاڑ بناتا ہے۔

## ح ظ ظ

الْحَظُّ - نصیب - مقررہ حصہ - بخت - أَحْظَ فَلَانٌ - فلاں شخص خوش بخت اور مالدار ہو گیا - اَلْحَظِيظُ - خوش نصیب و آسودہ حال \*۔  
قرآن کریم میں بہت بڑے نصیب والے (خوش بخت) کو ذُوْ حَظٍّ عَظِيمٍ کہا گیا ہے (۱۰۵)۔ یہ وہ ہے جو پرانی کدو حسن کارانہ انداز سے دور کرتا اور جادہ حق پر استقامت سے چلے جاتا ہے (۱۰۷-۱۰۸)۔

## ح ف د

حَفَدٌ - يَحْفِدُ - کام میں بھرتی اور جلدی کرنا - خدمت کرنا - اَلْحَفْدُ وَالْحَفْدَةُ - خدام و اہوان (حافد کی جمع ہے) جو شخص کوئی کام کرے اور اس میں اطاعت اور تیزی دکھائے تو اسے حافد کہتے ہیں \*۔ قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْ لَّكُمْ مِّنْ أَرْوَاحِكُمْ بَنِينَ وَ حَفَدَةً (۱۱۴) ”اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے اولاد (بیٹے) پیدا کی۔ اور خدمتگار بھی“۔ بعض نے کہا ہے کہ حِفَادُ الثَّجَلِ - آدمی کی اولاد اور

اولاد در اولاد کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نسبتی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ بعض نے ہوتے مراد لئے ہیں \*\*\*۔ لیکن اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ اس سے مراد خدمتگار ہی ہیں۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں سے تمہاری اولاد پیدا کی۔ نیز تمہارے لئے خدمتگار بنائے۔ ہوتے وغیرہ بھی اس لئے مراد لئے جاتے ہیں کہ ان کی خدمت زیادہ صداقت آمیز ہوتی ہے \*\*۔ واضح رہے کہ ”خدمتگار“ سے مراد کام کاج میں معاون اور مددگار ہیں۔ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق ”نوکر“ نہیں جنہیں انسانیت کا درجہ ہی نہیں دیا جاتا۔

## ح ف ر

حَفَرُ الشَّيْءِ بِحَفِيرٍ۔ کسی چیز کو کھودنا۔ جو جگہ کھودی جائے اسے حَفْرَةٌ کہتے ہیں اور جس چیز سے کھودا جائے اسے بِحَفَرٍ کہتے ہیں۔ حَفَرٌ (۱۳۲) الْحَفَائِرُ۔ جانور کے سم کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ چلنے میں مٹی کھودنا چلا جاتا ہے۔ اسی سے حَفَائِرٌ اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر کوئی نشان بناتا گیا ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعْتُ عِلَّی حَفَائِرَی۔ میں اپنے اس راستہ پر لوٹ آیا جس پر میں گیا تھا۔ یعنی اپنی پہلی حالت پر واپس آجانا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھودنے کے علاوہ، اوّل اس کے بھی ہیں۔

سورة نَارِ عِلَّتْ میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آئے والے انقلاب میں ان سے وہ سب قوت و دولت چھن جائیگی جو انہوں نے اس طرح سلب و نہب سے حاصل کر رکھی ہے اور اس طرح وہ اُسی حالت پر لوٹ جائیں گے جس پر وہ اس دولت و قوت کے حصول سے پہلے تھے، تو یہ اسکا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، ذرا ان کی سننا! یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری پھر وہی پہلی ہی حالت ہو جائیگی۔ یَقُولُونَ ؕ اِنَّا لَمَرْدُودُونَ (۹۱)۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ حَفَائِرٌ اس طرح لوٹنے کو کہتے ہیں کہ آخری حصہ بالکل پہلے حصہ پر ہلٹ جائے \*\*\*۔ (As you were) ہو جانا۔ یا مرنے کے بعد جب ہڈیاں تک کھوکھلی ہو جائیں، پھر زندگی کی حالت کی طرف لوٹ آنا۔ یعنی دوبارہ زندہ ہو جانا۔

## ح ف ظ

حَفِیْظَتُهُ - حَفِیْظًا - نگہبانی کرنا - حفاظت کرنا - بچانا \* - الْحَفِیْظُ  
 کے بھی یہی معنی ہیں (۱۱۳)۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن  
 الفاظ میں حاء اور فاء اکٹھے آئیں اُن میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔  
 محفوظ کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُمرشے کو منتشر نہ ہونے دیا جائے۔ جمع  
 رکھا جائے۔ حَافِیْظٌ - حَفِیْظٌ - وہ شخص جو کسی چیز کی نگہبانی کیلئے مقرر کیا گیا  
 ہو۔ محافظ - نگہبان \* - اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّسَّ بِمَا عَمِلَتْهَا حَافِیْظٌ (۸۶)۔ ”ہر  
 شخص پر نگہبان مقرر ہے، اور اِنْ رَبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ  
 (۱۱)۔ ”میرا رب ہر شے کا نگہبان ہے،“ - سورۃ ق میں مومن کو بھی  
 حَفِیْظٌ (۵۴) کہا گیا ہے۔ اس کے معنی ہونگے قانون خداوندی کی نگہداشت  
 کرنے والا - حَافِیْظٌ کی جمع حَفَیْظَةٌ ہے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ اُن کائناتی قوتوں (ملائکہ) کیلئے بھی آیا ہے  
 جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہر شے پر کنٹرول رکھتی ہیں۔ (۶۱)۔  
 اِسْتَحْفِظْ حَفَیْظًا حَفَیْظًا حَفَیْظًا - سورۃ مائدہ میں ہے بِمَا اِسْتَحْفِیْظُوْا  
 مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ (۵۴) یعنی جو کتاب اللہ انکی حفاظت میں دی گئی تھی۔  
 جس کی حفاظت کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا۔ مَحْفُوظٌ - حفاظت میں رکھا  
 ہوا۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَ جَعَلْنَا السَّمٰوٰتِ سَفَافًا مَّحْفُوظًا (۲۱)۔ ”ہم  
 نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا“۔ فتح القدیر میں ہے کہ اس کے معنی مَرْفُوعًا  
 اونچا ہیں \*\*۔ لیکن ہمیں لغت سے اسکی تائید نہیں ملی شاید یہ معنی اس  
 اعتبار سے لئے گئے ہوں کہ حفاظت کی غرض سے کسی شے کو اتنی بلندی پر  
 رکھ دیا جائے جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہو۔ لیکن یہ معنی قیاسی ہونگے۔  
 (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان س۔ م۔ و)۔

نصر نے کہا ہے کہ اَلْحَفَیْظُ سیدھے اور واضح راستے کو بھی کہتے  
 ہیں \*۔

## ح ف ف

اَلْحَفِیْفُ - گنجے کے سر کے ارد گرد کے بال۔ اس سے اس کے معنی  
 ہوتے ہیں ہر وہ چیز جو کسی چیز کے گردا گرد واقع ہو اور اسے اپنے گھیرے  
 میں لئے ہو۔ حَفِیْفٌ بِالْشَّیْءِ - اس نے اسے کسی چیز کے ذریعہ گھیر لیا۔



حَفَّافٌ حَوْلَهُ - اس نے اسکے گرد گھیرا ڈال دیا \* - اصل میں ، جس لفظ میں حاء اور فاء اکٹھے ہوں اس میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے \*\* -

سورۃ کہف میں دو باغوں کے متعلق ہے - حَفَفَتْ لَهُمَا بَنَاتُهَا (۱۸/۳۹) ”ہم نے انکے گردا گرد کھجوریں لگائیں“ - سورۃ زمر میں ہے وَ تَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِظِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۳۹) - ”تو ملائکہ کو دیکھو گا کہ وہ عرش کے ارد گرد گھیرا ڈالے ہیں“ - عرش ، کائنات کے کنٹرول کا مرکز ہے - اور ملائکہ ، عالم امر و خلق کی وہ قوتیں جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لاتی ہیں - یہ سب قوتیں خدا کے کائناتی کنٹرول کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں -

## ح ف ی (ح ف و)

الْحَفَّاءُ - آدمی یا اونٹ کے پاؤں اور جانوروں کے مشم یا کھر کا زیادہ چلنے سے چھل جانا۔ ننگے پاؤں ، بغیر جوتے یا موزے کے چلنا۔ احْتَفَفِي - وہ ننگے پاؤں چلا \*\*\*\* - چونکہ انسان ننگے پاؤں اس کام کے لئے اٹھ کر چل دیتا ہے جسکے متعلق اسے بڑی کاوش اور اضطراب ہو ، اس لئے اس لفظ کا استعمال شدت اور مبالغہ کے لئے ہوتا ہے - حَفَفِيْ بِهٖ : اسکے ساتھ مہربانی و لطف سے پیش آیا ، اس کا انتہائی اکرام و احترام کیا ، اسے دیکھ کر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا \*\*\* - حَفَفِيْ عَنْهٖ بِحَفَفِيْ - کسی کا حال بار بار ، اکثر بار بار صرار پوچھتے رہنا - احْفَظِي السُّؤَالَ - اس نے بار بار سوال دہرایا - با صرار مانگا - احْفَظِيْ - اس عالم کو کہتے ہیں جو نہایت کاوش کے ساتھ علم حاصل کرے - جو بات کی تہہ تک پہنچ جائے - احْفَظِي الرَّجُلَ - آدمی نے بڑی کوشش اور کاوش سے بات معلوم کی \*\*\*\* - احْفَظِيْ - قاضی کو کہتے ہیں جو مقدمہ کی تہہ تک پہنچ کر فیصلہ دیتا ہے \*\*\* - احْفَظِيْ - بات کو اچھی طرح جاننے والا \*\*\*\* - وسیع معلومات اور ہمہ گیر علم رکھنے والا - سورۃ اعراف میں ہے يَسْتَنْتَوْنَكَ كَاْنَكَ حَفِيٌّ عَنْهُمَا (۱۸/۳۹) یہ ترجمہ سے (السَّاعَةِ) کے متعلق اس طرح پوچھتے ہیں گویا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی مسئلہ کی تحقیق کے پیچھے لگا ہوا ہے - سورۃ مریم میں خدا کے متعلق ہے اِنَّهٗ كَانَ رَبِّ حَفِيًّا (۱۹/۱۹) - وہ مجھ پر بہت مہربان ہے میری حاجت روا کرنے والا ہے - کیونکہ حَفَفِيْ بِهٖ کے معنی ہیں کسی کے

اکرام میں مبالغہ سے کام لینا۔ اصمعی نے حقیقی بیہ کے معنی کسی کی ضرورت پر اس کے کام آنا اور اسکو عزت سے ٹھیرانا کثے ہیں\*۔ سورۃ محمد میں ہے اِنْ يَسْتَفْذِلْكُمُوْهُمَا فَيَجْحَدِيْكُمْ (۲۴) اگر وہ تم سے (مال و دولت) مانگے اور اس مانگنے میں اصرار کرے تمہارا پیچھا لے اور چمٹ جائے۔ ننگے پاؤں تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) روکنا۔ (۲) سوال کرنے میں حد کر دینا۔ اور (۳) ننگے پاؤں ہونا ہیں۔ اس مادہ میں کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سے اِحْفَاءُ الشَّوَارِبِ ہے (یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹ لینا۔)۔ صاحب محیط نے اس کی تائید میں ابو فراس بن حمدان عدوی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

أَغَايَةُ الدِّينِ أَنْ تَحْفَتُوا شَوَارِبَكُمْ

يَا أُمَّةَ ضَعِيكَتْ سِيْنُ جَهْلِيهَا الْاِمَمِ

کیا تمہارے نزدیک دین کی غایت یہی رہ گئی ہے کہ مونچھوں کو جڑ سے مونڈا جائے؟ اے وہ قوم کہ تیری جہالت پر دنیا کی قومیں ہنس رہی ہیں۔

## ح ق ب

الْحَقِيقَةُ۔ وہ بند جو اونٹ کے پیٹ کے نیچے سے کھینچ کر کجاوہ یا کاٹھی کے ساتھ کس کر باندھا جائے۔ (اسے ہمارے ہاں ”تنگ“ کہتے ہیں) اس کے بنیادی معنی روکنے اور قید کرنے کے ہوتے ہیں (ابن فارس)۔ الْحَقِيقَةُ۔ تھیلا، بالخصوص وہ تھیلا جو پالان کے پچھلے حصہ میں لٹکا رہتا ہے۔ الْمُحْتَقِبُ۔ وہ شخص جو اپنے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو سواری پر بٹھائے۔ الْمُحْتَقِبُ فُلَانٌ۔ فلاں آدمی نے اپنے کجاوہ یا کاٹھی کے پچھلے حصہ میں کچھ باندھ کر لٹکا لیا۔ الْمُحْتَقِبُ فُلَانٌ لَا تَمُ۔ فلاں آدمی نے گناہوں کا ہشتارہ اپنے پیچھے باندھ لیا۔ الْحَقِيقَةُ مِینَ الدَّهْرِ۔ زمانہ کی ایک مدت جسکی مقدار مقرر نہیں۔ الْحَقِيقَةُ وَالْحَقِيقَةُ زمانہ۔ اسٹی (۸) سال کا زمانہ۔ سال۔ سالہا سال، (جمع احْقَابٌ)\*۔ یہ لفظ غیر متعین مدت کے لئے بولا جاتا ہے\*\* سورۃ کہف میں ہے اَوْ اَمْضِيَ حَقْبًا

\* تاج۔ \*\* راغب، لطائف اللغة میں اس کے معنی آلدہ ہر لکھے ہیں۔ یعنی زمانہ۔

(۱۶۸)۔ ”سالہا سال تک چلتا رہوں“۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لَبِیْثِیْنَ  
فَیْئُهَا أَحْقَافًا (۱۶۸)۔ ”وہ اس میں زمانہ دراز تک رہینگے“۔ مَادَ امْتَرِ  
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۶۹) تک۔ یعنی جب تک زمین و آسمان قائم  
ہیں۔

## ح ق ف

الْحَقِیْقُفُ۔ لمبا بلند یا بڑا گول ریتلا ٹیلہ۔ جمع أَحْقَافٌ ہے۔ نیز  
بل کھائی ہوئی ریتیلی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ أَحْقَافٌ (۱۶۹)۔ بمن میں،  
ہاں اور حضرموت کے درمیان ٹیلے اور پہاڑ ہیں جہاں قوم عاد رہتی تھی\*۔

## ح ق ق

حَقٌّ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا  
کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے\*۔ یعنی کسی  
چیز کا ٹھوس شکل (Concrete Form) میں سامنے آ جانا۔ یا ثابت (Establish)  
ہو جانا۔ جن الفاظ میں حاء اور قاف اکٹھے آئیں ان میں اثبات (ثابت ہونے)  
کا مفہوم مضمر ہوتا ہے\*\*۔ ابن قاری نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں  
میں صحت (صحیح ہونا) اور استحکام و ثبات دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں  
عِندَ حَقٍّ لِّقَاتِحِہَا۔ یعنی اونٹنی کا حمل ثابت ہونے پر۔ رَجُلٌ حَقٌّ  
الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس شخص کی مردانگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔  
رَسُوٌّ فَاحَقُّ الرَّسِیْقَةِ کے معنی ہیں اس نے تیر چلایا اور اس کے ساتھ ہی  
جانور مر گیا۔ لہذا یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اسکا تیر نشانے  
پر لگا تھا۔ یعنی یہ بات محض قیاسی اور نظری نہیں کہ تیر نشانہ پر لگا ہے  
یا نہیں۔ مرے ہوئے شکار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تیر نشانہ پر لگا تھا۔  
اِحْتَقَقَتْ بِہِ الطَّعْنَةُ کے معنی ہیں نیزے کے وارنے سے قتل کر دیا۔  
جس سے ثابت ہو گیا کہ وار کاری تھا۔ طَعْنَةُ مُعْرِقَةٌ\*۔ یا مُعْرِقَةٌ\*  
نیزے کی اس مار کو کہتے ہیں جو سیدھی آ رہا ہو جائے اور اس طرح اس کے  
ٹھکانے پر لگنے میں کوئی شبہ نہ رہے\*۔ لہذا حَقٌّ کے معنی ہیں کسی چیز  
کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت ہنکر سامنے آ جانا۔ چنانچہ سورۃ احقاف میں ہے کہ  
مجرمین کو عذاب کے سامنے کھڑا کر کے ان سے پوچھا جائیگا کہ اَلَمْ یَسْ  
ہٰذَا بِالْحَقِّ (۱۶۹)۔ ”کہو اسکاقت عمل ایک ٹھوس حقیقت ہے یا

نہیں؟“ اسی طرح جب حضرت یوسفؑ کو مصر میں ممکن حاصل ہو گیا تو انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ”هَذَا تَوْرِيْلُ رُءُءِ يَتَايَ مِيْنُ قَبْلِ“۔ ”یہ ہے مال اس خواب کا جو میں نے بہت پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا“۔ ”قَدْ جَعَلْتَهَا رَبِّيْ حَقًّا“ (۱۲/۱)۔ ”میرے نشو و نما دینے والے نے ایسے ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں سامنے لا کر دکھا دیا ہے“۔ اسی طرح سورۃ حجر میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں نے انہیں انکی کبرسنی کے زمانہ میں بیٹے کی خوشخبری دی اور حضرت ابراہیمؑ کو اس پر تعجب سا ہوا تو انہوں نے کہا ”بَشِّرْ نَاكَ بِالْحَقِّ“ (۱۵/۵) ”ہم جو تجھے خوشخبری دے رہے ہیں وہ ایک ٹھوس واقعہ بن کر سامنے آ جائیگی“۔

لہذا حَقِّ کے اولین معنی ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بن کر سامنے آ جانا۔

(۲) چونکہ کوئی شے ٹھوس واقعہ میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتی ہے جب اسکی نشو و نما تعمیری (Constructive) ہو۔ اس لئے حَقِّ، اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو کہتے ہیں۔ چنانچہ تَحْقِیْق کے معنی ہیں کھڑے کو نہایت مضبوط کر کے بٹنا \* تَوْب \* مُحَقِّق \* اُس کھڑے کو کہتے ہیں جو پختہ ہوا ہو (محیط)۔ اَلْحَقِّ \*۔ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں لگ گئے ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے باربرداری کا کام لیا جاسکے۔ نیز وہ اس قابل ہوں کہ وہ اونٹیوں کو حاملہ کر کے ٹھوس نتائج مرتب کر سکیں۔\*\*

اِحْتَقَّ الْفَرَسُ کے معنی ہیں گھوڑا لاغر ہو گیا، دبلا ہو گیا اور رَحْتَقَ الْمَالُ کے معنی ہیں مولیٰ مٹے ہو گئے۔\*\* اِنْ حَقَّتِ الْعُقْدَةُ۔

کے معنی ہیں گرہ نہایت مضبوطی سے لگ گئی۔\*\*۔ لہذا حَقِّ کے معنی ہوئے ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو۔ امٹ ہو۔ اسلئے قرآن کریم میں یُحَقِّقُ \* بمقابلہ یَمْنَحُ \* (یمحو) آیا ہے۔ وَ یَمْنَحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ یُحَقِّقُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ (۲۴/۲)۔ خدا کا قانون کائنات، تخریبی قوتوں کے نتائج کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری قوتوں کے نتائج کو برقرار رکھتا ہے، جو ٹھوس شکل میں موجود رہتے ہیں۔

(۳) کوئی چیز اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانوں حفظ و بقا کے عین مطابق ہو۔ جو زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ جو اپنی جگہ

پر بھی فیٹ ہو اور بدلنے والے حالات سے بھی موافق رہے۔ چنانچہ حقؑ کے تیسرے معنی ہیں علم و عقل، عدل و انصاف اور واقعات و مصالح کے مین مطابق ہونا۔ راغب نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ آجکل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوئے ہیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گتسی کی طرح لکڑی بڑھی ہوئی ہوتی تھی اور وہ لکڑی ساکٹ (Socket) میں اس طرح فیٹ آجاتی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر قائم بھی رہتی تھی اور دروازے کے ساتھ گھومتی بھی تھی۔ راغب کے نزدیک حقؑ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ حقؑ اس موجد کو کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اس لئے خدا کو الحقؑ کہا گیا ہے۔\*\*\* نیز ہر اس موجود چیز کو حقؑ کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔\*\*۔ اَلَا حَقُّ مِّنَ الْفَرَسِ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنا پچھلا پاؤں ٹھیک اس جگہ رکھے جہاں اسکا اگلا پاؤں پڑا تھا\*۔

ان معانی کی روشنی میں حقؑ اور باطیلؑ کی قرآنی اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آجائیکا۔

حقؑ اَلَا مَرُّ يَحَقُّ اور يَحَقُّ کے معنی ہیں وہ اس واجب ہو گیا۔ یعنی کسی بات کا واجب ہونا۔ حَقِيقَةٌ۔ اس چیز کو کہتے ہیں جسکی حفاظت تم پر واجب ہو جائے۔ حَقًّا عَلٰی الْمُتَّقِيْنَ (۱۸۰) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی متقین کے ذمہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس قانون (وصیت) پر خود ہی عمل پیرا ہوں بلکہ ان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اسکی حفاظت کریں۔ نیز کسی ملک کے جھنڈے کو حَقِيقَةٌ کہتے ہیں کیونکہ اس سے اس ملک کے وجود کا اثبات ہو۔ اور اسکی حفاظت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے\*۔

حقؑ الطَّيْرُ بَقِيَ کے معنی ہیں وہ سوار ہو کر راستہ کے درمیان چلا۔ اور اس طرح نمایاں ہو کر سامنے آ گیا\*۔

سورۃ یونس میں حقؑ کا لفظ ظَنُّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶) جہاں کہا گیا ہے کہ ظَنُّ، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیتا۔ اس لئے اتباع، حق کی کرنی چاہئے نہ کہ ظن کی۔ دین یکسر حق ہے۔ اس میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ خدا خود حق ہے (۱۷)۔ اس کا رسول حق ہے (۱۸)۔ اسکی طرف سے بھیجا ہوا قرآن کریم حق ہے (۱۹)۔ اس کے وعدے (قوانین) حق

ہیں (۱۵۰)۔ اس کا دین حق ہے (۱۳۳)۔ اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (۳۹)۔ چونکہ حقؑ۔ ظن و شکوک سے بلند ہوتا ہے۔ اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ہوتا ہے، اس لئے ظہور نتائج کو بھی آنحادثہؑ کہا گیا ہے۔ (۱۶۱)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ حقؑ کوئی ذہنی، نظری، تصوراتی، یا محض عقیدہ کی چیز نہیں۔ یہ عقائد اور نظریات حیات کے تعمیری نتائج کا نام ہے جو ٹھوس شکل میں سامنے آجائیں اور جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلے جائیں اور اپنی صداقتوں کیلئے خارجی دلائل کے محتاج نہ ہوں بلکہ سورج کی طرح اپنی دلیل آپ ہوں۔ اس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق ثابت نہیں کہلا سکتا جب تک اسکے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے نہ آجائیں۔

قرآن کریم میں سماءؑ کے متعلق ہے کہ وہ پھٹ جائیگا اور زمین کے متعلق ہے کہ وہ خالی ہو جائیگی (ان امور کی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں ملیکی) اسکے بعد فرمایا کہ وَ اٰذِنْتَ لِرَبِّہَا وَ حَقَّقْتَ (۸۴)۔ ”وہ اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون پر عمل کریگی اور اسے بنایا ہی اسکے مطابق گیا ہے“۔ اسی طرح اعمال کے نتائج واجب ہو جانے کیلئے حقؑ عَلَیْہِمْ الْقَضَاۃُ (۳۳)۔ اور فَحَقَّقْ عَلَیْہَا الْقَوْلَ (۱۶۶)۔ فَحَقَّقْ وَعِیْدِ (۵۶)۔ اور فَحَقَّقْ عِقَابِ (۳۸) آیا ہے۔ یا حَقَّقْنَا عَلَیْنَا نُنَجِّ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۳)۔ ”مومنین کو مخالفین کی تدابیر سے محفوظ رکھنا ہم پر واجب ہوتا ہے“۔ حَقِیْقٌ (۱۰۵)۔ مناسب۔ ضروری۔ واجب۔ لازم۔

اَسْتَحَقَّتْ اِثْمًا (۱۰۵)۔ انہوں نے ارتکاب جرم کیا ہے۔ (دیکھئے!) یہاں بھی واقعہ کے سرزد ہونے، یعنی اس کے امر واقعہ بن جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ یہ حقؑ کے بنیادی معنی ہیں)۔

(حقؑ کے ساتھ باطل کا ہنوان بھی دیکھئے تاکہ دونوں کے تقابل سے مفہوم اور نکھر جائے)۔

## ح ک م

اَلْحَكَمَةُ۔ گھوڑے کی لکام کو کہتے ہیں\*\*۔ بلکہ منہ میں لکام دیکر جس چمڑے سے اسے باندھ دیا جائے کہ وہ اسکے دونوں جبڑوں کو کس لئے اور

ادھر ادھر نہ ہونے دے۔ اسے حَکْمَةٌ کہتے تھے۔ اَحْکَمْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں گھوڑے کو اس طرح کی لگام دینا \*۔ چونکہ اس لگام کا کام یہ ہے کہ گھوڑے کو سرکش اور بے راہرو ہونے سے روک دے اسلئے حَکَمْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں میں نے گھوڑے کو روکا اور (لگام کے ذریعہ) قابو میں لیا۔ اَحْکَمْتُهُ عَنِ الْاَمْرِ کے معنی ہیں، اسے اس بات سے روک دیا۔ منع کر دیا۔ \* ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کی آخری حد کونسی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ اسی کو اختلافی امور میں فیصلہ کرنا کہتے ہیں۔ یعنی ہر ایک کے حقوق و واجبات کی حدیں متعین کر دینا اور کسی کو ان سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ اسی کو حَکَمْتُ کہتے ہیں۔ یعنی فیصلہ \*۔ حَاکِمُ کے معنی ہیں فیصلہ کرنے والا۔ اس قسم کا حکم دینے والا جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ حَکَمْتُ بَيْنَهُمْ کَذَالِیک کے معنی ہیں اس نے ان کے درمیان اس طرح کا فیصلہ کیا \*۔ اَلْحُكْمُ مِمَّا اُسْمُ ہے \*۔ اَلْحُكْمُ صاحب اختیار ثالث یا پنچ۔ ایسا فیصلہ کرنے والا جسے موافقت یا مخالفت میں فیصلے کا پورا پورا اختیار ہو۔ قانون نافذ کرنے والا۔ (۳۵ و ۳۶)۔

اَلْحِکْمَةُ کے معنی ہیں فیصلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا \*۔ یعنی ہر ایک کے حقوق کی حدیں مقرر کر کے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا۔ اسی لئے حَکِیْمُ اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ، ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نہایت حسن و اتقان کے ساتھ بنائے، یا معاملات کو اس طرح سر انجام دے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ حِکْمَةُ کو حکمت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں حِکْمَةُ، ”رائے یا قوت“ کو کہیں گے۔ یعنی فیصلہ دینے کی صلاحیت اور پھر اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت۔ اسی کو آجکل کی زبان میں حکومت کہتے ہیں۔

چونکہ حَکَمَ کے معنی کسی چیز کو (ایک مقام پر) روک دینے کے ہیں۔ اور جو چیز ایک مقام پر جم کر کھڑی ہو جائے وہ مستحکم ہو جاتی ہے۔ اسلئے اَحْکَمْتُهُ کے معنی ہیں اسکو مستحکم کر دیا \*۔ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے۔

قرآن حکیم کو حَکِیْمُ کہا گیا ہے (۳۶) کیونکہ وہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ وہ

تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔ خدا کو بھی "حکیم" کہا گیا ہے (۳۲)۔ کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک ٹھیک راستہ پر چلاتا ہے۔ ہر شے کو صحیح صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اپنے قانون کی لگام سے ہر شے کو مسخر کئے ہوئے ہے بِحُكْمِهِمْ بَيِّنَتُهُمْ فَيَمَّا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۳۳) وہ انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اسکی آیات مُحْكَمَاتٌ اور مُتَشَابِهَاتٌ ہیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسکا اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ عَوَّاذٌ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ الْمُتَشَابِهَ كُلُّهُ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۳)۔

عام الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

اللہ وہ ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس میں ایک قسم تو ایسی آیتوں کی ہے جو "محکم" ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم "متشابہات" کی ہے۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو "متشابہ" ہیں تاکہ فتنہ پیدا کرسکیں اور انکی تاویل نکالیں۔ حالانکہ اسکی تاویل اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں۔

ہم نے اس ترجمہ میں "محکم"۔ "متشابہ"۔ "تاویل"۔ وغیرہ الفاظ کو اسی طرح لکھ دیا ہے۔ اس لئے کہ انہی کے مفہوم کی وضاحت سے اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، مُحْكَمٌ کے معنی ہیں اپنی جگہ پر قائم۔ اٹل۔ صاف صاف فیصلہ کرنے والا۔ مستحکم۔ لیکن یہاں اس کے مقابل میں مُتَشَابِهَاتٌ کا لفظ آیا ہے اس لئے مُحْكَمٌ کے معنی ہونگے وہ جو مُتَشَابِه نہ ہو۔ اور مُتَشَابِه کے معنی ہونگے وہ جو محکم نہ ہو۔ یعنی مُحْكَمٌ اور مُتَشَابِه۔ مختلف قسم کی آیات ہیں۔ یا آیات کی دو قسمیں ہیں۔



مُتَشَابِه<sup>۳</sup> کے تفصیلی معنی ش - ب - ہ کے عنوان میں دیکھئے۔  
مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہوتے ہیں، ملتی جلتی ہونی چیزیں جن میں باہمی  
مشابہت اور موافقت ہو۔ تشبیہ کو اسی لئے تشبیہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک  
چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز کے ساتھ مثال دیکر سمجھایا جاتا ہے۔

ان معانی کے اعتبار سے مُحَرِّمَاتُ کے اولین معنی ہونگے ایسی آیات جن  
کے الفاظ سے وہی مفہوم ہو جو ان الفاظ کے معنی ہیں۔ مثلاً نکاح کے ضمن  
میں ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اَمْثَلُتُکُمْ (۳۴)۔ تمہاری مائیں تم  
پر حرام ہیں۔ اس میں اُمُّ کے معنی ماں کے ہیں۔ یعنی وہ عورت جس کے بطن  
سے کوئی پیدا ہو۔ لیکن مُحَرِّمَاتُ وَ مُتَشَابِهَاتُ کی جس آیت کو اوپر نقل  
کیا گیا ہے۔ یعنی (۳)۔ اس میں هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ میں اُمُّ کے معنی اس  
قسم کی ماں نہیں۔ اس میں اُمُّ کا لفظ استعارۃ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے  
مفہوم ہے ”اصل و بنیاد“۔ یہ اس لفظ کی تاویل ہے۔ تَاوِیْلُ کے معنی  
ہیں آخری نتیجہ۔ جو کچھ مآل کار ہو۔ کسی شے کی آخری حقیقت (Ultimate  
Reality)۔ قرآن میں انسانی راہنما کیلئے قوانین و ضوابط دئے گئے ہیں۔ ظاہر  
ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ  
سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو۔ جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ  
اَمْثَلُتُکُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے۔ اس قسم کی آیات مُحَرِّمَاتُ ہیں۔ لیکن  
اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اُس عالم  
سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات اور اسکی صفات۔  
مرنے کے بعد کی زندگی اور اُس میں اعمال کے نتائج۔ وہاں کی جنت اور  
جہنم۔ یا انسانی زندگی کا منتہی اور مآل۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد  
حقائق (Abstract Truths) کو جب بھی بیان کیا جائیگا تو تشبیہ و استعارہ  
اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائیگا۔ یعنی اُن کا بیان (Symbolically)  
ممکن ہوگا۔ مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ  
(۲۵)۔ وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ اور كَانَ عَرْشُهُ عَلٰی الْمَاءِ (۲۱)  
اسکا عرش پانی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْش سے مراد لکڑی (یا  
کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں۔ نہ ہی مَاء سے مراد پانی ہے۔  
یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعے  
بیان کیا گیا ہے۔ لہذا یہ آیات مُتَشَابِهَاتُ ہیں۔ ایسی آیات جن میں  
حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالم محسوسات سے باہر کے ہیں، اُن کی حقیقت، کُنہ، ماہیت، یعنی ان کی تَاسْوِیْلُ (What they Actually are) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غورو فکر کرنے سے ہم انکے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے۔ مثلاً لفظ عَرَّشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا مفہوم قوت و اقتدار (Authority or Control) ہے۔ یا كَانَ عَرَّشُهُ عَلَی السَّمَاءِ میں سَمَاءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَ جَعَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ نَظْرًا شَیْئًا حَتَّىٰ (۱۱۱)۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کس طرح عمل میں لاتا (Exercise کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (Life) کو کس طرح پیدا کیا۔ ان باتوں کی کُنہ و حقیقت کو ہم نہیں پاسکتے۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہمیں عام کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔ وَمَا أُولَیِّئُہُمْ مِّنَ الْعَالَمِیْنَ إِلَّا قَلِیْلًا (۱۸۵)۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ البتہ جہانتک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے، ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔ وَمَا یَذَّکَّرُ إِلَّا أُولَیِّی الْأَلْبَابِ (۳۶)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے پیش نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا۔ یہ لوگ ان ماوراءالعقل حقائق کی کُنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کیلئے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو ہست معاملات قرار دیکر ہمیشہ آسمان کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم ”رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ“ اور ”أُولَی الْأَلْبَابِ“ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ جو عقل و فکر سے کام لیکر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم

رکھتا ہے اسلئے ان کے حقائق (Truths) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن ہم انکی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے۔ یعنی ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ بھی۔ لیکن خدا انکی کنہ و حقیقت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے (۲۶۱ یا ۲۶۲))۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ”ایمان والوں“ میں دو قسم کے لوگ ہونگے۔ ایک وہ عوام جو وحی پر ویسے ہی ایمان رکھتے ہیں۔ اور دوسرے صاحبان علم و بصیرت جو عقل و فکر کی رو سے وحی کے حقائق پر غور و خوض کرتے ہیں۔ سورۃ مدثر میں اس دوسرے گروہ کو اَلَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ، کہہ کر ہکا بکا کیا ہے اور ان کے برعکس عام لوگوں کو ”اَلْمُؤْمِنُونَ“، (۲۶۳)۔

جن دو ذہنیوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق سورۃ مدثر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں سَقَرٌ (جہنم) کے متعلق کہا ہے کہ عَلَيَّهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۲۶۴) اس پر انیس (ملائکہ) مقرر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیلی بیان ہے۔ اس کے بعد فرمایا وَمَا جَعَلْنَاهُمْ اِلَّاٰ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا (۲۶۵)۔ انکی یہ گنتی (یعنی انیس کی تعداد) ان لوگوں کے لئے وجہ ”فتنہ“ ہے جو قرآن کے حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا اِيْمَانًا۔ جن لوگوں کو اَلْكِتَابُ (کا علم) دیا گیا ہے ان کے دل میں اس سے یقین پیدا ہو جاتا ہے اور (عام مومنین) کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ بہر حال مومنین کی جماعت کے خواص ہوں یا عوام ان میں سے کسی کے لئے بھی اس قسم کا تمثیلی بیان وجہ اضطراب و شکوک نہیں ہوتا۔ لیکن وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (۲۶۶) جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے، نیز وہ لوگ جو قرآن پر سرے سے ایمان نہیں رکھتے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کا حقیقی منشا کیا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ (قرآن میں یہ حقائق تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں)۔ ان بیانات سے

جو چاہتا ہے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتا ہے اور جو چاہتا ہے ان سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے وَمَا يَعْلَمُ جَنَّوَدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۳۶)۔ یہ خدا کے لشکر میں جنکی کنہ و حقیقت کا علم صرف اسی کو ہے۔ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ (۳۷)۔ لیکن ان کے تمثیلی بیان سے انسانوں کی راہنمائی مقصود ہے۔ لہذا جو ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ ہیں وہ ان کی کنہ و حقیقت کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ غور و فکر سے اس راہنمائی (ذکر) تک پہنچ جاتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔

یہ ہے آیات مُحْكَمَاتٌ وَ مُتَشَابِهَاتٌ کا پہلا مفہوم۔

مُتَشَابِهَاتٌ میں ایسے جقائق بھی شامل ہیں جنہیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا ہر زمانہ کا انسان اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہر سطح کے انسانوں کیلئے راہنمائی کا ضابطہ ہے اور ہر زمانہ کے انسانوں کیلئے بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ہو سکتا تھا نہ ابدی۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کیلئے یا ایک سطح کے انسانوں کیلئے ہی مفید ہو سکتا تھا۔ باقی انسانوں کیلئے بیکار ہوتا۔ اس قسم کی کتاب کیلئے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت اور لچک ہوتا کہ ہر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وہ خاصہ ہے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے اندر ایسی لچک رکھتے ہیں کہ اس سے ہر انسان اپنی اپنی سطح۔ علم و عقل کے مطابق مستفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کہ ”كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ“ (۳۶)۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رہا ہے۔ اور سورج کے متعلق ہے وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۸)۔ سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم) بطلمیوسی تصور رائج تھا، اجرام فلکی کی گردش سے حلق صحیح تصور ذہن انسانی میں آ نہیں سکتا تھا۔ جب بعد میں کوپرنیکس کا

نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کس طرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرم گردش ہیں۔ اسی طرح جب تک ہر شے کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کسی مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ جب تک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات مُتَشَابِهَات\* کی فہرست میں شامل تھیں۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات مُعْجَمَات\* کے زمرے میں شامل ہو گئیں۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کیلئے مُعْجَمَات\* کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کیلئے یہ مُتَشَابِهَات\* ہی میں داخل ہیں۔ جب تک یہ آیات مُتَشَابِهَات\* کے زمرے میں تھیں انکی حقیقت (تَاوِیْل\*) کا علم خدا کو تھا۔ جب یہ مُعْجَمَات\* کے ذیل میں آ گئیں تو انکی حقیقت ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ پر بھی منکشف ہو گئی۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ایسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۵)۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو فَسْئَلْہُمْ بِہِمْ خَبِيرًا (۲۹)۔ اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے۔ جب تک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جس نے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کر دیا ہے۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائیگا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خیر ہو جائیں گے۔

لہذا مُعْجَمَات\* و مُتَشَابِهَات\* کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے مُعْجَمَات\* و مُتَشَابِهَات\* ہونے کے مختلف مفہوم۔ لیکن مُعْجَمَات\* ہوں یا مُتَشَابِهَات\* تمام آیات اپنی اپنی جگہ پر یکسر مستحکم ہیں۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم ہے۔ اسی لئے سورۃ ہود میں ہے کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اَیَاتُہُ (۱۱)۔ یہ وہ کتاب ہے جسکی تمام آیات کو محکم بنا یا گیا ہے۔ یہ کتاب مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل ہے۔ اسکے حقائق غیر متبدل اور اسکے اصول تغیر نا آشنا ہیں۔ جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے انکی بھی حقیقت غیر متبدل (مُحْکَمَات\*) ہے۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات مُعْجَمَات\* ہیں۔

اسکے برعکس سورۃ زمر میں پوری کتاب کو مُتَشَابِهَات\* کہا گیا ہے۔

+ اللہ نَزَّلَ الْحَدِيثَ کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانً (۳۹)۔

لیکن یہاں مُتَشَابِهًا کا لفظ مُتَحَكِّمًا کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مُتَشَابِهًا کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ مُتَشَابِهًا کے مفہوم کیلئے ث۔ن۔ی کا عنوان دیکھئے۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ مُتَشَابِهًا ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آئینے سامنے کھڑی کر دی جائیں۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد۔ ہوں۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اسکی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں (نور و ظلمت) باہم دگر مُتَشَابِهًا ہیں۔ اس طریق بیان سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفرز کا تو خیال ہے کہ اشیاء پہنچاتی ہی اپنے تضاد سے جاتی ہیں)۔ لیکن اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم میں متضاد باتوں کا بیان ہے۔ اس کے متعلق اللہ نے کہہ دیا کہ نہیں۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں (۱۸۴)۔ اس کی تمام آیات باہم دگر ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں۔ مُتَشَابِهًا (متضاد اشیاء کو آئینے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔ لہذا قرآن کریم کی آیات مُتَشَابِهًا ہونے کے باوجود مُتَشَابِهًا ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کیتابًا مُتَشَابِهًا مُتَشَابِهًا ہے۔ یا یوں کہئے کہ متشابه وہ اسلوب بیان ہے جس میں حقائق کو ملتے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نور و ہدی) اور مشابہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اسکی ضد لا کر بات واضح کی گئی ہے۔

(سَبْعًا مِّنَ الْمُتَشَابِهَاتِ) (۱۸۴) کے لئے دیکھئے عنوان ث۔ن۔ی۔

قرآن کریم میں کیتابہ کے ساتھ حکمتہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱۸۴)۔ ایک چیز ہوتی ہے قانون (Law) اور ایک ہوتی ہے اس قانون کی مصلحت یا غایت و علت (The why of it) قانون کو کہتے ہیں کیتابہ (دیکھئے عنوان ک۔ت۔ب) اور اسکی مصلحت یا علت اور غایت کو کہتے ہیں حکمت۔ اس لئے کہ یہ حکمتہ ہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قانون کی غایت کیا ہے۔ اس کا متعین راستہ کونسا ہے۔ وہ کس روش پر انسانوں کو چلانا چاہتا ہے۔ اگر قرآن کریم کا مقصود یہ ہوتا کہ اس کے قانون کو مستبدانہ انداز سے (ڈنڈے کے زور پر) اندھا دھند منوایا جائے تو پھر خالی قانون (کتاب) کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ اسکا مقصود یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت علی وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی کے ساتھ) ہو اسلئے ضروری تھا کہ ان قوانین کی حکمت

(مقصد - غایت - مصلحت) بھی ساتھ ہی واضح کر دی جائے۔ لہذا کتاب کے ساتھ حکمت بھی دی گئی۔ یہ دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ سورۃ نساء میں ہے وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱۱۳)۔ خدا نے تیری طرف کتاب اور حکمت کو نازل کیا۔ کہیں قرآن کریم کو صرف الْحِكْمَةُ کہا گیا ہے (۱۶۱)۔ کہیں اسے الْكِتَابُ اور الْحِكْمَةُ کہہ کر ضمیر دونوں کے لئے واحد کی استعمال کی گئی (۲۳۱) تاکہ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس سے مراد ایک ہی چیز (قرآن کریم) ہے۔ سورۃ احزاب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ الْحِكْمَةُ کی بھی تلاوت ہوتی ہے (۳۳)۔ اس لئے حکمت وحی غیر متلو نہیں۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ حِکْمَتِ قرآن کریم کے اندر ہے۔ قرآن کریم سے باہر نہیں۔

حِکْمَتِ کو وحی کے ذریعہ نازل کرنے میں ایک بہت بڑا مقصد تھا۔ قرآن کریم نے احکام و قوانین اس لئے دیے ہیں تاکہ ان کا نتیجہ مرتب ہو۔ یعنی اسکے قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک نتیجہ پیدا کرنے (ایک مقصد حاصل کرنے) کا ذریعہ ہیں۔ اگر اللہ کی طرف سے صرف قوانین مل جاتے اور یہ نہ بتایا جاتا کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا نکلیگا تو ہو سکتا تھا کہ ہم ان قوانین پر اپنے طور پر عمل کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے کہ خدا کا منشا پورا ہو گیا ہے۔ خدا نے یہ نہیں کیا۔ اسنے قوانین دیے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لہذا ہمیں ہر وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان قوانین سے وہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے یا نہیں جو خدا نے متعین کیا ہے۔ اگر ہو رہا ہے تو پھر ان قوانین پر عمل بھی ٹھیک ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ان سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو پھر ہمیں رک کر اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے جسکی وجہ سے ان قوانین سے ان کا متعین کردہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ مثلاً قرآن کریم میں صَلَوة کے متعلق ہے کہ أَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹)۔ اسمیں أَقِمِ الصَّلَاةَ (صلوۃ قائم کرو) حکم (کتاب) ہے۔ اور دوسرا حصہ (کہ صَلَوة سے فحشاء اور منکر کی روک تھام ہو جائیگی) اس کی حِکْمَتِ ہے۔ اگر صَلَوة سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تو ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ کیونکہ جب خود خدا نے کہا ہے کہ اقامت صَلَوة سے ایسا ہوگا (تو اگر اقامت صَلَوة قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہو رہا ہے) تو اس

ہے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ نتیجہ بھی خود خدا ہی کا بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ مقصد تھا کیتاب<sup>۱</sup> کے ساتھ حکمت کے سُنَزَل مینَ اللہ ہونے کا (نیز دیکھئے عنوان ک۔ ت۔ ب)

حُکْمًا سے مراد وہ قوت فیصلہ (یا فہم) بھی ہے جو عوام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی وحی کے بغیر۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ<sup>۲</sup> وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (۲۸)

جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور اس کے قویٰ میں اعتدال آگیا تو ہم نے اسے حکم (فہم۔ قوت فیصلہ) اور علم عطا کیا۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملنے سے پہلے کی ہے۔ اس لئے اس سے مراد وہ حِکْمَۃ<sup>۳</sup> نہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کو، کب کس طرح اور کہاں، زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق، منطبق کیا جائے اور اس کے اصولی حکم کو جزئیات پر چسپاں کرنے کے لئے کیا انداز تعبیر اختیار کیا جائے۔ یا مختلف احکام میں سے کس کو مقدم اور کس کو مؤخر کیا جائے، یہ ساری حکمتیں عقل، فہم، فراست سے تعلق رکھتی ہیں اور اس الْحِکْمَۃ<sup>۴</sup> سے الگ ہیں جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے یَتْلُوَا عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ (۱۲)۔ اس میں تلاوت آیات۔ تزکیہ۔ تعلیم۔ کتاب اور تعلیم حکمت، پاروں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول ایک تو ان قوانین اور ان کی حکمت کی تعلیم دیتا ہے جو قرآن کریم کے اندر ہیں۔ اور (اس نظام کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں) بہت سی حکمتیں اس کے علاوہ بتاتا ہے اور اس طرح احکام خداوندی کے مناسب انطباق یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے فیصلے کرتا ہے۔ اس تعلیم حکمت سے اُمت کو پتہ سکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی مختلف ادوار و حالات میں اسی طرح کی حکمتیں (سمجھ کی باتیں) کام میں لائے۔ قرآن کریم کی بیان کردہ حکمت تو (اس کے قوانین کی طرح) غیر متبدل ہوگی لیکن یہ حکمت (عقل و فراست پر مبنی فیصلے) تغیر حالات سے بدلتی رہیگی۔

حکومت۔ قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے، خواہ اسے ضابطہ



قوانین ، قوت فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (۳۸)۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲)۔ خدا کی یہ حکومت ، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (۱۵)۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لایفک ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہیں گے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔ اس نظام کے مرکز کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت تھی کیونکہ وہ مرکز خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا۔ اپنے فیصلوں کی نہیں (۱۵ ; ۳۸)۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ نظام علیٰ حالہ آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ہیں۔ (۳۳) الدین ، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر سامنے آسکتا ہے۔ یہ اللہ-رادی چیز نہیں۔ ”خدا کی حکومت“ سے یہی مراد ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ جو ایسا نہیں کرتے ، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (۳)۔ اس قسم کی حکومت ہر زمانے میں قائم ہو سکتی ہے۔

## ح ل ف

الْحَلْفُ وَالْحَلِيفُ۔ دراصل اس قسم کو کہتے ہیں جسکے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان کیا جائے۔ اس کے بعد اس کا استعمال عام قسم کے لئے بھی ہونے لگا۔ \* الْحَلِيفُ۔ معاہدہ جو لوگوں کے درمیان ہو۔ دوستی نیز دوست۔ الْحَلِيفُ۔ معاہدہ۔ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو۔ حَلِيفٌ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا\*\* (۱۸) حَلَفَ۔ يَحْلِفُ۔ قسم کھانا\*\* (۲۲)۔ دراصل اس کے بنیادی معنی لزوم کے ہیں۔ یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگے رہنا\*\*\*۔ اس سے اس کا مفہوم پابندی کرنا ہو گیا۔

## ح ل ق

حَلِيقَةٌ۔ ہر گول گھیرے یا دائرہ کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کا ہو یا لوحے ، چاندی ، سونے وغیرہ کا۔ الْحَلِيقَةُ۔ زرہ۔ ہتھیار۔ رسی۔ گول نشان جو اونٹ پر بنایا جاتا ہے\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں بال صاف کرنا ، سر کے بال مونڈنا بھی بتائے ہیں۔ اس سے فعل حَلَقَ يَحْلِقُ کے معنی بال مونڈنے کے ہو گئے\*\*۔ راغب نے بھی حَلَقَ کے اصلی

معنی بال کاٹ دینے کے کٹے ہیں۔ \*\*۔ اَلْحَلْقُ - اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔ \*۔ اس کے اندرونی حصہ کو حَلْقُومُ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں مُحْتَلِقِیْنِ رُءُؤْ وَسَکَمِ (۲۸) آیا ہے۔ یعنی سر منڈانے والے۔ اور حَلْقُومُ کا لفظ (۵۱) میں بمعنی حلق آیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ ”سیدنا ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں میں کیس، اور ہندوؤں کے ہاں ”بودی“، (چوٹی) رکھنی۔ اہل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے ان کی پرورش کرتے تھے اور پھر ان کو حج کے ایام میں مقام منیٰ میں منڈوائے تھے۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا“ \*\*\*۔

## حل ل

حلؑ۔ کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔ وَاَحْلَلْ عَقْدَةَؑ مِینِ لِسْتَانِیْ (۲۴)۔ ”میری زبان کی گرہ کھول دے“۔ اسی طرح جب کسی جمی ہوئی چیز کو پگھلا دیا جائے تو اسے بھی حلؑ کہتے ہیں۔ یعنی اس کی گرہ کھل گئی۔ اور وہ حل ہو گئی۔ اسکے بعد حَلَّ الْمَكَانِ کے معنی ہو گئے کسی جگہ اترنا اور قیام کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ دراصل حَلَّ الْأَحْمَالِ سے ماخوذ ہے جسکے معنی ہیں سامان کی رسیوں کی گرہ کھول کر اسے اونٹوں پر سے اتار لینا۔ حَالَّہ کسی کے ساتھ اقرنا۔ قیام کرنا۔ اس سے حَلِیْلٌ ہے جسکے معنی خاوند کے ہیں اور حَلِیْلَتَہ کے معنی بیوی۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ (ایک ہی مکان میں) رہتے ہیں۔ یا ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔ قرآن کریم میں حَلَّائِلُ أَبْنَائِکُمُ آیا ہے (۳۳)۔ حَلَّائِلُ جمع ہے حَلِیْلَتَہ کی۔ یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔ اَلْحَلَّةُ۔ محلہ۔ قوم کی منزل۔ اَلْحِلَّةُ۔ اتری ہوئی قوم۔ نیز محلہ۔ اَلْحَلَقَةُ جوڑا (کپڑوں کا) جس میں عموماً قمیص، ازار، چادر یا عمامہ ہوتا ہے (یہ لفظ کنایہ پیوی کے لئے بھی بولا جاتا ہے)۔ اَلْحِلَّی۔ حرم کے حدود سے باہر کی جگہ۔ اَلتَّحِلَّةُ۔ وہ چیز جس سے قسموں کا کفارہ ادا کیا جائے (اور اس طرح قسموں کی گرہ کشائی کر لی جائے) حَلَّ آمُرُ اللہِ عَلَیْہِ۔ اس پر خدا کا امر واجب ہو گیا۔ عباب میں ہے کہ یَحِلُّ کے معنی واجب ہو جانے کے ہوتے ہیں اور یَحِلُّ کے معنی نازل ہونے (اترنے) کے \*۔

الْحِلَالُ\* (وَالْحَيْلَالُ\*) حرام کی ضد ہے۔ یعنی جس پر رکاوٹ کی گرہ نہ ہو۔ کھلی ہوئی چیزیں، جنکی حدود بندی نہ کی گئی ہو۔ الْحَيْلُ\* وَالْحَيْلُ\* کے بھی یہی معنی ہیں\*۔

سورۃ سائدہ میں ہے لَا تَحِلُّواْ اَشْعَائِرَ اللّٰهِ (۵)۔ یعنی شعائر اللہ کے احترام اور تعظیم کی جو گرہیں باندھی گئی ہیں انہیں مت کھولو۔ انکا احترام کرو۔

واجب ہونے کے معنوں میں (۲/۸۱) میں ہے فَتَحِلُّ عَائِيَّتُكُمْ غَضَبِي\* ”تم پر میرا غضب واجب ہو جائیگا“ حج میں جانوروں کے ذبح ہونے کے مقام کے متعلق ہے ثُمَّ مَحِلُّهُمَا إِلَى الْبَيْتِ الْمُقَدَّسِ (۲/۲۴) ”ان کے ذبح ہونے کا مقام کعبہ ہے“۔ سورۃ البلد میں ہے وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ (۹/۲)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تو اس شہر میں مقیم ہے۔ لیکن اس میں حِلٌّ سے مراد حَلَالٌ بھی لی جا سکتی ہے (راغب) یعنی انہوں نے تیرے معاملہ میں اس بلد امین کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور یہاں بھی تجھے تکالیف بہم پہنچائی ہیں اور تیری جان تک کے پیچھے ہڑ گئے ہیں۔ مولانا محمود الحسنؒ نے اس کے معنی لکھے ہیں ”اور تجھ پر قید نہیں دھیکے اس شہر کی“۔

جہاں تک حرام و حلال کا تعلق ہے، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جنہیں قرآن کریم میں حرام قرار دیدیا گیا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ ر۔ م) کھانے پینے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ ان پر سماعت کی کوئی گرہ نہیں باندھی گئی۔ نہ ہی کسی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ (دیکھئے ۸/۵۹؛ ۱۶۶/۱۱۹؛ ۱۶۶/۱۱۹) حتّٰی کہ رسول کو بھی اسکا اختیار نہیں دیا گیا (۱۶۶/۱۱۹)۔ سورۃ اعراف میں رسول اللہؐ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ يُحِلُّ لَهُمْ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۷/۱۵۷)۔ وہ طہیات کو حلال اور خبائث کو لوگوں کے لئے حرام قرار دیگا۔ تو اس سے مراد وحی کے ذریعے ایسا کرتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے (۱۶۶/۱۱۹)۔

لیکن قرآن کریم نے حَلَالاً کے ساتھ طَيِّباً بھی کہا ہے (۲/۱۶۸)۔ یعنی جتنی حلال چیزیں ہیں ان میں سے جو تمہیں مرغوب ہوں وہ کھاؤ۔ ناخوشگوار چیزیں یا مضر چیزیں مت کھاؤ۔ (حلال) کھانے کی چیزیں دیدہ زیب بھی ہوں۔

خوش ذائقہ بھی اور صحت کیلئے مفید بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے خوشگوار۔ اس میں ہر فرد کے اپنے اپنے ذوق اور پسند کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔ نیز اجتماعی مصالح اور مفاد کی گنجائش بھی۔

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طیبات، حلال ہیں اور خبیثات حرام۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ سب فی ذاتہ طیب ہیں۔ یعنی پاکیزہ۔ مفید۔ منفعت بخش۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال چیز کو بالضرور کھایا جائیگا۔ اگر کوئی چیز کسی کو نا پسند ہو، یا ضرر رساں، تو اسے اجازت ہے کہ وہ شے نہ کھائے۔ لیکن اسے حرام نہ سمجھے۔ اسی طرح اجتماعی مصالح کے پیش نظر، اسلامی معاشرہ، وقتی طور پر بعض چیزوں کے استعمال کو ممنوع قرار دے سکتا ہے۔

۔ ایسی پابندیاں عائد کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن کسی حلال چیز کو حرام سمجھ لینا یا اسے حرام قرار دیدینا قطعاً جائز نہیں۔ اسی طرح کسی حرام شے کو حلال قرار دیدینے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

خدا کے نظام ربوبیت کے پیش نظر حلال و حرام کے معنی یہ بھی ہونگے کہ عام اشیائے فطرت جنہیں اللہ نے نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی رزق کے سرچشمے۔ انہیں کھلا (حلال) رہنے دو اور انہیں روک کر لوگوں کو اس کے استفادہ سے محروم نہ کرو۔ یہ بھی خدا کے حلال کو حرام کر دینا ہے۔ یہ قرآنی نظام معیشت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Free Goods) کو (Economic Goods) میں تبدیل کرنا کبھی جائز نہیں قرار پاسکتا۔

(حرام و حلال کی مزید تفصیل کے لئے عنوان ح۔ ر۔ م بھی دیکھئے۔ اور عنوان ن۔ ع۔ م میں آنعام\* بھی۔ صید البعثر کے حلال ہونے کے لئے دیکھئے عنوان ب۔ ح۔ ر۔ آیت ۹۶)۔

مُحِلٌّ - وہ جو حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھے۔ غَيْرُ مُحِلٍّ - شکار کو حلال نہ قرار دینے والے۔ حِلٌّ - بمعنی حلال\* (۵)۔ تَحِلُّةٌ - قسم کا کفارہ۔ جس سے قسم کی پابندی سے رہائی مل جائے (۱۶)۔

## ح ل م

الْحُلُمُ - خواب\*۔ جمع أَحْلَامُ\* (۱۲)۔ خواب میں جاع۔ اور چونکہ یہ کیفیت بالغ ہونے کی دلیل ہے اس لئے سن تمیز و بلوغت کو بھی

الْحِلْمُ کہتے ہیں\*۔ (۲۹)۔ چونکہ سن تمیز کے ساتھ عقل و تمیز بھی آجاتی ہے اس لئے الْحِلْمُ متانت، وقار و سکون، عقل و تدبیر اور ضبط نفس کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ آمُ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَذَا (۵۲) کیا ان کا فہم و تدبیر، ان کی متانت و سنجیدگی، ان کی فرزانگی اور وقار انہیں اسی کا حکم دیتے ہیں۔ الْحِلْمُ کے معنی ہیں طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھی انسان بھڑک نہ اٹھے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں جلدی نہ کرنا۔ یعنی ذرا سی بات پر جھٹ سے بھڑک نہ اٹھنا۔ چنانچہ تَحَلَّمُ الْحَمَلُ۔ اس وقت کہتے ہیں جب مویشی فرہ ہو جائیں۔ (اور ان میں قوت برداشت پیدا ہو جائے)۔ الْحَلِيمُ خدا کی صفت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ اسے نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکاتی ہیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوجھے پن پر اکساتا ہے۔ بلکہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک پیمانہ (قانون) مقرر کر رکھا ہے جس تک وہ چیز بہر حال پہنچ جاتی ہے\*۔ (یعنی ہر عمل کا نتیجہ)۔ لہذا حَلِيمٌ کے معنی ہیں سمجھدار۔ ثقہ۔ بھاری بھرکم۔ ہر وقار۔ ہمیشہ اصول اور قانون کے مطابق کام کرنے والا۔ جو یونہی جذبات سے بھڑک نہ اٹھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوْ اَهٗ مِّنْهُمْ (۱۱)۔ ”یقیناً ابراہیمؑ بردبار، غمگسار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا“۔ اور حضرت اسماعیلؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے فَتَشَارُّنَا بَيْنَهُمْ حَلِيمٌ (۱۱)۔ ”ہم نے ابراہیمؑ کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی۔

ہمارے ہاں حِلْم (حلیم الطبع) سے مراد انکسار۔ فروتنی۔ نرم مزاجی لی جاتی ہے۔ یہ ہمارے اپنے لغت کے معنی ہیں۔ محض فروتنی تو ضعف اور کمزوری کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہے لیکن حِلْم قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کوئی بات بے سمجھی کی نہیں کرتا۔ جس میں مقابلہ کی قوت نہ ہو اس کا جھکنا شکست اور ذلت ہے۔ سرکشی کی قوت رکھتے ہوئے، قانون و ضوابط کے سامنے جھکنا، شرفِ انسانیت ہے۔

## ح ل ی

الْحَسْلُ۔ زیور، سامانِ آرائش، جو معدنیات ڈھال کر یا قیمتی پتھر وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے\*۔ جمع حَسَلٌ۔ مِّنْ حَلِيْمِيْمٍ عِجْلًا (۱۳۸) ”ان کے

زیورات سے بچھڑا (بنایا)۔ ”الْحِلْيَةُ“۔ آرائش کی چیز۔ تَسْتَخْرِجُونَ مِنْهُ حِلْيَةً“ (۱۶)۔ تم سمندر سے آرائش کی چیزیں (موتی وغیرہ) نکالتے ہو۔ حَلَّاهَا تَحْلِيَةً“۔ اس نے عورت کو زیور پہنایا\*۔ يَحْلِقُونَ فِيْهَا... (۱۸)۔ ”انہیں وہاں آرائش و زیبائش کی چیزیں پہنائی جائیگی“۔ اس کے بنیادی معنی تحسین و آرائش کے ہیں (ابن فارس)۔

## ح م ا

الْحَمَاءُ“ وَ الْحَمَّاءُ“۔ سیاہ بدبودار کیچڑ۔ خراب ہگڑی ہوئی مٹی۔ حَمِي“ الْمَاءُ“۔ پانی سیاہ بدبودار کیچڑ کے میلنے کی وجہ سے گدلا اور بدبودار ہوا ایسا پانی یا ایسے پانی والی جگہ حَمِي“ کہلائیگی، مؤنث حَمِيَّةُ\*\*۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَءٍ مَّسْنُونٍ (۱۵)۔ سیاہ متغیر شدہ مٹی کے اوپر جو پھٹی سی جم جائے، تخلیق انسانی کی ابتدا خدا نے اس سے کی۔ اسی کو طِیْنٌ“ قَلَازِبِ (۱۶)“ کہا گیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود پانی اور مٹی کے امتزاج سے ہوئی۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم نے بحر اسود کو عَيْنٌ حَمِيَّةٌ (۱۸) کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔

نوٹ : عنوان ح۔ م۔ ی کا آخری حصہ بھی دیکھئے۔

## ح م د

حَمْدٌ“۔ کسی نہایت حسین۔ متناسب۔ نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں تحسین و ستائش (Appreciation) کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام حمد ہے جس سے مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت و برتری کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں جنہیں صاحبِ محیط نے یوں بیان کیا ہے۔

(۱) جس حسن و رعنائی اور شاہکاری کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہئے (جیسے افعالِ محمودہ۔ مقامِ محمود۔ صفاتِ محمودہ وغیرہ)۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے

\* تاج۔ \*\* تاج و محیط و راغب۔

والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اسکی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو سرائی طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ **يُحِبُّونَ أَنْ يَتَحَمَّدُوا\*** **يَمَاتَمُ يَفْتَعَلُوا (۱۸۴)**۔ ”وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔“

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی تعریف کی جا رہی ہے وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہئے (تاکہ اس کی انفرادی خودی کے زندہ و بیدار ہونے کا اندازہ کیا جاسکے)۔ اضطراری طور پر (خود بخود یونہی میکانیکی انداز سے) کسی فعل کا سرزد ہو جانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا۔ حاشیکہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اسکے لئے بھی حمد کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (مَدَحَ الْجَمَالَ) اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بنا رہی ہے تو وہ مشین قابل حمد نہیں۔ بلکہ قابل مدح ہوگی اور اسکا بنانے والا مستحق حمد۔ یہی صورت رقص طاؤس کی ہے۔ طاؤس مستحق مدح ہے اور اس کا خالق (خدا) سزاوار حمد۔

(۳) حَمْدٌ کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی حمد (ستائش) کی جا رہی ہے اسے ستائش کرنے والے کا دل بھی پسند کرتا ہو۔ کسی کے دباؤ سے اسکی تعریف کرنا حمد نہیں۔ مدح ہے۔ نہ ہی حمد میں ملمع کاری، نمائش، منافقت، یا کسی کو بنائے۔ لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ حمد میں جذبات تحسین پر ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جا رہی ہے اسکا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے نقوش، اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ حمد، فریب، تغیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اسکا سرچشمہ یقین، محکم اور ایمان مکمل ہوتا ہے۔ (مدح ظنی چیزوں کی بھی کی جا سکتی ہے مگر حمد نہیں)۔

(۵) جن نفع بخش، کشش انگیز باتوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمال کے درجہ تک پہنچ

\* ہو سکتا ہے کہ یہاں حمد مجازاً بمعنی مدح استعمال ہوا ہو۔

چکے ہوں اور انکی نفع بخشیاں محسوس\* ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو آرٹ انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔ (جیب کترے کی ہاتھ کی صفائی وجہ حمد نہیں ہو سکتی)

ان شرائط کے ساتھ جذباتِ تحسین و ستائش کے اظہار کا نام حمد\* ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو اس کے لئے حمد\* نہیں بلکہ مدح\* کا لفظ بولا جائیگا۔ (قرآن کریم میں خدائی شاہکاروں کیلئے ہر جگہ حمد\* کا لفظ آیا ہے۔ مدح\* کا لفظ ایک جگہ بھی نہیں آیا)۔  
(واضح رہے کہ ثناء کا لفظ مدح اور ذم دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے \*\*)

لہذا جہاں قرآن کریم میں ہے کہ وَ يُسَبِّحُ الْقَرَعَةُ بِحَمْدِهِ (۱۳۳)۔ ”گرج، اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے \*\*\*“۔ ”یا وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (۳۱۸) ”کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں حمد اسی کے لئے ہے“۔ ”یاوَاٰنِ رَمٰنْ شَیْءٌ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ“ (۱۳۴) ”کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو“۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائناتی قوتیں، اس قسم کے تعمیری اور منفعت بخش نتائج پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں جو خدا کی حمد و تحسین کے زندہ پیکر ہیں۔ حتّٰٰ کہ اس مقصد کیلئے جب تخریبی قوتوں کو راستہ سے ہٹایا جاتا ہے تو یہ کام بجائے خویش وجہ ستائش ہوتا ہے۔ چنانچہ ظالم قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں کہا۔ فَقَطِّعْ دَآبِرَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (۲۵)۔ ”ظلم کرنے والی قوموں کی جڑ کٹ گئی۔ اور اللہ رب العالمین کے لئے حمد ہے“۔ اسی لئے خدا کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ عَزَّیْزٌ بھی ہے اور حَمِیدٌ بھی (۱۴)۔ یعنی اپنے غلبہ و اقتدار سے تخریبی قوتوں کو راستے سے ہٹا کر، تعمیری پروگرام کو اس طرح کامیاب بنانے والا کہ اس کے منفعت بخش نتائج خدا کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر بن جائیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ”اَلْمَلٰٓئِکَةُ وَلَهُ الْحَمْدُ“ (۱۴)۔ ہر طرح کا اقتدار و ستائش اس کے لئے ہے۔ جلال و جمال کا سرچشمہ وہی ہے۔ مومنین کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ حَامِدُونَ (۱۱۲) حمد کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسان کو علم الاسماء، یعنی اشیائے کائنات کا علم۔ (علم الفطرت) دیا گیا ہے (۲) کیونکہ

\* (محیط) \*\* (المنار)۔ \*\*\* تسبیح کے معنی ہیں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل رہنا۔ دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح۔



جب ملائکہ (کائنات قوتوں) نے کہا کہ وَنَحْنُ نَسْبِّحُ بِحَمْدِكَ (۲۷)۔ ”ہم تیری حمد و ستائش کی نمود کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں“ تو اس کے جواب میں یہی کہا گیا کہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲۸) آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا گیا۔ لیکن اس کا یہ علم اُسی صورت میں کائنات کو وجہ ستائش خداوندی بنا سکتا ہے جب وہ اپنے علم کے ماحصل کو وحی کے تابع رکھے۔ اس لئے اس سے کہہ دیا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۸) جو قوم خدا کی راہنمائی کے پیچھے چلے گی وہی خوف و حزن سے محفوظ رہے گی۔ یہ وہ مقامِ مَحْمُودٌ ہے۔ (۲۹)۔ ایسی پوزیشن جو سراپا وجہ حمد و ستائش ہو) جس پر نبی اکرمؐ فائز ہوئے۔ وہ خود أَحْمَدُ (۳۰) (بہت زیادہ حمد و ستائش کرنے والے) تھے۔ اس لئے (جیسا آپ کا دوسرا نام تھا ویسے ہی عملاً) مُحَمَّدُ (۳۱) ہو گئے۔ یعنی وہ جو مسلسل و پیہم وجہ حمد و ستائش ہو\* (جسکی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے) رسول اللہؐ کا نام أَحْمَدُ بھی تھا اور مُحَمَّدُ بھی۔ اس لئے أَحْمَدُ (۳۲) اور مُحَمَّدُ رَسُولُ اللَّهِ (۳۳)۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ مُحَمَّدُ (مُفْعَلٌ) کے معنی ہیں وہ جس کی یکے بعد دیگرے حمد کی جائے اور مَحْمُودٌ وہ ہے جس کی ایک بار حمد کی جائے۔ اقرب الموارد میں مُحَمَّدُ کے معنی ہیں الذی کثرت خصاله المحمودۃ۔ جو بکثرت قابل ستائش خصالتیں رکھتا ہو۔

حمد کے جو معانی اوپر دیئے گئے ہیں ان کی روشنی میں قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت (الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ - ۱) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چار لفظوں سے قرآن کریم نے کس طرح اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ اور منفعت بخش پہلو خدا کے اس عالمگیر قانونِ ربوبیت کے وجہ حمد و ستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے جو ہر شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج اوجِ کمال تک لے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حمدیت محض ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ جذبہ تحسین ہے جس کا اظہار نظام کائنات پر غور و فکر سے پیساختہ ہو جاتا ہے۔ جو قوم نظام کائنات پر غور نہیں کرتی وہ اس کے خالق کے کمال کو کس طرح (Appreciate) کر سکتی ہے؟ نیز جو اس کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل نہیں کرتی وہ کیسے سمجھ سکتی ہے کہ اس کے نتائج کس درجہ مستحق حمد و ستائش

\* تاج۔ \*\* بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاعلی معنی نہیں بلکہ مفعول معنی ہی ہیں۔

یعنی جو سب سے زیادہ مستحق ستائش ہو۔

ہیں۔ ”خدا کی حمد کرنا“ ایک عملی پروگرام ہے۔ یعنی نظام خداوندی کو عملاً متشکل کر کے ایسے معیروالعقول اور درخشنده نتائج پیدا کرنا جنہیں دیکھ کر دنیا کی ہر قوم ہکا بکا اٹھے کہ جس خدا نے ایسے قوانین عطا کئے ہیں وہ واقعی مستحق حمد و ستائش ہے۔

## ح م ر

أَلَا حُمْرٌ - سرخ - اسکی جمع حُمْرٌ ہے\*۔

بَسْدَدٌ بَيْضٌ وَ حُمْرٌ (۳۵/۴) - سفید اور سرخ رنگ کی تھیں یا دھاریاں۔

الْحِمَارُ - گدھا - (۲۵۹/۲) - اس کی جمع حُمْرٌ ہے - سورۃ مدثر میں ہے حُمْرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ (۶۲/۵) - گھبرا کر بدکنے والے گدھے۔

## ح م ل

حَمَلٌ - يَحْمِلُ - حَمَلًا - بار اٹھانا - اپنے اوپر لا دنا - اِحْتَمَلَ - اٹھانا - اَلْحَمْلَةُ - جنگ میں ہلک کر ہلہ بول دینا\* - حَمَلٌ - کسی پر لا دنا، بار اٹھوانا، کسی کے ذمہ کوئی کام لگا دینا - مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ (۱۲/۱۵) جن لوگوں پر احکام تورات کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی - اِحْتَمَلَ - اپنے اوپر بار لینا - (۱۱۴/۲) - حَمُولَةٌ - بار برداری کا جانور\* - حَمُولَةٌ وَ فَرَسًا (۱۳۳/۲) - حَمَالَةُ التَّحْطِبِ (۱۱۱/۱) - چغلمخور\* - لکائی بچھائی کرنے والی - مخالفت کے سامان جمع کرنے والی - حَمَلٌ - کسی کو اپنی جگہ سے اٹھا دینا\*\* - یعنی تباہ و برباد کر دینا - وَ حَمَلَتْ اِلَآرْضُ وَ الْجِبَالُ (۱۶/۱) - ”اور ارض و جبال تباہ کر دئے جائیں گے“۔

حَمَلُ الْاِمَانَةِ - امانت میں خیانت کرنا\*\*\* - سورۃ احزاب میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاِمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳/۷) - ”ہم نے امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا - اور اس (خیانت) سے ڈر گئے - لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے -

یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے۔“ یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی۔ تمام اشیائے کائنات اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہیں۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اس میں خیانت کرتا ہے۔ اسکی اطاعت نہیں کرتا۔ یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے۔

سورة عنكبوت میں ہے وَ كَا بَيْنَ مِّنْ دَابَّةٍ اَلَّا تَحْمِلَ رِزْقَهَا (۲۹)۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ یہاں حمل رزق کے معنی ذخیرہ اندوزی کرنے کے ہیں\*۔ قرآن کریم نے یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رزق کو سمیٹ کر رکھنے کا جذبہ انسان ہی میں ہے۔ حیوانات میں نہیں (یہ جو ہم چیونٹیوں، چوہوں وغیرہ کو ذخیرہ اندوزی کرتے دیکھتے ہیں تو تحقیقات نے بتایا ہے کہ یہ محض عادت ایسا کرتے ہیں۔ کسی مقصد کے ماتحت نہیں۔) علاوہ ازیں ان کا جمع کردہ ذخیرہ ان کی قوم کے تمام افراد کے کام آتا ہے۔ وہ گراں فروشی یا نفع اندوزی کے لئے ایسا نہیں کرتے۔ جب ایک گائے اپنا پیٹ بھر لیتی ہے تو باقیانندہ چارے کو سنبھال کر شام کے لئے نہیں رکھ لیتی۔ یہ انسان ہی کرتا ہے۔ اور مقصد اس سے گراں فروشی اور نفع اندوزی ہوتا ہے۔ اس کی یہی ہوس ہے جو تقسیم رزق میں اس قدر فساد کا موجب بنی ہوئی ہے۔ جس کے پاس قوت ہوتی ہے وہ سب کچھ سمیٹ کر ذخیرہ کر لیتا ہے اور کمزور اور غریب بھوکے مرتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ بَرَزُقَهَا وَ اِثْقَاكُمْ (۲۹)۔ اللہ ان حیوانات کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ حیوان صرف ضروریات پورا کرتے ہیں اور تم ذخیرہ اندوزی شروع کر دیتے ہو۔ یہ روش فسادِ آدمیت کا موجب ہے۔ (تفصیل میری کتاب نظام ربویت میں ملیگی۔)

سورة اعراف کی ایک آیت میں دہا گیا ہے کہ اپنے جذبات کا اتباع کرنے والوں کی مثال كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۲۶) ہے۔ حمل علی کے خبر کسی کو چلا کر تھکا دینے کے ہیں\*۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کتے کی یہ حانت ہے کہ اگر تو اسے چلا چلا کر (دوڑا دوڑا کر) تھکا مارے تب بھی وہ ہانپتا رہے اور اگر اسے ورسے ہی چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا رہے۔ اسے کسی شکل میں بھی سکون اور اطمینان نہیں ملتا۔ یا پھر یہ حَمَلَهُ عَلٰی اُسْرِ

سے ہو سکتا ہے جسکے معنی ہیں اسے کسی کام پر ا کسا یا \*۔ جیسے کتے کو شکار پر لپکایا جاتا ہے، یعنی تم خواہ کتے کو شکار پر لپکا کر دوڑاؤ یا اسے بیٹھا رہنے دو، وہ بہر حال ہانپتا ہی رہے گا۔ بیشتر اہل تفسیر نے یہاں حَمَلَ عَلَیْہِ کے معنی حملہ کرنے، ٹوٹ پڑنے اور اس کو مار کر بھگانے اور دھتکارنے کے کئے ہیں۔

## ح م م

حَمَّ النَّشْوَرُ حَمًّا۔ اس نے تنور میں ایندھن ڈال کر اسے گرم کیا۔ حَمَّ الشَّجْمَةُ۔ اس نے چربی کو پگھلایا۔ حَمَّ الْمَاءُ حَمًّا۔ اس نے پانی گرم کیا۔ الْحُمَامُ۔ اونٹوں یا تمام جانوروں کا بخار۔ حَمَّ فِکْر۔ غم۔ احْتَمَّ لَہُ۔ وہ اس کے لئے فکر مند ہوا۔ احْتَمَّ الرَّجُلُ۔ آدمی فکر کی وجہ سے سو نہیں سکا۔ احْتَمَّتِ الْعَیْنُ۔ بغیر کسی درد کے آنکھ نہیں لگ سکی یعنی نیند نہ آئی۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لَہُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیمٍ وَ عَذَابٌ أَلِیمٌ (۱۰۶)۔ وہ پینے کی چیز جو راحت جان ہونے کے بجائے سخت اذیت کا موجب بن جائے۔ یعنی عذاب الیم۔ لطائف اللغة میں ہے کہ اس کے معنی گرم پانی اور سرد پانی دونوں کے ہیں۔ سورۃ واقعہ میں ہے وَ ظِلٌّ مِّنْ یَّتَحَمَّوْا (۵۶)۔ اس کے معنی ہیں گرم سیاہ دھوئیں کا سایہ۔

الْحَمِیمُ۔ قریبی رشتہ دار جس کی خاطر فکر مند رہا جائے، یا جس کے دل میں تمہاری محبت ہو اور تمہارے دل میں اسکی محبت ہو، یا وہ جو اپنے متعلقین کی حمایت کا جوش دل میں رکھتا ہو۔ اور ان کے لئے گرمجوشی اور تپاک کا اظہار کرتا ہو۔ قرآن کریم نے اسے دلسوز دوست اور غمخوار رفیق کے معنوں میں استعمال کیا ہے (۱۰۶)۔ نیز حَمَّ الْاَسْرُ کے معنی ہیں اس امر کا فیصلہ ہو گیا۔ حَمَّ۔ حَمَّہُ۔ اس نے اس کا ارادہ کیا۔ حَمَّ اللہُ کَعَذَابُ وَ اَحَمَّہُ۔ خدا نے اس کے لئے ایسا فیصلہ کر دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں گرم ہونا اور ارادہ کرنا شامل ہیں۔

## ح م ی

حَمَّی النَّشْوَی۔ چیز کی حفاظت کی۔ کَلَّا حَمِی۔ حفاظت کی ہوئی گھاس۔ الْحَمِی۔ وہ بیمار جسے نقصان دہ چیزوں سے روک دیا گیا ہو۔ لہذا الْحَمِیۃ۔ وہ ہے جو کسی کی حفاظت کرے یا اسے نقصان دہ امور سے روکے۔ حمایت میں بہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔

\* تاج و محیط۔ حَمَّ در اصل حَمَّ سے اور احْتَمَّ لَہُ سے بدل کر آئے ہیں۔ \*\*\* تاج و محیط و راغب۔

حَام۔ ایام جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ نراونٹ جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ہو اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ (جیسے ہندوؤں میں ساند چھوڑ دیتے ہیں) اس سے بار برداری کا کام نہیں لیتے تھے۔ اور وہ ماندوں کی طرح آزاد پھرتا تھا جہاں جی چاہے جائے اور جہاں سے جی چاہے کھائے پیئے۔ اس میں ایک قسم کا توہم پرستانہ تقدس آجاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس سے روکا ہے (۱۰۳)۔

حَمِيَّتِ الشَّمْسُ وَالنَّارُ تَحْمِيْنِ۔ سورج اور آگ کی گرمی سخت ہو گئی۔ قرآن کریم میں ہے نَارٌ حَامِيَّةٌ (۱۱۱) سخت گرم آگ۔ ویسے حَمِيَّتٌ عَلٰی فُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں میں فلان پر غصہ ہوا۔ \*\* اَلْحَمِيَّةُ۔ جوش یا شدت غضب کو کہتے ہیں \*۔ حَمِيٌّ اَلْمَيْسَمَارُ۔ میخ گرم ہو گئی \*۔ قرآن کریم میں مرسایہ پرستوں کی دولت کے متعلق ہے يَوْمَ يَحْمِيْ عَمَلِيَّتُهَا فِی نَّارِ جَهَنَّمَ (۹۵)۔ ”جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا“۔ اسی (گرمی) سے اَلْحَمِيَّةُ ہے جسکے معنی غیرت اور ضد کے ہیں \*۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کو عزیز رکھتا ہے اس کی حفاظت کے لئے وہ گرمجوشی دکھائے۔ اگر وہ شے فی الواقعہ اچھی ہے تو یہ جذبہ قابل ستائش قرار پائیگا۔ اور اگر وہ شے مذموم ہے تو یہ جذبہ بھی مذمت کے قابل ہو جائیگا۔ زمانہ قبل از اسلام میں عرب اپنے معاشرہ کے رسوم و رواج کے تحفظ میں بڑی گرمجوشی دکھاتے تھے۔ چونکہ ان رسوم و رواج میں بیشتر مذموم تھے اس لئے قرآن کریم نے اُس جذبہ کو حَمِيَّةٌ اَلْجَاهِلِيَّةُ (۲۹) کہہ کر ہکا بکا کر دیا ہے۔

اَحْمَتُوْا مِلٰی الشَّیْءِ۔ چیز سیاہ ہو گئی۔ جیسے رات اور بادل \*۔

## ح ن ث

اَلْحَيْنُثُ۔ گناہ، معصیت، نافرمانی \*\*\*۔ (خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنا)۔ سورۃ واقعہ میں ہے وَكَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلٰی اَلْحَيْنُثِ اَلْعِظِیْمِ (۲۶) ”یہ لوگ بڑے بڑے سخت جرائم پر مصر رہا کرتے تھے“۔ اَلْحَيْنُثُ۔ عمد آجھوٹی قسم کھانے یا قسم کھا کر اسے پورا نہ کرنے کو بھی کہتے ہیں \*\*\*۔ فیز حق سے باطل کی طرف رجوع کرنے کو بھی \*\*\*\* حَنِثٌ فُلَانٌ فی کذا۔ اس نے کسی بارے میں گناہ اور کوتاہی کی، اسی سے جب بچہ جوان ہو جائے یعنی اس میں گناہ کرنے کی قوت آجائے تو کہتے بَلَغَ اَلْغُلَامُ اَلْحَنِثُ

یہ اس لئے کہ سن شعور کے بعد بچہ اپنے اچھے اور برے کاموں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس سے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے تو وہ مجرم گردانا جاتا ہے۔ (ابن فارس)۔ اور تَحَنُّث کے معنی گناہوں سے باز رکھنے کے ہیں\*۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت ایوبؑ میں ہے وَلَا تَحْنُثْ (۳۸) (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہو کر) حق سے باطل کی طرف مسائل نہ ہو۔ (اس کے لئے عنوان ض غ ث۔ بھی دیکھئے)

## ح ن ج د

الْحَنْجَرَةُ۔ حلق۔ \*\*\* مانس کی نالی \*\* جمع حَنَاجِرُ (۳۳)۔ حَنْجَرَةٌ اس نے اسے ذبح کر دیا \*\*\*۔

## ح ن ذ

الْحَنْذُ۔ گرم پتھروں کے درمیان گوشت بھون کر کباب بنا لینا\*۔ حَنْيَئْذُ۔ اس گرم گرم گوشت کو کہتے ہیں جس سے، بٹھنے کے بعد ابھی پانی ٹپک رہا ہو\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو ہکا دینا۔

سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے مہمانوں کے لئے عِجْلُ حَنْيَئْذُ (۱۱۹) لیکر آگئے۔ یعنی بٹھنا ہوا بچھڑا (مسلم)۔

## ح ن ف

الْحَنْفُ۔ پاؤں کا ٹیڑھا اور سڑا ہونا۔ رَجُلٌ حَنْفَاءُ۔ مڑا ہوا پاؤں۔ اسی سے حَنْيَئْفُ اسے کہتے ہیں جو غلط راستے سے ہٹ کر (مڑ کر) سیدھی راہ پر آجائے۔ راغب نے کہا ہے کہ حَنْفُ، گمراہی سے ہٹ کر استقامت (صراط مستقیم) کی طرف بائٹل ہونے کو کہتے ہیں\*\*\*۔ اس میں یکسو ہونے کا مفہوم غالب ہے۔ تفسیر المنار میں ہے کہ حَنْيَئْفُ لغت میں مسائل کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ پر اس لفظ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگ طریقہ کفر کی پیروی کرتے تھے۔ انہوں نے ان سب کی مخالفت کی اور ان کے طریقہ سے ہٹ کر دین مستقیم اختیار کر لیا\*\*\*\*\*۔

\* تاج و راغب۔ \*\* محیط۔ \*\*\* تاج۔ \*\*\*\* تاج و محیط و راغب۔ \*\*\*\*\* المنار

قرآن کریم میں رَجَسٌ اور قَوْلُ الزُّور کے اجتناب کے بعد کہا ہے  
 "مُتَّقَاءَ لِلّٰهِ" (۲۴۳)۔ اس سے حَنِیْف کا صحیح مفہوم سامنے آ جاتا  
 ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی قانون و روش زندگی سے منہ موڑ کر خدا کے قوانین  
 کی طرف آ جانے والا۔ غَیْرَ مُشْرِکِیْنِ بِہ (۲۴۴) اور ان قوانین کے ساتھ  
 کسی اور کی اطاعت کو نہ شامل کرنے والا۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنی پہلے ہر  
 غیر خدائی طاقت سے منہ موڑا جائے (یَکْفُرُ بِالطَّاغُوتِ) اور اس کے بعد  
 اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے (یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ) (۲۴۵)۔

یہی مطلب لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کا ہے۔ "یعنی کوئی صاحب اقتدار ہستی  
 نہیں بجز اللہ کے"۔ لہذا ہر مومن حَنِیْف ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ  
 کی روش تھی جنہیں قرآن کریم نے حَنِیْف کہہ کر پکارا ہے (۲۴۵)۔ ہر طرف  
 سے منہ موڑ کر صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے والا۔

## ح ن ک

اَلْحَنٰکُ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ منہ کے اندرونی حصہ (تالو) کو  
 کہتے ہیں۔ لیکن دوسروں نے کہا ہے کہ یہ منہ کے نچلے حصے، یعنی ٹھوڑی  
 کے نچلے حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کہتے ہیں تَحَنٰکُ فُلَانٌ۔ وہ اپنی  
 پکڑی کا بل ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اوپر لے گیا۔ اَلْحِنَاکُ۔ وہ بندھن  
 جس سے قیدی کو اس طرح باندھا جاتا تھا کہ اگر وہ اسے ذرا بھی کھینچے تو  
 اسکی ٹھوڑی کے نچلے حصہ میں تکلیف محسوس ہو۔\*\*

جانور (گھوڑے گدھے وغیرہ) کے منہ میں ایک تولگام دی جاتی ہے  
 اور جب لگام نہ ملے تو ایک رسی لے کر اسے اس کے نچلے جبڑے میں دے کر  
 ٹھوڑی کے نیچے بل دبدبا جاتا ہے اور اس طرح اسے ہکڑ کر لے چلتے ہیں۔  
 اسے اَلْحِنَاکُ کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں لَمْ اَجِدْ لِبَعَامَا  
 فَاحْتَنٰکْتُ دَابَّتَیْ۔ مجھے لگام نہیں ملی تو میں نے اپنی سواری کے  
 منہ میں رسی ڈال دی اور اس طرح اسے لے چلا۔ اسی سے اس کے معنی کسی پر  
 غالب آ جانے کے آتے ہیں۔ اَلْحَنٰکُ الْجَرَادُ الْاَرْضَ۔ ٹڈیاں زمین  
 پر چھا گئیں اور جو کچھ پیداوار تھی اسے صفا چٹ کر دیا۔ اِسْتَحٰنٰکُ  
 الْعِضَاءُ۔ جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی۔\*\*

قرآن کریم میں ہے کہ ابلیس نے یہ چیلنج دیا کہ لَا حَتٰنِکَ  
 ذُرِّ یَقْتَتِ (۱۶) میں بالضرور ابن آدم کی ٹھوڑی میں رسی باندھونگا اور

اس طرح اسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرونگا۔ اس میں نہ صرف یہی ہے کہ ابلیس اسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتا ہے بلکہ لَحْتِنَاک میں جو ذات کا پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہے۔ انفرادی مفاد پرستیاں جس طرح انسان کو اپنی گرفت میں لے کر ذلیل و خوار کرتی ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ جس طرح کتے کے پاؤں اُسکی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، اسی طرح انسان اپنے جذبات کے پیچھے لگا پھرتا ہے اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اگر اُسکی بجائے وہ انہی جذبات کو وحی کی روشنی میں چلائے تو کونین کی سرفرازیاں اُسکے حصہ میں آجائیں۔

جو کچھ انفرادی جذبات پرستیاں ایک فرد کے ساتھ کسرتی ہیں، وہی کچھ طاقطور قومیں کمزور قوموں کے ساتھ کسرتی ہیں۔ یعنی ان کے جڑے میں رسی ڈال کر انہیں جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتی ہیں۔ یہ بھی ابلیسی قوتیں ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت (۱۶۴) کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم نے ان طاقطور قوموں کے اُن حربوں کا کس طرح ذکر کیا ہے جنہیں وہ کمزور قوموں کو پھانسنے کے لئے اختیار کسرتی ہیں۔ (اسکی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں ملیگی)

## ح ن ن

الْحَنِیْنُ۔ کسی چیز کی طرف مشتاقانہ کہنچنا۔ شدت سے رونا یا خوش ہونا۔ بے تابانہ اشتیاق کی آواز خواہ غم سے ہو یا خوشی سے۔ صاحب مصباح نے لکھا ہے کہ حَنِیْنُ کا لفظ عرب ماں کی مامتا کیلئے بولا جاتا ہے۔ الْحَانِثَةُ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور اپنے بچے کیلئے بیحد مضطرب و مشتاق ہو رہی ہو۔ الْحَنَانَةُ۔ وہ عورت جسے اُسکے شوہر نے چھوڑ دیا ہو اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے غم میں بیحد اداس اور پریشان رہتی ہو\*۔

قرآن کریم میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ہے کہ آتَمِنَہُ..... حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا (۱۱۳)۔ اللہ نے اُسے اپنے ہاں سے رقت قلب۔ سوز و گداز۔ ماں کی سی محبت رکھنے والا دل عطا کیا۔ اسی اعتبار سے ہمارے ہاں خدا کے اسماء میں ایک نام الْحَنَانُ بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ عیسائیت کے خدا کے تصور (رقت و سوز و گداز) کی جھلک پائی جاتی ہے۔



حُنَيْنٌ\* (۲۵) مکہ کے قریب ایک وادی ہے جہاں نبی اکرمؐ کی مخالفین سے جنگ ہوئی تھی۔

## ح و ب

حُوبٌ - حَبَابٌ - یہ لفظ اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے\*۔  
 الْحَوْبَةُ - حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکاب جرم پر آمادہ کر دے\*\*۔ اسکے بعد گناہ کیلئے بھی اسکا استعمال ہونے لگا۔ نیز اسکے معنی ہلاکت۔ غم و فکر۔ اور درد مند ہونا بھی ہیں\*۔  
 جو گناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گناہ۔ حاجت یا مسکنت کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یتیم کا سال کہا جانے کو حُوبًا کَبِيرًا کہا گیا ہے (۲)۔ یعنی جرم عظیم۔ بڑی حق تلفی۔  
 حُوبٌ کے معنی گناہ، وحشت، تباہی بربادی، آفت اور بیماری بھی ہیں\*\*\*۔

## ح و ت

الْحَوْتُ - مچھلی، لیکن بیشتر بڑی مچھلی کے لئے بولا جاتا ہے۔  
 جمع أَحْوَاتٌ وَ حَيْثَانٌ\* - حَاوَاتٍ - اس نے اسے ایسا دھوکا دیا جیسے مچھلی دھوکا دیتی ہے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تڑپنے اور چلتے وقت رخ بدلنے کے ہوتے ہیں۔ مچھلی کو اسی اعتبار سے حَوْتُ\* کہتے ہیں۔ حَاتٌ عَلَيَّ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر لگانا\*\*\*\*۔  
 قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے فَالْتَقَمَهُ الْحَوْتُ (۳۴)۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں ”سو بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا“۔  
 سورة اعراف میں حَيْثَانُهُمْ (۱۶۳) آیا ہے۔ یعنی ان کی مچھلیاں۔

## ح و ج

الْحَاجَةُ - الْحَاجِيَّةُ - ضرورت۔ اصل میں اس کے معنی ہوتے ہیں اپنے مطلوب و مقصود تک عدم رسائی۔ جس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش ہو اس تک نہ پہنچ سکتا۔ پھر اس کا استعمال عام احتیاج (ضرورت مندی) کے لئے ہونے لگا\*۔ الْحَاجَةُ دراصل کانٹے کو کہتے ہیں۔ لہذا الْحَاجَةُ اس ضرورت کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ جائے اور

اٹک جائے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کے (حصول) کے لئے مضطرب اور مجبور ہو جانا۔

سورة یوسف میں ہے اِنَّا حَاجَّةٌۢ بِیْ نَفْسٍۭ یَّعْقُوْبَ (۱۲/۱۸)۔ یہ محض یعقوب کے دل میں ایک خلش تھی (جو اس نے پوری کر لی)۔ سورة مؤمن میں یہ لفظ مطلوب (جس چیز کی طلب ہو) کیلئے آیا ہے۔ حَاجَّةٌۢ بِیْ صَدُوْرِکُمْ (۲/۸) تمہارا دلی مطلوب و مقصود۔

## ح و ذ

اَلْحَوْذُ - کسی چیز کو گھیرے میں لے لینا\* نیز اس کے معنی جانور کو سختی اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے بھی ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، پھرتی۔ تیزی۔ کسی معاملہ میں چستی کرنا۔ اِسْتَحْوَذَ عَلٰی کَذَا - کسی چیز پر تسلط جمالیا، مستولی ہو گیا۔ حَاذَ الثَّمَنَ اس لکیر کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پشت پر دم سے گردن تک بنتی جاتی ہے۔ (یعنی ریڑھ کی ہڈی کی لکیر) یا پشت پر نمندہ رکھنے کی جگہ یا ران کے پیچھے کا وہ حصہ جس پر دم لگتی ہو۔ ایسے دونوں کنارے حَاذَ اَنْ کہلاتے ہیں\*۔ اسی لئے اَلْحَوْذُ کے معنی ہیں ہانکنے والے کا جانور کے پیچھے اس طرح چلنا کہ وہ اسکی دونوں ٹانگوں کے عین پیچ میں رہے اور وہاں سے سختی سے اسے ہانکے جائے\*\*\*۔ اس نقشہ کو سامنے رکھتے اور پھر اس آیت کا مطلب سمجھتے جس میں کہا گیا ہے کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ (۵۹/۱۶)۔ یعنی مفاد پرستیوں کے سرکش جذبات ان پر غالب آ گئے اور انہیں نہایت سختی سے ہانکتے رہے اور وہ انہی کے ڈنڈے سے عمر بھر چلتے رہے۔ یا کمزور قوم جو بالادست اقوام کے ڈنڈے سے ہانکی جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ح۔ ن۔ ک)۔

سورة نساء میں ہے قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْکُمْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ... (۴/۱۴)۔ اس میں نَمْنَعْکُمْ کے معنی ہیں تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کی۔ اور نَسْتَحْوِذْکُمْ کے معنی ہیں ہم تم پر غالب تھے۔ یعنی جب تم حملہ کرنے کے لئے آئے تو ہم ہی نے تمہیں اسکی جرأت دلائی اور تمہیں اُن کے خلاف چڑھا لائے۔ یعنی ہم نے جماعت مؤمنین سے تمہاری حفاظت بھی کی اور یہ بھی ہماری جرأت افزائی کا نتیجہ تھا کہ تم ان کے خلاف آ گے بڑھے۔

## ح و ر

حَار - يَحْوَرُ - حَوْرًا - لوٹنا - واپس ہونا - ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا - نیز زیادتی کے بعد پھر سے کم ہو جانا (۸۴/۱) ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا رنگ - (۲) ہلٹنا (۳) گھومنا لکھے ہیں - اَلْمُحَوَّرَةُ وَالْمُحَوَّرُ - ایک دوسرے کو لوٹا کر جواب دینا - تبادلہ گفتگو (جس میں بات لوٹائی جاتی ہے) (۱۸۸/۱ و ۵۸/۱) - اَلْمُحَوَّرُ - وہ لکڑی یا لوہا جسکے گرد کوئی چیز گردش کرتی ہے - اَلْحَوْرُ کے معنی تحیر اور حیرت کے بھی آتے ہیں - (دیکھئے عنوان ح - ی - ر) - اَلْحَوْرُ - ایک لکڑی ہوتی ہے جسے اس کی سفیدی کی وجہ سے بَيْضَاءُ بھی کہتے ہیں - صاغی نے تصریح کی ہے کہ اس لفظ (حَوْرُ) کی بنیاد سفید ہونے پر ہے - یعنی اس کے مادہ میں سفید ہونے کا مفہوم ہے - اس لئے اَلْحَوَارِیَّاتُ شہر کی عورتوں کو کہتے ہیں جن کا رنگ بھی سفید ہوتا ہے اور وہ ویسے بھی اجل رہتی ہیں - اَلْحَوَارِیُّ مِیْدے کو کہتے ہیں جو آئے کا لب لباب ہوتا ہے - نیز کھانے کی ہر اس چیز کو جسے صاف اور سفید کر لیا گیا ہو - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اَلْحَوَارِیُّوْنَ (۱۱/۱) - کہتے تھے بعض کا خیال ہے کہ وہ چونکہ دھوبی تھے اس لئے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - دوسروں کا خیال ہے کہ ان کی اپنی صفائی کی وجہ سے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - اکثریت اس طرف گئی ہے کہ ان کی نیت کی صفائی اور عمل کے خلوص کی بنا پر انہیں ایسا کہا گیا ہے - شمر کا قول ہے کہ اَلْحَوَارِیُّ خیر خواہ کو کہتے ہیں \*\* - بہر حال ، یہ لفظ ان کی پاکیزگی خیال - خلوص عمل اور حسنِ رفاقت ، سب کا آئینہ دار ہے - صاحب المنار کا خیال ہے کہ حَوَارِیُّ مِیْدے کو کہتے ہیں جو آئے کا خلاصہ ہوتا ہے - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اس لئے حَوَارِیُّوْنَ کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ قوم کے منتخب اور مخصوص افراد تھے \*\*\* -

حَوْرُ - یہ لفظ جمع ہے - اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے ، جو مذکر ہے اور حَوْرَاءُ بھی ، جو مؤنث ہے - اَلْحَوْرُ کے معنی ہوتے ہیں آنکھ کی سفیدی کا بہت سفید اور سیاہی کا بہت سیاہ ہونا اور جلد کا رنگ صاف ہونا - یا آنکھ کی سیاہی کا اتنا زیادہ ہونا کہ آنکھ اس سے بھری ہوئی معلوم ہو - ایسے مرد اور عورتیں جن میں یہ خصوصیات پائی جائیں - حَوْرُ کہلائیے گئے -

قرآن کریم میں متقیوں کے متعلق ہے وَ زَوْجُهُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ (۵۴ و ۵۳)۔ جس طرح حُورٌ مذکر اور مونث دونوں کے لئے آتا ہے اسی طرح عِیْنٌ بھی، اَعِیْنٌ (مذکر) اور عِیْنَاءُ (مونث) دونوں کی جمع ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَوْجُهُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ کے معنی ہم نشین بنانا ہیں۔ (دیکھئے عنوان ز۔ و۔ ج)۔ اسلئے ان الفاظ کے معنی صرف میاں بیوی بننے کے نہیں بلکہ ہم نشین اور باہم دگر رفقاء بننے کے بھی ہیں\*۔ میاں بیوی بھی باہمی رفاقت کی وجہ سے ایک دوسرے کے زَوْجٌ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں، جنتی معاشرہ کی پاکیزہ صفات عورتوں کو بھی حُورٌ کہا گیا ہے۔ (۵۵ و ۵۶)۔ نیز لیں نے (متعدد اسناد کی تائید سے) لکھا ہے کہ اَحْصَورٌ۔ جسکی جمع حُورٌ ہے۔ کے معنی پاکیزہ عقل (Pure or clean Intellect) کے ہیں۔ یعنی چالاک اور مکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل۔ چنانچہ مَا یُعِیْشُ بِأَحْصَورٍ اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو معاملات کا صاف نہ ہو۔ جو پاکیزہ عقل کے مطابق زندگی بسر نہ کرے۔ لہذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُورٌ عِیْنٌ) خواہ وہ عام ہمتشین ہوں یا بیویاں۔ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے کام میں نہیں لائی جائیگی۔ وہ عقل ادب خورده دل ہوگی۔ یعنی پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار۔

## ح و ط

حِیْطَۃٌ کے معنی ہیں حفاظت کرنا۔ محفوظ رکھنا۔ نگہبانی کرنا۔ مدافعت کرنا۔ کسی کی ضروریات کو پورا کرنا۔ لَا زِلَّتْ فِی حِیْطَۃِ اللّٰہِ کے معنی ہیں تو ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہے۔ رَجُلٌ یَّتَحَوَّطُ أَخَاهُ۔ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے بھائی کی خبر گیری کرتا ہے۔ اَلْحَتَّائِطُ۔ دیوار کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اندر کی چیزوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے۔ اَلْحَتَّاطُ۔ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں مال مویشی رکھے جائیں اور وہ چاروں طرف سے محفوظ ہو\*\*۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ حُطَّتِ الشَّیْءُ کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں۔ اور اَلْحَتَّاطُ میں شدت حفاظت پائی جاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لینا۔ اَلْحِیْطَۃُ۔ عقیف اور شریف ہورت کو کہتے ہیں۔ یعنی جو بہت زیادہ محتاط ہو\*\*\*۔

أُحِيطَ بِالنَّاقُورِ کے معنیے ہیس ساری کی ساری قوم ہلاکت کے گھیرے میں آگئی \* ۔ تباہیوں میں گھر گئی ۔

قرآن حکیم میں وَاللّٰهُ مُّحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (۲۹) اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم ، جو کچھ ہمارے جی میں آئے کرتے رہیں ، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ تو یہ خیال غلط ہے ۔ ان کے اعمال کبھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتے ۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے اور ان کے نتائج ، تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں ، انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ضرور ہلاک ہو کر رہینگے ۔ اس طرح ، مُحِيطٌ میں حفاظتِ اعمال اور انکے نتائج کی وجہ سے ہلاکت کے دونوں پہلو آجاتے ہیں ۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ہے وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ (۲۹) ”یقیناً جہنم ان انکار کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے“ ۔ دوسری جگہ ہے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۹۴) ”وہ اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں“ ۔

سورۃ کہف میں ہے وَأُحِيطَ بِشَمْرِهِ (۱۸) جسکے معنی ہیں اسکا مال و متاع ۔ باغ کے پھل وغیرہ سب تباہی کی لپیٹ میں آگئے ۔ سورۃ نمل میں ہے فَقَالَ أَحَاطَتْ بِمَالِكُمْ تَحِيطٌ بِهِ (۲۶) ”اسنے کہا کہ میں نے ایسی بات معلوم کی ہے جسکی تجھے خبر نہیں“ ۔ یہاں أَحَاطَ کے معنی ہیں کسی چیز کی معلومات فراہم کر لینا ۔ اسے حیطہ علم میں لے لینا ۔ سورۃ البروج میں ہے وَاللّٰهُ مِّنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ (۸۵) ”اللہ انکے گرد اگرہ غیر مرنی طور پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے“ ۔ اسکا مطلب وہی ہے جو مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (۲۵۵) ”وہ اللہ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے“ ۔ انکے حیطہ ادراک میں نہیں آسکتا ۔ وہ سمجھ نہیں سکتے ۔

## حول

حوّل کے بنیادی معنی کسی چیز کا تغیر پذیر ہونا ، ایک حالت سے دوسری میں جانا اور دوسری چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں ۔ چنانچہ جو چیز

اپنی پہلی حالت پر نہ رہے بلکہ اس میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اسے حال الشَّیْءِ یا اَحْوَالُ الشَّیْءِ کہتے ہیں کیونکہ اسکی حالت میں تغیر آجاتا ہے۔ مُسْتَحَالَّةٌ اور مُسْتَحْیِلَةٌ - ٹیڑھی کمان کو کہتے ہیں۔ نیز اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس میں کئی سال قصل نہ ہوئی گئی ہو (اور وہ اس طرح اونچی نیچی ہو جائے۔ یعنی اپنی پہلی حالت پر نہ رہے۔) راغب نے کہا ہے کہ حَوَّلْتُ الشَّیْءَ فَتَحَوَّلَ کے معنی ہیں غَیْبَرْتُ الشَّیْءَ فَتَغَيَّرَ - اس سے حیوَل کے معنی تغیر و تبدل کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۸/۱۸) میں، حِوَلًا کے معنی تبدیلی اور تغیر کے ہیں۔ حَوَالُ الشَّہْرِ - زمانے کے تغیرات کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ انسان کے سال، بدن یا خود اسکے نفس میں جو بدلنے والی کیفیات ہوتی ہیں وہ اسکا حال کہلاتی ہیں۔ نیز اَلْحَالُ زمانہ حاضر کو بھی کہتے ہیں۔ حَوَلٌ - بھینگا ہونے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آنکھ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہوتی۔ حیوَل کے معنی زوال یا انتقال کے بھی ہیں\*۔ (اس میں بھی حالت کے بدلنے کا پہلو موجود ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوری حرکت کے ہیں۔

گردش کے اعتبار سے حَوَلٌ - سال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کی گردش سے واقع ہوتا ہے (۲۴/۲۴)۔ اَحْوَالُ الشَّیْءِ کے معنی ہیں اس چیز پر ایک سال گزر گیا۔ اَلْحَوَلِیُّ - اس چار پائے کو کہتے جو ایک سال کا ہو جائے۔

حَوَلٌ کے معنی ارد گرد کے بھی آتے ہیں۔ حَوَلُ الشَّیْءِ کے معنی چیز کا کنسارہ یا طرف ہیں۔ حَوَ الْیَمِّنِکَ اور حَوَ لَیَمِّنِکَ سے مراد وہ اطراف ہیں جو تجھے گھیرے ہوئے ہوں۔ احاطہ کنے ہوں۔ مَحْوُلُ الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کا ارد گرد\*۔ جدا ہونے کے اعتبار سے، جو چیز دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے اسے حَالٌ بَیْنَهُمَا کہتے ہیں (۳۳/۵۳)۔ اس چیز کو جو درمیان حائل ہو جاتی ہے حِوَالٌ یا حَوَلٌ یا حَوَلٌ کہتے ہیں۔ الگ کر دینے کی نسبت سے کسی چیز کا رخ تبدیل کر دینے نیز اسے دگرگوں کر دینے، زائل کر دینے کو تَحْوِیْلٌ کہتے ہیں (۱۶/۵۶)۔ یہ لازم بھی ہے۔ اور اس طرح اس کے معنی دگرگوں ہو جانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا بھی ہیں۔ \*\* اَلتَّحْوَالَةُ

کے معنی ہیں ایک نہر کو دوسری نہر کی طرف موڑ دینا۔ مَحَال کے معنی ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا۔ (جو نا ممکن ہے) \* نیز باطل اور اپنے صحیح رخ سے ہٹا ہوا۔

حَوْلَة کے معنی قوت تصرف، غلبہ اور اقتدار کے بھی ہیں۔ نیز گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ جانے کو بھی کہتے ہیں۔ اپنی پیٹھ پر جو گٹھڑی وغیرہ اٹھائی جائے اسے حَال کہتے ہیں۔ نیز اس گڈیلنے کو بھی جس کے سہارے بچہ بتدریج چلنا سیکھتا ہے \*۔

حَيْلَة - مہارت نگاہ اور نظر کی تیزی نیز معاملات میں تصرف پر قابو اور تدبیر اس پر قدرت حاصل ہونے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ حَيْلَة وہ طریقہ ہے جس سے کسی بات تک پوشیدہ طور پر پہنچا جائے \*۔ ہمارے ہاں یہ لفظ عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ حالات میں تبدیلی کسرنے پر قدرت اور معاملات میں تصرف کرنے کی طاقت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لَا يَسْتَطِيعُونَ حَيْلَة - (۹۸)۔

حَوْرِل - گدواہ اور شاہد کو بھی کہتے ہیں۔ نیز کفیل کو بھی۔ حَاوِلَتْ لَهٗ بَصَرِي کے معنی ہیں، میں نے اس کی طرف تیز نظر سے دیکھا \*۔

## ح و و

الْحَوَّةُ - سبزی مائل سیاہی۔ گہری سبزی۔ لوہے کے رنگ جیسا رنگ۔ یعنی سرخی جو مسائل بہ سیاہی۔ اَحْوَاوَتْ اِلَاَرْضُ - زمین سرسبز ہو گئی \*۔

قرآن کریم میں ہے وَالَّذِي اَخْرَجَ التَّمْرَ عَلٰی - فَجَعَلَتْهُ غُثَاءً اَحْوٰی (۸۵)۔ ”خدا (کا قانون) زمین سے چارہ نکالنا ہے۔ پھر اسے خشک کر کے بالکل سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے“۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے \*\*\*۔ قرآن نے کہا ہے کہ جب گھاس خشک ہو جائے تو اسے غُثَاء کہتے ہیں اور جب وہ پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے تو اسے اَحْوٰی کہتے ہیں \*۔ (اس کا مؤنث حَوَّاء ہے)

(غُثَاء کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (غ - ث - و) (ی)

## ح و ی

الْحَوْرِیَّةُ - ہر چیز کی گولائی کو کہتے ہیں۔ (گول لپٹی ہوئی)  
 آت - جمع حَوَآیَا یعنی انتڑیاں \* - (۱۳۷)  
 حَوَآہُ - بِحَوْرٍ یَّہْر - کسی چیز کو جمع کرنا، اپنے اندر لے لینا، مالک ہونا۔ اس کا احاطہ کر لینا۔ اسے نگاہ میں رکھنا \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔

## حِیْثُ

حِیْثُ - جس طرح حِیْثُ زمانہ پر دلالت کرتا ہے (یعنی ”جب“)۔ اسی طری حِیْثُ مکان پر دلالت کرتا ہے۔ (یعنی ”جہاں“)۔ لیکن اخفش کا قول ہے کہ حِیْثُ کا استعمال زمانہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے \*\*۔ یعنی حِیْثُ کے معنی ”جب“ بھی ہو سکتے ہیں۔

سورة بقرہ میں ہے فَسَكُنُوا مِیْنَهَا حِیْثُ شِئْتُمْ (۲/۵۸)۔ تم جب چاہو یا جہاں سے چاہو۔ کھاؤ۔ ”جنتِ آدم“ کے ضمن میں ہے وَ کُلَّا مِیْنَهَا رَغَدًا حِیْثُ شِئْتُمَا (۲/۵۹)۔ ”تم جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ“۔ جنتی معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس میں ہر فرد کو سامانِ زیست ہر جگہ میسر ہوگا اور با فراغت میسر ہوگا۔

## ح ی د

حَادٍ عَنِ الطَّوْرِ یُقِ - یَحِیْدُ - وہ راستہ سے (ایک طرف کو) ہٹ گیا۔ الرَّجُلُ یَحِیْدُ عَنِ الشَّیْءِ - آدمی خوف اور نفرت کی وجہ سے کسی چیز سے رکتا اور باز رہتا ہے۔ حِمَارٌ حِیْدِلٌ وہ گدھا جو اپنے سایہ سے بدکتا ہو۔ حِیْدُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا اٹھا ہوا کنارہ جو بلند اور آگے کو نکلا ہوا ہو۔ سخت ٹیڑھی پسلی \*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی راستے سے ہٹ جانا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے ذَٰلِکَ مَا کُنْتَ مِیْنَهُ تَحِیْدُ (۵۱/۱۹)۔ ”یہ وہ ہے جس سے تم بدکتے اور کنارہ کشی اختیار کرتے تھے“۔

\* تاج \*\* تاج - صاحب محیط نے بھی اس کی تائید کی ہے۔



## ح ی ر

حَارَ بَصَرُهُ - یَحَارُ - کسی چیز کی طرف دیکھنے سے نگاہ کا چندھیا جانا۔ حَارَ فِی أَمْرِهِ : وہ اپنے معاملہ کا صحیح حل نہ پاسکا۔ حَیْرَةٌ کے اصلی معنی ہیں چمک سے آنکھوں کا چندھیا جانا (اور اس طرح نگاہ کو ادھر سے پھیر لینا) حَارَ وَاسْتَحَارَ راستہ نہ پانا۔ فَهَوُ حَیْرَانٌ - سو وہ متحیر رہ گیا۔ یعنی صحیح راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے مضطرب اور پریشان ہو جانے والا۔ حَارَ الْمَاءُ فِی الْمَسْکَنِ - اس وقت بولتے ہیں جب پانی کو آگے جانے کا راستہ نہ ملے اور وہ ایک ہی جگہ رک کر گردش کرتا رہے\*۔ الْمُسْتَحِیْرُ - لق و دق بیابان کے عرض میں جانے والا راستہ جس کا پتہ ہی نہ چلے کہ کس طرف لے جائیگا\*۔ اس کے معنی راستہ نہ پاسکنے کی وجہ سے پریشان اور مضبوط الحواس ہو جانے والا بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کَا لَّذِی اسْتَهْوَتْهُ الشَّیْطَانُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانٌ (۱۶) ”اس شخص کی مانند جسکے جذبات پر شیاطین قبضہ کر کے اسے زمین میں بھٹکاتے پھریں اور وہ حیران و پریشان ہو۔ یعنی جو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا جائے اور اس طرح یوں راہ گم کر دے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلے کہ اب کدھر جانا ہے۔“

## ح ی ز (ح و ز)

حَارَ الشَّیْءُ یَحْوِزُهُ - کسی چیز کو جمع کرنا اور اپنی جانب یا اپنے اندر لے لینا۔ اِنْحَارَ عَنْهُ - وہ اس سے ہٹ گیا۔ اِنْحَارَ اِلَیْهِ - وہ اس کی طرف مائل ہو گیا۔ تَحْوِزُ وَ تَحْیِزٌ - سانپ کی طرح بل کھانا۔ مڑ جانا۔ ایک طرف کو ہٹ جانا\*۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ مُتَحِیِّزًا اِلَیْ فِئَةٍ (۸۶) - اپنی جماعت کی طرف پھنچنے کے لئے مڑ جانے والا۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں حَیِزٌ (خالی جگہ، کنارہ، گوشہ) کی طرف ہونے والا۔ اس کی اصل واو سے ہے جس کے معنی ہیں ہر وہ مجموعہ جس کے اجزا ایک دوسرے سے پیوست ہوں\*\*۔ لہذا مُتَحِیِّزًا اِلَیْ فِئَةٍ کے معنی ہونگے اپنی (یا کسی) جماعت کے ساتھ مجتمع ہو جانے کی غرض سے۔

## ح ی ص

حَاصَ عَنْهُ - یَحِیْصُ - کسی چیز سے ہٹ جانا۔ الگ ہو جانا کسی سے بچنے کے لئے ایک طرف کو بھاگ جانا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ہٹنے کے

ساتھ تحریر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اَلْمَحِيضُ\*۔ ہٹنے کی جگہ۔ ایک طرف کو ہو جانے اور بھاگ جانے کی جگہ\*۔ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيضًا (۱۳۱)۔ ”وہ اس سے بچکر جانے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے“ وہ فرار ہو کر پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔

ایک طرف کو ہٹ جانے کے اعتبار سے اَلْحَيْضُ\* اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی ہو۔ (حَيْضُ بَيْضُ کے معنی ہیں کسی بات کا نہایت شدت سے مبہم ہو جانا\*\*۔ سخت الجھاؤ\*)۔

## ح ی ض

حَاضُ السَّيْلِ\*۔ سیلاب خوب بڑھ گیا اور اس کا پانی چڑھا اور بہہ نکلا،۔ دراصل اس لفظ کے معنی بہنے اور جاری ہونے کے ہیں۔ حَاضَتِ الْمَرْأَةُ\*۔ عورت کے ماہواری خون کا جاری ہونا\*\*\*۔ اَلْمَحِيضُ\* (۲۲۲)۔ حیض کا جاری ہونا، حیض کا خون، حیض کے ایام یا موضع حیض (جہاں سے حیض کا خون برآمد ہوتا ہے) لیکن بہ لفظ خود حیض کے لئے بھی آتا ہے (۱۵)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ بیول کے درخت سے جو سرخ رنگ کا پانی نکلتا ہے اس کے لئے حَاضَتِ الشَّجَرَةِ\* کہتے ہیں۔ تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ حَاضَتُ، تَحِيضُ\*۔ حَائِضٌ ہونا۔ وَالشَّيْءُ لَمْ يَحِيضْ (۱۵)۔ وہ عورتیں جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو (یعنی عمر کے لحاظ سے انہیں حیض آنا چاہیئے تھا لیکن کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آسکا)۔

## ح ی ف

اَلْحَائِفُ\*۔ ڈر رہی چیز۔ نیز راستی سے ہٹنے والے کو کہتے ہیں۔ اَلْحَائِفُ مِّنَ الْجَبَلِ\*۔ پہاڑ کا ایک طرف نکلا ہوا کنارہ۔ اَلْحَيْفَةُ\*۔ کنارہ۔ جانب۔ پہلو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھکاؤ اور میلان کے ہیں۔ اَلْحَيْفُ\*۔ فیصلہ کرنے میں ایک طرف کو جھک جانا۔ انصاف نہ کرنا، ظلم و زیادتی۔ حَافٌ عَلَيْهِ\*۔ اس پر ظلم و زیادتی کی\*\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے اَمْ يَخَافُونَ اَنْ يَّحْيِيَنَّ اللهُ عَلَيْهِمُ سَمًا وَّ رَّسُولًا (۵۲) ”کیا انہیں اس کا ڈر ہے کہ خدا اور اس کا رسول فیصلہ کرنے میں فریق مخالف کیطرف جھک جائیگا اور ان سے انصاف نہیں برتیگا،!“ (کس قدر غلط ہے ان کا یہ اندیشہ)۔

## ح ی ق

حَقَّاقٌ بِرَبِّهِ الشَّيْءُ بِحَقِّقٍ۔ کسی چیز نے اسے گھیر لیا۔ \* وَحَقَّاقٌ بِرَبِّهِ فِرْعَوْنُ سَوُّءٌ الْعَذَابِ (۳۵)۔ ”بدترین عذاب نے قوم فرعون کو گھیر لیا“۔ انسانی اعمال کے نتائج جس طرح اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور وہ ان کے اثر سے بچ نہیں سکتا، اُسکے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ فَحَقَّاقٌ بِرَبِّهِ لَقَدْ يَنْصَحِرُ وَمِنْهُمْ مَنَّا كَانُوا بِهِمْ يَسْتَهْزِءُونَ (۶)۔ ”جو لوگ ان میں سے پیغام خداوندی کا تمسخر اڑاتے تھے، انہیں اُس چیز نے گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے“۔ یعنی ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز پر چھا جانا۔ اس کے اوپر آکر بیٹھ جانا اور چپک جانا۔

## ح ی ن

أَلَحِيْنٌ۔ مطلقاً زمانہ اور وقت کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ وقت طویل ہو یا قصیر۔ (کم ہو یا زیادہ)۔ عربی زبان میں حِيْنٌ کا اطلاق ایک لمحہ سے لے کر لامتناہی حد تک ہوتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ حِيْنٌ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو جائے۔ یہ وقت مبہم ہوتا ہے اور اُس وقت معین و مخصوص ہو جاتا ہے جب اس کے بعد مضاف الیہ آجائے۔ حَتَّانَ أَلَقَوْمٌ کے معنی ہیں قوم جو کچھ چاہتی تھی اس کے حاصل ہونے کا وقت آ گیا۔ حِيْنٌ کے معنی مدت کے بھی آتے ہیں۔ اور جب دو وقتوں کا بعد بتانا ہو، یعنی یہ بتانا ہو کہ ایک کام کے بعد دوسرا ہوا، تو اس کے بعد اذ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے حِيْنَتَيْنِ۔ مثلاً أَنْتُمْ حِيْنَتَيْنِ تَنْظُرُونَ (۵۳) یعنی جس وقت جان نکلنے کے لئے حلق تک پہنچتی ہے اس وقت، اس حالت کے بعد، تم اسے دیکھ رہے ہوئے ہو۔

قرآن کریم میں ہے لَا تَحِيْنُ مَنَاصِ (۳۸)۔ یہاں لَا ت کے بعد مبتدا محذوف ہے۔ آیت کے معنی ہیں یہ وقت بھاگ نکلنے کا وقت نہیں ہے۔ حِيْنَتَهُ۔ اس کے لئے وقت مقرر کیا۔

سورہ بقرہ میں ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِيْنٍ (۲) اس کے یہ معنی ہونگے کہ تمہیں زمین پر ٹھہرنا ہے اور اس سے

فائدہ حاصل کرنا ہے ایک وقت تک کے لئے جس کی مدت معین نہیں۔ یہ مدت مختلف افراد اور مختلف اقدام کے لئے مختلف ہوگی۔ جس قسم کے اعمال کسی قوم سے سرزد ہونگے اس کے مطابق اسکی مدت حیات کا تعین ہو جائیگا۔ باقی رہا نوع انسان کا اس ارض پر قیام، سو اس کی مدت کے متعلق علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آلْحَيٰثِیْنُ - ہلاکت اور موت کو بھی کہتے ہیں۔ اَحَیَّاتُہُ اللّٰہ - خدا نے اسے ہلاک کر دیا۔ آلْحَیٰثِیْنُ - احمق کو کہتے ہیں اور آلْحَیٰثِیۃُ شَرَابِ کو\*۔

## ح ی ی

حَیِّی (حَیِّی) - یَحْیِی (یَحْیِی) - وہ زندہ رہا۔ یا زندہ ہوا۔ حَیَّۃ (حَیَّۃ) زندگی - اَحْیَۃ - اس نے اسے زندہ کیا۔ اَحْیَۃ - زندگی بخشنا۔ قَحْیَۃ سِنَہ - وہ اس سے سمٹا سکڑا۔ (Shrank) - علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زندگی کی ایک علامت سکڑنا ہے۔ آپ کسی جاندار چیز (مثلاً کیڑے وغیرہ) کو چھوڑیے، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سکڑ لے گا۔ سمٹ جائیگا۔ اگر وہ زندہ نہیں تو علیٰ حالہ رہیگا۔ اس کا یہ سمٹنا درحقیقت اس کے جذبہ تحفظ خویش (Preservation of Self) کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی سے عربوں نے اس مادہ سے سمٹنے اور سکڑنے کا مفہوم بھی لیا۔ یہیں سے حَیَّۃ (شرم) ہے کیونکہ حیاء کا مظاہرہ بھی سمٹنے سے ہوتا ہے۔ سانپ کو بھی حَیَّۃ اس کے سکڑنے اور سمٹنے کی وجہ سے کہتے ہیں\*۔

راغب نے حَیَّۃ کے معنی قوتِ حاسہ (Faculty of sensation) لئے ہیں۔ مَوْتِ اس کی نقیض ہے۔ (دیکھئے عنوان م - و - ت) راغب کے نزدیک حَیَّۃ کا استعمال مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) بڑھنے کی قوت (قوت نامیہ) جو نباتات اور حیوانات میں ہوتی ہے۔ (۲) قوتِ احساس (۳) قوتِ عقل و عمل (۴) رنج و غم سے آزادی (۵) حیاتِ اخروی وابدی جس تک انسان محض اُس حیات سے پہنچ سکتا ہے جو عقل و علم کی حیات ہوتی ہے۔ اور (۶) وہ حیات جس سے صرف خدا کی ذات متصف ہوتی ہے اور جس میں موت نہیں۔ (آلْحَیِّ الْقَیُّوْمُ)\*\*۔

اَحْیَۃ - زندہ کرنا۔ اَسْخِیَۃ - زندہ رکھنا نیز حیا کرنا۔ لَیْکِنْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیِیْ اَنْ یَّمْضُرَّ بِمَثَلٍ (۲۴) میں لا یَسْتَحْیِی کے معنی

ہیں ، اللہ کو اس میں کسی قسم کا بیاک یا رکاوٹ نہیں کہ وہ اس قسم کی مثال دے۔ \*\*۔ لَا حَتٰی عَنَّمْہُ کے معنی ہیں اس سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ \*\*۔ اَلْحَيٰۤاءُ کے معنی سرسبزی اور بارش کے بھی آتے ہیں کیونکہ ان سے زمین کی حیات وابستہ ہوتی ہے۔ حَتٰی عَلٰی یا حَتٰی هَلْ کے معنی ہیں اس کام کے لئے جلدی کرو۔ \*\*۔

حَيٰۤاءُ تَحِيّۃ کے معنی ہیں اس کے لئے خوشگوار زندگی ، درازی عمر کی آرزو کرنا یا دعا دینا۔ \*\*۔ سلام کرنا۔ \*\*\*\* (۸۶) تَحِيّٰتُ کا لفظ درحقیقت حیاتِ جاوید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ \*\*۔ نیز ہر قسم کی سلامتی اور آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے۔ \*\*۔ اَلْحَيٰۤاءُ کے معنی زندگی ہیں۔ جس طرح موت کے مقابلہ میں حیات کا لفظ آتا ہے (۱۴) اسی طرح مَمَات کے مقابلہ میں مَحْيَا آتا ہے۔ (۱۳)۔ اَلْحَيٰۤاءُ بعض اوقات منفعت (نفع بخشی) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ \*۔ اَلْحَيٰۤاءُ الطَّيِّبَةُ۔ رزقِ حلال با جنت کو کہتے ہیں۔ \*\*\*\*۔ حَبِيّ الطَّرِيقُ کے معنی ہیں راستہ ظاہر یا واضح ہو گیا۔ اور طَرِيقُ حَتٰی کے معنی ہیں واضح راستہ۔ \*\*\*\*۔

قرآنِ کریم میں حیاتِ اخروی کے لئے ہے وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيٰۤوَانُ (۲۹)۔ اس آیت میں حَيٰۤاءُ کے بجائے حَيٰوَانُ کا لفظ آیا ہے جسکا وزن فَعْلَانُ ہے۔ یہ فرق بڑا معنی خیز ہے۔ عربی زبان میں فَعْلَانُ کے وزن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شدت ، غلبہ ، ہنگامی طور پر کچھ نمودار ہونا اور حرکت و اضطراب کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ اخروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی نہیں جو اس دنیا میں طبعی قوانین کی رو سے قائم ہے۔ اس میں زندگی اچانک ایک نئی صورت اختیار کرے گی۔ \*\*\*\*۔ اور جمود و سکون کے بجائے حرکتِ پیہم اور سعی مسلسل ہوگی۔ \*\*\*\*۔ (اس فرق کے لئے اَخِيْرَةُ اور قِيٰۤامَةُ کے الفاظ بھی دیکھئے جو، ا۔ خ۔ راورق۔ و۔ م کے عنوانات میں ملینکے۔ نیز رَحْمٰن کا لفظ جو ر۔ ح۔ م کے تحت ملیگا)۔ حَيٰۤوَةُ کے مختلف مفہوم جنکا ذکر اوپر آیا ہے قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں مذکور ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ

\* تاج۔ \*\* راغب بحوالہ تاج۔ \*\*\* لین۔ لین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سانپ کو حیاتِ اس کی درازی عمر کی وجہ سے کہتے ہیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ سانپ صرف کسی حادثہ سے مرنا ہے۔ طبعی موت مرنا ہی نہیں۔ \*\*\*\* محیط۔ \*\*\*\* اس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ اخروی دنیا کی زندگی کے تسلسل میں تو ہوگی لیکن جن طبعی قوانین کے ماتحت اس دنیا میں زندگی کی نمود اور بقا ہوتی ہے ، اخروی حیات ان قوانین کے تابع نہیں ہوگی۔ وہاں اس کے لئے اور قوانین ہونگے۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم ان کی محض طبیعی زندگی (Physi-cal life) کو حیات نہیں قرار دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جو شرفِ انسانیت کو لٹے ہو۔ جس میں انسان قوانین خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے کر اپنی ذات کی نشو و نما کرتا چلا جائے۔ الحیۃ الدنئیۃ سے مراد ہے مفادِ عاجلہ۔ پیش پا افتادہ مفاد۔ فوری عیش و عشرت۔ محض قریبی فائدے۔ یعنی وہ زندگی جس میں مستقبل پر کوئی نگاہ نہ ہو۔ طبعی زندگی جس میں انسان حیوانی سطح (Animal Level) پر دن بسر کرتا ہے۔ نہ اس زندگی میں مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد تسلسلِ حیات پر یقین رکھتا ہے، الحیۃ الدنئیۃ ہے۔ قرآن کریم میں الحیۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کی اہم اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان معانی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ نیز اس حقیقت کو بھی کہ جس طرح ہمارے ہاں (اردو میں۔ اور اسی طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں) زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا (سانس لینا) اور موت سے مراد محض مرجانا (نفس کی آمدوشد کا بند ہو جانا) نہیں بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) بھی یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر (نفسِ مضمون کے اعتبار سے) دیکھنا چاہئے کہ وہاں کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے افراد قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ اور جب کہتے ہیں کہ اس قوم کا شمار زندہ قوموں میں ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے افراد سانس لیتے ہیں۔ مردہ اقوام اور زندہ اقوام کا مفہوم واضح ہے۔ اسی طرح یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے اَوْ مَن كَانَ مَيِّتًا فَتَا حَيِّیْنِهٖ وَ جَعَلْنَاهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ..... (۱۳۳)۔ ”اور کیا وہ جو مردہ ہو۔ پھر اسے ہم زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس سے وہ لوگوں میں چلے۔۔۔۔۔“۔ ظاہر ہے کہ یہاں موت اور حیات سے مراد طبعی موت اور زندگی نہیں بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ موت اور حیات کے معانی کے اس فرق کو ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ حضراتِ انبیاء کرام اقوامِ مردہ کو ایسی زندگی عطا کرنے کے لئے آئے تھے جو انہیں دنیا بھر کی سرقرازاں عطا کر دے۔ (۱۳۴)۔ یہ زندگی اب قرآن کریم کی رو سے مل سکتی ہے لیکن صرف اُسے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو (۱۳۵)۔ اور جو تباہیوں سے بچنا چاہے (۱۳۶)۔

# خ

## خ ب ا

خَبَّأَهُ - يَخْبِئُوهُ - خَبَّأً - چھپانا - پردہ میں رکھنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں - اِمْرَأَةٌ خَبَّأَتْ - خانہ نشین عورت جو گھر سے باہر نہ نکلتی ہو - اَلْخَبِيْثَةُ - بیچ کے وہ دانے جنہیں کسان زمین کے اندر چھپا دیتا ہے - قدرت کے خزانے جو اس نے زمین میں چھپا رکھے ہیں - اَلْغَيْبُ - ذخیرہ کی ہوئی اور چھپائی ہوئی چیز\* -

قرآن کریم میں اَلْغَيْبُ "فِي السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ" (۲۴) آیا ہے - کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کے اندر چھپے ہوئے خزانے - ان کی مستور قوتیں اور مضر صلاحیتیں - ان کے اندر پوشیدہ رزق کے خزانے -

## خ ب ت

اَلْخَبِيْثُ - نشیبی زمین جو وسیع بھی ہو\*\* - وسیع میدان جس میں کچھ آگا ہوا نہ ہو - (ابن فارس) اَخْبَتَ - وہ نشیبی زمین میں پہنچا، اس کے بعد یہ لفظ نرمی خشوع، تواضع اور جھک جانے، اطاعت کرنے نیز مطمئن ہونے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا\*\* -

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے "وَ اَخْبَتُوْا اِلٰی رَبِّهِمْ" (۱۱۱) - "وہ خدا کے (قانون ربوبیت کے) سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، - یعنی فَتَخَبَّيْتُ لَهُ قُلُوْبُ" بَهِمْ (۲۲) - "اس کے سامنے ان کے دل جھک جائیں یا نرم ہو جائیں، - انہی کو دوسری جگہ مَخْبِيْتِيْنِ (۲۲) کہا گیا ہے - دل کی نرمی اور جھکاؤ والے - اس سے پہلے فَتَلَهُ اسْلَمُوْا (۲۲) نے مفہوم واضح کر دیا ہے - قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جانے والے - اسے بطیب خاطر تسلیم کر لینے والے -

## خ ب ث

الْخَبِيثَاتُ - طَبِيبٌ کی ضد ہے اس لئے اسکے مفہوم کیلئے ط - ی - ب کا عنوان دیکھنا ضروری ہے - خَبِثٌ کے معنی گندے، گھناؤنے اور مکروہ کے ہیں خواہ وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ہو یا کلام میں - یا افعال میں - یا عقائد و خیالات میں \* - الْخَبِيثَاتُ - طَبِيبٌ کی ضد ہے ناپسندیدہ، ناگوار، خراب نیز دھوکا دینے والا - الْخَبَائِثُ - مکار آدمی - یا ردی شے \* - خَبِثَتْ الْحَدِيدُ وَالْفِضَّةُ - لوہے اور چاندی وغیرہ کا میل جو انہیں بوٹی میں پگھلانے سے الگ ہو جاتا ہے \* - ملاوٹ - کھوٹ - الْخَبِثُ - زنا کو بھی کہتے ہیں \* -

سورة اعراف میں خَبِثَ - اس زمین کے لئے آیا ہے جو شور ہو اور وہاں کچھ پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو بہت تھوڑا (۵۸) اسی طرح سورة ابراہیم میں کَلِمَةً طَبِيبَةً کے مقابلہ میں کَلِمَةً خَبِيثَةً آیا ہے جسے شَجَرَةٌ خَبِيثَةٌ سے تشبیہ دی گئی ہے (۲۶-۲۷) - اس کے معنی ہیں ایسا درخت جو پھل نہ دے - غلط نظریہ حیات دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا - ساری محنت اکارت جاتی ہے - حالانکہ غلط نظریہ حیات کی چمک دمک بھی بہت ہوتی ہے اور پھیلتا بھی بڑی کثرت سے ہے (۱۰۰) - لیکن اسے ثبات و قرار کبھی نہیں ہو سکتا - اسکی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوتی ہیں (۱۲) -

خَبَائِثُ - خَبِيثَةٌ کی جمع ہے چنانچہ (۱۵۷) میں ہے کہہ رسول طبیات کو حلال قرار دیتا ہے اور خبائث کو حرام - یعنی قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ خبائث ہیں اور جو چیزیں حلال ہیں وہ طبیات ہیں - (تفصیل کے لئے عنوان ح - ر - م اور ح - ل - ل دیکھئے) قرآن کریم میں فحش کاری یا فحش کار لوگوں کے لئے بھی خبیث کا لفظ آیا ہے - مثلاً سورة نور میں ہے الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ ... (۲۴) - یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خبیث باتیں خبیث لوگوں کے شایان شان ہیں - اور یہ بھی کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں - ثانی الذکر مفہوم کی تائید اسی سورة کی دوسری آیت سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً .... (۲۴) زانی مرد صرف زانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے .... (اسکی تشریح "مفہوم القرآن" میں ملیگی)



## خ ب ر

الْخَبَرُ - جمع أَخْبَارٌ ہے (۱۶) خَبَرٌ اور نَبَأٌ میں فرق یہ ہے کہ نَبَأٌ کسی بہت بڑے واقعہ کے متعلق ہوتی ہے اور خَبَرٌ عام واقعات کے متعلق۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ خَبَرٌ عرف اور لغت میں اس بات کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے نقل کی جائے \*۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اس تخصیص کے ساتھ نہیں آیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے سَأْتِيْكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ (۲۴) ”میں اس سے تمہارے پاس خبر لاؤں گا“۔

الْخَبِيرُ - خبر کو جاننے یا رکھنے والا۔ یا خبر دینے والا \*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ وَاللّٰهُ يَمَّا تَعْمَلُوْنَ خَبِيرٌ (۲۱)۔ ”جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“۔ خَبِيرٌ کے معنی بھی کسی چیز کے جاننے کے ہیں \*۔ (۱۸)۔ محیط میں ہے کہ یہ اس واقفیت کو کہینگے جو تجربہ کی بنا پر ہو۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی علم بتائے ہیں۔ اس اعتبار سے خَبَرٌ کے لئے علم اور واقفیت ضروری ہے۔

## خ ب ز

الْخَبْزُ - روٹی \*۔ (۱۲)۔ اصلی معنی اس مادہ میں مارنے اور دفع کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ الْخَبْزُ کے معنی ہوتے ہیں اونٹ کا رمین پر ہاتھ مارنا۔ چونکہ روٹی بھی اس طرح ہاتھ مارنے سے بنتی ہے اس لئے اسے خَبْزُ کہتے ہیں۔ یا اس لئے کہ روٹی سے بھوک مرق اور دفع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق ہر اس چیز پر کر دیا جاتا ہے جسے انسان کھائے یا معیشت کیلئے اختیار کرے \*\*۔ جیسے ہمارے ہاں بھی جب کہا جائے کہ ”اصل سوال تو روٹی کا ہے“ تو اس کے معنی رزق یا معیشت ہی کے ہونے ہیں۔

## خ ب ط

خَبَطَ - کسی چیز کو زور سے مارنا۔ پاؤں کو زور سے مار کر کسی چیز کو روندنا۔ درخت کو لکڑی سے مار کر اس کے پتے جھاڑنا۔ خَبَطَ الثَّقِيلُ - رات

کو سمت معلوم کئے بغیر یوں ہی منہ اٹھا کر چل دینا۔ تَخَبَّطَهُ الشَّيْطَانُ\*۔  
اسے شیطان نے ہاگل بنا دیا\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے تشدد اور ظلم  
کو بھی خَبَطُ کہتے ہیں۔ اور اخْتِبَاطُ الْمَعْرُوفِ کے معنی ہیں کسی  
سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا\*\*۔

سورۃ بقرہ میں سود خوار لوگوں کی حالت کا نقشہ یہ کہہ کر کھینچا گیا ہے کہ  
لَا يَتَّقُونَ إِلَّا كَمَا يَقْتُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِّنَ  
الْمَيْسِ (۲/۲۵)۔ ”یہ لوگ بسوں کھڑے ہوتے ہیں جیسے انہیں ماسپ نے  
ڈس لیا ہو“۔ اسمیں ذہنی جنون اور قلبی اضطراب کی شدت سب کی سب آجاتی  
ہے جو اس شخص کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی جسکے دل میں ہوس زر نے  
آگ لگا رکھی ہو۔ اگر اس آیت میں الشَّيْطَانُ سے مراد انسان کے سرکش  
جذبات لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا وہ شخص جو اپنے جذبات کے ہاتھوں  
ہاگل ہو رہا ہو۔ لیکن اس میں کمزور پہلو یہ ہوگا کہ اس شخص کی محسوس  
حرکات کی تشبیہ غیر محسوس شے سے ہوگی۔

## خ ب ل

الْخَبَلُ\*۔ الْخَبَلُ\*۔ اس کے بنیادی معنی کسی خرابی کے پیدا ہو جانے  
کے ہیں۔ مثلاً انسان کے اعضاء میں کوئی خرابی پیدا ہو جانا۔ فالج گر جانا۔  
جنون ہو جانا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کا جاتے رہنا  
ہیں۔ اسکے بعد اسکے عام معنی ہلاکت یا نقصان کے آئے ہیں۔\* وَجَلَّ\*  
مُخْبَلٌ\*۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ہاتھ پیر (اعضاء) کٹ گئے ہوں\*\*\*۔  
قرآن کریم میں ہے لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَالٌ (۱۱/۳۴)۔ ”تمہارے دشمن، تمہاری  
تغریب، میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھینگے“۔ اس میں ہر قسم کے نقصانات،  
شر، فساد آ جاتے ہیں۔

## خ ب و

خَبَّتِ النَّارُ وَالْحَرُّ\*۔ آگ اور جنگ کی تیزی و تندہی ساند پڑ  
گئی۔ پیر سکون ہو گئی۔ اس کا شعلہ افسردہ ہو گیا\*۔ سورۃ بنی اسرائیل میں  
ہے كَلَّمَآ خَبَّتْ (۱۷/۱۶)۔ ”جب وہ آگ بجھنے لگے گی“۔ اس کے  
بعد زِدْنَهُمْ سَعِيرًا (ہم ان کے لئے اسے اور زیادہ بھڑکا دینگے) نے  
مفہوم واضح کر دیا ہے۔

خَبَاءٌ\* - در اصل اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ نیز بالی میں دانہ کے اوپر کا خول\*\*۔ خاکستر کا پردہ جو شعلہ پر پڑ کر اسے دبا دیتا ہے۔

(خَبٌ\* (۲۷/۵) کے لئے دیکھئے عنوان خ - ب - ا - ابن فارس نے کہا ہے کہ خَبُوٌ اور خَبٌ\* - دونوں کے معنی چھپانے کے آتے ہیں)۔

## خ ت ر

الْخَتَرُ\* - بدترین عہد شکنی - عہد شکنی کرنا اور فریب دینا\*۔ در اصل یہ اس عہد شکنی اور غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان تھک کر چور چور ہو جائے۔ وہ تکان سے کمزور ہو جائے اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں\*\*۔ اس لئے کہ الْخَتَرُ، الْخَدَرُ کے ہم معنی ہے۔ یعنی ایسی غنودگی و بے حسی جو کسی زہر یا دوا کے پینے سے پیدا ہو جائے اور اعضاء میں کمزوری و اضمحلال کا باعث بنے۔ رَجُلٌ مُخْتَرٌ\* - وہ آدمی جس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں - خَتَرَةُ الشَّرَابِ\* - شراب نے اس کے قویٰ کو مضمحل کر دیا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مستی اور فتور کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں خَتَارٌ مَكْفُورٌ (۳۱/۳) آیا ہے۔ اس کے معنی دغا باز، قریب کار کے بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے آدمی کے بھی جو محنت نہ کرنے کی وجہ سے مست ہو چکا ہو۔ یا وہ آدمی جو احکام خداوندی کی بجا آوری میں مستی برتے۔ (یعنی آئیم\* - دیکھئے عنوان ا - ث - م)۔

## خ ت م

خَتَمٌ\* کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپا دینا اور ڈھانک دینا۔ اس طرح بند کر کے محفوظ کر دینا کہ اس کا کوئی حصہ باہر نہ نکل سکے۔ چنانچہ زمین میں ہل چلا کر اور بیج ڈال کر جو پہلی مرتبہ پانی دیتے ہیں اسے اہل عرب خَتَمَ الزَّرْعَ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ پانی دینے کے بعد مٹی جم جاتی ہے اور بیج مٹی کے اندر بند ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ کے خانوں میں شہد جمع کر کے موم کا نہایت باریک سا پردہ خانوں کے منہ پر بنا دیتی ہیں جس سے شہد اپنے بند اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسے بھی عرب خَتَمَ سے تعبیر کرتے ہیں (اس کے بعد خود شہد، اور ان خانوں کے منہ کو بھی خَتَمَ کہنے لگ گئے)\*\*\*۔

خَتَمَ الشَّقِیُّ خَتْمًا - کے معنی کسی چیز کے آخری سرے تک پہنچ جانے کے بھی ہیں\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - خَتَمَ اور طَبَعَ کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز پر لاکھ وغیرہ لگا کر مہر سے اس پر نشان لگا دینا - اور (۲) وہ نقش یا نشان جو اس طرح مہر لگانے سے بن جائے - پھر قدرے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کسی چیز کو بند کرنے اور روک دینے کے لئے بولا جانے لگا - اس لئے کہ مہر لگا کر خط یا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے اندر کی چیز باہر نہیں نکالی جاتی\*\* - خِتَامٌ اس لاکھ یا موم وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو بند کر کے اس پر مہر لگائی جاتی ہے - اور خَاتَمٌ وہ چیز ہے (انگوٹھی وغیرہ) جس سے اس لاکھ پر مہر لگائی جاتی ہے - ہر چیز کا انجام اور آخر خَاتَمٌ کہلاتا ہے - چنانچہ خَاتَمُ السُّوْمِ کے معنی ہیں قوم کا آخری فرد - ایسے ہی ہر پینے کی چیز کا خِتَامٌ اس کا آخری حصہ ہوتا ہے - (ابن فارس) - فراء کا قول ہے کہ خَاتَمٌ اور خِتَامٌ دونوں قریب المعنی ہیں - فُلَانٌ خَتَمَ عَلَیْكَ بَسَابَہُ کے معنی ہیں ”وہ شخص تجھ سے اعراض برتتا ہے اور اپنا دروازہ تجھ پر بند کر لیتا ہے“ -

قرآن کریم میں خَتَمَ اللہُ عَلَی قُلُوبِہِمْ (یا طَبَعَ اللہُ...) متعدد بار آیا ہے (۱) - دلوں پر مہر لگ جانے سے مطلب یہ ہے کہ ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی - چنانچہ سورۃ انعام میں آخِذَ اللہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ نے خَتَمَ عَلَی قُلُوبِکُمْ (پہلو) کی وضاحت کر دی ہے - یعنی علم حاصل کرنے کے دروازے ہی اس پر مسدود ہو جاتے ہیں - یہ حالت ان لوگوں کی ہو جاتی ہے جو اپنے دل کی مرضی سے (برضا و رغبت) غلط روش اختیار کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ مستقبل کی خوشگوار بیوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ہیں (۱۰۸: ۱۰۹) - اسی طرح وہ لوگ ہیں جو صحیح بات کے سننے سے انکار کر دیتے ہیں اور جب ان کے سامنے اسکا ذکر آئے تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں (۱۰۹: ۱۱۰) - جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تمہاری مجالس میں بیٹھتے ہیں - بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری باتیں نہایت غور سے سن رہے ہیں لیکن وہ اس وقت سوچ کچھ اور ہی رہے ہوتے ہیں - یہ صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں - (۱۱۰: ۱۱۱) - اور قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے (۱۱۱: ۱۱۲) - ان لوگوں کے اپنے اعمال خود رنگ بن کر ان کے دلوں

ہر مہر لگا دیتے ہیں (۸۳/۱۴) \*۔ ان مقاسات سے خَتَمَ اللہ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ مہر نہیں لگاتا۔ ان کے اپنے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق مہر بن جاتے ہیں۔

سورة تطفیف میں ”جنت میں پیسے کی شے، کسور حقیق مَسْخُتُوْمٌ (۸۳/۲۵) کہا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ خِتَامُہُ مِیْسُکٌ (۸۳/۲۶) اس کی مہر (یا وہ ذائقہ جو منہ میں باقی رہ جائے) مشک کا ہوگا۔ اس لئے کہ مِیْسُکٌ اَجُہُ مِیْنٌ تَسْتَنِیْمٌ (۸۳/۲۷)۔ اس میں وہ پانی ملا ہوگا جو بڑی بلندیوں سے آ رہا ہے۔ جس سے زندگی کو بلند ترین منازل تک پہنچنے کی قوت حاصل ہو جائیگی۔

سورة احزاب میں نبی اکرمؐ کو خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ (۳۳/۴۰) کہا گیا ہے۔ خَاتَمُ کے معنی اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی رو سے اس کے معنی آخری نبی ہیں۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد نبوت کو جاری سمجھنا قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔ جب قرآن کریم آخری کتاب ہے تو جس نبی پر قرآن کریم نازل ہوا وہ آخری نبی ہے (نبیؐ کے معنی ن۔ ب۔ ا کے عنوان میں دیکھئے جہاں اس امر کی بھی تصریح کی گئی ہے کہ کوئی نبی بغیر کتاب کے آ نہیں سکتا)۔ لہذا نہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب اور نہ ہی نبی اکرمؐ کے بعد کوئی اور نبی۔ یہ تصور کہ نبی اکرمؐ کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے ہیں، نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ نبوت خدا کی طرف سے ایک وہبی خصوصیت تھی جو بلا کسب و ہنر عطا ہوتی تھی۔ اسے نہ کوئی اپنی محنت سے حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی نبی، اسے دوسرے کو عطا کر سکتا تھا (تفصیل ن۔ ب۔ ا میں ملیگی) لہذا نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ یکسر باطل ہے۔

لیکن ”دھوائے نبوت“ کی ایک اور شکل بھی ہے جو بڑی دقیق فلہذا بڑی غور طلب ہے۔ ”نبوت“ سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرے۔ یعنی اس علم میں اس کی اپنی عقل و خرد کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ علم اسے خدا سے براہ راست ملے۔ ہمارے ہاں (تصوف میں) یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ ”اولیاء اللہ“، یا صوفیائے کرام، خدا سے براہ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے۔ بادنسے تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائیگی کہ یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ کشف و الہام اور وحی میں، حقیقت کے اعتبار سے، کوئی فرق نہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ بجائے خویش باب نبوت کو کھول دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے

صحیح بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو علم براہ راست دینا تھا وہ آخری نبیؐ کو دیدیا۔ یہ علم اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ کشف و الہام، انسان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر ہوتے ہیں، خدا کی طرف سے کشف حقائق نہیں ہوتا۔

## خ د د

الْخَدُّ (۳۱/۱۸) رخسار۔ زین میں کھودا ہوا مستطیل گڑھا۔  
اَلَا خَدُّوْ دُ۔ کھائی یا خندق \*۔

قرآن کریم میں ہے قَتِيلَ اَصْحَابِ اَلَا خَدُّوْ دُ (۸۵)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ذونواس، شاہِ یمن نے اہل نجران (عیسائیوں) کو مجبور کیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ دیں۔ وہ جب اس پر آمادہ نہ ہوئے تو اُس نے خندق کھدوا کر اس میں آگ جلائی اور انہیں اس میں ڈلوا کر جلا دیا \*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے خدا پرست یہودیوں کو اسی طرح آگ میں جلایا تھا \* لیکن قرآن کریم کے سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام مخالفین اسلام ہیں جو رسول اللہؐ سے ہر پیکار تھے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ قرآن کریم نے انہی کی تباہی کی خبر دی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحابِ اَلَا خَدُّوْ دُ اور تَبَع)۔

## خ د ع

خَدُّ ع کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا \*۔ ابن قاس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھپانے اور مخفی رکھنے کے ہیں۔ اصل میں خَدُّوْ ع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو کبھی قو بہت سا دودھ دیدے اور کبھی بالکل چڑھا جائے۔ (کچھ نہ دے)۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار انکی مہمان نوازی پر تھا۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے۔ ان کے جانوروں کا دودھ (یا گوشت) ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان آجائیں۔ وہ ان کے لئے اونٹنی کا دودھ دوہنے کیلئے جائیں اور اونٹنی دودھ چڑھا جائے۔ تو اس وقت میزبان کی حالت کیا ہوگی؟ اس قسم کی اونٹنی جسپر

بھروسہ ہی نہ کیا جا سکے خَدَّوْ ع \* کہلاتی ہے۔ اس سے خَدَّ ع کا مفہوم اچھی طرح ذہن میں آسکتا ہے۔ چنانچہ خَدَّ ع \* سراب کو کہتے ہیں \*۔ نیز غول بیابانی کو۔ اور اس راستے کو بھی جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ہو \*۔ نیز کسی بڑے کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لیتے تھے جس میں گھر کی قیمتی چیزیں بغرض حفاظت رکھتے تھے۔ اسے بھی خَدَّ ع \* کہتے تھے \*۔ لطائف اللغة میں ہے کہ الْخَدَّ ع \* اور الْخَدَّوْ ع \* اُس راستے کو کہتے ہیں جو کبھی نکھر کر سامنے آجائے اور کبھی گم ہو جائے۔ لہذا خَدَّ ع \* زندگی کی وہ روش ہے جس میں بظاہر تو کچھ بتایا جائے اور بیاطن کچھ اور۔ یا جس میں توقع کے مطابق امکان تو زیادہ کا عو اور نکلے کم۔ یا جو ایک حالت پر نہ رہے۔ یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ چنانچہ خَدَّ ع \* الْكَرَرِمْ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی سخی آدمی خلاف توقع بخل کا برتاؤ کرنے لگ جائے۔ خَدَّ ع \* السَّطَرُ اسوقت کہتے ہیں جب بارش خلاف توقع بہت کم ہو۔ سَوَقُ خَدَّ ع \* اس بازار کو کہتے ہیں جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ اور خَدَّ ع \* الْاَسْوَرُ اسوقت کہتے ہیں جب حالات دگرگوں ہوتے چلے جائیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ \*۔ خَدَّ ع \* کے معنی کم ہو جانے کے بھی آتے ہیں \*۔ اَلتَّسْنُونُ الْخَوَادِعُ \* ان سالوں کو کہتے ہیں جن میں کبھی فراوانی ہو اور کبھی قحط۔ یا جن میں بارش تو بہت ہو لیکن پیداوار کم ہو \* دَيْنَارُ خَدَّ ع \* اُس دینار کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں کھرا معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو۔ (ابن فارس)۔ اسذا خَدَّ ع \* سے مراد یا تو وہ جذباتی شخص ہے جو معاملات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں محض جذبات کی رو سے کرتا ہے۔ ذرا جذبات ابھر آئے تو بڑے بڑے وعدے اور دعوے کر دے۔ ذرا ان میں کمی اور افسردگی آگئی تو سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ یا ایسا مفاد پرست جو اپنی مصلحت کی خاطر، اپنے آپ کو ایسا بنا کر دکھائے جیسا (یا جتنا) وہ درحقیقت نہیں اور اس طرح معاشرہ کو دھوکے میں رکھے۔ معاشرہ کے استحکام کیلئے ایسے لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا وجود معاشرہ کے لئے سخت نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ صاحب محیط کے الفاظ میں خَدَّ ع \* کے بنیادی معنی اس اخفاء اور پوشیدگی کے ہیں جسکا قبل از وقت اندازہ نہ لگایا جا سکے \*\*\*۔ یہ مفاد پرستانہ ذہنیت کا شیوہ ہوتا ہے، یا سطحی جذبات پرستوں کا۔

قرآن کریم نے اس قسم کی فریب دینے والی ذہنیت کو ”دل کا مرض“ (۱) ”فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ“ (۲) قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا یہ فریب درحقیقت غیر شعوری طور پر خود ان کی اپنی ذات سے فریب ہوتا ہے۔ (وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ) (۳)۔ چونکہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے ان کی اس روش کا نتیجہ بدہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں اسلئے سورہ نساء میں اسے ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۴)۔ ”منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن (اس کے قانون مکافات سے ہوتا یہ ہے کہ) وہ اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں“۔ یعنی وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ (۵)۔ ”خدا فریبی“ خود فریبی (Self Deception) کا دوسرا نام ہے، لیکن لوگ اسے سمجھتے نہیں۔ مَا يَشْعُرُونَ (۶)۔ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ویسے بھی جو شخص جذبات میں اندھا ہو جائے اس کا شعور بیکار ہو جاتا ہے۔

## خ د ن

الْخِدْنُ۔ ساتھی۔ بات چیت کرنے والا۔ دوست\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ بیشتر یہ اسے ساتھی کے لئے بولا جاتا ہے جو شہوت نفسانہ کی وجہ سے کسی کے ساتھ رہے۔ \* جن الفاظ میں خاء اور دال اکھٹے آئیں ان میں اثر اندازی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ \*\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے کے ہیں۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کیلئے کہا ہے۔ مُخْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مَسْتَخِذَاتٍ أَخْذَ الْفَرْجِ (۱)۔ مُخْصَنَاتٍ اور مُسَافِحَاتٍ کے معانی ح۔ ص۔ ن اور س۔ ف۔ ح کے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ بالخصوص ح۔ ص۔ ن کے ماتحت۔ وہاں سے معلوم ہو جائیگا کہ سَفْح\* کے معنی ہیں محض شہوت رانی کی غرض سے جنسی اختلاط۔ یہاں اسکے ساتھ اِتَّخَذَ أَخْذَ الْفَرْجِ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسَافِحَةٌ\* کھلی ہوئی بد کاری تھی، جسکے لئے عرب جاہلیہ عورتوں کو پیغام بھیجا کرتے تھے۔ یعنی وہ ان کے معاشرہ کا ہام رواج تھا۔ اور خِدْنُ\*۔ چوری چھپے کی آشنائی کو کہتے تھے۔ منتہا دونوں کا ایک ہی ہے۔ انہیں الگ الگ بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کے



زمانے میں (نکاح کے علاوہ) جنسی اختلاط کی جتنی صورتیں بھی مروج تھیں ان سب کی تردید ہو جائے، اور اس کی ایک ہی شکل باقی رہ جائے۔ یعنی مُحْصِنَاتٌ۔ قلعہ بند اور حصارِ عفت میں محفوظ۔ نیز مُسَافِحَاتٌ سے مطلب ہے محض شہوت رانی کی خاطر۔ اس میں زنا کاری بھی آجاتی ہے اور وقتی طور پر یا ویسے ہی نکاح کی رسم پوری کر لینے کے بعد، نکاح کی ذمہ داریوں کو (Avoid) کمرے ہوئے جنسی تعلقات بھی۔ اور مُتَّخِذَاتٌ أَخْدَانٍ کے معنی صرف زنا کاری ہونگے۔ اگرچہ قرآنِ کریم نے یہ الفاظ لونڈیوں کے ضمن میں کہے ہیں (جو اُس زمانے میں عربوں کے ہاں ہوتی تھیں۔ دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک میں مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ) لیکن اس کا اطلاق عام ہے کیونکہ قرآنِ کریم کی رو سے زنا کی بہر حال ممانعت ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔

بالفاظ دیگر، سَفَحٌ، جنسی جذبات کی تسکین کی (قرآنی نکاح کے علاوہ) ایسی شکل ہوگی جو کسی معاشرہ میں معیوب نہ سمجھی جائے اور خِیْدٌ ن وہ شکل جسے وہ معاشرہ معیوب سمجھے۔ قرآنِ کریم کی رو سے جنسی جذبات کی تسکین کی ہر وہ شکل ناجائز ہوگی جو قرآنِ کریم کی رو سے نکاح اور اس کے مقصد کے خلاف ہو، خواہ کوئی معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ سمجھے۔ جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائش نسل ہے۔

## خ ذ ل

خَذَلْتَ الظُّبْيَةَ۔ ہرنی اپنے گلہ سے پیچھے تنہا رہ گئی ایسی ہرنی کو خَذَلٌ اور خَذُولٌ کہتے ہیں۔ زیادہ تر ایسی ہرنی (پا گئے) اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہے\*۔ تَخَذَلْتُ رَجُلًا۔ اس کے پاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اس طرح پیچھے رہ گیا۔ ایسے شخص کو رَجُلٌ خَذَلٌ اور الرَّجُلُ کہتے ہیں\*۔ أَخَذْتُ لَانٌ۔ ایسے شخص کا وقت پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جسکے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا\*\*۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ چھوڑ دینے اور مدد نہ کرنے کے ہیں۔

سورة آل عمران میں ہے اِنْ يَخْذُ لَكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهِ ۚ (۱۵۹) ”اگر وہ تمہیں بے مدد چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا“۔ جس قوم کا ساتھ خدا کا قانون چھوڑ دے (بمقابلہ

يَنْصُرُ (۱۵۹) اور وہ اس طرح باقی قوموں سے پیچھے رہ جائے قرآن کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا، خواہ ایک فرد اپنی جماعت سے پیچھے رہ جائے اور خواہ ایک قوم دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے، زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتا ہے (۱۶۴)۔ اسلام کے معنی ہیں تمام رفقائے سفر کا کامل ہم آہنگی سے ملکر ساتھ ساتھ چلنا۔ (دیکھئے عنوان س۔ ل۔ م میں تَسَالَمَ)۔ اور آئیم کے معنی ہیں اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانا (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م)۔ لیکن اگر کوئی شخص مختلف قسم کی کششوں سے، جن میں اولاد کے مفاد کی کشش سب سے زیادہ ہوتی ہے \*\*\*، جماعت سے پیچھے رہ جائے تو یہ خَذَل ہوگا۔ بہر حال اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ یعنی اپنے انفرادی مفاد اور ذاتی جذبات کی وجہ سے جماعتِ مومنین سے پیچھے رہ جانا۔ یا قرآن کریم کے نظام کو چھوڑ دینے سے اقوامِ عالم کی صف میں پیچھے رہ جانا۔ یہ دونوں خَذَل ہونگے۔

سورة الفرقان میں ہے وَكَانَ الشَّقِيطُ لِيَلْإِنْسَانِ خَذُولًا (۲۵)۔ یعنی انسان کے سرکش جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ انسان کا آخری وقت تک ساتھ دینگے لیکن وہ عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی ایسے جذبات ہمیشہ ہنگامی ہوتے ہیں۔

## خ ر ب

الْخَرَابُ۔ ویرانی۔ آبادی یعنی عُمُرَان کی ضد ہے۔ غیر آباد۔ مونا۔ خَرَب۔ غیر آباد ہو جانا۔ اَخْرَب۔ غیر آباد کر دینا۔ ویران کر دینا۔ اَلْخَرَبَةُ۔ ویرانہ، غیر آباد جگہ۔ اَلْخَرَبَةُ۔ جھلنی۔ عیب۔ دینی خرابی۔ شک و تہمت۔ ابن قارس نے اس سادہ کے اصل معنی کنارہ ٹوٹ کر خراب ہو جانا اور سوراخ ہو جانا بتائے ہیں، جیسے چاقو وغیرہ کی دھار یا کسی چیز کا کنارہ خراب ہو جانے سے دندانے پڑ جاتے ہیں۔ (ابن قارس) اَلْخَرَبَةُ۔ سوراخ کو کہتے ہیں۔ اَلْخَرَبَةُ۔ سوئی کے ناکے کو کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے يَخْرِبُونُ بَيُوتَهُمْ بَيَا يَدِيهِمْ (۵۱)۔ ”وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کرتے ہیں“۔ سورة بقرہ میں مساجد کے متعلق ہے کہ جو شخص ان میں ذکر اللہ کے لئے رکاوٹ کا موجب

\*\*\* یہ اس جہت سے کہا گیا ہے کہ خِذَاذِل اس ہرنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ \* تاج۔ نیز ابن قارس

بتا ہے ، سَعَىٰ فِي خَيْرَ آيِهَاتِ (۱۱۴) ”وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرتا ہے“۔ لہذا مساجد کی ویرانی یہی نہیں کہ ان میں لوگوں کا اجتماع نہ ہو۔ ان کی ویرانی یہ ہے کہ ان میں قوانین خداوندی کا ذکر اذکار اور صفات اللہ کے متعلق بات چیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآمَرُوا بِمُشُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۷۲) اکٹھا آیا ہے۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور باہمی مشورہ ، لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری جگہ ہے مشرکین مساجد کو آباد نہیں کر سکتے (۹۱)۔ اس لئے کہ وہ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔

## خ ر ج

خُرُوج کے معنی ہیں ابھرنا ، نکلنا۔ باہر آنا۔ التَّخْرُجُ۔ خرچ۔ (بمقابلہ آمدنی)۔ خَارِجٌ كُلُّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کے نکلے ہوئے بیرونی اور ظاہری حصہ کو کہتے ہیں۔ التَّخَارُجُ جیسا کہ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ سے عمدگی میں بازی لے جائے اور آگے نکل جائے۔ نیز ہر وہ چیز جو اپنی جنس کی چیزوں سے آگے نکل جائے\*۔ خَرَجَ فُلَانٌ فِي التَّصْنَاعَةِ کے معنی ہیں فلان شخص اپنی کاریگری میں بہت ماہر ہو گیا\*\*۔ نَاقَةُ مُخْتَرَجَةٍ۔ وہ اونٹنی جو اونٹیوں کی صفات سے نکل کر اونٹ کی ہم صفت ہو\*۔ يَتَوَمَّ التَّخْرُوجُ۔ عید اور میلے کے دن کو کہتے ہیں جب لوگ زینت و زیبائش کے ساتھ باہر نکلیں\*۔ خَرَجَتِ الرَّعِيْقَةُ عَلَيَّ الْوَالِي۔ اس وقت کہتے ہیں جب رعیت اپنے امیر سے باغی ہو جائے اور اطاعت چھوڑ دے\*\*۔

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ بارش سے کس طرح زمین مرده از سر نو زندگی حاصل کر لیتی ہے ، کہا كَذَٰلِكَ التَّخْرُوجُ (۵۱)۔ اسی طرح ”خروج“ ہوگا۔ یہاں خُرُوج کے معنی حیاتِ نو کے ہیں۔ اسی کو ذرا آگے چل کر يَتَوَمَّ التَّخْرُوجُ (۵۲) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں قیامت۔ ساعت۔ بعث۔ خروج وغیرہ الفاظ اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب میں حیاتِ نو کا پہلو مضمحل ہوتا ہے۔ یہ حیاتِ نو خواہ کسی قوم کے زوال کے بعد اس کا عروج ہو ، یا پوری انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا ، یا انسان کی موت کے بعد حیاتِ اخروی۔ یہ تمام تصورات ان اصطلاحات میں شامل ہیں اور سیاق و سباق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلان مقام پر کونسا مفہوم مراد لیا جائیگا۔

خَرَجَ اور خَرَجَ کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے (مثلاً ۹۸) ؛ (۲۳)۔ اس کے معنی ہیں وہ رقم جو اپنی دولت میں سے نکال کر دوسرے کو

دیدنی جائے۔ (ہم نے خَرَج کی فقہی اصطلاح سے بحث نہیں کی کیونکہ اس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآن کے-ریم میں نہیں آیا)۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عربوں کے ہاں خَرَج وہ معینہ مقدار ہوتی تھی جو آقا اپنے غلام پر روزانہ یا ماہوار مقرر کر دیتا تھا کہ وہ اس قدر اسے ادا کر دیا کرے۔ اس کے بعد خَرَج کا لفظ اس ٹیکس کے لئے بولا جانے لگا جو زمین پر لگایا جاتا تھا (جو ٹیکس ذمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ یعنی جِزۃ سے خَرَج)۔ کہتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات اسے خَرَج بھی کہہ دیتے تھے)۔ اب ہر اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو گورنمنٹ لوگوں کے اموال سے وصول کرے۔ دراصل شروع میں خَرَج زمین کی پیداوار کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جائیدادوں سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کے لئے بھی یہی لفظ بولا جانے لگا۔

خَارَج - وہ جو نکل پڑے۔ مَخْرَج - نکلنے کی جگہ۔ أَخْرَج - نکالنا۔ پیدا کرنا۔ اخْرَاج - نکال باہر کرنا۔ پیدا کرنا۔ مَخْرَج - وہ جو پیدا کرے۔ نکالے۔ مَخْرَج - وہ جو پیدا کیا گیا ہو۔ یا وہ جگہ یا وقت جہاں سے یا جس میں کوئی چیز نکالی گئی ہو (۱/۸)۔ اسْتَخْرَج - نکال لینا۔ سورۃ بقرہ میں اخْرَاج بمقابلہ کِثْمَان آیا ہے (۲/۲)۔ یعنی ظاہر کرنا۔ اسی سورہ میں قصہ آدم کے ضمن میں پہلے آیا ہے فَاتَخَّرَ جَهَنَّمَ۔ اس نے ان دونوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اور اس کے بعد ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوا۔ (۲/۲۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ خَرُوج اور مَبْطُوط الگ الگ ہیں۔ خُرُوج محض نکالنا ہے اور مَبْطُوط میں گراؤٹ بھی شامل ہے۔ یعنی اپنے مقام سے نیچے گر جانا۔ (تفصیل میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

## خ ر د ل

آلْخَرْدَل - رائی۔ خَرْدَلِ التَّلْحَم - اس نے گوشت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے۔ قرآن کریم میں ہے مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ (۲۱/۲)۔ ”رائی کے ایک دانے کے برابر“۔

## خ ر ر

الْخَرِيرُ - ہانی یا ہوا کے چلنے کی سرسراہٹ۔ اڑنے میں عقاب کے پروں کی آواز۔ سونے میں خرائوں کی آواز۔ الْخَرُّ - دراصل یہ بلندی سے بس طرح گرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی گرنے کی آواز بھی سنائی دے

بھر کر گرنے کے لئے استعمال ہونے لگا \*۔ خَقَرُمُوسَى صَعِيقًا (۱۶۳) ”موسیٰ کڑک سے بیہوش ہو کر گر پڑے“۔ یا قَكَآ نَتَمَاتْ خَقَرُمِنْ السَّمَاعِ (۲۲) ”گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے گرا ہو“۔ (یہ مشرک کی حالت بیان کی گئی ہے)۔

سورۃ فرقان میں مومنین کی بہت سی صفات گنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَ عَمِيًّانَا (۲۵) ”جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر گر نہیں پڑتے“، (بلکہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ خَرَّ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہونے ہیں کسی چیز پر قائم رہنا \*\*۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسمی طور پر تو ایسک طرف رہا، جذباتی طور پر، بلا غور و فکر تمسک یا لقرآن بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عمل بالقرآن غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ تمسک بالکتاب سے مقصد کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو خدا اپنی آیات کو بھی بہروں اور اندھوں کی طرح بلا سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے ماننے اور ان پر قائم رہنے کی اجازت نہ دیتا ہو وہ غیر خداوندی باتوں کو بلا غور و فکر تسلیم کر لینے کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہ مومن کی صفت ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جاتا۔ اُسے اس کا حکم ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُوْنًا (۱۶)۔ ”جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یقیناً سماعت۔ بصارت اور قلب، ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت پوچھا جائیگا۔ علم کے لئے سمع، بصر (یعنی حواس) اور قلب (Mind) کی شہادت ضروری ہے۔ اور مومن وہ ہے جو احکام اللہیہ اور قوانین خداوندی کو علی وجہ البصیرت مانتا ہے۔

## خ ر ص

اَلْخَرُّ صُ۔ اندازہ کرنا۔ تخمینہ لگانا۔ یعنی غیر یقینی چیزوں میں محض ظن و گمان سے کچھ کہنا۔ خَرُّ صُ التَّخَلُّلِ۔ کھجور کے درخت پر اندازہ کرنا کہ اسمیں کس قدر پھل ہوگا۔ کَمْ خَيْرُ صُ اَرْضِيكَ۔ تمہاری زمین کی پیداوار اندازاً کتنی ہوگی؟ اس اعتبار سے ہر ظنی و تخمینی بات، بلکہ جھوٹی

بات، کو الْخَرَصُ کہتے ہیں \*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۱۱۷) ”یہ لوگ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں“۔ سورۃ ذاریت میں ہے قَتِيلَ الْخَرَصِ اصْوٰنَ (۵۱) ”محض ظن و قیاس کی اتباع کرنے والے تباہ و برباد ہو جائیں گے“۔ حقائق کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے۔ اسلئے دین کا سارا مدار یقین پر ہے۔ کوئی ظنی اور قیاسی بات دین نہیں بن سکتی۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے (خود قرآن کریم کی داخلی اور تاریخی شہادت اس پر دلالت کرتی ہے)۔ اسلئے یہ یقینی طور پر دین ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا حقیقی معیار۔ راغب نے کہا ہے کہ ظن و تخمین سے کوئی بات کہنا، خواہ وہ حق کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، کذب (جھوٹ) ہے۔ اس اعتبار سے خَرَصَ کے معنی کذب (جھوٹا) ہوتے ہیں۔ \*\* خَرَصَ۔ اس نے جھوٹ بولا \*\*\*۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ظن و تخمین کا اتباع کرنے والے تباہ ہونگے۔ لہذا دین میں ظنیات کا اتباع کرنے والے (قرآن کریم کے دھوے کی رو سے) کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ خود ہماری اپنی حالت اسکی زندہ شہادت ہے۔

## خ ر ط م

اَلْخَرَطُوْمُ \* ناک \* یا ناک کا اگلا حصہ۔ ہاتھی کی سونڈ کو بھی کہتے ہیں \*\*\*۔ ثعلب نے کہا ہے کہ ہام طور پر درندوں کی تھوٹھنی کو خَطْمٌ اور خَرَطُوْمٌ کہتے ہیں۔ خَرَطِيْمٌ الْقَوْمُ۔ قوم کے سردار جو ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں \*۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ”فلان شخص قوم کی ناک ہے“۔ یہ باشرف ہونے سے کنایہ ہے۔ یا کہتے ہیں ”ناک کٹ گئی“۔ یعنی وہ بے عزت ہو گیا۔

قرآن کریم میں ہے سَتَسِيْمُهُ عَلٰی الْخَرَطُوْمِ (۶۹) ”ہم اسکی ناک پر داغ لگائیں گے“۔ مطلب ذلیل کرنے سے ہے کیونکہ چہرہ یا ناک کا داغ کر دینا انتہائی ذلت کی بات ہوتی تھی \*\*۔ اس میں قوہین و ذلت کا ایسا پہلو ہے جو چھپائے نہ چھپے۔

## خ ر ق

اَلْخَرَقُ \* کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بے قاعدہ پہاڑ ڈالنا۔ یہ الخَلْقُ کی ضد ہے جسکے معنی کسی چیز کو اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی

بنانے کے ہیں \*۔ خَرَقَ الثَّوْبَ۔ اسنے بغیر اندازے کے کپڑے کو پھاڑ ڈالا۔ \*\*۔ سورة بنی اسرائیل میں ہے لَنْ تَخْرِقَ اِلَّا رُضًا (۱۶)۔ اس کے معنی پھاڑ ڈالنے یا سوراخ کر دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک (مسافت) قطع کرنے کے ہیں \*\*۔ سورة کہف میں کشتی میں سوراخ کر دینے کے لئے خَرَقَهَا (۱۸) آیا ہے۔ خَرَقَ۔ اس نے جھوٹ بولا۔ خَرَقَ الْكَذِبَ۔ اس نے جھوٹ تراشا۔ اَلتَّخْرِقُ۔ جھوٹ بنانا۔ اَلتَّخْرِيقُ۔ کثرت سے جھوٹ بولنا۔ \*\*۔ سورة انعام میں ہے وَخَرَقُوا آلِهَ بَنِيْنَ (۶۶) وہ خدا کے لئے اولاد کا عقیدہ رکھتے ہیں جو یکسر جھوٹ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ غور و فکر اور قاعدے اور قانون سب کے خلاف ہے۔ اس سے حقیقت کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔

## خ ز ن

اَلْخَزْنُ کے بنیادی معنی کسی چیز کے ذخیرہ کرنے کے ہیں \*\*\*۔ اَلْخِزَانَةُ وَالْخِزْيَنَةُ وَالْمَخْزَنُ وہ جگہ جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جائے \*\*\*۔ اَلْخَزْرِيْنَةُ۔ وہ چیز جس کو حفاظت سے چھپا کر، بچا کر رکھا گیا ہو۔ اسکی جمع خَزَائِنُ ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِيْنِدِيْ خَزَائِنُ اللّٰهِ (۲۵)۔ ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں،“۔ خَزَائِنُ۔ جمع کرنے والا۔ یا محافظ (اسکی جمع خَازِنُوْنَ اور خَزَنَاتُ ہے) قرآن کریم میں ہے وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا (۳۶) ”جنت کے محافظ اُن سے کہیں گے،“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ (خَزْنُ) کے بنیادی معنی بچا کر حفاظت سے رکھنے کے ہیں۔ خَزَائِنُ اللّٰهُ کائنات کی وہ قوتیں اور ذخائر ہیں جو ہنوز انسان کے علم میں نہ آئے ہوں۔

## خ ز ی

خِزْيُ کے معنی ایسی ذلت ہے جس سے شرم آجائے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ذلت اور شرم دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اسکے معنی ہونگے ذلت آمیز رسوائی۔ یا ان ہیوب کو بطور سزا ظاہر کرنا جن کا اظہار باعث شرم ہو \*\*۔

قرآن کریم میں ضابطہ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ خِزْيُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۵) بنایا گیا ہے۔ یعنی اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز رسوائیاں۔ سورة طہ میں نَذِلَّ وَتَخْزِيْ (۲۲) ساتھ ساتھ آئے ہیں

جہاں اسکے معنی شرم و ندامت ہے۔ یعنی خفیف اور شرمسار ہونا۔ سورۃ الحجرات میں یہ لفظ تَقْضَحُونَ (۱۵۶) کے ساتھ آیا ہے۔ فضیحت و رسوائی۔ مَحْزَرِ الْكَافِرِينَ۔ کافروں کو ذلت آمیز رسوائیاں دینے والا (۲)۔ دنیا میں عزت و شرف کی زندگی مومن کا شعار ہے۔ ذلت و رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ لہذا جو قوم دنیا میں ذلیل و رسوا ہو وہ مومنین کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی دور کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی قوم زندگی کی خوشگوار بون سے دور (محروم) کر دی جاتی ہے۔ اور یہ انتہائی ذلت ہے۔

اگر کسی قوم کے متعلق یہ دیکھنا ہو کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے یا نہیں، تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط اور عزت و شرف کی حامل ہے یا اقوام عالم کے مقابلہ میں ذلیل و خوار ہے۔ اگر وہ ذلیل و خوار ہے تو وہ قوانین خداوندی کے مطابق نہیں چل رہی۔ اس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جو قوم ان قوانین کے مطابق تو زندگی بسر کرتی ہے جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں (یعنی تسخیر فطرت کرتی ہے) لیکن اپنی تمدنی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع رکھتی ہے، اسے مفاد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ اقوام مغرب کا شمار انہیں میں ہے۔

(۲) جو قوم تسخیر فطرت بھی کرتی ہے اور اپنی تمدنی زندگی بھی قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق بسر کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی بھی عزت و شرف کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت بھی درخشندہ و تابناک۔ یہ جماعت مومنین کی خصوصیت ہے۔ لیکن

(۳) جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے اور نہ اپنی تمدنی زندگی قرآن کریم کے مطابق رکھتی ہے، اس کی دنیا بھی خراب ہوتی ہے اور آخرت بھی تباہ۔ ہم اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) ”دنیاوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹنا“۔

## خ س ا

الْخَسِيفَةُ۔ ردی اُون کو کہتے ہیں جسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس جہت سے اس مادہ میں حقارت و نفرت کے معنی پیدا ہو گئے



ہو گئے۔ چنانچہ خَسَا الْكَلْبُ کے معنی ہیں اس نے کتے کو دھتکار دیا اور خَسَا الْكَلْبُ - کتا راندہ ہوا (یہ لازم و متعدی ہے) - الْخَسَاسِيُّ - ذلیل - کمینہ - دھتکارا ہوا \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دور کر دینے کے ہیں -

قرآن کریم میں قِرَادَةٌ خَسَاسِيَّةٌ آیا ہے (۲/۱۵)۔ ”ذلیل بندر“ - اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ق - ر - د) خَسَا الْبَصَرُ - نگاہ حیران ہو کر تھک گئی \* - سورة الملک میں ہے يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَسِيسًا (۹۶/۱) ”نگاہ درماندہ ہو کر کاشانہ چشم میں لوٹ آئیگی“ - سورة المومنون میں اهل جهنم کے متعلق ہے اخْسِئُوا فِيْهَا (۲۳/۸) ”اس میں ذلت و خواری کے ساتھ رہو“ - زندگی کی خوشگوارہوں سے محروم اور دور رہو۔

## خ س ر

خَسِيرٌ فُلَانٌ کے معنی ہیں وہ شخص راستہ سے گم ہو گیا \*\* - ہلاک ہو گیا \*\*\* - الْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ کے معنی ہیں کمی کرنا - نقص - خَسَرَ التَّوْزَنَ وَالْكَفِيلَ وَالْخُسْرَ - اس نے ماپ تول میں کمی کی - بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ الْخَسِيرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرے، اور لیتے وقت زیادہ لے \*\* - قرآن کریم میں ہے اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ (۲۶۱/۱) ”ماپ کو پورا کیا کرو اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ سورة تطفیف میں ہے - اِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَاِذَا كَالُوهُمْ أَوْ زَنَوْهُمْ بِخُسْرٍ وَّنَ (۸۳/۳) - ”جب لوگوں سے لیتے ہیں تو ماپ تول پورا کرتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ماپ تول میں کمی کر دیتے ہیں“ - (یہ آیت معاشیات کا بہت بڑا اصول بیان کرتی ہے - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان، ب - ی - ع) سورة الرحمن میں ہے وَاقِيْمُوا التَّوْزَنَ بِالْقَيْسُطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْاِمْيَنَ (۹۵/۴) - ”وزن کو عدل کے ساتھ پورا رکھو اور تول میں کمی نہ کرو“ - نیز معاشرہ کے توازن کو مت بگاڑو۔

صَفْقَةٌ خَسِيرَةٌ کے معنی ہیں غیر نفع بخش سودا جس میں نقصان ہو \*\* - الْخَيْبَةُ سَرَى کے معنی ہیں دھوکہ - قریب - عہد شکنی - کمینگی، خسارہ - خَسِرَهُ تَخْسِيرًا - اسکو ہلاک کر دیا \*\* -

اَلْخَسِيرُ - راستے سے گم ہو جانے والا - ہلاک ہو جانے والا - جو شخص کامیاب نہ ہو سکے\*\* - جو تجارت میں گھائے میں رہے - راغب نے کہا ہے کہ خُسْرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہیں - یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان، صحت و عزت میں کمی دونوں کے لئے خُسْرٌ بولا جاتا ہے\*\*\* - ابن الاعرابی نے الخاسیر کے معنی اس شخص کے کئے ہیں جو عقل و مال دونوں کھو چکا ہو\* -

خُسْرٌ - نقصان - تباہی\* - اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ خُسْرٌ (۱۰۳) - اگر انسان (کو بلا وحی کے تنہا چھوڑ دیا جائے تو) یہ نقصان ہی نقصان میں رہے گا - "اس نقصان میں ہر قسم کا زیان شامل ہے - خَسَارٌ - ہلاکت - نقصان - نقصان اٹھانے والا - اَخْسَرُ - سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والا - تَخْسِيرٌ - نقصان دینا - گھائے میں رکھنا - خیر سے دور کر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نقصان اور کمی کے ہیں -

## خ س ف

خَسَفَ الْمَكَانُ - يَخْسِفُ - خُسُوفًا - وہ جگہ زمین کے اندر دھنس گئی\*\*\*\* - ابن فارس نے اس کے معنی اندر گہرائی میں جا کر چھپ جانا اور دھنس جانا بتائے ہیں - قرآن کریم میں ہے فَخَسَفْنَا بِهِ وَبَدَارِهِ الْاَرْضَ (۲۸) ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا - نیست و نابود کر دیا - خَسَفَ کے ایک بنیادی معنی جاذور کو بلا چارہ اور گھاس کے باندھے رکھنا بھی ہیں - اسی سے اس کے معنی کسی پر جور و ظلم اور زیادتی کرنا ہونگے، پھر یہ لفظ، ذلت، توہین اور جبر کرنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا - اَلْخَسِيفَةُ لاغر - کمزور - بَنَاتِ الْقَوْمِ عَتَقَ الْخَسِيفَ - لوگوں نے بھوکے رات گزار دی - سَامَهُ خَسَفًا اس نے اسے ذلیل و خوار کیا - اَلْخَسِيفَةُ - اندر کو دھنسا ہوا - اَخْسَفَتِ الْعَيْنُ - آنکھ اندھی ہو گئی\*\*\*\* -

قرآن کریم میں يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ (۱۱) تباہی اور بربادی کے معنوں میں آیا ہے (یعنی اللہ انہیں زمین میں دھنسا دیگا - تباہ و برباد کر دیگا - خُسُوفًا - چاند گہن کو کہتے ہیں\*\*\*\* - يَثُرُ سَخْسُوفَةً - وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو\*\*\* - قرآن کریم میں (نبی اکرمؐ کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے سلسلہ میں ہے) خَسَفَتِ الْقَمَرَ (۷۵) -

جس کا مطلب یہ ہے کہ عرب جاہلیت (جن کا نشان قمر تھا) کا زور ٹوٹ جائیگا۔ وہ کمزور اور ماند پڑ جائیں گے۔ ان کی مخالفت اور سرکشی ختم ہو جائیگی۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ لیکن اگر اس کے حقیقی معنی لئے جائیں تو ترجمہ ہوگا ”چاند کو گھن لگ گیا۔ ماند پڑ گیا۔“

## خ ش ب

خَشَبٌ - موٹی لکڑی - جمع خَشَبٌ\* - قرآن کریم نے منافقین کو خَشَبٌ\* مُسْتَدَدٌ\* (۱۳۷) سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ایسی لکڑیاں جو دیوار کے آسرے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ خَشَبَةٌ خَشْبَاءٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اندر سے گھن نے کھا لیا ہو۔\*\* یعنی نہ ان میں عقل و فکر ہے نہ زندگی کی کوئی تازگی۔ نہ دماغ صحیح نہ قلب زندہ۔ نرمے کندہ، نا تراش ہیں۔ چنانچہ خَشَبٌ الشَّيْعَرُ اُسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص بونہی روائی سے شعر کہہ دے اور اسے کاٹ چھانٹ کر خوبصورت نہ بنائے۔ اور فحل خَشِيبٌ - اس نئے اونٹ کو کہتے ہیں جو سدھایا نہ جا سکا ہو۔ جبَّهَةٌ خَشْبَاءٌ - کٹھڑی پیشانی\*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سخت اور کھردرا ہونے کے ہیں۔ اَلْخَشَبُ پتھریلے اور سخت پہاڑ کو کہتے ہیں۔ نیز اس تلوار کو جو تازہ بننے کی وجہ سے ہموار اور چکنی نہ ہو۔

ان معانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کو خَشَبٌ\* کہہ کر کیوں پکارا ہے۔

## خ ش ع

خَشَعٌ کے معنی ہیں نگاہ یا آواز کا پست ہو جانا\* - خَشَعَتْ اَلْاَصْوَاتُ (۲۸) ”آوازیں پست ہو جائیں گی،“ اور خَشِيعَةٌ اَبْصَارُهُمْ (۳۸) ”ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی،“ اس کے بعد ہے تَوَقَّهْمُ ذِلَّةً - (انہیں ذلت آئے گی) - اس سے خَشِيعَةٌ اَبْصَارُهُمْ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ذلت و خواری کی وجہ سے نگاہوں کا جھک جانا۔ خَشَعَتْ اَلْاَرْضُ - زمین خشک ہوئی اور اس پر پانی نہ برسا\* خَشْوَعُ النُّكُوْكَتِبِ کے معنی ہیں ستارہ کا غروب ہونے وقت جھٹک جانا۔ خَشَعَتِ الشَّمْسُ - سورج کو گھن لگ گیا۔ اِخْتَشَعُ - سر جھکا کر نگاہ

نیچی کرنا \*۔ **الْخَشْعَةُ**۔ زمین کے سخت اور سنگلاخ قطعہ کو کہتے ہیں جس میں سبزہ نہ اُگے۔ نیز **الْخَاشِعُ**۔ گرد و غبار سے بھری ہوئی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پڑاؤ نہ کیا جاسکے \*۔ قرآن کریم میں زمینِ مردہ کے لئے **خَاشِعَةً** (۲۱۹) آیا ہے۔ سورۃ غاشیہ میں **نَاعِمَةً** کے مقابلہ میں **خَاشِعَةً** آیا ہے (۸۸/۲)۔ **نَاعِمَةً** کے معنی شگفتہ و شاداب اور تر و تازہ ہیں اس لئے **خَاشِعَةً** کے معنی افسردہ و پژمردہ ہونگے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد **عَامِلَةً** **نَاصِبَةً** (۸۸/۳) کہہ کر اس کی وضاحت کردی۔ یعنی تھکے ماندے۔ بے رونق۔ **خَاشِعِينَ**۔ ان لوگوں کے لئے بھی آیا ہے جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔ قرآن کریم نے اس کے معنی کئے ہیں **الَّذِينَ يَطْمَئِنُّونَ** **آتَهُمْ مُّسْلِقُوا رَبِّهِمْ** **وَأَنشَأَهُمْ لِيَوْمٍ رَّاجِعُونَ** (۲۶)۔ یعنی وہ لوگ جو اس کا گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کا سامنا کرنا ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے بارے میں خدا کے قانونِ مکافات کے سامنے جواب دہ ہیں اس لئے وہ ہر معاملہ میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے **خَشْوَعٌ** سے مقصود۔ قلبِ سلیم سے قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جانا۔ سر تسلیم خم کر دینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ **خَشَعٌ** کے معنی ہیں سر کو جھکا دیا۔

## خ ش ی

**الْخِشْيٰ**۔ خشک پودے کو کہتے ہیں۔ **الْخِشْيَاءُ**۔ خشک پتھر بلی زمین جہاں کچھ پیدا نہ ہو \*۔ عربوں کے نزدیک پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے سبزی کا خشک ہو جانا سخت خطرہ کا موجب ہوتا تھا۔ اس لئے **خَشِيَّةٌ** کا لفظ کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ہو جانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ صاحبِ محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ **خَشِيَّةٌ**۔ **خَوْفٌ** سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اہل عرب کے قول **شَجَرَةٌ خَاشِيَّةٌ** سے ماخوذ ہے، یعنی بالکل خشک درخت جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہے۔ اس کے برعکس **خَوْفٌ** کا لفظ صرف نقصان کے لئے آتا ہے کیونکہ وہ **نَاقَةٌ خَوْفَاءٌ** سے ماخوذ ہے یعنی بیمار اونٹنی جو مر نہیں گئی بلکہ اس کی زندگی کی آس باقی ہے \*۔ نیز **خَشِيَّةٌ** میں احتمال، امید اور توقع کے معنی بھی پائے جاتے ہیں جیسے **خَشِيَّتْ أَنْ يَكُونُ ذَٰلِكَ** **أَهْلٌ لَّكَ**۔ مجھے امید یا توقع تھی کہ یہ تمہارے لئے زیادہ آسان ہوگا۔ اسی طرح اس میں **عِلْمٌ** (جاننے) کے معنی بھی پائے گئے ہیں (۲۴/۹) (**خَوْفٌ**۔

کا لفظ بھی جاننے کے معنوں میں آتا ہے دیکھئے عنوان خ - و - ف)۔ جب اس کے معنی خوف کے ہوں تو اس سے مراد ہوتا ہے اس قسم کا خوف جو کسی کی عظمت سے دل پر طاری ہو جائے\*۔ خَشْيَةً کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کے انجام کا علم ہونے کی وجہ سے اس سے اندیشہ کرنا (۱۸/۱)۔ یا آسے ناپسند کرنا\*۔ خَشْيَتِ السَّيِّئِ سے عام طور پر مراد لی جاتی ہے خدا کا ڈر۔ لیکن اس ڈر کا صحیح مفہوم خشیت کے بنیادی معنوں سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی کوششوں کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ (ہُمْ السُّعْطٰلِحُونَ) (۲/۵)۔ ان کی محنتوں کا بیج ایک شجر طیب بن جاتا ہے جسکی جڑیں زمین میں مستحکم ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں پھیلی ہوتی۔ اور وہ ہر موسم میں مسلسل پھل دیتا رہتا ہے (۱۳/۱)۔ یہ نتیجہ ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس اگر قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کی جائے تو انسان کی کوششوں کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں۔ اور اس کی محنتوں کے پودے خشک ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا احساس کہ اگر ہم قانون خداوندی کے مطابق نہ چلے تو ہماری کھیتی جھلس کر رہ جائیگی، خَشْيَتِ اللّٰہِ (خدا کا ڈر) کہلاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج و عواقب کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احتمال، توقع، اندیشہ، اور علم کا پہلو مضمحل ہوتا ہے، اور ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی۔ یہ ہے اصل مفہوم خَشْيَتِ اللّٰہِ (خدا کے ڈر) کا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے خ - و - ف کا عنوان)۔

سورۃ توبہ میں ہے اَتَخْشَوْنَہُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ (۹/۱۳)۔ تم اس سے تو ڈرتے ہو کہ ان لوگوں کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا حالانکہ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہئے کہ اگر قانون خداوندی کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ”نتائج کا ڈر“۔ یہ ہے خَشْيَتِ کا صحیح مفہوم۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا (۹/۲۶) ”وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو“۔

## خ ص ص

الْخَصَاصُ کے بنیادی معنی ہیں خلل یا شکاف جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جائے۔ نیز چھید اور سوراخ کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ شکاف

سے چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَصَامَة کے معنی تنگی - بد حالی - فقر و فاقہ - ضرورت اور حاجت کے ہو گئے (۵۹) - انگور کی بیل سے پھل توڑ لینے کے بعد کہیں کہیں جو اکڑا چھوٹے پھوٹے باقی رہ جائیں انہیں الْخَصَامَة کہتے ہیں\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں شکستگی اور خلاء (کھلی جگہ) کا مفہوم ہوتا ہے - اس طرح الْخَصَامَة کے معنی ہوئے فقر اور حالت میں شکستگی -

یہ اس کے اولین معنی ہیں - چونکہ جن دو چیزوں کے درمیان شکاف آجائے وہ ایک دوسری سے الگ ہو جاتی ہیں ، اس لئے خُصُوصٌ کے معنی ہیں کسی کو دوسروں سے الگ کر کے اس کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا - لہذا خَاصٌّ عَامٌّ کی ضد ہے - یعنی عمومی کے مقابلہ میں خصوصی آئے گا - خَصَّصَہُ وَ اخْتَصَّصَہُ - اس کو باقیوں سے الگ کر کے اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا - یعنی ایسا برتاؤ جس میں دوسرے لوگ شریک نہ تھے\* - (۲۵) - خَصَّ الشَّيْءُ - کوئی چیز عام نہ ہوئی - خَصَّ الرَّجُلُ خَصَامَةً وہ ضرورت مند اور محتاج ہوا\*\* -

دوسروں سے الگ کر کے ، خصوصی برتاؤ کے سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی یہ آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ (۱۰۵) - ”اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے“ یہاں رحمت کے معنی وحی خداوندی ہیں - مطلب یہ کہ اللہ عام انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب (الگ) کر کے اسے وحی عطا کر دیتا ہے - وحی چونکہ وہی عطیہ ہے جو اکتسابی طور پر نہیں مل سکتی ، اس لئے وحی کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ملتی - بہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُسے ملتی ہے (بلکہ ہوں کہتے ہیں کہ اُسے ملتی تھی - کیونکہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے) جسے خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق دینا چاہے -

## خ ص ف

الْخَصْفُ - وہ جوتا جس میں اوپر تلے برابر کے چمڑے ہوں - اسکا ہر چمڑا خَصْفَتَہُ کہلاتا ہے - خَصَفَ النَّعْلَ يَخْصِفُہَا - جوئے پر دو برابر کے چمڑوں کو اوپر تلے رکھ کر سی دیا - خَصَفَ کے معنی ملانے اور جمع کرنے نیز جوڑنے ، پیوند لگانے اور گانٹھنے کے بھی آتے ہیں - خَصَفَ الْعَرَبُ يَانَ الْوَرَقَ عَالِيًا بَدَنِيًا - ننگے آدمی نے اپنے بدن پر پتوں کو چپکا لیا

لیا اور انہیں تو برتو رکھ لیا تاکہ مٹر ڈھانپا جا سکے \*۔ قرآن کریم میں قصہ آدم کے ضمن میں ہے وَطَفِقَا يَخْصِمَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ رَقِ الْجَنَّةِ (۲۴)۔ ”وہ باغ کے پتوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے“۔ جنسی شعور کی بیداری، یعنی حیا کے احساس سے مراد ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

الْخَصِصِيفُ کے معنی ہوتے ہیں جو چیز اپنے پاس نہ ہو اسکے لئے بہ تکلف کوشش کرنا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا۔

## خ ص م

الْخُصُومَةُ۔ جھگڑا۔ الْخَصْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ (یہ واحد۔ جمع۔ تشبیہ۔ سب کیلئے آتا ہے)۔ الْخَصِيمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ الْخَصْمُ۔ ہر چیز کا کنارہ، گوشہ۔ الْخُصُومُ۔ وادیوں کے دھانے \*۔

قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ الْخِصَامُ (۲۴) ”سخت جھگڑالو“۔ سورۃ حج میں ہے هٰذَا اِنْ خَصِمْنَا (۲۹)۔ ”یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں“۔

سورۃ نحل میں انسان کے متعلق ہے حُوْا خَصِيْمًا مُّشِيْمًا (۱۱)۔ یعنی اگر اسے وحی کی روشنی کے بغیر علیٰ حالہ رہنے دیا جائے تو یہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا نظر آئیگا۔ (نیز دیکھئے عنوان ج۔ د۔ ل)۔ سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَّ بُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِيْمُوْنَ (۵۸-۵۹)۔ ”یہ لوگ (ان باتوں کو) تجھ سے صرف جھگڑنے کی خاطر بیان کرتے ہیں۔ یہ ہیں ہی جھگڑالو“۔ سورۃ آل عمران میں (عیکل کے ہجاریوں کے ضمن میں) ہے وَمَا كُنْتُمْ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (۳۳) ”تو ان کے پاس نہیں تھا جب وہ آپس میں جھگڑتے تھے“۔

## خ ض د

خَضَدٌ۔ کسی گیلی یا سوکھی چیز کو موڑنا یا اس طرح توڑنا کہ وہ ٹوٹ تو جائے لیکن الگ نہ ہو۔ کبھی یہ کانٹے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خَضَدَ الشَّجَرُ۔ اسنے درخت کے کانٹے توڑ ڈالے (اور اس طرح

اس میں جو ایذا رساں عنصر تھا اسے ختم کر دیا۔ اِنْخَضَّتِ  
الْثَّمَارُ۔ پھل پچک گئے اور رس نکل جانے سے ان کی سرو تازگی ختم ہو  
گئی۔ رَجُلٌ مَخْضُوْدٌ\*۔ وہ آدمی جس کے پاس کوئی حجت نہ رہے یا جو  
چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے\*۔ اِخْتَضَدَ الْبَعِيْرُ۔ اس نے قابو ہانے  
کے لئے اونٹ کے نکیل ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا\*\*۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے رَفِیْ سِدْرٍ مَخْضُوْدٍ  
(۵۶/۲۸) ایسی پیریاں جن کی شاخیں پھل کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہوں۔ یا ایسی  
لذتیں جن سے ہر قسم کی خلش اور کانٹا نکال دیا گیا ہو۔ اور اگر اسے استعارۃً  
لیا جائے (دیکھئے عنوان س۔ د۔ ر) تو اسکا مطلب ہوگا، حیرت کی فراوانی  
لیکن اُس میں شکوک و اضطراب کی کوئی خلش نہ ہو (۵۳/۱۳)۔

## خ ض ر

الْخَضِرَةُ۔ سبز رنگ۔ جمع خَضِرٌ اور خَضِرٌ۔ قرآن کریم میں ثِيَابٌ  
سُنْدُسٍ خَضِرٍ (۴۱/۴۱) آیا ہے۔ یعنی سبز رنگ کے ریشمی کپڑے۔ یہاں  
خَضِرٌ، اَخْضَرٌ کی جمع ہے۔ اَلْخَضِيرُ۔ سبزہ (۱۱/۱۱)۔ سبز کھیتی۔ اَلْخَضِرُ۔  
ترم و نازک اور سبز ہونا۔ اَلْخَضِرَاءُ۔ بھلائی۔ فراخی۔ نعمت۔ سرسبزی و  
شادابی\*۔ چونکہ سبز رنگ زیادہ گہرا ہو کر مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے  
اسلئے عربوں کے ہاں اَسْوَدٌ کو اَخْضَرٌ اور اَخْضَرٌ کو اَسْوَدٌ بھی  
بولتے ہیں\*\*\*۔ بلکہ ابن فارس نے تو کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جو رنگ  
سفید رنگ سے مختلف ہو اس میں سیاہ رنگ کا شائبہ ہوتا ہے۔ مَخْضَرَةٌ\*  
(۲۲/۱۳) جو سبز ہو۔

الْخَضِرُ۔ اَلْخَضِيرُ۔ ”آبِ حیات والے خواجہ خضر، جن کے  
متعلق مشہور ہے کہ وہ پانیوں کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔  
لیکن یہ محض ”شاعری“ ہے۔ قرآن کریم میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔

## خ ض ع

الْخَضْوَعُ۔ جھکتے کے معنوں میں آتا ہے۔ خَضَعَ النُّجُومُ۔  
ستارہ غروب ہونے کی طرف مائل ہو گیا۔ اَلَا خَضَعَ۔ وہ شخص جس کی  
گردن میں پیدائشی طور پر ہستی اور جھکاؤ ہو۔ جو بے دست و پا ہو چکا ہو۔



خَضَعَهُ الْكِبَرُ - بڑھاپے نے اسے جھکا دیا - الْخَضِيعَةُ - سیلاب کی (نرم نرم) آواز - اخضع الرجل - آدمی نے گفتگو میں لوچ پیدا کی - الْخَضِيعَةُ - وہ آدمی جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری کرتا ہو - خضع - وہ ساکن اور مطیع ہو گیا -

قرآن کریم میں أمہات المؤمنینؓ (نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات) سے کہا گیا ہے فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (۳۴) ”اپنی گفتگو میں نرمی اور لوچ نہ پیدا کرو“ - تمکنت اور وقار سے باتیں کرو - گردنیں جھک جائے، یعنی مطیع و فرمانبردار ہوجانے کے لئے خاضع کا لفظ (۲۶) میں آیا ہے - أَعْنَأْتُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ - ”ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں“ -

## خ ط ا

الْخَطَاءُ - الْخَطَا - غلط - نادرست - اس کے معنی نشانہ خطا (Miss) کر جانا ہیں - کہتے ہیں کہ الْخَطَا اس قصور کو کہتے ہیں جو عمداً نہ کیا جائے اور الْخَطِيئَةُ وہ قصور ہے جو عمداً سرزد ہو - لیکن صاحب محیط کے نزدیک الْخَطِيئَةُ - بلا ارادہ اور بلا عمد بھی ہو سکتا ہے - لیکن ائٹم ہمیشہ عمداً ہوتا ہے - خَطِيئَةُ کی جمع خَطَايَا اور خَطِيئَاتُ ہے - دراصل اس سے مراد ایسا کام ہے جو اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب نہ کرے - چنانچہ عَلَيَّ النَّخْلِ خَطِيئَةُ مِثْنِ رُطَبٍ - کے معنی ہیں کھجور کے درخت پر تھوڑی سی رطب (کھجوریں) ہیں - قرآن کریم میں ہے بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ (۲۱) - جو ناہمواریوں کے کام کرتا ہے اور (اس طرح) اسکی خطائیں اسے گھیر لیتی ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَيِّئَاتُ کا نتیجہ خطاؤں میں گہر جانا ہوتا ہے - یعنی اس کے بعد انسان اپنے نشانے خطا کرتا جاتا ہے - اسے کوئی بات صحیح طور پر سوجھتی نہیں - اس کی کھجوریں پورا پھل نہیں لاتیں - لیکن اگر اس آیت میں واو کو تفسیری مانا جائے تو كَسَبَ سَيِّئَةً کے معنی ہونگے أَحَاطَتْ بِهِ، خَطِيئَتُهُ - آیت (۲۹) میں نسیان اور خطا کو الگ بیان کیا گیا ہے - لَا تَوَاخِذْنَا وَلَا نَنسِيْنَا أَوْ أَخْطَاْنَا - ”اگر ہم سے بھول یا خطا ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا“ - لیکن (۳۳) میں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَاْنَا ثُمَّ يَذْكُرُ لَكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ - ”تم پر اس بارے میں گناہ نہیں جو تم سے

خطا ہو جائے۔ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل کے ارادے سے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ خَطَاٌ اس غلطی کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جائے اور اس میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ اسی قسم کی بلا عمد خطائیں (سہو) تھیں جن کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ خدا انہیں ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھیگا۔ وَ الَّذِي اٰطَمَعَ اَنْ يَغْفِرَ لِيْ خَطِيئَتِيْ يَوْمَ الدِّرِیْنِ (۲۶/۸۴) ”وہ ذات جس سے مجھے توقع ہے کہ وہ ظہور نتائج کے وقت میری خطاؤں کے اثرات سے مجھے محفوظ رکھیگا۔“

سورة الحاقّة میں خَطِیْثُوْنَ کا لفظ اہل جہنم کے لئے آیا ہے (۱۱/۱۳) اور خَطِیْثَةٌ کا لفظ ظلم و سرکشی کے لئے بھی (۱۱/۱۴)۔ سورة علق میں ہے نَاصِیۡتَہٗ کَاذِبَۃٌ خَطِیْثَہٗ (۱۱/۱۴)۔ ”جھوٹی، خطا کار پیشانی“۔ ان مقامات میں خَطَاٌ کے معنی جرم ہیں جس میں قصد و ارادہ شامل ہے۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں قتلِ اولاد کے سلسلہ میں ہے اِنَّ قَتَلْتَهُمْ کَانَ خِیْطًا کَبِیْرًا (۱۷/۳۴)۔ ”ان کا قتل یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے۔“

تعبیرِ حات بالاً سے ظاہر ہے کہ خَطَاٌ اس غلطی کے لئے بھی آتا ہے جو سہواً ہو، اور اس کے لئے بھی جو بالارادہ ہو۔ جو بالارادہ ہو، وہ جرم ہوگی اور قابلِ مؤاخذہ۔ بعض اہل لغت نے خَطِیٌ کے معنی عمداً غلطی کرنا اور اَخْطَاٌ کے بغیر قصد غلطی کرنا بتائے ہیں۔

## خ ط ب

اَلْخَطْبُ ”بات، مسئلہ، حالت، معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ جَلّٰی اَلْخَطْبُ ”بات بڑی ہو گئی۔ معاملہ بڑا ہو گیا\*۔ سورة یوسف میں ہے قَالَ مَا خَطْبُکُمْۙ (۱۲/۱) ”بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا معاملہ کیا تھا“۔ سورة حجر میں ہے قَالَ مَا خَطْبُکُمْۙ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۳۶/۱) ”اس نے کہا کہ اے پیغامبرو! تمہارا معاملہ کیا ہے“۔ اس میں معاملہ کے اہم ہونے کا تصور ضرور ہوتا ہے۔ خَطَبُ الْمَرْأَةِ ”خَطْبًا“ و ”خِطْبَةً“۔ عورت کو نکاح کا پیغام دیا\*۔ خِطْبَةُ (۲۴/۲۵) نکاح کا پیغام۔ خِطْبَةُ ”منکیر عورت\*۔“

اَلْخِطَابُ ”ابک دوسرے سے بات چیت کرنا نیز جن الفاظ سے کسی کو مخاطب کیا جائے وہ خطاب کہلاتے ہیں\*\*۔ فَصَّلْ اَلْخِطَابَ۔ دو ٹوک بات یا معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دینا (دیکھئے عنوان ف۔ ص۔ ل)۔ خَاۡتِبَہٗ۔“

اس سے بات کی\*۔ اِذَا خَاطَبْتَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (۲۵)۔  
جب ان سے نساواقف اور جاہل لوگ (بھی) ہمکلام ہوتے (یا معاملہ کرتے)  
ہیں تو وہ ”سلام“ کہتے ہیں یعنی ایسی بات کہتے ہیں جس سے وہ غلطی سے  
محفوظ اور سلامت رہیں۔ خَاطَبَ میں بات کرنا یا معاملہ کرنا۔ دونوں مفہوم  
ہوسکتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں (۱) دو  
آدمیوں کے درمیان باتیں ہونا۔ اور (۲) دو مختلف رنگوں کا ہونا۔

## خ ط ط

الْخَطَّ۔ کسی چیز میں لمبی دھاری یا لکیر۔ نرم زمین میں خفیف اور  
پتلا سا راستہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اس نشان کے  
ہیں جو لمبا ہو۔ نیز ہر راستہ۔ الْخِطَّ۔ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ہوئی  
ہو لیکن اس میں نہ ہوئی ہو۔ وہ زمین جہاں تمہارے اترنے سے پہلے کوئی  
نہ اترا ہو۔ الْخِطَّةُ۔ زمین کا وہ حصہ جسے آدمی نشان لگا کر اپنے لئے  
برائے تعمیر مخصوص کر لے۔ خَطَّ۔ يَخْطُ۔ خَطَّطًا۔ لکھنا، کتابت کرنا۔  
كِتَابٌ مَخْطُوطٌ۔ لکھی ہوئی کتاب\*۔

سورة عنكبوت میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ  
قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطُّهُ بِيَمِينِكَ... (۲۹)۔ ”تو اس سے پہلے  
نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھ  
سکتا تھا“ اس میں ”اس (قرآن کریم) سے پہلے“ کی تخصیص صاف بتا  
رہی ہے کہ نزول قرآن کریم سے پہلے تو حضورؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے  
تھے لیکن اس کے بعد یہ صورت نہیں رہی تھی۔ پھر آپؐ نے لکھنا پڑھنا  
سیکھ لیا تھا۔ اس لئے یہ عقیدہ کہ حضورؐ ساری عمر اُمّی (آن پڑھ) رہے  
قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔

## خ ط ف

خَطَفْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا۔ خَاطِفٌ  
ظَلِيلٌ۔ ایک پرندے کا نام ہے جو پانی میں اپنے سایہ کو دیکھ کر اُسے  
پکڑنے کے لئے جھپٹتا ہے\*\*۔ خَطَفَاتٌ۔ ایک سیاہ پرند جو پرواز کرنے میں  
جھپٹتا ہے\*\*۔ الْخَاطِفُ۔ اس تیر کو کہتے ہیں جو زمین پر لگ کر گھسٹتے

ہوئے نشانہ پر جا لگے۔ گویا وہ کوئی چیز زمین سے اچک رہا ہو اسی سے آج کل  
الْخَطِیْفَةُ۔ اس لڑکی کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص بھگا کر لے جائے۔\*\*\*

قرآن کریم میں ہے یٰکَادُ الْبَرَقُ یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ (۲/۲۴)۔  
”قرب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی نگاہوں کو اچک کر لے جائے“۔ سورۃ حج  
میں ہے فَتَخْطِفُهُ الْغَیْمُ (۲۴/۲۴)۔ ”اُسے پرندے اچک کر لے گئے“۔  
دوسرے مقام پر ہے اِنَّا مِّنْ خَطِیْفَتِ الْخَطِیْفَةِ (۳۹/۳۹)۔ ”بجز اس کے کہ  
کوئی (یونہی ذرا سی) بات اچک کر لے جائے“۔ سورۃ عنکبوت میں ہے  
جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِیْهِمْ (۲۹/۲۹)۔ ”ہم  
نے حرم کو امن کی جگہ بنا دیا اور (حالانکہ) ان کے گرد و نواح سے لوگ اچک  
لئے جاتے ہیں“۔

خَطِیْفَتِ الْخَطِیْفَةِ (۳۹/۳۹)۔ اور اسْتَرْقَ السَّمْعَ (۱۸/۱۸)۔ ”یونہی  
اچٹی ہوئی بات لے اڑنا اور چوری چھپے کچھ سن لینا“۔ (دیکھئے عنوان  
س۔ ر۔ ق) یہ ان کاہنوں (نجومیوں) کے متعلق ہے جو علم غیب کی باتیں  
معلوم کرنے کے دعوے کرتے تھے۔ (اور اب بھی کئی جگہ کرتے ہیں جہاں  
ہنوز علم کی روشنی نہیں پہنچی)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ محض اڑکیں  
دور اڑتے رہتے ہیں۔ کوئی بات یونہی ٹھیک نکل آئی تو اسے اچھالتے پھرے۔  
جو غلط ثابت ہو گئی، اس کی تاویل کر لی۔ ورنہ غیب کے علم پر ان کی قطعاً  
دسترس نہیں۔ لَا یَسْتَعْمِلُونَ (۳۸/۳۸)۔ لَنْ یَسْمَعُوا عَنْ السَّمْعِ لَمْ یَعْمَلُوا  
(۲۶/۲۶)۔ نزول قرآن کریم کے بعد علم و بصیرت کا دور آ گیا۔ اب تو ہم  
پرستیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب ایسے عقائد کو علم کی بارگاہ سے آتشیں  
کوڑے پڑتے ہیں۔ (مزید تفصیل متعلقہ عنوانات میں ملیگی)

## خ ط و

الْخَطْوَةُ (وَ الْخَطْوَةُ) جمع خُطًا وَ خُطُوَاتٌ۔ وہ فاصلہ جو  
دو قدموں کے درمیان ہو۔ پھر اس کا استعمال قدم کے لئے بھی ہونے لگا۔ یا  
راستے کے لئے۔ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ (۱۶۸/۱۶۸) ”مرکش قوتوں کے یا مفاد  
پرستی کے جذبات کے راستے“۔ خُطَا الرَّجُلِ یَخْطُوُ اس آدمی نے چلنے  
کے لئے قدم بڑھایا۔ تَخَطَّیْتُہُ۔ میں اسے پھاند کر اس سے آگے بڑھ گیا\*۔  
ابن فارس نے کہا ہے کہ خُطُوُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے آگے  
بڑھ جانا۔ اور چلے جانا۔

## خ ف ت

خَفَّتِ الصَّوْتُ - بھوک کی شدت سے آواز میں ہستی آ جانا یا آواز کا نہ نکلنا، خَفَّتِ قَلَانٌ - فلاں آدمی مر گیا کیونکہ اس کی آواز منقطع ہو گئی اور وہ خاموش اور ساکت ہو گیا۔ اَلْخَفْتُ - چھپا کر بات کرنا۔ پوشیدہ گفتگو کرنا، \* - (جَہْرٌ کی ضد ہے) دیکھئے (۱۶۰) - سورہ اطلہ میں ہے بَتَّخَفَتُونِ بَيْنَهُمْ (۲۰۳) - ”باہم چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں“، - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پوشیدہ رکھنے اور چھپانے کے ہوتے ہیں۔

## خ ف ض

اَلْخَفُضُ - رَفْعٌ (بلند کرنا) کی ضد ہے - یعنی نیچے کرنا۔ خَفُضَ رَأْسَ الْبَعِیْرِ - اس نے اونٹ کی گردن نیچے کی طرف جھکا دی تاکہ اس پر سوار ہو۔ اَلْخَفِیْضَةُ - ہست ٹیلہ کو کہتے ہیں۔ اَلْخَفُضُ - نرم رفتاری - خَفَضَتِ الْاَبِلُ - اونٹ نے اپنی رفتار نرم کر دی - اسی سے اس کے معنی تواضع - فروتنی - اطمینان - سکون کے آتے ہیں۔

عِیْشٌ خَفِیْضٌ - پرسکون و بافراغت زندگی - خَفُضَ الْعِیْشُ - وسعت اور فارغ البالی کی زندگی \* - بغیر کسی دقت اور مشقت - پابندی اور رکاوٹ کے رزق فراواں ملنا - اس مادہ میں بنیادی طور پر یہ مفہوم ہوتا ہے - قرآن کریم میں ہے وَاخْفِیْضْ جَنَاحَکَ لِیَلْمُ ثَوْبِیْنِ (۱۸۸) - ”تو جماعتِ موسیٰ کے لئے اپنا بازو جھکا دے،“ - اسے نرم کر دے - ان سب کو اپنے بازو کے نیچے لے لے - اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے - خَفُضَ الطَّائِرُ جَنَاحَهُ - اس وقت بھی کہتے ہیں جب پرندہ اپنی پرواز کو روکنے کے لئے بازو سمیٹ لے \* - ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اپنی تیز رفتاری میں کمی کر دے تاکہ دیگر افراد کا رواں جواتنے تیز رو نہیں ہیں، تمہارے ساتھ چل سکیں - ایک قائد کو اپنے پروگرام کی ترتیب میں اپنے رفقاء کی استطاعت اور استعداد کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے - سورہ واقعہ میں ہے خَفِیْضَةٌ رَافِعَةٌ (۲۱) وہ انقلاب سرکشوں اور متمرّدوں کو پست کر دیگا اور صحیح نظام خداوندی پر چلنے والوں کو بلند کر دیگا - بہاں خَفُضٌ ضد ہے رَفْعٌ کی - یعنی جواوہر ہیں انہیں نیچے کر دیگا - جو نیچے ہیں انہیں اوہر کر دیگا - تہ و بالا کر دیگا (۱۸۸) -

## خ ف ف

الْخَفِيفُ\* وَالْخَفِيفُ\* ہلکا (ثقیل کے مقابلہ میں)۔ اَلْخَفِيفُ\*۔ ہلکا۔ بعض لوگوں نے خَفِيفُ\* اور خَفِيفُ\* میں یہ فرق کیا ہے کہ خَفِيفُ\* عقل و فکر میں ہلکا اور خَفِيفُ\* جسم میں ہلکا\*۔ (خَفِيفُ\* کی جمع خِفَافُ\* ہے۔ (۹/۳۱) راغب نے کہا ہے کہ خَفِيفُ\* کبھی تو قابل مدح صفت ہوتی ہے اور کبھی مذموم۔ مثلاً جس چیز کو ہلکا اور خوش آہند پایا جائے اسے خَفِيفُ\* کہتے ہیں اور جو گراں ہو اسے ثَقِیْلُ\*۔ یہ قابل مدح صفت ہے۔ اس کے برخلاف اوجھا\* سطحیت پسند\* کم وزن خَفِيفُ\* کہلاتا ہے اور گرانبار و پروقار ثَقِیْلُ\*۔ یہاں خَفِيفُ\* مذموم صفت ہوگی۔ اِسْتَخَفَّ\* فُلَانٌ بِحَقِّیْ\*۔ اس نے میرے حق کی کوئی عزت نہیں کی اور اسے بے وقعت سمجھا۔ تَخَفِيفُ\*۔ کمی کر دینے کو کہتے ہیں۔ اَلْخَفْفُ\*۔ اونٹ یا شتر مرغ کا پاؤں۔ نیز چرمی موزہ جو پاؤں میں پہنا جاتا ہے\*۔

ہلکا ہونے کی جہت سے\* تیز خرامی (جلدی چلنے) کو بھی اس سے تعبیر کرتے ہیں۔ خَفَّ الْقَوْمُ\* عَنْ وَطَنِهِمْ\*۔ لوگ اپنے وطن سے نکل کر تیزی سے سفر میں چلے گئے\*۔

قرآن حکیم میں بدوؤں کے خیموں کے متعلق ہے تَسْتَخِفُّونَهَا (۱/۸) ”تم انہیں ہلکا پھلکا پاتے ہو“۔ سورة الروم میں ہے لَا يَسْتَخِفُّونَكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ (۳۰/۶) ”جو لوگ خدا کے قانون پر یقین نہیں رکھتے وہ تجھے خفیف نہ سمجھیں“۔ یعنی تم میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جس سے مخالفین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ تم اپنے دعوے میں ہلکے اور عزائم میں ڈھیلے ہو اس لئے تمہیں تمہارے مقام سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے جانا چنداں دشوار نہیں۔

سورة القارعة میں ثَقُلَتْ بِمَقَابِلِهِ خَفَّتْ\* آیا ہے۔ وَ آمَاتَمَنَ ثَقُلَتْ\* سَوَازِيْنُهُ\* فَهَوَّيْ عِيشَتَهُ رَاضِيَةً\* وَ آمَاتَمَنَ خَفَّتْ\* سَوَازِيْنُهُ\* فَأَمَّتْهُ هَوَازِيْنُهُ\* (۱۰۶/۱)۔ ”سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگوار اور پسندیدہ زندگی بسر کریگا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہی کے عمیق گڑھے میں ہوگا، اس آیت میں ارتقاء کے ایک عظیم اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ طالب علموں کے لئے امتحان میں کامیابی کے لئے ”فی صد نمبروں“ کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے (مثلاً ساٹھ فیصد)

جو طالب علم سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی چالیس فیصد غلطیوں سے درگزر کر دیا جاتا ہے اور اسے اگلی جماعت میں ترقی دیدی جاتی ہے۔ یعنی اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے اور غلطیوں کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو طالب علم چالیس فیصد نمبر حاصل کرتا ہے اسے فیل کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ترقی کے لئے مقرر ہے۔ کائنات میں قانون ارتقاء کا اصول بھی یہی ہے۔ جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی تھوڑی بہت کمزوریاں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں۔ جس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس کی تھوڑی بہت صلاحیت اس کے کسی کام نہیں آتی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی اصول انسانی ارتقاء کا بھی ہے۔ جس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائیگا اسے زندگی کی اگلی منزل میں ترقی مل جائیگی۔ جس کا پلڑا کمزور رہیگا، وہ ترقی نہیں پاسکیگا۔ ”ترقی پانے والوں“ کو اہل جنت کہا گیا ہے اور آگے نہ بڑھنے والوں کو اہل جہنم۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ** (۱۱۵) ”یقیناً حسنات (اچھے اعمال) سیئات (غلط اعمال) کو دور کر دیتے ہیں“۔ اگر حسنات (تقویت بخش) اعمال حیات کا پلڑا بھاری ہو تو کمزوریوں کے مضرت رساں اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسانی اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے لایا جاتا ہے (۱۱۸)۔ لیکن فیصلہ اسی سے ہوتا ہے کہ حسنات کا پلڑا بھاری ہے یا سیئات کا۔ انسانی ذات کی نشوونما اور ضعف و اضمحلال کے لئے یہی اصول کارفرما ہے۔ جو اعمال اس کی تقویت اور استحکام کا موجب بنتے ہیں، اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو وہ اعمال جو اس کی کمزوری کا باعث تھے، نیچے دب جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اثرات اسکی نشوونما کو روکتے نہیں۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے، تو تقویت بخش اعمال، اس کے ارتقاء کا موجب نہیں بنتے۔ (مزید تشریح کے لئے ”ن۔ج۔و“ کا عنوان دیکھئے)۔

خ ف ی

الْخَافِيَّةُ - عَلَائِيَّةٌ کی ضد ہے۔ یعنی چھپنا۔ پوشیدگی۔ نیز چھپی ہوئی چیز۔ الْخَفَاءُ - جو چیز تم پر مخفی رہ جائے۔ اخْتَفَى - آخَفَى - اُسْتُخْفَى چھپ گیا۔ پوشیدہ ہو گیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (یعنی اخْفَاءُ) اِبْدَاءُ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (اِنْ تَبْدُوْا الصِّدْقَ قُلْتُمْ فَتَنِعْمًا هٰٓيَ - وَاِنْ تَخْفُوْهُمَا

..... ۲۱) اِبْدَاءُ کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں اخْفَاءُ

تَبَيَّنَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵) اس کے معنی بھی ظاہر کر دینے کے ہیں۔  
 نِدَاءٌ خَفِيًّا (۱۹)۔ دھیمی آواز۔ چھپی ہوئی آواز۔ سورۃ طہ میں اخْفِیْ اور  
 سِرًّا ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ (۲۰)۔ سورۃ الحاقۃ میں ہے لَا تَخْفِیْ مِنْكُمْ  
 خَفَیَّتَهُ (۱۹) ”کوئی چھپی ہوئی بات چھپی ہوئی نہ رہ سکے گی“۔ سورۃ  
 النساء میں ہے۔ یَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ (۱۳۸) ”وہ لوگوں سے چھپنا  
 چاہتے ہیں“۔ مُسْتَخْفٍ بِاللَّیْلِ (۱۳)۔ جو رات کو چھپ جائے یا  
 چھپ جانا چاہے۔ الخَفِیُّ پوشیدہ۔ جو ظاہر و آشکارا نہ ہو۔ قرآن کریم

میں طَرَفٌ خَفِیٌّ (۲۰) کنکھیوں سے دیکھنے کے لئے آیا ہے۔  
 اخْفَاہُ۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا۔ اس کے خفاء (پوشیدگی) کو  
 دور کر دینا\*۔ محیط میں ہے کہ خَفِیٌّ لَہُ کے معنی ظاہر ہونے کے آئے  
 ہیں اور اس کا استعمال ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں کوئی چیز پہلے سے چھپی  
 ہوئی ہو اور پھر ظاہر ہو جائے۔ یا کسی خفیہ طریقہ سے ظاہر ہو جائے\*\*۔  
 لطائف اللغۃ میں ہے کہ یہ لفظ اُضداد میں سے ہے جس کے معنی کَتَمَ (چھپا  
 دینا) اور اَظْهَرَ (ظاہر کرنا) دونوں آتے ہیں۔

ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ یہ لفظ اُضداد میں سے ہے۔  
 سورۃ طہ میں ہے اَکَادُ اُخْفِیَّتْہَا (۲۰) اس میں اگر اَکَادُ کے معنی ارادہ  
 کرنے کے لئے جائیں اور اُخْفِیَّتْہَا کے معنی ظاہر کرنے کے تو مطلب یہ ہوگا کہ  
 میں اسے ظاہر کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور اگر اَکَادُ کے معنی نفی کے لئے  
 جائیں اور اُخْفِیَّتْہَا کے معنی پوشیدہ رکھنے کے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ  
 میں اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ مطلب  
 دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا۔ اس نکتہ کی وضاحت عنوان (ک۔ و۔ د) میں  
 کی گئی ہے جسے ضرور دیکھ لینا چاہئے۔

## خ ل د

خَلُوْدٌ دوام کو کہتے ہیں۔ لیکن صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے  
 لکھا ہے کہ جب کسی چیز میں تغیر اور فساد بہت دیر میں پیدا ہو، یعنی  
 وہ بہت دیر تک نہ بگڑے تو اس کی اس صفت کے لئے خَلُوْد کا لفظ استعمال  
 کر دیتے ہیں۔ لہذا کسی چیز کے عرصہ دراز تک علیٰ حالہ قائم رہنے کو  
 بھی خَلُوْد کہتے ہیں خواہ وہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے\*۔ چنانچہ رُجُلٌ\*  
 مُخَلَّدٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس میں بڑھاپا بہت دیر میں آئے۔ کتاب  
 الاشتقاق میں اس کے معنی طَوْلُ الْعُمُرِ (لمبے عرصہ تک رہنا) اور



الْبَقَاءُ (غیر متغیر رہنا) کے لکھے ہیں۔ اَلْخَوَالِدُ۔ پہاڑوں چٹانوں اور پتھروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتے ہیں۔ خافہ بدوش، صحراء میں کھانا پکانے کیلئے پتھر کھڑے کر کے چولہا بنا لیا کرتے تھے جو انکے کوچ کے بعد وہیں رہ جاتے تھے (وہ انہیں ساتھ نہیں لے جاتے تھے)۔ انہیں بھی خَوَالِدُ کہتے تھے \*\*\*۔ خَلَدَ وَآخِلَدَ بِالْمَكَانِ والی الْمَكَانِ کے معنی ہیں وہ کسی جگہ مقیم ہو گیا اور کافی عرصہ تک اس میں رہا۔ آخِلَدَ الرَّجُلُ بِصَاحِبِهِ کے معنی ہیں وہ شخص اپنے ساتھی کے ساتھ ساتھ رہا اور اسکا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخِلَدَ إِلَيْهِ کے معنی ہیں وہ اسکی طرف مائل ہوا اور اسکے ساتھ ہی چمٹ کر رہ گیا \*۔ سورة اعراف میں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۱/۶)۔ ”اگر ہم چاہتے تو اس کے ذریعے اسے بلندی عطا کر دیتے لیکن وہ زمین کے ساتھ چمٹ گیا،،۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ثبات اور مستقل ساتھ لگے رہنے کے ہیں۔ یعنی غیر متغیر ہونا اور کسی کے ساتھ چپکے رہنا۔

قرآن کریم میں جنت کے ساتھ خَالِدٍ یُنْفِیْہَا یَا هُمْ فِیْہَا خَالِدٌ وَنَ (۲/۲۵) عام طور پر آیا ہے۔ اسمیں جہاں اس دنیا کا جتنی معاشرہ مراد ہے (دیکھئے جَنَّتٌ کا لفظ۔ ج۔ ن۔ ن کے عنوان کے نیچے) تو اس کے خَلُودٌ سے مقصود یہ ہے کہ جب تک وہ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق رہیگا اس میں تغیر اور بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں اس سے مراد اس زندگی کے بعد کی زندگی کی کیفیات ہیں، تو اس سے وہ حیات جاوید مقصود ہے جو اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے۔ یاد رہے کہ قرآن کریم میں جنت اور جہنم دونوں کے لئے خَلُودٌ کا لفظ آیا ہے۔ جنت کا خلود حیات جاوید ہے۔ یعنی وہ زندگی جو اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے۔ اور جہنم کے خلود سے مراد وہ حالات ہے جسمیں صلاحیتوں کی نشوونما رک جاتی ہے اور زندگی، ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسلئے اس میں جمود آجاتا ہے۔ لہذا یہ خَلُودٌ پتھروں اور چٹانوں کا سا خلود ہے۔ (تفصیل ان نکات کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملیگی)۔

مُخَلَّدٌ وَنَ۔ کلائیوں اور کانوں میں زیورات پہنے ہوئے۔ ان زیورات کو خَلَدٌ (واحد خَلَدَةٌ) کہتے ہیں۔ زیورات سے مزین \*\*\*۔ وَلَدَانٌ مُّخَلَّدٌ وَنَ (۵۶/۱)۔ کتاب الاشتقاق نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

آخِلَدَ۔ ایک زمانہ دراز تک مصیبتوں اور خیرائیوں سے بچانا \*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ شخص جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج و راغب۔ \*\*\* تاج۔ \*\*\*\*۔ غریب القرآن میرزا ابو الفضل بحوالہ بحر المحيط و لسان العرب۔

رہتا ہے بِحَسَبِ "أَنْ مَّالَهُ" أَخْلَدَهُ " (۱۴۱) وہ خیال کرنا ہے کہ اس کا مال زمانہ دراز تک اسے تباہیوں سے محفوظ رکھیگا یا حیات دوام عطا کر دیگا۔ یہ اس کا خیال خام ہے۔ بقا اس کے لئے نہیں جو مال جمع کر کے دوسروں کو اس کے فائدے سے محروم رکھتا ہے۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنَكُتُ فِيهِ الْآرْضِ (۱۴۲)۔

آخری زندگی کی حیات الخلد (زندگی جاوید) کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی ہمیشگی، خدا کی ابدیت کی طرح ہے۔ بالکل نہیں۔ خدا کی ابدیت کے مانند کوئی ابدیت نہیں۔ انسان کی حیات دوام، خدا کے قوانین کے مطابق ہوگی۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ذہن انسانی کی موجودہ سطح اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتی ہے نہ بتا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت اور جہنم کے خلود کے ساتھ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْآرْضُ (۱۰۸:۱۱) کہہ کر، خدائی ابدیت (Infinity) کی طرف سے خیال کا رخ ہٹا دیا ہے۔ (ان آیات میں اِلٰہَ مَا شَاءَ رَبُّكَ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ ص۔ ی)۔

## خ ل ص

خَلَصَ کے معنی ہیں کھوٹ اور میل سے الگ ہو کر صاف اور خالص ہو جانا۔ خَلَصَ مِنَ الْقَوْمِ۔ وہ قوم سے الگ اور کنارہ کش ہو گیا\*۔

أَخْلَصَ التَّشْيِءُ: کسی چیز کو خالص کیا، چن لیا۔\*\*\* اس لئے الْمُخْلَصُ اُسے کہتے ہیں جسے دوسروں سے الگ کر کے کسی کام کیلئے خالص اور مختص کر لیا جائے\*۔ اِنَّهٗ مِّنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲)۔

وہ (یوسف) عام لوگوں کی راہ پر چلنے والا نہیں تھا۔ اسے عام لوگوں سے الگ کر لیا گیا تھا۔ وہ ہماری روش خاص پر چلنے والا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے متعلق ہے خَلَصُوا انْجِيًا (۱۲) وہ باہمی مشورہ کرنے کے لئے لوگوں سے الگ ہٹ گئے۔ اسی اعتبار سے خَالِصٌ مِّنْ دُونِ النَّاسِ (۲) کے معنی ہیں دوسرے لوگوں کو الگ ہٹا کر، خالص (Exclusively) ان کے لئے۔ اِسْتَخْلَصَهُ۔ اُسے اپنے لئے خاص کر لیا (۱۲)۔

خَالِصٌ۔ جس چیز سے آمیزش کو الگ کر دیا جائے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْخَالِصُ۔ اور اَلتَّصَافِيُّ۔ دونوں مرادف المعنٰی ہیں۔ لیکن اَلتَّصَافِيُّ کبھی اسی چیز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے جو پہلے ہی سے

صاف ہو۔ اور خَیَالِیصٌ\* وہ ہوتا ہے جس سے آمیزش دور کر کے ایسے صاف کر لیا گیا ہو۔\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو صاف کرنا اور اس کے زائد اور فالتو حصوں کو چھانٹ دینا ہیں۔

الْخِیَالِصُ\*۔ وہ مکھن یا سونا چاندی جسے تپا کر خالص کیا جائے۔ خَلَقَصَ اللّٰهُ فُلَانًا۔ خدا نے فلاں کو اس مشکل اور الجھن سے نکال دیا جس میں وہ پڑ گیا تھا۔ جس طرح اُلجھا ہوا دھاگہ سلجھایا جاتا ہے\*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَتَحَنُّنٌ لَّہٗ مُخْلِصُونَ (۲۳۹)۔ ہم ہر طرف سے الگ ہٹ کر صرف قانون خداوندی کی راہ پر چلتے کیلئے مختص ہو چکے ہیں۔ اسکی وضاحت لہٗ مُسْلِمُونَ اور لہٗ عَلِیدُونَ نے کر دی ہے جو پہلی دو آیتوں میں آئے ہیں (۱۳۸-۱۳۶)۔ یعنی صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرنے والے۔ اس سے مُخْلِصِیْنَ لَہٗ الدِّیْنِ (۲۶۹) کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اور سب قوتوں سے منہ موڑ کر، اطاعت کو صرف خدا کے لئے مختص کر دینا۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا اِنَّا اَخْلَصْنٰہُمْ بِخَالِیَصَ ذِکْرِی الْقَادِرِ (۳۸)۔ ہم نے انہیں عام لوگوں سے الگ ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا) اس خصوصیت کی بنا پر کہ وہ ہمیشہ زندگی کے انجام و مآل کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ حقیقی زندگی کے گھر کو پیش نظر رکھتے تھے (۲۶۹) تاکہ جہاں اس کا تصادم طبعی زندگی سے ہو (ان دونوں میں Tie) پڑے (حقیقی زندگی کو طبعی زندگی کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے)۔

## خ ل ط

خَلَطَ اور خَلَّتَطَ۔ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ خواہ وہ اس طرح ملیں کہ پھر جدا بھی کر لی جا سکیں (جیسے اونٹوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دینا) اور خواہ اس طرح کہ وہ جدا نہ ہو سکیں\*۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلْمَزَجُ\* صرف سیّال چیزوں کے آپس میں ملانے کو کہا جاتا ہے اور اَلْخَلَطُ\* اس سے عام ہے۔\*\*\* جو شخص کاروبار میں شریک ہو ایسے خَلِیْطٌ\* کہنے ہیں۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کے لئے کاروبار میں شرکت ضروری نہیں۔ جو لوگ ویسے ہی آپس میں میل جول رکھیں، مل جل کر رہیں اور اس طرح ان میں دلی تعلق پیدا ہو جائے وہ بھی خَلِیْطٌ\* کہلاتے ہیں\*۔ اس کے معنی ساتھ رہنے والا یا پڑوسی بھی ہیں۔ اسکی جمع خَلِیْطَاءُ\* آتی ہے۔ (ابن فارس)۔

مِخْتَلَاطٌ کے معنیے مباشرت کے بھی ہوتے ہیں۔ رَجُلٌ مِخْلُطٌ  
مِیْلُطٌ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو مختلط النسب ہو۔ اور المِخْلُطُ  
ولد الزنا کو\*۔

خالطہ۔ اس کے ساتھ مل کر رہا، گڈ مڈ ہو گیا۔ سورة بقرہ میں یتیموں  
کے متعلق ہے وَلَٰنْ تَخَالِطُوْهُمْ فَاِِخْوَانُکُمْ (۲۴۰)۔ اگر تم ان سے  
میل جول رکھو یا ان کے کاروبار میں شریک ہو جاؤ تو ہر وقت اسکا خیال  
رکھو کہ وہ تمہارے اپنے بھائی ہیں۔ سورة ص میں خُلِطَاءُ کا لفظ کاروباری  
شرکاء کیلئے آیا ہے (۳۸)۔ سورة توبہ میں خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا.....  
(۱۰۴) کے معنیے ہیں، جنہوں نے اچھے کام کو برے کام کے ساتھ ملا دیا۔  
سورة انعام میں ہے مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۱۴۷) جو (چربی) ہڈی کے ساتھ ملی  
(لگی) ہو۔ سورة کہف میں ہے فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتٌ اَلَا رَٰضٍ (۱۸)۔  
اس (بارش) کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل جاتی ہے۔

## خ ل ع

خَلَعَ۔ کسی چیز کو اتار دینا۔ (نَزَعَ کے معنیے میں آتا ہے اس  
فرق کے ساتھ کہ خَلَعَ میں مہلت اور آہستگی ہوتی ہے۔ یعنی یہ عمل فوراً  
نہیں ہوتا۔ اور نَزَعَ میں جلدی اور تیزی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے  
خَلَعَ اور نَزَعَ کو ہم معنیے قرار دیا ہے۔ اَلْخَالِیْعُ۔ گرا ہوا، ٹوٹا ہوا  
درخت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنیے ہیں کسی چیز کا اُس  
چیز سے الگ ہو جانا جس کے ساتھ وہ پہلے شامل تھی۔ اَلْخَلْعُ۔ وہ طلاق  
جو ہوریت اپنے خاوند سے حاصل کرے\*\*۔ (یہ فقہی اصطلاح ہے قرآنی نہیں۔)

سورة طہ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا فَاخْلَعْ  
نَعْلَیْکَ (۲۱)۔ اس کے لفظی معنیے ہیں ”تو اپنے جوتے اتار دے“۔ لیکن  
صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم اسی جگہ  
قیام کرو۔ یہیں ٹھہرو۔ جیسے تم اس شخص کو جسے تم چاہو کہ تمہارے پاس  
کچھ وقت ٹھہر جائے کہتے ہو کہ ذرا اپنے جوتے موزے اتار کر اطمینان  
سے بیٹھو\*\*۔ لہذا آیت کے معنیے یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ  
سے کہا کہ تم جلدی نہ کرو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات سنو۔ اب تمہارا سفر  
(جو تم تلاش حقیقت میں کر رہے تھے) ختم ہو گیا ہے۔ اب تمہاری مسافتیں  
سمٹ گئی ہیں۔ (دیکھئے طویٰ)۔ اب تمہیں وحی کے ذریعے منزل مقصود

کا ہتہ بلا کاوش و تردد مل جائیگا۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اِخْلَعٌ نَعْلَيْكَ کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے اہل و عیال کے مشاغل سے فارغ ہو جا یعنی ذہن سے ان کے خیال کو نکال دے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں نَعْلٌ سے مراد اہل و عیال بھی لئے جاتے ہیں۔

## خ ل ف

خَلَفٌ کے معنی ہیں پیچھے۔ نیز یہ بعد کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً خَلْفَتَكَ۔ تیرے بعد۔ اَلْخَلَفُ۔ ایک قرن کے بعد دوسرا قرن (ایک نسل کے بعد دوسری نسل) نیز ان انسانوں کو کہتے ہیں جو پہلے لوگوں کے جانشین ہوں اور ان سے زیادہ ہوں۔ اَلْخَلَفُ۔ باپ کے بعد اس کی جانشین ہونے والی نیک اولاد، اگر اولاد بد اطوار ہو تو وہ خَلَفٌ کہلائیگی۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بولدے جاتے ہیں۔ ابن بَرِّی کا کہنا ہے کہ اَلْخَلَفُ آدمی کے بعد اس کے پسماندہ جانشینوں کے لئے، نیز بدل و عوض کے معنوں میں آتا ہے اور اَلْخَلَفُ اس کے لئے جو پہلے کے بعد آئے، جیسے قرن کے بعد قرن۔ یا لوگوں کے جانشین خواہ وہ لوگ مر چکے ہوں یا زندہ ہوں۔ ہلاک ہو جانے والوں کے بعد باقی رہ جانے والے۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ خَلَفٌ ہو یا خَلْفٌ، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی گزرے ہوؤں کے بعد آنے والے، البتہ فرق یہ ہے کہ خَلَفٌ خیر میں استعمال ہوتا ہے اور خَلْفٌ شر میں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اُس سادہ کے تین بنیادی معنی ہیں (۱) ایک چیز کا دوسری چیز کے بعد آنا اور اس کی جگہ لے لینا۔ (۲) آگے کی ضد۔ (۳) پیچھے۔ اور (۴) تغیر و تبدل۔ خِلْفَةٌ ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت چھڑ کے بعد درخت پر نکلیں۔ ایک دوسرے کے بعد آنے اور اس کی جانشینی کرنے کے لئے بھی خِلْفَةٌ بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (۲۵)۔ ”اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو اس طرح بنایا کہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ اَلْخِلْفُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھے یا جو پیچھے رہ جائے۔ ساتھ شریک نہ ہو (۲۸)۔ خَلَفَ آبَاهُ کے معنی ہیں وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اَلْخِلْفَةُ دوسرے کا جانشین، نیز وہ فرمانروا جو اپنے سے پہلے فرمانروا کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خِلَفَاءُ اور خِلَافٌ ہے\*۔ جب حضرت موسیٰؑ طُور پر گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا

اُخْلَفْنِي رَفِي قَسْوَمِي (۱۴۲) - تم (میری غیبت میں) قوم میں میرے جانشین بنو۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا تصور خاص طور سے ذہن نشین کرنے کے قابل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ زندہ ہو لیکن اُس جگہ موجود نہ ہو۔ اور خواہ مر چکا ہو۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكَم خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ (۱۰)۔ ”ہم نے تمہیں اُن کے بعد ملک میں ان کا جانشین بنایا“۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے روگردانی کی تو یَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱) میرا رب تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا۔ تم سٹ جاؤ گے اور تمہاری جانشین ایک اور قوم ہو جائیگی۔ قوم عاد کے متعلق ہے جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (۶۹)۔ ”تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا“۔ اور ثمود کے متعلق ہے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا (۷۰)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آدم (انسان) کے متعلق ہے۔ اِنْسِي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۲)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں خَلِيفَةُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ۔ یعنی زمین پر خدا کا نائب یا قائم مقام۔ یہ معنی بوجہ غلط ہیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ قرآن کریم میں آدم کو کہیں بھی خَلِيفَةُ اللَّهِ (اللہ کا خلیفہ) نہیں کہا گیا۔ خَلِيفَةُ فِي الْأَرْضِ کہا گیا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خَلِيفَةُ کے معنی ہیں کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اسکی جگہ لینے والا۔ (انگریزی میں اسے Successor کہتے ہیں)۔ خدا ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اسلئے خدا کے بعد یا خدا کی عدم موجودگی میں اسکی جانشینی کا تصور ہی باطل ہے۔ جو خود موجود ہو اسکا جانشین (Successor) کیسا؟ حضرت ابوبکرؓ خَلِيفَةُ الرَّسُولِ تھے۔ یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انکے جانشین۔ وہ خَلِيفَةُ اللَّهِ نہیں تھے۔ بیعت خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو ”یا خلیفۃ اللہ“ کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں ”خلیفۃ الرسول“ ہوں، ”خلیفۃ اللہ“ نہیں ہوں۔ انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کیلئے نہیں آیا۔ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے

اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کیلئے آیا ہے۔ آدم (انسان) کو جو خَلِيفَةً<sup>\*</sup> فِي الْأَرْضِ کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیا میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین (Successor) ہے۔ (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م اور ج۔ ن۔ ن۔) چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار شامل ہوتا ہے اسلئے اِسْتِخْلَافٌ<sup>\*</sup> فِي الْأَرْضِ سے مراد ہے ملک کی حکومت۔ کسی دوسری حاکم قوم کی جانشینی۔ (تفصیل ان امور کی میری تصنیف ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی جہاں آدم کے متعلق شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے)۔

یہ نظریہ بھی کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ (Powers Delegate) کر دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو۔ نہ مذہبی پیشوا کو۔ حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کئے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانین خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ دین بناتا نہیں۔ اس لئے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم ”خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا“، لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لئے ”نائب“ کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے تفویض اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

اِخْتِلَافٌ کے معنی ہیں وعدہ خلافی کرنا۔ اَخْلَفَ وَعْدَهُ کے معنی ہیں اس نے وعدہ کیا اور بعد میں اسے پورا نہ کیا\*۔ فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَمْدَهُ (۲۸)۔ ”اللہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کریگا“۔

اِخْتِلَافٌ۔ اتساق (موافق ہونے) کی ضد ہے۔ اس کے معنی یکے بعد دیگرے آنے کے بھی ہوتے ہیں\*۔ (جیسے اِخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۲۱۷) رات اور دن کا یکے بعد دیگرے بدل کر آنا۔ اور اختلاف یا مخالفت کرنے کے بھی\*۔ (جیسے فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَنِي إِسْرَءِیْلَ)۔ ”پھر ان کے درمیان فرقوں نے اختلاف کیا“۔

بعض کا خیال ہے کہ خَلَفَ\* اولاد صالح کو کہتے ہیں اور خَلَفَ\* غیر صالح کو۔ اور بعض نے اس فرق کو تسلیم نہیں کیا\*۔ قرآن کریم میں فَخَلَفَ مِّنْ بَعْدِ هِیمْ خَلَفَ\* (۱۶۹: ۱۷۰) غیر صالح کے لئے آیا ہے۔ فَخَلَفَ\* پیچھے رہ جانا (۱۲۰)۔ مَخْلُوفُونَ\* پیچھے رہ جانے والے (۸۱)۔ خَالَفَهُ\* اسکی مخالفت کی۔ مَخْلِيفَ\* وہ جو وعدہ خلافی کرے (۳۲)۔ مَخْتَلِيفَ\* الگ الگ (۱۶)۔ اسْتَخْلَفَ\* جانشین بنانا (۲۴)۔ مَسْتَخْلَفَ\* وارث (۵۴)۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے (۲۴)۔ لہذا جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں غلبہ و اقتدار اور حکومت و شوکت نہیں قرآن کریم کی رو سے نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمال صالحہ۔ ایمان و اعمال صالحہ کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان کا نتیجہ صرف آخرت میں (مرنے کے بعد) برآمد ہوگا، اس دنیا سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ یا ان سے مقصود ایک فرد کی اپنی ”روحانی ترقی“ ہے جسے معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

سورہ نھود میں ہے کہ حضرت شعیب\* نے اپنی قوم کو غلط روش زندگی سے باز رہنے کی تلقین کی اور فرمایا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلِكَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْتُمْ بِمَعْرِفَةٍ عَنْهُ\* (۱۱)۔ تاج نے لکھا ہے کہ خَالَفَهُ\* إِلَىٰ الشَّيْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز سے منع کرنے کے بعد اس کا قصد کرنا۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں جس بات سے تمہیں روکتا ہوں میرا ارادہ قطعاً یہ نہیں کہ میں خود اس کا قصد کروں۔

قرآن کریم کی رو سے کسی قوم میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے (۳۰) اور اختلافات کا سبب جانا اللہ کی رحمت (۱۶۹-۱۷۰)۔ قرآن کریم، لوگوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے (۱۶)۔ اور اسی لئے یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ جنتی زندگی کے مستحق وہ ہیں جن میں اختلافات نہ ہوں (۳۰-۳۱)۔ باہم اختلافات اور دین میں تفرقہ شرک ہے (۳۰-۳۱)۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا طریق یہ ہے کہ ان کے ہر متنازع فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے (۲۲)۔ لیکن یہ فریضہ امت کا اجتماعی نظام (حکومت قرآنی) سر انجام دیگا۔ (۶۵)۔ (ان امور کی مزید تفصیل ف۔ ر۔ ق کے عنوان میں ملیگی۔ نیز دیکھئے میری کتاب، سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم)۔



## خ ل ق

خَلَقَ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو بنانے یا کائنات کے لئے اسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا (یہی مفہوم تقدیر کا بھی ہے دیکھئے ق۔ د۔ ر) اسکے تناسب و توازن کو دیکھنا۔ یا کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مطابق بنانا۔ کسی چیز کو نرم و ہموار کرنا\*۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا\*\*۔ خَلَقَ إِلَّا دَرَبُہُمْ کے معنی ہیں اسنے کوئی چیز بنانے کے لئے چمڑے کو ناپا اور پہلے اس کا اندازہ لگایا۔ رَجُلٌ تَامَ الخَلْقَ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکی ساخت میں اعتدال ہو۔ جو بناوٹ اور تناسب کے اعتبار سے مکمل اور سڈول ہو۔ اس معنی میں خَلِیقٌ بھی کہتے ہیں۔ اور خُلُقَتَہ کے معنی ہیں چکنا پن، ہمواری، برابر ہونا۔ الخَلْقُ کے معنی ہیں کسی چیز کا شکاف وغیرہ سے خالی اور ہموار ہونا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا (استعمال کے بعد) ہموار اور صاف اور چکنا ہو جانا۔ (اسی جہت سے پرانی چیز کو خَلَقَ کہتے ہیں کیونکہ وہ گھس کر مپاٹ ہو جاتی ہے اور اس کا رُوں زائل ہو جاتا ہے)۔

لہذا خَلَقَ کے معنی ہونگے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو و زوائد کو دور کرنا اور پھر اسے اندازے اور پیمائے کے مطابق بنانا، اس طرح کہ اسکا نوازن و تناسب بالکل درست رہے۔ اور وہ صاف اور ہموار ہو جائے۔ بَدَعَ اور فَطَرَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ پہلی بار پیدا کرنا۔ ایجاد کرنا۔ اس اعتبار سے خَلَقَ کے معنی ہونگے مختلف عناصر کو مٹی نئی ترکیبیں دینا اور اس طرح ان سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نَطْفَةٍ (۱۱/۱)۔ یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۵۵/۱۳)۔

سورۃ حج میں رحم مادر میں نطفہ اور جنین کے مختلف منازل کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ مُضْغَةٌ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی مُخَلَّقَتٌ اور غَيْرِ مُخَلَّقَتٌ (۲۲/۵)۔ مُخَلَّقٌ کے معنی ہیں مکمل شدہ۔ یا ہموار کیا ہوا یا نرم کیا ہوا (محیط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُخَلَّقُ اُس تیر کو کہتے ہیں جسے مدعار کسر ٹھیک کسر دیا جائے۔ اس لئے آیت سے یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ مُضْغَةٌ یا تو پورا بچہ بن جاتا ہے اور یا نا تمام رہ کر گر جاتا ہے۔

سورۃ شعراء میں ہے "إِن هَذَا إِلَّا خَلْقٌ لَّآلِئِلَیْنِ" (۲۶/۱۳۷) یعنی یہ تو وہی پہلوں کا دستور، پرانی عادت، یا طریق کہن ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی رسم و رواج کے بھی لئے ہیں\*۔ اور اسی سے اس کے معنی عادات و اطوار کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ خَلْقٌ کسی کی طبیعی عادت کو کہتے ہیں\*۔ اور چونکہ عادت عموماً پرانی ہوتی ہے اس لئے خَلْقٌ کے معنی کہنگی کے بھی ہیں۔ خَلَقَ الثَّوْبُ - کپڑا پرانا ہو گیا۔ (۳۸/۲۸) میں ہے "إِن هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ"۔ یہ گھڑی ہوئی بات ہے۔ خِلْقَةٌ کے معنی ہیں کسی کی طبیعی ترکیب (Natural Constitution)\*۔ خَلَقٌ کے معنی ہیں انداز کے مطابق مقرر کیا ہوا حصہ۔ أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْآخِرَةِ (۳۱/۲۶) میں خَلَقٌ کے یہی معنی ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ خَلَقٌ کے معنی ہیں وہ فضیلت جو حسن اخلاق کی بنا پر حاصل ہو۔

(قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ بھی آیا ہے۔) (۵۲/۲۶)۔ اس کے متعلق ا۔ م۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔ خَلَقٌ کے معنی ٹھیک اندازہ لگا کر اس کے مطابق عزم کرنے اور منصوبہ باندھنے کے بھی آتے ہیں۔ نیز تربیت کرنے کے بھی\*\*۔

خَلَقٌ اور خَالِقٌ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات ہیں (۲۶/۸۱ و ۵۹/۲۵)۔ لہذا جس فرد یا قوم میں صفات خداوندی کی نمود ہوگی اس کا مظاہرہ اس کی قوت تخلیق سے ہوگا۔ اولاد پیدا کرنا تخلیق (Creation) نہیں، تولید (Procreation) ہے۔ یہ وہ حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوانات بھی انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ لہذا تولید، حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، انسانی سطح پر تخلیق شروع ہوتی ہے جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتے جس قوم میں قوت تخلیق نہیں اس میں صفات خداوندی کی نمود نہیں۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ:

ہر کہ اورا قوتِ تخلیق، نیست نزد ما جز کافرو زندقہ نیست

یہ بھی بباد رہے کہ تخلیق محض (Duplication) نہیں۔ یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے جلمے جانا تخلیق نہیں۔ تخلیق نئے نئے اضافے چاہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے منعلق ہے یَزِيدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَاءُ (۳۵/۱)۔ "وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے،" اس لئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اضافے کرتے رہیں۔ اس کو ایجاد کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَ اِنَّكَ لَتَعْلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٌ (۶۸) ”اور یقیناً تو خلق عظیم کا حامل ہے“۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، خلق کے معانی میں اعتدال، توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ یہ چیز شرف انسانیت کی دلیل ہے۔ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی میں یہ شرف اپنی بلند ترین سطح پر تھا۔ ہمارے ہاں جس چیز کو ”اخلاقیات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارے دور ملوکیت کی تمدنی زندگی کا آئینہ ہیں۔ قرآن کریم نے جو صفات مؤمن کی بیان کی ہیں، وہی صحیح اخلاق ہیں۔ اور ان صفات کی بلند ترین مظہر نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے جو نوع انسانی کے لئے حسین ترین نمونہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت کا یہ نمونہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

## خ ل ل

اَلْخَلُّ ۱۔ وہ راستہ جو ریگزار کے اندر تک جاتا ہو۔ یا جو دو ریگزاروں کے درمیان سے گذرتا ہو۔ اَلْخَلْلُ ۲۔ دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ خِلَالٌ ۳۔ درمیان کی جگہ۔ خِلَالُ اَلْیَدِ یَّارَ ۴۔ گھروں کے درمیان کی جگہ، گھروں کی حدود کے آس پاس کی جگہ۔ تَخَلَّلَ الشَّیْءُ ۵۔ چیز کے اندر گھس جانا۔ خَلَّ الشَّیْءُ ۶۔ چیز میں سوراخ کر دیا اور اس میں سے آ رہا چلا گیا۔ اَلْخِلَالُ ۷۔ وہ چیز جس سے آ رہا سوراخ کیا جائے۔ اَلْخَلْقَةُ ۸۔ احتیاج۔ اضطراری حالت۔ فَجَا سُوْا خِلَالِ اَلْیَدِ یَّارَ (۱۵) وہ شہروں کے اندر گھس گئے۔ خِلَلَتْهَا (۱۶) اس کے اندر۔

خُلَّةٌ ۹۔ دوستی۔ (۲۵۴) غالباً اس اعتبار سے کہ دوست ایک دوسرے کے دلوں کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں، یا انہیں ایک دوسرے کی احتیاج ہوتی ہے۔ خَلِيْلٌ (جمع أَخِلَاءٌ)۔ دوست (۱۴۶) و (۲۳)۔ خِلَالٌ ۱۰۔ باہمی دوستی (۱۴)۔

اَلْخَلُّ ۱۱۔ سرکہ۔

## خ ل و

خَلَا اَلْمَكَانُ ۱۲۔ معنی ہیں مکینوں کے چلے جانے سے کسی جگہ کا خالی ہو جانا۔ خَلَا الشَّیْءُ ۱۳۔ کسی چیز کا گذر جانا اور چلا جانا۔ خَلْوَةٌ ۱۴۔ کے معنی تنہائی ہیں۔ خَلِيَّةٌ ۱۵۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ۔ راغب کا قول

ہے کہ خَلَّتُوا کا استعمال زمان اور مکان دونوں کیلئے آتا ہے۔ چونکہ زمانے میں مرور (گذرنا) پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت نے خَلَّ الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لئے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہو جانا۔

قرآن کریم میں خَلَّتُوا بمقابلہ لَقُوا کے آیا ہے (۲/۱۶۷ و ۲/۱۶۸) جہاں اسکے معنی علیحدگی اور تنہائی میں ملنے کے ہیں۔ خَلَّتُوا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲/۱۶۷) کے معنی ہیں وہ لوگ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَّتْ (۲/۱۶۸) ”یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی“۔ لَا يَتَّامِرُ الْخَالِيسَةُ (۲/۱۶۹) کے معنی ایام گذشتہ ہیں۔ سورة يوسف میں يَخْلُ لَكُمْ وَجْهٌ أَبِيكُمْ (۱۲/۹۱) کے معنی ہیں تمہارے باپ کی ساری توجہ خالصتاً تمہارے لئے ہو جائیگی۔ کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں ہوگا۔ خَلَّ فِيْهَا نَذِيرٌ (۳۵/۳۳) جسمیں کوئی آگاہ کرنے والا (نہ) گزرا ہو۔ تَخَلَّتْ (۸۴/۴) خالی اور صاف ہو جانا۔ فَخَلَّتْ سَبِيلَهُمْ (۹/۵) ان کا راستہ چھوڑ دو۔ ان سے تعرض مت کرو۔ خَلَّ سَبِيلَ الْأَسِيرِ کے معنی ہیں قیدی کو آزاد کر دیا\*\*\*۔

## خ م د

خَمَدَتِ النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا اگوجہ اس کے انگارے نہ بجھے ہوں۔ اگر انگارے بھی بجھ جائیں تو اسے خَمَدَتِ النَّارُ کہیں گے\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حرکت کا ساکن ہو جانا نیز گرجانا بتائے ہیں۔ أَخْمَدْتُهَا۔ میں نے آگ کے شعلوں کو ساکن کر دیا۔ أَخْمَدْتُ د۔ وہ جگہ جہاں آگ کو دبا دیا جاتا ہے۔ خَمَدَ الْمَرْيَضُ۔ مریض بیہوش ہو گیا یا مر گیا۔ قَتُومٌ خَامِدٌ وَنٌ۔ وہ لوگ جن کی تم کوئی آہٹ تک نہ سنو\*\*\*\*۔ بے حس و حرکت لوگ۔ أَخْمَدَ اللَّهُ أَنْفَاسَهُ۔ خدا نے اسے ذلیل کیا یا موت دیدی\*\*\*۔ سورة انبیاء میں هُجِعَتْ لَهُمْ حَصِيدَاتُ الْخَامِدِينَ (۲۱/۱۵) ”ہم نے انہیں نشوونما کی قوت سے عاری کر کے بے حس و حرکت کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا“۔ دوسری جگہ ہے لَا ذَاهِمٌ خَامِدٌ وَنٌ (۳۶/۳۶)۔ ”سو دیکھو! وہ بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گئے“۔ زجاج نے بھی اس آیت کے معنی بتائے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی خاموش اور مردہ ہیں\*\*\*\*۔ تباہ ہو جانے والی قوموں کے خون سے حرارت سلب ہو جاتی ہے اور

ان کے پیکر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی ان کا خمود ہے۔ بجھے ہوئے  
انہیں۔ نیز ان کی حیاتِ ملی کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کٹ جاتی ہیں اور  
ان کے صرف نشانات باقی رہ جاتے ہیں۔

## خ م ر

خَمْرٌ\* - کسی چیز کو ڈھانپ دینا یا چھپا دینا۔ خَمَرَ الشَّيْءَ  
بِخَمِيرٍ\* - اس کو چھپا دیا۔ ڈھانپ دیا۔ خَمَرَ فُلَانٌ الشَّهَادَةَ\* -  
فلان نے گواہی کو چھپا دیا۔ اَلْخَمَرُ\* - اوٹ، آڑ، پردہ۔ خِمَارٌ\* - اوڑھنی  
جس سے عورتیں اپنے سر کو ڈھانپتی ہیں\* - (جمع خُمُرٌ\* - ۲۴)۔ لَطَائِفُ  
اللُّغَةِ میں ہے کہ عورتیں پہلے اپنے سر پر اَلْغِفَارَةَ\* اوڑھتی تھیں اور اس کے  
اوپر اَلْخِمَارُ\* - (غِفَارَةُ\* کے لئے دیکھئے عنوان غ - ف - ر) اَلْخَمَرُ\* -  
ہر نشہ آور چیز۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے  
کہا ہے۔ اَلْخَمَرُ مَا خَمَرَ الْعَقْلَ\* - خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں  
گڈمڈ اور فتور پیدا کر دے۔ بعض کا قول ہے ”لَا نَشَاءُ تَخْمِيرَ  
الْعَقْلِ“ - یعنی شراب کو خمر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ  
عقل کو ڈھانپ لیتی ہے\* - عرب ہام طور پر شیرہ انگور سے شراب  
بناتے تھے اور اسے خَمَرٌ\* کہتے تھے۔ دوسرے ان کے ہاں انگور کو بھی  
خَمَرٌ\* کہتے ہیں\* - تَخْمِيرٌ\* کے معنی ہیں خمر اٹھانا\* - خَمَامَرٌ  
الرَّقَبُ\* - فِي الْبَيْعِ مَخَامَرَةٌ\* - اس شخص نے خرید و فروخت میں فریب  
سے کام لیا اور آزاد کو غلام بنا کر بیچ دیا\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے  
بنیادی معنی ڈھانپ لینے اور ڈھانپ لینے کے ساتھ گھل میل جانے کے ہیں۔ اور  
اَلَا مِثْلُ خَمَارٍ\* کے معنی ہیں غلام بنا لینا۔ اس لئے کہ کسی کو غلام بنانے کے  
لئے اس کی عقل کو سلب کر لینا ضروری ہوتا ہے۔

فرآن کریم میں خَمَرٌ\* اور مَيْسِرٌ\*\*\* کے متعلق ہے کہ فَيَهِيْمَا  
اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعٌ لِّلنَّاسِ - ”ان میں بڑا اثم ہے اور لوگوں کے  
لئے فائدے بھی“ - وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِّنْ نَّفْعِيْهِمَا (۲۱۹) - ”ان کا  
اثم ان کے فائدوں کی نسبت بہت زیادہ ہے“ - اِثْمٌ کے معنی ہیں اضمحلال۔  
افسردگی۔ تکان۔ مستی۔ ایسی کمزوری جس سے انسان زندگی کی دوڑ میں پیچھے  
رہ جائے۔ (دیکھئے عنوان ا - ث - م)۔ یعنی نشہ آور اشیاء (اور میسر یعنی  
آسانی سے ہاتھ آئی ہوئی دولت) سے بیشک دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ انسان  
میں وقتی طور پر گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد قویٰ اس قدر

\* تاج و راغب - \*\* محیط - \*\*\* ميسرة کے معنی ہیں وہ دولت جو آسانی سے

ہاتھ آجائے۔ ج۔ و ابھی اس میں شامل ہے۔ (دیکھئے عنوان ی - س - ر)

کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان میں جہد و جہد اور سعی و عمل کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے انہیں رَجَسٌ مینِ عَمَلِ الشَّيْطَانِ قرار دیکر اس سے باز رہنے کی تاکید کر دی گئی (۹۰) اور بتا دیا کہ ان سے تمہارے اندر باہمی عداوت پیدا ہو جائیگی اور تم نظام صلوٰۃ کو قائم کرنے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔ (۹۱)۔ خَمْرٌ (شراب) کے طبعی اثرات کے متعلق ڈاکٹروں کی تحقیق یہی ہے کہ اس کا پہلا اثر دورانِ خون کو تیز کرتا ہے۔ اور یہ چیز بعض حالتوں (بیماریوں) میں اچھے نتائج مرتب کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کا اثر دورانِ خون کو بہت سست کر دیتا ہے۔ اور یہ اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ابتدائی قائلوں کے مقابلہ میں اس کا ثانوی نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

خَمْرٌ (اور مَسِيرٌ) سے صرف انسانی جسم ہی میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسانی ذات کی توانائیاں بھی افسردہ ہو جاتی ہیں، اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔

## خ م س

الْخَمْسَةَ - پانچ - ۵ - وَ يَقُولُونَ خَمْسَةَ (۱۸/۱) - يَوْمُ الْخَمِيْسِ - پانچواں دن (جمعرات) - خَمْسُونَ - پچاس - ۵۰ - اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱) - خَمْسٌ اور خَمْسٌ - پانچواں حصہ - فَاَنْتَ يٰلَہُ خَمْسَةَ (۸/۱) - خَمِيسٌ - پانچواں - اس کا مونث الْخَمِيسَةُ ہے (۲۴/۱)۔ مال غنیمت کا خَمْسٌ (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے ہے (۸/۱)۔ یعنی مرکز نظام خداوندی کے لئے - امیر ملت اس سال کو امت کی اجتماعی ضروریات پر صرف کریگا، اسی کو رَفِیْ مَسْبِيْلِ اللہ کہا جاتا ہے۔

## خ م ص

الْخَمِصَةُ - بھوک - خَمِصَ الْهَيْطَانِ - پیٹ کھانے سے خالی ہو گیا اور اندر کو پچک گیا - اِلَّا خَمِصٌ - ہاؤں کے تلوے کو کہتے ہیں جسکا قعر (Curve) اندر کی طرف ہوتا ہے۔ چونکہ سخت بھوک میں پیٹ بھی اسی طرح کمر کے ساتھ جا لگتا ہے اسلئے اس طرح کے بھوکے آدمی کو خَمِصٌ کہتے ہیں۔ اور مجازاً زَمَنٌ خَمِصٌ قحط سالی کے زمانہ کو\*۔ قرآن میں مَخْمَصَةٌ سخت بھوک کیلئے آیا ہے (۵/۳)۔

## خ م ط

خَمَطٌ اللَّحْمُ بِخَمِطِهِ - اسنے گوشت کو بیہون لیا - اگر اسے پانی میں ابال لیا جائے تو مَسْمُوطٌ کہیں گے - اَلْخَمَطُ - کھٹا - ہر کڑوی چیز - ہر ہودا جس میں کسیلا پن اور کڑواہٹ ہو - ایک قسم کا زہر قاتل یا زہریلا مہلک درخت - ہر بے کانٹوں والا درخت، پیلو کے درخت کا پھل \* - راغب نے اس کے معنی پیلو کا درخت کئے ہیں - قرآن کریم میں اہل سبا پر عذاب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ان کے عمدہ باغات کی جگہ ایسے باغات پیدا ہو گئے جو ذَوَاتِیْ اُكْلٍ خَمَطٍ تھے (۳۶) - یعنی کڑوے پھلوں والے - اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کی خوشگوار یوں کو بدمزگیوں سے بدل دیا -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) ننکا اور خالی اور سپاٹ ہونا - اور (۲) تسلط و غلبہ - اس اعتبار سے (معنوی انداز میں) اس کا مفہوم ہوگا کسی کو جور واکراہ اور ظلم و استبداد کی پاداش میں متاع حیات سے محروم کر دینا - بھی اہل سبا کے ساتھ ہوا تھا -

## خ ن ز ر

اَلْخَنَزَرَۃٌ - موٹا ہونا - بڑا موٹا ہتھوڑا جس سے ہتھر توڑے جاتے ہیں - اَلْخَنَزِرُیْرٌ - سُر - (جمع خَنَزَارِیْرٌ) - خَنَزَرٌ - اس نے خنزیر کے سے کام کئے - کسی کو کنکھیوں سے دیکھنے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے \*\* - قرآن کریم میں لحم خنزیر کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ہوا ہے (۲/۱۷۳) - نیز ان لوگوں کیلئے بھی یہ لفظ (خنزیر) آیا ہے جن کی سیرتیں مسخ ہو کر بدترین حیوانوں جیسی ہو جائیں - (۵/۶۰) - راغب نے لکھا ہے کہ اس کا استعمال مسخ صورت اور مسخ سیرت دونوں کیلئے ہو سکتا ہے \*\*\* - (نیز دیکھئے عنوان ق - ر - د) صاحب غریب القرآن نے اسے خَنَزِرٌ + نَزْرٌ سے مرکب لکھا ہے جسکے معنی ہیں سڑی گلی اور ناقص چیز \*\*\*\* - خنزیر (سُر) کے متعلق یہ عجیب چیز ہے کہ اسے دنیا میں ہر جگہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے - حتیٰ کہ یورپ کی جو قومیں اس کا گوشت کھاتی ہیں وہ بھی اس کے نام کو بطور گالی استعمال کرتی ہیں - خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ہے -

## خ ن س

خَنَسَ عَنْهُ - يَخْنِسُ - خَنَسًا - اس سے پیچھے ہٹ جانا - خَنَسَهُ - کسی کو پیچھے ہٹا دینا - الْخَنَسُ - ہرنوں کے چھپنے کی جگہ - (نیز دیکھئے کُنَسٌ) - خَنَسَ مِنْ بَيْنِ أَصْحَابِهِ - وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان میں سے چھپ گیا - الْخَنَسُ فِي الْقَدَمِ - پاؤں کے تلوے کا سپاٹ اور ہر گوشت ہونا\* - الْخَنِيسُ گھات لگانے والے مکار، نیز حیلہ ساز اور چالباز کو کہتے ہیں\* -

قرآن کریم میں ہے فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنُوسِ (۸۱) - اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو پیچھے ہٹتے ہیں - اور چونکہ ستاروں کی رفتار میں آواز نہیں ہوتی اسلئے دیے پاؤں پیچھے ہٹنے کا مفہوم بھی اس میں آجاتا ہے - یہ وہی شہادت ہے جَوَّالَتْنَجْمٍ إِذَا هَوَىٰ (۵۳) میں بیان ہوئی ہے (نیز، ۵۶ میں) - کیونکہ اس کے بعد بھی وحی و رسالت کا بیان ہے (۲۲-۲۳) -

سورة الناس میں التَّوَسَّلْ بِالْخُنُوسِ (۱۳) آیا ہے - یعنی کانوں میں کچھ پھونک کر دیے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا - چپکے چپکے غلط خیالات پھیلا کر چھپ جانے والا - مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ الْخُنُوسُ، چھپنے والی طماقت کو کہتے ہیں - یا اسے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسی کے بنیادی معنی چھپنے اور پوشیدہ ہونے کے ہیں -

## خ ن ق

خَنَقَ - يَخْنِقُ - کلا گھونٹ دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تنگی کے ہونے ہیں - چنانچہ الْخَنَاقُ - تنگی گھاٹی کو کہتے ہیں - تنگی کی جہت سے الْخَنَاقُ کے معنی کلا گھونٹنے کے آئے ہیں - الْخِنَاقُ - وہ رسی جس سے کلا گھونٹا جائے - اِنْخَنَقَ - اس کا کلا گھٹ گیا\*\*\* (خَنَاقٌ اسی سے ہے) اَلْمُنْخَنِقَةُ - جس کا کلا گھٹ جائے (اور وہ اس طرح مر جائے) قرآن کریم نے ایسے جانور کو حرام قرار دیا ہے (۵) -

## خ و ر

خَوَّرَ - يَخْوَرُ - خَوَّرًا - کمزور ہو جانا - بزدل ہو جانا - ٹوٹ جانا - سست پڑ جانا - خَارَتْ قُوَّةُ الْمَرِيضِ - مریض کی قوت کم ہو گئی



یعنی وہ کمزور ہو گیا۔ خَوَّارَتْ اَلْاَرْضَ - بارش کی کثرت سے زمین کی مٹی بہ گئی\*۔

اَلْخَوَّارُ - گائے بیل بکری۔ ہرن یا تیرون کی آواز۔ دراصل یہ گائے بیل کی آواز کے لئے تھا، پھر دوسری آوازوں کے لئے بھی بولا جانے لگا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ خَوَّارُ خاص طور پر گائے بیل کی آواز کو کہتے ہیں پھر استعارۃً اونٹ کی آواز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے\*۔ قرآن کریم نے عِجْلُ\* (بچھڑے) کیلئے لَہُ خَوَّارُ\* کہا ہے (۶۸/۶)۔ یعنی جس سے آواز نکلتی تھی۔

## خ و ض

خَاض - يَخْضُو ض - کے بنیادی معنی ہوتے ہیں پانی میں اترنا اور اس میں چلنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ اسکے بعد اسکا استعمال کسی معاملہ میں دیر تک مشغول رہنے کیلئے ہونے لگا۔ قرآن مجید میں اس کا بیشتر استعمال فضول باتوں میں اُلجھنے کیلئے ہوا ہے\*\*\*۔ خَاضَ - اسنے بیکار بات کی (اقرب الموائد)۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے وَخَضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا (۹/۶۹) اسکے معنی فضول باتوں میں اُلجھے رہنا ہیں۔ سورۃ طور میں ہے اَلَّذِينَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَلْعَبُوْنَ (۵۴/۱۴)۔ ”جو لوگ باطل میں منہمک اور حق سے غافل ہیں“۔ سورۃ مدثر میں مجرمین کی فہرست جراثم میں یہ بھی ہے کہ كُنْتُمْ تَخْضَوْنَ مَعَ الْخَائِضِيْنَ (۸۵/۲۵)۔ یہ اس ٹائپ کے لیڈروں کا ذکر ہے جو فلاح عامہ کیلئے عملاً کچھ نہیں کرتے لیکن بیانات دھڑا دھڑا دیتے، ریزولیشن پاس کرتے، اسکیمیں بناتے اور ہمیشہ (Planning) میں وقت گزارتے رہتے ہیں۔ یعنی باتیں ہی باتیں اور کام کچھ نہیں۔ نیز ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی سوشلگافیوں اور نکات آفرینیوں میں لکے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں (۱۰۴/۴)۔

## خ و ف

خَوَّفَ - قرائن اور شواہد سے کسی آنے والے خطرہ یا نقصان کا اندیشہ کرنا۔ اسے (Apprehend) کرنا۔ جس طرح طَمَعٌ کے معنی ہیں قرائن

\* تاج و محیط - \*\* تاج - \*\*\* تاج و راغب -

و شواہد سے کسی فائدہ کی توقع کرنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں خَوْفًا وَ طَمَعًا اکٹھا آیا ہے (۵۶)۔ اسکے برعکس حَزَنٌ بالعموم اس غم کو کہتے ہیں جو حادثہ کے گزر جانے کے بعد اسکے نقصان کی وجہ سے ہو۔ یعنی خَوْفٌ کا تعلق مستقبل (حادثہ واقع ہونے سے پہلے) کے اندیشہ سے ہے۔ اور حَزَنٌ بالعموم گزرے ہوئے واقعہ کے غم کو کہتے ہیں\*۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے وَ اِنَّ امْرَاةً خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا (۱۲۸) جسکے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ہو۔ لہذا خوف خدا وندی کے معنی یہ ہیں کہ اس احساس سے کہ قوانین خدا وندی کو چھوڑ دینے سے میرا کس قدر نقصان ہوگا، ان قوانین کا اتباع کرنا۔ غلط روش کے تباہ کن نتائج کے احساس اور اندیشہ سے اس روش سے مجتنب رہنا۔ چنانچہ سورۃ نعل میں اشیائے کائنات، اور ملائکہ کے متعلق ہے يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ قَوْلِهِمْ وَيَتَّقِعِلُّوْنَ مَا يَتُّوْنَ مَرُّوْنَ (۱۶)۔ ”یہ اپنے نشو و نما دینے والے کے غلبہ و اقتدار سے ڈرتے ہیں اور جنو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں“،۔ یعنی وہ قوانین خدا وندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ہوگا۔ لہذا خدا کا خوف کسی مستبد حاکم کے خوف کے مرادف نہیں۔ اس خوف سے مفہوم ایسا ہی ہے جیسے ہم جلنے کے اندیشہ سے آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ چنانچہ الْخَافَةُ اس چرمی جہ کو کہتے ہیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا اوڑھ لیتا ہے (تاکہ شہد تو مل جائے) لیکن وہ مکھیوں کے ڈنک سے محفوظ رہے۔ نیز تھیلہ جس میں (تلف ہونے کے خوف سے) کسی چیز کو محفوظ کیا جاتا ہے\*\*۔

خَوَافٌ - شور و غل کو کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی پریشانی اور گھبراہٹ کے ہیں۔ خَوْفٌ کے معنی قتل اور جنگ کے بھی ہیں\*\*۔ چنانچہ (۳۳) میں خَوْفٌ کے معنی قتل و قتال کے کئے گئے ہیں۔ تَخَوُّفٌ الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کر دینا\*\*۔ تَخَوُّفُهُ حَقُّهُ اسکے حق کو کم کر دیا۔ اَوْ يَتَاخَذُھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ (۱۱) کے معنی ہیں انہیں بتدریج کم کرنا ہوا تباہ کر دے، دفعۃً نہیں۔ نیز تَخَوُّفٌ کے معنی خوف کرنا، ڈرتے رہنا ہیں۔ اس طرح یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ باوجود ان کے خوف کرنے اور ہوشیار رہنے کے انکی گرفت کر لی۔ لیکن اول الذکر معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔

الْخَيْفَةُ - حالت خوف کو کہتے ہیں\*\*\*۔

اتباع ہدایت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو خوف اور حزن نہیں رہتا (۲۸)۔ لہذا اگر کسی قوم پر خوف چھایا رہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہدایت خداوندی کا اتباع نہیں کر رہی۔ مومن اور خوفِ باطل دو متضاد باتیں ہیں۔ لفظ مومن کا تو مادہ ہی امن ہے۔ پھر اسے باطل سے خوف کیوں؟

## خ و ل

الْخَوَالُ - ماں کا بھائی، یعنی ساموں - (جمع أَخْوَالٌ - أَخْوَالَتٌ - خَوُولٌ) - الْخَوَالَتُ - ماں کی بہن یا خالہ (اس کی جمع خَوَالَاتٌ ہے)۔ (۳۱) - أَخْوَالٌ (۳۱) میں آیا ہے۔ الْخَوَالُ - بھلائی کا نشان جو کسی آدمی میں نظر آئے۔ فوج کا جھنڈا - سیاہ اونٹ - هُوَ خَالٌ مَالٌ - وہ اونٹوں کا محافظ ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی خبر گیری اور نگہداشت کرنے کے ہوتے ہیں - خَوَالٌ (تَخْوِيلٌ) کسی کو سامان حشم و خدم عطا کر دینا - یا ایسی چیزیں دینا جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت پڑے - اِذَا خَوَّلْتَهُ نِعْمَةً (۳۹) - ”جب اللہ اسے سامان آسائش عطا کرتا ہے،“۔

## خ و ن

الْخَوْنُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کم کر دینا - خَوْنَتُهُ - اس کو کم کر دیا - رَفِيَ ظَهْرُهُ خَوْنٌ - اس کی کمر میں کمزوری ہے - نگاہ کی چند ہاٹ کو بھی خَوْنٌ کہتے ہیں -

خَانَ - يَخُونُ - خَوْنًا سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے - اس کا نام خِيَانَةٌ ہے - اس سے ظاہر ہے کہ خِيَانَةٌ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے - چنانچہ کہتے ہیں خَانَ الدُّلَّوُاْ الرِّشَاءُ - رسی نے ڈول سے وفا نہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب سے ڈول کنویں میں گر گیا - ہم رسی کی مضبوطی کے بھروسہ پر ڈول کو بھر کر کھینچتے ہیں - اگر رسی درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ جائے تو یہ اس کی خِيَانَةٌ کہلاتی ہے - لہذا اَمَانَةٌ تو یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے مطمئن (امن میں) ہو جائے اور اپنی اعتماد کو نہیں کھوئے - لیکن خِيَانَةٌ میں یہ اعتماد اور بھروسہ

باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قوانین خداوندی کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایک ایسی مضبوط کڑی ہے کہ لا انفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ ان پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کبھی راستہ میں دغا نہیں دیتے۔ یہ درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ نہیں جاتے۔ صرف ٹوٹ کر نقصان پہنچانا ہی نہیں بلکہ ہر تغیر، کمی اور تبدیلی کرنے کو تَخَوُّنٌ کہتے ہیں\*۔ خَانَهُ الدَّهْرُ۔ زمانہ نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، یعنی اس کی حالت بگاڑ دی\*۔

قرآن میں ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (۲/۲۵۸)۔ خَوَّانٌ ہر ایسے شخص کو کہہ سکتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جا سکے، اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کر دینے کی کوشش کرے۔ نیز بڑا خائن۔ قرآن کریم نگاہ کی خیانت تک سے منع کرتا ہے (۲/۱۹)۔

سورۃ بقرہ میں ہے اَنۡتَکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتٰنُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ (۲/۱۸۷)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِخۡتِیَانٌ سے مراد خیانت کا ارادہ یا تیاری کرنا ہے\*\*۔ لہذا دوسروں سے تو ایک طرف، خود اپنی ذات سے بھی خیانت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ خیانت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہئے۔ سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے۔ یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف عمل کرنا (خواہ اس کا علم کسی دوسرے کو ہو یا نہ ہو)۔ یہ انسانی خودی کی کمزوری کی دلیل، بلکہ (Dual Personality) کی علامت ہے۔ یعنی اُن باتوں کو ماننے والا کوئی اور ہوتا ہے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور۔ قرآن کریم اس سے روکتا ہے۔

سورۃ نسا میں ہے الَّذِیۡنَ یَخۡتٰنُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ (۴/۱) جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے کہ تم نہ تو نظام خداوندی کے خلاف سازش کرو۔ (لَا تَخۡوۡنُوۡا)۔ اور نہ ہی ان امور میں کسی قسم کی خیانت کرو جو تمہارے سپرد کئے جائیں (۸/۲۸)۔

## خ و ی

خَوَاتِ الْقَدَارِ۔ گھر ویران ہو کر گر پڑا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں خالی ہونا اور گرنا لکھے ہیں۔ اَرْضٌ خَاوِیۡۃٌ۔ ویران زمین\*۔ اَلۡخَوَآءُ کے معنی خالی ہونے کے ہیں\*\*۔ خَوِیَ الْمَکَانُ۔ جگہ خالی ہوئی\*\*\*۔

سورة بقرہ میں ایک بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِرَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (۲۵۹)۔ برباد اور ویران جسکے مکانات گر پڑے تھے۔ یا اس کے مکان؛ باوجود چھتوں کے قائم ہونے کے خالی تھے۔ سورة الحاقہ میں ہے اَعْجَازٌ تَخِلُّ خَاوِرَةٌ (۱۹) اندر سے کھوکھلے ہو کر گر پڑنے والے کھجور کے تنے۔ تباہ و برباد۔

## خ ی ب

خَابَ - يَخِيبُ - خَيْبَةٌ - محروم رہ جانا - نقصان اٹھانا - مایوس ہو جانا - نامراد رہ جانا\* - توقعات کا منقطع ہو جانا - مطلوبہ کو حاصل نہ کر سکتا - محتاج و فقیر ہو جانا\*\* - الْخِيَابُ اس چٹماق کو کہتے ہیں جس سے آگ نہ نکلے۔ (ابن فارس) قرآن میں ہے فَيَنْفُلِبُوا خَائِبِينَ (۱۳۶)۔ ”وہ خامر و نامراد واپس ہو جائیں“۔ قرآن کریم میں خَابَ کا لفظ اَفْلَحَ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اَفْلَحَ کے معنی ہیں کھیتیوں کا پروان چڑھنا ثمر بار ہونا۔ لہذا خَابَ کے معنی ہونگے، بے ثمر رہ جانا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (۹۰-۹۱) جس نے انسانی ذات (نفس۔ Self) کی نشو و نما کی، اس کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ جس نے اسے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشت حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلہ زندگی افسردہ ہو گیا۔ ایسے چٹماق کی مانند ہو گیا جس سے چنگاری نہ نکلے۔ اسی لئے سورة ابراہیم میں خَابَ کی تفسیر هَلَكَ سے کر دی گئی ہے۔ تباہی اور بربادی (۱۴۵)۔ اسمیں اس زندگی کی بربادی بھی شامل ہے (بلکہ یہ تو سب سے پہلے سامنے آ جانی ہے۔ اس لئے انسانی ذات (Self) کی نشو و نما کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں کا حاصل ہو جانا بھی ہے۔ ترک دنیا سے ”روحانی ترقی“ کا خیال غیر مرآئی ہے۔ انسانی ترقی تسخیر کائنات سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی جس میں شعلہ نہ ہو، راکھ کا ڈھیر ہے۔

## خ ی ر

الْخَيْرُ۔ ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو سب کو سرغوب ہو۔ نیز مفید چیز۔ یہ الشَّرُّ کی ضد ہے۔ الْخَيْرُ، ہر قسم کے مال کو کہتے ہیں۔ ہر بگھوڑوں کو بھی ان کی افادیت کے اعتبار سے خَيْرٌ کہتے تھے (۳۸)۔ خَيْرَاتٌ\*۔ خوبصورت و خوش اخلاق عورتوں کو کہتے ہیں\*۔ (یا جن میں بہت سی

خوبیاں ہوں۔ خوبصورتی بھی ایک خوبی ہے)۔ **خِیَارٌ** کے معنی اختیار کے ہیں۔ یعنی اس امر کا اختیار کہ جس چیز کو چاہے لے لے اور جسے چاہے چھوڑ دے (Choice)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ **أَنْتَ بِالْخِیَارِ**۔ تمہیں حسب مرضی کام کرنے کا اختیار ہے۔ **خِیْرَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ**۔ اس نے اُسے اختیار دے دیا کہ وہ دو چیزوں میں سے جسے چاہے لے لے۔ **اِسْتِخَارَةُ** کے معنی ہیں دو باتوں میں سے بہتر کو طلب کرنا۔ چونکہ دو چیزوں میں سے جسے اختیار کیا جاتا ہے وہ بہر حال دوسری چیز سے بہتر ہوتی ہے (یا اُسے ایسا سمجھا جاتا ہے) اس لئے **خِیْرٌ** کا لفظ شرف و برتری، فضیلت و کرم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ **هُوَ خِیْرٌ مِنْكَ**۔ وہ تم سے بہتر ہے، یہ افعِلْ التفصیل ہے۔ **خَارُ الرَّجُلِ جُلٌّ عَلٰی غَیْرِہِ**، **وَ خِیْرَةُ تَخْیِیْرًا**۔ اس نے آدمی کو دوسرے لوگوں پر فضیلت اور ترجیح دی۔ **اِخْتَرْتَهُ عَلَیْہِمْ**۔ میں نے اسے ان سب پر فضیلت دے دی۔ **خَارَةُ**۔ اُس کو چن لیا، منتخب کر لیا۔ **اَلْخِیَارُ**۔ ککڑی کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں **خِیْرٌ** کا لفظ مال و دولت کے معنوں میں متعدد جگہ آیا ہے۔ (مثلاً  $\frac{2}{18}$  و  $\frac{2}{22}$ )۔ **أَدْنٰی** کے مقابلہ میں **خِیْرٌ** ( $\frac{2}{11}$ ) میں آیا ہے۔ **مِثْلٌ**۔ کسی چیز کے مانند۔ اور **خِیْرٌ**۔ اس سے بہتر ( $\frac{2}{16}$ )۔ سورۃ انعام میں یہ لفظ **ضُرٌّ** کے مقابلہ میں آیا ہے ( $\frac{7}{14}$ )۔ سورۃ حج میں **فِتْنَةٌ** کے مقابلہ میں ( $\frac{2}{11}$ ) اور سورۃ بقرہ میں **شَرٌّ** کے مقابلہ میں ( $\frac{2}{16}$ )۔ سورۃ نحل میں یہ لفظ ہر اچھی بات یا اچھے کام کے لئے آیا ہے ( $\frac{11}{16}$ )۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے **بِیْدِکَ الْخِیْرُ** ( $\frac{3}{5}$ )۔ اس میں اختیارات و اقتدار اور ہر قسم کی بھلائیوں کا تصور موجود ہے۔ سورۃ احزاب میں **خِیْرَةُ** کا لفظ اختیار و انتخاب کے معنوں میں آیا ہے ( $\frac{33}{16}$ )۔ کائنات میں جو انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل جاری ہے اس کے لئے **یَخْتَارُ** کا لفظ آیا ہے ( $\frac{2}{18}$ )۔ سورۃ طہ میں حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا **وَاِنَّا اِخْتَرْتُکَ** ( $\frac{2}{13}$ )۔ میں نے تجھے (ایک مقصد عظیم کے لئے) چن لیا ہے۔ منتخب کر لیا ہے۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرام کے لئے **اِخْتِیَارٌ** کا لفظ آیا ہے ( $\frac{38}{2}$ )۔ یعنی منتخب افراد۔ ابن فارس نے کہا ہے **قِسْمٌ خِیَارٌ** اور **اِخْتِیَارٌ** کے معنی ہیں بہت سی صلاحیتوں کی مالک قوم۔

(۵۵) میں خَیْرَاتٌ\* حِیْسَانٌ\*۔ متناسب الاعضاء اور معتدل سیرت و کردار رکھنے والی عورتوں کے لئے آیا ہے ، یا متوازن اور عمدہ خوشگوار اشیاء کے لئے۔ چونکہ زندگی کی تمام خوشگواریاں اور اختیارات و اقتدارات کی وسعتیں وائین خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہیں اس لئے وحی کے لئے بھی خَیْرٌ\* کی جامع اصطلاح آئی ہے (۱۲۵/۱)۔ لہذا مومنین کی زندگی یہ ہے کہ انہیں وحی کے اتباع سے ساری دنیا کی مفید اور حسین چیزیں میسر ہوں اور ان کے اختیارات کی وسعتیں حدود فراموش ہوں۔ یہ ہے خَیْرٌ\* جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لئے سورۃ نحل میں ہے کہ جب مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تو یہی کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے کیا نازل کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں ایک جامع لفظ کہہ دیتے ہیں۔ قَالُوا خَیْرًا (۱۲۵/۱)۔ یعنی تمام دنیا کی خوشگواریاں اور خوشحالیاں اور اختیارات کی وسعتیں۔ اس کی تفسیر اگلے الفاظ نے یہ کہہ کر کر دی ہے کہ رَفِیْ ہٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَةً\* وَكَدًّا رُءُوسًا لِّلْآخِرَةِ\* خَیْرٌ\* (۱۲۵/۱) اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں ، اور مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ لہذا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں ، خیر ہے اور جس کا نتیجہ اس کے برعکس ہو وہ شر ہے۔ خوشگواروں میں انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما (Development) سب سے مقدم ہے۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ خوشگوار کہتے ہی اسے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشو و نما ہو۔ جس سے اس کی نشو و نما رک جائے وہ شر ہے۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اسے وہ اعمال صالحہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوں۔ (دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ ح) سورۃ بقرہ میں حج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَتَزَوَّدُوا قَائِلًا خَیْرًا الزَّادُ التَّقْوٰی (۱۹۷/۱)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم حج کے لئے زاد راہ ضرور لیا کرو۔ اس زاد راہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں بھیک مانگنے سے بچے رہو گے۔ (یہاں خَیْر کے معنی فائدے کے ہیں اور تقویٰ کے معنی محتاجی کی ذلت سے محفوظ رہنے کے۔)

## خ ی ط

الْخَيْطُ\*۔ دھاگہ۔ لڑی\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریکی کے ساتھ دراز ہونے کے ہیں۔ الْخَيْطُ\*۔ الْخَيْطُ\*

مَوْنٌ \* - رَفِی سَمٌ \* - الْخِیَاطُ : سوئی کے ناکہ میں ( ۱۶۴ ) - خَاطَ الشَّوْبَ -  
 لپٹے کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ سی دینا \* - خِیَاطٌ \* -  
 درزی \* -

قرآن کریم میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں الْخِیَاطُ الْاَبْيَضُ  
 وَالْخِیَاطُ الْاَسْوَدُ آیا ہے ( ۱۸۷ ) یعنی سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ -  
 اس سے مراد ہے صبح کی پھٹنے والی روشنی اور رات کی تاریکی \* - اس سے ظاہر  
 ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ لفظی معنی نہیں لئے جائے بلکہ مفہوم کے  
 اعتبار سے مطلب لیا جاتا ہے - اسی بنا پر لطائف اللغة میں الْخِیَاطُ الْاَبْيَضُ  
 کے معنی اَلنُّوْرُ (روشنی) کئے گئے ہیں -

اَلْخِیَاطُ - رنگ کو بھی کہتے ہیں \* - اور جماعت کو بھی \* -

## خی ل

خَالَ - يَخَالُ \* - گمان کرنا - خیال کرنا - خَبَّلَ \* - اندازہ سے معلوم  
 کرنا اور تارنا - خَبَّلَ اَلَيْهَ اَنَّهُ \* - کذا - اس کے وہم میں کوئی چیز ایسی  
 معلوم ہوئی - یعنی کوئی چیز جو درحقیقت ایسی نہ ہو لیکن یونہی متخیلہ میں  
 ایسی دکھائی دے - چنانچہ اَلتَّحَاوُّتُ اَلْمُخَيَّلَةُ اس بادل کو کہتے  
 ہیں جسے تم دیکھنے پر پرستا ہوا خیال کرو - اَلْخَبَالُ ( Scare - Crow ) کو  
 بھی کہتے ہیں - یعنی دو لکڑیوں کے اوپر سیاہ رنگ کا کپڑا ڈال کر اسے آدمی  
 کی شکل دیتے ہیں اور کھیت میں کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ جانور اسے آدمی  
 سمجھ کر کھیت کے قریب نہ آئیں \* - انہی معانی کے لحاظ سے سورہ طہ میں  
 سَاحِرِیْنِ دِرْبَارِ فِرْعَوْنَ کے متعلق ہے کہ انہوں نے رسیوں کو پھینکا تو یَخَبَّلُ  
 اَلَيْهَ \* مِّنْ سِجَرٍ هِیمٌ اَنَّهُمَا تَسْعٰی ( ۲۶ ) ”ان کی نگاہ بندی کی وجہ سے  
 حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں ایسا خیال پیدا ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں“ -  
 یعنی وہ درحقیقت دوڑ نہیں رہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ  
 متحرک ہیں - آپ غور کیجئے کہ قرآن نے سحر ( Magic ) کے متعلق کتنی بڑی  
 حقیقت کا انکشاف کیا ہے - اس نے کہا یہ ہے کہ سحر کے زور سے اشیاء کی  
 ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی - صرف دیکھنے والے کے خیال میں  
 تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اسے وہ اشیاء ایسی نظر آنے لگ جاتی ہیں ، یعنی  
 اس کا اثر محض نفسیاتی ہوتا ہے -



لیکن یہ مفہوم اسی صورت میں لیا جائیگا جب دربار فرعون کے مشربوں کی ”رسیوں اور لٹھیوں“ کو حقیقی معنوں میں لیا جائے۔ اگر ان کے مجازی معنی لئے جائیں تو پھر مطلب اور ہوگا۔ تفصیل ان امور کی اپنے اپنے مقام پر ملیگی۔ (نیز دیکھئے عنوان ص۔ ح۔ ر)

اسی سے خَيَّالَاءُ کے معنی ہیں ایسا غرور جو انسان اپنے اندر یونہی کسی ذہنی بڑائی کی بناء پر پیدا کر لے۔ یعنی وہ بڑائی در حقیقت اس میں موجود نہ ہو لیکن وہ خود فریبی سے ایسا سمجھ لے کہ اس میں وہ بڑائی ہے اور پھر اس پر فخر کرنے لگ جائے۔ ایسا کرنے والے کو مُخْتَالٌ کہتے ہیں۔ (۳۱/۱۸) یعنی خود فریبی میں مبتلا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی ایسی حرکت کے ہیں جس میں تلون بھی شامل ہو۔ خَيَّالٌ اسی سے ہے۔ خَيَّالٌ در حقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان خواب میں دیکھئے۔ ایک تو خواب میں ہر شے متلون ہوتی ہے۔ ابھی کچھ ابھی کچھ۔ دوسرے انسان سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ فی الواقعہ ایسا ہے۔ حالانکہ اسکی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے اس آیت کا مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ساحرین کی سحر طرازی کا ذکر ہے (اور جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ یعنی (۲۶/۲۶)۔

راغب نے کہا ہے کہ اسی سے لفظ خَيَّلٌ (۳۳/۳۳) ہے (یعنی گھوڑے یا گھڑ سواروں کا دستہ۔ (۱۳/۱۳) کیونکہ گھوڑا بھی اپنی رفتار میں اٹھلاتا ہوا چلتا ہے۔ اور گھڑ سوار کے دل میں بھی ایک عجیب قسم کا تکبر سا ہوتا ہے۔

## خ ی م

تَخْيِيمٌ کے معنی ہوتے ہیں خیمے نصب کر کے قیام کرنا۔ عرب اپنے قیام کیلئے جو عارضی سا گھر بنا لیتے تھے اسے خَيْمَةٌ کہتے تھے۔ اسکی ساخت کے متعلق بہت سے اقوال ہیں لیکن عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ چار لکڑیاں کھڑی کر کے ان پر درختوں (جھاؤ وغیرہ) کے پتے ڈال دئے جاتے تھے۔ اسے خَيْمَةٌ کہتے تھے۔ جو خیمہ کپڑے سے بنایا جاتا تھا اسے مِظَلَّةٌ کہتے تھے۔ خَيْشَمُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں اُسے کسی چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دیا۔ \*\*\* خَيْمَةٌ کی جمع خِيَامٌ ہے۔ یہ لفظ (۵۵/۵۵) میں آیا ہے۔ حَوْرٌ مَقْصُورَاتٌ فِی الْخِيَامِ۔

## د

## د ا ب

اَلْقَدَّابُ\* - اَلْقَدَّابُ\* - (کسی کام میں) مسلسل لگے رہنا - لگا تار کوشش کرنے رہنا - تسلسل اور مداومت کی وجہ سے اس کے معنی عادت مستمرہ یا حالت، دستور، طور طریق کے ہو گئے\* - دَاَبُ فُلَانٍ\* - اس شخص نے لگا تار کوشش کی، تھکا اور مصروف عمل رہا\*\* - کتاب الاشتقاق میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ دَاَبُ\* اس کام کے لئے بواتے ہیں جو مسلسل، بلا انقطاع کیا جائے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مداومت کے ہیں -

سورة آل عمران میں ہے کَدَّآبُ اِلٰہِ فِرْعَوْنَ (۳۰) - قوم فرعون کی روش کے مطابق - سورة يوسف میں دَاَبَا (۱۲) کے معنی ہیں بہت زیادہ محنت اور کوشش کے ساتھ مسلسل - سورة ابراهيم میں ہے وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ دَاَبِيَيْنِ (۱۳۸) - سورج اور چاند مسلسل اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں - وہ اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں مسلسل مصروف ہیں -

## داؤد علیہ السلام

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت (نسل) میں سے تھے - وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ (۸۴) - اللہ نے انہیں ایک کتاب (زَبُوراً) - (۱۳۳) دی تھی - (واضح رہے کہ زَبُوراً کے معنی ”ایک کتاب“ ہیں - لیکن سورة انبیاء میں اَلزَّبُورُ بھی آیا ہے - ۲۱۵ - جس کے معنی خاص کتاب کے ہیں - ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ پر نازل شدہ کتاب کا نام ہو) آپ کو علم کی فراوانی عطا کی گئی تھی (۲۱۵) اور محکم سلطنت (۳۸) - تاکہ آپ لوگوں میں حق کے ساتھ حکومت کریں (۳۸) - پہاڑی قبائل کے بڑے بڑے سردار آپ کے مطیع و فرمان پذیر تھے اور آپ کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے (۱۸) - نیز قبیلہ طیر کے خانہ بدوش افراد بھی جن سے سناہی

رسالے (گھوڑوں کے لشکر) مرتب ہوئے تھے (۳۸/۱۹)۔ آپ نے اس سے قبل بنی اسرائیل کے لشکر کے ساتھ جالوت کے لشکر کو شکست دی تھی اور جالوت کو قتل بھی کیا تھا (۲۵/۲۱)۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائیوں میں پہننے کا لباس (زرہ بکتر) آپ کی ایجاد تھی یا آپ کو اس میں خصوصی ملکہ حاصل تھا (۲۱/۸)۔ آپ کا زمانہ اندازاً . . . ق۔ م۔ سمجھنا چاہئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ بڑے خوش آواز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی سدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلات موسیقی ایجاد کئے۔ جب وہ پہاڑوں پر بیٹھ کر اپنا ہر بٹ بجاتے تھے تو شجر و حجر جھومنے لگ جاتے تھے۔ تورات اور ہماری تفسیری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔\*

## د ب ب

دَبَّ النَّعْمَلُ يَدْبُ دَبًّا۔ خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا۔ اس سے دَبَّ الشَّرَابُ فِی الْجِسْمِ کہتے ہیں۔ یعنی شراب کا جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر جانا۔ الدَّبَابَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے۔ ہر رینگنے اور چلنے والا جاندار\*۔ آہستہ رفتار۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس رفتار کو کہتے ہیں جو مَشْيٌ سے خفیف ہوتی ہے۔ الدَّبَابَةُ۔ کھالوں اور لکڑیوں سے بنائی ہوئی ایک بہت بڑی سی محفوظ گاڑی جس میں بیٹھ کر سپاہی قلعہ کی دیوار تک پہنچ جاتے تھے تاکہ اسے توڑ سکیں\*۔ (آجکل ٹینک کو دَبَابَةُ کہتے ہیں)۔ یہ آہستہ آہستہ چلتی تھی اور اس میں بیٹھنے والا دشمن کی زد سے محفوظ رہتا تھا۔ الدَّبَابَةُ۔ سخت زمین پر چلنے سے قدموں کی آواز۔ نیز شور۔ ڈھول بجانا اور ڈھول کی آواز کو بھی کہتے ہیں\*۔

[قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو دب دب کے عنوان کے تحت آنا چاہئے لیکن چونکہ اسے محض ضمنی طور پر لکھا گیا ہے اور قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا اس لئے اسے الگ لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔]

قرآن کریم میں دَابَّةٌ کا لفظ، رینگنے والے جانور، دو پاؤں پر چلنے والے اور چار پاؤں پر چلنے والے جانور، سب کے لئے آیا ہے۔ (۲۵/۲۱)۔ دَابَّةٌ کی جمع دَوَابٌّ ہے۔ سورۃ حج میں یہ لفظ انسانوں کے علاوہ باقی ذی حیات کے لئے آیا ہے (۲۲/۱۸)۔ سورۃ فاطر میں یہ لفظ انسانوں اور مویشیوں کے علاوہ دیگر ذی حیات کے لئے آیا ہے۔ (۳۵/۳۸)۔ سورۃ نحل میں ہے لَوْ يَسُوْا خِذْ اِلٰهَ الْاِنْسَانِ بَطْشًا مِّنْهُمْ سَاَتَرَ كَفَّيْهِمَا مِّنْ دَابَّةٍ يَّزِي

(۳۵/۶)۔ ”اگر اللہ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے، ان کی (فوری) گرفت کرتا تو زمین پر کوئی دابة نہ چھوڑتا،“۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں ”دابة“ کا لفظ خود انسانوں کے لئے آیا ہے کیونکہ انسانوں کے غلط اعمال کی وجہ سے انسانوں کو علاک ہونا چاہئے، نہ کہ دیگر مخلوقات کو بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کی وسعت کو دیکھا جائے تو اس سے مراد، انسان اور دیگر ذی حیات بھی ہو سکتے ہیں۔ سورۃ انفال میں، عقل و خرد سے کام نہ لینے والے انسانوں کو شرّ الدّوا“ ب (۸۴/۶) کہا گیا ہے۔ یعنی چلنے والے جانوروں (یا ذی حیات) میں سب سے زیادہ بدتر۔ یعنی حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ (۱۷۹/۱)۔

سورۃ النمل میں ہے وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنْ اِلَآرْضٍ تَكَلِّمُهُمْ (۲۸۴/۲)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شریر لوگ ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہیں۔ اس طرح یہ لفظ جمع ہو جائیگا\*۔ لیکن جب قرآن نے دَابَّةً کا لفظ انسانوں کیلئے بھی استعمال کیا ہے تو پھر ان شریر انسانوں کی جانوروں کے ساتھ مماثلت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس سے مراد جنگجو قومیں ہونگی۔ اسکی وضاحت تَكَلِّمُهُمْ نے بھی کر دی ہے جسکے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔ لیکن اگر تَكَلِّمُهُمْ کے معنی بات کرنے کے بھی لئے جائیں تو بھی دَابَّةً کے مندرجہ بالا مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (دیکھئے عنوان ک۔ ل۔ م)۔ سورۃ صبا میں حضرت سلیمانؑ کے نالائق (جانشین بیٹے) کیلئے یہ لفظ آیا ہے (۳۳/۱۳)۔ یعنی وہ انسان نہیں تھا، محض حرکت کرنے والا پیکر تھا۔ (تفصیل سلیمانؑ کے عنوان میں ملیگی) سورۃ ہود میں ہے وَمَا مِّنْ دَابَّةٍ فِیْ اِلَآرْضٍ اِلَّا عَلٰی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۱)۔ ”اس زمین میں کوئی دَابَّةً ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو،“۔ دَابَّةً سے مراد خواہ تمام حیوانات (انسان سمیت) ہوں یا صرف انسان، ان سب کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو پھر دنیا میں لوگ بھوک سے کیوں مرتے ہیں؟ ایک قحط میں مرنے والوں کی تعداد لا کھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور عام حالات میں بھی کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اگر انکے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو وہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور نہایت غور طلب۔ (جیسا کہ میں

نے اپنی کتاب ”نظام ربوبیت“ میں تفصیل سے لکھا ہے) ایسے مقامات میں اللہ بی ذمہ داری اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یعنی یہ نظام ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیے لیتا ہے جنکی نسبت (قرآن میں) اللہ کی طرف کی گئی ہے اور اسی طرح وہ حقوق و واجبات بھی، اسکی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جنہیں خدا کے حقوق کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے کی جاتی ہے جو خدا کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اور عَمَلِی اللہ رَزَقْہَا کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ ان تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام کے سرپرست عائد ہو جاتی ہے۔ لہذا نظام خداوندی میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے۔ رزق کے سرچشمے اصلاً اس نظام کی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں اور وہ نظام خدا کے دئے ہوئے رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی متنفس اس سے محروم نہیں رہنے پاتا۔ اس طرح خدا کی ذمہ داریاں خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ ہو تو مستبد قونین رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتی ہیں اور کمزور انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جسے چاہتے ہیں رزق دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ آسمانی انقلاب، رزق کے سرچشموں کو ان کے ہاتھ سے چھین کر، السانیت کی پرورش کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔

سورة شوریٰ میں ہے وَمِنْ اٰیٰتِہِمْ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَاْلَاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا مِنْ دَابَّةٍ - وَہُوَ عَلٰی جَمْعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (۲۴/۲۹)۔ ”اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموات، زمین اور فضائی کروں، کو پیدا کیا اور (جو) ان کے اندر اس نے ذی حیات (دابة) پھیلا دئے ہیں۔ اور وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق انہیں جمع کرنے پر قادر ہے،۔ اس آیت سے آسمانی کروں میں ذی حیات آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ نیز، اب غالباً وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب زمین کی آبادی، آسمانی کروں کی آبادی کے ساتھ مل جائے (دونوں جمع ہو جائیں)۔ قرآن نے انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہ رکھا ہے کہ ارض و سموات میں جو کچھ ہے وہ اس کے لئے تسخیر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اسکی یہ کوشش کہ آسمانی کروں تک جا پہنچے، قرآن، تعلیم کے مطابق ہے۔ ان کروں میں سے جن میں آبادی ہوگی وہ اس طرح زمین کی آبادی کے ساتھ مل جائیگی۔ دیکھا آپ نے کہ انفس و آفاق کی نشانیاں کس طرح قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے چلی جا رہی ہیں؟ (۲۵/۱)۔

## د ب ر

الدَّبَرُ - الدَّبَرُ - ہر شے کا پچھلا حصہ۔ بات کا انجام، نیز اس کے معنی پشت اور متعدد کے بھی کئے کئے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا آخری اور پچھلا حصہ بتائے ہیں۔ جمع ادْبَارٌ - سورۃ قمر میں ھے یٰۤاَنۡرَاسُوۡنَ الدَّبَرَ (۵۷)۔ وہ پیٹھ پھیر دینکے۔ سورۃ یوسف میں ھے مَنۡ دَبَّرَ (۱۲)۔ پیچھے سے۔ سورۃ نمل میں ھے وَلَیۡ مُدَبِّرًا (۲۰)۔ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔

ادْبَارٌ - پیچھے ہٹنا، آخری وقت - ادْبَارَ النَّجْمِ (۵۲)۔ آخر شب میں ستاروں کے ڈوبنے کا وقت \*۔ ستاروں کا پیچھے ہٹنا۔

الدَّابِرُ - ہر چیز کا آخر۔ اصل و بنیاد \*۔ فَتَقَطِّعَ دَابِرَ الْقَوْمِ (۱۵)۔ اس قوم کا آخری آدمی تک بھی ہلاک ہو گیا۔ اسکی جڑ کٹ گئی۔ الدَّابِرُ - الدَّابِرُ - کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھنے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا۔ آخری منزل (مقام تکمیل) کو سامنے رکھ کر نظم و نسق کرنا۔ یٰۤاَبۡرَہٰمَ لَا مَرۡءَیۡ (۳۲)۔ وہ تدبیر امور کرتا ہے۔ اَفَلَا یَتَذَکَّرُوۡنَ الْفُرۡقَانَ (۸۴) ”کیا یہ اس پر غور و فکر نہیں کرتے کہ قرآن کیا کہتا ہے، اور کاروان انسانیت کو کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ سورۃ ص میں ھے لَیۡسَ دَآءِیۡرَکُمۡ اَبۡتَآئِہِ (۳۸)۔ تا کہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔

الْمُدَبِّرَاتِ اَمۡرًا (۷)۔ معاملات کو تکمیل تک پہنچانے والے۔ تدبیر امور کرنے والے۔

سورۃ ق میں ھے فَاَصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ الْغُرُوبِ - وَ مِّنَ اللَّیۡلِ فَسَبِّحۡہُ وَ ادْبَارَ النُّجُوۡمِ (۹۰)۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا ھے کہ تمہارے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس سے مضطرب و بیچین نہ ہو۔ اور خدا کی ربوبیت کو مظہر حمد و ستائش بتانے کے لئے سرگرم عمل رہو۔ طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے۔ اور رات میں بھی اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جلدو جہد کرو۔ اور ادْبَارَ النُّجُوۡمِ میں بھی۔ سورۃ طور کے اخیر میں بھی یہی مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں آیا ھے۔ لیکن وہاں ادْبَارَ النُّجُوۡمِ ھے۔ اس کے معنی ستاروں کے ڈوبنے یا پیچھے ہٹنے کے ہیں۔ لیکن سورۃ

ق میں آد بٹار آیا ہے جو د بُر کی جمع ہے۔ دوسرا لفظ سُجُوْد ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی جھکنے یا مائل ہونے کے ہیں۔ اس سُجُوْد کے آد بٹار کیا ہیں، یہ چیز غور طلب ہے۔ عام تفاسیر اور کتب لغت میں اس کے معنی ”نحاز کے بعد، لکھے ہیں“۔ لیکن یہ معنی جچتے نہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہاں لفظ آد بٹار آیا ہے اِد بٹار نہیں۔ نیز د بُر کسی شے کے آخری اور پچھلے حصہ کو کہتے ہیں جو اس میں شامل ہوتا ہے۔ اور ”بعد“ کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ یا چیز ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی اور واقعہ یا چیز شروع ہو۔ ہم اپنی اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق متعین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

## د ث ر

آلَدَثَرُ - مالِ کثیر یا ہر کثیر شے کو کہتے ہیں۔ مَالٌ دَثَرٌ - بہت زیادہ مال۔ آلَدَثَارُ - وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے۔ تَدَثَرٌ بِالشَّوْبِ - وہ کپڑے میں لپٹ گیا۔ دَثَرُ الشَّجَرِ دَثُورٌ - درخت نے نشے پتے نکال لئے اور اسکی سبز شاخیں پھیلیں۔ هُوَ دَثَرٌ مَالٍ - وہ اونٹوں کی اچھی خبر گیری کرنے والا ہے۔ تَدَثِيرُ الطَّائِرِ - پرند کا اپنے گھونسلے کو درست کرنا۔ نیز آلَدَثُورٌ - مست رنار۔ بوجھل۔ اور زیادہ سونے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ (جو کپڑوں میں لپٹا رہے)۔ اور دَثَرُ الْآثَرِ نشان کے مٹ جانے کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے آ جانا۔ تہ بہ تہ جم جانا۔ یا اوپر چڑھ جانا۔ ان معانی کی رو سے راغب نیز ابن فارس نے اس مادہ کے مختلف استعمالات بیان کئے ہیں جن سے مفہوم کسی کے اوپر چھا جانا ہے۔ مَنَزَلٌ دَاثِرٌ - وہ منزل جس کے آثار (نشانات) مٹ گئے ہوں یا تہ بہ تہ مٹی چڑھ جانے سے چھپ گئے ہوں۔

قرآن حکیم میں نبی اکرمؐ کو يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۹۴) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ آلَدَثَارُ کے اعتبار سے اس کے عام طور پر معنی کئے جاتے ہیں۔ اے کپڑا اوڑھنے والے۔ لیکن تَدَثِيرُ الطَّائِرِ کے مفہوم کی رو سے اس کے معنی ہونگے، گھر کو ٹھیک کرنے والا۔ اور دَثَرٌ مَالٍ کے مفہوم کے پیش

\* لسان العرب - تفسیر فتح القدیر (شوکانی) - تفسیر روح المعانی (الوسی) \*\* تاج -

نظر اس کے معنی ہونگے، اچھی خبر گیری کرنے والا۔ لہذا اس کا یہی مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اے وہ جس کے ذمہ انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ہے۔ یا اے وہ جو نوع انسانی کے معاملات کو حسن تدبیر سے سلجھانے کیلئے آیا ہے۔ اور دَثَرُ الشَّجَرِ کے اعتبار سے معنی ہونگے، اے وہ جسکی آمد سے ایک نئی دنیا وجود میں آنے والی ہے۔ یا جسکی آمد سے جمن عالم پر بہار آنے والی ہے۔ اس مخاطب کے بعد آپؐ سے کہا گیا قُمْ فَاتَذَرُ (۴/۴) ”اٹھ اور دنیا کو غلط روش کے عواقب سے آگاہ کر دے“۔ اس کے بعد اس دعوت انقلاب کے مختلف اجزا کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اَلْمَدَنِيَّة میں انقلاب آفرینی اور نوع انسان کی خیر مگالی کا پہلو نمایاں ہے۔ یہی ایک آسمانی داعی انقلاب کی خصوصیت اور ذمہ داری ہوتی ہے۔ راغب نے جو مفہوم بیان کیا ہے اسکی رو سے اس کے معنی باطل کے ہر تصور اور نظریہ پر چھا جانے والا۔ (غالب آجانے والا) بھی ہو سکتے ہیں۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۲۱/۳) ”تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے“۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے استعمال کی مثالیں دیتے ہوئے کہا ہے کہ تَدَثَّرَ الرَّجُلُ فَرَسَهُ کے معنی ہیں آدمی اپنے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا\*۔ اس میں ”اچھل کر یا اچک کر“ کی خصوصیت قابل غور ہے۔ یہ چیز بتدریج نہیں ہوتی بلکہ یک لخت ہوتی ہے۔ جو انقلاب نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کا طریق (Revolutionary) تھا۔ یعنی انقلاب کا دفعۃً رونما ہو جانا۔ اس کے بعد اب قرآنی تصورات حیات کا غلبہ بتدریج ہو رہا ہے۔ اسے (Evolutionary) طریق کہتے ہیں۔ زمانہ ایک چیز کو لیتا ہے۔ اس کا تجربہ کرتا ہے اور اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صحیح نظریہ وہی ہے جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دیا تھا۔ لہذا اب قرآنی تصورات کا باطل کے تصورات پر غلبہ تدریجاً ہو رہا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس نظام کو لیکر اٹھے یا کوئی مملکت اسے اپنے ہاں نافذ کر کے اس کے انسانیت ساز تعمیری نتائج دنیا کے سامنے لے آئے تو یہ نظام پھر اچک کر، دوسرے نظامہائے حیات پر غالب آ سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت رسول اللہؐ کے اتباع میں تَدَثَّرَ کا یہ عمل خیر کس قوم کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے؟ وہی قوم اس دور میں انسانیت کی سب سے بڑی محسن ہوگی، اسی کے ہاتھوں شجر ہستی کے پھول کھلینگے اور جمن کائنات پر پھر بہار آئیگی۔



تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اَلْمُدَّتِّیْرُ کے معنی ہیں انسانی کمالات اور شرف نبوت سے آراستہ و پیراستہ ہونے والا۔ نیز اس نے کہا ہے کہ اَلْمُدَّتِّیْرُ کے معنی کنایہً ایسے شخص کے ہیں جس کے پاس کوئی پروگرام نہ ہو اور وہ فارغ بیٹھا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہہ کر حضورؐ کو عظیم الشان انقلابی پروگرام عطا کر دیا۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) نے اس کے معنی لکھے ہیں، نبوت اور اسکی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والا۔

عام خیال یہ ہے کہ اَلْمُدَّتِّیْرُ دراصل اَلْمُدَّتِّیْرُ تھا۔ (یعنی تَفَعَّلَ کے خاندان سے)۔ تاء مد غم ہو گئی دال میں۔ اور اس طرح اَلْمُدَّتِّیْرُ بن گیا۔

## د ح ر

اَلدَّحْرُ۔ کسی کو نکال دینا۔ دور کر دینا۔ دھکا دینا۔ ذلت کے ساتھ جبراً نکال دینے کو کہتے ہیں\*۔ سورۃ صافات میں ہے وَیَقْتَدِفُونَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ دُحُورًا (۸۹-۹۰) ”اور ہر طرف سے ملامت کئے جاتے ہیں، دھتکارے ہوئے“۔ دور اور دفع کرنے کے معنوں میں، سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق ہے مَذَّءُومًا مَدْحُورًا (۱۸)۔ ”ذلیل۔ دھتکارا ہوا۔ دور کیا ہوا“۔

## د ح ض

دَحَضٌ۔ اسکی اصلی معنی پھسلنے کے ہوتے ہیں۔ پھر اسکا استعمال کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانے، مٹانے یا باطل کر دینے، کیلئے ہونے لگا۔ کیونکہ دَحَضٌ بَرَجْلِیہ۔ اسوقت بولتے ہیں جب کوئی ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح اپنے پاؤں زمین پر مارتا اور رگڑتا ہے۔ مَكَانٌ دَحَضٌ۔ پھسلنی جگہ کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی ہٹ جانے اور پھسلنے کے لکھے ہیں۔

سورۃ کہف میں ہے لَیْسَ دَحِیضُوْاۤیْمَ الْحَقِّ (۱۸)۔ تاکہ وہ (باطل کے ذریعہ) حق کو اپنے مقام سے پھسلا دیں اور بیکار کر دیں۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔ حَبَّتْهُمْ دَاحِیْضَةٌ (۲۱) انکی دلیل اور دعویٰ (خدا کے نزدیک) بالکل بودا اور بے ثبات ہے۔ سورۃ صافات میں ہے فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ (۳۴)۔ اسکا پاؤں پھسل گیا۔ یا اسمیں طاقت نہ رہی۔ وہ کمزور و ناتوان ہو گیا

## د ح و (ی)

دَحٰی - پھیلا دینا - بچھا دینا - وسیع کر دینا\*۔ دَحَاۤءُ لَمَطَرٌ اَلْحَصَا۔ بارش نے کنکریوں کو بہا دیا۔ دَحٰیۤ اَلْاَیْلَ - اس نے اونٹوں کو ہانکا\*\*۔ مَرَّۤ اَلْفَرَسُۤ یَدُ حَوٍّ دَحَوًّا - گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا مٹی اڑاتا ہوا دوڑا\*\*\*۔ هُوَ یَدُ حَوٍّ یَالْحَجَرَ - وہ پتھر پھینکتا ہے\*\*\*۔ تاج نے اس معنی میں یَدُ حَوٍّ الْحَجَرَ بَیْدَہ لکھا ہے۔

دَحَا کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں اجرام سماوی کی تخلیق کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وَ اَلْاَرْضَۤ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحَاہَا (۱۳۱)۔ ”اور زمین کو اس کے بعد پھینکا۔ اور ہموار کیا،۔ سورۃ انبیاء میں کہا ہے کہ اَنۡ السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضَۤ کَاَنۡتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱)۔ اجرام فلکی (ارض و سما) کا ہیولی پہلے باہمد گر پیوست تھا۔ پھر انہیں الگ الگ کیا گیا۔ اس طرح زمین کے کرہ کا جداگانہ وجود عمل میں آیا۔ پھر اس میں مزید تغیرات سے ہمواری پیدا کی گئی۔ اس حقیقت کو دَحَاہَا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اَرْض (زمین) کو اس ہیولی سے یوں الگ کیا جس طرح گوہے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ یا جیسے بارش کنکریوں کو بہا کر دور لیجاتی ہے۔ یا جیسے گھوڑا گرد و غبار اڑاتا چلا جاتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ آج سے قریب ڈیڑھ ہزار سال پہلے، اجرام فلکی کی تخلیق سے متعلق یہ باتیں وحی کے علاوہ اور کون بتا سکتا تھا؟ نیز بَعْدَ ذٰلِکَ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ اَرْض (زمین) کی تخلیق اس ہیولی کے بعد ہوئی۔ یعنی یہ دوسری اسٹیج تھی۔ پہلے وہ ہیولی وجود میں آجا جو باہمد گر پیوست تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کرے (منجملہ اَرْض) تیزی سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے ”فلک“ میں تیرنے لگے (۳۶)۔

## د خ ر

دَخَرَ - یَدُ خَرَ و دَخِرَ - یَدُ خَرَ - جھوٹا ہونا۔ مطیع ہو کر جھک جانا۔ اَلْدَّخِرُ - جھکنے والا۔ دُخُوْرٌ - ذلت اور کمتری کو کہتے ہیں۔ اَلدَّخَرَ - تحیر کو کہتے ہیں جو عقل کی بیچارگی اور عاجزی کی دلیل ہے۔ اَدُخِرَہ - اس نے اسے ذلیل کر دیا۔ عاجز بنا دیا\*\*\*\*\*۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کہ وہ دَاخِرُوْنَ ہیں (۱۶۸)۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز۔ یہ معانی اس سے ملحوظ

آیت نے واضح کر دئے ہیں جس میں ہے کہ لِیَاشْهَرُ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ  
وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶)۔ ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے  
اللہ (کے قانون) کے سامنے سجدہ ریز ہے،“ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان  
س۔ ج۔ د)۔

انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے، مظاہر فطرت (اشیائے کائنات) کو  
معبود قرار دیکر، انسان کو ان کے سامنے جھکنا سکھایا ہے۔ قرآن کریم نے یہ  
اعلان کر کے کہ تمام اشیائے کائنات ان قوانین خداوندی کے سامنے جھکی  
ہوئی ہیں جن کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے، دنیائے انسانیت میں کتنا  
عظیم انقلاب برپا کر دیا؟

## د خ ل

دَخَلَ یَدْخُلُ۔ اندر داخل ہوا۔ خَرَجَ کی ضد ہے (۱۱۱)۔  
اَدْخَلَ۔ داخل کیا (۱۸)۔ دَاخِلَةٌ اِلَاَرْضٍ۔ وہ چیزیں جو زمین کے اندر  
چھپی ہوئی ہوں۔ اَلَّذِیْ دَخَلَ۔ جو کچھ اپنی جائداد سے آمدنی ہو۔ اَلَّذِیْ دَخَلَ۔  
سکر و فریب، دھوکا، نیز عقلی یا جسمانی ابتری اور فساد کو بھی کہتے ہیں\*۔  
راغب نے اندرونی ابتری اور دشمنی کے لئے بھی دَخَلَ کا استعمال کنایۃً  
بتایا ہے\*\*۔ سورۃ نحل میں ہے تَتَخِذُوْا اٰیْمٰنَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ  
(۹۴) ”تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا موجب بنا لیتے ہو، یہاں دَخَلَ  
کے معنی فساد اور ابتری کے ہیں۔

دَخَلَ بِالْبَرْأَةِ کے معنی ہیں، اس نے ہورت سے مباشرت کی۔ سورۃ  
نساء میں ہے مِنْ نِّسَائِکُمْ اَلَّتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (۳)۔ اس میں اسکے  
معنی مباشرت کے ہیں۔ یعنی ان ہورتوں کے بطن سے جن سے تم زنا شوئی کے  
تعلقات قائم کر چکے ہو۔

سورۃ توبہ میں منافقین کی ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ  
بہ لوگ طوعاً و کرہاً تمہارے ساتھ میدان جنگ میں آتو گئے ہیں لیکن  
ان کی حالت یہ ہے کہ لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغْرَاتٍ اَوْ مَدْخَلًا  
لَّوَلَوْ اَلِیْہِمْ یَجْمَعُوْنَ (۹) اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا (چھپنے  
کے لئے) غار یا گھسنے کے لئے کوئی مقام مل جائے تو یہ بدحواسی سے اسکی  
طرف بھاگ نکلیں۔ یہاں قرآن کریم نے مَدْخَلًا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ باب

افتعال سے ہے جس کے خواص میں کسی کام کو پورا زور لگا کر بہ مشقت کرنا داخل ہے۔ اس باب کے انتخاب سے قرآن کریم نے ان کی بدحواسی اور میدان سے بھاگ نکلنے کی شدت آرزو کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یعنی اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی چھپنے کی جگہ بھی آجائے تو یہ اس میں گھسنے کی کوشش کرینگے خواہ اس میں کتنا ہی زور کیوں نہ لگانا پڑے۔

## د خ ن

الدُّخَانُ - دھواں - دَخَنَ الدُّخَانُ دُخُونًا - غبار بلند ہو گیا \*۔  
دَخَنَ الدُّخَانُ - فتنہ کو ظاہر کرنا اور ہر انگ پختہ کرنا \*\*۔ خُلِقَ دَاخِنٌ -  
خراب اخلاق - الدُّخَانُ - قحط سالی، خشک سالی، اور بھوک کو بھی کہتے ہیں  
کیونکہ بھوک آدمی کو بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے اور آسمان کے درمیان  
دھواں سا نظر آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بھوک کو دُخَانٌ اسلئے کہتے  
ہیں کہ خشک سالی میں زمین سے غبار اڑ کر آسمان میں دھواں سا بن جاتا  
ہے۔ الدُّخَانُ - شر، خرابی اور ابتری کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ يَوْمَ  
دَخْنَانٍ - سخت گرمی اور مصیبت کا دن \*\*۔

قرآن کریم میں ہے کہ اَرْضٌ كُودٌ مَرَّاحِلٌ مِّنْ يُّدَا كِيَا - ثُمَّ  
اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۲۱) - پھر وہ دیگر اجرام فلکی کی  
طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ بالکل دھوئیں (گیس) کی حالت میں تھے۔ مائنس  
کے انکشافات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں جسے قرآن کریم نے اتنا  
عرصہ پہلے بیان کیا تھا۔ اجرام سماوی کے اولین ہیولے (Nebulae) کو  
ایسا ہی بتایا جاتا ہے۔

سورة دخان میں ہے۔ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (۲۳)  
(۲۴) - جب ماری فضا میں گرد و غبار (یا دھواں) پھیل جائیگا۔ جب مصائب  
و آلام عام ہو جائیں گے۔ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل جائیگا۔ یا بھوک اور قحط  
کی وجہ سے آسمان دھواں ہی دھواں نظر آئیگا۔ یہ عذاب الیم ہوگا  
(۲۵) -

## د ر ا

دَرَاةٌ - يَدْرُوهُ - دَرَاةٌ - دفع کرنا - رد کرنا \*\*۔ سختی سے ہٹانا \*\*\*۔  
دَرَاةٌ عَلَيْهِمْ دُرُوءًا - یکایک کسی کے سامنے نمودار ہو جانا - جَاءَ

\* تاج - محیط - راغب - \*\* تاج \*\*\* محیط۔

السَّقِيلُ دَرَّاءٌ - سیلاب کہیں دور سے آگیا، نہ معلوم کہاں سے یکایک آگیا\*۔  
دَرَّاءُ تَهْ عَثْبِي - میں نے اسے اپنے پاس سے ہٹایا (۱۶۷)۔ مَدَّارُ آةٍ\* -  
کے معنی مخالفت اور مدافعت کے ہوتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ يَسْـَٔدُّ رَوْعًا عَنْهَا الْعَذَابُ (۲۴)۔ ”یہ بات عورت سے سزا کو دفع کر سکتی ہے“۔ اس سے اس کی سزا رک سکتی ہے۔ سورۃ قصص میں ہے وَ يَسْـَٔدُّ رَوْعًا وَنَ بِالْحَسَنَةِ السَّقِيَّةُ (۲۸)۔ حسنات کے ذریعہ سقیات کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر، متنوع اسالیب سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور مؤثر تر تعمیر سے ہوتی ہے۔ آپ کمزور ہیں اس لئے ہر قسم کے تخریبی جراثیم آپ پر غالب آجاتے ہیں اور آپ بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیں۔ اس طرح آپ کی تخریب رک جائیگی اور تعمیر کا سلسلہ آگے چلیگا۔ زندگی کے ہر گوشے میں، تخریب کی مدافعت کا یہی صحیح طریق ہے۔ اسی کو ”نیکوں کا پلڑا جھکنا“ کہتے ہیں۔ تَدَّارُ عَوَا فِي الْخُصُومَةِ - کے معنی ہوتے ہیں جھگڑے میں ایک دوسرے کو دھکا دینا یا بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا اور اس طرح باہم اختلاف کرنا\*۔ یعنی ایک کا کہنا کہ یہ اس نے کیا ہے اور دوسرے کا کہنا کہ نہیں اس نے کیا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (۲۴) میں آیا ہے۔ یعنی فَادَّارُ عَوَا تَمَّ فِيْهِمَا - اہل لغت کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں تَدَّارُ آتَمَّ تھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک الگ باب ہے جسے قرآن کریم نے تو استعمال کیا ہے لیکن صرفیوں نے اسے الگ شمار نہیں کیا۔

## درج

دَرَجٌ - چلنا۔ بہت آہستہ آہستہ، کھسک کھسک کر چلنا\* اوپر چڑھنے والے کی طرح چلنا\*۔ مَدَّ رَجَسَهُ الطَّيْرُ بِقٍ - راستے کا واضح اور کھلا حصہ۔ دَرَجُ الْقَوْمِ\* - (آہستہ آہستہ) قوم ختم ہو گئی اور اس کی نسل باقی نہ رہی\*، قرآن کریم میں ہے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۱۸۲)۔ اس کے مہنے یہی ہیں کہ ہم انہیں یوں اس طرح آہستہ آہستہ پکڑ لینگے اور ختم کر دینگے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ تباہی کہاں سے آگئی۔

دَرَجَ الشَّيْءِ - اس نے چیز کو تہ کیا اور لیٹ لیا۔ اَلدَّرَجُ - وہ چیز جس پر کچھ لکھا ہوا ہو۔ دَرُجُ الْكِتَابِ - کتاب کی تہ\*۔

اَلدَّرَجَةُ - سیڑھی کا ایک ڈنڈا (Step) (دَرَجَاتُ اوپر کی طرف لے جانے والے ڈنڈے (Steps) اور دَرَكَاتُ نیچے کی طرف لانے والے\*\*)۔ راغب نے کہا ہے کہ مَنَزِلَةٌ اور دَرَجَةٌ تقریباً ایک ہی چیز ہے۔ لیکن مَنَزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو دَرَجَةٌ اس وقت کہتے ہیں جب اس پر چڑھا جا رہا ہو۔ نیز دَرَجَةٌ سے بلند منزلت بھی مراد لی جاتی ہے۔ اسی اعتبار سے دَرَجَاتُ کے معنی مراتب ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر طبقات۔ اَلْعَمَدُ اَرَجُ - پہاڑی راستوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر ہر موڑ کے بعد راستہ اور بلند ہو جاتا ہے۔ ان موڑوں کو اَلْعَمَدُ اَرَجُ کہتے ہیں\*۔ مجاہدین کے متعلق فرمایا کہ انہیں قَاعِدِیْنَ (بیٹھے رہنے والوں) پر دَرَجَةٌ حاصل ہے (۹۵)۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ مجاہدین اور مہاجرین اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ (۲۹) ”اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ“ رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کے متعلق ہے کہ وَ لَتَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْہِہُنَّ بِاَلْمَعْرُوفِ (۲۲۸)۔ عورتوں کے لئے، از روئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ بلحاظ حقوق و قرائض ان میں کسی کو کسی پر افضلیت نہیں۔ دونوں مساوی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہے وَ لِّلرِّجَالِ عَلَیْہِہُنَّ دَرَجَةٌ (۲۲۸)۔ مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں موجود ہے۔ طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی میعاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن مرد کے لئے عدت کی کوئی قید نہیں۔ نیز اگر طلاق مرد کی طرف سے ہو اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی مطلقہ بیوی کو پھر سے اپنی زوجیت میں لاسکتا ہے۔ وَ بُعُوْلَتُّہُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّہُنَّ رَفِیْ ذَالِکَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا (۲۲۸)۔ یہ ہے وہ بات جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں رعایت یا دَرَجَةٌ (ایک فضیلت) حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کے سلسلہ میں ہر جگہ

”عَلَيْهِنَّ“ نمایاں طور پر دکھائی دیگا۔ یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہونگے اور عورت کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں۔ عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کر سکیگی۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کریم کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے۔ اور اس باب میں دونوں برابر ہیں۔ جس قسم کے مردوں کے حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ)۔ انسان کی عمرانی اور معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب ہے جو ان چار لفظوں کی رو سے پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور کس قدر جامع ہیں یہ چار لفظ۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ اس کے بعد بِالْمَعْرُوفِ کہہ کر اس کی بھی صراحت کر دی کہ یہ بات کسی فرد یا معاشرہ کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی گئی۔ اس کی (Provision) قانون خداوندی میں کر دی گئی ہے۔ اسی قانون (قرآن کریم) نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بات کیا ہے جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک فوقیت (دَرَجَةٌ) حاصل ہے۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت کی طرف سے جو فرائض مرد اور عورت پر عائد ہوتے ہیں وہ بھی یکساں ہیں۔ تقسیم عمل کے لحاظ سے فطرت نے مرد اور عورت کی تخلیق میں فرق رکھا ہے۔ اس لئے جو فرائض عورت کے ذمے عائد کئے گئے ہیں انہیں عورت کو سرانجام دینا ہوگا اور جو مرد کے ذمے ہیں انہیں مرد کو۔ عورت کا مختص فریضہ جسے مرد ادا نہیں کر سکتا، اولاد کی پیدائش اور تربیت ہے۔ اور چونکہ اس میں عورت کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اس لئے کسب معاش کا فریضہ مردوں کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النَّسَاءِ (۲۳۶)۔ کے یہی معنی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر ملیگی)

## در

اَلْقَدَرُ۔ دودھ (لیکن اس میں موٹی دھار کا تصور اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے) اَلِدَّرَّةُ۔ دودھ کی فراوانی۔ اِسْتَدْرَ اللَّبَنُ۔ دودھ کثیر ہو گیا۔ دَرَّتِ السَّمَاءُ بِالنَّمَطِ۔ آسمان سے بکثرت (موسلا دھار) بارش برسی۔ ایسے موسلا دھار برسنے والے بادل مید رَارٌ کہلاتے ہیں۔ (۱/۱۰۰)۔ دَرَّ السَّيْرَاجُ۔ چراغ خوب روشن ہو گیا۔ کَتَبَ دُرِّيٌّ۔ چمکدار روشن ستارہ\*۔

جسمیں سے نور کی ندیاں روان ہوں (۲۳/۳۵)۔ یہ لفظ دُرَّةٌ\* (ایک موتی) میں بائے نسبتی لگا کر بنایا گیا ہے۔ یعنی موتی جیسا۔ صاحب محیط نے کہا ہے اَلْقَدَرُ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی دوسری چیز سے پیدا ہونے کے ہیں\*۔ جیسے، جانور سے دودھ۔ چراغ سے روشنی۔ تارے سے چمک۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے پیدا ہونا ہیں۔ نیز حرکت و اضطراب۔ اس سے دودھ کی دھار اور ستارے کی جھلملاتی روشنی کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ نے اپنے نور ہدایت (قرآن کریم) کو، کَوْنُ کَوْنٍ دُرِّیٍّ (۲۳/۳۵) سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ایسا ستارہ جس سے علم و بصیرت کی کرنیں، اس ندی کی طرح رواں ہوں جس میں جمود نہ ہو بلکہ پیہم حرکت ہو۔ یہ نور علم خداوندی سے پیدا ہو اور دنیا میں روشنی پیدا کرتا چلا جائے۔

## درس

دَرَسَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کوئی چیز پرانی ہوئی اور اس کا نشان مٹ گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مخفی ہونا، پست ہونا اور مٹنا ہیں۔ دَرَسَهُ الْقَوْمُ۔ لوگوں نے اس کے نشان کو مٹا دیا۔ طَرَبْتُ مَدْرُوسًا\* اس راستے کو کہتے ہیں جو لوگوں کی کثرت آمد و رفت کی وجہ سے پٹ کر دب گیا ہو۔ اسی طرح دَرَسَ الْحَبِطَةُ کے معنی ہیں گیہوں کو گاہ دینا۔ گیہوں (یا دوسرے اناج) کی بالوں کو زمین پر بچھا کر اس پر بیلوں کو مسلسل اور متواتر چلائے رہتے ہیں جس سے بھوسہ اور اناج الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسے گاہنا کہتے ہیں۔ لہذا دَرَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گھسنا یا ملنا کہ اس کا نشان مٹ جائے۔ اسی سے دَرَسَ التَّنَاقُطُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع و منقاد ہو جائے۔ اَلْمُدَّارُ سَتَہُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کیلئے پیہم مشقت کرنا یا اس کی خبر گیری کرنا\*\*۔ اور دَرَسَ الْكِتَابَ بِدَرَسٍ\* کے معنی ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ ازبر ہو جائے\*\*\*۔

سورة آل عمران میں ہے يَمَّا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۳۹) کتاب کو اس طرح گاہنا کہ اس کے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آجائیں۔ اس پر مسلسل غور و فکر کرنا تا کہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں وہ نکھر کر سامنے آجائیں۔ یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں۔



سورة انعام میں درِ آستہ کا لفظ آیا ہے (۱۵۷)۔ یعنی نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرنا۔ وَاِنْ كُنْتُمْ اَعْتَدْتُمْ لِقَائِهِمْ لَتُغْفِلِينَ (۱۵۷)۔ ہم ان کے مطالعہ کرنے سے یقیناً بے خبر تھے۔

## دری

اَلْقَدَرُكَ۔ کسی کا پیچھا کر کے اس سے جا ملنا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اسے جا پکڑنا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ سورة طہ میں ہے لَا تَخَافُ دَرَكَ (۲۰)۔ ”تجھے اسکا ڈر نہیں ہوگا کہ فرعون تجھے پیچھے سے آکر پکڑ لیگا،۔ سورة شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اِنَّا لَمُدْرِكُوْنَ (۲۱)۔ ”بس ہم پکڑے گئے،۔ فرعون کے لشکر نے ہمارا پیچھا کر کے ہمیں پکڑ لیا۔ تَدَارُكَ۔ کسی سے جا کر مل جانا۔ اسے پا لینا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اس میں یکے بعد دیگرے پہنچتے رہنے کا تصور ہے۔ مثلاً۔ سورة قلم میں ہے لَتَوَلَّآ اَن تَدَارِكَہُ نِعْمَہُ (۲۹)۔ اگر (اسکے رب کی) نعمت اس تک نہ پہنچ جاتی۔ یعنی اس (حضرت یونسؑ) پر مختلف واقعات گزرتے رہے لیکن خدا کی نعمت مسلسل اور متواتر اس کے شامل حال رہی۔ اَلدَّرَاکُ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے مسلسل اَنَّا۔ اَلتَّدْرِیْکُ مِّنَ الْمُعْطَرِّ۔ بارش کا یکے بعد دیگرے مسلسل گرنا\*۔ اَلدَّرَاکُ وَالْقَدَرَاکُ۔ کسی چیز کی گہرائی کا آخری حصہ۔ تہ۔ اَلْقَدَرَاکُ۔ دَرَجٌ کے مقابل میں آتا ہے۔ سیڑھی کے ڈنڈوں کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے دَرَجَاتٌ کہتے ہیں اور نیچے اترنے کے لحاظ سے دَرَکَاتٌ\*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت کے مراتب و منازل کو دَرَجَاتٌ کہا ہے۔ اس کے برخلاف جہنم کے منازل کو دَرَکَاتٌ۔ فی الدَّرَاکِ اَلْمُسْفِلِ مِّنَ النَّارِ (۱۶۵) جہنم کی سب سے نچلی تہ۔ غور کیجئے۔ سیڑھی وہی ہوتی ہے اور اس کے ڈنڈے بھی وہی۔ جو شخص اوپر چڑھنا چاہتا ہے سیڑھی اسے بلندی تک پہنچاتے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جو نیچے اترنا چاہتا ہے، وہی سیڑھی اسے ہستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کا موجب ہو جاتی ہے۔ زندگی ایک ہی ہے۔ جو اسے جس انداز سے بسر کرنا چاہے یہ اسے اسی انداز کی منزل تک پہنچاتے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اَدْرَاکَہُ : اسے جا لیا، پا لیا۔ اَدْرَاکَہُ بِصَمَرِی۔ میں نے اسے نگاہ سے پا لیا۔ دیکھ لیا\*۔ اسی اعتبار سے اَدْرَاکُ اس علم کو کہتے ہیں

جو محسوسات (حواس) کے ذریعہ حاصل ہو۔ سورۃ یونس میں ہے حَتَّىٰ إِذَا  
 أَدْرَاكَهُ الْغَرَقُ (۱۰:۹۶) ”جب اسے غرق ہونے نے آلیا،۔ یعنی جب اسنے  
 اپنے غرق ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جب اسنے محسوس کر لیا  
 کہ وہ غرق ہو چلا ہے۔

أَدْرَاكَ الشَّيْءِ۔ چیز اپنے وقت کو پہنچ گئی اور مکمل ہو گئی۔  
 انتہا کو پہنچی\*۔ قرآن کریم میں ہے بَلْ أَدْرَاكَ عَلَيْهِمْ فِي  
 الْآخِرَةِ (۲۹:۲۹)۔ اہل لغت نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کا  
 آخرت کے متعلق علم ختم ہو گیا۔ یہ اسکی حقیقت کو نہ پا سکے۔ اس سے بے  
 خبر رہے\*۔ راغب نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے  
 اس کے معنی یوں بھی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں جا کر اس بات کا علم  
 ہو جائیگا\*\*۔ لیکن ہمارے نزدیک ان معانی کی رو سے آیت کا مطلب واضح  
 نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ بات بنتی نہیں۔ اِدْرَاكَ کے معنی ہیں کسی چیز  
 کا مسلسل اور پیہم اسطرح آگے چلنے آنا کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے  
 سے ملا ہوا ہو۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ان لوگوں  
 کو مسلسل اور پیہم علم پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ان کے  
 بارے میں شک و شبہ میں ہیں بلکہ اندھوں کی طرح تاریکی میں۔ بَلْ هُمْ  
 فِي شَكٍّ مِّنْهَا۔ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ (۲۹:۲۹)۔

## د ر ہم

أَلِدْرَاهِمُ۔ ایک چاندی کے سکے کا نام ہے۔ اسکی جمع دَرَاهِمُ ہے۔  
 یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اسکی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے  
 یونانی\*۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رومی لفظ (Drawbrug) کا معرب ہے۔  
 اسطرح دینار (Dinarins) کا، اور فلس (Fails) کا۔  
 سورۃ یوسف میں ہے دَرَاهِمُ مَعْدُودَةٌ (۱۲:۲۰)۔ (انہوں نے حضرت  
 یوسفؑ کو) چند درہموں کے عوض (بیچ دیا)۔

## دری

دَرَيْتُهُ۔ میں نے اسے جان لیا۔ (۲۰:۱۹)۔ أَدْرَاهُ بِہم۔ اس کو اس  
 کے متعلق بتلایا\*۔ دَرَايَا کے معنی ہیں کسی قسم کی کوشش یا تدبیر سے  
 معلوم کرنا یا ایسی چیز کو معلوم کرنا جس میں پہلے شک ہو۔ یہی وجہ ہے

کہ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا ہیں۔ نیز کسی چیز میں تیزی۔ چنانچہ مید رئی کنگھی کو کہنے میں کیونکہ اس کے دندانون میں نکیلان اور تیزی ہوتی ہے۔ (اس سے در رائتہ میں طلب و قصد کے ساتھ، تیزی فہم کا تصور بھی ہو سکتا ہے)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں مَا آدُرَاکْتَ (تجھے کیا خبر ہے یا تجھے کس نے آگاہ کیا) آیا ہے اس کے بعد اس چیز کی ہمت یاں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۴۰)۔ لیکن جہاں جہاں مَا یَدُرُّ رِیْکَ (تجھے کیا چیز بتاتی ہے) آیا ہے وہاں اس چیز کے بعد اس کے متعلق یاں نہیں کیا گیا\*۔ بلکہ اس کے بعد لَعَلَّ (شاید) کہہ کر، پیش نظر بات کہی گئی ہے (دیکھئے ۲۲/۱۳ و ۳۳/۸۰)۔ یعنی مَا آدُرَاکْتَ کے بعد بات کا علم یقینی طور پر دے دیا گیا ہے لیکن مَا یَدُرُّ رِیْکَ کے بعد کہا ہے کہ شاید (یا ہو سکتا ہے) کہ یہ اس طرح ہو جائے۔ مثال کے طور پر سورۃ القدر میں پہلے کہا گیا ہے کہ وَمَا آدُرَاکْتَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ (۱۴۰)۔ ”تجھے کیا خبر کہ لیلۃ القدر کیا ہے“ اس کے بعد باقی آیات میں لیلۃ القدر کے متعلق مزید صراحت ہے۔ اس کے برعکس سورۃ شوریٰ میں ہے۔ وَمَا یَدُرُّ رِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ (۲۲/۱۳) ”تجھے کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو“

ان مثالوں سے مَا آدُرَاکْتَ اور مَا یَدُرُّ رِیْکَ کے استعمال کا فرق سامنے آ جاتا ہے۔

## د س ر

دُسْرٌ - دَسَارٌ کی جمع ہے۔ دَسَارٌ کے معنی کیل یا میخ کے ہیں۔ دُسْرٌ کے اصلی معنی سختی اور زور سے دھکا دینے کے ہیں\*\*۔ دَسْرَ الدِّسَارِ - کیلوں کو زور سے ٹھونکا۔ ویسے الدِّسَارُ کھجور کے ریشے کی رسی کو بھی کہتے ہیں جس سے کشتی کے تختوں کو آپس میں باندھا جاتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الدِّسَارُ کے یہ معنی خلاف قیاس ہیں۔ دَسْرَاءُ خود کشتی کو بھی کہتے ہیں\* اس لئے کہ وہ پانی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ قرآن کریم میں کشتی حضرت نوحؑ کو ذَاتِ الْوَاحِ وَ دَسْرٍ (۵۲/۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی کشتی۔ اگر دُسْرٌ

سے مراد میخیں ہی ہیں (ریشوں کی رسی نہیں) تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا زباناں وہ تھا جس میں دھات کا استعمال ہوئے لگ گیا تھا اور کشتیاں محض درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر لینے سے نہیں بنا لیتے تھے بلکہ تختوں اور میخوں سے بنائی جاتی تھیں۔ لیکن کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں نہ بھی ہے کہ اسے خدا کی زیر نگرانی، اس کی وحی کے مطابق بنایا گیا تھا (۱۱۱)۔ ممکن ہے اُس زباناں میں اس قسم کی صنعتی نادرہ کاری کا علم بھی (پہلے پہل) وحی کے ذریعے دیا جاتا ہو اور پھر اسکا استعمال عام ہو جاتا ہو۔

تاریخ انسانیت سے پردے اُٹھ جانے سے نہ معلوم کیا کیا حقائق سامنے آئیں گے، اور کتنی ایسی چیزیں، جن کے متعلق آج یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عقلِ انسانی نے کی تھی، وحی کی رہیں منت متحقق ہونگی؟

## د س س (د س و)

الدس۔ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے نیچے چھپا دینا یا دبا دینا۔ دفن کر دینا\*۔ راغب نے اس کے معنوں میں مجبور کرنے کا اضافہ کیا ہے۔ یعنی کسی چیز کو بزور کسی چیز کے اندر داخل کر دینا\*\*۔ دَسَسْتُ الشَّيْءَ فِي الشَّرَابِ۔ میں نے اس چیز کو مٹی میں چھپا دیا\*۔ سورۃ نحل میں ہے کہ جب (جاہلیتِ عرب میں) انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو وہ سوچتے کہ آمٌ بَدَسُّهُ فِي الشَّرَابِ (۱۶)۔ ”یا وہ اسے زمین میں دفن کر دے“۔ سورۃ شمس میں نفسِ انسانی کے متعلق ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۱۱)۔ ”جس نے اس کی نشو و نما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا“ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَمَّسَهَا (۱۱)۔ ”جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام رہا“۔ کھیتی (أَفْلَحَ) کی نسبت سے بیج کی مثال کو سامنے لائے۔ اس کی برومندی کے لئے اسے مٹی میں ملانا پڑتا ہے۔ اگر پانی۔ مٹی۔ ہوا۔ حرارت۔ روشنی کا تناسب صحیح ہو تو بیج کی صلاحیتیں نشو و نما پالیتی ہیں۔ وہ شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے۔ کونپل بن کر ابھرتا ہے اور تناور درخت کی شکل میں فضا میں جھومتا ہے۔ لیکن اگر اسی بیج پر مٹی زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو اس کی تمام صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ انسانی ذات میں بڑھنے سے پھولنے اور پھلنے کی صلاحیتیں مضمر کردی گئی ہیں۔ لیکن ان صلاحیتوں کی نشو و نما (موجودہ سٹیج پر) مادی دنیا کے اندر ہوتی ہے۔

اگر مادی قوتوں سے مناسب کام لیا جائے تو انسانی ذات کی مضر صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ مفاد پرستیوں کے بوجھ کے نیچے دب جائے تو اس کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

دَمْعٰی اصل میں دَمَسَّ تھا۔ چونکہ تین سین کا یکجا جمع ہونا گراں گزرتا ہے اس لئے اسے دَمْعٰی بنا دیا۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ اس سے مراد بخل ہے۔ کیونکہ بخیل آدمی اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور سخی اپنے آپ کو نمایاں اور کھلا ہوا رکھتا ہے۔ یہ معنی اس اعتبار سے (ایک گونہ) صحیح ہیں کہ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کی نشو و نما کا راز اعطی (دوسروں کو دینے) میں بتایا ہے اور بخل کو اس کی تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ فَامَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرِی۔ وَامَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرِی (۱۲۰:۶)۔ اسی کو ربوبیت کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں کی پرورش سے اپنی ذات کی نشو و نما کرنا۔ اور یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہی ہے۔

چھپانے کے اعتبار سے الدَّسِيسَةُ اس مکر و فریب کو کہتے ہیں جو چھپا ہوا ہو۔ مخفی طور پر داخل ہونے والی چیز\*\*۔

اہل لغت نے دَمْعٰی میں دَمْعٰی کا مادہ د۔ س۔ و یا د۔ س۔ ی بھی بتایا ہے۔ ان مادوں کے بنیادی معنوں میں یکسانیت کی وجہ سے ہم نے دَمْعٰہ اور دَمَاسَہ کو ایک ہی عنوان کے تحت دیدیا ہے۔

## د ع ع

الدَّعِیُّ - سختی کے ساتھ دھکا دینا۔ دَاعٍ دَاعٍ - بکریوں کو ڈانٹنے کی آواز۔ الدَّعَاعُ - آدمی کے چھوٹے بال بچے\*۔ (جن کی وجہ سے اسے دھکے کھانے پڑتے ہیں)۔

قرآن کریم میں ہے قَدْ اِلَیْكَ الدَّیُّ یَدْعُ اِلَیْتِیْم (۱۴۰)۔ ”یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے“۔ سورۃ طور میں ہے۔ یَوْمَ یُدْعَوْنَ اِلٰی نَارٍ جَہَنَّمَ دَعَاً (۱۴۰)۔ ”جس دن یہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھکیلنے اور اضطراب کے ہیں۔

سورة الماعون کی مذکورہ بالا آیت (۱۰۶) پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے  
سورة کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِاللَّذِّينِ  
(۱۰۶) ”کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا  
ہے؟“ کون ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہیگا کہ دین کی تکذیب کون  
کرتا ہے؟ اس کا جواب اگلی دو آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ فَذَٰلِكَ الَّذِي  
يَدْعُ الْيَتِيمَ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۱۰۷)۔ ”یہ  
وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب  
نہیں دیتا،۔ آپ نے غور کیا کہ دین اور معاشیات میں کتنا گہرا تعلق  
ہے؟ بلکہ صلوة اور معاش میں بھی؟ اس لئے کہ اگلی آیات میں یہ کہا گیا  
ہے کہ ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلوة کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ  
نماز کے محسوس و سرئی، ارکان کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن رزق کے ان  
سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح، روان، دواں ہر ایک ضرورت مند تک  
پہنچنا چاہئے، بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں ملیگی)۔

## د ع و

دَعَا کے معنی کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں۔ چنانچہ الدَّاعِيَةُ۔  
اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے۔  
الدَّاعِيَةُ۔ جنگ۔ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں۔ هُوَ مَنِّي  
دَعْوَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی  
کی آواز پہنچ جاتی ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں  
کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا۔

دَعَاہُ إِلَى الْأَمِيرِ کے معنی ہیں وہ اسے امیر کی طرف لے گیا۔  
اس اعتبار سے دَاعٍ صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی  
کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کی طرف لے جائے\*۔ اِدْرِعَاہُ۔  
(يَدْعُوْنَ) کے معنی تمنا کرنے کے ہیں\*۔ یا کسی چیز کو پکار پکار کر  
بلانے کے (۱۰۸)۔

تَدَاہَوُا عَدُوِّيہ کے معنی ہیں وہ اس کے خلاف جمع ہو گئے۔ اور  
تَدَا عَلٰی عَدُوِّيہ الْعَدُوِّ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ کے معنی ہیں دشمن نے  
ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ تَدَا عَتِ الْحَيَّطَانِ کے معنی ہیں  
دیواریں یکے بعد دیگرے گر پڑیں\*۔

دَعَوْتُهُ زَبَدًا - میں نے اسکا نام زید رکھ دیا - اَللّٰدَعِيّ - وہ لڑکا جسے متبنی بنا لیا جائے\* - (اسکی جمع اَدْعِيَاءُ ہے (۳۳/۳)۔

اَللّٰدَاعِيَّةُ - اس دودھ کو کہتے ہیں جسے تھنوں میں اسٹھے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسکے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جاسکے\* - نیز سبب یا باعث۔ اَلتَّدْوَاعِيّ - ان چیزوں کو کہتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اسکے اندر ہیجان پیدا کر دیں\*\* - (ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے دُعَاءُ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے)۔

وَاَدْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ (۲/۱۸۳) کے معنی ہیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ۔ سورۃ کہف میں نَادَى اور دَعَا دونوں مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۵۲/۱)۔ سورۃ اعراف میں دَعَا کے مقابل میں صَحَّت کا لفظ آیا ہے (۱۹۳/۶) جسکے معنی چپ رہنے کے ہیں۔ لہذا دَعَا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ہوئے۔

سورۃ بقرہ میں ہے قَادُعٌ لِّتَارِيْكَتٍ (۲/۱۱)۔ جسکے معنی ہیں ہمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار۔ اَللّٰدَعُوْی - پکار۔ مطالبہ۔ تقاضا۔ (۱/۱۰)۔

اب ہمارے سامنے دُعَا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لاحق ہو جاتے ہیں۔ یہ گوشہ ہے ”خدا سے دعا مانگنے“ کا۔ ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہوگی یا فتح۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دیکا اور زید مقدمہ ہارنے کے بجائے جیت جائیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا

رہتا ہے۔ یعنی خدا، انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے، خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

اور اگر خدا سچے کے حق ہی میں فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے، تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ خدا کو بہر حال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ہوا۔

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز نہ سہی، جائز ہی سہی۔ کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائیگا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ سب بیکار ہوگا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ۔ تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کریگا اور کس کی رد کریگا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذہب\* اور فلسفہ

\* مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔



صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ۔

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَسَنُتَجِدَنَّ لِسَنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۴)۔ ”تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائیگا،“۔

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جس قدر کوشش کریگا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔ لَيْتَسْ لِّلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔ وَآنَ مَعْنِيهِ سَوْفَ يَرَى (۵۳/۳۹) ”انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے۔ اور اسکی کوشش کا نتیجہ بلا تاخیر سامنے آ جائیگا،“۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائیگا، اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے لَمْ يَدْعُواةُ الْحَقِّ۔ انسان کی جو دھوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے۔ وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ۔ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر، اپنی توہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکیں گی۔ ایسے لوگوں کی مثال کتباً سطر کَتَفَقَّهُ إِلَى السَّمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِيغٍ۔ ہے، یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دھا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آ جائے تو) اس طرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لَمَّا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِی ضَلَالٍ (۱۳/۱۳)۔ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ

مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْهًا وَكَثْرَةً... (۱۳)۔ کائنات کی ہر شے، طوہا و کرہا، خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، تو انسان اس سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہذا، قرآن حکیم کی رو سے ”خدا سے دعا، کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا۔ یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا)۔ اس کے بعد ہے اِنَّ التَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۲۰)۔ یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سرکشی پرتتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ”خدا کو پکارنے“ سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمر بار ہونا۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشو و نما دینے والے (کے پروگرام کو) درخور حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اور وہ ان احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنْ الْمَضَاجِعِ۔ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ (۳۲)۔ وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر تباہیاں آئیں گی، جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ المؤمن میں ہے قَادُ هُوَ مُخْلِصِيْكَ لَكَ الدِّيْنَ... (۲۵)

خدا کو بکارو تو اس طرح کہ فرمان پذیری کے ہر گوشے کو خالصہ اُسی کے لئے وقف اور مختص کر دو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَ بَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ . . . . . (۲۴)۔ ”وہ ان کی ہکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں“۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ ”ہکار اور اس کے جواب“ سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يَهْدِي الْغٰثِقِثَ الْمُتَعَدِّينَ (۵۶)۔ ”تم اپنے نشو و نما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے ہکارو۔ اس طرح کہ یہ ہکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ بےاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا“۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ”خدا کو ہکارنے“ سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کردی ہے جہاں کہا ہے وَلَا تَفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِہَا۔ وَاَدْعُوْهُ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّثْنُ الْمُحْسِنِیْنَ (۵۷-۵۶)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد نسا ہمواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے ہکارو۔ بےاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے۔“

یہاں ”خدا کی رحمت“ کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَا۔ ”اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب۔ ۱۶۱)۔ میں ہر ہکارنے والے کی ہکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے ہکارتا ہے،“۔ اس کے بعد ہے۔ فَلَبِسْتُجِیْبُوْا لِیْ وَلَیْتُوْا یُنَادِیْ لَعَلَّہُمْ یَرْشُدُوْنَ (۱۸۶)۔ ”ہاں انہیں چاہئیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں،“۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو ہکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اُس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کس طرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مؤمنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم قدم پر ہکار رہی تھی کہ مَتَّي نَصْرُ اللّٰهِ (۲۴/۴)۔ خدا کی نصرت کب آئیگی؟ ان سے کہا کہ اَمَقْنُ يَجِيْبُ الْمُضْطَرُّ اِذَا دَعَاہُ وَيَكْشِفُ السُّوْءَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ خُلَفَاءَ اِلَّا رِضًا... (۲۴/۴) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی ہکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ استخلاف فی الارض، تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکیگا (۲۵/۵)۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بیکسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کر دیگا۔ اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں، ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہیں گی (۲۶/۲)۔ جماعت مؤمنین تو ایک طرف، خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اسکے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے۔ قَدْ اُجِيبَتْ دَعْوَا تَکُمَا، فَاسْتَقِیْمَا (۱۸۹/۱)۔ تم دونوں کی ”دعاء قبول ہو گئی ہے“، بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائیگا) تو اسکے بعد اسکے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعاء قبول ہو گئی ہے۔ لہذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں۔ اسی ”دعا“ کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا۔ قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا اُشْرُکُ بِہٖ اَحَدًا (۲۲/۳)۔ ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کو ہکارتا

ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸)۔

”دعا، کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے۔ جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں ”دعا“ کہتے ہیں، قرآن کریم میں وہ بھی ہیں۔ مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَسْرَافَتِنَا فِيْ أَمْرِنَا وَتَبَيُّتْ أَلْقَدَامَنَا۔ وَأَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۳۶)۔ ”اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں، اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر دے۔“۔ یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے برآئے کی درخواست کرتا ہے۔ یہ دعائیں درحقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں۔ اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اسکی خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ انکی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانع کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پالینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ (الْقَدَاعِيَّةُ اور الْقَدَوَاعِيَّہُ کے جو معنی شروع میں دئے گئے ہیں۔ ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خداوندی کے مطابق ہو۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے۔ اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو، قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے، ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے درحقیقت مضر ہوگا۔ (۱۹)۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اسکی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پھر اس میں اور خدا سے دعاء کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس طرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد

صرف قوتوں کی بیداری نہیں - سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے -  
 یعنی وہ مقصد ہے کیا جسکے حصول کیلئے آرزو کی جا رہی ہے - اور وہ ہے  
 کیسا ؟ - پھر اسکے حصول کیلئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائینگے - اور  
 اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائیگا - ایک مرد  
 مومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا  
 ہے اسلئے وہ، پہلے قدم سے آخری قدم تک، خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے -  
 اسکی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے - اسلئے وہ  
 اسکے لئے بھی خدا ہی کو ہکارتا ہے - خدا کی طرف سے سب کچھ اسکے قانون  
 کے مطابق ہوتا ہے - حتّٰی کہ دعاء کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی  
 بیداری بھی اسکے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے - علاوہ بریں، ایک اور بھی  
 نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے - خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت  
 دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما سے اپنے اندر (علیٰ حد بشریت) ان  
 صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لا محدود طور پر) صفات خداوندی یا  
 الاسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے - اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان  
 صفات حسنیٰ کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے معیار (Standard)  
 بن جاتی ہے - انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو ہکارنے سے مقصد یہ ہوتا  
 ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے  
 مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے - یہ ہے فرق ”خدا سے دعا مانگنے“ اور  
 اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں -

(دعا کی اجابت کے لئے عنوان ج و ب بھی دیکھئے)

اب رہیں حضرات انبیاء کرامؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن  
 میں ہے - سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے - اسکے  
 متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں - ہم ان کے لئے  
 ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے - باقی رہا ان  
 کی دھاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے  
 ہم کلام ہوتا تھا، اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام  
 ہو سکتا ہے - تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے -  
 خدا، حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا - اور  
 نبی اکرمؐ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے -

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے  
 ”خدا کے کسی مقرب“ سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے

دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ ”خدا تک پہنچنے“ یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر انسان، اس کے قوانین کے اقباع سے ”اس تک پہنچ سکتا ہے“ اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے۔ (وسیلہ کے قرآنی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوان دیکھئے) اور اس کے قوانین کا اتباع، قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں۔ مثلاً  $\frac{1}{5}$  و  $\frac{2}{81}$  و  $\frac{2}{81}$  و  $\frac{3}{2}$  و  $\frac{3}{136}$  و  $\frac{3}{136}$ ۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے۔ یعنی وَإِذَا مَا لَأْتَكَ عِبَادًا رِيًّا عَنِّي فَإِلَيَّْ قَرِيبٌ - ( $\frac{2}{186}$ )۔ ”جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق ہو جائیں تو (ان سے کہہ دو کہ) میں قریب ہوں“۔ یا لَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِن حَبْلِ الْوَرِيدِ - ( $\frac{9}{11}$ ) ”میں انسان سے اس کی رگ جان سے بھی قریب ہوں“۔ قرآن میں ضمناً خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ وہ ہر انسان سے، اس کی رگ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس طرح موجود نہیں جس طرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا، اس کائنات میں، بغیر جگہ (Space) گھیرے کس طرح موجود ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے کہہ دیا ہے کہ لَا تَدْرِي كُنْهُ إِلَّا بِنُصَارَةٍ - وَهُوَ يَدْرِي كُنْهُ إِلَّا بِمُصَارَةٍ (پہچان)۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے۔ خود خدا کی ذات سے نہیں۔ دُعا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔

باقی رہا خدا کا علم، سو جس چیز کو ہم ”ماضی - حال - مستقبل“ کہتے ہیں، علم خدا وندی کی رو سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے سامنے ماضی، سال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود

ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے ہونے والے واقعات کا اسطرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اسوقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اہمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (ایسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے۔ اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا۔

## د ف ا

آلذرف۔ حرارت اور گرمی۔ نیز وہ چیز جو گرمی پہنچائے۔ آذفاء۔ اس نے ایسے ایسا کپڑا پہنا دیا جو ایسے گرم کر دے۔ آلذرفاء۔ ہر وہ چیز جو گرمی پہنچائے۔ مثلاً اون وغیرہ\*۔ قرآن کریم میں موبشیوں کے متعلق ہے لَکُمْ فِیْہَا ذِفٌ وَمَنْافِعٌ (۱/۱۵)۔ یعنی ان میں تمہارے لئے (اون وغیرہ سے) گرمی یا گرمی بہم پہنچانے والا سامان اور دیگر فائدے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ذف۔ اونٹوں کے بچوں، ان کے دودھ اور ان کی دیگر منفعت بخش اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے۔

## د ف ع

دفع۔ کسی چیز کو قوت سے دور کر دینا۔ ہٹا دینا\*\*۔ (۲/۲۵۱) صاحب محیط نے کہا ہے کہ الذفع کے معنی ہیں کسی بات کو وارد ہونے سے پہلے ہی دور کر دینا اور الرد کے معنی ہیں اسے وارد ہو جانے کے بعد دور کرنا\*\*\*۔ بصائر میں ہے کہ جب دفع کے بعد الی آئے تو اس کے معنی سونپنے یا ادا کر دینے کے ہونگے۔ جیسے۔ فَادْفَعُوا إِلَیْہِمْ أَمْوَالَہُمْ (۴/۶) میں یعنی۔ ”ان کے مال انہیں سونپ دو“۔ اور جب اس کے بعد عن آئے تو اس کے معنی حمایت کرنے یا حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں\*\*۔ جیسے



إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا (۲۴۸)۔ ”یقیناً اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں“۔ اَلْمُدَّافِعَةُ۔ ایک دوسرے کو ہٹانا اور دھکے دینا\*۔ دَافِعٌ۔ ہٹانے والا (۲۴۹)۔

## د ف ق

دَفَقَ الْمَاءَ يَدْفُقُ۔ اس نے پانی گرا دیا بہا دیا۔ دَفَقَ الْكُوْزَ۔ پیالہ کے پانی کو یکبارگی گرا کر منتشر کر دیا۔ دَفَقَ الْمَاءَ۔ پانی یکبارگی ابل پڑا۔ سَيْلٌ دَفَاقٌ۔ وہ سیلاب جس کا پانی وادی سے اوپر اچھل جائے۔ اَلْدَفْقُ تیز رفتار اونٹ۔ اَلدَّفِيقُ تیز رفتار جس میں جانور اچھل کر چلے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو آگے کی طرف دھکا دینا۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے خَلَقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (۸۶)۔ ”اسے پیدا کیا گیا ہے تیزی سے اچھل کر گرنے والے پانی (سادہ تولید) سے۔ (یہ ماءٌ مَدْفُوقٌ کے معنوں میں آیا ہے)۔

## د ک ک

اَلدَّكَكُ۔ کوٹنا۔ توڑنا (دیوار یا پہاڑ کو) منہدم کر دینا۔ دراصل یہ کسی چیز کو توڑ کوٹ کر زمین کے برابر کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہست ہو جانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اَلدَّكْكَةُ۔ اَلدَّكَكُ۔ ہموار جگہ۔ زمین کے نشیب و فراز (اونچائی نیچائی) کو ہموار کر دینا\*\*\*۔ اِذَا دَكَّكَتِ الْاَرْضُ دَكًّا (۸۱)۔ ”جب زمین کے نشیب و فراز کو مٹا کر ہمواری پیدا کر دی جائے گی۔“ جب معاشی\*\*\*\* ہمواریاں پیدا کر دی جائیں گی اور اونچ نیچ سب مٹا دی جائیں گی۔ فَدَكَّكَتِ الدَّكَّةُ وَاحِدَةً (۶۶)۔ ایک ہی مرتبہ ہمواری کر دی جائیگی۔ جَعَلَتْهُ دَكَّا (۱۳)۔ اسے ہموار کر دیا۔ نشیب و فراز مٹا دیا۔ جَعَلَتْهُ دَكَّاءَ (۱۸) اسے توڑ کر ہموار کر دے گا۔ (یہاں اَرْضٌ معذوف ہے جس کے لئے دَكَّاءٌ مؤنث آیا ہے)۔ تاج نے لکھا ہے کہ اَلدَّكَّاءُ مٹی کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے جَعَلَتْهُ دَكَّاءَ کے معنی یہ ہونگے کہ وہ دیوار مسمار ہو کر ٹیلہ سا بن جائیگی۔ اَرْضٌ دَكَّاءٌ۔ ہموار زمین\*\*\*\*\*۔ اَلدَّكَّانُ۔ ایسی جگہ جسکا اوپر کا حصہ بیٹھنے کے لئے ہموار کر لیا جائے\*\*\*۔

تاج۔ \*\* تاج و راغب و محیط۔ \*\*\* تاج و محیط۔ \*\*\*\* دیکھئے عنوان ارض۔ \*\*\*\*\* راغب۔

## دل کی

دَلَّكَہُ بِیَدَہِمْ دَلَّکَا - کسی چیز کو ہاتھ سے ملنا اور رکھنا۔  
 دَلَّکْتَ الشَّمْسُ دَلَّوْکَا - آفتاب کا غروب ہونا، کیونکہ اسکی طرف دیکھنے  
 والا اپنی آنکھوں کو ملنے لگتا ہے\*۔ (لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ کمزور  
 سی ہے) دَلَّکْتَ دَلَّوْکَا - آفتاب کا زرد ہو جانا اور زوال یا غروب کی طرف  
 مائل ہو جانا۔ آفتاب کا ظہر کے وقت وسط آسمان سے نیچے کی طرف ڈھل جانا\*\*۔  
 ازہری نے کہا ہے کہ اسکے یہی معنی صحیح ہیں کیونکہ کلام عرب میں  
 دَلَّوْکُ کے معنی زوال کے آتے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی  
 معنی کسی چیز کا دوسری چیز سے ہٹ جانا (زوال) بتائے ہیں۔ لیکن اس نے  
 کہا ہے کہ دَلَّوْکُ میں کسی چیز کا نرمی اور آسانی سے ہٹ جانا پایا جاتا  
 ہے۔ ملنے رکھنے کے لئے بھی یہ لفظ اسی جہت سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ  
 ایسی صورت میں ہاتھ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔

الوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک  
 جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے ہیں۔ اس لئے زوال بھی دلوک ہے اور  
 غروب بھی دلوک ہے۔ جب آفتاب نصف النہار میں زوال کر جاتا (ڈھل جاتا)  
 ہے تو اسے دَالِکَة کہتے ہیں۔ ایسے ہی جب وہ غروب ہو جائے تب بھی  
 اسے دَالِکَة کہتے ہیں،\*\* کیونکہ دونوں حالتوں میں اسے زوال ہوتا ہے۔  
 لیکن نوادر الاعراب میں ہے کہ اسکے معنی آفتاب کے بلند اور اونچا ہونے کے  
 آتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دال (د) جہاں بھی لام (ل) کے ساتھ  
 آئیکا تو وہ حرکت کرنے، آنے جانے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ زوال  
 پذیر ہونے، ہر دلالت کریگا۔ چنانچہ دَلَّکَ التَّوْبُ کے معنی ہیں کپڑے  
 کو دھونے کیلئے سلا۔ دَلَّکْتَ الْمَرْأَةَ الْعَجِیْنَةَ عورت نے آٹا  
 گوندھا۔ تَدَلَّکَ الرَّجُلُ - آدمی نے نہاتے ہوئے اپنے بدن کو سلا۔  
 اَلَدَلَّوْکُ - خوشبو یا دوا وغیرہ جسے ملا جائے۔ بِعِیْرَ مَدَلَّوْکُ - اس  
 اونٹ کو کہتے ہیں جسے سفروں میں برابر کام میں لایا گیا ہو۔ اَلَدَلَّیْمُکُ -  
 چلنے میں ہلا پاؤں جمائے تیزی سے چلنا\*۔ ان تمام معانی سے واضح ہے کہ  
 اصل معنی اس مادہ کے حرکت کرنے ہی کے ہیں۔ لہذا جب آفتاب طلوع  
 صبح سے دوپہر تک بلند ہوتا جاتا ہے تو اسے بھی دَلَّوْکُ کہینگے۔ (جیسا  
 کہ نوادر الاعراب کے حوالہ سے اوپر لکھا گیا ہے) اور جب وہ نصف النہار

تک پہنچ کر نیچے کی طرف حرکت کریگا (یعنی ڈھلنا شروع ہوگا) تو اسے بھی "دُلُوک" ہی کہیں گے (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ نیز راغب نے بھی اس کے معنی سائل بہ غروب ہونے کے لکھے ہیں\*) ابن درید نے جمہورۃ اللغة میں کہا ہے کہ دُلُوک کے معنی غروب اور غائب ہو جانا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوکِ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْ اَنَ الْفَجْرِ (۱۵۸)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا "صلوۃ قائم کرو دُلُوکِ شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن،،۔ یہاں اگر "دُلُوک" کے معنی عام حرکت کے لئے جائیں تو اس میں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آجاتا ہے۔ اور "اَنَ الْفَجْرِ"۔ طلوع آفتاب سے پہلے، اور غَسَقِ اللَّيْلِ۔ غروب آفتاب کے بعد۔ یعنی اس طرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آجاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلوۃ کیلئے یہ سارا وقت تمہارے لئے کھلا رکھا ہے۔ اور اگر "دُلُوک" کو زوال آفتاب سے غروب تک مقید کر دیا جائے تو پھر (اوپر کے مفہوم کی رو سے) طلوع آفتاب سے لیکر اس کے نصف النہار تک پہنچنے کا وقت خارج ہو جائیگا۔ دوسری جگہ صَّلَاةٌ کیلئے طَرَفَتِ الشَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دن کے دونوں کناروں اور رات کے (ابتدائی) حصوں میں۔ دن کے دونوں کنارے فجر اور مغرب ہیں اور رات کے (ابتدائی) حصے غَسَقِ اللَّيْلِ۔ سورۃ نور میں صَّلَاةُ الْفَجْرِ اور صَّلَاةُ الْعِشَاءِ (۲۸) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہؐ) کے زمانہ میں ان دونوں اوقات میں اجتماعات صلوۃ ہوتے تھے۔ یہ "قُرْ اَنَ الْفَجْرِ" اور غَسَقِ اللَّيْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت "دُلُوکِ الشَّمْسِ" سے غَسَقِ اللَّيْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ "دُلُوک" کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ سوزوں ہونگے۔ (غَسَقِ)۔ ابتداء شب کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان غ۔ س۔ ق)۔

صلوۃ سے متعلق عنوان (ص۔ ل۔ و) میں آپ دیکھیں گے کہ صلوۃ سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن حکیم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس آیت (۱۵۸) میں بھی اقامت صلوۃ کے معنی فرائض زندگی کی سرانجام دہی

یا قرآنی نظام کے قیام کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز، صبحدم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لئے قرآن کریم کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے (یہ قرآن التفجیر ہوگا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت صلوة دلوک شمس سے غسق لیل تک ہوگا۔

## دل ل

دَلَّ الثَّمَرُ آتَرَ وَدَلَّ لَهَا عَلَيَّ زَوْجِيهَا - پیوی کا اپنے شوہر سے ناز و نغریے کرنا - اسکا فرط ناز میں ایسی حرکات کرنا جن سے بظاہر نظر آئے کہ وہ شوہر کی مخالفت کر رہی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ دَلَّ لَهَا عَلَيَّ الثَّمَرُ - اسے کوئی چیز بتائی، اس تک رہنمائی کی۔ آدَلَّ عَلَيَّ - وہ اس سے بے تکلف ہوا، اس پر جری ہوا، اس کی محبت پر مکمل اعتماد کی وجہ سے اس پر زیادتی کی۔ آدَلَّ لَهَا - ناز و ادا - آدَلَّ لَهَا - واضح راستے کو کہتے ہیں۔ اور آدَلَّ لَهَا - رہنما جس سے کسی چیز کا پتہ نشان معلوم کیا جائے۔ وہ چیز جس سے بات واضح کی جائے۔ آدَلَّ لَهَا - کسی کو راستہ دکھا دینے نیز علامتوں سے کسی چیز کا پتہ دینے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے کسی دوسری چیز کی معرفت حاصل کی جائے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی ایسی علامت کے ذریعے ظاہر کر دینا جسے تم غور و فکر کے بعد بتدریج جانو۔ یعنی معلوم علامت کے ذریعے اظہار حقیقت - نیز کسی چیز میں اضطراب اور حرکت کا موجود ہونا - قرآن مجید میں ہے کہ تم اپنے رب کے سایہ بڑھانے (کی حکمت) پر غور نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَيَّهِ دَلِيلًا (۲۵)۔ سایہ کے اس طرح گھٹنے اور بڑھنے کو معلوم کرنے کا ذریعہ (یا اسکا موجب) سورج کی روشنی ہے۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہ ہو اور اسکا گھٹنا بڑھنا معلوم نہ ہو سکے۔ سورة السبا میں ہے مَا دَلَّاهُمْ عَلَيَّ مَوْتِيہِ إِلَّا... (۳۲)۔ کسی چیز نے انہیں (حضرت سلیمانؑ کی) موت کا پتہ نہیں دیا بجز..... یعنی وہ چیز بتدریج، غور و فکر کے بعد، ذریعہ بنی اس امر کا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ فی الواقعہ وفات پا چکے ہیں۔ (اسکی تفصیل عنوان حضرت سلیمانؑ میں ملیگی)۔ لہذا دلیل وہ ذریعہ ہے جس سے کسی بات کا علم غور و فکر کے بعد بتدریج ہو سکے۔

## د ل و (ی)

آقِدْلُوْ - ڈول - (جب ڈول پانی سے بھرا ہوا ہو تو اسے ذَنْوُبُ کہتے ہیں \*\*\*\* لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔) دَكُوْتُ - آدَلِیْتُ - میں نے ڈول کنویں میں ڈالا\* - ہا ڈول بھر کر کنویں سے نکالا\*\* - اسی سے آدَلِی کے معنی ہیں کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ یا وسیلہ فراہم کرنا۔ جیسے پانی تک پہنچنے کے لئے ڈول ڈالنا پڑتا ہے۔ آدَلِی اَلْیَہُ بِمَآلِہُ : اسے اپنا مال دیا\* - دَلِی حَاجَتَہُ دَكُوْا - اس نے اپنی ضرورت کو طلب کیا۔ آدَلِی بِرَحِمِہ - اسنے اپنی رشتہ داری کو ذریعہ بنا کر چاہا کہ دوسرے تک پہنچ جائے اور اپنا کام نکال لے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں فرسی اور سہولت کے ساتھ کسی چیز کے قریب ہو جانا۔ قرآن کریم میں ہے تَدُلُوْا بِہَا اِلَی الْحُكَّامِ (۱۸۸) مال کے ذریعہ (رشوت دہکر) حکام تک پہنچ کر اپنے حق میں فیصلہ لے لینا۔

ڈول کو کنویں میں لٹکانے کی جہت سے تَدَلِی کے معنی ہوتے ہیں لٹکانا۔ قریب ہو جانا۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلٰی (۵۳) وہ قریب ہوا۔ (ہم رنگ ہو گیا)۔ ان حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ یہ مقام نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔ سورۃ اہراف میں ہے قَدْ لَّهْمَا بِغُرُوْرٍ (۶۶) انہیں فریب دیکر ہستیوں کی طرف گرا دیا۔ دَالَاۃٌ - مُدَالَاۃٌ - اس سے نرمی اور مدارات کی\*\*\* - دَلِی - یَدَلِی - متعیر ہونا\*

## د م م

دَمْدَمَ الْقَوْمَ وَدَمْدَمَ عَلَیْہِمْ - قوم کو ہلاک و برباد کر دیا۔ دَمْدَمَ عَلَیْہِ - اس پر غصہ ہوا اور غصہ میں اس سے بات کی\* - دَمْدَمَ عَلَیْہِمْ - انہیں ہلاک کیا اور پریشان و بے چین کیا\*\*\*\* - الدَمْدَمَةُ پریشان کن گفتگو - غضب\* - قباء و برباد کرنا\*\*\*\*\* الدَمْدَمُ سوکھی کھاس\* - دَمْدَمَ الْقَرْعَدُ - گرج زور دار ہوئی\*\* -

قرآن کریم میں ہے قَدْ دَمْدَمَ عَلَیْہِمْ رَبُّہُمْ (۱۱) - ان کے رب (کے قانون مکافات) نے انہیں اس طرح ہلاک کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

\* تاج - \*\* لائق - \*\*\* محیط - \*\*\*\* لطائف اللغة - \*\*\*\*\* راغب -

\*\*\*\*\* ابن فارس -

## د م ر

الْدَمُورُ - الدَّمَارُ - ہلاک ہو جانا - ہلاک کر دینا - اَلْتَدْمِیْرُ  
ہلاک کر دینا - بیخ کنی کر دینا - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں  
تباہی و بربادی کو کسی چیز میں داخل کر دینا - دَمَرٌ عَلَیْهِمْ - وہ بغیر  
اجازت، برائی کی نیت سے ان کے پاس آیا - وہ اچانک ان پر حملہ آور ہوا\* -  
قرآن کریم میں ہے وَدَمَرْنَا (۱۳۷) ہم نے تباہ و برباد کر دیا - ابن فارس  
نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھر وغیرہ میں داخل ہونے کے ہیں -  
بعض اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ داخلہ بغیر اجازت کے ہوتا ہے -

## د م ع

الْدَمْعُ - آنسو خواہ وہ غم کے ہوں یا خوشی کے - الدَّمْعَةُ - آنسو  
کا ایک قطرہ - دَمَعَتِ الْعَيْنِ - آنکھ نمناک ہو گئی\* -  
دَمَعَتِ السَّحَابَةُ - بادل سے پانی برسا\*\* - سورة مائدہ میں ہے -  
تَرَىٰ اَعْيُنُهُمْ تَفِيضٌ مِّنَ الدَّمْعِ (۸۳) ”تو دیکھیکا کہ ان کی  
آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں“ -

## د م غ

الِدِّمَغُ - بھیجا (سر کا گودا) دَمَغٌ - يَدْمَغُ - اسنے اسے ایسا زخم  
لگایا کہ وہ دماغ تک پہنچ گیا - الدَّمَوْغُ - وہ چیز جو کسی چیز کو  
توڑ پھوڑ کر رکھ دے - دَمَغَهُ - وہ اس پر غالب آ گیا\* - دَمَغَ الْحَقِّ  
الْبَاطِلُ - حق نے باطل کو ختم کر دیا - اسے مٹا دیا\*\* - حُجَّةٌ دَامِغَةٌ -  
دماغ توڑ دلیل\*\*\* -

سورة انبیاء میں حق کے متعلق ہے فَيَدْمَغُهُ (۲۱) وہ باطل کا بھیجا  
نکال دیتا ہے - اسے مٹا کر رکھ دیتا ہے - حق و باطل کی کشمکش میں (جو  
تعمیری اور تخریبی قوتوں کی شکل میں کائنات کے ذرے ذرے میں جاری ہے)  
حق (تعمیری پہلو) ہمیشہ باطل (تخریبی پہلو) پر غالب آتا ہے اور اس طرح یہ  
سلسلہ کائنات ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے - اگر تخریب غالب رہے  
تو ارتقاء تو ایک طرف کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہے - لہذا سنت اللہ یہ ہے  
کہ بَلْ نَقْذِرُ الْبَاطِلَ فَيَمْدَمُّهُ فَتَاٰذَا هُوَ  
زَاهِقٌ (۲۱) - ”ہم حق کے ذریعہ باطل پر ضرب لگاتے ہیں - سو حق ،

باطل کا مغز توڑ دیتا ہے۔ سو دیکھو! وہ (باطل کس طرح) نیست و نابود ہو رہا ہے!، اس کشمکش میں خدا کے تعمیری پروگرام کا، تخریبی پروگراموں پر غالب آنا، قانون کائنات ہے۔ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے غلبہ اور تسلط کی رفتار (ہمارے پیمانوں کے مطابق) بہت سست ہے۔ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا) ہوتا ہے۔ (۳۲/۵ و ۳۲/۶) لیکن اگر انسان، خدا کے قانون کا رفیق بن جائے، تو پھر اس کے نتائج، خود انسان کے حساب و شمار کے مطابق مرتب ہونے شروع ہو جائے ہیں۔

## د م و (ی)

دَم کے معنی ہیں خون۔ اَلِدَمَاءُ (۱۲/۲) اسکی جمع ہے \*۔ (دَمٌ \*۔ در اصل دَمَوٌ \*۔ یا دَمَی \* تھا)۔ قرآن کریم نے دَمًا مَسْفُوحًا (۱۳۶/۱) ”بہتے ہوئے لہو“ کو حرام قرار دیا ہے۔ (مزید تشریح م۔ ف۔ ح کے عنوان میں ملے گی)۔

## د ن ر

دِرْہَم \*۔ ایک طلائی سکے کا نام ہے۔ اسکی جمع دَرَنَہِمٌ آتی ہے۔ غیر عربی لفظ کو عربی بنا لیا گیا ہے۔ عرب اسے قدیم زمانہ سے بولتے چلے آ رہے تھے اسلئے یہ عربی ہو گیا \*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (۳۳/۳۳) میں آیا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ لفظ در اصل دِرْہَمٌ تھا۔ اسی لئے اسکی جمع دَرَنَہِمٌ آتی ہے \*۔ اس کے معنی ہونڈ یا گنی یا اشرفی کے ہیں جو طلائی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ، رومی لفظ (Dinarins) کا معرب ہے۔ عربوں کے ہاں رومیوں کے سکوں کا زیادہ رواج تھا۔ (تیز دیکھنے درہم)۔

## د ن و

دَنَّا۔ يَدْنُوْا۔ دُنُوْا۔ دَنَاوَةٌ \*۔ قریب ہونا۔ اَلْدُّنْيَا۔ نزدیک ترین چیز (یہ مؤنث ہے۔ اس کا مذکر اَدْنٰی ہے)۔ دَنِيْ \*۔ يَدْنٰی کے معنی ہیں کمزور اور ضعیف ہونا۔ اَدْنٰی الْقُرْجُلُ اَدْنٰی \*۔ اس شخص نے تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کی۔ اَدْنٰی الشَّقٰیءُ \* کسی چیز کو قریب کیا۔

آدُنْتِ ثَوْبَهُمَا عَلَيْنَهُمَا . اس نے اپنا کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا \*\*\*۔ اسی سے  
ہے يَدْ نِيْنِ عَلَيْنِهِنَّ مِّنْ جَلَابِيبِهِنَّ<sup>(۳۳)</sup> ”وہ اپنی چادریں (جلباب)  
اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔“

آلَادُنِي کے معنی ہیں زیادہ قریب، لیکن کبھی اس سے مراد أَصْغَرُ  
ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکے مقابلہ میں أَكْبَرُ آتا ہے۔ کبھی اس سے  
مراد آرْ ذُلُّ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں خَيْرُ آتا ہے۔ جب اس سے مراد  
أَوَّلُ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں آخِرُ آتا ہے۔ جب اس سے مراد أَقْرَبُ  
ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں أَقْصَى آتا ہے۔\*\*

قرآن کریم میں ہے فَبِيْ آدُنِي الْاَرْضِ (۳۰)۔ یعنی قریب کی سر  
زمین۔ سورة النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا . . . . . آوْ آدُنِي (۸۹)۔ اسکے معنی  
ہیں پھر وہ قریب ہوا . . . . . یا قریب تر۔ سورة الرحمن میں دَانِ (۵۴)  
بمعنی قریب آیا ہے۔ سورة العاقۃ میں ہے قُطُّوْا فَهَا دَانِيَةٌ (۱۱)۔ اسکے  
معنی بھی قریب ہیں۔ اَلْاَسْمَاءُ الدُّنْيَا (۳۶ و ۱۷) کے معنی ہیں قریب ترین  
آسمان۔ (دیکھئے عنوان س۔ م۔ و کے تحت سماء)۔

اَلدُّنْيَا (قریب تر) بمقابلہ اَلْاَقْصَا (بعید تر) (۲۴) میں آیا ہے۔ أَكْبَرُ  
کے مقابلہ میں یہ لفظ (۳۲) میں آیا ہے۔ اور أَكْثَرُ کے مقابلہ میں (۵۸) میں۔  
خَيْرُ کے مقابلہ میں (۲۱) میں۔

قرآن کریم میں اَلْحَيَاةُ الدُّنْيَا۔ بمقابلہ آخِرَةِ۔ اکثر مقامات پر  
آیا ہے۔ اور یہی وہ تقابل ہے جو زیادہ غور طلب ہے۔ اسلئے کہ اس تقابل  
میں اَلْحَيَاةُ الدُّنْيَا کو آخرت کے مقابلہ میں کم قیمت قرار دیا گیا ہے۔

عام مذاہب عالم میں، جہاں روح اور مادہ کی ثنویت (Duality) کا عقیدہ  
رائج ہے، دنیا اور اسکی متاع کو بڑا ذلیل اور حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہندو  
دھرم کی رو سے دنیا ہے ہی مایا یعنی فریب۔ اور اس فریب سے چھوٹ جانے  
کا نام نجات یا مکتی ہے۔ بدھ مت میں دنیا کے متعلق ہر آرزو ایک تکلیف کا  
پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اسلئے اصل حیات ترکِ آرزو کا نام ہے۔ یہی عقیدہ  
عیسائیت میں ہے جہاں نیکو کاروں کی بادشاہت آسمان میں ہے۔ چنانچہ انکے  
ہاں ترکِ دنیا سب سے بڑی ولایت ہے۔ یہی عقیدہ تصوف کی اصل ہے اور  
اس سے متاثر ہو کر خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی دنیا کو بڑا حقیر اور  
قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ”دنیا دار، اور گنہگار، قریب قریب



مرادف المعنی الفاظ ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس، دین اور دنیا ابکی دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ مومن کو (آخرت کے علاوہ) فی ہذہ الدنیا حسنة (۱۵۶) کی دھا سکاٹاتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لَقَدْ يَمْنُنَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (۱۵۷) حسن عمل کا نتیجہ (آخرت کے علاوہ) اس دنیا کی خوشگواریاں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ ذر لثَّةٍ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۵۸)۔ ”دنیا میں ذلت و خواری، کو خدا کا غضب اور اس کی لعنت قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ تصور باطل ہے کہ دنیا قابل نفرت ہے اور اس کی آسائشیں اور آرائشیں گناہ کی آلودگیاں!

لیکن قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں متاع دنیا کو قلیل اور اس کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے (ا۔ خ۔ ر) اور (ع۔ ج۔ ل) کے عنوانات دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ متفادِ ہاجلہ اور متاعِ اخیرہ سے قرآن کریم کا مطلب کیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ہے جو اپنی نگاہوں کو مفادِ ہاجلہ (فوری حاصل ہو جانے والے مفاد) پر مرکوز رکھتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی مفادِ ہاجلہ کو وہ متاعِ الدنیا قریبی مفاد، یا پیش پا افتادہ مفاد کہہ کر پکارتا ہے اور ان لوگوں کو سخت مطعون کرتا ہے جو ان پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر مستقبل کی خوشگواریوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ لہذا جو چیز قرآن کریم کی رو سے مذموم ہے وہ یہ ہے کہ انسان قریبی مفاد (Immediate Gain) کی خاطر مستقبل (Future) کی تابناکی کو نظر انداز کر دے۔ یعنی وہ زندگی اسی طبعی زندگی ہی کو سمجھ لے۔ اور یہ بھی مذموم ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر کے صرف ”عاقبت سنوارنے“ کے خیال میں لگ جائے (اسے رہبانیت کہتے ہیں جسے قرآن کریم جائز قرار نہیں دیتا۔ دیکھئے عنوان ر۔ ۵۔ ب)۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲۴۵)۔ اس دنیا میں، بھی خوشگواریاں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ حال بھی درخشنده اور مستقبل بھی تابناک۔ قریبی مفاد بھی اور مستقبل کے مفاد بھی۔

اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جس کا حال درخشنده نہیں وہ سمجھ لے کہ اس کا مستقبل بھی قاریک ہی ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمٰی فَهُوَ فِی الْآخِرَةِ أَعْمٰی وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۲۴۶)۔ ”جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں

بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا،۔ (اعظمی کے مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ع - م - ی)۔ لہذا -

(۱) یہ تصور بھی غلط ہے کہ دنیا کی خوشگواریاں قابل نفرت ہیں۔

(۲) اور یہ بھی غلط ہے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے، لہذا مفاد صرف اسی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد ہیں۔

(۳) صحیح تصور یہ ہے کہ اس دنیا کے مفاد بھی حاصل ہوں اور انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے اس قابل ہو جائے کہ وہ اسکے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرے۔ نیز اس دنیا میں نگاہ صرف اپنے ذاتی مفاد پر نہ رہے بلکہ تمام نوع انسانی اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی پر بھی نگاہ رہے۔ یہ مستقبل اس دنیا میں ہوگا اور دوسرا مستقبل اسکے بعد کی زندگی میں (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے عنوان ا - خ - ر)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان کو اقدار (Values) متعین کر کے دیتا ہے۔ وہ ہر شے کے متعلق بتاتا ہے کہ انسانیت کی میزان میں اسکی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ عقل اور ایمان کی رو سے صحیح مسلک زندگی یہ ہے کہ انسان، بلند قدر و قیمت کی شے کے لئے کم قدر و قیمت کی شے کو قربان کر دے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیاوی سامان زندگی اور اس کی خوشنمائیاں اپنی قدر رکھتی ہیں۔ انہیں ضرور حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی زندگی (یعنی انسان کی طبعی زندگی - Physical Life) کے کسی تقاضے میں اور انسانی زندگی (انسانی ذات) کے کسی تقاضے میں تصادم واقع ہو جائے (ان میں Tie) پڑ جائے تو اسوقت، انسانی ذات کے بلند تقاضہ کی خاطر طبعی زندگی کے کمتر درجہ کے تقاضہ کو قربان کر دینا چاہئے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں قرآن کریم نے (طبعی زندگی اور انسانی ذات کا مقابلہ کرتے ہوئے) دنیاوی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو کم قیمت بتایا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیاوی زندگی قابل نفرت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب طبعی زندگی اور انسانی زندگی (جسے مرنے کے بعد بھی قائم رہنا ہے) کا مقابلہ ہو تو پھر طبعی زندگی کی قیمت، انسانی زندگی کے مقابلہ میں کمتر سمجھنی چاہئے۔ یہ ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم ”دنیا اور آخرت“ کے متعلق۔

## دھ

آلْقَدْهُرٌ\*۔ دراصل مدتِ عالم کو کہتے ہیں جو اسکی ابتداء آفرینش سے لیکر اسکے اختتام تک ہوتی ہے۔ پھر، طویل مدت کیلئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ برخلاف زَمَانٌ\* کے جسکا اطلاق مدتِ قلیلہ اور مدتِ کثیرہ دونوں پر ہوتا ہے\*۔ قرآن کریم میں (تخلیق انسانی کے سلسلہ میں) حَیْمُنٌ\* مِیْنِ الْقَدْهُرِ (۱۱۰) آیا ہے۔ یعنی ایک زمانہ۔ یا زمانے کی ایک مدت۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور زبردستی کے ہونے ہیں۔ زمانہ کو دَہْرٌ\* اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز پر سے گزرتا اور اس پر غالب آجاتا ہے۔ آلدھارِہْرٌ\*۔ زمانہ کے حوادث اور گردشیں۔ دَہْرَہْمٌ\* اَمْرٌ\*۔ ان پر کوئی مصیبت نازل ہو گئی\*\*۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے جو زندگی کو اس طبعی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں۔ کہ وَمَا يَتُحَدِّثُونَ إِلَّا الْقَدْهُرُ\* (۲۵/۲۶)۔ یہ صرف مرورِ زمانہ (Time) ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ وقت گزرنے سے انسان کے قویٰ مضاعف ہو جاتے ہیں اور اسطرح وہ (Deteriorate) ہوتا ہوا مرجاتا ہے اور زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد کوئی اور زندگی نہیں۔ یہ وہی تصور ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (Materialistic Concept of Life) مادی نظریہٴ حیات کہتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِیْنٌ عِلْمٌ اِنْ هُمْ إِلَّا يَنْظُرُونَ\* (۲۵/۲۶)۔ ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔ قرآن ضمیمہ نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔ اب ہمارے دور میں دھَر (Time) کے متعلق جو جدید فلسفیانہ (اور سائنٹفک) تصورات قائم ہوئے ہیں ان کی رو سے زمان (Time) کی حقیقت ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ اور ابھی تو اس نہایت مشکل اور نازک موضوع پر تحقیق و تفتیش اور بحث و نظریہ کی ابتداء ہوئی ہے۔ آگے چلکر دیکھئے اس کے متعلق کیا کیا تصورات قائم ہوئے ہیں۔ بہر حال یہ عقیدہ کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ہے اور مرورِ زمانہ سے اسکا خاتمہ ہو جاتا ہے، اب عہدِ کہن کا فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے۔ اب تحقیقات کا رخ اسی طرف کو ہے کہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے۔ (اسکے متعلق تفصیل سے معارف القرآن

کی آخری جلد میں لکھا جائیگا جو آخرت سے متعلق ہوگی۔ لیکن ضمنی طور پر، میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا“ میں بھی لکھا جا چکا ہے۔ مرور زمانہ سے انسان کا جسم مضمحل ہوتا ہے۔ اسکی ذات (Personality) پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ زمانے کے اثرات سے غیر متاثر رہتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ اسکی ذات بھی ہے۔ اگر اس کی نشو و نما قرآن کریم کے طریق کے مطابق ہو جائے تو موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسی لئے، دھر (زمانہ) کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے آلدھقرؑ اس زمانے کو بھی کہا ہے جب انسان هنوز وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ هلّ آتٰی عٰلٰی الْاِنْسَانِ حَیْثُ مِیْنُ الْقَدَرِ لَمْ یَتَّکُنْ شَیْئًا مَّقْدُورًا (۹۱)۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ خود زمانہ (دھر) کو خدا مان لیا جائے۔ بہر حال، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، زمانہ یا دھر (Time) کے متعلق بحث، بڑی فلسفیانہ ہے جو ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (دھر) انہی دو مقامات میں آیا ہے جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔ اُن مقامات میں اس لفظ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

## دھق

دَہَقَ الْاَلْکَا سَ۔ اسنے پیالہ بھر دیا۔ مَاءٌ دَہَقَ۔ کثیر پانی۔ کَتَا سَ دَہَقَ۔ صاف پیالہ۔ بھرا ہوا پیالہ۔ آلدھق کے معنی ہونے میں زور سے دبانا۔ آلدھق کے شکجے کو کہتے ہیں۔ اَلْمَدَہَقُ۔ زور سے دبایا ہوا\*۔ (بھرے ہوئے کیلئے دَہَقًا کا لفظ غالباً اسلئے بولتے ہیں کہ اس میں چیز دبا دبا کر بھری جاتی ہے)۔

قرآن کریم میں کَتَا سَ دَہَقًا (۹۱) آیا ہے۔ یعنی پاک اور صاف، لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔ لیریز بھی اور مصفا بھی۔ یہی جنتی معاشرہ کی خصوصیت ہے۔ صحیح زندگی ایسی ہی ہونی چاہئے۔ بھر پور اور مصفا۔ جس میں زندگی، پاکیزگی اور حرکت بڑھانے والے عناصر کی فراوانی ہو، سب کچھ فراوانی اور پاکیزگی سے ملے۔ جس میں (طبعی ضروریات کے علاوہ) انسان کی مضر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے اور تطہیر قلب و نگاہ

بھی میسر ہو۔ زندگی کے پیالے پاکیزہ اور قوت بخش خوشگوار یوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں لبریز ہونے کے علاوہ چھلکنے (یعنی متحوک ہونے) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

## د ھ م

الْأُدْهُمَّةُ - سیاہی - اِدْهُمَّ الشَّيْءُ - چیز سیاہ ہو گئی - اِدْهُمَّ الْقَرْعُ : سیرابی کی وجہ سے کھیتی سیاہی مائل ہوئی - حَذَرَ يَثْقَّةً دَهْمَاءُ وَمُدَّ هَامَةً - سرسبز باغ جو اپنی سرسبزی کی شدت سے مائل بہ سیاہی ہو رہا ہو - عربوں کے ہاں گہرے رنگ کی سبزی کو دَهْمَةً کہہ دیتے تھے کیونکہ گہری سبزی سیاہی مائل ہو جاتی ہے - اور ہلکے رنگ کی سیاہی کو خَضْرَاءَ کہتے تھے کیونکہ وہ سبز رنگ کے قریب قریب آ جاتی ہے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تاریکی کے ساتھ کسی چیز پر چھا جانا ہیں - بعد میں کثرت استعمال سے اس میں تاریکی کی شرط بھی نہ رہی - قرآن کریم نے جنتی باغات کی شادابی و سرسبزی کی شدت کی بنا پر، اُنہیں مَدَّ هَامَتَيْنِ (۵۵/۶۴) کہا ہے - ایسی زندگی جس میں تازگی، شادابی، سرسبزی، شگفتگی، اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو۔

## د ھ ن

الْأُدْهُمَّةُ - چکناہٹ - اَلْدَّهْنُ - تیل - اَلْمَدَّهْنُ - تیل کی شیشی - اِدْهُمَّ - اس نے تیل مل لیا\*\* - قرآن کریم میں زیتون کے متعلق ہے تَنْبُتُ بِالْأُدْهُمِّ (۲۳/۴۳) وہ روغن (تیل) لیے ہوئے نکلتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت اور قلت کے ہوتے ہیں - اور اِدْهُمَّ کے معنی خیانت کرنے کے - اَلْمَدَّاهِنَةُ - قریب - ہناوٹ - تصنع، نمائش (چکنی چپڑی باتوں کے اعتبار سے) - اَلْدَّهْنُ - قریب دینا - باطن کے خلاف ظاہر کرنا - نرمی برتنا - رعایت کرنا - سنجیدگی اور حقیقت کا دامن چھوڑ دینا\*\* - سورۃ قلم میں ہے وَدَّوْا لَوْ تَدَّهِنُ فَيَدُّ هِنُونٌ (۱۸/۹) - یہ چاہتے ہیں کہ اگر تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو وہ بھی اپنے مقام سے ہٹ کر تجھ سے ”مفاہمت“، (Compromise) کر لیں - لیکن جو شخص حق پر ہو وہ اگر اپنے مقام سے ذرا سا بھی ہٹ جائے تو وہ باطل پر

پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ باطل کا باطل ہی رہتا ہے۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں اور بکر کہتا ہے کہ نہیں۔ تین اور تین چار ہوتے ہیں۔ اب ان میں ”مفاہمت“، کراٹے والا کہتا ہے کہ کچھ تم گھٹو اور کچھ تم بڑھو اور دونوں یہ مان لو کہ تین اور تین پانچ ہوتے ہیں۔ بکر کا اس سے کچھ نہیں بگڑیگا کیونکہ وہ جیسا پہلے غلطی پر تھا ویسا ہی اب رہیگا۔ لیکن اس سے زید فوراً اپنے مقام حق سے باطل پر آ جائیگا۔ یہ وجہ ہے کہ حق کسی کی خاطر اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتا۔ وہ اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ دین کے محکم اصول اپنے اندر کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ سورۃ واقعہ میں پہلے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کس قدر عظیم کتاب ہے۔ اس کے بعد ہے۔ اَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُذْهِبُونَ (۵۱/۸) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا تم ایسی کتاب میں خیانت کرتے ہو۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں کمی بیشی کرتے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ان کے صحیح مقام سے پھسلاتے ہو؟ مفہوم درحقیقت دونوں سے ایک ہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اس طرح لوگوں کو حق کے مقام سے ہٹا دیتی ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكْذِرُونَ (۵۱/۸)۔ اس تکذیب کو تم اپنے لئے ذریعہ معاش بناتے ہو؟

آلِدَّ هَانُ - سرخ رنگ کی کھال - تیل کی تلچھٹ\*۔ سورۃ رحمن میں ہے کہ آسمان و رَدَّہ کَالِدَّ هَانِ (۵۵/۸) ہو جائیگا۔ دوسری جگہ ہے کَالْمُهَلِّ (۷۸/۸)۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائیگا۔

## دہی (و)

دَہَاءُ - دَہِیَّا - اس نے اس میں عیب نکالا۔ اس کی تنقید کی۔ اسے سخت تکلیف پہنچائی۔ اَلدَّہِیَّةُ - امر عظیم - سخت مصیبت - دَوَّاهِیَّ - اَلدَّہِیَّ - زمانہ کے ہاتھوں جو سخت مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اَلدَّہِیَّ - اَلدَّہَاءُ - حیرت انگیز ہوشیاری اور چالاکی، نیز رائے کی عمدگی۔ دَہِیَّ - اس نے نہایت درجہ ہوشیاری سے کام کیا\*\*۔ چنانچہ رَجُلٌ دَہِیٌّ - انتہائی

ہوشیار اور چالاک آدمی کو کہتے ہیں\*۔ (دنیا کی مصیبتوں کا بیشتر حصہ عقلِ فریب کار کی چالاکیوں ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے)۔

قرآنِ کریم میں ہے وَ السَّاعِیَةُ آدُہُی (۵۴/۶)۔ وہ انقلاب کی گھڑی سخت مصائب والی ہوگی اور اچانک اور تحیر انگیز طریق سے آئیگی۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ دَہُی کے بنیادی معنی ہیں کسی ایسی چیز کا سامنے آجانا جو خوشگوار نہ ہو۔ لیکن حیرت انگیز اور اچانک طریق سے سامنے آنا جس سے انسان بھونچکا رہ جائے۔ انقلاب کہتے ہی اسے ہیں جو اچانک نمودار ہو اور دیکھنے والے متحیر ہو جائیں۔

## دور

دَارَ - يَدُوْرُ - دَوْرًا - کسی چیز کا اسطرح گھومنا کہ وہ گھوم پھر کر وہیں آجائے جہاں سے چلی تھی۔ الدَّوْرَةُ - ہرکار۔ الدَّائِرَةُ - حلقہ (سرکل) اس کی جمع دَوَائِرُ ہے۔ الدَّارُ (جمع دِيَارٌ) - مکان۔ اس لئے کہ اس میں لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ یا گھوم پھر کر وہاں آجائے ہیں۔ محلہ - شہر - علاقہ - ٹھہرنے اور سکونت پذیر ہونے کی جگہ - نیز ساری دنیا کو بھی کہتے ہیں، اور زمانہ کو بھی جو گردش کرتا رہتا ہے۔ دَارَةٌ - مصیبت گردش۔ الدَّارُ - گھومنے کی جگہ\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کو چاروں طرف سے گھیر لینا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے عَلَيْهِمُ الدَّائِرَةُ السَّوْءُ (۱۶/۶)۔ تباہی اور بربادی نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ یہاں دائرہ کے معنی ہیں وہ چیز جو کسی کو محبط ہو جائے۔ جو اسے ہر طرف سے گھیر لے۔ جیسا کہ دائرہ (سرکل) ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے يَتَنَزَّلُ عَلَيْكُمْ الدَّوَائِرُ (۹۸/۶)۔ ”وہ تم پر گردشوں کے آنے کا انتظار کرتے ہیں“

سورۃ نوح میں دِيَارًا (۱۱/۶) کے معنی ہیں، بسنے والا۔ مکین - نیز یہ نفی کے بعد، کسی ایک، کوئی ایک، کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے\*\*۔

دَارُ الْآخِرَةِ (۱۶۰/۶) کی اصطلاح قرآنِ کریم میں متعدد بار آئی ہے۔ اس کے معنی ہیں ”آخرت کا گھر“۔ یعنی مستقبل کی زندگی اور اُس زندگی کی آسائشیں۔ (دیکھئے عنوان ۱ - خ - ر)۔

سورۃ بقرہ میں تجارت کے متعلق ہے تَدَّ بَرُوْا نَهَمًا (۲۸۲) - جس کا تم لوٹ پھیر کرتے ہو - یعنی آپس میں مبادلہ کرتے ہو - چیزوں کو گردش دیتے ہو -

## دول

اَلدَّوْلَةُ - شہرت - اَلدَّوْلَةُ - باری اور نبوت - صَارَ الْفَيْيَ "دَوْلَةً" بَيْنَهُمْ - مال غنیمت ان میں منقسم ہو کر گردش کرنے لگ گیا - دَاوُلَ - پھیرنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا - قرآن کریم میں ہے تِلْكَ اَلْاَيَاتُ نَدَّ اَوَّلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۱۳۹) - "یہ وہ حالات ہیں جنہیں ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں" - کبھی اسکی باری کبھی اُسکی باری - تَدَّ اَوَّلُوهُ انہوں نے اسے باری باری لیا -

دَوْلَةٌ اور دَوْلَةٌ - بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں - یعنی گردش کرنا - پھرتے رہنا - لیکن بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کے معنی ہیں دو لشکروں کا باری باری ایک دوسرے کو شکست دینا اس طرح کہ پہلے ایک کو شکست ہو لیکن پھر شکست کھانے والا غلبہ حاصل کر لے - اور دَوْلَةٌ ان طور طریقوں کو کہتے ہیں جو ادلتے بدلتے رہیں - بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو مختلف ہاتھوں میں گھومتی پھرتی اور آتی جاتی رہے - اور دَوْلَةٌ اس چیز کے ادلتے بدلتے کو کہتے ہیں -

قرآن کریم نے مال کی گردش کے متعلق کہا ہے کَسَىٰ لَا يَكُوْنُ "دَوْلَةً" بَيْنَ غَنِيٍّ مِّنْكُمْ (۵۶) - تاکہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی نہ گھومنا پھرتا رہے - معاشیات (Economics) کا کتنا بڑا اصول ہے جسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے - معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص (اوپر کے) طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے - قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) رہنی چاہئے، نہ دولت کو ایک خاص سرکل کے اندر گردش کرنا چاہئیے - علاوہ برین، قرآن کریم میں یہ اصول بالخصوص مالِ فے کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے روپیہ کو بھی اوپر کے طبقہ (یعنی اربابِ حل و عقد) کے اندر صرف نہیں ہونے رہنا چاہئیے - اسے رفاہِ عامہ کے لئے گردش کرنا چاہئیے -



## د و م

دَوَامٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر قائم رہنا۔ دَامَ الشَّيْءُ عُمُ اسوقت بولتے ہیں جب کسی چیز پر لمبا زمانہ گزر جائے\*۔ اس سے اَلْمَاءُ الدَّائِمُ\*۔ ٹھہرے ہوئے یا ساکن پانی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ اَمُ اُس بارش کو کہتے ہیں جو لگاتار ہوتی رہے۔ لہذا اس مادہ میں کسی چیز کا لمبے زمانے تک یا ایک حالت پر رہنے کا تصور ہوتا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ دَامَ الشَّيْءُ عُمُ کے معنی ہوتے ہیں چیز گھومی۔ نیز یہ فعل تھکنے یا ٹھہرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ گھومنے کے اعتبار سے، اَللَّهُ دَامَتْ لُو کو کہتے ہیں جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ ابن کيسان نے لکھا ہے کہ مَادَامُ میں، ما کے معنی وقت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کہتے ہیں قُم مَادَامُ زَيْدٌ قَائِمًا۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں جب تک زید کھڑا رہے تم بھی کھڑے رہو\*\*۔ سورة رعد میں جنت کے متعلق ہے اَكْثَلُهَا دَانِيمٌ\* (۱۳/۳۵)۔ ”اس کے پھل قائم رہینگے“۔ یعنی جنت کی منفعت بخش چیزوں کا سلسلہ جاری رہیگا۔ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ وہاں رزق کی کمی نہیں ہوگی۔ اور سورة ہود میں ہے خَالِدِينَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ\* (۱۱/۱۸)۔ جب تک زمین و آسمان موجودہ حالت میں رہینگے۔ یعنی بہت لمبے عرصہ تک کے لئے۔ (تفصیل خ۔ ل۔ د کے عنوان میں دیکھئے)

سورة آل عمران میں ہے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا (۳/۳۴)۔ سوائے اس کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے۔

## د و ن

دُونُ۔ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَسَوْفَ (اوپر) کے برخلاف نیچے کے معنوں میں۔ هُوَ دُونَهُ۔ وہ اس کے نیچے ہے۔ کبھی قریب کے معنوں میں۔ زَيْدٌ دُونَكَ۔ زید تجھ سے (مرتبہ وغیرہ میں) قریب ہے۔ سامنے کے معنوں میں۔ مَشَى دُونَهُ۔ وہ اس کے آگے آگے چلا۔ پرے کے معنوں میں۔ هُوَ اَمِيرٌ عَلٰی مَادُونِ جَبَّحُوْنَ۔ وہ جیحون سے پرے کے علاقہ کا امیر ہے۔ علاوہ کے معنوں میں۔ وَبَعَثْتُوْنَ عَمَلًا دُونَ ذٰلِكَ۔ وہ اس کے علاوہ اور بھی کام کرتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ یہ لفظ

اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی پیچھے اور آگے، نیچے اور اوپر، سب آتے ہیں۔ ”فَسَبِّحْهُ دُونُ“۔ ذلیل چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس شریف اور اچھی چیز کو بھی کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے وَأَتَيْنَا مِيثَاقَ الْبَحْوٰنِ دُونِ مِيثَاقِ دُونِ ذَٰلِكَ (۲۱/۲۱) ہم میں سے بعض صالح ہیں اور بعض اس سے کم تر درجے پر ہیں۔

علاوہ یہاں پہلے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۱/۲۱) میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَنَسْذِيقَهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰی دُونِ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ . . . . ہم انہیں عذاب اکبر کے علاوہ۔ بسا اس سے پہلے عذاب ادنیٰ کا مزہ بھی چکھائیں گے۔ ”مِنَ“ دُونِ کے معنی ہیں ”علاوہ“، لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (۳/۳۳)۔ ”مومن مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں“۔ یعنی ایسا کبھی نہ کریں کہ مومنوں کو بھی دوست رکھیں اور ان کے ساتھ کفار کو بھی۔ انہیں مومنوں کو دوست رکھنا ہوگا یا کفار کو۔ اگر وہ کفار کو دوست رکھیں گے تو انہی میں سے ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں ”مِنَ“ دُونِ اللہ بھی اکثر مقامات پر آیا ہے جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ لوگ خدا کے ساتھ ساتھ اور قوتوں کی بھی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ خدا کے قانون تک نہیں پہنچتے۔ اس سے پہلے (یا ورے) ہی انسانوں کے خود ساختہ قانون و شریعت کو اپنے لئے واجب الاتباع مان لیتے ہیں۔ کتنے معبود ہیں جو انسانوں نے خدا سے ورے ہی اپنی ”پرستش“ کے لئے تجویز کر رکھے ہیں۔ یہ معبود مٹی اور پتھر کے بت نہیں۔ انسانی جذبات کے بت، ارباب اقتدار کے بت مذہبی پیشواؤں کے بت، غرضیکہ ہر آن ایک نیا بت۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندی دگر

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

یہی وہ بت ہیں جو انسان کو خالص قوانین خداوندی کے اتباع سے روکتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز تک پہنچنے سے قاصر رہ جانے کے لئے دُونِ بولا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ”مِنَ“ دُونِ اللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہوئے اس سے ورے ہی اور چیزوں کو اپنا مقصود و مستہلی قرار دے لینا۔ نزول قرآن کے بعد خدا تک پہنچنے سے قاصر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی کتاب کا اتباع ہے اور وہ کتاب ہر ایک کے سامنے ہے۔

## د ی ن

دِیْنٌ\*۔ یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ از انجملہ، غلبہ۔ اقتدار۔ حکومت۔ مملکت۔ آئین۔ قانون۔ نظم و نسق۔ فیصلہ۔ ٹھوس نتیجہ۔ جزا و سزا۔ بدلہ، ہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانبرداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے\*۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کے معانی حساب۔ غلبہ۔ تدبیر اور عادت کے لکھے ہیں۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی اطاعت۔ روش (دَا ب) اور ملت کے لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں، أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْجَعَالِ الْمِیْمُنِ۔ عالمگیر نشو و نما دینے والے کے قوانین و احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے، کو اَلِیَدِیْنِ کہا گیا ہے (۱۳۱-۳۲)۔ اسی کو دوسری جگہ اَلَا سَلَامٌ کہا گیا ہے (۱۸)۔ سورۃ واقعہ میں غَرَبَ مَدَرِیْنِیْنِ (۸۶) کے معنی ہیں وہ جو کسی کے ماتحت نہ ہوں۔ سورۃ توبہ میں ہے وَلَا یَدْرِیْنَ دِیْنََ الْحَقِّ (۲۹)۔ وہ نظام خداوندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے۔ سورۃ یوسف میں دِیْنََ التَّمْلِیْکِ (۱۲) کے معنی بادشاہ کا قانون ہیں۔ اور سورۃ نور میں جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے وہاں دِیْنََ اللّٰہِ (۲۴) کے معنی خدا کا قانون یا ضابطہ حکومت ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں، جہاں مال کے بارہ مہینوں اور ان میں سے چار حرمت والے مہینوں کا ذکر ہے، کہا گیا ہے کہ ذَٰلِیْکَ اَلِیَدِیْنِ اَلتَّقِیْمِ (۳۶) اسمیں بھی دِیْنٌ کے معنی ضابطہ قانون ہے۔ لیکن یَوْمَئِذٍ یُّوفِیْہِمْ اللّٰہُ دِیْنَہُمْ الْحَقِّ (۲۵) میں دِیْنٌ کے معنی اعمال کا بدلہ (جزا و سزا) ہیں۔ (اس میں دین کے معنی حساب بھی ہو سکتے ہیں\*\*۔ اس سے بھی مطلب مکافات عمل ہی ہے۔) سورۃ صافات میں ہے اِنَّا لَمَدَرِیْنُوْنَ (۳۴)۔ کیا ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا؟ کیا ہمارا حساب ہوگا؟۔

غلبہ و اقتدار اور قانون و اختیار کے مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے یَوْمَ اَلِیَدِیْنِ کے معنی خود واضح کر دئے ہیں جہاں کہا ہے کہ مَا اَدْرَاکَ مَا یَوْمَ اَلِیَدِیْنِ۔ ”تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے،“۔ جواب میں کہا کہ یَوْمَ لَا تَمْلِیْکَ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَّ اَلَا مَرُّ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۱۸۰-۱۹)۔ جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کیلئے کچھ اقتدار و اختیار نہیں رکھیگا۔ اور تمام معاملات قانون خداوندی

کے مطابق فیصل ہونگے۔ اسی کے متعلق سورۃ فاطر میں مَلِیْکِ یَوْمِ  
الْدِّیْنِ (۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جس دور میں انسانی زندگی آئین خداوندی  
کے مطابق بسر ہوگی۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کسی انسان  
کو کسی دوسرے انسان پر کوئی غلبہ و اقتدار نہیں ہوگا۔ غلبہ و اقتدار  
صرف قانون خداوندی کا ہوگا۔ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو آئین  
خداوندی کے تابع حاصل ہوتی ہے!

دریّن کے معنی عبادت مستمرہ کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ دریّن\* اس  
بارش کو بھی کہتے ہیں جو عادت\* ہمیشہ ایک جگہ آ کر برستی ہو\*۔ اس  
مفہوم میں بھی قانون اور ضابطہ کی شان جھلکتی ہے۔ خارجی کائنات میں  
قوانین خداوندی کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کا  
قانون وحی کے ذریعے (بوساطت حضرات انبیاء کرام\*) ملتا ہے۔ یہ قانون اپنی  
مکمل اور آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کا نام اَلْکَرِیْمُ  
ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے کو اَلْاِسْلَامُ کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں، نظام معاشرہ، ضابطہ زندگی، قانون حکومت  
آئین مملکت، عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں لیکن قرآن کریم  
نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے۔ اور وہ ہے الدین۔ یہی  
ہمارے معاشرہ کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور  
ہماری مملکت کا آئین ہے۔ اس آئین کی رو سے، انسانوں کی آزادی اور پابندی  
کی حدود مقرر کرنے کا پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوتا ہے۔ کسی اور کو  
نہیں ہوتا۔ اس لئے الدین میں اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) خدا کی ہوتی ہے۔  
اس کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے بروئے کار آتا  
ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عملاً اقتدار اعلیٰ کتاب اللہ کو حاصل ہوتا  
ہے۔ اسلامی مملکت، قرآنی اصولوں کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ  
(Agency) ہوتی ہے۔ اور چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا  
معیار بھی یہی کتاب ہے، اس لئے جزا اور سزا (اعمال کے نتائج) بھی اس کی رو  
سے متعین ہوتے ہیں۔ اس جہت سے دین کا یہ مفہوم (جزا و سزا) بھی عملاً  
حامی آ جاتا ہے۔ اسے نظام عدل کہا جائیگا جس کا دائرہ صرف عدالتی عدل  
تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اسلامی مملکت کا  
کانسٹی ٹیوشن قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کا دوسرا نام ہے۔ اس مملکت  
کا تمام کاروبار انہی اصولوں کی حدود کے اندر سرانجام پاتا ہے۔ اور مقصود  
اس سے نظام عدل و توازن کا قائم رکھنا ہے۔ اس کا نام الدین ہے۔

لہذا، الدین سے مراد ہے خدا کا عطا کردہ نظام زندگی جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جس دور میں انسان اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لے آئینگے وہ تمام دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف قوانین خداوندی کے محکوم ہونگے۔ اس لئے کہ ”مالک یوم الدین“، خدا کے سوا کوئی اور نہیں۔ ہر وہ فیصلہ جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، دینی فیصلہ کہلائیکا اور عدل کے محکم اصول پر مبنی ہوگا۔ سورۃ فاتحہ میں دیکھئے۔ خدا کی صفت ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کے ساتھ ہی اس کے نظام عدل و قانون (مالک یوم الدین) کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو سامان زیست اور اسباب نشرو نما تو بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیے ہیں لیکن انسانی مدارج کا تعین، ان کے اہمال کی رو سے ہوگا۔ اس کا نام آئین و قوانین کے مطابق عدل کی زندگی ہے۔ اور یہ چیز حیوانیت سے آگے بڑھ کر، خاصہ انسانیت ہے۔

مَدْرِیْنَتَہ کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ دَرِیْن کے اس مفہوم سے بنایا گیا ہے جسکا تعلق نظم و نسق سے ہے۔ کیونکہ مَدْرِیْنَتَہ وہی مرکزی مقام ہوتا ہے جو شہری نظم و نسق کے محاسن رکھتا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اطاعت کے مفہوم کے اعتبار سے وضع ہوا ہے کیونکہ مَدْرِیْنَتَہ (شہر) میں قانون اور ضابطہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے\*۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک یہ لفظ دراصل مَدْرِیْنَتَہ تھا، اور دَرِیْن سے مشتق۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دَرِیْن کے بنیادی معنوں میں اطاعت پائی جاتی ہے اور شہر کو مَدْرِیْنَتَہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حکومت کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور قرض کو دَرِیْن اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقروض کو جھکنا پڑتا ہے۔

دَرِیْن\*۔ قرضہ۔ اور تَدْرِیْن\*۔ ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا (۲۸۲)۔ دَرِیْن\* اس قرضہ کو کہتے ہیں جسکی ادائیگی کیلئے مدت مقرر کر لی جائے۔ جس قرض کیلئے مدت متعین نہ ہو وہ دَرِیْن\* نہیں بلکہ قَرَض\* کہلاتا ہے\*۔ محیط المحيط میں، تاج کے قول کی تائید کے ساتھ، یہ بھی لکھا ہے کہ عرف عام میں دَرِیْن\* اس قرضے کو کہتے ہیں جو مدت معینہ کیلئے سود پر دیا جائے۔ لیکن قرآن کریم نے چونکہ ربوا کو حرام قرار دیا ہے اسلئے اسمیں مسلمانوں کے باہمی لین دین میں دَرِیْن\* کا لفظ قرضہ بلا سود ہی کے لئے ہے (۲۸۲)۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلام کیلئے قرآن کریم نے دین کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنی ضابطہ حیات کے ہیں۔ "إِنَّ الْإِلَهَ بْنَ عِندَ اللَّهِ إِلَّا سَلَامٌ" (۱۸)۔ وَرَضِيتُمْ لَكُمْ "الْإِسْلَامَ" دَرِينَا (۵)۔ یہی آلدین ہے جسے دیکر نبی اکرمؐ کو بھیجا گیا تھا۔ "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" (۲۸)۔ نیز (۲۸) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ اس دین (نظام حیات) کو، دیگر تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے،"۔ مَذْهَبُ "کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اسلئے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہئے۔ دین ہی کہنا چاہئے۔ مَذْهَبُ اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔ اور دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ملا ہو۔ (مَذْهَبُ کے معنی کیلئے دیکھئے عنوان ذ۔ ہ۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ہیں لیکن دین میں فرقہ سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۴)۔ جو دین خدا کی طرف سے ملا تھا وہ سب کے لئے ایک ہی تھا۔ اس میں مختلف فرقوں کا کیا سوال؟ فرقے، مختلف انسانوں کے بنائے ہوئے راستے (مذہب) پر چلنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام سابقہ کے پاس خدا کا دین (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) آتا رہا لیکن انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو ضائع کر کے، ان کی جگہ انسانوں کے تراشیدہ راستوں کو اختیار کر لیا۔ اس طرح ان سے دین گم ہو گیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اسکی اصلی شکل میں قرآن کریم میں عطا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ یہی دین تھا جو اس مملکت کا آئین (Constitution) تھا جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس کے بعد، ہم نے، خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑے۔ اس طرح ہم نے بھی دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس نہج سے ہم بھی اقوام سابقہ کی سطح پر آ گئے۔ لیکن ہم میں اور ان میں ایک فرق ہے۔ ان کے پاس دین اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اس لئے وہ اپنے مذہب کو خدا کے عطا کردہ دین سے بدل نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس لئے ہم جسوقت بھی چاہیں اپنے مروجہ مذاہب کو دین خداوندی سے بدل سکتے ہیں۔ (اسی طرح دیگر اقوام عالم بھی چاہیں تو اپنے مذہب کو چھوڑ کر، قرآن کریم میں دئے ہوئے دین کو اختیار کر سکتی ہیں)۔ جب تک ہم ایسا نہیں کرتے، زندگی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

## ذ

## ذ ا

ذ ا۔ یہ۔ اس کا مونث ذرہ۔ ذرہ۔ ذرہ ہی۔ تا۔ قی وغیرہ ہیں۔ اس کا تثنیہ (دو کے لئے) ذان اور ذین۔ (مونث کے لئے تان۔ تین) آتا ہے۔ اور جمع اولاء (دیکھئے عنوان اولاء) اس سے پہلے اکثر ہوتا ملا ہوا ہوتا ہے۔ جیسے ہذا (اس کا مونث ہذرہ آتا ہے) یہ اشارہ قریب کے لئے ہے۔ اشارہ بعید کے لئے ذالیک (مذکر) تیلک (مونث)۔ اس کے آخر میں مخاطب کے مطابق ضمیر بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً ہمارا مخاطب ایک مرد ہے اور ہم اُس سے کہہ رہے ہیں کہ اُس چیز کو دیکھو۔ تو ہم ذالیک کہینگے۔ اور اگر مخاطب دو مرد ہوں تو ذالیکمما کہینگے۔ بہت سے ہوں تو ذالیکم۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک عورت ہو تو ذالیک کہینگے۔ اور بہت سی عورتیں ہوں تو ذالیکن کہینگے۔

ذ ا کے مختلف استعمال یہ ہیں۔ ذاکت۔ ذانیکت۔ (ہاتاکت۔ ہاتیکت)۔ جمع کے لئے اولاکت یا اوللیکت۔ کبھی ذاکت کے درمیان ل۔ لاکر، ذالیک (مونث کے لئے تیلکت) بنا لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کاف آنے سے کذالیک ہو جاتا ہے۔ اس کے استعمال کی مثالیں یہ ہیں۔

(۱) مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ . . . . . (۲/۵۵)۔ وہ کون ہے جو اس کے ہاں کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔

(۲) يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ . . . . . (۲/۲۵)۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے جسے کھلا رکھا جائے۔

(۳) اِنْ هَذَا اِنْ لَسَاحِرٍ اَنْ . . . . . (۲/۲۳)۔ یہ تو بس دو جادوگر ہیں۔

(۴) ذَالِیْكَ الْكِتَابُ . . . . . (۲/۲)۔ یہ وہ کتاب ہے . . . تیلکت اُمّہ

قَدْ خَلَتْ (۲/۱۶۱) یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی۔

(۵) فَذَٰلِكَ بُرْهَانُنْ... (۲۸)۔ یہ دونوں روشن دلیلیں ہیں۔  
 جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ذَٰلِکَ اشارہ بعید (وہ) ہے لیکن یہ اشارہ  
 قریب (یہ) کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں ذَٰلِکَ اشارہ قریب (یہ) کے  
 لئے زیادہ اور اشارہ بعید (وہ) کے لئے کم آیا ہے۔ مثلاً سورۃ روم میں فِطْرَتَ  
 اللّٰهِ التَّيْسِيْ فِطْرَتِ النَّاسِ عَلٰیٰهَا لَا تَبْدِيْلَ لِّیَخْلَقِ اللّٰهُ کَیۡۤیۡۤسَۃً  
 ذَٰلِکَ التَّوْحٰیۡدُ (۳۱)۔ یہی دینِ قیَم ہے۔ یا مثلاً سورۃ بنی  
 اسرائیل میں مَآپ تَوَلَّیْ کَیۡۤیۡۤسَۃً خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاوْحٰیۡدٌ (۱۵)۔ ”یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات  
 ہے“۔ ان مقامات میں ذَٰلِکَ اشارہ قریب کے لئے ہے۔

اس کے برعکس سورۃ کہف میں جہاں حضرت موسیٰؑ کے ایک سفر کا  
 ذکر ہے وہاں (اس مقام پر جہاں آپ کا ساتھی مچھلی پیچھے بھول آیا تھا)  
 کہا کہ ذَٰلِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ (۱۸) ”وہی توجہ تھی جسکی ہمیں  
 تلاش تھی“۔ یہاں ذَٰلِکَ اشارہ بعید کے لئے ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ ذَٰلِکَ آتا تو ہے بعید کے لئے لیکن اس سے  
 بُعد مسافت ہی مراد نہیں۔ جوشے بلندی، مرتبت کی وجہ سے اونچے  
 مقام پر ہو اور یوں دور ہو، اس کے لئے بھی ذَٰلِکَ آتا ہے خواہ وہ چیز  
 ویسے قریب ہی رکھی ہو۔ اسی اعتبار سے ذَٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ  
 فِیْہِ (۲) کے معنی ہونگے یہ کتاب جو بڑی با عظمت اور رفیع الشان ہے

## ذَٰلِکَ الْکِفْلِ

قرآن کریم نے آپ کا نام انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں لیا ہے (۲۱) و  
 لیکن مزید تعارف نہیں کرایا۔ قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں  
 جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ک۔ ف۔ ل)

## ذَٰلِکَ النُّونِ

حضرت یونسؑ کا لقب ہے (۲۱)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”یونس“  
 اور ”نون“۔

## ذ اب

الذَّیْبُ - بھیڑیا (۱۲)۔ الذَّیْبُ - ڈراندا۔ مذمت کرنا۔ سخت آواز\*۔  
 بدزبانی - ذَٰبُ الرَّجُلِ - آدمی زور سے چیخا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے



کہ اس کے بنیادی معنی کم ٹھہرنا، بے قراری ہیں۔ نیز کسی چیز کی ایسی حرکت جو ایک سمت سے نہ ہو۔ مثلاً تَذَابَّتِ الرِّيحُ کے معنی ہیں ہوا ہر طرف سے آئی۔ بھیزنے کو ذَرْتَبٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک طرف سے آتا ہے کبھی دوسری طرف سے۔

## ذ ا م

ذَا مَہ - يَذَّامُہ - کسی کو حقیر و مذسوم گردانا۔ نیز اسکے معنی عیب لگانے، رسوا کرنے، کے آتے ہیں۔ کسی کو جھڑک کر نکال دینے کے بھی\*۔ رَاغِب نے مَذَّوْمٌ بمعنی مَذَّوْمٌ لکھا ہے۔  
آذَامَہ - اسے مرعوب و خوفزدہ کر دیا\*۔

قرآن کریم میں ابلیس کے متعلق ہے۔ قَالَ اخْرِجْ مِنْهَا مَذَّوْمًا مَذَّوْرًا (۱۸/۶)۔ اسکے معنی ذلیل اور حقیر ہی کے ہیں۔ یا جھڑک کر نکالے ہوئے کے۔

## ذ ب ب

ذُبَابٌ - مکھیاں۔ واحد ذُبَابَةٌ - صاحب محیط نے جاحظ کے حوالے سے لکھا ہے کہ (عام مکھیوں کی جملہ اقسام کے علاوہ) عربوں کے ہاں ذُبَابٌ کا اطلاق ہر قسم کی بھڑوں، شہد کی مکھیوں اور مچھروں پر بھی ہوتا ہے\*\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا (۲۲/۴۶)۔ ”وہ مکھی بھی نہیں پیدا کر سکیں گے“۔ مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں ہٹایا اور دور کیا جاتا ہے۔ یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ہوتا۔ اس مادہ میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب و حرکت کے بھی ہیں۔ رَاغِب نے لکھا ہے کہ اَلذَّبُّ ذَبَةٌ مَعْلُوقٌ شَيْءٌ كَيْفَ هَلْنِي كَيْفَ اَوَازٌ كَيْفَ كَهْنِي كَيْفَ ہر، یہ لفظ ہر حرکت و اضطراب (تردد اور ڈھلے بقیں) کے لئے آتا ہے\*\*\*۔  
بَعِيرٌ ذَابٌّ - اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ایک جگہ پر کھڑا نہ رہے\*\*\*\*۔

ذَبَّ ذَبَةً - اگرچہ یہ لفظ ذب ذب کے تحت آنا چاہئے لیکن بعض اہل لغت نے اسے ذب ب کے تحت لکھا ہے۔ ہر دو میں اشتراک معنی کی وجہ سے ہم بھی اسے یہاں (ذب ب کے تحت) درج کر رہے ہیں۔ قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ہے مَذَّابِدٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَالِكٌ (۱۳۳/۱) اور

اسکی تشریح یہ کہہ کر دی ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (۱۳۳)۔ نہ یکسو ہو کر ادھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے مَن يَتَّبِعْ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ (۲۲)۔ جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ ادھر فائدہ دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ ادھر دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ مکھی کی طرح، کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے اسکے بعد اڑ کر کہاں جا بیٹھیگی۔ یہ کیفیت، ایمان اور یقین کی یکسر نقیض ہے۔ ایمان کی کیفیت تو یہ ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَفْزَمُوا (۳۱)۔ ایک مرتبہ خدا کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ ایمان اور استقامت، یہ ہے مومن کا شعار۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

## ذ ب ح

ذَبَحَ - يَذْبَحُ - اُندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑے حلق کاٹ دینا۔ چیر دینا۔ بھاڑ دینا۔ شق کر دینا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ذَبَحَتْهُ الْمَيْتَةُ\*۔ آنسوؤں نے اسکا گلا گھونٹ دیا۔ أَلْتَذَّبَحُ\*۔ بہت زیادہ ذبح کرنا۔ سر کو اسقدر جھکا دینا کہ وہ کمر سے نیچا ہو جائے۔ اِلِذْبَحْ\*۔ وہ چیز جو ذبح کی جائے\*۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون يَذْبَحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ (۱۶۶) و دیگر مقامات)۔ ”تمہارے اپنا کو ذبح کر دینے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے“، عام طور پر اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے عاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ سوال یہ ہے کہ يَذْبَحُونَ سے مراد سچ مچ ذبح کر دینا ہے یا اسکے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ سورۃ اعراف میں يَذْبَحُونَ کی جگہ يَقْتُلُونَ آیا ہے (۱۶۶)۔ یعنی وہ تمہارے ابناء کو قتل کر لیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے اس باب میں ذَبَحَ اور قَتَلَ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قَتَلَ کے معنی کیا ہیں۔ اس لفظ کے متعلق عنوان ق۔ ت۔ ل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ وہاں آپ دیکھینگے کہ اسکے

معنی صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اس کے معنی ذلیل و خوار کرنا۔ کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا۔ ایسا بنا دینا کہ اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو۔ کسی کو حقیر کر دینا، بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی کو علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہیں۔ (ان معانی کی اسناد ق۔ ت۔ ل کے عنوان میں ملینگی)۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذبح یا قتل سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل و حقیر کرنا اور کمزور و غیر مؤثر بنا دینا ہیں۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ہیں۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے تمام لڑکے مار دئے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ہی ختم ہو جائیگی\*۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی (حضرت ہارونؑ) بھی زندہ موجود تھے۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی پیدا ہوتے ہی مار نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار نہیں دیا کرتے تھے۔

(۳) سورۃ یونس میں ہے کہ قَتَلْنَا امِّنَ لِمُوسٰی اِلَّا ذُرِّۙۡۤیَّةًۙ مِّنْ قَوْمٍۭہِ (۱۰/۸۱) ”موسیٰؑ پر اس کی قوم کی ذرّہ بقت ایمان لائی،“۔ ذریت نثی ہود (یا نوجوانوں) کو کہتے ہیں۔ (دیکھئے ذ۔ ر۔ ر)۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ہی نہ ہوتی۔ (قوم کے نوجوانوں کے ایمان لانے کی وجہ سمجھنے کے لئے عنوان ذ۔ ر۔ ر۔ دیکھئے)۔

(۴) جب حضرت موسیٰؑ فرہون کے پاس آئے ہیں تو اس نے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اس قدر احسانات کئے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رہا ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتُ بَنَیۡۤیْۤیْ لِسُرَّۤاِیِیْلَ (۲۴/۲۴)۔ ”یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتنا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ہے،“۔ آپ دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرہون کے خلاف جو الزام عائد کیا ہے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ہے۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ہوتا تو آپ سب سے پہلے اس کا ذکر

\* بعض تفسیر میں ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوے ہزار بچوں کو قتل کیا تھا۔

کرتے کیونکہ یہ جرم، قوم کو غلام (محمکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جائیے۔ حضرت موسیٰؑ نے کسی جگہ بھی فرعون اور اسکی قوم کو اس جرم سے مطعون نہیں کیا۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اسکی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سچ مچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے۔ یعنی انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰؑ کو صندوق میں ڈال کر دریا میں کیوں بہا دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسوقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہونے ہی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو محفوظ رکھنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی۔

سب سے پہلے قویہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اسکی تصریح موجود ہے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے) اُسوقت دیا تھا جب حضرت موسیٰؑ اپنی دعوتِ انقلاب لیکر آئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھ کر فرعون کے اسیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ انکے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اسطرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ یہ جنو جی میں آئے کرتے جائیں؟ اسکے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں! میرے سامنے ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ سَنَقَتِلْ أَبْنَاءَ هُمٌ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَ هُمٌ (۱۲۲)۔ ”عنقریب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور انکی عورتوں کو زندہ رکھینگے“۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اسوقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت پھیلی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا۔ سورۃ المؤمن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت لیکر گئے تو اسنے کہا کہ اُقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَ هُمٌ (۲۵)۔ ”جو لوگ موسیٰؑ پر ایمان لائیں انکے بیٹوں کو قتل کر دو اور انکی عورتوں کو زندہ رکھو“۔ اس سے نہ صرف یہی واضح ہے کہ یہ حکم دعوتِ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں دیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ یہ

\*جب تک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ہو جاتا ہم یہی الفاظ لکھتے جائینگے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ۔

حکم تمام بنی اسرائیل کیلئے نہیں تھا۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے\*۔

ان شواہد سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا۔ لہذا جب یہ حکم ہی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں۔ کہ حضرت موسیٰؑ کو اسلئے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا۔ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رہا ہوگا۔ لیکن اسکے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کو محکوم قوم کا درجہ دیدیا ہوگا۔ اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اُس زمانے میں تو محکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ہوتی تھی۔ نہ انکے بچوں کیلئے تعلیم و تربیت کے کوئی مواقع ہوتے تھے، نہ بڑوں کیلئے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے ساتھ ٹکر لینے کیلئے پیدا کیا گیا تھا۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ انکی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی اور انہیں رموز مملکت اور غوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ہوتے۔ اس مقصد کیلئے تجویز یہ کیا گیا کہ انکی پرورش خود فرعون کے محلات میں ہو اور انکا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبیلی کی حیثیت سے گزرے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کیلئے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْشِیْ (۲۹) ”تا کہ تیری تربیت ہماری زیر نگرانی ہو،“۔ یعنی اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔ اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جسکے مطابق حضرت موسیٰؑ کو اس مہم کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس سے ذرا آگے ہے۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یٰمُوسٰی (۳۱)۔ ”اسطرح آہستہ آہستہ تم، اے موسیٰ، ہمارے پیمانے پر پورے اتر آئے،“۔

\* یہ بات آگے چلکر بتائی جائیگی کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے انکے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا۔ انکے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا؟۔

سورة القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں سے کہا گیا کہ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيِّهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ۔ (۲۸) ”تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ۔ اور جب تجھے اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا،۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کو قتل کر دیں گے۔ لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل اہشاء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زحائے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا۔ اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑ لیا تو اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوْهُ (۲۹) ”اسے قتل نہ کرو،۔ اسے ہم متبنیٰ بنا لیتے ہیں۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے۔ قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں۔ لہذا یہاں لَا تَقْتُلُوْهُ کے معنی قتل کرنا نہیں ہونگے بلکہ حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے ہونگے۔ (دیکھئے عنوان ق۔ ت۔ ل)۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بِذِّبِیْهِمْ اَبْنَاءَهُمْ وَ یَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَهُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت عام ہو رہی تھی اور قرون اور اس کی قوم کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ چنانچہ فرعون کے ارباب حل و عقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کو کب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائیگا۔ اس کا کچھ علاج کرنا چاہئے (۳۰) تو اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے۔ ہم اس پر عمل پیرا ہونگے۔ اور وہ تجویز یہی (قتل اہشاء کی) تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو کِتَبَہُ (۳۱) سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی ہیں ایک گہری چال۔ یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورة قصص میں ہے کہ وَ جَعَلَ اٰهْلَہَا شِیْعًا یَّتَضَعِفُ طَائِفَتًا مِنْهُمْ (۳۲) ”وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا“۔ اس کے بعد ہے بِذِّبِیْهِمْ اَبْنَاءَهُمْ وَ یَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَهُمْ (۳۳)۔ یعنی ان کے اہشاء کو ذبح کرتا تھا اور نِسَاء کو زندہ رکھتا تھا۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا جائے تاکہ اُس قوم میں بھوٹ پڑی رہے اور وہ پناہی آویزشوں میں الجھی رہے۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم، قوم، محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہر مردانگی نظر آئے۔ جن کے متعلق وہ سمجھتا کہ اُن کا اُبھرنا خطرناک ہے۔ انہیں دہاتا۔ اُنہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا۔ اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں، اُنہیں ابھار کر معزز و مقرب بنا لیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا۔ یہ کچھ بھی ہر ماسر سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوہر مردانگی نظر آئے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو، آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے اَبْنَاء کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَاء۔ اور قَتْل اَبْنَاء سے مراد ہے انہیں ذلیل و حقیر رکھنا۔ اور اَسْتَحْيَاء نِسَاء سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو کمزور کرنے جا رہا تھا۔

قرآن کریم کے شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قَتْل یا ذَبْح اَبْنَاء سے یہی مراد ہے۔ لیکن بہر حال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جاسکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرہون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے اَبْنَاء کو قتل کر دیا جائے (۲۵)۔ یعنی اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے بھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنا دی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہو سکتا ہے انہیں ایسا غیر موثر بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے (قَتْل کے یہ معنی عنوان ق۔ ت۔ ل میں دیکھئے)۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ، اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربار فرہون کے ماسرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔

بہر حال، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآنی شواہد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْح اَبْنَاء اور اَسْتَحْيَاء نِسَاء کے الفاظ استعارۃ استعمال ہوئے ہیں۔ مچ مچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دئے گئے ہیں۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْحِ آبْنَاءِ کو حقیقی معنوں میں لیا جائیگا۔ یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا۔ اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے الھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔ اس وقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو ماری ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

سورة مائدہ میں ان جانوروں کو جو بتوں کے استھانوں پر قربانی دئے جاتے تھے مَا ذَبَحَ عَلَى الشُّعْبِ (۵/۳۰) کہا ہے۔

سورة صافات میں حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے آپ کو اس طرح قربان کر دیے کیلئے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دیکر اس سے روک دیا اور وَقَدْ يَنْتَهِ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ (۳۶/۱۳)۔ ”اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا،۔ جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے کہ انہیں شام کے سرسبز و شاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ و گیاہ سرزمین میں خانہ کعبہ کی تولیت کیلئے متعین کر دیا۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کیلئے تھی۔ نہ صرف اپنی ماری عمر کے لئے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی۔ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۳۶/۸) اسلئے یہ ذبح عظیم تھی۔ یعنی بہت بڑی قربانی۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”جوئے نور“ میں ملیگی۔ اور بنی اسرائیل کے حالات ”برق طور“ میں)۔

## ذ خ ر

ذَخَرَ - يَذْخَرُ - کسی چیز کو لیے لینا۔ اپنا لینا۔ کسی چیز کو اسلئے چھپا رکھنا کہ وہ بوقت ضرورت کام آئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سمیٹ لینا۔ لِذَخَرَ لِذَخَرًا باب افتعال سے بمعنی ذَخَرَ ہی ہے۔ (لِذَخَرَ لِذَخَرًا اصل میں



اِذْ تَخَارَا تَهَا)۔ اَلْمُدَّخِرُ - اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑنے میں اپنی پوری پوری طاقت خرچ نہ کرے بلکہ کچھ طاقت بچا رکھے\*۔ اَلْمُدَّخِرُ فرہ - موٹا\*\*۔

سورة آل عمران میں ہے مَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (۳۸)۔ اس کے معنی ذخیرہ کرنے کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (خدا کے ایک سچے داعی انقلاب ہونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے۔ اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

## ذ ر ا

ذَرَّاءُ الْاَرْضِ - زمین میں بیج ڈال دیا\*۔ ذَرَّاءُ اللّٰهِ الْخَلْقُ - اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بڑھایا۔ کثیر کر دیا\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (۲۱)۔ ”وہ اس طرح تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا رہتا ہے“۔ سورة المؤمنون میں ہے هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳)۔ ”وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں بڑھایا اور پھیلاتا ہے“۔

ذُرِّيَّةٌ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ یہ ذَرَّاء سے مشتق ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک یہ ذُرٌّ سے مشتق ہے۔ ہم نے اسے (ذ - ر - ر) کے نیچے لکھا ہے۔

## ذ ر ر

الذَّرُّ - بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو دھوپ میں منتشر نظر آتے ہیں۔ الذَّرُّ کا واحد ذَرَّةٌ ہے۔ نہایت چھوٹی اور کم وزن چیز کو بھی اسی جہت سے ذَرَّةٌ کہا جاتا ہے۔ سورة زلزال میں مِّنْ يَّعْمَلُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۱) آیا ہے۔ ذرہ کے وزن برابر - یعنی خفیف سے خفیف۔ ذَرٌّ - کسی چیز کو چھڑکنا۔ متفرق کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باریکی اور انتشار ہوتے ہیں۔ ذَرَّ الْمَيْلَحَ عَلَى اللَّحْمِ - اسنے گوشت پر نمک چھڑکا۔ ذَرَّ الْحَبَّ فِي الْاَرْضِ - اسنے زمین میں بیج بکھیر دیا\*۔

الذَّرِّيَّةُ - الذَّرِّيَّةُ - آدمی کی اولاد اور نسل، خواہ نر ہو یا مادہ۔ لیکن کبھی اسکا اطلاق انسان کے والدین اور آبا و اجداد پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی یہ لفظ اجداد میں سے ہے\*۔ (اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائیگا)۔

راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنی تو چھوٹے بچے ہیں لیکن یہ کبھی چھوٹے اور بڑے سب بچوں پر بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہے تو جمع ہی کیلئے لیکن پھر واحد اور جمع سب کیلئے یکساں آتا ہے۔ بعض کے نزدیک ذُرر "بَقَّة" کا مادہ ذُرأ ہے۔ جسکے معنی پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہیں۔ (لین)۔

ذُررَةُ النَّبْتِ - سبزی پھوٹی۔

قرآن کریم میں ذُرر "بَقَّة" بمعنی اولاد اور نسل (۱۲۴) میں آیا ہے۔ سورة یٰسین میں جہاں کہا ہے کہ إِنَّا حَمَلْنَاهُ ذُرْرًا یَقْتَتُهُمْ فِی الْفُلْکِ (۳۶)۔ "ہم نے ان کی ذریت کو کشتی میں سوار کیا"۔ تو وہاں ذریت کے معنی (اس نسل کے) چھوٹے بڑے سب ہیں۔ اس آیت (۳۶) ہی کی وجہ سے اہل لغت نے الذُرر "بَقَّة" میں اولاد اور آباء کے معنی تسلیم کئے ہیں اور اسی بناء پر یہ لفظ اضداد میں مانا گیا ہے، لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کہیں بھی آباء کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ آباء کے بالمقابل اولاد کے لئے ہی استعمال ہوا ہے (۸۸)۔ مذکورہ الصدر آیت (۳۶) میں بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ذُرر "بَقَّة" اولاد ہی کے لئے ہے، جبکہ ہم الفُلْکِ آتَمَشْحُونُ سے مراد حضرت نوحؑ کی ایک معین کشتی لیں جو وحی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی اور ذُرر "بَقَّة" سے مراد اُس زمانہ کے انسانوں کی نسل لی جائے۔ اس طرح اس لفظ میں متضاد معانی ہوتی نہیں رہینگے۔

سورة یونس میں ہے فَمَا مِّنْ لِّمُؤَسِّیْ اِلَّا ذُرْرٌ یَّقَّةٌ مِّنْ قَوْمٍ مِّمَّ (۱۰۱)۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں بہت تھوڑے لوگوں نے \*\*\*۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں اسکی قوم کے نوجوان \*\*\*۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنی زیادہ واضح ہیں۔ انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ہیں۔ پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے، یا نئے ماحول سے مطابقت، کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ قوم کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے جو ظلم و استبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ کرتے ہوئے، دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ۔ ب۔ ح)۔

## ذرع

الذَّرَاعُ - ہاتھ کا کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک کا حصہ۔  
 کلائی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، نیز ایک پیمانہ جس سے ناپا جاتا ہے\*۔ سورۃ  
 کہف میں ہے وَ كَتَبْنَاهُمْ بِأَيْمَانِهِ (۱۸)۔ ”ان کا کتا اپنے دونوں  
 ہاتھ (یعنی اگلی ٹانگیں) بچھائے ہوئے تھا،۔ ذَرْعُهُ كَذًا۔ اسکا طول  
 اسقدر ہے\*\*۔ ذَرْعُهُمَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا (۲۳)۔ ”اسکی پیمائش ستر ہاتھ  
 ہے،۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا لمبا  
 ہونا اور اُگے کی طرف حرکت کرنا۔ مثالی یہ ذَرْعٌ۔ مجھے اسکی دسترس  
 نہیں\*۔ ضِيقُ يَدِ ذَرْعًا۔ کسی کام کی دسترس نہ رکھنا۔ سورۃ ہود میں  
 حضرت اوطؑ کے متعلق ہے ضَاقَ يَهُيمٌ ذَرْعًا (۱۱)۔ اسنے ان کے معاملہ  
 میں اپنے آپکو کوتاہ دست پایا۔

الذَّرِيعَةُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو شکار کیلئے بطور آڑ  
 استعمال کی جاتی ہے\*۔ نیز ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کے توسط سے مقصد  
 تک ہاتھ پہنچ سکے۔

## ذرو

ذَرَّتِ الرِّيحُ الشَّقِيئُ ذَرُوءًا۔ ہوا اس چیز کو اڑا کر لے گئی۔  
 ذَرَا الْحِنَظَةِ يَذُرُّوْهُمَا ذَرُوءًا۔ اسنے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے  
 کے لئے ہوا میں اڑایا۔ فَتَذَرَّتْ۔ پس گیہوں بھوسے سے الگ ہو کر صاف  
 ہو گیا۔ ذَرَاوَةُ النَّبْتِ۔ پودے کے جھڑے ہوئے خشک اجزاء جو ہوا  
 میں اڑ جائیں۔

ذَرُوءَةُ الشَّقِيئِ۔ چیز کا بلند تر اور اونچا حصہ\*۔

سورۃ کہف میں ہے تَذَرُّوْهُ الرِّيحُ (۱۵)۔ ”ہوائیں اسے اڑائیں  
 اڑائے پھرتی ہیں،۔ سورۃ ذاریات میں ہے۔ وَالَّذَرِيْتُ ذَرُوءًا (۵)۔  
 ذَرُوءٌ۔ پھیلا دینا۔ بکھیر دینا۔ ذَارِی (الذَّارِی) بکھیر دینے والا، پھیلا  
 دینے والا (نشر و اشاعت کرنے والا)۔ وہ قوتیں جو کسی پیغام (یا نظام) کی  
 نشر و اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے۔ ذرائع  
 رسل و رسائل و مواصلات و نشر و اشاعت۔

## ذ ع ن

آذْ عَنّ - اطاعت میں جلدی کرنا - دوڑ کر حکم کی تعمیل کرنا -  
نَاقَة مِذْ عَانَ - مطیع اونٹنی - مِذْ عَنِینَ (۲۴) لپک کر اطاعت کرنے  
والے - آذْ عَنّ لَہ - اس کے لئے جھکا اور اس کا تابع فرمان ہوا -

صاحب محیط نے آذْ عَانَ کے اصطلاحی معنی بتاتے ہوئے لکھا  
ہے کہ الاِذْ عَانَ اعتقاد یعنی دلی عزم کو کہتے ہیں - اور عزم، تردد کے  
بعد ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں - اِذْ عَانَ کے مختلف مراتب ہوتے  
ہیں جن میں سے ادنیٰ ترین کو ظن اور اعلیٰ ترین کو یقین کہا جاتا ہے -  
اور ان دونوں کے درمیان تقلید اور جہل مرکب کا مرتبہ ہوتا ہے -

## ذ ق ن

الْقَاتِن - لہوڑی - جمع آذْ قَانَ - (۳۱) - منجازاً چہرے کو بھی  
کہہ دیتے ہیں - جیسے یَغِیْرُوْنَ لَیْلَۃَ ذِ قَانَ سَجْدًا (۱۱۶) میں منہ کے بل  
کرنے کیلئے یہ لفظ آیا ہے -

## ذ ک ر

اِذْ کَرُوْا وَالتَّذْکَرُ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - کسی بات کا  
دل میں حاضر کر لینا - یہ لفظ تَسْمٰی کے مقابلہ میں آیا ہے (۶۸) - تَسْمٰی  
کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا - لہذا ذِ کَرُ کے معنی ہوتے  
کسی بات کو یاد کرنا -

اِذْ کَرُوْا - اِسْتَذْکَرُوْا - تَذْکَرُوْا - کے ہام معنی ہیں کسی بات  
کو یاد کر لینا - لیکن ابواب کے خصوص کے لحاظ سے ان کے مفہوم میں  
لطیف سا فرق ہے - اِذْ کَرُ اصل میں اِذْ تَکَرَّہ - صوفی تکرانی ہی وجہ سے ذال کو دال کر دیا - پھر  
تاء کو وال میں مدغم کر دیا - اس سے مُذْکَرُ اسم ناعل بنے -  
اَلتَّذْکَرُ کِیْرُوْا - جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے - (۶۹)  
اِذْ کَرُوْا (۶۹) یاد دہانی -

ذِکْرُ حَقِّقَہ - اسکے حق کی حفاظت کی اور اسکو ضائع نہیں کیا -  
اُذْکَرُوْا اِنِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ - تم پر جو خدا کے احسانات ہیں  
انکی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو -

شہرت کو بھی ذِکْر کہتے ہیں۔ نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی۔ اور شرف و عزت کو بھی۔ اور عبرت و موعظت کو بھی۔ ذِکْر اُس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں\*۔

الذِکْر۔ قوی اور شجاع مرد۔ تلوار کی تیزی اور سختی کو بھی کہتے ہیں\*۔ نیز نر، بمقابلہ الانثیٰ (۳۵) میں آیا ہے۔

مَذْکَر۔ مؤنث کی ضد ہے۔ نیز سخت مصیبت جس کا مقابلہ مرد ہی کر سکیں\*۔

قرآن کریم کو الذِکْر کہا گیا ہے (۱۱)۔ کیونکہ اسمیں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی۔ اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ بِذِکْرُونِ (۱۱) کہا گیا ہے۔ نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکْر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جدوجہد جنہیں اُنہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ (۲۴ و ۲۵)۔ اصلئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اس طرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکْر کہا گیا ہے (۳۵)۔ اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں، حتیٰ کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ خود قوانین خداوندی ذِکْر اللہ (۳۶) ہیں۔ شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳) میں آیا ہے۔ نیز (۲۳) میں، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِیَقُوْا بِکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو۔ سورۃ قمر میں مَذْکِرٌ آیا ہے (۱۵)۔ سورۃ دھر میں جہاں آیا ہے کہ انسان ہر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمْ یَتَّکُنْ شَیْئًا مَّذْکُورًا (۱)۔ نو اسمیں مَذْکُورًا کے معنی ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آگئی ہو اور قائم ہو\*\* (Existing by Itself)۔

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْکُرْ وْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (۲۵۴)۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کروں گا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کروں گا۔ تم

ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ (یہاں، علاوہ دیگر اسور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اسکا جواب دیتا ہے۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے)۔ لہذا ذکرِ کثر اللہ کے معنی قوانینِ خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ گنتے رہنا)۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحبِ ضربِ کایمی کا فرعون کے مقابلہ کے لئے جانا، ذکر اور تسبیح ہے۔ (تسبیح کیلئے دیکھئے س۔ ب۔ ح کا عنوان)۔ میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت و وعظت حاصل کرنا ذکر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانونِ خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشر و اشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ”ذکر اللہ“ ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (۱۳۸)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ”سچے“ کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کس طرح رہیں؟ سچا اطمینان، علی وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آ جانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتیں کہ وہ بات حق و صداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ سچا اطمینان، جماعتِ مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی (۱۳۵)۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا۔

## ذکر و

و ذکر کاء۔ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا مکمل ہو جانا۔ خلیل نے کہا ہے کہ اللہ کاء فی السین۔ عمر کے پختہ ہو جانے کو کہتے ہیں جب انسان کی قوتیں کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی اعتبار سے اللہ کاء ذہانت اور فطانت کی تہوی اور تکمیل کو کہتے ہیں۔ ذکر کی تیز فہم۔

بڑا ذہین۔ ذَکَّتِ النَّارُ\*۔ آگ بھڑک اٹھی\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تیزی اور نفوذ کے ہوتے ہیں۔

الْقِتَّةُ کِیَّةٌ\* کے معنی جانور کو ذبح کر دینے کے ہوتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی حرارت غریزی نکال دینے کے ہوتے ہیں\*۔ (ذَکَّتِ النَّارُ کی جہت سے)۔ باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہوتا ہے۔ یہ اس کی مثال ہے۔ یعنی ذَکَّاءٌ\* کے معنی حرارت۔ او ذِکِّیٰ\* کے معنی حرارت نکال لی۔ سلب کر لی۔ اسی کو سلب ماخذ کہتے ہیں۔ یعنی لفظ کے مسادہ کی جو خصوصیت ہو اسے سلب کر لینا۔ قرآن کریم میں ہے اِلَّا مَا ذَکَّیْنٰهُمْ\* (۵۱)۔ ”ہجڑ اس کے جسے ہم ذبح کر لو“۔

## ذ ل ل

ذِلَّةٌ\*۔ ذَلَالَةٌ\* کے معنی ہیں کسی ٹی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ راغب نے الذَّلَّ\*۔ زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہا ہے اور الذَّلَّ\* اس جھکنے کو کہتے ہیں جس میں طبیعت کی تیزی و سختی از خود مغلوب ہو جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ذُلٌّ\* کسی غیر کے دباؤ اور جبر سے نہ ہو تو یہ مذموم صفت نہیں رہتی۔ ذَلُّوا\*۔ (جمع ذُلٌّ\*) جو تابع فرمان ہو جائے اور منہ زور نہ رہے\*۔ سورۃ بقرہ میں ہے اِنْتَهَا بِقَرَّةٍ\* لَا ذَلُّوا\* (۱۶۱) ”وہ ساندھے جسے ہلکے میں نہیں جوتا گیا“۔ عِزُّ الْمَذَلَّةِ\* اس گدھے کو کہتے ہیں جس کے اوپر بوجھ لدا ہو اور پیچھے سے لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہو\*\*۔ اس سے ذِلَّت کا صحیح نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

ذُلُّ الْکَرَمِ\* تَذَلُّلٌ\* کے معنی ہیں انگور کے خوشے نیچے بھکا دینے گئے\*۔

قرآن کریم میں تَذَلُّلٌ، تَعِزُّزٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵)۔ اور وہیں ان دونوں لفظوں کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یعنی عِزَّت کے معنی ہیں حکومت اور مملکت مل جانا۔ غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانا۔ اور ذِلَّت کے معنی حکومت و مملکت کا چھن جانا۔ غلبہ و اقتدار کا کھو جانا۔ سورۃ یٰس میں سویشیوں کے متعلق ہے فَهَبْ لَهَا مَا لَکُونُ\* وَذَلَّلْنَاهَا (۳۶)۔ انسانوں کو ان پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ انہیں انسانوں کا مطیع

و فرمائی کہ اللہ نے اسے (۱۳۳) ذلت و ذلّت و رسوائی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ میدان جنگ میں کمزوری کیلئے یہ لفظ (۱۳۲) میں آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ (۵۴)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں اَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ کے معنی رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۲۸) ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلہ میں سخت۔ جَنَاحَ الذَّلِيلِ (۱۳۴) نرمی تواضع اور مہربانی کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم نے ذلت و مسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے۔ (۲۱)۔ یہ ذلت اسی دنیا کی ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (۱۵۲)۔ اس کے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ و اقتدار اور قوت و سطوت کی زندگی ہے۔ وَاللَّهُ الْعِزَّةُ وَرَسُولُهُ وَاللَّهُ الْعِزَّةُ (۸)۔ ”غلبہ و اقتدار اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعت مومنین کے لئے ہے“۔ مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (۱۳۸)۔ سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔ حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (۵۵)۔ لہذا جس زندگی میں غلبہ و اقتدار اور شوکت و حشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ وَضُرْبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ وَالْمَسْكِتَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۲۱)۔ ”ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے“۔ اس دنیا کو اغیار کے حوالے کر کے، بیکسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو ”روحانی ترقی“ حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔ قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت و اقتدار سرفرازی و مہر بندی۔ شوکت و حشمت۔ دولت و قوت۔ حکومت و سطوت کی زندگی، ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ذلت و خواری، محکومی و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہو سکتا۔ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنِّي ذَكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى (۲۴)۔ ”جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائیگی اور ہم



اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائینگے۔“ یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

## ذ م م

ذَمَّہ - يَذْمُہ - ذَمًّا - مَذْمُومٌ - مَذْمُومٌ کی ضد ہے۔ برائی کرنا۔ اِسْتَذَمَّ - اسنے قابل مذمت کام کیا۔ بِيَمِ ذَمِيْمَةٍ - اسے کوئی ایسا عارضہ یا آفت لاحق ہے جسکی وجہ سے وہ باہر نہیں نکل سکتا\* - مَذْمُومٌ (۱۸/۲۸) میں انہی معانی میں آیا ہے۔

ذِمَّتہ - ہر وہ ذمہ داری - معاہدہ - قول و قرار جسکے ضائع کر دینے سے مذمت لازم آتی ہو\*\* - جس عہد وغیرہ کے توڑ دینے پر انسان کی مذمت کی جاتی ہو\*\*\*۔

اَلِذِّمَّتہ - امان - کفالت - ضمانت - ذِمِّيٌّ - وہ آدمی جسے عہد حاصل ہو۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی گئی ہو۔ جسے ہر طرح کی ضمانت دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم میں ہے لَا يَرْقُبُوا فِيْكُمْ اِلَّا وَّلَا ذِمَّتہ (۹/۸) ”یہ کسی حق اور حرمت - عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے،“ (اسکی تشریح کیلئے عنوان ال ل دیکھئے)۔

## ذ ن ب

اَلذَّنْبُ - ذَمٌ - ذَنْبٌ - وہ اسکے (ذَم کے) پیچھے پیچھے رہا۔ مَسْتَذْنِبٌ - اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹوں کی دموں کے پیچھے پیچھے رہے۔ اَلِذَّنْبُ - ہر چیز کا پچھلا حصہ نیز اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی دم کو کجاوہ سے باندھ دیا جائے۔ اس جہت سے اس مادہ کے معنوں میں کسی چیز کے آخری حصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ذَنْبَةُ الْوَادِي - وادی کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اَلذَّنْبَابَةُ پیچھے لگنے والے کو۔ انہی معانی کے پیش نظر راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّنْبُ دراصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کے ہکڑنے کو کہتے ہیں۔ نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو۔ نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذَنْبٌ کہتے ہیں\*\*۔ اس اعتبار سے یہ لفظ جرم اور معصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ يَذْنِبُهُمْ (۱۱/۱۱) میں اسکے معنی جہرا دم کے ہیں۔ یعنی ان کے رب نے ان کے جہرا تم کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ نیز ذَنْبٌ - خسیس چیز اور رذیل اور کمینہ کو بھی کہتے ہیں\*۔

چونکہ دُم ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اسلئے ان اتہامات کو بھی ذَنْوُبٌ کہا جا سکتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے چپکا دئے جائیں۔ (جسطرح الْفِثْوَةُ دُم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ دیکھئے عنوان ق۔ ف۔ و)۔ چنانچہ سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے لِيَتَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (۴/۴۸)۔ تو اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اسلئے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہو جائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر ورغلائے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا۔ (نیز دیکھئے عنوان ق۔ د۔ م)۔

ذَنْوُبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسکی دُم کے بال گھنے ہوں اور وہ بالوں سے بھری ہوئی ہو۔ نیز اس بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ (اگر وہ خالی ہو تو اُسے دَلْوٌ کہا جائیگا)۔ نیز ایسے دن کو بھی کہتے ہیں جس کا شر بہت طویل ہو جائے، اتنا طویل کہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو۔

سورۃ ذاریات میں ہے فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنْوُبًا مِّثْلَ ذَنْوُبِ أَصْحَابِهِمْ (۵۱)۔ ناج، محیط اور راغب نے کہا ہے کہ ذَنْوُب کے معنی نصیبہ یا حصہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا نصیبہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو ان کی مثل تھے۔

بعض لوگ اپنے آپ کو، ازہر کسرت نفسی، مَذْنُوب (ہامی پر معاصی وغیرہ) کے لقب سے بباد کرتے ہیں۔ ذنب یا گناہ، حکومت خداوندی کے جرم کو کہتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو ”مجرم“، کہنا پسند نہیں کرتے تو مَذْنُوب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہو گیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہئے، نہ کہ اسے اپنے لئے نشان امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دیدیا جائے۔

## ذہب

ذہاب کے معنی ہیں چلا جانا۔ گزر جانا۔ ذہب یہم کے معنی ہیں لے جانا۔ ذہب عتلیٰ کتذآ کے معنی ہیں، میں فلاں بات کو بھول گیا۔ اگر ذہب کے ساتھ عتلیٰ آئے تو اس کے معنی چھوڑ دینے کے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ الی آئے تو اس کے معنی متوجہ ہو جانے کے آتے ہیں\*۔ صاحب کشاف نے کہا ہے کہ اذہبہ کے معنی ہیں اس کو زائل کر دیا۔ دور کر دیا۔ لے گیا۔ (۲/۱۶۱)۔ اور ذہب یہم کے معنی ہیں اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ یعنی خود بھی اس کے ساتھ چلا گیا\*\*۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں آیا ہے ذہب اللہ ینورہیم (۲/۱۶) تو اس کے معنی لے جانے کے ہیں۔ ساتھ چلے جانے کے نہیں۔ الحمد ذہب۔ جانا، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ہو۔ نیز بیت الخلاء کو بھی کہتے ہیں جہاں قضائے حاجت کیلئے جائیں\*۔ لیکن قرآن کریم میں مذہب کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ اسلام کیلئے درین کا لفظ آیا ہے۔ در حقیقت مذہب کے معنی مکتب فکر (School of Thought) کے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں صرف درین تھا۔ بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو درین کی جگہ مذہب (طریقہ) نے لے لی۔ چنانچہ ذہب فی الیدین مذہب کے معنی ہیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا۔ اور فلاں یتذہب الی قولِ آبی حنیفۃ کے معنی ہیں فلاں شخص امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ہے\*\*\*۔ اس سے درین (یعنی وہ ضابطہ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) کم ہو گیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مذہب آہیب آگے چل پڑے۔ جب تک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مذہب آہیب نہیں مٹتے درین قائم نہیں ہو سکتا۔ ”مٹنے“ کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ ان حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا۔ یا وہ جزئیات تھیں جنہیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا۔ انکی حیثیت ابدی نہیں ہے۔ ابدی صرف خدا کا دین ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ لہذا، احلاف کے مختلف مذاہب کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس چلا آ رہا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے۔ جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے۔ باقی

رہیں فقہی جزئیات، تو ان کی حیثیت دائمی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر دور کی فقہ قرآن کریم کے اہدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ہوگی۔

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے وہاں مذہب اسلام کا ترجمہ (Religion of Islam) ہو گیا اور اس سے درپن کا تصور بالکل مٹ گیا، اور اسلام بھی دیگر مذاہب عالم میں سے ایک مذہب سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ اسلام، درپن\* (ضابطہ حیات) کا نام تھا۔ مذہب (Religion) نہیں تھا۔

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے لیکن اس پر عمومی اجماع ہے کہ اس کے اصلی معنی ”دیوتاؤں کی تعظیم“ کے ہیں۔ اس کے بعد کسی مافوق الفطرت ہستی کی پرستش کے قواعد و ضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان ہی معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ہے (دیکھئے Century Dictionary)۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس معنی میں ریلیجن نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات یا زندگی کا قانون ہے۔ لہذا اسلام کو ریلیجن یا مذہب نہیں کہنا چاہئے۔ یہ درپن\* ہے۔

”مذہب“ درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ہے جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ وہ اسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رونما ہوتے ہیں، وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لئے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لئے ان کے حامی جھکتا اور گڑگڑاتا تھا۔ ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتا تھا۔ سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا۔ انسان کی اپنی تو ہم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھکتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس مادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرادی۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے۔ حکمران طبقہ نے ان ”خدائی نمائندگان“ سے کٹھ جوڑ پیدا کیا تو انہوں نے انہیں ”ابشور کا اوتار“، ”ظل اللہ علی الارض“، اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دیکر، عوام کو ان کے حضور جھکتا سکھایا۔ ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام ”مذہب“ (Religion) ہے جو انسانوں میں اب تک متواتر چلا آ رہا ہے۔

مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لئے، خدا کی طرف سے، ہوساطت حضرات انبیاء کرامؑ دین ملتا رہا۔ اس نے انسان کو، کائنات میں، اس کے صحیح مقام سے شناسا کرایا۔ اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشو و نما اور بہبود و ترقی کے لئے استعمال کرے۔ اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی۔ خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور ”مذہب“ کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ہو رہا ہے اس لئے آہستہ آہستہ مذہب کا دور دورہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ اس طرح دین کے قیام کے لئے راستہ صاف ہو رہا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کس طرح ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ مذہبی پیشوائیت سے بیزار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہی قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ہوگا۔ اب انسان سن شعور کو پہنچ رہا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کی توہم پرستیاں ڈرا سکتی ہیں، نہ کاغذ کے پھول پہلا سکتے ہیں۔ اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

الذہب\*۔ (۱۸۸) اس سونے کو کہتے ہیں جو کان سے نکال کر صاف کر لیا گیا ہو۔ (جو ابھی کان میں ہو اور گلا کر صاف نہ کیا گیا ہو) اسے قیبر\* کہتے ہیں۔ جس چیز پر سونے کا ملمع کیا گیا ہو یا سونے کا پترہ چڑھایا گیا ہو اسے مذہب\* کہتے ہیں۔ ذہیب الرجل\*۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایک دم کان میں بہت سا سونا دیکھے اور اسے دیکھ کر سراسیمہ و مبہوت ہو جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) چلے جانے اور (۲) حسن و تازگی کے ہیں۔ سونے کو ذہب\* ان دوسرے معانی کی جہت سے کہتے ہیں۔ آید\* حُبَّة\*۔ ہلکی سی بارش یا سخاوت کو کہتے ہیں\*۔

## ذہل

ذہلۃ\*۔ ذہل عتہ\*۔ کسی چیز سے ربط و ضبط رکھنے کے باوجود اسے چھوڑ دینا۔ یا جانتے بوجھتے چھوڑ دینا۔ یا کسی شغل میں منہمک ہو

جانے کی وجہ سے بھول جانا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ذُھُول کے معنی ہیں محبوب چیز کی یاد باقی نہ رہنا اور اس کی عدم موجودگی کے باوجود دل کا خوش رہنا اور کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرنا\*۔ صاحب محیط نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ذُھُول کسی دہشت کی وجہ سے محبوب کو چھوڑ دینا ہے۔ ذَہیل۔ ہوش و حواس جاتے رہنا\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہو جانا۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (۲۴)۔ ”جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دیگی“۔ یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لئے کہی گئی ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سانسے آ جاتا ہے جس میں مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی۔ اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں خارج نہ ہوں۔ ذَہَل، میں یہ تمام معافی آ جاتے ہیں۔ یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اس طرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔

## ذُو

ذُو۔ صاحب، والا (جیسے ہم، صاحب اولاد یا اعلیٰ و فکر والا، کہتے ہیں)۔ اسکی جمع ذَوُون اور ذَوِیْن نیز اُولُو آتی ہے۔ مونث ذَات\*۔ تشبیہ ذَوَاتَانِ۔ جمع ذَوَات\*۔ قاعدے کی رو سے ذُو کبھی ذِی اور کبھی ذا ہو جاتا ہے۔ ذَوُ عُسْرَةٍ (۲۸۰)۔ صاحب عسرت۔ جو تنگدستی میں پڑا ہو۔ فَذُو دُعَاءِ عَرْرِ یض (۵۱)۔ لمبی چوڑی دعائیں مانگنے والا۔ ذَوِی الْمَرْبِی (۱۶۱)۔ رشتے دار۔ ذَاتِ الْیَمِیْنِ وَذَاتِ الشِّمَالِ (۱۸) دائیں اور بائیں طرف۔ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۳۳)۔ دلوں کے اندر کی باتیں۔ یعنی جو کچھ دل کے اندر ہے۔

ذَوَاتَا آفَنَانِ (۵۵)۔ مختلف علوم و فنون والے۔

## ذوالقرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رہائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا۔ قرآن کریم نے (سورہ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے (۸۳: ۱۰-۱۱) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ن)۔

## ذود

الذودُ دُ۔ ہانکنا۔ دفع کرنا۔ جھڑک کر نکال دینا۔ ہٹا دینا۔ اَلْمِذَّوْدُ دُ۔ وہ جگہ جہاں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا ہے۔ بیل کے سینگ جس سے وہ اپنی مدافعت کرتا ہے، یعنی جس سے وہ دوسروں کو ہٹا کر دور رکھتا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز سے الگ اور یک سو کر دینا۔

سورہ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پیٹاؤ (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں (تَذُوْدَانِ ۲۸) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نقشے کو پھر سانسے لائیے کہ پیاسے جانور پانی کی طرف بڑھنا چاہیں اور ان کا چرواہا انہیں ادھر جانے سے روکے۔ ایسے اَلذَّوْدُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے روک کیوں رہی ہیں۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ اَلْحَقُّ بِحَقِّكَ اَلرَّعَاءُ (۲۸)۔ ہم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواہے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اسکی وجہ بھی بتائی کہ وَابْنُ نَاسِیْخٍ کَبِیْرٍ (۲۸) (ہم لڑکیاں ہونے کی وجہ سے کمزور ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اسلئے ہم کب جرات کر سکتی ہیں کہ ہمارے جانور پہلے پانی پی لیں۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری کی پوری تپستان کس حسن و خوبی سے بیان کر کے رکھ دی ہے۔ دنیا میں بھی ہوتا چلا آیا ہے اور بھی ہو رہا ہے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ہے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری

آتی ہے۔ اسمیں استثناء ہے تو انہی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لیکر آتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو انکی باری پر ہانی پلانے کا انتظام کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے۔ *فَسَقَىٰ لَهُمَا* (۲۸) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو ہانی پلا دیا۔ پیغمبر یہی کچھ کرنے کے لئے آتے تھے۔ اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں یہی کچھ کریگا۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لئے آزاد کرا دینا تاکہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں۔ اگرچہ حضرت موسیٰؑ اسوقت ابھی منصب نبوت پر سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن طبیعت کا دھماکا ابھی ہی کاموں کی طرف تھا۔

## ذوق

ذَاقَ - چکھنا - مزہ معلوم کرنا\*۔ راعب نے لکھا ہے کہ یہ دراصل تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کھا کر اسکی اندرونی حالت کو معلوم کرنا ہیں۔ یہ اسکے اصلی معنی ہیں۔ پھر اسکا اطلاق ہر تجربہ پر ہونے لگا\*\*۔ یعنی کسی چیز کا تجربہ ہو جانا۔ *فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ* (۲۴)۔ جب انہیں ”شجرہ“ کا تجربہ ہو گیا۔ *ذَاقُوا* - چکھنے والا۔ جو تجربہ حاصل کرے (۱۸۴)۔ (مؤنث *ذَاقَتْ*)۔ *آذَاقَ* - مزہ چکھانا۔ تجربہ حاصل کرانا (۱۱۴)۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بالعموم عذاب کے ساتھ آیا ہے (اگرچہ بعض مقامات پر رَحْمَةً کے ساتھ بھی آیا ہے)۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو اسطرح محسوس کرے گویا اس نے ان کا مزہ چکھ لیا ہے۔ اسے اسکا عملی تجربہ ہو جائے کہ فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

## ذی ع

ذَاعَ - بتذریعہ - پھیل جانا۔ ظاہر ہو جانا۔ عام ہو جانا۔ *آذَاعَ سِرَّهُ* - اسنے اسکے راز کو افشا کر دیا۔ ظاہر کر دیا۔ اور لوگوں میں مشہور کر دیا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے معنی لوگوں میں پکار کر کہہ دینا اور اعلان کر دینا ہیں\*\*\*۔ (۸۳) میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ *وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ* *آذَاهُوا بِهِ*۔ ”جب ان تک کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلانے اور اڑاتے ہیں۔“



ر

## رأس

الرَّأْسُ - (جمع رُءُوسٌ) سر - ہر چیز کا اعلیٰ حصہ - سردار قوم - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور بلند ہونے کے ہیں - رَئِيسٌ - سردار قوم - رَأْسُ الْعَمَلِ - اصل مال - الرَّائِسُ - والی - حاکم - اَلْمَرْؤُوسُ - رعیت -

قرآن کریم میں مناسب حج کے ضمن میں ہے - وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ (۱۶۶) - اپنے سروں کو نہ منڈاؤ - دیکھئے (عنوان ح - ل - ق) - اصلی سرمایہ کیلئے رُءُوسٌ اَمْوَالِکُمْ آیا ہے (۲۶۹) - یعنی ”سرمایہ“، (تفصیل ر - ب - و کے عنوان میں دیکھئے) -

## رأف

الرَّأْفَةُ - رحمت اور رافت مرادف المعنی الفاظ ہیں - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ رَأْفَةٌ تو یہ ہے کہ تم سے ان امور کو دفع کر دیا جائے جو ضرر رساں ہوں اور رَحْمَةٌ یہ ہے کہ تمہیں ایسے امور بہم پہنچائے جائیں جو راحت رساں ہوں - اسکی تائید صاحب المنار نے کی ہے جس میں لکھا ہے کہ رَأْفَةٌ کا نتیجہ دفع ہلا ہے اور رَحْمَةٌ سے مراد خوشحالیوں کا زیادہ عطا کرنا ہے - لہذا رُءُوفٌ اور رَحِيمٌ سلبی (Negative) اور ایجابی (Positive) دونوں پہلوؤں کو محیط ہو جاتے ہیں - ان اسباب و عناصر کا دفع کرنا جو کسی کی نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں اور اسکے ساتھ ہی اس ساز و سامان کا بہم پہنچانا جس سے اسکی نشو و نما ہوتی جائے -

خدا کی رَأْفَت و رَحْمَت کس طرح ملتی ہے، اسکے متعلق سورۃ بقرہ میں کہہ دیا کہ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّعِبَا اِيْمَانَكُمْ۔ اِنَّ اللَّهَ بِالْاِنْسَانِ لَكَرُؤُوفٌ رَّحِيْمٌ (۲/۱۳۰)۔ اللہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے ایمان کو یونہی بلا حفاظت، چھوڑ دے اور وہ بلا نتیجہ رہ جائے۔ وہ تو رُؤُوفٌ رَّحِيْمٌ ہے۔ یعنی وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے ایمان کے نتیجہ خیز ہونے کی راہ میں جس قدر موانع آئیں انہیں راستہ سے ہٹائے اور ایمان کے مثبت نتائج پیدا کرتا جائے۔ لہذا اسکی رَأْفَت اور رَحْمَت، اِيْمَان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی انسانیت کی صحیح نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ ایمان کے معنی ہیں قانون خداوندی کی صداقت پر یقین اور اعتماد رکھنا اور اسکی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینا۔

چونکہ عام طور پر انسانوں کی تکلیف رفع کرنے کا جذبہ مجرکہ، رقتِ قلب (دل کی نرمی) ہوتا ہے اسلئے رَأْفَت کے معنی نرمی کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِیْ دَرَبِنَ اللّٰهِ (۲۴/۲)۔ ”قانونِ خداوندی کے نفاذ میں نرمی سے کام مت لو،۔ ایسا نہ ہو کہ اس خیال سے کہ یہ سزا انہیں تکلیف پہنچائیگی تم مجرمین کو جرم کی سزا ہی نہ دو یا اس میں نرمی برتو۔ اسلئے کہ اگر ظالمین اور مجرمین کو سزا نہ دی جائے تو مظلوموں کی داد رسی کیسے ہو۔ عیسائیت نے خدا ترمی کا بھی غلط مفہوم اپنے سامنے رکھا جسکی وجہ سے ظالموں کی رسیاں دراز ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ مذہب کو کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر محبوس ہونا پڑا اور سیاست بے سہار ہو گئی۔ قرآنِ حکیم نے اسی لئے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ یہ انکا خود تراشیدہ مسلک تھا اور جذباتِ رافت و رحمت کی غلط تعبیر کا پیدا کردہ (۲۴/۲)۔ اسلام عدل قائم کرنے کا مکتبہ تھا جسکے لئے زیادتی کرنے والوں کی فوتوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ لہذا اسمیں رَأْفَت کے ساتھ غِلْظَت (نرمی کے ساتھ سختی) کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (دیکھئے عنوان غ۔ ل۔ ظ)۔

## رأی

رُؤْيَا۔ کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا۔ یہ لفظ آنکھوں سے دیکھنے یا عقل و بصیرت سے معلوم کرنے یا خواب و خیال میں دیکھنے اور تصور کرنے سب کے لئے آتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے کہ جب اس کے ساتھ صرف ایک مفعول آئے تو اس کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتے ہیں اور جب دو مفعول

آئیں تو اس کے معنی جاننے یا علم حاصل کرنے کے ہوتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی ہوتے ہیں اور جب اس کے بعد الی آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اس طرح دیکھنا (یا غور و فکر کرنا) کہ اس کے بعد انسان کو عبرت و موعظت حاصل ہو\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ رَأَى رُؤْيَةً۔ آنکھ سے دیکھنے کو۔ رُؤْيَا خواب دیکھنے کو، اور رَأَى يَأْذِل سے دیکھنے اور غور کرنے کو کہتے ہیں\*\*۔ الْمَرَأَى وَالْمَرَأَةُ۔ منظر۔ الْمِرْآةُ۔ آئینہ۔ الرُّؤْيَا۔ خواب۔ الرُّؤْيَى۔ رائے۔ خیال۔ جب کوئی بات یقینی نہ ہو، ظنی ہو تو اس کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر لینا رائے کہلاتا ہے\*۔ أَرَأَيْتَكَ۔ (۱/۶) عرب اس معنی میں بولتے ہیں جس معنی میں ہم کہتے ہیں ”بتاؤ تو سہی“۔ ”ذرا خبر تو دو“۔ اور أَلَمْ تَرَ إِلَى... (۱/۵) تعجب کے موقع پر بولتے ہیں ”تم نے دیکھا نہیں!“! یعنی تمہیں اس بات پر تعجب نہیں آتا؟ لیکن ایسے موقعوں پر اس میں عبرت خیز نظر ڈالنے کی دعوت بھی ہوتی ہے۔ سورة آل عمران میں يَرَوْنَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ۔ (۳/۱۳) تاکید اور وضاحت کے لئے آیا ہے۔ جیسے ہم لوگ ”آنکھوں دیکھی“ وغیرہ بولتے ہیں۔ اور سورة مریم میں رَرْتُمَا (۲/۲۴) منظر یا ظاہری حالت کے معنوں میں آیا ہے۔ رَرْتُمَا النَّاسَ (۲/۲۴) لوگوں کے دکھانے کے لئے۔ يَرَاءُوْنَ النَّاسَ (۱/۶۲) لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ هُمْ يَرَاءُوْنَ (۱/۶) وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں (کہ وہ نمازی ہیں) لیکن صلوة کی حقیقت کو فراموش کر چھوڑتے ہیں۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں کو آب رواں کی طرح کھلا رہنا چاہئے انہیں بند لگا کر روک رکھتے ہیں (۱/۶)۔ سورة سومن میں هُمَا أُرِيكُمُ إِلَّا مَا أَرَى (۲/۲۶) ”میں تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں“۔ سورة شعراء میں هُمَا مَعًا تَرَآءُ الْجَمْعُ مَعًا۔ (۲/۲۶) ”جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا“۔ بَادَرَى الرَّامِي (۲/۱۱) کے لئے دیکھنے عنوان (ب۔ د۔ و)

## ر ب ب

رَبَّ کے معنی نشو و نما دینا ہیں۔ یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے گزارنا کہ وہ بتدریج نشو و نما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے\*\*\*۔ جس طرح فطرت، قطرہ، نیساں کو موقی بنانے کے لئے نئی تبدیلیوں

سے گزاری اور رفتہ رفتہ اسکی نشوونما کثی جاتی ہے\*۔ یہ طریق نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں رَبٌّ وَلَدَهُ رَبًّا وَرَبَّتُهُ وَتَرَبَّتُهُ\*۔ اس نے بچے کی پرورش و تربیت کی۔ نگرانی کی تاآنکہ وہ بالغ ہو گیا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے۔

مِنْ دُرَّةٍ بِيَضَاءِ صَافِيَةٍ  
مِثْلًا تَرَبَّبَ حَائِرَ الْبَحْرِ

یعنی (ممدوح) اس صاف اور سفید موتی سے (بھی زیادہ خوبصورت ہے) جس نے سمندر کی گہرائیوں میں پرورش پائی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا اور اسے سنوارنا۔ اسی سے الرَّبُّ مالک، خالق، کسی چیز کی نگرانی اور اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں (۲) کسی چیز کا جمے رہنا اور ایک جگہ قائم رہنا۔ چنانچہ کہتے ہیں أَرَبَّتِ السَّحَابَةُ\* بیہلذم التبتدة۔ بدلی برابر اس شہر پر ٹھہری یا برستی رہی۔ اور (۳) کسی شے کو دوسری شے کے ساتھ ملا دینا۔ لہذا تسلسل کے ساتھ نشوونما دینے چلے جانا اور درست کرتے رہنا ربوبیت ہے۔ مجازاً بچہ کو تھپک کر سلا دینے کے لئے رَبَّتِ الْمَرْأَةُ صَبِيحَتَهَا کہتے ہیں\*۔ کیونکہ نیند اور آرام و سکون کا وقفہ بچہ کی نشوونما سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

کسی معاملہ کی اصلاح اور درستگی اور اس کے استحکام کے لئے بھی رَبٌّ يَرْبُّ رَبًّا کہا جاتا ہے\*۔ اور کسی چیز کو جمع کرنے اور بڑھانے چلے جانے کو بھی\*۔ چنانچہ رَبِّيَابَةٌ اس تھیلہ کو کہتے ہیں جس میں بہت سے تیروں کو اکٹھا رکھا جائے۔ اور رَبُّ الشَّاهِنِ کے معنی ہیں، اس نے تیل کی اصلاح کر کے اسے خوشبودار بنایا\*\*۔

چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے أَلْبَرَّتْ أُنْ پودوں کو کہتے ہیں جو گرمیوں میں بھی مرجھاتے نہیں بلکہ ان کی سرسبزی و تازگی، سردی اور گرمی دونوں میں یکساں رہتی ہے\*۔ اور أَلْمَرَبُّ أَسْ زمین کو کہتے ہیں جہاں درخت اور پودے بکثرت پائے جائیں اور جہاں ہمیشہ سرسبزی و شادابی رہے\*۔ اسی طرح أَلْثَرِيَّةُ کے معنی ہیں بہت سے گھنے درخت۔ بہت بڑی جماعت (جو دس ہزار یا اس سے لگ بھگ ہو)۔ یا سامان عیش کی کثرت و فراوانی\*۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جماعت کو رَبِّيٌّ کہا جاتا ہے گویا یہ رَبِّيَّةُ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اسی جمع

رَبِّ يَشُونَ آتی ہے \*۔ (دیکھئے ۱۳/۵)۔ اَلرَّبَّابَةُ۔ تہ ہر تہ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں \*\*۔ اور اَلرَّبَّابَةُ۔ شیریں پانی جو کثرت سے ایک جگہ جمع ہو گیا ہو \*\*\*۔ اَلرَّبَّابَةُ کے معنی عہد و میثاق اور مملکت کے بھی ہیں \*\*\*۔ کیونکہ اس سے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ مل جاتی ہے۔ (ابن فارس)۔ اَلرَّبَّابَةُ۔ ایسی جگہ (جہاں) میں یہ لفظ آتی ہے کیوں کہ اسے استعمال۔ نیز وہ بکری جسے چراگاہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ گھریلو چارہ پر پرورش کیا جائے تاکہ جس وقت ضرورت ہو اسکا دودھ دوہ لیا جاسکے \*\*۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر رَبِّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی نشوونما دینے والا۔ پایہ تکمیل تک پہنچانے والا۔ انتظام کرنے والا۔ اصلاح کرنے والا۔ اسلئے قوم کے مدبر اور منتظم سردار کو رَبِّ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔ اور گھر کے مالک کو رَبِّ الْبَيْتِ \*\*۔ رَبِّ الْقَوْمِ کے معنی ہیں اس نے قوم کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان پر سیادت کی \*\* رَبِّ کی جمع اَرْبَابُ آتی ہے (۱۲/۲)۔

بڑے بھائی کو بھی رَبِّ کہا جاتا ہے \*\*\*\*۔ اس اعتبار سے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ (فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ... ۵/۲۴)۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تو اور تیرا بڑا بھائی (ہارونؑ) دونوں جاؤ اور دشمن سے جنگ کرو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے طنزاً کہا ہو کہ تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمن سے جنگ کرو۔ اَلرَّبَّانِيٌّ۔ جس کی نسبت رب کی طرف ہو۔ یا وہ معلم جو لوگوں کو بڑے بڑے علوم سے پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کی غذا دیکر انکی ذہنی نشوونما کرے۔ ہر صاحب علم کو بھی رَبَّانِيٌّ کہا جاتا ہے۔ اور راسخ فی العلم کو بھی \*\*۔ انہی معنوں میں رَبَّیُّ بھی استعمال ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱/۲) سے ہوتی ہے۔ یعنی کائنات کا ہر حسین گوشہ خدا کی صفت ربوبیت کا پیکر حمد و ستائش ہے۔ کائنات میں ہر شے اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک عظیم الشان پروگرام کارفرما ہے جس میں ایک ادنیٰ سا بیج اپنی نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ رہا ہے۔ اسی کو خدا کا نظام ربوبیت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی لئے قابل حمد و ستائش ہے کہ وہ ہر شے کو ربوبیت عطا کرتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جس طرح

خدا کا یہ نظام ربوبیت خارجی کائنات میں از خود کارفرما ہے اسی طرح انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی اور معاشری دنیا میں اسی نظام ربوبیت کو نافذ کریں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ رزق کے تمام سرچشمے تمام افراد کی پرورش کے لئے عام ہو جائیں اور ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کو دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے وقف کر دے۔ اس طرح تمام نوع انسانی کی مضمحل صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی اپنی نقطہ تکمیل تک پہنچ جائیں گی۔ جو لوگ اس نظام کو قائم کر دیں گے وہ رَبَّانِیُّوْنَ کہلائیں گے (۳۸)۔ اور اس نظام کا قیام قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہوگا۔ یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصود و منتهی ہے۔ یعنی دنیا میں نظام ربوبیت کا قیام۔ اسی کے لئے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ ذریعہ ہوتی ہے افراد انسانیہ کی ربوبیت کا۔ چونکہ ربوبیت میں انسان کی طبعی (جسمانی) زندگی کی پرورش بھی شامل ہوتی ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی، اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ایسے وسائل و ذرائع، ہر ایک کے لئے یکساں طور پر، مہیا کرے جن سے ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ جب انسانی ذات کی اس طرح نشوونما ہو جائے تو موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے حیات آخرت کہتے ہیں۔ خدا کی ربوبیت کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا ہے۔

”ربوبیت عالمینی“۔ بس یہ ہے اسلامی معاشرہ کا مقصود و منتهی۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت بلا لحاظ نسل و رنگ اور بلا امتیاز خون و وطن۔ جب تک خدا کی یہ صفت، افراد اور ان کے مجموعہ معاشرہ میں منعکس نہیں ہوتی، ان کی زندگی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ یہ قرآن کریم کی پہلی آیت اور اس کی تعلیم کا نقطہ آغاز ہے۔ جس کے اندر یہ صفت خداوندی منعکس ہوتی ہے، وہ پوری پوری محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے۔ اسی لئے اس معاشرہ میں، نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے، نہ دولت اکٹھی کرنے کا خیال۔ نہ رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ دوسروں کی محنت کو غصب کر لینے کا خیال۔ قرآن کریم کا مقصود اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل اور قیام ہے

اور یہی معاشرہ ہے جو دنیا کو محسوس طریق پر دکھا سکتا ہے کہ خدا کا تجویز کردہ نظام کس قدر درخور حمد و ستائش ہے۔ یہ عملی تفسیر ہے۔ الحمد للہ رب العالمین کی۔

## رَبَّ (حرف)

رَبَّ - رَبَّ - رَبَّمَا - یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم اپنے ہاں ”اکثر و بیشتر“ کا لفظ بولتے ہیں۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے“۔ ”عام طور پر کہا جاتا ہے“۔ ”عموماً حالت یہ ہوتی ہے“۔ وغیرہ۔ نیز یہ تاکید اور شدت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں، وہ بہتیرا چاہتے رہے۔ انہوں نے اس کے لئے کتنی ہی بار کوشش کی۔ وغیرہ۔ رَبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۱۳)۔ انکار کرنے والے بہتیرا چاہیں گے کہ اے کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ یا انکار کرنے والوں کی اکثر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے۔ یا یہ لوگ ہمیشہ اس حسرت میں رہیں گے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے۔ اس کے برعکس یہ حرف ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ”کبھی کبھی“۔ قرآن کریم میں سیاق و سباق سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرف کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

## رَبَّ ح

رَبَّحٌ - تجارت میں چیزوں کے تبادلے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اسے رَبَّحٌ کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی تجارت میں زیادتی، اضافہ اور کامیابی بتائے ہیں۔ رَبَّحٌ و رَبَّاحٌ - تجارت میں اضافہ و ترقی کو کہتے ہیں\*\*۔ أَرْبَحُ النَّاقَةَ - اسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص صبح کے وقت بھی اونٹنی کا دودھ دے اور پھر دوپہر کے وقت بھی۔ لیکن تَرَبَّحُ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی حیران رہ گیا\*\*\*۔ قرآن کریم میں آیا ہے فَمَا رِبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲۶)۔ ”ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا،“۔

## رَبَّ ص

تَرَبَّصْ - انتظار کرنا۔ کسی پر خیر یا شر واقع ہونے کا انتظار کرنا\*\*۔ یا سودے وغیرہ کے سستا یا مہنگا ہونے کا انتظار کرنا یا کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا\*۔

سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ایلاء کے سلسلہ میں انتظار کیلئے آیا ہے۔  
 لِلَّذِينَ يُؤْتُونَ مِن نَّسَاءِ هِمْ تَتَرَبَّصُّنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ... (۲۳۶)  
 ”جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت تک انتظار ہے،۔ یعنی وہ عورتوں کو اس حالت میں غیر معین عرصہ تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں چار ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں نکاح میں رکھنا ہے یا آزاد کھو دینا ہے۔ تَتَرَبَّصُّنَّ\*۔ انتظار کرنے والا (۲۳۵)۔

## رب ط

رَبِطَہ\*۔ اسے باندھ دیا۔ آلِ رَبَّاطٍ\*۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو باندھا جائے۔ الرِّبَاطَةُ\*۔ تعلق۔ بندھن۔ ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی پختگی سے باندھنا اور جمعے رہنا دئے ہیں۔ آلِ رَبَّاطٍ\*۔ کسی کام کو مسلسل کرتے رہنا۔ دشمن کی سرحدوں پر مسلسل ہمراہ دیتے رہنا۔ رَبِطَہ\* الرِّبَاطُ\*۔ سرحد پر حفاظت کیلئے فوج کے اڈے بنانا\*۔ (۱۶۰)۔

سورۃ آل عمران میں ہے لَصَبِيرٌ وَا وَ صَابِرٌ وَا وَ رَابِطٌ وَا (۱۶۹)۔ اس میں رَابِطٌ وَا کے معنی اپنی حفاظت کا مستحکم انتظام کرنا، اور ایک دوسرے سے جڑ کر رہنا یا مسلسل مقصد کے لئے سرگرم عمل رہنا ہیں۔

رَبَطَ اللہ عَالِیٰ قَلْبِہِمْ۔ خدا نے اسے صبر و ضبط کی توفیق دی اور اسکے دل کو مضبوط کر دیا\*۔ سورۃ انفال میں ہے وَلَیْسَ رَبُّ طَ عَالِیٰ قُلُوبِہِمْ\* وَ یُنَبِّئُہِمْ اَلَا قَدْ اَمَّا (۱۶۱)۔ ”تا کہ وہ تمہارے دلوں کو تقویت دے اور اس کے ذریعے تمہارے قدموں میں ثبات عطا کر دے“۔  
 اَلرَّیْبَاطُ\*۔ ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جانا۔ تعلق\*۔

## رب ع

أَرْبَعَةٌ\*۔ چار کا عدد (مذکر کیلئے) (۲۰۰) اور أَرْبَعٌ\* مؤنث کیلئے (۲۰۱)۔ أَرْبَعُونَ وَا أَرْبَعِیْنَ\*۔ چالیس۔ (۲۰۲) أَلْأَرْبَعُ\* اور الْأَرْبَعُ\* ایک چوتھائی\* (۲۰۳) رَبَّاعٍ\*۔ چارچار۔ (۲۰۴)۔ رَابِعٌ\*۔ چوتھا (۲۰۵)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ”چار کے عدد، کے علاوہ اس کے بنیادی، معنی کسی چیز پر قائم رہنا اور اسے اوپر اٹھانا بھی ہیں۔



## ر ب و

رَبًّا - يَرْبُو - زیادہ ہونا - بڑھنا - پھولنا\* - لِيَرْبُوْا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۹) - "تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو" - سبزی کا بڑھنا اور پھولنا (۲۲) - رَبَّ السَّوْرِ يَتَّى - اس نے ستو میں پانی ملایا اور اس طرح ستو پھولا\* - رَابٍ - مونث رَابِيَّةٌ - وہ چیز جو اوپر چڑھ جائے - جو اوپر آجائے - زَبَدًا رَابِيًا (۱۳) - وہ خس و خاشاک یا جھاگ جو اوپر آجائے - اخْذَةً رَابِيَّةً - سخت گرفت - بہت زیادہ (بڑھی ہوئی) گرفت\* - ایسی گرفت جو انسان کے اوپر چھا جائے اور اسے مغلوب کر دے - (۱۶) - اَرْبِي - زیادہ کثیر - مال و دولت میں زیادہ بڑھا ہوا\* - (۱۶) - رَبْوَةٌ - زمین کا بلند حصہ - سطح مرتفع\* - (۲۳) - رَبَّقِيْثَةٌ - میں نے اسے بڑھایا، اسے غذا دی - اسے پیالا - پرورش کیا\*\* - (۱۶) - اَلرَّيْبَا (الرَّيْبُو) - وہ سود جو قرض پر وصول کیا جاتا ہے - رَأْسُ الْعَالِ پر زیادہ لینا\*\*\* (تفصیل آگے آتی ہے) -

سورة آل عمران میں ہے لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۳۹) - سود مت کھاؤ - تم سمجھتے ہو کہ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے - حالانکہ درحقیقت اس سے قومی سرمایہ میں کمی ہوتی ہے - (دیکھئے عنوان ض - ع - ف) - قرآن کریم نے جو معاشی نظام تجویز کیا ہے اس میں سود کی کہیں گنجائش نہیں - جب اس میں دولت کا جمع کرنا ہی منع ہے تو پھر سود تو کچھ اس میں قرضہ کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا - اس میں فالتو سرمایہ (Surplus Money) کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں - سارے معاشرے میں بٹ جاتا ہے - قرآن کریم میں قرضہ وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں ، وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب هنوز قرآن کریم کا معاشی نظام ربوبیت منسحل نہ ہوا ہو -

سود تو ایک طرف - اُس نظام میں کسی کو عطیہ بھی کمونی چیز اس نیت سے نہیں دی جاسکتی کہ اس سے زیادہ واپس ملیگی - وَمَا اَتَيْتُمْ مِّنْ رَبِّ لِيَرْبُوْا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۹)\*\*\*\* - جو کچھ تم لوگوں کو ان کے واجبات سے زیادہ دو اور اس سے غرض یہ ہو کہ اس میں بڑھوتی ہو تو نظام خداوندی میں اس میں بڑھوتی نہیں ہو سکتی - اس کی تفسیر (۶۴) میں یہ کہہ کر

\* تاج و محیط - \*\* اس کے لئے عنوان ر - ب - ب بھی دیکھئے - \*\*\* راعب - \*\*\*\* تاج نے اس کے معنی "عطیہ" کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو کسی کے واجب سے زیادہ مل جائے -

کردی کہ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ کسی پر اس مقصد کے لئے احسان نہ کر کہ تجھے اُس سے زیادہ واپس ملے۔ اس نظام کی تو بنیاد ہی اِیْتَانِ زَكَاةٍ پر ہے۔ یعنی دوسروں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا۔ اس لئے (۳۹) میں رَبًّا کے مقابلہ میں زَكَاةً آیا ہے۔

قرآن کریم نے اَلرَّبُّو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ہے کہ وَاعْتَلِ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵)۔ ”خدا نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربو کو حرام“۔ سوال یہ ہے کہ ربو کسے کہتے ہیں؟ اس مقام پر قرآن کریم ربو کو بیع کے مقابلہ میں لایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ربو، بیع کی ضد ہے۔ بیع کیا ہے، اس کی تشریح، عنوان (ب۔ ی۔ ع) میں کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔

جو کچھ ہم کسی دوسرے سے لیتے ہیں، اسکی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً عطیہ۔ اجرت۔ سود (عام معنوں میں)۔ منافع (تجارت میں)۔ جوئے کی جیت۔ اب دیکھئے کہ ان میں فرق کیا ہوتا ہے۔

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے، نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے کچھ واپس لینے کے خیال کے بغیر، تحفہ دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسلئے یہ شکل ہمارے زیر نظر موضوع سے خارج ہے۔

(۲) اجرت۔ یہ محنت (Labour) کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ (Capital) کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) سود۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ (Capital) دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر، اصل سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ہے۔ اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار۔ اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ نہ محنت کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ ”انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے“۔ یعنی وہ صرف محنت کا معاوضہ جائز قرار دیتا ہے۔ سرمایہ (Capital) استعمال کرنے کا معاوضہ جائز نہیں قرار دیتا۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں کے سامنے

نہیں تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربو' میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دیتا ہے۔ اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس میں بھی اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل پر زائد ہیں، تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذالیکُ بِلَا نَقْصٍ لِّمُ قَالُوا لَاتَقِمَا الْبَيْعَ مِثْلُ الرِّبَا (۲/۲۷۵)۔ وہ بیع اور ربو' کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں ایک نوعیت کی چیز نہیں ہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے، اور دکاندار کو اسکی محنت کا معاوضہ سرمایہ سے الگ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے۔ لیکن ربو' میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے، جو حرام ہے۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ٹھہرا کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام ہے۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربو' ہے۔ (اس بات کا تعین معاشرہ کریگا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا)۔ لہذا، ہر وہ کاروبار جس میں انسان صرف سرمایہ لگا کر، اپنے اصل سے زائد وصول کرے، قرآن کریم کی رو سے الرِّبَا میں داخل ہوگا۔ خواہ وہ زمین کی بٹائی ہو یا کاروبار میں (Sleeping Partner) کا منافع میں حصہ۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (Un-earned Income) کہتے ہیں۔ یعنی وہ آمدنی جو محنت سے کمائی نہ جائے۔

اور جب نہ سرمایہ لگایا جائے نہ محنت کی جائے تو وہ آمدنی جوئے کی ہے۔ (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (Risk) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع یا نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربو' میں (Risk) نہیں ہوتا۔ لیکن یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (Risk) ہو تو جو عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ہر داؤ میں (Risk) ہوتا ہے۔ بیع اور ربو' میں اصل فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ بیع میں رأس المال + محنت کا

معاوضہ (اجرت) واپس ملتے ہیں۔ اور ربو' میں رأس المال + رأس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ اجرت حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام ہے، خواہ وہ سود کے نام سے پکارا جائے یا تجارت کے "منافع"، کے نام سے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رأس المال ہر اضافہ کسی شکل میں بھی جائز نہیں ہوگا۔ اگر تجارت اُس زمانہ میں ہوگی جب هنوز افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ نے اپنے اوپر نہیں لی، (یعنی عبوری دور میں) تو رأس المال کے علاوہ اتنے منافع کی اجازت ہوگی جو دوکاندار کی دن بھری محنت کے معاوضہ کے برابر ہو۔ اور جب دوکاندار کی ضروریات زندگی بھی معاشرہ پوری کریگا تو تجارت میں اشیاء کی فراہمی بلا منافع ہوگی۔ معلوم نہیں انسان کو قرآن کریم کے نظام معاش تک پہنچنے میں ابھی کتنا وقت لگے۔ لیکن جتنا وقت بھی لگے، انسان اپنے خود ساختہ جہنم سے اسی وقت نکل سکے گا جب اس نے قرآنی نظام اختیار کیا۔ موجودہ نظام معیشت جس میں سرمایہ کے استعمال کے معاوضہ کو حلال و طیب سمجھا جاتا ہے، قرآنی نظام کے خلاف اعلان جنگ ہے (۲/۷۹)۔

## رت ع

رَتَعٌ - يَرْتَعُ - رَتَعًا - رَمَزَ مقام میں سیر ہو کر کھانا پینا اور حسب مرضی گھومنا پھرنا۔ رَتَعٌ کا لفظ دراصل جانوروں کے کھانے چرنے کیلئے آتا ہے اور جی پھر کر کھانے کے لئے، پھر استعارۃً انسانوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جَمَلٌ رَاتِعٌ (جمع۔ اہل رَتَعٌ) آزادی کے ساتھ کھانے پینے والا اونٹ۔ اَلْمَرْتَعُ - چراگاہ۔ اَرْتَعَتِ اَلْأَرْضُ - زمین میں گھاس اور چارہ بکثرت ہو گیا۔

سورۃ یوسف میں ہے کہ برادران حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ یوسفؑ کو ہمارے ساتھ باہر جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے يَرْتَعُ وَ بَلْعَبٌ (۱۲/۱)۔ تا کہ وہاں ہنسی خوشی سے کھائے پیے اور کھیلے کودے۔ "يَرْتَعُ وَ بَلْعَبٌ"، کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو آجکل ہمارے ہاں پکنک (Picnic) کا ہے۔

## رت ق

رَتَقٌ - شکاف کو بند کر دینا، بھر دینا، ملا دینا۔ نیز جڑی ہوئی اور ملی ہوئی چیز۔ اِرْتَتَقَ الشَّيْءُ - چیز مل گئی اور جڑ گئی۔ اس میں

کہیں شکاف نہ رہا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ الْقَرْتَقُ\* جوڑنا اور ملانا ہے خواہ وہ خلقی ہو خواہ مصنوعی\*\*۔ قرآن کریم میں ارض و سموات کے متعلق ہے کہ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا۔ (۲۱)۔ شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولہ ملا جلا تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کٹرے الگ الگ ہو گئے۔ (۴۹)۔ غور کیجئے کہ یہ اعلان چوٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کے ذہن میں اسکا تصور تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرام شروع میں ایک ہی ہیولہ تھے اور بعد میں یہ الگ الگ ہوئے۔ آج سائنس کی تحقیقات نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لیکن اسوقت اس حقیقت کو خالق کائنات کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا؟

## رت ل

الْقَرْتَلُ\*۔ دانتوں کا موتیوں کی لڑی کی طرح سفید، آبدار، اور نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ہونا۔ کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ مربوط و مرتب ہونا، حسن ترتیب اور حسن نظم لئے ہوئے ہونا۔ الْقَرْتَلَاءُ\*۔ ایک قسم کی مکڑی جو اپنے جالے کو نہایت عمدہ حسن اور تناسب سے بنتی ہے\*\*\*۔

قرآن کریم کے متعلق ہے وَرَتَقْنَاهُ قَرًّا تَبَيَّلًا (۲۵)۔ ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب، تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہم دگر جوڑا ہے۔ اسکی ساری تعلیم، ایک خاص نظم کے ساتھ، اسکی مرکزی فکر کے گرد گھومتی ہے۔ نبی اکرمؐ سے کہا گیا وَرَتَقْنَا الْقُرْآنَ تَبَيَّلًا (۶۳)۔ تم بھی اسے اسی طرح حسن نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔

## رج ج

الْقَرْجُ\*۔ ہلانا۔ شدت سے حرکت دینا۔ زلزلہ ڈال دینا۔ کسی چیز کو ہلا کر اسکی جگہ سے ہٹا دینا، بے جگہ کر دینا۔ اَلْقَرْجَةُ السَّحَرُ\*۔ سمندر متموج اور متلاطم ہو گیا۔ الْقَرْجَاتُ جَنَّةٌ\*۔ شیر کی کچھار\*\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۱)۔ جب زمین سخت حرکت سے متزلزل ہو جائیگی۔ دوسری جگہ ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتْ اِلْاَرْضُ زِلْزَالًا (۲۹)۔ جب زمین کو ہلایا جائیگا اس کا ہلایا

جانا،۔ یعنی پوری شدت سے ہلائی جائیگی۔ قرآن کریم کے اس قسم کے بیانات سے، کائنات کا طبیعی انقلاب بھی مقصود ہو سکتا ہے اور تمدنی انقلاب بھی۔

## رج ز

رَجَزٌ (اور رَجَزٌ) کے بنیادی معنی اضطراب پیہم اور مسلسل حرکت کے ہیں۔ اَلرَّجَزُ۔ اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اسکی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اسکی ٹانگیں اور رانیں کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اٹھنے کے قابل ہو سکتا ہے\*۔

رَجَزٌ۔ وہ عذاب ہے جس میں کوئی قوم اضطراب پیہم میں مبتلا رہے اور ایسی کمزور ہوتی جائے کہ اس کے لئے اٹھنا دشوار ہو جائے۔ عَذَابٌ مِّنْ رَّجَزٍ اَلَيْسَ (۳۳)۔ ”وہ عذاب جو درد ناک اضطراب ہے،۔ دوسری جگہ ہے۔ رَجَزًا مِّنَ السَّمَاءِ (۲۹)۔ وہ تباہیاں اور بربادیاں جو خارجی حوادث کی رو سے آئیں۔ سورۃ اعراف میں ان مختلف قسم کی تباہیوں کو رَجَزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوم فرعون کو پیش آئی تھیں۔ (۱۳۴)۔

سورۃ انفال میں ہے کہ ہم نے (بدر کے میدان میں) شیطان کے پیدا کردہ رَجَزٌ کو تم سے دور کر کے تمہارے دلوں میں تقویت اور پاؤں میں استقامت پیدا کر دی (۱۱)۔ یہاں سے رَجَزٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی پائے استقلال میں لغزش آ جانا۔ ایسی کمزوری پیدا ہو جانا جس سے دلوں میں اضطراب اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے۔ اس لئے سورۃ المدثر میں جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ”اب تو اس دعوت انقلاب کو لیکر اٹھ،۔ تو اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَالرَّجَزَ فَا هَجِرْ (۵۴)۔ اس کمزوری کو جھٹک کر الگ کر دے جو اٹھنے میں لڑکھڑاہٹ کا موجب بن جائے۔ تم اور تمہارے رفقاء اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لو کہ تم اس بار گراں کو لیکر مردانہ وار اٹھ کھڑے ہو۔ اس سورۃ میں مخاطب تو نبی اکرمؐ سے ہے لیکن یہ تعلیم تمام جماعت کے لئے ہے۔ ایسا عظیم انقلاب اسی جماعت کے ہاتھوں برپا ہو سکتا ہے جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئے۔

## رجس

الرجس - سخت آواز - کسی بہت بڑی اور مختلف قسم کی مخلوط چیزوں کی آواز کو کہتے ہیں - جیسے فوج یا سیلاب کا شور یا بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک - رَجَسَتِ السَّمَاءُ - بادل بڑے زور سے گرجا - اِرْتَجَسَ الْبَيْتُ - عمارت اس طرح ہلی یا لرزی کہہ اسکی آواز سنائی دی - اَلرَّجَّاسُ - سمندر کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سخت اضطراب بھی ہوتا ہے اور شور بھی - لہذا رَجَسٌ کے معنی ہوتے ہیں التباس - شک - تردد - اضطراب - کسی معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا - هُمْ فِيْ مَرْجُوْسَةٍ مِّنْ اَمْرِ هِمٌ - وہ لوگ اپنے معاملہ میں شک - اضطراب اور التباس میں ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اختلاط اور التباس کے ہیں - گندگی کو بھی اَلِرَّجْسُ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ لٹھڑ اور چپک جاتی ہے - اور خود اس میں بھی کئی آلائشیں ہوتی ہیں - قرآن کریم میں ہے وَ يَجْعَلُ الْاِرْجَسَ عَلٰى الَّذِيْنَ لَا يَتَعَقِلُوْنَ (۱۶۱) - ”جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ رجس ڈال دیتا ہے، - یہاں عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ رَجَسٌ بتایا گیا ہے - لہذا معنی واضح ہیں - یعنی شک - التباس - اضطراب - نیز اس کے معنی ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر تک بھی قبیح ہو اور ان میں بہت زیادہ قباحت ہو - نا خوش آئند امور - قرآن کریم نے خَمْرٌ - مَيْسِرٌ - اَنْصَابٌ - اَزْوَاجٌ - کسور رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ کہا ہے (۹۰) - اس میں قباحت اور نا پسندیدگی بھی ہے اور اضطرابی کیفیت بھی - اسی طرح کھانے کی حرام چیزوں کے متعلق کہا ہے - فَاِنَّ رَجْسًا (۱۶۱) - رَجَسَهُ عَنْ اَلْاَمْرِ کے معنی ہیں، اُس نے اسے اس کام سے روک دیا - لہذا رَجَسٌ وہ کام ہے جن سے انسانی شرف کے نشو و نما میں خلل اور رکاوٹ پیدا ہو جائے - تاج نے کہا ہے کہ اس سے وہ کام مراد ہیں جو انسان کو عذاب (تباہی) کی طرف لے جائیں - بات ایک ہی ہے - مِرْجَسٌ اس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو یہ دیکھنے کے لئے کنویں میں لٹکایا جائے کہ پانی کی گہرائی کس قدر ہے -

سورۃ احزاب میں اہل بیت نبویؑ کے متعلق ہے يَرْبِدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمْ الْاِرْجَسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳) - خدا چاہتا ہے کہ تم سے رَجَسٌ دور کر دے - یعنی اضطرابات اور التباسات - یا وہ موانع جو تمہاری صحیح

نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں۔ سورۃ انعام میں ایمان والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا سینہ اسلام کے لئے کھل جاتا ہے۔ اس کے برعکس، غلط راستے پر چلنے والوں کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ان کی مانس پھول جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے کَذَّالِیْکَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الْیَرْجُسَ عَلَی الذِّیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۳۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ رجس کے اندر دل کی تنگی - تعصب - تنگ نگہی ضد - ہٹ دھرمی - عقل و فکر سے کام نہ لینا - نیز شکوک - اضطراب وغیرہ سب کا مفہوم آ جاتا ہے۔ اسی بنا پر منافقین کو رجس مجسم کہا گیا ہے (۹۵)۔ یعنی شکوک و اضطراب اور صحیح نظام کے راستے میں خلل اور رکاوٹ۔ برعکس ایمان والوں کے (۱۳۶-۹۵)۔

## رجع

رَجُوعٌ کے معنی ہیں پلٹنا - لوٹنا - واپس ہونا۔ اور رَجَعٌ کے معنی ہیں پلٹانا\*۔ لیکن اس حقیقت کو شروع ہی میں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے ہاں جس مفہوم کیلئے رجعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں۔ ہمارے ہاں رجعت سے مراد ہوتی ہے پسپائی - کسی کا اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانا۔ (رجعت پسند Re-actionary کو کہتے ہیں)۔ یعنی اسمیں تنزل - پستی اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ برعکس اسکے عربی زبان میں اسکے معنی یا تو اُسی پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور یا اُس سے بہتر کیفیت لئے ہوئے۔ چنانچہ اَلرَّجْعَةُ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد، پھر ازدواجی تعلق قائم کر لینے (میاں بیوی بن جانے) کو کہتے ہیں۔ یعنی اُسی پہلی حالت کی طرف لوٹ آنے کو۔ اور لَیْسَ لَیْ مِّنْ فُلَانٍ رَّجْعٌ کے معنی ہیں مجھے اس شخص سے کوئی نفع نہیں پہنچا۔ یعنی اس کے ہاں سے کوئی چیز پلٹ کر نہیں آئی۔ اسی طرح عربوں کے ہاں ضرب المثل ہے مَا هُوَ إِلَّا سَجْعٌ لَّیْسَ تَعْتَهُ رَجْعٌ۔ یہ نہرا سجع ہی سجع ہے جسکے تحت کوئی (رجع) فائدہ نہیں۔ چنانچہ اَرْجَعْتَ الْاِبِلَ اُسوقت کہتے ہیں جب اونٹ لاغر ہو جانے کے بعد پھر قربہ ہو جائے۔ اور سَفَرَةٌ مَّرْجِعَةٌ اس سفر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ مَرَّجِعٌ بہت نفع بخش جنس۔ رَجِیْعٌ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جسکے بٹ کھل گئے ہوں اور اسے دوبارہ بٹ دیا جائے\*۔



رَجَعَ کے معنی پلٹانا ہیں۔ جو چیز گردش کرتی ہے وہ پلٹ کر اسی مقام پر آتی ہے جہاں سے وہ چلی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر گردش میں رَجَعَ پایا جاتا ہے۔ سورۃ الطارق میں ہے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۱)۔ اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ کائنات کی بلند فضا یا اس کے اندر جو کترے ہیں وہ گردش کرتے ہیں۔ اور جس مقام سے چلتے ہیں پلٹ کر وہیں آ جاتے ہیں۔ یا اس کے معنی ہیں وہ بلند فضا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کروں کو یا دیگر اشیا کو پلٹاتی ہے۔ (اور انکی گردش سے کائناتی زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں)۔ پیچھے لوٹنے کے معنوں میں یہ لفظ (۸۱) میں آیا ہے جہاں اس کے مقابلہ میں مُضِیًّا ہے جس کے معنی آگے چلنے کے ہیں۔

رَجَعَ إِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا۔ (Having a Recourse to)\*\*۔ نیز رَجَعَ کے معنی ردِ عمل (Reaction) یا نتائج مرتب ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعَ الْعَلَفُ فِي الدَّابَّةِ۔ جانور پر چارہ کا اثر نمایاں ہو گیا\*۔ رَجَعَ كَلَامِي فِيهِ۔ میری بات نے اس پر اثر کیا\*۔ أَلْتَرَجِعُ مِنْ الْكَلَامِ۔ کے معنی ہیں وہ بات جو خود کہنے والے کی طرف لوٹا دی جائے\*۔

ژالہ (اولیٰ) کو بھی رَجَعَ کہتے ہیں کیونکہ وہ اس پانی کو واپس دیدیتا ہے جو اس نے زمین سے حاصل کیا تھا۔ نیز بارش کو بھی\*۔ اور اس پانی کو بھی جو سطح ارض پر بہ رہا ہو\*\*\*۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۱) کے معنی ہونگے وہ بلندی جو بخارات کو پانی (بارش) کی شکل میں پلٹا دیتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے صُمُّ بِكُمْ عُمَىٰ فَوَيْلٌ لِّالَّذِينَ لَا يَرْجِعُونَ (۲/۸)۔ ایسے مقامات پر یَرْجِعُونَ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دھوت پیش کی تو سامنے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک اہل کتاب، جو کسی وقت میں حق پر تھے لیکن بعد میں حق کے راستے سے ہٹ گئے۔ ان سے یہی کہا گیا کہ تم پھر حق کی طرف پلٹ کر آ جاؤ۔ وہ اس سے انکار کرتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا۔ وہ جب حق کی طرف نہیں آتے تھے تو ان کے

متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ اسکی طرف آتے ہی نہیں۔ اسکی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم نے لَا يَرْجِعُونَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان مقامات میں صحیح ترجمہ ”رجوع کسرتا، ہوگا۔ ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر حق کی طرف نہیں ہلتے۔

سورة طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے فَرَجَعْنَاكَ اِلَىٰ اٰمِكَ (۲۱)۔ ”ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا۔“ سورة نور میں ہے۔ وَ اِنْ قِيلَ لَكُمْ اَرْجِعُوْا فَاَرْجِعُوْا (۲۴)۔ ”اگر صاحب خانہ تم سے کہیں کہ واپس چلے جاؤ۔ تو واپس ہو جاؤ“۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی جب باپ کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تو اس کے لئے فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰی اٰبِهٖمْ کے الفاظ آئے ہیں (۱۲)۔

سورة النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے قاصد کو خط دیکر ملکہ سبا کی طرف بھیجا تو اس سے کہا کہ خط دینے کے بعد پیچھے مڑ آنا۔ اور پھر انتظار کرنا کہ ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ فَانْظُرْ مَّاذَا يَرْجِعُونَ (۲۸)۔ سورة ق میں موت کے بعد دوبارہ زندگی کو رَجْعٌ کہا گیا ہے (۵)۔ یعنی مرنے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا۔ (اس دنیا کی طرف لوٹنا نہیں۔ بلکہ مرنے کے بعد زندہ ہو جانا)۔

اس مقام پر اس غلط تصور کا ازالہ ضروری ہے جو رَجَعْتَ اِلٰی اللہ کے غیر قرآنی مفہوم سے عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کی موت کی خبر سن کر کہا جاتا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۱۵۶)۔ اور اس کے معنی کئے جاتے ہیں ”ہم اللہ کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“۔ اس سے ذہن دو صورتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم پیدا ہونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد (حشر کے دن) ایک میدان میں جمع ہونگے جہاں اللہ تعالیٰ بھی ہونگے اور اس طرح ہم لوٹ کر اُس کی طرف چلے جائیں گے۔ یہ تصور اس لئے غیر قرآنی ہے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ہے اور تمام انسانوں کو اس مقام کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ خدا کے لئے کسی خاص مقام کا تعین باطل تصور ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے۔ هُوَ مَعَكُمْ اَيْتَمًا كُنْتُمْ (۵)۔ مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی، اعمال کے جزا و سزا کا رنگ کیا ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی سادہیت اس زندگی میں

سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ ”مردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔ قرآن کریم تو یہ بھی کہتا ہے کہ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۲۱/۲۱)۔ تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔ وَجِئَیْ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۲۱/۲۱)۔ اُس دن جہنم لائی جائیگی۔ خدا کے متعلق کسی خاص مقام یا سمت کا تصور جہاں ہم مرنے کے بعد جائیں گے، قرآن کریم کی رو سے درست نہیں۔

دوسری صورت جسکی طرف ذہن (إِنْقَالَ لِلَّهِ . . . . . سے) منتقل ہوتا ہے تصوف کی پیدا کردہ ہے۔ ویدانت (ہندوؤں کے ”تصوف“) کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح (آتما) درحقیقت روح کائنات، یعنی خدا (پر ماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ جزو اپنے کل سے جدا ہو کر مسادہ کی دلدلوں میں پھنس چکا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے تناسخ کے چکر کاٹ رہا ہے۔ آخر الامر یہ جزو پھر اپنے کل میں جا ملیگا جس طرح، (اپنشد کے الفاظ میں) ”شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں“۔ ویدانت کا یہی تصور ہمارے تصوف میں آیا جسکی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ ”انسانی روح“\* خدا کا ایک جزو ہے اور یہ جزو اپنے کل سے ملنے کے لئے مضطرب و یقارار ہے۔

بشنوا ز نے چون حکایت می کند

از جدا ئیها شکایت مے کند (رومی)

مرنے کے بعد نیک لوگوں کی روح اپنے ”کل“ (خدا) میں جا ملیگی۔ یہی زندگی کی کامیابی و کامرانی ہے۔

عشرتِ قطره ہے دریا میں فنا ہو جانا (غالب)۔

”الْیَوْمَ رَاجِعُونَ“ سے (اُن کے نزدیک) مراد ہے جزو کا اپنے کل کی طرف لوٹ جانا اور اُس سے جا کر مل جانا۔ اسی لئے یہ لوگ موت کو وصال کہتے ہیں۔ (فلاں صاحب کا وصال ہو گیا۔ یا فلاں بزرگ واصل بالحق ہو گئے) وصال کے معنی مل جانے کے ہیں۔

یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے، اسلئے کہ انسان اور خدا کا تعلق جزو اور کل کا نہیں۔ کسی کل سے اگر کوئی جزو الگ ہو جائے تو کل ناکام رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیز ذات خداوندی میں نقص کا باعث ہے۔ لہذا، إِنَّا الْیَوْمَ رَاجِعُونَ کا یہ مفہوم بھی غلط ہے۔

\* ”انسانی روح“ کی ترکیب بھی غیر قرآنی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (روح)۔

سمت یا مقام کا تصور رَاجِعُونَ کے علاوہ اِلَیْہِ (اس کی طرف) کے لفظ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اس لئے کہ ہم اِلَیْہِ یا اِلَیْنَا سے خود ہی سمت مراد لے لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس کا ہر جگہ یہی مفہوم نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ - تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب مائے کو کس طرح پھیلاتا ہے۔ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلْنٰہُ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَیْہِ دَلِیْلًا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے قانون مشیت کی رو سے ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سائے نہ گھٹتے نہ بڑھتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سورج کو اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ اس کے گھٹنے بڑھنے کی دلیل (موجب) بن گیا ہے۔ اس کے بعد ہے ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۴۵:۴۶)۔ پھر ہم اسے (یعنی سائے) کو اپنی طرف (اِلَیْنَا) کھینچ لیتے ہیں، نہایت آسانی سے کھینچ لینا۔ اس آیت میں اِلَیْنَا کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص سمت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے قانون کائنات کے مطابق سائے سمٹ جاتے ہیں۔ لہذا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کا ایک مفہوم ”خدا کے قانون طبعی کے مطابق نقل و حرکت کرنا“ بھی ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے وَلَہُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَکَرْہًا وَاِلَیْہِ یَرْجِعُونَ (۳:۸۲)۔ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے سر بسجود ہے۔ طوعاً و کرہاً۔ اور اس طرح ہر شے کا قدم اُسی مرکزی طرف اٹھتا ہے۔ ہر شے اُسی محور کے گرد گردش کر رہی ہے۔ اُسی قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سورۃ یٰسین میں ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ یَبْدِیْہِ مَلٰکُوتُہٗ کُلِّ شَیْءٍ وَاِلَیْہِ یَرْجِعُونَ (۳۶:۸۳)۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے۔ ہر شے کی باگ ڈور اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس لئے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے۔ اس کا ہر قدم اسی قانون کی طرف اٹھتا ہے۔ اس سے وہ ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتی۔ اور چونکہ ”اشیاء“ میں خود انسان بھی شامل ہیں اس لئے یہ بھی اُس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانون مکافات کی زنجیروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اٹھ رہا ہے۔ (وَاِلَیْہِ یَرْجِعُونَ)۔

اب یہاں سے ہم خارجی کائنات کے قانون طبعی سے آگے بڑھ کر انسانی دنیا کے قانون مکافات کی طرف آ گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات میں اِلَیْہِ رَاجِعُونَ (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) آئے ہیں۔ مثلاً

ارشاد ہے کَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِۦٓ لَکَیۡطٌ غٰلِیّ - اَنّ رَاٰهُۥٓ اَسْتَفْغٰنِی - جب انسان اپنے متعلق یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں (ہر ایک سے مستغنی ہے) تو پھر سرکشی اختیار کر لیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لاکھ اپنے آپکو مستغنی سمجھے - اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الشَّرْجُ عٰلِیّ (۶۸)۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا - اسے بہر حال اسی قانون کی طرف آنا ہے - اس حقیقت کو وَاللّٰہُ تَرٰ جَعُ الْاِلٰہُ سُوْر (۳۵) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی یہاں ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے - سورۃ انبیاء میں ہے کہ تمام نوع انسانی ایک ہی جماعت اور ایک ہی برادری ہے لیکن لوگوں نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے - وَتَقَطَّعُوْا اٰمْرَہُمْ بِبَیِّنٰتِہُمْ (۲۱) - اسکے بعد ہے کُلُّ الْاٰیٰتِ رَاجِعُوْنَ - اور اسکے بعد ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِّنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَ اَنْ لِّسَعِیِّہِ وَ اِنَّا لَہٗ کَآئِبُوْنَ (۲۱) - پس جو شخص صلاحیت بخش پروگرام پر کاربند رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اسکی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں - ہم ان سب کو لکھتے رہتے ہیں - اس سے کُلُّ الْاٰیٰتِ رَاجِعُوْنَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے قانونِ مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں - تمام اعمال اس محور کے گرد گردش کرتے ہیں - ہر ایک کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے - کوئی اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا - یہ لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری گرفت سے دور جا رہے ہیں حالانکہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف از خود کھینچے چلے آ رہے ہیں - کُلُّ الْاٰیٰتِ رَاجِعُوْنَ - نیز دیکھئے (۱۶۵ و ۲۸۱-۲۸۲) جہاں مکافات عمل کا مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے -

اعمال کے نتائج کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ یہ نتائج صرف دوسری زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے - یہ تصور بھی صحیح نہیں - اعمال کے نتائج، عمل سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں - پھر ان میں سے بعض نتائج کا ظہور اسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور بعض کا ظہور اسکے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے - لہذا قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ اِلٰی مَرَّ جِیْعَکُمْ فَا نَبِیُّکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹) - اور جس کے معنی یہ کہئے جاتے ہیں کہ ”تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پس میں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دوں گا،“ تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ

جب انسان مرنے کے بعد خدا کی طرف جائیگا تو اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے تمام اعمال ہمارے قانونِ مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے انکے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ اسی کی رو سے انکے نتائج تمہارے سامنے آجائے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ **فَاتِمَا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِيدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاتِلَيْنَا يَرْجِعُونَ** (۲۸)۔ ہم ان مخالفین کو جس سزا کی وعید دے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ظہور میں آجائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا تیری وفات کے بعد ہو۔ لیکن زود ہو یا بدیر۔ ان کے اعمال کے نتائج بہر حال ہمارے ہی قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ یہ اس کے دائرے سے باہر جا نہیں سکتے۔ **(فَاتِلَيْنَا يَرْجِعُونَ)**۔

لیکن جن اعمال کے نتائج انسان کی اس زندگی میں سامنے نہیں آتے وہ اسکے بعد کی زندگی میں سامنے آجائے ہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ آیا ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی **إِلَيْهِ تَرْجِعُونَ**۔ ”خدا کی طرف لوٹو گے“۔ یعنی تم یہ نہ سمجھ لو کہ اب تو ہم سر گئے اس لئے اب ہم ہر کسی کی گرفت نہیں۔ تم مرنے کے بعد بھی خدا کے قانونِ مکافات کی طرف جاؤ گے۔ اس سے تمہارے لئے کہیں مفر نہیں۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے **إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کا مفہوم۔

بعض مقامات پر یہ لفظ ٹھیک ان معنوں میں بھی آیا ہے جن معنوں میں ہمارے ہاں رجوع کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً **أَنتَهُمُ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ** (۳۱)۔ یہ لوگ اپنے رسولوں کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ ان تصریحات کی روشنی میں **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کا صحیح مفہوم سمجھئے۔ قرآنِ کریم میں جہاں **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** آیا ہے اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ اس میں جان تک بھی دیدینی پڑتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تمہارے سامنے بھی زندگی کے مختلف پہلو آئیں گے۔ دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی کا خوف۔ بھوک۔ اموال و ثمرات اور نفوس کا اتلاف۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ اسکے بعد ہے **وَبَشِيرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** (۱۵۶)۔ تو خوشگوار نتائج کی بشارت دیدے ان لوگوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ

انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کھدیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری ساری زندگی خدا (کے نظام) کیلئے وقف ہے۔ اور ہم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یا یہ کہ جب ہماری ساری زندگی اُسکے نظام کیلئے وقف ہے تو یہ مشکلات و مصائب ہمیں اسکے راستے سے ہٹا نہیں سکتیں۔ ان کے علی الرغم ہمارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھتا ہے۔ ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ (إِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ)۔ اور ہماری اس جد و جہد کے نتائج بھی اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہونگے جس پر ہمیں پورا پورا بھروسہ ہے۔ جتنے موانعات آنا چاہتے ہیں انہیں۔ جتنی رکاوٹیں کوئی ڈالنا چاہتا ہے ڈال لے۔ ہم ان سے گھبرا کر اپنا رخ کسی دوسری سمت کو کبھی نہیں موڑینگے۔ ہمارا ہر قدم، بہر حال و بہر طور، اسی منزل کی طرف اٹھے گا جو ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا منتہی و مقصود ہے۔ (إِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ)۔ اس کے بعد ہے اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَٰوٰتٌ مِّنْ رَبِّہِمْ وَرَحْمَةٌ وَّ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۵۵:۵۷)۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک و تہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے۔ ”اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ“ خود ”إِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ“ کی تشریح کر رہا ہے۔

قرآن کریم کے ان مقاصد سے واضح ہے کہ إِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ کے یہ معنی نہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے اور ہم لوٹ کر اُس مقام کی طرف اسکے پاس جائینگے۔ نہ ہی یہ کہ ہماری ”روح“ اُس کل کا ایک جزو ہے اور یہ جزو آخر الامر اپنے کل سے جدا ملیگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی، نظامِ خداوندی کیلئے وقف ہے۔ (إِنَّا لِلّٰہِ)۔ اور دنیا بھر کی مشکلات و مصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اُسی نظام کی طرف اٹھتا ہے۔ اُسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اس کی رو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ وہی ہمارے دائرہٴ حیات کا مرکز ہے۔ ہماری تمام تگ و تاز کا رخ اسی قبلہ کی طرف ہے۔ (إِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُونَ)۔ نیز یہ کہ ہمارا ہر عمل اس کے قانونِ مکافات کی طرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔ وہ اس سے ادھر ادھر کہیں ہٹ نہیں سکتا۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ اِس زندگی میں سامنے آ جائے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی میں۔ اس لئے کہ اس کا قانونِ مکافات اسی دنیا تک محدود نہیں۔

## رج ف

الترجف\* - کسی چیز کا متحرک ہو جانا - یا لرز اٹھنا۔ اس میں حرکت کے ساتھ اضطراب اور پریشانی کا ہونا ضروری ہے - رَجَفَ الثَّقَلَبُ - گہبراہٹ کی وجہ سے دل کا شدید اضطراب\* - راغب نے کہا ہے کہ الترجف\* - اضطراب شدید کو کہتے ہیں\*\* - التراجيف\* - لرزہ کے ساتھ بخار - اَرَجَفَتْ اِلْرَّيْحُ الشَّجَرُ - ہوائے درختوں کو ہلا ڈالا - رَجَفَتْ اِلْاَرْضُ\* - زمین متزلزل ہوئی - الترجفۃ\* - زلزلہ - اَلَا رَاجِيفٌ - فتنوں کو بیدار کرنے والی، بے حقیقت، اضطراب انگیز خبریں\* - اس سے فعل اَرَجَفَ آتا ہے - اَلْمَرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ (۳۳) - شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے لوگ جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے\* -

قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے فَاتَّخَذَ تَهُمُ التَّارِجِفَةُ (۷۸) - ”انہیں زلزلہ نے اُن پکڑا،“ - سورۃ قارۃ علیٰ میں ہے - يَوْمَ تَرُجِفُ التَّارِجِفَةُ (۷۹) - ”جس دن کانپ اٹھنے والی کانپ اٹھیگی،“ - دوسری جگہ ہے يَوْمَ تَرُجِفُ اِلْاَرْضُ (۷۳) - جسوقت نچلے درجہ کے لوگ (عوام) سخت اضطراب میں ہونگے - یا جسدن زمین لرز اٹھیگی -

## رج ل

رَجُلٌ\* - (جمع اَرَجُلٌ\*) - پاؤں (۳۸) - رَجَالٌ\* - پا پیادہ چلنے والے (یہ رَاجِلٌ کی جمع ہے) بمقابلہ رُكَّابًا (۲۸۹) نیز خَيْلٌ (رسالہ) کے مقابلہ میں رَجِلٌ بمعنی پیادہ لشکر (۱۷۷) - رَجُلٌ\* - مرد - جمع رَجَالٌ\* (۲۲۸) لوگ - اشخاص (۷۴) - صاحب محیط نے کہا ہے کہ مرد کو اس کی قوت اور بہادری کی بنا پر رَجُلٌ کہا جاتا ہے - اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ جَاءَ مِنْ اَفْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْمَعُ (۳۱) اور وَ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ (۲۸) میں رَجُلٌ کے معنی قوی اور بہادر آدمی کے ہونگے\*\*\* - (ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر مشتقات ٹانگ کے معنوں سے مشتق ہیں لیکن الرَّجُلُ بمعنی مرد اس معنی سے جداگانہ مفہوم رکھتا ہے -

## رج م

رَجْمٌ\* کے اصلی معنی ہیں پتھروں سے مارنا (ابن فارس) - پھر اس کے معنی قتل کرنے کے بھی ہو گئے - نیز تہمت لگانا اور گالی دینا - جھڑک کر



نکال دینا۔ کسی کو چھوڑ دینا یعنی قطع تعلق کر لینا\*۔ نیز الرَّجْمُ کے معنی ہیں کسی کو مطعون کرنا\*۔ الرَّجْمُ جَامٌ\*۔ پتھروں کو کہتے ہیں۔ اور میر جَامٌ (Sling) یعنی گوبھیا کو جس سے پتھر کو دور پھینکا جاتا ہے\*\*۔

سورة یس میں ہے لَتَشِينُ لَسَمُ تَنْتَهُوْا لَتَنْتَرُجِمَنَّكُمْ (۳۶/۱۸)۔ ”اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دینگے“۔ یا قتل کر دینگے۔ سورة شعراء میں ہے لَتَتَكُوْنَنَّ مِّنَ الثَّمَرِ جُؤْمِيْنَ (۲۱/۱۱۶)۔ ”تو ان میں سے ہوگا جنہیں سنگسار یا قتل کر دیا جاتا ہے“۔ سورة حجر میں شیطان کو رَجِيْمٌ کہا گیا ہے جس کی تفسیر یہ کہہ کر کر دی گئی اِنَّ عَلَمِيْكَ كَتَبَ اللّٰهُ مَنَةً (۳۵/۳۴)۔ لہذا رَجِيْمٌ اور مَلْعُوْنٌ ہم معنی ہیں۔ (مَلْعُوْنٌ کے لئے دیکھئے عنوان ل۔ ع۔ ن)۔ یعنی وہ جو خدا کی نوازشات سے محروم رہ جائے۔ جو اس سے دور ہو جائے۔ جس سے قطع علائق کر لیا جائے۔ جس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے۔

رَجْمٌ۔ اٹکل پچو باتیں کرنا۔ چنانچہ حَدِيْثٌ مَّرْجَمٌ کے معنی ہیں ایسی ظنی بات جس کی حقیقت معلوم نہ ہو سکے\*۔ رَجْمٌ الرَّجْلُ بِالْغَيْبِ کے معنی ہیں اس آدمی نے غیب کے متعلق ایسی بات کہی جسے وہ جانتا نہیں۔ قَالَهُ رَجْمًا۔ اس نے یونہی اٹکل پچو بات کہہ دی\*\*۔ سورة کہف میں ہے کہ یہ لوگ جو اصحاب کہف کی تعداد بتاتے ہیں یونہی رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸/۱۸) باتیں کہتے ہیں۔ یعنی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ بے جانے بوجھے (حقیقت کا علم رکھے بغیر) اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے بھی الرَّجْمُ کے معنی اَلْظَّنُّ لکھے ہیں۔

زمانہ قدیم میں مندروں اور معبدوں میں کاہن ہوتے تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ (اب بھی مندروں کے پجاری اور خانقاہوں کے پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں)۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہم بہ باتیں ”آسمان“ سے منکر آتے ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ یہ سب رَجْمًا باتیں کرتے ہیں۔ یعنی محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ان میں سے کبھی کبھار کوئی بات ٹھیک بھی نکل آتی ہے (جیسے دس قیاسی باتوں میں سے ایک آدھ ٹھیک نکل آتا کرتی ہے) ورنہ انہیں علم و حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دیکھئے (۱۵/۱۸ و ۱۶/۹ و ۱۷/۹ و ۱۸/۲۴)۔ نزول قرآن کے بعد علم و بصیرت کا زمانہ آگیا، اس لئے اس قسم کی توہم پرستیوں کیلئے اب کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب ان خرافات کو ”آسمان سے آتشیں کوڑے“ پڑتے ہیں۔

جیسا کہ (ل - ع - ن) کے عنوان میں بتایا جائیگا، قرآن کریم کی رو سے لَعْنَت گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ یعنی غلط روش کی بنا پر زندگی کی ان خوشگوار یوں سے محرومی جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ جسے اس طرح خوشگوار یوں سے محروم کر دیا گیا ہو وہ مَلْعُونٌ کہلائیگا۔ یہی معنی رَجِيمٌ کے ہیں۔ یعنی دور پھینکا ہوا۔ یعنی جو ان خوشگوار یوں سے محروم ہو۔ اس کے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے۔ اس سے دور دور رہا جائے۔ ہر وہ قوت یا جذبہ جو ہمیں قوانین خداوندی کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرے یا جہالت اور بے بصری کی طرف مائل کرے، اس قابل ہے کہ اس سے دور دور رہا جائے۔ اسی کو ملعون یا رجیم کہا جائیگا۔

## رج و

الرَّجَاءُ۔ امید (یا "س" کی ضد ہے) \*۔ بالعموم یہ ایسی امید کو کہتے ہیں جو موہوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے ظن کے لئے بولا جاتا ہے جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ لیکن چونکہ خوشی اور ڈر دونوں لازم ملزوم ہیں اس لئے پھر یہ ایسے ظن کے لئے بھی بولا جائے لگا جس میں خوف ہو۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ آمَلٌ اور رَجَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ آمَلٌ تو پسندیدہ امر کے لئے آتا ہے اور رَجَاءٌ پسندیدہ اور غیر پسندیدہ دونوں کے لئے \*\*۔ ازہری نے کہا ہے کہ رَجَاءٌ کے ساتھ اگر حرف نفی ہو تو اس کے معنی خوف کے آتے ہیں \*۔ ابن قتیبہ نے بھی لَا يَرْجُونَ کے معنی لَا يَخَافُونَ کہتے ہیں (القرطبي - جلد ۱)۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ بعض اوقات رَجَاءٌ کا لفظ بول کر خوف کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ "لَا رَجَاءَ"۔ موخر کرنا۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا۔ معاملہ کو ملتوی کرنا۔ اَلرَّجَاءُ۔ کنارہ۔ کنویں کا کنارہ، اوپر سے نیچے تک \*۔ طرف۔ جمع اَرْجَاءٌ (۱۹/۱)۔ مَرْجُوٌّ۔ جس سے امیدیں وابستہ ہوں (۱۱/۱)۔ مَرْجُونَ۔ جنہیں انتظار میں رکھا جائے۔ جن کا معاملہ تعویق میں ڈال دیا جائے۔ (۱۹/۱)۔ سورۃ شعراء میں ہے قَالُوا اَرْجِهْ (۲۶/۱)۔ "انہوں نے کہا کہ اس کے معاملہ کو تاخیر میں ڈال دو"۔ (نہز ۱۱/۱)۔ سورۃ احزاب میں ہے تَرْجِيْ مَنْ تَشَاءُ مِّنْهُمْ وَتُؤْوِيْ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ (۳۳/۵۱)۔ یہاں تَرْجِيْ کے معنی ہیں پیچھے رکھنا۔ الگ ہٹا دینا۔ کنارے کی طرف ڈال دینا۔ بمقابلہ تُوْوِيْ۔ اپنے پاس جگہ دینا۔

## ر ح ب

رَحْبَ الْقَشَى رَحْبًا - وسیع ہونا۔ اَرَحْبَةً - اس نے اسے وسیع کر دیا۔ ابن فارس نے بھی اس مادے کے بنیادی معنی وسعت اور کشادگی بتائے ہیں۔ طَرِيقٌ رَحْبٌ - وسیع راستہ۔ مَرَحِبًا بیک - تو کشادہ جگہ میں آیا ہے۔ تجھ سے یہاں وسعت اور کشادہ ظرفی کا سلوک ہوگا۔ رَحْبَةً - مکان کا صحن \*۔ قرآن کریم میں ہے وَضَاقَتْ عَلَیْکُمْ اِلَآ رُضٌ یَّمَا رَحِبَتْ (۲۵)۔ ”زمین اپنی فراخیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی“۔ سورۃ ص میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا مَرَحِبًا بِکُمْ (۳۸)۔ ”تمہارے لئے کشادگی نہیں“۔ تمہیں کوئی خوش آمدید نہیں کہتا۔ یہ ہے جہنم کی زندگی جس میں کوئی ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش نہ ہو۔ جہاں کوئی کسی آنے والے کو مرحبا نہ کہے۔ جہاں نہ دل میں کشادگی ہو نہ نگاہوں میں وسعت۔ نہ کسی کے لئے پیشانی خندہ ہو نہ لب متبسم۔ اگر ہوں بھی تو محض دکھاوے کے لئے۔ دل میں ہر ایک، دوسرے کے لئے کہے کہ لَا مَرَحِبًا بِکُمْ۔ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟

## ر ح ق

رَحِیقٌ - خالص پیرانی، عمدہ خوشبو والی، بہترین شراب۔ وہ شراب جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ اسی جہت سے ہر خالص شے کو رَحِیقٌ کہتے ہیں۔ مثلاً حَسَبٌ رَحِیقٌ - خالص حسب۔ مِسْکٌ رَحِیقٌ - وہ مشک جس میں کچھ ملاوٹ نہ ہو\*۔

قرآن کریم نے اہل جنت کے سلسلہ میں رَحِیقٌ مَخْتُومٌ (۸۳) کہا ہے۔ یعنی خالص مشروب، اور پھر اس طرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے۔ زندگی کی پاکیزہ سزور اور خوشگواریاں۔

## ر ح ل

اَلرَّحْلُ - (جمع رِحَالٌ) - کجاوہ۔ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اسلئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہو کر سفر کیا جائیگا۔ پھر یہ لفظ خود اونٹ کے لئے، نیز جس چیز پر بیٹھا جائے، یا جہاں اترا جائے، نیز مکان کے لئے بولا جاتا ہے\* اس لفظ کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن میں سامان وغیرہ رکھ کر لادا جاتا ہے۔ مثلاً خرجیں۔ یا ہوریاں\*۔ سورۃ یوسف میں ہے رِحَالِہِمُ (۱۲)۔ ”ان کی ہوریوں میں“۔

الرَّحْلَةُ - سفر\* - نیز وہ جگہ جہاں کا انسان سفر کرے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سفر جاری رکھنے اور سفر کرتے رہنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے رَحْلَةً إِلَيْهِمْ وَالْصَّيْفِ (۱۴۱)۔ ”گرمی اور سردی کے سفر“۔ الرَّمْلُ رَحْلَةٌ - وہ مسافت جسے آدمی ایک دن میں عادی طے کر لیتا ہو\*۔ منزل۔

## رحم

رَحْمٌ و رَحِيمٌ - بطن عورت کا وہ خانہ جس میں بچہ پرورش پاتا ہے اور اس غلاف میں خارجی اثرات سے محفوظ رہتا ہے\*۔ اس معنی میں رَحْمٌ بھی بولا جاتا ہے (راغب)۔ رَحْمَةٌ وہ عطیہ جو کسی کی ظاہر و باطن کمی کو پورا کر دے (اور جسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے)\*۔ عطیہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز بغیر قیمت اور بلا مزد یا بے معاوضہ دی جائے۔ لہذا رَحْمَتٌ وہ سامانِ نشو و نما ہے جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ روم میں ہے وَإِذَا أَوْقَنْتَا النَّحْلَ رَحْمَةً فَرِحْتُمَا بِهَا - وَ أَنْ تَصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمْتُمْ يُنْذِرُ لَهُمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ (۳۱) اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے لطف اندوز کراتے ہیں تو وہ اس پر اترا جاتے ہیں۔ اور جب ان پر ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں،۔ یہاں رحمة بمقابلہ سیئۃ آیا ہے۔ لہذا اس سے مراد زندگی کی تمام خوشگواریاں مراد ہیں۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں رزق کی بسط و کشادہ کاری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں رحمة سے مراد رزق (سامانِ زیست) ہے جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں والدین کے سلسلہ میں اولاد کی آرزو بتائی گئی ہے کہہ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا (۱۶)۔ ”اے میرے رب تو ان کی نشو و نما کر جیسا انہوں نے مجھے اس وقت پالا تھا جب میں چھوٹا سا تھا،۔ سامانِ رزق جو بارش سے پیدا ہوتا ہے، یعنی فصلیں، رَحْمَتٌ ہیں (۳۶ و ۳۸)۔ زندگی کی خوشگواریاں (نعماء) جو بلا معاوضہ ملتی ہیں، رَحْمَتٌ ہیں۔ (۱۱۰)۔ قصہ حضرت موسیٰ میں ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ جو دیوار کے نیچے مدفون تھا، اسے اللہ کے حکم سے اس طرح محفوظ کر دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بلوغت کے بعد ملے۔ اس خدائی انتظام کو رَحْمَتٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸)۔

نیز رَحْمَةً کے معنی کسی کو ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں\*۔ اسی لئے قرآن کریم میں خَسْرٌ کے مقابلہ میں رَحْمَةً آیا ہے (۱/۱ و ۳/۳) اور مَسِيحَتَةً کے مقابلہ میں بھی (۳۶/۳۶)۔ اور اَهْلَكَ کے مقابلہ میں رَحِيمٌ بھی (۲۸/۲۸)۔

چونکہ خدا کی ربوبیت کے معنی صرف انسانی جسم کی نشو و نما نہیں بلکہ اس کے شرفِ انسانیت (انسانی ذات۔ Self) کی نشو و نما (Development) بھی ہے جو اُس ضابطہٴ حیات کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے، اسلئے وحی کو بھی رَحْمَتٌ کہا گیا ہے۔ (۱/۵ و ۲/۳۳)۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کی راہ نمائی سب سے بڑا ذریعہ نشو و نما ہے جو یکسر وہی طور پر ملتا ہے، اس لئے رحمتِ خصوصی ہے۔

چونکہ خدا رَبُّ الْعَالَمِينَ ہے (یعنی تمام کائنات کو نشو و نما دینے والا اور نوعِ انسانی کی صلاحیتوں کی تکمیل کرنے والا) اس لئے اس نے سامانِ نشو و نما کا وہی طور پر عطا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ کَتَبَ رَحْمَتُكُمْ عَلٰی نَفْسِهِمُ الرَّحْمٰتُ (۱/۵)۔ ”تمہارے رب نے سامانِ نشو و نما کا بہم پہنچانا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے“۔ اس طرح وہ کائنات کی ہر شے کو اپنے دامنِ ربوبیت و پردہٴ رحمت میں لئے ہوئے ہے (۱/۵)۔ اسی لئے سورۃ فاتحہ میں، رَبِّ الْعَالَمِينَ کے ساتھ ہی۔ اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ بھی آیا ہے (۱/۲)۔ زبان کے قاعدے کے لحاظ سے رَحِيمٌ کے معنی ہونگے عمومی طور پر مسلسل سارا نشو و نما بہم پہنچانے والا۔ اور رَحْمٰنٌ وہ جو کسی ہنگامی ضرورت کے رستہٴ سیدت اور غلبہ کے ساتھ سامانِ رحمت بہم پہنچائے\*\*۔ اول الذکر طریق نشو و نما کا عام ارتقائی ذریعہ اور ثانی الذکر کو انقلابی ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ یا دَوْرِ حَاضِر کے علم الحیات (Biology) کی اصطلاح میں اول الذکر (Progressive Evolution) ہوگی۔ اور آخر الذکر فجائی ارتقاء (Emergent Evolution)۔ یہ فرق تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔ سورۃ الرحمن میں ہے يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - كُلٌّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۲۹/۲۹)۔ ارض و سموات میں جو کچھ ہے (ابھی

\* تاج۔ \*\* النار۔ رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے (جیسے عَطَشَانٌ۔ غَضَبَانٌ) اور رَحِيْمٌ کا وزن فَعِيْلٌ ہے (جیسے عَلِيْمٌ۔ حَكِيْمٌ وغیرہ)۔ فَعْلَانٌ ان صفات کے لئے آتا ہے جو شدید اور ہنگامی ہوں اور فَعِيْلٌ ان کے لئے جولا زم و ثابت ہوں۔

نشو و نما کے لئے) خدا (کے ذرائع ربوبیت) کا محتاج ہے۔ پھر، ان چیزوں کا یہ عالم نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی ہیں اس لئے انہیں ایک ہی قسم کا سامانِ نشو و نما ملتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ان کی حالت میں ہر وقت تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ان کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ رحمِ مادر کے اندر جنین کی نشو و نما کا تقاضا کچھ اور۔ بچے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ بڑے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ جب تک کوئی شے ایک حالت میں رہتی ہے، خدا کی صفتِ رحیمیت کے مطابق اس کی نشو و نما ایک انداز سے ہوتی جاتی ہے۔ لیکن جو بھی اس کی حالت بدلتی ہے اس کی صفتِ رحمانیت کے مطابق اس کی نشو و نما کے انداز و طریق میں بھی ہنگامی تبدیلی آجاتی ہے۔ یوں عمومی ارتقاء اور ہنگامی ارتقاء کے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر شے اپنے نقطہ آغاز سے منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے رب۔ رحمان اور رحیم سے مراد۔

رَحْمٌ کے اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق قرابت (رشتہ داری) پر بھی کیا جاتا ہے\*۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ بَيْنَهُمْ رَحْمٌ (ان دونوں کے درمیان قریبی قرابت داری ہے)۔ اَرْحَامٌ۔ رَحْمٌ کی جمع ہے (۳/۵) یعنی رحمِ مادر۔ نیز اسکے معنی رشتہ داری کے آتے ہیں۔ (۱۳/۱)۔ نیز (۳/۱)۔ اُولَآءِ رَحَامٌ کے معنی رشتہ داروں کے ہیں (۸/۵)۔

چونکہ رَحْمٌ میں نرمی ہوتی ہے اسلئے یہ لفظ سختی کے مقابلہ میں نرمی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَشِدَّاءُ عَلٰی الْكُفَّارِ رَحْمَاءُ بَيْنَهُمْ (۳۹/۴)۔ مخالفین کے مقابل میں سخت اور باہمدگر بہت نرم۔ سورۃ کہف میں اقْرَبَ رَحْمًا (۱۸/۱) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں رشتے داری کا زیادہ پاس کرنے والا۔ لیکن ابن فارس نے اَلرَّحْمَةُ اور اَلرَّحْمَةُ ہم معنی بتائے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زیادہ سہربان اور ہمدردی کرنے والا، نرم خواوروفاکیش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رِقَّت (نرمی) اور تعطف و میلان کے ہیں۔

چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ (اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں) گنہگار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کے نزدیک نجات صرف خدا کے رَحْمٌ (Mercy) سے ملتی ہے۔ رَحْمٌ کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے فلاح و فوز (کامیابی و کامرانی) اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ خدا

کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے جسے قانونِ مکافات عمل کہتے ہیں۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى (۵۳)۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ جد و جہد کرے۔ البتہ اس سعی و عمل کے لئے، انسان کو مختلف صلاحیتیں، خارجی کائنات میں سامانِ نشو و نما اور عقل کی راہنمائی کے لئے وحی کی روشنی، خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے، اس لئے یہ سب رَحْمٌ مِّنْ دَاخِلٍ ہے۔ یعنی یہ تمام نشو و نما خدا کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ اب جو شخص ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر خدا کے قانون کے مطابق اپنی ذات کی نشو و نما کر لے گا (جو ایک صحیح معاشرہ کے اندر دوسروں کی ربوبیت سے ہوتی ہے) وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے بہرہ یاب ہو جائیگا۔ جو ایسا نہ کریگا، وہ ان سے محروم رہ جائے گا۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں۔ لہذا انسان اپنی منزلِ مقصود تک خدا کی (Grace) سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق پہنچتا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

اُن بہشتی کہ خدائے بتوبخشند ہمہ ہیچ

تا جزائے عملِ تست، چنان چیزے ہست

اسی بنیادی تصور سے قرآن کریم ایسی قوم تیار کرتا ہے جو اپنی جنت کے گل و لالہ اپنے خونِ جگر سے کھلاتی ہے۔ اور اپنا جہانِ نو خدا کے قاقونِ مکافات کے مطابق اپنی قوتِ بازو سے پیدا کرتی ہے۔

## زخ و

اَلْبَرُّ خَوْ۟نٌ نُّرْمٌۭ جِیْزٌ۔ رَخْوٌۭ الشَّشٰی وَّ رَخٰی۔ رَخَا۔ کسی چیز کا نرم یا ڈھیلا ہو جانا۔ اِسْتَرْخٰی کے بھی یہی معنی ہیں۔ اَرُخَاہُ۔ رَاخَاہُ۔ اسنے اسکو نرم کر دیا اَرُخٰی دَاۤیْقَتَہُ: اسنے اپنے جانور کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے اسکی حسبِ مرضی چلنے دیا۔ اَلرُّخَاہُ۔ نرم رفتار ہوا\*۔ قرآن کریم میں ہے تَجَرُّیْۤی بَاۡمَرَّہٗ رُخَاہُ (۳۸)۔ وہ (ہوا) اُس کے حکم سے نرمی اور سبک رفتاری اور آزادی سے چلتی تھی۔ فَرَسٌ رَّیْخُوۃٌ\*۔ سبک رفتار اور نرم خو گھوڑے کو کہتے ہیں\*۔

## رد ا

اَلرَّیۡدُۃُ۔ بھاری بوجھ جو ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں۔ رَدَاۡ الشَّشٰی بَیۡہ۔ اس نے کسی چیز کے ذریعے کسی چیز کو سہارا دیا۔ تقویت

دی۔ مددگار بنایا۔ اصل میں آلتر د'ء' مددگار، معین اور ناصر کو کہتے ہیں\*۔ جب کسی جانور پر اسطرح بوجھ لادا جائے کہ اس کے دونوں طرف کے بوجھ ہم وزن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو رد'ء' کہتے ہیں۔ وہ اسطرح ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے فَارْصِدْهُ مَعِيَ رِدْآ (۲۸)۔ "اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بیٹھ دے"۔

رَدِی'۔ پیچھے پیچھے آنے والے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں اسے مذموم شے کیلئے استعمال کرنے لگ گئے\*\* (کیونکہ عموماً پیچھے لگنے والی چیز اگلی سے کمتر ہوتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دو بنیادی معنی ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن ہیں (۱) کسی چیز کا خراب یا ردی ہو جانا۔ اور (۲) مدد کرنا۔

## ر د د

رَدَءَ۔ یَرُدُّ۔ کسی کو لوٹا دینا۔ واپس کر دینا۔ رَدَّہُ عَنِ الْاُمْرِ۔ اس نے اسے اس بات سے لوٹا دیا۔ رَدَّہُ کے بعد اگر علیٰ آئے تو اس میں تحقیر اور اہانت کا پہلو ہوتا ہے۔ مثلاً رَدَّہُ عَلَیْہِ التَّشْی'۔ اس نے اس کی چیز قبول نہ کی اور حقارت کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔ لیکن اگر اس کے بعد الیٰ ہو تو اس میں عزت و اکرام کا پہلو ہوتا ہے۔ فَرَدَّدْنَاہُ اِلَیْ اُمِّہِ (۲۸) ہم نے موسیٰ کو امکی ماں کی طرف (عزت و اکرام کے ساتھ) واپس کر دیا۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں) آلتر د'۔ ردی شے۔ دَرُّہِمٌ رَدٌّ۔ کھوٹا۔ کہہ۔ لَامَرَدَّةٌ فِیْہِ۔ اسمیں کوئی فائدہ (Return) نہیں۔ اِلْرْتَدَّہُ التَّشْی'۔ چیز واپس ہو گئی، پلٹ گئی۔\* راغب نے لکھا ہے کہ الایر تَدَادُ اُسی راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو\*\*۔ تَرَدَّدَ اِلَیْہِ۔ وہ اس کے پاس بار بار آیا گیا۔ یہیں سے تَرَدَّدَ فِی الْاُمْرِ کے معنی ہیں کسی معاملہ میں مذبذب رہنا اور کسی فیصلہ تک نہ پہنچ سکرنا\*\*۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَبَعُوْا لَنْفُسِہُمْ اَحْقَ بَرًا دَیْنًا (۲۸) ان کے خاوندوں کا زیادہ حق ہے کہ انہیں واپس لے لیں۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے یَوْمَ لَا یَسْرُدُہُ (۲۲) وہ دن جو آکر پھر واپس نہیں جائیگا۔ جسے ٹالا نہیں جاسکیگا۔ (۱۱) میں خَیْرٌ مَرَدًّا آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں انجام کار کے لحاظ سے نفع بخش۔ سورۃ شوریٰ میں ہے هَلْ اِلَیْ اُمْرِ دَیْنٍ سَبِیْلٌ (۲۲)۔ "کیا اس کے واپس چلنے جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے؟" [فَرَدَّدُوْا اَیْدِیْہُمْ فِیْ اَنْفُوْاہِیْمِ (۱۲) کیلئے



دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی [اس لفظ میں مآل اور انجام کار کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے، اسلئے اعمال کے نتائج کے لئے اس کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔

سورة السجده میں ہے اَلَيْسَ بِرَدٍّ عَلَيْنَا السَّاعَةِ (۱۱۱) انقلاب کس وقت آئیگا، اسکا علم خدا ہی کیلئے مخصوص ہے۔ اس کا علم اُسی سے متعلق ہے۔ اُسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے، اور کسی کی طرف نہیں جاتا۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اوروں کو صرف قیاس اور اندازہ ہو سکتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ و۔ ع)

مَرَدُّوْهُ - واپس کیا ہوا، لوٹایا ہوا (۱۱۱)۔ سورة هود میں ہے عَذَابٌ غَيْرُ مَرَدُّوْهِ (۱۱۱)۔ جسے واپس نہ کیا جا سکے۔ جو آکر رہے۔

سورة نحل میں ایک آیت ہے جو قرآنی نظام ربوبیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی مختلف استعداد ہوتی ہے [اسکا مقصد ۲۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے معاشرہ کے چھوٹے بڑے، ہر قسم کے کام چلتے رہتے ہیں دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ر] لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اس کے ماحصل (رزق) کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لیں۔ یعنی وہ یہ سمجھ لیں کہ چونکہ یہ ہماری ہنرمندیوں سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہم ہی اس کے مالک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلْنٰوْا بِرِآدٍ رِّزْقِيْهِمْ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَوَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (۱۱۱)۔ ”جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اپنے رزق کو اپنے زیر دستوں کی طرف نہیں لوٹائے (اس ڈر سے کہ) اس طرح یہ سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے“؟ ”بِرِآدٍ“ کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انہیں بطور خیرات کے دیدیں۔ کہا یہ ہے کہ یہ فالتو رزق، درحقیقت اُن کیلئے ہے جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور جنہیں اسکی ضرورت ہے، اسلئے جسکے لئے یہ ہے اُسی کی طرف اسے لوٹا دینا چاہیئے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ تم اس سے انکار کرتے ہو کہ کہانے کی استعداد اور رزق کے اسباب و ذرائع خدا کی نعمتیں ہیں جو اسکی طرف سے مفت ملی ہیں۔ اَفَبَيْنِعْمَةً اللّٰهُ يَتَجَمَّدُوْنَ (۱۱۱)۔ ”کیا یہ لوگ جو اپنی زائد از ضرورت دولت کو ان کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اسکی ضرورت ہے، خدا کی نعمت سے انکار کرتے ہیں“؟ یہ ہے قرآن کریم کا سوشل آرڈر۔ عمرانی اور معاشی نظام۔ (اسکی تفصیل میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملیگی)۔

رد ف

الرَدْفُ - الرَدْفُ دِفْتُ - سوار کے پیچھے جو دوسرا شخص سوار ہو وہ اس کا رَدْفُ یا رَدْفُ کہلاتا ہے۔ ایسے ہی ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے پیچھے ہو۔ رَدْفُہ و رَدْفَہ - اس کے پیچھے پیچھے ہونا\* - قرآن کریم میں ہے عَسَىٰ أَنْ يَكُونُ رَدْفٌ لَّكَمُ (۲۴)۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آ رہی ہو“۔ تمہارے بالکل قریب ہو۔ ساتھ لگی ہوئی ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تیار ہے پیچھے لگ جائے۔

سُرْدَفُ - اپنے پیچھے کسی کو سوار کرنے والا نیز کسی کے پیچھے لگنے والا\* - مِّنَ الْمُتَلَاكِكَةِ سُرْدَفِيْن (۹)۔ ”یکے بعد دیگرے مسلسل آنے والے“۔ راغب نے کہا ہے کہ السُّرْدَفُ اگلے سوار کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے دوسرے شخص کو بٹھالے\*\*۔ رَدْفُ - پیچھے (یا قریب) آنے والا۔ تَتَّبَعَهَا الرَّادِفَةُ (۷۹)۔ ”پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئیگی“۔

یعنی جزا و سزا کی ساعت - خدا کا قانوں مکافات - ظہور نتائج کا وقت - ہر عمل کا نتیجہ جو اسکے پیچھے لگا رہتا ہے۔

ردم

اَلرَّدْمُ - کسی خلا یا شکاف کو بند کر دینا - سَدُّ بھی اس کا مترادف ہے - لیکن رَدْمٌ میں سَدُّ سے کچھ زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے - رَدْمُ السَّبَابِ - دروازہ بند کر دینا - اسکا ایک تہائی حصہ بند کر دینا \*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شکاف کے بند کر دینے کے ہوئے ہیں - سورۃ کہف میں ہے اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا (۱۸/۱۸) - اس سے پہلی آیت میں سَدًّا کہا گیا ہے (۱۸/۱۷) - یعنی اس قوم نے ذوالقرنین سے کہا کہ ہمارے لئے ایک روک سی (سَدًّا) بنا دے - اس نے کہا کہ روک سی کیوں! میں تمہارے لئے اچھی خاصی اونچی دیوار (رَدْمٌ) بنائے دیتا ہوں -

ردی

رَدِّیٰ وَ تَرَدِّیٰ - (فی البیِّن) وہ کتبوں میں گر پڑا (اس معنی میں رَدِّیٰ کے ساتھ رَدِّیٰ بھی بولا جاتا ہے)۔ نیز پہاڑ سے گر کر مر گیا \*۔ مَابُغْنِیْ عَنِّهِ مَالُهُ اِذَا تَرَدِّیٰ (۹۲/۱۱)۔ جب وہ تباہیوں کے جہنم میں سر کے بل

گریگا تو اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہ آسکیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ تَرَدَدَی کے معنی ہیں اپنے آپ کو تباہیوں کے سامنے پیش کر دینا۔ یعنی جو شخص مال سمیٹ کر رکھتا ہے اور اسے انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتا وہ تباہیوں کو آواز دیکر اپنے گھر بلاتا ہے۔ اَلْمُتَرَدِّیَّةُ۔ اس جانور کو کہتے ہیں جو گر کر مر جائے۔ اسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے (۵/۳۱)۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنی عام ہلاکت کے بھی لئے جاتے ہیں۔ رَدِیَ فُلَانٌ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ فَهُوَ رَدِیٌّ۔ وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ اَرْدَاهُ غَيْرُهُ۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا۔ اَلرَّادِیُّ۔ تباہی بربادی۔ ہلاکت۔ (اَلرَّادِیُّ۔ چادر)۔ سورۃ طہ میں ہے فَتَرَدَّدِی (۲۱/۲)۔ تو ہلاک ہو جائے۔ سورۃ حٰم السجده میں ہے اَرْدَاکُمْ (۲۱/۲)۔ اس کے معنی تباہ و برباد کر دینا ہیں۔ اَلْمُرَدِّیُّ۔ پھینکے ہوئے پتھر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ میں بنیادی معنی پھینکنے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے اَلْمُرَدِّیُّ کے معنی لا ابالی بن سے کسی ہلاکت گاہ میں گر جانا بھی لکھے ہیں۔ رَادِیَ عَنِ الْقَتْلِ۔ اس کے معنی ہیں اس نے قوم کی مدافعت میں پتھر پھینکے۔ (رَدِیٌّ۔ کے لئے عنوان دیکھئے رد)۔

## ر ذ ل

اَلرَّذُلُ۔ وہ چیز جس سے اس کے رذی اور نکما ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔ اَلرَّذُلُ۔ اَلرَّذَالُ۔ اَلرَّذِیْلُ۔ وہ آدمی جو دوسروں سے کمتر درجہ کا ہو۔ حقیر اور کم مرتبہ انسان۔ نیز رذی اور نکمی چیز جس میں سے اچھی چیزیں نکال لی گئی ہوں۔

اَلرَّذَالُ۔ بہت زیادہ حقیر گھٹیا اور نکما۔ اس کی جمع اَرْدَالُوْنَ اور اَرَادِلُ آئیگی۔ قرآن کریم میں ہے کہ قوم نوح کے سرداروں نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا کہ جو لوگ تیری جماعت میں شامل ہوئے ہیں ”ہُمُ اَرَادِلُنَا“ (۱۱/۱)۔ وہ ہمارے معاشرے کے حقیر اور رذیل لوگ ہیں۔

اَرْدَالِ الْعُمَرُ (۱۱/۱) عمر کا رذی حصہ۔ بڑھا ہے کا وہ حصہ جس میں حالت بے ہوشی ہو جاتی ہے کہ لَا یَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمِهِ (۱۱/۱)۔ انسان ان چیزوں کو بھی بھول جاتا ہے جن کا اسے پہلے عام ہوتا ہے۔ حافظہ جاتا رہتا ہے۔

## رزق

رزق\* - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے۔ یا جو غذا خدا کی طرف سے ذی حیات کو بطور سامان نشو و نما ملے۔ بارش کو بھی رزق\* کہتے ہیں اور مقررہ آمدنی کو بھی۔ چنانچہ سُرْتُزِقَاتٌ\* ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کی تنخواہیں یا راشن اور روزینے مقرر ہوں۔ نیز رَزَقَاتٌ\* اس سامان خوراک کو کہتے ہیں جو فوجی کو بطور راشن دیا جاتا ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو وقت مقرر پر دینا۔ اسکے بعد بلا قید وقت ہر عطیہ پر اس کا اطلاق ہونے لگ گیا۔

قرآن کریم نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رَزَقٌ\* اللہ (۲/۲۰۰) کہا ہے۔ سورۃ حجر میں مَتَعَايِشٌ\* اور رَزَقٌ\* ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ (۱۵/۱)۔ لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ زندگی موت کے بعد بھی مسلسل آگے چلتی ہے اس لئے اس کے نزدیک سامان نشو و نما کی ضرورت صرف طبعی جسم کی پرورش ہی کے لئے نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے مرنے کے بعد انسانی ذات کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع کو بھی رَزَقٌ\* سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵۸)۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جنت زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے۔ وہاں بھی انسانی ذات کی نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا۔ (تفصیل ج۔ ن۔ ن کے عنوان میں ملیگی)۔

لہذا رَزَقٌ\* سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں سامان زیست (ضروریات زندگی) کی تقسیم قانونِ وحی کے تابع ہو (جسے نظام ربوبیت کہتے ہیں) تو انسانی جسم کی نشو و نما اور اس کی ذات کی نمود و بالیدگی بلا مشقت ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ نظام ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جن کے متعلق فرمایا کہ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ\* (۳۰/۲)۔ جو کچھ سامان نشو و نما ہم انہیں دیتے ہیں، وہ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اسے سمیٹ کر نہیں بیٹھ جاتے، اور نہ ہی تسالے لگا دیتے ہیں، بلکہ اسے کھلا رکھتے ہیں (دیکھئے عنوان ن۔ ف۔ ق)۔ چونکہ یہ نظام قانونِ خداوندی کے تابع متشکل ہوتا ہے اس لئے اس نظام کی وساطت سے تقسیم رزق کے متعلق

اللہ نے کہا ہے کہ یہ رزق ہماری طرف سے ملتا ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۱۵۲ و ۱۵۱)۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی“۔ اس طرح خدا کی یہ ذمہ داری کہ وہ ہر متنفس (چلنے والے) کو رزق دیتا ہے (۱۱) بطریق احسن پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ (اگر ایسا معاشرہ قائم نہ ہو اور رزق کی تقسیم انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ہو تو جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں) لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں اور کسروڑوں ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ غلط معاشرہ میں رزق کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جاتی ہے اور نچلے طبقہ کے لوگ نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں (۱۱)۔ اس لئے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے اس میں انسان کی صرف محنت (Labour) ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہذا انسان صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ باقی سب کچھ خدا کا ہے اور اسے اس کے احکام کے مطابق تقسیم ہو جانا چاہئے۔ (۱۳ و ۱۴)۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب نظامِ ربوبیت میں ملیکی جس میں قرآنی معاشرہ میں تقسیم رزق کے اہم مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے)۔ بہر حال اسے ایک مرتبہ پھر سن رکھنا چاہئے کہ جو حکومت قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے (اسے اسلامی حکومت کہتے ہیں) اس کا بنیادی منشور یہ ہوتا ہے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (ماسانِ رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے۔ اس نظام میں، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے امت کی تحویل میں رہتے ہیں اور فاضلہ دولت بھی کسی کے پاس نہیں رہتی۔ یعنی اس میں ہر شخص پوری پوری محنت سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ یوں مملکت ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتی ہے۔ خدا کے دئے ہوئے رزق کی، خدا کے بندوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم، یہ ہے اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد۔

سورۃ واقعہ میں ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ (۸۳)۔ راغب نے کہا ہے کہ یہاں اس کے معنی تَصْيِيبُ یعنی حصہ کے ہیں۔ لیکن اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم قرآن جیسی کتاب کو اس لئے جھٹلاتے ہو کہ اس سے تمہاری روٹی چلتی رہے!

## ر س خ

رَسَخَ - يَرَسُخُ - رَسُوخاً - کسی چیز کا اپنے مقام پر محکم اور جائے گیر ہو جانا۔ رَسَخَ الْمَطَرُ - بارش کا پانی زمین میں جذب ہو گیا \*۔ یہ اسوقت بولینگے جب بارش کا پانی اس حد تک زمین کے اندر چلا جائے کہ وہ زمین کی نمی سے جا ملے۔

قرآن کریم میں الْقَرَسِيُّخُونُ فِي الْعِلْمِ آیا ہے (۳)۔ اسکے معنی ہونگے وہ لوگ جو علم میں پختگی حاصل کر لیں اور علم کی تہہ میں اتر جائیں۔ راغب نے کہا ہے کہ رَسَخَ فِي الْعِلْمِ وہ ہے جو علم میں اس حد تک تحقیق کر چکا ہو کہ اسکا کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو \*\*۔

قرآن کریم اپنی دعوت علی وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اسے غور و فکر اور علم و تحقیق کی رو سے سائنس کی تلقین کرتا ہے۔ لہذا رَسَخَ فِي الْعِلْمِ وہ شخص ہے جو اپنی تحقیق کی رو سے یقینی نتائج تک پہنچ جائے اور اسطرح اسکا ایمان علی وجہ البصیرت محکم ہو جائے۔ (آیت ۳ کے مفہوم کے لئے، عنوان ح - ک - م کے تحت، محکمات و متشابہات کی بحث دیکھئے)۔

## ر س ن

الْقَرَسُ - کھودنا - دبا دینا - یہیں سے میت کے دفن کرنے کو بھی رَسٌ کہتے ہیں۔ پرانا کنواں خواہ پختہ ہو یا نہ ہو۔ نیز الْقَرَسُ کسی چیز کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں۔ رَسٌ النَّحْشِيُّ وَرَسِيئَتُهُ - بخاری کی ابتدائی علامات - جیسے انگڑائیاں آنا \*۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی اس تھوڑے سے اثر کے ہوتے ہیں جو کسی چیز میں موجود ہوتا ہے \*\*۔ آهْلُ الْقَرَسِ - ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ابتداءً خود ہی کوئی جھوٹ گھڑیں اور پھر اسکی تشہیر کریں۔ یہ دراصل رَسٌ بَيْنَ الْقَوْمِ سے ماخوذ ہے جسکے معنی فساد اور عداوت پیدا کرنے کے ہوتے ہیں \*۔ اب فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی جم جانے کے ہیں۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْقَرَسِ (۲۵) عاد اور ثمود کے ساتھ کسی سابقہ قوم کے لئے آیا ہے۔ اسکے متعلق لغت میں بہت سے اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ الْقَرَسُ ایک وادی کا نام ہے۔ ممکن ہے اس وادی میں کوئی پرانا کنواں ہو جس سے اسکا نام ایسا مشہور ہو گیا ہو۔ \*\* لیکن اگر معنوی

خصوصیت مراد لی جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ قوم غلط باتیں وضع کر کے لوگوں میں فساد ڈلوایا کرتی تھی۔ یا ایسی قوم تھی جس میں انکے نبی کی تعلیم کا یونہی سا اثر باقی رہ گیا تھا۔

## ر س ل

رِسْلٌ کے اصلی معنی ہیں (کسی چیز کے سامنے جو رکاوٹ ہو اس کا دور ہو جانا اور اس طرح اس کا) اطمینان اور نرمی و سکون کے ساتھ چل پڑنا۔ \* چنانچہ نَاقَةُ رَسْلَةٍ - نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں۔ ایل مَرَّاسِيْلٌ - نرم رفتار اونٹوں کو۔ اسی سے رَسُوْلٌ ہے، جس کے معنی ہیں چل پڑنے والا، روانہ ہونے والا۔ پھر کبھی صرف نرمی اور سکون کے لحاظ سے عَلِي رَسْلِيْکٌ کہہ دیتے ہیں، یعنی تم اپنے حال پر سکون اور اطمینان سے جس طرح جی چاہے رہو۔ اور کبھی صرف چل پڑنے کے لحاظ سے رَسُوْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ \* نرمی کے اعتبار سے اَلرَّسْلُ - نرم رفتار کو کہتے ہیں۔ اَلْمُسْتَرْسَلُ کے معنی ہیں جانور کی رفتار میں آہستگی \*\*

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انبعاث ہیں۔ یعنی چل پڑنا۔ اسی اعتبار سے جماعت اور گٹھ کو اَلرَّسْلُ کہتے ہیں۔ جَاءَتِ الرِّجْلُ اَرْسَالًا - گھوڑے ٹکڑی ٹکڑی آئے۔ \*\* (اس میں تسلسل کا پہلو بھی ہے)۔ اَلرَّسَالُ (کسی کی طرف) بھیجنا۔ اَرْسَلْتُهُ عَلَيْهِ - اس نے اسے کسی پر مسلط کر دیا۔ اَلرَّسُوْلُ - جو شخص خدا کی طرف سے بندوں کی طرف بھیجا جائے۔ خود وہ شخص بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے اور اس کا پیغام بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے۔ یعنی لفظ رَسُوْلٌ - رَسَالَةٌ اور مَرَّسَلٌ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ \*\* یعنی پیغام اور جسے پیغام دیکر بھیجا گیا ہو، وہ۔ اَلرَّسِيْلُ فِي الْقِرَاءَةِ کے معنی ہوتے ہیں آہستہ آہستہ سنوار کر پڑھنا۔ \*\* لہذا اَلرَّسُوْلُ کے معنی ہونے جو شخص اپنے بھیجنے والے کی طرف سے مسلسل، بتدریج، نہایت نرم روی سے پیغام دے۔ نیز خود اس کا پیغام بھی اَلرَّسُوْلُ ہے۔

وہ حضرات جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور اس وحی کو وہ انسانوں تک پہنچاتے ہیں خدا کے رسول کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں اَنْبِيَاءٌ بھی کہا ہے اور رَسُوْلٌ بھی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی ذات کے دو منصب ہیں۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا

ملنا ہے اور رسالت اس وحی کا آگے پہنچانا۔ نہ نبوت بغیر رسالت کے ہو سکتی ہے اور نہ رسالت بغیر نبوت کے۔ (تفصیل اس اجمال کی ن۔ ب۔ ا۔ کے تحت ملیگی جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی بلا شریعت، یہ خیال غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے رسول اور نبی میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ ہر نبی صاحب کتاب تھا (۲۱۳) اور ہر رسول بھی (۲۵)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے رسول ہوں۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّيؑ (۶۲)۔ ”میں اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں“۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَؑ (۵۶)۔ ”جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے تیری طرف نازل ہوا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے“۔ لہذا رسول اللہؐ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملا تھا آپ اسے خود اُمت کو دیکر گئے تھے۔ اسے دوسروں پر نہیں چھوڑا تھا۔

رسول، جنہیں انسانوں تک پیغام پہنچانے کے لئے چنا جاتا تھا، انسان ہوتے تھے (۱۱۰) اور انسانوں میں سے بھی مرد (۱۱۰: ۱۱۱: ۱۱۲)۔ رسول سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا کہ وہ من جانب اللہ ہے اور صداقتوں سے معمور (۲۸۵) اور سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ یعنی اس جماعت کا سب سے پہلا رکن ہوتا تھا جسے وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور نظام خداوندی کی تشکیل کے لئے وجود میں لاتا تھا (۶۶)۔ وہ خود بھی اپنی وحی کا اتباع کرتا تھا (۱۱۰: ۱۱۱: ۱۱۲) اور اس وحی کو ایک عملی نظام زندگی بنانے کیلئے دوسروں سے اسکی اطاعت کراتا تھا (۱۱۰)۔ وہ اپنے حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتا تھا۔ نہ ہی یہ چیز کسی رسولؐ کے شاہیاں کی شان تھی کہ وہ انسانوں کو قوانین خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۲۸: ۲۹)۔ اس طرح رسول کی وساطت سے قوانین خداوندی کی اطاعت، خود خدا کی اطاعت قرار پا جاتی تھی (۸۰)۔ لہذا یہ اطاعت اس نظام کی اطاعت ہوتی تھی جو رسول کے ہاتھوں قوانین خداوندی کی عملی تنفیذ کیلئے مشکل ہوتا تھا۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ اسکے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کی رو سے قائم ہوا تھا۔ اس نظام میں



خليفة الرسولؐ وہ فرائض سرانجام دیتا تھا جنہیں اپنی زندگی میں رسولؐ سرانجام دیتا تھا۔ یعنی منظم اور اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا۔ اس طرح ”اطاعت خدا و رسولؐ“ کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ اب اگر پھر اسی قسم کا نظام قائم ہو جائے جس میں قرآنی قوانین عملاً نافذ ہوں تو پھر اسی اطاعت کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے جسے ”خدا اور رسولؐ“ کی عملی اطاعت کہا جاتا ہے۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ”اسلامی نظام“\* میں ملیگی جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ”اللہ اور رسولؐ“ کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے بعد ضمیر یا صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ”اللہ اور رسولؐ“ کی اطاعت دو الگ الگ اطاعتیں نہیں ہوتیں۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانین خداوندی کی اطاعت جو اس نظام کی وساطت سے کی جاتی ہے جسے رسولؐ متشکل کرتا ہے اور جو رسولؐ کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کے ذریعہ آگے چلتا ہے)۔

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ ”الرسولؐ“ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو تیر اندازی میں تمہارا حاتھی اور موافق ہو\*\*۔ اگرچہ لسان العرب میں ہے کہ اس معنی میں ”رسولؐ“ آتا ہے۔ ”رسولؐ“ نہیں\*\*\*۔ لیکن خدا اور اس کا رسولؐ، درحقیقت ”تیر اندازی“، میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کے احکام رسولؐ (اور اس کے متبعین کی جماعت) کے دست و بازو کی قوت سے عملاً نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لئے بدر کی جنگ کے موقع پر خدا نے کہا تھا کہ ”وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ“ (۱۶۱)۔ ”وہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے خود خدا چلا رہا تھا“،۔ خدا اور رسولؐ (اور اس کی جماعت) کی یہی باہمی رفاقت ہے جس سے دنیا میں نظام خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ (اس کی مزید تفصیل قآبِ قُدُوسِیْن (۱۶۳) میں دیکھئے۔ عنوان ق۔ و۔ س)۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے نبی یا رسولؐ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ نبی اور رسولؐ کی الگ الگ خصوصیات نہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کو

\* نیز ”سلیم کے نام خطوط“ (جلد دوم) میں اطاعت رسولؐ سے متعلق خطوط ہیں۔

\*\* تاج و محیط۔ \*\*\* لسان العرب

دیکھئے جہاں نبی یا رسول کی خصوصیات یا تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً رسول کسی سے اپنا حکم نہیں منواتا، صرف کتاب خداوندی کی اطاعت کراتا ہے (۳۸)۔ وہ اگر کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہے تو وہ اسکی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ صحیح راستہ وحی کے ذریعے دکھاتا ہے (۳۳)۔ رسول خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا (۱۹)۔ وہ کسی سے اجر و حالت نہیں مانگتا (۱۴)۔ رسولوں کے بیوی بچے ہوتے تھے (۱۳)۔ تمام رسول اپنے اپنے وقت پر آئے اور تشریف لے گئے (۳۳)۔ لیکن نبی آخر الزمانؐ کی بعثت کے بعد، نجات و سعادت حضورؐ پر ایمان اور قرآن کریم پر عمل کرنے ہی سے مل سکتی ہے (۱۵۸)۔ رسول ہمیشہ مرکزی مقامات میں آیا کرتے تھے (۵۹)۔ رسول کو رحالت ملنے سے پہلے قطعاً علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے رحالت ملنے والی ہے (۲۸ : ۲۴)۔ نبی اکرمؐ نبوت ملنے سے پہلے ان پڑھ تھے (اس کے بعد نہیں)۔ (۲۸)۔ نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی تھے (۳۳)۔ اس لئے اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے نہ رسول۔ رسول صرف خدا کا راستہ دکھاتے تھے۔ دوسروں کو اس راستے پر لگانا ان کے ذمے یا اختیار میں نہیں تھا (۵۹)۔ بعض رسولوں پر ایمان لانا اور بعض پر نہ لانا کفر ہے (۱۵)۔ یہ اور اس قسم کی دیگر خصوصیات، انبیاء کرام اور رسولوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ حتکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر (بفرض محال) رسول بھی مداهنت برتے یا اپنی وحی میں کسی قسم کی تبدیلی کر لے تو اس پر خدا کا عذاب آجائے (۲۸ : ۱۵ : ۱۱۳ : ۱۴)۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ہے اور وہ دین کا مکمل ضابطہ ہے، اس لئے نبوت کے ختم ہو جانے سے انسانی راہ نمائی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سوال صرف اس نظام کے قائم کرنے کا ہے جسے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔

اِرْسَال کے معنی چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اُرْسَلَ الْخَيْلَ فِي الْغَارَةِ۔ حملہ میں گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں\*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اِسْتَاكَ\* (روک لینے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵) جہاں اسکے معنی کھلا چھوڑ دینے کے ہیں۔ اُرْسَلَ عَلٰی کے معنی ہیں کسی پر مسلط کرنا (۱۹)۔

## ر س و

رَسَا الشَّقِيئِي "بَرَسُو" - اَرَسَى - اَرَسَاءٌ - کسی شے کا قرار گیر ہو جانا - جم جانا - رَسَتِ السَّقْفِيْنَتُ "تَرَسُو" - کشتی لنگر انداز ہو گئی - اَرَسَى السَّقْفِيْنَتُ : کشتی کو لنگر انداز کیا - لُهم رَايا - اَلْمِرْسَاةُ - کشتی کا لنگر\* - مَجْرَهَا وَ مَرَسُهَا (۱۱) - کشتی کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا - سورة اعراف میں اَلسَّاعَةِ کے متعلق ہے اَيَّانَ مَرَسُهَا (۱۸۷) - اس کا وقوع کب ہوگا - وہ کب رُک کر ہمارے سامنے آئے گی - مَرَسَى اسم مفعول ہے جو ظرف کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے - اس کے معنی رکنے کا وقت اور رکنے کا مقام دونوں ہو سکتے ہیں - قَدْ وَرَى رَّاسِيَاتٍ (۳۴) - دیکھیں جو ایک جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہوں - رَوَّاسِي (۱۳) - جمے ہوئے پہاڑ (واحد رَاسِيَة\*) -

## ر ش د

رَشَدَ - بَرَشَدَ - رُشِدًا - نيز رَشِيدَ - بَرَشَدَ - رَشَدًا وَرَشَادًا - معاملہ کا صحیح حل ، یا صحیح راستہ ، پالینا\*\* - الرُّشْدُ - معنی سے راہ راست پر استقامت کو کہتے ہیں\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی راستہ پر ہتکتی سے جم جانے کے ہیں - الرُّشْدُ والرُّشْدُ - غَيَّی کی ضد ہے - یہ صحیح راہنمائی اور ہدایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے\*\*\* - (۲۵۶) - سورة نساء میں رُشِدًا (۲) آیا ہے جس کے معنی معاملہ فہمی کی صلاحیت یا عقل کی ہتکتی کے ہیں - اِسْتَرَشَدَ فُلَانٌ لَا مَرَمَ - اس شخص نے اپنے معاملہ کا صحیح حل پا لیا - اَرَشَدْتُہ - میں نے اسے ٹھیک راہ بتائی - اَلرَّشِيْدُ (۱۱) - صحیح راستہ بتانے والا - نیز وہ شخص جو معاملات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائے یا جس کے اندازہ کئے ہوئے معاملات پوری طرح بغیر کسی کی مدد اور رہنمائی کے انتہا تک پہنچ جائیں\*\* -

سورة کہف میں ہے کہ ان نوجوانوں نے خدا سے دعا کی کہ ہماری اس انقلابی مہم میں ہمیں سامانِ رحمت و ربوبیت عطا کر دے اور ہمارے معاملہ میں ہماری راہنمائی کا سامان فراہم کر دے - وَ هَتَّيْی "لَنَا مِیْنُ اَمْرِیْنَا رَشَدًا" (۱۸) - اس کے بعد ہے کہ تمہارا نشو و نما دینے والا تمہیں سامانِ رحمت بھی دے گا - وَ بَهْتَّيْی "لَكُمْ مِیْنُ اَمْرِیْكُمْ" میرُفَقًا (۱۸) - اور تمہارے مقصد کی کامیابی کے لئے آسانیاں بھی ہم پہنچا

دے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رَشَدٌ صرف صحیح راستے کی طرف راہنمائی ہی نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری تدابیر اور انکی کامیابی کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے۔ چنانچہ اَلْمُرَاشِدُ ان راستوں کو کہتے ہیں جو منزل مقصود تک پہنچادیں۔ قرآن کریم میں رَشَدٌ ۱۔ ضَرَّ ۲۔ (نقصان) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۴/۱)۔ لہذا رَشَدٌ ایک جامع لفظ ہے جس میں ہدایت، حکمت و بصیرت سے لیکر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے حامان سب آ جاتے ہیں۔ اسی لئے انبیائے کرامؑ (انقلاب خداوندی کی طرف دعوت دینے والوں) کو رَشَدٌ عطا ہوتا تھا (۲۱/۵)۔ اور جماعت مومنین رَاشِدٌ وُن کی جماعت ہوتی ہے (۲۱/۶)۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ملتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ خدا کے سوانہ کوئی وِلیؑ ہے اور نہ کوئی مُرَشِدٌ (۱۸/۱)۔ لیکن ہم ہیں کہ انسانوں کو اپنا پیر و مرشد بناتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہے ہیں!

## ر ص د

رَصَدٌ ۱۔ وہ اسکے انتظار میں رہا۔ اَلْمُرَاصِدُ ۲۔ منتظر اور کسی کی نقل و حرکت پر نگروانی کرنے والا۔ اَلرَّصِیْدُ ۳۔ درندہ جو حملہ کرنے کا منتظر رہے۔ قرآن کریم میں ہے یَجِیْدُ لَہُ شِہَابًا رَّصَدًا (۲۴/۲)۔ وہ ایک شعلہ کو اپنے انتظار یا گھات میں بیٹھا ہوا پائیگا۔ اُرْصَادٌ کے معنی ہیں کسی کا انتظار کرنا اور (انتظار میں) تیاری کرنا۔ اُرْصَادٌ اِلَیَّکُم مِّنْ حَارِبٍ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہُ (۱۰۰/۱) ”خدا و رسول“ (نظام خداوندی) کے خلاف جنگ کرنے والے کے لئے گھات بنانے اور تاک میں رہنے کے لئے۔ نیز مخالفانہ کاروائیاں کرنے کے لئے۔ اَلْمُرْصَدُ ۴۔ اَلْمِرْصَادُ (۱۰۰/۱ و ۱۰۱/۱) وہ راستہ یا جگہ جہاں بیٹھکر دشمن کی تاک لگائی جائے۔\*

خدا کے میرْصَادٌ (گھات) میں ہونے (۱۰۱/۱) کے یہ معنی ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک پر نگہ رکھتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آتا ہے تو اسے فوراً دبوچ لیتا ہے۔ کوئی شخص اُس قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس راستے سے کسی چیز کو گزرنا ہو وہاں اس کی تاک میں بیٹھنا۔ انسان

کا ہر عمل ، قانونِ خداوندی کے معین کردہ راستے سے گذر کر اپنی منزل و منتہی تک پہنچتا ہے ، جسے اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے ۔ لہذا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا ۔

## ر ص ص

رَمَقَهُ - بَرَصَهُ - رَمَقًا - اس نے کسی چیز کے اجزا کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انہیں باہم گہر مضبوطی سے جوڑ کر ملا دیا، جیسے انہیں سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ اَلرَّمَقُ صَاصٌ سیسے کو کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے کہ مومن خدا کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں کَاَنَّهُمْ بَنِيَّانٌ مَّرْمُوسُونَ (۱۱)۔ گویا وہ ایک ایسی محکم دیوار ہیں جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب قلوب ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔ اور قلوب کی پیوستگی ، مقصدِ زندگی اور ضابطہٴ حیات کے ایک ہونے سے ہوتی ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ جس جماعت (امت مسلمہ) کی کیفیت یہ ہونی چاہئے تو وہ آج کس طرح فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو حاصلِ قرآن سمجھ رہی ہے!

## رض ع

رَضِعَ بَرَضِعٌ - رَضَعَ يَرْضِعُ - رَضَعًا وَرَضَاعًا وَرَضَاعَةً ۔  
بچہ کا ماں کے پستان کو چوس کر دودھ پینا\*\*۔ أَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (۲۳)  
تمہاری دودھ شریک بہنیں (جن سے نکاح حرام ہے)۔ اَرْضِعْ - دودھ پلانا۔ اِلِئْتِرْضَاعٌ - دودھ پلوانا چاہا\*\*۔ وَأُمِّيهِتُكُمْ الْفَتَى اَرْضَعْنَكُمْ (۲۳)  
(تمہاری وہ ماں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے (ان سے بھی نکاح حرام ہے)۔ مَرَأِضِعٌ - دودھ پینے کی جگہ - چھاتیاں\*\*\*۔ (واحد - مَرَضِعٌ)  
سورۃ قصص میں ہے - وَحَرَّضْنَاهُ عَلَىٰ الْمَرَأِضِ (۲۸) - یعنی ہم نے موسیٰ کو دودھ پینے سے روک دیا۔ اس میں مَرَأِضِعٌ - مَرَضِعٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مَرَضِيعَةٌ کی بھی۔ پہلی شکل میں اس کا مفہوم چھاتیاں، اور دوسری شکل میں دودھ پلانے والیاں، ہوگا۔ مَرَضِيعَةٌ - دودھ پلانے والی ہورت - اِنَّا (۲۲) - اس کی جمع بھی مَرَأِضِعٌ ہے۔ اِلِئْتِرْضَاعٌ - بچے کو (انٹا سے) دودھ پلوانا چاہا - (۲۳۳)۔



کے سامنے دم مارنے کی جا نہیں۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اُس کے حضور پیش کرنی ہو تو اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نیز اس درخواست کو، بادشاہ کے مقربین میں سے کسی کی وساطت سے وہاں تک پہنچانا ہوگا تاکہ وہ سفارش کرے۔ ان درخواستوں کے فیصلے (یا بادشاہ کے دیگر احکام) کسی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش ہو گیا تو گاؤں بخش دیا۔ اگر ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دئے۔ بادشاہ کی خوشی اور ناراضگی بھی کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ سعدی کے الفاظ میں، مزاج شاہان کی کیفیت ہے ہوتی ہے کہ ”گاھے بہ ملائے برنجند و گاھے بہ دشنامے خلعت بہ چخشند“۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام دیتے ہیں۔ لہذا بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی رکھیں۔ اسے خوش کر لیں۔ ایشور کی بھگتی۔ ڈنڈوت۔ ہوجا پاٹ۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں دینا سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور پر ماتا کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھگتوں سے راضی رہے۔

قرآن کریم نے (اور اس سے پہلے انبیاء سابقہ<sup>۲</sup> کیطرف وحی نے) اس توہم پرستانہ تصور کو مٹا کر، اسکی جگہ خدا کا صحیح تصور دیا۔ اس تصور کی رو سے بتایا گیا کہ خدا مستبد حکمرانوں کیطرح نہیں۔ اس نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر رکھا ہے اور کائنات کے تمام امور اس کے متعین کردہ قوانین و اصول کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے بھی اس نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں (جن کا علم انسان کو انبیاء کرام<sup>۳</sup> کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے اور اب وہ قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ وہ (بادشاہوں کی طرح) یونہی خوش ہو کر نہ کسی کو انعام دیتا ہے، نہ یونہی ناراض ہو کر عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا نے انسانی زندگی کے سامنے ایک مقصد رکھا ہے اور اس نے جو قوانین عطا کئے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انسان ان کے مطابق زندگی بسر کرے، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ انسانوں کے لئے یہ راستہ خدا کا پسندیدہ ہے۔ یعنی اگر انسان اس راستے پر چلتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر اس کے

خلاف جاتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں ”خدا کی رضامندی“ (یا اس کے خلاف، غضب وغیرہ) کے الفاظ آئے ہیں تو وہ اسی مفہوم کے ترجمان ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے ”وَرَضِیْتُمْ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دَرِیْتُمْ؟“ (۵)۔ ”میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور ضابطہ حیات پسند کیا ہے“۔ اگر انسان اس ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ خدا کے پسندیدہ راستے پر چلتا ہے۔ اسے ”رَضِیَ اللَّهُ عَنْهُ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف، ایک مومن کے دل کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ راستے کو محبوب رکھتا ہے اور اس کے خلاف دوسرے راستوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبِیْبُكُمُ الْإِیْمَانُ وَزَیِّنَتْهُ فِی قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَتْ لِّلْكَفَرِ وَالْفُسُوقِ وَالْعِصْیَانِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْقَاسِدُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۲۸) ”لیکن اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین بنا دیا ہے اور کفر و فسق و عصیان کو نا مرغوب۔ ایسے ہی لوگ صحیح راستے پر چلنے والے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے“۔ ایمان کا دلوں میں اس طرح مرغوب بن جانا، ”رَضُوا عَنْهُ“ ہے۔

اس سے رَضِیَ اللَّهُ عَنْهُمْ ”وَرَضُوا عَنْهُ“ (۱۰۰) کا مفہوم سمجھ میں آجائیگا۔ یعنی ”اللہ کے راضی ہونے“ سے مراد یہ ہے کہ خدا کے پسندیدہ راستہ (قرآن کریم) کے مطابق چلا جائے۔ اور انسانوں کے خدا سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا تجویز کردہ راستہ، ان کے دلوں میں محبوب و مرغوب بن جائے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں منافقین کے متعلق ہے کہ یُرْضُوا نَفْسَهُمْ بِآفَاقِ الْوَحْشِیمُ وَتَنَافَىٰ قُلُوبُهُمْ (۸) ”وہ اپنے منہ سے تم کو راضی کسرتے ہیں اور ان کے دل انکار کسرتے ہیں“۔ یہاں اِرْضَاءٌ بمقابلہ آبی آبی ہے۔ آبی کے معنی ہیں سختی سے انکار کرنا۔ لہذا رَضِیَ کے معنی ہر ضا و رغبت موافقت کرنے اور دلی طور پر ہم آہنگی کے ہونگے۔ یہ مفہوم سورۃ بقرہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے منکرین کے متعلق ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اِنْتَقِیْ لِلّٰہِ (۲۶)۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، تو وہ ایسا نہیں کسرتے۔ اس کے بعد مومنین کا ذکر ہے کہ وہ اِبْتَغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (۲۸) کی زندگی بسر کسرتے ہیں۔ اس سے آگے ہے اُدْخِلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّةً (۲۸)۔ خدا کی اطاعت شعاری میں پورے کے پورے داخل



ہو جاؤ۔ یعنی لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲۸)۔ غیر خدائی قوتوں کے احکام و قوانین کا اتباع مت کرو۔ ان تمام ٹکڑوں کو سامنے رکھنے سے مَرْضَاتِ اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کے احکام و قوانین کی پوری پوری اور برضا و رغبت اطاعت۔ یہی معنی رَضِيَ اللہ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ بطیب خاطر پوری ہم آہنگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ان قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اور قوانین خداوندی کے خوشگوار نتائج ان سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی سعادتیں اور برکتیں ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے دلوں میں قوانین خداوندی کی محبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو اتَّبَعَ رِضْوَانُ اللہ (۱۶۱) سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں بَاءِ يَسْتَخِطُّ مِنْ اللہ کہا ہے (دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ط)۔ سورۃ محمد میں واضح کر دیا ہے کہ رِضْوَانُہ کے معنی ہیں مَا نَزَّلَ اللہ یعنی قرآن۔ پہلے کہا گیا ہے كَرِهَ اللہ لِمَنِ امْتَرَازَہ (۲۶)۔ اور اس کے بعد ہے كَرِهَ اللہ لِمَنِ امْتَرَازَہ (۲۸)۔ یعنی، رِضْوَانُہ قرآن کریم (مَا نَزَّلَ اللہ) کا اتباع ہے اور سَخَطُہ غیر قرآنی احکام کا اتباع۔ لہذا مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ قرآن کریم (مَا نَزَّلَ اللہ) کا پورا پورا اتباع کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اس سے پورے طور پر ہم آہنگ اور متفق رکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون مکافات کے مطابق زندگی کی خوشگواریاں اور شادائیاں ان کے ہمرکاب ہو جاتی ہیں۔ اسی زندگی کا نام عِبْشَۃٌ رَاضِيۃٌ (۱۶۱) ہے۔

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خدا سے بیٹے کی دعا مانگی اور کہا وَاجْعَلْہٗ رَبِّ رَاضِيًا (۱۹)۔ یہاں رَاضِيًا کے معنی یہاں تو محبوب و مقبول کے ہیں۔ اور یہ کہ وہ تیرے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو۔ تاج میں رَضِيَ اللہ کے معنی مطیع بھی لکھے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومنین سے جَنَاحَاتِ اور مَسَاكِينِ طَبِيعَۃً کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللہِ اَكْبَرُ ذَالِكِ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۱۰)۔ اللہ کی ”رضوان“ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ ایک عظیم کامرانی (Achievement) ہے۔

یہ آیت جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟

انسان نام ہے اس کی طبعی زندگی (Physical Life) اور انسانی ذات (Self) کا۔ زندگی کی کامیابی سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی بھی خوشگوار رہے اور اس کی ذات کی بھی نشو و نما ہو جائے۔ انسان کی نشو و نما سے مراد یہ ہے کہ اس میں جس قدر مضمحل صلاحیتیں ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے جس میں اس کی تمام صفات بطریق احسن جلوہ فرما ہیں۔ وہی صفات انسان کی ذات میں بھی ہیں لیکن علی قدر بشریت۔ یعنی چھوٹے پیمانے پر۔ انسانی ذات کی نشو و نما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ان صفات کی نمود ہوتی جائے۔ اب ظاہر ہے کہ انسانی ذات کو جس قدر زیادہ نشو و نما حاصل ہوگی یہ اتنی ہی زیادہ صفات خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی جائے گی۔

ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا ہے کہ انسانی ذات کی اس طرح نشو و نما ہونی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے زندگی کی خوشگواریاں بھی ملتی چلی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زندگی کی یہ خواہشگواریاں بڑی خوش آئند اور مبارک ہیں اور ان کا حاصل ہو جاتا بھی بڑی چیز ہے۔ لیکن حقیقی کامرانی و کامیابی یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات، صفات خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ذالیک هو الفوز العظیم۔ ان اعمال کا بدلہ (یا نتیجہ) ایک تو اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ انسان کی خارجی دنیا حسین و خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے۔ یہ انقلاب (یعنی انسانی ذات کا نشو و نما پا جانا) بہت بڑی کامرانی ہے۔ یہی چیز ہے جسے بانداز دگر یوں کہا گیا ہے کہ لہم مایشاؤن فیہا ولدبنا مزید (۱۴۸) ”جنت میں ان کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس (اس سے بھی) بڑھ کر (کچھ اور) ہے“۔ یعنی انسان کی خواہش اس کے علم و جذبات کی موجودہ سطح کے مطابق ہی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب جنت کی زندگی میں یہ سطح ہی بلند ہو جائیگی تو وہاں جو کچھ ملیگا وہ ان کی موجودہ خواہشوں اور آرزوؤں سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس کی ذات کی نشو و نما باطنی نطفہ ہوگی کہ اس کے شعور کی موجودہ سطح اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اس حقیقت کو قراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی ذات کی یہ نشو و نما صرف اس معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جو قرآن کریم متشکل کرتا ہے۔ خانقاہوں کی مجرد گاہوں میں نہیں ہو سکتی۔ لہذا بات پھر وہیں آجانی

ہے کہ رضوان من اللہ یا مرہضات اللہ، قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے خوشگوار نتائج کا نام ہے۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَرَادَتْهُنَّ (۲۱/۴۸)۔ اس کے لئے عنوان ش۔ ف۔ ع دیکھئے۔

## ر ط ب

الرَّطْبُ - يَابِسٌ\* (خشک) کی ضد ہے۔ یعنی تر و تازہ چیز جس میں نمی ہو۔ نرم و نازک شاخ۔ ہری بھری گھاس۔ سرسبز زمین۔ الرَّطْبُ - گذری کھجور\*۔ قرآن کریم میں رَطْبًا جَنِيًّا (۱۱/۱۵) آیا ہے۔ چنی ہوئی گذری کھجوریں۔ سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۵۶/۳)۔ اس کے معنی تازہ اور خشک پھل کے بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب ہر تر اور خشک چیز ہے۔ یعنی کائنات کی مختلف چیزیں۔ اور کتاب مبین صحیفہ فطرت یا کائناتی قوانین کا ضابطہ ہے۔

(رَطْبٌ وَّ يَابِسٌ\* کے لئے ی۔ ب۔ س کا عنوان بھی دیکھئے)۔

آیت (۱۱/۱۵) کو سامنے لائے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر ہلکی ہوئی کھجوریں لٹک رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، دسمبر کے مہینے میں نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں فلسطین میں سخت سردی ہوتی ہے اور تازہ کھجوروں کا موسم نہیں ہوتا۔ اب عیسائی مورخ خود اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ ۲۵ دسمبر حضرت عیسیٰؑ کا یوم پیدائش نہیں۔ عیسائیوں نے بعد میں یہ عقیدہ ایرانیوں سے مستعار لیا تھا جن کے ہاں ۲۵ دسمبر متھرا کا یوم پیدائش تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور ۲۵ مارچ اس کے مرا کر جی اٹھنے کا دن۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ متھرا آخری زمانے میں پھر دنیا میں آئے گا۔ (دیکھئے معراج انسانیت صفحہ ۵۱)

## ر ع ب

رَعَبَ الْحَوْضَ - حوض کو بھر دیا۔ رَعَبَ السَّيْلَ - الوادی - سیلاب نے وادی کو بھر دیا۔ اس کے ایک معنی تو ہیں بھر دینا اور دوسرے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا۔ رَعَبَ السَّنَامَ - اسنے کوہان کو کاٹ لیا۔ أَلَيَّرَ عَيْبَةَ - کوہان کا کٹا ہوا ٹکڑا\*۔

اس اعتبار سے راغب کے نزدیک الرَّعْبُ کے معنی ہیں خوف سے بھر جانے کی وجہ سے بول چال سے منقطع ہو جانا \*۔ صرف ڈر کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَمَّا لَبِثْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸)۔ ”تو ان کی وجہ سے خوف کھا جائے“۔

جماعت مؤمنین کو اس قدر قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ میدان جنگ میں مخالفین ان کو دیکھ کر رعب سے کانپنے لگ جائیں۔ لیکن یہ چیز صرف اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دنیا میں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف بتایا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے سَتَلْقَىٰ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرَّعْبَ يَمَنُوا شُرَكَاءُ بِلَٰهِهِمْ (۳۰)۔ ”ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دینگے اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں“۔

## رع د

رَعْدٌ بادل کی گرج۔ اسکے معنی کپکپانے اور تھرتھرانے کے بھی آتے ہیں۔ مجازاً زجر و توبیخ کو بھی کہتے ہیں۔ الرَّعْدَانُ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت باتیں بناتا ہو۔ زیادہ بڑ بڑ کرتا ہو۔ \*\* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بادلوں کی آواز کے معنوں میں آیا ہے (۲۹: ۱۳)۔ وَيَسْبِغُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ (۱۳)۔ رَعْدٌ اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے اور اپنے تعمیری نتائج سے خدا کی حمد و ستائش کی زندہ پیکر بن جاتی ہے۔ (دیکھئے عنوانات م۔ ب۔ ح اور ح۔ م۔ د)۔ کائنات کی ہر قوت اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کیلئے سرگرداں رہتی ہے۔ اور ان کی نقل و حرکت کا مجموعی نتیجہ کائنات میں تعمیری اضافے ہوتا ہے۔ ہم جب ان قوتوں کو الگ الگ دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض قوتیں محض ڈر اور خوف کا موجب نظر آتی ہیں (جیسے بجلی کی کڑک) لیکن یہ ہیئت مجموعی ان سب کا نتیجہ تعمیری ہے۔ اور یہی چیز خدا کی حمد و ستائش کی مظہر ہے۔

## رع ن

الرَّعُونَةُ = حماقت کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رُعُونَةُ فکر کی کمی کو کہتے ہیں اور حُمُقٌ بطلانِ فکر کو \*\*\*۔



میں رہبانیت کے مسلک کے متعلق ہے فَمَارَعَوْهُمَا حَقٌّ رِعَايَتِيهَا (۲۶) ”وہ اس کی نگہداشت نہ کر سکیے جیسا کہ اس کی نگہداشت کا حق تھا“۔ سورۃ المومنون میں ہے وَالَّذِينَ هُمْ لَا يُسْتَلْتِهِمْ وَعَهْدُهُمْ رَاعُونَ (۲۳)۔ ”جو لوگ اپنی اسانات کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے وعدوں کی نگہداشت رکھتے ہیں“۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم (یہودیوں کی طرح) رَاعِيْنَا مت کہو (۱۰۴)۔ اور (۲۶) میں ہے کہ وہ لوگ (یہودی) رسول اللہؐ کو مخاطب کرتے وقت الفاظ کو توڑ مروڑ کر کہا کرتے تھے جس سے ان کا مفہوم بدل جائے۔ انہی الفاظ میں رَاعِيْنَا کا لفظ بھی شامل تھا۔ یہ ان کی دناؤ کی انتہا تھی کہ جوشِ مخالفت میں عام آدابِ معاشرت کو چھوڑ کر بالکل بازاری سطح پر اتر آتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ رَاعِيْنَا کہہ دیا کرتے تھے جو رَعُوْنَت سے ہے۔ (دیکھئے عنوان ر-ع-ن)۔ لیکن صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رَاعِيْنَا، مُرَاعَاة سے ہے (جو بابِ مفاعلہ سے ہے) اور اس باب کی خصوصیت اشتراک ہے۔ اس طرح رَاعِيْنَا کے معنی یہ ہوئے کہ تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ اس قسم کے کلمات رسولؐ خدا کی شان میں استعمال کرنا کھلی بے ادبی اور گستاخی ہے۔\*\* یعنی انہیں غیر مشروط طور پر اطاعت رسول کا اقرار کرنا چاہئے، جو دراصل اطاعت خدا ہے اور یہی ان کا فریضہ حیات ہے۔ انہیں رسول سے کہنا یہ چاہئے کہ اُنْظُرْنَا آپ ہم پر نگاہ رکھئے کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے بعد ان کا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ کے تمام احکامات کو سن کر ان کی اطاعت کریں۔ وَاسْمَعُوا (۱۰۴)۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو ایسے قول (لہذا ایسے فعل سے بھی) روکا گیا ہے جس میں غلط اور صحیح ملتبس ہو جائیں اور حق و باطل کا امتیاز واضح نہ ہو۔ اگر کسی قول یا عمل سے اہانتِ رسول یا تنقیصِ توحید کا شائبہ تک بھی پیدا ہوتا ہو تو اس سے بچنا چاہئے اور محض نیک نیتی کو اس کے جواز کے لئے اڑ نہیں بنانا چاہئے۔ مسلمان کی ہر بات اور ہر عمل کو صاف، واضح اور بین ہونا چاہئے۔ ان امور میں (بالخصوص) شاعری جس قسم کا لائسنس لے لیتی ہے اس کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

## ر غ ب

رَغْبَةً کے اصلی معنی کسی چیز کے وسیع ہو جانے کے ہیں۔ رَغْبٌ الشَّيْءِ - چیز وسیع ہو گئی۔ حَوْضٌ رَغِيبٌ - وسیع حوض۔ الرِّغْبَةُ وَ الرِّغَابُ - بہت زیادہ چاہنا، ارادہ کی وسعت\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) طلب کرنا۔ چاہنا (۲) وسعت بتائے ہیں۔ وَاَدِ رَغِيبٌ - بڑی کشادہ وادی جس میں بہت زیادہ پانی سما جائے۔ تَرَاغَبَ الثَّمَرَانِ - جگہ وسیع ہو گئی۔ اَرُغِبَ اللّٰهُ قَدْ رَكَتَ - خدا تیرے مرتبہ کو بڑھائے۔ اَلرَّغَابُ بہت دودھ دینے والے اور کثیر المنفعت جانور۔ نیز ہر وسیع و کشادہ چیز کو رَغِيبٌ کہتے ہیں\*\*۔ اسی سے راغِب نے کہا ہے کہ جب رَغِيبٌ فَيُنْدِرِ بِا رَغِيبٍ اَلْيَمِّدِ کہا جائے تو اس کے معنی ہونے ہیں۔ (ارادے کی وسعت کے ساتھ) کسی چیز کو چاہنا اور اس کی حرص کرنا۔ اِنْقَالًا اِلَى اللّٰهِ رَاغِبُونَ (۹۶) میں بھی یہی معنی ہیں۔ (نیز ۱۴۸) میں۔ اور جب رَغِيبٌ عَنْهُ کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے رغبت کو اس سے پھیر لینا\*۔ جیسے وَمَنْ يَتَرُغَّبْ عَنْ مِلَّةٍ اِبْرَاهِيمَ (۱۳۰)۔ نیز (۱۹۱) میں رَاغِبٌ کے بعد عَنْ آیا ہے۔ ان مقامات میں اس کے معنی پھر جانا۔ رغبت ہٹا لینا ہیں۔

سورة نساء میں ہے لَا تَتُوتُوْا نِهْنًا مَّا كُتِبَ لِهْنٍ وَ تَتَرُغَّبُونَ اَنْ تَتَذَكَّرُوْا هُنَّ (۱۳۴)۔ یہاں تَتَرُغَّبُونَ کا صلہ کوئی نہیں (نہ الی) نہ عَنْ) لیکن سیاق عبارت کا تقاضا ہے کہ اس کا صلہ الی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم بیوہ عورتوں اور یتیم لڑکیوں کو وہ کچھ تو دینا نہیں چاہتے جو قانون خداوندی کی رو سے انہیں ملنا چاہئے اور چاہتے یہ ہو کہ ان سے نکاح کرلو۔ تاج نے صراحت کی ہے کہ رَغِيبٌ فَيَمْدِ کے معنوں میں رَغِيبَةٌ بغیر فی کے بھی آتا ہے۔ یعنی اُسے چاہا۔ اس کا ارادہ کیا۔

سورة انبیاء میں رَغِبًا بِمَقَابِلِهِ رَغِبًا آیا ہے (۲۱) رَغِبٌ کے معنی خوف کے ہیں۔

## ر غ د

عِيشَةً رَّغْدًا وَ رَغْدًا - خوشگوار کشادہ اور فراخ روزی۔ بافراغت روزی۔ رَغْدًا عِيشَتُهُمْ - انکی زندگی خوشگوار اور روزی کشادہ ہو گئی۔ اَرُغْدُوا مَوَاشِيَهُمْ - انہوں نے آزادی سے اپنے مویشی چرنے کے لئے چھوڑ دیے۔

اَرْغَدُوْا: وہ سرسبز و شاداب جگہ پہنچے \*۔ اَلْاَرْغَدُ مال، پانی، گھاس، روزی وغیرہ کا وافر، کثیر اور باافراط حصہ جو طبیعت میں تکدر نہ پیدا کرے اور وجہ پریشانی نہ ہو \*\*۔

سورۃ بقرہ میں جنتِ آدم کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں رزق کی کیفیت رَغَدٌ اَحْيَتْ شَيْثَمًا (۲/۲۵) تھی۔ یعنی جہاں سے جی چاہے نہایت فراغت سے سامانِ زیست مل جائے۔ اسی کے متعلق سورۃ طہ میں ہے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان۔ لباس اور مکان (یعنی انسان کی بنیادی ضروریات زندگی) بغیر جگرہاش مشقت کے مل جاتے تھے (۲۰/۱۱۸)۔ وہ ان ضروریات سے محروم نہیں رہتا تھا۔ سورۃ نحل میں ہے یا تَبَوُّوا رِزْقَهَا رَغَدًا اَمِنْ كُلِّ مَسْكَنٍ (۱۶/۱۱۶)۔ یہ اس دنیا میں جنتی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں ہر فرد کو سامانِ زیست نہایت فراوانی سے مل جاتا ہے۔ ہر جگہ اور بافراط۔ اس میں لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں نہیں لے سکتے۔ تمام سامان و ذرائع رزق، نوع انسان کی پرورش اور اسکی صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے کھلے رہتے ہیں اور یہ اس نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ کس کوئی فرد سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائے اور اسے ہر شے افراط اور فراوانی سے ملے۔ رَغَدًا اَحْيَتْ شَيْثَمًا۔ جہاں سے چاہے نہایت فراغت سے مل جائے۔

## ر غ م

اَلْاَرْغَمُ: (راء کی تینوں حرکتوں۔ زیر۔ زیر۔ پیش کے حاتھ)۔ ناپسندیدگی۔ کراہت۔ جبر۔ اصل میں اَلْاَرْغَمُ۔ اَلْاَرْغَمُ۔ خاک کو کہتے ہیں۔ اَرْغَمَ الشُّذْلُ۔ ذلت نے اسے خاک میں ملا دیا۔ اس سے اس کے معنی کسی سے ذبردستی اطاعت کرائے کے آتے ہیں۔ ویسے اَلْمَرْغَمُ ناک کو کہتے ہیں \*\*۔ اَلْمَرْغَمُ۔ وہ جگہ جہاں کوئی، کسی سے ناراض ہو کر یا بھاگ کر چلا جائے۔ اس کے بعد اس کے معنی قلعہ نیز راستہ اور وسعت اور فراخی کے بھی لئے جانے لگے \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) مٹی اور (۲) راستہ یا بھاگنے کی جگہ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو شخص نظامِ خداوندی کے لئے اپنی جگہ سے ہجرت کرے گا۔ یَجِدْ فِيْ رَاسِ رُضٍ مَّرْغَمًا (۱/۳۰)۔ اسے دنیا میں بہت سی پناہ گاہیں مل جائیں گی جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی \*\*\*۔ اگر



دشمنوں نے اس پر ایک راستہ بند کر دیا ہے تو اسے کئی راستے کشادہ مل جائیں گے۔

## ر ف ت

رُفَاتٌ - بھوسہ یا سوکھی چیز میں سے جھڑ جانے والا چورا۔  
بوسیدہ ٹکڑے اور ریزے۔ نیز رسی کے ٹکڑے۔ اِرْفَاتُ الْحَبْلِ - رسی ٹکڑے  
ٹکڑے ہو گئی۔ رَفْتَهُ - بِرَفْتَهُ - کسی چیز کو توڑنا، کوٹنا یا ہاتھ  
سے بھر بھرا دینا۔ جیسے مٹی کے ڈھیلے یا بوسیدہ ہڈی کو بھر بھرا  
دیا جاتا ہے \*۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِذَا كُنْتُمْ عِظًا مَّأْوَرُفَاتًا (۱۹)۔ کیا جب  
ہم مڈیاں ہو جائیں گے اور اسے بوسیدہ کہہ یونہی بھر بھرا جائیں یا چورا  
چورا ہو جائیں (تو اسکے بعد بھی اٹھائے جائیں گے)؟ - عصر حاضر کے مادہ پرستوں  
(Materialists) کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی صرف طبیعی عناصر  
کے سہارے قائم رہ سکتی ہے۔ اگر یہ سہارے ٹوٹ جائیں تو پھر زندگی کا امکان  
نہیں رہتا۔ ان کے اس خیال خام کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ جس خدا  
نے زندگی کو پہلی مرتبہ بلا طبیعی سہاروں کے پیدا کر دیا تھا وہ اس پر  
قادر ہے کہ اسے موجودہ طبیعی سہاروں کے بغیر (بلا سہارا یا کسی اور نوعیت  
کے سہاروں کے ساتھ) قائم رکھے۔ (۵۱)۔ اسی کو حیات بعد الممات  
کہا جاتا ہے۔

## ر ف ث

اَلشَّرَفُ - یہ ایک جامع لفظ ہے جو ان تمام باتوں کو محیط ہوتا ہے جو  
جنسی اختلاط کے سلسلہ میں سرزد ہوتی ہیں۔ یعنی ابتدائی گفتگو سے لیکر  
انتہائی منزل تک کی تمام تفصیل اس میں آجاتی ہیں \*\*۔ محیط میں ہے کہ  
لفت میں اس کے اصلی معنی ہیں وہ گفتگو جو جماع کی طرف داعی ہو۔ نیز  
مقدمات جماع - راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ فحش باتیں ہیں جن کا  
ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً جماع اور دواعی جماع کا ذکر۔ ابن فارس  
نے کہا ہے کہ اَلشَّرَفُ کے اصلی معنی جماع ہیں لیکن یہ ہر اس بات کے لئے  
آتا ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان شرمائے۔ نیز اَلشَّرَفُ فحش کلامی کو  
کہتے ہیں۔ چنانچہ حج کے ضمن میں ہے فَلَا رَفَثَ (۱۹)۔ اس سے مراد یہ

ہے کہ حج کے اجتماع میں کدوئی فحش خیال یا ایسی بات یا حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس میں جنسی میلان پایا جاتا ہو۔ روزوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ التَّمِيمَةِ التَّرَفُّثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (۲/۱۸۷)۔ ”تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رُفٹ حلال کیا گیا ہے۔“ یہاں قرآن کریم نے ”إِلَىٰ نِسَائِكُمْ“ کا ٹکڑا بڑھا کر واضح کر دیا ہے کہ اس سے کناہہ جماع ہے۔

## ر ف د

الرَّفْدُ - عطا - صلہ - ایسی چیز جس سے کسی کو سہارا دیا جائے۔ مدد، حصہ و نصیب۔ رَفْدَةٌ - بَرَفْدَةٌ - رَفْدٌ - اسنے اسکی مدد کی۔ اسے دیا۔ اَلرَّفَادُ - مدد دینا - عطا کرنا۔ اصل میں اَلرَّفَادُ زین یا کعباؤہ کے نیچے کپڑا وغیرہ (رَفَادَةٌ) رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ جانور کی پیٹھ زخمی نہ ہو جائے۔ اَلرَّفَادَةُ - کپڑے کا ٹکڑا یا پھاہا جس سے زخم کا مداوا کیا جائے۔ نیز وہ عطیہ اور چندہ جو (زمانہ جاہلیت میں) قریش اکھٹا کر کے اس سے محتاج حاجیوں کے لئے کھائے پینے کا سامان خرید کر لے تھے۔ اَلرَّفَادُ - کسب کرنا - کمانا \*۔

سورة ہود میں ہے بِئْسَ الرَّفْدُ اَلْمَرْفُودُ (۱۱/۹۹) کتنا برا عطیہ اور صلہ ہے۔ کتنی بری مدد ہے جس سے ان کا مداوا کیا گیا ہے اور جس کا انہیں سہارا دیا گیا ہے۔

## ر ف ع

رَفَعَ - يَرْفَعُ - بلند کرنا - راغب نے کہا ہے کہ رَفَعَ کبھی تو مادی چیز جو بڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی تعمیر کے وقت دیوار وغیرہ کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے۔ کبھی ناسوری اور شہرت یا ذکر بلند کرنے کے لئے اور کبھی مرتبہ بلند کرنے کے لئے آتا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، اونچا کرنا اور اٹھا لینا۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کو قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ نیز پھیلانے اور ظاہر کرنے کے۔

رَفَعَ - متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی مفہوم میں شدت یا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کام کرنا اسے تیزی اور شدت سے کرنا۔

مثلاً رَفَعَ الْبَتَّيْنُ رَفِي سَتِيرِهِ۔ اونٹ نے اپنی رفتار (بہت تیز) کر دی۔  
 رَفَعَ الْقَوْمُ۔ لوگ ملک کے بلند علاقوں پر چڑھ گئے۔ يَرْقُ رَافِعٌ۔  
 بلندی پر چمکنے والی بجلی۔ الرَّرِ فَاعَتَهُ (را کی تینوں حرکتوں کے ساتھ)  
 آواز کی سختی اور شدت۔ رَفَعَ۔ رَفَعَتَهُ۔ شریف اور عالی مرتبہ ہونا\*۔  
 قرآن کریم میں ہے رَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ (۲۳)۔ ہم نے  
 تمہارے سر پر طور کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ یعنی تم اس کے دامن میں تھے  
 اور پہاڑ تمہارے اوپر تھا۔ عمارت کی بلندی کے لئے تعمیر کعبہ کے ضمن میں  
 ہے اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْاَتَوَاعِيْدَ (۱۲۶)۔ ”جب ابراہیم (اس گھر کی)  
 بنیادیں اٹھاتا تھا“۔ رَفَعَ صَوْتًا۔ آواز بلندی کی۔ رَفَعَ صَوْتَهُ فَوْقَ  
 صَوْتِهِ کے لفظی معنی تو کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہیں لیکن اس  
 سے مراد کسی کی رائے پر اپنی رائے کو فائق کرنا بھی ہوتا ہے (۲۹)۔  
 درجات کی بلندی کے لئے حضرت ادریسؑ کے متعلق ہے وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا  
 عَلِيًّا (۱۹)۔ ”ہم نے اسے بلند درجات عطا کر دیے“۔ خود اللہ تعالیٰ نے  
 اپنے آپ کو رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ (۱۵) کہا ہے۔ اس میں اگر رَفِيعٌ کو  
 مَرْفُوعٌ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب ہوگا مَرْفُوعٌ عَنِ الدَّرَجَاتِ۔  
 یعنی وہ بتدریج اپنے مقام بلند تک نہیں پہنچا بلکہ وہ ہے ہی اسی مقام پر  
 مستوی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تدریج اور ارتقاء کی منازل سے بلند اور بالاتر ہے۔  
 اس سے اقتدار اعلیٰ اور بالا دستی بھی مراد ہے۔ نیز رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ کے  
 معنی عَالِي الدَّرَجَاتِ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی بلند مرتبوں والا۔ اور اگر ہم  
 رَفِيعٌ کو بمعنی فاعل (یعنی رَافِعٌ) لیں تو اس کے معنی ہونگے ”درجات  
 کا بلند کرنے والا“۔ سورۃ واقعہ میں جہاں خَافِضَةٌ کے مقابلہ میں رَافِعَةٌ  
 آیا ہے (۵۶) وہاں بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی بلند مدارج و مقام پر لے جانے  
 والی۔ یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا  
 گیا ہے کہ بَلَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۱۵۸) تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ  
 اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیے اور اس طرح اپنا مقرب بنا لیا۔ ورنہ اگر  
 رَفَعَ کے معنی جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَيْهِ (خدا کی  
 طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑیگا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے۔ اس لئے  
 کہ جب بھی کسی جسمانی شے کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ فلاں کی طرف  
 گئی ہے تو جس کی طرف وہ چیز جائیگی اس کا کوئی مقام متعین کرنا ضروری  
 ہوگا۔ خدا کو کسی ایک مقام میں محدود سمجھنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔

اس لئے بَلَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ کے معنی یہی ہیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کر کے اسے اپنا مقرب بنا لیا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”شعلہ“ مستور“ میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ جلیلہ میں ملیگی)۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴) ہم نے تیری عظمت کو تیرے لئے بہت بلند کر دیا۔ (رَفَعَ اور صَعِدَ کے لئے دیکھئے ص۔ ع۔ د۔ ۳۵)

## ر ف ف

رَفَّ کے بہت سے معنی ہیں لیکن قرآن کریم میں (۵۵) صرف رَفَّ کا لفظ آیا ہے (جو ثلاثی نہیں رباعی ہے) اس لئے ہم رَفَّ کی بحث کو ضروری نہیں سمجھتے۔ رَفَّ الطَّائِرُ وَرَفَّ الرَّفَّاءُ۔ پرندے فضا میں ہر کھولے اور انہیں ہلایا۔ السَّوَّافُ۔ منتشر ہتے۔ الرَّفَّاءُ۔ فرش، بچھونے، گدے تکیے، نیز سبز رنگ کے گدیوں جو سونے کے لئے دری وغیرہ پر بچھائے جاتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد (خیمہ کے پردے وغیرہ کا) وہ زائد حصہ (جھالر) ہے جو لٹکا رہے لیکن عام طور پر اس کے معنی فرش یا بچھونے ہی کے ہیں\*۔ ابن فارس نے رَفَّ کے معنی باغیچے، بچھونے اور سبز کپڑے کے لکھے ہیں۔

## ر ف ق

الرَّحِمَةُ (جمع مَرَاتِقُ) کٹہنی۔ نیز نرمی و سہولت۔ رَفَقَ الشَّاقَّةَ۔ اونٹنی کے بازو (کٹہنی) کو باندھ دیا تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ وہ رسی جس سے اس کے بازو کو (پچھلی ٹانگ کے ساتھ) باندھا جاتا ہے رَفَاقُ کہلاتی ہے۔ اسی سے الرَّفْقَةُ کے معنی ہم سفر جماعت کے ہیں (کیونکہ چلتے وقت ان کی کہنیاں ایک ساتھ ہلتی ہیں) لیکن جب وہ جماعت ایک دوسرے سے الگ ہو جائے تو پھر ان کے لئے رَفْقَةُ کا لفظ نہیں بولا جاتا، البتہ ان میں سے ہر ایک ساتھی کو رَفِیقُ کہا جاسکتا ہے۔ الرَّفَاقَةُ۔ جماعت۔ لَارْتَفَقَ۔ اس نے کٹہنی پر ٹیک لگائی۔ الرَّفْقُ تَفَقُّ۔ جس چیز پر ٹیک لگائی جائے۔ تکیہ، سہارا\*\*\*۔ چونکہ اس طرح ٹیک لگانے سے راحت ملتی ہے اس لئے لَارْتَفَقَ یہ کے معنی ہیں اس سے فائدہ اٹھایا۔ رَفَقَ یہ یا رَفَقَ عَلَيْهِ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تشدد کے بغیر ایک دوسرے کے قریب اور ہمنوا ہونے اور باہم

مواقت کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے حَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (۹۶)۔ ”یہ اچھے ساتھی ہیں“۔ ایسے رفقاء سفر جن کی رفاقت سے انسان کی خامیاں پوری ہو کر اس کی ذات کا اور معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ اور یہ سب کچھ بطیب خاطر ہو۔ کٹھنی کے لئے یہ لفظ (۹۶) میں آیا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے يَهْتَبِيْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِ كُمْ مِّرْفَقًا (۱۸)۔ وہ تمہارے پیش نظر مقصد میں آسانیاں پیدا کر دیگا۔ اسی سورۃ میں جہنم کو سَاءَتٌ مَّرْفَقًا (۱۸) اور جنت کو حَسَنَتٌ مَّرْفَقًا (۱۸) کہا گیا ہے۔ یعنی ٹیک لگانے کی جگہ۔ جس کے آسرے سے اوپر اٹھا جائے۔ جہنم کی زندگی ایسی ہے جس کے سہارے انسان، زندگی کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ جنت کی زندگی ایسی ہے جو انسان کے اوپر اٹھنے اور بلندیوں کی طرف جانے کا بہترین سہارا بنتی ہے۔ ایسا سہارا جس سے کبھی توازن نہیں بگڑتا (حَسَنَتٌ مَّرْفَقًا)۔ انسان اُسی سہارے سے اوپر اٹھ سکتا ہے جو اُس کے توازن کو قائم رکھے۔ توازن بگڑ جانے سے انسان لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ (سَاءَتٌ مَّرْفَقًا)۔ سہارے تو جہنمی معاشرہ میں بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے ناہموار ہوتے ہیں اس لئے انسان ان کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ان سے اس کی ذات کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جنتی معاشرے کے سہارے ہیں جن سے افراد کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اوپر اٹھنے اور آگے بڑھنے چاہے جاتے ہیں۔

## رقب

الرَّقَبَةُ۔ گردن کو کہتے ہیں۔ رَقَبَةٌ۔ اس کی گردن میں رسی ڈالی\*۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی گردن میں رسی ڈال دی جائے تو وہ تابع و منقاد ہو جاتا ہے، چنانچہ عرف عام میں الرَّقَبَةُ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی جمع الرِّقَابُ ہے۔ آیت (۲۴۰) میں الرِّقَابُ کے معنی غلام ہی ہیں۔ واحد کے لئے رَقَبَةٌ\* (۲۴۰) وغیرہ میں بمعنی غلام آیا ہے\*۔ رَقَبٌ۔ يَرْقُبُ۔ کے معنی انتظار کرنا، اور حفاظت و نگہداشت کرنا، دونوں آتے ہیں۔ جیسے وَلَمْ يَرْقُبْ قَوْلِيْ (۲۴۰) میں اس کے معنی جہاں انتظار کرنے کے لئے جاسکتے ہیں وہاں نگہداشت کرنا، پاس اور لحاظ رکھنا بھی ہو سکتے ہیں۔ اور (۲۸) میں يَتَرَقَّبُ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن باب کی خاصیت کے لحاظ سے اس میں بار بار کوتاہی اور تجسس سے

کسی چیز کا انتظار کرنا اور نگہداشت کرنا مراد ہوگا۔ تاج میں اس کے معنی کسی چیز کی توقع کرنا اور اس کا انتظار کرنا لکھے ہیں۔ راغب نے اس کے معنی انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں بار بار اس کا خیال آتا تھا اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔ الرقیب کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت اور نگہداشت کرنے والا اور کسی چیز کا انتظار کرنے والا۔ نگران اور حفاظت کرنے والا۔ ان معنوں میں وَكَانَ اللَّهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا (۳۳/۱ و ۳۴/۱) آیا ہے۔ (۵۸/۱) میں رقیب بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے کھڑے رہنے کے ہیں۔ گردن کو بھی الرقبۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایستادہ رہتی ہے۔

ہات کا لحاظ رکھنے اور پاسداری کرنے کے لئے یہ لفظ (۳۴/۱) میں آیا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، (۲۴/۱) میں بھی اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔

الرَّقِيبَ الشَّيْءُ۔ کسی چیز کا انتظار کیا۔ الرَّقِيبَ الشَّيْءَ۔ کسی جگہ کے اوپر چڑھنا۔ بلند ہونا۔ مَرَقِبَةً۔ چڑھنے کی جگہ۔ الرَّقِيبَةَ۔ تحفظ اور ڈرنے گھبرائے، دونوں معنوں میں آتا ہے۔ سورۃ دخان میں فَارَقِيبَ آیا ہے (۲۴/۱ و ۲۵/۱)۔ اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ سورۃ یونس میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے قُلْ فَإِنَّتَظِرُونِ الْآثِيَّ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِينَ (۱۰۴/۱)۔ ”اں سے کہو کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔“

## رق د

الرَّقْدُ۔ الرَّقَادُ۔ الرَّقُودُ۔ سونا (نوم)\*۔ قرآن کریم میں یہ مادہ یَقَظُ (بیداری) کے مقابلہ میں آیا ہے۔ وَتَحْسَبُهُمْ آيَاتًا وَأَهُمُ رُقُودٌ (۱۸/۱)۔ ”تو خیال کرتا ہے کہ وہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں،۔ مَرَقْدًا۔ خوابگاہ (سوئے کی جگہ)۔ سورۃ یس میں ہے مَن بَعَثْنَا مِن مَّرَقْدِنَا (۳۶/۱)۔ ”ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا،۔“

راغب نے کہا ہے کہ الرَّقَادُ تھوڑی سی خوشگوار نیند کو کہتے ہیں\*\*۔ ان معانی کے اعتبار سے سورۃ کہف کی آیت (۱۸/۱) کا مفہوم واضح ہو

جاتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ دیر تک نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی سی نیند کسر لیتے تھے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ باہر سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

## ر ق ق

الترقُّ - الترقُّ - باریک جھلی یا کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔ الترقُّ - سفید صحیفہ۔ سفید ورق جس پر لکھا ہوا ہو\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پتلا پن اور نرمی ہیں۔

الترقُّ - الترقیُّ - پتلی اور باریک چیز۔ الترقُّ - طبیعت کی نرمی۔ الترقُّ - غلامی\*۔

قرآن کریم میں ہے و کتاب مستطور فی رَقٍ مَنشور (۵۲/۳)۔ ”لکھی ہوئی کتاب‘ پھیلی ہوئی باریک جھلی پر“۔

## ر ق م

رَقْمٌ - بِرَقْمٍ - رَقْمًا - لکھنا۔ رَقْمٌ الی کتاب: کتاب کو اس طرح لکھا کہ حروف، نقاط، اعراب وغیرہ کے لحاظ سے وہ واضح اور مبین ہوئی\*\*۔ قرآن کریم میں ہے کتاب مَرَقُومٌ (۸۳/۴)۔ واضح عبارت میں لکھی ہوئی کتاب یا نشان زدہ کتاب، کیونکہ رَقْمٌ الثبوت کے معنی ہوتے ہیں کپڑے پر دھاریاں بنانا اور قیمت کے تعین کے لئے نشان لگانا۔ دَابَّةٌ مَرَقُومَةٌ۔ وہ جانور جس کے پاؤں پر داغنے کے نشانات اور دھاریاں موجود ہوں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحریر اور لکیریں کھینچنے کے ہیں۔ وہ خلیل کے حوالے سے لکھتا ہے کہ الترقُّم کے معنی ہیں عبارت کو علامات کے ذریعے واضح کرنا۔ اور کتاب مَرَقُومٌ کسی کتاب کو اس وقت کہیں گے جب اس کے حروف پر نقطوں کے ذریعے علامات لگا دی جائیں۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْکِتَابِ وَالْتَّقِیْمُ (۱۸/۱) آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کہئے جاتے ہیں کہ ان غار والوں کے حالات ایک دھات کی تختی پر لکھ کر ان کے غار کے باہر لگا دیئے گئے تھے اسلئے انہیں اصْحَابُ التَّقِیْمِ کہنے لگ گئے۔ چنانچہ صاحب کتاب الاشتاق نے بھی کہا ہے کہ التَّقِیْمُ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی مَفْعُولٌ یعنی

مَرْقُومٌ" آیا ہے۔ یعنی لکھی ہوئی۔ لیکن حال کی تحقیقات کا رخ اس طرف گیا ہے کہ یہ لفظ وہی ہے جسے تورات میں رَاقِیْمٌ کہا گیا ہے۔ یہ ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیشرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرہ کہنے لگے۔ یہ جزیرہ نعلے سینا اور خلیج عقبہ کے شمال کی طرف سطح مرتفع پر واقع تھا۔ جب دوسری صدی عیسوی میں رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کیا ہے تو اس شہر نے رومی نوآبادی کی حیثیت سے بڑی شہرت اختیار کر لی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقہ کے اثری انکشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں بڑے بڑے وسیع غار ملے، بن کے اندر اور باہر عمارات کے نشان ملتے ہیں۔ خیال غالب یہی ہے کہ أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸/۹) انہی غاروں میں سے ایک غار میں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے جہاں بعد میں انکی یادگار کے طور پر معبد بنایا گیا تھا۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الکھف والرقیم)۔

## رق و

الرَّقْوُ - ریت کا چھوٹا سا ٹیلہ۔ الرَّقْوَةُ - حلق کے نیچے سینے کا بالائی حصہ جہاں سانس پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ ہنسل (کی ہڈی)۔ اسکی جمع ترَاقِیہ اور الرِّقَاقِیُّ آتی ہے \*۔ اِذَا بَلَغَتِ الرَّاقِیَّ (۳۹/۴۵) قرآن کریم میں آیا ہے۔ یعنی "جب جان سینے کے اوپر کے حصے تک آ پہنچے گی"۔ آخری وقت آ پہنچے گا۔ اصل مفہوم اس میں اوپر چڑھنے کا ہے۔ چنانچہ رَقَاتُ الطَّائِرِ کے معنی ہیں پرندہ اپنی اڑان میں بلند ہو گیا۔ (اس کے لئے عنوان ر۔ ق۔ ی بھی دیکھئے)۔

## رقی

رَقِیَ - بَرَقَی - رَقِیًّا - رَقِیًّا اوپر چڑھنا۔ نِزَارُ تَقْلٰی وَ تَرَقْلٰی - اوپر چڑھنا \*۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ تَرَقْلٰی فِی السَّمَاءِ (۱۳/۱۳) "ہا تو آسمان پر چڑھ جائے"۔ الرَّقْوَةُ - ہنسل، نیز سینے کے اوپر حلق کے آگے کا حصہ جہاں سانس چڑھتا ہے۔ جمع ترَاقِیہ اور الرِّقَاقِیُّ \*\*۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا بَلَغَتِ الرَّاقِیَّ (۳۹/۴۵)۔ نیز دیکھئے عنوان (ر۔ ق۔ و)۔ الرَّقِیَّةُ - جھاڑ بھونک۔ رَقَاهُ رَقِیًّا - وَرَقِیًّا - اسنے اس پر جھاڑ بھونک کی۔ رَاقِی - جھاڑ بھونک کرنے والا \*۔ قرآن کریم میں ہے مَن رَاقٍ (۳۹/۴۵)۔

\* تاج و محیط۔ \*\* بعض اہل لغت نے لفظ الترَاقِی کی ت کو اصلی مانا ہے لیکن ہمارا راجح خیال یہ ہے کہ اس میں ت زائد ہے اور اس کا مادہ ر۔ ق۔ و ہے۔



کون ہے جو جھاڑ پھونک سے اسکی جان بچا لے؟ ابن فارس نے کہا ہے کہ رَقِيٌّ کے بنیادی معنی میں (۱) چڑھنا اور (۲) تعویذ منتر وغیرہ شامل ہیں۔ اَلْمَرُّ قَاتٌ وَالْمِرُّ قَاتٌ - سیڑھی کسو کہتے ہیں \* - اَلْعَرَقَاءُ \* - پہاڑوں پر چڑھنے والا \*۔

## ر ک ب

رَكِبَهُ يَرْكَبُهُ - رَكُوبًا - کسی چیز پر چڑھا، بلند ہوا، سوار ہوا \* - خواہ جانور پر ہو یا کشتی وغیرہ پر۔ اِذَا رَكِبْنَا فِي الْقَيْفِيَّةِ (۱۸/۱)۔ ”جب وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے“۔ رَاكِبٌ - سوار۔ اسکی جمع ہے اَلرَّكَبُ (۸/۲) اور رَكَبَانٌ (۲۳۹/۲) بمقابلہ رَجَالًا - یعنی پیدل۔ اَلرَّكَابُ - وہ اونٹ جن پر سواری کی جائے (۵۶/۶) (اسکا واحد رَاكِبٌ ہے جو اس مادہ سے نہیں ہے)۔ اَلْمَرُّ كَبٌ (جمع اَلْمَرَّاكِبُ) - جس پر سواری کی جائے۔ رَكُوبٌ - سواری کا جانور (۳۷/۲)۔

رَكَبَ - ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھنا۔ جمانا \*۔ چڑھانا \*۔ ترکیب دینا۔ (۸۲/۸)۔ مُمْتَرَاكِبًا - ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا (۱۷/۱)۔

انسان کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہے اور اب اسکے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا اور اوپر کواٹھتا جائیگا۔ اسکے لئے سورۃ انشقاق میں ہے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ ”تم ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے ہوئے درجہ بدرجہ اوپر کواٹھتے جاؤ گے“۔ انسانی زندگی کا موجودہ مقام اسکا منتہی نہیں۔ اسے ابھی بہت آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اس لئے موت سے سلسلہ حیات ختم نہیں ہو جاتا۔ خاک کے ذرے حیاتیاتی طور پر (Biologically) ارتقائی منازل طے کرتے پیکر انسانی تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس پیکر میں انسانی ذات طبعی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ ارتقاء (Evolution) کی اگلی منزل شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کے بجائے انسانی ذات (Human Personality) کا ارتقاء۔ یہ ارتقاء اسی زندگی میں شروع ہو کر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کے راستے میں طبعی موت (Physical Death) کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ خود انسانیت (Humanity) تہ بہ تہ اوپر کواٹھتی چلی آرہی ہے۔ تاریخ انہی تہوں کا ریکارڈ ہے۔

## ر ک د

الْشَّرْكُودُ - ساکن ہونا۔ اَلْتَرَاكِيدُ - ٹھہری ہوئی ساکن چیز جو چلتی نہ ہو\*۔ رَكَدَتِ السَّيْفُيُنَّةُ - کشتی لنگر انداز ہو گئی\*\*۔

اَلْقُرُوَاكِيدُ - چولہے کے تین پتھر جو خانہ بدوش عرب استعمال کرتے ہیں (کیونکہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں)\*\*۔

قرآن کریم میں کشتیوں کے متعلق ہے رَوَاكِيدُ عَلٰی ظَمْهَرٍ (۴۲)۔  
”سمندر کی پشت پر کھڑی کی کھڑی رہ جائیں“۔ چل نہ سکیں۔ یعنی اگر خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوائیں ساکن ہو جائیں تو بادبانوں سے چلنے والی کشتیاں ساکن رہ جائیں۔

## ر ک ز

اَلْزَكَزُ - دھیمی سی آواز، آہٹ، یا آواز جو زور دار نہ ہو۔ یا انسان کی وہ آواز جو دور سے سنائی دے، جیسے شکاری کی اپنے کتوں کے لئے آواز\*۔  
سورۃ صریم میں ہے اَوْ تَسْمَعُ لَهْمُ رِ كَزَا (۱۸)۔ ”یا ان کی دھیمی سی آواز (بھسک) بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟“۔ ”خفی“ کے اعتبار سے رَكَزَتْ كَذَا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا۔ اور اَلْزَكَزُ مال مدفون کو کہتے ہیں۔ اور معدنیات کو بھی جنہیں خدا نے زمین میں مدفون رکھا ہے\*\*\*۔ چونکہ جس چیز کو دبایا اور گاڑ دیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بالکل قائم اور ثابت رہتی ہے اسلئے اَرْتَكَزَ کے معنی ہیں وہ اپنی جگہ قائم اور ثابت ہو گیا\*\*۔ اسی سے رَكَزَ الشَّرْمُجَ کے معنی ہیں اسنے نیزہ کھڑا کر کے زمین میں گاڑ دیا۔ اور اَلْمَرْكَزُ - نیزہ گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو دوسری چیز میں اس طرح اتار دینا (گاڑ دینا) کہ وہ اس میں مستحکم ہو جائے۔ (۲) آواز۔ آہٹ۔

## ر ک س

اَلتَّرَكْسُ - کسی چیز کو اس طرح پلٹانا یا موڑنا کہ اسکا اگلا سرا مڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ جا ملے۔ کسی چیز کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا\*\*\*\*۔ رِ كَاسٌ - اس رستی کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا

اونٹ کی نکیل میں باندھ دیا جاتا ہے اور دوسرا سر اس کے پاؤں سے اور اسے اتنا تنگ رکھا جاتا ہے کہ اونٹ کا سر بری طرح جھکا رہے اور وہ اس طرح سخت تکلیف میں رہے۔ یہ کچھ اسے سدھانے کیلئے کرتے ہیں۔ اُرْ تَكْسُ - اس کا سر جھک گیا۔ وہ الٹ گیا \*۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اُرْ كَسَتْهُمْ بِحَسَا كَسَبُوْا (۸۸)۔ ”اللہ نے انکے اعمال کی وجہ سے انکا سر جھکا دیا“۔ انہیں ذلیل و خوار کر دیا۔ انہیں سخت مصیبت میں ڈال دیا۔ یہاں انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا۔ یہی معنی (۹۱) میں بھی ہیں۔

## ر ک ض

اَلْقَرْ كَضُ - گھوڑے کو تیز دوڑانے کیلئے ابڑھ لگانا۔ پرندے کا اڑنے کیلئے پروں کو متحرک کرنا۔ اَلْقَرْ كَضُ - تیز دوڑنا۔ قرآن کریم میں ہے مِثْنًا يَرُ كَضُوْنَ - لَا تَرُ كَضُوْا (۱۳-۱۴)۔ اس کے معنی تیزی سے بھاگنے کے ہیں۔ اَلْمِرْ كَضُ - وہ چیز جس سے آگ کو حرکت دیکر بھڑکا یا جائے \*۔ سورة ص میں حضرت ایوبؑ کے قصہ میں ہے اُرْ كَضُ يَرُ جَالِك (۳۸)۔ اس کے معنی چلنے کے ہیں۔ اپنے پاؤں کو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی ٹانگ کو (پانی میں ڈال کر اسے) حرکت دے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ر ک ض کے بنیادی معنی آگے کی طرف متحرک ہونا یا متحرک کرنا ہیں۔

سورة انبیاء کی آیت (لَا تَرُ كَضُوْا - ۲۱) ایک عظیم حقیقت کی ترجمان ہے۔ مسابق آیت میں ہے کہ جو قومیں اپنے معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھنے کی بجائے اپنی تدابیر کے تابع رکھتی ہیں وہ معاشرے میں فساد پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سے دولت کی تقسیم سخت ناہموار ہو جاتی ہے جس کا آخر الامر نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ دولت کے نشے میں بدست اس کا احساس نہیں کرتیں کہ وہ کس تباہی کی طرف کشاں کشاں چلی جا رہی ہیں۔ تا آنکہ جب وہ تباہی محسوس طور پر ان لوگوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو وہ اس سے بچنے کے لئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت خدا کا قانون مکافات انہیں آواز دیتا ہے کہ لَا تَرُ كَضُوْا - مت بھاگنے کی کوشش کرو۔ تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وَارْ جِعُوْا اِلٰی مَا اُنْتُمْ فِیْہِ وَتَسْلٰکُمْ - چلو واپس اپنے عظیم الشان محلوں میں اور آسائش کے مقامات میں جنہیں تم نے غریبوں کے

خون کی رنگینی سے مزین بنا رکھا تھا۔ وہیں واپس چلو۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۲۱/۱) تاکہ تم سے دعاں جا کر ہو چھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے آئی تھی اور ان عیش سامانیوں پر تمہارا کیا حق تھا ؟ ۔

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے انجام کا نقشہ کس قدر بین انداز میں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے ؟

## ر ک ع

رُكِعَ کے معنی ہوتے ہیں منہ کے بل جھکنا یا گر جانا ۔ نحوہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں ۔ البتہ سر ضرور جھک جائے ۔ راغب نے کہا ہے کہ رُكُوعُ کے معنی جھکنے کے ہیں ۔ یہ لفظ کبھی بالخصوص جسمانی شکل میں جھکنے کے لئے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے لئے بولا جاتا ہے ، خواہ وہ عبادتاً ہو یا بغیر عبادت ۔ یعنی کسی کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کے ۔ ویسے بھی بوڑھے شخص کے لئے جو کمزور و نحیف ہو جائے رُكِعَ الشَّيْخُ کہتے ہیں ، کیونکہ ایسی کمزوری میں انسان ذرا جھک جاتا ہے ۔ یا جس شخص کی حالت سقیم و خستہ ہو جائے اس کے لئے بھی رُكِعَ قُلَانٌ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی جھکنے کے لکھے ہیں صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں عرب ، حنیف شخص کو رَاكِعٌ کہا کرتے تھے جبکہ وہ بتوں کی پرستش نہ کرتا ہو اور کہا کرتے تھے رَاكِعٌ اِلٰی اللّٰہِ ۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کے معنی تھے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مطمئن ہو گیا ۔ رَاكِعٌ کی جمع رُكْعٌ آتی ہے ۔

رُكُوعٌ وَ سُجُودٌ (دیکھئے عنوان م - ج - د) در حقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے ۔ مجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے ۔ یعنی کامل اطاعت ۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوا الزَّكٰوۃَ وَ اَرْکَعُوا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ (۲/۴۳) ۔ یعنی جو جماعت مومنین ، قوانین خداوندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے ، تم بھی ان میں شامل ہو کر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو ۔

چونکہ انسان کے جسم کی حرکات اس کے دل کے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں ۔ (مثال کے طور پر جب ہم ”نہیں“ کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا سر خود بخود

دائیں بائیں هل جاتا ہے اور جب ”ہاں“ کہتے ہیں تو اس کی حرکت خود بخود اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ اس لئے قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی محسوس ترجمانی اجتماعاتِ صلوة میں رُکُوع اور سجدۃ کی شکل میں ہوتی ہے۔ تَرَاهُمْ رُکُعًا سَجِدًا... سَيَسْمَاهُمْ فِي وَجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السَّجْدَةِ (۳۹)۔ ”تو انہیں رکوع و سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے... اطاعت کے اثر سے ان کی قلبی کیفیات ان کے چہروں پر (ظاہر) ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں رکوع اور سجدہ تو کرے لیکن اپنی زندگی غیر خدائی قوانین کے تابع بسر کرے، تو اس کے یہ رکوع و سجدہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں ہونگے۔ یعنی وہ چند منٹ کے لئے (اور وہ بھی بظاہر) خدا کے سامنے جھکتا ہے لیکن اپنی پوری زندگی میں عملاً غیر اللہ کے سامنے جھکتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے یہ رکوع اور سجدہ خدا کی اطاعت کی علامات نہیں ہیں۔ سچا رکوع اور سجدہ یہ ہے کہ انسان کا دل قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائے، اور دل کے جھکنے کے ساتھ اس کا سر بھی تعظیماً جھک جائے۔ اجتماعاتِ صلوة کی محسوس حرکات سے بھی مقصود ہے۔

## رک م

الرَّكْعَةُ - کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا اور جمع کرنا، حتکہ وہ تہ بہ تہ ڈھیر کی شکل اختیار کر جائے\*۔ فَيَرُكْعُهُ (۱۰۸)۔ ”وہ ان سب کو اوپر تلے ڈھیر بنا دیگا“۔ رُكْعًا۔ اوپر تلے رکھی ہوئی چیزوں کا ڈھیر\*۔ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكْعًا (۲۳)۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر دیز بادل کی شکل دیدیتا ہے۔ سورۃ طور میں ہے سَحَابٌ مَّرْكُومٌ (۵۲)۔ تہ بہ تہ بادل۔ نَاقَةٌ مَّرْكُومَةٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت قربہ ہو۔ جس پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی ہوں\*۔

## رک ن

رَكْنٌ - بَرَكْنٌ (الْيَمِينِ)۔ کسی کی طرف مائل ہونا اور سکون پانا\*۔ سورۃ ہود میں ہے وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمْتُمْ (۱۱۳)۔ جو لوگ سرکش ہیں ان کی طرف مت جھکو۔ ان کی طرف مسائل مت ہو۔

سورة بنی اسرائیل میں ہے وَ لَوْلَا اَنْ تَبْتَئِنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكُنْ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (۱۳)۔ ”اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو تھوڑا سا ان کی طرف جھک جاتا۔“ رسول کا مقام یہ ہوتا ہے کہ جہاں عام انسان (اپنے مشن کی خاطر ہی سہی) کچھ نہ کچھ دوسروں کی خاطر جھک جاتے ہیں، رسول ایسا کبھی نہیں کرتا۔ (دیکھئے ۶۸ و ۱۵)

الرُّكْنُ۔ وہ چیز جس سے کسی کو تقویت پہنچتی ہو۔ سہارا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت کے ہیں۔ رُكْنٌ کسی چیز کے نوی ترین پہلو کو کہتے ہیں۔ سورة ہود میں ہے اَوْرٰی اِلٰی رُكْنٍ شَدْرِیْنِ (۱۱) میں ایک محکم سہارے کی پناہ لیے لوں۔ ابن فارس نے رُكْنٌ شَدْرِیْنِ کے معنی عزت و غلبہ بتائے ہیں جس کی وجہ سے کسی کو تاب مخالفت نہ ہو سکے۔ اَرْكَانُ الشَّيْءِ۔ چیز کے اطراف و جوانب۔ وہ سہارے جن پر وہ چیز قائم ہو\*۔

## ر م ح

الرَّمْحُ۔ (جمع رِمَاح)۔ نیزہ\*۔ قرآن کریم میں ہے تَنَائُسُهُ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ (۹۳)۔ ”جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں“۔

(مجازاً عربوں میں فقر و فاقہ کو بھی الرَّمْحُ کہتے ہیں\*\*۔ تاج میں اس معنی کے لئے بجائے رُمَحْ کے رِمَاح لکھا ہے)۔

## ر م د

الرَّمَادُ۔ راکھ کو کہتے ہیں۔ خاکستر\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاَرْمَدُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا رنگ غبار آلود اور گدلا ہو، یعنی خاکستری رنگ۔ رَمَادَةٌ۔ ہلاکت۔ تباہی۔ اَرْمَدُ الْقَوْمُ۔ لوگ خشک سالی میں مبتلا ہوئے اور ان کے مویشی تباہ ہو گئے\*۔

قرآن کریم میں غلط روش زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو ایسی رَمَادٌ سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر سخت تیز ہوا چلے (۱۷)۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھکڑ میں اس خاکستر کا نام و نشان تک باقی نہیں رہ سکتا۔ غلط نظام اور غلط عمل، زمانے کے تند و تیز تقاضوں اور شدید حوادث کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے، اگرچہ (راکھ کے ڈھیر کی طرح) وہ بہت بڑے اور زیادہ نظر آتے ہیں۔

## ر م ز

الْقَرْمِزُ کے معنی جنبش و حرکت کے ہیں\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حرکت و اضطراب بتائے ہیں۔ الْقَرْمِيزُ۔ کثیر الحرکت کو کہتے ہیں۔\*\* اسی سے اس کے معنی اشارے کے ہیں خواہ وہ ہونٹوں سے کیا جائے یا آنکھوں سے یا ابروؤں سے یا منہ، ہاتھ اور زبان سے۔ اور اس کے ساتھ آواز نہ ہو۔ اور اگر آواز ہو تو ہلکی سی، جیسے کانٹا پھوسی میں ہوتی ہے۔\*\*

سورة آل عمران میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے..... آلاءُ تَكْلِيمٍ النّاقِسِ ثَلَاثَةُ آيَاتٍ إِلَّا رَمْزًا (۳/۴۶)۔ ”تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات نہ کرے گا،،۔ شریعت یہود میں، روزے میں بات کرنا بھی منع تھا۔ یا ایسے روزے بھی رکھے جاتے تھے جن میں چپ رہنے کی نیت کی ہو (دیکھئے، ۱۹/۱)۔

## ر م ض

الرَّمَضُ۔ ریت وغیرہ کا سخت دھوپ سے تپ جانا۔ الرَّمَضُ۔ الرَّمَضَاءُ۔ سخت گرمی اور تپش\*\*۔ شَهْرُ رَمَضَانَ۔ (رمضان کا مہینہ) قدیم عربی میں اس مہینے کو نَتَاقِیْ کہتے تھے۔ جب مہینوں کے نام بدلے گئے (یہ بھی زمانہ قبل از اسلام کی بات ہے) تو چونکہ یہ مہینہ (اس تبدیلی نام کے وقت) سخت گرمی میں پڑتا تھا اسلئے اسکا نام رَمَضَانَ ہو گیا\*\*۔ اس مہینے میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔

قمری مہینوں کے لحاظ سے کوئی مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں نہیں آسکتا۔ اسلئے اب رمضان کا مہینہ سخت سردی میں بھی آجاتا ہے۔ لیکن ہاں ہمہ یہ کہلاتا رمضان ہی ہے۔ (مہینوں کی تبدیلی کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ا)۔

## ر م م

رَمَّ الْعَظْمُ: ہڈی گل سڑ گئی اور بوسیدہ ہو گئی۔ رَمَّ الشَّيْءُ رَمًّا وَارْتَمَتْهُ۔ اس نے اس چیز کو مکمل طور پر کھما لیا۔ الرَّمْمَةُ۔ بوسیدہ ہڈیاں۔ الرَّمْمَةُ۔ بوسیدہ رسی۔ الرَّمِيمُ۔ گذشتہ سال کے ہودوں میں سے جو کچھ بچ جائے۔ نیز ہر پرانی اور بوسیدہ چیز کو بھی کہتے ہیں۔ الرَّمَّ

خشک گھاس کا چوراہہ بھوسہ - پانی کے اوپر بہ جانے والا کچرا - "لَا رُمَامَ" - خاموش ہو جانا - سکوت - "الرَّمَمُ" - بوسیدہ چیز کو درست کر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہوتے ہیں - (۱) چیز کو درست کرنا - (۲) چیز کا بوسیدہ ہو جانا - (۳) خاموش رہنا - اور (۴) باتیں کرنا (اضداد میں سے ہے) -

قرآن کریم میں ہے "مَنْ يَحْتَمِلِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ" (۳۶/۸) - "ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے" - سورۃ ذاریات میں اُس تباہ کن آندھی کے متعلق ہے جو قوم عاد پر چلی تھی کہ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَنْتَ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلْتَهُ كَالرَّمِيمِ (۵۱/۲۱) - "وہ کسی شے کو نہیں چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی بجز اس کے کہ اسے چورا کر کے رکھ دیتی تھی" -

## ر م ن

الرَّمَّانُ - انار - (درخت ہوں یا پھل ، واحد رُمَّانَةٌ) - غالباً انار کی تاثیر کی وجہ سے (جو دل کو قرار دیتی ہے) رَمَنَ بِالرَّمَّانِ کے معنی ہیں وہ اس جگہ مقیم ہو گیا - قرآن کریم نے انکور - زینون - اور اناروں کے باغات کا ذکر کیا ہے - وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونِ وَالرَّمَّانِ (۱۶۰) -

## رمی

رَمَى الشَّيْءُ - رمی بیہ - کسی چیز کو پھینک دینا یا ڈال دینا - یعنی گرا دینا - رَمَى السَّهْمَ عَنْ الْقَوْسِ - کمان سے تیر پھینکا - الرَّمِيَّةُ - چھوٹا تیر - خَرَجَ بِرَمِيٍّ - وہ تیر سے شکار کرنے کے لئے نکلا - الرَّمِيَّةُ - وہ نشان (ہدف) جسکی طرف تیر پھینکے جاتے ہیں - \*\*\* -

سورۃ مرسلات میں ہے اِنْهَذَا رَمِيٌّ بِشَرِّ رِيٍّ (۸۴/۲۴) - "وہ چنگاریاں پھینکتی ہے" - سورۃ فیل میں ہے تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ (۱۰۵/۱) - "تو ان پر پتھر پھینکتا تھا" - سورۃ انفال میں ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى (۸/۱) - جنگ بدر میں جو تیر اندازی تیری طرف سے ہو رہی تھی وہ تیری طرف سے نہیں بلکہ درحقیقت اللہ کی طرف سے تھی - اس لئے کہ یہ تمام



لڑائیاں خدا کے حکم کے ماتحت اس کے نظام کو بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔ کمانڈر جب حکومت کے حکم سے فوج کشی کرتا ہے تو وہ جنگ اُس حکومت کی طرف سے سمجھی جاتی ہے۔ یا جب فوج کمانڈر کے حکم سے حملہ کرتی ہے تو وہ حملہ کمانڈر کی طرف سے متصور ہوتا ہے۔

اس آیت میں رَمَيْتَ کا کوئی مفعول بہ مذکور نہیں اور بہ بھی واقعہ ہے کہ رَمَيْتَ کے بعد مختلف مفعول بہ آنے سے ان کے مطابق ہر جگہ الگ معنی ہوتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں میدان جنگ کا ذکر ہے اور پہلے قَتَلْتُمْ تَقْتُلُوْهُمْ کہہ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں دشمنوں کے قتل کا تذکرہ ہے۔ اس لئے رَمَيْتَ سے تیر اندازی ہی مراد لیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی (لین نے مختلف اسناد سے لکھا ہے کہ) جب ننہا رَأْسَيْتُهُ یا مَرَامَاۃً کہا جائے تو اس کے معنی تیر اندازی یا سنگ باری کے ہوتے ہیں۔

رَمَاۃً بِقَبِيْضٍ۔ اس نے اسے ہرائی کے ساتھ متہم کیا\*۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْرُكُوْنَ اَلْمُحَصَّنَاتِ (۲۴)۔ ”جو لوگ ہاک دامن ہورتوں پر تہمت لگاتے ہیں“۔ کسی پا کدامن کے خلاف تہمت لگانا، ”تیر اندازی“ یا ”سنگ باری“ کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس کی سزا بھی سخت تجویز کی ہے (۲۴)۔

## روح

رَاحٌ\*۔ رَوْحٌ\*۔ رُوحٌ\*۔ رِيْحٌ\*۔ سب ایک ہی مادہ کے الفاظ ہیں۔ اور انہی سے رَاحَةٌ\*۔ رَوْحَةٌ\*۔ لَسْتِرَاحَةٌ\*۔ تَرْوِيْحَةٌ\*۔ رِيْحَانٌ\*۔ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ رَاحٌ کے بنیادی معنی ہیں ہوا کا چلنا، ہوا کا آنا، ہوا کا محسوس کرنا\*۔ چونکہ ہوا انبساطِ زندگی، حرکت اور قوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس مادہ سے بننے والی مختلف شکلوں میں یہ تمام مفہوم مضمر ہو گئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی وسعت اور فراخی کے ہیں۔

الرَّوْحُ\*۔ راحت۔ سرور۔ خوشی۔ رحمت۔ وسعت۔ مَكَانٌ\* رَوْحَانِيٌّ\*۔ عمدہ اور پاکیزہ مکان\*۔ الرِّيحُ\*۔ ہوا۔ الرِّيحَةُ\*۔ ہوا کا کچھ حصہ۔ رِبَاحٌ\*۔ اس کی جمع ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں ارسالِ رِبَاحِ بیشتر مقامات میں رحمت و شادمانی کے لئے استعمال ہوا ہے اور ارسال

رَبِّحْ عَذَابَ كُفْرٍ \* - صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ جب ہوا (الْزَّبْحُ) تند و تیز ہو تو اسے الْعَصِيفُ کہا جاتا ہے۔ جو ہوائیں ہادل لاتی ہیں وہ مُبَشِّرَاتٌ کہلاتی ہیں۔ جو بارش لاتی ہیں انہیں الْمُعْصِرَاتُ کہا جاتا ہے۔ میدانوں اور صحراؤں میں ہلاکت انگیز ہوا کو بھی عاصِفُ کہا جاتا ہے۔ لیکن سمندر میں طوفان لانے والی ہواؤں کو الْقَوَاصِفُ کہتے ہیں۔

الزَّبْحُ \* - نصرت - غلبہ و قوت - گردش - انقلاب - اور باری \*۔  
وَتَذْكُرُ رَبَّكَ \* (۸۶)۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔ تمہاری قوت چلی جائے گی۔ تَرَوْا نِعْمَةَ \* - دراصل یہ یٹھنے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں یعنی سستانے کو۔ پھر نماز تراویح کی ہر چار رکعت کو کہتے ہیں کیونکہ چار رکعتوں کے بعد تھوڑا سا راحت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اَلرَّوْحَةُ \* - تنگی کے بعد فراخی مل جانا - رَاحَةٌ \* - شام کے وقت موبشیوں کا گھروں کو واپس آنا۔ چنانچہ اَلرَّوْحُوعُ \* - شام یا زوالِ آفتاب کے بعد سے رات تک کا وقت \* - سورۃ سبا میں رَوَّاحٌ \* (شام کا سفر) بمقابلہ غَدُوٌّ \* (صبح کا سفر) آیا ہے۔ (۳۴)۔

صاحب محیط نے اَلرَّوْحُوعُ کے معنی فرحت و مسرت، راحت و رحمت کے ہلاوہ، یادِ نسیم، مدد - انصاف و عدل جس سے فریادی کو راحت و سکون نصیب ہو جائے، بھی لکھے ہیں۔ اور اَلرَّوْحُوعُ کے معنی (عام انسانی روح کے ہلاوہ) رحمت، خدا کی طرف سے وحی اور خود قرآن کریم \*۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے يَنْزِلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بِالرَّوْحِ مِّنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِّنْ عِبَادِہٖ (۱۶)۔ یہاں اَلرَّوْحُوعُ سے مراد وحی ہے۔ اور سورۃ شوریٰ میں ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحٰیۡنَا اِلَیْكَ رَوْحًا مِّنْ اَمْرِۡنَا (۲۴)۔ یہاں رَوْحًا سے مراد خود قرآن کریم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں کہا گیا ہے وَیَسْئَلُوۡنَکَ عَنِ الرَّوْحِ قُلِ الرَّوْحُ مِّنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۸)۔ ”تجہ سے اَلرَّوْحُوعُ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ اَلرَّوْحُوعُ میرے رب کے امر سے ہے“۔ تو وہاں روح سے مراد انسانی روح (Soul) نہیں بلکہ وحی ہے۔ اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی ہے جہاں اَوْحٰیۡنَا اِلَیْكَ کہا گیا ہے۔ (۱۶)۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وحی کی سہایت سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کا تعلق عالم امر سے ہے۔ دنیائے محسوسات سے نہیں۔ اس لئے تم اس کی سہایت کو نہیں سمجھ

سکتے۔ اس پر ایمان لانا ہوگا۔ البتہ اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہو۔ ”ماہیت“ کے معنی یہ ہیں کہ وحی کیسے ہوتی ہے۔ خدا اور نبی کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اسی بنا پر صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رُوحُ الْقُدُسِ (۲/۸۷)۔ جسکی تقویت حضرت عیسیٰؑ کو حاصل تھی، تورات اور انجیل کے احکام تھے جو انھیں بذریعہ وحی عطا کئے گئے تھے اور جو تفسوس انسانہ کو مقدم بنا دینے کا موجب تھے۔ بعض نے رُوحُ الْقُدُسِ سے مراد جبریل لی ہے اور یہی مفہوم سورۃ الشعراء میں الشُّرُوحُ الْأَمِينُ (۲۱/۱۳) کا لیا ہے \* جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَزَّلَ بِهِ الشُّرُوحُ الْأَمِينُ عَلٰی قَلْبِكَ (۲۱/۹۶)۔ اور اسکی تائید سورۃ بقرہ کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں جبریل کے متعلق ہے فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۲/۹۷) اس سے ظاہر ہے کہ الروح الامین جبریل ہی کا لقب ہے۔ سورۃ نحل میں ہے قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (۱۶/۲)۔ لہذا روح القدس بھی جبریل ہی کو کہا گیا ہے۔ ہم چونکہ وحی کی کنہ و ماہیت کو نہیں جان سکتے اسلئے جبریل کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں ہو سکتے۔ رُوح کے لفظ سے اس طرف اشارا ملتا ہے کہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جو نبیؐ کے قلب پر انکشاف حقائق کسرتی ہے۔ اور ملائکہ وہ کائناتی قوتیں ہیں جو قانون خداوندی کو مشہود بناتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَلَائِكَةُ اور رُوح کا الگ الگ بھی ذکر آیا ہے (۲/۹۷ ; ۲۱/۹۶ ; ۲۱/۹۷)۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی کڑیاں تو وہی ہیں جو عام حیوانات کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ لیکن اسکے بعد انسان کو دوسرے حیوانات سے یہ کہہ کر ممتاز کر دیا گیا ہے کہ وَتَفْخُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِيْهِ (۲۱/۹۷)۔ اس میں خدا نے اپنی ”روح“ پھونکی۔ اور اسکا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ وَجَعَلْ لَّكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۲۱/۹۷)۔ انسان کو سمع و بصر یعنی ذرائع علم اور قلب عطا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ”روح خداوندی“ سے مراد وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں اور جس سے انسانی خصوصیات وابستہ ہیں۔ یہ (انسانی خودی) ہر انسان کو یکساں طور پر ملی ہے۔ اسکے بعد دیکھنا یہ ہوگا کہ انسان اسے کس حد تک نشوونما دیتا ہے۔ اسکی کتنی

(Development) کرتا ہے۔ روحانیت سے یہی مراد ہے اور یہ نشوونما قرآنی معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ”توانائی“ یعنی ”روح“، کو ”روحنا“ (ہماری روح) کیوں کہا ہے؟ کیا یہ چیز ”ذاتِ خداوندی“ کا جزو ہے؟ اس سوال کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہہیں کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے ”مادی توانائی“، کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس ”توانائی“ کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے ”روحنا“ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہ راست ملی ہے۔ یہ ”انسانی ذات“ ہے۔ اسی کو ”الوہیاتی توانائی“، سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ”الوہیاتی“، ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں ”اللہ (خدا) کی طرف منسوب۔ لہذا ”الوہیاتی توانائی“ سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی ”غیر از خدا“ کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ ”انسانی توانائی“، کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ ”مادی توانائی“، سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ ”ذات“، کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ اسے ذاتِ خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ”توانائی“، ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نہ اس کا منتہی اس کی ذات سے جدا کر مل جانا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ توانائی، غیر نشوونما یافتہ شکل (Un- Developed Form) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشوونما

دینا، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اسکی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات اس کے طبعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

مادی تصور حیات (Materialistic Concept Of Life) اور قرآنی تصور حیات میں فرق ہی یہ ہے کہ اول الذکر کی رو سے، انسان عبارت ہے صرف اس کے طبعی جسم سے۔ اس جسم کی مشینری، طبعی قوانین کے تابع سرگرم عمل رہتی ہے اور جب انہی قوانین کے مطابق وہ چلنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے، انسان عبارت ہے اس کے طبعی جسم اور اسکی ذات سے۔ اسکی ذات، طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی اس لئے جب طبعی قوانین کے مطابق انسانی جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اس سے اس کی ذات کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔

جسطرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے، جو عقل، انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جسم اور ذات کی نشوونما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی ذات جوں جوں نشوونما پاتی جاتی ہے اس میں صفاتِ خداوندی (حدود بشریت کے اندر) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ (مزید تفصیل ن۔ ف۔ س کے عنوان میں ملیگی)۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی جگہ بھی ”انسانی روح“ کا ذکر نہیں کیا۔ ”روح خداوندی“ ہی کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ ”روح خداوندی“ (الوہیاتی توانائی) انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو اسے، قرآن کریم کی اصطلاح میں، نفس کہا جاتا ہے۔ (۱۹۱/۲)۔

اسی کو انسانی ذات (Human personality) یا خودی (Self) یا انا (I) کہتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم اور اسکی نشوونما کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کی وساطت سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جسم کا توانا ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح انڈے کے اندر جیتا جاگتا چوزہ بننے کے لئے، انڈے کے خول کا صحیح وسلامت رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی ایسا ہو کہہ جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے (مستقل اقدار) میں تضادم ہو۔ ان میں (Tie) پڑ جائے، تو اسوقت، جسم کے تقاضے کو ذات کے تقاضے پر قربان کر دینا، شرط انسانیت (ایمان کا تقاضا) ہو جاتا ہے۔ جس طرح، جب انڈے کے اندر چوزے کا ”دم گھٹنے لگے“، تو وہ انڈے کے خول کو چونچیں مار مار کر توڑ دیتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہی یہی ہے۔ یعنی جب طبعی تقاضوں میں اور مستقل اقدار میں (Tie) پڑے تو مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبعی تقاضوں کو قربان کر دینا۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں الْقَرِیْنَانُ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ رحمن میں ہے وَالْحَبْءُ ذُو الْعَصْفِ وَالْقَرِیْنَانُ (۵۵/۱۴)۔ الْقَرِیْنَانُ۔ ایک خوشبودار گھہاس ہوتی ہے۔ یا ہر خوشبودار گھہاس۔ نیز سبزی کے تختے بشرطیکہ ان میں سے خوشبو آرہی ہو اور ان پر ابتدائی پھول آرہے ہوں۔ فراء نے کہا ہے کہ کھیتی کے تنہ کو عَصْف کہتے ہیں اور اسکے پتوں کو رِیْنَانُ۔ الْقَرِیْنَانُ اولاد کو بھی کہتے ہیں اور رزق کو بھی۔

أَرَاحَ۔ اس نے آرام کیا۔ سویشیوں کو شام کے وقت باڑے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑا (۱۶/۱)۔

## ر و د

رَوْدٌ۔ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی طلب میں چلتے رہنا۔ پیہم حرکت میں رہنا\*۔ الرَّائِدُ۔ چکی کے دستہ کو کہتے ہیں۔ رَائِدُ الْعِیْنِ۔ آنکھ میں پڑ جانے والا تنکا یا کچرا جو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر جاتا رہے۔

المَرَادُ۔ وہ جگہ یا راستہ جہاں اونٹوں کی آمد و رفت ہوتی رہے، اونٹوں کی اس آمد و رفت کو رِیَادٌ اَلْاَبِل کہتے ہیں۔ اَلرَّائِدُ۔ وہ شخص جسے پانی یا چارہ کی تلاش میں قافلہ سے آگے بھیج دیا جائے۔ چونکہ رَوْد کے بنیادی معنوں میں کسی کام کے لئے حرکت اور تگ و دو کا تصور نمایاں طور پر رہتا ہے لہذا ارَادَةُ کے معنی کسی چیز کی خواہش یا طلب کے ہو گئے ، لیکن پھر ارَادَةُ اور طَلَب میں فرق یہ ہو گیا کہ طَلَب تو انسان کی کسی بات یا عمل سے ظاہر ہو جاتی ہے اور ارَادَةُ کبھی پوشیدہ ہوتا ہے اور کبھی ظاہر۔ ارَادَةُ در حقیقت دل کے کسی طرف کھینچنے اور رجحانِ دلوں کی وجہ سے کسی چیز کی طرف جھکنے کا نام ہے۔ یا یہ ایسے میلان کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں نفع کی توقع ہو۔\*\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ ارادہ ایسی قوت کو کہتے ہیں جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں۔ پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھینچنا ہے ، اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے۔ ازاں بعد یہ کبھی صرف دل کے کسی طرف کھینچنے کے لئے اور کبھی محض فیصلہ کے لئے بولدیا جاتا ہے\*\*\*\*۔ اس سے رَاوَدَہ کے معنی ہونے سے چاہا، بار بار کسی سے کسی چیز کو طلب کیا۔ اس کے بعد عَنْ آنے سے یہ کسی کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی چیز طلب کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً (۱۲/۱) میں جہاں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ سَتَرَ اَوْدَ عَنِّهٖ آبَاهُ۔ ”ہم اسے ، اس کے باپ سے اس کی مرضی کے خلاف طلب کرینگے“۔ یعنی ہمارا باپ تو نہیں چاہتا کہ یوسفؑ کے بھائی کو ہمارے ساتھ جانے دے لیکن ہم اس کی مرضی کے خلاف اسے اس سے مانگیں گے۔ آرَاد۔ اس نے ارادہ کیا ، چاہا۔ يَسْرِيْدُ۔ وہ ارادہ کرتا ہے۔ ان معنوں میں یہ (۳۶/۲) میں آیا ہے۔ یعنی اِنْ يَسْرِدْ ذٰلِكَ الرَّحْمٰنُ يَضُرُّ... ”اگر رحمن مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے“۔

راو دہ' عَنْ نَفْسِیْہِ وَ عَلَیْہَا - کے معنی ہیں فریب دینا - دھوکا دینا - پھسلانا\* - نیز اس کے معنی ہمبستری کی خواہش کے بھی ہوتے ہیں\* - اس سے قرآن کریم کی آیات (مثلاً  $\frac{12}{33}$  و  $\frac{52}{33}$ ) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - پہلی آیت میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں عزیز کی بیوی کے غلط ارادے کی طرف اشارہ ہے - اور دوسری میں قوم لوط کی غلط روش کی طرف -

اَرْوَدْنِی السَّقِیْرَ - کے معنی ہیں وہ سفر میں ہر سکون رفتار سے چلا\* -

یہیں سے رُوَيْدَ کے معنی مہلت دینے کے ہو گئے۔ قرآن کریم میں رُوَيْدَا مہلت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَذَمِّمُوا الْكَافِرِينَ أَمْهَلْتَهُمْ رُوَيْدَا (۹۱)۔ ”پس تو کافروں کو مہلت دے۔ تھوڑی سی مہلت“۔

قرآن کریم میں جہاں ”خدا کے ارادوں“ کا ذکر آیا ہے، انہیں انسانی ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں۔ صحیح بھی ہوتے ہیں، غلط بھی۔ قابل عمل بھی ہوتے ہیں اور محض ”شاعرانہ“ بھی۔ لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ فیصلے ہیں جو عالم امر سے، اس کے قوانینِ مشیت کے مطابق سرزد ہوتے ہیں اور جن کے مطابق کائنات سرگرم عمل ہے۔

## رُوع

الرُّوعُ - حیرت و دہشت جو کسی چیز کی کثرت یا جمال کو دیکھ کر پیدا ہو۔ الرُّوعَةُ - دہشت، نیز حسن اور جمال کا اثر۔ الرُّوعُ - دل - خوف اور گھبراہٹ کا مقام\*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ (۱۱)۔ جب ابراہیم کے دل سے حیرانی اور گھبراہٹ جاتی رہی۔

## رُوم

الرُّومُ - سلطنت رومہ الکبریٰ (Roman Empire) - سورۃ روم (۳۰) میں ہے کہ رومی مغلوب ہو گئے۔ یہ اس شکست کا ذکر ہے جو ایران کے بادشاہ، خسرو پرویز، کے ہاتھوں رومیوں کو پہنچی تھی۔ جس میں رومیوں کا صوبے پر صوبہ فتح ہوتا چلا گیا تھا اور جس کا سلسلہ سنہ ۶۱۰ء تک جاری رہا تھا۔ قرآن کریم نے عین اس وقت جب رومی انتہائی کمزوری میں تھے، کہا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ پھر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ سنہ ۶۲۷ء میں ہرقل نے نہ صرف اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لئے بلکہ ایران کے اندر داخل ہو کر ان کے بڑے آتشکدے کو تباہ کر دیا۔ یہ اس سال (سنہ ۶۲۷ء) ہوا جب مسلمانوں کو مخالفین عرب پر، بدر کے میدان میں، پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ عربوں کا قریب ترین حریف ایران تھا۔ ایران کا اتنی قوت حاصل کر لینا کہ رومن ایمپائر بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر



سکے ، عربوں کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھا ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ، انہی عربوں کو ، قرآنی نظام کی بدولت اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ ان کے سامنے نہ ایرانی سلطنت ٹھہر سکی ، نہ رومن ایمپائر۔ یہ سب ”نکتہ“ ایمان کی تفسیر، تھا ۔

## رہب

رَهْبٌ - رَهْبٌ - رَهَبٌ - رَهْبَةٌ - رَهْبَةٌ - وَرَهْبَانٌ ۔  
 کے معنی ہیں ایسا خوف جس میں احتیاط بھی شامل ہو۔ (جیسے ہم جلنے کے خوف سے آگ سے محتاط رہتے ہیں)۔ اَلْمَرْهُوبُ - اَلْاَرَاهِبُ - شیر کو کہتے ہیں \* ۔ نیز اسکے معنی کمزور ہو جانے کے بھی آتے ہیں ۔ چنانچہ اَلرَّهْبُ وَالرَّهْبِيُّ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سفر میں تھک کر لاغر ہو گئی ہو۔ رَهِيْبٌ اَلْجَمَلُ کے معنی ہیں اونٹ اٹھا لیکن کمر کے کمزور ہونے کی وجہ سے پھر بیٹھ گیا ۔ \* اَلرَّهْبَانِيَّةُ ۔ (مسلک خانقاہیت) میں خوف، احتیاط، کمزوری ، کے تمام پہلو آجاتے ہیں ۔ یعنی (بزعیم خویش) خوفِ خدا کی وجہ سے لذاذِ دنیوی کو ترک کر دینا (اَلْاَلْ رَهَبٌ - اُن پرندوں کو کہتے ہیں جو شکار نہیں کرتے) \* اور اس طرح کمزور اور لاغر ہو جانا ۔ اس قسم کے زاہد کو اَلْاَرَاهِبُ ۔ کہتے ہیں ۔ رَهْبَانٌ اسکی جمع آتی ہے (۱۱۱)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رَهْبَانٌ فارسی کا لفظ ہے ۔ اور یہ مرکب ہے رُہ اور بَن سے ، جسکے معنی ہیں صاحبِ زہد \* ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہو کیونکہ مجوسیوں کے ہاں بھی مسلک خانقاہیت رائج تھا ۔  
 قرآن حکیم میں ہے وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (۱۱۱)۔ ”انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا چاہا ،“

سورۃ حشر میں ہے لَا اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ (۵۱)۔  
 ”تمہارا ڈر ان کے سینوں میں بہت زیادہ ہے ،۔ یہاں بھی رَهْبَةٌ کے معنی ڈر کے ہیں ۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اِیْقَیْ فَاَرْهَبُوْا (۲) تم صرف مجھ سے ڈرنا ۔ خدا سے ڈرنے کے معنی یہی ہیں کہ اسکے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈر کر ان کی نگہداشت کی جائے اور ان سے سرکشی اختیار کرنے سے احتیاط کی جائے (رہب کے بنیادی معنی ڈرنے اور احتیاط

کرنے کے ہیں)۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ يَدْءُوْنَ نَسًا رَّغَبًا وَرَّهَبًا (۲۱)۔ وہ زندگی کی خوشگوار یوں کو حاصل کرنے (رَّغَبًا) اور اسکی ناخوشگوار یوں سے بچنے (رَّهَبًا) کیلئے خدا کو پکارا کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے انسان کے لئے دفعِ حضرت اور جلبِ منفعت ہی وہ بنیادی جذبات ہیں جو عمل کیلئے محرک (Incentive) بنتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام ان دونوں حالتوں میں قانونِ خداوندی ہی کا اتباع کرتے تھے۔ یہی مسلک مومنین کا ہونا چاہیئے۔ باقی رہا رَّهَبَانِيَّة کا مسلک۔ یعنی ترک دنیا کا مسلک۔ سو قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے عیسائیوں نے خود ہی وضع کر لیا تھا۔ ہم نے اسے ان کے لئے تجویز نہیں کیا تھا (۲۴)۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فَمَا رَعَوْهَا حَقًّا رَّعَايَتِيهَا (۲۴)۔ پھر وہ (اپنے اس خود ساختہ مسلک) کو بھی پوری طرح نباہ نہ سکے۔ یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ مسلکِ خانقاہیت کے متعلق جو تصوف کی بنیاد ہے اور جسے (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں ”مغزِ دین“ قرار دیا جاتا ہے۔ جب مسلمان کے ہاتھ سے قرآن کریم کا دامن چھوٹا تو وہ تمام غیر قرآنی عناصر جنہیں قرآن کریم مٹانے کے لئے آیا تھا، ایک ایک کر کے اسلام کا جزو بنتے گئے۔ روم کی ملوکیت۔ ایران کی نسل پرستی۔ یہودیوں کی پیشوائیت اور روایت پرستی۔ اور عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلکِ خانقاہیت۔ سب اسلام کے اجزا بن گئے۔ اور اب اسلام انہی کے مجموعہ کا نام قرار پا چکا ہے۔ ہاں! لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ دین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ، بغیر کسی آمیزش کے، ہمارے پاس موجود ہے۔ لہذا ہم دینِ خالص کو ان آمیزشوں سے باآسانی الگ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی نیت ہو۔

## رہط

الرَّهْطُ۔ کسی آدمی کی قوم۔ قبیلہ۔ بعض نے کہا ہے کہ رَہْطُ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تین سے دس تک یا سات سے دس تک کی تعداد ہو۔ دوسروں نے کہا ہے اس سے کم پر بھی بولا جاتا ہے اور زیادہ پر بھی، لیکن اس میں مرد ہی ہوں، عورتیں شامل نہ ہوں\*۔ ابنِ فارس نے اس کے بنیادی معنی انسانوں وغیرہ کے اجتماع کے لکھے ہیں۔ سورۃ شمس میں رَہْطُ (۱۱)۔ برادری یا قبیلہ کے لئے آیا ہے۔

سورۃ نحل میں قوم ثمود کے سلسلہ میں آیا ہے۔ وَكَانَ فِي  
الْمَدْرِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۲۸) اور شہر  
میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے،، ظاہر ہے کہ اس سے ان  
اکابرین قوم کی طرف اشارہ ہے جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ ہر قوم۔  
ملک۔ حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں  
ناہمواریاں پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ باقی ملک انہی کے ہاتھوں  
تباہ ہوتا ہے۔

## رہق

رَهْقَهُ۔ يَرْهَقُهُ۔ رَهَقًا۔ اسے ڈھانپ لینا اور اس پر چھا جانا (راغب  
نے اس میں بزور وجہ چھا جانے کا اضافہ کیا ہے)۔ کسی چیز سے مل جانا۔ اسے  
آلینا اور اس سے لاحق ہو جانا \*۔ وَلَا يَرْهَقُ وَجُوهُهُمْ قَتَرٌ (۱۶)۔  
ان کے چہروں پر ذلت اور سیاہی نہیں چھا جاتی۔ اَرْهَقَهُ۔ اسے اسکی طاقت  
سے بالاتر کسی کام کی تکلیف دی اور اس پر مجبور کیا، مشکل میں ڈالا \*۔  
سورۃ کہف میں ہے يَرْهَقُهُمْ طُغْيَانًا (۱۸)۔ ان پر سرکشی کو  
چھا دے۔ یا انہیں سرکشی میں مبتلا کر دے۔

رَهَقٌ \*۔ یسوقوفی۔ حماقت۔ بد خلقی۔ تندہی و طراری۔ شرکا ارتکاب \*۔  
ابن فارس نے اس کے معنی دھاندلی، جلد بازی اور ظلم بتائے ہیں۔ قَزَادٌ وَهُمْ  
رَهَقًا (۹۲)۔ سوائیہوں نے انہیں جہالت میں بڑھایا۔ ازہری نے کہا  
ہے کہ یہ دراصل اِرْهَقٌ سے اسم ہے، جسکے معنی ہیں انسان کو کسی  
ایسے کام کے لئے مجبور کرنا جسکی اس میں طاقت نہ ہو \*۔ سَأَرْهَقُهُ  
صَعُوْدًا (۹۳)۔ میں اسے سخت مشقت میں مبتلا کرونگا۔

## رہن

الرَّهْنُ \*۔ (جمع رَهَانٌ) وہ چیز جو بطور ضمانت تمہارے پاس، اس چیز  
کے بدلے میں رکھ دی جائے جسے تم سے عاریتاً لے لیا گیا ہو۔ رَهْنٌ لغت  
میں ثبوت اور استقرار (ٹھہرنے اور جم جانے) کے معنوں میں آتا ہے، لیکن راغب  
کے نزدیک رَهْنٌ و رِهَانٌ وہ چیز ہے جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی  
جائے۔ لیکن الرَّهْنُ خاص طور پر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ  
میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے۔ یہ زیادہ تر گھوڑ دوڑ کے لئے مستعمل ہے۔

الرَّاهِنُ - ثابت اور تیار۔ موجود اور دائم - رَهْنُ الشَّيْءِ - چیز دائم اور ثابت رہی\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میں کسی چیز کا ایک حالت پر رہنا، خواہ وہ حق کے عوض ہو یا نا حق -

رَجُلٌ رَهِيْنَةٌ - اس کا پاؤں مقید ہے\* - اَنَا رَهِيْنٌ بِكَذَا - میں فلاں بات میں ماسخوذ ہوں\*\* - قرآن کریم میں ہے "كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ" (۵۲/۱) - ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گروہے، یعنی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کے اعمال کے نتائج پر ہے - سورۃ بقرہ میں قرضہ کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کاتب نہ ملے تو قَرِهْنٌ مَقْبُوضَةٌ (۲۸۳/۲) مستعاردی ہوئی چیزوں کے عوض کچھ چیزیں بطور ضمانت اپنے قبضے میں رکھ لینی چاہئیں۔ اس سے ہمارے ہاں کے "رهن بالقبضہ" کا جواز نکالنا (جو سود ہی کی دوسری شکل ہے) بڑی زیادتی ہے - "رهن بالقبضہ" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ (مثلاً) ایک کسان نے کسی سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور قرض دینے والے نے اس کی کچھ زمین بطور رهن لے لی - اس کے بعد اس زمین پر قرض دینے والے کا قبضہ ہوگا اور جب تک قرض ادا نہیں ہو جائے گا وہ اس کی پیداوار کھاتا جائے گا - (اور اس پیداوار کو قرض میں محسوب نہیں کرے گا) - اگر یہ رہو نہیں تو اور کیا ہے؟

## رہو

الرَّهْوُ - دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی - پانی کے جمع ہونے کی جگہ، نیز سکون، جس میں جوش و خروش نہ ہو - الرَّهَاءُ - ہموار اور کشادہ زمین - عَيْشٌ رَآهٍ - آسودہ و پرسکون زندگی - الرَّهْوَانُ - نشیبی زمین - وہ گھوڑا جس کی پشت دوڑتے وقت نرم ہو\*\*\* - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اعداد میں سے ہے اور ہبوط (نیچے آنا) اور ارتفاع (اوپر جانا) دونوں کے لئے آتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) اطمینان اور سکون اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست - قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لیکر چلے تو ان سے کہا گیا کہ وَاتْرُكِیْ التَّبَعْرَ رَهْوًا (۲۴/۲) - اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تو سمندر کو پھر سکون حالت میں چھوڑ دے - یعنی جب حضرت

موسٰیؑ وہاں پہنچے ہیں تو سمندر سکون کی حالت میں تھا۔ اس میں جوش و خروش نہیں تھا۔ وہ اترا ہوا تھا اور اس طرح اس نے خشک راستہ چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ سورۃ طہ میں ہے فَاضْرِبْ لَّهٖمْ طَرِيقًاۙ فِی الْبَحْرِ رِبِّیۡنَا (۲۱)۔ ”ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ اختیار کر“۔ اور اگر رَہُوا کے معنی کشادگی کے لئے جائیں تو بھی یہی مفہوم ہوگا کہ سمندر نے (پیچھے ہٹ کر) جو راستہ کشادہ کر دیا ہے انہیں وہاں سے لے چل۔ جس جگہ پہلے سمندر ہو وہ پست (نشیب) ہوگی اور جب وہاں سے سمندر ہٹ جائیگا تو وہ، دوسری زمین کے مقابلہ میں (جو هنوز زیر آب ہے) بلند ہو جائیگی۔

## ر و ض

رَوْضَۃٌ\*۔ وہ زمین جہاں خوشنما پھول، درخت اور پانی ہو۔ خوشنما باغ جس میں نہر ہو۔ سرسبز و شاداب جگہ جس میں، یا جس سے متصل پانی ہو۔ اس کی جمع رَوْضٌ\* و رِیَاضٌ\* و رَوْضَاتٌ\* ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو اسے رَوْضَۃٌ\* نہیں کہتے۔ نیز پانی جمع ہو جانے کی جگہ۔ اَرْضَ الْقَوْمِ\*۔ اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا۔ اَلْثَّرِیَّۃُ\*۔ کسی سے بکثرت کوئی کام لیکر اسے اس کام میں ماہر و مشاق بنانا اور سدھانا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) وسعت اور فراخی (۲) کسی چیز کو نرم یا کسی کام کو آسان کرنا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَهٖمۡۙ فِیۡ رَوْضَۃٍۙ یُّخْبِرُوۡنَ (۳۱)۔ ”وہ سرسبز مقام میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونگے“ اس کی جمع رَوْضَاتٌ\* (۳۲) میں آئی ہے۔

## ر و غ

رَاغَ الرَّجُلُ رَوْغًا\*۔ کسی تدبیر کی خاطر چپکے سے ایک طرف دٹایا مائل ہونا اور کترانا\*۔ پھر بقول ابن فارس، جھکنے اور ایک حالت پر نہ رہنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ رَاغَ فُلَانٌ\* اِلٰی فُلَانٍ\*۔ فلان آدمی فلاں کی طرف چھپ کر مائل ہوا۔ فراء نے کہا ہے رَاغَ اِلٰی اَهْلِیْہِ کے معنی ہیں وہ اپنے اہل کی طرف اس طرح لوٹا کہ (سامنے والوں سے) اپنی واپسی یا اس کی غرض کو پوشیدہ رکھا۔ اَرَاغَ\*۔ اِرَاغَۃٌ\*۔ وَاَرَاغَ\*۔ اس نے ارادہ کیا اور طلب کیا۔ رِیََاغَۃٌ\*۔ رِیَاغَۃٌ\*۔ اکھاڑہ\*\*۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت ابراہیمؑ میں ہے قرآغ لآلی الیہتہیمؑ (۴۹)۔ اور قرآغ عتہتہیمؑ (۳۴)۔ رآغ لآلی کے معنی ہیں اپنے ارادے کو دل میں رکھ کر کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ اور رآغ علی کے معنی ہیں غلبہ کے ساتھ کسی پر ٹوٹ پڑنا\*۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کی تدبیر ایسی تھی جس میں ارادے کی پوشیدگی کا پہلو بھی تھا اور قوت و غلبہ کا بھی۔

## ری ب

رَیْبٌ\*۔ یہ اصل میں نفسیات الجہن اور اضطرابِ نفس کے معنوں میں آتا ہے\*\*۔ نیز شک و شبہ اور بے چینی کو بھی رَیْبٌ\* کہہ دیتے ہیں\*\*\*۔ نیز گمان اور تہمت کو بھی\*\*\*۔ اسکے علاوہ حوادثِ روزگار گردشِ زمانہ اور ضرورت و حوائج کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شک کے ہیں یا شک اور خوف کے۔ اَلرَّیْبُ\*۔ جو چیز شک و اضطراب پیدا کر دے۔ نیز حاجت اور ضرورت کو بھی کہتے ہیں۔ رَابِیُّ الْأَمْرِ رَیْبًا کے معنی ہیں مجھے فلاں معاملہ نے شک و شبہ میں ڈالا\*\*\*۔

سورۃ توبہ میں (مسجد ضرار کے ضمن میں) رَرَبَّتْ رَفِیُّ قُلُوْبِهِمْ (۹۱) آیا ہے۔ اس کے معنی اضطراب اور بے چینی کے ہیں۔ سورۃ ابراہیم (۱۴) اور سورۃ السبا (۳۳) نیز دیگر مقامات میں مَرَّیْبٌ\*، شکست کی صفت بن کر آیا ہے۔ شکستِ مَرَّیْبٌ\*۔ یعنی اضطراب اور بے چینی پیدا کر دینے والا شک۔ (۳۳) میں مَرَّیْبٌ تَابٌ آیا ہے۔ یعنی شک کرنے والا۔ اور (۲۹) میں اَلرَّیْبُ تَابٌ بمعنی شک کیا۔ سورۃ الطور میں رَیْبُ الثَّمَنُونَ (۵۲) کے معنی ہیں حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کر سکتے ہیں، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کر سکتی۔

لہذا رَیْبٌ\* کے بنیادی معنی شک و شبہ کی وجہ سے اضطرابِ نفس کے ہونگے۔ قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ ذَٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (۲)۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جس میں کوئی بات ایسی نہیں جو شک و شبہ والی ہو اور اس کی وجہ سے انسان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش باقی رہے۔ اس میں کامل سکون و اطمینان دینے والی تعلیم ہے۔ اضطراب اور بے چینی کے لئے اس میں کوئی

\* تاج و محیط و راغب\*\* محیط۔ لیکن اقرب الموارد میں یہ معنی الریبة کے دئے ہوئے ہیں۔ \*\*\* تاج۔

گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہ یکسر علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر قائم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اطمینان علم و براہین ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اندھی عقیدت مندوں اور توہم پرستیوں سے نہیں۔

## ری ش

آلِرٌ یُّشُّ - آلِرَاشٌ - پرندے کے پر جن سے خدا ان کے جسم کو چھپاتا ہے \*۔ انسانوں کے لباس فاخرہ اور زینت کو بھی آلِرٌ یُّشُّ کہتے ہیں۔ نیز خوشحالی اور معاش کی فراخی کو۔ چنانچہ رَاشٌ فَلَائِنَا کے معنی ہیں معاش کے سلسلہ میں اسکی مدد کی اور اسے تقویت پہنچائی۔ اسکی حالت کو درست کر دیا اور اسے نفع پہنچایا۔ رَاشٌ الرَّجُلُ - آدمی آسودہ و مالدار ہو گیا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی خوش حالی کے ہیں۔ نیز وہ عمدہ چیزیں جنہیں انسان حاصل کرتا ہے۔

قرآن کریم میں لباس کے متعلق ہے کہ وہ تمہارا ستر بھی ڈھانپتا ہے اور رِبْشاً (رِبَی) باعث زینت بھی ہے۔ قرآن کریم اشیائے کائنات کے صرف افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی کی اہمیت پیش نہیں کرتا، ان کے جمالیاتی گوشوں (Aesthetic Aspects) کو بھی برابر کی اہمیت دیتا ہے۔ حسن فطرت کی تمام رعنائیاں اور دل ربائیاں، خالق فطرت کے اسی انداز تخلیق کی مظہر ہیں۔ یعنی ہر شے میں افادی اور جمالیاتی پہلو۔ مومن کی زندگی بھی ان دونوں گوشوں کی مظہر ہونی چاہئے۔

## ری ع

رَبْعٌ - ہر چیز کا بڑھا ہوا اور زائد حصہ۔ نیز ہر چیز کا اول اور افضل حصہ۔ رَاعِ الْقَطْعَامِ وَغَیْرُہُ - غلہ وغیرہ زیادہ ہوا، بڑھا، بکثرت ہوا۔ رِبْعٌ - رِبْعٌ - بلند زمین یا بلند جگہ۔ کَمِ رِبْعِ آرْضِیکَ - تمہاری زمین کی بلندی کس قدر ہے۔ ہر راستہ یا دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ، نیز پہاڑ۔ آلرِ رَبْعٌ - بلند ٹیلہ۔ وادی کی بلند جگہ جہاں سے پانی بہ کر نیچے آتا ہو۔ گرجا۔ رَبْعَانُ الشَّجَبَابِ - جوانی کا ابتدائی حصہ۔ نَفَاقَةٌ رَبْعَالَتٌ - بہت دودھ دینے والی اونٹنی \*۔

قرآن کریم میں ہے آتَّبِعُوا بَیْکُمْ رَبْعِ آيَةِ تَعَبَتْوُنَ (۲۶۸/۱) "کیا تم ہر بلند مقام پر (اپنی عظمت کی یادگار کے طور پر) کوئی نہ کوئی نشان

بنا لیتے ہو؟ اور وہ بھی بلا ضرورت۔“ اس سے مراد بلند عمارتیں ہیں جنہیں بطور یادگار (Memorials) بنایا جاتا ہے۔ اور جن کا مصرف کچھ نہیں ہوتا۔ یادگار وہی بہتر ہو سکتی ہے جو آنے والوں کے لئے نفع بخش ہو۔

## ری ن

رَیْنٌ \*۔ وہ زنگ جو کسی صاف چیز پر لگ جائے \*۔ میل کچیل کو بھی کہتے ہیں \*\*۔ رَانَ هَوَاهُ عَلٰی قَلْبِهِ رَیْنٌ \*۔ اسکی خواہشات اسکے دل پر غالب آگئیں۔ رَیْنٌ بِالرَّجُلِ \*۔ آدمی ایسے مخمضہ میں گرفتار ہو گیا جس سے نکلنا اسکے بس میں نہیں رہا۔ اَلرَّیْنَةُ \*۔ شراب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر غالب آجاتی ہے \*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانکنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے رَانَ عَلٰی قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳/۱۵)۔ ”اُن کے اعمال اُن کے دل پر زنگ بن کر چھا گئے“۔ غور کیجئے۔ دلوں پر مہریں کہیں باہر سے نہیں لگتیں۔ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ اور مہریں بن جاتے ہیں۔ اسی کو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ (۲/۲۱۷) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں کے اعمال، جن کا نتیجہ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ سطحی جذبات میں ایسا ڈوبتا ہے کہ غور و فکر کے راستے اس پر مسدود ہو جاتے ہیں۔



## ز

## ز ب د

الزَّبْدُ - ہانی وغیرہ کے اوپر آجانے والے جھاگ \*۔ قرآن کریم میں  
 ہے زَبْدٌ أَرِيَّا (۱۳۱)۔ اوپر آئے ہوئے جھاگ - الزَّبْدُ - مسکھ جس سے گھی  
 بنایا جاتا ہے - تَزْبِدُهُ - اس نے اس کا خلاصہ لے لیا \*۔  
 ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز سے دوسری چیز  
 پیدا ہونے کے ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ بطور استعارہ زَبْدٌ کثیر شے کے  
 لئے بولا جاتا ہے -

## ز ب ر

الزَّبْرُ - لکھنا - اَلتَّزْبِيرُ - لکھائی یا تحریر - مِزْبَرٌ - قلم -  
 اَلتَّزْبُورُ - بمعنی مِزْبُورٌ - یعنی لکھی ہوئی چیز - کتاب \* - اسکی جمع  
 زُبُرٌ ہے -

سورۃ نحل میں ہے کہ رسولوں کو اَلْبَيِّنَاتِ وَالزَّبُرِ دیکر بھیجا گیا  
 (۱۶۴) نیز (۲۶۶) - یہاں زُبُرٌ کے معنی کتابیں ہیں - دوسرے مقامات پر  
 بِالْبَيِّنَاتِ وَالزَّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۳۵: ۱۸۳) آیا ہے - یہاں  
 زُبُرٌ کی تفسیر کتاب منیر سے کی گئی ہے - سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ  
 كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ (۲۱۵) - بعض نے کہا ہے کہ  
 یہاں زَبُورٌ سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہے اور ذِکْرٌ سے مراد  
 تورات ہے - لیکن سعید بن جبیر کا قول ہے کہ زَبُورٌ ، تورات - انجیل -  
 قرآن کریم - ہر ایک کتاب الہی کو کہتے ہیں \* - اسکی تائید اس سے  
 بھی ہوتی ہے کہ سورۃ نساء میں ہے وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (۲۶۳) اگر  
 زبور سے مراد وہ خاص کتاب ہوتی جو حضرت داؤدؑ کو دی گئی تھی تو

زَبُورًا (ایک کتاب) نکرہ نہ ہوتا بلکہ القرآن اور الانجیل کی طرح الزبور ہوتا۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر وہ کتاب جس کی کتابت بڑی موٹی ہو زَبُورٌ کہلاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) لکھنا پڑھنا اور (۲) کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا ہیں۔ اَلزَّبْرَةُ - لوہے کا بڑا ٹکڑا \*۔ اسکی جمع زَبَرٌ اور زَبْرٌ آتی ہے۔ (۱/۶۶)۔ اسی سے اسکے معنی فرقے۔ الگ الگ گروہ، کے آئے ہیں۔ (۲/۵۳)۔

(چونکہ زَبْرٌ - زَبُورٌ کی بھی جمع ہے اس لئے (۲/۵۳) میں اس کے معنی الگ الگ کتابیں بھی ہو سکتے ہیں)۔

## ز ب ن

اَلزَّبْنُ - دھکا دینا۔ دفع کرنا۔ کسی چیز کو کسی چیز سے دور کر دینا اور مٹا دینا۔ اَلزَّبْنُ - سخت دھکا دینے والا۔ نَاقَةُ زَبُونٌ - وہ اونٹنی جو دودھ دوغنے والی کھلات مار دے اور دھکا دیدے۔ حَرْبٌ زَبُونٌ - شدید جنگ جس میں سخت ٹکراؤ ہو \*۔ لڑائی کو اسکی صعوبتوں کی وجہ سے زَبُونٌ کہتے ہیں \*\*\*۔ اَلزَّبْنِيَّةُ - ہر متعرد آدمی۔ سخت آدمی۔ سہامی۔ اسکی جمع زَبَانِيَّةٌ آتی ہے \*۔ (۹/۱۸)۔ وہ مجاہدین جو حق کی مدافعت کے لئے میدان میں نکلیں۔

## ز ج ج

اَلزَّجَجُ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریک ہونے کے ہیں۔ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ نیز کہنی کا نوکیلا سرا۔ اَلزَّجَّاجُ - کانچ اور شیشے اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں۔ واحد زَجَّاجَةٌ ہے \*\*\*\*۔ قرآن کریم میں چراغ کے متعلق ہے "فِي زَجَّاجَةٍ" (۲/۲۵)۔ اس سے مراد ہے شیشے کی چمنی یا فانوس۔

جب پیالہ بھرا ہوا ہو تو اسے "کاس" کہتے ہیں اور جب خالی ہو تو زَجَّاجَةٌ کہلاتا ہے \*\*\*\*\*۔

## ز ج ر

زَجَرَةٌ - بَزَجَرَةٌ - زَجْرًا نیز اَزْدَجَرَةٌ - اسنے اسکو روکا اور منع کیا اور جھڑکا۔ دراصل اسکے معنی آواز کے ساتھ کسی کو ہانک دینا اور

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* کتاب الاشتقاق - \*\*\*\* تاج و راغب - \*\*\*\*\* لطائف اللغہ نیز فقہ اللغہ - (لشالی)۔

دھتکارنا ہیں۔ زَجَرَ الْبَعِيرَ۔ اسنے اونٹ کو ڈانٹ کر ہانکا۔ اَلْتَزَجُوْرُ۔ وہ اونٹنی جو بلا ڈانٹ کھائے دودھ نہ دیتی ہو\*۔ اس لٹے اس لفظ میں ڈانٹنے اور جھڑکنے کا پہلو ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے فَالْزَّاجِرَاتِ زَجْرًا (۳۶)۔ اس سے مراد وہ جماعت مجاہدین ہے جو سرکش اور مستبد قوتوں کو ان کی دست درازیوں سے ڈانٹ کر روکتی ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے فَالْزَّاهِيَاتِ زَاهِيَةً وَاحِدَةً (۳۷) ”وہ صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی“۔ سورۃ القمر میں ہے مَافِيْهِ مَزْدَجَرٌ (۵۷)۔ جس میں ایسی باتیں ہیں جو مفساد سے روکتی ہیں۔ اس سے ذرا آگے ہے مَجْنُوْنٌ وَاَزْدُ جِرٍ (۵۹)۔ انہوں نے اپنے مجنوں قرار دیا اور ڈانٹ کر نکال دیا۔ مفاد ہرست گروہ اپنی قوت اور اقتدار کے نشہ میں ہر داعی الی الحق کے ساتھ اسی قسم کا ہرٹاؤ کرتے ہیں۔

## زج و

زَجَاهُ۔ يَزْجُوْهُ۔ زَجُوْا۔ وَاَزْجِيْ اِزْجَاءً۔ کسی چیز کو نرمی اور آہستگی سے ہانکنا۔ نرمی سے چلانا\*\*۔ قرآن کریم میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَزْجِيْ سَحَابًا (۲۳)۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ بادلوں کو آہستگی اور سہولت سے چلاتا ہے۔ زَجَا اَلَا مَرٌ۔ معاملہ آسان اور سیدھا ہو گیا۔ اَلْمَزْجِيْ۔ قلیل چیز\*\*۔

بِضَاعَةٌ مَزْجَاةٌ (۱۲)۔ قلیل سرمایہ۔ تھوڑی سی ہونجی\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بغیر کسی روک ٹوک کے پھینکنا اور چلا دینا ہیں۔ یعنی جسے آسانی سے نکالا اور روانہ کر دیا جائے۔ بِضَاعَةٌ مَزْجَاةٌ سے مراد ہوگی ایسی ہونجی جسے آسانی سے نکال کر دیا جاسکے۔

## زح زح

زَحْزَحَهُ عَنْهُ کے معنی ہیں اسے اس سے دور کر دیا، ہٹا دیا، ایک طرف کر دیا۔ هُوَ يَزْحِزْحُ مِيْنَهُ۔ وہ اس سے دوری پر ہے۔ اَلزَّحْزَاحُ دور۔ بعید۔\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا هُوَ بِمُزَحَّزٍ حَبِيبٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۹۶) وہ (طویلِ عمر) اس کو عذاب سے دور نہیں رکھ سکتا۔ سورۃ آل عمران میں ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۱۸۳)۔ جو تباہیوں سے دور رکھا گیا۔

## ز ح ف

زَحَفَ إِلَيْهِ زَحْفًا۔ اس کی طرف آگے بڑھا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے کی طرف بڑھتے چلے آنا ہیں۔ اصل میں زَحَفَ بچے کے کولہے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلنے کو کہتے ہیں\*۔ گھٹنوں کے بل چلتے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے\*\*۔ زَحَفَ الْبَنَعِيُّرُ۔ اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں کو گھسٹ گھسٹ کر چلنے لگا\*۔ الزَّحَافَةُ۔ وہ حیوانات جو زمین پر گھسٹ کر چلتے ہوں۔ جیسے کچھوا وغیرہ\*\*۔ پھر زَحَفَ فُوجُوهٌ کے چلنے کے لئے بولا جانے لگا کیونکہ وہ کثرت و گرانباری کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہیں۔ چنانچہ آزَحَفَ لَنَا بَنُو فُلَانٍ کے معنی ہیں، فلاں قبیلہ ہم سے لڑنے کے لئے مذکورہ بالا کیفیت سے آیا۔ تَزَاحَفُوا فِي الْقِتَالِ۔ وہ جنگ میں ایک دوسرے کے قریب اور بالمقابل ہو گئے۔ مَزَاحِفُ الْقَوْمِ۔ قوم کی لڑائیوں کے مقامات\*۔ الزَّحَفُ۔ جرار لشکر کو بھی کہتے ہیں جو دشمن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ سورۃ انفال میں ہے إِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحَفًا (۸)۔ جب تمہارا کفار کے ساتھ آنا سامنا ہو درآنحالیکہ وہ تمہاری طرف بڑھ رہے ہوں۔

## ز خ ر ف

الزُّخْرُفُ۔ سونا (جسکے زیورات بنتے ہیں)۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں۔ اس کے بعد زِبَانُش، زینت و آرائش کو بھی زُّخْرُفُ کہنے لگ گئے۔ اور پھر بطور تشبیہ ہر ملمع کی ہوئی جھوٹی بات کو\*\*\*۔ محیط نے سونا یا زینت دونوں میں سے ابسک کے اصلی معنی ہونے میں شک کیا ہے\*\*۔ زُّخْرُفُ کے معنی کسی چیز کے حسن کا کمال بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں زُّخْرُفُ الْقَوْلِ (۱۱۳) آیا ہے، جس کے معنی ملمع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اور حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُّخْرُفَهَا (۱۶) میں اس کے معنی سنگھار اور آرائش کے ہیں۔ سورۃ زخرف میں زُّخْرُفًا (۳۳) کے معنی سامانِ آرائش ہیں یا خود آرائش و نقش و نگار۔ راغب نے زُّخْرُفُ کے معنی مصنوعی زینت کئے ہیں\*\*\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی زینت کے ہیں اور سونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

## ز ر ب

الزَّرْبُ "زرب"۔ داخل ہونے کا راستہ۔ ہکریوں وغیرہ کے لٹھے لکڑیوں کا بازو۔ الزَّرَّارِیُّ (واحد زَرَّارِیُّ یا زَرَّارِیَّةٌ) گدے۔ بچھونے۔ ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ فراء نے کہا ہے کہ زَرَّارِیُّ۔ روئیں دار غالیچوں کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ معنی الزَّرَّارِیُّ مِّنَ النَّبَاتِ سے تشبیہ کے باعث پیدا ہو گئے ہوں جو ایسے زرد سرخ بودوں کو کہتے ہیں جن میں سبزی ہو\*۔ الزَّرَّارِیَّةٌ۔ عمدہ بچھونا یا قالین\*\*۔ قرآن حکیم میں زَرَّارِیُّ مَبْشُورٌ آیا ہے (۲۹۸)۔ اعلیٰ درجے کے بچھائے ہوئے فرش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ زَرْبُ کے بنیادی معنوں میں راحت کدہ یا آرامگاہ کا تصور مضمحل ہے۔

## ز ر ع

زَرَعَ۔ يَزْرَعُ۔ زَرْعًا وَ زَرْعَةً۔ زمین میں بیج ڈالنا۔ الزَّرْعُ "اُگانا"۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما دینے اور بڑھانے کے ہیں۔ لہذا، جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے معنی بیج ڈالنے کے نہیں بلکہ کھیتی اُگلنے کے ہونگے۔ انسان زمین کو تیار کر کے اس میں تخم ریزی کرتا ہے اور مناسب احتیاطیں برتتا ہے لیکن دانے میں سے کونپل پھوٹتا اور اس کا پودا اور پیڑ بن جاتا، یہ سب کچھ خدا کے قانونِ ربوبیت کے ماتحت ہوتا ہے جس میں انسان کے کسب و ہر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (۵۶)۔ "کیا کھیتی کو تم اُگلتے ہو یا ہم اُگلتے ہیں؟" تم صرف حَرْث کرتے ہو (۶۱)۔ یعنی تم صرف کھیتی ہوتے ہو۔ اُگلتے ہم ہیں۔ لہذا تم ساری کی ساری فصل کے مالک کیسے بن سکتے ہو؟ تم اپنی محنت کا حصہ لے لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ یعنی اُن لوگوں کو دے دو جنہیں اس کی ضرورت ہے (۵۶)۔

الزَّرَّاعُ (۲۹۸)۔ کھیتی کرنے والے۔ باغبان۔ (واحد زَارِعٌ) ذَرَعَ۔ کھیتی۔ بونے سے جو کچھ اُگ آئے\*۔ (۱۳ و ۱۲۲)۔

## ز ر ق

الزَّرَقُ - نیلا رنگ - الزَّرْقَةُ : نیلا ہٹ - سفیدی - آنکھ کی سیاہی میں سبزی - آنکھ کی سیاہی پر سفیدی کا چھا جانا - زَرَقَ - اس کی آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چڑھی - ایسا شخص اَزْرَقَ کہلائیگا۔ اس کی جمع زُرُقُ ہے - الزَّرَقُ - اندھے پن کو کہتے ہیں - زَرَقْتَ عَيْنَهُ تَزْرُقُ - آنکھوں کا نیلا ہو جانا\* - قرآن کریم میں ہے نَحْشُرُ النَّجْرَمِينَ يَوْمَ مَسِيدٍ زُرُقًا (۲۰۴) - (زُرُقُ جمع ہے - اس کا واحد اَزْرُقُ ہے) - حشر میں ہم مجرمین کو اندھا اٹھائیں گے ، ان کی آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چھائی ہوگی - راغب نے بھی لکھا ہے کہ زُرُقًا کے معنی ہیں اندھے - جن کی آنکھوں میں نور نہ رہے\*\* - اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عربوں کی روسیوں سے قدیم دشمنی تھی اور انکی آنکھیں نیلی تھیں اس لئے ہر مبغوض اور دشمن کو اَزْرَقُ الْعَيْنِ کہا جائے لگا، خواہ اس کی آنکھ نیلی نہ ہو\*\*\* لیکن ہم اول الذکر توجیہ کو بہتر تصور کرتے ہیں، اس لئے کہ اسے قرآنی تائید بھی حاصل ہے - چنانچہ اسی سورت میں کچھ آیات کے بعد نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰی (۲۰۴) ہے - یعنی ”ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے“ -

## ز ر ی

زَرَى عَلَيْنِهِ عَمَلَهُ - اس کے کسی کام پر اسے ملامت کرنا ، برا بھلا کہنا - عتاب کرنا - حقیر جاننا اور اس پر عیب لگانا - اَزْدَرَاهُ - اسے حقیر و بے وقعت گردانا - اَلْمَزْدَرَى - حقیر جاننے والا\*\*\*\* - قرآن کریم میں ہے تَزْدَرَى اَعْيُنُكُمْ (۱۱) - وہ لوگ جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں - (باب افتعال ہے - تاء ، دال سے بدل گئی ہے)

## ز ع م

الزَّعْمُ - الزَّعْمُ - اَلْزَعْمُ - بات - قول - جو حق بھی ہو سکتی ہے اور باطل بھی - لیکن اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن کے بارے میں شک کیا جاتا ہو اور وہ متحقق نہ ہوں - لیث نے کہا ہے کہ جب عرب کہتے ہیں ذَكَرَ فُلَانٌ تو یہ ایسے معاملات کے متعلق بات ہوتی ہے جس کی بابت یقین

ہو کہ وہ حق ہے۔ لیکن اگر شک ہو اور اس کا یقین نہ ہو کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے یا جھوٹ، تو ایسی جگہ زَعَمَ قُلَانٌ\* کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زَعَمَ کے معنی ہی جھوٹ ہیں۔ اَلتَّزَعُمُ\*۔ جھوٹ گھڑنا۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ زَعَمُوا ایسی باتوں کو کہتے ہیں جن کی نہ کوئی سند ہو نہ ثبوت، بلکہ یونہی زبانی نقل ہوتی چلی آرہی ہوں، کہ اس نے اس سے کہا اور اس نے اس سے\*۔ اصل میں اس کے معنوں میں ظن اور توقع کا پہلو شامل ہوتا ہے۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلزَّعَمُ\*۔ اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن میں شک ہو یا جن کے جھوٹا ہونے کا عقیدہ دل میں ہو۔ بعض لوگوں نے قول بلا دلیل کو زَعَمَ کہا ہے۔ بعض نے ادعائے علم (یعنی کسی بات کے جمانے کا دعویٰ کرنے) کو کہا ہے۔ بعض کے نزدیک زعم کا تعلق اعتقاد سے ہے، خواہ صحیح ہو یا غلط\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہو\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّنْ يَّبْعَثُوا (سجۃ)۔ ”حقیقت سے انکار کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے“۔ سورۃ انعام میں ہے بِزَعْمِهِمْ (۱۶۱)۔ اس کے معنی گمانِ باطل کے ہیں۔ زَعَمَ بِهِ: اس کی ذمہ داری لی، ضامن ہوا۔ اسی سے اَلزَّعِيمُ\*۔ ذمہ دار اور کفیل کو کہتے ہیں (۱۲۴ و ۱۲۸)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) بغیر صحت اور یقین کے کوئی بات کہہ دینا۔ اور (۲) کسی چیز کا ذمہ دار اور کفیل بن جانا۔

## ز ف ر

زَفَرَ - يَزْفِرُ - زَفِيرًا - سانس کو کھینچ کر نکالنا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں سانس کا بار بار پلٹنا تا آنکہ اس کی وجہ سے سینہ پھول جائے\*\*\*۔ (جیسے سسکیاں بھرنے میں ہوتا ہے) اس کا بیشتر استعمال گدھے کے رینکنے کی ابتدائی آواز پر ہوتا ہے اور اس کے برعکس شہیق اس کی آواز کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، اس لئے کہ زفير سانس اندر کی طرف

کھینچنے کو کہتے ہیں اور شہیق \* سانس کے باہر نکالنے کو \*۔ قرآن کریم میں زَفِيرٌ \* (۱۱۶) اکٹھا آیا ہے۔ اس کے معنی (آہیں بھرتے، سسکتے اور واویلا کرتے ہوئے) جھنجھٹے جلانے کے ہیں (۱۱۶)۔ اَلزَّفِيرُ \*۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو بھی کہتے ہیں \*۔ (۲۵) اور اس کا اطلاق ناگہانی مصیبت کے لئے بھی ہوتا ہے \*۔ اَلزَّرَقَرُ \*۔ جو بوجھ کمر پر لدا ہوا ہے کہتے ہیں۔ مسافر کا سامان سفر۔ مشکیزہ جس میں چرواہا اپنے لئے پانی لے جاتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بوجھ اور آواز دونوں لکھے ہیں۔

## ز ف ف

اَلزَّفِيْفُ \*۔ کے اصلی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں۔ نیز شتر مرغ کی وہ تیز رفتار جس میں وہ چلنے کے ساتھ اڑنے کو بھی ملا دیتا ہے \*۔ زَفَفَ البَعِيْرُ \*۔ اونٹ نے چلنے میں تیزی کی۔ اَلزَّفَفُ زَفَفَ \*۔ تیز رفتار شتر مرغ، نیز خوش رفتار اونٹنی۔ اَلزَّفِيْفُ \*۔ بجلی کی چمک کو بھی کہتے ہیں۔ زَفَفَ الْعَرُوْسُ اِلٰى زَوْجِهَا زَفَا وَ زَفَاتَا \*۔ اس نے دلہن کو شوہر کے پاس پیش کیا \*۔ (اس میں پیش کرنے والوں کے شدتِ شوق کا پہلو نمایاں ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہر چیز میں پھرتیلا پن اور تیز خرامی کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَاتَّقَبَلُوْا اِلَيْهِ بِزَقْوٰنٍ (۳۶)۔ ”وہ اس کی طرف تیزی سے آئے“۔ (اس میں جذبات کی شدت کا پہلو نمایاں ہے)۔

## ز ق م

اَلزَّقْمُ \*۔ لقمہ بنانا۔ نکل لینا۔ اَزَقَمَهُ الشَّيْءُ \*۔ اس نے اسے کسوی چیز بطور لقمہ دی اور اسے نگلوائی \*۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَقَمَ اور تَزَقَّمُ سے مراد کسی ناپسندیدہ چیز کو نگلنا ہے \*۔ اَلزَّقْمُ \*۔ ایک جنگلی پودہ کا نام ہے جس میں کڑوی سی تیز بو ہوتی ہے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدعینت ہوتے ہیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے طَلَعَتْهَا كَانَقَةٍ رَّءُوْسُ الشَّيْطَانِ (۳۶)۔ اس کے خوشہ کا خول ایسا ہے جیسے سانپ کا پھن ہو۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ پودا ناگ پھنی تھوہر کا ہوگا۔ لیکن پودا کسوی بھی ہو، قرآن کریم نے جس کیفیت کے لئے تشبیہاً اس لفظ کا استعمال کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ ثعلب نے کہا کہ اَلزَّقْمُ \*۔ ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو زہریلا اور قاتل ہو \*۔ اور



صاحب محیط نے لکھا ہے \*۔ کہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ایسی چیز کھا لے یا کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لئے وبال جان بن جائے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ (۳۶/۲۶)۔ وہ ایک ایسا درخت ہے جو جہنم (جہیم) کی جڑوں میں اگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی سچے سچ کا درخت نہیں، کیونکہ جہنم کی جڑ میں کونسا درخت اُگ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اس قسم کا رزق ہے جس سے انسانیت جل کر راکھ ہو جائے۔ اس کے خوشے بڑے بڑے سرکش و مستبد لوگوں (شیاطین) کے سروں جیسے ہونگے۔ یعنی ظالم و استبداد سے حاصل کردہ رزق۔ اسی کو شَجَرَةٌ مَّتَلْعُوْنَ تَہ بھی کہا گیا ہے (۱۶/۱۶) اور طَعَامُ الْاٰثِيْمِ بھی (۲۴/۲۴)۔ یعنی ایسا رزق جس سے انسان کی قوتیں مضمحل اور صلاحیتیں افسردہ ہو جائیں اور وہ زندگی کی صحیح خوشگوازیوں سے محروم رہ جائے۔ یہ ان لوگوں کا رزق ہے جو اپنے آپ کو (بزعم خویش) بڑا صاحبِ عزت و تکریم سمجھتے ہیں (۲۴/۲۴)۔ یعنی مُتْرَفِيْنَ کا طبقہ (۵۶/۵۶) جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت اور حکومت کرنے کے خوگر ہوں۔ اس رزق سے پیٹ تو ضرور بھر جاتا ہے (۳۶/۳۶) لیکن انسانیت نشو و نما نہیں پاسکتی (۳۶/۳۶)۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جو الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَ تَہ (۱۶/۱۶) آیا ہے اور جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا، ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ شَجَرَةٌ خَبِيْثَةٌ ہو جس کا ذکر (۱۶/۱۶) میں آیا ہے۔ یعنی باطل فظریہٴ حیات۔ بہر حال یہ تمام بیانات تشبیہی ہیں۔

## زکریا علیہ السلام

قرآن کریم نے انبیائے بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت زکریاؑ کا نام بھی لیا ہے (۸۵/۸)۔ ان کے متعلق سورۃ آل عمران (۳/۳۷)۔ سورۃ مریم (۲۱/۱۵) اور سورۃ انبیاء (۲۱/۸۹) میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور ان کی بیوی عقیم۔ لیکن ان کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بیدار کر دی گئی (۲۱/۲۱) اور ان کے ہاں حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ حضرت مریمؑ کو انہی کی کفالت میں دبا گیا تھا (۳/۳)۔

لوقا کی انجیل میں ہے کہ ”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں اہلبیاء کے قبیلہ میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں

سے تھی اور اس کا نام الیشع تھا۔ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی کیونکہ الیشع بانجھ تھی۔“

تورات (عہد نامہ قدیم) میں ذکرِ باہ نام کے ایک نبی کا ذکر آیا ہے۔ اسرائیلیوں کے ہاں ہیکل کے ایک بہت بڑے منصب دار کو نبی کہتے تھے جس کا ترجمہ کاہن کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے نبی کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ حضرت زکریاؑ کو قرآن کریم نے زمرہٴ انبیاء کرام میں شمار کیا ہے۔

## زک و

زَكَاَ الْمَالُ وَالْزَّرْعُ - يَزْكُوْ - زَكُوًّا وَزَكِيًّا - جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا۔ پھولنا۔ بڑھنا۔ نشوونما پانا۔ اَزْكِيَّ اللهُ الْمَالَ وَزَكَاَهُ - خدا نے مال کو نشوونما دی۔ بڑھایا۔ زَكَاَ الرَّجُلُ يَزْكُوْ - آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا۔ اسکی صلاحیتوں میں نشوونما آگئی۔ اسکی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی۔\*

لہذا زَكَاَ کے بنیادی معنی نشوونما پانا۔ بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا ہیں۔ راغب نے اس کے یہ معنی لکھ کر اسکی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے۔ فَلْيَنْظُرْ آيَةُهَا اَزْكِيَّ طَعَامًا (۱۸/۱۹) یہ دیکھو کہ کونسا کھانا ایسا ہے جو حلال اور خوش انجام ہے، یعنی جس میں نشوونما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے، جو زیادہ (Nutritious) ہے۔

الزَّكْوَةُ کے معنی ہیں نشوونما۔ بالیدگی۔ پھولنا۔ پھلنا۔ اسکے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں۔ غالباً اسلئے کہ درختوں کی نشوونما کے لئے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اسکے بنیادی معنی نہیں۔ خود قرآن کریم میں (ابک ہی آیت میں) اَزْكِيَّ اور اَطْهَرَ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ اَزْكِيَّ لَكُمْ وَاَطْهَرَ (۲۴/۲۴)۔ اس میں اَطْهَرَ تو پاکیزگی کے لئے ہے اور اَزْكِيَّ نشوونما کے لئے۔ پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت (Negative Virtue) ہے۔ بمعنی نقائص اور خرابیوں سے دور رہنا۔ لیکن زَكْوَةُ ايجابية صفت (Positive Virtue) ہے۔ بمعنی بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ نشوونما اور بالیدگی حاصل کرنا۔ صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے اَلزَّكِيَّ کے معنی لکھے ہیں خیر و خوبی کے ساتھ بڑھنے والا۔ عمدہ

صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا۔ یعنی اس میں بالیدگی اور ارتقا کا پہلو مضر ہوتا ہے۔ اَرْضُ زَكَاةً کے معنی ہیں سرسبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو۔ اَرْضُ زَكَاةً کے معنی ہیں اَنْفَعٌ۔ زیادہ منفعت بخش۔۔۔ اسی اعتبار سے زکا اس عدد کو کہتے ہیں جو زوج (جوڑا) ہو۔۔۔

سورۃ کہف میں ہے کہ خدا انہیں ایسا بیٹا دیگا جو انکے پہلے بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً (۱۸/۱۸)۔ نَفْسًا زَكِيَّةً (۱۸/۱۸) کے معنی ہیں اچھا، عمدہ، جوان، نشوونما یافتہ لڑکا۔ دوسری جگہ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹/۱۹) آیا ہے۔ سورۃ الشمس میں زَكَاةً کے مقابلہ میں دَسَّهًا کا لفظ آیا ہے (۹۱/۹۱)۔ تَدْسِيَةً کے معنی ہوتے ہیں دبا دینا۔ کسی کو زندہ دفن کر دینا (۱۵۹/۱۵۹)۔ اُسکی نشوونما کو روک دینا۔ لہذا تَزَكِيَّةً کے معنی ہونگے ان تمام سوانح کو دور کر کے جو کسی کی راہ میں حائل ہوں، اسکی نشوونما کیلئے حالات کو مساعد کرنا۔

قرآن کریم میں اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاَتُوا الزَّكٰوةَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے بھی دو ستون ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کے مفہوم کے لئے (ص۔ ل۔ و کے عنوان میں) ”صلوٰۃ“ کا لفظ دیکھئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے ”ایتائے زکوٰۃ“۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا۔ اور (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس ”نشوونما“ میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِىْ اِلْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۲۲)۔ ”یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے“۔ یعنی اسلامی مملکت کا قریضہ ”ایتائے زکوٰۃ“ ہوگا۔ یعنی دوسروں کو نشوونما دیتا۔ اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ اسی کے

متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ مومن وہ ہیں ہم لِّلَّذِیْۤ اٰتٰہُ کُۡوۡرٌ فَاَعٰیۡلُوۡنَ (۲۳) جو زکوٰۃ (یعنی نوع انسان کی نشوونما) کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مملکت اسلامی (یا نظام خداوندی) اپنے اس عظیم فریضہ (نوع انسان کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کس طرح سے دیگی؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے (اولاً) ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہینگے تاکہ وہ رزق کی تقسیم لوگوں کی ضرورت کے مطابق کر سکے۔ اور (دوسرے یہ کہ) افراد معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اسے اس طرح کھلا رکھیں کہ مملکت اس میں سے جس قدر ضرورت سمجھے، ”ایتائے زکوٰۃ“، (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے۔ حتکہ اس ضمن میں یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ افراد کی ضروریات پورا ہونے کے بعد بچ جائے، عندالضرورت وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے ۲۱۹)۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو مملکت اسلامی کی تمام آمدنی ”ایتائے زکوٰۃ“ کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

لیکن اس قسم کا اسلامی نظام، بتدریج قائم ہوگا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیر تشکیل ہوگا، اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے بٹائینگے۔ یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائیں گے۔ ان کے لئے قرآن کریم نے ”صدقات“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ”صدقات“ اور ”زکوٰۃ“ کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ حتکہ قرآن کریم نے ”صدقات“ کے خرچ کی جو مددات بتائی ہیں (۹۰) انہیں بھی زکوٰۃ کے مصرف کی مددات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلامی نظام مملکت کے شعبے ہیں۔ انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسان جو کچھ ضرورت مندوں کو دیگا وہ خیرات ہوگی۔ اسلامی نظام میں خیرات لینے یا دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ حکومت لیتی ہے وہ مملکت کا ٹیکس ہوتا ہے، اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس ہے۔ ”قیصر اور خدا“ کی یہ تقسیم، عیسائیت کی ثنویت

(Dualism) کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام میں اسکی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام میں، جو مملکت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے، اسے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا ہی کو دیا جاتا ہے۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے عنوانات ”ر۔ ب۔ ب“۔ ”ن۔ ف۔ ق“ اور ”ص۔ د۔ ق“، بھی دیکھئے)۔

سورة النجم میں ہے فَلَا تَزْكُوا أَنْفُسَكُمْ۔ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ اتَّقَى (۵۳/۳۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ نہ کر لو کہ تمہارا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو رہا ہے۔ اس کے لئے معیار، خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى (۹۲/۱۸)۔ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (نوع انسان کی پرورش کے لئے) دیتا ہے۔ یعنی مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى (۹۲/۵)۔ ”جو دیتا ہے اور تقویٰ شعار بنتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے لئے راستے آسان ہو جاتے ہیں (۹۲/۱۲)۔

## زل ف

الزَّلَفُ وَالزَّلْفَى وَالزَّلْفَةُ۔ قرب۔ درجہ و مرتبہ۔ الزَّلْفَةُ۔ شروع رات یا مطلقاً رات کا ایک حصہ (چھوٹا ہوا بڑا)۔ جمع زَلَفٌ ہے۔ الزَّلَفُ۔ سیڑھیاں، جن سے انسان بلند بھی ہو جاتا ہے اور اپنی منزل سے قریب بھی۔ اس میں قرب اور مدارج دونوں آجاتے ہیں (دَرَجَةٌ۔ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں جو اوپر کی طرف لیجائے)۔ زَلَفٌ إِلَيْهِ۔ وہ اس کی طرف قریب ہوا۔ اَزَلَفَهُ۔ اسے قریب کیا، اکٹھا کیا۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز سے قریب ہونے کے لئے آگے بڑھتے جانا بتائے ہیں\*۔ راغب نے کہا ہے زَلَفٌ رات کی منزلوں کو کہتے ہیں\*\*۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک الزَّلْفَةُ۔ منزل کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً (۲۴/۲۴)۔ ”جب وہ اسے قریب دیکھینگے“۔ سورة سبا میں ہے تَقَرَّبْكُمْ عِندَنَا زُلْفَى (۳۳/۳۳) ”جو مرتبہ میں تمہیں ہم سے قریب تر کر دے“۔ سورة شعراء میں ہے وَأَزْلَفْنَا ثُمَّ الْآخِرِينَ (۲۱/۲۱) ”اور ہم وہیں دوسروں کو قریب لے آئے“۔ سورة هود میں ہے أَيْمَنَ الْمَقَالُوتِ طَرَفَى النُّجُومِ وَأَزْلَفْنَا مِنَ الْقَيْلِ (۱۱/۱۱) یعنی دن کے دونوں سرے اور رات کے کچھ حصے۔ (نیز دیکھئے عنوان د۔ ل۔ ک نیز ط۔ ر۔ ف)

## زلزل

زَلَّيْقٌ - يَزْلَقُ - زَلَقٌ - يَزْلِقُ - زَلَقًا - پھسل جانا - لغزش  
 کھا جانا - اپنی جگہ سے ہٹ جانا - اَلزَّلَقُ - سہاٹ زمین جس پر قدم پھسل  
 جائیں - جس پر کوئی ہودا نہ ہو - اَلزَّلَقَةُ - چکنی چٹان - آئینہ\* - سورۃ کہف  
 میں ہے فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا (۱۸/۱۸) - ”وہ صاف اور چکنا میدان رہ  
 جائے جس میں کوئی سبزی وغیرہ نہ ہو“ - آئینہ کی طرح صاف اور چٹیل ہو  
 جائے - اَزْلَقَ فُلَانًا يَبْصَرًا - اس کی طرف بہت تیز (ناراضگی کی) نگاہ  
 سے دیکھا - اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ آنکھوں آنکھوں ہی میں اسے  
 اس کے مقام سے ہٹا دیگا\* - سورۃ القلم میں کفار کے متعلق ہے لَيَزْلِقُنَّكَ  
 يَا بَصَارٌ هِمٌ (۱۸/۱۸) - ”وہ تمہیں اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں گویا  
 اپنی نگاہوں سے تجھے اپنے مقام سے پھسلا دینگے“ -

## زلزل (زلزل)

زَلَّيْلٌ - زَلِيلٌ - مَزَلَّيْلٌ - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اَلْمَزَلَّةُ  
 والمَزَلَّةُ - جس جگہ انسان پھسل جائے - اَزَلَّيْلٌ : اسے پھسلا یا (۲۶/۲۶) -  
 اَلزَّلَّةُ - لغزش کو کہتے ہیں - یعنی اپنی جگہ سے ہل جانا - چنانچہ قرآن  
 کریم میں یہ لفظ ثَبَّتَ کے مقابل میں آیا ہے (۱۶/۱۶) - ابن فارس نے کہا ہے  
 کہ ہر وہ لفظ جس میں زاء کے بعد لام آتا ہو، اُس کے بنیادی معنی ہٹنے کے  
 ہوتے ہیں - گفتگو میں لغزش کر جانے یا اپنی رائے سے ہٹ جانے نیز غلطی  
 کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - راغب نے کہا ہے کہ زَلَّةٌ -  
 اُس لغزش کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو - اَلْمَزَلَّةُ کے معنی ہیں کسی  
 کو اس کے مقام سے ہٹا دینے اور پھسلا دینے کا قصد و ارادہ کرنا (۱۸/۱۸) -  
 زَلِيلٌ کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کے بھی آتے ہیں -  
 قَتُوسٌ زَلَّاءٌ - وہ کمان جس سے تیر بڑی تیزی کے ساتھ نکل جائے -

زَلْزَلَةٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو تیزی کے ساتھ حرکت دیکر ہلا  
 دینا یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا\*\* - زَلْزَلٌ - يَزْلُزِلُ - زَلْزَلَةٌ  
 وَزَلْزَالٌ - اسے ہلایا\*\* - اِذَا زَلْزَلَتِ اِلْاَرْضُ زَلْزَالَتْهَا (۱۱/۱۱) -  
 ”جب زمین ہلا دی جائیگی جیسا کہ اس کا ہلانا (ہوگا)“

## زل م

الزَّلَٰتُمْ۔۔۔ الزَّلَٰتُمْ۔ تیر کی لکڑی جس کے پچھلے سرے میں ہر نہ لگائے گئے ہوں۔ (جمع از لَام)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دبلا ہٹلا اور سپاٹ یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں۔ پھر از لَام سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانہ جاہلیت میں فال نکالتے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دئے جاتے۔ ان میں سے ایک ہر اَفْعَلْ (کسر) دوسرے ہر لَا تَفْعَلْ (نہ کسر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے۔ اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے\*۔ اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی۔ اور (جوئے کے) چانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا (۵/۱۱)۔ (قرعہ اندازی کے لئے عنوان ق۔ ل۔ م بھی دیکھئے)۔ قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع کر دیا۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے۔ وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ (قوانین خداوندی)۔ قرآن کریم کے ضوابط کے اندر رہتے ہوئے اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے۔ یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم۔ لیکن اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ہاں فال لینا۔ قرعے ڈالنا "استخارے کرنا" (یعنی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تسبیح کے دانوں کے سپرد کر دینا) عام روش زندگی ہو گیا ہے۔ گری ہوئی قومیں اپنی قوت بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں، عقل و فکر کو بھی ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ ایک مرد مومن اچھی طرح جانتا ہے

کہ خاکِ زندہ ہوں میں تابع ستارہ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتفاقات اور حوادث کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اتفاقات اور حوادث کو اپنے پروگرام کے تابع لاتا ہے۔

## ز م ر

زَمْزَمْ - آواز۔ اَلزَّمْزَمَارَةُ و اَلْمِيزْمَارُ - بانسری۔ زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - بانسری بجانا۔

اَلزَّمْزَمَةُ (جس کی جمع زَمْزَمْ ہے) منتشر فوج اور جماعت۔ کیونکہ کوئی جماعت شور سے خالی نہیں ہوتی\*۔ یا انہیں یک جا کرنے کے لئے عموماً بگل (یا صور) سے کام لیا جاتا ہے۔ راغب نے اس کے معنی تھوڑی سی جماعت کئے ہیں\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ سَيُنْفِقُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زَمْزَمًا (۳۹)۔ جنہوں نے انکار کی روش اختیار کر رکھی ہے انہیں جہنم کی طرف گروہ درگروہ لے جایا جائیگا۔ (زَمْزَمْ کے لفظ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے)\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں (۱) چیز کی کمی۔ اور (۲) آواز۔

## ز م ل

اَلزَّمِيلُ - اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی۔ یز تمہارا رفیق سفر جو معاملات میں تمہاری مدد کرتا ہے۔ زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - زَمْزَمْ - اس نے اسے اپنے پیچھے سوار کر لیا یا کجاوے میں اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھا لیا۔ اَلزَّمِيلُ - بوجھ۔ اس سے اَزْدَمَلُ الْعِمْلُ کے معنی ہیں اس نے ایک بار میں سارا بوجھ اٹھا لیا۔ اَلْمُزَامَلَةُ - اونٹ پر دونوں طرف عموزن سواروں کا بیٹھنا یا عموزن بوجھ لادنا۔

ایک اونٹ پر بالعموم دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔ ایسے سفر میں سب سے اہم اور پہلا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک اونٹ پر ایسی دو سواریاں بٹھائی جائیں جو ہم وزن بھی ہوں اور ہم خیال بھی تاکہ ان دونوں میں طبعی اور ذہنی، دونوں انداز سے ہم آہنگی ہو۔ اگر ان کا وزن برابر نہ ہو تو سفر میں اونٹ کو اور خود سواروں کو بھی تکلیف ہوگی۔ اور اگر وہ ہم خیال نہ ہوں تو یہ سفر، سَقَر (دوزخ) بن جائیگا۔ سب سے اچھا سالار کاروان وہ ہوتا ہے جو زَمِيل چننے میں ماہر ہو۔



رسول اللہؐ کو جب وحی کے ذریعہ قرآنی نظام کا نقشہ مسجھا دیا گیا تو اس کے بعد ان کا سب سے اہم فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ رفقاءؓ کار کی تلاش کریں اور ان کے انتخاب میں زمیلاً نہ انداز اختیار کریں۔ اس لئے کہ اسے عظیم پروگرام کی کامیابی کا راز رفقاءؓ سفر کے صحیح انتخاب میں تھا۔ یہ تھا وہ فریضہ جس کی طرف آپؐ کی توجہ یا یثہا الثمۃؓ مثل (۳/۳۳) کہہ کر دلائی گئی۔ اس کے بعد جس قسم کی تزمیئل رسول اللہؐ نے کی، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

از دمل۔ تزمئل۔ وازئل۔ فی ثیابہ۔ کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کپڑوں میں لپٹ گیا۔ اس اعتبار سے الٹمئل مثل اسے کہتے ہیں جو معاملات میں لا پرواہی برتے اور کاموں میں کوتاہی کرے۔\*\* ظاہر ہے کہ یا یثہا الثمۃؓ مثل میں الٹمئل مثل کے یہ معنی نہیں لئے جاسکتے، اگرچہ حیرت ہے کہ راغب جیسے بالغ نظر نے بھی لکھ دیا ہے کہ یہ لفظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور کنایہ ہے کوتاہی کرنے والے اور معاملات میں لا پرواہی برتنے والے سے۔\*\* ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بوجھ اٹھالینے کے لکھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ آلزمیئل اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جب کوئی مشکل معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے بدن پر مزید کپڑے ڈال لے اور اس طرح کپڑوں کی گٹھڑی سی بن جائے اور الٹمئل امئلہ کے معنی ہیں اونٹ کے دونوں طرف ہم وزن بوجھ لادنا۔ اس اعتبار سے الٹمئل مثل کا صحیح مفہوم یہی ہوگا کہ جو فریضہ تزمیئل میں بہت زیادہ احتیاط برتے اور سرگرمی دکھائے۔ آلزمئل بوجھ کو بھی کہتے ہیں اور از دمل الحیمل کے معنی ہوتے ہیں اس نے سارے بوجھ کو ایک دم لاد دیا۔\* اس اعتبار سے مزمیئل وہ ہوگا جو بار رسالت کو نہایت حسن و خوبی سے اٹھائے۔ کشاف میں عکرمہ کے حوالہ سے ہے کہ یا یثہا الثمۃؓ مثل کے معنی ہیں اے امر عظیم اٹھالینے والے۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے والے۔ تفسیر خازن نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ تستری نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ الٹمئل مثل کے معنی ہیں وہ شخص جس نے اپنے آپ کو خدا کا ہم رنگ کر لیا ہو۔ یہ رفاقت کی انتہائی شکل ہے۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) میں ہے کہ اس کے معنی مزمئل بالقرآن ہیں۔ یعنی قرآن کا بار اٹھانے والا۔ حامل قرآن۔ یہ معنی قرطبی نے بھی دئے ہیں اور کہا ہے کہ اسے حضرت ابن عباسؓ نے روایت

کیا ہے۔ بہر حال، نبی اکرمؐ کو جو یَا یٰسَہَا الٰہُ مَرْثٰیؑ کہہ کر ہکا را گیا ہے تو اس میں حضورؐ کے عظیم القدر قرائض رسالت کی طرف اشارہ ہے جن کا مقصد جماعتِ مومنین کو ساتھ لیکر دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کرنا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ لفظ مَرْثٰیؑ باب تَفَتُّعِل سے ہے۔ اصل اس کی مَرْثٰیؑ متلؑ تھی۔

## زنم

الزَّمْهَرُ یُرُّ - سردی کی شدت۔ نیز چاند کو بھی کہتے ہیں\*۔  
اَزْمَهْرَ الْیَوْمِ - دن سخت سرد ہو گیا۔ اَزْمَهْرَ الْوَجْہِ - چہرہ بری طرح بگڑ گیا اور دانت دکھائی دینے لگے۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے کہ لَا یَرَوْنَ فِیْہَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرًا یُرًّا (۱۳۱)۔ اس میں نہ تو سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی۔ ویسے اَلْمَرْثٰیؑ کے معنی ہیں ہنستے ہوئے دانتوں والا\*۔ غالباً سردی سے دانت بجنے سے طنزاً لیا گیا ہے۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے ”ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ زَهْرٌ سے ہو جس میں سیم زیادہ کر لی گئی ہو۔ زَهْرٌ کے معنی چمکنے کے ہوتے ہیں۔ اَزْمَهْرَاتِ الْکُتُوَاکِیْبِ - ستارے چمکے۔“ جب سردی زیادہ ہو تو ستارے زیادہ روشن اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔

## زنجیل

الزَّنَجَبِیْلُ - ادراک یا سونٹھ کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ اعلیٰ درجہ کی خوشبودار چیز شمار ہوتی تھی\*\*۔ صاحب محیط کا خیال ہے کہ یہ فارسی لفظ شَنَکَبِیْل کا معرب ہے\*\*\*۔ (یہ لفظ شَنَکَبِیْل نہیں بلکہ شَنَکَبِیْر ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کَانَ مِزَاجُہَا زَنَجَبِیْلًا (۱۴۱) ”اسکی مِلوئی سونٹھ کی ہوگی“۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (م۔ ز۔ ج) دیکھئے۔

## زنم

ابن فارس نے کہا ہے کہ زَنْم کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ لٹکا دینے کے ہیں۔

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج۔ \*\*\* محیط۔

الزَّانِيَةُ\*۔ وہ شخص جو کسی قبیلہ سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اسکے ساتھ ہونہی ملحق ہو\*۔ جیسے بکری کے گلے میں جونک کی طرح دو تھن سے لٹک رہے ہوتے ہیں جنہیں زَنَمَتَا الْعَنْزِ کہتے ہیں۔ عربوں میں نسب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کا نسب کچھ اور ہو (یا معلوم ہی نہ ہو) اور وہ ہونہی کسی قبیلہ کے ساتھ متمسک ہو جائے، وہ ذلیل اور کمینہ شمار ہوتا تھا۔ اسی لئے الزَّانِيَةُ\* کمینے آدمی کو کہتے تھے جو اپنی کمینگی اور شرارت میں بدنام ہو\*۔ الزَّانِمَةُ\*۔ ایک درخت جس پر پتے نہیں ہوتے\*۔ قرآن کریم میں زَنِيْمٌ کا لفظ (۱۸/۱۳) میں آیا ہے۔

## ز ن ی

زَنِي۔ يَزْنِي\*۔ زِنَى\*۔ زِنَاء\*۔ اس نے بدکاری کی\*\*۔ بلا عقد معروف کسی سے جنسی اختلاط کیا۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانِيَةَ (۱۳/۴)۔ ”زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ،“۔ یعنی یہی نہیں کہ زنا نہ کرو بلکہ مبادیات زنا تک کے بھی پاس نہ جاؤ۔ سورۃ فرقان میں ہے وَلَا يَزْنِ ثَوْنٌ (۲۵/۱۸)۔ ”زنا نہیں کرے،“۔ الزَّانِيَةُ\*۔ زنا کرنے والا مرد۔ الزَّانِيَةُ\* (۲۴/۲) زنا کرنے والی عورت۔ ان میں سے ہر ایک کی سزا سو سو کوڑے ہیں۔ (۲۴/۲)۔ البتہ اگر یہ جرم ایسی شادی شدہ عورت سے سرزد ہو جو پہلے لونڈی رہ چکی ہو (زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق\*\*\*) تو اس کی سزا اس سے نصف ہے (۲۵/۲)۔ اس لئے کہ لونڈیوں کی پرورش اور تربیت جس ہست ماحول میں ہوتی تھی اس سے ان میں اس بلندیِ کردار کی توقع رکھنا جو بلند، شریف اور پاکیزہ ماحول میں پیدا ہوتا ہے، زیادتی تھی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انسان کی اضطراری کمزوریوں پر کس قدر نگاہ رکھتا ہے۔

سنگساری (رجم) کی سزا قرآن کریم میں نہیں۔

ہمارے زمانے میں اس مسئلہ پر بڑی تحقیق ہوئی ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کے عروج و زوال پر کس قدر گہرا اثر پڑتا ہے اور جو قومیں مردوں اور عورتوں کی عفت کی پرواہ نہیں کرتیں وہ تہذیب و تمدن کی کس ہست سطح پر آجانی ہیں۔ (اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب میری کتاب سلیم کے نام خطوط، جلد سوم میں متعلقہ خط ملاحظہ فرمائیں)۔

\*تاج\*\*تاج و راغب۔\*\*\*قرآن کریم نے غلام اور لونڈیوں کے وجود (Institution) ہی کو ختم کر دیا۔ تفصیل م۔ ل۔ لک کے عنوان میں ملے گی۔

## ز ہ ر

زَهْدٌ (رَفِیْ وَعَنٌ) یَزْهَدُ - زَهْدًا - بے رغبت ہونا \*۔ کسی چیز سے اعراض برتنا اور اسے چھوڑ دینا \*۔ اس سے فاعل زَاهِدٌ ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ اہل قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا۔ اس لئے کہ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ (۱۲)۔ وہ حضرت یوسفؑ میں کچھ زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اَلزَّهِيْدُ - قلیل اور حقیر \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی کمی کے ہیں۔ اَلزَّاهِدُ وَالزَّهِيْدُ - تنگ اخلاق آدمی - کم خور آدمی \*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ زَهْدٌ دراصل کسی چیز کی طرف میلان چھوڑ دینے کو کہتے ہیں \*\*۔

زُهْدٌ یا زاهدٌ کا لفظ جن معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ یہ تصوف کی اصطلاح ہے جس میں دنیا سے بے رغبتی کو بڑی فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ (خود تصوف ہی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی ہودا ہے) قرآن کریم کی رو سے مومن کا فریضہ دنیا کی تسخیر ہے اور اس کی خوش گواہیوں سے متمتع ہونا اس کا حق۔ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ”ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے“ (۲۴)۔ مومن صرف ان چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جن سے خدا نے روکا ہے۔ ان کے علاوہ، وہ دنیا کی ہر چیز سے قائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے کام میں لاتا ہے۔

## ز ہ ر

اَلزَّهْرَةُ - اَلزَّهْرَةُ - ہودا - ہودے کا پھول - بعض نے کہا ہے کہ زَهْرَةٌ صرف کھلے ہوئے پھول کو کہا جاتا ہے۔ اَلزَّهْرَةُ مِّنَ الدُّنْيَا - دنیا کی سرسبزی و تازگی - حسن و زیبائش - شگفتگی و شادابی - حسان زیب و زینت - (۲۳)۔ اَلزَّهْرَةُ - سفیدی \*۔ حسن - درخشندگی - اَلزَّهْرَةُ بَقَاتٌ مِّنْ اَلْاَبْقَامِ - بہار کے دن \*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن - روشنی - اور صفائی پر دلالت کرتے ہیں۔

## زھق

زُھَوِّقٌ\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی دشواری کے ساتھ نکلنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ زُھَمَّتِ الشَّفْطُ کا مطلب یہ ہے کہ جان بمشکل نکلی\*۔ الْقَظَاهِقُ\*۔ ہوئے جانور کو کہتے ہیں جس میں گودا ہو\*\*۔ نیز اس جانور کو بھی جب بہت لاغر ہو۔ اس طرح یہ لفظ اُضداد میں سے ہے۔ الْقَظْهُوِّقُ\*۔ گہرے کنویں کو بھی کہتے ہیں اور بلند پہاڑوں کے درمیانی راستے کو بھی\*\*۔ لیکن تیزی سے ہو یا دشواری اور سستی سے، اسکے معنی کسی چیز کے نکل جانے کے ہوتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے۔ گزر جانے اور تجاوز کر جانے کے ہوتے ہیں۔ زُھَمَّتِ الرَّاحِلَةُ زُھَوِّقًا۔ اونٹنی گھوڑوں سے آگے نکل گئی۔ زُھَقَ الشَّهْمُ زُھَوِّقًا۔ تیر نشانے سے آگے نکل گیا۔ زُھَمَّتِ نَفْسُهُ\*۔ اسکی جان نکل گئی\*\*۔ تَزُھَقُ أَنْفُسُهُمْ (۱۵)۔ ”ان کی جانیں نکلیں“۔ الْقَظَاهِقُ\*۔ شکست خوردہ آدمی کو کہتے ہیں\*\*۔ الْقُحْرُھَقُ\* مقتول کو کہتے ہیں۔ زُھَقَ الشَّيْءُ\*، کوئی چیز تباہ و برباد ہوئی، مضحمل ہوئی\*\*۔

قرآن کریم میں باطل کے متعلق ہے فَادَّآهُوَ زَاهِقٌ\* (۲۱۸)۔ ہر وہ نظریہ یا پروگرام جو حق کے خلاف، تخریبی نتائج کا حامل ہو، ناکام و نامراد رہتا ہے۔ مٹ جاتا ہے۔ شکست کھا جاتا ہے۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزُھَقَ الْبَاطِلُ\*۔ ”اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زُھَوِّقًا“ (۱۸۱) اور کہو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل ہوتا ہی مٹنے والا ہے۔ یہاں زُھَوِّقُ کے معنی زَاهِقُ ہی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ۔ باطل اسوقت تک رہتا ہے جب تک حق (خدا کا تعمیری نتائج پیدا کرنے والا پروگرام) نہیں آتا۔ اس کے آنے سے باطل شکست کھا کر مٹ جاتا ہے۔ اس کے اندر حق کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ مزید تفصیل (ح۔ ق۔ ق) اور (ب۔ ط۔ ل) کے ہنوانات میں دیکھئے۔

أَزْھَمَّتْ الْأَنْعَاءُ کے معنی ہیں، میں نے برتن کو الٹ دیا\*\*۔ اس سے بھی اس کے معنی واضح ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ زُھَمَّتْ نَفْسُهُ کے معنی ہیں رنج و غم سے اسکی جان نکل گئی\*\*\*۔

## زوج

زَوْجٌ\*۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں (جیسے جوئے کے دونوں پاؤں)۔ یا ایک دوسرے کے مقابل ہوں (جیسے دن اور رات) وہ زَوْجَانِ

کہلاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی زوجہ ہوتی ہے۔ زوجہ کے اصلی معنی جوڑ کے ہیں۔ فرد (اکیلا) کے خلاف۔ لہذا زوجہ اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑ (یا ساتھی) ہو۔ خواہ اس کی مثل یا اس کے مقابل۔ زوج الشقیۃ ببالشقیۃ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو اس جیسی چیز کے ساتھ ملا دیا (باندھ دیا)۔ وَاِذَا التَّفْسُوسُ زُوِّجَتْ (۸۱) کے معنی ہیں جب ہر انسان اپنے ہمجماعت یا ہم مذاق کے ساتھ ملجائیکا۔ اور زُوِّجْنَاہُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ (۵۳) کے معنی ہیں انہیں حور عین کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائیکا۔ ساتھی بنا دیا جائیکا۔ (حُور کے معنی ح۔ و۔ ر) کے عنوان کے تحت دیکھئے)۔ اسی اعتبار سے ہر شے کے اشغال و نظائر (یعنی ایک ہی قسم کی چیزوں کو) ازواج کہتے ہیں\*۔ اُحْشَرُوا الذِّیْزَ ظَلَمُوا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۴) کے معنی ہیں ظلم کرنے والوں کو اور ان کی ہم کار پارٹیوں کو اکٹھا کرو۔ (یعنی ان کے مثل و نظیر اور لوگوں کو جو ان جیسے ہیں)۔ اسی طرح قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق مختلف مقامات میں آیا ہے کہ لَہُمْ فِیْہَا اَزْوَاجٌ مِّطَہَّرَۃٌ (۵۵) تو اس کے معنی نیک بیویاں ہی نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں پاکیزہ خیالات رکھنے والے ہم مشرب ساتھی۔ جنتی معاشرہ میں قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ چونکہ اس معاشرہ میں مرد بھی ہونگے اور عورتیں بھی، اس لئے ازواج میں میاں بیوی بھی شامل ہونگے۔ واضح رہے کہ جو جنتی معاشرہ دنیا میں قائم ہوگا اس میں میاں بیوی کے تعلقات میں افزائش نسل کا مقصد بھی شامل ہوگا۔ لیکن جنت آخرت میں میاں بیوی کی مواصلت یا افزائش نسل کا تصور قرآن کریم سے نہیں ملتا۔ لہذا وہاں کی (مردوں اور عورتوں کی) زوجیت، باہمی رفاقت (Companionship) کی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت آخرت کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے وہاں کی نعمتوں کا تمثیلی بیان ہے۔ اسے یہاں کے اندازِ زیست پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ وہاں کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔

انہی معانی کی بنا پر زوجہ\*۔ ہر شے کی قسم اور نوع و صنف (Species) کو کہتے ہیں\*۔ ازواجنا میںہم (۲۳۱) کے معنی ہیں قسم قسم کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ۔ یا طرح طرح کی چیزیں جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ کَمْ اَنْبَتْنَا فِیْہَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَثْرَہُمْ (۲۱) کے معنی ہیں ہم نے زمین میں ہر عمدہ نوع کی کتنی چیزیں پیدا کی ہیں۔ (دوسرے

نباتات میں نرمادہ کا ہونا ثابت ہے اور بعض جمادات کے متعلق بھی ایسا خیال کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ آخِرُ مِّنْ شَكَايَةٍ أَزْوَاجُ (۳۸/۵۸) اس کے معنی ہیں اس کے علاوہ اسی قسم کی اور رنگا رنگ سزائیں۔ وَ مِّنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱/۲۹) کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہم نے ہر نوع کی ایسی چیزیں تخلیق کی ہیں جو ایک دوسرے سے وابستہ اور ملتی جلتی ہیں۔ خواہ ایک دوسرے کے ہم رنگ ہوں اور خواہ ایک دوسرے کی ضد۔ مثلاً آسمان زَوْجٌ ہے زمین کا۔ سردی زَوْجٌ ہے گرمی کی۔ اور جوئے کا ایک پاؤں بھی زَوْجٌ ہے دوسرے پاؤں کا۔ زَوْجٌ کے معنی ایسے فرد کے بھی ہیں جس کا ساتھی یا نظیر و مثیل ہو۔ یعنی یہ لفظ دو ساتھیوں میں سے ہر ایک فرد کے لئے بھی اسی طرح مستعمل ہے جس طرح ان دونوں کے لئے۔ کبھی دونوں کے لئے زَوْجَانِ بھی بولتے ہیں\*۔

ازْدَوْجٌ۔ اور تَزْأَوْجٌ۔ وزن یا جمع ہندی کے لئے کسی فقرے کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنا، یا دو قضیوں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا\*۔ زَوْجٌ (جمع ازْوَاجٌ)۔ رفیق۔ ایک دوسرے کے ساتھی\*۔ زَوْجٌ (جمع ازْوَاجٌ) کے معنی شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زَوْجٌ\*\*۔ ان میں سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کا نام ہے از دواجی زندگی۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان (ل۔ ب۔ س) (۱۳۸/۱۳۸) میں ازْوَاجًا کے معنی بیویاں ہیں۔ تَزْوَاجُتُ اسْرَآةٌ کے معنی ہیں ”میں نے ایک ہورت سے شادی کی“۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن کریم کی رو سے از دواجی زندگی کس قسم کی زندگی ہوتی ہے تو اس کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ تَزْوَاجُتُ النِّوْمُ کے معنی ہیں نیند آنکھوں میں گھل مل گئی\*\*\*۔ لہذا میاں بیوی کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے۔ (نیز دیکھئے عنوان، ن۔ ک۔ ح)۔ اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں مردوں کے ساتھ ہورتیں (بیویاں) بھی ہونگی لیکن وہ بھی قلب و نگاہ کی پاکیزگی کو لئے ہوئے ہونگی اور سفر زندگی میں ایک رفیق کی طرح ساتھ چلنے والیاں۔ قرآن کریم نے ان رفقاء حیات کی خصوصیات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ باقی رہی مرنے کے بعد کی جنت، سو (جیسا کہ اجمالاً اوپر کہا گیا ہے اور تفصیلاً ج۔ ن۔ ن کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر

اسکی کیفیات کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے ساتھیوں کی کیسی کیفیت ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم رنگ اور ہم آہنگ ساتھی کا مل جانا، جنت ہے۔

## ز و د

الزَّادُ۔ موجودہ ضرورت سے زائد چیز کو کہتے ہیں جسے دوسرے وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لیا جائے\*۔ نیز اس کے معنی کھانے کے ہیں خواہ سفر کا ہو یا حضر کا\*\*۔ بالخصوص وہ کھانا جو سفر کے لئے تیار کیا جائے، توشہ\*\*\*۔ اَلْعِزُّوْدُ۔ توشہ دان کہو کہتے ہیں\*\*۔ زَوْدٌ تَشْهُ تَزْوِدًا۔ میں نے اسے زاد راہ دیا۔ تَزْوِدٌ: اس نے توشہ ساتھ لیا\*\*۔

قرآن کریم میں حج کے سلسلہ میں ہے وَ تَزْوِدُوا (۱۹۷)۔ جانے سے پہلے اپنے زاد سفر کا انتظام کر لیا کرو۔ (بونسی اٹھ کر نہ چل دیا کرو) اس لئے کہ فَارِسٌ خَيْرُ الزَّادِ التَّقْوَى (۱۹۷)۔ جب تم زاد سفر لے کر چلو گے تو اس سے تم دوسروں کے دست نگر ہونے سے بچ جاؤ گے۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تَزْوِدٌ کے معنی کسی اچھی چیز کو ادھر سے ادھر لے جانا ہیں۔

## ز و ر

الزَّوْرُ۔ سینے کا بالائی حصہ جہاں سینے کی تمام ہڈیاں اکٹری مل جاتی ہیں۔ جو شخص کسی کو ملنے کے لئے آتا ہو اسے بھی الزَّوْرُ کہتے ہیں۔ زُرْتَهُ۔ میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا، توجہ سے اس کا قصد کیا، اس سے ملا۔ الزَّوْرُ۔ التَّزْبَارَةُ۔ اَلْعِزَّارُ۔ ملاقات کرنا۔ زیارت کرنا۔ الزَّوْرُ۔ سینے کا ٹیڑھا پن اور ایک طرف کھجکا ہونا۔ اَلْاَزْوَرُ۔ وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ہو۔ جو چلنے میں سینہ کو ایک طرف زیادہ جھکا کر چلتا ہو۔ نیز کنکھیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اس لفظ کے معنی ایک طرف جھک جانے کے آتے ہیں۔ نیز سیدھے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو جانے کے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف کسو ہٹ جانے کے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے تَزَاوَرُ عَيْنٌ كَتَفْهِيمٌ (۱۸)۔ "سورج ان کے غار سے ایک



طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ ”زَوَّرَ عَنْهُ“۔ وہ اس سے ہٹ گیا۔ اسی سے الزَّوْرُ جھوٹ کو کہتے ہیں۔ حَبْلٌ لَّهٗ زَوْرٌ۔ رسی جس میں ہٹ ہو\*۔ سورۃ حج میں ہے وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جھوٹی اور بناوٹی بات سے بچو۔ لیکن اصل کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی حرکت۔ انسان کا ہر وہ قدم جو صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے، زَوْرٌ میں آجائیکا۔ اسلام، حرکت کا نام ہے۔ یہ ایک تحریک ہے۔ لیکن یہ حرکت ہلاتین منزل نہیں کہ جس طرف جی چاہا قدم اٹھا دیا۔ یہ حرکت ہے ایک متعین منزل کی طرف۔ اسلئے اس میں زَوْرٌ کا کوئی کام نہیں۔ اس کی تشریح اگلی آیت نے کر دی جہاں فرمایا حَسْبَاءَ لِلّٰہِ (۲۱)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اُس نصب العین کی طرف چلنا جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ غَيْرَ مُشْرِئِمْ بِهِم (۲۲)۔ اس میں کسی اور خیال، جذبہ اور میلان کی آمیزش نہ کرنا۔ اسی کو سورۃ فرقان میں ظَلُمًا وَّ زَوْرًا (۲۵) کہا ہے۔

”کَلَامٌ مُّزَوَّرٌ“۔ بنائی ہوئی اور جھوٹ کا ملمع کی ہوئی بات۔ زَوَّرَ الشَّيْءَ کے معنی ہیں کسی بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنا دیا۔ باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے۔ اس لئے تَزَوَّرَ کے معنی زَوْرٌ کو دور کرنے کے بھی ہیں اس کو اصلاح کہتے ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ کسی چیز کو سدھارنا، خواہ وہ خیر ہو یا شر، تَزَوَّرَ کہلائیگا\*\*۔ ملنے کے معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۱۲) میں آیا ہے۔ جہاں کہا ہے حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملو۔

## زول (زیل)

زَالَ - يَزُولُ وَ يَزَالُ - زَوَّالٌ - کسی چیز کا جساتے رہنا۔ تبدیل ہو جانا۔ مضمحل ہو جانا۔ ایک طرف ہٹ جانا۔ دور ہو جانا۔ جدا ہو جانا۔ باز آ جانا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اُسُسَاکَتِ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵) جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا۔ ”یقیناً اللہ (کا نانوں) آسمانوں کو اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں۔ الگ الگ نہ ہو جائیں“۔ زَيَّلَ - الگ الگ کر دینا\*۔

لَا يَزَالُ الْوَنَ (۲/۱۶) - وہ ہمیشہ اس حالت میں رہینگے - کبھی باز نہیں آئینگے۔ فَرَزَ يَلْزَمُنَا بَيْنَهُمْ (۱/۲۸) - ہم ان میں جدائی ڈال دینگے۔ لَوْ تَزَيَّلُوا (۲/۵) - اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

راغب کا کہنا ہے کہ زَوَالٌ اس چیز کی حرکت کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو اور بعد میں ثابت نہ رہی ہو\*۔ (اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو)۔

## ز ی ت

زَبْتٌ (۳/۵) - زیتون کا تیل - زَبْتُونَةٌ (۳/۵) - زیتون کا ایک درخت - بسا اس کا ایک پھل\*\* - (۲/۹) - اسے بڑا نفع بخش اور مفید درخت سمجھا جاتا ہے\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَالَّتَيْنِ وَالْقَزَيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ (۱/۳) - اس میں الْقَزَيْتُونُ - زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے\*\*\*\*۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اور أَلَيْتَيْنِ - حضرت نوحؑ کی بعثت کا مقام ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی دعوت - اور حضرت موسیٰؑ اور محمد عربیؑ کی دعوت - یہ سب آسمانی دعوتیں اس حقیقت کبریٰ کی شاہد ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ الْخ (۱/۵)۔

## ز ی د

زَبَدٌ کے معنی ہیں نشو و نما پانا - بڑھنا اور پھولنا پھلنا - یعنی زیادہ ہونا - نیز یہ متعدی بھی آتا ہے۔ زَادَ اللَّهُ خَيْرًا - اور زَبَدٌ کے معنی زیادہ دینا اور زیادہ کرنا ہیں\*\*۔ اَزْدَادٌ اَزْدَرِيَادٌ - زیادہ ہونا یا زیادہ کرنا (لازم و متعدی)\*\*\*۔

سورة رعد میں اَزْدَرِيَادٌ کے مقابل غَيِثٌ کا لفظ آیا ہے (۱۳/۸)۔ غَيِثٌ کے معنی کم ہو جانے یا اندر چلے جانے اور جذب ہو جانے کے ہیں۔ سورة يونس میں زَرِيَادَةٌ کا لفظ آیا ہے (۱۰/۶)۔ اور (۳۵/۵) میں مَزْبَدٌ ہے۔ یعنی وہ اضافہ اور زائد چیز جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد اس میں بڑھائی جائے۔ سورة آل عمران میں ہے ثُمَّ اَزْدَادُوا كُفْرًا (۳/۸۹)۔ اس کے معنی زیادہ ہونے، بڑھ جانے کے ہیں۔

\* راغب - \*\* تاج - \*\*\* محیط - \*\*\*\* لطائف اللغة - نے اسے جبل الشام لکھا ہے۔

سورة احزاب میں (حضرت) زَیْدٌ کا نام آیا ہے (۳۳)۔ یہی ایک صحابیؓ ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ یہ حارثہ کے فرزند اور نبی اکرمؐ کے خادم اور محبوب متبنیؑ تھے جن سے آپؐ نے اپنی بیوی بھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح کر دیا تھا۔

الزاد کے لئے عنوان ”ز۔و۔د“ دیکھئے۔

## زی غ

زَاغٌ - یُزَاغُ - زَبْغٌ - ایک طرف کو جھک جانا۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ - سورج مائل بزوال ہوا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اگرچہ زَاغٌ مَالٌ اور زَاغٌ قریب قریب ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن زَاغٌ صرف اس ہٹ جانے اور جھک جانے کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف ہو\*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں زَبْغٌ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی ایک طرف جھک جانے کے ہیں سوائے زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے کہ اس میں نگاہوں کے اوپر اٹھے یا کھلے رہ جانے کے معنی ہیں\*\*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (۶۱)۔ جب وہ صحیح راستے سے ہٹ گئے تو خدا کے قانون مکافات نے ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

یہ آیت قرآنی تعلیم کی ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اس نے جنہیں گمراہ کرنا ہوتا ہے ان کے دلوں پر مسہریں لگا دیتا ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ قہور قرآن کریم کی تعلیم اور خدا کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے کہ اسے سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے یا کجروی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس قسم کا وہ فیصلہ کرتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کجروی اختیار کرتا ہے تو اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں غلط طریق پر چل کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے یُؤْتِكُ عَنْهُ مَنَ اُفْیَکَ (۵۱) ”حق سے اس کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہتا ہے“۔ خدا کا قانون یہ نہیں کہ ایک شخص حق سے پھرنا چاہتا ہے لیکن خدا اسے زبردستی حق پر قائم رکھتا ہے۔ یا

ایک شخص حق پر قائم رہنا چاہتا ہے اور خدا اسے حق سے بھرا دیتا ہے۔ حق سے اسی کو بھرایا جاتا ہے جو خود اس سے بھرنا چاہے۔ دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا قانون اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا انسان کا فیصلہ، ویسا خدا کا قانون۔ اقبال کے الفاظ میں

خاک شو نذر ہوا سازد تر سنگ شو پر شیشہ اندازد ترا

جیسا انسان خود، ویسا خدا کا قانون۔ آنکھیں بند کر لو، اندھیرا ہو جائے گا۔ کھول لو، نظر آنے لگ جائیگا۔

سورة النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (۸۳/۱) نہ تو آپکی نگاہ، حقیقت سے کسی اور طرف کو ہٹی اور نہ ہی حد سے تجاوز کر گئی،۔ مَا طَغَى نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں رسولؐ کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ جو حد خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ سورة مَبَا میں ہے وَمَنْ يَزِغْ يَنْزِغْهُمْ عَنْ أَسْرِنَا (۳۴/۱)۔ یہاں اسکے معنی حکم سے بھرنے یا حکم عدولی کرنے کے ہیں۔

عذاب کے وقت آفراتفری کے سلسلہ میں زَاغَتْ الْأَبْصَارُ کے الفاظ آئے ہیں (۳۳/۱)۔ اس کے یا توبہ معنی ہیں کہ خوف کے وقت نگاہیں ایک مقام پر جمی نہیں رہتیں بلکہ ادھر ادھر ہٹ جاتی ہیں۔ اور یا (جیسا کہ صاحب محیط نے لکھا ہے) اسکے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں اوپر کو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ بہر حال مقصد خوف و ہراس کی کیفیت بیان کرنا ہے۔

کسی کی طرف سے نگاہیں بھر جانے کیلئے یہ الفاظ (۳۸/۱) میں آئے ہیں۔ اور زَیْغٌ بمعنی کجی، باطل کی طرف جھکاؤ، کجروی، (۳/۱) میں۔ یعنی توراتی تعلیم کے نقطہٴ ماسکہ پر مرتکز رہنے کے بجائے، ادھر ادھر ہٹ جانا۔ کسی اور طرف نکل جانا۔ اپنے میلانات اور رجحانات کے پیچھے چلے جانا۔ یہ روش زندگی بڑی تباہ کن ہے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ہمارے قلبی اور ذہنی میلانات و عواطف کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں قرآن کریم کے مرکز سے ادھر ادھر کبھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔ حق وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمارے جذبات و میلانات چاہتے ہیں۔ جو شخص پہلے سے کچھ خیالات یا عقائد ذہن میں رکھ کر قرآن کریم کی طرف اس مقصد سے جائے کہ قرآن کریم سے ان عقائد کی تائید حاصل کرے (خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں) اسے قرآن کریم سے کبھی صحیح راہ نمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن کریم سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے ادراک کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زینچ کو ہدایت کی ضد قرار دیا ہے (۳۰)۔ (مذہب تشریح ح۔ ک۔ م کے عنوان میں مَعَاذِکُم کے تحت دیکھئے)۔

## زی ل

دیکھئے عنوان ”ز۔ و۔ ل“۔

## زی ن

الزینۃ۔ وہ چیز جس سے آرائش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ خود کسی چیز کا نگاہ میں حسین معلوم ہونا بھی زینت کہلاتا ہے۔ زینۃ۔ کسی چیز کو آراستہ کرنا۔ کسی چیز (یا بات) کو خوشنما بنا کر دکھانا۔ ابلیس نے کہا تھا کہ لَا زینۃ لہم فی الارض (۱۵)۔ میں (انسان کو) اسکی طبعی زندگی (حیات ارضی) اسقدر خوشنما بنا کر دکھاؤں گا کہ یہ اسی کو نصب العین حیات بنا کر بیٹھ جائیگا۔ یعنی اسکا تصور حیات بالکل مادہ پرستانہ (Materialistic) ہو جائیگا۔ ازینۃ۔ آراستہ پیراستہ ہونا۔ مزین ہونا۔ (۱۶)۔ یوم الزینۃ (۱۷) بناؤ سنگھار کا دن۔ تہوار۔ روز جشن۔ قصہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ اَوْ زَارَ امینُ زینۃ القوم (۱۸) آیا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن سے وہ قوم اپنی آرائش کرتی تھی۔ دوسری جگہ اسی کو حُلِیِّہِمْ (۱۹) کہا گیا ہے۔ یعنی ان کے زیورات۔

قرآن کریم، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اسلئے وہ انسان کو نہ صرف اجازت دیتا ہے کہ وہ زیبائش و آرائش کی چیزوں سے اپنے اور کائنات کے حسن میں اضافہ کرے بلکہ اسکا حکم دیتا ہے کہ خذُوا زینۃکم عیندَ کلِّ مَسْجِدٍ (۲۰)۔ ہماری اطاعت گزاروں میں حسن و زینت کو اختیار کرو۔ جو لوگ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق بڑی سختی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زینۃ اللہ الَّتِیْ اُخْرِجَ لِعِبَادِهِم (۲۱)۔ ان سے کہو کہ زیبائش و آرائش کی جن چیزوں کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے؟ اس نے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ

اِنَّا جَعَلْنَاهَا مَاعَلٰی الْاَرْضِ زُرْنٰهَا لَهَا (۱۸)۔ جو کچھ زمین میں ہے سب اس کے لئے وجہ زینت ہے۔ اس لئے زمین میں جو کچھ بھی زینت و آرائش کا سامان ہے، سب انسان کے حسن و زیبائش کے لئے ہے۔ کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ البتہ اس اہم حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہی چیزیں زندگی کا نصب العین نہیں بن جانی چاہئیں (۱۹)۔ انہیں اصل نصب العین کے حصول میں مددگار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ یا یوں سمجھئے کہ دنیوی متاع حیات اور زیب و زینت کی اشیاء سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ ان چیزوں میں اور قرآن کی متعین کردہ حدود اور اقدار میں ٹکراؤ ہو، اس وقت ان چیزوں کو، ان اقدار کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینا ہوگا۔ یہی دین کا مغز اور قرآنی تعلیم کا ماحصل ہے۔

قرآن کریم میں (پہرے کے احکام کے سلسلہ میں) کہا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں (۲۰)۔ اور عورتیں لَا یُبْدِرْنَ زُرْنَتْھُنَّ إِلَّا مَا ظَہَرَ مِنْھَا (۲۱) اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں، ہاں جو ان میں سے خود بخود ظاہر ہو جائیں (تو اس کا مضائقہ نہیں)۔ یہاں زینت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں اپنا بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ مثلاً زیورات وغیرہ۔ اسکی تائید اگلے الفاظ سے ہو جاتی ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا یَضْرِبْنَ بَآرُجَیْھِیْنَ لَیَعْلَمَنَّ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زُرْنَتْھِیْنَ (۲۲)۔ وہ اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہو جائے۔ پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے، چھپے ہوئے زیور (جہانجھن یا چھاگل وغیرہ) کی آواز نمایاں ہو جاتی ہے۔ باقی رہی جسم کے اوپر کے حصہ کی اشیائے زینت، سو اس کیلئے کہہ دیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں (۲۳) یا جلباب اوڑھ لیا کریں (۲۴)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اشیائے زینت کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ البتہ افراد خاندان کے سامنے ان کی نمائش کر لیں تو اس میں ہرج کی بات نہیں (۲۵)۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ قرآن کریم اس باب میں بھی کہاں تک احتیاط برتتا ہے۔ جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں۔ عورت کیطرف سے غیروں کے سامنے نمود حسن یا اظہار زینت، سب سے بڑا محرک ہے۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے۔

# س

## س (حرف)

س۔ یہ حرف مضارع کے شروع میں آتا ہے۔ عربی میں فعل مضارع حال اور استقبال دونوں زمانے اپنے اندر رکھتا ہے، جب اس سے پہلے ”س“ آ جائے تو اس میں صرف مستقبل کے معنی باقی رہتے ہیں۔ جیسے سَيَفْعَلُ وہ کام کریگا۔ ”س“ عموماً مستقبل قریب کے معنی دیتا ہے۔ لیکن یہ قریب اور بعید محض اضافی چیزیں ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ استمرار (ہمیشگی) کا مفہوم بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ (۲/۱۳۲) یہ بیوقوف کہتے رہیں گے کہ۔۔۔ بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب یہ کسی ایسے فعل کے ساتھ آئے جس میں وعدہ یا وعید پایا جائے تو اس سے تاکید کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً فَسَيَكْفِيكَهُمْ اللَّهُ (۲/۱۳۷)۔ اللہ یقیناً ان کے مقابلہ میں تیرے لئے کافی ہوگا۔

## س ا ل

سَأَلْتَهُ الشَّقِیُّ۔ کے معنی ہیں میں نے اس سے وہ چیز مانگی۔ اور سَأَلْتَهُ عَنْ الشَّقِیِّ۔ وہ کے معنی ہیں میں نے اس سے اس چیز کے متعلق دریافت کیا۔ أَسْأَلُهُ سَأَلَهُ۔ اس کی ضرورت کو پورا کر دیا۔ السَّائِلُ۔ سوال کرنے والا۔ ضرورت مند\*۔ أَلْتَسْأَلَهُ۔ ضرورت۔ حاجت\*\*۔

قرآن کریم میں ہے أَمَّا السَّائِلُ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱)۔ ضرورت مند، صاحب احتیاج کو (ذلیل و حقیر سمجھ کر) مت ڈانٹو۔

سورة الرحمن میں ہے يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۵۵/۴۹)۔ کائنات میں ہر شے اپنی ضروریات کے لئے خدا کے سامنے جھولی پھیلائے ہے۔ ہر شے اپنی نشوونما کے لئے اس کے نظام ربوبیت کی محتاج ہے۔ - سورة

سجدہ میں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ یہ سَوَاءٌ لِّلْیَسَّاءِیْلِیْنَ (۲۱) ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ یہ انسانی رزق کا سرچشمہ ہے اس لئے اس سے ہر شخص کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ یہی اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ نہ یہ کہ مختلف لوگ اس پر حد بندی کر کے اسے اپنی اپنی ملکیت تصور کر لیں۔ خدا نے ان تمام چیزوں کو، جن کی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضرورت ہے، خود مہیا کر دیا ہے۔ وَآتَاکُمْ مِّنْ کُلِّ مَآسَا لَتَمُوْهُ (۱۴)۔ یہ اس کا نظام ربوبیت ہے۔ لہذا اس کی ربوبیت عامہ کو افراد کی ملکیت سمجھ لینا بہت بڑا جرم ہے۔

باہم ایک دوسرے سے دریافت کرنے کے معنوں میں سورۃ النبا میں ہے عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ (۹۸)۔ مَسْئَلُوْهُنَّ (۳۶) جن سے ہوچھ گچھ کی جائے۔ سورۃ طہ میں ہے قَدْ اُوْتِیْتَ سْؤَالَکَ یٰمُوسٰی (۲۱)۔ اس میں سْؤَالَ بمعنی مسؤل ہے۔ یعنی جس چیز کی تجھے احتیاج ہے۔ تیری مانگ۔ طلب۔ تیری مانگی ہوئی چیز۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ”سوال“ کے بنیادی معنی ضرورت اور احتیاج کے ہیں۔ جب ہم کسی سے کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں ان باتوں کے معلوم کرنے کی احتیاج ہوتی ہے جن کی بابت ہم دریافت کرتے (پوچھتے) ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کس جگہ اس کا ترجمہ دریافت کرنا ٹھیک ہوگا اور کس جگہ طلب کرنا۔

## س ا م

سَنِمٌ - یَسَامٌ - اکتا جانا - اَسَامَہ - اس نے اسے اکتا دیا\*۔ بعض نے کہا ہے کہ سَامٌ\* - کنایہ کسل کو بھی کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کسل (مستی) سے اوپر کی چیز ہے\*\*۔ لَا یَسْتَمُ الْاِنْسَانُ مِّنْ دُعَاءِ الْخَیْرِ (۲۱)۔ انسان مال اور دولت کی طلب سے اکتاتا ہی نہیں۔ اس کی یہ طلب، اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ جذبہ منافست کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ کی بنا پر۔ اور اس طلب کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا حَتّٰی زُرْتُمْ الْهَقَابِرَ (۱۲) تاآنکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا تَسْئَلُوْا اَنْ تَکْتُبُوْهُ (۲۸۲)۔ قرض کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ اکتا نہ جاؤ۔ دل برداشتہ نہ ہو جاؤ۔



## سبأ

سَبَاً - یمن کی ایک قدیم سلطنت کے دارالخلافہ کا نام تھا جس پر عہد حضرت سلیمانؑ میں ایک ملکہ حکمران تھی۔ قرآن کریم میں اس قوم، اس کے ملک اور ملکہ سبأ کا ذکر آیا ہے۔ (دیکھئے ۴۴ و ۳۳)۔ اس میں اس ملک کی سرسبزی اور زرخیزی کا خاص طور پر ذکر ہے اور پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی عبرت انگیز تباہی کا۔ انہوں نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کر کے پانی کو روکا تھا جس سے ان کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ یہ سیلاب اسی بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ایک امریکن ماہر حفريات (Archaeologist) نے ان آثار قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب، بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کئے تھے۔ اس کی کتاب کا نام (Qataban and Sheba) ہے اور مصنف کا نام (Wendell Phillips)۔ ان تفصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں۔ (۳۳/۱۹)۔

السَّبَاءُ - شراب کے کاروبار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سَبَاً السَّعْمَرُ کے معنی ہیں اس نے شراب خریدی\*۔ اگر سبأ کے شہر کا نام اسی نسبت سے تھا تو اس سے ذہن ان تاجستانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی وہاں اقراط تھی۔ لیکن السَّبَاةُ کے معنی لمبے سفر کے بھی ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ رَبَّنَا بَلِّغْنَا بَلْعِدُ بَيْنَنَا أَسْفَارَنَا (۳۴/۱۹)۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفروں کو لمبا کر دے تاکہ ہمارا تجارتی کاروبار وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ ممکن ہے اسی نسبت سے ان کے دارالسلطنت کا یہ نام ہو۔ ملکہ سبأ اور حضرت سلیمانؑ کے روابط کے متعلق عنوان ”سلیمانؑ“ دیکھئے۔

## س ب ب

سَبَّحَهُ سَبَّحًا - اسکو قطع کر دیا۔ کاٹ دیا۔ السَّبَّحُ - گالی دینا۔ (کیونکہ اس سے ایک دوسرے کی کاٹ ہوتی ہے یا تعلقات منقطع ہوتے ہیں)\*\*۔

السَّبَّحُ اور السَّبَّابُ - رسی - مضبوط اور لمبی رسی جس سے درخت وغیرہ پر اترا اور چڑھا جائے۔ یا جس سے پانی تک پہنچا جائے۔ اسی سے اس کے

معنی ہر اس ذریعہ کے ہو گئے جس سے کسی تک پہنچا جائے \*۔ اس جہت سے راستے کو بھی سَبَب کہلایا جاتا ہے \*\* کیونکہ وہ ایک منزل کو دوسری منزل کے ساتھ ملاتا ہے۔ نیز قرابت کا تعلق۔ رشتہ داری \*۔

قرآن کریم میں ہے وَتَقَطَّعْتَ بِهِمِ الْأَسْبَابَ (۱۶۶)۔ ”ان کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائیں گے“۔ وہ مفاد اور ذرائع جن سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں ختم ہو جائیں گے۔ سورۃ کہف میں ہے ثُمَّ أَتَّبَعَ سَبَبًا (۱۸۸)۔ ”پھر اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا“۔

سورۃ الحج میں ہے فَلْيَتَمَذُّذٌ يَسْبَبِ إِلَى السَّمَاءِ (۲۲)۔ یہاں اسکے معنی ذریعہ، سبب، یا سیڑھی کے ہیں \*۔ سورۃ المؤمن میں أَسْبَابُ السَّمَوَاتِ (۲۴) آیا ہے۔ صاحب تاج کے نزدیک اسکے معنی آسمان کی سیڑھیاں یا دروازے ہیں۔ ابو زید نے کہا ہے کہ اسکے معنی منازل کے ہیں \*۔ اور صاحب محیط نے اسکے معنی سیڑھیاں، راستے، اطراف و جوانب یا دروازے لکھے ہیں \*\*۔ لیکن ذرائع کا لفظ بڑا جامع ہے۔ ہمارے ہاں بھی اسباب و ذرائع کہتے ہیں۔ اور اس مقام پر یہی معنی زیادہ سوزوں بھی نظر آتے ہیں۔

سورۃ کہف میں ہے وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (۸۳)۔ اس کے معنی سامان و ذرائع ہی کے ہیں۔ گالی دینے کے معنوں میں یہ سادہ (۱۶۶) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطل کو گالی مت دو، ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے، جہالت کی بناء پر خدا کو گالی دیدیں۔ اس قسم کے مظاہرے، مذہبی مناظروں کے میدانوں میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔

## س ب ت

السُّبُتَاتُ۔ نیند۔ اس کے اصلی معنی راحت و سکون کے ہیں۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں)۔ اور چونکہ راحت و سکون کا مطلب یہ تھا کہ انسان حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرے اس لئے اس کے معنی ترک عمل اور قطع کرنے کے ہو گئے \*۔

چنانچہ سُبَّتَ۔ يَسْبُتُ۔ وَبَسْبُوتٍ سُبُوتًا۔ کے معنی ہیں اس نے راحت و آرام کیا \*۔ راغب نے لکھا ہے کہ سُبَّتَ کے معنی کاروبار چھوڑنا

بھی ہیں اور سنیچر کے دن میں ہونا 'سنیچر کا دن' گذارنا 'سنیچر کے دن میں داخل ہونا' بھی \*\*۔ سَبَّتَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو قطع کر دیا۔ اَلْسَبْتُ۔ بال مؤنث نے اور سر منڈانے کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمَسْبُوتُ۔ میت کو یا بیہوش آدمی کو کہتے ہیں۔ نیز اس بیمار کو بھی جو آنکھیں بند کئے پڑا رہے \*۔

يَوْمُ السَّبْتِ۔ ہفتے کا وہ دن جسے سنیچر کہتے ہیں خیال ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے \*۔ اس معنی میں یہ لفظ (۱۵/۲) میں آیا ہے۔ اور راحت و آرام کے معنوں میں سَبَاتُ (۹۸/۲) میں، جہاں کہا ہے وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سَبَاتًا۔ نیند کو موجب استراحت بنایا۔ سورۃ فرقان میں بھی یہی کہا ہے اور اس کے مقابلہ میں نَشْوُرًا (۲۵/۲) کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی چلنا پھرنا۔ منتشر ہونا۔ اٹھ کھڑے ہونا ہیں۔

یہودیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اپنے سَبَّت کی پابندیوں کو توڑا (۱۵/۲ و ۱۵۸/۲)۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ یہ اس دن مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے (۱۶۳/۲)۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی (۲/۲)۔ اور یہ وبال اس لئے آیا کہ وہ سب ایک مسلک پر چلنے کے بجائے باہمی اختلاف کرنے لگ گئے تھے (۱۳۴/۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عائد کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندیوں پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہفتے میں ایک دن کا کاروباری ناغہ بڑی معمولی سی پابندی ہے لیکن اس سے سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی سی طمع (Temptation) کا مقابلہ نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں وہ بھلا زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اترینگے؟ کیریئر نام ہی ضبط خویش (Self Discipline) اور ترغیبات کے مقابلہ کا ہے۔ واقعہ سبت کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود یہی ہے۔ (اس ضمن میں بنی اسرائیل پر جو عذاب آیا تھا اس کی تفصیل ق۔ ر۔ د کے عنوان میں دیکھئے) ہیسٹنگز نے اپنے انسائیکلو پیڈیا \*\*\* میں، عہد نامہ عتیق اور مشنا اور تالمود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سبت، جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا تھا اور سنیچر کا پورا دن رہتا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ، قریب ۳۸ اور امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا۔

## س ب ح

مَسْبُوحٌ کے معنی ہیں تیرنا۔ مَسْبُوحٌ بِالنَّهَارِ وَفِي النَّهَارِ مَسْبُوحًا  
وَمَسْبُوحَةً کے معنی ہیں نہر میں تیرا۔ اَسْبَحْتَهُ فِي الْمَاءِ۔ اسے پانی  
میں تیرا دیا۔ اَلَسْبَاحَاتُ کشتیوں کو کہتے ہیں۔ اَلَسَّوْا بِسَبْحٍ۔ وہ گھوڑے  
جو دوڑنے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتے ہیں۔ اَلَسْبَاحُ۔  
اچھے پیراک کو کہتے ہیں۔ نیز اس سے مشابہت کی بنا پر تیز رفتار گھوڑے  
اور اونٹ کو بھی کہتے ہیں\*۔

تلاش معاش کے لئے تگ و دو کرنے اور دوڑنے یا چلنے میں دور تک  
نکل جانے کو بھی مَسْبُوحٌ کہتے ہیں\*۔ زمین میں چلنے پھرنے اور گھومنے  
کو بھی اَلَسْبَاحُ کہتے ہیں\*\*\*۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی  
دوڑ کی ایک قسم بھی لکھے ہیں۔ لہذا مَسْبُوحٌ کے معنی ہونے کسی کام  
کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جد و جہد کرنا۔ ہر  
وقت سرگرم عمل رہنا۔ تاج میں ابن شکیل کا خواب مذکور ہے جس میں انہوں  
نے دیکھا کہ کوئی شخص ان کے لئے مَسْبُوحَانِ اللہ کی تفسیر بیان کر رہا ہے  
اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی تیز  
رفتاری میں تیر رہا ہوتا ہے۔ یعنی مَسْبُوحَانِ اللہ کے معنی ہیں خدا کی طرف  
تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا\*۔ راغب نے بھی کہا  
ہے کہ مَسْبُوحٌ اصل میں ”پانی یا ہوا میں تیزی سے گذرنا“ ہے۔ پھر استعارۃ  
فلک میں تاروں کی تیز خرامی کے لئے بولا گیا ہے۔ التَّسْبِيحُ خدا کی اطاعت میں  
تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔ ازاں بعد اس کا استعمال وسعت اختیار کر  
گیا اور اسے قولی یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لئے بولنے لگ گئے\*\*۔ حشاکہ  
اب مَسْبُوحَةٌ اُن دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پرو لئے جاتے ہیں حالانکہ  
یہ چیز ہربوں میں غیر معروف ہے۔ (تسبیح عیسائی راہبوں کے ہاں ہوتی تھی  
جنہوں نے اسے غالباً بدعت رالوں سے لیا تھا)۔

قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے کُلُّ شَيْءٍ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونُ  
(۳۶)۔ ”وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں“۔  
رسول اللہ کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوْرًا (۲۳)۔  
تیرے لئے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ تجھے بڑی جد و جہد کرنی ہوتی  
ہے۔ ہرندوں کے متعلق ہے کُلُّ شَيْءٍ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ (۲۴)۔ ان  
میں سے ہر ایک، فضا کی پہنائیوں میں، اپنے اپنے راستے\*\*\*\* سے بھی واقف

\*تاج۔ \*\*راغب۔ \*\*\*لطائف اللغة۔ \*\*\*\*صلاة کے لئے دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و۔

ہے۔ (حالانکہ وہاں کوئی نشانِ راہ نہیں لگا ہوتا) یا اپنے اپنے مقاصد کے پیچھے جانے سے واقف ہے، اور اپنی اپنی جد و جہد کے دوائر اور حصولِ معاش کے طور طریق سے بھی۔ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۴) کے معنی ہیں کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانون خداوندی کی رو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروفِ عمل ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے عروقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ خارجی کائنات کی چیزیں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے از خود (Instinctively) سرگرم عمل رہتی ہیں (اسی کو قصہٴ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے ۲/۱۶۱۔ یا مثلاً رعد کی تسبیح ۱۳/۱۶۳)۔ لیکن انسان کو اس کیلئے اپنے اختیار و ارادہ سے سرگرم عمل رہنا ہے۔ اس لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۳۳/۴۴)۔ تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہو۔ یہ پروگرام کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا فَتَسْبِيْحٌ بِاِسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۹۱/۵۱) اپنے نشو و نما دینے والے کی صفتِ ربوبیتِ عظمیٰ کو، جس پر ماری کائنات کی عمارت استوار ہے، انسانی معاشرہ میں عملاً متشکل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہنا۔ اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جد و جہد کو بھی ”ذکر و تسبیح“ کہا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرہون کی طرف جانے لگے ہیں تو انہوں نے اپنی اس مہم کے لئے بھی کہا تَهَا كَيِّ نَسْبِيْحَتِكَ كَثِيْرًا وَّ نَذْرُكَ كَثِيْرًا (۲۴/۲۴)۔

قرآن کریم جو نظامِ زندگی جماعتِ مومنین کے لئے تجویز کرتا ہے اس میں صلوٰۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس جماعت کے جذبہ اطاعتِ خداوندی کے عملی مظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کا اظہار رکوع و سجود کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ رکوع و سجود میں ایک عبدِ مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اُس کے قوانین کی اطاعت اور اُس کے بتائے ہوئے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے جد و جہد میں صرف کریگا۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام اصطلاح میں انہیں بھی خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کے اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کر کے نہ دکھائے، تو یہ زبانی قول و اقرار ایک بے نتیجہ رسم سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ صلوٰۃ میں حرکات و سکنات اور الفاظ، انسان کے جذبہ عمل کے بیتابانہ اظہار کی شکلیں ہیں۔ اگر عمل نہ رہے اور انسان ان شکلوں ہی کو مقصود و منتہی سمجھ لے تو اس کا نتیجہ

ظاہر ہے ۔ بہر حال ، یہ تو ظاہر ہے کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام گنا ، قرآنی تعلیم کا مقصود نہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے تسبیح سے مفہوم ، قوانین خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جد و جہد اور سرگرمی عمل ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ تَسْبِيْحٌ کے معنی تنزیہ کے ہیں ۔ نیز یہ لفظ ”سبحان اللہ“ کہنے ، یا صلوة اور ذکر اللہ ، حمد و مجد و ثنا ، کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لئے تنزیہ کے معنی ہونگے ، خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا ۔

اس سادہ میں تیزی ۔ مضبوطی ۔ شدت کا پہلو ہوتا ہے ۔ اسی لئے کِسَاءٌ مُّسَبِّحٌ کے معنی ہیں بہت مضبوط اور سخت بنا ہوا کمبل ۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے معنی ہونگے ، صفات خداوندی کو نہایت تیزی ، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا ۔ مطلب وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۔

سورة صافات میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنا لیا۔ فَلَمَّا لَا آتَاهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلْبَيْتِ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۳۹/۱۶) اگر یہ لفظ (مُسَبِّحِينَ) سَبِّح سے ہوتا تو اس کے معنی تیراک ہوتے ۔ لیکن سَبِّح کے اعتبار سے اس کے معنی ہونگے پوری قوت اور شدت سے جد و جہد کرنے والا ۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لئے پوری جد و جہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خود بخود آ جاتا ہے ۔

اسی سورة میں ذرا آگے چل کر ہے وَإِنَّا لَنَنحْنُ الْمُسَبِّحُونَ (۳۹/۱۶)۔ ہم یقیناً (اسی راہ میں) انتہائی قوت کے ساتھ جد و جہد کرنے والے ہیں۔ ان مقامات سے بھی تَسْبِيْحٌ کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں ۔ شدت ، مضبوطی ، تیزی کے ساتھ خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مصروف جد و جہد رہنا ۔

سُبْحَانَ مِّنْ كَذَا۔ تعجب کے موقع پر بولتے ہیں \* ۔ دوری کے اعتبار سے سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (۳۹/۱۵) کے معنی ہیں ، خدا ان تمام غلط تصورات سے بہت دور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں ۔ نیز سُبْحَانَ (مصدر) کے معنی ہیں ، سرگرم عمل رہنا \* ۔

فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تَصْبِحُونَ (۳۷) - شام و پہلے تمہارے لئے ان فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف رہنا ہے جو تمہارے لئے اللہ نے مقرر کئے ہیں۔

## س ب ط

اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں زیادتی اور کثرت کے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں۔ اسی سے السَّبَطُ - ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہیں سے اس کے معنی نسل اور خاندان کے ہو گئے۔ یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے۔ السَّبَطُ - پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ یہود کے قبیلہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسْبَاطُ کا لفظ بنو اسحاق (حضرت اسحاقؑ کی اولاد) کے لئے خاص تھا اور قَبَائِلُ کا لفظ بنو اسماعیل کے لئے۔ عربوں نے یہ تخصیص اس لئے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے اولاد حضرت ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں میں امتیاز ہو جائے\*\*۔ قرآن کریم میں بھی قوم حضرت موسیٰؑ کے لئے اسْبَاطُ - کا لفظ آیا ہے (۱۶۶)۔ نیز عرب السَّبَطُ - عجمی آدمی کو کہتے تھے۔ جس طرح جَعْدُ عربوں کو کہتے تھے\*\*۔

قرآن کریم میں اولاد حضرت یعقوبؑ کے لئے اسْبَاطُ کا لفظ آیا ہے (۱۳۶)۔

## س ب خ

سَبْعٌ - سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اسکی اصل سَبْعَةُ ہے جسکے معنی شیرنی کے ہیں۔ یہ اسلئے کہ وہ شیر سے بھی زیادہ تیز حملہ کرتی ہے اور عربوں کے ہاں سات کا عدد تامہ (Perfect Number) ہوتا ہے۔ السَّبْعُ - بِالْأَسْبَعِ یا السَّبْعُ - درندہ کو کہتے ہیں (۵)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسلئے کہ اتفاق سے عرب میں سات جانور درندے ہوتے تھے۔ لیکن راغب کا خیال ہے کہ انہیں سَبْعٌ اسلئے کہتے ہیں کہ ان کی قوت مکمل ہوتی ہے اور سات کا عدد بھی مکمل ہے\*\*۔ لین نے (بیضاوی کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ عربوں میں سَبْعَةُ سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں "کئی

\* محیط - \*\* تاج - ثعالبی نے فقہ اللغہ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔

ایک (Several) یا ”متعدد“ (Many) - اسی طرح سَبْعُونَ (ستتر) سَبْعِيَانَةٌ - (سات سو) بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔\*\* - جیسے ہماری زبان میں بیسیوں - پچاسوں - سینکڑوں - کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا۔ یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں۔ اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی۔ چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً (۹/۸۰) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو وہ مغفرت نہیں دینگے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دیدی جائیگی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ان کے لئے چاہے کتنی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی۔ ان معافی کے بیش نظر سَبْعَ سَمَوَاتٍ (۲/۲۹) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی متعدد اجرام فلکی۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ”سات سمندر ہار“۔ (۲/۲۹) میں متعدد کے معنی واضح ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ - فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ.....“ ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنی دولت کو کھلا رکھتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگلے اور ایک بال میں سو سودانے ہوں۔“ ظاہر ہے کہ یہاں سَبْعَ سَنَابِلٍ سے مراد متعدد (کئی) بالیں ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الثَّمَرَاتِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۱۵/۸) - اس کے لئے دیکھئے۔ عنوان (ث۔ ن۔ ی۔) میں لفظ مثنیٰ -

## س ب غ

السَّبْعَةُ - وسعت - فراخی - کشادگی - سَبْعَ الشَّيْءِ سُبُوغًا - کسی چیز (کپڑے - زرہ وغیرہ) کا لمبا اور لٹکتا ہوا ہونا - السَّبْعَةُ - وہ زرہ جنو ٹخنوں تک آجائے یا لمبائی کی وجہ سے زمین پر گھسٹنے لگے۔ (سَبْعَاتُ اس کی جمع ہے - ۳۳) - اَسْبَغَ شَعْرَهُ - اس نے اپنے بالوں کو لمبا کیا اور خوب بڑھایا۔ شَيْءٌ سَابِغٌ - بھر پور چیز۔\*\* ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - سَبَغَتِ النِّعْمَةُ - نعمت کا وسیع اور بھر پور ہونا۔\*\*\* قرآن کریم میں ہے وَاسْبِغْ عَلَيْنَا نِعْمَتَكَ (۳۱/۳) - خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھر پور، کثرت اور فراوانی سے دیا۔



## س ب ق

سَبَقَ کے بنیادی معنی ہیں دوڑنے میں آگے بڑھ جانا۔ اس کے بعد ہر شے میں آگے بڑھ جانے کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا۔ سَبَقَهُ۔ وہ اس سے آگے بڑھ گیا، بازی لے گیا۔ سَبَقَ رَسُولُ اللَّهِ وَصَلَّى أَبُو بَكْرٍ۔ سب سے پہلے رسول اللہ (دنیا سے) تشریف لے گئے اور ان کے پیچھے پیچھے (حضرت) ابوبکرؓ چلے گئے۔ اَلَسَبَقُ۔ اس شرط یا انعام کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ وغیرہ میں اول آنے والے کیلئے مقرر کر دیا جاتا ہے۔\*\*

اِسْتَبَقْنَا الْبَابَ (۱۲۵) وہ دونوں دروازہ کی طرف لپکے اور ہر ایک نے کوشش کی کہ وہ آگے بڑھ جائے۔\*\*

محیط میں ہے کہ جب اس کے بعد علیٰ آتا ہے تو آگے بڑھنے اور پہلے آنے والی چیز نقصان دہ ہوتی ہے اور جب اس کا صلہ لام آتا ہے تو اس میں پہلے آنے والی چیز فائدہ بخش ہوتی ہے۔\*\*\* سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی (۱۱۱)۔ ہماری طرف سے خوشگوار یوں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

سورة بقرہ میں ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۱۶۸) خوشگواریاں پیدا کرنے والے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ نفسیاتی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے لئے عمل اور جدوجہد کا جذبہ محرکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ (Competition) اور مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ہی وہ مہمیز ہے جس سے انسان دیوانہ وار مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ قرآن کریم بھی انسان کے اس جذبہ کی رعایت کرتا ہے اور اس کی پرورش چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس کا رخ بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ذاتی مفاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، نوع انسانی کے لئے خوشگواریاں پیدا کرنے والے امور میں سبقت کرو۔ اس سے تمہارے جذبہ مسابقت کی بھی تسکین ہو جائیگی اور معاشرہ میں وہ فساد بھی برپا نہیں ہوگا جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں سے آگے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورة حجر میں ایک جگہ یہ لفظ (تَسْبِقُ) يَسْتَأْخِرُ (پیچھے رہ جانے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵) اور دوسری جگہ يَسْتَأْخِرُ يَسْبِقُ کے مقابلہ میں مُسْتَقْدِرٌ مِّنْ آدَمَ (۱۶)۔ لہذا سَبَقُ۔ اِسْتَفْخَارُ (پیچھے رہ

جائے) کی ضد اور اِسْتَيْقَدَ اُم (آگے بڑھنے) کے مرادف ہے۔ سورۃ واقعہ میں مَسْبُوءٌ قِيُنَ (۱۱۱) بمعنی مَغْلُوبٌ آیا ہے۔ یعنی جس سے کوئی آگے بڑھ جائے۔

سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِیْقَاتُ الْحُسْنٰی (۲۱۱)۔ اسکے معنی کئے جاتے ہیں جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی آچکی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے کہ فلاں آدمی اچھے کام کرے گا اور فلاں برے کام۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون پہلے سے بنا رکھا ہے کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہوگا اور فلاں کا نتیجہ برا۔ اور اس کے بعد انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس قسم کا کام جی چاہے کرے۔ وہ جس قسم کا کام کریگا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائیکا۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحیح روش پر چلیں ان کیلئے خوشگوار ہاں ہیں۔ اور یہ چیز (کہ اُس روش کا نتیجہ یہ ہوگا) پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ ہم نے محض ان کی خاطر یہ اصول نہیں اختیار کیا۔

سورۃ حدید میں ہے سَابِقُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ ..... (۲۱) اپنے رب کی مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

## س ب ل

اَسْبَلَّ - لٹکانا - چھوڑ دینا - اَسْبَلَّ الْاَزَّارَ - ازار کو لٹکا دیا۔ اَسْبَلَّ دَمْعَهُ - اپنے آنسوؤں کو جاری کر دیا، چھوڑ دیا تاکہ وہ آنکھوں سے بہ نکلیں۔ اَسْبَلَّتِ السَّمَاءُ - آسمان سے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اَلْاَسْبَلَّ - بارش۔ لیکن وہ بارش جو آسمان سے لٹک کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو۔ اَلْاَسْبَلَّةُ - وسیع پیمانے پر ہونے والی بارش۔ اَسْبَلَّ الزَّرْعُ - کھیتی میں خوشے لٹکنے لگ گئے\*۔ لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی لٹکانے - چھوڑنے اور لمبا کرنے کے ہیں (ابن فارس)۔ اس سے اَلْاَسْبِلَّةُ و اَلْاَسْبِلَّةُ کے معنی ہیں راستہ - نرم راستہ جس میں سختی نہ ہو، راستہ کا واضح حصہ - سَبِيلٌ\*۔ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن مؤنث زیادہ مستعمل ہے۔ اس کی جمع سَبِيلٌ آتی ہے\*۔ ابن

فارس نے لکھا ہے کہ لمبائی اور دور تک چلنے جانے کی وجہ سے راستہ کو سَبَّیْل\* کہتے ہیں۔ اَلْسَبَّيْلَةُ مِّنَ الطَّرِيقِ۔ وہ راستہ جس پر لوگ عام طور پر چلتے رہیں یا وہ لوگ جو اپنی ضروریات کے لئے راستے پر آتے جاتے رہیں۔ راہرو۔ مسافر\*۔

قرآن کریم میں رَفِی سَبَّیْل۔ اللہ (۲/۱۶۰) کی اصطلاح متعدد بار آئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں رَفِی سَبَّیْل۔ الطَّاغُوتِ (۲/۲۱۶) آیا ہے۔ ”مومنین کی جماعت رَفِی سَبَّیْل۔ اللہ جنگ کرتی ہے اور کفار رَفِی سَبَّیْل۔ الطَّاغُوتِ جنگ کرتے ہیں“ (۲/۲۱۶)۔ اس سے رَفِی سَبَّیْل۔ اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ طاغوت وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو اپنے احکام کے تابع چلائیں اور دنیا میں باطل کا نظام قائم کریں۔ لہذا سَبَّیْل۔ اللہ کے معنی ہوئے قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے، نظام خداوندی کے قیام کی خاطر، اس راستہ پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لئے جو خدا نے مقرر کیا ہے، ذاتی مفاد پرستیوں کے بجائے نوع انسانی کی فلاح و بہبود (رب العالمینی) کے لئے، انسانی بھلائی کے کاموں کے لئے، مخالفت کی قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مومنین اسی مقصد کے لئے جیتے اور اسی کے لئے اپنی جان دیتے ہیں۔ اسی سے اتفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی حق کے اثبات اور نوع انسانی کی بہبود کی خاطر اپنا مال کھلا رکھنا، کہ جتنا ضروری ہو اس میں سے لے لیا جائے۔

اِبْنُ السَّبَّیْلِ۔ مسافر جو بہت سفر کرے۔ بعض کے نزدیک اس سے ایسا مسافر مراد ہوتا ہے جس کا زاد۔ راہ ختم ہو چکا ہو\*۔ قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا ہے کہ وہ ”اِبْنُ السَّبَّیْلِ“ کی مدد کرے۔ حتیٰ کہ صدقات کا ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے۔ (۹/۶۰)۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے جو اسلامی مملکت میں سفر کرے سفر کی سہولتیں بھی آ جاتی ہیں اور جو لوگ سفر میں کسی وجہ سے نادار ہو جائیں انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانا بھی۔ محیط نے اس کے معنی مہمان کے بھی دئے ہیں۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں ”ابن السبیل“ وہ لوگ ہونگے جو اسلامی مملکت میں عارضی طور پر آئیں جائیں اور رہیں مہیں (Non - Citizens)۔

سورة آل عمران میں اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ کہتے تھے کہ لَیْسَ عَلَیْنَا رَفِی الْاِمْنِیْنِ سَبَّیْل\* (۳/۲۰)۔ یعنی ہم ان غیر اہل کتاب

عربوں کے خلاف جو جی میس آئے کرلیں ہم ہر کوئی گروہ نہیں ہوگی۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس کے مطابق جو جرم اپنے قبیلہ کے اندر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے لیکن جو جرم قبیلہ سے باہر کیا جائے وہ جرم نہیں کہلاتا۔ قبائلی زندگی تو ایک طرف، خود اہل روم کے ہاں قانون موجود تھا کہ اپنی قوم کے فرد کی چوری جرم ہے اور غیر قوم والوں کے ہاں چوری جرم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سازی کہیں بھی ہو (خواہ وہ مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی قومیت کی گروہ بندی) اس سے یہی ذہنیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمدردیاں اور نفع رانیاں صرف اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں۔ اس سے باہر جتنے افراد انسانیت ہیں ان سے نفرت کی جائے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور آج سے چار ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا۔ عصر حاضر کی نیشنلزم اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ اور اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ جرم بہر نوع جرم ہے خواہ اپنوں کے خلاف کیا جائے یا دوسروں کے خلاف۔ اس میں انسان اور انسان، اور قوم اور قوم میں کوئی فرق نہیں۔ اسی لئے اس کے نزدیک اچھا کام وہی ہے جو فی سبیل اللہ کیا جائے۔ یعنی اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند ہو کر، نوع انسانی کی بہبود کی خاطر۔

قرآن کریم میں جنتی زندگی کے سلسلہ میں ہے عَيْنًا فِيْهَا تُسْتَعْمَلُ سِتْسِيْلًا (۲۱/۸)۔ ”اس میں ایک چشمہ ہے جسے سِتْسِيْلٌ کہتے ہیں“۔ محیط نے اس کی اصل سَلّ - سِتْسِيْلًا بتائی ہے جس کے معنی ہونگے راستہ دریافت کرنا\*\*۔ (ہوچھتے ہوئے آگے چلتے جاؤ)۔ اسی کو دوسری جگہ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸/۱۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاری چشمہ۔ ہر وقت بہتا رہنے والا چشمہ۔ یعنی خود زندگی کی جوئے رواں جو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ حیاتِ جاوداں جو ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ جو حرکتِ مسلسل سے عبارت ہے اور جس میں کہیں انقطاع اور حد بندی نہیں۔ کوئی روک اور رکاوٹ نہیں۔ اپنے زورِ دروں سے انسانی ذات کا مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا۔ ”سِتْسِيْلٌ“ اللہ، بھی یہی راہ ہے۔ وہ راستہ جس میں انسان ”مَا يَنْفَعُ النَّفْسَ“ (۱۳/۱۲) پر عمل پیرا ہوتا اور خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہی نہ راہ تھی جس کی طرف رسول اللہ ﷺ علی وجہ السرب دعوت دیتے تھے (۱۲/۸)۔ یہ قرآن

کریم کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انسانی صلاحیتیں بھرپور طور پر نشو و نما حاصل کر سکتی ہیں اس لئے کہ ”مَسْلَاۃُ الْاِنْسَانِ اِلٰی اَسْبَابِهَا : پیمانے کو لبالب بھر دینے کو کہتے ہیں \*۔

سورۃ نحل میں شہد کی مسکھی سے کہا گیا ہے ”فَاسْئَلْکِۚ سُبُلَ رَبِّکِ ذٰلَکَ (۱۶/۱)۔“ اپنے نشو و نما دینے والے کے راستوں پر فرمان پذیری سے چلی جا۔ اس سے واضح ہے کہ قوانینِ فطرت بھی ”اللہ کے راستے“ ہیں جن پر اشیائے کائنات چلی جا رہی ہیں۔ اور انسانوں کی راہنمائی کے لئے حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے ملی ہوئی وحی صحیح راستے ہیں (۱۶/۲)۔

سورۃ عنکبوت میں ہے ”وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْۤنَا لَنَنْۢبِذَنَّہُمْ سَبۡلَنَا۔ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحۡسِنِیۡنَ (۲۹/۲)۔“ اس کا مادہ ترجمہ یہ ہے کہ ”جو لوگ ہمارے لئے جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں“۔ یوں تو خدا کی طرف جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے ”الصراطِ المستقیم“ کہہ کر پکارا ہے (۱/۵) لیکن انسان کے سامنے، نت نئے دن زندگی کے نئے نئے مسائل آتے رہتے ہیں جن کا حل اسے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصول دئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا، جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خارجی کائنات کے احوال و کوائف، اقوامِ عالم کی تمدنی زندگی، اپنے زمانے کے مقتضیات اور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر گہرے غور و خوض اور فکر و تدبیر کی ضرورت ہوگی۔ اس طریقِ گار سے، معاملات پیش نظر کے متعلق قرآنی راہِ نمائی کے لئے جد و جہد کرنا، (اصطلاح میں) اجتہاد کہلاتا ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اجتہاد کریں گے، ہم ان کے سامنے زندگی کی صحیح راہیں کشادہ کرتے چلے جائیں گے۔ انہی راہوں کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ”سبیل السلام“ یعنی امن و سلامتی کی راہیں قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ”یُخْرِجُہُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النَّوْرِ بِاِذْنِہِ۔“ اس طرح کاروانِ انسانیت، تاریکیوں سے روشنی کی طرف آجاتا ہے۔ اور آخر میں ہے ”و یَهۡدِیۡہُمۡ اِلَی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیۡمٍ (۱۶/۵)۔“ اور یوں انہیں ”صراطِ مستقیم“ کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام راستے اسی صراطِ مستقیم میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ تمام جزئیات و تفصیل جنہیں جماعتِ مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتی ہے، قرآنی اصل کی شاخیں ہوتی ہیں اس لئے یہ تمام پکڑنڈیاں اسی شاہراہِ مقصود میں جا کر مل جاتی ہیں۔

## س ت ت

اَلِیْسَتْ - اَلِیْسَتْ - چھ - اصل میں سیدہؓ تھا \* - قرآن کریم میں ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۵۴) - "زمین اور آسمانی کُروں کو چھ ادوار میں پیدا کیا،، - اس میں ان ارتقائی ادوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر ہماری زمین اور دیگر اجرام اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچے ہیں - (یَوْمَ کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ی - و - م) - سِتُّوْنَ اور سِتِّیْن - ساٹھ - (۵۸) -

## س ت ر

مِثْرٌ - اوٹ - آڑ - پردہ جس سے کوئی چیز چھپائی جائے \*\* - سورة کہف میں ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا (۱۸) - وہ نوم (کھلے میدان میں رہتی تھی اس طرح کہ) ان کے اور سورج کے درمیان کوئی اوٹ یا آڑ نہیں تھی - اَلِیْسَتْ - پردہ - سِتْرَ الشَّیْءِ - اسے اس چیز کو چھپا دیا - اَمْتَرٌ - چھپ جانا \*\* - قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۲۱) - تم نہیں چھپتے تھے - سورة بنی اسرائیل میں ہے کہ جب تو قرآن کریم پڑھتا ہے تو تجھ میں اور ان لوگوں میں جو حیات مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے حِجَابًا مَسْتُورًا (۱۴) حائل ہو جاتا ہے - یعنی ایک ایسا پردہ حائل ہو جاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے - ان کے قلب و دماغ پر ایسا پردہ چھا جاتا ہے جو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے - ان کی نفسیاتی کیفیت کو حِجَابٌ مَسْتُورٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی غیر مرئی پردہ - نیز مَسْتُورٌ بمعنی مَاتِرٌ بھی ہے (چھپانے والا) جیسے مَسْجُورٌ بمعنی مَاحِرٌ - خدا کا ایک نام اَلِیْسَتْ - بھی مشہور ہے - لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا -

## س ج د

اَلَسَّجُودُ کے معنی ہیں ، سر کو جھکا دینا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ، پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں - نَعْلَتٌ سَاجِدَةٌ - جھکا ہوا کھجور کا درخت ، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے \* - سَجْدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے \* -

لہذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کار فرما ہے جسے دور حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیات یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہہ دیجئے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے، اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے، اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے ”سر جھکا دیا“، تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے حکومت کے قانون سے ”سرکشی“، اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (ہرہی) میں بات کرنا ہے اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ، اطاعت اور فرمان پزیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورہ نحل میں ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۱) اور جو جان دار کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب خدا کے سامنے سر بسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے، یہاں يَسْجُدُ کا مفہوم لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۲) انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ ج۔ د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرمان پزیری کے) معنوں میں۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) "حواس" کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہندوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ عام یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اُس زمانے کا مذہب\*، محسوسات کے دائرے میں گہرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے "خدا" کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ ہوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہتے ہیں کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لئے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے)۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسول اللہؐ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے۔ "فَاِذَا سَجَدُوا (۱۰۲)۔" پھر جب وہ سجدہ کر چکیں "تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔"

\* مذہب اور دین کے فرق کے لئے (ذ۔ ہ۔ ب) اور (د۔ ی۔ ن) کے عنوانات دیکھئے۔



ظاہر ہے کہ یہاں ”سجدہ“ سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ سچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں، نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں، صلوٰۃ اور حج ہی وہ ”تقارب“ ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، حرکات و سکنات کرے تو اس سے جمہور انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلوٰۃ کے عنوان (باب ص۔ ل۔ و) میں ملیگی۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس ہر خلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ هَٰذَا ۖ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ... (۲۴۱)۔ ”نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشادگی کی راہ اسکی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود، قرابتداروں، یتیموں، مساکین۔ ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے...“۔ یعنی صلوٰۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرمان پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے، تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷)۔ ”ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک، تک پہنچنا چاہئے،

(بند لگا کر) روک رکھتے ہیں ،،۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے۔

الْمَسْجِدُ - پیشانی کو کہتے ہیں جو زمین پر رکھی جاتی ہے۔ اور الْمَسْجِدُ اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے\*۔ یہ اسم ظرف ہے جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت، دونوں ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنا دی (۱۸/۲۱)۔ یعنی وہ مجاہدین تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہو گیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ اناہ بن گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۷/۱)۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (۹/۱۰) اور اسکا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ہے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ کہہ کر پکارا ہے (۹/۱۰)۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۱/۳۱) اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ”اللہ کی مسجدوں“ کو آباد کریں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اِنَّ الْمَسْجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۸/۲۱) ”مسجدیں صرف للہ کے لئے ہیں۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو“۔ فرقہ بندی شرک اس لئے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے، اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ کعبے کو جو مسجد الحرام کہا گیا ہے (۲۸/۲۸) کو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ وہ اُس امت کا مرکز محسوس ہے

جسکی خصوصیت مُسَلِّمَةٌ لَتَكْتُ (۲/۱۴۸) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا اس لئے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاِلَہِ الَّذِیْ بَرَكْنَا حَوْلَہٗ لِنَنْزِیْلِہٖ مِّنْ اٰیٰتِنَا (۱/۴) ”وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجد الحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے با برکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیوں) دکھائیں،“ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ سورۃ طہؑ میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لِنَنْزِیْلِکَ مِّنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۴)۔ ”تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں“۔ یہ آیات، اویزش حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کاسیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لئے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دئے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”عبادت“ اور ہام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ ب۔ د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوة بھی چونکہ قافون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ”عبادت“ کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِبٰنَتَکُمْ عِندَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱) اس میں ”مسجد“ (ظرف) کو مصدری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے\*۔ یعنی اطاعت کرنا۔ اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رهبانیت

\* لسان العرب سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

کو اطاعت و عبادت کا منتہی قرار دیا گیا تھا - یعنی ترک دنیا - ترک لذت - ترک زیبائش و آرائش - قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش، خدا کی اطاعت کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لئے اسے ترک کرنا، اطاعت نہیں - ان چیزوں سے ضرور متمتع ہونا چاہیئے - صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں - اس آیت کے اگلے حصے، اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے - آیت کا باقی حصہ یہ ہے - وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا - إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (۲۶۷)۔ ”تم کھاؤ پیو - لیکن حد سے تجاوز نہ کرو - خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“ - اس سے اگلی آیت میں ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِمُ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ... (۲۶۸)۔ ”ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے - اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے،؟ - دو آیتیں پہلے ہے قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ..... (۲۶۹)۔ ”ان سے کہدو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے - اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو - اور اطاعت کو خالص اسی کے لئے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو، - ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے -

سورة الفتح میں محمد رسول اللہؐ والذین معہ کے متعلق ہے تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۲۸۰) - ”تو انہیں رکوع کرتے ہوئے - سجدے کرتے ہوئے دیکھیگا، - یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلوة کے رکوع و سجود ہونگے - اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کئے ہونگے - اس کے بعد ہے سَيَمْنَاهُمُ فِي وُجُوهِهِمْ رِجْنٌ أَثَرُ السُّجُودِ (۲۸۱) - اس کے عام معنی ہیں ”ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں“ - مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں - یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے - قرآن کریم میں ہے يُعْرِفُ الْمُنْجِرَ سَوْنٌ بِسَيِّئِهِمْ (۲۸۲) مجرم اپنی

علامات سے پہچانے جائیں گے۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینائے رخ سے جھلک کر باہر آجاتی ہے۔

## س ج ر

سَجَرَةُ النَّارِ - يَسْجُرُهُ - سَجَرًا - اس نے تنور جلا دیا۔ اُسے گرم کرنے کے لئے اس میں پورا پورا ایندھن ڈال دیا۔ ایسے ایندھن سے بھر دیا۔ اسی لئے سَجَرَةُ النَّارِ کے معنی ہوتے ہیں۔ اس نے نہر کو بھر دیا۔ اَلْسَجُورُ - وہ چیز جس سے تنور کو جھونکا جائے۔ اَلْمَسْجُورُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے تنور میں ایندھن کو الٹا پلٹا جائے تاکہ وہ جلدی گرم ہو جائے۔ اَلْسَقَاجِرُ - اَلْمَسْجُورُ - ساکن اور بھری ہوئی چیز۔ (نیز اس کے معنی خالی چیز کے بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اخداد میں سے ہے\*\*)۔ وہ دریا جس کا پانی اُس کے طرف سے زیادہ ہو۔ سَجَرَتُ الْاِلَآءِ - میں نے برتن کو بھر دیا۔ اَلْسَقَاجِرُ - وہ مقام جہاں سے سیلاب گزرے اور اسے پُر کرتا ہوا چلا جائے۔ بِئْرُ سَجِيرٍ - پُر کنواں\*۔

سَجِيرُ الْمَاءِ - پانی کا جدھر جی چاہے راستہ پھاڑ کر نکل جانا\*۔ لہذا اس لفظ کے معنی آگ بھڑکانے کے بھی ہونگے اور بھر دینے اور لبریز ہو جانے کے بھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) بھرنا۔ (۲) ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا اور (۳) بھڑکانا، ہیں۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ فِي النَّارِ يَسْجُرُونَ (۴۴)۔ پھر وہ آگ میں جھونکے جائیں گے۔ سورۃ طور میں اَلْبَحْرُ الْمَسْجُورُ (۵۴) آیا ہے۔ یعنی بھرا ہوا سمندر۔ یا ایک سے دوسرا ملا ہوا سمندر۔ سورۃ تکویر میں ہے اِذَا الْبِحَارُ مَسْجِرَاتٌ (۸۱)۔ سمندر (آمد و رفت کی کثرت سے) ہر وقت بھرے بھرے نظر آئیں گے۔ (اور اگر بَحَارٌ کے معنی کناروں کی بستیاں لیا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بندرگاہیں آباد ہو جائیں گی۔ مقصد بھر حال دونوں کا ایک ہی ہے)۔

## س ج ل

اَلْسَجْلُ - پانی سے بھرا ہوا بڑا ڈول۔ سخی آدمی\*۔ اَلْسِجِلُ - کتاب۔ صحیفہ۔ نیز کاتب\*۔

السَّيْجِلُ۔ یہ لفظ معرب ہے فارسی لفظ سَنَکِبِ کَل سے۔ یعنی وہ مٹی جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے۔ زمانہ قدیم میں (جب لکھنے کی ابتدا ہوئی ہے تو) مٹی کی تختیوں کو آگ میں تپا کر پختہ کر لیا کرتے تھے اور انہی پر لکھا جاتا ہے۔ اسی کو السَّيْجِلُ کہتے تھے۔ بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے السَّيْجِلُ کہنے لگے۔\*\*

قرآن کریم میں ہے کہ قوم لوط پر حِجَارَةٌ مِّنْ سَيِّجِلٍ (۱۱۱/۸۴) برسائے گئے۔ انہی کو سورۃ ذاریت میں حِجَارَةٌ مِّنْ طِينٍ (۵۱/۳۳) کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سنگ گل متعجب تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں مقامات پر انہیں مَسْوُومَةٌ عِندَ رَبِّكَت (۱۱۱/۸۳ و ۵۱/۳۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ تھے۔\*\*\* لیکن السَّيْجِلُ میں لکھنے کا جو عنصر شامل ہے، اس اعتبار سے بھی مَسْوُومَةٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ [ہو سکتا ہے کہ یہ تہ تہ (مَنْضُودٍ ۱۱۱/۸۴) تختیاں ہی ہوں جو پہاڑ پر کسی لائبریری میں رکھی ہوں اور اس کی آتش فشانی سے سب سے پہلے یہی اڑ کر ان کی بستی پر گری ہوں]۔

سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْهَرُ السَّمَاءَ كَطَیِّ السَّيْجِلِ۔ (۲۱/۲۱)۔ یہ وہ دور ہوگا جس میں بلند یوں (یا بلند طبقے کے لوگوں) کو کاغذ کے فائل کی طرح لیٹ کر رکھ دیا جائیگا کہ ان کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس دور میں معاشرتی ہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ (۳۹/۶)۔

اگر ان آیات میں کسی کائناتی حادثہ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مقصود آسمانی کٹروں کا لیٹے جانا ہوگا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بھر کر الٹ جانا یا گر جانا ہیں۔ اس سے مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

## س ج ن

سَجَنَ۔ بِسَجْنٍ سَجْنًا۔ کسی کو قید کر دینا\* (۱۲/۳۵ و ۱۲/۳۵)۔  
السَّيْجِنُ۔ قید خانہ (۱۲/۳۵)۔

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* اقوام سابقہ پر جو عذاب طبعی حوادث (سہلاب، آندہ، زلزلہ، آتش فشاں مادہ) کے ذریعے آتا تھا، اسے اس قوم کے اعمال زندگی سے کیا تعلق تھا، اس کے لئے مصنف کی کتاب ”جوئے نور“ دیکھئے۔

سَجَّيْنٌ\* - یہ لفظ سورۃ تطہیف میں آیا ہے - مَسَا آدُرَاکَت مَسَا  
مَسَجَّيْنٌ\* (۸۳) - بعض نے اس کے معنی قید خانہ کئے ہیں - لیکن قرآن کریم  
نے کِتَابٌ مَرْقُومٌ\* (۸۳) کہہ کر خود ہی اس کی تفسیر کر دی ہے -  
یعنی نامہ اعمال - لکھی ہوئی چیز\* -

## س ج و

سَجَا اللَّيْلُ يَسْجُوْا - سَجَّوْا .. رات کا ساکن ہو جانا - ٹھہر جانا -  
تاریک ہو جانا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں سکون اور بند کرنے،  
ڈھانکنے کا مفہوم بتایا ہے - سَجَا اللَّيْلُ کے معنی ہیں رات کا شدید تاریک اور  
پرسکون ہونا - اَلْبَحْرُ السَّاجِيْ - پرسکون سمندر - اَلطَّرْفُ السَّاجِيْ -  
خاموش نگاہ - ابن الاہرابی نے کہا ہے کہ سَجَى اللَّيْلُ کے معنی ہیں  
رات کی تاریکی بڑھ گئی\* -

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّيْلُ اِذَا سَجَى (۹۳) - رات کی تاریکی اور  
اس میں فضا کا سکوت، اور نمودِ صبح سے پہلے اس کی شدید ظلمت، اس حقیقت  
پر شاہد ہے کہ (نظامِ خداوندی کے) اس پروگرام کو کامیابی تک پہنچنے میں  
وقت لگیکا اور وہ اپنے مدارج طے کرتا ہوا مقصود تک پہنچیکا - لہذا اس وقت  
جو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود معاشرہ  
کی تاریکیاں چھٹ نہیں رہیں تو اس سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ قوانین  
خداوندی نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے - مَسَا وَ دَعَاكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى  
(۹۳) ”نہ تو تیرے نشو و نما دینے والے نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی  
(یونہی، خواہ مخواہ) مشقت میں ڈال دیا ہے“ - وَالضُّحَى کے ساتھ آنے سے یہ  
بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ دن اور رات کے تغیرات اس پر شاہد ہیں کہ ان  
مخالفین کی یہ حالت ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہیکی - اس میں انقلاب آئیگا -

## س ح ب

سَحَبٌ - اس نے کھینچا - کھسیٹا - اَلْمَرْآةُ تَسْحَبُ ذَيْلَهَا -  
عورت اپنا دامن زمین پر کھسیٹتی (ہوئی چلتی) ہے - اِنْسَحَبْ - وہ زمین پر کھسٹ  
گیا - اسی سے اَلسَّحَابَةُ ہے جس کے معنی ہیں ہدلی، بادل کا ٹکڑا، کیونکہ  
وہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے - یا ہوائیں اسے کھینچتی ہیں، یا وہ دامن

گھسیٹتا ہوا چلتا ہے\*۔ (اس کی جمع سَحَابٌ ہے) قرآن کریم میں لفظ سَحَابٌ مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً السَّحَابِ الْمُسْتَخَرِّ (۱۶۳/۲) ”بادل جو مسخر کیا گیا ہے“ اور السَّحَابِ الثَّقِيَالِ (۱۶۳/۱) ”بھاری بھاری بادل“۔

کھینچنے کے معنوں میں سورۃ المؤمن میں ہے یُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ۔ (۲۴/۲۱)۔ وہ ”حمیم“ میں گھسیٹ کر یا کھینچ کر ڈالے جائیں گے۔ سورۃ قمر میں ہے یَوْمَ یُسْحَبُونَ فِي النَّارِ (۵۴/۲۸)۔ جس دن انہیں آگ میں گھسیٹا جائیگا۔

## س ح ت

السَّحْتُ۔ کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینا۔ کسی چیز کو آہستہ آہستہ چھیل کر الگ کر دینا۔ سَحَتِ السَّحْمُ عَنِ اللَّحْمِ۔ گوشت کے اوپر سے چربی کو چھیل کر الگ کر دیا\*۔ قرآن کریم میں ہے فَيَسْحَتُكُمْ بِعَذَابٍ (۲۱/۲۱)۔ وہ ایسی سزا دے گا کہ تمہاری جڑ کٹ جائیگی۔ یا وہ تمہیں آہستہ آہستہ مٹا دیگا۔

السَّحْتُ۔ ہر حرام چیز جس کا تذکرہ معیوب ہو، حرام اور گندہ پیشہ جو باعث عار ہو، ہر نا پسندیدہ اور حرام کی کمائی۔ اس لئے کہ وہ برکت و سعادت کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے\*۔ یہود کے متعلق ہے أَكْفَلُوا لَلِيسْحَتِ (۵۴/۲۸)۔ ان کا ذریعہ معاش بہت برا ہے۔ عام یہودی سود خوار اور بددیانت تھے اور ان کے مذہبی راہنما دین فروشی کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر قابل نفرت ذریعہ معاش اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور ایک یہودیوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ سرمایہ پرستی اور پیشوائیت جہاں بھی ہو وہاں یہی حالت ہوتی ہے۔ حَرَامٌ سَحْتٌ۔ سخت حرام کو کہتے ہیں۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سَحْتٌ اس حرام کو کہتے ہیں جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہ ہو بلکہ وہ کھلم کھلا حرام ہو\*\*۔ اَرْضٌ سَحْتَاءٌ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو\*۔ عامٌ اسْحَتٌ۔ قحط کا سال جس میں چارہ بالکل نہ پیدا ہو\*۔

## س ح ر

السَّحْرُ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی موڑنے اور پھیرنے کے ہیں۔ اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں



پیش کرنا\*۔ تہذیب میں ہے کہ اس کے اصلی معنی کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو۔ یعنی ایسا دھوکا جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکا کس طرح دیا گیا ہے۔ پھر یہ لفظ عام دھوکے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا\*\*\*۔ سَحَرَهُ وَتَحَرَّاهُ کے معنی ہیں اس کو دھوکا دیدیا۔ اِنْشَاءً اَنْتَ مِنْ التَّمَسُّحِ الرَّبِّیْنَ (۱۸۵-۱۸۳) کے معنی ہیں تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں دھوکا لگ گیا ہے۔ اور بار بار مبتلائے فریب ہو جاتے ہو۔ عَنَزَ مَسْحُورَةٌ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن وہ دودھ بہت کم دے۔ التَّمَسُّحُورُ اسے کہتے ہیں جس کی عقل میں خرابی ہو گئی ہو\*۔

مخالفین، رسول اللہؐ کو رَجُلًا مَسْحُورًا (۱۶۱) کہتے تھے۔ یعنی جسے دھوکا لگ گیا ہو۔ فریب خوردہ انسان۔ یا جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ یا جسکی عقل ماری گئی ہو۔ نیز اس کے معنی سَاحِر کے بھی کئے گئے ہیں۔ جیسے (۱۶۱) میں۔ سورۃ مومنون میں ہے قُلْ قَاتِلْنِیْ تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۶)۔ ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں (یا کس وجہ سے) دھوکا لگتا ہے؟ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے تمہارا رخ حقیقت کی طرف سے مڑ کر دوسری طرف پھر جاتا ہے؟ دھوکے کے علاوہ اس کے معنی جھوٹ کے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَكَذٰلِیْنَ قُلْتُ اِنْ سَكَمْتُمْ مَّبْغُوثُوْنَ مِّنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُولَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۱)۔ اگر تو ان سے کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ کہہ دیں گے کہ یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔

السَّحَرُ۔ سینہ کے اوپر کا حصہ۔ (پھیپھڑا۔ دل، کایچی وغیرہ)۔ ہر چیز کا کنارہ۔ اس اعتبار سے رات کے آخری حصہ کو سَحَر کہتے ہیں۔ یا صبح (فجر) سے ذرا پہلے۔ راغب نے آخر شب کی تاریکی کو دن کی ابتدائی روشنی میں خلط ملط ہونے کو، نیز ایسے وقت کو سَحَر بتایا ہے (۵۱/۵۲)۔ اَسْحَارُ اسکی جمع ہے\*\* (۵۱/۱۸)۔ دن کا آغاز۔ ابتدائے کاروبار کا وقت\*\*\*۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کی عمرانی زندگی میں ایک دور گزرا ہے جسے عہد سحر (Magic Age) کہا جاتا ہے۔ مغربی محققین نے اس دور کے متعلق بڑی کثیر معلومات فراہم کی ہیں۔ سحر (یا Magic) کے معنی یہ تھے کہ انسان مختلف طریقوں (جھاڑ۔

بھونک - تعویذ گنڈا - اوراد و وظائف ) سے کائنات کی مؤثر قوتوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی منشاء کے مطابق کام کریں - اسی کو جادو کہتے ہیں -

یعنی انسان کا پہلا دور پرستش کا تھا جس میں وہ کائناتی قوتوں سے عاجزی سے گڑگڑا کر مدد مانگتا تھا - لیکن اس کے بعد یہ دوسرا دور آیا جس میں اس نے ان قوتوں کو مجبور کرنے کا طریق اختیار کیا - ان ساحرین کا (پروہتوں کی طرح) معاشرہ میں بہت اونچا مقام تھا - لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انسان کا ”دور پرستش“ سے ”عہد سحر“ کی طرف آنا، فکر معقول (Rational Thought) کی طرف آنے کی پہلی اور دھندلی سی کوشش تھی -

”فکر معقول“ سے مراد یہ ہے کہ ہر حادثہ کا سبب معلوم کیا جائے - قانون علت و معلول (Cause And Effect) کے مطابق حوادث و واقعات کی وجہ معلوم کی جائے - ”دور پرستش“ میں انسان سمجھتا تھا کہ (مثلاً) بخار اس لئے آتا ہے کہ کوئی دیوتا ناراض ہو جاتا ہے - اسے رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس دیوتا کی بھگتی سے اسے خوش کر دیا جائے - اس میں علت اور معلول کا کوئی تصور نہیں تھا - وہ اس سے ”عہد سحر“ کی طرف آیا -

یعنی اس نے یہ سوچا کہ (مثلاً) اگر فلاں منتر کو اتنی بار، اس طریق سے دہرا لیا جائے تو اسکا لازمی نتیجہ فلاں ہوگا - بالفاظ دیگر اسکے ذہن میں عمل اور اس کے نتیجہ میں خاص ربط ہونے کی ذرا سی کمرن نمودار ہوئی - خدا کی طرف سے عطا کردہ دین نے یہ بتایا کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے - ہر کام کا ایک متعین نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے ایک خاص قانون کے مطابق -

اگر انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لے تو جب جی چاہے اس قسم کا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے - یہ وہ تصور ہے جس پر علوم سائنس کی ساری عمارت استوار ہے، اور جس محور کے گرد انسان کی زندگی اور اس کا مستقبل گردش کرتا ہے - سحر اس لئے باطل ہے کہ اس میں نتیجہ کسی خاص قانون کے مطابق مرتب ہونے کا تصور نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص طریق کچھ پڑھنے اور کرنے کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے - انسان کو فکر معقول قرآن کریم نے دیا ہے -

قرآن کریم میں داستان حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں ساحرین قوم فرعون اور ان کی سحر کاریوں کا ذکر تفصیل سے آتا ہے - انہیں سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ہوا تھا - اگر ان مقامات میں سحر سے مراد جادو ہے تو ان تمام واقعات (رسیوں کا چلنا وغیرہ) کو انہی معانی میں سمجھا جائے گا - لیکن اگر اس کے معنی ”باطل پرستی“ ہے تو پھر ان آیات کے مجازی معانی لئے جائیں گے - (تفصیل میری کتاب برق طور میں ملیگی) -

سِحْرٌ (جادو) کا مفہوم لینے سے ایک اہم چیز سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان جادو گروں نے سَحَرُوا۟ اَعْيُنَ النَّاسِ (۱۱۶)۔ لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یعنی وہ رسیاں سچ مچ چلنے نہیں لگ گئی تھیں۔ انہوں نے (ہاتھوں کے کرتب یا نفسیاتی قوت سے) ایسا کیا کہ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ یُخَيَّلُ الْيَهُودَ مِنْ سِحْرِ هِمَّ اَنْهَضَتْ سَعْيَ (۲۶)۔ ”موسےؑ کو ایسا خیال ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں“۔ یعنی سحر سے صرف دیکھنے والے کی قوت متخیلہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ وہ چیزیں فی الواقعہ ایسی نہیں بن جاتیں۔ ساحر دیکھنے، والے کی قوت متخیلہ کو متاثر کر دیتا ہے، اور بس ہمارے زمانے میں نفسیات (Psychology) کی تحقیقات نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ سب انسان کی قوت متخیلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آج سے کتنا عرصہ پہلے اس حقیقت کو واشگاف کیا تھا۔ (نیز دیکھئے عنوان خ۔ ی۔ ل)

یہودیوں کا سارا مذہب سحر و ساحری کا مرقع اور ان کے معبد اس قسم کی کرشمہ سازیسوں کی آماجگاہیں تھے۔ وہ ان باتوں کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ”اسم اعظم اور نقوش سلیمانی“ ان کی خاص چیزیں تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی اور واضح الفاظ میں بتایا کہ خدا کے نبیؑ ان توہم پرستیوں اور فریب سازیسوں سے بہت دور ہوتے ہیں۔ (۲۲)۔

قرآن کریم نے تو یہ کہا، لیکن قرآن کریم کی حامل قوم (مسلمانوں) نے گنڈے۔ تعویذ۔ ورد۔ وظائف، غرضیکہ ان تمام توہم پرستیوں کو ایک ایک کر کے اپنے ہاں جمع کر لیا اور اسے ”روحانیت“ قرار دیکر باطل کو حق کا لباس پہنا دیا۔ یا للعجب!

اوپر بتایا گیا ہے کہ کفار، نبی اکرمؐ کے متعلق کہتے تھے کہ وہ رجل مسحور ہے (۱۴)۔ یعنی اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے (۲۵)۔ نبی کی ذات اسقدر نشو و نما یافتہ اور مستحکم ہوتی ہے اور اسکی قوت ایمانی اسقدر مضبوط کہ اس کے مقابلہ میں ساحرین کی نفسیاتی قوت ایک ثانیہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتی، چہ جائیکہ وہ نبی کو متاثر کر دے اور وہ ان کے فریب سحر میں آجائے۔ یہ ناممکن ہے۔ حضرت موسےؑ کے قصے میں (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اتنا ہی کہا

ہے کہ انہوں نے خیال کیا کہ گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ لیکن یہ چیز اور ہے اور کسی کا جادو کے اثر سے مسحور ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جانا اور بات۔ نبی پر اس قسم کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا۔

(قصہ حضرت موسیٰؑ میں اگر سحر کے معنی باطل پرستی لٹھے جائیں تو پھر بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے)۔

## س ح ق

سَحَقَتْہ - يَسْحَقُہ - سَحَقًا - اسنے اسے کوٹ کر، پس کر، باریک کر دیا۔ اَلْاَسْحَاقُ - وہ پس گیا۔ سَحَقَتِ الرِّيحُ اَلْاَرْضَ - ہوائے زمین کے نشانات مٹا دئے۔ وہ اس تیزی سے چلی جیسے زمین کی مٹی کو پس رہی ہو۔ سَحَقَتِ الدَّابَّةُ - جانور تیز دوڑا۔ اسی سے اَلْاَسْحَاقُ کے معنی میں دور ہونا۔ اَسْحَقُ فُلَانًا - اس نے اسے دور کر دیا۔ ہلاک کر دیا\*۔ ابن فارس نے اسکی بنیادی معنی (۱) بَعْد اور دوری (۲) کسی چیز کو اسقدر کمزور کر دینا کہ وہ خستہ ہو جائے، بتائے ہیں۔ اَسْحَقَ الضَّرْعُ : تھن دودھ سے خشک ہونے اور مرجھا گئے۔ راغب نے سَحَقُ کے معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا کئے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَسَحَقًا لَا صَحْبَ السَّعِيرِ (۱۱)۔ اہل جہنم کے لئے (زندگی کی خوشگوار باتوں سے) بَعْد اور محرومی ہے۔ مَسْكَانٌ سَحِيقٌ (۱۲)۔ دور دراز جگہ۔

## س ح ل

سَحَلَتْہ - يَسْحَلُہ - سَحَلًا - اسنے اسے چھیل دیا اور کھرچ دیا، ریتا۔ اَلرَّيْحُ السَّحَلُ اَلْاَرْضَ - ہوائیں زمین (کی سطح) کو کھرچ دیتی ہیں۔ اَلْاَسْحَالُ - دریا یا سمندر کا کنارہ جسے پانی چھیلتا اور کھرچتا رہتا ہے\*\*۔ قرآن کریم میں ہے فَلْيُلْقِہِ الْبَیْمُ بِالْاَسْحَالِ (۲۹)۔ دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا۔

## س خ ر

سَخِرَہ - يَسْخَرُہ سَخَرًا وَ سَخَرًا وَ سَخَرًا کے معنی مذاق کرنا اور بیوقوف سمجھنے ہوئے ہنسی اڑانا ہیں۔ رَجُلٌ مَخْرُہ\*۔

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج و راغب

وہ آدمی جو بہت زیادہ لوگوں سے مذاق کرے اور انکی ہنسی اڑائے۔ اس سے اسم السَّخِرِ يَّتَهُ وَالسَّخِرِيُّ "وَالسَّخِرِيُّ" آتا ہے \*۔ یعنی ٹھٹھول، مذاق۔ سَخِرَهُ۔ يَسْخِرُهُ سَخِرَ يَسْخِرُ يَسْخِرُ يَسْخِرُ يَسْخِرُ يَسْخِرُ يَسْخِرُ۔ سَخِرَهُ تَسْخِيرًا۔ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا۔ کسی کو مجبور کر کے کسی کام پر لگا دینا۔ کسی سے کوئی کام بلا معاوضہ (بیگار کے طور پر) کرا لینا۔ کسی کو تابع فرمان کرنا۔ اپنے حکم کے مطابق چلانا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حقیر سمجھنے اور ذلیل کرنے کے ہیں۔

محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ مادہ مجرد ثلاثی سے آیا ہے اس سے مراد استہزاء ہے سوائے سورۃ زخرف کے کہ وہاں لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَ يَّتَهُ (۳۳/۲۳)۔ میں سَخِرَ يَّتَهُ کا لفظ تسخیر کے معنوں میں ہے \*\*۔

سورۃ زخرف کی یہ آیت ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد میں کسب و ہنر کی استعداد میں جو فرق ہے وہ اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف کام مختلف افراد کرسکیں۔ اگر تمام افراد کی استعداد ایک جیسی ہوتو کوئی شخص کسی دوسرے کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق کام ہی نہ کرے۔ یا تمام افراد ایک ہی قسم کا کام کرنے لگ جائیں۔ اس طرح معاشرہ کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن اختلاف استعداد کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ استعداد والے لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کم استعداد والے لوگوں کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا کر انہیں اپنی اغراض کے حصول کا آلہ کار بنالیں۔ اختلاف استعداد صرف تقسیم کار کے لئے ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے ہر ابن آدم واجب التکریم ہے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں ہے سَخِرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۲۱۸/۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کی ہر چیز کو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چلنے کے لئے پیدا کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے (جسے قوانین فطرت کہتے ہیں) ان اشیائے کائنات سے اپنے فائدے کے کام لے سکے۔ لہذا جو قوم، قوانین فطرت کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے اشیائے فطرت کو اپنے کام میں لائیگی وہی ان کی

تخلیق و تسخیر کے منشا کو پورا کریگی۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس اعلان سے انسانی دنیا میں کس قدر انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ انسان، کائنات کی قوتوں سے ڈرتا تھا۔ انہیں اپنا معبود بناتا تھا۔ ان کے حضور گڑ گڑاتا تھا۔ اپنے آپ کو ان سب کے سامنے کمزور و ناتواں سمجھتا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ یہ تصور یکسر باطل ہے۔ خدا نے کائنات کی تمام قوتوں کو انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھا ہے۔ یہ قوتیں اس کی معبود نہیں، اسکی خادم ہیں۔ ”ملائکہ“ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس سے انسان کا مقام کائنات کی ہر چیز سے بلند ہو گیا اور اس کے سامنے اشیائے فطرت کی تسخیر کے دروازے کھل گئے۔ دنیا میں جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کریگی وہ قوتیں اس کے تابع فرمان ہو جائیں گی۔ اس میں مومن اور کافر کا بھی کچھ فرق نہیں۔ البتہ مومن ان قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق انسانیت کی نشوونما کے لئے صرف کریگا اور کافر انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے کام میں لائیکا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) مقام آدم (آدمی کا مقام) یہ ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کو مسخر

کر کے اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

(۲) مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے منشاء خداوندی

کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

(۳) جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کرے، اسے مقام مومن قواہیک

طرف مقام آدم بھی نصیب نہیں۔

آج کا مسلمان خود سمجھ لے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کا مقام کیا ہے؟

سَخِرَ (مذاق اور استہزاء کے معنوں میں) قرآن کریم کے متعدد مقامات

پر آیا ہے (مثلاً ۲۱/۲۹ و ۲۴/۲۹)۔ سورۃ مومنوں میں لفظ مِخْرَ یٰۤا (۲۳/۱۱۰)

انہی معانی میں آیا ہے۔

## س خ ط

السَّخِطُ۔ السَّخَطُ۔ ناپسندیدگی، کراہت، نارضا مندی، غضب، غصہ۔

سَخِطَ عَلَیْہِ۔ وہ اس پر ناراض ہوا۔ سَخِطَ۔ اس نے ناپسند کیا، کراہت

کی۔ اَمَّخَطَہ۔ اس نے اسے ناراض کر دیا۔ غصہ دلادیا۔ اَلْمَسْخُوْطُ۔

مکروہ۔ ناپسندیدہ\*۔ راغب نے کہا ہے کہ سَخَطٌ اس شدید غصے کو کہتے

ہیں جو سزا کا مقتضی ہو\*\*۔

لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی غصے یا ناراضگی کے نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان انسانی جذبات سے بہت بلند ہے۔ اس کے معنی سورۃ محمد کی اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے ذَٰلِکَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا اسْتَحْطَّ اللَّهُ وَكُتِرَ هَوَا رِضْوَانَهُ فَاحْبَبْتَ أَعْمَالَهُمْ (۲۴)۔ ان کی ہلاکت اور تباہی اس لئے ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو احکام خداوندی کے مطابق نہیں ہیں۔ جو باتیں ان احکام کے مطابق ہیں یہ انہیں ناپسند کرتے ہیں (کُتِرَ هَوَا رِضْوَانَهُ) یعنی کُتِرَ هَوَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ (۲۴)۔ وحی خداوندی کو نا پسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرتے جن کی یہ توقع لگائے رہتے ہیں۔ لہذا مَا اسْتَحْطَّ اللَّهُ کے معنی ہوئے وہ امور جو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبط اعمال ہے۔ اس میں غصے اور ناراضگی کا کوئی سوال نہیں۔ (۱۶۱) میں بھی سَخَطٌ بمقابلہ رِضْوَانٍ آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں اُن سَخَطَ اللَّهُ کی تفسیر مَا قَدْ مَتَّ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ (۸۰) نے کر دی۔ یعنی مکافات عمل۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ ض۔ ی اور غ۔ ض۔ ب دیکھئے)۔

## س ۵۵

السَّدُّ۔ روک۔ ہر حائل ہونے والی چیز۔ پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے کہ السَّدُّ (س پر زبر سے) وہ روک ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہو اور السَّدُّ (س پر پیش سے) وہ پہاڑ یا روک ہے جو قدرتی طور پر بنی ہوئی ہو\*۔ لیکن بعض اس فرق کو نہیں مانتے۔ خود قرآن کربم میں پہاڑ کے لئے بھی السَّدُّ آیا ہے (۱۸) اور انسانوں کی بنائی ہوئی روک کے لئے بھی (۱۸)۔ سورۃ یس میں یہ لفظ ایسے امباب اور عناصر کے لئے آیا ہے جو انسان کی عقل و بصیرت کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ (۳۶)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے شکاف کو بھر دینا اور اسے ہموار کر دینا۔ سَدَّدَ الرُّمْحَ۔ نیزے کو میدھا کر دیا۔ درست کر دیا۔ سَدَّدَ الثَّقَمَ۔ شکاف بھر دیا\*۔ رَجُلٌ سَدِيدٌ۔ میدھی راہ پر چلنے والا آدمی۔ اَمْرٌ سَدِيدٌ۔ ایسی بات جو ہر اس خلا کو بھر دے جو حقیقت کے بارے میں رہ گیا ہو۔ متوازن اور درمیانہ بات جس میں

نہ افراط ہو نہ تفريط\*۔ قرآن کریم میں قَوْلًا سَدْرًا بَدَأَ آيَا هِی (۹ و ۳۳) نہایت متوازن، سیدھی، صاف بات۔ جس بات سے کوئی خلا باقی نہ رہے۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کبھی مبہم، پُر پیچ و خم، ذومعنی، ٹیڑھی میڑھی بات نہ کرو۔ ہمیشہ سیدھی، صاف، واضح، محکم، متوازن اور ٹھیک ٹھیک معنی بتا دینے والی بات کرو۔ ایسی بات جس کا تعلق براہ راست صحیح مقصد سے ہو۔ لایعنی اور بے فائدہ نہ ہو۔ سَدْرًا سَدْرًا اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگے\*۔ ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں۔

(سَدْرًا اور رَدْمًا کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان رد)

## س در

السَّيْدَرُ - بیری کے درختوں کو کہتے ہیں۔ (واحد سیدرة\*)۔ جب بیری کا درخت بہت گھنا ہو جائے تو اس کا سایہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور ہرب، صحرا کی سخت گرمی کے متائے ہوئے اس کے سایہ میں آرام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے جنت کے آرام اور نعماء کے لئے اسے بطور مثال بیان کیا گیا ہے\*۔ رَقِي سَدْرًا مَخْضُودًا (۵۶)۔ ایسے درخت جو پھل سے لدے ہوئے ہوں اور جن کے سایے نہایت گھنے ہوں۔ یا ایسے درخت جن کا سایہ تو ہو لیکن کانٹے نہ ہوں۔ بلا خلش آرام و راحت۔ سایہ کے اعتبار سے دوسری جگہ ہے۔ وَ نَدَّ خَيْلُهُمْ ظِلَّالًا ظَلِيلًا (۲۵)۔ اس میں آرام اور خوشحالی، دونوں پہلو مضمحل ہیں۔ بیری کا درخت ریگستانی اور سخت گرمی کے خشک علاقہ میں بھی سرسبز رہتا ہے لیکن بقول راغب، اس کا پھل زیادہ مفید غذائیت نہیں رکھتا۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب سب کا علاقہ سیلاب کے بعد بنجر ہو گیا تو وہاں سرسبز و شاداب باغات کی جگہ کچھ بیری کے درخت اُگ آئے۔ وَ شَتَّىٰ مِّنْ سَدْرٍ قَلِيلٍ (۳۳)۔ سَدْرٍ النَّخْلِ کھجوروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں\*\*۔

سَدْرٌ - وہ متحیر ہوا۔ سخت گرمی کی وجہ سے اسے دکھائی فہ دیا۔ السَّادِرُ - اُس شخص کو کہتے ہیں جو شدت گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے۔ سَدْرًا بَصَرُهُ سَدْرًا - شدت گرمی کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت اور اضطراب رائے کے ہیں۔ السَّادِرُ - متحیر کو کہتے ہیں۔



سورة النجم میں مقام نبوت کی کیفیات کو مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ وحی کی کیفیت صرف مثلاً اور تشبیہاً ہی بیان کی جاسکتی ہے، کیونکہ کوئی غیر نبی، وحی کی کیفیت اور ماہیت کو جان اور پہچان نہیں سکتا۔ وہ صرف اس کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے)۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں انسانی عقل و فکر کے لئے سوائے انتہائی حیرت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عقل انسانی اُس مقام کی ماہیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکتی۔ اسے وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ اس کے لئے قرآن حکیم نے عیندۂ سیدۃ رة المُنْتَهٰی (۵۳/۱۶) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں تعیر اپنی انتہا تک پہنچ جائے۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی کہ اِذْ یَغْشٰی السَّیْدَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳/۱۶)۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ یعنی یہ تمہارے (غیر از نبی انسانوں کے) لئے ممکن نہیں کہ تم جان سکو کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ تمہاری نگاہ کے لئے وہ تعیر کی فراوانی تھی جس نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۶)۔ نبی کی آنکھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کھاتی۔ وہ حقائق کو بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر دیکھتی ہے۔ لیکن صرف انہی حقائق کو جو اسے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ ان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ بڑھ سکتی ہی نہیں۔ کیونکہ اسے یہ چیزیں اس کے ذاتی کسب و ہنر سے نہیں ملتیں کہ وہ جس قدر زیادہ محنت کرتا جائے آگے بڑھتا جائے۔ اس پر حقائق منکشف کئے جاتے ہیں، جس قدر منکشف کئے جائے مقصود ہوں۔ انسانوں کے مقابلہ میں تو علم نبوت (وحی) لانتہا ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ راغب نے اِذْ یَغْشٰی السَّیْدَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳/۱۶) کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس میں اس مکان کی طرف اشارہ ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کو افاضہ السہب سے نوازا گیا تھا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے بیعت لی تھی (۳۸/۱۸)۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مکان کے مقابلہ میں کیفیت کا مفہوم زیادہ موزوں ہے۔ ویسے السَّیْدَةُ پانی کے منبع، نہر اور دریا کو بھی کہتے ہیں\*۔ السَّیْدَةُ سمندر کو کہتے ہیں\*۔ اس اعتبار سے بھی اس کا مفہوم علم الہی کا سرچشمہ (وحی) زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لہذا سیدۃ رة المُنْتَهٰی وحی کا سرچشمہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے تعیر ہی تعیر ہوتا ہے لیکن چشم نبوت اسے صاف طور پر دیکھتی ہے۔

## س د س

السُّدُسُ - السُّدُسُ - چھٹا حصہ (۳۱) - اَلْسَيْتُ - اصل میں سیدس تھا۔ آخری سین کو تا سے بدل کر سیدت کر لیا۔ پھر درمیانی دال کو تا سے بدل کر ادغام کر کے سیت بنا لیا۔ یعنی چھ - سیتون - میتین - ساٹھ - (۵۸) سادس چھٹا (۱۶) - (نیز دیکھئے عنوان س - ت - ت)

## س د ی

السَّادِي - کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں۔ قدَّ السَّادِي الشَّوْبَ - وَّسَدَّاهُ - اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا۔ السَّادِي - وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھریں - ذَهَبَ كَلَامُهُ سُدًى - اسکی بات بیکار چلی گئی - ابن فارس نے کہا ہے کہ سدی کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے ادھر چلے جانا ہیں۔ خلیل نے کہا ہے کہ سَدُو - بچوں کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں۔

قرآن حکریم میں ہے اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۵۹) - اس مادے کے بنیادی معنوں پر غور کیجئے۔ کپڑا بننے کے لئے تانے اور بانے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنہا تانا سو گز لمبا بھی کیوں نہ ہو وہ بیکار ہوتا ہے۔ جب تک اس میں بانا نہ بنا جائے وہ کپڑا نہیں بن سکتا۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا۔ وہ کبھی ”روحانیت“ حاصل کرنے کیلئے خاٹقاہوں، تجرد گاہوں، اور سجادہیوں کی طرف چلا گیا۔ اور کبھی خالص دنیا دار بن کر حکومت و سلطنت کی طرف آ گیا۔ اس نے روح اور مادہ - آتما اور پراکرتی - دین اور دنیا - مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اسکی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ یا وہ تانا رہیں اور یا بانا۔ وہ ثَوْب (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں۔ قرآن حکریم نے آکر کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کی زندگی تانا ہی تانا ہے۔ اس میں بانے کی بھی ضرورت ہے۔ تانے اور بانے کے امتزاج سے ثَوْب بنیگا۔ (ثَوْب اور ثَوْب کا مادہ ایک ہی ہے۔ دیکھئے ث - و - ب) لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ وہ یونہی شتر بے مہار نہیں

کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہ ہو۔ اس پر خدا کے قنازون مکافات کی کسری گرفت ہے۔ وہ اس کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتا۔

لہذا صحیح زندگی دین اور دنیا کے تسائے اور بنائے سے خدا کے مقرر کردہ ڈیزائن کے مطابق کپڑا بننے میں ہے۔ یہی ثواب کا کام ہے۔ تنہا عقل انسانی کبھی کامیابی تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ صرف تانا ہی تانا رہتی ہے۔ جب اس سے وحی الہی کی روشنی میں کام لیا جائے تو پھر اس سے صحیح تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اب دوسرے معنوں پر غور کیجئے۔ یعنی اونٹوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ دینا۔ خدا نے انسان کو اس طرح شتر ہے مہار نہیں چھوڑ دیا۔ اس کی راہ نمائی کے لئے اپنی طرف سے وحی کا ضابطہ بھیجا ہے۔ لہذا، اس کی زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ اُس ضابطہ کے مطابق چلے۔ اگر یہ اس کے مطابق نہیں چلے گا تو اس کی کوششیں بیکار چلی جائیں گی۔ کائنات میں، انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی یہ حالت ہے کہ ان کے لئے جو قوانین خدا نے بنائے ہیں، وہ ان پر چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ اسی کو ان اشیاء کی فطرت (یا جبلت) کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کے لئے بھی قوانین بنائے ہیں لیکن اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان قوانین کے خلاف جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرے۔ وہ ان قوانین کی پرواہ کرے یا نہ کرے، اس کے اعمال کے نتائج بہر حال ان قوانین کے مطابق مرتب ہونگے۔ وہ اس باب میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

## س ر ب

السَّارِبُ - چرنے والا اونٹ۔ مویشی اور چوپائے۔ السَّارِبُ - بہتا پانی۔ السَّارِبَةُ - راستہ۔ جانے کی جگہ۔ السَّارِبُ - زمین میں آزادی سے اپنی مرضی پر چلا جانے والا \*۔ سورۃ رعد میں ہے سَارِبٌ بِالسَّهَارِ (۱۳) دن میں چلنے والا \*۔ سورۃ کہف میں ہے فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸)۔ اس (مچھلی) نے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔ اس نے دریا کی راہ لی۔ اس لفظ میں کھلم کھلا آزادی سے چلنے کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ ازھری نے کہا ہے سَرَبَتِ الْإِبِلُ کے معنی ہیں اونٹوں کا کھلم کھلا جدھر

چاہے آزادی سے چلے جانا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ میں وسعت و کشادگی اور زمین پر چلنے کا مفہوم ہے۔ السَّوْبُ اور السَّوْبُ اس پانی کو کہتے ہیں جو مشکوں وغیرہ سے بہ نکلے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ٹپکنے والا پانی۔

سَرَّاب\*۔ وہ چمکتی ہوئی ریت جو صحرا میں بہتے پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور جوں جوں پیاسا اسکی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا\*۔ قرآن کریم نے غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سَرَّاب\* سے تشبیہ دی ہے۔ (۲۹)۔ وہ دور سے، بہتے ہوئے پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں (بڑے دلفریب اور خوشنما نظر آتے ہیں)۔ لیکن جب پیاسا ان کے پاس آتا ہے تو وہ اسکی تسکین کا سامان بننے کی بجائے الٹا ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ السَّوْبُ نشیب کی طرف جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز نشیبی جگہ کے لئے بھی\*\*۔ اس میں بھی آزادی سے چلنے کا پہلو موجود ہے، کیونکہ نشیب کی طرف پانی بلا رکاوٹ بہے جاتا ہے۔

## س ر ب ل

سَرَّابِیْل\* (جمع۔ اس کا واحد سِرَّابَال\* ہے)۔ کرتہ۔ یا زرہ یا ہر وہ لباس جو (بدن کے بالائی حصہ میں) پہنا جائے۔ مثلاً قمیص\*\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معنی میں آیا ہے۔ وَجَعَلْ لَّكُمْ سَرَّابِیْلَ تَقِيْكُمْ الْحَرَّ وَ سَرَّابِیْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (۱۱۱) ”اس نے تمہارے لئے پوشاک بنائی جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتی ہے اور زرہیں بنائیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں“۔ سورۃ ابراہیم میں سرکش مخالفین اسلام کے متعلق آیا ہے کہ جب ان کی قوتیں ٹوٹ جائیں گی تو سَرَّابِیْلُھُمْ مِّنْ قَطْرِ اَنْ (۱۲)۔ ان کی زرہیں تارکول کی بن جائیں گی۔ یعنی وہ زرہیں جو انہیں دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے تھیں تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر وہاں جان بن جائیں گی۔

## س ر ج

السِّرَّاج\*۔ چراغ کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو روشنی دے\*۔ (بعض کے نزدیک یہ درحقیقت فارسی لفظ چراغ کا معرب ہے)۔ اَلِیْسِرَّاج\*۔

\* تاج و راغب - \*\* راغب - \*\*\* تاج و محیط۔

آفتاب کو بھی کہتے ہیں \*۔ قرآن حکریم میں ہے جَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا (۲۵/۱۱)۔ بمعنی سورج۔ اور سورۃ نوح میں ہے وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا (۹۱/۱)۔ سورج کو چراغ بنایا۔ خود نبی اکرمؐ کو بھی سیراجاً مُنِيرًا (۳۳/۳۹) کہا گیا ہے۔ السِّرْجُ - زین - السِّرْجُ اج - زین ساز۔ نیز بہت جھوٹ بولنے والا \*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن، زینت اور جمال کے ہوتے ہیں۔ چراغ کو السِّرْجُ اس کی روشنی اور خوبصورتی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ زین کو بھی السِّرْجُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے جانور کی زینت ہوتی ہے۔ سِرْجٌ وَجْهَتُہ - اس نے اپنے چہرے کو حسین بنایا۔

## س ر ح

السِّرْحُ - التَّسْرِیْحُ - جانوروں کو صبح کے وقت چراگاہ میں چرنے کیلئے کھلا چھوڑ دینا \*\*۔ (حِیْنٌ تَسْرَحُونَ (۱۱/۱)۔ سِرَاحٌ اور تَسْرِیْحٌ کے معنی ہیں قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا۔ طلاق دے کر رخصت کر دینا \*\*۔ وَأُسْرٌ حِکْمٌ سِرَاحًا جَمِیلًا (۳۳/۳۸)۔ ”اور تمہیں حسن کا راہ انداز سے رخصت کردوں،“۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ اُسْرَاک (روک رکھنے) کے مقابلہ میں آیا ہے۔ فَاتَسْرَاکَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِیْحٌ بِإِحْسَانٍ (۲/۲۳۱)۔ یعنی قاعدے کے مطابق (نکاح کے ذریعے) روک رکھنا یا قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا۔ طلاق دیکر رخصت کر دینا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے اور چل پڑنے کے ہوتے ہیں۔

## س ر د

السَّرْدُ - چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جوڑنے چلے جانا (ابن فارس)۔ جیسے زرہ کے حلقوں کو ایک دوسرے میں داخل کرتے ہیں۔ چنانچہ زرہ بنانے اور جوڑنے یا دوسرے چمڑے کے سینے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ السَّرْدُ - سوراخ - السَّرْدُ - سوراخ کرنے کا اوزار۔ السَّرْدَةُ - چمڑے کا تسمہ جس سے جوڑے وغیرہ کو سیٹا جائے \*\*۔

قرآن حکریم میں زرہ بنانے کیلئے وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ (۳۴/۱۱) آیا ہے۔ یعنی اسکا اندازہ رکھو کہ سوراخ بالکل ٹھیک ہوں اور ان میں زرہ کی کڑیاں درست آتی جائیں۔

## س ر د ق

الشَّرَادِقُ\* - وہ شامیانہ یا سائبان جو گھر کے صحن کے اوپر کھینچ دیا جائے۔ یا ہر وہ دیوار، قنات یا اور ایسی ہی چیز جو کسی چیز کے گرد گرد کھینچ دی جائے اور وہ اسے اپنے احاطہ میں لے لے۔ اسی بنا پر، اس دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جو بلند ہو کر کسی جگہ چھا جائے اور اس طرح اسے گھیر لے\*۔ ابن فارس نے الشَّرَادِقُ کے معنی غبار بتائے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہے جو مغرب بنا لیا گیا ہے\*\*۔

قرآن کریم میں ہے نَارًا أَحَاطَ بِهِيَ سُرَادِقُهُمَا (۱۸)۔ جہنم کی آگ جسکے سائبان انہیں چاروں طرف سے گھیر لینگے۔ جہنم ان پر چاروں طرف سے محیط ہو جائیگی۔

## س ر ر

السِّرُّ - جو بات دل میں چھپائی جائے\*۔ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں لیکن کبھی اس کے معنی اس کی ضد (یعنی ظاہر کرنے) کے بھی ہوتے ہیں\*\*\*۔ السَّرُّورُ وَالْحَبُّورُ وَالْفُتْرَحُ - ملتے جلتے الفاظ ہیں لیکن السَّرُّورُ اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل ہی دل میں پوشیدہ رہے اور الْحَبُّورُ اس خوشی کے لئے آتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہو جائیں۔ یہ دونوں قابل تعریف صفات ہیں، مگر فُتْرَحُ اس خوشی کو کہتے ہیں جس سے انسان میں اکڑفون پیدا ہو جائے۔ اس لئے یہ مذموم ہوتا ہے\*\*\*\*۔ سَرَّةٌ - اسے خوش کیا (۲/۹) مَسْرُورٌ - خوش (۹/۱۳)۔

السِّرُّ - ہر چیز کی اصل و بنیاد۔ نیز اس کا خالص حصہ، اندرونی مغز۔ اس لئے عمدہ زمین کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ سَرَارَةٌ الْوَادِي - وادی کا بہترین حصہ۔ الْمَسْرَّةُ - پھولوں کا تختہ۔ السَّرَّاءُ - آسودگی و خوش حالی۔ عیش و عشرت کی فراوانی\*۔ بِمَقَابِلِ الضَّرَّاءِ (۹/۵)۔ السَّرَّاءُ يَتَّعُ - وہ لوندی جس سے جنسی تعلقات قائم کئے جائیں۔ السَّرَّاءُ يَرُ - حکومت و سلطنت۔ تخت۔ پلنگ\*۔ کیونکہ یہ آسودہ حال لوگوں ہی کے پاس ہوتا ہے۔

سورة انعام میں سِرٌّ بِمَقَابِلِ جَهَنَّمَ\* آیا ہے (۶/۱۳)۔ لہذا وہاں سِرٌّ کے معنی محض راز ہیں۔ سورة بقرہ میں مَا يُسِيرُونَ وَمَا يُمْلِكُونَ (۲/۲۴) آیا ہے۔ وہاں بھی اس کے معنی پوشیدہ طور پر باتیں کرنے کے ہیں۔

سورة ابراهيم میں ہے وَبُشَفِيقُوا مِيمًا رَزَقْنَاهُمْ سِيرًا وَاعْلَا نِيَّةً (۱۴)۔ خدا نے انہیں جنو کچھ دے رکھا ہے ، خواہ وہ ان کی غیر سرفی صلاحیتیں ہوں اور خواہ وہ سامان زندگی جو سامنے نظر آ جاتا ہے ، وہ ان سب کو نوع انسان کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ (یسا اس کا مطلب ہوگا) اعلان کرتے ہوئے اور خاموشی سے۔ سورة طہ میں ہے يَسْمَعُونَ السِّرَّ وَآخِطَى (۲)۔ وہ راز کو بھی جانتا ہے اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو بھی۔

سورة يونس میں ہے وَآسَرُوا النَّدَامَةَ (۱۰)۔ وہ (عذاب کو دیکھ کر) ندامت کو چھپائینگے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ یہ اُضداد میں سے ہے اور اس کے معنی ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر چھپانے کے معنی زیادہ موزوں ہیں۔

سُرُر کا لفظ تختوں کے لئے آیا ہے جن پر بیٹھتے ہیں (۱۳)۔ اس کا واحد سَرِير ہوتا ہے۔ اور سَرَارِی کے معنی ہوتے ہیں راز کی باتیں۔ (۹۱) اس کا واحد سَرِير ہوتا ہے۔ سَرَار۔ راز کی بات کرنا۔ دوسروں سے چھپا کر خفیہ بات کرنا (۲۶)۔

## س ر ع

السَّرْعُ۔ السَّرْعُ۔ السَّرْعُ۔ تیز ہونا۔ جلد واقع ہونا۔ تیزی ، جلدی۔ سَرْع۔ وہ تیز ہوا۔ اس نے جلدی کی۔ السَّرْعَانُ مِّنَ الْخَيْلِ۔ آگے نکل جانے والے گھوڑے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جلدی کرنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آتا ہے اللہ سَرَّعَ الْحِسَابِ (۲۴) ”اللہ جلد حساب لینے والا ہے“۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل اسی وقت اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے اس اثر اور نتیجہ کا ظہور ایک خاص وقت پر جا کر ہوتا ہے۔ جیسے بیج میں نشوونما تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہ درخت ایک وقت کے بعد جا کر بنتا ہے اور اس میں پھل بھی ایک وقت کے بعد جا کر لگتا ہے۔ عمل کا فوراً اثر مرتب کرنے لگنا، قانون مکافات کے سَرَّعَ الْحِسَابِ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان کی ذات اُسی وقت متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قطعاً دیر نہیں لگتی۔

سورة ق میں سیراً عتاً (۵۶) آیا ہے۔ جس کے معنی تپنوی سے (واقع ہو جانے کے) ہیں۔ سترّاع - مسّار عتہ - وسیراً عتاً - جلدی کرنا - ایک دوسرے سے سبقت کرنا - و سترّاعنوا لالی مغفیرۃ (۱۳۲) - "حفاظت کی طرف (جانے میں) جلدی کرو، -

## س ر ف

السرف - جو حد مقرر کی گئی ہو اس سے آگے بڑھ جانا - زیادتی کرنا\*۔  
نادانی کرنا (ابن فارس) - سورة بنی اسرائیل میں ہے - فتلاً یسرف فی القتّل (۱۴) - وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے - یعنی قانون نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہے - یا وہ نادانی سے از خود ہی قاتل کو قتل نہ کر دے - بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کرے - انّہ کان متصوّرًا سے یہ واضح ہو جاتا ہے - سورة الفرقان میں انفاق کے ضمن میں یہ لفظ قتر کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵) - قتر - بخل اور خرچ میں تنگی کو کہتے ہیں - لہذا اسراف ، تفریط کے مقابلہ میں اقراط ہوگی - یعنی جس مقام پر جس قدر ضرورت ہو وہاں اس سے زیادہ خرچ کر دینا - اس لئے کہتے ہیں سرفقت الّامّ ولّدہا - ماں نے اپنے بچے کو بہت زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کر دی\* - اس سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو - چنانچہ سرفقت الثمار - اُس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر اس طرح بہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ بیکار چلا جائے\* - اسی لئے کسی چیز کو اس مقام میں نہ رکھنا جس کے لئے وہ بنی ہے اسراف کہلاتا ہے - اور ایسا کرنے والے کو مسرف کہنا جاتا ہے - قوم لوط کو اسی لئے قوم مسرفون (۸۱) کہا گیا ہے ، کیونکہ وہ اغرائش نسل کے سادہ کو اس جگہ (لواطت میں) صرف کرتے تھے جس کے لئے وہ بنا نہیں اور اس طرح سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا - وہ پانی کھیتوں (حرث) کو سیراب کرنے کے بجائے دوسری جگہ ضائع ہو جاتا تھا - زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو بھی مسرفین کہا ہے (۲۶) -

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اسراف ، صرف بیجا (فضول خرچی) ہی کو نہیں کہتے - اس سے مطلب یہ ہے کہ انسانی توانائی ، وقت ، دولت یا کسی اور صلاحیت کا ایسے مقصد کے لئے نہ خرچ کرنا جس سے تعمیری نتیجہ مرتب ہو ، بلکہ اسے تخریبی مقصد کے لئے یا بے فائدہ ضائع کر دینا - (اسراف اور تبذیر کے فرق کے لئے ب - ذ - ر کا عنوان بھی دیکھئے) -



## س ر ق

سَرَقَۃٌ\* - کسی دوسرے آدمی کی محفوظ چیز کو خفیہ طریقہ سے لے لینا۔ اگر اسے کھلے ہندوں سے لیا جائے تو یہ عمل اِخْتِلَاسٌ\* - اِسْتِیْلَابٌ\* اِنْتِهَابٌ\* کہلائیگا۔ اور اگر مالک اپنی چیز کی حفاظت کے لئے مدافعت کرے لیکن پھر بھی وہ چیز اس سے بزور لے لی جائے تو اسے غَصَبٌ\* کہینگے\*۔ سَرِقَ الشَّيْءُ\* - چیز مخفی ہو گئی۔ هُوَ يَسْتَارِقُ النُّظَرَ اِلَيْهِ\* - وہ اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اِنْسَرَقَ عَنْهُمْ\* - چپکے سے کھسک جانا\*۔

سورة يوسف میں ہے اِنَّ اِهْنَكَ سَرَقَ (۱۲/۸۱)۔ ”تیرے بیٹے نے چوری کی ہے“۔ اَلْسَقَارِقُ\* - (۳۸/۵) چوری کرنے والا۔ اِسْتَرَقَ السَّمْعُ\* - چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا\* (۱۵/۱۸)۔ اسی کو (۳۶/۱۱) میں خَطِيفَتِ الْخَطِيفَةِ کہا گیا ہے۔ یعنی اڑتی ہوئی بات کو اچک لینا۔ (ذرا سی بات کہیں سن پانا اور اس پر قیاس آرائیوں کی عمارت تعمیر کر دینا)۔ (سَارِقٌ\* کی سزا قَطْعُ يَدٍ (۳۸/۵) کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ط۔ ع)۔

## س ر م د

اَلسَّرْمَدُ\* - دائم۔ وہ ہمیشہ رہنے والی چیز جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ لَيْلٌ سَرْمَدٌ\* - طویل رات۔ رازی نے کہا ہے کہ سَرْمَدٌ\* کا اشتقاق سَرْدٌ\* سے ہوا ہے جسکے معنی بے دریغ اور لگاتار کے ہیں۔ اس پر مِم داخل کر کے مبالغہ کا فائدہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اسکے معنی مسلسل اور لگاتار رہنے والی مدت کے ہونگے\*\*۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلسَّرْمَدِيٌّ\* اس چیز کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر\*\*\*۔

قرآن حکریم میں ہے۔ اِنْ جَعَلَ اللهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا (۲۸/۲۱)۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر اللہ تم پر رات کو بہت طویل کر دے\*\*۔ یا رات ہی رات رہے اور دن نہ آئے۔

## سری (و)

اَلشَّرَاۤءُ\* - رات کے بیشتر حصے میں چلنا۔ سَرَاۤءُ\* - یَسْرَرِي\*۔ سُرَاۤءُ\* - رات کو چلنا۔ اَسْرَاۤءُ\* - اِسْرَاءُ\* - رات کو چلنا۔ اَلسَّرِيَّةُ\*۔

فوج کا دستہ، کیونکہ وہ رات کو چلتا ہے تاکہ دشمن کو خبر نہ ہوئے  
ہائے\*۔ اَلَسَّرَیُّ\*۔ چھوٹی نہر جو نخلستان کی طرف جاتی ہو\*\*۔ سورة مریم  
میں ہے تَحْتِکَ سَرَرِیًّا (۱۹)۔ تیرے نشیب کی طرف ایک پانی کی نہر ہے۔  
سَرَاةٌ\*۔ ہر چیز کا بلند حصہ۔ وسیع زمین۔

راغب نیز صاحب محیط نے لکھا ہے کہ سَبَّحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی  
بِعَبْدِهِ (۱۹) میں اَسْرٰی کا لفظ سَرٰی یا سَرَرٰی (رات کے وقت چلتا)  
سے نہیں بلکہ سَرَاةٌ سے ہے۔ یعنی خدا اپنے بندے کو سَرَاةٌ  
(کشادہ زمین کی طرف لے گیا) جیسے اَجْبَلَ کے معنی ہوتے ہیں وہ پہاڑ  
پر چلا گیا۔ اور اَتَهَمَ کے معنی، وہ تہامہ میں چلا گیا\*\*\*۔ مکہ کی سرزمین  
حضورؐ (اور آپ کی جماعت) پر تنگ ہو چکی تھی اس لئے آپ نے مدینہ کی  
طرف ہجرت فرمائی جہاں کی فضا آپ کے مشن کے لئے وسیع اور کشادہ تھی۔  
لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سَرٰی یا سَرَرٰی ہی سے ہے اور لَیْلًا تاکید  
مزید کے لئے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے ہجرت رات کے وقت فرمائی  
تھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مردانگی و سخاوت کے معنوں میں (س۔  
ر۔ ی) اور (س۔ ر۔ و) دونوں سے آتا ہے۔ نیز اَلَسَّرَیُّ کے معنی ہیں کسی چیز  
کو کھولنا۔ سَرَاةٌ السَّهَارُ۔ دن کی بلندی کو کہتے ہیں۔

## س ط ح

اَلَسْطَیْحُ\*۔ گھوڑی چھت جو ہموار ہو۔ ہر چیز کا اوپر کا حصہ۔  
سَطَحٌ۔ یَسْطَحُ\*۔ اسنے بچھا دیا۔ پھیلا دیا نیز ہموار کیا، لیٹا دیا۔ پچھاڑ  
دیا۔ اَلْمَسْطَحُ\*۔ ہموار جگہ جس پر کھجوریں خشک کی جاتی ہیں\*\*\*\*۔  
قرآن کریم میں ہے وَآلِیْ اَلْاَرْضِ کَیْفَ سَطِیْحَتِ (۸۸)۔ زمین،  
کہ وہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔ اس کی اوپر کی سطح کس طرح ہموار  
بنائی گئی ہے۔

## س ط ر

سَطْرٌ۔ یَسْطُرُ\*۔ سَطْرًا (سیدھی لائنوں میں) لکھنا\* ابن فارس  
نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کے صف بند ہونے کے ہیں۔  
جیسے کتاب کی سطور اور درختوں کی لائن۔ اسی سے اس کے معنی لکھنے کے  
آتے ہیں۔ ن۔ وَالْقُلُومِ وَتَابَسْطُرُوْنَ (۶۸)۔ ن (جسے عام طور پر

\* تاج۔ \*\* محیط۔ \*\*\* راغب و محیط۔ \*\*\*\* تاج و راغب۔

دوات سمجھا جاتا ہے) اور قلم اور جو کچھ لکھنے والے لکھتے ہیں (یعنی قرآن کریم اور وہ تمام سرمایہ علم جسے انسان لکھ کر محفوظ کر لیتا ہے) اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کَانَ ذَٰلِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُورًا (۱۷۸)۔ یعنی لکھا ہوا۔ یہی معنی مَسْطَرٌ کے ہیں (۵۳)۔ اَلَا مَاطِیْرٌ (اُسْطُوْرَہ کی جمع ہے) قصے کہانیاں \*۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ لغت روم ہے یعنی، Story)۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ تاریخی شواہد پر غور کرو اور سوچو کہ جس قسم کے کام تم کرتے ہو، جن قوموں نے اس قسم کے کام کئے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۵)۔ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ ان سے کہا یہ جارہا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر بھی اسی طرح صادق آئیگا جس طرح اقوام سابقہ پر صادق آیا تھا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ قرآن کریم نے قانون مکافات عمل کے ضمن میں جو کچھ اپنے اولین مخاطبین کے متعلق کہا ہے، جب ان سے اُس کا ذکر کرو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کے متعلق ہے۔ یہ عیسائیوں کے متعلق ہے۔ یہ مشرکین مکہ کے متعلق ہے۔ یہ منافقین مدینہ کے متعلق۔ یعنی ان کے نزدیک سارے کا سارا قرآن انہی لوگوں سے متعلق تھا جو اُس وقت اسکے مخاطب تھے۔ اب ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم سے اگر اسکا کوئی حصہ متعلق ہے تو صرف وہ جس میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ جنت جو ان کے خیال میں محض مسلمان کھلانے سے مل جائیگی!)۔

چونکہ قصے کہانیاں عام طور پر جھوٹی ہوتی ہیں اسلئے سَطَرٌ۔ تَسْطِیْرٌ کے معنی ہیں جھوٹی باتیں جمع کرنا \*۔ نیز چونکہ سَطَرٌ سیدھی لکیر کو کہتے ہیں اسلئے اَلَسْطَرٌ کے معنی تلوار سے سیدھی کاٹ کاٹنے کے بھی آتے ہیں۔ اَلَسْطَاطُورٌ۔ چھری کو کہتے ہیں \*۔

سَیْطَرٌ عَلَیْہِ کے معنی ہیں کسی کے سر پر سطر کی طرح سیدھے کھڑے رہنا۔ اسی سے اَلْمُسَیْطِرُ ہے جسکے معنی نگران۔ محافظ۔ مسلط۔ داروغہ کے آتے ہیں \*\*۔ قرآن کریم میں ہے لَسْتُ عَلَیْہِمْ بِمُسَیْطِرٍ (۲۴) یا۔ اَمْ هُمْ الْمُسَیْطِرُوْنَ (۲۴)۔ اسکے معنی مَسْطَطُوْنَ کے ہیں۔ یعنی جو کسی پر مسلط ہوں۔

قرآن کریم میں اسے صَاد سے لکھتے لیکن سین سے پڑھتے ہیں۔ جو سین، طاء سے پہلے آئے اسے صَاد دونوں سے لکھنا جائز ہے \*۔

## س ط و

سَطَّاعَاتِيَّةٍ وَيَهٍ - سَطَّوْا وَسَطَّوْةٌ - کسی پر حملہ کرنا یا سخت گرفت کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا - راغب نے کہا ہے کہ کسی پر ہاتھ اٹھا کر حملہ کرنے کو سَطَّوْةٌ کہتے ہیں - دراصل یہ سَطَّا الثَّرَسُ سے ماخوذ ہے جسکے معنی ہیں گھوڑے کا اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونا \* - قرآن کریم میں ہے يٰۤاَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ (۲۲/۲۲) - قریب ہے کہ وہ ان پر حملہ کر دیں - ان پر دست درازی کریں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قہر و غلبہ اور بلندی کے ہوتے ہیں - سَطَّا السَّاءُ کے معنی ہیں ہانی بہت بڑھ گیا -

## س ع د

سَعِدَہُ، اللہ - يَسْعِدُہُ - سَعِدَہُ - اللہ نے اس کی مدد کی اور اسے توفیق دی - سَعِدَ - يَسْعِدُ - سَعِدَہُ - سَعَادَہُ - وہ مبارک اور با برکت ہوا - اَلْاِسْعَادُ - اَلْمُسَاعَدَہُ - معاونت کرنا - مدد دینا - فراء نے اس کے معنی بندہ کا اپنے رب کے حکم اور مرضی کی متابعت کرنا بتائے ہیں - اَلْاِسْعَادُ - کہنی سے پہنچے تک ہاتھ کا حصہ - (ساری قوت اور برکت اسی میں ہوتی ہے) - اسی سے اَلْمُسَاعَدَہُ کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا ہیں - یہ اس لئے کہ جب لوگ کسی کام میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں \* -

قرآن کریم میں سَعِيْدٌ، شَقِيٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے - وَ مِنْهُمْ شَقِيٌّ وَ سَعِيْدٌ (۱۱/۱۱) نیز شَقِيٌّ، سَعِيْدٌ کے مقابلہ میں (۱۰۸/۱۰۸) - یعنی سعید وہ ہے جسے قانون خداوندی کی رفاقت نصیب ہو جائے اور وہ اس کی کلائی پکڑ کر چلے - اور شَقِيٌّ وہ ہے جو اس سے محروم ہو - اس سے بڑا بد قسمت اور کون ہو - کتا ہے جسے قانون خداوندی کی تائید نصیب نہ ہو -

راغب نے اَلْسَعَادُ وَالسَّعَادَہُ کے معنی امور النہی کا، بھلائی اور خیر تک پہنچنے میں، انسان کی مدد کرنا لکھے ہیں - ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز سعد ہے اور فلاں نحس، فلاں دن سعد ہے اور فلاں نحس - یہ محض توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا - کوئی

چیز یا کوئی دن نہ سعد ہے نہ نحس - جس کام کا نتیجہ (قانون خداوندی کے مطابق) اچھا ہے، وہ عمل سعد ہے - اور جس دن اس کام کا اچھا نتیجہ سامنے آئے وہ دن مسعود ہے - اسی طرح جس کام کا نتیجہ (قانون مکافات کی رو سے) مضر ہو وہ عمل منحوس ہے، اور جس دن وہ نتیجہ سامنے آئے وہ دن نحس - دنوں (ہفتہ - اتوار - سوموار وغیرہ) کی اپنی حقیقت ہی کچھ نہیں - یہ تو ہم نے اپنی سہولت کی خاطر، وقت (Time) کے گز پر گریں لگا رکھی ہیں تاکہ حساب میں آسانی رہے - نہ ہی ستاروں میں کوئی سعد یا نحس ہے - ستارے، قوانین خداوندی کے مطابق گردش کرتے ہیں - ان کی گردش کا انسان کی "قسمت" سے کیا تعلق؟ اقبال کے الفاظ میں

تیرے مقام کو انجم شناس کیا سمجھے  
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں  
(مزید تفصیل ن - ح - س کے عنوان میں ملیگی) -

## س ع ر

السَّعِيرُ - آگ کی حرارت - تپش - نیز بھوک - ابن عرفہ نے کہا ہے کہ سَعِيرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو کسی کو پھونک ڈالے - فراء نے اس کے معنی کوقت، مشقت اور سخت تکلیف کے کئے ہیں - سَعِيرٌ نَاهِمٌ بِاللَّقَبْلِ - ہم نے انہیں تیر مار مار کر بھون کر رکھ دیا - مَسْعُورٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جسے سخت بھوک اور پیاس لگی ہو - نیز جو پیٹ بھرا ہونے کے باوجود کھانے کا حرص ہو - جس کی نیت نہ بھرے - السَّعَارُ - آگ کی حرارت اور سخت بھوک کو بھی کہتے ہیں - السَّعِيرُ - آگ - بھڑکتی ہوئی آگ -

سورة نساء میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَتَاكَلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا اِنَّهُمْ يَتَاكَلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا - وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (ب۲) - "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں - اور وہ بھڑکانی ہوئی آگ میں داخل ہونگے" - موت کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، یہ وہاں کی بات ہے - اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ شدتِ حرص سے ان کی نیت ہی نہیں بھرتی اور وہ مفت کے مال کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں - چنانچہ سَعِيرٌ اور سَعِيرٌ کے معنی دیوانگی کے بھی آتے ہیں -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مشتعل ہونے، بھڑک جانے اور بلند ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے سَعَرَ اور سَعَرَ النَّارَ وَالْحَرَبَ کے معنی ہیں آگ اور جنگ کو بھڑکا دینا\*۔ وَ إِذَا الْجَبَحِيْمُ سَعِيرَتُ (۸۱)۔ ”اور جب دوزخ بھڑکائی جائیگی“۔ اس میں عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے۔ بمعنی جس قدر کسی کے جرائم زیادہ سنگین اسی قدر ان کے نتائج زیادہ تباہ کن۔

## س ع ی

سَعَى کے معنی قصد و ارادہ کرنے، تیز چلنے، کے ہیں۔ کسی کام کے لئے اہتمام، دوڑ دھوپ اور کوشش کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ جانے یا دوڑنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد الی آتا ہے۔ جیسے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللَّهِ۔ اور جب یہ کام کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد لام آتا ہے۔ جیسے سَعَى لَهَا\*\*۔ السَّاعِي کوشش کرنے والا۔ نیز صدقات وصول کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ دوڑنے کے معنوں میں (۲۶۰) میں آیا ہے نیز (۲۶۱) میں۔ کوشش اور محنت کرنے کے معنوں میں (۱۹۹) میں۔ بمعنی دوڑ دھوپ۔ جد و جہد۔ تگ و تاز۔ سعی و عمل وغیرہ۔

قرآن کریم میں ایک آیت ہے لَيْسَ لِنَاثِلَيْكَ اِلَآ مَا سَعَى (۵۳) انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ سعی و کاوش کرے۔ یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ معاشیات (Economics) کی دنیا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کو صرف محنت (Labour) کا معاوضہ لینا چاہئے۔ سرمایہ (Capital) کا معاوضہ، یا یونہی بغیر محنت۔ کچھ لے لینا، جائز نہیں۔ اس اصول پر معاشیات کا جو نظام تعمیر ہوتا ہے اس کا اندازہ اہل بصیرت لگا سکتے ہیں۔ معاشرت اور تمدن کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہئے، نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے۔

”مذہب“ کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ نجات و سعادت، صرف انسان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ کسی کی سفارش سے نہیں مل

سکتی۔ نیز اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ عقیدہ کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ یا پچھلے جنم کے جرائم کی پاداش میں مبتلا ہوتا ہے، باطل ہے۔ انسان سفید لوح (Clean Slate) لیے کر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ سعی و عمل کرے اسی قدر وہ زندگی کی خوشگوار یوں کا اہل بن جاتا ہے۔

نیز اس اصول نے سیاست کی دنیا میں یہ کہہ دیا کہ ہر انسانی بچے کو سعی و عمل کا یکساں میدان ملنا چاہئے۔ اس باب میں نہ کسی کو رعایات ملنی چاہئیں اور نہ ہی کسی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنی چاہئیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ اصول کس قدر عظیم انقلاب کا منشور ہے؟

## س. غ. ب

سَغَبٌ - يَسْغَبُ - وَسْغَبٌ - يَسْغَبُ - سَغَبًا - وَمَسْغَبَةٌ۔  
تھکن کے ساتھ بھوکا ہونا۔ (راغب نے پیاس کا اضافہ بھی کیا ہے) ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بھوک بتائے ہیں اور الْمَسْغَبَةُ کے معنی قحط۔ قرآن کریم نے کہا ہے لَطْعَامٌ "فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ" (۱۱۳) "ایسے وقت میں انسانوں کی خوراک کا انتظام کرنا جب بھوک اور مشقت عام ہو رہی ہو"۔ قرآن کریم نے اس پروگرام (نظام) کو پہاڑی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (۱۱۳-۱۱۴) "فِي الْحَقِيقَةِ يَهْجِزُ كَمَا أَنَّ الْإِنْسَانَ مَحْنَتٌ أَوْ مَشَقَّةٌ يَسَّ كَمَانِ" اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے فقط اپنی ضروریات کے مطابق لیے کر باقی ماندہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کر دے، بالخصوص ایسے زمانے میں جب چاروں طرف بھوک ہی بھوک نظر آ رہی ہو، مِسْنٌ عَزْمٌ "الْأَسْوَرُ" ہے۔ اسی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ اسی کو نظام ربویت کا قیام کہتے ہیں۔ (سورۃ البلد کی یہ آیات) (۱۱۳-۱۱۴)۔ نظام ربویت کے سلسلہ میں عظیم حقائق کی مظہر ہیں۔ ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ (تفصیل میری کتاب "نظام ربویت" میں ملے گی)۔

## س ف ح

سَفَحَ الدِّمَ - اس نے خون بہایا۔ خون گرایا۔ سَفَحَ الدِّمَ - اس نے آنسو بہائے۔ سَفَحَ الدِّمَ - آنسو بہا۔ (لازم و متعدی)۔ اس سے

الْمُسَافِحَةِ کے معنی زنا کرنے کے آئے ہیں ، کیونکہ اس میں سادہ منویہ کو یونہی ضائع کر کے بہا دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ جاہلیت میں جب لوگ کسی عورت کو شادی کا پیغام دیتے تھے تو ان کے کہنے پر کہتے تھے اور جب زنا کے لئے پیغام دیتے تھے تو سَافِحِیْنِی کہتے تھے ۔ اَلْسَفِیْنِی ۔ جوئے کے نیروں میں سے چوتھا تیر جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ ہوتا تھا ۔ نہ ہی اس پر کوئی تاوان دینا پڑتا تھا ۔ یہ بلا نتیجہ رہتا تھا\* ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے سلسلہ میں پہلے ان عورتوں کی فہرست دی ہے جن سے نکاح حرام ہے ۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ اس تعلق کی شکل مَحْصِنِیْنِ غَیْرُ مُسَافِحِیْنِ (۳۳) ہو ۔ مَحْصِنِیْنِ کا مفہوم (ح - ص - ن) کے عنوان میں بیان ہو چکا ہے ۔ پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔ مُسَافِحِیْنِ کے معنی عونگے ، مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے ۔ اس سے قرآن کریم ایک عجیب حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ نکاح اور زنا کے جنسی تعلق میں فرق کیا ہے ۔ شہوانی لذت تو دونوں میں ہوتی ہے لیکن اول الذکر صورت میں یہ لذت مقصود بالذات نہیں ہوتی ۔ مقصود افزائش نسل ہوتا ہے ۔ لیکن زنا میں لذت مقصود بالذات ہوتی ہے اور زنا کار (مرد اور عورت دونوں) کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ استقرار حمل نہ ہو ۔ یہ معنی ہیں ”مادہ منویہ کو بہا دینے کی خاطر“ ۔ لہذا جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں انسان نکاح کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرے ۔ انہیں (Avoid) کرے ۔ اور مقصود مخض جذبہ شہوانی کی تسکین ہو ، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں قرار پاسکتی ۔

اسی سورۃ میں اگلی آیت میں قرآن کریم نے مَحْصِنَاتِ غَیْرُ مُسَافِحَاتِ وَلَا مُتَخِذَاتِ أَخْدَانِ (۳۴) کہا ہے ۔ اخدان کے لئے دیکھئے عنوان (خ - د - ن) ۔ مطلب اس سے چھپی آشنائی ہے ۔ (اگرچہ یہ لفظ اس زمانے کی لونڈیوں کے سلسلہ میں آیا ہے لیکن اطلاق اس کا عام ہے) ۔ ان تین اصطلاحات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا ۔

(۱) مَحْصِنِیْنِ ۔ جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں نکاح کی تمام حدود و قیود ، حقوق و فرائض ، غرض و غایت کو ملحوظ رکھا جائے ۔



(ii) اَلْسِفَاتُ\*۔ وہ جنسی اختلاط جس میں مُحْصِنَاتِیْن کی شکل نہ ہو، خواہ کوئی معاشرہ اسے اپنے ہاں معروف (Recognised) ہی قرار کیوں نہ دے لے۔ اور

(iii) اَلتَّخَاذِ اَخْدَانٍ۔ اختلاط کی وہ شکل جو اس معاشرہ میں بھی معروف نہ ہو۔

قرآن کریم کی رو سے صرف شکل (i) جائز ہے۔

## س ف ر

اَلسَّفَرُ\*۔ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے پردہ اٹھا کر اسے واضح اور بے نقاب کر دینا۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلسَّفَرُ کسی چیز کے ظاہری حصہ کے واضح کر دینے کو کہتے ہیں اور اَلنَّفَسُ\* (جس سے تفسیر ہے) کے معنی ہیں کسی چیز کے اندرونی حصہ کو کھول کر واضح کر دینا\*۔ بہر حال اس کے بنیادی معنی بے نقاب کرنا، واضح اور روشن کرنا ہیں۔ سَفَرَتِ الْمَرْأَةِ\*۔ عورت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے۔ چھٹ جانے اور صاف ہو جانے کے ہیں۔

اسی جہت سے اَلسَّفَرُ کے معنی عورتے ہیں جھاڑو دینا۔ اَلْمِسْفَرَةُ\*۔ جھاڑو کو کہتے ہیں۔ نیز سَفَرُ کے معنی ہرا گندہ کر دینا ہیں، جیسے سَفَرَتِ الرِّبْحِ\* اَلنَّغِيمِ\*۔ عوانے بادلوں کو منتشر کر دیا۔ اسی سے اَلسَّافِرُ\*۔ سفر کرنے والے (مسافر) کو کہتے ہیں۔ اَلسَّفَرَةُ\*۔ مسافر کا کھانا جو سفر کیلئے تیار کیا جائے۔ اس کے بعد اسکا اطلاق توشہ دان پر ہوئے لگا۔ اور پھر دسترخوان کو بھی سَفَرَةُ\* کہنے لگے\*\*۔

سَفِيرٌ\*۔ قوم کے درمیان صلح کرائے والا\*\*۔ اس اعتبار سے کہ وہ دونوں فریقوں کے دل کی بات کو باہر نکال کر معاملہ کو صاف کرا دیتا ہے۔ اَلسَّفَارَةُ\* وَالسَّفَارَةُ\*۔ قوم کے درمیان اصلاح یا صلح کی کوشش کرنا\*\*۔ اَلسَّفِيرُ\*۔ بڑی کتاب یا وہ کتاب جو حقائق کو روشن کرتی ہے۔ اسکی جمع اَسْفَارٌ\* ہے (۱۴) سَفَرُ الْكِتَابِ سَفَرٌ\*۔ کتاب کو لکھا\*\*۔ سَافِرٌ\*۔ لکھنے والا (اسکی جمع ہے اَلسَّفَرَةُ\*)۔ اَسْفَرُ الصُّبْحِ\*۔ صبح روشن ہوئی۔

قرآن کریم میں ہے وَالصُّبْحُ إِذَا اسْتَفْرَجَ (۳۳/۳۳)۔ ”جب صبح اچھی طرح روشن ہو جائے“۔ دوسری جگہ ہے وَجُودُهُ يَوْمَ تَشْذُجُ مَسْفِرَةٌ (۸۸/۸۸)۔ ”کچھ چہرے اس دن تابناک ہونگے“۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے يَا يَدِيْ سَفَرَةٌ (۸۸/۸۸)۔ ”لکھنے والوں کے ہاتھوں میں“۔ سورۃ بقرہ میں عَلٰی سَفَرٍ (۲/۱۸۳) آیا ہے۔ یعنی حالت سفر میں۔

## س ف ع

سَفْعٌ\*۔ کے معنی ہیں پکڑ کر کھینچنا۔ جھلسا دینا۔ داغ لگانا۔ نشان لگانا۔ نیز تھپڑ مارنے کو بھی کہتے ہیں۔ سَفَحٌ بِنَاصِيَتِهِ، وَبِرَّ جَلِيلٍ۔ اسے پیشانی کے بال یا ٹانگ پکڑ کر کھینچنا\*۔ قرآن کریم میں ہے لَتَسْفَعَا بِالنَّاصِيَةِ (۳۱/۳۱)۔ ہم بالضرور اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔ سختی سے گھسیٹیں گے۔ یعنی یہ بڑے بڑے مخالفین آخر الامر ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہو جائیں گے اور شکست کھا جائیں گے۔ ذلت کے لحاظ سے السَّفْعَةُ\* اس کوڑے کو کٹ کے ڈھیر کو کہتے ہیں جو کھنڈروں میں پڑا رہتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ سیاہی مائل رنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے\*۔ راعب نے سَفْعٌ\* کے معنی گھوڑے کی پیشانی کے سیاہ بال پکڑنے کے لکھے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) رنگ (سیاہی مائل) اور (۲) ہاتھ سے کسی چیز کو پکڑ لینا۔

## س ف ک

سَفْكٌ\*۔ بہانا، عموماً خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے\*\*۔ السَّفْكَاءُ\*۔ بہت زیادہ خون بہانے والا۔ نیز قادر الکلام آدمی کو بھی کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں يَسْفِكُ السَّيْمَاءَ (۲۱/۲۱) آیا ہے۔ یعنی خونریزی کریگا۔

## س ف ل

السَّفْلُ\*۔ (س کی زیر اور پیش سے) پستی۔ یہ عِلْوٌ اور عُلُوٌّ (بلندی) کی ضد ہے۔ اَلْاَسْفَلُ\*۔ بہت نیچے۔ یہ اَعْلٰی کی نفیض ہے۔ السَّفْلَةُ\* السَّاسُ۔ کمینے لوگ۔ نیچے درجے کے لوگ\*۔ نیز عرب السَّفْلَةُ\* خاص طور پر اُس آدمی کو بھی کہتے تھے جسے کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ میزبان کے ہاں سے کچھ چرا کر لیجائے\*\*\*۔

قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق کہا ہے جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۸۳/۸۳)۔ اس کے اوپر کے طبقے کو نیچے کا طبقہ بنا دیا۔ تہہ و بالا

کر دیا منافقین کے متعلق ہے کہ وہ فی الدنّٰی رُکِرَ الْاَسْفَلِ مِنْ النَّارِ (۱۳۵)۔  
 ”جہنم کے سب سے نچلے حصہ“ میں رہتے ہیں۔ قلبی اضطراب کی بدترین  
 حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی یہ حالت ہے اور مرنے  
 کے بعد بھی وہ بدترین عذاب میں ہونگے۔ فَوْقُ کے مقابلہ میں اَسْفَلُ  
 (۱۳۷) میں آیا ہے۔ اَسْفَلُ سَافِلِیْنِ (۱۳۵)۔ ہست سے ہست تر۔ ذلیل ترین۔

## س ف ن

سَفَنَ الشَّیْءُ - یَسْفِنُهُ سَفْنًا۔ کسی چیز کو چھیلنا یا اوپر سے کھس  
 دینا۔ سَفِیْنَتٌ اسی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی کشتی کے ہیں۔ (شاید اس  
 لئے کہ شروع میں کشتیاں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ درخت کے بہت  
 بڑے تنے کو چھیل چھیل کر اس میں بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے تھے۔ یا پھر اس  
 لئے کہ جب وہ چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی کو چھیلتی پھاڑتی  
 جا رہی ہے۔ سَفَائِنُ الْبَرِّ۔ اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ریگستانی کشتیاں) \*۔  
 قرآن کریم میں ہے رَکِبْنَا فِی السَّفِیْنَتِ (۱۸)۔ وہ دونوں کشتی  
 میں سوار ہوئے۔ اَمَّا السَّفِیْنَتُ (۱۹)۔ باقی رہا اس کشتی (کا معاملہ) ....

## س ف لا

سَفَہٌ کے معنی ہیں عقل کا ہلکا پن، نادانی، جہالت۔ سَفِیْہَہُ کسی  
 کو بیوقوفی اور جہالت پر آمادہ کرنا۔ کسی کو ہلاک کر دینا۔ سَفِیْہَہُ  
 الشَّرَّابِ سَفَہًا۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی پانی تو بہت پیئے لیکن  
 اسکی پیاس نہ بجھے۔ ثَوْبٌ سَفِیْہَہُ۔ جھڑے اور خراب بنے ہوئے کپڑے کو  
 کہتے ہیں۔ لیکن اس سادہ کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے بھی  
 ہیں۔ (جو کم عقلی کی علامت ہوتی ہے)۔ اس لئے زِمَامٌ سَفِیْہَہُ اس مہار  
 کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے ہلتے رہنے کی وجہ سے مضطرب رہے۔ حرکت  
 و اضطراب اور تلون کی بنا پر ناہختگی عقل و رائے کو سَفَاہَتٌ کہتے ہیں \*\*۔  
 حرکت و اضطراب، نیز ناہختگی عقل کی بنا پر قرآن کریم نے ان لوگوں  
 کو سَفَہَاءٌ کہا ہے جن کے دل نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔  
 جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ مسافرانہ انداز  
 سے دورخی چالیں چلتے ہیں (۱۰۰-۱۰۱)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے  
 ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ ان جیسا یہ عقل ہی کوئی نہیں کیونکہ  
 یہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کا شعور و احساس نہیں رکھتے (۱۰۲)۔

دوسری جگہ سَفِيْهٌ کا لفظ عام کم عقل لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے (۲۸۲) اور (۱۳۱) میں سَفِيْهًا کے ساتھ بَغْيِيْرٌ عِيْلَمٌ کے اضافہ نے بتا دیا کہ سَفَاہَتٌ یہ ہے کہ انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ قرآن کریم کی رو سے سَفَاہَتٌ (علم و عقل سے کام نہ لینا) بہت بڑا جرم اور سخت مذموم حرکت ہے۔ مومن وہ ہے جو وحی خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے۔

سَفَاہَتٌ (۱۳۱)۔ حماقت۔ بیوقوفی۔ جہالت۔

سورة بقرہ میں ہے وَمَنْ يَّرْغَبْ وَعَنْ مَّيْلَةٍ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِيْهٌ نَفْسُهُ (۱۳۱)۔ ملت ابراہیمی سے اس شخص کے سوا کون بے اعتنائی برت سکتا ہے جس نے اپنی ذات کے بارے میں کبھی غور و فکر سے کام نہ نہ لیا ہو۔ جس نے یہ سوچا ہی نہ ہو کہ ذات کی نشوونما کیسے ہو سکتی ہے اور یہ کیوں ضروری ہے؟ محیط نے اس کے معنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا اور حقیر و بے وقعت سمجھنا کئے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو درخور اعتنا نہ سمجھنا۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسک، انسانی ذات پر یقین اور اس کے بلند ترین قدر ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے، یا اسے (Seriously) نہ لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ (تفصیل اسی اجمال کی (ن۔ ف۔ س) کے عنوان میں ملیگی)

## س ق ر

السَّقَرُ۔ آفتاب کی گرمی اور اس کی اذیت۔ سَقَرَتْهُ الشَّمْسُ۔ دھوپ نے اسے پگھلا دیا۔ جھلسا دیا اور اس کے دماغ کو تکلیف پہنچائی۔ السَّقَاتُورُ اس لوہے کو کہتے ہیں جسے تپا کر اس سے جانوروں کو داغ دیتے ہیں۔ نیز السَّقَتَرُ کے معنی بُعد اور دور ہونے کے بھی ہیں\*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ جہنم کیلئے آیا ہے۔ ذُو قُوتُوَامَسَّ سَقَرٌ (۵۴)۔ سقر کے ان تھپیڑوں کا مزہ چکھو جو تمہیں زندگی کی خوشگوار یوں سے دور (محروم) کر دیتے ہیں۔

## س ق ط

سَقَطَ الشَّيْءُ۔ کسی چیز کا گر جانا۔ خواہ (مثلاً) کوئی جہت سے زمین پر آگرے یا کھڑے کھڑے زمین پر گر جائے\*\*۔ سَقَطَتْ چیز کو

لگاتار گرا نا \*۔ قرآن کریم میں ہے وَمَاتَ سَقِطٌ مِّنْ وَرَقَةٍ (۱/۵۶)۔ کوئی پتہ نہیں گرتا۔ سورۃ مریم میں ہے تَسْقِطُ عَلَیْكَ رُطْبًا جَنِيًّا (۲/۱۹)۔ وہ درخت تجھ پر تازہ کچھوڑیں لگاتار جھاڑ دے گا۔ سورۃ شعراء میں ہے فَتَسْقِطُ عَلَيْنَا (۲/۱۸۷)۔ ہم پر گرا دے۔ ساقِطًا۔ گرنے والا (۵/۲۴)۔

سورۃ اعراف میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَلَمَّا سَقِطَ رِیْءُ اٰیْدِیْهِمْ (۷/۱۳۹)۔ صاحب تاج نے اس کے معنی لکھے ہیں شرمندہ اور متحیر ہونا۔ زجاج نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں اپنے کٹے پر حسرت اور شرمندگی کے احساس کا پیدا ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ندامت سے ہاتھ ملنے کے ہیں \*۔ صاحب محیط نے بھی اس کے معنی ندامت ہی کے لکھے ہیں۔ اور یہی معنی قرآن کریم میں بھی واضح ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی غلطی اور حماقت کے احساس سے ندامت اور پشیمانی۔ آیت کے معنی ہونگے ”جب وہ پشیمان ہوئے“۔

## س ق ف

السَّقْفُ۔ چھت (جمع سَقَفٌ)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلند ہونے اور جھکا ہوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ السَّقِیْفَةُ۔ ہر وہ جگہ جس پر چھت ہو۔ بالعموم باہر نکلے ہوئے چھپر کو کہتے ہیں۔ عرب آسمان کو بھی سَقْفٌ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کے خیال میں وہ زمین کی چھت ہے \*۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا (۲۱/۱)۔ ”ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا“۔ یعنی فضائے کائنات خود محفوظ ہے اور اس کا سلسلہ کچھ اس طرح رکھا گیا ہے کہ اجرام فلکی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے وہ بالعموم فضا کے چکر میں آکر پس جاتی ہے اور اس طرح ہم اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گویا یہ فضا ہمارے ارضی مکان کے لئے چھت کا کام دیتی ہے۔ ویسے، آسمان کو سَقْف کہنے میں عربی محاورہ کی بھی رعایت ہے۔ یعنی عرب اسے چھت سے تعبیر کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم نے بھی ان کے محاورہ کی رعایت سے اس کے لئے وہی لفظ استعمال کیا۔ معنی اس کے اس طرح کی چھت نہیں جس طرح مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔ سماء کے معنی بھی یہ نیلگوں ”چھت“ نہیں جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ اس سے مراد بلند فضا یا اجرام فلکی ہیں۔ تفصیل (س۔ م۔ و) کے عنوان میں ملیگی۔

## س ق م

السَّقَامُ\* - السَّقَمُ\* - مرض - بیماری - هُوَ سَقِيمٌ\* الصَّحْدُورُ عَلَیْهِ\*۔  
وہ اسکے خلاف دل میں کینہ رکھتا ہے۔ قَلْبٌ سَقِيمٌ\* - ناخوش اور بیزار  
دل کو کہتے ہیں\*۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم بت پرست اور ستارہ پرست تھی۔ حضرت ابراہیمؑ  
انکے اس شرک کے خلاف انہیں دعوت توحید دیتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں  
قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَتَنْظُرْ نَظْرَةً فِي الشُّجُومِ\*۔ فَقَالَ لَئِیْ  
سَقِیْمٌ\* (۳۷/۸۸)۔ انہوں نے ستاروں کے معبود ہونے پر غور و فکر کیا۔ اس  
کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ میں تمہارے ان معبودانِ  
باطل سے سخت بیزار ہوں۔ یہ وہی بات ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں  
بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّا بَرَاءٌ وَّمِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ (۲۱/۱۷)۔  
میں تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو ان سے بیزار  
ہوں\*۔ اسی کو دوسرے مقام پر لَا اُحِیْبُ اِلَّا فِلِیْمَیْنِ (۲۱/۱۷) سے تعبیر کیا  
گیا ہے۔ یعنی میں ایسے معبودوں کو پسند نہیں کرتا جو ہرآن تغشیر  
پذیر ہوں۔

## س ق ی

السَّقْمٰی\* - ہلانا - السَّقْمٰی\* - اس سے اسم ہے جس کے معنی ہیں ”ہلائی“۔  
السَّقْمٰی\* وَالْاِسْقَاءُ\* - تقریباً ایک ہی معنی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سَقْمٰی\*  
منہ کے ذریعے ہلانے کو اور اِسْقَاءُ\* پانی دے دینے یا پانی بتانے کے لئے بولا  
جانا ہے۔ راغب کے نزدیک سَقْمٰی\* تو یہ ہے کہ کسی کو پینے کی چیز  
دے دینا اور ہلا دینا، اور اِسْقَاءُ\* یہ ہے کہ تم کسی کو پینے کی چیز دیدو  
خواہ وہ اسے پئے یا نہ پئے۔ اس لئے اِسْقَاءُ\* میں سَقْمٰی\* سے زیادہ جامعیت  
ہے۔ اَلْاِسْقَاۃُ\* - پانی ہلانے کی جگہ - یا پانی ہلانے کا برتن (۱۲/۱۲)۔ یا  
پانی ہلانے کا بندوبست - جیسے (۱۱/۱۱) میں - اَلْاِسْقَاۃُ\* پینے کے لئے پانی  
مانگنا یا بارش طلب کرنا - اَلْاِسْقٰی\* - موسلا دھار برسنے والا بادل\*\*۔

سورة بقرہ میں اِسْتَسْقٰی آیا ہے (۲/۲) جس کے معنی پانی یا بارش  
طلب کرنے کے ہیں۔ سورة شعراء میں ہے وَالَّذِیْ هُوَ بِطُعْمِنِیْ\* وَیَسْقِیْنِ\* (۲۱/۱۷)۔  
خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور ہلاتا ہے۔ سورة نحل میں ہے

نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِي بُطْحُوْنِهٖ (۱۶)۔ ”ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹ میں ہے (دودھ) پلائے ہیں۔“ سورة شمس میں ناقہ حضرت صالحؑ کے متعلق ہے نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سَقٰیہَا (۱۱)۔ یعنی اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھو اور اس کے پانی پلائے کا۔ قصہ حضرت یوسفؑ میں سِقَایَۃً (۱۲) کا لفظ ایسے برتن کے لئے آیا ہے جسے صَوَاعٌ بھی کہا گیا ہے (۱۲)۔

## س ک ب

سَكَبَ الْمَاءُ وَالْدَّمُ - اس نے پانی اور آنسوؤں کو بہایا۔ سَكَبَ الْمَاءُ - پانی بہا (لازم و متعدی)۔ مَاءٌ سَکِیْبٌ وَ مَسْکُوْبٌ - وہ پانی جو زمین کے اوپر بہ رہا ہو۔ جسے زمین کھود کر نہ نکالنا پڑے۔ ارباب لغت نے اس کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے بھی کئے ہیں، اس لئے مَاءٌ مَسْکُوْبٌ میں وہ پانی بھی آ جاتا ہے جو آبشار کی طرح اوپر سے گرتا ہے۔ قرآن کریم میں مَاءٌ مَسْکُوْبٌ (۵۶) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جنتی معاشرہ میں سامان زیست، جگر ہاش مشقتوں کے بغیر ملیگا (وہاں پانی پینے کے لئے کنواں تمہیں کھودنا پڑے گا)۔ لیکن غیر جنتی معاشرہ میں ان چیزوں کے لئے جگر ہاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے (۲۱)۔

رَجُلٌ سَكَبٌ - سبک روح اور پر نشاط انسان کو کہتے ہیں۔ \*\* فَرَسٌ سَكَبٌ تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔

## س ک ت

السَّكَوْتُ - السَّكَوْتُ - خاموش ہونا۔ نہ بولنا۔ سَكُوْتُ اور صَمْتُ میں فرق یہ ہے کہ سَكُوْتُ ان چیزوں کے خاموش ہونے پر بولا جاتا ہے جن میں بولنے کی قدرت ہوتی ہے اور صَمْتُ میں موخر الذکر شرط نہیں ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کی خاموشی پر بولا جاسکتا ہے خواہ وہ بولنے کی طاقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ سَكَّتِ الْغَضَبُ - غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَمَّا سَكَّتْ عَنْ مُوسٰی الْغَضَبُ (۱۵۴)۔ جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ راغب نے کہا ہے کہ سَكُوْتُ میں ایک گونہ سَكُوْنٌ پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَّتْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ \*\*\*

## س ک ر

سُکَّرٌ - نشہ میں ہونا - راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے - بیشتر یہ اس قسم کی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو نشہ اور شراب سے پیدا ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی ایسی کیفیت غصہ اور عشق سے بھی پیدا ہو جاتی ہے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت کے ہوتے ہیں - سَکَرٌ - شراب - نشہ اور مشروب (۱۶) - سَکَرَةٌ - غنودگی - بے عوشی - یہ بھی ایک نشہ کی سی کیفیت ہوتی ہے - قرآن کریم میں سَکَرَةُ الْحَمَوْتِ آیا ہے (۵۸) - یعنی موت کی بے ہوشی - سورۃ نساء میں ہے لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۲۴) - "صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ جب کہ تم سکر کی حالت میں ہو" - یہاں سُكَارَىٰ کے عام معنی حالت نشہ کے کثرت سے جاتے ہیں - لیکن لسان العرب میں ہے کہ اس سے مراد سُکَرُ النِّوْمِ یعنی نیند کا غلبہ ہے - سورۃ حج میں سُکْرٰی کا لفظ ایسے مدھوش لوگوں کے لئے آیا ہے جو خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے اوسان کھو چکے ہوں - (۲۲) - اور (۱۵) میں وفور جذبات سے پیدا ہونے والی بدمستی کے لئے سَکَرَةٌ آیا ہے - السَّکَرُ - نہر کو بند کر دینا - سَکِرَتِ الرَّیْحُ - ہوا ساکن ہو گئی - اَلْمَاءُ السَّاکِرُ - ٹھہرا ہوا پانی - سَکَرَ الْبَابُ - دروازہ بند کر دیا\* -

سَکَرَةٌ - اس کا گلا گھونٹ دیا - سورۃ حجر میں ہے سَکِرَتْ اَبْصَارُنَا (۱۵) - ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے - ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے -

سورۃ نساء کی مذکورہ صدر آیت کو پھر سامنے لائے جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ - (سُكَارَىٰ جمع ہے سَکْرَانٌ اور سَکْرَانَةٌ کی - جب تم پر نیند کا غلبہ ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ - اس سے آگے ہے حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۲۴) - تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو - یعنی جس حالت میں تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس میں صلوٰۃ کا کچھ فائدہ نہیں - اس سے ظاہر ہے کہ اگر انسان صلوٰۃ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتا ہو تو اس صلوٰۃ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا - صلوٰۃ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ تم جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو - لہذا قرآن کریم کو بلا



سمجھے پڑھنا (خواہ وہ صلوة میں ہو یا وبسے ہی) کوئی فائدہ نہیں دیتا۔  
قرآن کریم پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے  
کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلا مطلب سمجھے، بعض الفاظ کو دہرائے سے یہ  
سمجھنا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، عہد سحر (Magic Age) کی توہم  
پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔

## س ک ن

سَكُونٌ کے معنی ہیں، حرکت نہ رہنا۔ ٹھہر جانا\*۔ سَكَنَ  
سَكَنًا وَسَكْنًا۔ بود و باش اختیار کرنے، رہائش کرنے کے لئے استعمال  
ہوتا ہے\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ سَكُونٌ کسی چیز کا حرکت کے بعد  
ساکن ہو جانا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ کسی مقام کو وطن بنالینے یا کسی جگہ کو  
گھر بنالینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلسَّكَنُ کشتی کے پتوار  
کو کہتے ہیں جس سے اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اَلسَّكِينُ (۱۲/۱)۔  
چھری کو کہتے ہیں اس لئے کہ (راغب کے الفاظ میں) اس سے مذبوح کی  
حرکت، سکون سے بدل دی جاتی ہے۔ مِسْكِينٌ اُسے کہتے ہیں جس کی  
حرکت کو فقر اور محتاجی نے کم کر دیا ہو۔ یہ فقیر سے زیادہ محتاج  
ہوتا ہے۔ نیز ذلیل اور کمزور کو بھی مِسْكِينٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ  
کہف میں کشتی والوں کو مَسَاكِينُ کہا گیا ہے (۱۸/۱) کیونکہ وہ  
بادشاہ کے استبداد کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے\*۔ اَلْمَسْكِينَةُ۔  
سخنی اور مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتی ہے\*\*\*۔ نیز  
فقر و ذلت اور کمزوری اور مسکینی کی حالت کو\*۔

سَكَنَتُهُ تَسْكِينًا کے معنی ہیں میں نے اس کے اضطراب کو رفع  
کر کے اس کے دل کو سکون دیدیا۔ یا اسے ثابت و ساکن کر دیا۔ جَعَلَ  
الْقَلِيلَ سَكَنًا (۶/۶) کے معنی ہیں خدا نے رات کو ایسا بنایا جس میں  
تمہیں سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اِنْ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ  
(۱۳۰/۶) کے معنی ہیں تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہو جاتی ہے۔ ابن  
قارس نے کہا ہے کہ اَلسَّكَنُ ہر محبوب چیز کو کہتے ہیں جس سے سکون  
و قرار حاصل ہو جائے۔ اَلسَّكِينَةُ۔ اطمینان و سکون اور وقار کو بھی کہتے  
ہیں۔ الرمانی نے اسے اَلتَّسْكِينَةُ کا مرادف لکھا ہے\*\*\*۔ یعنی جمعیت خاطر۔  
اِسْتَسْكَنَ کے معنی ذلیل و کمزور ہو جانا ہیں\*۔ (یہ دراصل (ک۔ و۔ ن)  
سے ہے۔ (س۔ ک۔ ن) سے نہیں)۔

قرآن کریم میں یہ مادہ، کسی جگہ ہسنے کے معنی میں آیا ہے۔ جیسے (۲/۳۵) میں (۱۳۵) میں وَهْنٌ - ضَعْفٌ اور اسْتِكَانَةٌ - ہم معنی استعمال ہوئے ہیں لیکن جس ترتیب سے یہ الفاظ آئے ہیں (یعنی فَعَمًا وَهَنُوا... وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا) اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اسْتِكَانَةٌ انتہائی کمزوری کے لئے آتا ہے۔ (چونکہ اسْتِكَانَت - ک - و - ن سے ہے۔ اس لئے ہم نے اسے اس عنوان میں بھی لکھا ہے)۔ مَسْكَنَةٌ کو خدا کا غضب قرار دیا گیا ہے (۲/۶۱)۔ اس لئے کہ یہ اس جمود و تعطل کا نام ہے جس سے قوم، زندگی اور حرکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں فَقَرَاءٌ اور مَسْكِينٌ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۹/۶۱)۔ مسکین وہ ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے۔ قرآنی نظام میں کوئی مسکین اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ وہ ان چیزوں کو (بطور خیرات نہیں بلکہ) اپنے حق کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ سورۃ البلد میں يَتَرَبَّعًا ذَا مَقْرَبَةٍ - اَوْ مَسْكِينًا ذَا مَقْرَبَةٍ آیا ہے (۹۰/۱۶)۔ یعنی وہ جو لوگوں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا ہائے۔ اور جو ذرا کمزور ہو جانے پر، معاشرہ کے ہاتھوں مٹی میں مل جائے۔ غلط معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ جو ذرا نیچے گرا، معاشرہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ قرآنی معاشرہ کرتوں کو اٹھانے کے لئے قائم ہوتا ہے۔

## س ل ب

السَّالِبُ - کسی سے کوئی چیز زبردستی چھین لینا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کسی کو غافل یا کر اسکی چیز تیزی سے جھپٹا مار کر لینے کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو بھرتی سے لینے یا اچک لینے کے ہوتے ہیں۔ السَّالِبُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا ہو۔ شَجَرَةٌ سَالِبٌ - درخت جس کے پتے اور شاخیں سب جھڑ گئے ہوں۔ السَّالِبُ - وہ عورت جس کا بچہ مر گیا ہو۔ السَّالِبَةُ - ننکا ہونا۔ بدن پر کپڑے کا نہ ہونا\*\*۔

سورۃ حج میں ہے وَإِنْ يَسْأَلُوكَ الذُّبَابُ شَيْئًا (۲۲/۲۲)۔ اگر ان سے مکھی کوئی چیز جھپٹ کر لے جائے۔

## س ل ح

اَلِسْلَاحُ - اَلِسْلَاحُ - اَلِهْ جنگ - یعنی ہر وہ چیز جس سے جنگ کی جائے یا وار کیا جائے - ہتھیار - نیز ہتھیار کا آہنی حصہ - تلوار یا تلوار کی دھار - کمان جس میں تانت نہ ہو - لاٹھی \* - (جمع اَسْلِحَاتٌ) - وَلِيَّتًا خَذُوْا اَسْلِحَتَهُمْ (۱۶۴) - ”چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں“ -  
(سَلَحٌ - يَسْلَحُ - پرندوں کے بیٹ کرنے کو بھی کہتے ہیں \* -  
لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا ) -

## س ل خ

سَلَخَ - يَسْلُخُ وَيَسْلَخُ - کسی جانور کی کھال کھینچ لینا -  
سَلَخَتِ الْحَمِيَّةُ - سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی - اَلِسْلَخُ - سانپ کی کینچلی - سَلَخَتِ الْمَرْأَةُ دِرْعَهَا - عورت نے اپنی قمیض اتار دی \*\* -  
لہذا اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح الگ کر دینا کہ اس پر دوسری چیز کا نشان تک نہ رہے - چنانچہ قرآن کریم میں ہے .... اَلْقَيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (۳۶) - ہم دن کو رات میں سے اس طرح کھینچ لیتے ہیں (کہ رات میں دن کی روشنی کا ذرا سا نشان بھی نہیں رہتا) - اس لئے سَلَخَ الشَّهْرُ وَاِنْسَلَخَ کے معنی ہوتے ہیں مہینہ گزر گیا \*\* - (۹) اِنْسَلَخَ مِنْهُ - وہ کسی چیز کو چھوڑ کر، اتار کر اس سے خالی اور نکا ہو گیا - سورة اعراف میں ایک شخص کی حالت کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اَتَيْنَاهُ اَبْلَتًا فَاِنْسَلَخَ مِنْهَا (۱۵) - ہم نے اسے اپنے قوانین دیے اور وہ انہیں الگ چھوڑ کر اس طرح صاف نکل گیا جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے - یہ درحقیقت مسلمانوں ہی کی مثال ہے جنہیں اللہ نے قرآن کریم جیسا ضابطہ حیات دیا لیکن انہوں نے اسے اس طرح چھوڑ دیا کہ اس کا کوئی نشان تک بھی انکی ملٹی زندگی میں باقی نہ رہا - یہ اس میں سے صاف نکل گئے - انہوں نے اُسے کینچلی کی طرح اتار کر پھینک دیا - لیکن للہ الحمد کہ وہ (قرآن) اپنی اسی حالت میں صحیح و سلامت موجود ہے - اس لئے اُسے جب جی چاہے پھر اسی طرح اوڑھا جا سکتا ہے -

## س ل س ل

اَلْسَلْسَلَةُ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ متصل کرنا -  
اَلْسِلْسِلَةُ - زنجیر - تَسْلَسِلُ الْمَاءُ - پانی حلق میں روانی سے اترتا

چلا گیا \*۔ (سَلَّ کے معنی کسی چیز کو کھینچنے کے ہوئے ہیں۔ دیکھئے عنوان (س۔ ل۔ ل)۔

قرآن کریم میں سِلْسِلَۃُ (۳۳)۔ زنجیر کے لئے آیا ہے جس کی جمع سَلَسِلٌ ہے (۴)۔ زنجیر کا ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے ساتھ متصل چلا جاتا ہے اور اسی تسلسل سے وہ زنجیر بن جاتی ہے۔

## س ل ط

السَّلَاطُ۔ السَّلَاطُ۔ سخت اور مضبوط۔ التَّسْلِيْطُ۔ غالب کر دینا۔ غلبہ اور اقتدار دیدینا۔ سَلَطَہُ اللہ عَلَیْہِ۔ خدا نے اسے اس پر غلبہ و تسلط عطا کر دیا۔ (۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور قوت کے ہوئے ہیں۔

سُلْطَانُ التَّارِ۔ آگ کا بھڑکنا \*\*۔ السُّلْطَانُ۔ حجت، برہان \*\*۔ دلیل، ثبوت، سند۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ سَلِیْطٌ سے ماخوذ ہے جسکے معنی زیتون کے تیل کے ہوئے ہیں جو روشن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہی حجت و برہان سُلْطَانٌ کہلائیگا جو خود بھی روشن ہو اور بات کو بھی روشن کر دے \*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِیْنٌ (۳۵)۔ ”یا تمہارے پاس کوئی کھلی دلیل ہے“۔ لیکن السَّلَاطُ کے اعتبار سے اسکے معنی غلبہ و اقتدار۔ قوت اور طاقت کے بھی ہیں۔ ان معانی میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ ہم نے رسولوں کو بَشِیْرٰتٍ، یعنی واضح دلائل، دیکر بھیجا (۲۱)۔ لیکن ان کے مخالفین نے یہ کہہ کر ان سے انکار کر دیا کہ جب تک تم ہم پر غالب نہ آ جاؤ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ اسکے لئے سُلْطٰنٌ مُّبِیْنٌ (۱۲) آیا ہے۔ یا مثلاً سورۃ حجر میں ہے کہ اللہ نے ابلیس سے کہہ دیا کہ اِنْ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵)۔ میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہ لفظ ”مجاز قرار دینے“ کے معنوں میں بھی آیا ہے (۲۴) جس میں غلبہ کا مفہوم شامل ہے۔ سورۃ نساء میں ہے وَاَتَیْنَا مُوسٰی سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا (۱۷)۔ یہاں بھی اسکے معنی غلبہ و اقتدار کے ہیں۔ سورۃ الحاقۃ میں بھی سُلْطٰنِیَّۃً اسی معنی میں آیا ہے (۲۹)۔ یعنی سلطانی (میرا سلطان) + ہ (وقف کی ہاء)۔

سورۃ رحمن میں ایک آیت ہے جو ایک عظیم الشان حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ بِمَعَشَرَ الْجِیْنِ وَالْاِنْسِ اِنْ اَسْتَعْطَعْتُمْ اَنْ تَقْفُوْا مِنْ اَنْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْقَضُوْا۔ اے گروہ جن و انس!

اگر تم اسکی طاقت رکھتے ہو کہ ”اقطار السموات والارض“ سے آگے نکل جاؤ۔ تو جاؤ۔ ان سے آگے نکل جاؤ۔ (جن وانس کے معنی ہیں وحشی اور مہذب آبادیاں)۔ یہاں انسان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ اس مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکو تو جاؤ۔ اس سے آگے نکل جاؤ۔ اس سے آگے ہے۔ لَا تَنْفُذُوا وَلَا يَسُطُّونَ (۳۵)۔ تم سُلْطَان کے بغیر ان سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جسے سُلْطَان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُلْطَان اس قوت کا نام ہے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ [رسول اللہ کی زبان مبارک سے کہا گیا ہے وَأَجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيْرًا (۱۶۰)] اور مجھے اپنے ہاں سے مدد دینے والی قوت عطا فرما دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی ”روحانی ترقی“ نہیں سمجھ لینی چاہئے جو انسان کو ارض و سما سے آگے لے جاتا تو ایک طرف، اسے خود اس دنیا میں سر بزبری اور زیر دستی سکھاتی ہے۔ اس سُلْطَان سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سر کچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام اقطار السموات والارض سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے۔ یا اس سے بھی آگے کیوں نہ نکل جائے، وہ اقطار السموات والارض کے اندر ہی رہیگا۔ ان حدود سے باہر، انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سلطان پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

## س ل ف

سَلَفَ الْأَرْضَ وَاسْلَفَهَا - زمین میں ہل چلانا یا اسے ہموار کرنا۔  
 سَلَفَ الشَّيْبَى - چیز گزر گئی۔ آگے بڑھ گئی۔ سَلَفَ فُلَانٌ - وہ آدمی پہلے گزر گیا۔ اسلَفَ اس نے آگے بھیجا، پیش کیا، اَسَالِفَ -

پہلے گزر جانے والا۔ پیشرو\*۔ اَلْسَّالِفَةُ\*۔ جنگ یا سفر میں آگے رہنے والے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہوتے ہیں۔

سورة بقرہ میں ہے فَلَنَهْلِكُنَّكَ (۲۵)۔ جو پہلے لیا جا چکا ہے وہ اس کا ہے۔ سورة زخرف میں ہلاک شدہ قوموں کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا (۳۳)۔ ہم نے انہیں پیشرو (یعنی پہلے گزر جانے والے) بنا دیا (جن کی داستانیں اب عبرت کے لئے باقی ہیں)۔ سورة الحاقہ میں ہے يَمَّا اَسْلَفْتُمْ (۲۹)۔ جو کچھ تم نے پہلے کیا۔

## س ل ق

اَلْسَلَقُ\*۔ اس مادہ کے بنیادی معنی بلند ہونے اور اوپر چڑھنے کے ہیں\*\*\*۔ تَسَلَّقَ الثَّجِيدَ اَرًا۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ تَسَلَّقَ عَلٰی فِرَاشِهِ وہ درد و غم کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اطمینان سے لیٹ نہ سکا۔ سَلَقَ فُلَانًا بِالسَّقْوِطِ\*۔ اس نے فلان آدمی کی کوزوں سے کھال ادھیڑ دی۔ اَلْسَلَقِيَّةُ\*۔ راستہ میں قدموں اور کھروں کے نشانات۔ پتلی اور باریک کی ہوئی روٹی۔ نیز طبیعت\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْسَلَقُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو زبردستی بچھا دینا۔ خواہ ہاتھ سے ہو خواہ زبان سے\*\*۔ اور سَلَقَ فُلَانًا کے معنی ہوتے ہیں اس نے فلان آدمی کے نیزہ مار دیا\*۔ اسی نمج سے قرآن کریم میں ہے سَلَقُوا كُمُ بِاَلْسِنَتِهِ (۳۳) یہ لوگ تمہیں اپنی زبانوں کے طعن سے ابذا پہنچاتے ہیں۔ طعنوں کے تیر و نشتر مارتے ہیں۔ ان طعن آمیز باتوں سے تمہارے اوپر جڑھ دوڑنا چاہئے ہیں (یہی اسکے بنیادی معنی ہیں اگرچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے اس قدر مختلف معنی آتے ہیں کہ ان میں قدر مشترک متعین کرنا مشکل ہے)۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مادہ میں تکلیف پہنچانے کا مفہوم غالب ہے۔

## س ل ک

سَلَكَ\*۔ اس مادہ کے اصل معنی ہوتے ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے اندر چلے جانا یا ڈال دینا۔ سَلَكَ يَدَهُ فِي الثَّجِيبِ\*۔ اس نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کر لیا\*۔ صاحب محیط نے خَيْطٌ، سَيْطٌ اور سَيْطٌ کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ڈورا خواہ سینے کے کام آئے یا

ہار بنانے کے خبیث کہلاتا ہے ، لیکن وہ ڈورا جس میں موتی وغیرہ پروئے جاتے ہیں سِلَک کہلاتا ہے ، اور جس ڈورے میں موتی وغیرہ پروئے ہوئے موجود ہوں وہ سیمط کہلاتا ہے \*\*۔ اَسْلُو کُت - راستہ میں گھس جانا \*\*\*۔ سَلَکَ - چلنا یا چلانا - داخل ہونا یا داخل کرنا - (لازم اور متعدی دونوں معنی آتے ہیں)۔ اَسْلَکَ - چلانا - داخل کرنا \*۔

سورة حجر میں ہے کَذَّالِیْکَ نَسْلُکُہُ رَفِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ (۱۵/۱۴)۔ اسی طرح ہم اسے مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں - سورة طہ میں ہے وَ سَلَّکَ لَکُمْ فِیْہَا سَبْلًا (۲۰/۲۰)۔ اور تمہارے لئے اس (زمین) میں راستے چلانے - اور سورة فوج میں ہے لَتَسْلُکُوْا مِنْہَا (۲۱/۲۱)۔ تاکہ تم اس میں چلو۔

## س ل ل

اَلْسَلَّ - کسی چیز کو نرمی اور سہولت کے ساتھ نکال لینا - ابن فارس نے نرمی اور سہولت کے ساتھ چپکے سے خفیہ طور پر نکال لینے کا اضافہ کیا ہے - سَلَّ سَلَّیْل - نیام سے کھینچی ہوئی تلوار - اَلْسَلَّ لَہُ - وہ حصہ جو کسی چیز سے نکالا جائے \*۔ اَلْمَسْلُوْل - نکالا ہوا - نیز وہ آدمی یا جانور جسے آختہ کر دیا گیا ہو \*\*۔ قرآن کریم میں، انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے کہ اِسے سَلَّلَہُ مِنْ طِیْنٍ (۲۳/۱۴) سے پیدا کیا - یعنی وہ شے جو مٹی (جمادات - Inorganic Matter) سے بطور خلاصہ نکالی گئی ہو - اگر انسانی جسم کا تجزیہ کیا جائے تو وہ انہی جامد عناصر (مثل لوہا - چونا - فاسفورس وغیرہ) کا مرکب نظر آئے گا۔

اِنْسَلَّ وَ تَسَلَّلَ - وہ چھپ کر چلا گیا - آہستہ سے کھسک گیا - اَلْسَلَّ لَہُ - خفیہ طور پر چرانا - چوری - اَلْسَلَّ - اَلْسَلَّ لَہُ - اَلْاَسَلَّ - چور کو کہتے ہیں \*۔

سورة نور میں ہے اَلَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ (۲۴/۲۴) - جو تم میں سے چپکے سے کھسک جاتے ہیں -

## س ل م

سَلَّمَ \*\*\*\* - چونکہ یہی وہ مادہ ہے جس سے اِسْلَام کا لفظ آیا ہے اس لئے اس کے بنیادی معانی کو غور سے سمجھ لینا چاہئے کیونکہ انہی معانی سے

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* راغب - \*\*\*\* اس عنوان کے تمام معانی تاج - محیط اور لین سے ماخوذ ہیں -

اسلام کے مختلف گوشے واضح ہو جائیں گے۔

(۱) سَلَام کے بنیادی معنی ہیں وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہو گیا۔ اس کی ہر ایک کمی پوری ہو گئی۔ سَلَام الدُّنْو۔ اس نے ڈول کو پختگی کے ساتھ تیار کر دیا۔ سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے مُسَلَّمَةً لَا شَيْئَةَ فِيْهَا (۲/۲۴۱)۔ وہ جسمانی نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے۔ لہذا سَلَام کے بنیادی معنی ہیں اس طرح مکمل ہو جانا کہ پھر کوئی نقص اور کمی باقی نہ رہے۔ یعنی انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما اور تکمیل۔

(۲) اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی ہیں، ہر قسم کے آفات۔ خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں زیادہ معنی صحت اور عافیت سے متعلق ہیں۔ سَلَام مِّنَ الْاِفْتَةِ سَلَامَةً۔ وہ آفت سے محفوظ رہا۔ سَلَامَهُ اللهُ تَسْلِيْمًا۔ خدا نے اسے آفت سے محفوظ رکھا۔ قرآن کریم میں خدا کا ایک نام اَلْسَلَامُ بھی آیا ہے (۵۹/۲۴) جس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے ”تمام عیوب و نقائص سے پاک“۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس کے یہ معنی کئے ہیں انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ سَلَام اُسے کہتے ہیں جس سے دوسری چیزیں سلامتی حاصل کریں اور سَلَام وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے سلامتی حاصل کرے۔ یعنی وہ جس پر کوئی آفت آ سکتی ہو اور وہ اسکا متوقع بھی ہو لیکن اس سے محفوظ رہنا چاہے۔ لہذا خدا کا نام سَلَام اس لئے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال و انتشار سے محفوظ رکھا ہے اور اس کا نظام نہایت حفاظت و صیانت سے چل رہا ہے۔

لہذا سَلَام کے معنی ہیں آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنا۔ یہ اس مادہ کے دوسرے معنی ہوئے۔

(۳) اَلْسَلَامُ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی بلندی تک پہنچنے کا قابل اعتماد اور محفوظ ذریعہ۔ لہذا اس مادہ کے تیسرے معنی ہیں وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت اعتماد اور حفاظت سے بلندیوں تک پہنچ جائے۔

(۴) اَلْسَلَامُ کے معنی ہیں صلح اور صفائی کے ساتھ رہنے والا۔ اَلْسَلَامُ کہتے ہی صلح کو ہیں۔ لہذا اس مادہ کے چوتھے معنی ہیں۔ خود بھی امن و سلامتی سے رہنا اور دنیا میں بھی امن و سلامتی قائم رکھنا۔ تَسَالَمَتِ الْغَيْلُ کے معنی ہوتے ہیں گھوڑوں کا ایک ساتھ چلنا (ہاؤں ملا کر اس طرح چلنا کہ ان میں کامل ہم آہنگی ہو) اور کسی گھوڑے کا ایسی حرکت



نہ کرنا جس سے دوسرے گھوڑے بدک جائیں یا مشتعل ہو جائیں۔ اس سے اسلامی معاشرہ کا صحیح صحیح تصور سامنے آجاتا ہے۔

(۵) اَلْاِسْلَامُ وَالسَّلَامُ کے معنی ہیں اطاعت۔ انقیاد۔ سپردگی۔ جھک جانا۔ لہذا اس مادہ کے پانچویں بنیادی معنی ہوئے قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنا۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س۔ ل۔ م میں بنیادی طور پر نرمی اور انکسار کا پہلو مضمر ہوتا ہے \*۔

(۶) اِسْتَسْلَمَ تَكْتَمُ الطَّرِيقُ کے معنی ہیں وہ راستہ کے درمیان میں چلا اور اس سے ادھر ادھر نہ ہوا۔ قَالُوا سَلَامًا کے معنی ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کوئی لغویات نہیں کرتے۔ لہذا اس مادہ کے چھٹے معنی ہوئے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا۔

(۷) اِسْتَلَمَ الثَّرْعُ کے معنی ہیں کھیتی کی ہالیں نکل آئیں۔ لہذا اس مادہ کے ساتویں معنی ہیں کوششوں کا نتیجہ خیز ہونا۔

(۸) اور اَلتَّلِيمَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جسکے اعضاء نہایت نرم و نازک اور خوشنما ہوں۔ لہذا اس مادہ کے آٹھویں معنی ہوئے حسن و خوشنمائی۔

ان معانی سے ظاہر ہے کہ ”اَلْاِسْلَامُ“ اس نظام حیات کا نام ہے جس سے (۱) انسان کی تمام کمیاں پوری ہو جائیں اور اسکی صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پالیں (۲) جس میں وہ زندگی کی تمام تباہیوں اور بربادہوں سے محفوظ رہے۔ اور (۳) اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بلندیوں کی طرف پڑھتا چلا جائے۔ (۴) وہ خود اپنی ذات میں بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی سے رہے اور ساری دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کا موجب ہو۔ وہ سفر زندگی میں دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے چلے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے کوئی دوسرا مشتعل ہو اور اسطرح معاشرہ کا نظام خراب کر دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ (۵) انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے اور انکے سامنے اپنا سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھکا دے۔ اور یہ کچھ (۶) پورے پورے اعتدال اور توازن سے کرے۔ افراط و تفریط سے کام نہ لے۔ (۷) اسطرح اسکی کوششیں ثمر بار ہو جائیں گی اور اسکا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائیگا اور (۸) اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (توازن) پیدا ہو جائیگا اور پورے معاشرے میں بھی۔

یہ ہے وہ روش زندگی جسکے متعلق کہہ دیا کہ جو شخص اس روش کے خلاف کوئی اور روش اختیار کریگا، تو وہ اس قسم کے نتائج قطعاً پیدا نہیں کر سکے گی اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائیگا (۳۸)۔ یہ روش قرآن کریم کے اتباع کا دوسرا نام ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اتَّبَعَ الْهُدٰی (۲۰)

قرآن کریم میں مُسْلِمٌ اور اسکے مشتقات اس کثرت سے آئے ہیں کہ اس مقام پر ان تمام کا درج کرنا مشکل ہے۔ لہذا ان میں سے جستہ جستہ مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مُسْلِمَةٌ لَا شَيْخَةَ فَيَسْهَىٰ (۲۱) ”وہ ہر قسم کے نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے“۔ (۲۳) میں اِذَا سَلَّمْتُمْ کے معنی ہیں جبکہ تم دے دو۔ سوچ دو۔ حوالہ کر دو۔

سورة انفال میں ہے کہ تم آپس میں جھگڑنے لگ گئے تھے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۸)۔ اللہ نے تمہیں اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھا۔ سورة الطور میں سَلَّمَ (۵۸) کا لفظ بلند مقاسات تک پہنچنے کے ذرائع کیلئے استعمال ہوا ہے۔

سورة انفال میں ہے وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ (۶۱)۔ اسکے معنی صلح کے ہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری کیلئے یہ مادہ (مثلاً ۱۱۲) میں آیا ہے۔

سورة روم میں ایمان اور اسلام کو الگ الگ بیان کیا ہے (۳۰)۔ یعنی اِيْمَانٌ کے معنی ہیں کسی نصب العین کو صحیح مہان لینا اور اِسْلَامٌ کا مطلب ہے اس پر پورے پورے طور پر کاربند ہو جانا۔ اس کے مقابلہ میں، وہ لوگ جو محض مطیع ہو کر اسلام لانے ہوں اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں نہ ہوا ہو، ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مُسْلِمٌ ہیں، انہی سُوْمِيْنَ نہیں ہوئے (۲۳)۔ سورة النمل میں مسلمین کا لفظ اَلَا تَعْلَمُوْا عَلٰی (۲۱) کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی سرکشی اور حدود شکنی اختیار نہ کرنا۔ فرمان پزیر ہو جانا۔ سورة مریم میں لفظ (سَلَامٌ) لَتَقُوْا کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۱۳)۔

ان خصوصیات کے حامل انسان کو صاحب قلب سلیم کہا گیا ہے (۸۹)۔ اور ان صفات کی حامل قوم کو اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لِّكَ (۱۲۸) یعنی ایسی قوم جو احکامات الہی کا اتباع کرتی رہے۔ اس قوم کے ہر فرد کا فریضہ حیات یہ ہوگا کہ جس فرد سے اسکا معاملہ پڑے وہ اسے کہے سَلَامٌ عَلَیْکُمْ (۶۶)۔ میں تمہارے لئے سَلَامٌ کی آرزو کرتا ہوں۔ یعنی

ان تمام سعادتوں اور خوشگوار یوں کی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور وہ بھی اس کے جواب میں اس آرزو کا اظہار کرے اور یوں ان کا سارا معاشرہ سَلَامًا سَلَامًا (۳۱) کی حیات بخش صداؤں سے گونج اٹھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔ حَنِيفًا مَّسْلُحًا تھے (۳۲) یہی وہ نام ہے جو دین خداوندی کے متبعین کے لئے اللہ نے تجویز کیا تھا۔ قرآن کریم سے پہلے بھی اور قرآن کریم کے بعد بھی (۳۳)۔ انہی آپ کو فرقوں سے منسوب کرنا غیر اسلامی شعار ہے۔ اس لئے کہ فرقہ بندی شرک ہے (۳۴)۔ اور مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۳۵) اور کفر اور اسلام بھی ایک دوسرے کی ضد (۳۶)۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم کبھی مجرم نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَفَتَجْعَلُ الْمُتَسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ (۳۷)۔ ”کیا ہم مسلمین کو مجرمین جیسا بنادینگے؟“۔ لہذا مسلم وہی ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔

الاسلام، وہ ضابطہ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی ضابطہ حیات خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے اَفْتَعْيِرْ دِينَ اللّٰهِ يَتَّبِعُونَ۔ کیا یہ لوگ، اللہ کے (متعین فرمودہ) ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالانکہ تمام اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي الْقِسْمَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْهًا وَكَرْهًا وَالْاَيْدِ يَرْجِعُونَ (۳۸) کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے، طوہاً و کرہاً سر بسجود ہیں اور وہ ہر قدم پر اس قانون کی طرف لوٹاتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (۳۹) جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کریگا اس سے وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا۔ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۴۰)۔ اور اس کا جی چاہے تو تجربہ کر کے دیکھ لے کہ وہ آخر کار ضرور نقصان اٹھائیگا۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے سابقہ کو ملتا رہا اور جو آخر الامر قرآن کریم میں آکر مکمل ہوا۔ اسی کو خدا نے تمام نوع انسان کے لئے منتخب کیا ہے (۴۱)۔ لہذا اب، اس آسمان کے نیچے، خدا کا تجویز کردہ ضابطہ حیات جسے اس نے الاسلام کہہ کر ہکارا ہے، قرآن کریم سے باہر کہیں نہیں۔ اسی دین کے ماننے والوں کو مسلمین کہتے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو قرآن کریم کو خدا کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطہ حیات سمجھے۔

## س ل و

مَسْلُوًا - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلی دے۔ چنانچہ شہد کو بھی اَلْمَسْلُوًا کہتے ہیں\*۔ اور گوشت کو بھی\*\*۔ مَسْلُوَةٌ مِّنَ الْعَيْشِ۔ سہولت اور آرام کی زندگی کو کہتے ہیں جس میں غم و فکر نہ ہو\*\*\*۔ مَسْلَاةٌ عَنَّهُ تَسْلِيَةً۔ اس نے اس کے غم کو بھلا دیا\*۔ اَلْمَسَالِي۔ غم و فکر کو بھول جانے والا\*\*۔ مَسْلَاةٌ۔ وہ اس کی یاد کو بھول گیا۔ اس نے اس کے غم کو غلط کر لیا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سہولت کی زندگی اور فراخی عیش کے ہوتے ہیں۔

اَلْمَسْلُوًا - (۲/۵)۔ سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر کے مشابہ) جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو\*\*\*۔ (نیز دیکھئے عنوان۔ م۔ ن۔ ن)۔

## سليمان عليه السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے۔ آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے (۳۸) اور وارث (جانشین) تھے (۲/۱۶)۔ آپ کو علم اور قوت فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی (۲/۱۵)۔ اس لئے انہیں سطوتِ داؤدی کی وراثت محض ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مل گئی تھی، اگرچہ بنی اسرائیل میں بادشاہت وراثت میں مل جاتی تھی۔ شہروں کی مہذب آبادیاں اور وحشی قبائل (جن و انس) آپ کے لشکروں میں جمع رہتے تھے اور گھوڑوں کے رسالے ان پر مستزاد تھے (۲/۱۷)۔ حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بھی بڑا مشہور تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں۔ (۲/۱۱)۔ یعنی وہ ان سے بادبانی کشتیوں کو چلاتے تھے۔ پہاڑی قبائل کے سرکش افراد مختلف کاموں پر مامور تھے (۲/۱۲)۔ وہ آپ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے۔ مجسمے تراشتے اور تصویریں بناتے تھے (۳۳/۱۳)۔ اس زمانے میں یمن کے مشرق علاقہ پر قوم سبا کی حکومت تھی جو ستارہ پرست تھی۔ ایک ملکہ ان پر حکمران تھی۔ آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ بالآخر مطیع و فرمانبردار ہو گئی (۲۹/۲۴)۔ یہی لشکر وادی نمل میں سے گزرا تھا (۱۸-۱۹)۔ ہند ہند اسی لشکر میں ایک افسر تھا (۲۹-۳۰)۔ آپ اس شوکت و عظمت کے مالک تھے لیکن آپ کا جانشین کہہ زور ثابت ہوا (۳۴/۱۶)۔ تورات (سلاطین) میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

یہودیوں نے سحر و کھانت کے بہت سے لغو افسانے تراش کر آپ کی طرف منسوب کر رکھے تھے۔ خود تورات میں بھی اس قسم کی خرافات ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی ہے (۱۰۴)۔

## س م ر

سَمَدٌ - سَمُوْدٌ ۱ - تکبر سے سر کو اٹھائے رکھنا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رکے بغیر آگے بڑھتے چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ سَمَدَتِ الْاِبِلِ ۲ فِیْ سَبْرِہَا کے معنی ہیں اونٹ تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آگے بڑھتے گئیے۔ اس سے اس کے معنی تکبر اور سرکش کی گئیے جاتے ہیں۔ نیز من مانی کرنے کے بھی۔ سَمَدٌ - یَسْمُدُ کے معنی ہیں، بلند ہونا۔ سَامِدٌ - حیرانی میں کھڑا رہ جانے والے کو بھی کہتے ہیں (شاید اس لئے کہ وہ بھی سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس کے معنی لہو و لعب میں مشغول آدمی کے ہیں جو اپنے فرائض سے غافل ہو جائے\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ کبھی فکر و حزن سے چہرے کے بگڑ جانے کو بھی اَلْسَمُوْدُ کہتے ہیں\*\*۔ قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق ہے وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ وَأَنْتُمْ سَامِدُونَ ۳۔ فَاسْجُدْ لِلَّهِ وَاعْبُدْ ۴ (۱۰۳-۱۰۴)۔ تم ہنستے ہو۔ رونے نہیں ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اس سے بالکل بے خبر ہو کہ تمہارے اعمال کے نتائج کیا سامنے آنے والے ہیں۔ اس اعتبار سے سَامِدُونَ کے معنی غافل اور بے خبر کے آئینگے۔ لیکن اس کے بعد ہے فَاسْجُدْ لِلَّهِ وَاعْبُدْ ۵۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سَامِدُونَ کے معنی یہ ہونگے کہ تم بہت متکبر اور سرکش ہو۔ من مانی کاروائیاں کرتے ہو۔ تم اس روش کو چھوڑو اور احکام خداوندی کے سامنے جھکو اور اس کی محکومیت اختیار کرو۔

## س م ر

السَّمَرَةُ ۶ - گندمی رنگ - السَّمَرَاءُ ۷ - گیہوں - السِّمَرُ ۸ - رات - رات کی باتیں - رات میں قصے کہانیاں کہنا - السَّمِيرُ ۹ - شب میں قصہ گوئی کی محفل - نیز قصہ گو - (یہ جمع کے لئے بھی آجاتا ہے) (۲۳) - السِّمِيرُ ۱۰ - قصہ گو - داستان زن - اَلْمُسَامِرُ ۱۱ - رات کی قصہ گوئی کی محفل میں تمہارا شریک - سِمَارَةُ اللَّيْلِ ۱۲ - رات کو باتیں کرنا - سَمِيرٌ ۱۳ کے معنی زمانے کے بھی ہیں\*\*\*۔

آلسامیرۃ\*۔ آلسمترۃ\*۔ یہودیوں کی ایک قوم جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ نیز یہ چھوٹ چھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ آلسامیرۃ\* فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھو جائے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں\*\*۔ (۲/۹۷) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا، ایسا ہی کچھ آیا ہے۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا)۔ حضرت مسیحؑ سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سامیری کہہ کر پکارا ہے۔ ۲/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی (۲/۹۶)۔

لیکن اگر آلسامیریؑ کی اصل ستمرؑ ہے تو اس کے معنی دامشیاں گو، یعنی قصے کہانیاں کہنے والے کے ہیں۔ ”کہانیاں کہنے والے“ جس طرح قوموں کو گمراہ اور برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر، قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے وقوعہ مذلت میں گرتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے نامانوس شے قرار پا چکے ہیں۔

## س م ع

السَّمْعُ\*۔ کان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان آوازوں کو محسوس کرتا ہے۔ سننے کو بھی، اور کبھی کبھی خود کان کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ نیز جو چیز سنی جائے اسے بھی سَمْعٌ کہہ دیتے ہیں۔ سَمِيعٌ کے معنی سننے والا اور سنانے والا دونوں آتے ہیں (اگرچہ بعض علمائے لغت نے دوسرے معنوں کی تردید کی ہے)۔ اَسْمَعُ الْيَهُودَ کے معنی ہیں کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ کان لگانا اور بغور سننا۔ لیکن قرآن کریم میں يَسْتَمِعُونَ الْيَسْكَ (۱۴۲) سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایسے دکھائی دیں کہ وہ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں لیکن درحقیقت سن نہ رہے ہوں۔ انہیں وہ بہرا کہتا ہے۔ یعنی عقل سے کام نہ لینے والے۔ (۱۴۳)۔

اَسْمَعُ غَيْرِ مُسْمَعٍ۔ (۱۴۴) اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ہماری بات سن، اگرچہ تیری بات سنی نہیں جائیگی۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ قول طنزاً بہرا ہو جانے کی بددعا کے لئے، اور بصورت دیگر دعا کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی کبھی سَمْعٌ کا اطلاق خود فہم و تدبیر پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اَسْمَعُ کے معنی اَفْهَمُ (کسی کو سمجھا دینا) بھی آتے ہیں۔ نیز اس لفظ کا اطلاق اطاعت پر بھی کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اَسْمَعُونَ کے معنی اَطِيعُونَ ہوتے ہیں\*۔ (۱۴۵)۔ سَمِيعٌ لَّہُ کے معنی ہیں اس کی بات کو قبول کیا\*۔

قرآن کریم نے حصول علم کے لئے سمع، بصر اور قلب کا ذکر کیا ہے۔ سماعت و بصارت ان حواس (Senses) کی ترجمان ہیں جنکے ذریعہ محسوس اشیاء کے متعلق معلومات ذہن انسانی تک پہنچتی ہیں۔ یعنی یہ علم محسوسات (Perceptual knowledge) کے ذرائع ہیں۔ ان ذرائع سے جو معلومات (Sense Data) قلب (Mind) تک پہنچتا ہے وہ اس سے تصورات (Concepts) متعین کرتا ہے۔ اس طرح سمع، بصر و قلب سے Conceptual knowledge حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم علم محسوسات اور علم تصورات پر بڑا زور دیتا ہے اور جو لوگ سمع و بصر و قلب\*\* سے کام نہیں لیتے انہیں جہنمی قرار دیتا ہے (۱۴۶)۔ لیکن وہ اسکے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو پھر اسکے ذرائع علم اسے صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچاتے (۱۴۷)۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) غصہ میں انسان کس طرح اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے جذبات کا ہے۔

لالچ میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر ہر ہوشمند ہنستا ہے۔ اور تعصب میں انسان دوسرے کے نقطہ نگاہ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح نشیے کی حالت میں حواس صحیح کام نہیں دے سکتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ ایسے قرآن کریم خَتَمَ اللَّهُ عَلٰی قُلُوْبِیْهِمْ وَعَلٰی سَمْعِیْهِمْ وَعَلٰی ابْصَارِیْهِمْ غِشَاوَةً (۲/۲۱۷) سے تعبیر کرتا ہے۔ آنکھوں پر پردے پڑ جانا۔ کانوں میں ڈاٹ لگ جانا۔ اور دلوں پر مہریں لگ جانا\*۔ علم اُسی وقت صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے جب اس سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے۔ کیونکہ وحی کے ذریعہ وہ اصول زندگی ملتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی۔ انسان اپنے عقل و فہم سے جو اصول حیات بھی وضع کریگا وہ اس کے جذبات کی آمیزش سے خالی نہیں رہ سکتے۔

سَمَاعٌ\* - جاسوس کو بھی کہتے ہیں \*\* (۲/۲۱۷)۔

سورة كهف میں ہے اَبْصِرْ يَدِہٖ وَاَسْمِعْ (۱۸/۲۰) کیا خوب اسکا دیکھنا اور کیا خوب اسکا سننا ہے۔

مُسْمِعٌ - سنانے والا (۳۵/۳۲)۔ مُسْتَمِعٌ\* - سننے والا (۵۲/۳۸)۔

اِسْتَمَعَ - (چھپ کر) سننا (۴۲/۱)۔ کان لگا کر غور سے سننا (۲۳/۲۰)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُسْمِعُ اور اَلْمُسْتَمِعُ\* - ذکر جمیل اور شہرت کو بھی کہتے ہیں۔

## س م ک

اَلْمُسْمِكُ\* - گھر کی بلندی یا چھت - قَدْ سَمَكْتَهُ\* - اس نے اسکو بلند کر دیا \*\*\*۔ اَلْمُسِمَاكُ\* - وہ چیز جس سے کسی چیز کو بلند کیا جائے۔ اَلْمُسْمَاكُ\* - لکڑی جو خیمہ میں لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اونچا رہے۔ اَلْمُسْمَكُ\* - مچھلی کو کہتے ہیں \*\*۔ (کیونکہ وہ درمیان سے سوئی اور اونچی ہوتی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعَ سَمَكَهَا (۴۹/۲۸) خدا نے (آسمان کی) بلندی یا چھت کو اونچا کر دیا۔ فضائے سماوی کو بہت بلندی تک لے گیا۔ [ (Space) کی بلندی یا وسعت لامحدود ہے۔ ]



## س م م

السَّمُّ - تنگ سوراخ - جیسے سوئی کا ناکہ - (جَم) - یا کان اور ناک کا سوراخ - نیز زہر کو بھی کہتے ہیں - مَسَامٌ - جلد کے بارہک سوراخ - السَّمَامُ - ہر ہلکی پھلکی اور تیز چیز - السَّمُومُ - تیز گرم ہوا (لَو) جو اکثر گرمی کے دنوں میں چلتی ہے \* - قرآن کریم میں ہے فی السَّمُومِ وَحَمِيمٍ - (۵۶) - سورة حجر میں نَارِ السَّمُومِ (۱۵) آیا ہے -

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں؛ کسی چیز میں داخل ہونے کی جگہ - وہ لکھتا ہے کہ زہر کو مَسَمٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدن میں گھس جاتا ہے، اور مَسْمُومٌ گرم ہوا کو کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ تیزی کی وجہ سے بدن میں گھس جاتی ہے - راغب نے لکھا ہے کہ سَمَقَہ کے معنی ہیں اس میں گھس گیا، نیز مَسْمُومٌ اس گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کلسا اثر کرتی ہے \*\* -

## س م ن

سَمِينٌ - مَسَانَةٌ - وہ فریدہ ہوا - موٹا تازہ ہوا - سَامِنٌ - سَمِينٌ - (جمع سِمَانٌ) - فریدہ \* - قرآن کریم میں ہے بِقَرَاتٍ سِمَانٍ (۱۲) - سوئی گاٹیں - یا بَعِجْلٍ سَمِينٍ (۵۱) - موٹا بچھڑا آسَمَنُ الْقَرْجُلُ - آدمی موٹا تازہ ہو گیا - سَمَقَتْہ - وَأَسْمَنَتْہ اسے موٹا کر دیا \* - سورة غاشیہ میں جہنم کے کھانے کے متعلق ہے لَا یَسْتَمِنُ (۸۸) - وہ موٹا نہیں کرتا - بدن کو پڑھاتا نہیں - ذلت و رسوائی کی روٹی سے فریبی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ أَلَسَمِنُ \* - گھی کو کہتے ہیں جس کے کھانے سے انسان موٹا ہو جاتا ہے -

## س م و

سَمَاءٌ (جمع سَمَوَاتٌ) آسمان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین پر بلند اور سایہ فگن ہوتا ہے - نیز ہر اس چیز کو جو تمہارے اوپر چھائی ہوئی اور سایہ فگن ہو، سَمَاءٌ کہیں گے - چنانچہ گھر کی ہر چھت بھی سَمَاءٌ کہلاتی ہے - فقہ اللغة میں بھی سَمَاءٌ کی یہی تعریف کی گئی ہے - راغب نے کہا ہے کہ ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سَمَاءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے أَرْضٌ - نیز بادل اور بارش کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں - ہودے اور سبزے کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے اونچا ہوتا ہے \*\*\* -

اسْم کے معنی ہیں کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔  
 پھر فام کو بھی اسْم کہتے ہیں، اس کی جمع اسماء ہے۔ اس کا مادہ بھی  
 س-م-و ہے۔ اس جہت سے کہ اسم سے مسمی پہچانا جاتا ہے اور اسی سے اسے  
 بلندی و عزت حاصل ہوتی ہے۔ سَمِی کے معنی ہمنام اور نظیر و ہم پلہ کے آتے  
 ہیں۔ مَسَامَاة کے معنی باہمی مفاخرت کے آتے ہیں\*۔ سَمَتِی تَسْمِیة۔  
 نام رکھنا۔ اَلْمُسَمَّی کے معنی نام رکھا ہوا، بتایا ہوا، نامزد کیا ہوا۔  
 نیز معین، مقرر اور معلوم\*۔

صاحب مفردات نے عَلَّمَ اَدَمَ اَلْاَسْمَاءَ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے  
 کہ مَعْرِفَةُ اَلْاَسْمَاءِ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِمَعْرِفَةِ التَّسْمِی - جب  
 تک مسمی کا علم نہ ہو اس کے اسماء کا تعارف کچھ فائدہ نہیں دیتا\*\*\*۔  
 اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ہر  
 چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کر کے اس کو پہچاننے کے لئے  
 نام رکھتا ہے۔

قرآن کریم میں اَرْض و سَمَاء ہے شمار مقامات میں آتا ہے۔ اس  
 میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی، جس پر ہم رہتے ہیں، اَرْض  
 کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر بلندی کو (ہستی کی نسبت سے) سَمَاء اور ہر  
 ہستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) اَرْض کہتے ہیں، اس لئے اَرْض  
 و سَمَاء کے معنی کائنات کی ہستیاں اور بلندیاں ہونگے۔ اور جب اَرْض کو  
 سَمَاء کے مقابل میں لایا جائیگا تو سَمَاء سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا  
 نظام بھی ہوگا، اور اَرْض سے مراد انسان کی معاشرتی، معاشی اور تمدنی  
 زندگی۔ نیز سَمَاء یا سَمَوَات سے مراد محض اجرام فلکی ہی نہیں ہونگے  
 بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ابھر اور ایٹم وغیرہ  
 بھی ہونگے۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اَرْض و سَمَاء کے الفاظ آئے ہیں سیاق  
 و سباق پر غور کرنے سے باآسانی سمجھ میں آجائیگا کہ اُس جگہ سَمَاء میں  
 بلندی کا پہلو ہے اور اَرْض میں ہستی کا۔ خواہ وہ محسوس اشیاء میں ہو۔  
 خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان  
 کی معاشرتی زندگی ہو جسے اس نے اپنی مفاد پرستیوں کے سانچے میں ڈھال رکھا  
 ہے۔ (مزید بحث ارض کے عنوان کے تحت آچکی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کہ وَ عَلَّمْ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲/۳۱)۔  
 آدم کو تمام اشیاء کے اَسْمَاء سکھا دئے گئے۔ آدم سے مراد نعوذ آدمی  
 ہے۔ یعنی انسان (دیکھئے عنوان ۱۔ د۔ م) جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسماء  
 کا جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا جب تک آپ کو مسیحی (جس چیز کا وہ نام ہے)  
 اس کا علم نہ ہو۔ لہذا آدم کو جو علم الاسماء دیا گیا تو اس کے معنی یہ  
 ہیں کہ انسان میں اشیائے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی استعداد  
 رکھ دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملائکہ (کائنات میں کام کرنے  
 والی قوتیں) اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ جب انسان اس قانون سے واقف ہو  
 جاتا ہے جو کائنات میں کارفرما ہے تو جو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر  
 رہی ہیں وہ سب اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ لہذا جس قدر کوئی قوم  
 اشیائے فطرت کے متعلق معلومات بہم پہنچا کر انہیں اپنے تابع فرمان کر لے گی  
 اسی قدر وہ مسجود ملائکہ بنتی جائے گی۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ان  
 قوتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے۔ سو اس کے متعلق فرما دیا کہ فَمَنْ  
 تَبِعَ هَذِهِ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۸)۔ جو  
 قوم وحی خداوندی کا اتباع کریگی اسے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اور جو  
 قوم انہیں اپنی مرضی کے مطابق (اپنی مفاد پرستیوں کے لئے) صرف کرے گی  
 وہ خود بھی ہلاکتوں میں پڑیگی اور دوسروں کے لئے بھی باعثِ مصیبت بن  
 جائے گی۔ اُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲/۹)۔ اگر  
 تسخیرِ فطرت کرنے والی قوم کو ”آدم“ (محض آدمی) کہا جائے تو اشیائے  
 فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والی قوم کو ”مومن“ کہا  
 جائے گا۔ اور جو قوم نہ تسخیرِ فطرت کرے اور نہ ہی اتباعِ قوانین خداوندی  
 قواسے؟ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن بہر حال کہنا ہی  
 پڑتا ہے، کہ اسے دورِ حاضر کے مسلمان کہا جائے گا! با للعجب۔

”آدم“ کے علم الاسماء کے ضمن میں ایک مغربی ڈاکٹر نے اپنے نقطہ  
 نگاہ سے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری  
 عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔  
 اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص  
 بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام  
 رکھے جاتے ہیں، ان سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں\*۔

\*Dr. M. L. Tyler in "Homeo. Drug Pictures" (Preface).

اس سے بھی مراد، کائنات کے علوم طبعی کی تحصیل ہے جو ”آدمیت“ کی علامت ہے۔ ”غلط نام“ رکھنے کے ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنہیں تم (خدا کے علاوہ) اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز ایں نیست کہ اَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوْهُمَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ (۱۲/۱۲)۔ ”یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں“۔ سَاَنْزِلَ اللّٰهُ بِيْهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲/۱۲)۔ ”اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی“۔ یہ جو ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جائیں تو وہ مٹی اور پتھر کی عمارتوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے خدا کا قانون عطا کرے۔ کائناتی دنیا میں اس کا قانون کائنات، اور انسانی دنیا میں ضابطہ وحی (قرآن عظیم)۔ باقی سب بتانِ آزری ہیں۔

## س ن ب ل

السَّنْبُلُ۔ بالوں اور خوشوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد السَّنْبُلَةُ ہے (جمع سَنَابِلُ وِسَنَابِلَاتٌ) بال۔ خوشہ (۲۱/۲۱)۔ قَدْ سَنَبَلَ الزَّرْعُ۔ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں\*۔ (یہ لفظ غلے کے لئے آتا ہے۔ پھلوں کے لئے نہیں)۔

## س ن د

السَّنْدُ۔ وہ چیز جسکے ذریعہ کوئی آدمی سہارا لے۔ سَنَدٌ اِلَيْهِ يَسْنُدُ۔ اسنے ٹیک لگائی\* سَنَدُ الشَّيْءِ۔ اسنے اس چیز کو سہارا دیکر مضبوط کر دیا۔ اَلَسَّنْدُ۔ بلند پہاڑ جو تمہارے سامنے ہو۔ اَلَسَّنْدَانُ۔ لوہار کا اھرن جس پر لوہے کو گرم کر کے کوٹا جاتا ہے\*\*۔

اَلَسَّنْدُ۔ چادر کی ایک قسم جو یمن میں بنتی تھی۔ سَنَدُ الرَّجُلِ۔ آدمی نے چادر اوڑھ لی\*۔ قرآن کریم میں منافقین کو خُشْبُ مَسْنَدَةٍ (۱۳/۱۳) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور یہ بھی کہ وہ انسان نہیں، لکڑیاں ہیں جنہیں کپڑے پہنا دئے گئے ہوں۔ پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کیونکہ منافق میں خود اعتمادی نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ آسرے

ڈھونڈتا رہتا ہے۔ دوسرے معنی اس جہت سے درست ہیں کہ منافق کے اندر کچھ اور ہوتا ہے اور باہر کچھ اور۔ اور جو کچھ باہر ہوتا ہے ایسے وہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ نیز اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ منافق لکڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے سہارے ہی کھڑے رہ سکتے ہیں۔ اور اندر سے وہ کندہ نسا تراش ہوتے ہیں لیکن ان کا ظاہر پڑا مزین اور خوشنما ہوتا ہے۔

## س ن ن س

سُنْدُسٌ \*۔ باریک اور اعلیٰ قسم کے ریشم کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ معرب ہے \*۔

قرآن کریم میں ہے ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ (۱۸/۱۸)۔ ”سبز ریشمی کپڑے“۔

## س ن م

السَّقَامُ \*۔ اونٹ کا کوہان۔ الْقَسِيمُ \* مِّنَ النَّبْتِ۔ بلند ہودہ جسکے بھول (یا بالیں) نکل آئے ہوں۔ سَنَقَمَ الْاِلَافَةُ تَسْنِيْمًا۔ اسنے برتن کو اس طرح بھر دیا کہ جو چیز اس میں ڈالی گئی تھی (مثلاً غلہ وغیرہ) وہ اس کے کناروں سے بھی اونچی ہو گئی۔ تَسَنَقَمَ الْحَائِطُ۔ وہ دیوار ہر چڑھ گیا۔ اسْتَمَتِ النَّارُ۔ آگ کے شعلے بلند ہو گئے۔ سَنَامٌ \* کُلٌّ شَيْءٌ۔ ہر شے کا بلند حصہ یا بہترین حصہ \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رفعت اور بلندی کے ہیں۔

قرآن کریم میں تَسْنِيْمٌ آیا ہے جس کی تشریح اَنْ الْفَاظُ سے کر دی گئی ہے کہ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُعْرِضُونَ (۸۸/۸۸)۔ ”ایسا چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں“۔ اس میں بلندیوں کا تصور ہے۔ یعنی زندگی کے ارتقائی مدارج۔ انسانیت کی رفعتیں۔ صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما۔

## س ن ن

الْيَسَنُ \*۔ دانت \*۔ (۵/۵)۔ چونکہ جانوروں کی عمر دانت دیکھ کر بتائی جاتی ہے اس لئے اس کے معنی عمر کے بھی آئے ہیں۔ اَسَنَ الرَّجُلُ \*۔ آدمی بڑی عمر کا ہو گیا۔ اَلْسِنَّةُ \*۔ چہرہ۔ صورت۔ نیز چہرے کا کھلا اور نمایاں حصہ۔ نیز راستہ، طریقہ، دستور، اور قانون۔ اس کی جمع سَنَنٌ \* ہے۔ اسی

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج و راغب۔

سے سَنَّ الطَّعْنَ بِقٍ۔ (سین کے زیر۔ زیر اور پیش کے ساتھ۔ یہ سَنَّہ کی جمع نہیں۔ ایک الگ لفظ ہے۔) راستے کے کھلے واضح اور نمایاں حصہ کو کہتے ہیں\*۔ یہیں سے اس کے معنی طریقہ، مسلک، معمول اور قانون کے ہو گئے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتَيْنَا تَحْتَوِيَنَّ (۱/۲۴)۔ ”تم ہمارے طریقہ (قاعدہ۔ قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے“۔ سورۃ فاطر میں ہے۔ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ (۳۵/۳۵)۔ اب لوگوں کو صرف اس کا انتظار ہے کہ جو کچھ ان جیسی پہلی اقوام کے ساتھ ہوا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہو جائے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ قَدْ خَلَّيْنَا مِنْ قَبْلِكَ سُنْنَ (۱۳۱/۱۳۱)۔ تم سے پہلے بہت سے مسلک و مشرب طور طریقے، نظام ہائے حیات گذر چکے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا جاری رہنا۔ اور سہولت کے ساتھ اس کا یکے بعد دیگرے آنے رہنا۔ سَنَّ الشَّقِيَّ کے معنی کسی چیز کو سہل اور آسان کر دینا ہیں\*\*۔ اور سَنَّ التُّرَابَ عَلَيَّ وَجْهَ الْأَرْضِ کے معنی ہیں زمین پر مٹی کو آہستہ اور نرمی سے ڈالا حتّٰکہ وہ بند کی طرح بن گئی\*\*۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں مِّنْ حَمَآءٍ مَّسْنُونٍ (۱۹/۱۹) آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر سڑے ہوئے گارے کے کٹھے جاتے ہیں۔ لین نے (مختلف اسناد کے ساتھ) لکھا ہے کہ سَنَّتُ الْحَجَرِ عَلَيَّ الْحَجَرِ کے معنی ہیں ”میں نے پتھر پر پتھر رکھ کر گھسا“۔ اس طرح پتھر پر پتھر رکھ کر (اور پانی ڈال کر) گھسنے سے جو سڑا ہوا مرکب نکلتا ہے اسے سَنِيْنٌ کہتے ہیں۔ جب وہ کچھ عرصہ تک پڑا رہے تو سخت ہو جاتا ہے\*\*\*\*۔ بعض نے کہا ہے کہ مَّسْنُونٌ کے معنی تدر اور نرم کے ہیں۔ ابو الہیثم نے کہا ہے کہ مَنَّ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی متغیر ہو گیا\*۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی تھی۔ وہ مٹی جس کے ساتھ پانی ملا تھا۔ یعنی زندگی کی ابتداء جماد (Inorganic Matter) کے ساتھ پانی کی آمیزش سے ہوئی۔ جب ان دونوں کی آمیزش کے بعد قرن ہا قرن گزر گئے اور اس میں کافی تغیر و تبدل ہوتا گیا تو اس سے زندگی کی نمود ہو گئی۔ اس کو حَمَآءٍ مَّسْنُونٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے اُس طریق کا بتانا مقصود ہے جس سے زندگی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی۔ یہ مطلب نہیں کہ زندگی سادہ (Matter) کی پیداوار ہے۔

قرآن کریم کا یہ اعلان کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۸)۔ ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے جس پر تمام سائنٹیفک تحقیقات کی عمارت استوار ہے اور جو قانونِ مکافاتِ عمل کی روح ہے۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یہ کہنا کہ ”خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی“ کسی انسان کا کام نہیں تھا۔ انسان تو ابھی کل تک قانون (Law) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ دنیا میں جس قدر سائنٹیفک ایجادات ہوئی ہیں، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں وہ سب اس محکم اصول کی رہیں۔ سنت ہیں کہ قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اصول اس قدر محکم ہے کہ انسان اس پر کامل اعتماد کر سکتا ہے اور یہی وہ اعتماد ہے جس کے سہارے وہ آسمانی کروں تک جست لگائے سے بھی نہیں جھجکتا۔ وہ جب ایک دفعہ قانونِ خداوندی کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ اس یقین کے ماتحت کہ اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، وہ کچھ، بلا خوف و خطر، کرتا چلا جاتا ہے جس کے تصور سے بھی ان لوگوں کی روح کانپتی ہے جو اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے۔

جس طرح اس کا یہ اصول خارجی کائنات میں کارفرما ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہے۔ اس نے قوموں کے عروج و زوال کے لئے قوانین متعین کر دیے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کریگی وہ عروج حاصل کرے گی۔ جو ان کے خلاف جائیگی، تباہ ہو جائیگی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

اس قانون نے خود خدا کے تصور میں بھی ایسا عظیم انقلاب پیدا کیا ہے جس سے انسانی دنیا بدل گئی ہے۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں خدا کو ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح سمجھتا تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے ناراض ہو جاتا ہے تو گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیتا ہے۔ خوش ہو جاتا ہے تو مجرموں کو جاگیریں بخش دیتا ہے۔ ایسے خدا سے انسان ہر وقت ڈرتا اور کانپتا رہتا تھا کہ نہ جائے وہ کس وقت کیا کر دے۔ اس لئے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے۔

قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ بیشک خدا قادر مطلق اور حاکم اعلیٰ ہے لیکن اس نے کائنات اور انسانوں کے لئے قوانین مرتب کر دیے ہیں۔ اور، بے انتہا اور لامحدود قدرتوں اور قوتوں کا مالک

ہونے کے باوجود ، اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے ان قوانین میں تبدیلی نہیں کریگا ۔ لہذا ، انسانی زندگی کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے ۔ یعنی انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۔ اور اس کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ ”قانون کے مطابق سب کچھ کرنے والا خدا“ ۔ اور قانون غیر متبدل ۔ سوچئے کہ خدا کے اس تصور نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ۔ یہ قرآن ہی کا صدقہ ہے ۔

### س ن لا

سَنِيَهُ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ سَنَهُمَا وَتَسْنُوهُ ۔ کھانے اور پینے کی چیز خراب ہوگئی ۔ بگڑ گئی ۔ اَلتَّسْنُوَةُ بھس جانا ۔ سڑ جانا ۔ زمانہ گزرنے سے کسی چیز میں تغیر واقع ہو جانا ۔ یہ لفظ روٹی کے بھس جانے اور پینے کی چیزوں کے سڑ جانے پر بولا جاتا ہے ۔ طَعَامٌ سَنِيَهُ سڑا ہوا کھانا ۔ خَبِثٌ مِّنْ سَنِيهِ بھسی ہوئی روٹی ۔ قرآن کسریم میں ہے لَمْ يَتَسَنَّهْ (۲۵۹) وہ خراب نہیں ہوا ۔ بگڑا نہیں ۔ یعنی اتنی طویل مدت گزرنے کے باوجود وہ متغیر و مالمخوردہ نہیں ہوا\* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهُ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں ۔ سَنَهَتْ النِّسْخَةَ ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے ۔ بیشتر علمائے لغت کا خیال ہے کہ سَنَهُ (بمعنی سال) اسی مادہ سے ہے ۔ لیکن ہم نے سَنَهُ اور اس کے بعض مشتقات (س ۔ ن ۔ و) کے تحت لکھے ہیں ۔ لہذا اس مادہ کی تکمیل کے لئے اس عنوان (س ۔ ن ۔ و) کو بھی دیکھ لیجئے ۔

### س ن و

السَّنَةُ کے معنی ہیں سال (اس کی جمع سنَوَاتٌ ، سِنُونٌ اور مَنِينٌ ہے) ۔ اس کے مادہ کے متعلق اختلاف ہے ۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ سَنَهُ کی اصل (س ۔ ن ۔ و) ہے ، کیونکہ اہل عرب کہتے ہیں سَأْنَهْتُ فُلَانًا ۔ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کر لیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهُ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں ۔ سَنَهَتْ النِّسْخَةَ ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے ۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی



اصل سَنَوٌ ہے جس سے سَنًا - بِسَنَوٌ کے معنی ہیں کنویں کے گردا گرد گھومنا - چنانچہ السَّانِيَّةُ - اس جانور کو کہتے ہیں جو پانی نکالنے کیلئے کنویں کے ارد گرد گھمایا جاتا ہے - اسی سے سورج کے ایک دورے کو السَّنَّةُ کہتے ہیں - (اسے دَارٌ بھی کہتے ہیں) - اور چونکہ یہ دورہ ایک سال میں پورا ہوتا ہے اس لئے السَّنَّةُ کے معنی ہیں ایک سال - السَّنَّةُ شمسی سال ہوتا ہے، اور اَلْعَامُ، قمری سال - نیز السَّنَّةُ ایسے سال کو کہتے ہیں جس میں قحط اور شدت ہو - اور اَلْعَامُ اس سال کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی اور خوشحالی ہو - اسی بناء پر کہتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ فَلَبِثَ قِيَّهِيْمٌ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹) - تو اس میں عَامًا وہ مدت ہے جس میں مشکلات سامنے نہیں آتی تھیں اور سَنَةٌ وہ مدت جو سختیوں کی تھی - لین نے لکھا ہے کہ سَنَةٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں - اس لحاظ سے اَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہونگے اڑھائی سو سال - اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں - تو اس میں سے خَمْسِيْنَ عَامًا نکال دینے سے باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں جو ایک انسان کی عمر ہو سکتی ہے - لیکن یہ بہر حال ان لوگوں کے قیاسات ہیں - جب تاریخ کے مزید شواہد سامنے آئیں گے تو اس وقت یقینی طور پر کہا جاسکے گا کہ قرآن کریم کے اس بیان کا صحیح مفہوم کیا ہے کہ ”حضرت نوحؑ اپنے لوگوں میں پچاس کم ایک ہزار سال رہے“ (۲۹) - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت ان کے زمانہ تعلیم پر دلالت کرتی ہے - یعنی ان کا زمانہ نبوت اتنا عرصہ رہا - اس کے بعد دوسرے نبی کا زمانہ شروع ہوا - سَنَاهٌ - تَسْنِيَّةٌ کے معنی ہیں اس کو کھول دیا - سہل کر دیا -

## س ن ی

السَّنَى - روشنی - السَّنَاءُ والسَّنَى - بلندی اور رفعت \* -  
قرآن کریم میں ہے بِسْكَادُ سَنًا بَرْقِيہ، يَذْهَبُ يَا لَبَّاسَارِ (۲۳) - ”قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دے“ اس میں سَنًا کے معنی چمک اور خیرگی پیدا کر دینے والی روشنی کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور ارتفاع کے ہیں -

## س ھ ر

سَهْرٌ - سَهْرٌ - سَهْرًا - (رات کو) جاگنا - سَاهِرٌ - (رات کو) جاگنے والا \* - السَّاهِرَةُ - زمین کا بالائی حصہ، روئے زمین - دراصل یہ ایسی \* تاج - محیط - راغب -

زمین کے لئے بولا جائیگا جس پر لوگ بکثرت چلتے پھرتے رہیں۔ گویا وہ انکی وجہ سے بیدار ہے۔ \*\*۔

قرآن کریم میں ہے فَارْذَاهُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۶۱/۱۵) اُس (نشاۃ ثانیہ) کے بعد زندگی ہی زندگی ہوگی۔ اور بیداری ہی بیداری۔ یا نشوونما میں تیزی۔ کیونکہ اَرْضُ سَّاهِرَةٍ اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو بہت جلد ہودے اگلنے والی ہو۔ \*۔ چونکہ حیاتِ اخروی کی کیفیات، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس لئے قرآن کریم انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ نگہ، بصیرت ان تشبیہات و استعارات کے پردوں میں حقیقت کا خفیف سا پیر تو دیکھ لیتی ہے۔ اس سے زیادہ اس زندگی میں ممکن ہی نہیں۔

سربانی زبان میں السَّاهِرُ چاند (الْقَمَرُ) کو کہتے ہیں \*\*\*۔ اور عربی میں چاند گہن کو بھی۔ (لین)۔

## س ھ ل

السَّهْلُ۔ السَّهْلُ۔ نرم چیز۔ السَّهْلُ مِّنَ الْأَرْضِ۔ نرم زمین۔ اسکی جمع سَهْلٌ آتی ہے \*۔ قرآن کریم میں ہے تَتَخَيَّدُونَ مِّنْ سَهْوَلِيهَا قَصُورًا (۳۶/۴)۔ ”تم ہموار اور نرم زمینوں میں معلات تعمیر کرتے ہو“۔

## س ھ م

سَهْمٌ۔ حصہ۔ دراصل سَهْمٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس سے قرعہ ڈال کر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نیز گھر کا گزرنے کا راستہ السَّهْمُ۔ لاغر ہونا اور رنگ کا متغیر ہو جانا۔ اصل میں بہ اونشوں کی ایک بیماری ہوتی ہے جس میں انہیں گرمی اور پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ السَّهْمُ کسی غم یا فکر کی وجہ سے قرشرو ہونا۔ سَاهَمَ الْقَوْمُ۔ اسنے قوم کے ساتھ قرعہ اندازی کی \*\*\*\*۔ تیر اندازی میں مقابلہ کیا نیز باہم ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کی۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت یونسؑ میں ہے فَسَاهَمَ (۳۶/۱۱)۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں۔ اس نے باقیوں کے ساتھ قرعہ ڈالا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ فَسَاهَمَ میں کشتی والوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* (کتاب الاشتقاق) نیز ابن فارس۔ \*\*\*\* تاج و محیط و راغب

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ (حضرت) یونسؑ نے ہمارے قانون کا مقابلہ کیا۔  
فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ (۳۷/۱۳۱)۔ وہ لغزش کھا گیا۔ اس کا پاؤں پھسل  
گیا۔ حضرت یونسؑ سے ہجرت کا وقت متعین کرنے میں اجتہادی غلطی  
ہو گئی تھی۔

## س ه و

سَهَّاءٌ فِي الْأَمْرِ۔ کسی چیز کو بھول جانا۔ اہل لغت نے تصریح  
کی ہے کہ سَهَّوٌ، غَفْلَةٌ اور نِسْيَانٌ، تینوں لفظ ہم معنی ہیں۔ لیکن  
بعض نے تخصیص یہ کی ہے کہ سَهَّوٌ ان باتوں سے معمولی سی غفلت کو  
کہتے ہیں جو حافظہ میں موجود ہوتی ہیں۔ اور نِسْيَانٌ کسی چیز کا حافظہ  
سے بالکل محو ہو جانا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ سَهَّاءٌ الشَّقِيَّةُ کے  
معنی ہیں لاعلمی کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ اور سَهَّاءُ غَفْلَةٍ کے  
معنی ہیں جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینا \*۔ أَلْسَقَهُوٌ کے معنی ہیں  
ساکن اور نرم ہونا۔ أَلْسَقَهُوَةٌ۔ آسانی سے کھنچنے والی نرم کمان کو کہتے  
ہیں \*۔ ابن قارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر معانی کا تعلق غفلت اور  
سکون سے ہے۔ جَاءَ سَهَّوًا رَهْوًا وہ بڑے سکون کے ساتھ آیا۔

قرآن کریم میں ہے هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ (۵۱/۱۱)۔ ”وہ اپنے  
اشغال میں منہمک، حقیقت سے بے خبر ہیں“۔ دوسری جگہ ہے الَّذِينَ هُمْ  
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (۱۵۷/۱)۔ وہ اپنی صلوٰۃ (فرائض منصبی) کی طرف  
سے یکسر غافل ہیں۔ یہاں انکی تکمیل میں بہت سست اور ڈھیلے ڈھالے رہتے  
ہیں (۵۳/۱)۔ یا، وہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور صرف اس کے محسوس  
و مرئی حصہ (تعدیلِ ارکان۔ قیام، رکوع۔ سجود وغیرہ) ہی کو اصل صلوٰۃ  
سمجھتے ہیں (۱۶۷/۱) کیونکہ یہ بڑی آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں اور دیکھنے  
والوں میں عزت بھی ہو جاتی ہے۔

## س و ا

سَاءَةٌ۔ يَسُوءُهُ۔ کسی سے ایسی بات کرنا جو اسے ناگوار ہو۔  
حَتَّى الشَّقِيَّةِ۔ کوئی چیز بری ہونی۔ أَحَاءَ يَسِيئُ۔ برا کرنا، ناہمواری پیدا  
کرنا۔ بگاڑ اور ابتری رونما کرنا (یہ أَحْسَنَ کا ضد ہے) أَلْسَقِيَّةٌ۔ زندگی کی  
ناخوشگواریاں \*۔ یہ حَسَنَةٌ کی ضد ہے۔ اسکا مفہوم سمجھنے کیلئے (ح۔ س۔ ن)

کا عنوان دیکھئے۔ چونکہ حسن نام ہوتا ہے کسی چیز کے پورے پورے توازن قائم کر دینے کا اس لئے سَيِّئَةٌ توازن کے بگاڑ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ سَوَاءٌ کے معنی فساد، ہلاکت اور ضرر کے ہوتے ہیں\*۔ نیز حَسَنَةٌ درمیانہ روی کو کہتے ہیں۔ اس لئے سَيِّئَةٌ کے معنی ہیں افراط و تفریط\*\*۔ مَسَاوِيءٌ۔ ناخوشگوار امور، عیوب، نقائص\*\*۔

السَّوْءَةُ۔ بری خصلت، معیوب بات یا کام۔ ہر وہ قول و فعل جسکے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو۔ بنا بریں مرد اور عورت کی شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ اسکی جمع سَوَاتٌ ہے (۲۰؛ ۲۶)۔

قرآن کریم میں سَيِّئَةٌ بمقابلہ حَسَنَةٌ۔ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۱۱۹؛ ۱۳۱)۔ نیز اِقْتِصَادٌ (میانہ روی) کے مقابلہ میں مَسَاعٍ (۵۶)۔

مغموم یا متردد ہونے کے معنی میں (۱۱) میں سَيِّئٌ بَہِیمٌ آیا ہے۔

صحیح روش زندگی کا نتیجہ انسان کی ذات اور معاشرہ میں حسن کی افزائش ہے۔ یعنی اس سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ دونوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی ساری خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اسکے خلاف زندگی بسر کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی متضاد زندگیاں بسر کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے (۵۸)۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کا توازن بگڑا ہوا ہو تو اسکی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم حسن پیدا کرنے والے کام کرتے جاؤ۔ بگاڑ خود بخود رفع ہو جائیگا۔ اِدْفَعْ بِالنَّيِّبِ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةِ (۲۶)۔ اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کرو گے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائیں گی۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱)۔ سورۃ رعد میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بِتَذَرَعُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ (۱۳)۔ نیز (۵۸)۔ وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مفہوم نہیں کہ قرآن کریم ”ایک گل پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گل کر دینے“۔ یا ”جو کوٹ اتار لے اسے کرنا خود اتار کر دینے“ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم مجرمین کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کے لئے اُس نے قانونِ عدل کی تلقین کی ہے۔ یعنی جرم

کی سزا دینا تاکہ مجرمین کی جرأتیں بے باک نہ ہونے پائیں۔ لیکن اس کے لئے بھی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ جَزَاؤُ اسَیِّئَةٍ سَیِّئَةٍ مِّثْلُهَا (۲۲)۔ نیز (۱۰۱)۔ سزا ہمیشہ جرم کی نوعیت اور مقدار کے مناسب اور مطابق ہونی چاہئے۔ یہ نہیں کہ ذرا سے جرم کی سنگین ترین سزا دیدی جائے۔ (نیز جہاں اصلاح کا امکان نظر آئے وہاں معاف بھی کر دینا چاہئیے۔ (۲۲) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں کہ جو تم سے برائی کرے تم بھی اس سے اسی طرح کی برائی کرو۔ اس میں جرم اور اس کی پاداش (تعزیر) کا اصول بیان کیا گیا ہے جو خدا کے قانون مکافات پر مبنی ہے۔ یعنی سزا، جرم کی مناسبت سے۔ وَکُنْتُمْ جَزَاءَ اَسْوَا الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۰۱) ”یقیناً ہم انہیں ان کے اس قسم کے اعمال پر جو وہ کرتے رہے ہیں بدترین سزا دینگے“۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم انسان کو ایسی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (ہمواری اور خوشگواری) پیدا ہو اور معاشرہ میں بھی۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے قرآنی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات میں بھی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور معاشرہ میں بھی۔ نیکی یا بدی، بھلائی یا برائی کا قرآنی تصور یہی ہے۔

## نِسْوَاع

قوم نوح کا بت تھا (۲۱)۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے اچھی طرح متعارف تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنوہذیل کے لوگ اسی نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے۔

## س و د

اَلَا مَسْوَدٌ - اَبْیَضٌ کی ضد ہے۔ یعنی سیاہ۔ اسکی جمع مَسْوَدٌ ہے۔ (۳۵) اَسْوَدٌ یَسْوَدُ سیاہ ہوا۔ اَلَسَّوَادُ سیاہی۔ تاریکی۔ بال کثیر۔ شہر کے ارد گرد کے دیہات۔ بہت بڑی تعداد۔ هام لوگ۔ قوم کا بڑا حصہ۔ اَلْاَسَاِیدُ سردار یا سَیِّد سے نیچے کا سردار \*۔ اَلْاَسَیِّدُ رئیس \*۔ (صاحب سواد - جسکے ساتھ بہت سی جماعت ہو)۔ بادشاہ۔ آقا۔ شوہر۔

الْأَسِيَادَةُ - سرداری - "أَلَا سَوْدٌ مِّنَ الثَّوْمِ" - قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی - بزرگ قوم - "أَلَا يَأْمُرُ الْمُسَوَّدَةُ" - بدحالی اور تکلیف کے دن - \*\* - راغب نے لکھا ہے کہ ابیضاض الثَّوْمُ سے مراد مسرت و شادمانی ہوتی ہے اور اسْوَدَادُ الثَّوْمُ سے مراد تکلیف اور غم و حزن - \*\*\* - (تیز دیکھنے عنوان ب - ی - ض)۔

سَيِّدٌ ۱ - بمعنی سردار (۳۸) میں آیا ہے - مراد اس سے صاحب عزت و تکریم ہے - اور شوہر کے معنوں میں (۱۲) میں - لیکن وہاں یہ لفظ عزیز مصر کے لئے آیا ہے جو اپنی بیوی کے شوہر ہونے کے ساتھ وہاں کا سردار بھی تھا - عام شوہر کے لئے قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا - سورة نحل میں ہے وَجْهَهُ مُسْوَدًّا - (۱۱) کالا ، سیاہ - یعنی مغموم - سورة آل عمران میں ہے تَسْوَدُّ وَجُوهُ (۳۵) - چہروں کا کالا ہونا یعنی ذلیل ہونا - گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے چہروں کا رنگ سیاہ پڑ جانا - (بمقابلہ تَبْيِضٌ - سفید ہونا - باعزت ہونا)۔

## س و ر

سَارَ - يَسْوُرُ - سَوْرَةٌ کے معنی ہیں کسی پر چڑھ جانا - حملہ کرنا - سَرَّتْ الْحَائِطُ وَ تَسْوَرَّتْہ کے معنی ہیں میں دیوار پر چڑھ گیا - السَّوْرُ - شہر پناہ کو کہتے ہیں - اسی سے اس کے معنی بلندی ہیں - رفعت - شرف و فضیلت - بلندی و برتری - سَوْرَةٌ السَّلْطَانِ - بادشاہ کی سطوت و شوکت ، جاہ و جلال ، اور زور و دبدبہ کے لئے آتا ہے - السَّيَّوَارُ - کنگن کو کہتے ہیں جو سرداری اور مدارج کی بلندی کا نشان ہوتا تھا - (آساوَرُ اسکی جمع ہے) - "أَلَا سَوَارٌ" یا "أَلَا سَوَارُ" - سوار فوج کے کمانڈر کو کہتے ہیں - نیز بہترین تیر انداز اور عمدہ شہسوار کو - ابن فارس نے کہا ہے کہ "أَلَا سَوَارُ" عربی لفظ نہیں ہے - السَّوْرَةُ - درجہ و مرتبہ ، قدر و منزلت ، بلندی - نیز اس عمارت کو کہتے ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی اٹھ کٹی ہو - \*\*۔

قرآن کریم کی سَوْرَةُ کو سَوْرَةُ کہنے کی بہت سی توجیہات بیان کی گئی ہیں - بعض کا خیال ہے کہ ان کی بلند مرتبگی کی وجہ سے انہیں سَوْرَةُ کہا جاتا ہے - بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلی سورة بعد میں آنے والی سورة کے لئے میڑھی کا کام دیتی ہے اس لئے اسے سَوْرَةُ کہتے ہیں - بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ منزل بمنزل آتی ہیں اور ان سب کے مجموعہ

سے قرآن کریم کی عمارت کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے انہیں سُوْرَة کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ان میں قرآن کریم کے احکام محفوظ ہوتے ہیں، جس طرح شہر پناہ سے شہر کی حفاظت ہوتی ہے، اس لئے انہیں سُوْرَة کہا جاتا ہے\*۔ نیز علامت کو بھی سُوْرَة کہتے ہیں\*\*۔

سُوْر\*۔ مضبوط قوی اور شریف النسل اونٹوں کو بھی کہتے ہیں\*۔  
قرآن کریم میں یہ مادہ قرآنی سورۃ کے لئے (۲۳) میں آیا ہے۔ اور (۲۴) میں بھی۔ دیوار کے معنوں میں (۳۱) میں۔ اور سرداری (کی علامت یعنی کنگن) کے لئے (۱۸/۳۳ و ۳۱/۶) میں۔ سورۃ ص میں ہے اِذْ تَسُوْرُوْا السَّيْحَرٰبَ (۳۱/۳)۔ جب وہ دیوار پھاند کر معراب کے اندر آگئے۔  
جنت میں سونے کے کنگنوں کا جو ذکر آیا ہے (۱۸/۳) تو اس کا مطلب وہ قوت و حشمت اور سرفرازی و سربلندی ہے جو جماعت مومنین کو اس دنیا کی جنتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے۔ باقی رہیں اسکے بعد کی زندگی کی سرداریاں اور سرفرازیاں، تو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ حقیقت کا تمثیلی بیان ہے۔ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے ان چیزوں کی کنہ و حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ (دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ن)۔

## س و ط

السَّوْطُ\*۔ بعض چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملانا۔ خلط ملط کر دینا۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں۔ السَّوْطُ\*۔ چابک (کوڑا) کیونکہ وہ گوشت۔ کو خون کے ساتھ مخلوط کر دیتا ہے۔ یا بقول ابن فارس کھال میں گھس جاتا ہے۔ یا پھر اس لئے کہ وہ خود مختلف تسموں کو ملا کر بنا جاتا ہے۔ جمع اسوَاط\*۔ اگرچہ اس کے معنی کوڑوں سے مارنے کے ہیں لیکن عربوں کے ہاں ہر شدید اور درد انگیز سزا کو سَوْطُ عَذَابٍ کہہ دیتے تھے۔ یعنی سزا کا کوڑا۔ لیکن صاحب محیط اور راغب کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جو سَوْطُ عَذَابٍ (۸۹/۱۴) آیا ہے تو اس سے مفہوم انواع و اقسام (طرح طرح) کے عذاب ہیں\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سَوْطُ عَذَابٍ سے مراد ہے عذاب کا ایک حصہ و مقدار۔

## س و ع (سی ع)

سَاعٌ\*۔ سَاعٌ\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ میں اصلی معنی ہلاکت اور زوال کے ہوتے ہیں\*۔ چنانچہ کہتے ہیں سَاعٌ الشَّيْءُ\*۔

چیز ضائع ہوئی \*۔ مَوَّ ضَائِع \* سَائِع \*۔ وہ ضائع اور ہلاک ہونے والا ہے۔  
 نَاقَۃٌ مِّسِّيۃٌ \* اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کو جنگل میں چھوڑ  
 دے کہ اسے درندے ہلاک کر دیں۔ اَسَاعَۃٌ \*۔ اسے بیکار چھوڑ دیا اور ضائع کر دیا۔  
 رَجُلٌ مِّسِّيۃٌ و مِّسِّيۃٌ \* لِلْعَمَالِ۔ مال کو ضائع کر دینے والا آدمی۔ اَلْسَّيۡعُ \*۔  
 زمین کے اوپر بہنے والا پانی۔ سَاعُ الْمَاءِ وَالشَّرَابِ \*۔ پانی اور شراب  
 زمین پر گر کر بہنے لگی۔ تَسَيَّعَ الْبَقْلُ \*۔ سبزبان خشک ہونے لگیں \*۔

اَسْوَعُ \*۔ وہ ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں منتقل ہوا۔ یا ایک  
 گھڑی پیچھے ہوا \*۔ سَوَّعَ \* مِّنَ اللَّيْلِ۔ رات کا ایک (پرسکون) حصہ۔  
 اَلْسَّاعَۃُ \*۔ (واوی ہے، یائی نہیں) وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں (چونکہ  
 وہ گزر جاتا ہے اور وقت میں ہر لمحہ کمی ہوتی جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا  
 ہے کہ اس کے بنیادی معنی مسلسل گزرنے رہنے کے ہیں۔ نیز مشقت، بُعْد  
 اور دوری کو بھی اَلْسَّاعَۃُ کہتے ہیں۔ اَلْسَّاعَۃُ \*۔ ہلاک ہو جانے والوں  
 کو کہتے ہیں \*۔

قرآن کریم میں اَلْسَّاعَۃُ کا لفظ کثرت سے آیا ہے۔ قرآن کریم غلط  
 روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ ہلاکت  
 و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباہی  
 آجائے گی۔ تمہارے سعی و عمل ضائع ہو جائیں گے۔ تم ہلاک اور برباد  
 ہو جاؤ گے (اسی کو اِنْذَارُ کہتے ہیں)۔ وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے  
 اور اپنی روش پر جمے رہتے ہیں۔ ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب  
 کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب یہ اندر ہی اندر مرتب  
 ہونے والے اثرات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ہو جاتے  
 ہیں۔ اسے اَلْسَّاعَۃُ، یہ انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ  
 یہ انقلاب دفعۃً واقع نہیں ہو جاتا بلکہ آہستہ آہستہ ترتیب پا رہا ہوتا  
 ہے۔ البتہ اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جنہیں حقیقت کا عام نہ ہو وہ  
 یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دفعۃً نمودار ہو گیا ہے۔ چونکہ اکثر اوقات یہ انقلاب  
 اُس جماعت کے ہاتھوں نمودار ہوتا ہے جو حق کی حمایت کے لئے اٹھتی ہے،  
 اس لئے اَلْسَّاعَۃُ سے مراد حق اور باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس میں  
 باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ اَلْسَّاعَۃُ \*۔  
 ظہور نتائج کا نام ہے، جسے ہلاکت انگیز انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے۔



یا حق و باطل کا فیصلہ کن تصادم - چنانچہ سورۃ طہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تفصیل سے بتایا کہ فرعون کی سرکشی کس حد تک بڑھ چکی ہے ، اور اس کے بعد ان سے کہا کہ اس کے لئے تمہیں کیا کچھ کرنا ہے - اس کے بعد فرمایا إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ (۲۰) - اس کا یقین رکھو کہ حق و باطل کی آخری کشمکش کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے - یہ آ کر ہی رہے گا - فرعون کو اس طرح کیلہ نہیں چھوڑا جاسکتا - اب یہ انقلاب ضرور آئے گا - اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ سے بھی بار بار کہا گیا کہ تم اپنی جماعت کی پوری پوری تیاری کرو - إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ (۱۸۵) - آخری انقلاب کا وقت آئے والا ہے - وہ ضرور آکر رہے گا - یہ مخالفین ضرور تباہ ہو کر رہیں گے -

حق و باطل کی کشمکش چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی چلی آ رہی ہے - لیکن قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جب زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے ، تو نوعِ انسانی کی ربوبیتِ ہامہ کے تصور اور مفاد پرستیوں میں ایک عالمگیر ٹکراؤ ہوگا جسکے بعد زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی - یہ وہ عظیم السَّاعَةُ ہے جس کا ذکر بڑے ہیبت انگیز انداز سے قرآن کریم میں آتا ہے -

چونکہ نہ تو انسانی زندگی موت سے ختم ہو جاتی ہے اور نہ ہی اعمال کے نتائج کا سلسلہ یہیں منقطع ہو جاتا ہے ، اس لئے اس زندگی کے بعد ظہورِ نتائج کو بھی السَّاعَةُ سے تعبیر کیا گیا ہے - قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہاں کونسا انقلاب مراد ہے - یعنی اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کا وقت (حق و باطل کی کشمکش کا انقلاب) یا آخرت کی زندگی میں ظہورِ نتائج کا وقت -

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قوموں کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن اثرات ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا مجموعی نتیجہ (Accumulative Effect) ایک وقت پر جا کر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے لئے انقلاب کی گھڑی (السَّاعَةُ) ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا کہ یہ گھڑی کب آئے گی - سورۃ اعراف میں ہے يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِلُهَا - قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي - لَا يَجْعَلِهَا لِيَوْثِقَهَا إِلَّا هُوَ (۱۸۴) - ”یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب کی

گھڑی (جس سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے ہو) کب آئے گی۔ کہو کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے۔ اُسے اس کے وقت پر خدا کے سوا کوئی اور ظاہر نہیں کرے گا“ (نیز ۲۴:۴۴)۔ دوسری جگہ ہے یَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ - قُلْ اِنَّهَا عِلْمٌ عِنْدَ اللّٰهِ - وَمَا بِذُرِّيَّتِكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيْبًا (۲۳)۔ ”لوگ تجھ سے الساعۃ کی بابت پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو“۔ (نیز ۲۴:۴۴)۔ دیگر مقامات پر بھی یہی کہا ہے کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ (دیکھئے ۲۳:۴۴ و ۲۳:۸۵ و ۲۴:۴۴)۔

بنی اسرائیل کے گھرانے میں نبوت اور حکومت قریب ڈیڑھ ہزار سال تک رہی۔ شروع شروع میں تو وہ قوانین خداوندی کے پابند رہے لیکن بعد میں انہوں نے ہر قسم کی سرکشی اور فساد انگیزی شروع کر دی۔ انہیں بار بار سمجھایا گیا کہ اس روش زندگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور یہ برکات تمہارے گھرانے سے چھن کر دوسری شاخ کی طرف چلی جائیں گی۔ لیکن انہوں نے کسی کی نہ سانی۔ آخری مرتبہ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں خاص طور پر تنبیہ کی اور ان سے برسلا کہہ دیا کہ یاد رکھو۔

خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائے گی۔ (متی باب ۲۱ - آیات ۳۵ - ۳۳)

لیکن انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ کے اوراق سے ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ آخری انقلاب کی گھڑی آ گئی اور اس قوم کی شوکت و حشمت سب چھن گئی۔ اسی لئے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۲۳)۔ ”اس کی آمد اس انقلاب عظیم کا علم (دینے کے لئے) تھی۔“ (نیز دیکھئے ۲۳:۶۶ و ۲۳:۵۵) اور اگر اِنَّهٗ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ قرآن کریم اس انقلاب کا علم دیتا ہے جو اب آئے والا ہے۔

## س و غ

مَاعَ الشَّرَابِ - يَتَسَوَّغُ - سَوَّغًا - پینے کی چیز کا آسانی سے حلق کے نیچے اتر جانا۔ مَاعَ الطَّعَامِ ”کھانا آسانی سے حلق سے نیچے اتر گیا۔

السَّيِّوَاغُ\* - جس چیز سے گلے میں اٹکی ہوئی چیز کو نیچے اتارا جائے۔  
 شَرَابٌ سَائِغٌ\* - خوشگوار مشروب جو آسانی سے حلق سے نیچے اتر جائے۔  
 طَعَامٌ سَائِغٌ\* - خوشگوار کھانا۔ اسی سے مجازاً سَاغَ النَّهَارُ بولتے ہیں  
 یعنی دن آسانی سے گزر گیا\*۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے يَتَجَرَّرَعُهُ وَلَا يَسْكَدُ\*  
 يَسْكَدُ (۱۲/۱۲)۔ وہ اسے گلے سے اتار تولے گا لیکن بڑی ہی ناخوشگواری سے۔  
 (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج۔ ر۔ ع)۔ سورة نحل میں دودھ کے  
 متعلق ہے سَائِغًا لِلشَّهْرِ بَيْنَ (۱۶/۱۶)۔ وہ پینے والوں کے لئے بڑا خوشگوار ہے۔  
 یا آسانی حلق سے اتر جاتا ہے۔

## سَوْفَ (حرف)

سَوْفَ - یہ بھی اُس کی طرح مضارع پر آتا ہے اور اُس ہی کے معنی  
 پیدا کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک اُس مستقبل قریب کے لئے آتا ہے (یعنی وہ  
 عنقریب یا جلدی ہی ایسا کریگا) اور سَوْفَ مستقبل بعید کے لئے۔ لیکن یہ  
 کوئی کلیہ نہیں۔ سَوْفَ سے پہلے تاکید کے لئے بعض اوقات ل بھی آ جاتا  
 ہے جیسے وَلَسَوْفَ يَعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى (۹۳/۵)۔ اور تیرا رب تجھے  
 (اتنا) دے گا کہ تیرا راضی ہو جائے گا۔ (وہ تیری آرزو کے عین مطابق  
 ہوگا)

## س و ق

السَّاقُ\* - ہنڈلی۔ اسکی جمع سَوَقٌ\* ہے۔ (۳۸/۳۸)۔ السَّاقُ\* کے معنی  
 درخت کا تنا بھی ہیں۔ اسکی جمع بھی سَوَقٌ\* آتی ہے (۲۹/۲۹)۔ لیکن عرب جب  
 کسی معاملہ کی شدت کو بیان کرتے تو اسے سَاقٌ\* سے تشبیہ دیتے\*۔ (اسے  
 ک۔ ش۔ ف کے عنوان میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں دیکھئے)۔  
 قرآن کریم میں يَوْمَ يَكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۱۸/۱۸)۔ اور وَالتَّتَفَتُّ السَّاقُ\*  
 بِالسَّاقِ (۴۹/۴۹)۔ اور كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (۲۴/۲۴) میں شدت ہی کا  
 مفہوم ہے۔

سَاقٌ\* - مویشیوں کو پیچھے سے ہانکنا\*۔ (۵۴/۵۴)۔ (جسطرح قَادَ کے  
 معنی جانوروں کو آگے سے کھینچکر چلانا ہوتا ہے)۔ سَائِقٌ\* ہانکنے والا\*

- (۲۱) - مَسَاقٌ \* - هَانِكُنَا (۳۵) - اَلْسُوقُ \* - (جَمْعُ اَسْوَاقٍ \* - (۲۵) - بازار۔ کیونکہ لوگ اس جگہ اپنے مویشی وغیرہ ہانک کر بیچنے کیلئے لاتے ہیں \* - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س - و - ق شدت اور اجتماع کو ظاہر کرتے ہیں \*\* -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنے کے ہوتے ہیں - پنڈلی کو بھی اَلْسَاقُ اس لئے کہتے ہیں کہ چلنے والا اس پر چلتا ہے -

## س و ل

تَسْوِيلٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو حسین اور خوشنما بنا کر دکھانا تاکہ انسان اس کے کرنے کی طرف راغب ہو جائے - کسی ایسی چیز کو جسے نفس چاہے، یا کسی بری شے کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا \*\*\* - سورۃ یوسف میں ہے بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا (۱۸) -، یہ ایک ایسی بات ہے جسے تمہاری اپنی خواہشات نے تمہارے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا ہے - بعض نے کہا ہے کہ یہ سَوَّلَ سے ہے جس کے معنی تمنا کے ہوتے ہیں جو انسان کو باطل اور ہر قریب چیزیں بھی پسندیدہ بنا کر بتاتی ہے \*\*\* - سورۃ محمد میں ہے اَلشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ (۲۵) -، شیطان نے اسے ان لوگوں کے سامنے مزین کر کے پیش کیا اور اس طرح انہیں گمراہ کر دیا - سورۃ طہ میں سامری کا یہ قول ہے کہ وَكَذَّابِكُمْ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (۹۹) -، اسی طرح میرے دل نے یہ بات مجھے اچھی بنا کر دکھائی -

## س و م

سَوْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کی تلاش و جستجو میں جانا - یعنی یہ معنی مرکب ہیں - جانا اور تلاش و جستجو کرنا - لہذا کہیں صرف پہلے معنی مراد لئے جاتے ہیں - جیسے مَامَ اَلْاِبِلُ کے معنی ہیں اونٹ چرنے کے لئے گئے - یا انہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا - اور کہیں دوسرے معنی جیسے يَسُوْمُوْنَكُمْ سَوْمُ الْعَذَابِ (۲۹) - وہ تمہارے لئے بدترین عذاب کی تلاش میں رہتے تھے - طرح طرح کی مصیبتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا کرتے تھے - کسی کو مشکل اور دوبہر کام کی تکلیف دینا، اس سے ظلم و زیادتی اور برائی کا - لَوَّكُ كَسْرًا - سَامَتِ الطَّيْرُ عَلَي الشَّيْءِ -

\* تاج و محیط - \*\* العلم الخفاق \*\*\* تاج و راغب

پرنڈے اس چیز پر منڈلاتے رہے \*۔ سَامَ فُلَانًا اَلَا مَرَّ : اسے کسی بات کی تکلیف دی ، اور کوئی بات اس پر لازم کی \*۔ اَسَامَ الْاِمْرِیْلَ - اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

تلاش کے اعتبار سے اَلشَّوْمَةُ \*۔ اَلسَّيْمَةُ \*۔ اَلسَّيْمَاءُ \*۔ کے معنی ہیں علامت۔ نشان۔ سَوَّمُ الْفَرَسِ تَسْوِرُ بِنًا - گھوڑے پر نشان لگا دیا۔ لِيَكُنْ سَوَّمٌ فُلَانًا کے معنی ہیں فلاں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس لئے سورۃ الذَّٰرِیَّاتِ میں جہاں ہے لِيُنْزِلَ عَلَیْهِمْ حِجَابًا مِّنْ طَیْنٍ مَّسْوُومَةٍ \*۔ (۱۳۳: ۵۱) - تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ پتھر خدا کے قانون مکافات کی رو سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ (Earmarked) کر دئے گئے تھے۔ یا یہ کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ (انہیں چلایا گیا تھا)۔

سورۃ آل عمران میں عذاب دینے والے ملائکہ کو مَسْوَرٌ مِّنْ (۱۳۳) کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں اَلْغَیْلُ الْمَسْوُومَةُ (۱۳۳) آیا ہے۔ اس کے معنی بھی نشان زدہ گھوڑے یا ایسے گھوڑے ہیں جنہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ سورۃ نحل میں فِیْہِ تَسْمِیْمٌ (۱۶) آیا ہے۔ یعنی جن میں تم اپنے مویشی چراتے ہو۔ سَبِیْمًا (۲۹) کے معنی نشان اور علامت کے ہیں۔

## س و ی

اِسْتَوَّاءٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اعتدال پر ہونا۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس چیز کا اپنی انتہائی نشو و نما تک پہنچے ہوئے ہونا \*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں استقامت اور دو چیزوں کے درمیان اعتدال لکھے ہیں۔ اِسْتَوَّیَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ شخص اپنی پوری طاقت پر پہنچ گیا۔ اس کا شباب انتہا پر پہنچ گیا۔ قرآن کریم نے اِسْتَوَّیَ کی تشریح بَلَّتْغَ اَشْدَدَہُ سے کی ہے (۲۹)۔ اسی طرح اِسْتَوَّیَ عَلٰی سَوْقِیْہِ (۲۹) میں اِسْتَوَّیَ کے معنی واضح ہیں۔ یعنی ہودوں کا مضبوط ہو کر اپنے تنوں پر سیدھا کھڑا ہو جانا۔ اَلسَّوْرٰی \*۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اسی سے اَلصَّیْرَاطُ السَّوْرٰی \* ہے (۲۹)۔ یعنی اعتدال کی راہ۔ رَجُلٌ سَوْرٰی \* اس شخص کو کہتے ہیں جس کی خلقت اور اخلاق و اطوار، افراط و تفریط سے پاک ہوں۔

یعنی وہ متناسب الاعضاء بھی ہو اور سیرت کے اعتبار سے بھی اعتدال پر\*۔  
سورۃ مریم میں فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹) کے یہی معنی ہیں۔ سَوِيًّا  
عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ بمقابلہ مُكَيِّدًا عَلٰی وَجْهِهِ (۶۶) میں آیا ہے۔

سَوَاءٌ تَسْوِيَّتُهُ اور آسَوَاءُ کے معنی ہیں اس کو معتدل کر دیا،  
ہموار برابر اور یکساں کر دیا\*۔ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ (۲۹) کے  
معنی ہیں ان میں ٹھیک ٹھیک اعتدال پیدا کر دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ  
اس کے معنی ”حکمت کے تقاضوں کے مطابق بنانا“ بھی ہیں۔ چنانچہ الَّذِي  
خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ (۸۲) کے معنی ہیں خدا وہ ہے جس نے  
تجھے (مختلف عناصر کی ترکیب نو سے) پیدا کیا اور ایسا بنا دیا جیسا کہ  
تناسب و توازن اور حکمت و اعتدال کا تقاضہ ہے\*۔

اِسْتَوَىٰ اِلٰی الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز تک ذاتی طور پر بنا  
تدبیر کے ذریعہ پہنچ جانا\*۔ یا کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا۔ یا اس کی  
طرف متوجہ ہونا\*\*۔ اور اِسْتَوَىٰ عَلٰی میں غلبہ و تسلط کا مفہوم ہوتا  
ہے\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے لِيَسْتَوِيَ اَعْلٰی ظُهُورِهِمْ (۳۳)۔ نیز اِسْتَوَيْتَ  
... عَلٰی الْفَلَکِ (۲۸)۔ (سواری کے جانور یا کشتی پر جم کر بیٹھ جانا۔  
غالب اور مسلط ہو جانا۔ (خدا کے عرش پر اِسْتَوَىٰ کے لئے ع۔ ر۔ ش کا  
عنوان دیکھئے)۔

سَوَاءٌ کے معنی ہیں دو چیزوں کا باہم دگر برابر ہونا۔ جیسے سَوَاءٌ  
زَيْدٌ وَعُمَرُو۔ زید اور عمرو ہم مرتبہ ہیں۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔  
اِسْتَوٰیَا اور تَسَاوٰیَا۔ دو چیزیں ایک دوسرے کے مانند یا مثل اور نظیر  
ہوئیں۔ سَاوَيْتُ بَيْنَهُمَا مَسَاوَاةً۔ میں نے ایک کو دوسرے کے برابر  
کر دیا۔ اس لئے سَوَاءٌ کے معنی عدل کے آتے ہیں۔ سَوَّيْتُهُ بِہم۔ یا  
سَوَّيْتُ بَيْنَهُمَا کے معنی ہیں میں نے ان دونوں میں عدل کیا۔ فَأَنْبِئْ  
الْيَهُودَ عَلٰی سَوَاءٍ (۵۸) کے معنی ہیں انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے  
(یا برابری کی حالت میں) ان کا معاہدہ ان کی طرف واپس پھینک دو۔ سورۃ  
انبیاء میں ہے فَتَقُلْ اَازْنَتُكُمْ عَلٰی سَوَاءٍ (۲۱)۔ میں نے تم سب کو  
ساری بات یکساں طور پر کہہ دی ہے۔ زمین کے متعلق قرآن کریم میں ہے  
سَوَاءٌ لِّلرَّسَائِلِیْنَ (۱)۔ یعنی زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں  
طور پر کھلی رہنی چاہئے۔ سورۃ طہ میں ہے مَكَانًا سَوًی (۵۸)۔ جس

کے معنی یہ ہیں کہ یہ شرائط ہم پر اور تم پر یکساں طور پر عائد ہوں گی۔ یعنی ہم اور تم یکساں پوزیشن میں ہونگے۔ راغب نے کہا ہے کہ مَکَانٌ "سوی" اس مقام کو کہتے ہیں جس سے دونوں طرف کے فاصلے برابر ہوں۔ لیکن ابن سیدہ نے لکھا ہے کہ سَوَیٌ اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر نشانات لگے ہوں کہ لوگ ان سے اس مقام کا راستہ معلوم کر لیں\*۔ نیز السَّوَاءُ کسی چیز کے وسط اور درمیان کو بھی کہتے ہیں۔ سَوَاءٌ السَّيِّئِ لِلْخَيْرِ کے معنی ہیں راستہ کا درمیانی حصہ۔ اور سَوَاءُ الْجَحِيمِ (۳۴) کے معنی ہیں جہنم کے ہین وسط میں\*۔ فَسَوَّاهَا (۲۱) کے معنی ہیں خدا نے ان کے شہروں کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ یعنی وہ سب بستیاں تباہ ہو گئیں\*۔ سورۃ نساء میں هَلْ لَّوْ تَسَوَّيْ بِهِيْمٌ اِلَّا رُضٌ (۲۴)۔ اے کاش ان پر زمین ہموار کر دی جاتی۔ یعنی وہ اس سے قبل ہی ہلاک و برباد ہو چکے ہوتے۔ سورۃ کہف میں سَوَّوْیَ کے معنی ہموار کر دینے کے ہیں۔ (۱۸)۔

سیوی\* اور السَّوَاءُ کے معنی غیر کے بھی آتے ہیں۔ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ سَوَّاکَتٍ وَ سَوَّاءَ کَت کے معنی ہیں میں تیرے سوا کسی اور آدمی کے ساتھ گزرا۔ یعنی تیرے ساتھ نہیں بلکہ ایک اور شخص کے ساتھ\*۔

سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے فَاسْتَوَى (۵۳)۔ اس ایک لفظ میں شرف انسانیت کا انتہائی کمال، معجزانہ طور پر مدٹ کر آگیا ہے۔ یعنی حضورؐ سیرت و کردار اور علم و بصیرت کے اعتبار سے انتہائی اعتدال لئے ہوئے تھے اور آپکی ذات میں یہ خصوصیتیں کمال تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے بعد آپؐ مقام نبوت پر فائز ہونے کے اہل قرار پائے تھے۔ نبوت ہر کس و ناکس کو نہیں مل جایا کسرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ جسے اس مہبتِ گہری کے لئے منتخب کرتا تھا اس کی تربیت خدا کی نگرانی میں ہوتی تھی اور اس کی ذات معراج انسانیت کی مظہر بن جاتی تھی۔

## س ی ب

سَابَ - يَسِيْبُ - وہ تیز چلا\*۔ سَابَ الْمَاءُ - پانی بہا اور ہر طرف گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوام اور تسلسل کے ساتھ چلتے رہنے کے ہیں۔ جیسے يَسِيْبُ الْمَاءُ - پانی کے جاری ہونے کو کہتے ہیں۔ سَيِّبْتُ - میں نے اس چیز کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہے جائے۔ اسی مادہ سے السَّيَّابَةُ ہے۔ ایام جساہلیت میں عرب بعض جانوروں

کو) مقررہ بجیے دے چکنے کے بعد یا کسی کٹھن مرحلہ سے بغیر  
و خوبی گزار دینے کی وجہ سے یا بطور نذر) دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ  
دیا کرتے تھے اور ان سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہے کھاتے  
پیتے۔ کوئی انہیں روکتا نہیں تھا۔ (جیسے ہندوستان میں سانڈ چھوڑ  
دیتے ہیں) \*۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی توہم پرستیوں اور  
مشرکانہ رسوم کی سند خدا نے کہیں نازل نہیں کی۔ یہ سب تمہارے اسلاف  
کی خود ساختہ رسوم ہیں۔ اسلئے انہیں چھوڑ دو۔ (۱۰۳)۔

## س ی ح

سَاحَ الْمَاءِ - زمین کے اوپر پانی کا بہنا۔ السَّيْحُ - سطح زمین پر  
بہتا پانی \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بھی مسلسل چلتے  
رہنے کے ہیں۔ السَّيْحَةُ - زمین میں چلنا پھرنا۔ سیاحت کرنا (۲)۔ بعض  
کا خیال ہے کہ السَّيْحُ اسی سے ہے۔ لیکن دوسروں نے اسکی تصریح کی  
ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان م۔ س۔ ح) السَّائِحُ - سیر  
و سیاحت کرنے والا \*۔ قرآن کریم میں مومنین کی صفات میں السَّائِحُونَ  
(۹/۱۱۲) اور مومن عورتوں کے لئے سَائِحَاتُ (۲۵/۱۱) آیا ہے۔ (اگرچہ بعض کے  
نزدیک اس سے مراد ”روزہ رکھنے والے“ ہیں لیکن) راغب نے لکھا ہے کہ  
بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو باقتضائے فرمان خداوندی  
أَفَلَمْ يَتَّبِعُوا أَمْرِي أَلَا رَضُوا بِمَا أَمَرْتُهُمْ فَلْيُؤْمَرُوا بِتَقْوَىٰ يَوْمَئِذٍ  
بِهَا أَوْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا (۲۱/۱۱) عقل و فہم اور عبرت حاصل کرنے  
کے لئے سفر کرتے ہیں \*\*۔ یہی مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔ السَّاحَةُ -  
کھلی جگہ۔ میدان۔ گھروں کے درمیان کی کھلی اور خالی جگہ۔ نیز گھر کے  
معن کو سَاحَةُ الثَّدَارِ کہتے ہیں \*۔ (۳۴/۱۱)۔

مومن عورتوں کی صفت سَائِحَاتُ (سیاحت کرنے والیاں) کو سامنے  
رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ نظریہ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری  
میں محبوس رکھنا چاہئے کسقدر غیر قرآنی ہے۔

## س ی ر

السَّيْرُ - چلنا۔ جانا۔ دن کو ہو یا رات کو۔ [لیکن سَرَى رات کے  
چلنے کو کہتے ہیں (۱۵/۱۱) (۱۶/۱۱) - اس کے لئے عنوان س۔ ر۔ ی دیکھئے]۔



سَارَ الْقَرْجُلُ\*۔ آدمی چلا۔ سَيَّرَهُ\*۔ اس نے اسے چلا یا، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا۔ سَيَّرَهُ\*۔ روش۔ رفتار۔ چال۔ طور طریق۔ ہیئت۔ حالت\*۔ سَتَعْمِدُ\* هَا سَيَّرَتْهَا الْاُولَىٰ (۲۱) ”ہم اسے اپنی پہلی حالت پر لوٹا دینگے“۔ راغب نے کہا ہے کہ سَيَّرَهُ\* ایسی حالت کو کہتے ہیں جو کسی میں طبعی یا اکتسابی طور پر ہو۔ اَلْسَيَّارَةُ\*۔ ساتھ چلنے والوں کی جماعت۔ قافلہ (۱۲)۔

قرآن کریم اپنے قوانین کی صداقت کی دلیل میں تاریخی شواہد کو بار بار پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ سَيَّرُوا رِیْضَ الْاَرْضِ ثُمَّ اَنْظُرُوا اَكْتَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُتَكِبِّذِ بَيْنَ (۲۱)۔ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے ہمارے قوانین کو سچا نہیں سمجھا تھا۔ اس میں تاریخی استقراء اور حفارت (Archaeology) دونوں آجائے ہیں۔ یعنی اگر وہ قومیں (طبعی طور پر) زندہ ہیں تو ان کے احوال و کوائف کے مطالعہ سے، اور اگر وہ باقی نہیں رہیں تو ان کے آثار قدیمہ پر غور و فکر سے۔

## س ی ل

سَالِ الْمَاءُ\*۔ پانی بہہ گیا۔ اَسَالَهُ\* کسی نے اسے بہا دیا۔ مَاءٌ سَيَّلٌ\*۔ بہنے والا پانی۔ اَلْسَيَّلُ\*۔ بہت زیادہ بہتا ہوا پانی۔ سیلاب۔ اَلِیْسَيَّلَةُ\*۔ پانی کے بہنے کا انداز۔

سورة رعد میں ہے فَسَالَتْ اَوْدَیَّتُهُ (۱۳)۔ وادیاں بہ نکلتی ہیں۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا (۱۳)۔ پس سیلاب جھاگ کو بہا لے جاتا ہے۔

سورة سبا میں سَيَّلَ الْعَرَمَ (۳۴) آیا ہے۔ زور کا سیلاب۔ اسی سورة میں ہے وَاسْتَنْتَاهُ عَيْنَ الْقَيْطَرِ (۳۴)۔ ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔

## سمین

اَلِیْسَیْنُ\*۔ ویسے تو ایک حرف (س) ہے جس کے لئے (س) دیکھئے۔ لیکن ”یس“ (۳۱) کے معنی ”اے انسان“۔ یا ”اے سردار“ کے ہوتے ہیں۔ لغت طے میں ”یس“۔ یا اِنْسَانُ! کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل انسان ہی کی مخفف شکل ہے اور عربی زبان میں الفاظ کو اس طرح مخفف کر لینے کا عام

رواج تھا۔ مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کَتَفَى بِالسَّيْفِ شَا۔ یعنی کَتَا بِالسَّيْفِ شَاهِدًا۔ یا کسی شاعر کا ایک مصرعہ ہے۔ قَتَلْنَا لَهَا قَيْفِي لَتَا قَالَتْ قَافٍ۔ یہاں وَقَفْتُ کی جگہ اس نے صرف ”قَاف“ کہا ہے\*۔

آلِ سَيْنٍ۔ ستون اور سہارے کو کہتے ہیں۔ (مثلاً چھت کی کوئی کڑی کمزور ہو گئی ہے تو جو دوسری لکڑی اسے سہارا دینے کے لئے لگادی جائے اُسے سَيْنٌ کہا جاتا ہے) کیونکہ فینقی زبان میں اسکی شکل سی ستون کے مشابہ ہوتی تھی\*\*۔

سَيْنَاءُ۔ ایک قسم کے پتھر کو کہتے ہیں۔ وَطُورٍ سَيْنِيْنٍ (۲۵)۔ وَمِنْ طُورٍ سَيْنَاءَ۔ (۲۳) سِنَا (پتھروں کا) پہاڑ۔ شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ آلِ سَيْنِيْنَةِ۔ ایک قسم کے درخت کو کہتے ہیں۔

## سَيْنَاءُ

طُورٍ سَيْنَاءَ (۲۳) یا طُورٍ سَيْنِيْنٍ (۲۵) شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین)۔

## سَيْنِيْنٍ

طُورٍ سَيْنِيْنٍ (۲۵)۔ یا طُورٍ سَيْنَاءَ (۲۳)۔ شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین)۔

## ش

## ش ا م

اَلْيَدُ الشُّؤْمَى - بایاں ہاتھ - یہ اَلْيَمْنَى (دایاں ہاتھ) کی ضد ہے - اسی اعتبار سے اَلشُّؤْمُ (يَمْنٌ کی ضد ہے) - یعنی نحوست - صاحب تاج العروس نے شُؤْمُ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کے انجام کو نا پسند کیا جائے اور اس سے ڈرا جائے - قَدْ شَأْمَهُمْ - اس نے ان پر نحوست مسلط کر دی - رَجُلٌ مَشْشُومٌ - منحوس آدمی \* - (نحوست کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان ن - ح - س دیکھئے)۔

قرآن کریم میں اصْحَبُ الْمَيْمَنَةِ کے مقابلہ میں اصْحَبُ الْمَشْئِمَةِ (۵۶) آیا ہے - بائیں ہاتھ والے - یعنی بدبختی والے - جن کی شَأْمَتِ اعمال ان کے لئے عذاب بن کر آجائے -

ملک شام کو شَأْمُ \*\*\* اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قبلہ سے بائیں جانب واقع ہے \*\*\* -

## ش ا ن

اَلشَّانُ - (جمع اَلشُّوْنُ) - امر - معاملہ (بالخصوص اہم اور قابل لحاظ) حالت \*\*\* - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسے معاملہ اور حالت کے لئے بولا جاتا ہے جو گرانقدر عظمت کا حامل ہو \*\*\* - شَأْنٌ شَأْنٌ - اس نے اس کا قصد کیا ، (اسی سے اہم معاملہ کو شَأْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا قصد کیا جاتا ہے) نیز اس نے وہ کام کیا جسے وہ اچھی طرح انجام دے سکتا تھا - شَأْنُ الرَّأْسِ - کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ - تاج نیز ابن فارس - \*\* بعض اے غیر مہموز بھی بتاتے ہیں - \*\*\* تاج - \*\*\* راغب -

الشَّانِ - ایک رگ کا نام ہے جس سے آنکھ تک خون پہنچتا ہے - نیز وہ راستہ جس کے ذریعہ آنکھوں سے آنسو آتا ہے - شَثْوُنُ الخَمْرِ - شراب کا وہ حصہ جو جسم کے رگ و پے میں سرایت کر جائے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تلاش، طلب اور ارادہ کے ہیں -

سورة رحمن میں ہے بِسْمَلِهِ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - "کلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" (۵۹) - کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (انسانوں سمیت) وہ سب اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کے محتاج ہیں - یہ اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے - دوسرے حصے میں هُوَ سے مراد آقہؐ لیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں کہ وہ ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے - اس لئے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں هُوَ سے مراد مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لیا جائے تو بہتر ہے - اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے، اور ان اشیاء کی نشو و نما کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں - ان کی مختلف حالتوں میں نشو و نما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشو و نما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے - (۱۲۴) - اور اس طرح اشیائے کائنات کی (Development) کا سلسلہ، قانون ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے -

سورة يونس میں ہے وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ (۱۱) - تو جس حال

میں بھی ہو -

## ش ب لا

تَشَابَهَ کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے اس طرح ساٹا جلتا اور مانند اور مشابہ ہونا کہ ان میں التباس ہونے لگے اور امتیاز مشکل ہو جائے - شَبَّهَهُ اِثْقَاهُ کے معنی ہیں اسنے فلاں چیز کو فلاں چیز کی مثل بنا دیا - دونوں کو ایک دوسری سے ملتا جلتا ہوا بنا دیا - اِلشَبَّهَ وَالشَّبَّهَ کے معنی ہیں مثل اور مانند - اور شَبَّهَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ کے معنی ہیں بات اس پر مشتبہ، گھبر واضح (ملتبس) ہو

گئی \*۔ تَشْبِيْهٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی ہوتی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا۔ مُشَابَهَةٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا \*۔

قرآن کریم میں مُتَشَابِهًا (۲/۲۵) کے معنی ہیں باہم ملتا جلتا۔ اور اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا (۲/۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ وہ گائے کس قسم کی ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے لئے سب گائیں ملتی جلتی ہیں اسلئے التباس (شبہ) واقع ہو رہا ہے۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (۲/۱۶۹) کے معنی ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ باہمی مشابہت اور موافقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مُشْتَبِهًا وَغَيْرُ مُتَشَابِهٍ (۱۶۰) کے معنی ہیں آپس میں ملتے جلتے، اور ایسے جو ملتے جلتے نہیں۔ انہی کو دوسری جگہ مُتَشَابِهًا وَغَيْرُ مُتَشَابِهٍ (۱۶۴) کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کو مُحْكَمَات اور مُتَشَابِهَات کہا گیا ہے (۳)۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مُحْكَمَات کے ضمن میں (ح۔ ک۔ م) کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ [نیز ث۔ ن۔ ی کے عنوان میں مُتَشَابِهَات مَثَانِي بھی دیکھئے ۳۶/۲۳]

سورة النساء میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں ہے کہ یہودیوں نے نہ تو مسیحؑ کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب دیا وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷) ان پر حقیقت مشتبہ ہو گئی۔ (بات کیا ہوئی تھی؟ اس کی تفصیل میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق حصہ میں دیکھئے)۔

## ش ت ت

شَتَّه - يَشْتَتُهُ - شَتَاتًا - شَتَاتًا - اس نے ایسے الگ الگ اور متفرق کر دیا۔ دور کر دیا۔ شَتَّ - وہ متفرق اور جدا جدا ہو گیا (لازم و متعدی)۔ اَمْرٌ شَتٌّ - متفرق معاملہ \*۔ (اسکی جمع اَشْتَاتٌ ہے)۔ کہتے ہیں جَاءُوا اَشْتَاتًا - وہ الگ الگ متفرق طور پر آئے۔ سورة النور میں ہے جَمِيعًا اَوْ اَشْتَاتًا (۲۴/۲۱)۔ اکھٹے یا الگ الگ۔ سورة الليل میں ہے اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى (۹۴/۲)۔ تمہاری جدوجہد مختلف اور ایک دوسرے سے جداگانہ (سمتوں میں ہوتی) ہے۔ یعنی ہر فرد کے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ نیز، ایک فرد کی

زندگی میں بھی مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر چند یہ مقاصد مختلف اور متنوع ہوتے ہیں لیکن اگر بہ ہیئت مجموعی ان کی تقسیم کی جائے تو یہ دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک اعطیٰ کی شق (۹۲) اور دوسری بخیل کی شق (۸۲)۔ اعطیٰ سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لئے بھی دے۔ اور بخیل سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنے مفاد تک محدود رکھے۔ پہلی شق وجہ بالیدگی شرف انسانیت ہے اور دوسری شق، باعث تذلیل انسانیت۔

سورة طہ میں ہے نَبَاتٍ شَتَّى (۲۵)۔ انواع و اقسام کی بوٹیاں اور پودے۔ (شَتَّى جمع ہے شَتِیَّتٌ کی جس کے معنی ہیں جدا کیا ہوا، جداگانہ، الگ۔)

## ش ت و

الشَّیْثَاءُ۔ سردی کا موسم۔ عرب والے سال کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک شتاء، دوسرا صیف۔ پھر شتاء کے دو حصے، جن میں سے آخری تین مہینے رَبِیْعٌ کے ہوتے۔ اسی طرح صَیْفٌ میں قَیْظٌ کے تین مہینے ہوتے۔ ہوں سال چار موسموں میں بٹ جاتا تھا۔ چونکہ بالعموم سردی کے موسم میں عرب سفر کے لئے کم نکلتے تھے اور روزی تلاش کرنے کے بجائے گھروں ہی میں رہتے تھے لہذا اس زمانہ میں غلہ اور چارہ کی دقت ہوتی تھی۔ اس لئے الشَّیْثَاءُ قحط کہو بھی کہتے تھے۔ اور صَاحِبُ الشَّیْثَوَةِ وہ شخص جس کی طرف لوگ سردی اور خشک سالی کے مصائب سے گھبرا کر رجوع کریں۔\*\*

قرآن کریم میں قریش کے قافلوں کے لئے رَحْلَةُ الشَّیْثَاءِ وَالصَّیْفِ (۱۴۱) آیا ہے۔ یعنی ان کے سردی اور گرمی کے موسم کے سفر۔ اس سے درحقیقت مراد سارا سال ہے۔

## ش ج ر

شَجَرٌ۔ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہو جائے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں\*۔ اسی سے شَجَرٌ بَیْنَتَهُمْ کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔ (قرآن کریم میں فِیْمَا شَجَرٌ بَیْنَتَهُمْ (۶۵) باہمی اختلافات کے معنوں میں آیا ہے)۔

شَجَرٌ قُلَانٌ\* قُلَانًا۔ فلاں نے فلاں سے منازعت و مخاصمت کی۔  
 الشَّجَرَةُ\*۔ کے معنی درخت ہیں\*۔ (یہ جمع ہے۔ ایک درخت کوشَجَرَةٌ\* کہیں گے)۔ غالباً اس لئے کہ اس کے تنہ کے ایک ہونے کے باوجود اس کی شاخیں  
 منتشر اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی شَجَرٌ کے بنیادی معنی ہیں۔ اگرچہ  
 تاج العروس میں ہے کہ تَشَجَّرٌ کے معنی میدان جنگ میں فوجوں کا باہمی  
 گتھم گتھا ہونا ہے اور چونکہ درخت کی شاخیں بھی ایک دوسرے میں  
 گتھم گتھا ہوتی ہیں اس لئے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی مفہوم  
 کے اعتبار سے پہلی توجہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ یعنی ایک تنے کے بعد  
 شاخوں کا منتشر ہونا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا  
 بلند ہونا اور اس کے اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسے رہنا بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ قُلَانٌ  
 تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵)۔ اس شجر کے قریب نہ جانا۔ جیسا کہ آدم\*  
 کے عنوان (دیکھئے ا۔ د۔ م) میں لکھا جا چکا ہے، قصہ آدم در حقیقت نوع انسانی  
 کی تمثیلی سرگزشت ہے۔ انسان اپنی تمدنی زندگی سے پہلے ایسی حالت میں رہتا  
 تھا کہ اس کی ضروریات بہت قلیل تھیں اور سامانِ خور و نوش باقراط تھا۔  
 اس لئے ان میں باہمی افتراق و اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد جب الساقی شعور  
 نے ذرا ترقی کی تو اس نے تمدنی اور معاشرتی زندگی شروع کی۔ اس سے مختلف  
 افراد (اور اس کے بعد مختلف قبائل) کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests)  
 شروع ہوا اور اس تصادم سے باہمی اختلاف و افتراق پیدا ہوا۔ وَتَسَاكَانَ  
 النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۱۹)۔ ”نوع انسانی پہلے ایک  
 ہی جماعت تھی لیکن بعد میں انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کر  
 دیے“۔\*\* یہ مطلب ہے قُلَانٌ تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) سے۔ یعنی  
 ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ دیکھنا! تم سب کی اصل ایک ہی ہے۔ اس لئے  
 تم نے باہمی اختلاف و افتراق پیدا نہ کر لینا۔ لیکن عقلِ خود پس (ابلیس) نے،  
 جو ہر فرد کو اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے (برعکس عقلِ جہاں پس  
 کے جو پوری نوع انسانی کے تحفظ کی فکر کرتی ہے) انہیں انفرادی مفاد  
 پرستیوں کی طرف مائل کر دیا، اور اس طرح یہ آپس میں ایک دوسرے کے  
 دشمن ہو گئے (۲/۱۶)۔ لہذا اس مقام پر شَجَرٌ سے مفہوم انسانوں کے وہ  
 باہمی اختلافات ہیں جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں

\* تاج۔ \*\* (نوع انسانی کو پھر سے ایک ہی جماعت بنکر رہنا ہے لیکن یہ وحدت  
 انسانیہ وحی کے ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں)۔ (۲/۱۳)۔

اور جن کا حل صرف یہ ہے کہ انسان وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرے (۲/۳۸)۔ اسی کو ربوبیت عالمینی کہتے ہیں۔

## ش ح ح

الشَّحُّ ۱۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس نقشے کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہو، کسی جگہ تھوڑا سا پانی ہو اور بہت سے پیاسے۔ ایسی حالت میں دو آدمی جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل کر پیچھے ہٹانے اور آگے بڑھ کر اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اسے تَشَاَحُّاَ الْمَاءِ یا تَشَاَحُّاَہُ کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی نشو و نما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے۔ لہذا شَحُّ ۲۔ نفْس اس خصوصیت کی ضد ہوا۔ یہ مفہوم سورۃ حشر کی اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ یُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹)۔ وہ خود تنگی میں کیوں نہ ہوں دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيُخْرِجْهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَيُؤْتِ مِنْهُ مِمَّا يَشَاءُ (۵۹)۔ یاد رکھو! جو شخص (یا قوم) شَحُّ ۳۔ نفْس سے اپنے آپ کو بچائے انہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یعنی دنیا کے عام قاعدے کی رو سے، اُسی کسان کی کھیتی میں فصل اگتی ہے جو اسے سیراب کر لے۔ لیکن نظام ربوبیت میں اسکی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو دوسرے کے کھیت کی سیرابی کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ تَشَاَحُّاَ الْقَوْمِ کے معنی ہیں، لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے ہاتھ سے چیز نہ جاتی رہے۔ تَشَاَحُّاَ عَلَى الْأَمْرِ۔ وہ دونوں اس معاملہ میں جھگڑے اور ان میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ تھا کہ وہ چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روکنے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تَشَاَحُّاَ الْقَوْمِ وغیرہ کے یہی معنی نہیں ہونگے کہ اس قوم نے ایک دوسرے سے بڑھنے میں کوشش کی بلکہ یہ بھی کہ خود آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی۔ اس سے شَحُّ ۴ کے معنی بھی واضح ہو جائے ہیں۔ یعنی یہ نفسیاتی کیفیت کہ آگے بڑھ کر ہر چیز کو اپنے لئے مختص کر لینا اور دوسروں کو روکنا کہ اس چیز تک پہنچ نہ جائیں۔



اس بنیادی معنی کے اعتبار سے الشَّحُّ - بدترین قسم کی خود غرضی کو کہتے ہیں جس میں بخل اور حرص دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بخل صرف سال میں ہوتا ہے لیکن شَحُّ سال اور دیگر ہر قسم کی بھلائیوں کو اپنے لئے مخصوص کرنے کے لئے آتا ہے\*۔ اپنے لئے مخصوص کرنے اور دوسروں کو ان تک پہنچنے سے روکنے کے لئے۔ راغب نے کہا ہے کہ شَحُّ اس وقت کہتے ہیں جب انسان میں یہ کیفیت عادت ہائی جائے۔

اہل شَحَائِح بہت کم دودھ دینے والی اونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ اور زَنْد شَحَّاح اس چقماق کو جس سے آگ نہ نکلے۔ مَاء شَحَّاح۔ بہت تھوڑا سا پانی\*\*۔ سورۃ احزاب میں اَشِیْحَة کا لفظ آیا ہے (۱۹)۔ (اس کا واحد شَحِیْح ہے)۔ یعنی سخت بخیل و حرص۔

## ش ح م

الشَّحْمُ - چربی (جمع شَحُوم) - الشَّحْمَة - چربی کا ٹکڑا۔ عرب اونٹ کے کوهان کو بھی الشَّحْمُ کہہ دیتے ہیں\*\*\*۔

قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شَحُومَهُمْ (۱۶)۔ ان پر (گلے اور بکری کی) چربی حرام کر دی گئی تھی۔

## ش خ ص

شَخْصٌ - ہر دور سے نظر آنے والے جسم کو کہتے ہیں جو بلند ہو۔ بلندی کے اعتبار سے کہتے ہیں شَخْصٌ الْجُرْحُ - زخم اونچا یعنی ستورم ہو گیا۔ شَخْصٌ شَخُومًا وہ بلند ہو گیا۔ شَخْصٌ السَّهْمُ - تیر نشانے سے اونچا ہو گیا\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلندی ہائی جاتی ہے۔

شَخْصٌ بَصَرَةً کے معنی ہیں اس نے بغیر جوپکائے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا۔ دھشت کے مارے جب کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں تو اس وقت بولتے ہیں\*\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے تَشْخِصُ فِيمَا لَا أَبْصَارُ (۱۴)۔ اس انقلاب عظیم کے وقت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ سورۃ انبیاء میں ہے فَادِّهَا سَاخِصَةً أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا (۲۱)۔ اس نظام سے انکار کرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

## ش ح ن

شَحَنَ السَّقِيْنَةَ يَشْحِنُهَا - کشتی کو بھر دیا اور جو سامان اس میں لادنا تھا لاد دیا \*۔ قرآن کریم میں الْفُلُکِ الْمَشْحُوْنِ (۲۶/۱۱۹) آیا ہے۔ یعنی بھری اور لدی ہوئی کشتی۔ اِشْحِنْتَ - وہ مال و اسباب وغیرہ جس سے کشتی کو بھرا جائے۔ اَلْشَّحْنَةُ - وہ چارہ جو جانوروں کے لئے اکٹھا کر کے رکھ لیا جائے اور ایک رات دن کے لئے کافی ہو۔ شَحْنٌ - شَحْنًا کے معنی جھڑک دینے، دور کر دینے کے بھی آتے ہیں۔ (غالباً) اسی سے اِشْحِنْتَ - بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ کے ناظم کو کہتے ہیں۔ اَلْمُشْحِنُ - بغض و کینہ دل میں بھرا رکھنے والا \*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بھر دینا اور دور کر دینا دونوں آتے ہیں، لیکن یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ یعنی ان میں وجہ جامعیت کوئی نظر نہیں آتی۔

## ش د د

اَلِشْدَّةُ \* - سختی اور صلابت کو کہتے ہیں۔ شَدَّةٌ - اس نے مضبوط اور محکم کیا۔ شَتَّى شَدِيدٌ مُشْتَدٌّ - بہت مضبوط چیز۔ اَلشَّدُّ - کسی کو مضبوطی سے باندھ دینا۔ اَلِشْدَّةُ \* - بہادری اور ثبات قلب۔ اَلشَّدِيدُ شجاع - بہادر۔ قوی - نیز بغیل کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اِنْفَهَ لِحَبِّ الْخَمْرِ لِشَدِيدٍ (۱۰۱/۱) میں شَدِيدٌ کے معنی بغیل ہیں۔ اَلْاَشْدُّ - سن بلوغ - سن رشد۔ وَاَشْدُّ دُعَاۤیِ قُلُوْبِیْہِیْمَ (۱۸۸/۱) کے معنی ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دے \*\*\*۔

قرآن کریم میں سن بلوغ و سن رشد کے لئے لفظ اَشْدُّ اکثر مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۱۳۰/۱، ۱۵۳/۱، ۲۴/۱)۔ سورۃ نساء میں (۴/۲) میں یتیموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب تک وہ ”نکاح کی عمر“ کو نہ پہنچیں ان کے مال کی نگرانی کرو۔ اور دوسرے مقامات (۱۵۳/۱، ۱۳۰/۱) میں کہا گیا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ جوانی کو نہ پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر، جوانی ہے، صغیر منی نہیں۔

(۱۸۸/۱) میں ان یتیموں کے متعلق جن کی دیوار گری رہی تھی اور جسے حضرت موسیٰؑ اور انکے رفیق سفر نے کھڑا کر دیا تھا یہی کہا گیا ہے۔

(۲۸) میں عام انسانوں کی جوانی کی حالت کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ (۲۸) میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔

سورۃ یوسف میں شیداد کا لفظ کٹھن سالوں کے لئے آیا ہے (۱۲/۱۸)۔ یہ شدید کی جمع ہے۔ نیز اسکی جمع أشیداء بھی آتی ہے۔ سورۃ الفتح میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے أشیداء علی الکفوفار (۲۹)۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں بہت قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ أشدؑ۔ زیادہ سخت اور مضبوط (۳۳)۔ اشتدہ۔ سختی سے حملہ کرنا، یا تیزی سے چلنا۔ (۱۲/۱۸)۔

## ش ر ب

شرب۔ پشرب۔ پینا۔ سیراب ہونا۔ الشرباب۔ ہر وہ پینے کی چیز جسے چبانا نہ پڑے (۲۵۹)۔ المشرب۔ ہانی۔ ہانی پینا۔ ہانی پینے کا گھاٹ۔ پینے کا وقت یا پینے کی جگہ۔ وہ طریقہ جس سے ہانی پیا جائے۔ طعام ذومشربتہ وہ کھانا جسکے بعد بہت پیاس لگے۔

قرآن حکیم میں مشرب بہم (۲) میں آیا ہے، جسکے معنی ہانی پینے کی جگہ، یا خود ہانی کے ہیں۔ شرب (۲۵۵)۔ ہانی پینے کا حصہ یا باری۔ ہانی پینے کا وقت۔ پینا۔ شرب (۵۵)۔ پینا۔ شارب (۲۵)۔ پینے والا۔ (اسکی جمع شاربون اور شاررین ہے)

سورۃ بقرہ میں شرب کے بعد یطعمہ آیا ہے (۲۲۹)۔ یہاں شرب کے معنی ہیں سیر ہو کر پینا اور طعم کے معنی ہانی کا چکھنا۔

قصہ بنی اسرائیل میں آیا ہے وَأَشْرَبُوا رَفِ قُلُوبِهِمُ الْعِجْلُ (۲۳)۔ اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ بچھڑا ان کے دلوں میں پلا دیا گیا۔ لیکن استعارۃً مفہوم یہ ہے کہ بچھڑے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس کی محبت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

## ش ر ح

شرح۔ کھولنا۔ واضح کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی گوشت کو پھیلا دینے کے ہیں۔ کشادہ اور وسیع کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نیز اسکے معنی ہیں سمجھ میں آجانا۔ شرح الباب۔ دروازہ کھول دیا۔ شرح الکلام۔ بات کو سمجھ لیا۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، بَشِّرَہٗ صَدْرَہٗ لَیْسَ لَاسْلَامٍ (۱۲۶)۔ اسلام کیلئے اسکے سینے میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لفظ میں بات کے سمجھنے کی صلاحیت، صحیح بات کو قبول کرنے کی استعداد، اور حق کو اختیار کر لینے کی جرات، سب خصوصیات آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غلط راستے پر چلنے والوں کے متعلق فرمایا کہ یَتَجَعَّلُ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (۱۲۶)۔ وہ اس کا سینہ تنگ، پہنچا ہوا کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرح صدر بہت بڑی خصوصیت ہے جسے حاصل ہو جائے۔ تعصب سے ہٹ کر، بات کو دلائل و بصیرت کی بناء پر (On Merits) سمجھنا۔ حق و صداقت اور حسن و خوبی جہاں بھی ہو، اُسے (Appreciate) کرنا، اور پھر تمام مخالفتوں کے علی الرغم اسے اختیار کر لینا۔ نیز اُسے اسی طرح تفصیل و تبیین سے آگے پہنچانا۔ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ دشمن تک سے فراخ دلی برتنا۔ کہیں تنگ نظری کا ثبوت نہ دیتا۔ یہ سب باتیں شرح صدر میں آجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولو العزم انبیائے کرام نے ہمیشہ خدا سے شرح صدر (وسعت قلب و نگاہ اور رفعت عزم و ہمت) کی دعائیں مانگی ہیں (۲۵)۔ اور خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یہ شرح صدر کی بدولت ہے کہ ان کی اس قدر سخت سہم ہوں آسان ہو گئی اور اس طرح ان سے ذمہ داریوں کا وہ بوجھ ہلکا ہو گیا جس سے ان کی کمزوری تھی (۱۲۶)۔ ورنہ مخالفین کی کمینہ حرکات اہی تھیں جن سے انسان کا دم گھٹنے لگ جائے (۱۵)۔

لہذا قرآن کریم کی رو سے معاملات کے آسان ہونے کیلئے شرح صدر نہایت ضروری ہے (۲۵: ۱۲۶) اور ہر مسلم کا یہی شعار ہونا چاہئے (۱۲۶)۔ جس شخص میں تنگ نظری اور دوں ہمتی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کا سینہ اسلام کی روشنی کے لئے کشادہ نہیں ہوا۔ (۳۹) میں اسے قسوتِ قلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز بَشِّرَہٗ صَدْرَہٗ رَآءُکَ معنی ہیں کسی چیز کو بطیب خاطر قبول کرنا۔ اس کے لئے اپنا دل کھول دینا۔ (۱۶)۔

## ش ر د

شَرَّ دَ الْبَعِیْرُ۔ اونٹ بدک کر بھاگ نکلا۔ التَّشْرِیْدُ۔ جھڑک دینا۔ نکال دینا۔ منتشر کر دینا۔ کسی کو بدک کر بھاگ دینا۔ راعب نے کہا ہے کہ شَرَّ دَتْ بِہِ کے معنی ہیں، میں نے اس سے ایسا ہرقاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام کبھی نہ کریں۔ ویسا کام کرنے سے بدکیس اور

باز رہیں \*\*۔ قرآن کریم میں ہے فَشَرُّ دُ بَہِیمٍ مِّنْ خَلْقَتِهِمْ (۱۵۷)۔ یعنی انہیں ایسا مزہ چکھاؤ کہ جو لوگ ایسے ہی مقصد کیلئے ان کے پیچھے آ رہے ہیں وہ ان کی اس حالت کو دیکھ کر خود بخود بھاگ جائیں۔ متوحش ہو جائیں (اس لئے کہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بد کننا اور دور ہو جانا ہیں)۔

## ش ر ذ م

شِرْ ذِمَّةٌ - تھوڑی سی جماعت۔ بڑی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانے والی پارٹی۔ ثِيَابٌ شَرَّ اَذْمٌ - پرانے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ چیتھڑوں کو کہتے ہیں \*\*\*۔ قرآن کریم میں شِرْ ذِمَّةٌ قَلْبُ لُؤْلُؤٍ (۲۱) آیا ہے۔ یعنی حقیر اور قلیل سی جماعت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں ذال زائد ہے۔ یہ دراصل شَرَمَتْ التَّشْيُّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کمی چیز کو ہارہ ہارہ کر دینا ہیں۔ چھوٹی سی جماعت کو اس لئے شِرْ ذِمَّةٌ کہتے ہیں کہ وہ بڑی جماعت سے پھٹ کر الگ ہوتی ہے۔

## ش ر ر

شَرٌّ - خَبِيرٌ کی ضد ہے (۱۸)۔ لسان العرب میں ہے کہ شَرٌّ - برائی (سُوْءٌ) کو کہتے ہیں۔ اور مصباح میں ہے کہ اس کے معنی فساد اور ظلم کے ہیں۔ الشَّرَارُ - وَالشَّرَرُ - آگ کی چنگاریاں (جو آگ میں سے نکل کر اڑتی ہیں)۔ اس کا واحد شَرَّارَةٌ اور شَرَرَةٌ ہے \*۔ (۲۴) - شَرَّ الْمَاءِ مِینَ الْقِرْبَةِ - مشکیزہ سے پانی لگا تار ٹپکتا رہا۔ نیز الشَّرُّ کے معنی تیزی۔ نشاط۔ غصہ۔ طیش۔ حرص۔ فحش اور سفاقت ہوتے ہیں۔ نیز اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کی طبیعت کے مطابق نہ ہو۔ یا وہ اس کی ضروریات کے راستے میں روک بن جائے \*\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ہو جانے، ادھر ادھر اڑ جانے اور بکھر جانے کے ہیں۔

راغب کے نزدیک خَبِيرٌ اور شَرٌّ دونوں اضافی الفاظ ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کیلئے خیر ہو اور دوسرے کے لئے شر \*\*\*\*\*۔

چونکہ یہ لفظ خَبِيرٌ کی ضد ہے اسلئے اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان خ - ی - ر بھی دیکھنا چاہئے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے جو بنیادی معنی

\* تاج \*\* راغب۔ \*\*\* تاج و راغب۔ \*\*\*\* محیط۔ \*\*\*\*\* راغب۔ عنوان "خبر" میں

بتائے ہیں اس اعتبار سے شرّ کے معنے ہوں گے انسان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اس طرح صرف (یا ضائع) ہونا، بکھر جانا اور منتشر ہو جانا کہ ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس کے برعکس خیر کے معنے ہوں گے انسانی توانائیوں کا تعمیری نتائج پیدا کرنا۔ پانی دریا کے ساحلوں کے اندر مقید ہو کر بہے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے لیکن جب وہ سیلاب کی شکل میں ادھر ادھر بکھر جائے تو شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ہوا نرم روی کے ساتھ ایک سمت میں چلے تو موجب خیر ہے لیکن جب جھکڑ اور آندھی بن جائے تو تباہی کا موجب۔ توانائیوں کا بکھر جانا، قوتوں کا بد لگام ہو کر منتشر ہو جانا شر ہے۔ یہی چیز خود انسانی ذات کے متعلق بھی ہے۔ اگر اس کی قوتیں منتشر (Diffused) ہوں تو اس کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ اگر وہ مرتکز (Crystallised) ہو جائیں تو اس میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

سورة الفلق میں مین "شرّ" سے ماخلاق (۱۱۳) سے محفوظ رہنے کی دھا مکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس کے شر سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (Evil) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو (جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ ہائی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آجائے تو شر ہو جائیگا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحی خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا، خیر ہے۔ اور اسے انسانیت کی تخریب کے لئے استعمال کرنا شر۔ باقی رہیں ہماری معاشرتی مصیبتیں، سو وہ معاشرہ کے غلط نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر معاشرہ کے نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کر دیا جائے تو یہ تمام مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت اس انفرادی دکھ، درد (Pain) کی ہے جو طبعی طور پر ہوتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے تسخیر فطرت کرتا جاتا ہے ان تکلیفوں میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

اب رہیں وہ پریشانیاں جو جذباتی طور پر وجہ مصیبت بنتی ہیں۔ سو اگر انسان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو وہ ان پریشانیوں پر بھی غالب آ سکتا ہے۔ زاویہ نگاہ کے بدل جانے سے ان چیزوں کا اثر ہی بدل جاتا ہے۔ اس لئے "ابلیس" سے کہا گیا ہے کہ "ان عبادی لیس لک علیہم سلطان" (۱۵)۔ یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکیگا۔

خیر اور شر کے ان گوشوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گا جہاں سے وہ حقائق واضح ہو جائیں گے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مسئلہ خیر اور شر (Good and evil) کی بحث فلسفیانہ طور پر نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کا موضوع فلسفہ نہیں۔ اس کا مقصود ایسی راہ نمائی دینا ہے جس سے شر، شر ہی نہ رہے۔ یعنی توانائیاں بکھر کر تخریبی نتائج (Disintegration) نہ پیدا کریں، بلکہ نظم و ضبط کے ساتھ مجتمع ہو کر تعمیری نتائج پیدا کریں۔

واضح رہے کہ ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ کوئی شے فی نفسہ نہ خیر ہے نہ شر، اور ان کا طریق استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے، تو یہ چیز اشیائے کائنات یا کائنات اور انسان کی قوتوں کے متعلق ہے۔ جہاں تک ان مستقل اقدار کا تعلق ہے جن پر شرف انسانیت (یادین) کی عمارت استوار ہے اور جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں، وہ فی نفسہ خیر ہیں۔ مثلاً عدل و احسان فی نفسہ خیر ہیں۔ اور ان کی ضد ذاتی طور پر شر۔ اسی طرح وہ چیزیں جنہیں قرآن کریم نے حوام قرار دیا ہے، شر پیدا کرنے کا موجب ہیں۔

## ش ر ط

الشَّرَطُ\*۔ علامت یا نشانی جسے لوگ آپس میں مقرر کر لیں۔ (جمع أَشْرَاطٌ)۔ ہر چیز کا پہلا حصہ۔ الشَّرْطَةُ\*۔ فوج کا پہلا دستہ جو جنگ میں شریک ہو اور موت کے لئے بالکل تیار ہو۔ گورنر کے اہوان و انصار کی جماعت (کیونکہ وہ اپنے اوپر ایسی علامات لگا لیتے ہیں جن سے وہ پہچانے جاتیں)\*۔ اس کا واحد شَرْطِیٌّ ہے۔ قرآن کریم میں السَّاعَةِ\* (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا (۲/۱۸)۔ اس کی ابتدائی علامات تو آچکی ہیں۔ اب اس کے بعد وہ انقلاب کی گھڑی (وہ فیصلہ کن لڑائیاں جن میں مخالفین (قریش) کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد وہ اُنہی نہ سکے) جلد آ جائیگی۔

## ش ر ع

الشَّرَرِیَّةُ\*۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو، کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو۔ یعنی اسے

حاصل کرنے کے لئے کسی رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعت نہیں بلکہ کَرَعٌ کہلائیگا۔ اسی سے الشَّرْعُ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں۔ الشَّرْعُ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کہلا ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعٌ کے معنی ظہر ہیں۔ یعنی ظاہر ہو گیا۔ کھل گیا۔ شَرَعَتْ التَّوْبَاتُحُ کے معنی ہیں نیز سے سیدھے کٹے گئے۔ اَشْرَعُ الشَّيْءُ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا۔ اَلشَّيْرَاعُ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں۔ اَلشَّيْرُ بَعَثَ۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں۔ الشَّيْرُ بَعَثَ۔ وَاَلشَّيْرُ عَثَ۔ سیدھا اور واضح راستہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا۔ یعنی اس طرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آ جائے۔

سورة شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ (۲۲)۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی (اَلدِّينِ) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے۔ سورة جائیہ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِّ بَعَثَ مِّنَ الْاُمَرِ (۲۸) پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ)۔ یا شَرِّ بَعَثَ مِّنَ الْاُمَرِ۔ (ص) مفہوم خود الدین ہے۔ یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ۔ سورة سائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ”ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ما آفزل اللہ کے مطابق فیصلہ کر۔ اور جب تمہارے پاس حق آچکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو“۔ اس کے بعد ہے لِكُلِّ جَعَلْنَا مِّنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِّنْهُمَا جَا (۲۸)۔ ”اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا (تھا)۔“۔ یہاں شِرْعَةً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دئے گئے تھے (۲۲)۔ یہاں اس سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دئے جاتے رہے اور جن میں زماے کی



تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم، ساتھ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں۔ اس مفہوم کی تائید، سورۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِيُكَلِّمَ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِيكُوهُ فَلَا يَمُنُّوهُ زَعْنُكَتِ فِي الْأَمْرِ (۲۴)۔ ”ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں۔ (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں۔“

اس آیت (لِيُكَلِّمَ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِيكُوهُ) کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے۔ جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دیدنا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔ اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (۸۸)۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا۔ اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ شریعت سے مراد، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر امت کے لئے چلنا ضروری ہے۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دئے ہیں۔ یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہینگے لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی امت اپنے لئے جزئی احکام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشورہ سے خود مرتب کریگی۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہینگے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہونے رہینگے۔ ان احکام کو اگر شریعت کہا جائیگا تو یہ شریعت بدلتی رہیگی اور اصول شریعت غیر متبدل رہینگے۔

الشَّرَرِ بَعَثَ کے ان معانی کو سامنے لائیے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ ان معانی کے لحاظ سے الشَّرَرِ بَعَثَ (یعنی الدین کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہئے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو۔ ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں۔ جس تک ہر ایک کی رسائی ہو۔ جو مسلسل آ رہا ہو۔ بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو۔ لہذا شریعت وہ ہوگی جس میں جمود، تعطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی۔ وہ زندگی بخش نہیں رہے گی۔

سورة اعراف میں حَيْثُ تَنَاسَلْتُمْ... شَرَرَعَا (۱۶۲) آیا ہے۔ شَرَرَعَا جمع ہے شَارِع کی اور اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو اپنے سر کو اونچا کئے نمایاں طور پر سطح آب کے اوپر آجائیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو سر نیچا کئے جا رہی ہوں۔ (ابن فارس کی عبارت میں تَشْرَبُ ہے جس کے معنی پانی پینے کے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ تَسْرَبُ ہے)۔ لیکن جس مقام پر یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اس کے اعتبار سے پہلے معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ بنی اسرائیل، سبت کے روز کام کاج سے ناغہ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے ماہی گیر اس دن مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے۔ مچھلیوں میں (اور دیگر جانداروں میں بھی) یہ طبعی ملکہ ہوتا ہے کہ جب انہیں پیہم تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تو وہ چھپنے کی بجائے کھلے طور پر، انسانوں کے قریب پھرتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ وہ مچھلیاں کسرتی تھیں۔ لیکن بنی اسرائیل کے لالچی، ان کی اس روش سے فائدہ اٹھاتے اور سبت کے علی الرغم انہیں پکڑ لیتے۔ (تفصیل س۔ ب۔ ت میں دیکھئے)۔

## ش ر ق

الشَّرَقُ - شکاف کو کہتے ہیں۔ شَرَقَ الشَّاةَ - بکری کا کان چیر دیا۔ التَّشْرِيقُ - گوشت کو چیرنا پھاڑنا یا کاٹنا۔ أَيْقَامُ التَّشْرِيقِ - ہمیں سے ہے جس سے مراد عید الاضحیٰ کے تین دن ہیں جن میں قربانی کا

گوشت چیر کاٹ کر دھوپ میں رکھا جاتا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی روشن کر دینے اور کھول دینے کے ہیں۔ شَرَقَتْ الشَّمْسُ۔ سورج نکل آیا۔ وَأَشْرَقَتِ الشَّمْسُ۔ سورج نے روشنی کر دی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ أَیَّامُ النَّشْرِ یُنْقِیْ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں لوگ قربانی کے گوشت کو پارچے بنا کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلا دیتے تھے۔ الشَّرْقُ کے معنی آفتاب کے بھسی ہیں جبکہ وہ طلوع یا روشن ہو گیا ہو۔ چنانچہ طَلَعَتِ الشَّرْقُ آفتاب نکلنے کے لئے بولتے ہیں۔ لیکن غَرَبَتِ الشَّرْقُ کبھی نہیں کہتے۔ الشَّرْقُ۔ آفتاب کا روشن ہونا۔ وہ جگہ جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ یعنی مشرق۔ الشَّارِقُ۔ آفتاب، عین طلوع ہونے کے وقت \*۔

شَرَقَ النَّجْمُ وَأَشْرَقَ۔ کھجور کے درخت لمبے ہوئے یا ان میں سفید شگوفے نکلے۔ شَرِقَ الدَّمُ فِی عَیْنِیہ : اس کی آنکھ سرخ ہو گئی \*۔  
الْمَشْرِقُ قَائِمٌ۔ وہ انتہائی دو نقاط جہاں سے سورج سردی اور گرمی میں طلوع ہوتا ہے \*۔

قرآن حکیم میں مَشْرِقُ کے مقابلہ میں مَغْرِبُ آیا ہے (۱۱۵/۲) اور سورۃ ص میں بِالْعِشِيِّ وَالْأَشْرَاقِ بھی آیا ہے (۳۸/۱۸)۔ سورۃ رحمن میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (۵۵/۲) آیا ہے۔ یعنی سردی اور گرمی میں طلوع اور غروب کے انتہائی نقاط۔ اس سے مراد تمام روئے زمین ہے۔ اس طرح مشرقی اور مغربی زمینوں کے لئے مشارق اور مغارب بھی آیا ہے (۶۰/۲) اور صرف مَشَارِقُ بھی (۳۵/۲)۔ سورۃ اہراف میں ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو ارض یا برکت کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۱۳۰/۲)۔ یعنی اس یا برکت زمین کے ان حصوں کا جو اسکے شرق و غرب میں واقع تھے۔ یا اس پورے کے پورے خطہ کا۔ اس لئے کہ قرآن حکیم نے جہاں کہا ہے وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۱۱۵/۲) تو اس سے مراد کل کائنات ہے۔

سورۃ نور میں، نور خداوندی کے تمثیلی بیان میں لَا شَرْقَیَّةٌ وَلَا غَرْبَیَّةٌ (۲۴/۲۵) آیا ہے۔ یعنی وہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند و بالا ہے۔ اسکی روشنی عالمگیر (Universal) اور تمام کائنات کو محیط ہے۔ جس طرح خدا تمام نوع انسانی کا خدا ہے اسی طرح اس کا ضابطہ قانون (قرآن حکیم) بھی تمام نوع انسانی کی آنکھوں کیلئے روشنی ہے اور اسکا نظام

ربوبیت تمام انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ - یہی وہ نظام ہے جسکی روشنی سے  
آخر الامر تمام روئے زمین جگمگا اٹھیں گی - وَأَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ  
رَبِّهَا (۳۹) -

اَشْرَاقُ\* (۳۸) طلوع آفتاب (یا دن چڑھنے) کیلئے آیا ہے - (۱۵) میں  
مَشْرِقِیْنِ\* آیا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ عذاب نے انہیں اسوقت گرفت  
میں لے لیا جب ان پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی - یعنی طلوع آفتاب  
کے وقت -

## ش ر ک

اِشْتَرَكُ\* کے بنیادی معنی ہیں چمٹے رہنا - غلط ملط ہو جانا\* -  
شَارَكْتُ\* فَلَانًا کے معنی ہیں میں فلان کا ساتھی ہو گیا - اور اِشْتَرَكُ  
الْاَمْرُ کے معنی ہیں معاملہ گڈ مڈ ہو گیا - مَشَارَكَةٌ کے معنی ہیں  
ایک کا دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شریک ہو جانا - فَلَانٌ شَرِيْکُ  
فُلَانٍ - فلان شخص کسی دوسرے شخص کا شریک کار یا سا جھی ہے - نیز  
اس کے معنی ہیں کسی کی بہن یا بیٹی سے شادی کر کے اس کے خاندان سے  
رشتہ داری پیدا کر لینے والا - اسکی جمع شُرَکَاءُ\* آتی ہے - اَلشَّرَکُ\* -  
شکاری کے جال کو کہتے ہیں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے راستے جو بڑے راستے  
(اُمُّ الْعُقْرِ بَقِی) سے نکلیں اور آگے جا کر ختم ہو جائیں - ان کا واحد شَرَكَةٌ\*  
ہے\*\* -

شِرْکُ\* - قرآن حکریم کی خاص اصطلاح ہے - اسکے معنی ہیں غیر  
خدائی قوتوں کو خدا کے ہمسر سمجھنا - جو اختیارات صرف خدا کیلئے مخصوص  
ہیں ان کا حامل دوسروں کو بھی سمجھنا - انسانوں کے خود ساختہ قوانین  
کو، قانون خداوندی کے برابر سمجھنا - خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا  
حق تسلیم کرنا - قرآن حکریم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر شے  
انسان کیلئے تابع فرمان کر دی گئی ہے اور انسان سب برابر ہیں - کسی  
کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے سے اپنی اطاعت کرائے - لہذا اس کائنات  
میں، انسان سے برتر کوئی اور قوت نہیں - (انسان سب برابر اور کائنات کی  
دیگر اشیا انسان سے فروتر) - پس ایک خدا کی ذات ہے جو انسان سے برتر  
ہے - لہذا انسان کا خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنے سے برتر سمجھنا خود اسکی

اپنی تذلّیل ہے۔ اسی کو شرک کہتے ہیں۔ شرک سے خدا کی خدائی (خدا ہونے) میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ خود انسان اپنے مقام انسانیت سے گرجاتا ہے۔ اسلئے قرآن کریم کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اسکا صحیح مقام چھین لیتا ہے (۳۱/۱۳)۔ مشرکین وہی ہیں جو مقام انسانیت سے گر جاتے ہیں اور (خدا کے علاوہ اور) قوتوں کو اپنے سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بس ایک خدا کے قانون کی اطاعت (جو اسنے وحی کے ذریعہ قرآن کریم میں عطا کر دیا ہے) اور ساری کائنات کی تسخیر۔ یہ ہے توحید۔ اور اس میں ذرا سی بھی خرابی، شرک۔

أَشْرَکَ - اس نے شرک کیا، اس سے اسم فاعل مُشْرِکٌ ہے یعنی شرک کرنے والا۔ اسکی جمع مُشْرِرٌ کُتُونٌ اور مُشْرِرٌ کِیْنٌ ہے۔

نزول قرآن کے وقت ایک گروہ تو ان لوگوں کا تھا جو وحی خداوندی کے اتباع کے مدھی تھے۔ انہیں اہل کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہودی۔ نصرانی وغیرہ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو کسی آسمانی کتاب کے اتباع کے مدعی نہیں تھے۔ وہ اپنے خود ساختہ رسوم و آئین کے متبع تھے۔ وہ اپنے ذہنی تصور کے مطابق خدا کو بھی مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک خیال کرتے تھے۔ انہیں مشرکین کہا گیا ہے۔ (چونکہ یہ دونوں گروہ قرآن کریم کی دعوت سے انکار کرتے تھے اسلئے ان سب کو کَافِرِیْنٌ کہا گیا ہے)۔ یہ اصطلاحی تعبیریں ان گروہوں میں باہمی امتیاز کیلئے تھیں ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خود اہل کتاب بھی قانون خداوندی کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ یعنی اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے مسلک و آئین کا اتباع۔ قانون خداوندی اپنی اصلی شکل میں انکے پاس تھا ہی نہیں۔ اور جتنا کچھ تھا، وہ بھی محض تبرکاً تھا۔ ان کا عمل انکے علماء و مشائخ کی متعین کردہ شریعت پر تھا۔ لہذا عملاً یہ لوگ بھی مشرک تھے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے انہیں بھی مشرک کہا ہے۔ وَقَالُوا کُنُوْا هُوَ دَاوُدُ اَوْ نَصْرٰی تَهْتَدُوْا۔ قُلْ بَلْ مِثْلَ الْاَبْرَہِیْمَ حَنِیْفًا۔ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنِ (۲۳۵)۔

دینِ توحید صراطِ مستقیم ہے۔ اور مختلف فرقے وہ چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو انسان کو صراطِ مستقیم سے بہکا کر دوسری طرف لیجاتے ہیں اور تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اسلئے قرآن کریم نے فرقہ بندی کو

شرک قرار دیا ہے۔ (۳۲، ۳۱)۔ اس لشر کہ فرقوں میں آخری سند انسان ہوئے ہیں۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوتی ہے۔

لہذا شرک بھی نہیں کہ انسان بتوں کی یا سُر دوں کی پرستش کرنے لگ جائے۔ شرک یہ بھی ہے (اور یہ شرک بہت بڑا ہے) کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو خدا کے قانون کا درجہ دیدیا جائے اور اسطرح دین کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو موسمن سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت مشرک ہوئے ہیں۔ وَمَا يَتَّبِعُونَ إِلَّا كَثْرًا هُمْ بِآلِهَائِهِمْ مُشْرِكُونَ (۱۴، ۱۳)۔ ان میں سے اکثریت انکی ہے جو خدا پر اسطرح ایمان رکھتے ہیں کہ ایمان کے باوجود مشرک ہوئے ہیں۔

جسطرح سارے قرآن کریم میں توحید کی تفصیل کا تذکرہ ہے اسی طرح اس میں شرک اور اسکی جزئیات و تضمینات کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم شرک کو مٹانا اور توحید کو قائم کرنا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے معنی یہی ہیں۔ ہر غیر خداوندی قانون و آئین کی اطاعت سے انکار اور قانون خداوندی کی اطاعت کا عملی اقرار۔ مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۲۳)۔ اور غیر خدائی قوتوں پر بھروسہ کرنے والے اور شیطانی اقتدار کو تسلیم کرنے والے مشرک ہیں (۱۶، ۱۷)۔

ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم اکثر مقامات میں نظر آئیگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان، تمام دنیا کے مشرکین سے ہر حال میں جنگ کرتے رہیں۔ اُن مقامات میں مشرکین سے مراد زمانہ نزول قرآن کے مشرکین ہیں جنہوں نے جنگ کے حالات پیدا کر دئے تھے۔ اُس کے بعد جنگ صرف انہی سے کی جائیگی جو اُس قسم کے حالات پیدا کر دیں۔ بالفاظ دیگر، کسی مشرک سے محض اس کے مشرک ہونے کی بنا پر جنگ نہیں کی جائیگی۔ جنگ ان قوموں سے کی جائیگی جو جنگ کے حالات پیدا کر دیں۔ اس کے لئے قرآن کریم نے تفصیلی ہدایات دی ہیں۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں مشرکین (یا غیر مسلموں) کی جو ہوزیشن قرآن کریم نے متعین کر دی ہے اور ان سے جس قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم دیا ہے، وہ ہر دور کے مشرکین (یا غیر مسلموں) پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

- (۱) جو خصوصیات اور قوتیں خدا کے لئے مختص ہیں، ان میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا، شرک ہے۔
- (۲) اپنے آپ کو خدا کے سوا، کائنات کی کسی قوت یا کسی انسان کا محکوم اور تابع فرمان سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا، شرک ہے۔
- (۳) قرآن کریم کے علاوہ، کسی اور کی محکومی اختیار کرنا شرک ہے۔ اس ضابطہ کے علاوہ، کسی اور ضابطہ کو اپنا۔ حکم ماننا، شرک ہے۔
- (۴) الدین، ملت میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ فرقوں میں بٹ جانا اور گروہ درگروہ ہو جانا، شرک ہے۔
- (۵) ایک خدا۔ اس کا عطا کردہ ایک ضابطہ زندگی۔ اس پر چلنے والی ایک اُمت۔ اس اُمت کا ایک نظام۔ یہ ہے توحید۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے شرک ہے۔

## ش ر ی

شَرَّی کے معنی بیچنے اور خریدنے دونوں کے آتے ہیں۔ (اور یہی مفہوم بَیْع کا بھی ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خرید و فروخت، جنس کے عوض جنس سے ہوتی تھی جسے (Barter System) کہتے ہیں، تو اس میں ہوتا یہ تھا کہ ایک جنس والا جہاں اپنی جنس دوسرے کو دیتا تھا تو اسکے عوض دوسرے سے اسکی جنس خریدتا بھی تھا۔ اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک خریدتا بھی تھا اور بیچتا بھی تھا۔ لہذا یہ لفظ خریدنے اور بیچنے دونوں کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا\*۔ شَرَّی کا اصلی مطلب ہے کسی چیز کا اپنے قبضے سے نکال کر اس کے عوض دوسری چیز کو اپنے قبضے میں لے لینا۔ اس اعتبار سے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری چیز اختیار کر لینے کو بھی اِشْتِرَاء کہہ دیتے ہیں\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَرَّی بیچنے کے لئے اور اِشْتِرَاء خریدنے کے لئے زیادہ مستعمل ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں (۴۰/۲۸) میں یَشْرِی 'نَفْسَہ' کے معنی اپنے آپ کو فروخت کر دینے کے ہیں۔ وَ شَرَّوْہُ یَشْتَرِی بَخْسٍ (۱۲/۲۰) میں بھی اس کے معنی فروخت کرنے کے ہیں۔ لَیْکِنْ اِنَّ اللہَ اِشْتَرٰی (۱۱۱/۹) میں اس کے معنی خریدنے کے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اِشْتَرَوْا الضَّلٰلَۃَ بِالْهٰدِی (۱۱۹/۲) میں اس کے معنی ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے کے ہیں۔

نوٹ۔ شتر\* پان\* (ش کو زہر اور زہر سے) ایک درخت کو کہتے ہیں جس کی لکڑی سے کمان بنائے تھے۔ نیز جسم کی وہ رگ جو پھڑکتی اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کی جمع شترآیین\* ہے۔ شترآی کے معنی پھیلانا بھی ہیں\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز میں ہيجان پیدا ہو جانا اور اس کا بلند ہونا لکھا ہے۔ نیز شتری البتعیئر\* کی سترہ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا\*\*۔

قرآن کریم میں ہے إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآَنٍ لَهُمْ الْجَنَّةُ (۹۱)۔ ”بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور مال بعوض جنت خرید لئے ہیں“۔ یہ محض ذہنی عقیدہ نہیں بلکہ اسلامی نظام مملکت و معاشرت کی اصل و بنیاد ہے۔ اس میں، وہ نظام معاشرہ (مملکت) جو قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے مشکل ہوتا ہے، افراد مملکت کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے، افراد اپنے جان اور مال کو حکومتِ خداوندی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں، اور وہ حکومت انہیں اس دنیا میں جتنی زندگی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس سوم کی یہاں کی زندگی جتنی ہو جائے اسے آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی سیری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔

## ش ط ا

الشَّطَاءُ\*۔ کھجور یا کھیتی کی سوٹیاں۔ نثرے پھوٹنے والے ہودے۔ الشَّطَاءُ\* مِّنَ الشَّجَرِ\*۔ درخت کی جڑ کے آس پاس جو شاخیں پھوٹ نکلیں۔ شَطَا\* الْوَادِي\* وَالشَّهْرِ\*۔ وادی یا نہر کا کنارہ۔ ساحل\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے كَزَّرْعٍ أَخْرَجَ شَطَاً\* (۲۸)۔ کھیتی کی طرح جو اپنی سوٹیاں نکالتی ہے۔ مِّنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ\* (۲۸)۔ اس کا برکت وادی کے ایک کنارے سے۔

## ش ط ر

الشَّطْرُ\*۔ اُس حصہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے الگ ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کسی چیز کی ایک جانب کو کہنے لگ گئے خواہ وہ اس کے



ساتھ ہی ملی ہو\*۔ اور اس طرح اس کے معنی کنارہ ، طرف ، سمت اور بجانب ، نیز کسی چیز کا بعض حصہ ہو گئے ۔ الگ ہو جانے کی جہت سے اس میں دور ہو جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا ۔ چنانچہ الشَّطِيرُ کے معنی ہیں پردہ سی ، اجنبی ۔ نیز دور ، بعید ۔ سَنَزَلَ شَطِيرٌ ۔ دور کی منزل ۔ الشَّاطِيرُ ۔ ڈاک کا تیز رفتار گھوڑا جو لمبی مسافت کو قلیل عرصہ میں طے کر لے \*\* ۔ جہت اور سمت کے لئے کہتے ہیں شَطْرَ شَطْرَہ ۔ اس نے اس کی طرف جانے کا ارادہ کیا ۔ ویسے الشَّطْرُ ۔ کسی چیز کے آدھے حصے کو بھی کہتے ہیں \*\* ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سمت اور جہت کے معنوں میں آیا ہے ۔ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۳۶) ۔ مسجد الحرام کی سمت ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سمت کے لئے شَطْرُ کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب اس میں دوری کا مفہوم بھی شامل ہو ۔

## ش ط ط

شَطَّ ۔ يَشْطُطُ ۔ شَطَطًا ۔ دور ہو جانا ۔ مقدار یا حد مقررہ سے تجاوز کر جانا ۔ حق سے دور نکل جانا ۔ بے انصافی کرنا ۔ موخر الذکر معنوں میں أَشْطَہ بھی مستعمل ہے \*\*\* ۔ قرآن کریم میں ہے فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطِطْ (۳۸) ۔ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور نا انصافی نہ کر ۔ یعنی حق سے دور نہ لے جا ۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ قُلْنَا إِذْ أَشْطَطْنَا (۱۸) ۔ ہم ایسی بات کہہ چکے جو حق سے دور اور ہٹی ہوئی ہوگی ۔ راغب نے شَطَطٌ کے معنی حد سے زیادہ دور کے لئے ہیں ۔

الرماني نے شَطَّ شَطَنَ اور بَعْدَ کو مرادف المعنی لکھا ہے \*\*\*\* ۔ لہذا اس میں دوری کا مفہوم ہوگا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دوری اور میلان اور جھکاؤ دونوں لکھے ہیں ۔ لہذا وَلَا تَشْطِطْ (۳۸) کے معنی ہونگے ، کسی ایک طرف مت جھک جاؤ ۔

## ش ط ن

شَطَنٌ مضبوط ہٹی ہوئی لمبی رسی کو کہتے ہیں ۔ يَشْرُ شَطَوْنٌ ۔ اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو ۔ لمبائی کی نسبت سے ہر اس شے کو جو بہت دور ہو ، شَطِينٌ یا شَاطِينٌ کہتے ہیں ۔ الرماني نے شَطَّ ۔ شَطَنَ اور بَعْدَ (دور ہونے) کو مرادف المعنی لکھا ہے \*\*\*\* ۔ ابن فارس نے بھی

اس کے بنیادی معنی دور ہونے کے لکھے ہیں۔ شَطْن کے معنی ہیں وہ بہت دور چلا گیا۔ شَطْنٌ صَاحِبٌ کے معنی ہیں اس نے اپنے ساتھی کے رخ اور قصد کی مخالفت کی، اس کی نیت کے خلاف اپنی نیت رکھی۔ یہیں سے اس کے معنی مخالفت اور سرکشی کے لئے جاتے ہیں\*۔ اسی سے لفظ شَيْطَان بنا ہے۔ جسکے معنی ہونگے (۱) خدا کی رحمتوں سے دور۔ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم اور (۲) سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلنے والا۔ سرکش۔

شَيْطَانٌ۔ ایک بد صورت سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ اور رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ۔ ناگ بھنی تھوہر کو کہتے ہیں\*۔ (ابن فارس نے بھی اسکے یہی معنی لکھے ہیں)۔

بعض کا خیال ہے کہ شَيْطَانٌ در اصل شَاطٌ۔ بِشَيْطٌ سے مشتق ہے۔ شَيْطٌ کے معنی ہیں جل جانا۔ ہلاک ہو جانا۔ شَاطٌ الشَّيْءُ کے معنی ہیں وہ چیز جل گئی۔ شَاطٌ السَّمْنُ وَالزَّقِيقُ۔ گھی یا تیل اس قدر گرم ہوا کہ اس میں آگ سی لگنے لگی۔ اس سے شَيْطَانٌ کے معنی سرکش، شعلہ صفت اور تخریبی نتائج پیدا کرنے والے کے ہونگے\*\*۔

قرآن کریم میں ہے إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا (۱۹)۔ شیطان احکام خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہے۔ سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آکر اس قبلی کے مُکَا مَارا جس سے وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (۲۸)۔ یہ تو شیطانی کام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر جو غلط کام کیا جائے اسے شَيْطَانَت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (نیز ۱۲)۔ جو لوگ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے ان کے سرغنوں کو بھی شَيْطَانِیْن کہا گیا ہے۔ وَ إِذَا خَلَقُوا إِلَى شَيْطَانِيهِمْ (۲۴)۔ کے یہی معنی ہیں کہ جب یہ لوگ اپنی پارٹی کے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں۔

ان وحشی اور سرکش قبائل کے لوگوں کو بھی جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مطیع بنا کر کام میں لگا رکھا تھا شَيْطَانِیْن کہا گیا ہے (۲۱ و ۳۸)۔ سانپ کے لئے یہ لفظ قصہ حضرت ایوبؑ میں آیا ہے (۳۸)۔ غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) میں قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شَيْطَانٌ کے معنی پیاس کی شدت کے بھی ہیں۔ اس لئے حضرت ایوبؑ کے قصے میں اَنْتِي مَسْتَنِي الشَّيْطَانِ (۳۸) کے معنی سانپ کا چھو جانا اور پیاس کا غلبہ دونوں ہو سکتے ہیں

\*ناج و لین۔ \*\*عبرانی زبان میں شیطان کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے کے ہیں۔

نیز (۱۱) میں رَجَزُ الشَّيْطَانِ کے معنی پیاس کی وجہ سے پیدا شدہ کوفت اور نقاہت بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں شَجَرَةُ الزَّقْلُمِ کے متعلق کہا گیا ہے طَلَعَتْهَا كَأَنَّهُ رَعُوْسُ الشَّيْطَانِ (۱۵) یعنی اس میں سے جو پھوٹ کر نکلتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے سانپوں کے سر (بھن) جس طرح ناگ بھنی تو وہر کے چوڑے چوڑے ہتے ہوتے ہیں۔  
 کاہنوں اور نجومیوں کو بھی شَيْطَانِیْنُ کہا گیا ہے (۱۶ و ۱۷)۔

قرآن کریم کی رو سے ہر وہ قوت جو قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہے شَيْطَانٌ ہے، خواہ وہ انسان کے اپنے بے باک اور سرکش جذبات ہوں اور خواہ نظام خداوندی کی مخالف جماعتیں اور ان کے سرغنے۔ سرکشی اور تعریب ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے، اور صحیح نظام کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کا کام۔ شیطان اور طاہوت ایک ہی ہیں۔ اور طاہوت ہر غیر خداوندی قوت کا نام ہے۔ (۱۸ و ۱۹)۔

[شَيْطَانٌ کے متعلق مزید بحث اِبْلِیْسُ کے عنوان (ب۔ ل۔ س) اور (ع۔ ب۔ د) میں دیکھئے]۔

## ش ع ب

الشَّعْبُ - جمع کرنا اور متفرق کرنا۔ پھاڑنا اور شکاف ڈالنا۔ (افداد میں سے ہے)۔ راغب نے لکھا ہے کہ الشَّعْبُ کے معنی جمع کرنے اور متفرق کرنے کے اس لئے آتے ہیں کہ الشَّعْبُ مِّنَ الْوَادِي، وادی کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس کا ایک کنارہ ملتا ہو لیکن دوسرا کنارہ اس سے جدا ہوتا ہو۔ جب تم اس مقام کو دیکھو جہاں سے اس کا ایک سرا جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ جیسے ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا سرا اس سے ملتا ہے تو یوں نظر آئے جیسے دو سرے باہم دگرمل رہے ہیں۔ اس لئے اس کے معنی اکٹھا کرنے اور جدا کرنے، دونوں کے آتے ہیں\*۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ یعنی اس میں اجتماع کے ساتھ افتراق اور افتراق کے ساتھ اجتماع پایا جاتا ہے۔

الشَّعْبُ - بڑا قبیلہ۔ مختلف قبائل کا وہ جدِ اعلیٰ جسکی طرف وہ سب منسوب ہوتے ہیں، اور وہ انہیں سلا دیتا ہے۔ (جمع شُعُوبُ ۲۱)۔  
 قبیلہ، شَعْبٌ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ شُعْبَةٌ کے معنی ہیں شاخ، کسی چیز

کا الگ ہو جانے والا ٹکڑا، دو سینگوں یا دو شاخوں کے درمیان کا حصہ۔ اسکی جمع شُعَبٌ ہے (۳۶)۔ نیز الشَّعْبَةُ مین الشَّجَرِ۔ درخت کی مختلف پھیلی ہوئی شاخیں۔ الشَّعْبُ - پہاڑ کے درمیان راستہ۔ دو پہاڑوں کے درمیان جو کھلی ہوئی جگہ ہو۔ شُعْبَانٌ - رمضان سے پہلا مہینہ۔ اس مہینے میں عرب ہانی کی تلاش اور لوٹ مار کے لئے منتشر ہو جاتے تھے\*۔ (متفرق ہو جانے کے معنوں میں)۔

شُعَيْبٌ - ایک نبی کا نام ہے جو قوم مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کے خسر تھے\*\*)۔ [مزید تفصیل "شعیب" کے عنوان میں ملے گی]۔

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوع انسان است واحد، ایک عالمگیر برادری ہے (۲۱۳) لیکن باہمی تعارف کی غرض سے یہ مختلف شعوب و قبائل میں بٹ جاتی ہے۔ ان شعوب و قبائل کی تقسیم سے مقصد محض تعارف ہے، جس طرح ہم اپنے بیٹوں کے نام رکھ لیتے ہیں تاکہ ان کے تعارف میں آسانی رہے۔ اس سے کسی قسم کی برتری یا تفوق مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے دنیا کی کوئی نسل، کوئی قبیلہ، کوئی قوم دوسروں سے افضل نہیں۔ تمام انسان پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱)۔ مدارج کا معیار اعمال ہیں۔ اور جو سب سے زیادہ اچھے اعمال و کردار کا حامل ہو وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا جس میں کہا گیا ہے کہ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ اِنْ اَكْثَرَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۲۹)۔ جس طرح کسی شہر کو مختلف محلوں میں بانٹ دینے سے غرض محض تعارف کی آسانی ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کی قبائلی تقسیم بغرض تعارف تھی۔ اگر انسانی تمدن ایسی شکل اختیار کر لے جس میں تعارف کا مقصد قبائلی تقسیم کے بجائے کسی اور طرح حاصل ہو جائے تو پھر اس تفریق کا بغرض تعارف باقی رکھنا بھی ضروری نہیں رہے گا۔ باقی رہا معاشرہ میں مدارج کا تعین، سو اس کا مدار شرفِ انسانیت ہے۔

## ش ع ر

شُعْرٌ - انسان کے جسم پر جو بال پیدا ہوتے ہیں انہیں کہتے ہیں۔ (اونٹ کے بالوں کو وَبَرٌ اور بھیڑ کے بالوں کو صَوْفٌ کہتے ہیں۔

یہ تینوں الفاظ  $\frac{1}{8}$  میں آئے ہیں۔ اگرچہ زمخشری کے نزدیک شَعْرٌ کا لفظ انسان اور غیر انسان سب کے بالوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے\*۔

الشَّعْرُ اور الشَّعْرُ۔ کسی چیز کو سمجھ لینا، جان لینا، تاڑ لینا، معاملات کی باریکیوں کو جان لینا، حواس کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کر لینا۔ اس سے فعل شَعَرَ۔ يَشْعُرُ و شَعُرَ يَشْعُرُ آتے ہیں۔ اس کے مصادر میں الشَّيْعُرُ وَالشَّعْمُ وَالشَّعْوَرُ وَالشَّيْعَرَى بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

أَشْعَرَهُ۔ اسے بتایا، معلوم کرایا۔ بعض نے کسی شے کا حواس کے ذریعہ ادراک کر لینا ہی اس کے بنیادی معنی قرار دئے ہیں\*۔ (ذهنی فلسفہ اور تجربی تصورات عربوں کے ہاں شعور نہیں کہلاتے تھے۔ ان تصورات کو شعور سے تعبیر کرنا عجمی اصطلاح ہے جو یونانی طرز فکر سے پیدا ہوئی ہے)۔

بہر الشَّيْعَرُ کا عام استعمال کلام منظوم پر ہونے لگا۔ اس کی وجہ راغب نے یہ بتائی ہے کہ شاعری عربوں کی نازک خیالیوں، ہوشیدہ رازوں اور بذلہ منجیوں کا مجموعہ ہے۔ شاعیر\* کو شاعر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطانت و ذہانت سے ان معانی کا ادراک کر لینا ہے جن کا ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے۔ کبھی شیعِر\* سے جھوٹ بھی مراد لیتے ہیں۔ اور شاعیر\* جھوٹ بولنے والے کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ بیشتر جھوٹ شاعری میں جگہ پاتا تھا اس لئے یہ مثل بن گئی تھی کہ أَحْسَنُ الشَّيْعَرِ أَكْثَرُ بَهْ۔ یعنی سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ اپنے اندر رکھتی ہو۔ مخالفین رسول اللہ\* کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے تھے\*۔

شیعار\*۔ جنگ میں جو الفاظ بطور علامت (Code Word) استعمال ہوتے ہیں، یا سفر میں اپنے قافلہ کو پہچاننے کے لئے جو نشان مقرر کیا جاتا ہے، انہیں شیعار\* کہتے تھے۔ اسی طرح حج میں لے جانے والے جانور پر نشان لگانے کو اشعار\* کہتے تھے اور اس جانور کو شعیثہ\*۔ اس کی جمع شعیثہ\* ہے۔

شیعار\* الحج\*۔ حج کے مناسک و علامت اور آثار و اعمال کو بھی کہتے ہیں۔ نیز تمام وہ اعمال حج جو خدا کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے ادا کئے جاتے ہیں۔ ان اعمال و علامات کے مقام کو مَشْعَر\* کہتے ہیں۔ اس کی جمع مَشَاعِر\* ہے۔ اس معنی میں شعیثہ\* بھی آتا ہے\*۔

شِعْرَى۔ ایک ستارہ کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانے میں نکلتا ہے اور بہت روشن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں رَبُّ الشَّيْعَرَى (۵۳/۶) اسی کے لئے

آیا ہے۔ جاہلیت میں بعض عرب قبائل اس کی پرستش کیا کرتے تھے\*۔ لیکن اگر شاعری کو شاعر سے مصدر مانا جائے تو اس کے معنی عقل و شعور ہوں گے۔

قرآن کریم میں عقل، شعور، فکر، تدبیر، تفقہ، وغیرہ الفاظ مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ ہر مقام پر غور کرنے سے ان کا باریک اور لطیف فرق سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ایک قدر مشترک سب میں ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے وہ انہیں حیوانات سے بدتر اور جہنم کا اہل قرار دیتا ہے۔

قرآن کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہے اور نظم میں بیان کردہ مذسوم۔ قرآن، اسلوب بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصود بیان سے بحث کرتا ہے۔ شاعری سے اس کی مراد، وہ جذبات پرستی ہے جو حقائق سے بحث نہیں کرتی۔ چنانچہ سورۃ یس میں جہاں اس نے کہا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْتَبِغِي لَہُ (۳۶)۔ ہم نے رسولؐ کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی شاعری ایک پیغامبر انقلاب کے شایان شان ہوتی ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّفُرْآنٌ مُّبِیْنٌ (۳۶)۔ جو کچھ ہم نے رسولؐ کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیْثًا (۳۶)۔ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے یہ انہیں اس کے ذریعہ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ یعنی قرآن کریم، تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے۔ اور شاعری اس کے خلاف محض جذبات سے کھیلتی ہے۔ چنانچہ اس نے شاعروں کے متعلق کہہ دیا کہ وہ ایک ایسے اوٹ کی طرح، جسے جھوٹی پیاس (کی بیماری) اُدعر سے اُدعر اور اُدعر سے اُدعر لئے لئے پھر رہی ہو\*\*، جذبات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور انکی ساری عمر ان باتوں میں گزر جاتی ہے جنہیں وہ کسر کے کبھی نہیں دکھائے (۲۴۵-۲۶)۔ یہ روش زندگی ایک رسولؐ (اور اس کے متبعین) کے شایان شان نہیں۔ (کولرج کے الفاظ میں)\*\*\* (شاعری کی ضد (Antithesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔ قرآن کریم چونکہ سائنٹفک حقائق سے بحث کرتا ہے اس لئے شاعری (جو ان حقائق کی نقیض ہے) اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ دیگر اقوام عالم (مثلاً اہل یونان وغیرہ) کی طرح، عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی الہام ہوتا ہے۔ جس طرح آج بھی انگریزی زبان میں جب (Poet) کہا جاتا ہے تو اس سے مراد (Inspired) ہوتے ہیں۔ یعنی (Poet) وہی ہوتا ہے جسے (Inspiration) ہوتا ہو۔ قرآن، وحی اور انسانی ملکات میں نہایت شد و مد سے تمیز کرتا ہے تاکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کی طرف سے براہ راست علم اور انکشاف حقیقت صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے جو ایک نبیؐ کو ملتی تھی۔ (اور سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد، اب کسی کو نہیں مل سکتی)۔ وہ نہ کشف والہام وغیرہ کی اصطلاحات کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی انہیں خدا کی طرف سے براہ راست علم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب انسانی جذبات کی پیدا کردہ کرشمہ سازباں یا نفسیاتی قوت کی افسوں طرازیوں ہیں جنہیں علم و حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ وجہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ رسول شاعر نہیں ہوتا، جس طرح وہ کاہن، ساحر اور نجومی نہیں ہوتا۔ ان کی طرف شیاطین (انسانی سرکش جذبات) ”وحی“ نازل کرتے ہیں (۲۱/۲) لیکن رسولؐ کی طرف وحی خدا کی طرف سے ہوتی ہے جس میں اس کے اپنے جذبات و احساسات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی (۵۳/۳)۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں تصوف کی اصطلاح مروج نہیں تھی لیکن جن عناصر سے تصوف ترتیب پاتا ہے وہ انہیں اپنے ہاں کے شاعروں، کاہنوں، ساحروں وغیرہ میں موجود سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے ان تمام کی تردید سے درحقیقت تصوف کے عناصر کی تردید کی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر عرب، تصوف کی اصطلاح سے واقف ہوتے تو وہ یہ کہتا کہ تصوف ایک نبی کے شایان شان نہیں۔ اسکی بجائے اس نے یہ کہا ہے کہ نبی شاعر اور ساحر اور کاہن نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل کر کے انسانی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ تصوف یہ کچھ نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَتَّخِذُوا نَافِقُونَ وَالَّذِينَ آمَنُوا۔ وَمَا يَتَّخِذُوا نَافِقُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲)۔ ”یہ لوگ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن یہ دھوکا دراصل ان کی اپنی ذات (نفس) کو ہوتا ہے اور یہ اس کا شعور نہیں رکھتے“۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کی تدابیر تو شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر خود اپنی ذات کو دھوکا دیتے ہیں۔

غور کیجئے شعور اور غیر شعوری نفسیاتی کیفیات کا یہ لطیف فرق کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تُحِیُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ (۵)۔ شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ اسلام ایک دین ہے جو مملکت کی شکل میں متمکن ہوتا ہے۔ ایک مملکت کے کچھ شعائر (یعنی علامات یا Symbols) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ مثلاً کسی مملکت کا جھنڈا۔ جھنڈا ویسے تو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ انہی علامات کو شعائر کہا جاتا ہے۔ لہذا شَعَائِرُ اللّٰهِ سے مراد، اس مملکت کی محسوس علامات ہونگے جو قوانین خداوندی (قرآنی نظام) کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہو۔ ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔ واضح رہے کہ ان شعائر کی ہرستش نہیں کی جائیگی۔ صرف ان کا احترام کیا جائے گا۔ اور وہ بھی اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر (علامات) فی ذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ان کا احترام، قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے۔ اور بس۔

## ش ع ل

الشَّعْلَةُ۔ آگ کی لپک۔ لکڑی یا ایندھن جس میں آگ مشتعل ہو۔  
الشَّعْبِيلَةُ۔ جلتی ہوئی بتی۔ اَلْمَشْعَلُ۔ قندیل۔ شَعَلَ النَّارُ فِی الرَّحْطِ۔ اسنے لکڑیوں میں آگ بھڑکا دی۔ اِسْتَعْلَتِ النَّارُ۔ آگ لگ گئی اور بھڑکی\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے کناروں کا منتشر (بکھرا ہوا) ہو جانا۔ آگ کے بھڑکنے میں یہی کیفیت ہوتی ہے۔

اِسْتَعْلَ النَّارُ سٌ شَبَبًا۔ سر میں سفید بالوں کا بکثرت پھیل جانا اور اس طرح سر کا سفیدی سے بھڑک اٹھنا\*\*۔ یا سر میں سفید بالوں کا نمودار ہو جانا۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق یہی الفاظ آئے ہیں (۱۹)۔

## شعیر علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی—قطورا۔ سے) جو اولاد پیدا ہوئی ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ یہ حجاز کے شمال میں شام سے



متصل علاقہ میں ، سکونت پذیر ہوا اور اس کی نسل ، تاریخ کے اوراق میں قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی ۔ ان کا زمانہ قریب ۲۰۰۰ ق۔م سمجھنا چاہئے ۔ یہ قوم ہمیں بڑھی بھولی ۔ قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی ۔ تاآنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ۔ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں ، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے ۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہاں انہوں نے ایک مرد بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی ۔ اس مرد بزرگ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا ۔ (دیکھئے (۲۸/۲۲) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مرد بزرگ کون تھے ۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ تھے ۔ تورات میں ان کا نام کہیں راعوبیل ۔ کہیں یثرو اور کہیں حوہاب لکھا ہے ۔ مورخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوہاب ہی تھا (تورات ۔ کتاب گنتی ۱/۲۶) ۔ اور باقی نام ان کے القاب تھے ۔ اور یہی حوہاب قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں ۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے ۔ یعنی قریب ۱۷۰۰/۱۶۰۰ ق۔م ۔

تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا ۔ اس کا بیٹا دوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا ۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کی طرف (۲۹/۲۶) اور اصحاب الایکہ کی طرف (۲۹/۲۷) مبعوث ہوئے تھے ۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ ، بنو دوان ہی تھے ۔ قرآن کریم نے قوم مدین اور اصحاب الایکہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے گویا یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے ۔

حضرت شعیبؑ نے انہیں جو تلقین کی اُس سے ہتھ چلتا ہے کہ ان میں کس کس قسم کے جرائم پیدا ہو چکے تھے ۔ آپ نے ان سے کہا ۔ یٰقَوْمُ اعْبُدُوا اللَّهَ ۔ مَا لَکُمْ مِّنْ آلَهِ غَیْرَہُ (۸۵) ۔ اے میری قوم ! اللہ کی محکومی اختیار کرو ۔ اس کے سوا تمہارا کسویٰ اور الہ نہیں ۔ . . . فَاتَّوَفَّوْا الْکَیْمِلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَہُمْ وَلَا تَتَفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِہَا . . . (۸۵) ۔ تمہیں چاہئے کہ ماپ تول پورا پورا کرو ۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو ۔ ملک کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پیدا کرو ۔

اس سے واضح ہے کہ اس قوم میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں جنہیں دور کرنے کے لئے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے ۔ آپ نے ان

تک اپنی دعوت پہنچائی اور (حسب معمول) قوم کے سرمایہ دار طبقہ (مردارانِ قوم) نے آپ کی سخت مخالفت کی اور دھمکی دی کہ آپ اور آپ کے ساتھی انہی کا مسلک اختیار کر لیں ورنہ وہ ان سب کو بستی سے نکال دیں گے (۸۸)۔

سورۃ ہود میں اسی قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض کیا گیا ہے۔ جو اسلام کی ایک عظیم حقیقت کو اپنے آغوش میں لٹے ہے۔ انہوں نے کہا

يٰۤاِسْحٰعِيْبُ - اٰمٰنًا وَّمُتَكَّ تَاۡمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْجُبُ اَبۡسَاۡوُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِىۡ اَمۡوَالِنَا مَا نَشَاۡوُ . . . . . (۱۱۷)۔ ”اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ (ہمیں کہے کہ) ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباء و اجداد پوجتے رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہیں نہ کریں؟

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں صلوة اور معاشیات کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ صلوة سے مقصود ہے قوانین خداوندی کا اتباع - اور قوانین خداوندی معاشیات کو بھی اپنے دائرے کے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے صلوة اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

قوم نے اپنی سالت میں اصلاح نہ کی اور ضد اور سرکشی میں آگے بڑھتی گئی ، تا آنکہ وہ تباہ و برباد ہو گئی ۔ سورۃ اعراف میں ہے فَاَخَذَ تَنٰهُمْ الرِّحْفَةُ (۹۱)۔ ”انہیں لرزا دینے والی ہولناکی نے آلیا“ ۔ سورۃ ہود میں الصَّيْحَةَ کا لفظ آیا ہے (۹۳)۔ اس کے معنے بھی سخت آواز کے ہیں ۔ سورۃ شعراء میں اسے یَوْمِ الظِّلَّةِ (۲۶۹) کہا گیا ہے ۔ ”یعنی سامنے والا دن“ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سخت آواز کے ساتھ زلزلہ آیا جس سے آتش فشاں پہاڑوں سے دھوئیں کے بادل نکلے ۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو گئی ۔

(طبعی حوادث اور عذاب خداوندی کا باہمی تعلق کیا ہے ۔ اس کے لئے سیری کتاب ”جوئے نور“ میں حضرت قوحؑ کا عنوان دیکھئے) ۔

ش ع ف

اَلشَّغَافُ - دل کے غلاف یا پردہ کو کہتے ہیں۔ نیز دل کا اندرونی حصہ۔ سویدائے قلب۔ شَغَفَهُ - اُس کے غلافِ دل تک پہنچ گیا۔ شَغَفَهُ 'اَلْحُبُّ' - محبت اس کے غلافِ دل تک پہنچ گئی۔ محبت نے اس کے غلافِ دل کو شقی کر دیا (بیضاوی) اور اندر داخل ہو گئی۔\* اس لئے انتہائے محبت کو اَلشَّغَفُ کہتے ہیں۔\*\*۔

سورة یوسف میں ہے ”قَدْ شَغَفَتْهَا حُبًّا (۱۲)۔“ ”محبت کی وجہ سے یوسف اس کے دل کے اندر اتر گیا۔“ یعنی یوسف کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی۔

## ش غ ل

الشَّغْلُ - الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - مشغله ، مصروفیت ، ایسا کام جس میں مصروف ہو کر انسان دیگر امور پر توجہ نہ دے سکے۔ اِشْتِغَلَ فِيهِ السِّقْمُ - زہر اس میں سرایت کر گیا۔ مَالٌ مَشْغُولٌ - وہ مال جو تجارت میں لگا ہوا ہو\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ فَرَاغٌ (یعنی خالی ہونا) کی ضد ہے۔

قرآن کریم میں ہے شَغَلْتُنَا أَمْوَالُنَا (۳۸)۔ ہمارے اموال نے ہمیں اس طرح اپنے آپ میں جذب کر رکھا ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں۔

سورة یس میں اہل جنت کے متعلق ہے فِي شُغْلٍ فَكِيهُونَ (۳۱)۔ وہ (ہر وقت) کسی نہ کسی کام میں مصروف رہینگے اور وہ مصروفیت ان کے لئے کیف اور اور نشاط بخش ہوگی جس میں وہ بطیب خاطر مشغول ہونگے۔

## ش ف ع

شَفَعَ - اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْج) جوڑا بنا دینا\*\*۔ وَتَرٌ کے معنی ہیں اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور شَفَعَ کے معنی ہیں زَوْج (جفت) ہونا\*\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ شَفَعَ کے معنی کسی چیز کو اُس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں۔ اور شَفَاعَةٌ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرنے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرنے ہوئے مل جانے کے ہیں\*\*\*۔ شَفَعَةٌ کے معنی ہوتے ہیں کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا\*\*\*۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائیداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائیداد کی لگائیں\*\*۔ عَيْنٌ شَفَاعَةٌ۔

وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دیکھے۔ نَاقَتٌ شَافِعٌ۔  
وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو۔ اور دوسرا پیٹ میں ہو۔  
نَاقَتٌ شَفَوُعٌ۔ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوہنے میں دونوں وقت کا  
دودھ اکٹھا دے دے۔ الشَّفَائِعُ۔ مختلف قسم کے گھاس جو دودھ کو  
کراکٹھے اُگیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الشَّاةُ الشَّافِعُ اس بکری کو  
کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شَفَعٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا  
کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا۔ اس کے  
بعد شَفَاعَةٌ کے معنی سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص  
کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور  
اس کے حق میں سفارش کرتا ہے۔ نیز اس کے معنی دعا کرنے کے بھی آئے  
ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ۔ اس وقت کہتے  
ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ  
وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلبگار ہو۔

قرآن حکیم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ  
فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں  
ممکن ہے۔ اس اعتبار سے جماعت مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِيعٌ ہوتا  
ہے۔ یعنی اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ۔ اور اس نظام کا مرکز  
(امیر) ہر ایک کا شَفِيعٌ۔ وہ افراد کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی  
نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے۔ یہی باہمی (شفاعت) اس کی بنیادی  
خصوصیت ہے۔

اس جماعت کی یہ شَفَاعَةٌ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے۔  
اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے۔ اسکے لئے ان سے  
کہا گیا ہے کہ یہ پیرٌ وَتَقْوٰی (کشادگی اور قوانین خداوندی کے مطابق)  
کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثْمٌ وَعُدُوٌّ ان میں تعاون  
نہ کریں (۵)۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً  
مَسْنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً  
يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا (۸۵)۔ جو شخص حسن کارانہ انداز میں (اچھے کام میں)  
کسی دوسرے کے ساتھ مدد کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔  
اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی

اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص، دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائیگا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرام<sup>۳</sup> (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرم<sup>۴</sup>) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیگا۔ اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جسکی بنیاد قانون مکافات عمل پر ہے۔ مَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (۹۹:۷)۔ ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آ جاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور مد و کیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور انکی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اسکے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہونگے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰ<sup>۵</sup>) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اسکے گناہوں کا کفارہ دیکر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسول<sup>۶</sup> گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات و جرد میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے تو نبی اکرم<sup>۴</sup> سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیج دے گا حضور<sup>۷</sup> نہ سجدے سے سر اٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائیں گے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانون مکافات کی رو سے لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا تُتَبَّلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُوْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يَنْصَرُونَ (۲۸:۲۸)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جا

سکے گی نہ ہی کسی سے اسکے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکیگا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن حکریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۲۵)۔ ”وہ کون ہے جو اسکے پاس اسکے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔“ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے اور حضورؐ اپنی است کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کرینگے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اسلئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانون مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن حکریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہذا اگر قانون مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن حکریم میں موجود ہو تو اسکے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن حکریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دئے گئے ہیں۔ مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت یہ ہے ”اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے (ربوبیت عامہ کیلئے) کھلا رکھو۔ قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خُلْفَةً وَلَا شَفَاعَةً“ (۲۵۳)۔ جس میں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خریدی جا سکے گی۔ نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئیگی۔ اور نہ ہی کسی کی شفاعت۔ اسکے بعد اگلی آیت میں ہے مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۵۵)۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائیگی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانون مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن حکریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کیلئے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، ملزم ہونا ہے۔ مستفیث ہونا ہے۔ گواہ ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن حکریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہوگا وہ عدالت کے کٹھرے میں اکیلا کھڑا ہوگا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فَرَادٰی ..... وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شَفَعَاءَ كُمْ... (۹۵)۔ تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے .... تمہارے ساتھ

کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور ”پولیس کا سپاہی“، تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائیگا۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ... (۲۱)۔ ”ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا“۔ اس کے علاوہ گواہ بھی ہونگے۔۔۔۔۔ وَشَهِيدٌ (۲۱)۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائیکا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائیگی۔ یہ ہیں وہ شَفِيعٌ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۵۵)۔ ”وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے“، یہ گواہ رسول بھی ہونگے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَنْقُولُ مِمَّا ذَا أُجِبْتُمْ (۱۰۹)۔ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کریگا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اس طرح بلائی جائیں گی۔ يَوْمَ يَقُومُ الشُّرُوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا (۲۸)۔ جس دن ”اَلرُّوْحُ“ اور ملائکہ، صف باندھے کھڑے ہونگے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے،۔ لہذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دیدینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اسکی وضاحت خود قرآن نے کردی ہے جہاں فرمایا وَلَا يَمْلِكُ الْفَئِیْنُ يَدْعُوْنَ مِیْنُ دُوْنِهِ اَلشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ۔۔۔۔۔ (۲۳)۔ جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے رسول اللہ کو شَهِيدٌ کہا ہے۔ (۱۱۶)۔ شَفِيعٌ کہیں نہیں کہا۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنِ (۶۴)۔ انہیں ان کے سفارشوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی (۱۱۵)۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے۔ تِلْكَمُ الْجَنَّةُ اَوْ رِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۴) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم

ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی ہستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہینگے (۸۰)۔ اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کریگا وہ تباہ و برباد ہوگا۔ اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت کا وارث ہوگا۔ (۸۱-۸۲)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

- (۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہونگے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ مزا کا کچھ حصہ پائیگا۔
- (۲) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔
- (۳) مجرموں کا کسی کی مفارش سے چھوٹ جانا، یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کونسا مفہوم منظور ہے۔

سورة الفجر میں ہے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹)۔ اس کے معنی ہیں وہ ستارے جو ملکر رہتے یا چلتے ہیں اور وہ جو الگ الگ رہتے یا چلتے ہیں۔ یعنی اکٹھے نظر آنے والے اور الگ الگ دکھائی دینے والے ستارے۔

## ش ف ق

الشَّفَقِ - وہ سرخ جو غروب آفتاب سے شروع ہو کر کچھ دیر بعد تک رہتی ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَفَقٌ، غروب آفتاب کے وقت، دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں ملنے کو کہتے ہیں۔ نیز کنارہ کو بھی شَفَقٌ کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۸۴)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں رقت (کمزوری) کے ہونے ہیں۔



الشَّفِيقُ - الشَّيْفَقَةُ - کسی کے ساتھ بہت زیادہ خیر خواہی کی بناء پر اس قسم کا ڈر کہ اسے کہیں یہ نہ ہو جائے اور وہ نہ ہو جائے - أَشْفَقَ مِنْهُ - اس سے ڈرا - گھبرایا - أَشْفَقَ عَلَيْهِ - محبت کی وجہ سے اسکی دیکھ بھال کی اور اس پر کوئی تکلیف آنے سے ڈرتا رہا \* - ایسے خیر خواہ کو مُشْفِقٌ اور شَفِیقٌ کہتے ہیں - چونکہ خوف، کمزوری کی علامت ہوتا ہے اس لئے الشَّيْفَقَةُ کمزوری کو بھی کہتے ہیں - ثوبٌ شَفِیقٌ - کمزور کپڑا \*\* - چونکہ اس میں خوف اور کمزوری کا پہلو ہوتا ہے اسلئے اس صفت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے -

راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد مین آئے تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور فی آئے تو خیر خواہی اور مہربانی کا پہلو نمایاں \*\*\* - لیکن تاج نے اسی عبارت میں بجائے فی کے عَلٰی لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے -

سورة احزاب میں ہے أَشْفَقْنَ مِنْهَا (۳۳) - انہوں نے اس سے خوف کھایا - وہ حملِ امانت (امانت میں خیانت کرنے) سے ڈر گئے - سورة انبیاء میں ہے وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ (۲۱) - وہ اس (کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج) سے ڈرتے ہوئے اس سے خوف کھاتے ہیں - یعنی وہ اپنی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس قانون کا اتباع کرتے رہیں -

## ش ف ہ

شَفَّهَ عَنْهُ شَفَّهًا - اس نے اسے کسی کام میں لگا کر اس کی توجہ دوسرے کاموں سے ہٹا دی - شَفَّهَ - اس کے ہونٹ پر مارا - شَفَّهَ - اس سے بالمشافہ بات کی - شَفَّةٌ ہونٹ - دو ہونٹوں کو شَفَّتَانِ اور شَفَّتَيْنِ کہہ کر جمع شِفَاہ اور شَفَوَاتُ آتی ہیں \* -

قرآن کریم میں شَفَّتَيْنِ (۹) - دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ الشَّفَّةُ کے مادہ میں آخری حرف واو بھی ہو سکتا ہے اور ہاء بھی جو محذوف ہے \*\*\*\* -

بعض علمائے لغت نے شَفَّةٌ کی اصل شَفَوٌ قرار دی ہے - اس لئے ہم نے اسے ش - ف - و میں بھی لکھا ہے - وہاں بھی دیکھ لیا جائے -

## ش ف و

الشَّفَا - چیز کا کنارہ - ہر چیز کی حد - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ شَفَا (ش - ف - و) سے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں فاء - باء سے بدلی ہوئی ہو - یعنی شبا بدل کر شفا ہو گیا ہو - جب سورج غروب ہو رہا ہو تو کہتے ہیں مَا بَقِيَ مِّنْهُ إِلَّا شَفَا - یعنی اس کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے \* - اس سے اس کے معنی ہلاکت سے قریب ہونے کے آتے ہیں - شَفَتِ الشَّمْسُ - آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا \*\* -

قرآن کریم میں ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ (۱۰۶) کرتے ہوئے ساحل کے کنارے پر - نِزْ شَفَا حُفْرَةٍ (۱۰۴) - گڑھے کے کنارے پر -

الشَّفَةِ - ہونٹے کو کہتے ہیں جس کی جمع شَفَوَاتٌ اور شِفَاهٌ \* آتی ہے - اس سے مُشَافَهَةٌ منہ در منہ بات کرنے کو کہتے ہیں \*\* - قرآن کریم میں شَفَتَيْنِ (۹) - دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے (الشَّفَةِ) میں واو محذوف ہو اور یہ بھی کہ ہاء محذوف ہو - (نیز دیکھئے عنوان ش - ف - ہ)

## ش ف ی

شَفَاهٌ - يَشْفِيهِ - شِفَاءٌ - اسے شفاء دی ، بیماری سے ٹھیک کیا - الشِّفَاءُ کے معنی بیماری سے اچھا ہونے کے ہیں - پھر اسے دوا اور علاج کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے \*\* - قرآن کریم میں یہ لفظ مرض کے مقابلہ میں آیا ہے - وَأَذْكَأَ مَرَضَاتٍ فَهُمْ يَنْشَفُونَ (۲۱) - ”جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے“ - اور دوا کے معنوں میں بھی - فَبِئْسَ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ (۱۹) - اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کنارے پر آجانے اور اوپر سے جہان کنے کے ہیں - اس کا خیال ہے کہ شفاء مرض پر غالب آنے کی وجہ سے شفاء کہلاتی ہے -

## ش ق ق

شَفَقَ - يَشْفُقُ - شَفَقًا - کمی چیز کو پھاڑنا - اس میں شَقٌّ کرنا انشَقَّ - پھٹ گیا - الشَّقُّ - صبح \*\* - انشَقَّتِ الْعَصَا - شیرازہ بکھر گیا -

باہمی اختلافات شروع ہو گئے۔ شَقَّیَّ عَصَا الْمُسْلِمِیْن - اس نے مسلمانوں کی جماعت اور ان کی وحدت میں افتراق و انتشار پیدا کر دیا۔ اَلْمُسْتَقَاتَّةُ وَالشَّقِیْقَاتُ - مخالفت - عداوت - باہمی اختلاف\* - شَقِیٌّ - مشقت - صعوبت - کوفت - پوری قوت لگانے اور تک و دو کرنے سے تھک جانا - تَکَانَ - شَقَّیَّ عَلَیْهِہِ الْاَمْرُ - معاملہ اس پر گراں گزرا - شَقَّیَّ عَلَیْهِہِ - اسے مشقت میں ڈال دیا\*۔

اَلشَّقِیْقَةُ - مسافت کا بُعد - سفر - بعید\* (۳۴) - وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔

قرآن کریم میں پتھروں کے پھٹنے کے لئے شَقَّیَّ اور چشموں کے پھوٹنے کے لئے فَجَّرَ کے مادے آئے ہیں (۲۴) - سورۃ ص میں شَقِیْقَاتُ (۳۸) مخالفت کے معنوں میں آیا ہے - اور (۵۶) میں شَقِیْقَاتُ مخالفت اور اختلاف کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - سورۃ عبس میں ہے ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقَقًا (۸۶) - ”پھر ہم زمین کو محسوس طور پر پھاڑتے ہیں“ - سورۃ قصص میں ہے وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اَشْقِیَّ عَلَیْکَ (۲۸) - میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی سختی کروں یا کٹھن ذمہ داری ڈالوں - سورۃ نحل میں شَقِیَّ کے معنی مشقت کے آئے ہیں (۱۶)۔

شَقِیْق کے معنی ہیں مخالفت کرنا - عداوت کرنا - جداگانہ روش اختیار کرنا - مَنْ یَشَقِیْقِ الرَّسُوْلَ (۱۱۵) - شَقِیْق\* - اختلاف ایک دوسرے سے جدا ہو جانا (۳۵) - قرآن کریم میں ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَ الْقَمَرُ (۵۳) - انقلاب کی گھڑی قریب آئی اور ”القمر“ شق ہو گیا - اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق - م - ر) دیکھئے۔

## ش ق ی (و)

اَلشَّقَاءُ - شدت اور تنگی - نامرادی اور محرومی - شَقِیٌّ - یَشَقِیُّ - شَقَاوَةٌ - شَقِیْقَةٌ - بد بخت اور بد نصیب ہونا - شَقَاوَةٌ - سعادت کی ضد ہے اور چونکہ شقاوت میں کوفت اور تھکن ہوتی ہے اس لئے کوفت اور مشقت کو بھی شَقَاوَةٌ کہہ دیتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت و مشقت برداشت کرنا ہیں - نیز یہ سہولت، نرمی اور سعادت و خوش بختی کی ضد ہے - اَلْمُسْتَقَاتَّةُ - مصیبت جھیلنا - سختی برداشت کرنا - اَلشَّقِیْقِیْنِ اَلْجِیْمَالِ - ایسا پہاڑ جو اوپر سے باہر کی طرف نکلا اور جھکا ہوا ہو اور جس پر چڑھنا بہت مشکل ہو۔

قرآن کریم میں شقیّیؑ و سَمِیْنِدْ (۱۱۵) آیا ہے۔ یہاں شقاوت، سعادت کی ضد ہے۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کا قول ہے کہہ وَاکُنْ بِدُعَايِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۱۹)۔ یہاں محرومی و ناامدادی مراد ہے۔ سورۃ طہ میں ہے مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (۲) ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ تو زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ کر مشقتوں میں پڑھ جائے۔ اس ”تَشْقَىٰ“ کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوا ہے جہاں آدم سے کہا گیا ہے کہ اس جنت میں تیرے لئے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے موجود ہے (۲۸)۔ لیکن اگر تو ابلیس کی باتوں میں آ گیا تو یہ تجھے اس جنت سے نکال دیگا۔ فَتَشْقَىٰ (۳۰)۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو اس تمام سامان سے محروم رہ کر جگر پھاش مشقتوں میں پڑ جائیگا۔ سورۃ اللیل میں ہے کہ جہنم میں وہ جاتا ہے جو أَشْقَىٰ (۱۵) ہوتا ہے۔ بہت ہی ناامداد و ناکام، بدنصیب۔ لیکن اس کے مقابلہ میں أَتَقَىٰ (۱۶) آیا ہے۔ اس لئے أَشْقَىٰ کے معنی سرکش کے بھی ہو۔ کتنے ہیں سورۃ مریم میں جَبَّارًا شَقِيًّا (۱۹) آیا ہے۔ سورۃ المؤمنوں میں جہنمیوں کے متعلق ہے کہ وہ کہیں گے کہ عَلِمَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳) ہماری بد بختی ہم پر غالب آ گئی۔ یاد رہے کہ یہ محرومی اور بد بختی، انسان کے اپنے اعمال کے نتیجہ کا نام ہے۔ خوش بختی یا بد بختی انسان کے لئے ”مقدر“ نہیں ہوتی۔

## ش ک ر

الشَّكْرُ - اس مادہ میں اصلی معنی بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں \*\*۔ ابن فارس نے اس کے مختلف بنیادی معنی بتائے ہیں جن میں سے ایک، کسی چیز کا بھرا ہوا ہونا اور مقدار میں کثیر ہونا بھی ہیں۔ شَكْرَتِ النَّاقَةِ - اونٹنی کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ الشَّيْشَكَارُ - اس دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں جسے اگرچہ چارہ کم ہی ملے لیکن اس کے تھن دودھ سے بھرے رہیں۔ ضَرْبَةٌ شَكْرِيٌّ - دودھ سے بھرپور تھن۔ الشَّيْكَرَةُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسکے تھن دودھ سے بھرے ہوں \*\*\*۔

شَكْرَتِ الشَّجَرَةِ - درخت کے تنہ پر ٹہنیاں نکل آئیں۔ اِشْتَكْرَتِ السَّمَاءُ - بارش خوب زور سے برسی۔ اِشْتَكْرَتِ الثَّعْرَةُ وَالْبَرْدُ - سردی اور گرمی بھر پور ہو گئی۔ شَكْرَ فُلَانٍ - اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا۔ صَائِبُ تَاجِ الْعُرُوسِ کے نزدیک انسان کی

طرف سے شُکْر کے معنی اطاعت و ادائے فرائض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار، اور خدا کی طرف سے شُکْر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا، یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہیں۔ (مثلاً کوئی شخص اگر اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ہے تو اس کی یہ قربانی، اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دیدے۔ یہ مطلب ہے ”تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے“ کا)

شُکْر کے بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے ”سعی مشکور“ کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ یعنی ایسی کوشش جسکے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ ایسے بھرپور جیسے بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔ شاکِر (فَارِنْ اللّٰہ شاکِر عَلَیْہِمْ - ۱۵۸)۔ وہ ہے جو کسی کی کوشش میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ اور وہ بھی جسکی کوششیں اس طرح بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔ اسی طرح سورۃ زمر میں شُکْر کا لفظ ضبط اعمال (اعمال کے رائیگاں جانے) اور خُسْر کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۱۵۹-۱۶۰)۔ اس شخص کو شکوہ نہ ہو بھی کہا گیا ہے جسکی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں (۱۶۰)۔ صیغہ کے لحاظ سے شُکْر میں شاکِر سے زیادہبالغہ پایا جاتا ہے۔

چونکہ شُکْر کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ہیں اس لئے اس کے مقابلہ میں کُفْر کا لفظ آیا ہے (۱۶۰) جسکے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَ اَشْكُرْ وَاَلِیْ وَلَا تَكْفُرْ وَن (۱۶۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ اس سے نوع انسانی فائدہ اٹھائے۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو۔

خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے پہلے وہ صلاحیتیں آتی ہیں جو خود انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا (اور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا) ان کا شُکْر ہے۔ اور یہ چیز اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال صالحہ خدا کی نعمتوں کے شُکْر کا موجب بنتے ہیں۔ سورۃ احقاف میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جب کہا گیا ہے کہ ہم دھماکا کرو (اسکی آرزو کیا کرو) کہ رَبِّ اَوْزَعْنِیْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَکَ .... وَاَنْ اَعْصِلَ صَالِحًا (۱۶۱)۔ اے میری نشوونما دینے والے مجھے توفیق عطا کر دے کہ میں تیری دی ہوئی نعمتوں کا ”شکر“ کروں۔ یعنی میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ

مَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَسِيدٌ (۳۱) - جو خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھتا ہے اس سے خود اسکی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور جو ان پر پردے ڈالتا ہے تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خود اسکا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا اپنی ذات میں قابل حمد و ستائش ہے۔ تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں ہے۔

خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں خدا کے قانون کے مطابق صرف میں لایا جائے۔ یعنی نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائے۔ اس حقیقت کو سورۃ نحل میں ایک بستی کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ اس بستی میں رزق کی بڑی فراوانی تھی لیکن فکفرت بیکانعمہ للہ (۱۱۳)۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں پر پردے ڈالنے شروع کر دیے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب آگیا۔ ان کی طرف خدا کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ اس کے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ (۱۱۳)۔ تم خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنا۔ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُونَ (۱۱۳)۔ اگر تم صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرتے ہو تو۔ اس سے ظاہر ہے کہ شکر نعمت کے معنی ہیں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (حسامان رزق وغیرہ) کو خدا کے قانون کے مطابق عام رکھنا۔ اور کفر نعمت کے معنی ہیں انہیں اپنے خود ساختہ قوانین و نظریات (بیمہ کائنات) یا بَصْنَعُوا (۱۱۳) کے مطابق چھپا چھپا کر رکھنا۔ اسی کو سورۃ اہراف میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ شاکرین یٰۤاٰیُّہا کہ وہ ہیں جو ابلیس کی راہوں پر نہیں چلتے اور اس کے دام فریب میں نہیں آتے (۱۷)۔

سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ تُمْ بِعَعْتِنَاکُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَتَعْلَکُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲)۔ ہم نے تمہیں موت کے بعد نئی زندگی عطا کی تاکہ تم ”شکر کر سکو“۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوموں کو ان کی موت کے بعد حیات نو اس لئے ملتی ہے کہ وہ اپنی مضر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر سکیں۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندہ نہیں کھلا سکتیں۔ نہ ہی زندہ رہ سکتی ہیں۔

تصنیفات بالا سے واضح ہے کہ۔

(۱) مساعی کے مشکور ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان میں بھرپور نتائج

پیدا ہو جائیں۔ وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو جائیں۔

(۲) انسان کی طرف سے شُکْر کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنی

(الف) وہ اپنی مضر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرے اور

(ب) کائنات میں پھیلے ہوئے سامانِ نشوونما کو نوعِ انسانی کی پرورش

کیلئے کھلا رکھے۔ ان پر پردے نہ ڈالے۔

(۳) یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کی پوری پوری

اطاعت کرے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ انسان کی طرف سے شُکْر ہوگا۔ اور

(۴) خدا کی طرف سے شُکْر کے معنی یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال

میں بھر پور نتائج پیدا کر دے۔ یہ قانونِ خداوندی کی خصوصیت ہے کہ جو اسکے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

سورة الدهر میں ہے اِنْقَاهِدْ يَنْه السَّقِيلُ اِمَّا شَارِكًا وَاِمَّا

كَفْتُوْرًا (۱۳۰)۔ ہم نے انسان کو (وہی کے ذریعے) صحیح راستہ دکھا دیا

ہے۔ اب اسکی اپنی مرضی ہے کہ چاہے اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے

انکار کر دے۔ یہاں شُکْر سے مراد کسی بہت بڑی نعمت کی قدر کرنے

ہوئے اسے اختیار کر لینا ہیں۔ سورة نساء میں ہے اِنْ شُكِرْتُمْ وَاَمْسَتْكُمْ

(۱۳۱)۔ اگر تم اس ہدایت کی قدر کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ (۱۳۲) میں

شُکُوْر بمعنی شاکر استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ غریب القرآن (مرزا

ابوالفضل) نے لکھا ہے کہ اسکے معنی حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ

اٹھانا بھی ہیں۔ مثلاً سورة مہم میں ہے لَاعْمَلُوْا اِلَّا دَاوُدَ شُكْرًا (۱۳۳)۔

اے آلِ داوُد تم حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (ہمارے

قانون کے مطابق) عمل کرو۔ یعنی کائنات کی قوتوں اور مختلف اسباب و ذرائع

سے فائدہ اٹھانا، ان کا شکر ادا کرنا ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنوں میں تھوڑی چیز پر

اکتفا کر لینا بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن شُکُوْر اس گھوڑے کو کہتے

ہیں جسے قربی کی بنا پر تھوڑا سا چارہ بھی کافی ہو جاتا ہو۔ صلاحیتوں کے

نشوونما پا جانے سے خود بخود یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے

خارجی سہارے بھی بھر پور نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔

## ش ک س

شُكَاْسَةٌ اِلَّا خَلَاقٍ۔ اخلاق کا درشت اور تنگی ہونا۔ شاکسہ

اس نے اس سے تنگی کا ہر تاؤ کیا۔ اَللَّيْلُ وَالنَّهَارُ يَتَشَاكَسَانِ۔ دن

اور رات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ تَشَاكَتُوْا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی۔ یا انہوں نے ایک دوسرے سے لین دین اور خرید و فروخت کے معاملہ میں تنگی کا برتاؤ کیا\*۔

قرآن کریم میں ہے شَرَّكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ (۳۹)۔ کاروبار میں حصے دار جو تند خوئی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں اور معاملات میں تنگ نظری کا ثبوت دیں۔

## ش کی ک

الشَّكَّ - یقین کی ضد ہے۔ راعِب نے کہا ہے کہ جب دو متضاد چیزیں کسی شخص کی نگاہ میں ایک جیسی اور یکساں ہو جائیں تو اس کیفیت کو شَكَّ کہتے ہیں\*\*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس طرح عیلم سے یقین کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح شَكَّ سے رَیْب کی ابتدا ہوتی ہے (دیکھئے عنوان ر۔ ی۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ شَكَّ سُرَیْب\* تو کہتے ہیں لیکن رَیْب سُرَیْب\* شَكَّ کہتے نہیں کہتے\*\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی چیزوں کا ایک دوسری میں گھس جانا اور داخل ہو جانا بتائے ہیں، چنانچہ شَكَّكَتْهُ بِالرَّسْعِ کے معنی ہیں میں نے اس کے بدن میں نیزہ گھسا دیا۔ اسی سے شَكَّ ہے کہ اس میں دو چیزیں ایک دوسری میں گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے یقینی شکل جدا گانہ اور واضح نہیں ہوتی\*\*\*\*۔ راعِب نے لکھا ہے کہ شَكَّكَتْ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز میں آ پار سوراخ کر دیا اور جب کسی چیز میں یہ کیفیت ہوگی تو اس میں قرار و ثبات نہیں ہو سکے گا اور اس پر پختگی سے بھروسہ نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ خیال بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ شَكَّ سے استعارہ ہو جس کے معنی ہیں بازو کا پہلو سے چمٹ جانا۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ایک دوسرے سے مخالف چیزوں کا باہم گر مل جانا اور اس طرح عقل و فہم کو ان کے درمیان داخل ہو کر ان میں سے ایک چیز کو جدا گانہ دیکھنے کا موقع نہ ملنا\*\*\*\*\*۔ شَكَّوْا یَسُوْتْہُمْ کے معنی ہیں انہوں نے اپنے تمام مکانات ایک جیسے بنائے\*۔

ان مثالوں سے شَكَّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی دو متضاد باتوں کا یکساں محسوس ہونا اور اس لئے انسان کا کسی صحیح فیصلہ تک نہ پہنچ سکتا۔



حضرت عیسٰیؑ کے واقعہ صلیب کے ضمن میں کہا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفْتُمْوَا فِيهِدَلِيفِي شَكِّب مِئْنَهٗ (۱۵۷)۔ اس سے شک کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی وَلٰكِنْ شُبَّيْهَ لَهُمْ (۱۵۷)۔ حضرت عیسٰیؑ میں، اور جس شخص کو انہوں نے گرفتار کیا، اس میں ایسی باہمی مشابہت تھی کہ ان پر اصل حال مشتبہ ہو گیا۔ یہ وجہ ہے کہ وہ اس کی بابت شک میں ہیں کہ انہوں نے سمجھا کیا اور دراصل ہوا کیا تھا۔ (تفصیل میری کتاب ”شعلہ“ مستور“۔ ذکر حضرت عیسٰیؑ میں ملیگی)۔

## ش ک ل

الشَّيْئَلُ - (ش پر زیر اور زیر کے ساتھ) کسی کی مثل۔ اُس جیسا۔ رِیْ فِی فُلَانٍ شَکْلٌ مِّنْ اَبِیْہٖ۔ فلان آدمی میں اپنے باپ سے مشابہت ہے۔ سورۃ ص میں ہے وَ اٰخِرٌ مِّنْ شَکْلِہٖ اَزْوَاجٌ (۳۸)۔ اُسی قسم کی، اُس سے ملتی جلتی رنگا رنگ کی اور سزائیں۔ اس کی جمع اشْکَالٌ آتی ہے جسکے معنی مختلف معاملات اور ضرورتیں ہیں۔ شَکْلٌ اَلَا مَرٌ۔ معاملہ گڈ مڈ اور مشتبہ ہو گیا۔

الشَّيْکَالُ - اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں باندھی جائیں تاکہ وہ اس حد تک قدم اٹھا سکے جس تک یہ رسی اجازت دے۔ شَکْلٌ الدَّابَّةُ۔ اس نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر الفاظ کے معانی مماثلت اور باہمی مشابہت سے ماخوذ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شَکَلْتُ الدَّابَّةَ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جانور کی ایک ٹانگ کو اس جیسی دوسری ٹانگ سے باندھا جاتا ہے۔ الشَّيْکَالُ رِیْ الرَّحْلِ۔ وہ رسی جس سے کجاوہ کے اگلے اور پچھلے بندھنوں کو ملا کر باندھا جاتا ہے۔ یہ اسم آلہ ہے۔ اسی مادہ سے اسم فاعل شَاکِلٌ ہے جس کی مؤنث شَاکِلَةٌ ہے۔ اس کے معنی ہوئے باندھنے والی۔ یہ وہی چیز ہے جسے شیکال کہتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے قُلْ كُلٌّ یَّعْمَلُ عَمَلٰی شَاکِلَتِہٖ (۱۷)۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اس کی ممکنات (Potentialities) رکھدی گئی ہیں۔ آم بجی گٹھلی میں یہ اسکا قوت رکھدی گئی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما کے بعد آم کا درخت بن جائے جس میں آم جیسا بیٹھا، خوشبودار، رنگین پھل آئے۔ لیکن کیمکر (بول) کا بیج اگرچہ

درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں۔ ام کی گتھلی کا منتھی (Inner-Destiny) ام کا پھل ہے۔ کیکر کے بیج کا منتھی کانٹے دار درخت۔ ان میں سے کوئی شے اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کا اسکاں اسکے اندر ہوتا ہے، جس طرح ایک جانور اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس تک اس کی شاکلۂ اسے پہنچنے دیتی ہے۔ مندرجہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اپنی شاکلۂ کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ فطرت نے اس کا جو منتھی معین کر دیا ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی شاکلۂ متعین ہوتی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اسکے ممکنات کی بھی ایک انتہا ضرور ہے لیکن زندگی کی موجودہ اسٹیج اسکی آخری حد نہیں۔ یہ اَقْطَارُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵/۳۳) سے بھی آگے جاسکتا ہے۔ لیکن سوروی اثرات، ابتدائی ماحول، تربیت، تعلیم، جذباتی رجحانات وغیرہ وہ رسیاں ہیں جن سے اسکا پاؤں بندھ جاتا ہے۔ لیکن صحیح معاشرہ ان رسیوں میں وسعتیں پیدا کر سکتا ہے۔ قرآن کریم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کی مضر صلاحیتیں کامل نشو و نما پا جائیں۔ اس معاشرہ میں جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہ درحقیقت اس کی ذات کی صلاحیتوں کی وسعت کے لئے ہوتی ہیں۔ لَا يَسْكُفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲۸۶/۲) کا یہی مفہوم ہے۔ قرآنی معاشرہ میں ہر فرد پر اس کی شاکلۂ کے مطابق ذمہ داری عائد کی جائیگی اگرچہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کی حدود کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔ حیوان کے بچے کی نشو و نما کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے باپ جیسا ہو جائے۔ لیکن انسانی بچہ مناسب نشو و نما سے اپنے اسلاف سے کہیں آگے جاسکتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ موجودہ دور کا انسان بہ عیشت مجموعی اپنی سابقہ نسلوں سے کہیں آگے ہے۔ اسی طرح آنے والے دور کے انسان موجودہ زمانے کے انسان سے آگے جاسکتے ہیں، اس طرح، جہاں ایک دور میں مختلف انسانوں کی مضر ممکنات مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نسلِ انسانی کی ممکنات مختلف ہوتی ہیں۔ اور علم و شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ممکنات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسکی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ (واضح رہے کہ ان ممکنات سے مراد انسانی ذات کی خصوصیات ہیں جو ہر فرد میں ہمیشہ یکساں ہوتی ہیں۔)

صاحب لطائف اللغہ نے لکھا ہے اَلشَّوَاكِلُ (جو شاکلۂ کی جمع ہے) ان راستوں کو کہتے ہیں جو ایک شاہراہ سے پھوٹ نکلیں۔ (نیز تاج)۔ اس سے مراد زندگی کی مختلف راہیں اور انسانوں کے مختلف طور طریق ہیں جن پر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق چلتے ہیں۔

یاد رہے کہ انسانی اختیارات کی ایک حد ضرور ہے (جس طرح وہ ایک پاؤں اٹھا کر تو کھڑا رہ سکتا ہے لیکن دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا)۔ لیکن جس حد تک ایسے اختیار دیا گیا ہے اس میں وہ بالکل آزاد ہے۔ اس کے اختیار و ارادہ میں کوئی دخل انداز نہیں ہوتا۔ (مزید تفصیل ق۔ د۔ ر کے عنوان میں دیکھئے)۔

## ش ک و (ی)

شَکْوَةٌ - مشک یا چمڑے کا تھیلا جو پانی یا دودھ رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور جسکا صرف ایک طرف سے منہ کھلا ہوتا ہے۔ شَکْوٌ کے معنی ہیں اس مشکیزہ کا منہ کھول دینا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہو وہ باہر آجائے، یا ظاہر ہو جائے۔ اس سے شِکَايَةٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنے دل کی بات کو ظاہر کر دینا \*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنے پرانے حال کے اظہار کے ہیں \*۔ سورۃ یوسف میں ہے اِنَّمَا اَشْكُوْ بَثِيٍّ وَّ حَزْنِيٍّ اِلَى اللّٰهِ (۱۲/۸۶)۔ میں اپنی پریشان حالی اور رنج و غم کا اظہار اپنے خدا سے کرتا ہوں۔ دوسری جگہ ہے وَ تَشْتَكِيْ اِلَى اللّٰهِ (۵۸/۲۱)۔ ”وہ اللہ سے اپنی حالت کا اظہار کر رہی تھی“۔ اسی مادہ سے اَلشَّكْوَةُ ہے جس کے معنی ہیں دیوار میں ایسا موخلہ جو آ رہا نہ ہو۔ طاق \*۔ بعض نے اس کے معنی چراغدان کئے ہیں۔ (۲۵/۳۵)۔ اَلشَّكْوَى - شکایت \*\*۔

## ش م ت

تَشْمِيتُ الدُّعْدِ وَ تَشْمَاتَةٌ - کسی کے دشمن کا اس کی مصیبت پر خوش ہونا۔ اَشْمَتَهُ بَعْدَ وِجْمٍ - اس کے دشمن کو تکلیف پہنچا کر اسے خوش کیا، \*\*\*۔ جب حضرت موسیٰؑ فرط غضب میں حضرت عارونؑ کا سر ہکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچنے لگے تو حضرت عارونؑ نے ان سے کہا تھا قَلَّا تَشْمِيتُ بِيْ اَلْاَعْدَاءَ (۲۵/۶۰)۔ تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے اور خوش ہونے کا موقع نہ دے۔ وِجْمٌ التَّشْمِيتُ - چھینکنے والے کو دعا دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اس دعا سے شمات کو اس سے دور کرنا مراد ہوتا ہے۔ جیسے تَمْرِيْضُ کے معنی مرض کو دور کرنا ہوتے ہیں \*\*\*\*۔

## ش م خ

شَمَخَ الْجَبَلُ - پہاڑ کا بہت بلند اور لمبا ہونا۔ الْجِبَالُ الشَّوَامِخُ - بہت بلند اور لمبے پہاڑ۔ شَمَخَ الرَّجُلُ بَيَافِقِهِ - اس

آدسی نے اپنی ناک چڑھائی - تکبر کیا \* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا اور بلند ہونا بتائے ہیں - قرآن کریم میں رَوَّاسِي شَمِخَاتٍ (۴۴) آیا ہے - اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑ -

## ش م ز

الشَّمَمُ - نفس انسانی کا ناخوش آئند چیزوں سے متنفر ہونا - تَشَمُّزٌ وَجْهُهُ - اس کا چہرہ بگڑا، متغیر اور منقبض ہو گیا - لَشَمًا زٌ - ڈرنا اور گھبرانا - رونگٹے کھڑے ہو جانا، منقبض ہونا، گٹھٹ جانا، تنگی محسوس کرنا - لَشَمًا زٌ الشَّقِي - اسنے اس چیز کو ناپسند کیا - اَلْمُشْمِيزُ - متنفر - ناپسند کرنے والا - دھشت زدہ \* -

سورة زمر میں ہے اِذَا ذُكِّرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَتْ قُلُوبُ الَّذِيْنَ لَا يَتُومِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ (۳۵) - جب ان لوگوں کے سامنے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں - وَاِذَا ذُكِّرَ الَّذِيْنَ مِيْنٌ دُوْنِهِ اِذْآهَمُ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۶) اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں - انسان شخصیت پرستی سے خوش ہوتا ہے اور خالص قانون کی اطاعت اس پر شاق گزرتی ہے - اس لئے کہ انسانوں کو جذبات کی رو سے خوش کر لینا آسان ہوتا ہے اور قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا - قرآن کریم نے جو دین نوع انسانی کیلئے تجویز کیا ہے اس میں خالص قانون خداوندی کی اطاعت مقصود تھی - شخصیت پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں - لیکن انسانی آمیزشوں نے اس دین کی حالت یہ کر دی ہے کہ کوئی بات لیجئے، اسکی آخری سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے - خدا کا قانون (قرآن کریم) بہ حیثیت آخری سند (Final Authority) کے کہیں نہیں آتا - حتکہ اگر کسی کو ان ارباب من دون اللہ سے الگ کر کے خالص اطاعت خداوندی کی دعوت دی جائے تو وہ اس داعی کا سخت مخالف ہو جاتا ہے - یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت میں) توجہ دلائی ہے -

## ش م س

الشَّمْسُ - آفتاب (۲۸) دھوپ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگ برنگ اور متلون ہونے اور کم قرار پکڑنے کے ہیں - الشَّمْسُ مِيْنٌ الدَّوَابِّ وہ چوپایہ جسے قرار نہ ہو - آفتاب کو بھی الشَّمْسُ

اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ دھوپ کی گرمی۔  
لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمُورًا (۹۶)۔

مَطْلِعُ الشَّمْسِ (۹۷) وہ مقام جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا معلوم ہو۔  
انتہائی شرقی سمت۔ مَغْرِبُ الشَّمْسِ (۹۸)۔ وہ مقام جہاں سورج غروب  
ہوتا نظر آئے۔ انتہائی مغربی سمت۔

صاحبِ غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ  
تھا جس طرح عرب جاہلیت کا قومی نشان قَمَرٌ تھا \*\*۔ (اس اعتبار سے قَمَرٌ  
اور شَمْسٌ کے معنی کیلئے ق۔ م۔ رکا عنوان دیکھئے)۔

ابن کلبی نے کہا ہے کہ الشَّمْسُ ہر آنے زمانے کے ایک بت کا نام  
ہے \*\*\*۔ (شاید اسی کی طرف نسبت کر کے عرب عبد شمس نام رکھتے تھے)۔  
بعض کا خیال ہے کہ شَمْسٌ ایک مشہور چشمہ کا نام تھا \*\*\*۔

## ش م ل

الشِّمَالُ - بائیں جانب - (يَمِينٌ کی ضد ہے) - (۱۸)۔ يَمِينٌ  
(دایاں ہاتھ) يَمِينٌ وسعدت اور خیر و برکت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے  
الشِّمَالُ (بایاں) نحوست کا نشان۔ اسی لئے کہتے ہیں زَجَرْتُ لَهْ  
طَيْرَ الشِّمَالِ میں نے اس کے لئے نحوست کے ہرندے کو جھڑکا\*۔ قرآن  
کریم میں اصْحَابُ الشِّمَالِ (۵۶) اہل جہنم کے لئے آیا ہے۔ یہی ہیں  
جن کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا (۶۵)۔ الشِّمَالُ شمالی  
ہوا، جو بالعموم سرد ہوتی ہے۔ مصر میں یہ باد شمال سرد اور خشک ہوتی ہے،  
اور اگر یہ سات دن تک متواتر چلتی رہے تو مصری کفن تیار کرنے شروع  
کردیتے ہیں کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے\*۔

الشِّمَالُ - اس غلاف کو بھی کہتے ہیں جو بکری کے تھن پر چڑھایا  
جاتا ہے\*۔ اور الشِّمْلَةُ - وہ کملی ہے جس میں انسان لپٹ جائے\*۔ راعِب  
کا کہنا ہے کہ شِمَالٌ اس کپڑے کو کہتے تھے جس سے بائیں جانب ڈھانپ لیجائے۔  
نیز الاشِّمَالُ بالشَّوْبِ کسی کپڑے میں اس طرح لپٹنے کے لئے بولا جاتا  
ہے کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے\*\*\*\*۔ پھر یہ کپڑے میں لپٹنے کے  
لئے استعمال ہونے لگا۔ اسی اعتبار سے اِشْتَمَلَ عَلٰی الشِّمْلِیِّ کے معنی  
ہوتے ہیں کسی چیز پر محیط ہو جانا، اور اسے اپنے اندر شامل کر لینا\*\*\*\*۔

\* تاج - \*\* (میرزا ابوالفضل) - \*\*\* ابن فارس - \*\*\*\* راعِب - \*\*\*\*\* محیط۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔ اَلرَّحِيمُ  
تَشْتَمِلُ عَلٰی التَّوَكُّلِ - رحم نے بچہ کو اپنے اندر لیے رکھا ہے  
(۱۳۵) میں ہے اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاَنْثَتَيْنِ - یا وہ کچھ  
جود و مادیوں کے رحموں میں ہے۔

طبیعت اور عادت کو بھی اَلشِّمَالُ کہتے ہیں۔ اسکی جمع شَمَائِلُ ہے\*۔  
ہم نے اوپر لکھا ہے کہ (i) عربوں کے ہاں یَمِیْنُ سعادت اور خوش  
بختی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اور شِیمَالُ، نحوست کی نشانی۔ اور (ii) قرآن  
کریم نے اَصْحَابُ الشِّیمَالِ - اہل جہنم کو کہا ہے اور اَصْحَابُ  
الْیَمِیْنِ اہل جنت کو۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم  
بھی سعد و نجس کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح عرب (عہد جاغلیہ  
سے) عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآن کریم، عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے  
وہ اس زبان کے الفاظ اور محاورات کو انہی معنوں میں استعمال کرتا ہے جن  
معنوں میں عرب انہیں استعمال کرتے تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن  
کریم اس وجہ یا سبب کو بھی تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر عرب کسی لفظ  
کا خاص مفہوم لیتے تھے۔ یہ بنیادی نقطہ ہے جسے ہمیشہ پیش نظر  
رکھنا چاہئے۔

## ش ن ا

شَنَّآءُ - کسی سے سخت بغض رکھنا\*\*۔ محیط نے کہا ہے کہ یہ  
ایسے بغض کو کہتے ہیں جس میں دشمنی کے ساتھ بد خلقی بھی شامل ہو۔  
قرآن کریم میں شَنَّانُ قَوْمٍ (۵۳) آیا ہے۔ یعنی کسی قوم کا شدید  
بغض یا اس کی بدترین دشمنی۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ  
(۱۴۹) - تجھ سے بغض رکھنے والے کی جڑیں کٹ گئیں۔ ابن فارس نے کہا  
ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں بغض رکھنا اور گریز کرنا پایا جاتا ہے۔

## ش ہ ب

الشَّهَبُ - سفید رنگ جس میں سیاہی کی آمیزش ہو\*۔ (تقریباً ایسا  
رنگ جیسے آگ کا شعلہ جب اپنی انتہائی حد کو پہنچ جائے تو اس کا رنگ  
سفید ہو جاتا ہے اور اس کے مرکز میں کچھ سیاہی مائل سا رنگ نظر آتا

ہے)۔ نیز وہ پہاڑ جو برف سے ڈھکا ہوا ہو۔ سَنَّةٌ شَهْبَاءٌ۔ قحط والا سال جس میں کہیں سبزی نظر نہ آئے اور زمین خشکی کی وجہ سے یکسر سفید ہو چکی ہو۔ شَهَابٌ آگ کا بلند ہونے والا شعلہ۔ وہ شعلہ جو رات کو آسمان میں دور تک جاتا نظر آتا ہے۔ (اسے ٹوٹتا تارا کہتے ہیں)۔\*\*۔

زمانہ جہالت میں لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ نجومی، ستاروں کی گردش سے انسان کی تقدیر کے زائچے بنایا کرتے تھے۔ (اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے اور علم نجوم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے)۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی باتیں دورِ جہالت میں تو چل سکتی تھیں لیکن جب دنیا میں علم کی روشنی آ جائے تو اس قسم کی ظنی اور قیاسی چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ اگر اس وقت کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو علم و یقین کا ایک ”شہابِ مبین“ اس کے پیچھے آجاتا ہے جو اس ظن اور قیاس کی قلمی کھول کر رکھ دیتا ہے۔ (۱/۸ و ۳/۹ و ۴/۲)۔

## ش ۵ د

شَهِيدٌ يَشْهَدُ کے معنی ہیں حاضر ہونا۔ موجود ہونا۔ شَهِادَةٌ۔ جو کچھ کسی کو معلوم ہو (بصارت یا بصیرت کی بنا پر) اسے ٹھیک ٹھیک طور پر حاضر (بیان) کر دینا۔\*\*۔ ایسا کرنے والے کو شَهِيدٌ اور شَهِيدٌ کہتے ہیں۔ مَشْأَدَةٌ کے معنی (اہل لغت کے نزدیک) آنکھوں سے دیکھنا ہیں۔ لیکن اس مفہوم کو وسعت دے دی جائے تو اس کے معنی ہونگے کسی چیز کا حواس کی گرفت میں آ جانا۔

قرآن کریم میں غَیْبٌ کے مقابل میں شَهِادَةٌ کا لفظ آیا ہے (۵۶/۲۴)۔ غَیْبٌ کے معنی ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو (دیکھنے عنوان غ۔ ی۔ ب) اس لئے شَهِادَةٌ سے مراد محسوس اشیاء ہونگی اور غَیْبٌ سے مراد وہ توانائیاں یا نتائج جو مضمحل ہوں۔ لہذا شَهِادَةٌ (یا مَشْهُودٌ) وہ نتائج ہیں جو مرتب ہو کر محسوس صورت میں بسے نقاب ہو جائیں۔ غَایِبٌ الْفَرَسِ گھوڑے کی اس قوت کو کہتے ہیں جسے وہ دوڑنے میں محفوظ رکھ لے اور شَهِيدٌ الْفَرَسِ اس قوت کو جسے وہ کام میں لے آئے۔ نیز شَهِيدٌ کے معنی گھر پر موجود ہونا اور غَایِبٌ کے معنی سفر میں چلے جانا ہیں۔\*\*\*۔ چنانچہ روزوں کے احکام کے ضمن میں جو آیا ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵)۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے جو

حالت سفر میں نہ ہو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ (مسافر کے لئے الگ حکم ہے)۔ اِمْرَاۃٌ مَّشْهُدٌ\*۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند گھر پر موجود ہو\*۔ مَّشْهُدٌ\*۔ حاضر عونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یا جس مقام پر تمام پوشیدہ امور اور نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں (۱۱۹)۔ یَوْمٌ مَّشْهُوۃٌ\* کے معنی ایسے وقت کے ہیں (۱۱۳)۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوۃً\* (۱۸)۔ یہاں مَّشْهُوۃٌ\* کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقائق محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ (فَجْرٌ\* کے معنی متعلقہ عنوان میں دیکھئے)۔ شَهِدَ اَعۡکَمٌ\* (۲۳)۔ تمہارے مددگار۔

خدا کو شَهِید\* اس لئے کہا گیا ہے کہ ہر چیز اس کی نگاہوں کے سامنے ہے (۲۲)۔ اور رسول اس اعتبار سے شَہید\* (۲۸) ہوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے (اسی کو نبوت کہتے ہیں) انہیں وہ دوسروں کے سامنے پوری قطعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے (اسے رسالت کہتے ہیں)۔ یا اس لئے کہ وہ اپنی جماعت کے اعمال کا نگران (شَہید\*) ہوتا ہے۔ (۲۳)۔

اَلشَّہِیۡدُ\*۔ وَالشَّہِیۡدُ\*۔ شہد (عَسَلٌ\*) کو بھی کہتے ہیں۔ جبکہ ابھی وہ چہتے سے باہر نہ نکلا گیا ہو\*\*۔

شَہِیۡدٌ\* کے معنی گواہی دینے یا تصدیق کرنے کے بھی عوتے ہیں اور قسم کھانے کے بھی۔ شَہِیۡدٌ عَلَیۡہِمْ\* (۲۱) ان کے خلاف شہادت دینگے۔ شَہِیۡدٌ عَلَیۡکَ ذَا کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کے متعلق پوری اور قطعی خبر بتا دینا\*\*\*۔ صاحب غریب القرآن (ابو الفضل) نے (ابن عباسؓ کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ شَہِیۡدٌ کے معنی فیصلہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ (مثلاً ۱۲۱ میں)۔ اس اعتبار سے اللہ شَہِیۡدٌ بَیۡنَیۡیَ وَ بَیۡنَکُم\* (۱۶)۔ کے معنی فیصلہ کرنے والا ہونگے۔ نیز اس کے معنی نگہبان کے بھی ہیں (۲۳)۔

آپنے دیکھا ہے کہ اس لفظ کے استعمال کی صورتیں کتنی ہی متنوع کیوں نہ ہوں ان میں سے ہر ایک میں، موجود ہونا۔ حاضر رہنا۔ نظروں کے سامنے رہنا یا رکھنا، کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شَہِیۡدٌ\* کہا جاتا ہے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی۔ یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا۔ ویسے معنوی اعتبار سے دیکھا جائے تو



شہید زندہ انسان بھی ہو سکتا ہے اور (جسمانی طور پر) مردہ بھی۔ جو شخص اپنے مسأمتن یہ (جس پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی عملی شہادت پیش کر دے وہ شہید ہے۔ خواہ جان سے ہو یا مال سے یا کسی اور مطلوب شے سے۔ اور پھر آخر وقت تک اس روش پر قائم رہے۔ راہ خدا میں جان دینا، اپنے ایمان کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ 'شہداء علی الناس' (۱۳۲) ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی (مختلف اقوام عالم) کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی۔ ان سب پر نگران۔ اور ان کا مرکز (رسول) ان کے اعمال کا نگران (۱۳۳)۔ غور کیجئے کہ ملت اسلامیہ کا دنیا میں فریضہ کیا تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کا مقام کس قدر بلند تھا۔ ایک وہ ملت اسلامیہ تھی اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہیں کہ دوسروں کے اعمال و کردار کے نگران و محاسب ہونا تو ایک طرف، ہم اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ ملت، قرآن کریم کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتی تھی اور ہم افسانوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

## ش ہ ر

الشَّہْرَةُ\*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی بری بات کا نمایاں اور مشہور ہو جانا۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کا استعمال مطلقاً کسی معاملہ کے واضح ہو جانے اور مشہور ہو جانے کیلئے ہوتا ہے۔ (اردو میں عام طور پر شہرت اچھی باتوں کیلئے بولا جاتا ہے اور تَشْہِيرُ بری باتوں کے لئے)۔ الشَّہِيرُ\*۔ مشہور و معروف۔ معزز\*۔ الشَّہْرُ\* چاند کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ظہور سے مہینے کی شہرت ہو جاتی ہے۔ فیز مہینہ کمو بھی شہر\* کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔ اسی سے الشَّہْرُ\* چاند کو کہتے ہیں۔ شَہْرَةٌ مَشَہْرَةٌ\*۔ اس سے ماہانہ اجرت پر معاملہ کیا\*۔ قرآن کریم میں شہْرُ رَمَضَانَ (۱۸۵) مہینے کیلئے آیا ہے جسکی جمع اشْہَرُ\* (۱۶۷)۔ اور شْہُورٌ\* ہے (۱۶۶)۔

## ش ہ ق

شَہَقَ الرَّجُلُ\*۔ شَہَقَ\*۔ شَہِقًا\*۔ اس کے سینہ میں رونے کی آواز متردد ہوئی، بار بار اٹک اٹک کر نکلی۔ شَہِقُ\* الحِمَارُ وَتَشْہَاتُہ\*۔

گندھے کے رہنکنے کی آواز۔ الشَّهْوُوقُ - بلند ہونا۔ الشَّهْوَةُ - چیخ \*۔  
 قرآن کریم میں زَفِيرٌ وَشَهِيْقٌ (۱۱۶) آیا ہے۔ اس سے مراد چیخنا چلانا  
 ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مصیبت زدہ لوگوں کی آوازوں کے لئے استعمال  
 ہوتے ہیں، اور شَهِيْقٌ کے معنی ہیں کراہنے کی بہت بلند آواز۔ یہ لفظ  
 جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ہے جس کے معنی نہایت اونچے اور لمبے پہاڑ کے ہیں  
 جس پر چڑھنا دشوار ہو \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند  
 ہونے کے ہیں۔ نیز فَلَانٌ ذُو شَاهِقٍ سے مراد ہے وہ سخت غصہ ور ہے۔  
 قرآن کریم میں جہنم کی آواز کے لئے بھی شَهِيْقٌ کا لفظ آیا ہے۔  
 (۱۷)۔ جہنمی معاشرہ میں ہر طرف چیخ پکار ہوتی ہے۔ وہ یہاں کا جہنم ہو  
 یا آخرت کا۔

## ش و

شَهَاهٌ وَاشْتَهَاهٌ - کسی چیز کی خواہش کرنا۔ اسے چاہنا۔ رغبت  
 کرنا۔ طبیعت کا میلان ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَهْوَةٌ نفس کے ان  
 چیزوں کی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں جنہیں وہ چاہتا ہے۔ کبھی اس چیز  
 کو شَهْوَةٌ کہہ دیا جاتا ہے جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو۔ اور کبھی خود  
 اس جذبہ (میلان) کو شَهْوَةٌ کہتے ہیں \*\*۔

شَيْئِي شَهِيٌّ - لذیذ چیز۔ طَعَامٌ شَهِيٌّ - وہ کھانا جو طبیعت کو  
 مرغوب ہو \*\*\*۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ الدِّنْسَاءِ (۳۳) میں، خود  
 شَهَوَاتٌ (شَهْوَةٌ کی جمع) کے معنی (راغب کے الفاظ میں) مرغوب اشیاء  
 ہیں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس میں الشَّهَوَاتُ بطور مبالغہ بمعنی  
 مَشْتَهَاتٌ (مرغوب چیزیں) ہے۔ دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔  
 یعنی مرغوب اور پسندیدہ چیزیں۔ یا میلانات۔ (۲۴) میں یہ لفظ (باقی الفاظ  
 کے ساتھ مل کر) جنسی میلان کیلئے آیا ہے۔

جنتی زندگی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي  
 أَنْفُسُكُمْ (۳۱)۔ اس میں ہر مرغوب خاطر شے میسر ہوگی۔ جو کچھ  
 تمہارا دل چاہے۔

سورۃ مریم مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد، فَخَلَفَ مِنْ بَعدِ هِمِّ  
 خَلَفَ أَضَاءُ وَالصَّلَاةِ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹) ان کے بعد ایسے لوگ آگئے

جنہوں نے صلوة کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلیں (دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و) وہ اپنے جذبات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اگر انسانی خواہشات کو وحی کی روشنی میں پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ جنتی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے لیکن اگر انہیں وحی کی پابندیوں کو توڑ کر پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۱۶)۔ [نیز دیکھئے عنوان ہ۔ و۔ ی]

## ش و ب

الشَّوْبُ\*۔ خلط ملط کرنا نیز آمیزہ (پانی دودھ وغیرہ کا)۔ شَابُ الشَّيْءِ شَوْبًا۔ اس نے اس چیز کو خلط ملط کر دیا۔ ملا دیا۔ اس اعتبار سے الشَّوْبَةُ دھوکے اور فریب کو کہتے ہیں۔ ملاوٹ والی بات۔ الشَّوْأُئِيبُ\* (جمع ہے شَائِبَةٌ کی) اس کے معنی ہیں کشفاتیں اور غلاظتیں نیز نقائص و عیوب اور خطرات۔ شَوْبُ\*۔ شہد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں خود بھی موم ملا ہوا ہوتا ہے اور اسے ہر دوا کے ساتھ ملایا جاتا ہے\*۔

فرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهِمْ لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ (۳۷)۔ اس کے اوپر سے انہیں گرم آمیزہ دیدیا جائیگا۔ اس سے مراد بے اطمینانی کا جینا، ناگوار مصائب کو برداشت کرنا، نیز کشفات آمیز زندگی ہے، یا زندگی کی کشفاتیں۔ ہر فریب زندگی کے اثرات۔

## ش و ر

شَارَ الْعَسَلُ\*۔ شہد کو چہتہ سے نکال لیا اور جمع کر لیا۔ الْمَشَارُ\*۔ وہ چہتہ جس سے شہد نکالا جائے۔ الشَّوْرُ\*۔ چہتہ سے نکالا عوا شہد۔ الْعِشْوَارُ\*۔ وہ لکڑی جس سے شہد نکالا جاتا ہے۔ الْعِشْوَارَةُ\* چہتہ کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو ظاہر کرنا۔ پیش کرنا اور (۲) کسی چیز کو لیے لینا۔

شَاوَرٌ۔ مَشَاوَرَةٌ\*۔ تَشَاوَرٌ\*۔ باہمی مشورہ کرنا۔ اصل کے اعتبار سے (یعنی شَارَ الْعَسَلُ\*۔ چہتہ کو نچوڑ کر اس سے شہد نکالنے کے اعتبار سے)، مشورہ کے معنی ہوئے دوسرے کے خیالات کا نچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا\*\*۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے، تو جس طرح شہد کی

مکھیاں اپنی اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں ، مشاورت کے معنی ہونگے مختلف افراد معاشرہ کی اپنی اپنی رائے ، فکر ، خیالات ، اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دینا تا کہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے ۔ روئی دھنسنے والے کی کمان کی تانت کو بھی اَلْمِشْوَارُ کہتے ہیں \* ۔ لہذا بشورہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آراء کو دُھننا اور انہیں کھول کر نتیجہ نکالنا ۔

اَشَارَ اِلَيْهِ ۔ اسکی طرف اشارہ کیا \* (۱۹) ۔ اَلشَّوْرَةُ وَالشَّارَةُ ۔ حسن و جمال ۔ وضع قطع ۔ ہئیت ۔ لباس ۔ پوشاک ۔ فریبی ۔ زینت ۔ آرائش ۔ شَارَ ۔ يَشْوُرُ ۔ گھوڑے کو سدھایا ، یا خریدار کو بتانے کے لئے اس پر سوار ہوا اور اسے دوڑا کر دکھایا \* ۔

قرآن کریم نے نوع انسانی کی راہنمائی کے لئے اصولی قوانین دیئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں ۔ قرآنی نظام یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود وضع کریں ۔ یہ چیز باہمی مشورہ سے طے ہوگی ۔ اسی لئے جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَآمُرُهُمْ شَوْرًا بَيْنَهُمْ\* (۲۸) ۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے ۔ چونکہ سب سے پہلے قرآنی نظام خود نبی اکرمؐ نے قائم کیا تھا ، اسلئے حضورؐ کو بھی حکم دیا گیا کہ شَاوِرْهُمْ فِیْ الْاَمْرِ (۱۵۸) ۔ معاملات میں ان (مومنین) سے مشورہ کیا کرو ۔ اس سے ظاہر ہے کہ چونکہ مشورہ کا حکم تمام مومنین کے لئے ہے اس لئے ان کا نظام شریعت کبھی جامد اور متصلب (Rigid and Static) نہیں ہو سکتا ۔ ہر دور کے مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھیں گے ۔ اگر انکے زمانے کا تقاضا ہو تو وہ باہمی مشورہ سے ، کسی سابقہ دور کے فیصلوں میں رد و بدل بھی کر سکتے ہیں ، اور نئے فیصلے بھی کر سکتے ہیں ۔ اس طرح قرآن کریم کے غیر متبدل اصول تو اپنی جگہ قائم رہیں گے لیکن انکی روشنی میں وضع کردہ جزئیات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی ۔ یہ ہے مشاورت کے قرآنی حکم کا عملی مفہوم ۔ یہی خود رسول اللہؐ نے کیا تھا ( جس پر قرآن کا حکم شاہد ہے ) اس لئے منتِ رسول اللہؐ بھی یہی ہے کہ ہر دور کے مسلمان ایسا ہی کریں ۔ یہی وہ سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ہے (۱۱۵) جس کے اتباع کا حکم ہے ۔ مغربی انداز حکومت میں ، کوئی شے غیر متبدل نہیں ہوتی ۔ قوم جس قسم کے فیصلے چاہے کر سکتی ہے ۔ ان فیصلوں کے اوپر کوئی ایسی پابندی یا حدود نہیں جن کا

علیٰ حالہ رکھنا ضروری ہو۔ اس طرز حکومت کو سیکولر (Secular) کہتے ہیں۔ دوسری طرف، قدامت پرستی کے مسلک کی رو سے، شریعت میں کوئی جز قابل تغیر و تبدل نہیں۔ جو فیصلے پہلے ہو چکے ہیں وہ من و عن نافذ ہوتے رہیں گے۔ ان دونوں کے برعکس قرآنی نظام یہ ہے کہ، قرآن میں بیان کردہ احکام و اصول غیر متبدل ہیں۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم اپنے اپنے زمانے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی۔ اس طرح ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے استزاج سے، انسانی زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جائیگی۔

## ش و ظ

الشَّوْظُ اظٌ۔ الشَّيْوَ اظٌ۔ شعلہ جس میں دھواں نہ ہو\*۔ نیز آگ کی گرمی اور دھواں۔ آفتاب کی گرمی۔ ویسے چیخنے چلانے کو بھی کہتے ہیں، اور پیاس کی شدت کو بھی\*۔

قرآن کریم میں ہے بِرُّسُلٍ عَلَيَّكَ مَا شَوْ اظٌ مِّنْ نَّارٍ (۵۵)۔ تم دونوں گروہوں پر آگ کا شعلہ بھیجا جائیگا۔

## ش و ک

الشَّوْ كَتٌ۔ درخت کا کانٹا۔ ہتھیار (۹)۔ اَرْضٌ شَاكَةٌ۔ بہت کانٹوں والی زمین\*۔

الشَّوْ كَتٌ مِّنْ اِلْقَتَالِ۔ جنگ کی شدت۔ شَوْ كَتٌ السِّلَاحِ۔ ہتھیار کی تیزی اور دھار\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کھردرا ہونا یا کسی چیز کے کنارے کا دھار دار، تیز اور نوکیلا ہونا۔

## ش و ی

شَوَى اللَّحْمَ يَشْوِيْهُ شَيْئًا۔ گوشت بھوننا۔ اَلْيَشْوَاءُ۔ بھنا ہوا گوشت۔ شَوَى اَلْاِمَاءَ يَشْوِيْهُ۔ اسنے ہانی کو گرم کیا۔ اَشْوَى اَلْقَمَحَ۔ گیہوں اتنے سخت ہو گئے کہ انہیں بالوں سے، ہاتھ سے مل کر نکالا جاسکے اور بھونا جاسکے\*\*۔ سورۃ کہف میں ہے يَشْوِيْ اَلْوُجُوْہَ (۱۸)۔ حیوان کے چہروں کو جھلسا دیگا۔

\* تاج۔ محیط۔ راغب۔ \*\* تاج و محیط۔

الشَّوَى - کے معنی چاروں ہاتھ پاؤں اور انسان کی کھوپڑی اور سر کی کھال کے ہیں - اس کا واحد شَوَاةٌ ہے - بعض کا خیال ہے کہ بدن کے وہ تمام اعضاء جن پر ضرب لگنے سے موت واقع نہ ہو شَوَى ہیں - اسی جہت سے بے قدر اور غیر اہم چیز کو بھی شَوَى کہہ دیتے ہیں \* -

سورة المعارج میں جہنم کی آگ کے متعلق ہے نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى (۳۶) - وہ ہاتھ پاؤں کو زور سے کھینچ کر نکال لینے والی ہے - یعنی بالکل بیکار کر دینے والی - یا سر کی کھال کھینچ لینے والی - اس کے معنی ذلت اور مصیبت دونوں کے ہونکے - نیز قوت چھین لینے اور اہا ہج بنا دینے کے بھی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معمولی اور بے قدر چیز کے ہونے ہیں -

## ش ی ا

شَاءَ - بِشَاءَ - شَيْئًا - وَمَشِيئَةً کے معنی ہیں ارادہ کرنا - اکثر متکلمین نے مشیت اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں کیا حالانکہ دونوں میں باعتبار لغت فرق یہ ہے کہ مشیت ، ایجاد (پیدا کرنے) کو کہتے ہیں اور ارادہ کے معنی طلب (چاہنے) کے ہیں \* -

الشَّيْءُ - راغب کے نزدیک یہ لفظ ہر موجود چیز کے لئے بولا جائے گا خواہ وہ محسوس طور پر موجود ہو - مثلاً مختلف اجسام ، یا محض ذہنی طور پر موجود ہو مثلاً اقوال \*\* - نیز شَيْئٌ کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس کا علم حاصل کیا جاسکے یا جس کے متعلق کچھ خبر دی جاسکے \*\*\* - متکلمین نے اس پر بہت بحث کی ہے کہ شَيْئٌ کی ماہیت کیا ہے اور اس کا اطلاق کس کس قسم کی چیزوں پر ہوتا ہے - حتّٰی کہ بعض نے یہاں تک کہ دیا ہے کہ معدوم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے - لیکن ہمیں ان موشگافیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں - اس لئے کہ قرآن کریم ان متکلمانہ بحثوں میں نہیں الجھتا - قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ہے - اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْئٍ قَدِرٌ (۲/۲۵۰) - یہاں شے کے معنی چیز ، معاملہ یا حقیقت کے ہیں - سورة بقرہ میں ہے لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲/۲۸) - ”(جسدن) کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہیں آئے گا“ -

اس حقیقت کے سمجھ لینے کی بڑی ضرورت ہے کہ ”خدا کی مشیت“ سے اصل مفہوم کیا ہے ؟ ہمارے ذہنوں میں خدا کے قادر مطلق ہونے کا تصور یہ

ہے کہ اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون - نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ۔ وہ ایک خودمختار (اور معاذ اللہ) مطلق العنان حاکم کی طرح جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے - کبھی خوش ہوا تو جاگیر بخش دی - ناراض ہو گیا تو گاؤں کا گاؤں ہلاک کر دیا - (خدا کے قادر ہونے کے مفہوم کے لئے تو ق - د - ر کا عنوان دیکھئے لیکن یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ) خدا کے قادر ہونے کا وہ مفہوم قطعاً نہیں جو اوپر لکھا گیا ہے - اس لئے خدا کی مشیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قانون اور ضابطہ کا کوئی دخل نہیں -

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے - لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا اور وہاں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آ گیا ہے - یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ، خدا کی مرضی، منشا، ارادہ، اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا - اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی - یہاں یہی کہا جائیگا کہ اِنْشَاءً اَمْرُهُ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶/۸۱) - اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتا ہے - ”کہہ دینے“ کے معنی یہ نہیں کہ وہ سچ وچ ”کن“ کا لفظ زبان سے نکالتا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے)۔

اس سے آگے بڑھتے تو ہمارے سامنے کائنات کا محسوس سلسلہ آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک خاص قانون اور قاعدے کے مطابق عمل کر رہی ہے - اس گوشہ میں خدا نے اپنے امر کو پیمانوں اور اندازوں کے اندر محدود کر دیا ہے - وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدْرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۹) - یہاں خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا - یعنی اب کائنات کی ہر شے ان قوانین کے تابع چلنے لگی جنہیں خدا نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق (اول الذکر گوشے میں) بنایا تھا - اس کے لئے کہا گیا ہے کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۱۵/۱۵) - اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر

کر دیا۔ یہ تمام پیمانے (قوانین فطرت) خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے ہیں لیکن خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان قوانین میں دخل اندازی کی نہیں جائیگی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۳۹)۔ ”تو سنت اللہ (خدا کے قاعدوں) میں کبھی تبدیلی نہیں پائیگا“۔ اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنی ہوں گے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے۔ کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکے۔ چونکہ اس پہلے گوشے کے متعلق (جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر شے کے لئے قانون مقرر کیا گیا ہے) ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ اس لئے ہم خدا کے متعلق جو کچھ جان سکتے ہیں وہ ان قوانین ہی کی رو سے جان سکتے ہیں جو کائنات میں کار فرما ہیں۔ یعنی مشیت خداوندی کا یہ گوشہ، علم و تجربہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔

اب ایک اور قدم آگے بڑھئے۔ انہی قوانین کی رو سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا نے انسان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جو نسا راستہ چاہے اختیار کر لے۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۱۸)۔ جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ یعنی خارجی کائنات کی چیزوں کے برعکس، انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی پابندی کرے جو اس کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور چاہے تو ان سے سرکشی برت لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاں روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور فلاں کا نتیجہ کامرانی و کامیابی۔ یعنی اس گوشے میں انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جو نسی روش چاہے اختیار کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنے اعمال کے نتائج بھی اپنی مرضی کے مطابق مرتب کر لے۔ اس کا ہر عمل وہی نتیجہ مرتب کریگا جو اس کے لئے قانون خداوندی (مشیت) نے مقرر کر رکھا ہے۔ مثلاً اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو منکھیا کھا لے اور جی چاہے مصری کی ڈلی منہ میں ڈال لے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ منکھیا کھا کر اسکا نتیجہ مصری کی ڈلی کا سا پیدا کر لے۔ یہ قوانین، کہ فلاں روش کا نتیجہ کیا ہوگا، انسان کو وحی کے ذریعہ عطا کئے گئے ہیں (جو آج قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) لہذا جب انسان، خدا کے متعلق کچھ سمجھنا چاہے گا تو اسے قوانین فطرت کو بھی سمجھنا ہوگا جو خارجی دنیا میں کار فرما ہیں اور وحی کے قوانین کو بھی جو اس کی اپنی دنیا سے متعلق ہیں۔ جب وہ ان دونوں قوانین کو سمجھ لیگا تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے آجائیگی کہ یہ دونوں قوانین درحقیقت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔



قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ کے متعلق مَا يَشَاءُ کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ، متذکرہ صدر تینوں گوشوں میں سے کس گوشے سے متعلق ہے۔ جس گوشے سے مَا يَشَاءُ متعلق ہوگا اس کے مطابق اس کا مفہوم لیا جائیگا۔ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنی لینے سے ذہن میں وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو جائے ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں۔ تضاد ہماری اپنی کوتاہ نگہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ (اس جگہ صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان اسور کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی)۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۱۳۴)۔ اس کے واضح معنی ہیں کہ جو شخص خدا سے راہ نمائی لینا چاہے خدا اسے راہ نمائی دیتا ہے۔ یعنی مَنْ يَشَاءُ کے معنی ہیں جو شخص چاہے۔ لیکن اگر اس کے معنی یہ کئے جائیں کہ ”اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے“ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی اس کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے۔ (یعنی مَنْ يَشَاءُ کے معنی قانون مشیت کے ہونگے)۔ اس قانون کی تفصیل قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے يَهْدِي بِإِذْنِ اللَّهِ مَنْ يَشَاءُ اتَّبِعْ رِضْوَانَهُ (۵۶)۔ یعنی اللہ اس (قرآن) کے ذریعے اسی کو راہ نمائی دیتا ہے جو اس کے قانون کے ماتھ ہم آہنگی اختیار کرنا چاہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ یعنی اس کے لئے ابتداء (Initiative) ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوگی۔ اگر یہ قوانین خداوندی کے مطابق چلتا جائیگا تو اسے صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی مل جائے گی۔ اگر یہ اس سے انحراف برتیگا تو اس کا رخ تباہی کی طرف مڑ جائیگا۔ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (۱۱)۔ جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔

سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم ہر ایک کمانڈر مقرر کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا انتخاب کس خصوصیت کی بنا پر ہوا ہے، حالانکہ وہ صاحبِ مال و دولت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں نبی نے کہا کہ اسے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ زَادَهُ بِسُطَّةٍ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲۴)۔ اللہ نے اسے جسمانی قوت اور علم فراوان عطا کیا ہے۔ یعنی انہیں بتا دیا کہ خدا کا انتخاب یونہی اندھا دھند نہیں ہوتا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا

ہے۔ اس کی طرف سے جسے جو کچھ ملتا ہے اس لئے ملتا ہے کہ اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ يُوَفِّيْكَ مَلِكًا مِّنْ يَّشَاءُ (۳۳)۔ اللہ کی طرف سے قوت و ملک اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ یہاں مِّنْ يَّشَاءُ کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی قانون کے مطابق، یونہی اندھا دہند نہیں۔ یہاں سے سورۃ آل عمران کی اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تُوَفِّيْكَ الْمُلْكَ مِّنْ تَّشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَّشَاءُ... (۳۵)۔ قوت و اختیار اور عزت و حکومت کا ملنا اور چھٹنا ”مشیت“ پر موقوف ہے۔ یعنی یہ سب اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جسکی بنیاد اس پر ہے کہ جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے اسے اقتدار و اختیار ملتا ہے (۳۵)۔ جس میں صلاحیت نہیں رہتی اس سے یہ چھن جاتا ہے۔ تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ مشیتِ ایزدی (قانونِ خداوندی) کے تین گوشے ہیں :-

(۱) وہ گوشہ جہاں ہر شے کے لئے قوانین متعین ہوتے ہیں۔ اس گوشے میں خدا کا امر کارفرما ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق طے پاتا ہے۔ ہم اس گوشے کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

(۲) دوسرا گوشہ خارجی کائنات کا ہے جہاں ہر شے ان قوانین کے مطابق چلتی ہوئی ہے جو اس کے لئے گوشہ اول میں مقرر ہوتے ہیں۔ ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے۔

(۳) تیسرا گوشہ انسانی دنیا کا ہے۔ اس کے ایک حصہ (انسان کی طبعی زندگی) میں تو وہی قوانین کارفرما ہیں جو خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ لیکن اس کی انسانی سطح پر جن قوانین کی ضرورت ہے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔ یہ قوانین (مستقل اقدار) بھی غیر متبدل ہیں۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ وہ جیسی روش اختیار کریگا اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے۔ جتنی صلاحیت پیدا کرے گا اتنی ہی خوبیاں اور بڑائیاں اسے حاصل ہو جائیں گی۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں جو غیر متبدل ہے۔

یہ ہے مشیتِ خداوندی سے مفہوم۔ واضح رہے کہ جس گوشے میں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے، وہ (خدا) اس میں کبھی مداخلت نہیں

ہوتا۔ اس میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۱۴۴)۔ اس گوشے میں تم اپنی مرضی (مشیت) کے مطابق عمل کرو۔ ”جو تم چاہتے ہو کرو۔ ہم مغل نہیں ہونگے“۔ البتہ تمہارے اعمال کے نتائج قانونِ مشیتِ خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے۔ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۴۵)۔

اس ضمن میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے انسان کے ذہن میں عجیب الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ دھر میں ہے اِنَّ ہٰذِہٖ تَذْکِیْرٌۢ لِّمَنْ شَاءَ اَنْ یَّخْذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِيْلًا (۴۹) ”یہ قرآن کریم یقیناً ایک یاد دہانی ہے، سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف (کا) راستہ اختیار کر لے“۔ یہاں تک بات بالکل صاف ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے وحی مل گئی ہے۔ اس کے بعد انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اس وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے۔ لیکن اس کے آگے ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ (۱۴۶)۔ اسکا ہام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔ ”اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہے“۔ اس ترجمہ کی رو سے (ظاہر ہے کہ) نہ صرف یہ کہ یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں بلکہ انسانی اختیار و ارادہ کی ساری عمارت نیچے آگرنی ہے۔ یعنی ایک طرف تو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چاہو تو ایسا کر لو اور چاہو تو ویسا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ نہیں سکتے۔ تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ دراصل تمہارا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے۔ لہذا انسان مجبور محض ہے۔

سورۃ دھر کے علاوہ یہ آیت (قریب قریب انہی الفاظ کے ساتھ) سورۃ مدثر (۵۶: ۵۹) اور سورۃ تکویر (۸۱: ۲۸) میں بھی آئی ہے۔

”مَا تَشَاءُوْنَ“ نفی مضارع ہے جس کے ہام معنی ہیں ”تم نہیں چاہتے“۔ لیکن عربی گرامر کی رو سے اس کے معنی نہیں (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ”تم مت چاہو“۔ گرامر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا۔ مختصر المعانی میں ہے ثُمَّ النَّخْبَرُ قَدْ یَقَعُ مَوْقِعُ الْاِلٰہِ تَشَاءِ۔ اِنَّا لَنَتَغَاوُلُ اَوْ لَا ظَنُّہَا۔ الْحَبْرُ فِیْ وَفْوْعِہٖ کَمَا سَرَّ۔ اَوْ لَلَا حَتِّیْرَ اَزَّ عَنْ صُوْرَةِ الْاَمْرِ

أَوْ لِيَحْمِلَ الْمُخَاطَبُ عَلَى الْمُطْلُوبِ بَيَانٌ يَتَكُونُ الْمُخَاطَبُ  
مِيقَنٌ لَا يَحِيبُ أَنْ يَكْتَذِبَ الطَّالِبُ (صفحہ ۲۳۲) یعنی کبھی کبھی  
خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔ ایسا بطور تفاعل کے ہوتا ہے۔ یا  
منکلم چاہتا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ یا متکلم (صاف صاف) امر (حکم)  
کی صورت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر مخاطب کو اس بات کے لئے ہر انگلیختہ  
کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو منکلم  
کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔

زمخشری نے (اپنی تفسیر کشاف میں) اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔  
سورة بقرہ میں ہے وَأَذْأَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ  
إِلَّا اللَّهَ وَيَالِئُوا أَيْدِيَنَا إِحْسَانًا وَذَرُوا الثَّغُورَ بَنِي وَالْمَسَاكِينِ  
وَالْمَسَاكِينِ۔ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا... (۲/۸۳)۔ یہاں لَا تَعْبُدُونَ  
نفسی مضارع ہے۔ لیکن اس کے معنی نہیں کے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”جب  
ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ تم اللہ کے سوا اور کسی کی محکومی (عبادت)  
اختیار مت کرنا۔ اور والدین اور رشتہ داروں بتامنی اور مساکین کے ساتھ  
احسان کرنا“۔ اس کے بعد قُولُوا امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ”لوگوں کو  
اچھی بات کہو“۔ زمخشری نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں اخبار  
فی معنی النہی ہے۔ یعنی خبر، نہی کے معنوں میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں  
”تَذْهَبُ إِلَى فُلَانٍ، تَقُولُ لَهُ كَذَا“۔ اس میں ”تَذْهَبُ“۔  
”تَقُولُ“۔ اگرچہ مضارع کے صیغے ہیں لیکن ان سے مراد امر ہے۔ پھر وہ لکھتا  
ہے کہ۔ ”وَعَمَّوْا أَبْلَغَ مِنْ صَرَّيْجِ الْأَمْرِ وَالنَّهْيِ“۔ یعنی یہ انداز  
امر و نہی کے صیغوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلہ میں  
زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس انداز بیان کی اور مثالیں بھی ہیں مثلاً (اسی) سورة  
بقرہ میں ہے وَمَا تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ (۲/۲۶۲)۔ اس کے معنی  
بھی یہی ہیں کہ ”تم مت خرچ کرو بجز لوجہ اللہ“ یعنی مضارع نفسی نے  
نہی کے معنی دئے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں وَمَا تَنْشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ کے  
معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے  
کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہیئے یہ کہ اپنے اختیار و ارادہ  
کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔  
ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سورة زمر

میں ہے اِنْ تَكْفُرُوا فَاتِيَنَّ اللَّهُ غَنِيًّا عَنْكُمْ\*۔ اگر تم (قوانین خداوندی) سے انکار کرو گے تو (اللہ کا کیا ہگاڑ لو گے) اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ۔ وَلَئِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ\* (۳۹)۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تمہارے لئے شکر ہی کو پسند کرتا ہے۔

لہذا انسان کو چاہیے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے، بطیب خاطر، مشیت خداوندی (قوانین الہیہ) سے ہم آہنگی کی زندگی اختیار کرے۔

## ش ی ب

الشَّيْبُ\*۔ بڑھاپا۔ سفید بال یا بالوں کی سفیدی\*۔ سورۃ مریم میں ہے وَأَشْتَعَلَ الْقَرَأُ شَيْبًا (۱۹) اور سر بالوں کی سفیدی کی وجہ سے (شعلے کی طرح) بھڑک رہا ہے۔ یا سر میں سفید بال بکثرت نمودار ہو گئے ہیں۔ سورۃ روم میں شَيْبَةً\* (۳۰) بڑھاپے کیلئے آیا ہے۔ سورۃ مزمل میں ہے يَتَجَعَلُ الْوِلْدَ أَنْ شَيْبًا (۳۳) جس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مخلوط ہونا اور مل جانا ہیں۔ شَيْبٌ\* کو شَيْبٌ\* اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بالوں کی سفیدی، سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے۔

## ش ی خ

الشَّيْخُ\*۔ بوڑھا آدمی۔ نیز اونٹ کو بھی کہتے ہیں۔ استاذ۔ عالم۔ مردار قوم۔ ماسر فن کو بھی بزرگی اور فضیلت کی وجہ سے شَيْخٌ\* کہہ دیتے ہیں۔ الشَّيْخَةُ\*۔ بوڑھی عورت۔ شَيْخُوخَةٌ\*۔ بڑھاپا\*۔

قرآن کریم میں شَيْخٌ\* (۱۱) نیز (۱۲)۔ بوڑھے کے لئے آیا ہے۔ الشَّيْخَةُ\* کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اور الشَّيْخُ\* وَالشَّيْخَةُ\* بمعنی بیاہا (مرد) اور بیاہی (عورت) لغت عرب میں کہیں نظر نہیں آیا۔

## ش ی د

شَادَ الْبِنَاءَ\*۔ بِشَيْدَةٍ\*۔ وَشَيْدَةٌ\*۔ عمارت ہر چوہہ وغیرہ کا ہلستر کر کے اسے مضبوط اور بلند کر دینا۔ اَلشَّيْدُ\*۔ اس چوہہ وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے ہلستر کیا جائے۔ اَلْمَشْيِدُ\*۔ جو عمارت چوہہ وغیرہ سے بنائی

اور بلند کر دی جائے۔ محکم - مضبوط \*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے قَصْرٌ مَشِيدٌ (۲۴)۔ اَلْاِشَادَةُ - آواز بلند کرنا \*۔ بُرُوجٌ مَشِيدَةٌ (۲۸) کے معنی ہیں اونچے اور محکم قلعے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بلند کرنے کے ہوتے ہیں۔

## ش ی ع

شَاعَ الْخَبَرُ فِي النَّاسِ - لوگوں میں خبر پھیل گئی \*۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ (۲۹)۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ نا پسندیدہ باتیں پھیل جائیں۔

هَذَا شِیْعٌ هَذَا - یہ اس کی مثل ہے \*۔ سورۃ سبا میں ہے کَمَا فَعِلَ بِاَشِیَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ (۳۴)۔ جیسا انہی جیسے لوگوں کے ساتھ ان سے پہلے کیا گیا۔ سورۃ قمر میں ہے وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشِیَاعَكُمْ (۵۹)۔ ہم تمہارے جیسے لوگوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

اَلشِّیَاعُ - چرواہے کی بانسری یا اس کی آواز (جس سے وہ منتشر جانوروں کو بلاتا ہے)۔ بلانے والے - داعی \*۔ نیز اس کے معنی متابعت کرنے - یعنی بلانے والے کے پیچھے چلنے کے بھی آتے ہیں۔ شِیْعَةُ عَلِیِّ رَآیَہ - اس نے اس کی رائے کی پیروی کی - اسے تقویت دی - هَذَا شِیْعٌ هَذَا - یہ اس بچہ کی پیٹھ پر پیدا ہونے والا بچہ ہے - یہ ایسے اوپر تلے کے ، دو بچوں کے لئے بولا جاتا ہے جنکے درمیان کوئی اور بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ اَلْمُشَایِعُ - کسی کے ساتھ ساتھ (ملحق) رہنے والا - شِیْعٌ نِسَاءِ اِسے کہتے ہیں جو ہمیشہ عورتوں میں گھسا رہے - اَلشَّاعَةُ - بیوی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شوہر کے ساتھ ساتھ یا اس کے پیچھے رہتی ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی ہیں۔

ان معانی سے شِیْعَةُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی وہ لوگ جو کسی کے پیچھے چل کر ایک پارٹی بن جائیں - اور اس طرح ایک دوسرے کی تقویت اور مدد کا موجب ہوں - اگر یہ اتباع قانونِ خداوندی کی ہے جس میں تعاونِ بے اور تقویٰ میں ہوتا ہے تو اس پارٹی کا نام جماعتِ مومنین ہے ، جن کے ساتھ شامل ہونا باعثِ صدِ فخر و سعادت ہے - چنانچہ قومِ نوح کے مومنین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہِمْ اَلْبُرَّ اَہِیْمُ (۳۳) - یقیناً ابراہیمؑ ان ہی کے گروہ میں سے تھا - لیکن اگر اس قسم کی گروہ بندی انسانوں

کے پیچھے چل کر بنائی جائے تو قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے امت مسلمہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا** (۱۰۳)۔ تم سب کے سب اس کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ**۔ میں الذین فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا۔ کلّ حزبٍ بما لَدَيْهِمْ فَرَّحُونُ (۱۰۴)۔ (دیکھنا۔ تم سون بن جانے کے بعد کہیں) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہر فرقہ اس پر اکڑتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر، جبکہ اس کی رو سے خود فرقہ بندی ہی شرک ہے۔ اسی بنا پر اس نے رسول سے کہہ دیا کہ **إِنَّ الذِّينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسَتْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ** (۱۰۶)۔ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور گروہ گروہ بن جائیں۔ اے رسول۔ تیرا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان میں وحدت کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ وہی صورت جسے قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے۔ یعنی **اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ**۔ خدا کی کتاب کو مرکز قرار دیکر نظام قائم کر لینا۔ اس سے فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اگر شخصیتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے اور ایک نظام کے ذریعہ اطاعت صرف کتاب اللہ کی کی جائے تو فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ ("نظام کے ذریعے قرآن کریم کی اطاعت" کی شرط بڑی اہم ہے۔ انفرادی طور پر، اپنے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی اطاعت سے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ نظام کی رو سے اطاعت خداوندی سے وحدت امت برقرار رہتی ہے۔) یہ بھی واضح رہے کہ فرقوں سے مراد صرف مذہبی فرقے ہی نہیں، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ مومنین تو ایک طرف، قرآن کریم نے ہر قوم میں فرقہ بندی، پارٹی بازی اور گروہ سازی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے (۱۰۵)۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا میں "حکمت فرہونی" ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ یعنی پارٹیاں بناتی اور توڑتی رہتی ہے (۱۰۸)۔ (مزید تفصیل ف۔ ر۔ ق کے عنوان میں دیکھئے)۔

قرآن کریم میں شیعہ کا لفظ اقوام یا قبائل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (۱۰۹)۔

## اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ ”اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی“۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ۔

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشین پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ بڑی جلد کے ۳۹ صفحات۔

سلیم کے نام خطوط۔ ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور۔۔۔الات پیدا ہوئے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب۔ انداز بیان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کی فہرست ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمائیں۔

ملنے کے لئے

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) بی۔گبرگٹ لاہور



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ص

## صَاحِبُ الْحُوتِ

حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔ (۶۸/۳)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”یونسؑ“۔

## صالح علیہ السلام

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عاثرِ اولیٰ کے بعد کا ہے (دیکھئے عنوان ہودؑ)۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیِ قریٰ کہتے تھے۔ حجاز ان کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ ان کا علاقہ بڑا پرفضا اور زرخیز تھا (۲۶/۳۷)۔ یہ لوگ میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے تھے جو فنِ سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷۳/۷)۔

اس قوم کی طرف، انہی کے بھائی بند، حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (۷۷/۷)۔ انہوں نے ان تک وہی پیغام پہنچایا جو اس سے پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ اپنی اپنی قوم تک پہنچا چکے تھے (دیکھئے عنوانات نوح اور ہود)۔ یعنی بَلِّغُوا عِبَادِي وَأَطِيعُوا اللَّهَ مَالَكُمْ مِنْ آلِهِ غَيْرُهُ (۷۷/۷)۔ ”اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ نہیں“۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لَا تَعْتَبُوا فِي الْأَرْضِ مَقْسِرِينَ (۷۷/۷)۔ ”ملک میں سرکشی کرتے ہوئے فساد نہ پھیلانے پھرو“۔ حسب معمول مترفین کے طبقہ (سردارانِ قوم) نے اس دعوت کی مخالفت کی (۷۷/۷)۔

اس زمانے میں موسیٰ اور چراگاہیں ، چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے ۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مختص کر لیتے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے ۔ حضرت صالحؑ نے سرداران قوم سے کہا کہ رزق کے یہ سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں ۔ یہ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑسکتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوگا ۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو ۔ وہ اس پر بھی راضی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی ۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑ دیتا ہوں ۔ تم نے اگر اسے آزاد چرنے اور اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے معاہدے میں سچے ہو ۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش کہن پر قائم ہو ۔ (۱۰۰۰) ۔ انہوں نے اس اونٹنی کو عлак کر دیا (۱۰۰۱) ۔ اور خدا کے عذاب نے (جو کڑک اور زلزلہ کی شکل میں نمودار ہوا) انہیں تباہ کر دیا (۱۰۰۲) ۔

(طبعی حوادث ، مثلاً طوفان آب ۔ آندھی ۔ زلزلہ وغیرہ) ”خدا کا عذاب“ کس طرح بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں باب حضرت نوحؑ ملاحظہ کیجئے ۔

## ص ب ا

صَبَّأً - يَصْبِئًا - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا ۔ اس کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں ۔ صَبَّأً نَابُ البَعِیْر - اونٹ کی کچلی نکل آئی (ابن فارس) ۔ نیز کسی کے خلاف بغاوت کرنے اور دشمنی کرنے کے لئے صَبَّأً عَلَیْہِ کہتے ہیں \* صَبَّأً النَّجْمُ - ستارہ نکل آیا \* ۔

الصَّابِئُونَ - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے \* ۔ صاحب محیط کے نزدیک یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتا تھا جس طرح مسلمان کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں ۔ بعض کا

خیال ہے کہ یہ ستارہ پرست یعنی مشرک قوم تھی\*۔ صاحب المنار کا بھی یہی خیال ہے، اگرچہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل ملت ہیں جو مشہور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے عقائد بڑے مبہم سے ہیں\*\*۔ قرآن کریم میں صَابِیُّنَ کا ذکر (۲/۶۳) میں آیا ہے۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ الصابیُّون، حضرت نوحؑ کے دین کی پیروی کرنے والی قوم تھی۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت الکیسائی (Elkesaites) فرقہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہوا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہوا۔ گناہوں کو دھونے کے لئے پانی میں بیتسمہ لینا یا غسل کرنا ان کا امتیازی نشان تھا۔ اس جہت سے عرب انہیں ”مغتسلہ“ کہتے تھے۔ یہودیوں کے ایسینی فرقہ نے اس جدید مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ (Sampsenes) یا (Sampsites) فرقہ جو چوتھی صدی عیسوی میں بحر میت کے قرب و جوار میں پایا جاتا تھا، الکیسائی ہی تھا۔ یہ لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے اور ہاتھ منہ دھو کر یا غسل کر کے اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس لفظ کے لغوی معنی، ”سورج کی مانند“ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ الکیسائی عام نجوم جانتا تھا اس لئے اس کے فرقہ کو ستاروں سے خاص دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت، عرب اس فرقہ سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں ”صابئین“ کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ مشہور تھا کہ الکیسائی نے اپنی الہامی کتاب کو اپنے جس جانشین کے سپرد کیا تھا اس کا نام (Sobiai) تھا۔ ممکن ہے اسی سے انہیں (Sabians) کہا جاتا ہو۔ یا ان کے، پانی میں بیتسمہ لینے کی وجہ سے۔ ارامی زبان میں اس سے یہی مفہوم تھا۔

## ص ب ب

صَبَّ الْمَاءُ۔ اسنے اوپر سے پانی گرا دیا۔ فَصَبَّ۔ چنانچہ پانی گر گیا (لازم و متعدی)۔ الصَّبَابَةُ تھوڑی سی پینے کی چیز جو برتن میں باقی رہ جائے۔ الصَّبَبُ۔ نہر یا راستہ کا ڈھلوان اور نیچے کی طرف جانے والا حصہ۔ ڈھلوان زمین۔ اصْبَتُوا۔ لوگ ڈھلوان اور نشیبی زمین پر چلے۔ صَبَّ الرَّجُلُ۔ آدمی مٹا دیا گیا\*\*\*۔

سورة عبس میں ہے اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ہم نے اوپر سے پانی برسایا۔ سورة فجر میں ہے فَصَبَّ عَلَيْنِهِمْ سَوْطٌ عَذَابٍ (۱۲) تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ سورة حج میں ہے - يَصْطَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۹) - انکے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی گرایا جائیگا۔ انکے اکڑے ہوئے سروں کو جھکا کر انکی قوتوں کو پراگندہ کر دیا جائیگا۔

## ص ب ح

الصُّبْحُ \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگوں میں سے ایک رنگ کے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل یہ سرخ رنگ کو کہتے ہیں اور صبح کو صُبْحُ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سرخ ہوتا ہے۔ اور مِصْبَاحُ (چراغ کو) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی سرخ ہوتا ہے۔ الصُّبْحُ \*۔ فجر یا دن کا ابتدائی حصہ \*۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس وقت کو کہتے ہیں جب افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔ صَبَّاحُ \*۔ صَبَّاحُ کے بھی یہی معنی ہیں \*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ صَبَّاحُ دن کی روشنی کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ تینوں الفاظ آئے ہیں (۱۸)؛ (۳۷)؛ (۹۷)۔ مِصْبِیحُ \*۔ وہ جو صبح کے وقت میں داخل ہو \*۔ فَآخَذَ تَهُمُ الْقَصِيحَةَ مِصْبِیحِیْنِ (۱۵)۔ صبح ہوتے ہی انھیں سخت آواز نے آلیا۔ الصُّبْحُ \*۔ چراغ، نیز بتی کی لہو \*۔ (۲۵)۔ جمع مِصْبَیْحُ \*۔ ستارے (۲۱)۔ صَبَّحَ \*۔ کسی کے پاس صبح کے وقت پہنچنا \*۔ (۵۲)۔ اَصْبَحَ \*۔ ہو گیا (یعنی کان اور ستار کے معنوں میں)۔ اَصْبَحَ فُلَانٌ عَالِمًا۔ فلان آدمی عالم ہو گیا \*۔ فَآصْبَحَ مِّنَ الْخَاسِرِیْنَ (۵) وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ فَآصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا (۲۲)۔ تم خدا کی نعمت (قرآن کریم) کے ذریعے بھائی بھائی بن گئے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اَصْبَحَ کے عام معنی تو ”ہو گیا“ ہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نسبت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے ایسا ہو گیا۔ وہ شروع ہی میں ایسا ہو گیا۔

## ص ب ر

صَبْرٌ کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا \*۔ لہذا اسکے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی،

اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔ اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو اَلصَّبِيرُ کہلاتا ہے۔ اور پہاڑ کو بھی اَلصَّبِيرُ کہتے ہیں\*۔ اَلْأَصْبِرَةُ۔ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے ہیں جو صبح شام باقاعدہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آجائیں اور ان سے دور نہ رہیں\*\*\*۔ اَلِصَّبَارَةُ۔ (ص کی تینوں حرکات کے ساتھ) لوہے یا پتھر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں (جو ایک مقام پر جم کر پڑا رہتا ہے)۔ اَلصَّبَابُورَةُ۔ اس مٹی وغیرہ کو کہتے ہیں جو اس لئے کشتی میں رکھ دی جاتی ہے کہ اس سے کشتی جھکولے نہ کھائے\*\*۔ جس سے اس کا توازن قائم رہے۔ ان الفاظ سے صَبْرُ کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی سعی و کوشش کا نتیجہ بہت عمدہ نکلتا ہے اسلئے اَلصَّبِيرَةُ۔ غلہ کے ڈھیر کو کہتے ہیں\* جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو\*۔ غور کیجئے کہ یہ کس قدر مسلسل محنت اور استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جم کر ایک جگہ قائم رہنے کی جہت سے یہ لفظ کسی کو روکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اسلئے صَبْرُ کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں (ابن فارس)۔ یا کسی کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانا۔ بِمِیْنِ الصَّبْرِ۔ اس قسم کو کہتے ہیں جو کسی کو زبردستی (مجبور کر کے) کھلائی جائے\*۔

سورة بقرہ میں ہے فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۲۵)۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ کے مقابلہ کی تاب کس قدر ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ کونسے چیز ہے جس نے انہیں آگ کے عذاب کو جم کر برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں جرأت کا مفہوم آجاتا ہے۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ (۲/۶۱)۔ ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کیلئے نہیں رہ سکتے۔ اسی سورة (بقرہ) میں ہے رَبَّنَا آفِرْغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَكَبِيرًا آفِدْ آمِنًا (۲/۲۵)۔ یہاں وَثَبِتْ آفِدْ آمِنًا نے صبر کے معنوں کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی ثابت قدم رہنا۔ سورة آل عمران میں صَابِرِينَ کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِی سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (۳/۱۳۵)۔ انہیں

خدا کی راہ میں جسقدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو مست گم ہوئے، نہ ان میں کمزوری آئی، اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر ”ثَبِّتْ“ اَقْدَامُنَا سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۳۶)۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ یہ (رسولؐ) ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا تو لَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهِمْ۔ اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم مستقل مزاجی سے ان کی پرستش پر قائم رہتے۔ یہی معنی سورۃ ص میں وَاصْبِرْ وَاَعْلٰی اِلٰهَتِكُمْ (۳۸) کے ہیں۔ (۱۴۱) میں صَبَرْنَا بِمَقَابِلِهِ جَزْرًا اِیَّاہِ۔ جَزْرٌ ع کے معنی ہیں رسی کو درمیان سے کاٹ دینا۔ لہذا صَبَرٌ معنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا ہونگے۔ سورۃ کہف و حجرات میں صبر کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے جسکے لئے ہم کہتے ہیں کہ بے صبری کیوں ہوئے ہو؟ (Dont Be Impatient)۔ ذرا ٹھہرو۔ یونہی بے چین مت ہو۔ (۱۸۸؛ ۳۹)۔ سورۃ انفال میں ہے کہ اِنْ یَّکُنْ مِنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِاۤیَۃَ تَمِیۡمٍ۔ (۱۵) اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آجائیں گے۔ انہی کو الصَّابِرِیْنَ فِی الثَّبَاتِ سَاعِ وَالضَّرَّاءِ (۱۶) کہا گیا ہے۔ سورۃ مریم میں ہے وَاصْطَبِرْ لِّعِبَادَتِہِ (۱۹) خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو۔

یہ ہے وہ صَبَرٌ جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِیْزُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (۲۰)۔ اپنی قوتوں کی پوری نشو و نما اور اعتدال و تناسب کے لئے صبر اور صلوٰۃ کی راہ اختیار کرو۔ اور اسکے بعد ہے اِنْ اَللّٰہُ مَعَ الصَّابِرِیْنَ۔ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں، اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِکَ عَلٰیہِمْ صَلَٰوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ (۲۱)۔ یہ ہے صَبَرٌ کا قرآنی مفہوم۔ اسکے برعکس صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں۔ ہمارے ہاں صبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بیچارگی میں کہتے ہیں کہ۔ ”اچھا۔ جو تمہارے جی میں آئے کر لو۔ میں صبر کے سوا کیا کر سکتا ہوں“۔ اور اسی صبر کی تلقین یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ ”میاں! صبر کرو۔ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔“

یعنی صبر انتہائی بیچاریگی کا نام ہے۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چاریگی میں سپر ڈال دینا۔

مختصراً یہ کہ صَبْرٌ کے معنی ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کار بند رہنا اور اسکے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اس طرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ قرآن کریم میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ اصْبِرُوا وَصَابِرُوا (۱۹۹)۔ اصْبِرُوا کے معنی ہیں ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پر قائم رہنا، اور صَابِرُوا کے معنی ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجوانے کی کوشش کرنا۔ یا دوسروں کے مقابلہ میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، نہ آگے بڑھ سکتی ہے، جب تک وہ (قرآنی مفہوم میں) الصَّابِرُ نہ ہو۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ”صابر“ و شاعر، ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔

## ص ب ع

اصْبَغَ کے معنی ہیں انگلی۔ نیز انگلی کے بالائی پور کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اصْبَاحٌ آتی ہے۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے ۱۲۹)۔ صَبَّغَ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں اس نے انگلی کے اشارے سے اس کی راہنمائی اُس دوسرے شخص کی طرف کر دی۔\*

## ص ب غ

الصَّبَّغُ کے بنیادی معنی تغیر و تبدل، یعنی تبدیلی پیدا کر دینے، کے ہیں۔ اسی سے الصَّبَّغُ اور الصَّبَّغُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کپڑا وغیرہ رنگا جائے۔ صَبَّغَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں کپڑا رنگنا۔ الصَّبَّغُ - رنگریز کو کہتے ہیں۔ (نیز کذاب کو جو باتوں میں رنگ آمیزی کرے)۔ الصَّبَّغَةُ - رنگنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ نیز دین و ملت کو بھی۔\*\*

چونکہ رنگنے کے لئے کپڑے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے، اس لئے صَبَّغَ يَدَهُ بِالْمَاءِ کے معنی ہیں اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبویا۔ صَبَّغَ فُلَانًا فِي السَّعَةِ - فلاں شخص کو نعمتوں میں ڈبو دیا۔ اسی نہج سے سالن کو

صِبْغٌ کہتے ہیں ، کیونکہ اس میں روئی ڈبو کر کھائی جاتی ہے \* - (۲۳)۔  
عیسائی اپنے بچوں کو پتسمہ دینے کے لئے ہانی میں غوطہ دیتے ہیں (با رنگ  
چھڑکتے ہیں تو) اسے صِبْغَةً یا اصْطَبَاغٌ کہا جاتا ہے \*۔

قرآن کریم میں ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنْ اللّٰهِ صِبْغَةً  
(۱۳۸)۔ اللہ کا رنگ۔ اس رنگ سے زیادہ حسن و زیبائی پیدا کرنے والا رنگ  
اور کون سا ہو سکتا ہے ! سوال یہ ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد کیا ہے ؟ اس  
کا جواب آیت کے باقی حصے نے خود ہی دے دیا۔ وَ نَحْنُ لَهُ عَبِيدٌ وَنَ  
(۱۳۸) یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت اختیار کر لینا۔ ایسی  
اطاعت جس طرح رنگ کپڑے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ہے اور  
اس میں یکسر تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا قوانین خداوندی کی ہم آہنگی  
سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے رگ و ریشہ  
میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ ایک بالکل ”دوسرا“ انسان بن جاتا ہے۔ یعنی  
اس کی مضر صلاحیتیں نشو و نما پا لیتی ہیں اور اس میں صفاتِ خداوندی کا  
رنگ منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جس طرح اللہ کی ذات میں مختلف اور  
متضاد قسم کی صفات (مثلاً غفور و رحیم اور جبار و قہار) اس طرح متوازن طور پر  
جمع ہیں کہ ان میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ (انہی کو الاسماء الحسنی  
کہتے ہیں۔ یعنی مختلف صفات کا حسن کارانہ انداز سے یکجا ہونا)۔ اسی  
طرح اس انسان کے اندر بھی متضاد صفات پورے توازن کے ساتھ یک جا  
رہتی ہیں اور ان میں کبھی کشمکش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ چیز صرف معاشرہ کے  
اندر ممکن ہے۔ اس لئے صِبْغَةَ اللّٰهِ سے مراد کوئی ایسی ”روحانیت“ نہیں  
جسے خانقاہوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے یا اس میں کسی باطنی  
طریق سے ترقی کی جائے۔ یہ نام ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے  
کا جو قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔ نَحْنُ لَهُ عَبِيدٌ اور نَحْنُ  
لَهُ عَابِدُونَ (۱۳۸) کے یہی معنی ہیں اور انہی کے نتیجہ کا نام صِبْغَةَ اللّٰهِ  
ہے۔ ابن قتیبہ نے اس کے معنی دَرَبْنُ اللّٰهِ کہے ہیں \*\*۔

## ص ب و

الصَّبَوَةُ۔ ابتدائے شباب کی نادانی۔ عشق بازی۔ صَبَتِ النَّحْلَةُ۔  
کھجور کا مادہ درخت، دور کے نر کھجور کے درخت کی طرف جھکا۔ أَصْبَتَهُ  
الْعَمْرَةَ۔ عورت نے اس مرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اپنی طرف مائل کیا۔



الصَّحْبِيُّ - وہ بچہ جس کا دودھ نہ چھڑایا گیا ہو۔ یا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو  
صَبَاً فُلَانٌ يَصْبُو - فلاں آدمی کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے  
سے کام کرنے لگ گیا\*۔ سورۃ یوسف میں ہے أَصْبُ لِّلْيَهُنَّ (۱۲)۔ میں  
ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور لڑکوں کی سی نا سمجھی کی باتیں کرنے لگ  
جاؤں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) مائل کرنا۔  
جھکانا۔ جھکنا۔ اور (۲) کم عمری۔ مطلب اس سے ہوگا عقل و فکری رو سے نہیں  
بلکہ محض جذبات کے تابع، بچوں کی طرح، کسی چیز کی طرف مائل ہو جانا۔

## ص ح ب

صَحِيبٌ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگ جانا۔  
أَصْحَابُ الشَّيْءِ - میں نے اسے اس چیز کے ساتھ لگا دیا۔ صَحِيبٌ - وہ  
اس کے ساتھ رہا۔ لیکن اس میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب کم مرتبہ آدمی  
کسی بڑے مرتبہ والے کے ساتھ رہے تو اس وقت "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" صَحَابِیٌّ  
بولتے ہیں۔ اس کے برعکس بڑا آدمی چھوٹے کا مُصَاحِبٌ نہیں کہلاتیگا،  
حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ أَصْحَابُہُ وَالْمُصَاحِبَةُ  
کے معنی ہیں ساتھ رہنا۔ اس میں یہ تخصیص ہے کہ یہ ساتھ رہنا لمبے عرصہ کے  
لئے ہونا چاہئے۔ اگر لمبا عرصہ نہیں تو اسے اِجْتِمَاعٌ کہینگے\*۔ ابن  
فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے یا قریب رہنے کے  
ہوتے ہیں۔

أَصْحَابُ الرَّجُلِ وَلَهُ کے معنی ہیں وہ اس آدمی کا مطیع و فرمانبردار  
ہو گیا۔ الْمُصَاحِبُ - ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔ مطیع و فرمانبردار ساتھی\*۔  
أَصْحَابُ فُلَانًا کے معنی ہیں، اس کی حفاظت کی۔ چنانچہ قرآن کریم میں  
ہے وَلَا هُمْ مِينًا يُصْحَبُونَ (۲۱)۔ ہمارے عذاب سے ان کی کوئی  
حفاظت نہیں کر سکے گا۔ أَصْحَابُ (جمع أَصْحَابُ) - کسی کے ساتھ  
مسلل رہنے والا، چیز کا مالک۔ وہ شخص جو اس میں تصرف کا مالک ہو\*\*۔  
ساتھ رہنے (معاشرت) کے اعتبار سے بیوی کو صَاحِبَةُ (۱۰۴) کہا گیا ہے۔

قرآن کریم میں أَصْحَابُ النَّارِ اور أَصْحَابُ الْجَنَّةِ آیا ہے۔  
أَصْحَابُ کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ مادی  
مقامات کا نام نہیں جن میں رہنا ہوگا۔ یہ کیفیات کا نام ہے جو انسان کے  
ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور لگی رہیں گی۔ یہی صَحِيبٌ کے بنیادی معنی ہیں۔

انہی کو اصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ (۵۱) اور اصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ (۵۲) کہا گیا ہے۔ یعنی یمن و سعادت کے مالک اور شامت زدہ لوگ۔ سورۃ ذاریات میں اصْحَابِہِمْ (۵۹) سے مراد ہیں انہی جیسے لوگ۔ راغب نے کہا ہے کہ صاحبُ ہر اُس ساتھ رہنے والے کو کہہ دیا جاتا ہے جو مستقلاً کسی انسان یا حیوان یا مکان یا زمان کے ساتھ رہے۔ خواہ یہ ساتھ رہنا جسمانی طور پر ہو یا فکری طور پر۔ صاحبُ النُّفُوسِ (۶۸)۔ ”مچھلی والا“۔ یعنی جسکے ساتھ مچھلی کا واقعہ گزرا تھا۔ یعنی ذَا النُّفُوسِ (۲۱)۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْفِیْثِلِ - اصْحَابُ الْاُخْدُودِ - اصْحَابُ الْاَلْیُکْتَرِ - اصْحَابُ الْحِجْرِ - مختلف پارٹیوں اور قوموں کے لئے آیا ہے جن کی تفصیل قرآن کریم کے متعلقہ مقامات میں ملے گی۔ علاوہ ازیں اصْحَابُ الْکَہْفِ وَ الرَّقِیْمِ کا قصہ سورۃ کہف میں آیا ہے۔ (ان سب کے تشریحی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

سورۃ توبہ میں اُس واقعہ کا ذکر ہے جب نبی اکرمؐ (ہجرت کے وقت) ایک شام میں تھے اور آپ کے ہمراہ ایک ”ساتھی“ تھا۔ اس ”ساتھی“ کے متعلق کہا گیا ہے اِذْ یَقُولُ لِصَّاحِبِہِ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۱۰)۔ ”جب (رسول اللہؐ نے) اپنے ساتھی سے کہا کہ مت گھبراؤ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے“۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ساتھی حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ اسی بنا پر حضورؐ کے باقی ساتھیوں کو بھی صحابہؓ کہا جاتا ہے۔

## ص ح ف

الصَّحِیْفُ - روئے زمین - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کشادگی اور وسعت بتائے ہیں۔ الصَّحَافُ - چھوٹے چھوٹے حوض جو پانی جمع کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ الصَّحِیفَةُ بڑا پیالہ۔ پھیلا ہوا چوڑا پیالہ جس سے پانچ آدمی سیر ہو کر دوڑھ یا پانی پی سکیں\*۔ الصَّحِیْفَةُ (جمع الصَّحَافِ وَالصَّحِیْفُ) - لکھا ہوا کاغذ۔ یہ لفظ عرف عام میں چہرہ اور کتاب کے ورق کے لئے بھی بولا جاتا ہے\*\*۔ یہ دراصل ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں\*\*\*۔ الْمُصْحَفُ (سیم کی تینوں حرکات کے ساتھ\*\*)۔ متعدد صحیفوں (لکھے ہوئے اوراق) کا مجموعہ\*\*\*۔ الْمُصْحَفُ - قرآن کریم کو اشتباہ حروف کی وجہ سے اس طرح پڑھنا یا روایت کرنا جس طرح وہ قرآن کریم میں نہیں\*\*\*۔ قرآن کریم میں صَحَافُ (واحد صَحِیفَةُ)

بڑے بڑے طباق یا پیالوں کے لئے آیا ہے۔ (۳۳)۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے  
 يَتَلَوُاْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۶۸)۔ جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔  
 ان لکھی ہوئی آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے جو ہر قسم کے اسقام و نقائص  
 سے پاک اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہیں۔ غور کیجئے۔ قرآنی آیات  
 کو صحیف کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ شروع ہی سے لکھی  
 جاتی تھیں۔ اسکی تفسیر (۱۵-۱۴) میں کر دی، جہاں فی "صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ"  
 کہہ کر یہ بتا دی "سَفَرَةٌ" کیرام بَرَرَةٌ سے اسکی تشریح کر دی کہ  
 وہ، واجب العزت والتکریم کتابوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے  
 کہ نبی اکرم ﷺ پورے قرآن کریم کو لکھا کر اُمت کو دیکر گئے تھے۔  
 یہ صحیح نہیں کہ اسے بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے جمع کیا تھا۔ قرآن کریم کے  
 علاوہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی کتابوں کو صُحُفٍ اِبْرَآهِيْمَ  
 وَمُوسٰی (۱۹) کہا گیا ہے۔ اور عام لکھی ہوئی چیزوں کے لئے یہ لفظ  
 (۱۹) اور (۵۲) میں آیا ہے۔

## ص خ خ

الصَّخْصُ۔ لوہے کو لوہے پر یا کسی اور سخت چیز کو سخت چیز پر  
 زور سے مارنا۔ (جیسے کارخانوں میں ہوتا ہے)۔ نیز اس طرح دو سخت چیزوں  
 کے لگنے سے پیدا ہونے والی آواز اسی سے الصَّخَاخَةُ سخت اور کسخت آواز  
 کو کہتے ہیں جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ سخت مصیبت کو بھی کہتے ہیں۔  
 چنانچہ صَخْصِي "فَلَانٌ" بَعْظِيْمَةٍ کے معنی ہیں اس نے مجھ پر بہت  
 بڑا اہام لگایا \*۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کیلئے آیا ہے فَاِذَا جَاءَتِ الصَّخَاخَةُ  
 (۸۸)۔ مبہوت کر دینے والی مصیبت۔ اور اگر اس میں جنگ کی طرف بھی  
 اشارہ ہے تو پھر ہتھیاروں کی جھنکار کا پہلو بھی اس میں مضمر ہے (اور  
 ہماری Machine Age - مشینی دور، تو ہے ہی صَخَاخَةُ)۔

## ص خ ر

الصَّخْرَةُ۔ (جمع صَخَرٌ) بڑا سخت پتھر یا چٹان کا ٹکڑا۔ الصَّخَاخِرُ۔  
 لوہے پر لوہا مارنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے \*\*۔ (یہ صَخَاخَةُ کے ہم معنی  
 ہے۔ دیکھئے عنوان ص - خ - خ)

سورة کہف میں ہے اِذْ اَوْثَقْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ (۱۸)۔ جب ہم نے بڑے پتھر (یا چٹان) کے ٹکڑے کی پناہ لی تھی۔

سورة فجر میں قوم ثمود کے متعلق ہے جَاءُوا الصَّخْرَ بِالنَّوَادِرِ (۸۹) انہوں نے وادی میں بڑی بڑی چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ صَخْرَةٌ ہر پتھر کو نہیں کہتے، صرف بڑی چٹان کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔

## ص د د

صَدَّقَتْ عَنْهُ - يَصْدُقُ - صَدُّ وُدًّا - کسی سے رو گردانی کرنا۔ اعراض بہر تنہا \* - رَأَيْتَ الْمُتَنَافِقِينَ يَصْدُقُونَ عَنْكَ صَدُّ وُدًّا (۶۱)۔ تو منافقین کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے پورا پورا اعراض کرتے ہیں۔ منہ پھیر لیتے ہیں۔ صَدَّقَتْ عَنْهُ - يَصْدُقُ - صَدًّا - اسے کسی چیز سے باز رکھا، ہٹایا، پھیر دیا، روک دیا \* - وَصَدَّقَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۲۱)۔ اللہ کی راہ سے روکنا۔

صَدَّقَ - يَصْدُقُ صَدْرَ يَدًّا - اس نے شور و غوغا کیا۔ چیخ پکاری \* - اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِيدُونَ (۲۳) تیری قوم اس پر چلا اٹھتی ہے۔

صَدْرَ يَدِّ - کھولتا ہوا گرم ہانی - زخم سے رسنے والا خون آلود ہانی - جہنمیوں کی کھالوں سے ٹپکنے والا ہانی - نیز پیپ کو بھی کہتے ہیں \* - جہنم کے ہانی کو مَسَاءَ صَدْرَ يَدِّ (۱۶) کہا گیا ہے۔ کھیتوں کی نشوونما ہمیشہ ٹھنڈے ہانی سے ہوتی ہے۔ کھولتا ہوا گرم ہانی ہودوں کو جلا دیتا ہے اور ان کی نشوونما ختم ہو جاتی ہے۔ اسمائے جہنم کی زندگی میں انسانوں کو جو کچھ ملتا ہے اس سے ان کی جسمانی زندگی توقائم رہتی ہے لیکن کشت انسانیت یکسر جھلس کر رہ جاتی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ مَسَاءَ حَمِيمًا (۲۵) کہا گیا ہے۔ انسانیت کی نشوونما رک جانے کا نام جہنم ہے (دیکھئے عنوان ج - ح - م)

## ص د ر

الصَّدْرُ - سینے کو کہتے ہیں (جمع صُدُورٌ ہے)۔ پھر ہر چیز کے اعلیٰ، مقدم اور اگلے حصہ کو کہنے لگ گئے۔ صَدْرُ الْقَوْمِ - قوم کا رئیس \*\*۔

صَدَرَ - يَصْدُرُ - لوٹنا - واپس ہونا - یہ درحقیقت جانوروں کے پانی  
 ہی کسر واپس آنے کیلئے بولا جاتا ہے - وَرُودٌ - پانی پینے کیلئے گھاٹ پر  
 جانا ، اور صَدُّوْرٌ - واپس آنا - اَلصَّادِرُ - لوٹنے والا\* -

لہذا اس لفظ کے معنی آگے جانا - نکلنا اور لوٹنا ہیں - نکل پڑنے کے  
 معنوں میں یہ لفظ (ث) میں آیا ہے - اَصْدَرَ - واپس لے جانا ، لوٹانا - جانوروں  
 کو پانی پلا کر واپس لے جانے کے معنوں میں یہ لفظ (ف) میں آیا ہے -

صَدْرٌ (جمع صُدُوْرٌ) کا لفظ قرآن کریم میں دل کے معنوں میں  
 آیا ہے - اِنْ تَخْضَعُوْا مَعًا فِیْ صُدُوْرٍ کُمْ (۳۸) - راغب نے لکھا ہے کہ  
 قرآن کریم میں جہاں اللہ نے اَلْقَلْبُ کہا ہے تو اس سے مراد علم و عقل ہے  
 اور جہاں صَدْرٌ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس میں علم و عقل اور جذبات  
 سب شامل ہیں\*\* - لیکن یہ کلیہ نہیں -

قرآن کریم نے اپنے آپ کو شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰۷) کہا  
 ہے - یعنی تمام ذہنی اور نفسیاتی امراض کے لئے شفا - صاحب محیط نے  
 بَنَاتُ الصُّدُوْرِ کے معنی تفکرات لکھے ہیں\*\*\* -

(شَرْحِ صَدْرِ کے لئے دیکھئے عنوان ش - ح)

## ص د ع

اَلصَّادِعُ - کسی سخت چیز میں شکاف ڈالنا\*\*\*\* - ابن فارس نے کہا  
 ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں ”تْرِیْرٌ“ پڑ جانا ، کسی چیز کا کھل جانا  
 اور اس میں پھٹن پیدا ہو جانا یا بال آ جانا ہیں - اَلصَّادِعُ - لوگوں کی  
 جماعت - چیز کا ایک ٹکڑا - پھاڑی ہوئی چیز کا آدھا حصہ - صَدَّعَتْهُ صَدْعًا - اس  
 نے اسے پھاڑ دیا - آدھا آدھا کر دیا - اَلْمَصَادِعُ سخت زمین میں نرم  
 راستے - تیروں کی انہاں - اَلصَّادِعُ - دردِ سر - وہ درد جس سے سر پھٹا جا رہا  
 ہو - تَصَدَّعَ الْقَوْمُ واصَّدَّعُوا - قوم متفرق ہو گئی - صَدَّعَ الرَّجُلُ -  
 اس کے سر میں درد ہوا\* -

سورة حجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ  
 وَاعْرِضْ اِلَیَّ الْمُشْرَکِیْنِ (۶۶) - آیت کا دوسرا ٹکڑا پہلے کی تشریح  
 کر رہا ہے - یعنی اب ان مشرکین عرب سے اعراض برتو - ان سے کفارہ کشی  
 کرلو - اور اپنی الگ جماعتی تنظیم کرو - بعض نے اس کے معنی یہ بھی

لکھے ہیں کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اسے کھول کر بیان کرو۔ (لیکن ہمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ موزوں ہے)۔ سورۃ روم میں ہے **بَتَّيْنَتَانِ** (۳۰/۳۰)۔ جس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔ سورۃ واقعہ میں ہے **لَا يَصْدَقُ عَثُوثٌ عَنْتَهَا** (۹۱/۹۱)۔ اس سے درد سر نہیں ہوگا۔ دماغی خلل نہیں ہوگا۔ سورۃ حشر میں ہے **خِشَاعًا مُّتَّصِدًا** (۸۹/۸۹) ڈکڑے ڈکڑے ہو جانے والا۔ پھٹا ہوا۔ سورۃ طارق میں ہے **لَا رُضَ ذَاتُ الصَّيْدِ** (۸۶/۸۶)۔ ”زمین جو پودوں کے اگنے کے وقت پھٹ جاتی ہے“۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کائنات میں ہر شے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (بِالْحَقِّ)۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض عمل تخریبی بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تخریب درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہے۔ مثلاً ہم زمین میں تخم ریزی کرتے ہیں تو اس کے بعد دانہ پھٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ زمین بھی شق ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہ تخریبی عمل ہے۔ لیکن اس سے فصل کی ابتداء ہوتی ہے جو یکسر تعمیری نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر تعمیر سے پہلے تخریبی عمل ہوتا ہے۔ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** سے پہلے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی پروگرام میں صرف لا ہی لا ہو تو وہ تخریب ہی تخریب پیدا کرتا ہے۔ اس لئے

لَا وَابِلًا سَازُ وِبرگِ امتاں      نفی ہے اثبات مرگِ امتاں  
لہذا، ارض کا ذَاتُ الصَّيْدِ عِ ہونا، انسانی نشو و نما کے لئے ہے۔

## ص د ف

**الصَّيْدُ** - سیپی - ہر بلند عبارت یا دیوار یا پہاڑ\*۔ ابن فارس نے **الصَّيْدُ** کے معنی پہاڑ کا کنارہ یا جانب کٹے ہیں کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے **إِذَا مَسَّوْا كِلَى بَيْتَيْنِ الصَّيْدِ فَيَنْبُرُ** (۹۶/۹۶)۔ یہاں **صَدَفَيْنِ** کے معنی دو بلند پہاڑ ہیں۔ **الصَّيْدُ** - گھوڑے یا اونٹ کی ٹانگوں کی کجی\*۔ ٹیڑھے پن کے اعتبار سے **صَدَفَتِ عَنْتُهُ** کے معنی کسی سے اعراض ہرتنا۔ منہ موڑ لینا ہوتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ **عَنْ** آئیگا تو اس کے معنی منہ پھیر لینے کے ہو جائیں گے (۱۵۸/۱۵۸)۔ بغیر **عَنْ** کے بھی یہ معنی آجاتے ہیں۔ **صَدَفَ فُلَانٌ** وہ جھکا نیز اس نے منہ پھیر لیا۔ جیسے قرآن کریم میں ہے **ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ** (۲۶/۲۶)۔ یہ لوگ اس پر بھی اعراض ہررتے اور منہ پھیر لیتے ہیں۔ **الصَّيْدُ وَفٌ**۔ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنا رخ دکھائے اور پھر منہ پھیر لے\*۔

## ص د ق

صِدْقٌ - کِذْبٌ کی ضد ہے - جیسا کہ کِذْبٌ کے عنوان میں لکھا گیا ہے ، جب انسان کا دل اور اسکی زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کِذْبٌ کہتے ہیں ، خواہ وہ بات جسے وہ بیان کر رہا ہے ، سچی ہی ہو۔ اس لئے صِدْقٌ کے معنے ہونگے ، دل و زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا۔ اسی کو سچ کہتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک شکل اور بھی ہے۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ غلط ہے ، لیکن اسے جو کچھ معلوم ہے اسے وہ ٹھیک ٹھیک بیان کر رہا ہے۔ اس صورت میں اس کے دل اور زبان میں تو ہم آہنگی ہوگی ، لیکن اسکی بات غلط ہوگی۔ اس شخص کو ہم جھوٹا نہیں کہہینگے ، البتہ اس کی بات کو غلط کہہینگے۔ نیز صِدْقٌ کے معنے قوت اور شدت کے بھی آتے ہیں\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہی قوت کے ہیں اور سچ کو الصِّدْقُ اسی لئے کہتے ہیں کہ سچ میں فی نفسہ قوت ہوتی ہے ، اور جھوٹ بودا اور کمزور ہوتا ہے۔ شَىءٌ صِدْقٌ - ٹھوس اور سخت چیز کو ، اور رُحٌ صِدْقٌ مضبوط نیزہ کو کہتے ہیں۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئینگے ان میں ان بنیادی معانی کا پہلو مضمر ہوگا۔ اسے ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے۔

الصَّدِيقُ - دوست کو کہتے ہیں۔ الصِّيدُ - بَقْ - بہت سچ بولنے والا۔ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ سچ کا اس قدر خوگر کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔ نیز صِیْدُ بَقْ وہ ہے جو اپنے قول و اعتقاد میں سچا ہو اور اس کی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔ اس لئے کہ صِدْقٌ کے معنے ہیں سچ کر کے دکھا دینا۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر آتی ہے) ، الصَّدَقَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں دی جائے\*۔ بعض کا خیال ہے کہ صَدَقَةٌ وہ ہے جو واجب نہ ہو بلکہ محض بطور خیرات دیا جائے ، اور زَكَاةٌ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ جیسا کہ زَكَاةٌ کے عنوان (ز - ک - و) میں بیان ہو چکا ہے ، جب قرآنی نظام اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب معاشرہ (یا نوع انسانی) کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معین رقم افراد پر واجب قرار دینا ہے ،

\* تاج و راغب -

جو عام حالات میں وصول کمر لی جاتی ہے۔ (اس کے لئے زکوٰۃ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کر لیا گیا ہے)۔ لیکن ہنگامی حالات (Emergency) میں افراد سے اپیل کی جاتی ہے۔ جو کچھ وہ اس طرح دیتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے (۹۰؛ ۹۱)۔

صدق کے معنی ہیں اس نے جو کچھ کہا اس پر عمل کر کے اسے سچ کر دکھایا\*۔ سورۃ احزاب میں ہے مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (۳۳)۔ مومنوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ (۳۰)۔ ”یقیناً اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا“۔ سورۃ زمر میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ (۳۹)۔ ”حمد، اللہ کیلئے ہے جس نے اس وعدہ کو جو اس نے ہم سے کیا تھا سچ کر دکھایا“۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ نیکی اور کشادگی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشادگی راہ یہ ہے کہ تم صحیح تصورات حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انہیں سچ کر کے دکھا دو۔ ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے، اُولَئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوا (۲۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ہے جو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کر سکے (۲۱)۔ اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ہے۔

کسی واجب کام کے نہ کر سکنے کی وجہ سے جو کچھ بطور کفارہ دیا جاتا ہے اسے بھی صدقہ کہا گیا ہے (۲۱)۔ سورۃ بقرہ میں صدقات کا لفظ التبرؤا (سود) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۷)۔ یعنی تبرؤا تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارا واجب ہے اس سے زیادہ لو، اور صدقہ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر واجب ہے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) اس سے بھی زیادہ دو۔ اسی لئے کہا ہے کہ یَتَمَحَقُّ اللّٰهُ التَّوْبَةَ لَؤِیْ وَیُتْرَبِی الصَّدَقَاتِ (۲۷) (تبرؤا جسے تم بزعم خویش سمجھتے ہو کہ ہم نے زیادہ وصول کر لیا) تباه و برباد ہو کر رہتا ہے۔ اور صدقات (جسے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خواہ مخواہ دیدیا) بہت بڑھتے ہیں۔ اور تصدق و اصدق کے معنی ہیں جو کچھ کسی پر تمہارا واجب ہے اسے بھی چھوڑ دینا، بطیب خاطر دیدینا،



صدقہ کر دینا۔ مثلاً اگر قرضدار غریب ہو گیا ہے تو اسے قرض معاف کر دیا جائے (۲۸۰/۲) نیز (۹۴/۲؛ ۵۵/۲)۔ عورتوں کا مہر بھی صدقہ ہے (۲/۲) لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ دال کے ضمہ (پیش) سے آیا ہے۔ یعنی صدقہ۔ واضح رہے کہ مہر کوئی متعین رقم نہیں جس کے عوض عورت کو خریدا جاتا ہے۔ یہ محض ایک تحفہ (Gift) ہے جسے بطیب خاطر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا دینا ضروری ہے۔ (مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ صدقہ میں اخلاص (صدق) اور حق و دوستی اور رفاقت (صداقت) کا مفہوم مضمر ہے۔ صدیق\*۔ دوست کو کہتے ہیں (۶۱/۲) (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو مَبَوَّاتِ صِدْقٍ عطا کیا (۱۰۸/۱)۔ اس کے معنی ہیں ایسی سرزمین جو قوتوں اور توانائیوں، خوشگوار دیوں اور صلاحیتوں (Potentialities) سے بھری ہوئی تھی۔ (صاحب تاج العروس نے اس کے معنی مَنُزِلًا صَالِحًا لکھے ہیں)۔

قرآن کریم میں صدق اور صدق دو توں الفاظ ”سچ“ ”کرد کھا دینے“ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (صدق کی مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں۔ نیز سورۃ الفتح میں ہے) لَقَدْ صَدَّقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْبَرَاءَ بِالْحَقِّ... (۲۸/۲) ”یقیناً اللہ اپنے رسولؐ کے خواب کو عنقریب سچا کر دے گا“۔ اور سورۃ صافات میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے قَدْ صَدَّقْتَ الْبَرَاءَ (۱۰۵/۳) ”تو نے خواب کو سچ کر دکھا“۔ اسی صدق سے مُصَدِّق ہے جس کے معنی ہیں سچ کر کے دکھانا دینے والا (۳۸/۳)۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ (۲/۲) ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اہل کتاب کے پاس ان کی مڑھومہ کتابیں بالکل سچی ہیں۔ یہ معنی اس لئے غلط ہیں کہ خود قرآن کریم میں ان کتابوں کی بابت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تحریف والحاق ہو چکا ہے۔ لہذا جن کتابوں کو قرآن کریم خود معترف قرار دے رہا ہو وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے؟ دراصل (مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ) میں ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ عام اخلاقی اصول دنیا کی ہر قوم کے پاس بالعموم موجود ہیں۔ سب کی تعلیم یہ ہے کہ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔

\*صدق بمعنی صدق یعنی تصدیق کی، بھی آتا ہے۔ آیت (۲۸/۲) میں اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے رسولؐ کے دیکھے ہوئے خواب کی تصدیق کی اور اسے بتایا کہ تمہارا یہ خواب سچ ہو کر رہے گا۔ (راغب و کشاف)

چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیم محض نظری حیثیت سے موجود ہے۔ کوئی عملی نظام ایسا نہیں جو اس تعلیم کو سچا کر کے دکھائے۔ قرآن کریم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ یہ صرف اس تعلیم کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا عملی نظام بھی دیتا ہے جس میں یہ تعلیم سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ ظالم کبھی پتہ نہیں سکتا، لیکن اس کے باوجود ہم ظالموں کو پتہ دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ إِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الظَّالِمُونَ (۱۲۶) لیکن وہ اس کے ساتھ ایک عملی نظام ایسا دیتا ہے جس میں یہ اہم حقیقت (کہ ظالم کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی) عملاً سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یعنی وہ اخلاقی اصول جو دنیا میں محض نظری تعلیم بن کر رہ چکے ہیں قرآنی نظام میں ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے آجائینگے، اور اس طرح دنیا دیکھ لے گی کہ وہ اصول فی الواقعہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم ان اصولوں کو سچ کر کے دکھا دینے والا ہے۔ جو اقوام عالم کے ہاں موجود ہیں اور ان اصولوں کو بھی جو ان کے علاوہ، قرآن کریم میں آئے ہیں اور جن سے آسمانی ہدایت عالمگیر اور مکمل ہوئی ہے نیز اس اعتبار سے بھی کہ کتب سابقہ (توراة و انجیل) میں ایک آئے والے نبیؐ کے متعلق جس قدر نشانات مذکور تھے قرآن کریم نے ان سب کو نبی اکرمؐ کے ظہور میں سچا ثابت کر دیا۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے (اپنی کتاب مفردات القرآن میں) اس سلسلہ میں بڑی مفید بحث کی ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ | یہ دو کلمے ہیں جن کا مفہوم اکثر لوگوں نے نہیں سمجھا۔ انہوں نے خیال کر لیا کہ قرآن کریم نے تعریف و تبدیل شدہ کتابوں کی شہادت دی ہے۔ مُصَدِّقًا کا لفظ شبہ کا موجب ہو سکتا تھا کیونکہ تَعْدِيلٌ یُقْبَلُ کا لفظ اس مفہوم کے لئے مشترک ہو سکتا ہے۔ اور بَيْنَ يَدَيْهِ کے مفہوم کو لوگوں نے اس لئے نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ لوگ عربیت سے واقف نہیں رہے۔

واضح رہے کہ صَدَّقَهُ کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی آدمی یا بات کی سچائی کی شہادت دینا، اور دوسرے معنی یہ کہ اس نے اسے اسکی توقعات میں سچا بنا دیا۔ حمانہ میں ہے :-

فَدَّتْ نَفْسِيْ وَ سَامَكَتْ يَمِيْنِيْ  
فَوَارِسَ صَدَقَّتْ فِيْهِمْ ظَنُوْنِيْ

میری جان اور وہ تمام چیزیں جو میرے قبضہ میں ہیں ان شہسواروں پر قربان جن کے متعلق میرے تمام خیالات (قوقعات) سچ ثابت ہو گئے۔  
 اسی معنی میں قرآن کریم میں آیا ہے وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ (۳۳/۲۰) اور ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا ظن سچ کر دکھایا۔ سو انہوں نے اس کی پیروی کی۔

اگر آپ اس لفظ کے مواقع استعمال پر غور کریں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں، کیونکہ نبی اکرمؐ اور قرآن کریم بالکل اسی طرح آئے جس طرح تورات نے خبر دی تھی۔ لہذا آپ کی اور قرآن کریم کی آمد نے تورات کو سچ کر دکھایا۔ اس کے بعد اگر وہ لوگ قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی تکذیب کرتے ہیں تو انکی طرف سے یہ خود ان کی اپنی کتابوں کی تکذیب ہوگی [اس کے بعد علامہ فراہیؒ نے بتایا ہے کہ امام رازی وغیرہ نے ان آیات کے مفہوم میں کس طرح غلطی کھائی ہے، اور صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ہم بحث کے اس حصے کو چھوڑتے ہیں۔ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس بحث کو ان کی مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۶۴ تا ۶۷ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں]

علاوہ ان کے جنکا پہلے ذکر آچکا ہے، صَدَقَ کی مختلف شکلیں قرآن کریم میں اس طرح آئی ہیں۔ سچ کہنا۔ تصدیق کرنا۔ صَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (۵۲/۳۱)۔ سچ کر دکھانا۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا (۱۱۱/۲۰)۔ نیز لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الْفَرَقَ (۲۸/۲۰)۔ قَدْ صَدَقَ (۱۳/۲۰) ایسی سبقت جو شرف و فضیلت کو لئے ہو۔ مَدْخَلَ صِدْقٍ اور مَخْرَجَ صِدْقٍ (۸۰/۱)۔ شرف و فضیلت کے ساتھ آگے بڑھنا اور شرف و فضیلت کے ساتھ مناسب وقت پر پیچھے ہٹنا۔ یا سچائی کے ساتھ کسی معاملہ وغیرہ میں داخل ہونا اور سچائی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہونا اور نکلنا۔ لَيْسَانَ صِدْقٍ (۲۱/۲۰) شرف و فضیلت کی بناء پر حقیقی شہرت۔ مَقْعَدِ صِدْقٍ (۵۵/۲۰) ٹھہرنے کا ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں۔ صَادِقٌ (۱۱۱/۲۰) سچا۔ مخلص۔ اَصْدَقُ۔ صادق تر، زیادہ سچا (۸۰/۲۰)۔ تَصْدِيقُ۔ سچ کر کے دکھانا (۱۱۱/۲۰) مَتَّصِدٌ کسی کو کچھ بطور بخشش دیدینے والا یا جو کچھ اس کا کسی پر واجب (Due) ہو اسے چھوڑ دینے والا (۱۲/۸۸)۔ سورۃ حدید میں صدقہ دینے والوں کو مَتَّصِدٌ کہا گیا ہے (۵۶/۱۸) یعنی جو کچھ واجب ہے اس کے علاوہ اور بھی دینے والے۔ یہ سب اس لئے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو سچا کر

دکھائیں کہ ان کا فریضہ زندگی دوسروں کی نشو و نما کرنا ہے۔ کَذَّبَ کے مقابلہ میں صَدَقَ (صَدَقَ، صَدَقَتْ) میں آیا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ صِدْقُ کسی شکل میں بھی استعمال ہو، اس میں دل کی ہم آہنگی اور رضامندی کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کیا جائے یا دیا جائے وہ بھی دل کی رضامندی اور خوشنودی لئے ہو اور جو کچھ مانا اور تسلیم کیا جائے وہ بھی بطیب خاطر ہو۔ اس میں جنور و اکراہ کا شائبہ تک نہ ہو۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہی وہ عمل ہے جو وجہ تقویت ہو سکتا ہے، خود اس کام کے کرنے والے کے لئے بھی اور نوع انسانی کے لئے بھی۔ اس لئے اس کی رو سے صِدْقُ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

## ص ذ ی

الصَّادِی - کے بہت سے معنے ہیں، جن میں سے ایک معنے ہیں صدائے باز گشت (جو کسی مکان یا پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آئے)۔ اَصْدَى الْجَبَلِ۔ پہاڑ نے صدا کا جواب دیا۔ الصَّادِی - مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں۔ اَلتَّصْدِیْقَةُ - تالیاں پٹنا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ التَّصْدِیْقَةُ ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صدی کی طرح ہو، یعنی جس سے کوئی مفہوم نہ نکلتا ہو یا جس میں غنا و خوش الحانی نہ ہو\*\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ (عہد جہا ہلیہ کے عربوں کی صَلَوة\*) مَكَاةً وَ تَصْدِیْقَةً (ہم) کے سوا کچھ نہیں رہ گئی تھی۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم ہے بے معنی آواز اور حرکت\*\*۔ (اس آیت کے مفہوم کے لئے عنوان م - ک - و دیکھئے)۔ صَادَاہ - سامنے آنا۔ تَصْدِیْقُ لَہ - سر اٹھائے ہوئے کسی کے سامنے آنا۔ بار بار کسی کے سامنے آنا۔ صدائے باز گشت کی طرح کسی کی طرف ہلنا، درپے ہو جانا۔ متوجہ ہونا\*\*\*۔ فَاَنْتَ لَہ تَصْدِیْقُ (ہ)۔ تو اس کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوتا ہے۔

## ص ر ح

الصَّرَاحُ - ہر چیز میں سے خالص۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خالص چیز کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ کَأْسٌ صَرَّاحٌ - وہ پیالہ (شراب وغیرہ کا)

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* محیط -

جو خالص ہو اور اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔ اَلتَّصْوِرُ بُحٌ\*۔ (لازم اور متعدی) معاملہ کو واضح کر دینا۔ معاملہ کا کھل جانا۔ صاف اور خالص ہو جانا\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر ہونے اور کھل جانے کے لکھے ہیں۔ لَبَنٌ صَوَّرَ بُحٌ\*۔ خالص دودھ جس کے جھاگ بیٹھ چکے ہوں۔ اَلصُّوْرَ اَحْيَا۟ۃٌ\*۔ خالص شراب۔ اَلصُّوْرَ اَحْيَا۟ۃٌ\*۔ شراب کا برتن۔ اَلصُّوْرُ حَتّٰۗۃٌ\*۔ زمین کا اوپر کا حصہ۔ پشتِ زمین جو ہموار ہو۔ اَلصُّوْرُ حٌ\*۔ بلند، منقش و مزین شاندار مکان جو دوسرے گھروں سے منفرد اور الگ ہو۔ بلند عمارت۔ اس کے بعد یہ لفظ محل کے لئے استعمال ہونے لگا\*۔

سورۃ نمل میں ہے اِنَّہٗ صَوَّرَ مِّنْ قَوَارِرٍ (۲۴)۔ یہاں اس کے معنی محل کے ہیں۔ اور سورۃ مومن میں صَوَّرُ حَمًا (۳۶)۔ بلند عمارت کے لئے آیا ہے۔

## ص ر خ

اَلصُّوْرُ اَخٌ\*۔ سخت آواز یا فریاد کو کہتے ہیں۔ اَلصُّوْرُ حَتّٰۗۃٌ\*۔ مصیبت یا فریاد کے وقت سخت چیخ مارنا۔ اَلصُّوْرُ اَخٌ\*۔ فریاد کرنے والا۔ نیز فریادی کی مدد کے لئے پہنچنے والا۔ (فریاد رس)۔ اَلصُّوْرُ اَخٌ\* کے بھی یہی معنی ہیں\*\*۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا صَوْرَ اَخٌ لَّہُمْ (۳۶)۔ ان کا کوئی فریاد رس نہ ہوگا۔ صَوَّرَ اَخٌ\* مصدر بھی ہے یعنی اس کے معنی فریاد رسی، چیخ و پکار بھی ہیں۔ اَلْمُصَوِّرُ اَخٌ\*۔ فریاد رس، پکار پر مدد کے لئے پہنچنے والا۔ وَمَا اَنَّا بِمُصَوِّرٍۭ خِیۡکُمُ (۱۲۲)۔

اَصْطَرَّ اَخٌ\*۔ چیخنا۔ چلانا (مدد کے لئے)۔ وَہُمْ یَصْطَرُّ خَوْنٌ فِیۡہِمَا (۳۵)۔ وہ اس میں مدد کے لئے چیخیں چلائیں گے۔ دھائی دینگے۔ فریاد اور واویلا کریں گے۔

اِسْتَصَوِّرُ اَخٌ\*۔ کسی سے مدد مانگنا۔ مدد کے لئے چلانا (۲۸)۔

## ص ر ر

اَلتَّصْرِیۡۃُ\*۔ اَلتَّصْرِیۡۃُ سردی یا سردی کی شدت\*\*\*\*۔ وہ سردی (ہالا) جس سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں\*\*\*۔ زجاج نے کہا ہے کہ اَلتَّصْرِیۡۃُ\*۔ سخت چیخنے اور چلانے کو کہتے ہیں۔ رِیۡحٌ صِیۡرٌ وَّ صَوْرٌ صَوْرٌ\*۔ سخت آواز والی \*تاج و راغب۔ \*\*تاج و محیط نیز ابن فارس۔ \*\*\*لین۔ \*\*\*\*تاج۔

تیز ہوا۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ سخت گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں\*۔  
 لیکن صَرَّ کے بنیادی معنی باندھنے کے ہیں۔ (راغب نے کہا ہے کہ) صَرَّ صَرَّ  
 کا لفظ بھی اسی صَرَّ سے نکلا ہے اس لئے کہ ٹھنڈ سے بھی چیزیں بندھ کر  
 جم جاتی ہیں\*\*۔ اسی سے اصْرَارُ ہے جس کے معنی ہیں کسی بات پر سختی  
 سے جم جانا۔ الصَّرَّةُ۔ اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھی جاتی  
 ہے\*\*۔ اور اس طرح باندھی ہوئی نقدی کو الصَّرَرِیَّةُ کہتے ہیں\*۔ ابن  
 فارس نے ان معانی کے علاوہ، اس کے معنی بلند اور اونچا ہونا بھی لکھے ہیں۔  
 چنانچہ الصِّرَارُ ان اونچے مکانوں کو کہتے ہیں جن تک سیلاب کا پانی نہ  
 پہنچ سکے۔

قرآن کریم میں سخت سردی کے لئے یہ لفظ (۱۱۶/۳) میں آیا ہے۔  
 (۱۱۶/۵۴) میں رَرِیْحًا صَرَّ صَرًّا آیا ہے۔ سورة الذَّارِیَّتِ میں رِی صَرَّةٍ  
 (۱۱۶/۵۹) کے معنی ہیں تعجب سے کچھ بولتی ہوئی۔ لیکن اس میں شدت کے  
 معنی ہونگے۔ اس کے معنی منہ بسورنے کے بھی آتے ہیں\*۔ اس کے معنی  
 چیخ و ہکار، شور و غل، تکلیف کی شدت بھی ہیں\*۔ نیز کسی چیز کی بھی  
 شدت۔ مثلاً حیرت کی شدت، فرط تعجب۔

سورة آل عمران میں ہے وَلَمْ یُصِرُّوا (۱۳۵/۳)۔ وہ اصرار نہیں کرتے۔  
 جم کر نہیں بیٹھ جاتے۔ غلطی کا احساس ہو جانے پر اس کام سے فوراً ہٹ  
 جاتے ہیں۔

## ص ر ط

صِرَاطُ۔ عام عرب اسے صِرَاطُ پڑھتے ہیں۔ صاد کے ساتھ (صِرَاطُ)  
 قریض کا لغت ہے۔ صِرَاطُ کے معنی ہیں کسی چیز کو بغیر جباے نکل جانا۔  
 چنانچہ صِرَاطُ (اور صِرَاطُ) اس لمبی تلوار کو کہتے ہیں جو بہت  
 کٹنے والی ہو۔ گویا وہ جس چیز پر پڑتی ہے اسے نکل جاتی ہے۔ اسی نہج سے  
 کھلے اور واضح راستہ کو بھی صِرَاطُ کہتے ہیں۔ (یا تو تلوار کے سیدھے  
 اور لمبے ہونے کی وجہ سے۔ اور یا اس لئے کہ چلنے والا اسے نگلتا چلا جاتا  
 ہے۔ یا وہ راستہ ہزارہا راہروں کو نگلتا چلا جاتا ہے)\*\*\*۔

قرآن کریم نے الصِّرَاطُ الْعَسْتَقِیْمُ (۱/۵) کو دوسرے مقام پر طَرِیْقُ  
 مُسْتَقِیْمٌ (۱/۲) کہہ کر صِرَاطُ کے معنی طَرِیْقُ (راستہ) بتا دیے ہیں۔  
 (مُسْتَقِیْمٌ کے معنوں کیلئے دیکھئے عنوان ق۔ و۔ م)۔  
 (قرآن کریم میں ”پل صراط“ کا کوئی ذکر نہیں)۔

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* تاج۔ دیکھئے عنوان صرط و صراط۔

## ص ر ع

الصَّيرُوعُ - الصَّيرُوعُ - زمین پر ہنک دینا - پچھاڑ دینا - الصَّيرُوعَةُ - وہ شخص جو لوگوں کو بہت زیادہ پچھاڑتا ہو - الصَّيرُوعُ - پچھاڑا ہوا - اس کی جمع صَرَعی آتی ہے \* -

قرآن کریم میں ہے فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرَعی (۱۹) یعنی تم دیکھو گے کہ لوگ اس میں پچھڑے پڑے ہیں - الصَّيرُوعُ - مرگی کی بیماری کو کہتے ہیں - الصَّيرُوعُ - الصَّيرُوعُ - مثل - برابر کا - هَمَّأ صَرَعی عَانِ - وہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور برابر کے ہیں - اَلْمِصْرَاعَانِ مِینَ الْبَابِ - دروازے کے دونوں ہٹ - اَلْمِصْرَاعَانِ مِینَ الشَّعْرِ - شعر کے دونوں مصرعے \* -

## ص ر ف

الصَّرْفُ کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا اسے کسی دوسری چیز کے ساتھ تبدیل کر دینا - یعنی یا تو خود اسکی حالت میں تبدیلی پیدا کر دینا یا اسے کسی اور چیز سے بدل دینا \* - نیز لوٹا دینا - رخ پھیر دینا - هُٹا دینا \* - صَرْفَ الصَّيْثِيَّانِ مِینَ الْمَكْتَبِ - بچوں کو مکتب سے لوٹا دیا - واپس کر دیا - صَرْفَ التَّرْسُولِ - قاصد کو جہاں سے وہ آیا تھا وہیں واپس کر دیا \* - تَصَارِيْفُ الْاَلَامُورِ - معاملات کا الٹ پھیر اور انکو ایک دوسرے کی جگہ رکھنا - اَلْمَصْرُوفُ - پلٹنے کی جگہ - ہٹنے کی جگہ - تَصْرِیْفُ الرِّیَاحِ - ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف سوڑ دینا - اَلْمَصْرُوفُ رُکَ گیا - پلٹ گیا - صَرْفُ الْخَمْرِ اور تَصْرِیْفُ الْخَمْرِ - خالص شراب (کچھ ملائے بغیر) پی جانا - اسی سے الصَّرْفُ - خالص چاندی کو کہتے ہیں اور الصَّرَافُ وَالصَّیْرُفُ - سکے ہر کھنے والے ، ہا سکوں کے تبادلہ کرنے والے کو - قرآن کریم میں تَصْرِیْفُ الرِّیَاحِ (۱۶) متعدد مقامات میں آیا ہے - یعنی ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانا - یا ان کی حالت بدل دینا - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنٰہَا فِیْ هٰذَا الْقُرْآنِ (۱۶) نیز (۱۸) - ہمنے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے - لَیْسَ ذَکَرُوا (۱۶) تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سے سمجھ

\* تاج و محیط و راغب - \*\* راغب - \*\*\* تاج - \*\*\* محیط -

سکیں۔ تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں۔ قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اس کے متعدد گوشے سامنے آجائیں۔ یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں ”تکرار“ ٹھہراتی ہیں۔

سورة الفرقان میں ہے کہ جن لوگوں کی تم پرستش کرتے ہو وہی تمہیں جھٹلائیں گے کہ ہم نے تمہیں اپنی پرستش کیلئے نہیں کہا تھا فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا (۲۹) سو تم میں اس کی قدرت نہیں ہوگی کہ ان کی بات کا رد کر سکو۔ یا ہمارے عذاب کو دوسری طرف پھیر دو۔ یا اپنے آپ کو اس پروریشن سے ہٹا سکو۔ سورة کہف میں ہے وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا (۱۸)۔ کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں وہ اس عذاب سے ہٹ کر پناہ لے سکیں۔

سورة يوسف میں ہے فَاصْرِفْ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ (۱۲)۔ تو خدا نے اس (یوسف) سے ان عورتوں کی سازش کو ہٹا دیا، اس کا رخ پھیر دیا۔ یعنی اسے انکی سازشوں کے نقصان سے محفوظ رکھا۔ سورة احقاف میں ہے اِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ ..... (۹) ہم نے انکا رخ تیری طرف پھیر دیا۔ ان دونوں آیتوں سے صَرْفَ عَنِ اور صَرْفَ اِلٰی کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورة ہود میں عذاب کے متعلق ہے۔ لَيْسَ مَصْرِفًا عَنْهُمْ (۱۱)۔ وہ ان سے دوسری طرف نہیں پھریگا۔ ان سے ٹلیگا نہیں۔ سورة توبہ میں اِنْصَرَفْ آيا ہے (۹)۔ یعنی پھر جانا۔ اور صَرْفَ پھیر دینا۔

## ص ر م

صَرَمٌ - يَصْرِمُ - اسنے (رسی یا پھلوں کے خوشہ وغیرہ کو) کاٹ کر الگ کر دیا۔ صَرَمَ النَّخْلُ - اسنے کھجور کے پھل کاٹ لئے۔ صَرَمَ الْحَبْلُ - رسی ٹوٹ گئی۔ اَصْرَمَ النَّخْلُ - کھجوروں کے پھل کاٹنے کا وقت آگیا۔ اَلصَّرَرُ يُمَحُّ - وہ زمین جس کی کھیتی کاٹ لی گئی ہو۔ الصَّرَرُ يُمُ - کاٹا ہوا، مقطوع۔ کالی زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ رات اور دن کو بھی صَرَرِيْمٌ کہتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کٹ جاتا ہے۔ اَلصَّرَامُ - کاٹنے والا۔ نیز شیر کو بھی کہتے ہیں۔ اَلنَّصِيرَامُ - مُنْقَطِعٌ ہونا\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی قطع کرنا ہی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ لَبِصْرٌ مُنْقَطِعٌ مُصْبِحِينَ (۶۸)۔ وہ صبح ہوتے ہی اس کی فصل کاٹیں گے۔ ذرا آگے چل



کمر ہے ان "کُنْتُمْ صَارِمِينَ" (۲۴) - فصل کاٹنے والے - اور دو آیتیں پیچھے ہے - فَاَصْبَحَتْ كَالصَّارِمِ (۲۸) وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے اس کے پھل کاٹ لئے گئے ہوں - اسی کو سورۃ انبیاء میں حَصِيدٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۱) - (عموماً کھیتی کے لئے حصاد اور باغ کے لئے صرم آتا ہے) - ویسے الصَّارِمِ رات کو بھی کہتے ہیں\* ، اور بالعموم وہ سیاہ ہوتی ہے لہذا سوختہ بختی کی نشانی ہے - آیت (۲۸) میں اگر اس جہت سے معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ باغ جل کر رات کی طرح سیاہ ہو گیا -

## ص ط ر

دیکھئے س - ط - ر

## ص ع د

صَعِدَ (فِي السَّجَلِ أَوِ السَّجَلِ) وَ صَعِدَ عَلَيْهِ وَفِيهِ - وہ (سیڑھی یا پہاڑ وغیرہ) کے اوپر چڑھا - لیکن صرف چلے جانے کیلئے بھی بولتے ہیں - اَصْعَدَ فِي الْأَرْضِ - وہ دور تک چلا، یا گھوما\*\* - قرآن کریم میں ہے اِذْ تَصْعِدُونَ (۱۵۴) - جب تم دور نکلے جا رہے تھے - الصَّعِيدُ زمین کو کہتے ہیں - (۱۳ : ۱۸) - مٹی اور غبار کو بھی کہتے ہیں - نیز زمین کے بالائی حصہ کو - اوپر چڑھنے میں چونکہ سانس پھول جاتی ہے اسلئے اسے دشوار اور گراں کیلئے صَعُودٌ بولتے ہیں - تَصْعَدُ نَبِيٌّ ذَالِكِ الشَّيْءِ\*\* - مجھ پر یہ شے بہت ہی مشکل اور گراں ہو گئی\*\* - صَعْدٌ - شدید - سخت\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور مشقت کے ہیں -

سورۃ جن میں ہے يَسْأَلُكَ عَذَابًا صَعَدًا (۹۴) اسے سخت عذاب میں داخل کرتا ہے - یہی معنی صَعُودٌ کے ہیں (۹۴) - سورۃ انعام میں ہے کہ اسلام، سینے کی کشاد سے حاصل ہوتا ہے - تنگ نظر اور تنگ خیال جب اسلام کا تصور کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے كَأَنَّهُمَا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ (۱۲۱) گویا وہ بڑا زور لگا کر بلندی پر چڑھ رہا ہے - ایسی چڑھائی جس کے متعلق پتہ ہی نہیں کہ کہاں جا کر ختم ہو -

سورۃ فاطر میں ہے إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ - خوشگوار نظریہ، حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے - لیکن اس طرح اسکی رفتار انسانی حساب کے مطابق بہت مست ہوتی ہے - وَالْعَمَلُ

الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵)۔ عمل صالح اسے بلند کرتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریات زندگی میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتے جائیں۔ اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہو جائیں تو ان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں۔ (تدبیر امور کے سلسلہ میں ثُمَّ يَمْزُجُ الْمَيْدَ آيا ہے۔ ۳۷)۔

## ص ع ر

الصَّعَّرُ۔ اونٹوں میں ایک بیماری ہوتی ہے جس سے ان کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ نیز تکبر اور اکڑ۔ صَعِرَ (وَجْهَهُ)۔ يَصْعَرُ۔ صَعَرًا۔ چہرہ کا ٹیڑھا ہو جانا، ایک طرف کو مڑ جانا۔ الصَّعَّارُ۔ مغرور و متکبر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا اور رخسار کو جھکائے رکھتا ہے اور لوگوں سے رخ پھیرتا ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑ جانے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے لَا تَصْعَعِرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۸)۔ تکبر کی بنا پر لوگوں سے اعراض اور روگردانی نہ کرو۔ لوگوں سے بے رخ نہ برتو۔

## ص ع ق

صَاعِقَةٌ۔ بجلی کی کڑک\*\*۔ جمع صَوَاعِقُ۔ صرف سخت آواز کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ حِمَارٌ صَعِقٌ۔ اس گدھے کو کہتے ہیں جو نہایت سخت آواز کے ساتھ رینکے۔ بیہوش ہو کر گر جائے کو بھی صَعِيقٌ کہتے ہیں\*\*۔ اور عقل و خرد کے جانے رہنے کو بھی\*\*۔ سورة بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَآخَذْنَاكُمْ الصَّاعِقَةُ (۴۰) تو وہاں اس سے مراد بے ہوش ہو کر گر جانا ہیں (نیز دیکھئے عنوان ب۔ ع۔ ث اور م۔ و۔ ت) صَاعِقَتِ الرِّقَّةِ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کنواں ڈھ جائے اور چاروں طرف سے مٹی اس میں گرنے لگے\*\*۔

ہر مہلک عذاب کو بھی صَاعِقَۃً کہتے ہیں۔ اور موت کو بھی \*۔  
 بجلی کی کڑک کے معنوں میں یہ لفظ (۲۹) میں آیا ہے۔ اور ہلاکت کے  
 معنوں میں سورۃ الطور میں جہاں کہا ہے کہ فَذَرْنَهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا  
 يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ (۵۲)۔ اس میں ان کی اجتماعی بربادی  
 اور قومی تباہی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ سورۃ زمر میں جہاں نفخہ صور کا ذکر  
 ہے وہاں کہا ہے فَصْعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (۳۹)  
 صاحب تاج العروس نے اس کے معنی عقل و شعور سے محروم ہو جانے  
 کے بھی لکھے ہیں \*\*۔ (نفخ صور کے لئے ن۔ ف۔ خ اور ص۔ و۔ کے عنوانات  
 دیکھئے)۔ سورۃ اعراف میں ہے وَخَرَّ مُوسٰی صَعِيْقًا (۱۳۳)۔ اور موسیٰ  
 غش کھا کر گر پڑا۔

## ص غ ر

الصَّغَرَ - الصَّغَارَةُ - كِبَرٌ اور عِظَمٌ کی ضد ہے۔ چھوٹا ہونا \*\*\*۔  
 (عمر و جسامت میں یا قدر و منزات میں)۔ الصَّغَارُ ذلت و رسوائی۔ محکومی \*\*\*۔  
 سورۃ اعراف میں ہے فَتَاخَّرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصَّٰغِيْرِيْنَ (۱۳)۔ نکل جا۔  
 تیرے حصے میں کبریائی (بڑائی) نہیں آئے گی۔ کبریائی قانون خداوندی  
 کی اطاعت سے نصیب ہوتی ہے۔ اس سے سرکشی پرتنے کا نتیجہ ذلت و رسوائی  
 ہے۔ سورۃ انعام میں مجرمین کے متعلق ہے صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۱۲۵)۔ انہیں  
 قانون خداوندی کے سامنے جھکنا پڑیگا۔ چھوٹا بننا ہوگا۔ اس کا محکوم ہونا ہوگا۔  
 (واضح رہے کہ یہ جھکنا اور محکومی بطیب خاطر نہیں ہوگی بلکہ بے بسی  
 کی وجہ سے مجبوراً ہوگی۔ مجرم قانون کے سامنے مجبوراً جھکتا ہے)۔ نیز (۱۱۹)  
 اور (۲۷)۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ صَاغِرٌ وَّن کے معنی ہیں سرکشی چھوڑ  
 کر، کسی مملکت میں امن پسند شہری کی حیثیت سے محکوم (یا رعایا) بن کر  
 رہنا۔ یہ مفہوم سورۃ توبہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ  
 اہل کتاب میں سے جو لوگ سرکشی برتیں اور جنگ پر اتر آئیں \*\*\*\*\*۔ انکے

\*تاج و محیط۔ \*\*لین بحوالہ تاج۔ \*\*\*تاج۔

\*\*\*\*\* یہ چیز کہ قرآن کریم ان لوگوں کے خلاف جنگ کی اجازت دیتا ہے جو  
 سرکشی اختیار کر کے جنگ پر اتر آئیں، قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے۔ قرآن  
 کریم کی رو سے جنگ سے مقصود سرکش اور ظالم کو حق و انصاف کے سامنے  
 جھکانا ہے اور بس۔

خلاف جنگ کرو۔ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹۶)۔ تا آنکہ وہ اُس امن و آسائش کے بدلے میں جو اسلامی مملکت میں رہنے سے انہیں نصیب ہوگی، شہری ٹیکس دینا اور ہر امن رعایا کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیں۔ ان کا اسلامی مملکت میں برابر کی حیثیت سے نہیں بلکہ محکوم کی حیثیت سے رہنا ان کے لئے چھوٹا ہو جانا ہے۔ لیکن یہ چھوٹا ہونا سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا، ورنہ انہیں وہ تمام حقوق انسانیت حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم ہر فرزند آدم کو عطا کرتا ہے۔ لیکن وہ امور مملکت میں دخیل نہیں ہوسکیں گے۔

سورة بقرہ میں ہے صَغِيرًا اَوْ كَبِيرًا (۲۸۲)۔ اس کے معنی ہیں تھوڑا یا بہت۔ اصْغَرُ۔ زیادہ چھوٹا (۹۶)۔

## ص غ و (ی)

صَغَا يَصْغُو وَيَصْغَى يَصْغِي۔ مائل ہونا۔ جھکنا۔ صَغَتِ الشَّمْسُ۔ سورج مائل بغروب ہوا۔ صَاغِيَةً الرِّجْلُ۔ آدمی کے طرف دار اور حمایتی۔ صِغْوَةٌ مَعَكَ۔ اس کا میلان و رجحان تیری طرف ہے۔ اصْغَى حَقَّتْ۔ اس نے اپنا حق کم کر دیا\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ لِيَتَصَغَّى لِيَهْدِيَ اَفْئِدَةً... (۱۶۶) تاکہ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں۔ (نیز ۱۶۶)۔

## ص ف ح

الصَّفْحُ۔ ہر چیز کا چوڑا پہلو۔ اس کی چوڑی سطح۔ جانب اور پہلو۔ الصَّفْحُ مِنْ السَّيْفِ۔ تلوار کی چوڑائی۔ (دھار نہیں بلکہ چوڑا حصہ)۔ الْمُصَفِّحُ۔ چوڑی چیز۔ الصَّفْحَةُ۔ چوڑائی کے اعتبار سے کاغذ کی سطح کو کہتے ہیں۔ الْمُصْطَفَحَةُ۔ ہاتھ ملانا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چوڑائی کے ہیں۔

صَفَحَ۔ اپنے منہ کو موڑ کر چہرے کا چوڑا حصہ (ایک جانب) دوسرے کے سامنے کرنا۔ یعنی اس سے اعراض برتنا۔ پہلو تو تھی کرنا۔ صَفَحَ عَنْهُ۔ اسے چھوڑ دیا۔ معاف کر دیا۔ یہ عَفُو سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے کیونکہ عَفُو میں کسی کو مجرم قرار دے کر معاف کرنا ہوتا ہے اور صَفَحَ میں اسے مجرم گردانا ہی نہیں جاتا ہے\*\*۔ سورة بقرہ میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ (۱۶۶)۔

سورۃ زخرف میں ہے اَفَنَنْضِرُ بٌ عَنْكَ كَثْمٌ الَّذِي كَثُرَ صَفْحًا (۳۳/۵)۔  
 کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تم سے اعراض برتنے ہوئے ان تاریخی حقائق کو  
 تم سے پھیر دینگے؟ سورۃ حجر میں ہے فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸)۔  
 ان سے نہایت جمال آفریں انداز سے کنارہ کش ہو کر (اپنی جداگانہ تنظیم  
 کرتے جاؤ)۔ (۱۵/۸)۔ یعنی وَ اَهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۲۳/۶۳)۔ قرآن کریم  
 کا انداز معاشرت ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہہ کسی سے بنا کر رکھنا  
 تو ایک طرف، اگر کسی سے کنارہ کش ہونا ہو تو بھی نہایت حسن کارانہ  
 انداز سے، بڑی خوبصورتی سے، جمال آفرینی کے اسلوب سے الگ ہو۔ جو ضابطہ  
 حیات کسی سے کنارہ کشی کی صورت میں اس انداز کی تلقین کرتا ہو، فور  
 کیجئے کہ وہ دوستداری اور رفاقت کے تعلقات کو کن بلندیوں تک لے جاتا  
 ہوگا اور ان میں کس قدر حسن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوگا؟

## ص ف د

صَفَدٌ - صِفَادٌ (جمع أَصْفَادٌ) - چمڑے کا تسمہ یا لوہے کی زنجیر  
 جس سے قیدی کو باندھا جائے - بندھن - بندش - نیز گلے کا طوق یا پٹہ جو  
 چمڑے کا بنا ہوتا تھا - صَفْدَةٌ - يَصْفِدُهُ - کسی کو زنجیر وغیرہ سے باندھنا -  
 جکڑنا - الصَّفْدُ - عطیہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سے انسان معطی  
 کا زیر بار احسان ہو کر سروت کی زنجیر میں بندھ جاتا ہے \* - ابن فارس نے اس  
 کے بنیادی معنی (۱) باندھنا (۲) عطا کرنا لکھے ہیں -  
 قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے - مَقْرَنَيْنِ فِي الْأَصْفَادِ  
 (۱۴/۲۹) - وہ زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہونگے۔

## ص ف ر

الصَّفْرَةُ - زردی - پیلا پن - الصَّفْرَاءُ - سونا \*\* - یہ اصْفَرُّ کا  
 مسونٹ بھی ہے - اس صورت میں اس کے معنی ”پیلے رنگ والی“ ہونگے -  
 الصَّفْرُ - خالی چیز \*\* - صَفِيرٌ اِنَّاؤُهُ - اس کا برتن خالی ہو گیا - معاورہ  
 میں اس کے معنی ہوتے ہیں - ”اس کے، ویشی ہلاک ہو گئے،“ - (ابن فارس)  
 الصَّفِيرُ - ہر آواز نکالنے والا پرندہ - الصَّفِيرُ - موشیوں کو ہانی کے لئے  
 بلانے کی آواز \*\* - سیٹی کی آواز -

سورة بقرہ میں، بنی اسرائیل کی گائے (با ساند) کے متعلق ہے کہ وہ صفراء تھی یعنی اس کا رنگ زرد تھا (۲۹)۔ اور سورة مرسلات میں جہنم کے شعلوں کو جِہِلَّتْ صُفْرًا۔ زرد اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جِہِلَّتْ صُفْرًا سیاہ اونٹوں کو کہا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی سیاہ اونٹ ایسا نہیں ہوتا جسکی سیاہی زردی میں ڈوبی ہوئی نہ ہو۔ ایسی ہی زردی کے لئے یہاں صُفْرًا کہا گیا ہے \* (۳۳)۔ سورة زمر میں زرد کے لئے مُصْفَرًّا آیا ہے (۳۹)۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی پانچ چھ لکھے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ مندرجہ بالا معنوں ہی میں آیا ہے۔

## ص ف ف

الصَّفِّۙ۔ اَلتَّصْفِیۙفُ۔ صف بندی کرنا۔ صف بنانا۔ اَلصَّفِّۙ۔ صف (قطار) میں کھڑا ہونا۔ اَلصَّفِّۙ۔ وہ لوگ جو لائن لگا کر کھڑے ہوں \*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ ایک سیدھی لکیر پر آدمیوں کو کھڑا کرنا یا درختوں وغیرہ کو لگانا صَفِّۙ کہلاتا ہے۔ سورة کہف میں ہے وَاعْرِضْ وَهُوَ اَعْلٰی رَبِّکَ صَفًّا (۱۸)۔ وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کئے جائینگے۔ اَلصَّفِّۙ۔ پرندوں کا فضا میں اپنے بازو پھیلا دینا اور انہیں حرکت نہ دینا۔ صَافَّاتٌ۔ بازو پھیلانے ہوئے \*\*۔ سورة نور میں ہے وَالطَّیۡرُ صَفَّتٍ (۲۴)۔ پرندے جو فضا میں پر پھیلانے ہوں (صَافَّاتٌ کا واحد صَافَّۙ ہے)۔ اَلصَّافَّاتُ۔ صف بستہ جماعتیں (۳۶)۔ صَوَافُّ (صَوَافِیۙ) صف میں کھڑے ہوئے اونٹ (۲۶)۔ یہ بھی صَافَّۙ کی جمع ہے۔ مَصْفُوۙفۙ۔ صف میں لگائے ہوئے (۵۲)۔ اَلصَّفۡفُۙ۔ سپاٹ اور ہموار زمین جس کا گھاس وغیرہ سب صاف کر دیا گیا ہو \*\*۔ قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفۡفًا (۲۰۶) ہموار میدان۔ صَفۡفۙۙ السَّادِرُ۔ گھر کا برآمدہ \*۔

## ص ف ن

الصَّفۡنُ۔ دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ مل جائیں \*\*\*۔ صَفۡنَ الرَّجُلِ۔ آدمی نے اپنے دونوں پاؤں ایک لائن میں رکھے \*\*\*\*۔ صَفۡنَ الْفَرَسِ۔ یَصْفِنُ۔ صَفُونًا۔ گھوڑے کا اس طرح کھڑا ہونا کہ اس کے تین پاؤں زمین پر ہوں اور چوتھے

ہاؤں کا سٹم اس طرح اٹھا ہو کہ اس کا لگلا حصہ (کنارہ) زمین کو مس کرتا رہے \*۔ اس طرح کھڑا ہونے والا گھوڑا صَافین \* کہلاتا ہے، جمع صَوَافین \* و صَافینات \*۔ عربوں کے ہاں اس قسم کے گھوڑے اعلیٰ درجہ کے شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں الصَّافِنَاتُ الْجَيَادُ (۳۸)۔ ایسے ہی اصل گھوڑوں کے لئے آیا ہے۔

## ص ف و

الصَّافُو \*۔ الصَّافَاء \*۔ کسی چیز کا صاف اور خالص حصہ۔ راغب نے کہا ہے کہ الصَّافَاء کے معنی ہیں کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونا یہی اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ صَفْوَةٌ \* کُلٌّ شَيْءٍ \*۔ ہر چیز کا خالص حصہ۔

يَوْمَ \* صَافٍ \* وَصَفْوَان \*۔ وہ خنک دن جس میں نہ بادل ہوں اور نہ ہی فضا غبار آلودہ ہو۔ اصْطِفَاء \*۔ صاف اور خالص چیز کا لئے لینا۔ انتخاب کر لینا۔ اِسْتَصْفَاهُ \*۔ اسے مخلص سمجھا۔ اسے چنا۔ انتخاب کیا۔ الصَّافِيَّةُ (جمع صَافِيَا) مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لئے منتخب کر لے \*\*۔

الصَّافَاتُ (جمع صَفَوَات \* وَصَفَا) بڑا صاف، چکنا پتھر جس پر کچھ نہ اگ سکے۔ الصَّافُوَانَةُ (جمع صَفَوَان \*) کے بھی یہی معنی ہیں \*۔ (۲۶۴)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسم جمع ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الصَّافُوَان کے معنی بڑی چٹان ہوں اور اس کے ایک ٹکڑے کو صَفَوَانَةُ \* کہا جاتا ہو۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم \* کے متعلق ہے وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الْاَدْنٰی (۱۲۱) ہم نے اسے دنیا میں آمیزشوں سے پاک کر کے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کر لیا۔ مختلف انبیائے کرام کے متعلق فرمایا وَانْقَهُمْ عِندَ النَّالِمِیْنَ الْمُصْطَفٰیِّیْنَ (۳۸)۔ یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب افرادِ انسانیہ ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اصْفٰکُمْ (۱۶)۔ یعنی چن لینا۔ دوسروں سے الگ کر کے مختص کر لینا اور ترجیح و فضیلت دینا۔

سورۃ بقرہ میں الصَّافَاوَالْمَرْوَةُ \* کو مین \* شَفَاثِرِ اللہ کہا گیا ہے۔ (۱۵۸)۔ یہ مکہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔

سورۃ محمد میں ہے عَسٰی \* مُصْطَفٰی (۱۵) صاف کیا ہوا شہد۔

## ص ک گ

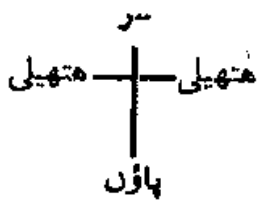
صَكَۙ - کسی چیز، ببالخصوص چوڑی چیز کے ذریعے زور سے مارنا۔  
صَكَۙ الثَّابَ - اس نے دروازہ بند کر دیا۔ صَكَۙقَہ - صَكَۙا - اسنے اسے  
دھکا دیا \*۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے فَصَكَۙتَتْ  
وَجَنَّتَا (۵۱/۲۹)۔ اسنے اپنے چہرہ پر ہاتھ مارا۔ لیکن یہ عمل ازور تعجب تھا۔  
جیسا کہ آیت (۱۱/۲۱) سے ظاہر ہوتا ہے۔

## ص ل ب

الصَّلْبُ - الصَّلِيبُ - مضبوط اور سخت۔ هُوَ صَلْبٌ - بِنِیْ دَرِیْنِہ۔  
وہ اپنے دین میں سخت اور مضبوط ہے۔ صَلْبٌ - اس نے اسے سخت اور مضبوط  
بنا دیا۔ الصَّلْبُ - ریڑھ کی ہڈی \*۔ (جمع اصْلَابٌ) ابن فارس نے کہا ہے  
کہ پشت کو بھی اس کی قوت اور سختی کی وجہ سے صَلْبٌ کہتے ہیں۔ قرآن  
کریم میں ہے۔ اَبْنَانِیْکُمْ الَّذِیْنِ مِیْنْ اَصْلَابِیْکُمْ (۲۳/۲۳)۔ تمہارے وہ بیٹے  
جو تمہاری اپنی ”پیٹھ“ (صلب) سے ہوں۔

الصَّلْبُ - آدمی کو مار دینے کے لئے لٹکانا۔ سولی چڑھا دینا۔ راغب  
نے لکھا ہے کہ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی  
کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ الصَّلْبُ - مردے کے  
ناک یا منہ میں سے جو پانی سا نکلتا ہے اسے کہتے ہیں۔ نیز وہ چکنائی جو ہڈیوں سے  
نکالی جائے \*۔ ابن فارس نے مَصْلُوبٌ کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ  
سولی پر چڑھائے ہوئے کو اس لئے مَصْلُوبٌ کہتے ہیں کہ اس کے چہرے  
پر چکنائی آ جاتی ہے۔ پھر سولی کو بھی صَلِیبٌ کہتے ہیں۔ لیکن  
راغب کی توجیہ بہتر نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ (عیسائیوں کے بتائے ہوئے  
نقشے کے مطابق) صلیب کی شکل یوں ہوتی تھی۔



مجرم کو اس تختے پر لٹکا کر اس کے دونوں ہاتھوں اور  
پاؤں میں میخیں گاڑ دیتے تھے اور اسے اسی حالت میں رہتے  
دیا جاتا تھا۔ تاآنکہ وہ درد و کرب اور ضعف و نقاہت  
سے دم توڑ دے۔

یہودیوں کے نزدیک صلیب پر مارنا لعنتی کی موت تھی۔ ان کا دعویٰ  
تھا کہ انہوں نے (حضرت) عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکا کر (معاذ اللہ) لعنتی



کی موت مار دیا۔ عیسائی اگرچہ (صلیب کی موت کو لعنتی کی موت نہیں کہتے لیکن) اس کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی۔ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں کی تردید میں کہا کہ یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے۔ ”وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ“ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۱۵۷)۔ ”اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا۔ اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا۔ اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی،“ حضرت عیسیٰؑ وہاں سے پہلے ہی تشریف لے جا چکے تھے اور انہوں نے جس شخص کو گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا۔ (تفصیل میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت اور فساد فی الارض کی مختلف سزائیں (حسب نوعیت جرم) بتائی گئی ہیں۔ ان میں ایک یُصَلَّبُوْا (۵/۳۳) بھی ہے۔ یعنی صلیب پر لٹکوا دینا۔ سولی دیدینا۔ صَلَبٌ۔ ایک آدمی کو سولی دینے کے لئے۔ اور صَلَابٌ۔ زیادہ آدمیوں کو سولی دینے کے لئے بولا جاتا ہے۔

## صلح

اصْلَاحُ الْيُسْرِ کے معنی ہیں اَحْسَنَ الْيُسْرِ۔ یعنی اس نے ایسا کام کیا جس سے اس (دوسرے آدمی) کی خرابی، نقص یا کمی دور ہو گئی۔ حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام کرنا۔ اسی لئے الصِّلَاحُ باہمی امن و سلامتی اور مسالمت کو کہتے ہیں، کیونکہ زمانہ جنگ کی بد نسبت، صلح و امن میں معاملات کے اندر توازن قائم رہتا ہے\*۔ الصِّلَاح کے معنی ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضہ کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا\*\*۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حالت میں ہونا۔ بالکل مناسب، درست، یا ترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا\*\*\*۔

سورة اعراف میں صحیح و سالم اور تندرست بچے کے لئے صَلَاحًا کا لفظ آیا ہے (۱۶۹)۔ یعنی ایسا بچہ جو ہر لحاظ سے مناسب اور درست ہو۔ سورة انبیاء میں، جہاں حضرت زکریا کے ہاں بڑھاپے کے زمانے میں اولاد پیدا ہونے کا ذکر ہے، وہاں کہا ہے وَاصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۲۱)۔ ہم نے اس کی بیوی سے اس نقص کو دور کر دیا جو اولاد پیدا کرنے سے مانع تھا۔ سورة نور میں وَالصَّالِحِينَ مِّنْ عِبَادِكُمْ وَامَّاٰتِكُمْ (۲۴) کے معنی ہیں وہ

غلام اور لونڈیاں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں - سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس وقت ہمارے باپ کی ساری توجہ یوسفؑ (اور اس کے بھائی) کی طرف ہے۔ اگر یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے تو پھر موجودہ نا ہمواری دور ہو جائیگی۔ وَتَكُونُوا مِّنْ بَعْدِهِمْ قَوْمًا صَالِحِينَ (۱۲۰) - اور بعد میں ہم ایسا گروہ باقی رہ جائینگے جن میں کوئی نا ہمواری نہیں رہے گی، اور ہمارے کام سنور جائینگے۔ یہاں صالحین کے لفظ نے اس کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی نا ہمواریاں دور ہو جانا۔ معاملات کا سنور جانا۔

قرآن کریم میں حَسَنَات کے مقابلہ میں سَيِّئَات کا لفظ اکثر آیا ہے۔ اور (۸۴:۲۸۱) میں سَيِّئَات کے مقابل میں عَمَلُوا الصَّالِحَاتِ آیا ہے۔ لہذا اعمال صالحہ اور حسنات ہم معنی ہیں۔ اس لئے دوسرے مقام پر مِّنْ عَمَلٍ صَالِحًا کے مقابل میں مِّنْ أَسَاءَ آیا ہے (۲۹:۴)۔ (س۔ و۔ ا۔ اور ح۔ س۔ ن کے عنوانات میں ان الفاظ کے معنی سامنے آجائینگے)۔ لہذا اہمالِ صالحہ کے معنی ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور نا ہمواریاں دور ہو جائیں۔ جو زندگی کی خوشگوار یوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ ٹھیک وہ کام کرنا جو اُس وقت کے حالات کے عین مطابق اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو۔ فساد اس کی ضد ہے (اس کے لئے عنوان ف۔ س۔ د دیکھئے)۔

قرآن کریم نے فساد اور صلاح کو ٹھیک ایک دوسرے کے مقابل میں استعمال کیا ہے۔ (۱۱:۲)۔ سورۃ قصص میں مَصْلَحِينَ کے مقابلہ میں جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ آیا ہے (۱۹:۲)۔ اسی سورت میں ذرا آگے، یہ مادہ خوش معاملگی کے معنوں میں آیا ہے (۲۸:۲)۔

قرآن کریم میں آپ شروع سے اخیر تک دیکھینگے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا کے ساتھ وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آیا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ وہ اعمال جن کا سرچشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو میکانیکی طور پر (Mechanically) سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے، جو اُسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال

بلا ایمان ہے نتیجہ ہوتے ہیں۔ سورۃ روم میں قرآن کریم نے مَن عَمِلَ صَالِحًا کے مقابلہ میں مَن كَفَرَ لَا كَرَ (۳۰/۳۰)۔ اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان، ایمان نہیں ہوتا۔

نیز اعمال بھی وہی اعمال صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمال صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نوع انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دیدی۔ اعمال صالحہ سے اس کی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، کیونکہ اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان لاینفک شرط ہے۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقین محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے متعین کیا ہے اور اعمال صالحہ، ان اقدار کے تحفظ کو کہتے ہیں، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی۔ اسی کو بالفاظ دیگر کیریکٹر کہا جائیگا۔ لہذا کیریکٹر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔ یہ یقین علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔

## صل ل د

الصَّلْدُ - الصِّلْدُ\*۔ ٹھوس چکنا پتھر\*۔ (۲۶۳/۲۶۳)۔ الصَّلْدُ آءٌ سخت ٹھوس زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو سکے\*۔ صَلْوَدٌ\*۔ بخیل آدمی۔ رَأْسٌ\* صَلْدٌ\*۔ وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں\*۔ لہذا الصَّلْدُ وہ چٹان ہوگی جس پر ذرا سی مٹی بھی باقی نہ رہے۔ سورۃ بقرۃ کی بحولہ بالا آیت میں یہ معافی واضح ہیں۔

## صل ل صل

الصَّلْصَالُ\*۔ خالص گیلی مٹی جس میں ریت مل جائے اور بھر خشک ہونے پر اس میں سے آواز آنے لگ جائے۔ جب اسے آگ میں پکا لیا جائے تو اسے قَخَّارٌ\* کہتے ہیں۔ یعنی خشک کچی ٹھیکری صَلْصَالٌ\* ہوگی۔ اور پختہ ٹھیکری قَخَّارٌ\*\*۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۱۵۹) - ہم نے انسان کو کھنکھنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا - (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تری اور تھوڑا سا پانی شامل ہوتا ہے - زندگی کے ابتدائی جرثومے (Life Cells) محسوس طور پر، پانی اور مٹی کے اسی امتزاج سے سامنے آتے ہیں - اسی کو قرآن کریم نے کہیں طِیْنٌ\* (۳۲) اور کہیں طِین لازِب (۳۶) سے تعبیر کیا ہے - یعنی انسان کی حیاتِ طبعی کا محسوس نقطہ آغاز۔

## ص ل و (ی)

اگرچہ صَلَوة اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص - ل - و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص - ل - ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صَلَوة کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس عنوان میں سادہ کے آخر کا ”واو“ اور ”ی“ دونوں ہی آگئے ہیں - ویسے ہم نے (ص - ل - ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے - چونکہ ”صلَوة“ دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم، اور اس کے مباحث خاص غور و فکر کے محتاج ہیں - ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کریں گے -

(۱) الصَّلَا - پشت کا درمیانی حصہ - کولہے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دم لگے - دم کے دونوں جانب کے حصے صَلَتَانِ کہلاتے ہیں - اس کی جمع صَلَتَوَاتٌ یا أَصْلَاءٌ\* آتی ہے\* - صَلَا - يَصْلُوْا - صَلَّوْا کے معنی ہیں صَلَا (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا - صَلَّوْا تَسْہُ - میں نے اس کے صَلَا پر مارا -

(۲) الصَّلَا کی نسبت سے، صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِيَةً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں، دوسرے نمبر کا گھوڑا، پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں، پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں - اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو، سَابِقُ\* کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو آخِرُ مُصْطَلٰی\* - اس سے صَلَّی کے معنی ہیں

\* تاج -

اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا۔ چنانچہ حضرت علی رضی کی ایک روایت میں ہے سَبَقَ رَسُولُ اللَّهِ - وَ صَلَّى أَبُو بَكْرٍ وَ ثَلَاثَ عُمَرَ وَ خَبَطْتُنَا فِثْنَةً - ”رسول اللہ پہلے تشریف لے گئے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکر رضی اور ان کے پیچھے عمر رضی بھی چلے گئے۔ اور ہمیں فتنوں نے بد حواس کر دیا“۔

(۳) تاج میں ہے کہہ صلی و اصطلاحی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (۲۴)۔ ”ہم مصلین میں سے نہیں تھے“۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ”ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے“۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جہت سے صلوٰۃ کے معنی ہونگے احکام الہی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا اور کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ لہذا تَصَلِّيَةٍ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے۔

(۴) ان تصریحات سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین، مکمل ترین، مستحکم ترین، اور حسین ترین ہے۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے ”روحنا“ کہہ کر پکارا ہے۔ دیکھئے عنوان روح)۔ یہ ذات، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفات خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشوونما کا موجب بنتا ہے۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو ”الاسماء الحسنی“ سے تعبیر کیا ہے۔ لہذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر، ان کے پیچھے پیچھے چلنا جائے۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے)

وہ یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (۱/۵) - یعنی اس توازن بدوش راستے کی طرف راہنمائی کی تمنا جو ہمیں انسانیت کی منزل مقصود تک لے جائے۔ اور سورۃ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۱) - ”پیرا رب صراط مستقیم پر ہے“ - یعنی جس صراط مستقیم پر چلنے کے لئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وہی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رہا ہے۔ ہم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے سے چل سکتے ہیں۔ لہذا صلوة کا بنیادی مفہوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر (علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا۔

(۵) سورۃ نور میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَللّٰهُ يَسْبِيحُ لَّهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَاَلَا رُضِ وَالطَّيْرِ صَفَّتۡ - کُلٌّ لَّهٗ قَدۡ عَلِيْمٌ صَلَاتِهٖ وَتَسْبِيحِهٖ (۲۴/۲۴)۔ ”کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ اور پر پھیلائے ہوئے پرند بھی۔ ہر ایک اپنی اپنی صلوة اور تسبیح کو جانتا ہے“۔ یعنی کائنات کی ہر شے اپنی صلوة اور تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پہنچنا ہے۔ اسکی جدوجہد کے دوائر کونسے ہیں۔ اسی چیز کو انکی صلوة اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تَسْبِيْحٌ کے لئے دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم (حیوانات کی طرح) جبلتی طور پر نہیں دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ جہانتک اسکی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، انسان ان چیزوں کا علم، عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کر سکتا ہے لیکن جہانتک اس کی ”انسانیت“ کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ لہذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اسکی ”صلوة و تسبیح“ کیا ہے، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے وحی کے دیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اسے قرآن کریم نے اِقَامَتِ صَلَوة کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ (وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ ۚ) - یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا۔

لیکن وحی کے دئے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہونا (اِقَامَتِ صَلَوة) انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت ہو سکتا ہے۔

بھی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔  
 حَتَّٰثُكَ اِيْكَ اِسْلَامِيْ مَمْلَكَتِ كَا فَرِيْضَه هِيْ بِهٖ بَتَايَا هِيَ اَلْقَدْرِ يَنْ اَلْمَنْ مَسْكَتُشْهَمُ  
 فِيْ اَلْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوا بِالنُّعُوْثِ وَنَهَوْا عَنِ  
 الْمُنْكَرِ (۴۲)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں  
 اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے (زکوٰۃ  
 کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان زک و)۔ اور معروف کا حکم دینگے اور منکر سے  
 روکینگے،، انہی کو دوسری جگہ اَلْاِرَاكِهٖ مُوْنُ السَّاجِدُوْنَ (۱۱۲) کہا  
 ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے۔ سجدہ کرنے والے۔ (رُكُوْعٌ اور سَجْدَةٌ  
 کیلئے دیکھئے عنوانات۔ ر۔ ک۔ ع اور س۔ ج۔ د)۔ اور یہی وجہ ہے کہ  
 دوسری جگہ اقامتِ صلوٰۃ اور امورِ مملکت کیلئے باہمی مشاورت کا اکھٹا ذکر  
 کیا گیا ہے۔ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآمَرُوْهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۳۸)۔ وہ  
 اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔  
 اور چونکہ جماعتِ مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانینِ خداوندی (کتابِ اللہ)  
 کے مطابق سرانجام پاتے ہیں اسلئے سورۃ اعراف میں تَمَسَّكُ بِالْكِتَابِ  
 اور اَقَامَتِ الصَّلٰوةَ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (۱۰۰)۔ لہذا اقامتِ صلوٰۃ  
 سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جس میں تمام افراد، قرآن کریم  
 کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں، اور یوں کتابِ اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں۔  
 اس مقصد کی مزید وضاحت کیلئے قرآن کریم میں صَلَّٰی کے مقابلہ میں تَوَلَّٰی کا  
 لفظ آیا ہے (۵۶: ۳۶)۔ تَوَلَّٰی کے معنی ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا۔ گریز کی  
 راہیں نکالنا۔ پھر جانا۔ منہ موڑ لینا۔ اس لئے صَلَّٰی کے معنی ہوئے قوانینِ خداوندی  
 کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا۔ نظامِ خداوندی کے متعین کردہ فرائض  
 منصبی کو ادا کرتے جانا۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اسی اعتبار سے کہا  
 ہے کہ صلوٰۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے، رخ کرنے اور متوجہ  
 ہونے کے ہیں (مفردات القرآن)۔ سورۃ اعلق میں ہے۔ اَرَاَيْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی  
 عَبْدًا اِذَا صَلَّٰی (۱۰۱)۔ یعنی جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا  
 کرنا چاہتا ہے تو یہ (مخالف) اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا  
 نہیں جسکو یہ محیط نہ ہو۔ چنانچہ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ  
 سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلِّوْتُکِ تَامِرُکِ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ  
 اَبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْہِ اَمْوَالِنَا مَا نَشَؤُ (۱۱) کیا تیری صلوٰۃ  
 تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ہمارے باپ

دادا اختیار کئے چلے آ رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں؟“ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلوة ہے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ہے۔ اس سے بھی صلوة کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں، قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلوة ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو) بات سمٹ سٹا کر یہاں آجاتی ہے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواہشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاہتا ہے یا وحی خداوندی کے مطابق؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام ”اقامت صلوة“ ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں ”اقامت صلوة“ اور ”اتباع جذبات“ کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ ..... (۱۵۹)۔ (انبیائے کرام کے بعد)،، ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ انہوں نے صلوة کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواہشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے،، گویا انسان کا اپنی خواہشات کے پیچھے چلنا صلوة کو ضائع کر دینا ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلوة کا قائم رکھنا ہے۔ سورۃ انعام میں ”محافظة صلوة“ کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ہے۔ (۱۶۳)۔ اسی بنا پر ابن قتیبہ نے الصَّلَاةَ کے معنی السَّيِّئَاتِ کُتِبَ عَلَيْكَ\*۔ یعنی اقامت صلوة درحقیقت اقامت دین ہے۔

(۶) الصَّلَاتِی کے معنی آگ اور ایندھن کے ہیں۔ اس سے صَلَّی عَصَاهُ عَلَی النَّارِ کے معنی ہیں، اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا۔ سلب ماخذ کے اعتبار سے صَلَّی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اس نے آگ کو ہٹایا اور دور کیا۔ (روح المعانی)۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلوة کے معنی ہونگے اپنی خامیوں کو رفع کرنا۔ صاحب المنار نے کہا ہے کہ صلوة قولاً و عملاً اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے، نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راہنمائی) کے محتاج ہیں۔ اسی جہت سے قرطبی نے کہا ہے کہ صلوة درحقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ہیں۔

\* القرطبی - جلد اول - صفحہ ۱۳، یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دئے ہیں۔



(۷) صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں\*۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا۔ کائنات کو مسخر کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

(۸) الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں\*\*۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشو و نما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوعِ انسان کی نشو و نما ہوتی جائے۔

(۹) صلوٰۃ کے جو مختلف مفہیم اوپر بیان ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبدِ مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے، وہ قریضہٴ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا  
وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا  
بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۲/۲۳۹)

”اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔ اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔ اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔، اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو۔

(ب) سورة نساء میں ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ  
وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ - حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴/۴۳)۔

”اے ایمان والو! تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالتِ سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تا آنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)۔“ اس کے بعد پھر تیمم کا ذکر ہے۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ بحث الگ ہے)۔

(ج) نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ إِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ  
لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْيَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ مِّنْهُمْ مَّنْ مَّعَكَ

وَلْيَسَّاءُ خُذُوا اسْلِحَتَهُمْ - فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ  
وَرَائِكُمْ - وَلَتَنَاتِ طَائِفَةٌ أُخْرَى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا  
مَعَكُمْ وَلْيَاخُذُوا حِذْرَهُمْ وَاسْلِحَتَهُمْ ..... (۱۰۴۰) -  
”اور جب تو ان کے درمیان ہو۔ پھر ان کے لئے قیام صلوٰۃ کرے۔ تو چاہئے  
کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار  
لے لیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور چاہئے  
کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلوٰۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلوٰۃ ادا کریں۔  
اور وہ اپنے بچاؤ (کاسمان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔“ اس کے بعد ۱۰۴۱  
قَضَيْتُمْ الصَّلَاةَ فَإِذَا كُنتُمْ فِي الْمَآثِرِ فَاتَّقُوا اللَّهَ قِيَامًا وَ قَعُودًا وَ عَمَلِي  
جَنُودًا بِكُمْ - فَإِذَا طُمَأْنِنْتُمْ فَاقِمُْوا الصَّلَاةَ ..... (۱۰۴۱) -  
”پھر جب تم صلوٰۃ ادا کر چکو تو کھڑے۔ بیٹھے۔ لیٹے جس طرح جی چاہے  
اللہ کا ذکر کرو۔ پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلوٰۃ کرو۔“  
اس سے پہلی آیت یہ ہے فَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ  
عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ  
يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ..... (۱۰۴۲) - ”اور جب تم زمین میں  
سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے ہرج کی بات نہیں کہ تم صلوٰۃ کم  
کر لو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائیں گے۔“ اس  
ضمن میں (۱۰۴۲) بھی دیکھئے۔

صلوٰۃ کے کم کرنے کا طریق (۱۰۴۲) میں بیان ہو چکا ہے۔

(د) سورة مائدة میں ہے وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخِذُوا هَؤُلَاءِ  
هُزُوعًا وَلَعِبًا ..... (۵۸) - ”اور جب تم صلوٰۃ کے لئے آواز دیتے  
ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں۔“ سورة الجمعة  
میں ہے إِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ مِنَ الْبُحْتِ فَاسْتَعِزُّوا بِاللَّهِ  
ذِكْرُ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ - ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ  
تَعْلَمُونَ - فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ  
وَابْتَغُوا مِنَ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ  
تُفْلِحُونَ ..... (۱۰۴۳) - ”جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلوٰۃ  
کے لئے بلایا جائے تو ”اللہ کے ذکر“ کی طرف جلدی آ جایا کرو اور کاروبار  
کو چھوڑ دیا کرو۔ اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو (تو تم اس حقیقت کو  
محسوس کر لو گے کہ) یہ تمہارے لئے (کس قدر) بہتر ہے۔ پھر جب صلوٰۃ  
ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔ اور

”اللہ کا بہت ذکر کرو“۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ“۔ اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشا نظر آجاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں ہے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ (۶۲/۱)۔

تصریحات ہالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوة کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ (ع۔ ب۔ د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائیگا، قرآن کریم کی رو سے ”خدا کی عبادت“ سے مفہوم اس قسم کی ”پرستش“ یا ”ہوجا پاٹ“ نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ”عبادت“ کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت۔ یا ”اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے“۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت، زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۲۸/۱۸)۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور اقامتِ صلوة کرتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں“۔ ان آیات میں، اطاعت خداوندی۔ اقامتِ صلوة اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی، اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہونگے۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ”اقامتِ صلوة“ ہی کا ایک حصہ ہونگے۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ (ر۔ ک۔ ع) اور (س۔ ج۔ د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے، انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے، اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ، خوشی، تعجب، عزم و ارادہ، ہاں اور نہ،

وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذباتِ عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ”سر تسلیم خم“ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے، اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں، بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے، وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار، اجتماعی شکل میں ہو، تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دینگا۔ احترام و عظمت، انقیاد و اطاعت، اور فرماں پذیری و خضوع سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ  
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذباتِ اطاعت و تسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلوٰۃ) جسے قرآن کریم، جماعتِ مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جسطرح آجکل ہمارے ہاں جلسوں کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسماً ادا کر دی جاتی ہے)۔ (وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ - وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ) ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر، قرآن کریم نے انہیں کیتاباً مَوْقُوتاً (م. ۱۰۳) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ”خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ“۔ اور دوسرے معنی ہیں ”ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے“۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے، تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہو جاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو، ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو، اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وَاتَّخَذُوا كَتَبًا ثَمَنًا)۔

یوں تو جماعتِ مومنین کی ساری زندگی—دن رات—صبح شام—قوانین خداوندی کی اطاعت اور انکے نفاذ کی تگ و تاز میں گذرتی ہے، لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ہنگامی طور پر بلائے جائیں۔ ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے، جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ”سعد و نحس“ کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے۔ سورج نکلنے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاہئے۔ دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک اجتماعات صلوٰۃ کا تعلق ہے۔ اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ . . . (۲۸) تم ”دلوک الشمس“ سے رات کی تاریکی تک اقامتِ صلوٰۃ کر سکتے ہو۔ اور صبح کے وقت کا قرآن بھی۔ (د۔ ل۔ ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ”دلوک“ میں، صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے، بالخصوص جب سورج کے بلند ہوئے۔ نصف النہار تک پہنچنے، مائل بہ زوال ہوئے اور غروب ہو جانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ہو۔ ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود، ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وَ اَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱۳)۔ ”دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامتِ صلوٰۃ کرو“۔

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلوٰۃ کے ساتھ کیا گیا ہے، وپسے اقامتِ دین کے سلسلہ میں جماعتِ مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح و تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن، رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے۔ دیکھئے (۱۶۰) و (۱۶۱) و (۱۶۲) و (۱۶۳) وغیرہ۔

سورۃ نور میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء کا ذکر (ضمنیاً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاہئے کہ وہ تمہاری (Privacy)

کے اوقات میں ، اجازت لیکر کمرے کے اندر آیا کریں ۔ یعنی مین قبل صلوٰۃ الفجر و حیثین تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ (۲۴/۵۸) ”صلوٰۃ الفجر سے پہلے۔ اور جب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیتے ہو۔ اور صلوٰۃ العشاء کے بعد“۔ اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اجتماعات صلوٰۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے۔ جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لیکر کیا ہے۔

جہاں تک صلوٰۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے ، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کیا پڑھ رہے ہو (۲/۲۴)۔ دوسرے مقام میں ہے وَلَا تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكُمْ وَلَا تَخَافُتْ يَهَاتَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (۱۱۰/۱)۔ ”اور اپنی صلوٰۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے۔ ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر“ بعض لوگوں کا خیال ہے اس آیت میں صلوٰۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ہے۔ نماز نہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا۔ ”ذکر“ کے متعلق قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے (۲۵/۲) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاہئے۔ یہ آواز بلند نہیں۔ (ذکر سے مراد ، قانون خداوندی کی یاد ہے)۔ اسلئے مندرجہ بالا آیت میں صلوٰۃ سے مراد ”نماز“ ہی ہو سکتی ہے۔ قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ہیں۔

تصريحات بالا سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں صلوٰۃ سے مراد اجتماعات صلوٰۃ ہیں۔ (اس کے لئے فعل صَلَّٰی - يَصَلِّي اُتَا ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں ”اقِمُوا الصَّلَاةَ“ کہا ہے وہاں ، یہ ہیئت مجموعی ، اس سے مراد ہے ، اقامت دین ۔ (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل و استحکام)۔ قوانین و احکام خداوندی کا اتباع ۔ ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبد مومن پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ہیں اجتماعات صلوٰۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ہیں۔ متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہاں اقامت صلوٰۃ سے مقصود کیا ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں ”مصلین“ آیا ہے وہاں بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (یہ ہیئت مجموعی) ہے یا صرف اجتماعات صلوٰۃ میں شرکت کرنے والے ، اس لئے کہ قرآن کریم نے ان ”مصلین“ کا بھی ذکر کیا ہے جو شرف انسانیت کی بلندیوں پر ہیں (دیکھئے (۲۴/۲۵)۔ اور ان کا بھی جن کے لئے تباہی ہے (۲۴/۲۵)۔

(۱۰) صَلَّیٰ عَلَیْہِ - راعب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا - دعا دینا - حوصلہ افزائی کرنا - پروان چڑھانا - نشوونما دینا - کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہوئے دینا \*۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً سورہ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْكَ عَلَيْهِمْ وَمَلَائِكَتُهُ ..... (۳۳)۔ ”خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں“۔ یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں۔ حوصلہ نہیں ہمارے، بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ (۲۵)۔ یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تبریک و تہنیت ہیں۔ انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے۔ ان کی نشوونما کرتا ہے۔ یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتُہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ..... (۳۳)۔ خدا اور اس کے ملائکہ نبیؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ یَا یٰہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳)۔ ”اے جماعت مومنین! تم بھی اپنے نبیؐ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اسکی مدد کرو۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو“۔ (۲۵)۔ وَتَعَزَّوْہُ وَتَوَقَّرُوْہُ (۲۹)۔ (تسا کہ تم اسکی مدد کرو۔ اسکی عزت و توقیر کرو۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے وَتَعَزَّوْہُ وَنَصَّرُوْہُ (۲۵)۔ ”جنہوں نے اسکی تائید و تعظیم کی۔ اسکی مدد کی“۔ اسطرح کہ وَاتَّبِعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہُ (۲۵)۔ ”جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا“۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوْا عَلَیْہِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق۔

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صَلَوَاتٌ جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرمؐ پر۔ اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلہ و سلام نبی اکرمؐ پر۔

آپ نے غور فرمایا کہ صَلَّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرمؐ لیکر تشریف لائے تھے۔ دوسری طرف نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد، اتفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لیکر آئیں تو اسے قبول کر، وَصَلْ عَلَیْہِمْ۔ اِنْ صَلَّوْتَکَ سَکَنَ لَہُمْ (۱۳۰)۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کر۔ اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement)، تحسین و تہریک (Appreciation)، ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے۔ وہ اس اتفاق فی سبیل اللہ کو قُرْبَاتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَّوْا الرَّسُوْلَ (۱۳۱) کا موجب سمجھتے ہیں۔ یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین و تہریک اور حوصلہ افزائی کا موجب۔ ("قرب خداوندی" کے لئے ق۔ ر۔ ب کا عنوان دیکھئے)۔

(۱۱) لغت عبرانی میں صَلَّوْا یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں۔ (۲۲/۳۰) میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔

## صلی

صَلَّى اللّٰحِجْمَ بِالصَّلَاةِ صَلَّیاً۔ اسنے گوشت کو بھون لیا۔ اسنے گوشت کو بھوننے کیلئے اسے آگ میں ڈال دیا \*۔

الصَّلَاةُ کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں۔ صَلَّی بِالصَّلَاةِ۔ اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی۔ وہ آگ میں جلا۔ صَلَّیْتُ الشَّاةَ۔ میں نے بکری کو بھون لیا \*\*۔ أَصْلَاہُ النَّارَ وَصَلَّاهُ۔ اس نے اسے جلنے کیلئے آگ میں داخل کر دیا۔ اسکا ٹھکانہ آگ میں بنا دیا \*\*\*۔

الصَّلَاةُ۔ بھنی ہوئی چیز۔ آگ جلانے کیلئے ایندھن \*۔

صَلَّی۔ وہ جو آگ میں بھنے۔ جو جہنم کی طرف جائے۔ مَن صَلَّی مَوَّصَّالِ الْجَحِیْمِ (۱۳۳)۔ الصَّلَاةُ : جانا، آگ کی تکلیف برداشت کرنا (۱۳۴)۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے الَّذِیْ یَصَلِّی النَّارَ الْکُبْرٰی (۸۴) جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوتا (یا بھنتا) ہے۔

سورۃ حاقہ میں ہے ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلَّوْہُ (۱۳۱)۔ پھر اسے جہنم میں داخل کرو۔ سورۃ مدثر میں ہے مَا صَلَّیْہِ سَقَرٌ (۲۶)۔ میں اسے دوزخ میں



داخل کرونگا۔ سورہ واقعہ میں ہے تَصْلِيَةً جَحِيمٍ (۵۶) جہنم میں جلانا۔ اَصْطَلَتْ (اِصْطَلَتْ) آگ تاپنا اور اس سے گرمی حاصل کرنا۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (۲۷)۔

## ص م ت

الصَّمْتُ۔ الصَّمُوتُ۔ الصَّمَاتُ۔ خاموش ہونا۔ (صَكَتَ اور صَمَتَ کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان س۔ ک۔ ت) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابہام اور اغلاق کے ہوتے ہیں۔ اَنْتُمْ صَامِتُونَ (۱۶۹) تم چپکے رہو۔ الصَّمَاتُ۔ سونے چاندی (یعنی نہ بولنے والی دولت) کو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف النَّاطِقُ۔ وہ دولت جو جانوروں کی شکل میں ہو۔ الصَّمُوتُ۔ گڑ جانے والی تلوار۔ حَائِطٌ مَّصْمُتٌ۔ وہ دیوار جس میں کوئی روشن دان، دروازہ یا شگاف نہ ہو\*۔

## ص م د

الصَّمَدُ۔ بلند جگہ جو، سخت ہو لیکن اتنی اونچی نہ ہو کہ پہاڑ کی حد تک پہنچ جائے۔ الصَّمَدُ۔ پتھر کی محکم چٹان۔ الصَّمَدُ۔ وہ سردار جسکی اطاعت کی جائے اور جسکے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ وہ ہستی جس کی طرف ضروریات کیلئے رجوع کیا جائے۔ وہ ہستی جس سے کوئی مستغنی نہ ہو سکے۔ وہ شخص جسے جنگ میں نہ بھوک ستاتی ہو نہ پیاس۔ نَاقَةُ مِصَّمَدٍ۔ وہ اونٹنی جو سردی کی شدت اور چارہ کے کم ہونے کے باوجود برابر دودھ دیتی رہے\*۔ صِمْدُ الْمِحْرَاثِ۔ ہل کی وہ لکڑی جسے ہل چلانے وقت ہالی ہاتھ سے پکڑتا ہے\*۔ الصَّمَدُ۔ قصد اور ارادہ کرنا\*۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے الصَّمَدُ آیا ہے۔ اللہ الصَّمَدُ (۱۶۴)۔ وہ اللہ ہی صمد ہے\*۔ الصَّمَدُ کے ان معانی پر غور کیجئے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے خدا کے متعلق کیسا وسیع اور بلند تصور پیش کیا ہے۔ یعنی ایسی بلند اور محکم چٹان کہ جب ہر طرف سے سیلاب کا پانی گھیر لے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے تو لوگ اسکی طرف رجوع کریں اور انہیں وہاں پناہ مل جائے۔ نیز وہ ذات جو دوسروں کی تمام ضروریات کو تو پورا کرے لیکن خود ان سب سے مستغنی ہو۔ نیز، اسکی نوازشات غیر منقطع ہوں اور اسکی ربوبیت مسلسل جاری رہے۔

جو قوم اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر لے اسکے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول میں بھوک اور پیاس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو اور دوسروں کی نشو و نما میں سردی اور قحط بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں۔ چٹان کی طرح محکم اور سب سے آسروں کا آخری سہارا۔ اور قابل اعتماد آسرا۔ لیکن دوسروں کے سہاروں سے مستغنی۔

خدا کے متعلق قرآن کریم نے قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ - اللَّهُ الصَّمَدُ (۱:۲) کہہ کر ایک اور بلند حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ أَحَدٌ کے معنی ہیں منفرد۔ یگانہ (Unique)۔ اس انفرادیت میں مخلوق سے بے ہمگی (Transcendence) کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن صمدیت کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کی ایک ایک سانس اسکی ربوبیت سے وابستہ ہے۔ اس سے اسکی باہمگی (Immanence) کا پہلو نمایاں ہے۔ لہذا وہ ذات باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ یہی صفت مومن کی ہونی چاہیے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ در قافلہ ہے ہمہ شو بہا ہمہ رو

یعنی أَحَدٌ بَقْتُ اور صَمَدٌ بَقْتُ دونوں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور بلند ترین ہے۔ یعنی (The Most Developed, Complete, and Perfect Personality) اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے، لیکن غیر نشو و نما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں۔ صفات خداوندی (الاسماء الحسنی) جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، ذات خداوندی کے مختلف گوشے (Facets) ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہیں۔ (مثلاً هُوَ لَا يُؤَلَّ)۔ لیکن دوسری صفات ایسی ہیں جو (حدود بشریت کے اندر) انسانی ذات میں منعکس ہو سکتی ہیں۔ ان میں صمدیت بھی شامل ہے۔ یعنی جوں جوں انسانی ذات کی نشو و نما ہونی جائیگی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ہوتی جائیگی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائیگی۔ حریت اور استغناء (Freedom and Independance) ذات کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ہیں (مزید تفصیل ر۔ و۔ ح اور ن۔ ف۔ س کے عنوانات میں دیکھئے)۔

## ص م ع

آلَا صُمِّعُ - چھوئے کانوں والا آدمی - ظَبْنِيْ مُصَمِّعٌ - ہرن جس کے سینک اوپر سے بتلے اور باریک ہوں - الصَّيْقُومَةُ - عقاب، کیونکہ وہ بلندی

ہر اڑتا ہے۔ صَوْمَعَةٌ - خانقاہ، چونکہ اسکا منارا اوپر سے لعبا اور نوکدار بنایا جاتا تھا۔ (جیسے گرجا یا مندر کا منارہ)۔ یا اسکی تنگی کی وجہ سے، جس طرح اس آدمی کا سر ہوتا ہے جسکے کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہوں۔ لیکن بلندی کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں صَوْمَعٌ بِنَاءٌ - اسنے اپنی عمارت کو بلند کیا۔ اصْمَعٌ - معزز ترین مقام پر ترقی کرنے والا۔ صَمِيعٌ - وہ اپنی دھن میں سر اٹھائے ہے پروائی کے ساتھ گزر گیا۔ صَوْمَعَةٌ کی جمع صَوَامِعٌ آتی ہے (۲۲)۔ خانقاہیں، یعنی راہبوں کی کوٹھڑیاں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں باریکی اور لطافت اور اتصال ہسبایا جاتا ہے۔ یعنی کسی شے کا باریک ہونا اور ساتھ ہی اس کے اجزا کا باہمدگر پیوست ہونا۔

## ص م م

صَمَمٌ کے معنی ہیں کان کا بند ہو جانا اور ثقلِ سماعت۔ صِمَامٌ الْقَارُورَةُ - شیشی کے ڈاٹ کو کہتے ہیں جس سے اس کا منہ بند کیا جاتا ہے۔ صَغْرَةٌ صَغَاءٌ - ٹھوس اور سخت چٹان جس میں کوئی شکاف نہ ہو۔ آلا صَمٌّ - بہرہ۔ اس کی جمع صُمٌّ ہے۔ نیز ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی مرضی کرے اور کسی کی نہ سننے اور جس سے یہ توقع نہ رہے کہ اسے اس کی خواہشات سے باز رکھا جاسکے گا۔ \*\*\*۔

الْمُصْتَمِمْ - وہ اونٹ جو بڑبڑائے نہیں اور نہایت استقامت سے چلتا جائے۔ \*\*\*۔ قرآن کریم میں صَمٌّ کا لفظ بہروں کے لئے آیا ہے، نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو حق کی آواز نہ سنیں اور اپنی مرضی کرتے چلے جائیں۔ وہ لوگ جو جانوروں کی طرح ہوں اور عقل و فکر سے کام نہ لیں (۲۴)۔ قرآن کریم اندھے، بہرے، گونگرے، حنکے، مردے، ان لوگوں کو کہتا ہے جو عقل و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام نہ لیں اور جذبات سے مغلوب ہو کر، یا تقلیدی طور پر، غلط راہوں پر چلتے جائیں۔

آصَمٌ - بہرہ کر دینا (۲۵)۔

## ص ن ع

صَنَعَ کے معنی کسی کام کو (قاعدے اور قانون کے مطابق نیز فن کے اعتبار سے) اچھی طرح کرنے کے ہیں۔ اس لئے یہ لفظ فِعْلٌ (کام کرنے) سے خاص ہے اور حیوانات کے لئے نہیں بولا جاتا۔ \*\*\*\*۔

\* تاج - محیط و راغب - \*\* لطائف اللغة - \*\*\* تاج و محیط - \*\*\*\* راغب -

صُنْعٌ \* - بہت اچھی کاریگری کو کہتے ہیں \* - صُنْعُ اللہِ الَّذِی  
 اَتَقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (۲۹) - خدا کی (کبھی عجیب و غریب) صنعت کاری ہے  
 جس نے ہر شے کو نہایت کمال و مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے -  
 صَنْعَةٌ \* - کسی چیز کا عمدگی سے بنانا (۱۸) - اَلْمَصْنَعُ \* - عمارات -  
 حوض یا تالاب جن میں بارش کا پانی جمع کر لیا جائے - محلات - قلعہ - پختہ  
 آبادیاں نیز صنعت گاہیں اور کارخانے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ آبپاشی کے  
 لئے جو کنواں وغیرہ بنایا جائے یہ اس کے لئے بولا جاتا ہے - راغب نے اس کے  
 معنی بلند اور معزز و ہر جلال مقامات کثیف ہیں - (۲۶۹) - صَنْعُ الْفَرَسِ \* -  
 گھوڑے کی عمدہ طریقہ سے دیکھ بھال ، نگرانی اور تربیت کرنا - هُوَ صَنِيعِي \* -  
 وہ میرا پروردہ و تربیت یافتہ ہے \* - سورۃ طہ \* میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق  
 خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تجھے فرعون کے محلات میں پہنچا دیا تاکہ وہاں  
 ہماری زیر نگرانی تمہاری تربیت ہو اور تم سلطنت کے امور اور مملکت کے انداز  
 سیکھ سکو - لِيَتَّصِنَعَ عَلٰی عَيْنِي (۲۹) - اس سے ظاہر ہے کہ ، ہونے  
 والے رسول کی پیدائش خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتی تھی اور شروع ہی سے  
 اس کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر نبوت جیسی عظیم القدر  
 ذمہ داری کا اہل بن سکے - اسی لئے حضرت موسیٰؑ کی قبل از نبوت زندگی کے  
 مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا - ثُمَّ جِئْتُ عَلٰی قَدَرٍ  
 يَمُوْسٰی (۲۶) - اتنی کٹھالیوں میں تاؤ کھانے - فَتَوْنَا (۲۶) کے بعد  
 تب کہیں جا کر تم نبوت کے ہیمنے پر پورے اترے - لہذا یہ سمجھنا محض  
 ”شاہری“ ہے کہ - آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے - اس سے آگے ہے  
 وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۶) اَلْاِصْطِنَاعُ کے معنی ہیں کسی چیز کے  
 سدھارنے میں انتہائی زور اور توجہ صرف کرنا - بہت زیادہ غور اور احتیاط سے  
 اصلاح و تربیت کرنا \* - لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری تربیت خاص  
 پروگرام کے مطابق کی گئی ہے - اس لئے کہ ہمیں تجھ سے ”اپنا کام“ لینا  
 تھا - یہ سب کچھ ہم نے اپنے ایک مقصد کے لئے کیا ہے - وہ مقصد کیا ہے؟  
 اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اَنۡقَہُ طَغٰی (۲۶) - فرعون کی طرف جاؤ - اس نے  
 حد اعتدال سے نکل کر بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے - یعنی استبداد  
 و سرکشی کی قوتوں کو مغلوب کر کے مظلوم انسانیت کو ان کے آہنی پنجہ  
 سے چھڑانا ، اور پھر ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ شرف انسانیت کے اہل بن  
 جائیں - یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے ایک نبی کی تربیت کی جاتی تھی -

اور جسے خدا نے خود ”اپنا کام“ کہا ہے۔ (واضح رہے کہ نبی کو اس دوران میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ انسان اپنی سعی و عمل سے مقام نبوت تک پہنچ سکتا ہے مقام نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے)۔

## ص ن م

الْمُؤْمِنَاتُ (جمع اَصْنَامٌ)۔ بت۔ صَنَعْتُمُ الصُّوْرَةَ کے معنی ہیں تصویر کو خوشنما اور جاذب بنا دینا\*\*۔ نیز کسی چیز کی بٹو کے خراب ہو جانے کو بھی کہتے ہیں\*۔ راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنادے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے، صَنَعْتُمُ کہلاتی ہے\*\*\*۔ لہذا اَصْنَامٌ وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانون خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ وَاجْتَبِئْنِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ اِلًا سِوَاكَ (۱۱۱)۔ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کر لیں تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اس کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور انکی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی\*\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُ هُمْ بِاِلٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكٌ كُفُّوا (۱۲۶)۔ ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک کے مشرک بھی رہتے ہیں۔ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق نہیں۔ ہم تو کسی بت کی پرستش نہیں کرتے۔ یعنی ہماری نگاہ مٹی اور پتھر کے بتوں کی طرف رہتی ہے اور ان بتوں کو کبھی نہیں دیکھتی جو ہر آن ہمارے قلب و دماغ کے صنمکدوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی آستینوں میں لئے لئے مسجدوں میں سجدے اور حرم کعبہ میں طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑی اصنام پرستی اور اس سے سنگین تر شرک اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ بت پرستی تھی جس کا خدشہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں (اپنی اولاد کی طرف سے) پیدا ہوا تھا اور ہم (ملت ابراہیمی کے مدعی) ان کے اس خدشہ کو سچا کر کے دکھلا رہے ہیں!

## ص ن و

الصَّيْنُو\* - کھجور وغیرہ کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صینُو\* کہتے ہیں - اس کی جمع صینُوَان\* ہے\* - لہذا نَخِيل\* صینُوَان\* (۱۳/۱) ایسی کھجوروں کو کہیں گے جن میں ایک ہی اصل سے دو دو یا زیادہ تنے پھوٹتے ہوں اور غَيْرُ صینُوَان\* (۱۳/۱) انہیں جو الگ الگ جڑوں سے تنہا نکلتی ہوں - الصَّيْنُوَة\* - حقیقی بہن ، بیٹی ، یا پھوپھی کو کہتے ہیں اور الصَّيْنُو\* حقیقی بھائی ، بیٹے اور چچا کو - کیونکہ ہ سب ایک ہی اصل کی شاخیں ہوتے ہیں\* -

## ص ه ر

الصَّهْرُ\* - گرم - شَمْسِ\* صَهْرُ\* - گرم چیز - الصَّهْرُ\* - چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا - صَهْرَانَهُ الشَّمْسُ\* تَصْهَرُ\* - دھوپ کی سخت تپش نے اس کے دماغ کو کھولا دیا، یا اس کی چربی پگھلا دی - صَهْرَانَهُ بِالنَّارِ\* میں نے اسے آگ پر پکا کر کلا دیا - الصَّهْرَانَةُ\* - پگھلائی ہوئی چربی\* - سورۃ حج میں ہے يَصْهَرُ بِهِ مَارِئِي بَطْنُو نِهِيْمَ\* (۲۲/۲) اس کے ذریعے جو کچھ ان کے اندر ہے اسے گلایا اور پکا دیا جائیگا - ان کی شدت اور سختی پگھلا دی جائیگی -

الصَّهْرُ\* - قرابت - اس کے متعین مفہوم کے لئے بہت سے اقوال آئے ہیں لیکن اکثریت کا خیال اسی طرف ہے کہ بیوی کے خاندان والے اَصْهَارُ\* کہلاتے ہیں اور شوہر کے خاندان والے اَخْتَانُ\* - قرآن کریم میں ہے فَجَعَلْنَاهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (۲۵/۲۵) - نسب سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو اپنے اباؤ اجداد کی طرف سے ہو اور صِهْرُ\* سے مراد وہ رشتہ داری ہے جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے\* - قرآن کریم عائلی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے - اس اعتبار سے وہ میان بیوی دونوں کے رشتہ داروں کو مشترکہ رشتہ دار قرار دیتا ہے -

## ص و ب

صَابَ - يَصُوْبُ\* - صَوْبًا کے معنی ہیں گھرنا - اوپر سے نیچے آنا - نیز قصد و ارادہ کرنا بارش کا گھرنا - صَوْبُ\* و صَوَابُ\* - خطا کی ضد بھی ہے - یعنی صحیح بات - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی

چیز کے اترنے اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بات یا کام جو اپنی صحیح جگہ پر پہنچ کر ٹھہر جائے صَوَابٌ کہلائیکا۔ سَتَمٌ صَائِبٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جا لگے۔ نیز صَوَابٌ کے معنی بہانے (گرانے) اور اوپر سے اترنے کے بھی آتے ہیں۔ آسمان سے بارش ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مُصِيبَةٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد ہر حادثہ اور واقعہ کو مُصِيبَةٌ کہنے لگے۔ تَنْصُوبٌ کے معنی ہیں کسی بات کی تصدیق کرنا کہ وہ ٹھیک ہے۔ اَلصَّيْبُ بارش کو کہتے ہیں \*۔ لسان العرب میں ہے کہ صَيَّبٌ دراصل اس بادل کو کہتے ہیں جو بارش برسانے۔ اسکی تائید ابن فارس نے بھی کی ہے۔ اَصَابَ مِّنَ الشَّمْرِ اَقْرَ کے معنی ہیں عورت کو چوما اور اس سے مجامعت کی۔ یعنی اپنی حاجت اس سے پوری کر لی \*\*۔

قرآن کریم میں صَيَّبٌ - بارش (یا بادل) کے معنوں میں (۱۸) میں آیا ہے۔ سورۃ نحل میں ہے فَاصَابَتْهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمُ مَسَاكُ نَوْمِهِمْ فَاسْتَمْتَزُوا وَنَ (۱۳)۔ جو کچھ بد عملیاں وہ لوگ کرتے تھے ان کے نتائج ان تک پہنچے اور جن آنے والے واقعات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں آکر گھیر لیا۔ یہاں اَصَابَ کے معنی ہیں کسی بات کا واقع ہونا۔ اَصَابَهُ الْكِبَرُ (۲۶) کے معنی ہیں اس پر بڑھاپا آگیا۔ سورۃ ص میں حَيَّتْ اَصَابَ (۳۹) کے معنی ہیں جس طرف کا وہ قصد کرتا تھا۔ اور سورۃ نبا میں قَالَ صَوَابًا (۳۸) کے معنی ہیں وہ درست اور ٹھیک بات کہے۔

سورۃ نساء میں مُصِيبَةٌ کے مقابلہ میں فَضْلٌ کا لفظ آیا ہے (۲۴)۔ لہذا مُصِيبَةٌ کے معنی معاشی بد حالی یا ناکامی کے ہوئے۔ اور (۹) میں مُصِيبَةٌ کے مقابلہ میں حَسَنَةٌ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے اسکی معنی ہوئے زندگی کی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں۔ سورۃ تغابن میں ہے مَا اَصَابَ مِّنْ مُّصِيبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۶۴) یعنی کائنات میں جو حوادث و واقعات ظہور میں آتے ہیں وہ سب خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں۔ اس میں مُصِيبَةٌ کے معنی حادثہ یا واقعہ (Event) کے ہیں۔ (اذن بمعنی قانون کے لئے ہنوان ا۔ ذ۔ ن دیکھئے)

سورۃ یوسف میں ہے نَصِيبٌ بِرَحْمَتِنَا مِّنْ نَّشَاءِ (۱۲)۔ ہم اپنی رحمت اپنے قانون مشیت کے مطابق جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں۔ اس کے

بعد وَلَا تُضَيِّعْ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (۱۲/۵۶) کہہ کر بات واضح کر دی کہ خدایٰ یہ رحمت، حضرت یوسفؑ کی حسن کارانہ زندگی اور کردار کا نتیجہ تھی۔ البتہ نبوت، انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ مُضَيِّبٌ (اسم فاعل) واقع ہونے والا۔ پہنچنے والا۔ (۱۱/۸۱)۔

## ص و ت

الصَّوْتُ: آواز (جمع اصْوَاتٌ)۔ یہ لفظ انسان اور غیر انسان دونوں کی آواز کیلئے بولا جاتا ہے۔ الصَّائِتُ: چیخنے والا۔ رَجُلٌ صَاتٌ: سخت آواز والا آدمی\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جو کچھ منہ سے نکلے اگر وہ کسی حرف پر مشتمل نہ ہو تو اسے صَوْتُ کہتے ہیں\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ دو جسموں کے ٹکرانے سے دب جانے والی (منضبط) ہوا کو صَوْتُ کہتے ہیں\*\*\*۔ (لیکن راغب کا مفہوم واضح نہیں)۔ قرآن کریم میں ابلیسی قوتوں کے لئے بھی صَوْتُ کا لفظ آیا ہے (۱۳/۱۶)۔ اسکے معنی ہر قسم کا غلط پراپگنڈا ہوگا۔ انسان کی آواز کے لئے بھی (۱۹/۳۱) اور گدھے کی آواز کیلئے بھی (۱۹/۳۱) جہاں اسے اَثْكِرًا لَا صَوَاتٍ کہا گیا ہے، یہ لفظ آیا ہے۔

سورة حجرات میں ہے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْتَقْ صَوْتِ النَّبِيِّ (۲۹/۲۹)۔ اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اگر اس میں صَوْتُ کے حقیقی معنی لئے جائیں تو یہ حکم آداب معاشرت سے متعلق ہوگا۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنے فیصلے کو رسولؐ کے فیصلے پر فائق نہ سمجھو۔ مشورہ میں رائے دو لیکن اطاعت اُس کے فیصلے کی کرو۔ (۳۳/۳۶، ۲۵/۶۵)۔

## ص و ر

الصُّوْرَةُ: شکل۔ ہیئت۔ کسی شے کی حقیقت۔ صفت۔ نوع۔ وہ خد و خال جس سے انسان کو پہچانا جائے اور دوسروں سے اس کا امتیاز کیا جائے\*\*\*\*۔ (۸/۸۲)۔ صَوْرٌ: صورت بنانا۔ (۳/۵)۔ الْمُصَوِّرُ: صورت بنانے والا۔ خدا کی صفت ہے (۲۳/۵۹)۔ کوئی شے، صورت (Form) کے بغیر محسوس و مرئی ہو نہیں سکتی۔ اسلئے اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پروگرام میں مصوریت کا مقام وہ ہے جہاں غیر مرئی و غیر محسوس قوتوں کو ایک خاص ترتیب دیکر (خلق) محسوس و مرئی بنا دیا جائے۔



صَوْرَةٌ\* - کی جمع صَوْرٌ بھی آتی ہے اور صُورٌ بھی\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں نَفِیْخِ صُورٌ کا ذکر آیا ہے (مَثَلًا يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۱۸)۔ تو اس کے معنی ہونگے جب صورتوں میں روح پھونکی جائے گی\*۔ جب اقوام کے مردہ پیکروں میں قمانوں خداوندی کے مطابق تازہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جب انہیں (نظام خداوندی کی رو سے) حیات تازہ مل جائیگی۔ اس دنیا میں حیات تازہ بھی اور مرنے کے بعد حیات نو بھی۔ نیز صُورٌ اس نرسنگھے کو کہتے ہیں جو لڑائی کے وقت بھجایا جاتا ہے\*۔ اور جس سے مراد اعلان جنگ ہوتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے جب نَفِیْخِ فِي الصُّورِ (۱۸) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظام خداوندی کے انقلاب کیلئے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائیگا۔

صَارَ الشَّيْءُ بِصَوْرَةٍ\* - کے معنی ہیں چیز کو مائل کر دینا۔ ایک طرف جھکا دینا۔ صَوْرٌ بِصَوْرٍ\*۔ مائل ہونا۔ صُرْتُ إِلَى الشَّيْءِ\*۔ میں اس چیز کی طرف مائل ہوا۔ صُرْتُ إِلَى\*۔ میری طرف متوجہ ہو۔ اسی لئے عَصْفُورٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آجائے۔ اور الصَّوَّارُ گایوں کے گلہ کو کہتے ہیں (جو چرواہے کی آواز پر چلتا ہے)۔ سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ فَتَّخْذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطُّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ (۲۶)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لے۔ اپنے سے ہلالے۔ اپنی طرف ایسا مائل کر لے کہ وہ تیری آواز پر چلتے آئیں\*۔

ابن فارس نے ان تمام معنی کو لکھنے کے بعد کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ان میں قیاس نہیں چلتا۔

## ص و ع

الصَّاعُ\*۔ الصَّيَّوَاعُ\*۔ الصَّوَّاعُ\*۔ ایک پیمانہ ہے جس سے غلہ ناپا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ الصَّيَّوَاعُ سے غلہ نہیں ناپا جاتا بلکہ یہ اس برتن کو کہتے ہیں جس سے پسا جاتا ہے\*۔ قرآن کریم میں صَوَّاعُ الْمَلِكِ (۱۲) آیا ہے۔ یعنی شاہی پیمانہ جس سے پانی بھرنے کا گام بھی لیا جاتا تھا۔ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی پھٹ جانے اور جدا ہو جانے کے بھی ہیں (ابن فارس)

## ص و ف

الصُّوفُفُ - اون - (جمع اصُّوفُفٌ ص ۸)۔ صُوفُفٌ - بھڑکی اون کو کہتے ہیں۔  
شَعْرٌ - بکری کی اون کو۔ اور وَبَرٌ - اونٹ کی اون کو \*۔ سورۃ نحل  
(۸۶) میں ان تینوں کا ذکر ہے۔ (بعض کے نزدیک الصُّوفُوفِیُّ - صُوفُفٌ - کی  
طرف منسوب ہے \*\*۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صوفی) کہیں نہیں آیا۔  
تصوف کا تصور ہی غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ تفصیل کے  
لئے دیکھئے میری کتاب "۱۱۔ لیم کے نام خطوط"۔ جلد سوم)۔

## ص و م

صَامٌ - رک جانا - ٹھہر جانا، باز رہنا - کہتے ہیں۔ صَامٌ عَنِ الْكَلَامِ -  
بات کرنے سے رک، خاموش رہا - صَامٌ عَنِ الثَّنِيكَاحِ - نکاح سے باز رہا۔  
صَامٌ عَنِ السَّيْرِ - چلنے سے رک - صَامٌ الْعَمَاءُ - پانی کھڑا ہو گیا - مَصَامٌ \*  
کھڑے ہونے کی جگہ \*۔

قرآن کریم میں صِيَامٌ کو فرض قرار دیا گیا ہے (۲/۱۸۳) - اس کے لئے  
بنا دیا کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا  
نام ہے (۲/۱۸۴)۔ یہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں جس میں قرآن کریم نازل ہونا  
شروع ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔ جو شخص مقيم ہو۔ (سفر میں نہ ہو) اور تندرست ہو (مریض  
نہ ہو) اور اس کی طبیعت ایسی ہو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانی پڑے  
(۲/۱۸۶) تو اس پر روزہ فرض ہے - مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفایاب  
ہونے کے بعد گنتی کو پورا کرے (۲/۱۸۷) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ہو  
وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (۲/۱۸۸)۔

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر  
بنانے کے لئے سالانہ عسکری ٹریننگ کے مرادف ہیں - ان کا مقصد قرآن کریم  
نے خود واضح کر دیا جہاں کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲/۱۸۳) تاکہ تم  
قوانین خداوندی کی نگہداشت کے قابل ہو جاؤ۔ لَتَشْكُرُوا اللَّهَ عَالِي  
مَا هَدَاكُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم قرآن کریم کی روشنی میں قوانین خداوندی کو  
انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام ہائے حیات پر غالب کر سکو۔  
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۲/۱۸۵) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج  
پیدا کر سکیں -

صَائِمٌ\* (۳۳/۳۵) روزہ رکھنے والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا۔ اپنے آپ پر کنٹرول (ضبط نفس) رکھنے والا۔ حدود اللہ کے اندر رہنے والا۔

## ص ی ح

الصَّيْحَةُ\* - پورے زور سے نکالی ہوئی سخت آواز۔ صَاحٌ - يَصِيحُ\* - چیخنا - اونچی آواز نکالنا - صِيْحٌ - يَهِيْمُ\* - ان پر گہراٹ طاری ہو گئی - صِيْحٌ - يَهِيْمُ\* - وہ سب ہلاک ہو گئے - الصَّيْحَةُ\* - لوٹ مار جبکہ وہ کسی قبیلہ پر یکبارگی ڈال دی جائے\* - راعِبٌ نے کہا ہے کہ صِيْحٌ\* دراصل آواز بھانڈنے کو کہتے ہیں - اسی سے اَلْمَصَّاحُ الخَشَبُ\* أَوِ الثُّوْبُ\* - ہے - یعنی لکڑی یا کپڑا پھٹا اور اس سے آواز نکلی\*\* - الصَّيْحَةُ\* - نوحہ کی چیخ و پکار کو کہتے ہیں\* - قرآن کریم میں الصَّيْحَةُ\* کا لفظ عذاب کے لئے آیا ہے ، یا اس آواز کے لئے جو زلزلہ کے وقت آتی ہے ، یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت آتی ہے - چنانچہ سورۃ ہود میں الصَّيْحَةُ\* آیا ہے (۱۱/۱) - اور اسی کو سورۃ اعراف میں الرَّجْفَةُ\* (۸/۸) کہا گیا ہے - یعنی زلزلہ - سورۃ یسٰ میں یہ لفظ ایسی تباہی اور عذاب کے لئے آیا ہے جو بیک لخت آجائے (۳۶/۴۶) - کیونکہ ایسے مواقع پر چیخ و پکار مچ جاتی ہے -

## ص ی د

صَادَةٌ - يَصِيْدُهُ\* وَ يَصَادُ\* - اصْطَادَهُ\* - کسی کو چال اور حیلہ یا جال کے ذریعہ پکڑ لینا - شکار کر لینا - الصَّيْدُ\* - شکار کرنا - نیز ہر وحشی جانور کو کہتے ہیں خواہ وہ شکار کر لیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو - نیز شکار کئے ہوئے جانور کو بھی کہتے ہیں\*\*\* - قرآن کریم میں صَيْدُ الْبَحْرِ\* اور صَيْدُ الْبَرِّ\* (۵۶/۶۶) آیا ہے - یعنی زبان میں الصَّيْدُ\* مچھلی کو کہتے ہیں\*\*\* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ صَيْدُ\* وہ چیزیں ہیں جو اپنی آپ حفاظت کریں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو - راعِبٌ نے کہا ہے کہ صَيْدُ\* ان حیوانات کے پکڑنے کو کہتے ہیں جو اپنی حفاظت کریں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں\*\*\* - صَيْدُ نَمَاءِ السَّعَاءِ\* - ہم نے بارش کا پانی لے لیا\*\*\* -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا بغیر ادھر ادھر التفات کئے اپنی مرضی سے سیدھے چلے جانا - شکار کو بھی صَيْدُ\*

اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جانور ادھر ادھر نہیں دیکھتا۔ سیدھا بھاگتا چلا جاتا ہے۔

## ص ی ر

صَارَ - کسی شے کا کسی خاص حالت تک پہنچ جانا۔ یا کسی خاص مقام تک پہنچ جانا۔ کسی شے کا ایک متعین شکل اختیار کر لینا۔ اَلْمَصِيرُ وہ مقام جہاں سب اطراف کے پانی آکر میل جائیں\*۔ جمع ہونے کی جگہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مآل اور مرجع کے ہیں۔ یعنی لوٹنا اور انجام پذیر ہونا۔ اَلْمَصِيرُ - منتہائے امر - انجام - مآل - اَلْمَصِيرُ آخر شے - منتہائے شے - کسی چیز کا انجام، مرجع و مآل - یہی معنی اَلْمَصِيرُ کے بھی ہیں۔ مَصِيرُ الْاُمُور - معاملہ کا انجام - آخری مقام - اسی سے صَارَ - يَصِيرُ - کے معنی ہونے میں کسی چیز کو قطع کر دینا\*۔

راغب نے کہا ہے کہ صَارَ سے مراد ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے۔ اسی سے اَلْمَصِيرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز انتقال و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے\*\*۔

قرآن کریم میں اِلٰی اللّٰهِ اَلْمَصِيرُ (۳۰) متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرف انسانیت کی تکمیل صرف اس راستے پر چلتے سے ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف جانے والا ہے۔ انسان کی آخری منزل، منتہائے سفر، یہ ہے کہ وہ صفات خداوندی کے رنگ میں رنگ جائے۔ اسی میں اس کی تکمیل کا راز ہے۔ اس مقام اور منزل کے علاوہ، اور جو مقام اور حالت ہے وہ بیثبات اَلْمَصِيرُ (۲۶) نہایت بری منزل اور بڑی خراب حالت ہے۔ اسی کو جہنم کہا گیا ہے۔ یعنی اگر انسانی زندگی کا مآل اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ کیفیت جہنمی ہے۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا، اور اس طرح اپنی تکمیل ذات کر لینا، یہ ہے اِلٰی اللّٰهِ اَلْمَصِيرُ۔ اس کے متعلق سورۃ شوریٰ میں ہے اِلٰی اللّٰهِ تَصِيرُ الْاُمُورُ (۲۵)۔ تمام معاملات کا مآل بالآخر قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اہل جنت کے متعلق ہے کَانَتْ لَہُمْ جَزَاءٌ وَ مَصِيرًا (۲۵)۔ جنت انکے اعمال کی جزا اور وہ مقام ہے جہاں ان کی ذات کی تکمیل ہوگی۔ اور یہی انسانی تک و تاز کا منتہی ہے۔

## ص ی ص

الصَّيْصِیَّةُ\* وَالصَّيْصِیَّةُ\* - گائے اور ہرن کا سینک (جس سے وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں)۔ اس سے ہر اس چیز کو صَّیْصِیَّةٌ\* کہتے ہیں جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ مثلاً حفاظت گاہ، قلعہ۔ اس کی جمع الصَّیْصِیَّاتُ\* آتی ہے\*۔ قرآن کریم میں ہے مِیْنُ صَّیْصِیْمِیْمٍ\* (۳۳/۳۶)۔ یعنی ان کے قلعوں سے جن میں وہ محفوظ ہو گئے ہیں۔

## ص ی ف

الصَّیْفُ - گرمی کا موسم\*۔ (یہ شِیْتَاءُ\* یعنی سردی کے بالمقابل ہے)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”ش - ت - و“۔ قرآن کریم میں درج ذیلہ الصَّیْفُ وَالشِّیْتَاءُ (۱۴/۱) آیا ہے۔ یعنی قریش کے سردی اور گرمی کے زمانے کے سفر۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں - (۱) زمانہ اور موسم (گرمی)۔ اور (۲) جھکنا اور ہٹ جانا۔ صَافَتْ هَتَنَ الْهَتْدَفِی کے معنی ہیں تیر نشانہ سے ایک طرف ہٹ گیا۔ یَوْمٌ صَائِفٌ - گرم دن۔

# ض

## ض اُن

ضَائِنٌ\* (جمع ضَائِنٌ\*) - بھیڑ (۱۶۶)۔ ضعیف اور کمزور کو بھی ضَائِنٌ کہتے ہیں\*۔ جیسے بزدل، (بکری جیسے دل والا) ڈرہوک کو کہتے ہیں۔

## ض ب ح

ضَبَّحَتِ الْخَيْلُ\* ضَبَّحًا - تیزی سے بھاگنے والے گھوڑے ہانپے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ ضَبَّحٌ\* اور ضَبَّيْعٌ\* گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنے کو کہتے ہیں، حتکہ ایسا محسوس ہو کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کی سیدھ میں آ گئی ہیں۔ سرپٹ دوڑنا۔ لیکن سہیلی نے کہا ہے کہ ضَبَّحٌ\* گھوڑے یا اونٹ کے تھکنے کے بعد ہانپنے کی آواز کو کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) آواز اور (۲) آگ کے اثر سے رنگ کا بدل جانا۔ نیز یہ بھی کہ یہ دراصل ضَبَّعٌ تھا (جس کے معنی اوپر دئے جا چکے ہیں)۔ قرآن کریم میں ہے وَالْعَدِيَّةِ ضَبَّحًا (۱۰۱)۔ اس سے تیز رفتار گھوڑے مراد ہیں جو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلیں۔

## ض ج ع

ضَبَّجَ واضْطَجَعَ - اس نے اپنا پہلو زمین پر رکھ دیا (لیٹ گیا)۔ الضَّجَّجَ\* - پہلو رکھنے یا لیٹنے کی جگہ\*۔ یہی معنی الضَّجَّجَ\* کے بھی ہیں۔ اس کی جمع الضَّجَّجَاتُ\* ہے (۳۲)۔ سورة آل عمران میں مَضَاجِعِهِمْ\* (۱۵۳) سے مراد ان کی قتل گاہیں ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں قتل

کر کے لٹا دیا جائے۔ اَلْمُضْجَاعَةُ سے مراد مجامعت بھی ہوتی ہے\*۔ یعنی ہم بستر ہونا۔ سورۃ نساء میں جہاں وَاَمْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ آیا ہے (۳۶) تو اس سے مراد زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنا ہے۔

## ض ح ک

ضَحِیْکَ۔ یَضْحَکُکَ۔ ضَحِکَا۔ خوشی کی وجہ سے چہرہ کا انقباض، اور دانتوں کا کھل جانا۔ ہنسنہ۔ ضَحِکُکَ (ہنسی)، کا پہلا درجہ تبسم ہوتا ہے۔ ضَحِیْکَ کے معنی تعجب کرنے یا تعجب سے ہنسنے کے بھی ہیں\*۔ ضَحِیْکَ الرَّجُلُ۔ اس آدمی کو تعجب ہوا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے قَلْبِیْضَحَکُوْا قَلِیْلًا (۸۲) انہیں چاہئے کہ تھوڑا ہنسیں۔ تھوڑی خوشیاں منائیں۔ اس کے مقابل وَلِیْبَکُوْا کَثِیْرًا (۸۲) ہے۔ یعنی بہت زیادہ روئیں۔ ضَاحِکَا (۲۹) خوش ہو کر۔ سورۃ تطفیف میں ہے کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳)۔ وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے۔ اَمْرًاۃٌ ضَاحِیْکَ۔ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو\*\*۔ سورۃ عود میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر رسیدہ بیوی کو لڑکے کی بشارت ملی فَضَحِیْکَتْ (۱۱)۔ بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ انہیں حیض جاری ہو گیا\* اور اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان میں ہنوز اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ جس مفسر نے ضَحِیْکَتْ کے معنی حَاضَتْ (حائضہ ہو گئی) کئے ہیں تو یہ اس لفظ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی حالت کا بیان مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی از رہ تعجب ہنسی تھیں، جس کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ اَتَعْجَبِیْنَ مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ\*\*\* (۱۱)۔ ان لوگوں کا حیض کی طرف (غالباً) اس لئے خیال گیا ہے کہ انہی حالات میں جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو وہاں آیا ہے وَ اٰمَلَحْنٰا لَہٗ زَوْجَہٗ (۲۱)۔ ہم نے اس کے لئے اسکی بیوی کو درست کر دیا۔ جو نقص تھا اسے رفع کر دیا۔ اور بیشتر یہ نقص حیض کا رک جانا ہی ہوتا ہے، اس لئے ایسے موقع پر جو لفظ بھی آیا اس سے مفہوم حیض جاری ہونا لے لیا گیا۔ یہ صحیح نہیں۔

## ض ح و (ی)

الضَّحْوُ - الضَّحْوَةُ - الضَّحِيَّةُ - الضَّحَى - دن چڑھے کا وقت ، طلوع آفتاب کے بعد کا وقت - بعض کا قول ہے کہ الضَّحَى طلوع آفتاب سے لیکر دن چڑھنے تک کے وقفہ کو کہتے ہیں\* - راغب نے کہا ہے کہ الضَّحَى دھوپ کے پھیل جانے اور دن کے چڑھ جانے کو کہتے ہیں\* - نیز اس وقت کو بھی ضحیٰ کہتے ہیں - الضَّحَاءُ - نصف النہار سے پہلے پہلے کا وقت - یا جب سورج طلوع کے بعد رُبْعِ سماء ہر ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی دن چڑھے کا وقت ہیں جب دھوپ کھل جائے اور ہر چیز واضح ہو جائے - وَ أَخْرَجَ ضُحًلَهَا (جیم) - ”اور اس کی روشنی نکالی“ - دن کو روشن کیا - ضَحِيٌّ - دھوپ لگنا ، دھوپ کے سامنے آنا ، دھوپ سے تکلیف اٹھانا - وَلَا تَضْحَكُوا (حیم) - ”نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائیگا“ - فَعَلَّاهُ ضَاحِيَةً - اس نے اسے کھلم کھلا کیا - ضَحَا الطَّيْرُ بِتَقِ ضَحْوًا - استہ واضح اور ظاہر ہو گیا\* -

لَيْلَةٌ ضَحِيَّةٌ - روشن رات جس میں بادل نہ ہوں یا جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر اور واضح ہونے کے ہیں -

## ض د د

الضَّيْدُ - ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے برعکس ہو - یعنی جو دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکیں - جیسے سیاہی اور سفیدی - موت اور حیات - بعض کے نزدیک ضِدٌّ ایک دوسرے کی ٹکر کی چیزوں کو بھی کہتے ہیں - الضَّيْدُ - مخالف - الْقَوْمُ عَلَيْهِ ضِدٌّ وَاحِدٌ - لوگ اس کے خلاف متفق ہو کر جمع ہو گئے - هُمَا مُتَضَادَّانِ - وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں\*\* -

سورة مریم میں ہے وَيَكُونُ نَسْوَانٌ عَلَيْهِمُ ضِدًّا (۸۴) - وہ ان کے مخالف ہونگے -

## ض ر ب

ضَرْبٌ کے بہت سے معانی آتے ہیں جن میں سے مشہور معنی مارنے کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں - اسی اعتبار



سے **الضَّرْبُ** اور **الضَّرِبُ**۔ مثل اور مشابہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں ایک بات دوسری بات کے قالب میں ڈھالی جاتی ہے۔ **وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا (۳۱)** کے معنی ہیں انکے لئے ایک مثال بیان کرو۔ یعنی اس بات کو مثال دیکر واضح کرو۔ اور **يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳)** کے معنی بھی یہی ہیں۔ یعنی خدا حق اور باطل کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی باہمی ٹکرانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ **ضَرْبُ الطَّقِيرِ**۔ ہرنند تلاش رزق میں کم میں چلے گئے۔ **ضَرْبُ فِي الْأَرْضِ**۔ اُس وقت بھولتے ہیں جب کوئی شخص تلاش معاش میں سفر پر چلا جائے۔ **أَضْرَبَ الرَّجُلُ فِي التَّبَيُّتِ** کے معنی ہیں اس شخص نے گھر میں قیام کیا۔ **ضَرْبُ عَنِ الشَّيْءِ** کے معنی ہیں وہ اس شے سے باز رہا۔ اعراض کیا۔ یہی **أَضْرَبَ عَنْهُ** کے معنی بھی ہیں، نیز **ضَرْبُ عَنْهُ** الذِّكْرُ **وَأَضْرَبَ عَنْهُ** کے، یعنی اس سے ذکر کو پھیر دیا، ہٹا دیا، روک دیا۔ (اسی سے جدید لغت میں **إِضْرَابُ** کے معنی ہیں اسٹرائک کرنا) **ضَرْبُ عَلَيَّ** اذْأَنَّهُمْ۔ ہم نے انہیں آواز مننے سے روک دیا۔ **ضَرْبُ إِلَيْهِ**۔ وہ اسکی طرف مائل ہوا۔ **إِضْطَرَبُ** کے معنی ہیں کسی چیز کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ کے ساتھ ٹکرانا۔ نیز اسکے معنی کمانے اور حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ **إِضْطَرَبَ آمْرُهُ** کے معنی ہیں اس کا کام خراب ہو گیا۔ \* **مُضْطَرَبُ**۔ متحرک کو کہتے ہیں \*۔ سورۃ انفال میں ہے **فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ (۱۲)**۔ اسکے معنی مارنے کے ہیں، اور **ضَرْبَتْ عَلَيْهِمُ الْيَذْكَةُ** و **الْمَسْكَنَةُ (۶۱)** کے معنی ذلت و خواری کی مار مارنے کے ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے **إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ (۱۱)**۔ اسکے معنی سفر کرنے کے ہیں۔ سورۃ نحل میں ہے **وَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ (۱۱)**۔ اللہ کی مثل اور مانند کسی کو قرار نہ دو۔ اس کی ذات کے متعلق اپنے ذہن میں تصورات پیدا نہ کرو کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے۔

**ضَرْبُ عَنْهُ**۔ روک لینا۔ بند کرنا۔ **أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمْ الذِّكْرَ (۲۳)**۔ کیا ہم اس ضابطہ ہدایت کو تم سے روک لینگے؟ کیا ہم قرآن کریم کے قوانین (مکافات عمل) کو تم پر لاگو (نافذ) نہیں کریں گے اور تمہیں کھلی چھٹی دیدینگے کہ تم جو جی میں آئے کرے رہو اور جس روش پر جی چاہے چلتے رہو! ایسا نہیں ہوگا۔

ضَرْبٌ مَثَلًا کے معنی میں مثال کے ذریعہ بات کو واضح کرنا۔ لیکن بعض مقامات پر صرف ضَرْب کے بھی یہی معنی آتے ہیں۔ مثلاً کَذَّالِیکَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱)۔ اس طرح اللہ حق و باطل کی وضاحت کرتا ہے۔ یا بات کو سمجھاتا ہے۔ اگرچہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) اس کے معنی حق و باطل کی کشمکش کے بھی ہیں۔ اسی طرح سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَّ رَبُّوہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا (۲۳/۵۸)۔ یہ لوگ تجھے بات نہیں سمجھائے (مثال پیش نہیں کرتے) بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں۔ اسی سے (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ) سورۃ نساء میں جو عورتوں کے متعلق ہے کہ وَاضْرِبُوہُنَّ (۴/۳۵) تو اس کے معنی ہیں مختلف طریقوں سے مثالیں دیکر انہیں سمجھاؤ۔ یعنی وَاضْرِبُوہُنَّ مَثَلًا۔ لیکن یہ معنی اس لئے کمزور ہیں کہ سمجھانے کے لئے اس سے پہلے فَعِظُوہُنَّ آچکا ہے۔ لہذا فَاضْرِبُوہُنَّ سے مراد وہ بدنی سزا (Corporal Punishment) ہے جو عدالت کی طرف سے بعض جرائم کی سزا دی جاتی ہے۔ عورتوں کا بلا عذر اپنے فطری وظائف زندگی (اولاد پیدا کرنے) سے سرکشی برتنا اور مرد بننے کی خواہش کرنا (جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے) ایک معاشرتی جرم ہے جس کا بذریعہ عدالت روکا جانا ضروری ہے۔

سورۃ طہ میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے فَاضْرِبْ لَہُمْ طَرِیقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰/۷۶)۔ انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جا۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اِضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۱/۲۱)۔ (نیز ۲۴/۲۴)۔ اپنی جماعت (عصا - دیکھئے عنوان ع - ص - و) کو سمندر سے ہار لے جا۔ یا، تو عصا ٹیکتا ہوا پایاب چلے جا۔ اسی طرح دوسری جگہ ہے اِضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۱/۲۱) جس کے معنی یہاں تو یہ ہیں کہ اپنی جماعت کو پہاڑ کی طرف لے جا۔ وہاں انہیں پانی کے چشمے مل جائیں گے۔ اور یہ کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار، اس سے مٹی اور پتھر وغیرہ میں شکاف ہو جائیگا اور اندر کا پانی باہر نکل آئیگا۔

## ض ر

ضَرَّ - یَضُرُّ - نقصان پہنچانا - الضَّرُّ - الضَّرُّ - نقصان - الضَّرُّ - عام طور پر مالی نقصان یا خارجی مصیبت کو کہتے ہیں اور الضَّرُّ - اس مصیبت یا بد حالی کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہو - الْقَضَاءُ - قحط - نقصان کی شدت - بد حالی - الضَّرُّ - لاغری - معذوری - الضَّرَّاءُ - معذور ہونا۔

لنگڑا ہونا۔ نیز اس کے معنی تنگی۔ سختی۔ بد حالی کے بھی ہیں۔ الضَّرَرُ یُزْرُ۔  
ناہینا۔ مریض۔ لاغر۔ مصیبت زدہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الضَّرَرُ یُزْرُ۔  
قوت نفس اور صبر کو کہتے ہیں۔

الضَّرَرُ - تنگی۔ الضَّرَرُ وَرَّةٌ - حاجت۔ اَلْاِضْطِرَّارُ - شدت  
احتیاج سے مجبور ہونا\*۔ اَلضَّرَرَةُ تَانٍ - چکی کے دونوں ہاٹ۔ ایک مرد  
کی دو بیویاں\*۔ اَلْاِضْطِرَّارُ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی (یعنی  
اس کی سوت) لانا۔ تَزَوَّجْتُ اَلْمَرْأَةَ عَلٰی ضِرٍّ - میں نے اس عورت  
سے پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود عربوں کو  
بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مضرت رسانی کا احساس تھا۔

اَلْمُضْطَرُّ - قریب ہونے والا\*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ نَفْعٌ کے مقابلہ میں (۱/۲۳) میں آیا ہے۔ خَیْرٌ  
کے مقابلہ میں (۱/۲۳) میں اور نِعْمَتٌ کے مقابلہ میں (۱/۲۳) میں۔ جسمانی  
تکلیف کے لئے (۱/۲۳) میں۔ اُضْطَرُّ (۱/۲۳) میں۔ جس کے معنی اضطراری حالت میں  
پہنچنے کے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَلَا یُضْطَارُّ کَاتِبٌ (۲/۸۲)۔ کاتب  
کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ (اس باب کا خاصہ ایک دوسرے  
کو نقصان پہنچانے کا ہے۔ اس لئے اس سے مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ  
تم میں سے کوئی اس کاتب (اور گواہ) کو تکلیف پہنچائے اور نہ ہی وہ کاتب  
(اور گواہ) تمہارے لئے کسی تکلیف کا باعث بنیں)۔ سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ  
اُولٰٓئِ الضَّارِّ (۴/۵) جنہیں کوئی جسمانی تکلیف (بیماری) نہ ہو۔ سورۃ  
توبہ میں ضِرَّارٌ آیا ہے (۹/۱۱)۔ یعنی باہم نقصان پہنچانے کی خاطر۔ یہ  
نقصان اجتماعی ہے۔ سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ مُضْطَارٍّ (۴/۱۱) جو ایک  
دوسرے کو تکلیف پہنچانے والا نہ ہو۔

سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ اُضْطَرُّہُ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ (۲/۲۲) میں  
انہیں بسے بس کر کے جہنم کے عذاب کی طرف لیجاؤں گا۔ دوسری جگہ ہے فَمَنْ  
اُضْطَرُّ (۲/۲۲)۔ جو مجبور ہو جائے۔ مُضْطَرٌّ (۲/۲۲) ہے بس مجبور۔

## ض ر ع

الضَّرَرُ ع\*۔ گائے بکری وغیرہ کا تھن۔ (اونٹنی کے تھن کو خِلْفٌ  
کہتے ہیں)\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نرمی کے ہیں

اور تھن کو ضَرْعٌ\* اس کی نرمی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ضَرْعُ الثَّوْمِ کے معنی ہیں چوہاؤں کے بچوں نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لیے لیا\*\*۔ اس سے تَضَرَّعَ إِلَى اللَّهِ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی اپنی نشوونما کے لئے ربوبیت کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا۔ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرَّعًا وَخُفْيَةً (۵۵)۔ یعنی اپنی نشوونما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرو (اس کی مزید تشریح کے لئے ع۔ و۔ ذ کے عنوان میں تَعَوَّذَ بھی دیکھئے)۔ اس سے آگے ہے إِنَّهُ لَا يَحْبِبُ الْمُعْتَدِينَ (۵۵)۔ وہ حدود فراموش کرنے والے سرکشوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تَضَرَّعًا کے اندر اطاعت خداوندی کا بنیادی تصور شامل ہے۔ سورہ انعام میں ہے لَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَسًا سُنَّتَا تَضَرَّعُوا (۶۶) جب ان پر (ان کے اعمال کی وجہ سے) ہمارے قانون مکافات کے مطابق سختی آئی تو انہوں نے اس وقت ہمارے قانون کی اطاعت کیوں نہ اختیار کر لی۔

الضَّرِيعُ۔ حجاز میں کانٹوں والا پودا ہوتا ہے۔ چوہائے اس کے پاس نہیں بھٹکتے۔ اگر اسے کھا لیتے ہیں تو اس سے کمزور ہو جاتے ہیں۔ یا ایک قسم کی بد بودار گھاس کو کہتے ہیں جو ٹھہرے ہوئے پانی میں پیدا ہوتی ہے اور مویشی اسے نہیں کھاتے\*۔ بعض اوقات سمندر اس قسم کے گھاس کو باہر پھینک دیتا ہے اور جو مویشی اسے کھاتا ہے وہ لافز اور کمزور ہو جاتا ہے\*\*۔ سورہ غاشیہ میں اہل جہنم کی غذا کو ضَرِيعٌ کہا گیا ہے (۸۸)۔ یعنی دوسروں کے ردی سمجھ کر پھینکے ہوئے ٹکڑے جن سے نشوونما ہونے کی بجائے انسانی صلاحیتیں اور بھی ہڑسردہ ہو جاتیں۔ محکوم اور کمزور اقوام کو اسی طرح کی غذا ملتی ہے۔ (نشوونما رک جانے کے اعتبار سے لفظ جَحِيْمٌ عنوان ج۔ ح۔ م میں دیکھئے)۔

کمزوری اور لاغری کے اعتبار سے الضَّارِعُ وَالضَّرْعُ۔ ہر نحر اور کمزور چیز کو کہتے ہیں\*۔ ضَرْعٌ لَهُ وَضَرْعٌ۔ اس سے کچھ مانگا اور مانگنے کے ساتھ اپنے عجز و تذلل کا اظہار کیا۔ الضَّرْعُ وَالضَّرْعُ۔ لاغر ہونا۔ مَثَلَهُ زَرْعٌ وَلَا ضَرْعٌ\*۔ اس کے پاس کچھ نہیں\*۔ اَضْرَعُ لِفُلَانٍ مَالًا کے معنی ہیں اس کے لئے مال خرچ کیا\*\*\*۔

بہر حال، انسان کا خدا کی طرف تَضَرَّعًا جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی نشوونما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرے اور

دل کے پورے جھکاو کے ساتھ اس کے قوانین کی اطاعت کرے۔ اگر ایسا نہ کریگا تو اسے ضررِ بے حد پہنچے گا۔ یعنی وہ ذلت کی روٹی جس سے شرفِ انسانیت کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں۔

## ض ع ف

الضَّعِيفُ - الضَّعِيفُ - الضَّعِيفُ - کمزوری\* - صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ ضَعِيفٌ - رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضَعِيفٌ - بدن کی کمزوری کو\*\* - سورة الروم میں قِسْوَةٌ کے مقابلہ میں ضَعِيفٌ آیا ہے (۳۸) - اور سورة انفال میں فوجی کمزوری کے لئے ضَعِيفٌ (۸) - سورة ابراهيم میں مُسْتَضْعِفٌ یُن کے مقابلہ میں ضَعِفاءُ آیا ہے (۱۲) - ضِعَافٌ (جس کا واحد ضَعِیفٌ ہے) - کمزور (۲) - ضَعِیفٌ (جمع ضَعِفاءُ) اور ضِعَافٌ (کمزور) (۲۸) اس مقام پر یہ لفظ جذبات سے مغلوب ہو جانے کے معنوں میں آیا ہے - اِسْتَضْعَفَہ - اسے کمزور سمجھا - حقیر جانا - (۱۵) - مُسْتَضْعِفٌ - جسے کمزور سمجھا جائے (۲) - ظاہر ہے جسے کمزور خیال کیا جاتا ہے اس کے حقوق بھی شصت کئے جاتے ہیں اور اس کی کمزوری سے ناجائز فائدے بھی اٹھائے جاتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کو دگنا کر دینا۔ اس اعتبار سے ضِعَافٌ (جمع اَضْعَافٌ) کے معنی ہیں کسی چیز کے مانند اور اس کا مثل۔ برابر کا حصہ - اتنا ہی اور - اس طرح دگنا ہو جانا - لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف دگنا نہیں بلکہ دگنے سے زیادہ تگنا چو گنا - نیز غیر محدود طور پر زیادہ ہونے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے\* - چنانچہ سورة بقرہ میں ہے فَيَضْعِيفُہُ لَہُ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً (۲۵) - اس کے معنی کئی گنا ہیں - سورة اعراف میں ضِعَافٌ دگنے کے معنوں میں آیا ہے (۳۸) - ضِعْفَیْنِ - دو چند (۲۵) -

سورة آل عمران میں ہے - لَا تَاۡکُلُوۡا اَلۡرِبٰوَاۡ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۳۹) - اس کے عام معنی کئے جاتے ہیں بڑھا بڑھا کر سود (در سود) نہ کھاؤ۔ لیکن راعب کا کہنا ہے کہ مُضَاعَفَةٌ دراصل ضَعِیفٌ سے ہے - ضِعَافٌ سے نہیں - اس لئے آیت کے معنی یہ ہیں کہ رِبُو، جسے تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے رویے کو بڑھانا ہے - بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت ضَعِیفٌ (یعنی) کم کرنا ہے\*\*\* - سود سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار

کی انسانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ رہنمائی سے قومی دولت گھٹتی ہے اور کمزوریوں پر کمزوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

## ض غ ث

ضَعَفَتْ الْحَدِيثُ - بات کو خلط ملط کر دینا۔ مجازاً الضَعْفُ کسی چیز کے اجزاء کے باہم گر ملتبس اور گڈمڈ ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اصل میں ضَعَفَتْ التَّسْنِیْمُ - اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کے متعلق واضح نہ ہو کہ وہ کمزور ہے یا موٹی اور اس کے کوہان کو مٹھی بھر کر دیکھا جائے کہ اس میں چربی ہے یا نہیں۔ اس لئے، غیر واضح اور ملتبس بات کو کَلَامٌ ضَعِيفٌ کہتے ہیں\*۔ (جمع أَضْعَافٌ)۔ قرآن کریم میں أَضْعَافٌ أَحْلَامٌ (۱۲/۲۴) آیا ہے۔ یعنی ایسے خواب جن کا مطلب واضح نہ ہو۔ پریشان خواب۔

ضِعْفٌ - اتنی گھاس، گدستہ یا شاخیں جو آدمی کی مٹھی میں آجائیں۔ مٹھی بھر چیز\*۔ سورۃ ص میں حضرت ایوبؑ کے تذکرہ میں ہے خُذْ بِلِصَّةِ كَتِّ ضِعْفًا (۳۸/۲۸) مٹھی بھر گھاس لے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الضِعْفُ تنکوں یا شاخوں کے مٹھے کو کہتے ہیں۔ طب قدیم میں، (اور آجکل بھی) کئی جسمانی تکالیف کا علاج جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پتوں سے کیا جاتا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی تھوڑی سی متاع دنیوی بھی ہے۔ یونہی مٹھی بھر۔

## ض غ ن

أَلِضْغَنٌ - شدید کینہ۔ سخت عداوت۔ انتہائی بغض۔ ضَغْنٌ عَلَیْهِ۔ اس نے اس سے شدید بغض رکھا۔ سخت کینہ رکھا۔ فَرَسٌ ضَاغِنٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بغیر مسار کھائے اپنی چال ہی نہ نکالے۔ اِضْطَغْنَهُ - اس نے اس چیز کو بغل کے نیچے دبا لیا۔ یا گود میں لے لیا\*۔ قرآن کریم میں ہے یُخْرِجُ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ (۲۹/۲۹)۔ اللہ ان کے کینوں کو باہر نکالے گا۔ یا جو کچھ بغل کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اُسے باہر نکالے گا۔ یعنی ان کی مخالفانہ سازشیں اور پوشیدہ ارادے طشت از ہام کردیگا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کچی یا ٹیڑھ پن کے ساتھ کسی چیز کو ڈھانپ دینا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قَنَآةٌ ضَغِیْنَةٌ - ٹیڑھے نیزے کو کہتے ہیں۔ ٹیڑھ پن اور ڈھانپے ہوئے (مستور) ہونے کی جہت سے اَلِضْغَنُ - کینہ اور عداوت کو کہتے ہیں۔

\* تاج - راغب - محیط - \* أَلِضْغَنٌ کے معنی گود اور اونٹ کی بغل کے بھی ہیں۔ نیز طوق اور میلان کے بھی۔  
لہ ۲۴/۲۴ میں یُخْرِجُ جَزْءًا مِّنْهُمْ ہے۔

## ض ف د ع

الْيَضْفَعُ ع\* - الْضَفْعُ ع\* - (جمع ضَفَاعِدُ ع\* - مِينْدُك\* -

## ض ل ل

الضَّلَالَةُ\* - حیرت - متحیر ہونا - سرگردان پھرنا - (Perplexed; Confused) کسی چیز کا ہوشیدہ اور غائب ہونا، مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جاسکے - مثلاً ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّيْلِ - پانی دودھ میں گھل مل کر غائب ہو گیا - دلیل نہ سوجھنے، نیز کسی بات کے بھول جانے اور حافظہ سے کم ہو جانے کے لئے بھی یہ فعل بولا جاتا ہے\*\* - ضَلَّالَةٌ\* - سیدھی راہ سے ہٹ جانا - (عمداً ہو یا سہواً - تھوڑا ہو یا بہت) - چونکہ صحرا میں راستہ کھو جانے والا اپنی تمام تگ و دو کے باوجود منزل کے قریب نہیں ہونے پاتا اس لئے کوشش کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضَلَّ سَعْيُهُ\* کہتے ہیں - اور چونکہ ریگستان میں اس طرح پھرنے کا نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوتا ہے اس لئے اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے\*\*\* - نیز ضائع ہونا - رائگاں جانا - مثلاً ذَهَبَ دَمُهُ ضِلَالَةً\* - اسکا خون یونہی رائگاں گیا - کیونکہ اسکا قصاص یا انتقام نہیں لیا جاسکا\* - ضَلَّ النَّبِيُّ فُلَانٌ\* - وہ میرے ساتھ سے نکل گیا اور میں اس پر قادر نہ رہا\* - الضَّلَالُ\* - وہ پانی جسو کسی چٹان یا درختوں کے نیچے بہ رہا ہو اور اس پر دھوپ نہ پڑے - الْمَضِلُّ\* - سراب جسو ریگستان میں پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے\* -

جب رسول اللہؐ نبوت سے پہلے تلاش حقیقت میں حیران و سرگرداں پھرتے تھے تو قرآن حکریم نے اس کیفیت کو وَوَجَدَكَ ضَالًّا (۱۳) سے تعبیر کیا ہے - ایک ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے بھبی، غلط تصورات زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے - اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے -

سورة بقرہ میں ضَلَّالَةٌ\* - ہُدًى کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۶) - اس نے 'راہ گم کردن' کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے - سورة ابراہیم میں کوششوں کے ناکام اور اعمال کے بے نتیجہ رہ جانے کو ضَلَّالٌ\* سے تعبیر

کیا گیا ہے (۱۳/۱۸)۔ سورۃ کہف میں ضَلَّ سَعْيُهُمْ (۱۳/۱۸) سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ایسے ثَبَات کے مقابل میں لا کسر بتایا گیا ہے کہ اسکے معنی ہلاکت و بربادی ہیں (۱۳/۱۳)۔ سورۃ حجر میں ضَلَّالَت کا نتیجہ نعمائے خداوندی سے محرومی و مایوسی بتایا گیا ہے (۱۳/۱۵)۔ سورۃ اعراف میں ضَلُّوا عَنَّا (۱۳/۱۷) کے معنی ہیں وہ ہم سے جاتے رہے با غائب ہو گئے۔ اور سورۃ السجدہ میں جہاں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (۱۳/۲۷) تو اس کے معنی ہیں کہ کیا جب ہم مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے (ختم ہو جائیں گے)؟۔ تَضَلَّیْلٌ۔ ضائع کر دینا۔ ناکام بنا دینا، بھٹکا دینا اور غلط راہ پر لگا دینا (۱۳/۲۷)۔ لہذا ضَالِّیْن (۱۳/۲۷) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو وحی کی راہ نمائی کے بجائے اپنے ذہنی قیاسات کی تجربہ گاہوں یا توہم پرستانہ عقیدہ مندوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح مارے مارے پھرتے ہیں جس طرح لق و دق صحرا میں ایک راہ گم کردہ مسافر حیران و پریشان پھرتا ہے۔ وہ دن بھر چلتا رہتا ہے لیکن شام کے وقت اسکی منزل اس سے دور ہو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح اسکی تمام کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں اور وہ انجام کار ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں منعم علیہ ہیں (۱۳/۲۷) جن کی کیفیت ان لوگوں کے برعکس ہوتی ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے (۲/۸۲) کہ لِن دین کے معاملہ میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ دو عورتیں اس لئے کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ اِلٰحِدَاهُمَا الْاُخْرٰی (۲/۸۲)۔ اگر ان میں سے ایک کسی تفصیل میں (Confused) ہو جائے تو دوسری ایسے یاد دلا دے۔ وہ اُس بات کو سامنے لے آئے۔ اس سے حافظہ کی کمزوری (بھول جانا) مراد نہیں بلکہ (عورت کے زیادہ جذباتی اور حیا دار ہونے کی وجہ سے) گھبراہٹ میں (Confused) ہو جانا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَهُوَ فِي الْاٰخِصَامِ غَيْرُ مُبْتَلٰی (۲/۱۸)۔ وہ جھگڑے (منازعہ فیہ معاملہ) میں واضح طور پر مافی الضمیر کر بیان کرنے والی نہیں ہوتی ہے۔ جھگڑے میں جذبات کی شدت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے معاملہ (Case) کو بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی۔ واضح رہے کہ لطیف جذبات کی زیادتی عورت کے فطری وظائف زندگی (اولاد کی پرورش) کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے یہ عورت کا نقص نہیں۔ البتہ مناسب تعلیم و تربیت سے اس کے یہ جذبات بھی باقی رہتے ہیں اور وہ فصیح البیان بھی ہو سکتی ہے (۲/۱۸)۔ دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ ب)



## ض م ر

الضَّمْرُ - الضَّمْرُ - لاغر ہونا - پیٹ کا کمر کے ساتھ لگ جانا -  
ضَمَرَ الْفَرَسُ - گھوڑے کا لاغر ہونا اور اس کے پیٹ کا کمر سے لگنا - قَضِيْبٌ -  
ضامیر - مرجھائی ہوئی شاخ جسکی ترو تازگی جاتی رہی ہو \* - قرآن کریم  
میں ہے علیٰ کلِّ ضامیر (۲۴) - پتلی دہلی سواروں پر - راغب نے کہا ہے  
کہ الضَّامِرُ مِّنَ الْفَرَسِ - اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جسکا  
دہلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اسے سدھانے کے لئے جو مشقت کرائی  
جاتی ہے اس کی وجہ سے ہو \*\* -

الضَّمِيرُ - مرجھایا ہوا انگور - ہر وہ بات جسے تم اپنے دل میں  
چھپاؤ - اَضْمَرَهُ - اس نے اسے چھپا لیا \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس  
کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) پتلا پن اور باریک ہونا اور (۲) کسی چیز کا  
چھپ جانا -

## ض م م

الضَّمُّ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا - اَضْطَمَّ الشَّيْءُ -  
کسی چیز کو اپنے لیے اکٹھا کیا - ضَمَمْتُهُ اِلَى صَدْرِي - میں نے اسے  
اپنے گلے سے لگایا \* - ضَمَّ عَلِيٌّ الْعَال - اس نے مارے مال پر قبضہ کر لیا \*\* -  
ضَمَّ جَنَاحَكَ عَنِ النَّاسِ - لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور  
اپنا پہلو، ان کے لئے نرم رکھو \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی  
معنی دو چیزوں میں موافقت اور مناسبت کے ہیں -

سورة طہ میں ہے وَاَضْمَمْتُ يَدَكَ اِلَى جَنَاحِيكَ تَخْشَرُجُ  
بَيْضَاءَ مِثْنِ غَيْرِ سَوْءٍ (۲۴) - اور سورة القصص میں ہے اُسْلَمَكَ  
يَدَكَ فِيْ جَنَاحِيكَ تَخْشَرُجُ بَيْضَاءَ مِثْنِ غَيْرِ سَوْءٍ وَاَضْمَمْتُ  
اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِثْنِ الشَّرْهَبِ (۲۵) - [”یَدُ بَيْضَاءَ“ کے مفہوم  
کیلئے عنوان ی - د - ی دیکھئے - نیز ج - ج - اور جَنَاحُ کیلئے  
دیکھئے عنوان ج - ن - ح] (۲۶) کا مفہوم یہ ہے کہ خوف کی حالت  
میں مضطرب و متردد مت ہو (پھڑ پھڑاؤ نہیں) بلکہ اس طرح  
اطمینان سے رہو جس طرح پرندہ حالت امن میں اپنے بازو سمیٹ کر بیٹھتا ہے -  
اور (۲۷) کا مجازی مفہوم بھی یہ ہے کہ اس آنے والے معرکہ میں ضبط و تحمل

یہ کام لو۔ پریشان مت ہو۔ اور بشارتیں دینے والے درخشندہ اصول زندگی کو (جو وحی کے ذریعے تمہیں دیئے گئے ہیں) پیش کرتے جاؤ۔ تم ہر مشکل و مصیبت سے محفوظ باہر نکل آؤ گے۔ دشمن کا شر تمہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیگا۔ ویسے، آیت (۲۸) کے لفظی معنی یہ ہیں۔ ”تم اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ بغیر کسی خرابی کے سفید نکل آئے گا۔ اور تم خوف سے اپنے بازؤں کو سمٹائے رکھو“۔

## ض ن ک

الضَّنْكَ۔ تنگ (جو کشادہ نہ ہو)۔ الضَّنْكَ۔ وہ شخص جو جسم، عقل، رائے وغیرہ میں کمزور ہو۔ وہ خادم جو محض روٹی کے معاوضہ میں کام کرتا ہو۔ رَجُلٌ مُتَضَنِّكٌ۔ لاغر آدمی\*۔

قرآن کریم میں ہے جو شخص (یا قوم) قوانین خداوندی سے اعراض برتیگی۔ فَانَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۲۲) ان کی معیشت تنگ ہو جائیگی۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کی معیشت تنگ ہے (اور مسلمانوں کا نمبر ان میں اس وقت سب سے آگے ہے) وہ قوانین خداوندی سے اعراض برت رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا محسوس اور واضح معیار ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

## ض ن ن

ضَنَّ بِالْشَّيْءِ يَضُنُّ۔ کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا۔ الضَّنَّيْنِ۔ وہ بخیل آدمی جو نفیس چیزوں کے ساتھ بخل کرے۔ اِلِضْنٌ۔ نفیس شے جسکے ساتھ بخل کیا جائے\*\*۔ جسے بچا کر رکھا جائے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۲۱)۔ ایسے خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اسکے عام کرنے میں بخل نہیں برتتا۔ وہ ایسے ہر اس شخص کو دیتا ہے جو لینا چاہے۔

## ض ہ ی (ا)

الضَّهْمَاءُ۔ وہ عورت جسے نہ حیض آتا ہو نہ بچے پیدا ہوتے ہوں۔ یا جس کی چھاتیوں میں ابھار نہ ہو اور اس طرح وہ مردوں سے مشابہ ہو۔ اسی

سے ضَاهَاہُ مُضَاهَاةٌ - وَضَاهَاہُ - مُضَاهَاةٌ کے معنی ہیں وہ اس کے مشابہ اور ہم شکل ہوا۔ هُوَ ضَهِيكٌ - وہ تیرا ہم شکل اور تجھ سے مشابہ ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے مشابہ ہونا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے بِضَاهِيُوْنَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ (۱۰۳)۔ یہ انہی جیسی بات کرتے ہیں (انہی کے ہم رنگ بنتے ہیں) جنہوں نے ان سے پہلے کفر کی روش اختیار کی تھی۔ یہ سب ہم رنگ ہیں۔ بعض لوگوں نے اسے ناقص یا ناقص مانا ہے اور بعض نے مہموز\*۔ چنانچہ لین نے اسے ضہی اور ضہیا دونوں عنوانوں کے تحت لکھا ہے۔ راغب نے اسکی اصل حمزہ بھی بتائی ہے۔

## ض و ا

ضَوْءٌ یا ضَوٌءٌ - نور اور روشنی کو کہتے ہیں۔ (جیسا کہ ن - و۔ ر کے عنوان میں بھی بتایا گیا ہے)۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ضَوْءٌ کا لفظ نُورٌ سے زیادہ شدت اور قوت رکھتا ہے۔ نیز ضَوْءٌ کسی کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُورٌ اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ہو\*\*۔ غالباً اسی جہت سے شَمْسٌ کو ضِيَاءٌ اور قَمَرٌ کو نُورٌ کہا گیا ہے (۱/۵)۔ کیونکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، سورج سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تَوْرَاتٌ کو نُورٌ کہا گیا ہے (۲۴/۳۵) اور دوسری جگہ اسے ضِيَاءٌ کہا گیا ہے (۲۱/۳۸)۔

أَضَاءَ کے معنی روشن کرنا ہیں۔ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَاحِوِلَتُهُ (۲/۱۲)۔ ”جب اس نے اس کے گرد و پیش کو روشن کر دیا“۔ نیز اس کے معنی روشن ہونے کے بھی ہیں۔ يَكَادُ زَيْتُهُنَّ يَظْفِي (۲۴/۳۵)۔ ”قریب ہے اس کا تیل کہ وہ روشن ہو جائے“۔

## ض و ز (ضیر)

ضَارَ فُلَانًا حَقَّقَهُ - اس نے اسکا حق کم کر دیا۔ فِسْمَةٌ ضَيْرٌ - وہ ظالمانہ تقسیم جس میں کسی کو نقصان میں رکھا جائے۔ وہ تقسیم جو عدل پر مبنی نہ ہو۔ الضُّوَارُ - مسواک کے اس ریشہ کو کہتے ہیں جو دانتوں

میں رہ جائے\*۔ (گویا اتنی سی کمی بھی ظلم ہو جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کجی اور (۲) کمی اور نقصان کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے تِلْكَ اِذْ اَقْسَمْتُمْ ضِيْزًى (۵۳)۔ یہ تقسیم تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہوئی۔

## ض ی ر

الضَّيْرُ - مضرت - گزند، ضَارَهُ، وَضَّرَهُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانا\*۔ قرآن کریم میں ہے لَا ضَيْرَ - (۲۱)۔ کچھ ہرج نہیں۔ قطعاً کوئی تکلیف یا مضرت کی بات نہیں۔

## ض ی ع

ضَاعَ - يَضْيَعُ - ضَيْعًا - ہلاک اور تلف ہو جانا۔ ضَاعَ الشَّيْءُ\*۔ چیز بے کار چھوڑ دی گئی اور اس کی خبر گیری نہ ہوئی۔ ضَاعَ الْعِيَالُ\*۔ اہل و عیال کی نگرانی خبر گیری اور تربیت نہ کی گئی اور انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا گیا۔ تَرَكَهُ يَضْيَعَةً\*۔ میں نے اسے بلا خبر گیری کے چھوڑ دیا۔ الضَّيَاعُ (ضَائِعٌ کی جمع ہے) وہ چیزیں جنکی خبر گیری نہ کی جائے اور وہ اس طرح ضائع ہو جائیں\*\*\*۔ الضَّيْعَةُ\*۔ جائداد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اگر اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا نہ رکھا جائے تو وہ مآل کار ضائع ہو جاتی ہے۔

سورة بقرہ میں ہے وَمَا كَانَ لِلّٰهِ لِيَضْيَعَ اٰيْمَانُكُمْ (۲۴۳)۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمانوں کو ویسے ہی چھوڑ دے، ان کا خیال ہی نہ رکھے اور وہ اس طرح بغیر کوئی نتیجہ مرتب کئے برباد ہو جائیں۔ سورة مریم میں ہے کہ انبیاء کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ (۱۱)۔ انہوں نے نظام صلوٰۃ کی کوئی پرواہ ہی نہ کی۔ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا اور اپنے اپنے خیالات و مفاد کے پیچھے پڑ گئے۔

## ض ی ف

الضَّيْفُ - سہمان - جمع اور واحد دونوں کے لئے آتا ہے\*\*\*۔ سورة ہود میں ہے لَا تَخْزُوْنَ فِيْ ضَيْفِيْ (۱۸)۔ یہاں ضَيْفٌ جمع کے لئے آیا ہے۔

ضَاۤفَ التَّيْمَرِ - وہ اس کی طرف مائل ہوا - جھکا - قریب ہوا - ضَيِّقَتْ -  
سہمان بنانا - سہمان نوازی کرنا\* -

سورۃ کہف میں ہے فَاتَّبَعُوۡا اَنْۢ بَصُرَۡتُمْ اَوْۤ اَنْۢ يَّضَيُّقُوۡا ۚ مَاۤ اَنتُمْۢ بِمُعْجِزِيۡنَ (۱۸) - انہوں نے  
ان کی سہمان نوازی کرنے سے انکار کر دیا۔ اَلْمُضَافُ - جائے پناہ - جس کو کسی  
کی طرف مائل کیا جائے، جھکایا جائے۔ نیز وہ شخص جس کو جنگ میں چاروں طرف  
سے گھیر لیا گیا ہو\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی  
مائل ہونے کے ہیں -

## ض ی ق

ضَاقَ - يَضِيقُ\* - ضَيْقًا - تنگ ہو جانا - ضَيْقٌ - تنگ کرنا -  
الضَّيِّقُ و الضَّيِّقُ - تنگی - یہ اَلشَّرْحُ کی ضد ہے - لہذا اس کا صحیح مفہوم  
سمجھنے کے لئے ش - ر - ح کا عنوان دیکھئے - یہ دونوں مادے (۱۲۶) میں  
ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں - ضَيِّقُ\* (۱۲۶) تنگ - ضَيْقٌ\* (۱۲۶) تنگی -  
ضَائِقٌ\* - وہ جو تنگ ہو (۱۲۶) - ان میں حزن، غم اور ملال کا مفہوم آجاتا ہے -  
ضَاقَ بِيْهِمْ ذَرَّعًا (۱۱) اس نے ان کی حفاظت کے لئے اپنی طاقت کو  
تنگ (کم) پایا - کوتاہ دست ہو گیا - ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَلْاَرْضُ (۱۱۸)  
ان پر زمین تنگ ہو گئی - وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (۱۱۸) وہ خود  
اپنے آپ سے تنگ آ گئے - سورۃ طلاق میں ہے وَلَا تَضَارُّوْا ۚ هُنَّ لِيَّضَيُّقُوْا  
عَلَيْهِنَّ (۶۵) - انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو -

## ط

## طَالُوْتُ

طَالُوْتُ\* - انہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اُن افواج کا کمانڈر مقرر کیا تھا جو جالوت کے مقابلہ کے لئے جا رہی تھیں۔ ان میں علم بھی تھا اور جسمانی توانائی بھی۔ اور یہی چیزیں ایک کمانڈر کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے اس تقرر کے خلاف بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ دولتمند نہیں۔ یعنی وہ (Aristocrat) طبقہ میں سے نہیں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کمانڈر کی صفات، فنونِ حرب کا علم اور توانائی ہیں، نہ کہ مال و دولت کی فراوانی۔ (۲۳۷)۔

صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے، عربی نہیں\*۔ راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے۔

## ط ب ع

الطَّبَّع\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کو تمثیلاً کسی چیز کی انتہا کے لئے استعمال کرتے ہیں، یعنی جہاں پہنچ کر وہ چیز ختم ہو جائے اور پوری ہو جائے۔ پیمانے کے لبالب بھر جانے کو طَبَّع\* کہتے ہیں۔ تَطَبَّعَ النَّهْرُ\* نہر بھر گئی۔ اس اعتبار سے الطَّبَّع\* مہر لگانے کو کہتے ہیں۔ ابواسحق نے کہا ہے کہ طَبَّع\* اور خَتَم\* ہم معنی ہیں۔ یعنی کسی چیز کو بند کر دینا اور ڈھانپ دینا اور اس کا یقین اور اطمینان کر لینا کہ اب اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے گی۔ مثلاً کہتے ہیں طَبَّعْتَ الثَّمَرَ\*۔ میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا اور اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آسکتی\*۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ طَبَّع\* - خَتَم\* سے زیادہ عام ہے اور تَقَشُّش\* سے زیادہ خاص\*۔ الطَّبَّاعُ\* والطَّابِعُ\* اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے بکریوں وغیرہ کے پہلو پر داغ دیکر نشان کیا جائے۔

الطَّبَاعَةُ - ڈھلائی، چھپائی کا کام۔ الطَّبَاعُ - ڈھلائی کا کام کرنے والا\*۔  
اصل میں جب کسی چیز کو ڈھال کر یا گھڑ کر پہلی شکل دی جائے تو اسے  
الطَّبْعُ کہتے ہیں۔

مہر لگانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے۔ فَطَبَّعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ  
فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۱۳۳)۔ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس کا نتیجہ یہ  
ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اسی کو ختم  
اللہ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (۲) کہا گیا ہے (دیکھئے عنوان خ۔ ت۔ م)۔ جب انسان  
ضد اور ہٹ، نفرت اور تعصب کی روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی کیفیت یہ  
ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کے صحیح طور پر سمجھنے اور ٹھیک نتیجہ  
تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اسی کو دل و دماغ پر مہر بن  
لگ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ یہ انسان  
کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ روش خود ہی مہر بن جاتی ہے۔  
رَأَىٰ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا بِكَاسِبُوْنَ (۸۳)۔ ان کے اعمال ان کے  
دلوں پر زنگ بن کر بیٹھ گئے۔ وہ غلط اعمال جو برضا و رغبت اور بلا جور  
واکراہ کئے جائیں (۱۰۸-۱۰۹-۱۱۰) وہ زنگ بن جاتے ہیں۔

## ط ب ق

الطَّبَقُ - عرچیز کا ڈھکنا جو اس پر فٹ آجائے۔ طَبَقَتُهُ تَطْبِيقًا۔  
اس نے اسے ڈھانپ دیا۔ فَانطَبَقَ - پس وہ ڈھک گیا۔ الطَّبَقُ مِّنْ  
كُلِّ شَيْءٍ - ہر وہ چیز جو کسی چیز کے برابر اور مطابق ہو۔ طَبَقَتُهُ  
مُطَابَقَةٌ وَطَبَاقًا۔ وہ اس کے موافق اور مساوی ہو گیا۔ الطَّبَقُ - روئے  
زمین۔ تھالی یا طباق جس پر کھانا رکھا جائے۔ زمانہ کی ایک صدی یا قرن۔  
حالت۔ الْمُطَابَقَةُ - موافق و مطابق ہونا۔ گھوڑے کا اس طرح چلنا کہ  
جہاں اگلا پاؤں پڑا تھا وہیں پچھلا پاؤں پڑے۔ اُس آدمی کا چلنا جسکے  
پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ اُس کے قدم بالکل برابر برابر اٹھتے ہیں۔  
الْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ - دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مطابق بنانا  
یا اوپر تلے رکھنا\*۔

قرآن کریم میں ہے الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا (۲۱) اس کے  
معنی ہیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے۔ سورۃ انشقاق میں انسان  
کی ارتقائی منازل کے متعلق ہے۔ لَتَرَىٰ كَبِيرًا طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۸۹)۔

”تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے“۔ تم مختلف طبقات میں سے گذرتے ہوئے اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ یا خود انسانیت (Humanity) تہ در تہ اوپر کو اٹھتی چلی جائیگی۔ تاریخ انہی تہوں کے ریکارڈ کا نام ہے (نیز دیکھئے عنوان ر۔ ک۔ ب)

## ط ح ی (و)

طَحْنٰی - یَطْحَنُ - طَحْنًا - کسی چیز کو پھیلانا۔ بچھانا۔ نیز پھیل جانا۔  
بچھ جانا۔ (لازم و متعدی) الطَّاحِیُّ - زمین پر پھیلی ہوئی چیز۔ وہ شے جو ہر چیز کو اپنی کثرت سے ہر کر دے۔ چنانچہ مَطْحَنَةُ طَاحِیَّةٌ - بڑے پھیلاؤ والے مائیان کو کہتے ہیں۔ اور الْقَمَرُ الطَّاحِیُّ - بلند چاند کو، جس کی روشنی پھیل رہی ہو\*۔ قرآن کریم میں ہے وَالْأَرْضُ رُضْرٌ وَمَا طَحَّهَاتَا (۱۱)۔ زمین اور وہ چیز جس نے اسے پھیلا دیا۔ یعنی وہ مختلف ادوار و مراحل جن سے گذر کر زمین کا آتشیں گولہ رہائش کے قابل ہوا۔

## ط ر ح

طَرَحَ - یَطْرَحُ - طَرَحًا - پھینک دینا۔ دور کر دینا۔ اَلِیْطْرَحُ - پھینکی ہوئی چیز (جسکی کسی کو ضرورت نہ ہو)۔ دَرِیْطَارٌ طَوَّارِحٌ - دور دراز شہر۔ اَلطَّرَحُ - دوری۔ دور کی جگہ۔ قَوْمٌ طَرَوْحٌ - وہ کمان جو تیر کو بہت دور تک پھینکے۔ طَرَفٌ مِیْطَرَحٌ - دور تک دیکھنے والی نگاہ\*\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل کر دو اور اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا (۱۲)۔ یا اسے کسی دور دراز ملک کی طرف نکال دو۔

## ط ر د

اَلطَّرْدُ - کسی کو حقیر سمجھ کر دور کر دینا۔ نکال دینا۔ ہٹا دینا۔ طَرْدٌ نَتَّةٌ - مینے اسے نکال دیا۔ اَلطَّرْدُ یُدَّةٌ - وہ اونٹ جنہیں کوئی حملہ کر کے ہٹا لے جائے۔ یا چترائے ہوئے اونٹ۔ وہ شکار وغیرہ جس کا تعاقب کیا جائے۔ اَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ - بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا۔ اَسْتَطْرَدَ لَہُ - وہ پیچھے اس لئے ہٹا کہ فریق مخالف پر پھر سے حملہ کرے لیکن ظاہر ایسا کیا گویا وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے\*\*\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ نصاریٰ کی اصطلاح میں مذہب کی بنا پر کسی کو سزا دینے کو اَلطَّرْدُ کہتے ہیں\*\*\*\*۔

\* تاج نیز کتاب الاشتقاق - \*\* تاج و محیط و راغب - \*\*\* تاج و راغب - \*\*\*\* محیط۔



قرآن کریم میں ہے - وَلَا تَنْظُرُوا لِلَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ<sup>(۱)</sup> جو لوگ اپنے نشوونما دینے والے کو پکارتے ہیں انہیں حقیر و ذلیل سمجھ کر اپنے سے دور نہ رکھو۔ انہی کے متعلق حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوا یا گیا کہ وَمَا أَنَا بِطَارِدٍ الْمُتْمُؤِنِينَ<sup>(۲)</sup>۔ میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نہیں نکالوں گا۔

غیر قرآنی نظام حیات میں قُرب و بُعد کا معیار، دولت اور وجاہت ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں قُرب و یگانگت کا معیار قلب و نگاہ کی ہم آہنگی (آئیڈیالوجی کا اشتراک) ہے۔ اس میں امیر اور غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ یہی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی۔ وہ کہتے کہ کیا ہم اس نظام میں آکر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھیں جنہیں ہم اپنے معاشرہ میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں؟ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ آپؐ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے الگ کر دیجئے، پھر ہم آئینگے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہاں معیار ہی کچھ اور ہے۔ میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو حقیر سمجھ کر الگ نہیں کر سکتا جن کے دل متاع ایمان سے بھرپور ہیں۔ اس نظام میں اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہاں زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین، خلوص اور حسن عمل سب سے زیادہ گراں بہا متاع ہیں۔

## ط ر ف

الطَّرْفُ\* - آنکھ - نگاہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا کنارہ اور (۲) کسی عضو کا حرکت کرنا۔ دراصل یہ آنکھ جھپکنے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ الطَّرْفُ\* در حقیقت ہلکیں جھپکنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے دیکھنے کو بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے\*۔ سورۃ النمل میں ہے - قَبِّلْ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ<sup>(۱)</sup>۔ تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے - یعنی بہت جلد - سورہ شوریٰ میں ہے يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ<sup>(۲)</sup>۔ کنکھیوں سے دیکھنا۔ الطَّرْفُ\* - ہر چیز کا وہ سرا جہاں وہ ختم ہو جاتی ہو۔ آخری کنارہ\*۔ قرآن کریم میں طَرْفِ النَّهَارِ<sup>(۳)</sup> اور اطْرَافِ النَّهَارِ<sup>(۴)</sup> آیا ہے۔

اطْرَافُ الْأَرْضِ\* - ممالک کے سرشار اور اشراف\*\*۔ الطَّرْفُ\* - شریف آدمی۔ عمدہ نسل کا گھوڑا۔ اعلیٰ نسب کا انسان۔ سردار شریف\*۔

سورہ رعد میں ہے - اَوَلَمْ يَرَوْا اَنْتَا نَتَّبِعِي الْاَلَا رُضَ نَنْتَقِصُّهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (۱۳۱) - کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح (آہستہ آہستہ) زمین (معاشی وسائل - رزق کے سرچشموں) کو ان بڑے بڑے لوگوں کے پاس سے کم کرتے جارہے ہیں جو انہیں اپنے قبضے میں لئے بیٹھے ہیں - قرآن کریم نے تیرہ سو برس ہوئے جب یہ بتا دیا تھا کہ دنیا کا وہ معاشی نظام جس میں رزق کے سرچشمے بڑے بڑے لوگوں کے قبضہ میں رہتے ہیں باقی نہیں رہے گا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی جائیں گی اور اس طرح کم ہوتی ہوتی ایک دن ان کی ذاتی ملکیت سے نکل کر معاشرہ کی تحویل میں چلی جائیں گی - اور قرآنی معاشرہ ان سے حاصل شدہ رزق کو زبوت عامہ کیلئے صرف کریگا۔ (۲۱/۳۳) میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے -

نیز طَرَف\* کے معنی گروہ اور جماعت کے بھی ہیں (قاموس)۔ نیز کسی چیز کا ایک حصہ (اقرب الموارد)۔ الطَّرَف\*۔ منتخب چیز کو بھی کہتے ہیں\*۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے - طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۱/۱۳۶) - ان کا ایک حصہ - یا ایک گروہ - نیز اس کے معنی کفار کے بڑے بڑے لیڈر اور منتخب افراد بھی ہو سکتے ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے)۔

## ط ر ق

الطَّرْقُ\* - کے اصل معنی مارنے کے ہیں - ہتھوڑے سے مارنا - چٹاخ سے مارنا - الطَّرْقُ\* - کاہن کا اپنی کھانت کے لئے کنکریاں مارنا - اَلْمِطْرَقُ\*۔ اَلْمِطْرَقَةُ\*۔ وہ لکڑی جس سے اون کو مار مار کر دھنا جائے۔ نیز ہتھوڑا۔ اَلطَّرْقُ\*۔ اَلطَّرْقُوقُ\*۔ رات کو آنا - اَلطَّارِقُ\*۔ رات کو آنے والا - اسے طَارِقُ\* اس لئے کہتے ہیں کہ اسے بالخصوص دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے - راغب نے کہا ہے کہ طَارِقُ\* راستہ چلنے والے کو کہتے ہیں، بالخصوص اس مسافر کو جو رات کو آئے۔ ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ\* کہتے ہیں کیونکہ وہ رات میں آتا ہے\*۔ قرآن کریم میں ہے وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (۸۱/۱) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے چار بنیادی معنی ہیں (۱) شام کو آنا - (۲) مارنا - (۳) کسی چیز کا ڈھیلا ہونا - اور (۴) کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ سی دینا -

الطَّرْقَةُ\* - کسی چیز کی طرف پہنچنے کا راستہ - طریقہ - عادت - چلن - نیز اَلطَّرِيقُ\* - اَلطَّرِيقَةُ\* جسکی جمع اَلطَّرِائِقُ\* آئیگی - سورہ طہ میں

ہے فَمَا ضَرِبَ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰)۔ پھر تو انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے جا۔ یہاں طریق کے معنی راستہ ہیں۔ نیز اس کے معنی قوم کے رؤساء اور معزز لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ بنیں۔ هُوَ لَا عِطْرَ يُفَتَّةٌ قَوْمٌ مِثْلُهُمْ وَطَرَّائِقٌ قَوْمٌ مِثْلُهُمْ۔ یہ قوم کے اشراف ہیں۔ مِطْرَاقُ الشَّيْثِيِّ۔ چیز کا مثل اور نمونہ \*۔ سورۃ طہ میں ہے کہ سردارانِ قوم فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے متعلق کہا کہ يَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَى (۲۱)۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلک و مذہب کو جو بہترین ہے ختم کر دیں۔ یا تمہاری قوم کے بہترین رؤساء و اشراف کو ختم کر دیں۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے امْثَلُهُمْ طَرِيقَةً (۲۲)۔ بہترین طریقے پر چلنے والا۔ سورہ جن میں ہے لَوْ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ (۲۳)۔ اگر وہ (صحیح) راستے پر قائم رہتے۔ ذرا پہلے ہے كُنَّا طَرَائِقَ قِدَادًا (۲۴)۔ ہم متفرق راستوں پر تھے۔ مختلف مسلک رکھتے تھے۔

الطَّرِيقَةُ۔ وہ چیز جو ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو۔ اَلْمَطَارِيقُ اَنْ اَوْنُوهَا كَوْنُهَا فِي اَوْنٍ اَوْ فِي اَوْنٍ اَوْ فِي اَوْنٍ۔ اونیٹ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہوں۔ اَطْرَقَتِ الْاَرَبِلُ۔ اونیٹ ایک دوسرے کے پیچھے چلے۔ اَطْرَقَتِ الْاَرْضُ۔ زمین میں مٹی کے اوپر مٹی چڑھ گئی۔ اَلِطْرَاقُ۔ جوڑنے کا پر تلہ جو ایک کے اوپر دوسرا رکھ کر سی لیا جائے \*۔ قرآنِ کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (۲۵)۔ یہاں طَرَائِقُ کے معنی اوپر تلے مختلف طبقات بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اجرامِ فلکی جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ یا وہ اجرامِ سماوی جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہیں۔

## ط ر ی (و)

الطَّرِيَّۃُ۔ نیا، نرم اور تروتازہ۔ طَرِيَّ اللَّحْمُ وَطَرَّ وَطَرَّ اَوْۃٌ۔ گوشت کا نرم اور تروتازہ ہونا \*\*۔ قرآنِ کریم میں سمندر کے متعلق ہے کہ اس میں سے لَحْمًا طَرِيًّا (۲۶) حاصل ہوتا ہے۔ تروتازہ گوشت یعنی سچھلی وغیرہ۔

## ط ع م

الطَّعَامُ۔ اہل عرب جب اسے مطلقاً بولتے ہیں تو اس سے مراد گیہوں یا کھجور ہوتی ہے۔ ورنہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کھائی جائے اور جس

سے انسان کے جسم کی پرورش ہو سکے۔ اَلطَّعْمَةُ - کھانے کی چیز - رزق - ذریعہ معاش - طَعْمُ الشَّيْءِ - چیز کا مزہ - اس لئے طَعِيمٌ اور تَطْعَمٌ کے معنی چکھنا بھی ہوتے ہیں \* - نیز طَعِيمٌ کے معنی ہیں اس نے پیٹ بھرا - طَاعِيمٌ کے معنی ہیں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو - نیز مستغنی \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں -

نیز اَلطَّعْمُ - قدرت اور اختیار کو بھی کہتے ہیں - طَعِيمٌ عَتِيہ - وہ امیر قادر ہوا \* - قرآن کریم میں طَعَامٌ (۲۱) کھانے کی چیز کے لئے آیا ہے - اور (۲۹) میں پینے یا چکھنے کے معنوں میں - اَطْعَمَ (۳۱) اس نے کھانا کھلایا - اِسْتَطْعَمَ (۱۸) اس نے کھانا مانگا -

اس کے عمومی معنی ہر قسم کے سامان پرورش کے ہیں - وَلَا يَتَحَضَّ عَلَى طَعَامِ الْمَيْسَكِيْنَ (۱۳۱) کے معنی صرف روٹیاں کھلانے کے نہیں - اس کے معنی ہیں ان لوگوں کی پرورش کا سامان بہم پہنچانا یا ضروریات سے مستغنی کر دینا جو نقل و حرکت سے معذور ہو جائیں یا جن کی زندگی کی گاڑی رک جائے -

سورة مائدہ میں ہے کہ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ (۹۶) - اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ پانی کے وہ جانور جن کا تم شکار کرو یا وہ جنہیں پانی از خود اچھال کر باہر پھینک دے، حلال ہیں - (ابن جریر) صاحب البستان نے بھی یہی لکھا ہے - تاج نے کہا ہے کہ جس جگہ سے سمندر کا پانی ہٹ جائے، وہاں جو کچھ رہ جائے اور بغیر شکار کئے مل جائے وہ طَعَامُ الْبَحْرِ ہے - لسان العرب میں ہے کہ طعام البحر ہے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنکی زندگی کا دار و مدار سمندر پر ہو -

## ط ع ن

طَعْنَهُ بِالرَّمْحِ يَطْعَنُ - اس کے نیزہ مارا، چبھو دیا - گھونپ دیا \* - طَعَنَ فَيْئَهُ - کسی میں عیب نکالنا - طنز کرنا \* - طَعْنًا فِي الدِّينِ (۲۶) - دین میں عیب نکالتے ہوئے - طعن کرتے ہوئے - طنز کرتے ہوئے -

## ط غ ی (و)

طَغَى - حد اور پیمانے سے باہر ہو جانے کو کہتے ہیں - اسی لئے دریا وغیرہ کے پانی کا بڑھکر مقررہ اندازہ سے زیادہ بلند ہو جانے یا ساحل سے باہر آ جانے کو طَغْيَانٌ کہا جاتا ہے - اَطْغَى - اسے حد سے متجاوز اور حدود شکن

بنایا۔ اسے طغیان و سرکشی پر ابھارا۔ الطاغیہ۔ حد سے متجاوز اور قانون شکن آدمی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع الطاغیون اور الطاغیہ۔ طغیۃ۔ اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ طاغیۃ۔ جبار و متکبر اور احمق و سخت گیر، نیز معاند انسان کو کہتے ہیں۔ بجلی کی شدید کڑک اور مہیب طوفان کو بھی۔ طغوی کے معنی سرکشی اور حدود شکنی کے ہیں\*۔ یہیں سے لفظ طاغوت ہے جو (صاحب مفردات کے نزدیک) ہر حدود شکن، نیز اللہ کے سوا ہر باطل معبود کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نیز اس کے لئے جو کسی کو سیدھی راہ سے بہکا کر غلط راستے پر لگا دے\*\*۔ جوہری کے نزدیک سرکشوں کے ہر سرغنہ کو طاغوت کہا جاتا ہے\*۔ زجاج نے کہا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی اطاعت اختیار کی جائے وہ طاغوت ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی طاقت\*۔

قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے اللہ، طغی (۲۴)۔ یعنی وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ فی طغیانہم یعمہون (۲۵) میں طغیان کے معنی سرکشی ہیں۔ اور (۲۶) میں لیطاغیہن سرکشوں کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ کے مقابلہ میں الطاغوت کا لفظ آیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون اور نظام، ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے۔ فَمَنْ یَسْکُفِّرْ بِالطَّاغُوتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (۲۷) میں یہ مفہوم واضح ہے۔ یعنی جو خدا پر ایمان لائے اور ہر غیر خدائی قوت (نظام - قانون) سے انکار کر دے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے یہی معنی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ اُعْبُدُوا اللَّهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۲۸) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز (۲۹) میں ہے الَّذِينَ آمَنُوا بِقَاتِلُونِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِقَاتِلُونِ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ۔ یہاں سبیل اللہ اور سبیل الطاغوت نے بتا دیا کہ طاغوت کے معنی ہر غیر خدائی اقتدار و نظام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو سبیل الطاغوت (غیر خدائی نظام کی خاطر) جنگ کرتے ہیں، اُولِیَاءَ الشَّیْطَانِ (۳۰) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ طاغوت اور شیطان مرادف المعنی ہیں۔ اس کی تشریح میں، یُسْرَ یُسْذَوْنِ اَنْ یَسْجَاکُمْوْا اِلٰی الطَّاغُوتِ (۳۱) ”یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں“، کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ طاغوت یا شیطان محض ذہنی تصورات نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام

وہ حاکم ، وہ عدالتیں ، وہ حکومتیں ، وہ نظام ، جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں ۔ ان کی طرف رجوع کرنا خدا سے انکار اور طاغوت کی عبادت ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ "أُولَئِكَ الشَّقِیُّنَ" (یعنی غیر خدائی اقتدار کے رفقاء کار) ہیں ۔

سورة حاقہ میں ہے لَمَّا طَغَى الْمَاءُ (۱۱) جب سیلاب آگیا ۔ (۱۲) میں الطَّاغِیَّةُ بجلی کی شدید کڑک کے لئے آیا ہے جس سے قوم ثمود کی ہلاکت ہوئی تھی۔ لیکن یہ عذاب خود ان کی سرکشی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ سورة شمس میں ان کے متعلق ہے ۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا (۱۱) ۔ ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر حق کی تکذیب کی ۔ سورة النجم میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (۵۳) ۔ اس کی آنکھ نہ تو صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹی اور نہ ہی اپنی حد سے بڑھی ۔ یعنی نبی بذریعہ وحی ، حقیقت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتا ہے لیکن اسی حد تک جس حد تک خدا اسے لے جاتا ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں نبی کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وحی کا سرچشمہ سرحدِ ادراک سے ماوراء ہوتا ہے ۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں وہ محدود ہوتا ہے ۔ خدا نبی کو بھی اتنا ہی علم دیتا ہے جتنا علم دیا جانا مقصود ہو ۔ نبی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔

## ط ف ا

طَفِیَّتِ النَّارُ ۔ وَاَنْطَفَاَتْ\* ۔ آگ کا شعلہ بیٹھ گیا اور وہ سرد ہو گئی ۔ اَطْفَا النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بجھا دیا ۔ اَطْفَا نَارَ الْحَرَبِ ۔ اس نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا\* ۔ قرآن کریم میں ہے كُتِّمْنَا وَاقْدُوا نَارًا لِلْحَرَبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵۶) ۔ ”جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اسے بجھا دیتا ہے،، ۔ استعارۃً اَطْفَا النَّفِیْتَةَ فتنہ فرو کرنے کو کہتے ہیں\*\* ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جب آگ کے شعلے اٹھنا بند ہو جائیں مگر اس کے انگارے روشن ہوں تو اس آگ کو خامدۃ\* کہتے ہیں ۔ لیکن جب آگ کے شعلے ساکن ہو جائیں اور اس کے انگارے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں تو اسے هامدۃ\* اور طافیئۃ\* کہتے ہیں\* ۔

راغب نے کہا ہے کہ یُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ (۹۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اور یُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ (۶۱) کے معنی یہ ہیں کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خدا کے نور کو بجھا سکیں \*۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا (مکمل) کر کے رہے گا اور یہ اس طرح ہوگا کہ اس کا بھیجا ہوا نظام، باقی تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدُّنْيَا كُلِّهَا (۶۱)۔

## ط ف ف

الطَّفِيفُ - تھوڑی چیز - نامکمل و ناقص چیز - الطَّفِيفَةُ - برتن کے بھرنے میں جسقدر کمی رہ جائے - طِفَّ النَّاقَةِ - يَطْفِئُهَا - اس نے اونٹنی کے پاؤں باندھ دئے - أَطْفِئِ النَّاقَةَ - اونٹنی نے نا تمام بچہ دیا - طَفَّفَ الْمُعَاوِيَةَ - اس نے پیمانہ کو پورا نہیں بھرا - اس میں کمی کی \*\*۔

قرآن کریم میں ہے - وَيَلْ لِّلْمُطَفِّفِينَ (۸۳) ”مطففین“ کے لئے تباہی ہے - اور اس سے اگلی دو آیتوں میں خود ہی اسکی تشریح کر دی کہ مطففین وہ ہیں کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ کر لیتے ہیں، اور جب دیتے ہیں تو ناپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں (۸۳)۔ قرآن کریم نے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتایا ہے (وَيَلْ) - یہ اس معاشرہ کا ذکر ہے جس میں نظام زندگی کا یہ انداز ہو کہ سرمایہ دار اور صاحب اقتدار طبقہ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیں بلکہ ان کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں - نظام سرمایہ داری میں کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا ہی نہیں جاتا۔ اگر پورا معاوضہ دیدیا جائے تو سرمایہ دار کو کیا ملے؟ وہ کام کرنے والوں کو کم از کم دیتا ہے اور خود زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے - اسی سے سرمایہ داری قائم رہتی ہے۔ قرآن کریم اسے تَطْفِيفٌ کہتا ہے اور اس نظام کا انجام تباہی اور بربادی بتاتا ہے - پھر اس لفظ کے معنی (اونٹنی کے پاؤں باندھنے) میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس سے کام کرنے والوں کی صلاحیتیں زنجیروں میں جکڑی رہتی ہیں اور کبھی بھی اپنی حقیقی جولا نگاہ کی اتمہائی وسعت تک نہیں پہنچنے پاتیں - وہ سمٹی، سکڑی، بندھی اور ناتمام رہ جاتی ہیں - لہذا تَطْفِيفٌ کے معنی صرف معاشی ناہمواریاں ہی نہیں بلکہ اس میں انسان کے احترام اور عزت میں کمی کرنا بھی داخل ہے - جس انداز اور طریق سے بھی شرف

انسانیت میں کمی واقع ہو جائے وہ تَطْفِيفٌ ہے۔ جس معاشرہ میں تکریم آدمیت اور احترام انسانیت میں کمی ہو (یعنی انسان کا پورا پورا احترام بہ حیثیت انسان نہ کیا جائے) وہ مطففین کا معاشرہ ہے جس کا انجام تباہی ہے۔

## ط ف ق

طَفِيقٌ يَفْعَلُ كَذَا۔ وہ ایسا کرنے لگا۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کام کو کرنا شروع کر دے اور پھر اس میں مسلسل لگا رہے۔ طَفِيقُ الْمَوْضِعِ۔ وہ اس جگہ جم کر رہا اور وہاں سے نہ ہٹا\*۔  
قرآن کریم میں ہے وَطَفِقْنَا بِتَخْصِيفُنْ ..... (۴۴)۔ وہ لگے ایسا کرنے۔

## ط ف ل

الطِّفْلُ۔ ہر نرم اور نازک چیز۔ طِفْلٌ۔ طِفَالَةٌ۔ طِفْوَ لَةٌ۔ نرم و نازک ہونا۔ الطِّفْلُ۔ ہر چھوٹی چیز۔ بچہ۔ جمع اَطْفَالٌ (۲۶)۔ (طِفْلٌ خود بھی جمع کیلئے آتا ہے) راغب نے کہا ہے کہ بچہ کو طِفْلٌ اس وقت تک کہتے ہیں جب تک کہ وہ نرم و نازک ہو\*\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ ثُمَّ نَخْرِجُكُمْ طِفْلًا (۲۲)۔ پھر تمہیں ایک بچے کی حیثیت سے پیدا کرتے ہیں۔

## ط ل ب

الطَّلَبُ۔ کسی چیز کے حصول کی خواہش، اس طرح کہ اس کے حاصل کرنے میں کوشش کرنی پڑے\*\*\*۔ یا کسی چیز کے پانے کی تلاش اور جستجو\*\*\*\*۔ کسی چیز کا متلاشی ہونا اور اسے پا لینا۔ طَلَبَ الْيَتِيمَ۔ اس نے اس سے مانگا۔ كَلَامٌ مَطْلَبٌ۔ اس گھاس کو کہتے ہیں جو پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لئے تکلیف اٹھانی پڑے۔ اُمُّ طَيْلُبَةَ۔ عقاب کو کہتے ہیں۔ اس میں تلاش اور دوری دونوں آجائے ہیں\*۔

سورۃ کہف میں ہے۔ فَلَمَن تَسْتَطِيعُ لَهُ طَلَبًا (۱۸)۔ یہاں طلب کے معنی تلاش کے بعد حاصل کرنے کے ہیں۔ سورہ حج میں الطَّلِبُ وَالْمَطْلُوبُ (۳۱) آیا ہے۔ طلب کرنے والا اور جسے طلب کیا جائے۔

\*تاج و محیط۔ \*\*تاج و راغب۔ نیز ابن فارس۔ \*\*\*محیط۔ \*\*\*\*راغب۔



## ط ل ح

الطَّلَحُ\*۔ ابن شعیل نے کہا ہے کہ یہ ایک لمبا درخت ہوتا ہے جس کے سائے میں لوگ بیٹھتے ہیں۔ اس پر پتے تھوڑے اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں۔ بیول کے درخت جو اونٹوں کے چارے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ابواسحق نے کہا ہے کہ اس سے مراد کیلے کا درخت ہے۔ نیز طَّلَحُ بمعنی طَلَعُ بھی آتا ہے (دیکھئے ط۔ ل۔ ع)۔ رَجُلٌ طَالِحٌ\*۔ خراب آدمی کو کہتے ہیں جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ یہ صَالِحُ کی ضد ہے۔ اور بَعِیْرٌ طَالِحٌ\*۔ تھکے ماندہ لاغر اونٹ کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسرے معانی کے لحاظ سے الطَّلَحُ\*۔ نعمت کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا درخت اور (۲) کمزوری اور لاغری کے ہیں۔

قرآن کریم میں جنت کے ذکر میں ہے طَّلَحٍ مَنضُودٍ (۵۶/۲۹)۔ تہ بہ تہ کیلے یا ترتیب سے جمائے ہوئے کیلوں کے درخت۔

## ط ل ع

طَلَعَ طُلُوعًا\*۔ نکلا۔ ظاہر ہونا (سورج وغیرہ کا)\*۔ (۲۳۰/۲)۔ مَطْلَعٌ اور مَطْلِعٌ\*۔ طلوع ہونے کی جگہ۔ (۱۸/۱)۔ یا طلوع ہونے کا وقت۔ یہ مصدر بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی طلوع ہونا، اور ظاہر ہونا بھی ہیں۔ سورۃ قدر میں اس کے معنی طلوع کے وقت کے ہیں (۹۷/۵)۔ طَلَعَ الْجَبَلُ\*۔ وہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اَطْلَعَ عَلٰی لَا مَرٍّ کے معنی ہیں وہ کسی معاملہ سے واقف و باخبر ہوا۔ چنانچہ اصمعی نے کہا ہے کہ کبھی مَطْلَعٌ اُس سیڑھی کو کہتے ہیں جس پر نیچے سے اوپر کی طرف چڑھا جائے\*\*\*۔ اَطْلَعَ عَلَیْہِ کے معنی ہیں وہ اس کے اوپر پہنچا اور وہاں سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا، اور مَطْلَعٌ اس طرح جھانکنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ (۵۳-۵۵/۳۷)۔

فراء نے کہا ہے کہ اَطْلَاعٌ اور بَلُوعٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی کسی تک پہنچنا۔ (۲۸/۲۸)۔ تَطْلِعُ عَلٰی لَا فَنِیدَہِ (۱۰۴/۲) جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اَطْلَعَ عَلٰی بَطَانِیْہِ۔ اس کی اندرونی حالت سے واقف ہو گیا\*۔ اَطْلُوعٌ\*۔ بلندی اور سرفرازی کے ساتھ نمودار ہونا\*۔ نَخْلَۃٌ مَطْلِیْعَۃٌ\*۔ وہ کھجور کا درخت جو اپنے ارد گرد کے کھجوروں کے درختوں سے اونچا ہو۔\*\*۔ اَطْلَاعٌ\*۔ وہ تیر جو نشانہ سے ہٹ کر اس کے اوپر کی جانب جا کر لگے\*۔ اَطْلَعَتْ عَلٰی لَا مَرٍّ۔ اسے معاملہ سے باخبر کیا (۱۷۸/۳)۔

الْقَطَائِعُ - کھجور کے درخت پر غلاف جیسی ایک چیز نکلتی ہے جس کے اندر اس کا خشوہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک سرانہو کیلا ہوتا ہے \*۔  
(۲۱/۵) - (۳۶/۱۳) - (۲۱/۱۶۸)

## ط ل ق

طَلَّقَ - آزاد ہو گیا۔ طَلَّقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِيهَا - عورت اپنے شوہر سے جدا ہو گئی۔ أَطْلَقَ الْأَسِيرَ - قیدی کو رہا کر دیا۔ نَاقَتَهُ طَالِقٌ - بلا نکیل کے اونٹنی۔ الْطَّالِقَةُ - وہ اونٹنی جسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھانے پئے۔ الْطَّلَقُ - ہرن (جو آزاد ہوتا ہے)۔ نیز وہ اونٹنی جو مقید نہ ہو۔ لَيْسَانَ طَلَّقَ - وُطِّلَقَ - تیز چلنے والی زبان۔ مُطْلَقٌ - مُقَيَّدٌ کی ضد ہے \*۔ یعنی جو محدود و مقید نہ ہو۔

سورۃ کہف میں ہے فَانْطَلَقَا (۱۸/۱)۔ وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ وَانْطَلَقَ الْاِمْتَلَا (۳۸/۶) بڑے بڑے سردار (تیزی سے) کہنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے کہا تھا کہ لَا يَنْطَلِقُ لَيْسَانِي (۱۳۱/۲)۔ میری زبان آزادی یا روائی سے نہیں چلیگی۔ (اس لئے کہ انہیں جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا یا کم از کم متمدن دنیا سے دور رہتے ہوئے)۔ اسلئے انہیں خیال تھا کہ وہ فرعون کے دربار میں شاید اس روائی اور طلاق سے گفتگو نہ کر سکیں جس کی وہاں ضرورت تھی)۔

راغب نے طلاق کے بنیادی معنی کسی بندھن سے آزاد کرنا اور نجات دینا بتائے ہیں۔ پھر یہ استعارۃً شوہر کا بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (۴۴/۴)۔ طَلَّقَ کے معنی ہیں طلاق دیدینا۔ (۴۴/۶)۔ مُطْلَقَتُهُ - طلاق دی ہوئی عورت، اسکی جمع مُطْلَقَاتٌ ہے (۴۴/۶)۔

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایسے معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے (دیکھئے عنوان ن۔ ک۔ ح) اس لئے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ناممکن ہو جانے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لئے طریق کار کیا ہے۔ لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد نے جب جی چاہا طلاق۔ طلاق۔ طلاق - کہہ دیا اور نکاح ٹوٹ گیا۔ اور اس کے

بعد اس جوڑے کا باہمی ملاپ نہیں ہو سکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح (حلالہ) کر کے ایک شب اس سے ہم آغوشی نہ کر لے۔ تو یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

الطَّلَاقُ "مَشرَتن" کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان م۔ ر۔ ر، دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ طلاق کا لفظ اسوقت بولا جائے گا جب میاں بیوی عقد نکاح سے آزاد ہو جائیں۔ طلاق کے ارادے یا اس کے ابتدائی مراحل کو طلاق نہیں کہا جائیگا۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لفظ طَّلَاق "ایک تو طَلَّقَ" سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں آزاد ہو جانا۔ اور دوسرے یہ لفظ طَلَّقَ سے اسم ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی آزاد کرانا ہونگے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد نکاح کا فسخ کرنا میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں ہے۔ اس کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اور طلاق کا فیصلہ عدالت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ طَّلَاق "کے معنی آزاد کرانا بالکل صحیح بیٹھتے ہیں۔

## ط ل ل

الطَّلُّ "بہت ہلکی سی بارش۔ پھوہار۔ بلکہ اوس جو کھلی فضا میں پڑتی ہے"۔ (۲۱۵)۔ الطَّلَاكَةُ "سرور۔ خوشی۔ حسن و جمال۔ تروتازگی۔ زندگی کی خوشگواہی"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) تروتازگی اور نرسی و نزاکت۔ (۲) جھانکنا اور (۳) کسی چیز کو باطل کر دینا ہیں۔ اور الطَّلُّ "ہلکی سی بارش" کہتے ہیں کیونکہ اس سے زمین کو زینت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔

## ط م ث

الطَّمَعُ "چھونا۔ ہذا جَمَعْلٌ مَّاطَمَعْتَهُ حَبْلٌ قَطَطٌ"۔ یہ اونٹ ہے جسے رسی نے قطعاً نہیں چھوا۔ طَمَعَتِ الْمَرْأَةُ "اس نے اس عورت کی بکارت زائل کر دی۔ بعض نے اس کے معنی عام جماع کرنے کے لئے ہیں۔ (عورت کو چھونے سے کنایہ بھی ہوتا ہے)۔ الطَّمَعُ "تہمت، گندگی، اور فساد کو بھی کہتے ہیں"۔

\*تاج۔ \*\*تاج و محیط و راغب۔

جنتی معاشرہ کی عورتوں کی عفت و عصمت کے ضمن میں کہا ہے کہ  
 اَمْ يَطْمِئِنُّنَّ اَنْسٌ قَبْلَ اَنْ يَكُونَ لَهُمْ وَلًا جَبَانٌ (۵۶)۔ اس سے قبل کسی  
 انسان نے (جن و انس میں سے کسی نے) انہیں چھوا نہیں ہوگا۔ کیسا  
 فردوس آفریں ہے یہ اطمینان کہ جس لڑکی سے میں شادی کر رہا ہوں اسے  
 اس سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔

## ط م س

طَمَسَ - مٹ گیا۔ اس کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ طَمَسَتْهُ طَمَسًا۔  
 مینے اسے مٹا دیا۔ اس کا نام و نشان تک ختم کسر دیا (لازم و متعدی) \*۔  
 سورہ نساء میں ہے قَبْلَ اَنْ نَطْمِيسَ وَجُوهًا (۴۴)۔ قبل اس کے کہ ہم  
 ان کے بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔ انہیں تباہ و برباد  
 کر دیں \*\*۔ سورہ یونس میں ہے۔ رَبَّنَا اَطْمِيسْ عَلٰی اَمْوَالِنَا (۱۰۸)۔  
 ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کر دے۔

طَمِيسٌ - مَطْمُوسٌ - اندھا، جسے کچھ نظر نہ آئے \*۔ سورہ قمر میں  
 قوم لوط سے متعلق ہے۔ فَطَمَسْنَا اَعْيُنَهُمْ (۵۴)۔ سدوم کے آتش  
 فشاں پہاڑوں سے آگ اور گندھک کے دھوئیں کا ایسا طوفان اٹھا کہ اس سے  
 ان کی آنکھیں بیکار ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ شدت جذبات سے اندھا ہو جائے  
 کیطرف بھی اشارہ ہو۔ اس لئے کہ بصیرت کے ختم ہو جانے کے لئے بھی  
 یہ لفظ آتا ہے۔ (دیکھئے ۳۶)۔ سورہ مَرْسَلَتْ میں ہے فَاِذَا النَّجْمُ  
 طَمِيسَتْ (۶۶)۔ جب ستاروں کی روشنی جاتی رہیگی۔

## ط م ع

طَمَعَ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں نفس انسانی کا  
 کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان اور جھکاؤ \*۔ اس میں حرص اور  
 امید دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی دل  
 میں کسی چیز کی پرزور امید کے ہیں۔ اَلْمَطْمَعُ - وہ چیز جسکی طمع کی جائے۔  
 جس چیز کی طرف نگاہ کھینچ کر چلی جائے \*۔ چنانچہ اس پرندے کو بھی  
 اَلْمَطْمَعُ کہتے ہیں جسے جال کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اسے دیکھ  
 کر دوسرے پرندے جال میں پھنس جائیں \*\*\*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ خَوْف کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳)۔ خَوْف۔ نقصان کے احساس کو کہتے ہیں، اس لئے طَمَعَ نفع کی امید ہے۔ آرزو رکھنے (خواہش کرنے) کے معنوں میں سورۃ معارج میں ہے۔ آيَطْمَعُ كَلٌّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ (۸)۔ کیا ان میں سے ہر شخص اسکی آرزو رکھتا ہے؟ اور توقع رکھنے کے معنوں میں۔ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (۱۵)۔ پھر وہ اس کی توقع بھی رکھتا ہے کہ میں اسے زیادہ کرتا جاؤں!

## ط م م

طَمَّ الْمَاءُ يَطْمُ طَمًا۔ ہانی نے کسی چیز کو ڈھانپ لیا اور اس کے اوپر چھا گیا۔ طَمَّ السَّيْلُ التَّكْيِثَ۔ سیلاب نے کنوئیں کو پاٹ دیا اور برابر کر دیا۔ طَمَّ الْبَيْتُ۔ کنوئیں کو مٹی سے بھر کر برابر کر دیا (ابن قارس)۔ طَمَّ الشَّجَرُ۔ پرندہ درخت کے بالائی حصہ پر جا بیٹھا۔ الطِّيمُ۔ سمندر۔ بکثرت ہانی۔ الطَّامَّةُ ایسی چیخ کی آواز جو ہر شے پر چھا جائے۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کے لئے الطَّامَّةُ الْكُبْرَى (۱۱) آیا ہے۔ یعنی وہ بہت بڑی مصیبت کی گھڑی جو سیلاب کی طرح چھا جائے گی اور سب پر غالب آجائے گی۔ مندرجہ بالا معانی کی رو سے اس حادثہ کو بھی طَامَّةٌ کہا جا سکتا ہے جو اونچ نیچ برابر کر دے۔

## ط م ن (طمان)

الطَّمَنُ۔ ساکن۔ فِيهِ تَطْمَئِنُّ۔ اس میں سکون اور وقار ہے۔ \*\*۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے کہا کہ مجھے بتا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے کہا کہ کیا تیرا اس پر ایمان نہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ”بَلَىٰ“۔ ایمان تو ہے۔ وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي (۲۰)۔ ولے میں اپنا اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔ اس سے (الطَّمَنُ) کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی تسکینِ قلب کی وہ کیفیت جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔ جو علم و فکر، دلائل و برہان، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اطمینانِ قلب کو اکثر اہ کی ضد قرار دیا ہے (۱۶)۔ اَكْثَرَاهُ کے معنی ہیں کسی بات کو زبردستی منوانا۔ (دیکھئے عنوان ک۔ ر۔ م) لہذا اطمینانِ قلب کے معنی ہونے کسی بات کو دل کی پوری رضامندی سے ماننا۔ اسی سورۃ (النحل) میں ذرا

آگے چل کر آمنؑ اور اطمینانؑ۔ کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ (۱۱۶) ، اگرچہ اطمینان کے لئے آمنؑ (بے خوفی) کو ضروری شرط قرار دیا گیا ہے (۱۳۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ملک میں امن ہو تو قلوب کو بھی اطمینان ہو۔ امن خارجی خطرات سے محفوظ ہونے کا نام ہوگا۔ لیکن (اطمینانؑ) اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی داخلی کشمکش سے محفوظ ہو، اور یہ چیز فریبِ نفس سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ علم و حقیقت کی بنا پر ہو۔ انسانی ذات (نفس) کی یہی وہ کیفیت ہے جسے ”جنت کی زندگی“ سے تعبیر کیا گیا ہے (۸۹)۔ لیکن اس حقیقت کو ساتھ ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ چیز خلوت گاہوں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوگی۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ ”فَاَدْخُلِيْ“ فی ”عِبَادِیْ“۔ وَاَدْخُلِيْ ”جَنَّتِیْ“ (۲۹۳)۔ جنت میں داخلہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ”خدا کے بندوں“ کے ساتھ شامل ہو۔ اور پھر یہ سب ملکر قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَتَّطَمَّئِنُّ الْقُلُوْبُ“ (۱۳۸)۔ ”اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ صحیح اطمینانِ قلب قوانینِ خداوندی ہی سے نصیب ہو سکتا ہے“۔ (دیکھئے عنوان ذ۔ ک۔ ر) جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اللہ کے ذکر سے مراد، تسبیح پر اللہ۔ اللہ پکارنا یا دل پر ضربیں لگانا، نہیں۔ اس سے مفہوم خدا کے قانون (قرآن) کو ہر وقت سامنے رکھنا ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ رزق کی فراوانی ہوتا ہے۔ (۱۱۶)۔ اگر مقصودِ حیات ہر فرد کا اپنا اپنا اطمینانِ قلب ہو تو دنیا سے خیر و شر کی تمیز ہی اٹھ جائے۔ ایک ڈاکو یا ٹھگ جب کسی کی جان لیکر کالی دیوی کے استھان پر مقررہ نذر چڑھا دیتا ہے، یا برہمن بت کی ہوجا کر لیتا ہے تو اسے ایسا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے جو ایک خدا پرست کے اطمینان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ لہذا مقصدِ زیست اپنا اطمینان نہیں (جو بسا اوقات فریبِ نفس ہوتا ہے)۔ مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں ہر معاملہ عدل و احسان کی رو سے طے ہو اور اس طرح ہر فرد کو صحیح اطمینان میسر آ جائے۔

”مُطْمَئِنِّیْنَ“ (۹۵) اطمینان سے سکونت پذیر ہونے والے۔ اقامت پذیر ہونے والے۔

## ط ہ ر

اَلطَّهَّارَةُؑ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے نجاست کا دور ہو جانا۔ ابن فارس نے اس کے معنی ستھرا پن اور میل کچیل کا زائل ہو جانا بتائے۔

\* تاج ۔

ہیں۔ صاحب تاج نے کہا ہے کہ طہرہ - طہرہ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور طہرہ کے معنی ہیں آبعده - یعنی اسے دور کر دیا۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَمُطَهِّرٌ مِّنَ الذِّمِّ كَفَرُوا (۳۳) - جس کے معنی ہیں خدا تجھے ان لوگوں سے الگ کر دے جو تیری صداقت کا انکار کرتے ہیں۔ یا تیرے خلاف جو اتہام تراشتے ہیں ان سے خدا تجھے بری کر دیگا۔ اسی نہج سے تَطَهَّرٌ کے معنی کسی شے سے نجاست اور آلائش وغیرہ کو دور کر کے اسے پاک اور صاف کرنا ہیں۔ طہیر کے معنی ہیں پاک اور صاف۔ مُطَهَّرٌ میں طہیر سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ طہور اس چیز کو کہتے ہیں جس سے پاکیزگی حاصل کی جائے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ چیز جو خود پاک ہو اور دوسری چیزوں کو پاک کر دے۔ (کیونکہ فَعُول کے وزن میں فاعیل کے مقابلہ میں زیادہبالغہ اور شدت ہوتی ہے) \*۔ چنانچہ قرآن کریم میں بارش کے پانی کو ماء طہوراً (۲۸) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی کشید کردہ (لہذا صاف) ہوتا ہے اور ہر شے کو پاک اور صاف کر دیتا ہے۔ طہر - وہ حالت یا زمانہ جس میں عورت حیض سے پاک ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو جائے تو طہرت کہا جاتا ہے اور جب اس کے بعد غسل کر لے تو تَطَهَّرَتْ کہا جاتا ہے \*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو ہے وَلَا تَقْرَبُوا حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ ..... (۲۲۲) تو اس میں یہی لطیف فرق ہے۔

قرآن کریم میں طہارت کا لفظ صرف جسمانی پاکیزگی کے لئے ہی نہیں استعمال ہوا بلکہ اس میں قلبی اور ذہنی پاکیزگی بھی شامل ہے۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ہے لَمْ يَرْدِ اللَّهُ أَنْ يَطْهِّرْ قُلُوبَهُمْ (۵۱) - یہ پاکیزگی قلب کی شہادت ہے۔ سورہ واقعہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶) - تو اس سے مراد یہی ہے کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے وہی لوگ مس رکھتے ہیں، وہی ان تک پہنچ سکتے ہیں، وہی ان سے باخبر ہو سکتے ہیں \*، جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو۔ جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں۔ جو اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے خالی کر کے اور اپنے دلوں کو تمام ذاتی رجحانات و میلانات سے منزہ رکھ کر اسے سمجھنا

چاہیں۔ اگر ذہن پہلے ہی سے غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ ہے اور دل ذاتی مفاد پرستیوں سے آلودہ، تو پھر قرآن کریم کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔ (دیکھئے عنوان م۔ م۔ م)۔ جو لوگ زندگی کی آلودگیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا احساس رکھتے ہوں انہیں مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے۔ اور قرآن کریم مُتَّقِیْنَ ہی کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ (ہُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۲﴾) اس کی بنیادی شرط ہے۔

رَجُلٌ طَاهِرٌ اِلَیْہِیَابٍ اس شخص کو کہتے ہیں جو نہایت پاکیزہ نفس ہو\*۔ کیونکہ عرب عام طور پر ثِیَاب\* کا لفظ انسانی ذات یا شخصیت کے لئے بولتے ہیں\*۔ اس لئے وَثِیَابُکَ قَطْمِیْرٌ ﴿۲۴﴾ کے معنی ہونگے، اپنی ذات کو تمام ہست خیالات سے بلند کر کے پاکیزگی قلب و نگاہ کا پیکر بناؤ۔ اور اگر ثِیَاب\* کے معنی دعوت کے لئے جمائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اپنی اس انقلابی دعوت کو تمام ایسے لوگوں سے دور رکھو جن کے قلب و دماغ پاکیزہ نہیں۔ اس جماعت میں وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اپنے دل اور دماغ کو تمام غیر خدائی تصورات سے پاک اور صاف رکھیں۔ نیز اس دھوت میں نظری طور پر بھی کوئی غلط تصور شامل نہ ہوئے ہوئے۔ (ثِیَاب\* کے معانی کے لئے ٹ۔ و۔ ب کا عنوان دیکھئے)۔

سورہ احزاب میں رسول اللہ\* کے اہل خانہ کے متعلق ہے وَیَطْمِئِنُّ رُکْمُکُمْ تَطْمِئِنًّا ﴿۳۳﴾۔ خدا تمہیں ہر قسم کے الزامات سے دور رکھے گا اور قلب و نظری پاکیزگی عطا کریگا۔

جنتی معاشرہ کے پاکیزہ سیرت اور تربیت یافتہ ہم نشینوں کو آؤ اَج\* مُطْمِئِنِّۃ ﴿۲۵﴾ کہا گیا ہے۔ اس میں بیویاں بھی شامل ہیں اور دوسرے رفقاء کار بھی۔ (دیکھئے عنوان ز۔ و۔ ج)۔

## ط و د

الطَّوْدُ\*۔ بلند پہاڑ۔ ریت کا اونچا ٹیلہ۔ الطَّاقِدُ\*۔ بوجھل اور جمی ہوئی چیز جو اپنی جگہ پر محکم ہو۔ طَادَ الشَّیْءُ\*۔ وہ چیز ایک جگہ پر جم گئی۔ بِنَاءٌ مُنْطَادٌ\*۔ بلند عمارت\*\*۔

قرآن کریم میں کا لَطَّوْدُ الْعَظِیْمِ ﴿۲۱﴾ ایسا ہے۔ یعنی بڑے ٹودہ (یا ٹیلہ) کی طرح۔



## ط و ر

الطَّوْرُ - سرسبز پہاڑ - اگر پہاڑ سرسبز نہ ہو تو اسے طَوْرٌ نہیں کہتے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے لمبا ہونے اور بڑھنے کے ہیں خواہ وہ زمان سے متعلق ہو یا مکان سے۔ اور پہاڑ کو طَوْرٌ اس کے طول، عرض اور بلندی میں پھیلنے اور بڑھنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الطَّوْرُ - اَيْلَہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جو سَيْنَاء یا سَيْنِیْن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے \*۔ (۲۳ : ۲۵)۔ دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔ اسی (طَوْرٌ) کے دامن میں بنی اسرائیل سے اس دعوت پر ایمان کا عہد لیا گیا تھا (۲۳)۔ (الطَّوْرُ - بار - دفعہ - مرتبہ - طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ - ایک بار کے بعد دوسری بار - دوسری مرتبہ - یا دوسری دفعہ - نیز جو کسی چیز کے بالمقابل یا اس کے برابر ہو - طَوْرٌ بھی اس معنی میں آتا ہے - اَطْوَارٌ - مختلف حدود یا اقسام - مختلف مدارج و احوال یا اندازے \*۔ قرآنِ کریم میں ہے قَدْ خَلَقْنَاكُمْ اَطْوَارًا (۲۱) - خدا نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل میں سے گذار کر انسانی منزل تک پہنچایا ہے - تمہاری تخلیق مختلف احوال و مدارج سے گذر کر ہوئی ہے - یا تمہیں مختلف احوال میں پیدا کیا ہے - طَارِبٌ (يَطْوُرُ) کے معنی قریب ہونا ہیں \*\*۔

## ط و ع

طَاعَ کے معنی ہونے ہیں کسی شے کا وسیع ہو جانا - طَاعَ لَہُ الثَّمَرُ تَعٌ - چراگاہ اس کے لئے وسیع ہو گئی اور وہ جہاں سے اس کا جی چاہا چرسکا \*۔ اس سے ”اطاعت“، کا بنیادی مفہوم سامنے آ جاتا ہے - یعنی دل کی کشاد سے کسی کام کا کرنا - چنانچہ قرآنِ کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں كَرْہًا (۱۱) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا - كَرْہًا کے معنی ہیں کسی کام کو ناگواری اور دل کے جبر سے کرنا - لہذا طَوْعًا کے معنی ہونے کسی کام کو بطیبِ خاطر، دل کی کشاد اور پسندیدگی سے کرنا - اسی لئے اَطَاعَ الشَّيْخُ کے معنی ہوتے ہیں کہجوریں ہک گئیں \*۔ (اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑیگا - وہ ٹوٹنے کے لئے خود ہی آمادہ ہیں) - اَطَاعَ کسی کے حکم کی بطیبِ خاطر تعمیل کرنا - اور طَاوَعَهُ اس کی موافقت کرنا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی کے ساتھ لگنے اور تابعدار ہو جانے کے ہیں -

اِسْتَطَاعَ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کے لئے جن قوتوں، صلاحیتوں اور اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا۔ اگر ان میں سے کوئی چیز ہے اور کوئی نہیں تو اسے صرف ایک حیثیت سے مَسْتَطِيعٌ کہا جائیگا\*۔

سورۃ بقرہ میں ہے - وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا (۲۸۱)۔ اس کے معنی ہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر عمل خیر کرنا۔ اس میں دل کی رضامندی تو بہر حال ہوگی لیکن اس میں اگر تھوڑی سی مشقت بھی اٹھانی پڑے (جو قابل برداشت ہو) تو ایسا عمل خیر بھی کہہ لینا چاہئے (۲۸۲)۔ سورۃ النحل میں غیر خدائی قوتوں کے متعلق ہے لَا يَسْتَطِيعُونَ (۱۱۱)۔ اس کے معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں۔ یعنی کسی کام کو پورا کرنے کے لئے جن قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے يَرْدُّوْكُمْ عَنْ دِرْبِكُمْ اِنْ اَسْتَطَاعُوْا (۲۱۶)۔ اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے تَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ (۲۵)۔ اس کے جذبات نے اسے اس امر پر آمادہ کر لیا، یا راضی کر لیا۔

قرآن کریم میں قوانین خداوندی کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے۔ درحقیقت سارے قرآن کی تعلیم کا منشا ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ اطاعت کے معنی ہم دیکھ چکے ہیں۔ یعنی کسی کام کو دل کی پوری پوری رضامندی، وسعت اور کشادگی سے کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی مستبد حاکم کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ اپنے دل کی مرضی سے خود اختیار کردہ حدود و قیود (Self-imposed Restrictions) کی پابندی ہے۔ (اسی کو اِسْلَامٌ کہتے ہیں)۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت نہ زبردستی کرائی جا سکتی ہے نہ اندھے طور پر کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کتاب (قانون) کے ساتھ حِكْمَتٌ (اسکی علت غائی۔ اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص علی وجہ البصیرت دیکھ لے کہ ان حدود کی پابندی میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں اور اس کے بعد اپنے دل کی پوری رضامندی سے ان پر عمل پیرا ہو جائے۔ یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق قرآن، نظام خداوندی قائم کرانا ہے۔ یعنی اس جماعت کے ہاتھوں جس کے افراد، دل کی پوری کشادگی کے ساتھ، علی وجہ البصیرت، اس نظام کے نتائج سے متفق ہوں اور کامل رضامندی سے اس کے قیام

و استحکام کے لئے کوشاں۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم۔ یعنی ہکسے ہوئے بھل کی طرح خود بخود کسی کی جھولی میں گر پڑنا، نہ کہ اسے کھسوٹ کر حاصل کرنا۔ اس کے مقابل میں تَوَلَّیٰ کا لفظ آیا ہے (۳۱)۔ یعنی منہ موڑ لینا یا گریز کی راہیں نکالنا۔ اصل یہ ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں ذرا سا بھی تردد۔ تامل۔ تذبذب۔ ہچکچاہٹ۔ یا کبیدگی خاطر ہو تو اسے اطاعت نہیں کہہیں گے، کیونکہ اطاعت کی بنیاد میں دل کی رضامندی شامل ہے۔ (۴۵) اطاعت کی جاتی ہے، کرائی نہیں جاتی۔ نا دانستہ یا لغزش سے کسی حکم کی خلاف ورزی اور بات ہے، لیکن جو شخص دل کی رضامندی سے نظام خداوندی (اسلام) میں نہ رہنا چاہے اُسے زبردستی نہیں رکھا جاسکتا۔ نہ ہی کسی کو اس کے اندر زبردستی لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے دین میں اک۔ راہ نہیں (۲۵۶)۔ جو لوگ بطیب خاطر اس نظام کو قبول نہ کریں، وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہیں گے۔ انہیں تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے لیکن اس نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔

سُطَاعٌ (۲۱)۔ جس کی اطاعت کی جائے۔ مَطَّقُوْا ع (۲۹) جو دل کی کشاد سے کسی کام میں لگ جائے۔

سورة مائدہ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے کہا ہَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَائِدَةً (۱۱۲)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کیا خدا ہماری اس عرض کو قبول کر لے گا؟ اس کی تائید میں سورة مؤمن کی یہ آیت لکھی ہے مَا لِلظَّالِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ (۲۸)۔ یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے۔ سورة کہف میں اسطَاع بجائے اسْتَطَاع آیا ہے (۹۷)۔

## طوف

طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں۔ طَافَ۔ اسْتَطَافَ۔ تَطَوَّفَ۔ طَوَّفَ۔ گھومنا۔ چکر لگانا\*۔ کسی چیز کے ارد گرد بکثرت چلنا\*\*۔ اَلْمَطَافُ۔ گھومنے کی جگہ۔ اَلطَّائِفُ۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لئے پہرہ دے۔ (یہ لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن جمع کے لئے بھی آتا ہے)\*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہ معنی لکھے ہیں۔ اَلطَّائِفَةُ۔ کسی چیز کا ڈکڑہ۔ لوگوں کی جماعت جو ہم آہنگی فکر و خیال یا اشتراک مذہب کی بناء پر متحد ہو اور اس سبب سے دوسروں سے ممتاز ہو\*\*۔ ابن فارس نے

لکھا ہے کہ عرب طائفہ کو کسی معین تعداد میں محدود نہیں کرتے تھے۔ نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بہر حال اس سے تھوڑی اور معمولی مقدار ہی مراد لی جاتی ہے۔ اَلطَّوْفُ "اف"۔ ایسا خادم جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے\*\*۔ اَلطَّوْفُ "فان"۔ ہمہ گیر موت، وہ مصیبت یا حادثہ جو قوم کو چاروں طرف سے گھیر لے اور ہر شے پر چھا جائے، مثلاً غرقابی، قتل و غارتگری، بارش جو زور دار ہونے کی وجہ سے بستیوں کو بہا لے جائے۔ نیز رات کی سخت تاریکی\*۔ قرآن کریم میں قوم حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَآخَذَهُمْ الطَّوْفُ "فان" (۲۹) انہیں طوفان نے آپکڑا۔

طَافَ - يَطُوفُ کے معنی رفع حاجت کے لئے جانا بھی ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے يَطُوفُ عَلَيْهِمْ سَبَكًا (۳۵)۔ ان پر دور جام چلایا جائیگا۔ سورہ نور میں ہے طَوَّافُونَ عَلَيْهِكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ (۲۴)۔ وہ تمہارے ارد گرد پھرتے پھرتے رہتے ہیں۔ سورہ القلم میں ہے - فَطَافَ عَلَيْهِمَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ (۱۹) تیسرے رب کی طرف سے ایک آفت ان پر پھر گئی۔ ایک مصیبت طاری ہو گئی۔ ایک حادثہ نے انہیں گھیر لیا۔ سورہ اعراف میں ہے طَافَ مِّنَ الشَّيْطَانِ (۲۶)۔ اس کے معنی ہیں سرکش جذبات کا کوئی خیال جو یونہی گھومتے گھماتے ذہن میں آجائے۔ طَائِفَةٌ۔ گروہ اور جماعت کے معنوں میں (۱۴۶) میں آیا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ خانہ کعبہ طَائِفِيْنَ اور عَاكِفِيْنَ کے لئے مرکزی مقام ہے (۲۵)۔ طَائِفِيْنَ کے معنی ہیں نوع انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ اور عَاكِفِيْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پروئے رکھے۔ ان کے معاملات کو درست رکھے۔ دنیا کے نظم و نسق میں درستگی اور آراستگی پیدا کرے (دیکھئے عنوان ع۔ ک۔ ف)۔ قرآن کریم نے ملت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے۔ اس مقصد کے لئے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (۲۳)۔ لہذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت، طَائِفِيْنَ کی جماعت ہے۔ یعنی نوع انسانی کی چوکیداری کرنے والی۔ حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے

خدا سے پوچھا کہ ان کی اولاد میں بھی خانہ کعبہ کی تولیت (اور نوع انسانی کی امامت) کا منصب جاری رہیگا تو ان سے کہہ دیا کہ لَا يَنْتَالُ عَرْشُهُ <sup>(۱۲۲)</sup> الطَّالِمِينَ - جو لوگ حقوق انسانیت میں کمی کریں گے وہ اس منصب کے اہل نہیں رہیں گے۔

یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ کے اجتماعات میں رکوع و سجود اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہم قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کسی کے آئین و قانون کے سامنے نہیں جھکتے، اسی طرح حج کے ان مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمارا یہ اجتماع، نوع انسان کی حفاظت کے لئے نظام خداوندی کا عملی نشان ہے۔

## طوق

الطَّوْقُ - وہ حلقہ جسے گردن میں ڈال دیا جائے۔ ہر وہ چیز جو کسی کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ راغب نے کہا ہے کہ دراصل طوق اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن میں بنا ہوتا ہے، جیسے قمری کی گردن کا حلقہ۔ یا مصنوعی حلقہ، جیسے موئے چاندی کا گلے میں ڈالا جانے والا حلقہ ہوتا ہے۔ تَطَوَّقَ - طوق پہن لینا \*۔ طَوَّقَ گردن میں طوق پہنانا۔ (۱۳۹)

الطَّاقَةُ - صاحب تاج العروس، صاحب محیط، راغب اور اقرب الموارد اس پر متفق ہیں کہ الطَّاقَةُ اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے۔ یعنی وہ کام اس پر اتنا شاق گذرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔ اسی سے انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آیا ہے کہ لَا تَحْمِلُنَا مَالًا طَاقَةً لَّنَابِه (۲۸۶)۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو۔ اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کرسکیں۔ جن کا کرنا ہمارے لئے دشوار ہو \*\*۔

روزوں کے احکام کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔ وَعَلَى الَّذِينَ يَطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (۲۸۳)۔ اس کے عام طور پر

معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کا فدیہ دیدیں۔ یہ معنی بالبداهت غلط ہیں۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے یا جو فدیہ دے سکتے ہیں روزہ سے مستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کمن پر فرض ہے؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں؟

اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دیدیں۔ اس لئے کہ یُرِّدُ اللّٰهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُسْرِ يَدُ بِيَكُمْ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵)۔ خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، مشقتیں نہیں چاہتا۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب السنار نے لکھا ہے کہ عرب اَطَاقَ الشَّيْءُ اسوقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اسکی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا تحمل ہونا پڑے۔ الَّذِینَ يَطِيقُونَہ سے مراد ہیں ضعیف۔ بوڑھے۔ وہ اپنا ہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاسوں پر لگایا جائے۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں\*۔ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لِلّٰهِ (۲/۱۸۴)۔ جو شخص قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اس میں يَطِيقُونَ اور تَطَوَّعَ کا فرق قابل غور ہے۔ يَطِيقُونَ سے مراد سخت مشقت ہے اور تطوع سے مراد ایسی اطاعت جس میں ذرا سی تکلیف کا پہلو ہو، (دیکھئے عنوان ط۔ و۔ ع)

## ط و ل

طَالَ بِطَوَّلٍ طَوَّلًا۔ دراز ہونا۔ لمبا ہونا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الطَوَّلُ رسی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہے۔ أَفْطَالَ عَلَيَّكُمْ الْعَهْدُ (۲/۸۶)۔ وہ عہد جو تم نے مجھ سے کیا تھا، کیا اس پر بہت لمبا عرصہ گذر گیا جو تم نے سمجھ لیا کہ اب اس پر قائم رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ کیا مجھے تم سے گشے ہوئے اتنا لمبا عرصہ گذر گیا تھا؟ یعنی عہد کے معنی زمانہ کے بھی ہو سکتے ہیں

طَوَّلَ \* - وسعت - فراخی - خوش حالی - استطاعت \* - (۲۵) - نیز قوت - طاقت \* - (۲۶) - تَطَاوَلَ - لمبا عرصہ گذر جانا (۲۷) - سورہ بنی اسرائیل میں پہاڑ کی اونچائی کے لئے یہی لفظ طَوَّلَا آیا ہے (۲۸)۔

## ط و ی

طَوَّلَ الصَّحِيفَةَ يَطْوِيْنَهَا طَيًّا - اس نے صحیفہ کو لپیٹ دیا - اِطْوَى - وَ اَنْطَوَى - وہ لپیٹ گیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - مجازاً کہتے ہیں طَوَّلَ عَتَبِيَّ التَّحْدِيثِ وَالسَّيْرِ - یعنی اس نے مجھ سے بات اور راز کو چھپایا - نیز طَوَّلَ الْبِلَادَ طَيًّا - اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا - یعنی راستوں کو لپیٹا - نیز طَوَّلَ اللهُ التَّبْعَدَ لَنَا - خدا نے ہمارے لئے مسافت کو سمیٹ کر دوری کو قریب کر دیا \* - اِلَيطِيَّةٌ - نیت اور مقصد - لیٹنے کی ہنیت - منزل مقصود \* - طَوَّلَ اللهُ عُمُرَهُ - خدا نے اس کی عمر ختم کر دی - اس کی مدت عمر کو لپیٹ دیا \* - سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ \* لِيَذْكُرْتُكَ (۲۱) - جس دن ہم سماء کو لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے - اور سورۃ الزمر میں ہے وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (۳۹) - اس دن (یوم القیمۃ) میں اَرْض سب کی سب اللہ کے قبضہ میں ہوگی - اور سَمَاوَات بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لیٹے ہوئے ہوں گے - ان دونوں مقامات کے ملانے سے بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جب قرآن کے قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہوگا تو اس انقلابی دور میں معاشی ذرائع اور اخلاقی اقدار (اَرْض اور سَمَاء) دونوں کا مرکز ایک ہی ہوگا - یہ دونوں ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہونگے - اس وقت حالت یہ ہے کہ معاشی ذرائع ایسے نظام کے ہاتھوں میں ہیں جس نے اخلاقی اقدار کو الگ رکھ چھوڑا ہے - لیکن اس دور میں یہ دونوں یک جا ہو جائیں گے اور اس طرح توحید عملاً متشکل ہو جائے گی - اسی لئے اس کے بعد کہا ہے کہ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۹) - یہ لوگ جو معاشی نظام اور اخلاقی اقدار کو الگ الگ رکھ کر عملاً شرک کرتے ہیں، خدا ان سے بہت دور اور بہت بلند ہے - لیکن اگر یوم القیمۃ سے مراد دنیا کا طبعی انجام لیا جائے تو اَرْض و سَمَاء سے مراد طبعی کائنات لی جائیگی -

سورۃ طہ مین ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کئے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّكَ بِاَلْوَادِ الْمُقَدَّسِ اِس سے عقلی طریق تحقیق اور وحی کے عمل۔ انکشاف کا فرق نکھر کر سامنے طویٰ (۲۴)۔ آجاتا ہے۔ عقلی طریق تجرباتی ہوتا ہے جس میں مسافت بڑی لمبی ہوتی ہے۔ لیکن وحی اس مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کر دیتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں (It Economises Human Efforts)۔ عقل کی راہیں بڑی پرہیز و خم ہوتی ہیں۔ وحی صراط مستقیم کے ذریعے سیدھے منزل تک لے جاتی ہے۔ عقل کے تجرباتی طریق سے مطلب یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے۔ آپ اس کا ایک حل تجویز کر کے اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ اس تجربہ میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔ ایک مدت کے بعد جب نتیجہ سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام رہا، وہ حل غلط تھا۔ آپ پھر دوسرا تجربہ شروع کر دیتے ہیں و قس علیٰ ہذا۔ اس طرح عقل کے تجرباتی طریق سے آپ کی مسافت بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ لیکن وحی شروع ہی میں آپ کے سامنے صحیح حل رکھ دیتی ہے اور اس طرح آپ کو ان تمام ناکام تجارب سے بچا لیتی ہے جو آپ کو عقل کے طریق کار کی رو سے کرنے تھے۔ اس طرح سفر حیات میں آپ کی مسافت بہت مختصر ہو جاتی ہے۔ نبی کے سامنے حقیقت اپنے آپ کو خود بخود منکشف کر دیتی ہے۔ اس طرح تلاش حقیقت میں اس کی مسافتیں سمٹ جاتی ہیں۔ لہذا نبوت سے سرفرازی کے معنی یہ ہیں کہ نبی سے عقلی تجربات کے لمبے راستوں کو چھڑا کر ایسے ”الواد المقدس طوی“ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں مسافتیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس وادی کو طویٰ کہا گیا ہے۔ راغب نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر طویٰ (کوٹوادی) کے ساتھ ملا دیا جائے جو اس سے پہلی آیت میں ہے تو اس کے (معنی یہ ہوں گے کہ میں نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا۔ یا پھر یہ کہ اس وادی کو دوبار مقدس بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ معنی کچھ دور از کار سے ہیں۔

## ط ی ب

طیب\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں وہ چیز جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی\*۔ یعنی ہر وہ چیز جو



دیکھنے، سننے، سونگھنے، کھانے میں بھی پسندیدہ ہو اور اس سے انسانی نفس بھی کیف اندوز ہو۔ ”لَا طَآئِبٌ“ اور ”الْمَطَآئِبُ“۔ پسندیدہ اور بہترین چیزیں۔ ”الطَّوْبَى“۔ یہ مصدر بھی ہو سکتا ہے اور ”طَیِّبٌ“ کا مؤنث بھی۔ معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدہ اور دائمی خوش حالی کی زندگی۔ خوش بختی۔ ”طَعَامٌ“۔ ”طَیِّبٌ“۔ وہ کھانا جو حلق میں سہولت سے اتر جائے۔ ”مَاءٌ طَیِّبٌ“۔ خوشگوار پانی۔ ”الطَّيِّبُ“۔ خوشبو\*۔

طَابَتْ اِلَآرُضُ طَیِّبًا۔ زمین زرخیز ہو گئی۔ اس پر گھاس اُگ آئی\*۔ قرآن کریم میں ہے ”وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا“ ”يَا ذُرِّ رَيْبٍ“ (۵۸) زرخیز زمین سے خدا کے قانون کے مطابق سبزی اُگتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ”خَبِيثٌ“ کا لفظ آتا ہے۔ ”وَالَّذِي خَبِيثٌ لَا يَخْرِجُ“ ”الْاِنْكِدَارِ“ (۵۸)۔ اور جو زمین نکمی ہو اس میں (اول تو سبزہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے) تو بہت تھوڑا۔ یہاں سے ”طَیِّبٌ“ اور ”خَبِيثٌ“ کے معنی واضح ہو جانے ہیں۔ اسی طرح سورہ ابراہیم میں ”شَجَرَةً طَیِّبَةً“ کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اسکی جڑیں زمین میں مضبوط ہوتی ہیں اور شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی۔ اور وہ ہمیشہ ثمر بار رہتا ہے۔ اس کے برعکس ”شَجَرٌ خَبِيثٌ“ وہ ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ذرا سا جھٹکا اسے اکھاڑ پھینکے (۲۴:۲۶)۔

سورہ سبا میں ”بَلَدَةٌ طَیِّبَةٌ“ (۳۴) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے دائیں بائیں باغات ہوں اور اس میں سامان رزق کی فراوانی ہو۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم مومنین کو ”حَيَاوَةٌ طَیِّبَةٌ“ (۹۷) عطا کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہوں۔ جس میں انہیں تمام عمدہ اور پسندیدہ چیزیں بمافراط میسر ہوں۔ ایسی چیزیں جن سے حواس اور دل دونوں لذت یاب ہوں۔

حلت و حرمت کے متعلق قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حلال ہے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیدیا ہے۔ لیکن اس نے حلال کے ساتھ ”طَیِّبٌ“ کا بھی اضافہ کیا ہے (”کُلُوا“ ”مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلَالًا طَیِّبًا“ (۲/۱۶۸)۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں خوشگوار اور پسندیدہ ہوں وہ کھاؤ۔ لہذا ان چیزوں کو چھوڑ کر

جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، دنیا کی ہر خوشگوار چیز سے متمتع ہوا جا سکتا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ نہ تو کوئی شخص کسی حلال شے کو حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر حلال شے کو بالضرور کھائے ۔ اگر کوئی حلال شے کسی کو مرغوب نہیں یا نقصان دہ ہے تو اس کے لئے کسی قسم کی مجبوری نہیں کہ وہ اسے ضرور کھائے ۔ وہ جس چیز کو خوشگوار سمجھے اسے کھائے ۔ اس معاملہ میں نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے نہ کسی انسان کی طرف سے کوئی جبر ہونا چاہئے ۔

فَعَمِلْتَ بِيْطِيْبَةٍ نَّفْسِيْ کے معنی ہیں میں نے اسے کسی خارجی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے کیا ہے \* ۔ سورہ نساء میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النَّسَاءِ (۴)۔ جن عورتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان میں سے اپنی پسند کے مطابق (جو تمہیں خوش آئند نظر آئیں) اپنے نکاح میں لاؤ۔ نکاح کے لئے پسندیدگی اور دل کی رضامندی ضروری ہے ۔ رضامندی (دل کی خوشی) کے معنوں میں اس سے ذرا آگے ہے ۔ فَانْ طِيْبْنَ لَكُمْ (۵) وہ اگر دل کی رضامندی سے تمہارے لئے کچھ چھوڑ دیں ۔ سورہ آل عمران میں ذُرِّيَّةٌ طَيِّبَةٌ (۳۳) کہا گیا ہے ۔ ایسی اولاد جو دل و دماغ ، اخلاق و اطوار اور جسمانی صحت ہر لحاظ سے خوش آئند ، اور ماں باپ کے لئے سکون قاب کا باعث ہو ۔

مومنین کی کامرانی کے متعلق کہا گیا ہے طُوبٰى لِّهٖمْ (۱۳) ۔ ان کے لئے ہر قسم کی خوشگواریاں اور سعادت مندیاں ہیں ۔ کتنا جامع ہے یہ لفظ جس میں جنت کی ساری وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں ۔

## ط ی ر

طَارَ - يَطِيْرُ طَيْرَانًا - پرندہ کا اپنے پروں کے ساتھ ہوا میں حرکت کرنا ۔ اِذَا (۳۸) - اَطَارَهُ - طَيَّرَهُ - اِذَا دِيْنَا - یا کسی کو لئے اِذَا - اَلطَّيْرُ - طَائِرٌ کی جمع ہے لیکن اس کا اطلاق واحد پر بھی ہو جاتا ہے (۳۸) - جمع کے طور پر یہ لفظ (۳۹) میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ہوا میں ہلکا ہونے کے ہیں ۔ اس کے بعد استعارہ اس کا استعمال ہر تیزی کے لئے ہوتا ہے ۔ اِسْتَطَارَ - کسی چیز کا متفرق اور منتشر ہو جانا \* - اَلْمُسْتَطِيْرُ - بلند اور منتشر - ہوا میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والا - جس سے ساری فضا متاثر ہو چکی ہو - (۴۱) - اَلطَّائِرُ - دماغ - ہر

چیز جس سے نیک یا بد شگون لیا جائے\*۔ دماغ کی رعایت سے مجازاً اس کے معنی بلند پرواز انسان کے لئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ اِنِّیْٓ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الْیَطِّیْنِ کَهَیْمَشَّةٍ الطَّیِّرِ..... (۳۸)۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند بناتا ہوں“۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے لئے اسی آب و گل سے ایسے نظام نوکی تخلیق کروں گا جس سے تم اپنی اس موجودہ ہستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال کشا ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ (آپ اناجیل میں دیکھئے۔ حضرت مسیحؑ کا انداز تبلیغ یہ تھا کہ آپ تمثیلات اور استعارات میں حقائق بیان کیا کرتے تھے۔)

الطَّائِرُ کے معنی نجوست (اعمال کے تباہ کن نتائج) یا شامت اعمال کے بھی لئے جاتے ہیں\*۔ الطَّائِرُ - عربوں کے نزدیک بخت یا نصیبہ کو بھی کہتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں اسے اعمال نامہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کَتِلَ اِنْسَمَانِ الْاَزْمَنْه طَائِرَه فِیْ عُنُقِه (۱۱۰)۔ اس میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے۔ اس لئے بھی کہ عمل سے پہلے تو انسان کو اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اسے اس کا اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے لے (یعنی اس کے نتیجہ سے بچ جائے)۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسکی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کا نتیجہ تو اس انسان سے جدا نہیں ہوتا۔ اَلِیَطِّیْرَةُ - بری فال سے جو بد شگونی لی جاتی ہے۔ تَطْطِیْرَیْمَ وَمِنْہُ وَاطْطِیْرَ۔ اس نے اس چیز سے بد شگونی لی\*۔ (۱۱۸-۱۱۹) و (۲۰) میں بد شگونی کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اس کے سوا ”شگون“ کی کوئی حقیقت نہیں۔

فَرَسٌ مُّطَارٌ - طِیَّارٌ - ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا\*\*۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر جینؑ اِنْسٌ اور طِیْرٌ پر مشتمل تھے۔ جینؑ سے مراد وحشی فہائل ہیں۔ اِنْسٌ مہذب آبادیاں۔ اور طِیْرٌ تیز رفتار گھوڑے (رسالے)۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے وَاَطْطِیْرَ مَحْشُوْرَةً (۳۸)۔ اسکے پاس نہایت تیز رفتار گھوڑوں کا لشکر جمع تھا۔

حضرت سلیمانؑ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ عَلَّيْمُنَا مَنطِقِ الطَّيْرِ (۲۹) اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہمیں الطیر کی بولی سکھانی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط سکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح سورہ (نمل) میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَتَذَقُّدُ الطَّيْرِ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهَدَّ هُدًى (۳۰)۔ اس میں طَيْرٌ انہی تیز رفتار گھوڑوں (کے رسالوں) کے لئے استعمال ہوا ہے۔ هُدًى انہی رسالوں کے ایک رسالدار کا نام تھا (اس زمانہ میں پرندوں کے نام پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے تھے جیسا کہ تورات - کتاب سلاطین سے ظاہر ہے)۔ نیز لسان العرب میں ہے کہ هُدًى هُدًى یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اسی رعایت سے اس کے ہر فرد کو هُدًى هُدًى کہا جاتا تھا، جیسے قزلباش ایک قبیلہ کا نام ہے لیکن اس قبیلہ کے افراد کو بھی قزلباش کہتے ہیں۔

## ط ی ن

الطَّيْنُ - گیلی مٹی \* - راغب نے کہا ہے کہ الطَّيْنُ ہانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں خواہ اس سے ہانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یعنی اگر وہ قدرے خشک ہو جائے تو بھی ایسے طین \* کہلایا جائیگا \*۔ الطَّيْنَةُ - ایسی مٹی کا ٹکڑہ - نیز یہ ایک قسم کی ٹھوس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس سے دستاویز وغیرہ پر مہر لگائی جاتی ہے۔ نیز مجازاً انسان کی جبلت اور فطرت کو بھی کہا جاتا ہے \*۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) تعالٰی نے فقہ اللغة میں کہا ہے کہ طین \* (مٹی) جب خشک ہو تو اسے صَلْبٌ کہتے ہیں \* جب آگ میں پکی ہوئی ہو تو الْفَخَّارُ کہلاتی ہے۔ اور جب گارے کی طرح چپچی ہو تو وہ لَا زَبٌ کہلاتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِن طِينٍ (۳۱)۔ تخلیق انسانی کی ابتدا طین \* سے ہوئی ہے۔ (اسکی تفصیل کے لئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ - عنوان انسان دیکھئے - نیز عنوان ص۔ ل۔ ص۔ ل) حضرت عیسیٰؑ نے جب اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ میں تمہیں طین \* سے طنائیرؑ بنا دوں گا (۳۸) تو اس سے مفہوم خاک نشینی کی ہست حالت سے نکال کر عروج و پرواز عطا کر دینا تھا۔ (دیکھئے عنوان ط۔ ی۔ ر۔)

## ظ

## ظ ع ن

ظَلَعَنَ - يَظْلَعُنَ\* - ظَلَعْنًا - کسی مقصد کے لئے سفر کرنا - پانی کے لئے ، چراگاہ کی تلاش میں ، ایک چشمہ سے دوسرے چشمے کی طرف یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جانا - ظَاعِنٌ\* - سفر میں جانے والا ، مسافر - الظَّاعِيْنَةُ\* - وہ ہودج جس میں کوئی عورت سوار ہو - یا خود وہ عورت جو اس میں سوار ہو - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ کنایۃً عورت کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں نہ ہو - الظَّاعِيُونُ\* - وہ اونٹ جسے سفر کے لئے تیار کیا جائے - (ابن فارس) - الظَّاعِيْنَةُ\* - حالت سفر\* - سورة نمل میں ہے يَوْمَ ظَلَعْنِيْكُمْ\* (۸۶) سفر کے دن - (بمقابلہ اِقَامَةِ\*) -

## ظ ف ر

الظَّفَرُ\* - الظَّفَرُ\* - انسانوں اور دوسرے جانوروں کا ناخن - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غیر شکاری جانوروں کے ظَفَرٌ\* ہوتے ہیں اور شکاری جانوروں کے مِخْلَبٌ\* (پنچہ) - آلا ظَفَرٌ\* - لمبے چوڑے ناخنوں والا - ظَفَرَةٌ\* - اس نے اس کے (چہرے میں) ناخن گاڑ دیا - الظَّفَرَةُ\* - ایک ہودا جو زمین سے نکلنے وقت ناخن کے مشابہ ہوتا ہے\*\* -

قرآن کریم میں ہے وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّاسًا كُلَّ ذِي ظَفَرٍ (۱۳۷) - اور ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دئے تھے - یہ ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا کے تھا (جَزَيْنَاهُمُ بِبَغْيِهِمْ\* (۱۳۷) - قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ذی ظَفَرٍ کا ذکر نہیں - الظَّفَرُ\* - کامیاب ہونا - مطلوب کو پا لینا\*\* - راغب نے لکھا ہے کہ یہ مفہوم دراصل ناخن گاڑ دینے سے لیا گیا ہے (اس لئے کہ جس چیز میں پنچہ

گاڑ دیا جائے وہ قبضہ میں آجاتی ہے)\*\*\*۔ آ لَا ظَفَّارٌ۔ کامیاب کر دینا۔ سورۃ فتح میں ہے مِّنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَ كَيْدَهُمْ عَلَيْهِمْ (۴۸)۔ اس کے بعد کہ تمہیں انپر غالب کر دیا۔ ان کے مقابلے میں کامیاب بنا دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں قہر۔ کامیابی۔ غلبہ اور قوت شامل ہیں۔

## ظ ل ل

الظِّلُّ (جمع ظِلَالٌ\*) سایہ۔ دھوپ نہ ہونا۔ عام طور پر جو سایہ مغرب کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب تک کے وقت کا سایہ) وہ ظِلُّ کہلاتا ہے اور جو مشرق کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب کے بعد مغرب تک کے وقت کا سایہ) اسے قیٰء کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کو چھپا لینا۔

چونکہ عرب کا ملک نہایت گرم ہے اور درختوں کی وہاں بہت کمی ہے اس لئے ان کے ہاں سایہ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے۔ اس بنا پر وہ راحت و آسائش کی ہر چیز کو کُنَايَۃً ظِلٌّ سے تعبیر کرتے ہیں\*\*۔ حتّٰی کہ جنت کو بھی ظِلٌّ کہتے ہیں۔ اور عزّت۔ حفاظت۔ ہر قسم کی خوش حالی اور مرفہ الحالی کو بھی۔ اِنَّ الْمُسْتَقِيْمِيْنَ فِيْ ظِلِّالٍ وَّ عِشْوٰنٍ (۶۶)۔ ظِلَالٌ ظِلَالًا۔ گھنا سایہ۔ بہت زیادہ آسائشیں (۶۷)۔ اُكْلُهُمْ دَائِمٌ وَ ظِلُّهُمَا (۱۳)۔ ہُمٌ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلِّالٍ (۳۶) میں زندگی کی آسائشیں اور خوشگواریاں مراد ہیں۔ اَظْلَلْنِيْ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا۔ اس نے میری حفاظت کی اور بڑی عزت سے رکھا\*۔

ظِلٌّ۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے۔ ہر وہ چیز جو کسی کو ڈھانک لے اور اس پر سایہ فگن ہو۔ یہ اچھے اور برے دونوں موقعوں کے لئے عام ہے\*\*\*۔ اَلظِّلَالُ مِّنَ الْبَحْرِ۔ سمندر کی بڑی بڑی موجیں۔ اَلظَّلَلُ وہ پانی جو درختوں کے سایہ تلے ہو\*۔ ظِلَّةٌ (جمع ظُلُلٌ\*)۔ ہر ڈھانپ لینے والی چیز\*۔ نیز بدلی جو سایہ ڈالے\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قوم شعیب کے عذاب کے متعلق ہے۔ فَاتَّخَذَهُمْ عَذَابٌ يَّوْمَ الظَّلَّةِ (۲۸۶)۔ انہیں اس دن کے عذاب نے پکڑ لیا جب اوپر سے آجانے والی چیز نے انہیں ڈھانپ لیا تھا۔ جس دن ان کے اعمال کے نتائج ان پر پوری طرح چھا گئے تھے۔

ظَلَّ \* يَفْعَلُ كَذَا کے معنی ہیں وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا \*۔  
 سورة شعراء میں ہے کہ قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا فَتَظَلُّ لَّهِمَا عَلَیْهِمَا (۲۱)  
 (۲۱) - ہم ہمیشہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے رہیں گے۔ سورة النحل میں ہے  
 کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے ظَلَّ وَجْهَهُ  
 مُسْوَدًّا (۱۶) - اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ سورة الحجر میں ہے،  
 وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلَّوْا فِيهِ يَعْزُّجُونَ  
 (۱۵) - ”اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں  
 چڑھنے لگیں“۔ ان مثالوں میں مداومت اور استمرار کا پہلو غالب ہے۔ یعنی  
 ہمیشہ ایسا ہوتا ہے یا ایسا ہوگا۔ اس کی بعض شکلوں میں ایک ہی لام رہ  
 جاتا ہے۔ مثلاً فَظَلَّتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (۵۶) ”تم ہشیمان ہو جاؤ گے“۔  
 ظِلَّ بِمَقَابِلِهِ حَرٌّ وَرٌ (گرمی)۔ (۳۵) میں آیا ہے۔ ظَلَّلَ مِّنَ النَّارِ  
 (۳۶)۔ آگ کے شعلوں کو کہا گیا ہے جو چھا جائیں یا ڈھانپ لیں۔  
 فَظَلَّلَتْ أَعْنَاقَهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (۲۱) کے معنی ہیں ان کی  
 گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔

## ظ ل م

ظَلَمَ کے بنیادی معنی ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف  
 کرنا۔ حد سے تجاوز کرنا۔ بعض آئمہ لغت نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی  
 معنی نقص اور کم کرنے کے آتے ہیں۔ اور امام راغب نے کہا ہے کہ  
 ظَلَمَ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ  
 کمی زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت اور اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ کسی  
 چیز کا توازن بگاڑ دینا \*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) تاریکی (۲) حد  
 سے تجاوز کر کے کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا، بتائے ہیں۔

پہلے معنی (یعنی کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا) کے اعتبار  
 سے مَظْلَمَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جسے کوئی زبردستی دوسرے سے چھین  
 کر لے جائے۔ الظَّالِمُ (جمع الظَّالِمُونَ الظَّالِمِينَ المَظْلَمَةُ) ان  
 لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کو دہالیں \*\*\*۔

ظَلَمَ فُلَانًا - حَقَّقَهُ، فلان کا حق کم کیا۔ اسی سے ہے لَمْ تَظْلِمِ  
 مِیْنَهُ شَیْئًا (۱۸)۔ اور انہوں نے اس میں کچھ کمی نہیں کی \*\*\*۔ اس نہج  
 سے ظَالِم کے معنی ہیں حقوق انسانیت میں کمی کرنے والا۔ دوسروں کے  
 واجبات کو پورا پورا نہ دینے والا۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کے معانی میں یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً عربوں میں ایک مثل ہے کہ مَنَ اسْتَرْعَى الْقَدْرَ ثَبَّ فَقَدْ ظَلَمَ۔ جس نے بھیڑے سے توقع کی کہ وہ گلہ کی نگہبانی کرے گا، اس نے ظلم کیا۔ یعنی بھیڑے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا۔ یا ظَلَمَ الْاَرْضَ اس وقت کہتے ہیں جب زمین کو ایسے مقام سے کھودا جائے جہاں سے اسے کھودنا نہیں چاہئے تھا۔ اس قسم کی زمین کو مَظْلُومَةٌ کہتے ہیں۔ ظَلَمَ الْبَعِیْرَ۔ اس نے اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے یونہی ذبح کر دیا۔ ظَلَمَ الْوَادِیَ اس وقت کہتے ہیں جب پانی اس مقام تک پہنچ جائے جہاں تک وہ اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ (اس اعتبار سے ظَلَمَ کے معنی حدود شکنی اور تجاوز کے ہوں گے)۔ نیز ظَلَمْتُہ کے معنی ہیں میں نے اسے وقت سے پہلے ہی استعمال کر لیا۔ الظَّالِمَةُ والمَظْلُومَةُ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے جمنے کے لئے رکھا جائے اور دھنی بننے سے قبل ہی پی لیا جائے\*۔

الظَّالِمَةُ اور الظَّالِمَةُ کے معنی ہیں اندھیرا۔ تاریکی۔ (جمع ظُلُمَاتٌ)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا (یعنی اس جگہ روشنی کا نہ ہونا جس کو روشن رہنا چاہئے تھا)\*۔ اس نہج سے اَمْرٌ مَظْلُومٌ اس معاملہ کو کہتے ہیں جسکے متعلق معلوم ہی نہ ہو سکے کہ اسے کہاں سے گرفت میں لیا جائے۔ یعنی تاریک اور غیر واضح معاملہ، اور یَوْمٌ مَظْلُومٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ ظُلُمَاتُ الْبَحْرِ کے معنی ہیں شدائدُ الْبَحْرِ (سمندر کی مشکلات)\*۔ شَعْرٌ مَظْلُومٌ نہایت سیاہ بالوں کو کہتے ہیں، اور نَبْتُ مَظْلُومٌ ایسے پودے کو جو گہری سبزی کی وجہ سے سیاہی کے قریب پہنچ جائے\*۔

قرآن کریم میں ظَالِمِیْن کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کے معنی ہیں قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والے، حقوق انسانیت میں کمی کرنے والے، دوسروں کے واجبات کو پورا پورا ادا نہ کرنے والے، دوسروں کی محنت کو اپنے مصرف میں لیے آنے والے، دوسروں پر زیادتی کرنے والے، اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما میں کمی کرنے والے۔

سورہ بقرہ میں ہے وَمَا تَنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّؤَفَّقُ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۴۲)۔ تم اپنے مال میں سے جس قدر بھی نوع انسانی



کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف لوٹا دیا جائیگا۔ یعنی جو کچھ تم نے دیا ہے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائیگی۔ یہاں لَا تَظْلِمُوْنَ کا مفہوم یُسُوْفُ الْاِیُّکُمْ نے واضح کر دیا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے۔ ثُمَّ تَسُوْفُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۲۸۹)۔ یہاں بھی تَسُوْفُ کے مقابلہ میں لَا یُظْلَمُوْنَ لا کر بات واضح کر دی۔ سورہ کہف میں باغات کی مثال میں ہے۔ آتَتْ اُكْلَهَا وَكَمْ تَظْلِمُ مِنْهُ شَیْئًا (۱۸)۔ وہ اپنے پھل (پورے پورے) دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔ مَنۢ بَتَّعَدَ حَدُّوْۤدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۲۹)۔ جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ ظالمین کی یہ بڑی جامع تعریف (Definition) ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین، قوانین خداوندی ہی کی رو سے ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت میں غصب کرتا ہے۔ لہذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظالم ہے کیونکہ وہ حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جو حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی کسی چیز میں کمی کر رہا ہوں اور اپنے ہاں اضافہ۔ لیکن درحقیقت وہ شخص خود اپنی ذات (نفس) کی نشوونما میں کمی کرتا ہے۔ وَلٰکِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (۱۱۶)۔

چونکہ حقوق انسانیت میں کمی کر دینے سے معاشرہ کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے اور خود انسانی ذات کا توازن بھی قائم نہیں رہتا اس لئے قرآن کریم میں ظلم کو سُوء کا مرادف قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں حَسَنًا کا لفظ آیا ہے (۱۱۶)۔ ”حسن“ تناسب و توازن کی بہترین شکل کا نام ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ میں نُور کے مقابل میں ظلمات کا لفظ آیا ہے (۲) جس کے معنی تاریکیاں ہیں۔ نُور وحی خداوندی ہے اور ظلمات ذہن انسانی کی پیدا کردہ توہم پرستیاں اور غلط اندیشیاں۔ وحی کی تعلیم ایک ہی ہوتی ہے، لیکن ذہن انسانی کی پیدا کردہ تاریکیاں مختلف قسموں کی ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نُور کی جمع کہیں نہیں آئی لیکن ظلمات بطور جمع آیا ہے۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ افسانے مختلف ہوتے ہیں۔

آیت (۲۰) میں اَضَاءَ کے مقابلہ میں اَظْلَمَ کا لفظ آیا ہے۔ اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریک ہو جانا اور تاریک کر دینا۔ نیز تاریکی میں داخل ہو جانا۔ چنانچہ مَظْلَمُونَ کے معنی ہیں اندھیرے میں رہ جانے والے (۳۶)۔ سورہ انبیاء میں ظَلُمْتُ کا لفظ ایسے مصائب و مشکلات کے معنوں میں آیا ہے جن کا حل انسان کو سچھائی نہ دے (۲۱)۔

سورہ ابراہیم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَقَفْلُومٌ كَفَّارٌ (۱۴)۔ یعنی انسان اگر وحی کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا رہے تو اسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور جو کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے اسے دبا دبا کر، چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، وحی کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے نوعِ انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھو اور کسی کے حقوق میں کمی نہ کرو۔ ظَلُمُوْمْ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ اسی طرح ظَلَمَ کے بھی یہی معنی ہیں۔ (۳۱)۔ قطعاً ظلم نہیں کرتا۔

دنیا میں جہاں جہاں ظلم ہو رہا ہو، خواہ اسکی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس ظلم کو مٹانا اور اسکی جگہ نظامِ عدل و احسان قائم کرنا، یہ ہے قرآنی تعلیم کا منشا۔

## ظ م ا

ظَمِيْئٌ - يَظْمِيْئٌ - ظَمْمًا - ظَمًا - پیاسا ہونا - یا سخت پیاسا ہونا۔ ظَمِيْئٌ - ظَمْمَانٌ - پیاسا (۲۹)۔ ظَمْمًا - ظَمًا - پیاس (۹)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مرجھا جانے اور کم آب ہو جانے کے ہیں۔ ”آدم“ کی جنت کے متعلق ہے کہ لَا تَقْلُمُوْا فِيْهَا (۲۸)۔ تو اس میں پیاس محسوس نہیں کرتا۔ پانی بافراط ملتا ہے۔ پانی کی کمی اور فراوانی کی اہمیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صحراؤں کے رہنے والے ہی لگا سکتے ہیں جن کی زندگی کا دار و مدار پانی پر ہوتا ہے۔ ان کے لئے پانی کی قلت سب سے بڑی مصیبت اور پانی کی فراوانی سب سے بڑی خوش حالی ہوتی ہے۔ جنتی معاشرہ میں کسی کو بنیادی ضروریات زندگی (کھانا پینا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) کے لئے جگر پاش مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں، نہ ہی ان سے کوئی محروم رہتا ہے۔ (۲۸)۔ اَلْظَّمِيْمُ - دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ\*۔

## ظ ن ن

ظَنُّوا (جمع ظَنُّونَ)۔ غیر یقینی عقیدہ کے دونوں سروں میں سے جو زیادہ قوی ہو اسے ظَنُّوا کہتے ہیں۔ ظَنُّوا واضح اور صاف صاف یقین نہیں ہوتا۔ صاف یقین کو عَلِمَ کہتے ہیں۔ مناوی نے کہا ہے کہہ ظَنُّوا اس راجح عقیدہ کو کہتے ہیں جس میں احتمالِ نقیض ہو۔ نیز یہ شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اور ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہ دونوں لکھے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کے علامات سے جو نتیجہ (Inference) حاصل کیا جائے اسے ظَنُّوا کہتے ہیں۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو نتیجہ سے عَلِمَ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور جب بہت کمزور ہوں تو ان سے مستنبط نتیجہ وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ کبھی کبھی یہ لفظ علم کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے\*۔

آپ نے اوپر دیکھا ہے کہ اہل لغت نے یہ کہا ہے کہہ ظن کا لفظ ایک طرف شک اور قیاس کے معنوں میں آتا ہے اور دوسری طرف علم اور یقین کے معنوں میں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے۔ قرآن کریم نے (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا) ظن کا لفظ علم اور یقین اور حق کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے ظن کبھی علم اور یقین کے معنوں میں نہیں آسکتا۔ دراصل (جیسا کہ راغب نے کہا ہے) جب کسی حقیقت کے متعلق پورا یقین نہ ہو تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ انسان کبھی حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں پہلوؤں کو ظن کہتے ہیں۔ راغب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب اس کے بعد آن یا آن آئے تو اس میں علم کی طرف رجحان غالب رہتا ہے اور وہ تقریباً یقین کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسکی مثالوں کے لئے دیکھئے (۲۹)؛ (۳۹)؛ (۴۰) وغیرہ۔

یقین اور قیاس کے ملے جلے پہلو کے اعتبار سے الظَّنُّونَ اس باشرف عورت کو کہتے ہیں جس سے باوجود زیادہ عمر ہونے کے شادی کر لی جائے اور یہ امید ہو کہ اس سے اولاد ہو سکتی ہے۔ نیز اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس میں پانی ہے یا نہیں۔ نیز اس قرضے کو الدَّيْنُ الظَّنُّونَ کہتے ہیں جس کے متعلق اطمینان نہ ہو کہ قرضہ لینے والا اسے ادا کریگا یا نہیں\*\*۔

\* تاج و راغب۔ \*\* تاج و محیط۔

قرآن کریم میں لفظ ظُنُّوْنَ قیاس آرائیوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وَتَظُنُّوْنَ بِآلِہِ الْغُیْبِ مَا لَہِ الْغُیْبُ نَا (۳۳)۔ ”اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے گمان اور قیاس آرائیاں کرنے لگ گئے“۔ یعنی تمہارے دل میں یقین کے بدلے شکوک اور وساوس پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ سورۃ بقرہ میں ظَنُّوْا بِمَقَابِلِہِ عَلَیْکُمْ آیَا ہِے۔ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ إِلَّا اَمَانِیُّہٗ وَاِنْ ہُمْ إِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲۸)۔ ”وہ کتاب کو اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ محض (ناظرہ) پڑھ لیتے ہیں۔ وہ صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں“۔ سورۃ النساء میں ہِے مَا لَہُمْ بِہِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اَتَّبَعَ الْظُّنَّ (۱۵۷)۔ انہیں اسکی بابت یقینی علم نہیں، وہ محض ظن کے پیچھے چلتے ہیں۔ سورۃ یونس میں ظَنُّوْا بِمَقَابِلِہِ حَقِّہٗ آیَا ہِے۔ اِنْ الْظُّنَّ لَا یُعْنِیْہِ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۲۶) ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

دین کی ساری عمارت علم اور یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ کے متعلق آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت خدا کا کیا حکم ہے تو آپ کے اعتقاد و عمل کی ساری عمارت متزلزل رہیگی۔ اس لئے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اسی لئے لیا ہے (۱۵) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے خدا نے نازل کیا تھا۔ رسول اللہ نے اسی قرآن کریم کو مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے دین میں صرف قرآن کریم یقینی ہے۔ اور سب ظنیات ہیں۔ اور اِنْ الْظُّنَّ لَا یُعْنِیْہِ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۲۶) خدا کا ارشاد ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دین نہیں ہو سکتی۔ دین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ خارج از قرآن، جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہوں انہیں صحیح مانی جا سکتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں وہ غلط ہونگی۔

الظَّنِّیَّةُ تہمت کو کہتے ہیں۔ الظَّنِّیُّنَ متہم شخص، جس سے بدگمانی کی بنا پر عداوت رکھی جائے\*۔

## ظہر

الظَّہْرُ مِیْنُ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا بیرونی اور بالائی حصہ (اندونی حصہ کی ضد)۔ انسان کے جسم کا شانوں سے لیکر سرین کے اوپر تک کا حصہ

پیٹھ - پشت) - سواری کو بھی کہتے ہیں - اور مال کثیر کو بھی جو نماہاں طور پر نظر آجاتا ہے - الظَّهِيرَةُ\* - مددگار - پشت پناہ\* -

ظِہْرِيٌّ وہ فالتواونٹ جسے سفر میں احتیاطاً (بطور Extra) ساتھ رکھ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑ جائے تو اسے استعمال کر لیا جائے - یعنی اس کی حیثیت مقدم نہیں ہوتی ، ثانوی ہوتی ہے - اسی سے اس کے معنی کسی کو پس پشت ڈال دینے یا نظر انداز کر دینے کے آتے ہیں - اتَّخَذَ حَاجَتَهُ ظِہْرِيًّا - اس کی ضرورت کو ناقابل توجہ سمجھا\* -

ظَهَرَ الشَّيْءُ - چیز ظاہر ہو گئی - نمایاں ہو گئی - ابھر کر سامنے آگئی - واضح ہو گئی\* - ظَهَرَ عَلَيَّ - اس نے میری مدد کی - ظَهَرَ بِي - ظَهَرَ عَلَيَّ - اس پر غالب آگیا - ظَهَرَتُ الْبَيْتَ - میں مکان کے اوپر چڑھ گیا - ظَهَرَ عَلَيَّ السَّيْرُ - وہ راز سے واقف اور مطلع ہوا - أَظْهَرَهُ عَلَيَّ - اسے اس پر غالب کر دیا - أَظْهَرُ - زوال آفتاب کا وقت ، یہ ظَہِيرَةُ الشَّمْسِ - (دھوپ کی سخت تپش اور حرارت) سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے\* - أَظْهَرَ - ظہر کے وقت میں داخل ہونا - ( ۳۸ ) - ظَاهَرَ وَتَطَاهَرَ عَلَيَّ - اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی - أَظْهَرُ - مددگار - (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) أَظْهَرُ مِّنَ الْمَرَاةِ - خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت - عربوں میں زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنے کے لئے ایسا کہا جاتا تھا\* -

ظَاهِرُ الْجَبَلِ - پہاڑ کی چوٹی یا بالائی حصہ - الظَّاهِرَةُ\* - اونچی زمین\* - کسی چیز کے زیادہ ہونے ، عام ہونے اور پھیل جانے کو بھی ظَهَرَ کہتے ہیں\*\* -

قرآن کریم میں ہے تَطَاهَرُواْ عَلَيَّهِمْ ( ۲ ) - تم ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو - سورة المومن میں ہے ظَاهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ( ۲۹ ) - ملک میں غالب قوم - سورة زخرف میں ہے - مَعَارِجَ عَلَيَّهَا يَظْهَرُونَ ( ۳۳ ) - سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں - اور سورة نور میں ظَہِيرَةُ کا لفظ (گرمی کی) دوپہر کے لئے آیا ہے ( ۲۴ ) - سورة احزاب میں تَطَاهَرُواْ ( ۳۳ ) کے معنی ہیں بیوی کے متعلق ظِہْرُ کا اعلان کر دینا - اس کا اعادہ ( ۳۸ ) میں ہوا ہے - سورة نور میں ہے لَمْ يَظْهَرُواْ عَلَيَّ عَوْرَاتِ النَّسَاءِ ( ۲۴ ) - وہ ہورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہیں - سورة جن

میں ہے فَلَا يُظْهِرُ عَنِّي غَيْبِيہِ أَحَدًا (۴۶) - وہ اپنے غیب سے کسی کو مطلع نہیں کرتا - سورۃ بقرہ میں أَبْوَابٌ (دروازوں) کے مقابلہ میں ظُہُورٌ (پچھواڑے) آیا ہے (۲۸۹) - یعنی مکان کی پشت کی طرف سے -

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ وَلَا يَبْدُرِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَظَاهِرَ مِينَهَا (۲۲) - وہ اپنی زینت (آرائش) کی چیزوں کی نمائش نہ کریں، بجز ان کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائیں - اسے مثال دیکریوں سمجھا دیا کہ وَلَا يَضُرُّنَّ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ (۲۲) - اور وہ اپنے پاؤں کو (زمین پر) اس طرح مار کر نہ چلیں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت کی اشیاء سے چھپائے ہوئے ہیں ان کا دوسروں کو علم ہو جائے - ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ آواز دار زیور ہے جسے ہندلیوں پر پہنا جاتا ہے اور جو معمولاً ڈھنپا رہتا ہے - اس کی نمود کا طریق یہ ہے کہ زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلا جائے جس سے اس زیور (جھاگل - جھانجن وغیرہ) سے آواز پیدا ہو جائے - یہ وہ اشیائے زینت ہیں جو شلوار وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہیں - باقی رہیں وہ اشیائے زینت جو اوپر کے حصے میں پہنی جاتی ہیں ، سو ان کے لئے کہدیا کہ وَلْيَضُرَّ بِنَّ بِخُمُرِهِنَّ عَلَي جُيُوبِهِنَّ (۲۲) - وہ اپنے سر کی چادروں کو جیب گریبان (مینے پر) ڈال لیا کریں - دوسری جگہ ہے يَدْ نِيْنَّ عَلَيْنَّ مِن جَلَّابِيْمِهِنَّ (۳۳) - وہ اوپر اوڑھے ہوئے (یا) اور کوٹ کی طرح پہنے ہوئے) کپڑے کو جسم کے ساتھ لگائے رکھیں -

ان اشیائے زینت کے اظہار کی ممانعت ، باہر کے لوگوں سے ہے - اپنے گھر کے لوگوں سے نہیں - (۲۲) - اب رہیں وہ چیزیں جو خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں تو انکی مثال ہاتھ کی انگٹھلی یا کنگن کی سمجھئے - یا ناک کے کسی زیور کی - اس لئے کہ اوڑھنی یا جلباب سے ہاتھ اور چہرہ بہر حال کھلے رہتے ہیں اور قرآن نے انہیں چھپانے کا حکم نہیں دیا - بلکہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں - انہیں بے پاک نہ ہونے دیں (يَغْضُؤْا مِّنْ أَبْصَارِهِمْ ۚ وَ ۲۳) - تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہ نہیں کہ چہرہ کو بھی چھپایا جائے - اس لئے کہ اگر عورتیں اپنے چہرے کو بھی چھپا کر باہر نکلیں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی -

یہ ہیں اظہار زینت کے متعلق قرآن کریم کی ہدایات - ممانعت ، نمود آرائش کی ہے - خود بخود ظاہر ہو جانے والی اشیائے زینت کی نہیں -

سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے خدا کو محض بطور ظیہرؑ (۱۱) رکھ چھوڑا ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک اہمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں کی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی ہے لیکن خدا کو (محض بطور Extra) ساتھ اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے بھی اپنے مفاد کے لئے استعمال کر لیا جائے۔ غور کیجئے کہ یہی چیز آج ہم پر بھی کس طرح صادق آتی ہے۔

سورۃ حدید میں اللہ کی ایک صفت الظّٰہِرُ بھی آئی ہے۔ هُوَ الظّٰہِرُ (۵۷)۔ اس میں الظّٰہِرُ کے معنی آنکھوں سے نظر آ جانے والا نہیں۔ اس لئے کہ جب بنی اسرائیل نے تقاضا کیا تھا کہ ہم اللہ کو جہرۃً (اپنی آنکھوں سے) دیکھنا چاہتے ہیں (۲۵) تو ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا تقاضا طیفلانہ ہے۔ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ لہذا یہاں تو الظّٰہِرُ کے معنی ہیں وہ ذات جس کی ہستی پر کائنات کی سرئی اور مشہود اشیاء دلیل ہیں یا اس کے معنی ہیں سب پر غالب۔ لیکن اُس کا غلبہ ایسا ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ الظّٰہِرُ کے ساتھ (الْبَاطِنُ) بھی ہے (۵۸)۔ جیسا کہ (ب۔ ط۔ ن) کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ہے، خدا اپنے تخلیقی مظاہر (Created World) کی رو سے سامنے آتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشیاء نے کائنات خود خدا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اشیاء اپنے خالق کی ہستی کی علامات (آیات اللہ) ہیں۔ اور جو قانونِ خداوندی رگِ کائنات میں خونِ حیات بن کر دوڑ رہا ہے وہ اُس کے اقتدار و اختیار کی زندہ شہادت ہے۔ اسی اعتبار سے خدا الظّٰہِرُ ہے۔ لیکن خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے وہ البّٰطِنُ ہے۔ اس سے (Immanence and Transcendence of God) کا وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جو مفکرین الٰہیات کے لئے اس قدر وجہٴ پیچ و تاب بنا رہتا ہے۔ یعنی یہ مسئلہ کہ خدا کائنات میں حاضر و موجود ہے یا اس سے الگ (کہیں اور۔ مثلاً عرش پر) بیٹھا ہے۔ وہ (اپنے قانون و اقتدار کے اعتبار سے) کائنات کے اندر ہے لیکن اس میں محبوس نہیں۔ اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) کائنات سے بالا ہے لیکن اس سے الگ (Excluded) نہیں۔ وہ بیک وقت الظّٰہِرُ بھی ہے اور البّٰطِنُ بھی۔ (Immanent) بھی ہے اور (Transcendent) بھی۔ وہ اپنی ذات (Personality) رکھتا ہے لیکن مشخص (Personified) نہیں۔ اس کا اقتدار، ایک توانائی (Divine Energy) ہے لیکن بغیر ذات (Personality) کے نہیں۔

## ع

## عاد

جیسا کہ تذکرہ قوم ثمود (عنوان ت - م - د) میں لکھا جا چکا ہے، تاریخ کے ابتدائی ایام میں عرب اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ (شام - عراق وغیرہ) میں امم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قوم، عاد کی تھی جو ایکطرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار (ق - م) تک ان علاقوں پر اس قوم کا تسلط نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انہیں قوم نوح کا جانشین بتایا ہے (۶۹) جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ابتداء بہت قدیم زمانہ میں ہوئی تھی۔ اس قوم (عاد) کیطرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف ریتیلے بل کھاتے ہوئے ٹیلوں اور ریگستانی صحرا کو کہتے ہیں۔ عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کہلاتا تھا۔ قرآن کریم کا بیان ہے کہ اس قوم کو (اُس زمانے کے لحاظ سے) سامان زیست افراط سے حاصل تھا۔ آپاشی کے لئے قدم قدم پر چشمے۔ پھلوں سے لدے ہوئے باغات۔ اولاد اور مواشی کی کثرت (۱۳۲-۱۳۳)۔ وہ عرب بلند مقام یا شاہ راہ پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے (۲۶۸)۔ وہ علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۶۹) لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے انہیں ایسی غلط روش پر ڈال رکھا تھا کہ ان کا علم و بصیرت صحیح کاموں میں صرف نہیں ہوتا تھا (۲۶۸)۔ حضرت ہودؑ نے انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان پر ایسی مسلسل آندھی چلی کہ وہ تباہ و برباد ہو گئے (۶۹-۷۰)۔ انہیں قرآن کریم نے عاد اولیٰ کہا ہے (۵۳)۔ ان میں سے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لا کر بچ گئے تھے ان کی نسل آگے چلی۔ انہیں عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔



(ان امور کی تفصیل - نیز اس نکتہ کی وضاحت کہ ان اقوام سابقہ کے اعمال، اور حوادث طبعی کے ذریعے ان کی تباہی میں باہمی ربط کیا تھا - میری کتاب ”جوئے نور“ میں ملیگی)

## ع ب ا

الْعَيْبُ - بار - بوجھ - وزن، سامان وغیرہ کا - مَاعِبَاتٌ - یہ - میرے نزدیک اسکا کوئی وزن نہیں - مجھے اسکی کچھ پرواہ نہیں \* - قرآن کریم میں ہے مَاعِبُونَ بِكُمْ رَبِّي (۱۵۰) - میرے نشوونما دینے والے کے نزدیک تمہارا وزن ہی کیا ہے - اس کی نگاہوں میں تمہاری قدر و قیمت کیا ہے - وہ تمہاری پرواہ کیا کرتا ہے - (ابن فارس)

## ع ب ث

الْعَبَثُ - ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو، یا ایسا کام جس کا فائدہ معلوم نہ ہو، یا ایسا کام جس کے کرنے والے کے سامنے اسکی کوئی غرض متعین نہ ہو - اسے معلوم نہ ہو کہ میں اسے کیوں کر رہا ہوں - بغیر مقصد اور غرض و غایت متعین کئے کوئی کام کرنا - اسی لئے کھیل کود کو عَبَثٌ کہتے ہیں \* - اصل میں عَبَثٌ بِلَالِی کے معنی ہیں اسے کسی چیز میں سلا یا - خلط ملط کیا \* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی خلط ملط کرنا ہی بتائے ہیں \* - جب کوئی کام مقصد اور غایت کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو انسان اس میں کسی ایسی بات کو نہیں ملاتا جس سے وہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو - لیکن جب کوئی مقصد اور منزل ہی متعین نہ ہو تو پھر اس کام میں جو کچھ چاہے ملے جائے - عَبَثٌ النَّاسِ - مختلف قبائل کے ملے جلے لوگ جو ایک جگہ اعلیٰ کی اولاد نہ ہوں - الْعَبِیْثَةُ - ملی جلی بکریاں - لہذا الْعَبَثُ کے معنی ہیں غیر مفید کام، وہ کام جس سے کوئی غرض و مقصد مطلوب نہ ہو \* -

قرآن کریم کی رو سے یہ تمام کائنات ایک متعین مقصد اور غایت کو سامنے رکھ کر پیدا کی گئی ہے اور انسانی تخلیق کی بھی ایک خاص غایت اور خاص مقصد ہے - صحیح روش زندگی وہ ہے جو انسان کو اس غایت اور مقصد کی طرف لے جائے - لیکن مادی نظریہ حیات کی رو سے کائنات اور انسان کی تخلیق یونہی اتفاقیہ عمل میں آگئی ہے - اسکی نہ کوئی غرض ہے نہ

غایت - لہذا انسان اپنی طبعی آسائش کے لئے جو روش بھی اختیار کر لے صحیح ہے - غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ قرآنی تصور زندگی اور مادی نظریہ حیات میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی بنیاد پر دونوں نظریوں کے مطابق زندگی کی پوری کی پوری عمارت (الگ الگ انداز سے) اٹھتی ہے - قرآن کریم نے اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ **أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا** (۲۱۵) - کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے ؟ اور پوری کائنات کے متعلق ہے **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِيِينَ** (۲۱) - نیز دیکھئے (۲۱) جس میں السماء کی جگہ السموات ہے - ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بطور کھیل تماشا کے نہیں بنا دیا - اسکی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے - اسے **بِالْحَقِّ** پیدا کیا گیا ہے (۲۱) - یعنی ایک غیر متبدل محکم پروگرام کے مطابق تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے - ہندو فلسفہ کی رو سے یہ تمام کائنات ”ایشور کی لیل“ ہے - یعنی خدا کا رچا ہوا ناول ، جس میں وہ خود سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے - اسی لئے اسے ”نٹ راجن“ کہا جاتا ہے - یعنی نٹوں (کھلاڑیوں) کا بادشاہ - قرآن کریم نے اس تصور کی خاص طور پر تردید کی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت (Seriousness) پر بڑا زور دیا ہے - اسی بنیاد پر انسان کے وہ تمام ایسے کام جو یونہی ، بلا صحیح غرض و غایت ، عمل میں آتے رہیں ، اُس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتے - چنانچہ اس نے قوم عاد کا ایک جرم یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں محض اس لئے بناتے تھے کہ وہ بطور یادگار فائیم رہیں - اسے اس نے **تَعْبَثُونَ** سے تعبیر کیا ہے (۲۱۸) - یعنی عمارت کا کوئی افادی مقصد ہونا چاہئے - یونہی ایک عظیم الشان مقبرہ بنا دینا جو کسی مصروف میں نہ آسکے ، فعل عبث ہے - کس قدر عبرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جس قوم (مسلمانوں) کو اس قسم کی تعلیم دی گئی تھی ان کی سلطنت کے ہافیات ، مقبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں - اور ان پر ہم فخر کرتے ہیں - یادگار ایسی ہونی چاہیئے جس سے منفعت بخش اور جمال آفریں نتائج مسلسل طور پر جاری رہیں - اسی لحاظ سے زندگی کا ہر کام جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں نہیں فعل عبث ہے - (اس سلسلہ میں عنوانات (ث - و - ب) - (ل - ع - ب) اور (س - د - ی) بھی دیکھئے)

## ع ب د

**عَبَثٌ** - دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے - اس کے کھانے سے اونٹ فرہ عو جاتے ہیں اور

ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھائے ہیں تو وہ پیاسے ہو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں۔ (۱) کشش و جاذبیت۔ (۲) ابتداء\* پیاس کی تکلیف لیکن آخر الامر (۳) فریبی اور دودھ کی فراوانی۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداء\* تکلیف لیکن آخر الامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں۔ اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تار کول ملتے تھے تو اس سے کشتی بد صورت ہو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے ایسی کشتی کو سَفِينَةٌ مَّعْبُودَةٌ\* کہتے تھے\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے۔ یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت۔ (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آتی جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عِبَادَةٌ\* کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سر انجام دیا جائے (کیونکہ عِبْدٌ\* پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش عوا گرجہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲۸۶) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی انسان، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف عوتی ہے لیکن درحقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے پہلے کہا کہ وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَ لِي تَنْفَعُ التَّوَّابِينَ (۵۱)۔ ان کے سامنے خدا کا ضابطہ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱)۔ ان سے کہہ دے کہ ہم نے تمام انسانوں کو، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی\*\*، اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداء\* مشقت اٹھانی پڑیگی (اس لئے کہ السابقون الاولون کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں۔ بالکل نہیں۔ مَا أَرْبِدْ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَمَا أَرْبِدْ أَنْ يَطْعَمُونَ (۵۱)۔

\*تاج۔ \*\* (جن و انس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)

ہم ان سے رزق نہیں چاہتے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائیں اور ہم کھائیں۔ ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ہے (تَنْفَعُ الشُّؤْمِيْنَ)۔ آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کرینگے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑیگا اور یہ گراں گذریگا۔ لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی۔

”مشقت اور منفعت“ کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عِبَادَہ کے معنی سمجھئے۔ تَعْبِيْدٌ کے معنی ہیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جو تیرے کے قابل بنا دینا\* (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ہیں۔ یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو۔ اسی طرح سڑک کو کسٹ کسر ہموار کر دینا تاکہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں، یہی تَعْبِيْدٌ کہلاتا ہے\*۔ آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداء کس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے۔

لہذا عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشاء خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶۱) سے اس مفہوم کو واضح کر دیا۔ طَّاغُوت کے معنی ہیں سرکش قوتیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے، یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو۔ دوسری جگہ ہے لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ (۱۶۲)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو\*\*\*۔ ”شیطان“ کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے

\* لین و تاج \*\* اس کے معنی (ط۔ غ۔ ی) کے تحت دیکھئے۔ \*\*\* اس کے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو۔ دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا۔ عراق میں (سوصل کے قریب) ایک باطن فرہ (بزیڈی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (”ملک طاؤس“ کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ہیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔

واضح کر دیا کہ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا (۱۶) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کرتے ہوئے ہے۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش۔ ط۔ ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ أَفَرَأَيْتَ آيَةً مِّنْ أَن تَأْخُذَ بِهِ لَٰهَـۥهُ ۖ هَـٰوَ اٰنْهٖ (۳۵) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (۱۶) یوں ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ ”اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو“۔ اس تقابل سے ”اللہ کی عبودیت“ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھ کر اور کتب سابقہ پڑھ کر ایمان رکھتے ہیں وَ يُرِيدُونَ أَن يُتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (۶۶)۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں، حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۴۵)۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات و خیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے، بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے۔ اسی کو اَعْبُدُوا اللَّهَ کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کریم نے ”خدا کی عبادت“ کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آجکل ”حکومت“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَ لَا يُشْرِكْ كُفْرًا بِعِبَادَةِ رَبِّهِ، أَحَدًا (۱۸)۔ ”ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ”عبادت“ میں کسی کو شریک نہ کریں“ اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَ لَا يُشْرِكْ كُفْرًا بِحُكْمِهِ، أَحَدًا (۱۹)۔ ”وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا“۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ إِنَّ اِلٰهَكُمْ اِلٰهًا وَاحِدًا (۲۱)۔ ”حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی“۔ اور اس کے بعد کہا ”أَمَرَ اٰتٰلَا تَعْبُدُوْا اِلٰهًا اِلَّا اِيَّاهُ (۲۲)۔ ”اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محمکویت) اختیار نہ کرو“۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم

کس طرح ”حکومت“ اور ”عبادت“ کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔ قصہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو، تو وہ ان کے سوا کیا ہیں اُن عَبَدْتُ بَنِي إِسْرَآئِيلَ (۲۶) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (۲۳)۔ اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات میں بھی یہ مادہ، حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَنْ لِّقَمِّ يَجْعَلْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵۴)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی، تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ہو سکے (۲) یہ خدا کی ”عبادت“ کر سکیں (يَعْبُدُونِ نَبِيٍّ)۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں (لَا يُشْرِكُونَ رِيَّ شَيْئًا ۝۴۴)۔ ظاہر ہے کہ اگر ”عبادت“ سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ”خدا کی پرستش“ کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہذا ”اللہ کی عبادت“ سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔

ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کرنے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو عیبید کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجہ استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی تھی۔ عیبید اور عیباد۔ عیبد کی جمع ہیں۔ عاید کی جمع عایدون اور عابدہ ہیں)۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ہاتھ میں آئے ہوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنائے لگ گئے۔ اب انہی کو عیبد اور عیبید کہنے لگے۔ ہوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ قرآن کریم میں عاید کے معنی محکوم (۲۳)۔ عابد کے معنی محکوم بنانا (۲۶) اور

عَبْدٌ کے معنی غلام (عَبْدٌ) واضح ہیں۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آ گیا ہے۔ چنانچہ اب تَعَبَّدٌ اور تَذَلُّلٌ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ (یعنی مطیع و منقاد ہو جانا، قانون کے سامنے جھک جانا)۔ تعبد و تذلل کا یہی جذبہ، پرستش کے اندر کار فرما ہوتا ہے۔ اس سے عِبَادۃ کے معنی پرستش ہو گئے۔ قرآن کریم میں ہے قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا۔ (۲۱)۔ انہوں نے کہا، ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت درحقیقت مظاہر ہوتے ہیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلب منفعت یا دفع مضرت) کے خیال سے جھکتے ہیں۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظر اسی مادہ سے عَبِيدَ يَعْبُدُ آتا ہے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ہیں\*\*۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ (۲۸)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہو سکتا ہے جس کے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہونگا جو اس قسم کے رحمن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر دے\*\*\*۔ (اب سے رحمن کو دور ہی سے سلام ہے)۔ واضح رہے کہ اگر عَابِدِينَ کو عَبِيدَ - يَعْبُدُ ہی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرمان بردار کے ہونگے۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر رحمن کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں، لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرمان بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

الْعَبْدُ کے پہلے معنی انسان کے ہیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ پھر

کولاءتو یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا\*۔

لہذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہونگے۔ چونکہ جذباتِ اطاعت و فرمان پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آ رہا ہے اس لئے قرآن کریم

نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صلوٰۃ\* جو ص۔ ل۔ و کے عنوان کے ماتحت درج ہے)۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں دیکھئے اَسْلَمْتُ اور نَعْبُدُ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی کو اَللّٰہِ یُنْ کھا گیا ہے (۱۳۱-۱۳۲)۔ نیز مُسْلِمُوْنَ اور عَابِدُوْنَ اور مُخْلِصُوْنَ بھی (۱۳۶-۱۳۸)۔

(۶) جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی غفیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ”خدا کی عبادت“ سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت۔ خدا کی محکومیت۔

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

(۴) عِبَادُ الرَّحْمٰن کے معنی ہونگے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اُس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے ایقاکِ نَعْبُدُ (۱) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اُس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلوٰۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اُسکی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان، زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱) سے بھی مقصود ہے۔

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ ”قوانین خداوندی کی محکومیت“ اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی



خوشگوار یوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشوونما عو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ”محکومی“ درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل، اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا عوتا ہے۔ یہ (Self-Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں عوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

## ع ب ر

عَبَّرَ کے معنی ہوتے ہیں ایک مقام (یا حالت) سے دوسرے مقام (یا حالت) تک پہنچ جانا۔ عَبَّرَ النَّهْرَ۔ اس نے نہر کو عبور کر لیا۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ عَبَّرَ السَّبِيلَ۔ اس نے راستہ قطع کیا، طے کیا۔ اَلْعَبْرَ۔ وہ چیز جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جائے۔ کشتی یا پل وغیرہ\*۔ اس اعتبار سے راغب نے لکھا ہے کہ عِبَارَةٌ\* وہ کلام ہے جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان میں پہنچتا ہے۔ اور عِبْرَةٌ\* اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی دیکھی چیز کی وساطت سے آن دیکھے نتائج وغیرہ تک پہنچا جائے\*\*۔ اس سے اِعْتَبَرَ الشَّيْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اچھی طرح سے پرکھنا اور اس کی کسی مثال کو سامنے لا کر اس کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا\*\*\*۔ اَلتَّعْبِيرُ۔ خواب کا انجام بتانا۔ اس سے فعل عَبَّرَ يَعْْبُرُ عَبْرًا وَعِبَارَةً بھی آتا ہے\*\*۔ ابن فارس نے اس معنی کی تائید میں خلیل کا یہ قول نقل کیا ہے عَبَّرْتُ الْقَدَنَانِيَّةَ تَعْبِيرًا۔ جس کے معنی دیناروں کو ایک ایک کر کے تولنے کے ہیں۔ یعنی ہاٹ کو دیکھ کر دینار کے وزن کا اندازہ کر لینا۔

خواب کی تعبیر کے لئے یہ مادہ (۱۲۳) میں آیا ہے۔ عِبْرَةٌ\* (۱۶۶) میں۔ فَاَعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ (۵۹) میں۔ یعنی مظاہر فطرت یا تاریخی شواہد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض و غایت اور قوانین خداوندی کے مقصود و مطلوب تک پہنچ جانا ارباب بصیرت کا کام ہے۔

عَبَّرَ السَّبِيلَ (راستہ قطع کرنے) سے، عَابِرِي سَبِيلِ آبا ہے (۱۲۳) جس کے معنی ہیں، راستے کو پار کرنے والے۔

## ع ب س

عَبَسَ وَجْهَهُ - اسنے اپنا چہرہ بگاڑ لیا۔ عَبَسَ تَعْبِيسًا کے بھی یہی معنی ہیں۔ اَلْعَبَّاسُ - وہ شخص جس کے چہرے پر ہر وقت شکن پڑی رہے۔ شیر کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْعَبَسُ دراصل اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے ساتھ لگ جائے اور خشک ہو جائے\*۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ عَبَسَ (۲۲)۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی یا چہرہ بگاڑا۔ دوری جگہ ہے۔ يَوْمًا عَبَّوْا قَمَطَرَ يَرًّا (۲۱)۔ ایسا دن جس کا چہرہ سخت شکن آلود ہو۔ بڑا بھیانک دن۔ جسکی سختی سے لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں۔ راغب نے کہا ہے کہ سینہ کی تنگی سے چہرے کے بگڑنے کو کہتے ہیں\*\*۔

## ع ب ق ر

عَبْقَرٌ - صحراء میں ایک چشمہ یا آبادی کا نام تھا جسکے متعلق عربوں میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں۔ وہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتے جسکا بنانا دشوار ہوتا اور اسمیں نادرہ کاری کا نمونہ ہوتا تو وہ کہہ دیتے کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں، یہ تو عَبْقَرٌ والوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یعنی جنموں کی۔ ابن سیدہ نے عَبْقَرٌ، یمن کے ایک شہر کا نام بتایا ہے جہاں کپڑوں اور فروش پر نقاشی، کڑھائی اور زری کا کام کیا جاتا تھا، وہاں کے کپڑے حسن و رعنائی میں ضرب المثل تھے۔ چنانچہ جب کسی چیز میں انتہائی حسن و جودت بتائی ہوتی تو اسکی طرف نسبت کردی جاتی تھی۔ اس کے بعد اَلْعَبْقَرِيٌّ۔ ہر کامل، غیر معمولی، اور سب سے اعلیٰ شے، نیز قبیلے کے سردار اور بلند مرتبہ شخص کو کہنے لگ گئے۔ فراء نے کہا ہے کہ اسکے معنی نہایت عمدہ دییز فرش کے ہیں یا دیساج کے\*\*\*۔ قرآن کریم نے عَبْقَرِيٌّ حِيسَانٍ کہا ہے (۵۹)۔ حسین اور نادر فروش۔

## ع ت ب

اَلْعَتَبَةُ - دروازہ کی چوکھٹ۔ اَلْعَتَبَةُ (کسی معاملہ میں) سختی۔ یا نہایت ناخوشگوار بات۔ چنانچہ سخت اور پتھر بلی زمین کو بھی اَلْعَتَبَةُ کہتے ہیں\*\*\*\*۔ نیز ایسی زمین کو بھی جو وہاں اترنے والے کے لئے سازگار نہ ہو\*\*۔ اَلْعَتَبُ - اونٹ کا تین پاؤں پر چلنا جبکہ اسکا ایک

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* تاج - راغب - محیط - \*\*\*\* تاج و محیط۔

پاؤں بندھا ہوا یا زخمی ہو۔ آدمی کا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں پر کود کود کر چلنا۔ تَعْتَبَ عَلَيَّهِ - وہ اس پر ناراض ہو گیا۔ اَلْمُعْتَابُ وَالْمُعْتَابَةُ - باہم غصہ اور ناراضگی کو بیان کرنا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور صعوبت کے ہیں۔ چنانچہ سیڑھی کے درجات کو عَتَبَات کہتے ہیں۔ نیز پہاڑوں میں پتھروں کی جو سیڑھیاں بنی ہوں انہیں بھی عَتَبَات کہتے ہیں۔ دروازہ کی چوکھٹ کو بھی اس لئے عَتَبَةُ کہتے ہیں کہ وہ نشیمنی جگہ سے ذرا اونچی ہوتی ہے۔ اَلْمُعْتَبِي کے معنی رضامندی ہیں۔ اِسْتَعْتَبَهُ - اس کی رضامندی اور خوشنودی چاہی۔ نیز اس کے معنی اپنی ناراضگی دور کر کے اس سے راضی ہو گیا بھی ہیں\*۔

قَدْ اَعْتَبَنِي فُلَانٌ - جن باتوں کی وجہ سے میں فلاں آدمی پر ناراض تھا اس نے وہ باتیں چھوڑ دیں اور مجھے راضی کر لیا\*۔ اِلَّا سَتِعْتَابُ - رضامندی طلب کرنا۔ معافی چاہنا۔ کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اس ناگواری، ناراضگی اور عتاب کو دور کر دے جو وہ محسوس کر رہا ہے۔ اَلْمُعْتَابُ - راضی کیا ہوا۔ جس سے عتاب دور کر دیا جائے\*۔ قرآن کریم میں ہے وَ اِنْ يَسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ (۲۱/۲۱)۔ اگر وہ ان باتوں کو دور کرنا چاہیں جو ان کے لئے وجہ ذلت و عذاب ہوئی تھیں اور اس طرح ہماری رضامندی طلب کرنا چاہیں تو وہ (ایسا کر نہیں سکیں گے)۔ ذلت اور عذاب ان سے چھوٹ نہیں سکیں گے۔ ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔ (نیز ۱۸/۱۸)۔

## ع ت د

عَتِيْدٌ - تیار۔ موجود۔ حاضر۔ قریب\*\*۔ (۵/۱۸)۔ اَعْتَدَ - تیار کرنا۔ حاضر رکھنا\*\*۔ ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا\*\*\*۔ (۲۱/۲۱)۔ جہنم چونکہ انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے مرتب ہوتی ہے اس لئے وہ اعمال کے ساتھ ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۲۱/۲۱)۔ ان کے لئے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے خدا نے وہاں اپنے طور پر الگ تیار کر رکھا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی جنت یا جہنم، زندگی کے ہر سانس

میں ساتھ کے ساتھ تیار کرتا رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے عنوانات جہنم وغیرہ دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی ہر فرد جہنم کے سامنے موجود اور اس کے قریب ہے)۔ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی قریب اور موجودگی ہیں۔

## ع ت ق

الْعَيْشِيُّ - حریت - آزادی - شرافت - نجابت - عزت - جمال - عَمَّتَقِ  
الْعَبْدُ يَعْتِقُ - غلام آزاد ہوا - آزاد ہونے والا غلام عَمَّتَقِ \* وَعَدَاتِقِ \*  
کہلائیگا \* - قرآن کریم میں خانہ کعبہ کو الْبَيْتُ الْعَمَّتَقِ کہا گیا ہے (۲۹)۔ یعنی نظام خداوندی کا وہ مرکز جو دنیا میں ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہے۔ جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہیں۔ نہ ذہنی نہ حکمرانی۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی انہی معانی کی تائید کی ہے۔ کسقدر بلند ہے وہ مقام جو ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو۔ اور کسقدر صاحب شرف و عظمت ہے وہ قوم جس کے مرکز کی بہ شان ہو۔ رَاحِ \* عَمَّتَقِ \*۔ وہ سربند شراب جسکی مہر کسی نے نہ توڑی ہو۔ شراب کہنہ - عَمَّتَقِ الْفَرَسِ \* عَمَّتَقًا - گھوڑا چلنے میں آگے نکل گیا \*۔ تعریفات میں ہے کہ عَمَّتَقِ کے معنی لغت میں قوت کے آتے ہیں \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ (i) ساخت اور اخلاق دونوں اعتبارات سے معزز و مکرم ہونے کے لئے۔ اور (ii) قدیم ہونے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ الْعَمَّتَقِ ہر پیشرو چیز کو کہتے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار سے ہو، خواہ مکان کے اعتبار سے، یا رتبہ کے اعتبار سے \*\*\*۔ لہذا کعبہ کے الْبَيْتُ الْعَمَّتَقِ۔ (۲۹) ہونے میں اس کا آزاد، صاحب قوت، اور شرف و عظمت نیز زمان کے اعتبار سے سب سے بلند اور آگے ہونا، تمام معانی آجاتے ہیں۔ یہی مقام اقوام عالم میں امت مسلمہ کا تھا۔ اس لئے کہ کعبہ درحقیقت نشان (Symbol) ہے نظام خداوندی کا اور اس قوم کا جس کا وہ مرکز ہے۔ جس طرح دارالسلطنت یا عَمَّتَقِ کسی مملکت کا نشان ہوتا ہے۔ اور عَمَّتَقِ کی سربلندی سے مراد خود اُس مملکت کی سربلندی ہوتی ہے۔

زمان (Time) کے لحاظ سے کعبہ کے تقدم ہونے کے معنی یہ ہونگے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے قومی مرکز (بیت المقدس) سے بہت پہلے (ملت ابراہیمی کے مرکز کی حیثیت سے) وجود میں آیا تھا۔

## ع ت ل

الْعَتَلَةُ - سوہے کا ایک موٹا سا ڈنڈا جس کا ایک سرا آگے سے ذرا چوڑا ہو (گینتی)۔ اس سے زمین یا دیوار کھودی یا ڈھائی جاتی ہے۔ نیز اس سے کھجور کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں۔ الْعَتَلُ - کسی کو نہایت بیدردی اور بیرحمی سے گھسیٹنے اور اٹھا لینے، نیز ہانکنے میں نہایت سختی اور طاقت سے زیادہ زور ڈالنے کے معنوں میں آتا ہے۔ أَخَذَ بِيْزِمَامِ الثَّقَانَةِ فَعَتَلَمَهَا - اس نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور اسے نہایت بے دردی کے ساتھ کھینچا۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ عَتَلَهُ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جیلخانے کی طرف نہایت بے دردی سے کھینچ کر لے جانا یا دھکے دیکر لیجانا۔ هُوَ مِعْتَلٌ - وہ بیدردی کے ساتھ کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے\*۔ راغب نے کہا ہے کہ الْعَتَلُ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس مقام سے پکڑنا جہاں اس کے مختلف حصے جمع ہو جاتے ہوں اور بزور اسے گھسیٹنا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہیں۔

سورہ دخان میں ہے فَاَعْتَلَوْهُ اِلٰی سَوَاعِدِ النَّجْمِ (۳۳)۔ اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔ الْعَتَلُ - بہت کھانے والا اور مال کو روک کر رکھنے والا۔ خیر خواہی کی باتوں سے اے-راض کرنے والا۔ بہت جھگڑالو\*\*\*۔ بیرحم۔ بیدرد۔ سخت گیر۔ اس میں یہ تمام معانی آجائینگے۔ قرآن کریم میں ہے عَتَلٌ بِعَدَدِ ذِي الْيَسْكَ زَنْيِمٌ (۱۸)۔ (زَنْيِمٌ کے لئے دیکھئے عنوان ز۔ ن۔ م)

## ع ت و

عَتَا - يَعْتُو - عَتِيًّا وَ عَتُوًّا - حد سے تجاوز کر جانا۔ حکم عدولی کرنا۔ عَتَتِ الرِّيحُ - ہوا تندہی و تیزی میں حد سے بڑھ گئی۔ یعنی جھکڑ اور آندھی بن گئی\*\*\*۔ سورۃ حاقہ میں قوم عَاد کے متعلق ہے قَالُ هَلِيْكَوْا بِرِّيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۱۶)۔ انہیں سخت زبردست آندھی کے طوفان نے ہلاک کر دیا۔ لَيْسَ عَاتٍ - سخت تساریک رات کو کہتے ہیں\*\*\*۔ مَلِكٌ عَاتٍ - جابر اور سنگی دل بادشاہ کو\*\*\*۔ سورۃ طلاق میں ہے عَتَتِ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا (۸)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے حکم سے سرکشی کی۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تکبر اور غرور کے ہیں۔ سورۃ فرقان میں ہے وَ عَتَوُوا عِثْوًا كَبِيرًا (۲۹)۔ انہوں نے سخت سرکشی اختیار کی۔ سورۃ مریم میں ہے اَشْدُّ عَلَيَّ الرَّحْمَنِ عِثْوًا (۱۹) جو رحمن کے خلاف سرکشی میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ لیکن دوسری جگہ یہ لفظ صرف شدت اور انتہا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وَ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ الْكِبَرِ عِثْوًا (۱۸)۔ میں بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں۔ یعنی بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ راغب کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ جانا جہاں اصلاح اور مداوا کا امکان نہ رہے۔

## ع ث ر

عَثَرَ السَّيْرُ - رگ پھڑکی۔ عَثَرَ عَثُورًا - کسی بات پر بغیر قصد کے مطاع ہو جانا۔ عَثَرَ عَلَى السَّيْرِ - وہ راز سے واقف ہوا۔ اَعَثَرَهُ - اسے آگاہ اور مطاع کیا۔ کہتے ہیں اَعَثَرْتُ فُلَانًا عَلَيَّ كَذَا - میں نے فلان کو اس چیز سے باخبر اور اس پر مطلع کس دیا۔ قرآن کریم میں ہے وَ كَذَلِكَ اَعَثَرْنَا عَلَيْهِمْ (۲۹)۔ اس طرح ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا۔ یعنی لوگوں کو ان کی خبر مل گئی۔ ان کا پتہ چل گیا۔ دوسری جگہ ہے فَانْ عَثِرَ عَلَيَّ اَنْتَهُمَا اسْتَحَقَّتَا اِثْمًا (۵)۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو، یا اس کا علم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اَلْعِثْوُ کسی چیز کے اثر، خفی کو کہتے ہیں۔ نیز مٹی۔

## ع ث ی

عَثَى کے معنی ہیں سخت فساد پیدا کرنا۔ شیرازہ بکھیرنا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ (ع - ث - ی) اور (ع - ی - ث) کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے، تاہم بیشتر یہ لفظ (یعنی عَثَى) ذہنی اور فکری فساد کے لئے بولا جاتا ہے\*\*\*۔ صاحب المنار نے لکھا ہے کہ عَثَا کے معنی ہیں شر اور فساد پھیلانا، شرارت اور بد معاشی عام کرنا\*\*\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فساد کے لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَ لَا تَعَثُوا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِينَ (۲)۔ ملک میں انتشار پیدا نہ کرو۔ معاشرہ میں فساد مت پھیلاؤ۔

## ع ج ب

الْعَجَبُ\* - جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے سلا ہوا ہو۔ ہر چیز کا آخری حصہ\*۔ تَعَجُّبٌ\* اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی بات کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ یا اس کیفیت کو کہ تم کسی چیز کو دیکھو اور وہ تمہیں پسند آئے اور تم سمجھو کہ تم نے ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جس چیز سے تعجب کیا جاتا ہو، یا جس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے اس سے اظہار حیرت و انکار کیا جائے، اسے عَجَبٌ کہتے ہیں\*\*۔ اس گھبراہٹ کو بھی عَجَبٌ کہتے ہیں جو کسی کام کو بہت بڑا سمجھنے سے طاری ہوتی ہے۔ جس جیسی چیز عام طور پر نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِيبٌ کہتے ہیں۔ الْعَجَبُ کے معنی غرور اور تکبر۔ خود رائی اور خود پسندی کے ہوتے ہیں\*۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عَجِيبٌ اس بات کو کہتے ہیں جس سے تعجب پیدا ہو اور عَجَابٌ اسے کہتے ہیں جو عَجِيبٌ کی حد سے تجاوز کر گیا ہو۔

قرآن کریم میں ہے مَن يَعْجِبُكُمْ قَوْلُهُ، فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۴)۔ اس کے معنی حیرت میں ڈالنے یا بھلی معلوم ہونے کے ہیں۔ یعنی دنیاوی زندگی کے متعلق جس کی بات تمہیں حیرت میں ڈالتی ہے۔ سورۃ جن میں ہے اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۶۲)۔ اس میں اس حیرت کی طرف اشارہ ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو۔ یعنی وحی کی مسابہت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے تعجب، کہ یہ قرآن کریم اس قسم کا عجیب و غریب کس طرح بن گیا؟

سورۃ احزاب میں ہے وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ حُسْنُهُمْ (۳۳/۵۲) خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔

## ع ج ز

عَجَزٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اسے ایسے وقت میں حاصل کرنے کے ہیں جب کہ وہ بالکل ہاتھ سے نکل رہا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی بات سے قاصر رہ جانے اور اسے کرنے کی طاقت نہ ہونے

\*تاج و راغب - \*\*قرآن کریم (۶۲) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کے یہی معنی موزوں نظر آتے ہیں اگرچہ کتب لغت میں یہ معنی نہیں ملتے۔ اس کے مصدری معنی بھی کئے جا سکتے ہیں۔

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کا پچھلا حصہ لکھے ہیں۔ پیچھے رہ جانا خود عَجَزٌ کی دلیل ہے۔ چنانچہ اَلْعَجْزَةُ - بوڑھے آدمی کے سب سے آخری بچے کو کہتے ہیں۔ تَعَجَّزْتُ التَّعْيِيرَ - میں اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار ہو گیا\*۔ اَلْعَجْوُزُ کے قریب ایک سو معانی کتب لغت میں لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (عَجْوُزٌ عَقِيْمٌ ۵۹) - بوڑھی یا کمزور اور ضعیف عورت کے لئے آیا ہے۔ اَلْعَجْزُ - کولہا - کسی چیز کا آخری حصہ - اس کی جمع اَعْجَازٌ ہے۔ نیز درخت کے تنے کے آخری حصہ کو بھی کہتے ہیں جو زمین سے متصل ہوتا ہے۔ اَعْجَازُ نَخْلٍ (۵۳) کے معنی ہیں کھجور کے درختوں کے جڑ والے تنے۔ اَعْجَازٌ - عاجز کرنا - کمزور کرنا - کمزور سمجھنا۔ اِنَّهُمْ لَا يَسْعُجِزُوْنَ (۸۹) - وہ عاجز نہیں کر سکتے۔ مُعْجِزٌ - عاجز کرنے والا - شکست دینے والا (۱۲۲)۔ نیز مُعْجِزِيْنَ (۵۲) - ایک دوسرے کو شکست دینے اور بے بس کرنے کی کوشش کرنے والے -

قرآن کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والے جو جی میں آئے کرلیں، وہ کبھی قانون خداوندی کو شکست نہیں دے سکتے۔ جو قانون انسانوں سے شکست کھا جائے وہ خدا کا قانون کیا ہوا؟ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انسانوں کی جماعت اس قانون کے نفاذ کی کوشش کرے تو وہ اپنے نتائج انسانی پیمانوں کے مطابق (جلدی) سامنے لے آتا ہے، اور اگر وہ کائناتی طریق پر کارفرما رہے تو اس کے نتائج کائناتی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتے ہیں (جن کی رو سے ایک ایک ”یوم“ ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے)۔ شکست اس قانون کو کبھی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ہاں جن معنوں میں معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، (یعنی نبی سے کسی ایسی خارق عادت بات کا سرزد ہونا جسے دیکھ کر دوسرے عاجز آجائیں) قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا۔

## ع ج ف

اَلْعَجْفُ - موٹاپے کا جاتے رہنا۔ اَعْجَفْتُ\*\* (جمع عَجَافٌ) - دبلا، لاغر،\*\*\*۔ سورۃ یوسف میں سَبْعٌ عَجَافٌ (۱۲) آیا ہے۔ یعنی سات دبلی پتلی (گائیں)۔ عَجَفَتْ نَفْسُهُ عَنْ الطَّعَامِ - اس نے بھوک کی خواہش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کھانے سے روک لیا\*\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (i) لاغری اور (ii) ضبطِ خویش کے لکھے ہیں۔

\* تاج و راغب - بظاہر یہ عجیف کی جمع معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاغر ہیں۔\*\*\* تاج و محیط -



## ع ج ل

الْعَجَلُ - الْعَجَلَةُ - جلدی - تیزی - راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں کسی چیز کو اسکے وقت سے پہلے ہی حاصل کر لینے کی خواہش۔  
 أَعْجَلْتِ الشَّاقَّةَ - اونٹنی نے وقت سے پہلے ہی نا تمام بچہ دیدیا۔  
 أَلَا عَجَالٌ فِي السَّيْرِ - اونٹ کا اٹھ کھڑے ہونے میں جلدی کرنا۔ یعنی سواری ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے اور اونٹ اٹھ کھڑا ہو۔ أَلَمْ يَعَجَلْ - وہ کھجور کا درخت جسکا پھل پہلے پک جائے۔ أَلَمْ يَعَجَلْ - وہ تھوڑا سا کھانا جو کھانے سے پہلے یونہی سہارے کے لئے پیش کیا جائے۔ مُسْتَعْجَلَاتُ الطَّيْرِ بِقِيٍّ - قریب اور مختصر راستے\*۔

قرآن کریم میں تَعَجَّلَ بِمَقَابِلِهِ تَأَخَّرَ آیا ہے (۲/۳)۔ اور عَاجِلَةٌ بِمَقَابِلِهِ آخِرَةٌ (۱۸/۱۹)؛ (۲/۳)۔ قرآن کریم کی یہ دو اصطلاحات (عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ) بڑی غور طلب ہیں۔ (انکے تفصیلی مفہوم کیلئے ا۔ خ۔ ر اور د۔ ن۔ و کے عنوانات دیکھئے)۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے جو انہوں نے بیج کے لئے رکھے ہیں۔ انکے ہاں کھانے کی تنگی ہے۔ ان میں سے ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا لاتا ہے۔ اسکے گھر میں گھنٹہ بھر میں روٹیاں ہی روٹیاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن دوسرا کسان اس وقتی تنگی کو برداشت کر لیتا ہے اور اس گندم کو اپنے کھیت میں بـو دیتا ہے۔ اس پر چھ سات مہینے کا زمانہ تو بڑا سختی کا گزرتا ہے لیکن اسکے بعد اسکے گھر دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں اور وہ بڑی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اول الذکر کسان نے عجلت سے کام لیا۔ یعنی اسکی نگاہ مفاد عاجلہ پر تھی۔ ایسے مفاد پر جو جلدی سے ہاتھ آجائیں۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ مفاد آخرہ پر تھی، یعنی مستقبل کی خوش حالی اور فارغ البالی پر۔ یہ ہے فرق عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ کا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر ہوتی ہے ہم انہیں مفاد عاجلہ دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل کی خوشگوار یوں میں انکا کوئی حصہ نہیں ہوتا (۱۸/۱۹)۔ اسکے برعکس جو لوگ مستقبل کی خوشگوار یوں پر نگاہ رکھتے ہیں تو انکا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور (ابتدائی محنت کے بعد) حال بھی خوشگوار (۱۸/۱۹)۔ یہی دو گروہ ہیں جنکا تقابل سارے قرآن کریم میں نظر آتا ہے۔

ایک پیش پا افتادہ، قریبی مفاد کی طرف لپکنے والے۔ (تَحْيِثُونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ)۔ (۲۸: ۲۵-۲۶)۔ اور دوسرے، مستقبل کی خوشگوازیوں کیلئے کوشش کرنے والے۔ ”مستقبل“ میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں موجودہ نسل کے بعد آنے والی انسانیت (Humanity)۔ اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس میں ”عَاجِلَةَ“ اور ”آخِرَةَ“۔ حال اور مستقبل۔ دونوں کی خوشگوازیوں حاصل ہو جائیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک گروہ وہ ہے جو انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی (Physical Life) قرار دیتا ہے جس کے مفاد اور تقاضے پیش پا افتادہ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ، انسان کو عبارت سمجھتا ہے اسکی طبیعی زندگی اور اسکی ذات سے۔ طبیعی زندگی، موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات مرنے کے بعد آگے چلتی ہے۔ اس لئے جن مفادات کا تعلق انسانی ذات سے ہے وہ عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ ہیں۔ یہ مستقل اقدار سے حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے۔ یوں ”دنیا اور آخرت“ دونوں کی خوشگوازیوں حاصل ہو جاتی ہیں۔

الْعَاجِلُ۔ لغت حمیر میں مٹی کو کہتے ہیں۔ اسی لئے خَلِيقُ الْاِنْسَانِ مِّنْ عَجَلٍ (۱۱۱) کے معنی کئے گئے ہیں انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے\*۔ (اسکی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں تخلیق انسانی کی ابتدا طین۔ مٹی۔ سے بتانی گئی ہے۔ ۳۲)۔ لیکن سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا (۱۶)۔ انسان جلد باز ہے۔ اس لئے (۱۱۱) میں بھی اسکے یہی معنی لئے جائیں تو زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ بالخصوص جب اسی آیت میں فَلَا تَسْتَعْجِلُوْا بِهٖ (۱۶) بھی آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ مفاد عاجلہ کے پیچھے جاتا ہے۔ یہ صرف وحی کا قانون ہے جس کے تابع چلنے سے اسکی نگاہ مستقبل پر بھی رہتی ہے۔ دوسری طرف، اسی عجلت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہ اعتراض کرتا ہے کہ اسکی غلط روش کے نتائج فوراً سامنے کیوں نہیں آتے۔ حالانکہ خدا کے قانون مہلت کی رو سے ہر عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جس طرح بیج اور اسکے پھل کے درمیان ایک مہلت کی مدت ہوتی ہے)۔ جن کی نگاہ خدا کے اس قانون پر ہوتی ہے وہ اس سے نہیں گھبراتے کہ مخالفین کی غلط روش کا نتیجہ فوراً کیوں نہیں سامنے آتا؟ انہیں خدا کے محکم قانون کی نتیجہ خیزی پر یقین ہوتا ہے۔

الْعِجْلُ - بچھڑا - بعض کا خیال ہے کہ ایک ماہ تک کی عمر کے گائے کے بچے کو عِجْل کہتے ہیں \*۔ (۹۲)؛ (۲۸۸) - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایک سال تک کی عمر کے گوسالہ کو عِجْل کہتے ہیں \*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس میں عجلت کا تصور موجود ہے - یعنی بچھڑا پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے اور یہ پھرتی اور تیزی بیل بننے کے بعد اس میں باقی نہیں رہتی \*\*\*۔

سورہ القیلمہ میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُعْجِرْکَ بِیْہِ لَیْسَ اَنْتَکَ لِتَعْجَلَ بِیْہِ (۹۵) - اس کے لفظی معنی ہیں، تو اپنی زبان کو اسکے ساتھ حرکت نہ دے تاکہ اسے جلدی لے لے - لیکن (جیسا کہ ح - ر - ک کے عنوان میں بھی لکھا گیا ہے) اس کے معنی (۲۱۳) کو ساتھ ملانے سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے کہہ وَلَا تَعْجَلَ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُنْزِلَ اِلَیْکَ وَحِیْہُ، یعنی تو (کسی نقطہ کے متعلق) عملی قدم اٹھانے میں عجلت نہ کر تا آنکہ اس کے متعلق پورا پروگرام بذریعہ وحی تجھے دیدیا جائے۔ جب وحی سارا پروگرام سامنے لے آئے پھر اس کے متعلق عملی اقدام کرو۔

ہم نے (ح - ر - ک) کے عنوان میں ضمناً یہ بھی کہا ہے کہ اس سے انسانی اعمالنامہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے - اس صورت میں (۹۵) کا (۲۱۳) سے تعلق نہیں ہوگا - لیکن (۲۱۳) کا مفہوم اس کے بغیر بھی واضح ہے۔

## ع ج م

لغت عرب میں (ع - ج - م) کا مادہ ابہام اور اخفاء کیلئے آتا ہے - یعنی وضاحت اور بیان کے خلاف - اَلَا عَجَمٌ - وہ آدمی جسکی بات فصیح اور واضح نہ ہو اگرچہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو (جمع اَعْمَاجِمٌ - اَعْجَمُوْنَ اَعْجَمِیْنَ) - پھر اسکے بعد اَلْعَجَمِیُّ ہر غیر عرب کیلئے بولا جانے لگا خواہ وہ فصیح ہی کیوں نہ ہو - اَلَا عَجَمٌ - گونگا۔

لطائف اللغہ میں ہے کہ اَلْعَجَمِیُّ غیر عرب کیلئے بولا جاتا ہے خواہ وہ فصیح بیان ہی کیوں نہ ہو - اور اَلَا عَجَمِیُّ غیر فصیح، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو - اَعْجَمٌ فُلَانٌ اَلْکَلَامَ - فلاں نے بات مبہم رکھی - بَابٌ مُعْجَمٌ - بند دروازہ - اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ - گھر سونا ہو گیا اور اسمیں جواب دینے والا کوئی نہ رہا \*\*\*\* - ابن فارس نے سکوت اور خاموشی

کو اس کے بنیادی معنوں میں لکھا ہے۔ قرآن میں **أَعْجَمِي** <sup>۱۱۳۸</sup> بمقابلہ **عَرَبِي** <sup>۱۱۳۹</sup> **مُتَّبِعِينَ** آیا ہے <sup>(۱۱۳۸)</sup>۔ نیز دیکھئے <sup>(۱۱۳۸ ; ۱۱۳۹)</sup>۔ **الْعَرَبِي** <sup>۱۱۳۹</sup> کے معنی فصیح ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ ب)

## ع د د

**إِعْدَادٌ** \* کے معنی ہیں تیار کرنا۔ مہیا کرنا۔ **أَعْدَدْتُ لِيَحْمِلُوا ذُرِّيَّ** <sup>۱۱۳۸</sup> **الْقَدُورِ مِنَ الْمَالِ وَالسَّيْلَاحِ** کے معنی ہیں میں نے حوادثِ زمانہ کے لئے مال و ہتھیار کی پوری پوری تیاری کر لی۔ **إِسْتَعْدَدْتُ** <sup>۱۱۳۹</sup> کے معنی بھی یہی ہیں۔ یعنی اس کے لئے مستعد اور تیار ہو گیا۔ **عَدَدٌ يَعْدُدُ عَدَدًا** کے معنی ہیں شمار کرنا۔ گنتی کرنا۔ **عَدَدٌ** اور **عَدْرِيَّةٌ** اس سے اسم آیا ہے \*۔  
(**وَلَا تَعْدُوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصَوْهَا**) <sup>(۱۱۳۹)</sup>۔ **مَعْدُودٌ** \*۔ گنے ہوئے \*۔ **أَيَّامًا مَعْدُودَةً** <sup>(۱۱۴۰)</sup> گنتی کے دن \*۔ وہ دن جن کی تعداد معلوم ہو۔ چنانچہ جب حضرت یوسفؑ کو قافلہ والوں نے بازار مصر میں بیچا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم میں **دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ** <sup>(۱۱۴۰)</sup> آیا ہے۔ یعنی انہوں نے اسے چند گنتی کے سکون کے عوض بیچ ڈالا۔ روزوں کے لئے بھی **أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ** آیا ہے <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ لیکن اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کردی گئی ہے جہاں کہا گیا کہ **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** <sup>(۱۱۴۲)</sup>۔ یعنی جو تم میں اس مہینہ (رمضان) میں اپنے مکان پر موجود ہو اسے چاہئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اس سے واضح ہے کہ روزے رمضان کے پورے مہینے کے ہیں۔ عیدۃ \* اس شمار کی ہوئی مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی \*۔ اور **الْعُدَّةُ** \* اس مال و دولت یا ساز و سامان کو کہتے ہیں جسے حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان تیار رکھے \*۔ **عُدَّةٌ** شمار کرنا۔ <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ **عَدَدٌ** متعدد، گنے ہوئے، <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ **عِيدَةٌ** \*۔ تعداد۔ گنتی <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ **عُدَّةٌ** \*۔ سامان جو تیار ہو۔ جو کسی حادثہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھا جائے۔ <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ **أَعْدَدْتُ**۔ تیار کرنا۔ مہیا کرنا <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔ **إِعْتَدْتُ**۔ شمار کرنا <sup>(۱۱۴۱)</sup>۔

## ع د س

**الْعَدَسُ** \*۔ مسور کو کہتے ہیں \*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ <sup>(۱۱۴۱)</sup> میں آیا ہے۔

## ع د ل

الْعِدْلُ\* - اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے - ان میں سے ہر ایک عِدْلُ\* کہلاتا ہے - لہذا اس کے بنیادی معنی ہیں برابر ہونا - عَدْلُ الثَّمِيرِ اَنَ - میزان کو برابر کر دیا - فَاعْتَدَلَ - پس میزان برابر ہو گئی - عَادَلَهُ مَعْتَادِلَةً - اس کے هموزن اور برابر ہوا - عَادَلَ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ - دو چیزوں کو باہم دگر ہم وزن کیا - برابر کیا - نیز دو چیزوں کا موازنہ کیا - عَدْلَهُ فِي التَّحْمِيلِ وَ عَادَلَهُ - محمل میں کسی دوسرے کے ساتھ سوار ہونا اور اس کے ساتھ وزن میں برابر ہونا - اَلْعِدْلُ\* - اَلْعِدْلُ\* - اَلْعِدْلُ\* - مثل اور نظیر - هموزن - اَعْتَدَلَ\* - کمیت و کیفیت کے لحاظ سے دو حالتوں کے درمیان ہونا - تناسب و توازن - قرآن کریم میں ہے فَعَدَلَكَتَ (۸۲) - خدا نے انسان کو متناسب الاعضاء بنایا - اس میں پورا پورا توازن و تناسب قائم رکھا - اسے سیدھا کھڑا کیا - اس کے لئے توازن کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے -

کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عَدْلُ\* کہلاتا ہے - اَوْ عَدْلُ\* ذَالِكَ صِيَامًا (۹۵) - ”یا اس کے برابر روزے رکھنا“ - ابن قارس نے عَدْلُ\* کے معنی فدیہ بھی بتائے ہیں - لَا يَتَوَخَّذُ مِنْهَا عَدْلُ\* (۲۸) - اس سے معاوضہ یا فدیہ نہ لیا جائیگا - يَا وَ اِنْ تَعْدِلْ\* كُلَّ عَدْلٍ (۱۰۱) - اور اگر وہ ہر قسم کا معاوضہ دینا چاہے - سورة حِجْرَات میں عَدْلُ\* اور قِسْطُ\* کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۲۹) - (قِسْطُ\* کا مفہوم عنوان ق - س - ط میں بیان کیا جائیگا) - قرآن کریم نے عَدْلُ\* اور اِحْسَانُ\* کا حکم دیا ہے (۹۱) - کسی کو پورا پورا معاوضہ دے دینا عَدْلُ\* ہے اور اس کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا اِحْسَانُ\* ہے (دیکھئے عنوان ح - س - ن) -

مثل اور نظیر کے معنوں میں یہ لفظ سورة انعام میں آیا ہے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وَ هُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ (۱۵۱) - یہ لوگ دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں -

عَدَلَ عَنِ الطَّرِيقِ کے معنی ہیں راستہ سے ہٹ جانا - عَدَلَ الطَّرِيقِ - راستہ ایک طرف کو مڑا یا جھکا\* - عَادَلَ الشَّيْءَ\* - وہ چیز ٹیڑھی ہو گئی\*\* - سورة النمل میں ہے بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ (۲۴) -

یہ وہ لوگ ہیں جو سیدھے راستے سے ایک طرف ہٹ گئے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی ہموار ہونا۔ اور ٹیڑھا ہونا۔ لیکن غالب یہ ہے کہ ٹیڑھا ہونے کا مفہوم عَن سے پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ مقدر کیوں نہ ہو۔

قرآنی معاشرہ کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ہوتی ہیں۔ اس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے۔ کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن اس معاشرہ کے افراد نے شروع ہی سے یہ عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ اتنا ہی لینگے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب نوع انسانی کی ربوبیتِ ہامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینگے۔ (۲/۱۹)۔ یہ بقایا ان لوگوں کے لئے ہوگا جو کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے اور جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ ان کی اس کمی کو پورا کر دینے کا نام احسان\* ہے۔ یہ احسان کسی پر ”احسان“ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی شکل خیرات کی ہوتی ہے۔ ان تمام افراد معاشرہ نے اس امر کا عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ ان کی محنت کا ماحصل سب کی نشوونما کے لئے کھلا رہے گا۔ یہ سب کچھ نظام معاشرہ کی تحویل میں رہتا ہے اور تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عدل و احسان کے حکم کے ساتھ ہی کھدیا ہے کہ فَتَحْشَاءُ اور مَنَّكَر سے باز رہو (۱/۹)۔ فَتَحْشَاءُ کہتے ہیں۔ بخل کو، اور مَنَّكَر کہتے ہیں عقلِ فریب کار کی حیلہ جو انہوں کو جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اکساتی رہتی ہے۔

## ع د ن

عَدْنٌ - يَتَعَدَّنُ وَ يَتَعَدَّنُ - کسی جگہ قیام کرنا۔ ٹھہرنا۔ جَنَائَاتِ عَدْنٍ - ایسے باغات جن میں جم کر قیام کیا جاسکے۔ اَلْمَعْدِنُ - کان۔ (Mine) - ہر چیز کی جگہ جہاں اس کی پیداوار ہو اور وہ وہاں مستقل طور پر پائی جائے۔ ہر چیز کا مرکز۔ اَلْمَعْدَانُ - جڑیں\*۔ قرآن کریم میں جَنَائَاتِ عَدْنٍ (۹/۲۲) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں راحت و آرام کی قیام گاہیں۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ”قیام کرنے کے باغ“ لکھے ہیں۔ یعنی ایسے باغیچے جن میں قیام بھی کیا جاسکے۔

## ع د و

الْعِدَاءُ وَالْعِدْوَاءُ کے معنی ہیں دوری۔ اَلْعِدَائِیُّ - اجنبی لوگ جو ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ اَلْعِدْوَةُ - دور جگہ۔ اَلِیْعْدُوَّةُ (ع) ہر تینوں حرکتیں) کنارہ۔ اَلْعِدَائِیُّ - وہ لکڑی جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے (اس طرح وہ دونوں لکڑیاں ایک دوسرے سے دور رہتی ہیں)۔ تَعَادَی کے معنی ہیں ایک دوسرے سے دور ہونا\*۔ گویا اس مادہ میں ایک بنیادی مفہوم دوری کا پایا جاتا ہے۔

اسی بُعد اور افتراق کی وجہ سے عَدُوٌّ وَّ شَرٌّ دشمن کہہ سکتے ہیں۔ یعنی صَدْرِ بَقِی (دوست) کی ضد۔ نَبِزٌ وَ لَیٌّ کی ضد (یعنی جو مددگار نہ ہو)۔ تَعَادَی التَّوْمُ - قوم نے ایک دوسرے سے دشمنی رکھی\*۔ اَلْعِدَائِیُّ - وہ دشمن جس سے تمہاری جنگ ہو۔ اَلْعِدَادِیَّاتُ - مجاہدین کے دوڑنے والے گھوڑے۔ (یعنی دور دور تک دوڑ کر چلے جانے والے)۔

عَدَا - یَعْدُوْ - عَدُوٌّ - عَدُوٌّ وَا - عَدُوٌّ وَاثًا - تَعْدَاءُ کے معنی ہیں تیز چلنا۔ دوڑنا۔ تَعَادَا وَا کے معنی ہیں انہوں نے تیز رفتاری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا\*۔ رَاغِب نے کہا ہے کہ عَدُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھنا اور باہمی تطابق و ہم آہنگی نہ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صورت محض رفتار کے اعتبار سے ہو تو اسے عَدُوٌّ کہا جاتا ہے اور اگر دلی کیفیت کے اعتبار سے ہو تو یہ عَدَاوَةٌ کہلاتی ہے، اور اگر عدل و انصاف میں ابتری سے ہو تو عَدُوٌّ وَاَنُ کہلائیگی\*۔ عَدَا عَدَیْتُمْ کے معنی ہیں اس نے اس پر ظلم کیا۔ یعنی حد سے تجاوز کیا۔ تَعَدَّاهُ - وہ اس سے تجاوز کر گیا، آگے بڑھ گیا۔ اور اَعْتَدَی عَدَیْتُمْ کے معنی ہیں اس پر ظلم و زیادتی کی\*۔ عَدُوٌّ وَاَنُ کے معنی بزور اور بدترین طریقہ سے، حد سے تجاوز کرنا بھی ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں حد سے بڑھنا اور ایسے معاملہ میں آگے بڑھ جانا جس میں ایک خاص حد میں رہنا چاہئے تھا۔

اَعْدَی الْاَمْرَ - وہ ایک معاملہ سے دوسرے کی طرف بڑھ گیا۔ اَعْدَاهُ الدَّاءُ - بیماری اس کے ساتھ دوسرے کو لگ گئی۔ مرض متعدی ہو گیا\*۔ التَّعَادِیُّ ناہموار جگہوں کو کہتے ہیں\*۔ اَلْعِدْوَةُ کے معنی ہیں بیماری کا متعدی ہونا۔ نیز کسی والی یا امیر سے ظالم کے خلاف مدد طلب کرنا\*\*۔

قرآن کریم میں قصہ\* آدم میں ہے کہ جب انسانوں نے ”امت واحدہ“ کے بجائے باہمی تشت و افتراق (مشاجرت) کی زندگی شروع کر دی تو ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل ہو گئیں اور ان میں دوری اور بُعد پیدا ہو گیا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ\* (۲/۱۶)۔ اس کے برعکس زندگی اَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ\* (۱۶/۱۶) کی ہے، جس میں دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جائے جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے میں جذب ہو جاتا ہے۔ باہمی عداوت\* سے التَّعَادِي\* نامہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے یہ مادہ مَوَدَّة\* کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۷۰)۔

سورة بقرہ میں اَعْتَدَآء\* اور عِصْيَان\* مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۲/۱۶)۔ یعنی سرکش اور حدود فراموشی۔ اسی طرح عَدُوَّان\* کا لفظ تَقْوٰی کے مقابل میں آیا ہے (۵/۴)۔ تقویٰ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (حدود اللہ) کی نگہداشت کرنا۔ لہذا عَدُوَّان\* کے معنی ہوئے حدود فراموشی۔ حد سے تجاوز کر جانا۔ (۱۶/۱۶) میں یہ لفظ (عَدُوَّان\*) اس زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے سزا کہا جاتا ہے۔ یعنی ظالموں کو۔ و خود ان کا عدوان گھیر لیتا ہے۔ سورة مائدہ میں عَدَاوَةٌ\* اور بَغْضَاء\* اکٹھا آیا ہے (۱۶/۵)۔ سورة کہف میں ہے وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ\* (۱۶/۸)۔ تم انہیں (Over Look) نہ کرو۔ نظر انداز نہ کرو۔ (۸/۸) میں عَدُوَّة\* کے معنی کنارہ ہیں۔

قرآن کریم میں جرم کے لئے لائٹم\* اور عَدُوَّان\* کے الفاظ بالعموم اکٹھے آئے ہیں (مثلاً ۲/۸)۔ لائٹم\* کے معنی ہیں ایسا کام جس سے انسان کی صلاحیتوں میں کمی آجائے اور اس لئے وہ دوسرے افرادِ کارواں کے ساتھ نہ چل سکے بلکہ ان سے پیچھے رہ جائے (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م)۔ اور عَدُوَّان\* کے معنی ہیں سرکشی کر کے آگے بڑھ جانا۔ اسلَام کا نظام یہ ہے کہ تمام افراد امت باہمدگر، بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں (دیکھئے عنوان م۔ ل۔ م)۔ جو شخص جماعت سے پیچھے رہ کر پیچھے رہ گیا (لائٹم\*) وہ بھی مجرم ہے اور جو سرکشی اختیار کر کے ان سے آگے نکل گیا (عَدُوَّان\*) وہ بھی مجرم ہے۔ اور اگر عَدُوَّان کو تَعْدِيَّة\* سے لیا جائے تو اس سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر متعدی ہو، یعنی جن کے

\* تفصیل ان امور کی ا۔ د۔ م اور ش۔ ج۔ ر کے عنوانات میں دیکھئے۔



اثرات سے دوسرے افراد معاشرہ بھی متاثر ہوں، اور انہم سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر اس شخص کی ذات تک محدود رہے۔ (مزید تفصیل ا۔ ث۔ م کے عنوان میں دیکھئے)۔

عَذَابٌ (۱۳۳)۔ حدود شکنی یا سرکشی کرنے والا۔ تَعَذَّلَ (۲۴۹) تجاوز کرنا۔ حد سے آگے بڑھ جانا۔ اَعْتَدَ (۲۴۸) زیادتی کرنا۔ مُعْتَدٍ (۱۶۰)۔ زیادتی کرنے والا۔ اس کی جمع مُعْتَدُونَ اور مُعْتَدُونَ ہے۔

## ع ذ ب

اس سادہ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہیں (۱) پانی کی خوشگوار اور شیرینی جو پیاس کو روک دیتی ہے۔ (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہوتی ہے۔ اور (۳) بندش، منع کرنا، اور رکاوٹ\*۔ ان معانی کو سمجھنے کیلئے صحرائے عرب کی زندگی کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ وہاں پانی بہت کمیاب تھا، اور پھر شیریں پانی؟ یہ نعمت بڑی تلاش و جستجو، محنت و مشقت اور لڑائی جھگڑوں کے بعد ملا کرتی تھی۔ کئی کئی دن اس سے رکنا پڑتا تھا (یعنی بغیر پانی کے رہنا پڑتا تھا) تب کہیں جا کر آب شیریں حاصل ہوتا تھا۔ اس نقشہ کو سامنے رکھتے اور پھر اس سادہ کی تفصیلات پر غور کیجئے۔ اَلْعَذَابُ۔ خوشگوار شیریں پانی۔ قرآن کریم میں ہے هَذَا عَذَابٌ مُّسْتَقَرٌّ (۲۵۵)۔ یہ خوشگوار اور شیریں (پانی والا) ہے۔ اَسْتَعَذَبَ الرَّجُلُ مَاءَهُ۔ وہ شخص میٹھا پانی لایا۔ اور اَعَذَبَ الْحَوْضُ کے معنی ہیں تالاب میں پانی کے اوپر جو تنکے وغیرہ پڑ گئے ہوں انہیں صاف کر دینا۔ اَلَا عَذَابٌ لِّاُولٰٓئِكَ (۲۵۵)۔ دو خوشگوار چیزیں۔ یعنی کھانا اور لذت جماع۔ یا شراب اور لعابِ دہن\*۔

اب اذیت اور تکلیف کا پہلو لیجئے، عَذَابٌ ان تنکوں (یا کوڑے کرکٹ) کو کہتے تھے جو پانی کے اوپر پڑ جائیں اور اس طرح اسے مکدر کر دیں۔ ان کوڑے کی چندیسوں کو بھی کہتے ہیں جسے نوحہ کرنے والی عورتیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ عَذَابَةٌ ایک درخت جسے کھسا کر اونٹ مر جائے ہیں۔ عَذَابٌ۔ سزا، نیز بھوک، پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں\*۔

اب بندش اور رکاوٹ کے مفہوم کو لیجئے۔ عَذُوْبٌ اور عَذَابٌ اُس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے

کھانا پینا چھوڑ دے۔ جو بغیر کچھ کھائے رات گزار دے اسے بھی عَذَابٌ کہتے ہیں\*۔ نیز اسے بھی جسے حفاظت اور سایہ کے لئے جہت نصیب نہ ہو\*\*۔ لہذا بھوک، پیاس، تکلیف، خانماں خرابی، سب کیلئے عَذَابٌ کا لفظ آیا ہے۔ روکنے کیلئے عَذَابٌ عَنْ الشَّمْسِ عَوْءٌ عَذَابٌ وَأَسْتَعِذُّ بِهِ کہتے ہیں۔ یعنی اسے کسی چیز سے روک دیا\*\*\*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معانی کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا نہ ہی ان سب کو کسی ایک معنی پر متحد کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام سختیوں اور تکلیفوں کیلئے جو فرعون کی قوم غالب اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھا کرتی تھی عَذَابٌ کا لفظ استعمال کیا ہے (مثلاً ۲۰)۔ اور سورہ بقرہ کے شروع ہی میں مُفْلِحُونَ (کامیاب اور کامران گروہ) کے مقابلہ میں لَتَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲) لا کر بتا دیا ہے کہ عَذَابٌ کے معنی زندگی کی خوشگوار سبکیوں سے محرومی و ناکامی ہیں۔ ایسی محرومی کہ پھر زندگی کی شیرینیوں سے متنع ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہے۔

نیز یہ لفظ جرم کی اس سزا کے لئے بھی آیا ہے جو عدالت سے ملتی ہے (۲۵، ۲۴)۔ اس میں اذیت کے مقابلہ میں روکنے کا پہلو زیادہ نمایاں ہے کیونکہ سزا سے مقصود ہی جرائم کی روک تھام ہے۔

خدا کی طرف سے عَذَابٌ کے معنی ہیں انسانوں کے غلط کاموں کے تباہ کن اور ہلاکت انگیز نتائج۔ اس اعتبار سے اللہ کو مُعَذِّبٌ کہا گیا ہے (۱۶)۔ اور جو اس طرح تباہ و برباد ہو جائے وہ مُعَذَّبٌ ہے (۱۷)۔

قرآن کریم کی رو سے دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری، خدا کا عذاب ہے (۲۸)۔ بھوک اور خوف، عذاب ہے (۱۱)۔ برکتِ سماوی اور ارضی کے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (۹)۔ گمراہ بندی اور پٹاری بازی عذاب ہے (۷)۔ باہمی اختلاف، عذاب ہے (۳)۔ [اختلافات کا مٹ جانا رحمت ہے۔ ۱۸، ۱۹]۔ یہ عذاب خداوندی کی طرف چند شکلیں ہیں۔ تفصیل اس کی قرآن کریم کے صفحات میں شروع سے آخر تک پھیلی ہوئی ہے۔

## ع ذ ر

الْعَذْرُ - ایسی کوشش جس سے انسان اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کو مٹا دینا چاہے\*\*\*\*۔ نیز وہ حجت جسے انسان بطور اعتذار پیش کرے\*\*\*\*\*۔

\* تاج و لین - \*\* لین - \*\*\* تاج و محیط - \*\*\*\* راغب - \*\*\*\*\* محیط۔

ابن فارس نے اس کے معنی لکھے ہیں انسان کا محض باتوں سے ان اعتراضات و الزامات کو رفع کرنے کی کوشش کرنا جو اس پر عائد کئے جائیں۔ عذْرَة کے اصلی معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہیں۔ اس کے بعد ان نجاستوں اور گندگیوں کو کہنے لگے جو ان میدانوں میں پھینکی جاتی ہیں \*۔ عَذْرَ الشَّيْءِ چیز کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔ پھر (سلب خاصیت کے طور پر) باب افعال سے نجاست اور آلودگی کو الگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ اَعْذَرَ الثَّغْلَامَ اَعْذَارًا کے معنی ہیں اس نے لڑکے کا ختنہ کر دیا۔ لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عذْرَة کہتے ہیں۔ دوسری طرف اَعْذَرَ الرَّجُلُ الدَّارَ گھر میں غلاظت بہت ہو گئی۔ اَعْذَرَتِ الثَّمَنَازِلُ مکانوں کے نشانات مٹ گئے \*\*۔ اس مادہ کے اسی قسم کے مختلف معانی کے پیش نظر ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں قیاس کو بالکل دخل نہیں، بلکہ اس کا ہر لفظ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض اس کے معنوں میں آلودگیوں کا زیادہ ہو جانا بھی ہیں اور آلودگیوں کے نشان کا مٹ جانا بھی۔

سورة مرسلات میں ہے عَذْرًا اَوْ تُعْذِرًا (۴۴)۔ سورة روم میں مَعْذِرَتُهُمْ (۸۰) آیا ہے۔ یہاں مَعْذِرَة مصدر بمعنی عذر ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے معنی عذر خواہی اور معذرت کے علاوہ حجت بھی ہیں \*\*۔ اور سورة فیامہ میں مَعَاذِ يَوْمِهِ (۱۵) ہے، جس کا واحد مَعْذَارٌ ہے۔ لغت بمن میں مَعَاذِ يَوْمٍ کے معنی پردے اور حجابات ہیں۔ اس طرح اَلْقَلْبِ مَعَاذِ يَوْمِهِ کے معنی اصل حقیقت پر پردے ڈالنا ہونگے۔ نیز اس کے معنی حجتیں پیش کرنا بھی ہیں۔

سورة توبہ میں ہے لَا تَعْتَذِرُوا (۹۶) جس کے معنی بہانہ سازیاں کرنا ہیں۔ عَذْرَ کے معنی ہیں ایسا عذر پیش کرنا جو ثابت نہ ہو \*\*۔ چنانچہ سورة توبہ میں مَعْذِرُونَ (۹۶) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والے۔ بہانہ سازیاں کرنے والے۔ کوتاہیاں کرنے والے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ان لوگوں کے ہیں جن کے پاس کوئی عذر تو نہ تھا لیکن وہ بتکلف عذر بناتے تھے۔ تَعْتَذِرُ اَلَا مَرُّ عَلَيْهِ۔ اس پر کام مشکل یا دشوار ہوا۔

لہذا عذر<sup>۲</sup> جہاں سچے دل سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو اپنی خطا کا احساس ہے اور وہ صحیح طور پر بتاتا ہے کہ اس سے ایسا کیوں ہوا، یہ عذر مستحسن ہے۔ لیکن دوسری قسم کا عذر یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر اپنے قصور کی غلط توجیہ کرتا ہے اور اس طرح محض باتوں سے اس کا ازالہ کر دینا چاہتا ہے۔

## عرب

الْعَرَبُ - الْعَرَبُ - اہل عرب - راغب نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کو الْعَرَبُ کہتے ہیں\*۔ لیکن صاحب تاج کے نزدیک يَعْرَبُ بَنٌ قَحْطَانٌ کی اولاد عرب عاربہ کہلاتی ہے۔ یہ شخص یعنی قبائل کا جد اعلیٰ تھا اور اسی نے پہلے پہل عربی زبان میں گفتگو کی تھی\*\*۔ (لیکن یہ توجیہ کچھ وقیع نظر نہیں آتی)۔ لَا عَرَابُ - عَرَابِيٌّ کی جمع ہے۔ یہ لفظ بادبہ نشین (یعنی دیہات اور جنگلوں میں رہنے والے) عربوں کے لئے مختص ہو گیا\*\*\*۔ قرآن کریم میں لَا عَرَابُ (۱/۶) انہی بادبہ نشینوں کو کہا گیا ہے۔

الْعَرَبِيٌّ - واضح کرنے والا - فصیح\*۔ لَا عَرَابُ - کسی بات کو صاف اور واضح کر دینا - بولنے میں غلطی نہ کرنا - عَرَبْتُ لَهٗ الْكَلَامَ - میں نے اس سے بات کھول کر کہہ دی\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں آتا ہے حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳/۱) یا قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۱۲/۱)۔ یا لِسَانًا عَرَبِيًّا (۱۴/۱)۔ تو اس کے معنی صرف عربی زبان کا قرآن نہیں، بلکہ اس کے معنی ہیں واضح کتاب۔ ایسی کتاب جو ہر بات کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ چنانچہ سورۃ زمر میں قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (۳۹/۲) کہہ کر اس کی وضاحت کردی۔ یعنی ایسی واضح کتاب جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔

الْعَرُوبُ - وہ بیوی جو اپنے شوہر کو محبوب ہو۔ اس کی عاشق ہو۔ اپنی محبت کو ظاہر کرتی ہو۔ اس کے ساتھ ہنستی بولتی ہو\*\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کھولنا اور واضح کرنا (۲) نشاط اور طیب نفس (۳) جسم یا عضو میں خرابی کے ہیں۔ نشاط اور طیب نفس سے، عَرُوبٌ خوش دل اور پر نشاط عورت کو کہینگے، لیکن عَرَبْتُ مَعِدَتَهُ کے معنی ہیں اس کا معدہ خراب ہو گیا۔ اس اعتبار سے امْرَأَةٌ عَرُوبٌ خراب اور بد اطوار عورت کو بھی کہتے ہیں۔ عَرُوبٌ کی جمع عَرُوبٌ ہے۔

”جنت“ کی بیویوں کے متعلق ہے عُرُبًا اَثَرَابًا (۵۱)۔ لیکن سباق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ (محبت اور پیار کے علاوہ، جو ایک اچھی بیوی کی بنیادی صفت ہے) اس سے مراد شائستہ، مہذب، فصیح الکلام، واضح اور صاف باتیں کرنے والیاں بھی ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے عہد جاہلیہ کی (غیر تربیت یافتہ) عورت کو غَیْرُ مُبَیِّنٍ (۲۳) کہا ہے۔ یعنی جو متنازعہ فیہ امور میں اپنی بات کو واضح طور پر بیان نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہی عورتوں کو جب قرآنی معاشرہ میں صحیح تربیت ملی تو وہ نہایت فصیح اور واضح باتیں کرنے والی ہو گئیں۔

اَلتَّعْتُرُ يَنْبُ۔ صرف واضح بات کرنے ہی کو نہیں کہتے، بلکہ دلیل کے ساتھ بات کرنے کو بھی کہتے ہیں\*۔ لہذا قرآنی معاشرہ میں مرد اور عورتیں سب کی باتیں صاف، واضح اور دلیل کے ساتھ ہوتی ہیں۔

## ع ر ج

عَرَجَ۔ اوپر چڑھنا۔ عَرَجَ فِي الدَّرَجَةِ۔ سیڑھی پر چڑھنا۔ مَعْرَجٌ\* سیڑھی (جمع مَعَارِجُ)۔ مَعْرَاجٌ\* بھی سیڑھی کو کہتے ہیں (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا)۔ عَرَجَ۔ يَعْرُجُ\*۔ اس کے پاؤں میں کوئی چیز لگ گئی اور اس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگ گیا۔ یہ لنگڑا پن عارضی ہوگا۔ مستقل طور پر لنگڑانے کے لئے عَرَجَ يَعْرُجُ\* کہیں گے۔ اَعْرَجُ\*۔ لنگڑا\*۔ (یعنی وہ آدمی جو ہموار زمین پر ایسے چلے جس طرح کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) عارضی یا مستقل جھکاؤ اور ٹیڑھ پن (۲) بلندی اور ارتقاء کے ہیں۔ اَلْعَرَجُ\*۔ لنگڑا ہونا، اس اعتبار سے ہے کہ لنگڑا آدمی ٹیڑھا چلتا ہے۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے سلسلہ ارتقاء کے ضمن میں آیا ہے۔ يَدْبُرُ الْاَسْرَ مِنْ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ خدا کسی اسکیم کو اپنے قانون مشیت کی رو سے طے کرتا ہے۔ پھر اس کا آغاز پست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲)۔ پھر وہ شے اس نقطہ آغاز سے بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھتی ہے اور ایک ایک مرحلہ کو ہزار ہزار سال (اور پچاس پچاس ہزار سال (۴۰) کی مدت میں طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسی نہج

سے خدا نے اپنے آپ کو ذیٰ الثَّعَارِجِ (۳۸) کہا ہے۔ ”سیڑھیوں والا خدا“۔ یعنی جو اس طرح بتدریج تمام اشیاء کو ان کی ارتقائی منازل طے کراتا ہے۔ وہ خدا صراطِ مستقیم پر بھی ہے (۱۱۶)۔ یعنی ایک توازن بدوش سیدھے راستے پر۔ اور اس کے ساتھ ہی ذیٰ الثَّعَارِجِ بھی ”صراطِ مستقیم“ پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کائنات کو آگے کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک دفعہ اس کائنات کو بنا دیا اور اب یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں ایک ساکن اور جامد ڈھیلے کی طرح پڑی ہے، بلکہ یہ کہ اس میں حرکت ہے اور یہ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ (Dynamic) ہے۔ نیز اس کی حرکت خطِ مستقیم پر (Linear) ہے۔ دوری (Cyclic) نہیں۔ یہ تصور یونانیوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ اوپر کی طرف بھی چڑھ رہی ہے۔ یعنی اس میں ارتقاء بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یعنی ہر آن آگے بڑھنے والی اور اوپر چڑھنے والی۔ قوانین خداوندی کی یہی راہ ہے جس پر چلنے کی تاکید انسان کو کی گئی ہے۔ یعنی انسان کو بھی ساکن اور جامد نہیں رہنا چاہئے۔ اسے آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا چاہئے (Progressive and Ascending)۔

أَعْرَجٌ بمعنی لنگڑا سورۃ نور میں آیا ہے۔ وَلَا عَلَی الْأَعْرَجِ (۲۴)۔ چونکہ لنگڑے کی ٹانگ میں خم ہوتا ہے اس لئے کھجور کے خوشے کی خمیدہ ڈنڈی کو عُرْجُونٌ\* (۳۶) کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الْأَعْرَجُ الطَّوْرُ بَقِیُّ کے معنی ہیں راستہ ٹیڑھا ہو گیا۔

أَلْعَرَجُ اسی سے نوسے تک اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ابن فارس)

## ع ر ج ن

عُرْجُونٌ\*۔ (دیکھئے ع۔ ر۔ ج)۔ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی۔ (۳۶)

## ع ر ر

الْعَرَّةُ۔ الْعَرَّةُ۔ الْعَرَّةُ\*۔ خارش کی بیماری۔ أَلْعَرَّةُ\*۔ ہر قسم کی مضرت، تکلیف، اذیت، گزند یا نقصان۔ نیز گناہ و قصور کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عَرَّةُ اس نے اسے تکلیف دی\*۔ سورہ فتح میں ہے فَتَّصِيْبُكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ\* (۲۸)۔ تمہیں انکی وجہ سے کہوئی نقصان پہنچ جائے۔ عَرَّةُ۔ اَعْرَثَهُ\*۔ کسی کے پاس جانا اور بغیر سوال کئے اس کا احسان طلب

کرنا - بخشش طلب کرنے کے لئے کسی کے سامنے آنا - ابن القفطاع نے کہا ہے کہ **الْمُعْتَرِّشُ** ملنے والے کو کہتے ہیں، لیکن اہل لغت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ **الْفَتَانِيعُ** تم وہ ہے جو سوال کرے (دیکھئے ق - ن - ع) اور **مُعْتَرِّشٌ** وہ ہے جو تم سے کچھ لینے کیلئے تمہارا چکر لگائے خواہ زبان سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے \* - اس کا مطلب مصیبت زدہ یا حاجت مند ہی ہے - قرآن کریم میں **الْفَتَانِيعُ** وَالْمُعْتَرِّشُ (۲۶) اکٹھا آیا ہے، مطلب مصیبت زدہ سے ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس محتاج کو کہتے ہیں جو ہر وقت تمہارے ساتھ چمٹا رہے اور تمہارا پیچھا لے لے - اس لئے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ”کسی چیز کیو کسی خراب چیز کے ساتھ لتھوڑ دینے“ کے بھی آتے ہیں -

## ع ر ش

**الْعَرْشُ** - کسی چیز کا رکن - ستون - گھر کی چھت - یا وہ سہارے جس پر چھت کھڑی ہو - سائبان \* - راغب نے کہا ہے کہ **الْعَرْشُ** دراصل ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں - اسکی جمع **عُرُوشٌ** ہے - نیز بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ (تخت) کو بھی کہتے ہیں \*\* - اسی سے اس کے معنی حکومت و سلطنت اور قوت و اقتدار کے ہو گئے - صاحب لطائف اللغة نے اس کے معنی غلبہ اور قوت کے کئے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بنائی ہوئی چیز میں بلندی کے ہیں -

سورہ النمل میں ملکہ سبا کے متعلق ہے وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ (۲۶) - اسکا بہت بڑا تخت تھا - سورہ بقرہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (۲۹) - اس بستی کے مکانات اپنی چھتوں یا ستونوں پر گہرے پڑے تھے - جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ (۱۳۲) - ایسے باغات جن میں اس قسم کی بیلین ہوں جو بانس وغیرہ کی ٹٹیوں پر چڑھائی جائیں - جیسے انگور کی بیلین -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے **عَرْشٌ** کا لفظ متعدد بار آیا ہے - مثلاً هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۲۹) - اس کے معنی اقتدار اعلیٰ - مرکزی کنٹرول کے ہیں - یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اسکا اقتدار اور کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں ہے - اور یہ کنٹرول اسکی بڑی محکم گرفت

میں ہے، جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آسکتی۔ ثُمَّ اسْتَوٰی اَعْلٰی الْعَرْشِ (۵۴)۔ اسْتَوٰی کے معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھنا۔ یعنی پوری طرح غالب آجانا ہیں۔

سورہ ہود میں ہے وَكَانَ عَرْشُهُ اَعْلٰی السَّمٰوٰتِ (۱۱)۔ اسکا عرش (مرکزی اقتدار) پانی پر ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ السَّمٰوٰتِ كُلَّ شَيْءٍ حَیًّا (۲۱)۔ ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی عطا کی ہے۔ یعنی حیات کا سرچشمہ پانی ہے۔ اسکی تائید دور حاضر کی تحقیق سے ہو رہی ہے کہ پانی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ حیات کی جل پری نے آنکھ ہی پانیوں میں کھولی ہے۔ لہذا جب قرآن کریم نے کہا کہ خدا کا عرش پانی پر ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ سرچشمہ حیات پر واحد کنٹرول خدا کا ہے۔ خدا کا یہ کنٹرول اسکے قانون کی رو سے کار فرما ہے۔ اسنے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے۔ بخارجی کائنات کی طرح انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کیلئے بھی خدا کا قانون ہے (جسے وحی کہتے ہیں)۔ انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا گیا ہے اسلئے اسے اسکا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو خدا کے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اپنے لئے کوئی اور قانون وضع کر لے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ، قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے زندگی کے خوشگوار نتائج مرتب کر لے۔ نتائج ہمیشہ قانون خداوندی کے مطابق ہی مرتب ہونگے۔ اس پر صرف خدا کا کنٹرول ہے، کسی اور کا نہیں۔ خدا کا عرش تمام کائنات پر بچھا ہوا ہے۔

## عرش

عرش\* کے معنی ہیں کسی چیز کا ظاہر ہو جانا، یا کسی کے سامنے پیش کرنا (۲۱)۔ عَرَضَ لَہُ کَذٰبًا۔ اسے ایسا مساجرا پیش آیا۔ سرمری طور پر کوئی چیز اسے نظر آئی۔ عَرَضَ عَلَیْہِ کَذٰبًا۔ اسے فلاں چیز دکھلائی۔ عَرَضَ الشَّیْءُ۔ چیز ظاہر ہو گئی۔ اَلْعَارِضُ۔ وہ چیز جو تمہیں پیش آئے یا تمہارے سامنے آئے۔ اَلْعَارِضَةُ۔ دروازے کی چوکھٹ کی بالائی لکڑی جس میں دروازہ گھومتا ہے۔ اَلْعَارِضُ۔ وہ بادل جواق میں پھیلا ہوا ہو\* (۲۱)۔ اَلْعَرَضُ۔ کسی چیز کی چوڑائی کو کہتے ہیں\*۔ قرآن



کریم میں جنت کے متعلق ہے عَرَضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۲۹) جسکی وسعت اور کشادگی تمام ارض و سماء (ساری کائنات) جتنی ہے۔  
 أَعْرَضَ عَنْهُ۔ اس سے اعراض کرلیا۔ پیٹھ موڑ لی۔ عَرَضَ الْفَرَسُ  
 فِي عَدْوِهِ۔ گھوڑا اپنی دوڑ میں سر اور سینے کو ایک طرف ٹیڑھا کر کے  
 دوڑا۔ یعنی اپنے آپ کو سیدھا رکھنے کے بجائے چوڑائی (عرض) میں رکھ کر دوڑا۔  
 اِعْتَرَاضٌ۔ کسی چیز کا اس طرح سامنے آجانا کہ اس سے راستہ رک  
 جائے۔ عَرَضَةٌ (۲۴)۔ آڑ۔

الْعَرَضُ۔ گھر کا ساز و سامان۔ مال و دولت۔ (۲۳)۔ سورة اعراف  
 میں ہے يَسَّأْخِذُوْنَ عَرَضَ هَٰذَا اَلَا دُنِيَ (۱۶۹)۔ یہ لوگ پیش  
 پا افتادہ مفاد (ساز و سامان) حاصل کر لیتے ہیں (اور مستقبل کا خیال نہیں  
 رکھتے)۔ یہاں عَرَضُ کے معنی ساز و سامان ہیں۔ راغب نے الْعَرَضُ کے  
 معنی ناپائدار شے بھی لکھے ہیں۔ سورة توبہ میں ہے لَمَوْ كَانَ عَرَضًا  
 قَرِيبًا (۶۶) اگر کوئی فائدہ یا سامان ایسا ہو جو جلد مل جائے۔ یہاں بھی  
 عَرَضُ کے معنی واضح ہیں۔ \*\*\*

قرآن کریم نے مَعْرِضُونَ کی تشریح تَوَلَّيْتُمْ سے کردی ہے  
 (۲۳ و ۲۴)۔ یعنی روگردانی کرنے والے۔ گریز کی راہیں نکالنے والے۔ پھر جانے  
 والے۔ ایک طرف ہٹ جانے والے۔ أَعْرَضَ عَنْ الْمُشْرِكِينَ (۱۵)  
 کے معنی ہیں فَاصْفَحْ (۸۵)۔ ان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔

## عرف

الْعَرَفُ۔ ہو (سہک) کو کہتے ہیں۔ عَرَفْتُهُ۔ میں نے اس کی ہو  
 پالی۔ یہیں سے اس کے معنی پہچاننے کے آتے ہیں۔ راغب کے نزدیک، کسی  
 چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کر لینا، مَعْرِفَةٌ یا  
 عِرْفَانٌ کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا جاننا عِلْمٌ سے کم درجے کا  
 ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اَللّٰهُ يَعْلَمُ کہتے ہیں (خدا کو اس کا علم ہے)۔  
 اَللّٰهُ يَعْرِفُ (خدا کو اس کی معرفت ہے) نہیں کہتے، کیونکہ خدا کا علم  
 (ہر شے کے متعلق) یقینی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ذات کا علم انسان  
 کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اس کی صفات کا  
 اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسے خدا کی معرفت کہہ سکتے ہیں۔ (قرآن کریم  
 میں اللہ کے لئے معرفت کا لفظ نہیں آیا)۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عارفِ حق بے اللہ (خدا کی معرفت رکھنے والوں) کے متعلق جو عام تصور ہے کہ وہ خدا کی ذات کا علم رکھتے ہیں، کس قدر غلط ہے۔ کائنات کے مشاہدہ اور قرآنی حقائق پر غور و فکر سے قوانین خداوندی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خود ذات خداوندی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا یکے بعد دیگرے۔ پے در پے ہونا۔ اور (۲) سکون اور اطمینان۔ چنانچہ الْعُرْفُ (اور الْعُرْفُ) گھوڑے کی ایال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بال یکے بعد دیگرے، پے در پے، ہوتے ہیں۔ عُرْفُ کے معنی پہچاننا اس لئے ہیں کہ نہ جانی پہچانی چیز سے انسان کو وحشت ہوتی ہے اور جانی پہچانی سے سکون و اطمینان ہوتا ہے۔ الْعُرْفُ - عمدہ خوشبو کو کہتے ہیں۔

عُرْفُ يَعْرِفُ - مَعْرِفَةٌ - وَ عِرْفَانًا - کسی چیز کو پہچان لینا۔ مَعَارِفُ الْأَرْضِ - زمین کے جانے پہچانے راستے\* - تَعَارَفُوا - انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ أَمْرٌ عَرَفْتُ - جانا پہچانا ہوا کام\*\*۔ أَلْعَرَفْتُ - جو اپنے آدمیوں کو پہچانتا ہو۔ (یا ان کا تعارف کراتا ہو)۔ رئیس قوم - نقیب جو سردار کے نیچے ہوتا ہے۔ أَلْتَعَرَفْتُ - کسی چیز کو پہچنوا دینا\*\*۔

پہچاننے کے اعتبار سے بلند چیز کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ أَلْعَرَفْتُ - ریت کا بلند ٹیلہ یا بلند جگہ۔ أَلَا عَرَفْتُ - بلند جگہ۔ نیز جو کھیتی ڈولوں اور کناروں پر ہو۔ قَلْبَةٌ عَرَفَاءُ - بلند چوٹی۔ نَاقَةٌ عَرَفَاءُ - بلند کوہان والی اونٹنی۔ أَلْعَرَفْتُ - دو چیزوں کے درمیان کی حد\*\*۔

اعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي - اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا\*\*۔ (۲۱)۔ عَرَفْتُ فُلَانًا - فلان کو اس کے جرم کی سزا دی\*\*۔

آگے پیچھے آنے کو بھی عَرَفْنَا کہتے ہیں۔ جَاءَ الْقَوْمُ عَرَفْنَا - قوم آگے پیچھے آئی۔ اس سے بعض نے کہا ہے کہ وَالْمُرْسَلَاتِ عَرَفْنَا (۲۲) کے معنی ہیں وہ فرشتے جو یکے بعد دیگرے آئیں\*\*۔

قرآن کریم میں يَعْرِفُونَ بمقابلہ يَنْكِرُونَ آیا ہے (۱۳)۔ اسی سے أَمْرٌ بِالْمَعْرِفِ وَ نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ متعدد مقامات پر آیا ہے۔

(مثلاً ۱۳۹)۔ سورۃ اعراف میں اَلْمَعْرُوفُ کی جگہ اَلْعَرَفُ آیا ہے (۱۳۹)۔  
 مَعْرُوفُ سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم  
 (Recognise) کر لے۔ اور مُنْكَرُ\*۔ وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ  
 کرے۔ جنہیں وہ (Recognise) نہ کرے۔ یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح  
 ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لیکر اس معاشرہ کے  
 روزمرہ کے رسوم و آداب تک سب آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان رسوم و آداب  
 کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہیں گے کیونکہ وہ قرآن کریم نے متعین کر  
 دئے ہیں، لیکن ان کی شکل و صورت اور تفصیل و جزئیات زمانہ کے تقاضوں  
 کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ لہذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین و آداب کو اپنے  
 وقت میں (Recognise) کر لے وہ معروف ہوں گے، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں  
 یا وہ انہیں خود تجویز کرے، حتکہ کسی قوم یا ملک کے رسم و رواج کو  
 بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی مَعْرُوفُ کے ذیل میں آجائیں گے۔  
 لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ان میں سے کوئی چیز  
 قرآن کریم کے اصول و احکام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے۔ ایسی بات منکر  
 ہو جائیگی (دیکھئے عنوان ن۔ ک۔ ر)۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر اَلْعَرَفُ کا بھی ذکر آتا ہے۔ وَعَلَى  
 اَلْعَرَفِ رِجَالٌ يَّعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيَرِهِمْ\* (۱۳۹)۔ عام طور پر  
 اَلْعَرَفُ اس مقام کو کہا جاتا ہے جو جنت اور دوزخ کے بین بین ہے اور ان  
 لوگوں کو اعراف والے سمجھا جاتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہوں گی  
 اور ان کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا ہوگا کہ انہیں کدھر بھیجا جائے۔ لیکن  
 یہ مفہوم درست نہیں۔ قرآن کریم میں صرف اَصْحَابُ الْجَنَّةِ اور اَصْحَابُ  
 النَّارِ کے دو گروہوں ہی کا ذکر ہے۔ کسی ایسے (تیسرے) گروہ کا ذکر  
 نہیں جو بین بین معلق ہو۔ دوسرے یہ کہ ان اہل اعراف کا مقام اتنا بلند  
 بتایا گیا ہے کہ وہ تمام اہل جنت اور اہل جہنم کو انکی نشانیوں سے پہچانتے  
 ہوں گے۔ لہذا بلندی کے اعتبار سے (جو اَلْعَرَفُ کا صحیح مفہوم ہے۔ یعنی  
 بلند مقامات\*)۔ یہ طبقہ بلند ترین انسانوں کا ہے۔ یہ حضرات اپنے اپنے گروہوں  
 پر بطور شاہد حامی آئیں گے (۱۳۹)۔ یہ گروہ، اَصْحَابُ الْجَنَّةِ میں سے غالباً وہ  
 طبقہ ہے جسے اَلْسَّائِقُونَ اور اَلْمُقَرَّبُونَ کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۳۹)۔  
 یہ وہ جماعت مومنین ہے جسے شہداء عَلَى النَّقَاسِ (۱۳۹) کہا گیا ہے۔

حج کے اجتماع میں عَرَقات کا بھی ذکر ہے (۱۹۸)۔ یہ وہ میدان ہے جس میں تمام دنیا کی ملت اسلامیہ کے نمائندوں کا باہمی تعارف ہوتا ہے۔

سورۃ محمد میں جنت کے متعلق ہے، عَرَاقَتُہَا (۲۶)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جنت جسے ان کے لئے خوشگوار بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جنت ان کی جانی پہچانی ہے، کیونکہ اس کا تعارف قرآن کریم نے کرا دیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جنت کو خوشبو سے بسا دیا۔ لیکن اس کے معنی متعارف کے زیادہ سوزوں نظر آتے ہیں۔

## ع ر م

عُرَامُ الْجَنَّةِ - لشکر کی تندی و تیزی، شدت اور کثرت۔ اَلْعُرَامُ مِّنَ الشَّجَلِ - آدمی کی تندی و درشتی، سختی اور اذیت رسانی۔ اَلْعُرْمُ - بند یا دیگر رکاوٹیں جمو وادیوں میں بنا دی جائیں۔ نیز سخت بارش جسے برداشت نہ کیا جاسکے\*۔

قرآن کریم میں سَبِيلُ الْعُرْمِ (۳۶) آیا ہے۔ جسکے معنی نہایت تند و تیز سیلاب کے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی سختی اور تیزی کے ہیں۔

## ع ر و

عُرْوَةٌ - بیری وغیرہ کی قسم کی خاردار جھاڑیوں یا پیلو کی قسم کے درختوں کا جھنڈ (جن کی جڑیں زمین میں پائیدار رہتی ہوں اور) جن کے پتے سردی میں بھی نہ گریں۔ چنانچہ جب جانوروں کے لئے کوئی اور چارہ نہ رہے تو یہی درخت ان کی جان بچاتے ہیں۔ ان پر ہر موسم میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس نہج سے ہر وہ شے جس پر بھروسہ کیا جاسکے عُرْوَةٌ کہلاتی ہے۔ نیز ڈول وغیرہ کا دستہ جس سے اسے پکڑا جائے عُرْوَةٌ کہلاتا ہے\*\*۔ ہر وہ سہارا جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمٹے رہنے اور جم کر باقی رہنے کے ہیں۔ اسی جہت سے عُرْوَةٌ کاج کو بھی کہتے ہیں جس میں ہٹن اٹکا رہتا ہے۔

سورہ بقرہ میں خدا پر ایمان کہو اَلْعُرْوَةَ التَّوْتَلٰی (سَلِّم) کہا ہے۔ یعنی ایسا محکم آسرا جس پر کامل بھروسہ کیا جاسکے۔ زندگی کا ایسا قانون

جو اپنی نتیجہ خیزی میں کبھی خطا نہ کرے۔ جسکی محکمیت پر پورا پورا اعتماد ہو۔ جو کبھی دغا نہ دے۔ جو راستہ ہی میں نہ ٹوٹ جائے۔

عَرَاهُ - اَعْتَرَاهُ - اس کے سامنے آیا - پیش آیا - یعنی وہ بات اس کے سامنے اس طرح آگئی کہ اس کے اور اس بات کے درمیان کوئی آڑ نہ رہی \*\*۔  
سورہ ہود میں ہے اَعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ (۵۳)۔ ”ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر کوئی مصیبت ڈال دی ہے“۔

## ع ر ی

الْمُرْيُ - ننگا ہونا - عَرِيَ - بَعَرِيَ - عُرِيَ - ننگا ہونا \*۔  
قرآن کریم میں ہے لَا تَعْرِي (۲۱۸)۔ تو ننگا نہ رہیگا۔ لباس کی محتاجی نہ ہوگی۔ جنتی معاشرہ میں جو بنیادی ضروریات ہر ایک کو میسر ہونگی ان میں لباس بھی ہے۔ (نیز کھانا پینا اور مکان (۱۱۸-۱۱۹)۔ اَلْعَرَاءُ - کھلی جگہ جہاں کوئی چیز آڑ کے لئے نہ ہو \*۔ قرآن کریم میں ہے فَتَبَدُّوا لَكُمْ يَالْعَرَاءُ (۳۵)۔ ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈال دیا۔ نیز تَبَدُّوا يَالْعَرَاءُ (۶۸)۔ اَلْعَرِيَّ کے معنی ہیں کنارہ، گوشہ، صحن، آنگن نیز دیوار۔ اَعْرَاءُ الْاَرْضِ - زمین کے ابھرے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں \*۔

[عَرَاهُ اور اَعْتَرَاهُ کے لئے دیکھئے عنوان ع - ر - و]

## ع ز ب

عَزَبَ - يَعْزُبُ - غائب ہو جانا - پوشیدہ ہو جانا - دور ہو جانا۔  
چلا جانا - اَلْمِعْزَابُ - وہ آدمی جو اپنے جانوروں کو لیکر لوگوں سے بہت دور چراگاہ میں چلا جائے۔ اَلْعَزَبُ - وہ آدمی جو اپنے اہل و عیال سے بہت دور چلا جائے۔ اِبِلْ عَزَبٍ - وہ اونٹ جو شام کو اپنے گھروں پر نہ آئیں \*\*\*۔  
قرآن کریم میں ہے وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ ..... (۲۱) تیرے رب (کے علم) سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دور نہیں جاسکتی۔ غائب نہیں ہو سکتی۔ یعنی خدا کے قانون کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔

## ع ز ر

اَلْعَزْرُ کے بنیادی معنی کسی کو روکنے (منع کرنے) کے ہوتے ہیں۔  
عَزَرْتُ الرَّجُلَ - میں نے اس آدمی کو روک دیا۔ اِمْسِي سے تَعَزَّرْتُ

کے معنی تادیب کے آتے ہیں۔ یعنی کسی کو وحد شرعی سے کم سزا دینا تاکہ وہ آئندہ جرم سے رک جائے۔ چونکہ یہ تادیبی کاروائی درحقیقت اُس آدمی کی اصلاح کے لئے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے، اس لئے اَلْعَزَّازُ نصرت کو بھی کہتے ہیں جس میں تعظیم کا جذبہ شامل ہو۔ قرآن کریم میں ہے وَعَزَّازُ تَمُوْهُمْ (۱۲)۔ تم نے ان کی مدد کی تعظیم کے ساتھ۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں قوت بہم پہنچانا۔ تلوار اور زبان سے مدد دینا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں تعظیم و نصرت اور تعزیر (مار کی سزا) دونوں لکھے ہیں۔

سورہ اعراف میں ہے فَاَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهِ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (۱۵۷)۔ اور سورہ فتح میں ہے لِيَتَّوْبُوْا بِاِلٰهِمْ وَرَسُوْلِهِمْ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوْقِّرُوْهُ (۲۹)۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رسولؐ کی مدد کریں (نصرت)۔ تعظیم کریں (توقیر)۔ اور عزَّازُ وہ اس کے مضیٰ ہیں رسولؐ کی ایسی مدافعت کرنا جس سے اس کی ذات اور اس کا پیغام تمام شریک عناصر کی تخریب سے محفوظ رہے۔ یعنی رسول اللہؐ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہونے دی جائے جس سے حضورؐ کی ذات پر کسی قسم کا طعن آئے یا آپؐ کی تعظیم پر کوئی اعتراض وارد ہو۔

## ع ز ز

اَلْعِزَّازُ۔ قوت۔ شدت۔ غلبہ۔ رفعت اور حفاظت کو کہتے ہیں۔ بصائر میں ہے کہ عِزَّةٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔ (یعنی اپنے اندر ایسی سختی پیدا ہو جانا کہ کسی کے دبائے سے دب نہ سکے)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معنی صلابت اور شدت کے لکھے ہیں۔ اسیلئے کہتے ہیں اَلْعِزَّازُ الْقَرْمَلُ۔ ریتلا ٹیلہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا اور ڈھیلا ہو کر نیچے نہیں گرا۔ \*\*\* اَلْمَعَزَّوْزَةُ سخت زمین۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر بارش ہونے سے اسکی مٹی یا ریت جم جائے اور وہ سخت ہو جائے۔ تَعَزَّزَتْ الشَّاقَّةُ۔ اونٹنی کے تھنوں کے سوراخ تشگ ہوئے اور ان سے مشکل سے دودھ نکلا۔ تَعَزَّزَ الشَّحْمُ۔ گوشت سخت ہوا۔ لہذا عِزَّةٌ بَعِزَّةٌ کے معنی ہیں کسی پر غالب آجانا۔ اسے اپنی صلابت اور سختی کی وجہ سے زیر کر لینا (۳۸)۔ اسیلئے اَلْعِزَّازَةُ عقاب کو کہتے ہیں۔ \*\*\* عِزَّةٌ کے مضیٰ ہیں قوی ہوا۔ عِزَّازَةُ اسے تقویت دی (۳۶)

عَزَّ عَلَيَّ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا - مجھ پر یہ بات بڑی ہی گدراں گذری کہ تم ایسا کرو\*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ذِلَّة کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵) اور اسکے معنی بتائے ہیں قوت و اختیار کا ملجانا (۳۵) - سورہ کہف میں اَعَزُّ نَفَرًا (۱۸) آیا ہے - یعنی قبیلہ اور جتھے کے اعتبار سے میں زیادہ صاحب اقتدار ہوں - سورہ ص میں ہے رَفِ عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ (۳۸) - قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے اپنی قوت کے نشہ میں بدست ہو کر اسکی مخالفت پر اثر آئے ہیں - سورہ التوبہ میں نبی اکرم کے متعلق ہے عَزَّيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (۲۸) - جس بات سے تمہیں تکلیف پہنچے وہ اس پر سخت شاق گزرتی ہے -

قرآن کریم میں خدا کیلئے اَلْعَزَّيْزُ آیا ہے - (۲۹) - یعنی کائنات میں غلبہ و اقتدار صرف اسکی قانون کو حاصل ہے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسکی قانون پر غالب آسکے - انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ و اقتدار اس جماعت کو حاصل ہو سکتا ہے جو ایک مرکز کے ماتحت، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے (۱۳) - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے : اقتدار اور غلبہ صرف خدا کیلئے ہے - لیکن اس نے ایسے قوانین بنا دیئے اور بتا دیئے ہیں جنکے مطابق چلنے سے انسان کو بھی اپنے دائرے میں غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جاتا ہے - یہ قوانین طبعی دنیا سے بھی متعلق ہیں اور انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی متعلق - جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائیگا - یہ معنی ہیں وَتُعِزُّمَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّمَنْ تَشَاءُ (۲۵) کے - یعنی اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق عزت اور ذلت عطا کرتا ہے - یونہی اندھا دھند کچھ نہیں ہو جاتا -

سورہ یوسف میں اَلْعَزَّيْزُ (۱۲) وہاں کے رئیس کے لئے آیا ہے - یعنی صاحب اقتدار - اسی رئیس کی بیوی نے حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالنے چاہے تھے - اس عورت کا نام قرآن کریم میں نہیں آیا - اسے صرف امْرَأَتُ الْعَزَّيْزِ کہا گیا ہے - (۱۲) یعنی عزیز کی عورت -

اَلْعِزُّ (۵۳) ایک بت کا نام ہے جسکی عہد جاہلیت میں قبیلہ غطفان پرستش کرتے تھے - (یہ لفظ اَلَا عَزَّ کا مؤنث بھی ہے) -

## الْعَزَىٰ

عرب کے زمانہٴ جاہلیت میں، قبیلہٴ غطفان کا ایک بت تھا۔ (۵۳/۱۹)  
(دیکھئے عنوان ع۔ ز۔ ز)

## ع ز ل

عَزَلَتْہُ عَنِ الْعَمَلِ وَعَزَلَتْہُ - اسے کام سے الگ کر دیا۔  
فَاعْتَزَلَ - پس وہ الگ ہو گیا۔ یعنی اسے ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ہٹ  
گیا۔ مَعَزُؤْلٌ - الگ کیا ہوا۔ ہٹایا ہوا۔ اَلْعَزْلُ - الگ ہو جانا۔  
علیحدگی۔ اَلْاِعْتِزَالُ - کسی چیز کا ایک طرف ہو جانا۔ اَلْعَزْلُ - ضبط  
ولادت کے لئے مادہٴ تولید کو رحم تک نہ پہنچنے دینا\*۔

سورہ کہف میں ہے وَإِذَا اَعْتَزَلْتُمْ عَنْهُمْ (۱۸/۱۹)۔ جب تم ان سے  
الگ ہو گئے۔ سورہ شعراء میں ہے اَنْتَهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعَزُؤْلُوْنَ  
(۲۱/۲۲)۔ وہ سننے سے الگ ہٹا لئے گئے۔ سننے سے روک دئے گئے۔ سورہ ہود  
میں ہے وَكَانَ رَفِیْ مَعَزِلٍ (۱۱/۲۲)۔ وہ ان لوگوں سے ہٹ کر کسی الگ  
جگہ میں تھا۔ سورہ احزاب میں ہے مِمَّنْ عَزَلْتَ (۳۳/۵۹)۔ جن سے تو نے  
علیحدگی اختیار کی تھی۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حیض کے دوران میں فَاَعْتَزَلُوا  
النِّسَاءَ - عورتوں سے الگ رہو۔ وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتّٰی یَسْطِیْهُنَّ  
(۲/۲۲۲)۔ اس کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی جب تک وہ حیض سے ہٹا کر نہ  
ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

## ع ز م

اِعْتَزَمَ الرَّجُلُ - وہ دوڑنے، چلنے نیز دیگر امور میں درمیانہ روی  
پر قائم رہا۔ اِعْتَزَمَ الطَّرِیقَ - وہ راستہ پر بغیر مڑے سیدھا چلتا چلا  
گیا۔ عَزَمَ عَلَی الْاَمْرِ وَاَعْتَزَمَ عَلَیْہِ - کسی کام کو قطعی طور پر کرنے  
کا ارادہ کیا۔ اس اعتبار سے عَزَمَ اور عَزَزَ بِمَعْنٰی کے معنی ہیں کسی بات  
کا فیصلہ کر کے اس پر پختگی سے جم جانا۔ مَا لِفُلَانٍ عَزِیْمَةٌ - فلاں  
آدمی کسی بات پر جمنا ہی نہیں۔ اَلْعَزَامُ - ارادے کا دھنی۔ شیر\*۔  
ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معاملہ کو حتمی اور قطعی  
کرنے کے ہوتے ہیں۔



سورہ بقرہ میں ہے وَإِنْ عَزَّ سَوْا الطَّلَاقِ (۲۴۰)۔ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیس۔ سورہ طہ میں آدم کے متعلق ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (۲۱۵)۔ ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تَعْزِزْ سَوْا عَقْدَةِ الثَّنِيكَاحِ (۲۳۵)۔ تم نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو۔ اُولَئِی السَّعْزِ (۳۵)۔ عزم و استقلال والے۔ عَزْمٌ اِلَّا مَوْرٌ (۲۳)۔ معاملات میں پختگی اور عزیمت۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ اور مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال کے مالک) ہوتے ہیں۔ اور ان کے عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن اب عَزَّ بِمَتَّہ کے معنی میں تعویذ، اور عَزَّائِمُ الْقُرْآنِ کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعمیہ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے \*\*۔ اور الْمُعْزِزُ کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا \*\*۔

## ع ز و

الْعِزَّةُ - لوگوں کا گروہ - جماعت - فرقہ - اسکی جمع (حالت رفعی میں) عِزٌّ وَّنْ اور (حالت نصبی اور جری میں) عِزٌّ بَنَ آتی ہے۔ یعنی جماعتیں جو متفرق ہوں \*۔ (۳۰)۔ راغب کا خیال ہے کہ یہ عِزٌّ وَّنْ سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں منسوب کیا \*\*۔ اس طرح یہ لفظ ایسی جماعت کیلئے بولا جائیگا جو کسی کی طرف منسوب ہو، لیکن راغب ہی نے دوسرا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ عِزَّاء سے مشتق ہے جسکے معنی صبر و تسلی حاصل کر لینے کے ہیں \*\*۔ اس طرح اس سے مراد وہ جماعت بھی ہو سکتی ہے جو کسی خاص عقیدہ وغیرہ پر مطمئن ہو، یا وہ جماعت جسکے افراد آپس میں ایک دوسرے سے صبر و تسلی حاصل کر لیتے ہوں۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی منسوب ہونے اور وابستہ ہونے کے لکھے ہیں۔

## عزیر

سورۃ توبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزُّنَا ابْنُ اللَّهِ (۹)۔ ”یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے“۔

عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا

مجموعہ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا - کتابِ محمیاہ - (باب ۸) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہٴ اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرا فقیہ) نے دوبارہ مرتب کیا - موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا - یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے (تفصیل میری کتاب ”معراج انسانیت“ کے باب اول ”ظہر الفساد“ میں ملے گی) -

یہود لٹریچر میں ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیانات ملتے ہیں - جیونٹس انسائیکلو پیڈیا نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی -

قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا - نہ ہی زمرہٴ انبیائے کرام میں ان کا نام لیا ہے - اس لئے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ (قرآن کی اصطلاح میں) نبی تھے یا نہیں - یہودیوں کے ہاں ”نبی“ ہیکل کے ایک بڑے منصب دار کو کہتے تھے جس کا کام کہانت ہوتا تھا -

”ابنیت عزیر“ کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے - اس لئے کہ یہودی قرآن کریم کے اس بیان کو چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی عزیر نبی کو ابن اللہ نہیں مانا - ہمارے ہاں حضرت ابن عباس رضی روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ یہودی اس قسم کا اعتقاد رکھتے تھے - ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہ عقیدہ تھا\* - لیکن یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند نہیں قرار پا سکتیں - یہودیوں کے موجودہ لٹریچر سے بھی ان کے اس عقیدہ کی شہادت نہیں ملتی - اس میں شبہ نہیں کہ یہودی (اور نصرانی) لٹریچر میں جس طرح مسلسل رد و بدل ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے پہلے ان کے ہاں اس قسم کا عقیدہ موجود ہو اور بعد میں انہوں نے اسے اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہو - نیز ہمارے زمانے میں جس انداز سے عہدِ قدیم کے تاریخی انکشافات ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ کل کو کونسی تاریخی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آنے والی ہے؟ اس حقیقت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ (فرعون کی لاش کی طرح) مزید تحقیقات کے بعد یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی نقاب کشائی ہو جائے -

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ”ابن اللہ“ مانتے تھے، اس سے مراد عزرا نبی نہیں بلکہ مصر کا ”عزیر دیوتا“ ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہیروڈوٹس نے، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام (Osiris) یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد ”س“ ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ”ایزاری“ آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سائنڈ بیل بوجا جاتا تھا اس کا نام ”ایزار ہاپی“۔ یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ”فتاح“ یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے)۔ حضرت موسیٰؑ نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپؑ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ پروہام اول (۹۳۳ ق۔ م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے قراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ”اسیر“ سمجھ کر اس کا ترجمہ ”قیدی“ کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔

مصر کے آثار قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے، عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ”آمن رع“ کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ابک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔

ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عزرا نبی۔ بہر حال، یہ تاریخی قیاسات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات حقیقت کو حتم و یقین کے ساتھ بے نقاب کر دیں۔

ہمارا ایمان بہر حال یہ ہے (اور یہی ہونا چاہئے) کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرفاً حرفاً سچ ہے اور اگر کسی زمانے تک کا علم انسانی اس کے کسی بیان کی تصدیق نہیں کرتا تو یہ علم کی کوتاہ دستی کا قصور ہے نہ کہ قرآن کریم کے نخیل بلند کا گناہ\*۔

## ع س ر

الْعُسْرُ - یہ یُسْر کے مقابلہ میں آتا ہے جس کے معنی نرمی، کشادگی، فارغ البالی کے ہیں (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر) لہذا عُسْر کے معنی تنگی، سختی، مصیبت، مشقت، کے ہیں\*\*۔ (۱۸۵/۲؛ ۲۰۲/۲)۔ سورہ الفرقان میں ہے وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عُسْرًا (۲۰۲/۲)۔ وہ دن کافرین کے لئے بڑی سختی کا ہوگا۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ معاملات میں کشادہ روی کی کمی، اور اخلاق کی تنگی، ہو جانے کو بھی عُسْر کہتے ہیں\*\*\*۔ سورہ طلاق میں ہے وَلَئِنْ تَعَسَّرْتَ ثُمَّ (۱۶۰/۲)۔ اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور شدت کے ہوتے ہیں۔ اگر سوت الجھ جائے اور سلجھ نہ سکے تو کہیں گے قَدْ تَعَسَّرَ الْغَزْلُ۔ تنگ حالی اور تنگ دستی کو عُسْرَة کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے آسانیاں حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تم مشکلات کا سامنا کرو۔ جو مشکلات کا سامنا نہیں کرتا اسے آسانیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ (۱۴۰/۲)۔ زندگی جمہد مسلسل کا نام ہے۔ یہ نہیں کہ جب یُسْر (آسانیاں) مل جائیں تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اس وقت بھی انسان کے سامنے مشکلات آئیں گی جن پر غلبہ پانے کے لئے اسے سعی و عمل کی ضرورت ہوگی۔ حیات جاوداں اندر ستیزاست۔ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴/۲)۔ یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ فی الواقعہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔

\* اس عنوان میں ہم نے شیخ عبد القادر صاحب کے ایک مقالہ سے مدد لی ہے جو رسالہ الفرقان کی اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (لفظ Apis)۔ لے گئی آف ایچٹ (Glanville) اولی ہسٹری آف ایچٹ (Sidney Smith)۔ اور آکسفورڈ جونیئر انسائیکلو پیڈیا کے حوالے دیئے ہیں۔ \*\* تاج۔ \*\*\* محیط۔

## ع س ع س

عَسْعَسَ اللَّيْلُ\* - رات آئی یا ختم ہو گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی گذر جانے کے ہیں، اور دوسروں کا خیال ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی آنے اور چلے جانے دونوں کے آتے ہیں۔ چنانچہ صاحب لطائف اللغة نے بھی اسے اضداد میں سے کہا ہے۔ لغت میں العَسْعَسَةُ کے معنی تاریکی کے ہلکا ہونے کے بھی ہیں اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب رات جانے والی اور صبح آنے والی ہو، یا دن جانے والا اور رات آنے والی ہو\*۔ ابن فارس نے عَسْعَسَ کے معنی آنے ہی کے لکھے ہیں اور کہا ہے کہ جانے کے لئے جو عَسْعَسَ بولا جاتا ہے وہ دراصل سَعَسَعَ ہے۔ عَسْعَسَ اللَّيْلُ\* - اسنے اس چیز کو حرکت دی۔ عَسْعَسَ الْيَدُ ثَبُ\*۔ بھڑبھڑا رات میں گھوما\*۔ قرآن کریم میں ہے وَاللَّيْلُ إِذَا عَسْعَسَ (۱۷۱) اس کے معنی رات کی تاریکی جانے کے ہی ہونگے کیونکہ اس سے آگے وَالصُّبْحُ إِذَا تَنَفَّسَ (۱۷۲) ہے۔ یعنی طلوع فجر۔ قرآن کریم نے ان مظاہر فطرت کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرَّمَ يَمْ (۱۷۳) یہ ایک صاحب عزت و تکریم رسولؐ کی (زبان سے تم تک پہنچی ہوئی) بات ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کے قوانین خدا کے متعین فرمودہ اور اثل ہیں اسی طرح قرآنی حقائق بھی خدا کے نازل کردہ اور غیر متبدل ہیں۔

## ع س ل

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) اضطراب اور (۲) شہد کے ہیں۔ اول الذکر کے اعتبار سے ہلنے والے لچکدار نیزہ کو رُمُحٌ\* عَسَّالٌ کہتے ہیں۔ نیز جو بلبلی ہوا کے زور سے سطح آب پر چلنے لگ جائیں انہیں اَلْعَسَّالُ کہتے ہیں۔ اَلْعَسَّالُ شہد کو کہتے ہیں۔ اَلْعَسَّالُ\*۔ شہد کا چہتہ توڑنے والا۔ عَسَّالٌ اَللّٰهُ فُلَانًا۔ خدا فلاں آدمی کو لوگوں میں محبوب بنائے۔ اَلْعَسَّالُ\* وَالْعَسَّالُ\*۔ تیز رفتار اونٹنی۔ اَلْعَسَّالُ\* نیک اور صالح لوگ۔ اَلْعَسَّالُ\*۔ نیک عمل انسان جسکی تعریف بھلی اور شیریں سمجھی جائے۔ هُوَ عَلَى اَعْسَالٍ مِّنْ اَبِيْهِ۔ وہ اپنے باپ کی خصوصیات کا حامل ہے\*\*\*۔ قرآن کریم میں جنت کی انہار کے متعلق ہے۔ اَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى (۲۵)۔ عام معنی ہیں صاف کردہ شہد کی نہریں۔ لیکن چونکہ یہ

سب بیان تمثیلی ہے (مَثَلُ الْجَنَّةِ . . . . .) اسلئے اس سے مراد پاکیزہ، شیریں اور قابل ستائش اوصاف و خصوصیات بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں رزق کی فراوانیاں بھی مقصود ہیں۔ ”وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں“ انتہائی فراوانی کے لئے بولا جاتا ہے۔

### عسلی

عَسَلٰی - یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم انہی ہاں کہتے ہیں (۱) قریب ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۲) امید ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۳) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ . . . . . (۴) شاید ایسا ہو جائے۔ مثلاً عَسَلٰی اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّجْمُوعًا - (۹۰) قریب ہے یا امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کر دے۔ یا مثلاً سورہ تحریم میں ہے عَسَلٰی رَبُّهُ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُبَدِّلَہٗ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكَنَّ . . . . . (۷۵) - ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو اس کا رب اُسے تم سے بہتر بیویاں دیدے۔ یا عَسَلٰی اَنْ تَكُوْنُوْا اَشْيَآءً وَهْوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲۶۶) - ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز نا پسند ہو لیکن وہ درحقیقت تمہارے فائدے کی ہو۔ دوسری جگہ اسی سورہ میں ہے - هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلَیْكُمْ الْفِتَالُ اَلَا تَقَاتِلُوْا (۲۶۶) - تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر تم پر جنگ کرنا ضروری قرار دیدیا جائے تو تم جنگ نہ کرو۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر . . . . .“

### ع ش ر

الْعَشْرَةُ وَالْعَشْرُ - دس - الْعِشْرُونَ - بیس - الْعَشِيرَةُ وَالْعَشِيرُ - دسواں حصہ \* - فَاَتَوْا بِعَشْرٍ سَوَارٍ (۱۱۳) - دس سورتیں لاؤ۔

عَاشِرًا - وہ لوگ مل جل کر رہے \* - یہیں سے مُعَاشِرَةٌ ہے - عَشِيرَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں آدمی کے باپ کی قریبی اولاد یا قبیلہ - راغب نے اس کے معنی آدمی کے اقرباء پر مشتمل جماعت لکھے ہیں - الْعَشِيرُ - جماعت - گروہ \* -

ذَهَبَ الْقَوْمُ عَشَارِيَاتٍ - قوم ہر طرف متفرق ہو کر منتشر ہو گئی \*\*۔ عَشِيرَةٌ (۲۱۳) قبیلہ - کنبہ - نیز ساتھ رہنے والے - الْعَشِيرَةُ (۲۱۳) رفیق - ساتھی - مَعَشَرَ (۲۱۳) جماعت - گروہ - مِعْشَارُ (۳۴) دسواں حصہ - عِشَارُ (۸) دس ماہ کی گاہن (حاملہ) اونٹنیاں - عَاشَرَ (۱۶) - مل جل کر رہنا - ہنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) دسا ور (۲) باہمی اختلاط ہیں -

## ع ش و (ع ش ی)

الْعِشَاءُ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجانا - اندھا ہو جانا \*۔ عِشَاءُ عَنَّهُ - وہ اسکی طرف سے ہلٹ کر کسی دوسرے کی طرف مائل ہو گیا - اس سے اعراض برتا \*\*۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے وَ مَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ... (۳۳)۔ جو خدائے رحمن کے قانون سے آنکھیں پھیر لے - جو اس کی طرف سے ہٹ کر کسی دوسرے قانون کو اختیار کر لے - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں جو خدا کے ذکر سے آنکھیں بند کر لے - اس کی طرف سے اندھا ہو جائے \*\*\*۔ مطلب دونوں کا ایسک ہی ہے - یعنی قانون خداوندی سے اعراض برتنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھندلکا (روشنی کا کم ہو جانا) - اور کسی چیز کا کم واضح ہونا ہیں -

الْعِشَاءُ - عام طور پر اس سے مراد رات سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا اطلاق مختلف اوقات پر ہوتا ہے - مثلاً ابتدائی تاریکی، مغرب سے عشاء کی وقت تک - زوال آفتاب سے طلوع فجر تک کا وقت - الْعِشَاءُ وَالْعِشَاءُ - دن کا آخری حصہ - مغرب سے عشاء کے وقت تک - الْعِشَاءُ - زوال آفتاب سے صبح تک کا وقت - زوال آفتاب سے غروب آفتاب - کبھی عِشَاءُ سے مراد رات بھی ہوتی ہے کیونکہ اس مادہ میں عِشَاءُ کے معنی تاریکی کے ہیں - شام کے کھانے کو الْعِشَاءُ کہتے ہیں - صَلَاتَا الْعِشَاءِ سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں - لیکن الْعِشَاءُ آن - مغرب اور عشاء کی نمازوں کو کہتے ہیں \*\*\*\*۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَ سَبِّحْ بِالْعِشَاءِ وَالْاُبْكَارِ (۳۸) - یہاں عِشَاءُ بمقابلہ اُبْكَارِ (دن کا پہلا حصہ) آیا ہے - سورۃ النِّازِعَاتِ میں عِشَاءُ اَوْ ضُحَاهَا (۲۹) آیا ہے - یعنی صبح کے مقابلہ میں شام - سورۃ ص میں عِشَاءُ کا لفظ (۳۹) دن کے پچھلے حصے کے لئے آیا ہے - سورۃ روم میں عِشَاءُ کا لفظ حِينَ تَطْهَرُونَ (۱۸) کے ساتھ آیا ہے -

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* راغب - \*\*\*\* یہ تمام معانی تاج نے مختلف حوالوں سے نقل کئے ہیں -

سورة يوسف میں خالی عیشاء آیا ہے (۱۲)۔ اس سے مراد بچھلا پھر،  
شام کا وقت یا رات کا وقت لیا جاسکتا ہے۔ سورة نور میں مین "قَبْلَ صَلَوةِ  
الْفَجْرِ" کے مقابلہ میں مین "بَعْدَ صَلَوةِ الْعِشَاءِ" آیا ہے (۲۸)۔

## ع ص ب

الْعَصَبُ\*۔ بدن کے پٹھے بالخصوص جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں،  
قوم کے بہترین آدمی۔ عَصَبُ کے بنیادی معنی موڑنے۔ لپیٹنے اور بل دینے کے  
کے ہیں۔ نیز کس کر باندھنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ عَصَبُ الشَّجَرَةِ  
کے معنی ہیں درخت کی متفرق شاخوں کو یکجا کر کے رسی سے کس کر باندھنا  
پھر اس کے پتے جھاڑنے کے لئے اسے جھنجھوڑنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ  
اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ لمبائی یا گولائی میں  
باندھنے کے ہوتے ہیں۔ الْعَصَابَةُ\*۔ پٹی (جو باندھی جاتی ہے)\*۔ "أَلَا مَرُّ  
الْعَصِيْبِ"۔ سخت معاملہ\*۔ "هَذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ" (۱)۔ یہ سخت  
دن ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے وہ دن مراد ہے جس نے ہر طرف سے  
ان کو باندھ رکھا ہو اور انہیں گھیر لیا ہو۔ یعنی جس سے بچ نکلنا ان کے  
لئے دشوار ہو۔ الْعَصَبِيَّةُ\*۔ آدمی کا اپنے خاندان کی مدد کے لئے لوگوں کو  
بلانا اور حق و ناحق، بہر طور، اپنی جماعت ہی کی حمایت و مدافعت کرنا۔  
عَصَبِيَّةُ\*۔ جماعت\*۔ (ایک قدر مشترک کے ساتھ بندھے ہوئے افراد)۔ قرآن  
کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ نَحْنُ عَصَبِيَّةُ  
(۱۲)۔ ہم ایک اچھی خاصی جماعت ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے وجہ  
تقویت ہیں۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کم از کم  
دس مردوں پر مشتمل جماعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے کم تعداد پر اس کا  
اطلاق نہیں ہوتا۔

## ع ص ر

عَصْرٌ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) وقت  
اور زمانہ۔ (۲) کسی چیز کو دہانا یا نچوڑنا۔ اور (۳) کسی چیز کے ساتھ  
چمٹ جانا۔ عَصَرَ الْعَيْنَ\*۔ انکور کا شیرہ نچوڑ لیا\*\*۔ سورة يوسف میں  
ہے اَنِّیْ اَرَاتِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا (۱۲)۔ میں نے اپنے آپ کو شراب  
کشید کرتے ہوئے دیکھا۔ نیز (۱۲)۔ الْعَصْرُ\*۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام



کا وقت آفتاب کے سرخ ہونے تک۔ ہر طویل مدت جو غیر محدود ہو اور کچھ اُمتوں (قوموں) پر مشتمل ہو جن کے ختم ہو جانے سے وہ عصر بھی ختم ہو جائے\*۔ (Age or Period) - صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معنی "الدَّهْرُ" (زمانہ) کئے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ (۱-۳) - زمانہ (یعنی تاریخ انسانیت) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان (جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے) وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ الْعَصْرُ کے معنی روکنے کے بھی ہوتے ہیں\*۔ (یعنی وقت کی وہ حدیں جن کے اندر کوئی واقعہ رکا ہوا ہو)۔ الْعَصْرُ - قبیلہ اور خاندان کو بھی کہتے ہیں\*۔ الْعَصْرُ - جمانے پناہ کو کہتے ہیں (ابن فارس)۔ الْإِعْصَارُ - بگولا۔ (جس تند و تیز ہو)۔ گرد و غبار والی تندہوا۔ (۲-۶۶)۔ الْمُعْصِرَاتِ - بادل یا وہ ہوائیں جو بادلوں کو لاتی ہیں\*۔ وہ بادل جو برستے ہیں\*\*۔ (۴-۸)۔ صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ الْمُعْصِرَاتِ وہ ہوائیں ہیں جو بارش لاتی ہیں اور الْمُبْتَسِرَاتِ وہ جو بادل لاتی ہیں۔

## ع ص ف

الْعَصْفُ - کھیتی کی سبزی - کھیتی کے پودوں کے تنوں کے پتے جو سوکھ کر جھڑتے اور چورہ چورہ ہو جاتے ہیں۔ پودوں کے تنوں کے پتے - کھیتی کے پتے - بھوسہ - (غلے کے دانوں کے اوپر جو چھاکا ہوتا ہے اس کے بھوسے کو کہتے ہیں) - خسود بال کو بھی کہتے ہیں - قرآن کریم میں اصحابُ الْفَيْلِ کے متعلق ہے کہ انہیں كَعَصْفٍ مَّاءٍ كُؤِلٍ (۱-۵) کر دیا۔ یعنی جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔ یا وہ کھیتی جس کے دانے کھائے گئے ہوں، یا اسے کیڑا لگ گیا ہو۔ کلیات میں ہے کہ ہر چیز کے پتے عَصْفُ کہلاتے ہیں۔ اسی سے دانے نکلتے ہیں۔ پہلی شکل یہ ہوتی ہے کہ پتے نمودار ہوتے ہیں، پھر تنا بنتا ہے، پھر اس میں سے دانوں یا پھلوں کے خول نکلتے ہیں\*\*\*۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم میں وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ (۵-۵) آیا ہے۔ یعنی وہ دانے جو چھاکے کے اندر ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پودوں کے تنوں کے وہ پتے ہوتے ہیں جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جائیں\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کھیتی اور پودوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گر چکا ہو اسے عَصْفُ کہتے ہیں\*\*\*\*۔

الْمُعْصِفَاتُ\*۔ وہ ہوائیں جو بادلوں، پتوں، اور خشک پتوں کے چورے کو اڑا کر لاتی ہیں\*۔ رِيْحٌ عَصِيفٌ۔ تیز چلنے والی ہوا۔ آندھی۔ جھکڑ۔ (۱۲۲)۔ اس کے مقابل میں رِيْحٌ طَيِّبَةٌ آیا ہے (۱۲۲)۔ یعنی خوشگوار ہوا۔ سورۃ مرسلات میں ہے فَالْعَصِيفَاتِ عَصِفًا (۴۴)۔ غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر لے جانے والی آندھیاں۔ الْعَصِفُ۔ تیزی اور سرعت کو بھی کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ الْعَوَاصِفُ وہ تند و تیز ہوائیں ہیں جو میدانوں یا صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور الْعَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں طوفان لے آئیں۔

## ع ص ۳

عِصْمَةٌ کے اصلی معنی روکنے یا منع کرنے، نیز کسی چیز کو باندھنے کے ہیں۔ گردن کے پٹہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَعْصَامٌ ہے۔ اَلْعِصَامُ۔ محمل کی اس رسی کو کہتے ہیں جو محمل کو جھانے کے لئے اس کے ایک طرف باندھی جاتی ہے۔ ایسی دو رسیوں کو عِصَامَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعِصَامُ مِّنَ الدَّلْوِ وَالْقِرْبَةِ۔ ڈول یا مشک کی وہ رسی جس سے باندھ کر انہیں اٹھایا جاتا ہے۔ عَصَمَ الشَّيْءُ يَعْصِمُهُ، کے معنی ہیں کسی چیز کو روک دینا۔ عَصَمَهُ اللهُ مِّنَ الْمَكْرُورِ۔ خدا نے نہ پسندیدہ اور تکلیف دہ چیز سے اس کی حفاظت کی اور بچا لیا۔ عَصَمَ الْيَوْمَ اور اَعْتَصَمَ یہ، کے معنی ہیں کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ (اَعْتَصَمَ کے یہی معنی ہیں)۔ اَعْتَصَمَ بِاللهِ کے معنی ابن فارس نے خدا کی حفاظت میں آکر محفوظ ہو جانے کے لگھے ہیں۔ اَعْصَمَ بَيْنَ الْاَنْوَاعِ۔ اس نے فلاں کو پکڑ لیا اور اس سے چمٹا رہا۔ اَعْصَمَ بِالْفَرَسِ۔ اس نے گھوڑے کی ایال پکڑ لی تاکہ وہ گھوڑے کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس پر سے گر نہ پڑے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پکڑ لینا، تھام لینا، روکنا اور ساتھ لگے رہنا ہیں۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَمَنْ يَعْصِمْ بِاللهِ فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۳۰)۔ جس نے قانون خداوندی کو مضبوطی سے تھام لیا اُسے زندگی کی متوازن راہ کی طرف راہ نمانی مل گئی۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا (۱۳۲) کے بھی یہی معنی ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۲۵) (اے رسول تو اس قانون خداوندی کو لوگوں

پہنچائے جا۔۔۔۔۔) وہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضورؐ کے جسم کی حفاظت مراد نہیں۔ اس لئے کہ آپؐ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے "أَفَتَأْتِيْنَ مَوْتًا أَوْ قَتْلًا" (۱۳۳)۔ تو کیا اگر وہ مرجائے یا قتل کر دیا جائے۔ یعنی اس میں قتل کر دئے جانے کے امکان کی وضاحت ہے، لہذا (۱۳۴) میں حضورؐ کے جسم کی حفاظت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حفاظت رسالت (پیغامات خداوندی) مقصود ہے۔

عَصِيْمٌ - حفاظت کرنے والا (۱۳۵)۔ اسْتَعَصِمَ - اس نے اپنے آپکو بچانے رکھنا چاہا۔ (۱۳۶)۔ تاج نے اسْتَعَصِمَ کے معنی انکار کیا، باز رہا بھی لکھے ہیں۔ عِصْمٌ جمع ہے عِصْمَةٌ کی۔ اس کے معنی عقد نکاح کے ہیں (۱۳۷)۔ یعنی وہ عورتیں جو تمہارے نکاح میں ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہونا چاہتیں، انہیں روکے نہ رکھو۔ بلکہ انہیں عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

## ع ص و

عَصَا کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں۔ لاثھی کیو اس لئے عَصَا کہتے ہیں کہ اسے ہکڑنے کے لئے انگلیوں کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے۔ عَصَوْتُ الْقَوْمَ کے معنی ہیں میں نے قوم کو جمع کر لیا۔ \* اَلْعَصَا۔ جماعت کو کہتے ہیں۔ شَقَّ الْعَصَا۔ جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ \* اَلْقُلُوبُ الْمُسَافِرُ عَصَاهُ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مسافر نے اپنی لاثھی ڈال دی۔ لیکن یہ محاورہ ہے یہ بتانے کے لئے کہ وہ منزل پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور پڑاؤ ڈالا۔ \* صاحب لطائف اللغة نے اَلْعَصَا کے معنی اَلْوَبَيْل (یعنی سخت۔ گراں) کئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ (۲۰) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں اپنی جماعت کو ساتھ لے کر پتھریلی زمین کی طرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنے عصا سے چٹان کو مار۔ اس سے اسکی اوپر کی مٹی اتر جائیگی اور چشمے کا پانی باہر نکل آئیگا۔ اسی طرح اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۱) کے ایک معنی ہیں اپنی جماعت کو لے کر سمندر (یا دریا) کی طرف چلا جا۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنا عصا ٹیکتا ہوا سمندر کے راستے چلا جا۔

عصائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۲۸) اگر اسے حقیقی معنوں پر معمول کیا جائے تو اس سے

\* تاج و راغب - تاج نے لکھا ہے کہ "اَلْعَصَا۔ جماعۃ الاسلام" یعنی عصا سے مراد اسلامی جمیعت ہے۔ راغب نے محاورہ "شَقَّ الْعَصَا" کے معنی جماعت سے الگ ہو جانا کئے ہیں۔

مراد لالٹھی ہوگی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنوں میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطہ خداوندی (وحی کا پیغام) ہوگا جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لئے وجہ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرین فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جاسکتے ہیں۔

## ع ص ی

عَصَی - یَعَصِی - عَصِیَانًا - مَعْصِیَۃً - سرکشی کرنا - نافرمانی کرنا \* - وَعَصَیْ اٰدَمُ رَبَّهٗ (۱۳۱) آدم نے اپنے نشوونما دینے والے کی نافرمانی کی۔ اصل میں اَلْعَصَیۃ اس اونٹ کے بچے کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہ چلے۔ ادھر ادھر نکل جائے \* - عَصَی الطَّائِرُ - پرندہ اڑ گیا - عَصَی الْعِرْقُ - رگ سے خون بند نہیں ہوا اور برابر جاری رہا \* - اِعْتَصَمَتِ الشَّوَابَةُ - گتھلی سخت ہو گئی - تَعَصَّی الْاَمْرُ - معاملہ شدید ہو گیا \* - ان مثالوں سے اَلْعَصِیَانُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورہ حجرات میں ہے کہ جو (مؤمن) کفر و فسوق و عصیان سے نفرت کرتے ہیں، وہ اَلْقَرَّاشِدُوْنَ ہیں (۱۱۷) - یعنی خدا کے تجویز کردہ صحیح راستہ پر۔ سورہ مجادلہ میں مَعْصِیۃُ الرَّسُوْلِ (۵۸) سے روکا گیا ہے۔ سورہ مریم میں عَصِیًّا (۱۱۱) نافرمان بردار کے معنوں میں آیا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ معصیت کا اطلاق بعض اوقات لغزش پر بھی ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ قانون خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ صحیح راستہ پر چلتے ہیں۔ جو اس راستہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں وہ زندگی کی تباہ کن روش اختیار کرتے ہیں۔ یہی مَعْصِیۃ ہے۔

راغب نے عَصَی کو عَصَا (ع - ص - و) کے تابع لکھا ہے اور کہا ہے کہ عَصَی کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ اپنی لالٹھی (عَصَا) سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ نیز اس شخص کے لئے جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے فَلَانٌ شَقِیٌّ اَلْعَصَا کہتے ہیں۔ یہیں سے عَصَی کے معنی نافرمانی کے لئے جانے لگے \*\*\*۔ لیکن یہ توجیہ کچھ چپتی نہیں۔ عَصَا کے لئے عنوان (ع - ص - و) دیکھئے۔

## ع ض د

اَلْعَضُدُ - ہاتھ کا کہنسی سے لیکر کندھے تک کا حصہ - (بازو) مجازاً عَضُدُہ کے معنی ہیں اسکی مدد و اعانت کی، دستگیری کی - اَلْعَضُدُ -

جہامی و مسددگار - کسی کا دست و بازو\* - قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُمْ  
مُسْتَقْبِذِي الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۱۸/۵) - میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے  
والوں کو اپنا دست و بازو بناتا۔

أَعْضَادُ الْحَوَاضِ وَغَيْرِهِم - حوض وغیرہ کے ارد گرد جو ہشتہ  
مضبوطی اور حفاظت کی خاطر بنا دیا جاتا ہے۔

## ع ض ض

عَضٌّ - کسی چیز کو دانتوں سے پکڑ لینا - دانتوں سے کاٹنا۔ عَضٌّ  
عَلَى يَدِهِ عَيْظًا - اسوقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی سے انتہائی  
عداوت رکھے اور دشمنی میں بہت زیادتی سے کام لے\*\*۔ سورہ آل عمران میں  
ہے - عَضُّوا عَلَىٰ عَنَتِكُمْ أَلًا تَامِلًا مِّنَ الْغَيْظِ (۱۱۸/۳) - یعنی تمہارے  
خلاف ان کی دشمنی کا یہ عالم ہے کہ یہ غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔  
دراصل یہ معاورہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کوئی غصے میں اپنا ہسی کچھ بگاڑے،  
اپنے مقابل پر اس کا بس نہ چل سکے۔

## ع ض ل

الْعَضَلَةُ - پٹھا جسکے ساتھ موٹا گوشت ہو (مچھلی جو پنڈلی اور  
بازو وغیرہ میں عوقی ہے)\*\*۔ عَضَلْتُهُ - مینے اسکی مچھلی پر مارا۔ اسکے بعد  
اسکے معنی ہو گئے کسی کو زبردستی اور سختی سے (کسی کام سے) روک  
دینا۔ فَلَا تَعْضِلُوهُنَّ (۲۴۲/۲) انہیں مت روکو۔ نیز اس کے معنی تنگ  
کرنے اور مجبور کرنے کے بھی ہیں\*\*۔ عَضَلْتُ عَلَيْهِ - اس نے اس پر تنگی  
کی۔ اسے روکا اور باز رکھا۔ الْمُعْضِلَاتُ - مشکل اور پرپیچ مسائل جنہیں  
سلجھایا نہ جاسکے۔ سختیاں - مصیبتیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے  
بنیادی معنی سختی اور معاملہ میں پیچیدگی کے عوئے ہیں۔

## ع ض و

الْعَضْوُ - الْإِعْضُو - بدن کا ٹکڑا - جسم کا کوئی ایک حصہ\*\*۔  
(مثلاً ہاتھ، کان، ٹانگ وغیرہ)۔ مجموعہ کا ایک فرد - جماعت کا ایک فرد\*\*\*۔  
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے حصے کو دینے  
کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَضِيَّةُ - ٹکڑے ٹکڑے کر دینا - تقسیم کر دینا۔

متفرق کر دینا۔ اَلْعِضَّةُ\*۔ چیز کا ٹکڑہ۔ لوگوں کا فرقہ۔ جھوٹ۔ (یہ دراصل عِضْوَةٌ\* تھا) اسکی جمع عِضْوُونَ اور عِضِيَّيْنِ\* ہے۔ نیز یہ عِضَّةُ\* (عاء کے ساتھ) کی بھی جمع ہو سکتی ہے جسکے معنی سحر (جادو) کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاضِيَّةُ\*۔ ساحر\*۔ غالباً اس لئے کہ جادو ٹونا عام طور پر گوشت کے ٹکڑے (یا ہڈی) پر کیا جاتا ہے۔

سورہ حجر میں ہے اَلَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِيَّيْنِ\* (۱۵۱)۔ جنہوں نے قرآن کریم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے\*\*\*۔ جس بات سے اپنا مطلب حل ہوتا ہو اسے مان لیا۔ جو بات اپنے مفاد کے خلاف جاتی ہو اسکی جگہ اپنی خود ساختہ شریعت کا اتباع کر لیا۔ ایسی روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے (۸۵) میں دیکھئے۔

یا اسے معض مترووں کی طرح پڑھنے یا تعویذ گنڈے لکھنے کے لئے رکھ چھوڑا\*۔

## ع ط ف

عِطْفٌ\*۔ ایک جانب۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مسڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے ہیں۔ عِطْفًا الشَّرْجَلُ۔ آدمی کے دونوں پہلو (Sides)۔ سر سے لیکر سرین تک۔ عِطْفًا كُلُّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کے دونوں جانب۔ اَلْعِطْفُ\*۔ لوٹنا۔ مڑنا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ اسوقت ہولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے سرے کی طرف موڑ دیا جائے\*\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے ثَانِي عِطْفِيْدٍ (۲۴)۔ پہلو نہیں کرتے ہوئے۔

عَطْفٌ۔ يَعْطِفُ\*۔ عَطْفًا کے معنی مسائل ہونے کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَاطِفَةُ\*۔ مہربانی۔ شفقت۔ صلہ رحمی\*۔

## ع ط ل

عَطَلٌ\*۔ عَطْوُلٌ\*۔ زیور سے خالی ہونا۔ عَطِلَتِ الْمَرْأَةُ\*۔ عورت زیور سے خالی ہوئی۔ ایسی عورت کو اَلْعَاطِلُ\* اور اَلْعَطْلُ\* کہتے ہیں۔ (اَلْمِعْطَالُ\* اس عورت کو کہتے ہیں جو زیور کے بغیر رہنے کی عادی ہو)۔ اَلْمِعْطِيلُ\*۔ خالی کر دینا۔ بیکار کر کے چھوڑ دینا۔ چنانچہ اس ڈول کو جس کی رسیاں ٹوٹ چکی ہوں اور اس سے پانی نہ نکالا جاسکے اَلْعَطِيلَةُ\* کہتے ہیں۔ قَتُوْسٌ\* عَطْلٌ\*۔ وہ کمان جس پر تانت نہ ہو۔ بِشْرٌ مِعْطِلَةٌ\*۔

وہ کنواں جس کے آس پاس آبادی نہ ہوئے کی وجہ سے وہ بیکار ہو چکا ہو، اور اس سے ہانی نہ بھرا جاتا ہو \*۔ (۲۵)۔ سورہ تکویر میں ہے اِذَا الْعِشَارُ عُطِيتْ (۱) جب حاملہ اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا جائیگا۔ اَلْعِشَارُ ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو بچہ دینے کے قریب ہوں۔ عربوں میں اونٹ کی جو اہمیت تھی وہ واضح ہے۔ اور ایسی اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہوں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دینے سے مفہوم یہ ہے کہ اس دور میں خود اونٹوں کی قدر و قیمت ہی نہیں رہیگی۔

عَطِّلَ لَا جِیْرَ - مزدور کا بیکار رہنا \*\*۔

## ع ط و

اَلْعَطْوُ - لینا - کسی چیز کو لینے کے لئے سر اور ہاتھوں کو اوپر اٹھا دینا - ظَبْنٌ عِطْوٌ - (عین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ) وہ ہرن جو درخت سے پتے کھانے کے لئے اپنے سر کو اوپر اٹھائے \*۔

اَلْاِعْطَاءُ - دینا - اَلْعَطَاءُ وَالْعَطِيَّةُ - جو کچھ دیا جائے - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِيتَاءُ (دینے) اور اِعْطَاءُ میں فرق یہ ہے کہ اِيتَاءُ کسی واجب کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ایسی چیز پر بھی جو محض تفضلاً دی جائے - لیکن اِعْطَاءُ صرف تفضلاً دینے کو کہتے ہیں \*۔ اَلْاِعْطَاءُ - سپردگی - اَعْطَى التَّجْعِیْرَ - اونٹ نے منہ زوری ختم کی اور مطیع ہو گیا - قَوْسٌ عَطْوٰی - نرم اور آسانی سے کھنچ جانے والی کمان \*۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۲۰) - جو سامان زیست نوع انسانی کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے مفت عطا ہوا ہے (یعنی رزق کے قدرتی وسائل) ان پر کوئی روک نہیں - جب خدا نے انہیں عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے عام کر دیا ہے تو ان پر روک کون ڈال سکتا ہے - اسی لئے قرآن کریم نے نظام ربوبیت کو قائم کرنے والوں کے متعلق کہا کہ مَنْ اَعْطٰی وَاَدْبَقٰی (۲۱) جو دیتا ہے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسی کے لئے آحانیاں ہیں - برخلاف اس کے مَنْ يَخْلِبْ وَاسْتَعْثِلْ (۲۲) - جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھتا ہے اور اس طرح دوسروں سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے دشواریاں ہی دشواریاں ہیں -

یہ ظاہر ہے کہ انسانی جسم کی پرورش کا مدار ہر اس چیز پر ہے جسے انسان اپنے لئے لیتا ہے۔ جسے وہ خود کھاتا پیتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نوالہ آپ کے منہ میں جائے اور پرورش میرے جسم کی ہوتی جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس، انسانی ذات (Self) کی نشوونما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اور برضا و رغبت دیتا ہے۔ اسی کو اِعْطَاء کہتے ہیں۔ قرآنی نظام کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ پوری پوری محنت کرنا لیکن اپنی محنت کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی سب نوع انسانی کی نشوونما کے لئے دیدینا۔ یہ ہے جماعت مؤمنین کا شعار زندگی۔

اَلتَّعَاطٰی\* - جس چیز کا حق نہ ہو اسے لے لینا۔ باہم کسی چیز کو لینے کے لئے کشمکش کرنا۔ پاؤں کے پنجوں پر کھڑے ہونا اور ہاتھ بڑھانا۔ بہت بڑی جرات کرنا\*۔ سورہ قمر میں اس سرکش کے متعلق ہے جس نے اس اونٹنی کو جسے حضرت صالحؑ نے خدا کے نام پر چھوڑا تھا قتل کر دیا تھا کہ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ (۲۹)۔ اس نے بڑی جرات کر کے ہاتھ بڑھایا اور اونٹنی کو مار دیا۔ یعنی اس چیز کو جا لیا جس کا اسے حق نہیں تھا (ابن فارس)

## ع ظ م

عَظْم\* - ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظْمُ الْفَدَّانِ - کسان کے ہل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جسکے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ عدل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ - قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے سالک ہوتے ہیں۔ عَظَمُ الطَّيْرِ يَقْر - راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظَمَةُ کے معنی تکبر و غرور۔ بڑائی۔ نیز عزت و حرمت کے بھنی ہیں۔ اَلْعَظِيْمَةُ - سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں عَظْم\* (جمع عِظَام\* اور اَعْظُم\*) ہڈیوں کے معنی میں متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۱۹۹/۱۹۹؛ ۱۹۹/۱۹۹؛ ۱۹۹/۱۹۹)۔ سورہ نور میں هَيِّسَن\* (آسان) کے مقابلہ میں عَظِيْم\* کا لفظ اہمیت کا مفہوم لئے ہوئے ہے (۲۴/۱۵)۔ اور النَّبَا الْعَظِيْم (۷۸) میں سخت حادثہ یا انقلاب عظیم کے معنوں میں۔



اور الْقَرَّ أَنْ الْعَظِيمِ (۱۸۷) کے معنی ہیں زندگی کے بنیادی حقائق کا ضابطہ۔ ”عَظِيمُ الْقَدَرِ“ کی رعایت سے، قرآن کریم وہ ضابطہ ہے جس سے زندگی کی سنگلاخ زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے۔ جس سے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں خدا کے متعلق ہے وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۲۵۶)۔ یعنی بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اور انسان کو شرف کی بلندیاں اور زندگی کی بنیادی قوتیں عطا کرنے والا۔ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۲۵۹)۔ جس کے قبضہ قدرت میں کائنات کی اساس و بنیاد کا کنٹرول ہو۔

## ع ف ر

الْعَفْرُ - مٹی۔ عَفْرَةٌ فِي التُّرَابِ بِتَعْفِيرٍ\*۔ اسے مٹی میں لت پت کر دیا۔ مٹی میں دبا دیا۔ الِتَعْفُورُ\*۔ وہ چیز جس پر مٹی مل دی گئی ہو۔ الِتَعْفُورُ\*۔ موٹا۔ مضبوط آدمی۔ نیز بہادر چست آدمی۔ رَجُلٌ عِيفَرٌ\* و عِيفَرِيٌّ\*۔ (نیز عِيفَرِيٌّ\*) و عِيفَرِيَّتٌ\*۔ چالاک اور شریر آدمی۔ نہایت تیز و طرار آدمی۔ حیرت انگیز ہوشیاری کے ساتھ معاملات میں گھس جانے والا آدمی۔ نیز ضبط کرنے والا، قوی تند خوانسان جو اپنے مد مقابل کو زیر کر لے\*۔

سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں سے ایک کے لئے عِيفَرِيَّتٌ\* مِّنَ الْجِنِّ (۲۹) آیا ہے۔ یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل، اور چست و چالاک آدمی، جس میں قوت اور معاملات کے اندر تک گھس جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ تیز و طرار۔ زیرک اور ہوشیار۔ انتہائی معاملہ فہم۔

## ع ف ریت

حضرت سلیمانؑ کے لشکر کا ایک زبردست اور شاہ زور (پہاڑی قبیلہ کا) سردار (۲۹) جو بہت تیز طرار اور معاملہ فہم تھا۔ دیکھئے عنوان (ع۔ ف۔ ر)۔

## ع ف ف

الْعِفَّةُ\*۔ نفس کا ایسی حالت میں پہنچ جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے\*\*۔ عِفَّةٌ\*۔ عِفَافٌ کے معنی ہیں حرام و نازیبا چیزوں

سے خود کو روکنا۔ قبائح سے رک جانا\*\*۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اَعْتَفَّتْ اِلَیْلُ التَّیْمِیْنِ۔ اونٹوں نے اپنی زبانوں سے خشک گھاس کو مٹی سے صاف کرتے ہوئے اٹھا لیا\*\*۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں رک جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اَلْعُفَّافَةُ اس تھوڑے سے دودھ کو کہتے ہیں جو دودھ دوہ لینے کے بعد تھنوں میں رک کر رہ جائے\*\*۔ عَفَّتِ الرَّجُلُ۔ آدمی نامناسب چیزوں سے رکا۔ تَعَفُّفٌ۔ کے معنی ہیں تھوڑی چیز پر کفایت کر لینا\*۔ بتکلف اپنے نفس کو روکنا اور کسی چیز سے دور رکھنا\*\*۔ بے جا باتوں سے شرم و حیا کرنا۔ ضرورت کے باوجود کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا۔ (س۱۳۴)۔ سورۃ نور میں ہے وَ اَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ (۲۴) اگر وہ اس کی بھی احتیاط رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ نِیْزَ وَ لَیْسَتْ تَعْفِیْفِ الذِّیْنَ لَا یَتَجِدُوْنَ نِیْکَاحًا (س۱۳۴)۔ جو نکاح کا سامان نہیں پاتے انہیں چاہئے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ اسی کو عفت (ہاکبازی) کہتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی عفت پر بڑا زور دیتا ہے۔ یعنی جنسی اختلاط کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیتا ہے جسے نکاح کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جنسی اختلاط سخت جرم ہے۔ وہ کھائے پینے کے معاملہ میں اضطراری حالت کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں حرام تک کھائے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے وہ اس کی تسکین کے لئے ناجائز اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔ بھوک اور پیاس انسان کے اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے ابھرتا ہے۔ اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ اس لئے جس جذبہ پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

## ع ف و

عَفُوٌ۔ اس کے اصلی معنی ”ترک“ کے ہیں۔ عَفَا عَنْہُ۔ اسے سزا دے بغیر چھوڑ دیا اور جائے دیا۔ معاف کر دیا\*\*\*۔ قرآن کریم میں عَفُوٌ اور صَفْحٌ کے لفظ اکٹھے آئے ہیں (س۱۰۶)۔ ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ صَفْحٌ بلیغ تر ہے۔ یعنی بالکل چھوڑ دینا، اور عَفُوٌ میں یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ کہہ سن کر چھوڑ دیا جائے\*\*\*۔ صاحب محیط کے نزدیک عَفُوٌ اور مَغْفِرَةٌ میں فرق یہ ہے کہ مَغْفِرَانٌ میں سزا قطعاً نہیں ہوتی اور عَفُوٌ

سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی \*\*۔ (مزا کے بعد عَفْوٌ سے مراد ہوگا سزا کے اثرات کو مٹا دینا۔ کیونکہ عَفْوٌ کے معنی مٹا دینا بھی ہیں۔ اور مَسْغِفِرَةٌ کے معنی ہونگے ان اثرات سے شروع ہی سے بچائے رکھنا)۔ عَفْوٌ۔ مٹا دینا۔ نیز مٹ جانا۔ عَفَا آثَرُهُ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ اسکا نشان تک مٹ گیا۔ اَلْعَفَاءُ۔ وہ بارش جو آثار منازل تک کو مٹا دے\*۔

صباح میں ہے کہ عَفْوُ الْمَالِ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے خرچ سے زائد ہو۔ اَعْطَيْتُهُ عَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں میں نے اسے بغیر مانگے مال دیا\*۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اَلْعَفْوُ سِنَ الْمَاءِ۔ وہ پانی جو پینے والوں سے بچ جائے اور بلا کلفت و مزاحمت حاصل ہو سکے۔ عَفَا شَعْرُ الْبَعِيرِ۔ اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے۔ عَفَا عَلَيْهِ رِفَى الْعِلْمِ۔ وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کی معلومات پر اضافہ کیا۔ عَفَا الصُّوفُفَ۔ اون کو زیادہ بڑھا کر کاٹا\*۔ صاحب لطائف اللغة نے اسے اضداد میں سے لکھا ہے۔ یعنی اس کے معنی مٹا دینے کے بھی ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی۔

لہذا اس کے معنی ہیں ضرورت سے زائد۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلی رکھیں اور کس قدر خود اپنے لئے رکھیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۱۹)۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ یہ ہے قرآن کریم کے نظام ربوبیت کا اصل الاصول۔ یعنی ہر فرد معاشرہ پوری پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لئے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے قرآنی نظام کے حوالے کر دے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد فاضلہ دولت (Surplus Money) ہے۔ قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس لئے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے۔

اَلْعَافِيَّةُ وَالْمُسْعِفَةُ کے معنی ہیں دوسروں کی ایذا سے محفوظ رکھنا۔ بیماریوں اور آفتوں سے بچانا\*۔ ابن اثیر نے اس کا یہ مفہوم بنایا ہے

کہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مستغنی کر دینا۔ ایک کی اذیت سے دوسرے کو محفوظ کرنا۔ گویا نہ کوئی تمہارا محتاج ہو اور نہ تم کسی کے محتاج ہو۔ اَلْمُعْتَقِبِیْ - وہ شخص جو تمہارے ساتھ رہے لیکن تم سے کسی سلوک کا طلبگار نہ ہو\*۔ طلبگار نہ ہونے کے اعتبار سے اَعْطِیْتُمْہُ عَقْوًا کے معنی ہیں میں نے اس کو بے مانگے دے دیا۔ نیز عَقْوُو کے معنی بہترین چیز کے ہوتے ہیں۔ نیز وہ چیز جس میں کسی قسم کی تکلیف و مشقت نہ اٹھانی پڑے\*۔

سورة بقرہ میں بنی اسرائیل کی خطا کاری کے بعد کہا ہے ثُمَّ عَقَوْنَا عَنْکُمْ (۲/۵۲) - یعنی اس غلطی کے مضر اثرات کو مٹا دیا۔ اسے معاف کرنا یا درگزر کرنا کہتے ہیں (واضح رہے کہ یہ اثر اس طرح سے مٹتا ہے کہ کوئی ایسا اچھا کام کیا جائے جس کے خوشگوار نتائج پہلی غلطی کے مضر نتائج کی تلافی کر دیں)۔ (دیکھئے عنوان ح - س - ن اور س - و - ا) - اپنے حق کو چھوڑ دینے کے معنوں کے لئے (۲/۲۳۷) دیکھئے - آگے بڑھ جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۹۵/۶) میں آیا ہے - یعنی وہ تعداد میں زیادہ ہو گئے - ترقی کر گئے۔

سورة شوریٰ میں ہے وَ جَزَاءُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا - یعنی قانون عدل کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ سزا ہمیشہ جرم کی نسبت سے دی جائے۔ جیسا جرم ویسی سزا - اس کے بعد ہے وَ مَن عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلٰی اللّٰهِ (۲۴/۲۴) - لیکن اگر مستغیث معاف کر دے اور اس طرح مجرم کی اصلاح کر دے اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب بن جائے، تو اس کا اجر اللہ سے ملیگا - یعنی عدل سے مقصد تلافی مسافات ہوتا ہے یا اصلاح - انتقامی سزا اس صورت میں دی جاتی ہے جب اول الذکر صورتوں کا امکان نہ ہو۔ [گناہوں کے معاف ہو جانے کے متعلق عنوانات (ت - و - ب) و (غ - ف - ر) اور (ح - س - ن) دیکھئے۔]

## ع ق ب

اَلْمُعْتَقِبُ - اَلْعَاقِبُ - اَلْعَاقِبَةُ - اَلْمُعْتَبَةُ - اَلْعَقَبَةُ - اَلْعَقَبَةُ - ان الفاظ کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر - یہی اس مادہ کے اصلی معنی ہیں - باقی تمام معانی (جو بہت سے ہیں) اسی مرکزی مفہوم کے گرد گھومتے ہیں۔ اَلْعَقِبُ - ایڑھی (جمع اَعْقَاب) - اولاد - نسل جو انسان کے پیچھے آتی ہے - بیٹے ہوتے - اَلْعَاقِبُ - ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کی جانشین ہو۔

اسکے پیچھے آئے۔ مثلاً بیٹا۔ سردار قوم کے پیچھے آئے والا افسر۔ عَقَبَتَہ۔ وہ اسکا جانشین ہوا۔ تَعَاقَبَ الْمُسَافِرَ اَنْ عَلٰی الدَّابَّةِ۔ دو مسافر یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہوئے۔ اَلْمُعَقَّبَتَہ۔ دن کو بھی کہتے ہیں اور رات کو بھی، کیونکہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ نیز اس کے معنی باری یا بدل کے بھی ہیں۔ تَعَقُّبٌ۔ ادھر ادھر دیکھنا یا مڑ کر پیچھے کو دیکھنا یا لوٹنا۔ تَعَقُّبٌ۔ کسیکا پیچھا کرنا۔ نیز کسی کو جرم کی وجہ سے گرفتار کرنا اور اسے جرم کی سزا دینا۔

راغب نے کہا ہے کہہ اَلْمُعَقَّبُ وَالْمُعَقَّبِي۔ اچھے بدلے کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔ نیز عَاقِبَتَہ بھی۔ اور عِقَابٌ اور عَقُوْبَتَہ سزا کیلئے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں۔ قرآن کریم میں عَقْبِي کا لفظ مسومین کی جزا اور کفار کی سزا دونوں کے لئے آیا ہے (۱۳۳)۔ محیط میں اَلْمُعَقَّبُ کے معنی ثل بٹول کرنے والے کے بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقَّبٌ لِّحُكْمِهِ (۱۳۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا۔ اَلْعَقَبَتَہ۔ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ۔ (۱۳۴)۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی، سختی اور صعوبت بھی لکھے ہیں۔

قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کیلئے اس سادہ کے مشتقات استعمال کر کے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے۔ قانون مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اسکے ساتھ ہی لگا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی آگے آگے کام جاتا ہے اور اسکے پیچھے اسکا نتیجہ چلا جاتا ہے۔ اسے جزا اور سزا کہتے ہیں۔ لہذا جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں آتی۔ خود اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اعمال کا جزء ہوتی ہے۔ جیسے ورزش کا نتیجہ (صحت) خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ اسلئے سورہ وعد میں کہا ہے کہ لَہٗ مُعَقَّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْہِ وَ مِّنْ خَلْفِہِ يَحْفَظُوْنَہُ سِنٌ اَمْرٍ اللّٰہِ (۱۳۳)۔ ہر انسان (یا انہی کے عمل) کے ساتھ آگے اور پیچھے ایسی قوتیں لگی ہوئی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسکی نگرانی کرتی ہیں اور اس کے ہر عمل کو آخری نتیجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں، اسی کو مآل کار، یا کام کا آخری نتیجہ کہتے ہیں۔ یہی ہر انسانی عمل کی عَاقِبَتَہ یا عَقْبِي ہے۔

یعنی اس کا آخری نتیجہ - تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا (۱۳۵)۔ یہ مآل (انجام) ہے ان لوگوں کا جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ لہذا عُقْبَى کے معنی اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہی نہیں۔ اس کے معنی ہر کام کا نتیجہ یا انجام ہیں۔ خواہ وہ انجام اسی دنیا میں سامنے آجائے۔ (یہ اس کے بعد کی زندگی میں)۔ چنانچہ (۱۳۶) میں جو آیا ہے اُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الْقَدَارِ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ان کے لئے اس دنیا کا انجام نہایت اچھا ہے۔ یہی معنی عَاقِبَةُ الْقَدَارِ (۱۳۶) کے ہیں جہاں یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ فَتَسَوُّفَ تَعْمَلُونَ۔ تمہیں جلدی معلوم ہو جائیگا۔ یعنی اسی زندگی میں بات واضح ہو جائیگی کہ دنیا کی خوشگواریاں کس کے لئے ہیں۔

بِمَنْقَلِبٍ عَلَى عَقِبَيْهِ۔ اپنی ایڑھیوں پر لوٹ جانا۔ بمقابلہ اتباع (۱۳۷)۔ اس کے معنی پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جانا، پھر اسی روش زندگی کو اختیار کر لینا ہیں جس پر کوئی پہلے ہو۔ یعنی جاہلیت کے بعد اسلام قبول کرنا، اور اسلام کے بعد پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا۔ (۱۳۸) میں یہی معنی ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نظام، رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی نہیں کہ ان کی وفات کے بعد تم پھر نظام جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ۔ یہ نظام علیٰ حالہ جاری رہیگا۔ اس سے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظام، افراد یا شخصیتوں کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اصولوں کے زور پر آگے چلتا ہے۔ شخصیتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ لیکن جب تک وہ اصول قائم رہتے ہیں جن پر وہ نظام متشکل ہوا تھا، وہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ البتہ جب ان اصولوں کو ترک کر دیا جائے تو پھر وہ نظام ختم ہو جاتا ہے۔ ختم نبوت کے معنی یہی تھے کہ اب یہ نظام (اسلام) شخصیتوں کے سہاروں کا محتاج نہیں رہیگا۔ یہ اپنے محکم اصولوں کی قوت پر آگے چلے گا۔ جب تک امت ان اصولوں پر قائم رہی وہ نظام آگے بڑھتا گیا۔ جب اس نے وہ اصول چھوڑ دیے تو وہ نظام بھی ختم ہو گیا۔ اب اس کے احیاء کی صورت یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصولوں کو پھر سے ضابطہ حیات بنا لیا جائے۔

## ع ق د

عَقْدٌ۔ مضبوطی سے گره باندھنا۔ یہ حَلٌّ (گرہ کھولنا) کی ضد ہے۔ پھر اس کے معنی کسی بات کو مؤکد کرنے کے ہو گئے۔ عَقْدَ الْعَهْدِ۔

اسنے عہد کو مضبوط کر دیا \*۔ اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ (۳۳) وہ لوگ جن سے تم نے محکم عہد باندھ رکھا ہے۔ اَلْعُقُودُ۔ عہد و پیمان \*۔ (جمع عُقُودٌ)۔ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ (۲۱)۔ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ اَلْعُقُودَةُ۔ (جمع عُقُودٌ) گرہ \*۔ عَقْدَةُ النِّكَاحِ (۲۳۵)۔ نکاح کی گرہ۔ وَاَحْمِلْ عَقْدَهُ مِیْنًا لِّیَسَّانِی (۲۰)۔ میری زبان کی گرہ کھول دے۔ ایسے روائی اور طلاق عطا کر دے۔ تَبَاکُہْ یَقْتَتِہُۙۤ اِقْوَالِی (۲۸) اہل فرعون میری (حضرت موسیٰؑ کی) بات کو سمجھ لیں۔

عَقْدَةُ \*۔ ارادے کو پختہ کرنا۔ حکومت۔ حکومت کی بیعت وفاداری۔ (جمع عُقُودٌ)۔ اَللَّاهُتِۢیْ فِی الْعُقُودِ (۱۱۳)۔ وہ جماعتیں جو کسی حکومت کو کمزور کرنے یا اسکی وفاداری میں تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یا نفسیاتی اثرات سے کسی کے محکم یقین کو متزلزل کر دیں۔ اَلْعُقُودَةُ۔ دل میں مضبوطی سے جمی ہوئی بات \*\*۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا)۔

## ع ق ر

عَقَرَّ النَّخْلَةَ۔ کھجور کے درخت کے بالائی حصہ کو گاہے کے ساتھ کاٹ دینا، جس کے بعد وہ خشک ہو جاتا ہے \*۔ اور راعِب کے نزدیک اس کے معنی ہیں کھجور کے درخت کو جوڑ سے کاٹ دینا \*\*\*۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اس کے معنی اسے اس طرح کر دینے کے ہیں کہ وہ پھل نہ لاسکے۔ اس لئے اَلْعَقْرَةُ کے معنی ہیں رحم کا عقیم (بانجھ) ہو جانا۔ حمل قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھنا۔ اَلْعَقْرُ۔ زخمی کرنا۔ نَاقِةٌ عَقِیْرٌ۔ وہ اونٹنی جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں \*۔ قرآن کریم میں عَاقِرٌ بانجھ عورت کے لئے (۳۹؛ ۱۵) میں آیا ہے۔ اور عَقْرٌ اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے (یا اسے قتل کر دینے) کے لئے (۵۲؛ ۹۱) میں۔

## ع ق ل

عَقَلَ کے معنی ہیں روکنا۔ منع کرنا۔ عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی ٹانگ کے نچلے حصہ کو موڑ کر اس کی ہڈی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ اَعْتَقِلْ لِّیَسَّانَہُ۔ اسکی زبان رک گئی۔ وہ بول نہ سکا۔ عَقَلَ۔ اس نے عقل سے کام لیا۔ عَقَلَ الشَّیْءَ۔ کسی چیز کو سمجھا، اس میں غور و تدبیر کیا۔ عَقَلَ فُلَانًا۔ فلاں کو روک دیا۔ بند کر دیا۔

قید کر دیا۔ اَلْعُقْلَةُ\*۔ وہ چیز جس سے کسی کو ہانده دیا جائے۔ مثلاً بیڑی وغیرہ۔ اَلْمَعْقِلُ\*۔ جائے پناہ (کیونکہ آدمی اس میں پناہ گیر ہوتا اور رک جاتا ہے۔ نیز اس لئے کہ وہ جگہ دشمن کو وہاں آنے سے روک دیتی ہے)۔ بلند پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جو روک بن جاتا ہے\*۔

قرآن کریم میں عقل و فکر سے کام لینے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے انہیں حیوانات سے بدتر قرار دیا گیا ہے، اور ان کا مقام جہنم بتایا گیا ہے (۱۶۹)۔ قرآنی حقائق کو نہ ماننے والوں (کفار) سے بار بار کہا گیا ہے کہ تم عقل و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔ تم قرآن کریم میں غور و تدبر کیوں نہیں کرتے۔ انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ (۱۶۴)۔ اس اعتبار سے عقل کا مقام بہت بلند ہے۔ خود عربوں کے ہاں بھی اَلْعَقِيْلَةُ\* اس صاحب شرف و عزت خاتون کو کہتے تھے جو پردہ نشین ہو۔ نیز قوم کے سردار کو۔ بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین چیز کو\*۔ عَقِيْلَةُ السَّحَرِ\*۔ موتی کو کہتے ہیں۔ اور اَلْعَاقِلُ\*۔ سمندر کے گہرے اور بہت پانی والے حصہ یا سمندر کی موج کو\*۔ واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنیوں کے اعتبار سے ان تمام الفاظ میں یہ مفہوم مشترک ہوگا کہ ان کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی زیادہ حفاظت کرتے ہیں اور انہیں روک کر رکھتے ہیں۔

عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نا مناسب باتوں سے روکے۔ لیکن یہی عقل اگر جذبات کے تابع ہو جائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے (۲۸)۔ ایسا انسان (یا قوم) علم و عقل کے باوجود زندگی کی غلط روش پر چل نکلتا ہے۔ وَ اَضَلَّهٗ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمِہٖ (۲۵)۔ اور اس کے ذرائع علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ (۲۶)۔ جس طرح نشے کی حالت میں انسان کے حواس صحیح کام نہیں کرتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی۔ وہ جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے حصول کا ذریعہ۔ اس مقام پر عقل، انسان کو اسکی انفرادی مفاد پرستیوں کے زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور اسے ربوبیت ہامہ (عالمگیر انسانیت کی نشو و نما) سے روکتی ہے۔ لہذا عقل کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسے وحی کے تابع رکھا جائے۔ یعنی انسان اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھے تو اسکی عقل اسے صحیح فائدہ پہنچا سکتی ہے (۲۸)۔



بالفاظ دیگر، عقل کو اپنی راہ نمائی کے لئے اسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یہ ہے تعلق عقل اور وحی کا۔ اس طرح عقل سے کام لینے والوں کو مومن کہا گیا ہے (۱۵/۶)۔ جو عقل وحی کے تابع نہیں چلتی اسے شیطان\* اور ابلیس\* کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوانات ب۔ ل۔ س اور ش۔ ط۔ ن)۔

## ع ق م

عُقْمٌ\*۔ دراصل اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے میں مانع ہو۔ عَقِیْمٌ\*۔ وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے\*۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عورت تک ہی محدود نہیں۔ رَجُلٌ عَقِیْمٌ\* و عَقَامٌ\*۔ اس مرد کو بھی کہتے ہیں جسکے اولاد نہ ہو۔ رِیْحٌ عَقِیْمٌ\*۔ خشک ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا بارش نہیں برساتی، یا درختوں کو بار بار نہیں کرتی۔ یَوْمٌ عَقِیْمٌ\*۔ سخت دن۔ ایسا دن جس میں ٹھنڈ (ماسان راحت) نہ ہو\*\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ عُقْمٌ کے اصل معنی بند کرنا، روکنا۔ اور قطع کرنا ہیں\*\*\*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نمایاں نہ ہونا۔ تنگ ہونا اور سخت ہونا ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ\*۔ (۲۱/۵)۔ بڑھیا بانجھ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے الرَّیْحُ الْعَقِیْمُ آیا ہے (۲۱/۵)۔ بمقابلہ رِیْحٌ لَّوْا قِیْحٌ\* (۲۲/۱۵) کے جو ہاتی برساتی ہیں۔ سورہ حج میں عَذَابٌ یَوْمٌ عَقِیْمٌ\* (۲۵/۲۵) آیا ہے۔ ”تباہ کرنے والے دن کا عذاب“۔ یعنی ایسا عذاب جس سے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جائیں۔ جس سے اسکی جڑ کٹ جائے۔ وہ عقیم رہ جائے۔

## ع ک ف

عَكَفَ۔ کسی چیز کو روکنا، یا رکنا۔ عَكَفَ عَلَیْہِ۔ اسکی طرف مسلسل بڑھا اور اس سے اپنا رخ نہ پھیرا۔ عَكَفَ۔ کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے لڑی میں پرو دینا، جس طرح موتیوں کو پرو دیا جاتا ہے۔ عَكَفَ الْجَوُّہَرُ فِی النَّظْمِ۔ گوہر لڑی میں پر گیا۔ شَعْرٌ مَعَكُوفٌ\*۔ کنگھی کٹے ہوئے، گندھے ہوئے بال (برخلاف پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں کے)۔ اسلئے عَكَفَ کے معنی ہیں (معاملات کو) درست کرنا\*\*۔ راغب

نے لکھا ہے کہہ **الْعُكُوفُ**۔ تعظیماً کسی شے کی طرف بڑھنے اور اس سے مستقل طور وابستہ ہونے کو کہتے ہیں۔ \*\*۔ **عَكَفَ الْقَوْمُ حَتَّى لَسَهُ**۔ قوم نے اس کے گرد گھیرا بنا لیا۔ \*

قرآن کریم میں ہے **الْمُهَذَّبُ الْمُتَعَكِّفُ** (۲۸) وہ جانور جسے کعبہ لئے جارہے ہوں لیکن اسے راستے میں روک دیا گیا ہو۔ یہاں اس کے معنی روکنے کے ہیں۔ سورہ حج میں ہے کہہ کعبہ کو **سَوَاءَنَ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ** (۲۵) بنایا ہے۔ یعنی وہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے مشترکہ طور پر بنائے پناہ ہے اور کسی پر اس کے دروازے بند نہیں۔ نہ ہی کسی کے حقوق زیادہ ہیں۔ سورہ طہ میں **عَاكِفِينَ** کا لفظ (۲۱) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں کسی کام پر مسلسل لگے رہنا۔ جمے رہنا۔

کعبہ کے متعلق ہے کہہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ سے کہا کہہ اسے **طَائِفِينَ** اور **عَاكِفِينَ** کے لئے پاکیزہ بنا دیں۔ (۲۵)۔ **عَاكِفِينَ** کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر ان کے معاملات کو درست حالت میں رکھے۔ ان کے الجھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی مشاطگی کرے اور اس طرح کیسوئے انسانیت کو سنوار دے۔ (تفصیل اس کی ط۔ و۔ ف کے عنوان میں دیکھئے)۔ یہ ہے منصب امت مسلمہ کا جس کے نظام کا مرکز کعبہ ہے۔ یعنی یہ امت اپنے آپ کو اپنے مرکز نظام خداوندی (کعبہ) سے متمسک رکھتی ہے، اور نوع انسانی کے معاملات کو سنوارتی ہے۔ اسی کو **شَهِدَاءَ عَلَى النَّاسِ** (۱۲۱) بھی کہا ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی۔ لیکن دوسروں کے اعمال کی نگرانی وہی جماعت ہو سکتی ہے جو خود قوانین خداوندی پر جم کر رہے اور اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھے۔

## ع ل ق

**الْعَلَقُ**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہہ اس کے بنیادی معنی کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھنا یا وابستہ کر دینا ہیں۔ **الْعَلَقُ** اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر کنویں کی چرخی لگی ہوتی ہے۔ یا چرخی مع اپنے ضروری سامان کے۔ **الْعَلَقُ**۔ خون (خواہ کسی قسم کا ہو)۔ یا تیز سرخ

یا گاڑا یا جما ہوا خون جو ابھی خشک نہ ہوا ہو بلکہ لوتھڑے کی قسم کا ہو۔ نیز چونک جو خون چوس لیتی ہے۔ نیز وہ مٹی جو ہاتھ سے چمٹ جائے۔ اَلْمِعْلَاقُ۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے۔ مثلاً ڈول کے دونوں کنارے جن میں رسیاں بندھی ہوتی ہیں انہیں اَلْمِعْلَاقَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعَلَقِیُّ۔ ایک قسم کی درخت پر چڑھنے والی بیل یا جھاڑی جس میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز اس میں الجھ جائے تو اس کا سلامت نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اَلْعِلَاقَةُ۔ اَلْعِلَاقَةُ۔ محبت کو کہتے ہیں جو دل کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اَلْمُعَلَّقَةُ۔ وہ عورت جو شوہر کے مفقود الخیر ہونے کی وجہ سے نہ شادی شدہ کی طرح ہو نہ مطلقہ کی طرح۔ ازہری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا خداوند نہ اس کے ساتھ انصاف کرے، نہ اسے چھوڑے۔ اور اس طرح اس کی حالت شادی شدہ اور بے شوہر والی عورت کے درمیان ہو جائے اور وہ ادھر لٹکتی رہے۔ قرآن کریم میں ہے فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۱۴۹)۔ تو تم اسے معلقہ کی طرح چھوڑ دو۔

سورة مومنون میں انسانی بچہ (جنین) کی جو مختلف حالتیں بتلائی گئی ہیں ان میں دوسری حالت عِلَقَةٌ کی ہے (۲۳)۔ یعنی چونک کی طرح (Sole-Shaped)۔ سورة علق میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۱)۔ عَلَقِ کے معنی اگر خون کے لوتھڑے کے لئے جائیں تو آیت میں انسان کی طبیعی خلقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اگر اس کا وسیع مفہوم لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو اگر (بغیر وحی کی راہ نمائی کے) علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی ہوس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ اپنے مفاد کے ساتھ چونک کی طرح چبٹا اور خون پیتا رہتا ہے اور ہر جگہ شکار پھانسنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اَعْلَقَ الصَّائِدُ کے معنی ہیں شکاری کے جال میں شکار پھنس گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَلَقُ عشق و محبت (جس میں کسی کو جی چاہتا ہے اور اس سے بندھ جاتا ہے یا، بقول تاج، جو دل میں جم جاتی ہے) کو بھی کہتے ہیں۔

## ع ل م

عِلْمٌ (عِلِمٌ - يَعْلَمُ)۔ کسی چیز کو کماحقہ جاننا۔ پہچاننا۔ حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا۔ محکم طور پر

\* تاج و محیط و راغب \*\* تاج -

معلوم کرنا\* - اس طرح ادراک حقیقت کرنے والے کو عَالِمٌ کہتے ہیں جس کی جمع عَالِمُونَ آتی ہے - اور عَلِیْمٌ کی جمع عَلَمَاءُ یعنی گہرا اور پختہ علم رکھنے والے - اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے ہیں جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے متمیز ہو سکے - (ابن فارس)

عربوں کے نزدیک عَلِیْمٌ کا درجہ معرفت اور شعور سے زیادہ بلند ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے عَلِیْمٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں - معرفت یا شعور کا نہیں - چنانچہ خدا کو عَالِمٌ یا عَلِیْمٌ کہہ سکتے ہیں ، عَارِفٌ (معرفت رکھنے والا) یا شَاعِرٌ (شعور رکھنے والا) نہیں کہہ سکتے - عَلِیْمٌ اور مَعْرِفَةٌ میں (انکے نزدیک) ایک فرق یہ بھی ہے کہ مَعْرِفَتٌ کسی چیز کے آثار و قرائن میں غور و فکر کر کے اس کا ادراک کرنے کو کہتے ہیں لیکن عام کے لئے یہ ضروری نہیں - ثانیاً معرفت کا لفظ بیشتر اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز ادراک کے بعد دھیان سے نکل جائے اور پھر دوبارہ اس کا ادراک ہو، لیکن عَلِیْمٌ میں یہ صورت نہیں ہوتی\*\* - (اس علم کی مثال جو تدبر و تشکر سے حاصل نہیں ہوتا وحی ہے - (۲۲) -

قرآن کریم نے (۲۱) سمع ، بصر اور قلب کو حصول علم کے ذرائع قرار دیا ہے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ہے) - دوسرے مقام پر قَلْبٌ کی جگہ فُؤَادٌ بھی کہا ہے (۲۶)\*\*\* - اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجائے ہیں - اور فُؤَادٌ کی نسبت سے اس میں احساسات بھی آجائے ہیں (دیکھئے عنوان ف - ا - د) - لیکن چونکہ علم اس وقت عَلِیْمٌ کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے اس لئے قرآن کریم نے وحی کو عَلِیْمٌ کہا ہے اور اس کی ضد کو اَعْمُوَاءُ (۲۴) - یعنی انسان کے خود ساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیوں جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ہے - اس لئے کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین اور حقائق و شواہد پر ہوتی ہے - جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا - وہ اپنے ہر دھوے کو دلیل و برہان کے زور پر پیش کرتا ہے (۲۵) - اور ان دعاوی سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براہین طلب کرتا ہے (۲۶) - اسے اپنے دعاوی کی محکمیت پر اتنا یقین ہے (اور یقین علم

\*ناج و محیط - \*\*ناج - \*\*\*قلب اور فؤاد کے فرق کے لئے ف - ا - د کا عنوان دیکھئے -

سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعاوی سے انکار کرنے والوں کے متعلق علانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کر سکتے (۱۱۳/۲)۔ اسی لئے قرآن کریم کی دعوت، علی وجہ البصیرت دعوت ہے (۱۱۳/۸)۔ یعنی (Rational) طریق۔

الْعَلَمُ وَالْعِلَامَةُ۔ ایسی نشانی جس سے کوئی شے پہچانی جاسکے۔ دو کھیتوں کے درمیان جو ڈول بنا دی جائے\*، اسی طرح ریگستانوں یا دوسرے راستوں میں راہ کی پہچان کے لئے جو چیزیں کھڑی کر دی جاتی تھیں انہیں بھی عَلَمٌ یا عَلَمٌ کہتے تھے\*۔ بڑے اور لمبے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہتے ہیں۔ اسکی جمع اَعْلَامٌ ہے (۵۵/۴)۔ اور جھنڈے کو بھی اسی لئے عَلَمٌ کہتے ہیں کہ اس سے ایک جماعت دوسری کو پہچانتی ہے۔ نیز وہ اثر یا نشان جس سے راستہ کا پتہ چلایا جاسکے سَعْلَمٌ کہلاتا ہے\*۔ اَعْلَمٌ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا بالائی ہونٹ پھٹا ہو\*۔ قدیم عرب، جنگ میں گھوڑے پر رنگین اون لٹکا دیتے تھے۔ اس عمل کے لئے اَعْلَمَ الْفَرَسَ کہتے تھے\*۔ اَعْلَمَ نَفْسَهُ۔ اپنے اوپر وہ نشان لگایا جو جنگ میں شریک ہونے والے لگاتے ہیں\*\*\*\*۔

اسی سے عَالَمٌ ہے (جس کی جمع عَالَمِیْنَ ہے)۔ اسم آلہ کا ایک وزن فاعل بھی ہے جیسے خاتَمٌ۔ مَائِیْخَتَمٌ بَیْمٌ۔ قَالَبٌ۔ مَائِیْقَلَبٌ بَیْمٌ۔ وغیرہ۔ عَالَمٌ بھی اسی طرح ہے جس کے معنی ہیں مَائِیْعَلَمٌ بَیْمٌ۔ یعنی وہ شے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے۔ چونکہ خدا کا علم، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے ہاری کائنات عَالَمٌ کہلائی جانے لگی۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہر ایک بھی عَالَمٌ کہلائیگا۔ مثلاً عالم انسان۔ عالم ماء۔ عالم نَار وغیرہ۔ اس کی جمع مذکر سالم نامانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہے۔ اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہوں تو انسانوں کو غالب رکھا جاتا ہے\*\*۔ اسی لئے نسل یا قوم کو بھی عَالَمٌ کہا گیا ہے۔ (اور قرن اور صدی کو بھی)۔ قرآن کریم نے عَالَمِیْنَ کو اکثر اقوام کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی کسی ایک زمانہ (Age) کے ہم عصر انسان۔ فَضِّلَتْکُمْ عَلٰی الْعَالَمِیْنَ۔ (۲۴/۲) یعنی بنی اسرائیل کو (اُس زمانے میں) ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی۔ نیز مختلف قسم کے لوگ یا دنیا بھر کے لوگ۔ (۱۵/۱)۔ اس جہت سے

رَبُّ الْعَالَمِينَ (۱) کے معنی، دور حاضر کی اصطلاح میں ”بین الاقوامی انسانیت کی نشو و نما دینے والا“ بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی خدا کی عالمگیر ربوبیت انسانیہ۔ اور تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا بھی جس میں انسان بھی شامل ہونگے۔

اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اگرچہ عَالَم کا لفظ کائنات کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اہل عرب ہر موجود شے مثلاً پتھر۔ مٹی کے لئے اسے نہیں بولتے بلکہ وہ اس لفظ کا اطلاق ہر ایسے جداگانہ مجموعہ پر کرتے ہیں جسکے افراد اگر عاقل نہ ہوں تو عاقل سے قریب تر ضرور ہوں۔ مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَان۔ عَالَمُ الْحَيَوَانَاتِ یا عَالَمُ الْنبَاتِ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن میں خدا کی صفت ربوبیت کا جلوہ نظر آتا ہے کیونکہ ان اشیاء میں صفت ربوبیت کو اپنانے کے لئے بنیادی صلاحیت موجود ہے۔ اور یہ صفت حیوان میں نمایاں ہے۔ مثلاً زندگی۔ غذا حاصل کرنا۔ سلسلہ تولید وغیرہ۔

لہذا خدا کی رَبُّ الْعَالَمِينَ کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آئی چاہئے۔ محض ذہنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رہنی چاہئے۔ اسی سے حَقِّد کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے (دیکھئے عنوان ح۔ م۔ د)۔

قرآن کریم میں ہے عَلَّمْ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲)۔ اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا۔ یا عَلَّمْ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۳)۔ اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اور عَلَّمْ بِالْقَلَمِ (۴)۔ اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔ عَلَّمَهُ الْكِتَابَ (۵)۔ اُسے بولنا (اپنے آپ کو Express) کرنا سکھایا۔ ان مقامات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح سکھایا جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھ دی۔ اسے ان کی استعداد عطا کر دی۔ اسکی واضح مثال سورۃ مائدہ میں ملیگی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھاتے ہو مِمَّا عَلَّمَتْكُمْ اللّٰهُ (۶)۔ اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری کتوں کو مدھانے کا طریقہ نہیں سکھاتا۔ اس نے انسان میں اسکی استعداد رکھ دی ہے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ہے۔

لہذا ایک علم تو وہ ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے پراہ راست ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ اور دوسرا علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں

میں رکھ دی گئی ہے ، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے ۔ قرآن کریم کے ان مقامات میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد ۔ یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے ۔ ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا ۔ اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتا ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی ، بشر کی ہوتی ہے ۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۱۳۸)۔

سورۃ فاطر میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہَا ۔ کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے ۔ وَ مِنْ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَیضٌ وَ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہَا وَ غَرَاۤیِبٌ سُوْدٌ ۔ اور پہاڑوں (میں) دیکھو کہ کس طرح سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں ۔ وَ سِیۡنَ النَّقَاسِ وَ الدُّوَابِّ وَ اَلَا نُنۡعَمُ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہُ کَذٰلِکَ ۔ اور اسی طرح انسانوں میں ، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں ۔

ان مقامات میں دیکھئے۔ قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ہے اِنۡعَمَآ یَخۡشٰی اللّٰہَ مِنْۢ عِبَادِہِ الۡعٰلَمَآءُ ۔۔۔ (۳۵/۴۸) ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت و قدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو ”علماء“ ہیں ۔ یعنی جو ان علوم کا علم رکھتے ہیں ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے ”علماء“ کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آجکل سائنسدان (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم علم الاشیاء کو بڑی بنیادی اہمیت دیتا ہے ۔ (تفصیل ان امور کی ”سلیم کے نام خطوط“ میں ملیگی)۔

## ع ل ن

عَلَمَآءٌ اَلَا مَرُّ ۔ بات ظاہر ہو گئی اور پھیل گئی ۔ اَلْعِلَآءُ ۔ کسی کام کو کھلم کھلا کرنا\* ۔ اَلْعِلَآءُ نِیۡۃٌ ۔ ظاہر و آشکارا ۔ یہ سیرت کی ضد ہے ، یعنی ہوشیدہ یا چھپ کر ۔ نیز راز\*\* ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ

سیر کے مقابل میں آیا ہے (۲۷۲)۔ آسَر کے بالمقابل اَعْلَن - یعنی ہر مالا کہنا، کھول کر کہنا۔ (۹۱)۔

## ع ل و

عِلْدُو الشَّقِیِّ ع۔ چیز کا بلند ترین حصہ۔ (سِفْل کی ضد ہے)۔ اَلْعِلَاءُ ع۔ شرف۔ بلندی۔ اَعْلَاهُ ع۔ عالیٰ بہ۔ اِسْتَعْلَاهُ ع۔ کسی چیز کے اوپر چڑھ گیا۔ اِسْتَعْلٰی۔ بلند ہوا۔ غالب ہوا۔ اَعْلَاهُ ع۔ اسے بلند کر دیا۔ تَعَالٰی۔ وہ بلند ہوا (۱۶۱)۔ اَلْعِلَآؤَةُ ع۔ پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد رکھا جائے۔ نیز یہ زائد یا اوپر سے، کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مَاعَدَوْا (۱۷۱) جس چیز پر بھی وہ غالب آجائیں۔

عَلَوْا (۱۷۱) سرکشی۔ لیکن جب بھی لفظ خدا کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی عظمت اور بلندی کے ہونگے (۱۷۱)۔ عَالِیْن (۲۳۶) سرکشی کرنے والے (اس کا واحد عَالٍ (اَلْعَالِیُّ) ہے اور مَوْثِعَ عَالِیَّةً)۔ لَتَعْلَنَ تم ضرور سرکشی اختیار کرو گے (۱۷۱)۔ وَجَعَلْنٰا عَالِیَّہَا سَافِلَہَا (۱۸۲) ہم نے اس کے بالائی حصہ کو نیچے کا حصہ بنایا۔ اَلْمُتَعَالِ (۱۷۱) بہت بلند۔ عالی مرتبت۔ اَلَا عُلِّی (۸۴)۔ سب سے بلند۔ سب پر غالب۔ عِلَآ (۲۳۶)۔ غالب ہوا (ایک دوسرے پر)۔

عِلَیُّوْنَ عِلَیِّیْن (۸۳/۱۹)۔ بلندوں کے اوپر بلندیاں\*۔ لیکن (۸۳/۲۰) میں عِلَیُّوْنَ کی تفسیر کِتَابٌ مَّرْقُومٌ سے کی گئی ہے۔ لہذا اس کے معنی اعمال نامہ کے ہونگے۔ لکھی ہوئی کتاب۔ لیکن ایسا اعمال نامہ جو انسان کو بلندوں کی طرف لے جائے۔ اس کے برعکس سِجِّیْن ایسا اعمال نامہ ہے جو انسانی نشوونما کو جکڑ کر رکھ دے۔ (۸۳/۹)۔

سورہ النمل میں ہے اَلَا تَعْلَمُوْا اَعْلٰی وَآتُوْنِیْ مُسْلِمِیْن (۲۷۱)۔ اس میں تَعْلَمُوْا کے معنی ہیں سرکشی اختیار کرنا، اور مُسْلِمِیْن کے معنی مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔

تَعَالٰ۔ عربوں میں جب کوئی بلندی سے نیچے والوں کو آواز دیتا تو یہ لفظ کہتا تھا۔ لیکن کثرت استعمال کے بعد یہ امتیاز باقی نہ رہا اور عرب لانے والا اس لفظ کو استعمال کرنے لگا\*\*۔ چنانچہ سورہ احزاب میں ہے فَتَعَالٰی (۳۳/۲۸) تم سب ہورہیں آؤ۔



واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی اور غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ظالم پر غلبہ یا کر مظلوم کی حمایت کرنا۔ یہ غلبہ مستحسن ہے اور جماعت مومنین کا شعار۔ دوسرا غلبہ یہ ہے کہ کمزوروں اور ناتوانوں پر غلبہ یا کر انہیں اپنے استبداد کا نشانہ بنانا۔ یہ غلبہ مذموم ہے اور قرعونیت کی علامت۔ اس قسم کے غلبہ کو ہم نے سرکشی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اپنی قوت کو قوانین خداوندی کے خلاف صرف کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ **وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** (۱۳۸) تم افسردہ خاطر مت ہو۔ اور مت گھبراؤ۔ (آخر الامر) تم ہی غالب ہو گے، اس لئے کہ تم قوانین خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس میں اسی غلبہ کی طرف اشارہ ہے جو طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر، دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مومن کبھی کافر سے مغلوب نہیں رہ سکتا۔ **وَلَسَنَّا بِجَعَلِ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا** (۱۳۹) ”اور اللہ عز و جل کافروں کو مومنوں پر غلبہ کی راہ نہیں دیگا“۔ یہ عوسکتا ہے کہ کسی معرکہ میں جماعت مومنین کو ہنگامی طور پر شکست عو جائے (۱۳۹)۔ لیکن کفار کا مومنین پر غالب رہنا، ناممکن ہے۔ لہذا اگر اپنے آپ کو ”مومن“ کہنے والے مستقلاً کفار سے مغلوب ہیں (خواہ کفار کا غلبہ حکمران کا ہو یا معاشی و معاشرتی) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مومن کی (Definition) پر پورے نہیں اترتے۔ کفار سے مغلوب ہونا تو ایک طرف، مومن کی یہ کیفیت ہے کہ، اقبال کے الفاظ میں

مومن سے بالائے ہر بالاترے غیرت او برتنابہد ہمسرے  
(علی)۔ حرف ہے جو الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان ”علی“

## عَلٰی (حرف)

علیٰ۔ یہ حرف بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

- (۱) ہر۔ اوپر۔ خواہ حقیقتاً ہو۔ جیسے **عَلٰی الْفَلَکِ تَحْمَلُون** (۲۳) تم کشتیوں کے اوپر سوار کرائے جاتے ہو (سوار ہوتے ہو)۔
- خواہ مجازاً۔ جیسے **فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ** (۲۵۳) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(۲) قریب کے معنوں میں - اَوْ اَجِیدُ عَلٰی النَّقَارِ هُدًی (۲/۲۱) یا میں اس آگ کے قریب کسی راہ نما کو دیکھوں (دیکھئے عنوان ۵ - د - ی)

(۳) باوجود کے مفہوم میں - وَآتٰی اَیُّوْبَ الْمَالَ عَلٰی حَبِیْبِهِ (۲۱/۲۱) مال کی محبت کے باوجود اسے (دوسروں کو) دے۔

(۴) مِّنْ (سے) کے معنوں میں - اِذَا اَکْثَرْتُمْ عَلٰی النَّاسِ (۴/۴) جب وہ لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں۔

(۵) ”کی وجہ سے“ کے معنوں میں - لَیْسَ کَبِیْرٌ وَّاَللّٰهُ عَلٰی مَا هَدٰۤی اَکْثَمُ (۱۸۵/۲۸۵) تاکہ تم اللہ (کے نظام) کو بلند کرو، اس وجہ سے (یا اس بنیاد پر) کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے۔ (لیکن یہاں اس کے معنی ذریعے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تم ہدایت خداوندی (قرآن) کے ذریعے اللہ کے نظام کو بلند کرو۔ (دیکھئے نمبر ۱۳)۔ (نیز ”کے مطابق“ بھی۔ دیکھئے نمبر ۱۱)

(۶) رَفِیْ (میں) کے معنوں میں وَ دَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰی حِیْمَنِ غَفْلَتِهٖ مِّنْ اَهْلِهَا (۲/۲۸) وہ اسوقت شہر میں داخل ہوا جب اسکے رہنے والے بیخبر تھے۔ ان کی بے خبری کی حالت میں۔ . . . .

(۷) ”کے ساتھ۔ کے متعلق“ کے معنوں میں - حَقِیْقٌ عَلٰی اَنْ لَا اَقُوْلَ عَلٰی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقُّ (۱/۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اس میں علیٰ اَنْ لَا اَقُوْلَ کا مطلب ہے بَيَانٌ لَا اَقُوْلَ۔ یعنی یہ کہ میں کچھ نہ کہوں۔ (سوائے حق کے)۔

(۸) اِلٰی (تک) کے معنوں میں - وَ عَلٰی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ (۱/۶) اور درمیانی (سیدھی) راہ اللہ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے - هٰذَا صِرَاطٌ عَلٰی مُسْتَقِیْمٍ (۱/۵) یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

(۹) سامنے - روبرو - وَلِیَتَصَنِّعْ عَلٰی عِیْنِیْ (۲/۶) تاکہ تیری تربیت میرے سامنے ہو۔

(۱۰) خلاف - لَا تَفْتَرُوْا عَلٰی اللّٰهِ کَذِبًا (۲/۲۱) تم اللہ کے خلاف جھوٹ تو نہ تراشو۔

(۱۱) کے مطابق - اَعْمَلُوْا عَلٰی مَّكَانَتِکُمْ (۱/۳۶) تم اپنی طاقت کے مطابق (یا اپنی جگہ پر) کام کرو۔

(۱۲) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے (یعنی اس کے کچھ معنی نہیں ہوتے)۔

(۱۳) بذریعہ - کے ذریعے - مثلاً سورہ آل عمران میں ہے رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَزَّوَجَلَّ رُسُلِكَ (۱۳۳)۔ اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ کیا تھا، وہ ہمیں عطا کر۔  
(۱۴) عَلَيْنَا - اس کے خلاف - عربی زبان میں ”ل“ کسی کے فائدہ کے لئے آتا ہے اور اس کے برعکس ”عَلَى“ آتا ہے - قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق (مفاد) اور ذمہ داریوں کے متعلق آیا ہے - وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْنَهُنَّ (۲۴۸) - جس قدر ان کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق ہیں۔

(۱۵) عَلَيْنَكُمْ بِيَالِصُّدُقِ - تم پر سچائی واجب ہے - تم ہمیشہ سچائی کے ساتھ رہو، اور اسے نہ چھوڑو۔ (یہ اسم فعل ہے)  
قرآن کریم میں ہے عَلَيْنَكُمْ أَنْفُسُكُمْ (۱۰۵) - تم پر اپنی ذات (کی اصلاح) واجب ہے۔

## عَمَّا (حرف)

دیکھئے عَنِ اور مِمَّا۔

## ع م د

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی استقامت و استواری (سیدھا کھڑے ہو بانا) ہیں، خواہ وہ محسوس چیزوں میں ہو یا رائے اور ارادے میں - اَلْعُمُودُ - اس لکڑی (پلے) کو کہتے ہیں جو خیمہ کے وسط میں ہوتی ہے اور جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے - اس کی جمع اَعْمِدَةٌ - عَمَدٌ - عُمُدٌ آتی ہے - اَلْعَمَدُ - سنگ مرمر کے ستونوں کو بھی کہتے ہیں\*۔  
قرآن کریم میں ہے رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِعَمَدٍ تَّرَوْنَہَا (۱۳)۔ خدا نے فضائی کمروں کو بغیر مرئی (Visible) اور محسوس ستونوں کے کھڑا کر رکھا ہے - ان کے ستون، وہ باہمی کشش و جذب ہے جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی - اس میں عَمَدٌ جمع ہے عُمُودٌ کی یا عِمَادٌ کی - سورۃ الہمزہ میں ہے فِيْ عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ (۱۴) - لمبے لمبے ستونوں میں -

الْعِمَادُ\* - وہ سردار جس پر معاملات میں بھروسہ کیا جائے - رئیس لشکر - طور بِلْ الْعِمَادِ - لمبے ٹڑنگے آدمی کو کہتے ہیں - عِمَادٌ کے معنی طول اور لمبائی بھی ہیں\* - قرآن کریم میں قوم عاد کے متعلق ہے اِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۱۱۷) - امن کے معنوں میں مختلف اقوال ہیں - الْعِمَادُ بلند عمارتوں کو کہتے ہیں\* - اس کا واحد عِمَادَةٌ ہے - اس سے اس کے معنی ہونگے وہ قوم جو بڑی بڑی بلند عمارتوں کی مالک تھی - عِمَادٌ خیموں کو بھی کہتے ہیں - اس سے اس کے معنی ہونگے وہ لوگ جو خیموں میں رہا کرتے تھے\* - یا وہ لوگ جن کے قد لمبے تھے\* - راغب نے کہا ہے کہ الْعِمَادُ اس چیز کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگائی جائے اور بھروسہ کیا جائے - لہذا ذَاتِ الْعِمَادِ کے معنی ہونگے ان چیزوں کے مالک جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا\*\* - الْعِمْدَةُ - جس پر اعتماد یا بھروسہ کیا جائے\*\*\* - الْعَمْدُ - الْعَمْدُ - وہ کام جو مقصد و نیت سے کیا جائے - یہ خطا کے مقابلہ میں آیا ہے (۹۳، ۹۴، ۹۵ و ۹۶) - (قتل عمد اور قتل خطا کے لئے دیکھئے عنوان ق - ت - ل)۔

## ع م ر

الْعِمَارَةُ\* - خَرَاب کی ضد ہے - خَرَابٌ کے معنی ہیں ویران اور برباد کرنا - لہذا عِمَارَةُ کے معنی ہیں آباد کرنا - الْعُمُرُ - اس مدت کا نام ہے جس میں بدن حیات کے ساتھ آباد رہے\*\* - عَمْرٌوُ اللّٰهُ - خدا نے اس کی عمر دراز کی - اسے باقی رکھا\* - ابن فارس کے نزدیک اس سادہ کے بنیادی معنی دو ہیں - (۱) بقاء اور درازی زمانہ اور (۲) اونچی اور بلند ہونے والی چیز، خواہ وہ آواز ہو یا اس کے سوا کدوئی اور چیز - سورۃ بقرہ میں ہے لَوْ يَعْمُرُ الْاَلْفَ سَنَةٍ (۹۶) - ”کاش! اُسے ہزار سال تک جیتا رکھا جائے“ - اَعْمَرَ الْاَرْضَ - زمین کو آباد پایا - الْعِمَارَةُ\* - جس سے جگہ کو آباد کیا جائے - الْعُمُرَةُ\* - ملاقات - کسی آباد جگہ جانا - شرعاً حج کے علاوہ کعبہ کی زیارت اور طواف وغیرہ کرنے کو کہتے ہیں - اَعْمَرَ (۱۵۸) - عمرہ کرنا تَعْمِيرُ الشُّوَبِ - کپڑے کی ہماوٹ کا عمدہ کرنا - الْعُمُرُ - دین - چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے لَعْمَرُ كَتَبَ اِنْشَاهُمْ لِنَفِي سَكْرَتِهِمْ يَتَعْمَرُونَ (۱۶) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ تیرا دین اس حقیقت پر شاہد ہے\* - (اگرچہ عرب عام طور پر لَعْمَرُ كَتَبَ - تیری حیات و بقاء کی قسم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں)۔

قرآن کریم میں ہے مِمَّا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَتَعَمَّرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ (۲۹)۔ مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں۔ مسجد، خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ یعنی اس نظام کا جس میں اطاعت صرف خدا کے قوانین کی جاتی ہے۔ لہذا جو لوگ ان قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کریں وہ ان مراکز کی آبادی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس مسجد کو جو امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی، جہنم کا ایندھن بتایا۔ (۱۰۹-۱۰۷)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ پرستی بھی شرک ہے (۳۲)۔

سورۃ طور میں وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ (۵۲) آیا ہے۔ آباد کیا ہوا گھر۔ آباد رکھنے کی جگہ۔ وہ جگہ جو ہمیشہ آباد رہیگی۔ (یعنی خانہ کعبہ)۔ قرآن کریم میں آل عمران کا ذکر آیا ہے (۳۴)۔ کہتے ہیں کہ عمران حضرت موسیٰ کے والد کا نام تھا۔ اس لئے آل عمران سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اِسْرَآءُتْ عِمْرَانُ (۳۳)۔ آل عمران کی ایک عورت یا عمران کی بیوی۔ اِیْنَتْ عِمْرَانُ (۳۴)۔ آل عمران کی ایک لڑکی (حضرت مریم)۔ یا عمران کی بیٹی۔

## ع م ق

الْعَمَقُ۔ الْعَمَقُ۔ الْغَمَقُ۔ کنویں وغیرہ کی گہرائی۔ راغب نے کہا ہے دراصل عَمَقُ نیچے کی طرف دوری (گہرائی) کو کہتے ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ جب عَمَقُ راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دوری کے ہوتے ہیں اور جب کنویں کی صفت ہو، تو اس کے معنی گہرائی کے ہوتے ہیں\*۔ (بحوالہ ابن فارس)۔

قرآن کریم میں ہے مِّنْ كُلِّ فُجٍّ عَمِيقٍ (۲۲)۔ اسکے معنی ہیں ہر دور دراز راستے سے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ الْعَمَقُ۔ الْعَمَاقَةُ کے معنی لمبا ہونا۔ بعید ہونا۔ اور پھیلا ہوا ہونا، نیز گہرا ہونا ہیں\*\*۔

## ع م ل

عَمَلٌ کے معنی کام کاج، ہنر مندی، مہارت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہیں۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ عمل کا لفظ فعل سے زیادہ خاص ہے

اس لئے کہ عمل ایک گونہ مشقت سے کسی کام کو کرنے کے لئے بسولا جاتا ہے۔ اسی لئے عَمِلَ کا لفظ خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا۔ فَعَمَلَ کا لفظ کیا جاتا ہے۔ (فَعَمَلَ اور عَمِلَ میں جو اور فرق ہیں اسے ف۔ ع۔ ل کے عنوان میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ ہرے) راعب نے کہا ہے کہ عَمَلَ\* ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۂ سرزد ہو، اس کے برعکس فَعَمَلَ\* کا لفظ حیوانات کی طرف اُس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب ان سے کوئی کام بلا قصد سرزد ہو۔ جتنی کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلَ\* کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے\*۔ صاحب محیط نے تو بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عَمَلَ\* در حقیقت عِائِم\* کی مقلوب شکل ہے۔ لہذا عَمَلَ\* کے لئے علم لاینفک شرط ہے\*\*۔ (جیسا کہ ف۔ ع۔ ل کے عنوان میں کہا گیا ہے) عَمَلَ\* کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (ہمیشہ کے لئے) کیا جاتا ہو۔ عَمَلَ\*۔ کام کرنے والا۔ (جمع عَمَالِیْنُ اور عَمَالِیْنُ) وَالْعَمَالِیْنُ عَمَلَتْہَا (۱۰)۔ ٹیکس وصول کرنے والے۔

قرآن کریم اَعْمَالَ کے نتائج بتاتا ہے۔ یعنی ان کاموں کے نتائج جنہیں انسان قصد اور ارادے کے ساتھ کرے۔ مَنَ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْشَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّہٗ حَیٰوَةً طَیِّبَةً وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَہُمْ بِاِحْسَنِّ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۶)۔ جو کوئی صلاحیت بخش کام کرتا ہے، مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہے، تو ہم بالضرور انہیں خوشگوار زندگی عطا کریں گے اور بالضرور انہیں باحسن طریق ان کے ان کاموں کا اجر دینگے جنہیں وہ کرتے رہے۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی ایمان اور عمل ہے۔ یعنی قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کی صداقت پر یقین اور ان کے حصول اور بقا کے لئے مسلسل عمل، اس یقین کے ساتھ کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ یہ ہے اسلام۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان اعمال پر استقامت کے ساتھ قائم رہا جائے، کیونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) عمل کی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کام ہمیشہ کے لئے کیا جاتا ہو۔

## ع م م

اَلْعَمَّ - باپ کا بھائی - چچا - (اسکی جمع اَعْمَام\* - عَمُوْمَہ\*۔ اور اَعْمَ اُتی ہے)۔ اَلْعَمَّةُ\* - باپ کی بہن یعنی پھوپھی - اسکی جمع عَمَّات\* ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ اس کی اصل عَمُوْمٌ سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی طول، کثرت اور بلندی کے ہوتے ہیں۔ اَلْعَمِيْمُ: لمبے ہودے کو کہتے ہیں۔ اور لمبے کھجور کے درخت کو عَمَقَّةٌ کہتے ہیں۔ عَمَّ الشَّيْءُ عَمُوْمًا۔ شے عام ہو گئی۔ یعنی تمام افراد اس میں شامل ہو گئے۔ اَلْعَمَقَّةُ۔ عام لوگوں کو کہتے ہیں۔ الْعِمَامَةُ۔ ہر وہ چیز جسے سر پر لپیٹ لیا جائے\*۔

قرآن کریم میں عَمَّ شَيْئَكُمْ (۴۴) باپ کی بہنوں (پھوپھیوں) سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔

## ع م ۵

عَمَّہ کے معنی ہیں راستہ کھوکھرا، یا تحیر میں، ادھر ادھر پھرنا یا نگاہ دوڑانا لیکن یہ نہ معلوم ہونا کہ صحیح رخ کونسا ہے۔ اَرْضُ عَمَّهَاءُ اُس سر زمین کو کہتے ہیں جس پر راستہ دکھانے والے نشانات نہ ہوں۔ اور ذَهَبَتْ اَبِلُّهُ الْعَمَّهِي اُس وقت کہتے ہیں جب کسی کے اونٹ اس طرح کھڑ جائیں کہ پتہ ہی نہ لگ سکے کہ وہ کدھر چلے گئے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں راستہ کی طرف کم راہ نمائی ہونا اور حیرانگی۔ یعنی معاملہ پیش نظر کے متعلق انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور اسکی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہو۔

اس اعتبار سے بصیرت کے اندھے پن کو عَمَّہ کہتے ہیں اور بصارت کے اندھے پن کو عَمَّی\*\*\*۔ اگرچہ راغب اور زمخشری کے نزدیک عَمَّی کا لفظ بصارت و بصیرت دونوں کے اندھے پن کیلئے بولا جاسکتا ہے اور یہی درست ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَيْسَ عَلَيَّ اِلَّا عَمِّي حَرَجٌ (۲۴)۔ یہاں اَعَمِّي سے مراد بصارت کا اندھا ہے۔ اور سورہ بقرہ میں ہے عَمَّ بِكُمْ عَمِّي (۲۸)۔ یہاں عَمِّي سے مراد بصیرت کا اندھا ہے۔ عَمِيہ قُلَان\*۔ اُس وقت کہتے ہیں جب کسی شخص کو اپنی بات ثابت کرنے کے لئے دلیل نہ مل سکے اور وہ اس طرح حیران رہ جائے\*\*\*۔

سورہ بقرہ میں فِي طَغْيًا نِيْهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۲۵)۔ راستہ کھوکھرا حیران و سرگرداں پھرنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ سورہ المؤمنون میں پہلے کہا کہ یہ لوگ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَا كِبُوْنَ (۲۳) ہیں۔ یعنی

سیدھے راستہ سے ہٹ جانے والے۔ اور اس کے بعد کہا "فِي طُغْيَا نِيهِمْ" يَعْمَهُوْنَ (۲۳/۵)۔ اس سے عَمَّہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی سیدھا راستہ کھو کر یا اس سے ہٹ کر صحیح راستہ نہ ملنے کی وجہ سے حیران و پریشان پھرنا۔

## ع م ی

عَمِي - يَعْمِي - عَمِي کے معنی ہیں دونوں آنکھوں سے ناپینا ہو جانا۔ اگر کوئی شخص ایک آنکھ سے اندھا ہو جائے تو اسے اَعْمٰی نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ (جیسا کہ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے) بصیرت کے زائل ہونے کو عَمَّہ کہا جاتا ہے اور بصارت کے چلے جانے کو عَمٰی، لیکن اَلْعَمٰی دل کی بصیرت کے زائل ہو جانے کو بھی کہتے ہیں (دیکھئے عنوان ع - م - ہ)۔ عَمِيَّة کے معنی ہیں گمراہ ہو جانا۔ باطل پر مصر ہو جانا۔ اَلْاَعْمَاءُ۔ وہ افتادہ زمینیں جہاں آبادی کا نشان تک دکھائی نہ دے۔ اَلْاَعْمِيَانِ۔ سیلاب اور آتش زدگی کی تباہی کو کہتے ہیں کیونکہ جب یہ (دونوں) آتے ہیں تو نہ نیک کو دیکھتے ہیں نہ بد کو۔ اندھا دھند آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اَلْعَمٰی۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسے راستہ نہ مل سکے۔

عَمِي عَلَيْهِ اَلْاَمْرُ کے معنی ہیں اس پر فلاں معاملہ غیر واضح اور مشتبہ ہو گیا۔ \*\*۔ اَلْعَمٰیۃ۔ گمراہی، بے راہ روی اور ہٹ دھرمی۔ نیز ظلمت شب کے آخری باقیماندہ حصے کو بھی کہتے ہیں \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔

صاحب لسان العرب کے نزدیک قَوْمٌ عَمَوْنَ اسوقت کہتے ہیں جب قوم تاریکی میں ہو اور حالات کا صحیح اندازہ لگا سکنے کے قابل نہ رہے \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ سَنَ كَانَ فِيْ هٰذِهِ اَعْمٰی فَهُوَ فِيْ الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلَّ سَبِيْلًا (۱۶/۲۶)۔ جو شخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ہوگا اور بالکل راہ گم کردہ۔ قراء کا قول ہے کہ اس آیت میں اَعْمٰی کے معنی ہیں دنیاوی نعمتوں سے محروم، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم اس دنیا میں نعمتوں اور آسائشوں سے محروم ہے وہ مستقبل کی زندگی میں بھی نعمتوں سے محروم رہیگی۔ وہ شاہراہ حیات سے اسقدر بھٹکی ہوئی ہوگی کہ صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے گی \*\*\*۔



حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں وَاَضَلَّ سَبِيلًا کے ٹکڑے نے اَعْمٰی کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ جو شخص سیدھے راستہ سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے، وہ بھوک پیاس خستگی اور واماندگی جیسی صدها مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسے صحرائے حیات میں کوئی نشان راہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسکی تشریح خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيْ حُسْبَةً خُتُّكَ وَتَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اَعْمٰی (۲۳۳)۔ جو ہمارے قانون حیات سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ لہذا قانون خداوندی کے چھوڑ دینے سے دنیاوی زندگی میں محتاجی اور ذلت نصیب ہوتی ہے، اور جس کی دنیاوی زندگی یوں ذلیل ہو اسکی آخرت بھی ذلیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں صُمٌّ - بُكْمٌ کے ساتھ عُمٰی کا لفظ آیا ہے (۲۱۸) (نیز عُمِيَانًا - ۲۱۵) جسکے معنی اندھے کے ہیں۔ عُمٰی اور عُمِيَانٌ اَعْمٰی کی جمع ہیں۔ سورہ طہ میں اَعْمٰی کے مقابلہ میں بَصِيْرٌ کا لفظ آیا ہے (۲۲۵)۔ اور سورہ انعام میں بتا دیا گیا ہے کہ جو وحی کی روشنی میں چلے وہ بَصِيْرٌ ہے اور جو اسکا اتباع نہ کرے وہ اَعْمٰی ہے (۲۰۷)۔ سورہ حم السجدہ میں التعمی کے مقابلہ میں الہدٰی کا لفظ آیا ہے۔ (۲۱۷)۔ یہاں التعمی کے معنی گمراہی (صحیح راستے سے بھٹک جانا) ہیں۔ (۲۸۶) میں ضلالت کو اندھا پن کہا گیا ہے۔ (۱۳۹) میں ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا وہ اَعْمٰی ہے۔ سورہ قصص میں ہے فَتَعْمِيْتُمْ اَعْيُنَكُمْ لَا تَرْءُوْا اَنْتُمْ تَعْمُوْنَ (۲۸) انپر معاملات مشتبہ ہو گئے۔ یہی معنی (۲۱۸) میں فَتَعْمِيْتُمْ اَعْيُنَكُمْ کے ہیں۔ یعنی ایسے واضح دلائل تمہیں صاف صاف دکھائی نہیں دیتے۔ سورہ حج میں اس کیفیت کو ”دل کی آنکھوں کے اندھا ہو جانے“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تَعْمٰی الْقُلُوْبُ النَّاسِ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲۶)۔ یعنی حقائق کا آنکھوں سے اوجھل ہو جانا یا صاف صاف دکھائی نہ دینا۔

لہذا، قرآن کریم کی رو سے جس طرح انسان کے سر کی آنکھوں کے لئے سورج (یا چراغ) کی روشنی کی ضرورت ہے۔ یعنی اگر روشنی نہ ہو تو آنکھیں اندھی (بیکار) ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عقل کی آنکھ کیلئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے۔ وہی عقل، بیجا قرار دی جا سکتی ہے جو وحی کی روشنی میں زندگی کے منازل طے کرے۔ نیز جو قومیں حقائق کا صحیح اندازہ

نہیں کرتیں اور اس طرح اندھی بن جاتی ہیں وہ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اور جس قوم کا امروز تاریک اور بھیانک ہو اس کا فردا (مستقبل) بھی تاریک ہوتا ہے۔ یہ تو ضرور نہیں کہ جس قوم کو اس دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہو جائیں اس کا مستقبل (حیات آخرت) بھی درخشندہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مستقبل اسی قوم کا درخشندہ ہوگا جس کا امروز شاندار ہو۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذلت و رسوائیوں میں گذر رہی ہو اور وہ آخرت میں جنت کی آسائشوں کی مالک بن جائے۔ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں اور شادایاں اور اس کے بعد کی زندگی کی درخشانیوں اور تابناکیاں ہیں۔ یاد رکھئے۔ مومن کا مقام، آدم (آدمی) کے مقام سے اونچا ہے۔ اس لئے جو کچھ آدمی کو میسر ہو مومن کو وہ کچھ بھی میسر ہونا چاہئے اور اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ملائکہ، آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لہذا مقام آدم یہ ہے کہ کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں۔ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر لے۔ اور مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر کے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لائے۔ لہذا اگر کسی قوم کا اشیائے فطرت پر تصرف نہیں تو وہ قوم مقام آدم تک بھی نہیں پہنچ سکی، چہ جائیکہ اسے مقام مومن نصیب ہو۔ جس قوم کو اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب نہیں اسے مقام آدم حاصل نہیں۔ چہ جائیکہ مقام مومن۔ اس لئے ایسی قوم کی آخرت کی زندگی کس طرح روشن ہو سکتی ہے۔ لیکن جس قوم کو مقام آدم نصیب ہے لیکن مقام مومن نصیب نہیں تو اسکی اس دنیا کی زندگی پر آسائش ہوگی۔ آخرت کی زندگی اسکی بھی تاریک ہوگی۔ مومن کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی تابناک ہوگی۔

## عَنْ (حرف)

عَنْ - یہ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً -

(۱) يَخْتَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ (۲۳) - وہ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۲) عَنْ الصِّرَاطِ لِنَسَاكِيَتِهِ (۲۳) - وہ راستہ سے ایسکی طرف ہٹ جائے

والے ہیں۔ اور ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ - ابراہیمؑ سے خوف ہٹ گیا، چلا گیا اور دور ہو گیا (۱۱/۱۱) - سَافَرْتُ عَنْ الْبَلَدِ - میں نے شہر سے سفر کیا - وہاں سے کسی دوسری جگہ گیا -

(۳) ”بدلے میں“ یا ”کی طرف سے“ کا مفہوم - يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲/۸) جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے بدلے میں کفایت نہیں کریگا - یا اس کی طرف سے جزا (معاوضہ) نہیں دے سکیگا -

(۴) مسبب ظاہر کرنے کے لئے (کی وجہ سے - کے سبب) - وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْ آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (۱۱/۵۳) - ہم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنے والے -

(۵) اوپر یا بعد کے معنوں میں - لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۲/۱۶) - تم ایک حالت سے اوپر دوسری حالت میں جاؤ گے - یا تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پہنچو گے -

(۶) مِّنْ (سے) کے معنوں میں - هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِمْ (۲۴/۴۵) اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے -

(۷) ب - (سے) کے معنوں میں - مَا يَنْطِقُ عَنْ الْهَوَى (۵۳/۵۳) - وہ اپنے جذبات و خیالات سے بات نہیں کرتا - ”ساتھ ، ذریعہ“ یا ”کی مدد سے“ کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے رَمِيَتْ عَنْ الْقَوْمِ یعنی رَمِيَتْ بِالْقَوْمِ - میں نے کمان کے ذریعہ تیر پھینکا -

(۸) فِيْ (میں) کے معنوں میں بھی آتا ہے -

(۹) زائد بھی ہوتا ہے (یعنی کوئی معنی نہیں دیتا)

کتاب لغت میں ان کی مثالیں دی ہوئی ہیں -

## ع ن ب

الْعَيْنَبُ - (واحد ، عَيْنَبَةٌ) - انگور - بہ انگور کے پھل اور اس کی بیل کے لئے بھی بولا جاتا ہے \* - اَعْنَابٌ (۲۶/۲۶) - عَيْنَب کی جمع ہے - الْعَيْنَبُ - (انگور کی) شراب \* -

## ع ن ت

الْعَنَتُوتُ\* - وہ ٹیلہ جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں مشقت، توڑ پھوڑ اور تکلیف کا مفہوم ہے اور اس میں سہولت، آرام اور درستی کا مفہوم نہیں ہے۔ چنانچہ اس میں کمزوری اور شکستگی کے معنی بھی ہیں اور دشواری اور مشقت کے بھی\*۔ عَنِتَّ الْعِظْمُ\* - ہڈی کمزور ہو کر ٹوٹ گئی۔ عَنِتَّتْ يَدُهُ\* - اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اور عَنِتَّتْہ کے معنی ہیں اس نے اسے مشکل میں ڈالا یا اس کے ذمہ ایسا کام لگا دیا جس کا کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوا\*۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اِعْنَاتُ کے معنی ہیں کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کرنا\*۔ صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ مَعَانِيَتٌ کے معنی تقریباً مَعَانِدَةٌ کے ہیں یعنی مسلسل عداوت و کشمکش کے، لیکن مَعَانِيَتٌ بائغ تر ہے کیونکہ اس میں خوف و ہلاکت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ عَنِتَّ فُلَانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں ہلاکت کا ڈر ہو\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مشقت اور دشواری وغیرہ کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے لَمَعْنِيَتِشُمْ\* (۱۱۶)۔ تم مشقت میں پڑ جائے یا ہلاک ہو جائے۔ دوسری جگہ ہے وَدَّعُوا مَاعَنِتِشُمْ\* (۱۱۷) وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت یا ہلاکت میں پڑ جاؤ۔ سورۃ نساء میں جنسی اختلاط کے احکام کے ضمن میں فرمایا۔ ذَالِكْ لِيَمَنَ خَشِيَ الْعَنَتَ (۴۵)۔ یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ہلاکت میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ عَنِتَّ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنوں میں فساد، گناہ، ہلاکت، غلطی، لغزش، ظلم و زیادتی نیز سخت مشقت اور دشواری کا مقابلہ کرنا شامل ہیں\*۔

## ع ن د

عِنْدَ (نون پر تینوں حركاتوں کے ساتھ)۔ عِنْدُودٌ ا۔ عِنْدُ ا۔ عِن۔ الطَّيْرُ يَنْقُ۔ وہ راستہ سے دور ہو گیا۔ ہٹ گیا۔ الکی ہو گیا۔ منحرف ہو گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں حد سے آگے بڑھ جانے اور صحیح راستہ کو چھوڑ دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عِنْدَتِ النَّاقَةُ\*۔ اونٹنی باقی اونٹوں سے الکی ہٹ کر تنہا چرتی رہی۔ عِنْدَ الرَّجُلِ\*۔ آدمی نے سرکشی کی اور

جان بوجھ کر حق کو رد کر دیا اور اس کی مخالفت کی۔ ایسا شخص عَنِید\* کہلائیگا۔ اَلْعَانِیدُ\*۔ وہ اونٹ جنو راستہ سے ہٹ جائے۔ اَلْمُعَانِیدَةُ\* وَالْعِیَادُ\*۔ الگ ہو جانا۔ مسلسل مخالفت کرنا۔ عِنْدَ الرَّجُلِ\* عَنِ\* اَصْحَابِہِ۔ اس نے سفر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، یا ان سے پیچھے رہ گیا۔ عَانِیدَةُ الطَّارِیْقِ\*۔ وہ راستہ جو سیدھے راستے سے ایک طرف کو ہٹا ہوا ہو۔ اَلْعِنْدُ\*۔ آڑے آ جانا۔ حائل ہو جانا\*۔ سورۃ مدثر میں ہے اِنَّہٗ كَانَ لَا یَتِنَا عَنِیْدُ (۶۶)۔ وہ ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا تھا۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔ وَ خَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۵) ہر مستبد اور سرکش تباہ و برباد ہو گیا۔

## عِنْدَ (ظرف)

عِنْدَ\*۔ ظرف ہے، بمعنی پاس۔ قریب۔ نزدیک۔ عِنْدَہٗ\* عَلَیْہِ السَّاعَةِ\* (۳۳/۸)۔ علم الساعت خدا کے پاس ہے۔ مِیْنُ عِنْدِ اللّٰہِ (۲۸)۔ خدا کی طرف سے۔ اللہ کے پاس سے۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِندِیْ مَاتَتْ سَاعَتُہُمْ لَیْسَ بِہِ (۱/۸) ان سے کہو کہ جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو وہ اگر میرے پاس ہوتا تو.....

## ع ن ق

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑھنا اور پھیلنا بتائے ہیں، خواہ وہ اونچائی میں ہو یا زمین پر پھیلنا ہو۔ اَلْعُنُقُ\* (جمع اَعْنَاقُ)\* گردن\*۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۱۲)۔ ان کی گردنوں کے اوپر (یعنی سروں پر) مارو۔ نیز اس کے معنی جماعت کثیر ہیں۔ الْاَعْنَاقُ\* پیش پیش رہنے والے آدمی، نیز رؤسائے قوم کو بھی کہتے ہیں\*۔ فَظَلَمْتَ اَعْنَاقَہُمْ لَہَا خَاضِعِیْنَ (۱۱)۔ ان کے اکابرین قوم عاجز و درمندانہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں۔ اکابرین کو ہمارے ہاں بھی ”گردن فراز“ کہتے ہیں۔

## ع ن ک ب

اَلْعَنٰکِبُوْتُ\*۔ مکڑی\*۔ قرآن کریم نے مشرکین کے مسلک کو تار۔ عنکبوت سے تشبیہ دی ہے (۲۱) جو ذرا سے تنکے یا انگلی کے اشارے سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ مسلک، دلیل و برہان اور علم و بصیرت کے

بجائے توہم پرستی اور جہالت پر قائم ہوتا ہے، اس لئے علم و فکر کی ذرا سی جنبش اسے بارہ بارہ کر دیتی ہے۔ شرک کا عملی مفہوم ہے کائنات میں ایک سے زیادہ ہستیوں کو صاحب اقتدار تسلیم کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہاں ایک سے زیادہ قوانین نافذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں قانون صرف ایک خدا کا رائج ہے۔ اس لئے انسانوں کی دنیا میں بھی صرف خدا نے واحد کا قانون نافذ ہونا چاہئے۔ یہ توحید ہے اور نہایت محکم نظریہ حیات۔ اس کے خلاف ہر نظریہ زندگی، تار عنکبوت ہے۔

## ع ن و

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا نہایت توجہ اور شدید خواہش سے ارادہ کرنا۔ (۲) عاجزی۔ (۳) کسی چیز کا ظاہر ہونا اور نکلنا۔ عاجزی کے اعتبار سے اَلْعَنُوۡۤا۔ اَلْعَنَاءُ کے معنی ہیں قید ہو جانا۔ مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ اَلْعَنُوۡۤا۔ قہر اور زبردستی۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ عَنُوۡۤا کے معنی کسی چیز کو زبردستی لے لینے کے ہیں۔ لیکن ابن سیدہ نے اس کے معنی محبت کے بھی بتائے ہیں۔ اس صورت میں یہ لفظ اضداد میں سے ہو جاتا ہے جو قہر و جبر کے علاوہ تسلیم و اطاعت کے معنوں میں بھی آئے گا\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عَنَّا الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس نے اس شے کو ظاہر کر دیا\*\*۔ عَنَّتِ اِلَآرُضُ بِالنَّبَاتِ تَعْنُو۔ زمین نے پودے نمودار کئے\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ عَنَّتِ التُّجُوۡۤهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوۡۤمِ (۲۱۱)۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی جھک جانے کے کئے ہیں اور بعض نے کھڑے ہو جانے اور کام کرنے کے\*۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ نظام خداوندی کے قیام کے لئے بطیب خاطر کھڑے ہو جائیں گے اور قوانین السہیہ کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ سے کریں گے۔ اس میں قانون کا غلبہ و قوت، اور قانون ماننے والوں کی تسلیم و اطاعت، دونوں پہلو آجاتے ہیں۔ بلکہ ”ظاہر ہو جانے“ کے اعتبار سے یہ بھی کہ لوگوں کی مضمحل صلاحیتیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے ابھر کر سامنے آجائیں گی۔

## ع ۵۵

عہد الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا۔ اس کی پیہم نگہداشت کرنا۔ ان بنیادی معنوں کی رو سے عہد کا

استعمال اس پختہ وعدہ کے لئے بھی ہونے لگا جس کی نگہداشت ضروری ہو\*۔  
 جب اس لفظ کے بعد الٰہی آئے تو اس کے معنی حکم کرنے کے ہو جاتے ہیں\*\*۔  
 جیسے عہدِ نَا اِلٰہی لِیْ اِبْرٰہِیْمَ (۱۳۵)۔ ہم نے ابراہیم کو حکم دیا۔  
 ابن فارس نے کہا ہے کہ الٰہی کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو  
 اس بات کی ہدایت کرنا جس کی نگہداشت اس پر واجب کی جائے۔ راغب نے  
 کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سے عہد و پیمان لیکر ایسے اس کے  
 ایفاء کی تاکید کرنا۔ ذمہ داری اور اسان کو بھی عہد کہتے ہیں\*\*۔  
 جیسے لَا یَسْتَالُ عٰہِدِیْ الظَّالِمِیْنِ (۱۳۶)۔ جو ہمارے قانون سے  
 سرکش ہو جائے اس کے بارے میں ہماری یہ ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔  
 اسی طرح اَوْفُوا بِعٰہِدِیْ اَوْفِ بِعٰہِدِکُمْ (۱۳۷) کے معنی ہیں تم  
 اپنے اس عہد کو پورا کرو جو تم نے میرے ساتھ استوار کر رکھا ہے،  
 اور میں ان ذمہ داریوں کو پورا کروں گا جو میں نے تمہاری بابت لے رکھی ہیں۔  
 عہد وفاداری کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِہِیْمَ  
 مِیْنُ عٰہِدٍ (۱۳۸)۔ ہم نے ان میں سے اکثر کو وفا شعار، یعنی اپنے عہد  
 کا پابند، نہیں پایا۔ عہدۃ کے معنی بھی ذمہ داری کے آتے ہیں\*\*۔ والیوں  
 اور حکام کے لئے جو شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں انہیں عہد کہتے ہیں۔  
 نیز عہد کے معنی جان پہچان یا ملاقات کے بھی آتے ہیں۔ عہد الشَّیْءِ  
 چیز کو پہچان لیا\*\*۔

## ع ۵ ن

الْعِیْہُنْ۔ رنگین اون۔ مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی اون۔ اَلْعِیْہُنَّ۔  
 شاخ کا مڑ جانا اور ٹوٹ جانا یا بغیر جدا ہوئے ٹوٹ جانا۔  
 اَلْعِیْہِیْنُ۔ فقیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شکستہ حال ہوتا ہے۔ نیز  
 اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اعضاء ڈھیلے ڈھالے ہوں\*\*\*۔ ابن فارس  
 نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت کے ہیں۔ چنانچہ  
 قَضِیْبُ الْعِیْنِ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں خمیدگی اور  
 شکستگی ہو۔

قرآن حکریم میں ہے وَ تَکُونُ الْعِیْبَالُ کَالْعِیْہُنِ (۹)۔ بہار  
 رنگین (یا مختلف رنگوں والی) اون کی طرح ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ اَلْعِیْہُنِ  
 اَلْعِیْہُوشِ (۱۰) آیا ہے۔ دھنی ہونی رنگین اون۔ ٹکڑے ٹکڑے کی  
 ہوئی مختلف رنگوں والی اون۔ ان کی خستگی اور شکستگی کی طرف اشارہ ہے۔

## ع و ج

هَوَجٌ - يَتَوَجُّ - ٹیڑھا ہونا - العیوجُ فی الارضِ - زمین کا ناہموار ہونا - عَاجٌ عَنَّهُ - اس سے لوٹ گیا - پلٹ گیا، باز آیا \* - مَا أَعْوَجُ بِكَتَلَامِهِ - میں اسکی بات کی طرف ملتفت نہیں ہوتا ہوں - اِنْعَاجٌ عَلَیْهِ - وہ اسکی طرف مڑ گیا \*\* - رَاغِبٌ لَمْ يَكْهَأْ لَمْ يَكْهَأْ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے دیکھا جاسکے اور العیوجُ اس ٹیڑھے پن اور ناہمواری کو جو عقل و بصیرت سے دیکھی جاسکے، جیسے معاشرہ کی ناہمواریاں اور نظام زندگی کا ٹیڑھا پن \*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ أَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو سیدھی اور کھڑی چیز (مثلاً دیوار یا لکڑی وغیرہ) میں ہو - اور أَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو بچی ہوئی چیز یا کسی معاملہ میں ہو -

سورہ کہف میں قرآن کریم کے متعلق ہے وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا (۱۸) یہ ایسا ضابطہ زندگی ہے جس میں کہیں پیچ و خم نہیں - اس کے مقابلہ میں قَبِيحًا آیا ہے (۱۸) - اس کے مخالفین کے متعلق کہا کہ يَبْغُوا نَهًا هِوَجًا (۲۵) - وہ چاہتے ہیں کہ اس کے راستہ میں ناہمواریاں اور خمیدگیاں پیدا ہو جائیں - لیکن جب وہ انقلاب آئیگا جسکی طرف قرآن کریم دھوت دیتا ہے تو ان بڑے بڑے لوگوں کی خود اپنی خمیدگیاں اور ناہمواریاں صاف کر دی جائیں گی - ان کے بل نکل جائیں گے - (۱۰۵:۱۰۷) - یہ اسوقت اس داعی کے پیچھے پیچھے چلیں گے جس کی دعوت میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں (۲۰۸) - قرآن کریم جس صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے اس میں کوئی پیچ و خم نہیں - وہ بالکل صاف اور سیدھا راستہ ہے - لیکن مفاد پرست گمراہ اس میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کرنا چاہتا ہے -

## ع و د

أَلْعَوْدُ - لوٹنا - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ أَلْعَوْدُ کسی کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ کرنا ہوتا ہے - لیکن رَاغِبٌ اور زمخشری کی تحقیق ہے کہ یہ لفظ ابتداء (پہلی مرتبہ) کسی کام کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے \* - چنانچہ صاحب محیط نے بھی اسکی تائید کی ہے اور شہادت میں حضرت شعیبؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے مخالفین سے کہا کہ قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنَّ عُدْنَا فِي مِلَّتِكَ كُنْمْ (۸۹) -



”اگر ہم نے تمہارے مسلک کو اختیار کر لیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم نے خدا کے خلاف جھوٹا اتہام باندھا“۔ اسمیں عُدْنَا کے معنی ان کی ملت میں دوبارہ جانا نہیں، کیونکہ حضرت شعیبؑ ان کی ملت (مذہب) پر کبھی تھے ہی نہیں۔ اسلئے اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہارے مشرب کو کبھی قبول نہیں کریں گے\*۔ لیکن اس آیت میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جواب جماعت (حضرت) شعیبؑ کیطرف سے ہے اور اس میں خود حضرت شعیبؑ شامل نہیں اگرچہ جواب انہی (حضرت شعیبؑ) کے الفاظ میں ہے۔ یعنی ان کا یہ جواب ان کی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر عُدْنَا کے معنی پلٹ کر واپس جانا ہونگے کیونکہ حضرت شعیبؑ کے ساتھی، پہلے ان مخالفین ہی کا مسلک رکھتے تھے۔

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عَاد کے معنی ویسے تو پلٹنے کے ہیں، لیکن بعد میں صَار کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی ”ہو گیا“۔ عام اس کے کہ وہ پہلے بھی ویسا تھا یا نہیں۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ ثُمَّ يَتَعَوَّدُونَ لِيَمَّا قَالُوا (۵۸) پھر وہ اپنی کسی ہوئی بات کی طرف پلٹتے ہیں۔ عَائِدٌ - لوٹ جانے والا، اسکی جمع عَائِدُونَ ہے (۲۴/۱۵)۔ اَعَادَ - يَعِيدُ (۸۵/۱۳)۔ لوٹانا۔ نیز اسکے معنی منزل مقصود تک پہنچانے کے بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ مَعَاد کے معنی ٹھکانا یا انجام\*\* نیز آخری مقام کے بھی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے لَرَّادُشْكٍ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸/۸۵)۔ اسکے معنی (لوٹنے کی جگہ کے اعتبار سے) یہ کہئے جاتے ہیں کہ آپ (نبی اکرمؐ) پھر اسی مکہ میں داخل ہونگے جہاں سے کفار نے آپکو نکالا تھا۔ اسکے معنی وطن اور جائے پیدائش کے بھی لئے جاتے ہیں\*\*\*۔ لیکن اگر اس میں مَعَاد کے معنی منزل مقصود کے لئے جائیں تو وطن یا جائے پیدائش کی بہ نسبت ”منزل مقصود“ زیادہ مناسب ہونگے، اس لئے کہ ایک نبی، وطن کی نسبتوں سے بلند ہوتا ہے، اور وہ فضا جو اس کے مشن کے لئے زیادہ مساعد ہو اس کا وطن بن جاتی ہے۔ لہذا آپ کا مکہ کیطرف لوٹنا اپنے وطن کی طرف مراجعت نہ تھی بلکہ آپؐ کے مشن کی تکمیل تھی۔ بہر حال یہ واضح ہے کہ يَعِيدُ سے مراد تکرار نہیں (یعنی بار بار لوٹانا نہیں) بلکہ ہر شے کو مختلف گردشیں دے کر (مختلف مراحل سے گزار کر)

اسکی ابتدا سے آخری نقطہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایسا کرنے والے کو رَبٌّ کہتے ہیں۔ اس ضمن میں (ر۔ج۔ع) کا عنوان بھی دیکھئے۔

الْعَائِدَةُ کے معنی احسان اور سلوک، مہربانی اور منفعت کے ہیں\*۔ چنانچہ کہتے ہیں هَذَا الْاَمْرُ اَعُوذُ عَلَيْكَ۔ یہ کام تمہارے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ نیز یہ کہه فُلَانٌ مَّائِيْدِيْءٌ وَمَّائِيْعِيْدٌ۔ فلاں آدمی کے پاس کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں ہے۔ نہ وہ پہلی مرتبہ کوئی کام کر سکتا ہے نہ اسکی تکرار کر سکتا ہے\*۔ اَلْمُعِيْدُ اسے کہتے ہیں جو اسکام کی طاقت رکھتے جسکا وہ عادی ہو چکا ہے۔ دراصل مُعِيْدٌ اس نراونٹ کو کہتے ہیں جو بار بار جفتی کھانے پر بھی تھکنے والا نہ ہو۔ نیز معاملات سے واقف اور تجربہ کار آدمی کو بھی کہتے ہیں\*۔ اَعَادَ لِيْلَاةٌ مَّرَرٌ۔ اسکام کی طاقت رکھی\*\*۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ يَبْدِيْءُ (۸۵) میں تکرار اور اعادہ ہی مراد نہیں بلکہ پوری پوری قوت اور طاقت، تدبیر اور واقفیت سے آخری نقطہ (انجام) تک پہنچانا بھی مراد ہے۔ یہ ہے ہر شے کا مَعَادٌ۔ (مَبْدَأٌ اور مَعَادٌ کیلئے دیکھئے عنوان ب۔د۔ا)۔ اَلْعِيْدُ۔ وہ وقت جسمیں خوشی یا غم لوٹ کر آئے\*۔ [الْعُوْدُ۔ ہر پہلی اور باریک لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز اس لکڑی کو بھی جس سے دھونی دی جائے]\*\*\*۔

## ع و ذ

عَائِدٌ۔ ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو۔ اسکی جمع عُوْدٌ ہے\*\*\*\*۔ عَادَاتٌ بیولڈرہا کے معنی ہیں مادہ کا اپنے بچہ کے پاس کھڑے رہنا اور اسکی حفاظت کرتے رہنا جب تک وہ چھوٹا رہے\*۔ اَلْمُعُوْدُ اونٹوں کی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو مکانات کے آس پاس ہو (تاکہ اونٹ ہر وقت نگاہ میں رہیں)۔ ان معانی کے اعتبار سے تَعُوْدٌ اور اِسْتِعَادٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی پناہ لینا۔ اسکی حفاظت میں محفوظ ہو جانا، اور عَادَ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اسے لازم پکڑ لینا۔ مستقل طور پر اختیار کر لینا\*\*\*\*۔

یوں تو نظام خداوندی قائم کرنے والی جماعت کو ہمیشہ اپنے نظام کی حفاظت کیلئے قوانین خداوندی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہونی ہے لیکن

اس نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں ، جبکہ انکی اپنی قوت ہنوز کم اور مخالفین کی مخالفت شدید تر ہوتی ہے ، انہیں ان قوانین کے ذریعے اپنی حفاظت و پرورش کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے ( جیسے ایک نوزائیدہ بچے کو شروع شروع میں اپنی ماں کی حفاظت و پرورش کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے )۔ یہ ہے وہ مرحلہ جسمیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳)۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴)۔ کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا۔ اس سے ذرا دور نہ ہٹنا۔ ذرا سے خطرے اور آہٹ کے وقت جھٹ سے اسکے آغوش میں آجانا اور اسطرح مخالفین کی سرکش قوتوں سے محفوظ ہو جانا۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآنی نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں تعوذ کی ضرورت خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام نظام کے بعد تعوذ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سے دور لے جانے والے میلانات و جذبات اور طاغوتی قوتوں سے ہنسا جوئی کی ضرورت تو زندگی کے ہر سانس میں رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نظام کے ابتدائی ایام میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی مرکز کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جب ایک طرف حقائق واضح ہو جائیں اور دوسری طرف نظام محکم ہو جائے ، تو پھر چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ از خود ہوتا جاتا ہے۔

سورہ نحل میں ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (۱۱۸)۔ اس کے ہام معنی یہ کہنے جاتے ہیں کہ جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو پہلے اعوذ پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کے اثرات اور مستبد قوتوں کا آلہ کار بننے سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اسکی تشریح اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی گئی کہ اِنَّهٗ لَيَسْـَٔلَہٗٓ سُلٰطٰنٌ عَلٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمۡمۡ یَتَشَوَّكُلُوْنَ (۱۱۹)۔ شیطان (یا ان سرکش قوتوں) کا غلبہ ان لوگوں پر کبھی نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتے ہیں اور قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے حضرت موسیٰ نے فرعون کے استبداد سے حفاظت حاصل کی تھی جب کہا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعِزُّکُمۡ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمۡ مِّنْ کُلِّ مُتَكَبِّرٍ (۲۰)۔ میں ہر متکبر ( کے استبداد سے بچنے کے لئے ) اپنے اور تمہارے نشوونما دینے والے کی حفاظت میں ہوں۔

یہ ہے تَعَوُّذٌ کا قرآنی مفہوم - یعنی خطرے کے وقت اپنے نظام سے اور زیادہ شدت سے متمسک ہو جانا اور قوانین خداوندی کی اور زیادہ پابندی سے اطاعت کرنا - اس کے برعکس ہمارے ہاں تَعَوُّذٌ سے مقصود صرف اتنا رہ گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ پڑھ لیا جائے ، یا قرآن کریم کی آیات کے تَعَوُّوْ بِذ لکھ کر گلے میں ڈال لئے جائیں - (ذرا تَعَوُّوْ بِذ کے مفہوم پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ؟) - یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت (پڑھنا) ضروری ہے (تاکہ اسے سمجھا جائے اور سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے) اور جس طرح ہر عبد مومن ہر کام کی ابتدا خدا کے تصور سے کرتا ہے اسی طرح ، قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز بھی غیر خدائی قوتوں سے حفاظت خداوندی (تَعَوُّوْذ) کے احساس سے کیا جائے (اور اس کے لئے اَعُوْذُ بِاَللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کے الفاظ کہ لئے جائیں تو یہ انسان کے جذبات کے اظہار کا طریق ہو جائیگا) - لیکن یہ سمجھ لینا کہ مقصود صرف ان الفاظ کا دھرا لینا ہے ، ٹھیک نہیں - البفاظ ، اظہار مقصد کا ذریعہ ہیں - مقصود بالذات نہیں - اَعُوْذ اور بسم اللہ درحقیقت قرآن کریم کی اس بنیادی تعلیم کا اعلان ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ فَتَمَنُّ يَكْتُمُرُ بِالطَّاغُوتِ وَيَتَوَكَّلُ عَلَى اللَّهِ فَتَقْدِرُ اسْتَمْسَكَ بِالسُّرُورَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲۵۷) - جو شخص ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرے اور صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرے ، تو اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا -

## ع و ر

اَلْعَوْرُ - ایک آنکھ کی بینائی کا جاتے رہنا - اَعُوْرٌ - کانا - نیز کوڑے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ عربوں میں کانا اور کوا دونوں منحوس شمار کئے جاتے تھے - اسی سے کمزور ، بزدل اور گاؤدی آدمی کو بھی کہتے ہیں جس سے کبھی کوئی بھلائی کا کام نہ ہو سکتا ہو - نیز وہ راستہ بتانے والا جسے خود بھی راستہ اچھی طرح معلوم نہ ہو - اَلْاَعُوْرُ مِّنَ الطَّرِيقِ - مٹی ہوئی کتاب - اَلْاَعُوْرُ مِّنَ الطَّرِيقِ - وہ راستہ جس پر کوئی نشان نہ ہو - اَلْعَانِيْرُ - ہر وہ چیز جو آنکھ کو تکلیف دے - اَلْعَوْرَةُ - ملک کی سرحد میں اس قسم کا خلل جہاں سے دشمنوں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہو - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ عَوْرَةُ الْقَوْمِ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں سے کسی قوم کو دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو -

چنانچہ سورۃ احزاب میں جوہے کہ **اِنَّ بَيُّوْتَنَا عَوْرَةٌ** (۳۳)۔ تو اس کے یہی معنی ہیں۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ **اَلْعَوْرَةُ** ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے خالی ہونے کی وجہ سے اس کی نگہداشت ضروری ہو۔ **اَعْوَرَ الشَّيْءُ**۔ کسی چیز کا اس طرح نمایاں ہو جانا کہ دوسرا اس پر حملہ کر سکے۔ ان معانی کے اعتبار سے **اَلْعَوْرَةُ** ہر اس شے کو کہتے ہیں جس میں کوئی ایسا خلل یا نقص ہو جس سے خوف کا امکان ہو۔ نیز ہر وہ شے جس سے شرم و حیا کی جائے۔ جو باعث عار ہو۔ عورت یا مرد کے مقام ستر کو بھی کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں **عَوْرَاتِ النِّسَاءِ** (۲۴) آیا ہے جس کے معنی ہیں عورتوں کی جنسیات (Sex) کے متعلق باتیں جنہیں عام طور پر پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے۔ عشا کی نماز کے بعد۔ اور دوپہر کے وقت جب تم کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتے ہو **ثَلَاثَ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ** (۲۸)۔ یہ تین ایسے اوقات ہیں جن میں تم کپڑے اتار کر بلا تکلف لیٹتے ہو۔ تمہارا پورا پورا ستر نہیں ہوتا۔ مطلب (Privacy) سے ہے۔

## ع و ق

**اَلْعَوْقُ**۔ روک دینا۔ لوٹنا دینا۔ واپس کر دینا۔ نیز وہ آدمی جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ نیز وہ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے۔ **عَاقِبِيْ** **عَنْ اَلْاَمْرِ الَّذِيْ اَرَدْتُ**۔ اس نے مجھے اس کام سے روک دیا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ **اَلتَّعْوِيْذُ**۔ روکنا۔ **مُعَوِّذٌ**۔ روکنے والا\*۔ قرآن کریم میں **اَلْمُعَوِّذِيْنَ** (۳۸) آیا ہے۔ **عَوَائِقُ الدُّهْرِ**۔ وہ حوادثِ زمانہ جو انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور انہیں دوسری مصروفیتوں سے روک دیں\*۔ **يَعُوْذُ**۔ قبیلہ کنعانہ کے بت کا نام تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قوم نوح کے بت کا نام تھا\*۔ (۴۶)۔

## ع و ل

**اَلْعَوْلُ**۔ ہر وہ چیز جو انسان کو گراںبار کر دے۔ جس کے بوجھ تلے وہ دب جائے\*\*۔ **عَالَ الشَّيْءُ** **فَلَانًا**۔ فلاں پر وہ چیز غالب آگئی اور اس پر بوجھ بن گئی جس کی وجہ سے وہ فکر مند ہو گیا۔ **اَلْعِيَالُ**۔ وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو۔ جن کے بوجھ کے نیچے وہ دبا ہوا ہو۔ اسی سے

أَعْمَالُ الرَّجُلِ کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا اور یہ بھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہو گیا۔ عَمَّالُ التَّمِيزَانِ کے معنی ہیں ترازو میں کان ہوئی (یعنی اس میں پاسبان کی ضرورت ہو گئی) اور اس کے پلڑوں کا وزن برابر نہ رہا۔ یہاں سے اس کے معنی بے انصافی کرنے کے آئے ہیں۔ هَالٌ فِي الْحُكْمِ۔ اس نے فیصلہ کرنے میں ظلم کیا\*۔

سورة نساء میں جہاں معاشرہ کی ہنگامی حالت میں اجتماعی مشکل کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اگر تم سمجھو کہ ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔ اس کے بعد ہے ذَٰلِكَ أَدْنٰی اَلَا تَتَعَوَّلُوْا (۳۰)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ تم حق سے نہ ہٹ جاؤ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ تم کثیر العیال ہو کر بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ\*\*۔ (نوٹ۔ ع۔ ی۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

## ع و م

الْعَوْمُ۔ تیرنا۔ السَّبْحُ بانی کے اوپر تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی غوطہ نہ کھائے اور الْعَوْمُ اس تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی بانی کے نیچے بھی چلا جائے۔ اَلْعَمَامَةُ۔ چھوٹی سی کشتی کو کہتے ہیں جس پر دریا عبور کیا جائے۔ اَلْعَوَامُ۔ سبک رفتار گھوڑا\*\*\*۔

قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کُلٌّ فِيْ فَلَکٍ یَّسْتَبَحُّوْنَ (۳۶)۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے۔ اسی تیرنے کی جہت سے اَلْعَمَامُ کے معنی سال ہوئے۔ یعنی وہ مدت جس میں ”آفتاب“ تیر کر اپنا دورہ پورا کر لیتا ہے\*\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَمَامُ اور اَلْسَنَّةُ میں فرق یہ ہے کہ اَلْسَنَّةُ کا لفظ اکثر اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں قحط سالی ہو اور اَلْعَمَامُ اس سال کے لئے جس میں فراخی اور فارغ البالی ہو\*\*۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْسَنَّةُ شمسی سال کے لئے بولا جاتا ہے اور اَلْعَمَامُ عربی مہینوں (قمری سال) کے لئے۔ اس لئے اَلْعَمَامُ، سَنَةِ کے مقابلہ میں چھوٹا ہوتا ہے\*\*۔

سورة عنکبوت میں حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَلَتَبِثَ فِیْہِیْمٌ اَلْثَفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسَ سَیِّنٍ عَمَامًا (۲۹)۔ اس میں سَنَةِ اور عَمَامٌ دونوں آگئے ہیں۔

\*تاج نیز کتاب الاشتقاق۔ \*\*تاج۔ \*\*\*راغب۔

راغب کی توجیہ کے مطابق سَنَّةٌ سختیوں کا دور ہے اور عَمَامٌ خوشحالی کا زمانہ\*۔ (اس کی مزید تشریح کے لئے عنوان س - ن - و (ہ) بھی دیکھئے)۔

## ع و ن

عَوْنٌ کے معنی ہیں مدد نیز مددگار\*\*۔ عَوَانٌ ادھیڑ کو کہتے ہیں۔ یعنی جو جوانی اور کسبِ برسی کے درمیان ہو\*۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے لَا فَارِضٌ وَلَا بَکْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ - وہ ساند (یا گائے) نہ بوڑھا ہے نہ نوجوان، بلکہ ان کے بین بین عَوَانٌ ہے۔ یعنی ادھیڑ عمر کا۔ (۲۸)۔ مُتَعَاوِنَةٌ - اُس عورت کو کہتے ہیں جو اگرچہ عمر میں زیادہ ہو لیکن اس کی جسمانی ساخت میں اعتدال ہو اور جسم ایسا بھرا ہوا ہو کہ نیچے کی ہڈیاں نظر نہ آئیں\*۔ یعنی اس میں نہ بچپن کا الٹڑ پن ہو۔ نہ جوانی کی تیزی اور تلون۔ اور نہ ہی بڑھاپے کی کمزوریاں ہوں۔ بلکہ اس میں درمیانی عمر کی پختگی آچکی ہو یہ تو اسکی ذہنی حالت ہو، اور جسمانی ساخت میں اعتدال اور بھراؤ ہو۔

اِسْتَعَانَ (۱۰۰) کے معنی ہیں اپنی ذات کے لئے اعتدال کی خواہش کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا۔ اسی نہج سے اللہ کو اَلْمُسْتَعَانَ (۲۱۱) کہا گیا ہے۔ اَهَانَ (۹۸) کے معنی ہیں کسی کی مدد کرنا۔ اور تَعَاوَنَ (۵) کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

اِسْتَعَانَ کے ان معانی کو پیش نظر رکھتے ہو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۱۰۰) کا مفہوم واضح ہو جائیگا۔ یعنی ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو قانونِ خداوندی کی متعین کردہ راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ان قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ (دیکھئے ع - ب - د) اور انہی کے ذریعے اپنی صلاحیتوں اور ذات میں اعتدال چاہتے ہیں۔ اس قسم کا اعتدال کہ اس میں پختگی اور حسن دونوں صحیح صحیح توازن و تناسب لئے ہوں۔ ان دونوں آرزوؤں سے ایسا دائرہ بن جاتا ہے جس میں ساری زندگی ایک نہج پر چلتی ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی مضمحل صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کرنا۔ اور ان صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی ہی کے مطابق صرف کرنا تاکہ ان سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو اور عالمگیر انسانیت صحیح اعتدال کی روش اختیار کر سکے۔ آپ نے اس کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس میں اطاعت اور اطاعت کے ساتھ استقامت

دونوں شرطیں آجاتی ہیں۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہہ وَاَسْتَعِيْنُوْا بِالْمَتْبَرِ وَالصَّلٰوَةِ (۲/۲۵۰)۔ صلوٰۃ اور استقامت کے ذریعے اپنی صلاحیتوں میں اعتدال اور پختگی طلب کرو۔ یہی طریق تمہارا معین و مددگار ہو سکتا ہے۔ اس سے خدا کی معاونت حاصل ہوتی ہے۔

نیز جہاں برّ و تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کی تاکید کی گئی ہے، وہاں تعاون سے بھی یہی مراد ہے۔ یعنی کسی شخص میں جن امور کی کمی وہ گئی ہو، اس کمی کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرنا تاکہ اس کا اعتدال برقرار ہو جائے اور اس کی خامی پختگی سے بدل جائے۔

## ع ی ب

الْعِيْبُ - نقص - برائی - خرابی - عَنَابُ الشَّيْءِ\* - وہ شے عیب دار ہو گئی - عَيْبَتُهُ\* - مینے اسے عیب دار بنا دیا - یا مینے اس میں عیب نکالا\* - سورہ کہف میں ہے فَتَا رَدُّتْ اَنْ اَعِيْبَهَا (۱۸/۲۹) - مینے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔

الْعَيْبَةُ\* مِّنَ الشَّرِّ جُل - آدمی کے راز کی جگہ - الْعِيَابُ\* - مینے اور قلوب - دھنیے کی وہ لکڑی جسے تسانت پر مار کر وہ روئی دھنتا ہے\* - (اس سے نکتہ چینی اور عیب جوئی کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔)

## ع ی ر

الْعَيْرُ\* - گدھا - الْعَيْرُ\* - قافلہ - اونٹ جو غذائی سامان لاد کر لاتے ہیں - وہ جانور جن پر غذائی سامان لاد کر لایا جاتا ہے خواہ وہ اونٹ یا گدھے ہوں یا خچر\* - سورہ یوسف میں ہے اَبَقَّتْهَا الْعَيْرُ (۱۲/۲۱) - اے قافلہ والو! ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں - (۱) کسی چیز کا ابھرا اور اوپر کو نکلا ہوا ہونا - اور (۲) آنا جانا - آمد و رفت - الْعَيْرُ\* ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں - مثلاً شانے کے وسط کی ہڈی - ہاؤں کے پشت پر ابھری ہوئی ہڈی - اسی سے بوجھ لادنے والے جانوروں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے - اور آمد و رفت کی جہت سے قافلہ کو۔

## عیسیٰ (علیہ السلام)

عیسیٰ - جوہری کا خیال ہے کہ یہ عبراتی یا سربانی لفظ ہے - لیث کا خیال ہے کہ یہ ایشوع سے معدول ہے\* - ہو سکتا ہے کہ یہ عِيسُو کی



بگڑی ہوئی شکل ہو۔ راغب کا خیال ہے کہ اگر یہ لفظ عربی الاصل ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اَلْعِيسَى سے ماخوذ ہو جس کے معنی ایسے سفید اونٹ ہیں جنکی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو\*\*۔ لیکن تاج نے کہا ہے کہ جنکی سفیدی میں قدرے بھورا پن ملا ہوا ہو\*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ حضرت مسیحؑ کے نام کے لئے آیا ہے (۳۰)۔ دوسرے مقام پر آپ کو اَلْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (۳۱) بھی کہا گیا ہے۔ آپ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہیں۔ جب قوم بنی اسرائیل کے انفرادی اور اجتماعی جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں بطور اتمام حجت، حضرت عیسیٰؑ کو مبعوث کیا۔ آپ نے انہیں اس آسمانی انقلاب کی طرف دعوت دی جو حضرت نوحؑ سے لیکر آخر تک تمام انبیائے کرام پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ یعنی ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کو مٹا کر معاشرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرنے کے لئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت (مفاد پرست اور غلط ہیں) یہودی پیشواؤں کے ابھی خلاف جاتی تھی اور رومی سلطنت کے بھی خلاف۔ چنانچہ انہوں نے ملکر سازش کی اور چاہا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جرم بغاوت میں صلیب کی سزا دے دی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تدبیر کو ناکام کر دیا اور حضرت عیسیٰؑ ان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے ہی ہجرت کر کے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔

جب یہودی اپنی اس تدبیر میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے دوسری چال چلی۔ ہال ایک متشدد یہودی تھا۔ اس نے مذہب عیسوی اختیار کیا اور رفتہ رفتہ سینٹ کے درجے پر پہنچ گیا\*\*\*۔ اس کے بعد اس نے بتدریج اس دین کے بجائے جو حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا تھا ایک نیا مذہب پیش کر دیا جس میں ابنیت مسیح۔ الوہیت مسیح۔ کفارہ کا عقیدہ۔ خانقاہیت کا مسلک، عیسائیت کے بنیادی عناصر قرار پا گئے۔ قرآن کریم نے آکر ایک طرف ان اتہامات اور الزامات کی تردید کی جو یہودی حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسری طرف ان تمام باطل عقائد کی تکذیب کی جنہیں سینٹ ہال (اور اس کے متبعین نے وضع کر کے) عیسائیت کا نقاب اڑھا رکھا تھا۔ تاریخی حقائق سے جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں\*\*\*\* یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق جو کچھ یہودی

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* عیسائیت میں سینٹ مرنے کے بعد بنتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ سینٹ بنتا وہی ہے جو اپنی زندگی میں اس مقام تک پہنچ چکا ہو۔ \*\*\*\* حال ہی میں، بحر میت کے قریب غاروں سے جو قدیم دستاویزیں ملی ہیں وہ بھی اصلی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

اور عیسائی مساترے چلے آ رہے تھے (اور اب بھی سان رہے ہیں) وہ غلط ہے اور صحیح پوزیشن وہی ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے (تفصیل ان تمام امور کی میری کتاب ”شعلہ“ مستور“ میں ملیگی)۔

## ع ی ش

عَمَاشٌ - يَتَعَيَّشُ - عَيْشًا - مَعَاشًا - مَعْيَشَةً - اس نے زندگی گزار دی - اَلْعَيْشُ - زندگی - زندگی گزارنا - چونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی اسلئے آجکل اَلْعَيْشُ روٹی کو بھی کہتے ہیں - اَلْمَعْيَشَةُ - کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے - سامان زیست\* - (جمع مَعَايِشُ) قرآن کریم میں اَرْضُ کے متعلق ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (۱۰ و ۱۱) اس میں تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا - لہذا ہمارے دور میں جن چیزوں کو وسائل پیدوار (Means of Production) کہتے ہیں وہ سب اَرْضُ کے اندر آ جاتی ہیں - (دیکھئے عنوان ارض) - اَلْمَعَاشُ - اسباب زندگی کے تلاش کرنے کا موقع\* - وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (۱۱) - عَيْشَةً - زندگی - طریقہ بود و ماند - فَهُوَ فِي عَيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۱۱) - تو اس کا طریق زندگی قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہے - با ایسا ہے جس سے وہ خوش ہے - سورۃ طہ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامان زیست (روٹی - کپڑا - مکان وغیرہ) بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اس کے لئے اسے جگرہاں مشقتوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا (۱۸، ۱۹) - یہ انسان کی قدیمی زندگی تھی جس میں افراد کے باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوتا تھا - اس کے بعد اس نے تمدن و معاشرت کی زندگی شروع کر دی جس میں سامان زیست کے حصول کے لئے باہمی مقابلہ شروع ہو گیا اور انسان مشقتوں میں پڑ گیا - اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو ضابطہ قوانین خدا کی طرف سے ملے اس کا اتباع کرو - اس سے رزق کی فراوانی ہو جائیگی (۲۳) اس کے بعد ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعْيَشَةً ضَنْكًا (۲۳) - اور جو قوم ہمارے اس ضابطہ قوانین سے اعراض برتیگی تو اس کی معشیت تنگ ہو جائیگی - وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى (۲۳) - اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے -

کے قدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے - اسے سامان زندگی کی

محتاجی ہوتی ہے۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ لہذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گذارنا اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر اطمینان دے لینا کہ ہماری ”روحانی ترقی“ ہو رہی ہے قرآن کریم کی رو سے کھلا ہوا فریب ہے۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط ہاں کہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہاں کی محتاجی اور زیوں حالی قرآن کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے مکمل نظام عطا کر دیا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے وہ تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں جن میں اس وقت پوری انسانی دنیا گرفتار ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”نظام ربویت“ میں ملے گی)۔ نیز دیکھئے عنوان (ع - م - ی)۔

## ع ی ل

الْعِيَالَةُ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قاقہ اور حاجت کے ہیں۔ عَالٌ - يَعِيْلُ\*۔ محتاج اور ضرورت مند ہو جانا۔ عَائِلٌ\*۔ ضرورت مند۔ محتاج\*۔ وَ وَجَدَكَ عَائِلًا فَآغْنِي (۹۳)۔ خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو تجھے اتنا دیا کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا۔ الْعِيَالَةُ\*۔ محتاجی۔ تنگ دستی (۲۸)۔ الْعَالَةُ\*۔ قاقہ۔ الْعِيَالُ (عَائِلٌ کی جمع ہے)۔ وہ لوگ جن کی کفالت کی جائے۔ جن کا خرچ اٹھا ہوا جائے\*۔

## ع ی ن

عَيْنٌ\* کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ سو سے بھی اوپر۔ اس کے اصلی معنی آنکھ کے ہیں۔ باقی سب اس سے مستعار ہیں\*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آنکھ۔ چشمہ۔ جاری پانی کیلئے اور متعین\*۔ سرسبز و شاداب (زمین) کے معنوں میں آیا ہے۔ مثلاً عَيْنًا (۶۰) بمعنی چشمہ۔ عَيْنُ النَّاسِ (۲۹) لوگوں کی آنکھوں کے سامنے۔ انکے روبرو۔ سورہ المومنون میں ہے ذَاتِ قَرَارٍ وَ مَعِينٍ (۲۳)۔ ہموار اور سرسبز و شاداب زمین۔ سورہ کہف میں ہے تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ (۱۸۹) یعنی جھیل یا سمندر میں۔ کَا مِّنْ مِّنْ مَّعِينٍ (۳۴) کے معنی ہیں جاری پانی سے لبریز پیالہ۔ [مَعِينٌ کو اہل لغت عَيْنٌ سے بھی بتاتے ہیں

اس کی معنی آنکھ، چشمہ، جاری پانی اور متعین\*۔

اور مَعْنٰی سے بھی۔ اس لئے اسے م۔ ع۔ ن کے تحت بھی لکھ دیا گیا ہے۔  
مَعْنُوْنَ کے لئے دیکھئے عنوان م۔ ع۔ ن۔ ]

اَعْيُنُ کے معنی ہیں وہ مرد جس کی آنکھ جنگلی گائے کی آنکھ جیسی ہو\*۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی اسکی جمع عِیْنُ ہے۔ یہ لفظ (۳۸) میں آیا ہے۔ نیز (۵۰) میں حُورِ عِیْنُ آیا ہے۔  
(اسکے معنی کیلئے عنوان ح۔ و۔ ر دیکھئے)۔ عِیْنُ\*۔ اَعْيُنُ کی بھی جمع ہے جو مذکر کے لئے بولا جاتا ہے اور عِیْنَاءُ کی بھی جو مؤنث کے لئے آتا ہے۔ اسی طرح حُورُ بھی مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔

## ع ی ی

عَنِ الرَّجُلِ بِأَلَمٍ - آدمی کسی کام کو نہ کر سکا اور اسکے کرنے سے عاجز رہا۔ عَنِی عَنِ حُجَّتِهِ۔ وہ اپنی دلیل و حجت پیش کرنے سے عاجز رہا یا اسے ہمتی سے پیش نہ کر سکا۔ اَعْيَا عِلْمُهُ اَلَا مَرُّ۔ وہ کام اسپر دشوار ہو گیا۔ اَعْيَا الشَّمَشِي۔ چلنے والا تھک گیا\*۔ اَلَا عِيَاءُ۔ کمزوری اور تکان جو چلنے سے پیدا ہو جائے\*\*۔ سورہ احقاف میں ہے لَمْ يَتَعْنِ بِخَلْقِهِنَّ (۱۱۸) اَللّٰہ (کائنات کی) تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا یا اسکے بنانے سے عاجز نہیں رہا۔ سورہ ق میں ہے اَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ اَلَا وَاَلَمْ يَخْلُقْ (۱۰۱)۔ کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے یا عاجز رہے (جو یہ لوگ خلق جدید کے متعلق شبہ میں ہیں)۔ اس میں ضمناً بائبل کے اس تصور کی بھی تردید کر دی گئی جس کی رو سے اس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ روز میں زمین اور آسمان پیدا کئے اور ساتویں دن تھک کر آرام کیا۔ (اسے یومِ سبت کہا جاتا ہے جس میں یہودی کام کاج نہیں کرتے)۔ خدا تھکتا نہیں۔ نہ ہی اسے نیند یا اونگھ آتی ہے۔ (۲۵۵)۔

## غ

## غ ب ر

غَبَرَ الشَّيْءُ 'ع'۔ کوئی چیز باقی رہ گئی۔ ٹھہر گئی۔ الْغَبِيرُ مِّنَ اللَّيْلِ۔ رات کا بقیہ۔ الْغَبَرُ وَالْغَبَارُ وَالْغَبَرَةُ۔ مٹی۔ گرد و غبار۔ الْغَبِيرُ۔ کینہ (جو دل میں باقی رہ جاتا ہے) \*۔ دَاهِيَةُ الْغَبَرِ۔ باقی رہنے والی آفت جس کے ازالہ کی کوئی شکل نہ ہو سکے \*۔ وہ مصیبت جو گذر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے \*\*۔ سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق ہے کَأَنْتَ مِّنَ الْغَابِرِينَ (۸۳)۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

سورہ عبس میں ہے عَلَيْنَهَا غَبَرَةٌ (۸۶)۔ چہروں پر گرد و غبار پڑا ہوگا۔ بمقابلہ مُسْتَفِيرَةٍ۔ ضَاحِكَةٍ۔ مُسْتَشْبِثِيرَةٍ (۸۷، ۸۸)۔ یعنی درخشندہ متبسم اور نوید آمیز چہروں کے مقابلہ میں افسردہ، غمناک اور حسرت آگیز چہرے۔

## غ ب ن

الْغَبْنُ۔ کسی مشترکہ معاملہ میں اپنے ساتھی کے مفاد یا حقوق میں پوشیدہ طور پر کمی کرتا۔ اگر یہ کمی مال میں ہو تو غَبْنٌ قُلُوبٌ کہتے ہیں اور اگر یہ کمی رائے وغیرہ میں ہو تو غَبْنٌ کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ غَبْنٌ کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور الْغَبْنُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے \*\*۔ چنانچہ الْمَغْبُونُ بغل اور کنج ران کو کہتے ہیں۔ غَبْنَتُهُ فِي الْبَيْعِ غَبْنًا۔ اس نے بیع میں اسے دھوکا دیا۔ یعنی اسے چیز کم یا خراب دیدی \*۔ غَبْنٌ رَأْيُهُ۔ اسکی ذکاوت اور فطانت کم ہو گئی \*\*\*۔

قرآن کریم نے قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴) کہا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن ظاہر ہو جائیگا کہ لوگوں نے جو معاملہ اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا [یعنی اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ کر اسکے بدلے میں جنت لیے لی۔ (۱۱۱)] اس میں کس نے کس قدر کمی کی ہے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ دن جب چیزیں ان مقدار پر (پیمانوں) کے خلاف ظاہر ہوں گی جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگا رہے تھے\*۔

قرآن کریم نے ظہور نتائج کے وقت کے متعلق کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو جائیگا اور نظر آجائیگا کہ کسبابی کے معیار تک پہنچنے کے لئے ان میں کس قدر کمی رہ گئی ہے (۱۱۱)۔ اس لئے یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴) کے معنی ہونگے وہ وقت جب تمام لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں معلوم ہو جائیگا کہ کس میں کس قدر کمی رہ گئی ہے۔ اعمال کے وزن کی کمی درحقیقت ان صلاحیتوں کی کمی ہے جن کے پورا ہونے سے انسان زندگی کی اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ لہذا یَوْمُ التَّغَابُنِ۔ ظہور نتائج کا وقت ہے جب ایک دوسرے کی کمی نمایاں ہو کر سامنے آجائیگی، خواہ وہ اس دنیا میں باطل کی قوتوں سے ٹکراؤ کا وقت ہو اور خواہ اس کے بعد کی زندگی میں انسانی صلاحیتوں کی جانچ کا وقت۔ اس زندگی میں تو قدم قدم پر تَغَابُنِ کا مرحلہ ہوتا ہے۔

تَغَابُنِ کے لفظی معنی ہیں باہم غبن کرنا۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق یا مال میں کمی کرنا۔ ایک دوسرے کی تغلیط کرنا۔ ایک دوسرے کو خفیہ طریق سے دھوکا دینا۔ قیامت کے دن (یعنی مرنے کے بعد ظہور نتائج کے وقت) مختلف افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے پر الزام دھرنے (ایک دوسرے کو کم عقل بتانے) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس اعتبار سے یَوْمُ التَّغَابُنِ کہا گیا ہو۔ البتہ وہاں ایک دوسرے کے حقوق میں کمی کرنے یا دھوکا دینے کا موقع نہیں ہوگا۔ اس لئے ان معانی کے اعتبار سے بھی سمجھا جائیگا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو جو دھوکے پہلے دیئے تھے ان کے نتائج وہاں سامنے آجائیں گے۔

## غ ث و

اَلْغُشَاءُ۔ جھاگ اور کوڑا کچرا۔ وہ کوڑا کرکٹ اور ہوسیدہ پتے وغیرہ جسے سیلاب بہا کر لائے۔ گندی گلی سڑی چیز کو بھی کہتے ہیں\*\*۔

\*راغب\*\* تاج و محیط۔

اور خس و خاشاک کو بھی جو کسی کام کا نہ رہے۔ یہ ہر اس چیز کے لئے ضرب المثل ہے جو کس مہر می کے عالم میں ضائع اور فنا ہو جائے اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ \*۔ قرآن کریم میں اس قوم کے متعلق جو سکافات عمل کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہو کہا گیا ہے فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً (۲۳)۔ ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا، اور اس طرح وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے، جیسا کہ سورہ السعد میں ہے کہ سیلاب آتا ہے تو خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے (۱۳)۔

یہ حالت تو اس قوم کی ہے جو یکسر تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسی قومیں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کی محکوم بن کر زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے سیلاب کے ساتھ بہنے والا خس و خاشاک کہ وہ بالکل بے دست و پا ہوتا ہے اور اسے جسٹرف سیلاب کی موجیں لے جانا چاہیں مجبوراً چلا جاتا ہے۔

## غ د ر

غَدْرٌ \*۔ کسی چیز میں خلل واقع کر دینا اور اسے چھوڑ دینا۔ اَغْدَرَهُ وَ غَدَا رَهُ \*۔ اس نے اسے چھوڑ دیا۔ \*۔ قرآن کریم میں ہے فَلَمَّ نَغَادِرٌ مِّنْهُمْ اَحَدًا (۱۹)۔ ہم نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ اَلْغَدْرُ \*۔ بڑا عہد شکن اور بے وفا۔

اَلْغَدْرُ \*۔ تلاب یا پانی کا وہ حصہ جسے سیلاب چھوڑ جائے۔ اَلْغَدْرُ \*۔ کسی کا ساتھ چھوڑ دینا۔ وفا کی ضد ہے۔ یعنی بے وفائی۔ \*۔ چنانچہ غَدْرَتِ الشَّامُ کے معنی ہیں بکری دوسری بکریوں سے پیچھے رہ گئی۔ \*\*\*۔

## غ د ق

اَلْغَدَقُ \*۔ بہت زیادہ۔ وافر۔ فراوان۔ \*\*\*\*۔ ہمہ گیر بارش۔ \*\*\*\*۔ اَغْدَقَ الْمَطَرُ \*۔ بارش بہت ہر سی۔ غَدَقَتِ الرَّضُ \*۔ زمین سرسبز ہو گئی۔ هُمْ رِیْ غَدَقٍ مِّنَ الْعَیْشِ \*۔ وہ لوگ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں وسعتِ رزق نصیب ہے۔ \*\*\*\*۔

\* راغب۔ \*\* تاج و راغب۔ \*\*\* ابن فارس۔ \*\*\*\* راغب نیز ابن فارس۔ \*\*\*\*\* تاج نیز کتاب الاشتقاق۔

قرآن کریم میں ہے لَا اسْتَقِیْهُمْ مَاءٌ غَدَقًا (۹۲)۔ ہم انہیں رزق فراوان عطا کرتے۔ انہیں سرسبز و شاداب زندگی بسر کراتے۔

## غ د و

الْغَدُوَّةُ - صبح سویرے - دن کا ابتدائی حصہ \*\*\* - غَدَا عَلَیْہِ غَدُوًّا - اس کے پاس صبح سویرے گیا \* - وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَہْلَیْکَ (۱۳۰) - الْغَدُو - کل (آنے والا - فردا) مستقبل کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - مَا قَدْ مَتَّ لِیْغَدِ (۵۹) - "اس نے مستقبل کے لئے کیا کچھ آگے بھیجا ہے" - غَدَاہُ - دن کا کھانا ، جو صبح جلدی کھایا جائے - (۱۸) -

غَدَا - فعل ناقص کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے جس کے معنی صَارَ کے ہوتے ہیں \*\* - سورۃ اعراف میں غَدُوًّا (غَدُوَّة کی جمع) کے مقابلہ میں اَصَالَ آیا ہے (۳۰) - اور سورۃ انعام میں غَدَاوۃ کے مقابلہ میں عَشِیٌّ (۵۳) - یعنی صبح - شام (لفظ غَدَاوۃ کا واؤ نہیں پڑھا جاتا - نہ ہی اس پر کوئی حرکت ہوتی ہے - اس کا تلفظ غَدَاۃ ہوگا) - سورۃ سبا میں غَدُوًّا (مصدر) کے مقابل میں رَوَّاح آیا ہے (۳۳) - یعنی صبح کا جانا اور شام کا آنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں -

## غ رب

الْغَرْبُ - لغت عرب میں اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں لیکن ان میں سے - (۱) مغرب (اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے غَرْبِیٌّ کہا جاتا ہے) - (۲) چلے جانا - (۳) علحدہ ہو جانا - زیادہ مشہور ہیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے کلمات کسی خاص قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں ہیں - غَرْوْبُ الشَّمْسِ - سورج کا غائب ہو جانا - غَرْبَتِ الشَّمْسُ تَغْرِبُ - سورج غروب ہوا - مَغْرِبُ الشَّمْسِ نِزْمُ مَغْرِبِ بَانَ الشَّمْسِ وَمُغْمِرٌ بَانَهُمَا آفتاب غروب ہو جانے کی جگہ یا وقت \* - (قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ شرق کے مقابلہ میں آیا ہے اس کے لئے دیکھئے عنوان ش - ر - ق) -

غَرْبٌ فُلَانٌ غَرْبَتٌ وَ غَرْبًا - وہ شخص وطن سے دور چلا گیا \* - اس سے غَرْبِیٌّ - مسافر اور اجنبی کو کہتے ہیں اور غَرْبَتٌ مسافری اور اجنبیت کو - اسی سے اردو میں غریب الوطن بولا جاتا ہے - لیکن اردو میں جو



”غریب“ کے معنی مفلس لئے جاتے ہیں یہ ہمارے ہاں کا اپنا استعمال ہے۔  
عربی میں اس کے معنی مسافر اور اجنبی کے ہونگے۔

غَرَابٌ کوڑے کو کہتے ہیں (۳۱)۔ اس لئے کہ وہ دور دور تک  
چلا جاتا ہے۔ اور اس کی رنگت کی وجہ سے غیر بیٹ سیاہ کو کہتے ہیں۔  
قرآن کریم میں ہے غَرَابِیْبٌ سَوْدٌ (۳۵)۔ بہت زیادہ سیاہ۔ کالے بچھنگ۔  
سورۃ طہ میں طُلُوْعِ الشَّمْسِ کے مقابلہ میں غُرُوْبِہَا  
آیا ہے (۲۰)۔

## غ ر ر

غَرَّةٌ - یَغْرَثُ - اسے فریب دیا اور بے بنیاد امیدیں دلائیں۔ چنانچہ  
الْمَغْرُوْرُ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی عورت سے یہ سمجھ کر  
شادی کر لے کہ وہ آزاد ہے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ تولونڈی تھی۔  
اسی سے غُرُوْرٌ عر اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان دھوکا  
کھا جائے یا جو انسان کو فریب میں مبتلا کر دے۔ غَارَاتِ الثَّقَاتِ کے  
معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہو گیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا  
کہ اس کا دودھ کم ہو جائیگا۔ گویا اونٹنی نے دھوکا دیا۔ لہذا اس مادہ  
میں غلط امیدوں کے ساتھ فریب دینے یا فریب کھا جانے کا مفہوم ہوتا ہے۔  
سورۃ آل عمران میں ہے وَ غَرَّہُمْ (۳۳)۔ ان کی افتراء پر دازی نے انہیں  
دھوکا دے دیا۔

سورۃ لقمن میں غُرُوْرٌ (۳۱) کے معنی دھوکا دینے والا ہیں (ہر وہ  
چیز جس سے انسان دھوکا کھا جائے)۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں غُرُوْرًا  
(۱۶) کے معنی ہیں دھوکا۔ یا دھوکا دینے ہوئے۔

سورۃ انفطار میں انسان کے متعلق ہے مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ  
(۹۴)۔ اس کے معنی ہیں تجھے اپنے ربِّ كَرِيْمِ کے بارے میں کس بات  
نے دھوکا دے رکھا ہے۔ مغالطے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن صاحب محیط نے  
لکھا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِفُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں تو فلاں پر کس طرح  
جری ہو گیا۔ اس کے خلاف تجھے یہ جرات کیسے ہو گئی۔ لہذا اس آیت  
(۹۴) کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تو نے جو خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے  
خلاف اپنے قوانین خود بنا لئے تو تجھے کیں بات نے اس قدر جرات دلا دی؟

الْغُرَّةُ - کپڑے کی تہ کو کہتے ہیں - الْغُرَّةُ\* - ہر چیز کا بہترین حصہ - سفیدی\* - (قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے)۔

## غ ر ف

الْغُرْفَةُ\* - ایک مرتبہ (چٹو سے) پانی نکالنا - الْغُرْفَةُ\* - چٹو میں پانی لینے کا انداز یا نوعیت و حالت - الْغُرْفَةُ\* - (چٹو سے) جو کچھ نکالا جائے - (اسکی جمع الْغُرَفُ ہے) - اغْتَرَفَ الْمَاءَ بِيَدِهِ (۴۹) - اس نے اپنے ہاتھوں سے پانی نکالا - نَقَاتَةُ غَارِ فَمَةٍ\* - تیز رفتار اونٹنی - الْغُرَفُ\* - ایسی ندی جس میں بکثرت پانی ہو - الْغُرْفَةُ\* - (جمع غُرَفُ\* وَغُرَفَاتُ\*) اوپر کا کمرہ - بالا خانہ\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے مختلف معانی کسی قاعدے اور قیاس کے تحت نہیں آئے۔

سورہ فرقان میں مومنین کے متعلق ہے اُولَئِكَ يَجْزُوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (۲۵) - انہیں ان کی استقامت کے بدلہ میں الْغُرْفَةُ\* دیا جائیگا - اس میں فراوانی اور بلندی سب کچھ آگیا - یعنی بلندیوں - روانیاں - فراوانیاں (نیز ۸۸؛ ۷۷؛ ۲۱) - مصاف زندگی میں آگے آگے بڑھتے جانا اور ارتقائی منازل کا حسن و خوبی سے طے کرنا - آپ غور کیجئے کہ اس ایک جامع لفظ سے قرآن کریم نے کیا کچھ بیان کر دیا ہے - سامانِ زیست کی فراوانیاں - سرفرازیں - زندگی کی جوئے رواں کا یہاں (دنیا) سے وہاں (آخرت) تک مسلسل آگے بڑھتے، اور سطح زندگی کا بلند ہوتے چلے جانا۔

## غ ر ق

غَرِقَ - يَغْرَقُ\* - غَرَقًا - پانی میں تہ نشین ہو جانا - بعض نے کہا ہے کہ غَرِقَ\* کے اصلی معنی ناک کے راستہ اتنا پانی بھر جانا ہیں جس سے دم گھٹ جائے اور اس طرح انسان مر جائے - لیکن (جیسا کہ ابن فارس نے کہا ہے) اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں اس کے آخری حصہ اور انتہا تک پہنچ جانے کے ہیں - مثلاً الْغُرْقَةُ\* اُس زمین کو کہتے ہیں جو انتہائی میراب ہو - اغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقُبُورِ\* کے معنی ہیں کمان کھینچنے والے نے کمان کو اس کی آخری حد تک کھینچا - اغْرَاقُ\* کہتے ہیں کمان کو پوری طاقت سے آخری حد تک کھینچ دینا - وَالنَّازِعَاتِ غَرَقًا (۹) - میں غَرَقًا دراصل اغْرَاقًا کی جگہ استعمال ہوا ہے\*\* - یعنی آخری حد تک کھینچتے ہوئے۔

أَغْرَقَهُ اُسے ڈبو دیا \*۔ سورة یونس میں فرعون کے متعلق ہے اِذَا  
 أَدْرَاكَهُ الْغَرَقُ (۱۰۱) ”جب اسے غرقابی نے آلیا“۔ یہاں غَرَقُ  
 کے معنی پانی میں ڈوبنے کے ہیں۔ ڈبونے کے لئے سورة اعراف میں ہے  
 فَاغْرَقْنَاهُمْ (۱۳۶)۔ سو ہم نے انہیں غرق کر دیا۔ ڈبونے ہوئے کو  
 مَغْرَقٌ کہیں گے۔ اس کی جمع مَغْرَقُونَ اور مَغْرَقِينَ ہے (۲۴۴)۔

## غ ر م

الْمُغْرَمٰی۔ گراں بار عورت۔ اَلْمُغْرَامُ۔ دائمی شر۔ سختی اور مصیبت۔  
 وہ شدید مصیبت جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا  
 مشکل ہو جائے۔ اَلْمُغْرَمُ۔ تاوان۔ جرمانہ۔ بیگار کی چٹی جس کا ادا کرنا  
 ضروری ہو۔ مفت کا جرمانہ۔ ایسی مصیبت جس سے چھٹکارا نہ ہو۔ اَلْمُغْرِمُ۔  
 مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لئے آتا ہے۔ مقروض تو اس لئے کہ وہ قرض  
 کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے۔ اور قرض خواہ اس لئے کہ اَلْمُغْرِمُ،  
 اسیرِ محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے۔ قرض خواہ  
 کو اسی طرح مقروض کے پیچھے پیچھے پھرتا پڑتا ہے۔ ابن فارس نے کہا  
 ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ساتھ ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کے ہیں۔  
 قرآن کریم میں اَلْمُغَارِمِیْنِ (۹۰) آیا ہے۔ اس کے معنی مقروض کے  
 بھی ہو سکتے ہیں اور مصیبت زدہ کے بھی، نیز وہ جس پر تاوان پڑ گیا ہو یا  
 ویسے ہی کوئی نقصان ہو گیا ہو۔ کیونکہ غَرِمَ رَفِی الْجَارَةِ کے معنی  
 ہوئے ہیں تجارت میں نقصان ہوا۔ اسی سورة میں ذرا آگے چل کر مَغْرَمًا  
 (۹۸)۔ آیا ہے جس کے معنی مفت کا تاوان یا جرمانہ ہیں۔ سورة واقعہ میں  
 ہے اِنَّا لَمَغْرَمُونَ (۵۶)۔ ہم ہر مفت میں تاوان پڑ گیا۔ سورة فرقان میں  
 عذاب جہنم کے متعلق ہے اِنَّ عَذَابَہَا كَانَ غَرَامًا (۲۵)۔ اس کا عذاب  
 ایسا ہے جو ہر وقت پیچھے لگا رہے گا۔ جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

## غ ر و

غیر آء\* اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری چیز کے  
 ساتھ چمٹا دیا جائے (مثلاً لٹی۔ سریش وغیرہ)۔ اسی سے اِغْرَاءُ کے معنی  
 ہیں کسی کو کسی کے پیچھے لگا دینا۔ اِغْرَی السُّکُوبَ بِالسُّقُوبِ۔  
 کتنے کوشکار کے پیچھے لگا دیا \*۔ لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ یا پیچھے

لگا دینے کے آئے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ (۱۳۰)۔ ہم نے ان کے درمیان عداوت کو لازم کر دیا، پیوست کر دیا۔ اَغْرَاهُ یہ۔ اسے کسی چیز کا دلدادہ و شیفہ بنانا، اس پر ابھارنا اور اکسانا، شوق دلانا\*\*۔ اسے کسی کے پیچھے لگا دینا، لپکا دینا\*۔ یہ ان تمام معانی کے لئے آئے گا۔ سورۃ احزاب میں ہے لَتُغْرِرَ يَنْشَكَبَ بِهِمْ (۳۳)۔ ہم تجھے ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔ انہیں سزا دینے کے لئے تجھے ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

## غزل

غَزَلٌ۔ رونی وغیرہ کا تنہا۔ غَزَلٌ کا تنہا ہوا سوت\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۹۶)۔ جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کے ہل کھول دئے، اسے ادھیڑ دیا۔ اَلْغَزَلُ۔ عورتوں سے دلہستگی کی باتیں کرنا۔ اَلْغَزَالُ ہرنوٹا (یا عرنوٹی یعنی ہرنی کا بچہ) جبکہ وہ حرکت کرنے اور چلنے پھرنے لگے۔ اَلْغَزَالَةُ۔ آفتاب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کرنوں کو (سوت کی طرح) روئے زمین پر بکھیرتا ہے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ بینوں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قِسْوَتِ اُنْسِكَاثًا (۹۶)۔ دیکھنا! کہیں تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جو نہایت محنت و مشقت سے سوت کاتتی ہے اور اس کے بعد اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔ غور کیجئے، (وحی کے مقابلہ میں) عقل کے تجرباتی طریق کا نقشہ کس حسن و خوبی سے کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ عقل ایک نظریہ کو لیتی ہے۔ ساری دنیا میں ڈنکا بچ جاتا ہے کہ اس نظریہ میں انسانیت کی مشکلوں کا حل پا لیا گیا ہے۔ وہ اس پر تجربہ کرتی ہے۔ اس میں بے انتہا توانائی صرف ہوتی ہے۔ وقت لگتا ہے۔ کتنے انسان قربانی دیتے ہیں۔ کتنے مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس پر یہی عقل اپنے کئے کرائے کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیتی ہے اور ایک اور نظریہ پر عمل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ (Trial and Error) کے اسی تجرباتی طریق سے وہ ہزاروں برس میں جا کر کہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ انسانی ترقی کی ساری تاریخ اسی ”ادھیڑ بن“ کی صبر آزمائی داستان ہے۔ اس کے برعکس وحی براہ راست

حقیقت کو سامنے لے آتی ہے اور انسان کو ان تمام جانکاه مراحل سے بچالیتی ہے جن میں سے اسے عقل کے تجرباتی طریق کے ذریعے گذرنا ناگزیر تھا۔ وحی اور عقل میں یہی فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں۔

ہر دو امیر کارواں ، ہر دو بہ منزلے رواں  
عقل بہ حیلہ می برد۔ عشق برد کشاں کشاں

## غ ز و

غَزَاہُ\*۔ غَزَوْا\*۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کا قصد کیا۔ اسے طلب کیا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ یعنی قصد اور طلب۔ غَزَوْا\*۔ مِیرا مقصد اس طرح کا ہے\*۔ مَغْزَی السَّکَلَامِ\*۔ بیات کا مقصد اور مطالب\*۔ اسکے بعد اس سے مراد دشمن کے خلاف جنگ کے قصد کے ہو گئے۔ غَزَا النُّعْدُو\*۔ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلا\*۔

آپ نے دیکھا کہ غَزَوْا\* میں مقصد و ارادہ کے ساتھ جنگ کا مفہوم شامل ہے۔ جماعت مومنین کا قصد اور ارادہ: قوانین خداوندی کے تابع ہونا ہے اس لئے ان کے غزوات دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہو گئے، نہ کہ کمزوروں کو ستانے اور لوٹنے کی خاطر۔

سورة آل عمران میں ہے اَوْ کَاثُوْا غُرَّی (۱۵۳)۔ یا وہ جنگ میں شامل ہوں۔ جنگ کر رہے ہوں۔

## غ س ق

الْغَسَقُ\*۔ ابتدائے شب کی تاریکی\*۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی سخت تاریکی کے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی تاریکی بتائے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ (۱۶)۔ یعنی (شروع) رات کی تاریکی تک۔ الْغَسَاقُ\*۔ چاند جبکہ وہ گہن لگ کر سیاہ ہو جائے۔ تاریک رات\*۔ قرآن کریم میں ہے مِّنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۳)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات کے وقت پیش آئے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں۔ جیسے طاریق\* رات کے وقت آئے والے کو کہتے ہیں\*\*۔ نِزْ غَاسِقٍ\* کے معنی ٹھنڈے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ رات

کو غَسَّاقٌ\* اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ دن سے نسبتاً ٹھنڈی ہوتی ہے\*۔  
 غَسَّاقٌ\*۔ نہایت ٹھنڈی چیز۔ جس کی ٹھنڈ جلا دے۔ چنانچہ سورہ النَّبَا میں  
 جہنم کے متعلق ہے کہ اس میں حَمِيمًا وَاغْسَاقًا (۳۸/۴) ہوگا۔ اس میں  
 غَسَّاقٌ\* کے معنی شدید ٹھنڈے کے ہیں۔ جسکی ٹھنڈ سن کر کے رکھدے۔  
 یعنی جہنم میں شدت کی گرمی اور شدت کی ٹھنڈ ہے۔ یہ دونوں نشوونما  
 کے لئے ہلاکت کا موجب ہوتی ہیں۔ کھیتی کو جس طرح گرمی جھلسا دیتی ہے  
 اسی طرح اسے ہالا بھی مار دیتا ہے۔ نشوونما کے لئے ضروری سامان،  
 اور اس کے استعمال میں تناسب، دونوں لازمی ہوتے ہیں۔ پانی سے کھیتی  
 پروان چڑھتی ہے لیکن یہی پانی جب زیادہ دیدیا جائے تو وہ گل سڑ  
 جاتی ہے۔ ہوا سے درخت لہلہاتے ہیں لیکن جب یہی ہوا جھکڑ بن جائے  
 تو وہ جڑوں سے اکھڑ جائے ہیں۔ ہودوں کی نشوونما کے لئے حرارت ناگزیر ہے  
 لیکن یہی حرارت جب تیز ہو جائے تو انہیں جھلسا دیتی ہے۔ لہذا جہنم،  
 سامان نشوونما سے محرومی ہی کا نام نہیں۔ سامان کی فراوانی کے ساتھ اگر  
 صحیح صحیح توازن و تناسب نہ ہو تو اس کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے، بلکہ  
 اس سے بھی بدتر۔ ہم سامان سے محروم ہیں، مغرب والے اعتدال سے محروم۔  
 یہاں فالج ہے، وہاں سرسام۔ جہنم بہر حال دونوں جگہ ہے۔ سامان زیست  
 کی فراوانی اور اس کی تقسیم اور استعمال میں صحیح صحیح تناسب، یہ دونوں  
 خدا کے نظام ربوبیت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ دنیا جنت بنتی ہے۔  
 جنتِ اُخروی میں بھی یہی کیفیت ہوگی۔

## غ س ل

غَسَّلَ - دھونا، پانی بہا کر کسی چیز کو میل کچیل سے پاک کرنا\*۔  
 فَاغْمِلُوا وَاُجُورْ هَکُمُ\* (۹/۱) اپنے چہروں کو دھوؤ۔ اَغْتَسَّلَ - غسل  
 کرنا\*۔ (۳۳/۳)۔ مَغْتَسَّلٌ\*۔ وہ جگہ جہاں نہایا جائے یا وہ پانی جس سے  
 نہایا جائے\*\*۔ (۳۸/۴)۔

سورہ الحاقہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے وَلَا طَعَامٌ\* إِلَّا مِینٌ\*  
 غِیْلِیْنِ (۳۹/۲)۔ اس کے عام معنی کٹے جاتے ہیں، دھوون یا غسالہ۔ یا  
 وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ہو۔ لیکن قماموس میں ہے کہ اس کے معنی  
 ہیں انتہائی گرم\*\*\*۔ (اس کے مفہوم کے لئے غ - س - ق کا عنوان  
 بھی دیکھئے)

## غ ش ی (و)

غَشِیَّ کے معنی کسی چیز کو (پوری طرح سے) ڈھانپ لینا یا اس پر (بالکلیہ) چھا جانا ہیں۔ غِشَاوَةٌ\* اس پردے کو کہتے ہیں جو کسی کو ڈھانپ دے اور اس پر چھا جائے (۲/۲۰۰)۔ غَشَاوَةٌ\* اس جیہلی کو کہتے ہیں جو دل پر بطور غلاف چڑھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جو تلوار کے نیام پر مڑھ دیا جاتا ہے۔ غَشِیَّ عَلَیْہِ\* اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی بیہوش ہو جائے کیونکہ اس وقت اس کے ہوش و حواس بالکل مستور ہو جاتے ہیں۔ غَشِیَّ قُلَانَا کے معنی ہیں وہ شخص فلاں آدمی کے پاس آیا۔ اور غَشِیَّہَا اور تَغَشَّیْہَا کے معنی عورت سے مجامعت کرنے کے آتے ہیں کیونکہ اس حالت میں مرد اسے ڈھانپ لیتا ہے\*۔ سورۃ اعراف میں ہے تَغَشَّیْہَا (۱۸۹)۔ سورۃ نوح میں ہے وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَہُمْ\* (۱۰۸) انہوں نے اپنے دلوں کو ڈھانپ لیا۔ انہیں غلافوں میں بند کر لیا۔

قرآن کریم میں غِشَاوَةٌ\* (۲/۲۰۰) کے معنی پردہ ہیں۔ اور غَشِیَّ کے معنی ڈھانپ لینا (۲/۲۰۰)۔ سورۃ اعراف میں مِیْہَادٌ\* (بچھوئے) کے مقابل میں غَمَاشٌ کا لفظ آیا ہے (۱۰۸) جس کے معنی اوڑھنے کے ہونگے۔ اَلْغَشَاوِیَّةُ\* (۸۸) ہر طرف سے چھا جانے والی مصیبت۔ یعنی اعمال کے ان نتائج کا ظہور جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں [جسے وَاللّٰهُ مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ\* کہا گیا ہے۔ (۲۹) یعنی خدا کا قانون مکافات کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یا اِنَّ جَہَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکَافِرِیْنَ\* (۱۰۸)۔ جہنم کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے]۔

## غ ص ب

غَضَبٌ\*۔ یَغْضِبُہُ\*۔ غَضَبًا\*۔ کسی سے کوئی چیز ظلماً و قہراً چھین لینا۔ اصل میں غَضَبٌ الْمَجِیْلُ کے معنی ہوسنے ہیں کھال پر سے بالوں کو یا اون کو نوچ نوچ کر اتارنا\*\*۔ (اسی لئے اس میں نوچنے اور کھسوٹنے کا پہلو ہوتا ہے)۔ غَضَبُ الرَّجُلِ الْمَرْأَةُ\*۔ مرد نے اس عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا\*\*\*۔

سورۃ کہف میں ہے۔ یَاْ خُذْ کُلَّ سَفِیْنَةٍ غَضَبًا (۱۰۸)۔ وہ (بادشاہ) ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام

حکومت میں ہوتا ہی یہ ہے کہ طاقتور، کمزوروں کے وسائل رزق کو زبردستی چھین لیتے ہیں۔ خدا کا نظام اس لئے آتا ہے کہ کمزوروں پر کسی قسم کا ظلم اور استبداد نہ ہوئے ہائے اور غصب و سلب (Exploitation) کا دور دورہ ختم ہو جائے۔

## غ ص ص

الْغُصَّةُ\*۔ کھانے کی چیز کا حلق میں پھنس کر رہ جانا۔ (پینے کی چیز کے اٹک جانے کو شَرَقٌ\* کہتے ہیں اور ہڈی وغیرہ کے اٹک جانے کو شَجَا۔ لیکن بیشتر یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا\*)۔ غصہ کی وجہ سے بھی گلے کے بند ہو جانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے\*\*۔ آغَصَّ فُلَانٌ\* عَلَيْنَا الْاَرْضُ\*۔ فلاں آدمی نے ہم پر زمین کو تنگ کر دیا۔ فَغَصَّتْ بِنَا۔ چنانچہ زمین ہم پر تنگ ہو گئی\*۔ الْغُصَّةُ\*۔ غم اور فکر کو بھی کہتے ہیں\*\*۔

قرآن حکیم میں جہنم کے متعلق ہے وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۱۳)۔ حلق میں اٹک جانے والا کھانا۔ اس دنیا میں بے عزتی کی روٹی جسے انسان نہ نگل سکے نہ اُگل سکے۔ ناجائز کمائی جس سے شرف انسانیت کا گلا گھٹ جائے، اور اخروی زندگی میں انسان آگے بڑھنے کے قابل نہ رہے۔ غور کیجئے! وہی رزق جو انسانی نشوونما کا موجب ہوتا ہے، جب گلے میں اٹک جائے تو انسان کی مسوت کا باعث بن جاتا ہے۔ انسانی ذات کیلئے رزق حلال اور اکل حرام میں یہی فرق ہے۔

## غ ض ب

غَضَبٌ\* کے معنی شیر ہیں۔ نیز سرخ یا ہر گہرے سرخ رنگ کی چیز\*۔ ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی شدت و قوت بتائے ہیں۔ غَضَبٌ\* رِضَا کی ضد ہے۔ بعض نے اس کی تعریف ”انتقاماً دل میں خون کا جوش مارنا“ کی ہے۔ اللہ کے غضب سے مراد نافرمانی پر اس کی گرفت اور سزا ہے\*۔ كُنَابَةٌ غَضَبَاتِ الْفَرَسِ\* عَلَيَّ السَّيِّئَاتِ کے معنی ہیں کھوڑے نے غصے میں آکر اپنی لگام چبائی۔ اسی طرح آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی غَضَبٌ\* کا اطلاق ہوتا ہے۔ آنکھ کے بالائی پپوٹے پر نکلنے والا پیدائشی دانہ غَضْبَةٌ\* کہلاتا ہے۔ نیز ایک جلدی بیماری جس میں سارا بدن سرخ



ہو جاتا ہے غَضَابٌ کہلاتی ہے ۔ مَغْضُوبٌ اسے کہتے ہیں جسے چیچک نکل آئے یا مذکورہ بالا بیماری ہو جائے ۔ غَضَابٌ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کھال موٹی اور سخت ہو ۔ غَضَا بِيٌّ اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تند مزاج اور تلخ کام ہو اور مخالفین کے ساتھ سخت ۔  
الْمَغْضُوبَةُ ۔ سخت چٹان کو کہتے ہیں اور الْمَغْضُوبُ بڑے سانپ کو (ابن فارس) ۔

قرآن کریم نے غَضَبٌ کو نِعْمَةٌ کے مقابل میں لا کر (۱۰۱) واضح کر دیا ہے کہ خدا کے غضب (یعنی اس کے قانون سے سرکشی اور انکار) کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔ یعنی نِعْمَت کے ہر پہلو کی ضد ۔ سورۃ بقرہ میں ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ کے بعد غَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۱۰۱) کہہ کر بتا دیا کہ ”اللہ کے غضب“ کا نتیجہ ذلت اور محتاجی ہوتا ہے ۔ دوسری جگہ اسے عَذَابٌ مُّهِينٌ (۱۰۱) ۔ یعنی رسوا کن عذاب ، سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ سورۃ اعراف میں قوم عاد پر ”اللہ کے غضب“ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔ وَقَطَعْنَا دَايِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (۱۰۲) یعنی ہم نے اس قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی ۔

اس سے واضح ہے کہ ”خدا کے غضب“ کا نتیجہ انفرادی اور اجتماعی تباہی اور بربادی ہے ۔ اس لئے کہ اس سے خدا کے قانونِ مکافات کی بے پناہ قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جب خدا کی طرف غَضَبٌ کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے ۔ خدا ، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے ۔ اس لئے ”خدا کے غضب“ سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی کے فطری نتائج ہیں ، جس طرح ”خدا کی خوشنودی“ کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں ۔

سورۃ اعراف میں غَضُوبَانِ آیا ہے (۱۰۵) ۔ یعنی غصہ میں بھرا ہوا ۔ ہر جوش ۔ اور سورۃ انبیاء میں مَغْضُوبًا آیا ہے (۸۷) ۔ یعنی ناراض ہو کر ۔ لیکن یہ دونوں لفظ خدا کے متعلق نہیں ۔ پہلا حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اور دوسرا حضرت یونسؑ کے متعلق ۔

## غ ض ض

الغَضُّ کے معنے ہیں کمی کرنا ، خواہ آنکھوں سے دیکھنے میں ہو ، خواہ آواز میں یا کسی برتن کی چیز میں \* - غَضَّ مِیْنَهُ یَغْضُّ - اس نے اس میں سے کم کر دیا - غَضَّ النَّغْصُنَّ - اس نے شاخ کو توڑ دیا - لیکن یہ اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ اچھی طرح سے نہ ڈوئے - لہذا اس کے بنیادی معنوں میں جھکانا اور کم کرنا ہیں - اَلْغَضِیُّضُ مِیْنِ الطَّرْفِ - وہ نگاہ جس میں ہلکیں جھکی رہیں - اَلْغَضُّ - ایسی تر و تازہ چیز جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو - اَلْغَضِیُّضُ الطَّرْفِ - آنکھوں کا بند ہو جانا \*\*\* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنا اور کم کرنا لکھے ہیں ، نیز تازگی و طراوت -

قرآن کریم میں یہ سادہ اَبْصَارٌ کے لئے (۲۴) میں آیا ہے جہاں اس کے معنے نگاہوں کو نیچا رکھنے ، یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں \*\*\* - اور صَوْتُ کے لئے (۳۱) میں - یعنی آواز کا پست رکھنا - دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے - جھکانا ، کم کرنا ، سمیٹ کر رکھنا ، بے باک نہ ہونے دینا ، نگاہوں کو بھی اور آواز کو بھی - یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں ہورتوں اور مردوں کا انداز - نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بیباک اور آوارہ ہونگی ، نہ بات بات کرتے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی -

## غ ط ش

غَطَّشَ - بَغْطِيشٌ - تاریک ہوا - اَغْطَشَ بَغْطِيشٌ - تاریک کیا - لَیْلٌ غَطَّاشٌ - اندھیری رات - فَلَآةٌ غَطَّاشَاءٌ - ایسا صحرا جس میں راستہ نہ ملتا ہو - اَلْغَطَّشُ فِی الْعَیْنِ - آنکھ کا چندھیا پن - ایسے چندھ آدمی کو اَغْطَشَ کہتے ہیں \*\*\*\* -

قرآن کریم میں ہے اَغْطَشَ لَیْلُهَا (۶۸) - اس کی رات کو اس نے تاریک کر دیا -

## غ ط و (ی)

اَلْغِیْطَاءُ - وہ چیز جس کے ذریعے دوسری چیز کو ڈھانپ دیا جائے - ڈھکنا - راغب نے کہا ہے کہ غِیْطَاءٌ - طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کو

کہتے ہیں جو بطور ڈھکنے کے کام میں لائی جائے اور غیطاء\*، لباس کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈال دیا جائے۔ مصباح میں ہے کہ غیطاء\* پردے کو کہتے ہیں۔ اَلْغِطَاءُ۔ وہ اندرونی لباس (مثلاً بنیان وغیرہ) جس سے عورتیں اپنے جسم کو ڈھانپ کر ان کے اوپر دوسرے کپڑے پہنتی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ جو چیز بلند ہو اور کسی دوسری چیز سے لمبائی میں اوپر آجائے تو اس کے لئے غَطًا عَلَیْہِ کہتے ہیں۔ اسی سے غَطَّتِ الشَّجَرَةَ کے معنی ہیں درخت کی شاخیں لمبی ہو گئیں اور زمین پر پھیل گئیں۔ غَطَّى الْقَبِيلُ۔ رات تاریک ہو گئی\*۔ قرآن کریم میں لفظ غیطاء، پردے (جہالت) کے لئے آیا ہے۔ کَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِیْ غِطَاءٍ عَن ذُرِّیَّتِہِ (۱۸/۱)۔ ان کی آنکھیں میرے قوانین کی طرف سے پردے (تاریکی) میں تھیں۔ یعنی اس کی طرف سے ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ عَلٰی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَةٌ (۲/۲)۔ ”ان کی آنکھوں پر پردہ ہے“

## غ ف ر

غَفَّرَ\*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینا ہے جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے\*\*۔ لہذا اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ غَفَّرَ\*۔ چھپانا، پردہ ڈالنا۔ غَفَّرَ الْمَتَاعَ فِی الْوَرَعَاءِ۔ سامان کو کسی برتن میں ڈال کر چھپا دینا\*\*\* (اور اس طرح اس کی حفاظت کر دینا)۔ الْمِغْفَرُ وَالْغِفَارَةُ۔ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی جو خود کے نیچے پھنی جاتی ہے اور جو گردن اور مونڈھوں کو ڈھانپ لیتی ہے تاکہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہے۔ اَلْغِفَارَةُ۔ ایک بٹی سی ہوتی ہے جسے عورتیں اسلئے سر پر باندھ لیتی ہیں کہ ان کی اوڑھنی تیل سے محفوظ رہے۔ اس کے اوپر اَلْغِیمَارُ (چادر) اوڑھتی ہیں۔ اَلْجَمْعَاءُ الْغِیْفِیْرُ۔ وہ خنود جو سارے سر کو اپنے اندر لے لے اور اس طرح اس کی حفاظت کر دے\*\*\*۔ اَلْغَفَرُ۔ وَالْغَفْرَانُ۔ ایک ہی معنی میں آتے ہیں (ابن فارس)

اس سے مَغْفِرَةٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی حفاظت۔ جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب

ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہو جائے، اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانون خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دُہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک تو اسکی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے اور دوسرے اسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان نتائج کے استحکام کے لئے بھی حفاظتی پہلو کا ساتھ ساتھ رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے مرض کے علاج کے لئے پہلے حفاظتی تدابیر (Preventives) اور اس کے بعد اصلاحی تدابیر (Curatives) اختیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تندرست انسان کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحت کو خراب کرنے والے مضر عناصر سے محفوظ رہے اور اسے ایسی غذا ملتی رہے جس سے اسکی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ لہذا۔

(۱) اگر غلط روش پر چلنے والی قوم کسی مقام پر پہنچ کر اپنے اصلاح حال کی فکر کر کے قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے (جسے تَوْبَةُ کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان ت۔ و۔ ب) تو اس سے اس کے اندر ایسی توانائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جس سے وہ اپنی سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ اسکی مَغْفِرَةٌ ہے۔ اور

(۲) قانون خداوندی کے مطابق چلنے والی قوم ان تخریبی قوتوں کی مذموم کوششوں سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی و بربادی کی تدابیر کرتی رہتی ہیں۔ یہ ان کی مَغْفِرَةٌ ہے۔ اور

(۳) قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی ذات کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے رہنا جس سے انسان تخریبی عناصر کے مضر اثرات سے محفوظ رہے، اور اجتماعی طور پر ملت اور اس کے نظام کے استحکام کے لئے سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہنا، اِسْتِغْفَارُ (مَغْفِرَاتِ طَلَبِ کرنا) ہے۔ چنانچہ صاحب محیط نے لکھا ہے کہہ اَلَا سْتِغْفَارُ کے معنی ہیں قبول اور عمل سے کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی خواہش کرنا۔ حفاظت چاہنا۔ اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں سے تجاوز کر کے اس سے اسکو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو\*۔ اور (تاج العروس میں ہے کہہ) غَفَرَ اَلَا مَرَّ بِغَفْرَتِهِ کے معنی ہیں اس نے اس معاملہ کو اسطرح درست کر دیا جسطرح اسے درست کرنا چاہئے تھا\*\*۔

ہمارے ہاں مَغْفِرَۃ کے معنی لئے جاتے ہیں ”خدا کا بندے کے گناہوں کو بخش دینا“ (اللہ مغفرت کرے۔) ”یسا“ خدا بخشنے۔“ ہم روز بولتے ہیں۔) ”بخشش“ کا تصور قرآن کریم کے بیش کردہ قانوں مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ قانوں مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غلط عمل مضر نتائج پیدا کرتے ہیں اور صحیح عمل خوشگوار نتائج۔ غلط اعمال کے مضر نتائج کا ”بخش دینا“ بے معنی سی بات ہے۔ ”بخشش“ کا یہ تصور ملوکیت کی فضا کا پیدا کردہ ہے جس میں بادشاہ خوش ہو کر مجرموں کے گناہ بخش دیا کرتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے ”جنت“ انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ کسی سے ”بخشش“ کے طور پر نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہہ حسنِ عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ہے مَغْفِرَت کا قرآنی مفہوم۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس پر ہر بیماری فوراً حملہ کر دیتی ہے۔ اس میں قوتِ مدافعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جراثیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ان جراثیم کا مقابلہ کر سکے۔ اس قسم کی طاقت کا اپنے اندر پیدا کر لینا اِسْتِغْفَار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز تسبیح کے دانوں پر اَسْتَغْفِرُ اللہ - اَسْتَغْفِرُ اللہ کے الفاظ دہرانے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے جس سے انسانی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہو جائے۔ خدا غَفُوْر ہے۔ یعنی اس کے قانوں پر عمل پیرا ہونے سے اس قسم کی قوتِ مدافعت اور سامانِ حفاظت مل جاتا ہے۔ اور مومنین کا شیوہ اِسْتِغْفَار ہے۔ یعنی اس قسم کی قوت اور حفاظت کا طلب کرتے رہنا۔ اس کے لئے جدوجہد کرتے رہنا۔ لہذا قرآن کریم میں مَغْفِرَۃ (۲۲۱) اور غَفُوْرَان (۲۸۵) کے معنی ہونگے حفاظت اور پناہ۔ غَافِر (۱۵۱) غَفُوْر (۱۵۲) اور غَفَّار (۸۴) کے معنی ہونگے حفاظت دینے والا۔ محفوظ رکھنے والا، اس فرق کے ساتھ کہ غَافِر اسم فاعل ہے اور غَفُوْر و غَفَّار اسم مبالغہ۔ اِسْتِغْفَار (۱۶۰) کے معنی ہونگے حفاظت طلب کرنا۔

جیسا کہ (ع۔ ف۔ و) کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، غَفُوْر کے معنی ہیں سزا کے بعد اس کے اثرات کو مٹا دینا۔ لیکن مَغْفِرَۃ کے معنی ہیں شروع عسی سے ان اثرات سے محفوظ رکھنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَغْفِرَۃ - عَذَاب کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵۱، ۱۵۲)۔ سورہ بقرہ میں مَغْفِرَۃ بمقابلہ فَمَر آیا ہے (۲۶۸)۔ یعنی احتیاج و افلاس سے محفوظ رکھنا

## غ ف ل

غَفَلْتَهُ تَغْفِيْلًا - اس کو ڈھانپ دیا - چھپا دیا - اس پر پردہ ڈال دیا \* - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - اَغْفَلْتَهُ - اس کو غافل کیا - قرآن کریم میں ہے لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (۲۲) - تم اس سے ”غافل“ تھے سو ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا - غَفْلَةٌ - کسی چیز کو چھوڑ دینا اور اس کو بھول جانا - راغب نے کہا ہے کہ غفلت اس مہو کو کہتے ہیں جو قلت - احتیاط و تحفظ کی بناء پر ہوتا ہے \* - دراصل اس کا مطلب کسی چیز کے متعلق (یا کسی کی طرف سے) لاپرواہ (Un-mindful) ہو جانا ہے - چنانچہ اَلْغَفُوْلُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو بچہ چاہے اس کا دودھ پی جائے اور جو آدمی چاہے اس کا دودھ دوہ کر لے جائے اور وہ اس کا کچھ خیال نہ کرے \* - اَلْغَفْلُ وہ شخص جس سے نہ بھلائی کی امید ہو نہ شر کا اندیشہ - وہ تیز جس پر کوئی نشان نہ ہو (جوئے میں ایسے تیر کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا - یعنی نہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا تھا نہ نقصان) - وہ راستہ جس پر نشان راہ نہ ہوں - وہ زمین جس پر کوئی آبادی نہ ہو - وہ مویشی جس پر شناخت کا نشان نہ ہو - وہ شخص جس کا حسب نہ ہو - وہ شعر جس کا کہنے والا معلوم نہ ہو \* - ان معانی سے اس لفظ کا اصل مفہوم سامنے آجاتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی بھول کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے ہیں ، اور کبھی کبھی یہ عمداً چھوڑ دینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے -

لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ بے خبری اور ناواقفیت کے لئے بھی آیا ہے جس میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں - مثلاً سورہ یوسف میں ہے کہ ہم تجھے وحی کے ذریعے داستان یوسف بتاتے ہیں وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَافِلِيْنَ (۱۴) - اگرچہ تو اس سے پہلے اس سے باخبر نہ تھا - اسی طرح قرآن کریم میں اکثر مقامات پر ہے - وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲) - اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں - سورہ نور میں اَلْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ (۲۳) ان باعصمت خواتین کے متعلق آیا ہے جو بدکرداری کی باتوں سے واقف تک نہ ہوں - غَافِلٌ - غَفْلٌ سے اسم فاعل ہے -

سورۃ انبیاء میں کفار کے متعلق ہے کہ وہ کہیں گے - قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۲۱) - ہم اس سے لاپرواہ رہے - یعنی جس بات کو

ہمیں ہر وقت دعیان میں رکھنا چاہئے تھا اسے ہم نے دھیان میں نہ رکھا۔  
لغت میں غَمَلَّة کے معنی یہ بھی ہیں۔

## غ ل ب

غَلَبَہ کے اصل معنی ہونے ہیں کسی کی گردن کے موئے حصے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لینا \* چنانچہ غَلَبَہ - یَغْلِبُہ کے معنی ہیں وہ موٹی، چھوٹی، اور ایک طرف کو جھکی ہوئی گردن والا ہوؤا۔ نَسَاقَہ غَلَبَاءُ - موٹی گردن والی اونٹنی کو کہتے ہیں \*\*۔ اس سے غَلَبَہ کے معنی قہرو بالا دستی، کسی پر مستولی اور قابض ہو جانے یا کسی کو شکست دیدینے کے آئے ہیں۔ یہ غَلَبَہ کا مصدر ہے۔ سورہ کہف میں ہے۔  
الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ (۱۸)۔ وہ لوگ جنہوں نے انکے معاملہ پر غلبہ پا لیا۔ سورہ روم میں ہے مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ (۳۰)۔ انہی مغلوب ہو جانے کے بعد۔ مَغْلُوبٌ (۵۰)۔ جس پر دوسرا غالب آجائے۔

الْغَلَبَاءُ (اسکی جمع غَلَبٌ ہے) گھنما باغیچہ \*\*۔ وَحَدَّائِقِ غَلَبًا (۸۰) گھنے باغات۔

## غ ل ظ

الْغِلَظَةُ (غین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ اگرچہ کسرہ زیادہ مشہور ہے) موٹاپا۔ سختی۔ شدت۔ اَغْلَظَ الشُّوْبُ - اس نے کپڑے کو موٹا پایا\*۔ غَلِيظٌ کے معنی سخت، موٹے کے علاوہ گاڑھا بھی ہیں۔ یعنی ایسی چیز جس کے منتشر اجزاء سمٹ کر کم جگہ میں جمع ہو جائیں اور اس طرح ان کی قوت بڑھ جائے۔ اَلْغِلَظُ - سخت اور ناہموار زمین کو کہتے ہیں (یعنی جو پتھریلی تو نہ ہو لیکن اس کے باوجود سخت ہو)۔ یہاں سے اس کے معنی سختی اور درشتی کے ہو گئے\*۔ فَرَّانٌ كَرِيمٌ میں ہے کہ جماعت مومنین کو ایسا طاقتور ہونا چاہئے کہ مخالفین ان میں سختی محسوس کریں۔ وَلَيَجِدُوا فِيكُمْ غِلَظَةً (۱۳۳)۔ لیکن ان کے مزاج میں سختی اور بد خلقی نہیں ہونی چاہئے۔ انہیں غَلِيظٌ الثَّقَلَبِ نہیں ہونا چاہئے (۱۵۸)۔ مخالفین کے مقابلہ میں بہت مضبوط، محکم اور سخت ہونا چاہئے اور ان کی شدت سے روک تھام کرنی چاہئے۔ وَاعْلَظْ عَلَيْهِمْ (۳۰)۔ اسی طرح جیسے خدا کے قوانین مکافات اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں غِلَظٌ شِدَادٌ واقع ہوئے ہیں (۶۱)۔

اِسْتَعْلَظَ۔ کسی چیز کا موٹا اور سخت اور مضبوط ہو جانا (جو بالعموم کسی چیز کے کمال پر پہنچنے سے ہوتا ہے) دراصل یہ فعل گیہوں وغیرہ کے خوشوں میں دانوں کے سونے ہو کر سخت ہو جانے پر بولا جاتا ہے \*۔  
 قرآن کریم میں اسلام کے شجر طیب کے متعلق ہے۔ فَاسْتَعْلَظَ (۲۹)۔  
 وہ مضبوط، سخت اور موٹا ہو گیا۔

## غ ل ف

اَلْغِلَافُ \*۔ محافظ۔ وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر چھائی ہوئی ہو۔  
 مثلاً انڈے کا چھلکا۔ کلی کے اوپر کا سبز خول۔ (جمع) غُلُفٌ \* و غُلُفٌ \*۔  
 سَيْفٌ \* اَغْلَفٌ \*۔ تلوار جو غلاف میں ہو۔ اَلْغُلُفُ \*۔ کثرت سے سرسبزی \*۔  
 قرآن کریم نے یہودیوں کا قول نقل کیا ہے۔ قَاتِلُوا قَتْلُوْهُنَا  
 غُلُفٌ (۸۸)۔ یہ اَغْلَفٌ کی جمع ہے۔ یعنی غلافوں میں بند ہیں۔ راغب  
 نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں  
 میں ہیں اس لئے ہم پر قرآن کریم کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔  
 اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل خود علوم  
 و معارف کے بھرے ہوئے برتن (اور مخزن) ہیں اس لئے ہمیں کسی نئے علم  
 کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے علوم سے بے نیاز ہیں \*\*۔ مطلب دونوں کا ایک  
 ہی ہے کہ ہم اس نئی دعوت کو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے۔ ہمیں  
 اسکی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ کسی دھوت یا نظریہ کے  
 رد و قبول کا فیصلہ فکر و بصیرت اور غور و تدبر کے بعد کیا جائے اس کے  
 متعلق بلا دیکھے بھالے کہہ دینا کہ ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ  
 ایسا طرز عمل علم و بصیرت کی بارگاہ میں کبھی قابل ستائش قرار نہیں پاسکتا۔  
 اور قرآن کریم ہے ہی سرتاپا علم و بصیرت۔

## غ ل ق

اَغْلَقَ الْبَابَ یُغْلِقُہُ۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ بَابٌ غُلُقٌ \*۔ بند  
 دروازہ \*\*\*۔ سورہ یوسف میں عزیز کی بیوی کے متعلق ہے۔ وَغُلِقَتِ الْاَبْوَابُ  
 (۲۳)۔ راغب نے کہا ہے کہ غُلُقٌ اسوقت بولا جائیگا جب بہت سے دروازوں  
 کو بند کیا گیا ہو۔ یا ایک ہی دروازہ کو بار بار بند کیا ہو۔ یا دروازہ  
 کو بڑی مضبوطی سے بند کر دیا ہو \*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے  
 بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں پھنس جانا یا اٹک جانا ہیں۔



## غ ل ل

غُلَّالٌ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا درمیان خلائوں میں چلے جانا۔ چنانچہ غُلَّالٌ اس ہانی کو کہتے ہیں جو درختوں کے درمیان سے بہ رہا ہو۔ اَلْغُلَّالُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس طرح قیدی کے اعضاء اس کے پیچ میں آجائے ہیں۔ اس کی جمع اَغْلَالٌ آتی ہے \*۔ (۱۵۷)۔ غُلٌّ۔ اسے غُلَّالٌ کے ذریعہ قید کر دیا \*۔ مَغْلُوثٌ۔ بندھا ہوا، مقید (۱۵۸)۔ اَلْغِيلُ۔ دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں \*\*۔ (۱۵۹)۔ نیز دھوکا اور فریب (جو چھپا کر کیا جاتا ہے)۔ یعنی اس میں چھپانے کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں لَا يَدْرِي هَبْ كَلَامًا مِّنَّا غُلَّالًا۔ ہماری بات لوگوں سے مخفی نہیں رہنی چاہئے \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا درمیان سے گزرنا اور کسی چیز کا جم جانا ہیں۔ غُلٌّ۔ بَغِيلٌ کے معنی ہیں کینہ رکھنا اور غُلٌّ۔ بَغِيلٌ کے معنی ہیں خیانت کرنا \*۔

سورہ آل عمران میں ہے وَمَا كُنْ لِنَبِيِّكَ أَنْ يَغْلُكَ (۱۶۳)۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کہئے جاتے ہیں کہ کسی نبی کے شاہان شان نہیں کہ وہ (مال غنیمت میں) خیانت کرے۔ لیکن صاحب المنار نے بعض مفسرین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس سے مراد غنیمت میں خیانت کرنا نہیں بلکہ وحی میں سے کچھ مخفی رکھنا ہیں۔ یہاں مفسرین نے غُلَّوْلٌ کے معنی کِتْمَانٌ (چھپانے) کے کہئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام تبلیغ رسالت ہے۔ جو وحی اس کی طرف بھیجی جاتی ہے وہ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ اب اگر اس میں کوئی بات ایسی ہے جو کسی کے معتقدات یا مفاد کے خلاف جاتی ہے تو اس میں رسول کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یہ کر ہی نہیں سکتا کہ وحی کا کچھ حصہ چھپا کر رکھ لے اور کچھ حصہ ظاہر کر دے۔ وہ وحی کو بہ تمام و کمال ظاہر کر دیگا۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا (۱۶۵)

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الشَّيْءِ كَأَنَّهُمْ عَلَيْهِمْ (۱۶۷)۔ وہ ان بوجھوں کو اتار دیگا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ہوئی چلی آرہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ یعنی وہ نوع انسان کو، جسم اور قلب و دماغ

کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر کے انہیں فقط قوانین خداوندی کی اطاعت پر لے آئیگا اور اس طرح انہیں صحیح آزادی عطا کر دیگا۔ کسقدر بلند تھا مقصد بعثتِ نبویؐ کا اور کسقدر کامیاب اور حسین تھا وہ طریق جس سے حضورؐ نے اس بلند مقصد کو پورا کیا۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہوں نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو (جنہیں قرآنی نظام نے اس حسن و خوبی سے توڑ کر رکھ دیا تھا) مڑگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور ان اغلال و سلاسل کو انتہائی تعظیم کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اُس ابتداء کی یہ انتہاء کسقدر عبرت ناک اور تاسف انگیز ہے!

## غل م

الْغُلَامَةُ - جنسی خواہش کی شدت کو کہتے ہیں۔ قَدْ غُلِمَ الرَّجُلُ - اسوقت کہتے ہیں جب آدمی جنسی خواہش سے مغلوب ہو جائے۔ اَغْلَمَ الْبَحْرُ کے معنی ہیں دریا ہرجوش ہو گیا اور موجیں مارنے لگا۔ اِغْتَلَمَ الشَّرَابُ - شراب تند و تیز ہو گئی۔ اس اعتبار سے اَلْغُلَامُ اس لڑکے کو کہتے ہیں جسکی مسیں بھیگ چکی ہوں۔ لیکن صاحب تاج العروس کے نزدیک پیدائش سے لیکر جوان ہونے تک بچے کو غُلَامٌ ہی کہتے ہیں۔ نیز کبھی (بڑے بوڑھے اپنے بیٹوں کو خواہ وہ ادھیڑ عمر کے ہی کیوں نہ ہوں غُلَامٌ کہہ دیتے ہیں۔ صاحب فقہ اللغة نے بھی کہا ہے کہ اگرچہ جنین سے لیکر بالغ ہونے تک بچے کے لئے مختلف الفاظ آتے ہیں لیکن یہ ہیئت مجموعی اسے غُلَامٌ ہی کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ محض بیٹے کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ مثلاً (۳۶)۔ اور نوجوان کے معنوں میں بھی (۱۸۰)۔ غِلْمَانٌ کا لفظ خدمت گار لڑکوں کے لئے آیا ہے۔ (۵۲)۔ یعنی وَلَدَانِ مُخَلَّاتٍ وَنَ (۵۶)۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے مراد اہل جنت کے بیٹے ہی ہوں۔ کیونکہ جنت میں آباء و ازواج و ذرّیات بھی تو ساتھ ہونگے بشرطیکہ وہ بھی صالح ہوں (۲۳)۔ (جنت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ن۔)

## غل و (ی)

غُلُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھ جانے اور تجاوز کرنے کے ہیں۔ اگر یہ حد سے تجاوز اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غِلَاءٌ کہتے ہیں۔ اور

قدر و منزلت میں ہو تو غُلُوْا۔ اور تیر میں ہو (یعنی وہ اپنی مقررہ حد سے آگے نکل جائے) تو غُلُوْا۔ اَلْمِغْلٰیٰ - اس تیر کو کہتے ہیں جسے کمان کے ذریعہ ہاتھ کو خوب تان کر انتہائی حد سے آگے جانے کے لئے پھینکا جائے۔ \* اَلْغُلُوَّةُ - اُس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک تیر پھینکا جا سکے۔ \* اَلْغَلِيَانُ - ہانڈی کے ابال اور جوش کھانے کو کہتے ہیں \*\*\*۔ سورہ دخان میں ہے يَغْلِيْ فِي السُّبُطُوْنِ كَغَلِيِّ الْحَمِيْمِ (۳۶۔۳۵) ”وہ پیٹ میں کھولیکا ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند“ (واضح رہے کہ یہ یائی ہے۔ واوی نہیں۔ بعض علمائے لغت کی طرح ہم نے بھی اسے واوی کے تحت ہی لکھ دیا ہے۔)

اِغْتَسَلِ الْبَغِيْرِ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا اور اونچا ہو کر چلا حتیٰ کہ وہ رفتار کے حسن کی حد سے گزر گیا \*۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا کہ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۱۰۱)۔ تو اس کا کیا مطلب ہے؟ دین سکھاتا یہ ہے کہ انسان اپنی مختلف قوتوں میں کس طرح صحیح توازن و تناسب پیدا کرے اور اس طرح اپنے معاشرہ کو بھی متوازن و متناسب رکھے۔ اسی کو حُسْنُ کہتے ہیں۔ کیونکہ حسن نام ہی صحیح تناسب کا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ س۔ ن)۔ توازن، افراط اور تفریط دونوں سے بگڑ جاتا ہے۔ لہذا دین میں غلو سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَذَرُوْا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَائِهِ (۱۸۰)۔ جو لوگ خدا کی صفات میں کسی ایک طرف کو جھک جاتے (یا نکل جاتے) ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خُدا لَا سَمَاءَ الْحُسْنٰی کا مالک ہے۔ اس کی تمام صفات میں انتہائی درجہ کا توازن اور حسن ہے۔ اس لئے ان میں نہ افراط جائز ہے نہ تفریط۔ غُلُوْا خواہ عقائد میں ہو خواہ عمل میں، حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔ دوسری جگہ آیات خداوندی میں العاد (ایک طرف نکل جانے) سے روکا گیا ہے (۱۰۲)۔ ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا، ہر بات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا، اور ہر عمل میں حسن پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا، یہ ہے اعتدال کی راہ۔ یہ چیز صرف وحی کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

## غ ۲۲

اَلْغَمْرَةُ - اس کے بنیادی معنی اس چیز کے ہوتے ہیں جو کسی چیز پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے۔ \* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس چھپانے

میں قدرے سختی اور شدت کا پہلو ہونا ضروری ہے۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب سفر میں پانی کم رہ جاتا اور اسے رفقاء سفر میں ماپ ماپ کر تقسیم کرنا پڑتا تو ایک پیالے میں چھوٹا سا پتھر رکھ دیتے اور اس میں پانی ڈالتے۔ جتنے پانی سے پتھر ڈوب جاتا اسے ایک حصہ قرار دیتے۔ اس پانی کو غَمْرَةٌ کہتے تھے۔ اور اُس پیالہ کو اَلْغَمْرُ۔ اس سے کثیر پانی کو بھی غَمْرُ کہتے لگے، اس لئے کہ وہ اپنے اندر جانے والے کو چھپا لیتا ہے اور اس پر چھا جاتا ہے۔ اسی سے مَوْتُ اَلْغَمْرِ۔ ڈوب کر مرنے کو کہتے ہیں۔ غَمَرَاتٌ۔ شدائد اور سختیاں۔ ناگواریاں۔ غَمْرَةُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کی شدت اور اس کا هجوم۔ قرآن کریم میں غَمَرَاتُ اَلْمَوْتِ آیا ہے (۱/۶)۔ سورہ مومنوں میں ہے۔ فَذَرُوهُمْ فِي غَمَرَاتِ تَيْمِيمٍ حَتَّىٰ حَيُّوا (۲۳/۵۳)۔ جن چیزوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے ہیں (جن مفاد ہرمتیوں میں یہ منہمک ہیں) انہیں مردست انہی میں چھوڑ دو۔ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ راعب نے کہا ہے کہ یہاں غَمْرَةٌ کے معنی جہالت کے ہیں جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔

## غ م ز

غَمْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا آنکھ سے اشارہ کرنا۔ اور غَمَزَ الْكَتَبُش کے معنی ہوتے ہیں اس نے مینڈھے کو ہاتھ سے دبا کر دیکھا کہ اس میں چربی ہے یا نہیں۔ صاحب محیط نے غَمَزَ کے معنی چبھونے، دبائے اور بھینچنے کے لکھے ہیں۔ اَلتَّغَامِزُ کے معنی ہیں باہم کسی کے کمزور پہلوؤں کی طرف آنکھوں یا ہاتھوں سے اشارہ کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں دوسری چیز سے ٹھوکے مارنا۔ اس کے بعد استعارۃً کسی کی عیب جوئی کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرَّوْا بِهِيْمٍ يَتَغَامَزُوْنَ (۸۳/۸۳)۔ جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ چشمکیں کرتے۔

## غ م ض

اَلتَّغَامِضُ۔ بہت نشیبی زمین۔ اَلْغَمَظُ النَّظَرُ۔ اس نے ہاریک بینی اور تعمق نظر سے کام لیا، گہری نظر ڈالی۔ جب کوئی شخص عمدہ اور

ٹھیک رائے دے تو اس کے لئے کہتے ہیں قَدْ أَغْمَضَ النَّظَرَ - ابن فارس نے اس کے معنی نشیب اور اندر کو گھس جانا بتائے ہیں - اَلْغَمَضُ - نیند کا جھونکا - بقول ابن فارس ، اتنی مقدار جس میں آنکھیں بند کر لی جائیں - غَمَضَ عَيْنَهُ وَأَغْمَضَ مَضْمَنًا : اس نے اپنی آنکھ بند کی - اسی بناء پر اِغْمَاضُ کے معنی ڈھیل دینا ، نرمی برتنا ، تغافل و تساهل اور چشم پوشی کے ہو گئے - اور اَلنَّغْمَةُ يَضُّ عَنْ الْإِسَاءَةِ - کسی کے برا کرنے پر چشم پوشی کر لینا - اِغْمَاضُ فِي التَّبَيُّعِ یعنی خرید و فروخت میں کسی عیب دار یا ردی چیز کو خریدتے وقت یہ مطالبہ کرنا کہ اسکی قیمت کم کر دی جائے کیونکہ اس میں فلاں نقص ہے \* - (۲۶۷) میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے - یعنی اتفاق فی سبیل اللہ میں ایسی ردی چیزیں نہ دو کہ جنہیں تم خود بھی لینا پسند نہ کرو اور اگر کہیں لینی بھی ہو جائیں تو ان کے نقص کی وجہ سے ان کی قیمت گھٹا کر دو -

## غ م م

غَمَّ الشَّيْءُ غَمًّا - اسے ڈھانپ لیا - چھپا لیا - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - غَمَّ السَّيْلُ - چاند بادل کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جاسکا - اَلْغَمَامَةُ - بدلی یا سفید بدلی کو کہتے ہیں - اسکی جمع غَمَامٌ ہے - (۲۷) - اَغْمَقَتِ السَّمَاءُ - آسمان ابر آلود ہو گیا - اَلْغَمَامَةُ - اس چھینکے کو کہتے ہیں جو اونٹ وغیرہ کے منہ پر چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ کھا نہ سکے - نیز اس کپڑے کو جس سے اونٹنی کی آنکھیں باندھ دی جاتی ہیں - اس سے اَلْغَمَشِي اس مصیبت کو کہتے ہیں جس سے انسان نکل نہ سکے ، نیز وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہ نظر آئے - اور اَلْغَمَشِي - غبار اور تاریکی کو - نیز جنگ کی شدت جو قوم پر چھا جائے - لہذا اَلْغَمُّ کے معنی ہیں حزن و کرب (جو چار سو سے کسی پر چھا جائے) - سورہ آل عمران میں یہ لفظ اَمْنَةً کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳۳) - اَلْغَمَّةُ - تحیر و التباس کو کہتے ہیں ، نیز تاریکی و تنگی کو \*\* - سورہ یونس میں ہے لَا يَكُنْ أَمْرًا كُفًّا عَلَيْنَا كُفُّ غَمَّةٍ (۱۶) - تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ اور حیران کن نہ رہے -

## غ ن م

اَلْغَنَمُ - بکریاں - (اس کا واحد شاة ہے جو اس مادہ سے نہیں آتا) - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کا اطلاق بھیڑوں اور بکریوں دونوں پر

ہوتا ہے \*\*۔ (۲۸)۔ اَلْغَنِيْمُ\*۔ اَلْغَنِيْمَةُ\*۔ اَلْغَنُومُ\*۔ مال غنیمت جو جنگ میں ہاتھ آئے\*۔ چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ہی سب سے بڑی دولت تھی اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ہاتھ آتے تھے۔ اس اعتبار سے اس مال کو غَنِيْمَةُ\* کہنے لگے۔ غَنِيْمٌ\*۔ کسی چیز کو بطور مال غنیمت پا لینا۔ کسی چیز کو بغیر بدل و مشقت کے حاصل کر لینا\*۔ اَنْعَمًا غَنِيْمَتُمْ\* (۸۹) اَلْمَغْنَمُ\*۔ جمع مَغَانِمُ\*۔ مال غنیمت (۹۴)۔

(مال غنیمت کے سلسلہ میں عنوانات (ف۔ ی۔ ا) اور (ن۔ ف۔ ل) بھی دیکھئے)

## غ ن ی

اَلْغِنٰی - حاجات سے بے نیازی - تونگری - آسودگی - یہ فقر (محتاجی) کی ضد ہے ، احتیاج نہ ہو ، غَنِيٌّ کہلاتا ہے - نیز آسودہ ، خوش حال ، تونگر بھی - (۲۳) و (۲۶)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کافی ہونا ہیں - اَلْغَنَانِيَّةُ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجیہ زیبائش و آرائش سے مستغنی ہو\*۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (۲۶)۔ خدا کو بندوں کی اطاعت کی ضرورت نہیں - ان کی اطاعت خود انکی اپنی ذات کے نفع کے لئے ہے - خدا کو کائنات میں کسی چیز کی احتیاج نہیں - اَغْنٰی - مستغنی کر دینا (۲۸)۔ اَغْنٰی عَنْهُ غَنَاءٌ فُلَانٌ - اسکی جگہ لی ، قائم مقامی کی ، اسکے جیسا کام دیا - اَغْنٰی عَنْهُ كَذَا - اس کے لئے فُلَان چیز کافی ہوئی ، اس نے اسے فائدہ پہنچایا - مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَا لَهُ (۱۱۱) - اسکے مال نے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچایا - اس کے کسی کام نہ آیا - لَا يَغْنِيْ عَنْكَ شَيْْءٌ (۱۱۲) - جو تیرے کسی کام نہیں آسکتا - اِنَّ الْفَاقِنَ لَا يَغْنِيْ مِنْ الْحَقِّ شَيْْءٌ (۵۳) - یقیناً حق کے مقابلہ میں باطل کوئی کام نہیں دے سکتا - باطل ، حق سے قطعاً بے نیاز نہیں کر سکتا - سورہ عبس میں ہے لِيُكَلِّ اَمْرِيْ مِنْهُمْ يَوْمَ مَّيْذِنَ شَمَانٍ يَغْنِيْهِ (۱۲۵) - اسدن ہر شخص اپنے اپنے دھندے میں اسقدر مشغول ہوگا کہ وہ کام اس کی ساری توجہات جذب کر لینے کے لئے کافی ہوگا - یا دوسروں سے بے نیاز کر دیگا - اَلْمَغْنٰی (اسم فاعل) وہ جو کفایت کرے - کام آئے - فائدہ پہنچائے - اسکی جمع مَغْنُوْنَ ہے - سورہ ابراہیم میں ہے کہ عذاب کو دیکھ کر متبعین اپنے لیدروں سے کہہینگے فَهَلْ اَنْتُمْ مَّغْنُوْنَ عَنَّا مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِّنْ شَيْْءٍ (۱۲۱)۔ ”کیاتم خدا کے عذاب کے

مقابلہ میں ہمارے کسی کام آسکتے ہو یا کفایت کر سکتے ہو؟۔ لیکن  
 اَغْنٰی عَنْہُ کذا کے معنی اس سے کسی چیز کو ہٹا دیا، دور کر دیا بھی  
 ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”کیا تم  
 ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ بھی دور کر سکتے ہو؟“۔ (نیز ۲۰۰)۔  
 اِسْتَعْنٰی۔ بے نیاز ہو جانا (۱۰۰: ۱۰۱)۔ غَنِيٌّ بِالْمَكَانِ وَفِيْہِ۔ اس  
 نے اس جگہ طویل مدت تک اقامت کی۔ کَانَ لَّہُمْ بِغَمَتٍ اَفِيْہَا (۱۱۸: ۱۱۹)  
 (۹۶)۔ گویا وہ ان مکانات میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ اس مادہ کے بنیادی  
 معنوں کی رعایت سے اس جگہ معنی صرف طویل مدت تک اقامت کرنا ہی نہیں  
 بلکہ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنا بھی ہیں۔ اَلْغَنَاءُ۔ کفایت۔  
 پوری صلاحیت و استعداد کے ساتھ کسی کی جگہ لے لینا اور اس کا مسا کام  
 دینا۔ اَلْغَنَاءُ۔ گانا۔

## غ و ث

اَلْغَوْتُ وَالْغِيَاثُ۔ مدد۔ اِسْتَعَاثَنِیْ فُلَانٌ فَاَغَثْتُهُ۔  
 فلان نے مجھے مدد کے لئے پکارا تو میں نے اسکی مدد کی۔ اَلَاِسْتِغَاثَةُ۔ طلب  
 غوث۔ مدد طلب کرنا۔ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّکُمْ (۹)۔ جب تم اپنے  
 رب کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ سورہ کہف میں ہے وَاِنْ يَسْتَغِيْثُوْا  
 یُغَاثُوْا بِمَاءٍ کَالْمُهْلِ (۲۹)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْتُ سے بھی  
 ہو سکتا ہے (مدد مانگنا) اور غِيَاثٌ سے بھی (پانی مانگنا)۔ اسی طرح  
 یُغَاثُوْا میں بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔\*\*\*۔ [دیکھئے۔ عن۔ وان  
 غ۔ ی۔ ث]

## غ و ر

اَلْغَوْرُ۔ ہر چیز کی گہرائی۔ عمق۔ بَعْدُ۔ رَجُلٌ بَعِيْدُ الْغَوْرِ۔  
 گہرا آدمی جو بڑا علم و تجربہ رکھتا ہو۔ اَلْغَوْرُ۔ اَلْغِيَارُ۔ کسی چیز  
 کے اندر گھس جانا۔ پانی کا زمین کے اندر اتر جانا۔\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے  
 اِنْ اَصْبَحَ سَاوُکُمْ غَوْرًا (۱۰۱)۔ اگر تمہارا پانی زمین کے بہت  
 نیچے اتر جائے (اور اوپر ہی نہ آئے تو تم کیا کرلو)۔ اَلْغَارُ۔ غار۔ (۱۰۲)۔  
 اَلْمَغَارَةُ۔ غار۔ اس کی جمع مَغَارَاتٌ ہے۔ (۱۰۳)۔ ”اندر تک گھس  
 جائے“ کے اعتبار سے اَغَارَ تیز رفتار ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور فَرَسٌ  
 مِغْوَارٌ نہایت تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔ اَلْمَغَارَةُ۔ حملہ آور

سواروں کا دستہ - نیز حملہ - أَشَارَ عَلَی الْقَوْمِ - قوم پر حملہ کیا\* -  
 قرآن کریم میں ہے فَالْمَغِيرَاتِ صَبَحًا (نہ) - حملہ کرنے اور دشمن  
 کی صفوں کے اندر جا گھسنے والے گھوڑے - ابن قاری نے لکھا ہے کہ اس  
 مادہ کے بنیادی معنی (۱) گہرائی اور (۲) کسی کے سال کو جبراً اور قہراً  
 لینے کے لئے اقدام کرنا ہیں -

## غ و ص

الْغَوَّاصُ - الْغَمَّاصُ - ہانی کے نیچے اترنا - غوطہ لگانا - الْغَمَّاصُ  
 غوطہ لگانے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں - الْغَوَّاصُ - غوطہ خور\*\* - قرآن  
 کریم میں حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں ہے وَ مِنْ الشَّيْطَانِ مَنْ  
 يَتَغَوَّصُونَ لَهُ (۲۱) - وہ سرکش اقوام کے لوگ جنہیں (حضرت) سلیمانؑ  
 نے اپنا فرمانبردار بنا لیا تھا اور وہ اس کے لئے غوطہ خوری کرتے تھے - انہی  
 کو دوسری جگہ غَمَّاصُ کہا گیا ہے (۳۸) - اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں  
 کہ وہ بڑی بڑی مہموں میں درانہ گھس جاتے تھے -

جوشخص کسی گہرے اور پیچیدہ معاملہ کی تہ تک پہنچ جائے اور اسے  
 حل کر لے یا نیچے کی جگہ سے کوئی چیز نکال لے، اسے بھی غَمَّاصُ  
 کہتے ہیں\*\*\* - اصل میں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں نشیب کی طرف تیزی سے  
 جانا\*\*\* - اس سے یہ لفظ، ہر چیز کے اندر داخل ہونے کے لئے بولا جائے لگا -

## غ و ط

الْغَسَوُطُ - الْغَنَائِطُ - نشیبی، اور وسیع زمین - چونکہ اہل عرب  
 فضائے حاجت کے لئے نشیبی زمین تلاش کرتے تھے تاکہ اوٹ میں ہو کر  
 رفع حاجت کر لیں، اسی لئے بیت الخلا کو بھی غَنَائِطُ کہتے لگے - نیز ایسی  
 نشیبی زمین ہی میں وہ فضائے پھینکتے تھے اس لئے انسانی فضلہ کو بھی  
 غَنَائِطُ کہنے لگے\* - (۳۳) - میں جَاءَ أَحَدُكُمْ مِنَ الْغَنَائِطِ سے  
 مراد ہے جانے ضرور سے فارغ ہو کر آنا -

غَطَّ - يَغْطُو - داخل ہو جانا - اندر چلے جانا، دھنس جانا،  
 الْغَوَّطُ - کھودنا\*\*\*\* - يَغْرِغُ غَوَّيْطَةً - گہرا کنواں\* -  
 \*تاج - \*\*تاج و محیط - \*\*\*راغب - \*\*\*\*ابن فارس - \*\*\*\*\*محیط -



## غ و ل

غَالٍ - اس کے بنیادی معنی دھوکے سے پکڑنے یا کسی کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کرنے کے ہیں۔ اَلْغَوْلُ - میدان یا ریگستان کی وسعت یا دوری کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سے گزرنے والا اس طرح ہلاک ہو جاتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ (ابن فارس)۔ اس بناء پر اَلْغَوْلُ - ہلاکت - مصیبت و آفت کو بھی کہتے ہیں۔ غَالَتْهُ غَوْلٌ - ہلاکت نے اسے برباد کر دیا۔ غَالَ الشَّيْءُ - اس نے اس چیز کو تباہ کر دیا۔ اَلْغَوْلُ - درد سر - مستی - ہر وہ شے جس سے عقل جاتی رہے۔ اَلْغَوَائِلُ - مصائب - تباہیاں۔ غَوْلٌ - عرب بھوت، چڑیل کو کہا کرتے تھے۔ نیز سانپ کو\*۔

قرآن کریم میں ”جنت کی شراب“ کے متعلق ہے لَا فِيْهَا غَوْلٌ (۳۷/۴۰)۔ اس میں نہ مستی ہوگی نہ سرگرائی۔

## غ و ی

غَوَى غَيًّا - بھٹک جانا۔ دھوکا کھا جانا\*\*۔ بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کے اعتبار سے غَيٌّ کا لفظ رُشْد کے مقابلہ میں آیا ہے۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲۵۶) ”صحیح اور غلط راستے نکھر کر الگ الگ ہو گئے“۔ اور دھوکہ کھا جانے کے معنوں میں مَاضِلٌ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى (۵۳)۔ ”تمہارا رفیق نہ تو تلاش حقیقت میں سرگرداں ہے اور نہ ہی اس نے دھوکا کھا یا ہے“۔ نیز تباہ اور برباد ہو جانا\*\*۔ جیسے وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى (۲۱)۔ راغب اور لسان العرب میں اس کے معنی فَسَدَ عَيْشُهُ لکھے ہیں\*\*\*۔ یعنی معیشت کا تنگ ہو جانا۔ زندگی خراب ہو جانا۔ روزی کا درہم برہم ہو جانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) صحیح سمت کی طرف راہ نمائی نہ ہونا۔ کسی معاملہ کا تاریک ہونا۔ اور (۲) کسی چیز میں فساد ہونا۔ سورۃ مریم میں جوہ فَسَوَفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۵۶)۔ تو اس میں راغب کے نزدیک غَيًّا کے معنی عذاب یا تباہی کے ہیں\*\*۔ یعنی اتباع شہوات اور ارضاعت

\* تاج و محیط و راغب - \*\* تاج و راغب - \*\*\* بحوالہ غریب القرآن۔ مرزا ابوالفضل - لیکن تاج میں فَسَدَ عَيْشُهُ کی بجائے فَسَدَ جَوْفُهُ ہے یعنی اسکا پیٹ خراب ہو گیا۔

صلوة کا خمیازہ - غَوْرِيَّ - غلط رو\* - ( ۲۸/۱ ) - تباہ و برباد ہو جانے والا -  
 غَاوٍ (جمع غَاوُونَ) بھٹک جانے والے\* - ( ۲۱/۱ ) - آغَاوَى - گمراہ کرنا  
 ( ۲۸/۱ ) - لیکن ( ۱۱/۱ ) میں جو ہے بِسْرِيْنْدُ أَنْ يُغْتَوِيَكُمْ\* - تو صاحب  
 تاج العروس اور راغب دونوں کے نزدیک اس کے معنی اعمال کے نتیجہ میں  
 تباہ و برباد کر دینے کے ہیں\* - اَلْغَاوَى - بد ہضمی - پیاس\* - اَلْغَاوِيَّ -  
 ٹڈی دل\* -

سورة شعراء میں ہے وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ( ۲۲/۱ )۔ اس  
 کے عام معنی تو یہی ہیں کہ شاعروں کے پیچھے لگنے والے فریب خوردہ  
 ہیں - اس لئے کہ (جیسا کہ عنوان ش - ع - ر میں بتایا جا چکا ہے) شاعری اس  
 ذہنیت کا نام ہے جس میں حقائق کی بجائے صرف جذبات سے کام لیا جاتا ہے  
 اور زندگی کا کوئی غیر متبدل نصب العین سامنے نہیں رکھا جاتا - اس لئے  
 ایسے لوگوں کے پیچھے لگنے والے (جو ان جذبات پرستیوں کو حقائق سمجھ  
 لیتے ہیں) فریب خوردہ ہوتے ہیں - لیکن پیاس کی جہت سے اس کے معنی یہ  
 بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی ، کیونکہ پیاس کی  
 تسکین صرف مثبت حقائق سے ہو سکتی ہے - مشتمل جذبات سے نہیں - اسی  
 لئے خود شاعروں کو بھی یہی غَاوُونَ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے ( ۲۲/۱ ) -  
 یعنی پیاسے اونٹ کی طرح سخت پریشانی میں مبتلا اور سارے سارے پھرنے  
 والے (دیکھئے عنوان ہ - ی - م) - یا اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاعروں  
 کو بھی اپنے مدح سراؤں سے دھوکا لگ جاتا ہے - وہ سمجھتے ہیں کہ یہ  
 فی الواقعہ ہمارے متبعین ہیں حالانکہ وہ محض ٹڈی دل کی طرح ہوتے ہیں -  
 دیکھنے میں لا کھوں ، لیکن بالکل بغیر کسی نصب العین کے - ان سب  
 کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے - ”بد ہضمی“ کے اعتبار سے دیکھا  
 جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ شعراء کا اتباع کرنے والوں کی حالت یہ  
 ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا جزو نہیں بنتا  
 بلکہ یونہی بلا نتیجہ ضائع ہو جاتا ہے - چند الفاظ جو ذہن کو وقتی لذت دیکر  
 موجب تباہی بن جاتے ہیں -

اَلْغَيَايَةِ - غبار آلودگی اور تاریکی جو چھا جائے - اَلْغَيَايَةِ جھنڈے  
 کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر سایہ کرتا ہے - پھر کسی چیز کی انتہا  
 کو بھی غَايَةِ کہتے لگ گئے کیونکہ جھنڈا فوج کا آخری سپہارا اور ان

کی ہستی کا آخری نشان ہوتا ہے۔ (ابن فارس)۔ [واضح رہے کہ غایۃ غ - ی - ی سے ہے لیکن اسے اسی باب میں لکھ دیا گیا ہے]۔ غَسَوَى الْفَصِيلُ "وَغَسَوَى غَوَايَۃً" وَ غَسَوَى کے معنی ہیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بد ہضمی ہو گئی اور اس کا پیٹ بگڑ گیا \*۔ اس سے بھی غَوَايَۃً کی تباہی کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کا شکار مُتَرَفِعِينَ ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس غَسَوَى الْجَدَى کے معنی ہیں بکری کے بچے کو دودھ سے روک دیا گیا حتیٰ کہ وہ لاغر اور مرنے کے قریب ہو گیا \*۔ اس سے بھی مکافاتِ عمل کی وجہ سے تباہی اور دیربادی کا تصور سامنے آجاتا ہے (نیز دیکھئے عنوان ع - ذ - ب)۔

قرآن کریم میں اس مادہ کے الفاظ جس جس مقام پر آئے ہیں، ان میں ایک چیز بقدر مشترک ملیگی۔ یعنی اس میں، قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے، انسان اپنے مفاد، خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور حق کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف جھک جاتا ہے۔ صحیح راستے سے ہٹک جاتا ہے۔ دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس میں یہ تمام باتیں آجاتی ہیں۔

## غ ی ب

ہر وہ چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہو، غَیْبٌ کہلاتی ہے۔ اگر وہ چیز تصور میں موجود ہے لیکن نگاہوں سے پوشیدہ ہے تو پھر بھی غَیْبٌ ہی کہلائیگی۔ غَیْبٌ نشیبی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ غَابَۃً۔ ایسی نشیبی زمین جس سے پہلے اونچی زمین آجائے اور اس لئے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ غَابَۃً۔ گھنے جنگل کو بھی کہتے ہیں جس میں درختوں کی وجہ سے زمین نظر نہیں آتی۔ گڑھے اور کنوئیں کی ترائی اور گہرائی، نیز ہر چیز جو کسی کو چھپا لے، اسی لئے غَیْبَۃً کہلاتی ہے (۱۲)۔ غَیْبَاتُ الشَّجَرِ۔ درختوں کی ان جڑوں کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر پھیلی ہوئی ہوں اور نظر نہ آئیں \*\*۔

قرآن کریم نے غَیْبٌ کے مقابلہ میں شَہَادَۃً کا لفظ لا کر (۵۹) اس کے معنی واضح کر دئے ہیں۔ یعنی غَائِبٌ وہ ہے جو مشاہدہ میں نہ آیا ہو۔ جو مشہود نہ ہو۔

فَرَسٌ شَائِبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑ میں اپنی کچھ قوت چھپا کر (Reserve) رکھ لے۔ اور فَرَسٌ شَہِیدٌ وہ جو ساری قوت کو نمایاں طور پر سامنے لے آئے \*\*\*۔

غَیْبٌ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کہیں موجود ضرور ہو لیکن آنکھوں سے اوجھل ہو۔ جب غَیْبٌ آنکھوں کے سامنے آجائیگا تو مَشْهُودٌ ہو جائیگا۔ اگر اس کا کہیں وجود ہی نہیں تو پھر اسے غَیْبٌ نہیں کہا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ غَیْبٌ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے کسی ایسے برے وصف کے ذکر کرنے کو کہتے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اسے ناگوار گزرے۔ اگر وہ بات اس میں سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اسے غَیْبٌ نہیں بلکہ تَهْمَتٌ کہا جائیگا\*۔ غِیْبٌ کے لئے فعل اِغْتَابَ آتا ہے (۱۲۴)۔

قرآن کریم نے اللہ کے لئے عَالِمٌ الْغَیْبِ کہا ہے (۲۲)۔ اس لئے ایمان بالغیب (۲) کے معنی ”اُن دیکھے خدا پر ایمان“ ہی نہیں۔ اس سے ایک تو مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جو مرتب تو اسی وقت شروع ہو جاتے ہیں جب وہ عمل سرزد ہو لیکن مشہود ہو کر سامنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اسی طرح نظام خداوندی کے خوشگوار نتائج اس کے اندر تو ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک اس نظام کو متشکل نہ کیا جائے وہ مشہود ہو کر سامنے نہیں آتے۔ مومنین کی جماعت اس نظام کے اُن دیکھے نتائج پر یقین رکھتی ہے اور اس یقین کے ماتحت اس نظام کے قیام کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دے جاتی ہے۔ اگر انہیں اس نظام کے اُن دیکھے نتائج پر ایمان نہ ہو تو وہ اس کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ لہذا اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کے اُن دیکھے نتائج پر ایمان اولین شرط ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲)۔ ایک کسان، سردی، گرمی، دن رات، مسلسل محنت کرتا ہے، صرف اس لئے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بیج جسے اس نے بویا ہے اب یک دن ثمر بار ہو کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس کھیتی کے لئے ایک دن بھی محنت نہ کرے۔ جو جماعت نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے پہلے پہل اٹھتی ہے اس کے سامنے اس نظام کے نتائج موجود نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس وقت سامنے آنے والے ہوتے ہیں جب وہ نظام متشکل ہو جائے۔ وہ اس نظام کی تشکیل کے لئے صرف اسی بناء پر قربانیاں دے جاتے ہیں کہ انہیں اس کی بار آوری پر یقین محکم ہوتا ہے۔ اسی کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے، اَلْغَیْبُ سے مراد وہ تمام اشیاء یا حقائق ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں خود ذات خداوندی بھی آجاتی ہے۔

سورہ ہود میں ہے وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۱۳)۔ اس سے مراد ہیں کائنات کی تمام وہ چیزیں اور قوتیں جو ہنوز انسان کی نگاہوں

سے پوشیدہ ہیں لیکن مستقبل میں سامنے آجائے والی ہیں۔ انہی کو مَفَاتِیحُ الْغَيْبِ (۱۶۹) اور غَائِبَاتُ (۲۵) کہا گیا ہے۔ زمانہ مستقبل کے لئے یہ لفظ (۱۶۹) میں آیا ہے اور گذشتہ زمانہ کی ان باتوں کے لئے جو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آئی تھیں (۳۳) میں، جہاں کہا ہے کہ ذَالِکَ مِّنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ۔ سورہ یوسف میں ہے۔ لَمْ آخُذْهُ بِالْغَيْبِ (۱۲)۔ میں نے پیچھے اسکی خیانت نہیں کی۔ غِيَابَاتُ (۱۲)۔ کنویں کی گہرائی۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں۔ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ... (۲۵)۔ ”ان سے کہو کہ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو“۔ حتیٰ کہ رسولوں کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا اعلان ہوتا ہے کہ لَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۱۱) ”میں غیب نہیں جانتا“۔ البتہ اللہ تعالیٰ انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے ذَالِکَ مِّنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِۦ اِلَيْکَ (۳۳) ”یہ غیب کی ان باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ چونکہ وحی تمام تر قرآن کریم کے اندر آگئی اور اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے اب کسی شخص کو غیب کا علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کا دعویٰ قیاس آرائیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کریم نے رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸) کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی یونہی اندھیرے میں تیر چلانا۔ اٹکیں دوڑانا۔ قیاس آرائیاں کرنا، جن میں سے کبھی اتفاقاً کوئی ٹھیک بھی نکل آتی ہے۔ البتہ تحقیقات کے ذریعے فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب تک وہ قوتیں دریافت نہیں ہونگی ”غیب“ سے متعلق ہونگی۔ جب دریافت ہو کر، محسوس طور پر سامنے آجائیں گی، مشہود ہو جائیں گی۔ لیکن بعض ”غیب“ ایسے ہیں جنہیں محسوسات کے دائرے میں لانا انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ مثلاً ذات خداوندی یا مرنے کے بعد کی زندگی کی کنہ و حقیقت۔ وغیرہ۔

[نیز دیکھئے عنوان ش۔ ہ۔ د]

## غ ی ث

الْغَيْثُ۔ بارش۔ وہ بارش جو دور دور تک ہو اور جو بڑی منفعت بخش ہو۔ وہ گھاس جو اس بارش سے پیدا ہو۔ غَاثُ اللّٰهُ الْبِلَادَ۔ خدا نے

شہروں پر پانی برسایا۔ فَرَسٌ ذُو غَنَیَّتٍ۔ گھوڑا جو اپنی رفتار کو یکے بعد دیگرے نکالتا رہے اور اسکی رفتار کی تیزی بڑھتی جائے۔ یَغِیْرُ ذَاتُ غَنَیَّتٍ۔ وہ کنواں جس کے اندر چشمہ ہو۔\*

قرآن کریم میں ہے وَ یَنْزِلُ الْغَیْثَ (۳۱)۔ خدا بارش برساتا ہے۔ سورہ کہف میں ہے وَ اِنْ یَسْتَغِیْثُوْا (۱۸)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْتُ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے اور غَیْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی۔ اسی لئے ہم نے اسے عنوان (غ۔ و۔ ث) میں بھی لکھ دیا ہے۔

## غ ی ر

غَیْرٌ۔ عام طور پر سوا، بجز اور علاوہ کے معنوں میں آتا ہے۔ مَسَالِكُمْ مِّنْ اِلٰہِ غَیْرِہُ (۵۹)۔ تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی اور اِلٰہ نہیں۔ غَیْرٌ۔ بدل دینا۔ تبدیل کر دینا۔ اِنْ اَللّٰہُ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ (۱۳)۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا (جب تک ....)۔ تَغَیْرٌ۔ بدل جانا۔ لَمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُہُ (۶۵)۔ جس کا مزہ نہیں بدلا جاتا۔

قرآن کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِنْ اَللّٰہُ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمُ (۱۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن اس میں ایک باریک پہلو ہے۔ عرب اونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ انہی پر اپنا مال وغیرہ لادتے تھے۔ اونٹ پر کجاوہ باندھا ہو یا سال لدا ہو، چلتے چلتے وہ ضرور ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ان چیزوں کو یا ان کی رسیوں کو مرمت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ چلتے چلتے اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے کہ کونسی رسی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ کونسا کجاوہ اپنی حالت پر نہیں رہا۔ جہاں ضرورت سمجھتے فوراً اونٹ کو بٹھاتے اور اس کا کجاوہ یا بوجھ درست کر دیتے۔ اسے وہ کہتے غَیَّرَ عَنْ غَیْرِہُ۔ اس نے اونٹ پر سے کجاوہ اتارا اور اسے درست کر (کے پھر باندھ) دیا۔\*\* یَا تَرٰکَ الْقَوْمَ یُغَیِّرُوْنَ۔ اس نے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کجاووں (سامان سفر) کی دیکھ بھال کر رہے تھے تا کہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کر کے چلیں۔\*\*

قوموں کی زندگی میں بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم اپنے سفر زندگی میں اپنے ساز و سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ کے ساتھ اس کی مناسب مرمت اور (Adjustment) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن جو اس سے غافل ہو جاتی ہے ”اس کے اونٹ کا بوجھ“ راستے میں گر پڑتا ہے۔

ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) دو چیزوں کے درمیان اختلاف۔ اور (۲) اصلاح اور منفعت۔ چنانچہ غَارَہُمْ اللہُ بِالْغَيْثِ کے معنی ہیں خدا نے بارش سے ان کی حالت کو درست کر دیا۔ اور الْغَيْرَةُ اس رسد یا سامان خوراک کو کہتے ہیں جس سے اہل و عیال کی حالت سدھاری جائے۔ اس بنا پر ان اللہ لَا يَغْيِرُ۔۔۔۔۔ میں تبدیلی بغرض اصلاح ہوگی۔ غَارَ۔ يَغَارُ (عَلَيْهِ)۔ کے معنی ہیں غیرت کھانا۔ اسی سے اسم ہے۔ یعنی جو چیز اپنی ہو اس میں جب کوئی دوسرا دخیل ہو تو اس کے خلاف اپنی حفاظت کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اسے غَيْرَةُ کہتے ہیں۔

## غ ی ض

غَاظٌ۔ يَغْيِظُ۔ غَيِظًا۔ کسی چیز کا کم یا ناقص ہو جانا، نیز کسی چیز کو کم کر دینا (لازم و متعدی)۔ غَاظَ الْمَاءُ۔ پانی جذب ہو گیا یا خشک ہو گیا۔ الْغَيْظُ۔ وہ نا تمام حمل جو ساقط ہو جائے\*۔ ابن فارس نے اس کے معنی کسی چیز میں کمی ہونا اور اس کا تہ نشین ہو جانا بتائے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے مَا تَغْيِظُ إِلَّا لَرْحَامٍ وَمَا تَزِدْ إِلَّا (۱۳۳)۔ رحم جس جنین کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے بلکہ نا مکمل گسرا دیتے ہیں۔ یا جنہیں وہ بڑھاتے ہیں۔ اس سے وہ جنین مراد لئے جا سکتے ہیں جو معینہ مدت (نو ماہ) سے کم میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ جنین جو معینہ مدت (نوماہ) سے زیادہ مدت لیتے ہیں۔ نیز شکم مادر میں ایک بچہ یا اس سے زائد بچوں کا وجود بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ راغب نے مَا تَغْيِظُ إِلَّا رَحَامٌ کے معنی کثے ہیں، وہ جسے رحم بگاڑ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ سورہ ہود میں طوفانِ حضرت نوحؑ کے ضمن میں ہے وَغَيِظَ الْمَاءُ (۱۱۱)۔ پانی کم ہو گیا۔ یا خشک ہو گیا۔

## غ ی ظ

الْغَيْظُ - غضب کو کہتے ہیں \* - راغب نے کہا ہے کہ غَيْظُ شدید ترین غضب کو کہتے ہیں یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دورانِ خون تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے \*\* - بعض نے کہا ہے کہ ابتدائی غضب یا جوش غضب کو غَيْظُ کہا جاتا ہے - دوسروں کا خیال ہے کہ غَيْظُ چھپا ہوا غصہ ہوتا ہے اور غَضَبُ ظاہر - یا یہ کہ غَضَبُ صاحبِ قدرت آدمی کے غصے کو کہتے ہیں اور غَيْظُ عاجز آدمی کے غصے کو \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اُس کرب اور بیچنی کے ہوتے ہیں جو کسی کو دوسرے کی طرف سے پہنچے - غَاظَهُ - اسے غصے میں لایا - برہم کیا - (۲۲/۱۵) - غَائِظٌ - وہ جو کسی کو غصے میں لائے - اسکی جمع غَائِظُونَ ہے (۲۶/۵۵) - التَّغْيِظُ - اظہارِ غیظ جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے \*\* - یعنی جوش و خروش - (۲۵/۱۲) -



# ف

## ف (حرف)

ف۔ یہ حسب ذیل مفہوم پیدا کرتا ہے :-

(۱) ترتیب کے لئے۔ یعنی یہ ہوا۔ پھر یہ ہوا۔ پھر یہ ہوا۔ جیسے  
 ثُمَّ خَلَقْنَا النَّسْطُفَةَ عِلْقَةً فَخَلَقْنَا الْعِلْقَةَ مَضْغَةً فَخَلَقْنَا  
 الْمَضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَّوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا... (۲۳)۔ پھر ہم نطفہ کو  
 لو تھڑا بناتے ہیں، پھر لو تھڑے کو گوشت کا ٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے (میں) ہڈیاں  
 پیدا کرتے ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ کلیہ نہیں کہ ف۔  
 ہر حال میں ترتیب کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات ترتیب نہیں بھی ہائی جاتی۔  
 مثلاً سورہ اعراف میں ہے وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا  
 بِأَسْنَا بَيِّنَاتٍ أَوْ هُمْ قَاتِلُونَ (۴)۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم  
 نے انہیں ہلاک کر دیا سو ہمارا عذاب ان ہر رات کے وقت آیا، یا اس وقت  
 جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے۔ اس میں ترتیب نہیں ہے۔

(۲) تعقیب کے لئے۔ یعنی ایک واقعہ کے بعد جتنی مدت میں دوسرا واقعہ  
 ہونا ہو وہ اس مدت میں واقع ہو جائے تو اس کا بھی۔ ف۔ سے اظہار کرتے ہیں۔  
 مثلاً تَزَوَّجَ فَوُلْدُكَ۔ اس نے شادی کی۔ پھر مدت صحیح کے بعد  
 اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اگر وہ مدت کم و بیش ہو تو پھر۔ ف۔ نہیں لایا  
 جائے گا۔

سورہ مریم میں ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ  
 مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرِيفًا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا  
 فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۲۱-۲۲)۔  
 فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا فَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى  
 جِذْعِ النَّخْلَةِ... (۲۳-۲۴) فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا  
 تَعْبُرْنِي... (۲۵-۲۶)۔ ”اور قرآن کریم میں قصہ مریم کو

بیان کر۔ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر جانب مشرق ایک جگہ چلی گئی۔ پس اس نے ان سے پردہ کر لیا۔ سوہم نے اپنی ”روح“ کو اس کی طرف بھیجا۔ تو وہ اسے ایک صحیح سالم انسان کی شکل میں متحمل ہو کر دکھائی دیا۔ . . . پھر مریم کو اس (بچہ) کا حمل ہوا۔ سو وہ اس کے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی۔ پھر درد زہ اسے کھجور کے درخت کی طرف لے آیا . . . . . پھر اسے نچلی سمت سے ایک آواز آئی کہ غم نہ کر۔ . . . ، ان آیات سے مطلب یہ نہیں کہ یہ تمام واقعات ، یکے بعد دیگرے ، مسلسل ، ایک ہی وقت میں ہوتے چلے گئے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کے لئے جس قدر مدت درکار ہوتی ہے ، ٹھیک اس مدت کے بعد دوسرا واقعہ ہوا۔

(۳) ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے لئے سبب بن جانا۔ مثلاً میں نے اسے تھوڑا مارا تو اسے غصہ آگیا۔ قرآن کریم میں ہے۔ فَوَكَّزَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ (۱۵)۔ پس موسیٰؑ نے اسے مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یعنی اس کی موت حضرت موسیٰؑ کی مار سے واقع ہوئی۔

(۴) واو عاطفہ (اور) کے معنوں میں۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاخْرَجَهُمَا مِيعَاتِا كَانَا فِيْهِمَا (۲۶) پس شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا اور اس طرح انہیں وہاں سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ (اگرچہ فَاَخْرَجَ میں ف ، سبب کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔)

(۵) جب یہ ان (اگر) کے بعد آئے تو اس کے معنی۔ تو۔ کے ہوتے ہیں۔ جیسے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاَتَّبِعُوْنِيْ (۳) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ یا مثلاً (اِنْ) کے بغیر ہی۔ تو۔ کے معنوں میں۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِیْنْ خَیْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوْهُ (۳۴) اور جو کچھ وہ عمل خیر کریں گے تو اس کی نافرمانی نہیں کی جائے گی (اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا)۔

(۶) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے۔ بَلِ اللّٰهُ فَعَّٰلٌۢ بِمَاۤ كَانُوْا عَلٰی (۳۶) بلکہ اللہ ہی کی محکومی اختیار کرو۔

(۷) بعض اوقات یہ قسم کی تاکید کے لئے آ جاتا ہے۔ مثلاً قَالَ فَبِمِیْزَتِیْكَ (۳۸) اس نے کہا تیرے غلبہ و اقتدار کی قسم۔ (یہاں ف کو زائد بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ محض بات کے تسلسل کے لئے آیا ہے)۔

## ف ا د

فَأَدَّ الْخُبْرَ يَفْقَادُهُ - روٹی کو بھوبھل میں سینکا - فَأَدَّ اللَّحْمَ بِالنَّارِ - گوشت کو آگ میں بھون لینا - الْخُبْرُ الْمَفْقُودُ - بھوبھل میں پکائی ہوئی روٹی - الْفَقْدُ - آگ\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بخار - شدت اور حرارت کے ہیں -

قرآن کریم میں دل کے لئے قَلْبٌ\* اور فُؤَادٌ\* (جمع أَفئِدَة\*) آیا ہے (۱۱۱) - اگرچہ ان دونوں کے استعمال میں کوئی خاص خط امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا، لیکن (جیسا کہ راغب نے لکھا ہے) دل کو فُؤَادٌ\* اس وقت کہہینگے جب اس میں بھڑکنے کے معنی ہائے جائیں\*\* - تاج نے لکھا ہے کہ فاد کے اصلی معنی هلنا اور هلانا ہیں - اس سے فؤاد دل کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بہت هلنا اور دھڑکتا رہتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسانی جذبات کی طرف اشارہ ہوگا تو فُؤَادٌ\* آئے گا اور جب انسانی فکر کے متعلق بات ہوگی تو قَلْبٌ\* - چنانچہ فَأَدَّ زَبْدًا کے معنی ہیں زید کے دل پر چوٹ لگائی - فَأَدَّ الْخَوْفُ فُلَانًا - فلاں آدمی کو خوف نے ہزدل بنا دیا\* - ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے -

لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) - قَلْبٌ\* اور فُؤَادٌ\* کی یہ تقسیم عمومی ہے - ورنہ ان دونوں کا استعمال دل کے معنوں میں ہوتا ہے - قرآن کریم میں سیاق و سباق کے رو سے دیکھنا چاہئیے کہ کس مقام پر عقل و فکر مراد ہے اور کس مقام پر جذبات - اسی فرق کی رو سے قَلْبٌ\* اور فُؤَادٌ\* کے معنی کرنے چاہئیں - ہمارے ہاں کے لفظ ”دل“ کے مقابلہ میں انگریزی کا لفظ (Mind) زیادہ جامع ہے -

سورة بنی اسرائیل میں ہے لَا تَقْنُفْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ\* - اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُونًا\* (۱۶) ”جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو - باد رکھو - سماعت - بصارت - اور فؤاد ان میں سے ہر ایک کی بابت پوچھا جائے گا“ - اس میں سمع اور بصر، حواس (Sense Perceptions) کے ذرائع ہیں اور فؤاد سے مراد (Mind) ہے یا جذبات - (Mind) اس لئے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے - اور ”جذبات“ اس لئے کہ اگر

ان اطلاعات کو جذبات متاثر کر دیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایمان کے لئے حواس اور فؤاد دونوں کی ضرورت بتائی ہے۔ یعنی ان حقائق کو عقل و فکر سے پرکھا جائے اور دل کے جھکاؤ سے قبول کیا جائے (۱۱۳-۱۱۱)۔

سورۃ ہود میں ہے کہ انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ مَا تُشِيبُتُ بِهِمْ فُتُوَادُكَ (۱۱۱)۔ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب بچے کو دریا میں بہا دیا تو اَصْبَحَ فُتُوَادُ اُمِّ مُوسٰی فَرِحًا (۲۸)۔ تو اس کا دل صبر و ضبط سے خالی ہو گیا۔ اس کے بعد ہے لَوْلَا اَنْ رَبَّنَا عَلٰی قُلُوبِنَا (۲۸)۔ اگر ہم اس کے قلب کو مضبوط نہ کر دیتے تو وہ اپنی بیچینی کا اظہار کر دیتی۔ (اس کے ساتھ ق۔ ل۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے)

## ف ا و

الْفَيْيَۃُ۔ جماعت۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے کی طرف تعاون و تناصر کے لئے رجوع کریں۔ نیز اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو فوج کے پیچھے ٹھہری ہوئی ہوتی ہے تاکہ شکست کے وقت اس کی طرف پناہ لی جاسکے\*۔ (۸۶)۔ اِنْفِيَاۃٌ۔ کھل جانا\*۔

## ف ت ا

مَفْتَنًا۔ مَفْتَنِيٌّ۔ مَا أَفْتَنَا بِفَعْلٍ كَذَآ۔ وہ (اس کام کو) برابر کرتا رہا۔ اسے ہمیشہ کرتا رہا۔ فَتْنِيٌّ عَيْنِ الْأَمْرِ۔ وہ اس بات سے رک گیا۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ فتنی سے پہلے ہمیشہ نفی آتی ہے\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے۔ تَا لِّلّٰہِ تَفْتَنُوْا تَذْكُرُ یُوسُفٰ (۸۵)۔ تو وہاں تَفْتَنُوْا سے پہلے لَا محذوف ہے۔ یعنی یہ اصل میں لَا تَفْتَنُوْا ہے۔ اہل عرب اس سے عام طور پر حرف نفی محذوف کر دیتے ہیں\*\*۔ آیت کے معنی ہیں ”تسم یوسف کی یاد سے کبھی باز نہیں آؤ گے۔ اسے کبھی نہیں بھلاؤ گے۔ ہمیشہ یاد کرتے رہو گے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تسلسل کے ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا۔

## ف ت ح

فَتَّحَ - يَفْتَحُ فَتْحًا - کھول دیا۔ فَتَحَ - کھولنے میں شدت کے لئے آتا ہے۔ انْفَتَحَ - کھل گیا\*۔

الْفَتْحُ\* - زمین کے بالائی حصہ پر بہتا ہوا پانی۔ مدد۔ نُصْرَت - دوجھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دینا۔ (یعنی بات کھول دینا کہ کون جیتا ہے)۔ فَتَحَ الْحَافِیْمُ بَیْنَهُمْ\* - حاکم نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ لَا سْتَفْتَحُ\* - کھلوانا چاہنا۔ فیصلہ یا غلبہ طلب کرنا۔ مدد طلب کرنا۔ (۲۹)۔ اَلْمَفْتَحُ\* - خزانہ۔ اَلْفَتْحُ\* - حاکم۔ پڑا فیصلہ کرنے والا، مشکل اور پُر پیچ معاملات کو کھولنے والا اور حقائق کو ظاہر کرنے والا۔ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ (۳۶)۔ اَلْفَتْحُ\* - رزق جسے خدا کسی کے لئے کھول دے\*۔

سورة بقرہ میں ہے۔ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَیْکُمْ\* (۲)۔ وہ باتیں جنہیں اللہ نے تم پر واضح کیا ہے۔ جن کے دروازے تم پر کھول دئے ہیں۔

سورة اعراف میں ہے۔ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا (۸۹)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان آخری فیصلہ کن بات لے آ۔ سورة ابراہیم میں ہے وَاسْتَفْتَحُوا (۱۴)۔ انہوں نے آخری فیصلہ کن بات طلب کر لی۔ سورة سجدہ میں اسی کو یَوْمَ الْفَتْحِ (۳۴) کہا گیا ہے۔ یعنی فیصلہ کن انقلاب کی گھڑی۔ سورة قصص میں قارون کے خزانوں کے لئے مَفَاتِیْحُ\* کا لفظ آیا ہے (۲۸)۔ سورة نور میں ہے اَوْ مَسَّکُمْ مَفَاتِیْحُہُ\* (۲۴) جن کے مال و اسباب کے تم نگہدار ہو۔ یا جن پر تمہارا کنٹرول ہو۔ (۳۵) میں یہ مادہ اِنْسَکَ (روکنے) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

سورة الفتح میں ہے۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (۱)۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے تیرے لئے زندگی کی راہیں کھول دی ہیں۔ یا علوم و معارف کے دروازے (وحی کے ذریعے) کھول دئے ہیں\*\*۔ یا ایک واضح، فیصلہ کن انقلاب عطا کر دیا ہے۔ بہر حال، قوانین خداوندی کی رو سے مشکلات کا رفع ہو جانا، رکاوٹوں کا دور ہو جانا، زندگی کی راہیں کھل جانا، حقائق کا منکشف ہو جانا، ایک فیصلہ کن انقلاب برپا ہو جانا اور اس طرح حق و باطل کا نکھر کر الگ الگ ہو جانا، فَتَحُ\* ہے۔

## ف ت ر

فَتَرَّ - يَفْتَرُ - فِتْرًا - تیزی کے بعد سناکن، سختی کے بعد نرم، ہو جانا۔ کسی چیز کا دھیمہ پڑ جانا۔ اسکی شدت میں کمی آجانا۔ فَتَرَ الْمَاءُ - پانی کی گرمی کم ہو گئی۔ الْفَاتِرُ - نیم گرم پانی کو کہتے ہیں۔ فَتَرَ جِسْمَهُ - اسکے جسم کے جوڑ بند ڈھیلے پڑ گئے۔ طَرَفُ فَاتِرٌ - کمزور نگاہ۔ (یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے چشم نیم باز)۔ أَفْتَرَ الشَّرَابُ - شراب خوار کے نشہ کی مستی ختم ہو گئی، اور وہ کمزور ہونے لگا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں کمزوری آجانا۔

سورہ انبیاء میں کائناتی قوتوں (ملائکہ) کے متعلق ہے۔ یُسَبِّحُونَ الشَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (۲۱)۔ وہ ہمیشہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں نہایت تیزی سے سرگرم عمل رہتی ہیں اور ان میں کبھی مستی نہیں آتی۔ فَتَرَ الْعَذَابَ - عذاب کو کم کیا یا اسکے زور کو ہلکا کیا۔ (۳۳/۵)۔

نبی اکرمؐ کی بعثت کے متعلق ہے کہ آپ علیٰ فِتْرَةٍ مِّنَ الرَّسُلِ (۱۹/۵) تشریف لائے۔ یعنی اس زمانہ میں جبکہ گذشتہ انبیاء بنی اسرائیل کی رسالت کا اثر دھیمہ پڑ چکا تھا۔ رسول اللہؐ سے پہلے آسمانی تعلیم میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے ایک نئے نبی کی ضرورت ہوتی تھی، کیونکہ علاوہ دیگر وجوہ و عناصر اس فِتْرَةٍ کے زمانہ میں سابقہ نبی کا پیغام بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہتا تھا۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد اس دعوت میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ اسلئے کہ حضورؐ کا پیغام قیامت تک اپنی اصلی شکل میں موجود رہیگا۔ لہذا اس میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے اس پیغام (قرآن کریم) کو ابھار کر سامنے لانے کی ضرورت ہوگی، اور یہ کام وارثین کتاب (امت محمدیہ) کے کرنے کا ہوگا۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیا جائے جسے نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے مطابق قائم کیا تھا۔

## ف ت ق

فَتَقَهُ - يَفْتِقُ - (يَفْتِقُ) - اس نے اسکو پھاڑ دیا\*۔

فَتَنَّقِ الثَّوْبَ - کپڑے کو ادھیڑ دیا اور اسکے ٹکڑوں کو الگ الگ کر دیا۔ \*\*۔ اَلْفَتَقُ - دو ملی ہوئی چیزوں کو الگ کر دینا۔ \*\*\*۔ کسی چیز میں کھلا پن اور کشادگی پیدا ہو جانا (ابن فارس)۔ قرآن کریم میں ارض و سماوات کے متعلق ہے۔ کَانَتَا رَئِیًّا فَفَتَقْنَا بَيْنَهُمَا (۱۳۱)۔ پہلے یہ تمام کائنات ایک ہی ہولنی تھی۔ بعد میں اس سے مختلف کٹ-رے پیدا ہو گئے (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر - ت - ق)۔

## ف ت ل

فَتَلَ - يَفْتِلُ - (رسی وغیرہ کو) بٹا - بل دے۔ \*\*\*\*۔ ابن فارس نے یہی اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں۔ اَلْفَتِيلُ - وہ باریک سی سفید چیز جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتی ہے۔ عرب اس سے قلیل اور حقیر شے کی مثال دیا کرتے ہیں۔ \*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا (۳۹)۔ ان کی ذات کی نشوونما میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (۱۴۰)

## ف ت ن

فَتَنٌ کے بنیادی معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹا الگ ہو جائے۔ چنانچہ وَرَقٌ فَتَيْنٌ جلائی تپائی ہوئی چاندی کو کہتے ہیں۔ اور دِرْیَارٌ مَفْتُونٌ وہ دینار جو آگ میں تپایا گیا ہو۔ \*۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں۔ چنانچہ اَلْفَتَانَةُ - کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر انکی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ \*\*۔ یہیں سے فِتْنَةٌ کے معنی تاؤ دیکر ہر کھنے اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔ \*

نیز اس کے معنی جلانے کے بھی آتے ہیں۔ فَتَنَ النَّارُ الْقَرْغِیْفَ۔ آگ نے روٹی جلا دی۔ اس سے فِتْنَةٌ کے معنی عذاب، مصیبت اور جنگ کے بھی آتے ہیں۔ نیز گمراہ کر دینے کے۔ \*

فِتْنَةٌ - اَفْتِنَتْہ کے معنی ہیں اسے پسند کر لیا۔ اسکو پسند آ گیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہہ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ (۵۸) کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان لوگوں کو ہم پر غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ اس فریب میں مبتلا رہینگے کہ یہ ہم سے بہتر ہیں اس لئے اپنے کفر کو

اور زیادہ پسند کرنے لگ جائیں گے \*۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اس قوم کا تختہ مشق مت بنا۔

قرآن کریم میں یہ مادہ جنگ کے معنوں میں (۹۱) آیا ہے۔ اور جنگ کے مصائب و مشکلات کے معنوں میں یُفْتَنُونَ (۱۳۶) میں۔ صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راستے پر لگا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۳۴) میں آیا ہے۔ نیز فِتْنَةٌ (۳۶) میں اس کے معنی گمراہی کے ہیں۔ یہی معنی اس مادہ کے (۵۹) اور (۱۳۷) میں ہونگے جہاں اس سے مراد صحیح راستے سے ہٹا دینا ہیں۔ خَیْرٌ کے مقابلہ میں فِتْنَةٌ (۲۱) میں آیا ہے۔ سورۃ طہ میں حضرت موسیٰ کے متعلق ہے وَفْتَنَّاكَ فُتُونًا (۲) ہم نے تجھے کئی کٹھالیوں میں سے گزار کر تیری تربیت کی اور اس طرح تجھے مقام نبوت کے شایان شان بنایا۔ یعنی فِتْنَةٌ کے معنی ہیں ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی مضر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے اور انسان پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی کس حد تک ربوبیت ہوئی ہے۔ جہان تک انسانی معاشرہ کا تعلق ہے اس کا قوانین خداوندی کے مطابق نہ رہنا، فِتْنَةٌ ہے۔ نیز فتنہ انگیزی (۲۳)؛ (۹۹)۔ یہ ہیئت مجموعی، یہ لفظ قرآن کریم میں ان رکاوٹوں کے لئے آیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل کی جاتی ہیں۔

ایذا، مصیبت اور تکلیف کے معنوں میں (۲۱) میں۔ عذاب (سزا) کے معنوں میں (۳۴) میں۔ دھوکا اور فریب کے معنوں میں (۲۴) میں۔ نیز الْمُفْتَنُونَ (۱۸) میں بمعنی فریب خوردہ و گمراہ۔ سزا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۵۹) میں آیا ہے اور (۲۳) میں لفظ فِتْنَةٌ معذرت اور حجت کے معنوں میں آیا ہے۔

## ف ت ی

الْفَتَاءُ۔ جوانی۔ شباب۔ الفتی۔ نوجوان۔ اس کے بعد یہ لفظ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا، خواہ وہ کسی عمر کا ہو۔ یعنی فتی۔ غلام، اور فَتَاةٌ لونڈی۔

فتی۔ بمعنی نوجوان لڑکا (۲۱) میں آیا ہے۔ اس کا تثنیہ فَتَيَانِ ہے (۱۲)۔ فِئْتَةٌ جمع ہے (۱۸)۔ نیز فِئْتَيَانِ بھی جمع آتی ہے۔ (۱۲)۔ فَتَاةٌ کی جمع فَتَيَاتٌ آتی ہے۔ (۲۵)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) تازگی اور نیا ہونا۔ شباب اور نوجوانی کا مفہوم اسی سے ہے۔ اور (۲) فیصلہ یا حکم کو واضح کر دینا۔

\*تاج۔ \*\*تاج و محیط۔



اَفْتٰی - کسی بات کا حکم بیان کر دینا - فتویٰ دیدینا - کسی سوال کا جواب دیدینا - کہتے ہیں کہ اسکی اصل فتیٰ یعنی نوجوان ہے \* جو قوت و تازگی رکھتا ہے - گویا فتویٰ دینے کے لئے علمی قوت و تازگی کی ضرورت ہے ، بسا پھر یہ اَلْفُتُوۃ سے ہے جس کے معنی سخاوت کے ہیں \* - اَفْتٰی حکم دینا - قُلِ اللّٰهُ یَفْتِیْکُمْ (۱۴۷) - اَسْتَفْتٰی - فتویٰ (حکم یا فیصلہ) طلب کرنا (۱۴۷) -

## ف ج ج

اَلْفَجَّ - دو پہاڑوں کے درمیان وسیع راستہ - فِجْجَجٌ اسکی جمع ہے \*\* - قرآن کریم میں ہے مِیْنٌ کُلٌّ فَتَجَّ عَمِیْقٌ (۲۲) - ”ہر دور دراز راستے سے“ - اَلْفَجَّجَ بھی اسی کو کہتے ہیں - اَلْفَجَّ - دو چیزوں کے درمیان کشادگی کر دینے اور فاصلہ بڑھا دینے کو کہتے ہیں - اَلْفَجَّجَ - دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی \*\* - قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا فِیْہَا فِجْجًا (۲۱) - ہم نے پہاڑوں میں کشادہ راستے بنائے -

## ف ج ر

اَلْفَجْرَ کے اصلی معنی بھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں - نیز اس میں میلان اور جھکاؤ (ایک طرف ہٹ جانے) کا مفہوم بھی ہوتا ہے - چنانچہ پہلے مفہوم کی رو سے فَجْرَہ - یَفْجُرُہ کے معنی ہیں پانی کو بھاڑ کر بہایا - فَجْرَہ تَفْجِیْرٌ - شدت سے پانی کو بھاڑ کر بہایا - اَفْجَرَ السِّنْبُوۃ - چشمہ کو بھاڑ کر نکالا - اِنْفَجَرَتْ عَلَیْہِمْ اَلْقَدْوَاہِی - ان پر ہر طرف سے مصیبتیں پھوٹ پڑیں - اَلْفَجْرَ - صبح کی روشنی جو تاریکی کو بھاڑ کر باہر نکل آتی ہے - روشنی کے اعتبار سے طَرَبُقٌ فَجْرٌ واضح راستے کو کہتے ہیں اور پھٹنے کے مفہوم سے اَلْفِجَارُ خود راستوں کو کہتے ہیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کشاد اور کھلا پن ہونے کے ہیں -

ایک طرف ہٹ جانے یا جھک جانے کے مفہوم سے فَجْرَ الشَّرَکِیْبِ فَجْوَرٌ کے معنی ہیں سوار اپنی زین سے ایک طرف ہٹ گیا - اور فَجْرَ عَنِ الْحَقِّ کے معنی ہیں وہ حق سے ہٹ گیا \* - فَاسِیْقٌ وَفَاجِیْرٌ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے -

لیکن اَلْفَجْرُ کے معنی مال و دولت کی فراوانی اور جُود و سخا اور عطیہ کے بھی ہیں۔ اور اَلْفَجِيرُ - سال دار آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ نیز فِجَارَاتُ الْعَرَبِ - عربوں کے مفاخرات کو۔ فَجَرَ الشَّجَلُ - آدمی سخی ہو گیا۔ تَفَجَّرَ بِالنَّكَرِ - اس نے بہت سخاوت کی\*۔

قرآن کریم میں پہاڑ سے چشمے پھوٹ نکلنے کے لئے یہ مادہ (فَجَرُ) میں آیا ہے۔ زمین سے چشمے بہہ نکلنے کے لئے (فَجَرُ) میں۔ اور نہریں نکلنے کے لئے (فَجَرُ) میں۔

سورۃ شمس میں نفسِ انسانی (انسانی ذات) کے متعلق ہے۔

فَاَلْهَمْنَاهَا فُجُورًا هَا وَتَقْوَاهَا (۱۱) اس کے معنی یہ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز کا علم رکھ دیا ہے۔ (یہ مفہوم کس طرح قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اس کے لئے ل۔ ۵۔ م کا عنوان دیکھئے)۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس آیت میں فُجُورًا هَا اور تَقْوَاهَا کہا گیا ہے جو نفسِ انسانی (انسانی ذات Human Personality) کی دو کیفیتوں کا نام ہے۔ فَجَرَ کے معنی پہاڑ دینا ہیں۔ لہذا انسانی ذات کا فُجُورٌ اس کا منتشر (Disintegrate) ہو جانا ہے۔ اور تَقْوَاهَا چونکہ اس کے مقابل میں آیا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے انسانی ذات کا تشتت و انتشار سے محفوظ رہنا۔ (Disintegrate نہ ہونا)۔ اسی وجہ سے دوسری جگہ مُتَّقِيْنَ کے مقابلہ میں فُجُورٌ آیا ہے (۳۸)۔ فَاجِرٌ کا لفظ (۶۱) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی راہ سے ہٹا ہوا۔

درحقیقت، جو انسان خدا کی راہ سے ہٹتا (اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا) ہے اس کی ذات (Personality) میں انتشار (Disintegration) واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے فاجر وہ ہے جس کی ذات مستحکم ہونے کے بجائے منتشر ہو جائے۔ نشو و نما یافتہ ذات (Developed Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ (Integrated) ہوتی ہے۔ لہذا سورہ شمس کی مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی ذات میں بننے اور بگڑنے کی صلاحیت رکھدی گئی ہے۔ اب جو شخص چاہے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت سے اپنی ذات کی نشو و نما کر کے اسے مستحکم کر لے۔ اور جو چاہے اس سے منحرف ہو کر اسے منتشر و متفرق (Disintegrate) کر دے۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسانی ذات میں نہیں۔ اسکی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے۔

یعنی وحی بتا سکتی ہے کہہ خیر کسے کہتے ہیں اور شر کیا ہے۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر انسان مطلق خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو وحی کی روشنی کے بغیر خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

## ف ج و

الْفَجْوَةُ\*۔ کشادگی۔ دو چیزوں کے درمیان کھلی جگہ۔ زمین کا وسیع حصہ۔ فراخ جگہ۔ وسیع میدان اور صحن۔ فَجَاءَ بَابَهُ فَجْوًا۔ اس نے اپنا دروازہ کھول دیا۔ الْفَجَاءُ۔ دونوں رانوں یا گھٹنوں یا ہنڈلیوں کے درمیان کا فاصلہ\*۔

قرآن کریم میں اصحاب کہف کے متعلق ہے۔ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ (۱۸)۔ وہ اس غار کے اندر ایک کھلی جگہ میں تھے۔

## ف ح ش

الْفَحْشُ\*۔ حد سے بڑھ جانا۔ زیادتی کر بیٹھنا۔ کسی بات کا حد سے تجاوز کر جانا۔ گفتگو میں آداب و احترام کے حدود پھاند جانا۔ فَحْشُ الْاَمْرِ\*۔ معاملہ حد سے تجاوز کر گیا۔ الْفَاحِشُ\*۔ حد سے تجاوز کر جانے والا\*\*۔ قرآن کریم میں فَحْشُ شَاءَ\* عَدُوْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶)۔ اور قِسْطٌ کے مقابلہ میں بھی (۲۸-۲۹)۔ سورۃ احزاب میں یہ لفظ قَسَمَتْ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۳۰-۳۱)۔ قَسَمَتْ کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہیں۔ (دیکھئے عنوان ق۔ ن۔ ت)۔ اس لئے فَحْشُ کے معنی حدود خداوندی سے تجاوز اور سرکشی کے ہیں۔ یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی فَحْشٌ میں داخل ہے۔ یا کوئی ذلیل اور شرمناک حرکت (۳۳)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں برائی یا شاعت کے ہیں۔

فَحْشُ شَاءَ کے معنی بخل ہیں۔ بخیل کو فَاحِشٌ کہتے ہیں\*\*۔ اَفْحَشُ اس نے بخل کیا\*\*\*۔ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں فَضْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۲۶۸)۔ فَضْلٌ کے معنی ہیں رزق کی کشائش، وسعت۔ لہذا فَحْشٌ کے معنی ہونگے رزق کی تنگی۔ کمی۔ یا اس کے خرچ میں ہاتھ روک لینا۔ اسی کو بخل کہتے ہیں۔ یا اس آیت (۲۶۸) میں فَحْشُ شَاءَ کے معنی ہونگے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا۔

آلَفَوَاحِشٌ\*۔ فَاحِشَةٌ\* کی جمع ہے۔ اور اَلْفَحْشَاءُ، فَاحِشَةٌ\* کا اسم ہے\*۔ یعنی حدود فراموشی۔

سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فَاحِشَةٌ\* میں شمار کیا گیا ہے (۱۴/۱)۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں فَاحِشَةٌ\* کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی زنا ہی کے ہونگے۔ سورۃ انعام میں ہے ”وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ“ (۱۵۲/۱)۔ ”تم فواحش کے قریب مت جاؤ۔ جو ان میں سے ظاہر ہو اور جو چھپی ہوئی ہو“۔ ان کے قریب مت جاؤ۔ لہذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آجاتی ہے۔ اسی بنیاد پر سورۃ نساء میں جہاں فرمایا کہ وَاللَّيْسَ بِآتِیْنِ الْفَاحِشَةَ مِّنْ نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ“ (۱۵/۱)۔ ”اور تمہاری عورتوں میں سے جو فاحشہ کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ“۔ تو اس میں فَاحِشَةٌ\* سے مراد زنا نہیں۔ اس لئے کہ اول تو زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے۔ دوسرے زنا کی سزا دوسرے مقام پر خود درج لکھی ہے (۲۲/۱)۔ لیکن اس جگہ فَاحِشَةٌ\* کے جرم کی سزا صرف گھروں میں روک لینا کہا گیا ہے۔ اس لئے یہاں فَاحِشَةٌ\* سے مراد زنا سے ورے بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا تک منتج ہو سکتی ہیں۔ قوم لوط کے متعلق کہا گیا ہے اَتَا تَوْنُ الْفَاحِشَةِ (۸۰/۱)۔ اور اس سے اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اس سے مراد لواطت ہے (۸۱/۱)۔ نہ کہ زنا۔ اور جس طرح دو مردوں کا اختلاط فاحشہ ہے اسی طرح عورتوں کا باہمی اختلاط (جماعت) بھی فاحشہ ہے۔

نیز لفظ فَوَاحِش (بطور جمع) خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف زنا ہی نہیں، دوسرے بے حیائی کے کام بھی فاحشہ میں داخل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (پیشہ ور عورتوں سے قطع نظر) فعل زنا کا ارتکاب یک لخت (فوری طور پر) ظہور میں نہیں آجاتا۔ اس کے لئے (غیر) مرد اور عورت باہمی (ملنے جلنے) کے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ پھر ذرا بات آگے بڑھتی ہے تو ہم آغوشی وغیرہ کی نوبت آتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ جنسی اختلاط (زنا) تک بات پہنچتی ہے۔ قرآن کریم ان مبادیات کو روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ فواحش ہیں جن کا ذکر اوپر (۱۵/۱) میں آیا ہے۔

## ف خ ر

اَلْفَتْخُوْرُ\* - وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو\* - اور دھار بھی پتلی ہو\*\*\* - اس سے اَلْفَتْخُوْرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی باتیں بڑی بڑی کرنا لیکن جوہر ذاتی کا بہت کم ہونا - ایسی باتوں پر ناز کرنا جو انسان کے ذاتی جوہر نہ ہوں بلکہ اضافی ہوں - مثلاً حسب و نسب - دولت و حکومت وغیرہ\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی پرانی باتوں کو شمار کرنا ہیں - سورة نساء میں بخیل کو فَتْخُوْرُ\* کہا گیا ہے (۳۶:۳۶) - یعنی جس کے تھن بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں سے دودھ بہت کم نکلتے - سورة حدید میں تَفْتَخُوْرُ\* بَتَيْنُکُمْ (۸۹:۸۹) آیا ہے - یعنی ایک دوسرے سے بڑا بننے کی کوشش ، ذاتی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اضافی نسبتوں کی بنیاد پر - ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انجان کے اندر ہے ، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یونہی نمائشی نسبتوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے بجائے جوہر ذاتی میں بڑھنے کی کوشش کرو - (۲۸:۲۸) -

اَلْفَتْخَاْرُ\* - مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے - اصل میں فَتْخَاْرُ\* مٹکوں (ٹھیلیوں) کو کہا جاتا ہے\*\* جو اندر سے خالی ہوتے ہیں لیکن بولتے بڑے زور سے ہیں - قرآن کریم میں ہے - خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخْفَاْرِ (۹۵:۹۵) - انسان کو ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے پیدا کیا - (تفصیل اس کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی) -

## ف دی

فَدَاہُ\* - يَفْدِيْہُ - فِدَاۃٌ و فِدَی\* - اس نے کچھ خرچ کر کے اسے کسی مصیبت سے بچا لیا - تَفَادَیْ مِیْنَهُ\* - اس سے بچا - اِفْتَدَیْ اِیْہُ بِکَذَا - اس نے خود کو مال کے عوض چھڑا لیا - فَادَاہُ مَفَادَاۃٌ\* - اہل لغت نے فَادَاہُ کے مختلف معنی لکھے ہیں - یہ بھی کہ اس نے کچھ دیکر اسے چھڑا لیا - اور یہ بھی کہ اس نے کچھ لے کر اسے چھوڑ دیا - بعض نے کہا ہے کہ مَفَادَاۃٌ\* یہ ہے کہ تم ایک آدمی دیکر اس کے عوض دوسرا آدمی چھڑا لو - اور فِدَی\* یہ ہے کہ تم روپیہ دیکر اسے خرید لو - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں\*\*\*\* - بہر حال اس میں کسی کو

بچا لینے کا پہلو بنیادی ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی یہی ہیں کہ کسی چیز کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے اسکی جگہ کسی دوسری چیز کو دے دینا۔

قرآن کریم میں یہ لفظ قیدیوں کو کفارہ دیکر چھڑانے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۸۵)۔ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے۔ وَقَدْ يَنْهَاهُ بِذِي بَيْحٍ عَظِيمٍ۔ (۳۰/۳۶)۔ یعنی ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچا لیا۔ انہیں حضرت ابراہیمؑ کی چٹھری سے محفوظ کر لیا اور تولیت کعبہ کی خدمت عظیم ان کے سپرد کر دی (۱۲/۲۵)۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جس میں تمام آرام اور چین چھوڑ کر اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دینا تھا۔ یہی وہ قیمت جو ان سے ان کی جان کے عوض بطور فدیہ لی گئی تھی۔

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ فَآيِسَاسًا بَعْدُ وَإِمًا فِدَاءً۔ (۲۴/۲۴)۔ انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا ان کا معاوضہ لیکر (قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لیکر چھوڑ دو) بہر حال انہیں چھوڑنا ہوگا۔ لہذا جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا خیال قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا۔ اسے قرآن کریم نے اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک)

واضح رہے کہ فَآيِسَاسًا بَعْدُ وَإِمًا فِدَاءً سے یہ مراد نہیں کہ جنگ کے قیدیوں کو گرفتاری کے فوری بعد رہا کر دینا ہوگا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ تقاضائے حالات انہیں قید میں رکھا جاسکتا ہے (فَتَشَدُّ وَالْوَثَاقُ۔ ۲۴/۲۴) اس کے بعد جب انخان (غلبہ) حاصل ہو جائے تو پھر ان کی (Disposal) کا سوال سامنے آئیگا جس کا یہ تقاضائے حالات فیصلہ کیا جائیگا کہ انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لیکر۔

## ف ر ت

الْفُرَاتُ۔ نہایت شیریں پانی۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اسے فُرَاتُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (يَفْرُتُ الْعُطَشَ) پیاس کو تسکین دیتا ہے۔ اسکی تیزی کو توڑ دیتا ہے۔ سورہٴ مرسلات میں مَاءٌ فُرَاتَانَا (۲۴/۲۴) آیا ہے۔ سورہٴ فرقان میں عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵/۲۵) آیا ہے۔ یعنی بہت شیریں۔

\* تاج۔ راغب۔ محیط۔

## ف ر ث

آلْفَرْتُ\* - غذا جب وہ اوجھڑی کے اندر رہے\* - سورہ نحل میں ہے کہ تم دیکھو کہ جانور کے پیٹ میں فرث اور خون جیسی اشیاء میں سے کس طرح دودھ جیسی صاف اور لطیف غذا تیار ہوتی رہتی ہے - (۱۶۶) - ویسے آلْفَرْتُ\* ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ریزہ ریزہ ہو گئی ہو (ابن فارس) فَرَثٌ - اس نے بکھیر دیا - فَرَثَ الْحَبُّ كَبِيدَةً - محبت نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیے - لہذا فَرَثُ\* ، غذا کی وہ حالت ہے جس میں وہ معدہ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے - اہل لغت نے اس سے گوہر مراد لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد جانور کی خوراک کی وہ حالت ہے جس میں وہ ہضم ہونے کے لئے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے - (لین نے یہی تصریح کی ہے) -

## ف ر ج

آلْفَرُجُ\* وَالْفُرُجَةُ\* - دو چیزوں کے درمیان شکاف یا کشادگی\*\* - بَابُ مَفْرُوجٍ\* - کھلا ہوا دروازہ - تَفَارُجٌ\* الْأَصَابِعُ - انگلیوں کے درمیانی شکاف - آلْفَرُجُ\* - شرمگاہ ، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی - نیز ہر خطرہ کی جگہ -

قرآن کریم میں ہے - إِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ\* - (۹۶) جب آسمان پھٹ جائے گا - کھول دیا جائے گا - دوسری جگہ ہے - إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ\* (۸۴) ”جب آسمان شق ہو جائیگا“ - سورۃ قیامہ میں ہے مَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ\* (۵۶) - ان میں کہیں کوئی شکاف نہیں - مطلب نقص اور خرابی سے ہے - جیسا کہ دوسری جگہ ہے هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ\* (۷۴) - ”کیا تجھے کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے؟“

قرآن کریم میں حفاظت عصمت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے یہی الفاظ آئے ہیں - چنانچہ مردوں کے متعلق ہے - يَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ\* (۲۴) - اور عورتوں کے متعلق ہے يَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ\* (۲۴) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں - حضرت مریم کی پاک دامنی کا اظہار بھی انہی الفاظ سے کیا گیا ہے - وَالَّتِي أَحْصَيْنَتْ فُرُجَهَا\* (۲۱) جس نے اپنی عصمت کا تحفظ کیا -

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ فَرَحٌ مقام مخصوص ہی کو نہیں کہتے بلکہ عربی محاورہ میں یہ لفظ عصمت کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ برخلاف ہماری زبان کے جس میں فَرَحٌ کا لفظ صرف عورت کی شرم گاہ کے لئے آتا ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، ان کے ترجمہ میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

## ف ر ح

الْفَرَحُ - لسان میں ہے کہ یہ حَزَنٌ کی ضد ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ فوری یا عارضی لذت پر انشراح صدر کو کہتے ہیں۔ اور سُرُورٌ اس انشراح صدر کو جس میں دل کو فوری اور دیر پا دونوں قسم کا اطمینان حاصل ہو، لیکن کبھی (اس فرق کی رعایت کے بغیر) یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں \*۔ سورہ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔ فَبِذْذِ الْيَقِينَ فَتُفَرِّحُوا (۱۰/۵۸)۔ انہیں چاہئے کہ اس قرآن کریم کے ملنے پر خوشیاں منائیں۔

نیز اس کے معنی لاترانے کے بھی ہیں \*۔ سورہ نمل میں ہے۔ بَلْ أَنْتُمْ بِمَهْدٍ يَشْتِكُمُ تَفَرِّحُونَ (۲۱/۶۶)۔ تم اپنے اس تحفہ پر پڑنا ناز کرتے ہو (کہ یہ بہت بڑی چیز ہے)۔ سورہ قصص میں ہے کہ قارون سے (اسکی قوم کے لوگوں نے) کہا۔ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۲۸/۲۹)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اس میں اس اوچھے پن کے مظاہرے کی طرف اشارہ ہے جو کم ظرف انسان میں مال و دولت کے مل جانے سے پیدا ہو جاتا ہے۔

سورہ روم میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم نے کہیں ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا، جس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَالٍ يُفْتَرُونَ (۳۰/۳۲) ہر فرقہ اپنے مسلک پر اتراتا ہے اور مگن ہو رہتا ہے کہ یہی مسلک حق ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔ بس میرا فرقہ ناجی ہے باقی سب جہنمی ہیں۔

سورہ آل عمران میں یَفَرِّحُونَ بِهَا کے مقابلہ میں تَسْتَوُونَ آيا ہے (۳/۱۶۹)۔ یعنی برا لگنا۔ اور (۱۱/۱۶) میں اس کے مقابلہ میں يُنْكِرُونَ آيا ہے۔ یعنی ناگوار گزرنا۔ سورہ روم میں اس کے مقابلہ میں يَتَقَنَطُونَ آيا ہے (۳۰/۳۶)۔ ناامید ہو جانا۔ اور سورہ حدید میں تَتَأَسَوْنَ (۲۶/۵۶)۔ "افسوس کرنا"۔ اس تقابل سے فَرَحٌ کے معنی اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔



## فرد

الْفَرْدُ - تنہا - اکیلا - زَوْجٌ جوڑے کو کہتے اور ان میں سے ہر ایک فَرْدٌ ہوتا ہے - وہ چیز جس کی مثال و نظیر نہ ہو - نَاقِۃٌ فَرَادَۃٌ - وہ اونٹنی جو چراگاہ میں سب سے الگ اکیلی چرتی ہو - \* راغب نے کہا ہے کہ الْفَرْدُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہ ملائی گئی ہو - یہ لفظ وَتَرٌ سے عام اور وَاحِدٌ سے اخص ہے - مُنْفَرِدٌ کے معنی یکتا (دوسروں سے الگ) ہونگے - \* - سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا (۲۱۹) - اے میرے نشوونما دینے والے مجھے تنہا نہ چھوڑ - لیکن چونکہ انہوں نے اولاد کے لئے دعا مانگی تھی اس لئے یہاں اس کے معنی بے اولاد کے ہونگے - سورہ مریم میں ہے کَلَّمْنَاهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (۱۹) - یعنی اعمال کے ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے نتیجہ میں شریک نہیں ہو سکے گا - نہ ہی اس کا کوئی حمایتی ہوگا - (اسے ۹۵) میں دہرایا گیا ہے - قانون مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متاثر ہوتا ہے - اس سے نفس انسانی (Self) کی یکتائی (Uniqueness) اور انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ حریت (Freedom) اور یکتائی، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات ہیں - قرآن کریم میں ہے - وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فَرَادٰیۙ كَمَا خَلَقْنَاكُمْۙ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹۵) اور یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح انفرادیت لئے ہوئے آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا - اس میں انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے - انسان اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے اور بہت سے مال و اسباب کو ان کے حصول کا ذریعہ - لیکن ان اعمال کا اثر اسکی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال و اسباب اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے - قرآن کریم کا قانون مکافات ایک عظیم حقیقت ہے جسکی بنیادوں پر انسانیت کی ساری ہمارت اٹھتی ہے - ہر عمل کا اثر اس فرد کی اپنی ذات پر ہوتا ہے - اس میں سے نہ آپ کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو کر آسکتا ہے - یہ انسانی ذات کی انفرادیت کی دلیل ہے -

## ف ر ر س

الْفَرْدَسَةُ - وسعت اور فراخی - صَدْرٌ مُفْرَدٌ - وسیع اور کشادہ سینہ - رَجُلٌ فَرَادِسٌ - بڑی چوڑی چکلی ہڈیوں والا آدمی - الْفَرْدَوْسُ - کھانے میں برکت - ضیافت - کَرْمٌ مُفْرَدٌ - انگوروں کی بیلے جو ٹٹیوں پر چڑھائی گئی ہوں - فِرْدَوْسٌ - سرسبز وادی - باغ اور بستان جس میں ہر قسم کے درخت ہوں - اہل شام بستانوں اور انگوروں کے باغات کو فَرَادِیسُ کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ رومی یا سریانی ہے - لیکن ابن القطاع نے کہا ہے کہ یہ عربی ہے اور الْفَرْدَسَةُ سے مشتق \* -

قرآن کریم میں جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ (۱۸/۱) آیا ہے - یعنی وسیع اور فراخ ، سرسبز اور شاداب باغات - اس دنیا میں ایسا جنتی معاشرہ جس میں ہر قسم کی وسعتیں اور فراخیاں ، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں - اور اخروی زندگی میں ہر قسم کی وسعت اور شادابی -

## ف ر ر

الْفَرَّارُ - کسی چیز سے ڈر کر بھاگنا \*\* - دراصل اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھولنے (کشف) کے ہیں \*\*\* - فَرَّارٌ کے بنیادی معنی جانور کے دانتوں کو کھولنا ہے - اس سے اِفْتِرَارٌ کے معنی ہیں ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا \*\*\*\* - ممکن ہے کہ کھل جانے سے ، بھاگ جانے کے معنی لئے گئے ہوں -

الْفَرَّارُ - بھاگنے والے - فَرَّارٌ کی جمع ہے - (خود الْفَرَّارُ بھی واحد کے لئے مستعمل ہے) - کَتِيبَةُ فَرَّارٍ - شکست خوردہ فوج جو بھاگ اٹھے \*\*\* - قرآن کریم میں یہ لفظ بھاگنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے - سورہ کہف میں فِرَارًا (۱۸/۱) آیا ہے - سورہ مدثر میں ہے فَرَّاتٌ مِّنْ قَسْوَرَةٍ (۲۱/۲۱) - شیر سے ڈر کر بھاگے ہیں - سورہ نوح میں ہے فَلَمَّ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا (۲۱/۲۱) - مینے جتنا انہیں اپنی طرف بلایا یہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے - سورہ قیامت میں ہے أَيْنَ الْفَرَّارُ (۲۵/۲۵) - بھاگنے کی جگہ کونسی ہے ؟ یا بھاگ کر کہاں جانا ہے ؟ سورہ ذاریت میں ہے فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ (۵۱/۵۱) - اس کے معنی رجعت الی اللہ - یا قانونِ خداوندی کی طرف لوٹنے کے ہیں - (مزید تشریح ج - ع - کے عنوان میں دیکھئے)

\* تاج و محیط - \* تاج - \*\*\* محیط و ابن فارس \*\*\*\* راغب -

## ف ر ش

فَرَشٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو بچھانا - کسی چیز کو پھیلانا - چنانچہ اَلْفَرَشُ اس فرش کو کہتے ہیں جو گھروں میں بچھایا جائے ، نیز کھیتی جو زمین پر خوب پھیل جائے - اور وسیع اور کشادہ فضا کو بھی - اَلْفَرَشُ اس بیل کو کہتے ہیں جو زمین پر پھیل جاتی ہے \* - اَلْفَرَاشَةُ اُڑنے والے کڑے مکوڑے کو کہتے ہیں (مثلاً پروانہ - تلی وغیرہ) - اَلْفَرَاشُ اسکی جمع ہے - (اَلْفَرَاشُ) - فِرَاشٌ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو بچھائی جائے \* -

سورة انعام میں ہے - وَمِنْ اَلْاَنْعَامِ حَمُولَاتٌ وَّ فَرَشَاتٌ (۱۶۶) - فراء نے کہا ہے کہ اس میں حَمُولَاتٌ سے مراد ایسے جانور ہیں جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے قابل ہوں اور فَرَشَاتٌ سے مراد وہ چوپائے ہیں جو اس قابل نہ ہوں - \* صاحب محیط نے کہا ہے کہ فَرَشَاتٌ سے مراد چھوٹی عمر کے اُونٹ ہیں \*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو ذبح کرنے اور کھانے کے لئے ہی سوزوں ہوں -

سورة رحمن میں ہے مُتَّكِئِينَ عَلٰی فُرُشٍ (۵۵) - یہ فِرَاش کی جمع ہے - یعنی بچھائی ہوئی چیزیں - سورة ذاریت میں ہے - وَاَلَا رَضَ فَرَشْنٰهُنَّا (۵۸) - ہم نے زمین کو پھیلا رکھا ہے - سورة واقعه میں ہے - وَفُرُشٍ مَّرْقُوعَةٍ (۵۶) - یہاں فُرُشٌ سے مراد پیگمات ہیں - اور مَرْقُوعَةٍ کے معنی ہیں عالی مرتبت -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْفِرَاشُ ، میاں بیوی میں سے ہر ایک کو کہتے ہیں ، لیکن اس کا صحیح انطباق بیوی پر ہوتا ہے -

## ف ر ض

اَلْفَرَضُ کے بنیادی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں - چونکہ جس چیز کو کاٹا جاتا ہے اس کا پہلے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسے کہاں سے اور کیسے کاٹنا چاہئے اس لئے یہ لفظ اندازہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا - اندازہ کرنے کے اعتبار سے اَلْفَرَضُ مَقْرَرٌ حصہ کو کہتے ہیں - نیز ہر وہ چیز جسے معین و مقرر کر دیا جائے - اَفْرَضَ لَہُ - اس کے لئے کسی چیز کو معین و مقرر کر دیا - فَرَضَ لَہُ فِی الْیَدِیْہِیْہِ - اسکی

تنخواہ کا رجسٹر میں اندراج کیا۔ اِفْتَرَضَ الْجُنْدُ - فوج نے اپنی تنخواہ یا واجبات وصول کر لئے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ چونکہ کاٹنے سے چیز نشان زدہ اور متعین ہو جاتی ہے اس لئے اِفْتَرَضَ ض\* کو فرض اسی جہت سے کہا جاتا ہے کہ اس کے حدود اور نشانات متعین ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں عورتوں کے مہر کے لئے فَرَرِ يَضَّةٌ کا لفظ آیا ہے (۲۳۶)۔ کیونکہ اس کی متعینہ مقدار اپنے اوپر لازم کر لی جاتی ہے۔ ترکہ کے حصہ کو نَصِيْبًا مَقَرُّوْضًا (۲) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی مقررہ حصہ ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں جہاں صدقات کی تقسیم کا اصول بیان ہوا ہے اسے فَرَرِ يَضَّةٌ مِّنَ اللّٰهِ (۹) کہا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اصول تقسیم۔ سورہ نور میں ہے سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا - (۲۴)۔ وہ سورہ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور اس میں درج شدہ احکام کو فرض ٹھہرایا گیا۔ لیکن یہ چیز کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ سارے کاسارا قرآن اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْفَرٰۤءَانَ (۲۸)۔ بے شک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کو فرض قرار دیا ہے۔ یعنی یہ فرض قرار دے دیا ہے کہ اس کے تمام احکام ہر پورا پورا عمل کیا جائے۔

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے۔ لَا فَرٰضٌ وَلَا بَیْکَرٌ (۱۸)۔ بیکر جوان کو کہتے ہیں۔ یا چھوٹی عمر والی کو۔ اس لئے فَرٰضٌ کے معنی ہوئے بڑی عمر والی۔ معمر و سن رسیدہ۔ جوہری نے کہا ہے کہ بڑی چیز یا ہر پرانی چیز کو فَرٰضٌ کہتے ہیں، کیونکہ اسی درخت کو کاٹا جاتا ہے جو پرانا اور بڑا ہو چکا ہو\*۔

قرآن کریم نے جس کام کے کرنے کا حکم دیدیا ہے وہ فرض ہے اور جس سے روک دیا ہے وہ ممنوع ہے۔ لہذا فَرٰضٌ کے ساتھ دوسری اصطلاحات (مثلاً واجب۔ مستحب وغیرہ)۔ یا دوسری طرف، حرام کے ساتھ اس قسم کے اصطلاحات (مثلاً مکروہ تحریمی۔ مکروہ تنزیہی وغیرہ) فقہ کی اصطلاحات ہیں، قرآنی نہیں۔

سورہ تحریم میں ہے قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَکُمْ تَحِلِّیَّةً اَیْمَانِکُمْ (۱۱)۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ اس قسم کی قسمیں جن میں حلال کو حرام کر لیا ہو، (کفارہ دیکر) توڑ دی جائیں۔ سورہ احزاب میں ہے مَا کَانَ عَلَی السَّیِّئِیْنَ مِّنْ حَرَجٍ فَاَیْمَانُ اللّٰهِ لَہُ (۳۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ نے رسولؐ کے لئے مہین

کر دیا ہو ان میں درحقیقت کوئی تنگی نہیں - واضح رہے کہ یہ ایک عمومی بات ہے (جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے) - اس کا سابقہ آیت (قصہ حضرت زیدؓ) سے خصوصی تعلق نہیں -

## ف ر ط

فَرَطٌ - اس مادہ میں اصل معنی سبقت کرنے اور آگے بڑھ جانے کے ہیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اسکی جگہ سے ہٹا دینے اور ایک طرف کر دینے کے ہیں - سبقت کرنے والا، دوسروں کو پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھتا ہے - الْفَرُطُ - تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے بڑھ جائے \*\* - الْفَرَاطُ اور تَفَرُّطٌ میں فرق یہ ہے کہ الْفَرَاطُ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو زیادتی اور کمال کی سمت میں ہو، اور تَفَرُّطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو کمی کی جہت میں ہو \* - فَرَطٌ عَلَيْهِ کے معنی ہیں کسی پر زیادتی کی - جلدی میں اسکے ساتھ ناروا سلوک کیا \*\* - قرآن کریم میں ہے - اِنَّا نَخَافُ اَنْ يَفْزُقَنَا عَنْ يَتِينِنَا (۱۱۴) - ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے - اسکے برعکس فَرَّقٌ کے معنی ہیں کسی بات میں کمی کرنا - کوتاہی کرنا - اسے ضائع کر دینا - صاحب لطائف اللغة نے بھی کہا ہے کہ فَرَّقٌ کے معنی ہیں کمی کرنا - اور اَفْرَقٌ کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا - قرآن کریم میں ہے قَالُوا يَلْعَنُ رَبُّنَا عَلٰى مَا فَرَّقْنَا فِيْهَا (۱۱۵) - وہ کہیں گے ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم نے (قانون مکافات کے صحیح اندازہ لگانے میں) کس قدر کمی کی - فَرَّقٌ اور اَفْرَقٌ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کا خیال تک نہ کیا جائے - فَرَّقَتِ السَّخْلَةُ - کھجور اور اسکے خوشے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا - اَفْرَقَ الْاُمَرَاءُ - وہ اسبات کو بھول گیا - اس نے اس بات کو چھوڑ دیا \* - قرآن کریم میں ہے وَ اِنَّهُمْ مُّفْرَقُونَ (۱۱۶) - اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونگے - یعنی دوسرے لوگ ان سے آگے بڑھ جائیں گے - جنت اور جہنم میں یہ بنیادی فرق ہے - یعنی جنت میں انسان زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور جہنم میں انسان کی نشوونما رک جاتی ہے - اور وہ متحرک کی بجائے جامد ہو جاتا ہے اَلَا مَرُّ الْفَرُّطِ - وہ بات جس میں آدمی حد سے بڑھ جائے \* - قرآن کریم

میں ہے و کَانَ آمْرُهُ فَرْطًا (۱۸)۔ اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔  
راغب نے کہا ہے کہ الْفَرْطُ - قصداً آگے بڑھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی  
اس میں مقصد اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے۔\*\*

سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ زمین ہر چلنے والے جانور اور ہوا میں  
اڑنے والے پرندے، تمہاری ہی طرح اسم ہیں۔ اس کے بعد ہے مَا فَرْطْنَا  
فِي الْكِتَابِ مِثْلَ شَيْءٍ (۲۹) ”ہم نے کتاب میں کسی شے کی کمی  
نہیں چھوڑی“۔ مباحی کے اعتبار سے یہاں الکتاب سے مراد، کتاب فطرت  
ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد خود قرآن کریم ہے تو بھی بات  
بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان ہوا ہے مکمل طور پر بیان  
ہوا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں رکھی گئی۔ اسکی تائید کئی ایک دیگر  
مقامات سے بھی ہوتی ہے۔

## ف ر ع

فَرْعٌ مَكْلٌ شَيْءٌ - ہر چیز کے بلند ترین حصے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ  
الْفَرْعَةُ - پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ فَارِعَةُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا بلند  
ترین حصہ\*۔ بلندی کے علاوہ لمبائی کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔  
چنانچہ الشَّفْرَعُ - ہر لمبی چیز کو کہتے ہیں\*۔ فَرْعُ الشَّجَرِ -  
درخت کی شاخ کو کہتے ہیں\*\*، اس لئے کہ وہ اصل (جڑ) کے مقابلہ میں  
اونچی ہوتی ہے اور ویسے لمبی بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے  
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴)۔ اسکی جڑ مضبوط و محکم  
ہے اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوتی ہیں۔

## فرعون

قدیم شاہان مصر کا لقب۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”موسیٰ“۔

## ف ر غ

فَرْغٌ - فَرْوُغًا - خالی ہونا۔ فَارِغٌ - خالی\*۔ وَ أَصْبَحَ فَرْوَادٌ  
أَمَّ مَوْسَى فَرْوَا - (۲۸) موسیٰ کی والدہ کا دل صبر سے خالی ہو گیا۔  
(بیچین ہو گیا)۔ فَرْغَ لَهُ وَ لَيْتَهُ - ہر طرف سے فارغ ہو کر کسی کی  
طرف توجہ دینا یا اس کام کا ارادہ کرنا\*۔ سورہ رحمن میں سَنَفَعُكُمْ لَكُمْ أَقْبَهُ الثَّقَلَانِ (۵۵)  
آیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اے ثقلان جب تمہاری باری آئیگی تو تمہاری طرف  
توجہ کرینگے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کام میں اس طرح مصروف ہے کہ

قدیم شاہان مصر کا لقب۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”موسیٰ“۔

\* تاج - \*\* راغب -

الْفِرَاقُ - ڈول کی وہ سمت جدھر سے ہانی انڈیلا جاتا ہے \* - اَفْرَاقٌ  
انڈیلنا - بھانا \* - اَفْرَاقٌ عَلَيْنَا صَبْرًا (۱۴۶) - ہم پر ہمت و استقامت  
فراوانی سے انڈیل دے - اَلْفِرَاقُ - چمڑے کا بڑا وسیع حوض یا برتن \* -

سورة الانشراح میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ اب جو تجھ سے ان  
تمام تفکرات کو دور کر دیا گیا ہے جن سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی (یعنی  
نظام خداوندی کے متشکل کرنے کی راہ میں جو مشکلات تھیں انہیں آسان کر  
دیا گیا ہے) تو اب اپنے پروگرام پر جم کر عمل کر - فَارَاقَتْ فَانْصَبَ  
(۱۴۶) - یعنی آپ کے پروگرام کا پہلا حصہ جس میں قدم قدم پر مزاحمت ہوتی تھی،  
اور اس لئے تعمیری کاموں کے لئے یکسوئی نہیں ملتی تھی، ختم ہو گیا ہے -  
اب پورے اطمینان کے ساتھ اس پروگرام کے تعمیری حصہ پر تمام توجہات کو  
مرکوز کر دیں - عام قاعدہ یہ ہے کہ جب مشکلات کا دور ختم ہو جاتا ہے تو  
پھر انسان اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے - لیکن نظام خداوندی میں کیفیت یہ ہوتی ہے  
کہ جب تخریبی پروگرام کے ابتدائی مراحل ختم ہوتے ہیں اور مخالفتوں پر  
قابو پا لیا جاتا ہے تو پھر اس پروگرام کا تعمیری حصہ شروع ہوتا ہے - اور  
اس میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے - یہ تعمیری پروگرام، پوری  
انسانیت کی نشو و نما پر مشتمل ہوتا ہے - یہ کوئی چھوٹا کام نہیں -

## ف ر ق

الْفَرَقُ - سر کی سانگ جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے  
سے الگ ہو جاتے ہیں - یہ ہیں اس کے بنیادی معنی - ابن فارس نے کہا ہے کہ  
اس مادے کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا اور الگ کر  
دینا ہیں - اَلْمَفْرَقُ - مانگ نکالنے کی جگہ - اَلْمَفْرَقُ الطَّرِيقُ - راستہ  
کی وہ جگہ جہاں سے اس میں سے نیا راستہ پھٹتا ہو - اَلْفَارَقُ - وہ بدلی جو  
دوسری چھائی ہوئی بدلیوں سے الگ ہو کر برے - اَرْضُ فَرَقَةٍ - وہ زمین  
جس کے پودے ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں \* -

اس اعتبار سے اَلْفَرَقُ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کرنا - فیصلہ  
کرنا - بات کو واضح طور پر الگ الگ کر کے بیان کرنا - فَارَقَ لَهْ  
الطَّرِيقُ - اس کے لئے دو راستوں میں سے صحیح راستہ واضح ہو گیا - فَرَقَ  
لَهْ اَسْرًا - بات واضح ہو گئی اور اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی \* -  
فَرَقَهْ - اسے الگ کیا -

الْفَرَقُ\* اور الْفَرَقُ\* - ایک پیمانے کو کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا - اس سے فَمَرَقَ کے معنی ہیں اس نے پیمانے (برتن) سے پانی پیا\* - الْفَرِيقُ\* - اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو جائے - تَفَرَّقَ\* کے معنی ہیں فساد کی غرض سے الگ الگ کر دینا - انتشار و تفرق پیدا کر دینا\* - الْفِرَقُ\* - الگ ہو جانے والا ٹکڑہ (۲/۲۴) - الْفِرَقَةُ\* - جماعت - گروہ (۱۱/۲۲) -

قرآن کو فَرْقَانُ\* - کہا گیا ہے (۳۰/۳) - اس اعتبار سے کہ یہ غلط اور صحیح (حق و باطل) کو بالکل الگ الگ کر دیتا ہے - اور یا اس لئے کہ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر شے کی قیمت ماپی جاتی ہے - یعنی مستقل اقدار کا مجموعہ - کتاب موسیٰ\* کو بھی فَرْقَانُ\* کہا گیا ہے - (۲۵/۵ و ۲۸/۲) - خدا کی وحی فَرْقَانُ\* ہوتی ہے - یعنی وہ حق و باطل میں فرق کر دیتی ہے - يَسُوْمُ الْفَرْقَانَ (۸۱/۴) - اس سے جنگ بدر کا دن مراد لیا جاتا ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا -

سورة انفال میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی تو يَجْعَلُ لَّكُمْ فَرْقَانًا (۸۱/۴) - اللہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا - مومن ، دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے کے لئے آتا ہے - ایسی بلند کردار کی زندگی جسے دیکھ کر ہر شخص ہکا بکا اٹھے کہ یہ عام انسانوں سے ممتاز انسان ہے - مومن کی زندگی ، حق و باطل میں امتیاز کا معیار ہونی چاہئے - دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان - قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملت واحدہ) بنایا ہے - اسی جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود، قرآن کریم کے واضح الفاظ میں شرک ہے (۳۰/۳) - اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں (۳۴/۳۴) جن سے اللہ اور رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا - (۱۶/۱) - قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی - وحدت خالق کا عملی ظہور وحدت امت (بلکہ وحدت انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے - لہذا جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ امت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے - امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے - امت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے ، اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں ، اور یہ شرک ہے -



سورة توبہ میں قَوْمٌ \* يَفْتَرِقُونَ \* آیا ہے (۵۶)۔ راغب نے فَرَقَ \* کے معنی خوف سے دل کا منتشر ہونا کئے ہیں۔ یعنی خوف سے بدحواس ہو جاتے ہیں \*۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوف زدہ لوگ ہیں جن سے امن نے مفارقت کر لی ہو۔

فَارَقَ - چھوڑ دینا - علیحدہ ہو جانا - قَارِ قَوْمُهُنَّ (۵۶) - ان سے الگ ہو جاؤ۔

## ف ر لا

فَرَّهَ - يَفْرَهُ - حاذق اور ماہر ہونا - چست اور پھرتیلا ہونا - حسین و جمیل ہونا - اس سے اسم فاعل قَارِهٌ \* آتا ہے ، اس کی جمع قَارِرٌ \* اور قَارٍ \* ہیں - الَفَارِ هَةٌ - حسین و ملیح نوجوان لونڈی - نیز بہت زیادہ کھانے والی کو بھی کہتے ہیں - فَرَاءَ نے کہا ہے کہ فَرَّهَ \* میں ہاء دراصل حاء کی جگہ ہے - یعنی فَرَّحَ - جس کے معنی اکڑنا اور اترا کر چلنا ہیں \*\*۔ قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے وَ تَنَحَّيْتُونُ مِّنَ الْجِبَالِ بِمُوتًا فَرَّهِيْنُ (۲۶۹) - اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تم بڑی مہارت سے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں محلات اور قلعے بناتے ہو ، اور دوسرے معنی یہ کہ تم پہاڑوں میں اتنے اتنے بڑے مکانات بناتے ہو جن پر تمہیں خاص طور پر فخر ہوتا ہے - اور اگر دونوں معانی کو یک جا سامنے رکھا جائے تو اس سے مراد ایسی حسین و جمیل عمارات ہونگی جنہیں نہایت صنعت کاری اور فخر کے ساتھ بنایا جائے۔

## ف ر ی

الْفَرَى \* - کھال (یا کپڑے) کو کاٹنا (یا پھاڑنا) ، درست کرنے اور سینے کے لئے - اور اَلْفَرَاءُ \* - اسے خراب کرنے کے لئے کاٹنا یا پھاڑنا - اَلْفَرَاءُ \* - کتربیونت کر کے کچھ کا کچھ بنا دینا - یہ اصلاح اور فساد دونوں کے لئے آتا ہے ، لیکن اس کا زیادہ استعمال خرابی ہی کے معنوں میں ہوتا ہے \*\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں افتراء جھوٹ ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔

الْفَرَى \* - گھڑی ہوئی بناوٹی بات - عظیم اور اہم بات - نیز حیرت انگیز اور عجیب سی بات کو کہتے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں هُوَ يَفْرَى \* الْفَرَى \* -

\* راغب - \*\* تاج و محیط و راغب - \*\*\* تاج و راغب

وہ حیرت انگیز اور تعجب خیز کام کرتا ہے \*۔ سورۃ مریم میں ہے کہ ہیکل کے پیشواؤں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۱۶۶)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ تو نے یہ عجیب حرکت کی ہے کہ رسم و آئین خانقاہیت کے خلاف راہبہ بن کر متاہل زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ اور دوسرے معنی یہ کہ انہوں نے خود حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کہا کہ وہ عجیب و غریب سا بچہ ہے جسے حضرت مریمؑ لے کر آئی ہے۔ اَلْفَرَى - حیران اور مبہوت ہو جانے کو کہتے ہیں (ابن فارس)۔ اَلْمُفْتَرِی - افتراء کرنے والا۔ کتیریونت کر کے کچھ کا کچھ بنا دینے والا۔ قَالُوا لَإِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ (۱۶۶)۔ اور مُفْتَرٍ (۲۸۶) بنایا ہوا۔ افتراء کیا ہوا۔ اَلْمُفْتَرِی عَلٰی - کسی کے خلاف بہتان تراشنا۔ کوئی بات خود وضع کر کے اسے کسی اور کی طرف منسوب کر دینا۔ (۳۳۰)۔

## ف ز ز

فَزَقْنَا عَنْ مَوْضِعِهِم - فلان آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔ فَزَقْنَا عَنْهُمْ - وہ اس سے الگ ہو گیا۔ ایک طرف ہٹ گیا۔ فَزَقْنَا الظَّالِمِی - یَفِزُّ - ہرن گھبرا گیا \*۔ اِسْتَفَزَّہُ - اسے اس کے گھر سے نکال دیا اور بے قرار کیا۔ اسے ہلکا اور بے وزن سمجھا، یا اسے ہلایا اور اپنے ساتھ رکھنا چاہا۔ اِسْتَفَزَّہُ الْخَوْفُ - اسے خوف نے پریشان کر دیا، اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور اپنے ساتھ لئے لئے بھرا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے کے ہیں۔ لہذا اس لفظ کے معنوں میں دل کا اضطراب بھی شامل ہے اور محسوس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانا بھی۔ ہلکا ہو کر اپنے مقام سے اکھڑ جانا دونوں میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی کسی کو گڑبڑا دینا اور اس طرح اسے اس کے مقام سے اکھیڑ دینا۔ قرآن کریم میں ابلیس سے کہا گیا ہے کہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ (۱۶)۔ ان میں سے جس پر تیرا زور چل سکے اسے گڑبڑا کر اس کے صحیح مقام (یا راستہ) سے ہٹا دے۔ فرعون کے متعلق ہے۔ فَاَرَادَ اَنْ یَسْتَفِیْزَہُمْ مِّنْ الْاَرْضِ (۱۶۰)۔ اس نے چاہا کہ انہیں گڑبڑا کر ان کے مقام سے اکھیڑ ڈالے \*\*۔ نیز اس کے معنی کسی کی تاک میں رہنے اور دھوکہ دے کر اسے ہلاکت میں ڈال دینے کے بھی آتے ہیں \*\*\*۔

\* تاج و محیط۔ \*\* تاج و راغب۔ \*\*\* تاج۔

## ف ز ع

الْفَزَعُ \* گھبراہٹ۔ ڈر۔ بیٹرد نے اپنی کتاب کامل میں لکھا ہے کہ اصل میں فَزَعٌ \* خوف کہہ رکھتے ہیں۔ پھر کنایۃً دشمن وغیرہ کے اچانک حملہ سے مدافعت کے لئے لوگوں کا تیزی سے باہر نکلنا بھی فَزَعٌ \* کہلانے لگا۔ \* راغب نے کہا ہے کہ فَزَعٌ \* اس انقباض اور وحشت و پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک چیز کی وجہ سے واقع ہو \*\*۔ اَلْفَزَعُ \* کسی سے فریاد کرنا۔ اور کسی کی فریاد رسی کرنا۔ دونوں معنی آتے ہیں (اضداد میں سے ہے)۔ فَزَعٌ اَلَيْسَ بِهِمُ \* اس نے ان سے فریاد کی۔ مدد مانگی۔ فَزَعَهُمُ \* اس نے ان کی مدد کی۔ ان کی فریاد رسی کی۔ اَفَزَعَهُمُ \* کے بھی بھی معنی ہیں۔ نیز اس کے معنی انہیں ڈرایا اور ان سے ڈر کو دور کیا، بھی ہیں۔ فَزَعَهُ \* اس نے اسے ڈرایا اور گھبرا دیا۔ فَزَعٌ عَنَّهُ \* اس سے خوف اور گھبراہٹ کو دور کر دیا \*۔ (یعنی اس میں سلب ماخذ کا خاصہ ہے)

قرآن کریم میں ہے لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ (۲/۱۳۱)۔ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں کبیدہ خاطر نہیں کر سکیگی۔ سورۃ النمل میں ہے۔ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ اَمِينُونَ (۲/۸۹)۔ وہ اس دن گھبراہٹ سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اسی سورۃ میں ہے۔ فَفَزَعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ (۲/۸۴)۔ کائنات کی ہر چیز گھبرا اٹھیگی۔ سورۃ سبا میں ہے۔ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ (۳۳/۳۳)۔ جب ان کے دل سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی۔

## ف س ح

الْفَسْحَةُ \* الْفَسْحَةُ \* وسعت اور فراخی۔ فَسَحَ الْمَكَانُ \* جگہ وسیع ہو گئی۔ اَلْفَسْحُ صَدْرُهُ \* اسکا سینہ کھل گیا۔ انشراح صدر ہوا۔ فَسَحَ لَهُ فِي الْمَجْلِسِ \* اس نے محفل میں اس کے لئے جگہ کر دی \*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا قِيلَ لَهُ كُفُّوا فَاُفْسِحْ لَكُمْ فِي الْمَجْلِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ (۵۱/۵۱)۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھ جایا کرو۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی اور وسعت پیدا کر دے گا۔

## ف س د

فَسَادَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا مضمحل ہو جانا۔ اس کا اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہنا۔ لَحْمٌ فَاسِدٌ اس گوشت کو کہتے ہیں جو گل سڑ کر بدنودار ہو گیا ہو اور کسی کام کا نہ رہا ہو۔ فَسَادٌ درحقیقت صَلَاح کی ضد ہے۔ صَلَاح کے معنی ہیں حالات کا مستقیم و متوازن رہنا۔ لہذا فَسَاد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہو جانا\*۔ [اس کے واضح مفہوم کے لئے ص۔ ل۔ ح کا عنوان دیکھئے کیونکہ جب تک صَلَاح کا صحیح تصور ذہن میں نہ آئے اس کی ضد (فَسَاد) کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا]۔

قرآن کریم نے مُفْسِدِیْنَ کے مقابلہ میں مُصْلِحِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے (۲/۱)۔ حرث و نسل کے تباہ کر دینے کو بھی فَسَاد قرار دیا ہے (۲/۵)۔ باپ تول کو پورا نہ رکھنا۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا۔ معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا۔ یہ سب فَسَاد ہے (۲/۸۵)؛ (۲/۱۸۳)۔ صالح نظام کو درہم برہم کر دینا۔ صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَاد ہے (۲/۸۵)۔ ارتکاب جرم کو بھی فَسَاد سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۱۸۳)۔ فَسَاد درحقیقت معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہونے کا نام ہے، خواہ اسکی شکل کوئی بھی ہو۔ اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ (۲/۸۵)۔ نیز ”حکمت فرعونی“ کا بھی یہی شیوہ ہوتا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کر کے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رہیں (۲/۸۵)۔ منشاۓ خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ہے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے۔ (۲/۸۵)۔

سورہ شعراء میں مُسْرِفِیْنَ کو مُفْسِدِیْنَ کہا گیا ہے (۲۶/۵۴) اور سورہ قصص میں یہ لفظ آحْسَن کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۶/۸)۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ ملائکہ نے کہا کہ آدم ارض میں فساد مچائے گا اور خوں ریزیاں کریگا۔ اس کے برعکس، نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (۲۶/۲)۔ ہم تیری مشیت کے ہر و گرام کو سزاوار حمد و ستائش بنانے کے لئے ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے جہانتک بھی جانا پڑے جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ نے جو پروگرام انسانوں کے لئے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے، اسکی خلاف ورزی کرنا فساد\* ہے۔ اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بد نظمی (Disorder)۔ کائنات کا یہ عظیم القدر اور مجیر العقول سلسلہ اس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے۔ اگر اس میں متعدد ”خداؤں“ کا اقتدار کار فرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۲)۔ انسانی زندگی بھی اسی حسن و خوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطہ\* واحد کے ماتحت بسر کی جائے۔

## ف س ر

الْفَسْرُ\* - واضح کرنا۔ چھپی ہوئی چیز کو کھول دینا۔ فَسَّرَ\* - يَفْسِرُ\* اور يَفْسُرُ\* - واضح کرنا۔ فَسَّرَ\* کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن اس میں مبالغہ کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اَلتَّفْسِيرَةُ\* - فارورہ کا امتحان (Test) کرنا\*۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق کہا ہے وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۲۵)۔ اسکی نہایت عمدہ وضاحت اور تشریح خود خدا نے کر دی ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَذِيبَتَنَا بَيِّنَاتٌ (۶۹) اسے ظاہر اور واضح کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر و توضیح، تصرف آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی ایک بات کو مختلف آیات میں پھیر پھیر کر بیان کرنے سے۔ (۶۵، ۶۶)۔ اس لئے قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے ہوگی۔ اور اس کے دعاوی کی تائید اور شہادت کائنات کے نظم و نسق اور تاریخی شواہد سے۔ یا اس کے نظام کو عملاً متشکل کرنے سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں، ان سے۔

## ف س ق

فَيْسُقُ\* - دائرہ حق سے باہر نکل جانا۔ فَسَقَتِ السَّرَّاطِيَةُ عَنْ قَيْشَرَ\* ہٹا۔ گدڑی کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل گئی۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ پھل نشوونما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے (یہی صورت ہر پھل کے ساتھ ہوتی ہے)۔ وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (Pattern) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے

چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنی پختگی تک نہیں پہنچتا۔  
 عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے فَسَقَتْ الرَّطَبَةَ عَنِ قِشْرِهَا  
 کہتے تھے۔ جاہلیت عرب میں یہ لفظ اسی مفہوم کے ادا کرنے کے لئے بولا  
 جاتا تھا۔ انسانوں کے لئے نہیں بولا جاتا تھا\*۔ قرآن کریم نے اسے انسانوں  
 کے لئے استعمال کیا۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا زندگی کا قالب  
 عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح نشو  
 و نما ہو جاتی ہے۔ جو فرد (یا گروہ) اس نظام کے قالب سے باہر نکل جائے  
 اسے فاسق کہتے ہیں۔ اس کی صحیح نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہر شخص  
 جو قانونِ خداوندی کے دائرے سے باہر نکل جائے وہ فاسق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں  
 یہ لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے وہاں اسکی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ الَّذِينَ  
 يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِمْ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ  
 بِهِ أَنْ يُوْصَلَ وَ يَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ (۲۶-۲۷)۔ یعنی فاسقین وہ  
 ہیں جو اللہ سے پختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کو ملانے کا  
 خدا نے حکم دیا ہے (یعنی نوعِ انسانی کا رشتہ) اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے  
 کر دیتے ہیں۔ اور انسان کی تمدنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔  
 اسی طرح ذرا آگے چل کر ظَالِمِينَ کو بھی فاسقین کہا گیا ہے  
 (۲۹)۔ اور کَافِرِينَ کو بھی (۹۰)۔ نیز معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے گریز  
 کی راہیں نکالنے والوں کو بھی (۸۱)۔ سورۃ المائدہ میں فِسْق کا لفظ احکام  
 خداوندی کی خلاف ورزی کے لئے بولا گیا ہے خواہ وہ حکم چھوٹا ہو یا بڑا  
 (۳۰)۔ یعنی ہر مجرم فاسق ہے۔ اس لئے کہ کبھی کبھار کے چھلکے میں ذرا  
 سا شگاف بھی پھل میں نقص پیدا کر دیتا ہے۔ مومن اور فاسق ایک دوسرے  
 کی ضد ہیں۔ (۳۰-۳۱)۔

سورۃ بقرہ میں ہے۔ ”لَا فَسْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ“۔  
 (۲۷)۔ اسکے عام معنی گالی گلوچ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم یہی  
 ہے کہ حج میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کرنی چاہئے جس سے انسان صحیح  
 راستے سے ذرا بھی اُدھر اُدھر ہو جائے۔ ایک دوسرے سے سخت کلامی اور  
 منب و شتم بھی اس کے اندر آجاتے ہیں۔

## ف ش ل

فَشِيلَ - يَفْشَلُ - کمزور اور بزدل ہو جانا\*۔ اصل میں الْفَيْشَلُ  
 ہودج کے پردے کو کہتے ہیں جس کے پیچھے ہورتیں بیٹھتی ہیں، یا وہ گدا  
 \* تاج و محیط۔

جسے ہودج میں بچھا کر اس پر عورتیں بیٹھتی ہیں۔ اسلئے فُتْشِلَ کے معنی ہوئے عورتوں کی طرح بزدل ہو جانا۔ اَلْیَمْدُ الْفُتْشَلَاءُ۔ بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں جو عموماً (دائیں کی نسبت) کمزور ہوتا ہے۔ \*\*۔ (یہ عوام کی بولی ہے، فصیح نہیں)۔ اس لئے فُتْشِلَ میں کمزوری کے ساتھ بزدلی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ \*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا (۸/۶)۔ آپس میں چھینا جھپٹی (تنازع اور جھگڑا) مت کرنے لگ جاؤ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ گے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ تَفْشَلُ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہ پڑا۔ اس سے بھی کمزوری اور عدم استحکام کا مفہوم واضح ہے، یعنی قوتوں کے بیکار ضائع ہو جانے سے کمزور ہو جانا۔

## ف ص ح

اَلْفَصْحُ۔ واضح اور ظاہر ہونا۔ ائمہ اشتقاق نے کہا ہے کہ اس ترکیب میں ”ظہور“ یعنی ظاہر ہونے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ایسی زبان جس سے مطلب بالکل ظاہر اور واضح ہو جائے فَصِيحٌ کہلائیگی۔ نیز وہ آدمی بھی فَصِيحٌ کہلائیگا جو بات کو واضح اور کھول کر بیان کرے اور اس کے بیان میں کوئی نقص اور خامی نہ ہو۔ اَلْفَصَاحَةُ بات کا واضح اور صاف ہونا۔ خوش بیانی۔ اَفْصَحَتِ الشَّاةُ۔ (پیوسی۔ یعنی بچہ دینے کے بعد ایک دو دن تک جس قسم کا دودھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد) بکری نے صاف دودھ دیا۔ اَفْصَحَ الصَّبِيحُ۔ صبح روشن اور نمودار ہو گئی۔ فَصْحٌ اس دودھ کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر سے جھاگ اتار کر بالکل صاف کر لیا جائے۔ اس لئے کسی چیز کو ان چیزوں سے صاف کر دینا جو اس میں بالعموم مل جاتی ہیں اَلْفَصْحُ کہلاتا ہے۔ \*\*\*\*۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کا قول (حضرت ہارونؑ کے متعلق) ہے۔ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّي (۲۸/۲)۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

## ف ص ل

اَلْفَصْلُ۔ دو چیزوں کے درمیان روک جو یہ بتا دے کہ یہاں تک پہلی چیز ختم ہو گئی اور اسی کے بعد دوسری چیز شروع ہو گئی (لِطَائِفِ اللُّغَةِ)۔

\*تاج۔ \*\*محیط۔ \*\*\*راعب۔ \*\*\*\*تاج و محیط و راعب۔

دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح الگ کر دینا کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور اس طرح ایک دوسری سے الگ اور متمیز ہو جائے\*۔ اَلْفَاصِلَةُ\*۔ اس موقی کو کہتے ہیں جو دو موتیوں کے درمیان امتیاز کے لئے ڈال دیا جائے۔ اَلْمَفَصِّلُ\*۔ جسم کے جوڑے۔ نیز پہاڑوں کے درمیان کی جگہیں جن سے پانی بہتا ہے۔ فَصْلُ الْخِطَابِ (۱۱۴)۔ فیصلہ کن بات۔ اَلتَّفْصِيلُ\*۔ جدا جدا کر دینا۔ واضح کر دینا، متمیز کر دینا۔ آیات مَفْصَلَات\*۔ واضح آیات۔ اَلْاِنْفِصَالُ\*۔ انقطاع۔ جدا ہو جانا۔ فیصال\*۔ بچے کا دودھ چھڑانا\*۔ (۱۱۴)۔ فَصْلُ الشَّيْءِ\*۔ چیز کو الگ الگ حصوں میں متمايز کر دینا۔ فَصْلُ الْكِتَابِ\*۔ کلام کو واضح کر دینا۔ کھول کر بیان کر دیا\*۔ فَصِيلَةُ الرَّجُلِ\*۔ خاندان (۱۱۴)\*۔ فَصْلٌ مِّنَ الْبَلَدِ\*۔ وہ شہر سے روانہ (جدا) ہو گیا\*۔ (۱۱۴)۔

قرآن کریم کے متعلق تَفْصِيلُ الْكِتَابِ (۱۱۴)۔ نیز اَلْكِتَابِ مَفْصَلًا (۱۱۵) کہا گیا ہے۔ عام طور پر تفصیل کے معنی (Details) لئے جاتے ہیں اور مفصل کے معنی (Detailed)۔ اس لئے جب قرآن کریم کو مَفْصَّلٌ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس میں تمام باتوں کی تفصیل (Details) دی ہوئی ہیں۔ لیکن، جیسا کہ اوپر دیکھا جا چکا ہے، تَفْصِيلُ کے معنی وضاحت ہیں اور مَفْصَّلٌ کے معنی واضح۔ یعنی جس میں ہر بات نکھار کر اور الگ الگ کر کے (Distinctly) بیان کی گئی ہو\*\*\*۔ قرآن کریم ایک واضح کتاب ہے جس کے مطالب میں کوئی ابہام (Confusion) نہیں۔ لیکن اس میں تمام امور کی تفصیل (Details) نہیں دی ہوئی۔ اس نے (بجز چند احکام کے) اصولی قوانین بیان کئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان اصولی قوانین کی تفصیل و جزئیات قرآنی نظام کو قائم کرنے والی جماعت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، خود طے کریگی۔ ان تفصیل میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ مناسب رد و بدل ہوتا رہے گا لیکن قرآن کریم کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے۔ بھی اَلْمَدْرِينُ الْقَتِيْمُ\* ہے (۱۱۴) اور بھی مستقل اقدار۔ كُتُبٌ قَتِيْمَةٌ (۱۱۴)۔

پھر سمجھ لیجئے کہ تَفْصِيلُ کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں اور مَفْصَّلٌ کے معنی واضح اور صاف، متمیز، نکھرا ہوا۔ (Distinct) نہ کہ (Detailed)۔ یعنی ایسا جس میں ہر اصولی حکم کی جزئیات تک بھی دی گئی ہوں۔



## ف ص م

فَصَّمْ - کسی چیز کو اس طرح توڑ دینا کہ وہ دو ٹکڑے نہ ہو بلکہ جڑی رہے۔ یہ لفظ بالعموم ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب کسی کڑی یا حلقے کا منہ کھل جائے لیکن وہ ٹوٹے نہیں۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اَلْفَصَّمُ یہ ہے کہ کوئی چیز صرف تڑخ جائے اور وہ جدا نہ ہو۔ اور اَلْفَصَّمُ - اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اِنْفَصَمَ - ٹوٹ گیا۔ کٹ گیا\*۔

سورة بقرہ میں خدا پر ایمان کے متعلق ہے کہ یہ اس قابل اعتماد قانون حیات پر ایمان ہے، لَا اِنْفِصَامَ لَهَا (۲۵۶)۔ جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں تڑخ تک بھی نہیں آسکتی۔ اس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

## ف ض ح

أَلَا فَضَحْ - ایسی سفید چیز جسکی سفیدی شدید نہ ہو۔ أَفْضَحَ المَشْبُوحُ - صبح ظاہر اور روشن ہو گئی۔ چنانچہ اَلْفَضْحُ خود صبح کو کہتے ہیں۔ اس سے فَضَحَتْ فَضْحًا کے معنی ہوتے ہیں کسی کے عیب کو ظاہر کر دینا۔ اَفْضَحَ کے معنی ہیں آدمی کا کسی برے کام کو کرنا اور اس کے ساتھ مشہور ہو جانا۔ اسکی برائیوں کا کھل جانا۔ اَلْفَضِيحَةُ - رسوائی کو کہتے ہیں۔ یعنی برائیوں کا کھل جانا\*\*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ رسوا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَتَلَا تَفْضَحُونَ (۱۸)۔ تم میری فضیحت نہ کرو۔ مجھے رسوا نہ کرو۔ یعنی لَا تَغْزُونَ (۱۹) مجھے شرمندہ نہ کرو۔

## ف ض ض

اَلْفَضُّ - بکھیر دینا۔ مجتمع ہونے کے بعد متفرق کر دینا۔ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اِنْفَضَّ - ٹوٹ کر بکھر جانا، متفرق ہو جانا۔ فَضَّ مِنَ النَّاسِ - متفرق لوگ\*۔

سورة آل عمران میں ہے لَا تَنْفَضُّوا مِّنْ حَوْلِيْكَ (۳)۔ وہ تیرے ارد گرد سے بکھر جائے۔ تجھ سے الگ ہو جائے۔ سورة جمعة میں ہے..... اِنْفَضُّوا لِيَّهَا (۱۱)۔ (مجمع کو چھوڑ کر) اس چیز کیطرف متفرق و منتشر ہو کر چل دیتے ہیں۔

فیضۃ\* - چاندی (۳/۱۳) - فَضْلُ الشَّيْءِ\* - کسی چیز پر چاندی چڑھائی -

## ف ض ل

الْفَضْلُ\* - نقص (کمی) کی ضد ہے - راغب نے کہا ہے کہ فَضْلُ کے معنی ہیں کسی چیز کا متوسط ضرورت سے زائد ہونا - فَضْلُ زیادہ تر اچھی باتوں میں استعمال ہوتا ہے - اور فَضُولُ\* بری باتوں میں - الْفَضِيلَةُ\* کے معنی مرتبہ کی بلندی اور برتری کے ہیں - (یہ تَفْضِيلَة\* کی ضد ہے -) یعنی بھلائی کی کثرت اور زیادتی - تَفْضِيلٌ عَلَیْہِ - وہ اس سے فضیلت و برتری میں بڑھ گیا - یا اس کے معنی ہیں اس نے اس پر احسان کیا اور اپنے زیادہ مال سے اسے دیدیا - فَوْاضِلُ الْمَالِ - مال کا منافع - مثلاً زمین کی پیداوار ، جانوروں کا کرایہ ، دودھ یا اون وغیرہ\* -

قرآن کریم میں یہ مادہ باب تفعیل سے فضیلت دینے کے معنوں میں آیا ہے - وَفَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ\* (۲/۲۱۷) میں نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت اور برتری عطا کی - رسول اللہ\* کو وحی کے وہی طور پر ملنے کو بھی فَضْلُ\* کہا گیا ہے - (۹۲/۱) - لیکن عام طور پر یہ مادہ معاشی خوش حالی کے معنوں میں آیا ہے - مثلاً لِيَتَّبِعْتُمْ مِّنْ فَضْلِهِ\* (۱۱/۱۳) کے معنی ہیں تلاش معاش - میدان جنگ کی فتوحات کو بھی فَضْلُ\* کہا گیا ہے (۱۳/۱۳) - مصائب اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے (۲۳/۳۳) - اور فَحْشَاءُ\* (بخل) کے مقابلہ میں بھی (۲۶۸/۲) -

لہذا فَضْلُ\* کا عمومی مفہوم زندگی کی خوش حالیوں اور معاشی فارغ البالیوں میں جن کے حاصل کرنے کی مؤمنین کو تاکید کی گئی ہے (۱۶/۱) - سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۱۸۴-۱۸۵) میں اس مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ، جہاں مختلف روش پر چلنے والی قوموں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اُنْظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ - دیکھو ہم نے کس طرح ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ خوش حالیوں عطا کی ہیں - یہ اس کا عمومی مفہوم ہے - خصوصی مفہوم ہر وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ملے جس میں وحی بھی شامل ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے - تمام قومی امتیازات اور ملی سرفرازیوں خدا کا فضل ہیں - اور اپنی ہم عصر اقوام کے مقابلہ میں ممتاز پوزیشن کا حاصل ہو جانا بھی اسکی نعمت ہے (۲/۲) -

سورہ النحل میں ہے وَأَللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔  
 یعنی جہاں تک رزق کمانے کی استعداد کا تعلق ہے وہ مختلف انسانوں میں  
 مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کو خدا نے زیادہ  
 استعداد دی ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اس استعداد سے جس قدر زیادہ کمالیے وہ  
 اس کا مالک ہے اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ فَمَا الَّذِي يُضِلُّوْا  
 بِرَأْدِیْ رِزْقِہِمْ عَلَىٰ مَا سَلَّکَتْ اٰیٰتِنَاۤہُمْ فَاُھْمٌ فِیْہِ سَوَآءٌ۔  
 جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے وہ زائد رزق کو اپنے ساتھیوں کی  
 طرف نہیں لوٹاتے اس خیال سے کہ اس طرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ  
 میں سب مساوی ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ  
 اَفَبِیْنَعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (۱۶)۔ یہ لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار  
 کرتے ہیں۔ یعنی زیادہ رزق کمانے کی استعداد، خدا کی طرف سے بلا معاوضہ  
 ملی تھی۔ یہ لوگ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی واحد ملکیت قرار دیکر  
 اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملی تھی۔  
 یہ آیت (اور اسی قسم کی دیگر آیات) مثلاً ۱۱۰: ۲۳، ۱۱۱: ۶۸، ۱۱۲: ۱۰  
 وغیرہ) قرآن کریم کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ اس نظام کی رو سے  
 ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ مؤمنین کا فریضہ یہ  
 ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کسر کے کمائی اور اپنی ضرورت سے زائد  
 رزق، دوسرے لوگوں کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ (تفصیل ان امور  
 کی سیری کتاب نظام ربوبیت میں ملے گی)۔

## ف ض و

اَنْفَضَّاءٌ۔ محن۔ وسیع زمین۔ وسیع جگہ \*۔ اَنْفِضَّاءٌ۔ ہانی جو  
 زمین پر بہ رہا ہو \*۔ اَفْضٰی فَلَآنٌ اِلٰی فَلَآنٍ۔ فلاں آدمی فلاں تک  
 پہنچ گیا \*۔ اسی سے کنایہ "اَفْضٰی الرَّجُلُ اِلِی الْمَرَاۤءِ" صورت سے  
 جماع کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اَفْضٰی دُحْقِیْقٌ آخر تک پہنچنے  
 کو کہتے ہیں اور یہ کنایہ ہے خاوت اور مباشرت سے \*۔ وَقَدْ اَفْضٰی  
 بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ (۲۱) میں یہی مفہوم ہے۔ یعنی آزاد فضا میں بے  
 روک ٹوک ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

## ف ط ر

اَلْفُطْرُ۔ بھاڑنا۔ تنق کرنا۔ پہلی مرتبہ بھاڑنا۔ (پہلی مرتبہ کی  
 خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں داخل ہے) چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما  
 \*ناج۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ فَطَائِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا ہوتا ہے ، حتیٰ کہ میرے پاس دو اعرابی (بدو) آئے جو ایک کنوئیں کے متعلق جھگڑ رہے تھے ۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فَطَرْتُہَا ۔ یعنی اس کے کھودنے کی ابتداء میں نے کی تھی ۔ لہذا فَطَرْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے اَنَا اَوَّلُ مَنْ فَطَرَ هٰذَا ۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اسکی ابتدا کی ہے \* ۔ اس لفظ فَطَائِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳) کے معنی ہیں وہ خدا جس نے پہلی مرتبہ کائنات کی تخلیق کی ہے ۔ اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہا گیا ہے (۱۴) ۔ سورہ ہنسی اسرائیل میں فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۵) کہہ کر اسکی وضاحت کر دی ۔ لہذا فِطْرَۃ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق ۔ وہ قانون یا طریقہ جس کے مطابق اس نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی ۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے ۔ فطرت کے معنی عام طور پر (Nature) کے لئے جاتے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں انسان کی فطرت یہ ہے ۔ اس سے مراد ہوتی ہیں ایسی خصوصیتیں جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں اور جو بدلی نہ جا سکتی ہوں ۔ لیکن لفظ فطرت کا یہ مفہوم بعد کی پیداوار ہے ۔ جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو اس میں (Nature) کا لفظ آیا ۔ اس لفظ کا ترجمہ ”فطرت“ کے لفظ سے کیا گیا اور اس طرح جو مفہوم لفظ (Nature) کا تھا وہی مفہوم لفظ فطرت کا ہو گیا ۔

نیچر (Nature) کے بھی دو مفہوم ہیں ۔ ایک تو وہ قوانین جو کائنات میں جاری و ساری ہیں ۔ انہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور ہر شے کے اندر رکھ دئے گئے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے ۔ فطرت کے اس مفہوم میں کوئی حرج نہیں ۔ اس مفہوم کے رو سے حیوانات کی جبلت (Instinct) کو بھی ان کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت ۔ یہاں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں ۔ انسان میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا ہے ۔ یعنی اس کا جسمانی نظام کم و بیش وہی ہے جو حیوانات کا ہے ۔ لہذا جو قوانین اس کے جسمانی نظام سے متعلق ہیں انہیں قوانین فطرت کہہ دینے میں بھی کچھ حرج نہیں ۔ یعنی

وہ قوانین جن کے مطابق انسان کی طبعی زندگی کی مشینری چل رہی ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ افزائش نسل۔ بیماری۔ موت۔ وغیرہ۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر خود ”انسان“ کی فطرت کا تصور سامنے لایا جاتا ہے تو یہ چیز محل نظر اور قابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام اسی فطرت کے مطابق دین ہے۔ یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کسی دوسری روش پر چل پڑتا ہے۔ یعنی اگر کسی انسانی بچہ کو خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔ یہ بات بالبداهت غلط ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو پیدا ہوئے ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیں جہاں کوئی اور انسان نہ ہو اور وہیں اسکی پرورش ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑا ہو کر بالکل جانور بن جائیگا۔ چنانچہ اس قسم کے کئی بچے ملے ہیں جن کی پرورش جانوروں کے اندر ہوئی۔ وہ بالکل جانوروں کی مانند تھے۔ اسوقت (۱۹۶۰ء) اس قسم کا ایک بچہ ہندوستان کے ایک ہسپتال میں زہر علاج اور زیر مشاہدہ ہے۔ یہ بالکل حیوانوں کی سی عادات و خصائص رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر انسان کو اسکی ”پیدائشی فطرت“ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور ہوگا۔ لہذا اگر یہی وہ ”فطرت اللہ“ (خدا کی فطرت) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ تو کوئی قابل شرف بات نہیں۔ (نیز خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اسکی یہی ”فطرت“ ہے بڑی گستاخی ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ خود قرآن کریم نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ”فطرت اللہ“ کے مظاہرے نہیں ہو سکتے۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کچھ اس انسان کے متعلق کہا ہے جو وحی کی راہ نعتی میں نہیں چلنا بلکہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے)۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ خَلِیْقٌ هَلُوْعًا (۱۰۰)۔ انسان بڑا ہی بے صبر ہے۔ اسکی نیت ہی نہیں بھرتی۔ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۱۰۱)۔ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ قَتِیْلٌ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرُوْا (۱۰۲)۔ بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۰۳)۔ بڑا ہی جلد باز ہے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرُ شَیْءٍ جَدُوْلًا (۱۰۴)۔ اکثر باتوں میں جھگڑنا رہتا ہے۔ فَاَرْذَلُوْا خَصِیْمَیْنِ مَّبِیْنِیْنِ (۱۰۵)۔ بڑا ہی جھگڑالو ہے۔ یہ کچھ قرآن کریم نے ”الانسان“ کے متعلق کہا ہے۔ اگر یہ مانا جائے

کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، تو اس سے خود ”خدا کی فطرت“ کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ (نعوذ باللہ) بڑا گہناؤنا ہے۔ لہذا، قرآن مکریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیالی اس قدیم تصور سے متاثر ہو کر پیدا ہوا جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ ”خدا نے آدم کو اپنی شکل پر ڈالا تھا“۔

اسی (غلط) تصور کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ہے جو اسے نیکی اور ہدی کا علم دیدہنی ہے۔ ایسے ”انسانی فطرت“ کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی فطرت خود خدا کی فطرت ہے اس لئے اس کے اندر کی آواز، خود خدا کی آواز ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق (Absolute right) اور مطلق باطل (Absolute wrong) میں تمیز کر دے۔ اگر یہ قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی تو پھر انسانوں کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ چیز حیوانوں تک تو چلی آتی ہے۔ یعنی حیوانات وغیرہ کو ان کے فرائض اور وظائف زندگی کا علم جبلی طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ یعنی ایک قرذ (نبی) کے ذریعے باقی افراد کو۔ انسان کے اندر یہ امکانی قوت موجود ہے کہ وہ چاہے تو حق کو اختیار کر لے اور چاہے باطل کو اختیار کر لے۔ یہی اختیار انسان کی بنیادی خصوصیت ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں۔ اگر انسان وحی کی راہ نمائی کو اختیار نہ کرے تو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور تباہیاں خریدتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ یَدْعُ الْإِنْسَانَ بِالشَّيْرِ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (۱۶) وہ بھلائی کو بلانے کے بجائے شر کو آوازیں دہکر بلاتا رہتا ہے۔ اگر انسان کے اندر ”خیر و شر“ کی تمیز و دبعت کر کے رکھ دی جاتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اسے ایسا کرنے کی آزادی ہی نہ ملتی۔ جس طرح حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس روش کے خلاف چلیں جس پر چلنے کی تمیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ (مزید تفصیل ل۔ ہ۔ م کے عنوان میں ملیگی)۔

لہذا، یہ تصور غلط ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ”فطرت“ پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کی طرف آئیے جس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہم

دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں (جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے) لفظ فِطْرَةٌ کے معنی ہیں وہ قانون یا قاعدہ جس کے مطابق کسی چیز کی پہلی مرتبہ تخلیق کی جاتی ہے۔ خدا فاطر السموات والارض ہے۔ لہذا فطرت اللہ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق۔ آیت یہ ہے فِطْرَتِ اللَّهِ التَّيْبَةِ فِطْرَةَ النَّاسِ عَلَيْهِمُ الْآثَارُ لَا تَبْدِيلَ لَهَا لِيَخْلُقِ اللَّهُ . ذَٰلِكَ الْكِتَابُ الَّذِي مَنَ الْفَقِيرُ (۳۰)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا، یعنی جس طرح اس نے تمام ارض و سما (کائنات) کو ایک خاص قانون کے مطابق پیدا کیا اسی طرح اس نے انسان کو بھی پیدا کیا۔ اس کے قانون تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ہے دینِ قیام یعنی محکم نظام۔ تم ہر طرف سے منہ موڑ کر اس قانون پر سیدھے چلتے جاؤ۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (۳۰)۔ اور اس کی تفسیر یہ ہے مَنِيبِينَ إِلَيْهِمْ . وَاتَّقُوهُ . وَآتِمُّوا الصَّلَاةَ . وَلَا تَكُونُوا تَوْأَمِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۳۰)۔ اس کی طرف توجہ کئے ہوئے۔ مونم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور نظامِ صلاۃ کو قائم کرو۔ اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ انسان کی ایک غیر متبدل فطرت ہے۔ وہ فطرت ”اللہ کی فطرت“ کے مطابق ہے۔ اور اس فطرت کی رو سے انسان خیر اور شر، حق اور باطل، میں از خود تمیز کر سکتا ہے۔ اور اسلام اس فطرت کا دھن ہے۔ یہ سب غلط عمارت احمی بنیاد پر اٹھی ہے کہ ہم نے لفظ فطرت کے وہ معنی لیے لئے جو یونانی لفظ نیچر کے معنی تھے۔ اگر اس لفظ کے وہ بنیادی معنی سامنے رکھے جائیں جو عربوں کے ہاں رائج تھے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے ان حیوانی رجحانات کے علاوہ جو انسان کی طبعی زندگی کا خاصہ ہیں، انسان کی کوئی غیر متبدل فطرت نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی وحی سے حاصل کرنی ہے۔ اور اس کا ایسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس راہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت (The Capacity to Choose) وہ خصوصیت ہے جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اس میں ہر انسان، یہ حیثیت انسان ہونے کے شریک ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی انسان کو دی گئی ہو اور کسی کو نہ دی گئی ہو۔ لیکن یہ خصوصیت مضمر شکل (Un - Developed Form) میں دی گئی ہے جس کی نشو و نما کی جاسکتی ہے۔ یہ ہے وہ خاص ساخت جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا

کیا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر انسان کی کوئی ”فطرت“ ہوتی تو اسے اختیار و ارادہ کی صلاحیت کبھی نہ ملتی۔ ”فطرت“ اور اختیار و ارادہ دو متضاد باتیں ہیں۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی ایک فطرت ہے اس لئے ان میں سے کسی کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل نہیں۔ انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں۔ انسان کے اندر بہت سی امکانی قوتیں ہیں جنہیں نشو و نما دینا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا، مقصدِ زندگی ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی مہری کتاب ”اسلام کے نام خطوط“ میں ایک خط میں ملے گی)۔

ہم نے دیکھا ہے کہ فطر کے معنی کھودنے۔ بھاڑنے۔ شق کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (۸۴)۔ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ نیز (۹۹)۔

مُتَفَطِّرٌ۔ پھٹ جانے والا۔ (۳۳/۱۸)۔ فُطُورٌ۔ شگاف۔ عروب، خلل، (۶۴)۔

## ف ظ ط

الْفُطْرُ۔ اونٹ کی اوجھ میں جمع رہنے والا ہانی جسے، صحرا میں جہاں ہانی نہ ملے اور جان کا خطرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں، اس کا پیٹ چاک کر کے نچوڑ لیا جائے اور اسے پی لیا جائے۔ یہ ہانی مجبوراً اور ہادلِ ناخواستہ پیا جاتا تھا، لہذا اس لفظ کو ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جائے لگا جس کے پاس خوشی سے نہ بیٹھا جائے بلکہ اسدِ ضرورت میں ہادلِ ناخواستہ پہنچا جائے۔ اسی سے یہ لفظ تند خو، جفا پیشہ، درشت مزاج شخص کیلئے بولا جاتا ہے۔

اِفْطَرَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس نے اونٹ کو ہانی ہلایا اور پھر اس کا منہ باندھ دیا تا کہ وہ جگالی نہ کر سکے۔ پھر جب سفر میں ہانی نہ ملا تو اس کا پیٹ چاک کر کے اس کو پی لیا\*۔

قرآن کے۔ ریم میں رسول اللہ کے متعلق کہا ہے کہ آپ اپنے رفقاء کے لئے نرم واقع ہوئے ہیں (لَيَنْتَ لَہُمْ)۔ فَطَّرْنَا نہیں ہیں (۳۳/۱۸)۔ یہی راہنما کی شان ہوئی چاہئے کہ لوگ اس میں کشش و جاذبیت پائیں اور اسے اپنا بہترین مشیر اور اچھا رفیق سمجھیں۔ نہ ایسا کہ وہ اپنی ہی اس بچھانے کی خاطر اپنے رفقاء کا پیٹ چاک کر کے ہانی نکال لے۔



صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْفَتْحَةُ اُس شخص کو کہتے ہیں جو صحت ، بد مزاج ، سنگدل ، درشت کلام ہو لیکن اس کے ساتھ ایسا بزدل بھی ہو کہ ڈرنے کے مقام پر ڈرنا تو ایک طرف ، جس جگہ کسی قسم کا خطرہ نہ ہو وہاں بھی ڈرے \*\*\* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ناپسندیدگی اور کراہت کے ہیں ۔

## ف ع ل

فِعْل کے معنی انسان کا حرکت کرنا ہیں ۔ اور اس کا مطلب ہے کوئی کام کرنا ۔ فِعْل کی صحیح تعریف کرنے اور عَمِل اور صَنَعَ اور فَعَلَ کا فرق بتانے میں علمائے لغت نے بڑی بحث کی ہے ۔ مثلاً صاحبانی کہتا ہے کہ کسی چیز کو وجود میں لے آنا فعل ہے خواہ وہ عمل ہو یا غیر عمل ۔ اس طرح یہ عمل سے زیادہ خاص ہے ۔ المحکم میں ہے کہ یہ کتابۃً ہر کام اور عمل کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ عمل متعدی ہو یا غیر متعدی ۔ ابن الکمال کا کہنا ہے کہ کسی چیز پر اثر ڈالنے سے اثر ڈالنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے فعل کہتے ہیں \* ۔ راغب نے فعل کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے لئے ہیں ۔ اس میں عمومیت ہے ، یعنی خواہ وہ عمدگی سے کی جائے یا بغیر عمدگی کے ۔ علم سے کی جائے یا بغیر علم کے ۔ قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے ۔ اس میں انسان ، حیوان ، جمادات سب یکساں ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ یہی مفہوم عمل کا بھی ہے اور صنیع اس سے زیادہ خاص ہے \*\* ۔ محیط میں کلیات کے حوالہ سے سادہ ”عمل“ کے تحت ہے کہ عَمَلَ اس کام کو کہتے ہیں جو فکر و تدبیر اور علم و ارادہ کے ساتھ سرزد ہو ۔ فِعْل میں یہ شرط نہیں ۔ نیز عَمَلَ اسے کام کو کہتے ہیں جو طویل مدت تک ہوتا رہے ۔ اس کے برعکس فعل ایک دفعہ بھی کسی کام کے کرنے کے لئے بولا جاتا ہے \*\*\* ۔ (اس کے ساتھ ع ۔ م ۔ ل کا عنوان بھی دیکھیے)۔

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ کے لئے فِعْل آیا ہے (عَمَلَ نہیں آیا) ۔ اور اس کا ہر فعل ، علم و ارادہ پر مبنی ہوتا ہے اور بیشتر امور ایسے ہوتے ہیں جن میں استمرار اور دوام بھی ہوتا ہے ۔ لہذا فِعْل کی وہ خصوصیات جو آئمہ لغت نے بتائی ہیں ، انہوں تک تو درست ہو سکتی ہیں ۔ افعال خداوندی کے لئے نہیں ۔

مَنْ فَعَلَ (۲۹) کس نے کیا ہے؟ فِعْلٌ (۳۰) کام۔ فَعَلَانِہٖ (۳۱) ایک حرکت۔ ایک دفعہ کام کرنا۔ فَاعِلٌ (۳۲) کرنے والا۔ فَعَالٌ (۳۳) بہت زیادہ کرنے والا۔ زبردست کام کرنے والا۔ کَانَ مَتَعْمُوْلًا (۳۴) جو کام کیا جا چکا ہے۔ ہو مکمل ہو چکا ہے۔

قرآن کریم میں یہ مادہ اس کثرت سے آیا ہے کہ اس کا احصاء اس مقام پر ممکن نہیں۔ نہ ہی اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ جہاں یہ مادہ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں جس کے لئے اس کی وضاحت یا تشریح کی ضرورت لاحق ہو۔

## ف ق و

فَقَدَّ - يَفْقِدُ - فَقْدًا - کسی موجود شے کو گم کر دینا\* - رَاغِب نے فَقْدًا اور عَدَمَ کا فرق یہ بتایا ہے کہ فَقْدٌ تو کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا ہے، لیکن عَدَمٌ فَقْدٌ نہ ہو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے سرے سے موجود ہی نہ ہونے کو بھی\*\* - سُوْرَةُ يَوْمِئِذٍ مِّنْهُ - مَا ذَا تَفْقِدُوْنَ؟ (۳۵) تم نے کیا چیز گم کر دی ہے۔ تم کیا چیز نہیں پا رہے ہو؟ اِنْفَقَدَ وَ تَفَقَّدَ - کسی گم گشتہ کا تلاش کرنا۔ لیکن رَاغِب نے کہا ہے کہ اَلْيَوْمِئِذٍ کے معنی ہیں یہ معلوم کر لینا کہ فلاں چیز گم ہو گئی ہے\* - لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی ہیں اس چیز کا طالب یا تلاش کرنا جو غائب ہو۔ چنانچہ سُوْرَةُ نَمْلِ مِّنْ حَضْرَتِ سُلَيْمَانَ کے متعلق ہے وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرُ (۳۶) - اس کے یہ معنی ہونگے کہ حضرت سلیمانؑ نے تیز رفتار گھوڑوں کے ہرکاروں کو (جو اس وقت وہاں نہیں تھے) طالب کیا۔ (دیکھئے عنوان ط۔ ی۔ ر)

## ف ق و

اَلْفَقِيْرُ - ریڑھ کی ہڈی کا ایک منکاً - اَلْفَقِيْرُ - وہ شخص جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ کمر شکستہ - نِزَا اَلْفَقِيْرُ اُس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں کھجور کا ہودا لگایا جاتا ہے\* - اسی طرح کنوئیں، نیزہ، گڑھے کو جس میں پانی بھر جاتا ہو فَقِيْرُ کہتے ہیں - اَلْمَقْدَرُ - اَلْفَقِيْرُ - گڑھا کھودنا - نیز موتیوں میں سوراخ کرنا - اونٹ کی ناک چھیدنا تاکہ اس میں نکیل ڈال دی جائے\* - اور ایسے اونٹ کو اَلْفَقِيْرُ کہتے ہیں\* - ان

معانی سے فقیر\* - اور فقیر\* کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - قرآن کریم میں فُقَرَاءُ اور مَسْكِيْنٌ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں (بج) جس کی وجہ سے ائمہ لغت اور فقہ نے ان کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے - لیکن ان میں کوئی متعین خط امتیاز نہیں کھنچ سکا - عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ فقیر\* وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو لیکن نہ اتنا کہ وہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے - اسکی جمع فُقَرَاءُ ہے - لیکن مَسْكِيْنٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو - مَسْكِيْنٌ کے معنی کے لئے دیکھئے عنوان س - ک - ن وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک انہی ہاں کے محتاج کو فقیر\* کہتے ہیں اور غیر قوم کا شخص جو اسلامی مملکت میں آکر بس گیا ہو اور صاحب احتیاج ہو مَسْكِيْنٌ کہلاتا ہے -

قرآن کریم میں فقیر\* - بمقابلہ غنی\* آیا ہے (۱۸۸ : ۲۳۳) - (غنی کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان غ - ن - ی) - لہذا فقیر\* کے معنی احتیاج کے ہوں گے - ضرورتوں کا کما حقہ پورا نہ ہو سکا - یعنی فُقَرَاءُ معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو پوری پوری محنت کرنے کے بعد بھی اتنا نہ کما سکیں کہ وہ ان کی ضروریات کے لئے مکفی ہو سکے - اصحاب احتیاج (۲۲) - لیکن اس کے معنی صرف طبعی ضروریات کی احتیاج ہی نہیں بلکہ انسان کی نشوونما کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہو ان کی احتیاج بھی فقیر\* ہے - چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرِ فَقِیْرٌ (۲۸) - جو کچھ بھی تو نے میرے لئے خیر میں سے بھیجا ہے میں اس کی احتیاج رکھتا ہوں - اس میں طبعی ضروریات اور شرف انسانیت کے اسباب و وسائل دونوں آجائے ہیں - اس اعتبار سے کائنات کی ہر شے اور ہر انسان اپنی نشوونما اور تکمیل ذات کے لئے ربوبیت خداوندی کا محتاج ہے - بِمَسْكِنِهٖ مِّنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ اِلَّاَرْضِ (۵۵) - کائنات کی ہر شے اس کی محتاج ہے - سورہ فاطر میں تمام نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ اَنْتُمْ اِلَیَّ اَتِیْتُمْ - وَ اَللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (۳۵) - تم سب اپنی نشوونما کے لئے عطا پائے خداوندی کے محتاج ہو، اور اللہ کسی معاملہ میں بھی تمہارا محتاج نہیں - طبعی ضروریات کے لئے انسان، قدرت کے عطا کردہ سامان پرورش کا محتاج ہے - اور شرف انسانیت کی نشوونما کے لئے وحی کی راہ معانی کا محتاج -

قرآنی معاشرہ میں فُقَرَاءُ وہ ہونگے جو پوری پوری محنت کے باوجود اتنا پیدا نہ کر سکیں جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو - معاشرہ ان کی

ضروریات کے فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور چونکہ ان کی سب ضروریات پوری ہوتی رہیں گی اس لئے اس معاشرہ میں در حقیقت فقیر (محتاج) کوئی نہیں رہے گا۔ یہ صرف اس وقت تک ہونگے جب تک قرآنی معاشرہ وجود میں نہیں آئیگا۔

فقیرۃ\*۔ کمر توڑ دینے والی مصیبت (۴۵)۔

## ف ق ع

فتاقیح\*۔ ہر تیز رنگ کو فتاقیح کہتے ہیں۔ سیا خالص اور صاف رنگ کو\* (جس میں دو-رے رنگ کی آمیزش نہ ہو)۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صفرائے کے ساتھ آیا ہے (۴۶) جس کے معنی ہیں گہرا زرد رنگ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں آتے۔ چنانچہ فتواقیح اللہم\*۔ زمانہ کے سائب و آلام کو کہتے ہیں۔

## ف ق لا

الفیقہ\*۔ کسی چیز کو جان لینا اور سمجھ لینا\*۔ قرآن حکیم میں ہے۔ لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا تَلْوِيْنًا (۴۸)۔ یہ بہت کم سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ اس قسم کی سمجھ اور پہچان کو کہتے ہیں جس طرح حیوان اپنی جبلی استعداد (Instinct) سے اپنی پہچان اور تمیز میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ چنانچہ تحمل\* فقہ\* اس اونٹ کو کہتے ہیں جو صحیح طور پر پہچان لے کہ کونسی اونٹنی حاملہ ہے اور کونسی اختلاط کے قابل\*۔

راغب نے کہا ہے کہ الفیقہ\*۔ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں\*\*۔ یعنی معروضات کے شاہد سے نتائج الخذ کر کے ان کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا\*\*۔ تَفَقُّهٌ فِي الدِّينِ (۴۹) کا یہی طریقہ ہے۔ یعنی زمانہ کے ٹھوس واقعات پر غور کر کے یہ سمجھنا کہ ان پر دین کے کون سے حقائق و قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے تفقہ فی الدین کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ہر مقام سے کچھ لوگ مرکز میں آئیں اور دین میں تفقہ حاصل کریں۔ پھر یہ واپس جا کر باقی لوگوں کو اس سے آگاہ کریں (۵۰)۔ یعنی تفقہ فی الدین کسی خاص گروہ کا اجارہ (Monopoly) نہیں۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ان حالات میں بتایا گیا تھا جو ابتدائے اسلام میں تھے۔ ویسے از روئے قرآن حکیم تفکر۔ تدبیر۔ تفقہ ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے۔

فقہ ایک قانونی اصطلاح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں (اور روزِ سرہ کے حالات کے مطابق) جزئی قوانین مستنبط کئے جائیں۔ یہ کام اسلامی نظام کا تھا۔ لیکن اب فقہ کے معنی ہیں کسی خاص امام کا مسلک۔ مثلاً فقہ حنفی کے معنی ہیں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ یا ان فقہاء کے فتاویٰ جو امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ اہل فقہ، اہل حدیث کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہیں۔ غور کیجئے، قرآن کریم کی رو سے تفقہ فی الدین کا مفہوم کیا تھا۔ اور اب اس کا مفہوم کیا رہ گیا ہے! جب دین، ایک نظام، اجتماعی کی بجائے انفرادی چیز بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

## ف ک ر

فَتَكْتَرُ - أَفْكَتَرُ - فَتَكْثَرُ - تَفْتَكْثَرُ فَيْثَهُ - کسی چیز یا (معاملہ) میں اطمینان سے (ایک خاص ترتیب کے ساتھ) غور کرنا اور عقل و نظر سے کام لینا\* (اور اس سے صاف نتیجہ اخذ کرنا)۔ صاحب مفردات کے نزدیک ہم انہی چیزوں پر فکر کر سکتے ہیں جن کا کوئی تصور دل میں قائم ہو سکے۔ جن چیزوں کا تصور قائم نہ ہو سکے ان میں فکر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے لکھا جاتا ہے کہ تَفْتَكْثَرُوا فِي آلَاءِ اللَّهِ وَلَا تَفْتَكْثَرُوا فِي اللَّهِ - اللہ کی قدرتوں (مظاہرِ فطرت وغیرہ) پر تو غور و فکر کرو، لیکن اللہ کی ذات کے متعلق کچھ نہ سوچو، کیونکہ اس کا تصور ہی ذہن انسانی میں نہیں آسکتا\*\*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَفْتَكْثَرُ کے معنی ہیرت حاصل کرنے کے لئے دل کو گھمانا اور ادھر ادھر ہلانا ہیں۔

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھنے جائیے۔ قدم قدم پر آپ کو غور و فکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دھوکے کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا اور اسے فکر و تدبیر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور و فکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (۱۶۳) ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسولؐ کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یوں ہی چلتے چلتے سن لو۔

اَنْ تَقُوْا نُوْحًا لِّهِ مَثَلٰی وَ قُرَادٰی - (۳۴) اس کے لئے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے جا رہے ہو اس میں بہے نہ جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رکو۔ تھمو۔ ٹھہرو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ سب کے سب نہیں تو ایک ایک۔ دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن خالصۃً للہ - دل میں کوئی اور خیال، جذبہ یا مقصد لئے ہوئے نہیں۔ اور پھر؟ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴) - پھر تم سوچو۔ غور کرو۔ بس یہ ہے وہ بات جسکی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہے مَّا يَصْحَابُكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴) - یہ دعوت فکر جو تمہیں دی جا رہی ہے وہ اس داعی کے جنون کا نتیجہ نہیں۔

اس قدر تاکید تھی غور و فکر کی !

لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ غور و فکر ہم پر حرام قرار پا چکا ہے۔ کوئی معاملہ ہو۔ کوئی مسئلہ ہو۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ہو۔ اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کی بابت اسلاف نے کیا کہا ہے۔ اگر آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسی بات کہیں جس کی سند اسلاف کے ہاں سے نہ ملتی ہو۔ تو آپ فتنہ پرداز۔ ملحد۔ بے دین۔ قرار پا جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے معاملات، حتیٰ کہ قرآن کریم کے متعلق، جو کچھ سوچا سمجھا جانا تھا وہ سب سوچا سمجھا جا چکا ہے۔ اب ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس کی اندھی تقلید کرتے جائیں۔ خود نہ کچھ سوچیں نہ سمجھیں۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو غور و فکر کا حکم دیا تھا تو وہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ تمام زمانوں کے انسانوں کے لئے یکساں حکم تھا۔ اس لئے (قرآن کریم کی رو سے) جس طرح ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ (اسلاف) غور و فکر کے لئے مکلف تھے اسی طرح ہم پر بھی غور و فکر لازم ہے۔ اگر ہم غور و فکر نہیں کرتے تو یہ روش قرآن کریم کے واضح حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔

لیکن ہم ہیں کہ غور و فکر کو الحاد اور بیدینی قرار دے رہے ہیں ! اصل یہ ہے کہ جب قومیں قوت عمل سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔ غور و فکر بجائے خویشی ایک عمل ہے جس میں ذہن کو بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پھر، غور و فکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل ہی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے۔ غور و فکر سے بھاگنے کی اصل وجہ

تو یہ ہوتی ہے لیکن انسان کی خوئے بہمانہ سازی اسے ”سلف صالحین“ کا اتباع قرار دیکر جھوٹے اطمینان کا موجب بنا دیتی ہے۔

یاد رکھئے۔ جو قوم غور و فکر سے محروم رہ جاتی ہے وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے۔ انسان و حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہے۔ ہم اپنے اسلاف کے غور و فکر کے نتائج سے مستفید ہو سکتے ہیں، لیکن ان کا غور و فکر ہمارے لئے حرفِ آخر نہیں ہو سکتا کہ اس سے اختلاف، الحاد و بیدینی قرار پاجائے۔ زمانے کی علمی اور فکری سطح بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے، علم و فکر میں آگے ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے اس لئے اس پر مسلسل غور و فکر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں غور و فکر کے لئے اس قدر کثرت سے تاکید آئی ہے کہ ان مقامات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ جب آپ قرآن کریم کا مطالعہ کرینگے تو وہ تمام مقامات آپ کے سامنے آجائینگے اور ان سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کے خلاف کتنی سخت تنبیہات آئی ہیں۔ (مزید تفصیل (ع - ق - ل) - (ع - ل - م) - (د - ب - ر) اور (ق - ل - د) کے عنوانات میں ملیگی)۔

## ف ک ک

فَكَشَهُ - يَفْكَشُهُ - فَكَشًا - اس نے اسے جدا کر دیا - فَانْفَكَتْ - تو وہ اس سے جدا ہو گیا - فَتَكَتْ الشَّيْءُ - میں نے اس چیز کو چھڑا دیا - اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا - فَكَتَّ الْاَسِيرَ - اس نے قیدی کو چھڑا دیا - فَكَتَّ يَدَهُ - اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا - یعنی مٹھی میں جو چیز تھی اسے ظاہر کر دیا - فَكَتَّ الْمُخْتَمَ - اس نے مسہر کو توڑ دیا\* -

قرآن کریم میں فَكَتَّ رَقَبَةً (۹۶) آیا ہے جس کے لفظی معنی کسی گردن کا آزاد کرنا ہیں۔ اس میں مظلوموں کو استبداد سے چھڑانے اور زیر دستوں کو ظلم سے بچانے کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے - لَسْمٌ بِكَتْنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتَّى تَسْأَلِيَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (۹۸) - اہل کتاب اور مشرکین اپنے باطل عقائد و رسوم کی خود ساختہ زنجیروں

سے رہا نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کے پاس (الْبَيْتَيْنِ) خدا کا یہ قانون نہ آتا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا ہے - وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷) - یہ اس لئے آیا ہے کہ انسانوں نے اپنے اوپر جو (خواہ مخواہ کے) بوجھ لاد رکھے تھے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا یہ انہیں ان سے آزادی دلائے۔ قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو انسانوں کے ہر قسم کے (ذہنی و جسمانی) استبداد سے نجات دلائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے ان تمام زنجیروں کو جو آپ ﷺ نے توڑی تھیں، ایک ایک کر کے اکٹھا کیا اور پھر سے انہیں اپنی گردنوں میں ڈال لیا۔ اب ہم ان جکڑ بندیوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہیں، لیکن وہ ایسی مقدس بن چکی ہیں کہ انہیں اتار پھینکنے کی ہمت کسی میں نہیں پڑتی۔ ان زنجیروں کو صرف قرآن کریم کی تعلیم توڑ سکتی ہے، اور قرآن کریم کی طرف ہم آنا نہیں چاہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

## ف ک ہ

فَكَيِّدَ الرَّقِجُلُ\* - وہ خوش مزاج، ہشاش بشاش اور پُر مزاح ہوا۔ ایسا شخص فکیہ\* اور فقاکیہ\* کہلائیگا۔ اَلْفُكَاكِيَّةُ\* - ہر قسم کا پھل - جمع فَوَاكِيہُ\* (۲۳)۔

اَلْفُكَاكِيَّةُ\* - دلچسپ اور دل کو شگفتہ کرنے والی باتیں - خوش گبی - مزاح، فَاكَاكِيَّةُ\* سَفَاكَاكِيَّةُ\* - ایک نے دوسرے سے مزاح کیا\*۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے - فِي شَفْعِلٍ فَكَاكِيَّةُونَ\* (۵۵) - وہ کام میں لگے ہوئے خوش ہونگے۔ ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے خوشی کی باتیں اور مزاح کریں گے۔ یہاں قرحت و انبساط سے بھرے ہونگے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْفُكَاكِيَّةُ\* خوش مزاجی اور شیریں کلامی کو کہتے ہیں۔

تَفَكَّكَاكِيَّةٌ مِّنْ كَذِّا\* - اس نے فلاں چیز سے تعجب کیا۔ تَفَكَّكَاكِيَّةٌ الرَّقِجُلُ\* - وہ نادم ہوا\*۔ اَلْاَفُكَاكِيَّةُ\* - تعجب کی بات - پُر مزاح بات۔ سورۃ واقعہ میں ہے فَظَلَلْتُمْ تَفَكَّكَاكِيَّةُونَ\* (۵۶) تم تعجب کرنے لگ جاؤ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ابتداء\* یہ لفظ تَفَكَّكَاكِيَّةُونَ\* تھا۔



بعد میں نون ہاء سے بدل کیا اور یہ تَفَكَّكْھُوْنَ بولا جائے لگا۔ تَفَكَّكْھُوْنَ کے معنی ہیں شرمندہ ہونا۔ اَلْفَکِیْہُ - اِترائے والا۔ اِکْڑ فون کرنے والا\*۔ قرآن کریم میں ہے اِنْقَلَبْجُوْا فِکْیْہِیْنِ (۸۳/۱) اِترائے ہوئے لوٹتے ہیں۔

ف ل ح

فَلَاحٌ کے معنی ہیں پہاڑنا۔ شکاف کرنا۔ چاک کر دینا۔ اسی لئے  
فَلَاحٌ کاشتکار کو کہتے ہیں کیونکہ وہ کھیتی کے لئے زمین میں ہل چلا کر  
اسے پہاڑتا ہے۔ فَلَاحَةٌ۔ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کرنے کو کہتے ہیں۔\*\*۔  
چونکہ فَلَاحٌ (کسان) کی محنت کا صلہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت ایک  
ایک دانہ کے بدلے سو سو دانوں سے اس کی جھولیاں بھر دیتی ہے، اس لئے  
فَلَاحٌ کا لفظ کامیابی اور بقاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (ابن فارس)

مُفْلِحُونَ۔ وہ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔ جن کی محنت ثمر بار ہو جائے۔ جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مومنین کے متعلق ہے۔ اُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲)۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ نفس انسانی کے نشوونما پا کر انسان کے کامیاب و کامران ہونے کے متعلق ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۱)۔ جس نے اس کی نشوونما کی وہ کامیاب ہو گیا۔

قرآن کریم نے انسانی سعی و عمل کا حاصل ”نجات“ نہیں بتایا۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ہوتی ہے۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی پہلی حالت میں پہنچ گیا۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ہوا۔ یہ قرآنی تصور نہیں۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جو ہر انسانی بچہ کو پیدائشی طور پر گناہ گار قرار دیتی ہے۔ اس کا ان گناہوں کی مصیبت سے چھوٹ جانا نجات (Salvation) ہے۔ یا ہندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ہیں کہ ہر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا کے جیل خانے میں محبوس ہے۔ اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے۔ یہی تصور بدھ مت میں ہے۔ ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے۔

**\*تاج و محیط و راغب - \*\*تاج -**

یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہو کر مسادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے۔ اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی اصل سے جا ملنا مقصود حیات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ تصور نہیں۔ اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک صاف سلیٹ لیے کر آتا ہے۔ وحی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے اس کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس سے اُسے اس زندگی کی تمام خوشگوار باتاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی۔ یہ سب مثبت نتائج ہیں، اس لئے انہیں فلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا۔ اس کا ثمر بار ہونا۔ بسا فووز سے (دیکھئے عنوانات ف۔ و۔ ز اور ن۔ ج۔ و)۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس نظام قرآنی کے آن دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۱۷۱)۔ پھر وہ اس نظام کو عملاً مشکل کرتے ہیں اور جب اس کے مرنی و محسوس نتائج ان کے سامنے آ جاتے ہیں تو ان کا ایمان بالغیب (یعنی کسی پر اعتماد کر کے اس کی بات مان لینا) یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۱۷۲)۔ ان کی مثال اس کسان (فلاح) کی سی ہے جو اپنے ایمان محکم کی رو سے بیچ کو مٹی میں ملا کر مہینوں اس پر محنت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کی محنت کے نتائج فصل بن کر اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اُولَئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲/۱۷۵)۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اَلْفَلَاحُ کے معنی اَلْبَقَاءُ ہیں۔ یعنی ثابت اور محکم طور پر باقی رہنا۔ اور مُفْلِحُونَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو عیشِ جاوداں کے مالک ہوں\*۔ یاد رہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ کامیاب زندگی اس دنیا کی بھی ہے اور موت کے بعد کی بھی۔ اسی طرح ”آخرت“ سے مراد اس دنیا میں مستقبل کی زندگی بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔

## ف ل ق

فَلَمَّا لَقِيَ الشَّيْءَ ۚ يَفْلُتُ ۚ وَفَلَمَّا لَقِيَ ۚ - اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا۔ فَلَاحٌ - چنانچہ وہ چیز پھاڑ گئی\*\*۔ فَلَاحٌ اَلْاَصْبَاحُ (۱/۶۱)۔ رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح کو نمودار کرنے والا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی خَلَاحٌ کے بھی ہو سکتے ہیں\*\*۔ اَلْفَلَاحُ - صبح۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی صبح کا واضح ہو جانا ہیں۔ اس کے معنی

مخلوق کے بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی مشکلات کے بعد حق کے واضح ہو جانے کے بھی ہیں \*۔ چنانچہ قُلْ أَهْوُذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳) میں یہی مفہوم مراد ہے۔

کائنات میں سلسلہ ارتقاء اس طرح جاری ہے کہ ایک چیز پھٹتی ہے تو اس میں سے نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے جو آگے بڑھتی اور اوپر کواٹھتی ہے۔ پھر اس میں سے اسی طرح ایک اور زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ دانے میں سے کونپل نکلتی ہے۔ پھر اس میں سے شاخ پھوٹتی ہے۔ شاخ میں سے پتہ پھوٹتا ہے۔ پھر شگوفہ۔ پھر پھول۔ پھر اس میں پھل لگتا ہے۔ پھل میں بیج پیدا ہوتا ہے۔ بیج سے پھر ایک نئے درخت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْغَيْبِ وَالنَّوْیِ - یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَمِیّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَمِیّتَ مِنَ الْحَیِّ (۶۶)۔ ”اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے“۔ یہ ہے خدا کا متعین کردہ قانون حیات و ارتقاء۔ اور یہ ہے رَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳)۔

## فلک

الْفَلَکُ - ہر چیز کا بڑا اور گول حصہ۔ سمندر کی مضطرب و متسرد موج۔ ستاروں کا مدار \*\*۔ قرآن کریم میں ہے کُلُّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۲۱)۔ تمام کرے اپنے اپنے مدار (Orbit) میں نہایت تیزی سے تیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اَلْفَلَکُ (۱۱)۔ کشتی کو کہتے ہیں (مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ہے نیز واحد و جمع کے لئے یکساں مستعمل ہے) \*\*۔

## فلن

فَلَانٌ وَفَلَانَةٌ - انسانوں کے ناموں کے لئے بطور کنایہ بولا جاتا ہے۔ اول الذکر مذکر کے لئے اور ثانی الذکر مؤنث کے لئے۔ اور الف - لام کے ساتھ (یعنی اَلْفَلَانُ وَ اَلْفَلَانَةُ) انسانوں کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً بہائم وغیرہ کے لئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے \*\*\*۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ فَلَانٌ اور فَلَانَةٌ بغیر الف - لام کے ذوی العقول کے نام کی جگہ کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسی چیز سے کنایہ مقصود ہو جو صاحب عقل و شعور نہ ہو تو فَلَانٌ اور فَلَانَةٌ پر الف - لام کا اضافہ کر لیتے ہیں \*\*\*\*۔

\* تاج و محیط - \*\* تاج و ابن فارس - \*\*\* تاج - \*\*\*\* محیط محیط -

قرآن کریم میں ہے یَا وَیْلَتْنِی لَیْسَتْنِی لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا (۲۸) ”ہائے میری تباہی! کاش، میں نے فلان کو دوست نہ بنایا ہوتا۔“  
 زجاج نے کہا ہے کہ یہاں فُلَانًا سے مراد شیطان ہے کیونکہ اس سے آگے ہے  
 وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُوًّا (۲۹)۔ ”اور شیطان آخر انسان  
 کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔“ لیکن [جیسا کہ ”شیطان“ کے باب (عنوان  
 ش۔ ط۔ ن) میں بتایا جا چکا ہے] ہر شریر انسان شیطان ہے۔ اس لئے اس میں  
 سرکشوں اور شرارت پسندوں کی دوستی کیطرف اشارہ ہے۔

## ف ن ن

اَلْفَنَدُ - بوڑھا ہونا - بڑھاپے یا بیماری کیوجہ سے عقل کا ناکارہ ہو  
 جانا - بات یا رائے میں غلطی کرنا - مٹھیا جانا \* - لسان العرب میں ہے کہ  
 فَنَدٌ کے معنی جھوٹ کے ہیں \* - راغب نے اس کے معنی کمزوری رائے  
 بتائے ہیں \*\* - فَنَدٌ - اسے جھوٹا، کمزور رائے والا یا فاجر العقل بتایا۔  
 اَفْنَدَ - جھوٹ بولا - بوڑھا آدمی جب بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے کہتے ہیں  
 قَدْ اَفْنَدَ - کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو صحت کی راہ سے ہٹی  
 ہوتی ہیں - لیکن بوڑھی عورت کو مُفْنِدَةٌ نہیں کہتے کیونکہ (عربوں  
 کے خیال کے مطابق) عورت جوانی کے زمانے میں کونسی صائب السرائے ہوتی ہے  
 جو اسے بڑھاپے میں مُفْنِدَةٌ کہا جائے؟ اصمعی نے کہا ہے کہ جب  
 بوڑھا ہونے کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ باتیں کرنے لگے تو اسے مُفْنِدٌ  
 کہتے ہیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوجھل اور  
 سخت ہونے کے ہیں - نیز اس بڑھاپے کے بھی جس کے ساتھ عقل کا فتور  
 شامل ہو۔

سورہ یوسف میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے لوگوں سے کہا کہ لَوْ لَا  
 اَنْ تَفْنِیْدُوْنِی (۱۲)۔ اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ  
 سے میری عقل میں فتور آگیا ہے اور میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگ  
 گیا ہوں تو.....

## ف ن ن

اَلْفَنُّ (جمع فَنُونٌ وَاَفْنَانٌ) حالت - قسم - نوع - عجیب معاملہ -  
 اَلْفَنُّ اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں تر و تازہ پتے ہوں - (جمع اَفْنَانٌ)

وَأَفَانِيْنَ\*۔ اَلْفَنُّوْنَ\*۔ مختلف قبیلوں کے ملے جلے لوگوں کو کہتے ہیں۔ رَجُلٌ مِيفَنٌ\*۔ حیرت انگیز و تعجب خیز کام کرنے والا مرد۔ اَفَانِيْنَ\* اَلْكَتْلَامُ۔ کلام کے مختلف اسالیب اور طریقے\*۔ اس سے علوم و فنون کا مفہوم واضح ہے۔

قرآن کریم میں جنت (بَلَدُ جَنَّاتٍ) کے متعلق ہے کہ وہ ذَوَاتَا اَفْنَانٍ (۳۸) ہے۔ جسکی مختلف شاخیں ہوں۔ جہاں مختلف علوم و فنون عام ہوں۔ قرآن کریم کی رو سے جنتی معاشرہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ مختلف فنون کی آماجگاہ ہوگا۔

## ف ن ی

اَلْفَتْنَاءُ\*۔ بَقَاءُ\* کی ضد ہے۔ بَقَاءُ\* کے معنی ہیں کسی چیز کا ایسی اصلی حالت پر قائم رہنا۔ (دیکھئے عنوان ب۔ ق۔ ی)۔ یعنی اس کا تغیر پذیر نہ ہونا۔ لہذا اَلْفَتْنَاءُ\* کے معنی ہونگے کسی چیز میں تغیرات واقع ہوتے رہنا۔ اسکا اپنی اصل حالت پر نہ رہنا بلکہ اس میں تغیر و تبدل واقع ہوتے رہنا۔ قرآن کریم میں ہے "كُلُّ مَنۢ عَلَیْہَا فَاَنٌۭ"۔ وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّیْكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۲۶:۲۷)۔ فَاَنٌۭ۔ اسم فاعل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ زمین پر جو کچھ ہے سب معدوم ہو جائیگا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائیگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کی ذات ایسی ہے جو تغیر پذیر نہیں۔

جسے "تغیر" (Change) کہا جاتا ہے، اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کسی شے کے اندر تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس طریق (Process) سے ہوتا یہ ہے کہ جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ چیز معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں کام اسطرح بیک وقت ہوتے ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پہلی چیز کب معدوم ہوئی اور اسکی جگہ دوسری چیز کب وجود میں آئی۔ (برگسان نے اس نکتہ کی بڑی عمدہ تشریح کی ہے) لیکن (برگسان کے فلسفہ کی رو سے) ذات (Personality) ایسی شے ہے جس میں نشوونما اور ارتقاء تو ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ معدوم ہو جائے (It does not cease to exist) اسی کو باردیونے (Changelessness in change) سے تعبیر کیا ہے۔ اور خدا چونکہ

مکمل اور مطلق ذات ہے اس لئے اس میں تغیر اور معدوم ہو کر پھر سے متشکل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دور میں ہنوز فلسفہ یہیں تک پہنچا ہے۔ لیکن اس سے بھی قرآن کریم کی مندرجہ صدر آیات (۲۵-۲۶) کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے۔

چونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ تبدیل شدہ چیز لے لیتی ہے، اس اعتبار سے اَلْفَنَاءُ۔ کسی چیز کے ختم ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ نیز اَلْفَنَاءُ بہت بوڑھے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو قریب الختم ہوتا ہے۔ اور فَنَاءُ القادر۔ گھر کے سامنے کے وسیع میدان کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں گھر کی ہمارت ختم ہو جاتی ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے کلمات کسی قیاس کے مطابق نہیں آتے۔

## ف ل م

فہم۔ یَفْہَمُ۔ فہمًا۔ کسی چیز کو جان لینا اور دل سے پہچان لینا۔ بعض لوگوں نے علم اور فہم میں یہ فرق کیا ہے کہ علم تو مطلق ادراک (کسی چیز کو جان لینے) کو کہتے ہیں اور فہم کہتے ہیں خارجی اشیاء پر غور کے بعد ذہن کا دوسری چیزوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جانا۔ بعض نے کہا ہے کہ الفاظ سے جو تصور ذہن میں آتا ہے اُسے فہم کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک فہم ذہن کی اس خوبی کو کہتے ہیں جس سے وہ مطالب کو تیزی اور عمدگی سے اخذ کر لیتا ہے\*\*۔ فہمۃ۔ میں نے اسے سمجھا دیا\*\*۔ قرآن کریم میں ہے فَفْہَمْتُمْنَهَا سَلِیْمٰنَ (۲۹)۔ ہم نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا۔

## ف و ت

فَاتَہُ اَلَا مَرٌ۔ وہ معاملہ اسکی گرفت سے جاتا رہا۔ ہاتھ سے نکل گیا۔ دسترس سے دور ہو گیا\*\*\*۔ (۱۵۲)۔ دراصل فَاتَہُ اَلَا مَرٌ کے معنی ہیں اس کام کو کرنے کا وقت نکل گیا\*\*\*۔ اَلْفَوْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لئے دشوار ہو\*\*\*\*۔ (۵۴)۔ چنانچہ معاورہ ہے هُوَفَوْتُ فَمِیْہِ اَوْفَوْتُ رَمَیْہِ۔ وہ اسے نظر تو آ رہا ہے لیکن اسکی دسترس سے باہر ہے\*\*\*۔ اَلْفَوْتُ۔ شگاف۔

نیز دو انگلیوں کے درمیانی خلا کو کہتے ہیں \*۔ تَفَاوُت کے معنی عدم مطابقت اور عدم تناسب کے ہوتے ہیں \*\*۔ سورة الملک میں ہے - مَا تَرَىٰ فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ - (۹۶) - تم خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی عدم تناسب نہیں دیکھو گے - ہر جگہ توازن و تناسب نظر آئے گا۔

## ف و ج

الْفَوْجُ - الْفَتَائِجُ - لوگوں کی جماعت - رؤساء کے متبعین - جمع افواج ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہو جانے کے ہیں - افاج - وہ تیز رفتار ہوا - فاجَ الثَّيْسُ - مشک کی خوشبو پھیل گئی - اس لفظے الْفَوْجُ تیزی سے گزرنے والی جماعت کو کہتے ہیں \*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے - یَوْمَ نَنفُثُ مِن مِّمِّ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (۲۸) - ”جس دن (یا جس دور میں) ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ کو اکٹھا کرینگے“ - یہاں اس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں - سورة النصر میں ہے یَدُ خَلْدُوْنَ فِیْ دَرَبِنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا - (۱۱۴) - ”اللہ کے دہن میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہیں“ - یہاں اس میں تیزی اور کثرت دونوں کا مفہوم ہے - نظام خداوندی کی تشکیل میں پہلا مرحلہ تو وہ ہے جس میں داعی الی الحق کی بڑی محنت اور مشقت کے بعد ، اِکا دکا کر کے ، مدت مدید میں ، کچھ افراد جمع ہوئے ہیں - پھر ان کی محنت شاقہ اور سعی پیہم سے ، اس نظام کے اولین مراحل طے ہوئے ہیں - یہ السابقون الاولون کی جماعت ہوتی ہے جنہیں قدم قدم پر سینکڑوں قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے - لیکن ان کی اس سعی مسلسل کے بعد ، جب یہ کھیتی پروان چڑھتی ہے تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر ، لوگ جوق درجوق اس نظام میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں - یہ ہے وہ منزل جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَدُ خَلْدُوْنَ فِیْ دَرَبِنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا -

## ف و ر

فَارَ - فَوْرًا - جوش مارنا - بھوٹ کر نکل پڑنا - فَارَتِ النِّقِدُ رًا - ہانڈی جوش کھائے لگی - اَلْفَوَارَةُ - وہ جگہ جہاں سے چشمہ جوش مار کر نکلے \*۔ رَجُلٌ فَيَّسُورٌ - تیز مزاج اور جلد غصہ میں آجانے والا آدمی \*\*۔

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* تاج و محیط و راغب -

سورة ہود میں ہے - فَارَ التَّنْزِيلُ (۱۱) - زمین میں سے جوش کے ساتھ  
چشمے اہل پڑے - سورة آل عمران میں ہے - وَ يَأْتُوْكُمْ مِّنْ قَوْرٍ هِيمٍ  
(۱۲۶) - وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں - سورة ملک میں ہے -  
وَ هِيَ تَنْفُوْرٌ (۶۴) - وہ جوش مار رہی ہوگی - ابن فارس کے نزدیک اس  
کے بنیادی معنی جوش مارنے کے ہیں -

قَوْرٌ کے معنی جلدی اور بغیر رکے کسی کام کو کرنے کے بھی ہیں -  
عربی زبان میں عَلَى الْقَوْرِ اور مِّنْ قَوْرٍ اور اردو میں فوراً بولتے ہیں -  
عجلت کا مفہوم اس لئے پیدا ہوا کہ جوش میں عجلت ہی سے کام لیا  
جاتا ہے -

## ف و ز

الْفَوْزُ - اگرچہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا پا لینے کے  
بھی ہیں \* - لیکن اس کا دوسرا مفہوم اپنی آرزو بنا خیر کو حاصل  
کر لینا ، مقصود کو پا لینا ہے \* - مصیبت سے رہائی پالینا محض ایک سلبی  
(Negative) چیز ہے لیکن قرآن کریم ، جنت کی زندگی کو ایک ایجابی  
(Positive) مقصد کا حصول (Achievement) قرار دیتا ہے - اس لئے وہ اہل  
جنت کو فَوَائِزُ وُنْ (۳۱) کہتا ہے - یعنی وہ جو فَنَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا  
(۳۳) کے حامل ہیں - اس میں اس دنیا کا مال و متاع اور خوشگواریاں بھی  
شامل ہیں ، جیسا کہ قرآن کریم نے (نہ۲) میں خود واضح کر دیا ہے -  
دوسری جگہ اسے مَفَازًا کہا ہے - (۳۸) - سورة آل عمران میں ہے کہ جو  
شخص تباہیوں سے محفوظ رہا اور ”جنت میں داخل ہو گیا“ - فَقَدْ فَازَ  
(۳۳) تو یہ ہے جسے کامیاب کہا جائے گا - دیکھئے ، اس میں دونوں پہلو  
موجود ہیں - تباہیوں سے بچنا اور زندگی کی خوشگواروں کا حاصل ہوجانا -  
یہ ہے کامیابی - اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے - يَنْجِي  
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اَتَّقَوْا بِمَفَازٍ تِهِيْمٍ (۳۹) - متقیوں کو اللہ تباہیوں سے بچاتا ہے ،  
اُن کی کامیابی کے ساتھ - یعنی وہ تخریبی قوتوں کے شر سے بھی محفوظ رہتے ہیں  
اور اپنے مقاصد کو حاصل بھی کرتے ہیں -

دنیا کے مذاہب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل  
کر لینا ہے - جن میں انسان گرفتار ہوتا ہے - لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصود  
حیات قرار نہیں دیتا - اس کے نزدیک ان تباہیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو



حاصل کرنے (Positive Achievement) کا نام کامیابی ہے۔ (دیکھئے عنوان ف۔ ل۔ ح اور ن۔ ج۔ و)۔ یہ مثبت کامیابی، اس دنیا میں۔۔۔ ربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت۔ یہی فوز عظیم ہے۔

## ف و ض

فَوَضَّضَ إِلَيْهِ الْأَمْرَ تَفْوِضًا۔ اس نے معاملہ اس کی طرف لوٹا دیا، اس کے حوالہ کر دیا\*۔ اس معاملہ کا فیصلہ اس کے اوپر چھوڑ دیا۔ أَلْمُفَاوَضَةُ کے معنی ہوتے ہیں ایک دوسرے کے برابر اور شریک کار ہونا۔ سَتَاعَهُمْ فَوَضَّضَ بَيْنَهُمْ۔ ان کا سامان اس طرح ان کے درمیان مشترک ہے کہ اس میں ہلا تخصیص غیرے سب برابر کے شریک ہیں۔ اسلئے قَوْمٌ فَوَضَّضَ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تمام لوگ برابر ہوں۔ کوئی کسی پر حکم نہ چلائے، نہ کوئی کسی سے مشورہ کرے۔ اور نہ ان کا کوئی حاکم اور لیڈر ہو\*۔ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جن کا معاملہ غیر واضح اور گڈمڈ ہو۔ ان میں سے کوئی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتا ہو اور ایک دوسرے پر کام ڈالتا ہو۔ اسی سے آجکل فَوَضَّضَتْ اَنَارُکِ (Anarchy) کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَ أَوْضَحَّ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ (۳۳)۔ میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اسے اپنے معاملہ کا مختار بناتا ہوں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی پر تکیہ کرنا اور اس کے سپرد کر دینا ہیں۔ جماعت مومنین قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتی ہے اور اپنے معاملات کو انہی کے سپرد کر دیتی ہے۔

## ف و ق

فَوْقُ۔ تَحْتَ کی ضد ہے۔ تَحْتَ کے معنی نیچے اور فَوْقُ کے معنی اوپر۔ قرآن کریم میں یہ لفظ أَسْفَلَ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے (۳۳)۔ فَاقَ فَوْقًا کے معنی ہیں کسی سے کسی بات میں زیادہ ہولنا۔ فَوْقُ کے معنی کبھی دُونُ یعنی ورے اور کمتر کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی کہے کہ فَلَانٌ صَغِيرٌ (وہ چھوٹا ہے) اور اس کے جواب میں کہا جائے وَ فَوْقَ ذَٰلِكَ تو یہاں فوق سے مراد ہوگا اس سے بھی چھوٹا (جتنا تم

بتا رہے ہو)\* - (۲۶) میں یہی مفہوم ہے - لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی یہ اوپر ہی کے معنی رکھتا ہے - یعنی مچھر سے بڑے مثلاً مکڑی وغیرہ -

الْفَتَائِقُ - ہر چیز کا بہترین حصہ - تَفْتَوَّقُ عَلٰی قَوْمٍ مِیہ کے معنی ہیں وہ رتبہ میں اپنی قوم پر بلند ہو گیا - اس اعتبار سے قرآن کریم میں لفظ فَوَّقُ غلبہ و تسلط کے معنوں میں آیا ہے - يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (۱۵) - ان پر خدا کا جو غلبہ و تسلط ہے اس سے خائف رہتے ہیں - اِلْتِمَاقًا - فَوَاقُ اور فَوَاقُ اس وقفے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہو - یا یہ کہ اونٹنی جنگل سے چر کر آئے تو اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس کا دودھ دوھا جائے\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی لوٹ آنا بھی ہیں - چنانچہ فَوَاقُ اِلْتِمَاقًا کے معنی ہیں دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا - سورة اعراف میں ہے - فَلْتَمِاْ اَفَاقُ (۳۴) - جب اسے غش کے بعد ہوش آیا - جب اس میں سکون پیدا ہوا - نِز فَوَاقُ ہچکی کو کہتے ہیں\* - سورة ہود میں ہے مَسَالَتْهَا مِیْنُ فَوَاقٍ (۳۸) - اس میں وقفہ نہیں ہوگا - ابن فارس نے اس کے معنی رجوع اور ہلٹ کسر آنا لکھے ہیں - یعنی تکرار اور دوبارہ ہونا - اِلْتِمَاقًا - فقر اور ضرورت کو کہتے ہیں - اِلْتِمَاقُ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی فقیر اور حاجت مند ہو گیا\* -

## ف و م

الْفُؤْمُ - بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاء، ثاء سے بدل دی گئی ہے اور اصل میں یہ لفظ فُؤْمُ (بمعنی لہسن) ہے - مگر صحیح یہ ہے کہ الفُؤْمُ گیہوں کو کہتے ہیں اور روٹی کو بھی - نیز ان تمام غلیوں کو کہتے ہیں جن کی روٹی پکائی جاتی ہے - بعض نے کہا ہے کہ الفُؤْمُ جسے کو کہتے ہیں\*\* -

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۶) میں آیا ہے -

## ف و لا

فَآءُ - فَوَّءُ - فِیئہ - سب کے معنی مَنہ (فَم) کے ہیں - جمع آفَوَآءُ - آفَوَآءُ - مسالے نیز وہ چیزیں جو خوشبو کے لئے ڈالی جاتیں - قسم قسم

\* تاج و راغب - \*\* تاج -

کے پھول اور کلیاں - انواع و اقسام کی چیزیں \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کھلنے کے ہیں - (یعنی کسی چیز کا پسند نہ ہونا بلکہ کھلا ہونا)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں کسی کی بات (قَوْلٌ) کو فَمٌ یا فَوَہ کی طرف منسوب کیا ہے وہاں اس کے جھوٹ کی طرف اشارہ ہے - یعنی وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں - ان کے دل کی تائید اس کے ساتھ شامل نہیں \*\* - يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۱۶۶) - وہ زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں -

## فی (حرف)

فی (۱) ظرف مکان یا ظرف زمان کے لئے آتا ہے - جیسے ، مسجد میں - یا چند سال کے عرصہ میں - فَاَصْبَحَ فِي الثَّمَدِ بَنَةً (۲۸) - پس وہ صبح کے وقت شہر میں آیا - بِأَغْلَبَتِ الشُّرُومُ ..... فِي بَيْضَعٍ سِنِينَ (۳۰) رومی مغلوب ہو گئے ، (اور وہ مغلوب ہونے کے بعد غالب آجائیں گے) چند سال کے عرصہ میں - یا ویسے ہی ”میں“ کے معنوں میں - مَثَلًا وَلَكُمْ فِي الْقِيَصَاصِ حَيٰوةٌ (۱۰۹) - تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے -

(۲) معیت (ساتھ) کے معنوں میں - قَالَ ادْخُلُوا فِيْ اُمَمٍ (۳۸) - ان سے کہیگا کہ تم (سابقہ) امم کے ساتھ (جہنم میں) داخل ہو جاؤ - یعنی انہی میں شامل ہو جاؤ -

(۳) سبب کے لئے - قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (۱۲) - (عزیز کی ہورت نے) کہا کہ یہی وہ ہے جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں -

(۴) علی (اوپر) کے معنوں میں - وَلَا صَلَیْبَ بَنَکُمْ فِيْ جَذْوَعِ النَّخْلِ (۲۰) - میں تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دوں گا -

(۵) الی (تک - کی طرف) کے معنوں میں - فَرَدَّوْا اَبْدَرِ بَنَهُمْ فِيْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۹) - تو وہ اپنے ہاتھ ان کے منہ تک لئے گئے -

(۶) مین (سے) کے معنوں میں - وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ کُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا - جس دن (۸۹) ہم ہر امت میں سے شاہد کھڑے کریں گے -

- (۷) مقابلہ کے لئے - فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ  
إِلَّا قَلِيلٌ (۸۸) - متاع دنیا آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہے۔
- (۸) کبھی یہہ زائد بھی ہوتا ہے - قَالَ أَرَأَيْتُمْ أَفِيضًا (۱۱) -  
اس نے کہا کہ اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ - فَيُفِيضُ اس لئے زائد ہے کہہ  
خالی اُرْ كَتَبُوا هَا کے بھی وہی معنی ہیں۔
- (۹) سورہ عنکبوت میں ہے - وَالَّذِينَ جَاءَهُدُ وَأَفِيضًا لَنُفِذَنَّ بِهِمْ  
مَسْئَلَنَا (۲۹) - اس کے معنی ہونگے، جو لوگ ہمارے لئے یا ہماری  
راہ میں یا ہماری (متعین کردہ منزل) کی طرف آنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں  
ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہ نمائی کر دیتے ہیں (یہ مثال لغت کی  
کسی کتاب میں نہیں ملی)۔

## فی ا

فَيُفِيضُ - سایہ - محیط میں ہے کہ طلوع آفتاب سے لیکر زوال آفتاب تک  
کے سایہ کو ظیل کہتے ہیں، اور زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کے سایہ  
کو فَيُفِيضُ - چونکہ سایہ لوٹ کر آتا ہے اسی لئے فُتَاءَ کے معنی لوٹنے سے  
واپس آنے کے ہوتے ہیں اور اَفْتَاءَ کے معنی لوٹانے اور پسٹانے کے۔  
فَيُفِيضُ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہوتے ہیں - مال غنیمت  
اور خراج کو بھی فَيُفِيضُ کہتے ہیں، اسلئے کہ وہ کفار کی طرف سے مسلمانوں  
کی طرف لوٹ آتا ہے۔

سورہ نحل میں ہے - يَتَفَتَّحُونَ ظِلِّهِمْ عَنِ الشِّمَائِلِ  
(۸۸) - اس کا سایہ دائیں بائیں لوٹتا رہتا ہے۔

سورہ حجرات میں ہے - حَتَّى تَفِيضَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ - (۴۹) - تاوقتیکہ  
وہ قانون خداوندی کی طرف لوٹ نہ آئے۔

قرآن کریم نے فَيُفِيضُ اور غنیمت کا الگ الگ ذکر کیا ہے - مال فَيُفِيضُ کے  
متعلق سورہ حشر میں ہے وَمَا أَفْتَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا  
أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلِلَّهِ اللَّهُ يَسْلُطُ  
رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ..... (۵۹) - ”اور اللہ نے اپنے رسول کو ان  
سے جو مال فَيُفِيضُ دلایا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ - لیکن  
اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط دیدیتا ہے“ - اس سے ظاہر ہے  
کہ مال فَيُفِيضُ وہ ہے جو بغیر لشکرکشی کے حاصل ہو جائے - ہو سکتا ہے کہ

اس میں (دشمن سے حاصل کردہ مال کے علاوہ) وہ مال بھی شامل ہو جو صوبے، اپنی ضروریات سے فاضل، مرکز کی طرف بھیج دیں۔ مال فی کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ یہ ”اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربىٰ - یتامیٰ - مساکین اور ابن السبیل کے لئے ہے۔“ اس کے بعد ”کی لا یَکُونُ دَوْلَةً بَیْنَ اَیْنٍ“ لَاحِظُوا مِنْکُمْ۔“ تاکہ یہ مال تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے۔“ یہ اصول قومی معیشت کے ایک بنیادی نکتہ کو بیان کرتا ہے۔ یعنی دولت کی گردش (Circulation) اوپر کے طبقہ ہی میں نہیں ہوتی رہنی چاہئے۔ اس کے بعد ”وَمَا آتَاکُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا“ (۲۹)۔ ”جو کچھ تمہیں رسولؐ دے اسے لے لو۔ اور جس سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔“ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے مملکت کی دولت کے مصارف کی اصولاً نشاندہی کر دی ہے لیکن اس کی تفصیلی تقسیم کا حق مرکز کو دیا ہے جو مقتضائے حالات کے مطابق خرچ کریگا۔

مال غنیمت کے متعلق سورۃ انفال میں ہے ”وَاعْلَمُوْا اَنْتُمْ غَنِمْتُمْ مِّثْنِ شَیْءٍ فَاَنْ لِّلّٰهِ خُمُسُهٗ“ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ... (۸)۔ اور سمجھ لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربىٰ کے لئے - یتامیٰ - مساکین اور ابن السبیل کے لئے۔“

صدقات کے مصارف کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ وہ ”فقراء - مساکین - اور صدقات کے کارکنوں کے لئے ہیں۔ اور ان کے لئے جنکی تالیف قلوب ضروری ہے۔ اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانے کیلئے۔ اور مقروض و مصیبت زدوں کے لئے۔ اور ”اللہ کی راہ“ میں خرچ کرنے کے لئے اور ابن السبیل کے لئے... (۹)۔“

مال فی اور غنیمت کے مصارف میں ”ذی القربىٰ“ کے متعلق استاذ محمدؒ عترة دروزہ نے اپنی کتاب ”الدستور القرآنی“ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ”رشتہ دار“ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اسلام میں پیش پیش رہے ہوں اور جنہوں نے اسلام اور ملت کے لئے مفید خدمات سرانجام دی ہوں۔ لیکن قرآن کریم کے دیگر مقامات سے اس مفہوم کی تائید نہیں ملتی۔ البتہ اس نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہؐ کے رشتہ دار نہیں، تو یہ چیز قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

## ف ی ض

فَاقِضَ السَّمَاءَ\* - يَفْقِضُ\* - فَيَقْضِي\* - فَيُوقِضُ\* - کسی جگہ پانی کا بہت زیادہ جمع ہو کر وہاں سے نکل پڑنا اور بہہ نکلنا - آنسوؤں کے بہنے کے لئے بھی آتا ہے (۵۸۳) - حَسَوْضٌ\* فَيَاقِضُ\* - لبالب بھرا ہوا حوض - بَعَثَرٌ\* فَيَاقِضُ\* - ہرجوش سمندر جس کا پانی اوپر سے اچھل کر نکل رہا ہو - الْفَيْضُ\* دریا اور نہر کو کہتے ہیں - فَيَقَاضُ\* - بہت پانی والی نہر - قَاضٍ السَّحَابُ\* يَفْقِضُ\* - مال بہت زیادہ ہو گیا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آسانی سے بہنے کے ہیں - یہیں سے یہ لفظ لوگوں کے کثیر تعداد میں ادھر ادھر جانے کے لئے استعمال ہونے لگا - چنانچہ آءِ لَفَاظَةِ\* کے معنی ہیں کثیر آدمیوں کا تیزی کے ساتھ چلنا - یکبارگی چل پڑنا - یکبارگی روانگی اور واپسی کو اِفَاقِظَةٌ\* کہتے ہیں - نیز باتوں میں بہ جانے (مشغول ہو جانے) کو بھی\* - در اصل الاِفَاقِظَةُ\* کے معنی لٹڈھانا ، اوپر سے گرانا اور بہانا ہیں (۵۰)۔

چل پڑنے کے معنوں میں قرآن کریم میں یہ لفظ (۲۹۹) میں آیا ہے - باتوں میں لگ جانے کے لئے (۲۸) میں - اور باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے ، دونوں معنوں میں (۲۳) میں -

## ف ی ل

الْفَيْلُ\* - ہاتھی\* - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ”فیل“ سے معرب ہے - اور جو لفظ فیل\* عربی الاصل ہے اس کے معنی کمزوری کے ہوتے ہیں - رَجُلٌ فَيْلٌ الْقَرَامِي\* - کمزور رائے والا آدمی -

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْفَيْلِ (۱۰۵) آیا ہے - اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرہہ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لیکر کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا اور اس کے لئے اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں ، خفیہ راستہ اختیار کیا تھا - لیکن گدھوں کے جُھنڈ ، جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کسی طرف جا رہی ہے اس لئے ہمیں ان کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک (لاشیں) ملیں گی ، ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آگئے - انہیں دیکھ کر قریش حرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آ رہا ہے - چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور

کا ہتھراؤ کیا۔ کچھ تو خود ان ہتھروں سے، اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی  
 بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے، وہ فوج بھس کی  
 طرح ہو گئی۔ یہ سارا واقعہ سورۃ فیل میں بیان ہوا ہے۔ واقعہ ایسا تھا  
 جسے مخاطبین عرب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے وہ جانتے تھے  
 کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے۔ قرآن کریم کا اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ تم  
 اس دین حق کی مخالفت چھوڑ دو ورنہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

# ق

## قارون

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون، هامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا (۲۴۰)۔ اور ان دونوں کی طرح قارون بھی ہلاک ہوئے والوں میں سے تھا (۲۴۱)۔ قارون قوم موسیٰؑ میں سے تھا اور سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے (۲۴۰-۲۴۱)۔ تورات میں ہے کہ قارون (قرح بن ظہار بن قیات بن لاوی) حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے اٹھا (گنتی ۱۰: ۱)۔ یہودیوں کا مشہور مؤرخ جوزیفس، اپنی تاریخ (Antiquity of the jews) میں لکھتا ہے کہ

قارون جسکی شہرت اس کے نسب اور اسکی دولت دونوں وجہ سے تھی، عبرانیوں کے مشاہیر میں سے تھا۔ اسے حضرت موسیٰؑ سے حسد پیدا ہوا اور اس نے تمام بنی لاوی کو اور اپنے اہل خاندان کو ان کے خلاف ابھارا (حصہ ۴ - باب ۳ - فصل ۲) جیوٹنس انسائیکلو پیڈیا میں ہے

قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے جو خزانے مصر میں دفن کئے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ تین سو خچروں کی ضرورت تو محض اس کے خزانے کی کنجیاں اٹھانے کیلئے ہوتی تھی۔ (جلد ۷ - صفحہ ۵۵۶)۔

چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دھوت انقلاب، نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو مٹانے کیلئے ہوتی تھی اسلئے قرآن کریم نے خصوصیت سے قارون کا ذکر کیا ہے۔ سرمایہ پرست کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ (وہ سمجھتا ہے کہ) میں جو کچھ کماتا ہوں وہ میری اپنی ہنر مندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے اس لئے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ



نہیں۔ میں جتنا جی چاہے جمع کروں اور ایسے جس طرح جی چاہے صرف کروں۔ قارون (جسے قرآن کریم نے اس ذہنیت کے ایک ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے) یہی کہتا تھا۔ قَالَ لَاقِمًا أُوتِيْتُهُ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِي (۲۸)۔ ”وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا ہے۔“ قرآن کریم کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹) یہ ان لوگوں کی بڑی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔ جس چیز کو انسان اپنی ہنر مندی اور ذاتی صلاحیت کہتا ہے ذرا سوچئے تو سمجھی کہ اس میں کتنا حصہ اس کا اپنا ہے اور کتنا حصہ قدرت کا عطیہ۔ خود انسانی ذہن اور اسکی استعداد کو لیجئے۔ یہ کسی فرد کی نہ اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے نہ زر خرید۔ یہ خالصہً موهبت خداوندی (عطیہ فطرت) ہے۔ اس سے آگے وسائل پیداوار (زمین اور مافیہا) کو لیجئے تو یہ تمام کے تمام فطرت کے عطا کردہ ہیں۔ اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں محنت (Labour) اسکی اپنی ہوتی ہے، باقی سب کچھ خدا کا عطا کردہ۔ لہذا اس میں اسکا صرف حق المحنت ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ خدا کا ہوتا ہے۔ خدا ”اپنے حصے“ کے متعلق کہتا ہے کہ ایسے نوع انسانی کی عام پرورش (ربوبیت عامہ) کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ لہذا قارون (سرمایہ دارانہ) ذہنیت، قرآن کے نظام ربوبیت کی ضد ہے، اور اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ اسی لئے قرآن کریم نے قارون کے اس قول کے بعد جسے اوپر درج کیا گیا ہے کہا ہے کہ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ آهَلَكَ مِیْنِ قَبْلِیْهِ مِیْنِ النَّفْرِ وَنِ مِّنْ هٰذَا اَشَدُّ مِیْنَهُ قُوَّةٌ وَهُوَ اَكْثَرُ جَمْعًا (۲۸)۔ ”کیا ایسے علم نہ تھا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جو طاقت اور جمیعت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے اس لئے یہ نظام کبھی پتہ نہیں سکتا۔

## ق ب ح

الْقَبِيْحُ\*۔ وہ چیز جسے نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے اور وہ عمل جس سے انسان کا دل نفرت کرے۔ مَقْبُوْحٌ\*۔ وہ شخص جسے ذلیل و خوار سمجھا جائے اور دھتکار دیا جائے۔ وہ چیز جسے بدناما بنا دیا گیا ہو۔ نیز جسے خیر سے دور رکھا جائے\*۔ ابن فارس نے قَبِيْحَتِهٖ کے معنی ایسے ہٹایا اور دور کر دیا لکھے ہیں، اور اس مادہ کے بنیادی معنی حسن کی ضد بتائے ہیں۔ نَفَاقَةٌ قَبِيْحَتُهُ الشَّخْبُ وہ اونٹنی جس کے تھنوں کے سوراخ بہت وسیع ہوں۔ قَبِيْحٌ التَّبِيْضَةُ۔ اس

نے اللہ سے کہو توڑ ڈالا۔ نیز ہر چیز کو توڑے پھوڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے۔ الْقُبْحُ - حسن کی ضد ہے \*۔

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے هُمْ مِّنَ الْمُتَقَبِّحُوْنَ حِیْنَ (۲۸)۔ وہ زندگی کی تمام خوشگوار یوں سے محروم کر دئے جائیں گے۔ وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ ان کی صلاحیتیں ضائع چلی جائیں گی۔

## ق ب ر

الْقَبْرُ - میت کو دفن کرنے کی جگہ۔ الْقَبْرَةُ - قبرستان۔ قَبْرُهُ - یَقْبِرُهُ و یَقْبُرُهُ - اس نے ایسے دفن کر دیا \*۔ سورہ عبس میں ہے۔ ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاَقْبِرَہُ (۸۱)۔ پھر خدا ایسے مارتا ہے (موت دیتا ہے) اور ایسے قبر میں رکھواتا ہے۔ اس کے لئے قبر مہیا کرتا ہے یا ایسے قبر میں دفن کرنے کا کہتا ہے۔ یہاں قَبْرُهُ نہیں کہا بلکہ اَقْبِرَہُ کہا ہے۔ کیونکہ قَبْرُهُ اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کو اپنے ہاتھ سے دفن کرے۔ مَقْبَرَةُ کی جمع مَقَابِرُ آتی ہے۔ سورہ تکوین میں ہے اُرْرْتُمْ اَلْمَقَابِرَ (۲۲)۔ قرآن کریم میں مِّنْ فِی الْقُبُورِ (۲۲) کنایہ ان کے لئے بھی آیا ہے جو زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو چکے ہوں یا جہالت اور تعصب میں اس درجہ آگے بڑھ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ م۔ و۔ ت اور ح۔ ی۔ ی کے عنوانات)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے مَرْدُوں کے متعلق قبر یا مرقد وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں (مثلاً مِّنْ بَعَثْنَا مِیْنَ مَرْدَرِنَا - ۳۶)۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ مردے کسی خاص مقام (قبروں) سے اٹھائے جائیں گے۔ اگر یہ مراد ہو تو ان مَرْدُوں کی بابت کیا کہا جائیگا جنہیں دفن نہیں کیا جاتا؟ دفن کرنا تو مَرْدُوں کی (Disposal) کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے ہاں اور طریقے بھی رائج ہیں۔ قرآن کریم کا مقصد موت کے بعد کی زندگی کو بیان کرنا ہے۔ عربوں کے ہاں چونکہ مَرْدے قبروں میں گاڑے (دفن کئے) جاتے تھے اس لئے قرآن کریم نے قبروں کا ذکر کیا ہے، ورنہ حیات بعد الممات کے لئے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے نہ اس جسم کی ضرورت جو موت کے ہاتھوں تلف ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد زندگی یقینی ہے لیکن اس زندگی کے لئے پیکر یا مظہر کس قسم کا ہوگا، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی اصل مقصد تو زندگی سے ہے، نہ کہ اس کے مظاہر سے۔

## ق ب س

الْقَبَسُ - آگ کا شعلہ (یا چنگاری) جسے کسی بڑی آگ سے حاصل کیا جائے۔ الْقَبَسُ - آگ کی چنگاری \*۔ سورہ طہ میں ہے۔ اَنْتَبِئْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ (۲۰) میں اس آگ سے تمہارے پاس شعلہ لے آؤں۔ اِنْتَبَسَ - اس نے بڑی آگ سے کچھ آگ لے لی \*۔ سورہ حدید میں ہے۔ نَقْتَبِسُ مِنْ نُّوْرِكُمْ (۵۴) - ہم تمہاری روشنی سے کچھ روشنی لے لیں۔ تمہارے دیے سے اپنا دیا جلا لیں۔ اس سے اِنْتَبَسَ الْعِلْمُ کے معنی ہیں کسی سے علمی استفادہ کرنا \*۔

## ق ب ض

قَبَضَ عَلَيْهِ يَدَهُ - اس نے اسے اپنے پورے ہنچے سے پکڑ لیا۔ گرفت میں لے لیا۔ قَبَضَ يَدَهُ عَنْهُ - اس نے اسے پکڑنے سے اپنے ہاتھ کو سکیڑ لیا۔ یا کھینچ لیا۔ دراصل قَبَضَ کے معنی کھینچ لینے یا سکیڑ لینے کے ہوتے ہیں \*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کو لے لینا اور (۲) کسی چیز کا سکیڑ اور سمٹ کر مجتمع ہو جانا بتائے ہیں۔ یہ بَسَطَ کی ضد ہے (۲۴۵) جس کے معنی پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں۔ سورہ فرقان میں ہے۔ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا (۲۹) پھر ہم اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

قَبْضَةُ - ملکیت۔ سورہ زمر میں ہے۔ وَاَلَا رُءُوسُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّعَلَٰتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (۳۹)۔ آسمانی انقلاب کے دور میں معاش کے تمام ذرائع اسی خدا کی ملکیت میں ہونگے جس کے تصرف میں کائناتی نظام ہے۔ یعنی اس وقت انسانی معاش بھی خدا ہی کے قانون کے تابع ہوگی۔ یہ نہیں ہوگا کہ کائنات میں خدا کا قانون چل رہا ہو اور زمین (انسانی معاش) میں انسانوں کا خود ساختہ قانون۔ یہ شرک ہے۔

قَبْضَةُ - اختیار کرنا۔ سورہ طہ میں سامری کے متعلق ہے کہ اس نے کہا کہ فَيَقْبِضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الْقَرَسُورِ (۲۸)۔ میں نے رسول (حضرت موسیٰ) کے نقش قدم (مسلك و مشرب) میں سے بہت تھوڑا سا اختیار کیا۔ یعنی میں نے ان کی بہت تھوڑی سی پیروی کی۔ فَتَبَذْتُهَا - اور پھر اسے بھی چھوڑ دیا \*\*\*۔

مَقْبُوضَةٌ - قبضہ کی ہوئی۔ ہاتھ میں لی ہوئی۔ (۲۸۳)۔

سورہ ملک میں ہرندوں کے متعلق ہے۔ صَفَاتٍ وَيَقْبِضُنَ (۱۶)۔  
اس کے عام معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں اور سکڑتے ہیں۔ لیکن  
صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ قَبْضُ الطَّائِرِ کے معنی ہیں ہرندے  
نے اڑنے میں تیزی کی۔ اسی طرح قَدَرَسُ قَبِيضُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں  
تیزی سے ہاؤں اٹھانے والا گھوڑا\*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی  
لکھے ہیں۔

## ق ب ل

قَبْلُ - بَعْدُ کی ضد ہے۔ قرآن کریم میں ہے رَبُّهُ لَا مَرُءٌ مِّنْ قَبْلُ  
وَمِنْ بَعْدُ (۳)۔ ”پہلے اور پیچھے اللہ ہی کا امر ہے“۔ نیز قَبْلُ کے  
معنی ”بغیر“ کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے قَبْلَ أَنْ تَنْفُذَ  
كَلِمَتَ رَبِّي (۱۸) جس کے معنی ہیں ”بغیر اس کے کہ میرے رب کے کلمات  
پورے ہو سکیں\*\*\*“۔ (اگرچہ یہاں اس کے معنی ”قبل اس کے“ بھی ہو سکتے ہیں)۔  
الْقَبْلُ الْقَبْلُ - (بِه الدَّيْبُ و الدَّيْبُ پیچھے کی ضد ہے۔ یعنی)  
آگے۔ سورہ یوسف میں ہے وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِّنْ قَبْلُ (۱۲)۔  
”اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے“۔

الْقَبْلُ - پہاڑ کا دامن (عرض میں)۔ الْقَبْلُ مِّنَ الزَّمَانِ - زمانہ  
کا اولین حصہ۔ الْقَبْلَةُ - بوسہ۔ قَدَّوَابِلُ الْأُمَرَاءِ - کسی معاملہ کے  
ابتدائی امور۔ مبادیات۔ الْقَابِلَةُ - آنیوالی شب۔ نیز وہ عورت جو بچہ  
جنائے\*\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا دوسری  
چیز کے آمنے سامنے ہونا ہیں۔ رہ گیا قَبْلُ کا لفظ جو بَعْدُ کی ضد ہے تو  
وہ اس بنیادی معنی کے تحت نہیں آتا۔ لہذا وہ خلاف قیاس ہے، اگرچہ یہ  
تداول کی جا سکتی ہے کہ جو چیز پہلے واقع ہوتی ہے وہ زمانہ کے سامنے آرہی  
ہوتی ہے۔ لیکن یہ توجیہ قرین قیاس نظر نہیں آتی\*\*\*۔

قَبْلُ کے معنی ہیں آمنے سامنے۔ نیز طرف، جہت، رخ، سمت۔ یہ  
بمعنی عِنْدُ بھی آتا ہے۔ یعنی پاس، نزدیک۔ اس کے معنی تاب و توان اور  
طاقت کے بھی ہیں۔ سورہ حدید میں ہے وَظَاهِرُهُ مِّنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ  
(۵۹)۔ اس کے معنی ”باہر کی جہت“ یا باہر کی طرف، سامنے سے عذاب،

دونوں آسکتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں قِبَلِ الْمَشْرِقِ (۲۴۱) آیا ہے۔ اس کے معنی مشرق کی سمت ہیں۔ لیکن اگر قِبَلِ کو قِبْلۃ کی جمع تصور کر لیا جائے تو اس کے معنی ”مشرق و مغرب کے تمام قبلے“ ہونگے۔ (تفصیل آگے چل کر آئیگی)۔

تَقَبَّلَہُ وَ قَبِلَہُ - اس نے اسے لے لیا۔ منظور کر لیا۔ قبول کر لیا۔ قرآن کریم میں ہے وَ هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (۲۴۲)۔ ”اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے“۔ دوسری جگہ ہے قَابِلِ التَّوْبِ (۲۴۳)۔ ”توبہ قبول کرنے والا“۔ تَقَبَّلَ - کسی چیز کو اس طرح قبول کرنا کہ وہ اجر و ثواب کی مستحق ہو\*۔ اِنَّا بِمَا يَتَّقِیْہُ اللّٰہُ مِّنَ الْمُتَّقِیْنَ (۲۴۴)۔ ”اللہ صرف متقین کا عمل قبول کرتا ہے“۔ ان آیات میں ”قبول کرنے“ سے مراد کسی چیز کا لے لینا ہیں (جیسے ہم کسی کا نذرانہ لے لیتے ہیں)۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عمدہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو اعمال اس کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کے مطابق سرزد ہوں وہی خوشگوار نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے۔ فَتَقَبَّلَہَا رَبُّہَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ (۲۴۵)۔ ”خدا نے اسے اچھی قبولیت سے قبول کیا“۔ قَبِیْلٌ وَقَبِیْلٌ - کھلم کھلا۔ رو در رو۔ آمنے سامنے۔ (نیز قَبِیْلٌ کے معنی ذمہ دار۔ کفیل۔ اور نمائندہ کے بھی ہوتے ہیں)\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَ حَشَرْنَا عَلَیْہِمْ كُلَّ شَیْءٍ قَبِیْلًا (۱۱۲)۔ ”ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے“۔ اَلْقَبِیْلُ - طاقت اور قوت\*۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَہُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَہُمْ بِہَا (۱۱۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ہمارے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔ وہ ان کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ اَلْقَبِیْلُ - شوہر۔ نیز تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت جو مختلف قبیلوں اور قوموں یا ایک ہی جہدِ اعلیٰ سے متعلق ہوں۔ اَلْقَبِیْلۃُ - خاندان۔ ایک باپ کی اولاد (جمع قَبَائِلُ)۔ (۱۱۴)۔ قَبَائِلُ الرَّاسِ سر کی ہڈیاں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ اولاد اسماعیل کے لئے قَبِیْلۃ کہتے ہیں اور اولاد اسحاق کے لئے سَبِط (جمع اَسْبَاط)۔

اَلْقَبِیْلۃُ - کنوئیں کے منہ پر رکھی ہوئی بڑی چٹان۔ اَقْبَلَ الْمُنہ - وہ اس کی طرف آیا۔ اَقْبَلَ الرَّجُلُ - اسے حماقت کے بعد عقل آگئی۔

قَابِلَتَهُ - مُقَابِلَتَهُ - وہ اس کے آمنے سامنے ہوا - روبرو ہوا - آقْبَلَ عَلَيْهِ - اس کی طرف متوجہ ہوا - آقْبَلَ عَلَيَّ الْأَمْرَ - وہ اس کام میں لگ گیا اور اسے چھوڑا نہیں - اسے اپنے سامنے رکھ لیا - تَقَابَلَا - وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے\* - قرآن کریم میں ہے اخذُوا أَنَا عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (۱۵۱)۔ یعنی وہ بھائیوں کی طرح تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہونگے۔

الْقِبْلَتَةُ - اس لفظ کے اصل معنی جہت یا سمت کے ہوتے ہیں۔ لیکن عرف عام میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف نماز میں رخ کیا جائے\*۔ جسے سامنے رکھا جائے۔ جو ”پیش نظر“ رہے۔ جو مقصودِ نگاہ یا نصب العین ہو۔

دین کے نظام میں قبلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہر نظام، ہر مملکت، ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افراد معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ دراصل نشان (Symbol) ہوتا ہے اس نظام یا حکومت کا جسے ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔ حکومت خداوندی کا محسوس قبلہ، اس مقام کے علاوہ اور کونسا مقام ہو سکتا تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ إِنْ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ (۲۴۸) یعنی دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا جسے تمام اقوام عالم کے لئے راہ نمائی کا نشان بنایا گیا۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۲۴۹)۔ ”جو اس میں داخل ہو گیا اسے دنیا جہاں کی آفات سے امن مل گیا“۔ قبلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اتباع کو قرآن کریم نے دین کے اتباع سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ایک جگہ ہے وَلَسُنَّ أَتَيْنَتْ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِ بَعْضٌ..... (۱۶۵)۔ ”اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے تمام آیات (دلائل) بھی لیے آئے تو بھی وہ تیرے قبلہ کا اتباع نہیں کریں گے۔ اور نہ تو ان کے قبلہ کے تابع ہوگا۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَلَسُنَّ تَتَّبِعُوا نَبِيَّكَ الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّةَهُمْ (۱۶۰)۔

”یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک تو ان کی ملت (مسلک) کا اتباع نہ کریگا“۔ اس سے ظاہر ہے کہ قبلہ، درحقیقت ملت و مسلک (دین) کا محسوس نشان ہے اور اتباع قبلہ سے مراد اتباع دین ہے۔

جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہوں، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے مرکز (قبلہ) کی طرف مرکوز رکھیں۔ وَ حَبِیْثٌ مَّا كُنْتُمْ قَوَّامُونَ وَ جَوُّهُكُمْ شَطْرَهُ (۲۵۰)۔ ”تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو“۔ یعنی اپنی توجہات کو اس کی طرف مرکوز کرو۔ تمہارا نصب العین حیات ایک ہو اور یہی وحدت نصب العین تمہاری وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے۔ اسی کی محسوس شکل، اجتماعات صلوٰۃ میں کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی تبتین کے لئے فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَوَلَّوْا وَ جَوُّهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ..... (۲۴۴)۔ ”کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف“۔ [اگر قِبَلَ کو قِبْلَتَہ کی جمع تصور کر لیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب میں جس قدر قبلے ہیں، وہ کسی قوم کے یا کسی مذہب کے ہوں، ان کی ساری اہمیت اضافی ہے۔ ذاتی نہیں]۔ بات بالکل واضح ہے۔ جو چیزیں کسی نظام کے لئے محسوس نشانات کا کام دیتی ہیں جب تک وہ نظام قائم رہے، ان نشانات کی اہمیت حتمی اور یقینی، اور ان کا احترام و التزام نہایت ضروری ہوتا ہے۔ (اسی کو دوسری جگہ شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر) لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہے تو ان نشانات کا احترام محض ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ لطیف اور اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے ایک جگہ تاکیداً کہا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اپنے دین اور نظام کے محسوس مرکز کی طرف رکھو۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری وفا شعار یوں کا مرکز کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس مرکز کی طرف منہ کرنا مقصود بالذات ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظام گم ہو جائے اور قوم انفرادی زندگی بسر کر رہی ہو، لیکن اس کے دل میں اس نظام کے قیام کی آرزو ہو، تو اس وقت قِبْلَتَہ کسے بنایا جائے؟ یعنی اس وقت اجتماعی زندگی کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی

کہ ایسے حالات میں وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً ۖ وَاقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۱۸۷) - یعنی ”اپنے گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز بناؤ اور وہیں سے نظام صلوٰۃ کے قیام کی ابتدا کردو“۔ یعنی اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے (ایک خاندان کو وحدت (Unit) تصور کر کے) کرو۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پوری کی پوری قوم کو محیط ہو جائیگا اور سب کے لئے ایک قبلہ قائم ہو جائیگا۔

یہودیوں کے لئے یہ اجتماعی مرکز بیت المقدس تھا۔ لیکن یہودیوں نے دین خداوندی کو اپنی نسل تک محدود کر لیا، لہذا یہ مرکز بھی ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا۔ عالمگیر انسانی برادری کا مرکز نہ رہا۔ ایک یہود ہر ہی کیا موقوف، اُس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم کے سامنے بھی عالمگیر انسانیت کی وحدت کا تصور نہیں تھا۔ ان کے برعکس، قرآن کریم کے پیش نظر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا، اس لئے وہ مختلف قومی مراکز میں سے کسی کو بھی اپنا مرکز قرار نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اس کعبہ کو مرکز قرار دے سکتا تھا جس کی بناء حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں اسی مقصد کے لئے رکھائی گئی تھی۔ (۱۴۷)۔ اس مقام کو مَثَابَةٌ لِّلنَّاسِ وَآمَنَّا (۱۴۵) قرار دیا گیا تھا۔ یعنی تمام نوع انسان کے لئے مرجع اور پناہ گاہ۔ یہ مَثَوَانِ الْعَمَّاكِفِ قِيَمِهِ وَالْبَادِ (۲۰۲) تھا۔ یعنی وہاں کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ یہ بنایا ہی تمام انسانوں کے قائدے کے لئے گیا تھا (۲۰۳)۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو دین خداوندی کا مرکز (قبلہ) بنایا گیا۔

جہاں تک خود امت مسلمہ کا تعلق ہے، تعیین قبلہ کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً ۭ وَسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰهَدَآءَ عَلٰی النَّاسِ وَيَكُوْنُوْا الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰهِيْدًا (۲۴۸)۔ ”اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا تاکہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگران رہو اور رسول (تمہارا مرکز ملت) تمہارے اعمال کا نگران رہے“۔ اس آیت جلیلہ میں مسلمانوں کے مقصد حیات، مقام اور طریق عمل کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ کعبہ کو قبلہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ دین، قومی دواثر سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو محیط ہو جائے۔ اس دین کی حامل امت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیگر اقوام عالم کے اعمال کی نگران رہے کہ کونسی قوم (نوع انسان کے لئے) کیا کچھ کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی نظم کی ضرورت ہے۔ اس نظم کا مرکز رسول (اور رسول کے بعد اس کے



سچے جانشین) ہوں۔ جب تک یہ نظام قائم رہا، تعین قبلہ کا منشا پورا ہوتا رہا۔ جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا نہ اس اُمت کا وہ مقام رہا، نہ اس کے قبلہ کی وہ حیثیت۔

رہ گئی رسم اذان، روحِ ہلالی نہ رہی

اس ”رسم“ میں روح پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پھر سے اُسی نظام کو زندہ اور قائم کیا جائے۔ قرآن کریم کی موجودگی میں اس نظام کا احیاء کچھ بھی مشکل نہیں۔ قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس پر متفرع نظام ہمیشہ قائم رہے اور اگر یہ کسی وقت (بدقسمتی) سے موجود نہ رہے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جاسکے۔ دنیا اب اپنی قوسی تنگناؤں سے دل برداشتہ ہو کر، کسی عالمگیر نظام کی متمنی ہوتی جا رہی ہے۔ اس نظام کے لئے ایک مشترکہ ضابطہ، حیات کی ضرورت ہے۔ یہ ضابطہ حیات، قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس دن دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، عالمگیر نظام حکومت کے خواب کی تعبیر سامنے آجائیگی۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی اُمت اپنے اندر وحدت پیدا کر کے اس قسم کے نظام کو متشکل کر کے دکھائے۔ اگر اسی قوم کے ”قبلے“ مختلف رہے تو ساری دنیا کا ایک قبلہ کس طرح بن سکے گا؟

## ق ت ر

الْقَتَرُ - الْقَتِيرُ - صرف گذر بسر کے قابل معیشت یا نفقہ - قَتَرٌ وَقَتَرٌ - گذر بسر کے لئے ضرورت سے کم خرچ کرنا، خرچ میں تنگی کرنا - لَمْ يَسْرِ قَتَرًا وَ لَمْ يَقْتَرُوا (۲۵) - نہ ہی وہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی مناسب خرچ میں تنگی کرتے ہیں - الْقَتِيرُ (۲۶) تنگ دست، بمقابلہ الْكُوفِ - صاحب وسعت - سورة بنی اسرائیل میں ہے - وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُورًا (۱۹) - انسان (اگر وحی کے تابع نہ چلے تو) بخل کرتا ہے اور اپنی دولت کو نوع انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہیں چھوڑتا۔

الْقَتَرُ - غبار - سیاہی - دھندلا، دھوئیں جیسا رنگ - مٹیالا رنگ - الْقَتَرَةُ - غبار بمعنی قَتَرٌ - بھول بعض یہ قَتَرٌ کا واحد ہے - تَرُّهُنَا قَتَرَةً (۱۶ و ۱۷) انہیں (ذلت کی) سیاہی ڈھانپ لے گی - ان پر افسردگی چھا جائے گی - الْقَتِيرُ - زرہ کے حلقوں کے کنارے - رَجُلٌ قَاتِرٌ - ضعیف آدمی -

## ق ت ل

الْقَتْلُ - ہتھیار کی ضرب ، یا پتھر ، یا زھر ، وغیرہ سے کسی کو مار ڈالنا ۔ جان نکال دینا ، قَاتَلَهُ - اس سے جنگ کی \* ۔ ایک نے دوسرے کو قتل کرنا چاہا \* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ذلیل و حقیر کرنے اور جھکا دینے کے بھی آتے ہیں \*\*\* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور مارت ڈالنے کے ہیں ۔ قَتِيلٌ الْإِنْسَانُ مِمَّا أَكْفَرَهُ (۱۱۰) - میں قوانین خداوندی سے انکار کرنے والوں کی ذلت و حقارت اور تباہی و بربادی ہی کا بیان ہے ۔ اسی طرح قَاتَلَهُمُ اللَّهُ (۱۱۱) کے معنی ہیں خدا انہیں ذلیل و حقیر کرے ۔ خدا انہیں تباہ و برباد کرے ۔ خدا انہیں مغلوب کرے ۔ قَتِيلَ الْخَيْرِ أَصْوَنَ (۱۱۲) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اسی طرح راغب نے لکھا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً إِمْلَاقٍ (۱۱۳) نیز وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ (۱۱۴) میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو میچ میچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں علم و تربیت سے محروم رکھنا ہے ۔ اور اس کے مقابلہ میں ان کا اسْتِحْيَاء (زندہ رکھنا) انہیں علم و بصیرت عطا کرنا ہے \*\*\* ۔ یعنی اس خیال سے بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا کہ اس کے اخراجات سے ہم غریب ہو جائیں گے ۔

تذلیل و تحقیر کے مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی ان آیات کا مطلب بھی صاف ہو جاتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا ذکر ہے ۔ (اس کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

تذلیل و تحقیر کے اعتبار سے قَتْلُ کے معنی ہیں کسی کو ایسا کر دینا کہ اس کی بات ہر کوئی دھیان نہ دے ۔ اس کی کوئی پرواہ نہ کرے ۔ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہے ۔ وہ (Ineffective) ہو جائے ۔ اُقْتُلُوا فَلَانًا کے معنی ہیں اُسے ایسا کر دو گویا وہ مردوں میں شامل ہو چکا ہے ۔ یعنی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو جائے ۔ قَتَلَ الشَّرَابَ کے معنی ہیں شراب میں ہانی ملا کر اس کی تندی اور کیف آوری کو کم اور ہلکا کر دیا \* ۔

قَتَلَ الشَّيْءُ خُبْرًا - اس نے اس چیز کا پورا پورا علم حاصل کر لیا ۔ اِنْقَهْ لِقَتْلٍ شَرٍّ - وہ شر کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اسی نہج سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو آرا ہے ۔ وَمَا قَتَلُوهُ بِقِيَمَتِنَا (۱۱۵) ۔ تو اس کے

معنی یہ ہیں کہہ انہیں حقیقت کا یقینی علم بالکل نہیں - یعنی مَاقَتَلُوا عَالَمَهُمْ بِقَتْلِهِمْ\* - اَلْبُسْتَان میں بھی مَاقَتَلُواوہ\* بِقَتْلِهِمْ کے معنی لکھے ہیں لَمْ بِحَرِيْطُوْا یہ، عَلِمَ - اَلْمُقْتَلُ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت تجربہ کار اور اشیاء کی حقیقت کا علم رکھنے والا ہو\* -

لہذا قرآن کریم میں جہاں قَتْل کا لفظ آئے گا ہر جگہ اس کے معنی مار ڈالنے کے نہیں ہونگے - سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی متعین کئے جائیں گے - کہیں مار ڈالنا - کہیں ذلیل و حقیر کرنا - غیر موثر بنا دینا - تباہ و برباد کر دینا - کہیں علم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا - اور کہیں پورا پورا علم حاصل کرنا ، وغیرہ - حتیٰ کہ انتہائی کوشش کرنا بھی، چنانچہ اِسْتَقْتَلَ فی الامر کے معنی ہیں اُس نے اس معاملہ میں جان کی بازی لگا کر کوشش کی\* -

سورۃ بقرہ میں یہودیوں کے متعلق ہے - وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّیْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲۶۰) تو اس کے یہ معنی بھی ہونگے کہ وہ اپنے انبیاء کی تعقیر و تذلیل کرتے تھے اور یہ بھی کہ وہ ان کے درہے قتل ہوتے تھے یا قتل کر دیتے تھے - حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ انہیں یہودیوں نے قتل نہیں کیا تھا - نہ ہی آپؑ کو صلیب دی گئی تھی (۱۵۷)۔ اسی سورت میں دوسری جگہ فَاَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۲۱۷) آیا ہے - اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ - اس لئے کہ راغب نے کہا ہے کہ قَتَلْتُ فَلَا نَا کے معنی ذَلَّلْتُهُ آئے ہیں - یعنی اسے مطیع و فرمانبردار بنالیا\*\* -

سورۃ نساء میں ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ - اس کے بعد ہے وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴) - یعنی اس طرح اپنے آپ کو تباہ نہ کرو - یا ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہ کرو - یا اپنی ذات کو ہلاک نہ کرو - جس معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانے لگ جائیں ، اس میں سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے -

قرآن کریم میں جنگ کرنے کے لئے بالعموم قِتَال کا لفظ آیا ہے (۲۱۶) لیکن (۱۵۳) میں جو کہا ہے کَتِيبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ - تو اس کے معنی ہیں وہ لوگ (جماعت مومنین) جن پر (قتل کرنا) جنگ واجب قرار دی گئی تھی - یہ معنی نہیں کہ ”جن کا قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا“ - اول تو اس

لئے کہ کُتِبَ عَلٰی کے معنی کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔  
 دوسرے یہ کہ قَتَلَ کے معنی قتل ہونے ہی کے نہیں۔ قتل کرنے کے بھی  
 ہیں۔ جیسے اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنْ الْقَتْلِ میں ہے (۲۱۰)۔ تیسرے یہ  
 کہ اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ ”ان کے لئے قتل ہو جانا مقدر ہو چکا ہے“ تو  
 یہ تصور قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف جاتا ہے جس کی رو سے انسان  
 اپنے اعمال میں صاحب اختیار ہے۔ مجبور نہیں۔

(سزائے قتل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ص۔ ص میں لفظ قصاص)۔

## ق ث ا

قِيَّامٌ - قِيَّامٌ - کھیرے کو کہتے ہیں \*\*۔

قرآن کریم میں قِيَّامٌ (۲۱۱) میں آیا ہے۔

## ق ح م

اَلْاِقْتِحَامُ - کسی خوفناک اور شدید معاملہ کے اندر گھس جانا۔  
 قَحَمَ الرَّجُلُ فِيْ اَلْاَمْرِ - اس نے اپنے آپ کو اس معاملہ میں بے سوچے  
 سمجھے یکبارگی ڈال دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی  
 کسی چیز پر ذرا سختی سے اقدام کرتے ہوئے پہنچنا ہیں۔ تَقَحَّمْتُ  
 بِهِنَّ التَّقَاتُ کے معنی ہوتے ہیں اونٹنی اسے لے کر وحشیانہ طور پر بھاگ  
 کھڑی ہوئی۔ قَحَمَتْهُ الْفَرَسُ اسے گھوڑے نے منہ کے بل گرا دیا \*\*۔  
 راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں گھوڑا، سوار کو لیکر خوفناک مقام  
 میں گھس گیا \*۔

ان معنوں میں یہ لفظ سورہ ص میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ هٰذَا  
 فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ (۳۸)۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اندھا دھند  
 تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ہے۔ مَحَالَةٌ قَحْوٌ - اس چرخہ کو  
 کہتے ہیں جو تیزی کے ساتھ گھومتی ہو۔ اِفْتَحَمَ الْمَنْزِلُ کے معنی  
 ہیں وہ گھر میں گھس پڑا۔ (اس میں سختی اور شدت کا پہلو ہوتا ہے) \*\*۔  
 یعنی تیزی کے ساتھ کسی مقصد کی طرف آنا۔ ان معنوں میں سورہ بلد میں ہے۔  
 فَلَا اِفْتَحَمَ الْعَقَبَةُ (۲۱۱)۔ انسان (خدا کے مقرر کردہ نظام ربوبیت کی)  
 گھاٹی پر چڑھنے کے لئے (جس کی تفصیل اگلی آیت میں دی گئی ہے) تیزی

سے دوڑ کر نہیں آتا۔ وہ اس میں، ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا درانہ نہیں گھستا۔ (حالانکہ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو یہ وہ منزل ہے جس کی طرف اسے والہانہ آنا چاہئے)۔

## قَدْ - (لَقَدْ) - (حرف)

قَدْ - (۱) ماضی کو ماضی قریب بنا دیتا ہے۔ قَدْ ضَرَبَ - اس نے مارا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَمَا لَنَا أَلَّا نُنْقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءَنَا (۲۴۲)۔ اب ہمارے لئے کونسی وجہ باقی ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے گھر بار اور بال بچوں سے جدا کر دئے گئے ہیں۔

(۲) فعل ماضی کے ساتھ تحقیق کے معنوں میں۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (۲۳)۔ مومن یقیناً کامیاب ہیں (یا کامیاب ہونگے)۔

(۳) مضارع کے ساتھ تحقیق کے لئے۔ قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ (۲۴)۔ اللہ یقیناً جانتا ہے کہ تم کس حال میں ہو۔

(۴) اکثر یا بکثرت کے معنوں میں۔ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ (۲۴۴)۔ ہم نے تجھے اکثر (یا بار بار یا بکثرت) آسمان کی طرف نظر لگائے دیکھا ہے۔

(۵) بعض اوقات یہ (الف) ”کبھی کبھی“ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً۔ قَدْ يَصْدُقُ الْكَذُّ وَبُ - جھوٹا بھی کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے۔ یا (ب) قَدْ يَفْقَدُ الْغَائِبُ - اسکی توقع ہے کہ جو اسوقت یہاں نہیں وہ آجائے گا۔ یا (ج) قَدْ فَعَلَ - وہ یہ کام پہلے ہی کر چکا ہے۔ یا مثلاً (د) جب کوئی ہوچھوے کہ فلاں کا کیا حال ہے۔ یا فلاں زندہ ہے یا مر گیا۔ تو اس کے جواب میں کہا جائیگا۔ قَدْ مَاتَ فلاں - وہ تو مر چکا ہے۔ وہ مر گیا۔

(۶) لَقَدْ - قَدْ پر۔ ل - بڑھانے سے تاکید بڑھ جاتی ہے۔ یعنی زیادہ یقین سے کہا جاتا ہے۔

## ق د ح

الْقِدْحُ - تیر کی ڈنڈی جس میں ابھی نہ ہر لگے ہوں نہ پھل - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز میں نقص

کی وجہ سے سوراخ ، شگاف یا گڑھا پڑ جانا ، اور (۲) کسی چیز کو چمچہ وغیرہ سے نکالنا۔ اَلْقَدَحُ - پیالہ (خالی پیالے کو قَدَحٌ اور بھرے ہوئے کو کاس کہتے ہیں۔) قَدَحَ بِالْقَزْنَدِ - اس نے چمچہ سے آگ نکالی۔ قَدَحَ فِيْ فُلَانٍ قَدْحًا - اس نے اس شخص میں طعن کیا۔ اسکی عیب چینی اور تنقیص کی \*۔

قرآن کریم میں ہے فَالْمُؤَرَّرَاتِ قَدْحًا (۱۴۱)۔ یہ قَدَحَ بِالْقَزْنَدِ سے ہے۔ یعنی وہ گھوڑے جو پتھروں پر اس طرح ستم ساریں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں نکلیں۔

## ق د د

اَلْقِدَّةُ - کاٹنا۔ کسی چیز کو طول میں شق کرنا یا چیرنا۔ میدان کو قطع کر لینا۔ کلام کو قطع کر دینا۔ نیز قد و قسامت یا کسی چیز کی کاٹ تراش \*\*۔ سورہ یوسف میں ہے۔ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ (۱۲۵)۔ اس عورت نے اسکی قمیص پھاڑ دی۔ اَلْقِدَّةُ - ٹکڑا۔ فرقہ۔ لوگوں کا گروہ ، ٹولی۔ (اسکی جمع قِدَدٌ ہے) قرآن کریم میں ہے كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (۹۴)۔ ہم مختلف فرقوں میں بنے ہوئے تھے۔ ہم متفرق راستے اختیار کئے ہوئے تھے۔ ایسے لوگ جو مختلف مقاصد رکھتے ہوں اور اس لئے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں \*\*۔

## ق د ر

قَدَرٌ کے بنیادی معنی ہیں اندازہ۔ پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشَّيْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت ، کمیت وغیرہ کو متعین کیا۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے ، کتنی ہے ، اس کا تناسب کیا ہے۔ اور قَدَرُ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں۔ یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے۔ قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشُّوْبَ کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسب تبدیلیاں کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آگئی۔ لہذا تَقْدِيرٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا۔ اور مَقْدَارٌ

اس پیمانے یا ماڈل یا (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کسی چیز بنائی جائے۔ \* قَدَرٌ کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ - پیمانہ، حجم، جسامت - طول، عرض، وغیرہ - هَذَا قَدَرٌ هَذَا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے، پیمانے، جسامت، وغیرہ کے بالکل برابر ہے - اس کے عین مطابق ہے - دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں - جَاءَ عَلَى قَدَرٍ کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا - اور جَاءَ زَقْدَرٌ کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے، حدود، پیمانے سے تجاوز کر لیا - اس سے آگے نکل گیا - أَقْدَرُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے - قَدَارٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو - نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا - الْمُقْتَدِرُ - ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں - كَمَ قَدَرَةٌ نَخْلِكَ - تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کس قدر معین فاصلہ ہے \* - عَوَامٌ کی بولی میں الْمُقْتَدِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کر کے بتائے کہ غلے کی کتنی نڈار پیدا ہونے کی امید ہے - قِدْرٌ - ہانڈی یا دیگی کو کہتے ہیں - اسکی جمع قَدُورٌ ہے - قَدِيرٌ - اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب سالوں کے ساتھ) ہڈیوں میں پکایا جائے - قَدَارٌ - ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی) \* -

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قَدَرٌ اور تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ - یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا - نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا - متوازن اور معتدل رہنا - ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے -

(۲) چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری قدرت حاصل ہو، اس لئے قَدَرٌ کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں - قَدَرْتُ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا - مَالِيْ عِلْمِيْكَ مَقْدَرَةٌ (یا مَقْدَرَةٌ - یا مَقْدِرَةٌ یا قَدَرَةٌ) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی

اقتدار و اختیار حاصل نہیں۔ اس بنا پر قَدَر کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار و ہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور و فکر کرنا۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں \*۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولیے یونہی دیدیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قَدَر کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ناپ تول کر دینا \*۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا \*۔

سورہ رعد میں ہے۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَتُهُ بِقَدَرِهَا (۱۳) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قَدَر) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں۔ یہاں سے قَدَر کے معنی اندازے۔ یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ وَكَانَ مِنْ شَيْئِهِ اِلَّا عِنْدَ نَسَاخِزَاتِهِ وَمَا تَنْزِيلُهُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ (۴۱)۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر، حضرت سلیمان کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قَدَر و رَاسِیَّت (۳۳)۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں، بنایا کرتے تھے۔ یہاں قَدَر کے معنی دیگی کے ہیں۔

کسی پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوا عَلٰیہُمْ (۲۳)۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر لو۔ سورہ انبیاء میں ہے۔ فَظَنُّوا اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلٰیہُمْ (۲۱)۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کر سکیں گے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ (۲۱)۔ یہاں قَدَر \*۔ بمقابلہ بَسْط \* آیا ہے۔ بَسْط کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی۔ لہذا قَدَر کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا نپا ٹلا ملنا۔

تَقْدِرُ \* کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش۔ ی۔ ا) میں مشقیات کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں



ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشہ اول وہ ہے جہاں امر الہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہی قواعد و ضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ انہی کو ان کی ”تقدیریں“ کہا جاتا ہے۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیال ہے، نشیب کی طرف بہتا ہے، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔ سورہ قرآن میں ہے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَيَقْدَرُ لَهُ تَقْدِيرًا (۲۹)۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دیے۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے۔ (جیسے سموات\*)۔ اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہی اسکی تَقْدِيرٌ ہے۔

امام راغب نے جو پہلی بات کہی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گزرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر سرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قَدَر (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہور (Actualize) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔ ”دَوْرٌ“۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے۔

قرآن کربیم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقہ نہیں مل گئی کہ آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔ اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جا رہا تھا۔

چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے۔ اس طرح وہاں تم نے گلہ بانی کی۔ اس طرح تمہاری تربیت ہوئی۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر تم "جِئْتُمْ عَلٰی قَدَرٍ بِمُوسٰی" (۲۱)۔ تم، اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا\*۔ یہاں لفظ "قَدَرٌ" نے اپنا مفہوم بالکل واضح کر دیا۔ سورۃ اعلیٰ میں ہے۔ "الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّيْهِ"۔ وَ الَّذِي قَدَّرَ فَنَهَّدَہِ (۲۸)۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیاء نے کائنات کی تخلیق کرتا ہے۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے۔ اور انکی اس راستے کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں۔ یہ ہے خدا کا نظام ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی "تَقْدِیرٌ" تک پہنچتی چلی جاتی ہے۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اسے دیگر اشیاء نے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے\* اور چاہے دوسرا راستہ جس سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز، وحی کی رو سے ہوتا ہے۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا، یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا۔ جس طرح مثلاً جب تک پہاڑی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ "فَلَمَّا زَاغُوا زَاغًا ۚ لَا يَأْتِيہُمْ مِّنْ رَّسُولٍ"۔ جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں

\* واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں کن مراحل میں سے گذارنا چاہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارنا چاہا ہے۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ نبوت وہی ہوتی ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

کو ٹیڑھا کر دیا۔ دوسری جگہ ہے۔ یَوْفُوتُكَ عَنْهُ مَنْ أَفِيكَتَ (۵۱)۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس لئے اس کے لئے تقдіرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ”تقدیر“ بن جائے گی۔ اقبال کے الفاظ میں:—

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است      تو اگر دیگر شوی او دیگر است  
خاک شتو نذرِ هوا سازد ترا      سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا  
شبمی ! افتندی تقدیرِ تست      قلزمی ! پائندی تقدیرِ تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہو جائیگا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔

گر ز یک تقدیرِ خون گردد جگر      خواہ از حق حکمِ تقدیرے درِ گر  
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست      زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقدیرِ ”یُر“ کا مفہوم۔ لہذا جب کہا جائے گا کہ إِنَّ اللَّهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جارہا ہے۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تقدیرِ ”یُر“) اس پر حاوی ہوگا۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے، اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے، خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جاسکتا۔ إِنَّ اللَّهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے ہیمائے (قوانین، اندازے، تناسب، توازن) مقرر ہیں، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت

بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے۔ یونہی اندھیر گردی نہیں۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو۔ اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا (۳۳) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے۔ اندھی فطرت (Blind Nature) کار فرما نہیں۔ نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے۔ ”پہلے سے لکھا ہوا“ صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ انسان کی ”قسمت“ نہیں۔ اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانونِ خداوندی کو قرآن کریم نے قَدَرٌ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ قوانین جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کار فرما ہیں۔ مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے یہی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے۔ اسی وجہ سے نزولِ قرآن کریم کی ”رات“ کو لَيْلَةُ الْقَدَرِ کہا گیا ہے (۱۰۱)۔ وہ ”شب“، (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں۔ یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر، انسانیت کی سطح پر آتا ہے، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie ہڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ عند الضرورت، جان تک کو بھی۔ دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے۔

## ق د س

قَدَسَ فِي الْاَرْضِ کے معنی ہیں وہ بہت دور تک چلا گیا \*۔ اس لئے قَدَسَہ کے معنی ہیں اس نے اس سے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا۔ قرآن کریم میں جہاں ملائکہ نے کہا ہے کہ نَقَدَسْ سَ لَكَتَ (۲۱) تو زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے لئے خود بھی پاک و صاف

ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کو ہساک اور صاف کرتے ہیں جو تیری اطاعت کرے \*۔ (لیکن ہمارے نزدیکی اس کا مفہوم وہ ہے جو آگے چل کر درج کیا جاتا ہے)۔ قَدْ اَوْسُ (۵۹)۔ خدا کی صفت ہے، جس کے معنی ہیں ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور، منزہ۔ اَلْقُدَّاسُ۔ گرانقدر اور محکم شرف، نیز اُس پتھر کو بھی کہتے تھے جو حوض میں یا اس کے دھانہ میں لگا دیتے تھے تاکہ اس سے پانی کا اندازہ ہو جائے اور اس طرح وہ آپس میں پانی کی تقسیم کر لیں \*\*۔

سورۃ بقرۃ میں نَسَبَ بَیْحُ اور نَقَدَّسُ س ساتھ ساتھ آئے ہیں (۲۱)۔ اس لئے اس کے ساتھ (س۔ ب۔ ح) کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہونگے، خدا کے کائناتی پروگرام کو درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لئے دور دور تک چلے جانا۔ بڑی تکی و تاز کرنا۔ انتہائی جد و جہد کرنا۔

رُوحُ الْقُدَّاسِ کے لئے دیکھئے عنوان (ر۔ و۔ ح)۔

الْأَرْضُ الْمُقَدَّسَةُ (۴)۔ وہ سر زمین جہاں زندگی کے ہر طرح کے سامان و اسباب بافراط موجود ہوں۔ یا برکت زمین (دیکھئے عنوان ب۔ ر۔ ک)۔ مصر اور فرات کا درمیانی حصہ \*\*۔ عام طور پر فلسطین کے علاقہ کو کہتے ہیں۔

## ق د م

الْقَدَمُ۔ پاؤں (۱)۔ اسکی جمع آفَدَامُ ہے۔ قَدَمٌ۔ آگے بڑھنا۔ پہل کرنا۔ مُقَدِّمَةُ الْجَيْشِ (دال کے زیر اور زبر سے) فوج کا ہراول دستہ۔ مُقَدِّمَةُ۔ ہر شے کا ابتدائی حصہ۔ قَدَمٌ۔ آگے بڑھنا۔ پیش کرنا \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہیں۔ سورہ حجر میں ہے۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۱۵)۔ اور سورہ اعراف میں ہے فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ (۲۳)۔ قَدَمٌ کے معنی ہیں سبقت کرنا۔ اور آگے بڑھتے چلے جانا۔ بہ اُخْرُ۔ پیچھے کی ضد ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ مُسْتَقْدِرٌ مِیْنِ کے مقابلہ میں مُسْتَأْخِرٌ (۱۵) آیا ہے۔

قرآن کریم میں مَا قَدَّ مَتِ آيِدِیْہِمِ (۲۵) متعدد مقامات میں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ اس سے

مراد اعمال انسانی ہیں۔ چونکہ انسان کی موت اس کے ان تمام اعمال کے بعد ہوتی ہے جو اس سے اس دنیا کی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں، اس لئے اعمال انسان سے آگے آگے چلتے ہیں۔ اس میں ماضی (Past) کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ نیز ہر عمل جو سرزد ہو جاتا ہے، ماضی (گذرے ہوئے زمانے) سے متعلق ہو جاتا ہے، اور انسان کی دسترس سے باہر۔ اور چونکہ اعمال کے نتائج بھی ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی لئے ان نتائج کو بھی ”پہلے بھیجے ہوئے“، کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مَن قَدْ لَنَا هَذَا (۳۹)۔ جس نے اسے ہمارے لئے آگے بھیجا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم پر یہ عذاب آیا ہے۔ لہذا، جنت اور دوزخ کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے ساتھ کے ساتھ تعمیر کرتا جاتا ہے۔ البتہ ان کی نمود اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

سورہ یونس میں ہے۔ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ (۱۰)۔ ایمان والوں کو بشارت دو کہ ان کے لئے ان کے نشو و نما دینے والے کے ہاں قَدَمَ صِدْقٍ ہے۔ یہاں قَدَم کے معنی بزرگی، شرف اور بلندی مدارج بھی ہیں، اور سبقت بھی۔ یعنی صلاحیتوں کی ایسی نشو و نما جس سے انسان، زندگی کے آئندہ مراحل طے کرنے (آگے بڑھنے) کے قابل ہو جائے۔ نیز ثبات و استحکام۔

قدیم اور حادث کی اصطلاحات قرآنی نہیں۔ متکلمین کی ہیں۔ البتہ قرآن کریم میں قَدَرِیْم کا لفظ پرانی، یعنی اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو پچھلے زمانہ سے چلی آرہی ہو۔ مثلاً اَلْعُرْجُونِ الْقَدَرِیْمِ (۳۱)۔ خوشہ کی کہنہ اور خشک شاخ۔ اِفْکُتْ قَدَرِیْمِ (۲۱)۔ وہ جوہر جو شروع سے چلا آرہا ہے۔ اَقْدَمُوْنَ (۲۱) اگلے زمانے کے لوگ۔ ابا و اجداد۔

سورہ فرقان میں ہے۔ وَقَدْ مَنَّ اَلِیْ سَاعِمِیْنِ (۲۵)۔ اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں۔ یعنی آگے بڑھ کر لینا۔ سورہ حجرات میں ہے۔ لَا تَقْدِرْ مَسْوَ اٰیٰتِیْنِ یَدٰی اللّٰهِ وَرَسُوْلِیْہِ (۲۶)۔ خدا اور رسول (نظام خداوندی) کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو۔ یا ان کی باتیں کاٹ کر نہ چلو۔ ان کی اطاعت کرو۔

سورہ فتح میں ہے مَّا تَقْدَمُ مِنْ ذَنْبِکَ (۲۸)۔ وہ نازیبا باتیں جو ان لوگوں نے پہلے سے تیرے پیچھے لگا رکھی ہیں۔ یعنی وہ باتیں درحقیقت

درست نہیں بلکہ ان لوگوں نے یونہی تہمت کے طور پر تمہارے پیچھے لگا رکھی ہیں (مثلاً ساحر - مجنون - شاعر - کاذب - مفتری - وغیرہ) - ذَنْبُکَ کے یہی معنی ہیں - اس انداز بیان کی مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں - مثلاً سورۃ نحل میں ہے - اَبْنِ شُرَکَآئِیَ الَّذِیْنَ کُنتُمْ تَشْبَقُوْنَ فِیْہِمْ (۱۶) - یہاں شُرَکَآئِیَ کے معنی ”میرے شریک“ نہیں - اس کے معنی ہیں وہ معبود جنہیں تم بزعم خویش میرے شریک سمجھتے تھے - (یا جو بزعم خویش میرے شریک بنتے تھے) - شُرَکَآءُ کُمْ الَّذِیْنَ کُنتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۲۲) - وہ جنہیں تم بزعم خویش خدا کے شریک قرار دیا کرتے تھے - لہذا ذَنْبُکَ (۲۴) کے معنی ”تیری نازیبا باتیں“ نہیں - اس کے معنی ہیں وہ نازیبا تہمتیں جن سے یہ مخالفین تجھے مطعون کرتے رہتے ہیں - (نیز دیکھئے عنوان ذ - ن - ب) -

## ق د و

الْقِدْوۃُ - درخت کی اصل جس سے شاخیں نکلتی ہیں - اسی سے الْقِدْوۃُ کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں - اور چونکہ یہ شاخیں سیدھی نکلتی ہیں اس لئے تَقْدَاتُ بَیۡہِمَا دَابَّتْہُ کے معنی ہوئے ہیں سواری کا جانور اسے لیکر سیدھے راستے پر چلتا رہا\* - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے مطابق بن جانا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہیں -

الْقِدْوۃُ - وہ جس کی پیروی کی جائے - جسکے پیچھے پیچھے چلا جائے\* - اِقْتَدَیْ - پیروی کرنا - قرآن کریم میں تمام انبیائے سابقہ کے ذکر کرنے کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے - اُولَئِکَ الَّذِیْنَ ہَدَیَ اللّٰہُ فَبِہِدْہُمْ اِقْتَدِہُ (۹۱) - یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی راہ نمائی (وحی) عطا کی تھی - پس انہی کی راہ نمائی کی پیروی تو کر، یعنی جو راہ نمائی انہیں دی گئی تھی اب وہی راہ نمائی اس قرآن کریم میں تجھے دی گئی ہے - لہذا قرآن کریم کی راہ وہی ہے جس پر تمام انبیائے سابقہ چلتے رہے ہیں - قرآن کریم پر چلنا انبیاء کی راہ پر چلنا ہے - قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو واضح کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے تمام انبیاء کرام کو ایک ہی دین ملتا رہا ہے - وہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا - اب وہی اصول (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم

میں دے دیئے گئے \*۔ اس لئے جو شخص قرآن کریم کا اتباع کرتا ہے وہ اسی راستے پر چلتا ہے جس پر انبیاء کرامؑ چلتے رہے ہیں۔ یہی معنی فتیہ ہذا ہُمْ اَقْتَدَوْا (۱۶۱) کے ہیں۔ اقتداء اس ہدایت کی ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء کو ملتی رہی ہے۔ اس کے خلاف دوسری راہ اشخاص کی اقتداء کی ہے جس کی مخالفت قرآن کریم نے جا بجا کی ہے۔ (مثلاً ۲۳)۔ لیکن ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے قرآن کریم نے روکا تھا۔ یعنی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی (قرآن کریم) کے بجائے، زندہ اور مردہ اشخاص کی اقتداء۔

## ق ذ ف

قَذْفٌ۔ تیر یا پتھر وغیرہ کو پھینکنا \*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی دور پھینکنا ہیں \*\*\*۔ اسی طرح یہ لفظ کسی بات کو منہ سے نکالنے اور پھینکنے، نیز کسی چیز کو ڈالنے کے لئے بولتے ہیں۔ اور استعارة الزام یا تہمت لگانے کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے \*\*، جیسے اس مفہوم کے لئے رُمِی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قَذْفٌ گالی دینے اور عیب جوئی کرنے کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے \*\*\*۔ چنانچہ قَذْفُ الْمُحْصِنَاتِ کے معنی ہیں اس نے پا کباز عورت پر بد چلتی کی تہمت لگائی۔ اَلْقَذْفُ۔ منجنيق وغیرہ جس سے کوئی چیز دور پھینکی جائے \*\*۔

سورہ طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اَنْ اَقْذَرِيْهِ فِي التَّابُوتِ فَاَقْذَرِيْهِ فِي النَّيْمِ (۲۹)۔ اسے تابوت میں رکھ دے اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔

سورہ انبیاء میں ہے۔ بَلْ نَقْذِرُ بِالْحَقِّ عَلَي الْبَاطِلِ (۲۸) ہم حق کو باطل پر مارتے رہتے ہیں۔ حق اور باطل میں باہمی تصادم و تزاخم، باہمی کشمکش، ہوتی رہتی ہے۔ تعمیری اور تخریبی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور تعمیری قوتیں آخر الامر غالب آجاتی ہیں۔ دور رکھنے کے معنوں میں سورہ الصافات میں ہے۔ وَيَقْذَرُونَ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۸) انہیں ہر طرف سے دور رکھا جاتا ہے۔

\* جن سابقہ احکام میں (اصول نہیں بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں احکام ہیں) کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں رد و بدل کر کے نئے احکام قرآن کریم میں دے دیئے گئے ہیں۔ لہذا، اب اطاعت خداوندی صرف قرآن کریم کی رو سے ہو سکتی ہے۔ اور کسی مبینہ آسمانی کتاب کی رو سے نہیں ہو سکتی۔ نیز دیکھئے صفوان (ن - س - خ)۔ \*\* تاج۔ \*\*\* راغب۔



## ق ر ا

قَرَأَ کے بنیادی معنی ہیں جمع کرنا (ابن فارس)۔ اقْرَأْتِ النِّقَاطَةَ کے معنی ہیں نر کا سادہ منویہ اونٹنی کے رحم میں قرار پا گیا اور جمع ہو گیا۔ قَرَأْتِ النِّقَاطَةَ۔ اونٹنی حاملہ ہو گئی۔ خون کے رحم میں جمع ہونے کو بھی قَرَأَ کہتے ہیں۔ اقْرَأْتِ التَّمْرَةَ اس وقت کہتے ہیں جب ہورت کو قَرَأَ یعنی حیض آجائے۔ قَرَأَ کی جمع قَرُوءٌ آتی ہے (۲۴۸)۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ یہ لفظ (قَرَأَ) اس وقت بھی بولتے ہیں جب ہورت حیض سے پاک ہو جائے۔

زجاج نے کہا ہے کہ قَرَأَ بھی یہیں سے فُعْلَان کے وزن پر مصدر ہے۔ اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قَرَأَ ان کو قَرَأَ ان اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سورتوں کو جمع کرتا ہے۔ اور انہیں ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ کتاب اللہ کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر قصص، امر، نہی، وعدہ، وعید، اور آیات اور سورتوں کو باہم جمع کر دیا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا نام قرآن اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقَرَأْنَاهُ فَاِذَا قَرَأْنَاهُ فَتَتَّبِعْ قُرْآنَهُ (۱۸: ۱۷)۔ اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جسطرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا۔ ثُمَّ اِنْ عَلَيْنَا بَيَانُهُ (۱۹: ۱۸)۔ پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہ کی زندگی میں جمع، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور اسے بعد میں یک جا کیا گیا تھا۔ علاوہ دیگر شواہد، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ جمع شدہ (کتاب کی) شکل میں تھا۔ اَلْقِرَاءَةُ۔ حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ کے معنی اس پر عمل کرنے اور اس کی پیروی کرنے کے بتائے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ قرآن عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں \*۔ اس اعتبار سے اقترأً بیاسمہ ربیک (۱۱) کے معنی ہونگے تو اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کر دے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ مدثر میں قثم فَاَنْذِرْ۔ وَ رَبَّکَ فَتَكْبِرْ (۳۲-۳۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے قرآن کے معنی اعلان عام کے ہونگے۔

قرآن کریم وہ الکتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں ہر بات یقینی ہے اور اس سے ہر قسم کا تذبذب اور نفسیاتی الجھن ختم ہو جاتی ہے (۲)۔ جو کچھ خدا نے حضور پر وحی کیا تھا وہ قرآن کریم میں محفوظ ہے (۶۹)۔ مومنین کو اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے اتباع کی اجازت نہیں دی گئی (۳۰)۔ رسول اللہ کو بھی قرآن کریم ہی کے اتباع کا حکم تھا (۱۱۰)۔ حضور اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے (۵۸)۔ جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا، تو ایسے لوگ مومن نہیں کافر ہیں۔ (۵)۔ اس میں تعلیم خداوندی مکمل طور پر آگئی ہے اور کوئی شخص اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا۔ (۳۷ و ۱۱۶)۔ یہ سابقہ تعلیمات کا مہیمن ہے (۵۸)۔ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۸۲) اور تمام اختلافات اسی سے رفع ہو سکتے ہیں (۲۲)۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے (۶۹)۔ اسی لئے اسے تَبِیْٰۤاتًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (۱۱۶) کہا گیا ہے۔ ایسا تصرف آیات کی رو سے کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے (۶۹ و ۱۱۶)۔ رسول اللہ ہر اختلافی معاملہ کی وضاحت قرآن کریم سے کرتے تھے (۱۱۶)۔ اور اسی سے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے (۵)۔ یہ خود روشنی ہے (۵) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس روشنی میں سفر حیات طے کرے (۱۱۶)۔ اسی لئے اس میں تدبیر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے (۲۶)۔ یہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان ہے (۱۱۶)۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو انسانی خیالات سے پاک و صاف کرے اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے (۵۶)۔ قرآن کریم میں غیر قرآنی خیالات و نظریات و تصورات و معتقدات کی آموزش شرک ہے (۲۲)۔ لیکن جب انسان شخصیت پرستی کا شکار ہو جائے تو ایسے یہی بات سخت ناگوار گذرتی ہے (۱۶ و ۳۶ و ۱۱۶)۔ چنانچہ جو شخص ان کے سامنے قرآن کریم پیش کرے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں (۲۲)۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس کی بات قطعاً نہ سناؤ اور شور مچاؤ تا کہ دوسرے لوگ بھی قرآن کریم کی آواز نہ سننے پائیں (۲۱)۔ اس طرح وہ خود بھی قرآن کریم

سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں (۱۶۶)۔  
قرآن کریم کی مثل کوئی چیز نہیں (۱۶۷)۔ مخالفین چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ  
قرآن کریم میں کچھ تبدیلی کر دیں لیکن حضور ﷺ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔  
نہ حضور ﷺ نے ایسا کیا (۱۶۸)۔

قرن اول کی جماعت مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا  
(۱۶۹)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار  
ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرم ﷺ خدا سے کرینگے (۱۷۰)۔ اس لئے  
کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر تھا۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین ہی  
چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی الدین سے تمسک ہو سکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو  
سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین،  
قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اور  
قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے (۱۷۱)۔

## قرب

قَرِيبٌ بمقابلہ بتعیید (۱۷۲)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی  
بتائے ہیں۔ الْقَرِيبُ - فاصلہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ بمقابلہ بَعْدُ،  
اور الْقَرِيبَةُ - رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ اور الْقَرِيبُ  
وَالْقَرَابَةُ رشتہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ یعنی رشتہ داری۔ ذِی  
الْقَرَبِی (۱۷۳) کے معنی ہیں جس سے رشتہ داری ہو۔ یعنی رشتہ دار۔ سورۃ  
شوریٰ میں ہے۔ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا التَّوَدُّةَ رَفِی  
الْقَرَبِی (۱۷۴)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں کہ (اے رسول) ان  
سے کہدو کہ میں پیغام رسالت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، بجز اس کے  
کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ یہ معنی نہ صرف یہ کہ قرآن کریم  
کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں بلکہ خود لغت کے بھی خلاف ہیں۔ جیسا کہ  
اوپر لکھا گیا ہے، الْقَرِيبُ ہی کے معنی رشتہ داری ہیں، نہ کہ رشتہ دار۔  
چنانچہ لسان العرب میں اس آیت کے معنی لکھے ہیں کہ اے پیغمبر!  
کہدو کہ میں تم سے رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر وہ حقوق تو ادا کرو جو  
میری قرابت داری کی وجہ سے تم پر ہائے ہوتے ہیں۔

اس کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اِنَّ ذَا الْقَرَبِیَ حَقُّهُ  
(۱۷۵) کے معنی ہیں "تو اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے"۔ یعنی ذَا قَرَبٍ بَاکِب۔

اسی طرح آقِ الْمَالِ عَلٰی حَبِيبِهِ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲۴) کے معنی ہیں ”اس نے اپنے رشتے داروں کو مال دیا“۔ یعنی ذوی قرْباء۔ اس اعتبار سے لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی میں ”تمہارا اپنا رشتہ“ مراد ہوگا۔ یعنی قُرْبًاكُمْ۔ یعنی تم اپنے رشتے ناطے کے حقوق مؤدت ادا کرو تو یہی میرا اجر ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کے متعلق سورۃ سبا میں کہا گیا ہے کہ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (۳۲)۔ ”ان سے کہہ دو کہ میں تم سے جو اجر مانگتا ہوں تو وہ خود تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہے۔“

بہر حال بات پہلی ہو یا دوسری، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ لوگوں سے اجر رسالت قطعاً نہیں مانگتے تھے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ ہر ایک نبی کا پہلا اعلان یہ ہوتا تھا کہ میں تم سے اجر رسالت کچھ نہیں مانگتا۔ (مثلاً ۲۰۹؛ ۲۱۵؛ ۲۱۶؛ ۲۱۸؛ ۲۵۰؛ ۲۵۱؛ ۳۶)۔

الْقُرْبٰی کے معنی ہیں کسی کے قریب ہونا چاہنا اور اس سلسلہ میں ذرائع اختیار کرنا \*۔ اَلْمُقَارَبَةُ۔ ایک دوسرے کے قریب ہو جانا۔ الْقُرْبَانُ۔ وہ چیز جس سے خدا کا قرب چاہا جائے \*۔

سورۃ مائدہ میں ”آدم“ کے دو بیٹوں کا ذکر ہے (یعنی دو آدمیوں کا) جن کے متعلق کہا کہ اِذْ قَرَّبْنَا قُرْبٰنًا فَتَقَبَّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا (۵)۔ ”جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی۔ سو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی“۔ قرآن کریم نے اس قربانی کی تفصیل نہیں دی کہ وہ کیا چیز تھی اور کس طرح پیش کی گئی تھی۔ یہ کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے جسے نذرانے کے طور پر پیش کیا گیا ہو، یا کوئی عمل۔ خیر بھی جسے بغرض حصول قرب خداوندی کیا گیا ہو۔

ہمارے ہاں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے قربانی کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔

قُرب۔ الٰہی سے مراد فاصلہ اور مکان کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ہونا نہیں۔ اس لئے کہ خدا کسی خاص مقام پر نہیں جہاں سے قُرب اور بُعد ماپا جاسکے۔ انسان جس قدر اپنے اندر خدا کی صفات منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ”خدا سے قریب“ ہوتا جاتا ہے۔ اور صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ چنانچہ

سورة علق میں ہے لَا تَطِيعُهُ وَاسْتَجِدُّ وَأَقْتَرِبُ (۱۶) تو اس شخص کی بات نہ مان (جو گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ بلکہ خدا کے قوانین کی) اطاعت کر اور اس طرح (خدا کے) قریب ہو جا۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کئے جا۔ اسی کا نام انسانی ذات کی بیداری اور اس کا استحکام ہے۔ اسی کو قربِ خداوندی کہتے ہیں جو ہر مومن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے ”مقربین بارگاہِ خداوندی“ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا، جس طرح ”اولیاء اللہ“ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوانین خداوندی کا اتباع معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتا ہے۔ تہجد کی خانقاہوں میں یا ویسے ہی انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی خدا کا قرب کسی اور ”اللہ“ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ (دیکھئے ۲۸)۔ اللہ، صرف ایک ہے اور وہ خدائے واحد ہے۔

قُرْبَةً۔ جمع قُرْبَاتُ (۱۶)۔ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ۔ عَرْضًا قَرَرِيبًا (۲۸)۔ جلدی حاصل ہو جانے والا فائدہ۔ پیش پا افتادہ مفاد۔ مفاد عاجلہ۔

زمانہ قدیم میں لوگ جانوروں کو ذبح کر کے اپنے معبودوں کے حضور پیش کرتے تھے تاکہ ان کی خوشنودی حاصل کریں۔ یہودی ان ذبح شدہ جانوروں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ چنانچہ سوختنی قربانی کا ذکر اکثر تورات میں آتا ہے۔ سورة آل عمران میں يَقْرُبَانِ تَاٰ كَلَهُ النَّسَارُ (۳۸۴) سے اسی قسم کی قربانی کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ قبول ہو جائے تو اسے آگ بھسم کر دیتی ہے۔

(خدا کے انسان سے قریب ہونے کے متعلق عنوان د۔ ع۔ و دیکھئے)۔

## ق ر ح

الْقَرْحُ۔ الْقَرْحُ۔ ہتیار وغیرہ کا زخم۔ بعض نے کہا ہے کہ الْقَرْحُ زخم کے نشان کو کہتے ہیں اور الْقَرْحُ سوزش اور جلن نیز درد والم جو زخم کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں یہ قَرْحٌ مِّنْ قَرْحٍ۔ اسے زخم کی وجہ سے درد ہو رہا ہے\*۔ راعب نے اسکی تائید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ خارجی اثر سے ہونے والا زخم قَرْحٌ اور اندرونی طور پر ہونے والا پھوڑا پھنسی قَرْحٌ ہے۔

قرآن کریم میں جنگ میں نقصان ہو جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔  
(۱۳۹)۔ یا اس نقصان کی وجہ سے جو تکلیف اور پریشانی ہو۔ دونوں کا مفہوم  
ایک ہی ہے۔

## ق ر د

الْقِرَادُ - جھڑ جانے والی یا الجھی ہوئی، ردی اون \* جو کاتی نہ  
جا سکے اور اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جائے۔ اس سے یہ لفظ  
حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

اَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں عاجزی و درماندگی کی وجہ سے وہ شخص  
ساکن ہو گیا۔ ذلیل ہو گیا اور جھوٹ سوٹ مردہ بن گیا \*۔ الْقِرَادُ - بندر  
کو کہتے ہیں۔ اسکی جمع الْقِرَادَةُ ہے۔ اور الْقِرَادُ - چیچڑی کو  
کہتے ہیں جو اونٹوں وغیرہ کے چمٹ جاتی ہے \*۔

قرآن کریم میں ہے کہ جن یہودیوں نے سبت کے احکام کی خلاف  
ورزی کی تھی \*\* انہیں قِرَادَةُ خَمْسِيْنِ بنا دیا (۲۵)۔ (خامسیٰ کے  
معنی ہیں ذلیل۔ کفینہ۔ بیکار۔ دیکھئے عنوان خ۔ س۔ ا)۔ سورہ نساء میں ہے  
کہ ان پر لعنت کی گئی تھی (۲۷)۔ یعنی وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم  
ہو گئے تھے۔ اسکی تشریح میں (۱۶۳-۱۶۴) میں کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیدیا  
کہ ان پر ایسے لوگ مسلط رہیں جو انہیں طرح طرح کا عذاب دیتے رہیں۔  
اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی عذاب تھا جسے دوسری جگہ ذِلَّةٌ اور مَسْكَنَةٌ  
کا عذاب کہا ہے (۲۱)۔ سورہ مائدہ میں منافقین کو بھی قِرَادَةُ کہا ہے۔ اور  
اسکی تشریح عَبْدَ الطَّاعُوْتِ سے کر دی گئی ہے (۲۰)۔ یعنی غیر خدائی  
فوتوں کے غلام اور محکوم۔ اسی چیز کو ان پر لعنت اور غضب کہا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کُوْنُوْا قِرَادَةُ خَمْسِيْنِ (۲۵) کے  
معنی یہ نہیں کہ انہیں سچ سچ کے بندر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے  
کہ ان پر ذلتوں اور رسوائیوں کی مار ماری گئی تھی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا  
کہ وہ یک نگیں اور یک مرکزی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے باہمی اختلافات  
کیا کرتے تھے۔ (۱۲۲)۔ اور یہ حالت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جو آئین  
و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دے۔ اس سے ان میں کھریکڑ ہی نہیں  
رہتا۔ یہودیوں کا قواعد سبت کی پابندی سے گریز کی راہیں نکالنا اسی عدم  
کردار کا مظہر تھا۔

## ق ر ر

الْقَرَارُ - کسی چیز کا ٹھہرنا، جمنا۔ یا کسی چیز کے ٹھہرنے کی جگہ۔  
 الْقَرَارَةُ - نشیبی زمین جہاں پانی ٹھہر جائے۔ اس معنی میں قَرَارٌ بھی  
 مستعمل ہے۔ قَرَّ بِالْمَكَانِ - کسی جگہ سکونت اختیار کرنا، وہاں ٹھہر جانا  
 اور جم کر رہنا۔ لَسْتُ قَرَارًا - ٹھہر جانا، جم جانا۔ اقَرَّ کے معنی ہیں کسی  
 چیز کو ٹھہرانا اور جما دینا، نیز اس کے معنی اعتراف اور اقرار کرنے کے ہیں۔  
 جیسے تَمَّ اقَرَّ رُتَمَ (۱۸۴) پھر تم نے اقرار کیا۔ مُسْتَقَرَّ الْحِمْلِ - رحم کا  
 وہ آخری حصہ جہاں حمل قرار پا جاتا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ  
 (۱۶) تمہارے لئے زمین میں قرار و ثبات کا مقام ہے۔ تم کم و بیش ٹھہرنا اور  
 رکنا ہے۔ اس آیت میں الحی حیثین (ایک وقت کے لئے) کے اضافہ نے یہ بتا دیا  
 کہ زمین ابدی قیام گاہ نہیں۔ صرف ایک وقت تک کے لئے ٹھہرنے اور  
 رکنے کی جگہ ہے۔ \*\*۔ [مُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ (۱۶)] کے مفہوم کے لئے  
 دیکھئے عنوان و۔ د۔ ع۔ [لِکُلِّ نَبَاتٍ مُسْتَقَرٌّ (۱۶)] کے معنی ہیں ہر  
 خبر کا ایک منتہی ہوتا ہے جہاں پہنچ کر اسکی صداقت یا عدم صداقت آشکارا  
 ہو جاتی ہے۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر واقعہ ایک خاص حد تک  
 جاتا ہے جہاں پہنچ کر وہ رک جاتا ہے اور اس کے نتائج ظہور میں آجاتے ہیں۔  
 یہی اس کا مستقر ہوتا ہے۔ الشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا (۳۸) سورج  
 (اپنی محوری گردش کے علاوہ) اپنے نظام کو لے کر ایک مستقر (Destination)  
 کی طرف تیزی سے جا رہا ہے۔ الْقَرَارُ - کجاوہ اور زمین کے بین بین ایک چیز  
 جسے سواری پر رکھ کر اس میں مرد بیٹھتے ہیں۔ نیز ہودہ کو بھی کہتے ہیں\*  
 جو عورتوں کے اونٹ پر بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔

اقَرَّ اللَّهُ عَيْنَهُ کے معنی ہیں خدا اسے اتنا مال دے دے کہ اسکی نگاہ  
 ٹھہر جائے اور وہ اپنے سے زیادہ مالدار لوگوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے  
 نہ دیکھتا پھرے\*۔ اس کا دوسرا مفہوم ہے ”خدا اُسے خوش رکھے“۔  
 اس سے آنکھوں کی ٹھنڈک مراد ہوتی ہے۔ یعنی مطمئن و مسرور۔ قَرَّةُ  
 الْعَيْنِ - جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ قرآن کریم میں ہے قَرَّةُ  
 أَعْيُنٍ (۲۵)۔ وَقَبْرِي عَيْنًا (۱۶)۔ اپنی آنکھ کو ٹھنڈک پہنچا۔ الْقَرَّةُ۔

\* تاج - نیز ابن فارس - \*\* اس کا یہ مطلب نہیں کہ ”آدم“ پہلے کسی اور جگہ  
 (جنت میں) تھا اور اسے پھر زمین پر بھیجا گیا، یہ ساری داستان اسی زمین (ارض)  
 سے متعلق ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ا د م میں لفظ آدم۔

ٹھنڈ۔ (الْقَرْشُ - سردی کے موسم کی ٹھنڈ کو کہتے ہیں اور بَرْدٌ ہر ٹھنڈ کو کہتے ہیں خواہ سردی کی ہو یا گرمی کی\*)۔ قَرَّعَ عَلَيْهِ السَّمَاءُ کے معنی ہیں اس پر پانی ڈال دیا۔ الْقَارُورَةُ ہر اس برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب رکھی جائے۔ بالخصوص شیشہ کا برتن۔ اسکی جمع قَوَارِيرٌ ہے (۱۵-۱۶)۔ پھر خود شیشے کو قَوَارِيرٌ کہنے لگ گئے۔ (۲۶)۔ اہل عرب مجازاً عورتوں کو بھی قَوَارِيرٌ کہہ دیتے تھے\*۔ یعنی آبگینی۔

## ق ر ش

کنب لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی لکھے ہیں۔ قَرَّاء کا قول ہے کہ قَرَّيش کا لفظ قَرَّش سے بنا ہے جس کے معنی ادھر ادھر سے چیزیں جمع کرنا اور سمیٹنا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قریش چونکہ حرم میں جمع ہوتے تھے اس لئے ان کا یہ نام پڑ گیا۔ اسی سے تَقَرَّش الْقَوْمُ ہے۔ یعنی لوگ اکٹھے ہوئے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ سامان تجارت خریدنے میں جلدی اور پہل کرتے تھے اس لئے قریش کہلائے، کیونکہ تَقَرَّش کے معنی ہیں سامان تجارت کو پہلے خریدنا۔ بعض نے کہا ہے کہ نضر بن کنانہ (قریش کے جہد امجد) ایک دن کپڑے میں لپٹ کر سمٹ گئے اس لئے ان کا نام قریش پڑ گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک دن نضر اپنی قوم کے پاس آئے تو لوگوں نے کہا کہ نَصْرٌ جَمَلٌ قَرَّيشٌ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط اونٹ ہے۔ چنانچہ اس کا لقب قریش پڑ گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ قُصَيٌّ کو ”قرشی“ کہا جاتا تھا اور اس نے یہ نام قریش کو دیا۔ یا یہ لفظ قَرَّش نامی دریائی جانور (ویل مچھلی) کی تصغیر ہے جس سے تمام سمندری جہاں اور ڈرتے ہیں۔ یا یہ ہے ”قریش بن مخلد بن غالب بن فہر“ کی وجہ سے پڑا جو ان کے تجارتی قافلہ کا مالک تھا اور ارگ کہا کرتے تھے قَدِمَتْ عَيْبَرُ قَرَّيشٍ وَخَرَجَتْ عَيْبَرُ قَرَّيشٍ۔ قریش کا قافلہ آیا اور قریش کا قافلہ گیا۔ ازہری وغیرہ نے کہا ہے کہ تجارت اور کاروبار اور تلاش رزق کے لئے سفر کرنے کی بنا پر ان کا نام قریش پڑا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کا دار و مدار ہی تجارت پر تھا اور ان کے پاس گذارا کرنے کے لئے زمین اور سویسی نہیں تھے۔ اس سے ہے قُلَانٌ يَتَقَرَّشُ الثَّمَالَ۔ فلان شخص مال جمع کرتا ہے\*۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو تولیت کعبہ کے لئے سرزمین حجاز میں بसा دیا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے قیدار پڑا



نامور تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں فہر (قریب ۳۲۵ء) اور قُصَیٰ بن کِلَاب (قریب ۴۷۵ء) بڑے مشہور ہیں۔ نبی اکرمؐ اسی خاندان کے چشم و چراغ (اور تمام دنیا کے لئے سراج منیر) تھے۔

کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش دور و نزدیک کے ممالک میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ تجارت ان کا کاروبار تھا۔ اس کے لئے مختلف قبائل و اقوام نے ان سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ان کے قافلے محفوظ رہیں گے۔ قرآن کریم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لَا يَلْفُ قَرَيْشٌ اِلَّا بِلَفِیْهِمْ رِحْلَةُ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ (۱۶:۱)۔ ”اُن عہد و پیمان کی وجہ سے جو (دوسری اقوام نے) قریش سے اس لئے کر رکھے ہیں کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں (ان کے قافلے سردی گرمی میں محفوظ طور پر سفر کرتے ہیں)۔“ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں یہ مقام کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، لہذا انہیں چاہئے کہ وہ رب کعبہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں۔ فَلْيَتَّعِبُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتُ الَّذِیْ اَطَعْتُمْ مِنْ جُوعٍ وَّ اَمْنٍ خَوْفٍ (۱۶:۲)۔ وہ رب کعبہ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا کیا۔

کیسی عمدہ دلیل ہے یہ۔ یعنی یہ لوگ خدا کے نام پر اتنے مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن اطاعت خدا کو چھوڑ کر اوروں کی کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی۔ اگر خدا کے نام سے مفاد حاصل کرتے ہیں تو خدا کے قوانین کی اطاعت بھی کریں۔ اور اگر اطاعت کسی اور کی کرنی ہے تو خدا سے اپنی نسبت ختم کریں۔

## ق ر ض

الْقَرْضُ۔ قطع کرنا۔ کاٹنا۔ قَرْضَ الْمَكَانِ۔ وہ کسی جگہ سے کترا کر نکل گیا۔ قَرْضَ فِیْ سَبْرٍ۔ وہ چلنے میں دائیں بائیں جھکا\*۔ (۱۶:۱) قَرْضُ۔ کوئی چیز جو دی جائے، یا کوئی کام جو کیا جائے، اس امید پر کہ وہ چیز واپس مل جائیگی یا اس کام کا بدلہ ملیگا\*۔ اقْرَضْ۔ کوئی چیز دینا، یا کوئی کام کرنا، اس امید پر کہ وہ واپس مل جائیگی یا اسکا بدلہ ملیگا۔ عربوں کے معاشرہ میں قَرْضُ حَسَنٌ کے معنی اچھا سلوک اور معاملہ بھی ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں بھی اس معنی میں یہ محاورہ آیا ہے (مثلاً ۲/۲۴۵)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نظام ربوبیت کے قیام کے لئے جدو جہد شروع کی جائے تو اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ جماعت میں جس جس چیز کی کمی ہو اسے ملکر پورا کیا جائے۔ ہر قسم کی کوشش، ہر قسم کا جانی اور مالی ایثار جو درکار ہو، اسے بطیب خاطر پیش کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ قَرْضٌ حَسَنٌ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر قرض کے دیگر معنی بھی ملا لئے جائیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اَلْقَرْضُ کے معنی ہیں چبانا \*۔ اَلْقَرْضُ یُقْرِضُ - چارے کا وہ گولہ جسے اونٹ اپنے پیٹ میں سے لوٹا کر منہ میں لاتا ہے۔ پھر اسے چباتا رہتا ہے۔ (جگالی کرتا ہے) اور جب وہ ہضم کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے معدہ میں لوٹا دیتا ہے کہ وہ جزو بدن بن جائے \*۔ نظام ربوبیت کے قیام میں، فرد جو کچھ معاشرہ کو دیتا ہے اسے ہوں سمجھئے کہ وہ قَرْضٌ یُقْرِضُ کی شکل میں ہوتا ہے۔ معاشرہ اسے مناسب مقامات میں صرف کر کے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ بہترین نتائج کا حامل بن جائے۔ اسطرح افراد نے جو کچھ دیا تھا وہ بہترین شکل میں پھر افراد کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ مَن ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللہَ قَرْضًا حَسَنًا فِیْضُ لَیْفَتَہُ لَہُ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً (۲/۲۴۵)۔ کوئی ہے جو اللہ کو ”قرضِ حسنہ“ دے تو وہ اسے اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے! یہ بڑھانا نتائج کے اعتبار سے ہے۔ اللہ کو کوئی قرض نہیں دیا جاتا، اس کے بندوں کو دیا جاتا ہے۔ لہذا وہ معاشرہ جو اللہ کے قانون کے مطابق متشکل ہو وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا نے بندوں کے متعلق اپنے اوپر لے رکھی ہیں، اور ان واجبات کو وصول کرتا ہے جو خدا نے بندوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد معاشرہ جو کچھ ایثار کریں اور جس حسن کردار کا ثبوت دیں، وہ سب ”اللہ کے لئے قرضِ حسنہ“ ہوگا۔

## ق ر ط س

اَلْقِرْطَاسُ - اَلْقِرْطَاسُ - اَلْقِرْطَاسُ - کاغذ۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے \*۔ (جمع قِرَاطِیْسٌ ۱/۶)۔ اَلْقِرْطَاسُ اس کھال کو بھی کہتے ہیں جسے تیر اندازی کے لئے نصب کرتے تھے \*۔ صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ اَلْقِرْطَاسُ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اس پر کچھ لکھا ہو، ورنہ ہلا لکھے کو طِیْرُسٌ اور کاغذ کہتے ہیں۔ (اگرچہ اس کے برعکس بھی ہے) \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَ لَوْ أَنزَلْنَاهَا عَلَىٰكَ كِتَابًا رَفِيقًا طاس۔  
(۱)۔ اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے۔

## ق ر ع

الْقَرْعُ\*۔ ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنا\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔ قَرْعَ رَأْسَهُ بِالْعَصَا۔ اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ قَرْعَ الثَّابَّ قَرْعًا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ الْقَرْعَاعَةُ\*۔ وہ پتھر (چقماق وغیرہ) جسے رگڑ کر آگ نکالی جائے۔ اَلْمِقْرَاعُ\*۔ مٹھوڑا وغیرہ جس سے پتھر توڑے جائیں۔ یہاں سے اس مادہ میں شدت اور سختی یا مصیبت کے معنی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ الْقَرْعَاءُ\* اس باغیچے کو کہتے ہیں جسے جانوروں نے چر ڈالا ہو۔ اور رِيَاضُ قَرْعٍ\* ان باغات کو جن میں ہریاول قطعاً نہ رہی ہو۔ اور اَلْقَرْعُ\* عمدہ تیز تلوار کو\*\*۔

قرآن کریم میں قَارِعَةً\* کا لفظ سخت مصیبت کے لئے آیا ہے جو قوموں پر ان کی شامتِ اعمال سے (غلط روش کے تباہ کن نتیجہ کے طور پر) آتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے۔ . . . تَصِيْبُهُمْ يَمَآ صَاعِقُوۡا قَارِعَةً\* (۲۴)۔ ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی۔ سورۃ حاقہ میں ہے۔ كَذٰلِكَ يَتُۡنَمُوۡدُوۡا عَادًاۙ بِالْقَارِعَةِ\* (۲۹)۔ اس سے مراد وہ تباہی ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ان پر آنے والی تھی۔ یہی الْقَارِعَةُ\* تھی جو قریش کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آئی اور یہی وہ قَارِعَةُ\* ہے جو ہر سرکش قوم پر ان کے ظلم و استبداد کی بنا پر ہمیشہ آتی ہے۔ اور جو آجکل قوموں کے باہمی تصادم (ٹکراؤ) سے آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے۔ سورۃ القارعۃ (۱۰۱) میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے اس دنیا میں واقع ہونے والے تصادمات کے علاوہ اخروی زندگی کا محاسبہ بھی شامل ہے۔

الْقَرْعَةُ\*۔ حصہ، نصیبہ۔ اسی سے الْقَرَاءَةُ الْقَرْعَةُ\* قرعہ اندازی کو کہتے ہیں\*\*\*۔ اس لئے کہ اس سے حصہ متعین ہو جاتا ہے، یا پھر اس لئے کہ قرعہ اندازی میں کسی سخت چیز (ہناسہ) کو دوسری چیز کے ساتھ ٹکرایا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں قرعہ اندازی کے لئے یہ لفظ (قرعہ) نہیں آیا۔ قصہ\* حضرت مریم\* کے ضمن میں ایک جگہ ہے اِذْ يُلْقُوۡنَ اَقْلَامَهُمْ (۳۳)۔ ”جب

وہ اپنے تیر یا قلمیں ڈالتے تھے۔“ اس سے قرعہ اندازی مراد لی جاتی ہے۔ یہودی بہت سے امور کے فیصلے قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر انجیل میں ملتا ہے۔ قرآن کریم، عقل و دانش اور فہم و تدبیر سے فیصلے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے، فیصلوں کے لئے ایسے طریق اختیار کرنا جس میں انسان اپنی عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دے، مستحسن عمل قرار نہیں پاسکتا۔

## ق ر ف

الْثَّقِرُفُ - درخت کی چھال۔ انار وغیرہ کا چھلکا۔ الثَّقِرُفُ مَبْنِیْنِ لَا رُضَ۔ وہ مٹی جو سبزیوں اور ان کی جڑوں کے ساتھ زمین سے اکھڑ آئے۔ الثَّقِرُفَةُ - کمائے اور حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا خلط ملط ہو جانا اور کسی چیز کو اوپر ڈال لینا، بہن لینا، بتائے ہیں۔ اِثْتَرَفَ کے معنی کمانا ہیں۔ اِثْتَرَفَ الثَّمَالَ - اس نے مال جمع کر لیا۔ رَجُلٌ قَرَفَةٌ - کماؤ مرد\*۔ رَاغِبٌ لَكَہَا ہے کہ اِثْتَرَفَ کے معنی محنت سے کمانا اور کام کرنا ہیں، خواہ اچھا کام ہو یا برا، لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے کے لئے ہوتا ہے\*\*۔

سورة انعام میں ہے۔ وَلَيَقْتَرِفْنٰوْا مَآہِمَ مَّقْتَرِفُوْنَ (۱۶۴) تاکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کٹے جائیں۔ جن چیزوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں۔

## ق ر ن

الْقَرْنُ - جانور کا سینک۔ انسان کے سر کا وہ حصہ جہاں جانور کے سینک ہوتے ہیں۔ سر کا بالائی حصہ۔ الْقَرْنُ مِّنَ الثَّقْوَمِ - قوم کا سردار\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) وہ چیز جو قوت اور شدت کے ساتھ ابھر آئے اور (۲) ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ اکٹھا کر دینا۔

الْقَرْنُ - زمانہ معینہ۔ اس زمانہ کی مدت میں اختلاف ہے، لیکن عام طور پر ایک سو سال (صدی) کی مدت کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ زمانہ کا کچھ حصہ قَرْنُ کہلاتا ہے جسکی حد نہیں مقرر کی جاتی\*۔ یا ہم عصر

یہا ایک امت جو ختم ہو چکی ہو۔ الْقِرْنُ ہم سر، ہم ہلہ \*۔ سورۃ انعام میں ہے۔ اَلَمْ يَرْوُا كَمَ اَهْلًا تَكُنَّا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ (۱/۲۱)۔ اس کے معنی اقوام سابقہ ہیں۔ قَرْنٌ کی جمع قُرُونٌ ہے۔

الْقَرْنُ \*۔ کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ باندھ دینا اور مسلا دینا۔ دو اونٹوں کو ایک رسی میں باندھ دینا \*۔ قَرْنٌ نَتْرٌ اَلَا سَارَىٰ فِي الْحَبَالِ۔ قیدیوں کو اکٹھا کر کے رسیوں سے باندھ دیا گیا \*\*۔ قرآن کریم میں ہے مَقَرَّرْنِيْنِ فِي الْاَصْفَادِ (۱۲/۱۶)۔ زنجیروں میں اکٹھے جکڑے ہوئے۔

قَرْنٌ الشَّيْطَانِ۔ شیطان کی امت یا اس کی قوت \*۔ اَقْرَنَ لِّلْاَمْرِ اسے معاملہ پر قدرت و طاقت حاصل رہی۔ اس نے کسی کام کی طاقت رکھی \*۔ قرآن کریم میں مَقَرَّرْنِيْنِ (۲۳/۲۳) کے معنی ہیں طاقت اور اقتدار رکھنے والے۔ الْقَرْنُ بَيْنَ \*۔ ساتھی۔ رفیق۔ ایک رسی میں بندھے ہوئے یا ایک جوئے میں جتے ہوئے \*۔ قرآن کریم میں قَرَرْنِيْنًا بمعنی ساتھی اور رفیق آیا ہے (۳۸/۳۸)۔ الْقَرَرْنِيْنَةُ \*۔ بیوی کو کہتے ہیں \*\*۔

سورۃ کہف میں ذَرِ الْقَرْنَيْنِ کا ذکر آیا ہے۔ (۱۸/۸)۔ کتب لغت اور تفاسیر میں اس کے متعلق اتنے مختلف بیانات ملتے ہیں کہ کثرت تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاہنشاہ کیخسرو (خرمسا یا سائرس) ہے۔ اور اس کے دو سینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جن پر وہ حکمرانی کرتا تھا۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا، اصطخر کے کھنڈرات سے شاہنشاہ خرمسا کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں \*\*\*۔ اس لئے کہ ایران میں مملکت کو قَرْنٌ (سینگ) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہی وہ شاہنشاہ تھا جس نے یہودیوں کو بابل کی المناک اسیری سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیش گوئیاں پوری ہوئی تھیں۔ یہ پیش گوئیاں تورات میں آجملہ بھی موجود ہیں۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔ جبریل نے انہیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ یہ، میڈیا اور فارس کی دو سلطنتوں کا شاہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملیگی۔ چنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیش گوئی میں اس ”دو سینگوں“ والے کا نام

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* (Sir Percy Sykes) نے اپنی کتاب (A History of Persia) کی جلد اول کے شروع میں (Cyrus) کے اس مجسمہ کا فوٹو دیا ہے۔

خرس لکھا ہے۔ چنانچہ جب خرس نے باہل فتح کر کے یہودیوں کو آزادی دلائی تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیش گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی۔

یہ بادشاہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتا ہوا لیڈیا (ایشیا) کو چمک کی شمال مغربی مملکت کے دار الحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارے تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے (۱۸۹)۔ پھر اس نے مشرق کی سمت لشکر کشی کی اور باختر کے علاقہ کی طرف گیا (۱۹۰)۔ اس کی تیسری لشکر کشی سلسلہ صکوہ کا کیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درہ صکوہ میں ایک دیوار بنائی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل ان لوگوں پر حملہ آور نہ ہو سکیں (۱۹۱)۔ یہ شاہنشاہ زرتشت کا متبع تھا۔ قرآن کریم کی کشادہ نگہی دیکھتے کہ اس نے اس کی بلندی سیرت و کردار کا کس خوبی سے اعتراف اور ذکر کیا ہے (۱۹۸)۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”ہرق طور“ میں ذوالقرنین کے عنوان کے تحت ملاحظہ کیجئے) پھر حال، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ وہ قیاسات ہیں جن تک دور حاضر کی تحقیق پہنچاتی ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد مزید تحقیقات سے کچھ اور واقعات بھی بے نقاب ہو جائیں جو قیاسات کو یقین میں بدل سکیں۔ قرآن کریم نے جس مقصد کے لئے ذی القرنین کا ذکر کیا ہے وہ مقصد اس تعین کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس سے کونسی تاریخی شخصیت مراد ہے۔

## ق ر ی

الْقَرْيَةِ۔ بڑا شہر۔ شہر۔ وہ جگہ جہاں ٹھہرنے کے لئے بہت سے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں\*۔ بستی۔ اسکی جمع قری ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ نیز خود جمع ہونے والے آدمیوں کو بھی کہتے ہیں\*\*\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ الْقَرْيَةُ اس شہر کو کہتے ہیں جس کے گرد شہر پناہ ہو۔ اور قَرْيَةٍ اور بَلَدَةٍ اسے کہتے ہیں جس میں یہ نہ ہو\*\*۔ (لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں)۔ قَرْيٍ کے معنی جمع کسرنے کے ہوتے ہیں۔ قَرْيٍ الثَّمَاءِ فِي الثَّعْوَضِ۔ حوض میں پانی جمع کر دیا۔ اسی اجتماعیت کے اعتبار سے بستی کو قَرْيَةٍ کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمع کرنے اور مجتمع ہونے کے ہوتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں قَرَارَ یَتَہ (۲۵۹) ہستی کے لئے آیا ہے۔ اور سورہ انبیاء میں قَرَارَ یَتَہ (۲۱) سے مراد اہل قریہ (ہستی کے لوگ) ہیں۔ سورہ زخرف میں الْقَرَارَ یَتَہ (۲۳) آیا ہے جس سے مراد مکہ اور طائف کی بستیاں ہیں۔ اہل لغت نے اسکی تصریح کی ہے کہہ قریش جب بھی الْقَرَارَ یَتَہ کہتے تو اس سے ان کی مراد مکہ اور طائف کی دونوں بستیاں ہی ہوتیں \*\*\*۔

## ق س ر

قَسْرَہٗ عَلٰی لَا مَسْرِ۔ اس نے ایسے اس بات پر مجبور کر دیا۔ قَسْرَہٗ۔ وہ اس پر غالب آگیا \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ غلبہ اور تسلط کے ہیں۔ الْقَسْرَہٗ شیر کو کہتے ہیں۔ نیز شکاری اور تیر انداز کو \*\*۔ قرآن حکیم میں ہے فَرَقَتْ مِنْ قَسْرَہٗ۔ (۴۴) شیر سے بھاگ رہے ہوں (کہ کہیں کھا نہ جائے)۔

## ق س س

الْقِسِّ۔ کسی چیز کو طلب کرنا۔ اسکی تلاش کرنا۔ فُلَانٌ قَسٌّ اِبِلٍ۔ فلان آدمی اونٹوں کا عالم ہے۔ یعنی جو اونٹوں کے ساتھ ہمیشہ رہے \* اور ان کی عادات و اطوار سے خوب واقف ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے اصلی معنی کسی چیز کی رات کے وقت جستجو کرنے کے ہیں \*\*۔ الْقِسِیْسُ۔ علم اور شریعت میں نصاریٰ کا سردار (۸۳)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ”شیخ“ کے آتے ہیں۔ کلیسا کے عہدوں میں اس کا درجہ اسقف (Bishop) سے نیچے ہوتا ہے \*\*\*۔

## ق س ط

الْقِسْطُ۔ مبنی بر عدل حصہ \*\*۔ حصہ، نصیبہ، مقدار \*\*\*۔ تَقْسِطُوا الشَّیْءَ بَيْنَہُمْ۔ انہوں نے اس چیز کو آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیا \*\*\*۔ چنانچہ قِسْطًا اس ترازو کو کہتے ہیں۔ (۱۵۰ : ۱۸۲) بلکہ (صاحب لطائف اللغة کے قول کے مطابق) سب سے زیادہ صحیح ترازو۔ اَقْوَمُ التَّمِیَازِیْنِ۔ الْقِسْطُ عَدْلٌ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں فَاحْکُمْ بَيْنَہُمْ بِالْقِسْطِ۔ (۵۲) اور سورہ اعراف میں قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ۔ (۲۹) اسی سے ہے۔ اَقْسَطَ۔ اس نے عدل کیا، انصاف کیا۔ سورہ حجرات میں ہے کہہ فَاصْلِحُوا بَيْنَہُمْ بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوا۔ اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُتَقْسِطِیْنَ (۴۹)۔

لیکن قَسَطٌ یَقْسِطُ کے معنی ظلم کرنے اور حق سے ہٹ جانے کے بھی آتے ہیں \*۔ (یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے)۔ آیت (۱۵۴) میں قَاسِطُونَ کے معنی ظلم کرنے والے ہیں۔ اس کے مقابل میں مُسْلِمُونَ آبا ہے (۱۵۴)۔ یعنی مسلم وہ ہے جو کبھی ناانصافی نہیں کرتا۔ اَلْقَسَطُ کے معنی ہوتے ہیں گردن کا سوکھ جانا۔

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، قِسطٌ اور عَدْلٌ دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھئے کہ عَدْلٌ کے معنی ہونگے دو آدمیوں میں برابر برابر کا سلوک کرنا۔ اور قِسطٌ کے معنی ہونگے کسی کے حقوق و واجبات کا پورا ادا کر دینا۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو آیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَقْسِطُوْا فِی النِّسْمٰتِ (۴) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم) یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کر سکو گے۔ (یعنی معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کر سکو۔ ان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکو)۔ یعنی اس میں کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کا سوال نہیں۔ خود اُن کے حقوق کو پورا کرنے کا سوال ہے۔ اس سے آگے ہے وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اِنْ تَعَدِلُوْا بَیْنَ النِّسْمٰتِ (۱۳۹) تمہیں اس کی استطاعت نہیں کہ عورتوں میں عدل کر سکو۔ یہاں مختلف عورتوں میں برابر کے سلوک کا سوال ہے، اس لئے عَدْلٌ کا لفظ آیا ہے۔

## ق س م

قَسَمَ - یَقْسِمُ - کسی چیز کے حصے کر دینا۔ بانٹ دینا۔ فَاَنْقَسَمَ چنانچہ وہ حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اَلْقِسْمَةُ - تقسیم، بانٹ \*\*۔ قِسمَةٌ ضِیْرَی (۵۳) - بے انصافی کی تقسیم۔ قرآن کریم میں ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیْوةِ الدُّنْیَا (۲۳)۔ ”ہم نے انکی دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کا حاکمانِ زیست تقسیم کیا ہے“۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ خدا یونہی (معاذ اللہ) اندھا دھند رزق کی تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کی تقسیم کے لئے اس کا قانون مقرر ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِّلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳)۔ انسان کو وہی کچھ ملیگا جس کے لئے وہ



کوشش کرے۔ یہ جو ہم دنیا میں اس اصول کے خلاف تقسیم رزق دیکھتے ہیں، تو یہ تقسیم، قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔

مَقْسُومٌ - تقسیم کیا ہوا (۱۵/۱) - مَقْسِمٌ - تقسیم کرنے والا۔ (۵۱/۱) - الْمُقْتَسِمِينَ (۱۵/۱) آپس میں ہانٹ لینے والے - اسْتَقْسَمَ - تقسیم چاہنا۔ جاہلیت میں جانور کو ذبح کر کے، تیروں یا پانسوں کے ذریعے اس کے حصے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کے طریق کار کو اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی فہم و بصیرت کی رو سے فیصلے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دیتا ہے جو وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی رو سے قمار بازی اور فال لینا ناجائز ہیں (قمار بازی کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر اور فال لینے کے لئے ز۔ ل۔ م)۔

قَسَمَ - دلیل و شہادت\*\* جو حق اور باطل کو الگ الگ کر کے رکھ دے۔ وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لِّہٖۤ اَنْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ (۵۶/۱) اگر تم سمجھ سکو تو یہ شہادت (جسے میں پیش کر رہا ہوں) ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ اَفْسَمَ بِالْغَیْبِ - کسی چیز کو بطور دلیل و شہادت پیش کرنا (۹۰/۱)۔ لیکن یہی لفظ جب عام لوگوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی قسم کھانے کے ہو جاتے ہیں۔ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ (۳۵/۱) مجرمین قسمیں کھائیں گے۔ ابلیس کے متعلق ہے۔ وَ قَسَمَ لہُمَا (۱۱/۱) - اس نے ان دونوں سے قسم کھا کر کہا۔

مومنین کا شیوہ قسمیں کھانا نہیں بلکہ اپنے دھوے کے ثبوت میں دلائل و شہادات پیش کرنا ہے۔ قسم توڑنے کا جو کفارہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حتی الامکان قسمیں کھائی ہی نہ جائیں تا کہ بعد میں کفارہ ادا نہ کرنا پڑے۔

## ق س و

قَسْوَةٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا سخت ہو جانا۔ پھر قَسْوَةٌ سے مراد قَسْوَةٌ الْقَلْبِ ہوتی ہے، یعنی سنگدلی۔ حَجَرٌ قَاسٍ - ٹھوس اور سخت پتھر۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ق۔ س۔ و کا خاصہ

قوت اور اجتماع ہے۔ \* - آرض قاسیۃ - سخت زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ لیلۃ قاسیۃ - سخت اندھیری رات -

قرآن کریم میں ہے ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فہی کالججارۃ أو أشد قسوة (۲۰) - ”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر“۔ اس میں قساوت کے معنی واضح ہیں۔ یعنی کالججارۃ - پتھر کی طرح سخت۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سورۃ الحج میں ہے والقاسیۃ قلوبہم (۲۲)۔ جن کے دل سخت ہیں۔ سورۃ الزمر میں یہ کہہ کر اس کی تشریح کر دی کہ یہ اُن لوگوں کی ضد ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ من شرح اللہ صدرہ لئلا یسلام (۳۹)۔ اللہ جن کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دے۔ لہذا دل کی قساوت کے یہ معنی ہیں کہ بلا غور و فکر اپنی بات پر اڑے رہنے، اور دوسرے کی نہ سننے کی وجہ سے انسان میں حق کے سمجھنے اور اس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ اسی کا نام ضد، تعصب، ہٹ دھرمی ہے۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ح اور ص۔ د۔ ر)۔

## ق ش ر ع

النقشاعیر وہ جو چھونے میں درشت اور کھردرا ہو۔ \* - انشعرت جلدہ - اس کی جلد ہر کپکپی آگئی۔ \* - اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ اس سے کنایہ خوف بھی مراد لیا جاتا ہے۔

سورۃ زمر میں ہے تنقشعیر مینہ جلودہ..... (۳۹)۔ اس سے ان کے بدن ہر کپکپی چھا جاتی ہے۔

## ق ص د

قصد کے اصلی معنی ہیں ارادہ کرنا۔ توجہ کرنا۔ کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس کے لئے اُٹھ کھڑے ہونا۔ خواہ یہ اعتدال کے ساتھ ہو یا نہ ہو۔ القصد فی الامر۔ کسی معاملہ میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنا۔ مثلاً قصد فلان فی مشیہ۔ اس نے اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کی۔ مقترقا قصیداً (۲۷) معتدل سفر۔ چنانچہ القصید و التقصید کے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا یا بیچ سے توڑ کر آدھا کر دینا۔ \*

اِقْتَصِدْ فِيْ اَمْرِهِ۔ وہ اپنے معاملہ میں مستقیم، معتدل اور میانہ رو رہا۔  
 ادھر ادھر نہیں جھکا۔ اسی سے اِقْتَصِدْ کے معنی ہیں راستہ کا سیدھا اور  
 واضح ہونا\*۔ قرآن کریم میں ہے عَلَيَّ اللّٰهُ قَصْدُ السَّبِيْلِ (۱۶)۔ ٹھیک  
 سیدھی اور مستقیم راہ کو واضح کرنا اللہ کے ذمے ہے۔ اس نے ایسا کر دیا ہے  
 اور وہی ایسا کر سکتا ہے۔ (لیکن لوگ اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی  
 راہیں اختیار کر لیتے ہیں)۔ اگر اس آیت میں علیٰ بمعنی الٰہی لئے جائیں تو  
 مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے والا راستہ صرف درمیانی ہے۔ ادھر ادھر کی  
 ٹیڑھی راہیں نہیں۔

رغب نے لکھا ہے کہ اِقْتَصَادٌ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک مطلقاً  
 محمود ہوتا ہے جس میں افراط و تفریط کے دو سیرے ہوتے ہیں اور ان کو چھوڑ  
 کر درمیانی راہ اختیار کی جاتی ہے، جیسے۔ وَ اِقْتَصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (۳۱)۔  
 اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ یہ محمود ہے۔ اس لئے کہ رفتار میں نہ  
 تیزی اچھی ہوتی ہے نہ سستی۔ لیکن دوسری قسم کے اقتصاد کے دو سروں میں  
 سے ایک محمود اور دوسرا مذموم ہوتا ہے۔ مثلاً عدل اور ظلم کے بین ہیں رہنا۔  
 ایسے شخص کو جو ان دو سروں کے درمیان آتا جاتا رہے مُقْتَصِدٌ  
 کہا جائیگا\*\*۔

رغب نے جو کچھ کہا ہے وہ ذرا وضاحت طلب بھی ہے اور غور طلب  
 بھی۔ (مثلاً) ایک طرف اسراف ہے اور دوسری طرف بخل۔ یہ دونوں سیرے  
 (Extremities) مذموم ہیں۔ محمود راستہ ان دونوں کے بین ہیں ہے۔ یعنی جود  
 و سخا۔ نہ بے جا اور فضول خرچ کرنا اور نہ ہی سب کچھ اپنی ذات کے  
 لئے رکھ چھوڑنا۔ یہ اقتصاد (درمیانی روی) قابلِ تعریف ہے۔ اب دوسری مثال  
 لیجئے۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل۔ ان میں سے صرف ایک سمت  
 (حق) ہی محمود ہے۔ دوسری سمت (باطل) محمود نہیں۔ لہذا ان دونوں کے  
 بین چلنا خوبی کی بات نہیں۔ قابلِ ستائش وہی ہے جو حق پر چلے، نہ وہ  
 جو حق اور باطل کی درمیانی راہ چلے۔ حق اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ جو شخص  
 اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جاتا ہے وہ باطل پر چلا جاتا ہے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طرف عدل ہے اور دوسری طرف ظلم ہے۔  
 قابلِ ستائش وہ ہے جو عدل پر چلے۔ لیکن ایک شخص عدل اور ظلم کی درمیانی  
 راہ چلتا ہے۔ یعنی کبھی عدل کرتا ہے کبھی ظلم کرتا ہے۔ یا نہ عدل کرتا ہے

نہ ظلم کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں (Indifferent) رہتا ہے۔ اس شخص کو اگر عدل کے پیمانہ سے ماپا جائے تو اس کا یہ عمل محمود نہیں۔ لیکن اگر ظلم کے پیمانہ سے ماپا جائے تو یہ بہر حال، ظالم سے بہتر ہوگا۔ اس کی مثال ہمیں سورۃ فاطر میں ملتی ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے وراثتِ کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا۔ **فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ** **وَمِنْهُمْ مَّقْتَصِدٌ**۔ **وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ**۔ (۳۵)۔ ”سو ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی نیکوں میں سبقت کرنے والا ہے“۔ (نیز دیکھئے ۵۶)۔ ظناہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابلِ ستائش (اور قرآنی معیار کے مطابق) سابق بالخیرات کا گروہ ہے۔ اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں۔ لیکن ان کے بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار گروہ اول میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ، گروہ اول سے ذرا اونچا ہوگا اور تیسرے گروہ سے بہر حال نیچے۔ لیکن اس کی اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابلِ ستائش نہیں کہا جائیگا۔ قرآنی معیار پر وہی پورے اتسار سے جو ”سابق بالخیرات“ ہونگے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے اور **اُمّۃٌ وَسَطٌ** وہ قوم ہے جو درمیان کی راہ چلتی ہے، تو یہ صحیح نہیں۔ اسلام، حق کا راستہ ہے، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ۔ اور **اُمّۃٌ وَسَطٌ**، حق پر چلنے والی جماعت ہے، نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت۔ (وسط کے لئے دیکھئے عنوان و۔ س۔ ط) البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہوں (مثلاً اسراف اور بخل) وہاں اسلام درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے۔

## ق ص ر

**الْقَصْرُ**۔ **الْقَصْرُ**۔ طویل نہ ہونا۔ کوتاہ اور مختصر ہونا۔ **الْقَصْرُ**۔ روکنا، بند کرنا (کسی حد میں محدود رکھنا)۔ **قَصَرَ الشَّيْءُ**۔ کسی چیز کی لمبائی میں کمی کرنا۔ **قَصَرَ الشَّعْرُ**۔ بال چھوٹے کر دئے۔ سورۃ نساء میں ہے **أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ** (۲۶) تم صلوٰۃ کو مختصر کر دو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اپنی انتہا یا مقررہ حد تک نہ پہنچنا اور (۲) روکنا۔ قید کرنا۔ **اِمْرَاۃٌ مَّقْصُوْرَةٌ**۔ پردہ نشین عورت۔

الْمَقْصُورَةُ\* - محفوظ دیواروں سے گھرا ہوا وسیع گھر یا چھوٹا کمرہ\*۔  
 قرآن کریم میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے متعلق ہے مَقْصُورَاتٌ\* فی  
 النِّحْيَةِ\* (۵۵) - خیموں میں بہ حفاظت رکھی ہوئیں - دوسری جگہ انہیں  
 قاصِرَاتُ الطَّرْفِ کہا ہے (۳۸) - اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سٹا کر  
 رکھنے والیاں\* - جونگاھوں کو بے ہاک نہ ہونے دیں - اَلْقَصْرِ\* - موٹی  
 موٹی (جلانے کی) لکڑیاں - بڑے درختوں کی جڑیں\* - قرآن کریم نے جہنم کے  
 شعلوں کو اس سے تشبیہ دی ہے (۴۴) - قَصْرَ عَنِّیْ اِلَّا مُرَّ - کسی بات سے  
 باز رہنا - ابن السکیت نے کہا ہے کہ قَصْرَ عَنِّہُ\* اس وقت بولتے ہیں جب  
 کوئی شخص کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو - یعنی اسے کرنے کی قدرت نہ  
 رکھے، اور اَقْصَرَ عَنِّہُ\* جب اُسے کرنے کی قدرت تو رکھے لیکن اس کے باوجود  
 باز رہے\* - سورة اعراف میں ہے ثُمَّ لَا يَنْقَصِرُ وُنَّ\* (۴۴) - وہ رکتے نہیں،  
 کمی اور کوتاہی نہیں کرتے۔

سورة فتح میں مَقْصِرِیْنِ آیا ہے (۲۸) - یعنی ہال کتروانے والے -  
 قَصْرَ سَهْمِہُ\* عَنِ الْاَهْدَافِ\* - اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا\* - اس  
 سے تَقْصِیْرُ\* کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جس کا استعمال ہمارے ہاں عام  
 طور پر ہوتا ہے - اور "قصور" کے معنی بھی -

## ق ص ص

قَصَّ اَثَرَهُ یَقْصُ قَصَصًا وَقَصَصًا - کسی کے پیچھے پیچھے اس  
 کے نقوش قدم پر چلنا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی  
 کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوئے ہیں - قرآن کریم میں  
 دیکھئے (۱۸/۲۸)

قَصَّ عَلَیْہِ الْعَجَبَرُ قَصَصًا - اسے وہ خبر بتا دی - اسے اس پر مطلع کر  
 دیا\* - قرآن کریم میں ہے - نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ  
 (۱۲) - ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں - اَلْقَاصُ\* - قصہ گو -  
 ایک حدیث میں ہے اِنْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ لَمَّا قَصَصُوْا هَلٰکُوْا - بنی  
 اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہو گئے - یا جب انہوں نے  
 (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو  
 ہلاک ہو گئے\* - (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا) - اَلْقِصَّةُ\* - معاملہ -  
 خبر - واقعہ\* -

قَصَّ الشَّعْرَ - اس نے بال کاٹے۔ اَلْمَيْقَصُ - قینچی کو کہتے ہیں\*۔  
 اَلْقَيْصَاصُ - مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا  
 مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا۔ قانون عدل کا مجرم کے  
 پیچھے پیچھے چلنا۔ راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ)  
 کا آنا کئے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں  
 استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق  
 ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن حکیم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس  
 نے کھدیا کہ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ  
 فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّفْسَ جَمِيعًا - جس نے کسی متنفس کو ماری ڈالا، بجز  
 اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا  
 ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے  
 تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ وَمَن أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّفْسَ  
 جَمِيعًا (۲۴)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے  
 گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم  
 کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے، یا ملک میں  
 فساد برپا کر دے، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (۲۴) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن  
 چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر  
 انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے  
 کہ كَتَبَ عَلَیْكُمْ الْقَيْصَاصُ فِي الْقَتْلِ (۲/۱۷۸)۔ ”تم ہر مقتولین  
 کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے“۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے  
 مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ  
 پہلے کہا جا چکا ہے، قِصَاص کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔  
 لہذا قصاص کا مطلب عوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اُسے اسے  
 ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ”قابل دست اندازی پولیس“ قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs ....)۔ لہذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے الْحَرُّ بِالْحَرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَىٰ بِالنَّثْلِ یا "لا" نثلی۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل، مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداهت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں اہم اصول مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عَفِيَ لَهٗ مِّنْ آخِيَّتِهِ شَيْءٌ فَتَاتِبَسَّاعٍ بِالْمَعْرِوفِ وَأَدَاةٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكُمْ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دیدی جائے تو اسے چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ”کچھ معاف کر دینا“۔ (شی) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ”کچھ معاف کر دینے“ (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ”کچھ معاف کر دینے“ کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ ایسے دیت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔ جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَا۔ کسی مومن کے یہہ شایاں ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّثْلُ مِثْلِهِ وَتَرْبِئَةٌ مِّثْلُ مِثْلِهِ۔ (شی) کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائیگا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے، مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عَفِيَ لَهٗ مِّنْ آخِيَّتِهِ شَيْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خوں بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقی ماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہوگی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے وَمَنْ يَقتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (۳۸) اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس



کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب ہے ، اور اس کی لعنت - اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے ۔ ”۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خون بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائیگی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیور میں آکر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی۔ جرم کی نوعیت اور احوال و ظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جَزَاؤُہُ جَہَنَّمَ کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور۔ قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے بھی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن حکمران کے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمدہ کی سزا بالعموم، موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے فَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اُسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو۔ فَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَّتِهِمُ سُلْطَانًا۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مدد کار نہیں، اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں، مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعمِ باطل میں نہیں رہنا چاہیئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو ”سلطان“ بنایا ہے۔ معاشرہ (نظامِ حکومت) کا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا ہشت پناہ ہوگا۔ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا (سورہ)۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ

قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ قَتْلًا یُسْرِفُ فی القَتْلِ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ”اسراف فی القتل“ ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَتَقَدُّ جَعَلْنَا لِيُؤَيِّدِيهِمْ سُلْطَانًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے۔ افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم، معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہذا قَتْلًا یُسْرِفُ فی القَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

۱۔ وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً، نادانستہ، بھول چوک میں، غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمدہ قتل کیا ہو۔

۲۔ معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی ہوجھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا، اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار بنے گا۔

۳۔ قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور ”اللہ کا غضب و لعنت اور عذاب عظیم“ وغیرہ اس کے ساتھ، یا اس سے الگ، یا اس سے نچلے درجہ پر، دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل، افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہذا، مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا، مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل ہلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خوں بہا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خوں بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ ”کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے“۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو بونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے۔ قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن، کسی باشد، ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۳۳)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خوں بہا ادا کرنا ہوگا تا کہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمدہ قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی اس قدر وقعت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جاسکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو، یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر، یا دشمن سے جنگ میں، یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے، وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ

افراد از خود) کہ بالحق کسی قتل کیا جا سکتا ہے۔ لہذا مقتولِ مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں۔ یہ ہے وہ قصاص جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (۲/۹۱)

## ق ص ف

قَصِفَ بِقَصِيفٍ - قَصِفًا - کسی چیز کو توڑنا۔ رَعْدٌ قَصِيفٌ - سخت آواز والی گرج۔ الْقَصِيفَةُ - درخت کے خشک ہو کر ٹوٹ جانے والے ٹکڑے۔ نیز ہر وہ چیز جو آدھوں آدھ سے دو حصوں میں ٹوٹ گئی ہو۔ عَصَفَتِ الرِّيحُ فَتَقَصَفَتِ السِّفِيْنَةُ - تیز آندھی چلی اور اس نے کشتی کو توڑ دیا \*۔ قرآن کریم میں قَصِيفًا مِّنَ الرِّيحِ (۱۶۹) اُنہی معنوں میں آیا ہے۔ یعنی ایسی تیز ہوا جو (کشتی کو) توڑ ڈالے۔ صاحب لطائف اللغات نے لکھا ہے کہ الْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں ہیں جو میدانوں اور صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور الْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں تلاطم پیدا کر دیں۔

## ق ص م

قَصَمَ يَقْصِمُ قَصْمًا - کسی چیز کو توڑ دینا (ابن فارس)، خواہ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے یا نہ ہو \*۔ هُوَ أَقْصَمُ الشَّيْءِ - اس کا سامنے کا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔ سَيْفٌ قَصِيمٌ - وہ تلوار جس کی دھار ٹوٹی ہوئی ہو \*۔ اسی سے کہتے ہیں قَصَمَهُ اللَّهُ - خدا اسے ذلیل کرے \*۔ سورہ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قُرْيَةٍ (۲۱) - کتنی ہستیاں تھیں جنہیں ہم نے ذلیل و خوار کر دیا۔ یعنی انہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔ ان کا شیرازہ بکھیر دیا (ان کے جرائم کی پاداش میں)۔

## ق ص و

قَصَا عَنْهُ - وہ اس سے دور ہوا۔ قَصَا الْمَكَانُ - جگہ دور ہو گئی (ابن فارس)۔ قَصْبِيٌّ - دور، بعید۔ جمع اقْبَاءٌ - الْقُصُوءُ - آخری حد تک دور۔ انتہائی بعید \*\*\*۔ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى (۸۶) - دور کے کنارے پر۔ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۶) - دور جگہ \*\*\*۔ الْمَسْجِدُ الْأَقْصَى (۱۶) - بہت دور کی مسجد۔ عام طور پر اس سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد

مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے قریب تین سو میل دور ہے، اور جس کی طرف نبی اکرمؐ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی مسجد گاہ بننا تھا۔ یعنی ان کے نظام اطاعت و فرماں پذیری کا مرکزی مقام۔

## ق ض ب

قَضَبَہُ - اس نے اسے کاٹ دیا۔ فَانْقَضَبَ - چنانچہ وہ کٹ گیا۔ قَضَابَةُ الشَّيْءِ - جو حصہ کسی چیز سے کاٹ دیا جائے۔ جو کچھ درخت کی شاخوں سے کٹ کر گرے۔ الْقَضَبُ - وہ شاخیں جو کسی درخت سے تیر اور کمان بنانے کے لئے کاٹی جائیں۔ یا ایک درخت جس کی لکڑی تیر کمان بنانے کے کام آتی ہے۔ یا ہر لمبا اور پھیلا ہوا درخت \*۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ درخت کی شاخوں کو قَضِيبٌ اور سبزپوں ترکاریوں کی شاخوں کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے \*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں عِنَبًا وَقَضْبًا (۸۸/۸) آیا ہے، تو اس کے معنی ترکاریوں کے ہیں۔ فراء نے کہا ہے کہ اہل مکہ ایک چارہ (قَتَّ) کو قَضْبٌ کہتے تھے \*۔

## ق ض ض

قَضَّ يَقْضُ - قَضًّا - کسی چیز کو کوٹنا اس میں سوراخ کرنا۔ قَضَّ الثَّوْدَ - اس نے میخ کو اکھاڑ لیا۔ الْقَضَّةُ - چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ کنکریوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گرتا ہے۔ انْقَضَّ الْجِدَارُ - دیوار میں شکاف آگیا مگر وہ ابھی تک گری نہیں \*\*\*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے اور خود تاج میں بھی ہے کہ اس کے معنی ہیں دیوار گر گئی۔ قرآن کریم میں ہے جِدَارًا يَرْسُدُ ۱۸۱ اَنْ يَنْقَضَ (۱۸۱/۱) دیوار جو گिरا ہی چاہتی تھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تین ہیں۔ (۱) کسی چیز کا نیچے کی طرف گرنا۔ (۲) چیز میں کھردرا پن اور نا ہمواری ہونا۔ (۳) چیز میں سوراخ کرنا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے سورہ کہف میں یہ لفظ گرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

## ق ض ی

الْقَضَاءُ کے مختلف معنی آتے ہیں۔ لیکن ان تمام معانی کی اصل کسی چیز کا منقطع ہونا، ختم ہو جانا، اور مکمل ہو جانا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے

\* تاج \*\* راغب - \*\*\* تاج و محیط و راغب۔

کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا اور اسے اُس کی جہت پر نافذ کرنا ہیں۔ یعنی جس طرف اسے جانا چاہیے اُدھر لے جانا۔ راغب نے القضاء کے معنی جدا کرنا اور قطع کرنا لکھے ہیں۔ قَدْ قَضٰی دَبْنَه کے معنی ہیں اس نے اپنے قرض کو پورا پورا چکا دیا اور اس طرح قرض خواہ کا جو معاملہ اس کے ساتھ تھا اسے ختم کر دیا۔ اسی لئے اس کے معنی حتمی اور آخری فیصلہ کے آتے ہیں۔ چنانچہ الْقَضٰی موت کو کہتے ہیں۔ قَضٰی الْمِیۡہ کے معنی ہیں معاملہ کو اس تک پہنچا دیا \*۔

الْقَضَاءُ کے معنی کسی چیز کو پورے طور پر بنا دینا اور اس کا اندازہ مقرر کر دینا بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی بات کو بالکل واضح کر دینا بھی ہیں \*۔

الْتَقَاضِی کے معنی، طلب کرنے کے ہیں \*۔

قرآن حکیم میں خدا کے متعلق ہے۔ اِذَا قُضِیَ اَمْرًا (۲/۱۱۷)۔ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ سورہ طہ میں ہے کہ دربارِ فرعون کے ساحرین نے فرعون سے کہا کہ قَاتِلْ مَا آتٰتْ قَاضٍ (۲/۶۰) جو کچھ تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر دے۔

سورہ فصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو مسکامارا۔ فَقَضٰی عَلَیْہِ (۲/۸۵)۔ اس کا کام تمام کر دیا۔ ذرا آگے ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے خسر سے کہا کہ اٰیْمًا لَا جَلٰیۡنَ قَضٰیۡتُ (۲/۸۸)۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں۔ سورہ زخرف میں یہ لفظ مَسْکُوت کے مقابلہ میں آیا ہے جس کے معنی بتا رہے ہیں۔ اس لئے یَقْضُ (۲/۱۳۰) کے معنی ختم کر دینے کے ہوں گے۔

چونکہ انسانی دنیا کے متعلق خدا کے فیصلے انسانوں تک وحی کے ذریعے پہنچتے ہیں اس لئے وَقَضٰیۡنَا الْمِیۡہ کے معنی ہیں ”ہم نے اس کی طرف وحی کی“ یا وحی کے ذریعے اپنا قطعی فیصلہ بتا دیا۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ قَضٰیۡنَا اِلٰیۡ بَنِیۡۡۤ اِسْرَآئِیۡلَ فِی الْکِتَابِ (۱/۵۴) ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اس فیصلہ کو بذریعہ وحی، کتاب میں بھیج دیا تھا۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے۔ وَقَضٰی رَبِّکَ اِلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاۤ اِیَّاهُ (۱/۵) تیرے رب نے وحی کے ذریعے اپنے اس حکم کو انسانوں تک پہنچا دیا کہ اس کے قانون کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہ کریں۔

سورہ قصص میں ہے ۔ اِذْ قَضَيْنَا اِلٰی مُوسٰی (۲۴۰) ۔ جب ہم نے موسیٰ کی طرف وسی کی ۔

سورہ حٰجِم سجدہ میں ہے فَتَقَضَّيْهُمْ سَبْعَ سَمَوٰتٍ (۱۱۴) ۔ ”سو انہیں متعدد کٹرے بنا دیا“ ۔ یہاں اس کے معنی ، بنانا ، مکمل کرنا ، اور اندازہ مقرر کرنا ہیں ۔ سورہ اَنْعَام میں ہے ۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ طِينٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا (۲) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی اور پھر ایک ميعاد ٹھہرا دی ۔ یعنی اس کا فیصلہ کر دیا کہہ نوع انسان کہہ زمین پر ایک مدت تک رہنا ہے ۔ [ وَلَكُمْ فِيْ الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۶۲) ] ۔ تمہارے لئے زمین میں ایک مدت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ۔

سورہ مومن میں ہے وَاللّٰهُ يَفْضِلُ بِالْحَقِّ (۲۰) ۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے ۔ سورہ مریم میں ہے ۔ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۰) فیصلہ شدہ بات طے شدہ معاملہ ۔ مقررہ قانون ۔

## ق ط ر

الْقَطْرُ ۔ بوندیں ۔ قطرے (واحد قَطْرَةٌ ہے) یا جو چیز قطرہ قطرہ جمع ہو کر بنے ۔ بارش (کا ہانی) ۔ مَحَابِّ قَطُورٌ ۔ بہت ہرسنے والا بادل ۔ الْقَيْطَرُ ۔ الْقَطِيرُ ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ یا تانبہ کی کوئی قسم \* (۹۶) ۔ الْقَطِيرَانُ ۔ الْقَطْرَانُ ۔ رال ۔ ایک قسم کا چکنا میال مسادہ جو صنوبر وغیرہ کے پھلوں سے نچوڑے ہوئے رس کو پکا کر تیار کیا جاتا ہے \* (۱۳) ۔

الْقَطْرُ ۔ کُنارہ ۔ جانب ، جمع اَقْطَارٌ (۵۵) ۔ اطراف و جوانب ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے الفاظ کسی قاعدے کے ماتحت نہیں ہیں ۔

## ق ط ط

الْقَطَطُ ۔ کسی چیز کو جوڑانی میں کاٹنا (ابن فارس نے اس میں تیزی سے کاٹنے کا اضافہ کیا ہے) ۔ طول میں کاٹنے کو قَطَطٌ کہتے ہیں ۔ اِنْقَطَطَ الشَّيْءُ ۔ چیز کٹ گئی ۔ الْقَيْطُ ۔ معین حصہ (کاٹ کر الگ کیا ہوا) ۔ صحیفہ جس پر کسی آدمی کو دیا جائے والا انعام لکھا ہو ۔ ہر لکھا ہوا صحیفہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ کتابِ محاسبہ کو قَيْطٌ کہتے ہیں \*\* ۔

قرآن کریم میں ہے - رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْقَنَا (۳۸) - جہاں اس کے معنی حصہ یا حساب نامہ کے ہیں - یعنی ”اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہمارا حساب چکا دے - یعنی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے - اس میں عجلت کر دے“ -

## ق ط ع

قَطَعَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا - راعب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں - جیسے قَطَعَ اللَّحْمُ - گوشت کاٹنا - اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِيلُ - ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا - قَطَعَ لِسَانَهُ - کسی پر احسان کر کے اس کی زبان بند کر دینے \* کو بھی کہتے ہیں \*\* - قرآن کریم میں يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ، أَنْ يَشَوْصَلْ (۲۲) میں، یہی معنوی انقطاع مراد ہے - یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملانے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں - نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں -

قَطَعَ خَصْمَهُ بِالْحَبِطَةِ - اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو لا جواب کر دیا \* - قَطَعَ رَحِمَهُ قَطِيعَةً - اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے - چنانچہ أَقْطَوْعَةً اس چیز کو کہتے ہیں جو قطع تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس) - قَطَعَ عُنُقَ دَابَّةٍ کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا - بلکہ مجازاً اس کے معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا \* - قَطِيعَتُ لِسَانِهِ کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی \* - قَطِيعَتُ يَدِهِ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ پیکار ہو گیا \* - چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قَطَعْنِ أَيْدِيَهُنَّ (۱۲) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ہورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر

\* تاج - \*\* غزوہ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو چالیس اونٹ دئے - وہ بہت غصہ ہوا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ اور جس طرح ہو سہری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو - صحابہ رض گئے اور وہ جتنے میں راضی ہوا اُسے دیکر راضی کر لیا - یہ تھا مطلب قطع لسان کا - (بحوالہ اصح السیر عبدالرؤف دانا پوری - صفحہ ۲۹۶) -



الگ کر کے پھینک دئے۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رک گئے۔ (یا فرط حیرت میں انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے)۔ اسی طرح قَطَّاعُ الطَّارِقِ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں\*۔ قرآن کریم نے (قوم لوط کے ضمن میں) اسے قَطَّعُ السَّبِيلِ کہا ہے (۲۹)۔ یا اس آیت میں نَقُطِعُونَ السَّبِيلَ کے معنی ہیں خلاف وضع فطری سے افزائش نسل انسانی کے راستے بند کر دینا۔ قَطَّعَ بِيَهُ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی اسیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی۔ وہ مایوس ہو گیا۔

قَطَّعَ مِّنَ اللَّيْلِ۔ سے مراد رات کا حصہ ہے جو شروع رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں\*۔ (دیکھئے ۸۱)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے۔

قَطَّعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی ناامید ہو گیا اور عاجز رہ گیا\*\*۔ قَطَّعَ الْأَمْرَ کے معنی ہیں کسی بات کا آخری فیصلہ کرنا۔ اسی سے آیت (۲۴) میں ہے مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں.....

سورة المائدة میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا (۵۸) جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو۔ لیکن لفظ قَطَّعَ اور قَطَّعَ بَدَنِ کے مذکورہ صدر معانی کے ہمیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی مساندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے "جَزَاءُ" بِمَا كَسَبَتْ لَكَ لَا مِّنَ اللَّهِ (۵۸)۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانون خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک کے۔ (نَكَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ ک۔ ل)۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ اس لئے کہ اس سے آگے ہے فَمَنْ تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَاصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ (۵۸)۔ اور جو مجرم ارتکاب جرم کے بعد پشیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اسے قانون خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی۔ لیکن اگر سزا میں اس کے

ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اُسے معافی مل جائے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر آپدیری کے معنی اختیار اور قدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی) تو قطع ید کے معنی ہونگے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس قدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے۔ اس میں چوری کے علاوہ ہر قسم کی خیانت بھی آ جاتی ہے۔

اسی سورۃ مائدہ میں نظام مملکت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے متعلق ہے اُن یُشَقَّقُوا اَوْ یُصَلَّبُوا اَوْ تُقَطَّعْ اَیْدِیْہُمْ وَاَرْجُلُہُمْ اَمِنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَتَوْا مِنْ اِلَآرْضِ (۱۳۷)۔ انہیں قتل کر دو۔ یا صلیب پر لٹکا دو۔ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے قطع کر دو یا انہیں جلا وطن کر دو۔ اس میں قتل کرنے، صلیب دینے، اور جلا وطن کرنے کے علاوہ ایک سزا قطع اَیْدِیْ وَاَرْجُل کی بھی ہے۔ اس کے معنی الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر قید کر دینے کے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ یہی الفاظ ساحرین دربار فرعون کی سزا کے بارے میں آئے ہیں۔ بناء بریں، قطع ید کے معنی یہ بھی لئے جاسکتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کر دو جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ تم نے دستخط کر کے (یا فلاں بات کر کے) اپنے ہاتھ کٹوا دئے۔ یعنی تم نے ہس ہو گئے۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے۔ اور اگر قطع ید سے مراد سچ مچ ہاتھ کاٹ دینے کے ہیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اُس وقت دی جاسکتی گی جب یہ جرائم ایسے عام ہو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی اور کوئی صورت نہ رہے۔ جیسے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں (Smuggling) اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اسکی روک تھام کے لئے انتہائی اقدامات ناگزیر ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بارڈر پولیس کو اجازت ہے کہ وہ (Smuggler) کو موقع پر گولی مار کر ہلاک کر دے، حالانکہ ظاہر ہے کہ ہم حالات میں موت کی سزا، قتل عمد یا بغاوت کے جرم میں دی جاسکتی ہے، اور وہ بھی اس وقت جب پوری تحقیقات (اور مجرم کو اپنی مدافعت کا موقع دینے کے بعد) جرم ثابت ہو جائے۔ لہذا، ایسے حالات میں چوری کی سزا، قطع ید ناگزیر ہو جائیگی۔

یا مثلاً جب ملک میں نظام خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ہو تو ایسی صورت

\* بعض کے نزدیک ان میں ڈاکو اور رھزن بھی شامل ہیں۔

میں کسی کی چیز چرانے کی واقعہ ایک سنگین جرم ہوگا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہئے۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو قطع ہند کی سزا دینا، کل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے، جس کا نتیجہ (۲۸) میں مذکور ہے۔

## ق ط ف

قَطِطٌ\*۔ کسی چیز کو (بالخصوص پھلوں کو) توڑ لینا یا کاٹ لینا۔ (ابن فارس)۔ الْقَطِطُ\*۔ انگور کا خوشہ جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو۔ اسکی جمع قَطَطٌ\* ہے\*۔ قرآن حکیم میں قَطَطٌ\* دَانِيَةً\* (۲۹) آیا ہے۔ ان کے خوشے قریب قریب ہیں۔ الْقَطِطُ\* اس درانتی کو کہتے ہیں جس سے پھل کاٹتے ہیں\*۔

## ق ط م ر

الْقِطْمِيْرُ\*۔ کھجور کی گٹھلی میں جو شکاف ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ایک نشان سا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا اس باریک سی جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے۔ اس لفظ کو تھوڑی سی چیز کے لئے بطور مثال بولتے ہیں\*\*۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔ مَا تَعْلَمُ كُنُوْنُ مِيْنُ قِطْمِيْرٍ\* (۳۰)۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اتنا بھی نہیں جتنی اُڑد پر سفیدی۔

## ق ع د

الْقَعَوْدُ\*۔ بیٹھنا۔ نیز یہ الْقَاعِدُ\* کی جمع ہے۔ یعنی بیٹھنے والے۔ الْقَمْعَدُ\*۔ بیٹھنا نیز بیٹھنے کی جگہ۔ اسکی جمع مَقْعَدٌ\* ہے۔ قَعَوْدٌ\* اور جُلُوْسٌ\* ہم معنی الفاظ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کھڑے سے بیٹھ جانے کو قَعَوْدٌ\* کہتے ہیں اور لیٹے سے بیٹھنے، یا سجدہ سے الٹ کر بیٹھنے کو جُلُوْسٌ\* کہتے ہیں۔ بعض علماء لغت نے کہا ہے کہ قَعَوْدٌ\* اسے بیٹھنے کو کہتے ہیں جس میں دیر اور ٹھہرائی پایا جائے۔ اسی لئے گھر کی بنیادوں کو قَعَوْدُ الْعِيْدِ الثَّابِتِ\* کہتے ہیں، جو اَبَسُ الثَّابِتِ\* کہتے ہیں۔ الْقَاعِدَةُ\*۔ وہ جڑ جس پر عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اسکی جمع قَوَاعِدُ\* ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ قَوَاعِدُ الثَّابِتِ\* ان ستونوں کو کہتے ہیں جن پر عمارت استوار کی جاتی ہے\*\*\*۔ قرآن حکیم میں (۳۱) میں، الْقَوَاعِدُ مِيْنُ الثَّابِتِ\* ہے۔

أُقْعِدَ الْقَرْجُلُ - وہ صاحب فراش ہو گیا، اور بیماری کی وجہ سے اس میں اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی طاقت ہی نہ رہی۔ قرآن کریم میں قَعَدَ، انْتَبِعَاتُ کے مقابلہ میں آیا ہے (۹۶)۔ قَعَدَ لِلْيَحْرَبِ کے معنی ہوئے ہیں اس نے جنگ میں لڑنے والے بہادروں کو تیار کیا\*۔ سورہ بروج میں ہے۔ اِذْ هُمْ عَلَىٰ نَهِْيَتِهَا قَعَوْدٌ\* (۹۵)۔ جب وہ لوگ (جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے) بالکل تیار بیٹھے تھے۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی کام میں سستی کرنے والے کو قَاعِدٌ کہا جاتا ہے\*\*۔ سورہ النساء میں الْقَاعِدُونَ، الْمُجَاهِدُونَ کے مقابلہ میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۹۵)۔ الْقَعِيدُ - وہ شخص جو تمہارے ساتھ بیٹھتا ہو۔ محافظ۔ نگران\*۔ (۹۶) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔

الْقَاعِدُ (مِنْ النِّسَاءِ) اُس معمر عورت کو کہتے ہیں جو اولاد، حیض، اور شوہر سے مایوس ہو چکی ہو۔ اسکی جمع الْقَوَاعِدُ (مِنْ النِّسَاءِ) ہے (۹۶)۔ مَقَاعِدُ - مرکزی مقامات (۹۷)۔ سورہ قمر میں ہے فِي مَقَاعِدِ صِدْقٍ - ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں۔ (دیکھئے عنوان ص - د - ق)۔ لیکن یہ مقام (جنت) محض بیٹھنے کی جگہ، یعنی تھوڑی دیر تک سستانے کا مقام ہے۔ آخری منزل نہیں۔

سورہ جن میں کاہنوں اور نجومیوں کی رصد گاہوں کے لئے مَقَاعِدُ لِلْكَافِرِ (۹۸) آیا ہے۔

## ق ع ر

الْقَعْرُ - کسی چیز کی انتہائی گہرائی۔ قَعْرُ الْبَيْتِ - کنوئیں کی تہ۔ قَعْرُ النَّخْلَةِ - اس نے کھجور کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ فَانْقَعَرَتْ\*۔ پس وہ جڑ سے اکھڑ گئی\*\*\*۔

قوم عاد پر جو آندہ کی سخت طوفان آیا تھا اس کے متعلق ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح اپنے مقام سے اکھاڑتا چلا جاتا تھا، كَانَتْهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ (۹۷)۔ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اس طرح اکھڑتے چلے جاتے تھے گویا وہ ایسی کھجوروں کے تنے تھے جو پہلے ہی جڑوں سے اکھڑی ہوئی ہڑی تھیں۔ اور یہ بھی کہ وہ اس طرح اکھڑ رہے تھے جس طرح ایسی کھجوریں اکھڑیں جن کی جڑیں بڑی گہرائی تک زمین میں گئی ہوئی ہوں۔ یعنی وہ قوم اپنے

آپ کو بڑی مستحکم سمجھتی تھی۔ وہ خیال کئے بیٹھی تھی کہ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اس لئے اسے کون اکھیڑ سکتا ہے۔ لیکن اسے ایک ہی آندھی کے طوفان نے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ سورہ حاقہ میں اَعْجَازٌ نَحْلٌ۔ خَاوِیۃٌ (۱۶) کہا گیا ہے۔ یعنی کھوکھلی کھجوروں کے تنے۔

## ق ف ل

قَتَلَ۔ یَقْتُلُ و یَقْتُلُ۔ قَتْلٌ۔ کسی کا سفر سے واپس آجانا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قَتْلٌ جہاد اور جنگ سے فوج کے واپس آنے کو کہتے ہیں۔ اَقْتَلَ الْجَیْشُ۔ لشکر واپس آگیا۔ اَلْقَتْلِیۃُ۔ وہ رفقاء سفر جو سفر سے واپس آ رہے ہوں (ابن فارس)۔ لیکن سفر پر جانے والوں کو بھی کہتے ہیں، اس فال نیک کے اعتبار سے کہ۔ یہ سلامت روی و باز آئی۔ یعنی ان کی خیریت سے واپسی کی آرزو کے لحاظ سے انہیں جانے وقت بھی اَلْقَتْلِیۃُ ہی کہتے ہیں\*۔ قَتَلَ الطَّغَمَ۔ اس نے کھانے کی چیزوں کا ذخیرہ کر لیا۔ قَتَلَ الشَّیْئِیۃُ۔ اس نے چیز کا اندازہ اور تخمینہ لگایا۔ اَقْتَلَ الْبَابَ۔ اس نے دروازہ کو بند کر لیا۔ اَلْقَتْلُ۔ تالا جس سے دروازہ بند کیا جاتا ہے\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْتَالٰہِمَا (۲۴)۔ کیا ان کے دلوں پر ان کے تالے پڑے ہوئے ہیں جو وہ قرآن کریم میں غورو خوض نہیں کرتے۔ اِسْتَقْتَلَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے بخل کیا۔

## ق ف و

اَلْقَفَا۔ اَلْقَابِیۃُ۔ گندئی۔ گردن کا پچھلا حصہ۔ اَلْقِفْوۃُ۔ دم۔ اسی سے اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ قَفُوۃٌ۔ قَفُوۃٌ۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ قَفَّیۡتُہُ زَبَدًا۔ ویز بید میں نے اس کے پیچھے پیچھے زید کو بھیجا۔ هُوَقَفِیۡہُمُ۔ وہ ان کا جانشین و پسماندہ ہے\*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے پیچھے پیچھے چلنے کے لکھے ہیں۔ اَلْقَفِیۃُ برتری کو بھی کہتے ہیں\*۔

سورہ حدید میں ہے ثُمَّ قَفَّیۡنَا عَلٰی اٰثَارِہِیۡمُ بِرُّسُلِنَا (۲۷)۔ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے۔ (بیز ۸)۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَلَا تَقْنُفْ مَالَيْسَ كَذَكَ بِهٖم عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالتَّفْؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْنُوْنًا (۱۶)۔ ”اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ (یاد رکھو) سماعت، بصارت اور قلب سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔“۔ قرآن کریم نے اس آیت میں عظیم حقائق بیان کئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ محض قیاس و گمان کی بنا پر، تقلیداً اور رسمًا کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہئے۔ اس کے متعلق خود تحقیق کرنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے عِلْمٌ کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اس میں سماعت و بصارت و قلب کی شہادت موجود ہونی چاہئے۔ سماعت و بصارت میں علم بذریعہ حواس (Per-ceptual Knowledge) آجاتا ہے، اور قلب (Mind) میں (Conceptual Knowledge) نیز یہ بھی کہ حواس کے ذریعے جو معلومات تم تک پہنچیں، ان سے نتیجہ مستنبط کرنے میں اپنے جذبات کو دخل مت دینے دو (اس لئے کہ فؤاد میں جذبات کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے)۔ ہر معاملہ کے متعلق پوری پوری خارجی معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر جذبات سے الگ ہو کر، اس سے نتیجہ نکالو۔

راغب نے بھی اس آیت کی شرح میں لکھا ہے کہ محض قیافہ اور گمان کی بنا پر کسی بات کا فیصلہ نہ کرو۔ وہ لکھتا ہے کہ قِيَافَةٌ دراصل اِقْتِفَاء کا مقلوب ہے۔

## ق ل ب

قَلْبٌ کے بنیادی معنی ہیں الٹنا پلٹنا۔ لوٹ پوٹ کرنا۔ کسی چیز کو ادا لتے بدلتے رہنا۔ چنانچہ قَلْبُ الشَّيْءِ یَقْلِبُہ کے معنی ہیں کسی شے کو الٹ پلٹ کر دینا۔ یعنی اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا۔ قَلْب کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ۔ تَقَلَّب کے معنی ہیں الٹ پلٹ ہونا، جیسے تیز گرم ریت پر سانپ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ قَلْبُ الْخُبْرِ۔ اس وقت کہتے ہیں جب روٹی اوپر سے پک جائے اور اندر سے پکانے کے لئے اسے الٹ پلٹ کیا جائے۔ مَقْلَبٌ اس لوہے کو کہتے ہیں جس سے کسان کھیتی کرنے کے لئے زمین کی مٹی کو الٹ پلٹ کرتا ہے\*۔

چونکہ انسان کا دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی قَلْبٌ کہتے ہیں۔ اور (چونکہ عقل و بصیرت

کا کام یہ ہے کہ وہ اشیاء اور اس کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لئے (عقل کو بھی قَلْب کہا دیتے ہیں\*۔

ابن ہشام نے قَلْب کے معانی میں سے چار بیان کئے ہیں (۱) دل (۲) عقل (۳) ہر چیز کا خلاصہ اور (۴) ہر چیز کا بہترین حصہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ میں دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا خالص اور گراں قدر حصہ (۲) کسی چیز کو ایک رخ سے دوسرے رخ پر پھیرنا۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں۔ هَذَا عَرَبِيٌّ قَلْبٌ۔ یہ شخص خالص عرب ہے۔ کھجور کے درخت میں ایک سفید سا مغز (گاہا) ہوتا ہے جو اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے۔ اِسے قَلْبُ النَّخْلَةِ کہتے ہیں\*۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ہر خالص شے کو قَلْب کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں قَلْب اور قُلُوْب دو لفظ آئے ہیں (قُلُوْبٌ - قُلُوْبٌ - قُلُوْبٌ) سے جس کے معنی بھوننے کے ہیں، یعنی تپش و خلش۔ سوز و گداز۔ درد و داغ) ان دونوں لفظوں میں ایک موٹا سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ قَلْب فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے اور قُلُوْب جذباتِ سوز و گداز کا منبع۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (۱۶۹)۔ قلب تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ سورۃ کہف میں ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَفْقَهُوْهُ (۱۸۸) یعنی ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اسی طرح سورۃ حج میں بتایا گیا ہے کہ قَلْب سے عقل و فکر کا کام لیا جاتا ہے۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا (۲۴)۔ سورۃ النحل میں ہے قُلُوْبُهُمْ مُّزَكَّرَةٌ (۱۶)۔ فریب کار یا بے پاک عقلیں۔ (دیکھئے عنوان ن - ک - ر) نیز قلب کے سرچشمہ عقل و فکر ہونے کے لئے (س - م - ع) اور (ب - ص - ر) کے عنوانات بھی دیکھئے۔

سورۃ بقرہ میں منافقین کے ضمن میں ہے فِی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲)۔ اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور ذہنی کیفیت کی طرف بھی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے ان کے متعلق کہا ہے وَمَا يَتَّخِذُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۱)۔ ”وہ اپنے آپ کے سوا اور کسی کو

دھوکا نہیں دیتے لیکن اسے سمجھتے نہیں۔“ اس میں دونوں (نفسیاتی اور ذہنی) کیفیات کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے قَلْبٌ کا لفظ عقل اور جذبات دونوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان کا لفظ (Mind) قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے (نیز دیکھئے عنوان ف۔ ا۔ د)۔

تَقَلُّبٌ۔ جد و جہد کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (۱۶: ۲)۔  
سورۃ شعراء میں ہے اَلَّذِیْ یَسْرُبُکَ حَیْنَ تَقُومُ وَ تَقَلُّبُکَ فِی السَّجْدِیْنِ (۱۹: ۲۱۸)۔ ”تو جب ان لوگوں میں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، کھڑا ہوتا ہے یا مصروفِ تگ و ناز ہوتا ہے، تو خدا تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ (۲۳: ۱۳۳)۔ جب تو بار بار بے تابانہ اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتا تھا تو ہم تیرے اضطراب کو دیکھ رہے تھے۔“ لہذا تَقَلُّبٌ میں جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی جد و جہد آجائیگی۔ مُتَقَلِّبٌ کے معنی ہیں لوٹنے کی جگہ (۱۴: ۱۴)۔ مُتَقَلِّبٌ۔ ہلٹا کھانے والا۔ سورۃ توبہ میں ہے وَ قَلَّبُوا کَتَابَ الْاُسُورِ (۲۸: ۲۸)۔ یہ لوگ تیرے لئے الٹ پھیر کی تدبیریں کرتے رہے۔ یہ لوگ سوچ بچار کرتے رہے کہ کس طرح تیرے معاملات میں بگاڑ پیدا کیا جاسکتا ہے (انہیں الٹایا جاسکتا ہے)۔ سورۃ کہف میں ہے یُقَلِّبُ کَتَفِّیْہِ (۱۴: ۱۴)۔ وہ اپنے ہاتھ ملتارہ گیا۔ سورۃ محمد میں مُتَقَلِّبُکُمْ (۱۹: ۲۹) آیا ہے۔ یعنی معاملات میں سرگرداں رہنے کی جگہ ہا وقت۔

## قل د

قَتَلَ النَّحْبَزَ۔ رستی کو بٹ دنا۔ اَلَا قَلِیْدٌ۔ اونٹنی کی ناک کی نتھنی جس میں نکیل کی رسی ڈالی جاتی ہے۔ اَلْمِیْلَادُ (جمع مَتَالِیْدُ)۔ کنجی۔ نیز خزانہ\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ۔ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ (۹۳: ۹۳)۔ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کے خزانے سب خدا کے لئے ہیں۔ اَلْقِلَادَةُ۔ ہار جو گردن میں ڈالا جائے (اس کی جمع اَلْقِلَآئِدُ آتی ہے)\*۔ قرآن کریم میں ہے وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ (۱۰: ۱۰)۔  
راغب نے لکھا ہے کہ قِلَادَةُ کے معنی ہٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہیں جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کر لے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے لے۔



اس سے تقلیدیہ<sup>۱</sup> کے معنی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ یعنی نکیل کی نتھنی جسے ناک میں، یا پٹا جسے اپنے گلے میں، ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے، اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے۔ چنانچہ اسی نہج سے کہتے ہیں تقلیدیہ<sup>۲</sup> الشولاقۃ<sup>۳</sup> الاعمال۔ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا \*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہہ آلنقلیدیہ<sup>۴</sup>۔ یہود اور نصاری کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مسدود نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح متواتر چلا آ رہا ہے \*\*۔

قرآن کریم اس لئے آیا تھا کہ نوع انسانی کے گلے سے وہ تمام زنجیریں اتار دے جو اس نے اشخاص پرستی کی رو سے پہن رکھی تھیں اور جن میں وہ غلاموں کی طرح جکڑے چلی آرہی تھی (۱۵۶)۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے ذریعے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن مسلمانوں نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مڑگانہ عقیدت سے اکٹھا کیا، اور پہلے سے بھی زیادہ کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں جس سے انسانیت کا جوہر حریت، فکر و عمل جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ قرآن کریم، قانونِ خداوندی کی اطاعت اور ساری کائنات پر حکومت کا سبق دیتا ہے، نہ کہ انسانوں کی غلامی کا سبق۔ تقلید، غلامی کی بدترین شکل ہے۔ امت لئے کہ غلامی میں انسان کا صرف جسم مقید ہوتا ہے، لیکن تقلید میں اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم، قدم قدم پر تدبیر و تفکر کا حکم دیتا ہے اور اسلاف کی اندھی تقلید کو منکرین کا شیوہ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی رسول نے خدا کی طرف دعوت دی تو یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی گئی کہ تمہاری یہ دعوت اُس مساک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثۃً آبا و اجداد سے آ رہا ہے۔ حضرت نوحؑ کو یہی جواب ملا (۲۳)۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا (۱۱۴)۔ یہی حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا (۲۵)۔ یہی حضرت شعیبؑ سے (۸۴)۔ اور حضرت موسیٰؑ سے (۱۸)۔ یہی رسول اللہؐ سے کہا گیا (۳۸)۔ غرضیکہ ہر رسول کی مخالفت یہی کہہ کر کی گئی (۲۳، ۲۴)۔ قرآن کریم کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل اور براہان نہیں لانی گئی۔ محض یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا گیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے (۱۵۶، ۱۶۰)۔ قرآن کریم کہتا ہے

کہ یہ روش ، انسانی سطح زندگی کی نہیں ، حیوانی سطح کی ہے ۔ لہذا جہنم کی زندگی ( ۱۰۶ ) - اس میں انسان کی آنکھیں پیچھے کی طرف رہتی ہیں ( ۳۳ ) - وہ سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتا ( ۸۶ ) - یعنی اس مسلک کی رو سے اُس قوم کو اپنا ماضی تو درخشندہ نظر آتا ہے لیکن مستقبل تاریک ۔ غور کیجئے کہ کیا آج ہماری بھی بعینہ یہی حالت نہیں ! کیا قرآن کریم کی دعوت کی ہر جگہ یہی کہہ کر مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ آواز اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثہ چلا آ رہا ہے ؟ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہئے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ان سے ورثہ میں ملا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لینا چاہئے ۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھنا چاہئے ۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط ۔ یہ دلیل کہ اُن بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا قرآن کو سمجھ کر ہی کہا تھا ، بڑی کمزور ، بلکہ باطل ہے ۔ قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا تھا ، اور ہر نسل کو اس پر غور و تدبر کا حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات کو خود قرآن کریم کے آئینے میں دیکھے ۔ یاد رکھئے ، ہم قرآن کریم پر ایمان لانے کے مکلف ہیں ، اس لئے ہمارے لئے حق و باطل کی سند صرف خدا کی کتاب ہے ۔ اسلاف کا احترام بجا اور درست ۔ لیکن وہ ہمارے لئے سند نہیں قرار پا سکتے ۔

## ق ل ل ع

قَلْعٌ قَلْعٌ اقْتُلْعْ - کسی چیز کو اس کی بنیاد سے اکھیڑ دینا اور اسے اسکی جگہ سے ہٹا دینا ۔ اَلْمَقْلُوعُ - معزول شدہ امیر ۔ اَلْقَلْعُ - وہ محفوظ جگہ جہاں چرواہا اپنا سامان رکھتا ہے ۔ اَلْقَلْعَةُ - کھجور کا وہ پودا جسے کھجور کے درخت کی جڑ سے اکھیڑ لیا جائے ۔ اَلْقَلْعُ عَنِ الْاَمْرِ - کسی کام سے رک جانا \* - قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ذکر کے بعد ہے ۔ يَسْمَعُ اَقْلِيْعِي ( ۱۱۸ ) - بارش سے کہا گیا کہ تو رک جا ۔ تھم جا ۔

## ق ل ل

اَلْقَتْلُ - تھوڑا ۔ قَلِيلٌ - اَلْقِيَاةُ - کثرت کی ضد ہے ۔ کَمِيٌّ - قَتْلٌ - يَقْتُلُ - کم ہونا ۔ قَلِيلٌ - کم ۔ اَقْتُلْهُ ، قَتْلَاهُ - اسکو کم کر دیا ۔ اَلْقَتْلُ - بہت کم \*\* ۔

الْقُلَّةُ - سر یا کوهان یا پہاڑ کا بالائی حصہ - جماعت \* - الْقِلَّةُ - غصہ یا طمع کی وجہ سے جو کچھ کسی سے آتی ہے \* - اسْتَقِيلَ الرَّجُلُ - وہ آدمی فرط غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا - اسْتَقِيلَهُ - اسکو اٹھا لیا ، بلند کر دیا - اسْتَقِيلَتِ السَّمَاءُ - آسمان بلند ہو گیا - اَلَا سَتَقِيلُ - بلند ہو جانا - اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا - کسی چیز کو اپنے لئے خاص کر لینا - هُوَ لَا يَسْتَقِيلُ بِهِذَا - اسے اسکی قدرت حاصل نہیں - وہ اسے اٹھا نہیں سکتا \* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کا کم ہونا ، اور (۲) ایک جگہ نہ ٹھہرنا لکھے ہیں -

قُل - تھوڑا ہونا - مَتَاعٌ قَلِيلٌ (۱۶۶) - قَلِيلٌ - تھوڑا کرنا - کم کرنا (۱۶۸) - أَقْلُ - اٹھا لینا \* (۱۶۹) - یعنی اسے ہلکا سا سمجھ کر اٹھا لینا -

## ق ل م

قَلَمٌ - کسی چیز کو چھیل کر اور درست کر کے ہموار کر دینا - (ابن فارس) - الْقَلَمُ - قلم جس سے لکھا جاتا ہے - قینچی - بے پھل اور بے پر کا تیر - تیروں میں وہ بھی شامل ہیں جن سے جوا کھیلا جاتا تھا - (اسکی جمع اَقْلَامٌ ہے) \* - سورہ آل عمران میں ہے کہ ہیکل کے پجاری حضرت مریمؑ کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کرتے تھے - يَمْسُقُونَ أَفْلَامَ مَتَمِّمٌ (۳۳) - اس میں اَفْلَامٌ کے یہی معنی ہیں - دوسرے مقامات پر قَلَمٌ سے مراد وہ قلم ہے جس سے لکھا جاتا ہے - مَثَلَانِ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ (۱۸) یا الَّذِي عَلَّمَكُم بِلِقَائِكُم (۱۹) - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ قَلَمٌ کہو قلم صرف اس وقت کہتے ہیں جب اسے تراش کر لکھنے کے قابل بنا لیا جائے ، ورنہ اس سے پہلے کلک کو يَرَاعَةُ یا قَصَبَةٌ کہتے ہیں \*\* - یہ الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ اُس زمانہ میں عربوں میں لکھنے کا رواج تھا - خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ عام لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو - (۲۸۴)

سورہ العلق کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ الَّذِي عَلَّمَكُم بِلِقَائِكُم (۱۹) ”و اللہ وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو سکھایا“ - اس میں ایک تو تحریری علم کی اہمیت واضح ہے - دوسرے یہ کہ خدا ، انسان کو براہ راست قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا - اس لئے اس آیت (اور اس

قسم کی دیگر آیات) سے مطلب یہ ہوتا ہے کہہ خدا نے انسان کے اندر اس طرح علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ اس نقطہ کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جائیں گے۔

## ق ل ی

الْقَلْبِیُّ - شدت بغض کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے اس کے معنی کسی چیز سے دور ہٹنا اور اس کے پاس سے چلا جانا لکھے ہیں۔ قَلْبِیُّ یَقْلِبُ - کسی سے بغض رکھنا اور انتہائی ناہمسندی ظاہر کرنا اور اسے چھوڑ دینا۔ بغض نے کہا ہے کہ قَلْبِیُّ یَقْلِبُ چھوڑ دینے کے معنوں میں آتا ہے اور قَلْبِیَّہُ یَقْلِبُ - بغض رکھنے کے معنوں میں۔ اصل میں قَلْبِیُّ کے معنی ہوتے ہیں گوشت وغیرہ کو بھوننا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے اور تیز ہونے کے ہیں۔ قَلْبِیَّہُ اس نے اسے کڑھائی میں بھوننا یا تلا - الْقَلْبِیَّہُ - کڑھائیاں بنانے والا - الْقَلْبِیَّہُ - الْقَلْبِیَّہُ - پتل یا مٹی کی بنی ہوئی کڑھائی جسمیں گوشت وغیرہ تلا جائے \*۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلْبُ (۹۳) - تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ ہی وہ تجھ سے ناراض ہے۔ سورہ شعراء میں حضرت لوطؑ کا یہ قول مذکور ہے کہ اِنِّیْ لِعَمَلِیْکُمْ مِّنَ الْفَعَالِیْنَ (۱۶۸) - میں تمہارے ان کرتوتوتوں سے سخت بیزار ہوں۔ میں تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا۔

## ق م ح

قَمَحَ النَّبَعِیْرُ قَمُوْحًا - اونٹ نے حموض پسر سر اونچا کر لیا اور پانی پینے سے باز رہا۔ قَمَحَتْ اِبِلُکَ - تمہارے اونٹوں نے حموض پسر آنے کے باوجود پانی نہیں پیا اور وہ سر اٹھائے کھڑے رہے۔ اَقَمَحَ الرَّجُلُ - آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اَقَمَحَ الْفُلُّ الْاَسِیْرَ - بیڑیوں نے تنگ ہونے کی وجہ سے قیدی کے سر کو اٹھا ہوا رہنے دیا \*۔ اس زمانہ میں بیڑیوں کے ساتھ گردن میں طوق ڈالے جاتے تھے جو اگر سخت یا تنگ ہوتے تو سر اونچے کا اونچا اٹھا رہ جاتا۔ قرآن کریم میں انہی کے متعلق ہے۔ فَتَهُمُ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶) - ان کے سر کھنچے ہوئے اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔

دراصل قَمَحٌ گہوں کو کہتے ہیں اور جو ستو اس گہوں سے بنایا جاتا ہے اسے قَمِيحَةٌ کہتے ہیں۔ ستو پھانکنے کے لئے سر کو اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ اسے الْقَمَحُ کہتے ہیں۔ اس کے بعد محض سر اٹھانے کو (خ-واہ کسی وجہ سے ہو) قَمَحُ کہنے لگے\*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ (گہوں کے معنوں میں) خلاف قیاس استعمال ہوتا ہے۔

## ق م ر

الْقَمَرُ۔ ہرمہینے کی تیسری رات سے پچیس کی رات تک کا چاند۔ پہلی دوسری اور چھبیس سنائیس تاریخ کے چاند کو ہلال کہتے ہیں\*\*۔ تَقَمَّرَ الْقَمَرُ آقۃ۔ عورت سے شادی کر لی اور اسے لے گیا۔ نیز چاند رات میں شب زفاف بسر کرنے کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے یہ معنی قَمَرۃ سے ماخوذ ہیں جس کے معنی غالب آجانے کے ہیں۔ لہذا چاند کو قَمَرُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی روشنی دوسرے ستاروں پر غالب آجاتی ہے\*\*\*۔ قَمَرْتُ فُلَانًا۔ میں نے فلاں آدمی کو دھوکا دے دیا\*\*\*۔ (چاند کے ساتھ جنون کا تعلق قدیمی تصور ہے۔ انگریزی زبان میں Lunatic کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے)۔ اسی سے الْقِمَارُ جوئے کو کہتے ہیں۔ الْقَمِيَرُ۔ مَقَامِر۔ جوا کھیلنے والا\*\*\*\*۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایام جاہلیت میں عربوں کا قومی نشان قَمَرٌ تھا۔ جیسے ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ تھا۔ اس اعتبار سے جہاں قرآن کریم نے کہا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَالْاِنْسَانُ الْقَمَرَ (۵۴)۔ تو اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مومنین اور قریش میں آخری تصادم کا وقت قریب آ رہا ہے۔ (دیکھئے عنوان م - و - ع)۔ اس وقت عرب جاہلیت کا تمام اقتدار ختم ہو جائے گا اور اسلام کا پرچم بلند ہو جائے گا۔ (دیکھئے عنوان ش - ق - ق)۔ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۹۶) میں عربوں اور ایرانیوں کے اکٹھے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد ہوا۔

لیکن اگر ان آیات میں شَمْسٌ اور قَمَرٌ کے حقیقی معنی سورج اور چاند کے لئے جائیں تو ان میں طبعی کائنات کے بعض ہونے والے تغیرات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم اس وقت متعین طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

## ق م ص

قَمَمَصَ الْفَرَسُ يَقْمَمُصُ وَيَقْمَمِصُ قَمَمَصًا وَ قِمَمَاصًا - گھوڑے کا اپنے دونوں ہاتھوں کو یکبارگی اٹھانا اور پھر ان کو ایک ساتھ زمین پر پٹک دینا۔ اَلْقِمَمَاصُ - اچھلنا۔ کودنا۔ نیز قلق و اضطراب کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْقَمَمُوْصُ - وہ جانور جو اپنے سوار کو لے کر کودنے لگے۔ اَلْقَمَمِيْصُ - بہت اچھلنے کودنے والا خچر\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں۔ ایک تو کسی چیز کو پہننا اور اس میں لیٹ جانا۔ اور دوسرے کسی چیز کا اچھلنا اور ہلنا۔ قَمَمَصَ الْبَحْرُ بِالسَّفِيْنَةِ - دریا نے موج کے ذریعے کشتی کو اچھالا\*\*۔

اَلْقَمَمِيْصُ - کھڑے کو کہتے ہیں جو پہنا جاتا ہے۔ عربی میں یہ لفظ مذکر استعمال ہوتا ہے اگرچہ کبھی کبھی مؤنث بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس کی جمع قَمَمِصٌ - اَقْمِصَةٌ اور قَمَمِصَانٌ آتی ہے۔ ابن الجزری نے کہا ہے کہ اَلْقَمَمِيْصُ اس سلعے سے کہتے ہیں جس میں دو آستینیں ہوتی ہیں اور نیچے سے کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ کپڑا روئی یا کتان کا ہونا چاہئے۔ اگر یہ کپڑا اون کا ہو تو پھر اسے قَمَمِصٌ نہیں کہتے۔ لیکن ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کپڑا زیادہ تراون کا نہیں ہوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اون کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اَلْقَمَمِيْصُ - غلاف قلب کو بھی کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں ہے۔ اِذْ هَبُوا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَسَّاتِ بَصِيْرًا (۱۲۱)۔ (حضرت یوسفؑ نے کہا) میرے اس کدورتہ کدولے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے رکھ دو۔ اس پر ساری بات کھل جائے گی۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) ان لوگوں کا لباس امتیازی نشان رکھتا تھا جو بلند مناصب پر فائز ہوں۔ حضرت یوسفؑ کی قمیص ان کے جاہ و عزت کا نشان تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی قمیص کو باپ کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اس سے ان کے مقام بلند کا اندازہ کر کے سمجھ لیں کہ ان کا بیٹا (یوسفؑ) کہاں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے اس سے پہلے (۱۲۰) میں) کہا گیا ہے وَ اَبْيَضَّتْ عَيْتَاهُ مِّنَ الْحَمْزِ يَوْسُفُ کے غم سے یعقوبؑ کی بینائی کم ہو گئی، غم و حزن کا یہ نتیجہ ہو جایا کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے سامنے حضرت یوسفؑ کی قمیص آئی تو فرط مسرت سے ایسا نفسیاتی اثر ہوا کہ ان کے اعصاب میں

تقویت آگئی اور کمزور بینائی پھر سے اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ فوری خوشخبری سے ایسی کیفیت عام طور پر پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

داستان حضرت یوسفؑ میں پہلے آپ کی قمیص کا ذکر اس وقت آتا ہے جب آپ کے بھائی اسے ”جھوٹے خون“ میں لت پت کر کے باپ کے پاس لے آئے تھے (۱۲/۱۸)۔ دوسری دفعہ آپ کی قمیص آپ کی ہا کد امنی کی شہادت بن کر سامنے آتی ہے (۱۲/۳۷)۔ اور اب تیسری مرتبہ انکی زندگی اور جاہ و منصب کی خوشخبری بن کر۔

قَمِيصَتِهِ قَمِيصًا قَتَقْتَمِصَّ - اس نے اسے کرتہ پہنایا اور اس نے وہ کرتہ پہن لیا۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اگر کرتہ کا گریبان سینہ پر ہو تو اسے دِرْع کہتے ہیں اور اگر گریبان مونڈھے پر ہو تو اسے قَمِيص کہتے ہیں\*۔

الْقَمِيصُ - اونٹ کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکتا بلکہ بے چین و بے قرار رہتا ہے\*\*۔

## ق م ط ر

الْقِمَاطِرُ - اس لکڑی کی بیڑی کو کہتے ہیں جو مجرموں کے پاؤں میں ڈال دی جاتی تھی تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں\*\*\*۔ اس سے انہیں چلنے پھرنے میں سخت اذیت پہنچتی تھی۔ پھر اس سے یہ لفظ نکلیف، پریشانی، سختی اور اذیت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ سختی کی وجہ سے آنکھوں اور ابروؤں پر جو شکنیں پڑ جاتی ہیں، انہیں بھی قِمَاطِرِ بَرٍّ کہتے ہیں۔ اِقْمَاطِرَ الْيَوْمِ - دن سخت ہو گیا، شَرَّ مَقْمَاطِرٍ کے معنی ہیں، شدید شر\*\*\*۔

قرآن کریم میں ظہور نتائج کے دن کو يَوْمًا عَمَبُوسًا قِمَاطِرِ بَرٍّ (۹۱/۶) کہا گیا ہے۔ بڑی سختی اور پریشانی کا زمانہ۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی بنیادی معنی دیے ہیں۔

## ق م ع

الْمَقْمَعَةُ - لوہے کا گرز۔ یا آنکس جس سے ہاتھی کو مارا جاتا ہے۔ اس کی جمع مَقَامِعٌ آتی ہے\*\*\*۔ قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ وَلَهُمْ مَقَامِعٌ مِّنْ حَدِيدٍ (۲۴/۲۴)۔ ان کے لئے لوہے (حدید) کے گرز ہونگے۔ یہ وہی حدید (فولاد) ہے جسے اللہ نے نظام عدل قائم رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ (۲۴/۲۴)۔ یعنی قانون اور اس کے ساتھ تنفیذی قوت۔ مَعَهُ قَمْعًا - وہ اس پر غالب آگیا اور اس نے اسے ذلیل کر دیا۔ قَمَعَ فُلَانًا - اس نے فلان آدمی کو اس کے ارادہ سے روک دیا۔ اَلْمَقْمُوعُ - ذلیل۔ مردود مقہور\*\*\*۔ لہذا مَقَامِعٌ (۲۴/۲۴) اس قوت کا نام ہے جس سے کسی سرکش کو

\* محیط - \*\* راغب - \*\*\* تاج و محیط و راغب -

اس کی سرکشی سے روک دیا جائے۔ مستبد اور ظالم کو مغلوب کر کے اسے بے بس بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کسی کو ذلیل اور مغلوب کرنا اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔

## ق م ل

الْقَمَلُ "جوں۔ الْقَمَلُ (قَمَلٌ)۔ چھوٹی چھوٹی چوٹیسیاں۔ چھڑی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ایک کیڑا ہے جو فصل میں لگ جاتا ہے اور اسے بالکل خراب کر دیتا ہے \*۔ کشاف میں اس کے معنی پستو اور گھٹن بھی دئے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ چھوٹی مکھیاں ہوتی ہیں \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ سے چند الفاظ آتے ہیں جو حقارت اور ذلت پر دلالت کرتے ہیں۔

## ق ن ت

قَنَتَ کے معنی ہیں کھڑا ہونا اور بات کرنے سے رک جانا۔ چنانچہ زجاج نے کہا ہے کہ قَنَائِمٌ "بیامسر اللہ کو قَنَائِتٌ" کہتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا۔ احکام خداوندی کو لیکر کھڑا ہو جانے والا \*۔ اور سِقَاءٌ قَنِيئَةٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اس طرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو \*۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو الْقَنُوتُ کہتے ہیں \*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ الْقَنُوتُ سے مراد ہوتا ہے کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا \*\*\*۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کُلٌّ لَّہُ قَنَائِتُونَ (۱۱۶)۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتی اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرتی ہے۔ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ تمام کی تمام نظام کائنات کو قائم رکھنے کے لئے کھڑی ہیں۔ یہی خصوصیت مومن مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہے۔ الْقَنَائِتِينَ وَالْقَنَائِتَاتِ (۳۳/۳۵)۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ کَانَ اُمَّةً قَنَائِتِیْلَہُ (۱۲۷)۔ وہ ایک فرد نہیں تھا بلکہ اس کی ذات میں پوری کی پوری امت سمویٰ ہوئی تھی۔



ایسی امت جو دعوت خداوندی کو لیکر کھڑی ہو اور اپنی تمام قوتوں کو اسی مصرف میں لانے کے لئے روکے ہوئے ہو۔ کامل اطاعت گذار اور فرمان پذیر امت۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی اطاعت کے دئے ہیں۔ اس مضمون کے لئے دیکھئے تتمہ میں مادہ "ام"۔

## ق ن ط

الْقَنَاطُ - روکنا۔ قَنَاطٌ مَاءٌ عَنَقًا - اس نے ہم سے ہانی روک لیا۔ اسی سے الْقَنَاطُ طے کے معنی ہیں بھلائی سے ناامید ہو جانا۔ قَنَاطٌ يَقْنُطُ - (نیز قَنَاطٌ يَقْنُطُ - اور قَنَاطٌ يَقْنُطُ) سخت مایوس ہو جانا۔ قَانِيطٌ - مایوس ہو جانے والا \*۔ (۵۶:۵۵)۔

سورۃ "حم" سجدہ میں بِمُرْسٍ قَنَاطٌ (۳۹) اکھٹا آیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے قُلْ يٰٓعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفْتُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ - اِنَّ اللّٰهَ بِغَفِیْرِ الذَّنُوْبِ جَمِیْعًا - اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الْرَحِیْمُ (۵۶)۔ (اے رسول) میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہہ دو کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ (کا یہ قانون کہ حسنات، سیئات کو بھالے جاتی ہیں) تمہاری تمام لغزشوں کے تخریبی اثرات سے تمہاری حفاظت کریگا۔ یقیناً وہ حفاظت اور رحمت کا مالک ہے۔ مسلمانوں نے اس آیت کو گناہوں کے لئے لائسنس سمجھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کرو اور خوب گناہ کرو۔ خدا کی رحمت ان سب کو معاف کر دیگی۔ جو شخص گناہ کر کے سمجھتا ہے کہ خدا اسے معاف نہیں کریگا وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ تصور قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم اور دین کی اساس و بنیاد (یعنی قانون مکافات عمل) کے جس قدر خلاف ہے اسکی تشریح کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت (۳۹) میں عیسائیت کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اسکی رو سے ہر انسانی بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ مٹ ہی نہیں سکتا۔ اسکی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان رکھے۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جو گناہ ایک دفعہ سرزد ہو جائے، کوئی عمل اس کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے انسان کو تناسخ کے چکر میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف نے (گوسالہ ہرستی کا) جو گناہ کیا تھا اس کی

ہاداش میں انہیں کچھ دنوں کے لئے جہنم میں رہنا ہوگا۔ قرآن کریم نے پہلے تو اس غلط عقیدہ کی تردید کی کہ انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ۔ یا سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر انسان سے کبھی لغزش ہو جائے تو اس سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے باز آفرینی کے مواقع ماری عمر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جو خدا کی رحمت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے اسے کبھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر رحمت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کے دروازے کھلتے کس طرح ہیں؟ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دوسری جگہ دیدیا ہے کہ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا مِّنْ رَّحْمَتِهِ رَبِّهِ ۚ إِلَّا الضَّالُّونَ (۱۵۹)۔ رحمت کے دروازے ان پر بند رہتے ہیں جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں۔ لہذا اسکی رحمت کا مستحق وہ ہوگا جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا۔ اس کے سوا رحمت خداوندی سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ جتنی اور صورتیں ہم نے اپنے ذہن سے تراش رکھی ہیں وہ فریب نفس کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۵) برائیوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے بھلائی کے کام کرو۔ بھلائیوں کا زندگی بخش نتیجہ، لغزشوں کے تخریبی اثر کو زائل کر دے گا۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ ح۔ م دیکھئے)۔

سورہ روم میں قَنِيطٌ۔ قَرِحٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۳)۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ يَتَّسُّ عُمُومِيٌّ مَعْنُوٌّ مِّنْ اَتَا هِ اور قَنِيطٌ خصوصيٌّ مَعْنُوٌّ مِّنْ۔ یعنی یہ، یاس سے زیادہ خصوصیت رکھتا ہے۔

## ق ن ط ر

اَلْقَنْطَرَةُ۔ پُل یا بلند عمارت۔ قَنْطَرَةٌ عَلَيْنَا۔ وہ ہمارے پاس طویل عرصہ تک جم کر مقیم رہا\*۔ لہذا اس لفظ میں کثرت کا تصور نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے راغب نے لکھا ہے کہ اَلْقَنْطَرَةُ مِّنَ اَلْمَالِ۔ مال کی اس مقدار غیر متعین کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے کافی ہو\*\*۔ (اسکی جمع اَلْقَنْطَارِيُّ آتی ہے)۔ اَلْقَنْطَارِيُّ اَلْمَقَنْطَرَةُ۔ (۳۳) وہ مال جو قنطار قنطار کر کے جمع کیا گیا ہو\*\*\*۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے\*\*\*۔ یعنی بہت زیادہ۔

اس آیت (۳۱) میں باقی چیزوں کے علاوہ ، سال و دولت کو انسان کے لئے وجہ جاذبیت بتایا گیا ہے ۔ قرآن کریم ، دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا ۔ وہ ہر فرد سے کہتا ہے کہ وہ اکتساب دولت میں ہوری کوشش کرے ۔ لیکن اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنی ذات کے لئے مجبوس نہ کر لے ۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے اور باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا چھوڑ دے ۔ چنانچہ اسی آیت کے تسلسل میں (۳۲) مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ الْمُتَنَفِّیُّنَ ہوتے ہیں ۔ یعنی اپنی دولت کو کھلا رکھنے والے ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے سونے چاندی کے ڈھیر (۳۳) کا مقصد ۔ یعنی اسے نوع انسان کی پرورش کے لئے عام رکھا جائے ۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے (۳۴) ۔ یعنی اس طرح سے (Hoard) کی ہوئی دولت ، جہنم کی آگ بن جاتی ہے ۔

## ق ن ع

قِنَاعٌ \* ۔ اس اوڑھنی کو کہتے ہیں جس سے ہورتیں اپنا سر ڈھانپتی ہیں \* ۔ راغب نے کہا ہے کہ جس چیز سے سر ڈھانکا جائے وہ قِنَاعٌ ہے ۔ اس سے قَنَعٌ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنے فقر کو چھپانے کے لئے سر پر کچھ اوڑھ لیا \* \* ۔ لہذا قَنَاعٌ وہ شخص ہوگا جو اپنی احتیاج کو دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دے ۔ اور الْقِنَاعَةُ اخفائے حاجت کا نام ہوگا ۔ اس کے ساتھ ہی راغب نے لکھا ہے کہ قَنَعٌ کے معنی ہیں اس نے اپنی اوڑھنی کو اٹھا دیا اور اپنا سر کھول دیا ۔ یعنی اپنی احتیاج کو لوگوں پر ظاہر کر دیا \* ۔ لیکن قَنُوعٌ \* اسے بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنے حصے پر راضی رہے اور تھوڑی سی بخشش پر خوش ہو جائے \* ۔ چنانچہ الْقَنَاعِیُّ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے ساتھ رہے ، اس کا بچا کھچا کھا کر گزارہ کرے ، اور اس سے زیادہ کچھ نہ مانگے ۔ اس سے قَنَاعَةُ کے معنی تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہونگے \* ۔ قَنَاعٌ اس سائل کو بھی کہتے ہیں جو باصرار نہ مانگے اور جو کچھ مل جائے اس پر راضی ہو جائے \* \* (۲۲) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنی ضرورت کے لئے کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ہیں ۔ سر سے کپڑا اٹھانے کی جہت سے سر کو اٹھا کر چلنے کو بھی قِنَاعٌ کہتے ہیں ۔ چنانچہ الْقَنَعُ رَأْسُهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے سر کو اونچا کیا ۔ لیکن یہ اضداد میں سے بھی ہے ۔ یعنی اس کے معنی نیچا کرنا بھی ہیں ۔

اَفْتَنَعْتُ\* اَلَا نَتَاءَ رَفِی الشَّهْرِ کے معنی ہیں میں نے اپنے برتن کے منہ کو ندی کے بہاؤ کی طرف کر کے رکھ دیا (ٹیڑھا کر دیا) تاکہ اس میں پانی بھر جائے۔ اس اعتبار سے کسی کی طرف مسائل ہونے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَنِيعَتِ اَلْاِبِلُ کے معنی ہیں اونٹ اپنی چیراگاہ، یا باڑے کی طرف مائل ہو گئے\*۔

سورة ابراہیم میں قرآن کریم نے اس بد حواسی کا نقشہ کھینچا ہے جو جنگ میں شکست خوردہ قوم پر چھا جاتی ہے اور اس سے اس میں افرا تفری پھیل جاتی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ مَهْطِعِیْنَ مَقْنِیْعِیْ رَوْسِیْهِمْ (۱۴۱)۔ مَهْطِعِیْنَ کے معنی ہیں بد حواس بھاگے جانا (دیکھتے ۵۔ ط۔ ع)۔ مَقْنِیْعِیْ رَوْسِیْهِمْ کے معنی بعض نے کئے ہیں سر اٹھا کر بھاگے جانا۔

## ق ن و

اَلْقِنُوءَ\*۔ اَلْقُنُوءَ\*۔ کمانی۔ قَنُوءُتْہ۔ میں نے اسے کما دیا، حاصل کیا اور اپنے لئے جمع کیا۔ اَقْنِیْءَ اَلْمَالِ۔ مال حاصل کرنا اور جمع کرنا۔ اَلْقَنَآةُ\*۔ ڈنڈا۔ قَنَآءُ اَلْحَمَاطِطِ۔ دیوار کی وہ جانب جس پر سایہ آجاتا ہو۔ نِز قَنَآةُ اُس کظیمہ (نالی) کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے\*\*۔ اَلْقِنُوءُ و اَلْقُنُوءُ۔ خوشہ (کھجور کا)۔ جمع اَلْقِنُوءَانُ و اَلْقُنُوءَانُ\*۔ قرآن کریم میں قِنُوءَانُ دَانِیَّةُ (۱۳۱) قریب جھکے ہوئے خوشوں کے لئے آیا ہے۔

## ق ن ی

اَلْقِنِیَّةُ\*۔ اَلْقُنِیَّةُ\*۔ جو کچھ آدمی کما کر حاصل کرے۔ نِز جمع کیا ہوا مال۔ قَنَی اَلْمَالِ یَقْنِی\*۔ وہ مال کماتا ہے۔ اَقْنِیْہَ اللہ۔ خدا نے اسے وہ چیزیں دیدیں جن کے حاصل ہو جانے کے بعد اسے سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا۔ ان سے اس کی فوری ضروریات بھی پوری ہو گئیں اور وہ انہیں جمع کر کے بھی رکھ سکا۔ اَرْضُ مَقْنَآةُ\* اس زمین کو کہتے ہیں جو اترنے والے کے لئے بالکل موافق ہو جائے۔ جس میں اُسے سب کچھ مل جائے اور اس طرح وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اسی اعتبار سے اَقْنِی کے معنی راضی کرنے کے بھی آتے ہیں\*\*۔

قرآن کریم میں ہے - وَ اَنْتَ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی (۵۳/۳۸) - خدا ہی غنی کرتا ہے اور وہ کچھ دیتا ہے جس سے انسان کو سکون اور اطمینان حاصل ہو جائے اور اس طرح وہ راضی ہو جائے -

## ق ۵ ر

اَلْقَاهِرَةُ - ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں ، جیسے ہنسی اور سینہ وغیرہ - اسی سے اس کے معنی بلندی کے آتے ہیں - جیسے جِبَالٌ قَوَّاهِرٌ - بلند پہاڑ - اور غلبہ کے معنی بھی - اَلْقَهْرُ - کسی کو مغلوب کرنے کے لئے اوپر سے ہکڑ لینا - لہذا اس کے معنی تسلط - اقتدار - غلبہ - گرفت کے ہیں - قَهْرٌ - وہ اس پر غالب آگیا - نیز اس کے معنی تابع کرنے کے بھی آتے ہیں - لِحْمٌ مَّقْهُورٌ - وہ گوشت جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے اور اس میں سے ہنوز ہانی رس رہا ہو\* -

قرآن کریم میں خدا کی ایک صفت اَلْقَهَّارُ بھی آتی ہے - (۱۲/۱۲۹) - جِبَّارٌ کے معنی پہلے لکھے جا چکے ہیں (عنوان ج - ب - ر) - یعنی جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قانون کے شکنجے میں کسکر جوڑ دے - اور اَلْقَهَّارُ کے معنی ہونگے وہ جس کا قانون سب پر غالب ہو - جسے کوئی شکست نہ دے سکے - جسے کوئی مغلوب نہ کرسکے - سورۃ انعام میں ہے - وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ (۱۸/۲۸) - وہ اپنے بندوں پر غالب ہے - یہ قہارت خدا کے تو شایان شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ و اقتدار ہے - لیکن جب کوئی انسان اس قہارت کا دعویٰ کرے تو اس کا نام قرعونیت ہوتا ہے - چنانچہ قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ (۱۲۰/۱۲۰) - ”اور ہم ان (بنی اسرائیل) پر غالب ہیں“ - یہ خالص استبداد ہے جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے جب کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمُ فَلاَ تَقْهَرْ (۹۳/۹۳) - جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے ، اسے بے یار و مددگار سمجھ کر اس پر سختی نہ کرو - نہ ہی اسے ذلیل سمجھو - یتیموں پر سختی نہ کرو - اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اشیائے کائنات کو اپنے تابع تسخیر کرنا تو بالکل ٹھیک ہے - لیکن کسی انسان کا دوسرے انسان پر استبداد کرنا یا اسے ذلیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے - مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے - ان معنوں میں یہ صفت جماعت مومنین کے لئے محمود صفت ہوگی اور صفت خداوندی کا عکس - یاد رکھئے - قوت فی ذاتہ شر نہیں ہے -

(خدا کی کوئی صفت بھی، معاذ اللہ، شر نہیں)۔ اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اسے کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرو تو وہ شر ہے۔ اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کرو تو عین خیر۔ خدا چونکہ خیر ہی خیر ہے، اس لئے اس کی ہر قوت، حسن اور تعمیر کے لئے ہوتی ہے۔ یہی صورت جماعت مومنین کی ہوتی ہے۔

## ق و ب

قَابٌ \*۔ کمان کے درمیانی حصے (دستے) اور ایک کنارے کا درمیانی فاصلہ۔ نیز مقدار \*۔

قرآن کریم میں مقام نبوت کے متعلق ہے۔ فَكَانَ قَبَابٌ قَبَابٌ سَيِّئِينَ۔ اَوْ اَدْنٰی۔ (۵۳) ایام جاہلیت میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے سے محکم عہد باندھتے تو وہ دو کمانیں لیتے۔ ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے اور اس طرح ان دونوں کا قَابٌ ایک کمر دیتے۔ پھر ان دونوں کمانوں کو اکٹھا کھینچ کر ایک تیر چلائے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے۔ جو ایک چاہتا ہے وہی دوسرا چاہتا ہے۔ ہم دونوں ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں \*\*۔ قرآن کریم نے نبی کے متعلق بتایا کہ وہ احکام اللہ کا اس قدر متبع ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو قوانین خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اس کا اور خدا کا تعلق گویا ان ساتھیوں کا سا تعلق ہو جاتا ہے جنہوں نے قَابٌ قَبَابٌ سَيِّئِينَ والا عہد کیا ہو۔ اَوْ اَدْنٰی۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب تر تعلق۔ یہی وجہ ہے کہ حق کا استحکام جو نبی کی قوت بازو سے ہوتا ہے اسے خود خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ فَلَمَّ تَفْتَلَتْوْهُمْ وَلَئِنَّ اللَّهَ فَتَلَهِمْ \*۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلَئِنَّ اللَّهَ رَمٰی (۱۰۰)۔ بدر کے میدان میں مخالفین حق کو تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا تھا۔ تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے، اللہ نے چلائے تھے۔ نبی اور خدا کا تعلق اسی قسم کی رفاقت اور ہم آہنگی کا تعلق ہے۔ غالب کے الفاظ میں۔

تیر قضا ہر آئینہ در تر کش حق است

ایسا کشادہ آں ز کمان محمدؐ است

یہ مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ اور نبی پھر اس مقصد کے لئے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کرتا ہے۔ اس طرح انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام

اس جماعت کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے وجود میں آتی ہے۔ حق کا عہد انہی کے ہاتھوں سے بلند ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو وحی خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے فیصلے اور عمل دنیا میں خیر و شر کا معیار بن جاتے ہیں، اور ان کی ”تیر اندازی“ خود خدا کی تیر افگنی ہو جاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق، جو حضورؐ نے اپنی حیات ارضی کے آخری سالوں میں فرمایا تھا، خدا رفیقِ اعلیٰ ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے۔ خدا کے ساتھ اسی عہد کا نام ایمان، اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ”خدا کا قرب اور رضا جونی“ ہے۔ یعنی خدا کے پروگرام سے ہم آہنگ ہو جانا۔

## ق و ت

الْقَوْتُ (جمع آتَوَات) - اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے\*۔ قرآن کریم میں ارض کے متعلق ہے۔ وَ قَدْ رَفِیْہَا آتَوَاتِہَا (۲۱)۔ اس میں خوراک پیدا کرنے کے پیمانے مقرر کر دئے۔ ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے وہ مختلف موسموں میں خوراک پیدا کرتی چلی جائے۔

الْمُقِیَّتْ - محافظ - نگران۔ وہ جو ہر شخص کو اس کی روزی یا ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے۔ وہ جو مخلوقات کو ان کا رزق دیتا ہے\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو کسی چیز کی نگرانی و حفاظت کرے اور اس کی خوراک کا بند و بست کرے\*\*۔ قرآن کریم میں ہے وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیَّتًا (۸۵)۔ اس کے معنی ہوں گے کائنات کی ہر شے کو اسبابِ زیست بہم پہنچانے والا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی محافظ اور قادر کے بھی ہیں۔

## ق و س

الْقَوُسُ - کمان\*\*\*۔ اَن کریم میں قَابَ قَوْسَیْنِ (۹۳) آیا ہے۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوانِ رن - و - ب) دیکھئے۔

قَاسَ الشَّیْءَ بِغَیْرِہ - کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے اندازہ کرنا\* (نیز ابن فارس)۔ رَیَا اِس قَاسَ یَقْوُسُ کَسَوْ قَاسَ یَقِیْسُ ہر قیاس کر لیا

\* تاج - \* راغب - \*\*\* تاج و راغب

جائے گا۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ اَلْمِقْوَسُ\*۔ وہ جگہ جہاں سے گھوڑے گھوڑ دوڑ کے لئے چھوٹتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ وہاں ایک رسی کمان کی شکل کی باندھ دی جاتی ہے اور اس رسی کے پیچھے سے گھوڑوں کو چھوڑا جاتا ہے\*۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق۔ و۔ س) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے۔ قَتَوَس\* (کمان) میں سختی بھی پائی جاتی ہے اور اس کے دونوں سروں کے ملے ہوئے ہونے کے اعتبار سے اجتماعیت بھی\*\*۔

## ق و ل

قَوْل\*۔ زبان سے کچھ کہنا، خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ ہو۔ جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قَوْل\* کہتے ہیں۔ نیز عقیدے، خیال اور رائے کو بھی۔ جیسے قُلَانٌ\* یَقُولُ\* بِقَوْلِ الشَّافِعِيِّ\* وغیرہ\*\*\*۔

اس کے مجازی معنی بہت سے آتے ہیں۔ مثلاً مارنا۔ غالب آنا۔ مرجانا۔ راحت پانا۔ متوجہ ہونا۔ وغیرہ\*\*\*۔

تَقْوَالْ عَلَیْہِمْ قَوْلًا\* کے معنی ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا (۱۹)۔

دل میں خیال کرنے کے لئے قرآن کریم میں ہے وَ یَقُولُوْنَ رِیْ\* اَنْفُسِہِمْ\* (۹۸)۔ قَوْل\* کی جمع اقْوَال\* اور اس کی جمع اقَاوِرِل\* ہے (۱۹)۔ قِیْل\*۔ کہنا۔ بات چیت۔ دل کی ہکار (۳۳)۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق۔ و۔ ل) کا خاصہ حرکت کرنا اور پھڑپھڑانا ہے۔ قَوْل\* میں زبان یا ہونٹوں کی حرکت موجود ہوتی ہے\*\*۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ اس کے ابتدائی اور حقیقی معنی ہیں۔ مجازی طور پر تو دل کے عقیدہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ مادہ بے شمار مقایسات میں آیا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کا مفہوم آسانی سے متعین ہو جائے گا۔ اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔



## ق و م

قَامَ - قِيَامًا - کھڑا ہونا - متوازن ہونا - کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا - محکم اور استوار ہونا - ثابت اور دائم رہنا - کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا - رک جانا - کسی جگہ ٹھہر جانا - بارونق ہونا\* - اَقَامَ - درست اور سیدھا کیا - کھڑا کیا\* -

قَامَ الرَّجُلُ الْمَرَاةَ وَقَامَ عَلَيَّهَا - مرد نے عورت کی کفالت کی ، اسکی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا - اس کے لئے رسد لایا - قَوَّامٌ - سامان رزق مہیا کرنے والا ، کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے\* - اَلشَّرَّ جَالٌ قَوَّامٌ اَمُّونَ عَلٰى النَّسَاۃِ (پہم) کے یہی معنی ہیں - یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے - اس کے معنی حاکم یا داروغہ نہیں ہیں - نیز قَوَّامُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا\* -

قَوَّامٌ - عدل و توازن - وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے - اتنا کچھ جس سے صرف ضروریات زندگی پوری ہو سکیں - قِوَامٌ - وہ چیز جس پر کسی معاملہ کا دارو مدار ہو - وہ جس کے سہارے کوئی معاملہ کھڑا رہ سکے - اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے - چنانچہ قُلَانٌ قِوَامٌ اَهْلٍ بَيْتِهِ کے معنی ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہے\* -

قَامَتِ - آدمی کا قد - قد کا متوازن طول - حسن قامت\* - قِيَمَتِ - کسی چیز کا بدل\* - جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی جائے اور وہ اس کے برابر تصور کر لی جائے ، تو وہ اسکی قِيَمَتِ ہو جائیگی - اِسْتَقَامَ اَلْاَمْرُ - کسی معاملہ کا معتدل و متوازن ہو جانا\* - مُسْتَقِيْمٌ - معتدل و متوازن - ٹھیک ٹھیک توازن و تناسب لئے ہوئے\* - تَقْوِيْمٌ - عدل و توازن برقرار کرنا\* - ( تَقْوِيْمُ اَلْبُلْدَانِ - جغرافیہ کے نقشہ کو کہتے ہیں - اور اَجَلُ تَقْوِيْمٍ کا لفظ کیلنڈر ، جنتری ، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)\*\* - مَقَامٌ - کھڑے ہونے کی جگہ\* - قِيَامٌ - وقایہ نام - اپنی مخلوق کے معاملات کی اس طرح تدبیر کرنے والا کہ انکی پیدائش ، اور روزی بہم پہنچانے کا بندوبست کرے اور ان کے رہنے کے مقامات کا علم رکھے - جو ہر چیز

ہر نگران ہو۔ نیز قِیَاسُوم کے معنی قائم بالذات بھی ہیں۔ یعنی جو اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو، لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جاسکے۔ (۲۵۵: ۱۱۱) \*\*\*۔ اَمْرٌ قَیِّمٌ کے معنی ہیں مستقیم و مستوی امر۔ معتدل و متوازن کام \*۔ خُلِقَ قَیِّمٌ \*۔ متوازن اخلاق۔ دَرِیْنٌ قَیِّمٌ \*۔ ایسا دین جس میں ہر شے متوازن و متناسب ہو۔ کُتِبَ قَیِّمَةٌ \*۔ وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں \*۔ قَوْمٌ \*۔ مردوں اور عورتوں کی جماعت۔ یا صرف مردوں کی جماعت جس میں عورتیں نہ ہوں \*۔

مفردات امام راغب میں ہے کہ قِیَاسٌ لِلشَّیْءِ سے کسی چیز کی رعایت اور حفاظت مقصود ہوتی ہے اور کبھی قِیَاسٌ عَزْمٌ اور پختہ ارادے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور قِیَاسٌ اور قِیَاسٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز مضبوط اور مستحکم رہ سکے۔ قِیَاسُوم \*۔ ہر چیز کا نگران۔ نیز اسے استحکام و توازن بخشنے، حفاظت کرنے اور وہ تمام چیزیں مہیا کرنے والا جو اس کی بقا و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔

قِیَاسَةٌ کا اصلی مفہوم ہے انسان کا یکبارگی اٹھ کھڑے ہونا۔ بہ لفظ قِیَاسٌ کے آخر میں ”ة“ کے اضافہ سے بنا ہے جس سے مطلب ہے یکبارگی ہونا۔ الْقِیَاسَةُ سے مراد اس خاص گھڑی کا واقع ہو جانا ہے جس میں انسان اس طرح یکبارگی کھڑا ہو جائے۔

إِقَامَةُ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا پورا پورا حق ادا کر دینا۔ نیز الْإِقَامَةُ فِي الْمَكَانِ کسی جگہ جم کر رہنے کے معنوں میں آتا ہے \*\*\*۔ اس سے مَقِیْمٌ، ہمیشہ رہنے والے کے لئے آتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی توازن قائم رکھنے کے ہیں۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئیں گے ان میں یہ بنیادی مفہوم ضرور موجود رہے گا۔ خواہ یہ توازن جسمانی ہیئت و پیکر کا ہو، یا معاشرتی اور تمدنی توازن، یا نفسیاتی توازن۔ جس چیز کا توازن بگڑ جائے وہ قائم (کھڑی) نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ قصہ حضرت موسیٰ کے ضمن میں یتیم بچوں کی دیوار کے متعلق ہے۔ جِدَّارًا یُرْبِدُ أَنْ یَنْقُضَ قِیَاسَةُ (۱۸) وہ دیوار گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے قائم (کھڑا) کر دیا۔ اسی سورہ (کہف) کے شروع میں قِیَمًا کے پہلے لَمْ یَجْعَلْ لَہُ عِوَجًا (۱۸) سے واضح کر دیا کہ قِیَمٌ وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ اسی سے دَرِیْنٌ الْقِیَمَتِ (۹۸) اور کُتِبَ قِیَمَةٌ (۱۸) کے معنی واضح ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے کہ وہ ایسی راہ بتاتا ہے جو

آثَمٌ (۱۶) ہے۔ یعنی سب سے زیادہ سیدھی اور معتدل۔ اور انسان کے متعلق ہے کہ اسے أَحْسَنُ تَقْوَرِہِمِ (۱۷) میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی بہترین توازن کا حامل۔ الْقِسْطَاسِ السُّنْتَقِیْمِ (۱۸) ”سیدھی ترازو“ سے مُسْتَقِیْمٌ کے معنی واضح ہیں۔ یعنی سیدھی راہ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسقدر متوازن کہ ذرا سی افراط و تفریط بھی اس کا توازن بگاڑ دے۔ جس طرح سورہ فرقان میں افراط و تفریط کی دو راہوں کے درمیان، اعتدال کی روش کو کَانَ بَیْنَ ذَٰلِکَ قَوَامًا (۱۹) کہا گیا ہے۔

سورہ بقرہ میں مَشْنٰی کے مقابلہ میں قَامَ لَا کَر (۲۰) بنا دیا ہے کہ اس کے معنی رک جانے اور ٹھہر جانے کے ہیں۔ نِزَاطَعِنِ (کوچ) کے مقابلہ میں اِقَامَۃ سے اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے (۲۱)۔ اسی طرح سورہ ہود میں اجڑی ہوئی بستیوں (حَصِیْرٌ) کے مقابلہ میں قَنَائِمٌ (۲۲) لا کر بہ واضح کر دیا ہے کہ اس کے معنی آباد اور ہر رونق کے ہیں۔ نِزَاطَعِنِ مُقِیْمٌ (۲۳) کے معنی بھی بارونق اور چلتے ہوئے راستے کے ہیں۔ سورہ تکویر میں لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ (۲۴) سے صِرَاطٌ مُسْتَقِیْمٌ (۲۵) ہر چلنے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

قیامۃ کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ہے جن کا مفہوم بڑا جامع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، (اسلام راغب کے قول کے مطابق) اس کا مفہوم ہے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔ اس دنیا میں قیامۃ کسی قوم کی وہ نشاۃ ثانیہ (حیات جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ہو۔ اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ہے ہی ایک انقلابی ظہور۔ قیامت، آخرت، مسامت، بعث، وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آ جاتا ہے۔ ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃ ثانیہ ہیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام۔ [شاہ ولی اللہؒ - حجة الله البالغہ - کتاب الفیتن میں لکھتے ہیں کہ ”زبان شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک ملک شام میں لوگوں کا جمع ہونا۔ قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اسوقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (جنگ) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد اکٹھا

\* غالباً مغلوں کے شام پر حملہ کی طرف اشارہ ہے جو تیمور کی زہر سر کردگی ہوا تھا۔ خود شاہ صاحب نے اس کا ذکر چند مطور آگے چل کر کیا ہے۔

ہونا“۔ [اسی طرح قیامت کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور موت کے بعد کے قیام کے لئے بولا جائیگا۔

قوم - قومیت - جب انسان نے انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر تمدنی اور اجتماعی زندگی شروع کی تو اس کا آغاز لامحالہ خاندان اور قبیلہ سے ہونا تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (اور خاندان سے آگے بڑھ کر ایک قبیلہ) کے افراد ایک وحدت قرار پا گئے جن میں وجہ جامعیت خون کا رشتہ (یا نسبی تعلق) تھا۔ جب مختلف گروہوں میں باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا۔ اس طرح ایک قبیلہ کے افراد میں باہمی عصبيت اور دوسرے قبیلہ کے افراد کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ اور یوں انسانی وحدت (مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر) پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے قومیت یا نیشنلزم کہتے ہیں، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس میں صرف اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ بعض ممالک میں (ایک نسل کے بجائے) ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والے افراد کو ایک قوم قرار دیدیا جاتا ہے۔

اسلام نے انسانوں کی تقسیم کا یہ اصول بدل دیا اور کہہ دیا کہ ایک نظریہ زندگی کے مانتے والے انسان (بلا لحاظ نسل - زبان - وطن) ایک برادری کے افراد ہیں اور اس کے برعکس نظریہ کے قائل، دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ایمان اور کفر کی تفریق، اور دور حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی تمیز کہتے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآنی ضابطہ حیات کو صحیح مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے خلاف کسی اور مسلک حیات کے قائل ہیں (۱۳)۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ خود تیرا بیٹا بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں (۱۴) کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، تو وہ اسی اصول کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب حضرت لوطؑ سے کہا تھا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں کیونکہ وہ ان کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی، تو وہ بھی اسی اصول کی بنا پر تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم سے کہہ دیا تھا کہ تم میرے اپنے نہیں ہو سکتے جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ، تو وہ بھی اسی حقیقت کا اظہار تھا (۱۵)۔ اس کے برعکس انہوں نے اس اصل عظیم کا اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں جو میرا اتباع کرتے ہیں (۱۶)۔ اسی معیار کے مطابق، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جب کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ (۱۷) ”سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں“ خواہ ان کا رنگ، نسل، زبان، وطن، کوئی بھی ہو۔

یہ ہے صحیح قومیت کا معیار جس کی رو سے قرآن کریم ، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے ۔ اب دنیا ، قومیت کے غلط اصول سے تنگ آکر خود اس حقیقت کی معترف ہو رہی ہے کہ انسانوں کے لئے صحیح وجہ جامعیت ہم آہنگی فکر و نظر ( آئیڈیالوجی کی یکسانیت ) ہے ، نہ کہ اشتراک رنگ و وطن ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا قرآنی اصول زندگی کو اختیار نہیں کرتی عالم انسانیت میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا ۔ اسی سے وہ عالمگیر برادری وجود میں آسکتی ہے جو انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر، وحدت انسانیت کے اصول کی حامل ہوگی ۔ یہی قرآنی معاشرہ کا مقصود و منتهی ہے ۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے مسلک اور روش زندگی کو ”صراط مستقیم“ سے تعبیر کیا ہے (۱) ۔ یعنی سیدھی اور توازن بدوش راہ ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے ۔ قرآن کریم سے پہلے ، ارباب فکر اور اہل مذاہب ، زندگی کی حرکت کو ”دوری“ (Cyclic) تسلیم کرتے تھے ۔ حکمائے یونان نے جب دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصود فطرت ”دائرہ“ ہے ، سیدھا چلنا نہیں ۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دوری ہے ۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے ، آگے نہیں بڑھ رہی ۔ اسی سے فیثا غورث نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا ۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح ، جوں بدل بدل کر ، بار بار اس دنیا میں ، مختلف قالبوں میں آتی ہے ۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جانا ، مقصود حیات ہے ۔ یہی تصور ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے ۔ یعنی انسانی روح درحقیقت خدا کی روح (ہم آتما) کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر ، زندگی کے چکر میں پھنس چکی ہے ۔ اس کا ان چمکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے ”کل سے جدا ملنا“ مقصود زندگی ہے ۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی سے ”وحدت الوجود“ کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے جو ہمارے تصوف کی بنیاد ہے ۔ یہی ”چکر“ عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کا گناہ ، پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے ۔ اگر وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ اس سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے ۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لئے (گوسالہ پرستی کی) غلطی ہو گئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑے گا ۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہی اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے جو وہ پہلے تھی۔ یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں۔ (As you were) ہو جانا مقصود حیات ہے۔ دوری حرکت (Cyclic Movement) سے بھی مراد ہے۔ یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا۔

قرآن کریم نے ارباب فکر اور اہل مذاہب کے اس غلط نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کولہو کے بیل کی طرح، ایک دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں۔ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے۔ خدا، کائنات کو صراط مستقیم پر لئے جا رہا ہے۔ اِنْ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱)۔ اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یَزِدُّ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَاءُ (۳۵)۔ اور انسان کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کی ممکنات (Possibilities) ودیعت کر دی گئی ہیں اور جدوجہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے۔ جو شخص، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، اس کی ممکنات، مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھتا جائیگا۔ اس طرح اس کا سفر، ایک دائرے میں نہیں، بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا۔ اس سے اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائیگا۔ لَتَرْکَبْنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ (۶۲) ”تم ضرور منزل بہ منزل۔ درجہ بہ درجہ۔ بلند ہوتے چلے جاؤ گے“۔ اس لئے، خدا صرف صراط مستقیم (میدھی اور توازن بدوش) راہ ہی کا مالک نہیں۔ وہ ذی السَّعَادَاتِ (۱۰۸) بھی ہے۔ یعنی ”سیڑھیوں والا“۔ بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، زندگی کا منتہی (As you were) ہو جانا نہیں۔ بلکہ ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء کارفرما ہے۔

زندگی کی دوری حرکت کا تصور، عہد کہن کے انسانی ذہن ہی کا مغالطہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں بھی جہاں انسانی فکر نے وحی سے روشنی نہیں لی، وہ اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیشے کا ”تکرار ازل“ (Eternal Recurrence) کا نظریہ اسی مغالطہ کا رہین منت ہے۔ ہیگل کا نظریہ تضاد بھی اسی کا مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر جب یہ دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس

کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ تصورات (Ideas) کا یہی چکر ہے جو کائنات میں کارفرما ہے۔ ہیگل (Hegel) کے متبع مارکس (Marx) نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں نہیں بلکہ نظامہائے زندگی (Social Orders) میں کارفرما ہے۔ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے نظام کے لئے پیغامِ مرگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد، نظام اشتراکیت پیدا ہو گیا۔ اب اس کی باری ہے۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریہ زندگی عطا کر سکتی ہے۔ اور وہ نظریہ زندگی ہے ”صراطِ مستقیم“ پر چلنا۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے رہ کر جامد اور متصلب (Static) ہو جانا، اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور ہموار راستے پر چلتے جانا اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جانا۔ ”حرکت اور ارتقاء“ یہ ہے قرآنی نظریہ زندگی کا ماحصل جسے اس نے ”صراطِ مستقیم“ سے تعبیر کیا ہے۔

## ق و ی

تَوْقَاتٌ۔ دراصل رسی کے ایک بٹ کو کہتے ہیں۔ (جس کی جمع التَّقْوَاتُ ہے)۔ حَبْلٌ تَقْوٍ۔ مختلف ہٹوں والی رسی۔ یہیں سے التَّقْوَةُ کے معنی قدرت کے ہیں۔ یہ ضَعْفَت کی ضد ہے، خواہ جسمانی ہو یا عقلی۔ اس کی جمع قِوٰی اور قِوٰی ہے۔ التَّقْوٰی طاقتور اور قوت والے کو کہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے ہے، اس لئے کہ کمالِ قوت اور ہر قسم کی طاقت کا وہی تنہا مالک ہے (۱۱۱/۱)۔ فَرَسٌ مَّقْوٍ۔ طاقتور گھوڑا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے ایک بنیادی معنی تو سختی، قوت اور زور کے ہیں لیکن دوسرے بنیادی معنی قلتِ خیر۔ یعنی مال و دولت اور عمدہ چیزوں کی کمی کے ہیں۔ اس اعتبار سے التَّقْوَاءُ ویران زمین کو کہتے ہیں اور التَّقْوٰی بھوک کو کہتے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔

\*تاج و محیط۔ \*\*بٹ کے معنی بھی سمجھ لئے چاہئیں۔ مثلاً تین باریک رسیوں کو ہل دھکر ایک موٹی رسی بنائی جائے۔ تو ان تین رسیوں میں سے ہر ایک کو اس موٹی رسی کا بٹ کہہ سکتے ہیں۔

أَقْوَاتِ الدَّارِ۔ گھر خالی ہو گیا۔ اس اعتبار سے چٹیل میدان کو بھی الْقَوَاءُ کہتے ہیں جو سبزی سے خالی ہو چکا ہو۔ الْقَوَائِیْتُ۔ انڈے کے خالی چھلکے کو کہتے ہیں جس سے بچہ نکل چکا ہو۔ أَلْسِنَةُ الْقَوَائِیْتُ۔ اُس سال کو کہتے ہیں جس میں بارش بہت کم ہوئی ہو۔ أَقْوَى الرَّجُلُ۔ بے آب و گیاه زمین میں اس کا توشہ ختم ہوا۔ وہ بھوکا اور ناساز ہوا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا، خواہ وہ ایسی ناداری کی حالت میں اپنے گھر اور اپنی قوم کے درمیان ہی کیوں نہ ہو\*۔

قرآن کریم نے زمین کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ وہ مَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ (۱۱۵) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ کے ان افراد کے لئے ہے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ یعنی زمین کی پیداوار انسانی پرورش کے لئے ہے نہ کہ ذاتی املاک بنا لینے کے لئے۔ صاحب محیط نے مُقْوِينَ کے معنی لکھے ہیں وہ جن کے پیٹ یا توشہ دان کھانے سے خالی ہوں\*\*۔ یا وہ لوگ جو بے برگ و گیاه میدان میں اتریں جہاں کھانے کو کچھ نہ ہو۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورت مند افراد۔ اسی کو دوسری جگہ سَوَاءٌ لِّلْیَسَآئِلِیْنَ (۱۱۶) کہا گیا ہے۔ یعنی زمین کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ قُوَّةٌ۔ کے لئے قرآن کریم میں ہے۔ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ (۱۱۷)۔ اس ضابطہ خداوندی کو نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ پختہ عزم کرو کہ اس کی تعمیل کرو گے۔ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِّیْنَ (۵۸)۔ زبر دست قوت والا۔ خدا۔ شَدِيدُ الْقُوَى (۵۳)۔

لہذا، موس بھی (حد بشریت کے اندر) صاحب قوت ہوتا ہے۔ کمزور اور ناتواں نہیں ہوتا۔ جو قوم کمزور اور ناتواں ہو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق جماعت مومنین نہیں ہے۔ لیکن ان کی قوت دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ہوگی، نہ کہ کمزوروں کو لوٹنے کھسولنے اور ناتوانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے۔ قوت جب ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کی جائے تو خیر ہوگی اور جب مظلوم کو لوٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو شر ہو جائیگی۔

## قیض

الْقَيْضُ۔ انڈے کے اوپر کا خشک اور سخت چھلکا۔ قَيْضٌ۔ کسی کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح لگا دینا کہ وہ اس کے ساتھ چپکی بھی رہے\* تاج و محیط۔ \*\* ابن قتیبہ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں (القرطبی - ج/۲ صفحہ ۱۵۵)



اور اس پر غالب بھی رہے ، جس طرح انڈے کا چھلکا اس کی زردی و سفیدی پر مستولی رہتا ہے \* - قرآن کریم میں ہے وَ قَدْ يَفْضُنَا لَهُمْ قُتْرَ نَاءٍ (۲۱/۴) - اور ہم نے ان کے لئے ان کے ساتھی لازم کمر رکھے ہیں جو ان پر مستولی رہتے ہیں -

## ق ی ع (ق و ع)

الْقَاعُ - ہموار نشیبی زمین جو وسیع ہو اور اس میں نشیب و فراز نہ ہو - نہ اس میں کنکریاں ہوں نہ پتھر اور نہ ہی اس میں درخت پیدا ہوتے ہوں - صاف چٹیل میدان جس میں ٹیلے اور پہاڑ نہ ہوں - قَاعَةُ الدَّارِ - گھر کا صحن یا میدان - صاغی نے کہا ہے کہ ق - و - ع کی ترکیب کسی جگہ میں پھیلنے پر دلالت کرتی ہے \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جگہ میں کشادگی کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۱/۴) - صاف چٹیل میدان جسکی تمام اونچ نیچ ختم ہو جائے - اس کی جمع قِيعَةٌ آتی ہے - ویسے قِيعَةٌ قَاعُ کے ہم معنی بھی ہے - سورۃ نور میں ہے - كَسْرَابٍ بِقِيعَةٍ (۲۱/۴) - چٹیل میدان میں سراب کی طرح -

## ق ی ل

قَالَ - يَقِيلُ - قَيْلًا - قَيْلُولَةً - دوپہر کو سونا - یا دوپہر کے وقت محض استراحت کے لئے لیٹنا ، خواہ اس میں سو یا نہ جائے - الْقَيْلُ - دودھ جو دوپہر کو پیا جائے - یا دوپہر میں کوئی چیز پینا - الْقَيْلُولَةُ - قیلولہ کرنے کی جگہ \*\* - (۲۵/۴) - قرآن کریم میں ہے اَوْ هُمْ فَمَانِلُونُ (۴/۴) - یا جبکہ وہ دوپہر کو آرام کر رہے ہوں -

# ک

## ک (حرف)

کت - حرف جر ہے - حسب ذیل معنوں کے لئے آتا ہے -

(۱) تشبیہ کے لئے - اُولَئِکَ کَالَاَنْعَامِ (۱۶۹) - وہ مویشیوں کی طرح ہیں - ان کی مثل - ان جیسے -

(۲) سبب یا مقصد (تعلیل) کے لئے بھی آتا ہے - وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدَاکُمْ (۱۹۸) - تم اسے یاد کرو (اس کے قوانین کو سامنے رکھو) اس لئے کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے (یہ معانی مرزا ابوالفضل نے اخفص کے حوالہ سے لکھے ہیں) - اگرچہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اسے یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے -

(۳) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مَثَلًا لِّیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ (۲۱) -

## ک (ضمیر)

کت - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مذکر حاضر کے لئے آتی ہے - ضَرَبْتُکَ - اس نے تجھے مارا -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُکَ - تیرا غلام -

قرآن کریم میں ہے اِذَا سَاَلْتِکَ عِبَادِیْ عَنِیْ (۱۸۶) - ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں“ - دوسری جگہ ہے اُسْکَیْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةِ (۴) ”تو اور تیری بیوی جنت میں رہو“ -

## ک (ضمیر)

ک - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مؤنث حاضر کے لئے استعمال ہوتا ہے - قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰکِ وَطَهَّرَکِ (۳۱) - ”اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاک کیا“ -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے۔ مثلاً لِيَذَّ نَبِيْكَ (۱۴۹)۔  
”اپنے قصور کے لئے“۔

## ک ا س

”اَلْكَاسُ“ س۔ پینے کا برتن جبکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو۔  
اگر پینے کی چیز موجود نہیں تو اسے ”كَاسٌ“ نہیں کہا جانے کا قَدْحٌ  
کہا جانے کا\*۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ خالی پیالے کو زَجَاجَةٌ  
کہا جائیگا۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ خالی پیالہ یا صرف شراب (پینے کی چیز)  
کو بھی ”كَاسٌ“ کہہ دیا جاتا ہے\*\*۔ خود تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے۔  
قرآن کریم میں ”كَاسٌ“ مِیْنِ مَتَعِيْنٍ (۳۶) آیا ہے۔ آب رواں سے بھرا ہوا  
پیالہ۔

## كَانَ - (حرف)

كَت (تشبیہ) + اَن (تاکید) سے مرکب ہے۔ اس کا استعمال اس موقع  
پر ہوتا ہے جہاں تشبیہ بہت قوی ہو۔ قَالَتْ ”كَانَ لَقَدْ“ هُوَ (۲۴)۔ اس نے  
کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے۔ گویا وہی ہے۔ کبھی اس کی تشدید (شد)  
کو دور بھی کر دیتے ہیں۔ جیسے ”كَانَ لَمْ يَدْ عُنَا“ (۱۴) گویا ہمیں ہکارا  
ہی نہ تھا۔ محیط نے لکھا ہے کہ اگر ”كَانَ“ کی خبر اسم جامد نہ ہو تو اس  
کے معنی ظن کے ہوتے ہیں۔

## كَانَ

”كَانَ يَتْنِ“۔ کتنے ہی۔ یہ زیادہ تر تعداد میں ابہام اور کثرت ظاہر کرنے  
کے لئے آتا ہے۔ وَ ”كَانَ يَتْنِ مِیْنِ نَبِیِّیْ“ (۱۴۵)۔ کتنے ہی نبی ایسے گزرے  
ہیں۔ یعنی تعداد متعین تو نہیں لیکن کم بھی نہیں۔

## ک ب ب

كَتَبَهُ بِكَتَبَ كَتَبًا۔ اس نے اسے اوندھا کر دیا۔ كَتَبَهُ  
لِوَجْهِهِ فَاَنْكَتَبَ۔ اس نے اسے منہ کے بل گرا دیا تو وہ منہ کے بل  
گر گیا۔ كَتَبَ الشَّيْءُ۔ اس نے اس چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف  
گڑھے میں پھینک دیا۔ كَتَبَ كَتَبَهُ۔ اسے الٹا اور ہچھاڑ دیا۔ اہل لغت نے

کہا ہے کہ کَتَبَ کَتَبَ میں بار بار اوندھا ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔  
یعنی جس چیز کو پھینکا جائے وہ بار بار اوندھی ہو کر نیچے کی جگہ قرار  
گیر ہو جائے\*۔ اس ”قرار گیر ہونے“ کا مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے کہ  
ابن فارس کے نزدیک اس سادہ کے بنیادی معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔  
[کَتَبَ کَتَبَ رباعی ہے اس لئے اسے الگ لکھنا چاہئے تھا لیکن چونکہ بعض  
ائمہ لغت نے اسے کتب کے تحت لکھا ہے اس لئے ہم نے بھی یہیں لکھنا  
مناسب سمجھا ہے]۔

الْمُكَيَّبُ وہ آدمی جس کا سر جھکا ہو اور اس لئے اسکی نگاہیں زمین  
کی طرف رہیں۔ اَكْتَبَ الرَّجُلُ۔ وہ منہ کے بل گر گیا۔ اَكْتَبَ الرَّجُلُ  
عَلَى عَمَلٍ۔ وہ کسی کام میں لگ گیا\*۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ فَكُتِبَ عَلَيْهَا (۹۳)۔  
انہیں اس میں اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔ (خاسر و نامراد اور ذلیل و خوار)۔  
سورہ نمل میں ہے۔ فَكُتِبَتْ لَهُمْ فِي النَّارِ۔ (۹۰) انہیں اوندھا  
کر کے داخل جہنم کر دیا گیا۔ سورہ ملک میں مَن يَمْشِي مُكِبًا عَلَى  
وَجْهِهِ کے مقابل میں ہے، مَن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔  
(۲۴)۔ اس سے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس غلط روش پر چلنے والے  
جو تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جائے۔ اوندھی کھوڑی کے لوگ جو  
ذرا عقل و بصیرت سے کام نہ لیں اور سر نیچا کئے، بلا سوچے سمجھے، غلط  
راستے پر چلتے جائیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو صحیح، سالم سیدھے  
متوازن راستے پر چلے جائیں۔

## ک ب ت

کَتَبْتُ۔ کے اصلی معنی کَتَبْتُ کے آتے ہیں۔ یعنی منہ کے بل گرا  
دینا۔ رسوا اور ذلیل کر دینا۔ شکست دیکر لوٹا دینا۔ ازھری نے کہا ہے کہ  
کَتَبْتُ کی اصل کَتَبْتُ ہے۔ (دال کو تاء سے بدل دیا گیا ہے) جس کے  
معنی جگر ہیں جو غیظ و غضب کا معزن ہے۔ لہذا اس کے معنی ہیں دشمن  
کو اس کے غیظ و غضب سمیت لوٹا دینا\*\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی  
کو تشدد اور تذلیل کے ساتھ واپس کر دینے کے ہیں\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے  
کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور کسی چیز سے ہٹا دینے اور پھر دینے  
کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ يَكْبِتْهُمْ (۱۳۶) یا انہیں ذلیل کر دے گا۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ کُتِبَتْ لَہُمْ اَکْثَرُ مِمَّا کُتِبَتْ لَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ (۵۸) جس طرح ان سے پہلے لوگ جو حق کی مخالفت کیا کرتے تھے، ذلیل و خوار ہوئے تھے، اسی طرح یہ بھی ذلیل و رسوا کئے جائیں گے۔

## ک ب د

الْکَبِیْرُ - وَالْکَبِیْرُ وَالْکَبِیْرُ - جگر۔ الْکَبِیْرُ - دردِ جگر۔ الْکَبِیْرُ - مشقت - سختی - ٹیلہ یا آسمان کا وسط - نیز اس کے معنی استقامت اور اعتدال کے آتے ہیں \* - راعِب نے کَبِیْرَ بمعنی کَبِیْرَ یعنی دردِ جگر بھی لکھا ہے \*\* - قرآن کریم میں ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبِیْرٍ (۹۱) فراء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ اس میں پورا پورا اعتدال اور تناسب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ تمام مشکلات اور موانع کا مقابلہ کر سکتا ہے \* - اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس کی ذات کی نمود اور نشوونما سختیوں سے تصادم میں ہوتی ہے - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور قوت کے بتائے ہیں۔

## ک ب ر

کَبِیْرٌ اور کَبِیْرٌ کے معنی ہیں بڑا ہونا - صِغَرٌ کی ضد ہے - الْکَبِیْرُ اور الْکَبِیْرٌ - بڑا - واضح رہے کہ کَبِیْرٌ کے معنی ہیں بڑا ہونا (مرتبہ یا جسامت وغیرہ میں) اور کَبِیْرٌ کے معنی ہیں معمر ہونا - الْکَبِیْرٌ - کسی چیز کا بڑا حصہ - وَالَّذِیْ تَوَلَّی کَبِیْرَہُ مِنْہُمْ (۲۳) - ان میں سے جس نے اس معاملہ کا بڑا حصہ اپنے سر لیا - یعنی جس شخص پر اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے - کَبِیْرٌ بِتَاءٍ کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں - اس کا مفہوم، آج کی اصطلاح میں، حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) ہے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَلَہُ الْکَبِیْرُ بِتَاءٍ فِی الْمَقْمُوٰتِ وَالْاَرْضِ - وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۵) "ارض و سما (جملہ کائنات) میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کا ہے - وہ (بڑے) غلبہ والا، حکمت والا ہے" - وَہُوَ الْحَکِیْمُ الْعَزِیْزُ (۹۵) - یہی مفہوم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ہے - یہی اقتدارِ خدا کے علاوہ کسی اور کا نہیں -

جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو حق کی دعوت دی تو اس نے (اسکی قوم نے) کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا منشا کیا ہے - تم (دونوں بھائی) چاہتے ہو کہ تَکُونُ لَکُمَا الْکِبَرُ بِنَاءُ فِي الْأَرْضِ (۱۳۸) - ”ملک میں اقتدار اعلیٰ تم دونوں کا ہو جائے“ -

تَکَبَّرَ اور اِسْتَكْبَرَ کے معنی ہیں بڑا بننا - سرکشی اختیار کرنا - اَبَىٰ وَ اِسْتَكْبَرَ (۱۳۹) - کَبَّرَ عَلَیْهِ الْاَمْرُ - معاملہ اس پر شاق گذرا - گراں گزرنے کے معنوں میں (۱۴۰ و ۱۴۱ و ۱۴۲) میں آیا ہے - اَلْکَبِیْرُ - سردار - نیز معلم اور استاد کو بھی کہتے ہیں - اَکْبَرَتِ الْمَرْأَةُ - اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو حیض آجائے - اور اَکْبَرُ الرَّجُلُ جب مرد کو ”سادہ“ ”مردمیت“ آئے لگے - چنانچہ اول الذکر معانی کی رو سے مجاہد نے کہا ہے کہ سورۃ یوسف میں جو ہے کہ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا - اَکْبَرَتْ لَهُ (۱۴۱) - تو اس کے معنی ہیں انہیں حیض آگیا (یا مادہ خارج ہو گیا) - یعنی اَکْبَرَتْ کے معنی ہیں حیض ہوا - اور ہاء وقف کیائے ہے \* - لیکن ہمارے نزدیک یہ مفہوم بے معنی اور رکبیک ہے - اس کے معنی صاف ہیں کہ جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو انہیں بہت بڑا پایا -

قرآن کریم میں اِسْتَكْبَرُ ، سجدہ اور اطاعت کے مقابلہ میں آیا ہے - (۱۴۰ و ۱۴۱) - اور ضعیف اور کمزور لوگوں کے مقابلہ میں بھی اِسْتَكْبَرُوا (۱۴۱) آیا ہے - اَدْنٰی کے مقابلہ میں اَکْبَرُ (۱۴۲) میں آیا ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا - اَوْ خَلَقْنَا مِنْ مِثَالِ يَتَكَبَّرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ (۱۴۱) - یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت ہی مشکل ہے -

اَلْمُتَكَبِّرُ (۱۴۱) - خدا کی صفت ہے - تمام عظمتوں اور بڑائیوں کا مالک - اور چونکہ خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا مومن کی اصل زندگی ہے اس لئے اس معنی میں مُتَكَبِّرٌ ہونا مستحسن ہے - (معیوب نہیں) یعنی -

مومن بالائے ہر بالا ترے غیرت او ہر نثار ہمارے

اسی کو قرآن کریم نے اَنْتُمْ اَلَاَعْلَوْنَ (۱۳۸) کہا ہے - تکبر وہ بُرا ہے جس کی رو سے انسان یہ چاہے کہ بغیر تعمیری نتائج پیدا کئے لوگوں

سے اپنی بڑائی منوائے۔ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۳۶)۔  
یہ استبداد ہے۔

لیکن اگر اس کا مفہوم اقتدار اعلیٰ لیا جائے تو پھر ”تکبر“ کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ صرف خدا کے لئے مختص ہوگا۔ اس اعتبار سے آیت (۱۳۶) کے معنی یہ ہونگے کہ تکبر (اقتدار اعلیٰ) صرف الْحَقِّ کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ کِبَر کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی کے نیچے نہ رہنا۔ یہ بھی انسان کے لئے جائز نہیں کیونکہ ایسے قوانین خداوندی کے تابع رہنا چاہئے۔

كِبَرٌ - بہت ہی بڑا (۱۳۶)۔ الْكِبَرُ - بہت بڑی مصیبتوں (۱۳۷)۔  
سورۃ مدثر میں ہے کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ قُمْ فَانْذِرْ (۱۳۷) اٹھ، اور لوگوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اس کے بعد ہے۔ وَرَبِّكَ فَكَبِيرٌ (۱۳۸)۔ پہلا حصہ (یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش سے باز رکھنا) تخریبی یا تمہیدی تھا۔ یہ دوسرا حصہ مثبت یا تعمیری ہے۔ یعنی ایسا نظام قائم کر دے، ایسی صورتِ حالات پیدا کر دے، ایسا نقشہ جمادے، ایسا معاشرہ متشکل کر دے، کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فی الحقیقت خدا کا قانون اور اس کا نظام تمام قوانین و نظام ہائے عالم سے بلند و برتر ہے۔ نظری اعتبار سے تو دنیا کی ہر قوم یہی کہتی ہے کہ ہمارا نظام (یا مذہب) سب سے اونچا ہے۔ لیکن تم ایسا کر کے دکھا دو جس سے ہر شخص بے ساختہ ہکا بھکا اٹھے کہ بے شک ہر قسم کی عظمتیں اور بڑائیاں قانون خداوندی کے لئے ہیں۔ اسی کو وَكَبِيرٌ تَكْبِيرٌ کہا گیا ہے (۱۳۹)۔ اور وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ (۱۴۰)۔ اذان اور صلوٰۃ میں اللہ أَكْبَرُ\* اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں سب سے اونچا، بڑا، اور غالب نظام صرف خدا کا نظام ہے جس کے قیام اور استحکام کے لئے ہم اٹھے ہیں۔ یہی وہ اعلان (تَكْبِيرٌ) تھا جس سے، نبی اکرمؐ کی مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں، اسلامی مملکت میں قریب ہونے تین سو مربع میل رومیہ کے حساب سے وسعت ہوتی گئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا رقبہ قریب بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گیا تھا۔ اور قرآنی نظام، ایرانی

\* یہ لفظ (اکبر) خدا کے لئے قرآن کریم میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے اکبر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اکبر ہے ہی وہی۔

اور رومی نظاموں پر غالب آ گیا تھا - غور کیجئے کہ کس قدر عظیم القدر تھا یہ اعلان اور عزم جو آج ایک بے روح رسم بن کر رہ گیا ہے - اقبال نے کس قدر صحیح کہا ہے کہ

ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

## کتاب

کِتَاب - عرب اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کی شرمگاہ میں لوہے کا جھلہ سا ڈال دیتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کے اونٹوں سے حاملہ نہ ہونے پائیں - اسے کِتَابُ النِّقَاقَةِ کہتے تھے - ابن فارس نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے - ہمارے ہاں گھوڑیوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں - اسی طرح جب وہ اونٹنی کے نتھنوں کو چمڑے کے باریک تسمہ سے سی کر بند کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے بچہ کو سونگہ نہ سکے تو اسے بھی کِتَاب کہتے تھے\* - اسی سے مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی کر بند کر دینے کے لئے بھی کِتَاب کہتے تھے - ہمیں سے لفظ کِتَاب ہے ، جس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کر کے انہیں اس طرح مجتمع اور یک جا کر دینا تھا جس طرح بوری میں سامان بند کر کے اسے اوپر سے سی دیا جاتا ہے - ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں - اس سے کِتَاب کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے -

اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَاب کہا ہے تو قرآن کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا نہیں تھا ، بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب و مدون تھا - منتشر حالت میں اسے کِتَاب کہا ہی نہیں جاسکتا تھا -

کِتَاب\* - چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اسلئے کِتَاب کے معنی ”اس نے لکھا“ ہو گئے - اور اِکْتِتَاب کے معنی ہیں اس نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا یا کسی سے کہا کہ وہ بولتا جائے اور یہ لکھتا جائے (۲۵) - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی گھڑلینے کے ہیں -

کِتَاب کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں\* - قرآن کریم میں کُتِبَ عَلَیْکُمْ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸) - یا کُتِبَ عَلَیْکُمْ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) - فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے - یعنی جو کام قانوناً



لازم قرار دیا جائے۔ اسی لئے مجموعہ قوانین کو کِتَاب کہا جاتا ہے ، کیونکہ اس میں گونا گوں احکام و اوامر جمع ہوتے ہیں۔ ابن فارس نیز صاحب لطائف اللغة نے بھی اَلْکِتَاب کے معنی اَلْفَرَس اور اَلْحُکْم لکھے ہیں۔ لہذا ، جب قرآن کریم کو کِتَاب کہا گیا ہے تو اس کے معنی ضابطہ قوانین کے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے وَ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ اَلْکِتَابَ (۲۴) یعنی (تمہارے غلاموں میں سے) جو آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کرنا چاہئیں۔ تحریر مانگیں۔ (۲۴) میں حَتَّی یَبْتَاعَ اَلْکِتَابَ اَجَلًا کے معنی ہیں جب عدت کی حد جو از روئے قانون خداوندی مقرر ہو گئی ہے ، اپنی آخری میعاد تک پہنچ جائے۔

سورۃ یونس میں ہے لَیْکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۱۰)۔ ”ہر قوم کے لئے ایک میعاد ہے“۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لَیْکُلِّ اَجَلٌ کِتَابٌ (۱۰) ہر میعاد کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھالے۔ جو چاہے اسے گھٹالے۔ خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔ اس قانون کے مطابق اپنی مدت حیات کو گھٹانا بڑھانا ، ہر قوم کے اپنے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران میں ہے مَا کَانَ لِیَنْفُسٍ اَنْ تَمْوُتَ (۳) یا ذَنْ اِلٰہِ کِتَابًا مَّوْجِلًا (۳)۔ کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی میعاد کا تعین کرتا ہے۔ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ (۳۵)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا، خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کے مطابق اپنی عمر بڑھالے، جس کا جی چاہے اسے گھٹالے۔ (انسان جب جی چاہے خود کشی کر کے مر سکتا ہے۔ اور بد پرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدتِ عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی (۳۵)۔

تفسیر المنار میں ہے کہ کِتَاب بمعنی مکتوب ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِکَ اَلْکِتَابُ (۲) سے اشارہ کرنے میں

حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف قرآن کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا \*۔ قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا۔ لہذا مکتوب صورت میں صرف قرآن کریم ہی موجود تھا جسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں کیتاب کا لفظ قانونِ خداوندی یا ضابطہ قوانینِ خداوندی کیلئے آیا ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم خود ضابطہ قوانینِ الہیہ ہے اسلئے یہ کتاب اللہ ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کا مجموعہ مرتب اور محفوظ شکل میں۔

قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ سورہ انفطار میں ہے وَإِنَّ عَلَيْنَا لَلْأَحْقَاقَ لِحَفِظِیْنَ۔ کیر امّا کاتبیین۔ یَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ (۸۲: ۱۴) تم (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لٹے ہیں۔ وہ ”معزز لکھنے والے“ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ کیر امّا کاتبیین کی تفسیر یَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ نے کردی۔ یعنی علم رکھنے والے۔ جانتے والے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (کتاب) اور جگہ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورہ طور میں ہے اَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ (۵۲: ۲۱)۔ یہاں یَكْتُبُونَ کا مفہوم ”جاننا“ ہے۔ یا سورہ انبیاء میں ہے وَالْاَنۡبَاۡ لَہٗۤ اٰتِیۡبُونَ (۲۱: ۲۸)۔ سورہ نمل (۲۸: ۲۸) میں کیتاب کا لفظ خط کے لئے آیا ہے۔ یہی وہ کتاب (چٹھی) ہے جس کے علم کا ذکر (۲۸: ۲۸) میں آیا ہے۔

قرآن کریم میں کیتاب اور حکمت آیا ہے۔ اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ح۔ ک۔ م)۔ کیتاب کے معنی ہیں قانون۔ اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض، غایت، مقصد، نتیجہ۔ (The why of it)۔ مثلاً کَتَبَ عَلَیْکُمْ الْاٰصِیَامَ کے بعد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ (۲۸۳: ۲)۔ تم ہر روزے فرض کئے گئے ہیں (یہ کتاب یا قانون ہے۔ اور) لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ۔ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ۔ اس قانون کی حکمت ہے۔ یعنی اس قانونِ خداوندی سے مقصد یہ ہے۔ اس کی غایت یہ ہے۔ اس کی علت یہ ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہو سکو۔ قرآن کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ

مرتب ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس قانون کی محض رسم پوری ہو رہی ہے، فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآن کریم نے بیان کیا تھا۔ اسی کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح ادا کئے جا رہے ہیں، اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی، ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا۔ حالانکہ قرآن کریم نے ان کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی۔ اگر ان کے نتائج (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہو رہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا۔ لہذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہونگے۔

کِتَابٌ اور حِکْمَتٌ (قانون اور اس کے نتائج) دین کا بنیادی نقطہ ہے۔ یعنی قرآن کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشنده نتائج جو اس دنیا میں سامنے آجائے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس لئے جہاں قرآن کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ اگر قرآن کریم سے یہ معلوم اور متعین کر لیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے۔

## ک ت م

کَتَمٌ کے معنی ہیں چھپانا۔ رَجُلٌ کَتَمُوْهُ۔ راز کو چھپانے والا آدمی۔ مِرَّةٌ کَتِمْ۔ پوشیدہ اور چھپا ہوا راز۔ قرآن کریم میں کَتَمٌ۔ بمقابلہ اِبْدَآءُ آیا ہے (تَمَّ)۔ نیز اِخْرَاجُ (باہر نکالنے) کے مقابلہ میں۔ (۲۱)۔ نیز بَيِّنَ (ظاہر کرنے) کے مقابلہ میں (۱۸۶ : ۱۵۹)۔ اور جَهَنَّمَ کے مقابلہ میں بھی (۱۱۰)۔ اس سے کَتَمٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ کَتَمٌ معانی کے پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اور سَتَرٌ محسوس اشیاء کے پوشیدہ رکھنے کو۔

سورہ آل عمران میں ہے لِمَ تَتَّبِعُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ (۳)۔ تم حق کو باطل کے ساتھ ملائے کیوں ہو۔ اور حق کو چھپائے کیوں ہو؟ یعنی حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہئے اور اسے ظاہر کرتے رہنا چاہئے۔ قرآن کریم حق بلا آمیزش ہے۔ لہذا قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کو نہیں ملانا چاہئے۔ اور اسے نکھار اور ابھار کر سامنے لانا چاہئے۔

## ک ت ب

الْكَتَبُ\*۔ کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور ڈھیر بنا دینا۔ ہانی وغیرہ کو اوپر سے گرا دینا۔ اِنْكَتَبَ الْيَرْمَلُ\*۔ ریت اکٹھی اور مجتمع ہو گئی\*\*۔ اَلْكَتِيْبُ\*۔ ریت کا ٹیلہ۔ اَلْكَتِبَاءُ\*۔ مٹی\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ انقلاب عظیم کے وقت یہ بڑے بڑے سردارانِ قوم (جِبَالُ\*) كَتِيْبًا مَسِيْنًا (۴۳) ہو جائیں گے۔ یعنی ایسے ریت کے تودے جو نیچے سے سرکتے ہوئے چلے جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنا مقام چھوڑ کر نیچے گر جائیں۔ اَلْكَتَبُ الصَّيْدُ\* کے معنی ہیں شکار، شکاری کے ہتھے ہر آگیا۔ (ابن فارس و راغب)

## ک ت ر

كَثْرَةٌ\*۔ قیامت کی ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں زیادہ ہونا، فراوانی، بہتات۔ اَكْثَرُ الرَّجُلِ\*۔ آدمی بہت مالدار ہو گیا۔ اَسْتَكْثَرَ مِنَ الشَّيْءِ\*۔ کسی چیز میں سے زیادہ لینے کی رغبت کرنا\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ\* (۴۶)۔ زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کر۔ اَلْكَوْثَرُ\*۔ ہر چیز جو کثیر ہو۔ خیر کثیر۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی تفسیر المقام المحمود میں لکھا ہے کہ الکوثر سے مراد خود قرآن کریم ہے، کیونکہ حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے اور قرآن کریم سرتاپا حکمت ہے۔ چنانہ جب نبی اکرمؐ اور آپ کی جماعت پر مخالفین کی طرف سے دنیا تنگ کی جارہی تھی اور حالات سخت نا مساعد ہو رہے تھے، حتکہ نظر آتا تھا کہ آپ کو اپنا وطن تک بھی چھوڑنا پڑیگا، تو عین اس عسرت کے زمانہ میں آپ سے کہا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں، نظام خداوندی کی تشکیل

کا ابتدائی دور عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے اور تمہیں زندگی کی خوش گواریاں بڑی افراط سے ملینگی۔ اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸)۔ چنانچہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں یہ وعدہ حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آگیا۔

یہ خیال بھی ہے کہ عبرانی زبان میں کوشر حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ (چنانچہ یہودیوں کا ذبیحہ اب بھی کوشر کہلاتا ہے) اور کوشر اسی سے معرب ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸) کے معنی ہونگے ”ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا“۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے عنوان، ن۔ ح۔ ر) لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی خیر کثیر زیادہ موزوں ہیں۔

انحصار کی تعداد

کَثُرَ - بہت ہونا۔ زیادہ ہونا (۲)۔ کَثُرَ - بڑھانا۔ زیادہ کر دینا۔ (۸۹)۔ اَكْثَرَ - زیادہ کرنا۔ (۱۱۳)۔ تَكَثَّرَ - ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھنے کی کوشش کرنا (۱۰۲)۔ اِسْتَكْثَرَ - بہت زیادہ حاصل کر لینا (۱۸۸)۔ بہت فائدہ اٹھا لینا (۱۲۹)۔

قرآن کریم میں ہے اَللّٰهُ اَكْمَرُ النَّاسِ (۱۰۲)۔ ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس تمہیں زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مال و دولت زندگی کی زینت کا باعث ہیں (۳۳) اس لئے ان کے حصول کی خواہش کوئی بری بات نہیں۔ لیکن زندگی کا مقصد یہ قرار دے لینا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے چلے جائیں تاکہ ہم دوسروں سے بڑھ جائیں اور ان کے مقابلہ میں فخر کر سکیں (۲۰) بڑی پست سطح کی ذہینت ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان میں اس قسم کی خواہش پیدا ہو جائے تو کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچ کر اس کی ہوس کی تسکین ہو جائے۔ انسان ساری عمر اس میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ حَتّٰی زُرْتُمْ اَلْمَقَابِرَ (۱۰۲) حتّٰی یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ بھی معیوب نہیں لیکن اس کا میدان اور ہے۔ تم ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو ذاتی جوہر اور نوع انسان کی عالمگیر بھلائیوں کے کام میں بڑھنے کی کوشش کرو جس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے (۸۳)۔ مال، مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ حتّٰی انسان کی پوری طبعی زندگی ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) ہے۔

بجائے خویش مقصد (End) نہیں۔ مال (یا طبعی زندگی) کو مقصود بالذات اور زندگی کا منتہی سمجھ لینا بڑی غلطی ہے۔ مقصود، انسانی ذات کا نشوونما ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے ہوتی ہے۔ مال کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ رہنا چاہیئے۔

## ک د ح

الْكَدْحُ - سعی و مشقت - کوشش - سعی پیہم، مسلسل جدوجہد۔  
 كَدْحٌ رَأْسُهُ بِالْمَشْطِ - اس نے کنگھے سے اپنے بالوں کو ساجھایا۔  
 كَدْحٌ لِعِيَالِهِ - اس نے بڑی دوڑ دھوپ سے اپنے اہل و عیال کے لئے کمایا\*۔ اس میں دراصل ایسی مشقت کا پہلو ہوتا ہے جو جگر پاش ہو۔  
 کیونکہ ”یہ کَدْح“ کے معنی ہوتے ہیں اس پر ذرا گہرا زخم لگا ہوا ہے\*۔

قرآن کریم میں ہے بَيَّا يَشْهَدُ الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا قَمَلًا قَلِيلًا (۸۴)۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ”جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہو جائیگا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش و خرم واپس آجائیگا۔ لیکن جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائیگا وہ ہلاکت کو پکاریگا“۔

اس آیت (۸۴) کا مفہوم دو طرح پر لیا جاسکتا ہے۔ تاج اور محیط میں ہے کہ كَدْحٌ لِنَفْسِهِ کے معنی ہیں ”اس نے اپنے لئے اچھے یا برے کام کئے“۔ اس اعتبار سے آیہ زیر نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان خواہ اچھے کام کرے خواہ برے، ان کے نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے۔ ”خدا کی ملاقات“ کے معنی اس کے قافون مکافات کا سامنا کرنا ہیں۔

لیکن اگر آیت کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ”اے انسان! تجھے اٹھے رب کی طرف جانے کے لئے مشقتیں اٹھانی ہوں گی۔ انہیں برداشت کر کے پھر اپنے رب کے سامنے جا سکیگا“۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کو بہر حال اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے۔ لیکن اسکے لئے اسے مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ اگر اس نے وحی کا اتباع کیا تو مخالفین کی طرف سے اسے تکلیفیں پہنچیں گی۔ لیکن یہ راستہ مقابلۂ آسان ہوگا۔ اور اگر اس نے وحی کا اتباع نہ کیا اور عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کیا تو اس سے اسے بڑی جگر پاش مشقتوں اور زخموں اور جراحاتوں

کے بعد وہاں تک پہنچنا نصیب ہو گا۔ اس کی مفاد ہرستیاں اس کا رخ پیچھے کی طرف موڑینگے اور زمانے کے تقاضے اسے آگے کی طرف کھینچیں گے۔ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اسی منزل کی طرف آ رہا ہے لیکن چونکہ اس نے وحی کے بجائے عقل کا تجرباتی طریق اختیار کر رکھا ہے اس لئے اسے اس کے لئے خون کے دریا بہرنے اور آگ کی خندقیں بھانڈنی پڑ رہی ہیں۔ غور کیجئے! کسقدر کشت و خون کے بعد اس کا ایک قدم صحیح منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اگر یہ وحی کی سمت اختیار کرتا تو اس کا راستہ مقابلہ آسان ہو جاتا۔

## ک د ر

الْكَدْرَةُ مِّنَ الْاَلْوَانِ - گدلا پن (خواہ کسی رنگ میں ہو) رنگ کا صاف نہ ہونا۔ بعض نے کہا ہے کہ كَدْرَةُ کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور كَدْرَةُ کا استعمال پانی اور چشمہ میں۔ اور كَدْرٌ کا استعمال ہر چیز میں۔ كَدْرٌ كَدْرٌ۔ گدلی اور میلی چیز جو صاف نہ ہو۔ الْكَدْرَةُ مِّنَ الْحَوَاضِ۔ تالاب کی تہ نشیں مٹی یا اس پر چڑھ جانے والی کالی۔ الْكَدْرَةُ۔ مٹی کا بڑا سا ڈھیلا یا بڑا پتھر جسے زمین سے اکھیڑ کر الگ کر لیا گیا ہو۔ الْكَدْرُ۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف جھپٹا۔ الْاَلْوَانُ۔ کسی چیز کے بکھر جانے سے جو تغیر واقع ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ الْكَدْرُ عَلَيْهِ الْقَوْمُ۔ قوم گروہ گروہ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) گدلا پن، صفائی کی ضد اور (۲) حرکت کے ہیں۔ نیز الْكَدْرُ کے معنی ہیں تیز رفتار ہوا۔

قرآن کریم میں ہے وَ اِذَا السَّجُّوْمُ اُنْكَدَرَتْ (۸۱)۔ اس کے لفظی معنی ہیں جب ستارے گدھے ہو جائیں گے۔ یعنی ان کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔ یا جب وہ بکھر جائیں گے۔ اگر ”سجوم“ کے مجازی معنی لئے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو جائیں گی۔ ان کی قوت مانند پڑ جائے گی۔ کیونکہ اگر الْقَمَرُ سے مراد عربوں کی ریاست اور الشَّمْسُ سے ایران کی سلطنت لی جائے (دیکھئے عنوان ق۔ م۔ ر۔ اور ش۔ م۔ م۔ س) تو السَّجُّوْمُ سے مراد چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوں گی۔ لیکن اگر اس سے مراد کائنات کا طبعی انقلاب ہے تو پھر ان الفاظ کے حقیقی معنی لئے جائیں گے۔

## ک د ی

الْكُذْبُ يَهُ\* - سخت زمین - بڑی سخت چٹان - اَكْذَبَ الرَّجُلُ\* - اس نے بخل کیا۔ اَكْذَبَ الْخَوَافِرُ\* - زمین کو کھودنے والا اس منام پر جا پہنچا جہاں سخت زمین یا چٹان آگئی اور وہ مزید کھدائی سے رک گیا۔ اَكْذَبَ السَّمَطَرُ\* - بارش کم ہو گئی\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے اَعْطٰی قَلِيْلًا وَاَكْذَبَ (۵۳) - وہ تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے - پھر ہاتھ روک لیتا ہے (ابن فارس)۔ مومن کی روش زندگی تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھتا ہے اور باقی سب کچھ نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے دے دیتا ہے۔ لیکن جو شخص اس نظام پر دل سے یقین نہیں رکھتا، صرف مصلحتاً اس جماعت کے ساتھ رہتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ گریز کی راہیں نکالتا رہتا ہے۔ (تَوَلَّی - ۵۳) - یعنی تھوڑا سا دیدیا اور اس کے بعد پھر ہاتھ روک لیا اور بہانہ مازیاں شروع کر دیں۔

## ک ذ ب

الْكُذِبُ\* کے معنی ہیں جانتے ہو جھٹتے کسی چیز کے متعلق خلاف حقیقت خبر دینا۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ عمداً ہو یا سہواً، دونوں صورتوں میں كُذِبُ\* کا لفظ بولا جائیگا\*۔ اَكْذَبَ الرَّجُلُ\* اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کو پکارا جائے اور وہ سوتے ہوئے کی طرح چپ حادہ لیر۔ كَذَّابَةٌ\* اس کپڑے کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا بنا چھاپا جائے\*\*۔ كَذَّبَ رَفِیٌ سَیْرَہ کے معنی ہیں اونٹ سست رفتار ہو گیا۔ یعنی جس رفتار سے وہ چل سکتا تھا اس رفتار پر نہیں چلا یا وہ بری چال چلا\*\*\*۔ بعض اوقات كَذَّبَ کے معنی واجب ہونے کے بھی آتے ہیں\*\*\*۔

قرآن کریم نے سورۃ منافقون میں کہا ہے کہ (اے رسول) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے۔ اس کے بعد ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے کہ تو واقعی اس کا رسول ہے لیکن وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (۱۳)۔ یہ منافق یقیناً کاذب ہیں۔ یہاں سے كِذْبُ\* کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ كِذْبُ\*



ہے۔ اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کذب کہیں گے۔ وہ بات اس کے عدم علم پر معمول کی جائیگی۔ یعنی یہ کہیں گے کہ اسے صحیح واقعہ کا علم نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے اس کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (۱۶۶)۔ اس لئے وہی بات زبان سے نکالنی چاہئے جس کے متعلق تحقیق کر لی جائے۔

سورۃ یوسف میں ہے بِدْمٍ كَذِبٍ (۱۲۸)۔ جھوٹ موٹ کا خون یعنی ایسا خون جو اس کا نہ تھا جس کا وہ بتایا گیا تھا۔ کاذب\*۔ جھوٹا (۱۱۱)۔ کذاب\*۔ بہت بڑا جھوٹا (۲۸)۔ مکذب\*۔ جھوٹ کہا ہوا (۱۱)۔ کذاب\*۔ جھٹلایا (۲۳)۔ تکذیب\*۔ جھٹلانا (۸۵)۔ مکذب\*۔ وہ جو جھٹلائے جائے اور کبھی نہ مائے (۵۶)۔

وحی (قرآن کریم) اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا ہے اور دلیل و برہان سے اس کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ (۱۱۲)۔ یہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا صحیح طریقہ۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لے کہ مجھے فریق مقابل کے دعویٰ کو بہر حال جھٹلانا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ہے وہ تکذیب\* جسے قرآن کریم نے سخت جرم قرار دیا ہے۔ علم و بصیرت کی بارگاہ میں اس سے بڑا جرم اور کونسا ہوگا؟

نیز تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدھی، اس کا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے۔ سورۃ الماعون میں دیکھئے، کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَرَأَيْتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِلَا لَدْرِبٍ (۱۶۶)۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کے بعد بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ وہ نمازی ہے جو صلوٰۃ کی غرض و ہایت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات ہی کو اصل صلوٰۃ سمجھے ہوئے ہیں، اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہئے تھا، بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۶۶)۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے ”تکذیب دین“ کون کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہے؟

## ک ر ب

الْكَرْبُ - شدید غم کو کہتے ہیں۔ اس کی اصل كَرَبٌ الْاَلَاَرْضِ سے ہے۔ جس کے معنی زمین میں ہل چلانے کے ہیں۔ یا یہ كَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ الْكَرْبُ - رسی بٹنے کو بھی کہتے ہیں، نیز بیڑی کو تنگ کر کے سختی سے باندھنے کے لئے بھی۔ كَرَبٌ - اُس رسی کو بھی کہتے ہیں جو ڈول کے ساتھ بندھی رہتی ہے اور ہر مرتبہ پانی میں ڈوبتی، بھیگتی اور اس طرح جلد گل سڑ جاتی ہے۔ كَرَبَ النَّاقَةُ - اس نے اونٹنی پر ہوجھلا دیا۔ الْكَرْبُ - وہ زمین جس پر کبھی کاشت نہ کی گئی ہو\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہوتے ہیں۔

ان معانی سے الْكَرْبُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی شدید غم، جس سے انسان بری طرح جکڑا جائے۔ گرانبار ہو جائے، اس کے آسے ٹوٹ جائیں۔ اس کا قلب الٹ ہلٹ ہو جائے۔ یہ ہے وہ كَرَبٌ جس کے متعلق کہا ہے کہ اس سے نجات کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قانونِ خداوندی کی اطاعت۔ قُلِ اللّٰهُ يَنْجِيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ (۶/۶۸)۔ اسی طریق سے خدا کے بندوں کو کرب سے نجات ملتی ہے (۲/۱۶)۔

الْكَرْوُ وَيَتَوْنُ - عبرانی زبان کا لفظ كَرُوْ وَيَتَوْنُ ہے۔ جس سے مراد مقرب فرشتے ہیں\*\*۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا)۔

## ک ر ر

الْكَرَّرُ - کسی چیز کو ہلٹانا، موڑ دینا، لوٹا دینا، پھیر دینا۔ موٹی رسی یا رسی کو كَرَّرَ کہتے ہیں\*\*۔ الشَّكْرُ يَرُّ - وَالشَّكْرُ آرُ - کسی چیز کو بار بار دہرانا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی اکٹھا کرنا اور ہلٹانا بتائے ہیں۔ تکرار اور تاکید میں فرق یہ ہے کہ تاکید اسے کہتے ہیں کہ ایک بات کہی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس پر زور دیا جائے نیز تاکید تین بار سے زیادہ نہیں کی جاتی۔ لیکن تکرار میں یہ دونوں باتیں ضروری نہیں\*\*\*۔

قرآن کریم میں کفار کی اس حسرت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ لَوْ اَنَّا كُنَّا كَرَّةً (۱۶/۱۶)۔ اگر ایک مرتبہ زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹا کر پھر وہی حالات پیدا کر دئے جائیں تو ہم یہ کریں اور وہ کریں۔

لیکن اسکی نفی کی گئی ہے (۳۹:۵۸)۔ اسلئے کہ زندگی جوئے رواں ہے۔ اسکا جوہانی ایک مرتبہ آگے نکل گیا وہ پھر واپس نہیں آسکتا۔ اسی طرح دنیا کی اس اسٹیج پر کوئی فرد دوبارہ نہیں آسکے گا۔ اس لئے تناسخ (آواگون)۔ دنیا میں بار بار آنے کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قانون ارتقاء میں اعادہ اور تکرار نہیں۔ یا آگے بڑھنا ہے (جسے جنت کہتے ہیں) یا ایک مقام پر رک جانا (جسے جہنم کہتے ہیں)۔

سورہ النازعات میں ہے۔ تِلْكَ اِذَا كُرِّرَتْۙ خَارِسَةًۙ (۹۹)۔ یہ سر کر پھر زندہ ہونا تو بہت نقصان دہ ہوگا۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰۤیْکُمْۙ اِلَیْکُمْۙ اَلْکُرِّرَاتِۙ عَلَیْہِمْۙ (۱۴)۔ پھر ہم نے حالات کو ایسا پلٹا دیا کہ وہ تمہارے حق میں ہو گئے اور تمہارے دشمنوں کے خلاف۔

## کرس

اَلْکُرْسِۖ - اصل و بنیاد\*۔ اَلْکُرْسِیُّ - کرسی جس پر بیٹھتے ہیں۔ اَلْکُرْسِیُّ وَ اَلْکُرْسِیُّ - حکومت و اقتدار۔ یا علم۔ چنانچہ اس صحیفہ کو جس میں علم ہوتا ہے کُرْسِیَّۃً کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کُرْسِیَّۃً ان اوراق کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے ملا دئے گئے ہوں۔ کیونکہ اَلْکُرْسِیُّ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملا دینا\*۔ آج کل کاہی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی اوپر تلے جم جانا یا اکٹھا ہو جانا بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَ سِعَ کُرْسِیُّہٗ السَّمٰوٰتِ وَاِلَآرَضَ (۲۵۵)۔ خدا کی ”کرسی“ تمام کائنات کو محیط ہے۔ اس میں کُرْسِیُّہٗ کے معنی باعتبار لغت بھی اور صاحب المنار کے نزدیک بھی، علم خداوندی ہیں۔ اگرچہ اسی کے معنی حکومت و اقتدار بھی ہو سکتے ہیں۔ ”علم“ کا مفہوم اس لئے قابل ترجیح ہے کہ اس سے پہلے یہ آیا ہے وَ لَا یُعِیْطُوْنَ بِیَشِیۡمِیۡۤہٗ مِیۡنَ عَلَیْمِہٖ اِلَّا بِعَمَآ شَآءَ۔ ”وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے مگر اس کے قانون مشیت کے مطابق“۔

سورہ ص میں حضرت سلیمانؑ کے تخت حکومت کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۳۸:۳۸)۔ اس میں بھی کُرْسِیُّہٗ کے معنی تخت یا ”بیٹھنے کی جگہ“ کے نہیں، بلکہ اقتدار حکومت ہے۔ ”تخت“۔ ”کرسی“ وغیرہ الفاظ، اقتدار اور منصب کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

## کرم

الْكَرَمُ\* اس صفت کو کہتے ہیں جو کمینگی کے خلاف ہو۔ عربوں میں کمینگی بدترین خصلت تھی، اس لئے كَرَمٌ بہترین صفت تھی۔ دراصل اس کے معنی تھے کسی ایسے بوجھ کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور اس کی جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ یعنی بڑے گرانقدر اجتماعی امور اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ کرنا یا سعی و کوشش کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ كَرَمٌ کسی کو بغیر ذاتی غرض و منفعت کے بقدر ضرورت فائدہ پہنچانا ہے۔ اس کے معنی خلوص کے بھی ہیں۔ اَلْاِکْرَامُ\* وَ اَلتَّكْوِيْنُ\*۔ کسی کو اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی یا ذلت نہ ہو، ساتھ ہی یہ کہ جو نفع پہنچایا جائے وہ بلند اور با شرف ہو\*۔ اس اعتبار سے عربوں کے ہاں اَلْاِکْرَامُ\* ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جاتی ہو۔ نیز الْاِکْرَامُ\* کے معنی ہیں آزاد اور شریف۔ نجیب۔ سخی۔ خوش نہاد۔ جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے، نرم خو، خلیق، وسیع الظرف، عمدہ حسب و نسب والا، پسندیدہ صفات کا مالک، با عزت۔ وہ گھوڑا جس پر جہاد کیا جائے۔ وہ اونٹ جس پر پانی لاد کر لایا جائے۔ نیز ہر پسندیدہ اور منتخب چیز\*۔ کثیر بارش کو بھی كَرَرِیْمٌ\* کہتے ہیں۔ اَرْضٌ\* مَكْرَمَةٌ\*۔ ایسی زمین جسے جوت کر، کھاد وغیرہ ڈال کر اچھی طرح تیار کر لیا جائے۔ نیز وہ عمدہ زمین جس میں بہت اچھی پیداوار ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ كَرَرِیْمَتٌ\* اَرْضُهُ\* النِّعَامُ\*۔ کھاد ڈالنے کی وجہ سے اس سال اس کی زمین بڑی زرخیز ہوئی اور اس میں بہت فصل ہوئی۔ كَرَرِیْمٌ السَّحَابُ\* تَكْرَرِیْمًا\*۔ بادل خوب اچھی طرح برسا\*۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک كَرَرِیْمٌ\* نہیں کہا جاسکتا جب تک اس سے كَرَمٌ\* کا ظہور نہ ہو چکا ہو\*\*۔

قرآن کریم نے جہنم کے دخانی ماہہ کے متعلق کہا ہے۔ اَلْبَارِدِیُّ وَلَا كَرَرِیْمٌ (۱۶)۔ جس میں نہ ٹھنڈ ہے نہ خوشگوار یا نفع بخشی۔ مومنین کی صفات میں ہے۔ اِذْ اَمَرُّوْا بِاللِّغْوِیِّ مَسْرُوْا کَرَامًا (۲۵)۔ جب کسی لایعنی اور لغو بات سے ان کا گذر ہو جائے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گذر جاتے ہیں۔

سورۃ علق میں خدا کو اَلَا کَرَمٌ (۱۱) کہا گیا ہے۔ اسی کو ذُو اَلْجَلَالِ وَ اَلْاِکْرَامِ (۲۵) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کَرَمٌ (۱۴) اور اَکْرَمٌ (۱۵) کے معنی عزت و تکریم عطا کرنا۔ بمقابلہ اَهْسَانٌ (۱۶)۔ عِبَادٌ مُّکْرَمُونَ (۲۱)۔ معزز بندے۔

مُکْرَمٌ (۲۲) عزت دینے والا۔ رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۸)۔ رزقِ باشرف۔ عزت کی روزی۔ جنتی معاشرہ کے خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں رزقِ کریم ملے گا۔ یعنی ماسانِ زیست بکثرت اور فراواں بھی اور عزت و توقیر کے ساتھ بھی۔ کیسی خوش بخت ہے وہ قوم جسے رزقِ کریم میسر ہو۔ لیکن یہ نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے ہی سے مل سکتا ہے۔ (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی)۔

قرآن کریم میں ہے وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیَّ اٰدَمَ (۱۵)۔ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو صاحبِ کرم بنایا ہے۔ یعنی خدا نے ہر فرزندِ آدم کو محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے۔ تکریمِ آدمیت کا یہ اعلانِ عظیم سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف سے ہوا۔ یعنی ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے قابلِ احترام ہے۔ ہر فرد کو عزت و شرف کا یہ بنیادی حق (Fundamental Right) قرآن کریم کی بارگاہ سے عطا ہوا۔ یہ انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے بعد اس عزت و تکریم کے مدارج، جو ہر ذاتی اور اعمالِ کریمانہ کے اعتبار سے قائم ہوتے ہیں۔ جو جتنا زیادہ قوانینِ الہیہ کی نگہداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ واجب التکریم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اِنْ اَکْرَمَکُمْ عِندَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (۲۹) جو سب سے زیادہ ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ قرآن کریم نے کس طرح عزت و شرف کے پرانے معیاروں (حسب و نسب۔ مال و دولت وغیرہ) کو بدل کر ان کی جگہ احترام و تکریم کے نئے پیمانے دے دیے، جن کی رو سے ہر انسان، بحیثیت انسان ہونے کے، واجب الاحترام ہے اور جو جس قدر زیادہ قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوتا جاتا ہے، یعنی عزت کا معیار جوہرِ ذاتی قرار پا گیا، نہ کہ اضافی نسبتیں۔ اسی ایک معیار سے بادشاہت، برہمنیت، پیشوائیت، سرمایہ داری کے تمام نظامِ کہن حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ یعنی ہر انسانی بچہ، خواہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو یا فقیر کے۔ برہمن کا بیٹا ہو یا چمار کا۔ انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔ اور باپ کی وجاہت یا عزت اسے دوسرے بچوں سے ممتاز نہیں کر سکتی۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ یا ہر ہوتا اس کے ذاتی جوہر اور عمل کی بنا پر ہوگا۔

## ک ر ء

اَلْكَرَّهُ - اَلْكَرْهُ - سخت نا پسندیدگی - مشقت - بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ جس کام پر خود تمہارا نفس ناخواستہ طور پر تمہیں مجبور کرے ، وہ کَرْهٌ ہے اور جس پر کوئی دوسرا مجبور کرے وہ کَرْهٌ ہے - راغب نے کہا ہے کہ جو تکلیف کسی انسان پر خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی لا دی جائے تو وہ کَرْهٌ ہے اور جو اسے خود اپنے آپ سے پہنچے وہ کَرْهٌ ہے \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ کَرْهٌ تو مشقت کو کہتے ہیں اور کَرْهٌ یہ ہے کہ تم کو کسی بات کے کرنے کے لئے کہا جائے اور تم اسے بادل ناخواستہ کرو - قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْهًا آیا ہے - (۳۴/۸۴) - طَوْعًا کے معنی ہیں بہ طیب خاطر اور کَرْهًا کے معنی زبردستی - سورۃ بقرہ میں ہے - کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کَرْهٌ لَّکُم (۲/۲۱۶) تم پر جنگ کو قانوناً ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ تمہاری طبیعتیں اسے بادل ناخواستہ قبول کرتی ہیں ، یا حالانکہ وہ تمہاری طبیعتوں پر ناگوار گذرتی ہے - سورۃ احقاف میں جنین کے متعلق ہے حَمَلَتْہُ اُمُّہُ کَرْهًا وَوَضَعَتْہُ کَرْهًا (۱۵/۲۱) - اس کی ماں بڑی مشقت سے حمل کے دن گزارتی ہے اور وضع حمل میں بھی تکلیف اٹھاتی ہے - سورۃ نحل میں اِکْرَہًا زبردستی کے معنوں میں آیا ہے - یعنی جو کام دل کی مرضی سے نہ کیا جائے (۱۱۶/۱) - سورۃ بقرہ میں کَرْهٍ کا لفظ اَحَبٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۱۶/۲) - اسی طرح (۳۹/۲) میں کَرْهًا حَبَبٌ کے مقابلہ میں - کَارِہُونَ (۲۸/۱) نا پسند کرنے والے - مَکْرُوہٌ (۱۴۸/۱) نا پسندیدہ -

قرآن کریم جس جماعت کے ہاتھوں آسمانی انقلاب کو لاتا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور نظام کو اپنے دل کی مرضی سے (ہلا جبر واکراہ) اپنی زندگی کا نصب العین بناتی ہے - لہذا اس کا اعلان یہ ہے کہ لَا اِکْرَہَ فِی الدِّیْنِ (۲۵۶/۲) - اس سوسائٹی کا ممبر بطیب خاطر بنا جاسکتا ہے ، کسی قسم کے جبر واکراہ سے نہیں - رسول اکرمؐ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یُکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۹۹/۱) - کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں ؟ اکراہ ، طبعی (Physical) بھی ہوتا ہے - جیسے کسی کے گلے پر تلوار رکھ کر اس سے بات منوالی جائے - اور ذہنی بھی - جیسے کسی کو شعبدہ دکھا کر اس سے اپنی بات منوالی جائے -

تیسری قسم کا اکراہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو روایات چلی آتی ہیں اور جو تصورات اور نظریات، معتقدات و خیالات، ہمیں اسلاف سے وراثتاً ملتے ہیں، انہیں ہماری تعلیم و تربیت کا جزو بنا کر دلوں میں راسخ کر دیا جائے، عام اس کے کہ انہیں خدا کی کتاب کی سند حاصل ہے یا نہیں۔ یا وہ علم و بصیرت اور عقل و فکر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ یہ اکراہ کی سنگین ترین شکل ہے۔ غلط تعلیم و تربیت سے بڑھ کر شدید اکراہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ قرآنی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی قسم کے اکراہ کی بھی اجازت نہیں۔ وہ ہر بات کو دلائل و براہین سے پیش کرتا اور دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس جماعت میں داخل ہونے پر کسی قسم کا جبر و اکراہ روا نہیں رکھا جاسکتا، اس میں سے نکلنے کے لئے بھی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر آپ اس سے نکلنے کی راہیں بند کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو جبر و اکراہ سے اس کے اندر رکھتے ہیں۔ لہذا ہمارے ہاں جو سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی حزا قتل ہے تو یہ چیز قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی اس شخص کو مسلمان رہنے پر مجبور کرتا ہے جس کا دل اسلام پر مطمئن نہ ہو۔ ایمان نام ہی دل و دماغ کے کامل اطمینان اور رضامندی کا ہے۔

سورۃ نحل میں ہے: "مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۙ اِلَّا مَنۡ اُكْرِهَۙ وَ قَلْبُهٗۙ مَطْمَئِنٌّۢ بِاِلٰہِۙ اِيْمَانٍۭ"۔ "وَلٰكِنۡ مَّنۡ شَرَّحَۙ بِاِلٰہِۙ كُفْرًاۙ فَتَعْلٰیہُمۡۙ غَضَبٌۢ مِّنَ اللّٰہِۙ وَ لَہُمۡۙ عَذَابٌۭ عَظِیْمٌۭ" (۱۶:۱)۔ جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرے۔ تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ لیکن ان میں وہ شخص شامل نہیں جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن اسے کفر (انکار) پر مجبور کر دیا جائے۔ کفر اُس کا کفر ہے جو اپنے سینے کی کشادگی (دل کی پوری رضامندی) سے کفر اختیار کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر جبر و اکراہ سے کسی سے کفر کا اقرار کرا لینا اُسے کافر نہیں بنا دیتا، تو جبر و اکراہ سے کسی سے ایمان کا اقرار لے لینا، یا اسے اس مسلک پر رہنے پر مجبور کر دینا، اُسے کس طرح مومن بنا سکتا ہے۔ مومن وہی ہے جو بطیب خاطر قرآن کریم کی صداقتوں کا اقرار کرے اور پھر دل کی پوری رضامندی سے اس مسلک پر قائم رہے۔ جہاں ذرا سا بھی جبر و اکراہ آیا، وہاں ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم تو ان لوگوں کو بھی مومن قرار

نہیں دیتا جو اسلامی مملکت کی شان و شوکت کو دیکھ کر (خود عہد نبویؐ میں) اسلام لے آئے تھے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم یوں کہو کہہ ہم اس جدید نظام کے تابع فرمان ہو گئے ہیں (أَسْلَمْنَا)۔ یہ نہ کہہو کہہ ہم ایمان لے آئے ہیں، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔ (۲۹)۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ جب ان کے سامنے (اور تواور) خود آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں، لَمْ يَخِرُّوا وَعَايِنَهَا صَمًا وَعَمِيًّا (۳۰)۔ تو ان پر بھرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ یعنی انہیں بھی آنکھیں کھول کر قبول کرتے ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی شخص کو اسلامی نظام میں مجبوراً داخل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نظام میں بطیب خاطر داخل ہو گیا ہے، تو اس کے بعد اسے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جب تک اس نظام کا ممبر رہیگا، اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی۔ اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی نظام یا سوسائٹی کا ممبر بھی رہے اور اس کے قواعد و ضوابط میں سے جسے چاہے تسلیم کرے اور جسے چاہے مسترد کر دے۔

## کے سب

کَسَبٌ کے اصلی معنی جمع کرنا ہیں۔ اس کے بعد اس کے معنی تلاش معاش کے بھی آتے ہیں۔ اور کسی چیز کو حاصل کر لینے اور اسے ہا لینے کے بھی \*۔

وَيْلٌ لِّهَٰمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ (۲۹) انہوں نے جس چیز کو (یعنی دین میں تحریف کو) اپنے لئے وجہ معاش بنا رکھا ہے وہ ان کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔ مَن كَسَبَ مَئِیَّةً (۳۱)۔ جس نے ناہمواریاں پیدا کیں۔ یہاں کَسَبَ کے معنی ”کرنے“ کے ہیں۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے لئے ناہمواریوں کو اکٹھا کر لیا۔

قرآن کریم میں آتا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲۸۶)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جس نے اچھے کام کئے ان کا فائدہ



اس کے لئے ہے (لَهَا) اور جس نے برے کام کئے اس کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے (عَلَيْهَا)۔ لیکن یہاں ”نیک اعمال“، اور ان کے فائدوں کے لئے کَسَبَ آیا ہے اور ”برے کام“، اور ان کے نقصانات کے لئے اُكْتَسَبَ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَسَبَ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات کے فائدے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کے فائدے کے لئے کرے۔ اور اُكْتَسَبَ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے۔ راغب کے اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نفع مند صرف وہی کام ہو سکتے ہیں جن میں اپنا اور دوسروں کا (سب کا) فائدہ مد نظر ہو۔ لیکن جن کاموں میں صرف اپنا ذاتی مفاد ہی پیش نظر ہو ان سے انسان کی ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ وہ اس کے لئے موجب نقصان ہوتے ہیں (عَلَيْهَا کے یہی معنی ہیں)۔ یہ چیز قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اس نے کہا ہے کہ وَ أَمَّا سَاءُ يَنْفَعُ النَّفْسَ فَيَمُوتُ فِيهَا لَا رُحْرَ (۱۳)۔ بقاء صرف ان کاموں کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوں۔

صاحب لطائف اللغة نے بھی کہا ہے کہ کَسَبَ، خیر کے لئے آتا ہے اور اُكْتَسَبَ، شر کے لئے۔

لیکن راغب یا صاحب لطائف اللغة نے کَسَب اور اُكْتَسَب کے معنوں میں جو فرق بتایا ہے وہ کلیہ نہیں۔ قرآن کریم میں ان شکلوں کا استعمال اس کے خلاف بھی ہوا ہے۔

## کے س د

کَسَدَ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اس قدر معمولی، گھٹیا، اور بے قدر ہونے کے ہیں کہ کوئی اسکی طرف رغبت نہ کرے۔ تہذیب میں ہے کہ کَسَدَ کے اصلی معنی خراب ہو جانے اور ہگڑ جانے کے ہیں۔ پھر اس کا استعمال، سامان اور بازار کے چالو نہ رہنے کے معنوں میں ہونے لگ گیا۔ کَسَدَ السَّعَادُ۔ بازار میں اس سامان کا چلن نہیں رہا۔ کَسَدَتِ الشُّوْقُ۔ بازار سرد پڑ گیا۔ اَلْكَسِيْدُ۔ گھٹیا۔ کم درجہ۔ کمینہ\*۔ قرآن کریم میں (سورہ توبہ) میں ہے وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا (۲۴)۔ وہ تجارت جس کی کساد بازاری (منہا پڑ جائے) سے تم ڈرتے ہو۔

## ک س ف

الْكَسْفَةُ - چیز کا ٹکڑا۔ جمع کِسْفٌ وکِسْفٌ\* (۱۶۴ : ۳۸۸)\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں ایسی خرابی آ جانے کے ہوتے ہیں جو پسندیدہ نہ ہو۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے کاٹ دینا اور الگ کر دینا۔ سورہ الطور میں ہے۔ اِنْ يَقْرُوا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ (۵۲)۔ اور سورہ شعراء میں ہے فَتَأْتِيَنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ (۲۸۷)۔ اس کے معنی عذاب ناگہانی یا تباہی و بربادی کے ہیں۔ کَسَفَ الثَّيُوبَ کے معنی ہیں اس نے کپڑے کدو کاٹا۔ کَسَفَتِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ۔ سورج اور چاند گہن میں آ گئے۔ کَسَفَتِ حَالَهُ۔ اس کا حال خراب ہو گیا۔ رَجُلٌ كَاسِفٌ الثِّبَالِ۔ بد حال آدمی۔ يَتَوَمَّ كَاسِفٌ۔ نہایت ہولناک اور شدت کی تکلیف کا دن\*۔ جس دن آسمان پھٹ پڑے۔

## ک س ل

الْكَيْسَلُ - کسی ایسے کام میں واماندگی اور گرانباری کا اظہار کرنا جس میں گرانباری اور تکان کا اظہار کرنا نہیں چاہئیں۔ الْكَيْسَلُ - روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو\*\*۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کمان اور تانت دونوں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی رابطہ نہ رہنے سے روئی نہیں دھنی جا سکتی۔ دونوں بیکار ہوتی ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی کام کے کرنے سے گرانباری محسوس کرنا اور اس کی تکمیل سے، یا اسے کرنے سے جی چرانا۔

اس مفہوم کو سامنے رکھیں اور پھر اس آیت پر غور کیجئے جس میں منافقت برتنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔ اِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالًا (۱۳۲)۔ نیز (۵۲)۔ یہ نظامِ صلوة میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ۔ یعنی ظاہری طور پر سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔

یہ نقشہ، جسے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ یہ ”رسول اللہؐ کے زمانے کے منافقین“ کی حالت کا بیان ہے، درحقیقت ہماری

ہی حالت کا نقشہ ہے۔ فور کیجئے کہ کیا ہماری نمازیں بے تانت کی گمان  
نہیں۔ [نیز دیکھئے سَاھُوْنَ (۱۰۴) عنوان س۔ ہ۔ و]

## ک س و

اَلْكِسْوَةُ۔ اَلْكِسْوَةُ۔ لباس، کپڑا جو پہنایا جائے\*۔ رَزَقْتُهُنَّ  
وَكِيسُوْتُهُنَّ (۲۳۳)۔ ان کا کھانا اور کپڑا۔ كَسَاہُ كَسُوًا۔ اسے  
کپڑا پہنا دیا\*۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔ (۲۳۳) ہم (جنین کی)  
ہڈیوں کو گوشت کا پہناوا پہنائے ہیں۔

## ک ش ط

اَلْكَشْطُ۔ کسی چیز پر سے اس پر چھائی ہوئی چیز اٹھا دینا۔ كَشَطَ  
الْغِطَاءَ عَنِ الشَّيْءِ۔ اس نے اس چیز سے ڈھکنا ہٹا دیا۔ كَشَطَ  
الْجِلْدَ عَنِ الْجَزْءِ وَر۔ اس نے ذبح کردہ اونٹ سے کھال اتار دی۔  
اَلْكِشَاطُ۔ اتاری ہوئی کھال۔ كَشَطَتْہُ۔ اس نے اسکو کھول دیا\*\*۔  
اِنَّكَشَطَ رَوْعَہُ۔ اس کا خوف جاتا رہا\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَاِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ۔ (۸۱) اس کے معنی ہیں  
جب ”آسمان“ سے پردہ اٹھا دیا جائیگا۔ جب اس کا پوست اتار دیا جائیگا  
(اور اس طرح فضائے کائنات کے اندر کی چھپی ہوئی قوتیں بے نقاب ہو جائیں گی)۔

## ک ش ف

اَلْكَشْفُ۔ پردہ اٹھا دینا۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا\*\*۔ قرآن کریم  
میں ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَکَ (۵۶)۔ ہم نے (تیری آنکھوں سے)  
پردہ اٹھا دیا اور اس طرح حقائق تجھ پر منکشف ہو گئے۔ نیز اس کے معنی  
ہٹا دینے، دور کر دینے کے بھی ہیں۔ سورہ اعراف میں ہے لَتُنِیْنَّ كَشَفْتُ  
عَنْكَ السَّرَّ جَزَ (۱۳۳)۔ اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے۔ كَشَفَ الضُّمُورَ  
(۱۰۴) تکلیف کا دور کر دینا۔ کَاشِفٌ\*۔ دور کر دینے والا (۱۰۴)۔

قرآن کریم میں ایک جگہ ملاکہ مَبَا کے متعلق ہے وَكَشَفْتُ عَنْ  
سَاقِیْہَا (۲۴)۔ اور دوسری جگہ سورہ قلم میں ہے یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ  
سَاقٍ (۱۸)۔ یہ عربوں کا معاورہ تھا جسے وہ اسوقت بولتے تھے جب کوئی  
سخت مرحلہ سامنے آجائے\*۔ چنانچہ راغب نے لکھا ہے کہ اسکی اصل

قَامَتِ الْحَرَبُ عَلَى سَاقٍ ہے ۔ جس کے لفظی معنی ہیں جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی مطلب یہ ہے کہ پورے زور و شور سے شروع ہو گئی ۔ گھمسان کا رن پڑا ۔ اسی سے سَاقُ امر شدید کے لئے آتا ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسکی اصل تَذْمِیْرُ النَّاقَةِ سے ہے جس سے مراد ہے آدمی کا اونٹنی کے رحم میں ہاتھ ڈال کر بچہ نکالنا ۔ ایسے موقع پر کُشِیفَ عَن السَّاقِ کہا جاتا ہے \*\* ۔ بہر حال ، اس کے معنی شدت کی سختی اور گھبراہٹ کے ہیں ۔

یہ جو ہمارے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ ہے اسکی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ہمکلام ہو سکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے ، ختم نبوت کی سہر کو توڑ دینا ہے ۔ اب انسانوں کے لئے علم کے سرچشمے صرف دو ہیں ۔ قرآن کریم ( جو وحی پر مشتمل ہے ) اور عقل انسانی ( مزید تفصیل عنوان ل ۔ ہ ۔ م ۔ میں دیکھئے )

## ک ظ م

الْكُظْمُ ۔ الْكَظْمُ ۔ حلق ۔ منہ ۔ سانس کے باہر نکلنے کا راستہ ۔ مخرج \*\*\* ۔ اس اعتبار سے اس کے معنی کسی چیز کے باہر نکلنے کے ہیں ۔ لیکن دوسری طرف الْكَظْمُ سانس کے رک جانے کو بھی کہتے ہیں \*\* ۔ كُظْمَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ کا جنگلی نہ کرنا ، اور جو کھایا ہو اسے اندر روک لینا \*\* ۔ اس سے كُظْمَ الْبَابِ کے معنی ہیں دروازہ بند کر دینا \*\*\*\* ۔ اسی سے الْكَظْمُ کے معنی خاموش ہو جانے کے آتے ہیں \*\*\*\* ۔ الْكُظْمُ اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کے پیٹ کا پانی خشک ہو گیا ہو اور وہ سخت پیاسا ہو \* ۔ لیکن كُظِیْمٌ اور مَكْظُومٌ کے معنی سخت غمگین و فکر مند اور مضطرب و بے قرار انسان کے ہیں ۔ \*\*\* بے چینی اور بے قراری کے معنوں میں سورہ المؤمن میں ہے ۔ اِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَظِیْمُنَ (۲۹) ۔ جب قلوب اچھل کر گلے تک آجائیں گے اور وہ لوگ سخت مضطرب و بے قرار ہونگے ۔ یا وہ اپنے قلوب کو دبا رہے ہونگے کہ کہیں وہ باہر ہی نہ نکل پڑیں ۔ سورہ القلم میں ہے ۔ وَهُوَ مَكْظُومٌ (۲۹) ۔ وہ بے چین اور بے قرار تھا ۔ سورہ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ہے فَهُوَ كَظِیْمٌ (۸۴) ۔ وہ یوسف کی جدائی میں بے قرار تھا ۔

سورہ آل عمران میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ کَاطِمِیْنِ النَّفِیْظِ (۱۳۳)۔ عام طور پر اس کے معنی کٹے جاتے ہیں غصہ کو دبانے والے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم غصے کو دبانے (Suppression) کی تلقین نہیں کرتا۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے کِیْظَامَۃ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں۔ جن زمینوں میں پانی کم ہو (جیسا کہ عرب کی سرزمین) وہاں ایک کنویں کے قریب ہی دوسرا کنواں کھود دیتے ہیں اور ان کنوؤں کے نیچے زمین دوز راستہ (Subterranean Channel) بنا دیتے ہیں جس سے ایک کنواں دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اگر ایک کنویں میں پانی کم رہ جاتا ہے اور دوسرے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس کا زائد پانی اس دوسرے کنویں کی طرف آجاتا ہے۔ اس زمین دوز نالی کو کِیْظَامَۃ کہتے ہیں\*۔ لہذا کَاطِمِیْنِ النَّفِیْظِ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی وجہ سے ان (مومنین) کی مشتعل ہونے والی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان قوتوں کو وحشیوں کی طرح بیونہی تخریب میں صرف کر دیں وہ انہیں دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اس طرح ان سے تعمیری کام لیتے ہیں۔ اسے کِیْظَامَۃ کہا جائیگا۔ اسی کو دور حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں (Sublimation) کہتے ہیں۔ یعنی زائد قوتوں کا دوسری طرف منتقل کر کے توازن قائم رکھنا۔ توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس حلقے کو بھی کِیْظَامَۃ کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے باندھی جاتی ہیں۔ نیز اس میخ کو بھی جس کے ساتھ ترازو کی زبان گھومتی ہے اور بتاتی ہے کہ دونوں پلڑوں میں سے کونسا بھاری اور کونسا ہلکا ہے۔ جب ان کا وزن برابر ہو جاتا ہے تو یہ زبان درسیان میں ٹھہر جاتی ہے\*۔ نیز کَاطِمِیْنِ النَّفِیْظِ کے معنی ہیں زائد توانائیوں کو اس طرف منتقل کر کے جہاں ان کی ضرورت ہو، اپنی ذات اور معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے۔ قرآنی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف افراد کی توانائیوں کا جائزہ لیتا رہے۔ جہاں جہاں ان کی ضرورت ہے انہیں اس طرف منتقل کر کے، کظامت کے ذریعے، معاشرہ کا توازن قائم رکھے اور معاملات میں درستگی پیدا کرتا رہے۔ اس طرح ایک فرد کی ذات میں بھی توازن قائم رہے گا اور سارے معاشرہ میں بھی۔ یوں جماعت مومنین کَاطِمِیْنِ النَّفِیْظِ ہو جائیگی۔ واضح رہے کہ جس چیز کو (Rational) کہا جاتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ اسمیں صحیح (Ratio) ہوتی ہے۔ جماعت

مومنین چونکہ اپنی ذات اور معاشرہ میں صحیح صحیح توازن رکھتی ہے اسلئے اسکی ہر بات (Rational) ہوتی ہے اور یہ (Ratio) کظامت کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے۔ توازن یا تناسب (Ratio) کے صحیح ہونے کا نام حسن ہے۔ اسی سے قرآن کریم نے ”نیکوں اور بھلائیوں“ کے لئے حسنات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور صفات خداوندی کو الاسماء الحسنی سے تعبیر کیا ہے۔ (تفصیل ان نکات کی ح۔ س۔ ن کے عنوان میں ملیگی)۔

## ک ع ب

الْكَعْبَةُ\*۔ ہڈیوں کا ہر جوڑ۔ ابھری ہوئی ہڈی جو پاؤں کے اوپر یا ہڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہوتی ہے۔ یا بالخصوص پاؤں کا ٹخنہ۔ سورۃ مائدہ میں كَعْبَتَيْنِ۔ دونوں ٹخنوں کے لئے آیا ہے (۹)۔ الْكَعْبُ\*۔ الْكَعْبَةُ\*۔ مربع ہڈی (جس پر نشانات لگے ہوتے ہیں اور) جسے کھیلنے میں پھینکا جاتا ہے\*۔ (عام طور پر ان سے جڑا کھیلا جاتا ہے۔ انہیں ہانسیہ کہتے ہیں) كَعْبَةُ\*۔ اونچی اور مربع جگہ کو کہتے ہیں۔ ہر چوکور مکان کو\*\*۔ لکن الْكَعْبَةُ\* خانہ کعبہ کے لئے مخصوص ہو گیا۔ الْكَعْبُ\*۔ شرف اور بزرگی کو بھی کہتے ہیں\*۔ الْكَعْبُ\*۔ ابھرا ہوا پستان۔ اسی جہت سے الْكَاعِبُ\*۔ نوجوان لڑکی کو کہتے ہیں۔ جمع كَعَوَاعِبُ\*۔ سورۃ النبا میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے لئے كَعَوَاعِبُ اَتْرَابًا آیا ہے (۶۸)۔ انہی کو دوسری جگہ عُرْبًا اَتْرَابًا کہا گیا ہے (۵۶)۔ اور اس کی تفسیر ذرا پہلے فُرُشِ مَرْفُوعَةٍ کہہ کر کر دی گئی ہے (۵۶)۔ یعنی عالی مرتبت، بلند پایہ خواتین۔ اس لئے كَعَوَاعِبُ میں جوانی کی تندرستی کے ساتھ ساتھ شرف و مجد (الْكَعْبُ) کی طرف بھی اشارہ ہے۔ (نیز دیکھئے ع۔ ر۔ ب اور ت۔ ر۔ ب) قرآن کریم کی رو سے کعبہ کا صحیح مقام کیا ہے، اس کے لئے عنوان، (ق۔ ب۔ ل)، میں لفظ قِبْلَتہ\* دیکھئے۔

## ک ف ا

كَافَاہُ عِلَّتِي الشَّقِيئِ\*۔ مَكَافَاةٌ\*۔ كِفَاءٌ\*۔ اس نے اس چیز پر اسے بدلہ دیا۔ كَافَاہُ\*۔ اس نے اس کی برابری کی۔ اس کا ہم پلہ ہوا۔ تَكَافَا الشَّقِيئَانِ\*۔ دونوں چیزیں برابر برابر ہو گئیں۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔

اسی لئے کُفُوٌ، وکُفُوٌ، وکُفُوٌ کے معنی اس کی مثل و نظیر اور اس کے ہم پلہ کے ہیں۔ اَلْکُفَاةُ رَفِی السَّیْکَاحِ اسی سے ماخوذ ہے۔ یعنی شوہر کا اپنی بیوی سے حسب، نسب، گھرانے وغیرہ میں برابر ہونا\*۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ وَلَمْ یَتَّکُنْ لَہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲)۔ اس کے برابر، ہمسر، ہم پلہ کوئی نہیں۔ یہ چیز ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر (Personality) منفرد (Individual) اور یگانہ (Unique) ہوتی ہے۔ اور خدا کی ذات چونکہ مطلق اور مکمل ہے اس لئے اس کی انفرادیت بھی یکسر مکمل اور بے نظیر ہے۔ سورۃ اخلاص بالخصوص، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Characteristics) کی شارح ہے۔ اس میں احدیت، ذات کی یگانگت (Uniqueness) پر دلالت کرتی ہے۔ صمدیت، اس کی آزادی (Freedom) کی شہادت دیتی ہے۔ عدم تولد، یہ بتاتا ہے کہ ذات، انسانی جسم کی طرح سلسلہ تولد و تناسل کی رو سے وجود میں نہیں آتی۔ اور کفو اس کی انفرادیت (Individuality) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں دیکھئے)۔

## ک ف ت

کَفَّتَ الشَّیْءُ لَیْسَ لَہٗ۔ اس نے چیز کو اپنے اندر لے لیا۔ کَفَّتَ الشَّیْءُ۔ اس چیز پر قبضہ کر لیا\*\*۔ جمع کر لیا\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَفَّتَ تیز ہانکنے کو بھی کہتے ہیں۔ کَفَّتَ الطَّائِرُ۔ پرندے نے اڑنے میں پھر سمیٹے اور تیز اڑا۔ اَلْکِیْفَاتُ۔ وہ جگہ جہاں کسی چیز کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ ہر کیفیات اَلْاَحْیَاءِ مکانوں کو اور کیفیات اَلْاَمْوَاتِ قبروں کو کہتے تھے\*\*۔

قرآن کریم میں ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِیْفَاتًا (۴۰)۔ کیا ہم نے زمین کو کیفیات نہیں بنایا۔ یعنی اس میں ہر قسم کی چیزیں جمع کر دیں۔ جمادات۔ نباتات۔ حیوانات۔ ہاتی۔ ہوا وغیرہ۔ نیز جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، کَفَّتَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی (اڑنے میں پروں کو سمیٹا)۔ فَرَسٌ کَفَّتَ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو یک بارگی اچھل پڑے اور سوار کا اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے\*\*۔ اس اعتبار سے زمین کے کیفیات سے مراد یہ ہوگی کہ یہ تیزی سے چل رہی ہے۔ یا دونوں معانی کو یک جا کرنے سے مطلب یہ ہوگا کہ یہ تمام چیزوں کو اپنے اندر لئے ہوئے نہایت تیزی سے چل رہی ہے۔

\* تاج و محیط و راغب۔ \*\* تاج۔ \*\*\* راغب و ابن فارس

## ک ف ر

کُفِّرَ کے معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے آتے ہیں۔ الرمانی نے أَخْفَى - سَتَرَ اور أَجَنَ کو کُفِّرَ کا مرادف لکھا ہے۔\*\*۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے کئے ہیں۔ چنانچہ اس شخص کو جو اس طرح ہتھیاروں میں ڈوب جائے کہ اس کا بدن نظر نہ آئے کَافِر کہا جاتا ہے۔ رات کو بھی کَافِر کہتے ہیں کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ سیاہ بادل کو بھی کَافِر کہتے ہیں۔ نیز دریا اور سمندر کو بھی کیونکہ یہ اپنی اندرونی چیزوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ کسان کو بھی کَافِر کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے\*۔ تاج، نیز صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ قبر کو بھی اَلْکُفْرُ کہتے ہیں۔ ان معانی کے اعتبار سے مومن کے مقابل میں کَافِر اُسے کہا جائے گا جو ٹھوس سچائیوں کو پس پردہ رکھنا چاہے۔ جو خدا کے دئے ہوئے ابدی حقائق کو پوشیدہ رکھے اور انہیں ابھر کر سامنے نہ آئے دے۔ یا جو اپنی یا دوسروں کی صلاحیتوں کو چھپائے اور انہیں بروئے کار نہ آئے دے۔ ان کی نشو و نما نہ ہوئے دے۔

چھپانے کے مفہوم کی وجہ سے اس کے معنی انکار کرنے کے بھی ہو گئے۔ اِیْمَان کے مقابل میں کُفْر کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ یعنی قرآنی صداقتوں کا انکار کرنا۔

کُفِّرَ بمقابلہ شُکِّرَ بھی آتا ہے۔ اس لئے کہ شکر کے معنی ہیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا (دیکھئے ش۔ ک۔ ر)۔ لہذا کُفْرانِ نعمت کے معنی ہیں نعمتوں کا چھپا لینا۔ انہیں نوع انسانی کے فائدے کے لئے کھلا نہ رکھنا۔

کُفَّارَہ کو کفارہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ غلط کام کے ضرر رساں نتیجہ کو ڈھانپ لیتا ہے\*۔ کُفِّرَ کے تین مصدر ہیں۔ (۱) کُفِّرَان\*۔ (۲) کُفِّرَ اور (۳) کُفُّوْر\*۔ کُفِّرَان کا استعمال عام طور پر انکارِ نعمت کے لئے ہوتا ہے اور کُفِّرَ کا استعمال دینی معاملات کا انکار کرنے کے لئے۔ اور کُفُّوْر ان دونوں میں استعمال ہوتا ہے\*۔ صاحب تاج نے البصائر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیشتر کَافِر (بمعنی کافر دین) کی جمع کُفَّارَہ آتی ہے۔ (۴۹) اور کَافِر (بمعنی کافرِ نعمت) کی جمع کُفَّرَہ\*۔ (مثلاً ۸۴ میں)۔ لیکن



ہمارا خیال ہے کہ قرآن کریم میں کُفَّارٌ - کُفْرَةٌ اور کَافِرُونَ سب ہی جمعیں بلا تفریق، کافر دین کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ کَافِرٌ - ویسے تو اس خول کو کہتے ہیں جو شگوفہ کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے\* لیکن یہ ایک مشہور خوشبودار دوائی کا بھی نام ہے جس کا اثر حیدت کو کم کر دینا ہوتا ہے۔

کُفَّورٌ - بڑا ناشکرا، بڑا منکر حق۔ اس میں کافر سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۳۱/۳۲)۔ اور کُفَّارٌ بھی کُفَّورٌ کے ہم معنی ہے، بلکہ اس میں کبھی کُفَّورٌ سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۵۲/۳۲)۔\*\*

قرآن کریم میں کُفَّرَ بمقابلہ اٰیْمَانٍ متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۲/۲۶ میں)۔ اور شُکِّرَ کے مقابلہ بھی (۱/۲)۔ سورہ انبیاء میں مومن کے متعلق کہا ہے کہ فَنَالَهُ كُفْرًا اَن لِّسَعْيِهِ (۲/۲۶)۔ یعنی اسکی کوششوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وہ بے نتیجہ نہیں رہیں گی (اس لئے کہ شُکِّرَ کے معنی ہیں کوششوں کے بھر پور نتائج مل جانا)۔ اسی طرح وَمَا يَفْعَلُوْنَ مِّنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوْهُ (۱۱۳/۳۱) کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی ان کا ہر عمل خیر پورا پورا نتیجہ مرتب کریگا۔

سورہ بقرہ میں اٰیْمَانٍ بِاللهِ کے مقابلہ میں کُفَّرَ بِاِلْطَاغُوْتِ کی تاکید آئی ہے (۲/۲۵۶)۔ اس کُفَّرَ بِالطَّاغُوْتِ کی تشریح دوسرے مقام پر وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتِ (۱۱۶/۳۱) کہہ کر کر دی۔ یعنی غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کرو۔ اس کی تفسیر سورہ نساء میں ان الفاظ سے کر دی کہ یُسْرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّعَا كُمْ وَاللّٰی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِہِ (۲/۲۶) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین سے کرائیں حالانکہ ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قانون سے اجتناب کریں۔ اُن سے انکار کر دیں۔ کہہ دیں کہ ہم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

لہذا اٰیْمَانٍ بِاللهِ (یا اللہ کی عبادت)\*\*\* کے معنی ہیں خدا کے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اور کُفَّرَ بِاِلْطَاغُوْتِ کے معنی ہیں غیر خدائی قانون سے اجتناب کرنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذہن تک محدود ہوں۔ ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے۔ قرآن کریم کے قانون کی صداقت کو

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتِ (۱۶/۲۱)۔

تسلیم کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اسکے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے۔ چنانچہ (۳/۴) میں کَفَرًا کے مقابلہ میں عَمِلَ صَالِحًا آیا ہے۔

انکار کے لحاظ سے اس کے معنی بری الذمہ ہونے کے بھی آتے ہیں۔ سورہ ابراہیم میں ہے اِنْتِیْ کَفَرْتَ بِمَاۤ اَشْرَکْتَ مَعُوْنَ (۱۲)۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا تو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ کاشفکار کے معنوں میں کَفَرًا جو کاذب کی جمع ہے (۵۴/۴) میں آیا ہے۔ کَافِرًا کی جمع کُفَرًا (۱/۱) میں آئی ہے۔ کَفَرًا (۳/۵)۔ وہ عمل یا شے جس سے کسی سابقہ لغزش کی تلافی ہو جائے۔

سورہ دھر میں ”جنت کی شراب“ کا مزاج کَافُورًا بتایا گیا ہے (۴/۱)۔ یعنی جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات میں سکون پیدا کرنے والی۔ لیکن یہ انسانی ذات کی اصلاح کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں اس ”شراب“ کا مزاج زَنْجَبِیْلًا (۲/۱) بتایا گیا ہے۔ یعنی مناسب قوت اور حدت پیدا کرنے والی۔ برودت اور حدت (لُھْذُک اور گرمی) کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے، سیرتِ مومن۔

جس سے جگر لالہ میں لُھْذُک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دھل جائیں وہ طوفان

قرآن کریم کی رو سے کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت۔ نفس الامر کا بیان (Statement of Fact) ہے۔ آپ ایک پارٹی بناتے ہیں۔ جو لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں انہیں اس کا ممبر کہا جاتا ہے۔ جو اس میں شامل نہیں ہوتے وہ غیر ممبر (Non-Members) کہلاتے ہیں۔ یہی فرق مومن اور کافر کا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ممبروں کو مومن کہا جاتا ہے۔ اور جو اس معاشرہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ”ذنان ممبرز“ (کافر) ہوتے ہیں۔

ان ”غیر ممبروں“ (کافروں) کے متعلق جس جس عذاب (تباہیوں) کا ذکر آیا ہے وہ ان کی غلط روش کے نتائج ہوتے ہیں جسے وہ صحیح راستہ کے انکار سے اختیار کرتے ہیں۔ یعنی صحیح راستہ کی پیروی چھوڑ کر (۲/۸) غلط راستہ اختیار کر لینا (۲/۹) اور اس طرح تباہیوں میں جا کرنا (۲/۹)۔ کَفَرًا عَنۡہُ کے معنی ہیں دور کر دینا (۲/۱)۔

اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آئیے کہ قرآن کریم نے کفر کا لفظ عملِ صالح کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے (۳/۴)۔ لہذا ایمان اور کفر صرف نظری (Theoretical) اعتقاد نہیں بلکہ عمل اور بے عملی (یا صحیح

عمل اور غلط عمل) کا نام ہے۔ یہیں سے سورۃ البقرہ کی اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور غلط مفہوم سے طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں، انہیں قرآن کریم صحیح روش کی طرف راہ نمائی دیتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ”جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔“ ”کافروں“ سے مراد لئے جاتے ہیں ”غیر مسلم“۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے۔ مسلمان نہیں ہوتے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں (کافروں) کو رسول کا انذار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر رسالت اور تبلیغ ہے کن لوگوں کے لئے؟ مومنین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اور کافروں کو یہ کچھ فائدہ نہیں دیتا! نیز جب نبی اکرمؐ نے انذار شروع کیا ہے تو اس وقت ساری دنیا ”کافر“ ہی تھی۔ اگر حضورؐ کا انذار کفار کے لئے بے سود تھا تو حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی (معاذ اللہ) کچھ نہیں تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں کفار سے مطلب سب غیر مسلم نہیں۔ یہ غیر مسلموں کے ایک مخصوص گروہ کا نام ہے۔ جہاں تک ”غیر مسلموں“ کا تعلق ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائلی باشندے، یا قطب شمالی کے اسکیمو، جنہوں نے ابھی تک اسلام یا قرآن کریم کا نام بھی نہیں سنا، وہ بھی غیر مسلم ہیں۔ لیکن ان کا شمار کفار کے زمرے میں نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، کفر، ایمان کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ایک شخص کے سامنے قرآن کریم کی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں۔ اسے ان کا مفہوم اور مطلب سمجھا یا جاتا ہے۔ وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کے بعد برضا و رغبت انہیں تسلیم کر لیتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے۔ اس کے سامنے بھی اسی طرح قرآنی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسے کافر کہہینگے۔ ان لوگوں کے انکار کی کئی وجوہات اور متعدد محرکات ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اس سے سرکشی ہرتے ہیں۔ خود بھی اس راستے سے رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر غیر مسلم، کافر نہیں ہوتا۔ کافر وہی ہوتا ہے جس کے سامنے حق کو پیش کیا جائے لیکن وہ تمام دلائل و براہین کے باوجود، اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور پھر لاکھ کوشش کرو، وہ اپنی ضد پراڑا رہے۔ کفار کی اس ذہنیت، اور اس کے بعد حق کی مخالفت میں ان کی تگ و تماز کا ذکر، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کیا ہے۔ مثلاً

(۱) وہ اہل کتاب کے متعلق کہتا ہے فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (۲۹)۔ ”جب ان کے پاس وہ آیا جسے وہ پہچانتے تھے، تو انہوں نے اس سے انکار (کفر) کر دیا“۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو، ان کے ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲۹)۔ ”بعد اس کے کہ حق ابھر کر ان کے سامنے آگیا“۔ سورۃ محمد میں ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا . . . . . مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ (۲۴)۔ ”یقیناً جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں . . . . . بعد اس کے کہ ہدایت ان کے سامنے ابھر کر آجاتی ہے . . .“۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ، حق اور صداقت (ہدایت) کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد، اس سے انکار کئے جانا، کفر کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے کفر اور ایمان کے امتیاز کا ذکر ہی حق کے سامنے آ جانے کے بعد کیا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے وَقُلِ الْحَقُّ مِّنْ رَبِّي كَمَا مِثْلُ مَا تُكْتُمُونَ (۱۸)۔ ”اور (ان سے کہو کہ) حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کر لے“۔ سورۃ دھر میں ہے إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۳۱)۔ ”ہم نے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اس کا جی چاہے تو اس کا قدردان بن جائے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے“۔ سورۃ زخرف میں ہے وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ (۳۳)۔ ”اور جب حق ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ ہے اور ہم اس سے انکار کرتے ہیں“۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد اس سے انکار کرنا، کفر کہلاتا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے حق آیا ہی نہیں وہ غلط راستے (ضلالت) پر تو ہیں لیکن انہیں کافر نہیں کہا جائے گا۔ ان کا شمار ضالین میں ہوگا۔ یعنی راہ گم کردہ۔ غلط راستے پر چلنے والے۔

(۲) سورة توبہ میں ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ اِنِ اسْتَحَبُّوْا الْكُفْرَ عَلٰی الْاِيْمَانِ (۲۳)۔ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں۔ اس سے واضح ہے کہ کفر، اس انکار کی راہ کا نام ہے جسے انسان اپنی پسندیدگی سے اختیار کرے۔ اسی طرح سورة النحل میں ہے کہ کفر اس کا ہے مَن شَرَحَ بِاِلٰهٍ كُفْرًا صَدْرًا (۱۶۶)۔ ”جس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے“۔ لہذا کفر وہ ہے جسے انسان اپنے اختیار و ارادہ (Choice) سے پسند کرے۔

(۳) اس قسم کے انکار کے کئی محرکات ہوتے ہیں۔ مثلاً اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ بغیاً ایسا کرتے ہیں (۹۰)۔ یعنی ضد اور سرکشی کی بنا پر۔ یا حسد آ ایسا کرتے ہیں (۱۰۹)۔ عام مخالفین حرب کے متعلق ہے کہ وہ اس دعوت سے انکار کرتے تھے اِسْتِكْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَكْرًا السَّیِّئِ (۳۵)۔ ”تکبر کرتے ہوئے اور بری تدبیریں کرتے ہوئے“۔ یعنی انہوں نے ظلم اور استبداد، اور دجل و فریب سے جو قوت اور دولت حاصل کر رکھی تھی، وہ اس کے نشے میں بدمست ہو کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی۔ (نیز دیکھئے ۲۵)۔ سورة نمل میں ہے کہ وَ جَعَلُوْا اٰیٰہَا وَ اسْتَحَبُّوْا اَنْفُسُہُمْ ظُلُمًا وَّ عُتُوًّا (۲۴)۔ ”انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہماری آیات سے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا“۔

(۴) بعض اوقات انسان، محض بات کی پیچ میں حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک دفعہ منہ سے نہ نکل گئی تو پھر (محض اپنی بات پر جمے رہنے کی خاطر) نہ کرتے چلے گئے۔ سورة اعراف میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْہُمْ رُسُلُہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ۔ فَمَا کَانُوْا لَیْسُوْا بِمَعَاکِذَ بَؤْسًا مِّنْ قَبْلِ (۱۰۹)۔ ”اور یقیناً انکے پاس رسول واضح دلائل لیکر آئے۔ مگر وہ ایسے نہ تھے کہ جس بات کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا، اس پر ایمان لے آئے“۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ کَذٰلِکَ اِلَیْکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیۡنَ (۱۰۹)۔

(۵) یہ لوگ، ضد۔ حسد۔ ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے بعد، دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ وہ ایسے تسلیم نہ کر لیں۔ وَ ہُمْ یَنْہَوْنَ عَنۡہُ وَ یَنْہَوْنَ عَنۡہُ (۶۶)۔ ”وہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور

رہتے ہیں۔“ دوسری جگہ ہے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدَّقُوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ .... (۲۴) ”یقیناً وہ لوگ جنہوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے ہیں“ (وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہہ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا النُّقُرِ اِنْ - وہ لوگوں کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہہ اس قرآن کریم کو مست سنو۔ وَالنُّغُوْا فِیْہِ۔ اور (جہاں کہیں اس کا چرچا ہوتا ہو) اس میں شور مچاؤ۔ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (۲۶)۔ شاید تم (اس طریق سے ان پر) غالب آسکو۔

یہ ہیں وہ لوگ کہ سَوَاعٌ عَلَیْہِمْ ؕ اَنْذَرْتَهُمْ ؕ اَمْ لَمْ تُنْذِرْ ؕ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (۲)۔ چاہے تو انہیں (ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرے یا نہ کرے، ان کے لئے برابر ہے۔ یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سمجھنے، سوچنے، دیکھنے، سننے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (۲)۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ لَہُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَہُوْنَ بِہَا۔ وَلَہُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِہَا۔ وَلَہُمْ اُذُنٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِہَا۔ اُولٰٓئِکَ کَاۡلًا نَّعْتَمٰ بِہُمْۚ بَلٰی ؕ هُمْۚ اَضَلُّ (۱۷۹)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (۱۷۹)۔ ”ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (یہ وہی شکل و صورت سے انسان نظر آتے ہیں ورنہ درحقیقت) حیوانات کی مطمح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ“ (کیونکہ وہ کم از کم اپنی جبلت پر توقاںم رہتے ہیں)

سوال یہ ہے کہ یہ کفر کی زندگی ہے کیا؟ یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی ہے کہ ایک تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے۔ کھایا، پیا، زندہ رہے، بچے پیدا کئے اور مر گئے۔ اس کے بعد ختم۔ دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسان، اسی طبعی جسم کا تمام نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات (Personality) کہا جاتا ہے۔ اس ذات کی نشوونما سے انسان حیات جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ حیوانات کو ”ذات“ نہیں دی گئی۔ یہ صرف انسانوں کا خاصہ ہے۔

پہلا تصور زندگی، کفر ہے۔ اس میں انسان، حیوانات کی سطح پر رہتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَسْتَمْتِعُوْنَ بِمَا کُودُوْنَ کَمَا تَاۡکُلُ الْاَنْعَامُ۔ وَالنَّارُ مَشْوٰی لَہُمْ (۱۲)۔ ”جو لوگ کفر کی روش اختیار

کرتے ہیں ، وہ سامان زیست سے متمتع ہوتے ہیں ، اور حیوانات کی طرح کھا ہی کر ( مر جاتے ہیں )۔ جہنم ان کا ٹھکانہ ہے ۔ یہ زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہیں رکھتے ( کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف ذات کی نشوونما کے لئے ہوتی ہے )۔ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں ، اور ان جذبات میں ایسے ڈوبتے ہیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ سورہ الجاثیہ میں ہے اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اللّٰهَ هَوٰیۙہٗ ۔ کیا تو نے اسکی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا اللہ بنا لیا ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلّٰہُ اللّٰهُ عَمَلٰہُۙ عِلْمَہٗ ۔ خدا کا قانون ، اس کے علم کے باوجود ، زندگی کی صحیح راہ اس کے سامنے نہیں لانا ۔ وَخَسَمَۙ عَلٰی سَمْعِہٖۙ وَتَلٰہُہٗۙ وَجَعَلَۙ عَلٰیۙ بَصَرِہٖۙ غِشًاۙ وَہٗۙ ۔ (جذبات میں بہ جانے سے اسکی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ) اس کے کانوں پر اور دل پر مسہریں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْۙ يَّهْدِیْہٖۙ مِّنۡۙ بَعْدِ اللّٰہِۙ ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کے علاوہ کوئی اور قانون صحیح راستے کی طرف اسکی راہ نمائی نہیں کر سکتا ۔ اَفَلَاۙ تَذٰکَّرُوْنَۙ ۔ کیا یہ لوگ اس سے نصیحت نہیں پکڑتے ؟ (۴۳)

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح جذبات کے پیچھے کیوں یہ جاتے ہیں اور زندگی کی بلند اقدار کا اتباع کیوں نہیں کرتے ؟ اس لئے کہ وَقَالُوْۤا مَا ہِیَۙ اِلَّاۙ حَیٰۤآۃٌۢ نَّحْنُۙ النّٰثِرِۙہٗۙ ۔ اور کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ نَمُوْتُۙ وَنَحْنُۙہٗۙ ۔ ہم (طبیعی قوانین کے ماتحت) مرتے اور جیتے ہیں ۔ وَمَاۙ یُّہْدِیْکُمْۙ اِلَّاۙ اللّٰہُۙہٗۙ ۔ وقت گزرنے سے ہمارے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور ہم مرجاتے ہیں ۔

یہ ہے ان کا تصور زندگی ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَاۙ لَہُمْۙ بِذٰلِکَۙ مِّنۡۙ عِلْمٍۙ اِنْۙ ہُمْۙ اِلَّاۙ یَنْظُنُّوْنَۙ (۴۴) ۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ۔ یونہی اپنے قیاسات سے باتیں کرتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے ۴۶)

اسی کا نام کفر ہے ۔ یعنی انسان کا اپنی ذات سے انکار ۔ اس انکار کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے ، نہ وحی اور رسالت پر ۔ اور آخرت کی زندگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہذا ، کفر درحقیقت مادی تصور حیات کا دوسرا نام ہے ۔ یعنی (Materialistic Concept of Life) ۔ اس تصور زندگی کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین ، انسان کا منتہائے زندگی قرار پا جاتا ہے اور زندگی کی بلند اقدار یا غیر متبادل اصولوں کی پہچاندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

جب انسان اس تصور زندگی کو عین حقیقت سمجھ لے ، تو جن امور سے بلند انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے ، اسے ان سے آگہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے ۔ حیوان کو آپ کیا سمجھا سکتے ہیں کہ دیانتداری کی زندگی بہت بلند ہوتی ہے اور بددیانتی سے شرف انسانیت کا زیاں ہو جاتا ہے !

## ک ف ف

الْكَفَّ (۱۳) - پہنچے تک ہاتھ کو کہتے ہیں ، کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مدافعت کرتا اور دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے سے روکتا ہے ۔ كَفَفْتُهُ عَنْهُ (۱۱) - میں نے اسے اس بات سے روک دیا ۔ ہٹا دیا ۔ سوڑ دیا ۔ فَكَفَّ هُوَ - پس وہ رک گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہکڑنا اور سکڑنا ہیں ۔ ہاتھ کو كَفَّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چیزوں کو ہکڑ لیتا ہے ۔ الْكَفْفَةُ - کسی چیز کے آخری کنارے کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ اسی کو كِفَافُ الشَّيْءِ بھی کہتے ہیں ۔ كِفْفَةُ - ترازو کے ایک ہلڑے یا بازو کو کہتے ہیں ۔ كَافَّةً اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اُس کی انتہا تک لے جا کر روک دے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں جو ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً (۹) - تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ”مشرکین سے ایسی جنگ کرو جو انہیں ظالم و ستم سے روک دے۔ یا جو تمہیں ان کے اثرات سے روک دے۔“ اس صورت میں كَافَّةً صفت ہوگی حَرًّا یا مَقَاتِلَةً کی جو مقدر ہے ۔ اسی کو حد آخر تک جنگ کرنا کہا جائیگا ۔ اور (جیسا کہ راغب نے آگے چل کر لکھا ہے) یہ بھی کہ مشرکین سے اجتماعی قوت سے (جماعۃً) جنگ کرو ۔

عام لغت و تفسیر کی رو سے اس آیت میں كَافَّةً کے معنی ہیں ”کل“۔ تمام کے تمام ۔ جمیع“۔ لیکن قرآن کریم میں انہی مشرکین سے جنگ کرنے کا کہا گیا ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ۔ یہ نہیں کہ جو مشرک جہاں بیٹھا ہو اس پر دھاوا بول دیا جائے ۔

أُدْخِلُوا فِي السِّلَاحِ كَافَّةً (۲۸) کے معنی ہیں ، تم اسلام میں وہاں تک پہنچ جاؤ جہاں تک اس کے شرائع کی آخری حدود ہیں \* ۔ یعنی اس کی انتہا تک پہنچ جاؤ ۔ بیونہی تھوڑا سا چل کر رک نہ جاؤ ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی جَمَاعَةً بھی کئے ہیں ۔ یعنی اجتماعی طور پر\*\* ۔ لیکن اس کے معنی روکنے یا حد آخر کے مفہوم سے



زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود راغب نے آیت وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ (۳۸) کے معنی کئے ہیں ہم نے تمہیں معاصی سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے \*\*\*۔

روکنے کے معنی میں يَكْفُتُونَ (۲۹) میں آیا ہے۔ اور (۲۸) میں بھی۔ نیز بَسْطٌ کے مقابلہ میں (۱۱) میں۔ اَلْكَفَّافُ مِّنَ الرِّزْقِ - رزق کی اتنی مقدار جو انسان کو دوسرے انسانوں کا محتاج بننے سے روک دے \*۔ اسی لئے اَلْكَفُّ کے معنی نعمت کے ہیں \*۔

## ک ف ل

اَلْكَفْلُ - کھولھے یا کولھے کے نچلے حصے کو کہتے ہیں \*۔ اَكْتَفَلَ بِهِ - اسے پیچھے کر دیا \*۔ اسی سے اَلْكَافِلُ اور اَلْكَفِيلُ کے معنی ذمہ دار اور ضامن کے آتے ہیں۔ کَفَلَتْ - اسکی خبر گیری کی۔ اس پر خرچ کیا۔ اسکا انتظام کیا \*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دوسری چیز کے اندر شامل ہو جانے اور متضمن ہو جانے کے ہیں۔

سورہ قصص میں ہے يَكْفُلُوْا نَهْ (۲۸)۔ جو اسے ہالیں۔ اسکی پرورش اور نکلہ ہر داخت کریں۔ سورہ نحل میں ہے۔ قَدْ جَعَلْتُمْ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا (۱۶)۔ تم اللہ کو اپنا ضامن قرار دے چکے ہو۔ سورہ ص میں ہے اَكْفِيْلُنِيْهَا (۳۸)۔ اس (دُنئی) کو میری کفالت میں دیدے۔ میرے سپرد کر دے۔ میری ملکیت بنا دے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔ وَكَفَلْتُمْ اَزْكَرَ بَقَا (۳۶)۔ مریم کو زکریا کی کفالت میں دیدیا۔

اَلْكَفْلُ - حصہ - نصیب - یہ اسوقت بولتے ہیں جب کسی کے ساتھ دوسرے کو بھی اتنا ہی حصہ دیا جائے \*۔ (۸۵) - كِفْلَيْنِ - دو حصے۔ دو گونہ حصے (۲۸)۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہاں کِفْلَيْنِ سے مراد دو عدد نہیں بلکہ تواتر و تسلسل نعمت مراد ہے اور اس میں حسب ضرورت کا مفہوم بھی ہے \*\*\*۔

سورہ انبیاء میں ذَا الْكِفْلِ (۸۵) کا نام زمرہ انبیاء میں آیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ شاید یہ حزقیل نبی ہوں جن کا ذکر توریت میں آتا ہے \*\*\*\*۔

\* تاج - \*\* محیط - \*\*\* راغب - \*\*\*\* بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ذوالکفل سے مراد کھل و ستو والا (یعنی گوتہ بدھ) ہیں۔

چونکہ قرآن کریم نے ان کے احوال و کوائف بیان نہیں کئے اس لئے اگر متعین طور پر نہ بھی کہا جاسکے کہ یہ کون تھے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نیز دیکھئے عنوان ذَا الْکِفْلِ۔

## ک ف ی

الْکِفَايَةُ\*۔ وہ چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور مقصود حاصل ہو جائے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اتنی مقدار میں ہونا کہ وہ ضرورت کو پورا کر دے اور اس سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو۔ کَفَاكَ الشَّيْءُ\*\*۔ یتکفیک۔ تجھے وہ چیز کافی ہے۔ الْکَفَايَةُ\*۔ غذا جو زندگی کے لئے کافی ہو۔ کَفَاهُ مَثْوًى نَتَتْهُ\*۔ فلان آدمی نے اس کے ہر مشقت کام کو اپنے سر لے لیا اور اسے اس سے بچا دیا\*\*\*۔ شَرَّ عَدُوٍّ\*۔ میں نے اسے اپنے دشمن کے شر سے محفوظ رکھا اور بچا لیا\*\*\*۔ رَجُلٌ كَافٍ وَكَفِيٌّ\*۔ جو تمہارے لئے کافی ہو اور اس کے بعد تمہیں کسی کی ضرورت نہ ہو۔ کَافَاهُ مَكَا فَاهُ\*۔ وہ اس کو کافی ہو گیا\*\*\*۔ الْکَفِيُّ\*۔ بارش\*\*۔ کَفَى عَيْنَهُ الشَّيْءُ\*\*۔ اس چیز کو اس سے ہٹا دیا یا پھیر دیا\*\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ اِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (۱۵)۔ یہ لوگ جو تیرے خلاف شرارتیں کر کے خوش ہوتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کی مخالفت سے تیری مدافعت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ہمارا قانون جس پر تو چل رہا ہے ان کے مقابلہ میں تیری حفاظت بھی کریگا اور تیرا مقصود بھی حاصل ہو جائیگا۔ (کَفَى میں دونوں باتیں شامل ہیں)۔ انہی معنی میں ہے فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ (۱۳۷)۔ سورہ زمر میں ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ (۳۶)۔ خدا کے احکام کی اطاعت کرنے والے (عَبْدُ) کو خدا کا قانون مکافات تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے اس کی منزل مقصود تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ اس کی تشریح اس سے گلے ٹکڑے نے یہ کہہ کر کر دی کہ وَيُخَيِّطُ لَّكَ بِأَلْيَدٍ مِّنْ دُونِهِ (۳۶)۔ یہ لہوگ تجھے غیر خدائی قوتوں سے ڈراتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

یہ ہے قوانین خداوندی کے اتباع کی بنیادی خصوصیت۔ سورہ رعد میں ہے۔ کَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا (۱۳)۔ شہادت (یا نگرانی) کے لئے خدا کافی ہے۔

انسان کے لئے کس قدر اطمینان اور سکون کا موجب ہے یہ بات کہہ اسے  
ایسا ضابطہ زندگی مل جائے جو اسے تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھے  
اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دے۔ اور اس طرح اسے دنیا کی ہر  
آستان سے مستغنی کر دے۔

## ک ل ا

كَالًا - يَكْلًا - كَلًا - وَكِيلًا وَكِيلَاءَةً - حفاظت کرنا۔  
چوکیداری کرنا۔ نگرانی کرنا۔ \* اَلْمُكَلَّلَاتُ - نہر کا کنارہ۔ ساحل۔  
بندرگاہ۔ ہر وہ مقام جہاں ہوا سے پناہ لی جائے۔ \*\*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ  
کے بنیادی معنوں میں دیکھ بھال کرنا اور چوکیداری کرنا لکھے ہیں۔  
قرآن کریم میں ہے۔ مَن يَكْلَلُكُمْ (۱۱۲)۔ تمہاری حفاظت کون  
کرتا ہے؟ کون تمہارا نگران ہوتا ہے؟

## ک ل ب

اَلْكَلْبُ - ہر چیز پھاڑ کرنے والے جانور (درندے) کو کہتے ہیں۔  
لیکن اس کے بعد یہ لفظ کتبے کے لئے ہی استعمال ہونے لگا (۱۱۶)۔ ویسے شیر  
کو بھی کہتے ہیں \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی  
چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ سختی سے لٹک جانا ہیں۔ چنانچہ اَلْكَلْبُ  
آنکڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سامان لٹکایا جاتا ہے۔ اَلْمُكَلَّبَةُ مِین  
النَّعِيشِ۔ روزی کی تنگی \*۔ اَلْمُكَلَّبُ کتوں کو شکار کے لئے سدھانے والا \*۔  
پھر یہ عام شکاری جانوروں (اَلْجَوَارِحُ) کو سدھانے کے لئے استعمال ہونے  
لگا۔ سورۃ المائدہ میں ہے وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلَّبِينَ  
تَعْلَمُوْنَ نَهْنُ مِمَّا عَلَّمْتُمْ اَللّٰهُ... (۵)۔ اور (تمہارے لئے حلال  
کیا گیا ہے) جو تم شکاری جانوروں کو شکاری تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ۔ تم ان  
کو سکھاتے ہو اس (علم) کی رو سے جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔

(ضمناً) اس آیت میں ایک چیز اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں کہا گیا  
ہے کہ تم شکاری جانوروں کو جو شکار کرنا سکھاتے ہو تو یہ اس علم کی رو  
سے ہے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ نے یہ علم، شکاریوں  
کو خود نہیں سکھایا۔ اس نے اس کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ  
دی ہے۔ اب جو انسان چاہے اس علم کو سیکھ لے۔ اللہ نے اس کی نسبت اپنی

طرف اس لئے کی ہے کہ اس علم کی تحصیل کی استعداد انسان کو اس نے دی ہے۔ لہذا، انسان جو کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کی رو سے کرتا ہے، اسے اللہ اپنی طرف بھی منسوب کر لیتا ہے۔ اس نکتہ کے سمجھ لینے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جائے ہیں۔ (مثلاً دیکھئے ۲۴۲)۔

## ک ل ح

كَانَحَ يَتَكَلَّحُ \* كَاوُحًا وَّ كَلَّاحًا - ترش روئی کے ساتھ ہونٹوں کا اوپر کو اٹھ جانا اور دانتوں کا نظر آنے لگنا، برا منہ بنانا۔ بڑی شدت سے منہ بگاڑنا۔ اَلْكَوْلُحُ - بد نما آدمی۔ اَلْكُلَّاحُ - فقط سالی کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی ترشرونی اور چہرے کے بد نما ہونے کے لکھے ہیں۔

سورة مومنون میں ہے هُمْ فِيْهَا كَالِحُونَ (۲۳)۔ وہ اس میں برا منہ بنا رہے ہونگے۔

## ک ل ف

اَلْكَفَّةُ - سیاہی مائل زردی۔ اَلْكَفَّةُ - سیاہی مائل زرد۔ مشقت کے باوجود جس کام کو برداشت کیا جائے۔ ہر مصیبت یا حق جسے ہدقت و صعوبت برداشت کیا جائے۔ اَلْكَفَّةُ - امر شاق۔ اَلْكَفَّةُ - ایسے کام کا پابند کرنا جو کسی پر گراں گزرے۔ تَتَكَلَّفُ اَلْاَمْرَ - اس نے اسے کام کو باوجود مشقت و تنگی برداشت کر لیا جس کا کرنا اس پر گراں گزرتا تھا\*\*۔ تَتَكَلَّفُ الشَّيْءَ - کسی کام کو اظہار شیفگی کے ساتھ کرنا اگرچہ اس کے کرنے میں اسے مشقت پیش آئے۔ اسی لئے عرف عام میں 'كَفَّةُ' مشقت کو کہتے ہیں اور تَتَكَلَّفُ اس کام کے کرنے کو جو مشقت، تصنع یا اوپرے جی سے دکھاوے کے لئے کیا جائے۔ چنانچہ سورة ص میں جوہ - کہ وَمَا اَنَّا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (۳۸) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ میں دکھاوے کے لئے یہ کچھ نہیں کر رہا۔

قرآن کریم میں کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ لَا يَتَكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلًا وَّ سَعَهَا (۲۸۶)۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتا۔ اس میں یہ سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ایک فرد کی وسعت کی حد وہ ہوگی جس تک وہ اپنی انتہائی کوشش اور محنت کے بعد

پہنچے۔ یہ نہیں کہہ انسان کسی حکم کی تعمیل میں پوری پوری کوشش نہ کرے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لے کہ مجھے اللہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا، انسان پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے تو وہ اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشادہ پیدا ہو۔ یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہیں، جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ کس مقام پر کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں۔

## ک ل ل

کَلَّ\*۔ کسی چیز کے تمام اجزاء۔ سب کا سب۔ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْض\* کے معنوں میں بھی ہوتا ہے\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ایک معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے گھیر لینا بتائے ہیں۔

کَلَّ\* کے معنی وکیل۔ بت۔ نو پیدا مصیبت۔ یتیم بچہ۔ صاحب عیال آدمی کے بھی آتے ہیں۔ نیز ایسا نکما شخص جو دوسرے پر بوجھ ہی بوجھ ہو اور اس میں کوئی بھی خوبی نہ ہو\*۔ هُوَ كَلٌّ عَلٰی مَوْلَاهُ (۱۱۶)۔ وہ اپنے آقا پر سراسر بوجھ ہے۔

کَلَّ\*۔ کَلَال\*۔ کَلَالَة\* کے معنی ہیں عاجز آ جانا، تھک جانا\*۔ اَلْکَلَالَة\*۔ قرآن کریم میں احکام وراثت کے ضمن میں اَلْکَلَالَة\* کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک (۱۱۶) میں اور دوسرا (۱۱۷) میں۔ مفسرین نے اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ کلالہ کسے کہتے ہیں۔ (چونکہ احکام وراثت ایک فنی موضوع ہے اور ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیلی گفتگو نہیں کر رہے اس لئے ہم ان بحثوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ مختصراً یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان میں سے) ایک گروہ کا خیال ہے (اور اکثریت اسی خیال کی حامل ہے) کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد۔ ابن قتیبہ نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے

کہ یہ مصدر ہے تَكَوَلَّاهُ النَّسَبُ سے ، جس کے معنی ہیں ”نسب اس کے اطراف تک پہنچ گیا“۔ باپ اور اولاد آدمی کی دونوں طرفین ہوتی ہیں۔ جب آدمی مر جائے اور نہ باپ چھوڑے اور نہ اولاد تو وہ اس طرح مر گیا کہ اس کی دونوں طرفین چلی گئیں۔ اسے کلالہ کہتے ہیں\*۔

المغرب (لغت کی مشہور کتاب) جلد ۲ - صفحہ ۱۵۹ میں ہے کہ والد اور ولد کے سوا جو وارث بھی ہو وہ کلالہ ہے۔ اور اس کا اطلاق وارث اور موروث دونوں پر ہوتا ہے ، اس قرابت (نسبی) کے اعتبار سے جو والد اور ولد کی حیثیت سے نہ ہو۔ لسان العرب میں (اخفش اور قراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ) کلالہ ، قرابت (نسبی) کی رو سے ہر وہ قرابت مند ہے جو والد اور ولد کے سوا ہو۔ یہ سورہی لغت کی بحث - قرآن کریم نے چار لفظوں میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ کَلَالَةٌ کسی کہتے ہیں - سورۃ نساء میں ہے اِنْ اِسْرُؤُا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَ لَهٗ اُخْتٌ قُلَّتْهَا..... (۱۳۷)۔ ”اگر کوئی شخص مر جائے۔ اس کی اولاد کوئی نہ ہو۔ اور اس کی بہن ہو تو (اس کا حصہ یوں ہوگا)۔ اسی سورت کے شروع میں ہے..... وَ لَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ..... (۱۳۶)۔ ”اور اس کا بھائی یا بہن ہوں تو“۔ یعنی کلالہ ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی اولاد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کا بھائی یا بہن ہو۔ والدین کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ اگر اس کے ماماں باپ ہونگے تو (۱۳۶) کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور طرح ہوگی۔ اور اگر وہ نہ ہونگے تو (۱۳۸) کے مطابق تقسیم اور ہوگی۔

آلِ کَیْسِلٍ - تاج\*\* - اور آلِ کَلَالٍ - حالت - کیفیت\*\*۔

اوپر کہا گیا ہے کہ کَلَّ کے معنی سب کے سب ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْض کے معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ہے کہ ان سے کہا کہ چار پرندے لو اور اُنہیں سداؤ۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ (۱۴۰)۔ اس میں کَلَّ جَبَل سے مراد بعض پہاڑ ہیں۔ لیکن یہاں کَلَّ کے معنی سب بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ کَلَّ اضافی اسم ہے اور جب کسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کے حلقہ میں جس قدر ہوں وہی کل ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں پہاڑ ہی دو چار ہوں۔ اس اعتبار سے کَلَّ کے معنی کَلَّ ہی ہونگے۔ دوسری طرف سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے متعلق ہے۔ وَ اَتَيْنَاهُ مِّنْ شَيْءٍ سَّجَبًا (۱۸۸)۔ ہم نے اسے ہر

قسم کا سامان دے رکھا تھا - اس میں "کل" شے سے مراد دنیا کی تمام چیزیں نہیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ استحکام مملکت وغیرہ کے تمام ضروری سامان دے رکھے تھے اور ان ضروری سامانوں میں سے بھی ہر ایک سامان کا کچھ حصہ - لفظ میں "کا مطلب" کچھ حصہ " ہے -

"کل" کے پہلے "ان" نافیہ اور بعد میں "إلا" آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں "کوئی بھی ایسا نہیں تھا" - "ان" "کل" "إلا" "كَذَّبَ الرَّسُلَ" (۳۸/۱۴) - کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے رسولوں کو نہ جھٹلایا - سب نے جھٹلایا - "كَلَمًا" - جب کبھی - "كَلَمًا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ" (۲۰/۲) - جب کبھی وہ انہیں روشنی دیتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں -

کلا اور کلا - دو جداگانہ الفاظ ہیں - انہیں الگ عنوانات میں دیکھئے -

## کلا (حرف)

کلا - (۱) یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں "نہیں بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ" - کلا "بَلْ لَا تَكْفُرُ مَوْنُ الْيَتِيمِ" (۹۱/۱) - ہر گز ایسا نہیں - بلکہ بات یہ ہے کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے - (اس میں جھڑکنے ، تنبیہ کرنے - یا باز رکھنے - یا مذمت کرنے کا پہلو ہوتا ہے) -

(۲) "حقیقت یہ ہے" - "واقعہ یہ ہے" - کلا "إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ" (۹۱/۱) - حقیقت یہ ہے (یہ امر واقعہ ہے) کہ انسان سرکش اختیار کرتا ہے -

(۳) میرزا ابوالفضل نے نضر بن شعیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی "نعم" (ہاں) کے بھی ہوتے ہیں - سورہ تکوین میں تین بار کلا آیا ہے (کلا "سَوْفَ تَعْلَمُونَ" - "ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ" - "كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ" - (۵۱/۱) - ان آیات سے کلا کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی خلاف حقیقت تصور کی تردید اور حقیقت کے متعلق حتم و یقین -

## کلا

کلا (مذکر) - کیلتا (مؤنث) - "دونوں" کے معنوں میں آتا ہے - کیلاہما - (۸۸/۱) دونوں (ماں اور باپ) - کیلتا الحجۃ - (۸۸/۱) - یہ دونوں باغ -

## ک ل م

کَلِمَةً کے معنی ہیں ایک لفظ - ایک بات - ایک جملہ یا ایک قصیدہ - یا ایک خطبہ - کَلِمَةً یا کَلِمَةً یا کَلِمَةً - تینوں طرح آتا ہے - کَلَام کے معنی ہیں بات \* - کَلِمَات (کَلِمَات کی جمع) کے معنی امور کے بھی آتے ہیں - مثلاً قرآن کریم میں ہے - وَإِذَا بُشِّرَ إِبْرَاهِيمَ رَبَّهُ بِكَتَمَاتٍ (۱۲۳) - جب ابراہیمؑ کو اس کے نشو و نما دینے والے نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے - یعنی اسکے سامنے مختلف امور آئے - وہ مختلف حوادث سے دو چار ہوا - مختلف قسم کی باتوں سے اس کا واسطہ پڑا - مختلف امور اس کے ذمہ لگائے - مختلف معاملات اسکے سپرد کئے - کَلِمَات میں یہ تمام معنی پوشیدہ ہیں -

الْكَلَام کے معنی ہیں زخمی کرنا \* - ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی (۱) بات کرنا اور (۲) زخمی کرنا لکھے ہیں - سورہ نمل میں ہے - أَخْرَجْنَاهُم مِّنْ دَابَّةٍ مِّنْ الْأَرْضِ تَنَكَّلِيهِمْ (۸۴) - یہاں تَنَكَّلِيهِمْ کے معنی زخمی کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور بات کرنے کے بھی - (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان د - ب - ب) نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ ک - ل - م کی خاصیت شدت اور قوت ہے - اس کی مثال الْكَلَام ہے - الْكَلَام سخت زمین کو بھی کہتے ہیں \*\* -

آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو نظریہ زندگی - تصور حیات - یا آئیڈیالوجی (Ideology) کہا جاتا ہے اسے کَلِمَةً سے تعبیر کیا گیا ہے - جیسے سورہ ابراہیم میں ہے - مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْنَاهَا ثَابِتٌ وَقَدْ رُءُوهَا فِي السَّمَاءِ (۱۳) - خوش گوار اور ثمر بار نظریہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سرسبز و شاداب درخت جسکی جڑیں مستحکم ہوں اور جسکی شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جھوم رہی ہوں -

كَلَّمَ - کسی سے بات کرنا (۱۶) - تَنَكَّلَم - کسی سے بات کرنا (۱۶) - نیز یہ شبہ کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے - جیسے مجھے اس میں کلام ہے - یا یہ روایت متکلم فیہ ہے -

سورہ آل عمران میں ہے - إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (۳۳) (اے مریم) خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے -



(اس سے آگے ہے کہ جس کے متعلق خوش خبری دی تھی اس کا نام عیسیٰؑ تھا)۔ عیسائیت میں کَلِمَۃٌ (Word) یا (Logos) ایک خاص اصطلاح ہے جس کے گرد (حضرت) عیسیٰؑ کی اینیت اور الوہیت کا تمام فلسفہ گردش کرتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی دور ازکار فلسفیانہ بحثوں میں نہیں الجھتا۔

سورہ یونس میں (نیز دیگر مقامات میں) ہے وَكَذَٰلِكَ حَقَّقْتُ ۚ کَلِمَۃٌ رَبِّکَ (۱۰/۳۴)۔ اس طرح تیسرے رب کی بات ان پر صادق آگئی۔ ان مقامات میں خدا کے کَلِمَۃ کے سیدھے سادے معنی ”خدا کی بات“ ہی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے۔ چنانچہ یہ لفظ ”قانونِ خداوندی“ کے معنوں میں عام طور پر استعمال ہوا ہے۔ قوانینِ خداوندی کا ایک حصہ خارجی کائنات میں نافذ العمل ہے۔ انہیں (Laws of Nature) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَعَدًا (۱۱/۶)۔ قوانینِ خداوندی صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لَکَلِّمَتِہٖ (۱۱/۶)۔ اس سے ختم نبوت لازم آتی ہے۔ یعنی جب ضابطہ خداوندی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مومن فرد یا جماعت جن حدود و قیود (خدا کے قوانین و اصول) کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر مکلف ہے، ان حدود کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہی حدود اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی بھی متعین کرتی ہیں۔ انہیں مملکت بھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتی ہوئی وہ آزاد ہوتی ہے کہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، اپنے معاملات، باہمی مشاورت سے طے کرے۔

## کم

کَمٌ - (۱) کتنی (مقدار) (۲) کتنی (تعداد) (۳) کتنی (دیر)۔ کَمٌ لَبِثْتُمْ فِی ٱلْأَرْضِ (۲۳/۴)۔ تم کتنی مدت تک زمین میں رہے ہو۔ کَمٌ مِّنْ فِئْتَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئْتَةً کَثِیْرَةً (۲۴/۹)۔ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ (”کئی“ یا ”بہتیری“ سے بھی مفہوم واضح ہو جاتا ہے)

## کُمْ (ضمیر)

کُمْ - ضمیر منصوب متصل ہے - جمع مذکر حاضر کیلئے آتی ہے -  
ضَرَبَکُمْ اس نے تم سب کو مارا - وَعَدَکُمْ اللہ - اللہ نے تم سے وعدہ  
کیا (۳۸) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے - غَلَامَکُمْ -  
تم سب کا غلام - سورہ آل عمران میں ہے مِّنْ رَبِّکُمْ (۳۵) تمہارے رب  
کی طرف سے -

## کُمَا (ضمیر)

کُمَا ضمیر منصوب متصل ہے - تشبیہ حاضر کیلئے آتی ہے - اور مذکر  
و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتی ہے - ضَرَبَکُمَا اس نے تم دونوں (مردوں  
یا عورتوں) کو مارا - يَتَّبِعُکُمَا (۲۴) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل ہے - غَلَامَکُمَا - تم دونوں کا غلام -  
(مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) - سورہ طہ میں ہے لَمِنَ مَعَبَدِکُمَا ... (۲۴)  
”میں تم دونوں کے ساتھ ہوں“ - اس سے ذرا آگے ہے فَمَنْ رَّبُّکُمَا  
يَلْعَنُوسَى (۲۹) - ”اے موسیٰ - تم دونوں (بھائیوں) کا رب کون ہے،؟“

## ک م ل

الْکَمَالَ - پورا ہونا - اَلْکَمَام کے معنی بھی پورا ہونا ہوتے ہیں -  
(ان دونوں میں جو باریک فرق ہے اس کے لئے عنوان - ت - م - م دیکھئے) -  
کَمُلَ - کامل ہونا - پورا ہونا - اَکْمَلَهُ - وَکَمَّلَهُ - اسے  
پورا کر دیا اور خوش نما بنا دیا - اَعْطَاهُ الْکَمَالَ کَمَلًا - اسے پورا پورا  
مال دے دیا\* - راغب نے کہا ہے کہ جب کہا جاتا ہے کَمُلَ ذَالِکَ  
تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس سے غرض تھی وہ حاصل  
ہو گئی\*\* -

روزوں کی گنتی پورا کرنے کے لئے کہا ہے - لِيَتَّكُمُ الْعِيدَ -  
(۱۸۵) - سورۃ المائدہ میں ہے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (۵) - اس کے دونوں  
معنی ہو سکتے ہیں - ایک تو یہ کہ تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل

کر دیا۔ اس سے اسلام کے آخری اور مکمل دین (ضابطہ حیات) ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ”اب تمہیں مخالفین پر پورا پورا غالب کر دیا۔ تمہارے غلبہ کو مکمل کر دیا“۔ یہ اُس وقت کی جماعت مومنین کے متعلق ہے۔ اسی لئے، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالف اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں (۵۱)۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ک۔ م۔ ل کا خاصہ شدت اور قوت ہے۔ کسی شے کے کمال میں اس کی قوت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔\*\*

## ک م م

الْكَفُّمُ - آستین - الْكَيْمُ - وہ غلاف یا خول جس سے پھول یا کالی ڈھکی ہوتی ہے۔ اسکی جمع اَكْمَامٌ ہے - (۱۱۱ و ۱۱۲) - كُمَيْتِ النَّحْلَةِ - کھجور میں بند کلیاں لگ گئیں۔ ایسا درخت مَكْمُومٌ کہلاتیگا۔ اَلْكَمَامُ - اونٹ کے منہ پر جو غلاف (یا چھینکا) چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کو کاٹے نہیں۔ اَلْكَسَّةُ - گول ٹوپی\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپنے والی چیز کے ہوتے ہیں۔

## ک م ہ

اَلْكَمَّةُ - پیدائشی اندھا پن - ایسے اندھے کو اَلْكَمَّةُ کہینگے۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ پیدائشی اور غیر پیدائشی دونوں کے لئے آتا ہے۔ كَمِيهَ النَّهَارِ - آفتاب پر غبار چھا گیا اور دن اندھیرا ہو گیا۔ كَمِيهَ فُلَانٍ - فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی - (یعنی بصیرت کم ہو گئی)۔ اَلْكَامِيهَ - وہ شخص جو اٹھ کر، جدھر اس کے جی میں آئے چل دے\*۔

سورة آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا ”وَ اُبْرِي“ اَلْكَمَّةُ (۳۸) - میں اندھوں کو نگاہ عطا کروں گا۔ جس کی بصیرت کم ہو چکی ہے میں اُسے واپس لا دوں گا۔ جو بغیر راستہ معلوم کئے یونہی چلے جا رہے ہیں میں انہیں راستہ دکھا دوں گا۔ میں ان کے لئے منزل متعین کروں گا۔ رسول کا یہی کام ہے جسے وہ وحی کے ذریعے سر انجام دیتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر راہ گم کردہ لوگوں کو اندھے اور صحیح راستے پر چلنے والوں کو آنکھوں والے کہا ہے۔

## ک ن د

كَتَدَ الشَّيْءُ يَكْتَدُهُ - اس نے اس چیز کو کاٹ دیا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ كَتَدَ التَّيْعُمَةَ - اس نے کفرانِ نعمت کیا۔ اَلْكَتَوْدُ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو تنہا خور ہو۔ لوگوں کی مدد نہ کرے اور غلاموں کو مار پیٹ کرتا رہے۔ یا وہ جو مصیبتوں کو گنتا رہے اور بخششوں کو بھلا دے\*۔ یعنی ناقدرا۔ نیز وہ زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو\*\*۔ اَلْكَتْدَةُ پہاڑ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ (۱۰۶)۔ یعنی انسان کو اگر علیٰ حالیہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شخص کے مانند ہو جاتا ہے جو تنہا خور ہو اور اپنے نشو و نما دینے والے کے عطا کردہ سامانِ رزق میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاہے۔ وہ ایسی سنگلاخ زمین بن جاتا ہے جس سے ربوبیت عامہ کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں۔ یہ ہے ”رب کی ناقد رشناسی“۔

## ک ن ز

اَلْكَتْرُ - زمین کے نیچے مدفون مال - (جمع كُتُوْرٌ)۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں۔ كَنْزٌ - يَكْنِزُ - دولت جمع کرنا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں اکٹھا ہونے کے ہیں۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُوْنَ . . . هَذَا مَا كَنْزْتُمْ . . . مَا كَنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۳۵-۳۶) میں مال و دولت جمع کرنے ہی کے معنی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے افراد کے لئے، مفاد خویش کی خاطر، دولت جمع کرنا جہنم تیار کرنا ہے۔ قرآنی نظام معیشت میں افراد کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس میں ہر فرد پوری پوری محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے نظام معاشرہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ نظام عند الضرورت اس کی اور اس کی اولاد کی تمام بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ لہذا اس نظام میں دولت جمع کرنے یا جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ جائداد بھی منجمد شکل میں جمع شدہ دولت ہی ہوتی ہے۔

سورۃ کہف میں ہے - كَنْزٌ لَّكُمْ (۱۸) - ان کی مدفون دولت۔ دبا ہوا خزانہ۔ سورۃ قصص میں كُتُوْرٌ اور مَفَاتِيْحٌ ایک ہی معنوں میں

استعمال ہوئے ہیں (۲۸)۔ یعنی خزانے۔ اَلْکَنْیُزُ - وہ کھجوریں جو ٹوکروں یا پرتنوں میں بھر کر سردی کے لئے محفوظ کر لی جائیں\*۔

## ک ن س

کَنْسَ الطَّبَسُ بِکَنْسٍ - ہرن اپنے چھپنے کی جگہ (جھاڑیوں میں) چھپ گیا۔ اَلْکَنْسُ - گھنے درخت جہاں جنگلی جانور پناہ لیتے ہیں۔  
اَلْکَنْسَۃُ - گھورا، جہاں کوڑا کرکٹ ڈال دیا جاتا ہے۔ نیز خود اس کوڑے کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ (غالباً اس لحاظ سے کہ ایسے مقامات کو ڈھانپ کر، یا نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کے بالائی حصہ سے کسی چیز کو ہٹا دینا اور (۲) چھپا دینا۔

قرآن کریم میں اَلْجَوَارِ اَلْکَنْسِ (۸۱) آیا ہے۔ ایسے سیارے جو چلتے چلتے غروب ہو جائیں۔ چھپ جائیں۔ (نیز دیکھئے عنوان خ - ن - س)۔  
اَلْکَنْیُۃُ - یہودیوں یا نصرانیوں کی عبادت گاہ\*\*\*۔ (نیز خوبصورت عورت کو بھی کہتے ہیں)\*\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ "کَنْیُۃ" کا عرب ہے جو یونانی الاصل ہے اور جس کے معنی جماعت کے ہوتے ہیں\*\*\*۔

## ک ن ن

اَلْکِنُّ - اَلْکِنَّةُ - اَلْکِنَانُ - ہر چیز کا غلاف اور پردہ۔ اَلْکِنُّ - وہ جگہ جہاں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے\*\*۔ اَلْکِنُّ کی جمع اَلْکِنَانُ اور اَلْکِنَانُ کی جمع اَلْکِنَّةُ آتی ہے۔ (۱۸/۵۷ ; ۱۶/۳۶ ; ۲۱/۵)۔ حفاظت کی جگہ (۱۱/۸)۔

کَنْشَ - اَلْکَنْشَ - اُسے چھپا دیا\*\*۔ (۲۴/۲۴) میں یہ لفظ بمقابلہ یَعْلِنُونَ آیا ہے۔ (اِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ) "یقیناً تمہارا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں"۔ یعنی اس کے معنی مخفی رکھنے کے ہیں۔  
مَنْکُنُونُ - حفاظت سے رکھا ہوا۔ محفوظ (۳۶/۳۶)۔ قرآن کریم کو کِتَابُ مَنْکُنُونُ کہا گیا ہے (۵۱/۵۱)۔ یعنی محفوظ کتاب۔ اس کے لئے فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ بھی کہا گیا ہے (۲۲/۲۲)۔

## کُنَّ (ضمیر)

کُنَّ - ضمیر منصوب متصل ہے - جمع مؤنث حاضر کیلئے آتی ہے -  
ضَرَّ بِكَ كُنَّ - اس نے تم سب عورتوں کو مارا - قرآن کریم میں ہے  
طَلَّقَتْ كُنَّ (۱۱) - وہ تمہیں طلاق دیدے -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے - سورہ یوسف  
میں ہے اِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيْمٌ (۱۲) - ”یقیناً تم ہورتوں کی خفیہ سازش  
(مکر) بہت بڑی ہوتی ہے“ -

## کھف

اَلْكُهْفُ - پہاڑ میں بڑا غار - چھوٹے کو غَار کہتے ہیں - یا پہاڑ  
میں کھود کر جو گھر جیسا بنا لیا جائے - جائے پناہ - تَكْهِفُ - اِكْتَهِفُ -  
وہ غار میں داخل ہو گیا یا کھف میں رہا \* -

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْكُهْفِ (۱۸) ان نوجوانوں کے لئے  
آپا ہے جنہوں نے آبادی سے باہر غار میں جا کر پناہ لی تھی - (تفصیل کے  
لئے دیکھئے عنوان ر - ق - م و اَصْحَابُ الْكُهْفِ وَالرَّقِیْمِ)

## کھل

اَلْكُهْلُ - ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں - تیس سال کی عمر یا تینتیس سے  
پچاس سال تک کی عمر - ازہری نے کہا ہے کہ اس عمر والے کو کھل  
اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان انتہائے شباب اور اپنی بھرپور  
صلاحیتوں پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر انحطاط شروع ہو جاتا ہے -  
نَعْجَتٌ مُّكْتَهِلَةٌ - بھیڑ جو پوری عمر کی ہو چکی ہو \* - نَبِیْتُ کُهْلٍ -  
وہ ہودا یا درخت جو اپنے بڑھنے پھولنے کی آخری عمر تک پہنچ چکا ہو \* -  
ابن فارس نے کہا ہے کہ کھل کے بنیادی معنی کسی چیز میں قوت پیدا  
ہونے اور اس کی ساخت کے محکم و مجتمع ہونے کے ہیں - اَلْمُكَاھِلَةُ -  
شادی کر لینا \* - سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَیُكَلِّمُ  
النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا (۳) - کم عمری میں بھی اور پوری عمر  
کو پہنچ کر لوگوں سے باتیں کریگا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت  
عیسیٰؑ نے ابتدائی عمر ہی سے معاشرہ کی خرابیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع

\* تاج و محیط و راغب - \*\* تاج - \*\*\* محیط -

کر دی تھیں۔ ویسے بھی (تاریخ بتاتی ہے کہ) انہیں نبوت مقابلاً کم عمر میں مل گئی تھی (یعنی قریب تیس سال کی عمر میں) لیکن قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کھلاً کہہ کر قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں (۳۱) برس کی عمر میں صلیب دی گئی اور وہ (یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق) صلیب پر وفات پا گئے یا (عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق) آسمان پر چلے گئے، تو یہ صحیح نہیں۔ وہ ادھیڑ عمر تک لوگوں کے درمیان رہے اور ان سے باتیں کرتے رہے۔

## کھن

الکھن۔ وہ شخص جو کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں دیتا اور معرفت اسرار کا مدعی ہوتا تھا\*۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ الکھن اس شخص کو کہتے تھے جو ماضی کی خفیہ باتوں کے متعلق بتاتا تھا۔ اور عرفاف اُسے جو آئندہ کے متعلق خبریں دیتا تھا\*\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام میں الکھن اس شخص کو کہتے تھے جو ہجاریوں کی طرف سے قربانیاں دیتا اور جانوروں کو قربان گاہ میں پیش کرتا تھا۔ اور عربوں کے ہاں الکھن اُسے کہتے تھے جو ”کنکریاں پھینک کر“ غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا\*\*\*۔

چونکہ عرب، مقام نبوت کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رسول اکرمؐ کو الکھن - شاعیر - اور مجنونؑ کہا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور کہا کہ فَمَا أَنْتَ بِمُجْنُونٍ رَبِّكَ بِيكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ (۵۴)۔ تو خدا کے فضل و احسان سے گاہن اور مجنون نہیں۔ (نبی کے معنی بھی پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ تفصیل متعلقہ عنوان میں ملیگی)۔ لیکن اب ہمارے ہاں پیش گوئیاں کرنے والوں کو مقربین بارگاہ خداوندی سمجھا جاتا ہے۔ کس قدر غیر قرآنی ہیں ہمارے نظریات و معتقدات؟

## کوب

الکوب۔ پیالہ جس کا دستہ نہ ہو\*\*\*\*۔ اسکی جمع اکثوابؑ ہے۔ قرآن کریم میں اکثوابؑ (۳۳) اسی قسم کے پیالوں کے لئے آیا ہے۔

\* تاج۔ \*\* رائے۔ \*\*\* محیط۔ \*\*\*\* تاج و راغب۔

## ک و د

کَادَ (کَوْدَ) کا استعمال بطور فعل مقارب کے ہوتا ہے اور اس سے صرف ماضی اور مضارع کے فعل آتے ہیں، دوسرے نہیں آتے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ”وہ کسی کام کے کرنے کے قریب ہو گیا“۔ (اسی لئے اسے فعل مقارب کہتے ہیں)۔ کَادَ يَفْعَلُ۔ قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گزرتا۔ وہ اسے کرنے والا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے معنی رکھنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ایسا کرنے والا ہی تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس سے رک گیا\*۔ کَادَ زَيْدٌ يَفْعَلُ۔ قریب تھا کہ زید ایسا کام کر بیٹھتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَوْلَا اَنْ تَبْتَئِنَاكَ لَقَدْ كِدْتُمْ تَرَكُنَ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (۱۶)۔ ”اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو ہو سکتا تھا کہ تو ان کی طرف تھوڑا بہت جھک جاتا۔ لیکن تو نے ایسا نہیں کیا،“۔

نیز اس کے معنی ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ وَ اِنْ كَادَ وَا لَيَسْتَفِيزُوْكَ مِنْ اِلَا رُضٍ لِّمُخْرِجُوْكَ مِنْهَا (۱۶)۔ ”انہوں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا کہ تمہارے پاؤں اکھاڑ کر تمہیں ملک سے نکال باہر کرتے،“۔

سورۃ طہ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو اس سلسلہ میں فرمایا اِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَتْ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِيُجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (۲۵)۔ اس میں آکادُ اُخْفِيْهَا کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ کَادَ کے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں نے اسے مخفی رکھنا چاہا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظہور نتائج کے وقت (السَّاعَةَ) کو اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ عام طور پر، اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ علم و بصیرت سے کام لیں وہ اس آنے والی گھڑی کا پہلے سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ نیز خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسے حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ گھڑی بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ آکادُ اُخْفِيْهَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اسے اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ مخفی بھی ہے اور مشہود بھی ہے۔



## ک و ر

کَوْرُ الْعِمَامَةِ - صافے کو گھمانا اور لپیٹنا - اس کے لئے تَتَكْوَرُ يَوْمَ الْعِمَامَةِ بھی آتا ہے \* - کسی چیز کو اوپر چڑھانے اور چھا دینے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے - اَلْكُتَارُ الرَّجُلُ - آدمی نے عمامہ باندھ لیا - اَلْمَيْكُوَارُ - عمامہ کو کہتے ہیں - اور اَلْكُوْرُ - عمامہ کی ایک لپیٹن کو \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھومنے اور اکٹھا ہونے کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے يَتَكْوَرُ اللَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَ يَتَكْوَرُ النَّهَارُ عَلَى اللَّيْلِ (۳۹) - وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا رہتا ہے - زمین کی گردش کے اعتبار سے دن اور رات کے پھیر کو تَتَكْوَرُ يَوْمَ کہنا کتنی بڑی بلاغت اور کیسی عظیم حقیقت ہے - گویا دن اور رات زمانہ کی ہگڑی ہے جسے وہ لپیٹنا چلا جا رہا ہے -

کَوْرَةُ تَتَكْوَرُ يَوْمَ کے معنی پچھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں - کَوْرُ الرَّجُلِ تَتَكْوَرُ يَوْمَ اس نے اس آدمی کو نیچے گرا دیا - کَوْرُ تَسَةٍ فَتَتَكْوَرُ - میں نے اسے گرایا پس وہ گر گیا \* - قرآن کریم میں ہے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۸۱) - اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جب "شمس" کو لپیٹ لیا جائے گا اور یہ بھی کہ جب اسے گرا دیا جائے گا - دونوں معانی کے اعتبار سے مفہوم ایک ہی ہے - یعنی (مسلمانوں کے ہاتھوں) ایران کی سلطنت کا خاتمہ - اُس سلطنت کے جھنڈے کا (جس کا نشان شمس، سورج تھا) لپیٹ دیا جانا - یا اس کا گر جانا - (دیکھئے عنوان ش - م - س) - اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ حقیقی معنی (سورج) لئے جائیں تو اس میں کسی آنے والے کائناتی تغیر کی طرف اشارہ ہے -

## ک و ک ب

اَلْكُوْكَبَةُ - ستارہ \* - راغب نے لکھا ہے کہ یہ ظاہر اور نمودار ہونے والے ستارہ کے لئے بولا جاتا ہے \* (۱) - جمع کَوَاكِبُ - اَلْكُوْكَبَةُ - زہرہ ستارہ - اَلْكُوْكَبَةُ - مجازی طور پر بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے - مثلاً آنکھ میں ہڑ جانے والی پھلتی - لمبے لمبے درخت - قوم کا سردار یا شاہ سوار - گرمی کی شدت - تلوار - ہانی - پہاڑ - مسلح مرد - کتبوں کا چشمہ - وغیرہ \* - اَلْكُوْكَبَةُ - جماعت کو بھی کہتے ہیں \*\*\* -

## ک و ن

”کان“ - یہ فعل ناقص ہے - ذیل کے معنوں میں آتا ہے :-

(۱) ”ہے“ کے معنوں میں - ”كَانَ اللَّهُ عَلَیْهِمَّا حَكِیْمًا“ (۳۳/۵۱) - اللہ علیم و حکیم ہے -

(۲) ”تھا“ کے معنوں میں - ”إِنَّا ابْرَآهِیْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ“ (۱۲۱/۱۲۰) - یقیناً ابراہیم (ایک فرد نہیں بلکہ) پوری کی پوری فرماں بردار امت تھا -

(۳) ”ہوگا“ کے معنوں میں - ”كَانَ شَرُّهُ“ مُسْتَطَبٌ (۹۶/۲۱) - جس کا فتنہ اڑ کر لگنے والا ہوگا - (یہاں اس کے معنی ”ہے“ بھی ہو سکتے ہیں) -  
(۴) ”ہو گیا“ کے معنوں میں - ”أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ“ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (۲۴/۲۴) - اس نے انکار کیا - سرکشی اختیار کی - اور اس طرح نہ ماننے والوں میں سے ہو گیا -

(۵) ”سزاوارہ“ - ”مَا كَانَ لِیَشْرَیَ أَنْ یُؤْتِیَہُ اللَّهُ الْکِتَابَ“ ..... (۷۸/۷۸) - کسی انسان کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت دے اور وہ .....

(۶) تاکید کے لئے بھی آتا ہے - اور کبھی زائد بھی ہوتا ہے - و مَا عَلِمَیْ بِمَا كَانُوا یَعْمَلُونَ (۲۱۳/۲۱۳) - مجھے کیا علم ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں - یہاں کَانُوا زائد ہے - صرف بِمَا یَعْمَلُونَ کے بھی یہی معنی ہیں - لیکن اگر اس کے معنی ہوں ”جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے تھے“ تو پھر کَانُوا زائد نہیں ہوگا -

كُنَّ - جمع مؤنث غائب - ”اِنْ كُنَّ یُؤْمِنُ بِآیَاتِ اللّٰهِ“ (۲۲۸/۲۲۸) اگر وہ خدا پر ایمان رکھتی ہیں -

اَكْتُ - واحد متکلم - ”وَلَمْ اَكْتُ بَعِیْثًا“ (۱۱/۱۱) - میں قانون شکن نہیں ہوں - اس میں نون گر گیا ہے دراصل اَكُنَّ تھا -

تَكْتُ - مذکر حاضر اور مؤنث غائب دونوں کے لئے آتا ہے - فَلَا تَكْتُ فِیْ مِرْیَۃٍ (۱۱۹/۱۱۹) - تو شک میں نہ رہ (دراصل تَكُنَّ تھا)

یَتَكْتُ - واحد مذکر غائب - ”لَمْ یَتَكْتُ مُغْتَبِرًا“ (۵۴/۵۴) - وہ نعمت کو بدلنے والا نہیں ہوتا - (دراصل یَتَكُنَّ تھا)

نَكَتٌ - جمع متکام - لَمْ نَكْتُ مِّنَ الْمُحْصِيْنَ (۴۴) - ہم مصلین نہیں تھے -

یہ تو ہوا کَانَ (فعل ناقص) - لیکن یہ فعل تام بھی ہوتا ہے - اس کی بحث آگے آتی ہے -

کَانَ - کسی چیز کا پیدا ہو جانا - واقع ہو جانا - کَوْنٌ\* اُس چیز کو کہتے ہیں جو یکبارگی اور دفعتاً واقع ہو جائے - لیکن جب کَوْنی چیز بتدریج پیدا ہو تو اسے حَرَکَتٌ کہتے ہیں - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَوْنٌ\* کے معنی ہیں کسی چیز کا مادی صورت اختیار کر لینا - راغب نے کہا ہے کہ کَوْنٌ\* کا لفظ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی جوہر اپنے سے بلند تر جوہر میں تبدیل ہو جائے - لیکن اگر اپنے سے پست جوہر میں تبدیل ہو جائے تو اسے فَسَادٌ کہتے ہیں - کَوْنٌ اللہ اَلْاَشْیَاءَ کے معنی ہیں خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا - اَلْکَائِنَاتُ کے معنی ہیں حادثہ - یعنی دفعتاً نمودار ہو جانا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی واقعہ کی خبر دینے کے ہیں - خواہ وہ ماضی میں ہوا ہو یا حال میں -

قرآن کے-ریم میں ہے بِتَدْرِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَاَلْاَرْضِ (۱۴) - یعنی خدا وہ ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے - (لُبْدَاعٌ\* - کسی چیز کو ایجاد کرنا - پہلی مرتبہ وجود میں لانا) - یہ کس طرح ہوا؟ اسے اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کر دیا - وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنْشَاءُ یَقُوْلُ\* لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۱۴) - یعنی جب وہ ایک امر کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے (اس امر سے) کہتا ہے (یَقُوْلُ لَهٗ) کُنْ - (ہو جا) - تو وہ ہو جاتا ہے (فَیَکُوْنُ) - یعنی ”امر“ کی حالت وہ ہے جس میں اشیاء نے ہنوز صورت اختیار نہیں کی ہوتی - جب وہ امر (خدا کے پروگرام کے مطابق) متشکل ہو جاتا ہے (صورت اختیار کر لیتا ہے) تو وہ شَیْءٌ بن جاتا ہے - ہم کسی شے کا تصور بغیر اسکی صورت (Form) کے کر ہی نہیں سکتے - خدا کے ”عالم امر“ کی کیا کیفیت ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے - اسلئے کہ وہاں صورت (Form) نہیں ہوتی - خدا اس (Formless) امر کو صورت (Form) عطا کرتا ہے - (اسی لئے اسے الْمُحْصِیُّوْرُ کہا گیا ہے (۴۴) - اور وہ امر شے بن کر ہمارے حیطہ ادراک میں آجاتا ہے - یہاں سے کَوْنٌ کے معنی ہیں اشیاء کا پہلی مرتبہ صورت اختیار کرنا - یہ سب خدا کے اس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اشیاء کے پیدا کرنے کے لئے مقرر کر رکھا ہے -

اَلْمَكَانُ\* - جگہ - مقام - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ اسی مادہ سے مشتق ہے - اور بعض م - ک - ن سے بتاتے ہیں - اس سے تَمَكَّنَ وغیرہ افعال بنائے گئے ہیں\* - (ہم نے م - ک - ن کا عنوان الگ لکھا ہے - اس کے تحت ان الفاظ کو دیکھئے)

اَلْاِسْتِكَاْنَةُ\* کے معنی ہیں خشوع و خضوع کرنا\* - یا عاجزی کا اظہار کرنا (۱۳۵) - (بعض کے نزدیک یہ لفظ سَتَكَّنَ سے ہے - اس لئے ہم نے اسے اس عنوان کے تحت بھی لکھا ہے -) اَلْمُكَاوْنَةُ\* - جنگ و جدال کو کہتے ہیں\* -

## ک و ی

كَوَاهُ\* يَكْوِرُهُ كَيْتًا - اسے گرم لوہے وغیرہ سے داغ دیا - اَلْمِيكْوَاةُ\* - داغ دینے کا آلہ\*\* - ابن فارس نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ كَوَاهُ بَعِيْنِيْہ کے معنی ہیں اس نے اسکی طرف گھور کر دیکھا - قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں (اور اسے نسوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے) ان کے اس مال کو جہنم کی آگ میں تپا دیا جائے گا - فَتَكْوَىٰ بِيْہَا... (۹۵) - اور اس سے ان کی ہیشانیوں اور پہلوؤں کو داغ دیا جائیگا - (جسطرح اُس زمانے میں بڑے بڑے مجرمین کو داغ دیا جاتا تھا) تاکہ ان کی دور ہی سے پہچان ہو جائے اور لوگ انکی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں - قرآن کریم کی رو سے سرمایہ داری سنگین جرم ہے اور ایسا کرنے والے معاشرہ کے بدترین مجرم -

## کئی - (حرف)

کئی\* - سبب ظاہر کرنے کے لئے (تاکہ - کے معنوں میں) - کئی\* لَا يَكُوْنُ دَوْلَةً بَيِّنًا اَلَا غَنِيًّا مِّنْكُمْ\* (۵۹) - تاکہ مال تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے - لِيَكِيْلًا - ل + کئی\* + لَا - تاکہ ایسا نہ ہو - (۶۰)

## ک ی د

کَیْدٌ\* - حیلہ اور تدبیر کو کہتے ہیں\* - محیط نے تعریفات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی خفیہ طریقہ سے کسی دوسرے کو نقصان

پہنچانے کا ارادہ کرنا عیسٰی \*\*۔ نیز یہ لفظ کوشش اور جدوجہد کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ بعض علمائے لغت نے کَیِّدٌ اور مَکْرٌ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیِّدٌ ضررِ رسانی، اور مَکْرٌ خفیہ تدبیر اور ضررِ رسانی کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیِّدٌ کے معنی خفیہ طور پر گرفت کرنا ہیں لیکن اس میں یہ شرط نہیں کہ ایسی تدبیر کرنے والا بظاہر اس کے خلاف کرے جو وہ بہ باطن چاہتا ہے۔ مگر یہ شرط مَکْرٌ میں ضروری ہے \*۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں)۔ راغب نے کہا ہے کہ کَیِّدٌ ایک قسم کی چارہ سازی اور حیلہ جوئی کو کہتے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی۔ اور بالعموم برے معنوں میں آتا ہے \*\*\*۔

کَادَ کے معنی ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں \*۔ جنگ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے \*۔

قرآن کریم میں دشمنوں کی خفیہ یا عام تدبیر کو کَیِّدٌ کہا گیا ہے۔ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ كَيْدٌ هُمْ شَيْئًا (۳۹)۔ ان کی سازشیں یا تدبیروں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ ساحرین فرعون کی شعبدہ بازی کو بھی کَیِّدٌ کہا گیا ہے۔ اِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدٌ سَاحِرٍ (۲۹) جو کچھ انہوں نے بنایا ہے وہ سحر (باطل) کی شعبدہ بازی ہے، اور بس۔ سورہ یوسف میں عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اِنَّهٗ مِّنْ كَيْدِ كُنَّ۔ اِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸)۔ یہ محض تمہاری سازش ہے۔ اور تم عورتوں کی سازشیں بڑی ہی گہری ہوتی ہیں۔

دوسری طرف خدا نے خود اپنی تدبیر کو بھی کَیِّدٌ کہا ہے۔ اِنَّهٗمۡ يَكِيْدُوْنَ وَنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدًا كَيْدًا (۱۶)۔ یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں۔ سورہ یوسف میں ہے كَذٰلِكَ كَيْدُنَا لِيَبُوْٓسُفَ (۱۶)۔ اس طرح ہم نے ایک عمدہ تدبیر پیدا کر دی جس میں یوسف کا فائدہ تھا۔ یا وہ اس کے حسبِ منشا تھی۔ سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا وَتَاللّٰهِ لَا كَيْدَ نَا۟ اَصْنٰٓءُ مَكْرُمٌ (۲۱) بخدا! میں تمہارے بتوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کر کے رہونگا۔

سورہ طور میں مَكِيْدٌ وَنَ آيَا ہے۔ (۵۲)۔ یعنی وہ جو سازش (یا تدبیر) کا شکار ہو جائیں۔

## کَيْفَ (حرف)

کَيْفَ - کیسے - کیونکر - کس طرح کے معنوں میں - کَيْفَ تَكْفُرُونَ يَا لَهِ (۲۸) - تم اللہ کا کس طرح انکار کر سکتے ہو - دوسری جگہ ہے - کَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ (۱۹) - تیرے رب نے کیونکر کیا؟ (ان سے) کیسا معاملہ کیا؟

## ک ی ل

کَالِ الطَّعَامِ - یَتَکَيَّلُ - کَيْلًا - غلے کو ناپا\* - اِذَا كَالُوا هُمْ (۸۳) - جب انہیں ماپ کر دیتے ہیں - اِکْتَالًا (علیٰ) - کسی سے ماپ کر لینا (۸۳) - تاج نے کال اور اِکْتَال دونوں ہم معنی بتا کر فرق یہ کیا ہے کہ کال کے معنی ہیں ، خود ناپ کر دوسرے کو دینا اور اِکْتَال کے معنی ہیں اپنے لئے خود ناپ کر لینا\* - رَاغِبٌ لَمْ يَكُنْ لَمْ يَكُنْ الطَّعَامِ کے معنی بتائے ہیں میں نے اس کے لئے غلہ ناپا ، اور کُنْتُ الطَّعَامِ کے معنی میں نے اسے غلہ (ناپ کر) دیا ، اور اِکْتَالْتُ عَلَيَّ - میں نے اس سے ناپ کر لیا\*\* - ابن فارس نے اس کی تائید کی ہے - کَيْلٌ - مِیْکَالٌ - پیمانہ جس سے غلہ وغیرہ کو ماپا جائے - (۱۳۵) خود (اس طرح ماپے ہوئے) غلہ کو بھی کہتے ہیں (۱۲۶) - کَيْلٌ - مِیْکَالٌ (۱۲۶) - ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ - قرآن کریم میں بڑی تاکید سے حکم ہے کہ لَا تَنْقُصُوا الْمِیْکَالَ وَ الْمِیْزَانَ (۱۱۱) - اس میں اگرچہ ترازو اور پیمانے کا ذکر ہے (کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو) لیکن اصولاً اس میں معاشی عدل کا بنیادی قانون آگیا ہے - معاشی عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ دیا جائے ، اور نہ ہی اپنے حق سے زیادہ لیا جائے اس اصول کے ماتحت ، سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے - اس لئے کہ (مثلاً) اگر ایک زمیندار یا کارخانہ دار کام کرنے والے کو وہ سب کچھ دے دے جو اس نے پیدا کیا ہے تو اس سے اسے خود کچھ نہیں ملتا - یہی قرآن کریم کا منشا ہے - یعنی معاوضہ محنت کا ملیگا - روپے کا نہیں - کام کرنے والے کی محنت کے ماحصل سے کچھ رکھ لینے والے مَخْسِرِينَ ہیں (۱۸۱) -

## اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ ”اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی“۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ۔

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے مختلف

مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشین پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسکی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔

سلیم کے نام خطوط۔ ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل

میں، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور سوالات پیدا ہوئے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب۔ انبیاؑ کی زبان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

ابلیس و آدم۔ اس میں، انسانی تخلیق اور نظریہ ارتقاء۔ قصہ آدم۔

ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت۔ رسالت۔ عقل اور وحی کے دوائر عمل جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

جوسے نور۔ قرآنی تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے انبیائے

سابقہ کے احوال و کوائف اور اقوام گذشتہ کے وقائع و حوادث کا جاننا ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ زریں کی پہلی کڑی ہے جس میں حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ سے پہلے تک کے انبیاء کرامؑ کے حالات آگئے ہیں۔

(مستمل)

برقِ طور - اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں بنی اسرائیل کی پوری داستان اور ان کے انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ درحقیقت قوموں کے عروج و زوال کے متعلق قرآنی اصول و قوانین کا بصیرت افروز مرقع ہے۔

شعلہٴ مستور - اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہے جس میں آسمانی انقلاب کے عظیم داعی، حضرت عیسیٰؑ کی حیات طیبہ کے وہ گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو اس سے پہلے عام طور پر نگاہوں سے اوجھل تھے۔ حضرت مریمؑ کا ”جرم“ - جناب مسیحؑ کی پیدائش - معجزات - کشمکش - واقعہ صلیب اور رفع الی السماء - نزول مسیحؑ سے متعلق تمام مباحث آگئے ہیں۔

معراجِ انسانیت - یہ عظیم کتاب نبی اکرمؐ کی اس سیرتِ مقدسہ پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اس میں قرآنی فکر و نظام کے تمام گوشے نہایت حسین و جمیل انداز میں سامنے آگئے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے ولایتی کاغذ پر بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر جگمگاتی ہوئی کتاب ہے۔

ان کے علاوہ

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف اور ماہنامہ طالع اسلام کیلئے ایک کارڈ لکھ کر تفصیل معلوم کریں۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ل

## ل - (حرف)

ل - ل - حسب ذیل معانی پیدا کرنے کے لئے آتا ہے :-

(۱) - اِسْتَحْقَاق - اَلْحَمْدُ لِلّٰہ (۱/۱) - حمد کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے -

(۲) - کُفًّی کے لئے کسی چیز کا مخصوص ہونا - وَلَسْتُمْ مَّا يَشْتَهُونَ (۱۱/۵۸) - خصوصیت سے اپنے لئے وہ چیز چاہتے ہیں کہ جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہے -

(۳) - اِظْہَارِ مِلْکِیَّتِ کے لئے - لَہُ مَنَافِ السَّمٰوٰتِ وَمَنَافِ الْاَرْضِ (۱۳/۱) - کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے -

(۴) - فائدہ حاصل کرنے کے لئے - وَآلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ (۳۴/۱) - ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا - یعنی لوہے کو نرم کسر دیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے (لام ملکیت اور لام انتفاع کے فرق کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) -

(۵) - سبب ظاہر کرنا ("تاکہ" کے معنوں میں) - وَآَنزَلْنَا لَیْلِکَ الذِّکْرَ کُرْیٰتٍ مُّبٰیِّنٍ لِّلنَّاسِ (۱۱/۱) - اور ہم نے تیری طرف یہ قرآن کریم نازل کیا ہے تاکہ تو اسے لوگوں کے فائدے کے لئے ظاہر کر دے -

(۶) - نفی کی تاکید کے لئے - مَا کَانَ اللّٰہُ لِيُطْلِعَکُمْ عَلٰی الْغٰیْبِ (۳۳/۵۸) - اللہ تمہیں غیب پر ہرگز مطلع نہیں کرتا -

(۷) اِلٰی (کیطرف) کے لئے - بِسَانَ رَبِّكَ اَوْ حٰی لَهَا (۱۱)۔  
کیونکہ تیرے رب نے اسکی طرف وحی کی ہے۔

تَكَثَّرَ کے معنوں میں - كَثُلَ يَجْزُرُ لَا جَلَ مَسْمَعِي (۱۳)۔ ہر  
ایک وقت مقررہ تک چل رہا ہے۔ دوسری جگہ اِلٰی اَجَلَ (۳۹) آیا ہے  
جس کے معنی ”وقت مقررہ تک“ ہیں۔

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں - وَتَلَّاهُ لِلْجَبِّينِ (۳۰)۔ اور اس  
نے اسے پیشانی کے ایک کنارے پر (کے بل) لٹایا۔

مجازی طور پر عَلٰی اسوقت آتا ہے جب کوئی بات کسی کے خلاف  
جائے۔ اور۔ ل۔ اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدے کے لئے ہو۔  
جیسے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲۸۹)۔ ”جو کچھ  
کوئی اچھا کام کرے وہ اس کے فائدے کے لئے ہے اور جو کچھ کوئی برا کام  
کرے وہ اس کے خلاف جائیگا۔ اس کا نقصان اسے ہوگا۔“ لیکن بعض اوقات  
ل بھی عَلٰی کے معنوں میں آجاتا ہے۔ وَ اِنْ اَسَا تُمْ فَلَهَا (۱۱)۔ اگر  
تم برائی کرو گے تو اسکا نقصان تمہیں ہی ہوگا۔ یا وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ  
سُوءُ الْعَذَابِ (۵۴)۔ ان کے لئے محرومی ہے۔ ان کے لئے بہت برا گھر ہے۔

(۹) فِی (میں) کے معنوں میں - وَتَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ  
لِیَوْمِ الْقِيَامَةِ (۲۱)۔ اور ہم قیامت کے دن (قیامت میں) انصاف کی  
میزانیں کھڑی کریں گے۔

(۱۰) عِنْدَ (کے پاس۔ کے قریب) اور بَعْدُ کے مفہوم کے لئے۔  
جیسا کہ بعض کے نزدیک - اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ اِلٰی  
غَسَقِ اللَّیْلِ (۱۸) میں لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ سے مراد ہے دلوک شمس  
کے قریب۔ یا دلوک شمس کے بعد۔ لیکن۔ ل۔ بعض اوقات مِیْنُ (سے) کے  
معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس لئے اس کے معنی دلوک شمس سے لیکر غسق لیل  
تک بھی ہو سکتے ہیں۔

(۱۱) مَفْعُول کو واضح کرنے کے لئے۔ جیسے لَا تَقُولُوْا لِمَنْ  
يُقْتَلُ (۲۴) نہ کہو اس شخص کو جو قتل کر دیا جائے۔

(۱۲) اِنْ یا قسم کے بعد تاکید کے لئے۔ لَعَنَکُمْ اَنْتُمْ لَفِیْ  
سَکْرَتِیْمٍ یَّعْمَهُوْنَ (۱۵)۔ تیری عمر\* کی قسم۔ وہ اپنی بد مستی

میں اندھے ہو رہے تھے۔ نیز قَوْرَیْشَکَ لَتَنَحْشُرَنَّ لَهُمْ (۱۸) تیرے رب کی قسم ہم بالضرور انہیں اکٹھا کر لائیں گے۔

(۱۳) کبھی زائد بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں۔ جیسے۔ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ (۲۳)۔ یہاں مَا تُوعَدُونَ کا بھی وہی مفہوم ہے۔

(۱۴) کبھی یہ ابتدائے کلام کے لئے بھی آتا ہے (کہ، کے معنوں میں)۔ اِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ ..... (۱۸)۔ جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اسکا بھائی ....

(۱۵) کبھی یقیناً کے معنوں میں (تاکید کے لئے) آتا ہے۔ لَتَمَسَّجِدَ أُسُوسٌ عَلَى النَّصْرَةِ (۱۸)۔ یقیناً وہ مسجد کہ جسکی بنیاد ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہو۔

## لا (حرف)

لا - نہیں کے لئے آتا ہے۔ لَا تَضْرِبْ - مت مار۔ اس کے علاوہ ذیل کے معانی کے لئے بھی آتا ہے۔

(۱) نفی جنس کے لئے۔ یعنی جس چیز کی یہ نفی کرتا ہے اس کی پوری کی پوری جنس کی نفی کرتا ہے۔ لَا رَيْبَ فِیْهِ (۲)۔ اس میں کوئی شک و شبہ یا اضطراب کی بات نہیں۔

(۲) لَیْسَ (نہیں) کے معنوں میں۔ لَا اصْفَرَ مِنْ ذَٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا رَفِیْ کِتَابِ سُبْحٰنِ (۱۱)۔ نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی۔ وہ سب ایک واضح کتاب کے اندر ہیں۔

(۳) لَا جَرَمَ - مجاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں۔ ”حق یہ ہے کہ“۔ جیسے (۱۱) میں۔

(۴) کبھی یہ جملے کے شروع میں اسطرح آتا ہے جیسے کسی کی بات کا جواب دیا جا رہا ہو۔ مَثَلًا لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۱۱)۔ نہیں! میں اس شہر کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

(۵) کبھی یہ زائد ہوتا ہے۔ مَثَلًا مَا مَنَعَكَ اَلَا (اَنْ + لَا) تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (۱۴)۔ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو پھر وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کر دیا۔ اگر یہاں ”لا“ نہ ہو جب بھی وہی معنی ہونگے۔ جیسے (۳۸) میں ہے۔ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ۔

## اللات

اللات - عہد جاہلیت میں طائف میں قبیلہ ثقیف کا بت تھا۔ یہ مؤنث ہے (۵۳/۱۶)۔ اسلئے اسے دیوی کہنا چاہئے۔

## لات (حرف)

لَا ت - نہیں کے معنوں میں۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَحِیْنَنَّ مَتَنَاصٍ (۳۸)۔ خلاصی کا وقت نہیں رہا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ لَا ت میں لَا نفی (نہیں) کے لئے ہے اور تَاء (ت) زائد ہے۔ مگر یہ زائد تاء حِیْنَنَّ کے ساتھ ہی آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ (لَا ت) فعل ماضی ہے جس کے معنی نَقَصَ کے ہیں۔ (جیسا کہ ل۔ ی۔ ت کے عنوان میں بیان ہوگا)۔ بعد میں یہ صرف نفی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَیْسَ ہے۔ سین کو تَاء اور یَاء کو الف سے بدل کر لَا ت بنا لیا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک مستقل لفظ ہے اور نفی کے لئے آتا ہے۔

## لُأَلْأُ

لُأَلْأُ التَّمَرَاتِ - یعنی تھمتھمتا۔ عورت نے اپنی آنکھوں کو چمکایا۔ لُأَلْأُ النِّقَارِ - آگ بھڑکی اور روشن ہو گئی۔ \*\* - اَلشَّأْوُ لُؤْ - (جمع لَآلِ)۔ موتی۔ کیونکہ وہ چمکدار ہوتے ہیں۔ \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمکدار ہونے کے ہیں۔

سورة حج میں جنتی معاشرہ کے اسبابِ زینت میں لُؤْ لُؤْ (۲۲/۲۳) بھی آیا ہے۔ سونے کے کڑے۔ موتی۔ ریشم کا لباس۔ یعنی سرداریوں اور سرفرازیوں کے تمام نشان و سامان۔ یہ ہیں جنتی معاشرہ کے سامانِ زینت و اسبابِ آرائش و زیبائش۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں قوت و سطوت اور آسائش و آرائش کے تمام سامان بافراط موجود ہوں اور ان کی تقسیم اور استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو۔

## لُأَلْأُ (حرف)

لُأَلْأُ - (ل + اُنْ + لَا) ایسا نہ ہو کہ۔ یا۔ تاکہ نہ۔ لُأَلْأُ یَعْلَمُ أَهْلُ الْبُکَیْنِ (۹۹/۴)۔ تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ۔ . . . اس مثال میں لا زائد ہے۔

\* تاج - \*\* تاج و راغب و محیط -

## ل ب ب

اَلْتَّبَّ عَلٰی لَا مَرَّ - کسی بات پر پختگی سے جما رہا اور اسے نہ چھوڑا - رَجُلٌ تَبَّ - وہ شخص جو اپنے کام کاج میں لگا رہے اور اسے چھوڑے نہیں - اَلَّتَّبَّ - کسی امر پر قائم رہنے والا، اسی لئے اس کے معنی قیام کرنے کے بھی ہوتے ہیں - اَلْتَّبَّ بِالْمَكَانِ - اس نے فلاں مقام پر قیام کیا\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) جمع رہنے اور ساتھ لگا رہنے اور (۲) خالص اور عمدہ ہونے کے ہیں -

لَبَّيْكَ - میں آپ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں - میں آپ کی اطاعت پر قائم ہوں - بعض نے کہا ہے کہ یہ دَآرِیُّ تَلَبُّ دَآرَہُ سے ماخوذ ہے - یعنی میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے - لہذا لَبَّيْكَ کے معنی ہیں میرا رخ آپ کی طرف ہے\* -

لُبَّ - ہر چیز کے خالص حصے کو کہتے ہیں - نیز مغز، گری - لُبُّ اللّٰوِزَ - بادام کو توڑ کر اس کا مغز نکال لیا\* - اللَّبَّبُ - سینہ کا وہ حصہ جس پر ہار پہنتے ہیں\* -

اَللَّبُّ عَقْلٌ - کو کہتے ہیں - اس کی جمع اَللَّبَابُ ہے - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی کے لِبْتُو یا عبرانی کے لِبُّ سے ماخوذ ہے جن کے معنی دل کے آتے ہیں - عربی میں دل کو اَللَّبُّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (بادام کے مغز کی طرح) چربی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے\*\* - راغب نے کہا ہے کہ لُبُّ نیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو آمیزش سے پاک ہو\*\*\* - (یعنی جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو - جو جذبات کے تابع نہ چلے) -

قرآن کریم نے اُولٰٓئِیْہِ اَلَا لَتَبَابِ (۱۸۹) کو خاص امتیاز کا حامل قرار دیا ہے اور ان کی بڑی تعریف کی ہے - یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں جو عقل کو جذبات کی لونڈی بنانے کے بجائے اُس سے وحی کی روشنی میں کام لیتے ہیں - اس طرح یہ عقل، عقل خود ہیں کے بجائے عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے - عقل خود ہیں انسان کو صرف اس کے انفرادی مفاد کے حصول کی راہیں بتاتی ہے اور عقلِ جہاں ہیں اُسے نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے - اسی لئے قرآن کریم نے اُولٰٓئِیْہِ اَلَا لَتَبَابِ کے بعد کہا ہے کہہ اَلَّذِیْنَ یَتَذَكَّرُوْنَ اللّٰہُ... (۱۸۹-۹۰) یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت جو اٹھتے،

بیٹھتے، لیٹے، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا، یہ ہے مومن کا شعارِ زندگی۔ ان میں سے اگر ایک چیز کی بھی کمی ہو تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔

## ل ب ث

لَبِثَ يَاقُوتُ لَبِثًا وَلَبِثًا وَلَبِثًا - رہنا۔ ٹھہرنا۔ رکنا۔ نیز دیر کرنے اور انتظار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اَلتَّلَبُّثُ - توقف۔ اقامت۔ توقف کرنے کے معنوں میں (۳۳/۱۳) میں آیا ہے \*۔ لَبِثَ بِالْمَكَانِ - کسی مقام پر جم کر ٹھہرا۔ وہاں مستقل رہا۔ \*۔ لَبِثَ - ٹھہرنے والا۔ قیام کرنے والا۔ اس کی جمع لَا يَبْثُونَ اور لَا يَبْثِينَ ہے (۴۸/۴۸)۔

مخالفینِ عرب، نبی اکرمؐ سے آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل مانگتے۔ یعنی وہ کہتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں۔ اس کے جواب میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۶/۱۶)۔ میں نے (دھوائے نبوت سے) قبل، تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے انسان کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ تم اگر عقل و خرد سے کام لو تو میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت بن کر تمہارے سامنے آ جائے۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔

غور کیجئے کہ کس قدر زبردست ہے یہ شہادت جسے نبی اکرمؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ایسی شہادت کہ اس کے خلاف کوئی ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا۔ سچے کی نشانی یہ ہے کہ وہ (دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ) مخالفین کے بھرے مجمع میں پوری جرأت سے کہہ سکے کہ میری زندگی میری صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

## ل ب د

لَبَدَ بِالْمَكَانِ - کسی جگہ قیام کرنا اور اس جگہ سے چمٹ جانا۔ لَبَدٌ - نمدہ کو کہتے ہیں جس میں اون کو گتھ گتھ کر جما ہوا جاتا ہے۔ اسی سے مَالٌ لَبَدٌ کے معنی ہیں کثیر دولت۔ بہت زیادہ جمع شدہ مال \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا اوپر تلے جمع

ہونا ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَهْلًا كُنْتَ مَالًا لُبْدًا (۳۶)۔ میں نے بہت سا جمع کردہ مال ضائع کر دیا۔ اَلنَّاسُ لُبْدٌ کے معنی ہیں لوگ یکجا جمع ہیں۔ اوپر تلے اکٹھے ہیں \*۔ قرآن کریم میں ہے يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبْدًا (۴۶)۔ وہ اس پر هجوم کر کے ٹوٹ پڑے۔ لِبْدُ الْقَوْمِ بِالرَّجُلِ۔ لوگوں نے اس آدمی کو گھیر لیا اور اس کے پاس سے نہ ہٹے \*\*۔

## ل ب س

لَبَسَ۔ يَلْبَسُ۔ لَبْسًا کے معنی ہیں خلط ملط مت کر دینا۔ مشتبہ کر دینا \*۔ اس کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے خلط ملط کر دینے اور مشتبہ بنا دینے کا مفہوم آگیا \*\*۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲۴) حق اور باطل کو باہم خلط ملط مت کرو۔ مشتبہ کرنے کے معنوں میں یہ لفظ (۶) میں آیا ہے۔ وَلَلْبَسْنَاهُ عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُونَ۔ ”انہوں نے جس اشتباہ میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے، ہمارا (قانون سکافات) انہیں اس اشتباہ میں مبتلا رکھیگا“۔ لَبَسَ۔ يَلْبَسُ۔ لَبْسًا کے معنی ہیں پہننا۔ اَللَّبْسُ۔ اَللَّبْسُ۔ جو کچھ پہنا جائے \*۔ اَللَّبْسُ۔ شوہر اور بیوی کو کہتے ہیں \*۔ قرآن کریم میں ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ (۲۸)۔ میان بیوی کا ایک دوسرے کا ساتھ بدن اور لباس کا ساتھ ہے (کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی۔ ان میں گہری راز داری ہوتی ہے)۔ اَللَّبْسُ۔ زرہ اور ہتیار کو بھی کہتے ہیں \*۔ قرآن کریم میں زرہ بنانے کے لئے صَنْعَةَ لَبُوسٍ آیا ہے (۲۸)۔ لَبَسَ فُلَانٌ اِسْرَاقًا۔ فلان شخص ایک عرصہ تک ہورت سے متمتع ہوتا رہا \*\*۔ (ان کا باہمی اختلاط رہا)۔

اَمْرٌ مُلْتَبِسٌ اور مُلْتَبِسٌ۔ مشتبہ امر \*۔ اَلْمُلْتَبِسُ۔ حقیقت کی پردہ پوشی کرنا اور اسے خلاف واقعہ بنا کر دکھانا \*\*۔ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۵۰)۔ یہ لوگ حیاتِ نو (نئی پیدائش) کے بارے میں شبہے میں ہیں۔ انہیں اس باب میں کچھ (Confusion) سی ہے۔

قرآن کریم ہر بات کو نکھار کر سامنے لاتا اور ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے تاکہ حقیقت کے سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ کہیں ابہام نہ ہو۔ التباس نہ ہو۔ ہر بات واضح، کھلی کھلی اور

صاف صاف ہو۔ اس کے نزدیک کیتمان حقیقت (حقیقت کو چھپانا) ہی جرم نہیں بلکہ حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرنا بھی جرم ہے ( $\frac{2}{3}$ )۔ لہذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت (Compromise) کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ حق ، حق ہے اور باطل ، باطل۔ دونوں آپس میں مل نہیں سکتے، چہ جائیکہ حق کو چھپایا اور باطل کو حق بنا کر دکھایا جائے۔ حق کو باطل کے ساتھ ملانے (تلبیس۔ حق و باطل) کے معنی یہ ہیں کہ وحی (قرآن کریم) کے ساتھ غیر از وحی امور کو بھی دین بنا دیا جائے۔ ہم نے یہی کچھ کر رکھا ہے، اور اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔

ل پ ن

الْقَلْبَيْنِ \* - (اَلْقَلْبَيْنِ) - اہنٹ جس سے عمارت بنائی جاتی ہے)۔  
قرآن کریم میں ہے - لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشُّرْبِیْنِ (۱۶۱) - خالص دودھ  
جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔

ل ج ا

تَجَاً وَالتَّجْتَاَ التَّيْمَ - اس نے اس کی طرف پناہ لی - اَلتَّجَاُ إِلَى  
 كَذَا - اسے کسی چیز کی طرف مجبور کیا - اَلتَّجَاَ فُلَانًا - اس نے فلاں کو  
 بچا لیا - اپنی حفاظت میں لے لیا\*\* - تَلَجَّتْ مِيْنَهُمْ - وہ ان سے الگ اور ان  
 کے زمرہ سے علیحدہ ہو کر دوسرے لوگوں کی طرف مائل ہو گیا\* - اَللَّجَاَ وَ  
 التَّلَجَاَ - جائے پناہ - بچنے اور محفوظ رہنے کی جگہ\* ( ۲۰ ) -

ج ج ج

الْشَّجَّ وَالشَّجَّةُ - گہرا ہانی - لُجَّ الثَّبَعُ - دریا کے درمیان وہ گہرے ہانی کا مقام جہاں سے اس کا کنارہ نظر نہ آئے - بَعَجُ لُجَّاجٌ - وسیع گہرے ہانی والا دریا - اَللَّجَّاجُ - جھکڑے میں بڑھتے چلے جانا ، خواہ اپنی غلطی بھی واضح کیوں نہ ہو جائے - جھکڑے یا مخالفت کرنے میں برابر اصرار کرنے جانا\*\* - اس سے فعل لُجَّ فِي الْأَمْرِ استعمال ہوتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا اپنے اجزاء پر بار بار پلٹنا اور پلٹانا ہیں - اَللَّجَّاجُ - اصرار کو کہتے ہیں - لُجَّ الثَّبَعُ - سمندر کے بڑے حصے کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں سمندر کے اجزاء اوپر تلے پلٹتے رہتے ہیں -



راغب نے لَجَجَہ کے معنی بار بار ہلٹنے اور آنے رہنے کے کئے ہیں اور اس سے لَجَجَہ البَحْرِ کے معنی سمندر کی موجوں کے بار بار آنے اور ہلٹنے کے ہیں۔ نیز اس نے لَجَجَہ کے معنی منع کئے ہوئے کام سے باز نہ آنے اور اسے کرتے چلے جانے کے کئے ہیں۔\*\*

سورۃ ملک میں ہے۔ بَلَّ لَجَّوْا فِی عَثُوْا وَ نَفُوْا (۱۶۶)۔ وہ اپنی نفرت اور سرکشی میں موج در موج آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سورۃ نمل میں ہے۔ حَسِبْتُمْ لَجَجَہ (۱۶۴)۔ اس نے اسے گہرا پانی سمجھا۔ سورۃ نور میں ہے بَحْرٍ لَّجَّی (۲۴)۔ گہرا اور وسیع سمندر۔

## ل ح د

الْتَحَدُ۔ وہ کھڑا یا شکاف جو قبر کے ایک پہلو میں عرضاً کھود کر بنایا جاتا ہے اور اس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے۔ (سرِ خلاف ضَرْبُج کے جو درمیان میں کھودا جاتا ہے)۔ لہذا، بقول ابن فارس، اس مادہ کے بنیادی معنی درمیان سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا ہیں۔ لَتَحَدَ اِلَیْہِ۔ وہ اس کی طرف مائل ہو گیا۔ جھک گیا\*۔ یہی معنی اَلْتَحَدَ اِلَیْہِ کے ہیں\*\*۔ اَلْتَحَدَ۔ وہ دین حق سے مڑا اور ہٹا۔ اَلْاِلْتِحَادُ کے اصل معنی مڑنا، ہٹنا اور جھک جانا ہیں۔ درمیانہ روی کو چھوڑ کر ظلم کی طرف مائل ہونا\*۔ سورۃ اعراف میں ہے اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اَسْمَائِہِمْ (۱۸۰)۔ جو لوگ صفات خداوندی کے بارے میں اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک جاتے ہیں (جیسے عیسائی، کہ انہوں نے خدا کو صرف رحم کا پیکر تصور کر لیا اور اس کے قانونِ مکافات سے الگ ہٹ گئے) اسی کا نام غلو فی الدین ہے (۱۶۱)۔ دوسری جگہ ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا (۱۶۳)۔ جو لوگ ضابطہ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں۔ اعتدال کی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جاتے ہیں۔ انحراف کرتے ہیں۔ سورۃ حج میں ہے وَ مَن یُّرِدْ فِیْہِ بِالْحِتَادِ یُظْلَمْ (۲۲)۔ جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ کجروی اور بے باکی کا ارادہ کرے۔ جو سیدھے راستے سے ہٹ کر اسے (کعبہ کو) غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگ جائے۔ سورۃ نعل میں ہے۔ لِسَانَ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ۔ . . . . (۱۶۱)۔ وہ شخص جس کے متعلق یہ اعتراض کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کو قرآن کریم سکھا جاتا ہے، اس کی زبان (تو عجمی ہے)۔ یہاں اَلْحِتَادُ کے معنی ہیں کسی غلط بات کو کسی کی طرف بطور اعتراض منسوب کرنا۔ یعنی راستی سے ہٹ کر، کسی کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا۔

مُتَّحِدًا (۱۸/۱) پناہ گاہ - وہ جگہ جسکی طرف انسان (اپنے راستے سے ہٹ کر) پناہ کے لئے جائے - سرنگ یا زمین دوز راستہ کو بھی کہتے ہیں\* -  
 سورة اعراف کی جس آیت کو اوپر درج کیا گیا ہے اُسے ایک بار پھر سامنے لائیے کیونکہ وہ ایک عظیم حقیقت کو ہیے نقاب کرتی ہے - پوری آیت ہوں ہے - وَ لِلّٰهِ اِلٰهًا سَمَاءٌ اَلْحُسْنٰی فَاَدْعُوْهُ بِهَا - وَ ذَرُّوا الَّذِیْنَ یُلْعِدُوْنَ فِیْ اَسْمَائِهِمْ - سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۸/۱۰) -  
 تمام صفات پورے اعتدال اور تناسب کے ساتھ ، اللہ کے لئے ہیں - اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو - اور جو لوگ اس کی صفات میں (اعتدال سے ہٹ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں ، انہیں چھوڑ دو - انہیں ان کی اس غلط روش کا نتیجہ بہت جلد مل جائیگا -

خدا کی ذات تمام صفات کی حامل ہے ، اور وہ صفات انتہائی اعتدال اور تناسب کے ساتھ اس میں جمع ہیں - ہم ان صفات کو خود اپنی ذات میں اجاگر کرتے باؤ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ - جو لوگ صفات خداوندی کے توقائل ہیں لیکن ان میں اعتدال اور تناسب کو ملحوظ نہیں رکھتے ، وہ ملحد ہیں - تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں - ان کی اس غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آ جائے گا - تم نے ان کی پیروی نہ کرنا -

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سامنے لایا گیا ہے - ملحد وہ نہیں جو خدا کی ذات یا اس کی صفات کا منکر ہے - ملحد وہ ہے جو انہیں مانتا ہے لیکن کسی ایک صفت میں افراط سے کام لیکر تناسب کو ہکاڑ دیتا ہے - یہ غلط روش ہے - اسلام کے معنی یہ ہیں کہ صفات ہوں یا قوانین (۲/۲) دونوں میں پورے پورے تناسب کو قائم رکھا جائے -

## ل ح ف

اَللّٰی حَافٌ - سردی میں جس کپڑے کو اوڑھا جائے اور اس میں لپٹا جائے - لحاف ، کمبل وغیرہ جو تمام کپڑوں کے اوپر اوڑھا جائے ہیں\* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لپٹ جانے ، ساتھ چمٹنے اور لگے رہنے کے بتائے ہیں - لَحَفَتْ - اس نے آسے لحاف سے ڈھانپ دیا - اَلتَّحَفَ بِہِ - وہ اس میں لپٹ گیا\* -

سورہ بقرہ میں ہے - لَا یَسْتَشْکِرُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲/۲۳) - وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے - مانگتے ہوئے چمٹ نہیں جاتے - استعارۃً اسکے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو بہت مبالغہ (شدت اور زیادتی) سے کرنا\*\* -

## ل ح ق

لَحِيقَتُهُ - پتلحِقَتُهُ 'وَأَلْحَقْتُهُ' لَحَقًا - کسی چیز کو ہا لینا - اس سے جا ملنا - أَلْحَقْتُهُ 'یہ - اسے اس کے پیچھے لگایا، اس سے ملا دیا - یہ لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے - أَلْحَقْتُ - وہ آدمی جو اپنے خاندان کو چھوڑ کر کسی دوسرے خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہو - لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ مل جانے کے ہیں - تَلَّاحِقَاتِ الرِّكَابِ - سواریاں ایک دوسرے سے ملتی چلی گئیں \* - سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کی دعا ہے - وَ أَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ (۱۲۱) - مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے - مجھے ان کے زمرے میں شامل کر دے - سورہ جمعہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے لئے بھی رسول ہیں - وَ آخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (۱۲) - اور ان اقوام کے لئے بھی جو ابھی ان سے نہیں ملیں - یعنی ان کے بعد آنے والی اقوام - اس لئے کہ حضورؐ خاتم النبیین ہیں اور تمام نوح انسانی کے لئے رسول ہیں - اس لئے آپ کی رسالت تمام آنے والی اقوام کے لئے بھی اسی طرح ہے جس طرح اسوقت کی مخاطب قوم کے لئے تھی - اس لئے حضورؐ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا عقیدہ باطل اور قرآنِ کریم کے یکسر خلاف ہے -

## ل ح م

لَحْمَةٌ - قرابت - رشتہ داری - نیز کپڑے کا ہانا، جو تانے کے ساتھ مل کر کپڑا بناتا ہے - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں گھسنا اور کٹھ جانا بتائے ہیں - گوشت کو اللَّحْمُ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء باہم دگر پیوست ہوتے ہیں - أَلْمَلْحَمَةُ - گھمسان کا رن - قتل و غارتگری کا بڑا واقعہ \*\* -

قرآن کریم میں لَحْمٌ الثَّغِينُزِیْر (سور کے گوشت) کی حرمت آئی ہے - (۲/۳۴) - أَلَلَّحْمِمْ - وہ گھر جہاں لوگوں کی بہت غیبتیں کی جائیں \*\* - قرآن کریم نے بھی غیبت کو ”مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے“ تشبیہ دی ہے - (۲/۱۲) - لَحْمٌ کی جمع لَحْمٌ - آئی ہے - (۲/۲۲) -

## ل ح ن

أَلَلَّحْمِنٌ - اس مادہ کے اصلی معنی ہوتے ہیں صحیح جہت اور راہ اعتدال سے کسی ایک طرف کو مڑ جانا یا مائل ہو جانا \* - اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے

کہ بات کو اس کے صحیح اسلوب اور مستعمل طریقہ سے ہٹا دینا۔ اسکی ایک شکل یہ ہے کہ خفیہ طور پر بعض الفاظ کے خاص معنی مقرر کر لئے جائیں۔ جب وہ لفظ بولا جائے تو عام لوگ اس کا مطلب اور لیں اور جسے وہ خاص معنی معلوم ہیں وہ اس کا مطلب دوسرا لے۔ اسکی دوسری شکل یہ ہے کہ خود لفظ کی ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے۔ اور تیسری شکل یہ کہ الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے۔ یا انہیں بطور تعریض استعمال کیا جائے۔ اسی سے ایسے آدمی کو جو بہت ذہین ہو اور تعریض سے صحیح مقصود سمجھ جائے "لَحِن" کہہ دیتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے موڑ دینا۔ اور (۲) ذہانت اور ذکاوت۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے کہ وَلَتَعْرِىٰ فَنفَثُهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۲۴) یعنی وہ جس طرح الفاظ کو موڑ توڑ کر کہتے ہیں اور صریح مفہوم کو چھوڑ کر کلام کا تعریضی مفہوم لیتے ہیں، اس سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہودیوں کے متعلق سورہ نساء میں ہے يَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مَسْمُوعٍ وَرَاعَيْنَا لَآئِيَ بِلَا سِيئَتِهِمْ (۲۶)۔ اسی قسم کی دو وجہن باتیں منافقین کیا کرتے تھے۔

الْلَّحْنُ۔ زبان اور بولی کو بھی کہتے ہیں۔ اور پڑھنے میں غلطی کرنے کو بھی چنانچہ لَاحِیْنٌ۔ غلط بولنے والے کو کہتے ہیں۔ قَدْ لَحْنٌ لَهُ لَحْنًا کے معنی ہیں اس نے اس سے اشاروں کنایوں میں اس طرح بات کی کہ وہ تو بات سمجھ جائے لیکن کوئی دوسرا آدمی نہ سمجھ سکے\*\*\*۔

## ل ح ی

لَحْنٌ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکی بنیادی معنی دو ہوتے ہیں۔ (۱) بدن کا ایک ٹکڑہ یعنی جبڑا۔ اور (۲) کسی چیز کو چھیل دینا۔ چنانچہ اَللَّحِیَّاءُ درخت کی چھال کو کہتے ہیں۔ اَللَّحِیَّةُ۔ ڈاڑھی۔ اَللَّحْنُ۔ جبڑا۔ ڈاڑھی اُگنے کی جگہ۔ لَحْنٌ۔ قُلَانَا اَلْحَتَا۔ میں نے اسکو ملامت کی۔ لَاحٍ۔ ملامت گو۔ مَلَحْنٌ۔ ملامت کردہ شخص۔ لَاحَا۔ مَلَا حَتَا۔ اس نے اس سے جھکڑا کیا۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔ لعنت ملامت کی\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ لَا تَاْخُذْ بِلِیْحَتِیْ (۲۴) اس کے لفظی معنی ہیں میری ڈاڑھی مت پکڑ۔ اور مفہوم یہ ہے کہ میری ملامت مت کر۔ ہماری زبان میں بھی ڈاڑھی نوجوان یا بچوانا اور پگڑی اچھالنا انہی معنوں میں بولتے ہیں۔

اگرچہ سورہ اعراف میں جو ہے وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخْيِهِ يَجْرُهُ إِلَيْهِ (۱۵۰)۔  
 ”اس نے اپنے بھائی کے سر کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا“۔ تو اس سے  
 زبانی ملامت کے ساتھ ہاتھوں کی حرکت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

## ل د د

لَدُنَّ کے اصلی معنی ایسے شخص کے ہیں جس کی گردن کا پہلو بڑا  
 سخت ہو اور اس کی وجہ سے اسے اس کے ارادہ سے موڑا نہ جا سکے۔ اس سے مراد  
 ایسا شخص ہے جو بڑا جھکڑا لو اور خود مر ہو اور کسی کی بات ماننے ہی  
 نہیں۔ اسکی جمع لَدُنَّ آتی ہے \*۔ اَللَّذِي يَدَّ اَنْ - گردن کے دونوں پہلو جو  
 کانوں کے نیچے ہوتے ہیں \*\*۔ نیز وادی کے دونوں کنارے۔ اس نہج سے  
 لَدُنَّ کے معنی ”حق سے ہٹے ہوئے“ (جمع) آتے ہیں۔ نیز بات کو نہ  
 سننے والے بہروں کو بھی کہتے ہیں۔ جھکڑا لو بھی گویا بہرہ ہوتا ہے،  
 دوسرے کی نہیں سنتا اور اپنی کہی جاتا ہے۔ اَلَّذِي عَنَّهُ \*۔ وہ اس سے ہٹ  
 گیا۔ اَلَّذِي دَرَّ \*۔ میں نے اسے بہت جھکڑا لو پایا \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے  
 کہ اس کے بنیادی معنی (۱) جھکڑا کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا کنارہ ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے هُوَ الَّذِي اَخْرَجَكُمْ مِنَ الْبُطُونِ (۱۰۳)۔ وہ بہت ہی سخت  
 جھکڑا لو ہے۔ سورہ مریم میں قَوْمًا لَدُنَّا (۱۱۱) آیا ہے۔

## لَدُنْ (لَدَى)

لَدُنْ۔ ہاں۔ نزدیک۔ مِّنْ لَدُنْ۔ طرف سے۔ ہاں سے۔ مِّنْ لَدُنْ  
 حَكِيمٍ خَبِيرٍ (۱۱)۔ خدا نے حکیم و خبیر کی طرف سے۔

ہمارے ہاں (تصوف میں) ”علم لدنی“ کی ایک اصطلاح رائج ہے  
 جس کا مطلب ہوتا ہے وہ علم جو کوئی شخص براہ راست خدا سے حاصل کرے۔  
 مفہوم اس سے کشف یا الہام ہوتا ہے۔ جیسا کہ الہام (ل۔ ہ۔ م کے  
 ہنواں) میں لکھا گیا ہے، ختم نبوت کے بعد الہام یا کشف کا تصور غیر  
 قرآنی ہے۔ اب انسان جو علم خدا سے براہ راست حاصل کرتا ہے وہ قرآن کریم  
 کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خدا سے براہ راست علم حاصل  
 نہیں کر سکتا۔ خدا سے براہ راست علم کا نام وحی ہے جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ  
 پر ختم ہو گیا۔

لَدَيْ - لَدُن کے معنوں میں آتا ہے - لَدَيْ التَّحَنُّاجِيرِ (۲۱۸) -  
گلوں تک - خلق کے نزدیک - خلق کے پاس - لَدَا الثَّيَّابِ (۱۲۵) - دروازہ  
کے قریب -

## ل ذ ذ

الذِّقَّة - خواہش - وہ مزہ جو طبیعت و مزاج کے مطابق ہو - اَلَمْ کی  
ضد ہے - لَذَّة - لَذِيذ - اس نے اسے لذیذ پایا \* لذیذ سمجھا - قرآن کریم  
میں ہے وَ تَلَذَّذُوا لَآ عَيْنٍ (۳۱) - اس سے آنکھیں لذت یاب ہوتی ہیں -  
الذِّقَّة بمعنی لذیذ بھی آتا ہے ، قرآن کریم میں ہے لَذَّةٍ لِّلْإِنسَانِ  
(۳۶) پینے والوں کے لئے لذیذ - صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا  
ہے کہ کسی مناسب و موافق طبع چیز کے ، اس حیثیت سے کہ وہ موافق طبع  
ہو ، ادراک کر لینے کو لَذَّة کہتے ہیں - مثلاً قوت ذائقہ کے لئے شیرینی کا  
مزہ الخ ..... \*\* -

## ل ز ب

لَزِب کے بنیادی معنی کسی چیز کے قائم اور ثابت رہنے ، جمے رہنے اور  
ساتھ لگے رہنے کے ہوتے ہیں - لَازِب - لازم کو کہتے ہیں - (ابن فارس) -  
اللزُّوْب - چمٹنا - طَيِّن - لَازِب (۳۶) - چمٹنے والی مٹی - اَللَّازِب - وہ  
چیز جو کسی کے ساتھ جم جائے - اس سے چمٹ جائے ، اور اس پر ثبت ہو جائے -  
لَزِبَ الطَّيِّن - مٹی جم گئی اور سخت ہو گئی - اَللَّزُّوْبَةُ - سخت قحط  
سالی کو کہتے ہیں جو شدید طور پر چمٹ جاتی ہے \*\*\* - (کیونکہ مصیبت کے دن  
جلدی نہیں گذرا کرے) -

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں سورۃ الصافات میں ہے کہ اسے طَيِّن لَازِب سے  
پیدا کیا گیا ہے (۳۶) - جب مٹی پانی کے ساتھ ملتی ہے تو اس میں زندگی  
کے اولین جرثومہ کی نمود ہوتی ہے - جیسے جوہڑوں کے کنارے چپچپی مٹی  
سے چھوٹے چھوٹے جرثومے (Life - Cells) پیدا ہو جاتے ہیں - ان سے زندگی  
(Life) ارتقائی طور پر اوپر کو ابھرتی ہوتی پھر انسانی میں آگئی ہے - (تفصیل  
کے لئے دیکھئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں عنوان - انسان) -

## ل ز م

لَزِم - يَلْزَم - لَزُوْمًا کسی چیز کا جمنا ، ہمیشہ رہنا ، ساتھ لگے  
رہنا اور جدا نہ ہونا - اَلْمِلْزَم - شکنجہ - اَلْمِلْزَم - کسی کے ساتھ لگا

رہنے والا۔ نیز گلے ملنے والے کو بھی کہتے ہیں\*۔ لَتَزِمَ الشَّيْئُ - چیز ثابت اور دائم رہی۔ لَتَزِمَ الثَّمَالُ فُلَانًا - فلاں آدمی پر سال واجب ہو گیا\*\*۔ لَتَزَوَّمُ الشَّيْئُ - کسی شے کا طویل عرصہ تک رہنا\*\*\*۔ اللِّزَامُ - جو چیز آکر چپک جائے اور پھر الگ نہ ہو۔ (۲۵)۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جو دعوت تم پر صاف اور واضح نہ ہو، ہو آنلَزِمُكُمْ مَوْتًا وَ أَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ (۱۸) کیا میں اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ سکتا ہوں؟ سورۃ فتح میں ہے وَ أَلْزَمَهُمُ الْكَلِمَةَ الْتَّقْوَىٰ (۲۹)۔ اس نے انہیں تقویٰ کی بات پر لگا دیا یعنی انہوں نے تقویٰ اختیار کر لیا۔ وہ اس پر مضبوطی سے جم گئے۔ سورۃ طہ میں عذابِ خداوندی کے متعلق ہے۔ لَسْكَانٌ لِّزَامًا (۲۹)۔ وہ ان کے ساتھ آکر چپک جائے والا تھا۔

## ل س ن

اس سادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کی ایسی لمبائی کے ہیں جو نہایت لطیف ہو اور منقطع نہ ہو (ابن فارس)۔ لِسَانٌ (جمع أَلْسِنَةٌ)۔ زبان (Tongue)۔ (۱۹)۔ لغت (Language) (۲۰)۔ قوتِ گویائی\* (۲۸)۔ سورۃ مریم میں حضراتِ انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلَيَّهَا (۱۹)۔ صاحبِ تاج کے نزدیک یہاں لِسَانٌ کے معنی تعریف و توصیف ہے۔ یعنی انہیں ایسا مقام عطا کر دیا کہ دنیا ان کا نام مدح و ستائش سے لیتی ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے ہمیشہ خدا کی صداقتوں کو بلند کیا اور دنیا کے سامنے صدق کو پیش کیا۔

قرآن کریم نے اختلافِ الوان و السنہ کو خدا کی نشانیاں قرار دیا ہے (۳۳)۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ تو ایک مدت سے جاری تھا لیکن ہمارے زمانہ میں (Language) نے زبان سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے، جسے (Ernst Cassirer) کے الفاظ میں (The Philosophy of Symbolic Forms) کہا جاتا ہے\*\*\*\*۔ اس فلسفہ کی رو سے ”زبان“ کے متعلق عجیب و غریب حقائق منکشف ہو رہے ہیں۔ علاوہ بریں، ڈاکٹر یک (Bucke) نے اپنی کتاب (The Cosmic Consciousness) میں زبانوں کے تجزیہ سے قوموں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جو اصول بیان کئے ہیں ان سے بھی یہ

\* تاج۔ \*\* محیط۔ \*\*\* راغب۔ \*\*\*\* یہ خود (Cassirer) کی ایک کتاب کا بھی نام ہے۔

حقیقت ہے نقاب ہوتی ہے کہ اختلاف السنہ کس طرح آیتہ میں آیات اللہ ہے۔ ابھی ان علوم کی ابتدا ہے۔ جب ان کی تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو پھر قرآن کریم کے یہ حقائق اور بھی ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

## ل ط ف

لَطِيفٌ - يَلَطِيفُ کے معنی ہیں کسی سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا۔ اور لَطِيفٌ - يَلَطِيفُ کے معنی ہیں کسی چیز کا چھوٹا اور باریک ہونا\*۔ اللَّطِيفُ - خدا کے اسمائے حسنی میں سے ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ خفیف اور دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ بھی کہ وہ انسانوں کو راہ نمائی دینے میں نہایت لطیف انداز اختیار کرتا ہے اور نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے\*\*۔ صاعب محیط نے اس کے معنی صاف اور شفاف کے بھی لکھے ہیں\*\*\*۔ خدا کے لطیف ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا قانون تدریج و اممال محسوس نہیں ہوتا۔ درخت بڑھتا ہے۔ اس سے پتے نکلتے ہیں۔ پھل لگتے ہیں۔ سورج ”چلتا ہے“۔ ساری کائنات میں تغیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ ارتقاء ہو رہا ہے۔ اعمال اپنے نتائج مرتب کر رہے ہیں۔ لیکن ان تمام حرکات، اممال اور تغیرات کی رفتار ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا رہتا ہے۔

اللَّطِيفُ مِنْ الْكَلَامِ - بڑی لطیف اور دقیق بات\*۔ اللَّطَائِفُ - وہ باتیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکیں\*\*۔

سورہ انعام میں ہے - لَا تَدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۶: ۱۰۳)۔ انسانی نگاہیں خدا کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اور وہ تمام نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ (اس لئے کہ) وہ لطیف و خبیر ہے۔ یہاں سے اللَّطِيفُ کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی باریک ہیں۔

سورہ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف نے کہا کہ ہم میں سے ایک آدمی ہستی کی طرف جائے اور وہاں کے حالات کا پتہ کرے اور کچھ کھائے کے لئے لائے۔ وَلَيَسَّطِطَنَّ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا (۱۸: ۱۶)۔ وہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لے تا کہ کسی کو تمہارا پتہ نہ لگ جائے۔ اس سے بھی لَطِيفٌ کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ یعنی کسی کام کو غیر محسوس طور پر سرانجام دیتا۔



## ل ظ ی

الْظُّلَى۔ آگ یا آگ کا شعلہ۔ راغب نے اس کے معنی آگ کا خالص شعلہ بتائے ہیں۔ یعنی جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ لَطِیْتِ النَّارُ وَتَلَطَّطَتْ۔ آگ بھڑک اٹھی۔

قرآن حکریم میں ہے۔ کَلَّا إِنَّهَا لَظُّی (۹۰)۔ شعلہ انکیز آگ۔ دوسری جگہ نَارًا تَلَطَّطٰی (۹۲) آیا ہے۔ یعنی ایسی آگ جو بھڑک رہی ہے۔

## ل ع ب

اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جو منہ سے بہنے والی رال کو کہتے ہیں۔ لَعِیْبٌ فُلَانٌ۔ اس نے بغیر صحیح مقصد کے کام کیا۔ صاحب محیط نے اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس سے قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ نیز اس کے معنی ہیں غیر موزوں کاموں سے دلہستگی پیدا کرنا اور اس سے مسرت حاصل کرنا۔ یا سود مند چیزوں کو چھوڑ کر غیر سود مند چیزوں کی طرف لگ جانا۔ لَعِیْبٌ۔ کھیل کھیلتے والا۔ لَعِیْبٌ، جِدُّ کی ضد ہے جِدُّ کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو (Seriously) کرنا۔ لہذا، لَعِیْبٌ کے معنی ہوتے کسی معاملہ میں (Serious) نہ ہونا۔ لَعِیْبٌ بِنَا الثَّمَوِجُ۔ اُسوقت کہتے ہیں جب موجیں کشتی کو منزل مقصود کی طرف نہ لے جائیں۔ اس بنا پر، لَعِیْبٌ کے معنی یہ ہوں گے کہ حرکت تو ہو لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ قدم تو اٹھیں لیکن منزل قریب نہ آئے۔ بلا مقصد کام، بلا نتیجہ عمل۔ لَانَّمَا اَنْتَ لَا عِیْبٌ۔ تم یونہی مذاق کر رہے ہو۔ تم اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لے رہے۔

لَعِیْبٌ کے ساتھ لَهْوٌ کا عنوان (ل۔ ہ۔ و) بھی دیکھئے۔ کلیات میں ہے کہ لَهْوٌ حق سے روگردانی کو کہتے ہیں اور لَعِیْبٌ باطل کی طرف متوجہ ہو جانے کو۔

سورہ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو ہمزوا و لَعِیْبًا لیتے ہیں (۵) انہیں اپنا دوست نہ بتاؤ۔ یعنی جو اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لیتے۔ سورہ انعام میں ہے وَذَرُّهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُونَ (۶۴) ”تو انہیں چھوڑ دے کہ یہ اپنی یہودہ باتوں سے (زندگی سے) کھیلتے رہیں۔“ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ اسے مذاق قرار دے رکھا ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھے۔ مستقبل کے اندر بہت سی باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں عیش امروزگی بجائے فکر فردا۔ آنے والی نسلوں کے مفاد کا خیال۔ پوری نوع انسانی کی بہبود کی فکر۔ اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی کا خیال۔ طبعی زندگی کے مفاد عاجلہ کے مقابلہ میں بلند اقدار کا تحفظ۔ اس کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان مستقبل کی کچھ پرواہ نہ کرے اور اپنی مادی توجہ طبعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد اور عیش امروز پر رکھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش زندگی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِيبٌ وَلَهْوٌ (۱۳۴) اپنی تمام تگ و تاز کو طبعی زندگی کی آسائشوں کی نذر کر دینا، بے مقصد زندگی ہے۔ وَلِلْآخِرَةِ الْخَيْرُ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ (۱۳۴)۔ جو لوگ تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مستقبل کی زندگی کا مفاد ہی اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ لَهْوٌ اس بات کو کہتے ہیں جو انسان کی توجہ کو اس چیز کی طرف سے ہٹا کر جو اس کے لئے ضروری ہے اس چیز کی طرف منحرف کر دے جو غیر ضروری اور بے مقصد ہے۔ ان آیات سے (جن میں الْحَيَاةُ الدُّنْيَا کو لَهْوٌ و لعب کہا گیا ہے) یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم دنیاوی زندگی کو قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کی خوشگوار یوں کے حصول اور کائناتی قوتوں کی تسخیر کو مومن کی زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے (دیکھئے عنوان د۔ ن۔ و)۔ ان آیات کا مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنی نگاہ کو مستقبل کے مفاد سے ہٹا کر مفاد عاجلہ اور قوری عیش پر مبذول کر لینا۔ زندگی کو محض طبعی زندگی سمجھنا اور حیوانی سطح پر جینا۔ جب طبعی زندگی کے کسی مفاد اور بلند انسانی قدر میں تصادم ہو تو بلند قدر کو طبعی مفاد پر قربان کر دینا۔ یہ روش غلط ہے۔ جو قومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت افراد کی ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ مستقبل کے مفاد کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیاوی مفاد ضرور حاصل کرو۔ طبعی زندگی کی خوشگوار یوں سے متمتع ہو۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کی خوشگوار یوں میں اور کسی بلند انسانی قدر میں (جو وحی کے ذریعے ملتی ہے) (Tie) پڑ جائے۔ تصادم ہو جائے۔ تو اس وقت بلند قدر کے تحفظ کی خاطر طبعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دینا چاہئے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم انسانی زندگی کو محض مذاق سمجھ رہے ہو۔

سورہ انبیاء میں ہے - وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَا عَمِيْنٌ (۲۱) - اور ہم نے اس سلسلہ کائنات کو یونہی، لا عیبن، نہیں بنا دیا۔ اسے ہم نے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کر دیا۔ یہ مذاق نہیں۔ یہ ہلا مقصد نہیں۔ اسکا ایک عظیم الشان مقصد ہے۔ یہ ایک اہم پروگرام کے ماتحت عمل میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نَقْذِرُ بِالْحَقِّ عَلٰی الْبَاطِلِ فَيَدُ مَغْنُهُ فَيَاذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱) - یہاں ہو یہ رہا ہے کہ تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں۔ اس سے تخریبی قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور تعمیری سلسلہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ یوں یہ سلسلہ کائنات، اس تعمیری طریق سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز محض کھیل تماشا کے طور پر ہلا مقصد و ہلا منزل پیدا کر دی گئی ہو اس کی صورت یہ نہیں ہوا کرتی۔ اس آیت میں قرآن کریم نے اس غلط تصور کی بھی تردید کی ہے جو ہندوؤں کے ہاں رائج ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایشور نے ایک لیلا رچا رکھی ہے۔ یعنی محض کھیل ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں ایشور کو ”نٹ راجن“ کہتے ہیں۔ یعنی کھلاڑیوں کا بادشاہ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تصور لغو ہے۔ وَلَكُمْ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱) - یہ باتیں بے حد قابل افسوس اور تباہی کا باعث ہیں۔ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (۳۸) کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے۔

لہذا کائنات اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو ہمیشہ (Seriously) لینا چاہئے۔ مذاق نہیں سمجھنا چاہئے۔ اور اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی اور کائنات کو حقیقت (Reality) قرار دیکر انسان کے سامنے ایک عظیم پروگرام رکھ دیا ہے۔ اس سے افلاطون (Plato) کا وہ طلسم بھی یکسر ٹوٹ گیا جس کی رو سے اس کائنات کو محض فریب سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ٹوٹنے سے ویدانت (ہندی تصوف) - خانقاہیت اور تصوف کی عمارت بھی نیچے آگری۔ دوسری طرف مغرب کے نظریہ مادیت (Materialism) کا بھی بطلان کر دیا جس کی رو سے زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور بس۔

## لعل (حرف)

لعل - یہ حرف حسب ذیل معانی پیدا کرتا ہے۔

(۱) ”تاکہ“ وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۴) - تم

قانون خداوندی کی نگہداشت کرو تا کہ تمہاری کھیتیاں برومند ہوں۔ یہ توقع اور ترجیسی (امید) کے لئے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے ”امید ہے کہ“..... ”توقع ہے کہ“۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں (مثلاً -  $\frac{2}{113}$  :  $\frac{1}{113}$  :  $\frac{2}{113}$ )۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت - مصلحت - وہ مقصد جس کے لئے وہ قانون دیا گیا ہے۔ لَعَلَّ یُہی حکمت بتانے کے لئے آتا ہے۔ وَ اتَّقُوا اللہ۔ کتاب ہے (یعنی قانون - یا حکم) اور لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوا اللہ۔ اس کی حکمت (مقصد یا غایت یا وہ نتیجہ جو اس حکم یا قانون کی اطاعت سے لازمی طور پر مرتب ہونا چاہئے)۔

(۲) ”شاید“ یا ”ہوسکتا ہے کہ“ کے معنوں میں۔ وَ مَا یُذَرُّکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ فَرَّ یُہبُ (  $\frac{2}{113}$  ) اور تجھے کیا خبر ہے، شاید وہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو۔ (ہوسکتا ہے کہ وہ قریب ہی ہو)۔

(۳) استفہام انکاریہ کے لئے۔ یعنی ایسا سوال جس کا جواب (یا اس سے مراد) نہیں ہوتا ہے۔ فَلَعَلَّکَ تَارِکٌ بَعْضُ مَا یُؤْخِی السَّاعَۃَ (  $\frac{1}{113}$  )۔ تو کیا تو (ان لوگوں کی خاطر) اپنی وحی کا کچھ حصہ ترک کر دیگا؟۔ (ہرگز نہیں۔ تو ایسا کبھی نہیں کریگا)۔

(۴) بعض اوقات یہ ”گویا کہ“ اور ”جیسے“ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت مثال میں پیش کی جاتی ہے۔ وَ تَتَّخِذُوا مَصَٰئِعَ لَعَلَّکُمْ تَعْلَمُونَ (  $\frac{2}{113}$  )۔ اور تم صنعت کاری کے بڑے بڑے کام کرتے ہو گویا تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم یہ صنعت کاری اس لئے کرتے ہو تا کہ تمہیں دوام و استمرار نصیب ہو جائے۔ یہ چیزیں تمہاری بقا کا ذریعہ بن سکیں۔

## ل ع ن

لَعْن کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا\*۔ خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوگی کہ انسان زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محرومی قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوگی۔ اس لئے لَعْنَت کے معنی ہونگے قانون مکلفات کی رو سے زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو جانا۔

دور رکھنے کے اعتبار سے اَللَّعِيْمَيْنِ (Scare - Crow) کو کہتے ہیں۔  
 یعنی وہ لکڑیاں سی جنہیں انسانی لباس پہنا کر کھیتوں میں کھڑا کر دیا  
 جاتا ہے تاکہ پرندے فصل سے دور دور رہیں اور اسے خراب نہ کریں\*۔  
 قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق پہلے کہا ہے فَاتَّكَتْ رَجِيمٌ\*  
 (۱۵/۳۶)۔ اور اس کے بعد ہے اِنَّ عَلَيكَ اللّٰعْنَةَ (۱۵/۳۷)۔ رَجِيمٌ کے معنی  
 ہیں کسی چیز کو دور پھینک دینا۔ اس سے بھی لَعْنَتٌ کے معنی واضح  
 ہو جاتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآنی تعلیم سے کبھی  
 اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں۔ قرآن کریم نے  
 کہا کہ بَلْ لَعْنَتْهُمْ اَللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ\* (۲/۸۸)۔ نہیں! بات یہ نہیں جو  
 وہ کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور  
 سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دئے گئے ہیں۔ اور یہ خدا کے قافوں مکافات  
 کے مطابق ہوا ہے۔ لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا  
 کافروں پر ”لعتیں“ برساتا ہے تو انہوں نے لَعْنَتٌ کے قرآنی مفہوم کو نہیں  
 سمجھا۔ خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا۔ اس سے خدا کے قافوں مکافات  
 عمل کا بیان مقصود ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص غلط راہوں پر چلتا ہے  
 وہ زندگی کی انسانیت ساز خوشگوار یوں سے دور ہٹ جاتا ہے۔ ان سے محروم رہ  
 جاتا ہے۔ اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو لعنت کہتے ہیں اور ایسے شخص  
 (یسا قوم) کو ملعون۔

مَلْعُونٌ دور کیا ہوا۔ اس کی جمع مَلْعُوْنَ نَسُوْنَ وَ مَلْعُوْنِيْنَ  
 ہے (۳۳/۶۱)۔ دور کئے ہوئے۔

## ل غ ب

لَغَبٌ - لَغَبًا - لَغْوًا - بہت زیادہ درماندہ ہونا اور تھک جانا۔  
 شدید تکان ہو جانا\*\*۔ اَللَّغْوُ - جسمانی تکان کو کہتے ہیں اور اَللَّغْوُ ب\*  
 ذہنی یا نفسیاتی تکان کو\*۔ مَلْغَمٌ - لَغَبٌ - وہ تیر جس کے ہر بہت کمزور  
 اور خراب ہوں۔ رَجُلٌ - لَغَبٌ - کمزور اور بیوقوف آدمی\*\*۔

قرآن کریم میں اہل جنت کا قول ہے کہ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ\*  
 وَلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغْوٌ ب\* (۳۵/۳۵)۔ اس میں نہ جسمانی مشقت ہوگی نہ ذہنی

اور نفسیاتی تکان۔ غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے اگلے مراحل جن کی طرف قرآن کریم لے جاتا ہے، زندگی کی موجودہ سطح سے کس قدر بلند اور لطیف ہیں۔ طبیعی (Physical) اضمحلال بھی نہیں اور ذہنی (Mental) یا نفسیاتی (Psychological) تکان (Exhaustion) بھی نہیں۔ جب ”زندگی کے اگلے مراحل“ سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہوگی، تو اس میں یہ کیفیت کس طرح پیدا ہوگی اسکا ہم، اپنے شعور کی موجودہ سطح پر رہتے ہوئے، اندازہ نہیں کر سکتے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس میں حیات (Life) کی توانائیاں پھر پور ہونگی۔

## ل غ و

الْشَّغْوُ - آوازیں جن سے ہر قوم اپنے مطالب کی تعبیر کرتی ہے۔ بولی۔ لَغَوْتُ لَغْوًا - میں نے بات کی۔ بعض کا خیال ہے کہ الْلَّغْوُ کے معنی پھینکتے اور ڈالنے کے ہیں۔ کلام کو اس لئے لَغَوْتُ کہتے ہیں کہ اسے پھینکا جاتا ہے\*۔ صاحب محیط کا خیال ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ الْشَّغْوُ یونانی لفظ لَوُ غَوُس (Logos) سے ماخوذ ہو جس کے معنی کلیمہ کے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) ناقابل اعتناء چیز اور (۲) کسی چیز سے شیفگی۔ یعنی ہر وقت اسی کی باتیں کرتے رہنا۔ چنانچہ پہلے مفہوم کی جہت سے الْلَّغْوُ اونٹ کے ان بچوں کو کہتے ہیں جو خوں بہا میں ناقابل اعتناء ہوں۔ اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے الْشَّغْوُ بولی کو کہتے ہیں اس لئے کہ ہر ایک اپنی بولی پسند کرتا اور اسے بولتا رہتا ہے۔

الْشَّغَا اور الْلَّغْوُ - پرندے کی آواز کو کہتے ہیں۔ الطَّيْرُ تَلْغُلُ بِأَصْوَاتِهَا - پرندے اپنی آوازوں سے شور مچاتے ہیں۔ اس اعتبار سے بے معنی باتیں جو کسی گنتی میں شمار بھی نہ ہوں، لَغْوٌ کہلاتی ہیں۔ یا وہ باتیں جو زبان سے یونہی بلا ارادہ نکل جائیں\*۔ راغب نے کہا ہے کہ لَغْوٌ وہ باتیں ہیں جو سوچ سمجھ کر نہ کی جائیں۔ اس لئے وہ (بغیر ارادہ کے) کسی قطار و شمار میں نہ ہوں۔ خلیل نے کہا ہے کہ لَغْوٌ اس بات کو کہتے ہیں جو یونہی منہ سے نکل جائے\*۔

کَلِمَةٌ لَا غِيَةَ بِمُودَةٍ بات کو کہتے ہیں۔ لَغَوْنِي قَوْلِيہ کے معنی ہیں وہ اپنی بات میں غلطی کر گیا۔ الْغَاہُ - اسے نامراد کر دیا۔ ناکام بنا دیا۔ بیکار کر دیا۔ الْلَّغْوُ - گری پڑی چیز\*۔

سورۃ بقرہ میں ہے لَا يَتُوءَاخِذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّذَنُورِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يَتُوءَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ قُلُوبُكُمْ (۲۴۵) - اللہ تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا - ان پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تمہارے دل کا فعل ہوں - یہاں سے لَغُو کے معنی واضح ہیں - یعنی وہ باتیں جو یونہی بلا ارادہ منہ سے نکل جائیں - دوسری جگہ لَغُو کے بعد ہے وَلٰكِنْ يَتُوءَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمْ اِلَّا بِمَا نَ (۸۹) - جو تم پختہ معاہدہ کرو - جو تم دل سے عہد کرو - جن بات سوچ سمجھ کر دل کے ارادہ سے کرو - اس سے بھی لَغُو کے معنی واضح ہیں -

جنت کی ”شراب“ کے متعلق کہا ہے - لَا لَغُو فِيْهَا وَلَا تَأْتِيْمٌ (۵۲) - اس سے انسان نہ تو بے معنی بکو اس کریگا اور نہ ہی اس سے اضمحلال پیدا ہوگا (نیز ۵۱) - دوسری جگہ جنت کے متعلق ہے - لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغُوًا اِلَّا سَلَامًا (۱۱) - یعنی اس میں ہر بات ایسی ہوگی جس سے سلامتی پیدا ہو - وہاں کوئی بات لَغُو نہیں ہوگی - یہاں لَغُو بمقابلہ سَلَام آیا ہے - سورۃ غاشیہ میں لَغُو کی جگہ لَا غِيَةَ آیا ہے (۱۱) - مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغُوِّ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵) - اگر انہیں کبھی لَغُو کے پاس سے گذرنا پڑ جاتا ہے تو وہ نہایت متانت سے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے وہاں سے گذر جاتے ہیں - یہاں لَغُو سے مراد ہر بیہودہ اور بے معنی بات کے ہیں -

ان مقامات سے لَغُو کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - بیہودہ باتیں - ایسی باتیں جو شریف انسانوں کے شایان شان نہ ہوں - بے معنی باتیں - ایسی باتیں جن میں آواز ہی آواز ہو، مطلب کچھ نہ ہو - ایسی گفتگو جو بے سوچے سمجھے کی جائے - ایسے کام جن کا کوئی وزن اور شمار نہ ہو - جماعتِ مومنین کے جنتی معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کا کوئی دخل نہیں ہوگا -

قرآن کریم میں ایک جگہ کفار کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ - اس قرآن کریم کو مت مانو - وَ اَلْتَعُوْا فِیْہِ - جہاں قرآن کریم کی آواز بلند ہو تم شور مچا دو - بے معنی باتیں کرنے لگ جاؤ - لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۲۱) - شاید اس طرح تم قرآن والوں پر غالب آ جاؤ - حیرت ہے کہ جو مسلک کفار کا تھا مسلمانوں کو بھی آج کل اس کی تلقین کی جاتی ہے - ان سے کہا جاتا ہے کہ جہاں سے تمہیں یہ آواز سنائی دے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ، تم اس کی بات

مت سنو، بلکہ شور مچا دو کہ کوئی اور بھی یہ آواز نہ سننے پائے۔ یہ طریقہ  
ہے جس سے تم ان لوگوں پر غالب آ جاؤ گے۔ اس لئے کہ اگر لوگوں نے قرآن  
کریم کی آواز سن لی تو وہ پھر تمہارے خود ساختہ مذہب سے کبھی مطمئن  
نہیں ہو سکیں گے۔

لہذا ہر وہ بات، وہ عمل، وہ تصور، وہ نظریہ، وہ عقیدہ جو انسان کو  
قرآن کریم سے دور رکھے لَغَوٌ ہے۔ یہی وہ لغویات ہیں جن میں ہم صدیوں  
سے الجھے چلے آ رہے ہیں۔ جب تک ہم اپنے دل و دماغ کو ان لغویات سے  
پاک اور صاف نہیں کر لیں گے، دینِ خالص تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

## ل ف ت

لَفْتَحَتْہُ یَلْفُتْہُ۔ کسی کو اس کی سمت سے موڑ دینا۔ جس رخ پر وہ ہو  
اس سے پھیر دینا۔ لوٹا دینا۔ واپس کر دینا۔ لَفْتَحَتْہُ عَنِ الْقَشِیْ۔ اسے  
کسی چیز سے ہٹا دیا، پھیر دیا \*۔ قرآن کریم میں ہے اَجِیْثُنَا لِتَلْفِیْتُنَا  
عَمَّا وَجَدْنَاۤہُمْ اَبَآءَنَا (۱۸/۲۸)۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے  
کہ ہمیں اپنے اسلاف کے راستے سے موڑ کر کسی اور طرف لے جائے۔  
الْتِفَاتٌ اسی سے ہے جسکے معنی ہیں رخ موڑنا \*۔ لِفْتَحَتْہُ مَتَعَةً۔ اس  
کا میلان اسکی طرف ہے \*\*۔ اَلْلَفْتُوْتُ وہ عورت جسکے ساتھ پہلے شوہر  
کا بچہ ہو اور اسکی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے وہ دوسرے شوہر کی طرف  
توجہ نہ کر سکے۔ نیز اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دودھ دوھنے والے کی طرف  
بار بار مڑ کر دیکھے، اسے کائے اور چلائے اور بمشکل دودھ دوھائے، کیونکہ  
اس کا بچہ مر چکا ہے \*۔ سورہ ہود میں اصحابِ حضرت لوطؑ سے کہا گیا ہے  
و کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ۔ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ  
اَحَدٌ (۱۱/۸۱)۔ اور پھر تم میں سے کوئی ادھر منہ موڑ کر بھی نہ دیکھے۔ ان  
چیزوں کو ایسا چھوڑ دو کہ پھر ان کی طرف تمہارا خیال بھی نہ آئے۔  
تمہاری یہ حالت ہو کہ۔ از گوشہ یاسے کہ پریدیم، پریدیم۔

## ل ف ح

لَفَحَ۔ سخت گرم ہوا کی لہٹ۔ لسان میں ہے کہ لَفَحَ ہر گرم  
چیز کو کہتے ہیں اور لَفَحَ ہر ٹھنڈی چیز کو۔ محیط میں اصمعی کے حوالہ  
سے ہے کہ جس ہوا کو لَفَحَ کہا جائے وہ گرم ہوگی اور جسے لَفَحَ کہا



جائے وہ ٹھنڈی ہوگی۔ لَفَّحَتْهُ النَّارُ بِحَرِّهَا۔ آگ نے اپنی گرمی سے اسے جھلسا دیا \*۔ سورہ مومنون میں ہے۔ تَلَفَّحَ وَجُوهُهُمْ النَّارُ۔ (۲۳/۱۰۴)۔ آگ ان کے چہروں کو جھلسا دیگی۔

## ل ف ف

لَفِظَتْہُ۔ بِتَلْفِظَتْہُ مِّنْ فِیْئِہِ۔ اس نے اسے اپنے منہ سے نکال کر پھینک دیا \*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ڈال دینے اور پھینک دینے کے ہوتے ہیں۔

الْقَلَابِظَةُ۔ سمندر (کیونکہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے وہ اسے کناروں پر پھینک دیتا ہے)۔ جو کا دہنے والے پرندے، کہہ وہ جو کچھ منہ میں لاتے ہیں اپنے بچوں کو دیدیتے ہیں۔ چکسی (کیونکہ جو کچھ دانہ وغیرہ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ اُٹا بنا کر اسے باہر پھینک دیتی ہے)۔ نیز وہ ہسکری جو چارہ کھا رہی ہو اور دودھ دھونے والا آجائے تو جو گھاس اس کے منہ میں ہو وہ اسے بھی چھوڑ دے اور دودھ دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ اَلتَّلْفِظَاتُ۔ جو کچھ منہ سے پھینکا جائے \*\*۔ لَفِظَ۔ منہ سے نکلی ہوئی آواز چونکہ اس میں آواز کا ہونا ضروری ہے اس لئے لَفِظَ اللہ نہیں کہتے بلکہ کلیمۃ اللہ کہتے ہیں \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ (۵/۸)۔ وہ کوئی بات بھی نہیں بولتا ہے۔

## ل ف ف

الَّتِفَافُ۔ لپیٹنا (نَشْرُ کی ضد ہے)۔ لَفَّفَ الشَّيْءُ بِالشَّيْءِ۔ اس نے اس چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا۔ اَلَّتِفَافُ۔ جماعت۔ گروہ۔ مجتمع سوگ۔ اَلَّتَفِيفُ۔ ملے جلے اکٹھے سوگ۔ مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے سوگ۔ اَلَّتِفَافَةُ۔ ہٹی وغیرہ جو لپیٹی جائے۔ اَلَّتِفَافُ۔ کٹھے ہوئے درخت۔ جَنَّتِ اَلَّتِفَافُ۔ کھنے، گنجان، بکثرت درختوں والے باغیچے۔ (۲۸/۱۶)۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ جِئْنَا بِكُمْ لَتِغْفِرْنَا (۱۶/۱)۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے اکٹھا کر کے لائیں گے۔ اَلَّتِفَافُ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لپٹ جانا۔ وَالتَّتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۲۹/۶)۔ شدت پر شدت جمع ہوتی گئی۔ مشکلات اکٹھی ہوتی چلی گئیں۔ ساق پھٹتی کو بھی کہتے ہیں۔ \*\*\*\*

\* تاج و راغب و محیط۔ \*\* تاج۔ \*\*\* محیط۔ \*\*\*\* تاج و راغب۔

## ل ف ی

الْفَتَاهُ\* کا ذریعہ۔ اس نے اسے جھوٹا پایا۔ وَالْفَتَاهُ سَيِّدٌ هَذَا لَدَى الْبَابِ (۱۲/۵)۔ ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ کے قریب پایا\*۔

سورۃ بقرہ میں ہے۔ مَا الْفَتَيْنَا عَلَيْهِ أَبَاءَنَا (۲/۲۱)۔ جس مسلک پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے۔

تَلَاَفَتِ التَّقْصِيْرَ\*۔ اس نے تقصیر کی تلافی کر دی۔ التَّلَاَفِي۔ بدلہ لئے لینا\*۔ تلافی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو چیز ہاتھ سے نکل گئی تھی اسے دوبارہ پا لیا گیا ہے۔ تلافی مافات۔ جو کچھ ہاتھ سے چلا گیا تھا اسے دوبارہ پا لینا۔ اَلْفَتَاهُ\*۔ مٹی اور ہر کری پڑی کھٹیا چیز کو کہتے ہیں\*۔ یعنی جو چیز یونہی پا لی جائے۔

## ل ق ب

اَللَّقَبْ\*۔ وہ نام جو کسی کا اصلی نہ ہو بلکہ بعد میں پڑ جائے۔ جمع اَلْقَاب\*۔ اس نام میں معنی کی رعایت ہوتی ہے، بخلاف اَعْلَام\* کے جس میں معنی کی رعایت نہیں ہوتی\*\*۔ لَقَبٌ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ لقب تشریف۔ لقب تعریف۔ اور لقب تسخیف۔ تیسری قسم سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں ذلت کا پہلو ہوتا ہے\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَتَّخِذُوا بِآلِ الْقَابِ (۱۱/۱)۔ ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھا کرو۔ (دیکھئے عنوان ن۔ ب۔ ز)

## ل ق ح

لِقَاح\*۔ گھوڑے یا اُونٹ کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں۔ اَللَّقَح\*۔ حمل۔ لَاقِح\*۔ حاملہ۔ (جمع لَوَاقِح\*)۔ لَقِیَحَتِ النِّقَاقَةُ\*۔ اونٹنی حاملہ ہوئی۔ اَللَّقَحَتِ الرِّیَاحُ الشَّجَرُ وَالسَّحَابُ\*۔ ہواؤں نے درختوں اور بادلوں کو بار آور بنا دیا\*\*\*\*۔ (درختوں کو اس طرح کہ ہوائیں نر درختوں کا زیرہ، مادہ درختوں پر لا کر ڈال دیتی ہیں جس سے ان میں پھول آ جاتے ہیں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اور بادلوں کو اس طرح کہ ہوائیں سمندر سے پانی اٹھا کر بادلوں کو بار آور کر دیتی ہیں۔ یہ ابن فارس کی تشریح ہے)۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔ وَارْسَلْنَا الرِّیْحَ لَوَاقِحَ (۱۲/۵)۔ ہم بار آور

ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں آندھی اور جھکڑ کی ہوا کو  
الرَّيْحَ الْعَاقِيْمَ (۵۱) کہا گیا ہے۔ بانجھ ہوا۔

## ل ق ط

لَقَطَ - يَلْقِطُ - لَقْطًا۔ کسی (گری پڑی) چیز کو زمین سے بلا محنت  
و مشقت اٹھا لینا۔ اَللَّاقِطَةُ\*۔ وہ پڑی ہوئی چیز جو کسی کو ملے اور وہ اسے اٹھالے۔  
نیز پھینکا ہوا نوزائیدہ بچہ۔ اسے اَللَّاقِطُ بھی کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے  
کہا ہے کہ اس کے معنی ہونے میں اس چیز کو زمین سے اٹھا لینا جسے  
اچانک دیکھا ہو اور اسے لینے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ ہو۔ اگرچہ بعض  
اوقات یہ مقصد اور ارادے کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

قرآن حکریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اسے  
الندھ مکنوئیں میں ڈال دو۔ يَلْقِطُهَا بَعْضُ السَّيَّارَةِ (۱۲)۔ کوئی  
قافلہ اسے پڑی ہوئی چیز دیکھ کر اٹھا کر لے جائیگا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ  
کے متعلق ہے کہ جب ان کی والدہ نے انہیں دریا میں بہا دیا۔ قَالَتْ قَطِطَةٌ  
آلُ فِرْعَوْنَ (۲۸)۔ فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا۔

## ل ق ف

لَقِيفَ - يَلْقِفُ\*۔ کسی چیز کو جلدی سے لے لینا۔ جو چیز تمہاری  
طرف پھینکی جائے اسے تیزی سے (ہاتھ سے یا منہ سے) اُچک لینا۔ راغب نے  
اسکے معنی کسی چیز کو مہارت اور ہوشیاری سے لے لینا لکھے ہیں۔  
اَلتَّلْقِيفُ\*۔ اَلتَّلْقِيفُ\*۔ کھانے کو نگل لینا۔ اَلتَّلْقِيفُ\*۔ گھ-وڑے یا  
اونٹ کا تیزی سے دوڑنے۔ میں اگلی ٹانگوں کو تیزی سے چلانا اور پیٹ کی  
طرف پوری طرح نہ جانے دینا\*۔ تَلْقِيفُ الشَّيْءِ\*۔ کسی چیز کو تیزی اور بھرتی  
سے لینا\*\*۔ قرآن حکریم میں حضرت موسیٰؑ کے ”عصا“ کے متعلق ہے۔  
فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ (۲۰) وہ فریق مقابل کے باطل (دلائل)  
کو ہونسی نگل گیا۔ وہ دلیلیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ اسنے انہیں ہاتھ  
بڑھا کر اُچک لیا۔ ساحرین نے جو کچھ جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا (ڈھونگ  
رچا رکھا تھا) اس نے اسے تیزی سے اُچک لیا۔ ساحرین کے جھوٹ موٹ کے  
”سانپوں“ کو موسیٰؑ کا ”اڑدھا“ جھٹ سے نگل گیا۔

## ل ق م

الْثَّقَمُ\* - جلدی اور تیزی سے کھانا - لَقِيعَةً\* - اسے اپنے منہ سے کھینچا اور جھٹ سے کھا لیا - الثَّقَمَةُ\* - اس نے اسے نگل لیا، مہلت کے ساتھ\* - یعنی پہلے منہ میں رکھا اور پھر نگلا - اس اعتبار سے لَقِیمٌ اور الثَّقَمُ\* - منہ میں لینے کو کہتے ہیں\*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہاتھ کے ذریعے منہ تک کھانا لے جانے کے ہیں - قرآن کریم میں قصہ حضرت یونسؑ میں ہے - فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ (۳۰/۳۳) - بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا - منہ میں لے لیا - لَقَمَ الطَّوْرُ یُقْ - اس نے راستہ کا منہ بند کر دیا\* - الْقَمَّةُ الْحَجَرُ - جھکڑے وقت حریف بمقابلہ کو لاجواب اور خاموش کر دیا\*\* -

## لقمان

قرآن کریم نے علم و حکمت کی باتوں کے سلسلہ میں ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے جس کا نام لقمان ہے - (وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ... (۱۲/۳۱) قرآن کریم نے انہیں نبی نہیں کہا - نہ ہی ان کا تفصیلی تعارف کراہا ہے - انہوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت آمیز باتیں کہی ہیں فقط ان کا ذکر کیا ہے (۱۲/۳۱) -

بعض نے کہا ہے کہ آپ حضرت ایوبؑ کے بھانجے تھے - بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے - بعض کا خیال ہے کہ آپ حبشی غلام تھے - مستشرقین میں سے میل کا خیال ہے کہ یہ یونانی ایساپ (Aesop) ہی ہیں - ڈاکٹر (Spanger) نے کہا ہے کہ یہ ایونہ کے الکسانی (Elxai) ہی کا دوسرا نام ہے - پروفیسر ہتی (Hitti) بھی اسی خیال کا مؤید ہے - تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۳۰/۳۱) اور طوایل بادشاہ (۳۱/۳۱) کی حکمت کی باتیں عرب کے لقمان کی نصائح سے ملتی جلتی ہیں - اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسماعیل میں سے ہونا چاہئے -

لیکن یہ سب قیامات ہیں - بعد کی تحقیق کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچا سکیگی - ایک بات البتہ بالکل واضح ہے - اگر لقمان، صاحبِ وحی تھے (جس کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا) تو حکمت کے معنی وحی ہونگے - اور اگر وہ صاحبِ وحی نہ تھے (جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے) تو حکمت

کے معنی یہ ہونگے کہ وہ، وحی کے احکام کے حکیمانہ نتائج کو سمجھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ جب الحکمۃ منزل من اللہ ہو تو وہ وحی ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اور جب یہ لفظ ہام انسانوں کی طرف منسوب ہو تو اس سے ہام دانش اطواری مراد ہوتی ہے۔

## ل ق ی

لیقاء\*۔ امام رازی نے کہا ہے کہ کسی جسم کا دوسرے جسم تک اس طرح پہنچنا کہ وہ آپس میں لمس کر جائیں، ليقاء\* کہلاتا ہے\*۔ لیکن امام راغب کے نزدیک لمس کرنا ضروری نہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ہونا ليقاء\* ہے۔ بعض کے نزدیک کسی بات کا حس اور بصر یا بصیرت سے ادراک کر لینا\*\* (Perception)۔ یا کسی بات کا پا لینا بھی ليقاء\* ہے۔ تِلْقَاءُ کے معنی ہیں۔ سامنے\*۔ یَوْمُ التَّلَاقِ (۳۱۵) کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنے کا دن۔ یعنی جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ التَّلَاقُ کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا ہیں کہ وہ دوسرے کے سامنے آجائے\*\*\*۔ جوہری کے نزدیک مطلق کسی چیز کو پھینک دینے کو بھی کہتے ہیں\*۔ نیز ليقاء\* کا لفظ جنگ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جب فوجوں کی ایک دوسرے سے مشہ بھیڑ ہو جاتی ہے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) دو چیزوں کا ملنا۔ آمنے سامنے ہونا۔ (۲) کسی چیز کو ڈال دینا۔ اور (۳) ٹیڑھا پن، جس سے اللَقْوَةُ\* ہے۔ (لیکن مؤخر الذکر واوی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے اِذْ التَّقْوَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۳۰)۔ جب وہ مومنین کے سامنے آئے ہیں۔ دوسری جگہ ہے فَتَلَقَّیْ اٰدَمُ مِنْ رَبِّهِمْ کَلِمَتًا (۲۳۱) اس میں تَلَقَّیْ کے معنی قوائین خداوندی کے حصول (پالینے) کے ہیں۔ زمین کے متعلق جہاں ہے وَالتَّقِیْنَا فِیْہَا رَوَّاسِیً (۱۵۹)۔ وہاں التَّلَاقُ کے معنی ڈال دینا یا بنا دینا ہیں۔ ڈال دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳۱) میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہرکارے کو اپنا خط دیا اور کہا فَاتَّقِیْہِ الْیٰسَیْمِ (۲۳۸) ”یہ خط ان کے سامنے ڈال دے“۔ یعنی (Deliver) کر دے۔ اس کے بعد ملاکہ سبا کا قول ہے اِنِّیْ الْیٰسَیْمِ الْیٰسَیْمِ کِتَابٌ کَرِیْمٌ (۲۳۹) ”میری طرف ایک باعزت خط بھیجا گیا ہے۔“ سورہ نحل میں۔ فَاتَّقُوْا الْیٰسَیْمِ اَلْقَوْلِ (۱۶۶) کے معنی ہیں، ان کی طرف بات ڈالنا یعنی کہنا۔

سورہ کہف میں ہے کہ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ، فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ، أَحَدًا (۱۸:۱۱۰)۔ اس کے معنی ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا کا (قانون یا) نظام ربوبیت، محسوس شکل میں اس کے سامنے آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ (قانون خداوندی کے متعین کردہ) صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس قانون کے مطابق صرف میں لائے اور اس میں کسی اور جذبہ یا مفاد پرستی کی کشش کو شریک نہ ہونے دے۔ لہذا، لِقَاءَ رَبِّ کے معنی ہیں خدا کے نظام ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ یا قانون خداوندی کی رو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہے۔ لِقَاءَ رَبِّ سے انکار (کفر) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے عملی پہلوؤں میں قانون خداوندی کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں نکالے۔ اس کا سامنا کرنے سے کترائے اور قانون مکافات کے سامنے جواب دہی سے انکار کرے۔ واضح رہے کہ قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجائے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لئے ان معانی میں لِقَاءَ رَبِّ یہاں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ جہاں تک اُس لِقَاءَ رَبِّ کا تعلق ہے جس میں خدا کے قانون ربوبیت کو مشہود طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نظام کائنات پر غور کرو۔ اس میں ریسرچ کرو۔ اس کے نظام و نسق کو سمجھو۔ اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائیں گے۔ (دیکھئے ۱۳)۔ لیکن ایسا وہی کر سکیگا جو پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود زندگی نہ سمجھ لے (۱۸:۶)۔ ایسے لوگ خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں (۲۳:۲)۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہئے کہ لِقَاءَ رَبِّ سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے۔ یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا (خواہ اس زندگی میں ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ بعض لوگ ”لِقَاءَ رَبِّ“ سے متعلق آیات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آخرت میں انسان کو خدا کا دیدار ہوگا۔ یعنی وہ اور خدا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے۔ ہم اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نہ تو خدا کی ذات مادی ہے اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ حیاتِ اخروی میں انسانی زندگی کی کیفیت کیسا ہوگی۔ اس لئے یہ تصور کرنا کہ اس زندگی میں انسان اور خدا اس طرح آمنے سامنے

ہونگے جس طرح یہاں دو انسان ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں، غلط ہوگا۔ اگر وہاں ”لیقاء رب“ ہوگا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہہ اسکی کیفیت کیا ہوگی۔

ہمارے ہاں عام طور پر ”بزرگوں“ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کو خدا نے ان کی طرف ”القا کیا“۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس بات کا علم انہیں خدا کی طرف سے بذریعہ الہام ہوا۔ یعنی انہوں نے اپنے علم و عقل سے اسے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ علم انہیں براہ راست خدا کی طرف سے عطا ہوا۔ اسی کو الہام یا کشف کہا جاتا ہے جس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ خدا کی طرف سے براہ راست علم صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب وہ علم قرآن کریم کے اندر ہے۔ اب یہ کہنا کہ کسی کو خدا کی طرف سے الہام یا القا ہوتا ہے مہر نبوت کو توڑنا ہے۔ [تفصیل اس اجمال کی (و۔ ح۔ ی) اور (ل۔ ہ۔ م) کے عنوانوں میں ملیگی]۔

واضح رہے کہ یہ جو ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ فلاں کام کرو، تو اس کا تعلق وحی، الہام، القا وغیرہ سے کچھ نہیں۔ یہ انسان کے نفس لاشعور (Un - Conscious Mind) کا عمل ہوتا ہے جس کے متعلق ہمارے زمانے میں تحقیقات کے نئے باب کھل رہے ہیں۔ وحی کی نوعیت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ وہ ایک یقینی علم ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے نبی کو براہ راست ملتا تھا۔

یٰلَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْۤا (۱/۲۵) اس (اہم کام) کی توفیق انہیں ہی ملتی ہے جو قوانین خداوندی کی استقامت سے اطاعت کرتے ہیں۔ اسے وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔

سورہ یونس میں ہے۔ ”مَنْ یُّلَاقِیْ نَفْسَیْ“ (۱۰/۱)۔ اس کے معنی ہیں، اپنی طرف سے۔

## لکن (حرف)

”لکین“۔ ”لیکن“۔ ”مگر یا لیکن“ کے معنوں کے لئے آتا ہے۔ ”فَلَا مَدَقَّ وَلَا مَتَلٰی“۔ ”لکین“ ”کَذَبَ“ ”وَتَوَلٰی“ (۱۰/۲۴)۔ تو وہ نہ تصدیق کرتا ہے نہ سیدھے راستے پر چلتا ہے۔ لیکن جھٹلاتا ہے اور گریہ کی

راہیں نکالتا ہے۔ ("لیکن" کے مقابلہ میں یہاں "بلکہ" ترجمہ کیا جائے تو زیادہ موزوں رہیگا لہذا) یہ "لیکن" اور "بلکہ" دونوں معنوں میں آتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت۔ بَلْ أَحْيَاءٌ وَالْكَائِنُ لَا تَشْعُرُونَ (۲/۵۳) میں اس کے معنی "لیکن" یا "مگر" کے ہیں۔ یعنی وہ زندہ ہیں لیکن تم انہی شعور کی موجودہ سطح پر اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔

## لَمْ (حرف)

لَمْ۔ یہ مضارع پر آتا ہے تو اس کے معنی ماضی منفی کے کر دیتا ہے۔ مثلاً۔ لَمْ يَلِدْ (۱۱/۲)۔ اس نے نہیں جنا۔ یَلِدُ۔ مضارع ہے جس کے عام طور پر معنی "جنتا ہے" ہونگے۔ لیکن لَمْ سے اس کے معنی "جنا" (ماضی) کے بھی ہو گئے اور نفی (نہیں) کے بھی۔ یعنی، نہیں جنا۔

## لَمَّا

لَمَّا۔ (۱) "جب" کے معنوں میں۔ لَمَّا وَرَدَ مَاءٌ مَدْيُنَ (۲۸/۲۸)۔ جب وہ مدین کے پانی (گھاٹ) پر پہنچا۔  
(۲) "ہنوز" نہیں (اب تک نہیں) کے معنوں میں۔ لَمَّا يَمْدُ وُقُوتَا عَذَابِ (۳۸/۸)۔ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔  
(۳) "الّا" (مگر) کے معنوں میں۔ اِنْ كُنَّ نَفْسٌ لَمَّا عَلَيْنَا حَافِظٌ (۸۶/۶)۔ کوئی متنفس ایسا نہیں مگر اس پر نگران موجود ہے۔ یعنی کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس پر نگران موجود نہ ہو۔ ہر متنفس پر نگران موجود ہے۔

(۴) "سب کے سب" کے معنوں میں۔ اِنْ كُنَّا لَمَّا لَيُؤْفِيَنَّهُمْ رَيْثُكَ اَعْمَالَهُمْ (۱۱۱/۱)۔ یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

(۵) بعض اوقات زائد بھی ہوتا ہے۔ وَاِنْ كُنَّ ذَالِكُ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۳/۳۳)۔ اور یہ سب طبعی زندگی کا ماز و سامان ہے۔ یہاں اگر لَمَّا نہ بھی ہو تو بھی یہی معنی ہونگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں اِنْ نافیہ ہو اور لَمَّا بمعنی اِلّا۔ (جیسا کہ نمبر (۳) میں لکھا جا چکا ہے)۔

## ل م ح

لَمَّا تَمَّحَ التَّيْدُ کسی کی طرف تیزی سے دیکھنا۔ نیز عجلت کے ساتھ دیکھنا۔ اَللَّمَّحَتِ عَجَلَتِ کے ساتھ دیکھنا۔ اَللَّمَّحَتِ التَّمَرَّاةُ مین



وَجَنَّهِيَهَا - عورت نے اپنے معامن کی جھلک دکھائی پھر انہیں چھو لیا - ایسا بالعموم حسینہ اپنے عاشق کے ساتھ کرتی ہے \* -

الْبَصَرُ - بچلی کے چمکنے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اظہار و اخفاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے \*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے چمکنے کے ہیں - لَمْ يَجْزِ الْبَصَرُ - نگاہ کا کسی چیز کی طرف اٹھنا \*\*\* - قرآن کریم میں آءُ مَرَّ السَّاعَةِ - (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے - كَلَّمَاحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ (۱/۱۱) - وہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی قریب تر -

## ل م ن

الْمُزْ - اس کے اصلی معنی آنکھ ، سر یا ہونٹوں سے اشارہ کرتے ہوئے خفیہ بات کرنا ہیں - مِنْهُ پَر عیب چینی کرنا - بعض نے اس کے معنی غیبت کرنے کے بھی لکھے ہیں - لَمْزَةٌ \* اُس چغلخور کو کہتے ہیں جو جماعت میں تفریق ڈالے اور دو دوستوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکائے \*\*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عیب کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے مَن يَلْمِزْكَ فِي الصَّدَقَاتِ (۹/۸) - جو صدقات (کی تقسیم) کے معاملہ میں تیرے خلاف اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - سورہ حجرات میں ہے لَا تَلْمِزُْوا أَنْفُسَكُمْ (۲۴/۱) - آپس میں ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو - مذاق نہ اڑاؤ - سورہ حمزہ میں هُمَزَةٌ لَمْزَةٌ (۲۴/۱) آیا ہے - کچوکے لگانے والے - عیب تراشنے والے ( تاکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو ) - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوسروں کے عیوب کی تلاش کرنا ہے \*\* -

## ل م ن

لَمْ يَسْ - ہاتھ سے چھونا - کسی چیز کو ادھر ادھر تلاش کرنا \*\*\*\*\* - سورہ جن میں ہے اِنَّا لَمَسْنٰ السَّمَاءَ (۸۲/۸) - ہم نے آسمان کو ٹھولا - ( غیب کی خبروں کے لئے قیاس آرائیاں کیں ) - اَلْتَمَسَ - کسی شے کو طلب کرنا - تلاش کرنا \*\*\*\*\* - ابن فارس نے ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تو کسی چیز کو ہاتھ سے چھونے کے ہیں لیکن پھر ہر متلاشی اور جستجو کرنے والے کو مُلْتَمِسٌ کہہ دیتے ہیں -

\* تاج - \*\* راغب - \*\*\* محیط - \*\*\*\* تاج و محیط - \*\*\*\*\* تاج و راغب -

سورہ حدید میں ہے - فَالْتَمِيسُوا نُورًا (۱۳۵) - تم روشنی کو تلاش کرو - اَلْتَمَا مَسَّةٌ - ایک دوسرے کو ہاتھ سے چھونا - نیز یہ کنایہ مجامعت کے لئے بولا جاتا ہے \* - اسی معنی میں قرآن کریم میں اَوَّلَمَسْتُمْ اَلتَّيْسَاءَ (۲۳۴) آیا ہے -

## ل م م

لَمَقَّہُ يَلْمُہُ لَمَقًا - اس نے اسکو جمع کر دیا - لَمَّ الشَّعَثَ - منتشر معاملات کو سمیٹ کر قریب قریب کر دیا - دَارُ نَالَمُوْمَةٍ - ہمارا کھر لوگوں کو جمع کر لینے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے - رَجُلٌ مِلَمٌ - قوم اور کنبہ کو جمع کر لینے والا آدمی \*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے ، قریب قریب ہونے اور ملا ہوا ہونے کے ہیں -

سورہ فجر میں ہے - وَتَا كُنُوْنَ اَلنَّشْرَاتِ اَكْلًا لَمَقًا (۱۹) - تم اس مال کو جو تمہیں میراث میں ملتا ہے ، سمیٹ کر خود ہی کھا جائے ہو ؟ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی نظام معیشت میں میراث انفرادی چیز نہیں رہتی - قرآن کریم میں وراثت کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں نظام قرآنی ابھی مکمل طور پر قائم نہ ہوا ہو - اس نظام کی تشکیل کے بعد فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی اس لئے ترکہ میں مال اور جائداد چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا - ( تفصیل متعلقہ عنوانات میں دیکھئے ) - اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ترکہ سے مختلف وارثوں کا حق نہیں دیتے - مارے کا سارا خود ہی کھا جائے ہو - اس صورت میں یہ آیت اس دور سے متعلق ہوگی جس میں میراث اور اس کی تقسیم کا هنوز عمل جاری ہوگا - ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام بھی بعض حالات میں اس عمل کو جاری رکھے - نیز مال و دولت اور جائداد کے علاوہ عام مستعملہ اشیاء بھی تو ترکہ میں آسکتی ہیں -

”قریب ہونے“ کے اعتبار سے اَلَمَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ، آدمی گناہ کے قریب ہو گیا - یعنی اس کا مرتکب تو نہیں ہوا ، البتہ اس نے اسکا ارادہ کر لیا تھا - بعض نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کبھی کبھار کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن اس پر اصرار نہ کرے - اَلْمَمَامُ کے معنی ہیں ، کسی وقت کوئی کام کر لینا لیکن اس پر اصرار نہ کرنا - چنانچہ کہتے ہیں

مَسَا يَزُورُنَا إِلَّا لِنَمَسٍّ \* وہ ہمارے ہاں بلا ہا ہندی کبھی کبھار آجاتا ہے۔ کبھی نے کہا ہے کہ لَمَسٍّ کے معنی بلا ارادہ غیر محرم کو دیکھ لینے کے ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں بلا ارادہ کسی معصیت کے قریب ہو جانا لیکن اس کا ارتکاب نہ کرنا۔ ”قریب ہو جانے“ کے اعتبار سے لَمَسٍّ کے معنی ہوسہ لینے کے بھی آتے ہیں \*۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْأَلْثَمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّامَمَ (۵۳/۳۳)۔ وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں، بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہو جائیں۔ ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں لیکن معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں۔ اس لئے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہئے کہ بار بار ایسا نہ ہو۔ غور کیجئے قرآن، نفسیاتی اصلاح کے لئے کس قدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ایک دم سختی نہیں کر دیتا۔

(لَمَ - لَمَعًا - حروف ہیں۔ انہیں انکے عنوانات کے تحت دیکھئے)۔

## لَنْ (حرف)

لَنْ - یہ مضارع پر آتا ہے تو (۱) اسے مستقبل کے معنی دیتا ہے۔  
(۲) نفی (نہیں) کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور (۳) اس نفی میں شدت پیدا کرتا ہے۔  
جیسے لَنْ تَقْعَلُوا (۲۳/۲۳) تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے۔

## ل ه ب

لَهَبٌ - آگ کا شعلہ۔ لَهَيْبٌ - اس شعلہ کی حرارت۔ أَلْهَبَ النَّارَ۔ اس نے آگ کو بھڑکایا۔ فَالْتَهَبَتْ - پس وہ بھڑک اٹھی \*۔ نیز دھوئیں کی طرح اوپر اڑنے والے غبار کو بھی لَهَبٌ کہتے ہیں \*۔ رَاغِبٌ لَهَبٌ کے معنی دھواں بھی لکھے ہیں \*\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ لَا يَغْنِيُ مِنَ اللَّهَبِ (۱۱۱/۱۱۱)۔ وہ آگ کے شعلے سے نہیں بچا سکتا۔ سورہ لہب میں آبی لَهَبٌ (۱۱۱/۱۱۱) آیا ہے۔ جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نارا ذات لَهَبٌ (۱۱۱/۱۱۱) میں داخل ہوگا۔ ابی لہب، نبی اکرمؐ کے چچا (عبد العزی بن عبدالمطلب) کی کنیت تھی، غالباً اسکی شعلہ مزاجی کی وجہ سے۔ وہ اسلام کا سخت مخالف تھا۔ وہ پدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض میں مر گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر



کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، حق اور باطل کی تمیز کی استعداد رکھدی ہے۔ یہ معنی ہوجوہ غلط ہیں۔ کائنات میں انسان کے علاوہ، ہر شے کو بطور جبلت (Instinct) اس راستے کی راہ نمائی عطا کر دی گئی ہے جس پر اسے چلنا ہے۔ ہانی کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ بکری کی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرہیز کرے۔ اگر اسی طرح انسان کے اندر بھی خیر و شر کی تمیز رکھدی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستے پر چلتا۔ (جس طرح ہر بکری گھاس ہی کھاتی ہے)۔ اور اس میں اس کے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی نہیں۔ ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر داخل نہیں کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تمیز انسان کی فطرت کے اندر تو ہے لیکن ماحول اور تعلیم کا اثر اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے اس کے ماں باپ یا معاشرہ بنا دے۔ اگر انسان پر یہ خارجی اثرات نہ ہوتے تو ہر بچہ حق کے راستے پر از خود چلتا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ایسے بچے ہائے گئے ہیں جو پیدائش کے ساتھ ہی (کسی حادثے کی وجہ سے) انسانوں کی بستیوں سے الگ ہو کر جنگل میں چلے گئے اور وہاں ان کی پرورش انسانی اثرات سے یکسر دور رہ کر ہوئی۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو بالکل جانور تھے۔ حق و باطل کی تمیز تو ایک طرف، ان میں کھائے پینے کے معاملہ میں بھی انسانی بچوں کی سی تمیز نہ تھی۔ لہذا یہ تصور صحیح نہیں کہ خیر و شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھدی گئی ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لفظ فیطرت" عنوان ف۔ ط۔ ر۔ میں)

اس آیت (۹۱) کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھدی گئی ہیں جن سے انسانی ذات (Personality) ٹکڑے ٹکڑے (Disintegrate) ہو جاتی ہے۔ (فُجُوْرَہَا۔ دیکھئے عنوان ف۔ ج۔ ر) اور وہ قوتیں بھی جن کی رو سے یہ اس انتشار (Disintegration) سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ (تَقْوَاہَا۔ دیکھئے عنوان و۔ ق۔ ی)۔ فُجُوْرَہَا اور تَقْوَاہَا کی ”ہا“ خود اسکی دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں ”نفس“ کی کیفیات ہیں۔ اس لئے اس کے معنی یہی ہیں کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ ہر دو ممکنات رکھ دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد، یہ انسان

کے اپنے اختیار کے بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمحل قوتوں (Latent Faculties) کو نشو و نما دیکر انہیں کس راستے میں صرف کرتا ہے۔ وہ انہیں اپنی ذات کی نشو و نما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب اور تدمیہ کا۔ (قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا)۔

باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ قرآن کریم کی رو سے، علم کے سرچشمے دو ہی ہیں۔ ایک وحی۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا۔ یہ حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے ساتھ اسکا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا، عقل انسانی (Human Intellect)۔ اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے۔ لہذا، ختم نبوت کے بعد، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم، جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اور دوسرے عقل انسانی۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے رو سے کیا جائے۔ بنا پرین، یہ تصور کہ رسول اللہؐ کے بعد، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اسکی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ نہ ہی کشف، الہام، وحی خفی، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہؐ کے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی۔ (دیکھئے عنوان و۔ ح۔ ی)۔

انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop) کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقل عامہ کی رو سے مستبعد ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں خوارقِ عادات یا کرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں، اسے صاحب کشف و الہام قرار دیتے ہیں، اور ”روحانی قوتوں“ کا مالک۔ لیکن ان باقوں کو ”روحانیت“ (یا دین) سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ محض قوتِ ارادی کی نشو و نما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلا تمیز مذہب و ملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں، اسے بطور فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے۔

اسے پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئے کہ خدا سے براہ راست علم ، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ہے جو حضرات انبیاء کرامؑ سے مخصوص ہے ۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لئے اب کسی شخص کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا ۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاہئے ۔ اور نہ ہی یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ہے ۔

## ل و

لَہَوٌ اور لَعِيبٌ ۔ دونوں ہم معنی الفساذ ہیں ( دیکھئے عنوان ل ۔ ع ۔ ب ) لیکن علمائے لغت نے ان میں فرق کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں یہ چیز مشترک ہے کہ انسان بے سود اور بے معنی باتوں میں مشغول ہوتا ہے اور جذباتی اور عارضی مسرت کے پیچھے پڑتا ہے ۔ لیکن لَہَوٌ کا لفظ لَعِيبٌ سے عام ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لَعِيبٌ سے مراد ہے جلدی سے مسرت حاصل کرنا اور اس سے دل کو راحت و آرام پہنچانا اور لَہَوٌ سے مقصود ہے خواہشات اور طرب جو انسان کی توجہ اور فکر کو مصروف کر دیں ۔ اس کے برعکس طرسموسی کا کہنا ہے کہ لَہَوٌ اس لذت کو کہتے ہیں جو ناہائدار ہو یا وہ لذت جو انسان کی توجہ اہم کاموں سے ہٹا کر غیر اہم کاموں کی طرف منعطف کر دے ۔ یا ایسے کاموں کو کہتے ہیں جن کی کوئی صحیح غرض نہ ہو \* ۔ راغب نے بھی یہی کہا ہے کہ لَہَوٌ سے مراد ایسے امور ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے باز رکھیں \* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں ( ۱ ) کسی چیز کے ذریعہ دوسری چیز سے توجہ کا ہٹ جانا ( ۲ ) کسی چیز کو ہاتھ سے چھوڑ دینا ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی ایک عظیم مقصد لئے ہوئے ہے اس لئے اسے بڑی سنجیدگی سے ( Seriously ) لینا چاہئے ۔ لہذا ہر وہ کام جس سے یونہی پیش پا افتادہ مفاد یا ناہائدار مسرت تو حاصل ہو جائے لیکن زندگی کا اصل مقصود نگاہوں سے گم ہو جائے ، لَہَوٌ اور لَعِيبٌ میں داخل ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۔ یعنی فوری عیش اور مفادات عاجلہ کی زندگی ( یا محض حیوانی سطح پر طبعی زندگی ) کو لَعِيبٌ وَلَہَوٌ کہا ہے ( ۳۶ ) ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ وہ جس بات کو لَہَوٌ وَلَعِيبٌ قرار دیتا ہے وہ یہ

نظریہ ہے کہ انسان زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر عارضی طرب انگیزیوں کے پیچھے ہڑ جائے۔ یعنی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھے۔ اسے بلند انسانی سطح پر نہ لے جائے۔ انہی باتوں کو اس نے لَہَوُ الْحَدِيثِ (۳۱) کہا ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں الْحَدِيثِ کے معنی قرآن کریم لے جائیں تو لَہَوُ الْحَدِيثِ کے معنی ہونگے ایسی باتیں جو انسان کو قرآن کریم سے غافل کر دیں۔

اس زاویہ نگاہ کو جس کی رو سے انسان زندگی کے اہم حقائق کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لے لَہِیْتَهُ قُلُوْبُهُمْ (۲۱) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی سے اٹھنی کے معنی ہیں، مصروف رکھنا۔ مشغول کر دینا۔ مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر کے دوسری باتوں میں لگا دینا۔ قرآن کریم میں ہے اَلْهٰکُمْ الشَّکَاثُ حَتّٰی زُرْتُمْ اِلَیْہِمْ (۱۲-۱۱)۔ ”تکاثر“ نے زندگی کے اہم مقاصد کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر کے تمہیں اور ہی طرف لگا رکھا ہے اور تم اسی روش پر چلے جاتے ہو تا آنکہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔ تَکَاثُرُ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھ جانے کی ہوس۔ غور کیجئے، قرآن کریم نے کس طرح دو لفظوں میں انسان کی پوری نگ و تاز اور نوع انسانی کی تاریخ کی داستان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لئے ان کی اور انکی اولاد کی ضروریات زندگی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھینگے کہ وہ دولت سمیٹنے کے لئے دیوانہ وار سارے مارے پھر رہے ہونگے۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ محض دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لئے۔ یہی جذبہ دنیا میں ساری تباہیوں کا موجب ہے۔ افراد کے لئے بھی اور اقوام کے لئے بھی۔ مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھ جانے) کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ قرآن کریم بھی اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَبِیْضُوْا الْخَیْرٰتِ (۲۸-۱۳)۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے تو ان کاموں میں بڑھو جن میں نوع انسانی کی وسعتوں اور بھلائیوں کا راز پوشیدہ ہو۔

تَلٰہٰی عَنْہُ\*۔ کسی سے بے رخی برتنا۔ توجہ کو اسکی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کر لینا (۱۰-۱۱)۔ اللّٰہُوْا وَاللّٰہُوْۃُ\*۔ وہ عورت جس سے لَہُوْ اور دلبستگی کا کام لیا جائے۔ پھر لَہُوْ مجازاً عورت کو کہنے لگے\*۔



چنانچہ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ سورہ انبیاء میں جو ہے لَوَّ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهٗنَا (۱/۲۱)۔ تو اس میں لَهٗنَا سے مراد عورت ہے \*۔ (لیکن یہ تکلف ہے۔ وہاں بھی لَهٗنَا کے معنی بے مقصد و بے حقیقت شے کے ہیں)۔ اور قتیبہ نے لَهٗنَا کے معنی بیٹا، عورت اور نکاح کے لکھے ہیں \*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس سے عورت یا بیٹا مراد لیا ہے انہوں نے اس لفظ کی عمومیت کو بعض چیزوں میں مخصوص کر دیا ہے۔

(لَهٗنَا کے ساتھ ل۔ ع۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ پوری حقیقت بیک وقت سامنے آجائے)

## لَوَّ (حرف)

لَوَّ - (۱) اِنْ (اگر) کے معنوں میں۔ فَلَوَّ اَنْ لَّيْنَا كَرَّةً فَتَكُونُ مِنْ اَلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۴/۲)۔ سو اگر ہمیں ایک بار لوٹ کر جانے کی مہلت مل جائے تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں۔ واضح رہے کہ لَوَّ بالعموم ایسے امور کے لئے آتا ہے جن کا وقوع میں آنا ممکن نہ ہو۔ یعنی محض فرضی طور پر ایسا کہا جائے۔ جیسا کہ اوپر کی آیت میں آیا ہے۔ یعنی اِنْ کا لوٹ آنا ممکنات میں سے نہیں۔ اس کا ترجمہ ”بفرض محال“ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

(۲) ”اگر“ کے ساتھ۔ ”اے کاش“ (تمنا) کے معنوں میں۔ مندرجہ بالا مثال میں بھی تمنا پائی جاتی ہے۔ ”اے کاش اگر کہیں ایسا ہو جائے تو،“ جیسے لَوَّ كَانُوا مُسْلِمِيْنَ (۱۵/۴)۔

(۳) اَنْ (کہ) کے مفہوم میں۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوَّ يَرُدُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا (۱۱۶/۲)۔ اہل کتاب میں سے اکثر وہ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنا دیں۔ (اگرچہ یہاں کاش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے)۔

(۴) لَوَّ کے ساتھ لائے نفسی بھی آتا ہے۔ لَوَّ لَا اَنْتُمْ لَكُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳۴/۳) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔

(۵) ”کیوں نہیں“ کے معنوں میں۔ لَوَّ لَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ (۵۱/۲) اسکی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا۔

(۶) لَوَّالَ - نہیں کے معنوں میں - فَلَوَّالَ كَانَتْ قَرْيَةً ....

(۹۸) - ایسی کوئی بستی نہ ہوئی .....

(۷) بعض اوقات - لَوَّالَ کی بجائے لَوَّمَا بھی آتا ہے - لَوَّمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلَايِكَةِ اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵) - اگر تو مسجدوں میں سے ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا؟

## لوح

اس مادہ کے اہم بنیادی معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں - آلاح التبرق - بجلی چمکی (ابن فارس) - اللّٰوَح - ہر پھلی ہوئی، چوڑی لکڑی یا ہڈی - جمع اللّٰوَح - سورۃ اعراف میں ہے وَ كَتَبْنَا لَهُ فِي الْاَلْوَاَحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً (۱۳۵) - ہم نے تمام امور کے اخلاقی اقدار، موسیٰ کے لئے تورات میں فرض قرار دے دیئے، جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی - یا ہم نے انہیں موسیٰ کے لئے تختیوں میں جمع کر دیا تھا - حضرت نوحؑ کی کشتی کو ذَاتِ الْاَلْوَاَحِ وَ دُورِہ (۱۳۳) کہا گیا ہے - یعنی جو تختیوں اور کیلوں سے بنائی گئی تھی -

قرآن کریم کے متعلق ہے - فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵) - اسی کو دوسری جگہ کِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۱) کہا گیا ہے - اس سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا اور تغیر سے مصون ہے - یہ کتاب (قرآن) علم خداوندی ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہمارے پاس (کتابی شکل میں) بھی محفوظ ہے -

اللّٰوَح کے معنی چمکنا نیز دیکھنا بھی ہیں - لَاحَتُهُ بَيَضَرَهُ لَوَّاحَةً - اُس نے اُسے دیکھا پھر وہ چیز چھب گئی، یعنی اس کی ایک جھلک دیکھی - نیز اس کے معنی پیاس کے بھی ہیں \* - لَوَّاحَةً بِالنَّارِ تَلَوُّوْا بِحَتًّا - اس کو آگ میں تپایا - یہیں سے لَوَّاحٌ کے معنی ہیں جلا اور جھلسا کر رنگ متغیر کر دینے والا \* - قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کے متعلق ہے - لَوَّاحَةً لِلْبَشَرِ (۴۴) - چمڑے کو جھلسا کر اس کا رنگ بدل دینے والی - ابن فارس نے کہا ہے کہ لَوَّاحَةً الْحَرُّ کے معنی ہیں گرمی نے اُسے جلا دیا اور سیاہ کر دیا حتکہ وہ دور سے نظر آنے لگ گیا - لَوَّاحُ الرَّقْجُلُ تَلَوُّوْا بِحَتًّا - اُس آدمی نے دور سے اشارہ کیا \* - آلاح التبرق - بجلی کوندی - لَاحُ النَّجْمُ

ستارہ چمکا\*۔ لہذا لَوُحٌ\* میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ہے۔ ہر آسمانی کتاب میں روشنی اور چمک ہوتی ہے۔ قرآن کریم کو (۱۲/۵) اور تورات کو (۹۶/۱) میں نور کہا گیا ہے۔

## ل و ذ

اللَّوْذُ\* بِالشَّقِيَّةِ\*۔ کسی چیز کے پیچھے چھپ جانا اور اس طرح محفوظ ہو جانا۔ اللَّوْذُ\*۔ پہاڑ کا کنارہ۔ وادی کا موڑ۔ اَلْمَلَاذُ\*۔ جائے پناہ۔ قلعہ۔ اَلْمَلَاوِذَةُ\* وَاللَّيْوَاذُ\*۔ ایک دوسرے کی آڑ لینا، چھپنا اور ایک دوسرے کی آڑ میں آنا۔ کترانا اور چال چلنا\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ يَتَسَلَّلُوْنَ مِيْنَكُمْ\* لِيُوَاذُ\* (۲۳/۴۳)۔ جو تم میں سے چپکے چپکے کھسک کر نکل جاتے ہیں۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی مخالفت کرنے کے ہیں اور اس پر آیت کے اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں\*۔ لیکن پہلے معنوں میں بھی عدول حکمی کا مفہوم واضح ہے، کیونکہ چپکے چپکے وہی کھسکتے ہیں جو تعمیلِ حکم نہیں کرنا چاہتے۔

## لوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ، حضرت لوطؑ، اول الذکر کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین کیطرف تشریف لے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی شرف نبوت سے سرفراز فرمایا اور سدوم کی طرف جانے کے لئے حکم دیا۔ یمن سے بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے قدیمی تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز اور مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی۔ قیاس ہے کہ یہ علاقہ بحر میت (Dead Sea) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا۔ جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اس علاقہ میں آباد تھی۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم میں آپ سے پہلے اور رسول بھی آچکے تھے اور حضرت لوطؑ ان میں اتنا لمبا عرصہ رہے کہ انہیں ان کا بھائی بند (أَخُوهُمْ) کہہ کر پکارا گیا (۲۶/۱۶)۔

یہ قوم (لواطت کی) شرمناک فحاشی میں مبتلا تھی (۲۶/۱۶)۔ اس کے علاوہ، وہ ”قطع السبیل“۔ رھزق اور قزاق کے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی تھی۔ (۲۶/۲۹)

آپ نے انہیں ان اعمالِ شنیعہ سے رکنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور وہ تباہ ہو گئی۔

قومِ سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔ جب یہ پہاڑ پھٹتے ہیں تو ان کے دھانے سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برسنے لگ جاتا ہے جس کی بوجھار دور دور تک جاتی ہے۔ قومِ لوطؑ کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں سے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اُٹھی۔ پھر ایسے زلزلے آئے جن سے زمین نیچے دھنس گئی اور بحرِ میت کا پانی اوپر چڑھ آیا۔ قرآن کریم نے ان تفصیل کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا (۸۳)۔ ”ہم نے ان پر سخت مینہ برسایا“۔ دوسری جگہ ہے وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارًا مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ (۱۱۱)۔ ”ہم نے اس قوم پر آگ میں پکے ہوئے پتھروں کا مینہ برسایا“۔ سورۃ حجر میں ہے فَآخَذْتَهُمُ الصَّيْحَةُ (۱۵)۔ ”ایک ہولناک آواز نے انہیں آنیا“۔ سورۃ قمر میں ہے إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا (۵۴)۔ ”ہم نے ان پر سنگ باری کا طوفان بھیجا“۔

(طبعی حوادث کس طرح خدا کا عذاب بنتے ہیں، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں حضرت نوحؑ کا عنوان ملاحظہ کیجئے)۔

وہیے لاط الشَّقِیُّ ”بِشَقِیِّی“ کے معنی ہیں ”وہ چیز میرے دل کے ساتھ چمٹ گئی“۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔

## ل و م

لَامٌ - ملامت کرنا۔ کسی کو بہت زیادہ برا بھلا کہنا۔ قرآن کریم میں ہے - فَلَا تَلْمُزْهُنَّ نِسَاءَ اللَّهِ لَدَتِهِنَّ وَأَنْتُمْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ (۱۴)۔ تم مجھے ملامت نہ کرو۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔

لَوْ مَتَّ - ملامت۔ لَائِمٌ - ملامت کرنے والا۔ لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵)۔ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کے نہیں ڈرتے۔ لَوْ أَمَّ - وہ جو بہت زیادہ ملامت کرے۔ مَلُومٌ - ملامت کیا ہوا (۵۱)۔ مُلِيمٌ - قابل ملامت (۳۴)۔ يَتَلَاوَمُونَ (۶۸)۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

لَوْ مَتَّۃً انتظار کو کہتے ہیں \*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی عتاب اور ملامت اور (۲) دیر کرنے کے لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلنَّفْسِ الْاَلْوَاۡمَةِ آیا ہے (۴۵)۔ اس کے تفصیلی مفہوم کے لئے (ن۔ ف۔ م) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے از خود یہ بتا دے کہ فلاں بات حق اور فلاں باطل ہے۔ اس کی راہ نمائی ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہے۔ (دیکھئے عنوان ل۔ ہ۔ م)۔ البتہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ہے کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتا ہے اس کے ارتکاب پر وہ اسے ملامت کرتی ہے۔ اسی کو ضمیر یا (Conscience) کہا جاتا ہے۔ لہذا ضمیر کی آواز حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتی۔ وہ اس بات کی تائید کریگی جسے آپ اچھا سمجھتے ہیں اور اس پر ملامت کریگی جسے آپ برا سمجھتے ہیں۔ وہ جینی کے بچے کو گوشت کھانے کے ارادہ پر ملامت کریگی لیکن مسلمان کے بچے کو گوشت کھانے پر آمادہ کریگی۔ اس لئے ضمیر کی آواز حق و باطل کا معیار نہیں قرار پا سکے گی۔ ”فتویٰ“ ہمیشہ وحی سے لینا چاہئے، نہ کہ اپنے دل سے۔ ٹھگوں کا دل انہیں کبھی مسافر کشی پر ملامت نہیں کرتا۔ ڈاکو کا دل اسے رھزنی پر کبھی نہیں ٹوکتا۔ عصر حاضر کے مہذب ٹھگوں اور ڈاکوؤں (ہالا دست اقوام کے ”محب الوطنوں“) کا دل انہیں کبھی اس پر ملامت نہیں کرتا کہ وہ کمزور اقوام کے خون کو اپنی قوم کے محلات کی آرائش کا موجب نہ بنائیں۔ لہذا غلط اور صحیح کا فیصلہ خدا کی وحی کر سکتی ہے، انسان کا دل نہیں۔

## ل و ن

اَللّٰوْنُ\*۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کر دے۔ نوع۔ صنف۔ قسم\*۔ لیکن چونکہ مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ہوتا ہے اس لئے لَوْنُ کے معنی رنگ کے ہو گئے۔ اَلْوَانُ\*۔ رنگدار ہو گیا۔ اَلْمُتَلَوِّنُ\*۔ وہ جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ رنگ بدلتا رہے\*۔

قرآن کریم نے اختلاف السنہ (زبانوں) اور اَلْوَانُ (رنگوں) کو صاحبانِ علم و بصیرت کے لئے ادراک حقیقت کی نشانیاں قرار دیا ہے (۳۴)۔ اس میں رنگ (اَلْوَانُ\*) سے مراد نسلیں (Races) ہیں جن سے متعلق تحقیق،

علم الانسان کا بہت بڑا شعبہ ہے۔ لیکن اگر اَلْوَان کے معنی عام رنگ (Colours) لئے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ دور حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو اس کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں (Colours) کو پہچانتی تھی۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہو، اتنی ہی بلند اسکی ذہنی سطح ہوگی۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشو و نما سے خاص تعلق ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر (Bucke) کی کتاب (Cosmic Consciousness) سورہ نحل میں ہے وَمَا ذَرَأْنَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ۔ (۱۶/۱۳) اس کے معنی انواع و اقسام کے ہیں۔

## ل و ی

لَوَى الْحَبْلُ بِالنَّوْرِ لَيْتَا۔ رسی کو پٹا اور دوہرا کر دیا۔ لَوَى بِرَأْسِهِ۔ اس نے اپنا سر پھیر لیا۔ یعنی اعراض کیا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو موڑ دینے کے ہیں (۱۳/۱۳)۔ لَوَى لَيْسَانُهُ بِيَكْذَا۔ کدایہ ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو باتیں ہٹانے سے\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمُ (۳/۳۶)۔ اور لَيْسَا بِأَلْسِنَتِهِمُ (۲۶/۲۶)۔ اس سے بھی مطلب ہے۔ یعنی زبان کو تروڑ مروڑ کر باتیں کرنا۔ جھوٹ بولنا۔ افترا پردازی کرنا۔

## ل ی ت

لَاتَهُ۔ يَلِيَّتُهُ عَن كَذَا۔ اسے کسی چیز سے پھیرا، موڑا۔ لَاتَهُ وَآلَاتُهُ۔ اسے کم کیا۔ اس کا پورا حق نہ دیا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَللَّيْتُ گردن کے ایک پہلو کو کہتے ہیں۔ اور اَللَّيْتُ۔ کم کر دینے کو۔ اور یہ کہ ان دونوں معانی میں کوئی قیاس نہیں چلتا۔ سورۃ حجرات میں ہے لَا يَلِيْتُكُمْ مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۲۹/۲۹)۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہیں کریگا۔ سورۃ طور میں ہے وَمَا أَلْتَنَاهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۹۲/۹۲)۔ اس کے معنی بھی کمی کرنے کے ہیں۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَّتْ سے ہے اور لَات اور اَلَّتْ کے ایک ہی معنی ہیں۔ بعض نے اسے وَلَّتْ سے کہا ہے۔ چنانچہ اسے وہاں بھی لکھ دیا گیا ہے)۔

\* تاج۔ \*\* راغب۔

لَوَى (نویز) لَوَى رَأْسُهُ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اسی میں لَوَى سے زیادہ شدت و مبالغہ پایا جاتا ہے۔

## لَيْتَ (حرف)

لَيْتَ - اے کاش (یہ حرف تمنا ہے) - يَلَيْتَنِي مِتَّ قَبْلَ هَذَا  
(۱۹/۲۴) - اے کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی ....

## لَيْسَ

لَيْسَ - نہیں کے معنوں میں آتا ہے - لَيْسَ الثَّيْرُ أَنْ ..... (۲۰/۱۷)  
یہ کشاد کی راہ نہیں ہے کہ ....  
اس فعل سے صرف ماضی کی شکلیں استعمال ہوتی ہیں - مثلاً لَسْتُ - لَسْتُمْ -  
لَيْسُوا - لَسْتُمْ - لَسْتُمْ - وغیرہ -

## ل ی ل

اللَّيْلُ وَاللَّيْلَةُ - رات، جو غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک  
یا طلوع آفتاب تک ہوتی ہے \* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عبرانی میں  
رات کو لَیْل کہتے ہیں اور سریانی میں لَیْلَا \* - لَیْل کی جمع لَیَال -  
اور اللَیالی آتی ہے -

سورہ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے - لَا تُكَلِّمُ النَّاسَ  
ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۲۱/۱۱) - اس کے معنی تین راتیں نہیں بلکہ تین شب  
و روز ہیں (متواتر تین دن تک جن میں راتیں بھی شامل ہیں) - اس لئے کہ  
(۲۱/۱۱) میں اسے ثَلَاثَةَ اَبْقَامٍ کہا گیا ہے - لیکن ان دونوں آیات کے مضمون  
میں ذرا سا ہار یک فرق بھی ہے - (۲۱/۱۱) میں کہا گیا ہے کہ اَلَا تُكَلِّمُ  
النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَبْقَامٍ اِلَّا رَمْزًا اور (۲۱/۱۱) میں اِلَّا رَمْزًا نہیں ہے - اس لئے  
دونوں کے لئے حکم الگ تھا اور راتوں کے لئے الگ -

سورہ ابراہیم میں نزول قرآن کریم کا مقصد بتایا گیا ہے لِيُخْرِجَ  
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) - تاکہ تو نوع انسانی کو تاریکیوں  
سے روشنی کی طرف لے آئے - یعنی نزول قرآن کے وقت نوع انسانی تاریکی میں  
تھی، قرآن کریم کی راہ نمائی انہیں روشنی میں لے آئی - اس جہت سے،  
اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن کریم دنیا کو ملا، لَیْل کہہ کر  
پکارا ہے - یعنی وہ زمانہ جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی - روشنی کا

کہیں نشان تک نہیں تھا۔ اس دور میں قرآن کریم نازل ہوا جس نے دنیا کو نئی اقدار سے روشناس کرایا۔ تاریکی میں انسان کے لئے (حقیقی یا محض خیالی) خطرات بھی ہوتے ہیں۔ روشنی کی وجہ سے یہ خطرات سلامتی میں تبدیل ہو گئے۔ پھر، اس روشنی کی تکمیل اس طرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا۔ **ہِیَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ** (۹۵)۔ ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اس طرح یہ تاریکی دور، قرآن کریم کی روشنی کی وجہ سے نوع انسان کے لئے سلامتی اور برکات کا دور بن گیا (۳۳)۔

## ل ی ن

**لَا نَ الشَّيْءُ**۔ چیز نرم ہوئی۔ **أَلَسْتَهُ**۔ میں نے اسے نرم کر دیا\*۔ **الْقَيْنِ**۔ نرم۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے **لَیْسَتْ لَهُمْ** (۱۵۸)۔ تو ان کے لئے نرم واقع ہوا ہے۔ یعنی **فَطْمَأْنَنًا** **الْقَلْبِ** نہیں (۱۵۸)۔ (دیکھئے عنوان ف۔ ظ۔ ظ اور غ۔ ل۔ ظ)۔ لیکن یہ لیت ان کے لئے تھی جو حق و صداقت کے سامنے جھک کر حضورؐ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ جو لوگ حق کی مخالفت میں نبرد آزما تھے ان کے مقابلہ میں حضورؐ اور آپ کے ساتھی ”اشداء“ تھے (۳۹)۔

حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ **وَأَلَسَّاهُ** **التَّحْدِیْدَ** (۳۳)۔ ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا۔ یعنی اسے، لوہا گلا کر یا تپا کر، اسلحہ سازی وغیرہ کی صنعت کا علم دیدیا۔ سورہ طہ میں ہے۔ **فَقَوْلًا لَّهِ قَوْلًا لَّیْسَیَا** (۲۴)۔ تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا۔

**الْیِّنَہُ**۔ کھجور کا درخت\*۔ تاج نے تصریح کی ہے کہ یہ اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جو دواعلیٰ قسم کی کھجوروں کے علاوہ ہو (۵۹)۔ بیشتر اہل لغت نے اسے (ل۔ و۔ ن) میں دیا ہے۔



## م

## ما

- مَا - (۱) جو کچھ - (الَّذِي) کے معنوں میں - مَا عَيْنُكُمْ يَنْفَعُ (۱۶/۱۶) - جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا۔
- (۲) مَنْ (جو - جس) کے معنوں میں - وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النَّسَاءِ..... (۴/۴۴) - جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو۔
- (۳) ”کیا چیز - کونسی چیز - کس چیز“ کے معنوں میں (استفہامیہ) - وَمَا تِلْكَ لَكَ..... (۲/۱۶) - اور یہ کیا چیز ہے۔
- (۴) شرط کے معنوں میں - فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ (۱۱/۱۱) - جب تک وہ تمہارے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہو۔
- (۵) تعجب (کیسے) کے معنوں میں - فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۱۲۵) - سو ان کا تباہ کن روش پر قائم رہنا کیسا تعجب انگیز ہے - دراصل یہ پورا مرکب اظہار تعجب کے لئے بیولا جاتا ہے (اکیلا مَا نہیں بلکہ مَا أَفْعَلَ کے وزن پر)۔
- (۶) ”جہانتک“ کے معنوں میں - فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۱۱/۱۱) - جہاں تک تمہاری استطاعت میں ہو قانون خداوندی کی نگہداشت کرو۔
- (۷) لَيْسَ (نہیں) کے معنوں میں - قَمَّارٌ رَيْحَتٌ يَجْعَلُ لَهُمْ (۲/۱۶) - سو ان کی تجارت فائدہ مند ثابت نہ ہوئی۔
- (۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے - قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۱۱/۱۱) - تم میں سے بہت کم شکر گزار ہوتے ہیں - اگرچہ یہاں مَا (الَّذِي) کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے۔
- (نوٹ) - کبھی مَا کی جگہ صرف م ہی آجاتا ہے - جیسے بيمَ يَرْجِعُ (۱۱/۱۱) - قَمَّارٌ (۲/۱۶) ”قاصد (جواب میں) کس چیز کے ساتھ واپس آئے ہیں“۔

(۹) مَاذَا - ”کیا“ (استفہامیہ) کے معنوں میں - یَسْتَسْتَلُوْا نَكَتَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (۲/۲۱۵) - تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا (یا کسقدر) کھلا رکھیں؟ مَا + ذَا - مَا استفہامیہ اور ذَا بمعنی موصول ہے - اور دونوں کا مرکب استفہام کا مفہوم دیتا ہے - یہ وہی ہے جو اوپر (۳) میں گذر چکا ہے - صرف اس کے آگے ذَا بڑھایا گیا ہے -

## م ا ی

مَسَاۤیَ فِیْہِ - مبالغہ کیا اور تعمق سے کام لیا - اَلْمِیَائَتَةُ - ایک سو - زمخشری نے کہا ہے کہ یہ مَسَاۤیَ تِ الثَّجِلِّدِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے کھال کو پھیلایا - اور سو (۱۰۰) بھی ایک بڑی اور وسیع تعداد ہوتی ہے -

مِیَائَتَةُ عَامٍ (۲/۲۵۹) - ایک سو سال -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ”سو“ بھی ہیں اور قوم میں فساد ڈالنا بھی ہیں - ہمارا خیال ہے کہ سو (۱۰۰) کو اَلْمِیَائَتَةُ شاید اس لئے کہتے ہوں کہ اس سادگی کے دور میں جس شخص کے پاس سو تک درہم و دینار یا اونٹ وغیرہ ہوتے ہونگے وہ (سرمایہ داروں کی طرح) قوم میں فساد کا موجب بن جاتا ہوگا - ہمارے ہاں بھی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس سو روپے ہوں وہ ایک قتل کے لئے بیباک ہو جاتا ہے -

## مَاجُوجُ

دیکھئے ”مَاجُوجُ“ - عنوان (۱-ج-ج) -

## ماروت

اَلْمَرَّتُ - وہ نق و دق صحرا جس میں کسی قسم کی سرسبزی نہ ہو - اَلْمَرَّتُ وَالْمَرَّتُ - توڑنا\* -

مَارُوْتُ - یہ عجمی لفظ ہے\* (۲/۲۱۵) - (دیکھئے عنوان ہاروت) -

## م ت ع

مَتَاعٌ - ضرورت کا ساز و سامان - ہر وہ ضرورت کی چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے (۱/۸۱) - اس کے بنیادی معنی ، وہ سامان ہے جسو ضروریات

سفر کے لئے کافی ہو\*\*۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ "اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے تھوڑا فائدہ حاصل کیا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو، بلکہ جلد ختم ہو جائے\*\*۔ اَلْمُتَعَةُ - ضروریات سفر۔ مثل ڈول، رسی، مشکیزہ، قلیل توشہ\*۔ نیز عورت کو طلاق دینے کے بعد جو نان و نفقہ شوہر سے ملتا ہے اسے بھی مُتَعَةٌ کہتے ہیں\*۔ اور گذر بسر کے قابل روزی کو بھی۔ اَلْمَتْرَاةُ "تَمْتِيعُ" صَبِيحَتھا کے معنی ہیں وہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے\*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز سے منفعت اور اس سے طویل مدت تک نفع اٹھانے کے ہیں۔ نیز جس فائدہ میں لذت کا پہلو مضمحل ہو۔ یا جس میں ارتفاع و ترقی ہو۔ اس میں بہر حال فائدہ اٹھانا قدر مشترک ہے۔

قرآن کریم نے اَرْضُ (زمین) کو جو مَتَاعُ کہا ہے (۲/۱۶۶) تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے سامانِ پرورش مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔ یہ مَتَوَاعٌ لِّلْیَسَّاقِیْلِیْنَ (۱۱/۶۱) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں (طور پر کھلی)۔

چونکہ مَتَاعُ میں پرورش کا پہلو غالب ہے اس لئے اَلْمَتَاعُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں سے بہتر اور طویل تر ہو۔ جسکی نشوونما اچھی ہو چکی ہو۔ عمدہ ہٹی ہوئی رسی۔ یا تیز سرخ شراب کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ مَتَعَ النَّهَارُ کے معنی ہیں دن چڑھ گیا۔ مَتَعَ الْحَبْلُ - رسی مضبوط اور سخت ہو گئی۔ اَلتَّمْتِيعُ کے معنی ہیں لمبا کرنا۔ عمر دراز کرنا۔ آباد کرنا۔ (اس کے علاوہ اس کے اور معنی بھی لغت میں دئے گئے ہیں) اس سے مَتَاعُ اسم آسکتا ہے جس کے معنی فائدہ دینا ہیں\*\*۔ اَفْرَعِیْتَ اِنْ مَتَّعْتُمْلَهُمْ سِنِیْنِ (۲/۶۶)۔ کیا تو نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہم برسوں ان کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

اَلْمَتَّعُ - خفیہ تدبیر کو بھی کہتے ہیں\*۔ اَسْتَعِ عَشْنُہُ کے معنی ہیں وہ اس سے مستغنی ہو گیا\*۔

## م ت ن

اَلْمَتْنُ - سخت بلند اور ہموار زمین۔ مَتْنٌ - یَمْتَنُ - وہ سخت اور مضبوط ہوا۔ اَلتَّمْتِینُ - خیموں کی رسیاں یا ڈوریاں۔ نیز خیمے نصب کرنے

کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمِثْلَانِ\*۔ دو ستونوں کے درمیان کا حصہ۔ اَلْمِثْلَانَتَانِ\*۔ شدت اور قوت۔ سختی اور مضبوطی۔ سَيْفٌ مَّتِينٌ\*۔ مضبوط ہشت والی تلوار۔ ثَوْبٌ مَّتِينٌ\*۔ مضبوط اور سخت کپڑا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں امتداد پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔ اِنَّ كَيْدِي مَّتِينٌ\* (۱۸۳/۱)۔ میری تدبیر بڑی محکم مضبوط اور شدید عوا کرتی ہے۔ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔ اسی اعتبار سے خدا کو اَلْمِثْمِثِينَ\* کہتے ہیں (۵۱/۵)۔ یعنی وہ جس کے محکم قوانین کے سہارے کائنات کے خیمے ابستادہ ہیں۔ یعنی خود بھی محکم اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ ذُو الْقُوَّةِ وہ ہوتا ہے جس کی قوت دوسروں پر بھی اثر انداز ہو۔ اور مَّتِينٌ\* اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات میں محکم اور مضبوط ہو\*۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ مَّتِينٌ\* میں دونوں باتیں آسکتی ہیں۔

### متی

متی\*۔ کب۔ متیٰ ہَذَا الْوَعْدُ\* (۳۴/۳)۔ یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ (کہی یہ۔ جب۔ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اُسوقت یہ شرطیہ ہوتا ہے)

### م ث ل

مِثْلٌ\*۔ کسی کے مشابہ یا مانند یا برابر۔ مِثْلٌ کے معنی کسی چیز کی (Description) ہیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے بیان کی جائے۔ مِثَالٌ کے معنی ہیں انداز، اسلوب، شکل و صورت۔ وہ نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔ قالب (Pattern)۔ وہ مقدار جس کے مطابق کوئی چیز ماپی جائے یا قطع کی جائے۔ نیز (Example) \*\*۔ امِثْلٌ کے معنی افضل کے ہیں۔ اس کا مؤنث مِثْلٰی ہے۔ اَلطَّرِيقَةُ الْمِثْلٰی۔ اُس طریقہ کو کہتے ہیں جو حق وعدل کے مطابق اور اس سے زیادہ مشابہ ہو۔ تَمَثَّلٌ کے معنی تصویر بنانا اور تَمَثَّلٌ کے معنی ہیں کسی کے مانند بن جانا۔ اِمْتِثَالٌ\*۔ کسی کے طریقہ کی پوری پوری پیروی کرنا۔ مِثْلُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا\*۔ (نیز زمین سے چپک جانے کے لئے بھی بطور اضداد استعمال ہوتا ہے)\*۔ مِثْلَةٌ کے معنی ہیں کسی کو قتل کر کے اس کے ہاتھ پیر کاٹنا اور اسکی صورت بگاڑ دینا\*۔ مِثْلَةٌ (اور مِثْلَةٌ) جسکی جمع مِثْلَاتٌ\* ہے\*\*\*۔ عبرتناک سزائیں نیز تاریخ کے وہ واقعات جو شاہراہ زمانہ پر اسطرح کھڑے ہوں کہ ان سے ہر رُہرو عبرت حاصل کرے\* (۱۳/۱)۔

\*تاج۔ \*\*لین و تاج و محیط۔ \*\*\*محیط۔

تِمَثَالٌ\* - تصویر کسو کہتے ہیں جسکی جمع تَمَثَائِلٌ\* ہے - صاحب تاج العروس کے نزدیک قرآن کریم میں تمائیل سے مراد انبیاء کرامؑ کی تصاویر ہیں\* - لیکن عیسائیوں کے نزدیک تَمَثَائِلٌ\* مجسموں (Statues) کو کہتے ہیں - اور تصاویر (Paintings) کو\*\* -

قرآن کریم میں مَثَلُہُمْ\* کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۲۴) میں مَثَلِ\* کے معنی مثال کے ہیں - یعنی مشابہ اور مانند - اور (۱۱/۶۶) میں مِثْلِہَا کے معنی ہیں جو اس جیسا ہو - سورہ رعد میں مَثَلِ\* الْجَنَّةِ النَّبِیِّ\* وَوَعْدِ الْمُتَّقِیْنَ\* (۱۳/۲۳) میں مَثَلِ\* کے معنی تمثیلی بیان کے ہیں -

سورۃ طہ میں بِطَرِّ یَقْتَرِیْکُمْ\* الْمُثَلِّی (۲۰/۲۰) کے معنی وہ راستہ ہیں جو حق و عدل اور توازن و تناسب سے زیادہ قریب ہو - اقرب الموارد میں کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مَثَلِ\* کے معنی فَضْلُ\* ہے - یعنی بڑھا - زیادہ ہوا اور غالب آیا - اس اعتبار سے اَمَثَلِ\* کے معنی اَفْضَلِ\* اور اَغْلَبِ\* ہو گئے (اس کا مؤنث مَثَلِی\* ہے) - لہذا بِطَرِّ یَقْتَرِیْکُمْ\* الْمُثَلِّی کے معنی ہوئے ایسا مسلک و مشرب جو دیگر مسالک و مشارب پر غالب ہو - ہر غالب قوم اپنے مسلک و مذہب کو افضل اور غالب سمجھتی ہے خواہ وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو - اَمَثَلُہُمْ\* طَرِّ یَقْتَرِیْکُمْ\* (۲۰/۲۰) کے معنی ہیں وہ شخص جو اعلیٰ درجہ کے طریقہ پر ہو - سورۃ نحل میں ہے کہ جو لوگ مستقبل کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے ان کا کرداری ڈھانچہ بہت ہی برا ہے - اس کے لئے مَثَلِ\* السَّوْءِ (۱۶/۱۶) کے الفاظ آئے ہیں - ان کے برعکس وَلِلّٰهِ الْمَثَلِ\* الْاَعْلٰی (۱۶/۱۶) - جو عملی ڈھانچہ خدا کے قانون کے مطابق بنتا ہے وہ نہایت بلند ہوتا ہے - اس لئے کہ کائنات کے جس قدر بلند ڈھانچے ہیں سب قانون خداوندی کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں -

سورۃ انبیاء میں ان بتوں کے لئے تَمَثَائِلٌ\* کا لفظ آیا ہے (۲۱/۲۱) جن کی پرستش قوم ابراہیم کیا کرتی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ تَمَثَائِلٌ\* کے معنی مجسمے ہیں - اس لئے (۳۳/۳۳) میں جہاں آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ تمائیل بنوایا کرتے تھے تو اس سے مراد مجسمے ہی ہیں - سورۃ مریم میں جہاں ہے فَارْمَلْنَا اِلَیْہَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۹) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریمؑ کی نگہ میں ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا - اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے - یعنی حضرت مریمؑ نے یہ کچھ اپنے خواب میں دیکھا -

سورۃ آل عمران میں ہے - مِثْلَيْهِمْ (۱۳) - یعنی اپنے سے دگنے -  
 قرآن کریم میں ہے "وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ  
 عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ... (۲۳) - "جو کچھ ہم نے  
 اپنے بندے کی طرف نازل کیا ہے اگر تم اس کی بابت شک میں ہو (کہ یہ  
 منجانب اللہ نہیں ہے) تو تم اس کی مثل ایک سورت (بنا کر) لاؤ" - اس کے بعد  
 خود ہی کہہ دیا کہ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا... (۲۴) -  
 لیکن اگر تم ایسا نہ کرو - اور تم ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکو گے - تو...  
 (اس چیلنج کو دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے - دیکھو ۱۱/۱۳ و ۱۱/۱۳) -

یہ قرآن کریم کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے زمانہ نزول کے (عرب) مخاطبین کو بھی دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو دیتا چلا آ رہا ہے، لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نہ تو اس زمانے کے عربوں نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے) اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کے بعد آج تک کسی میں اس کی ہمت پڑی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنا کر دکھائے۔ یہ چیلنج لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہے - معنوی حیثیت سے قرآنی حقائق ان ہلندیوں پر ہیں جن کا تصور بھی فکر انسانی نہیں کر سکتا - جہاں تک اس کے اسلوب بیان کا تعلق ہے، اس کی مثل و نظیر تو ایک طرف پروفیسر گب (H. A. R. Gibb) کے بیان کے مطابق اس کا ترجمہ بھی دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا\*\*\*۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل نرالا ہے - یہ نہ نثر ہے نہ نظم - نہ ہی اس اسلوب کی عربی لٹریچر میں کوئی مثال ملتی ہے (نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد) - اس لئے قرآن اپنے لفظوں اور معنوں، دونوں کے ساتھ، خدا کا کلام اور بے مثل و بے نظیر ہے - اس کی مثل کچھ ہو ہی نہیں سکتا -

## م ج د

الْمُتَجَدِّدُ - اس کے اصلی معنی کثرت کے ہوتے ہیں\* - یہ دراصل مُتَجَدِّدُ الْإِبِلُ سے ماخوذ ہے جو اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کسی وسیع اور نہایت سرسبز چراگاہ میں داخل ہو جائیں جہاں چارہ کثرت سے ہو\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی صفات محمودہ (مثلاً کرم و شرافت وغیرہ) میں انتہا تک پہنچ جانا ہیں - اس نے مُتَجَدِّدُ الْإِبِلُ کے معنی "اونٹ شکم سیر ہونے کے قریب ہو گیا" دئے ہیں -

آمَجِدَ نَا فُلَانٌ کے معنی ہیں ہمیں فلاں آدمی نے سہمائی کے طور پر اتنا دیا جو ہمیں کافی ہو گیا اور بیچ بھی رہا۔ نیز آمَجِدَ الْعَطَاءَ۔ اسے بکثرت بخشش دی۔ آمَجِدَ الْإِبِلَ۔ اونٹوں کو پیٹ بھر چارہ دیا\*۔ عربوں میں چونکہ سخاوت (کسی کو دینا) بہت بڑا شرف تھا اس لئے ان کے ہاں آمَجِدُ بلند ترین شرف کو کہتے تھے\*\*\*\*۔ اہل لغت نے مجد اور شرف کو ہم معنی لکھا ہے اور دونوں کے متعلق کہا ہے کہ ان میں آبائی شرف بھی شامل ہے۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے سَجِيدُ آیا ہے۔ شَرِيفٌ کہیں نہیں آیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مجد جوہر ذاتی ہے جس میں آبائی شرف کو دخل نہیں۔

قرآن کریم نے خدا کی صفت سَجِيدُ بتائی ہے (سج و سجود)۔ یعنی سامانِ ربوبیت (خواہ وہ طبعی زندگی سے متعلق ہو یا انسانیت کی راہ نمائی کے متعلق) کو نہایت کثرت اور فراوانی سے دینے والا۔ وسعت اور فراخیاں پیدا کرنے والا۔ انتہا تک پہنچا دینے والا۔ اور اسی بناء پر وہ حَمِيدٌ ہے۔ یعنی تعریف اور ستائش کا مالک۔

## م ح س

الْمَجْنُونُ سَيِّئَةٌ۔ ایک قدیم مذہب جسکی تجدید جناب زرتشت نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مَجْنُونُس کہتے ہیں\*\*\*۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لئے اہرمین و یزدان کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا۔ قرآن کریم میں الْمَجْنُونُس (سج و سجود) کا ذکر یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کسرایا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لئے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے۔

## م ح ص

الْمَحْضُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اس کے عیوب سے ہٹا کرنا\*\*۔ مَحْضُ الذَّهَبِ بِالْغَارِ۔ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو اس سے الگ کر دیا اور اس طرح سونے کو خالص کر لیا\*\*\*\*۔

\*تاج۔ \*\*راغب۔ \*\*\*تاج و محیط۔ \*\*\*\*محیط۔

مَحْصَنَ السَّيْنَانِ - اس نے نیزے کو جلادی ، چمکایا \* - قرآنِ کریم میں ہے - وَلَيُصْصِصَنَّ مَنَاقِبُ قُلُوبٍ بِكُفِّهِمْ (۳۳/۱۵) - تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں کھوٹ ہے اسے نکال دے۔

نیز حَبْلٌ مَحْصٍ - اس رسی کو کہتے ہیں جس کا چبھنے والا رواں استعمال سے صاف ہو گیا ہو اور وہ اس طرح نرم ہو گئی ہو۔ اور قَرَسٌ مَحْصٌ وَمُصْحَقٌ - مضبوط جسم والا کھوڑا \* - اس اعتبار سے مَحْصٌ کے معنی مضبوط اور طاقتور بنانے کے آئیں گے۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ مَحْصٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳۳/۱۵)۔ مَحْصٌ اور مَحْصٌ ذونوں میں کمی کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن مَحْصٌ میں کسی کی کمزوریوں کو کم کر کے اسے محکم بنانا مقصود ہوتا ہے اور مَحْصٌ میں کسی کو مٹا دینا مفہوم ہوتا ہے۔ (دیکھئے عنوان م - ح - ق)

## م ح ق

مَحْقَقَةٌ - اسے مٹا دیا حتکہ اس میں سے کچھ بھی بقی نہ رہا \* - اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا کم کیا \*\*\* - أَلَمْ يَحْقُقْ - کسی چیز کا تمام کا تمام ضائع ہو جانا حتکہ اس کا کچھ حصہ بھی نظر نہ آئے۔ مَحْقَقٌ الْحَرُّ الشَّقِيئُ - گرمی نے اس چیز کو جلا کر تباہ کر دیا۔ أَلَمْ يَحْقُقْ النَّبَاتُ - سخت گرمی کے باعث پودے سوکھ کر جل گئے \* - أَلَمْ يَحْقُقْ - ہلاکت \* - راغب کے نزدیک اس کے معنی کم ہو جانے کے ہیں \*\* - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ چنانچہ أَلَمْ يَحْقُقْ (م کی تینوں حرکات کے ساتھ) - قمری مہینوں کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا۔

سورہ بقرہ میں ہے يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبُو (۲/۲۶) - خدا کا قانون ربو کی بنا پر حاصل شدہ سرمایہ کو کم کر دیتا یا برباد کر دیتا ہے۔ وہ معاشرہ کبھی ثمر بار نہیں ہو سکتا جس کا معاشی نظام ربو پر قائم ہو۔ یہاں يَمْحَقُ بمقابلہ يَرْبِي آیا ہے جس کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔ سورہ آل عمران میں يَمْحَقُ بمقابلہ يَمْحَقُصُ آیا ہے (۳۳/۱۵) جس کے لئے دیکھئے عنوان (م - ح - ص)

## م ح ل

أَلَمْ يَحْلُ - خفیہ تدبیر - مکر - چال - شدت - شدید بھوک - قحط سالی - بارش کا بند ہو جانا اور زمین کا خشک ہو جانا - زَمَانٌ مَحْلٌ - خشک



زمانہ جس میں بارش نہ ہو۔ اَرْضٌ مَّحِلٌ\*۔ وہ زمین جہاں وقت پر بارش نہ ہوئی ہو اور اس وجہ سے وہاں قحط ہو گیا ہو۔ اَمْحِلَ الْقَوْمُ\*۔ وہ قوم قحط سالی میں مبتلا ہو گئی۔ مَاحِلَتُهُ مَحِلًّا\*۔ اس نے اس سے دشمنی کا رتاؤ کیا۔ اس سے زور آزمائی کی تاکہ معلوم ہو جائے کہ دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے۔ چنانچہ اَلْمَحَاحِلُ\*۔ جھگڑا کرنے والے حریف کو کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ (۱۳۳)۔ اس کے معنی ہیں سختی سے گرفت کرنے والا۔ سختی سے سزا دینے والا۔ بڑی قوت کے ساتھ مواخذہ کرنے والا۔ جس کا قانون مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہو اور جو اعمال کے نتائج مراتب کرنے میں بڑی سختی برتتا ہو اور کسی سے رعایت نہ کرتا ہو۔ اس میں سختی کے ساتھ قوت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مَحْجِلُنِي يَا قُلَانِ\*۔ اے شخص! مجھے قوت پہنچا\*۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مَحَالٌ\* دراصل حَوَالٌ\* اور حَيْلَتُهُ\* سے مشتق ہے اور اس میں میم زیادہ ہے۔ (اسکے لئے دیکھئے ح۔ و۔ ل) لیکن یہ بہت بعید ہے۔

## م ح ن

مَحْنٌ\* کے اصلی معنی کوڑے مارنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْمِحْنَةُ\* اسم ہے جس کی جمع مِحَنٌ\* آتی ہے۔ یعنی وہ مشقتیں جن سے کسی کی آزمائش کی جائے۔ مَحْنُ الْيُسْرِ مَحْنًا\*۔ اس نے کنوئیں کی مٹی وغیرہ نکال کر اسے صاف کر دیا\*\*۔

مَحْنُ الْاَلَادِيْمِ\*۔ اس نے چمڑے کو نرم کر دیا۔ اسے چھیل کر صاف کر دیا۔ اس نے چمڑے کو کھینچ کر وسیع کر دیا۔ مَحْنُ الْفِضْقَةِ\*۔ اس نے چاندی کو آگ میں تپا کر صاف اور خالص کر دیا\*\*۔

قرآن کریم میں ہے اُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِيَتَّقُوا (۳۳)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقویٰ کے لئے پاک اور صاف کر دیا۔ یا انہیں نرم اور کشادہ کر دیا۔

اِمْتِحَانٌ\* کے معنی کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے یا آزمائے کے ہیں۔ سورہ الممتحنہ میں ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اِذَا جَاءَكُمْ اَلْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَاِمْتَحِنُوهُنَّ (۲۱)۔ اے جماعت مومنین!

\* تاج و محیط و راغب۔ \*\* تاج۔

جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کر کے آئیں تو ان کے اندرونی حالات معلوم کر لیا کرو۔

## م ح و

مَحْتَاہُ یَمَحْتُوْہُ مَحْتَوًا۔ اس نے اس کے اثر اور نشان کو مٹا دیا اور ختم کر دیا، زائل کر دیا۔ اَلْمَحْتُوۃُ۔ بارش جو خشک سالی کے آثار مٹا دے۔ مَحْتَا الصَّبِیْحِ اللَّیْلِ۔ صبح نے نمودار ہو کر رات کو مٹا دیا۔ اَلْمَحْتُوۃُ۔ اس سیاہ نشان کو کہتے ہیں جو چاند کے اندر نظر آتا ہے \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو لے جانے اور غائب کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں مَحْتُوۃُ بمقابلہ اِثْبَاتِ آیا ہے۔ یَمَحْتُوْا لِّلّٰہِ مَا یَشَآءُ وَ یُثَبِّتُ (۱۳۹)۔ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق (نہ رکھنے کے قابل چیز کو) مٹا دیتا اور رکھنے والی چیز کو قائم رکھتا ہے۔ مثلاً اسے ہے جو تخریبی نتائج پیدا کرے اور باقی اسے رکھتا ہے جو تعمیری نتائج کی حامل ہو (۲۴۲)۔ یعنی جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو (۱۳)۔ محو و اثبات کا یہ اٹل قانون، کارکہ فطرت کے ہر گوشے میں کارفرما ہے اور اسی قانون کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یعنی بقائے نافع (۱۳)۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ”بقائے نافع“ کا اصول ”بقائے اصلح“ (Survival of the Fittest) کے اس اصول سے بہت بلند ہے جسے ڈارون (اور اس کے متبعین نے) طبیعیاتی قانون ارتقا میں دیکھا تھا۔ انسانی دنیا کے لئے صحیح اصول یہی ہے کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَاَیَمُکِّثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳) ”زمین میں وہی چیز (وہی نظریہ - وہی نظام) ٹھہرتی ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو، - یعنی وہ نظریہ زندگی اور نظام حیات جو نفع بخش ہو اور اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، پارٹی، قوم، یا ملک تک محدود نہ ہوں، پوری کی پوری انسانی دنیا کو محیط ہوں۔ دنیا کے تمام انسان ان سے مستمع ہوں۔

## م خ ر

مَخْرٌ۔ شق کرنا۔ بھاڑنا۔ چیرنا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں \*\*۔ مَخْرَتِ السَّفِیْنَتِ۔ کشتی ہانی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ مَخْرَتِ السَّقَابِیحِ \* تاج۔ \*\* محیط و ابن فارس۔

تیرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا\*۔ قرآن کریم میں ہے  
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَآخِرَ فَيْئِهِ (۱۶۶)۔ اس میں مَوَآخِرَ مَآخِرَۃ کی  
جمع ہے جس کے معنی ہیں سینہ بھر کو چیر کر چلنے والی (کشتیاں)۔

## م خ ض

مَخْضُ اللَّبَنِ - دودھ (دھی) کو بلویا - اسی سے مَخْضُ الشَّقِیْیِ  
مَخْضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو سختی سے ہلانا - اس طرح حرکت  
دینا جس طرح دھی کو بلوتے وقت حرکت دیتے ہیں - تَمَخَّضَ الْوَلَدُ -  
بچے نے حاملہ کے پیٹ میں اس طرح حرکت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کی  
پیدائش کا وقت قریب آ رہا ہے - الْمَخْاضُ - وہ حاملہ جس کے وضع حمل کا  
وقت قریب آ گیا ہو - مَخْضَتِ الْمَرْأَةُ - عورت کو درد زہ شروع ہو گیا\*\*۔  
سورۃ مریم میں الْمَخْاضُ (۱۶۶) انہی معنوں میں آیا ہے - یعنی درد زہ -

## م د د

مَدَدٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو لمبائی میں کھینچنا اور کسی  
چیز کا دوسری سے طول میں ملے ہوئے ہونا - اسی نسبت سے مَدَدٌ کے معنی سیلاب  
کے آتے ہیں کیونکہ اس میں پانی دور تک مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے - بڑھانے  
اور اضافہ کرنے کو بھی مَدَدٌ کہتے ہیں - مَدَدُ الْبَحْرِ - سمندر کے چڑھاؤ  
کو کہتے ہیں - یہ التَّجَزُّؤ (اتار) کی ضد ہے - مَدَدٌ کے معنی بچھانے اور  
پھیلانے کے بھی ہیں - مَدَدٌ نَظْرَهُ إِلَيْهِ - اس کی طرف جھانک کر دیکھا -  
نظر اٹھا کر دیکھا - مَدَدٌ اور اِمْدَادٌ کے معنی مہلت دینے کے بھی آتے ہیں -  
مَدَدٌ - لمبی پھیلی ہوئی یا کھینچی ہوئی چیز کو کہتے ہیں - مَدَادٌ -  
روشنائی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ قلم سے برابر آتی رہتی ہے اور بعد میں آنے  
والی روشنائی پہلی روشنائی سے ملتی رہتی ہے - مَدَدٌ کے معنی مدد دینے کے بھی  
آتے ہیں\*\*۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ مَدَدٌ بیشتر شر کے لئے آتا ہے اور اِمْدَادٌ  
خیر کے لئے\*\*\*۔ (مثالیں آگے آتی ہیں)۔

مَادَّةٌ - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو بڑھائے\*\*۔ اہل  
لغت نے اس کے معنی اَلِزَّادَةُ الْمُتَّصِلَةُ بھی بتائے ہیں - اس کے معنی  
ہیں وہ شے جو اس طرح بڑھے کہ اس کے اجزاء باہم دگر ملے رہیں - یہ لفظ  
(Matter) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا -

\* تاج و راغب و محیط - \*\* تاج و محیط - \*\*\* راغب -

سورة النمل - ( ۲۹ ) میں یہ مادہ ”بڑھانے“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورة حجر میں ہے۔ لَا تَمُدُّنَّ عَيْنَيْكَ ( ۱۵ )۔ تو اپنی آنکھوں کو (اس طرف) مت بڑھا۔ یعنی ان چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھ۔ روشنائی کے معنوں میں مَدَّاد ( ۱۸ ) میں آیا ہے۔ ”پھیلے ہوئے“ کے معنوں میں ( ۱۹ ) میں۔ یعنی ظِلِّ مَمْدُودٍ۔ اَمْدَادٌ خیر اور بھلائی کے معنوں میں۔ كَلَّا نَمِيدُ هَلْؤًا لَّعٍ وَ هَلْؤًا لَّعٍ مِّنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ( ۲۰ ) میں آیا ہے۔ اس لئے کہ یہ امداد ربوبیت اور پروردگاری کے سرچشمہ سے متعلق ہے۔ آیت کے معنی ہیں ”ہم سب کو مدد دیتے ہیں۔ آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی۔ یہ تیرے رب کی عطا سے ہوتا ہے۔“ وَ اَمْدَادُكُمْ بِاَمْوَالٍ وَ بَنِيْنٍ ( ۲۱ ) میں اَمْدٌ بھی خیر اور بھلائی کے لئے آیا ہے۔ آیت کے معنی ہیں ”اور مال اور اولاد سے تمہیں مدد دی۔ آگے بڑھایا“۔ اس کے برعکس، سورة مریم میں ہے قُلْ مَن كَانَ رَفِي الضِّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ( ۲۲ )۔ ”کہو کہہ جو کوئی گمراہی میں رہے تو رحمان اس کے لئے مہلت کا عرصہ لمبا کرتا جائے گا“۔ اس میں مَدَّ شَر کے لئے آیا ہے۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَ نَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ( ۲۳ )۔ یہاں بھی مَدَّ شَر کے لئے آیا ہے۔ یعنی ”ہم اسے لکھتے جائینگے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لئے عذاب کو لمبا کھینچتے جائینگے“۔

هُوَ الَّذِي مَدَّ اِلَّا رُضَ ( ۲۴ ) میں مَدَّ کے معنی پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں۔ ”اللہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے“۔ اور وَ يَمْدُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ ( ۲۵ ) میں اس کے معنی مہلت دینے اور دور تک لے جانے کے ہیں۔

سورة کہف میں مَدَّاد ( ۱۸ ) اضافہ کے معنوں میں آیا ہے۔

## م د ن

مَدَنٌ بِالْمَكَانِ۔ اس نے اس جگہ قیام کیا۔ اَلْمَدْرِيْنَةُ ( ۳۶ )۔ بڑا شہر اس کی جمع مَدَّ اِثْنٌ ہے۔ یعنی بہت سے شہر ( ۱۱ )۔ قلعہ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دريْن سے مشتق ہے (دیکھئے عنوان د۔ ی۔ ن)۔ مَدَّ اِثْنٌ ایران (فارس) کے ایک بڑے شہر کا نام تھا جو بغداد کے قریب تھا۔ مَدَّ يَنْ حضرت شعیبؑ کے قریب کا نام\* ( ۸ )۔ تَمْدُّ يَنْ الرَّقَّاجِلُ۔ آدمی آسودہ

\* محیط و راغب و تاج۔

و خوش حال ہوا۔ تَمَدَّنَ الرَّجُلُ - اس آدمی نے شہر والوں کی عادات اختیار کر لیں۔ دیہاتی بن چھوڑ کر شہریت و شائستگی اختیار کی۔ مَدَنَتْ مَدْرِيْنَه - میں نے شہر بنایا\*\*۔ اسے آباد کیا اور بسایا\*۔

## مَدِيْن

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے (۸۵)۔ نیز وہ علاقہ جس کی طرف حضرت موسیٰؑ گئے تھے (۲۴)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”شعیب“۔ نیز عنوان ”موسیٰ“۔

## مَرَأ

الْمَرْءُ - (میم پر تینوں حرکتیں جائز ہیں) نیز اُمْرُو - انسان یا مرد۔ الْمَرْأَةُ اور اَلْمَرْأَةُ عورت کو کہتے ہیں۔ مَرْوَعَةٌ - انسانیت۔ آدمیت کمالِ مردانگی۔ مَرِي الطَّعَامُ مَرْأَعَةٌ - کھانا خوشگوار ہو گیا۔ هَنِيئِي - لذیذ کھانے کو کہتے ہیں۔ اور مَرِي اس کھانے کو جس کا نتیجہ عمدہ ہو\*۔ هَنِيئِيْشَا مَرِيْشَا (۳)۔

## مَرَج

مَرَجٌ - ملانا۔ خلط ماط کر دینا۔ مَرَجٌ کے معنی گڈمڈ ہونے، مل جانے اور اختلاط کے ہیں (راغب نے یہ معنی الْمَرْوَجُ کے دئے ہیں)۔ اسی سے الْمَرَجُ کے معنی اضطراب اور التباس کے ہیں۔ نیز فتنہ و فساد کے\*\*\*۔ سورۃ ق میں ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں فَهَمْ فِيْ آسَرٍ مَّرِيْجٍ (۵)۔ وہ پیچیدہ معاملہ کے اند ہیں۔ وہ بڑے الجھاؤ اور پریشانی کی حالت میں ہیں۔ انہیں التباس ہو رہا ہے۔ وہ اسی اضطراب میں ہیں جو بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ الْمَرَجُ - مختلط چیز۔ بلند اور تند و تیز شعلہ\*\*\*۔ (لیکن، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا۔ مَرَجٌ کے معنی کھلا چھوڑ دینے کے بھی آتے ہیں۔ اسی لئے الْمَرَجُ - آگ کے آزاد شعلے کو کہیں گے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو)۔ سورۃ رحمن میں ہے۔ مِّنْ مَّرَاجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵)۔ آگ کے مغلوط یا بھڑکنے والے شعلے سے۔ لیکن الْمَرَجُ وسیع چراگاہ اور کھلی جگہ کو بھی کہتے ہیں جس میں جانور آزادانہ (کھلے طور پر) چرتے پھرتے رہیں\*\*\*۔ (غالباً اس لئے کہ اس طرح کھلے طور

ہر چرنے پھرنے سے ایک دوسرے کے جانور آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں)۔  
 اَمْرَجَہَا۔ اُس نے جانوروں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جہاں  
 چاہیں چلیں پھریں۔ چنانچہ اَلْمَرْجُ اُن اونٹوں کو کہتے ہیں جو بغیر  
 چرواہے کے آزاد چر رہے ہوں۔ اسی سے اَلْمَرْجُ کے معنی جاری کرنے  
 چلانے اور کھلا چھوڑنے کے بھی ہوتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ  
 اس کے بنیادی معنی آنے جانے اور اضطراب کے ہیں۔

قرآن کریم میں مَرْجُ الْبَحْرِ یُنِ (۲۵۵)؛ (۵۹) آیا ہے۔ جس کے  
 معنی ہیں اس نے دو دریا جاری کر رکھے ہیں جو آپس میں ملتے ہوئے بہ  
 رہے ہیں۔

## م ر ح

اَلْمَرْحُ۔ اس خوشی اور نشاط کو کہتے ہیں جس میں شدت اور  
 زیادتی سے انسان اپنی حدود سے متجاوز ہو جائے (اور اس میں اوجھے پن یا  
 اُترانے کی کیفیت پیدا ہو جائے)۔ اکڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔  
 ابن فارس نے اس کے معنی ایسی خوشی بتائے ہیں جس میں فرط طرب سے آدمی  
 آپس سے باہر نکل جائے۔ فَرَسٌ مِیْمَرْحٌ۔ طاقت کی مستی میں اٹھلا کر  
 چلنے والا ہر نشاط گھوڑا۔ قَوْسٌ مَرْوَحٌ۔ کڑی کمان\*\*۔ جو انتہائی تیزی  
 سے تیر پھینکتی ہو۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَمْنُنْ فِی الْاَرْضِ مَرْحًا (۶۱۱)۔ زمین  
 میں اکڑ کر نہ چلو۔ اسکی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی۔ یٰمَآ  
 کُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَغْتَبِرِ الْحَقُّ۔ وَیَمَآ کُنْتُمْ  
 تَمْرَحُوْنَ (۶۱۲)۔ یعنی یہ لوگ بغیر ایسے کام کئے جو تعمیری نتائج مرتب  
 کریں، یونہی اکڑتے رہتے ہیں۔ انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے۔  
 وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یَّعْتَمِدُوْا بِمَآ لَمْ یَفْعَلُوْا (۱۸۷)۔ چاہتے ہیں کہ  
 ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے کئے نہیں۔

## م ر د

مَرَدٌ۔ یَمْرُدٌ کے معنی ہیں سرکشی کرنا۔ مَرَدٌ عَلٰی الشَّیْءِ  
 کے معنی ہیں وہ اس چیز کا عادی ہو گیا۔ وہ ایسے برابر کرتا رہا۔ تَمْرُدٌ کے  
 اصلی معنی مشتاق ہو جانے اور ہادی ہو جانے کے ہیں\*\*\*۔ چنانچہ قرآن کریم

میں ہے۔ مَرَدٌ وَاَعْلَى السِّفَاقِ (۱۱۱)۔ وہ منافقت کے عادی ہو چکے ہیں۔  
 الْمَرْدَاءُ۔ اُس عورت کو کہتے ہیں جس کے سر پر ہال نہ ہوں \*۔ ابن  
 فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے چھلکے یا اوپر کے  
 روئیں اور بالوں کو صاف کر دینا ہوتے ہیں۔ اس سے الْأَمْرَدُ اس نوجوان  
 کو کہتے ہیں جس کی ڈاڑھی نمودار نہ ہوئی ہو۔ قرآن کریم نے شیطان کو  
 مَرِيدٌ کہا ہے (۱۱۲)۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مطلب ہوگا سرکش۔  
 راغب نے اسے شَجَرَةٌ مَرْدَاءٌ سے ماخوذ بتایا ہے جس کے معنی ہیں وہ  
 درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ ان معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا وہ جو  
 ہر قسم کی بھلائیوں اور خوشگوار یوں سے محروم ہو چکا ہو۔ یہ معنی رَجِيمٌ  
 اور لَعِینٌ کے مرادف ہیں۔ (دیکھئے عنوانات ر۔ ج۔ م اور ل۔ ع۔ ن)

الْمَرِيدُ۔ کھجور جو دودھ میں بھگو دی جائے تاکہ نرم ہو جائے۔  
 اصمعی نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے متل دیا جائے حتّٰی کہ وہ نرم ہو جائے  
 مَرِيدٌ کہلاتی ہے \*۔ قرآن کریم میں صَرَحٌ مَرِيدٌ آیا ہے (۱۱۳)۔  
 اس کے معنی ہیں ہموار یا چکنا کیا ہوا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے  
 معنی لمبی عمارت کے بھی ہیں۔ ویسے اَلشَّعْرُ مَرِيدٌ فِی الْبِنَاءِ کے معنی  
 ہوتے ہیں عمارت کو چکنا اور ہموار کرنا۔ اس پر پلاسٹر لگانا۔ اَلْمَرَادُ۔  
 بلند۔ نیز سرکش۔ خیر سے عاری \* (۱۱۴)۔

## م ر ر

مَرَّةٌ۔ مَرَّتَ بِہِم۔ مَرَّ عَلَیہِم۔ اس کے پاس سے گزر گیا۔  
 اَلْمَرَّةُ۔ ایک بار۔ مَرَّتَانِ۔ دو بار۔ مَرَّ کُلُّ مَرَّةٍ۔ ہر بار۔ اَوَّلُ  
 مَرَّةٍ۔ پہلی بار۔ اَلْمَرَّةُ۔ کڑوا \*۔ اِسْتَمَرَّ الشَّيْءُ۔ چیز ہمیشہ رہی۔  
 مسلسل رہی۔ ایک ہی طریقہ پر چلتی رہی \*\*\*۔ سَعَرَ مُسْتَمِرٌّ (۱۱۵) وہی  
 جھوٹ جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ یعنی اِفْذُكْ قَدَرِیْمٌ (۱۱۶)۔

سورة بقرہ میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ..... (۱۱۷)۔ طلاق دو  
 ہی بار ہو سکتی ہے۔ اس کا عام طور پر مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی  
 آدمی دو مرتبہ طلاق، طلاق کہدے (یا ایک ایک مہینہ کے وقفہ کے بعد دو  
 بار طلاق کا اعلان کردے) تو اس سے طلاق نہیں ہڑتی (واپسی ہو سکتی ہے)  
 لیکن اگر تین مرتبہ کہدے تو پھر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر  
 یہ (سابقہ میان بیوی) پھر باہمی نکاح کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کسی

دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے ہم بستر ہو۔ (اسے حلالہ یا تجلیل کہتے ہیں)۔ یہ خیال اور طلاق کا طریق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طلاق کے لئے ایک خاص طریقہ مقرر ہے۔ یعنی پہلے باہمی افہام و تفہیم۔ پھر ثالثوں کے ذریعے مصالحت کی کوشش۔ پھر عدالت کے ذریعے فیصلہ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے اور باہمی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو میان بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر یہی مرد اور عورت چاہیں تو باہمی نکاح کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا، اس جوڑے کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ ہو سکتا ہے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق کی نوبت آگئی تو پھر یہ میان بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کے بعد مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو پھر وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا مطلب **الطَّلَاقُ** **مَرَّتَانٍ** سے۔ جب تک طلاق (قید نکاح سے آزادی) عمل میں نہ آجائے اسے طلاق کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اس لئے **الطَّلَاقُ مَرَّتَانٍ** کے معنی واضح ہیں۔ یعنی قید نکاح سے ایسی آزادی دو مرتبہ ہو سکتی ہے جس میں لوٹ آنے کی اجازت ہو۔ تیسری مرتبہ کی آزادی کے بعد اس کی اجازت نہیں۔

**الْمَرْءُ**۔ رسی کو بھی کہتے ہیں۔ **أَمْرَرْتُ الْجَبَلَ**۔ میں نے رسی کو بٹ دیا۔ اس سے اس کے معنی قوت اور استحکام کے آتے ہیں۔ **الْمُسْتَمِرَّةُ** **مَرِيْرَةٌ**۔ اس کا ارادہ مستحکم ہو گیا۔ **الْمُسْتَمِرَّةُ بِالشَّقَى**۔ وہ اس چیز کے اٹھانے پر قادر ہو گیا۔ اہل عرب کہا کرتے ہیں **أَرْجَى الْغِلْمَانِ الَّذِي يَبْدَأُ بِعُمُقٍ ثُمَّ يَسْتَمِرُّ**۔ سب سے عونہار لڑکا وہ ہے جو ابتداءً بیوقوفی کرے اور پھر درست ہو جائے۔ اس سے **الْمِرَّةُ** کے معنی خلقی قوت و شدت اور عقل و اصالت کے آتے ہیں\*۔ چنانچہ صاحب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ **مِرَّةٌ** **الْإِنْسَانِ أَدْمَى** کی قوت کو کہتے ہیں۔ **سُورَةُ الْقَمَرِ** میں جو آیا ہے **فِي يَوْمٍ نَخَسٍ مَّسْتَمِرٍّ** (۹۶)۔ تو اس کے معنی سخت شدت کا دن ہیں (اس کے معنی ہیں ایسا دن جس کی نحوست مسلسل رہے)۔ نیز اس نے لکھا ہے کہ **سُورَةُ اَعْرَافٍ** میں جو ہے **حَمَلَتْ حَمَلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهِ** (۱۸۹)۔ تو اس میں **فَمَرَّتْ** یہ کے معنی سختی یا شدت کو محسوس کرنا ہیں۔

**سُورَةُ النِّجْمِ** میں **اللَّهُ تَعَالَى كَوْذُومٌ مَّرَّةً** (۵۳) کہا گیا ہے۔ اس کے معنی صاحب قوت و حکمت بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ جس کے ارادے مستحکم



اور تدبیریں قوی ہوں۔ اور یہ بھی کہ جو زندگی کی مختلف گزرگاہوں کا مالک ہو۔ اس لئے کہ ”مرؤر“ کے بنیادی معنی گزر جانے کے ہیں۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ”مرآة“ کے معنی ایسی حالت کے ہیں جس پر کوئی چیز مستقلاً چلتی رہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی قوانین خداوندی (سنة الله) کے ہونگے جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

## م ر ض

”مرض“۔ توازن اور اعتدال کا اس طرح ہگڑ جہانا کہ کسی قوت میں اضمحلال، ضعف یا کمی واقع ہو جائے۔ کمی کے لحاظ سے شمس ”مرربضة“۔ سورج کو اس وقت کہتے ہیں جب گرد و غبار سے اس کی روشنی مدہم پڑ گئی ہو۔ اور ”ارض“ ”مرربضة“۔ ایسی زمین کو جس میں طاقت کم ہو۔ یا جس میں پیداوار کم ہوتی ہو۔ نیز وہ زمین جہاں بد امنی ہو۔ ”مرض“ کے معنی ظلمت اور تاریکی کے بھی آتے ہیں۔ اور شک اور نفاق کے بھی۔

قرآن کریم میں ”مرض“ بمقابلہ شفاء آیا ہے (۲۸) جہاں اس کے معنی جسمانی مرض کے ہیں۔ اور ”فی قُلُوبِہِمْ“ ”مرض“ (۲۰)۔ جہاں اس کے معنی قلب و نگاہ کے توازن کے ہگڑ اور نفسیاتی الجھاؤ کے ہیں۔ لہذا، جسمانی بیماری ہو یا ذہنی اور قلبی فتور، دونوں کے لئے ”مرض“ کا لفظ آتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں سطحی جذبات پرستوں یا مفاد پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”فی قُلُوبِہِمْ“ ”مرض“ (۲۰)۔ اس قسم کی ذہنیت یا سیرت کو، قلب (Psyche) یا (Mind) کا مرض کہنا ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہے جس سے (بیسویں صدی سے پہلے) انسانی علم یا العموم بے بہرہ تھا۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے اپنے متعلق کہا ہے شفاء ”لِّمِمَّا فِی الصُّدُورِ“ (۱۵)۔ اس میں ”قلب کے امراض“ کا علاج اور شفاء ہے۔

اگر اس کا علاج وحی کی رو سے نہ کیا جائے تو یہ مرض اپنے زور دروں سے از خود بڑھتا رہتا ہے (۲۰)۔

## م ر و

صَفَاً اور مَرُوءَۃً مکہ میں مسجد حرام سے باہر دو پہاڑیاں ہیں۔ صَفَاً (صَفَاۃ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مَرُوءَۃً چھوٹے چھوٹے سفید برفی کنکروں کو۔ مراسم حج کے سلسلہ میں قرآن کریم نے انہیں

میں "شعائرِ اللہ" (۲/۱۵۸) کہا ہے۔ شعائر، کسی نظام یا مملکت کی اُن محسوس علامات (نشانات) کو کہتے ہیں جو تقارب اور مراسم میں اُس نظام یا مملکت کے قائم مقام سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا اُس کے شعائر میں سے ہوتا ہے۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دل میں اُس سلطنت کا احترام ہے۔ قرآن کریم نے جن محسوس علامات کو شعائر اللہ قرار دیا ہے اُن سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکومتِ خداوندی (قرآنی نظام مملکت) کے محسوس نشان ہیں جن کا احترام درحقیقت حکومتِ خداوندی کے احترام کا مرادف ہے۔ اس سے زیادہ ان محسوس علامات (Symbols) کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ (نیز دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر)۔

## م ر ی

مَرَّی التَّفَاقَةُ بِمَرِّ يَهُدَا مَرَّيًّا۔ اونٹنی کے تھنوں کو ہاتھ سے سہلانا (مس کرنا) کہ وہ دودھ دیدے۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ چنانچہ اَلْمَرَّيَّةُ اور اَلْمَرَّيَّةُ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جو اس طرح نکالا جائے۔\*\*۔ اس سے اس کے معنی ہیں تردد اور کوشش سے کسی بات کا نکالنا۔ چنانچہ مَرَّيَّةُ الْفَرَسِ کے معنی ہیں وہ چال جو کھڑا وغیرہ کھانے سے گھوڑا نکالے۔\*\*۔ لہذا مَرَّيَّةُ کسی معاملہ میں تردد کو کہتے ہیں۔ نیز شک اور جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب نے ان معانی کی یہی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ مَرَّيَّةُ شک سے خاص ہوتا ہے۔\*۔ جھگڑے کے مفہوم میں مناوی نے کہا ہے کہ مَرَّيَّةُ دوسرے کے کلام میں اظہارِ خال کے لئے طعن کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے آدمی کی تعقیر کی جائے، اور پس۔ اَلْمَرَّيَّةُ فِيهِ وَتَمَارِي کے معنی شبک کرنے کے ہیں۔ فراء نے تَمَارِي کے معنی تکذیب کرنے کے بتائے ہیں۔\*\*۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُنْسَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ (۲/۲۸)۔ جو لوگ اَلْسَاعَةِ کے بارے میں شک اور تردد میں پڑے ہیں۔ سورہ کہف میں ہے۔ فَلَا تَمَارِ فِيْهِمْ (۱۸/۱۸)۔ ان سے ان کے بارے میں جھگڑا مت کر۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۲/۲۴)۔ جھگڑا کرنے والوں یا شک اور تردد کرنے والوں میں سے نہ ہو جا۔

## مریم

مَرَّيْمٌ۔ یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کوئی بہت ہی عجیب بات کرتا ہے اسے عرب

يَا مَرْيَمُ كَهْكَرِ خَطَابِ كِـرْتِے هِيں ۔ اور اَلْمَرْيَمُ مِيْنِ الْيَسَّاعِ اُس عورت كو كہتے هِيں جو مردوں كے ساتھ باتيں كرنا پسند كرے ليكن برائيوں سے دور رھتی هو\* ۔

قرآن كَرِيم نے حضرت عيسٰیؑ كى والدہ ماجدہ كا نام مريمؑ بتايا هے ۔ (۳۵)۔ آپ (حضرت مريمؑ) كى والدہ كو اَمْرَاَتُ عِمْرَانِ (۳۶) كہكر پكارا كيا هے ۔ اس كے معنی ”عمران كى بيوى“ يا ”آل عمران كى عورت“ كے هِيں ۔ سورہ مريم ميں هے كہ آپ كى قوم كے لوگوں نے آپ كو يَأْخُذَتْ هُرُوقًا (۳۸) ”اے هارون كى بہن“ بهى كہا تها ۔ اس كے بهى دو معنی هوسكتے هِيں ۔ ايك تو يہ كہ آپ كے كسى بھائي كا نام هارون تها ۔ اور دوسرے يہ كہ حضرت هارونؑ (مورث اعلیٰ) كى طرف نسبت كى وجہ سے ايسا كہا كيا تها ۔ سورہ تحریم ميں آپ كو ابْنَتِ عِمْرَانَ (۳۹) كہا كيا هے ۔

آپ كى والدہ نے آپ كى پيدائش سے پہلے منت مافى تھى جس كى بنا پر آپكو هيكل كى خدمت كے لئے مختص كر ديا كيا (۳۵)۔ (تفصيل كے لئے ديكھئے عنوان ح ۔ ر ۔ ر)

حضرت عيسٰیؑ كو قرآن كَرِيم ميں عام طور پر ”ابن مريمؑ“ كہكر پكارا كيا هے ۔ ربنان اپنى كتاب (Life of Jesus) ميں اس ضمن ميں لکھتا هے ۔ ”آپ (حضرت عيسٰیؑ) طبقہٴ هوام سے متعلق تھے ۔ آپكے والد ، يوسف اور والدہ ، مريمؑ ، دونوں غريب گھرانے كے افراد تھے ۔ دستكارى ان كا پيشہ تها ۔ . . . . . آپ كے والد كا انتقال جلدى هو كيا ۔ اس كے بعد حضرت مريمؑ هى خاندان كى سرپرست رہ گئیں ۔ يہ وجہ هے كہ حضرت مسيحؑ عام طور پر ”ابن مريمؑ“ كے نام سے موسوم هوئے ۔ يعنى جب آپكو آپكے همنام بچوں سے متميز كرنا هوتا تها تو ”يسوع ابن مريمؑ“ يا ابن مريمؑ كہا جاتا تها“ ۔

حضرت مريمؑ كى زندگى كے متعلق تفصيلى حالات ميرى كتاب ”شعلہٴ مستور“ ميں مليں گے ۔

## م ز ج

اَلْمَرْجُجُ ۔ ملانا ۔ مَرْجُجُ الشَّرَابِ بِالْمَاءِ ۔ اس نے شراب ميں پانى ملا ديا ۔ مِزْجُجُ ۔ وہ شے جو (شراب ميں) ملائى جائے\*\*\* ۔ مِزْجُجُ الْخَمْرِ ۔ كافورؑ ۔ اس شراب ميں كافور كى خوشبو هے\*\*\* ۔ ابن فارس نے كہا هے كہ

دو ملی ہوئی چیزوں میں سے ہر شے دوسری کیلئے میزاج کہلاتی ہے۔  
 قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ - يَسْتَرْبُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ - (۲۸)۔ وہ ایسے پیالہ سے پیتے ہیں جس میں کافور کی آمیزش ہوتی ہے۔ کافور (دیکھئے ک - ف - ر) کی تاثیر یہ ہے کہ وہ حدت کو پروت (ٹھنڈک) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایک منظم اور بامقصد جماعت کی پہلی منزل اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے ٹسپن پیدا کرنے کی ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اگلی منزل یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کی مدافعت میں، نظام خداوندی کے مخالفین کے مقابلہ میں سخت گرم جوشی دکھاتے ہیں۔ اس کے لئے کہہا کہ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَتْ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا (۲۹)۔ یہ اس پیالہ سے پیتے ہیں جس میں زنجبیل (سوٹھ) کی آمیزش ہوتی ہے۔ سوٹھ کی تاثیر حدت پیدا کرنا ہوتی ہے۔ اس جماعت کے لئے یہ دونوں منزلیں ضروری ہیں۔ یا یہ کہ وہ انہوں کے ساتھ ٹھنڈک کا برتاؤ کرتے ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں گرمی کا۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رَحِمَاءُ بَيْنَهُمْ (۳۰)۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم  
 دریاؤں کے دل جس سے دھل جائیں وہ طوفان (اقبال)

متضاد اور مخالف قوتوں میں صحیح صحیح امتزاج سے مومن کی سیرت تعمیر ہوتی ہے۔ اسی کو اپنے اندر الاِسماءُ الْحُسْنٰی کا منعکس کرنا کہتے ہیں۔ یعنی مختلف صفات خداوندی کا خاص تناسب و توازن سے اپنے اندر اجاگر کئے جانا۔

## م ر ق

مَمَزَقَهُ - مَمَزَقَهُ - اس نے اسکو پھاڑ دیا۔ یا اس میں سوراخ کر دیا۔  
 فَتَمَزَقَ - پس وہ پھٹ گیا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اَلْمَمَزَقُ - پھاڑے ہوئے کپڑے وغیرہ کے ٹکڑے۔ تَمَزَقَ الْقَوْمُ - قوم منتشر اور پراگندہ ہو گئی \*۔

قرآن کریم میں ہے - اِذَا مُمَزَّقْتُمْ كُلُّ مُمَزَّقٍ (۳۳)۔ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جاؤ گے۔ اس دنیا میں قومی ضعف و انتشار، اور مرنے کے بعد طبعی انتشار، دونوں کو محیط ہو سکتا ہے۔

## م ز ن

الْمُزْنُ - وہ سفید اور روشن بادل جس میں پانی ہو۔ اس قسم کے بادل کا ٹکڑا مُزْنَةٌ کہلاتیگا \*۔ فُلَانٌ يَتَمَزَّنُ - فلاں آدمی بادل کی مشابہت اختیار کرتا ہے۔ یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے \*\*۔ قرآن کریم میں پانی کے متعلق ہے۔ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمْوہُ مِنَ الْمُزْنِ .... (۵۶)۔ کیا اُسے بادل میں سے تم نیچے لاتے ہو...؟ یعنی سامانِ رزق سب کا سب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

## م س ح

الْمَسْحُ - ہونچھنا۔ کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینا، جیسے مَسَحْتُ رَأْسِي مِّنَ الْمَاءِ وَجَبَّيْنِي مِّنَ الرِّشْحِ - میں نے پانی کو اپنے سر سے اور پسینے کو اپنی پیشانی سے ہونچھ ڈالا۔ ابو زید نے کہا ہے کہ کلام عرب میں مَسَحَ کے معنی تر کرنے یا دھونے کے بھی ہیں۔ یعنی آلائش کو پانی کے ساتھ صاف کر دینا۔ مَسَحْتُ بَدْرِي بِالْمَاءِ - میں نے اپنے ہاتھ کو پانی سے دھویا۔ اور تَمَسَّحْتُ بِالْمَاءِ - میں نے غسل کیا \*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ مَسَحْتُہُ بِيَدِي کے معنی ہیں، میں نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ سورۃ ص میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے گھوڑے ان کے سامنے آئے فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ (۳۸)۔ تو وہ ان کی ہڈیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ (جیسے سوار اپنے گھوڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں)۔

الْمَسْحُ - الْمِسَاحَةُ - ناہنا۔ مَسَحَ الْأَرْضَ - اس نے زمین کی پیمائش کی \*۔ اس کا (Survey) کیا۔ الْمَسْحُ - راستے کو کہتے ہیں اور الْمَسِيحُ اس شخص کو جو بہت چلنے والا (سیر و سیاحت کرنے والا) ہو \*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پھیلا کر کسی چیز پر چلانا۔

حضرت عیسیٰؑ کو مَسِيحٌ بھی کہتے ہیں (۳۳)۔ صاحبِ قاموس نے اس کے اشتقاق میں قریب پچاس اقوال نقل کئے ہیں \*۔ ان میں ایک یہ بھی ہے (اور راغب نے اس کی تائید کی ہے کہ) چونکہ آپ بہت چلنے والے تھے اس لئے آپ کو مَسِيحٌ کہا گیا ہے۔ اس کے بعد راغب لکھتا ہے

کہ اُن کے زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ انہیں مَسَّحَاتِیْن اور مَسَّحَاتِیْن کہا جاتا تھا۔\*\* اور حضرت مسیحؑ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، اس لئے انہیں مَسَّحٌ کہا گیا ہے۔\*\*\* لیکن صاحب محیط نے کہا ہے کہ قدیم زمانہ میں کاهنوں اور بادشاہوں کے بدن پر تیل وغیرہ کی مالش کی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بدن پر بھی مالش کی گئی تھی اس لئے آپ کو مَسَّحٌ کہا گیا (The Anointed)۔\*\*\*\* (نیز دیکھئے عنوان م۔ ی۔ ح جس میں لکھا گیا ہے کہ مَسَّحٌ غالباً عربی لفظ نہیں)۔

سورۃ سائدہ میں ہے کہ جب تم صلوٰۃ کے لئے اٹھو تو قَاغْسِلُوْا وُجُوْہَکُمْ وَاَيْدِیْکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ۔ اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک ہاتھوں کو دھو لیا کرو۔ اس کے بعد ہے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ (۵/۶)۔ یہاں چونکہ وَامْسَحُوْا قَاغْسِلُوْا سے الگ آیا ہے اس لئے اس کے معنی دھونے کے نہیں ہونگے۔ صرف ہونچھ لینے کے ہونگے۔

اس سے آگے ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی جانے ضرور سے آئے، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔ فَتَتِمَّسَحُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا۔ تو پاکیزہ مٹی کا قصد کرو۔ قَاغْسَحُوْا بِوُجُوْہِکُمْ وَاَيْدِیْکُمْ مِیْنَهٗ (۵/۶ و ۷)۔ ”پاکیزہ مٹی کا قصد کرو“۔ بات تو قرآن کریم نے اتنی ہی کہی ہے لیکن اس اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ بدن کی آلائش کو پاکیزہ مٹی سے صاف کر لیا کرو۔ اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لیا کرو“۔ یعنی ہونچھ لیا کرو۔

اصل یہ ہے کہ صلوٰۃ سے پہلے وضو سے جہاں مقصود ہاتھ پاؤں کو پاک اور صاف کرنا ہے وہاں اس سے مراد ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تمہیداً ضروری ہوتی ہے۔ پانی نہ ملنے (یا اس سے پرہیز) کی صورت میں ہاتھ پاؤں دھونے کا مقصد حل نہیں ہو سکتا، لیکن ”تیمم“ سے صلوٰۃ کی تیاری کا نفسیاتی پہلو ضرور سامنے آجاتا ہے۔ یعنی اس سے انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

## م س خ

الْمَسَّحُ۔ کسی کی شکل و صورت بدل دینا اور بگاڑ دینا۔ یعنی پہلی شکل کے مقابلہ میں زیادہ بد نما اور قبیح بنا دینا۔\*\*\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ

\* تاج۔ \*\* راغب۔ \*\*\* اس فرقہ کا نام (Essenes) ایسینی تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شعلہ مستور (تذکرہ حضرت عیسیٰ)۔\*\*\*\* محیط۔\*\*\*\*\* تاج و راغب و محیط

بکاڑنے اور قبیح بنانے کا یہ عمل جسمانی ساخت میں بھی ہوتا ہے اور عادات و اخلاق میں بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں، یہ تبدیلی قیامت کو لٹے ہوئے ہوگی۔ اس نہج سے اَلْمَسِيخُ مِّنَ النَّاسِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس میں حسن اور ملاحیت نہ ہو۔ یا جو کمزور اور احمق ہو۔ لَحْمٌ مَّسِيخٌ۔ وہ گوشت جس میں کوئی مزہ نہ ہو\*۔ طَعَامٌ مَّسِيخٌ۔ وہ کھانا جس میں نہ نمک ہو، نہ رنگ نہ مزہ۔ اَلْمَسِيخُ حَمَاقَةُ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کی ٹانگ کی مچھلی کا لاغر ہو جانا (تاج)۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَمَسَسْنَاهُمُ عَالِيٰ مَّكَاتٍ تَّيْهِيْمٌ (۳۶)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کی قوت و قدرت کے باوجود انہیں کمزور و عاجز کر دیں۔ ان کی قوت و قدرت مبدل بہ ضعف و درماندگی ہو جائے۔

## م س د

اَلْمَسْدُ۔ بٹنا۔ مَسَدَ الْحَبَلِ۔ اس نے رسی کو بٹ دیا۔ اَلْمَسْدُ۔ کھجور کے پٹھے جنہیں بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے۔ اس طرح بٹی ہوئی رسی کو بھی کہتے ہیں\*\*۔

قرآن کریم میں حَبَلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱) آیا ہے۔ یعنی کھجور کے پٹھوں کی بٹی ہوئی رسی۔ قانونِ مکافات کی محکم گرفت مراد ہے۔

## م س س

مَسٌّ۔ چھونا۔ کسی چیز تک پہنچنا\*\*۔ رَاغِبٌ لِّمَسِّ لَحْمٍ کے ہم معنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ لَحْمٌ تلاش کرنے اور ٹٹولنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو تلاش کیا جا رہا ہو وہ مل بھی جائے، برخلاف مَسٌّ کے کہ اس کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب کہ حاسہ لَحْمٌ کے ذریعہ اس چیز کا ادراک بھی کر لیا جائے۔

(۱) کسی چیز کا جو ابتدائی اثر ہو اسے بھی مَسٌّ کہتے ہیں۔ وَجَدَ فَلَانٌ مَّسَّ الْحُمَّى۔ اسے بخار کی ابتدائی کیفیت محسوس ہوئی۔ لَمْ يَتَّجِدْ مَسًّا مِّنَ النَّهْطِ۔ اسنے ذرا سی بھی تھکن محسوس نہ کی۔ نیز، ہر پیش آنے والی چیز اور اذیت کو مَسٌّ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے\*\*۔

\* تاج و عبط و راغب۔ نیز ابن فارس۔ \*\* تاج و راغب۔

التَّمَسُّسُ باہم ایک دوسرے کو چھونا۔ کنایہ مجامعت کو کہتے ہیں \* (۵۸/۳۸)۔ مجامعت کے لئے مَسَّ اور مَسَّس بھی استعمال ہوتا ہے \*\*۔ (۲۳۹/۲۳۹) میں مجامعت کے لئے تَمَسَّسُوا ہُنَّ آیا ہے۔

سورہ طہ میں ہے کہ جس مامری نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا اسے سزا یہ دی گئی تھی اَنْ تَقُولَ لَا مِسَّاسَ (۲۱/۶۶)۔ تاج العروس میں ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو کہتا رہے کہ میں کسی کو نہیں چھوتا اور کوئی مجھے نہ چھوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اور اس طرح وہ ”اچھوت“ (Un-Touchable) بن گیا تھا۔ یعنی اُس سے سب نے معاشرتی تعلقات منقطع کر لئے تھے۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ لَمَسَّ ہاتھ سے چھونے کے لئے خاص ہے اور مَسَّ عام ہے۔ یعنی ہاتھ سے چھونے اور بدن کے کسی عضو سے چھونے کے لئے بھی آتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۲۱/۶۶)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے۔ یعنی یہاں قرآن کریم کو مس کرنے کے معنی اسے چھونا نہیں، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے \*\*۔ روح المعانی سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی تطہیر اور قلب و دماغ کی پاکیزگی اولین شرط ہے۔ جو شخص غیر قرآنی خیالات اور نظریات کو لیکر قرآن کریم کی طرف آنیگا، قرآنی حقائق اس پر کبھی بے نقاب نہیں ہونگے۔ فکر و ادراک کی پاکیزگی کے ساتھ ہی قلب و نگاہ کی عفت و تطہیر بھی ضروری ہے۔ جو قلب انسانیت سوز خیالات کی آماجگاہ ہو وہ قرآن کریم کی روشنی سے منور نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم سے راہ نمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آنے اور اس کے دل میں تلاش حقیقت کی سچی تڑپ ہو۔ پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن کریم سے مس نہیں ہو سکتا۔

## م س ک

الْمَسْكُ - کھال (جس میں گوشت اور ہڈیاں وغیرہ بند رہتی ہیں یا جس کی مشک وغیرہ بنائی جاتی ہے)۔ چونکہ مشک وغیرہ پانی کو روک لیتی ہے اس لئے مَسْكٌ بہر۔ اَمْسَكْ - تَمَسْكْ - اِسْتَمْسِكْ - تَمَسْكْ - مَسْكٌ کے معنی ہیں کسی کو پکڑ لینا۔ کسی چیز سے چمٹ

\* تاج و راغب - \*\* محیط و تاج -



جانبا \* - آلا مَسَاك \* - بخل کرنا \*\* - اَلْمَسْكُ \* - مَشْك \* (کیونکہ وہ اُس خون سے ترتیب پاتی ہے جو ورن کے نافہ میں رک گیا ہو)۔

سورہ بقرہ میں اَمْسَاك \* بمقابلہ تَسْرِرِ يَحْ \* آیا ہے (۲۲۹)۔ یعنی نکاح میں رکھنا۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہ اِنْفَاق \* کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۰۰)۔ سورہ فاطر (۳۵) میں یہ فَتَحْ \* (کھول دینے) کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور (۳۵) میں زَال کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور زَال کے معنی اپنی جگہ سے ہٹ جانا ہیں۔ سورہ ص (۸۹) میں مَن \* (احسان کرنے) کے مقابلہ میں اَمْسَاك \* آیا ہے۔ اس میں بھی بخل کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ سورہ تطفیف میں جنت کی ”شراب“ کے متعلق ہے خِيْتَمُهُ \* مَسْكُ \* (۸۳)۔ اس کی مہر مشک کی ہے۔

سورہ مائدہ میں شکاری جانوروں کے شکار کے سلسلے میں ہے فَكَلُوا \* مِمَّا اَمْسَكْنَا عَلَيْكُمْ \* ..... (۵)۔ ”جس شکار کو وہ تمہارے لئے ہکڑ رکھیں۔ اس میں سے کھاؤ“۔

## م س و (ی)

اَلْمَسَاءُ \* - شام کے وقت کو کہتے ہیں۔ صَبَاح \* کی ضد ہے۔ مَسَاك \* فُلَان \* وَاَمْسَى \* وَاَمْسَى \* - فلاں آدمی نے تجھ سے کسی بات کا وعدہ کیا مگر پھر اس نے اس کے پورا کرنے میں دیر لگا دی۔ مَسَاك \* اللہ بِالْخَيْرِ \*۔ خدا تمہاری شام بھلائی کے ساتھ گزارے۔ اَلْمَسْنَى \* وَالْمَسْنَى \*۔ شام کا وقت \*\*\*۔ اَمْسَى \*۔ وہ شام کے وقت میں داخل ہوا۔

ابن القوطیہ نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ \* ظہر سے مغرب تک کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں۔ محمد نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ \* کا لفظ دو وقتوں پر بولا جاتا ہے۔ ایک تو زوالِ آفتاب کے وقت پُر اور دوسرے اس وقت پُر جب آفتاب غروب ہو \*\*۔ عرب کے لوگ مَسَاءُ \* کا لفظ کنایہ تباہی اور شر کے لئے، اور صَبَاح \* کا لفظ مسرت اور خیر و برکت کے لئے بولتے ہیں \*\*۔ قرآن کریم میں ہے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حَمِیْنٌ تَمَسُّوْنَ وَحَمِیْنٌ تَصْبِحُوْنَ (۲۱) ”پس اللہ کے لئے پاکیزگی ہے جب تم شام کے وقت میں داخل ہوتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو“۔ یہ اس کا عام ترجمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات زمان (Time) کے تعینات سے بلند ہے۔ صبح، شام (یا رات دن) کے امتیازات تمہارے لئے ہیں۔ خدا کی ذات ان تعدیدات اور تعینات سے بہت بلند ہے۔

۴

## مسیح

حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا نام (۳/۳) یا لقب - تفصیل کے لئے دیکھئے  
عنوان م - من - ح - نیز عیسیٰؑ - (آپ کی زندگی کے تفصیلی حالات میری کتاب  
”شعلہ مستور“ میں ملینگے)۔

## م ش ج

مَشَجَ بَمِنْهَمَا - اس نے دونوں کو باہم دگر خلط ملط کر دیا -  
ملا دیا\* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں - شَشْنِی\*  
مَشِیجٌ وَمَشِجٌ - ملی ہوئی چیز - اسکی جمع امْشَاجٌ ہے\*۔

قرآن کریم میں ہے - اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ  
(۴/۲) - ہم نے انسان کو اس نطفہ (مادہ) سے پیدا کیا جس میں مختلف جوہر  
امکانی شکل میں (Potentialities) مخلوط ہوتے ہیں - اس سے رحم مادر میں جنین  
وجود میں آجاتا ہے - نَبْتَلِيْهِ فَنَجْعَلْ لَّهٗ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۴/۲) - پھر ہم ایسا  
انتظام کر دیتے ہیں کہ جنین کے ان مضمحل جوہروں کی نمود ہو جائے تا آنکہ  
وہ صاحب سماعت و بصیرت بن جائے۔

## م ش ی

مَشْنِی\* - پیدل چلنا - راغب نے کہا ہے کہ مَشْنِی کے معنی ایک  
مقام سے دوسرے مقام کی طرف اپنے ارادے سے منتقل ہونے کے ہیں - مجازاً  
مَشْنِی کے معنی راہ پا جانے اور رہنمائی حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں\*\* -  
الْمَاشِيَّةُ\* (جمع الْمَوَاشِي) اونٹ بکری وغیرہ چوہا یوں کو کہتے ہیں -  
تاج العروس میں ہے کہ دراصل مَشَاءٌ کے معنی کثرت اور نشو و نما کے ہیں -  
چنانچہ امْرَأَةٌ مَّاشِيَّةٌ اس ہورت کو کہتے ہیں جس کے بہت بچے ہوں\*\* -  
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) انسان وغیرہ کی حرکت -  
اور (۲) نمو اور زیادتی کے ہیں -

قرآن کریم میں قَامُوا کے مقابلہ میں مَشَوْا آیا ہے (۲/۲) - یعنی چلنا -  
سورہ اعراف میں ہے - اَلْهَمَّ اَرْجُلٌ يَمْشُوْنَ بِهَا (۱۶/۵) - کیا ان کے  
پاؤں ہیں جن کے ذریعہ وہ چل سکتے ہیں؟

\* تاج و راغب - \*\* تاج و محیط -

سورہ قلم میں **مَشَقَّاءِ بَیِّنْمِیْمٍ** آیا ہے (۱۶۱)۔ اسکے معنی ہیں وہ شخص جس پر بہت زیادہ ادھر کی ہائیں ادھر پہنچاتا رہے۔ کبھی اس کے پاس پہنچے کبھی اُس کے پاس جائے، اور اس طرح لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرے۔

## م ص ر

**الْمِصْرُ**۔ دو چیزوں کے درمیان حد کو کہتے ہیں۔ شہر کو **مِصْرُ** اس لئے کہتے ہیں کہ وہ **مَمْصُورٌ** یعنی محدود ہوتا ہے۔ اس کے گردا گرد حد بندی کی جاتی ہے۔ **مِصْرُ** کے معنی ہیں کوئی شہر یا علاقہ۔ اور **مِصْرُ**۔ ملک مصر (Egypt) کو کہتے ہیں۔ سرخ مٹی کو بھی **مِصْرُ** کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں **مِصْرُ** (بمعنی شہر) سورہ بقرہ (۱۲۱) میں آیا ہے۔ میدانوں کی بے پایاں وسعتوں کے مقابلہ میں، محدود ہستی۔

## مصیطر

اسکا مادہ ص۔ ط۔ رہے۔ اسے اُسی عنوان کے تابع دیکھئے۔

## م ض غ

**الْمُضْغَةُ**۔ گوشت کا ٹکڑا۔ (گوشت کے علاوہ دوسری چیزوں کے ٹکڑے کو بھی کہہ سکتے ہیں)۔ **مُضْغَةُ** مِیْنِ اللَّحْمِ۔ گوشت کی اتنی مقدار کو کہتے ہیں جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالی جا سکے۔ **الْمُضْغَاغُ**۔ جو چیز چبائی جائے۔ **مُضْغَتِهِ**، **بِمُضْغَتِهِ**، **مُضْغًا**۔ کسی چیز کو دانتوں سے چبانا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔

قرآن کریم میں جنین (رحم میں بچے) کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت کو **مُضْغَةُ** (۱۱۱) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ حالت جس میں جنین ایک گوشت کے لوتھڑے کے مانند ہوتا ہے (اور اس میں ہڈیوں کا ہونا سخت نہیں ہوتیں)۔

## م ض ی

**مَضْیَ الشَّقِیِّ**۔ **بِمَضْیَ**۔ کسی چیز کا (پہلے) گزر جانا اور چلے جانا۔ **مَضْیَ الْمَلِیْفِ** **مَضْیَ**۔ تلوار نے کاٹ دیا (تیز ہونے کی وجہ سے)۔

\* تاج و محیط و راغب۔

الْمَاضِي\* - شیر، کیونکہ وہ اپنی جرات کی وجہ سے آگے ہی آگے رہتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے۔ تلوار (جو تیز ہو) کیونکہ وہ جس چیز پر ماری جاتی ہے اُسے کاٹ دیتی ہے\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَتَقَدُّمُضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸)۔ اسم سابقہ کی سنت گذر چکی ہے۔ تاریخی وقائع و حوادث سے مراد ہے۔

## م ط ر

الْمُطَرُّ\* - بارش\*۔ (۱۰۴)۔ الْمُنْطَارُ\* - عذاب کی بارش کے لئے بھی بولتے ہیں\*۔ راغب نے کہا ہے کہ مُطَرَّ اس بارش کے لئے بولتے ہیں جسکے نتائج خوش گوار اور بھلے ہوں۔ اور اُمُطَرَّ اس کے لئے جو نقصان رساں ہو\*\*۔ ابن فارس کہتا ہے کہ اُمُطِيرُ (مجہول) صرف عذاب ہی کے لئے آتا ہے۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق ہے۔ وَ اُمُطِرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا (۸۶) اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی۔ مُعْطِيرُ\* بارش لانے والا۔ هَذَا عَارِضٌ مُعْطِرٌ نَا (۱۱۶)۔ یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔

## م ط ی (و)

مَطَا\*۔ مَطْوًا\*۔ اس نے چلنے میں پورا زور لگایا اور تیز چلا۔ مَطْوَاءٌ\*۔ انکڑائی۔ بیشتر بخمار کے وقت آنے والی انکڑائی کو کہتے ہیں۔ اسی سے مَطَاوَتَمْطَى کے معنی بڑھنا، لمبا ہونا، دراز ہونا، ہو گئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ چنانچہ تَمْطَى النَّهَارُ کے معنی ہیں دن نے انکڑائی لی۔ یعنی طلوع آفتاب کے بعد اس نے بڑھنا شروع کیا۔ التَّمْطِی کے معنی ہیں اکڑ کر چلنا۔ اترائے ہوئے جانا۔ چلنے میں ہاتھوں کو بڑھانا اور پھیلانا\*\*\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ الْمَطَا ہشت کو کہتے ہیں اور تَمْطَى کے معنی ہیں اپنی پیٹھ کو اونچا کرنا اور بڑھانا۔ (اکڑنے میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے)۔ قرآن کریم میں ہے۔ ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهِ يَتَمَطَّى (۵۵)۔ ”وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اتراتا ہوا گیا“۔

## مع

مَعَ\*۔ ساتھ۔ یہ افطی و معنوی دونوں معیتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ جسمانی معیت کے لئے قرآن کریم میں ہے۔ دَخَلَ مَعَهُ السَّجْنُ فَنُتِیْنِ (۱۲)۔ ”اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے“۔ اور معنوی معیت

کے لئے - وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۶۶) - ”اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے“ -  
 اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ اور صابرین کسی مقام پر (ایک جگہ) اکٹھے  
 ہو جاتے ہیں - یا اللہ صابرین کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے - اس سے مقصود  
 صرف یہ ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت صابرین کے ساتھ ہوتی ہے -  
 کبھی یہ عیند - یعنی ”ہامس“ کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسا کہ  
 کہتے ہیں - جِئْتُ مِّنْ مَّعِ الثَّوْمِ - میں قوم کے ہامس سے آیا

## م ع ز

مَعَزٌ (جمع - واحد مَاعِزٌ) بکری\* - (۱۶۴/۱) - گٹھیلے بدن والے قوی  
 آدمی کو بھی الْمَاعِزُ کہتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی  
 معنی کسی چیز میں شدت اور صلابت کے ہیں - اور بکری کو الْمَعَزُ اس لئے  
 کہتے ہیں کہ ضَبَّانٌ (بھیڑ) کے مقابلہ میں اس میں ایک طرح کی سختی  
 ہوتی ہے -

## م ع ن

الْمَعْنُ - معمولی اور حقیر چیز - ایک طرف بہہ نصیر اور قلیل کے لئے  
 استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف ، طویل اور کثیر کو بھی کہتے ہیں -  
 زمین کے اوپر بہنے والا ہاتی - الْمَاعُونُ - ہر بھلائی - ہارش - کیونکہ وہ  
 خدا کی طرف سے بلا مشقت مل جاتی ہے - ہاتی - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا  
 جائے - ہر وہ چیز جو یونہی بلا مشقت مل جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے -  
 وہ چیزیں جو مسانگنے والوں سے روکی نہ جائیں - سامانِ نشو و نما - مَعْنُ  
 الْفَرَسُ - گھوڑا دوڑنے ہوئے دور نکل گیا - مَعْنُ الْمَاءِ - ہاتی بہا -  
 مَعْنُ النَّبْتِ - ہودے ہاتی سے میراب ہو گئے - مَعْنُ - جاری ہاتی جو  
 کھلا ہوا یہ رہا ہو\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز  
 کے بہنے یا چلنے وغیرہ میں سہولت کے ہیں - یعنی آسانی سے کسی کام کا ہو جانا -  
 قرآن کریم میں ہے - ذَاتَ قَرَارٍ وَ مَعْنٍ (۲۳/۵) - ایسی سر زمین  
 جو ہموار ہو اور اس میں ہاتی جاری ہو - سورۃ ماہون میں ہے وَ يَمْنَعُونَ  
 الْمَاعُونَ (۱/۱) - وہ ان چیزوں کو روک رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے  
 منفعتِ عامہ کے لئے ملی ہیں - یعنی سامانِ نشو و نما جسے بہنے ہاتی کی طرح  
 عام ہونا چاہئے\*\*\* - جسے آبِ رواں کی طرح ہر ضرورت مند کے دروازے کے سامنے  
 سے گزرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لے -

بعض نے کہا ہے کہہ مَعِيْنٌ عَيْنٌ سے ہے \*۔ اسی لئے اسے مَعِيْنٌ (ع۔ ی۔ ن) کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے۔ وہاں بھی دیکھ لینا چاہئے۔

## م ع ی

الْمَعْيُ - الْمَعْيُ - اَنْتَ - (جمع اَمْعَاءُ) - اَلْمَاعِيَّةُ - ٹکڑے ٹکڑے کاٹی ہوئی چیز - تَمَعْيُ الْقَشْرِ فَيَسْمَا بَيْنَهُمُ - شر اُن کے درمیان پھیل گیا \*\*۔ قرآن کریم میں جہنم کے گرم پانی کے متعلق ہے کہ وہ حیات بخش ہونے کی بجائے ہلاکت آفریں ہوگا۔ فَقَطَّعَ اَمْعَاءَهُمْ (۳۵)۔ اور اُن کی انتہریاں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا۔ ان کی حیاتِ انسانی منقطع ہو جائیگی۔ یا زندگی بخش ذرائع ختم ہو جائیں گے۔ سامان و ذرائع نشوونما سے محرومی ہو جائیگی۔ (غذا کو جزو بدن بنانے کا بڑا ذریعہ انتہریاں ہوتی ہیں)۔

## م ق ت

الْمَقْتُ - سخت بغض اُس شخص کے خلاف جسے تم دیکھو۔ وہ کہہ وہ برے کام کا خوگر ہو گیا \*۔ نِكَاحُ الْمَقْتِ - باپ کے مر جانے پر اسکی مذکورہ سے نکاح کر لینا، جاہلیت میں عربوں میں ایسے نکاح ہوتے رہتے تھے \*\*\*۔ قرآن کریم نے اسکی سخت ممانعت کی ہے (۳۴)۔ ویسے عام نفرت اور بیزاری کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لَمَقْتُ اللّٰهَ اَكْبَرُ مِّنْ مَّقْتِيكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۳۶)۔ اللہ کی بیزاری تمہاری اپنی بیزاری سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن مَقْتُ اللّٰه کے معنی ہونگے انسان کے برے اعمال کے ناخوش گوار نتائج جو قانون خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُولُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۱۱)۔ ”اللہ کے نزدیک یہ نہایت ناہمندیدہ بات ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو کچھ کرتے نہیں ہو“۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوانات غ۔ ض۔ ب اور ص۔ خ۔ ط وغیرہ)۔

## م ک ث

الْمَكْتُ - کسی جگہ پر انتظار کے ساتھ جم کر رہنا۔ اَلْمَاكِثُ - کسی جگہ انتظار میں ٹھہرنے والا۔ اَلْمُتَمَكِّثُ - منتظر۔ اَلْمَكَثُ - دیر کرنا۔ ٹھہرنا۔ انتظار کرنا۔ اَلْمَكْثُ - کسی کے انتظار میں ٹھہرے رہنا \*\*\*\*۔

\* راغب - \*\* تاج و محیط - \*\*\* تاج - \*\*\*\* تاج و محیط و راغب -

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم بقا چاہتے ہو۔ تمہاری آرزو یہ ہے کہ جریدہ عالم ہر تمہارا دوام ثبت ہو جائے۔ تم زندہ جاوید ہو جاؤ۔ تمہارے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں۔ تو اس کے لئے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو کہ مَا يَنْفَعُ النَّفْسَ فَيَمُوتُ فِيهَا لَا رُضٍ (۱۳۱)۔ جو چیز تمام نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہوگی وہی دنیا میں باقی رہے گی۔ طبعی دنیا میں بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قانون کارفرما ہے۔ لیکن دنیائے انسانیت میں ”بقائے نافع“ کا قانون نفاذ پذیر ہے۔ لہذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔ جس سے ربوبیت عامہ ہو جائے۔ اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں۔ یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظام ربوبیت کا مطلوب ہے۔ کیونکہ اس کا خدا ”رب العالمین“ ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ قُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِيُنْذِرَ آهَ عَلَى النَّفْسِ عَلَىٰ مَكْثٍ وَ نَذَرْنَا لَهُ تُنْزِيلًا (۱۶۶)۔ قرآن کریم کو ہم نے بتدریج نازل کیا ہے۔ اور اس کے مضامین کو الکی الکی بیان کیا ہے تاکہ تو اسے اسی طرح سے، ٹھہر ٹھہر کر، بتدریج لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ سورۃ نسل میں ہے۔ فَمَكْثَ غَيْرَ بَعِيدٍ (۲۴)۔ وہ تھوڑا عرصہ ٹھہرا۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا اُمْكُثُوا (۲۸)۔ تم یہاں ٹھہرو۔

## م ک ر

الْمَكْرُ - خفیہ تدبیر۔ چنانچہ جب غلہ کو گھروں میں چھپا کر رکھ لیا جائے (احتکار) تو اسے بھی الْمَكْرُ کہتے ہیں۔ جنگ کی تدبیر اور حیلہ کو بھی الْمَكْرُ کہتے ہیں\*۔

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ مَكْرُ اس خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اس شخص کو جس کے خلاف یہ تدبیر کی جائے اس مقام تک پہنچا دے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو\*\*۔

قرآن کریم میں، نظام خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی سازشوں کو مَكْرُ کہا گیا ہے۔ اور جماعتِ مومنین کی طرف سے ان کے جواب یا خدا

کے قانون مکافات کی رو سے ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو بھی متکثر<sup>۱</sup> ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وَ يَمُنُّكِرُوْنَ وَ يَمُنُّكِرُ اللّٰهُ - وَ اللّٰهُ خَتِيْرُ الْمَآكِرِ يَنْ (۲۸)۔ وہ تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے اور خدا (کا قانون) ان کے خلاف تدبیریں کر رہا تھا۔ خدا کی تدبیریں بہترین ہوتی ہیں۔ بڑی مؤثر اور کارگر۔

## م ک ک

مَكَّةُ الْعَظْمَىٰ - اس نے ہڈی کو اس طرح چوس لیا کہ اس کا گودا سب صاف کر دیا\*۔ (ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔) مَكَّةُ الْفَصِيْلُ مَآفِي ضَرْعِ اُمِّيہ - اونٹنی کے بچے نے وہ تمام دودھ چوس لیا جو اس کی ماں کے تھن میں تھا۔ مَكَّةُ - اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ کم کر دیا\*۔

مَكَّةُ - یعقوب نے کہا ہے کہ مَكَّةُ پورے حرم کو کہتے ہیں۔ اور مَكَّةُ شہر مکہ کو کہتے ہیں۔ مَكَّةُ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ مثلاً (۱) اسے اس لئے مَكَّةُ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو کم کر دیتا یا فنا کر دیتا ہے۔ (۲) چونکہ اس شہر میں پانی بہت کم تھا اس لئے یہاں کے باشندے یہاں کا پانی گویا چوس ڈالتے تھے یا سب کا سب نکال لیتے تھے۔ (۳) مَكَّةُ کے معنی جذب کرنے اور کھینچنے کے بھی آئے ہیں۔ یہ شہر چونکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا اور جذب کرتا ہے اس لئے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں۔ (۴) مَكَّةُ کی طرح مَكَّةُ بھی اڑدھام کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس شہر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اس لئے اسے مَكَّةُ یا مَكَّةُ کہتے ہیں۔ (۵) مَكَاكُ اور مَكَاكُ - ہڈی سے نکالے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں\* جو ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز ہے اس لئے اسے مَكَّةُ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں مَكَّةُ اس شہر کے لئے آیا ہے جس میں مسجد حرام ہے۔ (۲۸) - اسی کو مَكَّةُ بھی کہا گیا ہے (۳۵) - [دیکھئے عنوان ب۔ ک۔ ک۔]

## مَكَّةُ

مکہ معظمہ - (دیکھئے عنوان م۔ ک۔ ک۔ اور ب۔ ک۔ ک۔)



## م ک ن

الْمَكِينَةُ - تمکن و اقتدار کو اور الْمُكْنَسَةُ - قدرت و استطاعت کو کہتے ہیں۔ الْمَكَانَةُ - وقار اور سکون کو کہتے ہیں، اور الْمَكَانُ اس جگہ کو جو کسی چیز کو محیط اور اس پر حاوی ہو\*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ الْمُكْنَسَاتُ پرندوں کے گھونسلوں کو کہتے ہیں۔ [بعض کے نزدیک مَكَانُ کا مادہ (ک - و - ن) ہے]۔ نیز اس کے معنی سمت اور جہت کے بھی آتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَ يَسَّأَلُ تَبَاهُ الْمَوْتُ مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۳۳)۔ ہر سمت سے اس کی طرف موت آ رہی ہوگی۔ (یہ مَكَانُ ک - و - ن سے ہے)۔

سورة نساء میں ہے زَوْجِ مَكَانٍ زَوْجِ (۴۰) ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی۔ سورة یونس میں مَكَانُكُمْ (۱۸)۔ اپنی جگہ پر ٹھہرنے کے لئے آیا ہے۔

مَكْنُ الشَّقِيئِ - چیز قوی اور مضبوط ہو گئی۔ راسخ ہو گئی۔ اپنی جگہ پر جم گئی۔ اَمْكَنَ فُلَانًا اَلَا مَرٌّ - فلاں آدمی کے لئے وہ کام آسان اور سہل ہو گیا۔ ایسے اس پر قدرت حاصل ہو گئی۔ تَمْكِنُ مِّنْ اَلَا مَرٍّ - وہ اس پر قادر اور کامیاب ہو گیا\*۔

اس اعتبار سے مکان کے معنی قدر و منزلت اور رتبہ اور درجہ کے آتے ہیں۔ وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۲۲)۔ اور ہم نے اسے بلند مرتبہ عطا کیا۔ استطاعت اور قدرت کے معنوں میں سورة انعام میں ہے۔ اَعْمَلُوا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ (۱۶۴)۔ تم اپنی استطاعت بھر، اپنی پوری پوری طاقت کے مطابق، جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے پروگرام کے مطابق کرو۔ سورة یس میں ہے۔ لَتَمَسَّخَنَّهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ (۶۱)۔ ہم ان کی طاقت اور قدرت کے باوجود انہیں مٹا ڈالیں۔ ان کی قوت و قدرت کو کمزور و ناتواں بنا دیں۔ مَكِينٌ - زبردست قدرت اور منزلت والا۔ جو اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم کر بیٹھ جائے۔ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٌ (۸۱)۔ صاحب عرش کے نزدیک قدر و منزلت والا۔ مَكْنٌ - جما دینا۔ مضبوط بنا دینا۔ قرار گیر بنا دینا۔ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دَرَجَاتٍ (۲۵)۔ وہ ان کے دین کو ان کے لئے قائم اور مضبوط کر دیگا۔ جو نظام زندگی ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے اسے متمکن فی الارض کر دیگا۔ نیز اس کے معنی حکومت عطا کرنا بھی ہیں۔ كَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ (۱۵)۔ اس طرح ہم نے یوسف کو اس

ملک میں حکمرانی عطا کر دی۔ اسے صاحب اختیارات بنا دیا۔ اَمْكُنْتَهُ  
مِنْ الشَّيْءِ۔ اسے کسی چیز پر غلبہ اور قابو دے دیا۔ سورہ انفال میں ہے۔  
فَاَمْكُنْ مِنْهُمْ (۱/۲۱)۔ سو اللہ نے ان پر قابو پا لیا۔

قرآن کریم نے اپنی صداقت کے ہر کھنہ کے لئے تین معیار بتائے ہیں۔  
پہا تو اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ پہا تاریخی شواہد سے  
دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔  
اور یا استنتاجی طریق (Pragmatic test) کے ذریعے اسکی صداقت کو پہچانو (۱/۲۱)۔  
استنتاجی طریق کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا  
کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا  
نہیں۔ اسے اپنے دعویٰ کی صداقت پر اسقدر محکم یقین ہے کہ وہ اس استنتاجی  
طریق پر بڑا زور دیتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اپنے مخالفین سے بار بار  
کہتے ہیں کہ اَعْمَلُوا عَمَلِي سَكَانَتِكُمْ۔ تم اپنی طاقت اور  
استطاعت کے مطابق اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔  
اِنِّیْ عَمِلْتُ۔ میں اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ فَسَوَوْفَ  
تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهُ عَاقِبَةُ الْقَادِرِ (۱/۲۱)۔ عنقریب (نتائج سے)  
معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار اس گھر (دنیا) کی کامیابی و کامرانی کس کے  
حصہ میں آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّهٗ لَا یَفْلِحُ  
الظَّالِمُوْنَ (۱/۲۱)۔ تم دیکھ لو گے کہ خدا کا یہ قانون کسقدر سچا ہے کہ  
جو قوم نوع انسانی کے حقوق میں کمی کرتی ہے اور خدا کے قوانین سے سرکشی  
برتنی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسلام کو سچا ثابت کرنے کا  
یہ طریقہ تھا۔ یعنی اس کے عملی نظام کے نتائج سے دنیا پر واضح کر دینا  
کہ یہ نظام کس طرح بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہ تھا اسلام کا دعویٰ۔ اور اب  
حالت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے نظری دلائل سے کچھ متاثر بھی ہوئے  
ہیں وہ مسلمانوں کی عملی حالت دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ جس  
”مذہب“ پر چلنے والوں کی یہ حالت ہو وہ کس طرح نوع انسانی کی فلاح  
و فوز کا ضامن بن سکتا ہے؟ اور اس پر بھی جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ  
تم جس ”مذہب“ پر چل رہے ہو یہ خدا کا وہ دین نہیں جو اس نے رسول اللہؐ  
کی وساطت سے بھیجا تھا تو انہیں اسقدر غصہ آجاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے  
پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اعمال کو ان کے نتائج سے  
ہر کھنہ کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اب ان کے پاس کوئی  
کسوٹی ہی نہیں جس سے اس کا فیصلہ کیا جاسکے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ

ٹھیک ہے یا غلط - اسکی کسوٹی صرف ایک ہے - اور وہ یہ کہ اعمال کے جو نتائج قرآن کریم نے بتائے ہیں، اگر ہمارے اعمال سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام پا رہے ہیں - اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے، تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام نہیں پا رہے - یہ ٹھیک ہے کہ بعض اعمال کے نتائج مرنے کے بعد مرتب ہونگے لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام اعمال کے نتائج مرنے کے بعد ہی مرتب ہونگے اور اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آئیگا - قرآن کریم کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور یہی وہ نتائج ہیں جن سے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے - اس دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے اور قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی -

## م ک و

مَكَا - يَمْكُتُوْ - مَكَا۟ءٌ - سیٹی بجانا \* - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہاتھوں کو ایک خاص ہیئت سے اکھٹا کر کے سیٹی کی آواز نکالنے کو کہتے ہیں - راغب نے مَكَا الطَّقِيْرُ کے معنی پرندہ کے سیٹی جیسی آواز نکالنے کے لکھے ہیں \*\* - اَلْمَكَا۟ءُ - ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو باغات میں رہتا ہے \* - (اس کا یہ نام اس لئے پڑا ہے کہ اسکی آواز سیٹی کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے) - قرآن کریم میں عہد جاہلیہ کے عربوں کے متعلق ہے - مَكَائِنَ صَلَاتِهِمْ عِندَ الْبَيْتِ اِلَّا مَكَا۟ءَ وَتَصَدَّقُوْا (۱۸۸) - خانہ کعبہ کے قریب ان کی صلوٰۃ پر معنی آوازوں اور بے مطلب حرکتوں کے سوا کچھ نہیں - یعنی ایسی نماز جس میں محض چند الفاظ (بلا سمجھے) دھرا لئے جائیں اور چند حرکات ادا کر دی جائیں - سوچئے کہ کیا آج ہماری نمازیں بھی بالعموم یہی کچھ بن کر نہیں رہ گئیں؟ چند الفاظ کا دھرانا جنکا مفہوم نہ سمجھا جائے - اور چند حرکات جن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے - حالانکہ قرآن کریم نے جس صلوٰۃ کا حکم دیا تھا وہ قلب و دماغ کی تطہیر اور معاشرہ میں صالح انقلاب لانے کا ذریعہ تھی - اس میں ہر شخص کو معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں - کیوں ایسا کر رہا ہوں - اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا - دین (نظام خداوندی) کے پروگرام کی ہر کڑی ایک غایت لئے ہوتی ہے اور انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے - لیکن جب دین کا مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کے پروگرام کی یہ

حیات پھنسی کڑیاں، محض رسم بنکر رہ جاتی ہیں جن کی ادائیگی مقصود بالذات سمجھ لی جاتی ہے۔ اس مقام پر دین، ”مذہب“ بنکر رہ جاتا ہے۔

## م ل آ

مَلَا الشَّيْءَ يَمْلَأُهُ مَلَأٌ - کسی چیز کو بھر دیا۔ فَمَا مَسَّلَا - پس وہ بھر گئی۔ لَا مَسْلَمَتَيْنِ جَهَنَّمِ (۱۸) - میں ضرور جہنم کو بھر دوں گا۔ مِلْءٌ - وہ مقدار جس سے کوئی چیز بھر جائے\*۔ مِلْءٌ الْاَرْضِ ذَهَبًا (۳۶) - زمین بھر سونا۔ مَالِثُونَ - بھرنے والے (۳۶)۔

أَلْمَلَأَ - باہم مشورہ کرنا۔ نیز جماعت۔ جتھا۔ قوم کے سردار و شرفاء۔ رؤساء و امراء و اکابر وغیرہ\*۔ أَلْمَسَلَا الْعَالِ (۳۸) - بڑے بڑے سردار۔ بالاتر گروہ کے افراد۔ لیڈر قسم کے لوگ۔ دوسری جگہ نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ أَلْمَسَلَا الْعَالِ کی باتیں نہیں سن سکتے (۳۸)۔ یہاں اس سے مراد ہے عالم بالا کی بلند جماعتیں۔ یعنی خدا کے عالم امر کے متعلقین۔ مدبران امور السیہ۔ المیتلاء والمستلاء\*۔ مال دار لوگ۔ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں۔ جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں\*۔ قرآن کریم میں أَلْمَسَلَا بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ أَتَرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲۳)۔ جنہیں سامان زبست کی فراوانیاں حاصل تھیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جس قوم میں بھی کوئی رسول آیا سب سے پہلے اس قوم کے دولت مند طبقہ نے اس کی مخالفت کی۔ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (۳۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ایسا پیغام لاتے تھے جس کی سب سے بڑی زد دولت مند طبقہ پر پڑتی تھی۔ اسی لئے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے پیغام کی مخالفت کرتے تھے۔ اگر محض ”ہوجا پاٹ“ کا سوال ہوتا تو دولت مندوں کا اس سے کیا پگڑتا تھا جو وہ اس کی مخالفت کرتے۔ دولت مند تو بلکہ ایسے کاموں میں بیش از بیش حصہ لیتے ہیں اور چندے دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی تصریحات اس پر شاہد ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ جس انقلاب آفریں پروگرام کو لیے کر آئے تھے اس میں رزق کے سرچشمے دولت مندوں کے عاتھوں سے چھن

کر خدا کے قانونِ ربوبیت کے ہاتھوں میں آجائے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ یہ طبقہ ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ آج بھی جہاں قرآنی انقلاب کی آواز اٹھیکی سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا اور مذہبی پیشوائیت اس مخالفت میں ان کے ساتھ ہوگی۔  
(نیز دیکھئے عنوان ت - ر - ف)۔

## م ل ح

الْمِلْحُ\* - نمک - سخت نمکین (کڑوا) پانی جو شیریں پانی کی ضد ہوتا ہے۔ اَلْمِلْحَاحُ\* - نمک فروخت کرنے والا - کشتی چلانے والا کیونکہ وہ ہمیشہ شور پانی میں رہتا ہے۔ عرب، نمک کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس لئے ذمہ داری اور پاس خاطر کے لئے بھی اَلْمِلْحُحُ\* کا لفظ بولتے تھے، اور حسن لطیف کے لئے بھی\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سفید ہونے کے ہیں اور نمک کو مِلْحُحُ\* اس کے سفید ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔  
قرآن کریم میں کڑوے، سخت نمکین پانی کے لئے مِلْحُحُ\* کا لفظ آیا ہے۔  
هَذَا مِلْحُحُ\* اُجَنَاجُ\* (۲۵/۲) - وہ بہت سخت کھاری ہے۔

## م ل ق

مَلَقَ - يَمْلِيقُ\* - مٹا دیا - نرم کیا - اَلْمَلَقُ\* - اس لکڑی کے تختے کو کہتے ہیں جس سے ہل چلائی ہوئی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے۔ مَلَقَ اَلْاَرْضَ رِضًا تَمْلِيْقًا - لکڑی کے تختے سے زمین کو ہموار کرنا - اسی سے، کسی شخص کو ہموار (یا خوش) کرنے کے لئے جو چاہلوسی کی جاتی ہے اسے بھی تَمْلِيقُ\* و مَلَقَ\* کہتے ہیں۔ اَلْمَلَقُ\* کے معنی ہیں چکنا اور ہموار ہونا۔ اَلْمَلَقَةُ\* - چکنے پتھر کو کہتے ہیں\*\*۔ اَلْمَلِيقُ\* - ضعیف اور کمزور کو کہتے ہیں جسے حوادثِ زمانہ نے رگید کر نرم و خوار کر دیا ہو۔ اور اَلْمَمْلِيقُ\* اس شخص کو جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اَمْلَقَ مَاتَعَهُ\* - جو کچھ اس کے پاس تھا اسے خرچ کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ روکا۔ اُحٰی سے رَجُلٌ\* اَمْلَقٌ مِّنَ الْمَالِ - اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ مال و دولت نہ رہے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی چیز سے عاری ہونے اور کسی چیز کے نرم ہونے کے ہیں۔ اَمْلَقٌ\* - مفلسی۔

\*ناج - \*\*ناج و محیط -

قرآن کریم میں ہے کہ لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ أَمْسَلَقٍ۔ (۱۵۴)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے۔ یعنی اس خدشہ سے کہ تم اس سے مفلس ہو جاؤ گے (۱۵۴)۔ سارے ڈالو یا علم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔ یاد رکھو قرآنی نظام میں یہ ذمہ داری نظام کی ہوگی کہ تمہارے رزق کا بھی کفیل ہو اور تمہاری اولاد کے رزق کا بھی۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۱۵۴)۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) بھی۔“ خدا کی اس قسم کی ذمہ داریاں، اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔

## م ل ک

مِلْكٌ - قوت رکھنا۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا \*۔ اختیار و ارادہ۔ اتھارٹی۔ (Authority)۔ بنیاد محکم۔ وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو \*\*۔ اسی لئے ہانی اور غذا نیز دیگر اسباب و ذرائع کو بھی مِلْكٌ کہا جاتا ہے۔ عرب، لیبی، فی النواذری، مِلْكٌ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وادی میں چراگاہ، ہانی، مویشی، سب موجود ہیں۔ چونکہ صحرا میں زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہانی ہوتا ہے اس لئے ہانی کو مِلْكٌ کہتے ہیں۔ لَيْسَ لَهُمْ مِلْكٌ کے معنی ہیں ان کے پاس ہانی نہیں۔ ان کے ہاں معاورہ ہے الْعَمَاءُ مِلْكٌ أَمْرُهُ۔ ہانی ہر معاملہ کو درست کر دیتا ہے۔ یعنی جس کے پاس ہانی ہو وہ اپنے معاملات میں آزاد ہوتا ہے اور اس کے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں \*\*\*۔

جس ذریعے (یا چیز) سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسے مِلَاكٌ اَلَا مَرٌ کہتے ہیں۔ اسی لئے مِلَاكٌ گارے کو بھی کہتے ہیں \*\*\*۔ (کیونکہ اس سے پتھروں کو جوڑنے اور درست کرنے میں تاکہ حوض یا تالاب کا ہانی ضائع نہ ہونے پائے)۔

مِلْكٌ الْعَجِيْنُ بِمِلْكِهِ۔ آئے کر چھٹی طرح گوندھنے کو کہتے ہیں جس سے اس کے سب اجزاء یکساں ہو جائیں \*\*\*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ (م۔ ل۔ ک) کا خاصہ قوت اور شدت ہے \*\*\*\*۔ مِلْكٌ الطَّيْرِ بَقِي (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ)۔ راستہ کی حد، نیز راستے کے درسیانی یا بڑے اور واضح حصے کو کہتے ہیں \*\*\*۔ مِلْكُوْتٌ۔

عزت و اقتدار - حکومت و سلطنت - نیز ملکِ عظیم کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مملکت کے لئے مخصوص ہے\*۔ اس لئے کہ کائنات میں تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہے۔ وہی اسکی بنیاد اور سہارا، اور اسکی تمام کار فرمائیوں کا مالک ہے۔

مَالِیک کے معنی ہیں صاحب اختیار و اقتدار۔ سورہ نحل میں لَا یَمْلِکُ کی تفسیر لَا یَسْتَطِیعُوْنَ (۱۱۱) نے کر دی ہے۔ اسی طرح مَمْلُوک کی تشریح لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ (۱۱۱) نے کر دی۔ یعنی جسے کسی چیز پر کوئی اختیار نہ ہو۔ اور سورہ یس میں فَهُمْ لَهَا مَالِکُوْنَ کے بعد وَذَٰلَٰلِہَا (۳۶) نے واضح کر دیا کہ مَالِیک وہ ہے جس کے تابع دوسرا ہو جائے۔ سورہ بقرہ میں (حضرت طہالوت کے تذکرہ کے ضمن میں) جہاں بنی اسرائیل نے کہا ہے کہ وَابْعَثْ لَنَا مَلِیکًا (۲۴۶)۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے (نَقَاتِلْ فِیْ سَبِیلِ اللّٰہِ) تاکہ ہم اس کی زیر کمان خدا کی راہ میں جنگ کریں۔ کمانڈر، صاحبِ اقتدار ہی کو کہتے ہیں۔ اس سے متصل آیت (۲۴۶) میں بھی مَلِک کے معنی اقتدار و اختیار (Authority) کے ہیں۔ اسی طرح مَا أَخْلَقْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلٰٓئِکِنَا (۲۸) کے معنی ہیں ”ہم نے جو وعدہ تیرے ساتھ کیا تھا اسکی خلاف ورزی اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کی“\*۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ خدا کے مَالِیک ہونے میں جہاں اس کے کامل اختیار و اقتدار کا تصور ہے اسکے ساتھ ہی یہ تصور بھی ہے کہ اسکی یہ مالکیت استبداد کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور درستگی کے لئے ہے تاکہ اس کا نظم و نسق ٹھیک ٹھیک قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا رہے اور ہر شے کو اسکی زندگی کی بنیادی ضروریات بہم پہنچتی رہیں۔

قرآنِ کریم میں ایک اصطلاح آتی ہے۔ مَمْلَکَتٌ اٰیْمَانُکُمْ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہوئے“۔ یہ اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً۔

(۱) ان لوگوں کے لئے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں۔ (Subordinates)۔ جو کسی کی اسکیم کو پروئے کار لانے کے لئے اس کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ گھر کے ملازم وغیرہ بھی اسی ضمن میں آجائے ہیں۔ (دیکھئے) (۳۰/۲۸)؛ (۲۲/۵۸)؛ (۲۲/۳۱)؛ (۱۱/۲۱)؛ (۲۲/۳۱)۔

(۲) اُن عورتوں کے لئے جو نکاح میں آچکی ہوں (۳۳/۵۲)۔ اسی طرح سورہ نساء میں جہاں مجرمات کی فہرست کے بعد کہا ہے کہ وَالْمُحْصَنَاتُ مِّنَ الْيَتَامَىٰ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴/۳۶)۔ تو اس میں اگر مُحْصَنَاتُ کے معنی ”پاک دامن عورتیں“ لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ہر تمام پاک دامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں آجائیں۔ اور اگر ”مُحْصَنَاتُ“ کے معنی شوہر دار عورتیں ہوں (دیکھئے عنوان ح۔ ص۔ ن) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ہر تمام شوہر دار عورتیں حرام ہیں بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے ہاں آچکی ہوں اگرچہ ان کے پہلے شوہر کہیں موجود ہوں۔ (دیکھئے شق نمبر ۳)۔

لیکن سورہ مستحجنہ میں ہے کہ اگر کفار مکہ کی مومن عورتیں تمہاری طرف آجائیں تو انہیں ان کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ۔ صرف ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں دیدو اور ان سے نکاح کر لو۔ (۱/۲۱) یہ وہ ”شوہر دار عورتیں“ ہیں جن سے (اُن کے شوہروں کے ہوتے ہوئے) نکاح کی اجازت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے (۴/۳۶) میں إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ سے مراد یہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے اس طرح نکاح کیا گیا تھا۔

(۳) مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ لونڈیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (مثلاً ۲۳/۵۲ : ۲۴/۵۲)۔ لونڈیوں کے ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کا رواج عام تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ لونڈیاں جو ان کے معاشرہ کے رواج کے مطابق ان کے گھروں میں موجود تھیں اسی طرح ان کے گھروں میں رہیں۔ اگر ان لونڈیوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا تو اس سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتیں۔ اس لئے انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا گیا۔ قرآن کریم نے ان لونڈیوں کے لئے بھی مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدی ہوتے تھے۔ سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم آگیا کہ انہیں احساناً یا فدیہ لیکر رہا کرنا ہوگا (۲۳/۵۲)۔ اس حکم کے بعد جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو گیا اور اس طرح اسلام نے غلامی کے دروازے کو یکسر مسدود کر دیا۔ کسی انسان کو خرید کر غلام بنا لینے کا تصور ہی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے جو شرف و تکریم آدمیت کا علمبردار (۱۱۱/۱) ہے اور جو کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے (۳۱/۸)۔



ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مَسَامَلَتْکُمْ انْیَمَانُکُمْ کے الفاظ لونڈیوں کے لئے آئے ہیں وہ انہی لونڈیوں کے لئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ ان لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا لیا گیا، اور نئی لونڈیاں بنانے کا سلسلہ از روئے قرآن ختم ہو گیا۔ لہذا اب مسلمانوں کے ہاں لونڈیوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اب جو لوگ مَسَامَلَتْکُمْ انْیَمَانُکُمْ سے لونڈیوں کے جواز کی سند لاتے ہیں وہ قرآن کریم پر ظلم کرتے ہیں۔ اب قرآن کریم میں مَسَامَلَتْکُمْ انْیَمَانُکُمْ سے متعلق ہدایات کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم حلقہ اسلام میں داخل ہو جس کے ہاں لونڈیاں موجود ہوں تو قرآن کریم کی یہ ہدایات ان کے لئے خضر راہ بنیگی۔

(مَسَامَلَتْکُمْ انْیَمَانُکُمْ کے ضمن میں ی۔ م۔ ن۔ کا عنوان

بھی دیکھئے)

[مَسَامَلَتْکُمْ کے لئے دیکھئے عنوان ا۔ ل۔ ک]

## م ل ل

اُمِّلْتُ الذِّکْرَ عَلٰی الْکَافِیِّب۔ میں نے کاتب کو کتاب املا کرانی۔ لکھائی\*۔ اس معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۲۸۴) میں آیا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ مِلَّةٌ کی اصل اسی سے ہے\*\*۔ اس صورت میں مِلَّةٌ کے معنی ہونگے لکھا ہوا قانون۔

طَرِیْقٌ مِّلِیْلٌ۔ اُس واضح راستے کو کہتے ہیں جس پر بہکثرت آمد و رفت ہوتی ہو۔ اس اعتبار سے مِلَّةٌ کے معنی طریقہ اور راستہ کے ہونگے۔ ان معانی کو ابواسحاق نے لکھا ہے۔ اور اساس میں بھی اس کی تائید آئی ہے۔ یہیں سے مِلَّةٌ کا لفظ نکالا گیا ہے جس کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے کیونکہ اس جگہ پر آمد و رفت کی کثرت سے راستہ کے نشان بڑ جاتے ہیں۔ نیز اَلْحَمَلَةُ۔ گرم ریت کو بھی کہتے ہیں جس میں روٹی پکائی جاتی ہے\*\*\*۔ مناوی نے لکھا ہے کہ مَلَالٌ اس تکان اور دل برداشتگی کو کہتے ہیں جو کسی کام کو مسلسل کرنے سے پیدا ہو جائے\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکتا جانے اور تھک جانے کے ہیں۔ قرآن کریم میں مِلَّةٌ کا لفظ مشرب و مسلک اور دینی طریقہ کے لئے آیا ہے۔ حَتَّى تَشْبِعَ مِلَّتَهُمْ (۱۲۰)۔ تا آنکہ تو ان کے طریقے (یاد دین) کی پیروی کرنے لگے۔ اسلام کو مِلَّةٌ اِبْرَہِیْمَ (۱۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا۔

## م ل و (ی)

امْتَلَأَ کے معنی بڑھانے (ڈھیلا چھوڑنے اور مہلت دینے) کے آتے ہیں۔  
 اس لئے مدت طویلہ کو مِتْلَاوَةٌ مِّنَ الدَّهْرِ وَ مِتْلَى مِّنَ الدَّهْرِ کہتے ہیں\*۔ اَمْتَلَى۔ زمانہ کی طویل مدت\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَ اَهْجُرْ نِیْ مِتْلَیًّا (۲۹)۔ تو ایک طویل مدت تک مجھ سے الگ ہو جا۔ اَمْتَلَيْتُ التَّبَعِیْرَ۔ میں نے اونٹ کی پیکڑی میں (جس سے وہ بندھا تھا) کشادگی پیدا کر دی۔ یعنی اسے ڈھیلا کر دیا\*\*۔ اس سے یہ لفظ مہلت دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔  
 ومعنی کے معنوں میں سورۃ محمد میں شیطان کے متعلق ہے وَ اَمْلِیْ لَہُمْ (۲۵)۔ وہ ان سے لمبے لمبے وعدے کرتا رہتا ہے۔ بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں بندھاتا رہتا ہے۔ مہلت کے معنوں میں سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ اَمْلِیْ لَہُمْ (۱۸۳) میں انہیں مہلت دیتا ہوں۔

اَمْتَلَيْتُ الْكِتَابَ۔ میں نے کتاب کو لکھوایا۔ املاً کروایا۔ یہ اصل میں اَمْتَلَيْتُ ہے\*۔ سورۃ بقرہ میں ہے فَتَلِيْمَلِیْلٌ (۲۸۴)۔ چاہئے کہ وہ لکھوائے۔ سورۃ فرقان میں ہے فَہِیْ تَمْلِیْ عَلَیْہِ (۲۵)۔ (اس کے لئے م۔ ل۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

## مہا

دیکھئے عنوان مین اور عنوان مہا۔ (مین + مہا = مہما) کبھی اس کے آخر کا الف حذف ہو جاتا ہے اور بہ مہم رہ جاتا ہے۔

## مَن

مَن\*۔ جو۔ جس۔ جو کوئی۔ وَ لَہُ مَنٌ فِی السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ (۲۹)۔ جو کوئی (ہا جو کچھ) کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔

(۲) استہامیہ معنوں میں۔ یعنی کون، کس۔ جیسے مَنٌ بَعَثْنَا مِّنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶)۔ ہمیں کس نے ہماری خواہگاہ سے اٹھا دیا؟

\*راغب۔ \*\*تاج۔

## من

مین\* - حسب ذیل معانی کے لئے آتا ہے :-

(۱) ”سے“ کے معنوں میں - مینَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۴) - مسجد حرام سے (یعنی وہ آغازِ سفر کا مقام تھا) -  
إِنَّمَا مِینَ سَلَامَانَ (۲۳) - وہ سلیمان کی طرف سے ہے -

(۲) ”کل میں سے بعض (اسے تبعیض کہتے ہیں) - مِثْنَهُمْ مِّنْ كَلَامِ اللَّهِ (۲۵۳) - ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے خدا ہم کلام ہوا -

(۳) پوری جنس کے لئے (اسے تبیین کہتے ہیں) - مثلاً - مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِینَ رَحْمَتِهِ (۳۵) - اللہ جو رحمت بھی انسانوں کے لئے کھولتا (بھیجتا) ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ رحمت میں سے کوئی ایک حصہ بھیجتا ہے - رحمت جو بھی ہوگی اسے رحمت ہی کہا جائے گا - رحمت کا حصہ نہیں کہا جائے گا - اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے - مَتَّعْنَا تَنَاسُتًا بِهِ مِینَ آيَاتِهِ (۱۳۴) جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لائے . . . . . یعنی ہم تمام نشانیوں سے ایسا ہی برتاؤ کرینگے - لہذا تبیین میں ”کل کا مفہوم ہوتا ہے - یعنی اس قسم کی پوری کی پوری چیز - (مین کے استعمال میں تبعیض اور تبیین کے فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) -

(۴) ”کی وجہ سے“ کے مفہوم کے لئے - مِمَّا خَطَبْتُمْ اُخْرَقُوا (۴۱) - وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کئے گئے - یعنی ان کے غرق ہونے کی وجہ ان کی خطا کاریاں تھیں -

(۵) ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے - وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِینَ الْمُصْلِحِ (۴۲) - اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح - یعنی وہ مفسدین اور مصلحین کو الگ الگ پہچانتا ہے -

(۶) ایک کے بدلے میں دوسرا - اَرَضِیْتُمْ بِالْعِیْلَةِ الدُّنْیَا مِینَ الْآخِرَةِ (۴۸) - کیا تم مستقبل کے بدلے میں (یا اس کے مقابلہ میں) قریبی مفاد پر رضا مند ہو گئے؟ نیز (۴۹) -

(۷) نفی (نہیں) کی تاکید کے لئے - وَمَا مِینَ إِلَهِ إِلَّا اللَّهُ (۵۱) - اللہ کے سوا کوئی بھی الہ نہیں -

(۸) ب (کے ساتھ) کے معنوں میں - بِنْتَظِرُونَ مِّنْ طَرَفٍ خَفِيِّ - (۲۴/۲۴) - وہ دزدیدہ نگاہ سے (یا خفی نگاہ سے یا گوشہ چشم سے) دیکھتے ہونگے۔ (نیز ۲۴/۲۴)۔

(۹) عَلٰی (پر) کے معنوں میں - وَ نَصَرَ نَلِہٖ مِّنَ الْقَوْمِ... (۲۴/۲۴)۔ اور ہم نے اسے اس قوم پر غالب کر دیا۔

(۱۰) رَفِی (میں) کے مفہوم میں - اِذَا نَوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِّنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ (۲۴/۲۴)۔ جب جمعہ کے دن تمہیں صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے۔

(۱۱) عَن (سے) کے مفہوم کے لئے - قَدْ کُنَّا رَفِیْ غَفْلَتِہٖ مِّنْ ہٰذَا (۲۴/۲۴)۔ ہم اس کی طرف سے غفلت میں رہے۔

(۱۲) عِندَ (کے نزدیک - کے ہاں) کے معنوں میں - لَنْ تَغْنِیَ عَنْہُمْ اَمْوَالُہُمْ وَلَا اَوْلَادُہُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا (۲۴/۲۴)۔ اللہ کے ہاں (یا اللہ کے مقابلہ میں) ان کے اموال و اولاد ان کے کسی کام نہ آسکیں گے۔

(۱۳) زائد بھی ہوتا ہے - مَا تَسْقُطُ مِّنْ رَّقْعَةٍ (۲۴/۲۴)۔ کوئی پتہ نہیں گرتا کہ..... (اسے تاکید کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں)۔

## م ن ع

مَنْع کے معنی ہیں کسی شخص اور اس چیز کے درمیان حائل ہو جانا جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ بہ إعطاء کی ضد ہے۔ یعنی نہ دینا۔ راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ اِمْتِنَاعٌ۔ بَارِہْنَا۔ رُکْ جَانَا۔ مَنَاعٌ۔ مَنَاعٌ۔ مَنَوْعٌ۔ رُکْنِیْ وَالَا\*۔ مَنَاعٌ اور مَنَوْعٌ میں (بمقابلہ مَنَاعِ) مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ روکنے والا۔ روکنے کی جہت سے بغیل آدمی کو مَنَاعٌ اور مَنَاعٌ کہتے ہیں\*\*۔ المَنْعٰی۔ رُکْنًا۔ محفوظ ہو جانا۔ مَنَعَ الرَّجُلُ۔ آدمی محفوظ ہو گیا۔ حِصْنٌ مَّنِيعٌ۔ محفوظ اور مضبوط قلعہ۔ اَلْمَمَانَعَةُ۔ ایک دوسرے کو روکنے کے لئے جھگڑنا\*۔

قرآن کریم میں ہے - وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ یَّبْدُوْا کَثْرَ فِیْہَا اسْمِہٖ (۲۴/۲۴)۔ ”اس سے بڑھ کر زیادتی کرنے والا کون ہے جو (لوگوں کو) اس سے روکتا ہے کہ وہ مساجد میں اللہ کا نام لیں“۔ اس میں مَنْع کے معنی رکاوٹ ڈالنا، حائل ہونا ہیں۔ سورہ نساء میں ہے

وَتَمْنَعُكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۳۱)۔ اسکے معنی حفاظت یا مدافعت کرنے کے ہیں۔ ”(کیا) ہم نے مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی؟“

سورہ الماعون میں ہے۔ وَتَمْنَعُونَ الْمُتَاعُونَ (۱)۔ جو چیزیں بہتے پانی کی طرح عام ہونی چاہئیں یہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور انہیں روک کر اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ سورہ معارج میں انسان کی ہام نفسیاتی کیفیت کے متعلق ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنَعُوا (۲)۔ جب اسکے پاس مال و دولت آتا ہے تو وہ اسے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اس ذہنیت کا علاج نظام صلوة کی رو سے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ (۳) میں بھی کہا گیا ہے۔ اسی کو سورہ ق میں مَنَعَ لِلْخَيْرِ (۴) کہا گیا ہے۔ اسکے برعکس جنّتی معاشرہ کے متعلق ہے کہ اس میں سامان خور و نوش بڑی کثرت سے ہوگا (۵؛ ۶)۔ اور کوئی اسکے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ کوئی اسے روک کر نہیں رکھے گا۔ (۷؛ ۸) وہ سب کی پرورش کے لئے ہام ہوگا (۹)۔

## م ن ن

مَنّ۔ ہر اس احسان الہی کو کہتے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہ اٹھانی جائے۔ مَنّ عَالِیّہ۔ اس پر احسان کیا۔ یعنی ہلا مزد و معاوضہ کچھ عطا کر دیا۔ اَمْتَنّ عَلَیْہِ کے بھی یہی معنی ہیں۔ نیز مَنّ کے معنی احسان جتانے کے بھی ہیں، جو معیوب ہے۔ اَلْمَنْعُونَ۔ بہت احسان جتانے والا۔ نیز زمانہ اور موت کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے رَبِّبُ الْمَنْعُونَ۔ حوادث روزگار کو کہتے ہیں۔ اَلْمَنْعَان۔ بہت زیادہ انعامات عطا کرنے والا \*۔

قرآن کریم میں وحی کو بھی مَنّ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے ہلا کسب و ہنر محض وہی طور پر عطا ہونی ہے (۱)۔ یہ مَنّ رسول پر ہے۔ اور رسول کا اس وحی کو لیکر انسانوں کے پاس آنا، ان انسانوں پر خدا کا مَنّ ہے (۲)۔ قوم بنی اسرائیل کا فرعون کے استبداد سے نجات پالینا خدا کا مَنّ تھا (۳)۔

سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق ہے کہ انہیں مَنّاً چھوڑ دو، یا فِدَاءً (۴)۔ یعنی بطور احسان (ہلا معاوضہ) یا فدیہ لیکر۔ سورہ

ص میں یہ لفظ اُمْسِیک کے مقابل میں آیا ہے جسکے معنی روک رکھنے کے ہیں (۳۸)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو بہر حال چھوڑنا ہوگا۔ زرقہ یہ لیکر ہو یا احساناً۔ سورہ المدثر میں ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۴۶)۔ ”اس نیت سے احسان نہ کر کہ اسکے بدلے میں تجھے اس سے زیادہ واپس ملے گا“۔ یہاں سے مَنّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ مومن وہ ہیں جو ”اللہ کی راہ“ میں اس طرح صرف کرتے ہیں کہ لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى (۲۶۶)۔ وہ نہ اس کے معاوضہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی احسان جتا کر وجہ اذیت بنتے ہیں۔ مَنّ دراصل ایک بھاری وزن ہوتا ہے \*۔ لہذا احسان جتانے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو (احسان کے) بھاری بوجھ کے نیچے دبا دیا جائے۔

اس بوجھ کے اعتبار سے مَنّ کے معنی ہونے ہیں تھکا دینا۔ لاغر اور کمزور کر دینا۔ مَنّ الثَّاقَةِ - اونٹنی کو سفر کی تکلیف سے تھکا دینا اور لاغر اور کمزور کر دینا۔ مَنّ السَّيِّئِ قِلَانًا - اسے چلنے کے کمزور کر دینا۔ ذَهَبَ بِمَنْشَرِهِ - اسکی طاقت زائل کر دی۔ اَلْمَنْشَرُ - کمزور رسی یا کمزور آدمی۔ ثَوْبٌ مَنِيْنٌ - کمزور اور بوسیدہ کپڑا۔ اَلْمَنْشَرَةُ - مکڑی۔ مَنّ الشَّقِيَّةِ - چیز کم ہو گئی۔ اسی اعتبار سے مَنّ موت کو کہتے ہیں، نیز زمانہ کو۔ مَنّ الْحَبْلِ کے معنی ہیں رسی کو کاٹ دینا۔ ابن فارس نے اس مسادہ کے بنیادی معنی (۱) کاٹنا اور (۲) احسان کرنا، لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۸۲/۳۵)۔ ان کے لئے ایسا اجر ہے جس میں کمی نہیں ہوگی۔ غیر منقطع۔ مسلسل جاری رہنے والا۔ (سلسلہ ارتقاء میں کوئی چیز آگے بڑھ کر پیچھے نہیں آسکتی۔ یا وہ رک جائیگی اور یا آگے بڑھتی جائیگی)۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اجر انہیں بطور احسان نہیں ملے گا بطور استحقاق ملے گا۔

رَبَّ السَّمَوَاتِ (۵۲) - زمانے کی اضطرابی کیفیتیں۔ گردش زمانہ۔ مرور وقت۔ حوادث روزگار۔ واضح رہے کہ یہ لفظ متضاد معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اَلْمَنْقَةُ - قوت کو بھی کہتے ہیں۔ بالخصوص دل کی قوت کو۔ اسلئے مَمْنُون کے معنی کمزور اور قوی دونوں آتے ہیں \*۔ الرومانی نے اَلْمَمْنُون کے معنی موت لکھے ہیں \*\*\*۔ صاحب لطائف اللغة نے اسکے معنی اَلدَّهْر یعنی زمانہ کے دئے ہیں۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ان پر مَنَّ نازل ہوتا تھا۔  
 (۲۵)۔ یہ شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی گوند تھی جو درختوں  
 پر جم جاتی تھی \*۔ (یہ اب بھی ہوتی ہے اور لذیذ ہوتی ہے۔) لیکن راغب  
 نے اس معنی کے ساتھ دوسرا مفہوم یہ بھی بتایا ہے کہ مَنَّ اور سَنَّوٰی  
 سے خدا کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ مَنَّ احسان اور سَنَّوٰی تسلی  
 کا سامان \*۔

## مَنُوۃ

مَنُوۃ۔ جاہلیت عرب میں قبیلہ، ہذیل و خزاعہ کا بت تھا \*\*۔ (۵۳)۔  
 لات قبیلہ، ثقیف کا اور عزیٰ قبیلہ غطفان کا۔ ان تینوں کا ذکر (۴۰-۴۹)  
 میں آیا ہے۔

## م ن ی

مَنَّاهُ یَمْنِیْہِ مَنِّیًّا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اَلْمَنّٰی۔ اندازہ کرنیوالا۔ اَلْمَنّٰی \*۔  
 اللہ کا اندازہ۔ اَلْمَنّٰیۃ۔ موت کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا اندازہ مقرر کر دیا  
 گیا ہے \*۔ اَلْمَنّٰی (واحد مَنّیۃ) مقاصد۔ خواہشات۔ آرزوئیں۔ یعنی وہ کام جن  
 کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔ تَمَنّٰہُ تَمَنّیًّا۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کی  
 تمنا کی۔ اُمْنِیۃ (جمع اَمْنٰی)۔ خواہش۔ آرزو۔ ارادہ \*۔ نیز اس کے معنی  
 جھوٹ اور کذب کے بھی ہیں۔ تَمَنّٰی التَّحْرِیْثُ۔ بات گھڑلی۔ اَلَا مَنّٰی \*۔  
 وہ باتیں جن کی تمنا کی جائے اور اکاذیب۔ دونوں معنی ہیں \*۔

اَلْمَنّٰی۔ نطفہ (خواہش اور ارادہ کے اعتبار سے۔ یا اس اعتبار سے کہ  
 اس سے انسان کی پیدائش کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ابن فارس)۔

تَمَنّٰی الْکِتَابَ۔ کتاب کو پڑھا۔ اُمْنِیۃ۔ کتاب کی تلاوت۔  
 جو کچھ پڑھا جائے \*\*\*۔ اس معنی کے لئے تاج العروس نے خاص طور پر اشعار  
 بطور سند نقل کئے ہیں۔ اور ابن فارس نے کہا ہے کہ پڑھنے سے کتاب کے  
 مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ مِیْنٰہُمْ اُمْنِیُّوْنَ  
 لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمّٰرِی (۲۸)۔ "ان میں ان پڑھ لوگ بھی  
 ہیں جو صرف کتاب کی تلاوت کر سکتے ہیں"۔ (اس کے مطالب کو سمجھ نہیں  
 سکتے)۔ سورۃ حج میں ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا  
 نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی الشَّیْطٰنُ فِیْ اُمْنِیَّتِہِمْ فَمِنْ سَخِ اللّٰہِ  
 مَا یَلْقَی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یَحْکِمُ اللّٰہُ اَیَّتِہِمْ (۲۲)۔ اور ہم نے تجھ سے

پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا تو اس کے ساتھ بھی ہوا کہ (اس کے جانے کے بعد) شیطان (دین سے منحرف کرنے والے لوگ) اس کی کتاب میں (یعنی جس کی وہ تلاوت کرتا تھا)\*\* - اس وحی میں) اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے - اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو اس غیر خدائی تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی منزہ شکل میں پیش کر دیتا - اس آیت میں اللہ نے بتایا ہے کہ کس طرح مفاد پرست اور سرکش لوگ وحی میں رد و بدل کر دیتے تھے اور کس طرح دوسرا رسول آکر ان تبدیلیوں کو مٹاتا تھا - یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ قرآن کریم آیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی - اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا - یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم - لیکن بہت سے مفسرین نے پہلے، اُمْنِیَّتِیہ کے معنی ”آرزو“ کر کے خود ہی ایک مشکل پیدا کر لی اور پھر اس مشکل سے نکلنے کے لئے اس قسم کا قصہ وضع کیا جس کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے - چونکہ اس قصہ سے حضور رحلتِ مآبؐ کی شان اقدس ہر طعن پڑتا ہے اس لئے ہم اسے یہاں دھرانا نہیں چاہتے -

مَنْیًۖی - نطفہ - اَلَمْ یَرَکَ نَظَفَہٗ مِّنْ مَّنِّیْ - بِمَنْیًۖی (۳۵) -  
 ”کیا وہ (انسان) منی کا ایک نطفہ نہیں تھا جو ڈالی جاتی ہے“ -

## موت

مَوْتُ\* - دراصل حیات کی ضد ہے - مجازاً یہ سکون کے لئے بھی بولا جاتا ہے\* - ہر وہ چیز جس میں جمود کی وجہ سے حرکت و ارتقاء رک جائے، مردہ ہے - چنانچہ کہتے ہیں مَاتَتْ النَّارُ یَبُحُ\* - یعنی ہوا رک گئی اور ساکن ہو گئی - مَاتَتْ النَّارُ\* آگ بجھ گئی - مَاتَتْ الْخَمْرُ\* شراب کا جوش جاتا رہا - نیند پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے - چنانچہ مَاتَ الرَّجُلُ جُلَّ\* کے معنی ہیں وہ سو گیا\* - دراصل حیات کے مقابلہ میں موت کی بھی کئی قسمیں ہیں - مثلاً (۱) قوتِ نامیہ (بڑھنے پھولنے کی قوت) کا زائل ہو جانا - جیسے وَ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا (۳۱/۱۹) - اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے - (۲) محسوس کرنے کی قوت کا زائل ہو جانا - جیسے قَالَتْ یٰلَیْسَ لِّیْ حَیَۃٌ اَوْ اَمَلٌ ۚ ہٰذَا الَّذِیْ کُنْتُ تُنْفِیْہَا عَنْہُ ۚ اَنْتَ اَعْلَمُ ۚ (۳۱/۱۳) - مریم نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی - اور اس درد و کرب کو محسوس نہ کر سکتی - (۳) عقل و شعور کا زوال - جیسے فَسَا نَقَّکَ لَا تَسْمِعُ السَّمَوٰتِی (۳۱/۲۸) - تو مردوں کو نہیں سنا سکتا - یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور



سے کام نہیں لیتے۔ (۴) حزن اور خوف جو زندگی کو مکدر کر دے۔ یعنی ہر مشقت حالات، افلاس، ذلت، محکومی کی زندگی وغیرہ جیسے۔ وَ يَسَّاتِيَهُ الْمَوْتُ مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمُعَيِّنٍ (۱۳۴)۔ یعنی چاروں طرف سے ذلت و افلاس اور تباہیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر آرہی ہوں گی لیکن موت نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ بھوک کے ٹکڑوں سے اتنا کچھ مل جائے گا جس سے طبعی زندگی باقی رہے۔ (یہ جہنم کی زندگی کا نقشہ ہے)۔ مَوْتُ غشی اور جنون کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمَوْتَةُ وہ جانور جو بلا ذبح کئے مر جائے۔ اَلْمَوْتَةُ جنون کے مشابہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو بعض آدمیوں کی ہو جاتی ہے۔ (ابن قارس)۔

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات (زندگی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۸)۔ جس طرح حیات صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کے گونا گوں پہلو ہیں اسی طرح موت بھی صرف سانس بند ہو جانے کا نام نہیں۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ اور بدترین موت ہے قوموں کی اجتماعی زندگی کی موت جس میں وہ نہ زندہ ہوتی ہیں اور نہ مرقی ہی ہیں۔ یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے۔ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰی (۸۴)۔ قرآن کریم کا پیغام حیات اور انہی اقوام کے لئے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت باقی ہو۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۱۳۴)۔

قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آئے، اس کے سیاق و سباق سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہاں اس کے کون سے معانی مراد ہیں۔ ہر مقام پر موت کے معنی طبعی موت (Physical Death) نہیں ہونگے۔ (نیز دیکھئے عنوان ح - ی - ی)۔

## م و ج

اَلْمَوْجُ - لہر۔ مَسَاجِدُ الْمَوْجِ - لہر بلند ہوئی۔ اَلْمَوْجُ - سمندر کی موجوں کا اضطراب۔ مَسَاجِدُ يَمَوْجُ - اضطراب اور تعیر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اضطراب کے ہیں۔ مَوْجَةٌ الشَّيْبَانِ - جوانی کی لہر کو کہتے ہیں۔ عنفوان شباب۔

قرآن کریم میں مَوْجُ کا لفظ دریا یا سمندر کی لہروں کے لئے آیا ہے۔ (۱۴۴)۔

## م و ر

مَارَ الشَّيْئُ يَمْوُرٌ - کسی چیز کا بار بار آنا - متردد ہونا - اَلَمْوُرُ - کھومنا - موج و اضطراب - زمین پر تیزی سے بہنا اور بہ سرعت متحرک ہونا - مَارَ مَوْرًا - وہ آنے جانے لگا - اَلَمْوُرُ - روندنا ہوا ، ہموار راستہ - تیز رفتاری - سرعت - نیز نرم روی - اَلَمْوُرُ - مٹی جسے ہوا اڑائے\* -

قرآن کریم میں ہے يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا (۵۲) - جس (انقلاب کی گھڑی میں) بلندیوں والے اپنے مقام سے رہل کر سخت مضطرب اور اور متردد ہو جائیں گے - (یہ مفہوم سماء کے مجازی معنی کی رو سے لیا گیا ہے) -

## موسیٰ علیہ السلام

اَلْمَوْسَى - اُسْترا - مَاسَ رَاٰ مَآءَہ - اس نے اس کے سر کو استرے سے مونڈ دیا\*\* -

مَوْسَى - حضرت موسیٰ علیہ السلام - یہ عبرانی لفظ مَوْشَى کا معرب ہے جسکے معنی کھینچ کر نکالا ہوا ہوتے ہیں\*\* - چونکہ فرعون کے لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا تھا اس لئے آپ کا یہ نام قرار پا گیا\*\*\* -

حضرت ابراہیمؑ کے ہوتے ، حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا - آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں - آپ کے ایک بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا - یہودہ اور بن یامین (کا قبیلہ ، فلسطین کے علاقہ Judea) میں آباد تھا - ان دونوں قبائل کے افراد کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل - لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی - اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے -

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا - لیکن حضرت یوسفؑ نے (جو مشیت کی تدبیر کے ماتحت عجیب حالات میں مصر پہنچ گئے تھے - دیکھئے عنوان یوسفؑ) اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا تھا - اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اور بڑھتے بڑھتے ایک کثیر التعداد قوم بن گئے -

مصر میں فراعنہ کی حکومت تھی - "فرعون" کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا - مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش

کرتے تھے "امن رع" (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب قاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لیکر اسکندر کے زمانہ (۳۳۲ - ق - م) تک قراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسر حکومت تھا۔ جنہیں عمالقہ کہتے تھے۔

مصر میں بنی اسرائیل کی ابتداء تو ایک معزز گھرانے کی حیثیت سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ یہ قوم فرعون کے محکوم ہو گئے اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو دنیا کا ہر فرعون، محکوم قوم کے ساتھ کرتا ہے۔ جب ان پر ظلم و تشدد اپنی انتہا تک پہنچ گیا تو ان میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے جو خدا کے برگزیدہ رسول اور عظیم الشان دہمی انقلاب تھے۔

آپؑ پیدا تو ہوئے محکوم بنی اسرائیل کے گھرانے میں لیکن مشیت ایزدی نے آپ کی تربیت کا انتظام فرعون کے محلات میں کر دیا تاکہ آپؑ اسرار و رموز مملکت و سیاست سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں (۲۸/۲۸)۔ یہاں سے آپ نکلے تو مدین کے علاقہ میں پہنچے (۲۸/۲۲)۔ جہاں آپ کی شادی ہوئی اور آپ نے آداب شبانی سیکھے۔

مدین سے واپسی پر، کوہ طور پر آپ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے (۲۸/۱۳) اور آپ کو حکم ہوا کہ آپ فرعون کیطرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اسکے ہنجرے استبداد سے نجات دلائیں۔ آپ آئے اور اپنے بھائی ہارونؑ کے ساتھ فرعون کے پاس پہنچے (۲۸/۲۸)۔ فرعون اور اسکے پیشوا بیان مذہب کے ساتھ آپ کے معرکے رہے اور بالآخر آپ، بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر فلسطین کیطرف آگئے (۲۸/۲۷) اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کو اُس با یرکت زمین کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۲۸/۱۳)۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے موآب کی سرزمین میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی (دیکھئے استثناء ۳۴/۵)۔ حضرت ہارونؑ کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ (قرآن کریم نے ان تفصیل کا ذکر نہیں کیا)۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ اس کے بعد، قوم بنی اسرائیل کا عروج، طبقاً عن طبق، بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں یہ سطوت داؤدیؑ اور شوکت سلیمانیؑ کے وارث ہوئے۔ پھر انہوں نے جبل اللہ سے تمسک، یعنی قوانین خداوندی کا اتباع

چھوڑ دیا تو ذلت و مسکنت کی لعنت ان کے پیچھے لگ گئی۔ ان کی پہلی تباہی بخت نصر (بابل) کے ہاتھوں ۹۹۹ ق۔ م میں ہوئی۔ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔ قریب ایک سو سال کے اندر، فارس کے تین شہنشاہ، خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہو گئے اور اس طرح یہ پھر یروشلم میں آکر آباد ہو گئے۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۵۹ میں تمثیلی انداز میں ان کی اس تباہی اور باز آفرینی کا ذکر کیا گیا ہے)۔ ۳۳۲ ق۔ م میں اسکندر (یونانی) نے یہودیوں کی مرکزیت پر پھر ایک کاری ضرب لگائی۔ پھر ۳۲۰ ق۔ م میں بطلموس نے مصر کے راستے یروشلم پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آ گیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہو گئے۔ ۶۶ ق۔ م میں ان کی آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی۔ ہامپٹی رومی بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر ۵۱ ق۔ م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنائے گئے۔ فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا موقعہ دیا گیا جب ان میں حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے لیکن انہوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد ان کی تباہی کا آخری وقت آ گیا۔ چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے ۷۰ء میں ایسا وار کیا جس سے اس قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہر ثبت ہو گئی۔

سورہ بنی اسرائیل میں بخت نصر کے ہاتھوں پہلی بربادی اور اس آخری بربادی کے متعلق ذکر آیا ہے (دیکھئے پیکم)۔

حضرت موسیٰؑ خدا کے نبی تھے۔ انہیں اللہ نے کتاب دی تھی۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوسٰی الْكِتٰبَ (۲۴/۲) حضرت ہارونؑ بھی نبی تھے۔ انہیں بھی کتاب ملی تھی۔ چنانچہ سورہ صافات میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے وَاٰتَيْنَاهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱) اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ یا حضرت ہارونؑ کی کتاب کا نام مذکور نہیں۔ اَلتَّوْرٰة کا ذکر ہے (۲۴/۲)۔ لیکن تورات درحقیقت ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے مختلف انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئی رہیں۔ ان کے مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہتے ہیں۔

یہودیوں نے اس کتاب میں تحریف کر دی تھی۔ لفظی تحریف بھی (۲۶) اور معنوی بھی (۲۵)۔ نیز اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیئے تھے (۲۹)۔ اور یوں تلبیس حق و باطل ہو گئی تھی (۳۱)۔ اس لئے اس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے (۱۱۱)۔ ان کی تبیین و توضیح قرآن کریم نے آکر کی (۱۵)۔ [نیز دیکھئے عنوان ”تورات“]

## م و ل

الْمَالُ۔ ہر وہ چیز جس کے تم مالک ہو جاؤ۔ اس کی جمع اَمْوَالُ آتی ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ دراصل مَالُ اس سونے چاندی کو کہتے ہیں جس کا کوئی مالک بن جائے۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کے ذخیرہ کو بھی مَالُ کہتے لگ گئے۔ ویسے عربوں کے ہاں زیادہ تر اونٹوں کے گلے کو مَالُ کہتے تھے کیونکہ ان کے مال زیادہ تر اونٹوں ہی کی شکل میں ہوتے تھے۔ رَجُلٌ مَسْئِلٌ۔ بڑا مال دار آدمی۔ مَسْلَتٌ۔ میں نے اسے مال دے دیا۔ تَمَوَّلْتُ اور اِسْتَمَلْتُ کے معنی ہیں، میں بہت مالدار ہو گیا۔ مَسْوَلٌ۔ اس نے اسے مال دار کر دیا۔ عام ائمہ لغت کے نزدیک اَلْمَالُ کے مساوی لفظ واو ہی ہے۔ لیکن راغب نے اسے اَلْمَسْئِلُ کے تحت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مَالُ کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف۔\*\* یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس لئے مَالُ کہا گیا ہو کہ اس کی خاطر انسان کو کسی ایک طرف جھکنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر راغب کی تحقیق صحیح ہوتی تو مَالُ کی جمع اَمْوَالُ ہوتی نہ کہ اَمْوَالُ۔

نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں جماعت مومنین کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں نقص مِّنَ الْاَمْوَالِ (۲۵) بھی ہے۔ یعنی مال و دولت میں کمی ہو جانا۔ لیکن اس کے بعد اس جماعت کو، ان کے مخالفین کے اَمْوَالُ کا مالک بنا دیا جاتا ہے اور انہیں ہر طرح کی فراوانی حاصل ہو جاتی ہے (۳۳)۔ لہذا مال کی فراوانی، نظام خداوندی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی رحمت ہے۔ لیکن وہی مَالُ جو نظام ربوبیت کی اجتماعی تحویل میں ہو (۱۱۱)۔ اگر ہر فرد اپنا اپنا مال اپنے ہی مفاد کی خاطر جمع کرے تو اس مال سے وہ جہنم تیار ہوتی رہتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (۱۰۴)۔ اسی کا نام سرمایہ داری ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔ (۳۳-۳۴)۔

## م و ۵

ماء\*۔ دراصل مَوَّہ\* تھا۔ واو کو الف سے بدل دیا اور ہاء کو همزہ سے۔ اس طرح یہ لفظ ماء\* بن گیا۔ اس کے معنی ہیں۔ پانی۔ اس کی جمع میماء\* آتی ہے۔ مَآهَتِ السَّقْفِیْنَتَہ\* کے معنی ہیں کشتی میں پانی بھر گیا۔ بَنُوْ مَآءِ السَّمَاءِ۔ عربوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ بارش کی تلاش میں رہتے اور جہاں بارش کا پانی ملتا وہیں پہنچ جاتے\*۔

قرآن کریم میں ہے "كَانَ عَرْشُهُ عَلَى السَّمَاءِ (۱۱)۔" خدا کا عرش پانی پر تھا۔ اس کے مفہوم کے لئے ع۔ ر۔ ش کا عنوان دیکھئے۔

## م و ۵

مَہْد\* کے معنی ہیں جگہ کو ہموار اور نرم بنانا۔ اَلْمَہْد\*۔ نرم اور ہموار زمین۔ اَلْمِہَاد\*۔ بستر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نرم اور ہموار ہوتا ہے\*\*۔ بچھی ہوئی اور ہموار ہونے کی جہت سے قرآن کریم میں زمین کو میہاد\* کہا گیا ہے (۷۹)۔ یعنی وسیع بچھائی ہوئی اور ہموار۔ چونکہ بچھے کا بستر ہموار اور نرم ہوتا ہے اس لئے اسے اَلْمَہْد\* کہتے ہیں۔ یعنی گہوارہ\*\*\*۔ تَمَہِیْدُ الْاَلاٰءِ\* کے معنی ہیں کسی معاملہ کو ہموار کرنا اور درست کرنا۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ مجازاً اس سے مراد مال و جاہ میں فراخی کرنے کے ہو جاتے ہیں\*\*۔ یعنی نرم اور پُر آسائش زندگی بنانا۔ قرآن کریم میں ہے۔ "وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلَا نَفْسٍ بِهِمْ يَمْہِدُ وُنَ" (۳۸)۔ جو صلاحیت بخش کام کرتے ہیں وہ اپنی ذات کے لئے آسائشیں بہم پہنچاتے ہیں اور اسکی اصلاح اور ہمواری کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں جہنم کو بَیْئَسَ الْمِہَادِ\* (۱۶) کہا ہے۔ یہاں اس کے معنی رہنے یا ٹھہرنے کے مقام کے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ کو مَہِیْدُ\* کہا گیا ہے۔ "وَالْاَرْضَ قَرَشْنٰہَا فَتَنْعَمُ الْمَہِیْدُ وُنَ" (۳۸)۔ اور ہم نے زمین کو بچھ دیا اور ہم کچھے آسائشیں بہم پہنچانے والے، یا ٹھکانا مہیا کرنے والے ہیں۔

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت مریم\* اپنے بیٹے حضرت عیسیٰ\* کو ساتھ لے کر ہیکل کے پجاریوں کے پاس آئیں تو وہ (احبار و رہبان) ان کے پیچھے پڑ گئے (کہ انہوں نے ہیکل کی راہبہ کی زندگی چھوڑ کر آئین خانقاہیت کے خلاف

متاھل زندگی کیوں اختیار کر لی تھی)۔ انہوں نے خود جواب دینے کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کر دیا کہ تمہارے اعتراضات کا یہ جواب دیں گے۔ اس پر ہیکل کے شیوخ نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا کَتَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۱۶۹)۔ ”ہم اس سے کس طرح بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے“۔ یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ اس سے (جو ہماری سن رسیدگی کے مقابلہ میں یوں ہے جیسے گود میں کھیل رہا ہو) جو کل ابھی ہمارے سامنے بچہ تھا۔ جو ہمارے ہاتھوں کا کھلایا ہوا ہے۔ اس سے ہم مناظرہ شروع کر دیں۔ اس سے ”فی المهد“ (جھولے میں) کے معنی واضح ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی کہتے ہیں ”ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں“۔ یا ”جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش“۔ خود صَبِيًّا کے معنی بھی دودھ پیتا بچہ نہیں۔ (دیکھئے عنوان ص۔ ب۔ و)

یہی ”تکلم فی المهد“ ہے (یعنی کم عمری میں لوگوں سے اہم حقائق پر گفتگو کرنا) جس کی طرف (۱۶۰ و ۱۶۳ میں) اشارہ کیا گیا ہے۔ احبار و رہبان کے سوال کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ سچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں۔ آپ نے فرمایا اَنِّي عَبْدُ اللَّهِ۔ اَنِّي الْكَتَّابُ وَ جَعَلَنِي نَبِيًّا..... (۱۶۱)۔ میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی۔ [مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”شعلہ مستور“]۔

## م ل

الْمَهْلُ۔ الْمَهْلُ۔ الْمَهْلَةُ۔ سکون۔ اطمینان۔ نرمی۔ اَمْهَلَهُ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، اس پر سختی نہیں کی۔ اسے مہلت دے دی۔ ڈھیل دیدی۔ تَمَهَّلَ فِي عَمَلِهِ۔ اس نے اپنے کام میں جلدی نہ کی، اطمینان اور سکون سے کام لیا۔ الْمَهْلُ۔ سکینت اور وقار۔ نیز اچھے کام میں آگے بڑھنا۔ اَلْمَاهِلُ۔ تیز رو۔ آگے بڑھنے والا\*۔ سورة طارق میں ہے فَمَتَّهَلِ الْكَافِرَ بَيْنَ اَمْهَلِهِمْ رَوْبًا (۵۱)۔ ان مخالفین سے نرمی کا برتاؤ کرو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اسی کو مہلت کہتے ہیں۔ یہ خدا کے قانونِ تدریج و امہال کے مطابق طے پاتا ہے۔

(غالباً) مکون و جمود کے لحاظ سے، ہر دھات کو اَلْمُهْل کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ پگھلے ہوئے پتل، تانبے یا لوہے کے لئے آتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ زیتون کے تیل اور اس کی تلچھٹ کے لئے آتا ہے۔ نیز یہ اس راکھ اور انگاروں کو بھی کہتے ہیں جو روٹی سے اس وقت جھڑتی ہے جب اسے بھوبھل سے نکالتے ہیں۔ قبیلہ عامر اس لفظ کو زہر کے لئے بولتا ہے\*۔ بھر حال اس میں ہلاکت کا پہلو نمایاں ہے۔ سورۃ معارج میں ہے یَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ (۳۸)۔ یہاں مہل کے معنی پگھلی ہوئی دھات کے لئے جائیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ یعنی بڑے بڑے فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی۔ سورۃ کہف میں ہے یَغْفَتُونَ بِمَاءِ كَالْمُهْلِ (۲۹)۔ اہل جہنم کو جو پانی دیا جائے گا وہ مہل کی طرح ہوگا۔ یہاں اس کے معنی زہر کئے جائیں تو بھی ٹھیک ہے اور اگر آتشیں لاوا کئے جائیں تو بھی مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مہل حیات پھریں بھی ان کے حق میں ہلاکت آفریں ہونگی۔

## مہما

مہما۔ (کہتے ہیں کہ یہ مہما اور مہما کا مرکب ہے اور پہلے مہما کا الف ہاء سے بدل دیا گیا ہے)۔ ”جو کوئی (چیز) بھی“۔ ”جو کچھ بھی“۔ وَقَالُوا مَهْمَا تَا تِنَا يَه مین آیتہ (۱۳۳)۔ انہوں نے کہا کہ جو کوئی نشانی بھی تولائے گا۔۔۔ نیز اس کے معنی ”جب کبھی“ بھی ہوتے ہیں۔

## م ۵ ن

مہنتہ۔ اُس نے اسے اچھی طرح استعمال کیا۔ خوب رکڑا۔ استہنتہ۔ اس نے اس سے خدمت یعنی کام لیا اور اس طرح اسے کمزور کر دیا۔ اَلْمُهْنُ۔ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو کثرت محنت سے اسقدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس سے اونٹنی کو حاملہ نہ کرایا جائے تاکہ کمزور بچے پیدا نہ ہوں۔ اَلْمَاهِنُ۔ غلام اور خدمتگار۔ اَلْمِهْنَةُ۔ خدمت کرنے میں مہارت و ہوشیاری۔ اَلْمِهْنُ مین السِّر جہال۔ حقیر آدمی۔ ذلیل آدمی۔ قلیل الرائے۔ قلیل التعینز\*۔ ابن قاری نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی یہ وقعتی اور حقارت کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں اس مادہ کے لئے جس سے انسان کی (رحم میں) تخلیق ہوتی ہے سَلَلَتْ مین مَاءِ مہین (۳۲) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔



یعنی کمزور اور حقیر پانی سے نکالے ہوئے جوہر کے ذریعے۔ تقابل کی غرض سے ایسا کہا گیا ہے۔ یعنی اس قسم کے حقیر سے قطرہ ہے، اس قسم کا جیتا جاگتا، خوبصورت، ہونہار، سمیع و بصیر بچہ پیدا کر دینا، خدا کے قانونِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ کہاں وہ قطرہ آب، کہاں یہ دُرّ شاہوار!

## م ی د

مَادَ قَوْمَهُ - وہ اپنی قوم کے لئے سامانِ خوراک لایا۔ مَادَ هُمْ بِمَعِيدُهُمْ - یعنی مَادَ هُمْ ہے۔ یعنی انہیں سامانِ خوراک دیا۔ اسی سے اَلْمَعَادُ - سامانِ خوراک لینے والے کو کہتے ہیں۔ مَعِدَتُهُ - وَاَمَدُ تَهُ - میں نے اسے عطا کیا۔ مَادَنِي فَلَانٌ - فلاں نے مجھ پر احسان کیا\*۔ راعب نے اس کے معنی ”اس نے مجھے کھلایا“ بھی لکھے ہیں\*\*۔ مَادَ کے معنی شدت سے هلنا اور حرکت کرنا بھی ہیں، نیز جھکنا۔ مَادَتْ بِهٍ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین اسے لیکر گھومی۔ اَلْمَعَادَةُ - کھانا۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَلْمَعَادَةُ اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا ہو۔ اگر اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مَائِدَةُ نہیں بلکہ خِيَوَانٌ کہیں گے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اسے مَائِدَةُ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ میزبان کی طرف سے عطا اور تفضل کے طور پر مہمان کو دیا جاتا ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) حرکت اور (۲) نفع پہنچانا ہیں۔

اَلْمَعَادَةُ کے ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنْ يَنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ (۱۱۲) ”وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے“۔ ہر نبی کی طرح، حضرت عیسیٰؑ بھی اپنی جماعت سے کہہ رہے تھے کہ اگر وہ وحی کا اتباع کرتے رہے تو خدا انہیں رزق کریم دیگا۔ دنیا کی سرفرازیاں عطا کریگا۔ لیکن وہ جماعت جس قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہو رہی تھی ان کے پیش نظر، یہ بعید دکھائی دیتا تھا کہ انہیں اس کشائش سے سامانِ زیست مل سکیگا۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت انہوں نے کہا کہ کیا ایسے حالات میں بھی یہ ممکن ہے کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں ملن سب کو سامانِ نشوونما انسانوں کی طرف سے نہ ملے بلکہ نظامِ خداوندی کی طرف سے ملے تاکہ انہیں روٹی کے بدلے انسانوں کی

غلامی اختیار نہ کرنی پڑے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ تم مومن ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ **لَا تَقْتُلُوا اللَّهَ (۱۱۴)**۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ خدا نے کہا کہ وہ یقیناً ایسا انتظام کر دیگا (یعنی تقویٰ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا) **لِيَكُنْ فَمَنْ يَكْفُرُ بَعْدُ مِنْكُمْ فَتَأْتِيهِ أَعْيَادُهُ عَذَابًا...** (۱۱۵) جو ہمارے اس طرح کے دئے ہوئے رزق پر پردہ پوشی کرنے لگیگا اور اس نظام سے سرکشی برتیکا، تو اسے سخت عذاب دیا جائیگا۔ لہذا **مَتَّيْدَةً** میں **السَّمَاءِ**، نظام ربوبیت کا دوسرا نام ہے اور تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔

وہیسیے ان آیات کے جو عام معنی لئے جاتے ہیں انہیں قرآن کریم کے کسی اردو ترجمہ سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ سورہ نحل میں زمین کے متعلق ہے۔ **أَنْ تَمَيِّدَ بَيْكُمُ (۱۱)**۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر اطمینان سے سکونت پذیر رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے۔

کھلی اور فراخ جگہ کو **الْمَيِّدَانُ**۔ **الْمَيِّدَانُ** کہتے ہیں۔ لہذا **مَتَّيْدَةً** میں فراخی کا پہلو بھی ہے۔

## م ی ر

**الْمَيِّرَةُ**۔ کھانے کی چیزیں جنہیں کوئی شخص لاد کر لائے۔ **مَارَ عِيَالَهُ يَمِيرُ**۔ **مَيِّرَا**۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لایا۔ سورہ یوسف میں ہے **وَلَمَّا مَلَكَتْهُمُ امْرَأَتَانِ (۱۲)**۔ ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ (سامان خوراک) لائیں گے۔

## م ی ز

**مَازَ يَمِيرُ**۔ کسی چیز کو الگ کر لینا۔ علیحدہ کر لینا۔ **فَامْتَازَ**۔ اس وہ چیز الگ ہو گئی۔ **رَاغِبٌ** نے اس کے معنی ملتی جلتی چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے کئے ہیں۔ **فَرَأَى كَرِيمٌ** میں ہے **حَتَّى يَمَيِّرُ الْغَيْبِثَ مِنَ الطَّقِيبِ (۳۸)**۔ تاآنکہ (خدا) خبیث کو طیب سے الگ کر دے۔ سورہ یسین میں ہے۔ **وَامْتَازُوا الْيَوْمَ آيَئِهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۹)**۔ اے مجرمو! تم اب الگ ہو جاؤ۔ **تَمَيِّزُ**۔ الگ الگ ہو جانا۔ **تَمَيِّزُ الرِّجْلِ**۔ **مِنْ الْغَيْظِ**۔ وہ غصہ کی شدت سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ **تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ (۴۰)**۔ فریب ہے کہ وہ جوش میں پھٹ پڑے۔ **الْتَمَيِّزُ**۔ ملتی جلتی چیزوں میں فصل کرنا۔

## مِیْکَال

سورۃ بقرہ میں جِبْرِیْلَ وَ مِیْکَالَ آیا ہے (۲۸)۔ اس فرشتہ (Michael) کو یہودی اپنا دوست سمجھتے تھے ۔

## م ی ل

مَآلَ - وہ جھکا۔ مَآلَ الَیْہَ - وہ اس کی طرف جھکا۔ اس کی طرف مائل ہوا۔ متوجہ ہوا۔ مَآلَ عَلَیْہِ - وہ اس کے خلاف جھکا۔ اس پر ظلم کیا۔ اُس پر حملہ آور ہوا (۳۴)۔ مَآلَ عَنَ الْحَقِّ - وہ انصاف کی راہ سے ہٹ گیا۔ اعراض برتا۔ اَمَّآلَہُ - اسے جھکا لیا۔ مَآلَتِ الشَّمْسُ - سورج مغرب کی طرف جھک گیا۔ زوال آفتاب سے مراد ہے۔ مَبِیْلَ بَیْنِ الْاَلَامَیْنِ - اس نے دو معاملوں میں تردد کیا کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو۔ یعنی اس کا دل کبھی اس کی طرف جھکا اور کبھی اُس کی طرف\*۔ مَبِیْلَہُ - ایک بار جھکنا (۳۴)۔

اَلْمِیْلُ - میل۔ زمین کا ایک معین فاصلہ (مختلف مقامات پر اس فاصلہ کے تعین میں اختلاف ہے)۔ وہ مینار جو راستہ پر مسافروں کی راہ نمائی کے لئے بنا دیا جاتا ہے۔ نیز زمین کی طویل اور لامحدود مسافت کو بھی گتھتے ہیں۔ اور سرنہ کی سلائی کو بھی\*۔

راغب نے اَلْمَآلَ کو بھی مَبِیْلُ کے تحت ہی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو اس لئے مَآلَ کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف\*\*۔ لیکن ہم نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ (دیکھئے عنوان م۔ و۔ ل)۔

# ن

## ن

دیکھئے عنوان ، (ن - و - ن)

## ن ا ی

نَسَا يَنْسَهُ وَ نَسَا يَنْسُ عَنْهُ - میں اس سے دور ہوا - نَسَا یٰ یَسْم - اسے ہٹایا ، دور کیا ، ایک طرف کیا \* - قرآن کریم میں ہے وَ هُمْ يَنْسَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْسَوْنَ عَنْهُ (ۛۛ) - وہ (لوگوں کو اس قرآن کریم سے) روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں - اَلْمُنْتَسَا یٰ - مقام بعید کو کہتے ہیں - اَلنَّسَا یٰ - دراصل اس گڑھے یا نالے کو کہتے ہیں جو خیمہ کے ارد گرد اس غرض سے کھودا جاتا ہے کہ ہارش کا ہانی خیمہ کے اندر نہ آئے ہائے - اس سے دور دور رہے - اسی سے اس کے معنی مفارقت کے بھی آتے ہیں \* - اور اعراض ہرنے کے بھی \*\* - قرآن کریم میں ہے - اَعْرَضَ وَ نَسَا بَیْجَانِیْبِهِ (ۛۛ) - اعراض برتا اور سرکشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو دور لے گیا - پہلو تہی کی - نَسَا یٰ فِی الْاَرْضِ - وہ ملک میں دور چلا گیا \* -

## نَا (ضمیر)

- (ۛ) نَا - ضمیر مرفوع متصل ہے - جیسے فَعَلْنَا - ہم نے کیا - یہ تثنیہ - جمع - مذکر - مؤنث - سب کے لئے آتی ہے -
- (ۛ) ضمیر منصوب متصل ہے - تثنیہ و جمع متکلم کے لئے آتی ہے - اور مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے - اَصْلَانَا - ان دو نے ہمیں گمراہ کیا -
- (ۛ) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - رَبَّنَا - اے ہمارے رب - (تثنیہ و جمع - مذکر و مؤنث - متکلم کیلئے) -

\* تاج - \*\* واغیب نیز این فارس -

قرآن کریم میں ہے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا ارْزُقْنَا آرِنَا الذِّكْرَ يَنْزِلَ عَلَيْنَا مِثْرَ الْغَمِّ (۲۱۹)۔ ”اور جو کافر ہیں وہ کہہ بیٹھے۔ ”اے ہمارے رب! ان کو، جنہوں نے جن و انس میں سے ہمیں گمراہ کیا تھا ہمیں دکھا۔“ دوسری جگہ ہے كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ (۲۲۵)۔ ”ہم نے ان سے کیا معاملہ کیا۔“

## ن ب ا (ن ب و)

نَبَأٌ کے معنی ہیں خبر دینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے ہیں۔ خبر کو بھی النَبَأُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ نَبَأٌ۔ ”خبر کو نہیں کہتے، بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جس میں بڑا فائدہ ہو، اور اس سے علم حاصل ہو جائے یا وہ کم از کم ظن غالب تک پہنچ جائے۔ یہ خبر جھوٹ سے خالی ہونی چاہئے۔ جیسے تواتر یا خدا یا رسول کی دی ہوئی خبر“۔ لیکن یہ کلیہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں ہے ”إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا“ (۱۱۳)۔ ”اگر کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو“۔ یہاں فاسق کی لائی ہوئی خبر کو بھی نَبَأٌ کہا گیا ہے۔ اَنْبَاٌ اور نَبَاٌ کے معنی خبر دینے کے ہیں\*۔ تَبَيَّنَ ”عیب داری“ (۱۱۴)۔ ”میرے بندوں کو یقینی طور پر بتا دے۔“ وَ اَنْتَلَّ عَلَيْنِهِمْ نَبَاٌ اٰسْرَ اٰهِيْمَ (۲۱۶)۔ انہیں (کتاب اللہ سے) ابراہیم کی خبر (سرگزشت، یقینی واقعات) بتا دے۔

نَبَاٌ۔ نَبَوُءٌ۔ کے معنی ہیں بلند ہونا۔ مرتفع ہونا۔ اَلنَّبَاُۃُ۔ اونچی زمین کو کہتے ہیں۔ اَلنَّبِيْۃُ۔ مرتفع جگہ اور واضح راستے کو کہتے ہیں جو ابھر کر سامنے آجاتا ہے\*۔

یہاں تک بات ن۔ ب۔ ا (مادہ) کے متعلق تھی۔ لیکن عربی زبان میں ایک مادہ نبو (ن۔ ب۔ و) بھی ہے۔ نَبَوُۃُ۔ نَبَوُۃُ کے معنی ہیں بلند ہونا۔ مرتفع ہونا\*\*۔ اَلنَّبَاُۃُ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جو دوسری زمینوں سے اونچی ہو۔ اَلنَّبِيْۃُ۔ بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ نیز بلند نشان راہ جس سے رہنمائی حاصل کی جائے\*۔

قرآن کریم میں اَلنَّبِيْۃُ کا لفظ رسول کے لئے آیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نَبَاٌ سے مشتق ہے اور اس لئے اس کے معنی ہیں خبریں دینے والا۔ لیکن یہ تورات کا

دیا ہوا تصور ہے۔ یہودیوں میں نبیؑ ہیکل کے ایک خاص منصبدار کا لقب تھا۔ جو پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ اسی لئے انگریزی میں نبی کو (Prophet) کہتے ہیں۔ یعنی پیش گوئیاں (Prophecies) کرنے والا۔ لیکن قرآن کریم نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نبیؑ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بلند مقام۔ لہذا نبیؑ کے معنی ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرمؐ سے کہا یا نبیؑ اللہ (ہمزہ ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لفظ نبیؑ سے مشتق ہے) تو حضورؐ نے فرمایا لَسْتُ بِنَبِيِّ عِ اللَّهِ وَلَكِنْ نَبِيِّ اللَّهِ۔ اس سے واضح ہے کہ یہ لفظ نبیؑ سے مشتق ہے۔ نبی اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالم الغیب و الشهادة (دنیاۓ محسوس و غیر محسوس) دونوں کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیاۓ محسوسات تک پہنچاتا اور انہیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے۔ رسول اللہؐ نے جب اپنی نبوت کا اعلان قریش کے سامنے کیا تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور قوم سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک دشمن کا لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے کے لئے چلا آ رہا ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور کریں گے۔ (ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ اسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑ کی دوسری جانب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہم دامن کوہ سے اس کی دوسری سمت نہیں دیکھ سکتے)۔ اور دوسرے اس لئے کہ آپ نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اسی طرح اس حقیقت کو بھی مان لو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش زندگی کے نتائج، ہلاکتوں اور بربادیوں کا ایک لشکر جرار اپنے ساتھ لئے تمہاری طرف بڑھ چلے آ رہے ہیں۔ لہذا تم اس روش کو چھوڑ کر زندگی کی صحیح روش اختیار کرو۔

اس سے مقام نبوت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔ یعنی نبی، علم کے اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں وہ (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہ مقام نبوت ہے۔ پھر وہ اس علم (وحی) کو لیکر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تاکہ ان تک ان حقائق کو پہنچائے۔ اور عملاً مشکل کر کے دکھائے۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کا دوسروں تک پہنچانا)۔ نبوت، رسول اللہؐ پر ختم ہو گئی۔ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پاسکتا۔ (اس لئے کہ جس قدر وحی کی ضرورت تھی وہ دیدی

گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا)۔ باقی رہا فریضہ رسالت۔ یعنی اس وحی کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا۔ تو یہ فریضہ اس امت کے سپرد ہو گیا جسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا۔ (اسے تبلیغ اور اقامت دین کہا جائیگا۔ ”رسالت“ کہنے سے غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے)۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ رسول میں نبوت اور رسالت ایک ہی ذات کے اندر مجتمع ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم کی رو سے ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ختم نبوت کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس معنی میں رسول۔ لیکن تبلیغ (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانے) کا فریضہ امت کے سپرد ہے۔ لہذا امت اپنے نظام کی وساطت سے ”فریضہ رسالت“ کی ادائیگی کے لئے رسول اللہؐ کی جانشین ہے۔ قرآن کریم میں حضورؐ خاتم النبیین کی نبوت محفوظ ہے اور امت کے قرآنی نظام کے ذریعے ”فریضہ رسالت“ قیامت تک مسلسل آگے جاسکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہ لائے۔ یہ خیال قرآن کریم سے بے خبری پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ نے تمام انبیاء کو کتاب دی تھی۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔۔۔۔۔ (۲۱۳)۔ یہی الفاظ رسولوں کے لئے آئے ہیں (۵۶)۔ انبیاء کی انہی کتابوں کو مَآوُتِی النَّبِیِّیْنَ مِینَ رَبِّهِمْ (۱۳۶) کہا گیا ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا اَتَنسِیَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنی نَبِیًّا (۱۱) ”اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور (اس طرح) مجھے نبی بنایا ہے۔“ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسی لئے حضرات انبیاء کرامؑ کو (مثلاً خود نبی اکرمؐ کو) کہیں نبی کہا گیا ہے (۱۵) اور کہیں رسول۔ (۲۹)۔ حتکہ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے وَكَانَ رَسُولًا نَّبِیًّا (۱۶)۔ ”ایک پیغامبر (رسول) جسے نبوت عطا کی گئی تھی“۔ ختم نبوت (۳۳) کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرے۔ علم جس قدر وحی کے ذریعے دیا جانا مقصود تھا، وہ سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ لہذا الہام یا کشف وغیرہ کے ذریعے خدا سے براہ راست علم پانے کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدہ کے منافی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نبیؑ کا لفظ نَبَاوۃ سے مشتق ہے۔ لیکن اگر اسے نَبَا سے مشتق مانا جائے تو اس میں بھی بلندی مقام اور اخبار

عن الغیب (غیب کی باتوں سے باخبر کرنے) کے دونوں مفہوم آجائینگے۔  
اس "غیب" کے معنی وحی ہونگے جو نبی کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔  
(دیکھئے عنوان غ۔ ی۔ ب)۔ نہ کہ یہاں گوئیاں جن کے مدعی (مسلم  
اور غیر مسلم) ہر جگہ ملتے ہیں۔

## ن ب ت

النَّبَاتُ - النَّبَاتَاتُ - ہر وہ چیز جو زمین سے اُگے \*۔ النَّبَاتِیَّاتُ - اُگنے  
کی جگہ۔ اس مادہ میں ابھرنے اور نمایاں ہونے کے معنی بھی ہیں۔ چنانچہ لڑکی  
کے سینہ کے ابھرنے کے لئے نَبَتٌ قَدْ یُ الْعَجَارِ بَتْرَ کہا جاتا ہے اور لڑکے  
کے بالغ ہو جانے کو بھی نَبَتَتْ عَائِشَةُ الْغُلَامُ اور اَنْبَتَ الْغُلَامُ سے  
تعبیر کرتے ہیں۔ نیز النَّبَاتِیَّاتُ کے معنی تربیت کرنے کے آئے ہیں \*\*۔  
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوئی ہوئی چیز میں نشوونما  
ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَأَنْبَتَتْ مِنْ كَيْلٍ زَوْجٍ بَهِیْجٍ (۲۴)۔  
زمین ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے۔ سورہ آل عمران میں حضرت مریمؑ  
کے متعلق ہے وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (۳۶)۔ (اس کے رب نے) اُسے عمدہ  
پرورش سے پروان چڑھایا۔ یہاں جسمانی پرورش اور اخلاقی تربیت دونوں  
مقصود ہیں۔

نوع انسان کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنْ اَلْاَرْضِ نَبَاتًا (۹۱)۔  
اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تمہیں نباتات کی طرح نشوونما دیتا ہے  
اور یہ بھی کہ اللہ نے نوع انسان کو تمام کرہٗ ارض پر درخت  
کی شاخوں کی طرح پھیلا دیا ہے جس کی جڑ اور تنہا ایک ہی ہوتا ہے۔ نیز  
اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو زمین سے اسی طرح اگایا ہے  
جس طرح نباتات اگتے ہیں۔ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں ہے کہ تخلیق  
انسانی کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ (انسانی تخلیق  
اور نظریہ ارتقاء کے متعلق تفصیلات میری کتاب "اہلس و آدم" میں ملیگی)۔

## ن ب ذ

نَبَذَ - کسی چیز کو اسلئے پھینک دیا کہ اسکی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔  
چنانچہ النَّبْذُ ایسے بچے کو کہتے ہیں جسے راستے میں پھینک دیا گیا  
ہو \*\*\*۔ (یعنی ولد الزنا)۔ لہذا اسکے معنی ہیں کسی چیز کو حقارت کی وجہ سے



توجہ کے قابل نہ سمجھنا۔ نَبَذَ الْعَهْدَ۔ عہد کو توڑ دیا۔ نَبَذَ الْأَمْرَ۔ کسی کام کو پیکار چھوڑ دینا۔\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ہیں۔

آلَا نُنَبِّئُكَ۔ ایک طرف ہٹ جانا۔ کنارہ کش ہو جانا۔ (۱۹/۱)۔  
النَّبَذَ۔ کھجور یا کشمش کو پانی میں ڈال کر ایک طرف رکھ چھوڑنا تاکہ وہ نیچے بن جائے۔\*\*۔

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ (۳۱/۱)۔ سرمایہ دار اور اُس کا تمام مال ایک بے قدر و قیمت متاع کی طرح پیکار رہ جائیگا۔ (حُطَمَةُ کے لئے دیکھئے ح۔ ط۔ م)

سورہ انفال میں قوم مخالف سے معاہدات کے ضمن میں ہے کہ وَلَمَّا تَخَفْتُمْ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَتَهُ فَعَانَبْتُمْ آلِيَهُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ... (۵۸/۱)۔ اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خدشہ ہو تو ان سے برابری کی حالت میں معاہدہ کو ان کی طرف پھینک دو۔ یعنی خیانت کے خدشہ سے تم، بلا تنبیہ، پونہی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے لگ جاؤ۔ نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی فکر کرو۔ بلکہ جس برابری کی حیثیت سے تم نے ان سے معاہدہ کیا تھا، اسی حیثیت سے ان سے کہدو کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا اس لئے تمہارا اور ہمارا معاہدہ کا لعدم سمجھا جائے۔ عَلَىٰ سَوَاءٍ (یعنی انہیں برابری کی حیثیت دو۔ یا یکبارگی معاہدہ کو کالعدم قرار دینے سے انہیں اگر کسوٹی نقصان پہنچتا ہے تواز روئے عدل و انصاف انہیں اس نقصان سے بچاؤ) کی شرط جس اصولِ عدل کی گواہی دیتی ہے وہ قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، غیر مسلمانوں (زمانہ نبویؐ کے اہل کتاب) کی حالت یہ تھی کہ أَوْ كَلَّمَا عٰهَدُوْا عٰهَدًا نَّبَذُوْهُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ... (۱۱۱/۱) ”جب کبھی وہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو ان میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو (ردی کی ٹوکری میں) پھینک دیتا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں خالی نَبَذَ اور نَبَذَ عَلَىٰ سَوَاءٍ کا فرق بین طور پر سامنے آجاتا ہے۔

## ن ب ز

النَّبِيزُ۔ کسی کا نام دھرنے۔ کوئی برا لقب دینا۔ النَّبِيزُ۔ ایک دوسرے کو عار دلانا۔ ایک دوسرے کو عار دلانے والے القاب سے یاد کرنا۔ ایک دوسرے کے مذموم نام رکھنا۔ النَّبِيزُ۔ اخلاق اور حسب کے اعتبار سے کمینہ۔ النَّبِيزُ۔ کھجور کے درخت کا بالائی چھلکا۔

\*تاج و محیط و راغب۔\*\*محیط۔

قرآن کریم میں ہے - وَ لَا تَتَّبِعُوا بِأَنفُسِكُمُ الْغَفَّارَ (۲۱) - آپس میں ایک دوسرے کے طنز و تعقیر آمیز نام نہ دھرا کرو۔

## ن ب ط

الْغَبَطُ - وہ پانی جو کنواں کھودے ہر پہلے پہل نکلے۔ انْبَطَّ الْغَفَّارُ کھودنے والا کھودتے کھودتے پانی تک پہنچ گیا۔ اسی سے اس کے معنی ہوتے ہیں بات کو گہرائی سے نکال لینا اور ظاہر کر دینا\*۔ تحقیقات کے بعد بات کی اصل تک پہنچ جانا اور اسے ظاہر کر دینا۔ قرآن کریم میں ہے الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (۸۳) - ان میں سے وہ لوگ جو تحقیقات کے بعد بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے اس کے معنی استخراج کے ہیں\*۔ یہی معنی ابن فارس نے بھی لکھے ہیں۔ یعنی پیش نظر واقعات سے خاص نتیجہ نکالنا۔ اس کے غوامض تک پہنچ جانا۔

## ن ب ع

الْيَنْبُوعُ - چشمہ سے پانی کا نکلنا۔ الْيَنْبُوعُ - چشمہ، جہاں سے پانی نکلتا ہو (جمع يَنْبُوعَاتٌ)\*۔ قرآن کریم میں ہے - تَفْجُرُ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا (۱۶)۔ ”نو ہمارے لئے اس زمین سے چشمہ بہا دے“۔ سورۃ زمر میں ہے - فَسَلَّكَهُ يَنْبُوعًا رِیِّ الْأَرْضِ (۳۱)۔ ”پھر اسے (پانی کو) چشمے بنا کر زمین میں بہاتا ہے“۔ مَنَّاعُ الْمَاءِ - پانی پھونکنے کی جگہ\*۔

## ن ت ق

نَتَقَ - يَنْتَقِ - (يَنْتَقِ) - کسی چیز کو سخت حرکت دینا۔ اور هَلَاْنَا\* - وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۱۶) - جب ہم نے اس پہاڑ میں زلزلہ پیدا کیا جو ان کے سروں کے اوپر تھا۔ الْغَائِقُ مِنَ الْغَيْثِ - وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو اچھال اچھال کر اس کا کچھور نکال دے۔ یا اُسے گرا دے۔ الْغَائِقُ کے معنی اکھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں اور هَلَا کر جھاڑ دینے کے بھی\*۔ یہ سب حرکت ہی کے مظاہرے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنے کے ہیں کہ وہ ڈھیلی ہو جائے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھینچنے، ہلانے اور اسے اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے ہیں۔

## ن ث ر

نَشَرَ - يَنْشُرُ - نَشْرًا - کسی چیز کو بکھیر دینا - فَنَاشَرُ - پس وہ بکھر گئی - اَلنَّشْرُ - راز کی باتوں کو پھیلانا - بہت زیادہ باتیں کرنا - اَلْمُنَشَّرُ - کمزور آدمی جس میں کوئی بھلائی کی بات نہ ہو - اَلْمِنْشَارُ - اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس سے کچی کھجوریں گر جائیں - یعنی وہ پکنے سے پہلے ہی گر جائیں اور اس طرح اس کا پھل کسی کام نہ آئے - قرآن کریم میں مجرمین کے اعمال کے متعلق ہے فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا (۲۵/۲۴) ہم انہیں برے نتیجہ اور رائیگاں جانے والا بنا دینگے - مکافاتِ عمل کی میزان میں ان کا کچھ وزن نہیں ہوگا - وہ فضا میں منتشر ذرات کی طرح ہو جائیں گے - یعنی وہ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے - ("برے نتیجہ" رہ جانے سے یہی مطلب ہے) -

بکھرنے کے معنوں میں سورۃ انفطار میں ہے - اِذَا الْكُتُوبُ اُكْبِدَتْ اَنْتَشَرَتْ (۸۲/۴) - جب ستارے بکھر جائیں گے - ان کا شیرازہ منتشر ہو جائیگا -

## ن ج د

اَلنَّجْدُ - زمین کا وہ حصہ جو باند اور سخت ہو - نیز بلند ، کھلے اور واضح راستے اور ، ماہر راہنما کو بھی کہتے ہیں \*\* -

نَجْدًا اَلَا "مر" يَنْجِدُ - معاملہ واضح اور ظاہر ہو گیا \*\* - قرآن کریم میں ہے - وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۱۰۱/۲) ہم نے انسان کو (حق و باطل کے) دونوں راستے (وسی کے ذریعے) دکھا دیے - اب اس کے بعد وہ صاحب اختیار ہے کہ ان میں سے جو نسا راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کر لے - واضح رہے کہ حق و باطل کے راستے ، وسی (قرآن) کی "رو سے دکھائے گئے ہیں - انسان کے اپنے اندر اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ وحی کی روشنی کے بغیر از خود خیر و شر میں تمیز کر سکے - (دیکھئے عنوان ل - ہ - م اور ف - ط - ر) -

نیز ، خدا کا کام صرف راستے دکھا دینا ہے - صحیح راستہ پر چلا دینا نہیں - یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ جو نسا راستہ چاہے اختیار کر لے - یہی اختیار ، انسان کو اس کے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بنا دیتا ہے اور اسی سے وہ اپنے اعمال کے (اچھے اور برے) نتائج کا مستحق قرار پاتا ہے -

\* تاج و محیط و راغب - \*\* تاج و راغب -

## ن ج س

النَّجَسُ\* - یہ طّاہیر\* کی ضد ہے (جس کے لئے دیکھئے عنوان ط - ۵ - ر) قدّ نجس\* ثوبہ\* - اس کا کپڑا ناہاک ہو گیا\* - راغب نے کہا ہے کہ نجاستہ\* - دو طرح کی ہوتی ہے - ایک تو وہ جس کا ادراک حواسہ (بصارت) سے کیا جا سکتا ہے - اور دوسرے وہ جس کا ادراک بصیرت سے کیا جا سکتا ہے - جیسے دل کی آلودگی - نگاہ کی ناہاک - انہی معنوں میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ (۲۸) ”مشرکین یقیناً آلود گیوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں“ - دَاعُ ناجیس\* - ایسی بیماری جس سے انسان اچھا نہ ہو\* -

اہل عرب اپنے بچوں کے گلے میں آسیب اور نظر بد وغیرہ سے بچنے کے لئے تعویذ پہنا دیا کرتے تھے - یہ تعویذ گندی چیزوں کے ہوا کرتے تھے - مثلاً\* مردوں کی ہڈیاں - یا حیض کا کپڑا وغیرہ - اسے وہ النَّجَسُ جیسے کہتے تھے\*\* - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ازالہ نجاست کی وجہ سے اس عمل کو النَّجَسُ جیسے کہا گیا ہو -

## ن ج م

النَّجْمُ\* - ستارہ جب وہ نکلا ہوا ہو - جمع اَنْجُم\* اور نَجُوم\* - نیز اَلنَّجْمُ\* اُس ہودے کو کہتے ہیں جسکا تنہ نہ ہو اور وہ زمین پر پھیل جائے - برخلاف اَلشَّجَرُ\* کے جسکا تنہ ہوتا ہے\*\*\* - اَلنَّجْمُ\* وَالشَّجَرُ\* يَسْتَجِدُّ اَنْ (۵۹) کے یہی معنی ہیں - (یہ دونوں لفظ اسم جمع ہیں - ان کا واحد ”نَـ“ سے بنتا ہے - اگرچہ ، جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے ، اَلنَّجْمُ\* کی جمع بھی آتی ہے - ویسے ، اسم جمع بالعموم لفظاً واحد استعمال ہوتے ہیں اور معنای جمع - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں - اَلنَّجْمَةُ\* کلمہ (لفظ اور بات) کو بھی کہتے ہیں\*\*\* - قرآن کریم کے آہستہ آہستہ بالاقساط نازل ہونے کو بھی اَلنَّجْمُ\* کہا جاتا ہے\*\*\* - لیکن قرآن کریم میں اس مفہوم کے لئے یہ لفظ نہیں آیا -

نَظَرَ فِي الْأُمْرِ\* - کسی معاملہ میں اس غرض سے غور و فکر کرنا کہ اسکی تدبیر کس طرح سے کی جائے - چنانچہ سورہ صافات میں حضرت ابراہیم\* کے متعلق جو ہے کہ فَتَنَّا نَظَرَ نَظْرَةً فِي النَّجْمِ\* (۳۸) تو اسکے معنی غور و فکر

کس نے کے ہیں \*۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم نے (ن - ظ - ر) کے عنوان میں لکھا ہے۔ یعنی نکتہ چینی کرنا۔ عیب نکالنا تنقید کرنا۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ النَّجْوُ "رؤسائے قوم یا چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو کہتے ہیں"۔ برخلاف الشَّمْس "جس سے مراد ایران کی سلطنت ہے (۱۱۴)۔"

## ن ج و

نَجَاءٌ - نَجَاةٌ - نَجَاتٌ - کسی ایسی چیز سے محفوظ رہنا جس میں خطرہ ہو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ نَجْوَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بلند جگہ - النَّجْوَةُ وَالْمَنْجَى - اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس کی بلندی کی وجہ سے اس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔ راغب نے کہا ہے کہ النَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ - اس جگہ کو کہتے ہیں جو اپنی بلندی کی وجہ سے ارد گرد سے الگ اور ممتاز نظر آئے \*\*\*

نَجَا - يَنْجُو - نَجَاءٌ - تیز چلنے اور آگے نکل جانے کو بھی کہتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے اِذَا سَافَرْتُ ثُمَّ فِي الْجَدْوِ بَتَّ فَاَسْتَنْجُوا۔ جب تم کسی خشک اور قحط زدہ زمین میں سفر کرو تو وہاں سے تیزی سے گذر جاؤ۔ اسی لئے نَفَاةٌ فَاجِيَةٌ - تیز رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں \*\*\*۔

راغب نے کہا ہے کہ نَجَاءٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں \*\*\*\*۔ نَجَا غُصُونُ الشَّجَرَةِ - درخت کی شاخیں کاٹ دیں۔ نَجَا النِّجْدَ کے معنی ہیں کھال کھینچ دی \*\*\*۔ ابن فارس نے اس کے دو بنیادی معنی لکھے ہیں جو باہم مدغم متضاد ہیں۔ (۱) کسی چیز کو چھیل دینا اور کھول دینا۔ اور (۲) چھپانا اور پوشیدہ کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اسکا استعمال بلندی کے معنوں میں بھی بتایا ہے۔

اس لفظ کے بنیادی معنوں کو سامنے رکھنے سے نجات کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں انسان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کے جیل خانے میں بری طرح قید ہے۔ اسے اس قید سے رہائی مل جانے کا نام نجات ہے۔ ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں، اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے۔ اس سزا سے خلاصی مل جانے کا نام نجات ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ابن آدم پیدائشی طور پر اپنے

اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے آتا ہے اور اس کثافت سے اسکا چھٹکارا ناممکن ہے جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے۔ ویدانت (یعنی ہندوؤں کے تصوف) کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح (آتما) اپنی اصل (پرماتما) سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنسکر چیخ پکار کر رہی ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پا کر جزو کا اپنی اصل سے جا کر مل جانا نجات ہے۔ ایسا ہی تصور بدھ مت میں ہے جنکا عقیدہ ہے کہ ہر آرزو ایک مصیبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ انسان، ترک آرزو سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ اسے نروان کہتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان مذاہب نے تصور یہ دیا ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے اچھی حالت میں تھا۔ اس میں آکر یہ مصیبت میں پھنس گیا۔ اب اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے، پھر سے اپنی پہلی حالت میں پہنچ جانا (نجات) مقصود حیات ہے۔ قرآن کریم ان تمام تصورات کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان نہ تو اپنے کسی سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے اور نہ ہی اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کی آلودگی کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے دنیا جیل خانہ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود حیات ہو۔ نہ ہی انسانی روح، خدا کی روح کا جزو ہے جو مادہ کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور یہاں سے خلاصی پا لینے کا نام نجات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ ایک سادہ لوح (Clean Slate) لیکر دنیا میں آتا ہے۔ اسے فطرت کیطرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اس میں ”کچھ بننے“ کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) ہوتی ہیں۔ ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصود حیات ہے تاکہ انسان اس زندگی سے بلندتر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ مقصود زیست (As you Were) ہونا نہیں۔ ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہے۔ زمین کی زندگی انسان کی تربیت گاہ ہے۔ اس میں اسکی ذات کی نشوونما (Development) ہوتی ہے جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگواریاں اور شاد کامیاں حاصل کر لیتا ہے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ لہذا دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لینا مقصود حیات نہیں۔ اس دنیا کو مسخر کر کے اسکی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اسطرح اپنی ذات کی نشوونما اور انسانیت کی فہر و فلاح حاصل کرنا مقصود حیات ہے۔

دنیا میں باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش لازمی ہے۔ اور اس کشمکش ہی سے انسانی ذات کا استحکام ہوتا ہے۔ جو جماعت، قانون خداوندی کے

مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے ان مستبد قوتوں کی گرفت سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور تباہی اور بربادی سے مصئون۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی غلط روش کی وجہ سے مستبد قوتوں کے فولادی پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اسکے بعد پھر قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو اسے ان سرکش قوتوں کے دامِ ہلا سے رہائی مل جاتی ہے۔ اس کے لئے بھی نجات کا لفظ آیا ہے۔ (جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے رستگاری نصیب ہو جانا ان کی نجات تھی)۔

اب رہی مرنے کے بعد جہنم کی سزا سے نجات۔ سو اس کے متعلق یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی بعض لغزشوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے جہنم میں رہیں گے اور اس کے بعد، جب اس سزا کی مدت ختم ہو جائے گی یا ان گناہوں کی کشافتیں دور ہو جائیں گی تو پھر جنت میں چلے جائیں گے (۳۳)۔ یعنی ان کے ہاں جہنم سے مفہوم یہ ہے کہ یا تو انسان اس میں ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے بھیجا جائیگا اور یا اس لئے کہ اس کے گناہ دھل جائیں اور وہ پاک و صاف ہو کر جنت میں چلا جائے۔ اسکا نام ان کے ہاں نجات ہے۔

یہ دونوں تصور بھی قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے انسان جہنم میں نہ تو ایک قیدی کی طرح ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے جاتا ہے اور نہ ہی جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں گناہوں کی کشافتیں صاف ہوتی ہیں تاکہ انسان پاک و صاف ہو کر جنت میں جائے۔ قرآن کریم کا تصور یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمحل صلاحیتوں (ذات) کی اتنی نشوونما ہو جائے کہ وہ زندگی کی اگلی منزل (یعنی مسلسلہ ارتقاء کی اگلی کڑی) تک پہنچنے کے قابل ہو جائے تو اسے جنت کی زندگی کہنے میں جس میں اسکی نشوونما مزید ترقی حاصل کرتی رہتی ہے۔ لیکن اگر وہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے تو اسکی نشوونما رک جاتی ہے۔ اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں\*۔ جس کی نشوونما رک جاتی ہے وہ زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ اسی مقام پر رکا رہتا ہے۔ اس لئے کسی کے ”جہنم“ سے نکلنے

\* واضح رہے کہ جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی۔ اس مقام پر جس جنت اور جہنم کی زندگی کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے۔

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے جسکی رو سے (یہودیوں کی طرح) سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے (یا پاک و صاف ہونے) کے لئے کچھ وقت کے لئے جہنم میں جائیگا اور پھر وہاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائیگا۔ (اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے تفصیل ان امور کی جہنم اور جہیم وغیرہ عنوانات میں ملے گی)۔

نَجْوٰی کے معنی سرگوشی اور رازداری کی باتیں کرنے کے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بستی سے باہر جا کر کسی بلند مقام پر بیٹھ کر آپس میں رازداری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور اسکیمیں بنایا کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نَجَاۃ سے ماخوذ ہے۔ اس طرح نَجْوٰی کا مطلب ہوگا، مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اِنْتَجٰی کے معنی بلند مقام پر بیٹھنے کے ہیں\*۔ نَجِیۃ۔ ہم راز جس کے ساتھ سرگوشی کی جائے (۱۹)۔ اسی سے فعل نَجٰی و تَنَجٰی۔ باہم سرگوشی کرنے کے لئے آتا ہے۔ ترآن کریم میں نجوی کا لفظ راز اور مشوروں کے معنی میں کئی جگہ آیا ہے (مثلاً ۲۴ : ۵۸)۔

سورہ یونس میں فرعون۔ حضرت موسیٰؑ کی غرقابی کے سلسلہ میں ہے فَالْيَوْمَ اَنْتَ جَثِيۡمٌ بِيَدِ نٰۤيۡكٍ لِّتَكُوۡنَ لِمَنۡ خَلَفَكَ اٰیۡةٌ (۱۳)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ اس میں نَسَجَیۡم کے معنی ہیں کسی بلند جگہ پر پھینک دینا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ فرعون غرق ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا تھا تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آیۃ عبرت بن سکے۔ مصر کے تہ خانوں سے، فراغشہ کی جو لاشیں ملی ہیں اس میں فرعون حضرت موسیٰؑ کی لاش بھی موجود ہے (دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ عنوان ممی)۔ چونکہ یہ انکشاف حال ہی کا ہے اور ہمارے قدیم مفسرین کو اس کا علم نہیں تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ (یہی وجہ ہے کہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس آیت میں بَدَن کے معنی زرہ کے کئے ہیں۔ یعنی فرعون کی زرہ پانی سے باہر، بلند جگہ پر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن مذکورہ صدر انکشاف نے حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا ہے کہ بَدَن سے مراد فرعون کی لاش ہی ہے)۔



قرآن کریم نے اپنے حقائق کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جوں جوں  
انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں یہ نقاب عوقی جائیں گی، قرآنی حقائق کی  
وضاحت عوقی جائیگی (۳۱)۔ ان 'نشانوں' کے یہ نقاب ہونے کا ایک طریق  
تاریخی شواہد کا حامنہ آنا بھی ہے، جیسا کہ فرعون کی لاش کے سلسلہ میں ہوا۔

## ن ح ب

النَّحْبُ - وہ نذر (منت) جس کے واجب ہونے کا فیصلہ کر لیا جائے \*۔  
نَعَبَ الرِّقْلُ - بَنَحْبُ - آدمی نے نذر مانی \*\*۔ التَّنْحِيْبُ - لگا تار  
سرگرمی اور انہماک سے کام کرنا۔ النَّحْبُ - موت۔ جوا اور قمار بازی کو بھی  
کہتے ہیں کیونکہ اس میں شرط باندھی جاتی ہے جس کا پورا کرنا واجب  
ہو جاتا ہے۔

النَّحْبُ - خطرہ عظیم \*\*\*۔ بلند آواز سے رونا \*\*\*۔ ابن فارس نے بھی  
یہ دونوں معانی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ قَتَلَ نَحْبَةً - (۳۳)۔ ان میں  
وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی نذر (واجبات) کو پورا کر دیا۔ حق کی خاطر جان  
دے دی۔

## ن ح ت

تَحْتَ يَنْحَتُ و يَنْحِتُ - کسی چیز کو چھیلنا۔ تراش کر ہموار  
کرنا \*\*\*۔ النَّحْتُ - بڑھئی کے لکڑی چھیلنے کو کہتے ہیں \*\*\*\*۔  
قرآن کریم میں ہے - وَ تَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا (۲۴)۔ تم  
پہاڑوں کو کاٹ اور تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔

## ن ح ر

نَحَرَ الصِّدْر - سینے کا اوپر کا حصہ۔ سینہ پر جہاں ہار پہنا جاتا  
ہے۔ نَحَرَ الْبَيْتِ - يَنْحَرُهُ - نَحَرَ - اس نے اونٹ کے سینہ سے متصل  
اس جگہ پر نیزہ سارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (اونٹوں کو اسی طرح  
ذبح کرتے ہیں) \*\*\*۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس سادہ سے کئی الفاظ  
آتے ہیں۔ سینے کو بھی کہتے ہیں اور سینے کے چیر دینے کو بھی۔

قرآن کریم میں ہے - فَصَلَّ لِرَبِّكَ وَ انْحَرْ (۱۸)۔ اس میں  
وَ انْحَرْ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا

ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔ (۲) نماز میں دایاں ہاتھ ہائیں پر رکھنا۔  
 (۳) قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرنا۔ (۴) نماز میں سینے پر ہاتھ  
 بالادھنا۔ (۵) نماز میں (نحر تک) ہاتھ اٹھانا۔ (۶) اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ  
 کر کھڑے ہونا۔ (۷) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔ (۸) دن کے ابتدائی حصہ  
 میں (قبلہ رخ) کھڑے ہونا\*۔ لیکن نَحَرَ کے معنی ہیں دسترس پیدا کرنا۔  
 کسی بات پر حاوی ہو جانا۔ اسے اچھی طرح حاصل کر لینا۔ نَحَرْتُ الشَّيْءَ  
 عِلْمًا۔ میں علم کے ذریعے اس معاملہ پر حاوی ہو گیا\*\*۔ نَحَرْتُ الْأُمُورَ  
 عِلْمًا۔ اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا\*\*\*۔ چنانچہ اَلنَّحْرُ  
 وَالنَّحْرُ بَرٌّ کے معنی ہیں ماہر۔ عقل مند۔ تجربہ کار۔ ہر چیز کو سمجھنے  
 اور دیکھنے والا اور مضبوطی سے اس پر عمل کرنے والا\*\*\*۔ اس لئے وَانْحَرُ  
 (۱۶۸) کے معنی ہونگے، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور  
 تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہو کر، ان پر نہایت مضبوطی سے  
 عمل پیرا رہو۔

لیکن اگر اس آیت میں وَانْحَرُ سے مراد ”اونٹ کا ذبح کرنا“ لیا  
 جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جب  
 رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار  
 اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور  
 تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے  
 ڈھونڈتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں  
 کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو  
 قابلِ اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ  
 مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔ قرآن  
 کریم نے ہین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں ”اونٹ ذبح کرو“۔ یعنی  
 دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔ چنانچہ اس کمزور  
 جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی  
 فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ [اس ضمن  
 میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں ”کوشر“ حلال ذبیحہ کو کہتے  
 ہیں۔ اَلْكَوْثَرُ (۱۶۸) اسی سے عربی میں اعتبار سے اِنشَاءً عَطَيْنَاكَ  
 اَلْكَوْثَرَ (۱۶۸) کے معنی ہونگے ”ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحہ  
 کے عطا کیا“۔ لیکن ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی۔ دیکھئے عنوان  
 (ک۔ ث۔ ر) I۔

## ن ح س

النَّحَّاسُ\* (نون پر تینوں حرکتیں جائز ہیں)۔ پگھلا ہوا تانبہ۔ پیتل یا لوہے کو جب کوٹا جائے تو اس میں سے جو چنگاریاں اڑتی ہیں انہیں بھی کہتے ہیں۔ نیز اس اونچے ہو جانے والے دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جس میں خفیف حرارت ہو لیکن لپٹ اور شعلہ نہ ہو\*۔ راغب نے اس کے معنی ایسے شعلہ کے لکھے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔ یہیں سے نَحَّسَ\* ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ افقِ آسمان نَحَّاسٌ کی طرح سرخ ہو جائے۔ اسے عرب نجوست کی نشانی سمجھتے تھے\*\*۔ اسی سے النَّحَّاسُ ہر تاریک معاملہ کو کہتے تھے۔ اور مشقت، تکلیف، نقصان، ضرر اور تکان کو بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَّسَتْ اِلَّیْلٌ قُلَانًا۔ اونٹوں نے فلاں آدمی کو تھکا دیا۔ النَّحَّاسُ۔ اُن تین راتوں کو کہتے جن کا بڑا حصہ چاند نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہوتا ہے۔ تَنَحَّسَ قُلَانٌ۔ فلاں آدمی اونداھا ہو گیا۔ تَنَحَّسَ الرَّجُلُ۔ آدمی بھوکا رہا۔ نَحَّسَتْهُ نَحَّسًا۔ اس نے اس کے ساتھ بے مروتی کی۔ جفا کی۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَیْقَامٌ نَحَّسَاتٌ سخت سردی کے دنوں کو بھی کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سعادت کی ضد ہیں۔ النَّحَّاسُ پیتل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سونا چاندی کے مقابلہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کم تر ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں نَحَّاسٌ (۵۵/۳۵)۔ دھوئیں یا چنگاریوں کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ یعنی جہنم کا عذاب۔ سورہ قمر میں قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ان پر سخت جھکڑ آیا فی یومٍ نَّحَّسٍ مُّسْتَمِیْرٍ (۹۴/۱۹) ان کی مسلسل مصیبت کے دن میں۔ (یومٍ نَّحَّسٍ مرکب اضافی ہے) اسی کو دوسری جگہ اَیْقَامٌ نَحَّسَاتٌ (۲۱/۱۶) کہا گیا ہے۔ ہر مشقت ایام۔ (مرکب توصیفی)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سعد و نجس کا مفہوم وہ نہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے۔ ہمارے ہاں (مثلاً) کہتے ہیں کہ منگل کا دن منجوس ہوتا ہے۔ یہ خالص ہندوانہ تصور ہے اور توہم پرستی پر مبنی۔ کوئی دن یا کوئی گھڑی فی ذاتہ نہ سعید ہوتی ہے نہ منجوس۔ جسدن کسی پر اس کے کسی غلط کام کی وجہ سے مصیبت آتی ہے وہ دن اس کے لئے منجوس ہوتا ہے (یعنی مصیبت کا دن) اور جسدن کامیابی اور

شاد کامی اسکے سامنے آئے وہ دن سعید - لہذا سعادت اور نحوست انسان کے اپنے اعمال ہی کے نتائج کا نام ہے - (نیز دیکھئے عنوان س - ع - د)

## ن ح ل

النَّحْلُ - شہد کی مکھیاں\* - (۱۶۸) - النَّحْلَةُ النَّحْلَةُ - وہ عطیہ جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے دیا جائے\*\* - سورہ نساء میں ہے وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدَقَاتِهِنَّ النَّحْلَةَ (۲۴) - عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ، ہلا بدل دے دو - اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر وہ عطیہ (Gift) ہے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفہ دیا جاتا ہے\* - أَلْعَطَاءُ بِلَا عِيَاضٍ (لطائف اللغة) - تاج اور ابن فارس نے النَّحْلُ کے یہی معنی لکھے ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ یہ لفظ نَحْلٌ ہی سے مشتق ہے - یعنی جس طرح شہد کی مکھی ہلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید چیز عطا کر دیتی ہے، اسی طرح النَّحْلَةُ وہ شیریں تحفہ ہے جو عورت کو بطیب خاطر اور بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ہے - یہ ہے مہر کی حقیقت - (قرآن کریم میں مہر کا لفظ نہیں آیا) - یعنی یہ کوئی معین رقم نہیں جو بطور معاوضہ دی جائے - بلکہ تحفہ ہے جو کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مودت اور محبت کے اظہار کے لئے دیا جائے - اور جس پر دونوں فریق رضامند ہو جائیں - مقصود اس سے عورت کا وزن بڑھانا، اس کے وقار میں اضافہ کرنا ہے -

## نَحْنُ (ضمیر)

نَحْنُ - ضمیر مرفوع منفصل ہے - تثنیہ (دو) اور جمع متکلم کیلئے آتی ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے یکساں طور پر استعمال ہوتی ہے - نَحْنُ رَجُلَانِ - ہم دو مرد ہیں - نَحْنُ امْرَأَتَانِ - ہم دو عورتیں ہیں - نَحْنُ رَجُلٌ - ہم سب مرد ہیں - نَحْنُ نِسْوَةٌ - ہم سب عورتیں ہیں - سورہ بقرہ میں ہے نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ (۲) - ”ہم تو مذاق کرتے ہیں“ -

## ن خ ر

نَخْرٌ - يَنْخَرُ - آواز یا سانس کو ناک میں کھینچنا - ناک سے نکلنے والی آواز نَخِيرٌ کہلاتی ہے - النَّخْرَةُ خود ناک کو بھی کہتے ہیں -

\* تاج - \*\* راغب -

نَخْرَةٌ \* الْاَنْفَر - ناک کے اگلے حصے اور اسکی نوک کو کہتے ہیں \*۔  
 ناک کا شکاف - نثنا \*\*\* - اسی سے عَطْمٌ \* نَخِرٌ \* اس بوسیدہ ہڈی کو کہتے  
 ہیں جو اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی ہو \*۔ قرآن کریم میں عِظَامًا  
 نَخِيرَةً (۱۶۱) - بوسیدہ ہڈیوں کے لئے آیا ہے - نَخِيرَتِ الشَّجَرَةِ \* درخت  
 میں سے آواز نکلی - یہ اس وقت ہوتا ہے جب درخت بوسیدہ اور کھوکھلا  
 ہو جائے اور اس میں ہوا کے گزرنے کے لئے سوراخ ہو جائیں ، تو ہوا کے  
 چلنے سے اس میں سے آواز نکلے \*\*۔

## ن خ ل

نَخْلَتُهُ \* اسے صاف کیا - پسند کر لیا \* - نَخَلٌ الدَّقِيقُ \* آٹے  
 کو چھانی میں چھان لیا \* - اَلْمُنْخَلُ اور اَلْمُنْخَلُ \* چھانی - اَلنَّخْلُ \*  
 اَلنَّخِيلُ (واحد نَخْلَةٌ) - کھجور کے درخت - جو درخت کھجور کے  
 مشابہ ہوں مثلاً ناریل وغیرہ ، ان کے لئے بھی یہی لفظ بولتے ہیں (۲۶۶ : ۲۶۵ ;  
 ۲۶۸) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتخب کرنا اور  
 پسند کرنا ہیں - کھجور کے درختوں کو اَلنَّخْلُ اس لئے کہتے ہیں  
 کہ وہ تھے دار درختوں میں سب سے زیادہ بلند و برتر ہوتے ہیں -

## ن د د

نِدَّ \* معنی ہیں کسی کی مثل اور نظیر - لیکن یہ اسی مثل کے لئے  
 بولا جاتا ہے جو کسی کے جوہر و بنیاد (Basic characteristics, or Essence) میں  
 شریک ہو - اور چونکہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں انتشار و تنفر بھی پایا  
 جاتا ہے ، مثلاً نَدَّ الْبَعِيرُ \* اونٹ بدکا اور جدھر منہ اٹھا چل پڑا - نَدَّ \* نفرت ،  
 مخالفت ، اور علیحدگی کو کہتے ہیں - اس لئے نِدَّ مد مقابل کو کہتے ہیں -  
 یعنی ایسا شخص جو تمہاری مخالفت کرے - تم اسے ایک طرف لے جانا چاہو  
 اور وہ تمہیں دوسری طرف کھینچے - اور جسقدر تم اسے اپنی طرف لے جانے  
 میں زور لگاؤ اسی قدر وہ تمہیں اپنی طرف لے جانے میں کوشش کرے - چنانچہ  
 اَلنَّادُّ \* کے معنی ہیں متفرق ہونا - ایک دوسرے سے متوحش ہونا \*\*\* - ابن  
 فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انتشار و افتراق کے ہیں -  
 تَنَدُّدٌ \* کے معنی ہیں کسی کی برائیوں کو اچھالنا اور شہرت دینا - لَيْسَ  
 لَهُ نَدَّ \* کے معنی ہیں اسکے پاس رزق نہیں - یعنی کوئی بدکنے والا جانور  
 نہیں \*\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تمہارے لئے رزق پیدا کرتا ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲۶)۔ سو تم خدا کے مقابلہ میں ایسی طاقتوں کو تسلیم نہ کرو جنہیں تم (بزعم خویش) سمجھتے ہو کہ اسکی مثل و نظیر ہیں۔ یعنی خدا کی اس بنیادی خصوصیت (رزاقت) میں شریک ہیں۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔ وَ مِّنَ النَّاسِ مَنۡ يَّخۡفِیۡ ذُنُوبَہٗ عَنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یَّحِبُّۡنَہُمۡ اللّٰہُ (۲/۲۶۵)۔ یہاں اَنْدَاد سے مراد ہیں تمام وہ قوتیں جو خدا کے مد مقابل ٹھہرائی جاتی ہوں اور انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہوں (حُب کے یہی معنی ہیں)۔ یا وہ جاذبیتیں جن کی طرف انسان کھینچ کر چلا جاتا ہے۔ لہذا جس قوت کے سامنے آپ اس کے خوف سے جھکیں یا نفع کی امید سے اسکی طرف کھینچیں اور اس میں قانون خداوندی کا سرشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو وہ خدا کے مقابلہ میں نید ہو جائیگی۔ ایسا عقیدہ، تصور یا نظام جس میں کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو وہ اقتدار اور اختیار حاصل ہو جائے جو قوانین خداوندی کے لئے مخصوص ہے، "انداداً من دون اللہ" کا مظہر ہے۔

[بَیِّنَاتِ التَّنَادِرِ کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ د۔ و]

## ن د م

نَدَامَۃٌ\*۔ اس افسوس کو کہتے ہیں جو کسی ہاتھ سے نکل جانے والے معاملہ پر رائے بدل جانے سے پیدا ہو\*۔ نیز اپنی کوتاہی پر نفس کو برا بھلا کہنا، یا ایسا غم جس میں انسان بہ کہے کہ جو کچھ اس سے ہو گیا وہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا\*\*۔ پچتانا۔ ہشیمان ہونا۔ سورۃ یونس میں ہے وَأَسْرَوْا النَّدَامَۃَ (۱۰/۵۶)۔ "وہ ندامت کو چھپائینگے (یا ندامت ظاہر ہو جائیگی)"۔ نَادِمٌ\*۔ جسے ندامت ہو۔ اس کی جمع نَادِرِمِیْنٌ ہے۔ (۱۰/۳۶)۔ اَلنَّادِرِیْمُ\*۔ ساتھ بیٹھ کر شراب پینے والا\*۔

## ن د و (ی)

النَّدَىٰ کے بنیادی معنی ہیں رطوبت، نمی، شبنم۔ نَدَىٰ لَا رُضَ۔ زمین کی نمی۔ شَجَرٌ نَدِیَّانٌ\*۔ تر و تازہ درخت\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا اور یک جا ہونے (۲) رطوبت اور نمی کے ہیں۔

\*تاج و راغب - \*\*تاج - \*\*\*تاج و محیط و راغب -

چونکہ جس شخص کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو وہ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور اس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے اس لئے اَلنَّیْدَاءُ کے معنی خدائی آواز بلند کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی محض اونچی آواز، جس میں الفاظ نہ ہوں\*۔

آواز دینے کے مفہوم سے اس کے معنی ایک مجلس میں اکٹھے ہو کر باتیں کرنے کے ہو گئے۔ نَادَاہُ مُنَادَاةٌ۔ کسی کے ساتھ مجلس میں بیٹھا۔ اَلنَّادِیُّ وَالنَّادِیُّوۃُ۔ جہاں قوم جمع ہو کر بیٹھے اور باتیں کرے۔ نیز اَلنَّشِدُّوۃُ جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ دَارُ النَّدْوَةِ۔ مکہ میں ایک مکان تھا جس میں قریش مشورہ کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ اَلنَّادِیُّ۔ قبیلہ (جسے مدد کے لئے آواز دی جاتی ہے)۔ یا ہم نشین۔ اَلنَّشِدُّوۃُ۔ سخاوت اور کرم کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمُنَادِیَّاتُ۔ رسوا اور ذلیل کرنے والے کام جن سے پیشانیاں عرق الود ہو جائیں\*۔

قرآن کریم میں نِیْدَاءُ (۱۲۱) بمعنی آواز آیا ہے۔ اور نَادَاۤیْلَا یُنَادِی نِیْدَاءً پکارنے (آواز دینے) کے معنوں میں (۱۸۸ و ۱۸۹) میں۔ سورۃ مریم میں اَحْسَنُ نِدْرِیْقًا (۱۱۱) کے معنی ہیں، باعتبار مجلس و اجتماع بہترین اور نہایت عمدہ۔ سورۃ العنکبوت میں نَادِیْکُمْ (۲۹) کے معنی مجلس اور محفل و اجتماع ہیں۔ سورۃ العلق میں ہے۔ فَلَّیْسِدُ ع نَادِیْسَہُ (۱۱)۔ وہ اپنے مصاحبوں کو یا قبیلہ والوں کو بلائے۔

تَنَادَاۤیْلَا۔ باہم آوازیں دینا اور ایک دوسرے کو پکارنا۔ قرآن کریم میں ہے۔ تَنَادَاۤیْلَا (۱۸۸)۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔

سورۃ المؤمن میں یَوْمَ التَّنَادِ (۲۳) آیا ہے جس کے معنی یہ کہہ کر بتا دے گئے ہیں کہ یَوْمَ تَوَلَّیْشُوْنَ مُدْیِرِیْنَ (۲۳)۔ جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہو گے۔ یعنی جس دن تم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارو گے لیکن کوئی کسی دوسرے کی مدد کے لئے نہیں آئیگا۔ سب، دہشت اور خوف کے مارے، منہ پھیرے، الٹے پاؤں بھاگ رہے ہونگے۔ مَا لَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِیْنٌ عَصِیْمٍ (۲۳)۔ (اس دن) ”تمہیں خدا کی گرفت سے (مکافاتِ عمل سے) بچانے والا کوئی نہیں ہوگا“۔ یہ ہے یوم التناد۔ جس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو اور کوئی کسی کو لا کہ آوازیں دے، اس کی مدد کے لئے پہنچنا تو درکنار، وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

## ن ذ ر

نَذْرٌ \* - (نقصان سے بچنے کے لئے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے۔ نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی نَذْرٌ کے معنوں میں داخل ہے \*۔ مثلاً کوئی شخص اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے کہ میرا بچہ تندرست ہو گیا تو میں یوں کروں گا، تو یہ نَذْرٌ کہلاتی ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کے پیش آنے پر کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا جو واجب نہ ہو \*\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ڈرنے اور ڈرانے کے لکھے ہیں \*۔ اور یہ کہ جو کچھ واجب ہو اسے نَذْرٌ کہا جاتا ہے۔

نَذِرَ بِالشَّيْءِ \*۔ کسی چیز کو جانا اور اس سے ہوشیار اور چوکنا رہا۔ اِنذَارٌ کے معنی ہیں کسی کو کسی ضرر رساں یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ (Warn) کر دینا اور اس کے خوفناک نتائج سے ڈرانے۔ لشکر سے آگے آگے جو ہراول دستہ جاتا تھا تا کہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اپنے لشکر کو آگاہ کرتا رہے اسے نَذِرٌ بِشَرِّهِ الْجَيْشِ کہتے تھے۔ اَلنَّذِيرُ \*۔ آگاہ کرنے والا۔ نیز کمان کی آواز (کیونکہ اسے سن کر شکار خطرہ سے آگاہ ہو جاتا ہے)۔ نیز بڑھاپے کو بھی نَذِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ آنے والی موت سے آگاہ کر دیتا ہے \*۔

لہذا نَذِرٌ کے معنی ہیں غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دینے والا۔ خواہ وہ کوئی انسان ہو یا واقعہ۔ اس کی جمع نَذْرٌ آتی ہے (۵۳)۔ (برخلاف بشیرِ کے جو صحیح روش زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دیتا ہے)۔

قرآن کریم میں نَذْرٌ (نَذْرٌ و نَذْرٌ) بمعنی واجبات کئی ایک مقام پر آیا ہے۔ (مثلاً ۲۲ و ۶۱)۔ یعنی وہ امور جو اپنے آپ پر واجب قرار دے لئے جائیں۔ اِنذَارٌ (تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے) کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۳۱)۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ اِنذَار (Warning) انہی کو فائدہ دے سکتی ہے جن میں زندگی کے آثار موجود ہوں۔ لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۱)۔ جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہ ہو انہیں ان نتائج سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے (۲۴)۔ اِنذَارٌ اُسی کے لئے ہے جو اپنے اوپر کچھ واجب کر لے اور اسے ادا نہ کرے۔ اُس سے کہا جاسکتا ہے کہ عدم ادائیگی فریضہ سے کیا نقصان



ہوگا۔ لیکن جس نے انسانی فرائض کو اپنے اوپر واجب ہی نہیں سمجھا، اُسے اُس کی روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرنا کیا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے؟ یا مثلاً جو شخص خود کشی پر آمادہ ہو اس سے یہ کہنا کہ دریا میں نہ کودنا، ڈوب کر مر جاؤ گے، بے معنی ہے۔ دریا کی ہلاکت انگیزیوں سے انتباہ اسی کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو ہلاکت سے بچنا چاہے۔ (اسے متقی کہتے ہیں)۔

نَذِيرٌ کی جمع نَذِيرٌ آتی ہے (نَذِيرٌ و نَذِيرٌ)۔ مُنْذِرٌ۔ آگاہ کرنے والا۔ اس کی جمع مُنْذِرُونَ ہے (مُنْذِرُونَ و مُنْذِرُونَ)۔ جیسے آگاہ کیا جائے۔ اس کی جمع مُنْذِرُونَ ہے (مُنْذِرُونَ و مُنْذِرُونَ)۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق کہا ہے کہ وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔ ان حضراتؑ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ (از روئے وحی) لوگوں کو بتائیں کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہونگے (اسے خوشخبری یا بشارت کہتے ہیں) اور ان کی خلاف ورزی کا انجام کس قدر ہلاکت آفریں ہوگا (یہ تنبیہ یا انذار کہلاتی ہے)۔ جو لوگ زندگی کی ہلاکتوں سے بچنا چاہتے (انہیں متقین کہا جاتا ہے) وہ ان کی انذار سے فائدہ اٹھا کر، صحیح روش اختیار کر لیتے۔ جو ان ہلاکتوں کی پرواہ نہ کرتے، وہ اس انذار پر کان نہ دہرتے۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۴)۔ آج تبشیر و انذار کا فریضہ قرآن کریم ادا کرتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بدلائل و شواہد بتا دیا ہے کہ فلاں روش زندگی کا نتیجہ کیا ہوگا اور فلاں کا انجام کیا۔ اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ تم جو نسی روش جی چاہے اختیار کرلو۔

## ن ز ع

نَزَعَ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھیڑ کر، نکال کر، الگ کر دینا۔ ہٹا دینا۔ نیز کھینچنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں انْتَزَعَ بھی آتا ہے۔ نیز انْتَزَعَ لازم بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی اکھیڑنا اور اکھڑ جانا دونوں ہی ہیں۔ نَزَعَ فِي الْقَوَسِ۔ کمان کو کھینچا۔ انْتَزَعَ الشَّيْءَ۔ وہ کسی چیز سے رگا اور باز رہا۔

سورة اعراف میں ہے يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (۲۴)۔ ان سے ان کا لباس کھینچ لیا یا اتروا دیا۔ سورة معارج میں ہے نَزَّاعَةً لِّلشَّوْلِ۔

(۶۶) - زور سے کھینچنے والی - کھینچ کر نکال لینے والی - وَ النَّازِعَاتُ غَرَقًا (۶۶) - کھینچنے والی - ابن درید نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے النَّازِعَاتُ اور النَّاشِطَاتُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ تارے ہیں جو ایک مقام سے نکل کر دوسرے مقام کی طرف جاتے اور ایک جگہ ڈوب کر دوسرے مقام میں طلوع ہوتے ہیں\* - مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ انقلابی جماعتیں ہیں جو ان صلاحیتوں اور قوتوں کو جو نیچے دب کر رہ گئی ہوں، کھینچ کر اوپر لاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کو پھر سے صالح بنا دیتی ہیں - (المقام المحمود - صفحہ ۱۷)

نَزَّاعٌ - چھین لینا - بمقابلہ اِشْتَاءٌ (دینا) (۳۵) - سورة الطور میں جنت کی زندگی کے ضمن میں فرمایا - يَتَنَزَّاعُونَ فِيْهَا كَمَا (۵۲) - ”وہ اس میں ایک دوسرے سے پیالہ لینگے“ - اگر اس کے عام معنی لئے جائیں تو یہ نقشہ ہے ان دوستانہ صحبتوں کا جس میں پورے خلوص و محبت کے ساتھ بے تکلفی سے چھین جھپٹ ہوتی ہے اور لطف صحبت دوبالا ہو جاتا ہے (لیکن اس میں لغویت کا شائبہ تک نہیں ہوتا - جیسا کہ اس سے اگلی آیت سے ظاہر ہے) - علاوہ ازیں، تَنَزَّاعٌ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ”لو - یہ پیالہ تم پیو“ - وہ جواب میں کہتا ہے ”نہیں - تم پیو“ - یہ باہمی پیش کش اور اصرار و انکار ایسا حسین تنازع ہے جس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں - یہ ہے جنتی معاشرہ میں اربابِ ذوق و محبت کی مخلصانہ محفلوں کا رنگ -

اور اگر اس سے ذرا بلند ہو کر دیکھا جائے تو يَتَنَزَّاعُونَ فِيْهَا كَمَا کے معنی یہ ہونگے کہ یہ (جماعتِ مؤمنین کے افراد) ایک دوسرے سے زندگی کی مٹے حیات بخش کا پیالہ لینگے - جنتی زندگی، انفرادی زندگی نہیں جس میں ہر ایک کو نفسا نفسی پڑی ہوتی ہے - وہاں تمام افراد ایک دوسرے سے وہ سامان لیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو برو مندی عطا کرتا ہے - لیکن اگر ہر شخص خود غرض بن جائے اور ہر ایک کی نیت یہ رہو کہ دوسرے سے سب کچھ چھین کر خود ہی رکھ لے، تو یہ تَنَزَّاعٌ وہ ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے (۶۶) - یعنی جنتی معاشرہ میں یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہوگا، اور ایک دوسرے کی نشو و نما کی خاطر - لیکن غلط معاشرہ میں ہر فرد کی نیت یہ ہوگی کہ میں دوسرے سے سب کچھ چھین جھپٹ لوں - اس مفہوم کے اعتبار سے النَّزَّاعَاتُ ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو اپنی صحیح سمتوں

سے ہٹ کر چلتی ہیں \*\*\*۔ (اور ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں)۔ یہاں سے تنازعہ کے معنی واضح ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں یہ ٹکراؤ نہیں ہوتا (۳۶)۔ بلکہ باہمی ہم آہنگی اور اَللَّفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ (۱۳۲) کی زندگی ہوتی ہے۔

## ن ز غ

نَزَّغ کے اصل معنی چبھونے، کھوپنچے اور طعن کرنے کے ہیں، اور بقیہ تمام معانی اسی سے ماخوذ ہیں\*۔ چنانچہ پھر اس کے معنی آتے ہیں کسی کام میں خرابی پیدا کرنے کے لئے اُس میں گھسنا\*\*۔ نَزَّغَ بَيْنَهُمْ نَزَّغًا۔ ان کے درمیان فساد ڈال دیا۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھار دیا\*\*\*۔ ابن فارس نے یہی اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں۔ سورۃ یوسف میں ہے مِّنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَّغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اَخْوَاتِيْ (۱۲۱)۔ بعد اس کے کہ شیطان (حسد کے جذبہ) نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزَّغٌ (۲۰۶)۔ جب (انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ) کوئی ایسی بات دل میں ڈالے جس سے فساد کا اندیشہ ہو۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے کا جذبہ... نیز (۱۸)۔ اَلْمُحِيزُ غَضَبًا۔ اس لہوے کی سلاخ کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکالنے والا روٹیوں میں چھید کرتا ہے\*\*\*۔ اور روٹی کو اس میں اٹکا کر تنور سے باہر نکالتا ہے۔

## ن ز ف

نَزَفَتْ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ختم ہو جانے اور منقطع ہو جانے کے ہیں۔ نَزَفَتْ مَتَاعَ الْبَيْتِ۔ اس نے کنوئیں کا تمام پانی کھینچ کر نکال لیا۔ نَزَفَتْ الْبَيْتُ۔ کنواں پانی سے خالی ہو گیا۔ اسی سے نَزَفَتْ فُلَانٌ کے معنی ہوتے ہیں فُلَان آدمی کی عقل جاتی رہی۔ وہ مست اور بے ہوش ہو گیا۔ اَنْزَفَتْ الرَّجُلُ۔ آدمی مست اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کی عقل کا چشمہ خشک ہو گیا۔ اَلْمُحِيزُ غَضَبًا۔ ڈھیکلی۔ وہ چھوٹا سا ڈول جو ایک لمبی لکڑی کے سرے میں باندھا جاتا ہے، پھر اس لکڑی کو درمیان سے ایک دوسری زمین میں گڑی ہوئی لکڑی سے باندھا جاتا ہے اور اس سے پانی نکالا جاتا ہے\*\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ (۳۶)۔ ”شرابِ جنت“ سے وہ بدست نہیں ہونگے۔ سَكَرَانَ نَزَفَتْ۔ وہ بدست آدمی جس کی عقل بدمستی کی وجہ سے جاتی رہی ہو\*\*۔

\*عبط۔ \*\*راغب۔ \*\*\*تاج۔ \*\*\*\*تاج و محیط۔

واضح رہے کہ سورۃ الصافات میں وَ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ آیا ہے (۳۷/۳۷) جو مجہول ہے۔ اور سورۃ واقعہ میں وَ لَا يُنْزَفُونَ (۵۱/۵۱) آیا ہے جو معروف ہے۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ جنت کی شراب کے پیالے (یا نہریں) کبھی خشک نہیں ہوں گی۔ یا اس شراب کے خواص (لذت و سرور) میں کمی واقع نہیں ہوگی۔

زندگی جوئے روان است و روان خواہد بود

این مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

## نزل

نَزَلَ - بلندی سے نیچے کی طرف آنا۔ چنانچہ قرآن کریم میں نَزَّوْلٌ - عُرْوَج کے مقابل میں آیا ہے (۳۳/۳۳)۔ نَزَلَ - منزل کو کہتے ہیں۔ نیز جن چیزوں سے مہمان کی تواضع کی جائے۔ اس کے معنی برکت اور عطاء کے بھی آتے ہیں (۱۹/۱۹ و ۱۸/۱۸)۔ نیز - نَزَلَ - کھیتی کے بڑھنے، پھولنے پھانے کو کہتے ہیں۔ اَرْض - نَزَلَ لَمَہ - اُس زمین کو کہتے ہیں جس میں بڑی فراوانی سے کھیتی اُگے۔ اَلنَّزَلَ بارش کو کہتے ہیں۔ نَزَلَ لَمَہ - ایک مرتبہ کے نزول کے معنوں میں آتا ہے (۵۳/۵۳)۔ نَزَلَ بِل - مہمان کو کہتے ہیں۔ مَنَزَلَ - اترنے کی جگہ۔ جمع مَنَازِل (۳۶/۳۶)۔

اُنْزَلَ اور نَزَلَ میں عام طور پر فرق یہ ہے کہ تَنَزَّلَ بِل (نَزَلَ) آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں، اور اُنْزَلَ میں یہ شرط نہیں (لطف اللغۃ)۔ نَزَلَ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً (۲۱/۲۱)۔ بادلوں سے پانی ایک دم نیچے نہیں گر پڑتا، آہستہ آہستہ بارش کی شکل میں برستا ہے۔ تَنَزَّلَ بِل (۲۶/۲۶)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلنَّزَلَ بِل کے معنی کسی چیز کو ترتیب سے رکھنے اور اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں۔

لیکن قرآن کریم میں اس کے معنی ”اوپر سے نیچے اتارنے“ ہی کے نہیں۔ اس کے معنی عطا کرنے کے بھی ہیں۔ (وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ (۵۵/۵۵)۔ ہم نے لوہا عطا کیا۔ نیز مختلف چیزوں کے برآمد ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ حجر میں ہے کہ ہمارے پاس مختلف چیزوں کے خزانوں کے خزانے رکھے ہیں۔ وَ مَا نَنْزِلُ لَہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۵/۱۵)۔ لیکن ہم انہیں ایک مناسب اندازے کے مطابق برآمد کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں کائنات میں موجود نہیں ان کے نازل کرنے کے معنی یہ ہونگے

کہ انسان اپنی تحقیقات اور سعی و کاوش کے ذریعے انہیں حاصل کرتا جائے۔  
لہذا ان مقامات میں انشِزَال کے معنی ان اسباب کا بہم پہنچانا ہے جن سے  
انسان ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ ان چیزوں کے ذخیرے کائنات میں  
موجود ہیں۔ ان کا حصول، انسان کی محنت پر منحصر ہے۔

قرآن کریم کے لئے تَنْزِيل (نازل کرنے) کا جو لفظ آیا ہے تو اس  
سے مفہوم یہ ہے کہ وحی، رسول کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ (Subjective) چیز  
نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اسے خارج سے (Objectively) ملتی ہے۔ وحی ایک خارجی  
حقیقت ہے، انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے وحی کسب و ہنر سے  
حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف منزل من اللہ (خدا کی طرف سے عطا کردہ)  
ہوتی ہے۔ مادی کائنات میں انسان اپنی سعی و کاوش سے چیزوں کے اوپر  
پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے۔ اسے (Discovery) کہتے ہیں۔ لیکن وحی  
میں حقیقت خود اپنے آپ کو نبی پر منکشف (Reveal) کرتی ہے۔ اس لئے اس  
کے لئے انشِزَال کا لفظ آیا ہے۔ یعنی انسان خود بلند ہوتا ہوا حقیقت کے چہرے  
سے پردہ کشائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود نیچے اتر کر اس کے سامنے بے نقاب  
ہو جاتی ہے۔ یہ چیز وحی کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ  
رسول اللہ کی ذات پر ختم ہو گیا، اس لئے اب انسانوں کے پاس علم کے دو  
ہی ذریعے رہ گئے۔ ایک قرآن کریم کے اندر محفوظ حقائق اور دوسرے خارجی  
کائنات میں انسانی علم و عقل کی رو سے منکشف کردہ حقائق۔ ان کے علاوہ  
کوئی تیسرا ذریعہ علم انسان کے پاس نہیں۔ باطنی کشف کا دعویٰ در حقیقت  
وحی ہی کا دعویٰ ہے، فرق صرف الفاظ کا ہے۔ قرآن کریم میں ”کشف و الہام“  
کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس قسم کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ انسان  
میں بعض قوتیں ایسی ہیں (مثلاً قوت خیالی یا قوت ارادی) کہ اگر خاص مشقوں  
کے ذریعے ان کی نشو و نما (Development) کر لی جائے تو ان میں ایسی خاصیتیں  
پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ اسے لوگ کشف و  
کرامات سمجھنے لگتے اور ”روحانی قوت“ کا مظاہرہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ  
”روحانیت“ سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ نہ ہی دین سے کوئی واسطہ۔ اس لئے  
کہ جو انسان بھی چاہے وہ ان مشقوں کے ذریعے ایسی قوت حاصل کر سکتا ہے،  
خواہ وہ مشرک، کافر اور دھریہ بھی کیوں نہ ہو۔ دین کا مقصود اس قسم کی  
قوتیں پیدا کرنا نہیں، آدمی کو انسان بنانا ہے۔

مَنْزِل۔ اوپر سے نیچے اتارنے والا۔ نازل کرنے والا۔ عطا کرنے  
والا (۱۱۵)۔ نیز مَنْزِل (۱۱۶)۔ مَنْزِل۔ اتارا ہوا (۱۱۵)۔ نیز مَنْزِل

اتارا ہوا ( ۱۳۳ ) - یہ ، ظرف مکان (جگہ) یا زمان (وقت) - اور مصدر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے - رَبَّ أَنْزَلَ نَبِيًّا مُنْزَلًا مُبْرَكًا ( ۲۳ ) - ”اے میرے رب مجھے برکت والا اتارنا اتاریو“ - سورۃ یوسف میں مُنْزِلٌ بمعنی مہمان نواز آیا ہے - وَ أَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ( ۱۲ ) - ”اور میں بہت اچھا مہمان نواز ہوں“ -

تَنْزِيلٌ - آہستہ آہستہ اترنا - اسی سے تَنْزِيلٌ ( ۱۲ ) میں ہے -

## ن س ا

نَسَا - جھڑک دینا - ہانکنا - پیچھے ہٹا دینا - نَسَا الشَّيْءَ - کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا - مؤخر کر دینا - اَنْسَاہُ - اُسے حوض سے ہٹا دیا - پیچھے کر دیا - نَسَا تَهُ الْبَيْعَ - میں نے بیع میں اس سے ادھار کا معاملہ کیا اور اس طرح رقم کے لین دین کو مؤخر کر دیا - الشَّيْءُ تَاخِرٌ - پیچھے کرنا \* - اسی جہت سے ادھار کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ اس میں قیمت کی ادائیگی مؤخر کر دی جاتی ہے - بِسَاعَةِ بِنْتِ سَيْمَةَ - اس کے ساتھ ادھار کا سودا کیا - ( یہ اس قسم کے سودے کو کہتے ہیں جس میں قیمت یا چیز بعد میں دی جائے ) - اَلْمِنْسَاةُ - لاٹھی ، جس سے جانوروں کو پیچھے ہٹایا جاتا ہے ( ۱۴ ) - ابن فارس نے بھی یہ تمام معانی دیے ہیں -

سورہ توبہ میں ہے اِنَّمَا النَّسِيءُ زَيْدَاتٌ فِى الْكُفْرِ ( ۲۱ ) - ”یقیناً نسیء کفر میں ایک اضافہ ہے“ - اَلنَّاسِيءُ - عربی معاشرہ کی ایک خاص چیز تھی - ویسے تو قرآن کریم نے یہ کہہ کر اسکی تشریح کر دی ہے کہ يَحِلُّ لَكُمْ عَمَّا وَبُعِثَ مُؤْنَتُهُ عَمَّا ( ۲۱ ) - ”ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں - ایک سال اُسے حرام کر دیتے ہیں“ - لیکن اس کی تفصیل کا سمجھنا ضروری ہے - عربوں میں فمری مہینے رائج تھے - رَبِيعٌ - جُمَادِی - رَمَضَان - وغیرہ مہینوں کے نام ہی بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق موسموں سے تھا - لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر سال وہی مہینہ اُسی موسم میں صرف اُسی صورت میں آ سکتا ہے جب سال شمسی ہو - فمری ہونے کی صورت میں ایک ہی مہینہ مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے - عرب اسے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ( دیگر مہینوں کے علاوہ ) حج کی تقریب ایک ہی موسم میں ہو - اس کے لئے ( یہودیوں کے اتباع میں ) کرتے یہ تھے کہ ہر تیسرے سال ایک مہینہ خالی چھوڑ دیتے تھے [زیادہ صحیح الفاظ میں آٹھ سال میں تین مہینے -

کیونکہ قمری سال شمسی سال سے قریب گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے [اور اس طرح اپنے مہینوں کو پھر موسموں کے مطابق کر لیتے تھے۔ یہ مہینہ (جسے خالی چھوڑتے تھے) بالعموم ذوالحجہ کے بعد ہوتا تھا۔ اس ”آگے پیچھے کرنے“ کے عمل کو وہ ”نَسِیَ“ کہتے تھے۔ یعنی سال کو ایک مہینہ پیچھے ہٹا لینا۔

نیز ان کے ہاں سال میں چار مہینے (رجب۔ ذی قعدہ۔ ذوالحجہ اور محرم) واجب الاحترام مہینے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و قتال منع تھا۔ کیلنڈر کا یہ اہتمام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں ”نَسَاة“ کہتے تھے۔ یہ ”نَسَاة“ کبھی تو ان محترم مہینوں میں تغیر و تبدل کر دیتے۔ مثلاً حج کے بعد محرم کے متعلق کہہ دیتے کہ اس سال اسکی بجائے ربیع الاول کا مہینہ محترم ہوگا۔ و قس علیٰ ہذا۔ اور کبھی اس تیسرے سال کے خالی مہینے کو آگے پیچھے کر دیتے۔ اس سے معاشرہ کے نظام میں گڑبڑ ہو جاتی اور جن لوگوں کو یہ پہلے بتا دیتے کہ اس سال یوں کیا جائیگا وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا لیتے۔ اس کو بھی ”نَسِیَ“ کہتے تھے۔

قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کی ”نَسِیَ“ کو ختم کر دیا۔ ایک طرف اس نے اعلان کر دیا کہ ”إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (۲۶)۔“ ”قوانین خداوندی کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔“ اس لئے ہر تیسرے سال ایک مہینے کا خالی چھوڑ دینا بے معنی بات ہے۔ چنانچہ اس اعلان (۱۰ھ) کے بعد عربی کیلنڈر میں سال کے بارہ مہینے قرار پا گئے۔ اور مہینے قمری رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ قمری سال کے مہینوں کے نام تو وہی ہیں، لیکن وہ اب التزاماً اُن موسموں میں نہیں آتے جن کی نسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے۔ (مثلاً رَمَضَانَ۔ رَمَضٌ سے ہے جسکے معنی شدت کی گرمی ہیں۔ لیکن اب رمضان گرمی میں بھی آتا ہے اور سردی میں بھی)۔ اگر یہ کیلنڈر قمری کی جگہ شمسی ہو تو پھر ہر مہینہ ہمیشہ اُسی موسم

میں آتا رہے۔ اور سال کے بارہ مہینے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جس مدت میں زمین سورج کے گرد اپنا ایک دور ختم کرتی ہے اسکے بارہ حصے ہو جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے شمسی اور قمری دونوں میں سے جو سہا کیلنڈر جی چاہے اختیار کر لیا جاسکتا ہے۔ (دیکھئے ۱۰۷/۱۲؛ ۱۰۸/۱۲)۔ اس ”نَسِیَ“ کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے، قرآن کریم نے اس

”نَسِیَ“ کو بھی ختم کر دیا جس کی رو سے وہ قابل احترام مہینوں میں تقدم و تاخر کر دیا کرتے تھے۔ اسے قرآن کریم نے زَبَادَةٌ ”فِي الْكُفْرِ (۱۱۳) قرار دیدیا۔ اس طرح معاشرہ محکم بنیادوں پر استوار ہو گیا۔

قرآن کریم کا یہ اصولی قانون اب بھی موجود ہے کہ اگر کہیں جنگ چھڑ جائے تو وہ مسلسل نہ چلتی رہے بلکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ فلاں فلاں وقت کے لئے جنگ کو روک دینا ہوگا۔ اس التواء اور قطع تسلسل کے بڑے فائدے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ اس سے وہ جنگ ختم ہی ہو جائے۔ اس التواء کے عرصہ کا احترام تمام اقوام کے لئے ضروری ہوگا اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ التواء کے وقت کو مقدم یا موخر کر سکے۔ اس لئے کہ یہ تسیسٹی ہوگی جیسے قرآن کریم نے کفر، یعنی معاہدات کے عملی انکار، سے تعبیر کیا ہے۔

## ن س ب

النَّسَبُ\*۔ النسبۃ\*۔ قرابتداری جو خصوصیت کے ساتھ آباؤ اجداد میں ہو۔ باپ یا ماں کی طرف سے قرابتداری۔ یہ اس کے اصل معنی ہیں۔ پھر، دو ایسی چیزوں کے لئے جو کسی اعتبار سے بھی باہم مشابہت اور تعلق رکھتی ہوں ان کے اس تعلق کے اظہار کے لئے بھی النسبۃ\* بول دیتے ہیں۔ النسب\*۔ چیونٹیاں، جبکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی ہوں۔ چیونٹیوں کا راستہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے اتصال ہیں۔ نسب\*۔ خاندانی اتصال کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں نسباً\*۔ بمعنی قرابتداری (۲۵) میں آیا ہے۔ اور (اسکی جمع) أنساب\* (۲۳۱) میں۔

## ن س خ

نسخ\* کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اسکی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ نسخۃ\* الشمس\* الظلیل\*۔ آفتاب نے سایہ کو مٹا دیا اور اسکی جگہ روشنی لے آئی۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نسخۃ\* الریح\* آثار\* التدیارات\*۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔ (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگر گوں کر دینا)۔ نسخ\* الکتاب\*۔ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے النسخۃ\*۔ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں\*\*۔ قرآن کریم میں ہے انفا کثنا نسخنا نسخ\* (۴۵) \*ناج و راغب۔ \*\*ناج۔ محیط و راغب۔



”ہم لکھوا لیتے تھے“۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۴/۵۴) میں آیا ہے۔ فَيَنْسُخُ اللَّهُ۔ ”اللہ مٹا دیتا ہے“۔

لہذا نسخ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں نسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مسمات میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے۔ اور اسکا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ”ثواب“ کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ (مثلاً آہ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ :-

- (۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ اور
- (۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن انکا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا  
أَوْ مِثْلِيهَا۔ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
قَدِيرٌ (۲۶/۱۰۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔  
کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اُسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتکہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ”فراموش کرا دینے“ کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہؐ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے ”وَنُنَسِّيهَا“۔ اسکی دلیل میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسِي اَلَا مَا شَاءَ اللّٰهُ . . . . . (۱۰۶) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا، قرآن کریم اور رسول اللہؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اُس حکم کو منسوخ کر کے اُسکی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اسکی ناسخ۔

اور رسول اللہؐ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یاللعجب! ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسِي کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔ م۔ س۔ ی دیکھئے جہاں اسکی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (مَسَانِدُ سَخْ . . . . .) کا صحیح مفہوم - پیچھے سے سلسلہ کلام ہوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے) - اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دیے تھے ، اور وہ احکام تہذیب و غیرہ میں موجود ہیں - تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی ؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے - ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے - لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے - اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے - بعد میں ، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا - اس طرح یہ جدید وحی اُس سابقہ وحی کی قائم مقام (ناسخ) بن جاتی - یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے - چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ تورات کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے آکر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں) -

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اسکی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے - اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیے جاتے تھے - ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے - تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی - تو وہ ”روکے ہوئے“ احکام و قوانین اُس وقت نازل کر دیے جاتے - تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کار فرما رہا ہے -

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد ، اُسکی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی - بعض کو فراموش کر دیتی - اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر

و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آگیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کرلیگا۔ لہذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دئے جائیں۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہونگے۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ هنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کردی گئی ہے۔ (ان کی مثل احکام دیدئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔ **فَمَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا آتٰنٰهُمْ بِهٖ فَقَدْ اٰهْتَدَوْا** **وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ لَنَا لِمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲/۱۳۰)**۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پاسکیں گے۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم **مَا تَنْتَسِخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَسَا** **بِخَيْرٍ مِّنْهُ اَوْ يُنْصَحْ** کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يَرْسُلَ نَارَ الْهَدْيِ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۸)۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کریگا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ اور اس سے آگے ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا... (۲۹) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہذا مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتٍ مِنْ آيَاتٍ سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی حابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے۔ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ (۱۶)۔ ”اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں“۔

اس کے بعد لفظ نُنَسِّهًا ہے۔ یہ لفظ نَسِيَ سے ہے۔ نَسِيَ کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا، یا فراموش کر دینا، آتے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ی)۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتبِ آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (۲۴)۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نَسِيَ کے معنی کسی چیز کو عالی حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت نُنَسِّهًا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مٹھیمین\* ہے (۳۸)۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں۔ اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے، ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا\* (۱۱۶)۔ اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ لَا مَسْئَلَةَ لَإِكْلِمَتِهِ\* (۱۱۶)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں رد و بدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۹)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ إِنَّ اللَّهَ عَلَمٌ كَتَلٌ\* شَيْئٍ قَدِيرٌ\* (۱۱۶)۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطہ حیات دیا جائے۔ یہ سب کچھ اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اُسے پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اسکی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوة کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (۹)۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائے گا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یہاں مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہونگے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہونگے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہونگے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہونگے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ”ناسخ و منسوخ“ سے کچھ واسطہ نہیں۔

یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ”منسوخ“ اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

مَنْ تَسْبُخُ والی آیت (۱۰۰/۱)۔ یا سورة النحل کی آیت اِذَا بَدَأْنَا آيَةً مِّنْ مَّكَانٍ آيَةً (۱۰۰/۱) میں اگر آیت سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ”آیات اللہ“ کہہ کر پکارتا ہے) تو ”نسخ آیت“ سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آجانا۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفہ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ واللہ اعلم۔

## ن س ر

النَّسْرُ۔ گدھ کو کہتے ہیں۔ لیکن عربوں میں مختلف قسم کے گدھوں کے لئے الگ الگ نام ہیں۔ اس گدھ کی صفت میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ یہ بڑی تیز نظر رکھتا اور بلند پرواز ہوتا ہے۔ نیز نَسْرُ قبیلہ ذی الکلاع کا ایک بت تھا جو سرزمین حمیر میں تھا\*۔ قرآن کریم میں اس بت کا نام قوم حضرت نوحؑ کے ذکر میں آیا ہے (۲۶/۲۱)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اچک لینے اور چھین لینے کے ہیں۔ اور النَّسْرُ۔ چند ستاروں کے جھمکے کو نیز گدھ کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں بہر حال یہ لفظ قوم حضرت نوحؑ کے بت کے لئے آیا ہے۔

## ن س ف

نَسَفَ الْبَيْتَاءَ بَنَسَفَهُ۔ اس نے عمارت کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ الْبَيْتَاءُ۔ وہ اوزار جس سے عمارت کو اکھاڑا جاتا ہے۔ نَسَفَ الطَّعَامَ۔

اس نے غلے کو پھینکا۔ اَلْحَيْنَسَفْ - چھاج۔ نَسَفَتْ التَّوْبُحُ الشَّيْءَ - ہوا نے اس چیز کو اڑا دیا۔ اکھیڑ کر منتشر کر دیا۔ نَسَفَ التَّبْعِيْرُ اَلْاَرْضَ بِحَقْدَمٍ رَجْلِيْہ۔ اونٹ نے اپنے پاؤں کے اگلے سرے سے مٹی کو پھینکا اور اڑایا\*\*\*۔ اَلنَّسَافَةُ - پھٹکنے سے جو کچھ اڑے۔ اَلْحَيْنَسَفَةُ - چھلنی کو بھی کہتے ہیں۔ اور نَسَفَ الشَّيْءَ کسی چیز کے چھاننے کو\*۔ اَلنَّسِيْفُ - وہ نشان جو ایڑہ لگانے سے اونٹ کے پہلو پر (بال اڑنے سے) پیدا ہو جاتا ہے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنیے کشف یعنی کھولنا اور ظاہر کرنا لکھے ہیں۔

سورہ طہ میں ہے۔ لَنَنْسِفَنَّہُ فِی الْیَمِّ نَسْفًا (۲۰)۔ ہم اسے دریا میں بہا دیں گے۔ اس کے اجزا منتشر کر کے دریا برد کر دیں گے۔ ذرا آگے چل کر ہے۔ یَنْسِفُہَا رَبِّیْ نَسْفًا (۲۰)۔ تیرا رب انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیگا۔

## ن س ک

نَسَبَکَ الثَّوْبُ - اس نے کپڑے کو دھو کر ہاک اور صاف کر لیا۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنی دھونے اور صاف کرنے کے ہیں۔ باقی تمام معانی اسی اصول پر متفرع ہیں\*\*۔ اَرْضٌ نَسَبَتْ - سرسبز و شاداب زمین جس پر نئی نئی بارش ہوئی ہو\*۔

اس بنیادی معنی کی رو سے اس سے مراد کسی معاملہ کو درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے۔ نَسَبَکَ السَّيْبُخَةُ کے معنی ہیں اس نے زمین شور کو درست کیا۔ نَسَبَکَ اِلٰی طَرِیْقَتَہ جَمْعِیْلَتَہ۔ اس نے اچھا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر اس پر مداومت کی\*۔

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں مَنَسَبَکَ ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ عادی ہو چکے ہوں۔ خواہ یہ خیر میں ہو یا شر میں۔ اس کے بعد امور و مراسم حج کو مَنَسَبِکَ کہنے لگے۔ اور نَسَبَکَ یا نَسَبَکَ - ذبیحہ کو یا خون کو\*۔

اس کے بعد یہ لفظ ہر اس بات کے لئے بولا جانے لگا جو خدا کی طرف سے واجب ہوئی ہو۔ لہذا مَنَسَبِکَ کے معنی واجبات خداوندی کے طور طریقے ہو گئے\*\*۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہر اس چیز کے ہیں جس



کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے\*۔ قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں آیا ہے۔ فَإِذَا قَضَيْتُم مِّنَاسِيكُمُ (۲۴۰)۔ جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو۔ اس سے ذرا پہلے ہے فَفِيدُ يَتَهُ مِّن مَّيْتَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (۲۴۱)۔ اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہونگے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ۔ یہاں نُسُک سے مراد ذبیحے ہونگے\*۔ ابن قارس نے بھی اس کے معنی تقرب حاصل کرنے اور ذبیحہ کے لکھے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لئے جائیں۔ اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔

سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ إِن صَلَاحِي وَنُفْسِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱۶۳)۔ ان سے کہدو کہ میری صلوٰۃ اور میرے نُسُک\*۔ موری زندگی اور میری موت۔ سب خدا کے عالم گیر نظام ربوبیت کے لئے وقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد جملہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے اور نُسُک\* سے مراد زندگی کا ہر طور طریقہ\*\*۔

سورہ حج میں ایک جامع آیت ہے۔ لِيَكُلُّ أُمَّةٌ جَعَلْنَا مَنَاسِكَكُمْ هُمْ نَاسِيكُوهُ فَلَا يَتَنَازَعُ عَنْكَ فِي الْأَمْثَرِ فَإِذْ عِلِّيٰ رَبِّيكَ (۲۴)۔ ”ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ سو یہ لوگ تم سے امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں۔ تو انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتا رہ“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تو اصل فائسوں ہے جو ہمیشہ غیر مبدل رہا ہے۔ اور مَنَاسِيكُ\* اس کی وہ جزئیات و فروعیات (طور طریقے) ہیں جو زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق اس امر کو نافذ کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ مَنَاسِيكُ\* تو مختلف رہے ہیں، لیکن امر متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر اس امر کی طرف تھی جسے اہل مذاہب نے چھوڑ کر صرف مَنَاسِيكُ\* کو دین بنا لیا تھا۔ اصل دین کی یہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ إِنَّكَ لَعَلِّيٰ هُدًى مِّن تَقْيِيمٍ (۲۴)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس اصل کو تسلیم کر لے تو پھر اسے اس نظام (دین) کی جزئیات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ کیونکہ جب دین، اجتماعی نظام کا نام ٹھہرا تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد اس اجتماعی نظام کا رکن ہو لیکن اس

\* ابن قتیبہ (القرطبي - ج/۱ صفحہ ۱۷۵۔ \*\* شاہ عبدالقادر - شاہ رفیع الدین اور مولانا ابولکلام آزاد نے اپنے تراجم میں مناسک کا ترجمہ عبادت کے طور طریقے یا ارکان حج کیا ہے۔ مؤخر الذکر نے نسکی کا ترجمہ ”میرا حج“ کیا ہے۔

کی جزئیات میں اختلاف کرے۔ اس سے نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ باین ہمہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہو سکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کئے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کی طرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔

## ن س ل

النَّسْلُ - کسی چیز کا الگ ہو جانا۔ جدا ہو جانا۔ نَسَلَ الثَّوْبُ عَنْ الثَّجَعِیْر - اونٹ سے بال جھڑ کر الگ ہو گئے۔ نَسَلَ الْقَمِیْصُ عَنْ الْاِنْسَانِ - قمیص انسان سے الگ ہو گئی\*۔ النَّسَالَةُ - وہ اون جو گر پڑے۔ یا پرندے کا پر جو جھڑ جائے\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا آسانی سے نکل جانا اور نکالنا۔

نَسَلَ - یَنْسِلُ - تیز رفتار ہوا۔ دوڑا۔ اَنْسَلَ الْقَوْمُ - وہ قوم سے آگے بڑھ گیا۔ ذَنْبٌ نَسُوْلٌ - تیز دوڑنے والا بھیڑیا\*\*\*۔ النَّسَالُ - تیز رفتار۔ النَّسْلُ - وہ دودھ جو تھن کے سوراخ سے خود بخود ٹپکنے لگ جائے\*\*\*۔

اولاد کو نَسْلٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے نکلتی ہے۔ یا اس لئے کہ آباء و اجداد چلے جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم میں یُتَهْلِكُ النَّحْرُثُ وَالنَّسْلُ (۲۵۴) آیا ہے۔ یہاں نَسْلٌ کے معنی ذریت۔ مخلوق۔ اولاد۔ انسانی آبادی ہیں۔ یعنی نسلِ انسانی۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے کھیتی اور نسلِ انسانی کا (بغیر حق کے) تباہ کرنا سنگین جرم ہے۔

سورة انبیاء میں ہے وَهُمْ مِنْ كُلِّ حِدَبٍ یَنْسِلُوْنَ (۲۱)۔ وہ ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑینگے۔ طوفان کی طرح موجیں مارتے ہوئے اُمنڈ پڑینگے۔ سورة یٰسین میں ہے اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ (۳۱)۔ اپنے رب کی طرف تیزی سے نکل دوڑینگے۔

## ن س و

النِّسْوَةُ - النِّسَاءُ - النِّسْوَانُ - یہ سب الفاظ الْمَرْأَةُ کی غیر لفظی جمع ہیں۔ یعنی الْمَرْأَةُ کے معنی ہیں ایک عورت اور النِّسَاءُ راغب - \*\*محیط - \*\*\*ناج -

(وغیرہ) کے معنی ہیں بہت سی عورتیں - اَلْمَرَّاتُ کی جمع - اور النِّسَاءُ وَالنِّسْوَةُ وَالنِّسْوَانُ کا واحد ان کے مادوں سے نہیں آتا\*۔

قرآن کریم میں نِسَاء کا لفظ اضافت کے ساتھ عام عورتوں کے علاوہ بیویوں کے لئے بھی آیا ہے مثلاً اِلٰی نِسَائِكُمْ (۲/۱۸۷)۔ ”تمہاری بیویاں“۔  
مجازی معنوں میں یہ لفظ قوم کے اس طبقے کے لئے استعمال ہوا ہے جو جوہر مردانگی سے عاری ہو۔ (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ذ - ب - ح) اور (ب - ن - و)۔

## ن س ی

نِسْيَان کے اصلی معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ہوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے بھی نِسْيَان کہتے ہیں۔ یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا۔ چنانچہ وَلَقَدْ عٰهَدْنَا اٰدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ (۲/۱۱۵)۔ ”اور یقیناً ہم نے پہلے آدم کو حکم دیا تھا لیکن اس نے اسے ترک کر دیا۔ اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا“۔ اس میں نَسِيَ کے معنی ترک کر دینے کے ہیں، کیونکہ بھول جانے پر مواخذہ نہیں ہو سکتا (نیز یاد رکھنے کے لئے عزم کی ضرورت نہیں ہوتی)۔ اسی طرح نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (۹/۶) کے معنی ہیں انہوں نے قوانین خداوندی کو چھوڑ دیا تو خدا نے ان کی حفاظت کو چھوڑ دیا\*\*۔ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں کتنی باتوں کی تاکید کی لیکن تم نے ان سب کو بھلا دیا۔ یہاں بھلا دیا، سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمہارے حافظہ سے محو ہو گئیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے ان پر عمل نہیں کیا۔ یا کچھ عرصہ تک عمل کر کے انہیں چھوڑ دیا۔ نیز اس کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ رہنے دینے کے بھی ہیں۔ اس کی تائید میں صاحب غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے۔

سورة بقرہ میں سابقہ انبیاء کرام کے سلسلہ وحی کے متعلق ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا (۲/۱۰۶)۔ ہم جس سابقہ حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حکم دیدیتے ہیں اور جسے علیٰ حالہ چھوڑ دیتے ہیں تو اس جیسا حکم

دوسرے نبی کی وحی میں دے دیتے ہیں۔ (تفصیل ن۔ س۔ خ کے عنوان میں دیکھئے) اسی طرح سَنَقَرٌ نُّكَتَ فَلَا تَنْسَى (۱۴۷) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس وحی کو اس طرح محفوظ رکھیں گے کہ تو اس میں سے کسی بات کو بھی چھوڑ نہیں سکتے گا۔ اس میں سے کچھ بھی چھوڑتے نہیں پائے گا۔ سب ایک جگہ جمع ہو جائے گا۔ اس کی حفاظت کی شہادت دوسری جگہ موجود ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِآلِذِيْ اَوْ حَيْثُ شِئْنَا لَنُكَتَ (۱۴۸) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تجھے بذریعہ وحی دیا گیا ہے اس میں سے کچھ لے جائیں (لیکن ہماری مشیت ایسی نہیں)۔ اسی سے (۱۴۷)۔ کے بعد اِذَا مَشَاءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس میں سے اُسی صورت میں کچھ ترک ہو سکتا تھا کہ خدا کی مشیت ایسی ہوتی۔ لیکن خدا کی مشیت یہ تھی ہی نہیں (۱۴۸)۔ اس لئے اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں ہوا\*۔

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی اِذَا مَشَاءَ اللّٰهُ اس کی نفی کر دیتا ہے۔ کیونکہ ”استثناء بالمشیت“ اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے۔ (یعنی جہاں اِذَا کے بعد مَشَاءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو جس سے مراد خدا کی مشیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا)۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے خَالِدِينَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِذَا مَشَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرٌ مَّجْدُوذٍ (۱۱۸)۔ یعنی غیر مقطوع۔ اور استثناء میں نکتہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ہیں خدا کی مشیت سے ایسے ہیں۔ انہی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں ہیں۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا۔ (المنار جلد اول صفحہ ۱۹ - ۳۱۶ - زیر نَنْسَىٰ وَ نَنْسِيْهَا)۔

کسی چیز کی حفاظت کو ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ اسے حقیر و غیر اہم سمجھا گیا۔ اس لئے اَلنَّيْسَىٰ کے معنی ہیں ایسی چیز جس سے بے اعتنائی برقی جائے۔ اس کی جمع اَنْسَاءٌ ہے۔ چنانچہ جب ہرہوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ کہا کرتے تھے تَتَّبِعُوْا اَنْسَاءَكُمْ۔ انہی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو جنہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، تلاش کرلو\*۔

اس عدم اہمیت کی بناء پر اس کے معنی بھول جانے کے ہو گئے۔ اُنْسَاءٌ  
ایقاعہ اس نے اس کو بھلا دیا۔ نَسِیَآءٌ - بہت بھول جانے والا\*۔ نَسِیَآءٌ  
مَنْسِیَآءٌ (۱۳۱) - بھولی بسری -

ترک کر دینے کے معنوں میں قرآن کریم کی آیات اوپر درج کی جاچکی  
ہیں۔ ان کے علاوہ (۲۳۶/۱ اور ۲۳۷/۱) میں بھی یہی مفہوم ہے۔ یعنی ناقابل  
التفات سمجھ کر چھوڑ دینا۔ ذرِ کُترِی کے مقابلہ میں اُنْسَاءٌ (۶۸/۱) میں آیا  
ہے۔ یعنی بھلا دینا۔ بلا ارادہ بھول جانا خطا نہیں ہوتی (۲۸۶/۱)۔

## ن ش ا

نَشَا یَنْشَا - نَشَاةٌ - زندہ ہونا، نیا ہونا، رو نما ہونا، بلند ہونا،  
بڑھنا، بتدریج ترقی کرنا، نشو و نما پانا۔ نَشَاتِ السَّحَابِۃُ نَشَاٌ - بادل  
اُٹھا۔ اَلنَّشَیۡیُ - لڑکی یا لڑکا جو بچپن کی حد سے گزر کر جوانی میں قدم رکھ  
رہا ہو، یا رکھنے کے قریب ہو۔ اَلنَّشَیۡۃُ - ہر وہ ساعت جس میں آدمی رات  
کے وقت کھڑا رہے۔ یعنی سوئے نہیں۔ سونے کے بعد اٹھنے کو بھی کہتے  
ہیں۔ نیز ہر واقعہ جو رات کے وقت سرزد یا رو نما ہو۔ قَنَشَا فُلَانٌ  
لِحَاجَتِہِ، فلان آدمی اپنے کام کے لئے اٹھا اور چل پڑا۔ اَلْمُنَشَا - بلند  
نشان یا جھنڈا۔ اَلْجَوَارِ الْمُنَشَّۃُ (۵۵/۱) - بلند بادبانوں والی کشتیاں۔  
اَلْاِنْسَاءُ - کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اس کی تربیت کرنا\*\*۔ اَلنَّشْۡۃُ -  
نسل\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں۔

سورۃ انعام میں ہے۔ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ کُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ  
(۹۹/۱)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں "نفس واحد" سے پیدا کیا۔ یا آگے بڑھایا۔  
(اس کی تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی)۔ سورۃ واقعہ میں ہے  
اِنَّا اَنْشَاَ نَہْمُنْۢ اِنْشَاءً - (۵۱/۱)۔ ہم نے انہیں ایک خاص انداز سے نئی  
پیدائش دی۔ یا ہم نے ان کی خاص تربیت کی۔ نہایت عمدگی سے پروان چڑھایا۔  
اس سے ذرا آگے ہے وَ نُنْشِیْۤہُمْ فِیْ مَّآلَا تَعْلَمُوْنَ (۹۱/۱)۔ تمہیں  
اس انداز سے ایک نئی پیدائش دیں جو تمہارے علم میں بھی نہیں۔ ضَمْنَا مَّآلَا  
تَعْلَمُوْنَ سے ظاہر ہے کہ جہاں تک اس زندگی میں انسانی علم کی سطح کا  
تعلق ہے اس کی رو سے ہم جان نہیں سکتے کہ دوسری زندگی کی کیفیت اور  
ماہیت کیسی ہوگی۔ اسی کو دیگر مقامات میں خلقِ جدید، ایک نئی تخلیق  
سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱۴۹/۱ و ۱۵۰/۱ و ۱۵۱/۱)۔

سورة واقعہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ عَ أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا  
 آمُ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ (۵۱)۔ کیا تم اس کے درخت کو اگلے اور نشو  
 و نما دیتے ہو، یا ہم دیتے ہیں۔

سورة زخرف میں ہے مَنْ يَنْشُؤْا فِي الْحَيَاةِ (۳۳) جس کی  
 پرورش و تربیت زیورات میں ہوئی ہو۔ یا جس کی تربیت عورتوں کی طرح ہوئی  
 ہو۔ سورة رعد میں ہے۔ وَ يَنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۴)۔ وہی بھاری  
 بھاری بادلوں کو (سمندر کی سطح سے فضا میں) بلند کرتا ہے۔ سورة رحمن  
 میں جَوَّارَ الْمُنْشِئَاتِ (۵۵) آیا ہے۔ یعنی بلند بادبانوں والی کشتیاں۔  
 سورة مزمل میں نَاشِئَةَ اللَّيْلِ آیا ہے (۶۳)۔ یعنی رات کا اٹھنا۔ اِنْشَاءُ  
 نشو و نما دینا۔ بتدریج آگے بڑھانا۔ اور پروان چڑھانا خدا کی صفت ربوبیت  
 کا نتیجہ ہے۔ کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے مطابق، اُس کے قانون کی  
 رو سے نشو و نما پاتی اور بتدریج اپنے منتہی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔  
 یہی کچھ انسان کو اپنی دنیا میں کرنا ہوگا۔ یعنی اپنی اور اپنے ساتھ ہر فرد  
 انسانی کی نشو و نما۔ اس کی صلاحیتوں کی برو مندی اور انہیں تکمیل تک پہنچانا۔  
 یہی اسلام کا مقصود ہے۔

## ن ش و

النَّشْرُ۔ ہوا۔ خوشبودار ہوا۔ مہک۔ دراصل اس میں پھیلنے کا پہلو  
 غالب ہوتا ہے\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز  
 کو کھول دینے اور اس کے شاخ در شاخ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ النَّشِيرُ  
 کے معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ پھیلا دینا۔ نَشَرَ الْخَشَبَةَ۔  
 اس نے لکڑی کو چیر دیا۔ اَلْمِنْشَارُ۔ ارے کو کہتے ہیں اور اَلنَّشَارَةُ  
 اس برادے کو جو لکڑی چیرنے سے کرتا ہے۔ اَلنَّشْرُ۔ خبر کو پھیلا دینا۔  
 یا پتوں کا پھیلنا۔ درختوں کا پتے لے آنا۔ نَشَرَتِ الْاَرْضُ نَشُورًا۔ موسم  
 بہار آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگ آئے۔ اَلنَّشْرُ۔ اس  
 خشک گھاس کو کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش بڑھنے سے دوبارہ  
 سبز ہو جائے۔ اور اَلنَّشِيرُ۔ کاٹ کر جمع کی ہوئی کھیت کی پیداوار جسے  
 گاہا نہ گیا ہو۔ اَنْشَرَ الْاَرْضَ۔ اس نے باقی دیکر زمین کو حیات نو عطا  
 کر دی۔ اسی سے اَلنَّشُورُ۔ حیات تازہ کو کہتے ہیں\*۔

\* تاج و محیط و راغب۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں کیتاباً . . . مَنَشُّوْراً (۱۳۸) آیا ہے۔ کھلی ہوئی کتاب۔ سورہ طور میں فِی رَقٍّ مَنَشُّوْراً (۵۲) آیا ہے۔ پھیلے ہوئے صحیفہ میں۔ سورہ قمر میں ہے۔ جَرَّادٌ مِّنْتَشِيرٌ (۵۴)۔ بچھی ہوئی یا چھا جانے والی یا بکھری ہوئی ٹڈیاں۔ سورہ احزاب میں ہے فَاتَّشِيرُوْا (۳۳)۔ جب کھانا کھا چکو تو پھر متفرق ہو جاؤ۔ سورہ مرسلات میں ہے۔ وَالنَّشِيْرَاتِ نَشُوْرًا (۴۴)۔ دور دور تک پھیلانے والی قوتیں۔ سورہ لقمان میں ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے نیند کو آرام کا باعث بنایا وَجَعَلَ النَّهَارَ نَشُوْرًا (۲۵)۔ اور دن کو نَشُوْرٌ۔ اس کے معنی چلنے پھرنے اور متفرق ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں اور نیند کے بعد حیات تازہ کے بھی۔ کسی سورۃ میں غیر خدائی معبودوں کی ہے ہسی کے متعلق ہے۔ لَا يَتَمَدِّكُوْنَ مَوْتًا وَلَا حَيٰوَةً وَلَا نَشُوْرًا (۲۵)۔ وہ موت و حیات اور موت کے بعد حیات نو کی قدرت نہیں رکھتے۔ یہ حیات نو (مثلاً) اسی طرح ملتے ہیں جس طرح بارش کے چھینٹے سے زمین کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ اٹھتا اور اس کے آغوش میں خوابیدہ سبزہ لہلہا اٹھتا ہے۔ چنانچہ سورہ فاطر میں زمین کی اسی حالت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ كَذٰلِكَ الْيَكِّ النَّشُوْرُ (۳۵)۔ اسی طرح سے تمہاری حیات تازہ کی مثال ہے۔ حیات تازہ کی یہ مثال کس قدر بلیغ اور بصیرت افروز ہے۔ یعنی اُس شے کے اندر زندگی کے ممکنات تو موجود ہوتے ہیں لیکن اپنی خوابیدہ شکل میں۔ اس نئے طریق (Process) سے اسکی خوابیدگی کو بیداری سے بدل دیا جاتا ہے۔ (مردہ قوموں کو حیات تازہ ملنے کی بھی یہی صورت ہے)۔ موت کے بعد حیات سے انکار کرنے والوں کا قول ہے کہ مَنَاحِشُنْ بِمَنَشْرِ يَنْ (۲۵)۔ ہمیں حیات تازہ نہیں مل سکتی۔ ہم مر کر نہیں جی سکتے۔ کہا کہ یہ غلط ہے۔ خدا وہ ہے۔ اَمَاتَهٗ فَاَقْبِرْہٗ ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشِرْہٗ (۲۲) جو موت کے بعد انسان کو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق حیات تازہ عطا کرتا ہے۔

مردہ، جامد ہوتا ہے۔ زندہ بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ زندگی کی علامت کشاد اور وسعت، بڑھنا اور پھیلنا (النَّشُوْرُ) ہے۔ جس میں وسعت اور کشاد نہیں وہ زندگی سے محروم ہے۔ جو قوم اپنی جگہ ہر جم کر بیٹھتی ہے اور حرکت کر کے آگے نہیں بڑھتی وہ مردہ ہے۔

## ن ش ز

النَّشُوْرُ وَالنَّشَرُ۔ بلند اور اونچی جگہ۔ نَشَرٌ۔ وہ اونچی جگہ پر چڑھ گیا (اور محفوظ ہو گیا)۔ نَشَرَ الرَّجُلُ۔ آدمی بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

نَشْتَزِبِ الْقَوْمَ فِي الشَّخْصِ مَسْرُوعٍ - وہ قوم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا\*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نَشْتَزِبِ کہلاتا ہے۔ اسی سے نَشْوَزٌ کے معنی ہیں میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا، نافرمانی کرنے لگنا، متنفر ہونا، جھگڑنا، بدسلوکی کرنا، ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا۔ عورت کا مرد کے مقابل میں (۳۳)۔ اور مرد کا عورت کے مقابلہ میں (۳۸)۔ سورہ مجادلہ میں یہ لفظ مجلس سے اٹھ کھڑے ہونے کے لئے آیا ہے (۵۸)۔ سورہ بقرہ میں ہڈیوں کو اٹھانے، بلند کرنے اور ابھارنے کے معنوں میں آیا ہے (۲۵۹)۔

## ن ش ط

نَشِطَ مِّنَ الْعَمَلِ - وہ اس جگہ سے نکل گیا۔ النّاشِطُ - اُس جنگلی بیل کو کہتے ہیں جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف چلا جائے۔ اس سے اَنْشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنی ہیں اس نے گرہ کو کھول دیا\*\*۔ اَنْشَطَ الْبَعِيرَ مِّنْ عِقَالِهِ - اس نے اونٹ کو اسکی رسی سے کھول کر آزاد کر دیا\*\*\*۔ نَشِطٌ - ایسی گرہ باندھنے کو کہتے ہیں جو آسانی سے کھل جاتی ہو\*\*\*\*۔ اسی سے نَشِيطٌ - بَشِيطٌ - نَشَاطٌ کے معنی ہیں کسی کام کے لئے انسان کا مستعد اور خوش دل ہونا۔ راغب ہونا۔ اُس کام سے خوش ہونا۔ دلچسپی لینا۔ دل کی گرہوں کا کھل جانا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھومنے اور حرکت کرنے کے ہیں۔

قرآن کریم میں النّشِيطَاتِ نَشِطًا (۱۳) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ سیارے جو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ کیونکہ تَنْشِيطَاتِ الشَّقَاقَةِ فِي سَيْرِهَا کے معنی ہیں اونٹنی اپنی رفتار میں تیز رہی\*\*۔ نِيزِ اَنْتَشِطَ الْحَبَلُ کے معنی ہیں اس نے رسی کو اس حد تک کھینچا کہ وہ کھل گئی۔ نَشِطَ الْقَدْلُوْمِ الْبَشِيرِ۔ اس نے کنویں سے پانی کا ڈول کھینچا\*\*\*۔ (چرخہ کے بغیر کھینچنے کے لئے بولا جاتا ہے)

اس اعتبار سے وَالنّاشِيطَاتِ نَشِطًا میں ستاروں کی باہمی کشش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی تیز رفتاری سے ادھر ادھر جاتے والے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کشش کو بھی قائم رکھنے والے۔ ان کی گرہیں کھلی ہوئی بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ

\*تاج و ابن فارس - \*\*تاج - \*\*\*محیط - \*\*\*\*راغب -



بندھے ہوئے بھی ہیں۔ تیز رفتاری اور کشادگی بھی ہے اور نظم و ضبط کی پابندی بھی۔ دیکھئے ایک لفظ نَشْطٌ میں ان سیارگانِ فلک کی خصوصیات کی پوری دنیا کس طرب و نشاط سے جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ وَالنَّاشِيطَاتِ نَشِيطًا سے مراد یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں، یہ انقلابی جماعت انہیں ہٹا دیتی ہے۔ اس کا مشن یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے راستے میں حائل ہوں انہیں ہٹا دے\*۔

## ن ص ب

النَّصَبُ\*۔ کسی چیز کو کھڑا کر کے رکھنا۔ ابھار کر رکھنا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ہموار اور سیدھا کھڑا کر دینے کے ہیں۔ نَصَبَ الشَّجَرَةَ\*۔ درخت زمین میں لگا دیا\*\*\*۔ النَّصَبُ\* گاڑا ہوا جھنڈا۔ النَّصَبُ\* (وَالنَّصِيبَةُ\*)۔ ہر وہ چیز جسے نصب کر دیا جائے اور اس طرح وہ نشان اور علامت بن جائے۔ اسکی جمع اَلْأَنْصَابُ\* ہے۔ ان پتھروں کو بھی جو کعبہ کے گرد نصب کئے گئے تھے اور جن پر جانور ذبح کئے جاتے تھے اَلْأَنْصَابُ\* کہتے تھے\*\*\*\*۔ النَّصِيبُ\*۔ پتھر جو کسی چیز پر ابھار کر رکھ دئے جائیں۔ اس سے اسکے معنی متعینہ (قائم کردہ) حصہ کے ہو گئے\*\*۔ اَلْأَنْصَابُ\*۔ ہر چیز کا اصل اور مرجع\*\*\*\*۔ جَعَلْنَاهُ نَصَبًا عَيْنِي\*۔ میں نے اسے اپنی نگاہ کے سامنے قائم کر لیا کہ نہ اسے بھول سکتا ہوں نہ اس سے غافل رہ سکتا ہوں\*\*\*\*۔ یعنی اسے نصب العین بنا لیا۔

نَصِيبٌ يَتَنَصَّبُ\*۔ تھک جانا اور عاجز و درماندہ رہ جانا\*\*\*\*۔ (غالباً اس لئے کہ تھک جانے والا ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے)۔ النَّصَبُ\*۔ مشقت۔ تھکن۔ کوفت۔ عَيشٌ نَصِيبٌ\*۔ ایسی زندگی جس میں مشقت ہو۔ النَّصَبُ وَالنَّصِيبُ وَالنَّصِيبُ\*۔ بیماری۔ مضر۔ مشقت۔ ابتلا و آزمائش\*\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ\* (۱۵/۲۸)۔ جنت میں انہیں مشقت، تکان یا کسی قسم کی تکلیف چھوٹیکی نہیں۔ نَصِيبٌ\* بمعنی حصہ (۲۴/۲۴) میں آیا ہے۔ سورہ نساء میں نَصِيبٌ\* اور كَيْفَلٌ\* مرادف آئے ہیں (۲۵/۸)۔ سورہ مائدہ میں ہے وَمَا ذُبِحَ عَلَى النَّصَبِ\* (۵/۲۵)۔ اسکے معنی وہ پتھر یا استھان ہیں جن پر غیر اللہ کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں۔ سورہ

معارض میں ہے کَاَنَّهُمْ اِلٰی نَصَبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۳۳)۔ گویا وہ اس قسم کے استہانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ سورہ غاشیہ میں ہے عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸) وہ لوگ جو محنت و مشقت کر کے تھک جائیں۔ محنت اور مشقت ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ محنت صحیح راستے پر کی جائے تو اس کام کا نتیجہ حسب منشا مرتب ہو جاتا ہے۔ اس محنت سے انسان میں تکان پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہی محنت غلط طریق پر کی جائے تو اس کا صحیح نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اس طرح وہ محنت انسان کو بری طرح تھکا دیتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۰۵)۔ ان کے اعمال رائگاں گئے۔ انہوں نے صحیح نتیجہ پیدا نہ کیا۔ یہ ہیں عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸)۔ وہ لوگ جنہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق کام نہ کیا اس لئے ان کے حصے میں تکان اور ماندگی کے علاوہ کچھ نہ آیا۔

سورہ ص میں ہے کہ حضرت ایوبؑ نے خدا کو پکارا کہ اَنْتَیْیَ الشَّقِیْطُیْنِ یَنْصَبِ (۳۸) مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے جس کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف ہے۔ سورہ فاطر میں نَصَبٌ اور لُغُوبٌ (۳۵) ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ یعنی جسمانی مشقت اور نفسیاتی تکان۔ سورہ کہف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے کہا۔ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (۱۸)۔ ہمیں اس سفر سے تکان ہو گئی ہے۔ سورہ انشراح میں ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ (۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو مخالفتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں تو تمہارے پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے تم مزید جدوجہد شروع کرو۔ نصیب۔ یَنْصَبُ فی الامر کے معنی جدوجہد کرنا ہیں\*۔ عام طور پر جب مخالفت ختم ہو جائے تو پروگرام مکمل ہو جاتا ہے، لیکن اقامت نظام خداوندی کے پروگرام کا دوسرا حصہ مخالفت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مخالفت کا ختم ہونا گویا حصہ لا ہے۔ اس کے بعد حصہ لا (یعنی مثبت پروگرام) شروع ہوتا ہے۔ یوں اس جماعت کی ساری زندگی جدوجہد میں گذرتی ہے۔

## ن ص ت

نَصَبَتِ الرَّجُلُ یَنْصِبُ وَاَنْصَبَتْ (نَصَبَتْ کے مقابلہ میں اَنْصَبَتْ زیادہ فصیح ہے)۔ خاموش ہو جانا۔ چپ رہنا۔ کسی کی بات سننے کے لئے خاموش ہو جانا\*\*۔ وَاَنْصَبُوا (۳۳)۔ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔

\*محیط۔ \*\*تاج و محیط۔

## ن ص ح

نَصَحٌ \* - شہد صاف کرنے اور کپڑا سینے کو کہتے ہیں - پہلے معنوں میں نَصَحَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں چیز خالص ہو گئی - النَّاصِحُ \* - شہد خالص - اور دوسرے معنوں میں نَصَحَ الْخَيْطُ الْتَوْبُ \* - درزی نے کپڑے کو سیا، یا عمدگی سے میا \* - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا اور انہیں درست کرنا ہوتے ہیں - نیز النَّصِيحَةُ \* والنَّصِيحَةُ \* ضد ہے فریب اور دھوکا دینے کی - النَّاصِحُ \* وَالنَّاصِحُ \* - درزی کو کہتے ہیں - النَّاصِحُ \* - دھاگہ - النَّصِيحَةُ \* - سوئی - نَصَحَ \* - رِقْو کرنا \* - لہذا نَصِيحَةُ \* کے معنی ہونے کسی کے چاکر گریباں کا نہایت خلوص کے ساتھ رِقْو کرنا - کسی کے بھٹے ہونے کپڑے کو دل کی پوری صفائی کے ساتھ سی دینا - کسی کا سازگار اور خیر خواہ ہونا \* - رسول اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ وَأَنْصَحْ لَكُمْ \* (۶۴) - میں تمہاری چارہ سازی اور حازگاری کے لئے آیا ہوں - میں نہایت خلوص سے تمہارے پیرہن انسانیت کی رِقْو گری کی کوشش کر رہا ہوں - تَوَبُّوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً \* تَصَوُّوْ حَا (۱۱) - تم خدا کی راہ کی طرف اس طرح واپس آؤ کہ اس سے ہٹ کر پھر کسی اور راستے کو اختیار نہ کرو - اپنے آپ کو اس راستے کے ساتھ نہایت اخلاص کے ساتھ متمسک کر لو - اس سے پیوست ہو جاؤ -

## ن ص ر

تَصَوَّرَ الْغَيْثُ \* الْأَرْضَ \* - بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا - أَرْضٌ \* مَتَّصُوْرَةٌ \* - وہ زمین جہاں بارش ہو چکی ہو - الْتَوَّاصِرُ \* (نَاصِرٌ \* یا نَاصِرَةٌ \* کی جمع) وہ ندی نالے جو کسی وادی میں دور سے آئیں - ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ نَاصِرٌ \* اور نَاصِرَةٌ \* اس پانی کو کہتے ہیں جو دور و دراز جگہ سے آئے اور سیلاب کو آگے بڑھتے میں مدد پہنچائے \* - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ نَصْرٌ \* کے معنی وزن پہنچانے کے ہوتے ہیں \* - ابن قارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی خیر لانا اور خیر دینا، بتائے ہیں - نیز النَّصْرُ \* کے معنی عطیہ و بخشش لکھے ہیں -

لہذا اس کے بنیادی معنی زمین کی وہ سیرابی ہے جس سے وہ سرسبز و شاداب ہو جائے - قرآن کریم نے اس جماعت کو جو اس کے قوانین کے مطابق زندگی

بسر کرتی ہے مَفْلِحُونَؑ کہا ہے (۲/۲۰)۔ یعنی وہ لوگ جن کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں۔ جن کی فصلیں کامیاب ہو جائیں۔ (دیکھئے ف۔ ل۔ ح)۔ اس لئے خدا کا قانون وہ بارش ہے جس سے ان کی سعی و عمل کی کھیتی ثمر بار ہوتی ہے۔ اسی کو نصرت خداوندی کہتے ہیں۔ انسان کی وہ کوشش جو قانون خداوندی کے مطابق نہ ہو، اس کسان کی محنت کی طرح ہے جس کی زمین پانی سے محروم رہ جائے۔ انہی کو قرآن کریم نے اَخْسَرِينَؑ اَعْمَالًاؑ اور ضَلَّ سَعْيُهُمْؑ (۱۰۳/۱۰۳) کہا ہے۔ یعنی جن کی کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ اور ان کے کاروبار نے انہیں سخت نقصان پہنچا دیا۔ سورۃ آل عمران میں نصرت بمقابلہ خذل آیا ہے۔ خذل کے معنی ہیں کسی کا ساتھ چھوڑ دینا۔ اس لئے نصرت کے معنی ہیں کسی کا ساتھ دینا۔

چونکہ پانی، کھیتی کے اُگنے میں مدد دیتا ہے اسی لئے نصرت کے معنی اعانت اور مدد کرنا ہیں۔ محیط نے معونت اور نصرت میں فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ نصرت دفع مضرت کے لئے خاص ہے، اور معونت عام ہے۔ اِستِئْصَارٌ۔ مدد طلب کرنا۔ اِستِئْصَرَهُ عَلٰی فُلَانٍؑ اس سے فلان کے خلاف مدد مانگی۔ اِئْتَصَرَ۔ وہ ظالم کے ظلم سے محفوظ رہا۔ اس نے انصاف حاصل کر لیا۔ اس نے انتقام لے لیا\*۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَ اَنْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْؑ (۲۱/۲۸)۔ اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خدا کی نصرت، ان ثمرات کو کہتے ہیں جو اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہذا خدا کی نصرت (یا تائید غیبی) یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ خدا کا ارشاد ہے بَاۤیْسُھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْؑ (۲/۲۰)۔ اے ایمان والو۔ اگر تم نے خدا کی مدد کی قوہ تمہاری مدد کریگا۔ خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام کو دنیا میں قائم کرو۔ اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو۔ اگر تم نے یہ کر دیا تو اس نظام اور قانون کی برکات تمہارے شامل حال ہو جائیں گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وَ بَشِّرِیْتُ اَنْتُمْ اَمْسَکُمْؑ (۲/۲۰)۔ وہ تمہارے پاؤں جما دے گا۔ تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔ اس کے برعکس، جو لوگ اس قانون کے مطابق چلنے سے انکار کریں گے۔ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْؑ (۲/۲۸)۔ ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جائیں گے۔

سورة ہود میں ہے مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ (۱۱۱)۔ اس کے معنی ہیں مجھے خدا کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے۔ یا خدا کے خلاف میری کون مدد کر سکتا ہے۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی اگر میں قاتلون خداوندی کے خلاف چلوں تو میری اس غلط روش کے تباہ کن نتائج سے مجھے کون بچا سکتا ہے۔ سورة شوریٰ میں ہے وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (۲۴)۔ جب ان پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو وہ اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ سورة محمد میں ہے وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرْنَا مِنْهُمْ (۲۴)۔ اس کے معنی ظالم سے بدلہ لینے کے ہیں۔ سورة قمر میں ہے أَنَسِيْ مُغْلُوْبٌ فَاتَنْصِرْ (۵۴)۔ ”میں مغلوب ہوں سو تو میرا بدلہ لے“۔

أَلَا نُنْصَارُ (۱۱۱) قرآن کریم میں یہ لفظ مہاجرین کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اس سے مراد (مدینہ کے) وہ مومنین ہیں جنہوں نے مہاجرین کی مدد کی اور اس طرح نظام خداوندی وہاں متعین ہوا۔ ویسے اَنْصَارُ اللہ (۵۴) کے معنی ہیں، دین خداوندی کی مدد کرنے والے۔

## نصاری

نصاری حضرت عیسیٰؑ کے متبعین بخلاف ہنود (۱۱۱)۔ واحد نصیرانیؑ ہے (۱۱۱)۔ یم ہنودریؑ کے بالمقابل۔ نصیرانؑ اور نصیرانیؑ دونوں کی جمع نصاریٰ ہے۔

## ن ص ف

نصفؑ۔ نصفؑ۔ نصفؑ۔ کسی چیز کی دو شقیوں میں سے ایک شق یا اس کے دو (برابر) اجزاء میں سے ایک جزو۔ یعنی آدھا\*۔ قرآن کریم میں ہے فَلَهَا النِّصْفُ (۲۴)۔ اس (مؤنث) کے لئے نصف (آدھا) ہے۔ أَلَا نُنْصِفُ فِي الْمُعْتَمَلَةِ اسے کہتے ہیں کہ جس قدر فائدہ کسی سے حاصل کرے اتنا فائدہ اسے پہنچائے بھی۔ جس قدر کسی سے اجرت لے اسی قدر اس کا کام بھی کرے۔ کسی سے حقوق مانگے تو اس کے واجبات ادا کرے\*\*۔ قرآن کریم میں عدل اور قیسط کے الفاظ آئے ہیں۔ انصاف کا لفظ نہیں آیا۔ ابن قاری نے کہا ہے کہ أَلَا نُنْصِفُ فِي الْمُعْتَمَلَةِ کے معنی ہیں آدھے پر راضی ہو جانا۔

## ن ص و

النَّاصِيَةِ - سر کا اگلا حصہ - یا سر کے اگلے حصے کی وہ آخری حد جہاں بال اُگے ہوئے ہوتے ہیں\* - (لیکن دیگر لغات میں سر کے اگلے حصہ کی قید نہیں ہے) - پیشانی کے بال - (جمع النَّوَاصِي) مجازاً یہ لفظ عزت و شرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے\* - فَلَانٌ نَّاصِيَةٌ قَوْمِيہ وہ اپنی قوم کا سردار ہے\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بہتر چیز کو انتخاب کرنے یا کسی چیز میں بلندی اور شان و اہمیت ہونے کے ہیں - أَخَذَ بِنَاصِيَتِهِ - پیشانی کے بال پکڑنا - کسی کو بے بس کر کے قبضے میں رکھنا - سورة هود میں ہے وَمَا مِثْنٌ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ الْخَيْدُ بِنَاصِيَتَيْهَا (۱۱/۱۱) - یعنی ہر ذی حیات خدا کے قبضہ قدرت میں ہے - ہر ایک پر اس کا قانون حاوی ہے - کوئی اس کے قانون کی حد سے باہر نہیں - سب اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں -

سورة رحمن میں ہے فَيَتَوَخَّذُ بِالنَّوَاصِي وَآلَا تَقْدَامُ (۵۵/۵۵) - وہ پیشانی کے بالوں اور پہاؤں سے پکڑے جائینگے - ان پر پوری پوری گرفت ہوگی -

## ن ض ج

نَضِيجُ الشَّعَرِ - پھل اچھی طرح پک گیا - هُوَ نَضِيجُ الرَّقَائِي - وہ پختہ اور محکم رائے والا ہے\* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو آخری حد تک پکانا بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد ازاں یہ استعارہ ہر چیز کے انتہائی پختہ ہو جانے کے لئے بولا جاتا ہے - یعنی دراصل یہ لفظ آگ وغیرہ کی تپش سے جلانے اور پکانے کے لئے بولا جاتا ہے - اَنْضِجَ الطَّاهِي اللَّحْمُ کے معنی ہیں پکانے والے نے گوشت کو اتنا پکایا کہ وہ گل گیا اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ ہو گئے\* -

سورة نساء میں ہے كَلَّمَآ نَضِيجَتِ جِلْدُودُهُمْ (۴/۵۶) - یہاں نَضِيجَ کے معنی پک کر پختگی تک پہنچنا نہیں - اس کے معنی گل کر ریزہ ریزہ ہو جانا ہیں - یعنی ان کی قوت اور صلاحیت ختم ہو جائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج - ل - د) -

## ن ض خ

نَضَخَتْہ - يَنْضَخُہ - اس پر چھڑکا - نَضَخَ الْمَاءُ - پانی کا جوش مار کر ابلنا - پانی کا چشمہ سے اہل کر بہنا - عَيْنٌ نَضْخَاخَةٌ - جوش مار کر اہلنے والا چشمہ\* - ابن فارس نے لکھا ہے - کہ اس کے معنی کثیر پانی والا چشمہ ہیں -

قرآن کریم نے ”جنتی باغات“ کے متعلق کہا ہے کہ ان میں عَيْنُنِ نَضْخَاخَتُنِ (۵۹/۶۶) ہیں - جوش مار کر اہلنے والے چشمے - وہ قوتیں جو فوارہ کی طرح اپنے زورِ دروں سے بلندیوں کی طرف لے جائیں -

## ن ض د

نَضَّدَ مَتَاعَہ - يَنْضِدُہ - اپنے سامان کو اوپر تلے رکھنا - بعض چیزوں کو بعض پر ترتیب سے رکھنا - اس طرح ترتیب سے رکھا ہوا سامان نَضِيدٌ وَمَنْضُودٌ کہلاتا ہے\*\* - یعنی، تہ بہ تہ (۵۹/۶۶) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چند چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نظم و ترتیب کے سے ملا کر رکھنے کے ہوئے ہیں، خواہ انہیں کھڑا رکھا جائے یا چوڑائی میں رکھا جائے -

أَلَا نَضَادُ مِینَ الْجِبَالِ - پہاڑوں کی وہ چٹانیں یا پتھر جو ایک دوسرے کے اوپر تلے ہوں - أَلَا نَضَادُ مِینَ السَّحَابِ - وہ بادل جو تہ بہ تہ ایک دوسرے کے اوپر ہوں\*\* - سورہ ہود میں ہے وَأَمْطَرْنَا عَلَیْہَا حِجَابًا مِینَ سِجِّیْنِ مِینَ السَّحَابِ (۱۱/۸۴) ہم نے ان پر پے درپے اور مسلسل پتھروں کی بارش کی - یا ایسے پتھر برسائے جن کی مختلف تہیں (Layers) تھیں -

## ن ض ر

النَّضْرَةُ - خوش حالی و آسودگی - روزی - تسونگری - حسن - دراصل النَّضْرَةُ کے معنی چہرہ کا حسن اس کی آب و تاب اور تروتازگی ہے - النَّضِيرُ گہرے سبز رنگ والے کو کہتے ہیں - النَّضَارُ - سونے وغیرہ کا خالص جوہر - قَدْ أَنْضَرَ الشَّجَرُ - درخت کے پتے سرسبز ہوئے\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی حسن و جمال اور خالص ہونے کے ہیں -

\* تاج و محیط - \*\* تاج و محیط و راغب -

قرآن کریم میں ہے "وَجُودٌ" بِتَوْثِيذٍ نَاضِرَةٍ (۲۴۹)۔ اس دن کچھ چہرے ترو تازہ ، ہشاش بشاش ہونگے ۔ یعنی وَلَتَقْشَهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا (۲۵۱)۔ انہیں شادابی اور مسرت حاصل ہوگی ۔ تَعْرِفُ رِيَّ وَجُودِهِمْ نَضْرَةً النَّعِيمِ (۸۳)۔ "تو ان کے چہروں پر نعمتوں کی شادابی دیکھیگا"۔ یہ ان کی پہچان کی علامت ہوگی ۔ یہ ہے جتنی زندگی کی کیفیت ۔

## ن ط ح

نَطَحَ بِنَطْحٍ\*۔ اس نے سینگ مارا ۔ النَطِيحَةُ\*۔ وہ جانور جو کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے\*۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۵)۔ النِّقْوَاطِحُ\*۔ شدائد و مصائب\*۔

## ن ط ف

النَّطْفَةُ\*۔ صاف پانی ، کم ہو یا زیادہ ۔ ازہری نے کہا ہے کہ عرب تھوڑے سے پانی کو بھی نَطْفَةٌ کہتے ہیں اور زیادہ پانی کو بھی ، لیکن یہ لفظ تھوڑے پانی کے لئے خاص ہے ۔ النَّطْفَةُ\*۔ دریا ۔ سمندر ۔ آدمی کا مادہ\* منویہ ۔ نَطْفَ الثَّمَاءِ\*۔ پانی بہ گیا ۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ٹپک گیا\*\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنوں میں نمی اور تری بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد میں استعارۃً النَّطْفَةُ تھوڑے کو کہتے ہیں اور بیشتر یہ مذموم طور پر بولا جاتا ہے ۔ شَتَّىءٌ نَطِيفٌ\*۔ عیب دار چیز ۔

قرآن کریم میں انسانی خلقت کے ایک مرحلہ کے متعلق متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اسے نَطْفَةٌ سے پیدا کیا (۱۲)۔ یعنی اس سے جنین کی پیدائش ہوتی ہے ۔

## ن ط ق

نَطَقَ\*۔ آواز دار حروف کے ساتھ بولنا جس سے معنی سمجھ میں آتے ہوں ۔ حیوانات کے بولنے کو نَطَقٌ نہیں بلکہ صَوْتُ کہتے ہیں ۔ النَّطْقَةُ\* اللہ ۔ خدا نے اسے بلوایا\*\*\*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ نَطَقٌ کا لفظ انسان کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ویسے کسی بات کے واضح کر دینے کو بھی کہتے ہیں ۔ جیسے نَطَقَ الْكِتَابُ کے معنی ہیں کتاب نے بیان کر دیا اور واضح کر دیا\*\*\*\*۔ النَّطَاقَةُ\* کوکھ کو کہتے ہیں اور النَّطَاقُ\* اُس پشکے (یا لہنگے ازار وغیرہ) کو جو کمر کے ساتھ باندھ لیا جائے\*\*\*۔ اس

\*تاج و محیط و ابن فارس ۔ \*\*تاج و محیط و راغب ۔ \*\*\*تاج ۔ \*\*\*\*محیط ۔



اعتبار سے راغب نے کہا ہے کہ نَطَّقَ\* وہ لفظ ہے جو معنی کو اپنے گھیرے میں لے لینے کی وجہ سے نِطَاق\* کی طرح ہو\*\*\*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی دو بنیادی معنی لکھے ہیں۔ یعنی (۱) کلام یا کلام کے مشابہ کوئی چیز۔ اور (۲) ایک قسم کا لباس۔ یعنی النِطَاق۔ ازار۔

قرآن کریم میں ہے اِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ (۲۱۳)۔ اگر وہ بولتے ہیں تو۔ سورہ جاثیہ میں ہے هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِيقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۲۵۹)۔ یہ ہماری کتاب (تمہارا اعمال نامہ) ہے جو تمہارے خلاف ہر بات کو حق کے ساتھ بتا دیتی (یا واضح کر دیتی) ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ اَنْطَقْنَا اللّٰهُ الَّذِي اَنْطَقَ كَلَّ شَيْءٍ (۴۱)۔ ہمیں اسی خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نَطَّقَ\* سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل و حرکت اسکی شہادت دیتی ہے کہ.....

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سایمان\* کو مَنَطِيقُ\* القطیر (۱۶) دکھائی گئی تھی۔ اس کے معنی ہیں قبیلہ طیر کی بولی۔ (یا بطور استعارہ گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے فواعد و ضوابط)۔ (دیکھئے عنوان ط۔ ی۔ ر)۔ اگر اس سے مفہوم ”پرندوں کی بولی“ لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ عام جس سے انسان، پرندوں کی نقل و حرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ چیز، پرندوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔

## ن ظ ر

نَظَرَ۔ يَنْظُرُ\*۔ آنکھ سے دیکھنا۔ کسی چیز میں غور کرنا۔ اندازہ کرنا اور دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر اس کی بابت قیاس کرنا۔ چنانچہ اَلنَّظَرُ\* فراست کو کہتے ہیں۔ توجہ دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُنْظُرْ\* فی\*۔ میری طرف توجہ دو۔ میری طرف التفات کرو\*۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غور کرنا اور معائنہ کرنا ہیں۔

نیز اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ نَظَرَ\* تَه\* وَاَنْتَظَرَ\* تَه\*۔ میں اس کی آمد کا منتظر رہا۔ اسی سے مہلت دینے کے معنوں میں اَنْظَرُ\* تاج\*۔ \*\*محیط۔ \*\*\*راغب۔

استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کو مہلت دیدی۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْ نِيْ اِلٰی یَسُوْمٍ یُّبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنْ شِئْتَ مِنْ اَلْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۵۵)۔ ”اس (ابلیس) نے کہا۔ میرے رب تو مجھے یوم البعث تک مہلت دے دے۔ (اللہ تعالیٰ نے) کہا کہ تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی ہے۔“ سورة بقرہ میں ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو فَتَنْظِرُوْهُ اِلٰی مٰیْسَرَةٍ (۲۸۰)۔ ”اسے فراخی تک مہلت دیدینا چاہئے۔“

تَنْظِرَ کے معنی ہیں آمنے سامنے ہونا۔ اَلتَّنْظِیْرُ۔ مثل اور مشابہ۔ اَلتَّنْظِیْرُ کے بھی یہی معنی آتے ہیں\*۔

اَلتَّنْظِرَةُ کے معنی ہیں عیب اور بدھیتی۔ اَلْمُنْتَظَرُ۔ عیب دار۔ معیوب\*۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں جہاں کہا گیا ہے فَتَنْظِرْ نَظْرَةً فِی النَّجْوٰی (۳۸)۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم ستاروں کی پرستش کرتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی ماہیت پر غور و فکر کیا اور انہیں بتایا کہ ان میں وہ کیا کیا کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے وہ معبود بن سکنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (مثلاً یہ کہ وہ خود مجبور ہیں۔ ان کا طلوع و غروب بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ وہ اُفلیئینؑ ڈوب جائے والے ہیں وغیرہ وغیرہ)۔ اور اس کے بعد کہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (۳۹)۔ میں اس قسم کے معبودوں سے بیزار ہوں۔ میں ان کی پرستش نہیں کر سکتا۔

نَظَرَ لَہُمْ۔ کے معنی ہیں ان کی وجہ سے درد مند ہوا اور ان کی مدد کی۔ اور نَظَرَ بَیْنَهُمْ کے معنی ہیں ان کے درمیان فیصلہ کر دیا\*۔

اگرچہ نَظَرَ کے معنی غور کرنے کے بھی ہیں لیکن چونکہ اس کے اولین معنی صرف دیکھنے کے ہیں اس لئے قرآن کریم نے نَظَرَ اور بَصَرَ میں فرق کر کے بتا دیا۔ سورة اعراف میں ہے وَ تَرَاہُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَ هُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۶۸)۔ تو دیکھے گا کہ وہ صرف تیری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں (لیکن جو کچھ تو کہتا ہے اس پر) چشم بصیرت سے غور نہیں کر رہے ہوتے۔ اس طرح کے ”دیکھنے والوں“ کو قرآن کریم اَلْعُصٰی کہتا ہے۔ یعنی اندھے (۱۳)۔ وہ جن کی ”دل کی آنکھیں“ اندھی ہو جاتی ہیں (۲۶)۔

## ن ع ج

اَلنَّعِیْجُ۔ موٹا ہونا۔ نَعِیْتَ اِلَیْہِ۔ اونٹ فریبہ ہوئے۔ اَلنَّاعِیْجَةُ۔ نرم اور ہموار زمین جہاں پیداوار بہت اچھی ہوتی ہو۔ اَلنَّعِیْجَةُ۔ مادہ بھیڑ۔\* تاج و راغب۔

ہرنی - نیل گائے یا پہاڑی بکری\* - (جمع نِعَاج\*) - قرآن کریم میں یہ لفظ (واحد اور جمع) (نِعَاج: ۳۸) میں آیا ہے۔

## ن ع س

النَّعَاسُ\* - نیند کی گرانی سے حواس میں جو سکون اور خاموشی سی پیدا ہونے لگتی ہے\* - صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ نَوْمٌ\* نونیند کی وہ حالت ہے جسم میں انسان کے حواس قطعاً معطل ہو جاتے ہیں اور نَعَاسٌ\* اس کی ابتدائی حالت کو کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ سِنَّةٌ\* - سر میں نیند کی گرانی کو کہتے ہیں - نَعَاسٌ\* - آنکھ میں ہوتی ہے اور نَوْمٌ\* دل میں\*\* - راغب نے نَعَاسٌ\* کو نَوْمٌ\* قَلِيلٌ\* کہا ہے - ہلکی سی نیند - اور لکھا ہے کہ قرآن کریم کی آیت (۱۱) میں اس سے مراد سکون و اطمینان ہے\*\*\* - قرآن کریم میں ہے اِذْ يَغْشَىٰ كُفْرًا النَّعَاسَ آمَنَةً (۱۱) جب خدا نے امن و سکون کے لئے تم پر نَعَاسٌ\* طاری کردی - (نیز ۳۳) - اس سے مراد سکون و اطمینان ہے نہ کہ اونگھ۔

## ن ع ق

نَعَقَ الْقِرَاعِي بِغَنَمِهِ - يَنْعِقُ\* - نَعَقًا - چرواہے کا بھیڑ بکریوں کو (هانکنے کے لئے) جھڑکنا اور آواز دینا\*\*\*\*۔

سورہ بقرہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کئے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں - انہیں بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دی ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ چرواہے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ہیں، اپنی سمجھ بوجھ سے کچھ نہیں کرتیں - چرواہے کی یہ آواز بھی محض ”آواز“ ہوتی ہے جسکے معنی کچھ نہیں ہوتے - اندھی تقلید کرنے والے بھی الفاظ کے مفہوم کو نہیں سمجھتے - ان کے متعلق جو کچھ انہیں بتا دیا جاتا ہے (کہ یہ کہا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا اور وہ کہا جائے تو وہ) اسکے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں - مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَتَالَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً (۱۱)۔ ”حقائق سے انکار کرنے والوں کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو ایسے آواز دے رہا ہو جو بجز ہکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔“ (یعنی صَمٌّ\* - بُكْمٌ\* عُمًى\* - فَهَمْ\* لَا يَنْفَعِيهِمْ) - بھرے - گونگے - اندھے - جو عقل سے کام

نہیں لیتے)۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ہمارے مروجہ مذہب کی کیسی عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور انکے پیشوا چرواہے جنہوں نے اپنے آباء سے چند الفاظ سن رکھے ہیں جنہیں وہ بلا سمجھے بوجھے دہراتے رہتے ہیں۔ اور عوام ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں۔

## ن ع ل

نَعْلٌ\*۔ ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نشیبی ہونے اور نچلا حصہ ہونے کے ہیں۔ النَعْلُ\*۔ جوتا۔ ہر وہ چیز جس سے پاؤں کا زمین پر لگنے سے بچاؤ کیا جائے\*۔ سورہ طہ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ فَتَاخِلْ نَعْلَيْكَ (۲۴)۔ اپنے دونوں جوتے اتار دو۔ (ذرا اطمینان سے بیٹھو۔ اور سکون سے بات منو)۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان خ۔ ل۔ ع)

## ن ع م

نَعِيمٌ بِہِ عَيْنًا۔ اس نے کسی چیز یا منظر کو ایسی کیفیت لئے ہوئے پایا جس سے اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوا۔ دراصل تَنْعِيمٌ\* ایک پودا ہوتا ہے جسکے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اسکی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ثَوْبٌ\* نَاعِيمٌ\*۔ اُس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو بہت نرم اور آرام دہ ہو۔ اور نَعَامٌ\* جنوبی ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی خوشگوار اور تمام ہواؤں سے زیادہ مرطوب ہوتی ہے۔ اُن معانی کے اعتبار سے النَاعِمَةُ\*۔ النَعَامَةُ\* والمُنْعَمَةُ\*۔ آسودگی اور خوشگوار زندگی گزارنے والی خوش خوراک عورت کو کہتے ہیں\*\*۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہے۔ النَعَامَةُ\*۔ بلند عمارت جو کسی پہاڑ پر چھجے کی طرح ہو۔ کنوئیں پر جمائی ہوئی ابھری ہوئی چٹان۔ اونچا نشان یا جھنڈا جس سے راستے کا پتہ چلا یا جائے\*\*۔ اِبْنُ النَعَامَةِ\*۔ وہ پانی ہلانے والا جو کنوئیں پر کھڑا رہتا ہے\*\*۔

قوم کی اجتماعیت اور باہمی اتفاق کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے\*\*۔ کہتے ہیں شَالَتْ نَعَامَتُهُمْ\*۔ اُن کا شیرازہ بکھر گیا۔ النَعْمَةُ\*۔ وہ حالت جس میں انسان لذت محسوس کرتا ہے\*\*\*۔ نیز مسرت۔ مال و دولت۔ آسودگی و خوش حالی اور احسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے\*۔

\*تاج۔ \*\*تاج و محیط۔ \*\*\*راغب۔

ان معانی سے واضح ہے کہ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، باند اور اذیت و تکلیف سے دور ہو جانا نِعْمَت ہے۔ چنانچہ سورہ نحل میں دنیاوی زندگی کے مختلف ساز و سامان کے تذکرہ کے بعد کہا ہے كَذَٰلِكَ يَتِمُّ الْيَعْمَىٰ نِعْمَتَهُ عَلَيْهِ كُنتُمْ (۱۱۱)۔ اس سے نِعْمَت کے معنی واضح ہیں۔ سورہ لقمن میں اس سامان کو نِعْمَت اللہ کہا گیا ہے جو کشتیوں کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کیا جاتا ہے (۳۱)۔ سورہ آل عمران میں میدان جنگ کی فتوحات اور مال غنیمت کو بھی نِعْمَت کہا گیا ہے (۳۳)۔ سورہ نحل میں نِعْمَت کے مقابل ضَرَر لا کر اس کے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے (۱۱)۔ یعنی زندگی کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دور رہنا۔ سورہ دخان میں زندگی کی تمام آسودگیوں اور خوش حالیوں کو نِعْمَت سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۲)۔ سورہ غاشیہ میں نَاعِمَت کے مقابلہ میں خَاشِعَت اور نَاصِبَت (تھکے ماندے۔ افسردہ و غمگین۔ ذلیل و خوار) لا کر، زندگی کی تر و تازگی اور شادابی و شکفتگی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے (۸۸/۸)۔

بلندی اور رہنمائی (ہدایت خداوندی) کے مفہوم کی وضاحت کے لئے سورہ ابراہیم میں نِعْمَت اللہ کے مقابلہ میں کُفْر کا لفظ آیا ہے (۱۲۸)۔ اس مقام پر کفر کے معنی زندگی کی خوشگوازیوں کی ناقدر شناسی بھی ہو سکتے ہیں۔

نَاعِمَت (۸۸)۔ تر و تازہ خوشگوازیوں کے لئے ہوئے۔ نِعْمَت (۲۲)۔ آسودگی۔ نِعْمَت (۲۲)۔ فضل و کرم۔ احسان۔ اس کی جمع آنعم آتی ہے۔ کائنات کی ہر شے جسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے نِعْمَت ہے (۳۴/۳۴)۔ نیز اقوام عالم پر فضیلت مل جانا بھی نعمت ہے (۲)۔

طبعی آسائشوں کے علاوہ ذہنی صلاحیتوں کے عمدہ ہونے کے لئے بھی نِعْمَت کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۲۹/۲۹ و ۷۸)۔ اور جسمانی صفاتی اور تندرستی کے لئے بھی (۹)۔

قرآن کریم نے اس قوم کو جو زندگی کے بہترین اور بلند ترین مقام پر ہو، مَنَّعَ عَلَيْهِ سے تعبیر کیا ہے۔ اور انہی کے راستے پر چلنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں (۱)۔ نِعْمَت کے ان تمام معانی کو پیش نظر رکھنے سے جو اوپر لکھے جا چکے ہیں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی قوم کن خصوصیات کی حامل اور کس مقام پر سرفراز ہوگی۔ انہی لوگوں کو قرآن کریم

مومن کہتا ہے۔ لہذا، جنہیں یہ کچھ حاصل نہیں یا جو اس کے حصول کی جدوجہد نہیں کرتے۔ سمجھ لیجئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن نہیں۔ نِعَم کے معنی ہیں ”بہت ہی اچھا ہے“۔ نِعْمُ التَّاهِدُونَ (۵۸)۔ بہت ہی اچھے ہیں ہم سامانِ زندگی کے بہم پہنچانے والے۔ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ (۵۸)۔ بہت ہی اچھی بات ہے جسکی تمہیں نصیحت کر رہا ہے۔ (یہ دراصل نِعْم + ما ہے۔ یہ ما موصولہ ہے)۔

نِعْمٌ وَنِعَمٌ جمعِ اَنْعَام کے عام معنی مالِ مویشی کے ہیں۔ عرب عام طور پر یہ لفظ اونٹ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دنبہ کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن بعض نے اسے صرف اونٹوں کے لئے مخصوص قرار دیا ہے\*۔ قرآن کریم نے اونٹ۔ گائے۔ بھیڑ اور بکری۔ چاروں کو اس میں شامل کیا ہے (۳۹ و ۴۰)۔

قرآن کریم میں ۹ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةً اَلَا نَعَامٌ اِلَّا مَا يَمْلُؤُ غُلَّتْ لَكُمْ (۳۹)۔ تمہارے لئے بَهِيمَةً اَلَا نَعَامٌ حلال کئے گئے ہیں، بجز ان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہے۔ یہ الگ حکم اسی سورت میں دو آیات آگے چل کر ہے جس میں ”مردار۔ خون۔ خنزیر۔ کے گوشت کو اور ہر اس چیز کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام قرار دیا گیا ہے (۵)۔

جیسا (کہ ب۔ ۵۔ م) کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، بَهِيمَةً کے معنی ہیں وہ جو بول نہ سکے۔ اس اعتبار سے بَهِيمَةً اَلَا نَعَام کے معنی ہونگے، مویشی، جو بول نہیں سکتے۔ انگریزی میں جیسے (Dumb Cattle) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ لفظ (بَهِيمَةً) اَنْعَام کی صفت ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اَنْعَام میں سے جو بَهِيمَةً (گوئیں) ہیں وہ حلال ہیں۔ باقی نہیں۔ اَنْعَام تو سب کے سب بَهِيمَةً (گوئیں) ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم نے اونٹ، گائے۔ بھیڑ اور بکری کو انعام میں شامل کیا ہے۔ لیکن (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) بہیمۃ الانعام میں تمام وہ حیوان شامل ہیں جو چرتے چکتے ہیں۔

سورة فاطر میں اَنْعَام کو انسان اور دَوَاب سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵)۔ اگرچہ دَوَاب میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د۔ ب۔ ب)۔ لیکن یہاں دواب کے معنی پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے۔ لہذا، اَنْعَام سے مراد چارپائے ہونگے۔



ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے 'ا' لَا نَعَامٌ سے مراد چرنے چگنے والے مویشی ہیں۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے۔ سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ کھالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں۔ نیز یہ وجہ زینت بھی ہوتے ہیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ (یعنی اس زمانہ کے عرب 'ا' لَا نَعَامٌ سے یہ کام لیا کرتے تھے)۔ 'ا' لَا نَعَامٌ میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، سب کھانے کے لئے حلال ہیں۔ خنزیر، چرنے چگنے والا حیوان ہے اس لئے بھیمة الانعام میں شامل ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ح۔ ر۔ م)۔

## نَعَم (حرف)

نَعَمٌ۔ ہاں۔ قَالُوا نَعَمٌ (۶۳)۔ انہوں نے کہا۔ ہاں (ایسا ہی ہوا ہے)۔ یہ حرف ایجاب ہے۔

[نَعَمٌ اور نَعِمًا عنوان، ن۔ ع۔ م میں دیکھئے]۔

## ن غ ض

نَغَضَ الشَّقِيئُ يَنْغَضُهُ۔ کسی چیز کو متحرک کیا۔ نَغَضَ الشَّقِيئُ۔ کوئی چیز متحرک و مضطرب ہوئی۔ (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے)۔ نَغَضَ رَأْسَهُ۔ اس نے اپنے سر کو حرکت دی۔ اخفَضَ نے کہا ہے کہ تھرتھراہٹ کے ساتھ هلنے کو نَغَضَ کہتے ہیں۔ نَغَضَ شَرِ مَرِغٍ کو کہتے ہیں کیونکہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا سر بہت ہلتا ہے\*۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ اَنْغَضَ رَأْسَهُ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کی بات سن کر اس سے انکار کرتے ہوئے اپنا سر ہلا دے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تعجب سے یا کسی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے سر ہلانے کو کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے فَتَسْتَنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ (۱۶)۔ یہ تیری بات کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو تیرے سامنے ہلا دینگے۔ تعجب کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلا دینگے۔

## ن ف ث

نَفَثَ۔ يَنْفُثُ۔ پھونک مارنا۔ امطرح آہستہ سے پھونک مارنا کہ اسکے ساتھ لعاب دھن باہر نہ نکلے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ، منہ\* تاج و راغب۔



وغیرہ سے کسی معمولی سی چیز کے ، ہلکی سی آواز کے ساتھ نکلنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اگر اس سے کچھ زیادہ ہو جائے تو اسے تَفْثُلٌ کہہینگے ۔ اسی سے تَفَثٌ الشَّقِیُّ عَافِیَ الْقَلْبِ کسی بات کو ہولے سے کسی کے دل میں ڈال دینے کو بھی کہتے ہیں ۔ کسی کے کان میں کچھ پھونک دینا ۔ اِسْرَآةٌ تَفَاقُتُ ۔ جادوگری کو کہتے ہیں جو گہروں میں پھونکیں ماسر ماسر کر تعویذ گنڈے تیار کرتی ہے ۔ تَفَثٌ ۔ پھونک ماسرنا ۔ جادو کرنا ۔ دل میں کوئی بات ڈالنا ۔

قرآن کریم میں مِّنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ (۱۱۳) آیا ہے ۔ عَقْدٌ کے معنی ہیں پختہ گرہیں ۔ لہذا تَفَثَاتٌ کے معنی ہوئے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی سے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیں ۔ جو محکم ارادوں میں پھونک مار دیں ۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ قومیں یا جماعتیں ہیں جو اپنے جھوٹے ہر ایک گنڈے سے انسانوں کی فطری ترقی کو روک دیتی ہیں ۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس قسم کے عمل کو جس سے دوسرا کمزور پڑ جائے ، عرب سحر یا جادو کہتے تھے ۔

## ن ف ح

تَفْجُحٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کے چل پڑنے یا اٹھانے کے ہیں ۔ (ابن فارس) ۔ تَفْجَحُ الطَّيِّبُ يَتَفَجَّحُ ۔ خوشبو پھیلی ۔ تَفْجَحَتِ الثَّرِيحُ ۔ ہوا چلی ۔ رِيحٌ تَفْجُوْحٌ ۔ تیز چلنے والی ہوا ۔ تَفْجُحٌ ۔ ہر ٹھنڈی ہوا کو کہتے ہیں ۔ اور لَفْجُحٌ گرم ہوا کو ۔

التَّفْجُحَةُ مِّنَ الثَّرِيحِ ۔ ہوا کا جھونکا ۔ تَفْجُحَةُ الْقَدَمِ ۔ خون جو پہلی بار بیکبارگی تیزی سے نکل پڑے ۔ قرآن کریم میں تَفْجُحَةُ مِّنَ الْعَذَابِ (۲۱) آیا ہے ۔ یعنی عذاب خداوندی کی ایک لپٹ ۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ۔ عذاب کی جھلک ۔

## ن ف خ

تَفْخِخٌ ۔ يَتَفَخَّخُ ۔ منہ سے ہوا نکلنا ۔ پھونک ماسرنا ۔ جیسے تَفْخِخُ فِی النَّارِ ۔ اس نے آگ میں پھونک ماری ۔ سورہ کہف میں ہے اَتَفْخِخُوْا (۱۸) ۔ اسے دھونکو ۔

\* تاج و راغب ۔ \*\* تاج و محیط و راغب ۔ \*\*\* المقام المحمود صفحہ ۲۱۷  
\*\*\*\* تاج و محیط ۔

اِنْتَفَخَ الشَّيْءُ - چیز پھول گئی\* - اِنْتَفَخَ النَّهَارُ - دن چڑھ گیا\*\* - اِنْتَفَخَاءُ مِنَ الْأَرْضِ - بلند زمین - اَلْدُّفُ قَاخَةٌ - وہ پتھر جو پانی کی سطح سے اونچے ہوں - نیز ہلے\* - ابن فارس نے اس مادہ کے معنی پھولنے اور بلند ہونے کے لکھے ہیں -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں متعدد مقامات پر نَفَخَ فیہُ مِّنْ رُّوْحِهِم (۲۱) یا نَفَخْتُ فیہُ مِّنْ رُّوْحِی (۱۵) کے الفاظ آئے ہیں - جیسا کہ رُوح کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، رُوح سے مراد الوہیاتی توانائی (اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوت - انسانی ذات یا Personality) ہے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ملی ہے - اس لئے نَفَخَ رُوح سے مراد ہوا کی طرح کچھ پھونکنا نہیں بلکہ انسانی قوتوں اور توانائیوں کا عطا کرنا ہے جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں - یہی وہ چیز ہے جسکی طرف سورہ آل عمران میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ہو جائیگی - جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ہو جائیں گی - اَنَسِیْ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ - فَتَنْفَخُ فیہُ فَمَکْثُوْنٌ طَمِیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳۸) - میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے - میں تم میں ایسی روح پھونکوں گا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ہو جائیں گی - اقبال کے الفاظ میں -

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشّت پرے داری  
بہامن بہاتو آموزم طریق شاہبازی را

قرآن کریم میں نَفَخَ صُوْر کا بھی ذکر کئی جگہ آیا ہے - جیسا کہ (ص - و - ر) کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، اس کے معنی وہ نرم گھا (بگل) بھی ہیں جسے اعلان جنگ کے لئے بجایا جاتا تھا - اور یہ لفظ صورت (Form) کی جمع بھی ہے - اول الذکر مفہوم کے اعتبار سے نَفَخَ صُوْر کے معنی ہونگے حق و باطل کے درمیان اعلان جنگ - اور ثانی الذکر مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی ہونگے حیات تازہ عطا کرنا - نئی توانائیاں بخشنا، جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں (۱۱) - (دیکھئے عنوان ص - و - ر)۔

\* تاج و محیط - \*\* راغب -

## ن ف ذ

نَقِيدَ الشَّيْءِ \* يَنْقَدُ نَقَادًا - چیز کا فنا ہو جانا - جاتے رہنا -  
زمخشری نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں فاء کلمہ نون ہو اور عین کلمہ  
فاء - تو ان الفاظ کے معنی جاتے رہنے اور نکل جانے کے ہونگے \*\*۔ (مثلاً نَقِيدُ -  
نَقْدٌ - نَقَرٌ - نَقَمٌ - نَقَضٌ نَقْضٌ وَغَيْرُهُ)۔

أَنْقَدَ الْقَوْمُ \* لوگوں کا توشہ اور مال ختم ہو گیا \* - قرآن کریم  
میں ہے مَا عَيْنُكُمْ يَنْقَدُ وَمَا عَيْنُ اللَّهِ بَاقٍ (۱۶۶) - جو تمہارے پاس  
ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے - اسی  
باقی کی تفسیر دوسری جگہ مآلہ میں \* نَقَادٍ (۳۸) سے کر دی یعنی جو  
ختم ہی نہ ہو -

## ن ف ذ

النَّقَادُ \* کسی چیز کے آر پار ہو جانا - جیسے تیر کا نشانے میں ایک  
طرف سے گھس کر اس کے دوسری طرف سے باہر نکل جانا (خواہ وہ ذرا سا بھی  
باہر کیوں نہ نکل جائے) - طَعْنَةٌ نَقَائِدَةٌ \* نیزے کی ایسی مار کو کہتے  
ہیں جو آر پار ہو جائے \*\*\*۔

أَنْقَدَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں وہ (پیچھے سے چل کر اس گروہ میں  
شامل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا) انہیں پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل گیا -  
النَّقَائِدَةُ \* - کمرے کا سوراخ یا روشن دان جس سے روشنی اندر آتی ہو - نَقْدُ  
الشَّيْءِ \* اس نے کسی چیز کو بھاڑ دیا \*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس  
مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز میں سے گزر جانا ہیں -

قرآن کریم میں ایک عظیم آیت ہے جس سے انسانی ارتقاء کے ممکنات پر  
روشنی پڑتی ہے - سورۃ رحمن میں ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ - اے  
گروہ جن و انس! (یعنی وہ انسان جو مشہروں کے رہنے والے ہوں یا صحرا نشین) -  
إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ  
فَاتَنْفُذُوا - اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ آسمان و زمین (یعنی اس  
مادی کائنات) کے کناروں کو چیر کر آگے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ - لیکن یہ

\* تاج و راغب \* فعل - تینوں حرفوں سے ملکر بنا ہے - اس میں پہلا حرف فاء کلمہ،  
دوسرا ع کلمہ - اور تیسرا ل کلمہ ہے - دوا کلمہ ن ہو کے معنی ہیں پہلا حرف ن  
ہو - اور دوا کلمہ فاء کے معنی ہیں دوسرا حرف فاء (ف) ہو جیسے نقد -  
\*\*\* تاج و راغب و محیط -

یاد رکھو کہ - لَا تَنْفُذُواْ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵)۔ تم مسُلْطٰن!۔ (قدرت و غلبہ) کے بغیر نہیں نکل سکو گے۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے حدود سے باہر چلا جائے۔ لیکن اس کے لئے اسے ایک خاص قوت کی ضرورت ہوگی جو مادی موانعات پر غالب آسکے۔ یہ قوت وحی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے (اس لئے قرآن کریم نے خود وحی کو سُلْطٰن! کہا ہے۔ دیکھئے عنوان س۔ ل۔ ط)۔ یعنی وحی کے اتباع سے انسانی ذات میں ایسی نشو و نما آسکتی ہے کہ وہ مادی چار دیواری سے آگے نکل کر زندگی کے دیگر مراحل طے کرنے اور حیات جاوید حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ حیوانی سطح پر زندگی محض آب و گل کی طبعی زندگی ہوتی ہے لیکن انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس میں حیات جاوید کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام وہ سُلْطٰن! ہے جس سے زندگی آب و گل کی چار دیواری سے نکل کر آگے جاسکتی ہے۔ یاد رکھئے۔ مادی کائنات سے باہر نکلنے سے مراد انسان کے جسم کی پرواز نہیں۔ اس سے مراد اس کی ذات (Personality) کا ارتقاء ہے۔ جسمانی پرواز سے انسان جتنا اونچا جی چاہے اڑ جائے، وہ بہر حال مادی کائنات کی چار دیواری کے اندر ہی رہے گا۔ مادی کائنات سے آگے نکل جانا انسانی ذات ہی کے لئے ممکن ہے۔ یعنی موت کے بعد حیات جاوید حاصل کرنا۔ اس زندگی میں انسان کے لئے مادی کائنات کے حدود سے باہر نکل جانا ناممکن ہے۔ یہ چیز مرنے کے بعد، اگلی زندگی ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ”روحانی قوت“ سے مادی کائنات کے حدود سے باہر چلے جاتے ہیں، وہ محض اپنے خیالات کی رو سے ایسا سمجھتے ہیں۔ اپنے تخیل میں آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اس کے لئے کسی قوت (سلطان) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کی رو سے انسان مادی کائنات سے باہر مرنے کے بعد ہی جاسکتا ہے۔ اُسی زندگی میں پہنچ کر اسے حیات جاوید حاصل ہو سکتی ہے۔

## ن ف ر

النَّفَرُ۔ بے قرار ہونا اور اپنی جگہ سے اٹھ جانا، ہٹ جانا\*۔ ”جدا ہو جانا\*\*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی الگ ہو جانا اور دور ہو جانا بتائے ہیں۔ کسی چیز سے بے رخی برتنا اور اس سے الگ ہونا۔ نَفَرٌ اِلٰی الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف تیزی سے جانا\*\*۔ نَفَرَتْ الدَّابَّةُ و\*راغب۔ \*\*ناج و محیط و راغب۔

اسْتَنْفَرْتُ - جانور کا کسی سے گھبراننا اور دور چلے جانا - نَفَقَرْتُ -  
 اسْتَنْفَرْتُ - میں نے اسے متوحش کر دیا اور بھگا دیا - مُسْتَنْفِرٌ -  
 متوحش ہو کر بھاگ جانے والا \* - قرآن مجید میں ہے حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ  
 (۵۶) - ہدکنے والے گدھے - نَفَرُوا نَفْرًا مَشْرًا - وہ اس معاملہ کے لئے نکل  
 کھڑے ہوئے \* (۳۱) - اَلنَّفَرُ (۱۸) - وہ جتھا یا گروہ جو کسی کی مدد  
 کے لئے اٹھ کھڑا ہو - نَفِيرٌ بھی اسی معنی میں ہے \* (۱۶) - نَفُورٌ -  
 گھبرا کر بھاگنا - نفرت کرنا (۲۶) - اَلْمُنْفِرَةُ - مفاخرت (اس لئے کہ لوگ  
 اَبْنَا اَعَزَّ نَفَرًا کہا کرتے تھے) \* -

## ن ف س

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَفْسٌ کے بہت سے معنی ہیں -  
 منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ  
 پر بولا جاتا ہے - نیز وہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس  
 کی قوت) پیدا ہوتی ہے - عقل - علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے \*\*\* - اور  
 عَيْنٌ الشَّيْءِ کے معنوں میں بھی - جیسے جاءَ نِيَّ الْمَلِكِ بِنَفْسِيہ -  
 بادشاہ میرے پاس بنفس نفیس آیا - نیز عظمت اور بڑائی، ہمت، غیرت، ارادہ  
 اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی - نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بھند کے بھی  
 ہوتے ہیں \*\*\* - اسکے علاوہ خون کے معنوں میں بھی - چنانچہ نَفَاسٌ اُس  
 خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے \*\*\* - خود ولادت  
 (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے - نَفَسٌ - سانس کو کہتے  
 ہیں - اسکی جمع اَنَفَاسٌ آتی ہے \*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے  
 بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں - نَفَسٌ کے معنی وسعت اور  
 کشادگی کے بھی ہیں - ابک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں - اور طویل  
 چیز کو بھی - نَفِيسٌ مثال کثیر کو کہتے ہیں اور شَيْءٌ نَفِيسٌ وہ  
 عمدہ چیز جسکی طرف انسان لپک کر جائے - تَنَفُّسٌ کے معنی ہیں سانس لینا -  
 نِيز تَنَفُّسُ الصُّبْحِ کے معنی ہیں صبح کا واضح اور روشن ہو جانا (۸۸) -  
 نَفَاسٌ اور تَنَفُّسٌ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے  
 کی کوشش کرنا ہیں (۲۶) \*\*\* -

نیز اس کے معنی عیندی (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں - تاج العروس  
 نے اسکی مثال کے لئے سورہ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ  
 مَا فِي نَفْسِكَ (۱۱۶) لکھی ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب)  
 \* تاج و محیط و راغب - \*\*\* تاج و ابن فارس - \*\*\* تاج و لسان العرب -

جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (ہاس) ہے میں اسے نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں۔ مثلاً وَيُحْذِرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ (۳۳)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانون مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے\*۔

آنفُس کے معنی بھائی بند بھی عین (۲۸) اور خود اپنا آپ بھی (۲)۔ اس قسم کے مقایسات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (Yourself) یا (Himself) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں اس لفظ (نفس) کو قرآن کریم نے اس ”شے“ کے لئے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human Personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I-am-ness) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصورات حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (Physical life) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخر الامر مرجاتا ہے۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عصر حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریہ حیات (Materialistic Concept of life) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر ”مغربی تہذیب“ کہا جاتا ہے وہ اسی نظریہ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے

انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم نہیں ہی کرتا۔ (دیکھئے مثلاً  $\frac{29}{91-96}$ ؛  $\frac{23}{83-88}$ ؛  $\frac{31}{25}$ ؛  $\frac{39}{38}$ ؛  $\frac{33}{9}$ )۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبعی زندگی کا نام ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے، یا زیادہ سے زیادہ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہدے۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے، اور بس۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورہ الجاثیہ میں ہے۔ اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ الْاِلٰهَہٗ هَوَہٗ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضٰ اللّٰہُ اللّٰہَ عَلٰی عِلْمِہٖ۔ وہ قانون خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے۔ وَ خَشَعَتِ اَعْلٰی سَمْعِہِمْ وَ قَلْبِہِمْ وَ جَمَعَتِ اَعْلٰی بَصَرِہُمْ عِشْوَۃً۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ تَمَنّٰی یَقُوْلُوْنَہٗ مِیْنُ بَعْدِ اللّٰہِ۔ اَفَلَا تَذٰکُرُوْنَ (۲۵) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے، اسکی صحیح راستے کی طرف، بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیٰثَۃُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیٰی وَ مَا یُھٰلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانین طبعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور مرور زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ وَمَا لَہُمْ بِذٰلِکَ مِیْنُ عِلْمِہٖ۔ اِنْ ہُمْ اِلَّا یَطْمِئِنُّوْنَ (۲۶) انہیں حقیقت حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیکر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ ہُمْ کٰتِبُوْنَ کِمٰتًا کُلُّ الْاَنْعَامِ (۲۴)۔

جو لوگ ( بلند سطح زندگی سے ) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زیست سے فائدے اٹھاتے ( اور پھر مر جاتے ) ہیں ۔

اس کے برعکس ، دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں ۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور ” شے “ بھی ہے جسے اس کی ذات ، یا نفّس کہتے ہیں ۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی ۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اس سے انسان مرے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ۔ اگر اسکی مناسب نشوونما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد ، وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے ، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں ( اور جواب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ) ۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات ہر ” ایمان “ اور خدا ، وحی ، نبوت اور آخرت پر ایمان کی سطح لازم و ملزوم ہیں ۔

” انسانی ذات کیا ہے “ ۔ یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں ۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے ۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی ” شے “ ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے ۔ اختیار و ارادہ ( بصورت مطلق اور کُلّی طور پر ) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ ، ( محدود شکل میں ) انسان کو حاصل ہے ۔ اس کے سوا ، کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ۔ اسی لئے اسے خدا نے ” روحنا “ کہہ کر پکارا ہے ۔ یعنی الوہیاتی توانائی ( Divine energy ) ( دیکھئے عنوان ر ۔ و ۔ ح ) ۔ اگر انسان ، قوانین خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں ( حد بشریت کے اندر ) صفات خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں ۔ اسی کو اسکی ذات کا نشوونما کہتے ہیں ۔ واضح رہے کہ انسانی ذات ، ذات خداوندی کا جزو نہیں ۔ ذات ( وہ خدا کی ہو یا انسان کی ) ایک غیر منقسم وحدت ( Indivisible whole ) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے ۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے ، اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے ۔ حتّٰی کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی ( ۱۹/۲ ) ۔ یہی اس کا ” اعمالنامہ “ ہے جو اسکی گردن میں لٹکا رہتا ہے ۔ ( ۱۹/۲ ) ۔ اسی کی وہ ظہور



نتائج کے وقت پڑھیں گے۔ افسرؑ! کتابک کفلی ینفسیک السیوم علیک حسیباً (۱/۱۶)۔ ”تو آج اپنی کتاب پڑھ۔ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔“ (نیز ۱/۱۶: ۱/۱۷)۔ اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (Individuality) ثبت ہوتی ہے (۱/۱۶: ۱/۱۷)۔ یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَظَمَاتَهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَزِرَةً وَّزِرَةً أُولَئِكَ الْأُخْرَىٰ (۱/۱۷)۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔ ۱/۱۷: ۱/۱۸؛ ۱/۱۸: ۱/۱۹؛ ۱/۱۹: ۱/۲۰؛ ۱/۲۰: ۱/۲۱؛ ۱/۲۱: ۱/۲۲؛ ۱/۲۲: ۱/۲۳؛ ۱/۲۳: ۱/۲۴؛ ۱/۲۴: ۱/۲۵؛ ۱/۲۵: ۱/۲۶؛ ۱/۲۶: ۱/۲۷؛ ۱/۲۷: ۱/۲۸)۔ جب اتباع قوانین خداوندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ لیکن جس ذات کی نشوونما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے۔ [دیکھئے عنوانات (ج۔ ن۔ ن)؛ (ج۔ ح۔ م)؛ (جہنم)]۔ یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے پورے کے پورے ضابطہ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بن کر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔ وَتَجْعَلُهَا لَكُمْ قِيَامًا وَالَّذِي يُؤْتِي مَتْلَهُ يَتَزَكَّىٰ (۱/۲۱)۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے) اپنی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو ”دیتا ہے“۔ مَن آعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ (۱/۲۲) ”جو دیتا ہے اور (اسطرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے“۔ (نیز دیکھئے ۱/۲۲: ۱/۲۳)۔

یاد رہے کہ انسانی ذات ، ایک ملکہ ، صلاحیت ، استعداد ، یا امکانی قوت ہے جو بجائے خوبش نہ خیر ہے نہ شر ۔ دوسری ہر قوت کی طرح ، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے ۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher Values) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے ، تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اسکی نشوونما ہوتی ہے) ۔ اور

جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو، بہت مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایغو، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات، انسانی سطح زندگی پر۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں ”ہولی“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (اس مادہ میں ”ہستی“ کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے عنوان ہ۔ و۔ ی)۔ اور جب عقل (Intellect) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل، انسانی ذات کے تابع فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بدامان ہو جاتا ہے۔ (اقبال اول الذکر عقل کو، عقلِ خود میں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں ہیں، یا خرد ”ادب خوردہ دل“ کہہ کر پکارتا ہے)۔

جب ایغو، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر، بہت مفاد کی طرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر ”نفس امارہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے، عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ (۱۲)۔ یقیناً نفس، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے اِنَّهَا مَنَاصِرٌ حَقِیْقَیْ (۱۳)۔ بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے ”انسانی ذات“ سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساسِ ندامت بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت، ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے نفسِ لوامہ کہا ہے (۴)۔ یعنی ”ملامت کرنے والا نفس“۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کر سکے۔ خیر و شر کی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے۔ نفسِ لوامہ اُسی بات پر ملامت کریگا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت مدح ہو۔ [تفصیل اس اجمال کی (ل۔ ہ۔ م) اور (ف۔ ط۔ ر) کے عنوانات میں ملے گی]۔

جب انسان ، خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے ، تو ابغوا اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے ۔ ذات ، ہست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے ۔ (۳۹) ۔ اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۴۱) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے (۴۲) ۔ اسے ، عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا ۔ اس کے برعکس (Disintegrated Personality) ہوگی ۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْر ہٹا و تَقْوٰ ہٹا (۴۳) سے تعبیر کیا ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ہ ۔ م) ۔ اور ذات کی نشو و نما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے (۴۴) ۔

چونکہ انسانی ذات ، امکانی شکل (Realiseable Form) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے ، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم ، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے ۔ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِيَّ آدَمَ (۴۵) ۔ ”ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے“ ۔ ذات کی تکریم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے ۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا ، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکوم کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کر دینا ہے ۔ قرآن کریم کی ”رو سے اطاعت یا محکومی ، صرف قوانین خداوندی کی ہوسکتی ہے ۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ب ۔ د) ۔ یہ اطاعت ، کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا ۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے ۔ (اطاعت کے معنی ہی بطیب خاطر ، رضا و رغبت ، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ لَا یُسْکَلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا لَّا وَ سَعَتْهَا (۴۶) سے بھی مراد ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد ، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا ۔ [دیکھئے عنوان ک ۔ ل ۔ ف] ۔ قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی ۔ خالقانیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشو و نما کبھی نہیں ہوسکتی ۔ جنت کے لئے فَاَدْخُلْنٰی فِیْ عِبَادِیْ (۴۷) پہلی شرط ہے ۔

سورۃ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّيْهِ اَلْاَنفُسَ حَيٰثِنَ مَوْتِهِنَّ  
وَالَّذِيْ لَمْ يَتِمَّتْ رِفْقُهَا مَوْتَهَا فَتَقِيْلُ سِيْكَ الْاَنفُسِ قَتْلُهَا  
الْمَوْتِ وَ يَسْرِ سَيْلٌ اِلَى الْاٰخِرَةِ اِلَى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹/۴۲) ”اللہ موت کے  
وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرنے نہیں ان کی نیند کی حالت میں  
ایسا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم ہو جاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے  
اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیج دیتا ہے۔“ سوال یہ ہے کہ اس  
آیت میں ”نفس“ سے کیا مطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف  
کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے،  
لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم  
جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجز شعور (Conscious-  
ness) کے۔ (حتکہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے)۔ اس لئے ظاہر ہے  
کہ اس آیت میں ”نفس“ سے مراد اسکی شعوری حالت ہے۔ یعنی نیند اور موت  
دونوں حالتوں میں انسان کا شعور باقی نہیں رہتا۔ سونے والا جب جاگ اٹھتا  
ہے تو اس کا شعور پھر رو بہ عمل ہو جاتا ہے، لیکن موت کی صورت میں شعور  
کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد، شعور کے رو بہ عمل  
ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں۔ اس زندگی میں شعور (یا نفس) کس  
طور پر رو بہ عمل ہوتا ہے، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ  
سکتے۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے رو بہ عمل ہونے کا ایک ہی  
ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے ہمارا مادی جسم۔ ہم اس وقت، جسم کے توسط کے  
بغیر، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا  
کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا۔ نہ ہی اس کے  
بتانے سے کوئی فائدہ تھا۔ اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ  
سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن  
مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر  
 بیان کرتا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے۔

## ن ف ش

نَفْسٌ\*۔ اون یا روئی وغیرہ کو انگلیوں سے ہرا گندہ کرنا۔ (لازم اور  
متعدی دونوں طرح آتا ہے)۔ بعض نے کہا ہے کہ نَفْسٌ\*۔ ہر اس چیز کے  
منتشر ہو جانے کو کہتے ہیں جسکا منتشر ہو جانا مشکل نہ ہو۔ جیسے روئی۔  
اون وغیرہ\*۔ قرآن کریم میں الْعِشْنُ الْمَنْفُوشُ (۱۱/۱۶) آیا ہے۔ یعنی  
\*تاج و راغب و محیط۔

دھنی ہوئی (منتشر شدہ) رنگین اون - (ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ہونا لکھے ہیں -

ابن السکیت نے کہا ہے کہ نَفْثٌ کے معنی ہیں رات کے وقت بکریوں یا اونٹوں کا چرواہے کے علم کے بغیر ادھر ادھر منتشر ہو کر چرنا - (نَفْثٌ میں رات کے وقت ایسا ہونے کی تخصیص ہے - هَمْلٌ میں رات یا دن کی تخصیص نہیں ہوتی) - قرآن کریم میں ہے اِذْ نَفَثَ الشَّيْطَانُ فِيْهِمْ غَتَمٌ الْقَتُوْمِ (۲۸) جب لوگوں کی بکریاں اس میں رات کے وقت چرتے ہوئے منتشر ہو گئیں -

## ن ف ع

النَّفْعُ - ضَرٌّ وَضَرٌّ (نقصان) کی ضد ہے - لیکن درحقیقت نَفْعٌ اس ذریعے کو کہتے ہیں جس سے کسی خوشگواہی (خیر) تک پہنچا جائے - چنانچہ النَّفْعَةُ - لالھی کو کہتے ہیں - چرواہوں کی لالھی جس طرح "خیر" تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہے وہ ظاہر ہے -

قرآن کریم میں یہ لفظ ضرر کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۰۲) - اور اِثْمٌ کے مقابلہ میں (۲۱۹) بھی - لہذا ضَرٌّ کی طرح نَفْعٌ بھی خارجی اور داخلی دونوں حالتوں کی خوشگواہی کے لئے آئے گا - (مُتَنَافِعٌ) (واحد مُتَنَفِّعَةٌ) - فوائد - کام کی چیزیں - (۲۱۹) -

## ن ف ق

نَفَقٌ - اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں - (جس سرنگ میں نکلنے کا راستہ نہ ہو اسے سَرَبٌ کہتے ہیں) - النَّفَقَةُ - وَالنَّفَاقَةُ - جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ہیں جس پر وہ مٹی کی باریک سی پیٹری بچھا کر اسے بند رکھتا ہے اور اسے اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب اس کا کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے - نَفِيقٌ اس نیفہ کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے کھلے ہوں - (بعض کا خیال ہے کہ یہ نیفہ سے معرب ہے) - اسی لئے مُتَنَافِقٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام (یا سوسائٹی) میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے - نَفَقَتِ السَّوْقُ - بازار گرم ہوا، اور اس کے سامان کی مانگ ہوئی - (یعنی جو اشیاء کی درآمد اور برآمد کے لئے ہر وقت

کھلا رہے۔ ہر وقت مال آتا رہے اور اس کا نکاس ہوتا رہے۔ (لہذا انفاق<sup>\*</sup> کے معنی ہیں اپنی دولت کو کھلا رکھنا۔ عام کر دینا۔ باقی نہ رکھنا۔ ختم کر دینا<sup>\*</sup>۔ قرآن کریم نے اس کے مقابل میں اِمْسَاک<sup>\*</sup> (روک رکھنے) کا لفظ لا کر اس کے معانی کو واضح کر دیا ہے (۱۶۵۱)۔

چونکہ روپے کو کھلا رکھنے کا نتیجہ سرمایہ کی نفی (ختم ہو جانا) یا کمی ہوتا ہے، اس لئے نَفَاق<sup>\*</sup> کے معنی کسی چیز کے کم ہو جانے یا ختم ہو جانے کے بھی لئے جانے لگے<sup>\*</sup>۔ یہاں تک کہ ان معانی کو بنیادی معنی کی سی اہمیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اَنْفَقْتُ اِلَّا رِیْل<sup>\*</sup> اُسوقت کہتے ہیں جب سوناہے کی وجہ سے اونٹوں کی اون جھڑ جائے۔ یعنی منتشر اور پراگندہ ہو کر ضائع ہو جائے<sup>\*</sup>۔

قرآن کریم میں انفاق<sup>\*</sup> کے بنیادی معنی اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھنا ہیں۔ وَیَسْأَلُوْكَ نَّكَ مَاذَا اَنْفَقْتُمْ قُلِ الْعَفْوَ (۱۶۲)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (ربوبیت عامہ کے لئے) کھلا رکھیں۔ ان سے کہہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ یعنی فاضلہ دولت (Surplus money) جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے، سب کی سب ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہونی چاہئے۔ یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔

یہ قرآنی نظام کا بنیادی نقطہ ہے۔ مومن کی ہمیانی کے دونوں سرے کھلے رہتے ہیں اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس میں ہر فرد اپنی محنت کا ماحصل ڈالتا جاتا ہے اور نظام ربوبیت اسے نوع انسانی کی نشوونما کے لئے صرف کرتا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظام میں ہر فرد کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے اس لئے کسی فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے۔

بناء بریں ان مقامات میں انفاق<sup>\*</sup> کے معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا رکھنا زیادہ مناسب ہیں۔ ”کھلا رکھنے“ کا مطلب ہونگا نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں رکھنا۔ نَفَقَہ<sup>\*</sup> (۱۶۲)۔ ہر وہ چیز جسے اس طرح کھلا رکھا جائے۔ بعض مقامات میں اس کے معنی خرچ کرنے کے بھی آئینگے۔

نَافِقٌ - منافق ہونا (۱۶۶) - معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں کافر کہتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لئے جماعت مومنین کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ منافع میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہوا، تو یا جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے، اور یا اس میں ہل دلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے۔ یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے (۱۶۵)۔ قرآن کریم نے (سورہ فاتحہ کے بعد) سب سے پہلے انہی تینوں جماعتوں (مومن - کافر - منافق) کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے۔ اس کے بعد، سارے قرآن کریم میں ان تین جماعتوں کا ذکر ہے۔ یہ جماعتیں زمانہ نزول قرآن تک محدود نہ تھیں۔ یہ ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان کی خصوصیات اس قدر طول طویل ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

## ن ف ل

النَّفْلُ - ہر وہ عمل جو (واجب) سے زیادہ ہو۔ اَلنَّفْلُ - مالِ غنیمت۔ ہبہ۔ عطیہ۔ دونوں کی جمع اَنْفَالٌ آئے گی۔ نَفْلٌ کے معنوں میں نَافِلَةٌ بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَ مِنَ النَّفْلِ فَتَنَّهُمْ بِمَا نَافِلَةٌ لَّهُمْ (۱۶)۔ تورات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کو) لیے کر اٹھ۔ یہ تیرے لئے "نفل" کے طور پر ہے۔ اَلنَّفَالِیَّةُ - ہوتا۔ کیونکہ بیٹا تو اصل ہوتا ہے اور ہوتا اس پر زائد ہوتا ہے (۱۶)۔

اَنْفَالٌ (۱۶) - بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی مالِ غنیمت کے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مالِ غنیمت سے الگ (اور خاص) ہوتی ہے۔ عام طور پر اس کے معنی مالِ غنیمت یا ہبہ یا عطیہ کے لئے جاتے ہیں\*۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسے جنگ کے ساتھ مختص کر دینے کی ضرورت نہیں۔ اس سے مراد مملکت کی وہ تمام آمدنی ہو سکتی ہے جو متعین کردہ واجبات کے علاوہ ہو۔

اَلنَّفْوُ فِیْہِ - دریا۔ سمندر۔ عطیہ۔ بہت عطا کرنے والا آدمی\*۔

\*تاج - \*\*محیط۔

نَفَّلَ فُلَانًا - فلاں کو عطیہ کے طور پر کچھ دیا جس کے معاوضے کا وہ خواہاں نہیں \*\* - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عطیہ اور عطا کرنا ہیں -

## ن ف ی

نَفَّی - نَفَّیًا - ایک طرف کر دینا - نکال دینا - الگ کر دینا - دور کر دینا \* - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دینے یا دور کر دینے کے ہیں - النَّفَّیُّ - وہ اُبال جو ہانڈی باہر پھینک دے - وہ کنکریاں وغیرہ جو جانوروں کے ٹھوکر لگنے سے ادھر ادھر اُڑتی ہیں - وہ مٹی جسے ہوا درختوں کی جڑوں میں لا کر پھینک دیتی ہے - بڑے لشکر سے جو حصہ کٹ کر الگ ہو جائے اور ایک طرف کو رہ جائے - نَفَّی شَعْرًا فُلَانٍ - فلاں آدمی کے بال پریشان اور ہرا گندہ ہو گئے - یا گر گئے - نَفَّی السَّیْلَ الْغُضَّاءَ - سیلاب کوڑا کرکٹ بہا کر لے گیا - اسی سے نَفَّی کے معنی انکار کر دینے کے آتے ہیں - نَفَّی الْاَبَّ الْاَبْنَ - باپ نے بیٹے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا \* -

قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق جو نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں اور نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں کہا گیا ہے کہ انہیں قتل کر دو - یا سولی چڑھا دو - یا ”قطع ید و رجل“ کر دو - (دیکھو عنوان ق - ط - ع) - اَوْ یُنْفَوْا مِنْ اِلَاَرْضِ (سجہ) - نَفَّی کے ان معانی کے لحاظ سے جو اوپر درج کئے گئے ہیں اس کے معنی ہونگے ملک سے الگ کر دینا - جلاوطن کر دینا - صاحب محیط نے نَفَّی فُلَانًا کے معنی فلاں کو قید کر دیا بھی لکھے ہیں \* - لیکن مندرجہ بالا آیت میں مِنْ اِلَاَرْضِ کے اضافہ سے ظاہر ہے کہ اس کے معنی ملک بدر کر دینے کے ہونگے یا یہ کہ اسے آزادی اور دیگر مراعات سے محروم کر دیا جائے - (اس طرح زمین سے الگ کر دینے کا مفہوم ہوگا اسے باقی آبادی سے الگ کر دینا) -

## ن ق ب

نَقَبٌ - (دیوار میں) سوراخ کرنے کو کہتے ہیں - اور خود سوراخ کو بھی \* - سورۃ کھف میں ہے وَمَا اسْتَطَاعُوا لَہٗ نَقَبًا (۱۸/۲۸) - وہ اس دیوار میں سوراخ نہیں کر سکتے تھے - تَنْقَبُ عَنِ الشَّيْءِ کے معنی \* تاج - \*\* محیط -



ہیں کسی چیز کی تلاش میں بہت زیادہ کوشش کرنا - مارے مارے پھرنا\*\*۔  
 سورۃ ق میں ہے - فَتَنَّا قَبُولًا رَفِيًّا (۳۶) - انہوں نے شہروں کو چھان مارا کہ کوئی پناہ کی جگہ مل جائے - ابن قارس نے کہا ہے کہ نَقَّابٌ کے معنی ہیں نَقُوبٌ (پھاڑوں کے تنگ راستوں یا دروں) میں چلنا - أَلْتَقَيْتُ بَ بَانَسْرِي (کہونکہ اس میں چھید ہوتے ہیں) - أَلْتَقَيْتُ بَ کے معنی ہیں قوم کا نگران - ضامن - سردار - لوگوں کے احوال معلوم کرنے والا چھان بین کرنے والا\* - بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا (۱۴) - ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردئے -

أَلْتَقَيْتُ بَ - سوراخ - چہرے کو بھی کہتے ہیں - غالباً اسی لئے کہ اس میں کئی سوراخ ہیں - اور أَلْتَقَابٌ - اس کپڑے کو جس سے عورت اپنے چہرے کو چھپاتی ہے - أَلْتَقَابٌ کے متعلق ابن قارس نے کہا ہے کہ یہ معنی خلاف قیاس ہیں - أَلْتَقَيْتُ بَ - قابل - فخر بات - بلند کارنامہ - خوبی - اچھی خصلت\* -

## ن ق ذ

نَقَّذَہُ ' وَ اَنْقَذَہُ ' وَ اسْتَنْقَذَہُ - اسے چھڑانا، چھٹکارا دلانا، نجات دلانا - نَقَّذَ الرُّجُلُ - آدمی نے نجات پائی اور سلامت رہا\*\*\* - راعب نے لکھا ہے کہ یہ کسی سخت مشکل اور مصیبت و تباہی سے رہائی حاصل ہونے پر بولا جاتا ہے\*\*\*\* - لغزش کھانے اور پھسل کر گرنے والے کو بطور دعا نَقَّذَا لَكَ کہا جاتا ہے، یعنی خدا تجھے سلامت رکھے - أَلْتَقَيْتُ ذَہُ اُس گھوڑے کو کہتے ہیں جسے دشمن کے قبضہ سے چھڑا لیا جائے\*\*\* - قرآن کریم میں ہے - فَمَا نَقَّذَکُمْ مِّنْهَا (۳۲) "اس نے تمہیں اس سے بچا لیا" - نیز (۳۹ و ۴۰) - سورۃ حج میں ہے لَا یَسْتَنْقِذُکُمْ مِنْہُ (۲۲) - "وہ اسے چھڑا نہیں سکتے" -

## ن ق ر

نَقَّرَہُ ' نَقَّرَا - اس کو مینقار (رسل راہنے کے آلہ) سے مارا - أَلْتَقَّرُ - چکی یا سل کو راہنا - ابن قارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو ٹھوکانا جس سے اس میں گڑھے سے بڑجائیں - پھر اس کے معنوں میں وسعت ہو گئی - أَلْمِنْقَارُ - اس آلے کو کہتے ہیں جس سے سل وغیرہ راہتے ہیں - نیز چونچ کو - چونکہ اس سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اس

لئے آواز کے معنوں میں بھی یہ مادہ استعمال ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسی آواز جو زبان کو تالو سے چمٹا کر نکالی جائے اور اس سے گھوڑے کو ہانکا جائے۔ یا چٹکی کی آواز۔ **النَّقِيرُ**۔ سیٹی جیسی آواز\*۔ لسان العرب میں ہے کہ **نَقَرُوا** بگل کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے **فَإِذَا نَقَرْنَا فِي النَّاقُورِ** (۴۸)۔ جب سرکش قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے گا۔

**النَّقَارَةُ**۔ وہ ذرا سی چیز جسے پرندہ ایک مرتبہ اپنی چونچ میں اٹھالے\*۔ اس سے **النَّقِيرُ** اس چھوٹے سے نقطہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے\*۔ اس سے مراد ہوتی ہے بہت تھوڑی اور حقیر سی شے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ **لَا يَأْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا** (۲۵)۔ ”لوگوں کو اتنا بھی نہیں دینگے جتنی اُرد کے دانے پر سفیدی“۔

## ن ق ص

**النَّقْصُ**۔ حصہ میں کمی ہونا۔ ابن القطاع نے لکھا ہے کہ **نَقَصَ** کے معنی ہیں کسی چیز کے مکمل ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ جانے رہنا۔ اور **النَّقْصَانُ** اُس مقدار کو کہتے ہیں جو اس شے میں سے جاتی رہے۔ **النَّقْصَانُ** کے معنی عیب ہیں\*۔ **تَنَقَّصَ الشَّيْءُ**۔ چیز آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی\*\*۔ **نَقَصَ**۔ **يَنْقُصُ**۔ کم کیا۔ کم ہوا۔ (لازم اور متعدی دونوں کے لئے آتا ہے)۔

قرآن کریم میں ہے **نَقَصَ مِنَ الْأَمْوَالِ** (۲۵)۔ مال میں کمی آجانا۔ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے میں اس جماعت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں اموال کا نقصان بھی ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام کے بعد انہیں ہر طرح کی فراوانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی نظام کا نتیجہ لوگوں کے لئے رزق کی کمی ہو تو وہ نظام فرعون ہی اور رزق کی کمی خدا کا عذاب، جیسا کہ (۲۳) سے واضح ہے۔ کسی نظام کے قیام میں مشکلات اور مصائب کا سامنے آنا اور بات ہے اور اس کے نتائج کا نقصان دہ اور ضرر رسان ہونا اور بات۔ قرآنی نظام کے نتائج نہایت خوش گوار ہوتے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں مخالفین کی طرف سے پیش کردہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ان میں نقص مال بھی شامل ہے۔

## ن ق ض

**نَقَضَ** کے معنی ہیں ڈھا دینا۔ توڑ دینا۔ کھول دینا۔ عہد کر کے اسے توڑ دینا\*۔ **النَّقْضُ**۔ مسمار شدہ عمارت یا اس کا ملبہ۔ نیز وہ اونٹ جو تاج۔\*\* معیط۔

مسلسل چلنے سے لاغر ہو گیا ہو۔ اَلنَّقِیضُ\*۔ آدمی کے جوڑوں کی آواز\*۔  
 الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرُكَت (۳۳)۔ وہ بوجھ (ذمہ داری) جس نے تمہاری کمر  
 توڑ دی تھی۔ تَنَاقُضُ\*۔ توافق کی ضد ہے۔ ایک دوسرے کی مخالفت۔ یعنی  
 جس میں ایک بات دوسری بات کو توڑ رہی ہو۔

قرآن کریم میں نَقَضَ\* کا لفظ عہد شکنی کے لئے عام طور پر آیا  
 ہے (۲۷ و ۲۸)۔ نیز نَقَضَتْ غَزْلَتَهَا (۱۳) کے معنی ہیں سوت کے  
 ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ یا اس کے ہل کھول دئے۔

## ن ق ع

اَلنَّقْعُ\*۔ عمدہ خالص مٹی والی زمین جس میں پانی اکٹھا ہو جائے۔  
 کسی جگہ اکٹھا ہو جانے والا پانی۔ اوپر اٹھنے والا غبار\*۔ ابن فارس نے  
 کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی میال چیز کا اپنی جگہ ٹھہر  
 جانا اور (۲) ایک قسم کی آواز۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں۔  
 لیکن قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی فَاَنْتَرْنَ بِہِ نَقْعًا (۱۱)۔  
 وہاں اس کے معنی گرد و غبار اڑانے ہی کے ہیں۔ یعنی مجاہدین کے وہ گھوڑے  
 جو گرد و غبار اڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔

## ن ق م

اَلنَّقِمُ\*۔ وسط طریق۔ راستے کا درمیانی حصہ\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے  
 کہ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دینا اور اسے معیوب  
 بتانا۔ اس اعتبار سے اِنْتِقَامُ\* کے معنی ہونگے بری بات کو برا کہنا اور برائی  
 کرنے والے کو برائی کا بدلہ دینا۔ اَلنَّقِمَةُ\*۔ جرم کی سزا دینا\*\*۔ اسی کو  
 مکافات عمل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ذُو اِنْتِقَامٍ (۳۳) کہا گیا ہے۔ یعنی  
 وہ جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج پرآمد کرتے ہیں اور مجرموں  
 کو سزا ملتی ہے۔ ہمارے ہاں انتقام کا لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال  
 ہوتا ہے۔ اس لئے جب یہ لفظ اللہ کے لئے بولا جائے تو اس کا وہ مفہوم نہیں  
 لینا چاہئے جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں۔ اس کا مفہوم مکافات عمل ہے۔ سورہ  
 اعراف میں قوم قرعہوں کے متعلق ہے فَاَنْتَقِمْنَا مِنْہُمْ (۳۶)۔ ہم نے  
 انہیں ان کی غلط روش زندگی کا بدلہ دیا۔ اسی طرح سورہ سجدہ میں ہے۔ اِنَّا  
 مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲)۔ ہم مجرمین کو ان کے اعمال کا بدلہ

دیتے ہیں۔ نَقَمَ کے معنی ہیں کسی بات کو ناپسند کرنا۔ ہرا سمجھنا۔  
اعتراض کرنا (۹۹)۔ سورہ بروج میں ہے وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن  
يَقُولُوا مِثْلُ مَا قَالُوا . . . (۸۸)۔ اور یہ (کفار) ان (مومنین) کو اس وجہ  
سے ناپسند کرتے ہیں کہ یہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی وہ ان کے ایمان  
لے آنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔

## ن ک ب

نَكَتَبَ عَنْهُ يَنْكُتِبُ وَنَسَكِبَ يَنْكُتِبُ۔ ہٹ جانا۔ صحیح  
رخ ہر نہ رہنا۔ طَرِيقُ يَنْكُتِبُ۔ منزل مقصود سے ہٹا ہوا راستہ۔  
النَّكَبَاءُ۔ فروہ ہوا جوانے صحیح رخ سے ہٹ کر چلے۔ (نیز ابن فارس)۔  
قرآن کریم میں ہے عَنِ الْبَصَرِ اِطْرَافِ لَنَّا كَيْتُونَ (۲۳)۔ وہ صحیح راستے سے  
ہٹے ہوئے ہیں۔ اعراض برتنے ہیں۔ اَلْمَنْكِبُ۔ ہر چیز کا کنارہ نیز کندھا  
(کاندھا)۔ مَنَاكِبُ الْاَرْضِ۔ زمین کے اطراف و جوانب۔ قرآن کریم  
میں ہے فَاْمُشُّوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا (۱۵)۔ اس کے اطراف و جوانب میں چلو  
پھرو۔ بعض نے اس کے معنی پہاڑوں کے بھی کئے ہیں۔ کیونکہ اَلَا تَنْكِبُ  
اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا ایک کندھا دوسرے سے اونچا ہو۔\*\*

## ن ک ث

النَّكْثُ۔ ہرانے کھیل یا دیگر اونی کپڑے وغیرہ جن کی بنائی کو کھول  
دیا جائے تاکہ انہیں دوبارہ بنا جاسکے۔ نَكَثَ الْعَهْدَ۔ عہد کو توڑ  
دیا۔ نَكَثَ الْحَبْلَ۔ رسی کو کھول دیا۔ اَلنَّكْثَةُ۔ وعدہ خلافی۔  
نیز رسی کے لڑ یا ہٹ کو کہتے ہیں\*\*\*۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو  
توڑنے کے ہیں (ابن فارس)۔

قرآن کریم میں ہے۔ اِذَا هُمْ يَنْكُشُونَ (۱۳۵)۔ وہ عہد توڑ دیتے  
ہیں۔ اَنكَاثًا (۱۶۶)۔ ادھیڑی ہوئی اون وغیرہ کے ٹکڑے۔

## ن ک ح

نِكَاحُ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔\*\*۔ لیکن اس طرح ملانا  
جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں نَكَحَ  
النَّعَاسُ۔ نیند اس کی آنکھوں میں گھل گئی۔ یا جس طرح بارش کے قطرے

\* تاج و راعب۔ \*\* محیط۔ \*\*\* تاج۔

زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ تَنَكَّحَ الثَّمَطَرُ الْاَلَاَرْضَ - بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوتے ہیں جب بارش کا پانی زمین کی بالائی خشک سطح سے نیچے گزر کر زمین کی نمی تک جا پہنچے۔\*\*

ان مثالوں کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن کریم نے مرد و عورت کی عائلی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں نِكَاح سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے میاں بیوی کا ایسا تعلق جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے۔ جس طرح بارش زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ ایسا تعلق (اور وہ عمر بھر کے لئے) اسی صورت میں پیدا ہو سکتا (اور قائم رہ سکتا) ہے جب میاں بیوی میں فکر و نظر کی کامل آہنگی اور ذوق اور مزاج، خیالات و تصورات اور نظریات و معتقدات کی یک جہتی ہو۔ یہ نکاح کی بنیادی شرط اور خصوصیت ہوگی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ”ظاہرہ کے نام خطوط“)

ظاہر ہے کہ اسے تعلق کے لئے باہمی رضامندی اولین اور بنیادی شرط ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ اس میں تراضی مابین ضروری ہے۔ (۱۶ و ۱۷)۔ اور رضامندی اسی وقت ہو سکتی ہے جب لڑکی اور لڑکا خود فیصلہ کرنے کے قابل (یعنی بالغ) ہو چکے ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم نے بلاغت کے لئے ترکیب ہی بَلَّغُوا النِّكَاحَ (۱۶) کی استعمال کی ہے۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی ہے۔ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (۱۷ و ۱۸) اور أَشُدُّہ کے معنی دوسری جگہ یہ کہہ کر بیان کر دئے کہ وہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ہے (۱۹)۔ لہذا نہ نابالغ کے نکاح کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی، خود ان کی رضامندی تصور کی جا سکتی ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ نِكَاح کا لفظ عَقْد کے لئے آتا ہے۔ جماع کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے عَقْدَةُ النِّكَاحِ (۲۰) بھی کہا ہے۔ یعنی نکاح کی گرہ۔

سورة نور میں لَا يَجِدُ وُنَّ نِكَاحًا (۲۱) آیا ہے۔ جس کے معنی شادی کا انتظام ہیں۔ یا نکاح کا سامان۔ اس کے معنی رشتہ بھی ہو سکتے ہیں اور وہ اخراجات بھی جو ایک میاں بیوی کے لئے گھریلو زندگی میں ضروری ہوتے ہیں۔ نیز بیوی کا۔ ہر۔ (باقی رہا نکاح کی تقریب ہر خرچ اخراجات تو یہ محض

معاشرتی رسم ہے۔ قرآن کریم کی ”رو سے“ بالغ (صاحب عقل و ہوش) لڑکے اور لڑکی کا یہ معاہدہ کہ وہ ان تمام حقوق و فرائض کے ساتھ جو اس باب میں خدا نے عائد کئے ہیں، ازدواجی زندگی بسر کریں گے، نکاح کھلائیکا۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے نہ رسم۔ رسوم و تقاریب معاشرتی چیزیں ہیں۔ البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی شہادت ہو اور اسے کہیں منضبط (درج) ہو کر لیا جائے۔

## ن ک د

نَکِیدٌ عَیْشَہُ - اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو گئی۔ نَکِیدَتِ الرِّیْثَہُ - کنویں کا پانی کم ہو گیا۔ اَلنَّکِیدُ - وہ اونٹنیان جن کے بچے زندہ نہ رہیں\*۔ یا جن کا دودھ بہ مشقت دوا جاسکے\*\*۔ اس کے بنیادی معنوں میں کمی اور مشقت دونوں ہیں۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا اس کے طالب کے لئے بدقت نکلنا بتائے ہیں۔ نِیز نَاقِیۃٌ نَکِیدۃٌ کے معنی وہ اونٹنی ہیں جس کے دودھ نہ ہو۔ اَرَضُوْنَ زَبَکَادَ - بہت کم پیداوار والی زمینیں\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَ الَّذِیْ خَبِثَ لَا یُخْرِجُ اِلَّا نَکِیدًا (۸۸) - خراب زمین سے بہت تھوڑی پیداوار ہوتی ہے۔ یعنی جس پر محنت زیادہ کرنی پڑے اور حاصل کم ہو\*\*۔

## ن ک ر

النَّکَرُ - اَلنَّکَرُ - بہت زیادہ چالاکی۔ عقل کی فریب کاری۔ رَجُلٌ نَکِیرٌ - بہت چالاک اور طرار آدمی۔ اَلْمُنْتَکَرَةُ - ایک دوسرے کو فریب دینا\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِنَّ الصَّالٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (۲۴) - یقیناً صلاۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ اس کے عام معنی ہوں گے ہر وہ بات جو حد سے تجاوز کر جائے اور ناپسندیدہ حرکت۔ لیکن فَحْشَآءُ کے معنی بخل بھی ہیں (دیکھئے عنوان ف - ح - ش)۔ اور مُنْکَرٌ کے معنی ہیں عقل خود بین کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ بہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے۔ دوسرے اپنی فکر آپ کریں۔ ان معانی کی وضاحت (۴۵-۴۴) سے ہو جاتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کو اگر ننھا (اس کی عقل اور مرضی پر) چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے

تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ روک لیتا ہے۔ **لَا تَتَّبِعُوا الْاَذْهَانِ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَاثِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّا جَعَلُوْا لِّیْسَآئِلٍ وَّ الشَّحَرُوْا** (۲۴:۲۵)۔ ”لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ یعنی ان لوگوں کی جو نظام صلوٰۃ کے ہمیشہ پابند رہتے ہیں اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے۔“

**تَذَكَّرْ اِلَّا مَرُّ**۔ معاملہ دشوار ہو گیا۔ **اَلتَّكْوِيْنُ**۔ مصیبت اور سختی۔ **تَذَكَّرْ اِلَّا مَرُّ**۔ زمانہ کی سختی اور مصیبت\*۔ سورۃ کہف میں عَزَّوَجَلَّ **تَذَكَّرْ** آیا ہے (۱۸:۱)۔ یعنی سخت عذاب جسے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا۔ اسی طرح سورۃ قمر میں شَمِیْ **تَذَكَّرْ** آیا ہے (۵۴:۳)۔ سخت مصیبت انگیز بات۔

**تَذَكَّرْ**\*۔ ایسی بات جو خوش آئند نہ ہو۔ جسے دل قبول نہ کرے۔ جو طبیعت پر ناگوار گزرے (ابن فارس)۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ **فَرَح**\* (خوشی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳:۱)۔ سورۃ کہف میں ہے **لَتَقْدَرُ جَنَّتْ شَمِیْمًا تَذَكَّرْ** (۱۸:۱)۔ تو نے یہ بڑی ہی ناخوش آئند بات کی ہے۔ **اَلتَّكْوِيْنُ**۔ بہت زیادہ ناخوش آئند (۱۹:۳)۔ **اَلتَّكْوِيْنُ**۔ انکار\*۔ سورۃ شوریٰ میں ہے **مَّا لَكُمْ مِّنْ تَذَكَّرٍ** (۲۲:۳)۔ ”تم سے انکار نہیں ہو سکے گا“۔ نیز حق بات سے انکار کرنے کی سزا (یعنی تباہی اور بربادی)۔ **تَذَكَّرِ** کے معنی یہ بھی ہیں کہ جو کچھ برا لگے اسے بدل دیا جائے\*۔ **فَتَكَيَّفْتَ** **كَانَ تَذَكَّرِ** (۲۲:۳)۔ سو میری سزا کیسی تھی؟ ان کی بد اعمالیوں پر میرا رد عمل کیسا ہوا؟

**اَلتَّكْوِيْنُ**\*۔ کسی چیز کو نہ پہچاننا۔ **اَلتَّكْوِيْنُ**۔ درحقیقت **عِرْفَان**\* کی ضد ہے۔ یعنی نہ پہچاننا۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں ہے۔ **فَعَرَفَهُمْ** **وَهُمْ لَئِهْ مُنْكَرُوْنَ** (۱۲:۸)۔ یوسف نے انہیں (بھائیوں کو) پہچان لیا لیکن وہ اسے نہیں پہچان رہے تھے۔ سورۃ ہود میں ہے۔ **تَذَكَّرِ هُمْ** (۱۱:۱)۔ اس نے انہیں اجنبی سمجھا۔ ان پر اظہار تعجب کیا۔ اسی طرح سورۃ حجر میں **قَوْمٌ مُنْكَرُوْنَ** (۱۴:۱) کے بھی یہی معنی ہیں۔ یعنی اجنبی لوگ۔

**تَذَكَّرْ**\*۔ کسی چیز کو اس طرح بدل دینا کہ وہ پہچانی نہ جاسکے\*\*۔

(۲۴:۲۵)

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اکثر مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً ۱۳۳)۔ ان الفاظ (مَعْرُوفٌ وَنَهَى) اور مُنْكَرٌ کا صحیح مفہوم (ع۔ ر۔ ف) کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لئے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین و قوانین اور قواعد و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اس طرح سے قابل قبول ٹھہرائی جاتی ہیں انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the Society) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں مُنْكَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوفٌ وَنَهَى) اور مُنْكَرٌ کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں۔ اور اس تقسیم و تفریق کا معیار ہوتا ہے قرآن کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعْرُوفٌ وَنَهَى وہ ہیں جنہیں انسان کی ”فطرت“ پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں۔ اور مُنْكَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی ”فطرت“ لہا (یا نفرت) کرے۔ تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کر سکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہونی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کے لئے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (دیکھئے عنوانات ف۔ ط۔ ر اور ل۔ ہ۔ م) مَعْرُوفٌ وَنَهَى وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے۔ اور مُنْكَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا دے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان میں مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج سب آجاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کر کے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

لہذا مَعْرُوفٌ وَنَهَى وہ جسے قرآنی معاشرہ (Recognise) کرے۔ اور مُنْكَرٌ وہ جسے وہ (Recognise) نہ کرے۔ چنانچہ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ مَعْرُوفٌ وَنَهَى میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائیگی (۶۶) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہر اُس بات میں اطاعت کی جائیگی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے۔ اور قرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول و قوانین و احکام کے مطابق ہوں۔ جو بات قرآن کریم کے خلاف ہوگی وہ معروف نہیں بلکہ منکر ہوگی۔ یہی معروف و منکر کا اہل معیار ہے۔



## ن ک س

نَتَكَسَّ بِتَنَكُّسٍ - کسی چیز کو الٹ دینا - اونڈھا کر دینا - اِنْتَتَكَّسَ  
فُلَانٌ - فلاں اپنے سر کے ہل کر ہڑا - اَلْمُنْتَكِسُ - وہ گھوڑا جو چلتے وقت  
کمزوری سے سر اور گردن جھکا کر چلے - وہ گھوڑا جو دوڑ میں دوسرے گھوڑوں  
کے ساتھ چل نہ سکے - اَلنَّكَاسُ - وہ جسکا سر جھکا ہوا ہو\*۔

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سربراہوں اور  
کو دلائل و براہین سے سمجھا دیا کہ بت پرستی کس طرح وجہ تذلیل انسانیت  
ہے - اور وہ ان دلائل سے اپنے دل میں قائل بھی ہو گئے - لیکن پھر ان کی  
مفاد پرستیاں اور عزت نفس ان کے سامنے آگئی اور وہ اپنی بات کی طرف لوٹ  
گئے - اسے قرآن کریم نے ثَمَّ نَتَكَّسُوا عَلٰی رُءُوسِهِمْ (۲۱۵) سے تعبیر  
کیا ہے - یعنی وہ فکر و نظر کی ان بلندیوں تک پہنچ جانے کے بعد پھر  
اونڈھے گر گئے - پھر انہی ہستیوں میں آگرے جہاں وہ پہلے تھے -

سورہ السجدہ میں مجرمین کے متعلق ہے نَتَكَّسُوا رُءُوسِهِمْ (۳۲)  
ذلت سے اپنے سر جھکائے ہوئے - سورہ یٰس میں ہے - وَ مَن نَّعْتَصِرُ  
نَتَكَّسُهُ فِي الْخَلْقِ (۳۸) - جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ  
(قوی وغیرہ کے لحاظ سے جوانی کی) بلندیوں سے پھر ہستیوں کی طرف آجاتا ہے -  
جن باتوں کا پہلے علم ہوتا ہے انہیں بھی بھول جاتا ہے (۱۶۱ ; ۲۲) - یہ  
بڑھاپے کی وجہ سے قوی کے دضمحل ہو جانے کا عام بیان ہے -

## ن ک ص

نَتَكَصَّ عَنْ اَلْأَمْرِ - کسی کام سے ہچکچانا - اور پیچھے ہٹ جانا -  
نَتَكَصَّ عَلٰی عَقِبَتِهِ - لوٹ گیا - ہلٹ گیا - کہا گیا ہے کہ یہ لفظ  
خیر اور بھلائی سے ہلٹ جانے کے لئے خاص ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ لوٹ  
جانے کے معنوں میں آتا ہے\*\* - نَتَكَصَّ عَلٰی عَقِبَتِهِ - (۸۸) - اُلْتَمَسُوا  
پھر جانے کے معنوں میں آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ڈر اور  
بزدلی کی وجہ سے پیچھے ہٹنے کا مفہوم ہے اور ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے  
کہ اس کا استعمال بھلائی سے ہلٹ جانے کے لئے ہوتا ہے -

## ن ک ف

نَتَكَفَّ کے بنیادی معنی کسی چیز کو الگ کر دینے، کاٹ دینے  
اور ایک طرف کر دینے کے ہوتے ہیں\*\*\* - ابن فارس نے بھی اسکی تائید کی ہے -

\* تاج و راغب و محیط - \*\* تاج و محیط - \*\*\* راغب -

نَكَفَتِ الدَّمْعُ - انگلی سے آنسوؤں کا رخسار پر سے الگ کر دینا ( ہونچھ دینا ) \* - اسی سے اُسْتَنْكَفَ کے معنی ہیں رک جانا - کسی کام سے عار آنا - اسے برا محسوس کرنا اور خود کو اس سے بالاتر سمجھنا \*\* - رَجُلٌ نِكَفَ وہ آدمی جس سے نفرت کی جائے \*\*\* -

قرآن کریم میں ہے لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونُ عَبْدًا لِلَّهِ (۱۴۲) - مسیح ( کہہ جسے ، تم اے نصاریٰ ، خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو ) اسے قطعاً عار و انقباض نہیں کہہ وہ خدا کا عبد ہو - لہذا یہ مدعی مسرت اور گواہ چست کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ تو خدا کا عبد بننے میں فخر محسوس کرے اور تم اسے خدا بنا لو -

## ن ک ل

النَّكَلُ - مضبوط بھاری سخت بیڑی ( جمع اَنْكَالٌ ) - ایک سخت قسم کی لکام یا لکام کا لوہا - اس سے نَسَكَلَتْہ کے معنی ہیں کسی کو اس روش سے روک دینا جس پر وہ چل رہا ہو - نَكَلَ عَنْہُ - اس سے الٹے پاؤں لوٹ جانا - نَكَلَ بِہ کے معنی ہیں اسے جرم کی عبرت انگیز سزا دی ، کیونکہ سزا سے خود مجرم آئندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے رک جاتا ہے اور دوسرے بھی اسی سے عبرت پکڑتے ہیں \*\*\* -

قرآن کریم میں مخالفین قریش کے متعلق ہے - اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا (۹۳) - ہمارے پاس ان کے لئے سخت بیڑیاں ہیں - ظاہر ہے کہ یہ بیڑیاں وہ ہیں جو جنگ بدروحنین وغیرہ میں انہیں پہنائی گئیں - یا وہ تمام تدبیریں جن سے یہ لوگ اس مخالفت سے روکے گئے - سورہ النضر عِلَّتِ میں ہے - فَاَخَذَہُ اللّٰهُ نَكَالًا اٰلَاخِرَۃَ وَاٰلَاوَلٰی (۶۵) - خدا نے سزا دے کر قرہون کو ”آخرۃ واولی“ کے لئے عبرت بنا دیا - ( یہاں اخذ کے وہی معنی ہونگے جو اَتَّخَذَ کے ہیں ) -

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے نَكَالٌ میں ہر وہ تدبیر شامل ہوگی جس سے کسی کو اسکی غلط روش سے روک دیا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے - چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ یہودیوں میں سے جن لوگوں نے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں ایسی ذلت آمیز سزا دی گئی کہ وہ دوسروں کے لئے نَكَالًا بن گئے (۶۶) - یعنی موجب عبرت - اسی طرح چوری (سرقہ) کی سزا کے متعلق ہے نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۳۸) - یہ خدا کی تجویز کردہ ایسی سزا ہے جس سے وہ مجرم آئندہ ارتکاب جرم سے رک جائے - یہ اس قسم کے جرائم کے لئے روک کا کام دیگی - یعنی مقصد اس جرم کی روک تھام ، انسداد ہے ،

\* واغیب - \*\* تاج - \*\*\* تاج و ابن فارس -

لے (سلسلہ پڑھئے) یہ بیڑیاں پراس دشمن کو پہنائی جائیں گی جو حق کی مخالفت کر لیا۔ آخرت میں یہ بیڑیاں اس کے لئے کے راستے میں حائل ہوں گی۔ اسی کو جہنم کہا جاتا ہے۔

جس طریق سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جائے۔ ارتکاب جرم کے بعد عبرتناک  
مزا بھی انسداد جرم کا ایک طریق ہوتا ہے۔ اور مناسب حالات میں (احساس  
ندامت رکھنے والے) مجرم کو معاف کر کے اسکی اصلاح کرو دینا بھی ایک  
طریقہ۔ (۳۸-۳۹) میں یہ دونوں باتیں آگئی ہیں۔

## ن م ر ق

النَّمْرُوقُ\*۔ النَّمْرُوقَةُ\*۔ گدھے۔ تکیہ۔ وہ نمدہ وغیرہ جسے سوار کجاوہ  
کے نیچے اونٹنی کے پشت پر بچھاتا ہے\*۔ قرآن کریم میں نَمَارِقُ\* مَصْفُوفَةٌ\*  
(۱۵۸) آیا ہے یعنی صف میں بچھے ہوئے گدھے یا تکیے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں قاف زیادہ ہے۔ اسکی اصل نَمِرَةٌ\*  
ہے جس کے معنی دھاری دار کمبل کے ہیں۔ (غالباً وہ گدہ اس قسم کے کمبلوں  
کا بنتا ہوگا)۔

## ن م ل

النَّمْلُ\*۔ نَمْلَةٌ\* کی جمع ہے۔ چیونٹیاں\*\*۔ قرآن کریم میں حضرت  
سایمانؑ کے قصہ میں ہے حَتَّىٰ إِذَا أَتَوْا عِلٰی وَاْدِ النَّمْلِ۔ قَالَتْ نَمْلَةٌ\*  
يَا يٰٓأَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِينَكُمْ\* (۲۱۸)۔ صاحب تاج کے نزدیک  
وادی النمل، جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے\*۔ بعض کا قول ہے کہ وہ  
ارض شام میں ہے۔ لیکن اگر یہ وادی اُس راہ گزر پر واقع تھی جو ملکہ سبا  
کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا۔  
بہر حال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں، بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام  
ہے۔ اور النَّمْلُ\* اُس قبیلہ کا نام۔ نَمْلَةٌ\*۔ اس قبیلہ کی ایک عورت۔ معلوم  
ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس ہوتی تھیں۔  
جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ یعنی ان قبائل کا تمدن (Matriarchal)  
تھا۔

اَنَامِلُ\* (اَنَمْلَةٌ\* کی جمع ہے)۔ انگلیوں کے بالائی سرے۔ (۱۱۸)۔

## ن م م

النَّمْشُ\*۔ بھڑکانا اور برانگیختہ کرنا۔ فساد پیدا کرنے کے لئے بات کو  
پھیلانا۔ بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنانا۔ النَّمِيمَةُ\*۔ جفلی۔ آہستہ  
بات کی آواز۔ لکھنے کی آواز یا ترکش کی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ النَّمَامَةُ\*۔

\*تاج۔ \*\*تاج و قاموس۔ دیکھئے مادہ ”و د ی“

حس و حرکت - حیات نفس\* - اَلنَّفْسَامُ\* - جو شخص اپنے پیٹ میں بات نہ رکھ سکے\*\* - ادھر ادھر باتیں کرتا رہے - چغلخوڑ۔

قرآن کریم میں ہے - مَشَقَّاءِ بِنْتِ مِیْمٍ (۱۸) - چغل خور - ادھر کی باتیں ادھر بہت زیادہ پہنچانے والا - (یہاں نَمِیْمٌ بمعنی نَمِیْمَةٌ ہے) - لوگوں میں فساد پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ جھوٹی باتیں، اور باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والا۔

## ن و ع

نَاءَ - يَنْوُوءٌ - نَوُوءٌ - دشواری اور مشقت سے اٹھنا - نَاءَ يَالْحَيْحِلْ - وہ بوجھ کو لیکر گراں باری سے اٹھا - نَاءَ يَهْ الْحَيْحِلْ - بوجھ نے اسے گرا نیا کر دیا اور جھکا دیا\*\*\* - قرآن کریم میں قارون کے خزانے کے متعلق ہے - لَتَنْوُوءَ يَالْعُصْبَةَ (۲۸) - انہیں ایک مضبوط طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی - ابن فارس نے کہا ہے کہ نَاءَ کے معنی ہیں وہ بوجھل چیز کو لیکر اٹھا۔

## ن و ب

النَّوْبُ\* - کسی چیز کا بار بار لوٹنا - شہد کی مکھیوں کو اسی لئے نَوْبُ\* کہتے ہیں کہ وہ بار بار اپنے چہرے کی طرف آتی ہیں - حادثہ یا واقعہ کو فَنَائِيَّةٌ\* - (جمع نَوَائِبُ\*) کہتے ہیں کہ یہ چیز انسانی زندگی میں بار بار پیش آتی رہتی ہے - نَوْبَةٌ\* - نیز (نَوْبَةٌ\*) باری کو کہتے ہیں - (دراصل ہانی ہلانے کی باری کو کہتے ہیں) - اَلْمَتَابُ\* - ہانی کی طرف جانے کا راستہ کیونکہ لوگ اس پر بار بار ہاری سے گزرتے ہیں - اَلثَّنِيَّةُ\* - قائم مقامی کرنا - باری - اَنَابَ زَيْدٌ عَنَّهُ وَكَيْلًا - زید نے اپنی جگہ وکیل کو قائم مقام کر دیا\*\*\*\*۔

اِنَابَتٌ اِلَى اللّٰهِ - قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے - اَنِيبْتُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ (۵۴) - مُنِيْبِيْنِ اِلَيْهِ (۳۱) - وغیرہ - اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے شہد کی مکھی (نَوْبُ\*) کی مثال سامنے لائیے - وہ فضا کی پہنائیوں میں سینکڑوں میل ادھر ادھر نکل جاتی ہے - مختلف وادیوں میں بھرتی اور مختلف باغات میں گھومتی ہے - لیکن اپنی محنت کے ماحصل کو لیکر ہر بار اپنے چہرہ (مرکز) کے طرف لوٹتی ہے - وہ کہیں ہو اسکا چہرہ

\*ناج و راغب - \*\*ابن فارس - \*\*\*ناج و محیط - \*\*\*\*ناج و راغب و محیط۔

اسکی نگاہوں کا مرکز اور اس کی گردش کا محور ہوتا ہے۔ وہ اسکی نظروں سے ایک ثانیہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اسکی تمام توجہات کا قبلہ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت، سفر زندگی میں ایک مرد مومن کی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اسکی توجہات کا مرکز اور گردشوں کا محور خدا کا قانون (اور اسے نافذ کرنے والا نظام) ہوتا ہے۔ وہ ہر فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی متاع حیات اور حاصل تک و تاز کو لیکر اس کی طرف لوٹتا ہے۔ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرَہٗ (۲۵۴)۔ ”اور جہاں کہیں تم ہو اپنی توجہات کو اسی طرف مرکوز رکھو“۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ہر دروِست گردوں یگانہ نگاہ او بشاخ آشیانہ

بعینہ یہی کیفیت شہد کی مکھی کی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ثَمَّ "کای" مین "کل" الثَّمَرَاتِ فَاَسْلُیْکِ سُبُلَ رَبِّیْکِ ذُلًا (۱۶)۔ ”تو تمام پھلوں (پھولوں) کا رس چوس، اور اپنے رب کے راستے پر فرمانبرداری سے چلی جا،۔ ایک مومن دنیا بھر کے علوم و فنون کا اکتساب کرتا ہے لیکن ان کے ماحصل کا مرکز قرآن کریم کو بناتا ہے۔ قرآنی نظام اسے پھر تمام نوع انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔

یہ ہے اِنَابَتِ اِلٰی اللہ کا صحیح مفہوم۔ زندگی کے ہر دوراے ہر فیصلہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا۔ وہیں سے راہ نمائی لینا۔ اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو لیکر اسی کی طرف لوٹنا۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ توبہ، لغزش کے بعد ندامت کے لئے آتا ہے اور اناہت، مستقبل میں لغزشوں سے محفوظ رہنے کے لئے۔ یعنی توبہ میں انسان، غلط قدم اٹھ جانے کے بعد، واپس آکر صحیح راستے پر گامزن ہوتا ہے اور اناہت میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی سوچ لیتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور پھر اسی راستے پر چلتا ہے۔ یہ حفظ ما تقدم (Preventive) ہے، وہ تدبیر بعد مرض (Curative)۔

## ن و ح

نَاح - وہ چیخ چیخ کر روبا۔ نَوُحٌ - وہ عورتیں جو نوحہ کرنے کے لئے جمع ہوں۔ نیز نوحہ کرنا۔ اَلْتَّيْسَاحَةُ - نوحہ کرنا۔ اَلتَّنَاوُحُ - ایک

دوسرے کے آمنے سامنے ہونا (جسطرح عورتیں نوحہ کرتے وقت ہوتی ہیں) \*۔  
ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (یعنی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا)۔

نُوحٌ \*۔ حضرت نوحؑ (۲۶۰)۔ یہ غیر عربی لفظ ہے۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کا لقب ہے کیونکہ وہ بہت روئے اور گڑگڑائے رہتے تھے \*۔ لیکن زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔

قرآن کریم نے سلسلہ نبوت کا آغاز بالعموم حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَلِمًا اَوْحَيْنَا اِلَيْهِ نُوْحٌ وَالنَّبِيَّيْنِ مِيْنْ بَعْدِهِ . . . . (۱۶۳)۔ ”بیشک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جسطرح نوح کی طرف اور اس کے بعد دیگر انبیاء کی طرف وحی کی تھی“ . . . . (البشہ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت نوحؑ کے ساتھ آدم کا بھی نام آیا ہے۔ اس کے لئے دیکھئے عنوان (۱- ۵- ۵- م)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں سلسلہ رشد و ہدایت کی ابتداء قوم نوح سے ہوئی۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطہ زمین اور کتونس نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رخ اس طرف ہے کہ اسکی ابتدا عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل انسان کی تمدنی زندگی کی مؤسس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں، آج سے قریب چھ سات ہزار سال قبل، حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے۔ قرآن کریم (ان معاملات میں) نہ زمان سے بحث کرتا ہے نہ مکان سے۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔

حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد تھے۔ اسی لئے قرآن کریم انہیں ان کے مخاطبین کا بھائی کہہ کر پکارتا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ نُوْحٌ . . . (۲۶۱)۔ ”جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا“۔

اگرچہ قرآن کریم نے سلسلہ نبوت کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس قوم میں خدا کے رسول آچکے تھے۔ قرآن کریم میں ہے وَقَوْمُ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا اَنْرَسُلْ اَغْرَقْنَاهُمْ . . . (۲۵)۔ ”قوم نوح نے جب رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کر دیا“۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں ذہن انسانی ہنوز اپنے عالم طفولیت میں تھا اور وہ لوگ تمدنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات بھی اپنی عقل سے پوری نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی کس طرح بنائیں۔ . . . وَأَصْنَعِ الْفُلَ لَكَ بِأَعْيُنِنَا وَوْحَيْنَا . . . (۱۱:۱) ”ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ . . . وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے۔“

حضرت نوحؑ کا پیغام وہی تھا جو تعلیم ربانی کا اصل الاصول ہے۔ یعنی یَتَّقُوا رَبَّ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ . . . (۲۹:۱)۔ ”اے میری قوم۔ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی اللہ نہیں۔“ قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی (۲۳:۱)۔ اگر دعوت حضرت نوحؑ کا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش چھوڑ کر ”خدا کی پرستش“ میں لگ جائیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کی مخالفت ماری قوم کی طرف سے ہونی چاہئے تھی۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا (۲۶:۱) اور ارباب دولت و حشمت (سرداران قوم) کی طرف سے اسکی مخالفت ہوئی (۲۷:۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس میں مترفین (آسودہ حال سرماسہ داروں) کا طبقہ اپنی ہلاکت دیکھتا تھا اور غریبوں کا طبقہ اپنے لئے زندگی کے آثار پاتا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو اعلیٰ طبقہ کے نزدیک قابل نفرت شمار ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں اراذل (کمینے) کہتے تھے (۲۶:۱؛ ۲۷:۱)۔

مترفین کے طبقہ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی۔ حضرت نوحؑ کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں (۲۹:۱)۔ اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ وہ مغلوب ہو جائینگے (۳۰:۱)۔ اس کے بعد طوفان آیا (۳۱:۱)۔ مخالفین غرق ہو گئے اور حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کشتی میں سوار ہو کر صحیح و سلامت خشکی پر اتر گئے۔

اسی سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ”غیر“ جو حضرت نوحؑ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کا شمار ”اپنوں“ میں ہو گیا تھا اور خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اور آپ کی بیوی (جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے) ان کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں (۱۱:۱؛ ۲۶:۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نے پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کر دیا تھا کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہونی ہے۔ وطن اور خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَلَمَّيْتُ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹) ”وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہا“۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی۔ لیکن قدیم زمانے کی تاریخ میں ”بادشاہوں کی عمر“ سے مراد ہوتا تھا وہ زمانہ جس میں حکومت ان کے خاندان میں رہتی۔ اس اعتبار سے ساڑھے نو سو برس کا زمانہ وہ مدت ہے جس میں شریعت حضرت نوحؑ کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سَنَةٍ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل (چوتھائی سال) کے بھی ہیں لہذا ”أَلْفَ سَنَةٍ“ کے معنی ہوئے اڑھائی سو برس۔ اس میں سے پچاس سال نکال دینے سے باقی عمر دو سو سال رہ جاتی ہے جو مستبعد نہیں۔ [مزید تفصیل (س۔ ن۔ و) اور (ع۔ و۔ م) کے عنوانات میں دیکھئے]۔

## نور

النُّورُ - روشنی، جس قسم کی بھی ہو۔ یا روشنی کی شعاع۔ زمخشری نے کہا ہے کہ ضیاء میں نُور سے زیادہ زور اور شدت ہوتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضیاء ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُور اس روشنی کو جو ذاتی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورج کے لئے ضیاء اور چاند کے لئے نُور کا لفظ استعمال ہوا ہے\*۔ (نیز دیکھئے عنوان ض۔ و۔ ا)۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا (۱۰)۔ ”اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا“۔ واضح رہے کہ ضیاء اور نور کا یہ فرق وہاں ہی ہوگا جہاں ان الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لایا جائے گا۔ ورنہ نور کے معنی روشنی ہونگے۔ نُور اسے کہتے ہیں جو خود واضح اور ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو روشن اور واضح کر دے\*۔ اللہ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو نُور کہا ہے سورۃ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۱۵)۔ ”یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی واضح کتاب آگئی“۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لئے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ روشنی کا



دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے اور قیمت کیا۔ اسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے۔ یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا۔ لہذا جہاں اللہ نے قرآن کریم کو نور کہا ہے تو اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس نور (روشنی) سے مقصود کیا ہے۔ **يَهْدِيْ بِهٖمُ اللّٰهُ مَنۡ اَشْبَحَ رِضْوَانُہٗ سَبِيْلَ السَّلَامِ وَ يَخْرُجُہُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَ يَهْدِيْہُمْ اِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶۶)۔** ”اللہ اس روشنی کے ذریعے، ہر اس شخص کو جو اس کے قانون سے ہم آہنگ ہوتا ہے سلامتی اور تکمیل ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نکال کر (زندگی کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے۔“ \*\*\*۔ یعنی انہیں زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسی مشعل ہدایت کو لے کر دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ **جَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا يَّمشِيْ بِہٖم فِی النَّجَاسِ (۱۶۷)۔**

**مَنَارَۃ** اور **مَنَارٌ** اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے روشنی نکالے (اس کے بعد مجازاً اذان دینے کی جگہ کو بھی **مَنَارَۃ** کہنے لگے) \*۔ **مَنَارٌ**۔ ان حدود کو بھی کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے قائم کی جائیں \*۔ **مُنِيرٌ**۔ خوش رنگ اور روشن چیز یا آدمی کو کہتے ہیں \*۔ نیز روشن کرنے والا۔

**النَّارُ**۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ **نَارٌ** اور **نُّوْرٌ** دونوں لفظ ایک ہی اصل سے ہیں۔ (۱۶۸)۔ **نَارٌ** کے معنی ہیں شعلے کی لپٹ جو نظر آجائے \*۔ نیز **النَّارُ** کے معنی علامت اور نشانی کے بھی آتے ہیں، اس لئے کہ عرب اپنے اونٹوں کو گرم لوہے سے داغ دے کر نشان لگایا کرتے تھے \*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ **نَارٌ** اور **نُّوْرٌ** کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے اسکی دلیل کچھ وزنی نہیں۔ **نُّوْرٌ** کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ **نَارٌ** میں نفرت اور وحشت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسی لئے **نَارَتِ الثَّمَرِۃُ تَنْوُرٌ** کے معنی ہیں ہورت کا متنفّر اور متوحش ہونا۔ ہرن نیز، وحشی (غیر مانوس) جانوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ **بَقَرَۃٌ نَّوَارٌ**۔ اُس گائے کو کہتے ہیں جو نر سے متنفّر ہو۔ حشّی کہ **مُنَاوِرَۃٌ** کے معنی آپس میں گلی گلوچ کے ہیں۔ نیز **نَّائِرَۃٌ** کے معنی

\* تاج۔ \*\* موت کی تاریکی اور زندگی کی روشنی کے لئے دیکھئے (۱۶۸)۔

عداوت ، بغض اور فتنہ کے ہیں کیونکہ عداوت اور بغض بھی ایک اندرونی آگ ہے ۔ نَائِیْرَةُ الْحَرْبِ - سے مراد جنگ کا شر اور ہیجان ہے \* ۔ نَارُ الْحَرْبِ - اُس آگ کو کہتے تھے جسے عرب پہاڑ کی چوٹی پر جلاتے تھے اور جس سے مراد اعلانِ جنگ ہوتا تھا \*\*\* ۔ نَارُ السَّعْتِ وَمُ کے معنی ہیں قوم نے شکست کھالی \*\* ۔

اس سے عَذَابُ النَّارِ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ۔ ( بمقابلہ جنت کے جس کے نیچے پانی کی نہریں ہیں ۔ پانی اور آگ کا تقابل مفہوم کو واضح کر دیتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ن ۔ ہ ۔ ر ) ۔ اس میں اس دنیا کی زندگی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی ہلاکت سامانی بھی ۔ اَصْحَابُ النَّارِ وہ ہیں جو خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا ہوں ( ۳۸-۳۹ ) ۔ یہ آگ دلوں کو محیط ہوتی ہے ۔ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ النَّبِیُّ تَطْلِیْعُ عَلٰی الْاَفْئِدَةِ ( ۱۰۳ ) ۔ "قانونِ خداوندی کی بھڑکانی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں" ۔ (مزید تفصیل جہنّم اور ج ۔ ح ۔ م کے عنوانات میں ملیگی) ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نَار سے ہوئی ہے ( ۳۸ ) ۔ اس لئے جہاں نَار سے بچنے کی تاکید ہے تو اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے ۔ ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے ۔ اسی لئے عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور خود اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی ہیں ۔ اس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔

مَوْرَةُ حَجَرٍ میں ہے ۔ وَالْجَبَانُ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ ( ۱۵ ) ۔ جَبَان سے مراد وہ تمام چیزیں یا قوتیں ہیں جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ( Invisible ) ہیں ۔ اس آیت میں نَارِ سَمُوم (سخت نیز آگ) سے مراد وہ حرارت ہو سکتی ہے جو مادہ کی اُس حالت میں ہوتی ہے جب اس نے ہنوز کوئی متشکل صورت اختیار نہ کی ہو ۔ ایٹم وغیرہ کی حرارتیں اسی قبیل سے ہیں ۔ نیز جَبَان سے مراد وہ مخلوق بھی ہو سکتی ہے جو انسان سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور جو اب نابود ( Extinct ) ہو چکی ہے ۔ انسان اس مخلوق کا جانشین ہے (دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ف) ۔ چونکہ اس زمانے میں زمین کی

سطح نسبتاً زیادہ گرم تھی اس لئے اُس مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی یہ کہا گیا ہو کہ اسکی تخلیق ناری سے تھی، جس طرح انسان کی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس کی ابتدا مٹی سے کی گئی ہے۔

(ابلیس اور جان وغیرہ کے مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات ب۔ ل۔ س اور ج۔ ن۔ ن دیکھئے)۔ سورۃ نور میں ہے اللہ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔۔۔ (۲۴/۳۵)۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ نے اس مثال سے اپنی ذات کو سمجھایا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن کچھ تصور نہیں کر سکتا۔ یہاں خدا نے مَثَلُ نُورٍ کہہا ہے۔ یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے (جیسی آگے بیان کی گئی ہے)۔ نورِ خداوندی بڑا جامع لفظ ہے اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اسکا استعمال آیا ہے۔ اسکی جامعیت کے اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی ”روشنی“ ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے۔ عقل کی روشنی۔ علم کی روشنی۔ وحی کی روشنی وغیرہ۔ یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اس ”روشنی“ میں خدا کی کتاب (قرآن کریم) بھی شامل ہے۔ اس مثال میں قرآن ہی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ خود مثال کے مختلف حصے اور تشبیہات اس کی تائید کرتی ہیں۔

## ن و ش

النَّوْشُ - کسی چیز کو لیے لینا۔ تَنَاشَوْشَہ - اس نے ایسے لیے لیا۔ النَّوْشُ - طلب کرنا۔ النَّوْشُ وَشُ - قوی آدمی جسکی گرفت سخت ہو۔ نَاشِ بِہِ یَنُوشُ - وہ اس سے چمٹ گیا اور لٹک گیا \*۔ نَاشٍ فُتِلَا نَیَا - اس نے فلاں کو ہکڑا تا کہ اس کی ڈاڑھی اور سر کو کھینچے \*\*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَأَنشِ لَهُمْ التَّنَازُلَ (۳۳/۴)۔ اب وہ ایمان کو کیسے پا سکتے ہیں۔ اب وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل گیا۔

## ن و ص

النَّوْصُ - پیچھے ہٹنا۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی آمد و رفت بتائے ہیں۔ النَّوْصُ - بھاگنا۔ نَاصٍ یَنُوصُ - نَوَاصاً - متحرک ہونا اور کہیں چلے جانا۔ بھاگ کر چھٹکارا حاصل کر لینا۔ نَاصٍ عَنۡہُ - وہ اسکے پاس سے ہلٹ گیا، کترا کر نکلا اور بھاگ گیا۔ ایک طرف ہو گیا۔ نَاصٍ اِلٰی کَذَا - اسنے اسکی طرف پناہ لی \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَلَاتَ حِسْنٌ مِّنَّا صَیْ - (۳۸) پیچھے ہٹنے اور بھاگ کر کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا\*\*۔ مِّنَّا صَیْ کے معنی بھاگنے کی جگہ بھی ہیں اور خود بھاگنا بھی۔

## ن و ق

النَّاقَةُ\*۔ اونٹنی، جب وہ جوان ہو جائے (تقریباً چوتھے برس میں)۔  
النَّیْفَةُ\*۔ کھانے اور لباس کو بہت زیادہ عمدہ، خوشگوار اور پسندیدہ بنانا۔ نفاست۔ پختگی۔ عمدگی۔ مہارت۔ باریک بینی۔ تَنَوَّقَ فِی الْأُمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں انتہا کرنا، نہایت باریک بینی سے کام لینا۔ تاج نے ابن فارس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نَاقَةُ\* ہی سے بنایا گیا ہے کیونکہ عربوں کے ہاں اونٹنی نہایت پسندیدہ اور عمدہ شے مانی جاتی تھی۔ جسطرح جَمَلٌ\* (اونٹ) سے جَمَالٌ\* (حسن اور خوبصورتی) اور أَجْمَلٌ\* سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہے، اسی طرح نَاقَةُ\* سے تَنَوَّقَ\* اور التَّنَوُّقُ\* ہے جس کے معنی ہیں صاف کیا ہوا کھجور کا خوشہ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بلند اور اونچا ہونے کے ہیں۔ ممکن ہے اونٹنی کو النَّاقَةُ\* اسکی بلندی کی وجہ سے کہتے ہوں۔

قومِ ثمود کے ہاں پانی کی قلت تھی (دیکھئے ت - م - د)۔ جتنا کچھ پانی جمع ہوتا، قوم کے بڑے بڑے لوگ اسے اپنے موبشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور غریبوں کے جانور پیاسے مر جاتے۔ حضرت صالحؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ جو چارہ اور پانی خدا نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا قیمت دیا ہے، اسے کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص کر لینا ظلم ہے۔ تم اس روش سے باز آ جاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ چنانچہ بہت سی حیل حجت کے بعد وہ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے کہ پانی میں سب کی باری مقرر کر دی جائے۔ اس کے لئے حضرت صالحؑ نے کہا کہ بہت اچھا۔ یہ ایک اونٹنی ہے۔ میں اسے چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اسے اسکی باری پر پانی پینے دیتے ہو یا نہیں۔ اگر تم نے اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اگر تم نے اسے روک دیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد محض زبان سے کر لیا ہے، دل سے اسے نہیں ماننے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور انہوں نے اس اونٹنی کو بے دردی سے قتل کر دیا۔

اسے قرآن کریم میں نَاقَةُ اللَّهِ (سج) کہا گیا ہے۔ خدا کی مخلوق میں سے وہ اونٹنی جو اس بات کی علامت تھی (لَکُمُ آيَةٌ) کہ وہ لوگ اپنے اس

معاهدہ پر جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کار بند رہتے ہیں یا نہیں - جس طرح کعبہ کو خدا نے بیتیٹی\* (میرا گھر) کہا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو نفاقۃ\* اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

## ن و ل (ن ی ل)

النَّيْلُ\* - النَّائِلُ\* - عطیہ جو کچھ انسان کو مل جائے یا پہنچ جائے۔  
نَالَ اس نے ہا لیا۔ نَالَ مِّنْ عِنْدِ وَهٍ مَّطْلُوبَةٌ\* - وہ اپنے دشمن کو جو گزند پہنچانا چاہتا تھا وہ اس نے پہنچا دیا\*۔ اور یوں اپنا مقصد پورا کر لیا۔  
أَنْتَلْتُهُ إِيقَاهُ\* وَنَيْلْتُهُ\* - میں نے اسے کوئی چیز حاصل کرائی، دیدی یا پہنچا دی۔ نَالَ الْقَرْحِيئِلُ\* - روانکسی قریب آگشی\* - تَنْوِيْلُ\* - عطا کرنا۔  
النَّوَالُ\* - عطاء\*\*۔

النَّيْلُ\* - مصر کا مشہور دریا - نيز عِيْظَلِيمُ\* کا درخت جس سے نیل (رنگ) بنایا جاتا ہے\* - یہ ہندی لفظ نیل سے معرب ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے - لَا يَنْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ\* (۲/۱۲۴) - میرا عہد ظالمین کو نہیں پہنچے گا - یعنی جو لوگ میرے قوانین سے سرکشی اختیار کر جائیں گے اور انسانی حقوق میں کمی کرینگے انکے لئے میرا یہ وعدہ نہیں کہ انہیں نوع انسانی کی امامت ملیگی - سورہ توبہ میں ہے - لَا يَنْتَالُوْنَ مِّنْ عِنْدِ رَبِّكَ نَيْلًا\* (۲/۱۲۴) - نہ وہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں - سورہ اعراف میں ہے - لَا يَنْتَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ (۷/۴۹) - اللہ ان پر رحمت نہیں کرے گا۔

## ن و م

النَّوْمُ\* نیند (۲/۲۵۵) نیز (۹/۷۹) - مَنَامٌ\* - سونے کی جگہ یا وقت - یا نیند اور خواب (۱۱/۳۷۴ ; ۲۲/۳۹) - نیز اس کے معنی آنکھ کے بھی آتے ہیں اس لئے کہ نیند کی جگہ آنکھ بھی ہے\*\*\*۔ چنانچہ سورہ انفال میں جو ہے اِذْ يَبْرُكُ لَهُمُ اللّٰهُ فِي مَنَامِكَ\* (۸/۲۴) - تو اس کے معنی بعض مفسرین نے آنکھ ہی کے لئے ہیں\*\*\* - یعنی جب اللہ انہیں تیری نگاہوں میں (کم) دکھاتا تھا۔

نَامَتِ الرِّيحُ\* - ہوا سو گئی یعنی ساکن ہو گئی - نَامَتِ النُّقَارُ\* - آگ کی تپش اور تندی ماند پڑ گئی - نَامَ عَيْنٌ حَاجَتِيْہِ\* - وہ اپنی ضرورت سے غافل ہو گیا - اَلنَّوْمَةُ\* - جسے درخور اعتناء نہ سمجھا جائے - اَلنَّوْرُہِمُ\*۔

جو شخص اپنی چیزوں کی طرف سے غفلت برتے - نیز گمنام\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمود اور حرکت کے ٹھہر جانے کے ہیں - اِسْتَنَامَ اِلٰی 'فُلَانٍ' - فلاں کی طرف پہنچ کر اس نے اطمینان حاصل کر لیا -

## ن و ن

نُونُ\* - اسے عبرانی اور سریانی زبان میں بھی نُونُ\* ہی کہتے ہیں - اس کے معنی بڑی مچھلی کے آتے ہیں - اس حرف (ن) کی قدیم شکل بہت کچھ مچھلی سے مشابہت رکھتی تھی\*\* - قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کو ذَا النُّونِ (۲۹) بھی کہا گیا ہے - اور صَاحِبِ الْحُوتِ بھی (۱۸) - یعنی مچھلی والا - سورة الصَّفَّاتِ میں انہیں یونس کے نام سے پکارا گیا ہے (۳۷) -

تعریفات میں ہے کہ نُونُ\* علم اجمالی کو کہتے ہیں جس سے مراد دوات ہے ، کیونکہ وہ حروف جو علم کی صورت اختیار کرتے ہیں اجمالی طور پر اس کی روشنائی میں موجود ہوتے ہیں - یعنی معنی اس کے دوات ہیں اور مراد اس سے اجمالی علم ہے\*\* - سورة القلم میں ہے نٌ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ (۱۸) - ”دوات اور قلم اور جو کچھ لوگ ان سے لکھتے ہیں (یعنی علم) اس پر شاہد ہے کہ . . .“ (ہو سکتا ہے کہ یہاں ن مقطعات میں سے ہو) - تاج اور اقرب الموارد میں ہے کہ نُونُ\* کے معنی تلوار کے پھل (یا دھار) کے بھی ہیں - اس اعتبار سے دیکھئے نون - وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ کے معنی یہ ہونگے کہ سیف (تلوار) اور قلم یعنی جو کچھ اس سے لکھتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ . . . (دین خداوندی کی بالآخر کامیابی ہوگی) - تلوار سے مراد قوتِ نافذہ اور قلم سے مراد قانونِ خداوندی ہے - ”قرآن کریم اور تلوار“ وہ محکم شہادات ہیں جن کی موجودگی میں اسلام کا کوئی دعویٰ ہلا دلیل نہیں رہ سکتا - یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

در کمر تیغِ دو رو، قرآنِ بدست      تن بدنِ هوش و حواسِ الله مست  
ایں دو قوتِ حافظِ یک دیگر اند      کائناتِ زندگی را محور اند

سورة حمد میں اسی ضمن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے رسولوں کو بھیجا - ان کے ساتھ ضابطہ قوانین نازل کیا - اور فولاد (شمشیر) بھی - فیثہ بتائیں\* شَدِيدٌ وَ مَنَافِعٌ لِّلنَّاسِ (۵۷) - جس میں سخت قوت ہے اور نوع انسانی کے لئے فوائدِ کثیر - واضح رہے کہ قرآن کریم اور شمشیر کے ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کو شمشیر کے زور سے منوایا جائے گا - اس

کے معنی یہ ہیں کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا جس میں قرآنی اصول و قوانین نافذ کئے جائیں گے۔ اسی قوت نافذہ کو شمشیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ قوت جو دنیا میں ہدل قائم رکھنے کا موجب بنتی ہے اور جس سے مجرمین کو تباہ کاریوں سے روکا جاتا ہے۔

## ن و ی

نَسَوَى الشَّقِیُّیَ ۖ یَنْتَوِیْہُ - کسی چیز کا قصد اور دل میں عزم کرنا۔ پختہ ارادہ کرنا، اور اس کی طرف دل سے متوجہ ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) کسی چیز کا قصد اور (۲) کسی چیز کی گٹھلی۔ اَلنَّیْقَۃُ - وہ سمت جس کی طرف سفر کیا جائے\*۔ دل سے کسی کام کا عزم کرنا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے معنی ہیں دل کا جلسہ منفعت اور دفع ضرر کے لئے کسی مناسب کام کے لئے آمادہ ہونا\*\*۔ تَوَاکَتَ اللہ - خدا سفر میں تیرے ساتھ رہے اور تیری حفاظت کرے۔ اَلنَّیْقَۃُ - رفیق یا رفیق سفر\*۔ ہم نیت۔ اَلنَّیْقَۃُ - گٹھلی۔ اس کی جمع اَلنَّیْقَۃُ ہے۔ (۱/۶۶)۔ نَسَوَاۃُ الشَّمْرِ - کھجور کی گٹھلی۔

## ن ہ ج

اَلنَّهْجُ - اَلْمِنْهَاجُ - واضح راستہ۔ اَنْهَجَ الطَّرِیْقُ وَالْاَمْرُ - راستہ اور معاملہ واضح ہو گیا۔ نَهَجَ اَلْاَمْرُ کے بھی یہی معنی ہیں۔ فُلَانٌ اَسْتَنْهَجَ طَرِیْقَ فُلَانٍ - فلان آدمی فلان کے طریق پر چلا\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے لِيُكَلِّمَ جَعَلْنَا مِیْنَكُمْ شِرْعَۃً وَّ مِیْنَهَا جَمًا (۳۸)۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا، (اس کے تفصیلی مفہوم کے لئے عنوان ش - ر - ع دیکھئے)۔

## ن ہ ر

نَهَرَ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھلنے یا کھولنے کے ہیں۔ اَنْهَرَتْ الدَّمُ - میں نے خون کو کھول دیا اور بہا دیا۔ نَهَرَ کے معنی ہیں ہانی بہنے کی جگہ۔ بعض نے کہا ہے کہ نَهَرَ در اصل ہانی کو کہتے ہیں اور اس کے بہنے کی جگہ کو مجازاً نَهَرَ کہہ دیتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْهَارٌ ہے۔ اَلنَّهَرُ - بمعنی نَهَرَ ہے۔ نیز اس کے معنی وسعت و فراخی اور روشنی بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے

\*تاج - \*\*محیط - \*\*\*تاج و محیط و راغب -

إِنَّ الْمَشْهُورَ فِي جَنَّاتٍ وَ نَهَرٍ (۲۵) - تو اس میں نہر کے معنی روشنی اور فراخی کے ہیں - النَّهْرُ کے معنی ہیں کثیر اور وافر \* - روشنی کی جہت سے اَنْتَهَارُ دن کے لئے بولا جاتا ہے - یعنی لَیْل کی ضد - اَنْتَهْرَۃ کے معنی کسی چیز کو اچک کر لے جانا بھی ہیں - اسی لئے نَهَر الرَّجُلُ نہر کے معنی ہیں اس آدمی نے دن میں حملہ کیا \* - غالباً اسی جہت سے نَهَر الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس نے آدمی کو جھڑک دیا - اَلْمَنْهَرَةُ - مکانات کے سامنے کی کھلی جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے \* - یہاں سے وَ اَمَّا السَّقَائِلُ فَلَا تَنْهَرُ (۱۳) کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی صاحب احتیاج کو ذلیل و حقیر نہ سمجھو - اور (۱۴) میں والدین کے متعلق جو کہا ہے فَلَا تَقُلْ لَهُمْ اُفٍّ وَلَا تَنْهَرُهُمْ هُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۴) تو وہاں بھی لَا تَنْهَرُهُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی انہیں جھڑکو نہیں - ان کی تعقیر مت کرو - اور ان سے شرافت سے بات کرو -

قرآن کریم میں جنت کے متعلق بار بار آتا ہے تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا اَنْهَارٌ (۲۵) - ان باغات کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی - پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نہر کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن عربی زبان میں نہر اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہ رہا ہو - اس میں دریا ، ندی ، نہر سب ہی آ جاتے ہیں ، جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں \*\* -

قرآن کریم کے ان مقامات میں جہاں جہاں جنت سے مراد دنیوی زندگی میں جنتی معاشرہ ہے ، اس کی انہار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرمبز و شاداب رہے گا - اُكْلُهَا دَائِمٌ وَ ظِلُّهَا (۱۳) - اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہونگی - تَوْرَتِي اُكْلُهَا كُلَّ حَيٍّ (۱۴) - وہ اپنے پھل ہمیشہ دیتا رہتا ہے -

اور جہاں جنت سے مراد اُخروی جنت ہے ، تو اس کی تمام تفصیل تمثیلی ہیں - (۱۳ و ۲۵) - لہذا وہاں بھی اَنْهَار سے مراد اس قسم کی نہریں نہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں -

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانی کو زندگی کہا ہے (۲۱) اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے - اس لئے جس معاشرہ میں آبِ رواں کی فراوانی ہو اس میں زندگی کی فراوانی ہوگی - ”باغات میں نہریں رواں ہونے“ سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرمبزیاں ہیں -



## ن ہ ی

نَهَاهُ يَنْهَاهُ نَهْيًا - اَمَرَہ کی ضد ہے - روکنا - منع کرنا - باز رکھنا -  
 اَنْتَهَى - رک جانا - باز آجانا - اَلنَّهْيَةُ - کسی چیز کی انتہا اور آخری  
 حد کو کہتے ہیں - اَلنَّهْيَايَةُ کے بھی یہی معنی ہیں\* - ابن فارس نے کہا  
 ہے کہ یہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں - یعنی انتہا تک پہنچ جانا - انتہا  
 تک پہنچ کر ہر بات رک جاتی ہے - اس لئے اس کے معنی رک جانے کے آئے  
 ہیں - اَلنَّهْيَةُ - عقل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو بعض امور سے  
 روکتی ہے - اسکی جمع النہی ہے\* - (خود عقْل کے معنی بھی روکنے کے ہیں -  
 دیکھئے عنوان ع - ق - ل) - رَجُلٌ مِّنْہَا - وہ شخص جس کی رائے  
 پر لوگ اعتماد کریں\* -

قرآن حکیم میں ہے فَاِنْ اَنْتَهَوْا (۲/۱۹۳) - "اگر وہ لوگ لڑائی سے رک  
 جائیں" - يَنْتَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بمقابلہ يَتَّسِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ (۳/۹)  
 آیا ہے - یعنی معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا - یہ امت مسلمہ کا فریضہ  
 ہے - (مَعْرُوفٌ اور مُنْكَرٌ کے لئے دیکھئے عنوانات (ع - ر - ف) اور  
 (ن - ک - ر) - اُولٰٓئِی السَّہٰی (۲/۵۴) - صاحبان عقل و بصیرت - اَنْتَهٰی (۲/۵۵)  
 رک جانا - اَلْمُنْتَهٰی - انتہائی کنارہ - آخری حد - (۵۳/۱۳) - (سید رَہ کے لئے  
 عنوان م - د - ر دیکھئے)

## و

## وَ (حرف)

وَ - (۱) ”اور“ (And) کے معنوں میں - اَنْعَمْتُ لَهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ  
(۳۲/۴) - اُن کے چوپائے اور وہ خود...

(۲) مَعَ (ساتھ) کے معنوں میں - فَمَا جَمِعْتُمُوْا اَمْ رَكُومٌ وَ  
شُرَكَاءَ كُنتُمْ (۱۱/۲) - تم اپنے معاملہ کو اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر  
بالکل پختہ کرو۔

(۳) اَوْ (یا) کے معنوں میں - يَحْتَبِلُ مِنْ اِلٰهِ وَ حَتَبِلُ مِنْ  
النَّاسِ (۳۱/۱۱) - اللہ کے عہد کے ذریعہ یا لوگوں کے عہد کے ذریعے۔

(۴) تاکہ - کے معنوں میں - بِلَمِيتَيْنَا نُرْذِّ وَ لَا نَكْذِبُ (۴۱/۲)  
اے کاش ہم واپس بھیج دیتے جاتے تاکہ ہم پھر تکذیب نہ کرتے۔ (یہاں  
در اصل مَكْنٰی یا لَا مَ تعلیل محذوف ہے)۔

(۵) یعنی - کے معنوں میں - اے او تفسیری کہتے ہیں اور اس کا  
استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ واو عاطفہ  
(اور کے معنوں میں) ہے یا واو تفسیری (یعنی کے معنوں میں)۔ مثلاً قُلْنَا  
يٰۤاَنۡرَٰكُومُ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا عَلٰی اٰبْرٰهٖمَ (۲۱/۲) - اس کے یہ  
معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ - اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی  
ہو جا۔ اور یہ بھی کہ - اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی یعنی سلامتی والی  
(نقصان نہ پہنچانے والی ٹھنڈک) ہو جا۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہاں  
واو کا ترجمہ یعنی زیادہ موزوں ہے۔

(۶) قسم کے لئے - وَ الْعَصْرِ (۱/۳) - زمانہ کی قسم - یا زمانہ اس  
پر شاہد ہے کہ -

(۷) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے۔ فَلَمَّا اسْلَمْنَا وَتَلَّقَهُ لَلْجَبِينِ وَ نَادَیْنَاهُ (۱۱۳)۔ سو جب وہ دونوں جھک گئے اور اس نے (بیٹے کو) کنپٹی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی۔ (یہاں۔ و۔ کے بغیر بھی معنی وہی رہتے ہیں)۔

(۸) ”حَالَانِکَ“۔ ”درانِ حالیکہ“۔ کے معنوں میں (اسے واوِ حالِیہ کہتے ہیں)۔ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الذِّکْرَ (۲۴)۔ درانِ حالیکہ تم کتاب کی پیروی (یا تلاوت) کرتے ہو۔ نِزْوَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۴)۔ درانِ حالیکہ تم (خوب) جانتے ہو۔

## و ا د

الْوَاْدُ وَالْوَيْدُ۔ بلند اور سخت آواز۔ اونٹ کی بڑبڑاہٹ۔ وَ اَدَ فُلَانًا۔ اس نے فلان آدمی کو گرا نیار کر دیا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ چنانچہ بوجھ لیکر چلنے والے اونٹوں کی گراں رفتاری و وید کہلاتی ہے۔ یہیں سے وَ اَدَ الْبَيْتَ یَئِیدُ وَ اَدَا کے معنی ہیں (لڑکی کو) زندہ زمین میں دفن کر دیا۔ اور مٹی تلے دبا دیا۔ مٹی کا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ عرب جاہلیت میں قبیلہ ”کنندہ“ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے\*۔ اس لڑکی کو جسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جاتا اَلْمَوْدُ وَ اَدَا وَ اَلْوَيْدُ کہتے تھے\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ وَ اِذَا اَلْمَوْدُ دَا سُمِّیَتْ یَسَاٰی ذَاتُیْ قَتْلٍ (۸۱۶)۔ جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم کی سزا میں یوں مار دیا گیا تھا۔ رسول اللہؐ عورتوں سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔ (۱۱۶)۔ اس سے (غالباً) یہی لڑکیاں مراد ہیں، بجز اس کے کہ یہاں قتل سے مراد اولاد کو تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ہو۔ (دیکھئے عنوان ق۔ ت۔ ل۔ و۔ ذ۔ ب۔ ح)۔

اس سے مراد صرف عرب جاہلیت کے زمانہ کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لڑکیاں ہیں جنہیں ہمارے معاشرہ میں ”زندہ درگور“ کر دیا جاتا ہے۔ جو اپنی ساری عمر اس طرح بسر کر دیتی ہیں کہ نہ مردہ ہیں نہ زندہ۔ وہ گھروں میں نہیں ہوتیں، قبروں میں دفن شدہ ہوتی ہیں جہاں سے ان کی نجات کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ جب تک ہمارے معاشرہ میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین قرآن کریم کے مطابق نہیں ہوتے، بیچاری بے زبان لڑکیوں کی حالت ایسی ہی رہے گی۔ اور ان کی نشو و نما کی صلاحیتیں دفن ہی رہیں گی۔

## و ا ل

وَأَتَى الْيَتِيمَ - يَتِيمٌ "وَأَلَّ" - کسی کی طرف پناہ لی - اس کی طرف تیزی سے گیا ، اس کی طرف ہلنا - وَأَلَّ مِينَهُ - اس سے نجات چاہنا - التَّوَالُّ "وَالْمَوْتُ" وَالْمَوْتُ "آلَةُ" - نجات اور پناہ کی جگہ - جائے پناہ - آلَةُ الرَّجُلِ - آدمی کے گھر والے جن کی طرف وہ پناہ لیتا ہے \* - ابن فارس نے اس کے معنی مجتمع ہونے اور پناہ لینے کے لکھے ہیں -

سورة كهف میں مَوْتٌ نَبَلًا ( ۱۸/۵۸ ) پناہ اور بچاؤ کی جگہ کے معنوں میں آیا ہے -

## و ب ر

التَّوْبَرُ (جمع أَوْبَارٌ) - اونٹ ، خرگوش اور لوسڑی کے بال - أَهْلُ التَّوْبَرِ - ہادیہ نشین \*\* - قرآن حکیم میں أَوْبَارٌ - ( ۱۱/۸ ) آیا ہے - ( نیز دیکھئے عنوان ص - و - ف ) -

## و ب ق

وَبَقِيَ - يَبْقَى - وَبَقَا وَوَبُتَا وَوَبُتَا - ہلاک ہونا - التَّوْبِقُ - ہلاکت گہ - تَوْبِقٌ روک اور آڑ ک-و بھی کہتے ہیں ، اور قید خانہ کو بھی - أَوْبَقَهُ اس نے اسے روک دیا - قید کر دیا - نیز ہلاک کر دیا \*\*\* - ابن فارس نے کہا ہے کہ التَّوْبِقُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے - اور وَبَقِيَ کے معنی ہیں ہلاک ہو جانا - سورة كهف میں ہے - وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمُ تَوْبِقًا ( ۱۸/۵۸ ) - اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں - یعنی ان کے درمیان آڑ یا روک بنا دی یا ان کے باہمی تعلقات کو ان کے لئے وجہ ہلاکت بنا دیا - سورة شوریٰ میں ہے - أَوْ يَتُوبَ قَتْلُهُنَّ ( ۲۴/۲۴ ) - یا انہیں تباہ و برباد کر دے - چنانچہ التَّوْبِقَاتُ ہلاک کرنے والے گناہوں کو کہتے ہیں \*\*\* -

## و ب ل

التَّوْبَلُ - التَّوَابِلُ - موسلا دھار بارش \*\* - ( ۲۴/۲۴ ) - التَّوْبِلُ - شدید \*\* - نَاخَذَ نَاهُ أَخَذَ أَوْ بَيَّنَّا ( ۲۴/۲۴ ) - خرب و بیل - سخت مار - وَبِلٌ دراصل دھوبی کی اس موگری کو کہتے ہیں جس سے وہ کپڑوں کو کوٹتا ہے \*\* - اسی

\* تاج و محیط و اقرب الموارد - \*\* تاج - \*\*\* تاج و محیط و راجب -

سے اَلْوَبَالُ\*۔ شدت، سختی، ناپسندیدہ، فساد، نیز بمعنی مصیبت اور ناموافق و ناسازگار آتا ہے\*۔ وَبَالٌ آمُرُهُ (۳۹)۔ اپنے کام کا برا نتیجہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں شدت (سختی) ہائی جاتی ہے۔ نیز اکٹھا ہونا۔

## و ت د

اَلْوَتْدُ\*۔ کھونٹا اسکی جمع اَوْتَادُ\* ہے۔ وَتَدُ الْوَتِدُ يَتَدُهُ\*۔ وَتَدًا\*۔ اس نے زمین یا دیوار میں میخ یا کھونٹی گاڑ دی۔ اَلْمِيْتَدُ\*۔ وہ ہتھوڑی جس سے میخ یا کھونٹی ٹھونکی جائے۔ اَلْوَاتِدُ\*۔ ثابت (محکم گڑی ہوئی) چیز۔ وَتَدَ فُلَانٌ رَجُلًا\* فی الْاَرْضِ\*۔ فلاں نے زمین میں اپنا قدم جما لیا۔ اسی سے اَوْتَادُ\* اَلْاَرْضِ\* پہاڑوں کو کہتے ہیں اور اَوْتَادُ\* مِّنَ الْبِلَادِ\* شہروں کے رؤساء اور امراء کو\*\*۔

قرآن کریم نے فرعون کو ذُو الْاَوْتَادِ (۳۸) کہا ہے۔ اس کے معنی ہیں بڑی محکم قوتوں کا مالک۔ جسکے کھونٹے دور دور تک گڑے ہوئے تھے۔ اور پہاڑوں کو بھی اَوْتَادًا (۴۸) کہا ہے کیونکہ وہ بھی کھونٹوں کی طرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔

(اہل تصوف کے ہاں جو ابدال اور اوتاد کی اصطلاحات ہیں وہ قرآنی نہیں)۔

## و ت ر

اَلْوَتْرُ\*۔ اَلْوَتْرُ\*۔ فرد، یعنی اکیلی چیز۔ (شَفْعُ\* کے خلاف)\*\*۔ قرآن کریم میں وَالشَّفْعُ وَالْوَتْرُ (۸۱) آیا ہے۔ عدد طاق (Odd)۔ برخلاف عدد جفت۔ وَتْرَهُ مَالَهُ وَحَقَّقَهُ\*۔ اس نے اس کا مال اور حق کم کر دیا۔ قرآن کریم میں ھ وَلَن يَتَرَ كُتْمٌ اَعْمَالَكُمْ\* (۸۸)۔ وہ تمہارے اعمال (کے ثمرات) کو کم نہیں کریگا۔ وَتَرَ\* کے معنی بدلہ لینا اور اس میں زیادتی کرنا بھی ہیں۔ نیز جوڑے کو الگ الگ کر دینا\*\*۔ اَلْوَتْرُ\*۔ قتل کے سبب سے عداوت اور دشمنی\*\*\*۔

تَتَرَى\* (اصل میں وَتَرَى\* تھا۔ واو، تاء سے بدل گئی) چیزوں کا اس طرح بے دریغ آنا کہ ان کے درمیان کچھ وقفہ عو۔ اگر وہ مسلسل طور پر آتی رہیں تو انہیں مُتَوَاتِرٌ\* نہیں کہہینگے بلکہ مُتَتَابِعٌ\* یا مُتَدَارِكٌ\* یا مُتَوَاصِلٌ\* کہہینگے۔ جَاعَتِ الْغَيْلُ\* تَتَرَى\* کے معنی عورتیں

گھوڑے یکے بعد دیگرے کچھ کچھ وقفہ کے بعد آئے۔ مَوَاتِرَةُ العَقُوم۔ ایک دن روزہ رکھنا اور پھر ایک یا دو دن کا ناغہ کر دینا۔ مَوَاتِرَةُ میں وقفہ لازمی ہے۔ اگر وقفہ نہ ہو تو اسے مَدَارَكَةٌ وَمَوَاصِلَةٌ کہیں گے\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا (۲۳)۔ پھر ہم نے اپنے رسولوں کو وقفوں کے ساتھ متواتر بھیجا۔ التَّوْتِيرَةُ۔ کسی کام پر مداومت کرنا\*\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے جو مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں عدم مشابہت کی بنا پر قیاس کام نہیں کرتا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔

## و ت ن

التَّوَاتِينُ۔ اپنی جگہ مقیم، ثابت اور ہمیشہ رہنے والی چیز۔ التَّمَاءُ التَّوَاتِينُ۔ ہمیشہ بہنے والا پانی جو ختم نہ ہو۔ التَّوْتِيْنُ۔ رگ جان، جس کے کٹ جانے سے انسان مرجاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ التَّوْتِيْنَ (۱۶)۔ پھر ہم اسکی رگ جان کاٹ دیتے۔

## و ث ق

وَرِثَاقٌ۔ یا وَثَاقٌ۔ اس رسی، بیڑی یا بندھن وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ وَثَاقٌ باقدھنے کو اور وَثَاقٌ رستی کو کہتے ہیں۔ اَوْثَقَهُ۔ اسے رستی سے کس کر باقدھ دیا۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا يُوْثِقُ وَثَاقُهُ اَحَدًا (۹۶) نیز كَيْمٌ۔ وَثِقَ الشَّقِيْءُ کے معنی ہیں وہ چیز محکم اور مضبوط ہو گئی۔ قرآن کریم میں الْعُرْوَةُ التَّوْتِيْلِيْ كِي تَفْسِيْرُ لَا اَنْفِيْصَامَ لَهَا نے کردی (۲۶)۔ یعنی جو ٹوٹ نہ سکے۔ مَيْثَاقٌ اور مَوْتِيقٌ کے معنی ہیں پکا وعدہ۔ مستحکم عہد۔ وَثِيْقٌ یہ کے معنی ہیں کسی پر اعتماد کرنا۔ اسے امانت دار سمجھنا۔ اِسْتَوْثِقَ مِيْثَقًا۔ اس سے قابل اعتماد عہد حاصل کر لیا۔ كَسَبَلًا مَوْتِيقًا۔ اتنا وافر چارہ جس پر اعتماد کر لیا جائے کہ یہ سال بھر کے لئے کافی ہو جائیگا۔ رَاغِبٌ نے کہا ہے کہ اَلْمَيْثَاقُ اس عہد و پیمان کو کہتے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد ہو\*\*\*۔

## و ث ن

وَتَنّٰ بِاَلْمَكَانِ - وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا - اَلتَّوَانِ - مقیم اور جما ہوا - جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وَتَنّٰ بَتّٰ کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا \*۔ (جمع اسکی اَوْتَانٌ ہے (۲۱)۔ تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وَتَنّٰ چھوٹے صَنَنَم (بت) کو کہتے ہیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور، یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَتَنّٰ ہے۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں بدترین قسم کا وَتَنّٰ ہے جسکی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے۔

قرآن کریم تمام نوع انسان کے لئے مستقل ضابطہ حیات ہے جسے جب عملی شکل دی جائے تو ایک متحرک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ ”متحرک“ کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غور متبذل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتا ہوا زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے، تو یہ ”وثنیت“ ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ بدقسمتی سے ہم پتھر کے بتوں کو تو دیکھتے اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں لیکن اپنے قلب و دماغ میں رکھے ہوئے بتوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتے!

## و ج ب

وَجَبَّ السَّيْرُ تَوَجَّيْبًا - اونٹ نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور جم کر بیٹھ گیا \*۔ اَلتَّوَجَّيْبُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو فراہی کی وجہ سے اٹھ نہ سکے۔ اس اعتبار سے وَجَبَّ السَّيْرُ کے معنی ہیں دیوار گر پڑی۔ وَجَبَّ السَّيْرُ وَجَّوْبًا - آدمی مر گیا۔ (یعنی ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا)۔ اَلتَّوَجَّيْبَةُ - کسی چیز کا آواز کے ساتھ گرنے والا۔ اَلتَّوَجَّيْبُ موت کو کہتے ہیں \*۔ قرآن کریم میں ذبح کر دہ اونٹوں کے متعلق ہے فَاِذَا وَجَبَتْ جَسَدُهَا (۲۲)۔ جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں، یعنی ٹھنڈے ہو جائیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ گر پڑنا اور واقع ہو جانا اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔ وَجَبَّ السَّيْرُ - کسی چیز کا پختہ طور پر جمنے اور

لازم اور ضروری ہونا۔ اَوْجَبَتْہ۔ وَجَبَتْہ۔ اس نے اسے جمایا اور لازم کر دیا۔ اِسْتَبَوُ جَبَتْہ۔ وہ اسکا مستحق ہو گیا \*۔ نیز اس کے معنی ہیں، اس نے اُسے واجب سمجھا \*۔ وَاجِبٌ لِّفُلَانٍ حَقُّہ۔ اس نے اس کے حق کی رعایت کی \*\*۔

## و ج د

وَجَدَ وَجُودًا کے بنیادی معنی کسی چیز کو پا لینا ہیں۔ کبھی کسی چیز کو جاننے اور اس کا علم حاصل کر لینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ فعل، مصدر و ابواب یا صلوات کے فرق کے ساتھ اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً مَوْجِدَةٌ وَوَجَدَ اَنَا غَصَصَ کے لئے آتا ہے۔ وَجَدَ عَلَیْہ۔ وہ اس پر ناراض ہوا۔ نیز وَجَدَ بِتَجِدُ کے معنی مالدار اور فارغ البال ہونا بھی ہیں۔ چنانچہ اَلْوَجْدُ۔ اَلْوَجْدُ اور اَلْوَجْدُ۔ مالداری۔ فراخی۔ اور وسعت کو کہتے ہیں۔ وَجَدَ بِہ۔ وَجَدَ ا۔ اس سے محبت کی۔ اِنْقَہ لَتَجِدَ بِفُلَانَةٍ وَجَدَ ا شَدَّ بِہ۔ وہ فلاں عورت کی محبت کرتا اور اس کی جدائی میں غمگین رہتا ہے۔ وَجَدَ بِہ۔ اس نے اسے چاہا اور غمگین ہوا۔ اَلْوَجْدُ۔ ہموار زمین کو کہتے ہیں \*\*\*۔ اَلْوَجْدُ۔ غنی۔ تونگر۔ دولت مند \*\*\*۔ وَجَدَ۔ استطاعت، مقدور (۱۵)۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَتَجِدَنَّہُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ (۲۴) تو انہیں سب سے زیادہ حریص پائیکا۔ یہ لفظ زیادہ تر انہیں معافی میں استعمال ہوا ہے۔ وَجُودٌ یا مَوْجُودٌ وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نہیں آئے۔ یہ متکلمین کی اصطلاحات ہیں۔

## و ج س

اَلْوَجْسُ۔ خفی آواز یا دل کی گھبراہٹ کو کہتے ہیں۔ اس سے اَلْوَجَسُ۔ دل میں گزرنے والی بات کو کہتے ہیں۔ اَلْوَجَسُ۔ دل ہی دل میں کسی بات کو محسوس کرنا اور اسے پوشیدہ رکھنا۔ یونہی ذرا سا احساس ہونا یا خیال گذرنا جس میں خوف کا بھی شائبہ ہو \*۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَ اَوَّجَسَ مِنْہُمْ خِیْفَتَہ (۱۱۱)۔ اس نے ان کی طرف سے دل ہی دل میں ذرا خوف محسوس کیا۔

\* تاج و راغب۔ \*\* محیط۔ \*\*\* تاج و محیط۔



## و ج ف

وَجَفَّتِ الشَّيْئَةُ - چیز کا مضطرب ہونا - قَلْبٌ وَأَجِيفٌ - مضطرب (تیز دھڑکنے والا) دل - قرآن کریم میں ہے - قَلْثُوبٌ يَسْوَ مُشِيدٌ وَأَجِيفَةٌ (۹۱) - اس دن دل مضطرب و پریشان ہونگے۔

وَجَفَّتِ النَّفْسُ - گھوڑے کا تیز دوڑنا - أَوْ جَفَّتْهُ - میں نے اسے تیز دوڑایا - سورة حشر میں ہے - فَمَتَا أَوْ جَفَّتُمْ عَلَيْهِ مِينَ خَمِيلٍ وَ لَارٍ كَابٍ (۹۱) - تم نے اس پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے - لشکر کشی نہیں کی۔

## و ج ل

الْوَجَلُ - گھبراہٹ اور خوف - وَ جِلٌ - يَتَوَجَّلُ - گھبرانا - ڈرنا - ڈرنے اور گھبرانے والے کو وَ جِلٌ کہتے ہیں ، اس کی جمع وَ جِلُّونَ ہے - (۱۹۴) - الْوَجِيلُ - الْوَجِلُ - گڑھا جس میں پانی اکٹھا ہو جائے - الْوَجُولُ - بوڑھے لوگ - راغب نے لکھا ہے کہ الْوَجَلُ - دل ہی دل میں خوف کے احساس کرنے کو کہتے ہیں - \*\*\*۔

قرآن کریم میں مومنین کی صفت یہ لکھی ہے کہ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَ جِلَتْ قُلُوبُهُمْ (۹۴) - جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے - جیسا کہ دوسرے مقامات میں بتایا گیا ہے ، خدا کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کے قوانین کے خلاف رویہ اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے - اس تباہی اور بربادی کے احساس سے انسان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ ہوتی ہے - اسی کو خدا کا خوف کہتے ہیں - یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج و ہواقب کا احساس -

## و ج ل

وَجَاهُ الشَّيْئَةِ - کسی چیز کے سامنے یا بالمقابل - \*\*\* - الْوَجْهُ - کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے سامنے آنے کے ہیں - اس جہت سے الْوَجْهُ انسان کے اس حصہ جسم کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے - اور

\*تاج و راغب - \*\*تاج - \*\*\*راغب - \*\*\*\*محیط -

چونکہ انسان کا چہرہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اسی لئے اسے وَجْہٌ کہتے ہیں \*۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ خود نفس سے یا ذات کے لئے بھی بولا جانے لگا \*۔ مَنَ اسْلَمَ وَجْہَہُ اللہ (۱۱۴) میں وَجْہَہُ کے معنی ہوا اپنا آپ ہیں نہ کہ اپنا چہرہ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں لَیْسَ سُوْءٌ وَّجْہُکُمْ (۱) کے معنی بھی یہ ہیں کہ وہ تمہارا برا حال کر دیں۔ یا یہ کہ وہ تمہارے سرداروں کا برا حال کر دیں۔ وَجْہَہُ التَّقْوَمِ۔ قوم کے معزز اور شریف فرد یا سردار کو کہتے ہیں۔

وَجْہَہُ النَّہَارِ۔ دن کا ابتدائی حصہ۔ اَلْوَجْہُ مِنَ الدَّہْرِ۔ زمانہ کا ابتدائی حصہ۔ یعنی زمانہ کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے \*۔ اَلْوَجْہُ۔ جاہ۔ مرتبہ اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْوَجْہِیۃُ۔ صاحب جاہ۔ صاحبِ وجاہت۔ اَلْوَجْہِیۃُ۔ اس کھڑے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے ایک جیسا ہو۔ حضرت موسیٰ کے متعلق ہے۔ وَكَانَ عِندَ اللّٰهِ وَجْہًا (۳۳)۔ اس کے معنی صاحبِ عزت کے ہیں۔

وَجْہٌ کے معنی ہوتے ہیں مقصد (Purpose)۔ مطلوب (Object)۔ راستہ، جو مقصد تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا جائے (Course)۔ سمت (Direction) جس طرف کوئی جا رہا ہو۔ وہ منزل مقصود جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔ چنانچہ وَجْہَہُ الطَّرِیْقِ۔ اس منزل کو کہتے ہیں جس کی طرف راستہ لے جا رہا ہو \*۔ اور وَجْہَہُ اَلْاَمْرِ کسی بات کے مقصد اور اس کے صحیح رخ کو کہتے ہیں۔ (جہتہ اور وَجْہَہُ کے بھی یہی معنی ہوتے ہیں۔ سمت۔ مقصد۔ وجہ۔ سبب)۔ مَتَّوْجْہَہُ۔ وہ مقام جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔

قرآن کریم نے انسانی اعمال کی غایت یہ بتائی ہے۔ اِبْتِغَاءَ وَجْہِ اللہ (۲۴۴)۔ عام طور پر اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کی رضا جوئی یا خوشنودی کے لئے۔ اس سے ذہن انسانوں کے خوشی یا ناراضگی کے جذبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے بلند و بالا ہے۔ وَجْہِ اللہ کا صحیح مفہوم ہے وہ مقصود جو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ وہ منزل جسکی طرف قوانین خداوندی لے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لئے ہونا چاہئے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس کا ہر کام اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہونا چاہئے جو قوانین خداوندی نے اس کے

اٹھے مقرر کر دی ہے۔ سورۃ روم میں ہے وَمَا أُنْتِظَمٌ مِّنْ زَكَاةٍ  
تَرِيْدُونَ وَجَنَّةٍ اَللّٰہِ (۲۶)۔ جو کچھ تم نوعِ انسانی کی نشوونما کے  
اٹھے کرتے ہو، اس مقصد کے پیش نظر کہ تم اُس منزل تک پہنچ جاؤ جو  
قوانین خداوندی نے مقرر کر رکھی ہے۔ یعنی اس سے خود تمہاری اپنی ذات  
کی نشوونما اور صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔ اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی  
واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ "کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ"  
(۲۸/۲۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تغیر پذیر  
ہوتا ہے (ہَلَاکَت کے یہی معنی ہیں) لیکن استمرار اور دوام ان اعمال کو  
حاصل ہوتا ہے جو اس منزل کے حصول کے لئے سرزد ہوں جو خدا نے مقرر کر  
رکھی ہے۔ یا یہ کہ دنیا کا ہر راستہ تغیر پذیر ہوتا ہے، بجز اس راہ کے جو خدا  
کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جاتی ہے\*۔ یہی مفہوم سورۃ رحمٰن کی ان آیات  
کا ہے۔ "کُلُّ مَنۡ عَلٰیہَا فَتٰنٍ وَیَبْتَلٰی وَجْہَهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ  
وَ الْاِکْرَامِ" (۳۶/۳۶)۔ دنیا کا ہر نظام اور ہر راستہ تغیر پذیر ہے بجز  
اس راستے کے جو خدا نے ذوالجلال والاکرام کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے  
جائے\*۔ اسی کو اِیْتِغَاةً وَجْہَهُ رَبِّہِ الْاَعْلٰی (۳۲/۳۲) کہا گیا ہے۔  
دنیا میں ہر شخص کا اپنا اپنا مقصود و مطلوب اور ہر قوم کی اپنی اپنی منزل  
ہے۔ وَلٰی کُلٌّ وَّجْہَتٌۭ هُوَ مُوَلِّیْہَا (۲۳۸/۲۳۸)۔ جماعت مومنین وہ ہے کہ  
وہ زندگی کے جس گوشے اور کاروبار حیات کے جس شعبے میں بھی ہو اس کے  
سامنے ہمیشہ وہ منزل مقصود رہتی ہے جو قوانین خداوندی نے متعین کر دی  
ہے۔ فَمَا یَسْمَا تُوَلُّوْا فْتَمَّ وَجْہَهُ اَللّٰہِ (۱۱۵/۱۱۵)۔

## و ح د

اَلْوٰحِدُ۔ گنتی میں پہلا عدد۔ ایک۔ وَاَحِدٌ اور اَحَدٌ دونوں کے معنی  
"ایک" ہیں لیکن ان کے استعمال کا فرق اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا  
کہ جب کہا جاتا ہے کہ مَا اَتَانِیْ مِیْنُہُمْ اَحَدٌ تو اس کے معنی ہونگے  
میرے پاس ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ لیکن جب کہا جائے گا کہ  
جَاءَ نِیْ مِیْنُہُمْ وَاَحِدٌ تو اس کے معنی ہونگے ان میں سے میرے پاس  
صرف ایک شخص آیا (دو نہیں آئے)\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ هُوَ وَاَحِدٌ  
قَبِیْلَتِیْہِ کے معنی ہیں وہ اپنے قبیلہ میں ہکتا ہے۔

\* وَجْہَهُ رَبِّکَ یَا وَجْہَتِہُ کے معنی خود ذاتِ خداوندی بھی ہیں [دیکھئے  
عنوانات (ب۔ ق۔ ی) اور (ف۔ ن۔ ی)] لیکن راغب نے ان معانی کو ترجیح  
دی ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں۔ \*\* قاج۔

قرآن کریم میں اللہ کے لئے وَاحِدٌ بھی آیا ہے (۱۱۶) اور أَحَدٌ بھی (۱۱۷)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ أَحَدٌ وہ ہے جسکی ذات میں کوئی اور شریک نہ ہو اور وَاحِدٌ ایسے کہتے ہیں جسکی صفات میں کوئی اور شریک نہ ہو\*۔ چنانچہ أَحَدٌ کے معنی ہونگے وہ ذات جو بے مثل و بے نظیر ہو۔ جو یگانہ ہو۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت (Basic characteristic) یہ ہے کہ وہ یگانہ (Unique) ہو۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱۱۸) میں ذات خداوندی کی اس بنیادی خصوصیت، یعنی اسکی یگانگت (Uniqueness) کا ذکر ہے۔

أَلَا حُدَّانُ ان تیروں کو کہتے ہیں جو یکتا اور بے نظیر ہوں\*\*۔ اَلْمُتَّحِدَاتُ۔ اس ٹیلے کو کہتے ہیں جو دوسرے ٹیلوں سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہو\*۔ اِتَّحَدَ الشَّقِیْنَانِ۔ دونوں چیزیں خلط ملط ہو کر ایک ہو گئیں۔ مجازاً یہ لفظ متفق ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے\*۔

قرآنی تعلیم کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے، یعنی اس حقیقت کے اعتراف اور یقین پر کہ کائنات میں صرف ایک قوت ہے جس کا اقتدار و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی اور قوت کا آئین و قانون نہیں چلتا۔ لہذا انسانوں کی دنیا میں بھی اُسی کا قانون و آئین چلنا چاہئے۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہِ أَحَدٌ۔ (۱۱۸) وہ اپنے حکم اور قانون میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اسلئے مومن وہ ہے جو لَا یُشْرِکُ بِعِبَادَةِ رَبِّہِ أَحَدًا (۱۱۹)۔ جو اپنے رب کی معکومیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ جو خدا کے قوانین کے علاوہ (جنہیں اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے) اور کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکتا۔

(نیز دیکھئے عنوان ا۔ ح۔ د)۔

## و ح ش

اَلْوَحْشُ\*۔ جنگلی جانور جو انسانوں سے مانوس نہ ہو۔ جمع وَحْشٌ\* ہے۔ ایک کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ (مَسْکَانٌ وَحْشٌ) ہے آباد ویران جگہ سے منسوب چیز کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ مَسْکَانٌ وَحْشٌ\*۔ خالی جگہ۔ بَلَدٌ وَحْشٌ\*۔ وہ علاقہ جو ویران ہو اور وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ بَاتَ وَحْشًا\*۔ اس نے بھوکے رات گزار دی۔ وہ خالی پیٹ رہا\*\*۔ اَلْوَحْشُ\*۔ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے\*\*\*۔ یعنی نامانوس، وحشی، جنگلی۔ ذَالِکَ مِیْنِ وَحْشِ النَّاسِ\*۔ یہ آدمی رذیل اور آدم بیزار لوگوں میں سے ہے\*۔

\*محیط۔ \*\*تاچ۔ \*\*\*راغب۔

قرآن کریم میں ہے وَلَاذَّالْوَحْشُ حَشِيرَتُ (۱۱۱)۔ اس میں  
وَحْشُ کے معنی نامسانوں جانور بھی ہو سکتے ہیں اور وحشی اور جنگلی  
لوگ بھی۔

## و ح ی

الْوَحْشُ\*۔ اشارہ، جس میں تیزی اور سرعت ہو۔ وَحْشَتُ لَكَ بِمُخْبَرٍ  
كَذَا۔ میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارہ کر دیا۔ یا چپکے سے مطاع کر دیا\*۔  
چنانچہ سورہ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا  
کہ وہ لوگوں سے بات نہ کریں۔ فَاتَّوَحَّشِ الْيَتِيمِ (۱۱۱) لہذا اس نے لوگوں  
کو اشارہ سے کہا۔

(۲) راغب نے کہا ہے (اور صاحب تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے)  
کہ الْوَحْشُ کے معنی تیز اشارہ کے ہیں۔ اسی لئے شَيْءٌ وَحِيٌّ کے معنی  
ہیں وہ چیز جو جلدی سے آجائے، اور آمِرٌ وَحِيٌّ۔ تیز رفتار معاملہ۔ الْوَحْشُ  
جلدی۔ تیزی کرنا۔ اَوْحَى الْعَمَلُ۔ اس نے کام میں جلدی کی\*۔

(۳) الْوَحْشُ کے معنی کتابت (یعنی لکھنا) بھی ہیں۔ وَحْشَتُ  
الْكِتَابِ۔ میں نے کتاب کو لکھا۔ واح۔ لکھنے والا (کاتب)۔ الْوَحْشُ  
لکھی ہوئی چیز یا نامہ۔ چنانچہ جوہری نے کہا ہے کہ الْوَحْشُ کے معنی  
الْكِتَابُ ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔ اور  
ابن فارس اور راغب نے بھی۔ سورہ مائدہ میں جو ہے وَآذُ اَوْحَشَتْ اِلَى  
النَّحْوَارِیْنِ (۱۱۱)۔ تو اس میں وحی کے معنی ”لکھے ہوئے حکم“ کے  
ہیں\*۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو (بقول راغب) حضرت عیسیٰؑ کی وساطت  
سے (انجیل میں لکھی ہوئی) بھیجی گئی تھی۔

(۴) اَوْحَى کے معنی حکم کرنا۔ امر کرنا۔ چنانچہ صاحب تاج نے  
کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت (۱۱۱) میں حواریوں کی طرف وحی کرنے کے معنی  
یہ ہیں کہ خدا نے انہیں حکم دیا تھا\*۔ اور یہ وحی حضرت عیسیٰؑ کی  
وحاطت سے حواریوں کو ملی تھی\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے  
تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا عام ہو جائے، وَحَى کہلاتی ہے  
خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو۔ معنی طور پر یا ویسے ہی۔

سورہ حم سجده میں ہے وَآوَحَّى فِیْ کُلِّ سَمَاعٍ اَمْرَهَا (۲۱)  
”اس نے ہر سماء میں اس کا امر وحی کر دیا“ اس میں امر وحی (یا وحی)

امر) کے معنی مامور کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ قانون خداوندی جسکی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ اسی کو سورہ النور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ **كُلٌّ قَدْ عَيَّامٌ صَلَاتُهُ وَتَسْبِيحُهُ** (۲۴/۲۱)۔ کائنات کی ہر شے جانتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور وہ مقصد کیا ہے جس کے حصول کے لئے انہیں سرگرم عمل رہنا ہے۔ یہی وہ وحی ہے جو ان میں جاری و جاری ہے۔ یعنی امر خداوندی۔ خدا کا قانون۔ اس کے متعلق سورہ زلزال میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا رَّبُّكَ أَوْحَىٰ إِلَيْهَا** (۹۹/۱)۔ یعنی اس مقصد کے لئے خدا نے زمین کی طرف وحی کی ہے۔ زمین کو اسکا حکم دے رکھا ہے۔ زمین کے متعلق خدا کا قانون یہ ہے۔ اسی طرح سورہ النحل میں ہے **وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ** (۱۶/۱۸)۔ شہد کی مکھی کی طرف خدا نے وحی کر رکھی ہے۔ یعنی اس کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرے۔

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شے میں از خود ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسی کو قانون فطرت کہتے ہیں۔ یا، جانداروں کے لئے جبلت (Instinct)۔ یہ قانون ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے۔

انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے اس لئے اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسکا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے اس پر وہی قانون فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے۔ کھانا، پینا۔ سونا، جاگنا۔ افزائش نسل۔ بیماری، موت۔ سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں۔

لیکن انسان کی زندگی طبیعی زندگی (Physical life) ہی نہیں بلکہ اسکی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ہے۔ نیز اس کی ذات (Personality) بھی ہے۔ اس کے لئے بھی ایسے قانون کی ضرورت ہے، اور وہ قانون ایسا ہونا چاہئے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ قانون فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو۔ اس قانون کا نام بھی وحی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ :-

(۱) یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وہی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ اُس انسان کو نبی اور رسول کہتے ہیں۔ یہ وہی انہیں حضرات سے مخصوص ہے۔

(۲) کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے۔ یہ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار و ارادہ استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لئے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلے۔ اس لئے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہ راست دیے دی جاتی ہے، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انہیں بھر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

(۳) انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے، لیکن یہ اس کے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کرے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نکل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے، لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر معصری کی ڈلی کا ما پیدا کر لے۔

خدا کا قانون جو حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے۔ ”الْوَحْی“ کہلاتا ہے۔ اس کے خدا سے پائے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی، اور اس وحی کو انبیاء کرامؑ اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انہیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے نازل شدہ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر اس تک پہنچتی ہے۔ بالفاظ دیگر، اس میں انسان کی داخلیت (Subjectivity) کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں بکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے۔ منزل من اللہ کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کر سکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں

وہ صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں۔ یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے۔ یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر ہروس حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی کو نزول وحی کہتے ہیں۔ **فَاِنَّكَ** **نَزَّلْنَاهُ** **عَلٰی قَلْبِیْكَ** (۲۴)۔ اسے جبریل نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے۔ چونکہ وحی صرف حضرات انبیاء کرام<sup>۲</sup> کو ملتی ہے اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور سادہت کیسی ہوتی ہے، وہ کس طرح ملتی ہے۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے۔ (البتہ ہم علم و بصیرت۔ دلائل و براہین نیز وحی کے نتائج سے (Pragmatically) اس کی صداقت کو علی وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں)۔ انبیاء کو بہ وحی کبھی ”اشارہ“ سربہ“ کے ذریعے ملتی تھی، کبھی ”من وراء حجاب“۔ لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ **وَمَا كَانَ لِيُبَشِّرَ اَنْ يُّسَكِّتَ بِهِ اللّٰهُ لَآلَا وَحٰیًا اَوْ مِّنْ وَرَآیْ حِجَابٍ اَوْ بُرْسِلٍ رَّسُوْلًا فَاِیُّوْحٰیۤ اِیَّ ذٰلِیْہٖ مَا يَشَآءُ** (۲۴)۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے۔ بشر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہ<sup>۳</sup> کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰ<sup>۴</sup> کی صورت میں ہوا)۔ باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے، اسکے باہر اور کہیں نہیں۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (بُنَزَّلَ عَلَیْکُمْ<sup>۵</sup> ۲۵ و ۲۶)۔ یعنی رسول اللہ<sup>۳</sup> کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے۔ چونکہ رسول اللہ<sup>۳</sup> کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا اس لئے اب کسی انسان کو براہ راست وحی نہیں مل سکتی۔ اب انسان کے پاس علم کے دو ہی سرچشمے رہ گئے۔ ایک اس کی اپنی عقل اور دوسری خدا کی وحی جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ اس کے علاوہ کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں ملتا۔ الہام۔ کشف وغیرہ کے تصورات کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ (الہام کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ل۔ ۵۔ م)۔ قرآن کریم اور عقل کے ملنے سے انسانی علم مکمل ہو جاتا ہے۔ نیز یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہ<sup>۳</sup> کو جو وحی ملی تھی اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کریم سے باہر (روایات کے اندر) ہے۔



قرآن کریم میں وحی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں۔ اسکی رو سے صرف قرآن کریم وحی کے ذریعے ملا ہے (۱۶۹۵)۔ یہ تصور یہودیوں کے ہاں رائج تھا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ہاں آگیا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاحات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

(اس مقام پر وحی کے متعلق انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر آپ مزید تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں وحی کا باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے)۔

أَوْحَى إِلَيْهِ۔ کے معنی رسول بنا کر بھیجنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ أَوْحَى إِلَيْهِ جَلَّ کے معنی ہیں اس نے اپنے معتمد پیامی کو اپنے معتمد غلام کے پاس ایلیچی بنا کر بھیجا\*۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ وحی کو وحی اس لئے کہتے ہیں کہ فرشتہ اسے پوشیدہ طور پر مخلوق میں سے اسی شخص کو پہنچاتا ہے جس کی طرف وہ بھیجی جاتی ہے۔ اِخْتَفَاء کے اصلی معنی ایک کا دوسرے کے ساتھ علیحدگی میں خفیہ باتیں کرنا ہیں۔ ابو اسحق نے بھی کہا ہے کہ وحی کے اصلی معنی اِعْلَامٌ رَاقٍ خَفَاءٌ ہیں\*۔ اسی لئے قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے مخالفین کے متعلق ہے يُوْحِي بِعُضُؤِهِمْ اِلَى بَعْضٍ (۱۶۹۶)۔ اس کے معنی خفیہ سازشوں کے ہیں (نیز ۱۶۹۷)۔ اِخْتَفَاء کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو دل میں ڈال دینا۔ چنانچہ أَوْحَتْ نَفْسُهُ کے معنی ہیں اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس کے دل میں خدشہ پیدا ہو گیا۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ أَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اُمُّ مُوسَىٰ (۱۶۹۸ و ۱۶۹۹)۔ ہم نے ام موسیٰ کی طرف وحی کی ”کہ اس بچے کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا“۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وَحْيٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے، یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے حکم بھیجنا۔ اسی طرح والدہ موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہونگے ان کی طرف کسی کی وساطت سے حکم بھیجنا یا باخبر کر دینا۔ جس انداز سے انبیاء کی طرف وحی ہوتی تھی وہ

انہی سے مخصوص تھی۔ محض اَوْحٰیٰنَا کے لفظ سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ غیر نبی کی طرف بھی (اسی قسم کی) وحی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ بساد رکھئے وحی، جسکے معنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی حاصل ہونے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہؐ کو مل گئی اور اب وہ قرآن کریم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد انسانوں کو ان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے کچھ اور نہیں ملا۔ نہ ملے گا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے، یا دانستہ لوگوں کو فریب دیتا ہے۔

چونکہ وحی میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے قرآن کریم نے اسے ایسا اَلْعِلْمُ کہا ہے جو انسانی خیالات اور خواہشات سے یکسر متمیز ہوتا ہے (۱۶۶)۔ اس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ رسول کی وحی میں اس کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ - اِنْ هُوَ اِلَّا وَّحْيٌۢ بِشَوْءٍۭ حٰی - عَلَمٌۭ شَدِيدٌۭ الْفُتُوٰی (۵۳)۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ یہ وہ وحی ہے جو اسکی طرف بھیجی گئی ہے۔ بڑی قوتوں والے (خدا) نے اسے اس کا علم دیا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نبی کے علاوہ اور کسی کو یہ علم نہیں مل سکتا۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَعْلَمُ مِّنَ اللّٰهِ مَالًا تَعْلَمُوْنَ (۶۳)۔ میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ لہذا جو حقائق وحی کی رو سے ملتے ہیں عقل انسانی انہیں دریافت نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی کو وحی کی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔ عقل کے لئے قابل اعتماد راستہ وہی ہے جو وحی نے متعین کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء کرامؑ کو وحی بالفاظ ملتی تھی۔ یعنی وحی کے الفاظ بھی خدا کی طرف سے ہوتے تھے۔ الْوَحْيُ کے معنی الطَّوْقُ یُقِی الْمُعْتَمِدُ قابل اعتماد راستہ بھی ہیں (لطائف اللغة)۔

## و د د

اَلْوَدَّ - اَلْوَدَادُ - دوستی - محبت - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے محبت کرنا اور اسکے ہو جانے کی تمنا کرنا ہیں۔ اَلْمَوَدَّةُ محبت - اَلْوَدَّ میخ کو کہتے ہیں اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ اَلْوَدَّ کا ایک لغت ہے (جس کا مادہ و - ت - د ہے) \*۔

قرآن کریم میں ہے - يٰوَدَّ اَحَدٌ هُمْ (۶۶)۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ تمنا ہے - سورہ مریم میں ہے سَيَجْعَلُ لَّهُمُ الْقَرْحَمٰنُ وَدَّ (۶۶)۔ خدائے رحمن ان کے لئے جاذبیت اور محبت پیدا کر دیگا۔ اَلْوَدُّ وَدُّ خدا کی صفت ہے - (۸۹)۔ یعنی بہت زیادہ محبت کرنے والا۔

سورہ روم میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق ہے کہ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً (۳۱)۔ تم میں باہمی مودت پیدا کر دی۔ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ تم ایک دوسرے کے لئے تقویت (Support) کا موجب بن گئے۔ سورہ ممتحنہ میں مَوَدَّةً بمقابلہ عداوت آیا ہے (۳۱)۔

سورہ شوریٰ میں ہے قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا التَّوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی (۲۳)۔ ”تم ان سے کہہ دو کہ میں تم سے اس (رسالت) کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میں صرف رشتہ داری کے تعلقات (مودت) چاہتا ہوں۔“ اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ق۔ ر۔ ب دیکھئے۔

## و د

وَدَّ سَوَاعٌ۔ يَتَغَوَّثُ۔ يَتَغَوَّقُ اور تَسْرُ قوم نوح کے بت تھے۔ (۹۱)۔ عرب ان بتوں کے ناموں سے بخوبی متعارف تھے۔ چنانچہ وَدَّ نام کے ایک بت کی پرستش دومة الجندل میں قبیلہ بنو کاب کے ہاں ہوتی تھی۔

## و د ع

وَدَّعَ۔ يَدَّعُ۔ کوئی بیز ڈھنگی۔ قرار ہا گئی۔ وَدَّعَ وَوَدَّعَ۔ چھوڑا۔ ترک کیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھوڑنے اور خالی کر دینے کے ہیں۔ تَوَادَّعَ الْفَرِيقَانِ۔ دونوں فریقوں نے ترک جنگ کا معاہدہ کر لیا۔ اس عہد و پیمان کو وَدَّيْعُ کہتے ہیں۔ ہر اَلْوَدَّيْعُ ہر عہد و پیمان کو کہنے لگے۔ اور اَلْوَدَّيْعَةُ۔ امالت کو جو کسی کے ہاں حفاظت کے لئے رکھی جائے۔ تَوَدَّيْعُ الثَّوْبِ۔ کپڑے کو محفوظ جگہ رکھ کر اسے گرد و خبار سے بچا لینا۔ تَوَدَّعَهُ۔ اسے محفوظ مقام میں رکھ دیا۔

اَلْوَدَّيْعُ۔ ہر سکون اور باوقار آدمی۔ الوَدَّعُ۔ قبر بنا مقبرہ، جہاں مردہ سکون اور آرام سے بڑا رہتا ہے۔ اَلْمُسْتَوْدَعُ۔ وہ مقام جہاں کسی چیز کو حفاظت رکھ دیا جائے۔ قرآن کریم میں ہر جائدار شیے کے مُسْتَقَرٌّ

اور مُسْتَوْدَعٌ کا ذکر ہے۔ (دیکھئے۔ ۶۹ : ۱۱)۔ جاندار اشیاء کے سلسلہ ارتقاء (Organic evolution) کا اصول یہ ہے کہ ہر شے کچھ وقت کے لئے ایک خاص مقام میں، ایک خاص حالت میں، ٹھہرتی ہے۔ پھر وہاں سے نشو و نما ہاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچتی ہے۔ اور اس طرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہوئی اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔ یہ راستے میں رکنے کے مقاصد اس کے مُسْتَقَرٌّ ہیں اور آخری منزل اسکی مُسْتَوْدَعٌ ہے۔ جسے ہم ”راستے میں رکنے کا مقام“ (مُسْتَقَرٌّ) کہتے ہیں اس میں بھی وہ شے جمود کی حالت میں نہیں ہوتی۔ وہاں بھی اسمیں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ تبدیلی ایسی غیر مرنی ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ تبدیلی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ہم اس کی اگلی منزل کہتے ہیں۔

وَدَّعَاہُ وَدَّعَاہُ۔ اور وَدَّعَاہُ تَوَدَّعَاہُ۔ کسی کو الوداع کہنا۔ کسی کو رخصت کرنا۔ (وَدَّعَاہُ کا ایک مصدر دَّعَاہُ ہے جسکے معنی فراخی، عیش اور راحت و آرام کے ہیں)۔ اَلْوَدَّاعُ کہنے والا، مسافر کو یہ دعا دیتا ہے کہ خدا اسے سفر کی مشقت سے محفوظ رکھے اور آرام کی حالت میں پہنچا دے۔ یہ تھی اس لفظ کی اصل۔ بعد میں یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے اور چھوڑنے کے لئے بولا جانے لگا۔ اور اس کے بعد صرف چھوڑ دینے (ترک کر دینے) کے معنی میں استعمال ہونے لگا \*\*\*۔ چنانچہ سورہ الضحٰی میں مَسَا وَدَّعَاہُكَ رَبِّیْكَ وَمَا قَتَلَنِی (۹۳)۔ اور سورہ احزاب میں دَّعَاہُ اِذَا هُمْ (۳۸) کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں۔

## و د ق

وَدَّقَ السَّيِّدُ۔ اس کے قریب ہوا۔ وَدَّقَ السَّيِّدُ۔ آسمان سے بارش برسی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے اور سانوس ہونے کے ہیں۔ آسمان سے آنے کی وجہ سے بارش کو الْوَدَّقُ کہا جاتا ہے۔ محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی قریب آنا اور مسائل ہونا ہیں \*\*۔ وَدَّقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں سادہ چوپایہ کا، سر کی خواہش کے وقت، رطوبت باہر نکالنا۔ جب سخت بارش ہو رہی ہو اور اس میں غبار سا نظر آئے تو اس غبار کو وَدَّقُ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب گرمی کی شدت سے ہوا میں لہریں می نظر آئیں تو انہیں وَدَّیْقَةُ کہتے ہیں \*\*\*۔

تاج میں ہے کہ ہر قسم کی بارش خواہ زوردار ہو یا ہلکی و دُقی\* کہلاتی ہے۔  
قرآن کریم میں اَلْوَدُوقُ\* بارش کے لئے آیا ہے جب وہ بادلوں میں  
سے نکلے (۲۳/۲۴)۔

## و د ی

وَدَّی الشَّقِیُّ\* وَدَّیَا - وہ چیز بہ بڑی\* - اَلْوَادِی\* - وہ جگہ جہاں  
ہانی بہتا ہو۔ یہ اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے بعد دو پہاڑوں کے درمیان  
کشادہ زمین کو وادی کہنے لگے\*\*۔ اس کی جمع اَوْدِیَّة\* آتی ہے (۲۱/۲۲)۔  
پھر استعارۃً طریقہ، مسلک اور اسلوب کو بھی وادی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ  
کہتے ہیں فُلَانٌ فِیْ وَادِی غَیْبِیْرٍ وَاْدِیْکَ - فلاں آدمی تمہارے طریقہ  
سے جداگانہ طریقہ رکھتا ہے\*\*۔ قرآن کریم میں شاعروں (جذبات پرست  
انسانوں) کے متعلق کہا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّا نَقُھِمُ فِیْ کُلِّ وَادِیْ یَھْمُحُوْنَ (۲۱/۲۲)۔  
کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کس طرح ایک ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے پیاس کی  
بیماری پری طرح ستا رہی ہو اور اس کی کہیں تسکین نہ ہوتی ہو مختلف خیالات  
کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ (مزید تفصیل بش - ع - رکے عنوان  
میں دیکھئے)۔

اَوْدَاہُ\* - اس نے اس کا خون بہا دیا۔ اسے ہلاک کر دیا\*\*۔ اَوْدِی  
الْقَرْجُلُ\* - آدمی ہلاک ہو گیا\*۔ یہیں سے اَلْدِیَّةُ\* اس مال کو کہتے ہیں  
جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے\*\*\*۔  
یعنی خون بہا (۲۲/۲۳)۔

## و ذ ر

اَلْوَذْرَةُ\* - گوشت کی چھوٹی بوٹی جس میں ہڈی نہ ہو۔ ذَرَّةُ\* - اسے  
چھوڑ دے۔ هُوَ یَذْرُہُ\* - وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس لفظ کا مصدر نیز ماضی  
اور اسم فاعل مستعمل نہیں ہوتے۔ صرف امر اور مضارع مستعمل ہوتے  
ہیں\*\*\*\*۔ (یہ لفظ تَرَکَ کا مرادف ہے)۔

سورۃ المزل میں ہے وَذَرْنِیْ وَالْمُکْتَذِرِیْنِ (۲۳/۲۴)۔ ہمارے  
قانون کو جھٹلانے والوں کو ہم ہر چھوڑ دے دو۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔  
ان کے متعلق تم فکر مت کرو۔ ہمارا قانون ان سے خود نہٹ لے گا۔  
وَهَذَرُوْا اَزْوَاجَکُمْ - اور اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ جائیں۔

\* تاج - \*\* راعب - \*\*\* محیط - \*\*\*\* تاج و محیط -

## ورث

وَرِثَ آبَاہُ ۔۔ وہ اپنے باپ کا وارث ہوا ۔ اَوْرَثَہُ ۔ اَبُوہُ ۔ اسکے باپ نے اسے وارث بنایا ۔ اَلْوَرِثُ ۔ اَلْاَرِثُ ۔ اَلتَّوْرَاثُ ۔ میراث ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وَرِثُ اور مِيرَاثُ تو مال میں ہوتی ہے اور اَرِثُ حسب میں ہوتی ہے ۔ اَلْوَرِثُ ۔ تازہ چیز ۔ اَلْوَارِثُ خدا کی صفت ہے \* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی کی ملکیت میں ہونا اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہونا ہیں ۔ اس اعتبار سے خدا کے لئے اَلْوَارِثُ کے معنی واضح ہیں ۔

راغب نے کہا ہے کہ وراثت حقیقی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے جس میں اس پر نہ تو کوئی ذمہ داری عائد ہو اور نہ ہی اس پر اس سے محاسبہ کیا جائے ۔ نیز ہر وہ چیز جو ہلا بخت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے لئے قَدَرِثُ وَرِثُ کَـذَآ کہتے ہیں ، اور کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دینے کے لئے اَوْرَثَ کہا جاتا ہے ۔ وراثت صرف سال ہی میں نہیں ہوتی ۔ وَرِثْتُ عَلِیْمًا مِّنْ فُلَانٍ بھی کہتے ہیں ۔ یعنی میں نے فُلَانِ آدمی سے علم کا استفادہ کیا \*\* ۔ حضرت زکریاؑ نے جب خدا سے دعا کی تھی کہ میرے ہاں بیٹا عطا کر دے تاکہ وہ پَرِثْنِیُّ و پَرِثُ مِّنْ آلِ یَعْقُوبَ (۱۶) ۔ تو وراثت سے ان کی مراد اس خاندان کے علم و فضل کی وراثت تھی ، نہ کہ نبوت کی ۔ کیونکہ نبوت کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی ۔ یعنی جس طرح بیٹا باپ کی جائداد کا وارث ہو جاتا ہے محض بیٹا ہونے کی جہت سے ، اسی طرح نبی کا بیٹا ، محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو سکتا تھا ۔ نبوت خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتی تھی ۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسے شخص کو بھی خدا نبوت کے لئے منتخب کر لیتا تھا جس کا باپ نبی تھا ۔ اسے یہ منصب باپ سے وراثت میں نہیں ملتا تھا ۔ خدا سے وہی طور پر ملتا تھا ۔

سورة بقرہ میں اَلْوَارِثُ (۱۳۳) ۔ متوفی کے ترکہ کے وارث کے لئے آیا ہے ۔ سورة آل عمران میں ہے وَ لِلّٰہِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۳۶) ۔ اس میں میراث کے معنی ملک کے ہیں ۔ سورة الفجر میں ہے وَ تَاْکُفُوْنَ التَّوْرٰثَ اَکْثَرًا لَّعَلَّآ (۸۶) ۔ یہ لوگ میراث کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں ۔ سورة

اعراف میں ہے۔ تِلْكَ لَكُمْ الْجَنَّةُ أَوْ رِثْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۰۸)۔ یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں ، تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں ، وارث بنایا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وارث کے معنی صرف کسی کے ترکہ کا وارث نہیں بلکہ اپنی محنت کے ماحصل کے مالک کو بھی وارث کہا گیا ہے ۔ وراثت ارض کے بھی یہی معنی ہیں ، جس کے لئے صلاحیت شرط ہے (۲۰۹)۔

## ورد

الْوَرْدُ ۔ سر درخت کے پھول ۔ (اس کا واحد وَرْدَةٌ ہے) لیکن بعد میں یہ لفظ گلاب کے پھول کے لئے زیادہ بولا جانے لگا\* ۔ اور پھر سرخ یا گلابی رنگ کے لئے ۔ قرآن کریم میں ہے فَتَكَانَتْ وَرْدَةٌ كَاللَّهِثَانِ (۵۵) ۔ وہ دہستان کی طرح سرخ ہو جائے گا ۔ (دہستان کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ہ ۔ ن)۔

الْوَرْدُ ۔ گھاٹ ۔ (جانوروں کا) پانی کے گھاٹ پر پہنچنا ۔ خواہ اس میں داخل ہوا جائے یا نہ ہوا جائے\* ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ وہ لوگ یا جانور جو پانی پر آئیں ۔ انہوں بھی الْوَرْدُ کہتے ہیں۔ الْوَرْدُ الْوَرْدَةُ ۔ راستہ ۔ پانی یا گھاٹ تک پہنچنے کا راستہ ۔ الْوَرْدُ ۔ گھاٹ یا راستے۔ الْوَرْدُ ۔ گھاٹ پر پہنچنے یا اترنے والا ۔ جری ۔ آگے بڑھنے والا\* ۔ جو شخص پہلے منزل پر پہنچ کر قافلہ کے جانوروں کے لئے پانی کھینچ کر تیار رکھے\*\* ۔ أَوْرَدَ ۔ اس کو گھاٹ پر لا یا ۔ الْوَرْدُ يَسُدُّ ۔ قلب کی رگ\* ۔

سورۃ ہود میں ہے وَيَسُدُّ الْوَرْدُ الْوَرْدُ (۱۱) ۔ کتنا بُرا ہے وہ گھاٹ جس پر اُترا جائیگا ۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ وَنَسَوْنَ الْمَجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَرْدًا (۱۹) ۔ ہم مجرمین کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہنکا کر لائیں گے ۔ سورۃ یوسف میں قافلے کے آگے جا کر پانی وغیرہ لانے والے کے لئے وَارِدٌ کا لفظ آیا ہے (۱۲) ۔

سورۃ مریم میں جہنم کے متعلق ہے وَإِنْ مِنْكُمْ لَشَا وَارِدٌ هَا (۱۹) ۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو ۔ اس آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ تمام انسان (مومن و کافر سب) جہنم میں داخل ہونگے ۔

پھر مومنوں کو اس سے نکال لیا جائے گا اور کافر اس میں رہیں گے (اس کی تائید کے لئے اس سے اگلی آیت -  $\frac{1}{2}$  - پیش کی جاتی ہے)۔ لیکن یہ خیال ہوجوہ غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے، جہنم سے نکلنے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ جہنم ایسی ”جگہ“ نہیں جہاں سے سزا بھگتنے کے بعد نکل آنا ہوگا۔ جہنم درحقیقت سلسلہ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے کی کیفیت (State) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ **أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا** ( $\frac{1}{2}$  -  $\frac{1}{3}$ )۔ وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ اتنی دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہ سن سکیں گے۔ اس اعتبار سے آیت ( $\frac{1}{2}$ ) میں **مِنْكُمْ** سے مراد تمام نوع انسانی نہیں بلکہ (جیسا کہ پیچھے سے سلسلہ کلام چلا آ رہا ہے) اس سے مراد وہی کفار اور سرکش مجرم ہیں جو حیات بعد الممات جیسی اہم حقیقت کے منکر تھے۔ اور اس کے بعد ( $\frac{1}{2}$  میں) جو ہے **ثُمَّ** **الَّذِينَ اتَّقَوْا** تو اس میں **ثُمَّ** کے معنی ”اس کے بعد“ نہیں۔ یہ ایک الگ بات کا ذکر ہے۔ (دیکھئے عنوان **ثُمَّ**)۔ نیز نجات کے معنی عذاب سے محفوظ رکھنے کے بھی ہیں۔ (دیکھئے عنوان **ن۔ ج۔ و**)۔

لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ ( $\frac{1}{2}$ ) میں **مِنْكُمْ** سے مراد تمام انسان (مومن و کافر سب) ہیں تو، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، **وَرُدِّمِ** میں اندر داخل ہونا ضروری نہیں۔ اس سے مراد کسی مقام تک صرف پہنچنا ہیں۔ اس اعتبار سے یوں سمجھا جائیگا کہ جنت، خواہ دنیوی ہو خواہ اخروی، اس تک پہنچنے کے لئے تکلیفوں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے گا۔ آگ اور خون میں کھیلنا ہوگا۔ یہ ”پہل صراط“ دنیا میں ایک ایک قدم پر موجود ہے جس سے گزر کر جنت کا دروازہ ملتا ہے۔ جو شخص ان پُر خیار وادیوں میں ذرا غیر محتاط (غیر متقی) ہوا۔ یا مشکلات و مصائب سے گھبرا کر بھاگ اٹھا۔ وہ تباہیوں کے جہنم میں گر جائے گا۔ جو احتیاط برتے گا اور مصائب میں ثابت قدم رہے گا وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سخت دشوار گزار مراحل سے گزرنا ہوگا۔ (مثلاً  $\frac{2}{1}$  و  $\frac{3}{1}$  و  $\frac{4}{1}$ )۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں پہلے مشقتوں اور تکلیفوں سے گزرا جائے گا اور اس کے بعد جنت میں پہنچا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دنیا میں حق و صداقت کے پیامبروں کو مخالفین کی طرف سے تکلیف پہنچائی جائیگی۔ جو ان تکلیف کو برداشت کر کے جادہ حق و صداقت



ہر قائم رہے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ جنت اور جہنم کا فیصلہ انسان کے اس دنیا کے اعمال کرتے ہیں۔

جو حقیقت اوپر بیان ہوئی ہے اسے فلسفہ کی زبان میں یوں کہا جائیگا کہ تخلیق (Creation) کا طریق (Process) یہ ہے کہ ہر تخلیقی تصور (Creative Idea) کے مشہود (Manifest) ہونے سے پہلے ایک داخلی ہیجان اور خلجان ہوتا ہے۔ (اسے Labour Pains کہئے) ایک کامیاب نابغہ (Genius) اس تکرری خلجان اور ہیجان سے کامیاب باہر نکل آتا ہے۔ خام اور ناکام اس کشمکش میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ کتنے ہی خامسکار مفکر اس گرداب میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

نبوت اس طریق (Process) سے ماورا ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب وحی کی خود پیدا کردہ فکر نہیں ہوتی۔

## و ر ق

الْوَرَقُ درخت کے پتے۔ ایک پتے کو وَرَقَةٌ کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ (۱۶)۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ الْوَرَقُ چاندی کو کہتے ہیں خواہ وہ ٹھپہ لگی ہوئی ہو یا نہ ہو۔ ابوالہیثم نے کہا ہے کہ الْوَرَقُ۔ الْوَرَقُ اور الْوَرَقَةُ۔ خصوصیت کے ساتھ دراهم کو کہتے ہیں\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیر اور مال۔ اور (۲) خاکستری رنگ کے ہیں۔ سورہ کہف میں ہے فَتَابَعْتُهُمْ وَاحْبَدَكُمُ الْيَوْمَ بِوَرَقِكُمْ (۱۸)۔ اس کے معنی سکتے ہیں۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ کلام قدیم میں وَرَقُ ان جھلیوں اور کھالوں کو کہتے تھے جن پر لکھا جاتا تھا\*\*۔ اسی سے کتاب کے اوراق ہیں۔

## و ر ی

اس مادہ میں چھپنے اور ظاہر ہونے کے، دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ وَرَتِ الشَّارِبُ۔ آگ بھڑکی۔ أَوْرَى الشَّارِبَ۔ آگ بھڑکائی۔ اور وَرَاءُ تَوَرَّيْتُ۔ اس کو چھپا دیا۔ دراصل اس میں چھپانے اور ظاہر کرنے کے دونوں پہلو ایک وقت موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً یقماق کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور جب اس سے نکلتی ہے تو روشن ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں

وَرَىٰ الرِّقَّةَ نَدَىٰ - چمقناق سے آگ نکلی - اسی بناء پر وَرَىٰ التَّخَبَّرَ کے معنی میں اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریق سے ظاہر کیا\*۔ وَارَاءُ اسے چھپا ہوا۔ یَوَارِي (۱۱۱) چھپائے۔ تَوَارَى - چھپا\*۔ تَوَارَىٰ - ایہام\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ کسی قیاس کا پابند نہیں۔

آلِوَرَاءُ - ہوتے کو کہتے ہیں\*\*\*۔ وَ مِّنْ وَرَاءِ اسْحَاقَ بِعَقُوبَ (۱۱۱) کی یہی تفسیر کی گئی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو ان کے بیٹے اسحاقؑ کی بشارت ملی اور اسحاقؑ سے آگے، ایک ہوتے یعقوبؑ کی۔ تَوَارَاة کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی مادہ سے ہے\*۔ ایسی صورت میں اس کے معنی ہوں گے۔ وہ شے جس سے آگ یا روشنی حاصل کی جائے۔ (کتاب تورات کے لئے دیکھئے عنوان تَوَارَات\*)۔ وَرَاءَ ذَالِیْکَ - یعنی مِوٰی ذَالِیْکَ - اس کے سوا کچھ اور\*\*۔ وَ یَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَ (۱۱۱)۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے اس سے انکار کرتے ہیں۔

سورة واقعہ میں ہے۔ اَفَرَأَیْتُمْ النِّقَارَ الشَّیْءَ تَوَارُوْنَ (۱۱۱)۔ کیا تم نے آگ پر غور کیا جسے تم روشن کرتے ہو۔ اور سورة عادات میں ہے۔ فَالْتَمُوْا رِیْثَ قَدْحًا (۱۱۱)۔ وہ گھوڑے جن کے ٹاپ مبارنے سے آگ کی چنکار ہاں نکلتی ہیں۔

وَرَاءُ - وَرَى کے بنیادی معانی (چھپنے اور ظاہر ہونے) کے لحاظ سے وَرَاءُ کے معنی بھی پیچھے اور آگے دونوں آتے ہیں\*۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں، سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے معانی متعین کئے جائیں گے۔

## وزر

آلِوَزَرٌ - بلند اور محفوظ پہاڑ۔ وہ پہاڑ جس میں پناہ لی جائے۔ ہر جائے پناہ یا حفاظت گاہ\*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱۱)۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے\*\*\*۔

آلِوَزَرٌ - بارگراں۔ بہت بڑی ذمہ داری۔ اسکی جمع آوَزَارٌ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) ملجنا، جائے پناہ اور (۲) کسی چیز میں گرائی اور بھاری پن کے ہیں۔ وَزَرَ - اس نے بوجھ اٹھایا۔ وَازَرَ بوجھ اٹھانے والا\*۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی (۱۱۱)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

\*تاج۔\*\*محیط۔\*\*\*ابن قتیبہ (القرطبی۔ جلد ۱)۔ نیز ابن فارس۔\*\*\*\*کتاب الاشتقاق۔

ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری خود پوری کرنی ہوگی۔ اور کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ نہ ہی کوئی کسی دوسرے کے اعمال کی جزا اور سزا میں حصہ دار ہوگا۔ قانون مکافات کا یہ عظیم الشان اصول ہے جس کا قرآن کریم نے اس طرح اعلان کیا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری اور اپنے اپنے کثے کا پھل۔ آج کے جہنمی معاشرہ کا سا حال نہیں کہ — دانہ این می کارد، آن حاصل برد۔ محنت کوئی کرے، عیش کوئی اڑائے۔ جرم کوئی کرے، سزا کوئی بھگتے۔ غلطیاں کسی سے ہوں، اسکے نتائج کوئی برداشت کرے۔ تنخواہ کوئی پائے، ذمہ داریاں کوئی اٹھائے۔ قرآنی معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوگا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وہاں کا غیر متبادل اصول ہوگا۔

وَزِيرٌ وَمَوْأَزِرٌ۔ جس پر ذمہ داری ہو۔ وہ جو کسی کے بوجھ میں شریک ہو۔ راغب نے الْمَوْأَزِرَةَ کے معنی معاونت بتائے ہیں اور وَزِيرٌ کے معنی معاون و مددگار۔ نیز امیر کا بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانے والا۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَأَجْعَلْ لِّيْ وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِيْ (۲۹)۔ ”میرے اہل میں سے میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے۔“

أَوْ زَارَ الْحَرْبِ۔ جنگ کے ہتھیار (۳۰)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعت مومنین ضرورتاً جنگ اس لئے کرنی ہے کہ ”خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔“ یعنی جنگ کا امکان نہ رہے۔ دنیا میں امن و سلامتی ہو جائے۔ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْ زَارََهَا (۳۱)۔ ”تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔“

## وزع

وَزَعَتْهُ أَرْعَاهُ وَزَعَا۔ میں نے اس کو روک دیا۔ منع کر دیا۔ فَاتَّقِ زَعًا۔ ہنس وہ رک گیا۔ الْوَاذِعُ۔ روکنے اور باز رکھنے والا۔ اس جہت سے یہ حاکم اور والی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز ان سپاہیوں اور سرکاری کارندوں کے لئے بھی جو لوگوں کو اپنے قانون ہونے سے روکیں۔ نیز وہ شخص جو فوجی اسورگی تدبیر کرے اور فوج کو نظم و ضبط میں رکھے۔ کماندار۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے جیوش و عسا کر (لشکروں) کے متعلق ہے فَهَمُّهُمُ يَوْمَ زَهُونَ (۲۶) اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ وہ نہایت ترتیب سے صف در صف رہتے تھے، ادھر ادھر بکھڑے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ یا یہ کہ انہیں ایسے نظم و ضبط میں رکھا تھا کہ وہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی کسی پر ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ اسی سورۃ میں ذرا

آگے چل کر حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِرْ عَنِّي اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (۲۱۹)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے نشو و نما دینے والے مجھے ایسی تمام چیزوں سے روک دے جو تیرے شکر کے راستے میں حائل ہوتی ہوں۔ مجھے اتنا ضبط عطا کر دے کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف تیرے متعین کردہ راستے میں صرف کسروں۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اَوْزِرْ عَنِّي کے معنی توفیق دینا۔ سُبْحَانَا۔ اور کسی چیز کا شیدائی بنانا بھی ہیں۔ جب کسی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح راستے پر لگ جانے کی توفیق دیدی۔

سورہ حم سجدہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ فَهُمْ يَوْزَعُونَ (۲۱۹) وہ روک دیئے جائینگے (اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج۔ ح۔ م میں جمعیت)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قیاس اور قاعدے کے پابند نہیں۔

## وزن

اَلْوَزْنُ۔ ہاتھ سے کسی چیز کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرنا\*۔ کسی چیز کی مقدار معلوم کرنا\*\*۔ بعض نے کہا ہے کہ وَزْنٌ۔ ہلکا یا بھاری ہونے کو کہتے ہیں، لیکن لیث کا قول ہے کہ وَزْنٌ ایک چیز کے بوجھ کا دوسری چیز کے بوجھ کے برابر ہو جانا ہے۔ وَزَنَ۔ بَتَرَنَ۔ وزن کرنا۔ وزن کر کے دینا\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی استقامت اور تناسب و اعتدال کے ہیں نیز دو چیزوں کے وزن کو برابر کرنے کے۔

قرآن حکیم نے وَزْنٌ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ نظام کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ توازن کی رو سے قائم ہے۔ اگر مختلف اشیاء کا باہمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس کے لئے فرمایا۔ وَالسَّعْيَاءَ رَفَعْنَاهَا وَوَضَعَ الْاَلْمِيزَانَ (۵۵)۔ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو ان بلندپوئوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا۔ مختلف فضائی کہوں اور اجرام فلکی کی باہمی جذب و کشش اس عظیم المثل توازن کی زندہ شہادت ہے۔ چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسکی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے۔

آلَا تَتَطَفَّعُوا فِي الْمِيزَانِ (۵۵)۔ لہذا تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھو وَاَقِیْمُوا الْوِزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَخْسِرُوا الْمِيزَانَ (۵۶)۔ معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے جو اس توازن کے قیام کا ذمہ دار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطہ قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ الْمِيزَانَ بھی نازل کی ہے۔ یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام۔ وہی نظام وہ معیار بنتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح صحیح ”وزن“ متعین ہوتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَاهُمْ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷)۔ لیکن دنیا میں کوئی نظام قوت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہا کہ وَاَنْزَلْنَاهُ الْوَحْدَ الْيَدَ (۵۸)۔ اس کے لئے ہم نے فولاد (کی شمشیر) بھی نازل کی۔ یہ ہے قرآنی نظام کا صحیح نقشہ۔ یعنی خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (الکتاب)۔ اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے نظام (المیزان)۔ اور اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے قوت (الحدید)۔ حدید کے متعلق فرمایا کہ فِیْہِ بَاسٌ شَدِیْدٌ وَمَنْفَعٌ لِّیْنَاسِ (۵۹)۔ اس کی شدت اور سختی، فتنہ و فساد برپا کرنے والے عناصر کے لئے روک تھام کا کام دیتی ہے اور یوں یہ قوت، نوع انسانی کے لئے فی الجملہ۔ باعث منفعت بن جاتی ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهُ۔ فَتَنُوْا فِیْ عِیْشَتِهٖ رَاضِیَةً وَّ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهُ۔ فَآمِنٌ۔ فَاَمِنَ۔ ہساویرتہ (۶۰)۔ جس کی سعی و عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عیش فراوان کی زندگی نصیب ہوگی۔ جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت و رسوائی کے آغوش میں چلا جائیگا۔ (مَوَازِیْنٌ۔ میسزان کی جمع ہے)۔ اس نظام میں ہر چیز کا وزن ٹھیک ٹھیک، یعنی ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوگا۔ وَالْوِزْنُ یَوْمَ مَعْدِنِ الْحَقِّ (۶۱)۔ اور تمام وہ کوششیں جو خدا کے نظام ربوبیت عامہ کے خلاف ہوں گی بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔ فَلَا نَقِیْمُ لَہُمْ یَوْمَ الْقِیَمَةِ وَرَنَّا (۶۲)۔ اس طرح یہ معاشی اور معاشرتی نظام، کائناتی نظام سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے جس میں ہر شے موزون ہے۔ وَاَنْتَبِہْنَا فِیْہِمَا مِیْنٌ کَمُلٌ شَیْءٌ مَّوْزُونٌ (۶۳)۔ یعنی ایک خاص تناسب (Proportion) کو لئے ہوئے۔

توازن کے اعتبار سے وَزْنُ الرَّأْيِ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی رائے بہت صحیح اور وزندار ہو۔ اور رَاجِحُ الْوِزْنِ اس شخص کو جو کامل العقل اور کامل الرائے ہو\*۔ اور أَوْزَنُ الْقَوْمِ۔ قوم کے بہترین و معزز ترین فرد کو کہتے ہیں\*\*۔

## وس ط

الْوَسْطُ۔ ہر چیز کا درمیانی حصہ۔ وہ نقطہ جو دونوں اطراف سے برابر فاصلے پر ہو۔ وَسْطُ الشَّمْسِ۔ آفتاب کا آسمان کے درمیان آ جانا۔ وَسْطُ الثَّبَاتِ۔ وہ چیز جو خصوصیت سے گھر کے درمیان واقع ہو\*۔ محیط میں ہے کہ الْوَسْطُ اور الْوَسِطُ اس درمیانی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے تمام اطراف کا فاصلہ برابر ہو\*\*۔

چونکہ ہر چیز کا اوسط (درمیانی نقطہ) نقطہ اعتدال ہوتا ہے، یعنی افراط و تفریط کے بالکل درمیان، اس لئے یہ لفظ ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَاسِطَةُ الثَّقِيلِ دَقْر۔ ہار کا درمیانی موتی جو نفیس ترین ہوتا ہے۔ وَسْطَةُ الدُّنْيَا بَرٌّ۔ بہترین دینار\*۔ الْوَاسِطَةُ۔ درمیانی۔ بیچ میں پڑنے والا۔ علت (کسی چیز کا ذریعہ اور سبب)\*\*۔ الْوَسِيطُ۔ وہ شخص جو جھگڑا کرنے والوں کے بیچ میں پڑے\*۔ قرآن کریم میں جنگ کے گھوڑوں کے متعلق ہے فَوَسِطْنِ بِيَدِهِ جَمْعًا (نہ)۔ وہ دشمنوں کی صفوں کے درجہ گھستے ہیں۔

قرآن کریم میں امت مسلمہ کے متعلق ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۲۴۱)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت و وسط بنا دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام قوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر (Equidistant) ہو۔ یعنی نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں سب برابر ہوں، جس طرح دائرے کے مرکز سے محیط کا ہر نقطہ برابر فاصلے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو عدل اور انصاف کے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹے۔ اس قسم کی قوم صحیح معنوں میں اقوام عالم کے اعمال و افعال کی نگرانی اور محتسب ہو سکتی ہے۔ لہذا امت و وسط سے مراد ایسی قوم ہے جسے بین الاقوامی

اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو۔ جو تمام اقوام کے افعال و حرکات کی نگران ہو اور بین الاقوامی معاملات کو پورے پورے عدل و انصاف سے سلجھائے۔  
قرآن کریم نے یہ مقام متعین کیا تھا جماعت مومنین کا۔  
یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کا بین الاقوامی نظام اور اقوام عالم کے متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کے لئے اس قسم کا انتظام اس زمانے میں تجویز کیا تھا جب دنیا هنوز ”بین الاقوامی“ تصور تک سے نا آشنا تھی۔

## و س ع

وَسِيعٌ - يَسِيعُ - سَعَةً - قدرت رکھنا - طاقت رکھنا - اختیار رکھنا -  
مَا أَسِيعُ ذَٰلِكَ - میں اس کی قدرت نہیں رکھتا - هٰذَا لَا تَأْخُذُ بِسَعٍ  
عِشْرِينَ كَيْلًا - اس برتن میں بیس پیمانہ بھر چیز سمائے کی گنجائش  
ہے - اَلْوَسِيعُ - اَلْوَسِيعُ - فراخ - کشادہ - اَلْوَسِيعُ اَلْوَسِيعُ  
اَلسَّعَةِ - ان سب کے معنی ، فارغ البالی - کشادگی رزق - قدرت اور طاقت  
کے ہیں - اَلْوَسِيعُ - اُس گھوڑے کو کہتے ہیں جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا  
ہو تیزی سے دوڑے \* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی تنگی اور بد حالی  
کی ضد بتائے ہیں -

راغب نے لکھا ہے کہ وَسِيعٌ اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے  
ذرا زیادہ ہو جو اس کے سپرد کیا جائے۔ اس لئے لَا يَسْكُفُ اللَّهُ نَفْسًا  
إِلَّا وَشِعْهَاتَا (۲۸۶) کے معنی یہ ہیں کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام  
لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے \*\* - (اس کا صحیح مفہوم آگے  
آتا ہے) - اَلْوَسِيعُ - صاحب اختیار و وسعت \* - اَلْوَسِيعُ - خدا کے اسماء  
حسنی میں سے ہے \* -

قرآن کریم میں اَلْوَسِيعُ - اَلْمُقْتَرِرُ - کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۸۶) -  
یعنی وہ جسے رزق کی کشادگی نصیب ہو - یہی معنی سورۃ نور میں  
اَوَّلَسُوا السَّعَةَ کے ہیں (۲۴) - یعنی آسودہ حال اور کشائش والے لوگ -  
سورۃ زاریات میں ہے اِنَّا لَمُوسِعُونَ (۱۵) - ہم صاحب وسعت ہیں - یعنی  
ہماری قدرت اور اختیارات بھی وسیع ہیں اور ہم رزق میں فراخی اور کشادگی  
بھی عطا کرتے ہیں - سورۃ بقرہ میں ہے - وَسِيعٌ كُرْسِيُّ رَبِّهِ السَّمُوتِ  
وَ اَلْاَرْضِ (۲۵۵) - اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے - علم ہی نہیں بلکہ  
رحمت (سامان ربوبیت) بھی (۲۵) -

قرآن کریم میں ہے - لَا يُسْكَتُفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَمَنْعَهَا (۲۸۶) و ۱۵۳ و ۲۴ و ۲۳) - اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا جو اپنے احکام و قوانین کی اطاعت چاہتا ہے تو اس سے اس کا اپنا کوئی فائدہ مطلوب نہیں - یہ صرف اس لئے ہے کہ انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے - اس کی قدرت و اختیارات کا دائرہ وسیع ہو جائے - ایسے کشادگی اور فراخی نصیب ہو جائے\*\* - سورۃ اعراف میں اس کے ساتھ کہا گیا ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ (۲۴) - ان وسعتوں اور فراخیوں کا نسام جنت کی زندگی ہے - یعنی اس دنیا میں رزق اور زندگی کی خوشگواروں کی وسعت اور کشادہ ، اور خود انسانی ذات (Personality) کے اختیارات و ممکنات کے دائرے کی وسعت ، جس سے انسان آخری زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے - یہ وہ جنت ہے جو کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے - عَسْرُضْهَا كَعَسْرِ رُضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (۲۴) -

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ لَا يُسْكَتُفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَمَنْعَهَا کے معنی یہ ہیں کہ ان احکام کا ثمرہ وسعت ہے - یعنی جنت - یہ اسی مفہوم کی تائید میں ہے جسے دوسری جگہ بِسْرٍ يَسُدُّ اللَّهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُسْرٍ يَسُدُّ بِكُمْ الْعُسْرَ (۱۸۵) سے ادا کیا گیا ہے - اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ لَا يُسْكَتُفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَمَنْعَهَا کے یہ معنی بھی ہیں کہ خدا ایسے احکام دیتا ہے جو کسی کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں - اس آیت کا عام مفہوم یہی لیا جاتا ہے - لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات پر پہلا مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے - فرآئی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ انسانی ذات کی نشو و نما ہے جس سے اس کی صلاحیتوں اور ممکنات کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے -

## و س ق

وَسَقَىٰ بِسَقِيٍّ وَسَقَا - چیزوں کو ملانا - متفرق چیزوں کو اکٹھا اور جمع کرنا - نیز بوجھ اٹھانا - کسی چیز کو اپنے اندر لیے لینا - وَسَقَتِ الشَّاقَّةُ - اونٹنی نے نر کے جنسی مادہ کو اپنے اندر رحم میں جمع کر کے اس کا منہ بند کر لیا - یعنی وہ حاملہ ہو گئی - اِسْتَوَسَقَتِ الْاِبِلُ - اونٹ جمع ہو گئے\* - نواب صدیق خاں نے لکھا ہے کہ (و - س - ق) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے\*\*\* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اٹھا لینا بتائے ہیں -



قرآن کریم میں ہے وَ اللَّيْلُ وَمَا وَسَقَ (۸۴)۔ رات اور ہر وہ شے جسے وہ جمع کر لیتی ہے۔ یعنی تاریکیاں۔ یا ستارے اور چاند۔ وَسَقَ\*۔ ایک اونٹ کا بار۔ ساٹھ صاع۔ اِتِّسَقَ\*۔ ہر چیز کے مل جانے اور اس کے اجزاء کے اکٹھے ہو جانے کو کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَالْقَمَرَ اِذَا اتَّسَقَ (۸۸)۔ اس میں چاند کے کامل ہو جانے کا مفہوم ہے۔ اِتِّسَقَ\*۔ الْقَمَرَ۔ چاند کے بھر پور، کامل اور برابر ہو جانے کو کہتے ہیں۔ یہ حالت تیرہویں سے سولہویں رات تک ہوتی ہے۔

## وسل

اَلْوَسِيْلَةُ\*۔ کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنا۔ لہذا مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ اَلْوَسِيْلَةُ\* سے زیادہ خاص ہے کیونکہ وَصِيْلَةُ\* کے معنی کسی چیز تک پہنچنا ہیں اور وَسِيْلَةُ\* کے معنی رغبت کے ساتھ پہنچنا\*۔ اس کے معنی منزلت۔ مقام۔ مرتبہ کے ہیں\*۔ نیز ہر وہ چیز جس کے ذریعے کسی دوسرے سے قرب حاصل کیا جائے۔ نیز قَرْبَةٌ\*۔ یعنی قدر و منزلت کے اعتبار سے کسی سے قریب ہونا\*\*۔ تَوَسَّلَ اِلٰی\* بكذا۔ اس نے میری طرف فلاں چیز کے ذریعے قرب حاصل کیا\*\*\*۔ صاحب تاج العروس اور محیط نے وَسِيْلَةُ\* کے معنی مرتبہ۔ درجہ۔ قرب۔ تعلق کے لکھے ہیں۔ تَوَسَّلَ اِلٰی اللہ تَوَسَّلًا۔ اس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اسے خدا کا قرب حاصل ہو گیا۔ اَلْوَسِيْلُ\*۔ رغبت کر کے کسی کا قرب حاصل کرنے والا\*\*۔

سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے جس کے غلط (مروجہ) مفہوم نے، اسلام جیسے حیات بخش دین (نظام زندگی) کو اشخاص پرستی کا طلسم بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُوْنَ (۵)۔ اس کا سیدھے سادے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے۔ ”اے ایمان والو! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اس کی طرف ”وسیلہ“ طلب کرو۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ“۔ ہم نے اس میں لفظ ”وسیلہ“، کو علیٰ حالہ رہنے دیا ہے کیونکہ اسی کے غلط مفہوم پر اشخاص پرستی کی وہ عمارت قائم کی جاتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لفظ ”وسیلہ“ کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں ان کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور خدا کے ہاں درجہ مرتبہ، قرب، منزلت طلب کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے

میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یعنی خدا کے ہاں قدرو منزلت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرتے رہو۔

اور اگر لفظ ”وسیلہ“ کا ترجمہ ”ذریعہ“ کیا جائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے ہاں عزت و منزلت۔ درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ طلب کرو۔ یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ وہ عمل صالح ہے جو خدا کے ہاں درجہ اور مرتبہ ملنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طریق سے تم خدا کے مقرب بن سکتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے ”وسیلے“ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ وسیلہ ہے ”پیرومرشد“۔ لہذا مرشد (پیر طریقت) کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

اور جب ”وسیلہ“ کے معنی ”پیر ہکڑنے“ کے کر لئے تو ”جناہید“، کے معنی ہو گئے ”اپنے نفس سے جہاد کرنا“۔ جسے جہاد اکبر قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ، انسانوں کو قرار دینے والے اس دین (اسلام) کے نام لیوا ہیں جو دنیا سے شخصیت پرستی کو مٹا کر، خدا اور بندے کا براہ راست (قرآن کریم کے ذریعے) تعلق پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس دین کے عطا کرنے والے خدا کا اعلان یہ تھا کہ **وَإِذَا مَنَّ اللَّهُ عَلَى عَبْدٍ لَّيْسَ فِيكَ فِتْنَةٌ قَدْ رَزَقْنَاهُ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَاعْتَدِىٰ** عَنِیْیَ فَاِنَّیْیَ قَدَرِیْیَ۔ ”جب میرے بندے تجھ سے (اے رسول) میری بابت ہو جائیں تو (کہدو کہ) میں ان سے قریب ہوں، اتنا قریب کہ اُجیب دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ ”میں ہر شخص کی ہکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ **فَلَا يَسْتَجِیْبُوْا لَیْیَ وَلَیْسُوْا مِیْنُوْا اِیْیَ لَعَلَّہُمْ یَرْشُدُوْا** (۱۸۶) ”انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں۔ اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد و ہدایت مل جائے“۔ بات کس قدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے دوسرے لوگ ”مرشد“ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ (یَرْشُدُوْا) کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا کے علاوہ کوئی ”مرشد“ (راہ بتانے والا) نہیں (دیکھئے ۱۸۶)۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں) ”خدا اور بندے کے درمیان کسمپاشی اور طاقت حائل نہیں رہتی“۔ یہی وہ صحیح آزادی

ہے جسے عطا کرنے کے لئے نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے (۱۵۶)۔ لیکن ہم نے اس آزادی کی جگہ، انسان پرستی کی مقدس زنجیروں سے اپنے آپ کو اس طرح جکڑ لیا کہ ہمارے فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی آزاد نہ رہ سکا۔ یاد رکھئے۔ مسلمان، دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل صرف اس وقت ہو سکے گا جب اس نے انسانوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر صرف اللہ کے سامنے جھکنے کا مسلک اختیار کر لیا۔

## و س م

الْوَسْمُ - تپائے ہوئے لوہے سے داغ دینا یا نشان لگانا۔ الْوَسْمَامُ - وہ نشان جو داغ دینے سے پڑ جائے۔ وَسَمَ يَسِمُ وَسْمًا - جانور کو لوہے سے داغ دیکر نشان زدہ کرنا۔

السِّمَّةُ - علامت۔ نشانی۔ فُلَانٌ مَوْسُومٌ بِالْخَيْمَرِ - فلاں آدمی ہر بھلائی کا نشان ہے۔ مَوْسِمُ الْحَجِّ - وہ زمانہ جو اجتماع حج کے لئے نشان زد کر دیا جائے۔ تَوَسَّمُ فِرَاسَتٌ وَ ذَكَوَاتٌ كَوَكُهْتِي هِيَ - الْوَسْمِيَّةُ - موسم بہار کی ابتدائی بارش (جس سے زندگی اور حسن کی نمود کی نشان دہی ہو جاتی ہے) \*۔

قرآن کریم میں ہے سَنَسِيحُهُ عَلَى الْخَيْرِ طُومٌ (۲۸)۔ ہم اس کی ناک پر داغ دینگے۔ (ذلت و خواری مفہوم ہے)۔ سورة حجر میں ہے - اِنْ فِى ذَالِكَ لَآيَاتٍ لِّالْمُسْتَوْسِيحِينَ (۱۵)۔ اس میں صاحبان فِرَاسَت کے لئے نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو آثار و قرائن سے حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

## و س ن

الْوَسَنُ - السِّينَةُ - نیند کی ابتدا یا اونگھ یا نیند کے جھونکے کو کہتے ہیں۔ اس کا اگلا درجہ نَوْمٌ ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی غفلت ہوتے ہیں۔ هُوَ فِى سِنَةٍ - وہ غفلت میں ہے \*۔ اس کے معنی نیند کی گرائی اور شدت بھی ہیں \*\*۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے - لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ (۲۵)۔ بے خبر ہونا تو ایک طرف وہ کسی شے سے غافل تک، بھی نہیں ہوتا۔

\* تاج و راعب - \*\* تاج ۔

## و س و س

النَّوَسْوَسُ\* - ہلکی سی آہٹ - شکاری کی آہٹ - دیے ہاؤں چلنے سے پیدا ہونے والی خفیف سی آہٹ - چلنے میں زبور کے بجائے کی ہلکی آواز کو بھی کہتے ہیں (جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ہوتے ہیں)\*۔ دل میں مختلف قسم کے خیالات گذرنے کو بھی کہتے ہیں - نیز ہر غیر واضح کلام کو جس میں مختلف آوازیں مل گئی ہوں - نیز ایسی گفتگو کو جو بغیر نظم و ترتیب کے ہو\* - راغب نے النَّوَسْوَسَ\* کے معنی برے خیال کا دل میں گذرنا لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے فَتَوَسَّوْا لَهَا الشَّيْطَانُ (۲۴) - ”پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا“ - اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو خود غرضی کے جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتے ہیں - یا جنہیں شر پسند لوگ کسی کے دل میں پیدا کریں - النَّوَسْوَسُ النَّقَّاسُ الْقَذْرِيُّ يَتَوَسَّوْنَ فِي صُدُورِ النَّقَّاسِ (۱۱۸) - وہ جو دیے ہاؤں آکر چپکے سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ہے - ایسے لوگ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں - ان سے محتاط اور محفوظ رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے -

## و ش ی

النَّوْشِيُّ\* - کپڑے پر (مختلف رنگوں سے) نقش و نگار بنانا - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں\*\* - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف کوئی رنگ لگانا ہیں\*\*\* - اس کے بعد یہ لفظ رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا - چنانچہ کہتے ہیں وَشَّى النَّمَامُ كَلَامَهُ - چغلی خور نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی\*\*۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے - مَسَلَّمَةً لَا شَيْئَ لَهَا فِيهَا (۲۱) - وہ بالکل صحیح اور سالم ہے اور اس پر کوئی داغ نہیں ہے - یعنی کسی ایسے رنگ کا نشان نہیں جو اس کے سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو -

## وص ب

وَصَبَّ يَتَصَبَّ\* - وَصَّ وَبَّأ - کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا - اَوْصَبَّ کے بھی یہی معنی ہیں - (یہ متعدی بھی ہو جاتا ہے) - وَصَبَّ عَلَيَّ الْاَلَمُ\* - اس نے اس بات پر مداومت کی اور حسن کارانہ اسے انجام دیا -

\* تاج و معبط و راغب - \*\* تاج - \*\*\* راغب -

مَفَازَةٌ\* وَأَصِيبَةٌ\* - بہت ہی لمبا چوڑا لقی ودق بیابان جسکی انتہا نہ ہو۔  
الْوَصَبُ\* - ہمیشہ رہنے والی بیماری۔ اسی سے 'أَلَا وَصَابٌ' بیماریوں کو  
کہتے ہیں\*۔

قرآن کریم میں ہے - 'وَلَسَّ' التَّدْرِيْنُ\* وَأَصِيبًا\* (  $\frac{17}{87}$  ) - کائنات کی  
ہر شے خدا کی فرمان پذیری کر رہی ہے اور ایسا مداومت سے ہو رہا ہے -  
مسلل و پیہم ایسا ہو رہا ہے - (انسان کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے) -  
دوسری جگہ ہے 'وَلَهُمْ' عَذَابٌ\* وَأَصِيبٌ\* (  $\frac{35}{11}$  ) - لازم ہو جانے والا  
عذاب -

## وصد

الْوَصِيدُ\* - صحن، آنکھ - دروازے کی چوکھٹ - پتھروں سے بنایا  
ہوا احاطہ، جو اونٹوں کے لئے ہھاڑ میں بنا لیا جاتا ہے\* - سورة کہف میں  
ہے کہ ان کا کُتتا اپنے ہاتھ پھیلانے وَصِيدٌ\* میں رہتا تھا (  $\frac{18}{18}$  ) - اسکے  
معنی غار کے صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں - چوکھٹ سے مفہوم زیادہ  
واضح ہو جاتا ہے - 'أَوْصَدَ الْبَابَ' وَاَصْدَهُ کے معنی ہیں اس نے دروازہ  
بند کر دیا - 'أَوْصَدَ الْقَيْدَ' - اس نے ہانڈی کو ڈھانپ دیا\* - ابن فارس  
نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ہاتھ ملا  
دینے کے ہیں -

[لَقَدْ عَلَّمَهُمُ مَوْصِدَةً\* (  $\frac{13}{8}$  ) کے لئے دیکھئے عنوان ا - ص - د]

## وصف

وَصَفَتِ الشَّقِيئِ\* يَتَصِفُّهُ\* وَصَفًّا\* - کسی چیز کا حلیہ اور کیفیت  
بیان کرنا - الْوَصْفَةُ\* - کسی چیز کی حالت - کیفیت\*\* - ابن فارس نے کہا  
ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنے کے ہیں - نیز الْوَصْفَةُ\*  
کے معنی ہیں وہ علامت جو کسی چیز سے مستقل لگی رہے -

خدا کو دنیا میں قریب قریب ہر شخص مانتا ہے - لیکن جس جگہ پہنچ  
کر اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے کیسا؟ کوئی انسان اپنی عقل  
کی رو سے یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کیسا ہے - اس لئے کہ خدا اتنی عقل  
کی حد سے ماوراء ہے - لہذا خدا کے متعلق صرف وہی بات یقینی طور پر صحیح  
ہو سکتی ہے جسے خود خدا بتائے - اور اس کا ذریعہ وحی کے سوا اور کچھ

نہیں۔ اور وحی اب آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے۔ لہذا خدا کا صحیح تصور وہی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ جو تصور اس تصور کے خلاف ہوگا وہ غلط ہوگا، اور خدا کی طرف اس کا انتساب باطل۔ چنانچہ اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) تصورات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ (۱۶۶)۔ خدا کے متعلق جو تصور یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس سے بہت دور اور بلند ہے۔ وہ اس سے مبرا اور منزہ ہے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو بھی ”خدا پر ایمان“ لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کو مانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے متعلق صحیح صحیح تصور رکھو۔ اور یہ تصور وہی ہو سکتا ہے جسے خدا نے خود قرآن کریم میں پیش کیا ہے۔ یہ اس کی صفات یا اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ہیں۔ بالفاظ دیگر، خدا کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی محدود (Finite) لا محدود (Infinite) کو حیطہٴ ادراک میں لا نہیں سکتا۔ اسی لئے خدا نے صرف اپنی صفات بیان کی ہیں۔ اور انہی صفات سے ہم اس کے متعلق اندازہ کر سکتے ہیں۔ خدا، علیم ہے۔ خبیر ہے۔ بصیر ہے (وغیرہ) لیکن خود خدا، جو علیم و خبیر و بصیر ہے، ہے کیا؟ ہم اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں۔

## وصل

وَصَلٌّ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ جوڑ دینا۔ (فصل اور قطع کی ضد)۔ اَوْصَلْتَهُ اِصْطَالًا۔ اس کو اس تک پہنچا دیا، یا اس کے ساتھ ملا دیا۔ قَطْعٌ کے مقابلہ میں اِصْطَالٌ قرآن کریم میں (۲/۲۴) میں آیا ہے۔ وَصَلَ الشَّقِیْنِ یا اِلَى الشَّقِیْنِ۔ اس چیز کی طرف پہنچ گیا۔ قَطَعَ الرَّحِیْمُ کے مقابلہ میں وَصَلَ فُلَانٌ رَحِیْمَةً بولتے ہیں\*۔ (قطع رحم کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ط۔ ع)۔

اَلْوَصِیْلَةُ (۱۶۷)۔ وہ بکری جو لگاتار سات بطن میں دو دو سادہ بھی دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے۔ جاہلیت عرب میں اس نر بچہ کو ذبح نہیں کرتے تھے اور اس بکری کے دودھ کو عورتیں نہیں پیتی تھیں۔ اس بکری کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا\*۔ (بعض

ائمہ لغت نے اس بکری کا تعارف اور طرح سے بھی کراہا ہے۔ بعض نے بکری کے بجائے اونٹنی بھی بتایا ہے\*۔ پھر حال اس سے مقصود ان توہمات کا ذکر کرنا ہے جو اسلام سے پہلے وہاں رائج تھے۔

ہمارے ہاں کسی بزرگ کی وفات پر عام طور پر کہتے ہیں کہ ان کا ”وصال“ ہو گیا۔ یہ تصور ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) سے آیا ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح خدا کی روح کا ایک جزو ہے جو بد قسمتی سے مادی جسم کے جیل خانے میں محبوس ہو گئی ہے۔ اس جسم سے علیحدگی کے بعد یہ جزو اپنے کل سے جدا کر مل جائے گا۔ اس ملاپ کے لئے ”وصال“ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی فلاں واصل بالحق ہو گیا۔ خدا کے ساتھ مل گیا۔ وحدت وجود کے مسلک کی یہی تعلیم ہے۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ اسی طرح ”عرس“ کا تصور ہے جو عیسائیوں کے مسلکِ خاتقاہیت سے آیا ہے۔ اس کے معنی شادی کرنے کے ہوتے ہیں۔ عیسائیوں میں راہبہ عورتوں (Nuns) کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان کی شادی ان کے خدا (یسوع مسیح) سے ہو چکی ہوتی ہے۔ اور وہ گویا خدا کی عروس (دلہن) ہیں۔ یہی تصور ہمارے تصوف میں آگیا جہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ ”اللہ والے“ کی وفات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی شادی (عرس) خدا سے ہو گئی۔ یعنی خدا سے اس کا وصال ہو گیا۔ یہ سب تصورات غیر قرآنی ہیں۔

## و ص ی

وَصَلَّى الشَّيْئِي بِهٖ وَصِيًّا - متصل ہو جانا۔ مل جانا۔ وصاء بہ۔ بتصییہ۔ اسے اس سے ملا دیا۔ (لازم و متعدی)۔ وَصَلَى النَّبِیُّتُ - پودے گتھ گتھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔ اَرْضٌ وَاصِيَّةٌ - وہ زمین جس کے پودے قریب قریب، اور باہم گتھے ہوئے ہوں۔ فَلَاةٌ وَاصِيَّةٌ - وہ بیابان جو دوسرے بیابان سے ملا ہوا ہو\*\*\*۔

اس سے راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَصِيَّةُ کے معنی ہیں کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے کسی کو ایسی ہدایات دینا جن میں نصیحت بھی شامل ہو\*\*۔ امر و حکم اور فریضہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے اَوْصَى بِوَصِيٍّ کے معنی واجب قرار دینے، معاملہ سونپ دینے کے آتے ہیں۔ نیز اَوْصَى وَوَصَّی کے معنی عہد و پیمان کرنے کے آتے ہیں۔ اور کسی کو (اپنے مرنے کے بعد) کسی چیز کا مالک بنا دینے کے\*\*\*۔ اَلْوَصِيَّةُ - وصیت کرنے والا۔ نیز جسے وصیت کی گئی ہو (اس کے دونوں معنی آتے ہیں)۔

\*ناج - \*\*راغب - \*\*\*ناج و محیط

قرآن کریم میں ہے وَ وَصَّیْ بِهَا اِبْرٰهٖمَۙ بَنٰیۤیْهِ (۲۴۱)۔  
 ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس کا حکم دیا۔ اس بات کو مسلسل ان تک  
 آگے بڑھا دیا۔ سورۃ نساء میں ہے۔ یٰۤاَوَّلٰدِکُمْۙ اللّٰہُ فِیْ اَوَّلٰدِکُمْ  
 (۲۴۱)۔ اللہ اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے۔ سورۃ یٰسّٰ میں  
 تَوَّصَّیْتُمْۙ کا لفظ آیا ہے (۳۶)۔ سورۃ العصر میں جماعت مومنین کی خصوصیت  
 یہ بتائی گئی ہے کہ تَوَّاصَّوْا۟ بِالْحَقِّۙ وَ تَوَّاصَّوْا۟ بِالصَّبْرِ (۱۳۳)۔  
 اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین  
 و تاکید کرتے ہیں لیکن اس سادہ کے بنیادی معانی کے لحاظ سے اس میں یہ  
 پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ حق و استقامت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے  
 رہتے ہیں۔ ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ حق و استقامت ہے۔ ان کی وجہ  
 جامعیت قوانین خداوندی کی رو سے تعمیری نظام پر ثابت قدم رہنا ہے۔

مُؤَصَّ۔ وصیت کرنے والا (۲۴۲)۔

قرآن کریم میں ہے کَتَبَ خَیْرًاۙ اِنْ التَّوَّصَّیْتُۙ لِلْوَٰلِدَیْنِ وَاَۤاَلِیْنَ  
 بِالْمَعْرُوْفِ۔ حَقًّا عَلٰی الْمُتَّقِیْنَ (۲۴۰)۔ ”تم میں سے جس کے  
 سامنے موت آ موجود ہو۔ اور وہ مال چھوڑے۔ اس پر فرض قرار دے دیا گیا  
 ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور دیگر اقرباء کے لئے قاعدے کے مطابق وصیت کرے  
 ایسا کرتا متقیوں کے لئے لازم ہے۔“ اس سے واضح ہے کہ ترکہ کے لئے ماں باپ  
 اور دیگر اقرباء کے لئے وصیت کرنا خدا کی طرف سے قرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن  
 اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی وصیت نہ کر سکے۔ یا اس کی وصیت  
 پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (Cover نہ کرے)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے وارثین  
 کے لئے خود حصے مقرر کر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حصوں کو بیان  
 کرتے وقت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے کہ مِّنْۢ بَعْدِ وَ وصیۃ یُّوْصِیْ  
 بِهَاۙ اَوَّلٰدَیْنِ (۲۴۲)۔ ”وصیت جو اس نے کی ہو اس کے بعد۔ یا فرضے  
 کی ادائیگی کے بعد“۔ یہ حکم اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی  
 قسم کی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے  
 کہ وصیت صرف ایک تنہائی (۱) مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں  
 کے لئے نہیں۔ اس کی سند میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ  
 روایت صحیح نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ رسول اللہؐ کا کوئی ارشاد قرآن کریم  
 کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے کہا  
 جاتا ہے کہ حدیث قرآن کریم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس لئے اس حدیث  
 نے قرآن کریم کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس قسم کے عقیدے کے



متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔ یاد رکھئے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ اس کی کسی آیت کو نہ کوئی دوسری آیت منسوخ کرتی ہے نہ قرآن کریم سے باہر کوئی اور چیز منسوخ کر سکتی ہے۔ خدا کے کلام کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر محکم ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ س۔ خ)۔ لیکن اگر رسول اللہ ﷺ نے ایسی بات کہی ہو تو ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہو کہ وہ اپنے مال کے ایک تہائی حصہ سے متعلق فلاں کے حق میں وصیت کر دے۔ اس صورت میں یہ چیز دائمی حکم کی حیثیت نہیں رکھیں گی۔ محض وقتی مشورہ ہوگا۔

یہ بھی واضح رہے کہ وصیت اور وراثت کے احکام اسی وقت نافذ العمل ہوں گے جب افراد کے پاس فاضلہ دولت ہوگی۔ جب معاشرہ ایسا قائم ہو جائے جس میں ہر فرد اپنی فاضلہ دولت کو قرآن کریم کے حکم کے مطابق قرآنی نظام کے حوالے کر دے۔ (دیکھئے عنوان ع۔ ف۔ و) تو اس وقت ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔ نہ حضور ﷺ نے زائد از ضرورت دولت اپنے پاس رکھی، نہ ترکہ چھوڑا۔ نہ جائداد بنائی، نہ وہ وراثت میں کسی کی طرف منتقل ہوئی۔ اس طرح آپ ﷺ پر ترکہ اور وراثت کے احکام عائد نہیں ہوئے۔ یہی کیفیت تمام مومنین کی اس وقت ہوگی جب قرآنی نظام ربوبیت قائم ہوگا۔ اس وقت تک قرآن کریم کی رو سے ہر مومن ہر، جو کچھ مال چھوڑے، وصیت کرنا فرض ہے۔ اور وصیت کے معاملہ میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے معاملات کو قدر متعلقہ سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ولایت بھیجا۔ پیرسٹر کرایا۔ وہ اب بڑا امیر اور خوش حال ہے۔ دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ اس کی پرورش، تعلیم، تربیت وغیرہ کے تمام اخراجات باقی ہیں۔ یہ شخص اپنی وصیت کی رو سے اپنا پورا ترکہ اس نوزائیدہ بچے کو دے سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے حق وصیت نہ دیا جائے تو اس کے ترکہ کا آدھا حصہ بڑا بیٹا لے جائیگا۔ وصیت کے متعلق اس انفرادی حق کے بعد، قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں بکسر ظلم اور جانبداری سے کام لے تو معاشرہ (عدالت) کو اختیار ہے کہ عدل و انصاف کے مطابق، وارثین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے (۱۸۴)۔ وصیت کو قرآن کریم نے اتنی اہمیت دی ہے کہ سورۃ المائدہ میں اس کے لئے شہادت کا تفصیلی طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے (۱۸۶)۔

## و ض ع

وَضَعَ الشَّيْءُ مِيزًا يَدْرَهُ بِضَعْتِهِ - اس نے کسی چیز کو ہاتھ سے گرا دیا - نیچے رکھ دیا\* - وَضَعَ الشَّيْءُ فِي الْمَكَانِ - کسی چیز کو کسی جگہ رکھ دیا\* - سورة كهف میں ہے وَضَعَ الْكِتَابُ (۱۹۹) - سورة رحمن میں ہے - وَضَعَ الْمِيزَانَ (۵۵) - وضع حمل کے لئے یہ لفظ (۳۵) میں آیا ہے - وَضَعَ عَنْهُ (۲۲) - دور کر دینا - ہٹا دینا - گرا دینا - وَضَعَ ثِيَابًا - کپڑے اتار کر رکھ دینا - (۲۳) - مَوْضِعٌ جمع مَوَاضِعُ - جگہیں - موقعے - (۲۴) - مَوْضُوعَةٌ - رکھے ہوئے (۸۸) -

وَضَعَتِ النَّاقَةُ - اونٹنی تیز رفتاری سے چلی - وَضَعَ الرَّجُلُ - آدمی دوڑا - أَوْضَعْتُهُ - میں نے اسے دوڑایا\* - سورة توبہ میں ہے - وَلَا أَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ (۲۳) - وہ (فتنہ پیدا کرنے کے لئے) تمہارے اندر تک و تاز کرتے - سرگرم عمل رہتے - بھاگ دوڑ کرتے -

## و ض ن

وَضَنَّهُ - اس نے اسے ترتیب وار، ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ دیا - أَلْمَوْضُونَةُ - بنی ہوئی زرہ - یعنی جس کے حلقے ایک دوسرے میں ترتیب وار پڑے ہوں - یا وہ چیز جس میں جواہرات ٹانکے کئے ہوں - یا وہ چیز جسے تہ تہ جما کر رکھا گیا ہو - چنانچہ سَرَرِيْرٌ مَوْضُونٌ - دھڑے بنے ہوئے ہلنگ کو کہتے ہیں\*\* -

قرآن کریم میں سَرَرِيْرٌ مَوْضُونَةٌ (۵۱) آیا ہے - یعنی دھڑے اور مضبوط بنے ہوئے ہلنگ - یا جواہرات سے مرصع ہلنگ -

## وطا

وَطِيءٌ يَطْوُهُ وَطِيًّا - پاؤں سے کسی چیز کو روندنا - وَطِيءُ الْمَرْأَةِ يَطْوُوْهَا - عورت سے وطی (جماع) کرنا - وَطُوْا يَطْوُوْنَ - نرم اور سہل ہونا\* - فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو دبا کر پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں - سورة فتح میں ہے - لَمْ تَعْمَلُوْهُمْ أَنْ تَطْوُوْهُمْ (۲۸) - جنہیں تم لاعلمی میں ہمال کر دیتے -

\* تاج و راغب - \*\* تاج و راغب و محیط -

وَأَرْضًا لَّسَمٌ تَطَّشُوا هَا (۳۳/۳۳)۔ ایسی زمینیں جنہیں تم نے اپنے ہاؤں سے نہیں روندنا۔ ان تک ہنوز تمہارے قدم نہیں پہنچے۔ اَلْمَوُطَّنُ وَالْبَمَوُطِّيُّ۔ قدم رکھنے کی جگہ\*۔ وَلَا يَطَّشُونَ مَوُطَّنًا (۳۳/۳۳)۔ نہ وہ کسی ایسی سرزمین پر چلتے ہیں۔ مَوُطَّنًا۔ دراصل یہ کسی کے قدم پر قدم رکھنے کو کہتے ہیں۔ رَجُلٌ مَوُطَّنٌ الْعَقِيبِ۔ وہ شخص جس کی پیروی اور اتباع کی جاتی ہو\*۔ اس سے مَوُطَّنًا کے معنی موافقت اور مطابقت کرنے کے آتے ہیں\*۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے۔ لِيُؤْطِئُوا عِدَّةَ (۹/۳۳)۔ تاکہ اس طرح وہ اسے (مہینوں کی) گنتی کے مطابق کر لیں۔ سورۃ مزمل میں ہے۔ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا (۹۳/۳۳)۔ رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اٹھنا، سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے۔ یا انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا سَرَكَتِبُ بن جاتی ہے (کیونکہ وَطْئًا الْفَرَسِ کے معنی ہیں وہ گھوڑے پر سوار ہوا)\*\*۔ یہ نبی اکرمؐ کی اس جد و جہد کا بیان ہے جب حضورؐ (نظام خداوندی کے ابتدائی مراحل میں) دن رات مصروفِ کار رہتے تھے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے رات کا آرام بھی قربان کر دینا، انسانی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی واضح شہادت ہے، بالخصوص جب یہ قربانی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہ ہو، بلکہ نوعِ انسان کی نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے ہو۔

## و ط ر

اَلْوَطَرُ۔ حاجت۔ ایسی ضرورت جس کے پورا کرنے کی نکر اور خاص اہتمام ہو\*\*\*۔ اہم ضرورت\*\*\*\*۔ قرآن کریم میں ”قضاۃِ وطر“ (۳۳/۳۳) میں آیا ہے جس کے معنی ضرورت پورا کر لینا ہیں۔ یعنی قطعِ تعلق کر لینا۔ یا وظیفہٴ ازدواج کی خواہش و ضرورت کو پورا کر لینا۔ یعنی یہ فیصلہ کر لینا کہ اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی کو قطعِ تعلق کا فیصلہ کہہ سکتے۔

## و ط ن

اَلْوَطَنُ۔ انسان کے رہنے اور بسنے کی جگہ۔ اقامت گاہ۔ مجازاً بیل اور بکریاں پاندھنے کی جگہ کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ وَطَنٌ بَيْسٌ۔ بَطْنٌ۔ اَوُطَنٌ۔ قیام کرنا۔ اَسْتَوْطَنْتَهُ وَ اَنْطَطَنَتْهُ وَ تَوَطَّنَتْهُ وَ تَوَطَّنَ بَيْسٌ۔ اس نے اُس جگہ کو وطن بنا لیا۔ اَلْمَوُطَّنُ مِنَ الْحَرْبِ۔ جنگ کے میدان\*\*\*۔

\* تاج و راغب۔ \*\* محیط۔ \*\*\* تاج و محیط۔ \*\*\*\* راغب۔

قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے ۔ سورۃ توبہ میں ہے ۔  
لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ (۹/۲۵) ۔ ”یہ حقیقت ہے کہ اللہ  
نے بہت سے جنگ کے میدانوں میں تمہاری مدد کی“ ۔

## وع د

وَعْدٌ - يَعِدُ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ - وَعْدٌ -  
ہات کا ہو یا ہری ہات کا ۔ اگر وَعْدٌ کے ساتھ خیر یا شر کا ذکر نہ کیا جائے  
تو خیر کے لئے وَعْدٌ کہتے ہیں اور شر کے لئے اَوْعِدُ (لِطَائِفِ اللُّغَةِ) ۔  
الْمِيْعَادُ - وعدہ کا زمانہ یا مقام \* - مَوْعِدٌ کے معنی وعدہ اور عہد کے  
آئے ہیں، نیز وعدہ گاہ، وعدہ کا وقت \* - سورۃ کہف میں یہ لفظ ”وعدہ پورا  
ہونے کے وقت“ کے لئے آیا ہے (۱۸/۱) ۔

اَلْوَعِيدُ - حملہ کے وقت نذر اونٹ کا بڑبڑانا ۔ یہ لفظ ہر دھمکی  
اور تہدید کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ اَوْعِدْہُ اور تَوَعَّدْہُ کسی کو  
دھمکانا ۔ ڈراوا دینا \* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَاعْتَدْنَا مُوسٰی (۲/۵۱) ۔ اس میں اللہ کی طرف سے  
وقت مقرر کرنا اور حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اس کا قبول کرنا اور اتباع  
کرنا دونوں شامل ہیں ۔ اسی لئے یہ باب مُفَاعَلَتۃ سے آیا ہے ۔ ویسے  
مَوْاعِدۃ کے معنی باہمی عہد و پیمان کرنے کے ہیں ۔

خدا کے وعدوں سے مراد ہیں وہ نتائج جو اس کے قوانین پر عمل کرنے  
سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطا نہیں ہوتی ۔ اسی طرح ان قوانین  
سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں ۔

قرآن کریم میں اعمال صالحہ کے خوشگوار نتائج کے لئے بھی وَعْدٌ کا  
لفظ آیا ہے (۲۲/۵) ۔ اور غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج کے لئے بھی  
(۶۸/۱) ۔

سورۃ توبہ میں ہے اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعْدَہَا لِقَآءُہُ (۹/۱۱۳) ۔  
”(یہ) صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا“ ۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ خدا تم سے اس  
ہات کا وعدہ کرتا ہے ۔ یا خدا نے اس کا وعدہ کیا تھا ۔ تو اس کے معنی یہ

ہوں گے کہ خدا کے قانون ہر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا ”اپنے وعدہ“ سے خدا، اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جس طرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ”خدا کے وعدے سچے ہیں“ تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔

## وعظ

وَعِظَ کے معنی ہیں کسی کو کسی کام کے اچھے انجام اور مضر ہواقب و نتائج سے آگاہ کر کے اس کے دل کو نرم کرنا۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اَلْوَعِظُ کہتے ہیں انذار و تخويف کو۔ نیز اس طرح خیر کی باتیں بیان کرنا جس سے دل میں نرمی پیدا ہو جائے۔ صاحب محیط کے نزدیک اس کے معنی محض ”وعظ کہنے“ کے نہیں بلکہ حکم دینے کے ہیں۔ یعنی کسی کو کسی ایسی بات سے حکماً روک دینا جس کا انجام خراب ہو\*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی زجر و توبیخ کو کہتے ہیں جس میں ڈراوا بھی شامل ہو\*\*۔ قرآن کریم میں مَوْعِظَۃ کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حتیٰ کہ خود قرآن کریم کو بھی مَوْعِظَۃ مین رَکِّبِکُمْ (۱/۱۸۵) کہا ہے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ یعنی دوسروں کو غلط روش زندگی کے انجام و ہواقب سے متنبہ کر کے، اُس سے روکنا۔ اور (نظام کے اندر) افراد کو غلط کاموں سے حکماً (بذریعہ قانون) روکنا۔ چنانچہ سورہ نحل میں ہے اِنَّ اللّٰهَ یَسْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ . . . . . بِعِظَتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۱۶/۶۷)۔ اس میں پہلے امر کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اللہ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔ اور آخر میں بِعِظَتِکُمْ ہے۔ لہذا مومنین کے لئے خدا کا امر اور وعظ ایک ہی بات ہے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کا حکم، کسی ڈکٹیٹر کا مستبدانہ حکم نہیں ہوتا۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اسکی حکمت، علت غائی، مقصد، فائدہ بھی بتاتا ہے۔ حکم اور حکمت کے اس مجموعہ کا نام وعظ ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے وَمَا اَنْزَلْ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتَابِ وَالْحِکْمَۃِ بِعِظَتِکُمْ یہ (۲/۲۴۱)۔ خدا نے جو کتاب و حکمت (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے۔ یہ متقین

کے لئے مَوْعِظَتَہ ہے (۶۶)۔ ویسے اس کے ذریعے متنبہ ہر ایک کو کیا جائیگا۔ چنانچہ منافقین کے متعلق ہے فَاَعْمُرْ خُصْرًا مِّنْهُمْ (۶۳)۔ ان سے اعراض کر اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتا رہ، بڑے دلنشین انداز سے (۶۳)۔ لہذا غیر مسلموں کے لئے دین کی طرف دعوت کے سلسلے میں ”وعظ“ ہندو نصائح کے مرادف ہوگا، اور مسلمانوں کے لئے قرآنی احکام اور ان کے نظام کی طرف سے جاری کردہ ہدایات جن کے مقاصد و فوائد کو اس انداز سے سمجھایا گیا ہو کہ اس سے دل میں لیت و رقت پیدا ہو جائے اور وہ اس طرح ان پر عمل پیرا رہیں۔

## وعی

وَعَاهُ بِتَعِيْنِهِ وَعَيْيَا۔ نیز اَوْعَىٰ بُوْعَىٰ۔ اِئْتَعَاءُ۔ کسی چیز کو محفوظ کر لینا۔ یاد کر لینا۔ حفظ کر لینا۔ کسی چیز کو برتن میں جمع کر لینا۔ بالعموم وعی باتوں وغیرہ کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کے لئے آتا ہے اور اَوْعَىٰ اَشْيَاءَ اور مَاز و سَامَانَ کو محفوظ رکھنے کے لئے۔ اَلْوِعَاءُ (جمع اَوْعِيَتَہ) وہ چیز (برتن۔ تھیلا۔ بوری وغیرہ) جس میں دوسری چیزیں اکٹھی کر کے رکھی جائیں (۱۴)۔ سورہ معارج میں سَرْمَایَہ دارانہ ذہنیت والے کے متعلق ہے وَجَمَعَ فَاَوْعَىٰ (۹۹)۔ وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے بند کر کے رکھ لیتا ہے۔ سورہ انشراح میں ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَتَوَعَّوْنَ (۸۴)۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اس طرح جمع کر کے بند رکھتے ہیں۔ اُذُنٌ وَاَعِيَتَہ بات کو محفوظ رکھنے والا کان۔ یعنی جس کان میں جو کچھ پڑے پھر وہ اسے باہر نہ نکالے اور اس پر غور و فکر بھی کرے۔ سورہ حافہ میں ہے وَتَعِيَتَهَا اُذُنٌ وَاَعِيَتَہ (۶۶)۔ ”اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں“۔

## وفد

اَلْوَفْدُ۔ ریت کے اوپر سے جھکے ہوئے ٹیلے کی چوٹی۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جھانکنے اور نکلنے کے ہیں۔ اَلْوَفْدُ سب سے آگے نکل جانے والا (اونٹ)۔ اَلْوَفْدُ کسی چیز کا بلند ہونا اور اوپر سے جھکنا۔ تیز چلنا۔ جلدی کرنا۔ هُمْ عَلٰی اَوْفَادٍ۔ وہ لوگ سفر پر ہیں۔ اَلْوَفْدُ کسی کو کسی کے پاس ایلچی بنا کر بھیجنا۔

وَقَدْ فَلَّانَ\*۔ وہ کسی بادشاہ یا امیر کے پاس (ایلچی بنکر) پہنچا۔ اَوْقَدَ\* عَلَيَّہِ۔ اس نے اسے اس کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا۔ وُقُودٌ\*۔ بڑے لوگوں کے پاس عطایا لینے کے لئے جانا\*۔ اَلْوَقْدُ\*۔ وہ لوگ جو فتح کے جشن پر مبارکباد دینے کے لئے یا کسی اور موقع پر بادشاہ کے دربار میں پہنچیں\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَقْدُ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بادشاہوں کے پاس جاتیں\*\*\*۔

سورہ مریم میں ہے ہَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الْآرْحَمٰنِ وَقَدْ (۸۵)۔ جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے پاس بطور وَقْدِ اکٹھا کریں گے۔ اوپر دئے ہوئے معانی کے لحاظ سے وَقْدُ کے اندر بلندی اور عظمت، قرب اور مسابقت، عزت اور ہرگزیدگی، حصول عطایا و نوازشات اور وصول سماں نشو و نما سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ ہے متقین کے اعمال حیات کا نتیجہ اور اُن کا مقام۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ متقین کو سب سے اُگے رکھا جائیگا۔ اس میں بھی عزت اور ہرگزیدگی کا پہلو موجود ہے۔

## و ف ر

اَلْوَقْرُ مِّنَ اَلْمَالِ وَالْمَتَاعِ۔ وسیع پیمانہ پر کثیر مال و اسباب جن میں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ وَقَرَّ اَلْمَالُ\*۔ مال کثیر، باقراط اور پورا ہو گیا۔ اَرْضٌ وَقْرَاءٌ\*۔ وہ زمین جس میں بکثرت ہودے اور گھاس وغیرہ ہوں۔ وَقْرَهُ تَوَفِيرًا۔ اسنے اسکو بھرپور، کثیر اور مکمل کر دیا۔ اَلْوَقْرَاءُ\*۔ بھری ہوئی چیز۔ وہ پکھال جو پوری پکھال سے بنائی گئی ہو۔ اَلْوَاوِرَةُ\*۔ دنبہ کی بڑی چمکی (چمکی)۔ اَلْمَوَقُورُ\*۔ ہر وہ چیز جو مکمل ہو چکی ہو\*\*\*\*۔ قرآن حکیم میں ہے جَزَاءٌ مِّنْ وَّقْرًا\*۔ (۳۱)۔ پورا پورا بدلہ۔ جسمیں سے کچھ کم نہ کیا گیا ہو۔

## و ف ض

وَقَضَ يَفِضُ وَقَضًا۔ وہ تیزی سے دوڑا۔ اِسْتَوْقَضَ\*۔ اسنے جلدی کی۔ نَاقَةٌ مِيفَاضٌ\*۔ تیز رفتار اونٹنی۔ اصل میں اَلْاِفْضَاضُ کے معنی ترکش اٹھا کر تیزی سے بھاگنے کے ہیں۔ اسلئے کہ اَلْوَقْضَةُ\* چمڑے کا ترکش ہوتا ہے جسمیں لکڑی لگی ہوئی نہیں ہوتی۔ ویسے یہ اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں چرواہا اپنا توشہ وغیرہ رکھتا ہے\*\*\*\*\*۔

\*تاج۔ \*\*محیط۔ \*\*\*راغب۔ \*\*\*\*تاج و راغب و محیط۔ \*\*\*\*\*تاج و راغب۔

قرآن حکیم میں ہے ۔ کَاَنَّهُمْ اِلٰی نَصَبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۳۳)۔  
گویا وہ کسی نشان (Goal) کی طرف بھاگے جا رہے ہیں ۔

## و ف ق

اَلْوَقْفُ ۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونا ۔ ضرورت کے مطابق ہونا ۔ اَوْفَقْتَ الْاَبِلَ ۔ اونٹ سب برابر ہوئے اور ایک صف میں کھڑے ہو گئے ۔ اَلَا تَتَّفِقُ ۔ انسان کے عمل کا اندازے اور پیمانے (تقدیر) کے مطابق ہو جانا ۔ اَلتَّوْفِیْقُ ۔ اسباب کا مقصد کے مطابق کر دینا ۔ حصول مقصد کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے انہیں مہیا کر دینا ۔ موافقت پیدا کر دینا ۔ وَتَقٰی بَیْنَ الْقَوْمِ ۔ اس نے قوم کے درمیان صلح کرا دی ۔

سورہ نساء میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ان میں اصلاح کی کوشش کرو ۔ یُوَفِّیْقُ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا (۲۳) ۔ اللہ ان میں موافقت پیدا کر دیگا ۔ اعمال کے نتائج کو (سورہ النبا میں) جَزَاءً وَّ فَاقًا کہا گیا ہے (۶۸) ۔ یعنی عمل اور اس کے نتیجہ میں پوری پوری موافقت ۔ (قرآن حکیم کی رو سے جزا یا سزا خود عمل کے نتیجہ کا نام ہے) ۔ سورہ ہود میں ہے ۔ وَتَوَفَّیْقِیْ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۱۸) ۔ میرے بعض نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مل جانا ، یا ان میں صحیح موافقت پیدا ہو جانا ، قانون خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا اسکی کوئی صورت نہیں ۔ (۶۴) میں تَوَفَّیْقًا کے معنی سنوارنے اور سدھارنے کے ہیں ۔ یعنی اصلاح ۔ موافقت ۔

## و ف ی

وَفٰی الشَّیْءُ ۔ وفیتا ۔ وہ چیز مکمل ہو گئی ۔ پوری ہو گئی ۔ کثیر ہو گئی ۔ اسی سے وَفٰی وَاَفِ کے معنی ہیں مکمل اور کثیر ۔ اَوْفَانِیْ حَقِّیْ ۔ اس نے میرا حق پورا پورا دیدیا ۔ اُس میں کمی نہیں تھی ۔ یہی معنی وَفٰی کے بھی ہیں ۔ یعنی پورا پورا دیدینا ۔ اَسْتَوْفٰی فُلَانٌ حَقَّہُ ۔ اس نے اپنا حق پورا پورا لے لیا ۔ اَلْوَفٰی ۔ وہ شخص جو پورا پورا حق ادا کرے ۔ اور پورا پورا حق وصول کرے ۔ نیز بہت وفاشعار ۔ اَلْوَفَاءُ کے معنی ہیں وعدہ پورا کرنا ۔ عہد و پیمان کا لحاظ کرنا اور پاس رکھنا ۔ اَلْوَفَاةُ کے معنی ہیں موت ، یعنی دنیا میں زندگی کے دن پورے کر لینا ۔ تَوَفَّاهُ اللّٰہُ ۔ خدا نے اسے وفات دیدی ۔ اَلْوَقْفُ ۔ بلند زمین کو کہتے ہیں اور اَلْمَوَافِیْ ۔ اُس چیز کو جو آجائے یا اچانک نمودار ہو جائے ۔



قرآن حکیم میں ایسے عہد، نقض عہد کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۱۱)۔ اور (۳۳) میں وَفِیَّتْ کے معنی لَا یُظْلَمُونَ نے کر دئے ہیں۔ یعنی کمی نہ ہونا۔ پورا پورا مل جانا۔ سورہ ہود میں ہے وَأَنَّا لَمُسَوِّفُوهُمْ نَصِیْبُهُمْ غَیْرَ سَنَفُوْصٍ (۱۱۱)۔ اس سے تَوْفِیَّتْ کے معنی واضح ہو جائے ہیں۔ یعنی ہلا کسی قسم کی کمی کٹے پورا پورا دینا۔ سورہ نعل میں ہے وَاللّٰهُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفَّاکُمْ وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّمِرُّ دَلَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمْرِ (۱۱)۔ اس کے معنی ہیں، اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے۔ پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی بھرپور جوانی تک پہنچا دیتا ہے جس میں تمام قویٰ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچا دیتا ہے جس میں قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آجاتا ہے۔ یہ معانی، انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی پہلے پیدائش۔ پھر جوانی۔ پھر بڑھاپا۔ لیکن اگر یَتَوَفَّاکُمْ کے معنی ”وفات دیتا ہے“ کٹے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ بعض لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں۔

وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے حَتّٰی اِذَا جَاءَ اَحَدَکُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (۱۱)۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اُسے وفات دیدیتے ہیں۔ خدا کے قانون طبعی کے مطابق اس کے زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا قَاتَوْفَیْئَسْنٰی کُنْتَ اَنْتَ الْاَقْرَبُ عَلَیْهِمْ (۱۱۷)۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔

مُتَوَفَّی۔ وفات دہنے والا۔ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ (۵۳)۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں۔ اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ وَتَذَرُوْا وَتَذَرُ اللّٰهُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (۳۳)۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کر سکیں گے نہ صلیب دے سکیں گے۔ بلکہ تم اپنی طبعی موت مرو گے (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ)۔ یہ لوگ تمہیں صلیب دیکر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کریں گے (وَرَافِعُکَ اِلَیَّ)۔ اور یہ اس طرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے۔ (وَمُسْتَطَرِّکَ مِنَ الدِّیْنِ کَقَرُوْا)۔ (۳۳)۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے

کہ یہودی حضرت مسیحؑ پر ہاتھ ڈالتے، آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق، وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تھی خدا کی تدبیر جو کاسیاب ہوئی۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں ملیگی)۔

## و ق ب

الْوَقْتُبُ - پہاڑ یا چٹان میں گڑھا، جس میں پانی جمع ہو جائے۔  
الْوَقْبَةُ - ہموار میدان میں کنوئیں کی طرح ایک قدر آدم یا دو قدر آدم کے برابر گڑھا جس میں پانی جمع ہو جائے۔ پھر ہر گڑھے کے لئے بولا جائے لگا۔ الْوَقْبُ - کسی چیز کے اندر داخل ہو کر غائب ہو جانا۔ وَقْبَتِ الشَّمْسُ - سورج غروب ہو گیا۔ وَقْبَ الظَّلَامُ - تاریکی چھا گئی۔ یعنی لوگ اس کے اندر ڈوب کر غائب ہو گئے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا غائب ہونے کی جگہ غائب ہو جانا بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ (۱۱۳)۔ جب چاروں طرف سے تاریکیاں چھا جائیں۔ جب رات کی تاریکی میں آنے والی مصیبتیں گھیر لیں۔ (دیکھئے عنوان غ۔ س۔ ق)۔ لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ کے معنی ہیں ”ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو“۔ اور اس سے مراد ہیں وہ تمام چیزیں جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رک جائے، جیسے چاند جب ڈوب جاتا ہے تو نباتات کو ضرر پہنچتا ہے۔ ہماری ضروریات زندگی کے نہ ہونے سے جس قدر نقصانات ہمیں پہنچ سکتے ہیں، ہم ان سے محفوظ رہنے کے لئے، قانونِ خداوندی کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان نقصانات سے بچائے اور ہمیں سامانِ نشو و نما مہیا کر دے۔ (المقام المحمود)۔

## و ق ت

الْوَقْتُ - کسی کام کے لئے مقررہ زمانہ کی آخری حد۔ لہذا یہ لفظ ہے اندازہ زمانہ کے لئے نہیں بولا جاتا۔\*\* یعنی غہر معین عرصہ کو وقت نہیں کہہ سکتے۔ ہر چیز جس کے لئے اس طرح زمانہ متعین کر دیا جائے، مَوْقُوتٌ کہلاتی ہے۔ الْوَقْتُ وَالْمَوْقُوتُ - وقت مقرر کرنا۔ الْمَوْقُوتَاتُ - مقررہ وقت کو بھی کہتے ہیں اور مقررہ مقام کو بھی۔ چنانچہ مَوْقُوتَاتُ الْحَاجِّ - حاجیوں کے احرام باندھنے کے مقام کو کہتے ہیں\*\*\*۔

\* تاج و محیط و راغب - \*\* راغب - \*\*\* تاج -

قرآن کریم میں ہے وَ اِذَا الرُّسُلُ اُفْتِیَّتَتْ (۶۶) - جب رسولوں کا وقت مقرر کر دیا جائے گا۔ سورۃ نساء میں صَلَوة کے متعلق کِتَابًا مَّوْقُوتًا (۲/۱۸۳) کہا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ”خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ“ اور دوسرے معنی ہیں ایسا فریضہ جس کا وقت متعین کر دیا گیا ہو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْقُوتُ - حد مقرر کردہ چیز کو کہتے ہیں۔ یعنی جس کی حد مقرر ہو۔ سورۃ بقرہ میں نَمِیْ جَانِدَ کے متعلق ہے۔ هِیْ مَوْاقِیْتُ لِلنَّاسِ (۲/۱۸۹) - یہ لوگوں کے لئے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہیں (مِیْقَات کی جمع مَوْاقِیْتُ)۔ سورۃ نبا میں یَوْمَ الْفَصْلِ کے متعلق ہے كَانَ مِیْقَاتًا (۹۸/۱۸) - یعنی قانون مکافات کی رو سے ظہور نتائج کا وقت متعین ہوتا ہے۔

## وق د

وَقَدْ - آگ کو کہتے ہیں، اور آگ کے روشن ہونے کو بھی۔ وَقُودٌ - لکڑیوں کو کہتے ہیں جن سے آگ جلائی جائے۔ صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ اَلْحَطَطَبُ - ایندھن کی لکڑیوں کو کہتے ہیں۔ اور وَقُودٌ اس وقت کہتے ہیں جب ان لکڑیوں کو ساکا دیا جائے۔ اَوْقَدْ - اور اِسْتَوْقَدَ - آگ روشن کرنے کو کہتے ہیں\*۔

روح المعانی میں ہے کہ عربوں میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند پہاڑی پر آگ جلا دیتے۔ اس کو نار الحرب کہتے تھے (۶۳)۔ قرآن کریم میں اِسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۶۶) میں آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں اَوْقَدْ بِمَقَابِلِهِ اَطْفِیْاَ آیا ہے۔ (۵/۶۳)۔ اَطْفِیْاَ کے معنی آگ بجھا دینے کے ہیں۔ سورۃ قصص میں تَذْکَرُہُ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ قَسَا وَقِیْدٌ لِّیْ یٰلَہْمَا سَنُ عٰلٰی الطَّیِّیْنِ (۲۸/۳۸)۔ جس سے مراد اینٹوں کا آگ میں پکانا ہے۔ وَقُودٌ - ایندھن (۲۸/۶۶ و ۸۵)۔ مَوْقِدَةٌ (۱۶۴) جلائی ہوئی۔

## وق ذ

اَلْوَقْدُ - شدتِ ضرب - بھائر میں ہے کہ مَوْقُودٌ ذَہْ - اس جانور کو کہتے ہیں جسے لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اور ذبیح نہ کیا جائے اور جس پتھر سے اسے مارا جائے اس میں دھار نہ ہو\*۔ جاہلیت میں اس طرح مرے

ہوئے جانور کو کھالیا کرتے تھے\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لکڑی سے مارنے کے لکھے ہیں۔ اور مَوْقُوذَةٌ - جسے لکڑی کی ضرب سے مار ڈالا گیا ہو۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۳۱۰)۔ ابو سعید نے کہا ہے کہ اَلْمَوْقُذُ کا مطلب ہے گڈی کے اوپر اس زور سے مارنا کہ اس سے دماغ ماؤف ہو جائے\*۔

قرآن کریم نے اَلْمَمِيتَةُ (مردار) کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی ہے کہ مردار میں صرف وہی جانور شامل نہیں جو طبعی موت مر جائیں۔ اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو کلا گھٹ کر مر جائے۔ جو چوٹ کھا کر مر جائے (اَلْمَمِيتَةُ)۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے۔ جو سینگ لگ کر مر جائے۔ یا جسے درندوں نے کھایا ہو۔ ہاں، اگر ان میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا۔ (۳۱۰)۔

## وقر

اَلْوَقْرُ - کان میں بھاری پن ہونا۔ یا سماعت کا بالکل جانے رہنا\*\*۔ قرآن کریم میں ہے وَرَفِيَ اَذْنَاهُمُ وَقَرَّ ا (۲۷)۔ اَلْوَقْرُ - بھاری بوجھ۔ اَلْوَقْرَارُ - سنجیدگی، بھاری بھرکم پن، عظمت۔ جَنَّاتُ وَاْقِرَّ - باہمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرا نہ اٹھے\*\*۔ اس سے بھی وَقَارُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے مَالِكُمْ لَا تَسْرِجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۲۱)۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا سے وقار کے امیدوار (طلبکار) نہیں ہوتے۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ پگڑے۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں درست ہوگا جب اللہ کے معنی میں اللہ (اللہ سے) لئے جائیں۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ تم اللہ کے لئے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے۔

وَقَرَّ - کسی کی تعظیم کرنا۔ تَعَزَّرَ رَوْهٌ وَتَوَقَّرَ وَهٌ (۲۸)۔ اسے تقویت پہنچاؤ اور اس کی تعظیم کرو۔ سورۃ احزاب میں ازواج مطہرات سے کہا گیا ہے۔ وَقَرْنَ رَفِیْ بَيُّوتِكُنَّ (۳۳)۔ اپنے گھروں میں نہایت سنجیدگی اور وقار سے رہو۔ تم سے ذرا بھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہ ہو۔ یعنی یہ وَقَرَّ سے ہے۔ لیکن ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ وَقَارُ سے ہے جس سے امر قیر آتا ہے۔ جیسے وَعْدٌ سے عِدٌ آتا ہے\*\*\*۔

\*تاج - \*\*تاج و محیط و راغب - \*\*\*ابن فارس۔

## وق ع

وَقَعَ يَتَقَعُ - وَقُوعًا - چیز گر پڑی - وَقَعَتِ الْاِبِلُ - اونٹ بیٹھ گئی - وَقَعَ رَيْبُغٌ بِاِلَارِضِ - بہار کی پہلی بارش برسی - مَوَاقِعُ الْغَيْثِ - جن مقامات پر بارش برسی ہو - وَقَعَتِ الطَّيْرُ - پرندے اڑنے اڑنے کسی درخت یا زمین پر اتر پڑے - اَلْوَقْعُ - پتھر - اَلْوَقِيعَةُ - اَلْوَقِيعَةُ - جنگ، معرکہ - وَقَائِعُ الْعَرَبِ - عربوں کے ایام جنگ - اَلْوَقِيعَةُ - ہتوڑا\* - راعب نے کہا ہے کہ اَلْوَقُوعُ کسی چیز کے ثابت ہونے اور گرنے کو کہتے ہیں - اَلْوَقِيعَةُ ایسا واقعہ جس میں سختی اور ناگواری پائی جائے\*\* - زجاج نے کہا ہے کہ ہر آنے والی چیز جس کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ ضرور آئیگی - اسے وَقِيعَةٌ کہہ دیتے ہیں\* -

قرآن کریم میں ہے وَ يُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ (۲۲) - خدا نے (اپنے قانون کے مطابق) بارش کو روک رکھا ہے کہ وہ یونہی از خود زمین پر نہ گر پڑے - سورہ نساء میں ہے - وَقَعَ آجُرُهُ عَلَى اللَّهِ (۱۶۳) - اس کا اجر اللہ پر واجب ہو گیا - سورہ اعراف میں ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ (۱۶۸) - حق محسوس شکل میں سامنے آ کر ثابت ہو گیا - سورہ الطور میں ہے اِنْ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۵۲) - خدا کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا - دوسرے جگہ ہے اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۱۶) جب ہو جانے والی بات ہو جائیگی - لَيْسَ لِيَوْقَعَتِيهَا كَذِبَةٌ (۵۶) اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں - مَوَاقِعُ - واقع ہونے کی جگہیں (۵۶) - مَوَاقِعُ (اسم فاعل) - گر پڑنے والا (۱۸) - اَوْقَعَ - ڈال دینا - (۵۶) -

## وق ف

وَقَفَ بِالْمَكَانِ يَتَقِفُ - وَقُوفًا - وہ اس جگہ پر برابر کھڑا رہا - وَقَفْتُهُ - وَقَفًا - میں نے اسے ٹھہرا دیا\*\*\* - قرآن کریم میں ہے وَقِفُوهُمْ (۲) انہیں ٹھہراؤ - اَلْمَوْقِفُ - ٹھہرنے اور کھڑے ہونے کی جگہ - اَلتَّوْقِيفُ فِي الْحَدِيثِ - بات کو واضح کرنا\*\*\* - اصطلاحاً التَّوْقِيفُ کسی بات کو معین کرنے کے لئے بولا جاتا ہے -

## وق ی

وَقَلَى الشَّقِيُّ يَتَقَيُّهُ وَقَيَّأُوْ وَ قَيَّيَّةٌ - کسی چیز کی حفاظت کرنا - فکھبانی و نکہداشت کرنا - اسے مضر اور تکلیف دہ چیز سے بچانا - چنانچہ جب

گھوڑا چلتے وقت نعل نہ ہونے کی وجہ سے سنبھال سنبھال کر پاؤں زمین پر رکھے، خواہ اپنے سم میں درد کی وجہ سے ہو، یا سم کے چھل کر زخمی ہونے اور زمین کے سخت ہونے کی وجہ سے، تو اسے وَقَى الْفَرَسَ مِنَ الْحَفَا كَمَنْتَ هِيَ \*۔

وَقَايَة \*۔ احتیاط۔ یا محفوظ رکھنے کا ذریعہ (Preservative) \*\*۔  
سَرَج \* وَاَقِ۔ ایسی زین جو گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ٹھیک بیٹھ جائے اور اسے زخمی نہ کرے \*\*۔

قرآن کریم میں وَاَقِ بمعنی محفوظ رکھنے والا، بچانے والا آیا ہے۔  
مَاتَكَ مِّنَ اللَّهِ مِّنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاَقِ (۱۳۳) ”تیرے لئے اللہ کے مقابلہ پر نہ کوئی سرپرست ہوگا۔ نہ بچانے والا“۔ دوسرے مقام پر یہ مادہ محتاط رہنے اور اپنی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ (۲۴) اپنے آپ کو عذاب آتش سے محفوظ رکھو۔ یا اس سے محتاط رہو۔ وَاتَّقُوا اللَّهَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ احکام خداوندی کا اتباع کرنا۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ ان سے ہم آہنگ رہنا۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ مفہوم دیگر مقامات میں واضح کر دیا ہے۔ سورہ مائدہ میں تَتَّقُوای کے مقابلہ میں عُدُّوْاْ اَنْ کا لفظ آیا ہے (۵)۔ اور عُدُّوْاْ اَنْ کے معنی سرکشی کے ہیں۔ لہذا تَتَّقُوای کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہو۔ سورہ آل عمران میں اسکی مزید تشریح کر دی گئی ہے جہاں فرمایا یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (۱۳۱)۔ اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ وَلَا تَمُوتُوْا تَنْ لَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۱) یعنی تمام عمر قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو۔ بالفاظ دیگر اَعْبُدُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا (۱۳۳)۔ سب کے سب مل کر اللہ کے ضابطہ ہدایت کے ساتھ متمسک رہو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (قرآن کریم) سے ہم آہنگ رہنا۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کرنا۔ اسی لئے سورہ شعراء میں مُّتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں غَاوِیْنَ آیا ہے (۹۱-۹۶)۔ غَاوِیْنَ وہ جو قوانین الہیہ کی راہ نمائی چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیں اور مُّتَّقِیْنَ وہ جو اسکی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں۔ قوانین خداوندی کی اس کامل ہم آہنگی کے اعتبار سے سورہ ص میں مُّتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارَ کا لفظ آیا ہے (۳۸)۔ فَاجِرٌ وہ

ہے جو پھٹ کر الگ ہو جائے (دیکھئے ف - ج - ر) لہذا متقی وہ ہے جو اس ضابطہ کے ساتھ متمسک رہے - اسکے ساتھ چمٹا رہے - اس سے ہم آہنگ رہے - پھٹ کر الگ الگ ہو جائے (Disintegration) اور ہم آہنگ رہنے (Integration) کے مفہوم کے اعتبار سے سورہ الشمس میں ہے کہ خدا نے نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) میں یہ دونوں صلاحیتیں رکھ دی ہیں -

فَاتَّخَذْتُم مِّنْهَا فُجُورًا ۖ هَآؤُا تَقْوًى مِّنَ (۱۸) چاہے تم انسان ضابطہ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت و انتشار پیدا کر لے - انہی دونوں گروہوں کے متعلق سورہ محمد میں ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنے ہی خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتے ہیں (۱۴) - لیکن دوسرا گروہ ان کا ہے جو قوانین خداوندی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں - اس دوسرے گروہ کو ان کا تقویٰ مل جاتا ہے (آتْلٰہُمْ تَقْوًى اٰہُمْ - ۱۴) - لیکن یہ اسی کو ملتا ہے الَّذِیْ یُؤْتِیْ سَالٰہُ یَتَزَكٰی \* (۱۸-۱۶) - جو اپنا مال (یا جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد (۱۹-۱۶) اسکے پاس ہے وہ نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) دیدہ پتا ہے اور اس طرح خود اپنی ذات کی نشوونما (Development) کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے \* -

لہذا مَحْقِقِیْنَ وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کر کے اپنی ذات کی نشوونما کریں - تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تَقَاۃ) کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقْوًى) - ان کا ہر وقت خیال رکھے - (تَقْوًى الْقُلُوْب) اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے - اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے - ایسا تمسک جیسے زین گھوڑے کی پیشہ پر فٹ آجاتی ہے اور اسے زخمی نہیں ہونے دیتی -

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ یہ ہُدًی لِّلْمُحْقِقِیْنَ (۲) - ہے - یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خسار دار وادیوں سے محفوظ رہ کر جانا چاہیں - جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح طور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے - خود کشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا

بہلک ہوتا ہے، اس سے بچنا، بے سود ہوتا ہے۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲۶)۔ ”ان کے لئے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ وہ صحیح بات کو مانینگے ہی نہیں۔“ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں دیکھنا چاہئے کہ کہاں اس کے معنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہیں اور کہاں تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچنا۔ مثلاً وَقَيْنَا عَذَابَ النَّقَارِ (۲۶)۔ قَسُوا أَنْفُسَكُمْ (۲۶) مِّنْ يَّشُوقِ شُحًّا نَّفْسِيهِ (۵۹)۔ وَفِيهِمُ السَّيِّئَاتِ اور مِّنْ تَقَى السَّيِّئَاتِ (۲۶)۔ میں معنی بچانے کے ہیں۔ لیکن وَاتَّقُوا اللَّهَ (۵۹) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی کو تَقْوَىٰ کہتے ہیں۔ اور جو اتَّقَى (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے (۲۶)۔

حقیقت یہ ہے کہ تَقْوَىٰ قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اسقدر اہمیت دی ہے کہ یہ بجائے خویش گو یا ایک مادہ بن گیا ہے جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے۔ اس کے معنی ”پرہیزگاری“ نہیں۔ ”پرہیزگاری“ محض سلبی صفت (Negative virtue) ہے لیکن تقویٰ میں زندگی کی تباہیوں سے بچکر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے۔ یعنی اس میں سلبی صفت کے ساتھ ایجابی پہلو (Positive side) بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے۔ لفظ ”تقویٰ“ اسقدر جامع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں ہو نہیں سکتا۔ جس چیز کو عام طور پر کیریئٹر (سیرت اور کردار کی بلندی) کہا جاتا ہے، وہ اس کے اندر آجاتی ہے۔ ”کیریئٹر“ کی تعریف (Definition) (۲۷) مشکل ہے اور خود مغرب کے علمائے اخلاقیات بھی اس باب میں باہم دگر متفق نہیں۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل عقدہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، انسان کی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک حیوانی سطح زندگی جس کے تقاضے وہی ہیں جو دوسرے حیوانات کے ہیں۔ تحفظ خویش (Self-Preservation)؛ تغلب (Self-Assertion) اور افزائش نسل (Procreation)۔ تحفظ خویش کا جذبہ اسقدر قوی اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی سے تمام کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

دوسری سطح زندگی وہ ہے جسے ”انسانی زندگی“ کہہ لیجئے۔ اس زندگی میں مقصد، انسانی ذات کی نشو و نما ہونی ہے۔ یہ نشو و نما ان بلند اور



مستقل اقدار (Permanent Values) کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ حیوانی سطح زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے (یعنی کسی بلند قدر) میں تصادم ہو جائے، (ان میں Tie) پڑ جائے، تو، حیوانی زندگی کے تقاضے کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا چاہئے۔ یہ ”تھوڑی“ ہے۔ اس کو کریکٹر کہتے ہیں۔ (نیشنل کریکٹر نہیں بلکہ انسانی کریکٹر)۔ حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ بلند قدر کی حفاظت کے لئے جان تک بھی دینی پڑ جائے تو جان دیدے اور انسانی قدر کو بچا لے۔ اس لئے کہ جان کا تحفظ بہر حال حیوانی سطح زندگی کا تقاضہ ہے۔ اور بلند قدر کی قیمت اس سے زیادہ ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کو محض حیوانی زندگی (Physical Life) سمجھتے ہیں اور انسانی سطح زندگی (انسانی ذات) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ کافر ہیں۔ (۲۴۹/۱۳۸)۔ انسانی ذات پر ایمان رکھنا مومن کی خصوصیت ہے۔

قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال رکھنا اور نقصان سے بچنا عقل کا تقاضا ہے۔ جو اپنا نفع نقصان نہ پہچانے اسے ہاگل کہتے ہیں۔ چونکہ مومن کے نزدیک، انسانی ذات کا تحفظ، حیوانی زندگی کے تحفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے جب ان دونوں تقاضوں میں تصادم ہو جائے، تو اس کی عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی قیمت کی شے (انسانی ذات) کی حفاظت کے لئے چھوٹی قیمت کی شے (حیوانی تقاضے) کو قربان کر دے۔ لہذا، صحیح عقل و فکر کے مالک مومن ہی ہوتے ہیں (۱۳۸/۱۳۸)۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا (۱۳۸/۱۳۸)۔ ”اے عقل والو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو“۔ یعنی بلند اقدار کی خاطر ہست اقدار کو قربان کر دینا تقاضائے عقل و ایمان ہے۔ قرآن کریم انسان میں کریکٹر پیدا کرنے کے لئے خالی جذبات سے اپیل نہیں کرتا۔ وہ علم و بصیرت (Reason) سے اپیل کرتا ہے اور عقل کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا خود اس کے لئے کس قدر مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دھوت دیتا ہے (۱۳۸/۱۳۸)۔ اور مومنین کی خصوصیت یہ پشاقا ہے کہ وہ، اور تو اور، قوانین خداوندی کے سامنے بھی انیدھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے۔ (۲۴۹/۱۳۸)۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقویٰ۔ اور انہیں کہتے ہیں متقین۔

## و ک ا

تَوَوَّكَتًا عَلٰی الشَّيْطٰنِ - اس نے اس چیز پر سہارا لیا اور ٹیک لگائی۔ اَلتَّشْكَاةُ\* - لاٹھی، جس پر چلنے میں ٹیک لگائی جاتی ہے۔ بہت سہارا لینے والا آدمی\*۔ سورۃ طہ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا میں عَصَايَ اَتَوَكَّوْا عَلَیْهَا (۲۸)۔ یہ میرا عصا ہے جس پر میں سہارا لیتا ہوں۔ (اس کے مجازی معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ احکام و ضوابط مجھے ملے ہیں وہ میرے لئے عصائے زندگی ہیں جن کے سہارے میں سفر حیات طے کروں گا)۔ سورۃ طور میں ہے۔ مُتَّكِئِينَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْنُوفٍ لَّهُمْ (۵۲)۔

سورۃ یوسف میں (عزیز مصر کی بیوی کی ضیافت کے سلسلہ میں ہے) وَ اَعْتَدَتْ لَّهِنَّ مَتَّكًا\* (۱۲)۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس میں مُتَّكًا کے معنی اس چیز کے ہیں جس پر کھانے پینے یا بات کرتے وقت ٹیک لگائی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی خود کھانے (طعام) کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اَتَّكَا\* نَا عِنْدَ زَيْدٍ۔ ہم نے زید کے پاس کھانا کھایا\*۔

## و ک د

اَلْوِکَاد - وہ رستی جس سے دودھ دوھتے وقت گائے کے پیروں کو باندھ دیتے ہیں۔ نیز تسمہ جس سے زین کستے ہیں۔ اَلتَّوَاکِیْدُ - اَلتَّاکِیْدُ - اَلْمِیَاکِیْدُ - وہ جمرے کے تسمے جن سے زین کے اگلے یا پچھلے (حصے کو) کس کر باندھ دیا جاتا ہے۔ وَ کَیْدُ الرَّحْلِ - اس نے کجاوہ کو کس کر باندھ دیا۔ وَ کَیْدُ الْعَهْدِ وَ الْعَقْدِ وَ اَکْیْدَ هَمًا - اس نے عقد اور معاملہ کو بہت محکم اور موثق (پختہ) کر دیا۔ گرہ کو بہت سختی سے باندھ دیا\*\*۔

خلیل نے کہا ہے کہ اَکْیْدُتُ قسموں کی پختگی کے لئے زیادہ مناسب ہے اور وَ کَیْدُتُ باتوں کی پختگی کے لئے\*\*\*۔ بعض نے کہا ہے کہ تَاکِیْدُ کی نسبت تَوَکِیْدُ زیادہ فصیح ہے\*۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَنْقُضُوا اَلْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوَکِیْدِهَا (۱۶)۔ اپنی قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو۔

\* تاج و محیط - \*\* تاج و محیط و راعب و ابن فارس - \*\*\* راعب -

## و ک ز

اَلتَّوَكُّلُ - دھکا دینا - گھونسا مارنا - ضرب لگانا - ٹھوڑی پر مکا۔  
 مَارَانَا - وَكَزَهُ بِالرَّمْحِ - اس نے اس کے نیزہ گھونپا۔ وَكَزَتْ اَنْفَهُ  
 میں نے اس کی ناک توڑ دی\*۔ سورۃ قصص میں ہے قَتَلُوا كَزَهُ مُوسٰی  
 (۲۸/۱۵)۔ موسیٰ نے اسے گھونسا مارا۔ (مفہوم مارنے کا ہے)۔

## و ک ل

رَجُلٌ وَكَلٌ یا مَوَکَلٌ - اس آدمی کو کہتے ہیں جو خود کمزور  
 ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے۔ تَوَکَّلُوا تَوَکَّلًا -  
 لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنے شروع کر دیے۔ اَتَّكَلْ عَتَلِيْهِ  
 فِیْ اَمْرٍ - اس نے اپنے معاملہ میں اس پر اعتماد کیا۔ اَوْ کَلَّتْ عَتَلٰی  
 اَخِيْثَکَ التَّعَمُّلَ - میں نے تمام کام تمہارے بھائی پر چھوڑ دیا۔ اس  
 کے سپرد کر دیا۔ اَلتَّوَكُّلُ - اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے  
 آدمی کے کام کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے\*\*۔ نیز یہ کَفَّیْلٌ کے معنی  
 میں بھی آتا ہے۔ یعنی کسی بات کا ذمہ دار\*\*\*۔

ہمارے ہاں تَوَکَّلْ عَتَلٰی اللہ کے معنی یہ لائے جاتے ہیں کہ انسان  
 خود کچھ نہ کرے اور اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کے لئے از خود سب  
 کچھ کر دے گا۔ توکل کا یہ مفہوم قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے جو ہر  
 قدم پر سعی و عمل اور جد و جہد کی تاکید کرتا ہے۔

آپ ایک آدمی کو سمندر میں پھینک دیجئے۔ وہ تیرنا نہ جانتا ہو تو  
 ڈوب کر مر جائے گا۔ آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پانی میں ڈال دیجئے، وہ  
 جھٹ پانی کے نیچے چلا جائے گا۔ لیکن اگر آپ اسی لوہے کی چادروں سے ایک  
 خاص قاعدے کے مطابق ایک عظیم القدر جہاز بنا لیں تو وہ سینہ بھر پر بط کی  
 طرح تیرتا چلا جائے گا۔ اور اس میں اگر ہزار آدمی بھی سوار کر لیں تو بھی  
 وہ نہیں ڈوبے گا۔ (بشرطیکہ یہ وزن اس حد کے اندر ہو جسے وہ قاعدے کے  
 مطابق اٹھا سکتا ہے)۔

آپ جہاز کو سمندر میں کس اطمینان سے چلائے رہتے ہیں۔ اور کس  
 اطمینان سے اس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ اطمینان کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟

\*تاج و محیط و راغب - \*\*تاج - \*\*\*راغب -

اس ”ایمان“ سے کہ یہ جو قانون خداوندی ہے کہ اتنی جسامت کا جہاز اگر ہانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قدر وزن لے کر تیرتا رہیگا، یہ قانون کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس قانون پر ہورا ہورا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ راستے میں دھوکا نہیں دے گا۔ یہ آسرا ٹوٹے گا نہیں۔ یہ سہارا دغا نہیں دے گا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس طرح شارجی کائنات میں قوانین خداوندی جاری و ساری ہیں جن پر ہورا ہورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے جو قانون خدا نے عطا کیا ہے (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اس کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم اس کے مطابق چاو گے تو جس نتیجہ کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ یقیناً برآمد ہو کر رہے گا۔ اس کا نام ”تَوَكَّلْ“ عَمَلِی اللہ ہے۔ اور انہی معنوں میں خدا اَللّٰہُ وَکَیْلٌ ہے۔ یعنی جس کے قانون پر ہورا ہورا بھروسہ کیا جائے۔ عزم (کسی کام کے کرنے کا محکم ارادہ) اس توکل کی لازمی شرط ہے (۱۵۸)۔ جماعت مومنین وہ ہے جو اپنے عزم و ارادہ کے ساتھ قانون خداوندی کی محکمیت پر ہورا ہورا بھروسہ کرے۔ انہی کو مَتَوَكِّلِیْنَ کہا گیا ہے (۱۵۸)۔ جو اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون پر بھروسہ کرے وہ مشرک ہے۔ (۹۹:۱۰۰)۔

وَكُلِّ کے معنی ہیں معاملہ کسی کے سپرد کر دینا (۹۷)۔ سورۃ سجدہ میں ہے وَکَیْلٌ بِکُمْ (۱۱۱)۔ جس کے تم سپرد کئے گئے ہو۔

## و ل ت

اَلْوَلٰیۃ کے معنی ہیں نقصان اور کم کرنا۔ وَلَیْعَہُ حَقَّہُ، ہَلِیْعَہُ۔ اَوَلٰیۃ اس نے اس کا حق کم کر دیا۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَلِیْۤتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ (۱۳)۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم کر کے نہیں دے گا۔ سورۃ طور میں ہے مَا اَلْتَنٰہُمْ مِّنْ عَمَلِہِمْ (۵۲)۔ ان کے اعمال سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے۔ (اسے ل۔ ی۔ ت کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے)۔

## و ل ج

وَلَجَ۔ یَلِجُ۔ داخل ہونا۔\*\*۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَلُوْجُ کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں\*\*\*۔ اور بعض کے نزدیک اس

کے معنی آہستہ آہستہ داخل ہونے کے ہیں \*۔ اَلْوَلِيَّيْنِجَسَدٌ\*۔ (واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے)۔ دلی دوست۔ مخلص دوست۔ وہ شخص جو تمہارے خاندان سے تو نہ ہو لیکن تم اسے بہت ہی قابل اعتماد سمجھو (تمہارے اندر گھسا ہوا) رازدار (۱/۶)۔ سورۃ سبا میں وَلَجَ کے بمقابلہ خَرَجَ آیا ہے (۳۳)۔ دیگر مقامات پر ہے يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ (۳۶ و ۳۷)۔ اس میں يُولِجُ کے بجائے تُولِجُ ہے۔ وہ رات کو دن کے اندر داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات کے اندر۔

## ولد

اَلْوَلَدُ\*۔ جسے کسی نے جنا ہو۔ (مذکر۔ مونث۔ واحد، تثنیہ، جمع۔ سب کے لئے یہ لفظ آتا ہے۔ نیز جمع کے لئے اَوْلَادٌ\*۔ وَلَدَةٌ\*۔ اور وَلَدٌ\* بھی مستعمل ہیں)\*\*۔ لیکن یہ لفظ بچہ کے لئے اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب وہ ابھی رحم مادر میں ہو\*\*\*۔ اَلْوَلِيدُ\*۔ جب تک بچہ جھوٹا رہے، نیز غلام یا ملازم (جمع وَلَدَانٌ\*)۔ اَلْوَالِيدُ\*۔ باپ۔ اَلْوَالِدَةُ\*۔ ماں۔ اَلْوَالِدَانِ\*۔ ماں باپ۔ مَوْلِيدٌ\*۔ ولادت کا مقام اور وقت۔ مِيْلَادٌ\*۔ ولادت کا وقت\*\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْوَلَدُ\* کے معنی ہیں بغیر ماں باپ کے کسی جاندار کا وجود پذیر ہو جانا جیسے گرمی کے موسم میں ہندو ہانی میں جراثیم (یا اور ذی حیات) پیدا ہو جاتے ہیں\*\*\*۔ (یہ غالباً اس زمانے کی اصطلاح ہے جب جراثیم کے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچی تھیں ورنہ یہ جراثیم بھی بغیر ”ماں باپ“ کے پیدا نہیں ہوتے۔ اگرچہ ان کی پیدائش کا طریقہ عمل تَوْلِيدٌ سے مختلف ہوتا ہے)۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق متعدد مقامات پر ہے کہ اس کا وَلَدٌ\* نہیں (۱/۶)۔ اس سے صرف عیسائیوں کے اس عقیدہ ہی کی تردید مقصود نہیں جس کی رو سے وہ حضرت عیسیٰ\* کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ کہنا بھی ہے کہ خدا نے کائنات کو تَوْلِيدٌ\* کے سلسلہ سے پیدا نہیں کیا (جس طرح ماں باپ کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے) بلکہ اس نے اسے تخلیقاً پیدا کیا۔ تولید (Pro-creation) میں، پیدا کرنے والے (وَالِدٌ\*) کا ایک جزو، مَوْلُودٌ\* (جو جنا گیا ہو اس) میں شامل ہوتا ہے۔ اور والد میں اتنے حصے کی کمی آ جاتی ہے۔ لیکن تخلیق (Creation) میں پیدا کرنے والے (خالق) کی ذات کا کوئی جزو اس کی مخلوق میں نہیں آتا۔ اس لئے عمل

تخلیق سے اس کی ذات میں کسوٹی کمی (Deficiency) واقع نہیں ہوتی۔ خدا خالق ہے اور وہ انسانوں سے بھی تخلیق چاہتا ہے۔ باقی رہا عمل تولید، سو یہ ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں۔ آدمی، انسانیت کی سطح پر عمل تخلیق سے آتا ہے اور صرف تولید (اولاد پیدا کرنے) سے وہ حیوانی سطح پر رہتا ہے (اگرچہ افزائش نسل کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ جس طرح تحفظ خویش کے لئے کھانا، پینا ضروری ہے)۔ لہذا، انسان کو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نے ”تخلیق“ کس قدر کی ہے۔ نہ یہ کہ اس نے ”تولید“ کتنی کی ہے۔ کتنے بچے پیدا کئے ہیں۔ تخلیق، فریضہ انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کے علاوہ اور خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ وہ خدا کو أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۲۳/۱) کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی تمام خالقین میں سب سے بہتر خالق۔ وہ جس کی تخلیق حسن کی انتہائی شکل لئے ہو۔

صاحب لطائف اللغة نے لکھا ہے کہ الْوَلَدُ کا استعمال بیٹے اور بیٹے کے بیٹے (وَلَدُ الْوَلَدِ - یعنی پوتے) سب کے لئے ہوتا ہے (لیکن الْمَوْلُودُ صرف اسے کہہینگے جو براہ راست کسی کا بیٹا ہو)۔ قرآن کریم نے احکام وراثت کے ضمن میں کہا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰوْلَادُكُمْ (۱۱/۳)۔ اَوْلَادُكُمْ کی جمع ہے۔ لہذا اس سے مراد صرف اپنے بیٹے اور بیٹیاں ہی نہیں بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں۔ اگر کسی متوفی کا بیٹا زندہ ہے تو وہ اس کا وَلَدٌ ہوگا۔ اور اگر بیٹا پہلے مر چکا ہے لیکن اس کا پوتا (بیٹے کا بیٹا) زندہ ہے تو وہ بھی اس کا وَلَدٌ ہوگا اور وہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا۔ اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی اَوْلَادٌ میں شامل ہوگی۔ اسی طرح والدین سے مراد صرف ماں باپ نہیں ہونگے بلکہ یہ سلسلہ اوپر تک چلا جائیگا۔ یعنی دادا۔ نانی وغیرہ۔

سورۃ بقرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔ اس کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آ رہا ہے۔ اس ضمن میں کہا کہ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ (۲۴/۲)۔ مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں کے کھانے پینے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مَوْلُودٌ لِّہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی وہ جس کے لئے اس عورت نے بچہ جنا تھا۔ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو یہ الفاظ اس کے لئے ہونگے۔ اگر وہ نہیں تو اس کی جگہ جو اس کا (مذکر) وارث ہوگا یہ الفاظ اس کی طرف رجوع کر جائیں گے۔

## ولی

الْوَلِيُّ - کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا۔ ابن قاری نے بھی یہی اس مادہ کے بنیادی معنی بتائے ہیں۔ دَارٌ وَكَلِيَّةٌ - قریب گھر\*۔ قریب ہونے کے اعتبار سے الْوَلِيُّ کے معنی ہوتے ہیں دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بغیر فصل (ساتھ ہی) ہونا\*\*۔ رَاغِبٌ نے کہا ہے کہ الْوَلَاءُ وَالْتَوَالِي کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اسطرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، اور اس جہت سے استعارۃً یہ قرب کے لئے استعمال ہوتا ہے\*\*\*۔ وَلِيَّتُ الرِّضِّ - زمین پر موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد بارش برسی۔ اَوَّلِي لَكَ فَتَوَلَّى کے معنی ہیں خرابی اور تباہی تمہارے قریب پہنچ چکی ہے یا ساتھ ہی لگی ہوئی ہے۔ یہ زجر و عید اور توبیخ کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کام ہاتھ سے نکل جانے والے قائدے پر افسوس دلانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ هُوَ اَوَّلِي بِكَذَا۔ وہ اس کا زیادہ حق دار ہے، زیادہ لائق و مستحق ہے\* (۳۳)۔ قرب کے اعتبار سے الْوَلِيُّ دوست اور مددگار کو کہتے ہیں۔ اَلْمَوْلَاةُ - ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرنا۔ معاہدہ کرنا۔ ایک دوسرے کے قریب ہونا۔ لگاتار و مسلسل آنا۔ نیز اس کے معنی دو لڑنے جھگڑنے والوں کے درمیان صلح و صفائی کے لئے دخل اندازی کرنا بھی ہیں۔ لیکن اَلْمُسْتَوَلِي عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ قدرت میں لے لینا۔ اور اَلْمُسْتَوَلِي عَلَى الْاَمْرِ - کسی معاملہ پر غالب آجانا\*۔ اسی لئے الْيُولَاةُ - سلطنت اور حکومت کو کہتے ہیں\*\*۔ اور وَاَلِ - نگران و ناظم اور حاکم کو۔ اَوَّلِيَّتُهُ الْاَمْرُ - میں نے اسے معاملہ کا ناظم و نگران بنا دیا۔ الْوَلِيُّ بھی نگران و ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں\*۔ تَوَلَّاهُ (۳۴)۔ اس کو ولی بنا لیا۔ تَوَلَّى الْاَمْرُ - اس نے معاملہ کی ذمہ داری اٹھا لی۔

وَلَّى کے متضاد معنی آتے ہیں۔ کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور کسی سے اعراض کرنا بھی۔ وَلَّى هَارِبًا - پیٹھ موڑ کر بھاگا۔ اور فَوَلَّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے معنی ہیں تو مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کر۔ تَوَلَّى عَنْهُ - اس سے اعراض کیا\*۔ تَوَلَّاهُ کے معنی اس کی پیروی کرنا اور اسے اختیار کرنا بھی ہیں\* (۳۵)۔

قرآن مجید میں یہ سادہ ان تمام مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کسی کی طرف رخ کرنا (۱۱۵) اور روگردانی کرنا (۱۳۳)۔ حاکم بن جاتنا (۲۵)۔ وَلَا یَکُ بِمَعْنٰی غلبہ و اقتدار (۱۸)۔ وَلِیُّ مَدَد گار۔ حمایتی (۱۱۱) وَلِیُّ بِمَعْنٰی وارث (۱۳۳ : ۱۱۵)۔ المَوَالِیُّ (دور کے) رشتہ دار (۱۱۵ : ۱۳۳)۔

ایک راہ تو یہ ہے کہ انسان جس نظریہ یا تصور کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے (اسے ایمان کہتے ہیں) اس کے سامنے بطیب خاطر جھک جائے اور اس کی پوری پوری اطاعت کرے۔ (اسے اسلام کہتے ہیں)۔ لیکن دوسری راہ یہ ہے کہ انسان اس سے گریز کی راہیں تلاش کرے۔ یہ اعراض ہے۔ اس کو تَوَلَّی کہتے ہیں۔ چنانچہ (۱۳۳) میں یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور (۱۱۵) میں اَسْلَمَ کے مقابلہ میں (نیز ۱۱۵ : ۸۴ میں)۔ اور (۱۱۵) میں یہ لفظ اِطَاعَت کے مقابلہ میں آیا ہے۔ لہذا تَوَلَّی کے معنی یہی نہیں کہ انسان ایک مذہب (یا نظام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب یا (نظام) اختیار کر لے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کی پوری پوری اطاعت نہ کرے بلکہ گریز کی راہیں نکالتا رہے۔ اسی لئے تَوَلَّی کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳۳ : ۱۱۵)۔ صلی کے معنی پوری پوری اطاعت کرنا۔ کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہیں۔ صلی کے مقابلہ میں تَوَلَّی کی عام صورت یہ ہے کہ خدا کے دئے ہوئے دین (یا نظام اطاعت) کی جگہ انسان کی خود ساختہ شریعت کو دین قرار دیدیا جائے اور اس کی اتباع کو دین کی اطاعت بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے خدا اور انسان کا تعلق اس قسم کا قرار دیا ہے جسے ہم عام الفاظ میں رفاقت کا تعلق کہتے ہیں۔ اگر انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو خدا خود اس کا رفیق (ولی) بن جاتا ہے۔ اور اس کے قانون کے حیات بخش نتائج اس کے شامل حال ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ان قوانین کی اطاعت سے انسان کے ہاتھوں خدا کے کائناتی پروگرام کی تکمیل ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے)۔ اس طرح انسان خدا کا وَلِیُّ بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک طرف خدا کو مومنین کا ولی کہا ہے (۱۱۵)۔ اور دوسری طرف مومنین کو اَوَّلِیَاءُ اللہ کہا ہے (۱۱۵)۔ اَوَّلِیَاءُ وَلِیُّ کی جمع ہے۔ یاد رہے کہ اَوَّلِیَاءُ اللہ کا کوئی خاص گروہ نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ہر مومن وَلِیُّ اللہ ہے اور تمام مومنین اَوَّلِیَاءُ اللہ ہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَوَّلِیَاءُ اللہ وہ ہیں الذین آمَنُوا وَكَانُوا یَتَّقُونَ (۱۱۵)۔ جو لوگ قرآن کریم



ہر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ”پہچان“ یہ بتا دی کہہ لَتَهُمْ التَّبَشُّرُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۱۶۳)۔ انہیں اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ آخرت کی زندگی کو تو یہاں دیکھا نہیں جا سکتا لیکن یہاں کی زندگی تو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے۔ لہذا اُولِيَاءُ اللّٰهِ (جماعت مومنین) وہ ہیں جنہیں زندگی کی شادائیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں اور وہ دنیا میں نظام خداوندی کو قائم کریں (کیونکہ دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں صرف اسی نظام کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں)۔ انہی کو قرآن کریم نے حِزْبُ اللّٰهِ (۲۴۸) کہا ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں غیر خدائی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کو حِزْبُ الشَّيْطَانِ (۲۴۹)۔ اس تصور کے علاوہ اُولِيَاءُ اللّٰهِ کا جو تصور بھی ہے وہ غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا ہوا۔

سورہ محمد میں سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا ہے کہ تم اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کرو اور دیکھو کہ جن لوگوں نے وحی کے بتائے ہوئے راستے سے سرکشی برقی ان کا انجام کیا ہوا۔ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام دور حاضر کے مخالفین کا بھی ہوگا۔ اس کے بعد ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَّ اَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۲۶۳)۔ ”یہ اس لئے کہ جو لوگ وحی کے بتائے ہوئے راستے پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مولیٰ (دوست - رفیق - کارساز) اللہ ہے۔ اور جو اس راستے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہو سکتا“۔ یعنی جو شخص یا قوم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے اسے اسکی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں اللہ کے سوا کوئی کسی کا مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جماعت مومنین کا اعلان ہوتا ہے کہ اَنْتَ مَوْلٰىنَا (۲۸۶)۔ ”تو ہمارا مولیٰ ہے“۔ لیکن اس کے ساتھ سورہ تحریم میں (نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰى جِبْرِیْلَ وَصَالِحٍ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸۷)۔ ”اس کا مولیٰ اللہ ہے۔ اور جبریل اور صالح مومنین ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس مفہوم میں اللہ مولیٰ ہو سکتا ہے اس میں اللہ کے سوا کوئی اور مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اللہ - جبریل - اور مومنین کی ”مولائیت“ کی نوعیت الگ الگ ہے۔ انہیں ایک سطح کا مولیٰ سمجھنا غلط ہے۔ قوانین خداوندی کے خلاف کسی کی مولائیت کام نہیں آسکتی۔ ہُوْمَ لَا يَخْفٰى مَوْلٰى عَنْ مَوْلٰى شَيْئًا (۲۸۸)۔ ”جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکتا“ اس پر شاہد ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو بتا کید دھرایا، اور بار بار دھرایا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے اولیاء ہو سکتے ہیں اور مومن کسی غیر مومن (کافر) کا ولی نہیں ہو سکتا۔ بات بالکل واضح ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست رفیق، ہمراز، ہم نوا وہی ہو سکتے ہیں جن کی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو۔ جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ہوں، وہ ایک دوسرے کے دمساز اور ہمراز کیسے ہو سکتے ہیں؟ غیر مومنین سے اچھے کاموں میں تعاون کیا جا سکتا ہے۔ انہیں اپنا ہمراز اور دمساز نہیں بنایا جا سکتا (اس ضمن میں حسب ذیل آیات دیکھئے)۔  $\left(\frac{3}{24} - \frac{3}{116} - \frac{3}{89} - \frac{3}{139} - \frac{3}{124}\right) - \left(\frac{5}{11} - \frac{5}{43} - \frac{5}{16} - \frac{5}{17} - \frac{5}{13} - \frac{5}{10} - \frac{5}{16} - \frac{5}{17} - \frac{5}{13} - \frac{5}{10}\right)$

## و ن ی

النَّوْنِی - تکان۔ درماندگی۔ وائی۔ یئیی۔ وائی۔ سستی کرنا۔ تھک جانا، کمزور اور ضعیف ہو جانا۔ نَاقِیۃٌ وَاِیۡیۡسۡۃٌ\* - تھکی ہوئی اونٹنی۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کمزوری اور ضعف بتائے ہیں۔  
الْمِیۡیۡنَا وَ الْمِیۡیۡنَاۃُ\* - بندرگاہ، جہاں پہنچ کر جہاز دم لیتے ہیں۔  
نِیۡزِ الْمِیۡیۡنَا (بغیر حمزہ کے) ان پتھر کے ٹکڑوں کو بھی کہتے ہیں جس سے کانچ بنایا جاتا ہے\*۔

سورۃ طہ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ۔ وَلَا تَنۡیَا رِیۡ ذُرِّکُمۡرِیۡ (۲۴)۔ اور دیکھو اس کشمکش میں ضابطہ خداوندی کو آگے بڑھانے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔ اس مقصد کے لئے تمہاری تگ و تراز میں ذرا بھی کمی نہ آنے پائے۔

## وہب

وَهَبَ يَهَبٌ وَ هَبًا - هِبۡۃٌ - عطا کرنا۔ دینا۔ اُنْهَبِیۡۃٌ\* - وہ عطیہ جو نہ کسی چیز کے عوض دیا گیا ہو نہ ہی اس میں دینے والے کی اپنی غرض وابستہ ہو۔ اَلْمَوْهِبۡۃُ\* - وہ بادل جو جہاں واقع ہو وہاں ہی برس جائے۔ اَوْ هَبَّتْ لَا مَرۡکَظَا - میں فلاں امر ہر قادر ہو گیا\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ بغیر قیاس کے آئے ہیں۔

سورۃ احزاب میں ہے اِنْ وَهَبْتَ نَفْسَکَ (۳۳)۔ اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے حوالے کر دے۔ سورۃ مریم میں ہے قَالَ اِنۡشَاۡ اَنَا رَسُوْلٌ رَّسِیۡکَ لَا هَبَ لَکَ غُلَامًا زَکِیًّا (۱۶)۔ اس نے کہا کہ میں تیرے

رب کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ ”میں (خدا) تجھے ایک ہا کیزہ اور نشوونما یافتہ بچہ عطا کروں گا“۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا ”فَوَهَّبْ لِي رَبِّي حُكْمًا“۔ (۲۱)۔ اللہ نے مجھے قوت فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی۔ نبوت ایک ایسا علم ہے جو خدا کی طرف سے وہی طور پر ملتا ہے۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ خدا کی صفت ”وَهَّابٌ“ ہے (۳۰)۔ یعنی بلا مزد و معاوضہ بہت زیادہ عطا کرنے والا۔ سورۃ صٰ میں یہ لفظ واپس دینے کے معنوں میں بھی آیا ہے ”وَوَهَّبْنَا لَهُ أَهْلًا لَهُ“۔ (۳۸)۔ مطلب عطا کرنے سے ہی ہے۔ کھوئے ہوئے کا واپس مل جانا بھی تو عطا ہے۔

## وہج

”وَهَجَتِ السَّارُ“۔ ”وَهَّجًا“۔ آگ کا روشن ہونا، جلنا اور بھڑکنا۔ ”أَلَوْهَجِ“۔ آفتاب اور آگ کی حرارت۔ ”تَوَهَّجَ النَّجْوُ هَرًا“۔ جوہر چمک اٹھا\*۔

قرآن کریم میں ہے ”وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا“ (۲۸)۔ ہم نے (سورج کو) چراغ بنایا جو باقراط روشنی اور حرارت دینے والا ہے۔

## وہن

”أَلَوْهْنُ“۔ کسی کام یا معاملہ میں یا جسمانی طور پر کمزور ہونا۔ لیث نے کہا ہے کہ ”وَاهِنٌ“ اس آدمی کو کہتے ہیں جو کام اور معاملہ میں کمزور ہو۔ اور ”مَوْهُونٌ“۔ اُسے جو بدنی لحاظ سے کمزور ہو\*\*۔ سورۃ آل عمران میں ”وَهْنٌ“ کے ساتھ ضعف اور استکانت کے الفاظ آئے ہیں (۱۳۵)۔ اس سے اس کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ”وَاهِنٌ“۔ کمزور و ضعیف ہوا۔ ”أَوْهَنَ“ کمزور اور ضعیف بنایا۔ سورۃ انفال میں ہے ”أَنَّ اللَّهَ مَوْهِنٌ“ ”كَيِّدٌ الْكَافِرِينَ“ (۱۸)۔ اللہ مخالفین، کفار کے منصوبوں کو کمزور (ناکام) بنا دیگا۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے ”وَلَا تَهِنُوا“ (۱۳۸)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میں کسی قسم کی بھی کمزوری نہیں ہونی چاہئے۔ نہ جسمانی کمزوری (جس میں مادی اسباب بھی شامل ہیں) اور نہ ہی عقل و فکر اور علم و بصیرت کی کمزوری، کیونکہ قرآن کریم نے قیادت کے لئے جسمانی اور علمی دونوں صلاحیتوں کو ضروری قرار دیا ہے (۲۴)۔ نہ ہی سیرت و کردار میں کسی قسم کی کمزوری۔ اس طرح ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ”أَنْتُمْ“ ”لَا تَعْلَوْنَ“ (۱۳۸)۔ تم سب سے بلند ہو جاؤ گے۔

## وہی

الْوَهْمَىٰ - کسی چیز میں شگاف ہونا - کسی چیز کی بندشوں کا ڈھیلا  
 ہڑ جانا - اَوْهَمَاءُ - اس نے اسے کمزور کر دیا - اَلْحَتَائِطُ - بے بسی\* - دیوار  
 گرا چاہتی ہے - رَجُلٌ وَّاهٍ - ہودا - کمزور - احمق آدمی - ناقابل اعتماد -  
 جَدِیثٌ وَّاهٍ - نہایت ہودی بات\* -

قرآن کریم میں ہے وَ اَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَ مَنِيذٍ وَّاهِيَةٌ  
 (۲۹) - آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن اس کی بندشیں ڈھیلی پڑ جائیں گی -

## وِی (حرف)

وِی - تعجب و افسوس یا زجر و توبیخ یا ہشیمانی اور تعجب کے لئے  
 آتا ہے\*\*۔ قرآن کریم میں وَيَسْكَانُ آيا ہے (۲۸/۸۴) - (وِی + كَت + اَنَّ  
 یا وِی + كَا نَ) - ہائے افسوس - یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ ”ارے!  
 ہم تو کچھ اور سمجھ رہے تھے اور معاملہ یوں نکلا!“

## وی ل

وَيْلٌ - شر کا نازل ہونا - یہ مصدر جامد ہے جس کا کوئی فعل نہیں\*\*\*۔  
 اظہار درد و کرب کے موقع پر، نیز عذاب و تکلیف اور بد انجامی کے لئے یہ  
 کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْوَيْلَةُ - رسوائی - تباہی - بربادی - ہلاکت\*\*\* -

تباہی اور بربادی کے معنوں میں وَيْلٌ (۱۲/۱۲) میں آیا ہے - حسرت  
 اور افسوس کے لئے وَيْلَكَ (۲۶/۲۶) میں - اور شرم اور تعجب کے ملے جلے  
 جذبات کے لئے يٰوَيْلَتِي (۱۱/۱۱) میں -

## ہ

### ۸ (ضمیر)

۸۔ یہ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے۔ واحد مذکر غائب کے لئے آتی ہے۔

منصوب متصل کی مثال - يَنْصُبُ رُؤْسَهُ (  $\frac{2A}{81}$  ) - ”(جو) اس کی مدد کرتے“۔ مجرور متصل کی مثال - مَسَاكِنَهُ (  $\frac{2A}{81}$  ) - ”اسکی جگہ“۔

[یہ ضمیر کبھی ہر اور ہ بھی پڑھی جاتی ہے مثلاً فَيُثَرِّبُہ - یہ - اور کبھی یہ مساکن ہو کر محض وقف کے لئے پڑھا دی جاتی ہے مثلاً مَسَاكِنَہ - اور کِتَابَہ]۔

### ہا (ضمیر)

ہا۔ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے۔ واحد مؤنث غائب کے لئے آتی ہے۔ منصوب متصل کی مثال - اَنْتَہَا (  $\frac{2}{9}$  )۔ مجرور متصل کی مثال - لَمَوْ نَہَا (  $\frac{2}{9}$  )۔

## ہا

ہا۔ خُذْ (ہکڑو - لو) کے معنی میں آتا ہے۔ ہَسَاؤْمُ اقْرَءُوا کِتَابَہ (  $\frac{19}{19}$  ) لو۔ میری کتاب پڑھو۔ (اس میں جمع کے لئے اُم پڑھایا گیا ہے) ہا۔ تنبیہ کے لئے بھی آتا ہے۔ ہَا اَنْتُمْ اَوْلَا ع۔ ہاں تم وہی تو ہو۔

جب ہا، آی کے بعد آئے تو ندا (ہکارنے) کے لئے آتا ہے۔ جیسے ایشہا الرّجُلُ۔ اے مرد! اکثر ایشہا سے پہلے یا پڑھا کر یا ایشہا بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے یا ایشہا النّاسُ (  $\frac{1}{1}$  ) اے لوگو! [ہکذا کے لئے دیکھئے عنوان ہذا]۔

## هـٰؤُلَاءِ

هـٰؤُلَاءِ - (هَآ + اُوْلَآءِ) هـٰذَا اور هٰذِهِ دونوں کی جمع ہے۔  
 ”یہ سب“ (مذکر و مؤنث)۔ مذکر کے لئے هَآ نِثْمٌ هـٰؤُلَاءِ (۲/۵)۔  
 خبردار تم ہی وہ لوگ ہو۔ مؤنث کے لئے هـٰؤُلَاءِ بَنَاتِیْ (۱۱/۸) یہ سب  
 میری بیٹیاں ہیں۔

## هَآؤُمْ

دیکھئے عنوان هَآ۔

## هٰذَا

هٰذَا - (اسم اشارہ۔ واحد مذکر) ”یہ“۔ هٰذَا اِنَّ هٰذَا بِنْر (مذکر۔  
 تثنیہ) ”یہ دونوں“۔ هٰذِهِ (واحد مؤنث)۔ ”یہ“۔ هَاتَانِ هَاتَيْنِ۔  
 (تثنیہ مؤنث) ”یہ دونوں“۔ (هـٰؤُلَاءِ - جمع کے لئے آتا ہے)۔ ”یہ سب“۔  
 هٰكَذَا - (هَآ + كَآ + ذَا)۔ ”اسی طرح ایسا ہی“۔ اِهٰكَذَا  
 عَرَّشُکَیْ (۲/۴)۔ کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا؟

## هَارُوت

الْهَرَّتْ - نیزہ گھونپنا۔ کپڑے کو پھاڑنا اور چندی چندی کرنا۔  
 الْهَرَّتْ - منہ کی ہاچھوں کا کشادہ ہونا۔ الْهَرَّتْ - وہ شخص  
 جس کی ہاچھیں وسیع ہوں۔ رَجُلٌ هَرَّتْ - وہ آدمی جو فحش گوئی کے  
 ساتھ کسی راز کو پوشیدہ نہ رکھے\*۔

هَارُوت - افسانہ طرازوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو طرح طرح  
 کی چیستانیں مشہور کر رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بابل میں دو  
 فرشتے تھے۔ ہاروت اور ماروت۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ قرآن کریم  
 نے ان سزخرفات کی تردید کردی (۲/۴)۔ یہ عجمی لفظ ہے۔

(ماروت اور بابل کے عنوانات بھی دیکھئے)۔

## هَارُونُ

هَارُونُ\* - یہ عجمی نام ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام تھا۔ عربی میں اَلْهَارُونُ\* - عمدہ قسم کی کھجور کو کہتے ہیں\*۔

بعض لوگ اپنے اس (غلط) عقیدہ کی دلیل میں کہہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتے ہیں، حضرت ہارونؑ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب ملی تھی اور حضرت ہارونؑ ان کے ساتھ بغیر کتاب کے تھے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ کتاب، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں کو ملی تھی۔ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ (۳۷/۱۱)۔ ”اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی“۔

[مزید تفصیل کے لئے (ن۔ ب۔ ا) کا عنوان دیکھئے]۔

## هَامَان

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون، ہامان اور قارون کیطرف بھیجا تھا (۲۴/۳۶)۔ اور یہ تینوں ہلاک ہونے والوں میں سے تھے (۲۹/۲۹)۔

تاریخ انسانیت کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے۔ ہر جگہ بادشاہت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید، ”پیشوائیت“، (Priesthood) کا تسلط نظر آئیگا۔ بادشاہ تو خیر بادشاہی کرتا تھا، برہمن (مذہبی پیشوا) خدائی کرتا تھا۔ ایسی خدائی جس میں، سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اسکی رعایا میں سے ہوتا تھا۔ مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا) سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس مندر کا بڑا بچاری، شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سٹینڈروف، اپنی کتاب ”قدیم مصریوں کا مذہب“، میں لکھتا ہے۔

”آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات\*\* کا بھی افسر تھا۔ مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے بچاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیس اور شمالی اور

\* تاج - \*\* غالباً مذہبی عمارات مراد ہیں۔

مغربی مصر کے تمام مندروں کے ہجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیس کے مندر کے قبضہ میں تمام مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا،۔ یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (Head Priest) کی وجاہت۔ بھی آمن، قرآن کا ہامان ہے [جیسے تغیر لفظی سے آرون (Aaron) ہارون ہو گیا] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں (مصر کے عنوان کے تحت) مذکور ہے کہ

فراعنہ مصر کے اٹھارہویں خاندان کے وقت سے مندر کے ہجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے زمانہ میں آمن رع (واقع تھیس) کے کاہن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جنکی وجہ سے وہ بے حساب دولت اور قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر (Breasted) نے بھی اپنی کتاب ”تاریخ مصر“ میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے ہجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ ہامان کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا (۲۸)۔ اور فرعون نے ہامان (محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظام ”روحانیت“ کے سب سے بڑے رکن) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند عمارت یا برجی تعمیر کر دی جائے جس پر چڑھ کر وہ (معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ کے خدا کو جھانک لے (۳۶)۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمانی انقلاب کی آواز جب بھی اٹھی ہے اس کے مقابلہ کے لئے ملوکیت کبھی براہ راست سامنے نہیں آئی وہ ہمیشہ ”پیشوائیت“ کو آگے بڑھاتی ہے اور خود اسکی سپر میں محفوظ رہتی ہے۔ یہی فرعون نے کیا۔ خود پیچھے رہا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے ہامان اور اس کے ساحرین کو آگے بڑھایا۔ لیکن عصائے موسیٰؑ نے ان سب کی دسیسہ کاریوں کو نیست و نابود کر دیا۔ فَادَّاهِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُون (۱۱۷)۔

ملوکیت۔ پیشوائیت۔ اور سرمایہ داری، تینوں بلائیں انسانیت کے لئے ہلاکت آفریں ہیں۔ قرآن کریم نے، داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ان تینوں بلاؤں کا ذکر شرح و بسط سے کیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہارون، پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ۔ اور قارون، سرمایہ داری



کی خون آشامیوں کا پیکر۔ آسمانی انقلاب، انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے۔ اس کا علاج قرآنی نظام حکومت و معیشت میں ہے جس میں نہ کوئی کسی انسان کا بندہ اور غلام ہوتا ہے نہ محکوم اور محتاج۔

## ہ ب ط

هَبْطٌ ط - اترنا۔ راغب نے اس کے معنی دب کر مجبوراً اترنا لکھے ہیں \*\*\*۔ هَبْطٌ اَرْضٌ كَيْدًا - وہ فلاں زمین میں اتر\*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ هَبْطٌ مِّنْ مَّوْضِعٍ اِلَى مَّوْضِعٍ کے معنی ہیں وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو گیا\*\*۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے اهْبِطُوا مِصْرًا - (۲/۲۱)۔ جس کے معنی ہیں تم اس بیابانی زندگی سے کسی شہر کی طرف منتقل ہو جاؤ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب لفظ هَبْطٌ انسان کے لئے بولا جائے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ بخلاف اَنْزَالَ کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر باسرف چیزوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے\*\*\*۔ هَبْطُ الْمَرَضِ لِحُجْمِهِ کے معنی اس بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا۔ اسے لاغر کر دیا۔ اَلْهَبْطَةُ - نشیبی زمین کو کہتے ہیں۔ اور اَلْهَبْطُ کے معنی نقصان کے ہیں، نیز یہ لفظ ذلت، عاجزی اور شرم میں پڑ جانے کے لئے بھی آتا ہے۔ اَلْهَبْطُ - لاغر اونٹ کو کہتے ہیں\*۔ (ابن فارس)۔

لهذا هَبْطٌ ط کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی جب کہ دوسری حالت میں پہلی حالت کے مقابلہ میں کچھ کمی ہو۔ قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ اگر انسان وحی کی راہ نمائی میں اسے واحد بنکر رہیں تو یہ زندگی شرف انسانیت کی زندگی ہے لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو یہ اُس مقام سے ہستی کی طرف تبدیلی (هَبْط) ہے۔ فَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا (۲/۲۶)۔ ”ہم نے کہا کہ تم (اس) مقام بلند سے ہستی کی طرف جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔“ اس هَبْطٌ سے، بلند مقام آدمیت کی طرف تبدیلی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں (۲/۲۸)۔ تفصیل ان امور کی (۱۔ د۔ م) اور (ش۔ ج۔ ر) کے عنوانات میں مائیگی۔

## ہ ب و

الْهَبَاءُ - غبار - بہت باریک غبار جو فضا میں بالکل دھوئیں جیسا نظر آئے۔ یا وہ باریک غبار کہ جب کسی تاریک کوٹھڑی میں، روشندان سے دھوپ کی کوئی کرن آرہی ہو تو اس میں جو چھوٹے چھوٹے ذرے نظر آتے ہیں۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والے غبار کو بھی کہتے ہیں۔\*  
الْهَبْوَةُ - غبار - هَبَا الْغُبَارُ - گرد اڑی۔\*

جَاءَ يَسْهَبُشِي کے معنی ہوتے ہیں وہ خالی ہاتھ، خاک اڑاتا ہوا آیا۔  
الْهَبَابِي - قبر میں گرنے والی مٹی کو کہتے ہیں۔\*

قرآن کریم میں ہے کہ مکافات عمل کی میزان میں مجرمین کے اعمال بالکل بے وزن ہونگے۔ ان کا کوئی منفعت بخش نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔  
فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا (۲۳) - پھر ہم اسے خاکِ پراگندہ کی طرح کر دینگے۔

## ح ج د

الْهَجْوُ د - الْتَهَجُّدُ - سونے اور جاگنے دونوں کے لئے آتا ہے۔\*\*  
(اضداد میں سے ہے - لطائف اللغة) - راغب نے کہا ہے کہ الْهَجْوُ سونے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن هَجْدٌ نَّهْ فَتَهَجُّدُ کے معنی ہیں ”میں نے اسکی نیند کو دور کر دیا۔ پس وہ جاگ گیا،“ (جیسے مَرَضُهُ کے معنی ہونے میں ہیں اس کے مرض کو دور کیا۔ یا تیمارداری کی)\*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے وَمِنْ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدُ بِهِ (۹۶) - رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کے ساتھ) جاگو۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (۹۳)۔ ”رات کو قیام کر مگر تھوڑے حصے کو چھوڑ کر“۔ قرآنی انقلاب کے اولین مراحل میں پروگرام اسقدر طویل اور سخت ہوتا ہے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ، راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ هَجْوُ د دن میں سونے کو کہتے ہیں اور هَجْوُ ع رات میں سونے کو\*\*\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی کسی مقام پر ٹھہرنے کے ہیں۔

\* تاج و راغب و محیط - \*\* تاج - \*\*\* راغب - \*\*\*\* محیط۔

## ہ ج ر

الْمُهَاجِرُ - الْهَاجِرُ - کسی چیز کو چھوڑ دینا - ترک کر دینا - الگ ہو جانا - کاٹ دینا - جدا کر دینا - قطع تعلق کر لینا - نیز اعراض برتنا - راغب نے اس کے معنی دوسرے سے جدا ہونے کے بتائے ہیں خواہ یہ جدائی زبانی ہو یا قلبی یا بدنی - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) قطع و جدائی اور (۲) کس کر باندھنا بتائے ہیں - قرآن کریم میں ہے - وَآلُجُرُثِّمِ الْمَاجِرُ الْجَمِيلُ (۱۳۳) - نہایت خوبصورتی سے ان سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی تنظیم میں مشغول ہو جا - یعنی فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۸۵) - هَاجِرَاتٌ - بری باتیں - فحش باتیں - رسوا کن باتیں - ایسی باتیں جنہیں ترک کر دینا چاہئے \* - يَسْمُرُ سَمِيرًا تَهْجُرُونَ (۲۳۳) میں بعض کے نزدیک تَهْجُرُونَ کے معنی بکواس کرنا ہیں -

الْمُهَاجِرَةُ - ابی علاقہ سے دوسرے علاقہ میں کوچ کر جانا - اس سے فعل هَاجَرَ ہے - ازہری نے کہا ہے کہ دراصل اہل عرب کے نزدیک ہادیہ نشینوں کا شہر کی طرف منتقل ہو کر آ جانا ، الْمُهَاجِرَةُ کہلاتا تھا ، پھر اس شخص کو جو اپنے مقام رہائش کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے مُهَاجِرٌ کہہ دیتے ہیں \* - لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے - قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مرد مومن کا فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے کوشش کرے - وہ جس مقام میں رہتا ہے سب سے پہلے اپنی اس کوشش کو وہیں سے شروع کرتا ہے - لیکن اگر وہ دیکھے کہ وہاں کی فضا اس نظام نو کے لئے سازگار نہیں ، تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وہیں نہیں بیٹھے رہنا چاہئے - اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاہئے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہو - مومن کسی خاص خطہ زمین سے وابستہ نہیں رہ سکتا - مومن کا حمان ہر کہیں ہے - وہ کسی خاص زمین میں زندگی بسر کر کے وہیں مر جانے کے لئے پیدا نہیں ہوتا - وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے - اس مقصد کے لئے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاہئے - مال و دولت - جھوٹی عزت اور قوت - رشتہ دار - وطن - سب کچھ - اس "چھوڑ دینے" کا نام هِجْرَةُ ہے اور ایسا کرنے والے کو "مہاجر" کہتے ہیں - لیکن صرف "چھوڑ دینا"

ہی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں اکثر ہَاجَرُوا وَاِجَاهَدُوا (۲/۱۸) - اکٹھا آیا ہے۔ ہَاجَرُوا حصہ لائے اور اس کے بعد جَاهَدُوا حصہ لائے۔ اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جد و جہد ہی کا ایک پہلو ہے۔ ہجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔

مَسْجُورٌ - قرآن کریم میں ہے وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَسْجُورًا (۲۵/۲۵) - اور رسول، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کریم کو مَسْجُور بنا دیا تھا۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مَسْجُور کے معنی اس سے کہیں گہرے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گلے یا بھینس دوڑ جاتی ہو اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور رسی کا دوسرا سیرا اس کے سینک کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ہیں لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔ اس طرح بندھے ہوئے جانور کو مَسْجُور کہا جاتا تھا۔ اَلْهَيْجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا\*۔ رسول اللہ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، زوایات، قوانین، تفاسیر، وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَسْجُور بنا رکھا تھا جس سے وہ لچک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا۔ سینوں سے لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی ان کے خود ساختہ ”مذہب و شریعت“ کی رسی مناسب سمجھتی تھی۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے، قرآن کریم ان کے تابع تھا۔ یہ ہے مطلب قرآن کریم کو مَسْجُور بنا دینے کا۔

ابن قتیبہ نے ہَاجَر کے معنی ہڈیاں بکنے کے بھی لکھے ہیں\*\*۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے قرآن کریم کو محض منتر بنا رکھا تھا۔

## ه ج ع

الْهَجْوُ ع۔ سونا خواہ کسی وقت بھی ہو۔ یا رات کو سونا۔ کبھی یہ سونے بغیر صرف لیٹنے اور آرام کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ الْهَجْوُ جَاع۔ ہلکی سی نیند۔ رَجُلٌ هَجَعَةً۔ بیوقوف، لا اہالی اور غافل آدمی\*۔  
قرآن کریم میں ہے کَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الثَّقَلِ مَتَابِهْجَعُونَ (۱۱/۱۲)۔ وہ رات کو بہت کم سوتے تھے (جس انقلاب عظیم کی وہ تیاریاں کر رہے تھے اور جو کام انہوں نے اپنے ذمے لیے رکھے تھے، ان کی تکمیل میں وہ دن رات مصروف رہتے تھے اور رات کا بہت کم حصہ سونے میں گزارتے تھے) (۱۱/۱۲)۔

## ه د د

الْهَدُّ۔ کسی چیز کو سختی سے زور کی آواز کے ساتھ گرا دینا۔ منہدم کر دینا۔ عمارت کو توڑ کر گرا دینا۔ الْهَدَادُ۔ سمندر کی آواز جسے اہل ساحل سنتے ہیں اور جس میں ایک گونج سی معلوم ہوتی ہے۔ اور کبھی یہ آواز زلزلہ کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے۔ الْهَدَادَةُ۔ گرج (بادلوں کی)۔  
الْهَدَّةُ کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ هَدَّ دَتْ الْبَقَرَةُ۔ میں نے گائے کو ذبح کرنے کے لئے گرا دیا۔ الْهَيْدُ۔ گری ہوئی چیز\*\*\*۔ هَدَّةٌ تَهْدِيْدٌ۔ اس نے اسے دھمکایا اور خوف دلایا\*\*۔  
سورۃ مریم میں ہے وَتَخِيْرُ الْجِبَالُ هَدًّا (۱۹/۱۹)۔ پہاڑ سخت آواز کے ساتھ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

الْهَدُّ هَدٌّ۔ وہ کبوتر جو زیادہ غرغروں کرے۔ نیز ہر وہ پرندہ جو کبوتر کی طرح زیادہ بولے۔ ایک معین پرندہ کو بھی کہتے ہیں\*۔ لیکن قصہ حضرت سلیمانؑ میں جس هَدُّ هَدُّ (۲۲/۲۲) کا ذکر ہے وہ ان کی فرج کے ایک افسر کا نام تھا۔ اُس زمانے میں پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر قبائل اور اقرا کے نام عام طور پر رکھتے تھے۔ (انگریزوں کے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ وہاں لوگوں کے نام (Fox) اور (Lamb) عام طور پر ملتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھی طوطا رام اور چوہا مل جیسے نام پائے جاتے ہیں)۔ توریت (کتاب اول سلاطین) میں یہ نام (هد هد) کئی بار آیا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ هَدَّ اَهِدُ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اور تاج العروس میں ہے کہ هَدَّ دُ۔ حمیر کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو حضرت سلیمانؑ کا ہم عصر تھا۔

قرآن کریم میں آلِ تھَدُہْدُہْدُہ (ال کے ساتھ) آیا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نام نہیں تھا، بلکہ اپنے قبیلہ یا فوج کی نمائندگی کی جہت سے اسے اس طرح پکارا گیا ہے۔

## ہ د م

آلِ تھَدُہْمُ - عمارت کو توڑ دینا اور گرا دینا۔ آلِ تھَدُہْمُ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ آلِ تھَدُہْمُ - کمر توڑ دینا۔ آلِ تھَدُہْمُ - چکر جو کسی کو سمندری سفر میں آتے ہیں۔ آلِ تھَدُہْمُ - الثَّيْنَاءُ - عمارت گر پڑی\*۔ تھَدُہْمُ - الثَّيْنَاءُ - عمارت تھوڑی تھوڑی کر کے گر پڑی\*\*۔ دَرِمَاؤُہْمُ - تھَدُہْمُ - ان کے خون رائیگاں گئے\*۔ سورۃ حج میں ہے لَتَهْدُہْمُ مَتَّ صَوَامِعُہْمُ (۲۴)۔ عبادت گاہیں گرا دی جاتیں۔ یہاں یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان عبادت گاہوں کی عزت و حرمت کا لحاظ نہ کیا جاتا۔

## ہ د د

آلِ تھَدُہْدُہْدُہ - دیکھئے عنوان (ہ - د - د)۔

## ہ دی

ہَدِی - کے بنیادی معنی نمایاں اور روشن ہونا۔ آگے آگے ہونا۔ اور دوسروں کے آگے آگے چلنا ہیں۔ چنانچہ روشن ہونے کی وجہ سے دن کو ہَدِی کہا جاتا ہے۔ اور ہَدِی ہَدِی\* اس ابھری ہوئی چٹان کو کہتے ہیں جو پہاڑی میں دور سے نظر آجائے\*\*\*۔ قرآن کریم میں ہے اَفَلَمْ يَهْدِہْمُ (۲۳۸)۔ جس کے معنی ہیں، کیا یہ امران پر واضح، نمایاں اور روشن نہیں کیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) راستہ بتانے کے لئے آگے بڑھ جانا اور (۲) ہدیبہ اور تحفہ بھیجنا۔

ہَدِی (جو اصل میں ہَدِی تھا) - ہر چیز کے اگلے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے پہلے نظر آجاتا ہے۔ اس لئے جانور کی گردن پر الِ تھَدِی کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ باقی بدن سے آگے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہَدِی\* اور ہَدِی۔ اُس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ میں ذبح کرنے کے لئے لے جاتے تھے کیونکہ اُس جانور کو آگے آگے رکھا

\* تاج و راغب - \*\* محیط - \*\*\* تاج و محیط -

جاتا تھا۔ ہُدًی پتہ\*۔ اُس تحفہ کو کہتے ہیں جو بغیر معاوضہ دیا جائے، اس لحاظ سے کہ وہ ضرورت پڑنے سے پہلے ہی دیدیا جاتا ہے۔

ہُدًی کے معنی ہیں راستہ کو پہنچنا دینا۔ واضح کرنا۔ راہ نمائی کرنا\*۔ بعض اوقات ہُدًی کے معنی راہ نمائی کی بجائے راہ نما ہوتا ہے۔ مثلاً اَوْ اَجِدْ عَلٰی النَّارِ هُدًی (۲۱۱) میں ہُدًی (راہ نمائی) کا مطلب الہادی یعنی راہ نما ہے\*\*۔ سورہ بقرہ میں ہے حَتّٰی يَبْلُغَ الْاِلَهَادِیْ سَبْحِلّٰہ (۱۶۶)۔ اس سے مراد وہ جانور ہے جسے مکہ میں (حج کی تقریب) پر ذبح کیا جائے۔ نیز ہر قسم کا سامان اور مال (جو وہاں بھیجا جائے)۔ ہُدًی پتہ\* (۲۱۱) تحفہ۔ ہادی (۱۳) راستہ دکھانے والا۔ مہتدی (۵۴)۔ ہدایت پایا ہوا۔

دین کا مدار اس بنیادی حقیقت پر ہے کہ عقل انسانی، اُن مستقل اقدار کو نہ وضع کر سکتی ہے اور نہ ہی از خود ان کا انکشاف کر سکتی ہے جنکے مطابق انسانی زندگی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ اقدار خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ اسے وحی کہا جاتا ہے جو آخری بار نبی اکرمؐ کو ملی اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ عقل انسانی کو اس وحی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو (سورج کی) روشنی کی۔ جب انسانی عقل، وحی کی راہنمائی میں چلیگی تو یہ دنیا جنت بن جائے گی ورنہ فساد اور خون ریزیوں کا جہنم بنی رہے گی۔ وحی کی اسی راہ نمائی کو ہدایت خداوندی کہتے ہیں جو انسان کو زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف لے جاتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے ہدایت (راہ نمائی) صرف وحی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اِنَّ هُدًی اللّٰہِ هُوَ الْهُدًى (۱۶۰)۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کی تجویز کردہ راہنمائی، ہدایت نہیں، ضلالت ہے (۱۶)۔ یہی راہ سیدھی ہے۔ اس کے علاوہ ہر راستہ ٹیڑھا ہے (۳)۔ رسول، اسی ہدایت خداوندی کو لیکر آتے تھے۔ لیکن ان کے ذمے اس ہدایت کو لوگوں تک پہنچا دینا تھا۔ انہیں اس راستہ پر چلا دینا نہیں تھا (۲۴۲ و ۲۴۸)۔ سیدھے راستہ پر انسان خود اپنی رضا و رغبت سے چل سکتا ہے۔ زبردستی کسی کے چلائے نہیں چل سکتا۔ اس لئے کہ دین میں اکراہ نہیں (۲۵۶)۔ خود خدا نے بھی انسانوں کے لئے زندگی کی راہوں کو روشن اور واضح کیا ہے۔ انہیں ان راہوں پر چلنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا۔ اِنَّا هَدٰیْنٰہُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۹۱)۔ ہم نے اس کے لئے راستہ واضح کر دیا ہے۔ اب وہ چاہے تو اسے اختیار کر لے

اور چاہے اس سے انکار کر دے۔“ حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ ”ہدایت“ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں۔ راستہ اسی کو بتایا جاتا ہے جو منزل تک پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاہے۔ انہی کو مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انہی معنوں میں اپنے آپ کو ہُدٰی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲۴) کہا ہے۔ یعنی جو لوگ غلط راستے کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہیں ان کے لئے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی۔

## ہ ر ب

ہَرَبَ - يَهْرَبُ - هَرَبًا - وہ بھاگ گیا۔ هَرَبَ فِي الْأَرْضِ - وہ زمین میں دور چلا گیا۔ هَرَبًا بِهِ - اس نے کسی دوسرے آدمی کو بھگا دیا۔ هَرَبَ مِنْ الْوَقْدِ نِيَصْفِيهِ - میسج آدھی گھس گئی۔ أَهْرَبَ فُلَانٌ - فلاں آدمی معاملہ میں منہمک ہو گیا۔ مُسْتَعْرِقٌ هُوَ كَيْفَا - آہرَبَتْ الرِّبَا - ہوا نے خاک اڑائی۔

هَرَبَ - يَهْرَبُ - وہ زمین میں دور تک چلا گیا۔\*\*

قرآن کریم میں ہے وَأَنظَارُنَا إِنَّا لَنُفَعِّجُهُنَّ فِي الْأَرْضِ وَلَنُفَعِّجُهُنَّ هَرَبًا (۲۴)۔ ”اور ہمارا گمان ہے کہ نہ تو ہم زمین میں (مقابلہ کر کے) اللہ کو عاجز کر سکتے (شکست دے سکتے) ہیں اور نہ ہی بھاگ کر ایسا کر سکتے ہیں“۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بھاگ کر اس کے قانون مکافات کی زد سے نکل جائیں اور اس طرح اسے ہرا دیں۔

## ہ ر ع

الْهَرَعُ - وَالْهَرَاعُ - سختی سے ہانکنا۔ تیز دوڑانا۔ هَرَعَ إِلَيْهِ - اضطراب اور تیزی سے اس کی طرف پہنچا۔ الْهَرَاعُ - شدت شوق۔ الْمُهَرِّعُ - شیر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی حرکت و اضطراب بتائے ہیں اور اُهرِعَ الرَّجُلُ کے معنی بتائے ہیں وہ خوف سے کانپا۔ اور هُمُ يَهْرَعُونَ إِلَيْهِ کے معنی، وہ اس کی طرف کشاں کشاں آئے۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے متعلق ہے وَجَاءَهُ قَوْمُ مِثْلُ يَهْرَعُونَ إِلَيْهِ (۱۱)۔ اس کی قوم اس کی طرف شدت شوق سے تیزی کے

\* تاج و راغب - \*\* محیط۔



ساتھ دوڑتی ہوئی آئی۔ یُہْرَعُوْنَ میں شوق کی شدت اور مضطربانہ تیزی ہائی۔ جاتی ہے۔ اس لئے اس ایک لفظ نے ان کی اس حرکت کی پوری پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ یُہْرَعُوْنَ مجہول کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جذبات انہیں ایسا کرنے پر ابھار رہے تھے۔

## ہ ز ع

ہَزِیءٌ۔ ہَزُوًا۔ (اور هَزُوًا۔ اور هَزُوًا) کے معنی ہیں مذاق اڑانا۔ رَجُلٌ هَزِیْءٌ\*۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جسکا لوگ بہت مذاق اڑائیں۔ اور مَفَازَةٌ هَازِئَةٌ\* بِالْقَرْكِیْبِ۔ ایسا لق و دق جنگل جو سواروں کا مذاق اڑائے۔ (یعنی اسکی وسعت اور ہیبت سے سوار اپنے آپ کو خفیف محسوس کرنے لگ جائیں)\*۔ منافقین اپنی پیارٹی کے سرغنوں سے خلوت میں جا کر کہتے تھے کہ ہم جو جماعت مومنین سے جا کر ملتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔ نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ (۲/۱۳)۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ کیا مذاق کرینگے۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے خود ان کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔ یہ سراب کو حقیقت سمجھ کر اسکے حصول میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان کا خود اپنی نفسیاتی قریب انگیزیوں میں اسطرح مارے مارے پھرنا ان کے ساتھ عملی مذاق ہے۔ خدا کا مہلت کا قانون ان کی جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے یہ اپنی بے راہ روی میں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حقیقت کی دنیا میں اپنا مذاق آپ اڑواتے ہیں۔ اللہ یَسْتَهْزِیْهُمُ بِمِیْمٍ\* وَیَمْدُدُّهُمُ فِی طَغٰیَا نِیْمٍ\* یَعْمَهُوْنَ (۲/۱۵)۔

سورہ حجر میں ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی ہے۔ یہاں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی کارفرما ہے۔ تو یہ لوگ درحقیقت خدا کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ اِنَّا کَفٰیْنٰکَ الْمُسْتَهْزِیْنِ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۹۶-۹۵)۔ ”ہم ان مذاق کرنے والوں کے لئے تیری طرف سے کافی ہیں۔ یہ جو اللہ کے ساتھ اور معبود اختیار کرتے ہیں“۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ مذاق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مقام خدا کا ہے اس میں کسی اور کو بھی شریک سمجھ لیا جائے۔ یا خدا کے متعلق عقیدہ و تصور

کو یونہی (Lightly) لیا جائے۔ اور زندگی کے حقائق پر (Seriously) غور نہ کیا جائے۔

سورہ بقرہ میں ہے قَالُوا آتِنَا زَبَدًا مَّحْمُومًا (۲۰)۔ انہوں نے کہا۔ کیا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے؟

## ہ ز ز

هَزَّهٗ - يَهْزُوهٗ - هَزَّآ - کسی چیز کو حرکت دینا (کھینچ کر، دھکا دیکر، یا دائیں بائیں ہلا کر)۔ راغب نے کہا ہے کہ هَزَّهٗ - شدت کے ساتھ حرکت دینے کو کہتے ہیں۔ یعنی زور سے ہلانا\*۔ سورہ مریم میں ہے وَهَزَّيْطًا يَكْبَرُ (۲۵)۔ اسے زور سے اپنی طرف حرکت دے۔

هَزَّ الْحَادِي لَإِلَّاهِ هَزَّآ - حدی خواں نے ہنی حدی سے اونٹوں کو پر نشاط اور مست کر دیا چنانچہ وہ ہلکے پھلکے ہو کر چلنے لگے۔ اسی سے الْهَيْزَةُ - نشاط اور مستی کو کہتے ہیں (جس میں انسان جھومنے لگ جاتا ہے)۔ اِهْتَزَّ النَّبَاتُ - ہودے لہلہانے لگے (ہوا سے ہلنے اور جھومنے لگے)\*۔ قرآن کریم میں ہے فَاذْأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَاءَ اهْتَزَّتْ (۲۵)۔ جب ہم سینہ برسائے ہیں تو ہودے لہلہانے لگتے ہیں۔ دوسری جگہ یہ لفظ خاشعۃ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۶) جس کے معنی ہڑمردگی ہیں۔

## ہ ز ل

الْهَزْلُ - کسی معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ (Seriously) نہ لینا۔ یونہی مذاق کے طور پر لینا۔ هِزْلٌ بَلٌّ - بہت مذاق کرنے والا۔ الْهَزْلُ الْهَزْلُ - مذاق۔ الْهَزْلُ - لاغری کو کہتے ہیں\*\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کمزوری ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ الْهَزْلُ ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ ہو\*\*\*۔ قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے متعلق ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۱)۔ یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی مذاق کی بات نہیں۔ یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بحث کرتا ہے، سطحی جذبات کی تسکین کے لئے سرسری گفتگو نہیں کرتا۔ یہ ”شاعری“ نہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ پر بڑی سنجیدہ گی سے (Most Seriously) غور کرنا چاہئے۔ یونہی (Lightly) نہیں لینا چاہئے۔ نہ ہی اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اس میں خالی ہندو نصائح کے

طور پر باتیں کہ دی گئی ہیں۔ قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور حقیقت کہا گیا ہے نہ محض جھوٹ موٹ ڈرانے دھمکانے کی خاطر۔

## ہ ز م

هَزَمٌ \* - کسی سوکھی چیز کو اتنا دہانا کہ وہ ٹوٹ جائے \*۔ پھر اس کے معنی محض توڑ دینے کے ہو گئے \*\*۔ تَهَزَّزَتِ الْبُقُوعُ \*۔ کمان آواز کے ساتھ پھٹ گئی۔ اَلْهَزْرِيْمُ \* گرج جسکی آواز میں کٹاؤ ہو۔ هَزَمَ الْعَدُوَّ \*۔ دشمن کو شکست دیدی \* (۲۵۱)۔

جُنُدٌ \* ... مَهْزُومٌ \*۔ (۳۸/۱۱) شکست خوردہ لشکر۔ سورہ قمر میں ہے مَيِّهَزَمٌ الْجَمْعُ \* (۵۲/۲۵)۔ یہ جمعیت شکست کھا جائیکی۔

## ہ ش ش

هَشَّ \* حرکت دینا۔ (یہ هَزَّ کے قریب المعنی ہے)۔ اور عام طور پر نرم چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے پتوں وغیرہ کو حرکت دینا \*۔ یہیں سے هَشَّ الْوَرَقَ کے معنی ہیں درخت سے پتے جھاڑنا (ابن فارس)۔

حرکت اور نرمی کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی خوش ہونے کے بھی آتے ہیں۔ اَنَا بِهٖ هَشَّ هَشَّ \*۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اسی سے هَشَّاشْ ہشاش ہے۔ اَلْهَشِيْشِيُّ \*۔ وہ سخی شخص کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ بہت خوش ہو \*۔

سورہ طہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی کی راہ نمائی عطا ہوئی اور اللہ نے ان سے پوچھا کہ اس ضابطہ ہدایت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ اس سے کیا کام لینا چاہیگا، تو آپ نے کہا کہ یہ میرے لئے عمر بھر کا سہارا ہوگا۔ اور اَهْشَّ بِهَا عَلٰی غَنَمِيْ \* (۲۸/۱۸)۔ میں اس سے اپنی بھیڑوں (بنی اسرائیل) کے لئے غذائے نفس پیدا کرونگا۔ آیت کے لفظی معنی ہیں ”میں اس (عصا) سے اپنی بھیڑوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں“۔

## ہ ش م

اَلْهَشِيْمُ \* خشک چیز کو توڑ دینا (یا ہر ایسی چیز کو جس کا توڑنا دشوار نہ ہو)۔ اَلْهَشِيْمُ \* ٹوٹا ہوا۔ وہ گھاس جو خشک ہو کر چورہ چورہ ہو گئی ہو۔ خشک گھاس یا درخت \*\*\*۔ سورہ کہف میں ہے فَاصْبِرْ هَشِيْمًا (۱۸/۲۵) وہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ سورہ القمر میں ہے

\* رَاغِبٌ - \*\* تَاجٌ - \*\*\* تَاجٌ وَ رَاغِبٌ وَ مَحِيْطٌ -

فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُخْتَطِرِ (۵۳/۳۱)۔ وہ ایسے ردی چورے کی طرح ہو گیا جو ہار بنانے والے کی ہار سے خستہ ہو کر گرتا ہے۔ یعنی بالکل ناکارہ، خستہ و تباہ۔

تَهَشِيمُ النَّاقَةِ۔ اس نے پورے ہاتھ سے اونٹنی کا دودھ دوہ لیا (اور اس کے تھنوں کو خشک کر کے یا نچوڑ کر رکھ دیا)۔ اسی سے ہَشِيمٌ۔ روٹی توڑنے یا اس کا چورا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ نیز یہ عمر والے کا لقب تھا جو عبدالمطلب کا باپ تھا کیونکہ وہ حاجیوں کو ٹرید بنا کر کھلایا کرتا تھا۔ روٹی کو توڑ توڑ کر سالن میں ڈالتے ہیں۔ اسے ٹرید کہتے ہیں۔ الْهَشِيمُ۔ سخی آدمی کو کہتے ہیں۔ اور الْهَشِيمُ خشک اور نشیبی زمین کو\*۔

## ھ ض م

هَضْمٌ۔ کے اصلی معنی ہیں کسی نرم چیز کو کچلنا یا توڑنا۔ کسی چیز کو کم کرنا۔ هَضَمَ فُلَانًا۔ اس نے فلان آدمی پر ظلم کیا۔ اسے دبا یا اور اسکا حق غصب کر لیا۔ ہماری زبان میں بھی اس مفہوم کے لئے یہی کہتے ہیں کہ فلان نے اس کی چیز ہضم کر لی۔ الْهَضَامُ۔ شیر کو کہتے ہیں۔ هَضَمَهُ حَقَّقَهُ اس نے اس کا حق کم کر دیا۔ الْهَضِيمُ۔ نرم۔ لطیف۔ پختہ۔ خوشگوار۔ وہ چیز جسکا ایک حصہ دوسرے میں گھسا ہوا ہو\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔

سورہ طہ میں ہے فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۱/۱۱۴)۔ اس (جنتی معاشرہ) میں نہ حق تلفی کا خوف ہوگا نہ غصب و نہیب کا۔ اس میں نہ استبداد ہوگا نہ ناجائز انتفاع یا استحصال (Exploitation)۔ سورہ شعراء میں ہے۔ طَلَعْنَهَا هَضِيمٌ\* (۲۶/۱۳۸) جن کے شکوفے نہ بہتے ہوئے اور ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوں۔

## ط ع

هَطَعَ هَطْطًا وَهَطْطُوْعًا۔ تیزی سے کسی چیز کی طرف ڈرتے ہوئے بڑھنا۔ یا کسی چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے آگے بڑھنا اور نگاہوں کو اس پر سے ادھر ادھر نہ ہٹانا۔ اَهْطَعَ کے بھی یہی معنی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں\* تاج و محیط و راعب۔

أَهْطَعَ الْبَعِيرُ فِي سَيْرِهِ - اونٹ نے چلنے میں اپنے سر کو سیدھا اور گردن کو لمبا کیا \*۔ قرآن کریم نے جنگ کی بدحواسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں کہا ہے کہ مَهْطِعِينَ (۱۲۳) - لوگ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگ رہے ہونگے کہ انہیں این و آن کی کچھ خبر نہ ہوگی۔ ڈر اور دہشت کے مارے سیدھا رخ کئے بھاگ رہے ہونگے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں کسی چیز کی طرف رخ کرنے، اسکی طرف بڑھنے، نیز اطاعت و انقیاد کا مفہوم ہوتا ہے۔

## هَل (حرف)

هَل (۱) استفہام کے لئے آتا ہے۔ مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِمَا لَا تُخْسَرُونَ أَعْمَالًا (۱۸۸)۔ ”کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سخت خسارے میں رکھینگے؟“

(۲) قَدْ - (یقیناً) کے معنوں میں آتا ہے۔ هَلْ آتَى عِلَّیْ لَا نِسَانَ حِينَ مِیْنَ الدَّهْرِ (۱۶۱) ”یقیناً انسان پر ایسا وقت بھی گذر چکا ہے“.....

(۳) کبھی، بطور استفہام، مآثما فیہ کے معنوں میں آتا ہے۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵)۔ کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی کچھ ہے؟ (یعنی احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کچھ نہیں)۔

## هَل ع

أَهْلَعَ - گھبراہٹ - بے صبری - بہت زیادہ، حمد سے متجاوز اور بدترین قسم کی گھبراہٹ - رنج و حزن - أَهْلَوْعٌ - حریص اور انتہائی بغیل۔ تنگ دل - بے صبری کا مظاہرہ کرنے والا - هَالِعٌ يَهْلَعُ - وہ بھوکا ہو گیا \*۔ جب بھوک اور حرص اکٹھی ہو جائیں تو ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان جتنا بی چاہے کھا جائے اسکی بھوک مٹی ہی نہیں، اور ہر وقت واویلا (”ہے نہیں - ہے نہیں“) کرتا رہتا ہے۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ رَجُلٌ هَلْعَةٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت جلد گھبرا کر واویلا کرنے لگ جائے اور ہمت ہار دے \*\*\*۔

قرآن کریم میں ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ خَلِیقٌ هَلْوَعٌ (۹۴)۔ انسان کو اگر علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو اسکی حرص کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ یہ تو صرف نظام صاۃ ہے جو اس میں سیر چشمی پیدا کر دیتا ہے (۹۴) اور اس کے واویلے کو ختم کر دیتا ہے۔

\* تاج و محیط و راعب - \*\* تاج و محیط - \*\*\* ابن فارس -

## ہلک

هَلَكَتْ - يَهْلِكُكَتْ - کے معنی مر جانے کے ہیں ، اگرچہ عوام اس لفظ کو 'بری موت کے لئے بولتے ہیں'۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ٹوٹنے اور گر پڑنے کے ہیں - راعب نے کہا ہے کہ هَلَكَتْ کے معنی عذاب ، خوف اور فقر کے بھی ہوتے ہیں\*\*۔ اِسْتَهْلَكَتْ الْمَالُ - مال کو خرچ کر کے ختم کر دیا - اَهْلَكَتْ الْمَالُ - اس نے مال کو فروخت کر دیا - اَلْهَلَكَتْ - قحط کے سال\*۔ اَلْهَلَكَتْ كَتْ - فقیر اور نادار لوگ - وہ مسافر جو امداد اور صلہ حاصل کرنے کے لئے جائیں اور راستہ بھول جائیں - اَلْهَالِكَةُ - حریص اور لالچی نفس - اَلْهَلَكَةُ - ہر وہ چیز جو بالآخر تباہی کی طرف لے جائے\*۔ راعب نے کہا ہے کہ کسی چیز کا اپنے پاس نہ رہنا - کسی چیز کا خراب اور بدحال ہو جانا - مر جانا یا بالکل ضائع ہو جانا ، سب کے لئے هَلَكَتْ کا لفظ بولا جاتا ہے\*\*۔

قرآن کریم میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ قدیم میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ کوئی بستی کسی طبعی حادثہ (مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے) کی وجہ سے بالکل تباہ ہو جائے - لیکن عام طور پر قوموں کی ہلاکت سے مراد ان کی ذلت و رسوائی اور کمزوری و محکومی ہوتی ہے - یعنی اگر کسی قوم سے سروری و سرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہے - یہی وہ ہلاکت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ - وَ اَنْفِيقُوا رَفِيَ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (۱۹۵) - نظام خداوندی کے قیام کے لئے اپنے اموال کو کھلا رکھو - ایسا نہ کرو گے تو تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لو گے - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی حادثہ یا عارضی سبب سے کوئی قوم وقتی طور پر گر جاتی ہے لیکن حالات کے سدھرنے پر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے (یہ اس کی حیاتِ نو یا تَشْأَاةٍ ثَانِيہ کہلاتی ہے) - جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں کہا گیا ہے کہ تَمَّ ثَمَّ بَعَثْنَا كُتُبًا مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۲۶) - "ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں پھر اٹھا کھڑا کیا" - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تباہی عارضی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتی ہے - سورۃ بنی اسرائیل میں ہماری صورت کو عذاب سے اور دوسری کو ہلاکت سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸) نیز (۱۹۵) - لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں - اس میں بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے -

سورۃ قصص میں ہے 'كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ' (۲۸) - اس

کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی

\*تاج و محیط - \*\*راعب -

ذات باقی رہ جائے گی۔ اس کی تائید میں سورۃ رحمان کی یہ آیت ہمیشہ کی جاتی ہے۔ ”کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَنَآءٌ - وَ یَسْبِقُنِیْ وَجْہُہٗ رَبِّیْکَ ذُو الْجَلَالِ الْاِکْبَرِ“ (۲۷-۲۸)۔ لیکن ان آیات کا صحیح مفہوم یہ نہیں۔ پہلی آیت میں ہالیکٹ اور دوسری میں فَنَآءٌ دونوں اسم فاعل ہیں اور اسم فاعل کو جب تک خصوصیت سے مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کر دیا جائے اس کے معنی زمانہ حال کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اِنِّیْ جَاعِلٌ کے معنی یہ نہیں کہ میں بناؤنگا۔ اس کے معنی ہیں میں بنا رہا ہوں۔ لہذا ہالیکٹ اور فَنَآءٌ کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہو جائیگی\*۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہو رہی ہے۔ کائنات کی ہر شے حالتِ فنا و ہلاکت سے گزر رہی ہے۔ فنا کے معنی معدوم ہو جانا نہیں۔ اس کے معنی ہیں تغیر پذیر ہو جانا۔ ایک حال پر نہ رہنا۔ اور ہلاکت کے معنی بھی قوت کے کم ہو جانے کے ہیں۔ لہذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی۔ ہر شے میں ہر آن تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشو و نما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے۔ وہ تغیرات کے اثر سے مسمون رہتا ہے۔ اسی کو مستقل قدر کہتے ہیں۔ لہذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر یا روبہ انحطاط ہے، بجز مستقل اقدار کے جو قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ خدا کی ربوبیت کبریٰ (عالمگیر نشو و نما) ہے۔ لہذا وہی نظریہ زندگی، وہی نظام حیات، وہی قوم، تغیرات اور انحطاط سے محفوظ رہ سکتی ہے جو اپنا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کا غلبہ و تسلط اور قوت و اثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق سورۃ الْحَافِیۃ میں ہے کہ هَلٰکَ عَنۡشِیْ سُلٰطٰنِیَّہٗ (۱۹)۔ ”میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا“۔ قوتیں ضعف سے بدل گئیں۔

آیات مندرجہ صدر میں ”وجہ رب“ کے معنی خود ذات خداوندی بھی ہو سکتے ہیں

\* کائنات کا انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی اس قسم کا راز ہے جس قسم کا راز کائنات کا آغاز ہے۔ یہ امور انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ بہر حال، کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قانون کے مطابق قائم ہے۔ اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا۔ ابدی تو یہ بہر حال نہیں۔ یعنی اُن معنوں میں ابدی جن معنوں میں خدا ابدی ہے۔ ہمارے لئے یہ سوال بھی بیکار ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے تو بہر حال ایک دن موجودہ ارضی زندگی کو چھوڑنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جب تک اس میں رہیں اس کے حسن میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔

## ہ ل ل

الْهَلَالُ\* - کے اصلی معنی ہوتے ہیں آواز بلند کرنا\* - راغب نے لکھا ہے کہ رویت ہلال کے موقع پر اونچی آواز نکالنے کے لئے بولا جاتا ہے ، بعد ازاں ہر آواز کے لئے بولا جائے لگا\*\*\* - هَلَّ الرَّجُلُ\* - آدمی چیخا۔ اسْتَهْلَلَ الصَّيْبِيُّ\* - بچہ نے پیدا ہوتے ہی رونے کی آواز بلند کی۔ الْهَيْلَالُ\* - مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند۔ بعض نے کہا ہے کہ تیسری تاریخ بلکہ ساتویں تاریخ تک کے چاند کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ( اسی طرح قمری مہینے کی چھبیس - ستائیس تاریخ کے چاند کو بھی کہتے ہیں)۔ هَيْلَالٌ\* کو هَيْلَالٌ\* اس لئے کہتے ہیں کہ لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر بتاتے ہیں\* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی آواز بلند کرنا لکھے ہیں۔ اَهْلَ الشَّهْرِ\* - مہینہ کا چاند دیکھ لیا\*۔ الْهَيْلَالُ\* اور الْهَيْلَالُ\* - پہلی بارش کو بھی کہتے ہیں\*۔ (لیکن اسی بارش کو جسکے برسنے کی آواز آئے)۔

الْهَلَلُ\* - ہاتھی کے مغز کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زہر قاتل ہوتا ہے۔ یعنی زہر ہلاہل\*۔ هَلَّلَ - یہودی اور نصرانی اس لفظ کو تسبیح پڑھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو عبرانی اور سربانی زبان کا لفظ ہے\*\*۔ ہمارے ہاں بھی تسبیح و تہلیل کہتے ہیں۔ هَلَّلَ کے معنی ہیں لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا\*\*\*۔

قرآن کریم میں (کھانے پینے کی حرام اشیاء کی فہرست میں) ہے وَمَا اَهْلًا بِسْمِ لِيْغْيِرَ اللّٰهُ (۱/۲)۔ یعنی وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا جائے۔ جو چیز بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے وہ قرآن کریم کی رو سے حرام ہو جاتا ہے۔ مؤمن کے لئے خدا کے سوا کسی اور قوت کا تصور شرک ہے۔ ”منسوب ہونے“۔ یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام سے پکارے جانے کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ مثلاً شاہ مدار کے نام پر بکرا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بکرا ویسے تو حلال جانور ہے لیکن چونکہ اسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے پکارا گیا ہے ، یا اسے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے ، اس لئے اس کا کھانا حرام ہو جائے گا۔ اسی طرح کھانا پکا کر کھدیا جائے کہ یہ فلاں پیر صاحب کی نیاز ہے تو اگرچہ وہ کھانا پاک اور صاف ، حلال اور طیب تھا لیکن غیر اللہ کی طرف نسبت سے وہ حرام



ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نسبت میں شرک کا پہلو آجاتا ہے اور یہ توحید کے منافی ہے۔ قرآن کریم انسان کے عقائد اور تصورات کو شرک کے شائبہ تک سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ شرک وجہ تذلّیل انسانیت ہے۔

## ہَلُمَّ

ہَلُمَّ (۱) اَوْ۔ هَلُمَّ اِلَيْنَا (۳۳/۱۸)۔ ہماری طرف آؤ۔

(۲) لَاؤ۔ هَلُمَّ شَهِدَا عَکُم (۱/۱۵۱)۔ اپنے گواہ لاؤ۔

## ہُم

ہُم۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے۔ ہُم رَجَالٌ وہ سب آدمی ہیں۔ سورۃ منافقون میں ہے ہُم الَّذِینَ یَقُولُوْنَ... (۲۳/۶) یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں۔

(۲) ہُم ضمیر منصوب متصل بھی ہے۔ جمع مذکر غائب کے لئے آتی ہے۔ ضَرَبْتُهُمْ۔ اس نے ان سب کو مارا۔ سورۃ بقرہ میں ہے تَسْمَعُ عَرَضُهُمْ عَلٰی السَّمَلٰئِکَ (۲/۲۱)۔ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے کیا۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے۔ غَلَا مَتَّهُمْ۔ ان سب کا غلام۔

سورۃ طہ میں ہے حَبِیْطَتُهُمْ وَ عِصِیَّتُهُمْ... (۲۰/۶۶)۔ ان کی رسیاں اور ان کی لالٹھیاں...

## ہَمَا (ضمیر)

ہَمَا۔ تشبیہ غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے آتی ہے۔ هَمَا رَجُلَانِ۔ وہ دونوں مرد ہیں۔ هَمَا امْرَاَتَانِ۔ وہ دونوں عورتیں ہیں۔ سورۃ توبہ میں ہے اِذْ هَمَا فِی الْغَارِ (۹/۲۵)۔ ”جب وہ دونوں غار میں تھے“۔

(۲) یہ ضمیر منصوب متصل کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے اور تشبیہ غائب کے لئے آتی ہے۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں طور پر آتی ہے۔ ضَرَبْتَهُمَا۔ اس نے ان دونوں کو مارا۔ سورۃ بقرہ میں ہے فَسَاَزَ الشَّيْطٰنُ... (۲/۳۶)۔ پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے۔ غَلَا مَثْمَعًا۔  
ان دونوں کے غلام۔ (مذکورہ مؤنث دونوں کیلئے)۔ سورۃ طہ میں ہے  
بِسِحْرِ هَيْمًا (۲۶)۔ (یہ دونوں) اپنے سحر کے زور سے۔۔۔

## ہ م د

الْهَمُّوْدُ۔ آگ کا بجھ جانا۔ خَمَدَتِ النَّارُ اُسوقت کہتے ہیں  
جب اس کا شعلہ بیٹھ جائے، اور خَمَدَتِ هَمُّوْدًا اُسوقت جب وہ بالکل  
ہی بجھ جائے۔ اور جب وہ راکھ ہو جائے تو اس کے لئے هَبَّاءُ يَهْبُوْا کہتے  
ہیں۔ الْهَمُّوْدُ فِی الْاَرْضِ۔ زمین میں زندگی کا باقی نہ رہنا۔ یعنی نہ  
اس میں درخت و سبزہ ہو نہ اس پر بارش برسی ہو\*۔ قرآن کریم میں ہے  
وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِیْدَةً (۲۲)۔ تم زمین کو مردہ دیکھتے ہو جہاں  
سبزی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔

## ہ م ر

هَمَرَ الْمَاءَ بِهَمِيرٍ۔ اس نے پانی کو گرا دیا۔ یا بہا دیا۔  
هَمَرَ الدَّمْعَ۔ اس نے آنسو بہائے۔ اِنْهَمَرَ الدَّمْعُ وَالْمَطَرُ۔ آنسو  
اور بارش بہے۔ اِنْهَمَارٌ۔ خوب برسنے والا ہادل\*\*۔  
قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے قصہ میں ہے فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ  
السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّثَمَرٍ (۱۱)۔ پھر ہم نے آسمان کے دروازے زور سے  
برسنے والے پانی سے کھول دیے۔

## ہ م ز

الْهَمَزُ۔ کچوکا دینا۔ دھکا دینا۔ اور مارنا۔ کاٹ کھانا۔ اَلْهَمِيزُ  
کچوکے مارنے والا۔ جماعت میں تفریق ڈالنے والا۔ دوستوں میں جھگڑا  
ڈلوانے والا۔ غیبت کرنے والا۔ یہی معنی مبالغہ کے ساتھ اَلْهَمِيزَةُ میں  
پائے جاتے ہیں۔ اَلْهَمِيزَةُ۔ اَلْهَمِيزَةُ۔ لوہے کی نکیلی چیز (سیخ سی)  
جو سوار کے جوئے میں لگی ہوتی ہے اور اس سے وہ جانور کو کچوکے مارنا  
جاتا ہے تاکہ وہ تیز بھاگے\*\*\*۔ اسی کو ہماری زبان میں مہمیز (یا ایڑھ) لگانا  
کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَمِيزُ نچوڑنے نیز غیبت کرنے کو  
کہتے ہیں\*\*\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دہانے اور نچوڑنے کے  
لکھے ہیں، اور هَمِيزَةُ وَهَمِيزٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا۔

\* تاج۔ \*\* تاج و محیط و راغب۔ \*\*\* تاج و محیط۔ \*\*\*\* راغب۔

سورہ مومنون میں ہُمَزَاتِ الشَّاطِطِیْنِ (۲۳/۶۷) آیا ہے۔ سرکش مخالفین کی تمام وہ تدبیریں جن سے وہ جماعت مومنین میں تفرقہ انگیزی چاہتے ہوں۔ سورہ قلم میں ہَمَّازِ (۱۸/۱۱) آیا ہے۔ سورہ ہُمَزَہ میں ہُمَزَہ (۱۱/۱۳) آیا ہے۔ معنی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ یعنی اپنی دسیہ کاریوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے اور وہ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتا رہے۔ وہ نہ کائنات کے حسن کی تحسین (Appreciation) کا جذبہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرے۔ یہ ذہنیت سرمایہ دار کی ہوتی ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اس قدر مال و دولت ہے تو اس سے دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ جس کے پاس دولت نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں ہو سکتی۔ (المقام المحمود)۔

### ہ م س

الْهَمْسُ\*۔ خفی آواز۔ قدموں کی مخفی ترین آہٹ۔ الْهَمْسِيسُ\*۔ اونٹوں کے پاؤں کی آہٹ\*۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا\*۔ تو نہایت ہلکی سی آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا۔  
الْهَمْسُ\*۔ منہ کو بند کر کے کھانے کو چبانے کا کہ آواز نہ نکلے۔  
الْهَمْسُ\*۔ نچوڑنا۔ کوٹنا۔ الْمُهْتَمِسَةُ\*۔ آپس میں راز داری کی باتیں کرنا\*۔  
سورہ طہ میں ہے فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا (۲۰/۸)۔ تو سوائے ہلکی سی آواز کے کچھ نہیں سنے گا۔

### ہ م م

هَمٌّ\*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پگھلنے، بہنے اور آہستہ آہستہ رینگنے کے ہوتے ہیں۔ الْهَمُّ\*۔ غم اور حزن۔ کیونکہ وہ آدمی کو پگھلا دیتا ہے۔ هَمٌّ اور غَمٌّ میں فرق یہ ہے کہ غَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی بات کے واقع ہو جانے کے بعد دل میں پیدا ہو۔ اور هَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی پیش آنے والی مصیبت کے خیال سے پیدا ہو رہا ہو\*\*۔ هَمٌّ وَاَهَمُّ\*۔ اسے غمگین اور بے چین کیا۔ سورہ آل عمران میں ہے وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ (۳/۱۵۳)۔ ایک گروہ کو خود اسکی اپنی جانوں نے (اپنے خیالات کے وجہ سے) فکر مند کر رکھا تھا۔ یعنی وہ سچ مچ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھے بلکہ موہوم خطرات کے تصور سے خواہ مخواہ مضطرب و بے قرار ہو رہے تھے۔

اَلْهَمَّ ۞ کسی بات کی دل میں نیت کرنا۔ ارادہ کرنا\*۔ هَمَّ بِالشَّقَى ۞۔ کسی چیز کا ارادہ و قصد کیا لیکن اسے کیا نہیں\*\*۔ وَكَانَتْ هَمَّتْ بِهِمْ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بَرُّهَانَ لَمَّ يَشِيْهِ (۲۴/۲۴)۔ عزیز کی بیوی نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا (کہ یوسف کو اپنے دام ہوس میں پھانس کر چھوڑ دیگی) اور ہو سکتا تھا کہ یوسف بھی ایسی نیت کر لیتا اگر اس کے سامنے خدا کا واضح قانون نہ آچکا ہوتا\*۔ یعنی عزیز کی بیوی چونکہ محض اپنے جذبات کے تابع چل رہی تھی اسلئے اسے اس ارادہ بد سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے خدا کا قانون تھا اسلئے وہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غور کیجئے قرآن کریم نے اس داستان کے اثنے سے ٹکڑے میں کیسی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب انسانی جذبات اور کسی مستقل اور بلند قدر میں (Tie) ہڑ جائے تو مومن اس بلند قدر کے تحفظ کے لئے جذبات کے تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کا نام بلند اقدار پر ایمان ہے۔ سورہ مومن میں ہے وَهَمَّتْ كُتْلٌ اُمَّةٌ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَمَّازُ خَذُوْهُ (۲۸/۲۸)۔ ہر قوم نے اپنے اپنے رسول کے خلاف (نقصان پہنچانے کی) تدبیریں کیں یا اسکا ارادہ کیا۔ اَلْهَيْمَةَ ۞ جس کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پختہ ارادہ۔ آغاز ارادہ\*۔ اَلْمَهْمَاتُ مِّنَ الْاُمُوْر ۞ نہایت اہم امور\*۔

## ه ن ا

هَنَّا ۞۔ هُنَّا ۞۔ یہاں ۞۔ یہیں ۞۔ اِنَّا هُنَّا قَسَاعِدٌ وَّنَ (۲۴/۲۴)۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں (نیز ۲۴/۲۴)۔ هُنَالِكَ ۞۔ وہاں ۞۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا (۲۳/۲۳)۔ وہاں زکریا نے پکارا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳/۲۳)۔ وہاں مومنوں کے ابتلاء کا وقت آیا۔

## ہ ن ا

اَلْهَنِي ۞۔ ہر وہ چیز جسکے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہ ہو اور جسکے نتیجہ میں کوئی برائی نہ ہو۔ یہ لفظ دراصل خوراک کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ دوسری چیزوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے\*\*\*۔ طَعَامٌ ۞۔ هَنِي ۞۔ خوشگوار کھانا۔ اَلْهَنِيَّةُ ۞۔ تعزیت کے خلاف ہے۔ مبارک باد دینا\*۔ سورہ نساء میں ہے۔ فَكُنُوْهُ هَنِيًا مَّرَبًا ۞ (۴/۴)۔ اسے خوشگوار سے کھاؤ (اپنے تصرف میں لاؤ)۔

## هَنْ (ضمیر)

هَنْ ۛ - جمع مؤنث غائب کی مرفوع منفصل ضمیر ہے - هَنْ ۛ نِسْوَةٌ ۛ وہ سب عورتیں ہیں -

(۲) هَنْ ۛ - ضمیر منصوب متصل بھی ہے - ضَرَّ بِهَنْ ۛ - اس نے ان سب عورتوں کو مارا -

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامٌ مِّمَّهَنْ ۛ - ان سب عورتوں کا غلام -

سورة بقرہ میں ہے هَنْ ۛ لِبَاسٌ لَّكُمْ ۛ (۱۸۷) ”وہ تمہارے لئے (بمنزلہ) لباس ہیں -

سورة نساء میں ہے فَاتَّكِرْهُنَّ ۛ بِيَارِزٍ ۛ أَهْلِيهِنَّ ۛ وَاتَّو ۛ هَنْ ۛ أُجُورَ هَنْ ۛ . . . (۴۵) ان کے مالکوں کی اجازت سے انہیں نکاح میں لاؤ اور ان کے سہر انہیں دے دو -

## هُوَ (ضمیر)

هُوَ - واحد مذکر غائب کے لئے ضمیر مرفوع منفصل ہے - هُوَ رَجُلٌ ۛ وہ ایک مرد ہے - هُوَ اللَّهُ الَّذِي . . . (۴۴) وہی اللہ ہے -

## هُود

آلِ هَوْدَ ۛ - نرمی اور سہولت کے ساتھ حق کی طرف رجوع کرنا\* - قرآن کریم میں ہے - إِنَّا هَدَيْنَا السَّبِيلَ (۱۵۶) - ہم تیری طرف رجوع کرنے میں - آلِ هَوْدَ ۛ - یہودی\* - هَادَ ۛ - وہ یہودی ہوا - يَهْوُدَا ۛ - حضرت یعقوبؑ کے ایک بیٹے کا نام تھا\* -

سورة بقرہ میں ہے إِلَّا مَن كَانَ هَوْدًا . . . (۱۱۱) - سوائے ان کے جو یہودی ہوں - اور سورة مائدہ میں ہے وَالَّذِينَ هَادُوا . . . (۶۶) - اور جو لوگ یہودی ہوئے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”موسیٰ“)

## هُود علیہ السلام

قوم نوح کی جانشین ، قوم عباد ہونی (۶۶) - تفصیل عنوان ”نوح“، میں دیکھئے - ان کی طرف ان کے بھائی ، حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے - (۶۵) - یہ لوگ جسمانی طور پر ، مضبوط اور طاقتور تھے - بڑے ڈیل ڈول والے تھے -

(۶۹)۔ اور ان کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں (۲۶۱/۱۳۴)۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی وہ قوم نوحؑ سے آگے تھے۔ یہ بڑے بڑے مضبوط قلعے بنائے تھے (۲۶۱/۱۴۹)۔ اور پہاڑوں کی بلندیوں پر یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۲۶۱/۱۴۸)۔ اور علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۶۱/۱۴۷)۔ لیکن بڑے مستبد اور جبار تھے۔ غریبوں اور مظلوموں کو اپنے فولادی شکنجوں میں کس کر رکھتے تھے (۲۶۱/۱۳۰)۔

حضرت ہودؑ نے انہیں خدا کا وہی پیغام دیا جو اس سے قبل حضرت نوحؑ اپنی قوم کو دے چکے تھے۔ یعنی یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ..... (۲۶۱/۱۳۵)۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا اللہ اور کوئی نہیں۔ حسب معمول، سردارانِ قوم (مترفین کے طبقہ) کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی (۲۶۱/۱۳۶)۔ اور وہ اس شدتِ مخالفت میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ ان کا علم و بصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا (۲۶۱/۱۴۱)۔ اور تباہ کن آندھی نے انہیں برباد کر کے رکھ دیا (۲۶۱/۱۴۴)۔ اور ان کی جڑ کٹ گئی (۲۶۱/۱۴۵)۔ قرآن کریم نے اس قوم کو ”عادِ اولیٰ“ بھی کہا ہے (۵۳/۵)۔

(جو قومیں اس طرح ہلاک ہوئی تھیں، ان کے اعمال اور ان طبعی حوادث میں کیا تعلق تھا، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں عنوان ”حضرت نوحؑ“ دیکھئے)۔

## ہ و ر

هَارَ الْبَيْتَاءُ هَوْرًا۔ اس نے ہمارے کو منہدم کر دیا۔ فہَارٌ۔ پس وہ منہدم ہو گئی۔ (لازم و متعدی)۔ منہدم ہونے اور پھٹ کر گر پڑنے کے لئے اِنْهَارٌ بھی آتا ہے۔ وَ هَوَّ هَائِيرٌ وَ هَارٍ (اسم فاعل)۔ تَهَوَّرَ۔ وہ منہدم ہو گیا۔ تَهَوَّرَ۔ کسی چیز کا حوض کے کنارے یا کنویں کے دھانے سے حوض یا کنویں کے اندر گر پڑنا۔ تَهَوَّرَ الرَّجُلُ۔ آدمی معاملہ میں بلا سوچے سمجھے کھس گیا\*۔ یعنی اس میں اس طرح گر گیا جس طرح دریا کا کنارہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے۔ اِسے تَهَوَّرَ کہتے ہیں\*۔ قرآن کریم میں ہے عَلَيَّ شَتَا جُرْفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بَيْتُهُ (۱۶۹/۱۶۹)۔ ایک گرنے والے کنارے کی بالکل آخری حد پر جو اسے لے کر نیچے گر جائے۔

## ہ و ن

هَانَ۔ يَهْوُنُ۔ هَوْنًا۔ ذلیل ہونا اور هَانَ هَوْنًا سہل اور آسان ہونا۔ یعنی نرمی اور سہولت اور ذلت و رسوائی دونوں کے لئے یہ مادہ آتا ہے\*\*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سکون - سکینت و اطمینان یا ذلت کے ہوتے ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ جب انسان اپنے مزاج میں خود ہی ایسی نرمی اور جھکاؤ پیدا کر لے جس میں اسکی سبکی نہ ہوتی ہو تو یہ نرمی اور جھکاؤ محمود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مستبد قوت کسی میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کرے جس میں اسکی ذلت و رسوائی کا پہلو ہو تو یہ مذموم ہوتا ہے \*\*۔ **هَوْنُ الشَّيْءِ وَأَهَانُهُ** - کسی چیز کو حقیر سمجھنا - اسکی اہالت کرنا - **الْهَيْئَتَيْنِ** - ذلیل نیز آسان و سہل - **الْهَوَانُ وَالْمَهَانَةُ** - ضعف اور کمزوری \*۔ ذلت و حقارت \*\*\*۔

**هَيْئَتَيْنِ** - ساکن اور مطمئن - **إِسْرَافَةٌ هَوْنَةٌ** - مطمئن اور سہولت کے ساتھ کام کرنے والی باوقار عورت - **سَارَ عَلَى هَيْئَتِهِ** - وہ اپنی عادت کے مطابق نرمی اور سہولت کے ساتھ چلا -

سورة نحل میں ہے کہ جب ان (بدوؤں) میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر رنج و غم کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ قوم سے چھپتا بھرتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ **أَيْمُسِيكُهُ** **عَلَى هَوْنٍ أَمْ يَدُلُّهُ** **فِي التَّجَارِبِ** (۱۶۱) - وہ (اس لڑکی کو جس کی پیدائش کی خبر ملی ہے) ذلت و رسوائی کی خاطر باقی رہنے دے یا اسے مٹی میں دبا دے -

سورة الفرقان میں جہنم کے متعلق ہے **بَتَّخِلُّدُ فِيْهِ مِهَانًا** (۲۵) - اس میں ذلت و رسوائی کا مفہوم ہے - سورة مریم میں ہے **هُوَ عَلَى هَيْئَتَيْنِ** (۱۹) - یہ مجھ پر سہل اور آسان ہے - سورة نور میں ہے **تَعَسَّبُوْنَهُ هَيْئًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيْمٌ** (۲۷) - تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو حالانکہ قانون خداوندی کی رو سے وہ بہت بڑی بات ہے -

سورة الفجر میں تنگی زرق کی وجہ سے ذلیل اور کمزور کرنے کے لئے **وَبَشَىٰ أَهَاتَنِ** (۸۹) آیا ہے -

لہذا قرآن حکیم میں جہاں **عَذَابٌ مُّهِينٌ** (۲) آیا ہے تو اس کے معنی ہیں ایسی سزا جو ذلیل و رسوا بھی کر دے اور جس سے قوم کی قوت ٹوٹ کر اسمیں ضعف اور کمزوری آجائے - محکومیت میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں - نیز دوسروں کے آسروں پر جینے والی قوموں میں -

سورة الفرقان میں عباد الرحمن کے متعلق ہے يَمْشُونَ عَلٰى اَلاَرْضِ هَوْنًا (۲۵)۔ وہ دنیا میں نہایت اطمینان و سکون سے چلتے پھرتے ہیں۔ نہ ان میں کسی قسم کی افرا تفری ہوتی ہے نہ خوف اور گھبراہٹ۔ اس لئے کہ وہ کمزور اور ذلیل نہیں ہوتے۔ وہ اَعْلَوْنَ ہوتے ہیں (۳۸)۔ سب پر غالب۔ اگر اس میں صرف رفتار کے انداز کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میانہ روی سے چلتے ہیں اور یونہی اگرتے نہیں پھرتے (۳۹) اور اگر يَمْشُونَ عَلٰى اَلاَرْضِ کے معنی زمین میں غلبہ و حکومت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت قہر اور استبداد کی حکومت نہیں ہوتی۔

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سورة الفجر میں ہے کہ جب انسان پر رزق کی تنگی کی وجہ سے ذلت و خواری کا عذاب آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْ اِهَانَنِی (۱۶) ”میرے رب نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا“۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے سرفراز ہوتا ہے اور اعمال ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تمہارے پاس رزق کی فروانی تھی تو لَا تَشْكُرْ مَوْنُ السَّیِّئِیْمِ۔ وَلَا تَحْضِیْوْنَ عَلٰی طَعَامِ السَّیِّئِیْمِ (۱۸)۔ تم ان لوگوں کی جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے اور جن کی چلتی گاڑی رک جاتی تھی ان کی روٹی کے انتظام کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے۔ تم وراثت کا مال سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور چاروں طرف سے مال اکھٹا کرتے چلے جاتے تھے۔ (۱۹)۔ یہ تھا تمہارا وہ غلط معاشرہ جس کی وجہ سے تم ہر رزق کی تنگی آتی اور تم ذلیل و خوار ہو گئے۔

## ہوی

هَوٰی۔ يَهْوٰی۔ هَوٰیثا۔ اوپر سے نیچے کرنا۔ هَوٰی الشَّقِیْی۔ جہز اوپر سے نیچے کی طرف گری۔ هَوَاتِ الْعُقَابِ تَهْوٰی هَوٰیثا۔ عقاب شکار پکڑنے کے لئے نیچے کی طرف جھپٹا۔ اَلْمَهْوَاةُ۔ جَو (فضا یا خلا) نیز دو پہاڑوں کے درمیانی نشیبی علاقے کو کہتے ہیں\*۔ اَلْهَوٰی۔ کان میں ”بھن“ بھن کی آوازیں آنا\*\*۔ هَوَاع۔ ہر خالی چیز کو کہتے ہیں بالخصوص زمین و آسمان کے درمیان خالی فضا کو۔ نیز بزدل کو بھی کہتے ہیں\*۔ اَلْهَوٰی۔ انسانی جذبہ اور خواہش کو کہتے ہیں۔ یہیں سے هَوٰی یسہ۔



یَتَهَوَّاهُ - ہتوی کے معنی چاہنے، محبت کرنے یا پسند کرنے کے آئے ہیں۔  
 اِسْتَهْوٰی - اِسْتَهْوَاءُ - (۱۰۱) - اس نے اسے گرانما چاہا۔ اس کی عقل کو  
 لیے اڑا۔ یا اس کی خواہش کو اس کے لئے موزن کیا۔ هَوٰی صَدْرُہ  
 یَتَهَوِّی - اس کا سینہ خالی ہو گیا\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی  
 (۱) خالی ہونا اور (۲) گرنا بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰی (۵۳) - (طلوع ہونے  
 والا) ستارہ اس پر شاہد ہے جبکہ وہ نیچے کی طرف جا رہا ہو۔ سورۃ حج میں مشرک  
 کے متعلق ہے۔ اَوْ تَهَوِّیْ بِرَبِّهِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانَ سَجِیۡتٍ (۲۲) -  
 اسے ہوا اڑا کر کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے۔ اس میں نیچے گرانما  
 اور دور پھینک دینا، دونوں آجاتے ہیں۔ سورۃ النجم میں ہے۔ وَ التَّهَوُّۃُ تَفِیۡکَہُ  
 اَهْوٰی - (۵۳) - اس نے تباہ شدہ بستیوں کو خالی کر دیا۔ یا نیچے کرا دیا۔  
 سورۃ ابراہیم میں ہے۔ وَ اَفۡئِیۡدُ تَتَّهَمُ هَوَّاءُ (۱۲) - ان کے دل جیرات و  
 بسالت سے خالی ہو رہے تھے۔

سورۃ ابراہیم میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہے۔ فَاجْعَلْ اَفۡئِیۡدَہٗ مِّنَ  
 النَّاسِ تَهَوِّیْ اِلَیَّہِمُ (۱۳) - اور ایسا کر دے کہ لوگوں کے دل ان  
 کی طرف مائل ہو جائیں۔ سورۃ بقرہ میں لَا تَهَوِّۡلِ اَنْفُسُکُمْ کے بعد ہے  
 اِسْتَكْبَرُتُمْ (۲) - یعنی جن رسولوں کو تمہارا دل پسند نہیں کرتا تھا  
 تم ان سے انکار و سرکشی اختیار کر لیتے تھے۔

سورۃ النجم میں وحی کے مقابلہ میں انسان کے ذاتی خیالات کو ہتوی  
 کہا ہے۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (۵۳) -  
 یہ قرآن کریم اس رسول کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ وحی ہے جو اس کی طرف  
 بھیجی جاتی ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے وَ لَئِنْ اَتَّبَعْتِ اَهْوَاءَہُمۡ بَعُدَ الَّذِی  
 جِئَاۡکَ مِنَ الْعِلۡمِ... (۱۲) - اس وحی کے بعد اگر تم ان لوگوں کے  
 ذاتی خیالات کا اتباع کرو گے تو...

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم انسانی جذبات و خواہشات کے خلاف  
 نہیں (۱۳) - وہ ان جذبات و خواہشات کے خلاف ہے جو وحی کے تابع نہ  
 رکھے جائیں۔ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا لَّا یُضِلُّوۡنَ بِمَا هَوَّاءُہِمۡ یُغۡیۡرُ عَلَیۡہِمۡ  
 (۱۲) - ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو اپنے ذاتی خیالات کی بناء پر جنہیں  
 وحی (علم) کی سند حاصل نہیں ہوتی، لوگوں کو صحیح راستے سے بہکا دیتے ہیں۔

یہی وہ جذبات و خیالات ہیں جو انسان کو شرف انسانیت کی بلندیوں سے حیوانی سطح کی ہستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَ مَن يَحْتَلِلْ عَلَيَّهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ (۲۸۱)۔ اور جو غلط راستے پر چل کر ہمارے انعامات سے محروم رہ گیا وہ ہستیوں میں جا گرا۔ وحی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے۔ لیکن انسان اس راستے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اس طرح ذلتوں کی ہستیوں میں جا گرتا ہے۔ وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهٖتَا وَلَٰكِنَّ يَتَقَنَّ إِلَىٰ الْآرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوَاهُ (۳۶)۔ اگر وہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق چلتا تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے۔ لیکن وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا۔ یعنی (وحی کو چھوڑ کر) اپنے ذاتی خیالات و مفادات کے پیچھے لگ گیا۔

یہی وہ ہستیوں کی زندگی ہے جسے ہَوَاهُ کہا گیا ہے (۱۱۱)۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان کا دل و دماغ کچھ کام نہ دے اور وہ پریشانیوں اور ذلتوں میں مارا مارا پھرے۔ گری ہوئی حالت۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں نَارٌ حَامِيَةٌ یعنی بھڑکتی آگ۔

لہذا اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ اور اگر وہ سرکش و بے باک ہو جائیں (جسے شیطان کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ جہنم کی ہستیاں ہیں۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم کی ”رو سے انسانی جذبات کوئی قابل نفرت چیز نہیں کہ جنہیں دہانے یا فنا کر دینے میں ”روحانی ترقی“ کا راز مضمر ہے۔ بالکل نہیں۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے (جذبہ) اور انسانی سطح زندگی کے تقاضے میں (Tie) آڑے تو اس وقت اسے اس بلند تقاضے کی خاطر ہست تقاضے کو قربان کر دینا چاہئے۔ ”انسانی سطح زندگی کے تقاضے“ ان مستقل اقدار سے وابستہ ہیں جو وحی کی ”رو سے ملتی ہیں۔ انسانی جذبات کو وحی کی روشنی کے تابع رکھنا، یہ ہے وجہ بالیدگی شرف انسانیت۔ یا انسانی ذات کی نشو و نما (Development) کا طریق۔ جب دونوں میں تصادم (Clash) نہ ہو تو انسانی جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں۔

## ہی (ضمیر)

ہی - واحد مؤنث غائب ضمیر مرفوع منفصل ہے۔ ہی امْرَأَةٌ وہ ایک عورت ہے۔ قرآن کریم میں ہے ہی حَقِيقَةٌ (۱۱۱)۔ وہ سانب ہے۔

## ہ ی ا

هَيَّآءٌ اَلَا مَرَّ تَهَيَّيْتُمْ\* - اس نے معاملہ کو درست کر دیا۔ تیار کیا، ہموار کیا\*۔ سورہ کہف میں ہے وَهَيَّيْ لَنَا مِّنْ اَمْرِ نَسَارَ شَدَّآ (۱۸)۔ ہمارے لئے ہمارے معاملہ کی صحیح صورت مہیا کر دے۔ اَلْهَيَّيْتُمْ\*۔ کسی چیز کی حالت اور کیفیت۔ شکل و صورت\*\*\*۔ راغب نے کہا ہے کہ ہیئت محسوس بھی ہو سکتی ہے (یعنی شکل و صورت) اور معقول بھی\*\*۔ (یعنی کسی کی ذہنی، قلبی یا دوسری کیفیت جو محسوس شکل میں سامنے نہ آئے لیکن ہم بہ چشم بصیرت اسے دیکھ سکیں)۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اِنِّیْٓ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الطَّيْنِ کَهَیْئَتِ الطَّيْرِ (۳۸)۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند شکل بنا دوں گا“۔ اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کروں گا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال فشاں ہو جاؤ گے۔ تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی۔ یہاں ہیئت محسوس نہیں بلکہ معقول مراد ہے (یعنی جسے عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکے)۔

## ہ ی ت

هَیٔتَ لَکَ - فراء نے کہا کہ یہ حوران کا لغت ہے جو کسی طرح مکہ میں پہنچ گیا اور وہاں کے لوگ اسے بولنے لگ گئے۔ بعض کے نزدیک یہ عبرانی هَیٔتَالَخ سے عرب ہے\*\*\*\*۔ اس کے معنی ہیں ادھر آؤ۔ جلدی آؤ۔ هَیٔتَ کلمہ تعجب بھی ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ یہ اکسائے کے لئے بولا جاتا ہے\*۔

اَلْهَیٔتُ\*۔ گہری نشیبی زمین\*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی چیخنا اور هَیٔتَ یہ کے معنی اسے ”چلا کر پکارا“، لکھے ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (۲)۔ اپنی دلیل پیش کرو۔ جلدی سے سامنے لاؤ۔ بعض اہل لغت نے هَاتُوا کیو (ہ۔ ت۔ و) یا (ہ۔ ت۔ ی) کے تابع بھی لکھا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ هَاتِ دراصل اَتٰی بَوْتٰی سے ہے۔ اس کے الف کو ہاء سے بدل لیا گیا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے هَیٔتَ لَکَ (۱۲)۔ ادھر آؤ۔

## ہ ی ج

الْهَيْجُ - حرکت میں آنا - حرکت میں لانا - (لازم اور متعدی) هَاجَ  
الْأَيْل - اس نے اونٹوں کو رات کے وقت (جب وہ سکون میں تھے) حرکت دی اور  
چلایا - هَاجَ الْبَحْرُ - سمندر میں اضطراب اور ہیجان پیدا ہو گیا - هَاجَتِ  
الْأَيْلُ - اونٹ پیاسے ہو گئے - یہیں سے هَاجَ النَّبْتُ کے معنی ہیں  
سبزیاں خشک ہو گئیں - هَاجَ الْبَقْلُ - سبزی کا لمبا ہونا اور زرد پڑنا  
اور سوکھنا - الْهَاجَةُ - وہ زمین جس کی سبزیاں زرد ہو گئی ہوں یا خشک  
ہو چکی ہوں - قرآن کریم میں کھیتی کے متعلق ہے - ثُمَّ يَهْيِجُ (۳۶) -  
پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی  
(۱) برانگیختہ ہونا اور (۲) ہودوں کا خشک ہو جانا ہیں -

## ہ ی ل

هَالٌ عَلَى الشَّرَابِ هَيْلًا وَهَيْلًا - اس نے اس پر  
مٹی ڈالی - فَانْهَالَ وَتَهَيَّلَ پس مٹی پڑ گئی ، اوپر سے نیچے گر گئی -  
رَمَلَ هَالٌ وَآهَيْلٌ - ریک رواں - الْهَيْلُ وَالْهَيْلُ وہ ریت جو گر  
جائے - كَثِيبٌ آهَيْلٌ - ریت کا وہ ٹیلہ جس کی ریت گر جائے - الْهَيْوُلُ  
وہ منتشر ذرات جو دوپہر کو روشندانوں میں اڑتے نظر آتے ہیں - الْهَيْلَةُ  
چاند کے گرد حلقہ -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے معنی کسی چیز کو جسے ناپا  
جاسکے بغیر ناپے دے دینے کے ہیں - یعنی اسے بونہی دھکیل دینا (جس طرح  
بہنے والی ریت بونہی آگے بڑھ جاتی ہے) -

قرآن کریم میں ہے يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ  
الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهْيَلًا (۳۳) - جس دور (یا زمانے) میں زمین اور پہاڑ کانپ  
اٹھیں گے - اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے ریت کا وہ تودہ جو خود بخود ڈھیلا  
پڑ کر بہ گیا ہو - قرآنی انقلاب کے وقت بڑے بڑے سرداران قوم کی عظمت و افتدار  
کے ختم ہو جانے کی کیسی عمدہ تشبیہ ہے - یعنی دکھائی تو وہ ایسے دینکے  
گویا محکم اور مضبوط پہاڑ ہیں ، لیکن درحقیقت ان کی قوت اور استحکام ختم  
ہو چکے ہوں گے - بس ہوں سمجھنے جیسے دریا کے کنارے ریت کا تودہ جو  
خود بخود پھسل کر نیچے گرتا جا رہا ہو - غلط بنیادوں پر اٹھے ہوئے تمدن

کی بھی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے تقاضے کے دھچکوں کو سہار نہیں سکتا اور جونہی صحیح انقلاب سے اس کا سامنا ہوتا ہے رینگ رواں کی طرح نیچے آگرتا ہے۔

## ہی م

الْهَيْيَامُ\* - سخت ترین پیاس - ایک بیماری جسکی وجہ سے اونٹ اس طرح پیاسا ہوتا ہے کہ اسے سیرابی نہیں ہوتی\*\*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی سخت پیاس کے لکھے ہیں۔

أَلَا هَيْيَمٌ\* - وہ اونٹ جسے پیاس کی بیماری لگ جائے اور کسی طرح اس کی تشنگی دور نہ ہو سکے۔ مؤنث هَيْيَمَاءُ\* ہے۔ اور جمع هَيْيَمٌ\*۔ قرآن کریم میں ہے فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهَيْيَمِ\* (۲۵) ”تم پیو گے جس طرح جھوٹی پیاس کے مارے ہوئے اونٹ پیتے ہیں“۔ رَجُلٌ هَيْيَمَانٌ\* - پیاسا آدمی۔ رَجُلٌ هَائِمٌ\*۔ وَهَيْيُومٌ\* - متحیر اور حیران آدمی۔ هَيَامٌ فِی الْاَمْرِ\* - پتھیر۔ وہ اس معاملہ میں حیران اور پریشان رہا۔ الْهَيْيَامُ\* - وہ ریت جسے ہاتھ میں لیا جائے تو وہ ٹھہرے نہیں بلکہ برابر نیچے کی طرف پھسلتی جائے\*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی خشک ریت کے ہیں۔ الْهَيْيَمَاءُ\* - لقی و دق صحر۔ راجس میں پانی نہ ہو\*۔

هَامَتِ النِّقَاقَةُ تَهَيِّمٌ\* - اونٹنی چرنے کے لئے جدھر کو جی چاہا منہ اٹھا کر چل دی۔ لَيْلٌ آهِيْمٌ\* - وہ رات جس میں ستارے نہ ہوں (اور اس لئے مسافروں کو راستہ نہ مل سکے)۔ الْهَيْيَمُ\* - ان ریتلے میدانوں کو بھی کہتے ہیں جو پانی کو ابی جائیں\*\*۔

ان معانی کو سامنے رکھتے اور پھر یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسکا مفہوم کیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شاعری ایک پیام بر کے شایان شان نہیں ہوتی (۲۶)۔ (دیکھئے عنوان ش - ع - ر)۔ ایک رسول، خدا کا انقلاب آفرین پیغام لیکر آتا ہے۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اسکا ہر قدم اُسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کبھی ادھر نکل گیا، کبھی ادھر۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانون خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ فِیْسِیْ کُلِّ وَادٍ يَهْيِيْمُوْنَ (۲۵)۔ وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے شدید پیاس کی

بیماری مارے مارے پھرا رہی ہو، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولا نگاہوں میں جانکتا ہے۔ اس کا بہ مارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کمیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں۔ شاعر، جذبات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے، ایک پیاسے اونٹ کی طرح جسے پیاس کی بیماری کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتی اور اسکی پیاس بجھتی ہی نہیں۔ اس کے سفر کی راہیں تاریک ہوتی ہیں جن میں راستہ دکھانے والے ستارے کمیں نہیں ہوتے۔ برعکس اس کے ایک پیغامبر ایک متعین منزل کی طرف واضح، سیدھے اور توازن بدوش راستے پر نہایت جزم و یقین اور سکون و اطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع۔ مسلمان کے سپرد ”رسالت“ کا فریضہ ہوا تھا۔ یعنی خدا کے دئے ہوئے پیغام پر خود بھی چلتا اور اسے دوسروں تک بھی پہنچانا۔ لیکن یہ اس راستے کو چھوڑ کر اس طرح ”شاعری“ میں گم ہوا کہ اب اسے نہ راستے کا ہمہ نشان ملتا ہے، نہ منزل کا۔ ایک پیاسے اونٹ کی طرح زندگی کے لق و دق صحرا میں مسارا مسارا پھر رہا ہے اور کمیں اپنی تشنگی کی سیرابی کا سامان نہیں پاتا۔ اس لئے کہ اسکی پیاس بیماری ہوتی ہے، سچی پیاس نہیں ہوتی۔ کس قدر عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی افسوسناک ہے یہ روش؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ اُمت (جو شاعروں کی قوم بنکر رہ گئی ہے) راستہ دکھانے والا ضابطہ حیات ہر وقت بغل میں دابے ہوئے ہے۔ چشمہ شیریں پاؤں کے نیچے اور تلاش آب، صحراؤں کے سراب میں۔ اب ان کی پیاس کیسے بجھے؟

## ہی م ن

ہَیْمَنَ الطَّائِرِ عَلٰی فِرَاحِهِ۔ کے معنی ہوتے ہیں پرند نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر پروں کو پھیلا دیا، اور لٹکایا۔ ہَیْمَنَ عَلٰی کَذَا۔ وہ اس کا محافظ و نگران ہوا\*۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تمام کتب سابقہ کا مہِیْمَن کہا ہے (۳۸)۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ بھی الْمُهْمِیْمَن ہے (۵۹)۔ یعنی جو کائنات کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح بچوں کی ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ ہاء - میم - نون کیوٹی سادہ نہیں ہے -  
 الْمُتَهَيِّمِينَ "دراصل آمَن" سے ہے ، جس کا ہمزه ہ سے بدل گیا ہے -

## ہیہات

الْهَيْهَ - وہ جسے اس کے میلے کچیلے کپڑوں کی وجہ سے ایک طرف ہٹا دیا جائے - هَيْهَاتَ - ایک کلمہ ہے جسکے معنی "دور ہوا" کے ہوتے ہیں\* -  
 یہ اسم فعل ہے - یعنی ایسا اسم جسکے معنی ماضی کے (یا کبھی امر کے) ہوتے ہیں - اور ایسا فعل جس کی گردان نہیں ہوتی - قرآن کریم میں منکر بن حیات آخرت کی زبان سے کہا گیا ہے هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ (۲۳۶) - کس قدر بعید (از قیاس) ہے وہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے - (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ ضرور واقع ہو کر رہیگی) - یعنی وہ اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں کہ یہ جو رسول تم سے کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے تو یہ کس قدر بعید از قیاس ہے !

# ی

## ی (ضمیر)

ی - ضمیر مجرور متصل ہے۔ واحد متکلم (مذکر اور مؤنث دونوں) کیلئے آتی ہے۔ غلامِ مِی - میرا غلام۔ نیز ضمیر منصوب متصل - جیسے یَعْبُدُ وَنَسِی - کبھی یہ ی مفتوح بھی ہو جاتی ہے - جیسے نِعْمَتِیَ الشَّئِی (۱۲) - اور کبھی حذف بھی ہو جاتی ہے - مثلاً وَلِیْكَ دِرْیْن (۱۶) - میرے لئے میرا دین (یہاں دِرْیْن کے بعد ”ی“ حذف ہو گئی اور ”ن“ ہر صرف زیر رہ گیا۔)

## یا (حرف)

یا - حرف نداء۔ پکارنے کے لئے آتا ہے۔ ”اے“ کے معنوں میں۔ یا اَرْضُ اِهْلَیْی (۱۱) اے زمین تو نگل لے۔ یہ حرف نداء عموماً حذف بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا (۲۱) - (اے) میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑو۔ (یہاں رَب سے پہلے یا محذوف ہے) یا کے بعد آپشہا کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جیسے یا اِیْھَا الَّذِیْنِ آمَنُوْا (۲۸) - اے ایمان والو!۔

## ی اس

اَلْیَاسُ - ناامید اور مایوس ہونا - یَؤُسُ - یَتُؤُسُ - ناامید ہو جانے والا - اَسْتِیْئَسَ - ناامید ہو گیا \* - سورہ یوسف میں ہے فَلَمَّآ اَسْتِیْئَسُوْا مِنْہُ (۱۲) ”جب وہ اس سے مایوس ہو گئے“ - اور وَلَا تَاْیْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یَاْیْئَسُ . . . . . (۱۲) - اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

سورہ رعد میں ہے اَفَلَمْ یَاْیْئَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا . . . . . (۱۳) اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اس کے معنی اَفَلَمْ یَعْلَمُ کے ہیں - یعنی کیا



انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا\*۔ ابن فارس نے یہ معنی بھی بنیادی لکھے ہیں (یعنی جاننا)۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ یہ معنی مجازی ہیں\*\*۔ سورہ ممتحنہ میں ہے قَدْ يَتَّبِعُونَ مِّنَ الْآخِرَةِ . . . . . (۱۳۳)۔ یہاں اس کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ انکار جو ناامیدی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملیگا۔ آیت ہے وَلَا تَتَّبِعُوا مِّنْ رَّوْحِ اللَّهِ . إِنَّهُ لَا يَأْتِئُتْسُ مِّنْ رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ (۱۲۲)۔ ”اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ہوتا“۔ اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوا مِّنْ رَّحْمَةِ اللَّهِ (۳۹) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (نیز ۲۹)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاہتا۔ مومن وہ ہے جو علی وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہوتا ہے۔ اگر ایسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ہونے دیتا۔ وہ سنبھلتا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کر کے، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے۔ یہ ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کا مفہوم۔ ناامید وہ ہوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربہ اختیار کرتا ہے۔ جب اُسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ وہیں رک جاتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے سے ناامید ہو جاتا ہے۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ہو وہ کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ناامیدی اور ابلیسیت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ب۔ ل۔ س)۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ اس کے لئے کہا ہے کہ وَأَدْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ تم دفع مضرت اور جلب منفعت، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرَرٌ يُّسَبِّحُ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ (۲۶)۔ یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ہوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی۔ لیکن

وہ ہمت نہیں ہارتا۔ دل نہیں چھوڑتا۔ وہ ایسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا۔ یہ شخص ”خدا کی رحمت“ سے مایوس نہیں۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اسوقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں، تو اس پر مایوسی چھا جائیگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے، جسے خود اعتمادی حاصل ہے، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے ہر امید رکھتا ہے۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا۔ جو اس سے انکار کر دیتا ہے، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پر (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خود کشی تک لے جاتی ہے۔ خود کشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی۔

مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں۔ وہ یہ کہیگا کہ اس کے بعد سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار۔ اور اس کے بعد مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے۔ علاوہ بریں، انسانی ذات پر ایمان سے انسان، بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں۔ اسی کی قوت سے وہ طبعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا۔ حتکہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہو جائیگا لیکن اس کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آئیگی۔ آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے۔

## یَا جُوجُ وَ مَا جُوجُ

وہ اقوام جن کی یورشوں سے حفاظت کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنا کر دی تھی (۹۳) تفصیل عنوان (۱-ج-ج) کے تحت دیکھئے۔

## يَا قُوتُ

آيَا قُوتُ - یہ فارسی لفظ ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سخت اور صاف شفاف جواہرات جن کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ عموماً سرخ رنگ مراد ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کَا نَقْهَنَّ الْيَا قُوتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸)۔ گویا کہ وہ (مؤنث) یاقوت اور مرجان ہیں۔

## يَلِيْتُ

یہ حرفِ تدا (یا) اور لَیْتُ کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں ”اے کاہن“ (دیکھئے یَا اور لَیْتُ)۔

## ی ب س

یَبَسَ - کسی مرطوب چیز کا خشک ہو جانا۔ الْيَبَسُ - وہ چیز جو پہلے تر ہو اور پھر خشک ہو جائے۔ شَاةٌ يَبَسٌ - اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن خشک ہو جائیں اور وہ دودھ دینا بند کر دے \*۔ الْيَبَسُ - وہ جگہ جہاں پانی ہو اور پھر جاتا رہے۔ تورات میں الْيَابِسَةُ خشکی کے لئے آیا ہے بمقابلہ بَحْرٌ کے \*\*۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاَضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا إِلَى الْبَحْرِ يَبَسًا (۲/۲۶)۔ بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اسوقت خشک ہے۔

سورة انعام میں ہے وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۶/۶۹)۔ کائنات کی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں (یا خشک و تر پھل ایسا نہیں) جس کے لئے ضروری قانہ و قاعدہ ضعیفہ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو۔

## ی ت م

الْمَيِّتُ - اکیلا اور تنہا رہ جانا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے کہ الْمَيِّتُ اس ریشی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے ارد گرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ الْمَيِّتُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو۔ راغب کے نزدیک ہر منفرد

اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے \*۔ دُرَّةٌ یتیمٌ \*۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی ہو۔

بن باپ کے بچے کو بھی یتیمؑ اسلئے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حوالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یتیمؑ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ یتیمؑ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے یتیمؑ نہیں کہتے۔ اس کے برعکس لڑکی اُسوقت تک یتیمؑ کہلاتی ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں یتیمؑ ان بچوں کو کہتے ہیں جنکی ماں نہ رہے اسلئے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مر جائے تو اسے یتیمؑ نہیں کہتے۔ مُنْقَطِعٌ یا عَجَبٌ کہتے ہیں۔ اگر ماں باپ دونوں مرجائیں تو اسے لَطِیمٌ کہتے ہیں۔ (یتیمؑ کی جمع ایتامؑ اور یتامیٰ دونوں آتی ہیں)۔ اِمْرَاۃٌ مُّوْتِمٌ \*۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے یتیم ہو جائیں۔ یعنی جس کا شوہر مر جائے \*۔ لسان العرب میں ہے کہ یتیمؑ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خدواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں یتیمۃ النِّسَاءِ (۱۲۷) ایسی ہی عورتوں کے لئے آیا ہے۔

یتامیٰ کے ان معانی کو سامنے رکھتے اور پھر سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَأَنْ خِفْتُمْۤ اَلَا تَنْفُسُتُمْۤ اَفْرِ الَّتِی تَتَمَسَّی قَاتِلُکُمْۤ اَمَّا طَابَ لَکُمْۤ مِّنَ النَّسِیۡۤءِ مَثَلِی وَاَثَلَتِ وَرُبَّعَ . . . (۴)۔ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا خدشہ ہو) کہ تم ”یتامیٰ“ کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے۔ ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے۔ تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو۔ دو۔ تین تین۔ چار چار تک سے شادی کر لو۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں یہ۔ وہ ہو گئیں۔ بہت سے بچے لاوارث رہ گئے۔ بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا۔ یہ مشکل اس لئے تھی کہ

(۱) قرآن کریم کا عام قانون ایک ہورت سے شادی کرنے کا تھا۔  
(قَوَّاحِدَةً\* - ۳۰)

(۲) مسلمان ہورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں ، نہ مشرکین سے ۔ نہ اہل کتاب سے ۔ انہیں بہر حال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی ۔ اور مسلمان مردوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی تھی ۔

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان ہورتوں میں سے (الْمَسَاةَ - ۳۰) جو اس طرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کبر ۔ اور خواہ نیا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) ۔ حسب پسند ، ایک سے زیادہ سے نکاح کر کے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو ۔ یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے ۔ قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے ۔ اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے ۔

یَتِّمٌ - یَتِّمًا کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا ۔ قاصر ہو جانا اور تھک جانا ۔ در ماندہ ہو جانا ۔ بھی ہوتے ہیں ۔ نیز یَتِّمٌ کے معنی فکر و غم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی ۔ اس لئے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے ۔ اَلْیَتِّمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں\* ۔

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے ، اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَا تَتَّكِرْ مِّنْ اَلْیَتِّمِ (۸۶) ۔ ان آیات میں یَتِّمٌ سے مراد وہی نہیں جنکے باپ مر چکے ہوں ۔ اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں ۔ جو بے بار و مدد گار ہوں ۔ لہذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے ۔ اس کا کوئی مدد گار نہیں ۔ اسکی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے ۔ اسکا کوئی سونس و غمخوار اور کوئی بار و مدد گار نہیں ۔ وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے ، کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا ۔ قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے ۔ اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرمؐ

یہ کہا کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاَوٰی (۱۳)۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے۔ اور ایسے شخص کے لئے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرہ کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا ہو۔

### یحییٰ علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (۱۸۵)۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے (۱۹)۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوت فیصلہ کے مالک (۱۹) اور صفاتِ حسنہ سے آراستہ (۱۸۵)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہہ کر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰؑ ہی ہیں۔ انجیل (لوقا) میں ”یوحنا“ کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا (۱)۔

انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو ہورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بہتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔

ربنن نے اپنی کتاب (Life of Jesus) میں لکھا ہے کہ ”یوحنا“ کی تعلیم کا مرکز (Judea) تھا لیکن اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور حضرت عیسیٰؑ ان سے آکر ملے تھے۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ ”یوحنا“ اور حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین کے صحرا میں ایک عجیب انقلاب انگیز نظام قائم کیا تا آنکہ ۳۰ء میں ”یوحنا“ کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔

### ی دی

اَلْیَدُ۔ ہاتھ کو کہتے ہیں۔ مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ اسکی جمع اَیْدِیٰ ہے۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اسقدر متعدد معانی میں ہوتا ہے جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ جیسے ہمارے ہاں ”ہاتھ“ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جاہ اور وقار۔ قوت و اقتدار۔ غلبہ و تسلط۔ ملکیت۔ مددگار۔ امداد اور فریاد رسی۔ احسان و انعام۔ حفاظت و حیانت۔ حذاقت و مہارت۔ دوسری طرف یہ لفظ

ندامت و شرمندگی۔ ذلت و انقیاد کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق ہے کہ وہ اُولَیِّی الْاَیْدِیْ وَاُولَیِّی الْبَصَارِ تھے (۳۸/۳۵)۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کے مالک۔ دوسری طرف ان کے مخالفین کے متعلق کہا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ فَرَدُّوْا اَیْدِیْہُمْ فِیْ اَفْوَاهِہُمْ (۱۳/۱۳) انہیں بات کرنے سے روک دیا جائے۔ ابن قتیبہ نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں \*\*\*۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئیکا سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی کئے جائینگے۔ قرآن کریم میں بَیِّنَ یَدَیْہِ کا معاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے\*۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِّمَا بَیِّنَ یَدَیْہِ (۲/۱۳۶) کہا ہے۔ لہذا لِمَا بَیِّنَ یَدَیْہِ کے معنی ہیں ”جو اس کے سامنے ہے“۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مصدق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض، نزول قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مصدق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔ ”مصدق“ کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ص د - ق)۔

سورہ ذاریت میں ہے وَالسَّمَاءَ بَنَیْنَهَا بِأَیْدِیْہِ (۵۱/۵۱)۔ ہم نے آسمان (فضائی کروں یا خارجی کائنات) کو قوت و اقتدار کے ساتھ بنایا ہے۔ [نیز دیکھئے عنوان ا - ی - د]

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں عَن یَدِ (۹/۹) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے\*\*۔

سورہ فرقان میں ہے یَوْمَ یَتَعَصَّى الظَّالِمُ عَمَلِیْ یَدَیْہِ (۲۵/۲۵) اس کے معنی، غم و غصہ میں دانتوں سے ہاتھ چبانے کے ہیں۔ اعمالِ انسانی کے متعلق بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْہُمْ (۲۵/۲۵)۔ کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود

انسان کے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تَلْقَوْا بِأَيِّدِكُمْ إِلَى الْتَهْلُكَةِ  
(۱۶۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ  
ڈالو۔ سورہ حجرات میں ہے لَا تَقْتَدِرُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (۳۹)  
اس سے مراد احکام اور فیصلے ہیں۔

(سَارِق کے قطع یتد کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع - اور یتد بَيْضَاء  
کے لئے دیکھئے عنوان ب - ی - ض اور ض - م - م)۔

## ی س ر

الْيَسِيرُ - الْيَسِيرُ - نرمی - الْيُسُورُ - سہولت - آسانی - فراخی - کشائش  
آسودگی، تونگری - معیشت کی طرف سے فارغ البالی - بہتات - (عُسْرُ یعنی تنگی کی  
ضد ہے) \* - يَسِيرٌ وَيُسْرًا لَمْزُ - معاملہ آسان اور سہل ہوا - يَسْرٌ - اس کام  
کو آسان یا سہل کر دیا - تَيْسَرٌ وَاسْتَيْسَرَ - آسان ہوا - بِأَسَانٍ مہیا ہوا \* -  
(۲۶۶؛ ۳۳) - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کھل جانا اور ہلکا پھلکا ہونا لکھے  
ہیں - الْيَسَارُ - پایاں ہاتھ - بائیں جانب (بَيْمَيْنُ کی ضد ہے) \* - الْيَسِيرُ  
وَالْمَيْسُورُ - آسان - سہل - الْيَسِيرُ - تھوڑی چیز \* - الْمَيْسِرَةُ وَالْيَسَارُ -  
تونگری - آسودگی - غنی \* - (۲۸۰) - الْمَيْسِرُ - قمار - جوا - وہ اونٹ جو جوئے  
میں ہارا یا جیتا جاتا تھا \* -

قرآن کریم میں يُسْرٌ بمقابلہ عُسْرٌ آیا ہے (۱۸۵) - سورہ بنی اسرائیل  
میں ہے - فَكُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا (۱۶۸) - ان سے نرمی سے بات کرو -  
ایسی بات جو انہیں گراں نہ گذرے - سورہ احزاب میں يَسِيرًا (۳۳) کے معنی  
ہیں کم از کم - بہت تھوڑے - قلیل تعداد میں - ”کم وقت کے لئے یا کم  
تعداد میں“ دونوں معنی ہو سکتے ہیں -

سورہ بقرہ میں خَمْرٌ اور مَيْسِرٌ کے متعلق ہے فَيَسْهَمَا لَئِمْ كَتَيْبَرٌ  
وَمَنْفَاعٍ لِّلنَّاسِ وَأَنتُمْ سَمَاءٌ كَتَبَرٌ مِّنْ نَّفْعِهِمَا (۲۱۹) - مَيْسِرٌ  
يُسْرٌ سے ہے جسکے بنیادی معنی آسانی ہیں - اگرچہ عربوں میں مَيْسِرٌ ہر  
قسم کے جوئے کو کہتے ہیں - اس جوئے کو بھی جو تیسروں سے ایک خاص  
طریق سے کھیلا جاتا تھا اور جس میں اونٹ کے گوشت کے حصے بخرے کٹے  
جاتے تھے - لیکن اس کے مفہوم کو اسکے بنیادی معانی کے پیش نظر مقید نہ  
رکھا جائے تو ہر وہ مال جو انسان کو آسانی سے ہاتھ آجائے مَيْسِرٌ ہوگا -



اسکی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے (دیکھئے عنوان ۱۔ ث۔ م) اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس رویے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس قسم کی دولت کو ”جس“ مین ”عَمَلِ الشَّيْطَانِ“ کہہ کر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۹۰)۔ اور اسے قرآن کریم کے نظام صلوٰۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے (۹۱)۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دے (۹۲)۔ ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دیتی اور اس طرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائیگی، جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمائے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے۔ لہذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت و مشقت) ہاتھ آجائے قرآنی تعلیم کی روح کے مطابق ”میسر“ میں داخل ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کی ”تجارت“ جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت میسر ہے۔ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی میسر ہے۔ اس میں عرصہ سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو۔ ”لَنْ مَسَّ الْعُسْرُ بِسُرٍّ“ (۹۳)۔ جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتیں جو صحیح خوشگوار یوں کا موجب بنتی ہیں۔ البتہ اسے وہ ”سُر“ حاصل ہو جاتا ہے جو لائم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

### يعقوب عليه السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ۔ اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر ”زمرہ“ انبیائے کرامؑ میں

کیا ہے .... وَمَا أَنْزَلْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَلَا إسماعِيلَ وَلَا شَيْئًا وَلَا يَعْتُقُوبَ .... (۱۱۶)۔ آپ کا لقب اسرائیلیل (یعنی سرورِ خدا) تھا۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی۔ قرآن کریم نے بھی آپ کو اس لقب سے یاد کیا ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے .... اٰلَا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ .... (۹۳)۔ ”سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا“۔ اور سورہ مریم میں ہے مِّنْ ذُرِّيَّتِهِ اِبْرَٰهِيْمَ وَاسْرَآئِیْلَ .... (۵۸۰)۔ ذریتِ ابراہیم اور اسرائیل سے۔“

حضرت یوسفؑ آپ کے بیٹے تھے ۔

يعوق

قوم نوح کا بت تھا (۳۴)۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنو ہمدان اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتا تھا۔

یغوث

قوم نوح کا بت تھا (۴۱/۴)۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے۔ چنانچہ خود عرب میں قبیلہ بنو مراد کے لوگ اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے۔

يَقْطِين

الْيَقْطِئِينَ"۔ وہ بیل جو زمین پر پھیل جائے۔ جسے خربوزہ، تربوز، کدو کی بیلےں۔ بعض نے کہا ہے کہ يَقْطِئِينَ کدو کی بیل کو کہتے ہیں۔ نیز الْيَقْطِئِينَ کدو کو کہتے ہیں\*۔ صاحب تاج العروس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر وہ ہودا جو ایک سال کے اندر ہی پیدا ہو کر ختم ہو جائے يَقْطِئِينَ کہ۔ لائیگا۔ نیز ہر پڑا ہتہ يَقْطِئِينَ کہ۔ لائیگا۔ قرآن کریم میں شَجَرَةٌ مِّنْ يَّقْطِئِينَ (۱۳۶) آیا ہے۔ اس سے مراد ہے چوڑے پتوں والا ہودا جو سایہ دیتا ہو۔

## ی ق ظ

الْيَقِظَةُ - بیداری - يَهْ نَوْمٌ (نیند) کی ضد ہے - اس میں ہوشیاری کا مفہوم بھی ہوتا ہے - رَجُلٌ يَقِظٌ وَ يَقِظٌ - بیدار آدمی - اسکی جمع اَيُّقَاطٌ آتی ہے، بمقابلہ رُقُودٌ (۱۸/۱) - أَبَوَالْيَقِظَتَانِ - مرغ کو کہتے ہیں \* -

## ی ق ن

يَقِينٌ الْاَعْمَرُ وَيُقِنُّهُ وَيُقِنُّهُ - اس نے معاملہ کو جانا اور اسکی حقیقت معلوم کر لی - يَقِنٌ وَيَقِنٌ - کسی بات کا واضح اور ثابت ہو جانا - يَقِيْنٌ - شک کی ضد ہے - یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایہ ثبوت تک پہنچ جانا \* - مَوْتٌ کو بھی يَقِيْنٌ کہتے ہیں کیونکہ ہر مخلوق پر اس کا آنا یقینی ہے اور ٹھوس واقعات ہر روز اسکی شہادت دیتے ہیں \* -

سورہ انعام میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَكَوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کے مشاہدہ کے بعد يَقِيْنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (۲/۶) - سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَبَايَئَكَ الْيَقِيْنُ (۱۹/۱) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشوونما دہنے والے کے قانون ربوبیت کا کامل اتباع کئے جا، حتکہ کہ تیرا دعویٰ (کہ اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہونگے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجائے (نیز ۳۴/۳) -

لہذا اِيْمَانٌ کے معنی ہونگے کسی پر اعتماد کر کے اسکی بات کو صحیح مان لینا اور يَقِيْنٌ کے معنی ہونگے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجانا - لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (۲۴/۱) - تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے - قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آجائے ہیں - یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۲) - اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آجائے ہیں - اس طرح ان کا ایمان، یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۲) - یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی - اسی

یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

ہم نے ”ایمان“ اور ”یقین“ میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لئے ہے۔ ورنہ ایمان، خود یقین ہی کا نام ہے۔ اور یقین، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ”یقین“ ”ایمان“ کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

## ی م م

الْيَمَامُ - قصد کرنا \* - الْيَمَمُ - دریا - سمندر کو بھی کہتے ہیں \* -  
(۲۸۹ : ۲۸۰ : ۲۸۱)

التَّيَمُّنُ - کسی کام کا ارادہ کرنا، قصد کرنا \* - (۲۸۲ : ۲۸۳ : ۲۸۴)  
(دیکھئے عنوان م - س - ح)

## ی م ن

الْيَمْنُ - برکت - الْيَمِينَةُ - برکت - دائیں جانب - الْيَمِينُ -  
دائیں جانب - الْيَمِينُ - دایاں ہاتھ - دائیں جانب - (يَسَارُ کی ضد ہے) -  
نیز اس کے معنی قوت کے ہیں \*\* - يَمِينُ - جمع اَيْمَانُ - قسم - اس لئے  
کہ عرب قسم کھاتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر  
مارتے تھے \* -

سورہ کہف میں ہے ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸۸) - یعنی  
دائیں بائیں - سورہ قصص میں ہے مِّنْ شَاطِئِي الْوَادِئِ لَا يَمْنُ - اس  
کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”وادی کے دائیں کنارے سے“ اور یہ  
بھی کہ ”مبارک وادی کے کنارے سے“ -

قسم نے معنوں میں یہ لفظ (اَيْمَانُكُمْ) متعدد مقامات پر آیا ہے -  
(مثلاً ۲۴۴) - نکاح کے لئے عَقْدَتِ اَيْمَانُكُمْ کے الفاظ آئے ہیں (۳۳۰) -  
یعنی تمہارے عہد و پیمان بندھے اور مستحکم ہوئے -

برکت کے لئے اَصْحَابَ الْيَمِينِ (۵۱) - اور اَصْحَابُ الْيَمِينِ  
(۵۱) آیا ہے - لیکن اس کے معنی ”دائیں جانب والے“ بھی ہو سکتے ہیں -

نیز الطُّورِ (۱۲) - زور اور قوت کے معنوں میں سورہ صافات میں ہے  
فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (۱۳) - (ابراہیم) نے ان بتوں پر پوری  
قوت سے بھرپور وار کیا۔ اسی سورہ میں ذرا پہلے ہے قَالُوا إِنَّا نَكُفِّرُ كَثِيرًا  
تِلْكَ تَوَنِّيَاتِنَا عَنِ الْيَمِينِ (۱۴) - وہ کہہ بیٹھے ہم ہمارے پاس بڑی قوت اور  
زبردست ذرائع کے ساتھ آیا کرتے تھے - (اور اس طرح ہمیں حق کے راستے سے  
روک دیا کرتے تھے)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے - مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ -  
اس کے لفظی معنی ہیں ”جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے“ - بعض  
مقامات پر اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں - کسی  
کے تابع فرمان ہوں - (مثلاً ۱۵ میں) - لیکن بعض مقامات پر اس کے معنی غلام  
اور لونڈیاں ہیں - سورہ نور میں ہے وَالَّذِينَ يَبْتِغُونَ الْكِتَابَ  
مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۱۶) - تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو تم  
سے مکاتبہ کریں - یعنی ایک معاہدہ کے تحت آزادی کی تحریر مانگیں -

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا - غلام  
باہر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال  
لیتے تھے - یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ہوا - جب یہ لوگ مسلمان  
ہوئے تو ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں موجود تھیں - اسلام غلامی کو مٹانے  
کے لئے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اس وقت موجود  
تھے) ایک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ  
جاتا - یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر  
دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لئے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں - اسلام نے  
اس صورت حالات کو برقرار رکھنے دیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند  
کر دیا - لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے  
احکام دئے کہ وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو کر معاشرہ کا جزو بننے جائیں اور جب تک  
غلام رہیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے - مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ  
کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ  
انہی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے - ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ ہی  
بند ہو جانا تھا اس لئے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہے تھے - البتہ اگر اس  
دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان  
ہو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں تو ان غلاموں پر یہی  
احکام نافذ ہو جائیں گے -

مَمْلُوكَاتٍ اِيْمَانُكُمْ" کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے۔ بات صاف ہو جائے گی کہ یہ احکام اُسوقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں۔ اور بس۔ مثلاً وَالَّذِينَ هُمْ لِيَفْرُوْا جِهِيْمَ حَلِيْفَتُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَرْوْاجِهِيْمَ اَوْ مَمْلُوكَاتٍ اِيْمَانُهُمْ (۳۹:۳۰)۔ وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے)۔ مزید تفصیل کے لئے عنوان (م۔ ل۔ ک) دیکھئے۔

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لئے بطور سند پیش کر دیا۔ قرآن کریم ہر اس سے بڑا اتہام اور کہا ہو سکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے۔

## ی ن ع

يَنْعَ الثَّمَرُ - يَنْعَ - يَنْعَا - بھل کا ہک کر بالکل تیار اور توڑنے کے قابل ہو جانا۔ اَلْيَسِيْعُ - پوری طرح پکا ہوا بھل - اَلْيَانِيْعُ - پختہ بھل - سرخ \*۔ قرآن کریم میں ہے - وَيَسْعِيْهِ (ج۔ ۱) بھل کا پکنا - اس کا سرخ ہونا -

## یہود

قوم بنی اسرائیل - تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ" اور عنوان (ا۔ و۔ د)

## یوسف علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ - آپ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ - قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا) - بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک ابدھے کنویں میں ڈال دیا (۱۲: ۱۵) - جہاں سے انہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے - وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد) ، مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (۱۲: ۱۵-۱۶)

اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہو گئی۔

سورہ انعام میں حضرت یوسفؑ کا نام انبیاء کرام کے زمرہ میں آیا ہے۔  
 .... دَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ وَ اِيْشُوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُونَ  
 .... (۸۸)۔ اور سورہ مؤمن میں، دربار فرعون کا سردار مؤمن اپنی تقریر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے۔ (۲۴)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام جو بینات پر مشتمل تھا قوم مصر تک پہنچایا تھا۔

(حضرت یوسفؑ کے کوائف حیات اور ان کے حسن سیرت کی داستان نور پاش، میری کتاب ”جوئے نور“ میں ملیگی)۔

## ی و م

یَوْمٌ - دن۔ طلوع آفتاب یا طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت۔ یہ لفظ عربوں کے ہاں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دن اور رات کی اس میں کوئی قید نہیں ہوتی۔ صبح اور شام کی گردش بھی یَوْمٌ ہے (یعنی ایک دن)۔ سال بھی۔ ایک صدی بھی۔ ہزار سال اور پچاس ہزار سال بھی۔ وقت اور سَاعَتٌ کی طرح یَوْمٌ کے بعد بھی اذی بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یَوْمٌ مَشْیُذٌ کے معنی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو وقتِ شَیْذٌ اور سَاعَتِ شَیْذٌ کے ہوتے ہیں۔ گویا وقت۔ سَاعَتٌ اور یَوْمٌ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ یَوْمٌ کی جمع آیاتام ہے۔ ابن فارس نے یَوْمٌ کے معنی دن بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ استعارۃً یہ لفظ امر عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

نیز اس کے معنی ہیں حکومت اور دولت اور زمانہ ولایت۔ تِلْكَ اَیَّامٌ نُّدَآوِلْہَا بَیْنَ النَّاسِ (۳۳) میں آیاتام کے معنی حکومت و سلطنت کے لئے گئے ہیں۔

آیَاتام - وقائع (یعنی تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات یا معرکے) کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیاتام الثَّغَرِ کے معنی وقائع الثَّغَرِ ہیں۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیاتام اللہ انہی معانی میں آیا ہے۔ مثلاً وَ ذَکْکِیْرٌ هُمْ بِسَآئِمِ اللّٰہِ (۱۵)۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے

معرکہ کے لئے آیا ہے۔ یہ آپقام اللہ اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں لیستجزی قوتو ما بیما کانو یتکسیبون (۳۵)۔ تاکہ کسی قوم کو اس کے کئے کی سزا مل جائے۔ اسی لئے بعض اہل لغت نے آپقام کے معنی عقوبتیں اور سزائیں بھی کئے ہیں\*۔

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہہ خدا اپنے امر (ابتدائی قانون مشیت۔ دیکھئے عنوان ش۔ ی۔ ا) کے مطابق جب کسی اسکیم کو پروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کی ابتداء ہست ترین نقطہ سے کرتا ہے۔ یسدر بئر الا مر۔ مین السماء الی الارض۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے۔ یہ منازل ایک ایک یوم میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ نسیم بعرج الیہ فی یوم۔ کان میقدارہ الف سنۃ مبعثا تعدون (۳۲) ظاہر ہے کہ یہاں ”یوم“ سے مراد دور یا مدت یا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے۔ یہی دور بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (۳)۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دینگے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں یوم کا لفظ آئے گا تو ہر جگہ اس کے معنی اس ”دن“ کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے۔ مثلاً مالیک یوم الدین (۱۱) کے معنی ہونگے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا رہ جائے۔ یا وہ دور جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل و انصاف کی رو سے مرتب ہوں۔ یا ظہور نتائج کا وقت۔ و الا مر۔ یوم مئذیہ (۸۲)۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی۔ (مزید تصریح د۔ ی۔ ن کے عنوان میں دیکھئے)۔

### یونس علیہ السلام

حضرت یونسؑ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہو گیا۔ تورات میں ان کا نوشتہ ”کتاب یوناہ“



کے نام سے موجود ہے۔ ان کا زمانہ اندازاً ۷۰۰ ق۔ م کا قیاس کیا جاتا ہے۔  
 قرآن کریم نے کہا ہے کہ إِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۳۶/۱۳۹)۔  
 تورات (صحیفہ یوناہ) میں آپ کے متعلق تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ لیکن  
 (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو خدا کے  
 کسی رسول کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے  
 کہ آپ اپنی قوم سے خشناک ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے ارادہ سے  
 نکلے۔ راستہ میں کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی طوفان میں پھنس گئی۔  
 ملاحوں نے (غالباً) فیصلہ کیا کہ کچھ سواریوں کو دریا میں پھینک دیا  
 جائے تاکہ کشتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور باقی مسافر محفوظ رہجائیں۔ آپ  
 کو بھی حوالہ دریا کر دیا گیا جہاں آپ کو ایک بڑی مچھلی نے دبوچ لیا۔  
 لیکن آپ صحیح و سلامت کنارے تک پہنچے۔ دیکھئے (۲۱/۸۸-۲۱/۸۹)۔  
 حضرات انبیاء کرامؑ کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ  
 ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لئے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے  
 اس علاقے کی طرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لئے مساعد  
 ہوتی تھی۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی۔  
 معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے اپنی قوم سے، اپنے اجتہاد کے مطابق،  
 ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا۔ قبل از وقت  
 تھا۔ اس لئے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (۳۶/۱۳۶)۔ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ  
 آپ نے صاحبِ حوت کی طرح نہ ہو جانا (۲۸/۲۸) [نیز دیکھئے عنوان ۱۔ ب۔ ق]  
 قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کی طرف آپ کو  
 رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسکی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی۔ (یعنی  
 اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (۳۶/۱۳۶)۔ انہوں نے آپ کی دھوت  
 سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آجاتا، وہ ایمان لے آئے اور  
 اس طرح انہیں مہلت مل گئی (۳۶/۱۳۸)۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے  
 بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب ۶۹۰ ق۔ م میں) انہوں نے پھر وہی  
 شیوہ اختیار کر لیا۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم  
 نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) انہیں خدا کے  
 عذاب سے متنبہ کیا۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ  
 کیا اور دوسری طرف سے دریا میں سخت سیلاب آیا۔ اور اس طرح نینوا کا  
 نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّونِ (۲۱/۸۸) اور صَاحِبِ الْحُوتِ (۲۸/۲۸)  
 کہہ کر بھی پکارا ہے۔

## اللہ الحمد

کہ

لغات القرآن کی جو تہی (اور آخری) جلد بھی مکمل ہو گئی۔  
اس کے بعد اس کا تتمہ آپ کے سامنے آئیگا جس میں 'پوری لغات  
پر نظر ثانی کے بعد' ضروری اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں۔

## اللہ کا شکر ہے

کہ

اس لغات کی تکمیل سے میری عمر ابھر کی محنت  
محفوظ ہو گئی۔ اب "مفہوم القرآن" کی طباعت کا  
سلسلہ شروع ہوگا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن  
اور مفہوم القرآن کی موجودگی میں 'قرآن کریم کے  
سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہیگی۔

## یہ بہر حال

ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا ہر وقت  
امکان ہوتا ہے۔ مینے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح  
ڈالی ہے۔ دیگر ارباب ذوق اور علم دوست حضرات 'مزید  
غور و تدبر سے' اسے بہتر بنا سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں غور و فکر  
کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس باب میں  
کسی انسان کا قول بھی حرف آخر نہیں کہلا سکتا۔ والسلام۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## تتمہ

ہم نے لغات القرآن، جلد اول (صفحہ ۳۳) پر لکھا تھا کہ اگر لغات کی طباعت کے دوران، مزید غورو فکر سے بعض اہم نکات سامنے آئے، یا قارئین کی طرف سے مفید مشورے، تجاویز یا وضاحت طلب امور موصول ہوئے، تو آخری جلد کے ساتھ ایک تتمہ شائع کر دیا جائیگا۔ یہ تتمہ اسی مقصد کے پیش نظر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں بیشتر اضافے یا ترمیمات جلد اول سے متعلق ہیں۔ جہاں تک طباعت کی غلطیوں کا تعلق ہے، ان میں سے صرف انہی اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے جن سے مفہوم پر اثر پڑتا تھا۔ دیگر معمولی غلطیوں، یا آیات میں بعض مقامات پر اعراب کی غلطیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب اردو کے ٹائپ میں عربی عبارت چھاپی جائے تو اس میں اعراب کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ آیات کا قرآن کریم کے نسخے سے مقابلہ کر لینا چاہئے۔ یہ ضروری ہے۔ ان اضافوں یا تبدیلیوں کے بعد بھی یہ دعوے نہیں کیا جاسکتا کہ جو کچھ اس لغات میں لکھا گیا ہے وہ حرف آخر ہے۔ یہ بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جس میں اصلاح کی گنجائش ہر وقت رہتی ہے۔

## مبادیات

صفحہ ۱۵ - سطر ۹ - ”جو اسم بنتے ہیں“ میں ”اسم“ کی جگہ ”فعل“ ہونا چاہئے۔

## تمہید

ہم نے صفحہ ۷۳ - نمبر (۲) کے تحت لکھا ہے کہ مبادوں میں جہاں ”و“ یا ”ی“ آئے وہاں مادہ کا تعین کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جب مادہ کا آخری حرف ”و“ یا ”ی“ ہو تو اس

مادہ میں بیشتر ”و“ یا ”ی“ دونوں ہی شکلیں جائز ہوتی ہیں۔ ایسے مادوں کو جن کے آخر میں ہم نے ”و“ دیا ہے، ”ی“ میں بھی دیکھ لینا چاہئے۔ بعض جگہ ہم نے فہرست میں مادہ بتاتے ہوئے آخری حرف ”و“ لکھ دیا ہے لیکن لغت میں آخر میں ”و“ کی بجائے ”ی“ ہے۔ مثلاً آمّی، تّاس۔ تاسوا۔ اسوة۔ میں ہم نے مادہ بتاتے وقت ”اس و“ لکھا ہے اور لغت میں ان کی تشریح ”ا۔ س۔ ی“ کے عنوان کے تحت دی گئی ہے۔ لہذا جہاں مادہ کے آخر میں ”و“ ہو اور وہ ”و“ میں نہ ملے تو اس کے ساتھ ”ی“ میں بھی دیکھ لیجئے۔ اسی طرح جہاں مادہ کا آخری حرف ”ی“ ہو اور وہ ”ی“ میں نہ ملے تو ایسے ”و“ میں بھی دیکھ لیجئے۔

بعض الفاظ جو قرآن کریم میں نہیں ملتے اور فہرست میں آگئے ہیں :-

لفظ	مادہ
بائع	ب ی ع
بدعۃ	ب د ع
ذہ	ذ ا
کفا	ک ف ف
محاسبہ	ح ص ب

(۴) ایک اہم بات حروف تہجی کی ترتیب کے ضمن میں ہے۔ عربی زبان میں (ن - و - ہ) بھی ترتیب وار لکھتے ہیں اور (ن - ہ - و) بھی۔ ہم نے ”فہرست الفاظ قرآنی“ میں (ن - و - ہ) کی ترتیب کو ملحوظ رکھا لیکن اصل لغات میں سہواً یہ ترتیب (ن - ہ - و) کی ہو گئی۔ یہی ترتیب شروع سے اخیر تک چلی جاتی ہے۔ اس لئے آپ کو لغات میں (ن) کے بعد (ہ) ملیگی اور اس کے بعد (و)۔ مادے تلاش کرتے وقت اس ترتیب کو ذہن میں رکھئے۔ واضح رہے کہ مادوں میں تو ”ھ“ کے بعد ”و“ کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن خود حرف ”و“ لغت میں ”ھ“ سے پہلے ملے گا۔ ملاحظہ ہو۔  
صفحہ (۱۶۸۰) اور (۱۷۶۷)۔

اب اصل لغات کی طرف آئیے۔

ا

صفحہ ۱۹۰

نمبر (ہ) میں اَلَمْ تَرَ بَرَاءے تعجب بتایا گیا ہے، لیکن اس قسم کا مرکب عموماً دعوت غورو فکر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ”اَفَلَا“ اور ”اَوَّلَا“، اَفَلَمْ اور اَوَّلَمْ وغیرہ بھی۔

ا ب د

صفحہ ۱۹۲

دوسرے پیریگراف کے آخری حصہ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ جہنم کی بالآخر کوئی حد زمانی ہے، اس کے بعد جہنم ختم ہو جائیگا اور جہنمی اس سے نکل کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ تصریح موجود ہے کہ جہنم سے نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ ابدیت اس قسم کی ابدیت نہیں جس قسم کی ابدیت خدا کے لئے مخصوص ہے۔ اسکی تشریح اگلا پیرا کر رہا ہے۔

ابراہیم

صفحہ ۱۹۳

اُمَّةٌ قَانِتًا۔

”ا م م“۔ (صفحہ ۲۶۱) میں اُمَّةٌ کے معنی اسام بھی دئے ہوئے ہیں۔ نیز اسکی معنی وہ شخص بھی ہیں جو ہر قسم کے خیر کا منبع و سرچشمہ ہو۔

”امام، کی تائید قرآن کریم میں دوسری جگہ اُنْتِیْ جَاعِلُکَ لِلنَّفَاسِ اِمَامًا (۱۳۳) سے کر دی ہے۔ اس لئے، جیسا کہ عنوان (۱ - م - م) میں لکھا گیا ہے، آیت (۱۳۳) میں اُمِّیَّة کے معنی امام اور مقتدا بھی کہئے جاسکتے ہیں۔

## ا ب ی

صفحہ ۱۹۶

(۱) اس مادہ میں چوتھی سطر کے آخر میں جہاں الارباء والا بقاء لکھا گیا ہے وہاں سے الارباء حذف کر دیا جائے۔

(۲) نیچے سے چوتھی سطر میں یتا بی کی جگہ یتا بی ہونا چاہئے۔

## ا ج ج

صفحہ ۲۰۲

سَمِعْتُمْ اَجَلَةَ التَّوْمِ میں نے لوگوں کی مخلوط حرکتوں اور آوازوں کا شور ماسنا۔

صفحہ ۲۰۳

شعر سے اوپر کے پیریگراف میں کہا گیا ہے کہ جب کسی مردہ قوم پر دوسری مہذب اور ترقی یافتہ قوم استیلاء کر لیتی ہے تو اس سے کچھ عرصہ کے بعد اس مردہ قوم کو زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ طاقتور قومیں، کمزور قوموں کو اپنا غلام بنائیں تاکہ کمزور قوموں کو ازسرنو زندگی مل جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم تو یہ ہے کہ طاقتور قوموں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کمزور قوموں کی کمزوریوں کو رفع کر کے انہیں انسانیت کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنا دیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر طاقتور قومیں ایسا نہ کریں تو کمزور قومیں خود ایک دن اٹھ کر ان کی غلامی کے جوئے کو کالے سے اتار پھینکیں گی۔

## ا ج ر

صفحہ ۲۰۵

دوسرا پیرا۔ یہ مفہوم لین بے قاموس کے حوالے سے دیا ہے۔

## ا ج ل

صفحہ ۲۰۶

اجل مدت معینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس آخری حد کو بھی جہاں وہ مدت ختم ہو جاتی ہے۔

## اح ۵

صفحہ ۲۰۷

پانچویں سطر میں آحَدٌ اِلَّا حُدْرٰیْن لکھا ہے۔ صحیح ”آحَدٌ اِلَّا حُدْرٰیْن“ ہے۔

## اخ ۵

صفحہ ۲۰۸

دوسری سطر۔ مَّا خُذٌ کی بجائے مَّا خُذٌ ہونا چاہئے۔

## ام ۵

صفحہ ۲۱۴

اخیر میں لکھئے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے جس تمدنی دور سے قرآن کریم نے اس تمثیلی داستان کا آغاز کیا ہے، اس میں کوئی عظیم شخصیت ”آدم“ کے نام کی ہو اور اس دور کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔ یا اس دور کی نسبت سے اس شخصیت کو اس نام سے پکارا گیا ہو۔ ہم نے انہیں بالیقین ”نبی“ اس لئے نہیں لکھا کہ قرآن کریم نے زمرہ انبیاء میں ان کا ذکر بصراحت نہیں کیا۔

۲۔ قرآن کریم میں ”قصہ آدم“ بیان کرنے سے ایک مقصد تو یہ تھا کہ انسان کو بتایا جائے کہ اگر اس نے وحی کا دامن چھوڑا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور اس حالت سے نکل کر پھر سے جنتی زندگی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے وحی سے تمسک۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس قصہ سے ان باطل عقائد کی بھی تردید کر دی جسے (بالخصوص) عیسائیت نے پھیلا رکھا تھا۔ یعنی یہ کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ ساتھ لاتا ہے، اور یہ گناہ حضرت عیسٰیؑ کے کفارہ پر ایمان لانے بغیر دھل ہی نہیں سکتے۔ یا یہ کہ مرد کو پھسلانے کا باعث عورت ہوتی ہے اس لئے عورت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یا یہ کہ (جیسا کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے) فطرت کی قوتیں دیوی دیوتا ہیں، انسان کو انہیں معبود بنانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے اس داستان سے ان تمام باطل عقائد و تصورات کی تردید کر دی۔

## ارب

صفحہ ۲۲۱

چوتھی سطر۔ اَلْاَوَّلٰی اَوَّلٰی الْاَوَّلٰی مِّنَ الرَّجَالِ کے معنی لکھے گئے ہیں ”جنہیں نکاح کی ضرورت نہ ہو“۔ ان میں ایسے ملازم



(یا دیگر ہست درجہ کے کام کاج کرنے والے) بھی شامل ہو سکتے ہیں جو زیادہ عقل و فکر کے مالک نہ ہوں اور کھانے پینے سے زیادہ کسی اور طرف ان کا دھیان ہی نہ جاسکے۔ یا وہ کسی طرح وجہ کشش ہی نہ بن سکیں۔ قرآن کریم کی یہ اصطلاح بڑی جامع ہے۔

## ارض

صفحہ ۲۲۱

تیسرا پیرہ۔ پہلی سطر۔ اس میں اَرْضًا کی جگہ اَرْضًا ہونا چاہئے۔

## ارک

صفحہ ۲۲۴

الاراک۔ یہ چارہ ترش نہیں بلکہ نمکین اور تلخ سا ہوتا ہے۔ اونٹ اسے پیٹ بھر جائے پر کھائے ہیں تاکہ اس سے کھانا ہضم ہو جائے۔  
آررِیکۃ کے ضمن میں راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آرکت بالعمکان سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت کرنا ہیں۔ اس لحاظ سے آررِیکۃ مسہری کو اس لئے کہا جائے گا کہ اس پر ٹھہرا اور رہا جاتا ہے۔ گویا وہ قیام گاہ ہوگی۔

## ازر

صفحہ ۲۲۴

پہلی سطر۔ الارز کے پہلے معنی ”کمر“ کاٹ دئے جائیں۔  
تیسری سطر۔ الارز کے معنی لکھے ہیں ہر وہ چیز جو ستر کا کام دے۔ اس کی بجائے یہ کہئے کہ ہر وہ چیز جو تمہارے بدن کے لئے ستر کا کام دے۔

## ازف

صفحہ ۲۲۵

دوسری سطر میں بجائے التَّيَّازِف کے التَّيَّازِف ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔

## اسف

صفحہ ۲۲۸

چھٹی سطر۔ ”حزن دل“ کی بجائے ”خون دل“۔

## اسن

صفحہ ۲۲۹

پہلی سطر میں آلاسن کے بجائے آلاسن ہونا چاہئے۔

## ا س ی

صفحہ ۲۲۹

اس میں مادہ (ا - س - و) بھی شامل ہے ۔

## ا ص ر

صفحہ ۲۳۳

یہ اضافہ کر لیجئے ۔ راغب نے کہا ہے کہ ”لَا صِرُّ“ سے مراد وہ امور ہیں جو بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں مائع اور حائل ہوتے ہیں اور ان تک پہنچنے نہیں دیتے ۔

## ا ف ک

صفحہ ۲۳۶

(۱) الْمُؤْتَفِكَاتُ - اَفَكَتْ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں ۔ نیز کسی کو اس کی صحیح راہ سے پھیر دینا بھی ۔ اس لحاظ سے اُتَفَكَتْ میں صحیح راہ سے ہٹ جانے اور جھوٹ گھڑ لینے کا مفہوم آسکتا ہے ۔ اَلْمُؤْتَفِكَاتُ ان ہواؤں کو بھی کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے ہٹی ہوئی چلتی ہیں ۔ لہذا الْمُؤْتَفِكَاتُ کے معنی ہوسکتے ہیں وہ بستیاں جو اپنی صحیح روش پر قائم نہ رہیں اور غلط اعمال کرتی رہیں ۔ یا جھوٹ گھڑتی رہیں ۔ اگرچہ قرآن مجید کا طرز بیان یہی بتا رہا ہے کہ وہ خصاص بستیاں تھیں جنہیں اللہ دیا گیا تھا ۔

(۲) جھوٹ گھڑنے کے معنوں میں سورۃ احقاف میں ہے فَتَسْتَفْتُوْنُ مِنْذَ اٰفَكَتْ قَدْرِيْمٌ (۲۱) ۔ یہ کہہینگے کہ یہ تو وہی جھوٹ ہے جو ابتدائی ایام (قدیم) سے گھڑا جاتا رہا ہے ۔ اسی کو دوسری جگہ قرآن کریم نے سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۳) سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی وہ جھوٹ جو شروع سے چلا آ رہا ہے ۔

(۳) سورۃ نور میں قرآن کریم نے مومنین کو نصیحت اور تاکید کی ہے کہ وہ جھوٹے الزامات نہ وضع کیا کریں اور معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کو نہ پھیلایا کریں (دیکھئے ۲۴/۲۳) ۔ اس ضمن میں اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک گروہ نے کسی پر جھوٹا الزام لگایا تھا ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ جَاءُوْا بِاِلْفَاكِ عَصِيْبَةٍ مِّنْكُمْ (۲۳) ۔ ”جو لوگ اس جھوٹ کو افترا کر کے لائے ہیں وہ تمہیں میں سے ایک گروہ ہے“ ۔ اس سارے واقعہ میں قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ وہ کون تھا جس کے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا ۔ اس نے کہا صرف یہ ہے کہ جب یہ خبر جماعت مومنین تک

پہنچی ہے تو ان کا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ حسن ظن سے کام لیتے اور کہہ دیتے کہ هٰذَا اِفْكٌ مُّبِينٌ\* (۲۳/۱۶)۔ اور هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ\* (۲۳/۱۶)۔ یہ وہی بات ہے جس کی دوسری جگہ یہ کہہ کر وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی بات تم تک پہنچائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو (۲۳/۱۶)۔ قرآن کریم نے صرف اتنا کہا ہے لیکن ہماری تاریخ (روایات) میں اس واقعہ کو (معاذ اللہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر کے اس پر افسانہ طرازی کی ایک عمارت قائم کر دی گئی ہے۔ حتکہ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ خود نبی اکرمؐ بھی اس باب میں سخت متردد تھے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے میکے بھیج دیا تھا جہاں ان کی حالت غیر ہو گئی۔ حتکہ خدا نے بذریعہ وحی ان کی براءت کی۔ تب حضور اکرمؐ انہیں گھر لائے۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک گھڑا ہوا قصہ ہے جسے خاص مقصد کے ماتحت وضع کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے مستند واقعہ کی حیثیت سے لئے جلیے آ رہے ہیں، اور جب مخالفین اسلام اس پر اعتراض کرتے ہیں تو ہم طیش میں آ جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اس کے جواب میں وہی کہہ دینا چاہئے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ هٰذَا اِفْكٌ مُّبِينٌ\* (۲۳/۱۶)۔ یعنی یہ واقعہ جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، افک مبین اور بہتان عظیم (۲۳/۱۶) ہے۔

## اکل

صفحہ ۲۳۸

دوسرا پیرا۔ راغب نے لکھا ہے کہ اکل مال سے مراد انفاق مال ہے، اس لئے کہ مال کا بیشتر مصرف کھانے پینے اور معاشی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے۔

آخری پیرا۔ یوں چاہئے۔ ”ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ....

## الک

صفحہ ۲۴۲

پہلی سطر۔ اَلْمَا لُکُکِیْ بِجَاۤءِ اَلْمَا لُکُکِیْ۔

دوسرے پیرے میں تاج کا \*\* حوالہ دیا گیا ہے۔ تاج میں یہ مادہ (م ل ک) کے تحت آیا ہے۔

## اَلَا (حرف)

صفحہ ۲۴۶

پہلی سطر۔ ”اَلَا تَعْلَمُوْا“ یوں ہونا چاہئے۔

## ال و (الی)

صفحہ ۲۵۲

دوسرے پیرے کے آخر میں بڑھائیے۔

آلاء\* پر بحث کرتے ہوئے علامہ حمید الدین فراہیؒ اپنی تالیف مفردات القرآن صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں :-

اگرچہ آلاء\* کے معنی بدالاتفاق نعمتیں ہی بتائے جاتے ہیں لیکن قرآن مجید اور اشعار عرب میں اس لفظ کا استعمال ہوتا رہا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ بظاہر اس کے معنی ”عجیب کاریگریاں، معلوم ہوتے ہیں جن کے لئے فارسی کا لفظ ”کرشمہ“ استعمال ہو سکتا ہے۔۔۔“۔  
انہوں نے جوہری کے حوالہ سے آلاء کے معنی خصال جمیلہ، اچھی صفات، خوبیاں بھی لکھے ہیں، اس ضمن میں انہوں نے متعدد عربی اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

## الی (حرف)

صفحہ ۲۵۳

نمبر (۴) میں وَاَلَا مَرُّ الْيَكْتَا کی بجائے اَلْيَكْتَا ہے (۲۷)

## ام ت

صفحہ ۲۵۵

مطر چھٹی۔ ”بمقابلہ قاعاً صَفْنَصْفَاً“ کے معنی یہ ہیں کہ اُمْتًا اس کی ضد ہے۔

## ام ر

صفحہ ۲۵۶

دوسرے پیرے کے آخر میں لکھئے۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوموں کی ہلاکت کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ آرام پرست، کثرت کی طالب، تعیش پسند اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی مالک ہو جاتی ہیں۔ ان میں آسودہ حالوں کی کثرت ہوتی جاتی ہے جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتے ہیں اور اس سے قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

## ام س

صفحہ ۲۶۰

چوتھی سطر میں اَمْس کی جگہ اَلَا مَس۔ چاہئے۔

## ا م ل

صفحہ ۲۶۰

چھٹی سطر شروع میں ”ہے“ کے بعد دو نشان \*\* رہ گئے ہیں، یعنی یہ عبارت تاج میں ہے۔

## ا م م

صفحہ ۲۶۱

اُمَّةٌ - فُعْلَتَةٌ یا فُعْلَتَةٌ دونوں وزنوں پر مبالغہ کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے۔ فُعْلَتَةٌ کے وزن پر اس کے معنی ہونگے جسکا بہت قصد کیا جائے۔ اس منہوم سے اس کا مطلب امام ہو سکتا ہے۔ اور فُعْلَتَةٌ کے لحاظ سے اس کے معنی ہونگے جو بکثرت کسی کا قصد کرے۔ اس اعتبار سے آیت (۱۳۰) میں اُمَّةٌ سے مراد ہوگا خدا کی طرف بار بار قصد کرنے والا۔ اُمَّةٌ (۱۳۰) کے لئے ابراہیم کے عنوان کے تحت بھی لکھا جا چکا ہے۔

## ا م ن

صفحہ ۲۶۵

شروع پیرا۔ ”جب اَمْنٌ کا صلہ لام ہو، میں بجائے اَمْنٌ کے اَسَنَ چاہئے۔“

## ا م ا

صفحہ ۲۶۸

دوسری سطر۔ ”خواہ وہ انہیں عذاب دے“ ہونا چاہئے۔

## ا م و

صفحہ ۲۶۹

دوسری سطر۔ عَبْدٌ کی بجائے عَبْدٌ چاہئے۔

## ا ن

صفحہ ۲۷۰ شق (۳)۔ حوالہ آیت (۲۹) کی جگہ (۸۶) ہونا چاہئے۔

## ا ن س

صفحہ ۲۷۵

تیسرا پیرا۔ انسان اور بشر کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان ”ب ش ر“۔

## ا ه ل

صفحہ ۲۸۰

پہلی سطر۔ صاحب محیط نے اس لفظ کے متعدد معنی درج کئے ہیں۔ پھر ابوحنیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے بالخصوص بیوی مراد ہوتی ہے۔

## ا و ب

صفحہ ۲۸۲

اس میں (\*\*) دو نشان سے راغب کا حوالہ مراد ہے، محیط زائد ہے۔  
راغب نے اختیار کا لفظ نہیں لکھا۔ صرف ارادہ لکھا ہے۔ لہذا ”اختیار“ کاٹ دیا جائے۔

صفحہ ۲۸۳ اس عنوان کے اخیر پر لکھئے۔

اگر اس آیت میں ”جبال“ کے حقیقی معنی (پہاڑ) لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت داؤدؑ پہاڑوں سے وہ کام لیتے تھے جن کے لئے فطرت نے انہیں بنایا ہے۔ حفاظت کا کام، جنگلات اگانے اور لکڑی حاصل کرنے کا کام، معدنیات نکالنے اور پتھروں کو مختلف مصارف میں لانے کا کام۔ وغیرہ وغیرہ، یہ تھی پہاڑوں کی طرف سے قانون خداوندی کے مطابق اطاعت۔

## ب (حرف)

صفحہ ۲۹۲

نمبر (م) آیت اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ بِاَتَّخِیَا ذَرِّكُمْ میں ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاَتَّخِیَا ذَرِّكُمْ چاہئے۔

## ب ا س

صفحہ ۲۹۳

پہلی سطر شروع بیشس (بڑا) کی بجائے ”بڑا“ ہونا چاہئے۔

## ب خ ل

صفحہ ۳۰۰

دوسری سطر راغب کی عبارت کا پورا ترجمہ یوں ہے ”بخل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اپنی جمع جوڑ کے ساتھ بخل کرے۔ یعنی انہیں خرچ کی ضرورت پر روکے رکھے۔ اور دوسری قسم یہ کہ انسان دوسرے کی جمع جوڑ کو ضرورت پر خرچ ہونے دیکھ نہ سکے۔ اور یہ زیادہ قابل مذمت ہے۔“ پھر اس نے موخر الذکر بخل کے لئے آیت (۳۳) کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔

## ب د ل

صفحہ ۳۰۴

آخری پیرے کی آخری سے اوپر کی سطر میں آیت (۴۰) میں اِسْتَبْدَالَ زَوْجِی میں الف زائد ہے۔ یہ اِسْتَبْدَالَ زَوْجِی ہے۔

## ب د و

صفحہ ۳۰۵

دوسرا پیرا - بِادِیَ الرَّأٰی (۱۱۱) کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے تیرا اتباع کیا ہے وہ کسی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر نہیں پہنچے بلکہ یونہی ایک بات سنی اور اس کے پیچھے لگ گئے۔

## ب ر د

صفحہ ۳۱۰

دوسرے پیرا کی دوسری سطر۔ آیت کا حوالہ (۲۱۱) کی بجائے (۲۱۹) ہے۔

## ب ر ک

صفحہ ۳۱۶

صفحہ کے آخر کی چار سطروں کی جگہ (آیت کے بعد) یہ لکھئے۔

تَبَارَکَ - بابرکت اور ہر قسم کے خیر و برکت کا سرچشمہ ہونا۔  
تَبَارَکَ الَّذِی... سے مراد ہے وہ ذات جس میں خیر و برکت اپنی پوری کثرت کے ساتھ انتہا تک پہنچ چکی ہو۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل سرچشمہ خیر و برکت جہاں تمام خویاں اپنی کامل شکل میں موجود ہیں اور ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی، ذاتِ خداوندی ہے۔ اور ربوبیتِ عالمینی اسی سرچشمہ خیر و برکت سے ہوتی ہے۔ جو قوم اللہ کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرے، اسے بھی (علی حد بشریت) سرچشمہ خیر و برکت اور عالمگیر انسانیت کے لئے سامانِ نشو و نما مہیا کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہئے۔

## ب س ل

صفحہ ۳۲۱

چوتھی سطر کے آخر میں بڑھائیے۔

راغب کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔ ”روکنے کے مفہوم کے پیش نظر البَسْلُ اس کو کہینگے جسے محروم کر دیا گیا ہو۔ نیز اس چیز کو جسے کسی کے پاس گرو رکھ دیا ہو،۔“

راغب نے اس مادہ میں بَسْلُ اور حرام کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ حرام عام ہے اور بَسْلُ اس روکنے اور منع کرنے کو کہینگے جس میں قہر پایا جائے۔

## ب ش ر

صفحہ ۳۲۳

پہلا پیرا شروع۔ ”بِشَارَةِ“ سے لیکر ”خبر دینا“ تک کی عبارت کا حوالہ اقرب الموارد ہے۔

سطر ۱۱ - بَشَارَةٌ کی بجائے بَشَارَةٌ چاہئے ۔

عنوان کے آخر پر لکھئے ۔

قرآن کریم میں بَشِيرٌ و نَذِيرٌ حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے آیا ہے (۱۹)۔ بَشِيرٌ کے معنی ہیں وہ جو لوگوں کو ایمان اور اعمال صالح کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دے۔ اور نَذِيرٌ وہ جو انہیں غلط روش زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرے۔ دوسری جگہ نَذِيرٌ کے ساتھ مَبَشِيرٌ بھی آیا ہے (۱۴)۔ اس کے معنی بھی خوش خبری دینے والا ہیں ۔

## ب ص ر

صفحہ ۳۲۳ -

سطر ۳ - بَصِيرَةٌ - خون کا نشان یا ٹیکا جس کے ذریعے شکار کی نشاندہی

ہوتی ہو۔

سطر ۴ - بَصْرَةٌ - سخت زمین نیز خستہ سفید پتھر کو کہتے ہیں (تاج)

راغب نے چمکدار کا اضافہ کیا ہے ۔

صفحہ ۳۲۴ - سطر ۱۱ - پہلا لفظ ”میں“ کاٹ دیجئے ۔

(۲) عنوان کے آخر میں حسب ذیل اضافہ کیجئے ۔

لَسْتُ بَصِيرَ الشَّيْءِ - کسی چیز کو بغور دیکھا (تاج و محیط) راغب نے لکھا ہے کہ لَسْتُ بَصِيرَ کے معنی ہیں بصیرت طلب کرنا ۔ نیز یہ بمعنی أَبْصَرَ بھی ہوتا ہے ۔ یعنی دیکھنا ۔ قرآن کریم میں ہے وَ كَانُوا مَسْتَبْصِرِينَ (۲۸) یعنی وہ دانسا و بینا اور معاملہ فہمی کی صلاحیت رکھتے تھے ۔

قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ عاد و ثمود کی قومیں باوجود عقل و بصیرت رکھنے کے ، تباہ و برباد ہو گئیں ۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی گئی کہ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ أَبْصَارًا وَ أَفْئِدَةً ۔ ہم نے انہیں سننے ، دیکھنے اور سمجھنے سوجنے کی صلاحیت دے رکھی تھی ۔ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَا أَبْصَارُهُمْ وَ لَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بَيِّنَاتٍ لِّلَّهِ (۲۷) ۔ لیکن چونکہ انہوں نے قوانین خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی ، اس لئے ان کی سماعت و بصارت اور عقل و بصیرت ان کے کسی کام نہ آ سکی اور وہ تباہ و برباد ہو گئے ۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ اگر عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام نہ لیا جائے ، تو وہ



افراد یا اقوام کو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ذرا دیکھئے کہ عقل کرتی کیا ہے۔ انسان، اپنے ساتھ حیوانی جذبات (Animal Instincts) لئے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہی جذبات اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات (Desires) پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس کی عقل خام، اور جذبات غالب ہیں، تو عقل اس خواہش کے جواز کے لئے دلائل (Justificatory Reasons) تراشیگی اور اس کے حصول کے لئے طرح طرح کی تدابیر سوچیگی۔ اس طرح وہ خواہش (Desire) - تمنا (Wish) بن جائے گی۔ اور جب انسان آخری فیصلہ کے بعد اس کے حصول پر تل جائیگا تو وہ ارادہ (Will) ہو جائے گی۔ اس صورت میں انسانی عقل، اس کی خواہشات یا جذبات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوگی۔

اگر عقل ذرا پختہ ہے، تو وہ اس انسان کو سمجھائے گی کہ اس خواہش (جذبہ) کے پورا کرنے میں تمہارا کتنا بڑا نقصان ہے۔ یعنی عقل زیادہ سے زیادہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل، خیر و شر میں تمیز کر ہی نہیں سکتی۔ یہ تمیز صرف وحی کے ذریعے ہوتی ہے جو نوع انسانی کے عالمگیر نفع نقصان، اور انسانی ذات کے ضعف و قوت کے لئے حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے، انسان تباہی سے اسی صورت میں بچ سکتا ہے جب وہ عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام لے۔

آج دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ قومیں جو تباہی اور پرہیزی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل و علم کو وحی کے تابع نہیں رکھتیں۔

اور ہم اس لئے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں کہ ہم نہ وحی سے مستفید ہوتے ہیں، نہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

## باطل

صفحہ ۳۲۶ -

باطل کے معنوں میں لکھا گیا ہے کہ یہ ایسی کوشش کا تمام ہے جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں ایسے کام بھی ہیں جو بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے نتیجہ تو ہر کام کا مرتب ہوتا ہے۔ باطل ان کوششوں کا نام ہے جن کا نتیجہ وہ نہ نکلے جو

ان سے مقصود ہو۔ کوشش یہودہ۔ معنی ناکام۔ اور اس سے انسان میں ضعف پیدا ہو جائے۔ یہ ہے باطل کا وہ تخریبی اثر جس کا مداوا تمسک بحالہق کے سوا ہو نہیں سکتا۔

## ب ط ن

صفحہ ۳۲۸ -

پہلی سطر۔ بَطْن کے معنی پیٹ۔ اندرونی حصہ۔ اسکی جمع بَطُون ہے۔ تیسرا پیرہ۔ پہلی سطر میں حوالہ (  $\frac{55}{54}$  ) سے پہلے لکھئے ”اس کی جمع بَطَانِین ہے“۔

(آخر میں اضافہ) ظاہر الامرِ ثمر و بَاطِنِہ (  $\frac{1}{131}$  ) سے مراد ہے گناہ کی محسوس و غیر محسوس شکلیں۔ اس میں نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک آجاتے ہیں۔

## ب ع د

صفحہ ۳۳۱ -

دوسری سطر میں بَعْدًا و بَعْدًا ہے۔ اس میں بَعْدًا کی بجائے بَعْدًا صحیح ہے۔

## ب غ ل

صفحہ ۳۳۳ -

آخر میں لکھئے۔ چونکہ خچر، گھوڑی اور گدھے کے اختلاط سے وجود میں آتا ہے اس لئے ہر اس جانور کو بھی بَغْل کہتے ہیں جو دو مختلف جنسوں کے ملاپ سے پیدا ہو۔

## ب غ ی

صفحہ ۳۳۶ -

حضرت مریمؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں حسب ذیل اضافہ کر لیجئے۔ لیکن اگر بتغیث کے معنی ”بدکار“ ہی لئے جائیں، تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ نے کہا کہ میں ہیکل میں تجرد کی زندگی بسر کر رہی ہوں اس لئے میرے متعلق خاوند سے اختلاط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری صورت بدکاری کی ہو سکتی ہے۔ سو میں بدکار بھی نہیں۔ اس لئے میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت مریمؑ ہیکل میں (Nun) کی زندگی گزار رہی تھیں۔ بعد میں، جب ان تک تعلیم خداوندی پہنچی تو انہوں نے ہیکل کی تجرد کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لی۔ چونکہ یہودیوں کے ہاں کسی (Nun) کے لئے متاہل زندگی

بسر کرنا جائز ہی نہیں تھا ، اس لئے وہ حضرت مریمؑ کی اس زندگی کو (معاذ اللہ) ہدکاری کی زندگی قرار دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی اسی خود ساختہ شریعت کی تردید کر کے اپنی والدہ کی مدافعت کی تھی۔

واضح رہے کہ بتغیٰ باوجود صیغہ مذکر ہونے کے ، صرف عورت کے لئے استعمال عوتا ہے۔ ایسی عورت کو بتغیثہؑ نہیں کہتے۔

## ب ق ع

صفحہ ۳۳۷ -

ساتویں سطر۔ ”نیز“ کے بجائے ”الْبَقِیَّةُ“ ہونا چاہئے۔

## ب ق ی

صفحہ ۳۳۹ -

دوسرا پیرہ۔ وَجْہِ رَبِّ کے دوسرے مفہوم کے لئے عنوان (و۔ ج۔ ہ) دیکھئے۔

## ب ک ر

صفحہ ۳۴۰ -

پہلی سطر۔ ”الْبَیِّنَاتُ“ کی جمع ”الْبَتَاتُ“ ہے۔

## ب ل د

صفحہ ۳۴۳ -

نیا پیرہ۔ ”بَلَدَ الْفَرَسِ“ کی جگہ ”بَلَدَ الْفَرَسِ“ ہونا چاہئے۔

## ب ل س

صفحہ ۳۴۴ -

پہلے پیرے کے آخر میں لکھئے۔

لیکن اگر ”بَعَثُ“ کے مفہوم کی گہرائی پر نگاہ ڈالئے تو یومر ”بُعِثُوا“ کے معنی اور ہونگے۔ ”بَعَثُ“ کے معنی ہیں ان موانع کو دور کر دینا جو کسی کی آزادی کے راستے میں حائل ہوں۔ کھلا چھوڑ دینا۔ ابلیس سے کہا یہ گیا کہ تمہارا کام انسانوں کی اخلاقی بندھنوں کو توڑ کر انہیں ”مُتَّادِرِینَ“ آزاد کر دینا ہے۔ تمہاری ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک انسان ان اخلاقی حدود کو توڑ کر یکسر آزاد نہ ہو جائیں۔ جب وہ اس طرح آزاد ہو جائیں گے تو پھر ان کے لئے تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لئے تمہیں اس وقت تک کی مہلت کی ضرورت ہے سو وہ مہلت تمہیں دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی بندھنوں کو ابتداءً توڑنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے لیکن جب یہ ایک مرتبہ ٹوٹ جائیں تو پھر انسان غیر شعوری طور پر خود بخود ، اس سیلاب میں بہے چلا جاتا ہے۔

عنوان کے اخیر پر لکھئے - نیز دیکھئے عنوانات (ق - ن - ط اور ی - ا - م) -

(۳) صفحہ ۳۳۵ کے اوپر بائیں ہاتھ کی طرف عنوان (ب - خ - ع) کی جگہ (ب - ل - م) لکھئے -

## ب ہ ل

صفحہ ۳۵۸ -

سطر ۱۲ میں انٹی کے بجائے انٹسی -

## ب ی ن

صفحہ ۳۷۰ -

عنوان کے آخر میں لکھئے -

اِسْتَبَانَ الْأَمْرُ - معاملہ کھل گیا، ظاہر اور واضح ہوا - قرآن کریم میں ہے وَلَيَسْتَنْبِیْنَنَّ سَبِیْلُ الْمُجْتَرِمِیْنَنَّ (۱/۵۵) - تاکہ مجرموں کی راہ کھل کر واضح ہو جائے - فَبَيَّنَ الشَّقِیُّ ع - چیز واضح اور ظاہر ہوئی - تَبَيَّنَتْهُ - میں نے اسے کھولا، واضح کیا اور اسے سمجھا (لازم و متعدی) - (۱/۶۶)

## ت ف ث

صفحہ ۳۸۰ -

سطر چھٹی - التَّفَثُ کے معنی بالوں کی پراگندگی و پریشانی ہیں، نہ محض پراگندگی و پریشانی -

اسی لائن کے آخر میں جو ابن عباس رضی کا قول ہے، وہ یہ ہے کہ تَفَثٌ سر کے بال مونڈنے یا تراشنے، ڈاڑھی مچھلی بنانے اور بغل کے بال لینے اور ذبح ورسی کو کہتے ہیں -

## ت ل و

صفحہ ۳۸۲ -

پہلی سطر کا پہلا لفظ - تَلَّوْا تہ کے بجائے تَلَّوْا تہ -

دوسرا پیرا پہلی سطر - تِلَاوَةٌ کے بجائے تِلَّوٌ وتَلَّوٌ صحیح ہے -

راغب کی عبارت کا پورا ترجمہ یوں ہے -

تَلَا کے معنی ہیں کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی غیر حائل نہ ہو - یہ شکل کبھی تو جسعانی طور پر ہوتی ہے اور کبھی حکم کا اقتداء کرنے میں - اور ان معانی میں اس کا مصدر تَلَّوٌ وتَلَّوٌ آتا ہے - کبھی اس کے معنی پڑنے اور غور و تدبر کرنے کے ہوتے ہیں تو اس کا مصدر تِلَاوَةٌ آتا ہے -

## ت م م

صفحہ ۳۸۵ -

دوسرے پیرے میں جہاں کہا گیا ہے کہ ”اب ہم نے تمہارا غلبہ و اقتدار انتہا تک پہنچا دیا“، تو اس سے مراد ان مخالفین کا سرنگوں ہو جانا ہے جو نبی اکرمؐ سے مدتِ العمر برسرِ پیکار رہے تھے۔ ورنہ دین (نظامِ خداوندی) کا غلبہ و اقتدار حضورؐ کے بعد بھی آگے بڑھتا گیا تھا۔

اور اگر ”دین“ کے معنی دینِ اسلام ہی لیں تو اس سے مراد تکمیلِ دین ہوگی جو قرآنِ کریم کے اندر آکر اپنی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔

## ث م د

صفحہ ۴۰۱ -

چوتھی سطر۔ الثَّامِدُ کے معنی ہیں چوہایہ یا انسان کا بچہ جو تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کر دے۔ یہ اسکی ابتدائی عمر ہوتی ہے۔

## ث م

صفحہ ۴۰۳ -

آیت (۱۱۵) میں وجہِ اللہ کے معنی ذاتِ خداوندی بھی ہو سکتے ہیں لیکن ذاتِ خداوندی ہمارے سامنے اس کی آیات کی رو سے ہی آتی ہے۔ آیاتِ اللہ میں قانونِ خداوندی کی حیثیت بنیادی ہے۔

## ث م

صفحہ ۴۰۴ -

ثُمَّ کے ایک معنی ”اس پر بھی، اس کے باوجود بھی“ ہوتے ہیں، مثلاً يَمْشِرُونَ نِعْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَ نَهَا (۱۱۷)۔

## ث ن ی

صفحہ ۴۰۶ -

پانچویں سطر۔ نَسِیَ الْحَقِيقَةَ کے بجائے نَسِیَ الْحَقِيقَةَ ہونا چاہئے۔  
صفحہ ۴۰۷ - اوپر سے تیسری سطر کے بعد لکھئے۔ ”یعنی سب کا سب اپنے لئے رکھ لینکے۔ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑینگے۔“  
صفحہ ۴۰۷ - نیچے سے تیسری سطر (اوپر کو)۔ انگریزی کا لفظ کاٹ دیجئے۔ اس پیرے کے اخیر پر لکھئے۔ کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَلًا کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیم پہلی کتابوں کے متشابه ہے اور اصولاً ان کی تکرار۔

## ج ب ب

صفحہ ۴۱۲ -

الجُبُّ کے معنی بتاتے ہوئے محیط نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایسے گہرے گڑھے اور کھائی کو بھی کہتے ہیں جسکی تہ اور آخری حد معلوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے کنویں کو کہتے ہیں جو سخت زمین میں کھودا جاتا ہے۔

## ج ب ر

صفحہ ۴۱۳ -

اس کا حوالہ رہ گیا ہے۔ ”الجبائر“۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا“ کا حوالہ تاج و محیط و راغب ہے۔

صفحہ ۴۱۴ - نیچے سے پانچویں سطر۔ ”اس کی نوعیت“ یہ الفاظ کاٹ دیں۔

## ج ب ل

صفحہ ۴۱۵ -

حضرت داؤدؑ کے پہاڑوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں، اسی تتمہ میں عنوان (ا۔ و۔ ب) بھی دیکھئے۔

صفحہ ۴۱۶ - ساتویں سطر میں سرداران قوم کی بجائے سردار قوم ہونا چاہئے۔

## ج ب و (ی)

صفحہ ۴۱۷ -

(اضافہ) جَبَّی الْمَاءِ فِي الْحَوْضِ، جس کے معنی ہیں حوض میں پانی جمع کیا، سے الجابیۃ کے معنی ہوتے ہیں پانی جمع کر لینے والا حوض۔ اسکی جمع جَبَوَابِ (الجَوَابِی) ہے۔ قرآن کریم میں ہے و جِیْفَتَانِ كَالْجَبَوَابِ (۳۷/۱۳)۔

(تاج و محیط و راغب)

## ج ح م

صفحہ ۴۱۹ -

دوسری سطر۔ جَحَمَ الْبَعِیْرُ کے بجائے الْبَعِیْرُ چاہئے۔

## ج د ر

صفحہ ۴۲۲ -

دوسری سطر۔ التَّجِدُّرُ کے بجائے الْجَدُّرُ چاہئے۔

## ج ر ز

صفحہ ۴۲۵ -

آخر میں یہ لکھئے -

اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ زمین پر ہے اسے مثلاً کر خاک اور خشک ویسے گیاه کسرتے رہتے ہیں - (بہار اور خزاں کے دور جاری رہتے ہیں)

## ج ر ف

صفحہ ۴۲۶ -

آخری پیرا - دوسری سطر - بجائے انڈیل دینے کے ” نکال لینے، چلو سے لیے لینے، نیز کاٹ دینے “ چاہئے -

## ج ر ی

صفحہ ۴۲۷ -

الجَارِیَّةُ مؤنث ہے جَارٍ اور الجَّارِیُّ کا جسکے معنی ہیں چلتے والا، بہنے والا، تیزی سے دوڑنے والا - جَارِیَّةٌ کی جمع جَارِیَّاتٌ اور جَوَارِیُّ آتی ہے - قرآن مجید میں ہے الجَّارِیَّاتِ بِسْرًا (۱۱۵) - بہنے اور پانی میں تیرتی چلی جانے کی وجہ سے کشتی کو بھی جَارِیَّةٌ کہہ دیتے ہیں - اسکی جمع جَوَارِیُّ اور جَارِیَّاتٌ ہے -

## ج ع ل

صفحہ ۴۲۸ -

جعل کے لغت میں بہت سے معنی ہیں - صاحب محیط نے اسکے معنی بدل دینے کے بتائے ہیں - مثلاً جَعَلْنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا (۱۹۹) - یعنی ہم نے اس کے بالائی حصے کو نچلے حصے سے بدل دیا - اور نام رکھنے کے - مثلاً - جَعَلْنَاکُمْ اُمَّةً وَ سَطًا (۱۳۳) -

اور اعتقاد رکھنے کے - مثلاً یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلَہًا اٰخَرَ (۱۹۹) - گو یہ سب ” کر دیتے اور بنا دیتے “ کے مفہوم ہی سے ہیں لیکن ان مثالوں سے اس مادہ کا مزید استعمال واضح ہو جاتا ہے -

## ج ل ل

صفحہ ۴۲۹ -

دوسری سطر - معمر یا جلیل القدر میں معمر زائد ہے - اسکی بجائے بڑا عظیم المرتبت - ہونا چاہئے -

واغب نے لکھا ہے کہ جلال میں جلالت سے زیادہ کمال پایا جاتا ہے -

## ج م م

صفحہ ۴۴۱ -

چھٹی سطر میں ”سیرابی“ کاٹ دیجئے۔

## ج ن ح

صفحہ ۴۴۳ -

آخری پیرا، پہلی سطر۔ ”گناہ کے معنوں میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے۔“  
اس عبارت میں ”یہ لفظ“ کی جگہ ”جستاح“، لکھئے۔

## ج ن ن

صفحہ ۴۴۴ -

دوسری سطر۔ راغب نے کہا ہے کہ جَنّ کے معنی کسی چیز کو  
حاسبہ (نگاہ) سے پوشیدہ کر دینا ہیں۔

صفحہ ۴۴۴ - آٹھویں سطر۔ جَنّیّٰن کے معنی کے بعد لکھئے، اسکی جمع  
أَجِنَّةٌ ہے (۴۴۴)۔

## ج ہ ن م

صفحہ ۴۴۵ -

پہلا پیرا - حوالہ (\*) سے مراد فٹ نوٹ میں تاج ہے۔

## ج و ب

صفحہ ۴۴۶ -

پہلی سطر۔ قوسین کے اندر کی عبارت کی بجائے حسب ذیل عبارت لکھئے  
(اس لئے کہ جواب دہنے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ  
اس کے منہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے۔ ویسے  
سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے۔ لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو  
گیا ہے۔ راغب)

(۲) اضافہ۔ سوال دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو کسی بات پر مسئلہ  
کا دریافت کرنا۔ اور دوسرے امداد و اعانت طلب کرنا۔ لہذا اس اعتبار سے  
جواب کی بھی دو قسمیں ہونگی اور ایسابت و استجابت، ان دونوں قسموں کے  
جواب کے لئے بولا جائیگا۔ یعنی کسی سوال کا جواب دینا، یا کسی مانگ  
اور مطالبہ کو پورا کر دینا۔

## ج و و

صفحہ ۴۴۹ -

پانچویں سطر کا آخر۔ ”آسمان کو الجوّ“، میں، ”آسمان“ کی بجائے  
”بالائی فضا“ لکھئے۔



صفحہ ۴۶۰ - پہلی سطر - راغب نے اٰثِمَانٌ اور مَعِیٌ کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اٰثِمَانٌ کسی کام کے کرنے کے ارادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے (خواہ وہ کام نہ ہو سکے)۔



لغات القرآن جلد دوم، سوم اور چہارم سے متعلق تتمہ کے مندرجات ان جلدوں میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٠٠﴾

# لُغَةُ الْقُرْآنِ

قرآنی مرطالِب کا لِسَانِ تَرْکِلُو پِیڈیا

جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی و مرطالِب۔  
مُسْتَنْد کُتُبِ لُغَت کی بُنیاد پر اس اِنْداز سے مُتَعَيِّن کئے گئے ہیں  
کہ قرآن جو تصوّرات پیش کرتا ہے، اُن کا مکمل نقشہ  
سامنے آجائے اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی اُبْجَہَاؤ پِیڈیا ہو

پَر وِیز

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) جلد اول بی کلبک لاہور ۲۵

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	لغات القرآن (اول)
مصنف	غلام احمد پرویز
ایڈیشن	چہارم اکتوبر 1998
ناشر	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 ملی گلبرگ، لاہور پاکستان فون: 5753666, 5764484

زاہد بشیر پرنٹرز

مطبع

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ  
آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست مشمولات

صفحہ	از	تا
.....	۳۴-۴	(۱) پیش لفظ
.....	۷۳-۱	(۲) مبادیات
		(یعنی عربی گرامر کے ابتدائی قواعد)
.....	۱۸۵-۷۴	(۳) فہرست الفاظ قرآنی
		(جن کے سامنے مادے دئے گئے ہیں)
.....	۱۸۶	(۴) اغلاط نامہ مبادیات و فہرست

## لغات

صفحه	از	تا	
۲۹۱-۱۸۹	....	....	۱
۳۷۰-۲۹۲	....	....	ب
۳۹۳-۳۷۱	....	....	ت
۴۱۱-۳۹۴	....	....	ث
۴۶۰-۴۱۲	....	....	ج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پیش لفظ (پہلا ایڈیشن)

خاک ماخیزد کہ سازد آسمانے دیگرے  
ذرہ، ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نوع انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ ایسے ابدی حقائق پر مشتمل ہے جن پر زمانہ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہو سکتے، اور جو اسقدر عالمگیر اور ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے اور تاریخ کے ہر دور میں انسانی فکر کی امامت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کی کیفیت یہ ہو اسکی زبان کو کسقدر جامع، ہمہ گیر، وسیع، بلند اور عمیق، اور اسکی ساتھ، کسقدر صاف، واضح اور متعین ہونا چاہئے۔ ایک مغربی مفکر نے جو عیسائیت سے برگشتہ ہو کر ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو انسانی عقل و بصیرت کی تسکین کر سکے۔ کہا ہے کہ وہ جس مذہب کی تلاش میں ہے اسکی کتاب کی زبان ایسی ہونی چاہئے:

جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اسقدر عمیق اور پر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے\*۔

قرآن کریم کی زبان اس معیار پر بھی صحیح طور پر پوری اترتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مشیت ایزدی نے قرآن کے انقلابی پروگرام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے عربوں جیسی قوم کا انتخاب کیا تو، نزول قرآن سے صدیوں پہلے، اس قوم کے ذہن پر یہ فریضہ عائد کر دیا کہ وہ اپنی زبان کو بتدریج ارتقائی منازل طے کرائے اس مقام تک لے جائے کہ وہ قرآن کے عظیم حقائق کی متحمل ہو سکے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا، تو ایک شاخ (بنی اسرائیل) کے حصے میں نبوت اور حکومت آئی اور دوسری شاخ (بنی اسمعیل) کو حجاز کی وادی غیر ذی زرع میں بسایا گیا، جہاں ان کے ہاں (حضرت اسمعیلؑ کے

\* Julian Huxley-N.Y. Times 22.8.52.

بعد) نہ کوئی نبی مبعوث ہوا، نہ انہیں بادشاہت ملی۔ لیکن یہ شاخ، رفتہ رفتہ ایک ایسی قوم بن گئی جو دایہ فطرت کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی اور نبی آخر الزمان<sup>۶</sup> کے پیغام کی اولین مخاطب بننے کی اہل قرار پائی۔ اسکے ساتھ ہی اس نے اپنی زبان کو اس قدر جلا دی کہ وہ اپنے آپ کو 'بجا طور پر، عرب (یعنی فصیح البیان) اور دوسروں کو 'عجم (یعنی گونگرے) کہا کرتے تھے۔ لفظ "عربی" کے معنی ہی صاف، واضح اور بیٹن کے ہیں۔ اس وقت عربی زبان کی اصل (Origin) اور اسکے ارتقائی مراحل کے متعلق کوئی تحقیقاتی بحث میرے پیش نظر نہیں۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جہاں بنی اسرائیل صدیوں تک تمدن و حضارت کے بلند اور پر شکوہ محلات تعمیر کرنے میں مصروف رہے اور سطوت داؤدی<sup>۷</sup> اور شوکت سلیمانی<sup>۸</sup> کے حامل بنے، ان کے بھائی۔ بنی اسمعیل۔ اس تمام عرصہ میں، شعوری یا غیر شعوری طور پر، ایک ایسی زبان کی ترتیب و تہذیب میں کوشاں رہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی زبان نہیں کرتی تھی۔ مہرین علم الاسنہ کے پیش کردہ نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر تاریخ کے کسی خاص دور میں، کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے۔ اس ضمن میں انکی تحقیق یہ ہے کہ ہندی۔ یورپی (Indo-European) زبانوں میں جس قدر الفاظ مروج ہیں ان کے تصوراتی مشتقات (Root-Concepts) کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو اکیس تک پہنچتی ہے۔ اور تو اور، جس زمانے میں سنسکرت ایک زندہ زبان تھی، اور سورج اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا، اس زمانے میں اس زبان میں سورج کے لئے کل سینتیس (۳۷) الفاظ تھے اور آگ کیلئے پینتیس (۳۵)۔ اسکے برعکس عربوں کو دیکھئے تو ان کے ہاں شہد کیلئے اسی الفاظ۔ سانپ کیلئے دو سو۔ شیر کیلئے پانچ سو۔ تلوار کیلئے ایک ہزار۔ اور اونٹ کیلئے پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ موجود تھے\*۔ اس سے عربوں کے تخیل کی وسعت اور ان کی زبان کی جامعیت کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔

وَ اِنَّہٗ لَآتٰنٰزِیْلُہٗ رَبِّہٖ الْعَالَمِیْنَ ۔ نَزَلَ بِہٖ  
الشُّرُوْحُ الْاَلَامِیْنَ عَلٰی قَلْبِیْکَ لِتَكُوْنَ مِّنَ  
الْمُنْذِرِیْنَ ۔ بِلِیْسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (۱۶۵-۱۶۶)

اور یہ (قرآن) کائنات کے نشوونما دینے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ روح الامین اسے لیکر تیرے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ تو زمرہ انبیاء میں شامل ہو جائے جو لوگوں کو ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتے تھے۔ (یہ قرآن) عربی مبین (بات کو کھول کر بیان کرنے والی عربی زبان) میں (نازل ہوا ہے)۔

یہ تسو اس زبان کے متعلق تھا جس میں قرآن نازل ہوا۔ خود قرآن کے متعلق ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲/۱۴)  
 ہم نے اس (قرآن) کو صاف اور واضح کتاب بنا کر نازل  
 کیا ہے تاکہ (تم بات کو اچھی طرح) سمجھ سکو۔

دوسری جگہ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۲۳) کہا ہے۔ قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے معنی ”قرآن بزبان عربی“ بھی ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی کہ واضح اور کھول کر بات کرنے والا قرآن۔ اس حقیقت کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورة الرعد میں ہے کہ وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳) اور اس طرح ہم نے اسے کھلے اور واضح فیصلے کے طور پر نازل کیا ہے،۔ سورة طہ میں ہے وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۲۱۳) اور اس طرح ہم نے اسے واضح کتاب (کی شکل میں) نازل کیا ہے۔ (نیز (۲۱۲ ; ۲۱۳)۔ سورة زمر میں قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرُ ذِي عِوَجٍ (۳۹) کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہ قرآن اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس کے مطالب میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ سورة کہف میں ہے وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا (۱۸) اور اس میں کوئی پیچ و خم نہیں رہنے دیا۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے كِتَابٌ فَصِيحٌ اِلَيْتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۲۱) ”یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات الگ الگ کر کے، نکھار کر، بیان کی گئی ہیں۔ (اس طرح) یہ قرآن صاف اور واضح (ہو گیا ہے) ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔“

قرآن کے حقائق نہایت بلند اور اس کے مطالب غایت درجہ عمیق عیسٰی لیکن اُس کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس کا انداز بیان بڑا آسان ہے۔ سورۃ دخان میں ہے فَاتِنَّمَا يَسْتَرْزِقُهُٓ يٰلَيْسَ اِيَّاكَ لَعَلَّاهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۸/۲۸) ”اے رسول! ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں“۔ سورۃ قمر میں اس حقیقت

کو ان الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ "وَلَقَدْ يَسْقُرُنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِ كُرَر فَهَلْ مِّنْ مَّثَدٍ كَبِيرٍ" (۹۳) "یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"، تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم ہر بی زبان میں نازل ہوا تھا اور اپنے مطالب میں بڑا صاف، واضح اور آسان ہے۔ اس سے انسان (عام طور پر) اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جس شخص کو عربی زبان آتی ہو وہ قرآنی حقائق کو آسانی سمجھ لیگا۔ یعنی قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے صرف عربی زبان کا جاننا کافی ہوگا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب بھی سمجھی نہیں جاسکتی جب تک انسان اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے۔ لیکن اگر صرف عربی زبان جاننے سے قرآنی حقائق سمجھ میں آسکتے تو عرب (جن کی مادری زبان عربی ہے) قرآنی حقائق کے ماہر ہوتے۔ لیکن عرب کس حد تک قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عربوں سے مراد صرف ان کے عوام نہیں۔ اس میں ان کا پڑھا لکھا (علماء کا) طبقہ بھی شامل ہے۔ جب اس باب میں خود عربوں کی یہ حالت ہے تو غیر عربوں کے متعلق اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ ایک طرف قرآن کریم کا یہ دھویا ہے کہ وہ عربی زبان کی آسان کتاب ہے اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف عربی جاننے والوں میں سے، بلکہ خود ان میں سے جن کی مادری زبان عربی ہے، بہت کم ہیں جو قرآنی تعلیم کو کما حقہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا بنیادی اور اہم ہے اور اس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری۔

عربی زبان کی وسعت و جامعیت کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ زمانہ نزول قرآن سے پہلے ہی یہ زبان بہت منجھ چکی تھی۔ لیکن یہ معلوم کر کے غالباً آپ کو حیرت ہوگی کہ قرآن کریم نشر کی سب سے پہلی کتاب ہے جو اس زبان میں لکھی گئی\*۔

\* بعض لوگوں نے قرآن کریم سے پہلے عربی زبان میں نشر کی ایک آدھ غیر معروف سی کتاب کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن اس کے متعلق حتیٰ اور یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ عام تحقیق کا رخ اسی طرف ہے کہ قرآن کریم اس زبان میں نشر کی اولین کتاب ہے۔



عربوں کے ہاں شعر و شاعری کا زیادہ رواج تھا اس لئے ان کی زبان کا تمام تر ذخیرہ اشعار کی شکل میں تھا جو نسلاً بعد نسل (زبانی) آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا۔ جسے آج عربی لٹریچر کہا جاتا ہے وہ بیشتر عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں کتب احادیث و سیر اور تاریخ و آثار مرتب ہوئیں۔ قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں۔ عربی ادب کی کتابیں تالیف ہوئیں۔ اس زبان کی صرف و نحو کے قواعد مدون ہوئے۔ لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں وہ (باستثنائے معدودے چند) سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے۔ یہی کتابیں عربی زبان کا اولین سرمایہ ہیں۔

تاریخ کا طالب العلم اس حقیقت سے واقف ہے کہ عباسیوں کے زمانے میں، عجمی تصوراتِ حیات ساری فضا میں پھیل چکے تھے۔ انہوں نے سلطنت انہی کی مدد سے حاصل کی تھی اس لئے اس دور کی سیاست پر بھی انہی کا اثر غالب تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس گروہ کا سیاست پر اثر ہو، اس کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر چھا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان لوگوں کے قلم سے جو کچھ نکلا اس کے الفاظ تو عربی تھے لیکن ان الفاظ کے پیکروں میں تصوراتِ عجمی تھے۔ یوں عربی زبان، تصنیف و تالیف کے پہلے دور میں ہی، غیر عربی تصورات کی حامل بن گئی۔ یہ تبدیلی کس کس انداز سے ہوئی، اس کی تفصیل علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی مایہ ناز تصنیف فجر الاسلام میں شرح و بسط سے دی ہے۔ اس بحث کے آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

یقیناً آپ اس بارے میں مجھ سے متفق ہونگے کہ ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔

ظاہر ہے کہ جب عربی زبان پر خارجی (غیر عربی) اثرات اس طرح مرتب ہوئے اور اس کے الفاظ کے حقیقی مفہوم میں تبدیلی پیدا ہو گئی تو اس زبان کے جو الفاظ قرآن کریم میں آئے تھے ان کے مفہوم میں بھی فرق آ گیا۔ چونکہ ہماری کتب تفاسیر بھی اسی فضا میں مرتب ہوئی تھیں اس لئے وہ بھی عجمی تصورات سے متاثر ہوئیں۔ یوں قرآنی الفاظ کے اس مفہوم میں فرق آ گیا جو ان سے زمانہ نزول قرآن میں لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس فرق کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آئیگی۔

ہمارے ہاں جب تفاسیر لکھنے کی ابتدا ہوئی (یعنی تیسری چوتھی صدی ہجری میں) تو ان کا انداز یہ رکھا گیا کہ قریب قریب ہر اہم آیت کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کی ”شان نزول“، یہ ہے۔ یعنی فلاں واقعہ یوں ہوا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس طرح قرآن کریم کی آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کی رو سے نہیں، بلکہ ان واقعات کی رو سے متعین کیا گیا جن کے متعلق سمجھا گیا کہ وہ ان کے نزول کا سبب تھے۔ پھر اسی مفہوم کے مطابق قرآنی الفاظ کے معانی متعین کئے گئے۔ جو تفاسیر ان کے بعد لکھی گئیں ان میں متقدمین کا اتباع ہوتا چلا گیا۔ اس طرح متعلقہ آیات کا وہ مفہوم مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور چونکہ شان نزول کی روایات کا انتساب خود نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف کیا گیا تھا اسلئے آیات کی وہ تفسیر خود نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی تفسیر سمجھ لی گئی۔ اس طرح قرآن کریم کے اس مفہوم کو مقدس ترین سند بھی حاصل ہو گئی، حالانکہ تفسیری روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں بیشتر ضعیف اور وضعی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اکابر ائمہ نے سرے سے ان کا انکار ہی کر دیا ہے مثلاً اسام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں۔ مغازی۔ ملاحم اور تفسیر\*۔ لیکن اس کے باوجود ہماری کتب تفاسیر کا مدار بیشتر انہی روایات پر ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی ضعیف یا وضعی روایات کی بنا پر قرآنی آیت کی تفسیر کی جائیگی اور اس تفسیر کی روشنی میں قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کیا جائیگا تو وہ مفہوم قرآن کریم کا صحیح صحیح مطاب بیان نہیں کریگا۔ یہ بات ایک مثال سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آسکیگی۔ سورۃ النساء کی چونتیسویں آیت ہے **الَّذِينَ جَاءُوا مَوْتَناً عَلَىٰ نِسَاءٍ . . . . عَالِيَا كَتِّبَرًا** (۲۴/۳۳) اسمیں ابتدائی چار الفاظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے **مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے (ترجمہ شاہ رفیع الدین<sup>۱</sup>)** یہاں ”قوامون“ کا ترجمہ ”حاکم“ کیا گیا ہے حالانکہ لغت کی رو سے اس کے معنی ہیں ”روزی مہیا کرنے والے“، جس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم عمل کی رو سے مردوں کا فریضہ کسب معاش ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس لفظ (قوام<sup>۲</sup>) کا ترجمہ ”حاکم“ کس طرح ہو گیا۔ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔

\* تذکرۃ الموضوعات الشیخ محمد طاہر۔ بحوالہ مقدمہ معارف القرآن صفحہ ۲۸  
از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اسکا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑیگی۔ حضرت حسن بصریؓ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔ اس پر آپ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتیری اور بدنہ نہ دلویا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لٹے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا ہے جسکا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسے (اسکا) حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتیری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا۔ . . . ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ کی لونڈیوں کو مارو نہیں۔ اسکے بعد حضرت عمرؓ آئے اور عرض کرنے لگے۔ یا رسول اللہؐ! عورتیں آپکے اس حکم کو سنکر مردوں پر دلیر ہو گئیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ سا ریٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لیکر آنحضرتؐ کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا۔ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو جو تم میں سے اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔

حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کا سہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں اس روز ناچاقی ہو گئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمائے لگے۔ اشعث! تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے پوچھا نہ جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا۔ دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت۔ اور تیسری بات راوی کے ذہن

سے نکل گئی (نسائی)۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے\*۔

ان تفسیری روایات کی رو سے مرد کی پوزیشن حاکم، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کشاف میں ”قَوَّامُونَ“ کا مطلب ”نسیطین“ قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ”داروغے“۔ اور تفسیر جلالین میں ”متسلطین“۔ یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط رکھنے والے۔ اس لفظ کا یہی مفہوم کتب لغت میں بھی آگیا اور اسی سے ہمارے ہاں اسکا ترجمہ ”حاکم“ اور ”داروغہ“ ہو گیا۔ یہی تفاسیر تمام ممالک اسلامیہ کے مذہبی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں اور انہی کی تعلیم عوام کو دی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ عربی جاننے والے، حتیٰ کہ خود عرب (اہل زبان) بھی قرآن کریم کے حقیقی مفہوم تک بہت کم پہنچ پاتے ہیں۔

اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ

(۱) جب عربی زبان عباسیوں کے دور میں عجمی اثرات سے ملوث ہو گئی تھی۔ اور

(۲) ہمارے ہاں عربی زبان کا جسقدر اولین تحریری سرمایہ ہے وہ بیشتر اسی دور کا پیدا شدہ ہے۔ خواہ یہ کتب تفاسیر ہوں یا لغت کی کتابیں، کتب تاریخ ہوں یا ادبی تصانیف۔ اور کتب تفاسیر میں بھی، ضعیف یا وضعی روایات کی وجہ سے قرآنی آیات (والفاظ) کا مفہوم اپنی اصل سے ہٹ چکا ہے۔ تو

(۳) آج اسکی کونسی صورت باقی ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم متعین کیا جاسکے جو ان سے نزول قرآن کے زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ بات کسی اور زبان (اور کسی اور کتاب) سے متعلق ہوتی تو یہ دشواری ایسی تھی جسکا غالباً کوئی حل نہ مل سکتا۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) کے سلسلے میں بعض عناصر ایسے ہیں جنکی موجودگی میں یہ مسئلہ ایسا نہیں رہتا جسکا حل ناممکن ہو۔ سب سے پہلے یہ کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نزول قرآن سے پہلے عربی زبان کا تمام تر ذخیرہ ان کے شعراء کے کلام میں محفوظ تھا۔ عربوں کے معاشرہ میں شعراء کو خاص

مقام حاصل تھا۔ نیز انکی شاعری بھی زیادہ تر مختلف قبائل کے محاسن و خصائص اور ان کے متد مقابل قبائل کے معائب و ذمائم سے متعلق ہوتی تھی، اسلئے یہ اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نثر کو اگر ضبط تحریر میں نہ لایا جائے تو اسکا علیٰ حالہ آگے منتقل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن شعر کی کیفیت یہ نہیں۔ اسے جب بھی زبانی یاد کیا جائیگا اور دہرایا جائے گا تو اسکے الفاظ، اور الفاظ کی ترتیب اسی حالت میں رہیگی۔ یعنی شعر بالفاظہ، آگے منتقل ہوتا ہے، اسکا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ یہ وجہ تھی کہ زمانہ قبل از اسلام کے شعراء کا کلام بلفظہ، اور بجنسہ، آگے منتقل ہوتا رہا تاںکہ وہ (عباسیوں کے عہد میں) ضبط تحریر میں آگیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آس دور میں بہت سے وضعی اشعار بھی شعرائے جاہلیہ کی طرف منسوب کر کے ان کے کلام میں شامل کر دئے گئے، لیکن اس سے اس مقصد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا جس کے لئے ہم نے اس مقام پر اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔ وضعی اشعار کی زبان لاسحالہ وہی رکھنی پڑتی تھی جو اصل اشعار کی زبان تھی۔ ایسا نہ کیا جاتا تو اصل اور نقل میں فوراً تمیز ہو جاتی۔ بہر حال، شعرائے جاہلیہ کے کلام کا بیشتر حصہ اپنے اصلی الفاظ میں عربی ادب کی کتابوں میں مٹدوں اور محفوظ ہو گیا۔ یعنی عربی زبان کے وہ الفاظ جو زمانہ نزولِ قرآن میں مروج تھے، عربی ادب کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور چونکہ وہ اشعار بھی موجود ہیں جن میں وہ الفاظ استعمال ہوئے۔ ہیں اس لئے (ان اشعار کی مدد سے) ان الفاظ کا وہ مفہوم بھی متعین کیا جا سکتا ہے جو ان سے زمانہ نزولِ قرآن میں لیا جاتا تھا۔ یہ الفاظ قرآنِ کریم میں بیشتر انہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں جن معانی میں وہ ان اشعار میں استعمال ہوئے تھے اور جن سے زمانہ نزولِ قرآن کے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ اشعار (ادب کی کتابوں کے علاوہ) عربی زبان کی مستند لغت کی کتابوں میں بھی آچکے ہیں اور ان میں، ان کے الفاظ کے معانی سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ معانی، بعد میں مرتب ہونے والی کتب لغت نے، اول الذکر کتابوں کی سند سے اپنے ہماں درج کر لئے ہیں۔ ان الفاظ کے ان معانی سے، قرآنِ کریم کے الفاظ کے وہ معانی سامنے آسکتے ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں مروج تھے۔

(۴) یہ تو رہا وہ خارجی عنصر جس کے ذریعے یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ فلاں لفظ سے، زمانہ نزولِ قرآن میں، کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ عربی زبان کی ایک داخلی خصوصیت ایسی ہے جو خاصہ، اسباب

سے اثر پزیر نہیں ہو سکتی اور جس پر غور و فکر سے اسکے الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا۔ عربی زبان کے ہر لفظ کا ایک مادہ (Root) ہوتا ہے جو اپنے بنیادی معنی رکھتا ہے۔ گرامر کے قواعد کی رو سے اس مادہ کی شکلیں خواہ کیسے ہی بدلتی رہیں، اسکے بنیادی معنی کی جھلک ہر شکل میں موجود رہیگی\*۔ مادہ کے بنیادی معنی نو ایک طرف، اس سلسلہ میں یہاں تک بھی متعین ہے کہ اگر مادہ میں فلاں حروف (مثلاً ح اور ب) اکٹھے آئیں تو فلاں مفہوم پابا جائیگا اور فلاں حروف (مثلاً ص اور ر) اکٹھے آئیں تو فلاں مفہوم۔ لہذا، اگر مرور زمانہ سے کسی لفظ کے مفہوم میں فرق بھی آجائے تو بھی اس کے مادہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتداءً وہ لفظ کس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس طریق سے بھی یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ جو الفاظ قرآن کریم میں آئے ہیں زمانہ نزول قرآن میں ان سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

(۵) اس باب میں تیسرا عنصر یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے کے عرب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سر پر کھلا ہوا آسمان جس میں چمکتے تارے اور جگمگاتے چاند سورج، سامنے وسیع و عریض صحرا جس میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور کہیں کہیں پہاڑیاں، پانی کے چشمے زندگی کے مراکز ان کے ارد گرد ہری ہری گھاس، سرواقست کھجوروں کے جھنڈ، کہیں کہیں انگوروں کی بیلے اور اناروں کے پیڑ۔ ان کے آس پاس ان صحرائشینوں کے خیمے۔ خیموں کے اندر نہایت مختصر سامان زیست۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی متاع ان کے ہتھیار۔ تلوار۔ تیر۔ کمان۔ نیزہ۔ ڈھال۔ خنجر۔ سامنے چراگہ میں انکے مویشی۔ اونٹ، گھوڑے، بھڑیوں، بکریاں۔ بس یہ تھی ان کی کل کائنات جس کے گرد ان کی زبان کے تمام مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ چونکہ یہ تمام اشیاء محسوس و مرئی تھیں اسلئے ان کے متعلق جس قدر الفاظ استعمال میں آئے تھے ان کا مفہوم نہایت آسانی سے ذہن میں (بالکہ آنکھوں کے سامنے) آجاتا تھا۔ الفاظ کے صحیح مفہوم کے تعین میں دقت وہاں پیش آتی ہے جہاں وہ الفاظ فلسفہ اور مابعد الطبیعیاتی مسائل سے گفتگو میں استعمال ہوئے ہوں۔ یعنی جہاں بات تجریدی (Abstract) امور کے متعلق ہو۔ خانہ بدوشوں اور

\* اس زبان کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس سے ہر زمانے کی نئی نئی ضرورتوں کے ماحول نئے نئے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے لئے مادہ کے بنیادی معنی اور مختلف ابواب کے خواص سامنے ہونے چاہئیں۔ پھر کوئی نیا تصور ایسا نہیں رہتا جس کے لئے موزوں لفظ نہ بن سکے۔

صحرائشینوں کے ہاں تجربیدی مسائل کا کیسا کام؟ انہی لوگوں کی صاف ستھری، اُجلی، نکھری زبان تھی جسے عربوں کے ہاں سند مانا جاتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب (بہت دور جا کر نہیں) حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربوں کا غیر عربوں سے خلا ملا بڑھنے لگا تو آپ اہل مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر کچھ دن گذارو، کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

(۶) سادہ کے بنیادی مفہوم اور ان صحرائشینوں کے ہاں ان الفاظ کے عملی استعمال سے الفاظ کا صحیح مفہوم کس طرح سامنے آ جاتا ہے، اسکا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآن کریم میں ہے **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ** (۱۵۳) ”یہ حقیقت ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔ لفظ صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروج ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ جب کسی پر ایسی مصیبت آ پڑے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ جہاں انسان یکسر بے چارہ اور بے کس و بے بس ہو کر رہ جائے۔ جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، وہاں ہم کہتے ہیں کہ میان صبر کرو۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حتیٰ کہ جب کوئی کمزور و ناتواں مظلوم کسی کے ظلم و زیادتی کے خلاف کچھ نہ کر سکے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ ”اچھا! میرا صبر“۔ لیکن عربی مبین میں اس سادہ (ص۔ ب۔ ر) کے بنیادی معنی ہیں، کسی شخص کا مطلوبہ شے کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا، جم کر کھڑے ہو جانا، ثابت قدم رہنا۔ اب دیکھئے کہ صحرائشین ہرب اس سادہ کو کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ بادل کا وہ ٹکڑا جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو، **الصَّبِيرُ** کہلاتا تھا۔ **الْأَصْبِرُ** ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے تھے، جو صبح جنگل میں چرنے کیلئے چلے جائیں اور شام کو ٹھیک انہی قدسوں پر واپس آ جائیں۔ نہ کوئی ادھر ادھر ہو، نہ پیچھے رہے\*۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان (عربوں) کے ہاں **صَبْرٌ** کے معنی تھے استقامت، استقلال، استواری، ثابت قدمی، ایک اصول اور روش پر جم کر کھڑے رہنا، عمل میں دوام و استمرار۔ یہ ہے صبر کی وہ کیفیت جو انسان کے اپنے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔ اگر کبھی بوجھ یا سواریوں کی کمی بیشی سے کشتی کا توازن بگڑ جائے اور وہ ڈمکانے لگے تو ملاح ایک بڑا سا پتھر کشتی میں رکھ دیتے تھے جس سے اسکا وزن ہموار ہو جاتا

تھا۔ (ہمارے ہاں تانگے والے اکثر ایسا کرتے ہیں)۔ اس پتھر کو الصَّابُورَہ کہتے ہیں\*\*۔ لہذا صبر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی کے پاؤں ڈمکانے لگیں تو ”صبر“ سے اس کا توازن برقرار ہو جاتا ہے اور اسکے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ چونکہ اس قسم کے عمل پیہم اور ثبات و قرار کا نتیجہ کامرانیوں اور کامیابیاں ہوتا ہے اس لئے الصَّابُورَہ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو\*۔

اس لفظ (صبر) کے طریق استعمال کی ان محسوس مثالوں سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں عربوں کے ہاں اس کا مفہوم کیا تھا۔ اس مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔

(۲) مذکورہ بالا عرسہ عناصر عربی زبان کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسکے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی۔ لیکن، بایں ہمہ، صرف اتنی خصوصیات سے قرآن کریم جیسی کتاب کے الفاظ کے صحیح صحیح معانی متعین نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے کہ یہ کتاب زندگی کے ان اصولوں کا ضابطہ ہے جن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور جن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اس کا صحیح مفہوم یقینی طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ تنہا لغت سے یہ نہیں ہو سکتا۔ لغت انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے جس سے سہو و خطا اور خارجی اثرات کا امکان بہر حال باقی رہتا ہے۔ علاوہ بریں قرآن کریم نے بعض الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاحات اس قدر جامع ہیں کہ تنہا لغت سے وہ عظیم تصورات سامنے نہیں آسکتے جنہیں قرآن نے ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً صلوة۔ زکوٰۃ۔ تقویٰ۔ ایمان۔ اسلام۔ کفر۔ فسق۔ فجور۔ دنیا۔ آخرت وغیرہ۔ ان اصطلاحات میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات بڑی جامعیت سے سمودئے گئے ہیں۔ ان کی اس جامعیت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ جنوں جو انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن کریم ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن کا اندازہ یہ ہے کہ اسمیں اگر ایک مقام پر ایک بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اسکی وضاحت اس انداز سے کردی گئی ہے کہ اس سے مقام



اول کی بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اس انداز کو قرآن نے ”تصریف آیات“ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اس طرح مطالب کی وضاحت کر دینا۔ سورۃ انعام میں ہے وَكَذَٰلِكَ نَعْرِفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِيَنْبَشِّرَنَّهُ لِقَوْمٍ يَمْلِكُمُونَ (۱۶۶) ”اور اس طرح ہم آیات کو لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں کہہ تو نے بات دھس نہیں کرادی ہے اور تاکہ ہم ایسے ان لوگوں کے لئے واضح کر دیں جو علم و بصیرت سے کام لیں“۔ قرآن کریم کا یہ وہ خصوصی انداز ہے جس سے اس کے مطالب واضح طور پر سامنے آ جاتے ہیں اور اس کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مثلاً لفظ (صبر) کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں انہیں پیش نظر رکھتے اور پھر قرآن کریم کی طرف آئیے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۳)۔ ”یقیناً اللہ صابرین کے ساتھ ہے“۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ الصابرین کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَكَأَيُّنَ مِّثْنٍ نَّصَبِيْۤىۤىۡ قَتَلَ مَعَهُ رَیِّثُوْنَ كَثِيْرٌ فَمَتَّوْهُنَّوْا اِلَیْمَاۤ اَصَابَتْهُمُ فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَاۤ اُخْتُكَاۤنُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (۱۳۵) ”کتھے ہی انبیاء (ایسے گذرے) ہیں جن کی معیت میں بہت سے رہتانی لوگوں نے (مخالفین کے مقابلے میں) جنگ کی۔ پھر ان تکالیف کی وجہ سے جو انہیں اس طرح اللہ کی راہ میں پیش آئیں نہ وہ سُست گم ہوئے۔ نہ ان میں کمزوری آئی۔ اور نہ ہی وہ مخالفین سے مغلوب ہوئے۔ (یہی وہ) الصابرین ہیں جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے“۔ اگلی آیت میں ان کی اس کیفیت کو ثبوتاً اَقْدَامُنَا (۱۳۶) دھما سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ دعا کہ ”ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ“۔ عین میدان جنگ کی حالت میں کہا ہے فَاِنْ یَّكُنْ مِّثْنُکُمْ مِّاۃٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِاۡ تَدُوْنَ . . . . (۶۶) ”اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے“۔ ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح اور متعین طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن کریم میں صبر سے مفہوم کیا ہے اور صابر کسے کہتے ہیں۔

یہی کیفیت قرآنی اصطلاحات کی بھی ہے۔ قرآن کریم ان کے مفہوم کی وضاحت بھی تصریف آیات کی رو سے کر دیتا ہے۔ لہذا کوئی عام لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح، اگر وہ تمام آیات ہیک وقت سامنے رکھ لی جائیں جن میں قرآن کریم نے انہیں استعمال کیا ہے، یا ان کے مفہوم کو بیان کیا

ہے، تو ان الفاظ و اصطلاحات کے معانی متعین کرنے میں دشواری نہیں رہتی۔ ان مقامات پر غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ”قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔“

۸۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ

(۱)۔ سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ہے اور خصوصیت کیا۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں، اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ہر پتیکر میں جھلکتی رہیگی۔

(ب)۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرا نشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصور (Concept) کیا تھا۔ واضح رہے کہ جب تک تصورات (Concepts) کا تعین نہ کیا جائے، الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر دور حاضرہ میں (Semantics) نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ علم اللسان کے اس شعبہ کا مطالعہ، الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

(ج)۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئیے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصور (Quranic Concept) سامنے آ جائیگا۔

(د)۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئیے۔ اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئیے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اسکی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ذہن کو خارجی اثرات سے الگ رکھ کر قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی مدد کی محتاج نہیں ہوتی۔

یہ ہے وہ طریق جس سے قرآن کے الفاظ اور آیات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس ضمن میں، علامہ جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد رشید اور سید رشید رضاؒ کے استاد امام شیخ محمد عبدہ، (علیہ رحمۃ) نے تفسیر المنار کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے اعلیٰ مراتب کے سلسلہ میں بعض اہم امور بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والے مفرد الفاظ کے حقیقی معنی سمجھے۔ یعنی یہ معلوم کرے کہ ان الفاظ کو اہل عرب کیونکر استعمال کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے قول و فہم پر بھروسہ نہ کرے۔ نہ اس پر اکتفا کرے۔ اسلئے کہ بہت سے الفاظ زمانہ نزول قرآن میں کسی خاص مطلب و معنی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں، تھوڑا یا زیادہ عرصہ گزرنے پر، ان کے دوسرے معنی کنے جانے لگے۔ مثلاً لفظ ”تاویل“، جو ”تفسیر“ کے معنوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ دوسرے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی ”انجام کار“، ”ہاقبت“، ”قرآن کے وعدہ وعید کا نتیجہ ظاہر ہونا“\*۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملت میں بعد میں پیدا ہونے والی اصطلاحات کی تحقیق کرے۔ اور پھر ان میں اور قرآن میں آنے والے الفاظ میں فرق کرے۔ اکثر مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ ان اصطلاحات کی ”رو سے کرتے“ ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رائج ہو چکی تھیں۔ قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیں جو زمانہ نزول

\* سید رشید رضاؒ نے اس سلسلہ میں لفظ ”الولی“ کی مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں اس لفظ کے معنی ناصر و مددگار، حمایتی اور دوست کے ہیں۔ ”اولیاء اللہ“ کے معنی ہیں وہ اہل ایمان و تقویٰ جو اللہ کے دین کے حامی و مددگار ہیں۔ لیکن بعد میں یہ اصطلاح چل پڑی کہ وہ لوگ جو کرامات و خوارق کا مظاہرہ کریں اور ظاہری اسباب سے ماوراء قوانین لطرت میں تصرف کریں انہیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے، حالانکہ صحابہ کبارؓ ”اولیاء اللہ“ کے یہ معنی جانتے ہی نہیں تھے (المنار)۔

قرآن میں لٹے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہتر طریق یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔ بعض اوقات وہ دیکھیگا کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ”ہدایت“ وغیرہ۔ ان مقامات پر غور و فکر سے معلوم ہو جائیگا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اسلئے کہا گیا ہے کہ ”الْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا“۔ قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کیلئے قانون یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ہوں۔ پورے موضوع و مطالب سے اتفاق رکھتے ہوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔ (مقدمہ تفسیر المنار)

(۹) میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میری زندگی، بچپن سے لیکر اسوقت تک، اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رہی ہے۔ ابتداء میں نے بھی (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول ہے) اسکا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا۔ لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصود قرآن دیگر است۔ رسم و آئین مسلمان دیگر است۔ یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اسوقت جب میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اہم نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے، اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ ”تصریف آیات“ کی رو سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تبویب القرآن کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک موضوع سے متعلق، قرآن کریم کی تمام آیات کو یک جا کر کے انہیں مربوط مضمون کی شکل میں مرتب کرنا۔ اگرچہ تبویب القرآن کے متعلق اس سے پہلے بھی کوششیں ہوئی تھیں لیکن جو خاکہ علامہ اقبالؒ کے پیش نظر تھا، اور جسکی تفصیل انہیں نے مجھے بتائی تھی، اس کے مطابق کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی۔ اس کے لئے ایک نئی کتاب کی تدوین کی ضرورت تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی

کہ کوئی جماعت، یا مجھ سے زیادہ موزوں فرد، اس اہم کام کے لئے تیار ہو جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور بالآخر یہ اہم کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ اس کے لئے میں نے سینکڑوں عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات کی تبویب (Classification) کی۔ اس میں کئی برس لگ گئے۔ پھر ہر موضوع کو، انسائیکلو پیڈیا کے انداز پر، مربوط مقالہ کی شکل میں مرتب کیا۔ اسکے بعد ان مقالات کو مختلف مجلدات میں تقسیم کیا۔ اس طرح ”معارف القرآن“ کا طویل سلسلہ وجود میں آیا۔ اس میں سے، من و یزدان۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برق طور۔ شعلہ مستور۔ معراج انسانیت، شائع ہو چکی ہیں۔ باقی جلدیں اپنے وقت پر شائع ہوتی جائیں گی۔ ویدہ التوفیق۔

(۱۰) ”معارف القرآن“، اور میری دیگر تصانیف و مقالات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے نوجوان، تعلیم یافتہ (بالخصوص ”مذہب گزیدہ“،) طبقہ کے دل میں قرآن کریم کی قدر و منزلت اور عظمت و عقیدت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ میری (سالہا سال کی) محنت اور کوشش کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہمارا نوجوان طبقہ (جو انسانوں کے خونِ ساختہ مذہب سے گھبرا کر، خدا کے عطا فرمودہ دین ہی سے دور بھاگ رہا تھا) کسی طرح قرآن کریم کے قریب آجائے اور اس پر براہ راست غور و فکر کرنا شروع کر دے۔ میری ان حقیر سی کوششوں سے (بتوفیق خداوندی) جو نتیجہ برآمد ہوا وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔ ان نوجوانوں کی کثیر تعداد قرآن کریم کے قریب آگئی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

یہ طبقہ قرآن کے قریب تو آ گیا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ وہ اس کتابِ عظیم کی تعلیم کو براہ راست سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ قرآن کریم نہ موجودہ تراجم سے ان کی سمجھ میں آتا ہے، نہ تفاسیر سے۔ (وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے) اس لئے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ طریق بتایا جائے جس سے وہ قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے لگ جائیں۔ اس مطالبہ میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عربی زبان سے ناواقف تھے اور وہ بھی جو اسے جانتے تھے۔ اس کی وجہ وہی تھی جسے تفصیل سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک مدت کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس دشواری کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن کریم کا ایسا لغت ہو جس میں قرآنی الفاظ اور تصورات کا مفہوم اس انداز سے متعین کیا گیا ہو جسکی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔ مینے بہت تلاش کیا لیکن اس قسم کا کوئی لغت مجھے نہ مل سکا۔ اس قسم کا لغت تو ایک طرف، مفردات امام راغبؒ

کے علاوہ، نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گذری جسے خالص قرآنی الفاظ کا لغت کہا جاسکے۔ (حیال ہی میں لغات القرآن کے عنوان سے بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن وہ ہمارے پیش نظر مقصد کو پورا نہیں کرتیں۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس طرز پر قرآن کریم کے افہام و تفہیم کی طرح ڈالی تھی۔ اور کچھ الفاظ کے معنی بھی اس انداز سے متعین کئے تھے۔ اگر وہ قرآن کریم کا پورا لغت اس نہج پر مرتب فرما جاتے تو وہ بڑے کام کی چیز ہوتا۔ میں نے اپنے ظرف کے مطابق ان کی قرآنی بصیرت سے بھی استفادہ کیا ہے)۔ اندریں حالات، چارہ کار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس قسم کا لغت مرتب کیا جائے۔ قرآن کریم کا لغت مرتب کرنا، اور وہ بھی اس انداز کا جسکا ذکر اوپر آچکا ہے، جسقدر مشکل کام ہے اس کا اندازہ اہل علم حضرات بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میں نے (جسطرح اس سے پہلے تبویب القرآن کے سلسلہ میں کیا تھا) بڑی کوشش کی کہ اس عظیم اور مشکل کام کے لئے کوئی جماعت تیار ہو جائے، لیکن (جسطرح پہلے ناکامی ہوئی تھی) اس میں (بھی) ناکامی ہوئی۔ ادھر یہ دشواری تھی اور ادھر ان ارباب ذوق کا (جنہیں میں قرآن سے قریب لے آیا تھا) یہ تقاضا کہ انہیں بتایا جائے کہ وہ قرآن کو براہ راست کسطرح سمجھیں، شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں جب اپنی طرف نگاہ ڈالتا تھا تو ایسے مشکل اور اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نہ اپنے اندر کماحقہ اہلیت پاتا تھا، نہ ہمت۔ ایک مدت تک یہ کشمکش جاری رہی۔ اور آخر الامر، اسکے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ، بھلی بری جیسی بھی ہو، اس کام کی بنیاد رکھ دینی چاہیے۔ جب ایک دفعہ اسکی طرح پڑ گئی اور اس نے مفید نتائج مرتب کئے تو پھر دوسرے (اور مجھ سے زیادہ اہلیت رکھنے والے) حضرات اس پر بہتر عمارت استوار کر دینگے۔ یہ تھے وہ حالات جن سے مجبور ہو کر میں نے اس لغت کی ترتیب کا فیصلہ کیا۔ سالہا سال کی مسلسل محنت کے بعد، جیسا کچھ یہ مرتب ہو سکا ہے، آپ کے سامنے ہے۔ اس دشوار گزار سفر میں مجھے بعض اچھے رفقاء کی معیت بھی نصیب ہو گئی۔ نیز کٹھن منازل پر میں نے ان حضرات سے مشورے بھی کئے جو ان مشوروں کے اہل تھے۔ اور آمادہ بہ تعاون۔ جی نہیں چاہتا کہ میں اس مقام پر، حبیب مکرم، (سابق سفیر مصر) ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (نور اللہ مرقدہ) کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ انہیں عربی زبان پر جسقدر عبور اور قرآن سے جسقدر عشق تھا اس کا ان احباب کو بخوبی علم ہے جنہیں ان کو قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ کلام اقبال کی شرح اور ترجمہ کے سلسلہ میں میرے ان کے ساتھ برسوں تک

گہرے تعلقات رہے۔ عربی ادب کے سلسلہ میں سینے ان کے تبحر علمی سے جسقدر استفادہ کیا اس کی قدر و قیمت کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔ لغات کے مرتب ہو جانے کے بعد میں نے اسکا مسودہ ایسے ذی علم احباب کو بھی دکھا لیا جن کی عربی زبان کی استعداد اور قرآنی ذوق کا مجھے اندازہ تھا۔ میں ان تمام احباب کا بضمیم قلب شکر گزار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ، اس حقیقت کا اعلان میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس لغت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ تنہا مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ علامہ اسلم حیراچوریؒ لغت کی تکمیل سے پہلے انتقال فرما گئے۔ اگر وہ اسے ایک نظر دیکھ لیتے تو میرا پورا اطمینان ہو جاتا۔ اس انداز سے قرآن کو سمجھنے والا (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) مجھے آج کہیں نظر نہیں آتا۔ میرا فہم قرآن ان کی بصیرت فرقانی کا جسقدر رہین کرم ہے اسکے لئے میرا ایک ایک سانس انکا سپاس گزار ہے۔

(۱۱) زیر نظر لغت کی ترتیب و تدوین میں سب سے پہلا فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ عربی زبان کے کون سے لغت کو بطور اساس و بنیاد سامنے رکھا جائے۔ مروّجہ کتب لغت میں تین کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ یعنی لسان العرب۔ تاج العروس۔ اور قاموس۔ (ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب لغت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور خاص خاص شعبوں میں وہ ان سے بھی زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ ہیئت مجموعی ان تین کتابوں کو خاصی شہرت حاصل ہے)۔ ان تینوں کے محاسن و خصوصیات کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہی طے پایا کہ تاج العروس کو بنیاد قرار دیا جائے۔

تاج العروس، قاموس کی شرح ہے۔ اور چونکہ لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اسلئے اس میں لسان کی ضروری تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاج العروس آخری (Latest) مفصل اور مستند لغت ہے جس میں اس سے پہلے کی شائع شدہ قریب قریب تمام مستند کتب لغت کا خلاصہ آگیا ہے۔ لسان العرب ابن مکرمؒ کی تالیف ہے جن کی وفات ۷۱۱ھ میں ہوئی۔ قاموس کے مولف علامہ فیروز آبادی ہیں جن کی وفات ۸۱۶ھ میں ہوئی۔ تاج العروس کے مولف کا پورا نام محب الدین، ابن الفیض، السید محمد مرتضیٰ الحسینی الواسطی الزییدی الحنفی ہے۔ ان کی وفات ۱۲۰۵ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی معرکہ آرا لغت کو مصر میں مدوّن کیا۔ یہ دس ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ مصر کے مطبع الخیریہ کا طبع شدہ ہے جس پر سن

طباعت ۱۳۰۶ھ (بار اول) درج ہے۔ لین کے قول کے مطابق ، تاج العروس میں لسان العرب کے علاوہ، ایک سو مستند کتب لغت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں عربی کا مشہور لغت (Lane's Lexicon) تاج العروس ہی پر مبنی ہے۔ ترقیب کے اعتبار سے یہ لغت بڑا سائنٹیفک ہے۔

(۲) تاج العروس کے ساتھ جس کتاب کو ہم نے بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے وہ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب ۵۰۲ھ) کی مشہور تصنیف ”المفردات فی غریب القرآن“ ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا لغت ہے اور اس درجہ مقبول اور مشہور کہ اس کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کتاب بڑی مختصر ہے۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ مطبع میمنیہ (مصر) میں ۱۳۲۴ھ میں چھپا تھا۔

(۳) تیسری اہم کتاب، ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی مقایس اللغۃ ہے جس میں ہر لفظ کا سادہ اور سادہ کے بنیادی معنی دئے گئے ہیں۔ چونکہ ہمارے لغت کا مرکزی نقطہ، سادہ کے بنیادی معنی ہیں اس لئے اس میں ابن فارس سے نمایاں استفادہ کیا گیا ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ چھ جلدوں میں مصر میں (۱۹۵۲ء میں) چھپا تھا۔

(۴) اس کے بعد جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا گیا وہ پطرس بستانی کی محیط المحيط ہے۔ یوں تو یہ کتاب مختصر ہے۔ (۲۰ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے)۔ لیکن اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں، (۱۸۷۰ء میں) چھپا تھا۔

یہ وہ کتب لغت ہیں جن کے حوالے آپ کو زیر نظر لغت میں بالعموم ملینگے۔ ان کے علاوہ اکثر مقامات پر حسب ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

(الف) فقه اللغة۔ ابو منصور الثعالبی کی مشہور کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑی مستند خیال کی جاتی ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ ۱۹۳۸ میں مصر میں چھپا تھا۔

(ب) اقرب الموارد۔ لغت کی مشہور کتاب ہے جسے سعید الخوری الشرتونی اللبنانی نے مرتب کیا تھا۔ ہمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں (۱۸۸۹ء میں) چھپا تھا۔

(ج) منتہی الارب۔ عربی۔ فارسی کا مشہور لغت ہے۔ ہمارے سامنے وہ نسخہ ہے جو مطبع اسلامیہ لاہور میں (۱۹۲۵ء میں) چھپا تھا۔



(د) کتاب الاشتقاق۔ یہ ابن درید کی تصنیف ہے (جنکی وفات ۳۲۱ھ میں ہوئی تھی) لغت میں ابن درید کا مقام بہت بلند ہے اور انکی یہ کتاب سادہ کے بنیادی معنی معلوم کرنے کے لئے بڑی مفید ہے اگرچہ مقایسہ اللغۃ جیسی مفصل نہیں۔ اسکے علاوہ، ابن درید کی لغت کی مشہور اور مستند کتاب جمہرۃ اللغۃ ہے بھی بعض مقامات میں استفادہ کیا گیا ہے۔

(ر) العلم الخفای فی علم الاشتقاق۔ یہ نواب صدیق حسن خان کا مختصر سا رسالہ ہے لیکن اسمیں مادوں کے حروف کی بنیادی خصوصیات عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔

(س) الالفاظ المترادفة۔ یہ علی ابن عیسیٰ الرمسانی (متوفی ۳۸۴ھ) کا رسالہ ہے جس میں مرادفات کے لطیف اور دقیق فرق کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

(ش) لطاائف اللغۃ۔ یہ احمد بن مصطفیٰ البیاضی (دمشق) کی کتاب ہے جسمیں الفاظ کی لغوی باریکیوں سے بحث کی گئی ہے۔

(ص) کتاب القرطین۔ یہ اسام ابن قتیبہ الدینوری (المتوفی ۴۷۷ھ) کی مشہور کتابوں—مشکل القرآن وغیرہ—پر مشتمل ہے اور مصر میں ۱۳۵۵ء میں چھپی ہے۔ ابن قتیبہ کا مقام علمی دنیا میں بہت بلند ہے۔

(ط) البتستان۔ شیخ عبداللہ البستانی البستانی (المتوفی ۱۰۹۳ھ) کا یہ لغت ۱۰۹۲ء میں چھپا تھا۔ اسکا مقدمہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

ان کتب لغت کے علاوہ زمخشری کی تفسیر (کشاف) تفسیر جلالین اور علامہ محمد عبدهؒ کی شہرہ آفاق تفسیر المنار، سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر لغت میں ان کتابوں کے حوالے میں یا تو کتاب کا (پورا یا مخفف) نام دیا گیا ہے یا مصنف کا۔ مثلاً تاج۔ راغب۔ محیط۔ ابن فارس۔ لین۔ العلم الخفای وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر دیگر کتب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کا حوالہ متعلقہ مقام پر دے دیا گیا ہے۔

(۱۲) اس لغت میں ترتیب (بالعموم) یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے سادہ کے بنیادی معنی دئے گئے عین۔ پھر عربی زبان میں اسکے استعمال کی مثالیں۔ ان مثالوں میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ یہ حتی الامکان محسوس اشیا کی مثالیں ہوں تاکہ ان سے زیر بحث لفظ کا مفہوم محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ اس طرح متعلقہ لفظ کا لغوی مفہوم متعین کرنے کے بعد، قرآن کریم

کی ان آیات کو درج کیا گیا ہے جن میں وہ لفظ (اپنی مختلف شکلوں) میں آیا ہے۔ ان آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد اہم الفاظ اور اصطلاحات کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے قرآن کس قسم کا تصور (Concept) پیش کرتا ہے، اور وہ تصور قرآن کریم کی مجموعی تعلیم میں کیا مقام رکھتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ کتاب محض قرآنی الفاظ کا لغت نہیں بلکہ اس میں قرآنی تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جن دوستوں نے اس لغت کا مسودہ (پورا یا اسکا بعض حصہ) دیکھا، ان کی رائے یہ ہے کہ اسکا بغور مطالعہ کر لینے کے بعد قرآن کا طالب علم کسی تفسیر کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ اس خصوصیت کے پیش نظر ہم چاہتے تھے کہ اس لغت کا نام کچھ اور رکھا جائے جس سے اسکی یہ خصوصیت نمایاں طور پر سامنے آجائے، لیکن اس سے اسکی بنیادی خصوصیت (یعنی قرآنی الفاظ کے معانی) کے نظر سے اوجھل ہو جانے کا امکان تھا، اسلئے اسکا نام لغات القرآن ہی تجویز کیا گیا ہے۔

اس مقام پر تینا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ، قرآن کریم کے الفاظ (مفردات) کا لغت ہے، پوری عربی زبان کا لغت نہیں۔ اسلئے نہ تو اس میں عربی زبان کے تمام الفاظ آئے ہیں اور نہ ہی الفاظ کی تشریح میں ادبی بحثوں کو چھیڑا گیا ہے۔ اس میں ہر لفظ کے متعلق صرف اس حد تک بحث کی گئی ہے جس حد تک اسے قرآن نے لیا ہے۔ نیز قرآن کریم کی آیات بھی تمام کی تمام نہیں دی گئیں۔ مثلاً اگر ایک لفظ قرآن کی بیس آیات میں (ایک ہی مفہوم میں) آیا ہے تو ان میں سے ایک آیت دی گئی ہے۔ البتہ جہاں مختلف آیات میں اس لفظ کو جداگانہ مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں وہ تمام آیات درج کر دی گئی ہیں۔ جہاں کسی آیت کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی وہاں اس کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات کو قرآن کریم سے نکال کر خود دیکھ لینا چاہئے۔ اس سے بات واضح ہو جائیگی۔

(۱۳) اس ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں قاعدہ ہے، الفاظ کے ایک معنی ”حقیقی“ ہوتے ہیں اور ایک ”مجازی“۔ مثلاً جب ہم کہیں کہ ”وہ تو شیر ہے“ تو اس سے مراد وہ (شیر) جانور نہیں جو جنگل میں رہتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ شیر جیسا بہادر ہے۔ لفظ ”شیر“ کے حقیقی معنی ”جنگل کا ایک طاقتور جانور“ ہیں اور (مندرجہ بالا فقرہ میں) مجازی معنی ”بہادر“۔

”حقیقی اور مجازی معانی، کی یہ صرف ایک مثال ہے۔ بلند پایہ تصانیف میں اور بھی بہت سے طرق و اسالیب بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی مقصود ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ انداز بیان، تشبیہات اور استعارات پر مشتمل (Symbolical) ہوتا ہے\*۔ لیکن یہ بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔ اس ضمن میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے۔

عرب کے لوگ کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں۔ یعنی ان کے ہاں بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قیاس، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، اخفاء، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے۔ خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص۔ غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپ کو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں۔۔۔ قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا، قرآن کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر سکتا۔۔۔ کیونکہ عجمی زبانوں میں مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی ایک آیت ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰ الْأَنْبِيَاءِ فِي الْكُفْرِ سِنِينَ عَدَدًا (۱۸)۔ اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر لیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں سمجھا جاسکیگا جو ان الفاظ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اسکا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا، تو اب بھی آپ نے مفہوم کا ترجمہ تو کر دیا، الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکتے۔ (قرطبن جلد ۲ - صفحہ ۱۶۳)

\* اس قسم کے اسلوب بیان کے متعلق مشہور انگریز ادیب (Chesterton) کہتا ہے۔  
Not literally true, but only really true. (Quoted by W. H. Urban—  
in Humanity and Deity—P. 117)

\*\* یہ آیت احباب کھف کے متعلق ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ اس کا لفظی ترجمہ یوں کرتے ہیں ”پس پردہ مارا ہم نے اوپر کانوں ان کے بیچ غار کے برس کئی ایک“۔

یہ انداز بیان عام کتابوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جس کتاب عظیم کی یہ کیفیت ہو کہ اس کے حقائق کو تمام نوع انسان کے لئے، ہر زمانے میں شعل ہدایت بننا ہو، اسکا وہ حصہ اسی انداز کا ہونا چاہئے جس کا تعلق حقائق سے ہو۔ اس سے ہر دور کے ارباب علم و بصیرت اور اصحاب فکر و تدبر، اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق، الفاظ کے مجازی معانی سے، قرآنی حقائق کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اور یوں، جوں جوں انسانی عقل کی سطح بلند ہوتی جائیگی، قرآنی حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آتے جائیں گے۔

لہذا قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ متعلقہ آیت میں فلاں لفظ کے معنی حقیقی لئے جانے چاہئیں یا مجازی۔ زیر نظر لغت میں اسکا بھی التزام کیا گیا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ جن مقامات پر ہم نے کسی لفظ کے مجازی معنی لئے ہیں وہاں (بالضرور) اسکے مجازی معنی لئے جائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اسکے بعد متعلقہ آیت میں جو معنی (حقیقی یا مجازی) زیادہ موزوں نظر آئیں انہیں اختیار کر لینا چاہئے۔ یہی کیفیت ان مقامات کی بھی ہے جہاں ہم نے قرآنی آیات سے کوئی خاص مفہوم مستنبط کیا ہے۔ قارئین میں سے جنہیں ہمارے مفہوم سے اختلاف ہو وہ اپنے لئے خود مفہوم متعین کر سکتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ زیر نظر لغت میں جو حصہ الفاظ کے لغوی معانی سے متعلق ہے وہ مستند کتب لغت سے ماخوذ ہے، اس لئے مستند ہے۔ لیکن جو کچھ ہم نے اپنی طرف سے کہا ہے اگر کسی کو اس سے اتفاق نہ ہو تو وہ اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اس کا مفہوم خود متعین کر سکتے ہیں۔

بعض الفاظ کے سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ جو معانی اس لغت میں دئے گئے ہیں وہ قرآن کریم کے ان تراجم سے مختلف ہوں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہیں (اسکی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں)۔ ایسی صورت میں آپ اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ہم نے ہر لفظ کے لغوی معانی کی سند میں اس کتاب کا حوالہ دے دیا ہے جہاں سے وہ معانی لئے گئے ہیں۔ اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ارباب علم کے نزدیک ان کی حیثیت مستند ہے۔ ان کتابوں میں البتہ بعض اوقات ان کے مؤلفین نے (لغوی معانی کے علاوہ) قرآنی تعلیم کے بارے میں خود اپنی رائے بھی دی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر ان آراء سے اختلاف کیا ہے۔ اسلئے کہ اشخاص کی آراء ان کی ذاتی استعداد، رجحانات و میلانات، نیز خود اس زمانے کی علمی سطح اور

عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں وہ تربیت پاتے ہیں، اسلئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہوتی۔ ایسے مقامات پر ہم نے اپنے فہم و بصیرت (اور اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق) جو بہتر سمجھا ہے لکھ دیا ہے۔ لیکن ہم نے ہر مقام پر اس کا التزام کیا ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ (ہماری بصیرت کے مطابق) قرآن کریم کی بہ ہیئت مجموعی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ یہی اصول ہمارے اس لغت کی اصل و بنیاد ہے۔

اردو زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ داخل ہیں لیکن یہ الفاظ اردو میں ان معانی سے مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن معانی میں وہ بنیادی اور اصولی طور پر عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ زیر نظر لغت میں جب اس قسم کے الفاظ (ہماری) اردو زبان کی عبارت میں آئیں تو ان کے وہی معانی سمجھے جائیں جن معانی میں وہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک لفظ کا ذکر خصوصیت سے کرنا ضروری ہے جو آپ کو زیر نظر لغت میں بکثرت ملیگا۔ وہ لفظ ہے ”قانون“۔ ہمارے ہاں قانون سے عام طور پر مفہوم وہ (Laws) لئے جاتے ہیں جن کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن لفظ قانون کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ قانون سے مراد ایسے محکم اصول ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً ”قانون فطرت“، سے مراد ہیں وہ لگے بندھے اصول و ضوابط جن کے مطابق خارجی کائنات کا محیر العقول سلسلہ اس نظم و ضبط سے چل رہا ہے۔ ”قوانین خداوندی“ سے مراد ہیں انسانی زندگی سے متعلق وہ اصول و ضوابط جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ و قس علی ذالیک۔ لہذا اس لغت میں جہاں یہ لفظ (قانون) آئے، سیاق و سباق کے مطابق اس کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے۔

بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ لغت کی رو سے ایک ہی لفظ کے متعدد معنی دئے گئے ہیں۔ ہم اس وقت اس امر کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ایک ہی لفظ کے متعدد (اور بعض وقت متضاد) معانی کیوں ہو جاتے ہیں۔ (یہ، علم الالسنہ کا ایک اہم مسئلہ ہے اور ہمارے موضوع سے خارج)۔ بالعموم یہ اختلاف معانی ان الفاظ کے طریق استعمال کی بنا پر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کا لفظ جس مقام پر آئیگا، یا تو سیاق و سباق بتا دیگا کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، یا تصریف آیات سے یہ مقصد حاصل ہو جائیگا۔ یعنی قرآن کریم کی ان متعدد آیات کو سامنے لانے سے جہاں وہ لفظ آیا ہے۔ ہم نے اپنے لغت میں یہی طریق اختیار کیا ہے۔

(۱۴) ان اہم اسور کے علاوہ ذیل کے مختصر نقاط بھی پیش نظر رہنے ضروری ہیں۔

(۱) لغت میں حروف مقطعات کے معانی نہیں دئے گئے۔ یہ قرآنی مفردات نہیں بلکہ مخففات ہیں۔ انکے متعلق ہم اپنا نقطہ نظر، مفہوم القرآن میں بیان کرینگے اور وہیں انکا مفہوم بھی دینگے۔ (مفہوم القرآن کا تعارف ذرا آگے چل کر آتا ہے)۔

(ب) عربی زبان میں حروف کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی تفصیلی بحث ایک مستقل موضوع ہے جو اس قسم کی لغت کی کتاب میں جو آپ کے پیش نظر ہے ضمنی طور پر نہیں کی جا سکتی۔ بسا بریں اس لغت میں حروف کی بحث کو صرف اس حد تک محدود رکھا گیا ہے جہاں تک یہ بحث قرآنی آیات کے سمجھنے میں مفید تصور کی گئی ہے۔

(ج) بعض حروف کے متعلق لکھا گیا ہے کہ فلاں آیت میں یہ ”زائد“ ہے۔ زائد کے یہ معنی نہیں کہ وہ بلا ضرورت استعمال کیا گیا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اس حرف کے (اس مقام میں) الگ معنی کچھ نہیں لیکن اہل زبان اسے ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس سے کلام میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر قرآن اسے استعمال نہ کرتا تو قرآن کا انداز غیر فصیح ہو جاتا۔

(د) عربی الفاظ کے مادے بالعموم سہ حرفی (ثلاثی) ہوتے ہیں لیکن بعض سادے چار حرفی (رباعی) بھی ہوتے ہیں۔ عام کتب لغت میں رباعی کو ثلاثی کے تابع دے دیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس باب میں اسی طریق کا اتباع کیا ہے جہاں مقامات کے جہاں رباعی مادہ کا الگ دیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے۔

(ر) حضرات انبیائے کرامؑ اور اقوام سابقہ کا تعارف الگ عنوانات کے تحت کرایا گیا ہے۔ لیکن یہ تعارف (لغت کی مناسبت سے) اجمالی ہے۔ تفصیلی تعارف میری دوسری تصانیف (مثلاً جوئے نور، برق طور، شعلہ مستور، معراج انسانیت) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(س) قرآنی آیات کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے کہ اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً (۹۴) سے مراد ہے ساتویں سورۃ (سورۃ اعراف) کی آیت ۹۴۔ چونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں دو ایک کا فرق ہوتا ہے، \* اسلئے اگر زیر نظر لغت میں کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ

\* آیات کے نمبروں کے لحاظ سے، ساری دنیا کے لئے قرآن کریم کے ایک اسٹینڈرڈ (Standard) نسخہ کی بڑی ضرورت ہے جو کتابت کی غلطیوں سے بھی بالکل پاک ہو۔

ملے تو ایک دو آیات آگے پیچھے دیکھ لیں۔ لغات میں درج شدہ آیات کو اگر آپ قرآن کریم کے نسخہ سے ملا لیں تو بہتر ہوگا تاکہ اگر ان میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اسکی تصحیح ہو جائے۔ قرآنی آیات میں صحت کا بالخصوص خیال رکھنا چاہئے۔

(ص) لغت میں عندالضرورت حوالہ کے ساتھ قرآنی آیات بھی درج کر دی گئی ہیں۔ لیکن جہاں آیت درج نہ کی گئی ہو اور صرف حوالہ دیا گیا ہو وہاں آپ متعلقہ آیت قرآن کریم سے خود نکال کر دیکھ لیں۔ اس سے بات واضح ہو جائیگی۔

(ط) بعض اوقات ”قرآن کریم“ یا ”قرآن مجید“ کے بجائے صرف ”قرآن“ لکھا ہوا ملیگا۔ اسے عدم احترام پر محمول نہ کیا جائے۔ قرآن کریم بہر حال وہی نوع واجب الاحترام ہے خواہ اس کے ساتھ احترام کا لفظ آئے یا نہ آئے۔ جہاں ایسا لفظ موجود نہ ہو وہاں آپ اسکا اضافہ خود کر لیں۔

(۱۵) یہ لغت اولاً و اساساً ان حضرات کے لئے مرتب کیا گیا ہے جو عربی زبان سے واقف نہیں۔ اسلئے

(۱) اس میں علمی اصطلاحات سے اجتناب کیا گیا ہے اور ہاٹ عام فہم الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ نیز کوشش کی گئی ہے کہ اسکا انداز سلیس اور سادہ ہو تاکہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ البتہ جہاں گفتگو ہی کسی علمی یا فنی مسئلہ کے متعلق ہو وہاں اسلوب بیان کا فنی یا نسبتاً مشکل ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

(۲) لغت سے پہلے، قریب ستتر صفحات میں ”عربی زبان کے گرامر کے قواعد، آسان اور غیر فنی زبان میں دئے گئے ہیں۔ یہ عربی زبان کی پوری گرامر (صرف ونحو) نہیں، صرف مبادیات ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ جو حضرات عربی زبان سے ناواقف ہوں انہیں عربی الفاظ کی مختلف شکلوں اور عربی فقرات کی مختلف ترکیبوں سے شناسائی ہو جائے اور وہ اس طرح لغت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر آپ نے ان مبادیات کا غور سے مطالعہ کیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی مدد سے آپ عربی زبان سے کافی حد تک شناسا ہو جائیں گے۔

(۳) عربی زبان کے اصول کے مطابق لغت کی ترتیب الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ سادوں کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ مثلاً لفظ ”متقین“ آپ کو (م۔ت۔ق) کے تحت نہیں ملیگا۔ اس لفظ کے مادہ (و۔ق۔ی) کے ماتحت

ملیگا۔ لیکن عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے یہ مشکل (بلکہ بعض اوقات ناممکن) ہوگا کہ وہ معلوم کر سکیں کہ فلاں لفظ کا مادہ کیا ہے، اور جب وہ مادہ ہی معلوم نہیں کر سکیں گے تو وہ اس لفظ کو لغت میں تلاش کیسے کریں گے؟ اس دقت کے پیش نظر ہم نے تمام قرآنی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ اس فہرست کو حروف تہجی (ا۔ ب۔ ت۔ ث) کے مطابق ترتیب دیا ہے، اور ہر لفظ کے سامنے وہ مادہ دے دیا ہے جس کے ماتحت وہ لفظ ملیگا۔ مثلاً فہرست میں لفظ ”متقین“ م۔ کے ماتحت (یہ ترتیب م۔ ت۔ ق) دیا گیا ہے، اور اس کے سامنے لکھا گیا ہے۔ و۔ ق۔ ی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لفظ ”متقین“، لغت میں ”و۔ ق۔ ی“ کے عنوان کے تحت ملیگا۔ یہ فہرست قریب سو صفحات سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ مکمل ہو، لیکن اس میں پھر بھی سہو و خطا کا امکان ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی سہو یا غلطی نظر آئے تو اس سے مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ اڈیشن میں مناسب اصلاح کر لی جائے۔

مبادیات اور فہرست میں، کوششیں بسیار کے باوجود، چند ایک طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انہیں فہرست کے آخر میں ”اغلاط نامہ“ میں درج کر دیا گیا ہے۔ آپ متعلقہ الفاظ کی تصحیح کر لیں۔

۱۶۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس لغت کی تدوین کا محرک جذبہ یہ تھا کہ جن حضرات کے دل میں قرآن کریم کا ذوق پیدا ہو چکا ہے وہ براہ راست اسے سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ مقصد بڑی حد تک زیر نظر لغت سے پورا ہو جانے کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن اکثر احباب کا خیال تھا (جس سے غور و فکر کے بعد مجھے بھی متفق ہونا پڑا) کہ اس کے باوجود (یا یوں کہہئے کہ اس کے ساتھ) قرآن کریم کے ایک رواں ترجمہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے (اور ابن قتیبہ ہی نے نہیں، اب یورپ کے اکثر فاضل مستشرقین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ) قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ”مفہوم القرآن“، میں ملیگی)۔ یہ بالکل درست ہے۔ میرے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبیر فی القرآن نے خود مجھے بھی اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مشکل مسئلہ پر ایک عرصہ تک غور کیا اور ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو ترجمہ اور تفسیر کے بین بتین ہے۔ یہ کچھ اس سے ملتا جلتا ہے جسے انگریزی زبان میں (Paraphrasing) کہتے ہیں۔



اردو زبان میں اسے ”مفہوم“ کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن کا مفہوم اپنے الفاظ میں۔ میں نے قرآن کریم کے بعض مقامات کا ”مفہوم“ اس انداز سے متعین کیا اور اسے تجربہٴ مختلف احباب کے سامنے پیش کیا۔ یہ تجربہ بڑا مفید رہا۔ ان کی رائے تھی کہ اس سے قرآن کریم کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں رہتی۔ اس تجربہ کے بعد میں نے، قرآنی الفاظ کے ان معانی کے ”رو سے جو زیر نظر لغت میں دئے گئے ہیں، قرآن کریم کا مفہوم مرتب کیا ہے۔ اسی کا نام ”مفہوم القرآن“ ہے جو ابتدائی مسودہ کی شکل میں اس وقت موجود ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ زیر نظر لغت اور مفہوم القرآن کی اشاعت سے وہ دشواریاں رفع ہو جائیں گی جو قرآن مجید کے سمجھنے میں عام طور پر پیش آتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ (لغت نہیں تو کم از کم) مفہوم القرآن انگریزی زبان میں بھی شائع ہو جائے تاکہ بیرونی دنیا (بالخصوص یورپ اور امریکہ) خپدا کی اس عظیم کتاب کو جو تمام نوع انسانی کی رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے، براہ راست سمجھ لے اور اس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اس کا یہ دعویٰ کس قدر مبنی بر صداقت ہے کہ جو نظام اس نے عطا کیا ہے وہ نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں علی وجہ البصیرت محسوس کرتا ہوں کہ مغربی ممالک اس نظام کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن یہ نظام ان کے سامنے نہیں آ رہا۔ یہ اسی صورت میں سامنے آ سکیگا جب قرآن کریم کو، اس کی اصلی شکل میں، دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

۱۔ لغت (اور اس کے ساتھ مفہوم القرآن) سالہا سال کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے مرتب تو ہو گئے لیکن اتنی ضخیم کتابوں کے چھپوانے کی مجھ میں کہاں استطاعت تھی؟ یہ وہ مقام تھا جہاں میں بسے بس تھا۔ میری تصانیف سے جو کچھ (تھوڑا بہت) منافع حاصل ہوتا ہے وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں صرف ہو جاتا ہے (بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کے لئے بھی کفایت نہیں کرتا۔ اس عظیم مشن کے متعدد گوشے ایسے ہیں جو سرمایہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے)۔

اس بسے بسی نے مجھے عرصہ تک وقف اضطراب رکھا تا آنکہ میرے ان قرآنی احباب نے جو میرے مشن سے متفق ہیں، از خود آگے بڑھ کر میرا یہ بوجھ ہلکا کر دیا، اور یوں میرے لئے اس دشوار گزار مرحلہ کو آسان بنا دیا۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور میرا دل ان احباب کے لئے جذبات سے امتنان سے لبریز ہو رہا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہ شکریہ

کے خواہاں ہیں، نہ ستائش کے مستحق۔ قرآن کا رشتہ بھی دنیا میں عجیب رشتہ ہے۔

اس کے بعد، طباعت کی عملی دشواریاں سامنے آئیں۔ آجکل لیتھو کی چھپائی جس بری طرح سے کتاب کو مسخ کر دیتی ہے اس کا مجھے تلخ تجربہ ہے۔ میں اس تجربہ کو، کم از کم لغت جیسی اہم کتاب کے سلسلہ میں، دہرانے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ اوفسٹ کی چھپائی کے متعلق معلوم کیا تو وہ ہماری بساط سے کہیں زیادہ تھی۔ اب اسے دے کے ٹائپ کی چھپائی رہ جاتی تھی۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ ہمارے ہاں ابھی ایسا ٹائپ رائج نہیں ہوا جس کے ساتھ اعراب ہوں، اور اعراب الہی لگانے سے وہ اپنے صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے لئے کئی ایک مطابع میں تجربے کئے گئے۔ ایک پریس میں مبادیات اور فہرست کو چھپوا کر بھی دیکھ لیا۔ اس تمام تگ و تاز کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ لغت کی طباعت کی اطمینان بخش صورت اسی نہج سے ہو سکتی ہے کہ پریس اپنے زیر اہتمام ہو۔ اس کے لئے کافی عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ بہر حال اب خدا خدا کر کے اس کا انتظام ہوا ہے اور میں اس قابل ہوا ہوں کہ لغت کی پہلی جلد احباب کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ اس کی طباعت اب بھی میرے معیار کے مطابق نہیں (اس میں بھی بعض اوقات اعراب اپنے ٹھیک مقام پر نہیں لگ سکتے۔ لیکن میں نے اسے اس لئے گوارا کر لیا ہے کہ ”معیار“ کی تلاش میں، وقت کی اشد ضرورت کو بالآخر کب تک التوا میں ڈالا جا سکتا ہے؟ احباب کے تقاضوں کا تو یہ عالم ہے کہ -- سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔ اس لئے اپنی طرف سے جسقدر بھی اچھے سے اچھا ہو سکا، اسے چھاپ دیا گیا ہے۔

اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن، چار یا پانچ جلدوں میں تکمیل تک پہنچ جائیگی۔ اس کے بعد ”مفہوم القرآن“ کی طباعت کی باری آئیگی۔ ”مفہوم القرآن“ کے لئے بھی احباب کے تقاضے جسقدر شدید ہیں اس کا مجھے احساس ہے۔ لیکن چونکہ اس مفہوم کی سند، صرف لغت زیر نظر میں مل سکیگی، اس لئے اسے لغت کی تکمیل سے پہلے شائع نہیں کیا جا سکتا۔ و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

واضح رہے کہ زیر نظر لغت میں قرآنی آیات کا اردو ترجمہ لغوی مفہوم کی رعایت سے دے دیا گیا ہے۔ مفہوم القرآن کا انداز اس سے الگ ہے۔ اس میں قرآن کریم کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

(۱۸) عام کتب لغت اسوقت مکمل ہوتی ہیں جب ان کی تمام جلدیں چھپ کر سامنے آجائیں۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے زیر نظر لغت بھی اسی طرح مکمل ہوگا۔ لیکن یہ صرف لغت کی کتاب نہیں۔ اس میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات بھی آ گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اسکی ہر جلد اپنی جگہ مکمل اور خود مکتفی ہے۔ لہذا آپ اس کا انتظار نہ کیجئے کہ تمام جلدیں چھپ جائیں تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ ہر جلد سے الگ الگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ آپ اسے لغات کی طرح نہ دیکھئے، کہ جب کسی خاص لفظ کے معانی معلوم کرنے ہوں تو کتاب کھول کر وہ معانی دیکھ لئے اور پھر کتاب رکھ دی۔ آپ اسکا مسلسل مطالعہ کیجئے۔ اس طرح قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے جائیں گے۔

(۱۹) اگرچہ لغت کا پورا مسودہ طباعت کے لئے تیار رکھا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ طباعت کے دوران، مزید غور و فکر سے بعض اہم چیزیں اس وقت سامنے آئیں جب متعلقہ جلد چھپ چکی ہو، یا قارئین کی طرف سے مفید مشورے، تجاویز یا وضاحت طلب امور سامنے آئیں۔ اگر ایسا ہوا تو آخری جلد کے ساتھ ایک تکملہ شائع کر دیا جائیگا جس میں یہ تمام امور آجائیں گے۔

(۲۰) جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، میں اپنی کسی تحریر کو نہ سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اس موضوع پر حرف آخر۔ میری دیگر تصانیف کی طرح یہ لغت بھی بہر حال انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش ہے۔ جو احباب مجھے میری غلطیوں سے مطلع اور اپنے مشوروں سے مستفید فرمائیں گے میں انکا شکر گزار ہوں گا بشرطیکہ یہ بغرض تعاون ہو، نہ کہ بحث و جدل کی خاطر۔ میں بحث میں الجھا نہیں کرتا۔

اگر میری اس کوشش ناتمام سے کچھ احباب بھی قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ یہی میری زندگی کا مقصد اور یہی میری کاوشوں کا منتہی ہے۔  
ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّميع العليم۔



# لُغَاتُ الْفِتْرَانِ

## بَابِ اَوَّل

### عربی لُغَتِ اِسْتِفَادَہ کے لئے ضروری معلوما

یہ باب ان قارئین کے لئے لکھا گیا ہے جو عربی زبان اور اس کی گرامر سے واقف نہیں۔ اس میں صرف نحو کی دقیق اصطلاحات اور فنی باریکیوں سے بحث نہیں کی گئی، بلکہ مختصر اور سادہ الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ عربی الفاظ کی شکلیں کس طرح بدلتی ہیں اور اس تبدیلی سے معنوں میں کیا فرق پڑتا ہے؟

## عربی لغت کے استفادہ کے لئے ضروری معلوما

### عربی زبان کی لغت کی خصوصیت

آپ اردو زبان کی ڈکشنری میں (مثلاً) ”تُسْتَعَلِمُ“  
یا ”تعلیم“ کے الفاظ دیکھنا چاہیں تو مُتَعَلِم آپ  
کو ”م“ کی تختی میں اور تعلیم ”ت“ کی تختی میں مل

جائے گا۔ لیکن اگر آپ یہی الفاظ عربی زبان کی ڈکشنری میں دیکھیں گے تو نہ متعلم ”م“ کی  
تختی میں ملے گا اور نہ ہی تعلیم ”ت“ کی تختی میں۔ یہ دونوں ع۔ ل۔ م (علم) کے باب  
میں ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ عربی زبان کی لغت (ڈکشنری)  
میں الفاظ کی ترتیب ان کے حروف کی ترتیب کے مطابق ہو۔ یہ پہلی دشواری ہے جو  
عربی نہ جاننے والوں کی راہ میں عربی زبان کی ڈکشنری سے الفاظ کے معانی معلوم کرنے  
کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کیوں ہے تو یہی  
دشواری ایک طرف بہ بتا دیگی کہ عربی زبان کس قدر سائنٹیفک ہے اور دوسری طرف یہ  
کہ اس کے الفاظ کے معانی معلوم (بلکہ متعین) کرنے کس قدر آسان اور دلچسپ ہیں۔

عربی زبان کا ہر لفظ الگ الگ مستقل حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جس طرح درخت  
کے شاخیں، پتے، پھول، پھل اس کے بیج یا جڑ سے نکلے ہوئے ہیں اسی طرح اس  
زبان کا ہر لفظ اپنی ایک جڑ اور اصل رکھتا ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتا ہے۔

**مادہ** | اس جڑ یا اصل کو مادہ (Root) کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ایک مادہ

سے سینکڑوں الفاظ (اسماء۔ افعال۔ صیغے وغیرہ) بنتے ہیں۔ ان الفاظ کی شکلیں  
مختلف ہوں گی لیکن ان میں سے ہر ایک میں اس جڑ (مادہ) کی خصوصیت ضرور موجود  
ہوگی، نیز یہ کہ یہ الفاظ اور ان کی مختلف شکلیں یونہی اندھا دھند نہیں بن جاتیں۔ یہ

خاص قاعدوں کے مطابق سائنٹیفک طریقے سے بنتی ہیں اور ہر شکل اپنا خاص مفہوم رکھتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم ہو اور ان قاعدوں سے واقفیت ہو جن کے مطابق اس مادہ سے مختلف الفاظ خاص شکلیں لئے ہوئے ابھرتے ہیں تو مادہ کے معنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ ان تمام الفاظ کے معانی خود بخود سامنے آ جائیں گے۔ یہ وجہ ہے کہ عربی زبان کی ڈکشنری میں مختلف الفاظ کو ان کے حروف کی ترتیب سے نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں ان کے مادہ کے تحت دیا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم کرنا آ جائے تو اس سے نہ صرف اس خاص لفظ کے معانی معلوم ہو جائیں گے بلکہ اس "خاندان" (شجرہ درخت) کے تمام افراد سے تعارف ہو جائیگا اور ہم ان کے خط و خال کو دیکھتے ہی بتا دیں گے کہ یہ کس اصل کی شاخیں ہیں۔

اب ہم ایک مثال سے بتاتے ہیں کہ مادہ (بالعموم) کس طرح معلوم کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ ہماری روزمرہ کی بولی میں شامل ہیں :

### مادہ معلوم کرنیکا طریقہ

- (۱) معلوم (۲) معلومات (۳) عالم (۴) علماء (۵) علم (۶) مُعَلِّم (۷) متعلِّم (۸) متعلمہ (۹) معلّمہ (۱۰) تعلیم (۱۱) علوم (۱۲) علیم (۱۳) علمی (۱۴) علامت (۱۵) علمیت (۱۶) علامہ

یہ تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں جنہیں ہم بے تکان اپنی زبان میں لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ آپ ان الفاظ کی ساخت پر غور کیجئے۔ ایک بات نمایاں طور پر نظر آ جائیگی۔ یعنی کچھ حروف ایسے ہیں جو ان تمام الفاظ میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ حروف ہیں "ع۔ ل۔ م۔" ان کے علاوہ باقی حروف ایسے ہیں جو کسی ایک لفظ میں پائے جاتے ہیں لیکن دوسرے میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً عالم میں "الف" ہے جو تعلّم میں نہیں۔ متعلّم میں "ت" ہے جو معلوم میں نہیں۔

وہ حروف جو تمام الفاظ میں مشترک پائے جاتے ہیں ان الفاظ کا مادہ (اصلی حروف)

کہلاتے ہیں۔ اس اصول کے مطابق مندرجہ بالا سواہ الفاظ کا مادہ "ع - ل - م" (علم) ہے۔

ایک مادہ سے جو مختلف الفاظ بنائے جاتے ہیں وہ اس مادہ کے "مشتقات" ہیں۔

[نوٹ بعض اوقات ایک لفظ جس انداز سے لکھا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے اس کے ساتھ مادہ کے اصلی حروف اور زائد حروف کے علاوہ اور حروف بھی ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اصل لفظ جس کا مادہ معلوم کرنا ہو ان حروف کو الگ کرنے سے سامنے آتا ہے۔ مثلاً فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ میں اصلی لفظ يَكْفِي ہے۔ باقی حروف (ف - س - ك - هُم) اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ ان حروف کو الگ کر کے يَكْفِي کا مادہ معلوم کیا جائیگا۔ عربی زبان سے تھوڑی سی واقفیت ہو جانے سے باسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی لفظ میں اس قسم کے حروف کون کون سے ہیں۔ یہ حروف خاص مقصد کے لئے آتے ہیں۔]

عربی زبان کے حروف ہجا (Alphabet) حسب ذیل ہیں :	الف اور حمزہ کا فرق
ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ك ل م ن ه و ی -	

زیر نظر لغت میں الفاظ انہی حروف کی ترتیب سے سامنے آئیں گے۔ ان حروف میں صرف ایک چیز قابل ہورہے اور وہ ہے الف اور حمزہ کا فرق۔ الف پر زبر 'زیر' پیش کچھ نہیں ہوتا۔ جیسے قَالَ میں ق کے بعد الف ہے لیکن اس پر کوئی حرکت نہیں اس کے برعکس أَكَلٌ میں الف پر زبر ہے اس لئے اسے الف نہیں بلکہ حمزہ کہیں گے۔ اسی طرح يَأْتِي میں الف پر جزم ہے۔ یہ بھی حمزہ ہے الف نہیں۔

عربی زبان کے کسی لفظ کے مادہ میں الف کبھی نہیں آئیگا، حمزہ آئیگا۔ اگر کسی مادہ میں الف نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس جگہ درحقیقت اصلی حرف واو یا ی تھا۔ الف اس واو یا ی سے بدل کر آیا ہے۔ مثلاً قَامَ میں مادہ ق - و - م ہے۔ گویا قَامَ اصل میں، قَوْمٌ تھا۔ واو، الف سے بدل گیا ہے۔ اسی طرح بَاعَ کا مادہ ب - ی - ع ہے۔ ی، الف سے بدل گئی ہے۔

**حروفِ علت** | عربی حروفِ ہجا میں تین حروف (ا - و - ی) حروفِ علت (Vowel) کہلاتے ہیں اور باقی حروف صحیحہ یا حروفِ صحت (Consonant) - علت بیماری کو کہتے ہیں - جس لفظ میں ان حروف میں سے کوئی حرف آجائے اس کے مادہ کے معلوم کرنے میں کچھ پریشانی ہو جاتی ہے (روگ لگ جاتا ہے) - اس لئے کہ یہ حروف اس لفظ کو اس کی صحیح حالت اور پورے وزن پر نہیں رہنے دیتے - ان امور کی تفصیل میں جانے کی آپ کو ضرورت نہیں - یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جس مادہ میں واو ہو اسے واوی اور جس مادہ میں ی ہو اسے یائی کہتے ہیں - ان مادوں کا فرق ظاہر کرنے اور حروفِ علت کی پریشان کن تبدیلیوں کو سامنے لانے کے لئے ہم آگے چل کر کچھ مثالیں پیش کریں گے جنہیں سمجھ لینے سے حروفِ علت والے مادوں کا معلوم کر لینا بھی چنداں دشوار نہیں رہیگا -

**مادہ اور اسکے مشتقات** | ہر مادہ سے معین اوزاف پر 'افعال' (Verbs) اور اسماء (Nouns) بنائے جاتے ہیں (انہیں اس مادہ کے "مشتقات" کہتے ہیں) حروف (Particles) مادہ سے نہیں بنتے -

[عربی زبان میں دیگر زبانوں کی طرح حروف بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان کا تفصیلی بیان آگے چل کر آئیگا]

مختلف مادوں سے حسب ذیل افعال اور اسماء بنتے ہیں :

(نوٹ - اصطلاحات کی تشریح آگے چل کر آئیگی)

افعال اور ان کے مختلف ابواب :

- (۱) فعل ماضی - معلوم و مجہول - مثبت و منفی وغیرہ (مع جملہ اقسام) -
- (۲) فعل مضارع - معلوم و مجہول - مثبت و منفی - لام تاکید اور نون تاکید (ثقیلہ و خفیفہ) کے ساتھ - وغیرہ -
- (۳) امر - حاضر و غائب وغیرہ -
- (۴) نہی - حاضر و غائب -



## افعال

**فعل ماضی** | گزرے ہوئے زمانے کو ماضی کہتے ہیں۔ لہذا جو کام گزرے ہوئے زمانہ میں ہوا ہو یا کیا ہو وہ ”فعل ماضی“ کہلاتا ہے۔ انگریزی گرامر میں اسے (Past Tense) کہتے ہیں۔

**فعل مضارع** | موجودہ زمانہ کو حال (Present) اور آنے والے کو مستقبل (Future) کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ان دونوں زمانوں (یعنی حال و مستقبل) کے لئے ایک فعل استعمال ہوتا ہے جسے ”فعل مضارع“ کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے (Aorist Tense) کہا جاتا ہے۔

**فعل مثبت اور منفی** | جس فعل میں کسی کام کے کرنے کا ذکر ہو وہ فعل مثبت (Affirmative) کہلاتا ہے۔ جس فعل میں نہ کرنے کا ذکر ہو وہ فعل منفی (Negative)۔ فعل ماضی کو منفی بنانے کے لئے اس کے شروع میں مَ یا بڑھا دیتے ہیں اور فعل مضارع کے شروع میں لا۔

**فعل کی ضمیریں** | عربی زبان میں فعل کے ہر صیغے میں ایک ضمیر (Pronoun) ہوتی ہے۔ مثلاً کَتَبَ کے معنی صرف ”لکھا“ نہیں بلکہ ”آں (مذکر) نے لکھا“۔ اسی طرح ”أَكْتُبُ“ کے معنی ہیں ”میں لکھتا ہوں“۔  
ضائر (Pronoun) کی تین قسمیں ہیں۔ غائب کی ضمیر (Third Person)۔ مخاطب کی ضمیر (Second Person)۔ اور متکلم کی ضمیر (First Person)۔ جس فعل میں غائب کی ضمیر ہوگی وہ ”غائب“ کہلائیگا۔ جس میں مخاطب کی ضمیر ہوگی وہ ”مخاطب“ اور جس میں متکلم کی ضمیر ہوگی وہ ”متکلم“۔

**مذکر و مؤنث** | عربی زبان میں مذکر (Masculine) اور مؤنث (Feminine) کے افعال (Verb) کے لئے بھی الگ الگ شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کَتَبَ - اس (مذکر) نے لکھا - کَتَبَتْ - اس (مؤنث) نے لکھا - یا ذَهَبَ وہ (مذکر) گیا اور ذَهَبَتْ وہ مؤنث گئی۔

**واحد - تثنیہ - جمع** | اردو زبان میں ایک کو واحد (Singular) اور ایک سے زیادہ کو جمع (Plural) کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں

”دو“ کے لئے الگ صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اسے تَثْنِيَّةٌ یا مُثْنٰی (Dual) کہتے ہیں۔ مثلاً كَتَبَ : اس ایک (مذکر) نے لکھا۔ كَتَبَا : ان دو (مذکروں) نے لکھا۔ اور كَتَبُوا : ان دو سے زیادہ یا سب (مذکروں) نے لکھا۔

آپ نے دیکھا کہ عربی زبان میں محض صیغہ بدل دینے سے کیا کیا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ زبان بڑی جامع ہے۔

**فعل معلوم و مجہول** | فعل (Verb) کی ابھی ایک اور قسم باقی ہے اور وہ ہے معلوم و مجہول۔ فعل معلوم (Active) وہ ہے جس میں فاعل

(یعنی کام کرنے والا) معلوم ہو۔ مثلاً قَتَلَ کے معنی ہیں ”اس نے قتل کیا“۔ اس میں معلوم ہے کہ قتل کرنے والا کون ہے۔ لیکن جب کہا جائے ”قُتِلَ“ (وہ قتل کیا گیا) تو اس میں یہ معلوم نہیں کہ قاتل کون ہے۔ اول الذکر کو فعل معلوم یا فعل معروف کہتے ہیں اور ثانی الذکر کو فعل مجہول (Passive)۔ آگے چل کر ہم بتائینگے کہ فعل معروف سے فعل مجہول بتا کس طرح ہے۔

فعل کے متعلق یہ تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد اب آپ فعل کے وزن اور صیغے دیکھئے۔

## فعل ماضی کے صیغے (گردان یا شکلیں)

فعل ماضی معلوم (مثبت)

غائبہ	مذکر	واحد	وہ گیا	ذَهَبَ
		مثنیٰ	وہ دو گئے	ذَهَبَا
		جمع	وہ سب گئے	ذَهَبُوا
	مؤنث	واحد	وہ گئی	ذَهَبَتْ
		مثنیٰ	وہ دو گئیں	ذَهَبَتَا
		جمع	وہ سب گئیں	ذَهَبْنَ
حاضر	مذکر	واحد	تو گیا	ذَهَبَ
		مثنیٰ	تم دو گئے	ذَهَبْتُمَا
		جمع	تم سب گئے	ذَهَبْتُمْ
	مؤنث	واحد	تو گئی	ذَهَبَتْ
		مثنیٰ	تم دو گئیں	ذَهَبْتُمَا
		جمع	تم سب گئیں	ذَهَبْتُنَّ
مستکلم	مذکر و مؤنث	واحد	میں گیا یا میں گئی	ذَهَبْتُ
		مثنیٰ و جمع	ہم دو یا ہم سب گئے ہم دو یا ہم سب گئیں	ذَهَبْنَا

نوٹ - فعل ماضی منفی بنانے کے لئے شروع میں "مَسَا" بڑھا دیجئے۔ مثلاً

مَسَا ذَهَبَ : وہ نہیں گیا۔

## فعل ماضی مجہول (مثبت)

فعل ماضی مجہول بنانے کے لئے پہلے حرف پر پیش اور دوسرے حرف پر زیر ہو جاتا ہے ۔

غائب	مذکر	واحد	وہ قتل کیا گیا	قُتِلَ
		مثنیٰ	وہ دو قتل کئے گئے	قُتِلَا
		جمع	وہ سب قتل کئے گئے	قُتِلُوا
	مؤنث	واحد	وہ قتل کی گئی	قُتِلَتْ
		مثنیٰ	وہ دو قتل کی گئیں	قُتِلَتَا
		جمع	وہ سب قتل کی گئیں	قُتِلْنَ
انفہار	مذکر	واحد	تو قتل کیا گیا	قُتِلْتُ
		مثنیٰ	تم دو قتل کئے گئے	قُتِلْتُمَا
		جمع	تم سب قتل کئے گئے	قُتِلْتُمْ
	مؤنث	واحد	تو قتل کی گئی	قُتِلْتُ
		مثنیٰ	تم دو قتل کی گئیں	قُتِلْتُمَا
		جمع	تم سب قتل کی گئیں	قُتِلْتُنَّ
مستکمل	مذکر و مؤنث	واحد	میں قتل کیا گیا، میں قتل کی گئی	قُتِلْتُ
		مثنیٰ و جمع	ہم دو یا ہم سب قتل کئے گئے ہم دو یا ہم سب قتل کی گئیں	قُتِلْنَا

نوٹ ۔ منفی ماضی مجہول بنانے کے لئے "مسا" بڑھا دیجئے۔ جیسے "مسا قُتِلَ" :

وہ قتل نہیں کیا گیا ۔

## فعل مضارع (حال و استقبال) معلوم - مثبت

غائب	مذکر	واحد	وہ جانتا ہے یا جانے گا	يَعْلَمُ
		مثنیٰ	وہ دو جانتے ہیں یا جانیں گے۔	يَعْلَمَانِ
		جمع	وہ سب جانتے ہیں یا جانیں گے۔	يَعْلَمُونَ
	مؤنث	واحد	وہ جانتی ہے یا جانے گی	تَعْلَمُ
		مثنیٰ	وہ دو جانتی ہیں یا جانیں گی	تَعْلَمَانِ
		جمع	وہ سب جانتی ہیں یا جانیں گی	يَعْلَمْنَ
حاضر	مذکر	واحد	تو جانتا ہے یا جانے گا	تَعْلَمُ
		مثنیٰ	تم دو جانتے ہو یا جانو گے	تَعْلَمَانِ
		جمع	تم سب جانتے ہو یا جانو گے	تَعْلَمُونَ
	مؤنث	واحد	تو جانتی ہے یا جانے گی	تَعْلَمِينَ
		مثنیٰ	تم دو جانتی ہو یا جانو گی	تَعْلَمَانِ
		جمع	تم سب جانتی ہو یا جانو گی	تَعْلَمْنَ
منکلم	مذکر و مؤنث	واحد	میں جانتا ہوں یا جانوں گا میں جانتی ہوں یا جانوں گی	أَعْلَمُ
		مثنیٰ و جمع	ہم دو یا ہم سب جانتے ہیں یا جانیں گے ہم دو یا ہم سب جانتی ہیں یا جانیں گی	نَعْلَمُ

نوٹ - فعل مضارع منفی بنانے کے لئے شروع میں دو لا، بڑھا دیا جاتا ہے۔

مثلاً دو لا يَعْلَمُ : وہ نہیں جانتا ہے یا نہیں جانے گا،

## فعل مضارع مجہول - مثبت

فعل مجہول بنانے کے لیے پہلے حرف پر پیش اور تیسرے پر زبر لگایا جاتا ہے

غائبہ	مذکر	واحد	وہ قتل کیا جاتا ہے یا قتل کیا جائیگا	یَقْتُلُ
		مثنیٰ	وہ دو قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائیں گے	یَقْتُلَانِ
		جمع	وہ سب قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائیں گے	یَقْتُلُونَ
	مؤنث	واحد	وہ قتل کی جاتی ہے یا قتل کی جائیگی	تَقْتُلُ
		مثنیٰ	وہ دونوں قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائیں گی	تَقْتُلَانِ
		جمع	وہ سب قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائیں گی	یَقْتُلْنَ
حاضر	مذکر	واحد	تو قتل کیا جاتا ہے یا قتل کیا جائے گا	تَقْتُلُ
		مثنیٰ	تم دو قتل کئے جاتے ہو یا قتل کئے جاؤ گے	تَقْتُلَانِ
		جمع	تم سب قتل کئے جاتے ہو یا قتل کئے جاؤ گے	تَقْتُلُونَ
	مؤنث	واحد	تو قتل کی جاتی ہے یا قتل کی جائے گی	تَقْتُلِينَ
		مثنیٰ	تم دو قتل کی جاتی ہو یا قتل کی جاؤ گی	تَقْتُلَانِ
		جمع	تم سب قتل کی جاتی ہو یا قتل کی جاؤ گی	تَقْتُلْنَ
مستقبل	مذکر و مؤنث	واحد	میں قتل کیا جاتا ہوں یا قتل کیا جاؤنگا میں قتل کی جاتی ہوں یا قتل کی جاؤنگی	اَقْتُلُ
		مثنیٰ و جمع	ہم دو یا ہم سب قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائیں گے ہم دو یا ہم سب قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائیں گی	نَقْتُلُ

نوٹ - منفی بنانے کے لئے شروع میں "لا" بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے

لَا یَقْتُلُ : وہ قتل نہیں کیا جاتا ہے یا قتل نہیں کیا جائے گا،

## بعض تغیرات

فعل ماضی اور فعل مضارع کے جو اوزان پیچھے دئے گئے ہیں (وہ ثلاثی مجرد کے ہیں) ان کے مطابق ہر فعل سے اتنی ہی شکلیں بنائی جاسکتی ہیں۔ فعل معلوم (معروف) میں ماضی کے درمیانی یعنی دوسرے حرف پر الگ الگ حرکت (زبر، زیر، پیش) ہوتی ہے۔ مثلاً فعل ماضی عَلِمَ میں ل پر زیر ہے لیکن کُذِلَ میں قی پر پیش ہے اور ذُهِبَ میں ہ پر زیر ہے۔ اسی طرح مضارع معروف میں بھی تیسرے حرف پر مختلف حرکات ہوتی ہیں مثلاً یَعْلَمُ میں ل پر زیر ہے، یَنْصُرُ میں ص پر پیش ہے اور یَكْذِبُ میں ذ پر زیر ہے۔ ان درمیانی حروف کی حرکاتوں کے اختلاف کے متعلق تفصیل سے اگلے باب میں لکھا جائے گا جہاں بتایا جائے گا کہ "ابواب اور ان کے خواص" کیا ہیں۔

یہ تو رہا درمیانی حرف کی حرکاتوں کا بیان۔ فعل ماضی کے صیغوں کے آخر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا لیکن فعل مضارع کے شروع میں بعض حروف کے آجائے سے اس کے صیغوں کے آخر میں کچھ تغیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً اِنْ - لَمْ - لَمَّا۔ لام امر - لاء نہیں، میں سے جب کوئی حرف مضارع سے پہلے آجائے تو:

۱۔ مضارع کے جن صیغوں کے آخر میں ن نہیں ہوتا ان کے آخری حرف پر جزم آجاتا ہے۔ مثلاً یَعْلَمُ - تَعْلَمُ - اَعْلَمُ - تَعْلَمُ سے لَمْ یَعْلَمُ - لَمْ تَعْلَمُ - لَمْ اَعْلَمُ - لَمْ تَعْلَمُ۔

۲۔ جمع مؤنث کے صیغوں کو چھوڑ کر (جواہنی حالت پر رہتے ہیں) باقی جن صیغوں کے آخر میں ن ہے وہ اُڑ جاتا ہے۔ مثلاً:

یَعْلَمَان - یَعْلَمُونَ - تَعْلَمَان - تَعْلَمُونَ - تَعْلَمَیْن سے  
لَمَّا یَعْلَمَا - لَمْ یَعْلَمُوا - اِنْ تَعْلَمَا - لَمْ تَعْلَمُوا اور  
لَمْ تَعْلَمَیْ -

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جمع مؤنث کے دو صیغوں کے ن ہر حال میں باقی

رہتے ہیں۔ مثلاً لَمْ یَعْلَمَنَّ - لَمْ تَعْلَمَنَّ -

۳۔ اسی طرح بعض حروف مضارع کے شروع میں آتے ہیں تو وہ مضارع کے ان صیغوں کے آخری حرف پر زیر لگا دیتے ہیں جن کے آخر میں ن نہیں ہوتا اور جن کے آخر میں ن ہوتا ہے ان میں وہی تغیر پیدا کرتے ہیں جو لَمْ اور لَمَّا وغیرہ کرتے ہیں۔ وہ حروف یہ ہیں :

أَنْ - لَنْ - كَى - لَكَی -

مثلاً یَعْلَمُ - تَعْلَمُ - اَعْلَمُ - نَعْلَمُ سے أَنْ یَعْلَمُ - لَنْ تَعْلَمُ

لَكَی اَعْلَمُ -

اور یَعْلَمَانِ سے لَنْ یَعْلَمَا - یَعْلَمُونَ سے أَنْ یَعْلَمُوا

وغیرہ - جمع مؤنث کے دو صیغوں کے آخری ن ہر حال میں باقی رہتے ہیں۔ مثلاً لَنْ یَعْلَمَنَّ - لَنْ تَعْلَمَنَّ -

۴۔ مضارع کے شروع میں لام تاکید اور آخر میں نون تاکید کے آنے سے بھی

مضارع میں بعض تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً لَا یَحْطُمُ کے آخر میں نون تاکید بڑھایا جانے تو وہ لَا یَحْطُمَنَّ ہو جانے گا۔ یعنی م کا پیش زبر سے بدل جائے گا۔ اسی طرح اَحْتَسَنُ کے پہلے لام تاکید اور آخر میں نون تاکید بڑھانے سے لَا حَتَّسَنَّ ہو گیا۔ یعنی لُ کا پیش زبر سے بدل گیا۔ (بغرض اختصار انہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

اب امر اور نہی کے صیغوں کو لیجئے -



## امر کے صیغے (IMPERATIVE)

مذکر	واحد	تو جا	اَذْهَبْ
	مثنیٰ	تم دو جاؤ	اَذْهَبَا
	جمع	تم سب جاؤ	اَذْهَبُوا
مؤنث	واحد	تو جا	اَذْهَبِي
	مثنیٰ	تم دو جاؤ	اَذْهَبَا
	جمع	تم سب جاؤ	اَذْهَبْنَ

چونکہ امر (حکم) زیادہ تر سامنے والے شخص (مخاطب) کو دیا جاتا ہے اس لئے حاضر کے صیغوں سے امر کی شکلیں بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں غائب اور متکلم کے صیغوں سے بھی امر آتا ہے۔ مثلاً لِيَفْعَلْ : اسے کرنا چاہئے یا وہ کرے۔

## نہی کے صیغے (PROHIBITIVE IMPERATIVE)

مذکر	واحد	تو مت جا	لَا تَذْهَبْ
	مثنیٰ	تم دو مت جاؤ	لَا تَذْهَبَا
	جمع	تم سب مت جاؤ	لَا تَذْهَبُوا
مؤنث	واحد	تو مت جا	لَا تَذْهَبِي
	مثنیٰ	تم دونوں مت جاؤ	لَا تَذْهَبَا
	جمع	تم سب مت جاؤ	لَا تَذْهَبْنَ

نہی کے صیغے بھی امر کی طرح حاضر کے لئے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں

غائب اور متکلم سے بھی نہیں کے صیغے مستعمل ہیں۔ مثلاً "لَا يَعْلَمُ" : وہ نہ جانے ،  
اسے نہیں جانتا چاہئے ، "لَا يُشْرِكُ" : وہ شرک نہ کرے ، اسے شرک نہیں کرنا  
چاہئے ، "لَا يَغْتَسِبُ" : وہ غیبت نہ کرے ، اسے غیبت نہیں کرنا چاہئے ،

### اسم (NOUN)

یوں تو عربی زبان میں نام کو اسم کہتے ہیں لیکن اس میں اسم کا مفہوم بہت  
وسیع ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں عربی زبان کے تمام الفاظ صرف تین شکلوں میں  
تقسیم ہوتے ہیں۔ (۱) اسم (۲) فعل (۳) حرف۔ لہذا عربی زبان میں جو لفظ بھی فعل  
یا حرف نہیں ہوگا وہ اسم ہوگا۔

مختلف مادوں سے جو فعل بنتے ہیں وہ پہلے لکھے جا چکے ہیں۔

### اسم کی متفرق شکلیں

جس طرح (سابقہ صفحات میں) افعال (ماضی - مضارع - امر -  
نہی) کے اوزان اور ان کی مختلف شکلیں آپ کے سامنے آئی ہیں  
اسی طرح اسماء کے بھی متفرق اوزان اور مختلف شکلیں ہوتی  
ہیں۔ مثلاً مُشْرِكٌ کے معنی ہیں شرک کرنے والا۔ لیکن آپ کہیں مُشْرِكٌ دیکھیں گے  
کہیں مُشْرِكَةٌ۔ کہیں مُشْرِكُونَ اور کہیں مُشْرِكِينَ وغیرہ وغیرہ۔  
لفظ مُشْرِكٌ میں یہ تبدیلیاں خاص مفہوم رکھتی ہیں۔ مُشْرِكٌ کے معنی ایک  
(مذکر) مشرک۔ مُشْرِكُونَ اور مُشْرِكِينَ کے معنی ہیں بہت سے مشرک مرد۔  
مُشْرِكَةٌ : ایک مشرک عورت۔ مُشْرِكَاتٌ : بہت سی مشرک عورتیں۔

نوٹ : ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مُشْرِكٌ کی جمع مُشْرِكُونَ اور مُشْرِكِينَ  
(دونوں) آتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاں آپ کا جی چاہے مُشْرِكُونَ  
کہہ دیں اور جہاں جی چاہے مُشْرِكِينَ۔ اس کے لئے خاص قاعدے مقرر ہیں، لیکن

چونکہ ان قواعد کا تعلق نحو سے ہے اور ان کا بیان بہت طویل طویل ' اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ مقصد پیش نظر کے لئے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ بعض حالتوں میں مُشْرِکُون آتا ہے اور بعض میں مُشْرِکِین۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسم کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ان شکلوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

**مَذْکَرٌ وَمُؤَنَّثٌ** | جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ' مذکر (نر) کو کہتے ہیں اور مؤنث (مادہ) کو۔ اکثر مذکر نام ایسے ہوتے ہیں جن کا مؤنث نہیں ہوتا۔ مثلاً (ہماری زبان میں) دریا۔ سمندر۔ آسمان۔ مذکر بولے جانے میں لیکن ان کا مؤنث کوئی نہیں ہوتا ' ان کے برخلاف بہت سے مذکر نام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے مقابلہ میں ان کا مؤنث بھی ہوتا ہے۔ مثلاً دھوبی کے مقابلہ میں دھوبن۔ عربی زبان میں مذکر نام کو مؤنث بنانے کے لئے کچھ قاعدے مقرر ہیں۔ مثلاً:

(۱) مذکر اسم کے آخر میں ة (گول ت) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً عَالِمٌ (جانتے والا) عَالِمَةٌ (جانتے والی)۔

(یاد رکھئے۔ گول ت (ة) زائد حروف میں ہوتی ہے ' مادہ کے اصلی حروف میں نہیں ہوتی)۔

(۲) جو مذکر اسم اَفْعَلٌ کے وزن پر ہو اس کا مؤنث کبھی فُعَلٌ کے وزن پر اور کبھی فَعْلَاءُ کے وزن پر آتا ہے۔ جیسے أَصْفَرُ (جو اَفْعَلُ کے وزن پر ہے) کا مؤنث صُفْرَى آئیگا (جو فُعَلٌ کے وزن پر ہے)۔ آخرُ بروزن اَفْعَلٌ کا مؤنث اُخْرَى (بروزن فُعَلٌ) ہوگا (۱) اور أَصْفَرُ (بروزن اَفْعَلُ) کا مؤنث صُفْرَاءُ (بروزن فَعْلَاءُ) آئیگا۔

(۱) اَدْنٰی کا مؤنث دُنْيَا بھی اسی قاعدے کے مطابق ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں ایک کے لئے واحد، دو کے لئے تثنیہ یا مثنیٰ اور دو سے زیادہ کے لئے جمع آتی ہے۔

واحد اسم کو تثنیہ بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کے آخر میں ”ان“ یا ”ین“ بڑھا دیا جائے۔ ان اور ین سے پہلے جو حرف ہو اس پر زبر دھینکا اور آخری نون پر ہمیشہ زیر‘ مثلاً :

عَیْنٌ ایک آنکھ - سے تثنیہ - عَیْنَانِ یا عَیْنَانِ (دو آنکھیں) - یَدٌ ایک ہاتھ سے تثنیہ - یَدَانِ یا یَدَیْنِ (دو ہاتھ) - عَالِمَةٌ : ایک جاننے والی عورت سے تثنیہ - عَالِمَتَانِ یا عَالِمَتَیْنِ (دو جاننے والی عورتیں) -

مرکب اضافی (Possessive Construction) میں جب مضاف (Adjunct) تثنیہ ہو تو اس کا آخری نون اڑ جاتا ہے۔ مثلاً تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ میں یَدَا درحقیقت یَدَانِ (تثنیہ) تھا لیکن چونکہ یہ مضاف تھا اس لیے اس کا نون اڑ گیا اور یَدَانِ کی جگہ صرف یَدَا رہ گیا۔ اسی طرح اَخْلَعَ نَعْلَیْکَ میں نَعْلَیْ مضاف ہے اس لئے اس کا نون اڑ گیا اور نَعْلَیْنِ کے بجائے صرف نَعْلَیْ رہ گیا۔

جمع | عربی زبان میں جمع کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ جمع سالم (Sound Plural) اور جمع مُکَسَّر (Broken Plural)۔ جمع سالم اسے کہتے ہیں جس میں واحد کی شکل اسی طرح صحیح و سالم باقی رہے اور مُکَسَّر میں واحد کی شکل بدل جاتی یا اس کے حروف کی ترتیب ٹوٹ جاتی ہے۔ مثلاً عَالِمٌ (واحد) سے عَالِمُونَ جمع سالم ہے اور کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ مُکَسَّر ہے۔ اس میں لفظ کِتَابٌ (واحد) اپنی اصلی شکل پر نہیں رہا۔

جمع مذکر سالم بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ واحد کے آخر میں ”ون“ یا ”ین“ لگا

دیا جائے اور و سے پہلے حرف ہر نیش اور ی سے پہلے حرف ہر زیر دیدیا جائے۔ (آخری نون پر ہمیشہ زیر رہیگا) مثلاً۔

عَالِمٌ سے جمع مذکر سالم - عَالِمُونَ یا عَالِمِينَ آئیگا۔

جمع مؤنث سالم بنانے کے لئے واحد کے آخر میں ات کا اضافہ کر دیا جائے، مثلاً۔

عَالِمٌ سے جمع مؤنث سالم عَالِمَاتٌ آئیگا۔

(ت کہاں آئیگا اور ت کہاں۔ اس کا تعلق نحو کے قاعدوں سے ہے)۔

وہ جمع جس میں واحد جوں کا توں نہیں رہتا بلکہ اس میں

جمع مکسر

کچھ تبدیلی آ جاتی ہے "جمع مکسر" کہلاتی ہے۔ مثلاً

کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ - رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ - قَلَمٌ کی جمع اَقْلَامٌ - رَجُلٌ کی جمع رِجَالٌ۔

اس جمع کے بہت سے اوزان ہیں اور مختلف وزنوں پر آنے والے اسموں کی مختلف وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے۔ یہاں چند کثیر الاستعمال جمعوں کے اوزان مع امثلہ درج کئے جاتے ہیں:

(۱) اَفْعَالٌ (کے وزن پر)۔ جیسے قَلَمٌ کی جمع اَقْلَامٌ اور رَبٌّ کی جمع اَرْبَابٌ۔

(۲) اَفْعُلٌ (کے وزن پر)۔ جیسے رَجُلٌ کی جمع اَرْجُلٌ اور نَفْسٌ کی جمع اَنْفُسٌ۔

(۳) اَفْعِلَةٌ (کے وزن پر)۔ جیسے لِسَانٌ کی جمع اَلْسِنَةُ۔

(۴) فِعْلَةٌ (کے وزن پر)۔ جیسے قَتْلٌ کی جمع فِثْمَةٌ۔

- (۵) فَعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے صُورَةُ کی جمع صُورٌ -
- (۶) فَعُولٌ (کے وزن پر) - جیسے بَيْتٌ کی جمع بِيَّوتٌ -
- (۷) فَعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے قِطْعَةٌ کی جمع قِطَعٌ -
- (۸) فَعَالٌ (کے وزن پر) - جیسے ثُوبٌ کی جمع ثِيَابٌ -
- (۹) فَعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے أَحْوَرٌ کی جمع حَوَرٌ -
- (۱۰) فَعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے كِتَابٌ کی جمع كُتُبٌ -
- (۱۱) فَعْمَلِيٌّ (کے وزن پر) - جیسے مَرِيضٌ کی جمع مَرَضِيٌّ -
- (۱۲) فَعْلَةٌ (کے وزن پر) - جیسے كَافِرٌ کی جمع كُفَرَةٌ -
- (۱۳) فَعْعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے رَاكِعٌ کی جمع رُكْعٌ -
- (۱۴) فُعْلَاءٌ (کے وزن پر) - جیسے سَفِيهَةٌ کی جمع سَفَاهَاءٌ -
- (۱۵) أَفْعِلَاءٌ (کے وزن پر) - جیسے غَنِيٌّ کی جمع أَغْنِيَاءٌ -
- (۱۶) فَعَالِلٌ (کے وزن پر) - جیسے نُسْرُقٌ کی جمع نُسَارِقٌ -
- (۱۷) فَعْمَائِلٌ (کے وزن پر) - جیسے أَرِيكَةٌ کی جمع أَرَائِكٌ -
- (۱۸) فَوَاعِلٌ (کے وزن پر) - جیسے كَاعِبٌ کی جمع كَوَاعِبٌ -
- (۱۹) أَفْعَالٌ (کے وزن پر) - جیسے اصْبِعٌ کی جمع اصْبَاعٌ -
- (۲۰) أَفْعَالٌ (کے وزن پر) - جیسے أُسْطُورَةٌ کی جمع أُسْطُطِيرٌ -
- (۲۱) فَعَالِلٌ (کے وزن پر) - جیسے قِرْطَاسٌ کی جمع قِرَاطِيسٌ -

(۲۲) مَفْعًا عَلٍ (کے وزن پر) - جیسے مَسْجِدٌ کی جمع مَسَاجِدٌ -

(۲۳) مَفْعًا عِیْلٌ (کے وزن پر) - جیسے مَسْكِبِیْنٌ کی جمع مَسَکِبِیْنٌ -

انگریزی زبان کے ان دو فقروں پر غور کیجئے :

### نکرہ اور معرفہ

1. On my way to Lahore I saw a house.

2. The house was an old one.

عربی : (۱) رَأَيْتُ فِي طَرِيقِي إِلَى لَاهُورِ بَيْتًا -

(۲) وَكَانَ الْبَيْتُ قَدِ يَمًّا جَدًّا -

اردو ترجمہ : (۱) لاہور جاتے وقت میں نے ایک مکان دیکھا -

(۲) وہ مکان بہت پرانا تھا -

پہلے فقرہ میں لفظ لاہور ایک شہر کا نام ہے ' اسے (Proper Noun) یا اسم معرفہ کہتے ہیں - عربی زبان میں بھی ایسے اسماء کو معرفہ ہی کہتے ہیں - اس سے آگے (بَيْتًا = A house) ہے - یعنی ایک مکان ' اسے (Common Noun) یا اسم نکرہ کہتے ہیں - عربی میں بھی اسے اسم نکرہ ہی کہتے ہیں -

اگلے فقرہ میں الْبَيْتُ = The house کے معنی "کوئی مکان" نہیں بلکہ اس سے مطلب وہی مکان ہے جس کا ذکر پہلے فقرہ میں آچکا ہے - یعنی اب یہ لفظ (house) نکرہ یا (Common Noun) نہیں رہا بلکہ معرفہ (Proper Noun) بن گیا -

گویا اسم معرفہ دو قسم کا ہوا - ایک تو وہ جو پہلے ہی معرفہ ہو - جیسے لاہور - زید وغیرہ اور ایک وہ جسے نکرہ سے معرفہ بنا لیا جائے -

عربی زبان میں اسم نکرہ ہر تنوین آتی ہے - تنوین دو زہر - دو زیر - دو پیش کو کہتے ہیں - انہیں تنوین اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس حرف پر تنوین ہو اس کے آخر میں نون کی آواز نکلتی ہے - جیسے نَسَلًا، رَجُلٌ، قَلَمٌ -

اسے سمجھ رکھئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس اسم پر تنوین ہو وہ ضرور نکرہ

ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ نُوحٌ - لُوطٌ - مُحَمَّدٌ (علیہم السلام) جیسے انبیاء کرام کے اسماء ہر تنوین ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو اسم نکرہ ہو اس پر تنوین ہو۔

نکرہ سے معرفہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ نکرہ سے پہلے اَلْ لگا دیا جائے۔ مثلاً بَيْتٌ کے معنی ہیں کوئی گھر (A house) اور الْبَيْتُ کے معنی ہیں وہ خاص گھر (The house)۔ گویا عربی زبان کا اَلْ وہی کام کرتا ہے جو انگریزی زبان کا (Definite Article, The) کرتا ہے۔ جس اسم سے پہلے اَلْ آجائے اس پر تنوین نہیں آتی۔ اسم کے متعلق مذکورہ تفصیلات کے بعد اب ان مختلف اسماء کو دیکھنے جو مادہ سے مشتق ہوئے ہیں۔

**۱۔ مصدر** | اردو میں مصدر (مثلاً مارنا) سے افعال بنتے ہیں (اس نے مارا۔ وہ مارتا ہے۔ وہ مارے گا۔ تو مارا، وغیرہ) لیکن عربی زبان میں افعال 'مصدر اور جملہ اسماء وغیرہ دو حقیقت مادہ سے بنتے ہیں۔ مثلاً ضرب (ضرب) مادہ ہے۔ اس سے ضَرَبَ فعل ماضی بنا جس کے معنی ہیں "اس نے مارا"۔ اور الضربُ مصدر ہے جس کے معنی ہیں "مارنا۔ مار۔ چوٹ"۔ ثلاثی مجرد کے مصادر کے اوزان تو غیر معین ہیں لیکن ثلاثی مزید فیہ اور رباعی کے مصادر ان کے ابواب کے مطابق معینہ اوزان پر بنائے جاتے ہیں<sup>۱</sup>

ثلاثی مجرد کے مصادر کے چند اہم اوزان درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) اگر فعل کسی فن یا پیشہ سے متعلق ہو تو اس کا مصدر "فِعَالَةٌ"۔

کے وزن پر آتا ہے۔ مثلاً كِتَابَةٌ (کتابت)۔ تِجَارَةٌ (تجارت)۔ قِرَاءَةٌ (پڑھنا)۔

(۱) ثلاثی مجرد۔ ثلاثی مزید فیہ، رباعی وغیرہ اصطلاحات یہاں پہلی مرتبہ آئی ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے آئندہ باب دیکھیں جس میں "ابواب اور ان کے خواص" کا ذکر ہے۔



(۲) فَعَلَ وزن کی ماضی اگر لازم ہو تو اس کا مصدر فَعَّلٌ کے وزن پر

آئیگا۔ جیسے غَضِبَ سے مصدر غَضَبٌ - فَرَحَ سے مصدر فَرَحٌ -

(۳) فَعَّلَ وزن کی ماضی اگر لازم ہو تو اس کا مصدر فُعِّلَ کے وزن پر

آئیگا۔ جیسے قَعَدَ سے مصدر قَعَّوْدٌ - خَرَجَ سے مصدر خَرَّوَجٌ -

(۴) فَعَّلَ اور فَعَّلَ کے وزنوں پر ماضی اگر متعدی ہو تو اس کا مصدر

فَعَّلَ کے وزن پر آتا ہے۔ جیسے سَمِعَ سے مصدر سَمِعَ اور نَصَرَ سے

مصدر نَصَرَ -

ہم نے یہ اوزان بطور مثال دیدئے ہیں ورنہ ثلاثی مجرد کے مصادر کے اور بھی

بہت سے اوزان ہیں۔

۲۔ مصدر میمی | مصدر کی ایک قسم مَفْعَلٌ کے وزن پر آتی ہے اور وہ

مصدر میمی کہلاتی ہے۔ مثلاً شَرَبَ فعل سے مَشْرَبٌ مصدر میمی ہے اور یہی وزن اسم

ظرف کا بھی ہے۔

۳۔ اسم مَرَّة | کسی کام کو ایک بار کرنے کے لئے ہر فعل سے فَعْلَامَةٌ کے وزن

پر "اسم مَرَّة" بنا لیا جاتا ہے۔ مثلاً سَكَّرَ (ایک بار مدھوش ہونا) - نَظَرَا

(ایک بار دیکھنا)۔

۴۔ اسم نوع | کسی کام کی وضع ہیئت - ڈھنگ بتانے کے لئے اس فعل سے فَعْلَةٌ

کے وزن پر اسم نوع بنا لیا جاتا ہے۔ جیسے سِيرَ (چلنے کا ڈھنگ وضع یا ہیئت)۔

ہر فعل سے اس کام کے کرنے یا ہونے کی جگہ یا وقت  
 بتانے کے لئے مَفْعَلٌ (ع ہر زہر اور زہر حسب قاعدہ)<sup>۱</sup>  
 کے وزن پر اسم مکان یا زمان بنا لیا جاتا ہے ۔

۵۔ اسم مکان و زمان  
 (ظرف)

### اسم زمان و مکان کی شکلیں

مَفْعَلٌ	واحد	قتل کرنے کی جگہ ، قتل گاہ قتل کرنے کا وقت یا زمانہ	مَفْعَلٌ
	مثنیٰ	دو قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے دو وقت یا دو زمانے	مَفْعَلَانِ مَفْعَلَيْنِ
	جمع	قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے اوقات یا زمانے	مَفَاعِلُ
مَفْعَلٌ	واحد	قتل کرنے کی جگہ قتل کرنے کا وقت یا زمانہ	مَفْعَلٌ
	مثنیٰ	دو قتل کرنے کی جگہیں دو قتل کرنے کے وقت یا زمانے	مَفْعَلَانِ مَفْعَلَيْنِ
	جمع	قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے اوقات یا زمانے	مَفَاعِلُ

اسی طرح مَغْرِبٌ (سورج غروب ہونے کی جگہ یا وقت) - مَسْجِدٌ (سجدہ کرنے

۱۔ اگر مضارع کے "ع" ہر زہر یا پیش ہو تو اسم ظرف کے "ع" ہر زہر ہوگا

ورنہ زہر ۔

کی جگہ یا وقت)۔ مَقْعِدٌ (بیٹھنے کی جگہ یا وقت) وغیرہ۔ یہ ثلاثی مجرد سے اسم زمان و مکان بنانے کا وزن ہے۔ ثلاثی مزید فیہ وغیرہ سے اسم مفعول کی شکل ان معنوں کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے، مثلاً مُغْتَسِلٌ (غسل کرنے کی جگہ یا غسل کرنے کا وقت) اور مُسْتَقَرٌّ (ٹھہرنے اور قرار پانے کی جگہ یا وقت)۔

۶۔ اسم آلہ | ہر فعل سے اس آلہ کے لئے جس کے ذریعہ وہ کام کیا جائے مَفْعَلٌ - مَفْعَالٌ کے وزنوں پر اسم آلہ بنایا جاتا ہے۔

### اسم آلہ کی شکلیں

الْمَارِيءُ	واحد	مارنے یا چوٹ لگانے کا آلہ	مَضْرِبٌ - مَضْرَابٌ
	مثنیٰ	مارنے یا چوٹ لگانے کے دو آلے	مَضْرِبَانِ - مَضْرَابَانِ مَضْرِبَيْنِ - مَضْرَابَيْنِ
	جمع	مارنے یا چوٹ لگانے کے آلے	مَضْرِبٌ - مَضْرَابٌ
الْمُؤَنِّسُ	واحد	مارنے یا چوٹ لگانے کا آلہ	مَضْرِبَةٌ
	مثنیٰ	مارنے یا چوٹ لگانے کے دو آلے	مَضْرِبَتَانِ مَضْرِبَتَيْنِ
	جمع	مارنے یا چوٹ لگانے کے آلے	مَضْرِبٌ - مَضْرَابٌ

اسی طرح مِفْتَاحٌ (کھولنے کا آلہ ، کنجی) - مِيزَانٌ (تولنے کا آلہ ، ترازو) وغیرہ ۔

۷۔ اسم فاعل | ہر فعل سے اس کام کو کرنے والے کے لئے ایک اسم ”فَاعِلٌ“ کے وزن پر بنا لیا جاتا ہے ۔

### اسم فاعل کی شکلیں

(ACTIVE PARTICIPLE NOUN)

مذكر	واحد	جاننے والا	عَالِمٌ
	مثنی	دو جاننے والے	عَالِمَانِ عَالِمَيْنِ
	جمع	جاننے والے (بہت سے)	عَالِمُونَ عَالِمِينَ
مؤنث	واحد	جاننے والی	عَالِمَةٌ
	مثنی	دو جاننے والیاں	عَالِمَتَانِ عَالِمَتَيْنِ
	جمع	جاننے والیاں (بہت سی)	عَالِمَاتٌ

اسی طرح ظَالِمٌ ، قَاتِلٌ ، جَاهِلٌ وغیرہ سے بھی شکلیں بنائی جا سکتی ہیں ۔

یہ ثلاثی مجرد کے اسم فاعل کی شکلیں ہیں۔ ثلاثی مزید فیہ اور رباعی سے اسم فاعل کی شکلیں "ایواب اور ان کے خواص" میں دیکھئے۔

۸۔ اسم مفعول | ہر متعدی فعل سے اس چیز کے لئے جس پر کام کیا جائے ایک اسم "مفعول" کے وزن پر بنا لیا جاتا ہے۔

### اسم مفعول کی شکلیں (PASSIVE PARTICIPLE NOUN)

مذکر	واحد	قتل کیا ہوا	مَقْتُولٌ
	مثنیٰ	دو قتل کئے ہوئے	مَقْتُولَانِ مَقْتُولَيْنِ
	جمع	بہت سے قتل کئے ہوئے	مَقْتُولُونَ مَقْتُولِينَ
مؤنث	واحد	قتل کی ہوئی	مَقْتُولَةٌ
	مثنیٰ	دو قتل کی ہوئیں	مَقْتُولَتَانِ مَقْتُولَتَيْنِ
	جمع	بہت سی قتل کی ہوئیں	مَقْتُولَاتٌ

اسی طرح مَعْدُودٌ، مَعْرُوفٌ، مَسْنُورٌ وغیرہ سے تمام شکلیں بنائی جا سکتی ہیں۔ یہ ثلاثی مجرد کے افعال سے اسم مفعول کی شکلیں ہیں۔ ثلاثی مزید فیہ اور رباعی سے مفعول کا وزن "ایواب اور ان کے خواص" میں دیکھئے۔

۹ اسم صفت | عربی زبان میں اسم صفت (Adjective) کے بہت سے اوزان ہیں۔ ان میں زیادہ استعمال ہونے والے اوزان حسب ذیل ہیں۔

(۱) فَعِيلٌ - جیسے کَرِيمٌ - لَطِيفٌ -

(۲) فَعَلٌ - جیسے حَسَنٌ -

(۳) فَعِلٌ - جیسے سَهْلٌ - صَعْبٌ -

(۴) أَفْعَلٌ - جیسے أَسْوَدٌ - أَبْيَضٌ - أَعْرَجٌ -

۱۰۔ اَفْعَلُ التَّفْضِيلِ | جب دو آدمیوں میں 'ایک دوسرے سے مقابلہ ہو اور ہم بتانا چاہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے

سے بڑھا ہوا (یا سب سے بڑھا ہوا) ہے تو اس کے لیے أَفْعَلُ کے وزن پر اَفْعَلٌ

اَلتَّفْضِيلِ بنالی جاتی ہے۔ جیسے اَعْلَمُ (بہت زیادہ جاننے والا) وغیرہ۔ دو کے

درمیان مقابلہ ہو تو (Comparative Degree) کہیں گے اور سب کے ساتھ مقابلہ ہو تو (Superlative Degree)۔

### اَفْعَلُ التَّفْضِيلِ کی شکلیں

مذکر	واحد	زیادہ چھوٹا - بہت چھوٹا	أَصْغَرُ
	مثنیٰ	دو زیادہ چھوٹے	أَصْغَرَانِ - أَصْغَرَيْنِ
	جمع	بہت سے زیادہ چھوٹے	أَصْغَرُونَ - أَصْغَرِينَ أَصَاغِرُ
مؤنثی	واحد	زیادہ چھوٹی	صَغْرَى
	مثنیٰ	دو زیادہ چھوٹی	صَغْرَيَانِ صَغْرَيْنِ
	جمع	بہت سی زیادہ چھوٹی	صَغَرِيَّاتُ - صَغَرٍ

۱۱۔ اوزان مبالغہ | جب کسی صفت میں زور و شدت اور زیادتی کا اظہار کرنا ہو، تو مختلف فعلوں سے مبالغہ کے اوزان (Exaggerative)

(Adjective استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں زیادہ استعمال ہونے والے یہ ہیں۔

(۱) فَعْمَالٌ - جیسے تَوَابٌ - عَلَامٌ - غَفَّارٌ -

(۲) فَعْمِيلٌ - جیسے صَدِيقٌ -

(۳) مَفْعَمِيلٌ - جیسے مَسْكِينٌ -

(۴) فُعْلَمَةٌ - جیسے هُمْزَةٌ - لَمْزَةٌ -

(۵) فَعْلٌ - جیسے اَسْفٌ - فَرَحٌ -

(۶) فَعْمِيلٌ - جیسے رَحِيمٌ - عَظِيمٌ -

(۷) فَعْمُولٌ - جیسے غَفُورٌ - وَدُودٌ - ظَلُومٌ -

(۸) فَعْمَالٌ - جیسے کِبَارٌ -

(۹) فَعْمُولٌ - جیسے قِيَوْمٌ -

(۱۰) فَعْمَلَانٌ - جیسے رَحْمَنٌ - غَضَبَانٌ -

ضمائر | جب ہم کہتے ہیں "حامد آیا" تو آپ کے ذہن میں فوراً ایک آدمی آجاتا ہے جس کا نام حامد ہے۔ اسے اسم ظاہر کہتے ہیں۔ یعنی بالکل

کھلا ہوا نام۔ لیکن جب ہم کہیں "وہ آیا" تو اگرچہ اس وقت بھی ہم کسی آدمی کے آنے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے متعین نہیں ہوتا کہ کون آیا۔

مگر جب ہم کہیں "حامد آیا۔ وہ بیمار تھا"۔ تو اب اس لفظ "وہ" سے

مطلب سمجھ میں آگیا۔ یعنی "حامد"

لہذا لفظ "وہ" کے اندر حامد کا نام چھپا ہوا ہے۔ پوشیدہ اسموں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً :

### (۱) اسم ضمیر (PRO-NOUN)

جب اسمائے ضمیر شروع میں آئیں تو ان کی شکل اس طرح ہوتی ہے۔

غائب			مخاطب (حاضر)			مستکلم		
واحد	مثنیٰ	جمع	واحد	مثنیٰ	جمع	واحد	مثنیٰ	جمع
ہُوَ	ہُمَا	ہُم	أَنْتَ	أَنْتُمَا	أَنْتُمْ	أَنَا	نَحْنُ	نَحْنُ
ہِیَ	ہُنَّ	هِنَّ	أَنْتِ	أَنْتِیْنِ	أَنْتِیْنِ			

لیکن جب ان ضمائر سے پہلے کوئی اسم یا فعل یا حرف مل کر آئے تو ان کی حسب ذیل شکلیں ہو جاتی ہیں :

غائب			مخاطب (حاضر)			مستکلم		
واحد	مثنیٰ	جمع	واحد	مثنیٰ	جمع	واحد	مثنیٰ	جمع
ہُوَ	ہُمَا	ہُم	کَ	کُمَا	کُمْ	یَا	یَا	یَا
ہِیَ	ہُنَّ	هِنَّ	کِ	کُنَّ	کُنَّ			

(۲) اسم اشارہ | پوشیدہ اسماء کی دوسری قسم اسم اشارہ (Demonstrative Pronoun) ہے۔ جیسے :



(۱) اشارہ قریب :

مؤنث			مذکر		
جمع	مثنیٰ	واحد	جمع	مثنیٰ	واحد
هَؤُلَاءِ	هَاتَانِ هَاتَيْنِ	هَذِهِ	هَؤُلَاءِ	هَذَانِ هَذَيْنِ	هَذَا

(ب) اشارہ بعید :

مؤنث			مذکر		
جمع	مثنیٰ	واحد	جمع	مثنیٰ	واحد
أُولَئِكَ	تَئَانِكَ تَيْنِكَ	تِلْكَ	أُولَئِكَ	ذَانِكَ ذَيْنِكَ	ذَلِكَ

نوٹ : ذَٰلِكَ اشارہ قریب اور بعید دونوں کے لئے آتا ہے ۔

ہوشیدہ اسماء کی تیسری قسم اسم موصول (Relative

(۳) اسم موصول

Pronoun) ہے ۔ جیسے :

مؤنث			مذکر		
جمع	مثنیٰ	واحد	جمع	مثنیٰ	واحد
الَّتِي الَّتِي	الَّتَانِ الَّتَيْنِ	الَّتِي	الَّذِينَ	الَّذَانِ الَّذَيْنِ	الَّذِي

ہوشیدہ اسماء کی چوتھی قسم اسمائے استفہام

(۴) اسمائے استفہام

(Interrogative Pronoun) ہے ۔ جیسے : مَنْ (کون

شخص) اور مَا (کونسی چیز) ۔

## مادہ اور اس کے حروف

گزشتہ صفحات میں آپ ثلاثی مجرد - ثلاثی مزید فیہ - رباعی وغیرہ اصطلاحی الفاظ پڑھ

چکے ہیں۔ ان کا تفصیلی بیان تو آئندہ باب میں آئے گا، جہاں یہ بتایا جائیگا کہ ”ابواب اور ان کے خواص“ کیا ہوتے ہیں۔ اس مقام پر مختصر الفاظ میں دیکھئے کہ ان کا مطلب کیا ہے۔

عربی زبان میں استعمال ہونے والے اکثر و بیشتر الفاظ کے مادے تین حروف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو **ثلاثی** (تین حرفوں والا) کہتے ہیں۔ لیکن بعض مادے تین سے زیادہ حروف بھی رکھتے ہیں۔ جس مادہ میں چار حرف ہوں اسے **رباعی** اور جس میں پانچ ہوں اسے **خمس** کہتے ہیں۔ ذیل میں رباعی مادہ ”زل زل“ سے افعال اور اسماء کی ایک ایک شکل بطور مثال درج کی جاتی ہے۔

ماضی معروف	مضارع معزوف	ماضی مجہول	مضارع مجہول	اسم
زَلَزَلَ	يُزَلِّزُ	زَلَزَلَ	يُزَلِّزُ	زَلَزَلَ
نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر	
لَا تُزَلِّزُ	مَزَلَزَلَ	مَزَلَزَلَ	زَلَزَلَةً - زَلَزَالٌ	

نوٹ: قاعدے کی رو سے رباعی مادوں کو ثلاثی سے الگ لکھنا چاہئے لیکن بہت سے ارباب لغت انہیں ثلاثی کے تحت ہی لکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی لغت میں انہیں (بجز مستثنیات) عام طور پر ثلاثی کے تحت لکھا ہے۔ لیکن اسکی تصریح کر دی ہے کہ یہ رباعی ہے۔

## مادہ میں حرف علت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عربی کے ان الفاظ کا مادہ تو نسبتاً آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے جن

میں حروف صحت ہوں، لیکن جن مادوں میں حروف علت ہوں ان کا دریافت کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے، بالخصوص واوی اور یائی میں یہ معام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے

کہ اس مادہ میں واو ہے یا ی ۔ بعض شکلوں میں اگر واوی کو یائی یا یائی کو واوی سمجھ لیا جائے تو معنوں میں بہت فرق پڑ جاتا ہے ۔ مثلاً صَلَّی ایک لفظ ہے ۔ اگر اسے صلو (مادہ) سے لیا جائے تو اس کے معنی ہونگے "صلوۃ ادا کرنا" اور اگر صلی (مادہ) سے لیا جائے تو اس کے معنی ہونگے "آگ میں جھونکنا" ۔ چونکہ عربی نہ جاننے والوں کے لئے یہ متعین کرنا از بس دشوار (بلکہ ناممکن) ہے کہ کسی لفظ کا صحیح مادہ کیا ہے اس لئے ہم نے زیر نظر لغات کے شروع میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کو انہی شکلوں میں لکھ کر جن میں وہ قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے سامنے ان کا مادہ لکھ دیا ہے ۔ آپ جس لفظ کے معنی معلوم کرنا چاہیں اسے پہلے اس فہرست میں دیکھ کر متعین کر لیں کہ اس کا مادہ کیا ہے ' پھر اس مادہ کے معنی لغات میں دیکھ لیں ۔

ذیل میں ہم چند مثالیں درج کرتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ جن مادوں میں حروف علت آتے ہیں ان میں مختلف اوزان اور ابواب میں جا کر کیا کیا (تعجب انگیز اور پریشان کن) تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ۔

نوٹ : اس مقام پر آپ ابواب کے صرف نام دیکھ جائیے ان کا تفصیلی تعارف اور خواص آئندہ باب میں سامنے آئیں گے ۔

## حروف علت والے مادوں میں تبدیلیوں کی مثالیں

### پہلی مثال مادہ - و ع د

مادہ	فعل کی قسم	فعل ماضی	فعل مضارع	اسم	نہی
و	معلوم	وَعَدَ	يَعِدُ	عِد	لَا تَعِدْ
و	مجہول	وَعِدَ	يُوْعِدُ	لِئَوْعِدَ	لَا تُؤْعِدْ

## دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
و	وَاَعِدْ	مَوْعِدٌ	اَوْعِدْ	مِيعَادٌ	مَوْعِدٌ

## دوسری مثال مادہ د ع و

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
د ع و	معلوم	دَعَا	يَدْعُو	ادْعُ	لَا تَدْعُ
	مجهول	دُعِيَ	يُدْعَى	لِئْتَدْعَ	لَا تُدْعَ

## دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
د ع و	دَاعٍ، الدَّاعِي	مَدْعُوٌّ	ادْعَى	مَدْعَى	مَدْعَى

## تیسری مثال مادہ و ق ی

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
و ق ی	معلوم	وَقَى	يَقِي	قِ	لَا تَقِ
	مجهول	وُقِيَ	يُوقَى	لِيُوقَ	لَا يُوقَ

## دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
و ق ی	وَاقٍ، الوَاقِي	مَوْقَى	اَوْقَى	مِيقَى	مَوْقَى

## چوتھی مثال مادہ ق و ل

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
ق و ل	معلوم	قَالَ	يَقُولُ	قُلْ	لَا تَقُلْ
	مجهول	قِيلَ	يُقَالُ	لِيَقُلْ	لَا يُقُلْ

## دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
ق و ل	قَائِلٌ	مَقُولٌ	أَقُولُ	مِقُولٌ	مَقَالٌ

## پانچویں مثال مادہ ب ی ع

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
ب ی ع	معلوم	بَاعَ	يَبِيعُ	بِعْ	لَا تَبِيعْ
	مجهول	بِيعَ	يُبَاعُ	لِيَبِيعَ	لَا يَبِيعَ

## دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
ب ی ع	بَائِعٌ	مَبِيعٌ	أَبِيعُ	مَبِيعٌ	مَبَاعٌ

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

لغات القرآن

۲۵

مبادیات

مادہ	قسم	فعل	تفعیل	افعال	افتعال	تفاعیل	مفاعله	تفعل	استفعال
وعد	معلوم	ماضی	وعد	اوعد	اتعد	تواعد	واعد	توعد	استوعد
		مضارع	یوعد	یوعد	یتعد	یتواعد	یواعد	یتوعد	یستوعد
	مجهول	ماضی	وعد	اوعد	اتعد	تووعد	ووعد	توعد	استوعد
		مضارع	یوعد	یوعد	یتعد	یتواعد	یواعد	یتوعد	یستوعد
		کام	وعد	اوعد	اتعد	تواعد	واعد	توعد	استوعد
		نهی	لا توعد	لا توعد	لا تتعد	لا تتواعد	لا تتواعد	لا تتوعد	لا تستوعد
		فاعل	سوعد	سوعد	ستعد	ستواعد	مواعد	سوعد	مستوعد
		مفعول	سوعد	سوعد	ستعد	ستواعد	مواعد	سوعد	مستوعد

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تَفَعُّلٌ	اِفْعَالٌ	اِفْتَعَالٌ	تَفَاعُلٌ	مُفَاعَلَةٌ	تَفَعَّلَ	اِسْتَفْعَالٌ
دع و	معلوم	ماضی	دَعَى	أَدْعَى	أَدْعَى	تَدَا عَى	دَا عَى	تَدَعَّى	اِسْتَدْعَى
دع و	مضارع	يَدْعَى	يَدْعَى	يَدْعَى	يَدْعَى	يَتَدَا عَى	يُدَا عَى	يَتَدَعَّى	يَسْتَدْعَى
دع و	ماضی	دَعَى	دَعَى	أَدْعَى	أَدْعَى	تَدَوَّعَى	دَوَّعَى	تَدَعَّى	اِسْتَدْعَى
دع و	مضارع	يَدْعَى	يَدْعَى	يَدْعَى	يَدْعَى	يَتَدَا عَى	يُدَا عَى	يَتَدَعَّى	يَسْتَدْعَى
دع و	لا	دَعَّ	أَدَعَّ	أَدَعَّ	أَدَعَّ	تَدَا عَ	دَا عَ	تَدَعَّ	اِسْتَدَاعَ
دع و	نہی	لَا تُدْعَ	لَا تُدْعَ	لَا تُدْعَ	لَا تُدْعَ	لَا تُدَاعَ	لَا تُدَاعَ	لَا تُدَعَّ	لَا تُسْتَدْعَ
دع و	اسم فاعل	مُدْعٍ، الْمُدْعَى	مُدْعٍ، الْمُدْعَى	مُدْعٍ، الْمُدْعَى	مُدْعٍ، الْمُدْعَى	مُدَّاعٍ، الْمُدَّاعَى	مُدَّاعٍ، الْمُدَّاعَى	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُسْتَدْعٍ، الْمُسْتَدْعَى
دع و	مفعول	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُدَّاعٍ، الْمُدَّاعَى	مُدَّاعٍ، الْمُدَّاعَى	مُدَّعٍ، الْمُدَّعَى	مُسْتَدْعٍ، الْمُسْتَدْعَى

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تَفْعِيل	اَفْعَال	اَفْعَال	تَفْعَال	مُفَاعِلَه	تَفْعَل	اِمْتِفَاعِل
وقی	معلوم	ماضی	وقی	أوقی	اتقی	تَوَاقی	وَاقی	تَوَقی	اَسْتَوَقی
	مضارع	یوقی	یوقی	یوقی	یتقی	یتَوَاقی	یوَاقی	یتَوَقی	یَسْتَوَقی
	ماضی	وقی	وقی	أوقی	أتقی	تَوَوَقی	وَوَقی	تَوَوَقی	اَسْتَوَقی
	مضارع	یوقی	یوقی	یوقی	یتقی	یتَوَاقی	یوَاقی	یتَوَقی	یَسْتَوَقی
وقی		ر	وقی	أوقی	اتقی	تَوَاقی	وَاقی	تَوَقی	اَسْتَوَقی
	نهی	لا تَوَقی	لا تَوَقی	لا تَوَقی	لا تَتَقی	لا تَتَوَاقی	لا تَوَاقی	لا تَتَوَقی	لا تَسْتَوَقی
	فاعل	موقی - الموقی	موقی - الموقی	موقی - الموقی	متقی - المستقی	متَوَاقی - المتَوَاقی	مَوَاقی - المَوَاقی	مَتَوَقی - المتَوَقی	مَسْتَوَقی - المستَوَقی
وقی		موقی	موقی	موقی	متقی	متَوَاقی	مَوَاقی	مَتَوَقی	مَسْتَوَقی



[illegible]

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تَفْعِيل	اَفْعَال	اَفْتَعَال	تَفَاعُل	مُفَاعَلَة	تَفَعُّل	اِسْتَفْعَال
مادہ	معلوم	بَا	بِيع	اَبَاع	اَبْتَاع	تَبَا يَع	بَا يَع	تَبِيع	اَسْتَبَاع
		بَاع	يَبِيع	وَبِيع	وَبِيع	يَتَبَا يَع	وَبَا يَع	يَتَبِيع	وَيَسْتَبِيع
		بَاع	يَبِيع	اَبِيع	اَبْتِيع	تَبُو يَع	بُو يَع	تَبِيع	اَسْتَبِيع
مادہ	مجهول	بَا	بِيع	اَبَاع	اَبْتَاع	تَبَا يَع	بَا يَع	تَبِيع	اَسْتَبَاع
		بَاع	يَبِيع	وَبِيع	وَبِيع	يَتَبَا يَع	وَبَا يَع	يَتَبِيع	وَيَسْتَبِيع
		بَاع	يَبِيع	اَبِيع	اَبْتِيع	تَبُو يَع	بُو يَع	تَبِيع	اَسْتَبِيع
مادہ	مجهول	بَا	بِيع	اَبَاع	اَبْتَاع	تَبَا يَع	بَا يَع	تَبِيع	اَسْتَبَاع
		بَاع	يَبِيع	وَبِيع	وَبِيع	يَتَبَا يَع	وَبَا يَع	يَتَبِيع	وَيَسْتَبِيع
		بَاع	يَبِيع	اَبِيع	اَبْتِيع	تَبُو يَع	بُو يَع	تَبِيع	اَسْتَبِيع
مادہ	مجهول	بَا	بِيع	اَبَاع	اَبْتَاع	تَبَا يَع	بَا يَع	تَبِيع	اَسْتَبَاع
		بَاع	يَبِيع	وَبِيع	وَبِيع	يَتَبَا يَع	وَبَا يَع	يَتَبِيع	وَيَسْتَبِيع
		بَاع	يَبِيع	اَبِيع	اَبْتِيع	تَبُو يَع	بُو يَع	تَبِيع	اَسْتَبِيع
مادہ	مجهول	بَا	بِيع	اَبَاع	اَبْتَاع	تَبَا يَع	بَا يَع	تَبِيع	اَسْتَبَاع
		بَاع	يَبِيع	وَبِيع	وَبِيع	يَتَبَا يَع	وَبَا يَع	يَتَبِيع	وَيَسْتَبِيع
		بَاع	يَبِيع	اَبِيع	اَبْتِيع	تَبُو يَع	بُو يَع	تَبِيع	اَسْتَبِيع

**نگہ باز گشت** | مادہ اور اس کے مشتقات کا مختصر ما بیان آپ کے سامنے آچکا ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثال کے ذریعے آپ کے سامنے وہ تمام مختلف شکلیں آجائیں جو گذشتہ صفحات میں آپ کی نگاہوں سے گذری ہیں۔ اس سے آپ کو اس کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ زیر نظر لغت میں آپ کو ایک عنوان کے تحت کس کس قسم کے الفاظ بالعموم ملیں گے۔ مثلاً مادہ ہے۔

### فتح یعنی ف - ت - ح

اس مادہ کے تحت آپ کو فُتَحَ (فعل ماضی معروف) - فُتِحَ (فعل ماضی مجہول) - يَفْتَحُ (فعل مضارع معروف) - يَفْتَحُ (فعل مضارع مجہول) - اِفْتَحَ (اسم) - لَا تَفْتَحَ (نہی) - فَاتَحَ (اسم فاعل) - مَفْتُوحٌ (اسم مفعول) - مَفْتَحٌ (اسم ظرف) - مِفْتَاحٌ و مِفْتَاحٌ (اسم آلہ) - فِتْحٌ (اسم مبالغہ) وغیرہ ملیں گے۔ ان کے علاوہ فُتِحَ کے مختلف ابواب سامنے آئیں گے۔ مثلاً اِفْتَحَ (باب اِفْعَال) - فُتِحَ (باب تَفْعِيل) - فَاتَحَ (باب مُفَاعَلَة) - تَفَاتَحَ (باب تَفْعَال) - تَفَاتَحَ (باب تَفْعِيل) - اِفْتَحَ (باب اِفْعَال) - اِفْتَحَ (باب اِفْعَال) - اِفْتَحَ (باب اِفْعَال) وغیرہ بھی لکھے ہوئے ملیں گے۔

نوٹ : زیر نظر لغت میں ہر مادہ کے تحت یہ تمام مشتقات نہیں دئیے گئے۔ جس طرح لغت میں صرف وہی مادے دئیے گئے ہیں جن سے متعلق کوئی لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اسی طرح ہر مادہ کے تحت الفاظ کی صرف وہی شکلیں دی گئی ہیں جو قرآن مجید میں آئی ہیں (بعض مقامات میں ان تمام شکلوں کو بالتفصیل بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی) اس لئے کہ ہمارا یہ لغت قرآن کریم کا لغت ہے نہ ہی زبان کا مکمل لغت نہیں۔

## حروف

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ' عربی زبان کے تمام الفاظ تین قسموں کے ہوتے

ہیں - (۱) یا تو وہ لفظ نام ہوگا - اسے اسم کہا جاتا ہے - جیسے :

اللَّهُ - مُحَمَّدٌ - قَلْبُكَ - عَالِمٌ - قَتَلَ - تَعْلِيمٌ - وغیرہ -

(۲) یا وہ لفظ کسی کام کے کرنے یا ہونے کے لئے بولا جائے گا - اسے فعل

کہا جاتا ہے - مثلاً ذَہَبَ : وہ گیا (فعل ماضی) - يَسْأَلُ : وہ کھاتا ہے یا کھانے کا

(فعل مضارع) قُلْ : تو کہہ دے (فعل امر) وغیرہ

(۳) اور یا وہ حرف ہوگا - بالفاظ دیگر اگر کوئی لفظ نہ اسم ہے نہ فعل ' تو

وہ لازماً حرف ہوگا - مثلاً اس فقرہ میں

أَنَا - أَذْهَبُ - إِلَى - السَّيِّئَاتِ -

أَنَا اسم ضمیر ہے (معنی - میں) - أَذْهَبُ فعل ہے (میں جاتا ہوں) - السَّيِّئَاتِ

اسم ہے (معنی - گھر) - اب رہ گیا إِلَى - سو یہ حرف ہے (معنی - کی طرف) - فقرے کے

معنی ہونے - میں گھر کی طرف جاتا ہوں -

ہر چند حرف نہ اسم ہے نہ فعل اور دیکھنے میں بھی

زبان کا سب سے چھوٹا جزو ہے (مندرجہ بالا مثال میں

إِلَى پھر بھی وزن دار دکھائی دیتا ہے ورنہ خالی ب - ل بھی حروف ہیں)

لیکن زبان میں ان کی بڑی اہمیت ہے - یہ زبان میں ربط پیدا کرتے ہیں - اسماء اور

افعال کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں - گفتگو میں زور و قوت اور معنوں میں

ہمواری اور استواری پیدا کرتے ہیں - انہی سے اقرار اور انکار کا علم ہوتا ہے اور

انہی کے ذریعہ کلام میں استفہام - ترغیب - تاکید - تنبیہ کے معانی پیدا ہوتے ہیں -

ان کی تبدیلی سے فعل کا پورے کا پورا مفہوم بدل جاتا ہے - مثلاً "رغبت"

عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اگر ہم (عربی زبان میں) کہیں رَغِبْتُ اِلَيْهِ تو اس کے معنی ہوں گے "میں اس کی طرف مائل ہوا"۔ لیکن اگر اِلٰی (حرف) کی جگہ عَنِ آ جائے اور ہم کہیں رَغِبْتُ عَنْهُ تو اس کے معنی ہوں گے "میں نے اس سے اعراض برتا۔ اس سے منہ موڑا۔ اسے چھوڑ دیا"۔ آپ نے دیکھا کہ حرف (جو بظاہر نہ نام کا ہے نہ کام کا) کس طرح افعال کی ناک میں نکیل ڈالے انہیں ادھر سے اُدھر لے لے پھرتا ہے۔ یہ حروف وہی ہیں جنہیں انگریزی زبان میں (Prepositions) کہتے ہیں اور جن کی اہمیت کا غالباً آپ کو اندازہ ہے۔

**محذوفات کی جگہ** | اتنا ہی نہیں کہ یہ افعال کے معانی میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک حرف کتنے ایسے الفاظ کے معنی دے جاتا ہے جو اس فقرے میں کہیں نہیں ہوتے۔ یعنی وہ محذوف (Understood) ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَلْمُفْسِدُ مِنَ الْمَصْلِحِ ۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ مفسد کو مصلح سے جانتا ہے۔ لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ درحقیقت اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مفسد کو مصلح سے الگ کر کے۔ تمیز کر کے۔ فرق کر کے جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔ دیکھئے اس عبارت میں ایک حرف مِّن نے اس محذوف عبارت کا کام دے دیا۔ یا مثلاً قرآن میں ہے اَلَا (اِنَّ لَا) تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ۔ اس کا ویسے ترجمہ یہ ہوگا کہ "اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو یقیناً اللہ اس کی مدد کر چکا ہے"۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ کوئی حرج نہیں کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ (جس طرح) اللہ اس کی مدد (فلاں موقع پر) کر چکا ہے (اب بھی کرے گا)۔ چنانچہ عربی

زبان میں یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ اگر اَنْ (حرف شرط) کے جواب شرط سے پہلے فَقَدْ آجائے تو اس کا مفہوم وہ ہوتا ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔

**حرف کی قسمیں** | حرف کے اس تمہیدی تعارف کے بعد اب یہ دیکھئے کہ اس کی قسمیں کتنی ہیں۔ یہ قسمیں حروف کے انداز استعمال

کی رو سے کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) وہ حروف جو صرف افعال (Verbs) سے پہلے آتے ہیں۔ ان سے فعلوں کے معنوں میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً - لَمْ - لَنْ - قَدْ - سَ - سَوْفَ وغیرہ۔ لَمْ اور لَنْ دونوں مضارع پر آتے ہیں اور دونوں "تاکید کے ساتھ نفی" (نہ) کے معنی پیدا کرتے ہیں۔ لَمْ فعل مضارع کو فعل ماضی منفی کے معنوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے یَا کُلُّ (وہ کھاتا ہے یا کھائیکا) سے پہلے لَمْ آجائے تو لَمْ یَا کُلُّ کے معنی ہو جائیں گے "اس نے قطعاً نہیں کھایا"۔ اسی طرح جب اَرع سے پہلے حرف لَنْ آجائے تو اس کے معنی منفی مستقبل کے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً لَنْ یَا کُلُّ : "وہ قطعاً نہیں کھائیکا"

(۲) دوسری قسم کے حروف وہ ہیں جو تنہا لفظوں پر نہیں بلکہ جملوں پر آتے ہیں۔ مثلاً اِنَّ - اَنَّ - کَانَ - لَیْتَ - لَکِنْ - لَعَلَّ وغیرہ۔ جملوں کے پہلے آتے ہیں اور جملہ میں خاص معنی پیدا کر دیتے ہیں۔ جیسے اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یَقِیْنًا 'بے شک' یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

(۳) تیسری قسم کے وہ حروف ہیں جو اسم سے پہلے آتے ہیں۔ ب - فی - ل - عَلٰی - مِنْ - اِلٰی - عَنْ وغیرہ۔ جیسے ہَا لِقَلَمٍ (قلم سے 'قلم کے ساتھ) فِی الْبَیْتِ

(گھر میں)۔ اِلٰی اللّٰہ (اللہ کی طرف)۔ عربی زبان میں ان حروف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس اہمیت میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب ان سے پہلے فعل آئے۔ جیسا کہ ہم رَغِبْتُ اِلَيْهِ اور رَغِبْتُ عَنْهُ کی مثال میں بتا چکے ہیں۔

**حروف کا ترجمہ** نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے حروف تو اپنے معانی معین رکھتے ہیں لیکن نمبر ۳ کے حروف کچھ اس انداز سے آتے ہیں کہ اردو زبان میں ان کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ مفہوم کے اعتبار سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً

(۱) عَلٰی کے معنی "پر" اوپر" ہیں۔ عربی زبان میں کہیں گے عَلٰی سَفَر لیکن اردو میں اس کا ترجمہ "سفر پر" غیر فصیح ہوگا۔ "سفر میں" ٹھیک ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ "اگر تم سفر پر ہو"۔ ہم کہیں گے "اگر تم سفر میں ہو"۔

(۲) یا مثلاً ل کے معنی "لئے یا واسطے" ہیں۔ جیسے لَزَّ يَدُ : زيد کے لئے یا زيد کے واسطے۔ لیکن جب ہم اس سے پہلے فعل لا کر قُلْتُ لَزَّ يَدُ کہیں گے تو اس کا ترجمہ "میں نے زيد کے لئے کہا" نہیں ہوگا، اس کا صحیح ترجمہ ہوگا "میں نے زيد سے کہا"۔

اسی طرح ب کے معنی عموماً "ساتھ" یا "سے" کئے جاتے ہیں، لیکن مختلف فعلوں (VERBS) کے ساتھ آتے ہیں اس کا ترجمہ مختلف ہو جائیگا، جیسے

(۱) ذَهَبَ بِاِلَيْكَ : لفظی ترجمہ۔ وہ کتاب کے ساتھ گیا۔ یا محاورہ ترجمہ۔ وہ کتاب لے گیا۔

(۲) حَكَمَ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہ : لفظی ترجمہ۔ اس نے ما انزل اللہ کے ساتھ فیصلہ کیا۔ یا محاورہ ترجمہ۔ اس نے ما انزل اللہ (قانون خداوندی) کے مطابق فیصلہ کیا۔

آپ نے دیکھا، ان مثالوں میں کہیں بھی ب کے معنی " سے " یا " ساتھ " نہیں۔  
زیر نظر لغت میں حروف کا عام ترجمہ دیا گیا ہے۔ لیکن اردو زبان میں ان کا ترجمہ  
(عبارت کے لحاظ سے) الگ الگ ہوگا۔ اس کے لئے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں۔ زبان  
سے واقفیت اور تھوڑی سی مشق کے بعد سمجھ میں آ جاتا ہے کہ فلاں فقرہ میں  
حرف کا صحیح ترجمہ کیا ہونا چاہئے۔

**تفصیلی بیان** | جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عربی زبان میں حروف کو بڑی اہمیت  
حاصل ہے جس کے پیش نظر آپ گرامر (اور بعض لغت) کی کتابوں  
میں حروف کے متعلق بڑی طویل بحثیں دیکھیں گے۔ لیکن ہم نے اس مقام پر بھی، اور  
لغت کے اندر بھی بڑے اختصار سے کام لیا ہے اور فنی بحثوں، لفظی باریکیوں اور  
علمی اصطلاحوں سے قطع نظر کر کے حروف کے صرف وہ معانی بیان کر دئے ہیں جن کا  
استعمال عام ہوتا ہے۔ مثلاً گرامر کی کتابوں میں واو عطف کی بہت سی قسمیں دی گئی ہیں  
لیکن ان سب کا ترجمہ " اور " (and) ہی ہوتا ہے۔ ہم نے ان اقسام سے بحث  
نہیں کی۔ نیز ہم اس بحث میں بھی نہیں الجھے کہ ایک حرف کے آنے سے اسم میں کیا

کیا اعرابی 'رفع' (پیش) نصب (زہر) جر (زیر کی) تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ان مبتدا  
کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ  
کو عربی زبان کے الفاظ اور ان کی مختلف شکلوں کی اس قدر پہچان ہو جائے کہ مادہ کے  
معنی سمجھ لینے کے بعد ان مختلف شکلوں کا مفہوم بھی آپ کے سامنے آ سکے اور اس  
طرح آپ قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ فنی نکات آفریدیوں اور  
اصطلاحی موشگافیوں سے بحث کرنا ہمارے پیش نظر نہیں۔



## ابواب اور ان کے خواص

یہ بتایا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں ہر فعل مادہ سے بنتا ہے۔ مادہ ان اصلی حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل کی پہلی شکل وجود میں نہ آسکے۔ فعل کا مادہ کبھی تین حروف کا ہوتا ہے اور کبھی چار کا۔ (اسماء کے مادہ میں باج اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں) تین حرفی مادہ کو **ثَلَاثِي** کہتے ہیں۔ یہ **ثَلَاثَةٌ** سے بنتا ہے جس کے معنی "تین" ہیں۔ عربی زبان میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں۔ چار حرفی مادہ کو **رُبَاعِي** کہتے ہیں۔ یہ **أَرْبَعَةٌ** سے بنتا ہے جس کے معنی "چار" ہیں۔ عربی زبان میں رباعی افعال کم استعمال ہوتے ہیں۔

اگر کسی فعل کا مادہ تین حروف کا ہو اور اس کی ماضی کی پہلی شکل میں بھی تین حروف ہی ہوں تو وہ ثلاثی مجرد کہلاتا ہے۔ لیکن جب مادہ تین حروف کا ہو مگر ماضی

**ثلاثی مجرد اور  
ثلاثی مزید فیہ**

کی پہلی شکل میں تین حروف سے زیادہ ہوں تو اسے فعل کو ثلاثی مزید فیہ کہا جائیگا۔ آپ کو شاید اس پر تعجب ہوگا کہ جب مادہ تین ہی حروف کا ہے تو پھر فعل ماضی میں تین سے زیادہ حروف کیسے آسکتے ہیں؟ یہ اس طرح کہ ثلاثی مجرد میں کچھ حروف کا اضافہ کر دینے ہیں اور اس اضافہ سے وہ ایک نیا باب بن جاتا ہے اور بسا اوقات اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ یہی وہ تبدیلیاں ہیں (یعنی ابواب اور ان کے خواص) جن کی وضاحت کے لئے موجودہ عنوان آپ کے سامنے لایا گیا ہے۔ "ابواب اور ان کی خاصیتیں" عربی زبان کی منفرد خصوصیت ہے جس سے یہ زبان لامحدود وسعتوں کی حامل ہو گئی ہے، لہذا آپ اس عنوان کو بڑے غور سے دیکھئے۔

**ثلاثی مجرد کے ابواب** | ابواب ثلاثی مجرد کے بھی ہوتے ہیں اور ثلاثی مزید فیہ کے بھی۔ پہلے ثلاثی مجرد کے ابواب کو

لیجئے۔ یہ وہ ابواب ہیں جن کا مادہ سہ حرفی ہے اور ماضی کی پہلی شکل بھی سہ حرفی ہے۔

اور اس میں کسی حرف کا مزید اضافہ نہیں ہوتا ہے ' صرف حرکت بدل جانے سے باب بدل جاتا ہے ' اور حرکت بھی تینوں حروف کی نہیں بلکہ صرف دوسرے (یعنی درمیانی) حروف کی حرکت بدلنے سے ایک نیا باب ظہور میں آ جاتا ہے ۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ' فعل ثلاثی مجرد میں ماضی کی پہلی شکل تین حرف رکھتی ہے ۔ ان میں سے پہلا اور تیسرا (آخری) حرف ایک حالت میں رہتے ہیں لیکن دوسرا (درمیانی) حرف ایک حالت پر نہیں رہتا ' اس پر کبھی زیر کبھی زہر اور کبھی پیش آتا ہے ۔ یہی درمیانی حرف فعل مضارع میں بھی بدلتا رہتا ہے ۔ ہر نئی شکل جو فعل سے نکلتی ہے اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زیر - زہر - پیش) سے مل کر بنتے کہ "باب" کہلاتی ہے ۔

ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں :-

نمبر	فعل ماضی	فعل مضارع	کیفیت
۱	فَتَحَ	يَفْتَحُ	درمیانی حرف "ت" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر زہر ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر زہر ہے ۔
۲	ضَرَبَ	يَضْرِبُ	درمیانی حرف "ز" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر زہر ہے اور فعل مضارع میں اس پر زہر ہے ۔
۳	كَتَبَ	يَكْتُبُ	درمیانی حرف "ت" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر زہر ہے اور فعل مضارع میں اس پر پیش ہے ۔
۴	عَلِمَ	يَعْلَمُ	درمیانی حرف "ل" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر زہر ہے اور فعل مضارع میں اس پر زہر ہے ۔
۵	ثَقُلَ	يَثْقُلُ	درمیانی حرف "ق" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر پیش ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر پیش ہے ۔
۶	وَرِثَ	يَرِثُ	درمیانی حرف "ر" ہے ۔ فعل ماضی میں اس پر زہر ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر زہر ہے ۔

(نوٹ ۔ ثلاثی مجرد کے اول الذکر پانچ ابواب عام طور پر آتے ہیں ۔ آخری چھٹا

باب قرآن میں شاذ آیا ہے ۔)

مندرجہ بالا چھ متفرق شکلیں ہیں جو فعل ماضی اور فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہیں اور یہی ثلاثی مجرد کے ابواب ہیں۔ ان میں سے ہر شکل ایک باب کہلاتی ہے۔ ان ابواب کا معنوں سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ فقط اتنا بتاتے ہیں کہ عربی زبان میں جس قدر ثلاثی مجرد کے افعال (ماضی - مضارع) آئینگے وہ انہی شکلوں کے اندر آئینگے۔ لیکن اگر ایک ہی باب میں درمیانی حرکتوں کو بدل دیا جائے تو اس طرح بعض اوقات معنوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

کیفیت	فعل مضارع	فعل ماضی	
ماضی اور مضارع میں درمیانی حرف پر پیش ہے 'اس کے معنی ہیں "دور ہوا"	يَبْعُدُ	رَبَعَدُ	۱
فعل ماضی میں درمیانی حرف پر زہر اور فعل مضارع میں درمیانی حرف پر زہر ہے۔ اب اس کے معنی ہیں "ہلاک ہوا" مر گیا	يَبْعُدُ	بَعَدُ	
فعل ماضی میں درمیانی حرف پر زہر اور فعل مضارع میں درمیانی حرف پر زہر ہے۔ اس کے معنی ہیں "غمگین ہوا" رنجیدہ ہوا" (فعل لازم)۔	يَحْزَنُ	حَزَنُ	۲
فعل ماضی کے درمیانی حرف پر زہر اور فعل مضارع کے درمیانی حرف پر پیش ہے۔ معنی "غمگین کیا" رنجیدہ کیا" (فعل متعدی)	يَحْزَنُ	حَزَنُ	

ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں، لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں ثلاثی مزید کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف وزن پر آتے ہیں جن میں بیشتر استعمال ہوئے والے ابواب قرآن مجید میں بارہ ہیں اور یہ حسب ذیل ہیں :-

### ثلاثی مزید فیہ کے ابواب

کیفیت	ثلاثی مزید فیہ		باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نہز مادہ کے حروف)	نمبر شمار
	فعل ماضی	فعل مضارع			
اس باب میں ثلاثی مجرد کے درمیانی حرف کو مشدد کر دیا جاتا ہے۔	كَرِمَ	يَكْرِمُ	كَرِمَ	كَرِمَ	۱
	عَلِمَ	يَعْلَمُ	عَلِمَ	عَلِمَ	

نمبر شمار	باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نیز مادہ کے حروف)	ثلاثی مزید فیہ	کیفیت
			فعل ماضی	فعل مضارع
۲	اَفْعَالٌ	حَسَنَ نَعِمَ	اَحْسَنَ اَنْعَمَ	يُحْسِنُ يَنْعِمُ
۳	مُفَاعَلَةٌ	جَاهَدَ قَتَلَ	جَاهَدَ قَاتَلَ	يُجَاهِدُ يُقَاتِلُ
۴	تَفَاعُلٌ	كَثُرَ غَمَزَ	تَكَاثَرُ تَغَامُزُ	يَتَكَاثَرُ يَتَغَامَزُ
۵	تَفَعُّلٌ	قَطَعَ عَلِمَ	تَقَطَّعَ تَعَلَّمَ	يَتَقَطَّعُ يَتَعَلَّمُ
۶	اِنْفِعَالٌ	قَلَبَ فَجَرَ	اِنْقَلَبَ اِنْفَجَرَ	يَنْقَلِبُ يَنْفَجِرُ
۷	اِفْتِعَالٌ	قَرَبَ كَسَبَ	اِقْتَرَبَ اِكْتَسَبَ	يَقْتَرِبُ يَكْتَسِبُ
۸	اِسْتِفْعَالٌ	كَبَّرَ غَفَرَ	اِسْتَكْبَرُ اِسْتَغْفَرُ	يَسْتَكْبِرُ يَسْتَغْفِرُ
				اس باب میں ثلاثی مجرد ہر "اس ت" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
				اس باب میں ثلاثی مجرد کے پہلے حرف کے بعد "الف" بڑھایا جاتا ہے۔
				اس باب میں ثلاثی مجرد کے پہلے حرف کے بعد "ت" اور پہلے حرف کے بعد "الف" بڑھایا جاتا ہے۔
				اس باب میں ثلاثی مجرد سے قبل "ت" بڑھا کر درمیانی حرف مُشَدَّد کر دیا جاتا ہے۔
				اس باب میں ثلاثی مجرد سے قبل "ان" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
				اس باب میں شروع میں "همزہ" اور ثلاثی مجرد کے پہلے حرف کے بعد "ت" بڑھائی جاتی ہے۔

نمبر	باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نیز مادہ کے حروف)	ثلاثی مزید فیہ		کیفیت
			فعل ماضی	فعل مضارع	
۹	افعلال	سود بیض	اسود ابیض	یسود یبیض	اس باب میں ثلاثی مجرد کے شروع میں ہمزہ کا اضافہ اور آخری حرف کو مشدد کیا جاتا ہے۔
۱۰	افعیلال	دہم	ادہام	یدہام	اس باب میں باب نمبر ۹ پر آخری مشدد حرف سے قبل الف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
۱۱	افعل	زمل دثر	ازمل ادثر	یزمل یدثر	اس باب میں شروع میں ہمزہ کے علاوہ پہلے اور دوسرے حرف کو مشدد کیا جاتا ہے (بعض اسے باب تفعیل کی ایک متغیر شکل قرار دیتے ہیں)۔
۱۲	افاعل	ثقل	اثاقل	یثاقل	اس باب میں شروع میں ہمزہ اور پہلے حرف کے بعد الف لایا جاتا ہے نیز پہلے حرف کو مشدد کیا جاتا ہے (بعض اسے باب تفاعل کی متغیر شکل قرار دیتے ہیں)۔

نوٹ - ان ابواب کا مصدر اسی وزن پر آنے کا جواب کے خانے میں درج ہیں۔

مثالیں ذرا آگے چل کر آئیں گی۔

یہاں آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان تبدیلیوں سے بالآخر مقصود کیا ہوتا ہے؟ ان تبدیلیوں سے مقصود معانی میں وسعت اور ان کے درمیان معنوی فرق و اختلاف پیدا کرنا ہے۔ یعنی ایک ہی فعل جب باب تفعیل میں ہو تو اس کے معنی اور ہوتے ہیں اور باب افعال میں ہو تو اور۔ ان ابواب کی یہ خصوصیات (یعنی خاص معنی) مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ لہذا (اگرچہ ان خصوصیات میں بعض اوقات استثناء بھی ہو جاتی ہے) کسی فعل کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ :

۱۔ اس مادہ کے معنی کیا ہیں اور

۲۔ وہ کس باب میں ہے۔

یہ عربی زبان کی وہ خصوصیت ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ ذیل میں ہم ان ابواب کی خصوصیتیں (مختصراً) درج کرتے ہیں۔ آپ انہیں غور سے دیکھیں۔

## ابواب ثلاثی مزید فیہ کے خواص

اب ثلاثی مزید فیہ کے مختلف ابواب کے خواص دیکھئے۔ واضح رہے کہ ہم نے مختلف ابواب کے تمام خواص درج نہیں کئے۔ صرف اسی قدر خواص دئے ہیں جو قرآن کریم میں استعمال شدہ الفاظ کے سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

### ۱۔ باب تَفْعِيل :-

(اس باب سے مصدر تَفْعِيل کے وزن پر آئیگا۔ مثلاً تَكْرِيم - تَنْزِيل)<sup>۱</sup>

ثلاثی مجرد کو باب تَفْعِيل میں لے جائیں تو مندرجہ ذیل فوائد و خواص مطلوب ہوتے ہیں :

(۱) لازم فعل متعدی بن جاتا ہے۔ مثالیں :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
ثَبَّتَ	مضبوطی سے جا ثبت ہوا۔	ثَبَّتَ	مضبوطی سے جایا ثبت کیا۔
كَرَّمَ	شریف و باعزت ہوا	كَرَّمَ	شریف و باعزت بنایا

(۱) کبھی کبھی تَفْعِيل کے علاوہ تَفْعِلَة اور فَعَال کے وزن پر بھی

اس کا مصدر آ جاتا ہے۔ جیسے جَرَّبَ سے مصدر تَجَرَّبَ اور تَجَرَّبَ۔ اور كَذَّبَ سے مصدر تَكْذَّبَ و كَذَّاب۔ بالخصوص جب مادہ میں آخری حرف صحیح نہ ہو بلکہ حرف علت ہو تو مصدر ہمیشہ تَفْعِلَة کے وزن پر آئیگا۔ جیسے صَلَّى سے تَصَلَّى اور سَمَّى سے تَسْمِيَة۔

(۲) ثلاثی مجرد کا فعل متعدی جو ایک مفعول چاہتا ہے اس باب میں آنے کے بعد

دو مفعول چاہنے لگتا ہے - جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی و مثال	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی و مثال
سَمِعَ	اس نے سنا - سَمِعَ زید الخبر : زید نے خبر سنی - یہاں ”الخبر“ مفعول ہے -	سَمِعَ	سنایا - سَمِعَ زید حامد الخبر : زید نے حامد کو خبر سنائی - یہاں ”حامد اور الخبر“ دو مفعول ہیں -
فَهِمَ	اس نے سمجھا - فَهِمَ حامد الکلام حامد نے بات سمجھی - یہاں ”الکلام“ مفعول ہے -	فَهِمَ	سمجھایا - فَهِمَ حامد ذاکر الکلام حامد نے ذاکر کو بات سمجھائی، یہاں ”ذاکر اور الکلام“ دو مفعول ہیں -

(۳) کسی کام میں زور و شدت، زیادتی و کثرت اور مبالغہ کے معنی پیدا ہو جاتے

ہیں - جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
قَطَعَ	اس نے کاٹا	قَطَعَ	بہت زیادہ کاٹا، خوب اچھی طرح کاٹا۔ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا -
قَتَلَ	مار ڈالا، قتل کیا	قَتَلَ	بکثرت قتل کیا - بری طرح قتل کیا -

(۴) کسی کام کو بتدریج تھوڑا تھوڑا اور بار بار کرنے کے لئے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
نَزَّلَ	اترا ، نازل ہوا	نَزَّلَ	اتارا ، نازل کیا ، بار بار تھوڑا تھوڑا بتدریج اتارا ۔
ذَكَرَ	یاد کیا	ذَكَرَ	یاد دلایا بار بار یاد دلایا ۔

(۵) کسی کام کو کسی کی طرف منسوب کرنے کے لئے بھی یہ باب استعمال کیا

جاتا ہے ۔ مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
كَذَّبَ	جھوٹ بولا	كَذَّبَ	اسے جھٹلایا ، جھوٹا بتایا ۔ اسکی طرف جھوٹ کو منسوب کیا ۔
صَدَقَ	سچ بولا	صَدَقَ	اسے سچا بتایا ۔ اس کی تصدیق کی ۔ سچ اسکی طرف منسوب کیا ، سچ کر کے دکھایا ۔



(۲) کسی کیفیت کو دور کرنے اور سلب کرنے کے لئے بھی یہ باب استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
مَرَضَ	وہ بیمار ہوا۔	مَرَضَ	اس کی بیماری دور کی۔
ذُكَا	حرارت غریزی۔	ذُكَا	جانور کی حرارت غریزی نکالی 'اسے ذبح کیا'۔

(۳) باب افعال کے مخالف معنوں کے لئے بھی آتا ہے۔ مثلاً :

أَفْرَطَ (باب افعال) حد سے تجاوز کیا۔ افراط۔

فَرَّطَ (باب تفعیل) حد سے کمی کی۔ تفريط۔

(۹) بعض اوقات یہ ثلاثی مجرد کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً بَشَّرَ اور بَشَّرَ کے معنی ایک ہیں۔

### باب تفعیل سے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

مصدر	اسم مفعول	اسم فاعل	نہی	امر	فعل مضارع		فعل ماضی	
					معلوم	مجهول	معلوم	مجهول
تَعْلَمُ	تَعْلَمُ	تَعْلَمُ	لَا تَعْلَمُ	عَلِمَ	يَعْلَمُ	يَعْلَمُ	عَلِمَ	عَلِمَ

### (۲) باب افعَال کے خواص

(اس باب سے (حروف صحت والے مادوں کا) مصدر افعَال کے وزن پر آنے کا۔

مثلاً اِسْلَامٌ - اِكْرَامٌ)

ثلاثی مجرد کو افعَال میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب

ہوتے ہیں۔

(۱) ثلاثی مجرد کے فعل لازم کو فعل متعدی بنانے کے لئے - جیسے :-

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب افعال	معنی
فَرِحَ	وہ خوش ہوا	اَفْرَحَ	اسنے خوش کیا
عَزَّ	وہ با عزت و سر بلند ہوا	اَعَزَّ	اسنے با عزت و سر بلند کیا

(۲) ثلاثی مجرد اگر متعدی ہے اور ایک مفعول چاہتا ہے تو اسے دو مفعول والا  
متعدی فعل بنانے کے لئے - جیسے :-

ثلاثی مجرد	مثال	ثلاثی مزید فیہ باب افعال	مثال
قَرَأَ	اس نے پڑھا	اَقْرَأَ	پڑھایا
	قَرَأَ زَيْدٌ كِتَابًا : زید نے کتاب پڑھی یہاں ”کتاباً“ مفعول ہے۔		اَقْرَأَ زَيْدٌ حَامِدًا کتا با : زید نے حامد کو کتاب پڑھائی۔ یہاں ”حامداً“ اور کتاباً“ دو مفعول ہیں۔

(۳) کسی ”وقت یا جگہ میں داخل ہونا“ بتانے کے لئے - مثلاً :-

اَصْبَحَ (باب افعال) وہ صبح کے وقت میں داخل ہوا۔

اَمْسَى (باب افعال) وہ شام کے وقت میں داخل ہوا۔

اُعْرِقَ (باب افعال) وہ عراق میں داخل ہوا۔

(۴) کسی ”حالت یا صفت کا پایا جانا“ بتانے کے لئے :- جیسے

كَبِّرَ (باب افعال) اسے بڑا پایا۔

(۵) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے۔ مثلاً  
 اَلْحَقَّ (باب افعال) بمعنی لَحِقَ (ثلاثی مجرد) : پیچھے سے آکر ملا۔

(۶) کسی صفت کے زائل ہونے اور سبب کرنے کے لئے۔ مثلاً  
 اَعْتَبَ (باب افعال) عتاب زائل کیا۔

(۷) باب ثلاثی مجرد متعدی کا لازم بنتا ہے۔ جیسے کَسَبَ (ثلاثی مجرد متعدی) عَلَسَ وَجْهَهُ :- اسے منہ کے بل گرایا، فَاكَبَ (باب افعال لازم) تو وہ منہ کے بل گر گیا

اس باب سے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

مصدر	اسم مفعول	اسم فاعل	نہی	امر	فعل مضارع		فعل ماضی	
					معلوم	مجهول	معلوم	مجهول
اَسْلَمَ	اِسْلَامٌ	اِسْلَامٌ	لَا تَسْلَمَ	اَسْلَمِ	يَسْلَمُ	يَسْلَمُ	اَسْلَمَ	اَسْلَمَ

### (۳) باب مُفَاعَلَةٍ کے خواص

(اس باب سے مصدر مُفَاعَلَةٌ اور فِعَالٌ کے وزن پر آتا ہے۔ مثلاً

وَجَاهَدَ وَجَاهِدًا، مُسَابَقَةً وَمُسَابَقًا)۔

ثلاثی مجرد کو باب ”مُفَاعَلَةٍ“ میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب

ہوتے ہیں :

(۱) دو آدمیوں کا ایک ہی کام میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف ہونا مثلاً

جب دو آدمی آپس میں جنگ کر رہے ہوں تو قَاتِلٌ کی جگہ قَاتِلٌ کہا جائیگا۔ یعنی

دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مثالیں دیکھئے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ	معنی
حَرْبٌ ۸	جنگ، لڑائی	حَارَبَ	ایک دوسرے کے خلاف لڑے
جَاهَدَ	اس نے پوری کوشش کی	جَاهَدَ	ایک نے دوسرے کو زبر کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کی
ضَرَبَ	نقصان پہنچایا	ضَارَبَ	ایک نے دوسرے کو نقصان پہنچایا

(۲) کسی کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مقابلہ کرنے کے لئے - جیسے:

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ	معنی
سَبَقَ	وہ آگے بڑھا	سَابَقَ	ایک نے دوسرے سے آگے بڑھنے اور سبقت لی جانے کی کوشش کی، آگے بڑھنے میں مقابلہ کیا۔
سَرَعَ	وہ تیز رفتار ہوا	سَارَعَ	ایک نے دوسرے سے جلدی کرنے میں مقابلہ کیا

(۳) باب تفعیل کی طرح کسی کام میں کثرت و زیادتی بنانے کے لئے - مثلاً:

ضَاعَفَ (باب مفاعلہ): کئی گنا بڑھایا، دو چند، چاند کیا۔

(۴) باب افعال کی طرح لازم کو متعدی بنانے کے لئے بھی کبھی کبھی یہ باب

مستعمل ہوتا ہے - مثلاً :

معنی	ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ
دور کیا	بَعُدَ	دور ہوا	بَاعَدَ
چھپایا			وَارَى

(۵) کبھی اس کے معنی - ثلاثی مجرد کے ہوتے ہیں - مثلاً :

نَافَقَ (باب مفاعلہ) اس نے منافقت کی -

قَاتَلَ (باب مفاعلہ) اس نے مار ڈالا، قتل کیا، بمعنی قَتَلَ (ثلاثی مجرد) -

بَارَكَ (باب مفاعلہ) اس نے خیر کا اضافہ کیا، برکت دی -

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

مصدر	اسم مفعول	اسم فاعل	نہی	امر	فعل مضارع		فعل ماضی	
					مجهول	معلوم	مجهول	معلوم
مَقَاتَلَةٌ قَتَلَ	مَقَاتَلَةٌ قَتَلَ	مَقَاتَلَةٌ قَتَلَ	لَا تَقَاتِلْ	قَاتِلْ	يُقَاتِلُ	يُقَاتِلُ	قَاتَلَ	قَاتَلَ

#### (۴) باب تَفَاعُلٍ کے خواص

(اس باب سے مصدر تَفَاعُلٍ کے وزن پر آئیگا۔ مثلاً تَقَابَلُوا)

ثلاثی مجرد کو باب تَفَاعُلٍ میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فائدے مطلوب

ہوتے ہیں :

(۱) دو یا دو سے زیادہ افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا :

ایک شخص کا دوسرے کے ساتھ (مفاعلہ کے باب کی طرح) یا ایک جماعت کا دوسری جماعت

کے ساتھ کسی کام کو کرنا (اب مفاعله میں بالعموم ایک فرد دوسرے فرد کے مقابل میں ہوتا ہے اور باب تفاعل میں عام طور پر ایک جماعت دوسری جماعت کے مقابل ہوتی ہے)۔  
مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفاعل	معنی
قَبِلَ	سامنے ہوا۔	تَقَابَلَا	آپس میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے
رَأَى	دیکھا	تَرَاءَى	آپس میں ایک نے دوسرے کو دیکھا۔

(۲) باب ”مُفَاعَلَةٌ“ کا اثر قبول کرنے کے لئے آتا ہے۔ اگر ”مُفَاعَلَةٌ“

میں فاعل و مفعول درکار ہوں تو اس باب (تَمَاعُلٌ) میں صرف فاعل درکار ہوگا :

باب مفاعله	معنی	باب تفاعل	معنی
بَاعَدَهُ	اسے دور کیا	تَبَاعَدَا	وہ دور ہو گیا

نوٹ - غور کیجئے ۔ دور ہونے میں دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں لیکن

جب ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دور ہو گیا تو اس سے بات واضح ہو جاتی ہے ۔

یعنی دونوں کا ذکر ضروری نہیں ہوتا ۔

(۳) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہوتا ہے ۔ جیسے :-

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفاعل	معنی
عَالَ	بلند ہوا	تَعَالَى	بلند ہوا

اس باب سے مشتق افعال و اسما کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول اور یہی اسم مکان و زمان بھی ہے	مصدر
تَنَزَّاهُ	يَتَنَزَّاهُ	تَنَزَّاهُ	لَا تَتَنَزَّاهُ	مَتَنَزَّاهُ	مَتَنَزَّاهُ	تَنَزَّاهُ

### (۵) باب تَفَعَّل کے خواص

(اس باب سے مصدر تَفَعَّل کے وزن پر آنے کا۔ جیسے تَقَدَّمَ)

ثلاثی مجرد کو باب "تَفَعَّل" میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب

ہوتے ہیں :-

(۱) باب تَفَعَّل میں جس کام کو کیا جائے اس کا اثر قبول کر لینے اور اس

کام کے ہو جانے کے لئے یہ باب استعمال ہوتا ہے۔ جیسے :-

باب تَفَعَّل	معنی	باب تَفَعَّل	معنی
قَطَّعَ	کاٹ کر ٹکڑے کیا	تَقَطَّعَ	کاٹ کر ٹکڑے ہوا۔
قَدَّمَ	آگے بھیجا، پیش کیا	تَقَدَّمَ	آگے آیا، پیش ہوا۔

(۲) کسی کام کا یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا ہونا یا کرنا۔ جیسے :-

تَجَرَّعَ (باب تَفَعَّل) گھونٹ گھونٹ پیا۔

(۳) کسی کام کو کرنے اور اس کے فوائد سے متمتع ہونے کے لئے زور لگانا اور

جد و جہد کرنا - جیسے :-

تَعَلَّمَ (باب تَفَعَّلُ) اس نے (کوشش اور کاوش سے) علم حاصل کیا -

تَدَبَّرَ (باب تَفَعَّلُ) اس نے (سعی و محنت سے) غور کیا پیچھا کیا -

(ن) کسی کام کو چھوڑنا اور اس سے دور ہونا - مثلاً :-

”هَجُودٌ“ کے معنی نیند اور سونا ہیں -

تَهَجَّدَ (باب تَفَعَّلُ) میں اس کے معنی ہوں گے : اس نے سونا چھوڑا -

یعنی جاگا -

(ہ) باب تَفَعَّلُ کے ہم معنی ہوتا ہے - جیسے :-

باب تَفَعَّلُ	معنی	باب تَفَعَّلُ	معنی
فَكَّرَ	اس نے غور و فکر کیا -	تَفَكَّرَ	اس نے غور و فکر کیا -

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع		اسم	اسم فاعل	اسم مفعول (و اسم ظرف)	مصدر
	معروف	مجهول				
تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ	تَدَبَّرَ

## (۶) باب اِنْفَعَالُ کے خواص

(اس باب سے مصدر اِنْفَعَالُ کے وزن پر آنے کا - جیسے اِنْقِلَابُ)

ثلاثی مجرد کو باب اِنْفَعَالُ میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) ثلاثی مجرد کے جن افعال میں اثر اندازی اور زور لگا کر کرنے کا مفہوم

پایا جاتا ہے - یہ باب ان افعال کا اثر قبول کرنے اور ویسا ہو جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے



نیز متعدی فعل کو لازم کر دیتا ہے ۔ مثلاً :-

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب اَنْفَعَالَ	معنی
قَلَبَ	پلٹا ، پھیرا ، الٹا	اِنْقَلَبَ	پلٹ گیا ، پھر گیا ، الٹ گیا ۔
فَلَقَ	پھاڑا	اِنْدَاقَ	پھٹ گیا ۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	صرف زمان و مکان	مصدر
اِنْقَلَبَ	يَنْقَلِبُ	اِنْقَلِبْ	لَا تَنْقَلِبْ	مِنْقَلِبْ	مِنْقَلِبْ	اِنْقِلَابٌ

نوٹ ۔ یہ باب لازم ہی آتا ہے اور کسی لازم فعل سے نہ مجہول بنایا جاتا ہے

نہ اسم مفعول ۔

## ۷۔ باب اِفْتِعَال کے خواص

(اس باب سے مصدر اِفْتِعَال کے وزن پر آنے کا ۔ مثلاً اِكْتَسَبَ)

ثلاثی مجرد کو باب اِفْتِعَال میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد متعارف

ہوتے ہیں ۔

(۱) ثلاثی مجرد فعل کا اثر قبول کرنا اور جو کام کیا جائے اس کا ہو جانا جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب اِفْتِعَال	معنی
جَمَعَ	جمع کیا ، اکٹھا	اِجْتَمَعَ	جمع ہوا ، اکٹھا ہوا ۔
هَدَى	راستہ بتایا ، رہنمائی کی	اِهْتَدَى	راستہ پر لگا ، رہنمائی ہوئی ، راستہ معلوم ہوا ۔

(۲) کسی کام میں محنت کرنا اور انتہائی زور لگانا ، مثلاً :

تلائی مجرد	معنی	تلائی مزید فیہ باب افتعال	معنی
كَسَبَ	اس نے کمایا	اَكْتَسَبَ	اس نے محنت اور انتہائی زور لگا کر کمایا ۔
جَهَدَ	کوشش کی	اجْتَهَدَ	پوری کوشش اور انتہائی زور لگایا ۔

(۳) اپنے جی سے کسی کام کو بنا لینا اور گھڑ لینا :- جیسے

تلائی مجرد	معنی	تلائی مزید فیہ باب افتعال	معنی
كَتَبَ	لکھا	اَكْتَتَبَ	اپنی طرف سے لکھ لیا ۔
خَلَقَ	بنایا	اَخْتَلَقَ	اپنے جی سے بنا لیا ، گھڑ لیا ، تراش لیا ۔

(۴) کسی کام کو چاہنا اور اسے طلب کرنا ۔ نیز کسی چیز کو پیش کرنا اور

اظہار کرنا ۔ مثلاً :-

تلائی مجرد	معنی	تلائی مزید فیہ باب افتعال	معنی
عَذَرَ	اس نے معاف کیا ۔ عذر قبول کیا	اعْتَذَرَ	اس نے معافی چاہی ۔ عذر پیش کیا ۔

(۵) باب تَمَفَّا عَل کی طرح اس باب میں بھی باہمی اشتراک کا مفہوم پایا جاتا

ہے۔ مثلاً :

تلائی مجرد	معنی	تلائی مزید فیہ باب افتعال	معنی
قَتَلَ	قتل کیا	اَقْتَتَلَ	باہم قتل کیا
سَبَقَ	آگے بڑھا	اَسْتَبَقَ	آپس میں ایک دوسرے سے سبقت کی۔

اس باب کے مشتق اسماء و افعال کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع		اسم	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
	معلوم	مجهول					
اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ	اَشْتَمَلُ

## (۸) باب اِسْتِفْعَال کے خواص

تلائی مجرد کو باب "استفعال" میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب

ہوتے ہیں :

(۱) کسی کام کو چاہنا، اسے ضبب کرنا اور مانگنا۔ مثلاً :

تلائی مجرد	معنی	تلائی مزید فیہ باب استفعال	معنی
تَصَبَّرَ	امس نے مدد کی	اَسْتَصَبَّرَ	امس نے مدد چاہی، مدد مانگی
عَفَّرَ	اسنے بچایا، محفوظ رکھا	اَسْتَعَفَّرَ	امس نے حفاظت چاہی۔ بچاؤ کا طالب ہوا۔

(۲) مفعول میں فعل کی صفت کو پانا یا سمجھنا - جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب استفعال	معنی
ضَعُفَ	کمزور ہوا	اَسْتَضَعَفَ	اسے کمزور پایا ، یا کمزور سمجھا -

(۳) کسی کام کا اثر قبول کرنے اور اس کے ساتھ جیسا کیا جائے ویسا ہو جانے

کے لئے بھی اس باب کو استعمال کیا جاتا ہے - جیسے :

اَسْتَجَابَ (باب استفعال) پکار کا جواب دیا ، آواز کو قبول کیا -

(۴) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے - جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب استفعال	معنی
قَرَّ	و ٹھہرا	اَسْتَقَرَّ	وہ ٹھہرا

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع		امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
	معلوم	مجہول	معلوم	مجہول			
اَسْتَنْصَرَ	اَسْتَنْصَرَ	اَسْتَنْصَرَ	اَسْتَنْصِرْ	لَا تَسْتَنْصِرْ	مُسْتَنْصِرٌ	مُسْتَنْصَرٌ	اِسْتِنْصَارٌ

## (۹) باب اِفْعِلَال کے خواص

(۱) ابواب نمبر ۹ تا ۱۲ بہت کم استعمال ہوتے ہیں

(۱) یہ باب کسی رنگ یا عیب کو ہٹانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے :

اسم	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب افعلال	معنی
اَبِیضٌ	سفید	اَبِیضٌ	سفید ہوا۔
اَسْوَدٌ	کالا	اَسْوَدٌ	سیاہ ہوا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اَبِیضٌ	یَبِیضُ	اَبِیضْ	لَا تَبِیضُ	مَبِیضٌ	اَبِیضًا

## (۱۰) باب اِفْعِلَال کے خواص

باب اِفْعِلَال در اصل باب افعلال (نمبر ۹) کی ایک قسم ہے اس لئے اسی کے

خواص رکھتا ہے۔ نیز حرف ”ی“ کے اضافہ کی وجہ سے معنی میں زور وبالغہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً :

اَدَّهَامٌ (باب افعلال) سخت سیاہ ہوا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اَدَّهَامٌ	یَدَّهَامُ	اَدَّهَامْ	لَا تَدَّهَامْ	مَدَّهَامٌ	اَدَّهَامًا

## ۱۱، ۱۲۔ باب اِفْعَلْ اور باب اِفْعُلْ کے خواص

یہ ابواب در اصل باب تَفَعَّلْ اور باب تَفَاعَلَ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں

اور انہی ابواب کے خواص اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مثالیں :

باب اِفْعَلْ	معنی	باب اِفْعُلْ	معنی
اَزَمَلَ	(۱) اس نے چادر اوڑھی۔ (۲) اس نے ساتھی بنایا۔	اِثْمَا قَلَ	وہ بوجھل اور بھاری ہوا۔
اِطْهَرَ	اس نے پاکی اختیار کی، پاک ہوا۔	اِدَّارَكَ	ایک دوسرے کو ملا۔ ایک نے دوسرے کو پایا۔

## رُبَاعِی مجرّد اور مزید فیہ کے ابواب

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، ثلاثی وہ فعل ہے جس میں سادہ یعنی اصلی حروف کی

تعداد تین ہو۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) مجرّد (۲) مزید فیہ۔ ”مجرّد“

وہ جس کی ماضی کی پہلی شکل میں صرف تین حروف ہوتے ہیں۔ ”مزید فیہ“ وہ جس

کی ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں لیکن پھر حال اصلی حروف تین ہی

ہوں۔ مثال کے طور پر ”نَصَرَ“ فعل ماضی کی پہلی شکل ہے۔ اس میں تین حروف ہیں۔

یہ ثلاثی مجرّد ہے۔ لیکن ”اَسْتَنْصَرَ“ جو اگرچہ نَصَرَ میں ہی کچھ حرفوں

کے اضافہ سے بنا ہے، ثلاثی مجرّد نہیں بلکہ ثلاثی مزید فیہ ہے۔

وہ فعل جس کی ماضی کی پہلی شکل میں چار حروف ہوں اور وہ چاروں اصلی ہوں اور ان میں کوئی بھی زائد نہ ہو۔ فعل رباعی کہلاتا ہے۔ اگر ماضی کی پہلی شکل میں

رباعی  
مجرد۔ مزید فیہ

صرف چار حرف ہوں تو وہ فعل رباعی مسجود کہلائے گا۔ لیکن جب اصلی حروف تو چار ہی ہوں لیکن ماضی کی پہلی شکل میں چار سے زیادہ حروف ہوں تو اسے رباعی مزید فیہ کہینگے۔

عربی میں عموماً ثلاثی افعال زیادہ استعمال ہوتے ہیں، رباعی کم استعمال ہوتے ہیں اور اسی لئے رباعی کے ابواب بھی کم ہیں۔ رباعی مجرد کا تو صرف ایک باب ہے۔

### (۱) باب فَعْلَلَة

وہ فعل جس کا مادہ (اصلی حروف) چار حرفوں پر مشتمل ہو اور ماضی کی پہلی شکل میں بھی صرف چار حرف ہوں، رباعی مجرد کہلاتا ہے۔ اور اس کا ایک باب ہے۔ یہ باب عموماً متعدی ہوتا ہے۔ مثالیں :

وَسَّوَسَ : اس نے خیال یا وسوسہ ڈالا۔

زَلَزَلَ : اس نے ہلایا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

مصدر	اسم مفعول	اسم فاعل	نہی	امر	فعل مضارع		فعل ماضی	
					مجهول	معلوم	مجهول	معلوم
(۱) زَلَزَلَة	زَلَزَل	مُزَلَزِل	لَا تُزَلِّزْ	زَلَزِلْ	يُزَلِّزُ	يُزَلِّزُ	زَلَزَلَ	زَلَزَلَ
(۲) زَلْزَال								

نوٹ۔ مصدر میں دوسرا وزن کم مستعمل ہے۔

## رباعی مزید فیہ اور اس کے ابواب

جب فعل ماضی کی پہلی شکل میں اصلی چار حروف کے ساتھ ساتھ کچھ زائد حروف بھی ہوں تو وہ فعل ”رَبَاعِیْ مَزِیْدٌ فِیْہِ“ کہلاتا ہے۔ اس کے ابواب یہ ہیں۔

### (۱) باب اِفْعِلَّ

اس باب میں ماضی کی پہلی شکل اِطْعَمَ اَنْ ہے یہ طِعْمَ اَنْ سے بنی ہے۔ اِطْعَمَ اَنْ میں شروع کا الف اور آخر میں ن پر تشدید زیادہ ہے۔ اسی طرح اِشْمَعِرَ اور اِشْمَا ز۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اِطْعَمَ اَنْ	یُطْعِمُنِ	اِطْعِمْ	لَا تَطْعَمُنِ	مُطْعِمُنِ	اِطْعَمَ اَنْ

### (۲) باب تَفْعَلْ

رباعی مزید کا ایک باب جو رہا ہی مجرد کے باب کا اثر قبول کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کی ماضی کی پہلی شکل تَفْعَلْ کے وزن پر آتی ہے۔ جیسے : تَزَحَّجَ ، تَزَلَّزَلَ۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
تَزَحَّجَ	یَتَزَحَّجُ	تَزَحَّجْ	لَا تَزَحَّجْ	مَتَزَحَّجْ	تَزَحَّجَ



امید ہے کہ عربی گرامر کے ان مختصر سے نکات سے (عربی نہ جاننے والے) قارئین اتنا سمجھ گئے ہونگے کہ عربی الفاظ کے مادے کیا ہوتے ہیں۔ ان مادوں سے الفاظ کی مختلف شکلیں کیسے بنتی ہیں اور ان شکلوں سے الفاظ کے معنوں میں کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ معلومات نہ صرف زیر نظر لغت سے استفادہ میں بڑی مدد دینگی بلکہ عربی زبان کے سمجھنے میں بھی مدد و معاون ثابت ہونگی۔

آئندہ باب میں قارئین کے سامنے ایک فہرست آئیگی جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ ان کی اصلی شکل میں (یعنی جس شکل میں وہ قرآن میں آئے ہیں) دئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے سامنے اس کا مادہ دیا گیا ہے تاکہ لغت سے الفاظ کے معنی معلوم کرنے میں دقت نہ ہو۔

# لُغَاتُ الْعَرَبِ

## باب دوم

جیسا کہ سابقہ باب میں لکھا جا چکا ہے ' عربی زبان کے ہر لفظ کا (بجز حروف کے) ایک مادہ ہوتا ہے اور لغت میں وہ لفظ اپنے مادہ کے تحت لکھا جاتا ہے۔ عربی جاننے والوں کے لئے تو یہ معلوم کر لینا مشکل نہیں ہوتا کہ فلاں لفظ کا مادہ کیا ہے، لکن جو لوگ عربی زبان سے واقف نہیں ان کے لئے الفاظ کے مادے معلوم کرنا مشکل (بلکہ بعض اوقات ناممکن) ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی کو ایک لفظ کا مادہ ہی معلوم نہیں ہوگا تو وہ اسے لغت میں تلاش کیسے کریگا؟ مثلاً ایک لفظ ہے "مُتَقَبِّلٌ"۔ عربی نہ جاننے والا اسے "م ت" کے نیچے تلاش کرے گا، اور اس کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہیں ہوگا کہ یہ لفظ "وق ی" کے تحت ملے گا جو اس کا مادہ ہے۔ چونکہ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس لغت کی مدد سے عربی نہ

جاننے والے حضرات قرآنی مطالب کو براہ راست سمجھ سکیں اس لئے ان کی سہولت کے لئے قرآنی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کر دی گئی ہے۔ اس فہرست میں قرآن کا ہر لفظ اسی شکل میں دیا گیا ہے جس میں وہ قرآن کے اندر موجود ہے اور اس کے سامنے وہ مادہ دیا گیا ہے جس کے تحت وہ لفظ لغت میں ملے گا۔ آپ قرآن کے جس لفظ کے معانی معلوم کرنا چاہیں اسے فہرست میں عام ڈکشنریوں کے قاعدے کے مطابق تلاش کر لیں۔ پھر اس کے سامنے جو مادہ دیا گیا ہو اسے زیر نظر لغت میں (ڈکشنری کے قاعدے کے مطابق) اس کے مقام میں دیکھ لیں۔ مطلوبہ لفظ اس مادہ کے تحت مل جائیگا۔

اس فہرست میں :

(۱) عام طور پر قرآنی الفاظ پر اعراب (زیر - زیر - پیش - جزم وغیرہ) نہیں دئے گئے۔ ایسا کیا جاتا تو فہرست (بلا ضرورت) طویل ہو جاتی۔ مثلاً اَسْتَغْفِرُ - اَسْتَغْفِرُ کو الگ الگ لکھنے کی بجائے ایک ہی جگہ (استغفر کی شکل میں بلا اعراب) لکھ دیا گیا ہے اور اس کے سامنے اس کا مادہ (غ ف ر) دیدیا گیا ہے۔ البتہ جہاں اعراب کے بدل جانے سے مادہ بدل جاتا ہے وہاں الفاظ پر اعراب لگا دئے گئے ہیں۔ مثلاً صَفًّا کا مادہ (ص ف ف) ہے اور صَفًّا کا مادہ (ص ف و)۔ ان پر اعراب دیدئے گئے ہیں۔

اسی طرح عربی میں مختلف وجوہ کی بنا پر اسم کے آخری حرف ہر زیر (ـَ یا ـُ) زیر (ـِ یا ـِ) پیش (ـُ یا ـُ) آئے ہیں۔ فہرست میں ایسے الفاظ کی بھی صرف ایک شکل دی گئی ہے۔ مثلاً قرآن میں کہیں عَلِمَ ہے۔ کہیں الْعِلْمُ، عَلِمَ الْعِلْمُ، عَلِمَ اور الْعِلْمُ۔ فہرست میں آپ کو صرف (علم) ملے گا۔

(۲) عربی زبان میں بعض اوقات اصل لفظ سے پہلے (ال) یا (ف) وغیرہ کے حروف آ جاتے ہیں۔ مثلاً الْبَيْت - يَا قَدْ كَرَّ - زیر نظر فہرست میں ایسے الفاظ اپنی اصل شکل میں ملیں گے۔ یعنی (الْبَيْت) آپ کو (ال) کے نیچے نہیں ملے گا بلکہ

بیسیت کے مقام پر ملے گا۔ لیکن جہان (اَلْ) کسی لفظ کا جزو ہے تو وہ لفظ (اَلْ) ہی کے تحت ملے گا۔ مثلاً (اَلْوَاخ)۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے بعض اوقات یہ متعین کرنا بھی مشکل ہوگا کہ (اَلْ) اس لفظ کا اصلی جزو ہے یا نہیں۔ لیکن اس دشواری کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ ایسے الفاظ کو آپ (اَلْ) کے تحت بھی دیکھ لیں اور (اَلْ) کے بغیر اصل لفظ کے تحت بھی۔

اسی طرح عربی میں متعدد حروف 'اسم اور فعل سے پہلے' اور مختلف ضمیریں اسم اور فعل کے بعد 'اس طرح ملا کر لکھدی جاتی ہیں کہ عربی نہ جاننے والوں کے لئے انہیں الگ الگ کر کے الفاظ کی اصلی شکلیں جاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اَفْتَبَرُوْهُمُ مجموعہ ہے اُ + ف + تَمَارُوْنَ + هُ کا۔ اور فَوَقْنَا مجموعہ ہے ف + ق + نَا، کا۔ اور فَاَلْهَمَهَا مجموعہ ہے ف + اَلْهَم + هَا کا۔ اور اَلْهَكُمُ مجموعہ ہے اَلْهَى + كُمْ کا۔ لہذا ان میں سے جس لفظ (یا حرف) کے معنی دیکھنے مقصود ہوں اسے الگ کر کے لغت میں دیکھئے۔

(۳) بعض اوقات لفظ کے مادہ میں بھی تھوڑی سی دقت پیش آجاتی ہے۔ ایسا ان مادوں میں ہوتا ہے جن میں (ی) یا (و) آئے۔ مثلاً (تَرَاتِی) کا مادہ (رقی) بھی ہو سکتا ہے اور (رق و) بھی۔ ایسے الفاظ کی صورت میں فہرست میں دونوں مادے دیدئے گئے ہیں۔ لیکن اگر کسی جگہ ایسا نہ کیا جاسکا ہو تو ان مادوں کو (ی) میں بھی دیکھ لینا چاہئے اور (و) میں بھی۔ اس ضمن میں مزید دیکھئے تتمہ ص ۱۸۰۲ جلد چہارم عنوان تبیہ۔

(۴) فہرست میں حروف مقطعات مثلاً اَلرّٰی - کہیسعص - وغیرہ نہیں دئے گئے۔ اس ضمن میں مزید دیکھئے تتمہ ص ۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان تبیہ۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ فہرست ہر لحاظ سے مکمل ہو لیکن اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض قرآنی الفاظ نہ آسکے ہوں یا کوئی اور غلطی رہ گئی ہو۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اگر انہیں کہیں اس قسم کا سہو یا غلطی نظر آئے تو اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی تصحیح کر دی جائے۔

اب فہرست الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ ہر صفحہ پر تین خانے ہیں۔ اور ہر خانے میں "لفظ" کے نیچے قرآنی الفاظ ہیں اور "مادہ" کے نیچے وہ مقام جہاں وہ الفاظ نیت میں ملیں گے۔



## قرآنی الفاظ کی فہرست

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
أ	أ	آخذین	ا خ ذ	آسفوا	ا س ف
آباء	ا ب و	آخر	ا خ ر	آسن	ا س ن
آت	ا ت ی	آخران	،،	أصاا	ا ص ل
آتی	،،	آخرة	،،	أفاق	ا ف ق
آتوا	،،	آخرون	،،	أفلین	ا ف ل
آتی	،،	آخرین	،،	أکلون	ا ک ل
آتیت	،،	آدم	ا د م	آل	ا و ل
آتیة	،،	آذان	ا ذ ن	آلاء	ا ل و (الی)
آتیتم	،،	آذن	،،	آلآن	ا ل ا و ن
آتیتموا	،،	آذنا	،،	آلاف	ا ل ف
آتین	،،	آذنت	،،	آلهة	ا ل ه
آتینا	،،	آذوا	ا ذ ی	آمر	ا م ر
آثار	ا ث ر	آذیتمو	،،	آسرون	،،
آثر	،،	آزر	ا ز ر	آسن	ا م ن
آثم	ا ث م	آزفة	ا ز ف	آمنا	،،
آثمین	،،	آسی	ا س و	آمنت	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
آمنة	ا م ن	ائتيا	ا ت ي	ابرئى	ب ر أ
آمنتم	،،	اِذْن	ا ذ ن	ابرار	ب ر ر
آمنوا	،،	اِذْنُوا	،،	ابراهيم	ا ب ر ا ه ي م
آمنون	،،	ائمة	ا م م	ابرح	ب ر ح
آمنين	،،	اهـ	ا م ر	ابرص	ب ر ص
آمين	ا م م	آب	ا ب و	ابرموا	ب ر م
آن	ا و ن	آب	ا ب ب	ابسلوا	ب س ل
آن	ا ن ي	آبى	ا ب ي	ابشروا	ب ش ر
آناء	،،	ابايل	ا ب ل	ابصار	ب ص ر
آنس	ا ن س	اباريق	ب ر ق	ابصر	،،
آنستم	،،	ابت	ا ب و	ابصرنا	،،
آنف	ا ن ف	ابتدعوا	ب د ع	ابعث	ب ع ث
آلية	ا ن ي	ابتغر	ب ت ر	ابعثوا	،،
أوى	ا و ي	ابتغ	ب غ ي	ابغى	ب غ ي
أووا	،،	ابتغى	،،	ابق	ا ب ق
أوى	،،	ابتغاء	،،	ابقى	ب ق ي
أوبنا	،،	ابتغوا	،،	ابكى	ب ك ي
آيات	ا ي ي	ابتغى	،،	ابكار	ب ك ر
آية	،،	ابتغيت	،،	ابكم	ب ك م
آيتين	،،	ابتلى	ب ل و	ابل	ا ب ل
أنت	ا ت ي	ابتلوا	،،	ابلعني	ب ل ع
انتمروا	ا م ر	ابحر	ب ح ر	ابلغ	ب ل غ
انتمن	ا م ن	ابدا	ا ب د	ابلغت	،،
انتوا	ا ت ي	ابدل	ب د ل	ابلغوا	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ابلیس	ب ل س	اتبعتم	ت ب ع	اتل	ت ل و
ابن	ب ن ی	اتبعنا	»	اتلوا	»
ابن	ب ن و (بنی)	اتبعوا	»	اتم	ت م م
ابن السبیل	ب ن و + س ب ل	اتت	ا ت ی	اتم	»
ابناء	ب ن و (بنی)	اتخاذ	ا خ ذ	اتمت	»
ابنة	»	اتخذ	»	اتمنا	»
ابنتی	»	اتخذت	»	اتموا	»
ابنوا	ب ن ی	اتخذتم	»	اتوا	ا ت ی
ابنی	ب ن و	اتخذتموا	»	اتوب	ت و ب
ابو	ا ب و	اتخذنا	»	اتوكا	و ك ا
ابوا	ا ب ی	اتخذوا	»	اتيا	ا ت ی
ابواب	ب و ب	اتخذی	»	اتیت	»
ابوین	ا ب و	اتراب	ت ر ب	اتین	»
ابی	»	اترفتم	ت ر ف	اتینا	»
ابی لهب	ا ب و + ل ه ب	اترفنا	»	اثاب	ث و ب
ایض	ب ی ض	اترفوا	»	اثاث	ا ث ث
ایضت	»	اترك	ت ر ك	اثارة	ا ث ر
ابین	ا ب ی	اتسق	و س ق	اثاروا	ث و ر
ابین	ب ی ن	اتقی	و ق ی	اثاقلتم	ث ق ل
اتی	ا ت ی	اتقی	»	اثبتوا	ث ب ت
اتباع	ت ب ع	اتقن	ت ق ن	اثختموا	ث خ ن
اتبع	»	اتقوا	و ق ی	اثر	ا ث ر
اتبعت	»	اتقین	»	اثرن	ث و ر
		اتقین	»	اثقال	ث ق ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اثقلت	ث ق ل	اجرمنا	ج ر م	احب	ح ب ب
اثل	ا ث ل	اجرموا	،،	احباء	،،
اثم	ا ث م	اجسام	ج س م	احبار	ح ب ر
اثر	ث م ر	اجعل	ج ع ل	احببت	ح ب ب
اثنان	ث ن ی	اجعلوا	،،	احبط	ح ب ط
اثنين	،،	اجل	ا ج ل	احترقت	ح ر ق
اثیم	ا ث م	اجلب	ج ل ب	احتمل	ح م ل
اجاء	ج ی ء	اجلت	ا ج ل	احتملوا	،،
اجاج	ا ج ج	اجلدوا	ج ل د	احتكن	ح ن ك
اجتبی	ج ب ی	اجلین	ا ج ل	احد	ا ح د
اجتم	ج و ب	اجمعوا	ج م ع	احدی	،،
اجتبت	ج ب ی	اجمعون	،،	احدث	ح د ث
اجتبینا	،،	اجمعین	،،	احذر	ح ذ ر
اجثت	ج ث ث	اجنب	ج ن ب	احذروا	،،
اجترحوا	ج ر ح	اجنة	ج ن ن	احرص و	ح ر ص
اجتمعت	ج م ع	اجنح	ج ن ح	احزاب	ح ز ب
اجتمعوا	،،	اجنحة	،،	احس	ح س س
اجتنبوا	ج ن ب	اجور	ا ج ر	احسان	ح س ن
اجد	و ج د	اجیب	ج و ب	احسن	،،
اجداث	ج د ث	اجیبت	،،	احسنم	،،
اجدر	ج د ر	اجیبوا	،،	احسنوا	،،
اجر	ا ج ر	احادیث	ح د ث	احسوا	ح س س
اجر	ج و ر	احاط	ح و ط	احشروا	ح ش ر
اجرام	ج ر م	احاطت	،،	احصى	ح ص ی



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
احصرنهم	ح ص ر	احمى	ح م ی	اختین	ا خ و
احصرو	»	احی	ح ی ی	اخذان	ا خ د ن
احصن	ح ص ن	احیاء	»	اخذود	ا خ د د
احصنت	ح ص ن	احیط	ح و ط	اخذ	ا خ ذ
احصوا	ح ص ی	احوی	ح و و	اخذة	ا خ ذ
احصینا	»	احیی	ح ی ی	اخذت	»
احضرت	ح ض ر	احییت	»	اخذتم	»
احطت	ح و ط	احیینا	»	اخذن	»
احطنا	»	اخ	ا خ و	اخذنا	»
احفظوا	ح ف ظ	اخاف	خ و ف	اخذوا	»
احق	ح ق ق	اخالف	خ ل ف	اخر	ا خ ر
احقاب	ح ق ب	اخبار	خ ب ر	اخری	»
احقاف	ح ق ف	اغتبوا	ح ب ت	اخراج	ا خ ر ج
احکم	خ ک م	اغت	ا خ و	اخرت	ا خ ر
احکمت	»	اغتار	خ ی ر	اخرج	ا خ ر ج
احل	ح ل ل	اخرت	»	اخرجت	»
احلام	ح ل م	اخرنا	»	اخرجتم	»
احلت	خ ل ل	اغتصموا	ح ص م	اخرجنا	»
احلل	»	اختلف	خ ل ف	اخرجوا	»
احللنا	»	اختلف	خ ل ق	اخرنا	ا خ ر
احلوا	»	اختلف	خ ل ط	اخزی	ا خ ز ی
احال	ح م ل	اختلف	خ ل ف	اخزیت	»
احمد	ح م د	اختلفتم	»	اخشوا	ا خ س ا
احمل	ح م ل	اختلفوا	»	اخشرون	ا خ س ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اخشوا	خ ش ی	اخوة	ا خ و	ادفعوا	د ف ع
اخضر	ح ض ر	اخيار	خ ی ر	ادکر	ذ ک ر
اخطاتم	خ ط ا	اخيہ	ا خ و	ادل	د ل ل
اخطانا	خ ط ا	اد	ا د د	ادنی	د ل و
اخفی	خ ف ی	اداء	ا د ی	ادنی	د ن و
اخفض	خ ف ض	اداراتم	د ر ا	ادوا	ا د ی
اخفي	خ ف ی	ادارك	د ر ك	ادهی	د ه ی
اخفيم	»	اداركوا	د ر ك	اذ	ا ذ
اخلاء	خ ل ل	ادبار	د ب ر	اذا	ا ذ ن
اخلاص	خ ل ص	ادبر	»	اذا	ا ذ ا
اخلد	خ ل د	ادخل	د خ ل	اذا	ا ذ ا
اخلصنا	خ ل ص	ادخلا	»	اذاعوا	ذ ی ع
اخلصوا	»	ادخلنا	»	اذاق	ذ و ق
اخلع	خ ل ع	ادخلوا	»	اذان	ا ذ ن
اخلف	خ ل ف	ادخلي	»	اذبح	ذ ب ح
اخلفت	»	ادری	د ر ی	اذکر	ذ ک ر
اخلفتم	»	ادراءوا	د ر ا	اذکروا	»
اخلفنا	»	ادرك	د ر ك	اذقان	ذ ق ن
اخلفوا	»	ادری	د ر ی	اذقنا	ذ و ق
اخلق	خ ل ق	ادريس	ا د ر ی س	اذل	ذ ل ل
اخن	خ و ن	ادع	د ع و	اذلة	»
اخوان	ا خ و	ادعوا	»	اذلین	»
اخوان	خ و ل	ادعیاء	»	اذن	ا ذ ن
اخوان	ا خ و	ادفع	د ف ع	اذنت	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اذنین	ا ذ ن	ارتدوا	ر د د	ارسل	ر م ل
اذهب	ذ ه ب	ارتضی	ر ض ی	ارسلت	ر
اذهبوا	ر	ارتقب	ر ق ب	ارسلتم	ر
اذهبتم	ر	ارتقبوا	ر	ارسلنا	ر م ل
اذهبوا	ر	ارجاء	ر ج و	ارسلوا	ر
اذی	ا ذ ی	ارجع	ر ج ع	ارصاد	ر ص د
ار	ر أ ی	ارجعوا	ر	ارض	ا ر ض
ارائک	ا ر ک	ارجعی	ر	ارضعت	ر ض ع
اراد	ر و د	ارجل	ر ج ل	ارضعن	ر
ارادا	ر	ارجم	ر ج م	ارضعی	ر
ارادوا	ر	ارجوا	ر ج و	ارعوا	ر ع ی
اراذل	ر ذ ل	ارجه	ر	ارغب	ر غ ب
اربی	ر ب و	ارحام	ر ح م	ارکب	ر ک ب
ارباب	ر ب ب	ارحم	ر	ارکبوا	ر
اربة	ا ر ب	اردی	ر د ی	ارکس	ر ک م
اربع	ر ب ع	اردت	ر و د	ارکسوا	ر
اربعة	ر	اردم	ر	ارکض	ر ک ض
اربعین	ر	اردن	ر	ارکعوا	ر ک ع
ارتاب	ر ی ب	اردنا	ر	ارکعی	ر
ارتابت	ر	ارذل	ر ذ ل	ارم	ا ر م
ارتابوا	ر	ارذلون	ر	اروا	ر أ ی
ارتبتم	ر	ارزق	ر ز ق	ارهبوا	ر ه ب
ارتد	ر د د	ارزقوا	ر	ارهی	ر ه ق
ارتدا	ر	ارسی	ر م و	اری	ر أ ی

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ارید	ر و د	اساور	س و ر	استعوذ	ح و ذ
ارینا	ر ا ی	اسباب	س ب ب	استحياء	ح ی ی
از	ا ز ز	اسباط	س ب ط	استحيوا	و
ازاغ	ز ی غ	اسیع	س ب غ	استحيي	ح ی ی
ازدادو	ز ی د	استاجر	ا ج ر	استخرج	خ ر ج
ازدجر	ز ج ر	استاجرت	و	استخف	خ ف ف
ازر	ا ز ر	استاذن	ا ذ ن	استخلص	خ ل ص
ازفت	ا ز ف	استاذنوا	و	استخلف	خ ل ف
ازکی	ز ک و	استبدال	ب د ل	استرق	س ر ق
ازل	ز ل ل	استبرق	ا س ب ر ق	استرهبوا	ر ه ب
ازلام	ز ل م	استبشروا	ب ش ر	استزل	ز ل ل
ازلفت	ز ل ف	استبقا	س ب ق	استسقى	س ق ی
ازلفنا	و	استبقوا	و	استشهدوا	ش ه د
ازواج	ز و ج	استجاب	ج و ب	استضعفوا	ض ع ف
ازید	ز ی د	استجابوا	و	استطاع	ط و ع
ازین	ز ی ن	استجار	ج و ر	استطاعوا	و
ازینت	و	استجب	ج و ب	استطعت	و
اساء	س و ا	استجبت	و	استطعم	و
اساتم	و	استجیب	و	استطعموا	ط ع م
اساءوا	و	استجیبوا	و	استطعنوا	ط و ع
اساری	ا س ر	استحبوا	ح ب ب	استعجال	ع ج ل
اساطیر	س ط ر	استحفظوا	ح ف ظ	استعجلتم	و
اسأل	س ا ل	استحق	ح ق ق	استعذ	ع و ذ
اسألوا	و	استحقا	و	استعصم	ع ص م

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
استعلی	ع ل و	استکبرتم	ک ب ر	استیقنت	ی ق ن
استعمر	ع م ر	استکبروا	،،	اسجد	س ج د
استعیثوا	ع و ن	استکثرت	ک ث ر	اسجدوا	،،
استغاث	غ و ث	استکثرتم	،،	اسجدی	،،
استغشوا	غ ش ی	استمتعتم	م ت ع	اسحار	س ح ر
استغفار	غ ف ر	استمتعوا	،،	اسحق	س ح ق
استغفر	،،	استمسك	م س ك	اسخط	س خ ط
استغفرت	،،	استمع	م م ع	أسر <sup>۸</sup>	ا س ر
استغفروا	،،	استمعوا	،،	أسر <sup>۸</sup>	س ر ی
استغفري	،،	استنبر	ن ص ر	أسر <sup>۸</sup>	س ر ر
استغلفظ	غ ل ظ	استمتع	م ت ع	أسری (فعل) س ر ی	
استغنی	غ ن ی	استنبروا	ن ص ر	أسری (اسم) ا س ر	
استفت	ف ت ی	استنكفوا	ن ك ف	اسرائیل	ا س ر ا ئ ی ل
استفتحوا	ف ت ح	استوی	س و ی	اسرار	س ر ر
استفز	ف ز ز	استوت	،،	اسراف	س ر ف
استقاموا	ق د م	استوقد	و ق د	اسرح	س ر ح
استقر	ق ر ر	استویت	س و ی	اسروت	س ر ر
استقم	ق و م	استویتم	،،	اسرع	س ر ع
استقیما	،،	استهزی	ه ز أ	اسرف	س ر ف
استقیموا	،،	استهزوا	،،	اسرفوا	،،
استکالوا	ک و ن	استهوت	ه و ی	اسروا	س ر ر
استکبار	ک ب ر	استیأس	ی أ س	اسس	ا س س
استکبر	،،	استیأسوا	،،	استطاعوا	ط و ع
استکبرت	،،	استیسر	ی س ر	اسعوا	س ع ی

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اسفا	ا م ف	اسلمنا	م ل م	اشحۃ	ش ح ح
اسفی	و	اسلموا	و	اشد	ش د د
اسفار	م ف ر	اسلنا	م ی ل	اشداء	و
اسفر	و	اسم	م م و	اشدد	و
اسفل	م ف ل	اسماء	و	اشر	ا ش ر
اسفلین	و	اسمع	م م ع	اشرار	ش ر ر
اسقط	م ق ط	اسمعوا	و	اشراط	ش ر ط
اسقی	م ق ی	اسمعیل	اسمعیل	اشراق	ش ر ق
اسقینا	و	اسوا	م و و	اشربوا	ش ر ب
اسکن	م ک ن	اسواق	م و ق	اشربی	و
اسکنا	و	اسوة	ا م و	اشرح	ش ر ح
اسكنت	و	اسود	م و د	اشرقت	ش ر ق
اسکنوا	و	اسودت	و	اشرك	ش ر ک
اسلام	م ل م	اسورة	م و ر	اشرکت	و
اسلحة	م ل ح	اسیر	ا م ر	اشرکتکم	و
اسلفت	م ل ف	اشاء	ش ی و	اشرکتکوا	و
اسلفتم	و	اشارت	ش و ر	اشرکنا	و
اسلک	م ل ک	اشتات	ش ت ت	اشرکوا	و
اسلکوا	و	اشتدت	ش د د	اشعار	ش ع ر
اسلکی	و	اشتری	ش ر ی	اشفقتم	ش ف ق
اسلم	م ل م	اشترؤا	و	اشفقن	و
اسلما	و	اشتعل	ش ع ل	اشق	ش ق ق
اسلمت	و	اشتعلت	ش م ل	اشقی	ش ق ی
اسلعتم	و	اشتتهت	ش ه و	اشکر	ش ک ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اشکروا	ش ک ر	اصحاب {	ص ح ب	اصلب	ص ل ب
اشکرا	ش ک و	اليمن {	ی م ن	اصلح	ص ل ح
اشمأزت	ش م ز	اصحاب {	ص ح ب	اصلحا	»
اشهاد	ش ه د	الفيل {	ف ی ل	اصلحنا	»
اشهد	»	اصحاب {	ص ح ب	اصلوا	ص ل ی
اشهدت	»	الكهف {	ک ه ف	اصلی	»
اشهدوا	»	اصدع	ص د ع	اصم	ص م م
اشهر	ش ه ر	اصدق	ص د ق	اصنام	ص ن م
اشياء	ش ی ء	اصر	ا ص ر	اصنع	ص ن ع
اشیاع	ش ی ع	اصرف	ص ر ف	اصوات	ص و ت
اصاب	ص و ب	اصروا	ص ر ر	اصواف	ص و ف
اصابت	»	اصطادوا	ص ی د	اصول	ا ص ل
اصابع	ص ب ع	اصطبر	ص ب ر	اصیب	ص و ب
اصب	ص ب و	اصطفى	ص ف و	اصیل	ا ص ل
اصباح	ص ب ح	اصطفیت	»	اضاء	ض و ء
اصبتم	ص و ب	اصطفینا	»	اضاءت	»
أصبح	ص ب ح	اصطنعت	ص ن ع	اضاءوا	ض ی ع
اصبحت	»	اصغر	ص غ ر	اضحك	ض ح ك
اصبغتم	»	اصفی	ص ف و	اضرب	ض ر ب
اصبحوا	»	اصفاد	ص ف د	اضربوا	»
اصبر	ص ب ر	اصفح	ص ف ح	اضطر	ض ر ر
اصبروا	»	اصفحوا	»	اضطرتهم	»
اصبنا	ص و ب	اصل	ا ص ل	اضعاف	ض ع ف
اصحاب	ص ح ب	اصلاب	ص ل ب	اضعف	»
		اصلاح	ص ل ح		

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اضغات	ض غ ث	اطفا	ط ف أ	اعتدى	ع د و
اضغات	ض غ ث	اطفال	ط ف ل	اعتدت	و
احلام	ح ل م	اطلع	ط ل ع	اعتدنا	و
اضغان	ض غ ن	اطلمت	و	اعتدوا	و
اضل	ض ل ل	اطان	ط م ن (طآن)	اعتدینا	و
اضلا	و	اطانتم	و	اعترى	ع ر ی
اضلتم	و	اطانوا	و	اعترفنا	ع ر ف
اضلان	و	اطمس	ط م س	اعترفوا	و
اضلوا	و	اطمع	ط م ع	اعتزل	ع ز ل
اضمم	ض م م	اطوار	ط و ر	اعتزلتموا	و
اضیع	ض ی ع	اطهر	ط ه ر	اعتزلوا	و
اطاع	ط و ع	اطهروا	و	اعتصموا	ع ص م
اطاعوا	و	اطیرنا	ط ی ر	اعتلوا	ع ت ل
اطراف	ط ر ف	اطيروا	و	اعتمر	ع م ر
اطرحوا	ط ر ح	اطیعوا	ط و ع	اعثرنأ	ع ث ر
اطعام	ط ع م	اظفر	ظ ف ر	اعجاز	ع ج ز
اطعم	ط و ع	اظلم	ظ ل م	اعجب	ع ج ب
اطعموا	و	اظن	ظ ن ن	اعجبت	و
اطعم	ط ع م	اظهر	ظ ه ر	اعجل	ع ج ل
اطعموا	و	اعادة	ع و د	اعجمی	ع ج م
اطعن	ط و ع	اعان	ع و ن	اعجمین	و
اطعنا	و	اعبد	ع ب د	اعد	ع د د
اطغی	ط غ ی	اعبدوا	و	اعداء	ع د و
اطغیت	و	اعتبروا	ع ب ر	اعدت	ع د د



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اعدل	ع د ل	اعقاب	ع ق ب	اغترف	غ ر ف
اعدلوا	،،	اعقب	،،	اغدوا	غ د و
اعدوا	ع د د	اعلى	ع ل و	اغرقنا	غ ر ق
اعذب	ع ذ ب	اعلام	ع ل م	اغرقوا	،،
اعراب	ع ر ب	اعلم	،،	اغرينا	غ ر و
اعراض	ع ر ض	اعلموا	،،	اغسلوا	غ س ل
اعراف	ع ر ف	اعلنت	ع ل ن	اغشيت	غ ش ي
اعرج	ع ر ج	اعلنتم	،،	اغشيننا	،،
اعرض	ع ر ض	اعلون	ع ل و	اغضض	غ ض ض
اعرضتم	،،	اعمى	ع م ي	اغطش	غ ط ش
اعرضوا	،،	اعمال	ع م ل	اغفر	غ ف ر
اعز	ع ز ز	اعمام	ع م م	اغفلنا	غ ف ل
اعزة	،،	اعمل	ع م ل	اغلال	غ ل ل
اعصار	ع ص ر	اعملوا	،،	اغلب	غ ل ب
اعصر	ع ص ر	اعناب	ع ن ب	اغلظ	غ ل ظ
اعصي	ع ص ي	اعناق	ع ن ق	اغنى	غ ن ي
اعط	ع ط و	اعنت	ع ن ت	اغنت	،،
اعطى	،،	اعوذ	ع و ذ	اغنياء	،،
اعطوا	،،	اعهد	ع ه د	اغوى	غ و ي
اعطينا	،،	اعيب	ع ي ب	اغويت	،،
اعظ	و ع ظ	اعيدوا	ع و د	اغويننا	،،
اعظم	ع ظ م	اعيد	ع و ذ	اف	ا ف ف
اعف	ع ف و	اعين	ع ي ن	افاء	ف ي أ
اعفوا	،،	اعينوا	ع و ن	افاض	ف ي ض

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اتفاق	ف و ق	افل	ا ف ل	اقتربتموا	ق ر ف
افاك	ا ف ك	افلت	»	اقتل	ق ت ل
افئدة	ف ا د	افلح	ف ل ح	اقتلوا	»
افت	ف ت ی	افتنان	ف ن ن	اقدام	ق د م
افتح	ف ت ح	افواج	ف و ج	اقدامون	»
افتدى	ف د ی	افواه	ف و ه	اقذفی	ق ذ ف
افتدت	»	افوز	ف و ز	اقرأ	ق و ا
افتدوا	»	افوض	ف و ض	اقرءوا	»
افتراء	ف ر ی	افیضوا	ف ی ض	اقرب	ق ر ب
افتری	»	اقام	ق و م	اقربون	»
افتريت	»	اقاموا	»	اقررتهم	ق ر ر
افترينا	»	اقاویل	ق و ل	اقررنا	»
افتوا	ف ت ی	اقبر	ق ب ر	اقرضتم	ق ر ض
افرغ	ف ر غ	اقبل	ق ب ل	اقرضوا	»
افرق	ف ر ق	اقبلت	»	اقسط	ق س ط
افسحوا	ف س ح	اقبلنا	»	اقسطوا	»
افسدوا	ف س د	اقبلوا	»	اقسم	ق س م
افصح	ف ص ح	اقتت	و ق ت	اقسمتم	»
افضى	ف ض و	اقتل	ق ت ل	اقسموا	»
افضتم	ف ی ض	اقتلوا	»	اقصی	ق ص و
افعل	ف ع ل	اقتحم	ق ح م	اقصد	ق ص د
افعلوا	»	افتد	ق د و	اقصص	ق ص ص
افق	ا ف ق	اقترب	ق ر ب	اقض	ق ض ی
افك	ا ف ك	اقتربت	»	اقضوا	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اقطار	ق ط ر	اکالون	ا ک ل	اکفر	ک ف ر
اقطع	ق ط ع	اکبر	ک ب ر	اکفرن	ک ف ر
اقطعوا	ق ط ع	اکبرن	ک ب ر	اکفروا	ک ف ر
اقعد	ق ع د	اکتالوا	ک ی ل	اکفل	ک ف ل
اقعدوا	ق ع د	اکتب	ک ت ب	اکل	ا ک ل
اقفال	ق ف ل	اکتبوا	ک ت ب	اکلا	ک ل
أَقْلُ	ق و ل	اکتسب	ک س ب	اکام	ک م
أَقْلُ	ق ل ل	اکتسب	ک س ب	اکاوا	ا ک ل
اقلام	ق ل م	اکتسبت	ک س ب	اکام	ک م م
اقلت	ق ل ل	اکتسبن	ک س ب	اکملت	ک م ل
اقلعي	ق ل ع	اکتسبوا	ک س ب	اکمه	ک م ه
اقم	ق و م	اکثر	ک ث ر	اکن	ک و ن
اقمت	ق و م	اکثرت	ک ث ر	اکنان	ک ن ن
اقمّم	ق و م	اکثروا	ک ث ر	اکنة	ک ن ن
أَقْمِن	ق و م	اکدی	ک د ی	اکننتم	ک ن ن
اقتی	ق ن ی	اکرام	ک ر م	اکواب	ک و ب
اقتتی	ق ن ت	اکراه	ک ر ه	اکون	ک و ن
افوات	ق و ت	اکرم	ک ر م	اکید	ک ی د
اقول	ق و ل	اکرمین	ک ر م	أَلْ	ا ل
اقوم	ق و م	اکرمی	ک ر م	أَلْ	ا ل ل
اقیموا	ق و م	اکره	ک ر ه	أَلَّا	ا ل
اک	ک و ن	اکرهت	ک ر ه	أَلَّا	ا ل
اکابر	ک ب ر	اکسوا	ک س و	أَلَّا	ا ل
اکاد	ک و د	اکشف	ک ش ف	أَلَّا-أَلَّا	ا ل



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
امانی	م ن ی	امروا	ا م ر	ادم	ا م م
أَمَّتْ	ا م ت	امس	ا م س	امن	ا م ن
أَمَّتْ	م و ت	امساک	م س ک	امنت	”
أَمَّةٌ	ا م و	امسحوا	م س ح	امنة	”
أُمَّةٌ	ا م م	امسك	م س ک	امتم	”
امتازوا	م ی ز	امسکتم	”	امنن	م ن ن
امتحن	م ح ن	امسکن	”	امني	م ن ی
امتحنوا	”	امسکوا	”	امنية	”
امتع	م ت ع	امشاج	مشج	اموات	م و ت
امتعة	”	امشوا	م ش ی	اموال	م و ل
امتلت	م ل أ	امضوا	م ض ی	اموت	م و ت
امثال	م ث ل	امطر	م ط ر	امور	ا م ر
امثل	”	امطرت	”	امهات	ا م م
أَمَدٌ	ا م د	امطرنا	”	امهل	م ه ل
أَمَدٌ	م د د	امعاء	م ع ی	امي	ا م م
امددنا	”	امكثوا	م ک ث	اميت	م و ت
أَمْرٌ	ا م ر	امکن	م ک ن	امين	ا م ن
أَمْرٌ	م ر ر	امل	ا م ل	اميون	ا م م
أَمْرٌ	ا م ر	املاً	م ل أ	اميين	”
أَمْرٌ	م ر أ	املی	م ل و	أَنَّ	أَنَّ
امراة	”	املاق	م ل ق	أَنَّ	أَنَّ
امرعتان	”	املك	م ل ک	أَنَّ	أَنَّ
امرت	ا م ر	املي	م ل و	أَنَّ	أَنَّ
امرفا	”	امليت	”	أَنَّ	أَنَّ

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
أَنَّى	أَنَّى	أَنبِیَاءَ	ن ب أ- ن ب و	الذاد	ن د د
أَنَا	أَنَا	أَنْتَ	أَنْتَ	الذر	ن ذ ر
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انذرت	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انذرنا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انذروا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انزل	ن ز ل
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	الزلت	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انزلتموا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انزلنا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انس	ان س
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انسى	ن س ی
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انساب	ن س ب
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انسان	ان س
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انسلك	س ل خ
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انسوا	ن س ی
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	السی	ان س
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشأ	ن ش أ
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشاء	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشأتم	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشأنا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشر	ن ش ر
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشرنا	»
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشزوا	ن ش ز
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	انشق	ش ق ق
أَنَا	أَنَا	أَنْتِ	أَنْتِ	أَنْتِ	أَنْتِ

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
انشئت	ش ق ق	انفجرت	ف ج ر	انکر	ن ک ر
انصاب	ن ص ب	انفخ	ن ف خ	انما	ان + ما
انصار	ن ص ر	انفخوا	»	انه	ن ه ی
انصب	ن ص ب	انفذوا	ن ف ذ	انهی	»
انصبوا	ن ص ت	انفروا	ن ف ر	انهار	ن ه ر
انصح	ن ص ح	انفس	ن ف س	انهار	ن ه ر
انصر	ن ص ر	انقسام	ف ص م	انهار	ن ه ر
انصرفوا	ص ر ف	انفضو	ف ض ض	انی	آنی
انصروا	ن ص ر	انفطرت	ف ط ر	انیب	ن و ب
انطق	ن ط ق	انفق	ن ف ق	انیبوا	»
انطلق	ط ل ق	انفقت	»	او	او
انطلقا	»	انفقتهم	»	اوب	ا و ب
الطلقتهم	»	انفقوا	»	اوابین	»
انطلقوا	»	انفلق	ف ل ق	اوارى	و ر ی
انظر	ن ظ ر	انقذ	ن ق ذ	اواه	ا و ه
انظروا	»	انقص	ن ق ص	اوبار	و ب ر
انظری	»	انقض	ن ق ض	اوبی	ا و ب
انعام	ن ع م	انقلب	ق ل ب	اوتی	ا ت ی
انعم	»	انقلبتم	»	اوتین	»
انعمت	»	انقلبوا	»	اوتاد	و ت د
انعمنا	»	انکث	ن ک ث	اوتوا	ا ت ی
انف	ا ن ف	انکال	ن ک ل	اوتی	»
انفاق	ن ف ق	انکحوا	ن ک ح	اوتی	»
انفال	ن ف ل	انکدرت	ک د ر	اوتیت	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اوتیم	و	اوعیه	و ع ی	اهانن	ه و ن
اوتینا	و	اوف	و ف ی	اهب	و ه ب
اوتان	و ث ن	اوفی	و	اهبط	ه ب ط
اوجس	و ج س	اوفوا	و	اهبطا	و
اوجفم	و ج ف	اوقد	و ق د	اهبطوا	و
اوحی	و ح ی	اوقدوا	و	اهتدی	ه د ی
اوحی	و	اول	ا و ل	اهتدوا	و
اوحیت	و	اولی	و	اهتدیت	و
اوحینا	و	اولی	و ل ی	اهتدیم	و
اودیه	و د ی	اولاً	ا و ل ا	اهتزت	ه ز ت
اوذوا	ا ذ ی	اولسک	ا و ل س ک	اهجر	ه ج ر
اوذی	و	اولو	ا و ل و	اهجروا	و
اوذینا	و	اولات	ا و ل ا ت	اهد	ه د ی
اورث	و ر ث	اولات	ا و ل ا ت	اهدی	و
اورثتمو	و	الاحمال	ا ل ا ح م ا ل	اهدوا	و
اورثنا	و	اولاد	ا و ل ا د	اهدی	و
اورثوا	و	اولی لك	ا و ل ی ل ک	اهش	ه ش ش
اورد	و ر د	اولو	ا و ل و	اهل	ه ل ل
اوزار	و ز ر	اولی النعمة	ا و ل ی الن ع م ة	اهل	ه ل ل
اوزع	و ز ع	اولون	ا و ل و ن	اهل	ه ل ل
اوسط	و س ط	اولیاء	ا و ل ی ا	اهل	ه ل ل
اوصی	و ص ی	اولیان	و	اهلك	ه ل ل ک
اوضعوا	و ض ع	اولین	ا و ل ی ن	اهلکت	و
اوعی	و ع ی	اوهن	و ه ن	اهلکنا	و
		اهان	ه و ن	اهلکوا	و



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اهلون	ا ه ل	ایام	ی و م	ایدنا	ای د
اهم	ه م م	ایامی	ای م	ایدی	ی د ی
اهواء	ه و ی	ایان	ایان	ایقاف	ی ق ظ
اهوی	و	ایانا	ایا + نا	ایکة	ای ک
اهون	ه و ن	ایاه	و + ه	ایلاف	ا ل ف
ای	ای	ایاها	و + ها	ایمان	ی م ن
ای	ای	ایاهم	و + هم	ایمان	ا م ن
ایاب	ا و ب	ایای	و + ی	ایمن	ی م ن
ایاک	ایا + ک	ایة	ای ی	این	این
ایاکما	ایا + کما	ایتاء	ا ت ی	اینما	این + ما
ایاکم	ایا + کم	اید	ای د	ایوب	ایوب
		ایدت	و	ایها	ای + ها

## ب

باد	ب	باخع	ب خ ع	بازغة	ب ز غ
باء	ب و	بادون	ب د و	باس	ب ا س
بائس	ب ا س	بادی	و	باساء	و
بئر	ب ا ر	بارد	ب ر د	باسرة	ب س ر
بش	ب ا س	بارزة	ب ر ز	باسط	ب س ط
بائع	ب ی ع	بارزون	و	باسطون	و
باء وا	ب و	بارك	ب ر ک	باسقات	ب س ق
بشیس	ب ا س	بارکنا	و	باشروا	ب ش ر
باب	ب و ب	بارئ	ب ر ا	باطل	ب ط ل
بابل	ب ا ب ل	بازغ	ب ز غ	باطن	ب ط ن

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
باطنة	ب ط ن	بدءوا	ب د أ	بروج	ب ز ج
باعد	ب ع د	بدأنا	»	برهان	ب ر ه
باغ	ب غ ی	بدت	ب د و	»	»
باقی	ب ق ی	بدن	ب د ر	بری	ب ر ا
باقون	»	بدع	ب د ع	بریتون	»
باقیات	»	بدعة	»	برية	» - ب ر ی
باقية	»	بدل	ب د ل	بس	ب س س
بال	ب و ل	بدلنا	»	بساط	ب س ط
بالغ	ب ل غ	بدلوا	»	بست	ب س س
بالغة	»	بدن	ب د ن	بسر	ب س ر
بالغون	»	بدو	ب د و	بسط	ب س ط
بایع	ب ی ع	بذیع	ب د ع	بسطة	»
بایعتم	»	بر	ب ر ر	بسطت	»
بث	ب ث ث	برا	ب ر أ	بشر	ب ش ر
بحار	ب ح ر	براء	»	بشری	»
بحر بحران	»	براءة	»	بشرموا	»
بحرین	»	برد	ب ر د	بشرنا	»
بحيرة	»	بررة	ب ر ر	بشروا	»
بخس	ب خ س	برز	ب ر ز	بشرین	»
بخل	ب خ ل	برزت	»	بشیر	»
بخلوا	»	برزخ	ب ر ز خ	بصائر	ب ص ر
بدا	ب د و	برزوا	ب ر ز	بصر	»
بدأ	ب د أ	برق	ب ر ق	»	»
بدار	ب د ر	برکات	ب ر ك	»	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
بصل	ب ص ل	بعولة	ب ع ل	بل	بل
بصير	ب ص ر	بعيد	ب ع د	بلى	بلى
بصيرة	»	بعير	ب ع و	بلا	ب ل و
بضاعة	ب ض ع	بغى	ب غ ى	بلاد	ب ل د
بضع	»	بغاء	»	بلاغ	بلغ
بطائن	ب ط ن	بغال	ب غ ل	بلد	ب ل د
بطانة	»	بغت	ب غ ى	بلدة	»
بطر	ب ط ر	بغثة	»	بلغ	ب ل غ
بطرت	»	بغضاء	ب غ ض	بلغا	»
بطش	ب ط ش	بغوا	ب غ ى	بلغت	»
بطشة	»	بغى	»	بلغن	»
بطشتم	»	بقر	ب ق ر	بلغنا	»
بطل	ب ط ل	بقرات	»	بلغوا	»
بطن	ب ط ن	بقرة	»	بلونا	ب ل و
بطون	»	بقعة	ب ق ع	بل-يغ	ب ل غ
بعث	ب ع ث	بقل	ب ق ل	بنى	ب ن ى
بعث	ب ع ث ر	بقى	ب ق ى	بناء	»
بعثت	»	بقية	»	بنات	ب ن و- ى
بعثنا	ب ع ث	بك	ب ك ك	بنان	ب ن ن
بعد	ب ع د	بكت	ب ك ى	بنوا	ب ن ى
بعدت	»	بكر	ب ك ر	بنون	ب ن و
بعض	ب ع ض	بكرة	»	بنى	ب ن و
بعل	ب ع ل	بكم	ب ك م	بنى اسرائيل	ب ن ى اسرائيل
بعوضة	ب ع ض	بكى	ب ك ى		

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
بنیان	ب ن ی	بهتان	ب ه ت	بیع	ب ی ع
بنی	،،	بهجة	ب ه ج	بین	ب ی ن
بنینا	،،	بهیج	،،	بین ابیدی	،، + ی دی
بوا	ب و ا	بهیمة	ب ه م	بینا	،،
بوانا	،،	بیات	ب ی ت	بینات	،،
بوار	ب و ر	بیان	ب ی ن	بینة	ب ی ن
بور	،،	بیت	ب ی ت	بینوا	،،
بورک	ب ر ک	بیض	ب ی ض	بیوت	ب ی ت
بهت	ب ه ت	بیضاء	،،		

## ت

ت	ت	تاتون	ا ت ی	تارکوا	ت ر ک
تائب	ت و ب	تاتی	،،	توز	أ ز ز
تائبات	،،	توثرئون	ا ث ر	تاس	ا س و
تائبون	،،	تائم	ا ث م	تاسرون	ا س ر
تاب	،،	تاجر	ا ج ر	تاسوا	ا س و
تابا	،،	تاجیل	ا ج ل	تافک	ا ف ک
تأبی	أ ب ی	تاخذوا	ا خ ذ	تاکل	ا ک ل
تابع	ت ب ع	تاخذون	،،	تاکلوا	،،
تابعین	،،	تاخر	ا خ ر	تاکلون	،،
تابوا	ت و ب	تودوا	ا د ی	تالمون	ا ل م
تابوت	تابوت	تاذن	ا ذ ن	تالیات	ت ل و
تاتنی	ا ت ی	تارة	ت و ر	تاسر	ا م ر
تاتوا	،،	تارك	ت ر ک	تاسرون	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تامرین	ا م ر	تبذر	ب ذ ر	تبغی	ب ع ی
تامن	ا م ن	تبذیر	،،	تبقی	ب ق ی
تاویل	ا و ل	تبرأ	ب ر أ	تبیكون	ب ك ی
تب	ت و ب	تبری	،،	تبلی	ب ل و
تب	ت ب ب	تبرانا	،،	تبلغ	ب ل غ
تباب	،،	تبرءوا	،،	تبلغوا	،،
تبارک	ت ب ر	تبرج	ب ر ج	تبلوا	ب ل و
تباشروا	ب ش ر	تبرجن	،،	تبلون	،،
تبايعم	ب ی ع	تبرنا	ت ب ر	تبنون	ب ن ی
تبت	ت و ب	تبروا	ب ر ر	تبوء	ب و ،
تبت	ت ب ب	تبسط	ب س ط	تبوءا	،،
تبتس	ب أ س	تبسل	ب س ل	تبوءوا	،،
تبتم	ت و ب	تبسم	ب س م	تبور	ب و ر
تبتفون	ب غ ی	تبشر	ب ش ر	تبهت	ب ه ت
تبتغی	،،	تبشرون	،،	تبیان	ب ی ن
تبتل	ب ت ل	تبصر	ب ص ر	تبیّد	ب ی د
تبتیل	ب ت ل	تبصرة	،،	تبیض	ب ی ض
تبغسوا	ب خ س	تبصرون	،،	تبیع	ت ب ع
تبخلوا	ب خ ل	تبطلوا	ب ط ل	تبین	ب ی ن
تبد	ب د و	تبع	ت ب ع	تبیّن	،،
تبدل	ب د ل	تبعثون	ب ع ث	تبینوا	،،
تبدلون	ب د و	تبعوا	ت ب ع	تبدلوا	ب د ل
تبدی	،،	تبع	ب غ ی	تتبع	ت ب ع
تبدیل	ب د ل	تبعون	،،	تتبعان	ت ب ع

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تتبعون	و	تتوفى	و ف ی	تجوع	ج و ع
تتبيب	ت ب ب	تتولوا	و ل ی	تجهر	ج ه ر
تتيسر	ت ب ر	تثبیت	ث ب ت	تجهروا	و
تتجافى	ج ف و	تثريب	ث ر ب	تجهلون	ج ه ل
تتخذ	ا خ ذ	تثقفن	ث ق ف	تحتاجون	ح ج ج
تتخذون	و	تثير	ث و ر	تخاضون	ح ض ض
تتذكرون	ذ ك ر	تجادل	ج د ل	تخاور	ح و ر
تتدى	و ت ر	تجادلون	و	تخبرون	ح ب ر
تترك	ت ر ك	تجارة	ت ج ر	تخسبون	ح ب س
تتركون	و	تجارون	ج أ ر	تخبط	ح ب ط
تتفرقوا	ف ر ق	تجاهدون	ج ه د	تخبون	ح ب ب
تتفكر	ف ك ر	تجتنبون	ج ن ب	تحت	تحت
تتقلب	ق ل ب	تجددوا	و ج د	تحدث	ح د ث
تتقون	و ق ی	تجدون	و	تحدثون	و
تتكبر	ك ب ر	تجربون	ج ر م	تحدرون	ح ذ ر
تتلى	ت ل و	تجرى	ج ر ی	تحرثون	ح ر ث
تتلقى	ل ق ی	تجربان	و	تحرص	ح ر ص
تتلوا	ت ل و	تجزى	ج ز ی	تحرك	ح ر ك
تتاون	و	تجزون	و	تحرم	ح ر م
تتارى	م ر ی	تجسبو	ج م س	تحمروا	و
تتمنوا	م ن ی	تجعل	ج ع ل	تحروا	ح ر ی
تتناجوا	ن ج و	تعملون	و	تحریر	ح ر ر
تنزل	ن ز ل	تجلى	ج ل و	تخزن	ح ز ن
تتوبا	ت و ب	تجمعوا	ج م ع	تخزنون	و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تحزنی	ح ز ن	تحید	ح ی د	تخسروا	خ س ر
تخس	ح س س	تخبطوا	ح و ط	تخسیر	خ س ر
تخسب	ح س ب	تخیون	ح ی ی	تخشی	خ ش ی
تخسبون	»	تخبی	ح ی ی	تخشع	خ ش ع
تخسدون	ح س د	تخاصم	خ ص م	تخشوا	خ ش ی
تخسوا	ح س س	تخاطب	خ ط ب	تخضعن	خ ض ع
تخسنا	ح س ن	تخاف	خ و ف	تخط	خ ط ط
تخسون	ح س س	تخافا	»	تخطف	خ ط ف
تخشرون	ح ش ر	تخافت	خ ف ت	تخفی	خ ف ی
تخصن	ح ص ن	تخافون	خ و ف	تخفوا	»
تخصنون	»	تخافي	»	تخفون	»
تخصوا	ح ص ی	تخالطوا	خ ل ط	تخفي	»
تخط	ح و ط	تثبت	خ ب ت	تخفيف	خ ف ف
تحکم	ح ك م	تختانون	خ و ن	تختل	خ ل و
تحکمون	»	تختصموا	خ ص م	تخلدون	خ ل د
تخل	ح ل ل	تختصمون	»	تخلف	خ ل ف
تخلوا	»	تختلفون	خ ل ف	تخلق	خ ل ق
تحلة	»	تخر	خ ر ر	تخلقون	»
تخلقوا	ح ل ق	تخرج	خ ر ج	تخوف	خ و ف
تحمل	ح م ل	تخرجون	»	تخونون	خ و ن
تحملون	»	تخرصون	خ ر ص	تخويف	خ و ف
تحنث	ح ن ت	تخرق	خ ر ق	تخبرون	خ ی ر
تحويل	ح و ل	تخزون	خ ز ی	تدارك	د ر ك
تحية	ح ی ی	تخز	»	تداينتم	د ی ن

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تدخرون	ذ خ ر	تذکرة	ذ ک ر	تربصتم	ر ب ص
تدخل	د خ ل	تدکرون	،،	تربصوا	،،
تدخلوا	،،	تذکروا	،،	تربصون	،،
تدرسون	د ر س	تذکیر	،،	ترتابوا	ر ی ب
تدرک	د ر ک	تذل	ذ ل ل	ترتدوا	ر د د
تدرون	د ر ی	تذلیل	،،	ترتیل	ر ت ل
تدری	،،	تذودان	ذ و د	ترثوا	و ر ث
تدع	د ع و	تذوقوا	ذ و ق	ترجع	ر ج ع
تدعی	،،	تذهب	ذ ه ب	ترجعون	،،
تدعوا	،،	تذهبوا	،،	ترجف	ر ج ف
تدعون	،،	تذهبون	،،	ترجمون	ر ج م
تدلی	د ل و	تذهل	ذ ه ل	ترجو	ر ج و
تدلوا	،،	تر تری	ر ا ی ،،	ترجون	،،
تدمر	د م ر	ترآء	،،	ترجی	،،
تدمیر	،،	ترائب	ت ر ب	ترحم	ر ح م
تدور	د و ر	ترآت	ر ا ی	ترحمون	،،
تدهن	د ه ن	تراب	ت ر ب	ترد	ر د د
تدیرون	د و ر	تراث	و ر ث	تردی	ر د ی
تذبجوا	ذ ب ح	تراض	ر ض ی	تردن	ر و د
تذر	و ذ ر	تراضوا	،،	تردون	ر د د
تذرن	،،	تراضیم	،،	تردین	ر د ی
تذروا	ذ ر و	تراقی	رقی-رق و	ترزق	ر ز ق
تذرون	و ذ ر	تراود	ر و د	ترزقان	،،
تذکر	ذ ک ر	تربص	ر ب ص	ترضی	ر ض ی



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ترضع	ر ض ع	ترهق	ر ه ق	تساءلون	س ا ل
ترنوبون	ر ض ی	تری	ر ا ی	تساقط	س ق ط
ترغبون	ر غ ب	تربحون	ر و ح	تسأل	س ا ل
ترفع	ر ف ع	ترید	ر و د	تسالون	س ا ل
ترفعوا	ر ف ع	تریدون	ر و د	تسأوا	س ا م
ترقی	ر ق ی	ترین	ر ا ی	تسبح	س ب ح
ترقب	ر ق ب	تزال	ز و ل	تسبحون	س ب ح
ترک	ت ر ک	تزاور	ز و ر	تسبق	س ب ق
ترکب	ر ک ب	تزد	ز ی د	تسبوا	س ب ب
ترکبون	ر ک ب	تزداد	ز ی د	تسبیح	س ب ح
ترکبوا	ر ک ب	تزدری	ز ر ی	تستأخرون	ا خ ر
ترکت	ت ر ک	تزر	ز ر	تستانسوا	ا ن س
ترکتم	ت ر ک	تزرعون	ز ر ع	تستبدلون	ب د ل
ترکتتموا	ت ر ک	تزعمون	ز ع م	تستبین	ب ی ن
ترکضوا	ر ک ض	تزغ	ز ی غ	تسترون	س ت ر
تَرَكَّنْ	ت ر ک	تزکی	ز ک و	تستجیبون	ج و ب
تَرَكَّنْ	ت ر ک	تزکو	ز ک و	تستخرجون	خ ر ج
ترکنا	ت ر ک	تزل	ز ل ل	تستخفون	خ ف ف
ترکنوا	ر ک ن	تزودوا	ز و د	تسترضعوا	ر ض ع
ترکوا	ت ر ک	تزول	ز و ل	تستطع	ط و ع
ترمی	ر م ی	تزولا	ز و ل	تستطیع	ط و ع
تروون	ر ا ی	تزهی	ز ه ق	تستطیعون	ط و ع
ترهبون	ر ه ب	تزیدون	ز ی د	تستعجل	ع ج ل
		تزیلوا	ز ی ل	تستعجلون	ع ج ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تستعجلوا	ع ج ل	تسریح	س ر ح	تسیمون	س و م
تستغفر	غ ف ر	تسع	ت س ع	تشاء	ش ی ا
تستغفرون	,,	تسعة	,,	تشاؤن	,,
تستغیثون	غ و ث	تسعة عشر	,, + ع ش ر	تشابه	ش ب ه
تستفت	ف ت ی	تسعون	,,	تشابهت	,,
تستفتحوا	ف ت ح	تسعی	س ع ی	تشاقون	ش ق ق
تستفتیان	ف ت ی	تسفکون	س ف ک	تشاور	ش و ر
تستقدمون	ق د م	تسقط	س ق ط	تشتروا	ش ر ی
تستقسموا	ق س م	تسقی	س ق ی	تشتکی	ش ک و
تستکبرون	ک ب ر	تسکن	س ک ن	تشتهی	ش ه و
تستکثر	کثر	تسکنون	,,	تشخص	ش خ ص
تستمعون	س م ع	تسلکوا	س ل ک	تشریون	ش ر ب
تستووا	س و ی	تسلموا	س ل م	تشرک	ش ر ک
تستوی	,,	تسلیم	,,	تشرکون	,,
تستهزءون	ه ز ا	تسمع	س م ع	تشطط	ش ط ط
تسجد	س ج د	تسمعون	,,	تشعرون	ش ع ر
تسجدوا	,,	تسمی	س م و	تشقی	ش ق ی
تسحر	س ح ر	تسمیة	,,	تشقیق	ش ق ق
تسحرون	,,	تسنیم	س ن م	تشکرون	ش ک ر
تسخرون	س خ ر	تسوء	س و ء	تشت	ش م ت
تسر	س ر ر	تسوی	س و ی	تشهد	ش ه د
تسرحون	س ر ح	تسود	س و د	تشهدون	,,
تسرقوا	س ر ف	تسوروا	س و ر	تشیع	ش ی ع
تسرون	س ر ر	تسیر	س ی ر	تصاحب	ص ح ب

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تصبح	ص ب ح	تصاۃ	ص ل ی	تطع	ط و ع
تصبحون	،،	تصنع	ص ن ع	تطعمون	ط ع م
تصبر	ص ب ر	تصنعون	،،	تطغوا	ط غ ی
تصبرون	ص ب ر	تصوموا	ص و م	تطلع	ط ل ع
تصدی	ص د ی	تصیب	ص و ب	تطمئن	ط م ن
تصدق	ص د ق	تصیبوا	،،	تطمعون	ط م ع
تصدقوا	،،	تصیر	ص ی ر	تطوع	ط و ع
تصدقون	،،	تضار	ض ر ر	تطهر	ط ه ر
تصدون	ص د د	تضاروا	،،	تطهرون	،،
تصدیة	ص د ی	تضحی	ض ح و	تطهیر	،،
تصادیق	ص د ق	تضحکون	ض ح ک	تطیرنا	ط ی ر
تصرف	ص ر ف	تضربوا	ض ر ب	تطیعوا	ط و ع
تصرفون	،،	تضرع	ض ر ع	تظاهرا	ظ ه ر
تصرف	،،	تضرعوا	،،	تظاهرون	،،
تضطلون	ص ل ی	تضرون	ض ر ر	تظلم	ظ ل م
تصدون	ص ع د	تضع	و ض ع	تظلمون	،،
تصع	ص ع ر	تضعون	،،	تظما	ظ م ا
تصغی	ص غ و	تضل	ض ل ل	تظن	ظ ن ن
تصف	و ص ف	تضلوا	،،	تظنون	،،
تصفحوا	ص ف ح	تضلیل	،،	تظهرون	ظ ه ر
تصفون	و ص ف	تضیقوا	ض ی ق	تعارقوا	ع ر ف
تصلی	ص ل ی	تطوا	و ط ا	تعاسرتم	ع س ر
تصلحون	ص ل ح	تطاول	ط و ل	تعاطی	ع ط و
تصل	ص ل و	تطرد	ط ر د	تعالی	ع ل و
تصل	و ص ل				

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تعالوا	ع ل و	تعری	ع ر ی	تعملون	ع م ل
تعالین	،،	تعرج	ع ر ج	تعودوا	ع و د
تعاونوا	ع و ن	تعرض	ع ر ض	تعولوا	ع و ل
ثعبثون	ع ب ث	تعرضوا	،،	تعی	و ع ی
تعبد	ع ب د	تعرضون	،،	تغابن	غ ب ن
تعبدا	،،	تعرف	ع ر ف	تغتسلوا	غ س ل
تعبدون	،،	تعرفون	،،	تغر	غ ر ر
تعبد	،،	تعریف	،،	تغرب	غ ر ب
تعبرون	ع ب ر	تعز	ع ز ز	تغریب	غ ر ی ب
تعتدوا	ع د و	تعزروا	ع ز ر	تغریق	غ ر ق
تعتدون	ع د د	تعزموا	ع ز م	تغشی	غ ش ی
تعتذرو	ع ذ ر	تعس	ت ع س	تغفر	غ ف ر
تعشو	ع ث ی	تعضوا	ع ض ل	تغفروا	،،
تعجب	ع ج ب	تعظون	و ع ظ	تغفلون	غ ف ل
تعجبون	،،	تعقف	ع ق ف	تغلبون	غ ل ب
تعجبین	،،	تعفوا	ع ف و	تعلوا	غ ل و
تعجل	ع ج ل	تعقلون	ع ق ل	تغمضوا	غ م ض
تعبد	ع د و	تعلموا	ع ل م	تغن	غ ن ی
تعبد	و ع د	تعلمون	ع ل و	تغنی	،،
تعبدان	،،	تعلمون	ع ل و	تغیض	غ ی ض
تعدل	ع د ل	تعلمون	ع ل ن	تغیظ	غ ی ظ
تعدلوا	،،	تعلموا	ع ل و	تفاخر	ف خ ر
تعدوا	ع د و	تعمی	ع م ی	تفادون	ف د ی
تعدون	ع د د	تعمدت	ع م د	تفاوت	ف و ت
تعذب	ع ذ ب	تعمل	ع م ل	تفتتو	ف ت ا

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تفتح	ف ت ح	تفعل	ف ع ل	تقدموا	ق د م
تفترون	ف ر ی	تفعلون	،،	تقر	ق ر ر
تفتري	،،	تفقد	ف ق د	تقرأ	ق ر أ
تفتن	ف ت ن	تفقدون	،،	تقرب	ق ر ب
تفتنون	،،	تفقهون	ف ق ه	تقربا	،،
تفت	ت ف ث	تفكهون	ف ك ه	تقربوا	،،
تفجر	ف ج ر	تفلهون	ف ل ح	تقربون	،،
تفجير	،،	تفندوا	ف ن د	تقرض	ق ر ض
تفرح	ف ر ح	تفور	ف و ر	تقرضوا	،،
تفرحوا	،،	تفي	ف ی أ	تقسطوا	ق س ط
تفرضوا	ف ر ض	تفيض	ف ی ض	تقسموا	ق س م
تفرق	ف ر ق	تفيضون	،،	تتشعر	ق ش ع ر
تفرقوا	،،	تقا	و ق ی	تقصروا	ق ص ر
تفرون	ف ر ر	تقاتل	ق ت ل	تقصص	ق ص ص
تفريق	ف ر ق	تقاتلون	،،	تقضي	ق ض ی
تفسحوا	ف س ح	تقاسموا	ق س م	تقطع	ق ط ع
تفسدون	ف س د	تقبل	ق ب ل	تقطعت	،،
تفسقون	ف س ق	تقبلوا	،،	تقطعوا	،،
تفسیر	ف س ر	تقتل	ق ت ل	تقطعون	،،
تفشلا	ف ش ل	تقتلون	،،	تقع	و ق ع
تفشلوا	،،	تقتیل	،،	تقعد	ق ع د
تفصيل	ف ص ل	تقدروا	ق د ر	تقعدوا	،،
تفضحوا	ف ض ح	تقدير	،،	تقف	ق ف و
تفضیل	ف ض ل	تقدم	ق د م	تقلب	ق ل ب

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تقلبون	ق ل ب	تکرمون	ک ر م	تلاذ	ل ذ ذ
تقم	ق و م	تکره	ک ر ه	تلظی	ل ظ ی
تقنطوا	ق ن ط	تکرهون	،،	تلفت	ل ف ت
تقوی	و ق ی	تکسب	ک س ب	تلفح	ل ف ح
تقول	ق و ل	تکسبون	،،	تلقاء	ل ق ی
تقولون	،،	تکفر	ک ف ر	تلقى	،،
تقوم	ق و م	تکفرون	،،	تلقف	ل ق ف
تقوموا	،،	تکاف	ک ل ف	تلقوا	ل ق ی
تقویم	،،	تکام	ک ل م	تلقون	،،
تقهر	ق ه ر	تکلمون	،،	تلك	ذلك
تقی	و ق ی	تکلم	،،	تلكم	،،
تقیموا	ق و م	تکلموا	ک م ل	تلكم	،،
تک	ک و ن	تکن	ک ن ن ک و ن	تلمزو	ل م ز
تکائر	ک ث ر	تکنزون	ک ن ز	تلوت	ت ل و
تکاد	ک و د	تکوی	ک و ی	تلومون	ل و م
تکبروا	ک ب ر	تکون	ک و ن	تلوون	ل و ی
تکبیر	،،	تکونا	،،	تلهی	ل ه و
تکتب	ک ت ب	تکونون	،،	تلیت	ت ل و
تکتبوا	،،	تل	ت ل ل	تلین	ل ی ن
تکتبوا	ک ت م	تلی	ت ل و	تم	ت م م
تکتمون	،،	تلاق	ل ق ی	تمائیل	م ث ل
تکذبان	ک ذ ب	تلاوة	ت ل و	تمار	م ر ی
تکذبون	،،	تلبثوا	ل ب ث	تماروا	،،
تکذیب	،،	تلبسون	ل ب س	تمارون	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تمام	ت م م	تمنى	م ن ی	تناوش	ن و ش
تمت	و	تمن	م ن ن	تنبی	ن ب ا
تمترونها	م ر ی	تمنع	م ن ع	تنبتون	و
تمترونها	و	تمنن	م ن ن	تنبت	ن ب ت
تمتع	م ت ع	تمشوا	م ن ی	تنبتون	و
تمتعوا	و	تمشون	م ن ن	تنشرون	ن ش ر
تمتعون	و	تمشون	م ن ی	تنصرون	ن ص ر
تمثل	م ث ل	تموت	م و ت	تنته	ن ه ی
تمد	م د د	تموتون	و	تنتهوا	و
تمدون	و	تمور	م و ر	تنجی	ن ج و
تمر	م ر ر	تمهید	م ه د	تنحتون	ن ح ت
تمرحون	م ر ح	تمید	م ی د	تنذر	ن ذ ر
تمرون	م ر ر	تمیز	م ی ز	تنزع	ن ز ع
تمس	م س س	تميلوا	م ی ل	تنزل	ن ز ل
تمسمن	و	تناهبوا	ن ب ز	تنزلت	و
تمسکوا	م س ک	تناجوا	ن ج و	تنزیل	و
تمسوا	م س س	تناجیم	و	تنسی	ن س ی
تمسون	م س و	تناد	ن د و	تنسون	و
تمشون	م ش ی	تنادوا	و	تنشق	ش ق ق
تمشی	و	تنازعتم	ن ز ع	تنصر	ن ص ر
تمکرون	م ک ر	تنازعوا	و	تنصروا	و
تملی	م ل و	تناصرون	ن ص ر	تنصرون	و
تملک	م ل ک	تنال	ن ی ل	تنطقون	ن ط ق
تملکون	و	تنالوا	و	تنظر	ن ظ ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تنظرون	ن ظ ر	تنهی	ن ه ی	توصیة	و ص ی
تنفخ	ن ف خ	تنیا	و ن ی	توعدون	و ع د
تنفد	ن ف د	تواب	ت و ب	توعظون	و ع ظ
تنفذون	ن ف ذ	توابین	،،	توف	و ف ی
تنفروا	ن ف ر	تواخذ	أ خ ذ	توفی	،،
تنفس	ن ف س	توارث	و ر ی	توفت	،،
تنفع	ن ف ع	تواصوا	و ص ی	توفكون	ا ف ك
تنفقون	ن ف ق	تواعدتم	و ع د	توفون	و ف ی
تنقذ	ن ق ذ	تواعدون	،،	توفیت	،،
تنقص	ن ق ص	توب	ت و ب	توفیق	و ف ق
تنقصوا	،،	توبة	،،	توقدون	و ق د
تنقضوا	ن ق ض	توبوا	،،	توقروا	و ق ر
تنقلبوا	ق ل ب	تولون	ا ت ی	توقنون	ی ق ن
تنقم	ن ق م	توقی	،،	توكل	و ك ل
تنقسمون	،،	توثرن	ا ث ر	توكلت	،،
تنكح	ن ك ح	توجل	و ج ل	توكلا	،،
تنكحوا	،،	توجه	و ج ه	توكلوا	،،
تنكرون	ن ك ر	تود	و د د	توكید	و ك د
تنكصون	ن ك ص	تودون	،،	تول	و ل ی
تنكيل	ن ك ل	تؤذون	ا ذ ی	تولی	،،
تنوء	ن و ء	تورون	و ر ی	تولوا	،،
تنور	ث ن و ر	توریه	تورات	تولون	،،
تنهر	ن ه ر	توسوس	و س و س	تولیتهم	،،
تنهون	ن ه ی	توصون	و ص ی	تومر	ا م ر



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تومرون	ا م ر	تهتز	ه ز ز	تهنوا	و ه ن
تومن	ا م ن	تهجد	ه ج د	تهوی	ه و ی
تومنون	و	تهجرون	ه ج ر	تیسوا	ی ا س
تووی	ا و ی	تهدوا	ه د ی	تیسر	ی س ر
تهاجروا	ه ج ر	تهدی	و	تیمموا	ی م م
تهتدون	ه د ی	تهلك	ه ل ك	تین	ت ی ن
تهتدی	و	تهلكة	و		

## ث

ثابت	ث ب ت	ثجاج	ث ج ج	ثلی	ث ل ث
ثاقب	ث ق ب	ثری	ث ر ی	ثم	ث م
ثالث	ث ل ث	ثعبان	ث ع ب	ثم	ث م
ثالثة	و	ثقل	ث ق ل	ثمانی	ث م ن
ثامن	ث م ن	ثقفتموا	ث ق ف	ثمانیة	و
ثانی	ث ن ی	ثقفوا	و	ثمانین	و
ثاوی	ث و ی	ثقلان	ث ق ل	ثمر	ث م ر
ثبات	ث ب ی	ثقلت	و	ثمرة	و
ثبت	ث ب ت	ثقیل	و	ثمن	ث م ن
ثبتنا	و	ثلاث	ث ل ث	ثمود	ث م د
ثبتوا	و	ثلاثون	و	ثواب	ث و ب
ثبط	ث ب ط	ثلة	ث ل ل	ثوب	و
ثبوت	ث ب ت	ثلث	ث ل ث	ثرب	ث ر ب
ثبور	ث ب ر	ثلثان	و	ثياب	ث و ب
				ثیبات	ث ی ب

## ج

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
جاء	ج ی ا	جالوت	جالوت	جبل	ج ب ل
جاءت	»	جامدة	ج م د	جبلۃ	»
جائر	ج و ر	جامع	ج م ع	جبین	ج ب ن
جاءوا	ج ی ا	جان	ج ن ن	جشی	ج ث و
جئت	»	جثنا	ج ی ا	جحدوا	ج ح د
جئتم	»	جانب	ج ن ب	جحیم	ج ح م
جئتموا	»	جاوز	ج و ز	جد	ج د د
جابوا	ج و ب	جاوزا	»	جدار	ج د ر
جاثية	ج ث و	جاوزنا	»	جدال	ج د ل
جاثمین	ج ث م	جاهد	ج ه د	جدد	ج د د
جادل	ج د ل	جاهدا	»	جدر	ج د ر
جادلت	»	جاهدوا	»	جدلا	ج د ل
جادلتم	»	جاهل	ج ه ل	جدل	»
جادلوا	»	جاهلون	»	جدید	ج د د
جار	ج و ر	جاهلیة	»	جذاذ	ج ذ ذ
جاریات	ج ر ی	جب	ج ب ب	جذع	ج ذ ع
جارية	»	جبار	ج ب ر	جذوة	ج ذ و
جاز	ج ز ی	جبارین	»	جذوع	ج ذ ع
جاسوا	ج و س	جبال	ج ب ل	جراد	ج ر د
جاعل	ج ع ل	جباه	ج ب ه	جرحتم	ج ر ح
جاعلون	»	جبت	ج ب ت	جرز	ج ر ز
		جبریل	جبریل	جرف	ج ر ف

لغة	ماده	لغة	ماده	لغة	ماده
جرم	ج ر م	جم	ج م م	جنود	ج ن د
جروح	ج ر ح	جال	ج م ل	جنى	ج ن ي
جرين	ج ر ي	جالة	،،	جو	ج و و
جزء	ج ز ا	جمع	ج م ع	جواب	ج و ب - ج ب ي
جزاء	ج ز ي	جمعان	،،	جوار	ج و ا ر ي
جزعنا	ج ز ع	جمعة	،،	جوارح	ج و ا ر ح
جزوع	،،	جمعنا	،،	جودى	ج و د ي
جزيت	ج ز ي	جمعوا	،،	جوع	ج و ع
جزية	،،	جمل	ج م ل	جوف	ج و ف
جسد	ج س د	جملة	،،	جهاد	ج ه د
جسم	ج س م	جميع	ج م ع	جهار	ج ه ر
جعل	ج ع ل	جميل	ج م ل	جهاز	ج ه ز
جعلوا	،،	جن	ج ن ن	جهالة	ج ه ل
جعلت	،،	جنا	ج ن ي	جهد	ج ه د
جعلتم	،،	جنات	ج ن ن	جهر	ج ه ر
جعلنا	،،	جناح	ج ن ح	جهرة	،،
جعلوا	،،	جناحي	،،	جهز	ج ه ز
جفاء	ج ف و	جنبه	ج ن ب	جهنم	ج ه م
جفان	ج ف ن	جنة	ج ن ن	جهول	ج ه ل
جلاء	ج ل و	جنتان	،،	جیاد	ج و د
جلى	،،	جنعوا	ج ن ح	جیب	ج ي ب
جلالیمب	ج ل ب	چند	ج ن د	چید	ج ي د
جلال	ج ل ل	جنف	ج ن ف	جیوب	ج ي ب
جلدة	ج ل د	جنوب	ج ن ب	جی	ج ي ا

## ح

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
حاج	ح ج ج	حافین	ح ف ف	حجاب	ح ج ب
حاجة	ح و ج	حاق	ح ی ق	حجارة	ح ج ر
حاجبتم	ح ج ج	حاقة	ح ق ق	حجة	ح ج ج
حاجز	ح ج ز	حاکمین	ح ک م	حجج	»
حاجزین	»	حال	ح و ل	حجر	ح ج ر
حاجوا	ح ج ج	حام	ح م ی	حجرات	»
حاد	ح د د	حامدون	ح م د	حجور	»
حاذرون	ح ذ ر	حاملات	ح م ل	حدائق	ح د ق
حارب	ح ر ب	حاملین	»	حداد	ح د د
حاسبنا	ح ص ب	حامية	ح م ی	حلب	ح د ب
حاسبین	»	حب	ح ب ب	حدث	ح د ث
حاسد	ح ص د	حبال	ح ب ل	حدود	ح د د
حاش	ح ا ش	حبیب	ح ب ب	حدیث	ح د ث
حاشرین	ح ش ر	حبة	»	حدید	ح د د
حاصب	ح ص ب	حبط	ح ب ط	حذر	ح ذ ر
حاضرة	ح ض ر	حبطت	»	حر	ح ر ر
حاضری	»	حبك	ح ب ك	حرام	ح ر م
حافرة	ح ف ر	حبل	ح ب ل	حرب	ح ر ب
حافظ	ح ف ظ	حتى	حتى	حرث	ح ر ث
حافظات	»	حتم	ح ت م	حرج	ح ر ج
حافظوا	»	حشیشا	ح ث ث	حرد	ح ر د
حافظون	»	حج	ح ج ج	حرس	ح ر س

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
حرصت	ح ر ص	حسبوا	ح س ب	حضور	ح ص ر
حرصتم	،،	حسد	ح س د	حصول	ح ص ن
حرص	ح ر ض	حسرات	ح س ر	حصید	ح ص د
حرف	ح ر ف	حسرة	،،	حصیر	ح ص ر
حرقوا	ح ر ق	حسرق	،،	حضر	ح ض ر
حرم	ح ر م	حسن	ح س ن	حضرُوا	،،
حرّمات	،،	حسنى	،،	حطام	ح ط م
حرمت	،،	حسنات	،،	حطب	ح ط ب
حرمتنا	،،	حسنة	،،	حطة	ح ط ط
حرموا	،،	حسنت	،،	حطمة	ح ط م
حرور	ح ر ر	حسنيين	،،	حظ	ح ظ ا
حریر	،،	حسوم	ح س م	حفدة	ح ف د
حریص	ح ر ص	حسیب	ح س ب	حفرة	ح ف ر
حریق	ح ر ق	حسیر	ح س ر	حفظ	ح ف ظ
حزب	ح ز ب	حسیس	ح س س	حفظة	،،
حزین	،،	حشر	ح ش ر	حفظنا	،،
حزن	ح ز ن	حشرت	،،	حففتنا	ح ف ف
حساب	ح س ب	حشرنا	،،	حفي	ح ف ی
حسابیه	،،	حصاد	ح ص د	حفیظ	ح ف ظ
حسان	ح س ن	حصب	ح ص ب	حق	ح ق ق
حسب	ح س ب	حصحص	ح ص ص (حصحص)	حق الیقین	ح ق ق + ی ق ن
حسان	،،	حصدتم	ح ص د	حقب	ح ق ب
حسبت	،،	حصرت	ح ص ر	حقت	ح ق ق
حسبتم	،،	حصل	ح ص ل	حقیق	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
حکام	ح ک م	حمئة	ح م أ	حوایا	ح و ی
حکم	»	حمد	ح م د	حوب	ح و ب
حکمة	»	حمر	ح م ر	حوت	ح و ت
حکمت	»	حمل	ح م ل	حور	ح و ر
حکمتهم	»	حملت	»	حول	ح و ل
حکیم	»	حملتم	»	حولین	»
حل	ح ل ل	حملنا	»	حي	ح ی ی
حلائل	»	حملوا	»	حیوة	»
حلاف	ح ل ف	حمولة	»	حیة	»
حلال	ح ل ل	حمية	ح م ی	حیتان	ح و ت
حلفتم	ح ل ف	حمید	ح م د	حيث	ح ی ث
حلقوم	ح ل ق	حمير	ح م ر	حيثا	»
حلقم	ح ل ل	حميم	ح م م	حیران	ح ی ر
حلم	ح ل م	حناجر	ح ن ج ر	حیل	ح و ل
حلوا	ح ل ی	حنان	ح ن ن	حيلة	»
حلي	»	حنت	ح ن ث	حین	ح ی ن
حلیة	»	حنفاء	ح ن ف	حینذ	ح ی ن اذ
حلم	ح ل م	حنیذ	ح ن ذ	حيوا	ح ی ی
حمأ	ح م أ	حنيف	ح ن ف	حيوان	»
حمار	ح م ر	حنين	ح ن ن	حيوك	»
حالة	ح م ل	حواری	ح و ر	حيثم	»
خ					
خائبين	خ ی ب	خائف	خ و ف	خائنة	خ و ن
منايضي	خ و ض	خائفين	»	خائنين	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
خاب	خ ی ب	خافیه	خ ف ی	خبیث	خ ب ث
خاتم	خ ت م	خال	خ و ل	خبیثه	»
خادع	خ د ع	خالات	»	خبیثون	»
خارج	خ ر ج	خالد	خ ل د	خبیر	خ ب ر
خارجین	»	خالدین	»	ختار	خ ت ر
خازنین	خ ز ن	خالص	خ ل ص	ختم	خ ت م
خاسی	خ س ا	خالصة	»	ختم	»
خاشین	»	خالفین	خ ل ف	خد	خ د د
خاسرة	خ س ر	خالق	خ ل ق	خذ	ا خ ذ
خاسرون	»	خالقون	»	خذوا	»
خاشع	خ ش ع	خالقین	»	خذول	خ ذ ل
خاشعات	»	خالیه	خ ل و	خر	خ ر ر
خاشعة	»	خامدون	خ م د	خراب	خ ر ب
خاشعون	»	خامسة	خ م س	خراج	خ ر ج
خاصة	خ ص ص	خاننا	خ و ن	خراصون	خ ر ص
خاضعین	خ ض ع	خانوا	»	خرج	خ ر ج
خاضوا	خ و ض	خاویة	خ و ی	خرجت	»
خاطئة	خ ط ا	خبأ	خ ب ا	خرجتم	»
خاطئون	»	خبائث	خ ب ث	خرجن	»
خاطیة	خ ط ب	خبال	خ ب ل	خرجنا	»
خاف	خ و ف	خبث	خ ب و	خرجوا	»
خافت	»	خبث	خ ب ث	خردل	خ ر د ل
خافضة	خ ف ض	خبیر	خ ب ر	خرطوم	خ ر ط م
خافوا	خ و ف	خبیز	خ ب ز	خرق	خ ر ق

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
خرقت	خ ر ق	خصم	خ ص م	خلاف	خ ل ف
خرقوا	،،	خصم خصم	،،	خلاق	خ ل ق
خروا	خ ر ر	خصمون	،،	خلال	خ ل ل
خروج	خ ر ج	خصيم	،،	خلت	خ ل و
خزائن	خ ز ن	خضتم	خ و ض	خلة	خ ل ل
خزلة	،،	خضر	خ ض ر	خلد	خ ل د
خزى	خ ز ي	خطا	خ ط ا	خلصوا	خ ل ص
خسار	خ س ر	خطاب	خ ط ب	خلطاء	خ ل ط
خسر	،،	خطايا	خ ط ا	خلطوا	،،
خسران	،،	خطب	خ ط ب	خلف	خ ل ف
خسروا	،،	خطبة	،،	خلفاء	،،
خسف	خ س ف	خطف	خ ط ف	خلفة	،،
خسفنا	،،	خطفة	،،	خلفتموا	،،
خسوف	،،	خطوات	خ ط و	خلفوا	،،
خشب	خ ش ب	خطينة	خ ط ا	خلق	خ ل ق
خشع	خ ش ع	خفاف	خ ف ف	خلقت	،،
خشعت	،،	خففت <sup>٨</sup>	خ و ف	خلقنا	،،
خشوع	،،	خففت <sup>٨</sup>	خ ف ف	خلقوا	،،
خشى	خ ش ي	خفم	خ و ف	خلوا	خ ل و
خشيت	،،	خفف	خ ف ف	خلود	خ ل د
خشية	،،	خفى	خ ف ي	خليفة	خ ل ف
خشنيا	،،	خفية	،،	خليل	خ ل ل
خصاصة	خ ص ص	خفيف	خ ف ف	خمر	خ م ر
خصام	خ ص م	خلا	خ ل و	خمس	خ م م
		خلائف	خ ل ف		



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
خمسة	خ م س	خوان	خ و ن	خیر	خ ی ر
خمسين	,,	خوض	خ و ض	خیرات	,,
خبط	خ م ط	خوف	خ و ف	خیرة	,,
خنزیر	خنزیر	خول	خ و ل	خیط	خ ی ط
خناس	خ ن س	خولنا	,,	خیط الایض خ ی ط + بیض	
خنزیر	خنزیر	خیاط	خ ی ط	خیط الاسود خ ی ط + سود	
خنس	خ ن س	خیام	خ ی م	خیفة	خ و ف
خوار	خ و ر	خیالة	خ و ن	خیل	خ ی ل
خوالف	خ ل ف				

## د

دآئین	د آ ب	دار	د و ر	دخان	د خ ن
دائرة	د و ر	داع	د ع و	دخل	د خ ل
دآثم	د و م	داعی	,,	دخات	,,
دآئمون	,,	دافع	د ف ع	دخلتم	,,
داود	داود	دافق	د ف ق	دخلتموا	,,
دأب	د آ ب	ماء دافق	م و ه + د ف ق	دخلوا	,,
دأبا	,,	دامت	د و م	دخول	,,
دابة	د ب ب	دامو	,,	دراسة	د ر س
دابر	د ب ر	دان	د ن و	دراهم	د ر ه م
داحضة	د ح ض	دانية	,,	درجات	د ر ج
داخرون	د خ ر	دبر	د ب ر	درجة	,,
داخرین	,,	دهی	د ح و - ی	درست	د ر س
داخلون	د خ ل	دحورا	د ح ر	درسوا	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
درك	د ر ك	دفع	د ف ا	دمدم	د م د م
دری	د ر ر	دفع	د ف ع	دمر	د م ر
دسی	د س س (د س و)	دفعتم	د ف ع ت م	دمع	د م ع
دسر	د س ر	دك	د ك ك	دنی	د ن و
دع	و د ع	دكاه	د ك ا ه	دنیا	د ن ی ا
دع	د ع ع	دكت	د ك ت	دوآثر	د و ا ث ر
دعا	د ع و	دكة	د ك ة	دواب	د ب ب
دعاء	د ع ا	دكتا	د ك ت ا	دولة	د و ل ة
دعائی	د ع ا ی	دل	د ل ل	دون	د و ن
دعوا	د ع و ا	دلی	د ل و	دهاق	د ه ا ق
دعوی	د ع و ی	دلو	د ل و	دهان	د ه ا ن
دعوة	د ع و ة	دلوك	د ل و ك	دهر	د ه ر
دعوت	د ع و ت	دلیل	د ل ل	دهن	د ه ن
دعوتم	د ع و ت م	دم	د م و	دیار	د ی ا ر
دعوتهموا	د ع و ت ه م و ا	دما	د م ا	دیه	د ی ه
دعی	د ع ی	دمت	د م ت	دین	د ی ن
دعیتم	د ع ی ت م	دمتم	د م ت م	دینار	د ی ن ا ر

## ذ

ذا	ذ ا	ذئب	ذ ا ب	ذاقوا	ذ ا ق و ا
ذا	ذ و	ذات	ذ و	ذاك	ذ ا ك
ذا النون	ذ ا النون	ذاریات	ذ ا ر ی ا ت	ذاکرات	ذ ا ك ر ا ت
ذائقة	ذ و ق	ذاقا	ذ و ق	ذاکرین	ذ ا ك ر ی ن
ذائقون	ذ و ق و ن	ذاقت	ذ و ق ت	ذالك	ذ ا ل ك

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ذلکم	ذ ا	ذریة	ذ ر ر (ذری)	ذمة	ذ م م
ذلکما	„	ذریات	„	ذنب	ذ ن ب
ذلکن	„	ذق	ذ وق	ذنوب	„
ذان	„	ذکر	ذ ک ر	ذو	ذ و
ذانک	„	ذکری	„	ذوالکفل	ذوالکفل
ذاهب	ذ ه ب	ذکران	„	ذوالقرنین	ذوالقرنین
ذباب	ذ ب ب	ذکرت	„	ذوا	ذ و
ذبح	ذ ب ح	ذکرتم	„	ذواتا	„
ذبحوا	„	ذکروا	„	ذواتی	„
ذر	و ذ ر	ذکرین	„	ذوقوا	ذ و ق
ذری	„	ذکور	„	ذوی	ذ و
ذرا	ذ ر ا	ذکیتم	ذ ک و	ذه	ذ ا
ذراانا	„	ذل	ذ ل ل	ذهاب	ذهب
ذراع	ذ ر ع	ذلة	„	ذهب	„
ذراعی	„	ذلل	„	ذهبت	„
ذرة	ذ ر ر	ذلت	„	ذهبنا	„
ذرع	ذ ر ع	ذللتنا	„	ذهبوا	„
ذروا	ذ ر و	ذلول	„	ذی	ذ و
ذروا	و ذ ر				

ر

رابطوا	ر ب ط	رابية	ر ب و	راجفة	ر ج ف
رابع	ر ب ع	رأت	ر آ ی	راحمین	ر ح م
راپا	ر ب و	راجعون	ر ج ع	راد	ر د د

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
رأفة	ر د ف	راودتن	ر و د	ربا	ر ب و
رادو	ر د د	راودوا	،،	ربیون	ر ب ب
رادی	،،	رؤس	ر أ س	رتق	ر ت ق
رازقین	ر ز ق	رءوف	ر أ ف	رتل	ر ت ل
رأس	ر أ س	رای	ر أ ی	رتلنا	،،
رءوس	،،	رئ	،،	رج	ر ج ج
راسخون	ر س خ	رویا	،،	رجال	ر ج ل
راسیات	ر س و	رایت	،،	رجت	ر ج ج
راشدون	ر ش د	رأبم	،،	رجز	ر ج ز
راضية	ر ض ی	رايتموا	،،	رجس	ر ج س
راعنا	رعن(رعی)	راین	،،	رجع	ر ج ع
راعون	ر ع ی	رب	ر ب ب	رجعی	،،
راغ	ر و غ	ربو	ر ب و	رجعت	،،
راغب	ر غ ب	ربائب	ر ب ب	رجعتم	،،
راغبون	،،	رباط	ر ب ط	رجعنا	،،
راقة	ر أ ف	رباع	ر ب ع	رجعوا	،،
رافع	ر ف ع	ربانیون	ر ب ب	رجفة	ر ج ف
رافعة	،،	ربانیین	،،	رجل	ر ج ل
راق	ر ق ی	ربت	ر ب و	رجلان	،،
راکع	ر ک ع	ربحت	ر ب ح	رجلین	،،
راکعون	،،	ربطنا	ر ب ط	رجم	ر ج م
ران	ر ی ن	ربع	ر ب ع	رجمنا	،،
رأوا	ر أ ی	ربما	رب	رجوع	ر ج ع
راودت	ر و د	ربوة	ر ب و	رجوم	ر ج م

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
رحیم	ر ح م	رزق	ر ز ق	رغبت	ر غ ب
رحال	ر ح ل	رزقنا	،،	رغد	ر غ د
رحبت	ر ح ب	رزقوا	،،	رفات	ر ف ت
رحل	ر ح ل	رس	ر س س	رفث	ر ف ث
رحلة	،،	رسالة	ر س ل	رفد	ر ف د
رحما	ر ح م	رسل	،،	رفرف	ر ف ف
رحم	،،	رسول	،،	رفع	ر ف ع
رحاء	،،	رشاد	ر ش د	رفعت	،،
رحمة	ر ح م	رشد	،،	رفعنا	،،
رحمن	،،	رشید	،،	رفیق	ر ف ق
رحمنا	،،	رصد	ر ص د	رفیع	ر ف ع
رحیق	ر ح ق	رضاعة	ر ض ع	رق	ر ق ق
رحیم	ر ح م	رضوا	ر ض ی	رقاب	ر ق ب
رخاء	ر خ و	رضوان	،،	رقبة	،،
رد	ر د د	رضي	،،	رقود	ر ق د
ردأ	ر د أ	رضیت	،،	رقی	ر ق ی
ردت	ر د د	رضیم	،،	رقیب	ر ق ب
رددت	،،	رطب	ر ط ب	رقیم	ر ق م
رددنا	،،	رعاء	ر ع ی	ركاب	ر ك ب
ردف	ر د ف	رعاية	،،	ركام	ر ك م
ردم	ر د م	رعب	ر ع ب	ركب	ر ك ب
ردوا	ر د د	رعد	ر ع د	ركبا	،،
ردوا	،،	رعوا	ر ع ی	ركبان	،،
رزاق	ر ز ق	رغب	ر غ ب	ركبوا	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ركز	رك ز	رواسی	رس و	رھط	رھ ط
ركع	رك ع	رواكد	رك د	رھق	رھ ق
ركن	رك ن	روح	روح	رھوا	رھ و
ركوب	رك ب	روضات	روض	رھين	رھ ن
رمى	رم ی	روضة	،،	رھينة	،،
رياح	رم ح	روع	روع	رثاء	رأى
رماد	رم د	روم	روم	رياح	روح
رمان	رم ن	رويدا	رو د	ريب	رى ب
رمز	رم ز	رهان	رھ ن	رہبۃ ریح	روح
رمضان	رم ض	رھب	رھ ب	ريحان	روح
رميت	رم ی	رهبان	،،	ریش	رى ش
رسيم	رم م	رهبانية	،،	ريح	رى ع
رواح	روح	رہبة	،،		

## ز

زاجرات	زج ر	زالنا	زول	زجاجة	زج ج
زاد	زی د	زانی	زن ی	زجر	زج ر
زادت	،،	زائفة	،،	زجرة	،،
زادوا	،،	زاهدين	زه د	زحزح	زح زح
زارعون	زر ع	زاهق	زه ق	زحف	زح ف
زاغ	زی غ	زبائفة	زب ن	زخرف	زخ ر ف
زاغت	،،	زبد	زب د	زد	زی د
زاغوا	،،	زبر	زبر	زدنا	،،
زالت	زول	زبور	،،	زراپی	زر ب

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
زراع	ز ر ع	زلزلت	زل ل (زلزل)	زوجت	ز و ج
زرتم	ز و ر	زلزلة	„	زوجنا	„
زرق	ز ر ق	زلزلوا	„	زوجین	„
زرع	ز ر ع	زلف	ز ل ف	زور	ز و ر
زروع	ز ر ع	زلفی	„	زهرة	ز ه ر
زعم	ز ع م	زلفة	„	زهق	ز ه ق
زعمت	„	زلق	ز ل ق	زهوق	ز ه و ق
زعمم	„	زللم	ز ل ل	زیادة	ز ی ا د
زعیم	„	زمر	ز م ر	زیت	ز ی ت
زفیر	ز ف ر	زمرهر	ز م ه ر	زیتون	„
زقوم	ز ق م	زنا	ز ن ی	زیتونة	„
زکی	ز ک و	زنجبیل	ز ن ج ب ی ل	زید	ز ی د
زکوة	„	زنوا	ز ن و	زیغ	ز ی غ
زکریا	ز ک ر ی ا	زنیم	ز ن م	زیلنا	ز و ل
زکی	ز ک و	زوال	ز و ل	زین	ز ی ن
زکیة	„	زوج	ز و ج	زینا	„
زلم	ز و ل	زوجان	„	زینت	„
زلزال	زل ل (زلزل)			زینة	„
				زینوا	„

## س

س	س	سائحون	س ی ح	ساجحات	س ب ح
ساء	س و ء	سائح	س و غ	سابعات	س ب غ
سائبة	س ی ب	سائق	س و ق	سابق	س ب ق
ساعت	س و ء	سائل	س أ ل	سایقات	„
سائحات	س ی ح	سائلین	„	سایقوا	„

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
سابقون	س ب ق	سال	س أ ل	سبحوا	س ب ح
ساجد	س ج د	سئل	س	سبع	س ب ع
ساجدون	س	سألت	س	سبعة	س
ساحة	س ي ح	سألت	س ي ل	سبق	س ب ف
ساحر	س ح ر	سئلت	س أ ل	سبقت	س ب ق
ساحران	س	سألتهم	س	سبقوا	س
ساحرون	س	سألتهموا	س	سبل	س ب ل
ساحل	س ح ل	سالمون	س ل م	سبيل	س
ساخرين	س خ ر	سالوا	س أ ل	ستة	س ت ت
سادة	س و د	سئلوا	س	سائر	س ت ر
سادس	س د س	سامدون	س م د	ستين	س ت ت
سار	س ي ر	سامر	س م ر	سجى	س ج و
سارب	س ر ب	سامرى	س	سجد	س ج د
سارعوا	س ر ع	سؤل	س أ ل	سجدوا	س
سارق	س ر ق	ساوى	س و ي	سجدوا	س
سارقة	س	ساهرة	س ه ر	سجرت	س ج ر
سارقون	س	ساهم	س ه م	سجل	س ج ل
ساعة	س و ع س ي ع	ساهدون	س ه و	سجن	س ج ن
سافل	س ف ل	سبا	س ب أ	سجود	س ج د
سافلين	س	سبات	س ب ت	سجيل	س ج ل
ساق	س و ق	سبب	س ب ب	سجين	س ج ن
ساقط	س ق ط	سبت	س ب ت	سحاب	س ح ب
ساقى	س و ق	سبح	س ب ح	سحابة	س
ساكن	س ك ن	سبحان	س	سحار	س ح ر



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
سحت	س ح ت	سراج	س ر ج	سفاهة	س ف ه
سحر	س ح ر	سراح	س ر ح	سفر	س ف ر
سحران	س ح ر	سرادق	س ر د ق	سفرة	س ف ر
سحرة	س ح ر	سراع	س ر ع	سفلول	س ف ل
سحروا	س ح ر	سرب	س ر ب	سفه	س ف ه
سحق	س ح ق	سرحوا	س ر ح	سفهاء	س ف ه
سحیق	س ح ق	سرد	س ر د	سفينة	س ف ن
سخر	س خ ر	سرر	س ر ر	سفیه	س ف ه
سخرنا	س خ ر	سرق	س ر ق	سقی	س ق ی
سخرنا	س خ ر	سرمد	س ر م د	سقاية	س ق ی
سخری	س خ ر	سرور	س ر ر	سقر	س ق ر
سخط	س خ ط	سری	س ر ی	سقط	س ق ط
مد	م د د	سریر	س ر ر	سقطوا	س ق ط
مدی	م د ی	سربع	س ر ع	سقف	س ق ف
سدر	س د ر	سطحت	س ط ح	سقنا	س ق ن
سدرة	س د ر	سعی	س ع ی	سقوا	س ق ی
سدس	س د س	سعة	س ع ع	سقیا	س ق ی
سدید	س د د	سعدوا	س ع د	سقیم	س ق م
سدین	س د ی	سعر	س ع ر	سکاری	س ک ر
سر	س ر ر	سعر	س ع ر	سکت	س ک ت
سراء	س ر ا	سعوا	س ع و	سکرو	س ک ر
سراثر	س ر ا	سعی	س ع ی	سکرة	س ک ر
سراب	س ر ب	سعید	س ع د	سکرت	س ک ر
سرایل	س ر ب ل	سعی	س ع ی		

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مكن	س ك ن	ساعون	س م ع	سننة	س ن و ه
مكنتم	و	سماه	س م و	سننة	س ن ن
مكنين	و	سان	س م ن	سندس	س ن د س
سكنينة	و	سموات	س م و	سنن	س ن ن
سل	س أ ل	سمع	س م ع	سنين	س ن و ه
سلالة	س ل ل	سمعت	و	سوء	س و ه
سلال	س ل س ل	سمعتهم	و	سوى	س و ي
سلام	س ل م	سمعتوا	و	سواء	و
سلسبيل	س ب ل	سمعنا	و	سواى	س و أ
سلسلة	س ل س ل	سمعوا	و	سوات	و
سلط	س ل ط	سمك	س م ك	سوءة	س و ه
سلطان	و	سموا	س م و	سواع	س و ا ع
سلطانيه	و	سموم	س م م	سؤال	س أ ل
سلف	س ل ف	سمى	س م و	سؤل	و
سلقوا	س ل ق	سديت	و	سود	س و د
سلك	س ل ك	سميتمو	و	سور	س و ر
سلكتنا	و	سميع	س م ع	سورة	و
سلم	س ل م	سمين	س م ن	سوط	س و ط
سلمتم	و	سن	س ن ن	سوف	س و ف
سلموا	و	سنا	س ن ي	سوق	س و ق
سلوى	س ل و	سنابل	س ن ب ل	سول	س و ل
سلم	س ل م	سنبل	و	سولات	و
سليان	سليان	سنبله	و	سوى	س و ي
سم	س م م	سننة	و س ن	سويت	و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
سهول	س ه ل	سيحوا	س ي ح	سيق	س و ق
سي	س و ء	سيد	س و د	سيل	س ي ل
سيئات	و	سير	س ي ر	سيما	س و م
سيئة	و	سيرة	و	سيناء	سيناء
سيت	و	سیرت	و	سينين	سينين
سيارة	س ي ر	سيروا	و		

## ش

شاء	ش ي ء	شان	ش ا ن	شر	ش و ر
شئت	و	شاني	ش ن ا	شراب	ش و ب
شئما	و	شاور	ش و ر	شرب	و
شئتم	و	شاهد	ش ه د	شربوا	و
شئنا	و	شاهدون	و	شرح	ش ر ح
شاخصة	ش خ ص	شبه	ش ب ه	شرد	ش و د
شاربون	ش و ب	شتاء	ش ت و	شرذمة	ش و ذ م
شارك	ش و ك	شتي	ش ت ت	شمر	ش و ر
شاطئي	ش ط ا	شجر	ش ج ر	شرع	ش و ع
شاعر	ش ع ر	شجرة	و	شرعة	و
شافعين	ش ف ع	شج	ش ح ح	شرعوا	و
شاقوا	ش ق ق	شحوم	ش ح م	شرقي	ش و ق
شاكر	ش ك ر	شداد	ش د د	شرقية	و
شاكرون	و	شددنا	و	شرك	ش و ك
شاكلة	ش ك ل	شدوا	و	شركاء	و
شامخات	ش م خ	شدید	و	شروا	ش و ر ي

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
شریعة	ش ر ع	شق	ش ق ق	شهادات	ش ه د
شريك	ش ر ك	شقاق	،،	شهد	،،
شطا	ش ط أ	شقة	،،	شهداء	،،
شطر	ش ط ر	شققنا	،،	شهدتم	،،
شطط	ش ط ط	شقوا	ش ق ق ی	شهدنا	،،
شعائر	ش ع ر	شقوة	،،	شهدوا	،،
شعب	ش ع ب	شقي	،،	شهر	ش ه ر
شعر	ش ع ر	شك	ش ك ك	شهرين	،،
شعراء	ش ع ر	شكر	ش ك ر	شهوة	ش ه و
شعری	،،	شكرتم	،،	شهوات	،،
شعوب	ش ع ب	شكل	ش ك ل	شهود	ش ه د
شعیب	شعیب	شكور	ش ك ر	شهور	ش ه ر
شغف	ش غ ف	شال	ش م ل	شهید	ش ه د
شغل	ش غ ل	شائل	،،	شهیدین	،،
شغلت	،،	شمس	ش م س	شهیق	ش ه ق
شِفَا	ش ف و	شنان	ش ن أ	شي	ش ی أ
شِفَاء	ش ف ی	شوی	ش و ی	شیاطین	ش ط ن
شَفَاعَة	ش ف ع	شواظ	ش و ظ	شیب	ش ی ب
شفة	ش ف ه (شفو)	شوب	ش و ب	شيبة	،،
شفتین	،،	شوری	ش و ر	شیخ	ش ی خ
شفع	ش ف ع	شوكة	ش و ك	شیطان	ش ط ن
شفعاء	،،	شهاب	ش ه ب	شیع	ش ی ع
شفق	ش ف ق	شهب	،،	شیعة	،،
شفیع	ش ف ع	شهادة	ش ه د	شیوخ	ش ی خ
				شیه	و ش ی

## ص

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
صائم	ص و م	صالح	ص ل ی	صالح	ص ح ف
صائمات	»	صالح	ص ل ی	صخر	ص خ ر
صائبون	ص ب ا	صالح	ص ل ح	صخرة	»
صابر	ص ب ر	صالحات	»	صد	ص د د
صابرة	»	صالحون	»	صددتم	»
صابروا	»	صالحین	»	صددنا	»
صابرون	»	صالوا	ص ل ی	صدر	ص د ر
صاحب	ص ح ب	صامتون	ص م ت	صدع	ص د ع
صاحب	ص ح ب	صهت	ص ب ب	صدف	ص د ف
الحوث	ص ح و ت	صباح	ص ب ح	صدفین	»
صاحبة	ص ح ب	صبار	ص ب ر	صدق	ص د ق
صاحبي	»	صبينا	ص ب ب	صدقات	»
صاخة	ص خ خ	صبح	ص ب ح	صدقة	»
صادق	ص د ق	صبر	ص ب ر	صدقت	»
صادقات	»	صبرتم	»	صدقنا	»
صادقون	»	صبرنا	»	صدقوا	»
صارمين	ص ر م	صبروا	»	صدوا	ص د د
صاعقة	ص ع ق	صبغ	ص ب غ	صدود	»
صاغرون	ص غ ر	صبغة	»	صدور	ص د ر
صافات	ص ف ف	صبوا	ص ب ب	صدید	ص د د
صافنات	ص ف ن	صبی	ص ب و	صدیق	ص د ق
صافون	ص ف ف	صحاف	ص ح ف	صدیقة	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
صديقون	ص د ق	صَفَا	ص ف ف	صنع	ص ن ع
صِر	ص و ر	صَفَا	ص ف و	صنعة	»
صِر	ص ر ر	صَفَح	ص ف ح	صنعوا	»
صِرَاط	ص ر ط	صَفَر	ص ف ر	صنوان	ص ن و
صِرَّة	ص ر ر	صَفَرَاء	»	صواب	ص و ب
صِرْج	ص ر ح	صَفْصَف	ص ف ف	صواع	ص و ع
صِرْصِر	ص ر ر	صَفْوَان	ص ف و	صواعق	ص ع ق
صِرْعَى	ص ر ع	صَكَّتْ	ص ك ك	صواف	ص ف ف
صِرْف	ص ر ف	صَل	ص ل و	صوامع	ص م ع
صِرْفَت	»	صَلَّى	»	صوت	ص و ت
صِرْفَانَا	»	صَلُوة	»	صور	ص و ر
صِرْيَخ	ص ر خ	صَلَب	ص ل ب	صورة	»
صِرِيم	ص ر م	صَلَبُوا	»	صورنا	»
صِعْد	ص ع د	صَلَح	ص ل ح	صوم	ص و م
صِعْق	ص ع ق	صَلَد	ص ل د	صهر	ص ه ر
صِعْقَا	»	صَالِصَال	ص ل ص ل	صياصي	ص ي ص
صِعُود	ص ع د	صَلَا	ص ل و	صيام	ص و م
صَعِيد	»	صَلَوَات	»	صيب	ص و ب
صِغَار	ص غ ر	صَلَّى	ص ل ي	صبيحة	ص ي ح
صِفَت	ص غ و	صَم	ص م م	صيد	ص ي د
صَغِير	ص غ ر	صَمَد	ص م د	صيف	ص ي ف
صَغِيرَةٌ	»	صَمُوا	ص م م		
صَف	ص ف ف				

## ض

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ضائق	ض ی ق	ضراء	ض ر ر	ضغث	ض غ ث
ضاحك	ض ح ك	ضرار	دو	ضفادع	ض ف د ع
ضاحكة	دو	ضرب	ض ر ب	ضل	ض ل ل
ضار	ض ر ر	ضربت	دو	ضلال	دو
ضاق	ض ی ق	ضربت	دو	ضلالة	دو
ضاقت	دو	ضربنا	دو	ضلت	دو
ضال	ض ل ل	ضربوا	دو	ضللتنا	دو
ضالین	دو	ضرر	ض ر ر	ضلوا	دو
ضامر	ض م ر	ضرب	ض ر ع	ضنك	ض ن ك
ضان	ض ا ن	ضعاف	ض ع ف	ضنین	ض ن ن
ضبح	ض ب ح	ضعف	دو	ضياء	ض و ء
ضحی	ض ح و	ضعفاء	دو	ضیر	ض ی ر
ضحكت	ض ح ك	ضعفوا	دو	ضیزی	ض و ز
ضد	ض د د	ضعفین	دو	ضیف	ض ی ف
ضر	ض ر ر	ضعیف	دو	ضیق	ض ی ق

## ط

طائر	ط ی ر	طائفین	ط و ف	طاعة	ط و ع
طائعين	ط و ع	طائفین	دو	طاعم	ط ع م
طائف	ط و ف	طاب	ط ی ب	طاعوت	ط غ ی
طائفة	دو	طارد	ط ر د	طاغون	دو
طائفان	دو	طارق	ط ر ق	طاغیة	دو

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
طاغین	ط غ ی	طعموا	ط ع م	طمع	ط م ع
طاف	ط و ف	طعن	ط ع ن	طوی	ط و ی
طاقة	ط و ق	طعنوا	،،	طوافون	ط و ف
طال	ط و ل	طغی	ط غ ی	طوبی	ط ی ب
طالب	ط ل ب	طغوا	،،	طود	ط و د
طالوت	ط ل و ت	طغوی	،،	طور	ط و ر
طامة	ط م م	طغیان	،،	طوع	ط و ع
طباق	ط ب ق	طقق	ط ف ق	طوعت	،،
طبتم	ط ی ب	طفقا	،،	طوفان	ط و ف
طبع	ط ب ع	طفل	ط ف ل	طول	ط و ل
طبق	ط ب ق	طل	ط ل ل	طویل	،،
طبن	ط ی ب	طلاق	ط ل ق	طهر	ط ه ر
طحی	ط ح ی	طلب	ط ل ب	طهرا	،،
طرائق	ط ر ق	طلح	ط ل ح	طهور	،،
طردت	ط ر د	طلع	ط ل ع	طی	ط و ی
طرف	ط ر ف	طلعت	،،	طیب	ط ی ب
طرفی	،،	طلاق	ط ل ق	طیبات	،،
طری	ط ر ی	طلاقم	،،	طیبة	،،
طریق	ط ر ق	طلقتمو	،،	طیبون	،،
طریقة	،،	طلقوا	،،	طیر	ط ی ر
طعام	ط ع م	طلوع	ط ل ع	طین	ط ی ن
طعم	،،	طمست	ط م س		
طعمتم	،،	طمسنا	،،		



## ظ

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ظالم	ظ ل م	ظلم	ظ ل ل	ظمان	ظ م أ
ظالمة	„	ظلل	„	ظن	ظ ن ن
ظالمون	„	ظللنا	„	ظنا	„
ظانين	ظ ن ن	ظلم	ظ ل م	ظننا	„
ظاهر	ظ ه ر	ظلمات	„	ظننت	„
ظاهرة	„	ظلمة	„	ظننتم	„
ظاهروا	„	ظلمت	„	ظنوا	„
ظاهرين	„	ظلمتم	„	ظنون	„
ظعن	ظ ع ن	ظلمنا	„	ظهر	ظ ه ر
ظفر	ظ ف ر	ظلموا	„	ظهروا	„
ظل	ظ ل ل	ظلوا	ظ ل ل	ظهري	„
ظلال	„	ظلوم	ظ ل م	ظهير	„
ظلام	ظ ل م	ظليل	ظ ل ل	ظهيرة	„
ظلة	ظ ل ل	ظماء	ظ م أ		
ظلت	„				

## ع

عائدون	ع و د	عابري	ع ب ر	عَادَ	عَادَ
عائل	ع ي ل (عول)	عابر	„	عَادَ	ع و د
عابد	ع ب د	عاتية	ع ت و	عادوا	„
عابدات	„	عاجلة	ع ج ل	عادون	ع د و
عابدون	„	عَادَ	ع د و	عاديات	„
عابدين	„				

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
عادیتم	ع د و	عامل	ع م ل	عتو	ع ت و
عادیین	ع د د	عاملة	،،	عتوا	،،
عارض	ع ر ض	عاملون	،،	عتی	،،
عاشروا	ع ش ر	عامین	ع و م	عتید	ع ت د
عاصف	ع ص ف	عاهد	ع ه د	عتیق	ع ت ق
عاصفات	،،	عاهدا	،،	عثر	ع ث ر
عاصفة	،،	عاهدت	،،	عجاب	ع ج ب
عاصم	ع ص م	عاهدتم	،،	عجاف	ع ج ف
عافین	ع ف و	عاهدوا	،،	عجب	ع ج ب
عاقب	ع ق ب	عباد	ع ب د	عجبت	،،
عاقبة	،،	عبادة	،،	عجبتهم	،،
عاقبتهم	،،	عبث	ع ب ث	عجبوا	،،
عاقبوا	،،	عبد	ع ب د	عجزت	ع ج ز
عاقر	ع ق ر	عبدت	،،	عجل	ع ج ل
عاکف	ع ک ف	عبدتم	،،	عجلت	،،
عال	ع ل و	عبدنا	،،	عجلتم	،،
عالم	ع ل م	عبدین	،،	عجلنا	،،
عالمون	،،	عبرة	ع ب ر	عجوز	ع ج ز
عالمین	،،	عبس	ع ب س	عجول	ع ج ل
عالی	ع ل و	عبثری	ع ب ق ر	عجیب	ع ج ب
عالية	،،	عبوس	ع ب س	عد	ع د د
عاليهم	،،	عبید	ع ب د	عداوة	ع د و
عالین	،،	عتت	ع ت و	عدة	ع د د
عام	ع و م	عتل	ع ت ل	عدتم	ع و د

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
عدد	ع د د	عرفات	ع ر ف	عسعس	ع س ع س
عدم	ع د س	عرفت	»	عسل	ع س ل
عدل	ع د ل	عرفوا	»	عسقم	ع س ی
عدن	ع د ن	عرم	ع ر م	عسر	ع س ر
عدنا	ع و د	عروة	ع ر و	عشاء	ع ش و
عدو	ع د و	عروش	ع ر ش	عشار	ع ش ر
عدوان	»	عريض	ع ر ض	عشر	»
عدوة	»	عز	ع ز ز	عشرة	»
عذاب	ع ذ ب	عزة	»	عشرون	»
عذب	»	عزرتهموا	ع ز ر	عشي	ع ش ی
عذبنا	»	عزروا	»	عشية	»
عذت	ع و ذ	عزونا	ع ز ز	عشیر	ع ش ر
عذر	ع ذ ر	عزلت	ع ز ل	عشيرة	»
عراء	ع ر ی	عزم	ع ز م	عصا	ع ص و
عرب	ع ر ب	عزمت	»	عصى	ع ص ی
عربي	»	عزموا	»	عصبة	ع ص ب
عرجون	ع ر ج ن	عزي	ع ز ز	عصر	ع ص ر
عرش	ع ر ش	عزير	ع ز ر	عصف	ع ص ف
عرض	ع ر ض	عزیز	ع ز ز	عصم	ع ص م
عرضة	»	عزین	ع ز و	عصوا	ع ص ی
عرضتم	»	عسی	ع س ی	عصي	ع ص و
عرضنا	»	عسر	ع س ر	عصي	ع ص ی
عرضوا	»	عسری	»	عصیان	»
عرف	ف	عسرة	»	عصیب	ع ص ب

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
عصیت	ع ص ی	عقد	ع ق د	عَلِمُوا	ع ل و
عصیتم	»	عقدة	»	علي	»
عصینا	»	عقدت	»	علیا	»
عضد	ع ض د	عقدتم	»	علیم	ع ل م
عضوا	ع ض ض	عقر	ع ق ر	علیون	ع ل و
عضین	ع ض و	عقروا	»	عليهم	علی + هم
عطاء	ع ط و	عقلوا	ع ق ل	عم	عن + ما
عطف	ع ط ف	عقود	ع ق د	عم	ع م م
عطلت	ع ط ل	عقیم	ع ق م	عات	»
عظ	و ع ظ	علا	ع ل و	عاهد	ع م د
عظام	ع ظ م	علی	علی	عمارة	ع م ر
عظم	»	علام	ع ل م	عمد	ع م د
عظوا	و ع ظ	علامات	»	عمر	ع م ز
عظیم	ع ظ م	علانية	ع ل ن	عمران	»
عفا	ع ف و	علق	ع ل ق	عمرة	»
عفريت	عفريت	علقة	»	عمروا	»
عفو	ع ف و	علم	ع ل م	عمل	ع م ل
عفونا	»	علماء	»	عملت	»
عفي	»	علمت	»	عملتم	»
عقاب	ع ق ب	علمتم	»	عملوا	»
عقب	»	علمتموا	»	عموا	ع م ی
عقبی	»	علمنا	»	عمون	»
عقبة	»	علموا	»	عمي	»
عقبی	»	علموا	ع ل و	عميان	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
عمیت	ع م ی	عنكبوت	ع ن ك ب	عید	ع و د
عمیق	ع م ق	عنید	ع ن د	عیر	ع ی ر
عمین	ع م ی	عوان	ع و ن	عیسی	عیسی
عن	عن	عوج	ع و ج	عیشه	ع ی ش
عناب	ع ن ب	عورات	ع و ر	عیلة	ع ی ل (عول)
عنّت	ع ن ت	عورة	،،	عین	ع ی ن
عنّت	ع ن و	عوقب	ع ق ب	عینان	،،
عنّم	ع ن ت	عوقبم	،،	عینین	،،
عند	عند	عهد	ع ه د	عیون	،،
عنق	ع ن ق	عهدنا	،،	عیینا	ع ی ی
		عهن	ع ه ن		

## غ

غائبة	غ ی ب	غافرين	غ ف ر	غدو	غ د و
غائبون	،،	غافل	غ ف ل	غدوا	،،
غائبین	،،	غافلات	،،	غدوت	،،
غائط	غ و ط	غالب	غ ل ب	غمر	غ ر ر
غائظون	غ ی ظ	غاوون	غ و ی	غراب	غ ر ب
غابرين	غ ب ر	غبرة	غ ب ر	غرایب	،،
غار	غ و ر	غشاء	غ ث و	غرام	غ ر م
غارمین	غ ر م	غد	غ د و	غربت	غ ر ب
غاسق	غ س ق	غداء	،،	غربی	،،
غاشية	غ ش ی	غداة	،،	غریبة	،،
غافر	غ ف ر	غدق	غ د ق	غرث	غ ر ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
غرف	غ ر ف	غفران	غ ف ر	غمرات	غ م ر
غرفات	»	غفرنا	»	غممة	غ م م
غرفة	»	غفلة	غ ف ل	غمام	»
غرق	غ ر ق	غفور	غ ف ر	غنم	غ ن م
غروب	غ ر ب	غل	غ ل ل	غنمتم	»
غرور	غ ر ر	غلاظ	غ ل ظ	غنني	غ ن ي
غزى	غ ز و	غلام	غ ل م	غوى	غ و ي
غزل	غ ز ل	غلامين	»	غواش	غ ش ي
غساق	غ س ق	غلب	غ ل ب	غواص	غ و ص
غسق	»	غلبت	»	غور	غ و ر
غسلين	غ س ل	غلبوا	»	غول	غ و ل
غشى	غ ش ي	غلت	غ ل ل	غوي	غ و ي
غشاوة	»	غلظة	غ ل ظ	غويننا	»
غصب	غ ص ب	غلف	غ ل ف	غبي	»
غصة	غ ص ص	غلقت	غ ل ق	غيابت	غ ي ب
غضب	غ ض ب	غللمان	غ ل م	غيب	»
غضبان	»	غلوا	غ ل ل	غيث	غ ي ث
غضبوا	»	غلي	غ ل و - ي	غير	غ ي ر
غطاء	غ ط و	غليظ	غ ل ظ	غيض	غ ي ض
غفار	غ ف ر	غم	غ م م	غيظ	غ ي ظ
غفر	»	غمرة	غ م ر	غيوب	غ ي ب

## ف

ف فأت ف ي أ فأتون ف و ز

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
فَاء، وا	ف ی ا	فالق	ف ل ق	فجرة	ف ج ر
فات	ف و ت	فان	ف ن ی	فجرت	،،
فأشمة	ف أ و	فاه	ف و ه	فجرنا	،،
فئتان	،،	فتی	ف ت ی	فجوة	ف ج و
فئتين	،،	فتاح	ف ت ح	فجور	ف ج ر
فاتحين	ف ت ح	فتح	،،	فحشا	ف ح ش
فاتنين	ف ت ن	فتحت	،،	فخار	ف خ ر
فاجر	ف ج ر	فتحنا	،،	فخور	،،
فأحشة	ف ح ش	فتحوا	،،	فداء	ف ذ ی
فار	ف و ر	فترة	ف ت ر	فدية	،،
فارض	ف ر ض	فتقنا	ف ت ق	فديننا	،،
فارغ	ف ر غ	فتنا	ف ت ن	فقات	ف ر ت
فارقا	ف ر ق	فتنة	،،	فراذی	ف ر د
فارقوا	،،	فتنم	،،	فرار	ف ر ر
فارھین	ف ر ه	فتنوا	،،	فراش	ف ر ش
فاز	ف و ز	فتون	،،	فراق	ف ر ق
فاسق	ف س ق	فتيات	ف ت ی	فرت	ف ر ر
فاصلين	ف ص ل	فتیان	،،	فرث	ف ر ث
فاطر	ف ط ر	فتية	،،	فرج	ف ر ج
فاعل	ف ع ل	فتيل	ف ت ل	فرجت	،،
فاقرة	ف ق ر	فج	ف ج ج	فرح	ف ر ح
فالق	ف ق ع	فجاج	،،	فرحوا	،،
فاكهة	ف ك ه	فجار	ف ج ر	فرحون	،،
فاكهون	،،	فجر	،،	فرد	ف ر د

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
فردوس	ف ر د س	فريضة	ف ر ض	فطر	ف ط ر
فروت	ف ر ر	فريق	ف ر ق	فطرة	ف ط ر
فرتم	ف ر ت م	فريقان	ف ر ق ا ن	فطور	ف ط و ر
فرش	ف ر ش	فريقين	ف ر ق ي ن	فظ	ف ظ ط
فرشنا	ف ر ش ن ا	فزع	ف ز ع	فعال	ف ع ل
فرض	ف ر ض	فزعوا	ف ز ع و ا	فعل	ف ع ل
فرضتم	ف ر ض ت م	فماد	ف م د	فعلة	ف ع ل ة
فرضنا	ف ر ض ن ا	فمادت	ف م د ت	فعلت	ف ع ل ت
فرط	ف ر ط	فسدتا	ف س د ت ا	فعلتم	ف ع ل ت م
فرطت	ف ر ط ت	فسق	ف س ق	فعلن	ف ع ل ن
فرطتم	ف ر ط ت م	فسقوا	ف س ق و ا	فعلنا	ف ع ل ن ا
فرطنا	ف ر ط ن ا	فسنيسره	ف س ن ي س ر ه	فعلوا	ف ع ل و ا
فرع	ف ر ع	فسوق	ف س ق	فقر	ف ق ر
فرعون	ف ر ع و ن	فشلتهم	ف ش ل ت م	فقرآء	ف ق ر آ ء
فرغت	ف ر غ ت	فصال	ف ص ل	فقيير	ف ق ي ي ر
فرق	ف ر ق	فصل	ف ص ل	فك	ف ك ك
فرقان	ف ر ق ا ن	فصلت	ف ص ل ت	فكر	ف ك ر
فرقة	ف ر ق ة	فصلنا	ف ص ل ن ا	فكهين	ف ك ه ي ن
فرقت	ف ر ق ت	فصيلته	ف ص ي ل ت ه	فلان	ف ل ن
فرقنا	ف ر ق ن ا	فضة	ف ض ض	فلق	ف ل ق
فرقوا	ف ر ق و ا	فضل	ف ض ل	فلك	ف ل ك
فروا	ف ر و ا	فضلت	ف ض ل ت	فواحش	ف و ا ح ش
فروج	ف ر ج	فضلنا	ف ض ل ن ا	فؤاد	ف أ د
فري	ف ر ي	فضلوا	ف ض ل و ا	فواق	ف و ق



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
فواكه	ف ك هـ	فوز	ف و ز	فهمنا	ف هـ م
فوت	ف و ت	فوق	ف و ق	فهي	في
فوج	ف و ج	فوم	ف و م	فيل	ف ي ل
فور	ف و ر				

## ق

ق	ق و ي	قاسية	ق م و	قام	ق و م
قَا نُلْ	ق و ل	قاصد	ق ص د	قاموا	,,
قَا نُلُونْ	ق ي ل	قاصرات	ق ص ر	قالت	ق ن ت
قائم	ق و م	قاصرات	ق ص ر +	قائلات	,,
قائمة	,,	الطرف	ط ر ف	قالتون	,,
قائمون	,,	قاصف	ق ص ف	قائطين	ق ن ط
قاب	ق و ب	قاض	ق ض ي	قانع	ق ن ع
قاب قوسين	ق و ب + ق و س	قاضية	,,	قاهر	ق هـ ر
قابل	ق ب ل	قاطعة	ق ط ع	قبائل	ق ب ل
قاتل	ق ت ل	قاع	ق ي ع	قبر	ق ب ر
قاتلا	,,	قاعد	ق ع د	قبس	ق ب س
قاتلوا	,,	قاعدون	,,	قبض	ق ب ض
قادر	ق د ر	قال	ق و ل	قبضة	,,
قارعة	ق ر ع	قالا	,,	قبضت	,,
قارون	ق ا ر و ن	قالت	,,	قبضنا	,,
قاسطون	ق م ط	قالنا	,,	قبل	ق ب ل
قاسم	ق م م	قائوا	,,	قبلة	,,
		قالين	ق ل ي - و	قبور	ق ب ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
قبول	ق ب ل	قدمت	ق د م	قربان	ق ر ب
قبیل	،،	قدمتم	،،	قربنا	،،
قتال	ق ت ل	قدمتموا	،،	قرة	ق ر ر
قتر	ق ت ر	قدمنا	،،	قروح	ق ر ح
قتره	،،	قدموا	،،	قردة	ق ر د
قتل	ق ت ل	قدور	ق د ر	قرض	ق ر ض
قتلی	،،	قدوس	ق د س	قرطاس	ق ر ط س
قتلت	،،	قدیر	ق د ر	قَرَنٌ	و ق ر
قتلتم	،،	قدیم	ق د م	قَرَنٌ	ق ر ن
قتلتهموا	،،	قذف	ق ذ ف	قرناء	،،
قتلنا	،،	قذفنا	،،	قرنین	،،
قتلوا	،،	فری	ق ر ی	قروء	ق ر أ
قتور	ق ت ر	قرأ	ق ر أ	فرون	ق ر ن
قثاء	ق ث أ	فرى	،،	قربى	ق ر ر
قُتِدَ	قُتِدَ	فرأت	،،	قريب	ق ر ب
قُدَّ	ق د د	فرار	ق ر ر	قرية	ق ر ی
قدت	،،	فراطیس	ق ر ط س	فريتین	،،
قدح	ق د ح	قرآن	ق ر أ	قريش	قريش
قدد	ق د د	قرانا	،،	قرین	ق ر ن
قدر	ق د ر	قرب	ق ر ب	قست	ق س و
قدرنا	،،	قربا	،،	قسط	ق س ط
قدروا	،،	قربى	،،	قسطاس	،،
قدس	ق د س	قربات	،،	قسم	ق س م
قدم	ق د م	قربة	،،	قسمة	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
قسمنا	ق س م	قطران	ق ط ر	قلم	ق ل م
قسوة	ق س و	قطع	ق ط ع	قلن	ق و ل
قسورة	ق س ر	قطعت	,,	قلنا	,,
قسيسين	ق س س	قطعتن	,,	قلوب	ق ل ب
قص	ق ص ص	قطعن	,,	قليل	ق ل ل
قصاص	,,	قطعنا	,,	قليلة	,,
قصد	ق ص د	قطمير	ق ط م ر	قم	ق و م
قصر	ق ص ر	قطوف	ق ط ف	قمتن	,,
قصص	ق ص ص	قعد	ق ع د	قمر	ق م ر
قصصنا	,,	قعدوا	,,	قمطرير	ق م ط ر
قصصنا	ق ص م	قعوا	و ق ع	قمل	ق م ل
قصوى	ق ص و	قعود	ق ع د	قميص	ق م ص
قصور	ق ص ر	قعيد	,,	قناطر	ق ن ط ر
قصي	ق ص ص	قفوا	و ق ف	قنطار	,,
قصي	ق ص و	قفينا	ق ف و	قنطوا	ق ن ط
قضى	ق ض ي	قل	ق و ل	قنوان	ق ن و
قضب	ق ض ب	قل	ق ل ل	قنوط	ق ن ط
قضوا	ق ض ي	قلى	ق ل ي	قوا	و ق ي
قضي	,,	قلاؤد	ق ل د	قوى	ق و ي
قضيت	ق ض ي	قلمه	ق ل ب	قوارير	ق ر ر
قضيتن	,,	قلبوا	,,	قواعد	ق ع د
قضينا	,,	قلبين	,,	قوام	ق و م
قط	ق ط ط	قلت	ق و ل	قوامون	,,
قطر	ق ط ر	قلتم	,,	قوة	ق و ي

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
قوتلتهم	ق ت ل	قولى	ق و ل	قيضنا	ق ي ض
قوتلوا	،،	قوم	ق و م	قيعة	ق ي ع
قوس	ق و س	قوموا	،،	قيل	ق و ل
وسين	،،	قوي	ق و ي	قيله	،،
قول	ق و ل	قهار	ق ه ر	قيم	ق و م
قولا	،،	قيام	ق و م	قيمة	،،
قولوا	،،	قيامة	،،	قيوم	،،

## ك

ك	ك	كارهون	ك ر ه	كالوا	ك ي ل
كَ	كَ	كارهين	،،	كامله	ك م ل
ك	كَ	كاس	ك ا س	كاملين	،،
كاتب	ك ت ب	كاشف	ك ش ف	كَانَ	كَانَ
كاتبوا	،،	كاشفة	،،	كانما	،،
كاتبون	،،	كاشفوا	،،	كَانَ	ك و ن
كاتبين	،،	كاظمين	ك ظ م	كانا	،،
كاد	ك و د	كف	ك ف ي	كانت	،،
كادت	،،	كافة	ك ف ف	كانتا	،،
كادح	ك د ح	كافر	ك ف ر	كانوا	،،
كادوا	ك و د	كافرة	،،	كاهن	ك ه ن
كاذب	ك ذ ب	كافرون	،،	كاين	كَانَ
كاذبة	،،	كافرين	،،	كباثر	ك ب ر
كاذبون	،،	كافور	،،	كبار	،،
كاذبين	،،	كالجون	ك ل ح	كسبت	ك ب ب

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
كُتِبَتْ	ک ب ت	كُنَّا	ک ی د	كَسَبَا	ک س ب
كُتِبُوا	»	كَذَاب	ک ذ ب	كَسَبَتْ	»
كَبِد	ک ب د	كَذَالِك	ک + ذ ا	كَسَبْتُمْ	»
كَبِر	ک ب ر	كَذَالِكُمْ	»	كَسَبُوا	»
كَبِرَى	»	كَذِب	ک ذ ب	كَسَف	ک س ف
كِبْرَاء	»	كَذِبَتْ	ک ذ ب	كَسُوَّة	ک س و
كِبَرَتْ	»	كَذِبْتُمْ	»	كَسَوْنَا	»
كَبِكْبُوا	ک ب ب	كَذِبْنَا	»	كَشَطَتْ	ک ش ط
كَبِرِيَاء	ک ب ر	كَذِبُوا	»	كَشَف	ک ش ف
كَبِيرَةٌ	»	كَرَام	ک ر م	كَشَفَتْ	»
كَتَاب	ک ت ب	كَرَامَا	ک ر م	كَشَفْنَا	»
كَتَابِيهِ	»	كَاتِبِينَ	ک ت ب	كَظِيم	ک ظ م
كَتَب	»	كَرْب	ک ر ب	كَعْبَةٌ	ک ع ب
كَتَبَتْ	»	كَرَّة	ک ر ر	كَعْبِينَ	»
كَتَبْنَا	»	كَرْتِينَ	»	كَف	ک ف ف
كَتَم	ک ت م	كَرْسِي	ک ر م	كَفَا	»
كَثَر	ک ث ر	كَرَمَتْ	ک ر م	كَفَى	ک ف ف
كَثْرَةٌ	»	كَرْمَنَا	»	كَفَات	ک ف ت
كَثُرَتْ	»	كَرِه	ک ر ه	كَفَار	ک ف ر
كَثِيب	ک ث ب	كَرِهْتُمُوَا	»	كَفَارَةٌ	»
كَثِير	ک ث ر	كَرِهُوا	»	كَفَر	»
كَثِيرَةٌ	»	كَرِيم	ک ر م	كَفَرَان	»
كَدَّتْ	ک و د	كَسَاد	ک س د	كَفَرَةٌ	»
كَدَح	ک د ح	كَسَالِي	ک س ل	كَفَرَتْ	»
		كَسَب	ک س ب		

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
كفرتم	ك ف ر	كلام	ك ل م	كُنَّا	ك و ن
كفروا	،،	كأب	ك ل ب	كُنْتُ	،،
كفروا	،،	كلنا	كلا	كُنْتُمْ	،،
كففت	ك ف ف	كلم	ك ي ل	كُنْتُمْ	،،
كفل	ك ف ل	كلم	ك ل م	كنز	ك ن ز
كفلين	،،	كلما	ك ل ل	كنزتم	،،
كفو	ك ف أ - و	كلمات	ك ل م	كنس	ك ن س
كفوا	ك ف ف	كأمة	،،	كنود/كواكب	ك ن د ب
كفور	ك ف ر	كلوا	ا ك ل	كنوا	ك و ن
كفي	ك ف ف	كلي	،،	كوني	،،
كفيل	ك ف ل	كُم	كُم (حرف)	كهف	ك ه ف
كفينا	ك ف ي	كُم	كُم (ضمير)	كهل	ك ه ل
كل	ك ل ل	كُمَا	كُمَا ،،	كيف	كَيْفَ (حرف)
كل	كُل (حرف)	كُمُوا	كُم ،،	كي	كَي ،،
كَلَّا	كَلَّا (حرف)	كُن	ك و ن	كيد	ك ي د
كَلَّا	،،	كن	ك ن ن	كيدوا	،،
كَلَّا	أ ك ل	كُنْ	ك و ن + كُنْ (ضمير)	كيل	ك ي ل
كلالة	ك ل ل				

## ل

ل	ل (حرف جر)	لاشين	ل ب ث	لاعين	ل ع ب
ل	ل (حرف توكيد)	لَات	لَات	لاعنون	ل ع ن
لا	لَا (حرف)	لَات	لَات	لاغية	ل غ و
لائم	ل و م	لازب	ل ز ب	لاقي	ل ق ي

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
لُكُنْ	ل ك ن	لَحِيَّة	ل ح ي	لُكُنْ	ل ك ن
لُكُنْ	ل ك ن	لَد	ل د د	لُكُنْ	ل ك ن
لُكُنَا	ل ك ن ا	لَدَى	ل د ي	لُكُنْ	ل ك ن
لَا مَسَمَ	ل م س	لَدُنْ	ل د ن	لُكُنْ	ل ك ن
لَوْ لَوْ	ل ا ل ا	لَدَى	ل د ي	لُكُنْ	ل ك ن
لَاهِيَّة	ل ه و	لَدَى	ل د ي	لُكُنْ	ل ك ن
لِبَاس	ل ب س	لَذَّة	ل ذ ذ	لُكُنْ	ل ك ن
لِبَث	ل ب ث	لِزَام	ل ز م	لُكُنْ	ل ك ن
لِبِثَت	ل ب ث	لِسَان	ل س ن	لُكُنْ	ل ك ن
لِبِثَم	ل ب ث م	لِسْت	ل س ت	لُكُنْ	ل ك ن
لِبِثْنَا	ل ب ث ن ا	لِسْتَم	ل س ت م	لُكُنْ	ل ك ن
لِبِثُوا	ل ب ث و ا	لِسْتَن	ل س ت ن	لُكُنْ	ل ك ن
لِبَد	ل ب د	لَطِيف	ل ط ف	لُكُنْ	ل ك ن
لِبَس	ل ب س	لِظَى	ل ظ ي	لُكُنْ	ل ك ن
لِبِسْنَا	ل ب س ن ا	لَعَب	ل ع ب	لُكُنْ	ل ك ن
لِبْن	ل ب ن	لَعَلَّ	ل ع ل	لُكُنْ	ل ك ن
لِبُوس	ل ب س	لَعَن	ل ع ن	لُكُنْ	ل ك ن
لِجَّة	ل ج ج	لَعْنَا	ل ع ن ا	لُكُنْ	ل ك ن
لِجُوا	ل ج و ا	لَعْنَةُ	ل ع ن ة	لُكُنْ	ل ك ن
لِجِي	ل ج ي	لَعْنَت	ل ع ن ت	لُكُنْ	ل ك ن
لِحْم	ل ح م	لَعْنُوا	ل ع ن و ا	لُكُنْ	ل ك ن
لِحْن	ل ح ن	لَعُو	ل ع و	لُكُنْ	ل ك ن
لِحُوم	ل ح م			لُكُنْ	ل ك ن

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
لَوَّ	ل و م	لَوَّ	ل و م	لَوَّ	ل و م
لواحة	ل و ح	لَوْن	ل و ن	لَوَّاحَة	ل و ح
لواذ	ل و ذ	لَوَّوْا	ل و ی	لَوَّاذ	ل و ذ
لواقح	ل ق ح	لَوَّهٗ	ل و ه	لَوَّاقِح	ل ق ح
لوامة	ل و م	لَهَب	ل ه ب	لَوَّامَة	ل و م
لوح	ل و ح	لَهُو	ل ه و	لَوَّح	ل و ح
لوط	ل و ط	لَوَّي	ل و ی	لَوَّط	ل و ط
لَوَّلَا	ل و لا	لَيَالٍ	ل ی ل	لَوَّلَا	ل و لا
لَوَّمَا	ل و ما	لَيَالِي	ل و ی	لَوَّمَا	ل و ما
لومة	ل و م				

## م

ما	مَاذَا	مَاذَا	مَا لَك
ماء	مَارِب	مَارِب	مَامِن
مائة	مَارِج	مَارِج	مَامُون
مائتين	مَارِد	مَارِد	مَائِعَة
مائدة	مَارَوْت	مَارَوْت	مَائِدَة
مأب	مَاعُون	مَاعُون	مَاهِدُون
مات	مَآكُثُون	مَآكُثُون	مَاهِيَة
ماتوا	مَآكِرِين	مَآكِرِين	مَبَارَك
ماتي	مَآكُول	مَآكُول	مَبَارَكَة
ماجوج	مَال	مَال	مَبْتَلِي
مَادَمَت	مَالُثُون	مَالُثُون	مَبْتَلِينَ
مَادَمْتُمْ	مَالِك	مَالِك	مَبْثُوث



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مبثوثة	ب ث ث	مناب	ت و ب	متصدقة	ص د ق
مبدل	ب د ل	متاع	م ت ع	متصدقين	و
مبدي	ب د و	متبر	ت ب ر	مطهرة	ط ه ر
مبذرين	ب ذ ر	متبرجات	ب ر ج	متطهرين	و
مبرهون	ب ر أ	متبعون	ت ب ع	متعال	ع ل و
مربون	ب ر م	متتابعين	و	بمتع	م ت ع
مبسوطتان	ب س ط	متجاورات	ج و ر	متعت	و
مبشر	ب ش ر	متجائف	ج ن ف	متعتم	و
مبشرات	و	متحرف	ح و ف	متعمدا	ع م د
مبشرون	و	متحيز	ح ي ز	متعنا	م ت ع
مبصر	ب ص ر	متخذ	أ خ ذ	متعوا	و
مبصرات	و	متخذات	و	متفرقة	ف ر ق
مبصرون	و	متراكب	ر ك ب	متفرقون	و
مبطلون	ب ط ل	متربة	ت ر ب	متقابلين	ق ب ل
مبعدون	ب ع د	متربص	ر ب ص	متقلب	ق ل ب
مبعوثون	ب ع ث	متربصون	و	متقلبان	و
مبلسون	ب ل م	متردية	ر د ي	متقون	و ق ي
مبلغ	ب ل غ	مترفوا	ت ر ف	متقين	و
مبوا	ب و أ	مترفين	و	متكأ	و ك أ
مبين	ب ي ن	متشابه	ش ب ه	متكثون	و
مبينات	و	متشابهات	و	متكئين	و
مبينه	و	متشاكسون	ش ك س	متكبر	ك ب ر
مت	م و ت	متصدع	ص د ع	متكبرين	و
متى	م تى	متصدقات	ص د ق	متكفين	ك ل ف

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
متلقیان	ل ق ی	محال	ج ل س	محراب	ح ر ب
مستم	ت م م	مجاهد	ج ه د	محرر	ح ر ر
مستم	م و ت	مجمعون	ج م ع	محرم	ح ر م
متنا	”	مجدوذ	ج ذ ذ	محرمه	”
متنافسون	ن ف س	مجرى	ج ر ی	محروم	”
متوسمين	و س م	محرم	ج ر م	محرومون	”
متوفى	و ف ی	مجرمون	”	محسن	ح س ن
متوکل	و ک ل	مجمع	ج م ع	محسنات	”
متوکلون	”	مجموع	”	محسنون	”
متوکلین	”	مجموعون	”	محسنین	”
متین	م ت ن	مجنون	ج ن ن	محسور	ح س ر
مشابهة	ث و ب	مجنوس	مجنوس	محشورة	ح ش ر
مثالي	ث ن ی	محبب	ج و ب	محصنات	ح ص ن
مشبور	ث ب ر	محبب	م ج د	محصنة	”
مثقال	ث ق ل	محاريب	ح ر ب	محصنين	”
مثقلة	”	محاسبة	ح س ب	محضر	ح ض ر
مشقون	”	محال	م ح ل	محضرون	”
مثل	م ث ل	محبة	ح ب ب	محظور	ح ظ ر
مثلی	”	محتضر	ح ض ر	محفوظ	ح ف ظ
مشلات	”	محتظر	ح ظ ر	محکات	ح ک م
مثلي	”	محجوبون	ح ج ب	محكمة	”
مثلی	ث ن ی	محجور	ح ج ر	محل	ح ل ل
مثوی	ث و ی	محدث	ح د ث	محلین	ح ل ق
مشوبة	ث و ب	محذور	ح ذ ر	محلي	ح ل ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
محملة	ح ل ل	مخلصون	خ ل ص	مدهنون	د ه ن
محمد	ح م د	مخلصين	»	مدين	م د ن
محمود	»	مخالف	خ ل ف	مدينة	م د ن
محوئا	م ح و	مخلفون	»	مدينون	د ي ن
محيي	ح ي ي	مخلقة	خ ل ق	مدينين	»
محييا	»	مخمصة	خ م ص	مذوم	ذ ا م
محيص	ح ي ص	مد	م د د	مذبذبين	ذ ب ب
محيض	ح ي ض	مدائن	م د ن	مذعنين	ذ ع ن
محيط	ح و ط	مداد	م د د	مذكر	ذ ك ر
محیطة	»	مدبر	د ب ر	مذكور	»
مخاض	م خ ض	مدبرات	»	مذموم	ذ م م
مخبتين	خ ب ت	مدبرين	د ب ر	مر	م ر ر
مختال	خ ي ل	مدة	م د د	مرء	م ر ا
مختلف	خ ل ف	مدت	»	مرأ	م ر ي
مختوم	خ ت م	مدثر	د ث ر	مرات	م ر ر
مخذول	خ ذ ل	مدحضين	د ح ض	مراضع	ر ض ع
مخرج	خ ر ج	مدحور	د ح ر	مراغم	ر غ م
مخرجون	»	مدخل	د خ ل	مرافق	ر ف ق
مخرجين	»	مدد	م د د	مرءة	م ر ر
مخسرين	خ س ر	مددنا	»	مرت	»
مخضرة	خ ض ر	مدرار	د ر ر	مرتاب	ر ي ب
مخضود	خ ض د	مدركون	د ر ك	مرتان	م ر ر
مخلدون	خ ل د	مذكر	ذ ك ر	مرتفق	ف ق
مخلص	خ ل ص	مدهامتان	د ه م	مرتقبون	»

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مرسج	م ر ج	مرصوص	ر ص ص	مزاج	م ز ج
مرجان	»	مرض	م ر ض	مزجاة	ز ج و
مراجع	ر ج ع	مرضی	»	مزحزح	ز ح ز ح
مرجفون	ر ج ف	مرضات	ر ض ی	مزدجر	ز ج ر
مرجوا	ر ج و	مرضت	م ر ض	مزقتم	م ز ق
مرجوبین	ر ج م	مرضعة	ر ض ع	مزقنا	»
مرجون	ر ج و	مرضیة	ر ض ی	مزمّل	ز م ل
مرح	م ر ح	مرعی	ر ع ی	مزن	م ز ن
مرحب	ر ح ب	مرفق	ر ف ق	مزید	ز ی د
مرحمة	ر ح م	مرفود	ر ف د	ممس	م س س
مرد	ر د د	مرفوع	ر ف ع	مساجد	س ج د
مردفین	ر د ف	مرقوعة	»	مساس	م س س
مردوا	م ر د	مرقد	ر ق د	مسافحات	س ف ح
مردود	ر د د	مرقوم	ر ق م	مسافحین	»
مردودون	»	مرکوم	ر ک م	مساق	س و ق
مرسی	ر س و	مروا	م ر ر	مساکن	س ک ن
مرسل	ر س ل	مروة	م ر و	مساکین	»
مرسلات	»	مری	م ر أ	مسئول	س أ ل
مرسلة	»	مریب	ر ی ب	مسئولون	»
مرسلوا	»	مریة	م ر ی	مسبحون	س ب ح
مرسلون	»	مریج	م ر ج	مسیوقین	س ب ق
مرشد	ر ش د	مرید	م ر د	مست	م س س
مرصاد	ر ص د	مریض	م ر ض	مستأخرین	أ خ ر
مرصد	»	مریم	م ر ی م	مستانسین	أ ن س

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مستبشرة	ب ش ر	مستهزون	ه ز أ	مسكوب	س ك ب
مستبصرين	ب ص ر	مستيقنين	ي ق ن	مستكونة	س ك ن
مستبين	ب ي ن	مسجد	س ج د	مسكين	و
مستخف	خ ف ي	مسحور	س ج ر	مسلم	م ل م
مستخلفين	خ ل ف	مسجونين	م ج ن	مسلمات	و
مستسلمون	م ل م	مسح	م م ح	مسلمة	و
مستضعفون	ض ع ف	مسحورين	م ح ر	مسلمون	و
مستطر	س ط ر	مسحور	و	مسلمين	و
مستطير	ط ي ر	مسحورون	و	مسمى	م م و
مستعان	ع و ن	مسخر	م خ ر	مسمع	م م ع
مستغفرين	غ ف ر	مسخرات	و	مستنا	م م س
مستقبل	ق ب ل	مسخنا	مسخ	مسندة	م ن د
مستقدمين	ق د م	مسد	م س د	مسنون	س ن ن
مستقر	ق ر ر	مسرف	م ر ف	مسود	م و د
مستقيم	ق و م	مسرفون	و	مسودة	و
مستكبر	ك ب ر	مسرفين	و	مسومة	م و م
مستكبرون	و	مسرور	س ر ر	مسومين	و
مستمر	م ر ر	مسطور	م ط ر	مسي	م و م
مستمسكون	م س ك	مسغبة	م غ ب	مسيح	م م ح
مستمع	س م ع	مسفرة	م ف ر	مسيطر	س ط ر
مستمعون	و	مسفوح	س ف ح	مسيطرون	و
مستنفرة	ن ف ر	مسك	م س ك	مشاء	م ش ي
مستودع	و د ع	مسكن	م ك ن	مشارب	ش ر ب
مستور	س ر ت	مسكنة	و	مشارق	ش ر ق

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مشتمة	ش أ م	مصباح	ص ب ح	مضاعفة	ض ع ف
مشتبه	ش ب ه	مصبحين	ص ب ح	مضمت	م ض ي
مشاركون	ش ر ك	مصدق	ص د ق	مضطر	ض ر ر
مشعون	ش ح ن	مصدقات	ص د ق	مضعفون	ض ع ف
مشرب	ش ر ب	مصدقين	و	مضغة	م ض غ
مشرق	ش ر ق	مصر	م ص ر	مضل	ض ل ل
مشرقين	و	مصرخ	ص ر خ	مضلين	و
مشارك	ش ر ك	مصروف	ص ر ف	مطاع	ط و ع
مشاركات	و	مصطفين	ص ف و	مطر	م ط ر
مشاركة	و	مصفى	و	مطففين	ط ف ف
مشاركون	و	مصفر	ص ف ر	مطلع	ط ل ع
مشاركين	و	مصفوفة	ص ف ف	مطلعون	و
مشعر	ش ع ر	مصلی	ص ل و	مطلقات	ط ل ق
مشفقون	ش ف ق	مصلح	ص ل ح	مطلوب	ط ل ب
مشكوة	ش ك و	مصلحون	و	مطمئن	ط م ن
مشكور	ش ك ر	مصلين	ص ل و	مطمئنة	و
مشوا	م ش ي	مصور	ص و ر	مطمئنين	و
مشهد	ش ه د	مصيب	ص و ب	مطوعين	ط و ع
مشهود	و	مصيبة	و	مضويات	ط و ي
مشي	م ش ي	مصير	ص ي ر	مظهر	ط ه ر
مشيد	ش ي د	مصيطر	س ط ر	مطهرة	و
مشيدة	و	مضى	م ض ي	مطهرون	و
مضاييح	ص ب ح	مضاجع	ض ج ع	مظالم	ظ ل م
مصانع	ص ن ع	مضار	ض ر ر	مظالمون	و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مظلوم	ظ ا ل م	معروضون	ع ر ض	معين	ع ي ن - م ع ن
مع	مع	معرضين	و	مغارات	غ و ر
معاجزين	ع ج ز	معروشات	ع ر ش	مغارب	غ ر ب
معاد	ع و د	معروف	ع ر ف	مغاضب	غ ض ب
معاذ	ع و ذ	معروفة	و	مغانم	غ ن م
معاذير	ع ذ ر	معز	م ع ز	مغتسل	غ ص ل
معارج	ع ر ج	معزل	ع ز ل	مغرب	غ ر ب
معاش	ع ي ش	معزولون	و	مغربين	و
معاشيش	و	معشار	ع ش ر	مغرقون	غ ر ق
معتبين	ع ت ب	معشر	و	مغرم	غ ر م
معتد	ع د و	معصرات	ع ص ر	مغرمون	و
معتدون	و	معصية	ع ص ي	مغشي	غ ش ي
معتز	ع ر ر	معطلة	ع ط ل	مغضوب	غ ض ب
معجز	ع ج ز	معقب	ع ق ب	مغفرة	غ ف ر
معجزين	و	معقبات	و	مغلوب	غ ل ب
معلود	ع د د	معكوف	ع ك ف	مغلولة	غ ل ل
معلودات	و	معلقة	ع ل ق	مغنم	غ ن م
معدودة	و	معلم	ع ل م	مغنون	غ ن ي
معذب	ع ذ ب	معلوم	و	مغير	غ ي ر
معذبون	و	معلومات	و	مغيرات	غ و ر
معدبين	و	معمر	ع م ر	مفاتيح	ف ت ح
معذرة	ع ذ ر	معمرور	و	مفاتيح	و
معذرون	و	معوقين	ع و ق	مفاز	ف و ز
معرة	ع ر ر	معيشة	ع ي ش	مفازة	و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مفتحة	ف ت ح	مقتحم	ق ح م	مقطوعة	ق ط ع
مفتر	ف ر ی	مقتدر	ق د ر	مقعد	ق ع د
مفتري	،،	مقتدرون	،،	مقمحون	ق م ح
مفترون	،،	مقتدون	ق د و	مقنطرة	ق ن ط ر
مفتريات	،،	مقتر	ق ت ر	مقنعي	ق ن ع
مفتنون	ف ت ن	مقترفون	ق ر ف	مقوين	ق و ی
مشر	ف ر ر	مقترنين	ق ر ن	مقيت	ق و ت
مفرطون	ف ر ط	مقتسمين	ق س م	مقیل	ق ی ل
مفروض	ف ر ض	مقتصد	ق ص د	مقیم	ق و م
مفسد	ف س د	مقتصدية	ق ص و	مقیمین	،،
مفسدون	،،	مقدار	ق د ر	مکاه	م ک و
مفصل	ف ص ل	مقدس	ق د س	مکان	ک و ن
مفصلات	،،	مقدسة	،،	مکانه	م ک ن
مفعول	ف ع ل	مقدور	ق د ر	مکب	ک ب ب
مفلحون	ف ل ح	مقربة	ق ر ب	مکة	م ک ک
مقابر	ق ب ر	مقربون	،،	مکتوب	ک ت ب
مقاعد	ق ع د	مقرنين	ق ر ن	مکت	م ک ث
مقاليد	ق ل د	مقسطين	ق س ط	مکذبون	ک ذ ب
مقام	ق و م	مقسات	ق س م	مکذوب	،،
مقامة	،،	مقسوم	،،	مکرم	م ک ر
مقامع	ق م ع	مقصرين	ق ص ر	مکرموا	،،
مقبوحين	ق ب ح	مقبورات	،،	مکرم	ک ر م
مقبوضة	ق ب ض	مقضى	ق ض ی	مکرمه	،،
مقت	م ق ت	مقطوع	ق ط ع	مکرمون	،،



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مکرونا	م ک ر	ملقون	ل ق ی	ممسکات	م س ک
مکروا	»	ملقیات	ل ق ی	ممطر	م ط ر
مکروه	ک ر ه	مَلَّک	ال ک + م ل ک	مملوک	م ل ک
مکظوم	ک ظ م	مَلَّک	م ل ک	معن	م ن + م ن
مکابین	ک ل ب	ملکت	»	ممنوعة	م ن ع
مکن	م ک ن	ملکم	»	ممنون	م ن ن
مکنا	»	ملکوت	ال ک + م ل ک	من	من
مکتون	ک ن ن	ملکین	»	من	من
مکیال	ک ی ل	ملوک	م ل ک	من	من
مکیدون	ک ی د	ملوم	ل و م	من	من
مکین	م ک ن	ملومین	»	منوة	منوة
ملا	م ل ا	ملی	م ل و	مناد	ن د و - ی
ملء	»	ملیک	م ل ک	منادی	»
ملئه	»	ملیم	ل و م	منازل	ن ز ل
ملائكة	ال ک - م ل ک	مم	م ن + ما	مناسک	ن س ک
ملت	م ل ا	ما	»	مناص	ن و ص
ملاقي	ل ق ی	مات	م و ت	مناع	م ن ع
ملاقوا	»	ممتزین	م ر ی	منافع	ن ف ع
ملة	م ل ل	معد	م د د	مناققات	ن ف ق
ملتحد	ل ح د	معدود	»	مناققون	»
ملجأ	ل ج ا	معدودة	»	مناققین	»
ملح	م ل ح	ممرد	م ر د	مناکب	ن ک ب
ملعونة	ل ع ن	ممزق	م ز ق	منام	ن و م
ملعونین	»	ممسک	م س ک	منیث	ب ث ث

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
منتشر	ن ش ر	منصور	ن ص ر	منیر	ن و ر
منتصر	ن ص ر	منضود	ن ض د	مواخر	م خ ر
منتظرون	ن ظ ر	منطقی	ن ط ق	موازين	و ز ن
منتقمون	ن ق م	منظرون	ن ظ ر	مواضع	و ض ع
منتهی	ن ه ی	منع	م ن ع	مواطن	و ط ن
منتھون	،،	منفطر	ف ط ر	مواقع	و ق ع
منثور	ن ث ر	منفقون	ن ف ق	مواقعوا	،،
منجوا	ن ج و	منفکین	ف ک ک	مواقیت	و ق ت
منخنة	خ ن ق	منفوش	ن ف ش	موئل	و أ ل
من ذا	من + ذا	منقعر	ق ع ر	موالی	و ل ی
منذر	ن ذ ر	منقلب	ق ل ب	موودة	و أ د
منذرون	،،	منقلبون	،،	موبق	و ب ق
منذرين	،،	منقوص	ن ق ص	موت	م و ت
منزل	ن ز ل	منکر	ن ک ر	موتی	،،
منزلون	،،	منکرة	،،	مؤتفکات	أ ف ک
منزلین	،،	منکرون	،،	مؤتفكة	،،
منسأة *	ن س أ	مننا	م ن ن	موقوا	م و ت
منسک	ن س ک	منوع	م ن ع	مؤتون	أ ت ی
منسی	ن س ی	منون	م ن ن	موثق	و ث ق
منشآت	ن ش أ	منهاج	ن ه ج	موج	م و ج
منشئون	،،	منهمر	م ه ر	موجل	أ ج ل
منشرة	ن ش ر	منی	م ن ی	مودة	و د د
منشرين	،،	منیب	ن و ب	مؤذن	أ ذ ن
منشور	،،	منیبین	،،	مور	م و ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مورود	و ر د	مولود	و ل د	مهلكى	ه ل ك
موريات	و ر ى	مولى	و ل ى	مهلكين	”
موزون	و ز ن	مومن	ا م ن	مها	مها
موسى	موسى	مؤمنة	”	مهيل	ه ى ل
موسعون	و س ع	مؤمنون	”	مهيمن	ه ى م ن
موص	و ص ى	مومنين	”	مهين	ه و ن
مؤصدة	أ ص د	موهن	و ه ن	مهين	م ه ن
موضوعة	و ض ع	مهاجر	ه ج ر	ميت	م و ت
موضوطة	و ض ن	مهاجرات	”	ميتة	”
موطا	و ط أ	مهاجرين	”	ميتون	”
موعد	و ع د	مهاد	م ه د	ميشاق	و ث ق
موعدة	”	مهان	ه و ن	ميراث	و ر ث
موعظة	و ع ظ	مهتد	ه د ى	ميزان	و ز ن
موعود	و ع د	مهتدون	”	ميسر	ى س ر
موفوا	و ف ى	مهتدين	”	ميسرة	”
موفور	و ف ر	مهجور	ه ج ر	ميسور	”
موفون	و ف ى	مهد	م ه د	ميعاد	و ع د
موقدة	و ق د	مهدت	”	ميعات	و ق ت
موقنون	ى ق ن	مهزوم	ه ز م	ميكال	م ى ل
موقوت	و ق ت	مهطعين	ه ط ع	ميلة	”
موفوذة	و ق ذ	مهل	م ه ل	ميمنة	ى م ن
موفوفون	و ق ف	مهلك	ه ل ك		
مولى	و ل ى	مهلكون	”		
مؤلفة	أ ل ف	مهلكوا	”		

## ن

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ن (ثقیله یا خفیفه)	ن	ناشرات	ن ش ر	نبی	ن ب أ
ن (وقایه)	ن	ناشطات	ن ش ط	نَبِیَّات	ن ب ت
نا	نا (ضمیر)	ناصبه	ن ص ب	نَبِیَّات	ن ب ت
نأ	ن أ ی	ناصح	ن ص ح	نَبِیَّوَا	ن ب أ
ناثم	ن و م	ناصحون	ن	لَبِیْغِی	ب غ ی
ناتی	أ ت ی	ناصر	ن ص ر	لَبِیْطِی	ب ل و
نؤی	ن	ناصرین	ن	لَبِیْهَل	ب ه ل
ناج	ن ج و	ناصیه	ن ص و	لَبِیْدَل	ب د ل
ناجیتهم	ن	ناضرة	ن ض ر	لَبِیْد	ن ب ذ
ناخذ	أ خ ذ	ناظرة	ن ظ ر	لَبِیْدَت	ن
نادی	ن د و - ی	ناظرین	ن	لَبِیْدَانَا	ن
نادت	ن	ناعمة	ن ع م	لَبِیْدُوا	ن
نادمین	ن د م	لافتوا	ن ف ق	لَبِیْرَا	ب ر أ
نادوا	ن د و - ی	نافلة	ن ف ل	لَبِیْرَح	ب ر ح
نادی	ن	ناقة	ن و ق	لَبِیْشَر	ب ش ر
نادیتهم	ن	ناقور	ن ق ر	لَبِیْطَش	ب ط ش
نادینا	ن	ناکبون	ن ک ب	لَبِیْعَث	ب ع ث
نار	ن و ر	ناکسوا	ن ک س	لَبِیْغِی	ب غ ی
نازعات	ن ز ع	ناکل	أ ک ل	لَبِیْلُوا	ب ل و
ناس	أ ن س	ناهون	ن ه ی	لَبِیْوَا	ب و أ
ناسکو	ن س ک	نبأ	ن ب أ	لَبِیْوَة	ن ب أ
ناشئة	ن ش أ	نبؤ	ن	لَبِیْ	ن

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
نبت	ب ی ت	نجب	ج و ب	نحن	ن ح ن
نبیون	ن ب ا	نجد	و ج د	نحی	ح ی ی
نبین	ب ی ن	نجدین	ن ج د	نخاف	خ و ف
نبیین	ن ب ا	نجزی	ج ز ی	نختم	خ ت م
لتبرأ	ب ر ا	نجس	ن ج س	نخرة	ن خ ر
نتیع	ت ب ع	نجعل	ج ع ل	نخرج	خ ر ج
نتبوا	ب و ا	نجم	ن ج م	نجزی	خ ز ی
نتجاوز	ج و ز	نجمع	ج م ع	نخسف	خ س ف
لتخذ	ا خ ذ	نجنی	ن ج و	نخشی	خ ش ی
نتخطف	خ ط ف	نجوی	،،	نخفی	خ ف ی
نترص	ر ب ص	نجوت	،،	نخل	ن خ ل
نترك	ت ر ك	نجوم	ن ج م	نخلة	،،
نتقبل	ق ب ل	نحی	ن ج و	نخاف	خ ل ف
نتقنا	ن ت ق	نحینا	ن ج و	نخلق	خ ل ق
نتكلم	ك ل م	نحاس	ن ح س	نخوض	خ و ض
نتلو	ت ل و	نحب	ن ح ب	نخوف	خ و ف
نتنزل	ن ز ل	نحرق	ح ر ق	نخیل	ن خ ل
نتوفی	و ف ی	نفس	ن ح س	نداء	ن د و - ی
نتوكل	و ك ل	نفسات	،،	ندامة	ن د م
نثبت	ث ب ت	نحضر	ح ض ر	نداول	د و ل
نح	ن ح و	نحفظ	ح ف ظ	ندخل	د خ ل
نحی	،،	نخل	ن ح ل	ندری	د ر ی
نجاة	،،	نحلة	،،	ندعوا	د ع و
نجازی	ج ز ی	نحمل	ح م ل	ندل	د ل ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ندی	ن د و	نزداد	ز ی د	نسف	ن م ف
نذر	ن ذ ر	نزع	ن ز ع	نسفت	و
نَذَرُ	و ذ ر	نزعنا	و	نسفع	م ف ع
نذرت	ن ذ ر	نزع	ن ز ع	نسقط	س ق ط
نذرتم	و	نزل	ن ز ل	نسقي	س ق ی
نذق	ذ و ق	نزلة	و	نسك	ن س ك
نذكر	ذ ك ر	نزلت	و	نسكن	س ك ن
نذل	ذ ل ل	نزلنا	و	نسل	ن م ل
نذور	ن ذ ر	نزید	ز ی د	نسلخ	س ل خ
نذهب	ذ ه ب	نساء	ن س و	نسلك	م ل ك
نذیر	ن ذ ر	نسارع	س ر ع	نسلم	م ل م
نذیق	ذ و ق	نسئل	س أ ل	نسم	و س م
نری	ر أ ی	نسب	ن س ب	نسمع	س م ع
نراود	ر و د	نسبح	س ب ح	نسوا	ن س ی
نرب	ر ب و	نستبق	س ب ق	نسوة	ن س و
نرث	و ر ث	نستحوذ	ح و ذ	نسوق	س و ق
نرد	ر د د	نستحيي	ح ی ی	نسوی	س و ی
نرزق	ر ز ق	نستدرج	د ر ج	نسی	ن س ی
فرسل	ر م ل	نستعين	ع و ن	نسي	ن س أ
نرفع	ر ف ع	نستنسخ	ن س خ	نسبنا	ن م ی
نری	ر أ ی	نسجد	س ج د	نسيت	و
نرید	ر و د	نسخة	ن م خ	نسيتم	و
نزاعة	ن ز ع	نسخر	س خ ر	نسیر	س ی ر
نزد	ز ی د	نسر	نسر	نسینا	ن س ی

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
نشاء	ش ی ا	نصروا	ن ص ر	نطیع	ط و ع
نشأة	ن ش ا	نصف	ن ص ف	نظر	ن ظ ر
نشتري	ش ر ی	نصابي	ص ل ی	نظرة	و
نشد	ش د د	نصوح	ن ص ح	نظل	ظ ل ل
نشر	ن ش ر	نصب <sup>۸</sup>	ن ص ب	نظن	ظ ن ن
نشرت	و	نصب <sup>و ۸</sup>	ص و ب	نعاج	ن ع ج
نشرح	ش ر ح	نصب <sup>۸</sup>	ص و ب	نعاس	ن ع س
نشرك	ش ر ك	نصير	ن ص ر	نعبد	ع ب د
نشط	ن ش ط	نضاختان	ن ض خ	نعجة	ن ع ج
نشور	ن ش ر	نضجت	ن ض ج	نعجز	ع ج ز
نشوز	ن ش ز	نضرب	ض ر ب	نعد <sup>۸ و</sup>	ع و د
نشهد	ش ه د	نضرة	ن ض ر	نعد <sup>و</sup>	و ع د
نصارى	نصارى	نضطر	ض ر ر	نعد <sup>و</sup>	و ع د
نصب	ن ص ب	نضع	و ض ع	نعد <sup>و و</sup>	ع د د
نصبت	و	نضيد	ن ض د	نعدب	ع ذ ب
نصبر	ص ب ر	نضيع	ض ی ع	نعف	ع ف و
نصح	ن ص ح	نطیع	ط ب ع	نعقل	ع ق ل
نصحت	و	نطعم	ط ع م	نعلم	ع ل م
نصحوا	و	نطفة	ن ط ف	نعلمن	ع ل ن
نصدق	ص د ق	نطق	ن ط ق	نعلي	ن ع ل
نصر	ن ص ر	نطمس	ط م س	نعم	ن ع م
نصراني	نصارى	نطمع	ط م ع	نعماء	و
نصرف	ص ر ف	نطوي	ط و ی	نعم	نعم + ما
نصرنا	ن ص ر	نطيحة	ن ط ح	نعمة	ن ع م

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
نعمر	ع م ر	نفسد	ف س د	نقر	ق ر ر
نعمل	ع م ل	نقشت	ن ف ش	نقره	ق ر ا
نعود	ع و د	نفصل	ف ص ل	نقرب	ق ر ب
نعید	،،	نفضل	ف ض ل	نقص	ن ق ص
نعیم	ن ع م	نفع	ن ف ع	نقص	ق ص ص
نغادر	غ د ر	نفعت	،،	نقصص	،،
نغرق	غ ر ق	نفعل	ف ع ل	نقض	ن ق ض
نغرين	غ ر و	نفق	ن ف ق	نقضت	،،
نغفر	غ ف ر	نفقات	،،	نقع	ن ق ع
نفاثات	ن ف ث	نفقة	،،	نقعد	ق ع د
نفاد	ن ف د	نفقد	ف ق د	نقلب	ق ل ب
نفاق	ن ف ق	نفقه	ف ق ه	نقموا	ن ق م
نفتن	ف ت ن	نفور	ن ف ر	نقول	ق و ل
نفحة	ن ف ح	نفوس	ن ف س	نقیب	ن ق ب
نفخ	ن ف خ	نفیر	ن ف ر	نقیر	ن ق ر
نفخة	،،	نقاتل	ق ت ل	نقیض	ق ی ض
نفخت	،،	نقب	ن ق ب	نقیم	ق و م
نفخنا	،،	نقبوا	،،	نلك	ك و ن
نفد	ن ف د	نقتبس	ق ب س	نكاح	ن ك ح
نفدت	،،	نقتل	ق ت ل	نكال	ن ك ل
نفر	ن ف ر	نقدر	ق د ر	نكتب	ك ت ب
نفرغ	ف ر غ	نقدس	ق د س	نكتل	ك ی ل
نفرق	ف ر ق	نقذف	ق ذ ف	نكتم	ك ت م
نفس	ن ف س	نفسر	ن ق ر	نكث	ن ك ث



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
نكثوا	ن ك ث	نمل	ن م ل	نواصي	ن ص و
نكح	ن ك ح	نملة	،،	نؤت	ا ت ي
نكحتم	،،	نملي	م ل و	نؤثر	ا ث ر
نكد	ن ك د	نمن	م ن ن	نوح	نوح
نكذب	ك ذ ب	نمنع	م ن ع	نوحى	و ح ي
نكر	ن ك ر	نموت	م و ت	نوخر	ا خ ر
نكروا	،،	نميت	،،	نودوا	ن د و - ي
نكسوا <sup>٨٩</sup>	ك س و	نمير	م ي ر	نودي	،،
نكسوا <sup>٨٩</sup>	ن ك س	نميم	ن م م	نور	ن و ر
نكص	ن ك ص	ننبى	ن ب ا	نورث	و ر ث
نكفر	ك ف ر	ننجي	ن ج و	نوف	و ف ي
نكلف	ك ل ف	ننزع	ن ز ع	نولي	و ل ي
نكلم	ك ل م	ننزل	ن ز ل	نوم	ن و م
نكن	ك و ن	ننس	ن س ي	نومن	ا م ن
نكون	،،	ننسى	،،	نون	ن و ن
نكير	ن ك ر	ننسخ	ن س خ	نهى	ن ه ي
نلزم	ل ز م	ننسف	ن س ف	نهار	ن ه ر
نلعب	ل ع ب	ننشئ	ن ش ا	نهتدي	ه د ي
نلعن	ل ع ن	ننشز	ن ش ز	نهدي	،،
نلقى	ل ق ي	ننصر	ن ص ر	نهر	ن ه ر
نمارق	ن م ر ق	ننظر	ن ظ ر	نهلك	ه ل ك
نمتع	م ت ع	ننقص	ن ق ص	نهوا	ن ه ي
نمد	م د د	ننكس	ن ك س	نهيت	،،
نمكن	م ك ن	ننهى	ن ه ي	نيسر	ي س ر
		نوى	ن و ي	نيل	ن و ل

## و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
و	و	واقعة	وق ع	وجلون	و ج ل
وابل	و ب ل	وال	و ل ی	وجوه	و ج ه
واثق	و ث ق	والد	و ل د	وجه	و
واجفة	و ج ف	والدات	و	وجهة	و
واحد	و ح د	والدة	و	وجهت	و
واحدة	و	والدين	و	وجیه	و
واد	و د ی	واهیة	و ه ی	وحد	و ح د
وادی المقدس	و + ق د م	وبال	و ب ل	وحده	و
وارث	و ر ث	وبیل	و	وحوش	و ح ش
وارثون	و ر ث	وتر	و ت ر	وحي	و ح ی
وارد	و ر د	وتین	و ت ن	وحید	و ح د
واردون	و	وثاق	و ث ق	وَدَّ	و د
وازره	و ز ر	وثقی	و	وَدَّ	و د
واسع	و م ع	وجبت	و ج ب	وَدَّ	و د
واسعة	و	وجد	و ج د	وَدَّ	و د
واصب	و ص ب	وجدا	و	ودت	و د ت
واعدنا	و ع د	وجدت	و	ودع	و د ع
واعظ	و ع ظ	وجدتم	و	ودق	و د ق
واعظین	و	وجدنا	و	ودوا	و د د
واعیة	و ع ی	وجدوا	و	ودود	و د و د
واق	و ق ی	وجلة	و ج ل	ورآء	و ر آء
واقع	و ق ع	وجلت	و	ورث	و ر ث

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ورثوا	و ر ث	وصید	و ص د	وقع	و ق ع
ورد	و ر د	وصيلة	و ص ل	وقعة	و ق ع
وردة	و ر د	وصينا	و ص ی	وقعت	و ق ع
وردوا	و ر د	وضع	و ض ع	وقفوا	و ق ف
ورق	و ر ق	وضعت	و ض ع	وقود	و ق د
ورقة	و ر ق	وضعنا	و ض ع	وكز	و ك ز
ورید	و ر د	وطأ	و ط أ	وكل	و ك ل
وزر	و ز ر	وطر	و ط ر	وكلنا	و ك ل
وزن	و ز ن	وعاء	و ع ی	وكيل	و ك ی
وزنوا	و ز ن	وعد	و ع د	ول	و ل ی
وزير	و ز ر	وعدت	و ع د	ولي	و ل ی
وسط	و س ط	وعدنا	و ع د	ولاية	و ل ی
وسطی	و س ط	وعدوا	و ع د	ولد	و ل د
وسطن	و س ط	وعظت	و ع ظ	ولدان	و ل د
وسع	و س ع	وعید	و ع د	ولدت	و ل د
وسعت	و س ع	وفی	و ف ی	ولدن	و ل د
وسق	و س ق	وفاق	و ف ق	ولوا	و ل ی
وسواس	و س و س	وفد	و ف د	ولي	و ل ی
وسوس	و س و س	وفيت	و ف ی	ولیت	و ل ی
وسوسة	و س و س	وقی	و ق ی	ولیم	و ل ی
وسيلة	و س ل	وقار	و ق ر	وليحة	و ل ح
وصی	و ص ی	وقب	و ق ب	ولید	و ل د
وصف	و ص ف	وقت	و ق ت	ووری	و ر ی
وصلنا	و ص ل	وقر	و ق ر	وهاب	و ه ب
وصية	و ص ی				

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
وهاج	و ه ج	وهبنا	و ه ب	وی + کَان	ماده
وهب	و ه ب	وهن	و ه ن	وی ل	
وهبت	و ه ب	وهنوا	و ه ن	ویلتی	و ه ب
ه					
ه	ه (ضمیر)	هارون	ه ا ر و ن	هدیت	ه د ی
ه	ه (سکته)	هكذا	ه ا + ک + ذ ا	هدیه	و ه ب
ه	ه (وقف)	هالك	ه ا ل ک	هدینا	و ه ب
ها	ها (ضمیر)	هالکین	و ه ب	هرب	ه ر ب
ها	ها (حرف تبیینیه)	هامان	ه ا م ا ن	هزل	ه ز ل
هَآؤُ لَا	هؤلا	هامة	ه م د	هزموا	ه ز م
هاؤم	هاؤم (اسم فعل)	هاویة	ه و ی	هزؤ	ه ز ا
هاتوا	ه ی ت	ههنا	ه ن ا	هزی	ه ز ی
هاتین	ه ا ت ا	هه	و ه ب	هشیم	ه ش م
هاجر	ه ج ر	هباء	ه ب و	هضم	ه ص م
هاجرن	و ه ب	هجر	ه ج ر	هضمیم	و ه ب
هاجروا	و ه ب	هد	ه د د	هل	ه ل
هادوا	ه و د	هدی	ه د ی	هالك	ه ا ل ک
هادی	ه د ی	هدایة	و ه ب	هلم	ه ل م
هذا	ه ا ت ا	هدست	ه د م	هلوع	ه ل و ع
هذان	و ه ب	هذنا	ه و د	هم	ه م
هذه	و ه ب	هدوا	ه د ی	هم	ه م
هار	ه و ر	هدهد	ه د ه د	هما	ه م ا
هاروت	ه ا ر و ت	هدی	ه د ی	هماز	ه م ز

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
همت	ه م م	هنيئا	ه ن ا	هيى	ه ي ا
همزات	ه م ز	هو	ه و	هيئة	ه ي ة
همزة	ه	هوى	ه و ي	هيت	ه ي ت
همس	ه م س	هواء	ه و ا	هم	ه ي م
هموا	ه م و	هود	ه و د	هين	ه ي ن
هن	ه ن	هون	ه و ن	هيهة	ه ي ة + ه
هنالك	ه ن ا ل ك	هي	ه ي	هيهات	ه ي ه ا ت

## ي

ي	ي (ضمير)	ياخذون	أ خ ذ	يالمون	أ ل م
يا	يا (حرف ندا)	يوخر	أ خ ر	يالون	أ ل و
ياايها	ه	يودي	أ د ي	يأليستها	يا + ل ي ت + ه ا
ياب	أ ب ي	ياذن	أ ذ ن	يامر	أ م ر
يابس	ي ب س	يبعث	ب ع ث	يامرون	ه
يابسات	ه	يشس	ي أ س	ياسن	أ م ن
ياتل	أ ل و	يشن	ه	يامنوا	ه
ياتمرون	أ م ر	يشوا	ه	يان	أ ن ي
ياتون	أ ت ي	يافكون	أ ف ك	يسؤد	أ و د
ياتي	ه	ياقوت	يا ق و ت	يسؤد	أ د ي
ياتيان	ه	ياكل	أ ك ل	يؤس	ي أ س
ياتين	ه	ياكلان	ه	يؤيد	أ ي د
ياجوج	ياجوج (ا ج ج)	ياكان	ه	يبايعن	ب ي ع
ياخذ	أ خ ذ	ياكلون	ه	يبايعون	ه

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يبتغ	ب غ ي	يبطش	ب ط ش	يتبدل	ب د ل
يبتغون	،،	يبطشون	،،	يتبروا	ت ب ر
يبتكن	ب ت ك	يبطل	ب ط ل	يتبع	ت ب ع
يبتلي	ب ل و	يبعث	ب ع ث	يتبعون	،،
يبث	ب ث ث	يبعثون	،،	يتبوء	ب و أ
يبحث	ب ح ث	يبغون	ب غ ي	يتبين	ب ي ن
يبغض	ب خ ص	يبغي	،،	يتجرع	ج ر ع
يبغضون	،،	يبغيان	،،	يتجنب	ج ن ب
يبخل	ب خ ل	يبقى	ب ق ي	يتحاجون	ح ج ج
يبخلون	،،	يبكون	ب ك ي	يتحاکموا	ح ك م
يبده	ب د أ	يبلى	ب ل ي	يتخافتون	خ ف ت
يبدل	ب د ل	يبلس	ب ل س	يتخبط	خ ب ط
يبدلون	،،	يبلغ	ب ل غ	يتخذ	أ خ ذ
يبدون	ب د و	يبلغا	،،	يتخذون	،،
يبدى	ب د أ	يبلغوا	،،	يتخطف	خ ط ف
يبدین	ب د و	يبلغون	،،	يتخلفون	خ ل ف
يبس	ي ب ص	يبلو	ب ل و	يتغيرون	خ ي ر
يبسط	ب ص ط	يبلون	،،	يتدهرون	د ب ر
يبسطوا	،،	يبلي	،،	يتذكر	ذ ك ر
يبشر	ب ش ر	يبور	ب و ر	يتذكرون	،،
يبصر	ب ص ر	يبیتون	ب ي ت	يتر	و ت ر
يبصرون	،،	يبين	ب ي ن	يتراجعا	ر ج ع
يبطى	ب ط أ	يتاخر	أ خ ر	يتربص	ر ب ص
يبطن	،،	يتامى	ي ت م	يتربصن	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یتربصون	ر ب ص	یتفكرون	ف ک ر	یتنافس	ن ف س
یترددون	ر د د	یتغیوا	ف ی ا	یتناهون	ن ه ی
یترقب	ر ق ب	یتقبن	ق ب ل	یتنزل	ن ز ل
یترقبون	،،	یتقدم	ق د م	یتواری	و ر ی
یترك	ت ر ك	یتقون	و ق ی	یتوب	ت و ب
یتركوا	،،	یتقی	،،	یتوبون	،،
یتزکی	ز ک و	یتکثون	و ک ا	یتوفی	و ف ی
یتساءلون	س ا ل	یتکبرون	ک ب ر	یتوفون	،،
یتسئلون	س ل ل	یتکلم	ک ل م	یتوکل	و ک ل
یتسنه	س ن ه	یتکلمون	،،	یتوکاون	،،
یتضرعون	ض ر ع	یتلی	ت ل و	یتولی	و ل ی
یتطهر	ط ه ر	یتلاومون	ل و م	یتولون	،،
یتطهرون	،،	یتلطف	ل ط ف	یتیم	ی ت م
یتعارفون	ع ر ف	یتلقی	ل ق ی	یتیمین	،،
یتعد	ع د و	یتلو	ت ل و	یتیهون	ت ی ه
یتعلمون	ع ل م	یتلون	،،	یشب	ث ب ت
یتغامزون	غ م ز	یتم	ت م م	یشبتوا	،،
یتغیر	غ ی ر	یتاسا	م س س	یشخن	ث خ ن
یتفجر	ف ج ر	یتمتعون	م ت ع	یشرب	ث ر ب
یتفرقا	ف ر ق	یتطی	م ط ی	یشفقوا	ث ق ف
یتفرقون	،،	یتمنوا	م ن ی	یشنون	ث ن ی
یتفضل	ف ض ل	یتمنون	،،	یحادل	ج د ل
یتفطرن	ف ط ر	یتناجون	ن ج و	یحادلون	،،
یتنزهوا	ف ق ه	یتنازعون	ن ز ع	یحار	ج و ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یحارون	ج ا ر	یحیب	ج و ب	یجرمون	ح ر م
یحاورون	ج و ر	یحیر	ج و ر	یحزن	ح ز ن
یجاهد	ج ه د	یحاجون	ح ج ج	یحزنون	،،
یجاهدون	،،	یحادون	ح د د	یحسب	ح س ب
یحیی	ج ب ی-و	یحاربون	ح ر ب	یحسبون	،،
یحیی	،،	یحاسب	ح س ب	یحسدون	ح س د
یحییون	ج ن ب	یحاط	ح و ط	یحسنون	ح س ن
یحجد	ج ح د	یحافظون	ح ف ظ	یحشر	ح ش ر
یحجدون	،،	یحاور	ح و ر	یحشرون	،،
یحید	و ج د	یحب	ح ب ب	یحض	ح ض ض
یحیدون	،،	یحیب	،،	یحضرون	ح ض ر
یحیر	ج ر ر	یحبرون	ح ب ر	یحضن	ح ی ض
یحرم	ج ر م	یحبس	ح ب س	یحطم	ح ط م
یحیری	ج ر ی	یحبط	ح ب ط	یحرف	ح ف ی-و
یحزی	ج ز ی	یحبطن	،،	یحفظن	ح ف ظ
یحزون	،،	یحبون	ح ب ب	یحفظون	،،
یحعل	ج ع ل	یحاسب	ح س ب	یحق	ح ق ق
یحعلون	،،	یحاسبون	،،	یحکم	ح ک م
یحلی	ج ل و	یحاسبوا	،،	یحکمان	،،
یحمحون	ج م ح	یحادث	ح د ث	یحکمون	،،
یحمع	ج م ع	یحذر	ح ذ ر	یحل	ح ل ل
یحمعون	،،	یحذرون	،،	یحاقون	ح ل ف
یحنب	ج ن ب	یحرقون	ح ر ف	یحلل	ح ل ل
یحهلون	ج ه ل	یحرم	ح ر م	یحملون	،،



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يَحْمِلُونَ <sup>۸۶</sup>	ح ل ی	يَخْذُلُ	خ ذ ل	يَخْلُقُونَ	خ ل ف
يَحْمِلِي	ح م ی	يَخْرِبُونَ	خ ر ب	يَخْلُقُ	خ ل ق
يَحْمَدُوا	ح م د	يَخْرُجُ	خ ر ج	يَخْلُقُونَ	”
يَحْمِلُ	ح م ل	يَخْرُجَا	”	يَخْضَوْنَ	خ و ض
يَحْمِلُنَّ	”	يَخْرُجْنَ	”	يَخُوفُ	خ و ف
يَحْمِلُونَ	”	يَخْرُجُونَ	”	يَخُوفُونَ	”
يَحْمُومٌ	ح م م	يَخْرُصُونَ	خ ر ص	يَخِيلُ	خ ی ل
يَحُورُ	ح و ر	يَخْرُونَ	خ ر ر	يَدُ	ی د ی
يَحُولُ	ح و ل	يَخْزِي	خ ز ی	يَدَا	”
يَحْيَى	ح ی ی	يَخْسِرُ	خ س ر	يَدَافِعُ	د ف ع
يَحْيَى <sup>۸۷</sup>	يَحْيَى	يَخْسِرُونَ	”	يَدْبِرُ	د ب ر
يَحِيطُونَ	ح و ط	يَخْشَفُ	خ ش ف	يَدْبِرُوا	”
يَحِيقُ	ح ی ق	يَخْشَى	خ ش ی	يَدْخَضُوا	د ح ض
يَخَادَعُونَ	خ د ع	يَخْشَوْنَ	”	يَدْخُلُ	د خ ل
يَخَافُ	خ و ف	يَخْصِفَانِ	خ ص ف	يَدْخُلُونَ	”
يَخَافُونَ	”	يَخْصِمُونَ	خ ص م	يَذَرُونَ	د ر أ
يَخَافَا	”	يَخْطَفُ	خ ط ف	يَذَرُونَ	د ر س
يَخَالِفُونَ	خ ل ف	يَخْفَى	خ ف ی	يَذَرُكَ	د ر ك
يَخْتَارُ	خ ی ر	يَخْفَفُ	خ ف ف	يَذَرِي	د ر ی
يَخْتَانُونَ	خ و ن	يَخْفُونَ	خ ف ی	يَذْسُ	د س س
يَخْتَصُ	خ ص ص	يَخْفِينِ	”	يَذْعُ <sup>۸۸</sup>	د ع و
يَخْتَلِفُونَ	خ ل ف	يَخْلُ	خ ل و	يَذْعُ <sup>۸۹</sup>	د ع ع
يَخْتَمُ	خ ت م	يَخْلُدُ	خ ل د	يَذْعِي	د ع و
يَخْدَعُونَ	خ د ع	يَخْلَفُ	خ ل ف	يَذْعُو	”

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یدعون	د ع و	یربوا	ر ب و	یرزقون	ر ز ق
یدعون <sup>و ٨ ٤ ٤ ٨</sup>	د ع ع	یرببی	،،	یرسل	ر س ل
یدمغ	د م غ	یرتاب	ر ی ب	یرشدون	ر ش د
یدنین	د ن و	یرتابوا	،،	یرضی	ر ض ی
یدهنون	د ه ن	یرتد	ر د د	یرضمن	ر ض ع
یدی	ی د ی	یرتدد	،،	یرضون	ر ض ی
یدینون	د ی ن	یرتع	ر ت ع	یرضین	،،
یذبح	ذ ب ح	یرتقوا	ر ق ی	یرغب	ر غ ب
یذبحون	،،	یرث	و ر ث	یرغبون	،،
یذر	و ذ ر	یرثون	،،	یرغبوا	،،
یذرون	،،	یرجع	ر ج ع	یرفع	ر ف ع
یذکر	ذ ک ر	یرجعون	،،	یرقبون	ر ق ب
یذکرون	،،	یرجموا	ر ج م	یرکبون	ر ک ب
یذوق	ذ و ق	یرجوا	ر ج و	یرکضون	ر ک ض
یذوقون	،،	یرجون	،،	یرکعون	ر ک ع
یذهب	ذ ه ب	یرحم	ر ح م	یرکم	ر ک م
یذهبا	،،	یرد <sup>و ٨ ٤ ٤ ٨</sup>	ر د د	یرمون	ر م ی
یذهبن	،،	یرد <sup>و ٨ ٤ ٤ ٨</sup>	ر و د	یرمی	،،
یذهبوا	،،	یردوا <sup>و ٨ ٤ ٤ ٨</sup>	ر د د	یروا	ر أ ی
یذیق	ذ و ق	یردون	،،	یرون	،،
یری	ر أ ی	یردن	ر و د	یرهبون	ر ه ب
یراون	،،	یردوا <sup>و ٨ ٤ ٤ ٨</sup>	ر د ی	یرهق	ر ه ق
یراد	ر و د	یرزق	ر ز ق	یری	ر أ ی
یربط	ر ب ط			یرید	ر و د

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یریدان	ر و د	یسام	س ا م	یستخفون	خ ف ی
یریدون	،،	یسامون	،،	یستخلاف	خ ل ف
یریکموا	ر ا ی + کم	یسبتون	س ب ت	یستسخرو	س خ ر
یزال	ز و ل	یسبح	س ب ح	یستصرخ	ص ر خ
یزالون	،،	یسبحن	،،	یستضعف	ض ع ف
یزجی	ز ج و	یسبحون	،،	یستضعفون	،،
یزداد	ز ی د	یسبق	س ب ق	یستطع	ط و ع
یزدادوا	،،	یسبقون	،،	یستطیع	،،
یزرون	و ز ر	یسبوا	س ب ب	یستطیعون	،،
یزعمون	ز ع م	یستاخرون	ا خ ر	یستعتبوا	ع ت ب
یزفون	ز ف ف	یستاذن	ا ذ ن	یستعتبون	،،
یزکی	ز ک و	یستاذنون	،،	یستعجل	ع ج ل
یزکون	،،	یستبدل	ب د ل	یستعجلون	،،
یزلقون	ز ل ق	یستبدلون	،،	یستعفف	ع ف ف
یزنون	ز ن ی	یستبشرون	ب ش ر	یستعففن	،،
یزنین	،،	یستثنون	ث ن ی	یستغشون	غ ش ی
یزوج	ز و ج	یستجیب	ج و ب	یستغفر	غ ف ر
یزید	ز ی د	یستجیبون	،،	یستغفرون	،،
یزیدون	،،	یستحبون	ح ب ب	یستغیثان	غ و ث
یزیع	ز ی غ	یستحسرون	ح س ر	یستغیثوا	،،
یسارعون	س ر ع	یستحيون	ح ی ی	یستفتحون	ف ت ح
یساقون	س و ق	یستحیی	،،	یستفتون	ف ت ی
یسئل	س ا ل	یستخرجا	خ ر ج	یستفز	ف ز ز
یسئلون	،،	یستخفف	خ ف ف	یستفزون	،،

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يستقدمون	ق د م	يسجن	س ج ن	يسقون	س ق ي
يستقيم	ق و م	يسحبون	س ح ب	يسقين	و
يستكبر	ك ب ر	يسحت	س ح ت	يسكن	س ك ن
يستكبرون	و	يسخر	س خ ر	يسكنوا	و
يستمع	س م ع	يسخرون	و	يسلب	س ل ب
يستمعون	و	يسخطون	س خ ط	يسلط	س ل ط
يستنبئون	ن ب أ	يسمرون	ي س ر	يسلك	س ل ك
يستنبطون	ن ب ط	يسمر	و	يسلم	س ل م
يستنقذوا	ن ق ذ	يسمر	و	يسلموا	و
يستنكح	ن ك ح	يسمر	و	يسلمون	و
يستنكحها	و	يسمر	و	يسمع	س م ع
يستنكف	ن ك ف	يسمر	و	يسمعون	و
يستوفون	و ف ي	يسرفوا	و	يسعون	س م و
يستوون	س و ي	يسرق	س ر ق	يسمن	س م ن
يستوي	و	يسرقن	و	يسوؤا	س و أ
يستويان	و	يسرنا	ي س ر	يسوم	س و م
يستهي	ه ز أ	يسرون	س ر ر	يسومون	و
يستهيأ	و	يسطرون	س ط ر	يسومون	و
يستهيؤن	و	يسطون	س ط و	يسومون	و
يستيقن	ي ق ن	يسع	و س ع	يسومون	و
يسجد	س ج د	يسعي	س ع ي	يسومون	و
يسجدان	و	يسعون	و	يسومون	و
يسجدون	و	يسفك	س ف ك	يسومون	و
يسجرون	س ج ر	يسقي	س ق ي	يسومون	و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یشاقق	ش ق ق	یشهدون	ش ه د	بصرون	ص ر ر
یشترون	ش ر ی	بصب	ص ب ب	یصطر خون	ص ر خ
یشتری	»	یصبح	ص ب ح	یصطفی	ص ف و
یشتهون	ش ه و	یصبجوا	»	یصعد	ص ع د
یشرب	ش ر ب	یصبر	ص ب ر	یصعقون	ص ع ق
یشربون	»	یصبروا	»	یصفجوا	ص ف ح
یشرح	ش ر ح	یصحبون	ص ح ب	یصفون	و ص ف
یشرك	ش ر ك	یصد	ص د د	یصلی	ص ل ی
یشركن	»	یصدر	ص د ر	یصلب	ص ل ب
یشركون	»	یصدعون	ص د ع	یصلبوا	»
یشرون	ش ر ی	یصدفون	ص د ف	یصلح	ص ل ح
یشری	»	یصدق	ص د ق	یصلحا	»
یشعر	ش ع ر	یصدقوا	»	یصلحون	»
یشعرون	»	یصدفون	»	یصلحون	ص ل ی
یشفع	ش ف ع	یصد	ص د د	یصلحون	و ص ل
یشفعون	»	یصدوا	»	یصلحون	و ص ل و
یشفی	ش ف ی	یصدون	»	یصلی	»
یشقی	ش ق ی-و	یصدن	»	یصم	ص و م
یشقق	ش ق ق	یصر	ص ر ر	یصنع	ص ن ع
یشقی	ش ق ی-و	یصرف	ص ر ف	یصنعون	»
یشکر	ش ک ر	یصرفون	»	یصور	ص و ر
یشکرون	»	یصرمون	ص ر م	یصهر	ص ه ر
یشوی	ش و ی	یصرمن	»	یصیب	ص و ب
یشهد	ش ه د	یصروا	ص ر ر	یضار	ض ر و

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يضاعف	ض ع ف	يطغى	ط غ ي	يظنون	ظ ن ن
يضاهئون	ض ه ي	يطفئوا	ط ف أ	يظهر	ظ ه ر
يضحكون	ض ح ك	يطلب	ط ل ب	يظهرون	ظ ه ر
يضر	ض ر ر	يطلع	ط ل ع	يعبؤ	ع ب أ
يضرب	ض ر ب	يطمئن	ط م ن	يعبد	ع ب د
يضر بن	ض ر ب ن	يطمث	ط م ث	يعبدوا	ع ب د و ا
يضربون	ض ر ب و ن	يطمع	ط م ع	يعبدون	ع ب د و ن
يضرعون	ض ر ع	يطمعون	ط م ع و ن	يعتدون	ع د و
يضرون	ض ر ر	يطوف	ط و ف	يعتذرون	ع ذ ر
يضع	و ض ع	يطوفوا	ط و ف و ا	يعتزلوا	ع ز ل
يضعن	و ض ع	يطوفون	ط و ف و ن	يعتصم	ع ص م
يضل	ض ل ل	يطوقون	ط و ق	يعجب	ع ج ب
يضلل	ض ل ل	يظهر	ظ ه ر	يعجز	ع ج ز
يضلون	ض ل و ن	يظهرن	ظ ه ر ن	يعجزون	ع ج ز و ن
يضي	ض و أ	يظير	ظ ي ر	يعجل	ع ج ل
يضيع	ض ي ع	يظيروا	ظ ي ر و ا	بعد	و ع د
يضيفوا	ض ي ف	يطيع	ط و ع	يعدلون	ع د ل
يضيق	ض ي ق	يطيعون	ط و ع و ن	يعدون	ع د و
يطاع	ط و ع	يطيقون	ط و ق	يعذب	ع ذ ب
يطاف	ط و ف	يظاهرون	ظ ه ر	يعرج	ع ر ج
يظنون	و ط أ	يظلمون	ظ ل م	يعرجون	ع ر ج و ن
يظلم	ط ب ع	يظلمون	ظ ل م و ن	يعرشون	ع ر ش
يطعم	ط ع م	يظنون	ظ ن ن	يعرض	ع ر ض
يضعمون	ض ع م و ن			يعرضوا	ع ر ض و ا

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يعرضون	ع ر ض	يعلمان	ع ل م	يغضضون	غ ض ض
يعرف	ع ر ف	يعلمون	،،	يغضون	،،
يعرفن	،،	يعلمون	ع ل ن	يغفر	غ ف ر
يعرفون	،،	يعمر	ع م ر	يعفرون	،،
يعزب	ع ز ب	يعمروا	،،	يغل	غ ل ل
يعش	ع ش و	يعمل	ع م ل	يغلب	غ ل ب
يعص	ع ص ي	يعملون	،،	يغلبوا	،،
يعصرون	ع ص ر	يعمّهون	ع م ه	يغلبون	،،
يعصم	ع ص م	يعودون	ع و د	يغلل	غ ل ل
يعصون	ع ص ي	يعودون	ع و ذ	يغلي	غ ل و ي
يعصين	،،	يعوق	يعوق <sup>و ا و و</sup>	يغنوا	غ ن ي
يعض	ع ض ض	يعيد	ع و د	يغني	،،
يعطوا	ع ط و	يعيدوا	،،	يغنيا	،،
يعطي	،،	يعمي	ع ي ي	يغوث <sup>و ا و و</sup>	يغوث <sup>و ا و و</sup>
يعظ	و ع ظ	يغاث	غ و ث	يغوصون	غ و ص
يعظم	ع ظ م	يغاثوا	،،	يغوي	غ و ي
يعفوا	ع ف و	يغادر	غ د ر	يغير	غ ي ر
يعفون	،،	يغيب	غ ي ب	يغيروا	،،
يعقب	ع ق ب	يغر	غ ر ر	يغيظ	غ ي ظ
يعقل	ع ق ل	يغرر	،،	يفتح	ف ت ح
يعقلون	،،	يغرق	غ ر ق	يفتدوا	ف د ي
يسع-قوب <sup>و ا و و</sup>	يسع-قوب	يغرن	غ ر ر	يفتدي	،،
يعكفون	ع ك ف	يغشي	غ ش ي	يفتر	ف ت ر
يعلم	ع ل م	يغشي	،،	يفتری	ف ر ي

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يَفْتَرُونَ	ف ر ي	يَفْلَح	ف ل ح	يَقْرَضُ	ق ر ض
يَفْتَرِي	،،	يَفْلَحُونَ	،،	يَقْسِمُ	ق س م
يَفْتَرِينَ	،،	يَقَاتِلُ	ق ت ل	يَقْسِمَانِ	،،
يَفْتَنُ	ف ت ن	يَقَاتِلُونَ	،،	يَقْسِمُونَ	،،
يَفْتَنُونَ	،،	يَقَالُ	ق و ل	يَقْصُ	ق ص ص
يَفْتَنِينَ	،،	يَقْبِضُ	ق ب ض	يَقْصِرُونَ	ق ص ر
يَفْتِي	ف ت ي	يَقْبِضِينَ	،،	يَقْصُونَ	ق ص ص
يَفْجُرُ	ف ج ر	يَقْبِضُونَ	،،	يَقْضِي	ق ض ي
يَفْجُرُونَ	،،	يَقْبَلُ	ق ب ل	يَقْضُونَ	،،
يَفْرُ	ف ر ر	يَقْتَتِلَانِ	ق ت ل	يَقْطَعُ	ق ط ع
يَفْرَحُ	ف ر ح	يَقْتَرِفُ	ق ر ف	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْرَحُونَ	،،	يَقْتَرِفُونَ	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْرُطُ	ف ر ط	يَقْتَرُوا	ق ت ر	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْرُطُونَ	،،	يَقْتُلُ	ق ت ل	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْرُقُ	ف ر ق	يَقْتُلِينَ	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْرُقُونَ	،،	يَقْتُلُوا	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْسَحُ	ف س ح	يَقْتُلُونَ	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْسُدُ	ف س د	يَقْدَرُ	ق د ر	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْسُدُونَ	،،	يَقْدَرُونَ	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْسُقُونَ	ف س ق	يَقْدَمُ	ق د م	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْصِلُ	ف ص ل	يَقْذِفُ	ق ذ ف	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْعَلُ	ف ع ل	يَقْذِفُونَ	،،	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْعَلُونَ	،،	يَقْرَأُ	ق ر أ	يَقْطَعُونَ	،،
يَفْتَنُونَ	ف ق ه	يَقْرَبُوا	ق ر ب	يَقْطَعُونَ	،،



لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یقیمون	ق و م	یکفرون	ک ف ر	یلج	و ل ج
یقین	ی ق ن	یکفل	ک ف ل	یلحدون	ل ح د
یساء	ک و ن	یکفلون	،،	یلحقوا	ل ح ق
یکاد	ک و د	یکفون	ک ف ف	یلد	و ل د
یکادون	،،	یکفی	ک ف ی	یلدوا	،،
یکبت	ک ب ت	یککؤ	ک ل أ	یلعب	ل ع ب
یکبر	ک ب ر	یکاف	ک ل ف	یلعبون	،،
یکبروا	،،	یکلم	ک ل م	یلعن	ل ع ن
یکتب	ک ت ب	یککن	ک و ن	یلفظ	ل ف ظ
یکتبون	،،	یکنزون	ک ن ز	یلق	ل ق ی
یکتم	ک ت م	یکور	ک و ر	یلقی	،،
یکتمن	،،	یکون	ک و ن	یلقوا	،،
یکتمون	،،	یکونا	،،	یلقون	،،
یکد	ک و د	یکونون	،،	یلمز	ل م ز
یکذب	ک ذ ب	یکیدون	ک ی د	یلمزون	،،
یکذبون	،،	یلاقوا	ل ق ی	یلون	و ل ی
یکره	ک ر ه	یلبشون	ل ب ث	یلوون	ل و ی
یکرهون	،،	یلبس	ل ب س	یله	ل ه و
یکسب	ک س ب	یلبسوا	،،	یلهث	ل ه ث
یکسبون	،،	یلبسون	،،	یم	ی م م
یکشف	ک ش ف	یلت	و ل ت	یمارون	م ر ی
یکف	ک ف ف	یلتفت	ل ف ت	یمت	م و ت
یکف	ک ف ی	یلتقط	ل ق ط	یمترو	م ر ی
یکفر	ک ف ر	یلتقیان	ل ق ی	یمتع	م ت ع
یکفروا	،،				

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
يَمْتَعُونَ	م ت ع	يَمْنُ	م ن ن	يَنْبِذُ	ن ب ذ
يَمَحُ	م ح و	يَمْنِي	م ن ي	يَنْبَغِي	ب غ ي
يَمَحَصُ	م ح ص	يَمْنَعُونَ	م ن ع	يَنْبُوع	ن ب ع
يَمَحِقُ	م ح ق	يَمْنُونَ	م ن ن	يَنْتَصِرُونَ	ن ص ر
يَمَحُو	م ح و	يَمْنِي	م ن ي	يَنْتَظِرُ	ن ظ ر
يَمِدُ	م د د	يَمُوتُ	م و ت	يَنْتَظِرُونَ	,,
يَمِدُدُ	,,	يَمُوتُونَ	,,	يَنْتَقِمُ	ن ق م
يَمِدُونَ	,,	يَمُوتُوا	,,	يَنْتَه	ن ه ي
يَمْرُونَ	م ر ر	يَمُوجُ	م و ج	يَنْتَهُونَ	,,
يَمْسُ	م س س	يَمْهَدُونَ	م ه د	يَنْجِي	ن ج و
يَمْسَسُ	,,	يَمِيتُ	م و ت	يَنْجَحُونَ	ن ح ت
يَمْسِكُ	م س ك	يَمِيْزُ	م ي ز	يَنْذِرُ	ن ذ ر
يَمْسِكُونَ	,,	يَمِيلُونَ	م ي ل	يَنْذِرُونَ	,,
يَمْشُونَ	م ش ي	يَمِينُ	ي م ن	يَنْزِعُ	ن ز ع
يَمْشِي	,,	يَنْابِيعُ	ن ب ع	يَنْزِعُ	ن ز غ
يَمْكُثُ	م ك ث	يَنْادُونَ	ن د ي و	يَنْزِعُ	,,
يَمْكُرُ	م ك ر	يَنْادِي	,,	يَنْزِعُ	,,
يَمْكُرُونَ	,,	يَنْازِعُ	ن ز ع	يَنْزِفُونَ	ن ز ف
يَمْكُنُ	م ك ن	يَنْالُ	ن و ل	يَنْزِلُ	ن ز ل
يَمْكُنِينَ	,,	يَنْالُونَ	,,	يَنْسِي	ن س ي
يَمْلُ	م ل ل	يَنْثَوْنَ	ن ا ي	يَنْسُخُ	ن س خ
يَمْلِكُ	م ل ك	يَنْبِيْ	ن ب ا	يَنْسِفُ	ن س ف
يَمْلِكُونَ	,,	يَنْبَأُ	,,	يَنْسِلُونَ	ن س ل
يَمْلَلُ	م ل ل	يَنْبِتُ	ن ب ت	يَنْسِي	ن س ي

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یشوا	ن ش ا	ینقص	ن ق ص	یوثر	ا ث ر
یشی	،،	ینقصوا	،،	یوثرون	،،
یشیر	ن ش ر	ینقض	ق ض ض	یوثق	و ث ق
یشرون	،،	ینقضون	ن ق ض	یوجه	و ج ه
ینصر	ن ص ر	ینقلب	ق ل ب	یوح	و ح ی
ینصرون	،،	ینقلبون	،،	یوحی	،،
ینطق	ن ط ق	ینکت	ن ک ث	یوحون	،،
ینطقون	،،	ینکثون	،،	یوحي	،،
ینطلق	ط ل ق	ینکح	ن ک ح	یوخذ	أ خ ذ
ینظر	ن ظ ر	ینکعن	،،	یؤخر	أ خ ر
ینظرون	،،	ینکر	ن ک ر	یؤد	أ د ی
ینع	ی ن ع	ینکرون	،،	یسود	و د د
ینعق	ن ع ق	ینکسون	ن ک س	یودون	،،
ینغضون	ن غ ض	ینهی	ن ه ی	یوذن	أ ذ ن
ینفخ	ن ف خ	ینهون	،،	یؤذون	أ ذ ی
ینفد	ن ف د	ینیب	ن و ب	یؤذی	أ ذ ی
ینفروا	ن ف ر	یواخذ	أ خ ذ	یؤذین	،،
ینفضوا	ف ض ض	یوادون	و د د	یورث	و ر ث
یتفع	ن ف ع	یواری	و ر ی	یوزعون	و ز ع
ینفعون	،،	یواطئوا	و ط أ	یسوسف	و س و س
ینفق	ن ف ق	یویق	و ب ق	یوسف	،،
ینفقون	،،	یؤت	أ ت ی	یوسوس	و س و س
یمفوا	ن ف ی	یوقی	،،	یومی	و ص ی
یتقدون	ن ق ذ	یوتون	،،	یوصل	و ص ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
یوصین	و ص ی	یوقتون	ی ق ن	یهبط	ه ب ط
یوعدون	و ع د	یول	و ل ی	یهتدون	ه د ی
یوعظ	و ع ظ	یولج	و ل ج	یهجمعون	ه ج ع
یوعظون	و ع ظ	یولد	و ل د	یهدی	ه د ی
یوعون	و ع ی	یولف	و ل ف	یهدی	و
یوف	و ف ی	یولون	و ل ی	یهدون	ه د ی
یوفی	و ف ی	یولون	و ل و	یهرعون	ه ر ع
یوفضون	و ف ض	یوم	ی و م	یهزم	ه ز م
یوفق	و ف ق	یومئذ	و م اذا	یهلك	ه ل ك
یوفك	أ ف ك	یومرون	أ م ر	یهلكون	و
یوفكون	و ف ك	یومن	أ م ن	یهن	ه و ن
یوفون	و ف ی	یومنون	و م ن	یهود	و ه و د
یوفی	و ف ی	یومین	ی و م	یهودی	یهود
یوق	و ق ی	یونس	یونس	یهی	ه ی أ
یوقد	و ق د	یهاجر	ه ج ر	یهیج	ه ی ج
یوقدون	و ق د	یهاجروا	و ه ج ر	یهیمون	ه ی م
یوقع	و ق ع	یهب	و ه ب	یهیس	ی أ س

## اغلاط نامہ مبادیات و فہرست

کوشش کے باوجود طباعت میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ ان غلطیوں کی تصحیح ابھی کر لیں۔ ان میں بعض مقاسات پر تو صرف حروف اڑ گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۷ سطر ۱۰۔ کم کرنے والا۔ صفحہ ۱۴۔ نہیں کے صیغے۔ صفحہ ۷۳۔ مر بجائے امر۔ صفحہ ۴۳ سطر ۱۲۔ مضارع۔ صفحہ ۴۸۔ وزان بجائے اوزان۔ لیکن ذیل کی غلطیاں ایسی ہیں جن کا اثر معانی پر پڑتا ہے اس لئے ان کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

صفحہ سطر	تصحیح	صفحہ سطر	تصحیح	
۲۲	۵	فَعَلَ کی جگہ فَعَلْ	۱۲۵	ساہرۃ کے سامنے م س ہ ر
۳۰	۱	اَفْتَعَالَ کی جگہ اَفْتَعَالَ	۱۳۱	صلی کی جگہ صلی
۳۰	۵	یَسَوَاعِدُ کی جگہ یَسَوَاعِدُ	۱۵۱	مُسْتَم کے سامنے ت م م
۳۹	۶	اَسْتَبِيعَ کی جگہ اَسْتَبِيعَ	۱۶۱	متوکل کے سامنے و ک ل
۷۰		اَنَسَ کے سامنے ا ن م	۱۶۱	نا کے سامنے نا
۷۶		ہوا کی جگہ ابوا	۱۶۲	تبراء کی جگہ تبرأ
۸۸		اَقْطَار کے سامنے ق ط ر	۱۶۳	نذہب کے سامنے ذ ہ ب
۸۹		الہم کے سامنے ل ہ م	۱۷۳	یحکم کے سامنے ح ک م
۱۰۴		تصبر کے سامنے ص ب ر	۱۷۷	یسفی کے بجائے یسفی
۱۱۴		حصل کے سامنے ح ص ل	۱۷۸	پہلا کالم آخری سطر کے
۱۲۳		زالتا کے سامنے ز و ل	۱۸۴	بجائے یشہد۔ ش ہ د
				یؤذون کے سامنے ا ذ ی